بیس (۲۰) بڑے مسلمان

- حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ
- مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
- مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
- شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
- مولانا اشرف علی تھانویؒ
- علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ
- مولانا عبید اللہ سندھیؒ
- مفتی کفایت اللہ دہلویؒ
- مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
- علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
- مولانا محمد الیاس دہلویؒ
- مولانا شاہ عبد القادر رائپوریؒ
- مولانا احمد علی لاہوریؒ
- مفتی محمد حسن امرتسریؒ
- مولانا ابو الکلام آزاد
- مولانا محمد علی جوہر
- مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ
- مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
- مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ
- سردار احمد خان پتافی

جمع و ترتیب : عبد الرشید ارشد

إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ

اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہونگے تو دو سو پر غالب آجائیں گے۔

(الانفال : ٦٦)

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ

فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ

ان ایمان والوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا۔

اسے سچ کر دکھایا۔ پھر ان میں کچھ وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے — اور کچھ وہ ہیں جو

(شہادت کے) مشتاق ہیں

(الاحزاب : ٢٤)

پیس (۲۰)
بڑے مسلمان
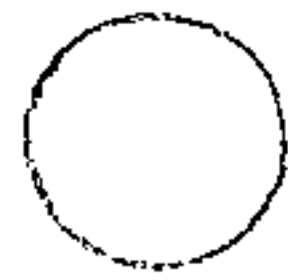
ترتیب

عبدالرشید ارشد

مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ
۳۲-اے شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

انتساب

- والدِ محترم حضرت حاجی تاج محمدؒ صاحب مدظلہ
- استاذی حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مدظلہ شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ ساہیوال
- برادرِ بزرگ حکیم حافظ محمدؒ اسلم صاحب زاد اللہ محاسنہٗ

کے نام

جن کی پُرخلوص دُعاؤں، مُشفقانہ تربیت اور سلامتیٔ فکر و عمل کا یہ فیضان ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اِس کتاب کی ترتیب و تدوین کی عزّت و سعادت بخشی

اجمالی فہرست

بِسْمِ اللّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

گُزارشِ احوال

اُولٰئِكَ آبَائِی فَجِئْنِی بِمِثْلِهِمْ   اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

کتاب "بیس بڑے مسلمان" آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں جن اکابر کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہا جا
ہے کہ ان کی پوری زندگی کتاب و سنت کی اشاعت و تبلیغ اور ملک و ملت کی آزادی کے لیے وقف تھی۔ اور اس فریضہ کو ا
کرتے ہوئے انہوں نے اپنی پاکیزہ زندگی میں علم و بصیرت، تقویٰ و ایثار۔ جہد و عمل اور خلوص و للہیت کی ایسی تابندہ و درخش
روایات قائم کی ہیں جن کی بہت کم مثالیں تاریخ عالم میں ملتی ہیں۔ یہ بزرگ ہستیاں غازی اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے
جذبۂ اقامتِ دین اور علم و سیاست، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کتاب و سنت سے مستفاد و مستنیر فکر و فلسفہ ا
حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سوزِ دروں، سلوک و تزکیہ نفس، دعوت و عزیمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا بہتر
حسین مرقع تھیں۔

اس کتاب کے لیے اکابر کے اسمائے گرامی کا انتخاب کرتے وقت مختلف نقشے ہمارے سامنے آئے۔ اور بالآخر
نقشہ ترتیب پایا جو آپ کے سامنے ہے۔ اس برصغیر میں —— ان اکابر کے علاوہ بھی بہت سی نامور ہستیاں یقیناً ایسی ہیں
کے سیر و سوانح کو محفوظ کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کتاب میں پیش کیے جانے والے حضرات کے تذکار کا —— خص
حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادی، حضرت مولانا حسین علیؒ واں بھچراں، حضرت م
ظہیر احسن محدث نیمویؒ، حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ، حضرت محمد عبداللہ سلیم پوریؒ (کندیاں والے)، حضرت م
حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ اور دوسرے متعدد حضرات کی پاکیزہ زندگیاں اس قابل ہیں کہ ان کا مستقل تذکرہ کیا جائے۔ ہم ا
کتاب سے فارغ ہو کر انشاء اللہ اس طرف متوجہ ہوں گے۔ اور عزم یہ ہے کہ سیر و سوانح کے سلسلے میں برصغیر پاک و
کے ان تمام علماء و مشائخ کا تذکرہ محفوظ کر دیں۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس خطہ زمین میں ملک و
کی خدمات سرانجام دیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہم اس کے اتمام کی دعا کرتے ہیں۔

جن اصحاب کا ہم نے اس کتاب میں تذکرہ کیا ہے انہوں نے امت مسلمہ کے لیے جو عظیم الشان کارہائے نمایاں
دئے۔ ان پر وہ ملک و ملت سے کسی صلہ و ستائش یا داد و تحسین کے طالب نہیں تھے۔ ان کی نظر "ان اجری الا علی ال
پر رہی، رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر انہوں نے خدا کے بندوں کو اس کے دین کی دعوت پہنچائی۔ اور اس
زمانے کے گرم و سرد کو انتہائی خندہ پیشانی اور صبر و ثبات سے برداشت کیا۔ یہ لوگ خود تو ملک بدر ہوئے، قید و بن
سے گذرے، شعلوں میں کود سے، آگ سے کھیلے، طوفانوں سے ٹکرائے اور سلطنت برطانیہ کے جاہ و جلال اور جبر و استبداد
کا مقابلہ کیا لیکن اس کے بدلے میں ہمیں صحیح دین، خالص توحید، عشقِ رسالت، احترامِ اسلاف، علم و عمل کے بے پ

جذبے اور آزادی کی نعمت عظمیٰ کی دولت سے مالا مال کر گئے۔ —— ان کی بلندیٔ کردار، حسن عمل اور پاکیزگی سیرت کو تاریخ کے صفحات پر محفوظ کرنا اور ان کے افکار و خیالات سے افرادِ ملت کو روشناس کرانا وقت کا اہم تقاضا تھا۔ ہم نے اپنی کم مائیگی اور کوتاہ علمی کے باوجود یہ سعادت و شرف حاصل کرنے کی جہد و سعی کی ہے اس میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ قارئین پر چھوڑتے ہیں

کتاب کی کتابت مختلف خوشنویسوں سے کرائی گئی اور ہمیں اندازہ نہ رہا کہ کتنے صفحات ہو گئے ہیں تمام کو جمع کرنے کے بعد شمار کیا گیا تو تقریباً بارہ صد صفحات تھے۔ مجبوراً تین صد کے قریب صفحات کا اخراج کیا گیا۔ لیکن یہ اخراج اس طرح کیا گیا کہ اس کا کتاب پر کوئی اثر نہ پڑے۔ یہ خارج شدہ مواد بجائے خود بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے لہذا اسے جلدی علیحدہ مستقل کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ اتنا مواد خارج کرنے کے باوجود کتاب کی ضخامت اندازہ سے خاصی زیادہ ہو گئی اس غیر متوقع اضافہ اور کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر بہترین جلد بندی کے سبب اعلان کردہ قیمت میں اضافہ ناگزیر تھا امید ہے کہ قارئین محسوس نہیں فرمائیں گے۔

آخر میں تمام مضمون نگار اصحاب اور اپنے ان بزرگوں اور رفقاء کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے رشحاتِ قلم سے یہ کتاب مرتب و مزین ہوئی اور جن کی کرمفرمائیوں اور دعاؤں سے یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی —— علامہ خالد محمود صاحب اور محترم سید انور حسین صاحب نفیس رقم کی مربیانہ و مشفقانہ سرپرستی اور برادرِ عزیز حافظ محمد اکرم سہیل کے تعاون و محنت پر ان کا ممنون ہوں، مولوی مرتضیٰ حسن نے مسودات و مضامین کے نقل کرنے میں جو کام کیا۔ اس پر ان کا شکریہ بھی واجب ہے —— اور یہ کتاب پیش کرتے ہوئے ان سب حضرات کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن چھ ماہ کی قلیل مدت میں ختم ہو گیا۔ اتنی بڑی کتاب کا اتنی مختصر سی مدت میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونا اس کی اہمیت و افادیت کی دلیل ہے۔ لیکن دوسری اشاعتی مصروفیات کی بنا پر دوسرا ایڈیشن تاخیر سے پیش کیا جا رہا ہے۔ چونکہ "بیس اکابر" میں سے اکثر و بیشتر مسند رشد و ہدایت پر فائز تھے لہذا نئے ایڈیشن کے آخر میں سلوک و تصوف کے متعلق چار اہم مضمون شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ کتاب کے مطالعہ کرتے ہوئے اس سلسلہ میں کوئی اشکال پیدا ہو تو اس کا حل ہو سکے۔ اور اسی طرح آخر میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے متعلق ایک اہم مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس اضافے اور کاغذ کی ہوشربا گرانی کے باعث کتاب کی قیمت میں معمولی اضافہ کیا گیا ہے۔

۱۷ر شوال ۱۳۹۰ھ ۱۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء عبدالرشید ارشد

بار اول	۱۱۰۰	[illegible]
بار دوم	۱۱۰۰	[illegible]
بار سوم	۱۱۰۰	جولائی ۱۹۷۵ء

مولا والا پرنٹرز ملت بلڈنگ سرکلر روڈ لاہور

"بیس۲۰ بڑے مسلمان"

مسلمانوں کے بڑے اور ہیرو بیس اور تیس کی قید سے ہمیشہ آزاد اور بالاتر رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہزاراں ہیروؤں اور بڑوں سے بھرا پڑا ہے، اور ان میں جو بھی نظر آتا ہے مع اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بڑا ہی نظر پڑتا ہے۔ محدثین ہوں، مفسرین، فقہاء ہوں یا متکلمین، صوفیاء ہوں یا عارفین، حکماء ہوں یا اصولیین، اخیار ہوں یا مورخین، غزاۃ ہوں یا مجاہدین، خلفاء ہوں یا سیاسیین، امت کے جس دور پر بھی نگاہ ڈالی جائے وہ بیس تیس یا چالیس پچاس نہیں، ہزاراں ہزار کی تعداد میں نظر پڑیں گے۔ اور اپنے اپنے رنگ کا ہر ایک بڑا ہی نظر پڑے گا جو ایک ہو کر بھی ایک امت کی برابر ہوگا۔ حتی کہ اس دورِ انحطاط اور زمانہ قحط الرجال میں بھی اور بڑوں کی کوئی کمی محسوس نہ ہوگی کہ انہیں بیس تیس کی حدود میں محدود کیا جا سکے۔

پھر بھی "بیس بڑے مسلمان" کی تصنیف میں یہ عشر بینی، بڑوں کی کمی کی بنا پر نہیں بلکہ وسائل کی قلت کی بنا پر ہے، جیسا کہ خود مولف کتاب نے بھی اسے واضح کرتے ہوئے اس عشر بینی کے سوا اور بھی مثالی شخصیتوں اور بڑوں کے نام گنائے ہیں جو اس کتاب میں نہیں آسکے۔ مقصد کتاب محض نام بردہ شخصیتوں یا ان بڑوں کی منفرد ہستیوں کو سامنے لانا نہیں بلکہ ان عہد آفریں شخصیتوں کے سلسلہ سے مسلمانوں اور اسلام کی ایک جامع تاریخ کو پیش کرنا ہے جو شخصی تعارف نہیں بلکہ ایک مثالی تاریخ کا تعارف ہے۔

(یہ بیس بڑے مسلمان جنہیں اس کتاب میں متعارف کرایا گیا ہے کسی ایک دائرہ یا کسی ایک ہی لائن کے لوگ نہیں بلکہ متعدد گوشہ ہائے زندگی کی مختلف لائنوں کی مجسم اور منضبط تاریخ ہیں جن کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر ایک راہ رو۔۔ راہ، نشانِ راہ اور منزلِ راہ متعین کر سکتا ہے کیونکہ ان شخصیتوں کا ابھر کر ہونا درحقیقت اسلام اور سچے مسلمانوں کے مختلف مقاماتِ زندگی اور ان مقامات کے علوم و معارف کا نمایاں سامنے آجانا ہے جبکہ وہ ان راہوں پر چل چکے ہیں اور اثناء راہ کی ساری مشکلات کو عبور کر کے نشاناتِ راہ اور استقامتِ راہ کا پتہ دے گئے ہیں)

اس لئے محترم مولف کتاب کا ہم سب مسلمانوں کو ممنون ہونا چاہئیے کہ انہوں نے صرف بیس۲۰ مثالی شخصیتوں ہی کو نہیں پہنچوایا، بلکہ چلنے والوں اور عزم راہ رکھنے والوں کے لئے بیس۲۰ سے کہیں زیادہ اصولی راستوں کی نشان دہی کر دی ہے جن میں سے ہر ایک راستہ منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے کافی وافی اور شافی ہے۔ یہ شخصیتیں روشنی کے مینار ہیں کہ ان میں سے جس کی روشنی میں بھی گامزنی کی جائے گی، منزلِ مقصود آجائے گی۔ فجزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔

حق تعالیٰ ان مبارک ہستیوں کی قبروں کو نور سے بھرے اور راہ نوردوں کو ان کی راہ پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

محمد طیب غفی عنہ۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند

وارد حال لاہور — ۸ ر اکتوبر ۱۹۷ء

مُرتّبِ کتاب

صحیح تاریخ اور سن تو یاد نہیں، بعض دوسرے خاندانی واقعات کی روشنی میں قیاس کر کے اپنی تاریخ پیدائش یکم ستمبر ۱۹۳۲ء ٹھیرائی ہے جائے پیدائش آبائی گاؤں ہری پور تحصیل نکودر ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) ہے۔ ہمارے گاؤں کی نصف آبادی راعی مسلمانوں اور نصف سکھوں کی تھی، اگر ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہمارے گاؤں کے مسلمان گاؤں سے نکلنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی تاخیر کر دیتے تو شاید ایک فرد بھی زندہ نہ بچتا۔

پرائمری اپنے گاؤں سے کر کے نکودر ہائی سکول پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ چھٹی جماعت کا آغاز کیا تھا کہ والد ماجد[1] کے حکم سے ہائی سکول چھوڑ کر مدرسہ عربیہ خلیلیہ نکودر میں حضرت قاری تاج محمدؒ (حال عبدالحکیم ضلع ملتان) سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا۔ بڑے بھائی حافظ محمد اسلم صاحب بھی یہیں قرآن پاک حفظ کر کے دہرا رہے تھے۔ سوا پارہ حفظ کرنے کے بعد مشرقی پنجاب کی مشہور دینی درس گاہ مدرسہ رشیدیہ[2] رائے پور میں قرآن پاک حفظ کر کے درسِ نظامی کی کتب شروع کیں۔

---

[1] والد ماجد حاجی تاج محمد صاحب میرے خاندان کے کئی دوسرے افراد کی طرح بغرضِ معاش پہلے افریقہ اور ان دنوں برطانیہ میں تھے۔ آغازِ شباب ہی سے رائے پور آمد و رفت کی وجہ سے متشرع اور پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے۔ افریقہ اور برطانیہ میں بھی بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

لندن میں بھی نہ چھوٹے مجھ سے آدابِ سحر خیزی

ایسے رہے جیسے خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون میں رہ رہے ہوں۔ خاندان کے بعض دوسرے افراد چودھری ولی محمد گو ہیر (رشتے میں پھوپھا جو بعد میں ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہوئے) تایا زاد بھائی محمد مختار (حال ڈائریکٹر واپڈا) جو ان دنوں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں پڑھ رہے تھے کے تقاضا و اصرار کے باوجود کہ مجھے جدید اعلیٰ تعلیم دلائی جائے، والد صاحب کا حکم غالب رہا۔ وہ اگر چاہتے تو مجھے برطانیہ بلا کر تعلیم دلا سکتے تھے اور ان دنوں یہ بہت سہل تھا لیکن ان کی یہ کیفیت تھی

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ　　سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

آج برطانیہ میں تبلیغی جماعت اور بعض دوسری تنظیموں کی بدولت ان گنت چہروں پر مسنون داڑھی دکھائی دیتی ہے لیکن ۴۸-۱۹۴۹ء میں شاید وہ تنہا اس استقامت پر عمل پیرا تھے۔ ان کے جذبِ دروں اور آہِ سحر گاہی کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ میں دینی اور تبلیغی امور کو فروغ ہوا۔ برطانیہ کے دوسرے بڑے شہر میں جمعیۃ المسلمین قائم ہوئی جس کے وہ برسوں امیر رہے۔ برمنگھم میں اسی جمعیۃ نے چار لاکھ پونڈ کے صرفے سے یورپ کی سب سے بڑی جامع مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جو آج کل ایک ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام تکمیل کے مراحل میں ہے۔ جنرل حق نواز تبلیغی جماعت کے ایک سفر میں والد صاحب سے ملے۔ مجھے خط لکھا کہ "آپ کے والد صحیح معنوں میں مردِ مومن ہیں"۔ یہی کچھ تاثر کرنل الٰہی بخش معالج بانیٔ پاکستان کے والد میاں محمد بخش، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور قاضی عبدالقادر جھاوریاں اور ان سے ملنے والے ہر شخص کا ہے۔ امسال حج کر کے وطن تشریف لا کر یہاں چنیوٹ میں قیام فرما ہیں، خدائے تعالیٰ ان کا سایہ سلامت با کرامت رکھے۔

[2] حال جامعہ رشیدیہ ساہیوال۔ یہ ہمارے گاؤں سے تین میل جانب جنوب دریائے ستلج کے کنارے واقع تھا۔

ہمارے گاؤں میں میرے تایا بابو فتح محمد نمبردار کو اخبار "مدینہ" بجنور اور چچا چودھری رحمت اللہ کو "زمزم" لاہور آیا کرتے تھے۔ پرائمری ہی سے ان کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ دادا جان کے پاس قصے کہانیوں کی کتابیں حاتم طائی، الف لیلہ، چہار درویش وغیرہ اور ان کے چچا زاد بھائی کے ہاں طلسم ہوشربا کے ساتوں دفتر تھے۔ ان سب کو بار بار پڑھتا رہتا۔ خاندان کے اکثر افراد بر طانیہ تھے۔ ان کی باتیں سنتا۔ تقریباً سات آٹھ سال کی عمر میں اپنے گاؤں سے دو میل دور مختم پور میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو ایک جلسہ میں تقریریں کرتے سنا جو یاد نہیں کیا تھیں البتہ عبدالرحیم عاجز مرحوم کی پنجابی نظم کا پہلا شعر اب تک یاد ہے ؎

راتیں سُتیاں پیاں میں نوں اک خواب آ گیا — گئے بدلشی ایتھوں ایتھے انقلاب آ گیا

تیرہ سال کی عمر میں اپنے گاؤں سے بارہ میل دور ملسیاں جا کر حاجی محمد شفیع (حال لاہور) کے ہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تقریر سنی۔ اسی کے لگ بھگ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کی زیارت کی (حضرت سے بیعت پاکستان میں کی) علامہ حافظ غلام رسول صدر المدرسین جامعہ رشیدیہ ساہی وال ان دنوں رائے پور کنز الدقائق وغیرہ پڑھتے تھے ان دنوں بھی ان پر رشک آتا تھا اور آج بھی، رائے پور میں تعلیم کے دوران وہیں کے ایک طالب علم "رشید احمد"[1] سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں دیوبند پڑھتے تھے اور رائے پور کے مدرسہ میں ان کی بہت شہرت تھی۔ ان کی باتیں سنیں۔ دیوبند کے حالات پڑھتا اور سنتا رہتا تھا۔ اب وہاں کے ایک طالب علم کو دیکھا۔ تایا زاد بھائی سے جو علیگڑھ پڑھتے تھے۔ ان کے گھر آنے پر اکثر گفتگو اور بحث و مذاکرہ رہتا۔ چودھری ولی محمد کو ہیر اکثر ہمارے گاؤں آتے اور کئی کئی ہفتے قیام کرتے ان کے پاس دنیا بھر کے اخبارات و رسائل آتے۔ ان کو دیکھنے کا موقع ملتا۔ میں گاؤں میں پیدا ہوا، گاؤں میں پلا بڑھا لیکن مندرجہ بالا واقعات و حالات نے طبع میں روشنی اور جولانی پیدا کی اور اُمنگ پیدا ہوئی کہ گاؤں سے نکل کر کسی بڑے شہر کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کروں لیکن وہ جگہ کون سی ہو دارالعلوم دیوبند میں بڑی کتب میں داخلہ مل سکتا تھا اور سر میں سودا یہ بھی سمایا تھا کہ ایسی درسگاہ ہو جہاں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم کا اہتمام ہو۔ جامعہ ملیہ پر نظر انتخاب پڑی، خط و کتابت کی، میری عمر زیادہ اور استعداد کم تھی۔ تین سال کا نصاب منگا کر تیاری شروع کی کہ اس طرح چھلانگ لگا کر آٹھویں میں داخلہ لیا جائے۔

ملکی سیاست عروج پر تھی۔ انتخابات کی آمد آمد تھی، دو سال یونہی ضائع ہو گئے ———— قیام پاکستان پر قافلے کے ساتھ چل کر پاکستان آ کر ڈیڑھ دو ماہ ادھر اُدھر پھر کر میاں چنوں ضلع ملتان میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ اور ایک سال مزید ضائع ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء میں مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان میں داخل ہو کر دوبارہ درس نظامی کی کتب شروع کیں لیکن یہ جان کر کہ تکمیل نصاب میں آٹھ سال لگیں گے۔ واپس میاں چنوں آ کر حضرت مولانا محمد ابراہیم[2] صاحب جگراؤنوی کے مدرسہ عربیہ میں حضرت موصوف سے اور حضرت مولانا محمد عبداللہ[3] دھرم کوٹی سے منتخب کتب پڑھ کر، جامعہ رشیدیہ ساہی وال

---

[1] ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، قیام پاکستان کے بعد جامعہ عباسیہ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے جامعہ ازہر (مصر) گئے۔ کئی سال وہاں پڑھ کر اور رہ کر آکسفورڈ سے تصوف میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل پیپلز اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں صدر علوم اسلامیہ ہیں۔

[2] حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صورت و سیرت کے لحاظ سے مثالی بزرگ تھے، حضرت مولانا گنگوہیؒ سے ابتداً بیعت ہوئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے بعد سوائے نبی اور صحابی کے کسی بزرگ کی زیارت کی حسرت نہیں اور نبی و صحابی کی زیارت بیداری میں ممکن نہیں۔

(بقیہ حاشیہ [2] اور [3] اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مشکوٰۃ جلالین تک پڑھ کر اس سے اگلے سال دوبارہ مدرسہ عربی خیر المدارس میں داخل ہو کر ۱۹۵۳ء میں دورۂ حدیث کر کے سندِ فراغت لی۔ مولانا محمد یوسف مدیر "بینات" کراچی دورہ کے ساتھی تھے۔ اُن دنوں بھی اُن کی علمی و عملی بلندی کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا تھا اور آج بھی۔ اور اسی دورہ کے سال میں چند ماہ ضلع لائل پور کی مشہور دینی درسگاہ دار العلوم ربانیہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد رفیق کشمیری سے استفادہ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں منشی فاضل کیا۔

نشر و اشاعت، امامت و خطابت: ملتان سے فراغت کے بعد حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کے حکم پر ایک مسجد میں امامت و خطابت کا آغاز کیا اور ان کی سرپرستی میں ادارۂ اشاعت دینِ قیّم میاں چنوں کی بنا ڈالی جس کی جانب سے کئی سالانہ سیرت کانفرنسیں اور بیسیوں تبلیغی اجلاس منعقد کرائے۔ مکتبہ رشیدیہ کے نام سے سکول کی کتب کی دکان کی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ پر مشاہیر شعراء کی کہی ہوئی نظموں کا رزمیہ انتخاب بنام "نغماتِ جہاد" شائع کیا جس کی ایک ہزار کاپی اہالیانِ میاں چنوں نے فوج کو بھیجی —— ایک چارٹ "شجرۂ روحانی و علماءِ ربانی" اکابر دیوبند کے سلاسلِ سلوک پر شائع کیا، جس کی حضرت قاری محمد طیب نے خصوصاً بہت تعریف فرمائی۔ اور چند ایک چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرائے۔ ۱۹۴۸ء میں ریڈرز ڈائجسٹ کے متعلق نوائے وقت میں مضمون پڑھا کہ پندرہ سولہ معروف زبانوں میں کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ اس طرح کا رسالہ نکالنے کی دُھن انہی دنوں سے سوار ہو گئی، وسائل نہ تھے۔ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ماہنامہ "عمران" کی درخواست دی جو سی۔ آئی۔ ڈی کی نذر ہو گئی۔ ۱۹۶۳ء میں ایک سال ہفت روزہ "دعوت" کی ادارت کی۔ میرا ذہن ابتدا ہی سے اس طرف چل رہا تھا کہ عمدہ اشاعتی ادارہ ہونا چاہیے۔ ۱۹۶۰ء میں "چٹان" کے سالنامہ میں آغا شورش کاشمیری نے "ندوۃ المصنّفین" دہلی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ —— کاش! پاکستان کے مذہبی دیوانے بھی اس پر غور کریں اور ملک میں ندوہ جیسا کوئی معیاری اشاعتی ادارہ قائم کریں۔ اس بات نے مہمیز کا کام کیا اور میں نے ۹/۱/۶۰ کو روزنامچہ میں لکھا کہ —— "ان شاء اللہ کبھی نہ کبھی دن ایک معیاری اشاعتی ادارہ پبلک لمیٹڈ کمپنی کی شکل میں قائم کیا جائے گا" —— اور یہ درد لے کر اِدھر اُدھر دستک دیتا رہا کہ مل کر ایسا ادارہ قائم کیا جائے۔ مولانا سید نیاز احمد شاہ گیلانی، علامہ خالد محمود ایم۔ اے مولانا مقبول احمد ساہیوال (حال گلاسگو) کے ساتھ ایک مجلسِ مشاورت میں "ادارہ حفظ معارفِ اسلام لاہور" کی بنیاد رکھی گئی لیکن اس ادارے کی زندگی دو تین کتب کی اشاعت تک محدود رہی۔ راقم اس کا مہتمم تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا عبداللہ درخواستی کی صدارت میں ایک ایسی ہی مجلس میں ایک ادارہ بنام "دار المؤلفین" کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ مولانا محمد علی جالندھری مہتمم، مولانا سید حامد میاں ناظم اعلیٰ، راقم ناظم نشر و اشاعت اور حکیم محمود ظفر سیالکوٹی خازن مقرر ہوئے۔ اس کی تین چار مجلسیں ہوئیں لیکن نشستند و گفتند و برخاستند کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا ——

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سوائے ان لوگوں کے جو حضرت مسیح علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر زندہ ہوں۔ صبح تہجد کے لیے اُٹھے، وضو کیا، چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھے تھے کہ گر کر جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ وفات سے اگلے سال بارش سے قبر کھل گئی، نعش کو کئی گھنٹے باہر نکال کر دوبارہ قبر ٹھیک کر کے دفن کیے گئے۔ عینی شاہدوں کا حلفیہ بیان ہے کہ جسم کے وزن اور لچک میں کوئی کمی نہ تھی۔ حتّٰی کہ منہ پر گرنے سے چوٹ کا نشان ایسے تھا جیسے غسل دینے کے وقت تھا۔ ایک صاحب نے پنجہ کو ہلا جلا کر دیکھا تو اس میں پوری لچک تھی۔

۳؎ مولانا مرحوم حضرت مولانا ابراہیم صاحب کے پہلے شاگردوں میں سے تھے۔ اپنے مرشد حضرت رائے پوری سے عشق تھا۔ بہت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ صحیح معنوں میں صوفی اور عالم باعمل تھے۔ ۱۹۶۳ء میں انتقال فرمایا۔

بیس بڑے مسلمان : انہی دنوں مجھے خیال ہوا کہ جن حضرات نے گزشتہ صدی ملک و ملت کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کیے رکھیں اور اشاعت اسلام، تحریک آزادی کے لیے کام کیا۔ ان کے تذکار و سوانح پر ایک کتاب ترتیب دینا چاہیے چنانچہ "بیس بڑے مسلمان" کے نام سے کتاب کا اعلان کر دیا۔ پانچ چھ سال بعد اللہ کا نام لے کر ۱۹۶۷ء میں لاہور آ کر مکتبہ رشیدیہ کے نام سے کام شروع کیا۔ پہلی کتاب تذکرہ مولانا محمد یوسف دہلویؒ کے نام سے شائع کی۔ اس کے بعد النبی الخاتمؐ جس کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ نیشنل بک سنٹر سے اس کتاب کی تزئین و آرائش پر اول انعام ملا۔ "بیس بڑے مسلمان" کتاب بھی شائع ہوئی جس کا تیسرا ایڈیشن قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ الحمدللہ یہ کتاب دستاویزی اور حوالہ جات کی کتب میں شمار ہوتی ہے

برطانیہ کی سیاحت : ستمبر ۱۹۷۱ء میں برطانیہ سیاحت کے ویزے پر جانا ہوا۔ برطانیہ میں میرے احباب و رشتہ دار اتنے ہیں جتنے شاید پاکستان میں نہ ہوں۔ جاتے ہوئے چھ دن کابل ٹھہرنا ہوا۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ یہاں کے لوگوں نے (انگریزوں کی خفیہ تحریک پر) امان اللہ خاں کو اس لیے ملک بدر کر دیا تھا کہ اس کی بیوی کا فوٹو چھپا تھا اب وہاں نوجوان لڑکیاں سکرٹ پہنے پھر رہی ہیں۔ چار ماہ برطانیہ رہ کر تقریباً ہر بڑے شہر میں گیا۔ ایڈنبرا مانچسٹر یونیورسٹیوں کی لائبریریاں دیکھیں۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کی مہربانی سے برٹش میوزیم (لندن) دو دفعہ جانا ہوا۔ اردو، عربی، فارسی کی کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ وہاں موجود ہے کہ دیکھ کر حیرانی ہوئی اور یہ بات سمجھ آئی کہ علامہ اقبالؒ نے یہ مصرع کیوں کہا تھا ع

کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں جا کے یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور بانی جماعت اسلامی دونوں بڑھاپے کی عمر میں برطانیہ وغیرہ گئے۔ کاش ہمارے طلباء علماء نوجوانی میں برطانیہ جائیں اور وہاں سے عبرت حاصل کریں کہ "کافر" علمی دنیا میں بھی ہم سے کس قدر آگے ہیں۔ برطانیہ گیا تو ملک سالم تھا۔ واپس آیا تو ایک بازو کٹ چکا تھا۔ واپسی پر چند گھنٹے عمان ایئرپورٹ پر ٹھہرنا ہوا۔ ایئرپورٹ کی شکستہ حالت اور زنانہ ویرانی دیکھ کر روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

پبلک لمیٹڈ کمپنی : جس عزم کا اظہار جنوری ۱۹۶۰ء میں کیا تھا اس نے حقیقت اور واقعہ کی شکل دسمبر ۱۹۷۳ء میں اختیار کی کہ مکتبہ رشیدیہ پبلک لمیٹڈ کمپنی کی شکل میں معرض وجود میں آ گیا اور قیام پاکستان کے بعد غالباً مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ پہلا اشاعتی ادارہ ہے جو بطور پبلک لمیٹڈ کمپنی قائم ہوا۔ مکتبہ کی جانب سے اب تک سولہ سترہ عمدہ کتب شائع ہو چکی ہیں جس میں مکاتیب سید احمد شہید (فارسی مخطوطہ) تفسیر روح المعانی (عربی) (مشتمل بر سولہ جلد، بارہ جلدیں شائع ہو چکی) بیس بڑے مسلمان، تفسیر عثمانی بترجمہ حضرت شیخ الہندؒ جیسی ضخیم کتب شامل ہیں۔ یہاں تک پہنچنے میں کتنی دشواریاں پیش آئیں اسکے بیان کا یہ محل نہیں ہے۔ میرے عزائم میں فراوانی لیکن عمل میں شدید کوتاہی رہی ہے لیکن بزرگوں کا چلن ہمیشہ مشعل راہ بن کر صراط مستقیم پر چلاتا رہا ہے خواب میں بچپن سے مسلسل دیکھتا آ رہا ہوں، اب اس کی تعبیر کے نقوش ابھرنے شروع ہوئے ہیں۔ تصویر مکمل ہوتی ہے یا نہیں اس کا علم و اختیار خدا کو ہے لیکن اس کے فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کام ضرور لیں گے۔

استغفر اللہ واتوب الیہ۔ افوض امری الی اللہ وہو المستعان وعلیہ التکلان

۱۱ / ۲۴ عبد الرشید

قرآن کریم نظم و معنی کے مجموعہ کا نام ہے۔ جہاں الفاظ کا یہ نظم نہیں وہ قرآن نہیں یہی وجہ ہے کہ محض ترجمہ قرآن کو قرآن نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہاں الفاظ کی وہ نشست اور ترتیب نہیں رہی۔ اسی طرح اگر معانی کی تعبیر غلط ہو تو بھی قرآن محفوظ نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی صحیح مرادات بتلانے والا طبقہ ہر دور میں موجود رہا۔ پس قرآن پاک کی وہی تعبیر صحیح ہے جس کا حال اس کے ماضی سے منقطع نہ ہو اور ہم صرف اسی تعبیر کو اختیار کر سکتے ہیں جو اسلام کے اسنادی پہلو سے کہیں نہ ٹکرائے۔ اسلام کے تسلسل حیات اور حفظِ دین کی خصوصیت اس کا اسنادی پہلو ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر اسے تھامے رہنا اسلام کا ایک معجزہ ہے اسباب کی دنیا میں اس کا باعث وہ علمائے ربّانی رہے ہیں جو آج سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم تک زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ صحابہؓ کے بعد کوئی طبقہ بحیثیت طبقہ کے مقدس نہیں کہ پورے طبقہ کو پاک باطن اور بلا استثناء عدول کہا جائے لیکن پھر بھی اس امّت کا کوئی قرن مصلحوں، ہادیوں، مجدّدوں اور مقدّسین سے خالی نہیں رہا اور ائمہ علوم، ائمہ ہدایت اور ائمہ کمالات ظاہر و باطن کی کسی دور میں نفی نہیں ہوئی۔ ان وارثانِ نبوّت میں کوئی طبقہ نسبتِ ایمان و احسان کا محافظ رہا کوئی نسبتِ احسان و عرفان کا، کوئی الفاظِ قرآن کا اور کوئی سنّتِ صاحب قرآن کا، اور یہ سب طبقے اپنے عصری تقاضوں کے ساتھ تاقیامت باقی رہیں گے۔ یہی اسلام کی زندگی ہے اور یہی اسلام کا تسلسل ہے۔

قرآن کریم کی ابدی حفاظت کا دائرہ الفاظِ کتاب اور مطالبِ کتاب ہر دو کو محیط ہے جس طرح اس کے نقوشِ کتابیہ ہر تحریفِ لفظی سے محفوظ ہیں اس کے معانی و مطالب بھی ہر تحریفِ معنوی سے مصئون ہیں۔ الفاظ اور معانی و مطالب دونوں کی حفاظت ہوتی چلی آئی ہے۔

قرآن کریم کی اس ابدی حفاظت کا خود ربّ العزت نے تکفل فرمایا اور اس کے لئے جو اسباب پیدا کئے وہ امّت کے اہلِ حق کے ذریعہ اس کے طرقِ حفاظت ہیں۔ جب بھی اسلام کے خلاف کفر و الحاد کی آندھی چلی ربّ العزت نے اس امّت کے بہترین نفوس اس کے مقابلے میں کھڑے کر دیئے۔ ہر بزرگ نے اپنے مناسبِ حال کسی نہ کسی مورچے کو سنبھالا۔ اور ایسے بڑے مسلمانوں کا ایک قافلہ ہر دور میں باطل سے نبرد آزما رہا ہے۔ افراد کا کسی جزئی مسئلے میں کوئی اختلاف ہو تو ہو لیکن ان کی مجموعی کوششیں ہمیشہ معصوم رہی ہیں۔ یہ حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ ہے کہ آپؐ کا دین تاریخ کے ہر دور میں زندہ ہے۔ دسویں صدی ہجری کے مشہور فاضل علامہ حسن شرنبلالی (صاحبِ نور الایضاح) اپنے رسالہ "النفحۃ القدسیہ" میں لکھتے ہیں۔

امرنا بحفظ النظم والمعنی جمیعًا فانہ دلالۃ علی النبوۃ (ص ۱۳)	ہم لوگ قرآن پاک کے الفاظ و معنی دونوں کی حفاظت پر مامور ہیں اور یہی نبوّت کا معجزہ ہے۔

ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذری کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین و تاویل الجاھلین (کتاب المدخل)	اس علم کو ہر صحیح جانشین سے آگے ثقہ لوگ لیتے رہیں گے وہ اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی من گھڑت باتوں اور جاہلوں کی تاویل کو ہمیشہ دور کرتے رہیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بھی فرمایا:۔

انّ منکم من یقاتل علی تاویل القرآن کما قاتلت علی تنزیلہٖ۔	بے شک تم میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو قرآنی مرادات کے لئے بھی اسی طرح جہاد کریں گے جیسے تنزیلِ قرآن

(اوکما قال رواہ احمد والطحاوی) پر میں جہاد کرتا رہا ہوں۔

اس روایت میں الفاظِ قرآن کی طرح مراداتِ قرآن کے تحفظ کی بھی خبر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ امت کے ذریعہ قرآنِ پاک کی ہر لفظی اور معنوی تحریف سے پوری طرح حفاظت رہے گی۔

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:۔

لن یبرح ھذا الدین قائما یقاتل علیہ عصابۃ من المسلمین حتی تقوم الساعۃ۔

یہ دین برابر قائم رہے گا اور اس کے لئے مسلمانوں کا ایک طبقہ برابر لڑتا رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے یہ حدیث روایت کی:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لاتزال طائفۃ من امتی قائمۃ بامر اللہ لا یضرھم من خذلھم اوخالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم ظاھرون علی الناس (صحیح مسلم ص ۱۴۳ ج ۲)

میری امت کا ایک طبقہ امرالٰہی پر برابر قائم رہے گا جو انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کریں گے یا ان کی مخالفت کریں گے وہ انہیں کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ طبقہ لوگوں پر ظاہر رہے گا۔

فطرت سلیمہ کے خلاف چلنے اور حق سے ٹکرانے والے اگر قیامت تک رہیں گے تو ایسے مسلمانوں کا بھی ایک طبقہ ضرور رہے گا جو اپنے مالک کی وفاداری اور اطاعت میں اس کے رحم و کرم اور رضوان و غفران کا مظہر ہوں۔

ولا یزالون مختلفین ہ الا من رحم ربک ولذالک خلقھم ط (پ ۱۲۔ سورہ ہود)

اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر تیرا پروردگار رحم کرے اور اسی لیے ان کو پیدا کیا ہے۔

در خانہ عشق از کفر ناگزیر است ،
دوزخ کرا بسوز گر بولہب نباشد ،

قرآن پاک نے اس مقام پر ایک ایسے ہی طبقے کی نشاندہی کی ہے جو رحم و کرم کا مظہر ہو کر قیامت تک دین فطرت کا ساتھ دے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بتلایا کہ آپ کی امت گمراہی کے کئی حصوں میں بٹ جائے گی تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ایک طبقہ جو میری سنت اور میری جماعت کے مطابق ہوگا وہ حق پر ہوگا اور وہی راہ نجات ہوگی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق پر قائم رہنے والا طبقہ بھی قیامت تک باقی رہے گا اور کوئی آندھی حق کے درخت کو اپنی جڑ سے نہ اکھاڑ سکے گی۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا ،

ائمہ ہدایت اور ائمہ ضلالت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حق اور باطل کی معرکہ آرائی برابر جاری رہے تو جس طرح ہدایت مسلسل رہے گی گمراہی بھی برابر چلے گی اب ان کا امتیاز کیسے ہو؟ جواباً گذارش ہے کہ خطِ مستقیم صرف ایک ہوتا ہے اور ٹیڑھے خط کئی۔ ہدایت کی راہ صرف ایک ہے

باطل کی راہیں کئی ہیں اسی لئے ظلمتوں کو جمع کی صورت میں اور نُور کو واحد کی صورت میں ذکر کیا ہے جعل الظلمات والنور (پ ۷ سورۃ الان
پس ہدایت کے باقی رہنے میں مسلسل رستے کی بقا ہے اور گمراہی کے باقی رہنے میں ایک طریق کی بقا ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے
کبھی کوئی گمراہی سر اٹھائے اور کبھی کوئی گمراہی دم مارے۔ گمراہی میں گو وہ سب برابر ہوں مگر ہر گمراہی کی راہ ایک دوسرے سے مختلف
جیسے ٹیڑھے خط آپس میں سب مختلف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ ضلالت کبھی اپنے طریق کو کبھی ایک دوسرے کی طرف اسناد نہیں کر
نمرود، شداد، فرعون، ہامان سب اپنے اپنے وقت میں ائمۃ الکفر تھے مگر ایک دوسرے سے انتساب کے ہرگز مدعی نہ تھے۔ بخلاف
ان کے انبیائے کرام جو ائمہ ہدایت تھے سب ایک دوسرے کے مصدّق اور ایک ہی راستے کے داعی تھے۔

اولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده (پ ۷، سورۃ انعام)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم ہوا کہ "یہ سارا طبقہ میرے رستے پر تھا آپ بھی اسی راہ پر چلیں" نبوت کے جھوٹے مد
اور انکارِ حدیث کے مبلغین مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، مرزا غلام احمد، عبداللہ چکڑالوی اور غلام احمد پرویز یہ سب گمراہی کے امام ہیں
آپس میں کوئی انتساب نہیں رکھتے اور نہ ان میں سے کسی نے اپنے طریق کفر کو اپنے ماقبل سے اسناد کیا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے طر
موجد ہوتے ہیں بخلاف ان کے وہ تمام اہلِ حق جو ان ائمہ ضلالت کے مقابلے میں ائمہ ہدایت بنے آپس میں اسناد و اعتماد رکھتے ہیں
صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو مسیلمہ کذاب کے خلاف اٹھے۔ ان کی غلامی پر وہ سب اہلِ حق فخر کرتے ہیں جنہوں نے مرزا غلام احمد کی تحریک
مقابلہ کیا بلکہ علماً اور عملاً وہ اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہی پیروی سمجھتے ہیں۔ ختم نبوت کے عقیدے میں یہ امت کا اتصا
مگر یہ مدعیان نبوت آپس میں متصل نہیں۔ مسٹر پرویز اپنی فکر کے خود موجد ہیں لیکن ان کے خلاف اٹھنے والے اپنے مسلک کے موجد
وہ پہلے کے متوارث دین کے داعی ہیں اور اپنے متقدمین اہلِ حق کی پیروی کو ہی راہِ نجات سمجھتے ہیں۔ حق ایک مسلسل راہِ ہدایت ہے
کا رکن آپس میں اسناد و اعتماد رکھتے ہیں اور باطل کی راہیں گو ہر دور میں موجود رہیں لیکن وہ آپس میں مسلسل اور مربوط نہیں۔ حق کا اتفاقیانہ اس
اسنادی پہلو ہے۔ حق ایک راہ ہے جو مسلسل چلی آ رہی ہے۔ یہی صراط مستقیم (سیدھی راہ) ہے اور اس کے سوا باقی سب سبل (کئی راہ)

وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله۔ (پ ۸ سورۃ الانعام)
یہ میری ایک سیدھی راہ ہے اسی پر چلو اور متعدد راہوں
چلو یہ تمہیں میری راہ سے جدا کر دیں گی۔

سیدھی راہ چلنے والے اہلِ حق جو انبیاء کرام کی پیروی میں اس راہ پر چلے وہ گو انفراداً انفراداً معصوم نہ تھے مگر ان کا مجموعی موقف
ضرور معصوم رہا اور اسی طریق سے ہدایت کی راہ آگے پھیلتی رہی اسی میں اسلام کی بقا تھی اور اسی میں اسلام کی زندگی تھی۔ یہ صحیح ہے
انفراداً معصوم نہ ہونے کی وجہ سے ان میں بھی اختلافات اور نزاعات ہوئے مگر ان کے اختلافات فروعات کے اختلاف تھے۔
اصول و عقائد کے نہیں۔ ہم ان کی توجیہ کرتے ہیں تردید نہیں اور فقہی اختلافات میں انہیں راجح اور مرجوح سے آگے نہیں جانے
یہی وجہ ہے کہ ان سب کے باوجود یہ ایک راہ ہے اور یہ راہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی جماعت کی راہ ہے
سب اہلِ حق اپنے ہر عقیدے اور عمل کی سند اپنے پہلوں سے لیتے رہے اور اسی طریق سے یہ متوارث دین ہم تک پہنچا ہے
یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ سے چلا اور بارھویں صدی کے بعد یہ اسناد حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان میں
پاک و ہند بلکہ بیشتر بلادِ عربیہ کی دینی فضا اسی گھرانے سے قائم ہوئی اور اپنے بعد والوں کے لئے بھی خاندان روشنی کا مینار

حضرت شاہ صاحب کے بیٹوں شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے قرآنِ پاک کے پہلے اردو ترجمے لکھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے حدیث و فقہ کی مسند سنبھالی۔ انگریزی عملداری میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور حضرت شاہ صاحب کے پوتے شاہ اسماعیل شہید عملی جہاد کے لئے اٹھے۔ بعد میں آنے والے سب اہلِ علم اسی گھرانے سے سند لیتے رہے اور یہی خاندان ان ممالک میں اہلِ حق کا سلسلہ اسناد اور مرکزِ اعتماد تھا۔

اسی عہد کے قریب قریب یورپ صدیوں کی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ انگریز ہندوستان میں اپنے پاؤں مضبوط کر رہے تھے۔ مسلم حکمرانوں کی باہمی مخالفت کا انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور DIVIDE AND RULE کی راہ سے وہ پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے مسلم ممالک اور تہذیبِ اسلام کے تحفّظ کے لئے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ یورپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے مسلم ممالک کو تہذیبِ جدید کی راہیں دکھائیں۔ "وقت کے تقاضوں پر پورا اترنا چاہیے" یہ ایک بڑا حسین عنوان تھا۔ جدّت پسندی کے نام سے مغرب پسندی اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ محدثین دہلی کے پیرو وقت کے تقاضوں سے غافل نہ تھے مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ MODERNISATION کی راہ سے WESTERNISATION ہمارے گھروں میں گھس رہی ہے۔ سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں جب اقتدار کے سایے میں پروان چڑھیں تو دینی اور روحانی قدروں کی زبان بھی بدل جاتی ہے۔

اس باب میں عثمانی ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ترک قوم مصطفےٰ کمال کی قیادت میں اپنے ماضی سے کٹ گئی اور مغربی قدروں میں بہہ کر اپنے رسم الخط تک کو بدل ڈالا۔ آئندہ ترک نسلیں ایک عظیم ذخیرۂ علم سے جو عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں مشرقی رسم الخط میں پھیلا ہوا تھا محروم ہو گئیں۔ ترک کلچر مغربیت میں فنا ہو گیا اور ایک عظیم اسلامی سلطنت اپنے ماضی سے یکسر کٹ گئی۔

ہندوستان کے مسلمانوں اور خاص کر محدثین دہلی کے علم و فکر کے وارثوں کے لئے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی کے بعد اس باب میں کہ اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے مسلم مفکرین کی آرا مختلف تھیں۔

۱: —— بعض مسلم مفکر یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے دفتروں اور ملازمتوں میں کچھ رعایت لے کر مغربی فکر و نظر سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے اور مسلمانوں کو دنیوی تعلیم میں اتنا آگے نکلنا چاہیے کہ غلام ہندوستان میں وہ کسی دوسری قوم سے پیچھے نہ رہیں۔ یہ رستہ ابتدا میں بالکل بے ضرر تھا لیکن مغربی فکر و نظر سے سمجھوتہ کرتے ہوئے انجام کار اپنے ماضی سے کٹنا لازمی تھا۔ چنانچہ جلد ہی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقائد افکار میں ڈھلنے لگے اور اعمال وسعتِ قلب BROADMINDEDNESS کی بھینٹ چڑھنے لگے۔ اسی دور کے قریب سر سیّد نے علیگڑھ سکول کی بنیاد رکھی (جو بعد میں کالج اور یونیورسٹی تک پہنچ گیا) اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان اس نظریے کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ ایک اچھی وقتی مگر وقتی تدبیر تھی جس کا متوارث اسلام سے کوئی اسنادی تعلق نہ تھا۔

۲: —— محدثین دہلی کے پیرو اس بات کے حامی تھے کہ گو جنگِ آزادی میں ہم ناکام ہو چکے ہیں مگر مغربی فکر و نظر سے سمجھوتہ نہ ہونا چاہیے۔ انگریزی زبان بے شک سیکھ لی جائے مگر انگریزی تہذیب و تمدن کو نہ اپنایا جائے اور درس و تدریس اور تزکیہ و تعلیم کے ذریعہ اسلام کی علمی اور فکری قوت کو محفوظ رکھا جائے جس سے پھر کسی وقت راہ عمل کے چراغ روشن ہو سکیں۔ یہ حضرات اپنی فکر و نظر کے موجد نہ تھے علوم نبوت کے ترجمان اور متوارث اسلام کے وارث تھے اور اسی راہ سے وہ ملت اسلامیہ کی راہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اسنادی سلسلہ صحابہ کرامؓ، بزرگانِ اسلام اور محدثین دہلی سے مربوط تھا۔ اسی دور کے قریب اہلِ سنت والجماعت کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند

قائم ہوئی۔

۳۔ مسلمانانِ ہند میں ایک یہ خیال بھی کام کر رہا تھا کہ نماز روزہ جیسے چند اعمالِ اسلام کو باقی رکھ کر انگریزی عملداری کو خلوص قلب سے اپنا لیا جائے اور انگریزوں کو اپنے اولی الامر میں داخل سمجھا جاتے۔ یہ لوگ دین اور دنیا کی تقسیم کے حامی تھے اور دینوی مراعات حاصل کرنے کے سوا ان کا کوئی مطمع نظر نہ تھا۔ انگریزوں سے کامل وفاداری کے اظہار کے لئے یہ لوگ محدثین دہلی کے خلاف بھی کبھی کبھی دم مارتے تھے اور ان کی مرکزی دینی رہنمائی انہیں بہت کھٹکتی تھی۔ اس دور کے قریب کئی دنیادار مشائخ کو استحکام ملا اور ان کی گدیوں نے باقاعدہ شکل اختیار کی مگر انگریزوں کو اولی الامر میں داخل کرنے کے لیے ان کی آواز پھر بھی کافی نہ تھی۔ ابھی تک علمی چراغ محدثین دہلی کے چراغ سے ہی روشن تھے۔ اس کام کے لیے نبوت کی ہدایت درکار تھی۔ انگریزوں نے ضرورت محسوس کی کہ غلام ہندوستان میں ایک نبوت بھی قائم کی جائے جو انہیں اپنے اولی الامر میں داخل کرے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں انگریزوں نے ایک کمیشن لندن سے ہندوستان بھیجا تاکہ وہ اس کے متعلق مسلمانوں کا مزاج معلوم کرے اور آئندہ کے لیے مسلمان کو رام کرنے کے لئے تجاویز مرتب کرے۔ اس کمیشن نے ایک سال ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کے حالات معلوم کئے۔

۱۸۷۰ء وائٹ ہاؤس لندن میں کانفرنس منعقد ہوئی جس میں کمیشن مذکور کے نمائندگان کے علاوہ ہندوستان میں متعین مشنری کے پادری بھی دعوتِ خاص پر شریک ہوئے جس میں دونوں نے علیحدہ علیحدہ رپورٹ پیش کی جو کہ "دی ارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا" کے نام سے شائع کی گئی جس کے دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

رپورٹ سربراہ کمیشن سر ولیم ہنٹر

"مسلمانوں کا مذہبا عقیدہ یہ ہے کہ وہ کسی غیر ملکی حکومت کے زیر سایہ نہیں رہ سکتے اور ان کے لیے غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے۔ جہاد کے اس تصور سے مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ ہے اور جہاد کے لیے ہر لمحہ تیار ہیں۔ ان کی کیفیت کسی وقت بھی انہیں حکومت کے خلاف ابھار سکتی ہے۔"

رپورٹ پادری صاحبان

"یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کسی ایسے غدار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں جو ظلی نبوت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو جائے تو اس کے حلقہ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے لیکن مسلمانوں میں سے اس قسم کے دعویٰ کے لئے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے برصغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا اس وقت فوجی نقطہ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی لیکن اب جب کہ ہم برصغیر کے چپہ چپہ پر حکمران ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبہ پر عمل کرنا چاہیے جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔"

اقتباس از مطبوعہ رپورٹ کانفرنس وائٹ ہاؤس لندن منعقدہ ۱۸۷۰ء۔

دی ارائیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا (محفوظ)

ان تینوں ذہنوں میں نمایاں فرق یہ تھا کہ پہلا ذہن دنیوی تقاضوں کے ضمن میں دین کو باقی رکھنا چاہتا تھا۔ دوسرا طبقہ دین کے ضمن میں دنیوی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا حامی تھا اور تیسرا ذہن دین اور دنیا کی پوری تقسیم کا ہمنوا تھا۔ ان تینوں طبقوں میں اسنادی امتیاز صرف دوسرے طبقے کو حاصل تھا۔ یہ حضرات درس و تدریس میں باقاعدہ اسناد اور تزکیہ و تعلیم میں باقاعدہ سلسلوں کے حامی تھے۔

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند محدثین دہلی کے نظر و فکر کی نشاۃ ثانیہ تھی اس کے بانی اور پہلے سرپرست حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں باقاعدہ شریک تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پہلے اور دوسرے ذہن کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کے لیے صحت عقائد پر سرسید سے خط و کتابت کی جو انہی دنوں "تصفیۃ العقائد" کے نام سے شائع ہو گئی تھی۔ پھر ان حضرات کے ارشد تلامذہ اور دیوبند کے پرنسپل شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن خود علی گڑھ تشریف لائے۔ حضرت مرحوم اور ان کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تقریروں سے نہ صرف دونوں ذہن ایک دوسرے کے قریب ہو گئے بلکہ پہلے طبقے کی کافی حد تک دینی اصلاح بھی ہو گئی۔ علامہ شبلیؒ اور ندوۃ العلماء کے ذریعہ جو جدید نظریات اسلام کے نام سے سامنے آ رہے تھے ان کی اصلاح کے لیے بھی علمائے دیوبند نے نمایاں سعی فرمائی جو تاریخ دیوبند کا بہترین سرمایہ ہے۔ علامہ شبلیؒ اور شبیر احمد عثمانیؒ کی مشترکہ جلسوں میں شرکت اس کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہوئے بلکہ ان کے ارشد خلفاء میں شمار ہوئے جس کی وجہ سے مولانا عبدالباری ندوی اور عبدالماجد دریابادی جیسے مغربی علوم کے شناور اکابر دیوبند پر اپنی نگاہ نچھاور کرنے لگے۔ اور اس کا اثر پھیلتا چلا گیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی جو آج کل ندوۃ العلماء کے ناظم، جامعہ اسلامیہ مدینہ (مدینہ یونیورسٹی) کے رکن اور رکن مجلس تاسیسی رابطہ اسلامی ہیں۔ اور آج کی دنیائے اسلام کے جانے پہچانے مفکر اور اپنی خاص صلاحیتوں کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں وہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے خلیفہ مجاز ہوئے۔ علمائے دیوبند کی ان کوششوں اور علوم نبوت کی ان بے لوث وفاداریوں کے لیے گو مغربی طرز کا پروپیگنڈا ساتھ نہ تھا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان حضرات نے علم و تقویٰ اور تزکیہ و طہارت کی روشنی میں اسلامیان ہند کی ہر شعبہ میں کامیاب راہنمائی کی ہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا دردمند دل جب سوئی قوم کو جگا رہا تھا اور مرحوم کی آتشیں نوائیں مسلمانان ہند کو جھنجھوڑ رہی تھیں تو علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ مبادا ڈاکٹر صاحب مرحوم کی فکر اسلام کی اسنادی علم سے ذرا مختلف ہو جائے۔ فلسفۂ اسلام کی بعض گہرائیوں پر مرحوم سے گفتگو ہونی چاہیے۔ چنانچہ امام العصر حجۃ الاسلام علامہ انور شاہ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لاہور تشریف لائے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم سے اہم ملی مسائل اور اسلام کی فکری گہرائیوں پر کافی دن تبادلۂ افکار رہا۔ انجمن حمایت اسلام میں ڈاکٹر صاحب نے قادیانیوں کے متعلق جو موقف اختیار کیا وہ زیادہ تر انہی مذاکرات کی صدائے بازگشت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دائرہ اثر میں اس حقیقت کو خوب اجاگر کیا کہ نبوت کے اختلاف سے قوم بدل جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت پر اسرائیل سے ایک نئی قوم نکلی اور نصاریٰ یہود سے علیحدہ ایک نئی امت بن گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آئی تو ایک اور ملت کا موجب ہوئی اور یہود و نصاریٰ کے بعد امت مسلمہ کا قیام عمل میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر کسی اور نبی کا پیدا ہونا مان لیا جائے تو پھر ایک اور قوم عمل میں آ جائے گی جو ملت اسلام

سے علیحدہ ایک الگ قوم قرار پائے گی اور جس طرح اہل اسلام کی عقیدت کے مرکز مکہ اور مدینہ ہیں اس نئی قوم کی وفاداریاں اپنے جدید مرکز نبوت سے وابستہ ہوں گی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ان پاکیزہ کوششوں میں علمائے دیوبند کا بہت دخل ہے[۱] اور انہی حضرات کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے افکار سلف سے کہیں نہیں ٹکراتے اور نازک سے نازک مسائل میں وہ اسلام کی شاہراہ عظیم سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہوئے۔ انہی دنوں ڈاکٹر علامہ اقبال اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی جداگانہ قومی نظریہ پر متفق ہوتے جس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے سیاسی میدانوں میں برسوں بعد تک سنی جاتی رہی[۲]۔ البدر الساری کے مصنف لکھتے ہیں:۔

لم یستغن عن آرائہ الدقیقۃ فی الفلسفۃ مثل الفیلسوف الدکتور السر محمد اقبال الھندی ۔۔۔
وسمعت سنۃ ۱۳۴۷ھ فی دیوبند من الفخم عبداللہ جغتائی من اخص اصحاب الدکتور المرحوم ان الدکتور اقبال بنی کثیرا علی دقۃ رایہ فی غوامض الفلسفۃ ص۲۰ طبع مصر[۱]

علمائے دیوبند کا اعتدال

علمائے دیوبند دین کے سمجھنے سمجھانے میں نہ تو اس طریق کے قائل ہیں جو ماضی سے یکسر کٹا ہو کیونکہ وہ مسلسل رشتہ نہیں ایک نئی راہ ہے اور نہ وہ اس افراط کے قائل ہیں کہ رسم ورواج اور تقلید آباء کے تحت ہر بدعت کو اسلام میں داخل کر دیا جائے۔ جن اعمال میں تسلسل نہ ہو اور وہ تسلسل خیر القرون تک مسلسل نہ ہو وہ اعمال اسلام نہیں ہو سکتے۔ یہ حضرات اس تقلید کے پوری طرح قائل اور پابند ہیں جو قرآن و حدیث کے سرچشمہ سے فقہ اسلام کے نام پر چلتی آئی ہے۔ قرآن کریم تقلید آباء کی صرف اسی بنا پر مذمت کرتا ہے کہ وہ آباء عقل و اھتداء کے نور سے خالی ہوں۔

اولو کان آباءھم لایعقلون شیئا ولا یھتدون (پ۲)	بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ کو جانتے ہوں۔

ائمہ سلف اور فقہائے اسلام جو علم و اھتداء کے نور سے منور تھے ان کی پیروی نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف پیغمبروں ہی کی نہیں صدیقین، شہداء اور صالحین کے رستے پر چلنے کی بھی ہر نماز میں رب العزت سے درخواست کریں کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم ۵ صراط الذین انعمت علیھم (پ۱)	اے اللہ چلا ہمیں سیدھی راہ پر ۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا۔

اس مسلک اعتدال کی وجہ سے علمائے دیوبند دینی بے قیدی اور خود رائی سے بھی محفوظ رہے اور شرک و بدعت کے اندھیرے بھی انہیں اپنے جال میں نہ کھینچ سکے ان کے اعمال و افکار سے اسلام کا تسلسل بھی قائم رہا اور کوئی غیر مسلسل نظریہ و عمل دین کے نام سے

[۱] حضرت شاہ صاحب کے دقیق فلسفیانہ نظریات سے ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے فلسفی بھی بے نیاز نہ تھے [۲] اور میں نے دیوبند میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے ۱۳۴۷ھ میں سنا کہ ڈاکٹر اقبال فلسفے کی گہرائیوں میں حضرت شاہ صاحب کی دقت نظری کے بہت مداح تھے۔

اسلام میں داخل بھی نہ ہونے پایا۔ یہ حضرات علم وعمل کے تسلسل سے اسلام کے چراغ روشن کرتے گئے اور تاریخ دیوبند پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام واقعی ایک زندہ دین ہے جو ان حضرات سے لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد سعادت مہد تک مسلسل ہے۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولینا العلامۃ قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:۔

"اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ علمائے دیوبند کی رو سے امت کے لئے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے۔ اس لئے علمائے دیوبند ان کی محبت وعظمت کو تحفظ ایمان کے لئے ضروری سمجھتے ہیں مگر غلو کے ساتھ اس محبت وعقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے۔ ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے کہ انہیں یا ان کی قبروں کو سجدہ ورکوع یا طواف ونذر یا منت وقربانی کا محل بنالیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت سید احمد کبیر رفاعیؒ، حضرت شیخ علی ہجویریؒ، حضرت شیخ معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صحیح جانشین اور ان کے فیوض سے زندگی کے خاکوں میں اتباع سنت کا رنگ بھرنے والے بھی بزرگانِ کرام ہیں۔ ان حضرات کا فیض روحانی اعمال تسخیر سے نہیں اعمال سنت سے قائم ہے اور یہ حضرات باقاعدہ چشتی، سہروردی، نقشبندی اور قادری نسبتوں سے انتساب رکھتے ہیں۔ بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو حکمت اور تزکیہ نفوس کا یہ رستہ اب صرف اسی مسلک کے لوگوں سے آباد ہے۔ یہ حضرات علم وعمل ہر دو ابواب میں اسنادی پہلو قائم رکھتے ہیں۔ بدعات کی روک تھام میں بھی یہ حضرات صرف اسی لیے پیش پیش رہے ہے کہ ان اعمال کا اسنادی پہلو کہیں موجود نہ تھا اور یہ تردید بھی نئی نہ بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی) بھی اسی رنگ میں بدعات کی تردید فرماتے رہے ہیں۔

اجتناب از اسم ورسم بدعت تا از بدعت حسنہ در رنگ بدعت سیئہ احتراز ننماید بوئے ازیں دولت بمشام جان او نرسد و ایں معنی امروز متعسر است کہ عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است بظلمات بدعت آرام گرفتہ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند و باحیائے سنت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہندہای بدعت اند ومحو کنندہای سنت وبدعتہا پہن شدہ را تعامل خلق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آں فتوے مے دہند ومردم را بدعت دلالت مے نمایند" (مکتوب ۵۴ دفتر دوم ص ۱۰۲)

ترجمہ:۔ بدعت کے نام اور عمل سے بھی پرہیز لازم ہے جب تک بدعت حسنہ سے بھی اسی طرح پرہیز نہ کرے جس طرح بدعت سیئہ سے پرہیز کی جاتی ہے روحانیت کی بو طالب کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتی اور یہ بات آج بہت مشکل ہوگئی ہے۔ ایک جہان بدعت کے دریا میں ڈوب رہا ہے اور لوگ بدعت کے اندھیروں میں آرام لے رہے ہیں کس کی مجال ہے کہ بدعت کے خلاف دم مارے اور احیائے سنت کے لیے زبان کھولے۔ اسوقت اکثر مولوی بدعتوں کو رواج دے رہے ہیں اور سنتوں کو مٹا رہے ہیں۔ رواج یافتہ بدعتوں کو مجبوری قرار دیکر انکے جائز بلکہ بہتر ہونیکا فتویٰ دے رہے ہیں اور لوگوں کو بدعت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جن علمائے ربانی کی تمنا کی تھی کہ احیائے سنت کے لیے زبان کھولنے والے اور بدعات کے خلاف دم مارنے والے کہاں ہیں؟ ان کی یہ تمنا حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان اور اسی تحریک کی نشأۃ ثانیہ حضرات اکابر دیوبند سے پوری ہوئی۔ فللّٰہ المنۃ

سرزمین پاک و ہند میں نوے فیصد مسلمان فقہ حنفی کے مقلد ہیں۔ فقہ حنفی امام ابوحنیفہ کے اجتہادات ان کے تلامذہ کے استخراجات اور پھر اصحاب ترجیح کے فیصلوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی چھان بین اور کانٹ چھانٹ کے بعد فقہ کا کوئی مسئلہ اصول شریعت کے خلاف باقی نہیں رہ سکتا مگر اس طریق عمل میں ایک اور پہلو بھی تھا وہ یہ کہ عمل کرنے والے کی نظر فقہاء وائمہ کی تخریجات تک محدود رہ گئی۔ اور گو وہ اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہؓ کے طریق سے متجاوز نہ کرتے مگر عمل کرنے والے کا شعور اتباع سنت کی لذت پوری طرح محسوس نہ کر سکتا تھا۔ علمائے دیوبند نے اعمال وعبادات کو ان کے مصادر کی طرف لوٹایا، احادیث کے دفاتر کھلے، تحقیقات پھیلیں، رجال کی نئے سرے سے پڑتال ہوئی، مطالب ومعانی میں بحثیں کی گئیں اور گو ان حضرات کو فقہ کا کوئی مفتیٰ بہ فیصلہ اصول شریعت سے ٹکراتا ہوا نہ ملا تاہم اس راہ تحقیق نے ایسی فضا پیدا کر دی کہ پہلے جن مسائل پہ فقہ سمجھ کر عمل کیا جاتا تھا اب وہی مسائل نور سنت کی روشنی دینے لگے اور ان اعمال وعبادات میں اتباع سنت کی وہ لذت محسوس ہونے لگی جو اس فکری تبدیلی کے بغیر ہرگز ممکن نہ تھی۔ علمائے دیوبند نے نہ صرف پاک و ہند کے احناف کو سنت کا شعور بخشا بلکہ ان کی حدیثی تحقیقات نے شام و مصر تک ان حضرات کے علوم پھیلا دئیے۔ یہ حضرات نہ صرف عملاً حنفی ہیں بلکہ آج حنفیت کی مسند تدریس انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ یہاں نہ ظاہریت کی تفریط ہے اور نہ اہل بدعت کی سی افراط بلکہ سلف صالحین کی سی کامل اتباع ہی دیوبند کا مسلک مختار ہے۔

فقہ میں سنت کی راہیں معلوم کرنے کے لئے آٹھویں صدی میں حافظ جمال الدین زیلعیؒ نے علم حدیث کا ایک بڑا ذخیرہ "نصب الرایہ" کے نام سے جمع کیا تھا۔ یہ عظیم علمی سرمایہ سالہا سال سے نایاب تھا۔ علمائے دیوبند نے نہ صرف اسے دوبارہ طبع کرانے کا اہتمام فرمایا بلکہ اس پر بغیۃ الالمعی فی تخریج الزیلعی کے نام سے ایک جلیل القدر عربی حاشیہ تحریر فرما کر علمائے حدیث پر ایک بڑا احسان فرمایا۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مصر سے بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ علمائے دیوبند کی یہ کوشش فقہ حنفی اور علم حدیث کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ محدث کبیر ملا علی قاریؒ کی کتاب شرح نقایہ فقہ و حدیث کا عظیم سرمایہ تھی مگر ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہ تھی۔ دیوبند کے شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے "محمود الرایہ" کے نام سے اس پر ایک مستقل حاشیہ لکھ کر اسے بڑے اہتمام سے شائع فرمایا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تمام فقہی ابواب کو احادیث و روایات کی روشنی میں مرتب کرانے کا اہتمام فرمایا اور خانقاہ میں "اعلاء السنن" کے نام سے ایک عظیم علمی ذخیرہ بیس۲۰ جلدوں میں مرتب ہوا جن میں سے تیرہ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ کتاب کیا ہے فقہی تحقیقات اور تحقیق روایات کا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ علاوہ ازیں وہ آیات احکام جن سے فقہ حنفی کے مختلف ابواب میں استناد کیا گیا ہے۔ ان کی تحقیقات پر حضرت تھانویؒ نے ایک اور عظیم کتاب "آیات القرآن فی ادلۃ النعمان" چار ضخیم جلدوں میں مختلف علمائے دیوبند سے مرتب کرائی۔ افسوس کہ یہ کتاب ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آسکی۔ اس کے مسودات حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کے پاس کراچی میں موجود ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کتاب جلد شائع ہو اور اس ذخیرہ علمی سے سنت کی راہیں اور زیادہ روشن رہیں۔ مندرجہ بالا کتابیں فقہ حنفی کی وہ عظیم خدمات ہیں کہ کسی اور مکتب فکر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ان کتابوں کے علاوہ فقہ حنفی کی تقریباً تمام متداول کتابیں جو مدارس عربیہ میں نصاب زیر تعلیم ہیں۔ ان پر حاشیہ لکھنے کا فخر بھی

علمائے دیوبند کو حاصل ہے۔

علم حدیث کی خدمات

اس مسلک کے اکابر نے علم حدیث کی وہ خدمات سرانجام دی ہیں جن کا تصور بھی اس قرن میں مشکل تھا۔ حدیث کی ہر اہم کتاب پر عربی شرحیں لکھیں حاشیے رقم فرمائے اور نئے تقاضوں کے مطابق حدیث کا گرانقدر ذخیرہ اردو میں بھی نئی ترتیب سے پیش فرمایا۔ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری کے امالی "فیض الباری" علی صحیح البخاری مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے اپنے تفسیر قرآن کے مخصوص انداز میں ایک نہایت لطیف حاشیہ صحیح بخاری پر تحریر فرمایا جو باوجود اختصار کے متن کے ساتھ آٹھ جلدوں کی ضخامت رکھتا ہے۔ افسوس کہ عصرِ حاضر کا یہ اردو شاہکار ابھی تک طباعت پذیر نہیں ہو سکا۔ شیخ الحدیث حضرت مولینا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی "لامع الدراری" علی صحیح البخاری کی پہلی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ محدث کبیر حضرت مولانا فخر الدین شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند مدظلہ کی صحیح بخاری پر اردو تقریرات کئی جلدوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ صحیح بخاری کی خدمات ہیں جو ان حضرات نے انجام دی ہیں۔ ابواب بخاری کی خدمات ان کے علاوہ ہیں۔ صحیح مسلم کی بہترین شرح شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے کئی ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی۔ جو "فتح الملہم" کے نام سے شائع ہوئی۔ رأس المحدثین حضرت مولینا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے ابوداؤد کی شرح "بذل المجہود" کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں عربی میں شائع کی۔ حضرت شیخ الهند اور حضرت شاہ صاحب کے امالی کئی دفعہ چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ "الطیب الشذی" مولینا اشفاق الرحمن کاندھلوی۔ "الکوکب الدری" شیخ الحدیث حضرت مولینا محمد زکریا مدظلہ اور "معارف السنن" حضرت مولینا محمد یوسف بنوری مدظلہ ترمذی کی بہترین شرحیں ہیں۔ حضرت مولینا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم نے بھی ترمذی کی ایک نہایت جامع اور نفیس عربی شرح تحریر فرمائی ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سنن نسائی پر حضرت مولینا اشفاق الرحمن صاحبؒ نے بہترین حاشیہ تحریر فرمایا۔ مؤطا امام مالکؒ کی مفصل عربی شرح شیخ الحدیث حضرت مولینا محمد زکریا مدظلہ نے چھ ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع فرمائی۔ اور طحاوی کی شرح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے "امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار" کے نام سے کئی ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی اس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔ مشکوٰۃ کی شرح "التعلیق الصبیح" حضرت مولینا محمد ادریس کاندھلوی نے سات ضخیم جلدوں میں عربی میں تحریر کی جو چھپ رہی ہے اور سنن ابن ماجہ پر حضرت مولینا انور شاہ صاحبؒ نے ایک نہایت عمدہ حاشیہ لکھا جو ابھی تک چھپ نہیں سکا۔ ایک اور حاشیہ جو مفصل شرح کا درجہ رکھتا ہے مولینا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلویؒ نے بھی تحریر فرمایا جو الحمدللہ کراچی سے شائع ہو گیا ہے۔

اردو میں علم حدیث کی خدمت

سب سے پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس طرف توجہ فرمائی اور اپنے مخصوص ادبی انداز میں صحیح بخاری پر تشریحی نوٹ لکھے ان کے بعد عمدۃ المحدثین حضرت مولینا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنیؒ نے "ترجمان السنۃ" کے نام سے ایک گرانقدر علمی ذخیرہ چار ضخیم جلدوں میں مرتب فرمایا جسے ندوۃ المصنفین دہلی نے اپنے روایتی انداز میں شائع کیا اور اسی طرح صاحب موصوف نے "جواہر الحکم" کے نام سے تین چھوٹے چھوٹے مجموعے موجودہ دور کے خصوصی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھے "ترجمان السنۃ" کے نام سے انہوں نے جو کام کیا وہ اگرچہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا (کیونکہ ان کا ارادہ اس طرح کی آٹھ دس جلدیں لکھنے کا تھا مگر زندگی نے مہلت ہی اتنی دی کہ چار جلدیں پوری کر سکے)۔ تاہم یہ ایک ایسا عمدہ علمی ذخیرہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے یہ اپنے دور کی حدیث کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ حضرت مولینا مرحوم کا انداز تحریر ایسا ہے کہ متوسط درجے اور اوسط درجے

ۃ سے لوگ اس سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ عوام کے لئے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ نے پانچ جلدوں میں "معارف الحدیث" کے نام سے
م حدیث کی خدمت کی اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان گراں بہا تحریرات پر نظر کرنے سے یہ غلط پروپیگنڈا پادر ہوا ہو جاتا ہے کہ راسخ العلم
مائے کرام عصرِ حاضر کے تقاضوں سے غافل ہیں۔

جدید عصری تقاضوں پر مفید دینی لٹریچر

علمائے دیوبند نے عصر جدید کے پھیلتے ہوئے الحاد کے آگے ہر ممکن بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب میں سب سے پہلا مرحلہ یہ
ماکہ قرآن کریم کو نئی نسلوں کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ روایات کے کسی قسم کے الجھاؤ کے بغیر نفس مراد نہایت آسان پیرایہ میں ادا
ہو جائے اور جہاں جہاں دشمنانِ اسلام مورچے بنائے ہوئے ہوں وہاں ایسی تعبیر اختیار کی جائے کہ نفس اختلاف میں اترے بغیر تمام پیدا ہونے
والے یا پیدا کئے گئے شبہات از خود دور ہو جائیں۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پر ایک نہایت شگفتہ،
مغز اور دلکش تفسیری حاشیہ لکھ کر عصرِ حاضر کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ آپ کے حواشی اگر ایک طرف سلف صالحین کے مسلک
کے مطابق ہیں تو دوسری طرف موجودہ ضروریات کے بھی عین مطابق ہیں پڑھتے جائیے۔ معاندین اسلام کے پیدا کئے ہوئے شبہات کی جڑ از خود
کٹتی چلی جائے گی پھر کسی فریق کی دلآزاری نہیں کسی فرقے کا نام تک نہیں زبان اور طرز بیان خشک اور پرانا نہیں بلکہ نہایت سلیس اور دلنشین
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیری حاشیے کو اتنی مقبولیت عطا فرمائی ہے کہ پاکستان، ہندوستان، چین، ہانگ کانگ اور افغانستان وغیرہ میں
فارسی میں ترجمہ ہو کر، چھپ چکا ہے اور پاک و ہند میں چھ سات اداروں نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ تاج کمپنی نے حسب روایت
سائزوں میں چار قسم کے کاغذ پر شائع کیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات جو اسلام کو سلف کے آئینے میں مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس
تفسیر میں نہایت اطمینان اور شرح صدر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ اور حاشیہ علمائے دیوبند کا جدید نسل پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا کام بیان القرآن کے نام سے کیا ہے۔ حکیم الامت کی یہ تفسیر
ان معنوی خوبیوں کے اعتبار سے اتنی جامع اور مختصر ہے کہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس تفسیر کو غور سے پڑھنے کے بعد کسی
دوسری تفسیر کی طرف مراجعت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تفسیر و ترجمہ کے سلسلہ میں علمائے دیوبند نے جتنا کام کیا ہے دوسرے تمام
گروہوں کا اجتماعی کام بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت جو ترجمے برصغیر پاک و ہند میں سب سے زیادہ مقبول و موثر ہیں وہ علمائے
دیوبند کے ہی ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے انگریزی حاشیہ قرآن اور اردو حاشیہ قرآن یہ بھی زیادہ تر علمائے دیوبند خصوصاً
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہی فیضان ہیں۔ عقلیت پسند ذہن کو اساسی اسلام کے قریب کرنے کیلئے شیخ الاسلام
مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی "العقل والنقل" "خوارق عادات" اور "مسئلہ تقدیر" جیسی تحریرات عصری تقاضوں کے پیش نظر نہایت مفید کتابیں
ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ کی کتاب "سائنس اور اسلام" حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ کی "اشاعت اسلام" مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
کی "اسلامی معاشیات" مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کی "اسلام کا اقتصادی نظام" "اخلاق اور فلسفہ اخلاق" "قصص القرآن" (چہار جلد) مولانا
محمد ادریس کاندھلوی کی "علم الکلام" حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندی کی "آلات جدیدہ اور احکام اسلام" مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی "اسلام اور
غلامی" اور اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا محمد منظور نعمانی کی مختلف کتابیں وہ صحیح دینی لٹریچر ہے جو اکابر دیوبند
اور منتسبین دیوبند کے ذریعہ جدید نسلوں کو ملا ہے۔

ندوۃ المصنفین دہلی

عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو میں کتاب وسنت اور سیرۃ تاریخ اسلام کی وسیع تر اشاعت کے لئے فضلائے دارالعلوم دیوبند مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی (حال صدر شعبہ دینیات علیگڑھ یونیورسٹی) نے ندوۃ المصنفین دہلی کی بنیاد ڈالی۔ یہ چاروں حضرات علامہ انور شاہ کشمیری کے ہونہار تلامذہ اور دارالعلوم دیوبند کے قابل فخر فرزند ہیں۔ ان کی مساعی سے ندوۃ المصنفین دہلی نے اردو میں جو مفید دینی لٹریچر شائع کیا اس لٹریچر اور مذکورہ بالا لٹریچر کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اکابر دیوبند اور منتسبین دیوبند نے عربی اور اردو میں کتاب وسنت اور فقہ کی اشاعت وتبلیغ میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اس کے مقابلہ میں کسی دوسری ایک جماعت یا سب جماعتوں کے دینی لٹریچر کو ملا کر بھی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ جن حضرات نے اس مفید دینی لٹریچر کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کو ماضی سے وابستہ رکھتے ہوئے اور اسلاف پر تنقید سے بچتے ہوئے جدید نسلوں تک دین پہنچانے کی عزت انہی حضرات کو حاصل ہے۔ یہ بزرگ پرانے متن میں نیا مطالعہ کرنے کی بحمداللہ پوری استعداد رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس مفید دینی لٹریچر کے پیچھے کسی منظم پارٹی کا پروپیگنڈا نہیں اور نہ اسے کسی سیاسی گروہ کی تائید حاصل ہے مگر یہ کوئی کمزوری نہیں دین کا تقدس ہے کہ اسے اس قسم کی آلائشوں سے بالا رکھا جائے۔

سرزمین پاک وہند میں کئی افراد اور جماعتیں دین کا کام کر رہی ہیں۔ جماعت دیوبند کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اپنے علم وفکر کو اسلاف سے جوڑ کر آگے چلتے ہیں ان کا حال ماضی سے مربوط اور ان کا دین عہد صحابہؓ تک مسلسل ہے۔ دین کے نام پر جب یہ کہا جائے کہ پہلوں نے دین کو غلط سمجھا تھا۔ صرف ہم اس کے صحیح داعی ہیں یا اسلاف پر اس طور تنقید وجرح کی جائے کہ جس سے نقاد کی عظمت دلوں میں راسخ اور اسلاف کی عزت ووقعت اور عظمت ورفعت کم ہوتی چلی جائے تو ظاہر ہے کہ ایسے داعی حق اس عظیم قافلے کے رکن نہیں ہو سکتے جو عہد رسالت کے بعد قیام حق کے لئے چلا تھا اور قیامت تک اس کے ارکان اس راہ پر کاربند رہیں گے یہی حق کا تسلسل ہے اور یہی اسلام کی زندگی ہے۔ دین کی جو دعوت اسلاف سے مربوط نہیں وہ حق نہیں نفس کا فریب ہے۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے اس تسلسل کی یوں خبر دی ہے:۔

لاتزال طائفة من امتی قائمة بامر الله لایضرهم من خذلهم اوخلفهم حتی یاتی امر الله۔	میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اس کی مخالفت کرنے والے اسے کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔

زیر نظر کتاب ان "بیس بڑے مسلمانوں" کا تذکرہ ہے جو اسی عظیم قافلے کے رکن تھے۔ یہ اہل حق عہد رسالت سے قائم بامر اللہ چلے آ رہے ہیں اور اس وقت بھی ان کے جانشین اور خلفاء اس عظیم قافلے کا نشان ہیں۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ جب یہ کہتے ہیں کہ

ع سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

تو گویا وہ بھی اس مسلسل قطار کا ہی دم بھرتے ہیں اور اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کا اسناد قائم رہے حضرت امام ابن سیرینؒ تو علم اسناد کو بھی دین ہی قرار دیتے ہیں کیونکہ اس پر دین کا مدار ہے۔ امام مسلمؒ ان سے نقل کرتے ہیں:۔

ان هذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون	بے شک یہ علم (علم اسناد) دین ہے پس دیکھو کہ تم کن

دینکم لوگوں سے دین حاصل کرتے ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اگر کہا جائے کہ جماعت دیوبند آئینی طور پر ایک جماعت نہیں ان کی کسی ایک رجسٹر میں ممبر سازی نہیں۔ اس کے کارکنوں کے موضوع مختلف ہیں اگر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مفتی کفایت اللہ دہلویؒ استخلاص وطن کے لئے قید وبند کی صعوبتیں اٹھاتے رہے تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ زیادہ تر حکمت اور تزکیہ نفوس میں مصروف رہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے فقہ وحدیث کی مسند نے زینت لی۔ حضرت مولینا محمد الیاس کاندھلوی امر بالمعروف کے لئے ہر بستی وصحرا میں گھومے تو نہی عن المنکر کے لئے مولانا مرتضےٰ حسن چاندپوری، مولانا عبد الشکور لکھنوی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ اہل باطل کے سامنے تلوار بن کر چمکتے رہے۔ اور ان سب کے شیوخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے تزکیہ نفوس جہاد بالسیف، درس وتدریس اور مسند ارشاد وفتاویٰ میں ساری عمر گزار دی۔ تو یہ افراد جو مختلف موضوعوں اور میدانوں میں کام کرتے رہے اور ہر ایک کا دائرہ عمل ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ اب یہ مختلف حضرات اس عظیم قافلے کے رکن کیسے ہو سکتے ہیں جو عہد رسالت سے قائم بامر اللہ چلا آرہا ہے۔ طائفہ وہی ہے جس کے ارکان ایک نظام میں منسلک ہوں جواباً عرض ہے کہ طائفہ کے لئے موضوع عمل ایک ہونا ضروری نہیں جو لوگ اصولاً متحد ہوں اور موضوعاً تقسیم کار میں جدا جدا کام کر رہے ہوں یہ ان کے ایک جماعت ہونے کے منافی نہیں۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ کبھی وہ ایک جگہ جمع ہوں اور ایک رجسٹر میں مندرج ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اقطار عالم میں پھیلے ہوتے ہوں اور بعض ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ ہوں مگر سلف سے مربوط رہنے میں سب ایک دوسرے کے قوت وبازو ہوں۔ حدیث مذکورہ بالا کا محدثین نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث امام محی الدین نوویؒ اس طائفہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:۔

قلت ویحتمل ان ھذہ الطائفۃ مفرقۃ بین انواع المومنین منھم شجعان مقاتلون ومنھم فقھاء ومنھم محدثون ومنھم زھاد وآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر ومنھم اھل انواع اخریٰ من الخیر ولا یلزم ان یکونوا مجتمعین بل قد یکونون متفرقین فی اقطار الارض وفی ھذا الحدیث معجزۃ ظاھرۃ فان ھذا الوصف مازال بحمد اللہ تعالیٰ من زمن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) الی الآن ولا یزول حتی یاتی امر اللہ المذکور

میرے خیال میں طائفہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ مسلمانوں کی متفرق اقسام پر مشتمل ہو ان میں (۱) لڑنے والے بہادر بھی ہوں (۲) فقہا بھی (۳) محدثین بھی (۴) زاہد وعابد بھی (۵) امر بالمعروف کا تبلیغی کام کرنے والا (۶) باطل کا مقابلہ کرنے والے اور (۷) کئی دوسرے نیک کام کرنے والے بھی۔ طائفہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ (ایک رجسٹر یا ایک جگہ) جمع ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اقطار ارض میں پھیلے ہوئے ہوں اس حدیث میں اسلام کا ایک ظاہر معجزہ مذکور ہے کیونکہ قیام بامر اللہ کا یہ وصف اس امت میں عہد رسالت سے لے کر اب تک مسلسل چلا آرہا ہے اور یہ تسلسل اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ قیامت واقع نہ ہو جائے۔ اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے

فی الحدیث وفیہ دلیل لکون الاجماع حجۃ وھو اصح مایستدل بہ من الحدیث

کہ امت کا اجماع حجت ہے[1]۔ اور اجماع کے حجت ہونے پر احادیث سے جو استدلال کئے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ صحیح یہ استدلال ہے۔

(شرح صحیح مسلم صہ۱۴۳ ج ۲)

اسنادِ سلف کے اثرات

جن حضرات نے علم و عمل کے چراغ سلف کے اسناد سے روشن کئے ہوں ان کے ذمے سلف کا دفاع بھی لازمی ہوجاتا ہے۔ اور وہ اس بات کے مکلف ہیں کہ اپنے اسلاف کے عمومی کردار کو ہر دور میں بے داغ اور آئندہ نسلوں کے لئے بمنزلہ چراغ ثابت کرتے چلے آئیں۔ اس کے بغیر اسلام ایک مسلسل حقیقت نہیں رہتا اور نہ اسے ایک زندہ مذہب کہا جاسکتا ہے۔

اسلام کے اس تسلسل کا آغاز صحابہ کرامؓ سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پاک و ہند کی علمی و عملی فضا میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ ہمارے بعض دوست اس زنجیر کی پہلی کڑی کو کمزور بتاتے ہیں اور جن چند نفوس کا اقرار کرتے ہیں انہیں بھی حکمتِ عملی (یا تقیہ) اور خاموشی کی چادر اوڑھا دیتے ہیں اور دوسرے بعض حضرات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان مثل شاہ اسماعیل شہیدؒ اور شاہ محمد اسحاق محدثین دہلی پر اعتراض کرتے ہیں اور گو ان کے ایک بزرگ یہ بھی کہتے ہیں کہ علمائے مخاطین شاہ اسماعیل کو کافر نہ کہیں اسی میں سلامتی ہے مگر ان کی اس خاندان سے مخالفت پھر بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ محدثین دہلی کے پیرو تحریک خلافت میں ترکوں کے ساتھ تھے لیکن یہ بزرگ اور ان کے ساتھی ترکوں کی مخالفت میں کام کرتے رہے۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ علمائے حق اسنادِ دین کے دفاع میں صحابہؓ پر تنقید اور مخالفت بھی روکیں اور محدثین دہلی کی بھی عمومی صفائی پیش کریں کیونکہ اسناد کی یہی کڑیاں انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاتی تھیں اور اسلام کا تسلسل انہی حضرات سے قائم تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرو صحیح اسلام کے اسناد سے یوں بے نیاز ہوگئے کہ انہوں نے اس لڑی کے اعلیٰ ترین افراد صحابہ کرامؓ سے بھی ایک بڑا منصب (نبوت) اپنے گھر میں تجویز کرلیا اور مرزا صاحب نے اعلان کردیا کہ ہر وہ حدیث جو میری وحی کے خلاف ہو قابلِ قبول نہیں۔ چودھری غلام احمد پرویز نے پرلے اسلام سے بغاوت کرکے نیا "طلوع اسلام" جاری کرلیا۔ دینی نظریات کی اس کش مکش میں علمائے دیوبند مکمل طور پر صحابہ کرامؓ سے لے کر محدثین دہلی تک اسناد اسلام کی ہر کڑی سے پورے وفادار رہے اور سلف صالحین کی اتباع کی یہاں تک پابندی کی کہ کسی چھوٹی سے چھوٹی بدعت کو بھی دین نہ بننے دیا۔

دنیا نے اپنے آپ کو بدلا گھڑی گھڑی
اک اہلِ عشق ہیں کہ جہاں تھے وہیں رہے

تسلسلِ اسلام اور اسنادِ دین کو کمزور کرنے والے ان مختلف طبقوں سے ان اکابر نے اگر کوئی اختلاف کیا تو یہ اس لئے نہیں کہ وہ اختلاف پسند تھے یا انہیں کسی طبقے سے کوئی ذاتی بغض تھا بلکہ محض اس لئے کہ اسلام جس مبارک سلسلے سے ہم تک پہنچا ہے اس سے پوری وفا کی جائے۔ ان کے ہاں نئے الحادی یا بدعی نظریات کی تخریب و تردید اس لئے ضروری تھی کہ اس کے بغیر اصل اسلام کی تعمیر اور بقا

---

[1] ۔ کیونکہ اجماع تبھی ہوگا جب یہ طائفہ بھی ساتھ ہو۔ اور اس طائفہ کا حق پر ہونا منصوص ہے۔ پس اجماع کے حق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔

کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن ان کی یہ تردید بھی اصولی رہی اور اس کا انداز جدلِ احسن رہا جس کی تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے،

وجادلھم بالتی ھی احسن پ١٤ اور ان سے مجادلہ احسن طور پر کرو

ناموسِ صحابہؓ کے دفاع میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ہدیۃ الشیعہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ہدایۃ الشیعہ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے مطرقۃ الکرامۃ علیٰ مرآۃ الامامۃ اور ہدایات الرشید الیٰ افحام العنید تحریر کیں۔ اور محدثین دہلی کے علمی منصب کی پوری نمائندگی کی جیسا کہ الامام المحدث شاہ ولی اللہ کی "ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفا" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" اور شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" سے ظاہر ہے۔ اس عہد متاخر میں مخدوم القوم سردار احمد خاں پتافیؒ کی قائم کردہ تنظیم اہل سنت، مولانا سید نور الحسن بخاری کی قیادت میں اس پلیٹ فارم کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اس عظیم شاہراہ اسلام میں ایک بہت بڑا فتنہ انکار ختم نبوت سے پیدا ہوا اور منکرین ختم نبوت یورپ میں تبلیغی مشنوں کے حسین عنوان سے مسلمانوں کو ارتداد کی گود میں کھینچ رہے تھے۔ علمائے حق نے مسلمانانِ ہند کو اس فتنے سے پوری طرح خبردار کیا۔ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ۔ حضرت مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنیؒ مفتی اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا اور عقائد اسلام کے تحفظ کے لیے مسلمانان ہند کو وہ علمی اور تحقیقی لٹریچر مہیا کیا کہ منکرین ختم نبوت دم بخود رہ گئے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم اور حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ بھی اس میدان میں ان حضرات کے ہم نوا رہے ہیں۔ میدان تبلیغ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شعلہ نوائی سے ربع صدی کے قریب گرم رہا اور شاہ صاحب آخر دم تک ان کے سروں پر تیغ براں کی طرح لٹکتے رہے اور ان کے بعد مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ اور ان کے بعد اب مولانا محمد علی جالندھری اس مورچے کو سنبھالے ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی کا مشن تحفظ ختم نبوت قرار دے رکھا ہے گو اس باب میں مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ابوالحسنات اور مولانا محمد داؤد غزنوی نے بھی بے شک بہت کام کیا ہے، لیکن زمام کار پیروان محدثین دہلی حضرات علمائے دیوبند کے ہاتھ رہی ہے۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری اہل باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ تیغ بے نیام رہے اور انہیں جہاں اور جب کہیں پتہ چلا کہ کوئی اسلام میں رخنہ اندازی کر رہا ہے اور ملت اسلامیہ کو سلف صالحین کے ساتھ جوڑے رکھنے کی بجائے توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ایسا کرنے والے بزعم خود مردان امت کی ایسی رہبری کر رہے ہیں کہ پوری تاریخ میں ملت کو ایسا عالی دماغ قائد و رہنما ملا نہیں آیا تو حضرت مولانا اس کے سامنے بلاخوف لومۃ لائم سینہ سپر ہو گئے۔ اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ فتنہ انکارِ حدیث پر ضرب کلیمی کی ضرورت ہے تو انہوں نے صاف اور واشگاف الفاظ میں ایک جلسہ عام میں اعلان فرمایا کہ جو حدیث کا منکر ہے وہ قرآن کا منکر ہے اور قرآن کا منکر دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی علمائے ربانی خاموش نہیں تھے لیکن حضرت لاہوریؒ کے اس نعرہ رستاخیز کے بعد ملک اور بیرون ملک کے ہر فرقہ و خیال کے علماء کے دستخطوں سے ایک ضخیم جلد شائع ہوئی جس میں حضرت مولانا کے اس خیال کی مکمل تائید کی گئی اور اس پر اجماعِ امت ہو گیا کہ حدیث کے منکر کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اب اس سلسلے میں مولانا سرفراز احمد خاں صاحب صفدر شیخ الحدیث مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری

قابلِ قدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

ردِّ بدعت و شرک

اتباعِ سنت اور حدیث کا انکار کرنے والا گروہ "مرکزِ ملت" کے نام سے ایک نئی اصطلاح وضع کر کے قرآن کی تعبیر و تشریح کا اختیار اسے سونپ دیتا ہے کہ یہ نام نہاد مرکزِ ملت زمانے کے تقاضوں اور امنگوں کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ کے ارشادات، صحابہؓ کے فیصلوں اور اجماعِ امت کے مسائل سے قطع نظر کر کے جو چاہے فیصلہ کر دے۔ ایک دوسرا گروہ ایسا ہے جو زبانی کلامی محبت و عشقِ رسول کا بہت دعویدار ہے اور اپنے سوا تمام طبقاتِ امت کو قابلِ گردن زدنی اور دنیا کے ہر کافر و مشرک سے بدتر سمجھتا ہے، لیکن عملاً اس کا حال یہ ہے کہ شریعت کے پرنور چہرے کو مسخ کر کے دین میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے اور جب ٹوکا جاتا ہے تو "ثواب کا کام ہے، کیا حرج ہے" ان جیسی باتیں کہہ کر اپنی وضع کردہ رسوم و بدعات کو داخل کرتا اور من گھڑت انکار کو شریعت قرار دیتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں اپنے ان رسوم و رواج کو دین و شریعت کا جزو بنانے کے لیے بے معنی دلائل کا انبار لگا دیتا ہے۔ ایسے رسوم و رواج کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعت قرار دیا ہے اور بدعت ایسی برائی ہے کہ جس کا چھوڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی کے لئے نیا دین اختیار کرنا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر خطبہ میں بدعت کی برائی بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے بعد صحابہؓ سے لے کر آج تک علمائے حقانی نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ ردِ بدعت پر مرکوز رکھا کیونکہ اسی سے شرک کی راہ نکلتی ہے۔ جانشینان محدثین دہلی نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا۔ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید بریلویؒ نے اس بارے میں بہت مضبوط موقف اختیار کیا یہی وجہ ہے کہ مبتدعین کی نظر میں سب سے زیادہ یہی دو حضرات کھٹکتے ہیں۔ ان حضرات کے بعد اکابر دیوبند نے ان کی جانشینی کا حق ادا کیا اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ردِ شرک و بدعت کی خدمات کو تا قیامت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی قریب میں مولانا حسین علی (واں بھچراں) اور مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری نے اس فریضہ کو بطریقِ احسن ادا کیا۔ مولانا محمد منظور نعمانی سالہاسال اس میدان میں کام کرتے رہے۔ اور آج کل ان سب کی جانشینی کا حق تحریری طور پر حضرت مولانا سرفراز احمد خاں سر انجام دے رہے ہیں اور حق یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر انہوں نے قابلِ قدر ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے کتاب و سنت کی راہیں واضح اور کشادہ نظر آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم میں اثر رکھا ہے چنانچہ تھوڑے عرصہ میں ان کی اکثر کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

قافلۂ اسلام کے ان کارکنوں کی نظر مخالفین کی مخالفت کی بجائے اصل اسلام کی اشاعت پر زیادہ مرکوز رہتی ہے مخالفت یہ صرف رستے کی چھیڑ ہے جسے خدام دیوبند پسند نہیں کرتے۔ ہاں گلے پڑ جائے تو پھر اس سے گریز بھی نہیں پھر یہ حضرات ایسے کج رو الناوں کو چھٹی کا دودھ یاد کرا دیتے ہیں۔ اور صدق کی تلوار حق کا جلال بن کر چمکتی ہے اس کا مقصد بھی مخالف کی تذلیل نہیں متوارث اسلام کی وفا ہے کیونکہ اسناد اسلام کی جملہ کڑیاں اپنی اپنی جگہ لائق تحفظ ہیں۔

علم و تحقیق اور تزکیہ و تدریس تک ہی نہیں اکابر دیوبند نے نئے نئے پیش آمدہ حالات میں ملت کی ہر بزم پر راہنمائی کی ہے۔

جس طرح فروعی مسائل میں ائمہ مجتہدین میں اختلاف ہوا۔ اسی طرح خالصتہً سیاسی مسائل میں ہر دور میں نظریاتی اختلاف پایا گیا ہے برِ صغیر ہندوستان میں بھی یہ نظریاتی اختلاف پیدا ہوا۔ اکابر دیوبند کا ایک وقیع گروہ اگر کانگریس کے ساتھ اتحاد و اشتراک کو ملک و ملت کے لیے مفید خیال کرتا تھا تو دوسرا وقیع گروہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم اور کانگریس سے عدم اشتراک و اتحاد کا موید تھا۔ پہلے گروہ کے قائد حضرت مولانا

سید حسین احمد مدنیؒ اور دوسرے کے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تھے اور دونوں گروہوں کا یہ اختلاف مبنی بر دیانت تھا اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے دلائل تھے۔ یہ کہنا تاریخی حقائق کا منہ چڑانا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تمام خدام یا متعلقین کانگرس کے موید تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی علی الاعلان حمایت کی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کے لیے مفید اور بہتر قرار دیا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پاکستان کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قائداعظم کے بعد تصور پاکستان کے خاکہ میں رنگ بھرنے کا سب سے موثر عمل حضرت علامہ ہی کا تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ نے قرارداد پاکستان کی تائید میں بیانات جاری فرمائے۔ جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد رکھی، مضامین لکھے، پرزور تقاریر کیں۔ پیرانہ سالی میں ہمت کو جوان کر کے قائداعظم کا پورا پورا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی فضائیں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر آفریں خطابت کا جواب مسلم لیگ کے پاس شیخ الاسلام ہی کی وجد آفریں زبان تھی اور پھر سابق صوبہ سرحد اور سلہٹ (مشرقی پاکستان) کا ریفرنڈم تو شیخ الاسلام ہی نے جیتا تھا۔ حضرت علامہ پاکستان کی حمایت میں نہ نکلتے تو آج یہ علاقے بھی ہندوستان کے پاس ہوتے۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ کی پاکستان میں شمولیت محدث دیوبند کا پاکستان پر احسان عظیم ہے۔ حلقۂ دیوبند سے حضرت علامہ ہی پاکستان کی حمایت میں نہیں نکلے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی، حکیم الامت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ اور حکیم الامت کے دوسرے سب خلفاء پاکستان کے حامی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے چار بڑے عہدیداروں (سرپرست، صدر مہتمم، صدر مدرس، مہتمم) میں سے تین مسلم لیگ کے ہم خیال تھے۔ سرپرست حضرت تھانویؒ تھے۔ صدر مہتمم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تھے اور مہتمم حضرت قاری محمد طیب دامت برکاتہم تھے۔ صدر مدرس اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کانگریس کے ہم خیال تھے۔

ہمیں ان دوستوں پر بہت افسوس ہے جو پاکستان کی مخالفت میں تو دیوبند کا ذکر کرتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں اکابر دیوبند کی خدمات کا خاطر خواہ تذکرہ نہیں کیا جاتا حالانکہ ان اکابر کی خدمات کے بغیر پاکستان کی تعمیر کسی طرح ممکن نہ تھی۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا اختلاف بھی مسلمانوں کے سودے پر نہیں دیانت پر مبنی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان وہ قوت ایمان اور ہمت عمل رکھتے ہیں کہ متحدہ ہندوستان میں کبھی مغلوب نہیں رہیں گے۔ ایک تہائی کے قریب تعداد اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر یہ خدا کے ہو کر رہیں اور محمد بن قاسم، سلطان محمود غزنوی وغیرہم حضرات کا جذبہ اپنے اندر پیدا کر لیں تو ہندو اکثریت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی اور اگر ایمانی جذبہ مفقود رہا، بے عملی والحاد نے راہ پکڑ لی تو پھر ایک علیحدہ ملک لے کر بھی ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ حضرت مولانا مدنیؒ مسلمانوں کو اپنے آئینہ میں دیکھتے تھے مگر حضرت تھانویؒ انہیں حالات کے آئینہ میں اور ان کی عملی کوتاہیوں کو دیکھ رہے تھے۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کہ حضرت مدنیؒ کا اختلاف کسی غرض پر نہیں دیانت و خلوص پر مبنی تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم لیگ کے جلسوں میں بارہا فرمایا کہ مجھے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے پورا سیاسی اختلاف ہے مگر مجھے ان کی دیانت پر کبھی ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا۔ واقعی بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ حقیقت ہے کہ دیوبند کے ایک حلقے میں اگر کانگریس کی حمایت تھی تو دوسرا حلقہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں

علی الاعلان مسلم لیگ کے ساتھ تھا اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے تمام خلفاء بھی پاکستان کے حامی تھے۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جو لوگ پاکستان کی مخالفت میں حضرت مولانا مدنیؒ کے اسم گرامی کو اچھالتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی کوششوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے انہیں اصولا اس وقت کے سیاسی اختلافات سے دلچسپی نہیں بلکہ علماء کے خلاف ایک اندرونی بغض ہے جس کو یہ لوگ وقتاً فوقتاً اگلتے رہتے ہیں مسلمانوں کو ایسے بے رحم انداز گفتگو سے محتاط رہنا چاہیے۔ علمائے دین کے خلاف اس قسم کے خیالات دین سے بیزاری کا ایک نیا عنوان ہے۔

قراردادِ مقاصد

پاکستان بننے کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلمانوں سے کیے گئے اس وعدے کو پورا کیا کہ پاکستان کا دستور قرآن وسنت پر مبنی ہوگا اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد پاس کرائی جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی سلطنت ہوگا اور اس کے قوانین شریعت اسلامیہ پر مبنی ہوں گے۔ شیخ الاسلام نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور بڑی محنت سے قرارداد مقاصد پاس کرائی مگر افسوس کہ مولانا کی وفات کے بعد ملکی قیادت کے مدوجزر نے اس قرارداد کو بھی ایک یادگار ماضی بنا کر رکھ دیا حالانکہ یہ قرارداد پاکستان کی روح تھی اور اسی مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

تعلیماتِ اسلامی بورڈ اور شریعت کی قانونی دفعات

خاں لیاقت علی خاں مرحوم نے شیخ الاسلام کے ارشاد کے مطابق تعلیمات اسلامیہ کا ایک بورڈ قائم کیا جو شریعت کی روشنی میں پاکستان کی قانون سازی کرے اور پھر یہ سفارشات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوں۔ بعض اعیانِ حکومت کا خیال تھا کہ علمائے اسلام وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانونی جزئیات مرتب نہ کر سکیں گے اور روایات کے اختلاف میں الجھ کر رہ جائیں گے مگر علمائے دیوبند نے وقت کے اس چیلنج کو بھی قبول کر لیا اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت علامہ سید محمد سلیمان ندویؒ خلیفہ خاص حضرت حکیم الامت تھانویؒ جو اس بورڈ کے ممبران میں سے تھے انہوں نے اس بیدار مغزی، روشن خیالی اور وسعت نظر سے اسلام کی قانونی جزئیات مرتب کیں کہ حکمران طبقے کے لیے اعتراض کا کوئی موقعہ نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ قانونی مسودات کو سرخ فیتے سے باندھ رکھیں اور دستور ساز اسمبلی تک پہنچنے ہی نہ دیں ہمیں اس وقت اس کی علت اور غایت سے بحث نہیں ہمیں صرف یہ بتلانا ہے کہ علمائے دیوبند نے وقت کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ہر موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اکابر علمائے اسلام نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی بھی پوری صلاحیت رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ اجتہاد آزاد نہ ہو۔ پچھلے مجتہدین کرام کے بیان کردہ اصولوں کے ماتحت ہو اور اس کا مقصد بھی نئے مسائل کا حل ہو پہلے فیصلوں کی تردید وتنقیص نہ ہو اس قسم کے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ نئے اجتہاد کا مطلب پچھلے مجتہدین کی تغلیط نہیں بلکہ پچھلے ذخیرۂ اجتہاد پر ایک ضروری اضافہ ہے۔ علمائے دیوبند نے اس قسم کے اجتہاد کو کبھی منع نہیں کیا ہاں یہ ضروری

ہے کہ اس کی اجازت انہی لوگوں کو ہو جو اس کے اہل ہوں اور پچھلے فقہاء و مجتہدین کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں۔

اسلامی دستورِ مملکت کی مساعی

پاکستان ایک مسلم جمہوری مملکت ہے یہاں ہر مکتبِ فکر کے مسلمان رہتے ہیں۔ ہر ایک کی فکر اور فقہ جدا ہے۔ شیعہ لوگوں میں اکثریت اثنا عشری فرقے کی ہے۔ اہل سنت کے بڑے بڑے گروہ دیوبندی اور بریلوی ہیں۔ اہلحدیث کے ہم خیال بھی کافی موجود ہیں مولانا مودودی کے ہم مسلک بھی کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں۔ ان تمام مکاتب فکر میں کوئی ایسا مکتب نہیں جس پر دوسرے سب مکاتب جمع ہو جائیں ہر ایک کے اپنے اصول ہیں اور اپنے مسائل ہیں ان میں سے جو جماعت بھی نفاذِ شریعت کے لئے آگے بڑھے گی دوسری جماعتیں اسے اپنے مسلک کے لیے خطرہ سمجھیں گی گو وہ جماعت دوسرے مکاتبِ فکر کو کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائے کہ اسلامی قانون سازی کے وقت ہر مکتبِ فکر کی فقہ کا پورا احترام کیا جائے گا۔ یہ یقین دہانی اسی قسم کی ہوگی جیسے کانگریس مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتی تھی کہ ہندوستان آزاد ہونے پر ہر طبقے کو اس کے حقوق پورے ملیں گے لیکن مسلم لیگ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اقتدار پر قبضہ ہونے کے بعد مسلمان انہی کے رحم و کرم پر ہوں گے اسی طرح مسلمانوں کا ہر مکتبِ فکر نظام اسلامی کے قیام کی باگ کسی ایک مکتب فکر کے ہاتھ میں دینا اپنے لیے خطرناک سمجھتا ہے مبادا وہ لوگ اقتدار پر آکر ان کی فکر و فقہ کو نظر انداز کر دیں۔ جماعت اسلامی اگرچہ اپنے آپ کو تمام فرقوں سے بالاسمجھتی ہے اور گروہی تعصبات سے دور رہنے کا اعلان کرتی ہے لیکن عملاً وہ مولانا مودودی کی مساعی سے ایک ایسا فرقہ بن چکی ہے جس کو ہر فرقے سے تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ جماعت کی اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے ارکان اور متفقین وغیرہ زیادہ تر مولانا مودودی کا مسلک رکھتے ہیں مگر اس ایک مکتبِ فکر کے ساتھ وہ تمام مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرنا چاہتے ہیں اور جب یہ بات سامنے آتی ہے تو مولانا مودودی کی یقین دہانی پھر وہی رنگ اختیار کرتی ہے جو کانگریس کے لیڈر اختیار کرتے تھے۔ ان حالات میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور مملکت اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے یہاں کے رہنے والے تمام مکاتبِ فکر مشترکہ کمان سے نہ چلیں۔ جماعت اسلامی کے ارکان علیحدہ علیحدہ ہر مکتبِ فکر کے افراد کو اپنے ساتھ کھینچتے ہیں لیکن ان کے مکاتبِ فکر کو ان کی نمائندہ حیثیت میں کبھی انہوں نے دعوت نہیں دی اور نہ انہوں نے دوسرے تمام مکاتبِ فکر کی کبھی کوئی مشترکہ میٹنگ بلائی ہے۔ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے لیے وہ کسی مشترکہ قیادت کے قائل نہیں[1] علمائے دیوبند اس اصولی ضرورت سے پوری طرح باخبر تھے نظام اسلامی سے گریز پائی کرنے والے مسلمانوں کے باہمی اختلافات

---

[1] امیر جماعت اس دور میں داعی اسلام کہلاتے ہیں بلکہ انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ "داعی اسلام بے چارہ کیا کرے" سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف مسلم فرقوں کو یکجا کرنے کے لیے آج تک کیا کیا۔ تحریری طور پر تو وہ سبق دیتے ہیں میں امت مسلمہ کو یکجا کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں اور اسی نعرے کی بدولت شروع شروع میں ہندوستان کے بعض بڑے علماء نے اس آواز پر لبیک کہا اور کئی اکابر نے ان کی تحسین بھی کی جس کو آج بھی جماعت اسلامی اچھالتی ہے لیکن عملاً وہ بعض اجتہادی مسائل اور بعض دوسرے امور میں پوری امت کے مجددوں پر تنقید کر کے اہل سنت والجماعت کے تمام فرقوں سے ایک علیحدہ فرقہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اسلامی نظام جو اصل مقصد ہے اس کے لیے تو وہ مشترکہ قیادت کے قائل نہیں لیکن جمہوریت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی بھی قیادت قبول کرتے ہیں اور نوابزادہ نصر اللہ خاں کی بھی۔ ع این چہ بوالعجبی است (ارشد)

کو نظامِ اسلام کے نفاذ کا ایک بہانہ بنا رہے تھے علماء دیوبند نے اس مغرب زدہ طبقے کا چیلنج بھی قبول کیا اور کراچی میں مختلف مکاتبِ
کے علماء کی ایک مشترکہ میٹنگ بلائی جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ تمام مکاتبِ فکر کے اکابر شامل ہوئے۔ مولانا م
نے اپنے مکتبِ فکر کی نمائندگی خود کی۔ اکتیس علماء کی یہ نمائندہ میٹنگ بلانے کا سہرا علامہ سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا احتشام الحق
صاحب تھانوی کے سر بندھا۔ کافی بحث وتمحیص اور محنت و عرق ریزی کے بعد وہ مشترکہ دستوری خاکہ تیار ہوا جس پر تمام مکاتبِ
متفق ہوئے یہ اکتیس علماء کا "تاریخی فیصلہ" کہلاتا ہے اور بارہا چھپ چکا ہے اور ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے جو فرقہ وارا
اختلاف کی آڑ میں اسلامی نظامِ زندگی سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ علمائے دیوبند کا یہ وہ تاریخی کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک مثال ر
گا ہمیں اس وقت اس کی تفصیلات سے بحث نہیں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرزمین پاک و ہند میں مسلکِ دیوبند ہی ایسا
مسلک ہے جس کے علماء نے باہمی اختلاف کو کم کرنے اور مشترک ملّی ضروریات کے موقعہ پر مختلف مکاتبِ فکر کو جوڑنے کی پو
مخلصانہ کوشش کی ہے۔

عائلی قوانین اور علمائے حق

عائلی اختلافات و مسائل پر حکومت پاکستان نے ایک عائلی کمیشن مقرر کیا جو یہ رپورٹ پیش کرے کہ عائلی قوانین کو کس طرح کتاب وسنت
کے مطابق بنایا جاسکتا ہے اس کمیشن میں مولانا احتشام الحق تھانوی بھی ایک رکن تھے لیکن اس کے باقی ارکان مغرب زدہ تھے۔ انہوں نے
اپنی جو رپورٹ مرتب کی اس میں عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کے عنوان سے ایسی تجاویز پیش کی گئیں جو سراسر اسلامی تعلیمات کے منا
تھیں۔ مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس پر اختلاف کیا اور اپنا ایک مفصل اختلافی نوٹ لکھا جو کتاب وسنت کی صحیح عکاسی کرتا تھا
خود اعیانِ حکومت میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو اسلام کے نام سے غیر اسلامی قانون کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس
اختلاف کو اہمیت نہ دی۔ عائلی سفارشات کو منظوری کے درجہ میں تھیں لیکن ان کا نفاذ نہ ہوا تھا کہ مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا۔ اور مارشل لا
کے سایے میں ان سفارشات کو ایک آرڈیننس کے ذریعہ قانون کی شکل دے دی گئی اور اس کی دفعات قوم کے سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ
بعض امور میں صریحاً قرآن وسنت کی مخالفت کی گئی ہے اور قرآن پاک میں تحریف کر دی گئی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مف
محمد حسن صاحبؒ خلیفۂ اکبر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تجویز وصدارت میں شیعہ سنی۔ دیوبندی۔ بریلوی۔ اہلحدیث تمام مکاتبِ
کا نمائندہ اجتماع جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد میں ہوا۔ اور بالاتفاق عائلی قوانین کو مداخلت فی الدین قرار دیا گیا۔ لیکن اس فیصلہ کی اشاعت کی
اجازت نہ ملی۔ اسی طرح مولانا احمد علیؒ کی صدارت میں اسی قسم کا فیصلہ ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں محمد ایوب خاں نے ملک کو نیا آئین دیا اور اس
تحت انتخابات ہوئے ہزارہ سے مولانا غلام غوث ہزاروی صوبائی اسمبلی کے ممبر اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے مفتی محمود صاحب قومی اسمب
کے ممبر منتخب ہوئے۔ صوبائی اسمبلی میں عائلی قوانین کے خلاف صدائے بازگشت سنی گئی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے اس سلسلے میں ایک
معرکۃ الآرا تقریر کی اور کہا کہ صوبائی اسمبلی ان قوانین کو مسترد کرنے کی سفارش کرے۔ ایک مرد مجاہد کی للکار جرأت وبیباکی اور کتاب
سنت کی ترجمانی کا یہ اثر ہوا کہ سوائے چار پانچ ممبروں کے تمام ہاؤس نے مولانا کی تائید کی اور عظیم اکثریت سے مولانا کی تجویز پاس ہو
اور یہ قرارداد مرکزی اسمبلی کو بھیج دی گئی لیکن قومی اسمبلی میں اس کا جو حشر ہوا وہ ایک طویل درد انگیز داستان ہے جس کو علامہ اقبال
کے الفاظ میں مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساحری

ختمِ نبوّت اور علمائے حق

اسلام اللہ کا آخری دین۔ قرآن پاک خدا کی آخری کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں لیکن مملکت پاکستان میں بوجوہ اس عقیدہ کے خلاف کام ہوتا رہا۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ تحفظ ختم نبوت کے بارے میں ایک موثر تحریک چلائی جائے اور حکومت تک اپنے مطالبات پہنچائے جائیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی جالندھری نے تمام مکاتب فکر کے تقریباً پانچ صد نمائندہ علماء کرام کو دعوت دی اور برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں ایک عظیم تاریخی اجتماع ہوا اور طے ہوا کہ اس سلسلے میں آئینی اور قانونی طور پر اپنے مطالبات حکومت تک پہنچائے جائیں۔ ایک مجلس عمل ترتیب دی گئی جس کے صدر مولانا ابو الحسنات قادری خطیب جامع مسجد وزیر خاں مقرر ہوئے۔ تحریک پر امن طریق سے چل رہی تھی کہ مجلس عمل کے تمام ارکان کو کراچی میں گرفتار کر لیا گیا۔ تحریک اتنی ہمہ گیر اور وسیع ہو چلی تھی کہ مغربی پاکستان کے نوے فیصد عوام و خواص اس کے ساتھ تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب محمد ممتاز دولتانہ نے بھی ہمنوائی کی۔ امید تھی کہ اس عوامی اور اسلامی تحریک کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے لیکن مجلسِ عمل کی گرفتاری سے ملک میں آگ لگ گئی۔ اور تحریک جذبات کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اور لاہور میں مارشل لار لگانا پڑا اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت کی غلط پالیسی اور مجلس عمل کے ارکان کی گرفتاری کا ردّ عمل تھی۔ عرض کرنا یہ مقصود ہے کہ علمائے حق نے جہاں بھی ملتِ اسلامیہ کے ایک اہم بنیادی مسئلہ کی حفاظت کے لیے پوری امت کو ایک سٹیج پر لا کھڑا کیا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں اکٹھے نہیں ہو سکتے وہ حقائق سے چشم پوشی کرتے اور اپنے مخصوص مفادات و نظریات کے پرچار کی خاطر ہمیشہ سے غلط پروپیگنڈہ کرتے چلے آتے ہیں۔

اس مختصر تحریر میں ان خدمات کی تفصیل کا حصہ پیش نہیں کی جا سکتی جو ان علمائے حق نے برصغیر پاک و ہند میں ملت اسلامیہ کی راہنمائی کرتے ہوئے سرانجام دیں۔ اس کام کی قدرے تفصیل "بیس بڑے مسلمان" کے عنوان سے آپ کے سامنے ہے جو بیس علمائے حق اور متوسلین کی متاعِ حیات ہے جس میں ذی علم اور فاضل حضرات کے قلم سے ان اکابر کے سیرتی خاکے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ان اہل حق کی پاکیزہ داستان ہے جو ایک صدی کے قریب اپنے اپنے دائرہ عمل میں حق کا نشان بنے رہے۔ اس پاکیزہ داستان کی تحریک تجویز اور ترتیب عزیز محترم مولینا حافظ عبد الرشید ارشد فاضل خیر المدرس نے کی ہے۔ جو اس پاکیزہ کوشش پر ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں۔ رب العزت عزیز موصوف کی اس کوشش کو اسی طرح حیات دوام بخشیں جس طرح انہوں نے اپنے اسلاف کی خدمات کو زندہ رکھنے کی یہ گراں بہا کوشش کی ہے ؎

نامِ نیک رفتگان ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

راقم الحروف اپنی علمی بے بضاعتی اور ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے اس لائق نہ تھا کہ ان پاکباز و پاک نہاد اکابر کی سوانح پر کچھ ابتدائی سطور لکھے لیکن عزیز موصوف کے اصرار اور گذشتہ کئی سال کی مودت نے مجبور کر کے یہ چند سطور لکھوا دی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے ان بزرگوں کے تبحر، تقدس اور ان کی قربانیوں کا حق ادا نہیں ہوسکا لیکن اس انتساب سے یہ کچھ امید ہوگئی ہے کہ رب العزت ان کی محبت کا صدقہ ان کے ساتھ حشر فرمائے ؎

أُحِبُّ الصالحین ولستُ منهم لعل الله یرزقنی صلاحا[1]

یہ سطور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور انگلستان میں جہاں کوئی مطلوب کتاب پاس نہیں مسافرت کی حالت میں لکھی گئی ہیں کوئی کمزوری رہ گئی ہو یا کوئی ضروری بات نہ آسکی ہو تو دوستوں سے معذرت اور چشم پوشی کا خواستگار ہوں۔

خاکپائے اکابر اہل سنت والجماعت
خالد محمود سیالکوٹی عفا اللہ عنہ
ایم اے برمنگھم یونیورسٹی

---

[1] نیک لوگوں سے محبت رکھتا ہوں اور ان میں سے نہیں ہوں۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی (ان کی برکت سے) نیکی عطا فرمائے۔

از حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

مختصر تاریخ

دارالعلوم دیوبند

کی داخلی راہ نمائی ہو اور دوسری طرف خارجی مدافعت۔ نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایمان وارانہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔ ان مقاصد کے لئے کمر باندھ کر اُٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے راہنما اور لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء وقت تھے اور ان کی یہ باہمی گفت و شنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلۂ خیال نہ تھا بلکہ تبادلۂ الہامات تھا۔ جیسا کہ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمہ اللہ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند سے سُنا کہ وقت کے ان تمام اولیاء اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کی واحد صورت قیام مدرسہ ہے چنانچہ اس مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حفظِ دین و مسلمین کے لئے اب ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ کا قیام ضروری ہے۔ کسی نے بہت صریح لفظوں میں کہا کہ مجھے منجانب اللہ الہام کیا گیا ہے کہ ان حالات میں تعلیم دین کا ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے۔ ان اہل اللہ کا اس تبادلۂ واردات کے بعد قیام مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالمِ غیب کا ایک مرکب اجماع تھا جو قیام مدرسہ کے بارہ میں منجانب اللہ واقع ہوا۔

اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیام مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی۔ وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردہ میں مُلک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہوئی تھی۔ جو محض مقامی یا ہنگامی نہ تھی کیونکہ اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا اثر بھی مقامی نہ تھا جس کے تدارک کی فکر تھی وہ پورے ملک پر پڑ رہا تھا اس لئے اس کے دفعیہ کی یہ ایمانی رنگ کی تحریک بھی مقامی انداز کی نہ تھی بلکہ اس میں عالمگیری پنہاں تھی۔ گو ابتداء میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی، مگر اس وقت اس میں ایک تناور شجرۂ طیبہ لپٹا ہوا تھا جس کی جڑیں سچے قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں ان نفوس قدسیہ کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ تھے جنہوں نے اس غیبی اشارہ کو سمجھا اور اُسے ایک تجویز کی صورت دی۔

بنائے دارالعلوم

کچھ وقت گذرنے کے بعد یہ مبارک تجویز عملی صورت میں نمودار ہوئی اور ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ

مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو دارالعلوم کی بناء رکھ دی گئی

بناء رکھنے کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی۔ اس بناء میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ قابل ذکر ہیں جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تاسیس مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے دست و بازو رہے ہیں اور بناء کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن رکین کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔ بعد میں حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلسِ خیر کے رکن رکین ہوئے اور بالآخر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد و ایماء پر دارالعلوم کے عہدۂ اہتمام پر فائز ہوئے اور آپ کا عہد اہتمام خیر و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ دارالعلوم کی معنوی بناء کے لئے تو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے آٹھ اصول تحریر فرمائے۔ جو اس ادارہ میں تمام قوانین کے لئے اساس و بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ اصول عملی تجویز فرمائے جو اس ادارہ کے نظم و انتظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ دونوں بزرگوں کے اصولِ ہشتگانہ درج ذیل ہیں جو اس دارالعلوم کی حکمت عملی اور نظم و انتظام کی اساس ہیں۔

اساسی اصول ہشتگانہ

از حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی — بانی دار العلوم دیوبند

۱۔ اصل اوّل یہ ہے کہ تامقدور کارکنانِ مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں خیراندیشان مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے

۲۔ ابقاء طعام طلباء بلکہ افزائش طعام طلباء میں جس طرح ہوسکے خیراندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳۔ مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اسکی نوبت آئیگی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔

القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ اور اس کے پس وپیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامّل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائیگی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بدل وجان قبول کریں گے نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم اُمور مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد صادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیراندیش ہو اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے مشورہ کی نوبت نہ آوے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہلِ مشورہ معترض ہوسکتا ہے۔

۴۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہوچکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اوّل تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶۔ اس مدرسہ میں جبتک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جبتک یہ مدرسہ انشاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ چلیگا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا اور امداد غیبی موقوف ہو جائیگی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے

۷۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے اُمید ناموری نہ ہو بالجملہ حسنِ نیت اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

انتظامی اصول ہشتگانہ

از حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ —— مہتمم دوم دار العلوم دیوبند

۱- ہر کارخانہ کے امور جزئیہ کی بنا ایک شخص کی رائے پر رہنی چاہیئے - اسی قاعدہ پر اس کارخانہ کے امور جزئیہ کے ا
میں کسی صاحب کو اہل مشورہ میں سے دخل نہ ہو الا مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرمادیں جیسا اہل شوری مل کر پسند کر

۲- امور جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے بندہ ان کا مشکور ہوگا مگر انجام ا
موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہیئے۔

۳- جس کسی صاحب کو، خواہ اہل شوریٰ خواہ اور عام خلق، کوئی امر قابل اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے مزاحمت نہیں
جلسۂ شوریٰ میں پیش کر کے اس کو طے کرالیں اور جیسا قرار پائے اس کے انجام پر مہتمم کو عذر نہ ہوگا۔

۴- مشورہ کے جلسے جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہ ہوں گے اگرچہ اس کی ہی کسی بات پر غور دہ ہو اور یوں اہل شو
اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا۔

۵- مہتمم اگر اہل شوری کے اجتماع تلک کسی امر ضروری کے انجام پر انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اط
دے گا اور اس ضروری امر کو سب صاحبوں کو قبول کرنا ہوگا۔

۶- آمدنی مدرسہ کی مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی کیونکہ صرف ضروریہ کے لئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضرور
حاجت ضروری سے زیادہ روپیہ جب جمع ہو جایا کرے گا تو خزانچی کے پاس جمع کر دیا جائے گا۔

۷- ہر روز وقت مقررۂ مدرسہ پر مہتمم مدرسہ میں جایا کرے گا اور اسی وقت میں امور متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کرے گا۔

۸- مناسب ہے کہ سب اہل شوریٰ مل کر اپنے دستخط اس معروضہ پر فرمادیں کہ مہتمم کو جائے سند رہے۔

دستخط العبد محمد قاسم — دستخط العبد ذوالفقار علی — دستخط العبد محمد عابد

تحریر ۲۳ ذیقعدہ ۲۸۸ھ

دارالعلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں

دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں ایک انار کا درخت ہے۔ اسی درخت کے نیچے سے آبِ یات کا یہ چشمہ پھوٹا اور اسی چشمہ نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبیاری شروع کر دی اور دوسری طرف اس کی تیز و ند رَو نے شرک، بدعت، فطرت پرستی، الحاد و دہریت اور آزادیٔ فکر کے ان خس و خاشاک کو بھی بہانا اور راستہ سے ٹانا شروع کر دیا جنہوں نے مسلمانوں کے قلوب میں جڑ پکڑ کر انہیں یہ روزِ بد دکھایا تھا۔ بانیٔ دارالعلوم کا یہ خواب کہ میں انہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطرافِ عالم میں پھیل رہی ہیں" را ہوا اور مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہو گئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ فیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ کا یہ خواب کہ "علوم دینیہ کی چابیاں مجھے دی گئی ہیں" خواب ہی نہ رہا بلکہ حقیقت کے باس میں جلوہ گر ہو گیا۔

اور اس مدرسہ کے ذریعہ ان چابیوں نے ان قلوب کے تالے کھول دیئے جو علم کا ظرف تھے یا ظرف بننے والے تھے جن سے لم کے سوتے ہر طرف سے پھوٹنے لگے اور چند نفوس قدسیہ کا علم آن کی آن میں ہزارہا علماء کا علم ہو گیا۔ حضرت سید احمد شہید اتے بریلویؒ دیوبند سے گذرتے ہوئے جب اس مقام پر پہونچے تھے جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ ھے اس جگہ سے علم کی بُو آتی ہے" پس وہ خوشبو جس کو سید صاحب کی روحانی قوتِ شامہ نے سونگھا تھا ایک سدا بہار گلاب لے پھول، بلکہ گلاب آفریں درخت کی شکل میں آگئی جس سے ہزاروں پھول کھلے اور ہندوستان کا اُجڑا ہوا چمن تختۂ گلاب بن لیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوشبو بیج بنے گی، بیج سے کلی کھلے گی، شگفتہ کلی سے پھول بنے گی، پھول سے گلدستہ بنے گی اور اس گلدستہ ی خوشبو سے سارا عالمِ انسانی مہک اُٹھے گا اور کسے پتہ تھا کہ ایشیا کی فضا میں مغربی استعماریت کے جو جراثیم پھیلے ہوئے ہیں وہ س کی جراثیم کش مہک سے آپ ہی اپنی موت مرنے شروع ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس وقت کے برطانوی ہند میں نئی فاتح قوم انگریز) کو فکر تھی کہ ہندوستان کے دل و دماغ کو یورپین سانچوں میں کس طرح ڈھالا جائے جس سے برطانویت اس ملک یں جڑ پکڑ سکے۔ ظاہر ہے کہ دل و دماغ کے بدل دینے کا واحد ذریعہ تعلیم ہو سکتی تھی جس نے ہمیشہ ان سانچوں میں دلوں اور دماغوں لو ڈھالا ہے جن کو لے کر تعلیم آگے آتی ہے اس لئے ہندوستان کو فرنگی رنگ میں ڈھالنے کے لئے لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کی اور وہ اسکولی اور کالجی تعلیم کا نقشہ لے کر یورپ سے ہندوستان پہنچا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں"۔ یقیناً یہ آواز جب لہ ایک فاتح اور برسرِ اقتدار قوم کی طرف سے اٹھا اور تھا بھی وہ تعلیم کا ——— جو بذاتِ خود ایک انقلاب آفریں حربہ ہے تو اُس

نے ملک پر ذہنی انقلاب کا خاطر خواہ اثر ڈالا۔ اس تعلیم سے ایسی نسلیں اُبھرنی شروع ہوگئیں جو اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں لیکن اپنے طرز فکر اور سوچنے کے ڈھنگ کے اعتبار سے انگریزی جامہ میں نمایاں ہونے لگیں۔ اس ذہنی مگر خطرناک انقلاب کو دیکھ کر بانیٔ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم قائم کر کے اپنے عمل سے یہ نعرہ بلند کیا کہ ———"

"ہماری تعلیم و تمدن کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں ——— جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات بیدار ہوں اور دین و سیاست کے لحاظ سے اُن میں اسلامی شعور زندہ ہو۔ اس کا ثمرہ یہ نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات پر بریک لگ گیا اور بات یک طرفہ نہ رہی بلکہ ایک طرف اگر مغربیت شعار افراد نے جنم لینا شروع کر دیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز جذبہ بھی برابر کے درجہ میں سامنے آنا شروع ہوگیا۔ جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک و تر کو بہالے جائے گا اگر اس کی رو کا ریلا بہاؤ پر آ گیا تو ایسے بند بھی باندھ دیئے گئے ہیں جو اُسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔ بہرحال وہ ساعت محمود آگئی کہ مدرسہ کا آغاز ہو اور اس کی یہ تعمیر و دفاع کی ملی جلی تعلیم عملاً ساحت وجود پر آگئی۔ ملا محمودؒ دیوبندی نے (جو حضرت بانیٔ دارالعلوم کے امر پر مدرسہ دیوبند کا یہ تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کے لئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے) اپنے ایک شاگرد (کہ ان کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخر کار شیخ الہند مولانا محمود حسن کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے) بٹھا کر کسی عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہور عالم درس گاہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح کر دیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا نہ شہرت پسندی کا ردکار اور جذبہ، نہ نام دنمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹر و اشتہارات کی بھرمار۔ بس ایک شاگرد اور ایک اُستاد، شاگرد بھی محمود اور استاد بھی محمود۔ دو نفر یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آگئی۔ سادگی اور ندرت ایمان کا دور دورہ شروع ہو گیا جو سنّتِ نبوی اور اتباع سلف کی رُوح ہے۔ مقصد نہ ترفہ تھا نہ تنعم، نہ تعیش نہ تزین نہ تفاخر نہ تکاثر بلکہ صرف "ما انا علیہ واصحابی" کا مرقع بنانا اور "علیکم بسنتی الخ" و "واتبع سبیل من اناب الیّ" کی سیدھی راہ کی عملی تصویر کھینچنی تھی اور اس تصویر کشی میں کمال احتیاط و اعتدال بھی پیش نظر تھا کہ صراط مستقیم کے یہ خطوط کہیں اُن بہتر بڑے فرقوں کے خطوط سے نہ مل جائیں جنہیں شریعت کی اصطلاح میں سُبل متفرقہ کہا گیا ہے۔

ہفتاد و دو طریق ضدکے عدد سے ہیں ۔۔۔ اپنا ہے وہ طریق کہ باہر حد سے ہے

اس لئے جامعیت و اعتدال اور دین و دانش کے ملے جلے اندازوں کے ساتھ اس درس گاہ میں تعلیم و تربیت کا خطِ مستقیم کھینچا گیا۔

دارالعلوم کا سلسلۂ سند و استناد

دارالعلوم دیوبند کا سلسلۂ سند حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدّس سرہٗ العزیز سے گزرتا ہوا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب اس جماعت دیوبند کے مورثِ اعلیٰ ہیں جن کے مکتبِ فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی۔ حضرت ممدوح نے اولاً اس وقت کے ہندوستان کے فلسفیانہ مزاج کو اچھی طرح پرکھا۔ پھر علومِ شریعت کو ایک مخصوص جامع عقل و نقل طرز میں پیش فرمایا۔ جس میں نقل کو عقل کے جامہ میں ملبوس کرکے نمایاں کرنے کا ایک خاص انداز پنہاں تھا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند نے ولی اللّٰہی سلسلہ کے تلمذ سے اس رنگ کو نہ صرف اپنایا جو انہیں ولی اللّٰہی خاندان سے ورثہ میں ملا تھا بلکہ مزید تنور کے ساتھ اس کے نقش و نگار میں اور رنگ بھرا، اور وہی منقولات جو حکمت ولی اللّٰہی میں معقولات کے لباس میں جلوہ گر تھے حکمتِ قاسمیہ میں محسوسات کے لباس میں جلوہ گر ہوگئے۔ پھر آپ کے سہل ممتنع اندازِ بیان نے دین کی انتہائی گہری حقیقتوں کو بلاشبہ علم لدنی کے خزانہ سے ان پر بالہامِ غیب منکشف ہوئیں، استدلالی اور لمیاتی رنگ میں آج کی خوگر محسوس یا حس پرست دنیا کے سامنے پیش کردیا اور ساتھ ہی اس خاص مکتبِ فکر کو جو ایک خاص طبقہ کا سرمایہ اور خاص حلقہ تک محدود تھا، دارالعلوم دیوبند جیسے ہمہ گیر ادارہ کے ذریعہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے تحت دیوبندیت، درحقیقت قاسمیت یا قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد اس دارالعلوم کے سرپرست ثانی قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے قاسمی طرزِ فکر کے ساتھ دارالعلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا جس سے اصول پسندی کے ساتھ فروعِ فقہیہ اور جزئیاتی ترتیب کا قوام بھی پیدا ہوا اور اس طرح فقہ اور فقہا کے سرمایہ کا بھی اس میراث میں اضافہ ہوگیا۔

ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد دارالعلوم کے اولین صدر مدرس جامع العلوم اور شاہ عبدالعزیز ثانی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے جو حضرت بانیٔ دارالعلوم سے سلسلہ تلمذ بھی رکھتے تھے دارالعلوم کی تعلیمات میں عاشقانہ، والہانہ اور مجذوبانہ جذبات کا رنگ بھرا جس سے یہ صہبائے دیانت سہ آتشہ ہوگئی۔

آپ کے وصال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ثالث شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند جو حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ کے تلمیذ خاص بلکہ علم و عمل میں نمونۂ خاص تھے ان تمام الوان علوم کے محافظ ہوئے اور انہوں نے چالیس۴۰ سال دارالعلوم کی صدارت تدریس کی لائن سے علوم و فنون کو تمام منطقہ ہائے اسلامی میں پھیلایا اور ہزار ہا تشنگانِ علوم ان کے دریائے علم سے سیراب ہوکر اطراف میں پھیل گئے۔ اس لحاظ سے یوں سمجھنا چاہیئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ جماعت دارالعلوم کے جدامجد ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہٗ جدِ قریب، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اخ الجد اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بمنزلہ پدر بزرگوار ہیں۔

دارالعلوم کا مسلک

علمی حیثیت سے یہ ولی اللّٰہی جماعت مسلکاً اہلِ سنّت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب و سُنّت اور اجماع

وقیاس پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک تمام مسائل میں اوّلین درجہ نقل و روایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے یہاں کتاب و سنّت کی مرادات اقوالِ سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر محض قوتِ مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے متعین ہو سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ عقل و درایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہم کتاب و سنّت کا ایک بڑا اہم جزو ہے۔ وہ روایات کے مجموعہ سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارع علیہ السلام کی غرض و غایت سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں۔ اس لئے جمع بین الرّوایات اور تعارض کے وقت تطبیق احادیث اس کا خاص اصول ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کر دینا نہیں چاہتا جب تک کہ وہ قابلِ احتجاج ہو۔ اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوصِ شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں محسوس ہوتا۔ بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرّا رہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے علمی و عملی پھول اپنے اپنے موقعہ پر کھلے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بطریق اہلِ سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال و قال سے بیزار اور بری ہے۔ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے۔ اس نے اپنے منتسبین کو علم کی رفعتوں سے بھی نوازا اور عبدیت و تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا اور اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغنا، (علمی حیثیت سے) اور غنار نفس (اخلاقی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوتے، وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبات سے بھی بھرپور ہوتے۔ نہ رعونت اور کبر و نخوت کا شکار ہوتے اور نہ ذلّتِ نفس اور مسکنت میں گرفتار۔ وہ جہاں علم و اخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دینے لگے وہیں عجز و نیاز، تواضع و فروتنی اور لا امتیازی کے جوہروں سے مزین ہو کر عوام میں ملے جلے اور "کاحد مِنَ النّاس" بھی رہے۔ جہاں مجاہدہ و مراقبہ سے خلوت پسند ہوتے وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ سپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوتے۔ غرض علم و اخلاق، خلوت و جلوت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات و دواعی ہر دائرہ دین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی۔ جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں محدّث ہونے کے معنیٰ فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنیٰ محدث سے بیزار ہو جانے یا نسبتِ احسانی (تصوّف پسندی) کے معنیٰ متکلم دشمنی یا علمِ کلام کی حذاقت کے معنیٰ تصوف بیزاری کے نہیں۔ بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فارغ درجہ بدرجہ بیک وقت محدّث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی، محسن اور حکیم و مربّی ثابت ہوا جس میں زہد و قناعت کے ساتھ عدمِ تقشف، حیا و انکسار کے ساتھ عدمِ مداہنت، رأفت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، قلبی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت در انجمن کے ملے جلے جذبات راسخ گئے۔ اِدھر علم و فن اور تمام اربابِ علوم و فنون کے بارے میں اعتدال پسندی اور حقوق شناسی نیز ادائیگی حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہرِ نفس پیوست ہو گئے۔ بنابریں دینی شعبوں کے تمام اربابِ فضل و کمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں یا فقہاء، صوفیاء ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولیین، امراء اسلام ہوں یا خلفاء اس کے نزدیک [illegible]ب واجب الاحترام

اور واجب العقیدت ہیں۔ اس لئے جذباتی رنگ سے کسی طبقہ کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح وذم میں حدود شرعیہ سے بے پروا ہو جانا اس کا مسلک نہیں۔ اس جامع طریق سے دارالعلوم نے اپنی علمی خدمات سے (شمال میں) سائیبیریا سے لے کر (جنوب میں) سماٹرا اور جاوا تک اور مشرق میں برما سے لے کر مغربی سمتوں میں عرب اور افریقہ تک علوم نبویہ کی روشنی پھیلا دی۔ جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔ دوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے فضلاء نے کسی وقت پہلو تہی نہیں کی حتیٰ کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ بالخصوص تیرھویں صدی کے نصف آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی سرپرستی میں ان کے ان دو مریدانِ خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے منتسبین اور متوسلین کی مساعیٔ انقلاب جہادی اقدامات اور حریت و استقلال ملّی کی فداکارانہ جدوجہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پر ان کی قید و بند وغیرہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائی جا سکتی ہیں نہ بھلائی جا سکتی ہیں۔ جو لوگ ان حالات پر محض اس لئے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہِ سرفروشی میں قبول نہیں کئے گئے تو اس سے خود ان ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ اس بارہ میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اربابِ تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ کسی دیوبندی النسبت کی ہوں یا غیر دیوبندی کی جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہو لایعبأ بہ اور قطعاً ناقابلِ التفات ہیں۔ اگر حسنِ ظن سے کام لیا جائے تو ان تحریرات کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہ کی جا سکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے مرعوب کن عوامل کے نتیجہ میں محض ذاتی حد تک حزم و احتیاط کا مظاہرہ ہیں۔ ورنہ تاریخی اور واقعاتی شواہد کے پیش نظر نہ ان کی کوئی اہمیت ہے نہ وہ قابلِ التفات ہیں۔ ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اور انہیں متوارث جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلاف رشید بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملّی خدمات کے سلسلہ میں آگے آتے رہے (خواہ وہ تحریکِ خلافت ہو یا استخلاصِ وطن) اور بروقت انقلابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔ مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا اور وسعت نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین و ملت اور قوم و وطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم کو حاصل رہی ہے۔ جب کہ یہ تمام شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آ سکتے تھے اور اسی پہلو کو اس نے نمایاں رکھا۔ اس لئے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جامع علم و معرفت، جامع عقل و عشق، جامع عمل و اخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت و جلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع حکم و حکمت، جامع ظاہر و باطن، جامع حال و قال ہے۔ اس مسلک کو جو سلف و خلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے۔ اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیناً مسلم، فرقۃً اہل السنّت والجماعت، مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً اشعری، سلوکاً چشتی بلکہ جامع سلاسل، فکراً ولی اللّٰہی، اصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔

اس مسئلہ میں چونکہ "مسلک دارالعلوم" کے نام سے ہم نے ایک مستقل رسالہ لکھ دیا ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کے بعض جامع جملے اس تحریر میں لے لئے گئے ہیں۔ تفصیلات کیلئے اس رسالہ کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔

دارالعُلوم دیوبند کا مجموعی مذاق اور اس کی تربیت کا رُخ

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں جب کہ مسلمانوں کی شوکت ہندوستان سے پامال ہو چکی تھی اور حالات میں یکسر انقلاب اور تبدیلی آچکی تھی۔ دارالعلوم نے ان بدلتے ہوئے حالات میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ کہ مسلمانوں میں بلحاظِ دین و مذہب اور بلحاظِ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی کہ وہ حالات کی رَو میں بہ جائیں۔ پختگی اور عزیمت کیساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی ثقافت کے زاہدانہ و متوکلانہ اخلاق پر قایم رکھا مگر اس حکمت کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرون حدود جائز توسّعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدّن و معاشرت میں طبعی طور پر ناگزیر تھا مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا اور جدید تمدن و معاشرت میں اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہوسکا اور اسلامی غیرت و حمیّت باقی رہ گئی۔ مرعوبیت اور احساس کمتری قلوب میں جمنے نہیں پایا۔ ضمیر کی حریت و آزادی کا پورا پورا تحفظ کیا اور اتّباع اغیار کے بجائے سنّت نبوی کو معیار زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں ابھارے۔ جس سے عام تمدن و معاشرت میں پرہیز گاری اور تقویٰ و طہارت کے دواعی اُجاگر رہے

بلحاظ حقیقت یہ سب کچھ اس کا ثمرہ تھا کہ دارالعلوم اور اس کے پروردوں کے مسلک اور زندگی کے معاملات کی اساس و بنیاد فلسفہ اور عقل محض پر نہیں تھی بلکہ انبیاء علیہم السّلام کے ڈالے ہوئے راستہ پر یعنی ——— محبت و عشق پر تھی جو ایمان کا بنیادی جوہر اور غالب عنصر ہے۔ فلسفہ اختراعات اور آزادیٔ فکر کی راہ پر لے جاتا ہے اور عشق و محبت اتباع و ادب کی راہ پر چلاتا ہے۔ فلسفہ کی بنیاد چونکہ عقلی اختراعات پر ہے اس لئے اگلا فلسفی پچھلے فلسفی کی تجہیل اور تغلیط کو اپنا واجبی حق سمجھتا ہے اور نبوت کی بنیاد چونکہ وحی اور عشق و محبت خداوندی پر ہے اس لئے ہر اگلا پیغمبر پچھلے پیغمبر کی تصدیق و محبت کو جزو ایمان بتاتا ہے۔ اندرونی جذبات کا یہی فرق فلاسفہ اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہے۔ پس دارالعلوم کے طرز تربیت اور تعلیم و تمدن کا اہم جزو چونکہ وحی الٰہی کے ساتھ ہمہ وقتی شغل و اشتغال اور قال اللہ و قال الرّسول ہی کا تمام تر مشغلہ تھا اس لئے طبعی طور پر اس کے حلقوں میں ادب و اتّباع اور عشق و محبت کی بنیادیں استوار ہوئیں اور ان کا اثر اوپر کی تعمیر یعنی دیانت، معاشرت اور عادت و عبادت میں آنا ناگزیر تھا اس لئے اس نے بدلتے ہوئے حالات پر پچھلوں کے نقشِ قدم کو برقرار رکھا اور زمانہ کی رَو میں عوام کو کلیتہً بہنے نہیں دیا اور اس کی اس عزیمت کی عظمت کو دوست

ور مخالفوں سب نے تسلیم کیا۔
لیکن ان بزرگوں نے اس دور میں اپنے حسن نیت اور اخلاص سے ہندوستانی مسلمانوں کی عزت نفس اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان کی مادّی ترقی و سربلندی کے لئے مساعی سرانجام دیں ان سے کبھی آویزش نہیں کی ان کے کسی اقدام سے اگر دین یا دینی ذوق اور دین کے کسی عقیدہ وعمل کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس کا کھل کر مقابلہ کیا اور اس طرح امکانی حد تک دین میں آزاد فکری اور آزاد روشی اور بے قیدی کی مداخلت کے راستے روکے رکھے۔

دار العلوم کی مجالس

دار العلوم میں تین ذمہ دار مجالس ہیں۔
۱۔ مجلس شوریٰ ۲۔ مجلس عاملہ ۳۔ مجلس علمیہ

۱۔ مجلس شوریٰ | یہ مجلس دار العلوم کی سب سے بڑی با اختیار مجلس ہے۔ دار العلوم کا تمام نظم ونسق اس جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی جملہ تجاویز درباره انتظام و تعلیم قطعی اور جملہ کارکنان دار العلوم کے لئے واجب التعمیل ہوتی ہے۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد اکیس ۲۱ ہے جس میں کم از کم گیارہ ۱۱ علماء کا ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ باقی ارکان مسلمانوں کے دیگر طبقات سے منتخب ہو سکتے ہیں مگر حتی الامکان دو ممبر باشندگان دیوبند سے لئے جاتے ہیں۔ مہتمم اور صدر مدرس بحیثیت عہدہ مجلس شوریٰ کے رکن رہتے ہیں۔ اس مجلس کے سال میں دو جلسے ہوتے ہیں۔ ایک محرم میں دوسرا رجب میں۔ اس مجلس کا کورم سات ۷ ہوتا ہے۔

۲۔ مجلس عاملہ | یہ مجلس، مجلس شوریٰ کے ماتحت ایک مستقل مجلس ہے جو مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور منظور کردہ تجاویز کے عمل درآمد کے سلسلہ میں ذمہ داروں کے طریق عمل پر نظر رکھتی ہے۔ نظم و تعلیم اور دفاتر کے حسابات کی اور کارکردگی کی نگرانی اس کے ذمہ ہے۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد نو ۹ ہے۔ مہتمم اور صدر مدرس باعتبار عہدہ اس کے مستقل رکن ہوتے ہیں بقیہ سات ممبر مجلس شوریٰ کے ارکان میں سے منتخب ہوتے ہیں۔ اس مجلس کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے۔ مجلس عاملہ کے سال بھر میں چار جلسے ہوتے ہیں۔ پہلا ربیع الاول میں، دوسرا جمادی الاول میں، تیسرا شعبان میں اور چوتھا ذی قعدہ میں۔ مجلس عاملہ کا کورم پانچ ہوتا ہے۔

۳۔ مجلس علمیہ | تمام درجات عربی، فارسی، اردو، دینیات اور تجوید وغیرہ کے تعلیمی کاموں میں صدر المدرسین کو مشورہ دینے کے لئے ایک مجلس ہے، جس کا نام مجلس علمیہ ہے۔ اس کے ممبران میں صدر المدرسین، مہتمم دار العلوم اور اساتذہ طبقہ اعلیٰ شامل ہیں۔

دارالعلوم کی سندیں اور سرٹیفکیٹ

دارالعلوم میں درجات عربیہ سے فارغ ہونے والوں کو تین سندیں دی جاتی ہیں۔

۱۔سند العالم	یہ سند اس کو دی جائے گی جو دورۂ حدیث کا امتحان پاس کرلے۔
۲۔سند الفاضل	یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو دورۂ حدیث کے علاوہ دورۂ تفسیر بھی پڑھ چکا ہو۔
۳۔سند الکامل	یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو درجۂ تکمیل کے علوم و فنون پڑھ چکا ہو۔

مذکورہ بالا تینوں سندیں طالب علم کی استعداد اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے تین درجے کی ہیں۔ اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ۔ جن میں بہ تفاوت الفاظ اور عنوان امتیاز رکھا گیا ہے۔ یہ سب سندیں عربی میں ہوتی ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں سندوں کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جامعہ ازہر قاہرہ (مصر) اور مدینہ یونیورسٹی مدینہ منورہ (حجاز) منظور کرلیا ہے۔

درجات فارسی سے فارغ ہونے والے کو صرف ایک سند دی جاتی ہے۔

درجۂ تجوید سے فارغ ہونے والے کو ایک سند دی جاتی ہے۔

درجۂ ابتدائی دینیات سے فارغ ہونے والے کو طلب کرنے پر سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر نصاب کی تکمیل سے پہلے کوئی شخص کسی مجبوری کی وجہ سے دارالعلوم کو چھوڑنا چاہے تو جس درجہ تک کی کتابیں اس نے پڑھی ہیں اس کا سرٹیفکیٹ / تصدیق نامہ دیا جاتا ہے۔

فراغت کے بعد اگر کوئی شخص سند کے علاوہ سرٹیفکیٹ بھی لینا چاہے تو اسے ایک مطبوعہ سرٹیفکیٹ بھی دیا جاتا ہے جو اردو اور انگریزی میں ہے۔

دارالعلوم کا ملک کے دوسرے اداروں سے رابطہ

۱: ملک کے دوسرے علمی اور ثقافتی اداروں سے دارالعلوم کا بھی رابطہ قائم ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کے کارکن ادارۂ ثقافت ہند کے ممبر بنائے گئے ہیں۔

۲: دارالعلوم وقتاً فوقتاً ہندوستان میں منعقد ہونے والی تعلیمی اور ثقافتی نمائشوں میں بھی ان کی درخواست پر باضابطہ شرکت کرتا ہے اور اس کی مخطوطات وہاں بھیجی جاتی ہیں جس سے دارالعلوم کے کتب خانہ اور نوادر کے ذخیرے کی عظمت قائم ہوتی ہے۔

۳: طبی اداروں میں اس کے کتب خانہ کی قلمی اور نادر کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔

۴: تصنیفی اداروں میں (مثلاً حیدرآباد دکن وغیرہ) یہاں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں اور مخطوطات بھیجی جاتی ہیں۔

۵ : سرکاری کمیشنوں جیسے لسانی کمیشن یا اوقاف کمیشن وغیرہ میں بھی دارالعلوم کی مختلف اوقات میں شرکت ہوتی، شاہد طلب کئے جانے پر بطور نمائندہ شاہدین کو بھیجا جاتا ہے۔

جرائدِ دارالعلوم

دارالعلوم سے دو رسالے نکلتے ہیں۔

رسالہ دارالعلوم | یہ رسالہ اُردو میں نکلتا ہے اور اس میں علمی مضامین شائع کئے جاتے ہیں جو مختلف اصولی، فروعی، تاریخی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں نیز معلوماتی ذخیرہ کافی حد تک پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک دینی اور علمی رسالہ ہے۔

رسالہ دعوت الحق | یہ رسالہ عربی زبان میں شائع ہوتا ہے جس میں اکابر دارالعلوم کے علمی اور مسلکی مضامین عربی زبان میں شائع کئے جاتے ہیں تاکہ اکابر دارالعلوم کے علوم جو اردو میں ہونے کی وجہ سے عرب ممالک تک نہیں پہنچ سکے پہنچ سکیں اور ان سے عرب ممالک بھی مستفید ہوسکیں اور ساتھ ہی دارالعلوم کی خدمات اور کارناموں سے واقفیت حاصل کرسکیں۔

دارالعلوم کا دفاع عن الدین

دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر رہی۔ خواہ وہ فتنہ نقل و روایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیادوں سے اُٹھا۔ اس جماعت نے ہر دور میں اعلاء کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سر اٹھایا۔ متصوفین بے تصوف کی جانب سے بدعات، محدثات اور شرکیہ حرکات کا فتنہ روایتی انداز میں اُبھرا تو اُس نے روایتی ہی طور پر مقابلہ کیا اور فتنہ کی بے سروپا اور بے سند روایتوں کی قلعی کھول کر شریعت و طریقت کی مستند نقول سے اس کا استیصال کیا اور مقابلہ میں نقل و روایات کا ایک بڑا ذخیرہ پیش کر دیا۔ مدعیان عقل و اجتہاد کی طرف سے آزادیٔ فکر، عدم اتباع سلف اور نیچریت کا فتنہ، عقل محض کا سہارا لے کر دین میں داخل ہونے لگا تو اُس نے عقلی دلائل پیش کرکے کامیاب مدافعت کی۔ اور جس کے لئے حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ نے ایک مستقل حکمت ہی مدوّن فرمادی جس کے سامنے فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا تو اُس نے فلسفہ کے انداز کو پہچان کر اس کے راستے روک دیئے۔ غرض بدعت پسندی، ہوا پرستی، دہریت نوازی، بے قیدی، مطلق العنانی اور آزادیٔ افکار کی جڑیں دارالعلوم نے کھولی کرکے عقل و نقل، روایت و درایت اور حکمت و دین کی جڑیں مضبوط کردیں۔

دارالعلوم نے مُلک کو کیا نفع پہنچایا

دارالعلوم نے اس نوعیت کے افراد پیدا کئے جنہوں نے تعلیم، تزکیۂ اخلاق، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت، نیز تبلیغ، حکمت اور طب وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان افراد نے کسی مخصوص خطہ میں نہیں بلکہ ہند و پاک کے

ہر ہر صوبہ اور بیرونی ممالک میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیتے۔ ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک سو سال کی مدت میں اگر دارالعلوم ان خدمات کا جائزہ لیا جائے جو اُس نے ہندوپاک میں انجام دیں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کے ہر ہر حصہ میں اُس اپنے ایسے فرزندانِ رشید پہنچائے جو اس خطہ میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور مخلوق خدا کو ظلمت جہل سے نکال کر نورِ علم سے مالا مال کر دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے فضلائے دارالعلوم کی صوبہ وار فہرست ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ درج ذیل ہے۔

ہندوستان

نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء کرام	نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء
۱	یو۔ پی	۱۸۹۶	۱۰	مدھیہ پردیش	۲۸
۲	مغربی بنگال	۱۵۱	۱۱	مشرقی پنجاب	۹۶
۳	آسام و منی پور	۲۶۵	۱۲	دہلی	۱۲
۴	بہار و اڑلیسہ	۷۸۰	۱۳	مہاراشٹر	۳۹
۵	مدراس	۳۰	۱۴	گجرات	۳۸
۶	ٹراونکور	۴	۱۵	راجستھان	۴۳
۷	کیرالہ	۴۲	۱۶	جموں و کشمیر	۱۰
۸	اندھرا	۵۲	۱۷	نیپال	۳
۹	میسور	۶		میزان ہندوستان	۳۹۵

پاکستان

نام صوبہ	تعداد	نام صوبہ	تعداد
مغربی پاکستان	۱۵۱۹	مشرقی پاکستان	۱۷۲

میزان پاکستان	۳۱۹۱
میزان ہندوستان	۳۷۹۵
میزان ہندوستان و پاکستان	۶۹۸۶

ان فضلائے دارالعلوم نے اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے رنگ سے دین کے کسی نہ کسی شعبہ میں شخصی یا اجتماعی حیثیت سے کام کیا اور کر رہے ہیں۔

دار العلوم کے فیوض بیرون ہند میں

پھر دار العلوم نے اپنے علمی فیوض سے صرف ہند و پاک ہی کو نہیں بہرہ اندوز کیا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے اسلامی ممالک بھی اس کی ضیا پاشیوں سے جگمگا اُٹھے۔ چنانچہ غیر ملکی فضلاء دار العلوم کی فہرست از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ یہ ہے۔

نمبر	ملک	تعداد	نمبر	ملک	تعداد	نمبر	ملک	تعداد
۱	افغانستان	۱۰۹	۶	انڈونیشیا	۱	۱۱	جنوبی افریقہ	۱۴
۲	روس بشمول سائبیریا	۷۰	۷	عراق	۲	۱۲	سعودی عرب	۲
۳	چین	۴۴	۸	کویت	۲	۱۳	سیام	۱
۴	برما	۱۴۴	۹	ایران	۱۱	۱۴	یمن	۱
۵	ملائشیا	۲۸	۱۰	سیلون	۲			

میزان بیرونی ممالک ۴۳۱

میزان ہند و پاک ۶۹۸۶

ہند و پاکستان اور بیرونی ممالک کے فضلاء کی مجموعی میزان ۷۴۱۷

فضلاء کرام کے علاوہ جن طلباء نے دار العلوم سے استفادہ کیا ان کی تعداد ۵۸۳۱۰

ان فضلاء کرام اور طلبہ کی مجموعی تعداد جنہوں نے دار العلوم سے استفادہ کیا ۶۵۷۲۷

تفصیلات آئندہ صفحات میں آ رہی ہیں۔

دار العلوم کا حصہ تصانیف میں

دار العلوم کا مسلک اور مخصوص رنگ علماء دار العلوم کی تصانیف میں صاف نمایاں رہا۔ ہمیشہ بر وقت اور برمحل تصانیف اس احاطہ سے نکلتی رہیں۔ دار العلوم نے سو سال کے عرصہ میں ۱۱۶۴ مصنفین پیدا کئے جن میں سے تقریباً ۲۷۰ اونچے اعلیٰ کے مصنفین ہیں۔ علماء دار العلوم میں سے چند مشہور و معروف مصنفین کی فہرست درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	نام مصنف	تصنیف کا رنگ
۱	حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند	متکلمانہ
۲	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ	محدثانہ
۳	حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ انبیٹھوی	محدثانہ
۴	حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی	عارفانہ، صوفیانہ، فقیہانہ اور مفسرانہ۔ آپکی تصانیف کی تعداد جو ہر علم و فن میں ہیں ایک ہزار سے زائد ہے۔
۸	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ	محدثانہ

نمبر شمار	نام مصنف	تصنیف کا رنگ
۶	حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب	مناظرانہ
۷	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری	محدثانہ، فقیہانہ و مناظرانہ
۸	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب	سیاسی و فقیہانہ
۹	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی	مؤرخانہ
۱۰	حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب	فقیہانہ و مؤرخانہ
	حضرت مولانا اعزاز علی صاحب	محشیانہ، فقیہانہ اور ادیبانہ
۱۲	حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی	فلسفیانہ و متکلمانہ
۱۳	حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	مؤرخانہ و محققانہ
۱۴	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ	فقیہانہ
۱۵	حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدظلہ	محدثانہ و متکلمانہ
۱۶	حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مدنی	محدثانہ
۱۷	حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب	سیاسی و مؤرخانہ
۱۸	حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ	مؤرخانہ
۱۹	حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدظلہ	ادیبانہ و مؤرخانہ
۲۰	حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ	محدثانہ
۲۱	حضرت مولانا عبدالصمد صاحب صارم سیوہاروی مدظلہ	محققانہ

۲۲ راقم کو اس فہرست میں اپنا نام شمار کراتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے تاہم تحدیثاً للنعمۃ اظہار نعمت بھی شکر نعمت ہے کہ اس ناکارہ کی تالیفات کا عدد بھی جو مختلف موضوعات پر ہیں تقریباً سوا سو (۱۲۵) ہے جن کا رنگ ان کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔

مشاہیر دارالعلوم

علمائے دیوبند میں ایسے مشاہیر بھی ہوئے جو اپنے اپنے وقت کے امام ملت، علم و عمل کا نمونہ، خواص و عوام کی رشد و ہدایت کا مرکز، سند حدیث، رنگ تفسیر، فقہ و درایت میں راسخ اور ذاتی خدا پرستی کے ساتھ مخلوق کے حق میں مربی اخلاق، مصلح دینی اور دوسرے قومی و ملی امور میں مسلمہ طور پر قائد تسلیم کئے گئے ہیں۔ مثلاً

۱: حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند

آپ بانی دارالعلوم ہیں مگر جماعت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے نیز اس حیثیت سے کہ تاسیس و بنائے دارالعلوم بھی

دار العلوم ہی کی ایک نسبت ہے اس موقعہ پر بھی آپ کا تذکرہ کر دیا گیا۔

مذہبی خدمات متعدد مناظرے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے کئے۔ تصانیف اور تقریروں کے ذریعہ ولی اللّٰہی مسلک کی وضاحت اور اشاعت کی متکلمانہ اور عارفانہ انداز سے اصول اسلامیہ اور اساسی عقائد دین کو عقلی دلائل سے مستحکم اور مضبوط کیا، اور دین اسلام کی سرحدات کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ اغیار کے حملے ان پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

سیاسی خدمات ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں عملی اور قائدانہ حصہ لیا۔ جنگ شاملی میں خود سپاہیانہ جنگ کی۔

سماجی اصلاحات معاشرہ (سوسائٹی) میں غلط قسم کی رسوم سے جو ابتری پھیلی ہوئی تھی اسے پہلے اپنے گھر سے ختم کیا۔ اس کے بعد دوسروں کو اس کے ترک پر آمادہ کر کے معاشرہ کو صاف کیا جس کی تفصیل کتاب "مسلکِ دار العلوم" میں بقدر ضرورت کر دی گئی ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے کتاب "سوانح قاسمی" ملاحظہ ہو۔

۲۔ قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

آپ بھی دار العلوم کے طالب علم نہیں بلکہ بانیوں میں سے ہیں اور سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر چونکہ یہ بھی دار العلوم ہی کی ایک نسبت ہے اس لئے اس موقعہ پر بھی آپ کا تذکرہ کیا گیا۔

دینی خدمات علم حدیث، فقہ اور تصوف سے بہت زیادہ شغف رہا۔ ہزارہا انسانوں نے آپ سے استفادہ کیا۔ آپ نے علماء کی دینی تربیت فرمائی اور انہیں دین کے بارے میں اتنا راسخ اور مستحکم بنا دیا کہ ان افراد پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہ ہو سکا۔

سیاسی خدمات ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حضرت نانوتویؒ کے دوش بدوش قائدانہ حصہ لیا اور نو ماہ تک اسیر فرنگ رہے۔ جن لوگوں نے ان کی سیاسی اور جہادی خدمات پر پردہ ڈالنا چاہا ہے، خواہ اپنی لاعلمی اور معاملات سے بے خبری کی بناء پر یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے، ان کی مصلحت اندیشی لایعبأ بہ اور باخبر لوگوں کے نزدیک لغو ہے۔

۳۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ دیوبندی

دینی خدمات آپ حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حضرت کے بعد قاسمی علوم کا جو فیضان عالم میں آپ کی ذات سے ہوا اس کی نظیر دوسرے تلامذہ میں نہیں ملتی۔ اپنے استاد میں فانی اور استاد کے علم میں غرق تھے۔ دین کے ہر دائرے میں آپ کی خدمات نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ درس، تصنیف، ارشاد و تلقین اور جذبۂ جہاد وغیرہ میں آپ کی خاموش خدمتیں زبانِ حال سے گویا ہیں۔ آپ اپنے استاد حضرت نانوتویؒ کے علوم کے امین اور خزینہ دار تھے۔ آپ نے ان علوم کی ایضاح و تفصیل و تفہیم و تیسیر میں نمایاں حصہ لیا اور عظیم خدمت انجام دی۔ حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کی اعلیٰ ترین طباعت بہ تزئین حواشی و عنوانات آپ ہی نے شروع فرمائی اور "حجۃ الاسلام" پر آپ ہی نے سب سے پہلے عنوانات قائم کئے اور قرآن شریف کا ترجمہ فرمایا۔ بخاری کے ابواب و تراجم پر ایک جامع اور دبیز رسالہ تصنیف فرمایا۔ متعدد مناظرانہ تصانیف بھی فرمائیں اور مناظرے بھی کئے۔ دار العلوم دیوبند میں چالیس برس تک مسلسل درسِ حدیث دے کر آٹھ سو ساٹھ ۸۶۰ اعلیٰ استعداد کے، صاحب طرز عالمِ دین، فاضل علوم اور ماہرین فنون پیدا کئے۔ آپ کا درسِ حدیث اُس دور میں امتیازی شان رکھتا تھا اور مرجع علماء تھا۔ آپ کو علماءِ عصر نے محدث عصر تسلیم کیا۔ بیعت و ارشاد کے راستہ سے ہزارہا تشنگانِ

معرفت کو عارف باللہ بنایا اور آپ کا سلسلۂ طریقت ہندوستان سے گذر کر افغانستان اور عرب تک پہنچا۔ متعدد علمی تصانیف آپ نے ترکہ میں چھوڑیں۔

سیاسی خدمات ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کرانے کے لئے ایک زبردست انقلابی تحریک چلائی جس کو "رولٹ کمیٹی" کی رپورٹ میں "ریشمی رومال کی تحریک" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ تحریک بہت زیادہ موثر تھی مگر راز میں نہ رہ سکی اور ناکام ہو گئی۔ پھر بھی اس کی آگ جن کے دلوں میں لگی ہوئی تھی انہوں نے آئندہ کام کر کے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ آپ تقریباً پانچ برس مالٹا میں قید رہے۔

۴۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھویؒ

آپ حضرت بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے داماد تھے۔ حضرت کے تلامذہ میں سے بھی تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے پاس عرصہ تک قیام رہا۔ سرسیدؒ نے آپ کو علی گڈھ بلا کر مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات کے عہدہ پر فائز کیا۔ سرسید اس پر اظہار مسرت کیا کرتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ بھی مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی نسبت سے خالی نہیں ہے۔ احقر نے بھی مولانا محمد عبداللہ سے اجازت حدیث حاصل کی ہے۔

۵۔ حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہیؒ

آپ حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اور جلیل القدر محدث تھے۔ آپ مدرسہ جامع مسجد امروہہ میں جسے حضرت نانوتویؒ نے قائم فرمایا تھا ایک طویل عرصہ تک بحیثیت صدر المدرسین فائز رہے اور آخر عمر تک درس حدیث میں منہمک رہے۔ آپ علوم قاسمیہ کے امین تھے اور ان کی ترویج میں عمر بھر نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اپنی مخصوص صلاحیتوں کے لحاظ سے آپ علوم قاسمیہ کی مجسم تصویر اور بالفاظ دیگر حضرت نانوتوی کے مثیل شمار کئے جاتے تھے۔ آپ کا فیضان علمی دُور دُور تک پہنچا اور سینکڑوں طالب علم آپ کے درس سے عالم و فاضل بن کر نکلے۔ عالم بے مثل حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب غورجویؒ مفسر شہیر حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہیؒ اور اس قسم کے دوسرے اور بھی ماہرین علم و فضل آپ کے تلامیذ ہیں جن سے علم و دین پھیلا اور ایمان و عرفان کا رنگ دلوں میں جما۔

۶۔ حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینویؒ

آپ مشہور اطباء میں سے تھے۔ حکیم اجمل خان صاحبؒ کے استاد تھے۔ طبیہ کالج دہلی کے ممتحن رہے۔ آخر دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی ہو گئے تھے۔ با اوقات بزرگ، معمولات کے شدت سے پابند، ذاکر و شاغل، تہجد گذار اور شب بیدار لوگوں میں سے تھے علم نہایت راسخ اور نکھرا ہوا تھا۔ ابتداءً غازی پور میں قیام رہا۔ آخر میں دہلی کو وطن بنا لیا اور وہیں وفات ہوئی۔

۷۔ حضرت مولانا عبدالعلی صاحب دہلویؒ

آپ حضرت مولانا نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ دہلی کے محدث شمار ہوتے تھے۔ مدرسہ عبدالرب دہلی میں ایک طویل مدت تک بحیثیت صدر مدرس درس حدیث دیا۔ آپ نے سینکڑوں شاگرد چھوڑے۔ تقویٰ، طہارت اور استقامت

میں آپ خود ہی اپنی مثال تھے۔ آخری سانس تک جماعت کی نماز اور صف اولیٰ ترک نہیں ہوئی تھی۔ آخری عمر میں فالج کا اثر نقل وحرکت سے معذور ہوگئے۔ اسی حالت میں حکم کے مطابق خدام آپ کو اٹھا کر صف اولیٰ میں رکھ دیتے تھے اور آپ بیٹھ کر امام کی اقتدار کرتے تھے۔ اپنے اُستاد میں فنائیت کا درجہ رکھتے تھے اور ہر وارد و صادر سے فرماتے تھے کہ قاسمی بن جاؤ محروم نہیں رہو گے۔ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ جیسے اکابر آپ کے تلامذہ میں سے تھے۔

۸۔ حضرت مولانا نواب محی الدین خاں صاحبؒ

آپ بھی حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ اور جلیل القدر علماء میں سے تھے۔ ریاست بھوپال میں آپ مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ کے علم اور پاکیزہ زندگی سے بھوپال اور اس کی ریاست نے برس ہا برس فیوض و برکات حاصل کئے۔ آپ گھر کے نواب اور امراء میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد بادشاہ دہلی ظفر شاہ کے مصاحبین خاص میں سے تھے اور حضرت نانوتویؒ کے معتقد تھے۔ حضرت نانوتویؒ نے جہاد کے سلسلہ میں ان ہی کے ذریعہ بادشاہ تک اپنی سکیم پہنچائی تھی۔ شاہ ظفر جب انگریزوں کے خلاف اُٹھے تو ایک جنگی مورچہ پر ممدوح بھی سربراہ تھے۔

۹۔ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھویؒ

آپ بھی حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند میں عرصہ دراز تک رہ کر تعلیم حاصل کی اور پھر دارالعلوم ہی میں عرصہ تک درس بھی دیا۔ دارالعلوم سے مالیر کوٹلہ تشریف لے گئے اور وہاں ریاست کی طرف سے عہدۂ افتاء پر فائز رہے۔ مشاہیر اہل افتاء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ عمر کا آخری تمام حصہ مالیر کوٹلہ میں عہدۂ افتاء پر ہی گذارا، اور وہیں آپ کی وفات ہوئی مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحبؒ بھی آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ صاحب بیعت وارشاد بزرگوار میں سے تھے۔ جن سے ایک بڑے حلقے نے تربیت باطنی حاصل کی۔ خواجہ فیروزالدین مرحوم اکاؤنٹنٹ جنرل ریاست کپورتھلہ آپ کے مخصوص متوسلین میں سے تھے جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی رہے ہیں۔ احقر نے حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد کچھ دنوں آپ سے بھی تربیت باطنی حاصل کی ہے۔ علوم عقلیہ وعالیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور آپ کی تدریس میں ایک خاص برکت تھی جو محسوس ہوتی تھی۔ دارالعلوم کے درجات ابتدائیہ کے ممتحن تھے۔ صاحب اسرار و معارف تھے اور اکثر دیشتر آپ کی تشریف آوری دیوبند کے موقعہ پر اساتذہ وطلبہ آپ کے حلقہ میں بیٹھ کر مستقبل کے بارے میں باتیں پوچھتے تھے۔ اور آپ بطور پیشین گوئی کچھ نہ کچھ ارشاد فرما دیا کرتے تھے۔ آپ کا تقویٰ وطہارت مسلّم اور نمایاں تھا، شب بیدار علماء میں سے تھے۔

۱۰۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے باضابطہ مفتی بلکہ دارالعلوم میں دارالافتاء کا نقطۂ آغاز ہیں۔ دارالعلوم میں دارالافتاء کی منضبط صورت آپ ہی کے وجود باجود سے معرض وجود میں آئی۔ آپ عارف باللہ، صاحب درس وتدریس، صاحب بیعت وارشاد اور مربی اخلاق بزرگ تھے۔ آپ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز تھے جو حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ آپ سے دارالعلوم کے حلقوں نے ظاہری و باطنی فیوض و برکات کافی حد تک حاصل کئے۔ افتاء کی خدمات کے ساتھ ساتھ حدیث، فقہ اور تفسیر

کے اونچے اسباق بھی آپ پڑھاتے تھے۔ جلالین شریف میں احقر ناکارہ کو بھی حضرت مفتی اعظم ہی سے تلمذ حاصل ہے۔ آپ کا بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی کافی پھیلا۔ آپ ہی کے خلیفہ اعظم حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی تھے جن کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر ہیں جن سے عرب اور افریقہ میں نقشبندیہ طریق کا کافی شیوع ہوا اور سینکڑوں کی اصلاح ہوئی۔ ساؤتھ افریقہ اور ایسٹ افریقہ کے لوگ جب حج کے لئے حاضر ہوتے ہیں تو اکثر و بیشتر مولانا بدر عالم صاحب مدظلہ[1] کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو کر جاتے ہیں۔ ابتدا میں حضرت مفتی اعظم ہی حضرت مہتمم صاحب کی غیبت میں نیابت اہتمام کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ بہرحال دار العلوم آپکے علم، سلوک، افتاء اور انتظام وغیرہ سے سارے ہی شعبوں میں مستفید ہوتا رہا ہے۔

۱۱۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

آپ حکیم الامت، مشہور محدث، عارف باللہ، فقیہ اور بزرگ تھے۔ آپ دین کے ہر شعبہ کے کاموں کے لئے من اللہ موفق تھے۔ ۱۵ برس کان پور کے مدرسہ جامع العلوم میں درس قرآن و حدیث دیا جس سے آپ کے تلامذہ ملک کے ہر ہر خطے میں پھیل گئے۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا کہ سفر کرکے وعظ و تبلیغ نہ فرمایا ہو۔ تصنیف کے میدان میں قدم رکھا تو ہر علم و فن میں ہزار سے اوپر تصانیف ورثہ میں چھوڑیں۔ آخر میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں مقیم ہوئے تو ہند و بیرون ہند کے ہزارہا انسانوں کو بیعت و ارشاد کے سلسلہ سے واصل فرمایا۔ بڑی تعداد میں آپ کے خلفاء ہیں جنہوں نے مختلف خطوں میں اصلاح و تربیت کا کام مختلف رنگوں سے انجام دیا۔ آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین صدر المدرسین دار العلوم دیوبند سے زیادہ مستفید ہیں۔ جو حدیث و تفسیر میں حضرت نانوتویؒ سے مستفید ہیں نیز آپ حضرت نانوتویؒ سے براہ راست بھی بعض تفسیری درسوں میں مستفید ہوئے۔ حکیم الامت کا لقب آپ کے لئے اسم بامسمیٰ تھا۔ بہرحال آپ کی تقریر، تحریر، تصنیف اور تبلیغ سے لاکھوں مسلمانوں کو علمی و عملی فیض پہنچا اور ہزاروں مسلمانوں کی باطنی اصلاح ہوئی۔ آپ دار العلوم میں اُس سال بغرض حصول تعلیم تشریف لائے تھے جس سال حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوا۔ اس لئے حضرت نانوتویؒ سے مزید استفادہ نہیں فرما سکے مگر حضرت کے تلامذہ حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا عبد العلیؒ صاحب اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب سے استفادۂ کمالات کیا۔

۱۲۔ حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب امروہویؒ

آپ حضرت مولانا احمد حسنؒ صاحب امروہی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تفسیر کے بعض اسباق حضرت نانوتوی سے بھی پڑھے۔ ان دونوں بزرگوں کے فیوض سے آپ کے اوپر حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ کے اسباق میں متکلمانہ رنگ غالب تھا۔ جگہ جگہ حضرت نانوتویؒ کے علوم کا حوالہ بھی دیتے تھے اور انہیں وضاحت کے ساتھ بیان بھی فرماتے تھے۔ امروہہ میں ایک عرصہ تک درس دیا اور آخر میں کچھ عرصہ جب کہ ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ گرفتار کر لئے گئے تو دیوبند میں بھی بعہدہ صدر مدرسی درس حدیث دیا ہے۔

---

[1] ان سطور کی تحریر کے وقت حضرت مولانا زندہ تھے بعد میں انتقال فرما گئے۔

۱۳- حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ صاحب

آپ حضرت بانیؒ دارالعلوم کے صاحبزادہ تھے۔ علم وفضل کی لائن میں آپ کی تفہیم ضرب المثل تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم خامس ہوئے مگر دور اہتمام میں بھی درس وتدریس کا مشغلہ نہیں چھوڑا۔ مشکوٰۃ، جلالین، صحیح مسلم اور منطق میں میر زاہد وغیرہ آپ کے درس میں رہتی تھیں۔ مشکوٰۃ اور مسلم احقر نے بھی ان ہی سے پڑھی ہے۔ کٹھن سے کٹھن مسئلہ کو اپنے انداز تفہیم سے پانی کر دیتے تھے۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے متوسل اور خلیفہ تھے۔ بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی تھا مگر کم۔ زیادہ مصروفیت نظم دارالعلوم اور اہتمام میں رہتی تھی۔ آپ کا چالیسؔ سالہ دور اہتمام تعمیری وتعلیمی ترقیات کا دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ دینی ادارہ مدرسہ کی حیثیت سے ترقی کرکے آپ ہی کے دور اہتمام میں" دارالعلوم" بنا اور اس کا حلقۂ اثر ہندوستان کے تمام خطّوں میں زیادہ پھیلا۔ آپ مشاہیر ہند میں سے تھے۔ زیادہ انہماک انتظام دارالعلوم اور درس وتدریس میں تھا۔ لیکن وقتی طور پر ملکی سیاست میں بھی کم وبیش آپ نے حصہ لیا۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء روہیل کھنڈ کے اجلاس عام مراد آباد کی آپ نے صدارت فرمائی اور ۳ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ کو اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جو اس زمانہ میں کتابی صورت میں شائع بھی ہوا، جس میں انگریزوں سے ترکِ موالات پر زور دیا گیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے عہدۂ اہتمام کی عظمت کے پیش نظر نظام دکن نے آپ کو حیدرآباد کے عہدۂ مفتیٔ عدالت عالیہ کے لئے نامزد کرکے بلانے کی استدعا کی جسے آپ نے بمشورۂ جماعت منظور فرمایا اور چار سال وہاں گذارے۔ واپسی پر پھر بدستور اپنے فرائض سنبھال لئے۔ آپ کا اخلاص اور ظاہر وباطن کی یکسانی جماعت میں مسلّم تھی۔ آپ کی آبائی نسبت کی عظمت کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ آپ کے اساتذہ بھی آپ کا احترام کرتے تھے۔

۱۴- حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ صاحب عثمانی دیوبندی

آپ دارالعلوم دیوبند کے چھٹے مہتمم تھے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو دین کا خاص فہم عطا فرمایا تھا۔ آپ کی دانش وتدبر مشہور زمانہ تھی۔ ادبیات کے ماہر تھے۔ عربی نظم ونثر دونوں پر کمال قدرت رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے نظم ونسق نے آپ کے تدبر ودانش سے عظیم استفادہ کیا۔ آپ کی اس دانش وبینش اور عظیم علمی شخصیت کی بناء پر حکومت حیدرآباد کا عہدۂ افتاء مولانا حافظ محمد احمدؒ صاحب کے بعد آپ ہی کو تفویض کیا گیا تھا۔ آپ کا حلم، تواضع، مروّت اور تحمل مشہور زمانہ تھا۔ آپ حضرت گنگوہیؒ کے متوسّل اور طریقت کے معمولات کے نہایت پابند تھے۔ وفات کے دن مجھ سے حسرت کے ساتھ فرمایا کہ میرا بارہ ہزار اسم ذات کا افسوس کہ آج پورا نہیں ہو سکا۔ شب بیدار اور ہمہ وقت مشغول کار رہتے تھے۔ ان کی مجلس پرشکوہ اور مورث طمانینت ہوتی تھی۔ کئی عربی قصیدے اور کئی مفید ترین تصانیف آپ کا ترکہ ہے جو امت کو ملا۔ ان میں "اشاعت اسلام" ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو مقبول خواص وعوام ہے۔

۱۵- مولانا حکیم عبد الوہاب صاحب یوسف پوری (ضلع غازی پور) المعروف بہ حکیم نابینا

آپ دہلی کے مشہور طبیب، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے عاشق مرید اور علوم دینیہ کے ماہر تھے۔ نابینائی کی حالت میں تحصیل علم کی اور مہارت تامّہ پیدا کی۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب کے تلامذہ میں سے تھے۔ انہیں کی طالب علمی کے زمانہ میں یورپ کا ایک سیاح دارالعلوم دیکھنے آیا تو اس نے واپس ہوکر یورپ کے اخبارات میں دارالعلوم کے حالات کا ذکر کرتے

ہوئے لکھا کہ دار العلوم میں پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ایک نابینا طالب علم اپنے ساتھیوں کو اقلیدس کا تکرار کرا رہا تھا اور اقلیدس کی مشکل مشکل شکلیں سامنے کے طالب علم کی کمر پر انگلی سے کھینچ کھینچ کر اُسے سمجھا رہا تھا یہ طالب علم یہی حکیم عبد الوہاب صاحب تھے۔ بعد تعلیم حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ سے بیعت کی اور حضرت کی صحبت سے مستفید ہو کر باطنی کمال پیدا کیا۔ خود مجھ سے ایک دفعہ ذکر فرمایا کہ میں نے طب پڑھنے کے بعد حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ ذریعہ معاش کے طور پر میں نے طب پڑھ لی ہے لیکن اطباء مریض کا چہرہ مہرہ دیکھ کر، قارورہ دیکھ کر اور دوسرے مشاہدات سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں لیکن میں نابینا ان تمام مشاہدات سے معذور ہوں اور چاہتا ہوں کہ معاش اس فن (طب) سے پیدا کروں، اس لئے میرے حق میں دعا فرما دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نبّاضی کی مہارت عطا فرمائیں گے اور تم نبض دیکھ کر وہ تمام باتیں معلوم کر لوگے جو دوسرے اطباء مشاہدات سے معلوم کرتے ہیں۔ یہ قصہ سُنا کر فرمایا کہ الحمد للہ میں اپنے شیخ کی اس کرامت کو روزانہ مشاہدہ کرتا ہوں اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھ پر مرض اور مریض کے احوال کی تمام نوعیتیں منکشف ہو جاتی ہیں چنانچہ ان کی نبض شناسی کی مہارت اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ باپ یا بھائی کی نبض دیکھ کر بیٹے اور دوسرے بھائی کے احوال مرض بتا دیا کرتے تھے۔ باوجود علمی استحضار کے شغل آخر تک طب اور مطب ہی کا غالب رہا اور اسی میں پوری عُمر گذاری۔ لوگ شفاء بدن کے ساتھ ان کے تقویٰ و طہارت اور معمولات کی پابندی اور پختگی سے شفاء رُوح بھی حاصل کرتے تھے۔

۱۶۔ حضرت مولانا سیّد مرتضیٰ حسنؒ صاحب چاندپوری

آپ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے اور حضرت تھانویؒ کے ہمعصروں میں سے تھے۔ ذکی، طباع اور تیز فہم علماء میں سے تھے۔ آپ کی تقریر معروف اور مشہور تھی۔ زبردست مناظر تھے۔ مبتدعین اور قادیانیوں کو تا بہ دروازہ آپ ہی نے پہنچایا۔ عرصۂ دراز تک دربھنگہ اور مراد آباد میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیئے اور آخر میں دار العلوم کے عہدۂ نظامت تعلیم اور پھر نظامت تبلیغ پر فائز ہوئے۔ دار العلوم میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ کی نمایاں اور غیر معمولی خطابت نے ملک کے گوشہ گوشہ کو مستفیض کیا۔ آپ کو ردّ بدعات اور ردِّ قادیانیت سے خاص شغف تھا اور اس سلسلہ میں آپ کی بہت سی قابلِ قدر تصانیف ہیں جو طبع ہو چکی ہیں۔

۱۷۔ حضرت مولانا نجم الدینؒ صاحب

سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور۔ آپ مشہور حلیم و سلیم عالم تھے۔ لاہور کے علمی حلقوں میں آپ کے علم کی خاص شہرت تھی۔

۱۸۔ حضرت مولانا علامہ محمد انور شاہؒ صاحب کشمیری

سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند۔ آپ حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے۔ علم کا چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ آپ تمام علوم منقولات و معقولات میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ قوّتِ حافظہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ کئی مشہور محققانہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کا درس حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا جو ایک خاص امتیازی طرز

لئے ہوتے تھا۔ آپ کے تبحر علمی نے درسِ حدیث کو جامع علوم و فنون بنا دیا تھا۔ آپ کے درس نے نقل و روایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لئے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ آج بھی نمایاں علماء اور صاحب طرز فضلاء زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ ہیں جو ہند و پاک میں علمی مسندوں کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ کے یہاں ردِّ قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فتنہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہت سی معرکۃ الآرا کتابیں خود بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے اور کوئی بھی اپنا نوشتہ لا کر سناتا تو غیر معمولی خوشی کا اظہار فرما کر دعائیں دیتے تھے۔ تقریباً ۱۳۲۷ھ سے آپ نے دار العلوم میں درس کا آغاز فرمایا ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپ دار العلوم کے صدر مدرس رہے۔ اس دوران تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا جن میں سے آپ کے دور صدر مدرسی میں ۸۰۹ طلبہ نے درس حدیث لیا اور اس فن پاک کو تقریراً و تحریراً اور درساً و تدریساً دُور دُور تک پھیلایا۔

۱۹۔ حضرت مولانا شاہ وارث حسنؒ صاحب لکھنوی

آپ مشہور صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ دار العلوم میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی دان طبقہ بالخصوص گورنمنٹ کے بڑے بڑے عہدے دار آپ سے زیادہ مستفید ہوتے۔ ابتدائے عہد میں آپ سے بعض خوارق کا ظہور بھی ہوا ہے۔ ریاضت کافی کی اور آپ پر اس کے اثرات نمایاں تھے۔

۲۰۔ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ

محدث مدرسہ امینیہ دہلی، مفتیٔ اعظم ہندوستان۔ اپنے زمانہ کے مشہور و مسلّم مفتی اور فقیہ تھے۔ حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نکتہ رس علماء میں سے تھے۔ تدریس و افتاء کے علاوہ سیاسی لائن میں بھی نمایاں کام انجام دیا۔ آپ ہی جمعیۃ العلماء ہند کے سب سے پہلے صدر ہوئے اور عرصہ دراز تک صدر رہے۔ جمعیۃ العلماء اور کانگرس کی تحریکوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ کئی مرتبہ جیل گئے۔ آپ کا علم و فہم علماء میں تسلیم شدہ تھا۔ حضرت تھانوی جیسی مردم شناس ہستی نے فرمایا کہ "میں مفتی کفایت اللہ کے تدبّر اور مولوی حسین احمد کے جوشِ عمل کا معتقد ہوں"۔ مجموعی طور پر آپ فقیہ، محدث، مفتی، مجاہد، اور نکتہ سنج علماء دیوبند میں سے تھے۔

۲۱۔ حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

آپ دار العلوم دیوبند کے پانچویں صدر المدرسین تھے۔ حضرت شیخ الہند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ علم و فضل کے ساتھ غیر معمولی مقبولیت رکھتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء مجازین میں سے تھے۔ علم سے فراغت کے بعد اپنے والد مرحوم کے ساتھ ۱۳۱۶ھ میں مدینہ طیبہ پہنچے اور اٹھارہ ۱۸ سال مدینہ منورہ میں رہ کر مختلف علوم و فنون بالخصوص حدیث شریف کا درس دیا۔ زندگی کمال زہد و قناعت کی تھی جو کمال صبر و تحمل سے اس مدت میں بسر ہوئی۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ۱۳۱۸ھ میں ہندوستان تشریف لائے پھر ۱۳۲۰ھ میں واپس تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۷ھ میں دار العلوم میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۳۲۹ھ تک درس دیا۔ پھر اسی سال مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۱ھ میں پھر ہندوستان واپس تشریف لائے

اور اسی سال مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ حجاز ہی میں اسیر کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ ۱۳۳۸ھ میں مالٹا سے رہا ہو کر حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اور اسی سال اکابر کے حکم سے جامعہ اسلامیہ امروہہ میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ پھر ۱۳۳۹ھ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس رہے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۳۹ھ میں ہی جامعہ اسلامیہ سلہٹ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا۔ سلہٹ میں آپ ۱۳۴۵ھ تک قیام پذیر رہے۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے ڈابھیل تشریف لے جانے پر آپ شوال ۱۳۴۵ھ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس بنائے گئے۔ آپ بڑے درجہ کے محدّث تھے۔ حدیث کے مشہور اسکالر تھے آپ کا درس حدیث بہت مقبول تھا۔ کئی تصانیف فرمائیں جو سیاست اور تصوّف پر ہیں۔ ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۷۷ھ تک بتیس برس دار العلوم میں صدر مدرس اور ناظم تعلیمات رہے۔ اس دوران میں ۴۴۸۳ طلبہ نے آپ سے بخاری اور ترمذی پڑھ کر دورہ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ آپ ان تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت مردانہ سے سیاسی کام بھی پوری تن دہی سے انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں آپ جمعیۃ العلماء ہند کے بار بار صدر بنائے گئے۔ آپ جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے قائدین میں سے تھے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور سر دھڑ کی بازی لگادی۔ کئی مرتبہ جیل گئے اور آخر کار ملک کو آزاد کرایا۔ بہر حال مجموعی حیثیت سے آپ عالم، فاضل، شیخ وقت، مجاہد، جفاکش، جری اور اولو العزم فضلاء دار العلوم دیوبند میں سے تھے۔

۲۲۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ

سابق ناظم جمعیۃ الانصار دار العلوم دیوبند۔ سکھ مت سے آپ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ آپ دار العلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذکاوت، ذہانت اور حافظہ کے مالک تھے ذہن خلقی طور پر سیاسی تھا۔ سیاست میں گہری نظر تھی، ابتداءً طبعی اور علمی انداز میں اور بعد میں مشاہداتی انداز میں۔ یورپ اور ایشیا کے بہت سے انقلابات آپ کے سامنے گذرے اس لئے سیاسی اسکیموں کی ساخت و پرداخت میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک "ریشمی رومال" میں سرگرم حصہ لیا۔ افغانستان کی آزادی کی اسکیم آپ ہی نے مرتب فرمائی تھی۔ ۲۵ سال تک جلا وطن رہے۔ واپس تشریف لا کر فلسفہ ولی اللّٰہی سے ملک کو روشناس کرایا۔ سندھ ساگر اکاڈیمی اور محمد قاسم ولی اللّٰہی سوسائٹی قائم کی۔ جس نے حضرت نانوتویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علوم کی کافی خدمت کی۔ افغانستان میں آپ نے انڈین نیشنل کانگرس کی ایک باضابطہ شاخ قائم کر کے افغانستان کے حق میں ہندوستان کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ آپ کانگریس میں شرکت کے حامی تھے مگر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ من حیث القوم۔ دار العلوم میں آپ نے جمعیۃ الانصار قائم کی جس کے بڑے بڑے دو اجلاس مراد آباد اور میرٹھ میں ہوئے۔ اور اس کے حلقۂ اثر میں وسعت اور قوت پیدا ہوئی۔ آپ دار العلوم کو ایک علمی انداز سے ملی تنظیم کا ایک مرکز بنانا چاہتے تھے۔ جس کا نقش اوّل جمعیۃ الانصار کا قیام تھا۔

۲۳- حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ سہسرامی

آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پرنسپل تھے۔ مشہور عالم ذی استعداد فاضل تھے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے راستہ سے آپ کا علمی فیضان بنگال کے گرد و نواح میں کافی پھیلا۔ متواضع فہیم اور خلیق علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

۲۴- حضرت مولانا عبدالرزاق صاحبؒ پشاوری

آپ افغانستان میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ حکومت افغانستان میں آپ کا خاص وقار تھا۔ آپ وہاں کی پریوی کونسل کے صدر بھی تھے اور شرعی احکام میں آپ کا فیصلہ آخری ہوتا تھا۔ جس پر بادشاہ اور حکومت سب سر جھکا دیتے تھے۔

۲۵- حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ

خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ۔ آپ قابل قدر علم کے حامل تھے۔ "ارشاد الباری" آپ کی مشہور تالیف ہے آپ گہرا علم رکھتے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید تھے۔

۲۶- حضرت مولانا محمد سہول صاحبؒ بھاگل پوری

آپ دار العلوم کے ممتاز ابناء قدیم میں سے تھے۔ دار العلوم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف دینی مدارس میں آپ نے مدرسی کی۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل رہے۔ دار العلوم دیوبند میں تقریباً آٹھ سال درس دیا۔ پھر تقریباً تین سال یہاں کے مفتی کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد ازاں مدرسۂ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس ہو کر تشریف لے گئے اور عمر کا آخری حصہ وہیں گذارا۔ آپ کا علمی فیض بہت عام ہوا۔ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ جیسے لائق اور فاضل علماء آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ ممدوح رقت قلب کے ساتھ صاحب دل تھے اور اکابر اسلاف کے نقش قدم کے انتہائی طور پر محافظ تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ آپ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی رہے۔

۲۷- حضرت مولانا محمد میاںؒ صاحب منصور انصاری

آپ حضرت نانوتویؒ کے نواسے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے خاص معتمد تلمیذ رشید تھے۔ ابتداءً حضرت شیخ الہندؒ کے علمی کاموں میں شریک رہے اور اخلاقی استفادہ کیا۔ پھر حضرت کے سیاسی منصوبوں میں شریک ہوئے۔ اور آخر کار حضرت کے امین اور راز دار رفقاء میں شمار ہوئے۔ ریشمی خط کو حجاز لے کر آپ ہی روانہ ہوئے تھے اور برطانوی حکام کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کے قبضہ میں نہ آئے اور بمبئی سے پشاور تک مخفی سفر کیا۔ ہندوستان کی سرحد پار کر کے افغانستان میں داخل ہو گئے اور ریشمی خط اپنے موقعہ پر پہنچا دیا۔ کابل کا انقلاب آپ کے سامنے ہوا۔ بچہ سقہ کی چند روزہ حکومت میں آپ کو کابل سے بھی جلاوطن کر دیئے جانے کا آرڈر دیا گیا اور آپ کسی نہ کسی طرح کابل سے روپوشی کے ساتھ روس کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں افغانستان میں انقلاب ہو گیا اور جنرل نادر شاہ حکمران ہو گئے۔ انہوں نے مولانا کو عقیدت کے ساتھ پھر بلایا اور روسی سفارت خانہ میں بحیثیت نائب سفیر آپ کو روس بھیجا گیا۔ وہاں سے واپسی پر مستقلاً آپ کابل میں مقیم ہوئے۔ ۱۳۵۸ھ میں مجھے آپ نے بحیثیت مہتمم دار العلوم دعوت دی اور مجلس شوریٰ نے اس دعوت کو بکمال خوشی

منظور کرتے ہوئے مجھے بطور نمائندہ دارالعلوم افغانستان بھیجا تاکہ میں امیر نادر شاہ کی وفات پر تعزیت اور موجودہ بادشاہ افغانستان امیر ظاہر شاہ کی تخت نشینی پر تہنیت پیش کروں۔ افغانستان میں آپ کا علمی اور سیاسی وقار قوم اور حکومت یکساں طور پر مانتی تھی۔ مولانا ابوالکلام مرحوم کا جذبہ اور فیصلہ یہ تھا کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وہ مولانا منصورؒ کو ہندوستان لائیں گے لیکن آزادیٔ ہند کے چند ماہ بیشتر ممدوح کا وصال ہوگیا۔ رحمہ اللہ۔

۲۸۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی

آپ پوربی علاقہ میں خاص شہرت رکھتے تھے مگر آخر میں ان پر عدم تقلید کا غلبہ ہوگیا اور جماعت دیوبند سے انتساب کا رشتہ کمزور ہوگیا۔

۲۹۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

آپ حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد علیہ تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کے حامل تھے۔ علم مستحضر تھا اور بڑا منقح علم تھا۔ درس مقبول تھا، علوم عقلیہ سے خاص ذوق تھا منطق، فلسفہ اور علم کلام میں غیر معمولی دسترس تھی۔ حکمت قاسمیہ کے بہترین شارح تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مسجد فتح پوری دہلی کے مدرسہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تدریس علوم میں مشغول ہوئے۔ پھر دارالعلوم میں بحیثیت مدرس بلائے گئے۔ اونچے طبقہ کے اساتذہ میں آپ کا شمار تھا۔ بعد ڈابھیل میں ایک عرصہ تک شیخ التفسیر کی حیثیت سے کام کیا اور اپنے آخری دور میں چند سال دارالعلوم کے صدر مہتمم بھی رہے۔ صحیح مسلم کی بہترین شرح متکلمانہ انداز میں لکھی اور حکمت قاسمیہ کو اس میں نمایاں رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے تفسیری فوائد جو حضرت نے ترجمہ کے ساتھ شروع فرمائے تھے آپ نے پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ بے مثال خطیب تھے اور خطبات میں قاسمی علوم بکثرت بیان کرتے تھے۔ تحریر و تقریر میں انہی علوم کا غلبہ تھا۔ سیاسی شعور اونچے درجہ کا تھا۔ ملکی معاملات میں آثار چڑھاؤ کا پورا نقشہ ذہن کے سامنے رہتا تھا اور اس بارے میں جچی تلی رائے قائم کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک "ریشمی رومال" میں شریک رہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ آخر میں مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہوگئے اور جمعیۃ علماء اسلام کی بنیاد ڈالی۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان پہنچ کر ترک وطن کر دیا۔ پاکستانی پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے۔ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔ قرار داد مقاصد پاس کرائی۔ وہاں کی قوم نے آپ کو شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کیا۔ ایک سفر کے دوران میں بہاول پور میں وفات پائی اور کراچی میں دفن ہوئے۔ پورا ملک اور حکومت سوگوار ہوئی اور عرصۂ دراز تک آپ کا غم منایا جاتا رہا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

۳۰۔ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہٗ

سابق صدر المدرسین مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد، موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔ آپ اونچے درجہ کے محدث ہیں۔ جمعیۃ العلماء ہند اور کانگریس کی تحریکوں میں برابر حصہ لیتے رہے اور کئی بار جیل گئے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کی وفات کے بعد آپ ہی کو جمعیۃ العلماء ہند کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۳۷۷ھ، ۱۹۵۸ء سے ۱۳۸۲ھ، ۱۹۶۳ء تک دارالعلوم میں آپ سے ۱۱۶۱ طلبہ نے بخاری شریف پڑھی۔

۳۱۔ حضرت مولانا فضل ربی صاحبؒ

آپ شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں ایک جوشیلے عالم تھے۔ آپ حکومت افغانستان کی ہیئت تمیزیہ کے رکن کی حیثیت سے بہت ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔

۳۲۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہٗ [له]

آپ دارالعلوم دیوبند کے موجودہ صدر المدرسین ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔ اس وقت معقولات میں خصوصاً اور جمیع علوم میں عموماً فرد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ موجودہ اساتذۂ دارالعلوم و دیگر مدارس دینیہ اکثریت کے ساتھ آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ درسِ حدیث میں آپ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ مختلف مدارس دینیہ، فتح پوری دہلی، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ ہاٹ ہزاری چاٹگام وغیرہ میں صدارت تدریس کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ کے اساتذہ نے بالآخر آپ کو دارالعلوم کے لئے انتخاب فرمایا اور بہت اونچے طبقہ کے اساتذہ میں آپ کا شمار رہا۔ ۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کے صدر مدرس، ناظم تعلیمات اور مجلس شوریٰ کے ممبر بنائے گئے۔ آپ کے زمانہ صدر مدرسی میں ۱۳۷۷ھ سے ۱۳۸۷ھ تک ۱۱۶۱ طلبہ دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

۳۳۔ حضرت مولانا ماجد علی صاحبؒ

آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پرنسپل رہے اور اس نواح کے مشاہیر علم و فضل میں سے تھے۔

۳۴۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحبؒ امرتسری

آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں سے تھے۔ حدیث اور قرآن پر اچھی اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ آریوں اور قادیانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور متعدد مناظرے کئے۔ آپ کا لقب شیر پنجاب تھا۔ میلان عدم تقلید کی طرف تھا۔ آزادیٔ ملک کی تحریک میں جمعیۃ العلماء ہند کے ساتھ رہے اور باوجود اختلاف مسلک کے اکابر و اسلافِ دیوبند کے بہت زیادہ گرویدہ اور اخلاقی طور پر ان سے غیر معمولی انداز سے وابستہ رہے۔ اس احقر سے بہت زیادہ مانوس تھے۔ ہمیشہ ملاقات کے وقت مصافحہ اور معانقہ ہی پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ پیشانی بھی چومتے تھے، اور بعض اوقات آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے۔

۳۵۔ حضرت مولانا مناظر احسنؒ صاحب گیلانی

آپ بھی مشاہیرِ فضلاءِ دیوبند میں سے تھے۔ صاحب طرز مصنف، نیز ذہن و ذکا اور طباعی میں منفرد تھے۔ تحصیل علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے آرگن رسالہ "القاسم" کے ایڈیٹر اور رئیس التحریر منتخب کئے گئے اور عرصۂ دراز تک قلمی خدمات سے ہندوستان کے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے۔ اس کے بعد حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس دوران میں بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکلیں۔ "کائنات روحانی"، "سوانح ابوذر غفاریؓ"، اور "مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" وغیرہ آپ کی

[له] افسوس کہ حضرت مولانا وفات پا گئے۔

مخصوص اور مشہور تصانیف ہیں۔ تصانیف اور علمی مقالات کا عدد بہت کافی ہے جو مقبول خواص و عوام ہے۔ آخر میں احقر کی فرمائش پر آپ نے "سوانح قاسمی" تین جلدوں میں مرتب کی جو آپ کی تصانیف میں ایک شاہ کار تصنیف ہے۔ اس کے بارے میں جب احقر نے اُن سے فرمائش کی تو بہت خوشی اور امنگ سے اُسے قبول کرتے ہوئے لکھا کہ میری علمی زندگی کی ابتدا "القاسم" ہی سے ہوئی تھی اور شاید انتہا بھی "القاسم" (یعنی حضرت نانوتویؒ) ہی پر ہوگی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی کی چوتھی جلد آپ نے شروع کی۔ پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر فانی نے جواب دے دیا اور "القاسم" پر انتہا ہوگئی۔ تقریر و خطابت نہایت عالمانہ، ادیبانہ اور پُر جوش ہوتی تھی۔ دقیقہ سنج اور نکتہ رس علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کی ممتاز حیثیت مانی جاتی تھی۔ ۱۳۷۵ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

۳۶۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیملپوریؒ

آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حدیث سے خاص لگاؤ تھا۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں عرصہ تک صدر مدرس رہے اور علوم و فنون کا درس دیتے رہے۔ پاکستان بننے پر مدرسہ خیر المدارس ملتان میں اُستاد حدیث مقرر ہوئے۔ کئی سال سے ضعیف ہونے کی وجہ سے گھر پر تھے۔ گذشتہ سال انتقال ہوگیا۔

۳۷۔ حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب کابلیؒ

آپ مشہور سیاسی لیڈر تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں بہت نمایاں کام کئے۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد عرصہ تک دہلی میں قیام کیا۔ پھر اپنے وطن واپس جاکر وہیں مقیم ہوگئے۔ میں جب ۱۳۵۸ھ میں افغانستان حاضر ہوا تو بقید حیات تھے۔ اور میرے ساتھ غیر معمولی محبت اور ادب و احترام بلکہ نیاز مندی سے پیش آتے تھے حالانکہ میں اُن کا خورد تھا۔ آپ زبردست مجاہد تھے اور جہاد کا جوش سینہ میں اُبلتا ہوا رکھتے تھے۔ ہٹلر نے جب یورپ پر حملہ کیا تو میں اس وقت کابل ہی میں تھا اور اتفاق سے مولانا ہی کے مکان پر موجود تھا۔ حملہ کی خبر سُنتے ہی جوشِ مسرت سے رو پڑے۔ سجدے میں گر گئے اور فرمایا کہ "خداوندا! تیرا شکر ہے کہ بھیڑیوں میں باہم جنگ شروع ہوگئی جس سے انسانوں کے بچ جانے کی توقع ہوگئی"۔

۳۸۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علماء اور شیوخ میں سے تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ آپ کا طرز اصلاح و تہذیب نفس ہو بہو حضرت تھانویؒ کی طرح تھا۔ پہلے ضلع اعظم گڑھ میں پھر شہر گورکھپور میں اور پھر الہ آباد شہر میں آپ نے اپنی خانقاہیں قائم فرمائیں۔ بڑے بڑے ذی علم اور صاحب جاہ و ثروت حضرات کی اصلاح آپ کے ذریعہ سے ہوئی۔ ہزاروں بندگانِ خدا کو روحانی فیض پہنچایا اور یہ خطّہ آپ کے وجود باجود سے بہرہ اندوز ہوتا رہا۔

۳۹۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ ممتاز فضلاء دیوبند میں سے ہیں اور ابتداء طالب علمی سے انتہا تک احقر محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے رفقاء تعلیم میں سے ہیں۔ قوی الاستعداد ہیں اور استحضار علم کے ساتھ معروف فقہ

ادب میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ فراغت تعلیم کے بعد دار العلوم کے درجہ ابتدائی کے مدرس ہوئے اور تعلیمی ترقی کی منزلیں طے کر کے طبقۂ وسطیٰ اور پھر طبقۂ اعلیٰ کے مدرسین میں شمار کئے گئے۔ فقہی مناسبت اور فقہ سے خاص ذوق کی بناء پر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتیٔ اعظم دار العلوم کے حلقۂ افتاء میں شامل ہوئے، اور ایک ممتاز فتویٰ نویس ثابت ہوئے۔ بالآخر حضرت ممدوح کی وفات کے بعد دار العلوم کے عہدۂ افتاء پر بحیثیت مفتیٔ دار العلوم آپ ہی کا انتخاب کیا گیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اسارتِ مالٹا سے رہا ہو کر آجانے کے بعد آپ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے۔ اور حضرت کے وصال کے بعد اصقر کی معیت میں حضرت اقدس مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کیا اور حضرت مرشد تھانویؒ سے خلافت حاصل کی، اور تعلیم ظاہر کے ساتھ تعلیم باطن کی طرف مشغول ہوئے۔ الحمد للہ مولانا کے متوسلین بکثرت ہیں اور مخلوق کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ تصنیف و تالیف کا ذوق ابتداء ہی سے تھا۔ فقہ و حدیث اور مناظرہ میں نہایت مفید تصانیف کا ایک ذخیرہ ہے جو آپ کے قلم سے نکلا اور خواص و عوام کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی زمانۂ طالب علمی سے ہی تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں نہایت عمدہ قصائد، مراثی اور واقعاتی نظمیں کہیں، جن کا مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور آج وہاں کے ممتاز مفتیوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ گورنمنٹ پاکستان نے اسلامی قانون کی تدوین کے لئے علماء کی جو کمیٹی بنائی آپ اس کے رکنِ رکین رہے۔ آپ نے لانڈھی (کراچی) میں ایک بڑے دار العلوم کی بنیاد ڈالی، جو آج مرکزی حیثیت کی ایک ممتاز تعلیم گاہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ آپ فضلاء دار العلوم دیوبند میں ایک ہمہ جہتی امتیاز رکھتے ہیں۔

۴۰۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ

از عزیز احمد قاسمی ناظم شعبۂ تنظیم ابناء قدیم و ناظم شعبۂ تبلیغ دار العلوم دیوبند

آپ حضرت بانیٔ دار العلوم قدس سرہ کے پوتے اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دار العلوم کے صاحبزادے ہیں۔ آپ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ نے ۱۳۳۷ھ میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی اور دار العلوم میں حسبۃً للہ درس و تدریس کا آغاز کیا اور درس نظامی کی مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۸ھ تک دار العلوم کے نائب مہتمم رہے اور ۱۳۴۸ھ سے اب تک کہ ۱۳۹۹ھ ہے آپ ہی دار العلوم کے مہتمم ہیں۔ اس وقت پورے ہندوستان میں بہترین خطیب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر خطہ میں پہنچ کر تقریر و خطابت کے ذریعہ اسلامی مقاصد کی اشاعت اور مسلک دار العلوم کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔ تقریباً ایک سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایک مستقل ادارہ آپ کی تصانیف کو شائع کر رہا ہے جو ملک میں مقبول ہیں۔ شعر و سخن میں بھی اپنے بزرگوں کی طرح ثقہ انداز میں دخل رکھتے ہیں۔ آپ کی متعدد نظمیں، مثنویاں، اور قصائد ہیں جو رسالہ "دار العلوم" اور "القاسم" میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بعض بلیغ نظمیں کتابی صورت میں بھی مستقلاً شائع ہوئی ہیں۔ آپ ہندوستان کے متعدد علمی اور تعلیمی اداروں کے ممبر اور سرپرست ہیں اور متعدد مدارس کے بانی ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہیں اور عرصۂ دراز تک سنٹرل وقف بورڈ کے ممبر رہے۔ دار العلوم کے ذمہ داروں میں سے آپ پہلے شخص

ہیں جنہوں نے بیرونی ممالک کے متعدد سفر کئے۔ افغانستان، برما، عدن، حجاز، مصر، اردن، لبنان، ساؤتھ افریقہ، روڈیشیا کینیا، ٹانگانیکا، زنجبار، مڈغاسکر، حبش، ماریشس، ری یونین، پاکستان وغیرہ میں جاکر دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ آپ کے زمانے میں دارالعلوم نے غیر معمولی ترقی کی۔ تعلیمی اور تعمیری سلسلہ کافی بڑھا۔ کاموں اور شعبوں میں اضافہ ہوا۔ اساتذہ، طلبہ اور عملہ کا عدد بہت بڑھ گیا۔ آمدنی کی رفتار غیر معمولی طور پر ترقی پذیر ہوئی جس کی تفصیل آنے والے نقشوں سے معلوم ہوگی شعبوں نے محکموں کی صورت اختیار کرلی جیسا کہ آگے متعلقہ نقشہ جات سے تفصیلات معلوم ہوں گی۔ ممدوح حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ کا بیعت و ارشاد کا سلسلہ ہند و بیرون ہند میں پھیلا ہوا ہے۔ اہتمام کے طویل الذیل کاموں کے باوجود درس و تدریس کا مشغلہ آپ کا کبھی ترک نہیں ہوا۔ حدیث و تفسیر اور فن حقائق اسرار کی کتابیں جیسے حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ اکثر زیر درس رہتی ہیں۔ دیوبند میں آپ کی ایک مستقل مجلسِ مذاکرہ قائم ہے جس میں طلبہ اور شہر کے لوگ جمع ہوکر علمی استفادہ کرتے ہیں۔

۴۱۔ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ

آپ بھی دارالعلوم دیوبند کے نہایت ممتاز فضلاء میں سے تھے۔ آپ نے ۱۳۲۱ھ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو مدرسہ نعمانیہ پورینی ضلع بھاگلپور کے لئے منتخب فرمایا۔ چنانچہ آپ تقریباً سات سال اس علاقہ میں درس دیتے رہے۔ پھر آپ شاہجہان پور تشریف لائے اور ایک مسجد میں افضل المدارس کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں حسبۃً للہ درس دیتے رہے۔ یہاں تقریباً تین سال نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا۔ ۱۳۳۰ھ میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس ہوا، اور پہلے سال آپ کو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نورالایضاح وغیرہ پڑھانے کے لئے دی گئیں۔

دورانِ ملازمت میں جب حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند ریاست حیدرآباد کی مفتئ اعظم کے عہدہ پر سرفراز فرمائے گئے تو اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کو اپنی معیت میں لے گئے۔ وہاں ایک سال قیام رہا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے ساتھ ہی آپ دیوبند واپس تشریف لائے۔ آپ کو مفتئ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے بعد صدر مفتئ دارالعلوم دیوبند کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ اس کے بعد آخر عمر تک دارالعلوم دیوبند ہی میں آپ کا قیام رہا۔

فقہ و ادب آپ کا خاص فن تھا۔ جس کی مہارت مشہور زمانہ ہے۔ آپ جب ابتداءً دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے۔ تو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نورالایضاح آپ کو دی گئیں مگر آپ کے درس نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ شیخ الادب والفقہ کے لقب سے مشہور ہوئے اور عمر کے آخری دور میں کئی سال ترمذی جلد ثانی اور تفسیر کی بلند پایہ کتابیں بھی پڑھائیں۔ علم فقہ، علم حدیث، علم ادب، علم تفسیر وغیرہ ہر فن کی کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ تعلیم کے ساتھ طلباء کی تربیت اور نگرانی کا آپ میں خاص ذوق تھا جس سے طلباء کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ آج تک آپ کے شاگرد آپ کو یاد کرتے ہیں اور آپ کی نظیر نہیں پاتے۔ آپ کی پابندئ اوقات ضرب المثل تھی۔ اوقات درس کی پابندی میں آپ خود ہی اپنی نظیر تھے حتیٰ کہ بعض اساتذۂ دارالعلوم

نے درس میں اوقات کی پابندی کا سبق حضرت ممدوح ہی سے حاصل کیا۔

مدرسی کے ابتدائی دَور سے آخیر عمر تک منٹوں اور سیکنڈوں تک کی پابندی فرماتے تھے۔ بے نفسی اور تواضع میں بدطولیٰ رکھتے تھے۔ بڑی سے بڑی کتابوں کے درس کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی کتاب پڑھانے میں کبھی عار نہ ہوتا تھا۔ ترمذی و بخاری کا درس بھی دے رہے ہیں اور بچوں کو میزان الصرف، علم الصیغہ اور نور الایضاح وغیرہ بھی پڑھا رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب طالب علم وہ ہوتا تھا جو یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں لگا رہے اور سب سے زیادہ مبغوض وہ ہوتا تھا جو غیر تعلیمی مشاغل میں لگ کر، پڑھنے میں تساہل کرے خواہ وہ خود ان کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

آپ کو جس طرح اردو نظم و نثر پر قدرت تھی اسی طرح عربی نظم و نثر پر بھی کامل دستگاہ تھی۔ آپ نے ادب کی بعض مروجہ کتابوں کے غیر اخلاقی مضامین دیکھ کر خود ہی ادب کی ایک کتاب نفحۃ العرب مرتب فرمائی جس میں نفحۃ الیمن کے معیار کو باقی رکھتے ہوئے اس کے غیر اخلاقی مضامین کو حذف کر کے ان کی جگہ اس کتاب کو مستند تاریخی حکایات و قصص اور اخلاقی مضامین سے مالا مال کر دیا۔ اور اس پر مفید حواشی کے اضافہ سے افادہ میں مزید اضافہ کر دیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور مدارس میں داخلِ درس ہے۔ آپ نے نور الایضاح، دیوان حماسہ، کنز الدقائق، متنبی، شرح نقایہ وغیرہ کتابوں پر جو مفید حواشی تحریر فرمائے۔ اُن سے آج تک بڑے بڑے استاد استفادہ کرتے ہیں۔

انتظامی امور میں بھی آپ کی اہلیت مسلّم تھی اور وقتاً فوقتاً ادارۂ اہتمام میں بھی آپ کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ غرض آپ ایک بے نظیر اُستاد اور متبحر عالم دین اور ایک جامع شخصیت تھے۔ دار العلوم میں آپ کی علمی خدمات کا دَور پورے ۴۴ برس تک ممتد رہا۔ ۱۳۷۴ھ میں اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

۴۲۔ حضرت مولانا عبد الغفور صاحب مہاجر مدنی مدظلہ[1]

آپ دار العلوم کے فیض یافتہ اور آخری دورِ طالب علمی میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے مستفید ہیں۔ نقشبندیہ سلسلہ کے ممتاز مشائخ میں سے ہیں۔ اصل سے صوبہ سرحد کے باشندہ ہیں لیکن عرصہ دراز سے مدینہ طیبہ میں مہاجر کی حیثیت سے مقیم ہیں اور حجازی قومیت اختیار فرمالی ہے۔ آپ پر غلبہ باطنی ارشاد و ہدایت کا ہے۔ سرحدی و پاکستانی لوگ بکثرت آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہیں۔ مدینہ منورہ میں آپ کا مقامِ سکونت ایک مستقل خانقاہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ہر وقت طالبوں اور مستفیدین کا مجمع لگا رہتا ہے۔ اس وقت حجاز میں آپ ممتاز مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔

۴۳۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدظلہ[2]

آپ دار العلوم کے ممتاز فضلاء و علماء میں سے ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کے مخصوص اور معتمد علیہ تلامذہ میں سے ہیں۔ احقر کے خاص تعلیمی رفیق اور دورۂ حدیث کے ساتھی ہیں۔ اور ہم نسب بھی ہیں۔ حدیث، فقہ اور تفسیر میں امتیازی مہارت کے حامل ہیں۔ قوتِ حافظہ امتیازی ہے۔ علوم اور کتب کا استحضار تام ہے۔ اونچے درجہ کے اربابِ تدریس میں سے ہیں۔ علوم سے فراغت کے بعد بعض مدارس میں سلسلۂ تدریس سے منسلک

[1] افسوس کہ ... [illegible] سال آپ کا انتقال ہو گیا۔ [2] افسوس کہ گذشتہ سال [illegible] ۱۹۷۴ء آپ کا انتقال ہو گیا۔ (طبع ثالث)

رہ کر بالآخر دار العلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے بلائے گئے اور کتب تفسیر کے ساتھ دورہ کی کتب حدیث بالخصوص ابوداؤد شریف اکثر و بیشتر آپ ہی کے درس میں رہتی تھی۔ اتباع سنت اور عظمت سلف کا خاص شغف ہے۔ علوم شرعیہ اور رد مذاہب باطلہ میں بہت سی کتب کے بہترین مصنف ہیں۔ محققانہ انداز سے بحث کرتے ہیں جس میں علمی مواد کافی ہوتا ہے۔ علمی تصانیف کے سلسلہ میں مشکوۃ المصابیح کی شرح (التعلیق الصبیح) آپ کا تصنیفی شاہکار ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔ ممالک اسلامیہ کا سفر کئے ہوئے ہیں اور بیروت جاکر آپ نے خود ہی شرح مشکوۃ طبع کرائی۔ سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے کئی جلدوں میں محققانہ سیرت لکھی۔ جس میں آزاد خیال مصنفوں پر علمی انداز سے تنقید کی ہے اور ان کے بہت سے شکوک و شبہات کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ عربی ادب میں بخاص مہارت ہے۔ عربی اشعار برجستگی سے کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آپ کی نظمیں ہیں تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار کرلی اور جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث ہیں۔ تقریباً ہر جمعہ کو آپ کے وعظ کی مجلس ہوتی ہے جس میں ہزاروں کا اجتماع ہوتا ہے۔ حق گوئی میں (حکیمانہ انداز کے ساتھ) ید طولیٰ رکھتے ہیں اور سچی بات بلاخوف لومۃ لائم برملا کہتے ہیں۔ تقویٰ اور خشیۃ اللہ آپ پر نمایاں نظر آتا ہے۔ ممتاز مشاہیر علم و فضل میں سے ہیں۔

۴۴۔ حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مدظلہ

آپ دار العلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں۔ متعدد کتب میں احقر کے ہم سبق رہے ہیں۔ علمی استعداد شروع سے مضبوط تھی۔ اصل وطن ضلع ہزارہ (پاکستان) ہے۔ صاف گو خطیب ہیں۔ آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کو جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا ناظم منتخب کیا گیا ہے۔ موصوف کی علمی شہرت کی بناء پر مصر نے آپ کو بطور نمائندہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان دعوت دی اور آپ نے وہاں کی عالمی مؤتمر میں علماء عالم کو خطاب فرمایا۔ آپ کا شمار وہاں کے مشاہیر میں ہے۔

۴۵۔ حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی

آپ بھی دار العلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ فراغت تحصیل کے بعد دار العلوم دیوبند کے درجہ ابتدائی کے مدرس رہے۔ فن حدیث میں خاص دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد کئی بار حضرت شاہ صاحبؒ کے ہاں ترمذی اور بخاری کی سماعت فرمائی۔ آپ حضرت شاہ صاحب کے علوم کے خاص ترجمان ہیں۔ فیض الباری شرح صحیح بخاری آپ کی تالیفات کا شاہکار ہے۔ حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز حضرت قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ کا سلسلۂ ارشاد و ہدایت الحمد للہ وسیع ہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کی اور ٹنڈو الہ یار کے مدرسہ میں ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا اور درس حدیث میں مشغول رہے۔ پھر پاکستان سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں مقیم رہے۔ آپ کا سلسلہ بیعت و ارشاد خصوصیت سے افریقہ میں بہت پھیلا۔ بکثرت افریقی آپ سے بیعت ہیں۔ زمانۂ حج میں جو قافلے ایسٹ یا ساؤتھ افریقہ سے آتے ؛ وہ اکثر و بیشتر آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہو کر واپس ہوتے۔ آپ کی تصنیف و تالیف میں ترجمان السنۃ علم حدیث میں ایک شاہکار تصنیف ہے جس میں اکابر دار العلوم اور بالخصوص حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کے علوم کو جمع کر کے خود اپنے علم اور علمی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس

مبارک کتاب کی تین ضخیم جلدیں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی ہیں۔ جو خواص و عوام میں مقبول ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں انتقال فرمایا۔

۴۶۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہ

آپ حضرت مفتی اعظم الشیخ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی قدس سرہ کے فرزند رشید اور دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ درسیات سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے درس و تدریس کے سلسلے میں لئے گئے۔ پھر دارالافتاء میں اپنے والد بزرگوار کی زیر تربیت افتاء نویسی کی مشق کی۔ اور دارالافتاء میں بحیثیت نائب مفتی کام شروع کیا اور فتویٰ نویسی میں مہارت حاصل کی۔ ایک عرصہ تک حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ایک عرصۂ دراز تک کلکتہ میں مقیم رہے اور وہاں کے لوگوں کو علم اور دین سے مستفید کیا۔ اس کے بعد دہلی آکر ادارہ ندوۃ المصنفین قائم کیا۔ جو وقت کا ایک بہترین معیاری ادارہ ہے جس نے اسلامی علوم و فنون کی بہت سی قابل قدر تصانیف ملک کے سامنے پیش کیں آپ اس وقت دہلی کے مشاہیر علم و فضل شمار کئے جاتے ہیں۔ بہت سے علمی اور دینی اداروں کے ممبر ہیں اور مرکزی حج کمیٹی کے صدر ہیں۔ گورنمنٹ بھی آپ کی بات کا اثر لیتی ہے۔ قومی کاموں میں آپ کا خاص حصہ ہے۔ تحریک آزادیٔ ہند کے سپاہیوں میں سے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کے کاموں میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے دست راست رہے ہیں اور ان کے وصال کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے صدر عامل کے عہدہ پر فائز ہیں۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے مؤثر ممبروں میں سے ہیں۔ بہترین اور شیریں دل مقرر ہیں۔ بیرونی ممالک میں بھی آپ کی آمد و رفت رہی ہے۔ حال ہی میں آپ نے روس کے بعض دینی اداروں کی دعوت پر روس کا سفر کیا تھا۔ مجموعی حیثیت سے دارالعلوم کے ممتاز فضلاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

۴۷۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ

آپ سید علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اعلیٰ ترین علمی استعداد کے مالک، نہایت درجہ کے ذکی اور طباع فضلاء میں سے تھے۔ ابتداءً دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ پھر دارالعلوم کی طرف سے مدراس بھیجے گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مدرس رہے تصنیف و تالیف کی مخصوص صلاحیتیں رکھتے تھے۔ متعدد اعلیٰ ترین کتابوں کے مصنف تھے۔ ہندوستان کے بڑے بلند پایہ مقرر اور خطیب تھے۔ بہترین سیاستدان تھے۔ ندوۃ المصنفین کے مخصوص کارپردازوں میں سے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کے صف اوّل کے لیڈروں میں سے تھے۔ کئی بار جیل گئے۔ طویل عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ رہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلابی ہنگاموں میں اپنی جان پر کھیل کر ہزاروں کی جانیں بچائیں۔ پارلیمنٹ کے بے لوث اور نڈر ممبر تھے فرقہ پرست بھی ان کا لوہا مانتے تھے۔ گورنمنٹ بھی انہیں مانتی تھی اور ان کے اثرات قبول کرتی تھی۔ غرض ان کی شخصیت ایک جامع اور مؤثر شخصیت تھی جس کا ہندوستان کے تمام علمی اور سیاسی طبقات پر اثر تھا۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور اس کے کاموں میں دخیل تھے۔

۴۸ - حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی مدظلہ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کے تلامذہ میں سے ہیں علوم درسیہ سے فراغت کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس اور مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے ذمہ دار کارکنوں میں سے ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے حکم پر جمعیۃ علماء ہند کے ناظم بنے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کے بعد ایک سال تک ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کے عہدہ پر فائز رہے۔ جمعیۃ اور کانگرس کے بڑے مخلص سپاہی اور صف اوّل کے لیڈروں میں سے ہیں۔ کئی بار جیل گئے۔ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ "علماء ہند کا شاندار ماضی" کئی جلدوں میں اور "تاریخ اسلام" آپ کی شاہکار تصانیف ہیں۔ بچوں کی اسلامی تعلیم سے بہت زیادہ شغف ہے۔ چنانچہ دینی تعلیم کے متعدد رسائل تصنیف فرمائے جو بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ تعلیم کے ہر شعبہ میں اور ہر مضمون میں اسلامی رنگ دیکھنے کی تڑپ ہے اور اس تڑپ کا مظاہرہ تصنیف کردہ کتابوں اور چارٹوں سے ہوتا ہے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے کارگذار ممبر ہیں مجموعی حیثیت سے علم و عمل میں دستگاہ اور صلاح و تقویٰ حاصل ہے۔

۴۹ - حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہ

آپ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ایم۔اے کیا۔ دلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے۔ آج کل علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں سُنّی دینیات کے شعبہ کے انچارج ہیں۔ رسالہ برہان کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی قابلیت اپنی جماعت میں مسلّم ہے۔ کناڈا، انگلینڈ وغیرہ میں آپ کے لکچر بہت مقبول ہوئے۔ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور ادارہ مجلس معارف القرآن (اکاڈمی قرآن عظیم) کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین ہیں۔ آپ بھی حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس وقت آپ کی شخصیت ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ مصر، شام، حجاز، کویت، لبنان، کناڈا، انگلستان وغیرہ کے آپ نے قومی طور پر سفر کئے اور اپنی قابلیت سے ادبی اور علمی حلقوں میں ممتاز رہے۔ مصر کی عالمی مؤتمر میں احقر کی معیت میں آپ کا خصوصی سفر ہوا اور عالمی مؤتمر میں آپ کے خطاب کو سُنا گیا۔

۵۰ - حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ

آپ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ رحمۃ اللہ علیہ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے علوم کے امین ہیں جن کی ذات سے حضرت کے علوم کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی۔ علمی دنیا میں آپ کا ایک خاص درجہ اور مقام ہے۔ ادبیت اور عربی و فارسی کی ادبی قوت بے مثال ہے۔ عربی زبان میں بے تکان اور بے تکلف بولتے ہیں جس میں برجستگی اور روانی ہوتی ہے۔ عربی تحریر اور انشاء پردازی میں ایک بے نظیر صاحب طرز ہیں۔ متعدد اعلیٰ کتب کے مصنف ہیں ترمذی شریف کی نہایت ہی جامع اور بلیغ شرح لکھی ہے جس میں محدثانہ اور فقیہانہ انداز سے کلام کیا گیا ہے۔ اس کی عربیت اور طرز ادا معیاری ہے اور ذخیرۂ معلومات بہت کافی ہے۔ اس سے تبحر اور تفقہ دونوں نمایاں ہیں۔ آپ نے مصر، بیروت، شام حجاز، عراق اور افغانستان وغیرہ کے سفر کئے۔ مصر میں علماء دیوبند کا سب سے پہلے آپ نے تعارف کرایا اور وہاں کے اخبارات اور رسائل نے آپ کے بلیغ مضامین نہایت ذوق و شوق سے شائع کئے۔ جس سے مصر و شام میں آپ کی علمیت کا چرچا ہی

نہیں ہوا بلکہ دھاک بیٹھ گئی اور معیاری علماء کی مجلسوں میں آپ کو نہایت توقیر اور احترام کے ساتھ طلب کیا جانے لگا۔ علامہ طنطاوی مصری صاحب تفسیر طنطاوی پر آپ نے مصنف کے رُوبرو نقد و تبصرہ کیا جس سے خود مصنف متاثر ہوئے اور بہت سی تنقیدات کو انصاف پسندی کے ساتھ انہوں نے قبول کیا اور "یا استاذ" کے الفاظ سے خطاب فرمایا۔ عربی میں برجستگی اور ید طولیٰ حاصل ہے۔ مؤتمر عالم اسلامی قاہرہ (مصر) میں رئیس پاکستان کی حیثیت سے آپ کو بلایا گیا اور وہاں آپ نے مسلک علماء دیوبند کے مطابق مسائل پر نقد و تبصرہ فرمایا۔ بعض مسائل کے متعلق آپ کے مقالہ کو اہمیت دی گئی اور کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ آپ نے کراچی میں ایک مثالی دارالعلوم قائم فرمایا اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر نیوٹاؤن کی عظیم مسجد میں ابتداءً زہد و قناعت اور بے سرو سامانی کے ساتھ تعلیم دینی شروع کی۔ فقر و فاقہ تک برداشت کیا مگر کار تعلیم جاری رکھا۔ بالآخر سنت الٰہیہ کے مطابق، آخر میں لوگوں کا رجوع ہوا اور یہ دارالعلوم کئی لاکھ کی عمارت ہے جس میں پندرہ بیس کے قریب اساتذہ کار تعلیم و تدریس میں مشغول ہیں۔ حدیث و فقہ میں ممدوح کی استعداد و لیاقت ممتاز حیثیت رکھتی ہے جسے ان کے ہم عصر بھی بطوع و اعتراف تسلیم کرتے ہیں۔ آپ فضلاء دیوبند میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ملک میں معروف ہیں۔ صوبہ سرحد (مغربی پاکستان) آپ کا وطن ہے اور اس وقت بحیثیت ناظم اعلیٰ دارالعلوم نیوٹاؤن کراچی میں قیام فرما ہیں۔

۵۱۔ حضرت مولانا حامد الانصاری غازی مدظلہٗ

آپ حضرت مولانا منصور انصاریؒ رفیق سیاست حضرت شیخ الہندؒ کے صاحبزادے ہیں اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری کے تلامذہ میں سے اور حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ کے نواسوں میں سے ہیں۔ علمی ذوق سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے صاحب طرز ادیب ہیں۔ مشہور اخبار "مدینہ" بجنور کے برسہا برس ایڈیٹر رہے۔ پھر بمبئی میں اپنا مستقل اخبار "جمہوریت" جاری کیا۔ آپ کے سیاسی مقالات کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ قادر الکلام شاعر بھی ہیں صوبہ بمبئی کی جمعیۃ علماء کے صدر ہیں۔ سیاست پر کافی نظر اور سیاسی نشیب و فراز میں مہارت و حذاقت رکھتے ہیں۔ "اسلام کا نظام حکومت" آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو مقبول ہے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور ادارہ مجلس معارف القرآن (اکاڈمی قرآن عظیم) کے رکن ہیں۔

۵۲۔ حضرت مولانا مفتی محمد محمود صاحب مدظلہٗ سابق ایم۔ پی (پاکستان)

آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں بہت زیادہ معروف ہے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ کے ممبر رہے ہیں۔ حق گوئی میں بے باک ہیں۔ فقہی اور حدیثی استعداد کے ساتھ عصری معلومات پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں آپ کی تقریریں شرعی اور عصری معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ افتاء آپ کا خاص منصب ہے اور آپ کے فتاویٰ ملک میں اعتماد و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ وطن صوبہ سرحد (مغربی پاکستان) ہے۔ آپ اپنی گوناگوں علمی خصوصیات کی وجہ سے مصر کی عالمی مؤتمر میں بھی طلب کئے گئے اور وہاں آپ کا بلیغ خطاب وقعت کے ساتھ سُنا گیا۔ آپ دارالعلوم کے ممتاز فضلاء اور پاکستان کے مشاہیر میں سے ہیں۔

۵۳۔ حضرت مولانا سید محمد منت اللہ صاحب رحمانی مدظلہٗ

آپ بھی دار العلوم کے ہونہار ابن قدیم ہیں۔ دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد خانقاہ رحمانی میں اپنے والد بزرگوار کے جانشین کی حیثیت سے گدی نشین ہوتے اور خلقِ خدا کی روحانی اصلاح میں مشغول ہوگئے۔ ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جامعہ رحمانی میں جاری رکھا۔ آپ کی وجہ سے جامعہ رحمانی کو کافی ترقی ہوئی تا آنکہ جامعہ کی سابقہ عمارت ناکافی ہو جانے کی وجہ سے آپ نے جدید عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جو آج نہایت شان دار صورت میں دیدہ زیبی کے ساتھ کھڑی ہوئی علومِ دینیہ کی اشاعت و ترویج کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے ایک نہایت ہی شان دار لائبریری اور کتب خانہ بھی تیار کرایا ہے جس کی شان دار عمارت تمام ضروری علوم و فنون کی کتابوں سے بھرپور اور آراستہ ہے۔ عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ (مصر) کے لئے بحیثیت امیر شریعت بہار آپ کا نام منتخب کیا گیا۔ احقر کی معیت میں آپ نے مصر و حجاز کا سفر فرمایا۔ مؤتمر اور الرابطۃ الاسلامیہ مکہ مکرمہ میں آپ نے مقالات پیش فرمائے جن کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آپ مشاہیر ملک میں سے ہیں، اور فضلاء دیوبند میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی دینی و ملی خدمات اور ساتھ ہی آپ کے والد ماجد حضرت اقدس مولانا محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ارشد حضرت اقدس مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی قدس سرہٗ کی روحانی نسبت اور حلقہ اثر کے زیر اثر اہلِ بہار و اڑلیسہ نے آپ کو امارت شرعیہ بہار و اڑلیسہ کا امیر شریعت منتخب کیا۔ آپ کی امارت کے زمانہ میں امارت شرعیہ نے بہت زیادہ ترقی کی اور اس کی شاخیں صوبہ کے مختلف اضلاع میں قائم ہوگئیں۔ جو شرعی قانون کو عملی طور پر اس خطہ میں نافذ العمل کئے ہوئے ہیں۔ آپ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکنِ رکین اور مؤثر ممبر بھی ہیں۔

یہ مختصر فہرست ان مشاہیر کی ہے جن کے فیوض سے ہند و پاک کا گوشہ گوشہ سیراب ہو رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیرونِ ہند میں بھی ان حضرات کے فیوض جاری ہیں۔ مشاہیر میں بہت سے ذی استعداد افراد ایسے ہیں جو پڑھنے پڑھانے میں تو زیادہ مشہور نہیں ہوئے لیکن اپنی اہلیت اور قابلیت کی بنا پر دوسرے علمی کاموں میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے مثلاً تصنیف، خطابت، طب اور صحافت وغیرہ میں بہت مشہور ہوئے۔ چند افراد کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ مولانا احسان اللہ صاحب تاجورؔ۔ نجیب آبادیؒ

سابق پروفیسر دیال سنگھ کالج، لاہور و ایڈیٹر "ادبی دنیا" لاہور۔ آپ بہت مشہور صحافی اور ممتاز شاعر تھے۔

۲۔ مولانا مظہر الدین صاحب بجنوریؒ

سابق ایڈیٹر "الامان" دہلی۔ آپ مشہور مقرر اور صحافی تھے۔ مسلم لیگ کے ممتاز لیڈروں میں سے تھے۔ دار العلوم دیوبند میں کچھ عرصہ مدرس بھی رہے۔

۳۔ مولانا شائق احمد صاحب عثمانی

سابق ایڈیٹر "عصر جدید" کلکتہ۔ آپ دیوبند کے ممتاز فاضل اور ذہن و ذکاء اور علمی استعداد میں اپنے دور میں فرد مانے جاتے تھے۔ مگر فراغت کے بعد علمی سلسلہ قائم نہیں رہا۔ بلکہ اخباری دنیا میں آکر اسی میں منہمک رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کرلی۔

۴۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بجنوری

سابق ایڈیٹر "منصور" و "نجات" بجنور۔

۵۔ مولانا حکیم جمیل الدین صاحب بجنوری

آپ مشہور طبیب تھے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحبؒ کے استاد تھے۔

دارالعلوم کے فضلائے کرام کی کارکردگی

دارالعلوم دیوبند نے بحیثیت تعلیم گاہ ہونے کے ہرجہتی تعلیم دی اور ہمہ نوع فضلاء پیدا کئے، جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام کیا۔ ذیل میں فضلائے دارالعلوم کی کارگردگی کا مختصر تذکرہ بصورت اعداد و شمار پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نے کون کون سی خدمات انجام دیں۔ یہ اعداد و شمار کارگردگی کے لحاظ سے ہیں۔ یعنی اگر ایک ابن قدیم نے پانچ یا چھ کام کئے ہیں تو ہر کام میں اس ابنِ قدیم کا شمار کیا گیا ہے۔ یہ اعداد و شمار سن آغاز دارالعلوم ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک کے ہیں (یعنی گذشتہ سو سال کے)

۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ۱۰۰ سال کے عرصہ میں دارالعلوم دیوبند نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں درجِ ذیل ہمہ نوع فضلاء کرام پیدا کئے۔

مشائخ طریقت	۵۳۶	مناظر	۱۵۴۰
مدرسین	۵۸۸۸	صحافی	۶۸۴
مصنفین	۱۱۶۴	خطیب و مبلغ	۴۲۸۸
مفتی	۱۷۸۴	طبیب	۲۸۸

دارالعلوم کے ۴۸۷ فضلاء نے صنعت و حرفت اور تجارت کے ساتھ دینی خدمات بھی انجام دیں۔

ابنائے قدیم دارالعلوم نے ۸۹۳۶ مدارس و مکاتب قائم کئے۔

مذکورہ بالا خدمات میں جن حضرات نے اونچے درجہ کا مقام حاصل کیا ان کی تعداد درجِ ذیل ہے۔

اعلیٰ درجہ کے معلمین و مدرسین	۴۴۸	اعلیٰ درجہ کے صحافی	۱۰۸
" " " مصنفین	۲۷۶	" " " خطیب و مبلغ	۲۸۸
" " " مفتی	۱۶۴	" " " طبیب	۱۶۴
" " " مناظر	۱۱۲		

ملک میں دار العلوم کی شاخیں اور زیر اثر مدارس

دار العلوم کے فیضان نے ایک طرف تو ایسی شخصیتیں پیدا کیں جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل امت اور ایک مستقل جماعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف مدارسِ دینیہ کا سلسلہ قائم کر کے شخصیتیں اور کردار بنانے کی مشینیں نصب کر دیں اور منتسبہ مدارس اور انجمنوں کے ذریعہ اپنے غیر معمولی فیضان کا سلسلہ ہمہ گیر انداز میں پھیلا دیا۔

دار العلوم کی تاسیس کے بعد تقریباً ایک ہزار مدارس عربیہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہوئے۔ ان میں سے بہت سے مدارس ایسے ہیں جن کے امتحانات اور کارگذاری کی نگرانی بھی دار العلوم ہی کے ذمہ ہے مگر وہ خود اپنے اثر کے لحاظ سے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، جیسے جامعہ ملّیہ ڈابھیل۔ (تقسیم کے بعد اس کی نگرانی ختم ہو گئی) یا مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد، یا مدرسہ جامع مسجد امروہہ یا مدرسہ گلاؤٹھی وغیرہ۔ اگر ان متعلقہ مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ بھی دار العلوم کے فیض یافتہ حضرات میں شامل کئے جائیں جیسا کہ بالواسطہ وہ یقیناً شامل ہیں تو ہندوستان کا کوئی علمی حلقہ ایسا نظر نہ آئے گا جہاں دار العلوم کی ظاہری اور معنوی برکات کام نہ کر رہی ہوں۔ پھر اگر ان تمام مدارس متعلقہ و مکاتب اور اجتماعی اداروں کے حلقہائے اثر کو بھی دیکھا جائے تو بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی صحیح العقیدہ مسلمان خواہ وہ کسی حصہ کا رہنے والا ہو، دار العلوم کے ربقۂ تعلق و انتساب سے سبک بار نہیں ہو سکتا۔ جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس تخمِ سعادت کا شجرۂ طیبہ کہاں کہاں تک پھیلا اور اس کے ثمراتِ شیریں نے کتنوں کو حیاتِ لازوال بخشی۔

بیرونِ ہند ممالکِ غیر میں دار العلوم کا اثر

پھر کوئی اسلامی منطقہ ایسا نہیں جہاں دار العلوم کے علمی اثرات کسی نہ کسی صورت میں نہ پہنچے ہوں اور قائم نہ ہوں، حتیٰ کہ مرکزِ اسلام و مہبطِ وحی کی خدمت کے لئے بھی دار العلوم ہمہ وقت حاضر رہا۔ اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے متعدد فضلاء نے حجازِ مقدّس میں بھی مستقل افادہ و درس کا سلسلہ جاری کیا اور ان حضرات کا درس اس قدر مقبول ہوا کہ اہلِ حجاز نے دُور دُور سے آکر اس میں شرکت کی۔ اس طرح مرکزِ اسلام (حجازِ مقدس) اور مرکزِ علوم دار العلوم کے درمیان ایک مخصوص ربط قائم ہو گیا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنی نے حرمِ مکّہ میں حدیث، تفسیر اور مختلف فنون کے درس کا کامیاب سلسلہ جاری فرمایا۔ اس درس سے اہلِ مکّہ و اہلِ مدینہ اور دوسرے حجازیوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ دوسرے ممالک سے جو زائرین آتے تھے وہ بھی اس درس سے فیض یاب ہوتے تھے۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ نے حرمِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیم میں اٹھارہ سال تک علوم کتاب و سنّت کے دریا بہائے جس سے ہزاروں حجازی، شامی، عراقی اور مختلف بلادِ اسلامیہ کے لوگوں نے اپنی علمی پیاس بجھائی اور ان تک دار العلوم کی سند پہنچی۔

پھر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس سرہٗ کے برادرِ بزرگ حضرت مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی،

قدس سرہٗ مہاجر مدنی فاضل دارالعلوم دیوبند نے مدینہ طیبہ میں مستقل طور پر ایک مدرسہ "المدرستہ الشرعیہ" کے نام سے جاری کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس مدرسہ کی روداد ہر سال چھپتی ہے۔ اس میں کئی سو طلبہ اور متعدد مدرسین کام کر رہے ہیں۔ اس مدرسہ میں جملہ علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں اور بچوں کو دستکاری بھی سکھائی جاتی ہے۔ اسی مدرسہ میں دارالعلوم کے مشہور استاذ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب دیوبندی نے بھی مستقل مدینہ منورہ میں قیام فرماکر برسہا برس تعلیم دی۔ اہلِ مدینہ نیز مضافاتِ مدینہ کے لوگ اس سرچشمۂ علم سے اب تک سیراب ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدظلہ[1] سابق استاذ دارالعلوم دیوبند نے بھی جو ابنائے قدیم دارالعلوم میں سے ایک ہونہار فاضل عالم اور شیخ طریقت ہیں مدینہ منورہ میں مستقل قیام فرماکر بیعت و ارشاد، اصلاح اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری فرمایا ہے جو تا حال قائم ہے۔ گو مولانا محترم بوجہ امراض و کبرسنی ضعیف ہوگئے ہیں لیکن ہمت باطنی سے فیضان کے یہ سب سلسلے بدستور قائم ہیں اور نہ صرف اہلِ حجاز بلکہ دوسرے ممالک مثلاً ساؤتھ افریقہ اور ایسٹ افریقہ وغیرہ کے ہزارہا افراد آپ کے علوم و فیضان سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ افغانستان، پاکستان، برما، افریقہ وغیرہ میں تقریباً ہر صوبہ اور بعض ممالک میں شہر بہ شہر مدارس اور خانقاہیں قائم ہیں۔ جہاں فضلائے دارالعلوم ظاہری و باطنی افاضات میں مشغول ہیں۔ تاریخی اعداد و شمار کے علاوہ خود اس ناچیز کا مشاہدہ بھی گواہ ہے۔

دارالعلوم کے تعلیمی مصارف اور اس کی کفایت شعاری

دارالعلوم کے تعلیمی مصارف پیش کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصارف کی نوعیتیں بھی پیش کر دی جائیں تاکہ دوسرے اداروں سے مقابلہ کرنے میں آسانی ہو۔

دارالعلوم میں ابتدا ہی سے مفت تعلیم کا انتظام ہے۔ مفت تعلیم کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ طلبہ سے کوئی تعلیمی فیس نہیں لی جاتی بلکہ ہر امیر و غریب طالب علم کو حسب ذیل چیزیں بالکل مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

تعلیم، کتابیں، رہنے کے کمرے، بجلی کی روشنی، سردیوں میں گرم پانی، گرمیوں میں سرد پانی، طبّی امداد۔ ایسے طلبہ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ۱۵۰۰ ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ جو طلبہ غیر مستطیع ہوتے ہیں انہیں مذکورہ سہولتوں کے علاوہ حسب ذیل امداد بھی مفت دی جاتی ہے۔

دونوں وقت کا کھانا، سال میں چار جوڑے کپڑے، سال میں دو جوڑے جوتے، تیل اور صابون وغیرہ کے اخراجات کے لئے ۲۵ نئے پیسے ماہوار، سردیوں میں لحاف اور کمبل۔ ایسے طلبہ کی تعداد تقریباً ۹۰۰ ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ حضرات مدرسین اور کارکنان کی تنخواہیں ہیں جن پر ہر ماہ تقریباً بتیس ہزار ۳۲۰۰۰ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اس مرکزی ادارے کی شان، اس کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھئے پھر اس کے تعلیمی اخراجات پر نظر ڈالئے تو آپ کو اس کے کارکنوں کی دیانت داری، کفایت شعاری اور اخلاص مندی کا اندازہ ہو جائے گا۔

[1] افسوس کہ مولانا انتقال فرماگئے۔

ذیل میں ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ایک سو سال کی آمدنی و خرچ وغیرہ کے کچھ اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں۔

	روپیہ — آنہ — پائی		روپیہ — آنہ — پائی
سو برس کی کل آمدنی	۱,۰۸,۳۱,۵۶۶ — ۱۳ — ۲	سو برس کا کل خرچ	۱,۰۸,۴۶,۹۴۶ — ۱۱ — ۳
سو برس کا کل خرچہ تعمیرات	۱۱,۰۰,۸۹۵ ۱۳ ۶	سو برس کی تعداد فضلاء کرام	۷۴۱۷
سو برس کی تعداد فتاویٰ	۲,۶۹,۲۱۵	سو برس کی تعداد وقفی جو کتب خانہ میں موجود ہیں ...	۸۲,۳۵۰

فضلاء و مستفیدین دار العلوم کی عددی تفصیلات

سو برس میں جن طلبہ نے دار العلوم سے استفادہ کیا اور جن کے تعلیمی اخراجات دار العلوم نے برداشت کئے ان کی تعداد ۶۵,۷۲۷

سو برس میں فضلاء کرام کی تعداد جنہوں نے سند و دستار حاصل کی یعنی ۷۴۱۷ کو منہا کرنے کے بعد ان طلبہ کی تعداد جنہوں نے دار العلوم سے استفادہ کیا۔ ۵۸,۳۱۰

کل خرچہ میں سے صرف تعمیرات منہا کرنے کے بعد سو برس میں کل خرچ کی مقدار ...... روپیہ ۹۷,۴۶,۰۵۰ — آنہ ۱۳ — پائی ۹

۹ — ۱۳ — ۹۷,۴۶,۰۵۰ روپیہ کو اگر ۶۵,۷۲۷ طلبہ پر تقسیم کیا جائے تو ایک طالبعلم پر خرچ کی مقدار ...... ۱۴۹ روپے

۹ — ۱۳ — ۹۷,۴۶,۰۵۰ روپیہ کو اگر ۷۴۱۷ فضلاء کرام پر تقسیم کیا جائے تو ایک مکمل عالم تیار کرنے پر خرچ کی مقدار ...... ۱۳۱۴ روپے

اتنی حقیر رقم سے ایک ایسے عالم کا تیار ہونا جو قوم کی تمام ضروریات، مثلاً تزکیہ نفوس، تدریس، تصنیف، افتاء، صحافت، خطابت و تبلیغ اور اصلاح عام کے فرائض وغیرہ کو بخوبی انجام دے سکے، یقیناً ایک معیاری اور مثالی کامیابی ہے جس کی نظیر دنیا کے رسمی اداروں میں ملنی ناممکن ہے۔ دار العلوم بجا طور پر اس پر فخر و ناز کر سکتا ہے بالخصوص جب کہ یہ بھی پیش نظر رکھا جائے کہ اس ۷۴۱۷ کی تعداد میں کتنی ہستیاں ایسی بھی ہیں کہ اگر لاکھوں روپیہ ان میں سے کسی ایک پر نچھاور کر دیئے جائیں تو کم ہیں جن میں سے بعض کے نام ہم اوپر شمار کرا چکے ہیں۔

بہر حال دار العلوم کا فیض باران رحمت کی طرح عام رہا۔ علم کے پیاسے دُور دُور سے آئے اور اس نے ہر ایک کے ظرف اور ہر ایک کی طلب کے موافق اس کی پیاس بجھائی۔ ہند و پاک کا کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہ ملے گا، جہاں اس چشمۂ علم دین سے نکلی ہوئی کوئی نہر موجود نہ ہو جس سے سب لوگ سیراب ہوتے ہیں۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں　　ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

نوٹ: مذکورہ بالا سطور میں ۹ — ۱۳ — ۹۷۴۶۰۵۰ روپے کا جو خرچ دکھایا گیا ہے وہ تعمیرات کے علاوہ باقی شعبہ جات دار العلوم کا خرچ ہے۔ اسی میں دار الافتاء کا خرچ بھی شامل ہے جس سے سو سال کے عرصہ میں ۲,۶۹,۲۱۵ فتاویٰ صادر کئے گئے اور کتب خانہ کے اخراجات بھی ہیں، جس میں سو سال کے اختتام پر ۸۲۳۵۰ کتب موجود ہیں۔

دار العلوم کے اسلاف

دار العلوم دیوبند کے اسلاف میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ سے لے کر حضرت نانوتوی قدس سرہٗ تک کے سارے بزرگ شمار ہوتے ہیں کیونکہ مسلکاً اور روایتہً دار العلوم دیوبند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کی جانب منسوب ہے اور سلوک میں حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کا سلسلہ اکابر دار العلوم میں جاری و ساری ہوا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور خود حاجی صاحب قدس سرہٗ دار العلوم کے اسلاف میں سے ہیں۔

ان کے علاوہ دار العلوم کے اسلاف وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے دار العلوم کی رسمی یا معنوی سرپرستی فرمائی۔ مثلاً حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری قدس سرہٗ جن کا دخل تعمیر مدرسہ کے معاملات سے رہا اور ان کی مبارک رائیوں کو اہمیت حاصل رہی ہے چنانچہ تعمیر مدرسہ اور عمارتی سنگ بنیاد کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا ذوق تو یہ تھا کہ مدرسہ کی عمارات خام ہوں گھاس پھوس پر بیٹھ کر طلبہ تعلیم پائیں تاکہ زہد و قناعت، سادگی، بذاذۃ اور صبر و توکل کی شان ان میں نمایاں رہے لیکن دوسرے اہل الرائے حضرات کی رائے یہ تھی کہ دار العلوم کی عمارات پختہ اور مستحکم بنوائی جائیں تاکہ مدرسہ اپنی صورت کے لحاظ سے بھی نمایاں رہے لیکن اس بارہ میں جب کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی رائے متاثر نہ ہوئی تو آخر کار حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہٗ سے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ پر اثر ڈلوایا گیا اور آپ نے مولانا احمد علی صاحب کے ارشاد کے بعد اپنی رائے تبدیل فرما دی اور مدرسہ کی پختہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اسی طرح حضرت مولانا قاضی محمد اسمٰعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ منگلوری جو صاحب سلسلہ اور نہایت پائے کے بزرگوں میں سے تھے۔ دار العلوم کے قیام کے سلسلہ میں ان کے مکاشفات بھی تھے جن کا ظہور قیام دار العلوم کی صورت میں ہوا۔ اس لئے آپ بھی اسلاف دار العلوم ہی میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دار العلوم کے اعلیٰ عہدے دار

دار العلوم میں اعلیٰ ذمہ دارانہ عہدے صرف چار ہی ہیں۔

۱۔ سرپرستی　　۲۔ اہتمام　　۳۔ صدارت تدریس　　۴۔ افتاء

ان چاروں عہدوں کے لئے ہمیشہ ایسی ممتاز شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آتا رہا جو اہل اللہ، اہلِ دین و اہلِ تقویٰ اور جامع شریعت و طریقت تھے۔

دار العلوم کے سرپرست

دار العلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانی دار العلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز تھے۔ جن کا پُرامن و بابرکت عہد آج تک احاطہ دار العلوم میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۷۹ء تک سرپرست رہے۔ حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دوسرے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے۔ آپ کے عہد کی برکات دار العلوم پر نور آفتاب کی طرح چھائی رہیں جن سے ظلمتوں کو قرار پکڑنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ آپ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء سے ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء تک سرپرست رہے۔ آپ کے بعد ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں باجماع اہل دار العلوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ سرپرست تسلیم کئے گئے جن کے نورانی آثار سے آج تک دار العلوم کا احاطہ چمک رہا ہے۔ ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو حضرت اقدس مولانا عبد الرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہ کو سرپرست تسلیم کر لیا گیا۔ آپ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء سے ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء تک سرپرست رہے۔ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹا سے رہا ہو کر واپس تشریف لائے۔ تو پھر آپ ہی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء تک سرپرست رہے۔

آپ کے بعد ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز سرپرست ہوئے۔ آپ نے اپنی باطنی توجہات اور صرف ہمت کے ذریعہ دار العلوم کے جہاز کو فتن و حوادث کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھا۔ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں اپنی گوناگوں مشغولیات کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد سے آج تک سرپرست کے نام سے کسی شخصیت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔

دار العلوم کے مہتمم

اہتمام کے عہدہ پر بھی ہمیشہ اپنے وقت کے منتخب مخصوص افراد کا انتخاب ہوتا رہا۔ سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی تھے جو طریقہ چشتیہ صابریہ کے ایک معروف صاحب سلسلہ بزرگ تھے اور زہد و ریاضت کا پیکر تھے۔ آپ کا حلقہ اثر دیوبند اور اطراف و جوانب میں بہت وسیع تھا۔ آپ اولاً محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے رجب ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء تک مہتمم رہے۔ ثانیاً ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء تا ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء اور ثالثاً ربیع الاوّل ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء تا شعبان ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء مہتمم رہے۔

آپ کے اہتمام اوّل کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی عہدہ اہتمام پر فائز ہوئے۔ آپ طریقت و حقیقت کے ایک بلند پایہ شیخ اور حضرت شاہ عبد الغنی صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہ کے ارشد خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ صاحب ان پر فخر کیا کرتے تھے۔ موصوف بہت سے اکابر دار العلوم مثل حضرت مفتی مولانا عزیز الرحمٰن صاحب

قدس سرہٗ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے شیخ طریقت تھے۔ دارالعلوم کی معنوی ترقی میں حضرت ممدوح کی تربیت وصرف ہمت کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح قطب عالم عارف باللہ حضرت مولانا نانوتوی اور قطب ارشاد عارف باللہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کا تھا۔ آپ اولاً شعبان ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء تا ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء اور ثانیاً ذی قعدہ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۲ء تا ربیع الاول ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء دارالعلوم کے مہتمم رہے۔ آپ کے بعد تیسرے مہتمم حاجی محمد فضل حق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اور ایک صالح و متقی بزرگ تھے۔ آپ شعبان ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۳ء سے ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء تک مہتمم رہے۔

آپ کے بعد ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے چوتھے مہتمم ہوئے۔ آپ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے رشتہ کے بھائی اور جہاد شاملی میں ردیف کی حیثیت رکھتے تھے۔ نہایت ہی باخدا بزرگ اور صاحب دیانت و تقویٰ لوگوں میں سے تھے۔ آپ کے زمانہ اہتمام کی انتہا جمادی الاول ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء ہے۔

آپ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی دارالعلوم کے پانچویں مہتمم بنائے گئے۔ آپ کا عہد سابقہ تمام عہدوں سے طویل پر شوکت اور پرہیبت گذرا ہے۔ یہ دور چالیس برس تک ممتد رہا اور اس چالیس سالہ مدت ہی میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی۔ حضرت ممدوح کی ذاتی و آبائی وجاہت نے بہت سے پیدا شدہ فتنوں کو دبا کر دارالعلوم کے حلقۂ اثر کو وسیع تر بنایا، مالی امداد بہ کثیر مقدار میں بڑھیں۔ بڑی بڑی عمارتیں مثلاً دارالطلبہ قدیم، دارالطلبہ جدید کا کچھ حصہ، دارالحدیث تحتانی، مسجد دارالعلوم، کتب خانہ، دارالمشورہ، قدیم مہمان خانہ اور مختلف احاطے ارض دارالعلوم پر نمایاں ہوئے۔ کارکنوں میں اضافہ ہوا۔ حاصل یہ کہ اس درس گاہ نے مدرسہ سے دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ کی صورت اسی زمانہ میں اختیار کی جس کے ماتحت آج بہت سے اضلاع اور صوبجات کے بہت سے ادارے چل رہے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ دارالعلوم کے چھٹے مہتمم ہوئے۔ آپ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی نیابت میں رکھے گئے تھے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اپنی دانش و بینش اور فہم و فراست میں یگانۂ ہند تسلیم کئے جاتے تھے۔ ممدوح نے اپنے خداداد تدبر سے دارالعلوم کے انتظامات کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر منظم کیا۔ تقسیم کار کے ذریعہ مخلوط امور کو شعبوں میں تقسیم کیا اور دارالعلوم کو حقیقی معنی میں مرکزی حیثیت دی۔ موصوف کا یہ مستقل اہتمام گو تقریباً ڈیڑھ برس رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے دست راست اور ان کی چالیس سالہ خدمات کے روح رواں نیابت کی صورت میں آپ ہی رہے۔ آپ کا زمانۂ اہتمام شعبان ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء تک رہا۔

(از مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی ناظم شعبہ ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کے

بعدہ ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ دارالعلوم دیوبند کے ساتویں مہتمم ہوئے، اور بحمداللہ اب تک آپ ہی کے دستِ مبارک میں زمامِ اہتمام ہے۔ آپ کا حلقۂ اثر ہندوپاک سے گذر کر افغانستان، برما، حجاز مقدس، ایران، مصر، الیسٹ افریقہ اور جنوبی افریقہ تک پھیل گیا۔ آپ کے زمانۂ اہتمام میں انگلینڈ، امریکہ میں بھی دارالعلوم تعارف ہوا اور وہاں سے بھی امدادی رقوم وصول ہوئیں۔ آپ کے زمانہ میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی۔ دارالعلوم کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوا۔ مالیات میں بھی بے حد اضافہ ہوا اور تعمیرات بھی بہت زیادہ ہوئیں جس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے بخوبی ہوسکتا ہے جس میں دارالعلوم کی ترقیات اور اضافوں کو دو حصّوں میں تقسیم کرکے موازنہ کیا گیا ہے۔ ایک حصّہ آغاز دارالعلوم ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۴۷ھ تک چھ مہتمموں کا ۶۴ سالہ دورِ اہتمام ہے اور دوسرا حصّہ ۱۳۴۸ھ سے ۱۳۸۲ھ تک کا ہے جو حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا ۳۵ سالہ دورِ اہتمام ہے۔ اس میں ان دونوں ادوار کی آمد و صرف، مصارفِ تعمیر، تعداد کتب در کتب خانہ، تعداد فتاویٰ اور تعداد فضلاء موازنہ کرکے دکھلائی گئی ہے اور نتیجۃً دورِ ثانی میں بہ نسبت دورِ اوّل اضافوں اور ترقیات کے اعداد پیش کردیئے گئے ہیں۔[۱]

نامِ مدات	۱۲۸۳ھ تا ۱۳۴۷ھ (روپیہ - آنہ - پائی)	۱۳۴۸ھ تا ۱۳۸۲ھ (روپیہ - آنہ - پائی)	اضافہ (روپیہ - آنہ - پائی)
۱: آمدنی	۱۴,۸۸,۸۲۳ - ۹ - ۱۱	۹۳,۴۲,۷۴۳ - ۳ - ۲	۷۸,۵۳,۹۱۹ - ۹ - ۴
۲: خرچ	۱۵,۰۰,۲۵۷ - ۷ - ۳	۹۳,۴۶,۹۸۹ - ۴ - ۰	۷۸,۴۶,۴۳۱ - ۱۲ - ۹
۳: صرفہ تعمیرات	۳,۶۶,۷۸۵ - ۷ - ۱۱	۷,۵۴,۱۱۰ - ۹ - ۷	۳,۸۷,۳۲۵ - ۰ - ۰
۴: کتب خانہ میں تعداد کتب	۳۰۴۶۱	۵۱۸۸۹	۲۱۴۲۸
۵: تعداد فتاویٰ جو دارالعلوم سے روانہ کئے گئے	۴۴۸۹۴	۲۶۴۳۲۱	۲۱۹,۴۲۷
۶: تعداد فضلاء کرام	۱۸۸۴	۵۵۳۳	۳۶۴۹
۷: مجموعی تعداد طلباء دارالعلوم	۷۹۰	۱۵۶۹	۷۷۹
۸: تعداد امدادی طلباء	۳۶۵	۸۲۵	۴۶۹
۹: تعداد مدرسین	۲۴	۵۹	۳۵
۱۰: تعداد دیگر ملازمین	۳۲	۱۸۲	۱۵۰
۱۱: دارالاقامہ میں کمروں کی تعداد	۱۰۰ اندازاً	۲۲۸	۱۲۸
۱۲: دارالاقامہ میں طلباء کی تعداد	۵۰۰ ″	۱۰۷۳	۵۷۳
۱۳: شعبہ جات کی تعداد	۱۱	۳۰	۱۹

---

[۱] حضرت قاری صاحب کے متعلق معلومات مولانا عزیز احمد کی ہیں۔

دار العلوم کے صدر مدرس

ا : دار العلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ، فائز ہوتے جو اپنی جامعیت علوم ظاہرہ و باطنہ کے سبب شاہ عبد العزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۶ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آپ سے حدیث پڑھ کر ۷۷ طلباء فارغ التحصیل ہوئے۔

ب : ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ جو علوم منقولہ کے ساتھ ساتھ علوم معقولہ خصوصاً علم ہیئت و ریاضی میں امام وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء تک صدارت تدریس پر فائز رہے اور آپ کے ذریعہ ۲۸ طلباء فارغ التحصیل ہوئے۔

ج : ۱۳۰۸ھ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی دار العلوم کے تیسرے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آپ نے پچیس برس تک مسلسل حدیث اور تفسیر کلام ربانی کے علوم کے دریا بہاتے اور تشنگان علوم اس بحر ذخار سے سیراب ہو کر دوسروں کو سیراب کرتے رہے۔ آپ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس عرصہ میں ۸۶۰ طلبہ آپ سے حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

د : ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں بحر العلوم محدث دوران علامہ عصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قائم مقام صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ پھر ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں موصوف مستقل صدر مدرس ہوئے۔ آپ اپنے علم و عمل زہد و تقویٰ، تبحر و تفقہ اور حفظ و روایت کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔ آپ ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۳۸ھ تک قائم مقام صدر مدرس اور ۱۳۳۸ھ سے اوائل ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء تک صدر مدرس رہے۔ اس بارہ[12] سالہ مدت میں آپ سے حدیث پڑھ کر ۸۰۹ طلباء نے فراغت حاصل کی۔

ھ : شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں استاد العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مسند نشین صدارت تدریس ہوئے۔ جن کے علم و فضل اور اخلاق فاضلہ سے ہزاروں تشنگان علوم نے ظاہری و باطنی تکمیل کر کے اپنی علمی و روحانی پیاس بجھائی۔ آپ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس دوران میں آپ سے ۴۴۸۳ طلبہ نے بخاری و ترمذی پڑھ کر فراغت حاصل کی۔

و : ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء میں جامع معقول و منقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہٗ دار العلوم کے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آج آپ ہی بحمد اللہ اس عہدہ پر فائز ہیں[1]۔ آپ معقولات کے امام ہیں۔ حضرت شیخ الہند سے ظاہراً و باطناً مستفید ہیں اور طریقت میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری قدس سرہٗ سے سلسلۂ بیعت رکھتے ہیں۔ عرصہ دراز سے آپ بحیثیت محدث دار العلوم میں احادیث کی مختلف کتابوں کا درس دیتے رہتے ہیں۔ خصوصیت سے صحیح مسلم

[1] سنہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

آپ کے درس کا شاہکار رہی ہے جس کی مقبولیت طالبانِ علم و حدیث میں عام ہے۔ آپ کے زمانہ میں ۱۳۷۷ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ۱۱۶۰ طلبہ فارغ التحصیل ہوئے اور بحمد اللہ اب بھی آپ کا فیض جاری ہے۔

دارالعلوم کے مفتی

الف: دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی ابتداء ہی سے ہوتا رہا ہے سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی جو دارالعلوم کے صدر المدرسین تھے وہی اس اہم کام کو بھی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۱ھ تک اس خدمت کو بھی انجام دیا۔

ب: اس کے بعد کسی مخصوص شخصیت کے ذمہ یہ کام نہیں رکھا گیا بلکہ مختلف اساتذہ کرام سے افتاء کا کام لیا جاتا رہا چنانچہ ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۱۰ھ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔

ج: استفتاء کی تعداد بڑھ کر غیر معمولی حد تک پہنچ جانے کی وجہ سے باقاعدہ ایک دارالافتاء کی بنیاد ڈالی گئی اور ۱۳۱۰ھ میں دارالافتاء قائم کر کے حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کو مفتی کا عہدہ سپرد کیا گیا۔ آپ کے زمانہ میں دارالافتاء سے ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۴۶ھ، ۱۶ برس کی مدت میں ۳۷۶۲۱ فتاویٰ روانہ کئے گئے ۱۳۲۹ھ سے پہلے کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ملتا۔ اس لئے ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۲۹ھ تک، ۱۹ سال کے فتاویٰ کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔

د: ۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ صدر مفتی اور حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحبؒ مفتی کی حیثیت سے دارالافتاء کے ذمہ دار بنائے گئے۔ یہ دور ۱۳۴۸ھ تک رہا اور اس دور میں ۴۴۸۸ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

ہ: ۱۳۴۹ھ میں تنہا حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحبؒ کی ذمہ داری میں دارالافتاء آگیا اور اس دور میں ۳۴۵۲ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

و: ۱۳۵۰ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ حال مفتی پاکستان و ناظم اعلیٰ دارالعلوم کراچی مفتی دارالعلوم بنائے گئے۔ آپ اس عہدہ پر ۱۳۵۴ھ تک فائز رہے۔ آپ کے زمانہ میں ۱۸۲۹۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

ز: ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد سہول صاحبؒ مفتی مقرر فرمائے گئے۔ آپ ۱۳۵۷ھ تک مفتی رہے۔ آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

ح: ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب میرٹھی مفتی مقرر فرمائے گئے۔ آپ صرف ایک سال تک رہے اور ایک سال میں ۵۸۴۰ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

ط: ۱۳۵۹ھ میں دوبارہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ مفتی مقرر فرمائے گئے اور ۱۳۶۱ھ تک آپ مفتی رہے۔ اس دوران میں ۱۷۶۸۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

ی : ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا محمد فاروق صاحب امبیٹھویؒ ابن حضرت مولانا صدیق احمد صاحب مفتی مالیرکوٹلہ العلوم کے مفتی مقرر کئے گئے۔ آپ ۱۳۶۳ھ تک رہے۔ آپ کے دور میں ۸۴۲۷ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

ک : ۱۳۶۴ھ میں پھر مولانا اعزاز علی صاحبؒ مفتی مقرر فرمائے گئے۔ آپ ۱۳۶۶ھ تک مفتی رہے اور آپ کے ن زمانہ میں ۲۰۴۰۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

ل : ۱۳۶۷ھ میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہان پوری مدظلہ، مفتی مقرر فرمائے گئے، اور اس ت تک کہ ۱۳۸۴ھ ہے آپ ہی مفتی دارالعلوم ہیں۔ فتاویٰ میں آپ کی محنت و عرق ریزی اور شب و روز کا انہماک معروف ربان زدِ عام ہے۔ آپ کے زمانہ میں ۱۳۸۲ھ تک ۱۳۳۷۵۲ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے[۱]

دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم

۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ

نمبر شمار	اسماء گرامی حضرات نائبین اہتمام	از	تا	دیگر تفصیل
۱	مولوی عبدالقدیر صاحب دیوبندیؒ	۱۳۰۷ھ	ربیع الاول ۱۳۰۹ھ	
۲	مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب دیوبندیؒ	ربیع الاول ۱۳۰۹ھ	صرف ایک سال	۱۳۱۰ھ تا ۱۳۱۶ھ
دوبارہ	〃 〃 〃 〃 〃	۱۳۱۷ھ	۱۳۲۳ھ	کوئی نہیں رہا۔ ۱۳۲۴ھ
۳	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۲۵ھ	۱۳۴۳ھ	میں کوئی نہیں رہا۔
۴	حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ،	۱۳۴۴ھ	۱۳۴۷ھ	۱۳۴۸ھ میں کوئی نہیں رہا
۵	حضرت مولانا سید محمد مبارک علی صاحب نگینوی مدظلہ،	۱۳۵۰ھ	تا حال	
۶	حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی دیوبندی	۱۳۵۱ھ	صرف ایک سال	

دارالعلوم کے صدر مہتمم

نوٹ : دارالعلوم میں یہ کوئی مستقل عہدہ نہیں رہا۔ وقتی طور پر حسب ذیل دو حضرات اس منصب پر فائز رہے۔

نمبر شمار	اسماء گرامی حضرات صدر مہتمم	ابتدائی سن	آخری سن	دیگر تفصیل
۱	حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ	۱۳۴۴ھ	۱۳۴۷ھ	۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۳ھ
۲	حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ	۱۳۵۴ھ	۱۳۶۲ھ	کوئی نہیں رہا۔

۱۳۶۲ھ تا حال کوئی نہیں رہا۔

[۱] یہ مضمون حضرت قاری صاحب نے ۸۴ھ کو لکھا تھا۔ اب جبکہ ۹۵ھ جا رہا ہے مفتی صاحب موصوف ہی کام کر رہے ہیں۔ اسکے بعد جو فتاویٰ جاری کئے گئے انکا ہمیں علم نہیں ہو سکا (ارشد)

دارالعلوم دیوبند کے ممبران مجلسِ شوریٰ

ذیل میں ان حضرات کے اسماء گرامی درج کئے جاتے ہیں جو ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۴ھ تک دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر رہے یا ہیں۔

اسماء گرامی حضرات ممبران مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

نمبر شمار	اسماء گرامی	ابتدائی سن	آخری سن
۱	حضرت حاجی عابد حسین صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۱۰ھ
۲	حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ	۱۲۸۳ھ	۱۲۹۷ھ
۳	مولانا مہتاب علی صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۰۴ھ
۴	مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۲۱ھ
۵	مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۲۳ھ
۶	منشی فضل حق صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۱۱ھ
۷	شیخ نہال احمد صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۰۴ھ
۸	حکیم مشتاق احمد صاحبؒ	۱۲۹۸ھ	۱۳۰۹ھ
۹	حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ	۱۲۹۸ھ	۱۳۲۳ھ
۱۰	حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوریؒ	۱۳۰۵ھ	۱۳۱۲ھ
۱۱	شیخ ظہور الدین صاحب دیوبندیؒ	۱۳۱۲ھ	۱۳۲۳ھ
۱۲	مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ	۱۳۱۳ھ	۱۳۲۹ھ
۱۳	مولانا قاضی محمد محی الدین صاحب مراد آبادیؒ	۱۳۱۳ھ	۱۳۴۷ھ
۱۴	مولانا محمد عبد الحق صاحب پور قاضیؒ	۱۳۱۳ھ	۱۳۳۶ھ
۱۵	شاہ منظور حسین صاحب گنگوہیؒ	۱۳۱۳ھ	۱۳۳۸ھ
۱۶	حکیم محمد اسماعیل صاحب گنگوہیؒ	۱۳۱۳ھ	۱۳۳۶ھ
۱۷	شاہ سعید احمد صاحب انبیٹھویؒ	۱۳۱۳ھ	۱۳۳۹ھ
۱۸	حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ	۱۳۲۱ھ	۱۳۵۲ھ

نمبر شمار	اسمائے گرامی	ابتدائی سن	آخری سن
۱۹	حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری ؒ	۱۳۲۱ھ	۱۳۳۷ھ
۲۰	مولانا حافظ حکیم احمد صاحب رام پوری ؒ	۱۳۲۱ھ	۱۳۴۱ھ
۲۱	خلیفہ احمد حسن صاحب دیوبندی ؒ	۱۳۲۳ھ	۱۳۲۸ھ
۲۲	حافظ داد الٰہی صاحب دیوبندی ؒ	۱۳۲۳ھ	صرف ایک سال
۲۳	منشی مظہر حسن صاحب دیوبندی ؒ	۱۳۲۳ھ	۱۳۵۰ھ
۲۴	منشی فراغت علی صاحب دیوبندی ؒ	۱۳۲۳ھ	۱۳۲۸ھ
۲۵	شیخ محمد حسین صاحب دیوبندی ؒ	۱۳۲۳ھ	صرف ایک سال
۲۶	مولانا حکیم مسعود احمد صاحب ابن حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ؒ	۱۳۲۴ھ	۱۳۵۰ھ
۲۷	مولانا سعید الدین صاحب رام پوری ؒ مدار المہام ریاست بھوپال	۱۳۲۴ھ	۱۳۴۷ھ
۲۸	مولوی ظہور علی احمد صاحب پور قاضی وکیل سرکار بھوپال	۱۳۲۴ھ	۱۳۴۷ھ
۲۹	شیخ حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی ؒ محلہ کوٹلہ	۱۳۲۴ھ	۱۳۲۵ھ
۳۰	مولانا قاضی محمد حسن صاحب مراد آبادی قاضی القضاۃ بھوپال	۱۳۳۰ھ	۱۳۶۵ھ
۳۱	حاجی حافظ فصیح الدین صاحب میرٹھی ؒ	۱۳۴۴ھ	صرف ایک سال
۳۲	مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی ؒ	۱۳۴۴ھ	۱۳۵۴ھ
۳۳	مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب کٹھوری ؒ	۱۳۴۴ھ	۱۳۷۳ھ
۳۴	مولانا حکیم مشیت اللہ صاحب بجنوری	۱۳۴۴ھ	۱۳۷۲ھ
۳۵	مولانا عبدالرحمٰن صاحب سیوہاروی	۱۳۴۴ھ	۱۳۵۰ھ
۳۶	مولانا حکیم محمد اشفاق صاحب رائپوری خواہر زادہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب ؒ	۱۳۴۴ھ	۱۳۶۷ھ
۳۷	مولانا حکیم رضی الحسن صاحب کاندھلوی ؒ	۱۳۴۵ھ	۱۳۴۹ھ
۳۸	حاجی شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی ؒ	۱۳۴۵ھ	۱۳۷۱ھ
۳۹	مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند (بحیثیت عہدہ)	۱۳۴۸ھ	تاحال
۴۰	مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی ؒ سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۷ھ
۴۱	مولانا حکیم مقصود علی صاحب مقصود جنگ ناظم الاطباء حیدر آباد دکن	۱۳۵۰ھ	۱۳۸۱ھ
۴۲	مولانا محمد صادق صاحب کراچی بانی مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی۔	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۷ھ
۴۳	مولانا حکیم سعید احمد صاحب گنگوہی المعروف بہ حکیم اجمیری	۱۳۵۰ھ	۱۳۵۹ھ
۴۴	مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوری سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۲ھ

نمبر شمار	اسماء گرامی	ابتدائی سن	آخری سن
۴۵	خواجہ فیروزالدین صاحب جنرل اکاؤنٹنٹ ریاست کپورتھلہ	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۲ھ
۴۶	مولانا محمد فضل اللہ صاحب وانمباڑی مدراس	۱۳۵۰ھ	۱۳۵۲ھ
۴۷	مولانا عبدالرحمٰن خاں صاحب خورجہ	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۱ھ
۴۸	مولانا سعید احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ ہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۷ھ
۴۹	مولانا شاہ رحمت علی صاحب موضع بہیران ضلع جالندھر	۱۳۵۰ھ	صرف ایک سال
۵۰	مولانا حافظ محمود صاحب رامپوریؒ مدار المہام ریاست اندرگڑھ راجپوتانہ	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۹ھ
۵۱	مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی صدر مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۲ھ
۵۲	حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ بانی جماعت تبلیغ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۳ھ
۵۳	مولانا نواب حبیب الرحمن صاحبؒ شیروانی صدر یار جنگ علی گڈھ	۱۳۵۳ھ	۱۳۵۹ھ
۵۴	مولانا حافظ محمد یوسف صاحب گنگوہیؒ	۱۳۵۲ھ	۱۳۶۳ھ
۵۵	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ مدنی بحیثیت عہدہ (صدر مدرس)	۱۳۵۳ھ	۱۳۷۷ھ
۵۶	نواب عبدالباسط خان صاحبؒ حیدرآبادی	۱۳۵۴ھ	۱۳۶۶ھ
۵۷	خان بہادر شیخ ضیاءالحق صاحب رانجپوریؒ ضلع سہارن پور	۱۳۵۴ھ	۱۳۷۳ھ
۵۸	حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی بحیثیت عہدہ صدر مہتمم	۱۳۵۴ھ	۱۳۶۲ھ
۵۹	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیۃ العلماء ہند دہلی	۱۳۵۵ھ	۱۳۷۳ھ
۶۰	مولانا محمد ابراہیم صاحب رانڈیریؒ	۱۳۵۵ھ	۱۳۶۷ھ
۶۱	مولانا حکیم محمد یٰسین صاحب نگینویؒ	۱۳۶۰ھ	۱۳۷۸ھ
۶۲	حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری قدس سرہٗ	۱۳۶۰ھ ۱۳۷۷ھ (دوبارہ)	صرف ایک سال ۱۳۸۱ھ
۶۳	مولانا ظہیر الحسن صاحب کاندھلویؒ	۱۳۶۰ھ	۱۳۶۲ھ
۶۴	مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی سلمہٗ اللہ تعالیٰ	۱۳۶۲ھ	۱۳۶۷ھ
۶۵	مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند دہلی	۱۳۶۲ھ	۱۳۸۲ھ
۶۶	مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ	۱۳۶۳ھ	تاحال
۶۷	مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مدظلہ	۱۳۶۳ھ	۱۳۶۷ھ
۶۸	مولانا شبیر علی صاحب تھانوی حال مقیم پاکستان	۱۳۶۳ھ	۱۳۶۷ھ
۶۹	مولانا بشیر احمد صاحب کھٹوریؒ	۱۳۶۳ھ	۱۳۷۳ھ
۷۰	مولانا احمد سعید صاحب دہلوی	۱۳۶۴ھ	۱۳۷۷ھ

نمبر شمار	اسماء گرامی	ابتدائی سن	آخری سن
۷۱	حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند	۱۳۶۸ھ	تاحال
۷۲	مولانا محمد نبیہ صاحب خانجہاں پوریؒ	۱۳۶۸ھ	۱۳۸۱ھ
۷۳	مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی مدظلہ دہلی	۱۳۶۸ھ	تاحال
۷۴	مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ اعظم گڑھ	۱۳۶۹ھ	صرف ایک سال
۷۵	مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ دہلی	۱۳۷۰ھ	تاحال
۷۶	مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی لکھنؤ	۱۳۷۰ھ	تاحال
۷۷	حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور	۱۳۷۰ھ	۱۳۸۲ھ
۷۸	مولانا مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی مدظلہ مفتی مالوہ	۱۳۷۳ھ	تاحال
۷۹	مولانا حبیب الرحمن صاحب مدظلہ مئو ضلع اعظم گڑھ	۱۳۷۳ھ	تاحال
۸۰	مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی مدظلہ مانڈر ضلع مونگیر	۱۳۷۳ھ	تاحال
۸۱	مولانا محمد سعید صاحب مدظلہ سملکی (سورت)	۱۳۷۳ھ	تاحال
۸۲	مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی مدظلہ امیر شریعت بہار و اڑلیسہ (مونگیر)	۱۳۷۴ھ	تاحال
۸۳	مولانا حکیم محمد اسماعیل صاحب نگینویؒ دہلی	۱۳۷۴ھ	۱۳۸۲ھ
۸۴	حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی بحیثیت عہدہ (حاضر صدر مدرس)	۱۳۷۷ھ	تاحال
۸۵	مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب رحمہ اللہ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۱۳۷۷ھ	۱۳۸۰ھ
۸۶	مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ لکھنؤ	۱۳۸۲ھ	تاحال
۸۷	مولانا عبدالقادر صاحب مدظلہ مالیگاؤں	۱۳۸۲ھ	تاحال
۸۸	مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد مدظلہ میرٹھی	۱۳۸۲ھ	تاحال
۸۹	مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدظلہ صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۳۸۲ھ	تاحال
۹۰	مولانا حامد الانصاری غازی صاحب مدظلہ صدر جمعیۃ العلماء بمبئی	۱۳۸۲ھ	تاحال
۹۱	مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ بجنوری	۱۳۸۲ھ	تاحال
۹۲	مولانا فضل اللہ صاحب مدظلہ حیدرآباد	۱۳۸۲ھ	تاحال
۹۳	مولانا سید حمید الدین صاحب مدظلہ فیض آبادی شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ	۱۳۸۲ھ	تاحال

دار العلوم دیوبند

(مشاہیر عالم کی نظر میں)

علامہ سید رشید رضا (مصر)

اگر میں اس مدرسہ کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے بہت غمگین واپس جاتا ——— (تقریر)

"میں نے مدرسۂ دیوبند میں جسے ازہر ہند کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ایک جدید علمی رجحان ترقی کرتے دیکھا۔ ہندوستان بھر میں میری آنکھوں کو ایسی ٹھنڈک کہیں حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ مدرسۂ دیوبند میں حاصل ہوئی اور نہ اتنی خوشی حاصل ہوئی جتنی وہاں۔ اس کی وجہ صرف غیرت و اخلاص ہے۔ جو میں نے اس مدرسہ کے علماء میں دیکھا۔" ——— (بحوالہ رسالہ المنار مصر)

مولانا ابوالکلام آزاد

"آپ کی یہ درسگاہ دراصل ایک ایسا کارخانہ ہے جو مسلمان کی روحوں کو ڈھالتا ہے۔ یہ کارخانہ قائم ہے تو ہمیں پریشان نہ ہونا چاہئے۔ اس درس گاہ کے اسلاف نے عمل کا جو نمونہ پیش کیا تھا اور جن مقاصد کو لیکر یہ درس گاہ قائم کی تھی۔ اگر وہ روشنی آپ کی رہنمائی کر رہی ہے۔ تو میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ شاندار مستقبل اس کے لیے تیار ہے ——— (تقریر)

ڈاکٹر راجندر پرشاد (سابق صدر جمہوریہ ہند)

آپ کے دار العلوم نے صرف اس ملک میں بسنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ممالک کے طلباء بھی آپ کے یہاں آتے ہیں۔ اور یہاں سے تعلیم پاکر جو کچھ یہاں انھوں نے سیکھا ہے۔ اپنے ممالک میں اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ یہ بات اس ملک کے باشندوں کے لیے قابل فخر ہے۔

دار العلوم دیوبند کے بزرگ علم کو علم کے لیے پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں۔ ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں مگر کم۔ ان لوگوں کی عزت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ آج دار العلوم کے بزرگ اسی طرز پر چل رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف دار العلوم یا مسلمانوں ہی کی خدمت نہیں بلکہ پورے ملک اور ایشیا

کی خدمت ہے۔ آج دنیا میں مادیت کے فروغ سے بے چینی پھیلی ہوتی ہے اور دلوں کا اطمینان اور چین مفقود ہے۔ اس کا صحیح علاج روحانیت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ سکون و اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے لیے مہیا فرما رہے ہیں۔ اگر خدا کو اس دنیا کو رکھنا منظور ہے۔ تو دنیا کو بالآخر اسی لائن پر آنا ہے۔ میں دارالعلوم آکر بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے کچھ لے کر جا رہا ہوں۔

اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان

"میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور سے وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے۔ افغانستان کے علماء دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور علم و روحانیت کے یقین میں جو فضیلت اور مرتبت انھیں حاصل ہے۔ اس کے ہمیشہ وہ قائل و مداح رہے ہیں۔ بہت سے افغان علماء اس دارالعلوم سے فیضیاب ہوئے اور انھوں نے اپنے وطن عزیز واپس جاکر وہاں علم کی روشنی پھیلائی اور ملک کی خدمات انجام دیں۔

مسٹر عبداللّٰطیف (وزیر عدل و صحت برما)

"یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے صرف اپنے ہم مذہبوں کے لیے نہیں بلکہ پورے ملک کے لیے لائق انسان پیدا کیے۔"

محمد عبدالفتاح عودہ (مصر)

"میں نے دیوبند میں اسلام اور سنن و ایمان کا ایک قلعہ دیکھا اور محسوس کیا کہ دین کس طرح دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا ضامن ہوتا ہے اور کس طرح سلف صالحین کی تقلید جس کی حفاظت یہاں کے بزرگان دین کر رہے ہیں اور جس سے یہاں کے طلبہ فیضیاب ہو رہے ہیں۔ ایک بیش بہا میراث شمار کی جاتی ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس طریقہ کو مضبوطی سے پکڑیں اور مستقبل کی عمارتوں کے لیے اسے بنیاد بنائیں۔"

رشید احمد اسماعیل ٹکولیا (جوہانسبرگ جنوبی افریقہ)

"انگریزی زبان بولنے والی دنیا میں اس کو (دارالعلوم دیوبند کو) ایٹن، اور کیمبرج کا درجہ دیا جاتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ درجہ اس کی شان کے لیے کمتر ہے۔ دارالعلوم کا رتبہ دوسرے اداروں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

نیاز برکنیر (ترکی)

"لائبریری اور اس کے بیش قیمت قلمی کتب کے ذخیرے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ میں نے یہاں اتنا خلوص پایا کہ اپنی ممنونیت کے اظہار کے لیے پوری طرح الفاظ نہیں پاتا۔ میں اس عمدہ کام پر جو یہاں کا عملہ اور مدرسین انجام دے رہے ہیں۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ایس، ای ملّاں (جنوبی افریقہ)

دارالعلوم کے جملہ شعبوں کو بغور ملاحظہ کرتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے اپنی سیاحت وسفر میں کسی جگہ ایسی مذہبی عظیم الشان درسگاہ نہیں دیکھی جو اپنی نوعیت میں ایک مرکزی درسگاہ کہلانے کے قابل ہو۔ موجودہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔

ڈی جولیس جرمینس (پروفیسر لوڈاپیسٹ یونیورسٹی ہنگری)

"میں نے خود اپنے ملک میں دیوبند کے مدرسہ کے بارے میں سُنا۔ مجھے ہمیشہ سے شوق تھا کہ علوم اور اسلامی اسپرٹ (روح) کے اس قلعہ کو دیکھوں ترکی اور مصر کے قدیم مدرسوں کے بعد جو مسجدوں میں قائم کیے جاتے ہیں مجھے عربی اور تعلیمات اسلامی کی اس گہرائی اور جدّوجہد کو دیکھ کر اور بھی زیادہ حیرت ہوئی جو اس مدرسے کے در و دیوار میں دائر و سائر ہے۔

جناب ابراہیم الجبالی (رئیس وفد جامعہ ازہر۔ مصر)

ہمیں دار العلوم دیوبند کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہم نے مختلف درجات میں پھر کر درس و تدریس کا معاینہ کیا اور اس مدرسے کے مدیر جناب شیخ شبیر احمد عثمانی اور حضرات اساتذہ کرام سے ملاقات کی۔ ہم نے ایسا منظر دیکھا جس نے ہمارے قلوب کو مسرت سے پُر کر دیا۔ اور ان کے چہروں پر علم کا نور دیکھا۔ ہم نے ایک ایسی جماعت دیکھی جس نے علوم دین، یعنی تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی خدمت کے لیے، اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ اس کے علاوہ دُوسرے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً عربی، ادب، منطق، فلسفہ، اور الٰہیات وغیرہ، ہم دُعا کرتے ہیں کہ ان علوم سے امتِ اسلامیہ کو یہ حضرات نفع پہنچائیں۔"

پروفیسر گرے ونٹ (آکسفورڈ یونیورسٹی۔ لندن)

" یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ مجھے دیوبند دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قدیم اسلامی کلچر اب بھی یہاں پوری آب وتاب سے درخشاں ہے۔ ایک مؤرخ کے لیے اس سے زیادہ روشن مواقع کا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

عثمان کیدو (نمائندہ چینی اسلامی نیشنل سالویشن فیڈریشن)

" میرے لیے یہ بات باعثِ سعادت ہے کہ مجھے دار العلوم دیوبند کو دیکھنے کا موقعہ نصیب ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خالص مذہبی ادارہ ہے۔ اسے ازہر مشرق کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔"

ایم۔ حسن (وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی)

یہ (دار العلوم دیوبند) صحیح معنی میں ایک یونیورسٹی ہے۔ مجھے ہندوستان اور یورپ کی بہت سی یونیورسٹیوں کے بارے میں ذاتی تجربہ

میں کہہ سکتا ہوں کہ جدید طرز کی بہت سی یونیورسٹیاں اس قدیم طرز کی یونیورسٹی سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔

جناب انوار السادات (وزیر حکومت مصر و جنرل سیکرٹری موتمر اسلامی)

اس عظیم تاریخی یونیورسٹی کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں خلوص دل سے اپنے ان بھائیوں کو مبارک باد پیش کروں۔ جو اس کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ نفع پہنچے اور یہ علم و معرفت کا ایک منار ثابت ہو۔

رئیس روسی وفد (برائے ہندوستان)

"میں نے یونیورسٹی (دارالعلوم دیوبند) کو دلچسپی سے دیکھا۔ برِّاعظم کے اس حصہ میں یہ مذہب اسلام کا ایک مرکز ہے۔ میں اپنے میزبانوں کی دریادلی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ امن اور فیاضی کا جذبہ جو مذہب اسلام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ہندوستانی عوام اور سوویٹ یونین کے عوام کے درمیان ہمیشہ ترقی پذیر رہے"

امریکی وفد برائے ہندوستان

"ہماری امریکی جماعت کو ایک دن یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) قیام کرنے کا موقعہ نصیب ہوا۔ ہم نے مشہور علماء اور ان کے شاگردوں سے ملاقاتیں کیں۔ درحقیقت اسلام ہی کا جذبہ روح کو نور بخشتا ہے اور یہ نور یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) ضوفشاں ہے۔

(مختار حسن، عمر حسن احمد، امیر رشید، سعید احمد، امیر حسین، محمد احمد امریکہ)

جناب علی اصغر حکمت (سفیر ایران برائے ہندوستان)

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس عبد ضعیف کو اس عظیم الشان دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی نعمت سے نوازا۔ اور یہاں کے پایۂ ناز اساتذہ کرام اور علمائے عظام کی مصاحبت کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے کلمات طیبات سے اس عبد ضعیف کے دل و جان بہرہ ور ہوئے۔ ان کے باقی رہنے والے آثار و تالیفات سے میں محظوظ ہوا جو کہ بقول "مداد العلماء افضل من دماء الشہداء" (علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے افضل ہے) اپنے دامن میں ربانی برکات اور آسمانی فضیلتیں لئے ہوئے ہیں ——————————————"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مولانا ظفر علی خان

دیوبند

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند — ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ملتِ بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند — حکمتِ بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دو چند

اسم تیرا بامسمیٰ، ضرب تیری بے پناہ — دیوِ استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند

تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جان سے نثار — قرنِ اول کی خبر لائی تری الٹی زقند

تو علم بردارِ حق ہے، حق نگہبان ہے ترا — "خیلِ باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند"

ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو — کر لیا اُن عالمانِ دینِ قیم نے پسند

جان کر دیں گے جو ناموسِ پیمبر پر فدا — حق کے رستے پر کٹا دیں گے جو اپنا بند بند

کفر ناچا جن کے آگے بارہا گھنگھرو کا ناچ — جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

اس میں قاسم ہوں کہ انور شاہ کہ محمود الحسن — سب کے دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

گرمیٔ ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج
جن سے پرچم ہے روایاتِ سلف کا سربلند

شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۳۳ھ ○ ۱۳۱۷ھ

۱۸۱۷ء ○ ۱۸۹۹ء

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کا خط جو انھوں نے

حضرت نانوتوی رح کی تعزیت میں مولانا رفیع الدین صاحب کو مکہ سے لکھا

از فقیر امداد اللہ عفی عنہ بخدمت بابرکت عزیز دل نور چشم رفیع الدین صاحب دام محبتہ

بعد سلام مسنون و دعا کے معلوم کردنی خط تمہارا عزیز انتظار میں بھیجا اور سب کی

معلوم ہوا احوال واقعہ جانکاہ کا خطوط سے اور بھوپال اور میرٹھ وغیرہ سے مفصل معلوم ہوا تھا اس صدمہ نے ہم کو

صدمہ عظیم بہت کر دیا انا للہ وانا الیہ راجعون رضا بقضا بندہ ہیں اوسکی جو جانب کی

ہم سبکو سے کو جامے جانی دل سے اوسکی رضا پر رہیں ہماری نفع نقصان کو وہ خوب جانتا ہے اس

اوسپر سونپ کر اپنے کام میں مصروف ہیں جسمیں رضا ہو اللہ تعالیٰ حاصل ہو خیر دیں

جو تم میں بڑی سرپرست مدرسہ کی تھی وہ نسبت نفع دوسرے کو سمجھ لو اگرچہ ہیں صاحب موجود

ہیں ہم سب صاحب اہل مدرسہ کی بہبود میں مصروف ہو مگر فقیر کی تمکو لکھنا واجب ہوا ضرور

تم سب خصوصاً تم کہ مدرسہ کی متہمم ہو چند امور کا لحاظ چاہئے اول تو مدرسہ کی کام میں

کوشش اور رعایت مکرر کی چاہئے یا امانت اور دیانت رہنا چاہئے اگر کیتنی ساتھ ہو توجہ

رعایت رہوے اور کل کو جواب دینا ہوگا دوسرے مدرسہ کا مال بیت المال ہے دوسرے کی

قرض دو یا کسی کی تنخواہ میں دیکر تو تمکو اسمیں تصرف نہیں پہنچتا تیسرے

سارے مدرسین اور اہل مدرسہ فقیر کے عزیز اور ہمارے ہیں مگر عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب کے چند وجوہ سے زیادہ

عبدالرشید ارشد

شیخ المشائخ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

انیسویں صدی عیسوی میں ملک و ملت جن ممتاز ترین اور عظیم المرتبت شخصیتوں پر فخر کر سکتی ہے ان ہی میں سے ایک مایۂ ناز اور عہد آفریں شخصیت شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ کی ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کا نہایت پر آشوب دور تھا چھ سو سال کی حکومت پر انگریز رفتہ رفتہ قابض ہوتے جا رہے تھے اس میں بہادری و جاں بازی کا دخل کم اور فریب کاری و جعل سازی کا دخل زیادہ تھا۔

حضرت شیخ المشائخ نے ان حالات سے متاثر ہو کر روحانیت اور سیاست کے امتزاج سے ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایک طرف بزم علم و عرفاں اور رشد و ہدایت کی روشن شمع تھی اور دوسری طرف جنگ و پیکار اور میدان سیاست کی شہسوار تھی گزشتہ پوری ایک صدی میں اس جماعت نے اپنے علم و عمل اور اصلاح و ہدایت کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کے معرکۂ جہاد شاملی سے لیکر ۱۹۴۷ء تک حصول آزادی کیلیے ملک و ملت کی جو زبردست خدمات انجام دیں اور سیاسی غلامی کی فضا میں ذہنی آزادی کو جسطرح برقرار رکھنے کی کامیاب جدوجہد کی ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی وغیرہم حضرات کے اسماء گرامی اور ان کی خدمات جو سینکڑوں میں چند مثالیں ہیں اسی "سلسلۃ الذہب" کی نامور ترین کڑیاں ہیں۔

خاندان حضرت شیخ المشائخ نسباً فاروقی تھے آپکا سلسلۂ نسب پچیس واسطوں سے سلسلۂ تصوف کے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے اس سے اوپر اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے حضرت ابراہیم بن ادہم کا امام زین العابدین بن امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے ہونا بیان کیا ہے مگر یہی صحیح ہے کہ وہ فاروقی النسب تھے آپکے والد ماجد کا اسم گرامی حافظ محمد امین ہے مولانا

شیخ محمد محدث تھانویؒ آپ کے ہم جد تھے جن کے اجداد اورنگ زیب سے لیکر انقلاب ۱۸۵۷ء تک تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں برسر اقتدار رہے، قاضی القضاۃ کا منصب بھی اسی خاندان میں تھا اس سلسلے کی آخری کڑی قاضی عنایت علی خاں تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں شاملی کے معرکے میں انگریزی فوج سے مردانہ وار جنگ کی اور اسی کی پاداش میں اس خاندان کو نہ صرف دینوی وجاہت سے محروم ہونا پڑا بلکہ تمام خاندان منتشر ہوکر تباہی کی آخری منزل پر پہنچ گیا۔

مولانا غلام رسول مہر اپنے مضمون "بزرگان دیوبند" میں لکھتے ہیں۔

"بزرگان دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اولین درجہ کا احترام و اعزاز حاصل ہے۔ وہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ان کے اسماء گرامی، اس سرزمین کے آسمان پر ان درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستہ بتاتے ہیں وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے مشعل بردار تھے جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے جو دلوں اور روحوں میں برابر دین حقہ کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار دار العلوم دیوبند ایسی ہے جو تقریباً ایک صدی سے اس وسیع سرزمین پر دینی علوم کے قیام و بقاء کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے اسکی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی ہے جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں کے دوائر میں قابل فخر ہیں"۔

تاریخ مشائخ چشت میں جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ "حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ۱۲۳۳ھ میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد حجاز چلے گئے انھوں نے صابریہ سلسلہ کو عروج کی انتہائی منزل پر پہنچا دیا۔ اور ان کے فیوض ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہے دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی ان کے اثرات پہنچے۔ حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی (المتوفی ۱۲۵۹ء) کے خلیفہ تھے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حجاز سے واپس آئے تو ارشاد و تلقین کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندوستان کو منور کر دیا اللہ تعالےٰ نے انہیں دل و دماغ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ انیسویں صدی کی تین عظیم الشان تحریکوں کا منبع و مخرج تھے۔ (۱) مسلمانوں کی دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جو تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی۔ جس نے بالآخر دیوبند کی شکل اختیار کی ان ہی کے خلفاء و مریدین کی پر خلوص جد وجہد کا نتیجہ تھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ) مولانا محمد یعقوب نانوتوی حاجی محمد عابد دیوبندی حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے۔ ان ہی بزرگوں کی کوشش سے دینی تعلیم کا چرچا ہوا۔

(۲) باطنی اصلاح و تربیت کے لیے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں دو بزرگوں کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حاجی امداد اللہ صاحب کے خلیفہ تھے۔ نصف صدی سے زیادہ انھوں نے ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے گوشے میں بیٹھ کر مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کیا۔ لیکن مولانا تھانویؒ کی تحریک میں وہ وسعت اور گیرائی پیدا نہ ہوسکی جو مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دینی تحریک کو حاصل ہوئی۔

مولانا محمد الیاسؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور جذبہ اللہ تعالےٰ نے انہیں عنایت فرمایا تھا۔ اس کی مثال اس عہد میں مشکل سے ملے گی۔ گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاس نے کیا۔

(۳) انیسویں صدی کی تیسری اہم تحریک آزادی وطن کی تھی اس سلسلہ میں خود حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مسلک ...

جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہ ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں جنگ آزادی کے زمانہ میں تھانہ بھون کا انتظام حاجی صاحبؒ نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور خود دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصل فرماتے تھے۔ آزادی وطن کے جس جذبہ نے حاجی صاحب کے قلب میں جگر کو گرمایا تھا۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے پہلو میں ایک شعلہ بن گیا انھوں نے اور ان کے رفقاء نے اور تلامذہ نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کا اقتدار ختم کرنے کے لیے جن مصائب کا سامنا کیا تاریخ ہند کا کوئی دیانتدار مورخ انکو بھلا نہ سکے گا۔

(تاریخ مشائخ چشت ص ۲۳۳،۳۴

پیدائش

حضرت شیخ المشائخ کی والدہ ماجدہ شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی کی صاحبزادی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے خاندان سے تھیں آپ اپنی ننھال نانوتہ میں دوشنبہ کے دن ۲۲ صفر المظفر ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے والد ماجد نے امداد حسین نام رکھا تاریخی نام ظفر احمد (۱۲۳۳ھ) ہے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا نام بجائے امداد حسین کے امداد اللہ تجویز فرمایا۔ اور پھر یہی نام زبان زد ہوگیا۔ پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی لکھتے ہیں:-

مزید تفصیل

آپ کا نام نامی آپ کے والد مرحوم نے امداد حسین رکھا تھا، لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نبیرۂ شاہ عبدالعزیز صاحب نے امداد اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا۔ شاید ان کو امداد حسین نام پسند نہ آیا کہ اس میں شرک کی بو آتی ہے چنانچہ اس نام کو حاجی صاحب نے بھی ترک کر دیا، اور کتابوں نیز خطوط میں ہمیشہ امداد اللہ ہی لکھا کیے۔

راقم الحروف کو "گلزار معرفت" سے جو آپ کی غزلیات وغیرہ کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے ایک اور نام کا بھی پتہ چلا ہے اور وہ نام خدا بخش ہے یہ نام کس نے رکھا معلوم نہ ہو سکا۔ لکھتے ہیں ؎

ہم نہ شاعر ہیں نہ ملّا ہیں۔ نہ عالم ہیں ولے — رکھتے ہیں ہر باب میں اللہ سے امداد ہم
اے خدا بخش اس زمین میں لکھ غزل اک اور تو — تا کہ جانیں شعر گوئی میں تجھے استاد ہم

لیکن اس قافیے اور ردیف میں دوسری غزل لکھنے کا مذکورہ بالا شعر میں جو پتہ دیا ہے اس میں آپ لکھتے ہیں ؎

ہے نہ یہ شعر و غزل، ہے اپنی مجذوبانہ بڑ — بڑ نہیں یہ مشق کو کرتے ہیں کچھ ارشاد ہم
ڈر ہے کیا فوج گنہ سے۔ ہے خدا بخش اپنا نام — اور تسپر رکھتے ہیں اللہ کی امداد ہم

ان اشعار میں بھی خدا بخش اور امداد اللہ دونوں ناموں کا اظہار صاف ہے آپ نے اپنے مختلف خطوط میں اپنا ایک اور نام عبدالکریم بھی تحریر فرمایا ہے چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھتے ہیں:

"از فقیر عبدالکریم عزیز القدر۔ عالی مرتبت مولوی محمد قاسم زاد شوقہ و ذوقہ باللہ تعالیٰ" (امداد المشتاق کا حصہ مرقومات امدادیہ) ایک اور خط میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب کو لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"از فقیر حقیر عبدالکریم عفی عنہ" (مرقومات امدادیہ ص ۲۲۱)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام حاجی صاحب نے کسی مصلحت کی وجہ سے رکھا تھا آپ کا تاریخی نام ظفر احمد تھا اور والد صاحب کا نام حافظ محمد امین بن شیخ بڈھا بن شیخ بلاقی تھا (شمائم امدادیہ ص ۶)[1]

[1] حیات امدادیہ ص ۵۳-۵۴

تعلیم

والدہ ماجدہ کو آپ سے بے انتہا محبت تھی اگرچہ آپ کے تین بھائی اور ایک بہن تھی مگر والدہ کو جو تعلق آپ سے تھا۔ وہ دوسروں سے نہ تھا۔ اسی لاڈ پیار کی وجہ سے آپ ابتدائی تعلیم سے بھی محروم رہے ابھی عمر کی ساتویں منزل ہی میں قدم رکھا تھا کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے انتقال کے وقت خاص طور پر وصیت کی کہ کوئی میرے بعد اس بچے کو ہاتھ نہ لگائے۔ اس وصیت کی تعمیل میں یہاں تک مبالغہ کیا گیا کہ کسی کو آپ کی تعلیم کی جانب توجہ نہ ہوئی بالآخر آپ خود ہی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے شوق سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، مگر ہر مرتبہ کچھ ایسے مواقع پیش آتے رہے کہ اس وقت حفظ کی تکمیل نہ ہو سکی اس زمانہ میں استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتویؒ جن سے آپ کا ننھیالی تعلق تھا۔ دہلی کے عربک کالج میں مدرس تھے۔ آپ انکے ہمراہ تحصیل علوم کیلئے دہلی تشریف لے گئے۔ "شمائم امدادیہ" میں لکھا ہے:

سولہ سال کے سن میں وطن شریف سے ہمراہی حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اسی زمانے میں چند مختصرات فارسی تحصیل فرمائے اور کچھ صرف و نحو اساتذہ عصر کی خدمت میں حاصل کی، اور مولانا رحمت علی تھانوی سے تکمیل الایمان شیخ عبدالحق دہلویؒ کی قرأت اخذ فرمائی۔"

آگے چل کر لکھا ہے کہ:

"بالہام غیبی و بجذبہ لذت کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع قرأۃ حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پر گزرانا۔ اور حصن حصین و فقہ اکبر امام ابو حنیفہؒ قرأۃ مولانا عبدالرحیم نانوتویؒ سے اخذ کیا۔ یہ ہر دو بزرگوار ارشد تلامذہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے تھے۔ اور مفتی صاحب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے۔" (شمائم امدادیہ ص۔ الغائیہ ص ۱۲)

مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ آپ نے شیخ عبدالرزاقؒ سے پڑھی جو مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے ایک واسطے سے شاگرد تھے۔ مثنوی مولانا روم سے آپ کو تمام عمر بڑا شغف رہا۔

بیعت

دہلی اس زمانہ میں علماء و مشائخ کا مرکز تھی۔ مولانا نصیر الدین دہلوی طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کے مسند نشین تھے۔ دہلی کے زمانہ قیام میں آپ کو ان سے عقیدت ہو گئی اور آپ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی شمائم امدادیہ میں ہے کہ "چند دن تک پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر اجازت و خرقہ سے مشرف ہوتے اور اذکار طریقہ نقشبندیہ اخذ فرماتے۔"

کچھ عرصہ بعد آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس آراستہ ہے شیخ المشائخ مجلس نبوی میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔ غایت ادب کی وجہ سے قدم آگے نہیں پڑتا تھا۔ اچانک آپ کے جد امجد حافظ بلاقی تشریف لائے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بارگاہِ نبوی میں پہنچا دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک میں آپ کا ہاتھ لے کر حضرت میاں نور محمدؒ جھنجھانوی کے حوالے فرما دیا۔

حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت اور شجرہ نسب

جھنجھانہ حضرت میاں جیؒ کا مولد پاک ہے اور آپ شاہ العلمین کی اولاد احفاد میں سے ہیں حضرت کا شجرہ نسب نویں پشت میں شاہ عبدالرزاق صاحب (شاہ العلمین) سے مل جاتا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

شیخ المشائخ فرماتے ہیں کہ "میں جب بیدار ہوا تو پریشانی کا عجیب عالم تھا۔ میں اس وقت جھنجھانہ سے واقف نہ تھا۔ کئی سال اسی طرح گزر

(بقیہ حاشیہ) ۱۲۰۱ھ میں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مشہور مجدد دین و مجاہد اسلام حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کا سن اور سال بھی وہی ہے اور اس اعتبار سے آسمان اسلام پر ایک ساتھ ان دو کواکب مسعود و درخشاں کا طلوع نئے معنوں میں ایک قران السعدین کہلائے گا جو آگے چل کر استقلال امت محمدی اور استحکام دین متین کے لیے ۱۸۳۲ء کے جہاد حریت میں بھی ایک دوسرے کے ہمدم و ہمقدم رہے اور جن کی ہم نفسی اور ہم آہنگی سے اسلام میں شریعت و طریقت کی الگ الگ راہوں اور جدا جدا مسلکوں کے نام پر جو فتنہ عظیم پیدا ہو چکا تھا اسکا بہ طریق احسن سدباب ہوا۔

سید جمال محمد میاں علیؒ حضرت میاں جیوؒ کے والد ہیں حضرت اپنے خوش قسمت ماں باپ کے دوسرے فرزند ارجمند تھے آپ کے برادر بزرگ کا اسم گرامی، غلام ضامن تھا آپ کا نام مقدس اشارہ باطنی تہدیہ کے تحت "نور محمد" قرار پایا۔

حضرت کے والد ماجد ایک متوسط درجے کے زمیندار تھے اور فضیلت و بزرگی میں اس وقت کے خاندان علوی کے افراد میں گل سر سبد تھے اسی اعتبار سے آپ نجیب الطرفین ہیں اور عزت و عظمت شرافت و نجابت کے ساتھ فضیلت و بزرگی آپ کی خاندانی میراث ہے۔

ابتدائی تعلیم اور سفر دہلی

حفظ کلام پاک آپ نے جھنجھانہ ہی کے کسی مکتب میں کیا۔ ابتدائی فارسی تعلیم بھی یقیناً دستور زمانہ کے مطابق اپنے خاندان کے کسی بزرگ یا کسی دوسرے صاحب علم سے حاصل کی ہوگی ایک نوعمر و نوجوان طالب علم کی حیثیت سے اپنی عمر عزیز کے کتنے سال اپنے طن مالوف میں گزارے اور کس سن میں پہلی بار حصول تعلیم کی غرض سے شاہجہاں آباد (دہلی) کا سفر اختیار کیا اس کی کوئی تفصیل روایتاً کسی کی زبانی نہیں معلوم ہو سکی، لیکن سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۸۰۶ء میں یعنی قریباً بیس برس کی عمر میں تحصیل علم و سلوک کی غرض سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت اقدس میں حاضری دی قریب قریب یہی زمانہ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کا حصول تعلیم کی غرض سے قیام دہلی کا ہے یا ہونا چاہیے چونکہ آپ کا اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سال پیدائش ایک ہی ہے کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ قیام دہلی میں حضرت میاں جیوؒ پیپل والی مسجد میں رہتے تھے جو زینت المساجد نامی تاریخی مسجد سے متصل ہے۔ آپ بہت جلد علم سفینہ سے علم سینہ کی طرف راغب ہو گئے اور تکمیل درسیات و تحصیل علوم متداولہ نہ کرتے ہوئے راہ سلوک کے ایک گرم رو مسافر بن گئے۔ جوہر اندیشہ کی گرمی نے اپنی جولانیاں دکھانے کے لیے تصوف و طریقت کے صحرائے ناپید کنار کو انتخاب کر لیا۔ ہو سکتا ہے کہ خود آپ کے استاد کامل کی صحبت نے آپ کو یہ نکتہ سمجھا دیا ہو کہ علم حق ذوق و وجدان سے حاصل ہوتا ہے محض کتابوں سے نہیں۔

ملازمت

دہلی سے سلسلہ تعلیم ترک کرنے کے بعد آپ جھنجھانہ واپس آگئے کچھ زمانہ تک یہیں قیام رہا۔ اس کے بعد آپ نے قصبہ لوہاری جلال آباد میں بچوں کو قرآن پاک اور فارسی کی تعلیم دینے کے لیے ملازمت کر لی۔ اس وقت کے اعتبار سے آپ کی تنخواہ دو روپیہ ماہوار تھی اور آپ کے لیے کھانا متمول خاتون اقبال بیگم کے گھر سے آتا تھا۔ آپ کبھی کبھی جمعرات کو لوہاری سے جھنجھانہ چلے آتے تھے جمعہ کا دن دولت کدہ پر بسر ہوتا تھا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ و دیگر اعزا کے ساتھ جھنجھانہ ہی رہتی تھیں ہفتہ کے روز آپ جھنجھانہ سے لوہاری واپس تشریف لے جاتے اور یہاں سے وہاں تک کا سفر ایک گھوڑی پر کرتے۔ جو آپ کی ملکیت تھی۔ جھنجھانہ میں حضرت کا مکان محلہ پیرزادگان متصل نیلا روضہ مسجد چشتی کے قریب تھا۔ جس کا ایک کوٹھا اور ایک سہ دری ہنوز بجنسہ موجود ہے قصبہ لوہاری میں آپ کا ایک حجرہ میں قیام رہتا تھا جو اب بھی اسی حالت میں ہے۔

حلیہ مبارک

آپ کا حلیہ مبارک یہ تھا۔ پستہ قد، نحیف الجثہ، گندمی رنگ، آنکھیں نہ چھوٹی نہ بڑی اوسط درجہ کی، لباس نیلا تہ بند گیرواکرتہ، دوپلی ٹوپی

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

گئے آخر کار مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی کی راہنمائی سے گوہر مقصود ہاتھ آیا اور حضرت میاں جیو کی خدمت میں حاضری کا موقع نصیب (باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

بیعت سلوک و جہاد

سلسلہ سلوک میں آپ کے پیر و مرشد شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی ہیں انھوں نے ہی آپ کو سلسلہ چشتیہ میں خلعت خلافت سے نوازا۔

آپ نے اور آپ کے مرشد کامل نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر جو تجدید بیعت (جہادی) فرمائی وہ بھی اس سلسلہ میں بڑی اہم اور دور رس تاریخی اثرات کی حامل ہے۔

سید شہیدؒ کی شخصیت بڑی انقلاب آفریں شخصیت تھی آپ کی طبیعت پر حمیت دین و غیرت اسلامی کا غلبہ تھا اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت صالحہ اور نظر کیمیا اثر نے اسے عزم و عمل اور جوش جہاد میں بدل دیا تھا۔

چنانچہ جب حضرت سید احمدؒ نے اپنے رفقاء عزیز جناب مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب بڑھانویؒ کے ساتھ اپنی تحریک تبلیغ دین اور تامین جہاد کی ابتدا کی تو دور و نزدیک کے مسلمانوں نے پورے جوش و خروش اور ذوق و شوق کے ساتھ لبیک کہا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت لوگوں کے رجوع اور اہل طلب کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ پورے کے پورے شہروں میں تھوڑے ہی آدمی ایسے ہوں گے جو تربیت اور اس قافلہ دین کی برکات سے محروم رہے ہوں گے۔

پھر جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی تو عوام و خواص فقیر و امیر سب نے اسے گرم جوشی کے ساتھ قبول کیا۔ کاشتکار ہل چھوڑ کر، تاجر دکانیں بند کر کے، ملازم اپنے آقا کو سلام کر کے، امراء اپنے محلوں سے نکل کر، علماء اور مشائخ درس و ارشاد چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو گئے اور ایسے پلٹ کر اپنے گھروں کی طرف نہ دیکھا۔

اس تحریک جہاد اور تبلیغی جدوجہد کے سلسلہ میں جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا گزر دوآبہ کے مشہور شہر سہارنپور میں ہوا تو مسجد الوہنی میں آپ کی ملاقات شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ سے ہوئی۔ نقش حیات میں اس تاریخی ملاقات کا ذکر حضرت مولانا ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان صدق ترجمان کے حوالے سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دورۂ تبلیغ میں حضرت شاہ حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی پیر و مرشد حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ سے ملاقاتی ہوئے تو [illegible] لوگوں کے نہ ہونے حضرت شاہ صاحب نے بھی مجھے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت فرمائی۔ درآں حالیکہ وہ خود صاحب ارشاد مکمل تھے اور ہزاروں آدمی ان کے مرید تھے اور فرمایا کہ واقعہ میں مجھے کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی حاجت نہیں، مگر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اسی میں دیکھتا ہوں (نظر کشفی سے) اور اسی لیے بیعت ہوتا ہوں۔ پھر خلوت ہوئی اور دونوں حضرات فیوض روحانیہ کا اکتساب کرنے کے لیے حجرہ میں چلے گئے جب نکلے ہیں تو سید صاحب پر نسبت چشتیہ اور گریہ و بکا کا غلبہ تھا اور حضرت حاجی شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ پر نسبت نقشبندیہ کا۔"

بہرحال حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اپنے مرید خاص قاضی حکیم مغیث الدین صاحب سہارنپوری و حضرت میاں جیوؒ کو بھی جھنجھانہ سے بلا کر حضرت سید احمدؒ [illegible] کے دست حق پرست پر بیعت کرائی کہتے ہیں جس وقت آپ کے پیر و مرشد کا پیغام لے کر ان کا آدمی جھنجھانہ پہنچا تو حضرت اپنی گھوڑی کا منہ ہاتھ میں لیے ہوئے [illegible] تھے، پیغام سنتے ہی حضرت پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور گھوڑی بھی لوٹ پوٹ ہونے لگی یہاں تک کہ اس کی بری حالت ہو گئی آپ سہارنپور پہنچے اور اپنے پیر و مرشد کی تعمیل ارشاد اور پیروی حکم کرتے ہوئے سید صاحبؒ سے بیعت ہوئے۔

[illegible] قافلہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پنجاب بالاکوٹ پہنچا تو حضرت میاں جیوؒ بھی اپنے پیر و مرشد

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

ہوا۔ دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی صورت ہے جو خواب میں دکھلائی گئی تھی۔ حضرت میاں جیوؒ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ کیا تمہیں اپنے خواب

(بقیہ حاشیہ) حضرت شاہ عبدالرحیمؒ اور سید صاحب کے ساتھ تھے اور جہاد میں شریک ہوئے، مگر بعد میں کسی مآل اندیشی اور مصلحت کے پیش نظر خود آپ کے پیرو مرشد نے واپسی وطن کا حکم دیا اور آپ لوہاری تشریف لے آئے اور ان سرفروشوں کی آخری جماعت نے بالاکوٹ کی تنگ اور سنگلاخ گھاٹی میں ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان جن میں مسافروں کا چلنا بھی آسان نہیں اپنے سے دس گنا حریف کے مقابلے میں جان دی۔

حیات باکرامات

قصبہ لوہاری میں ایک معلم کی حیثیت سے آپ کام کرتے رہے اور مستورالاحوال رہے۔ آخر شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی و مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک عجیب طریقہ سے آپ کے مرید ہوئے اور آپ کے جلوہ عام کرنے کا باعث بنے۔ جب حضرت حاجی صاحبؒ میاں جیوؒ سے بشارت غیبی پاکر مرید ہوگئے تو انھوں نے اپنے مرید ہونے کا واقعہ حضرت ضامن صاحب سے بیان کیا چنانچہ حافظ ضامن صاحب جیسے شوخ طبع بھی حضرت کے نادیدہ عاشق زار پرستار بن گئے اور حضرت سے ملاقات کرنے کا جوش اور ولولہ ان کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ حضرت حاجی صاحب سے آپ کی جائے قیام معلوم کی انھوں نے بتلایا کہ وہ لوہاری کی جامع مسجد میں بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے ہیں اور اصل وطن جھنجھانہ ہے جھنجھانہ کا پتہ یہ ہے محلہ پیرزادگان مکان متصل مسجد چشتی صاحبؒ مسجد کے پاس دھوبی رہتے ہیں ان سے معلوم کرلینا۔ آپ لوہاری تشریف لے گئے معلوم ہوا کہ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ جھنجھانہ تشریف لے گئے ہیں۔ حافظ صاحب نے جھنجھانہ کا رخ کیا۔ جب دھوبیوں کے محلہ میں پہنچے تو حضرت میاں مسجد چشتی کے سامنے ایک مزار کے قریب جو چشتی صاحب کے نام سے مشہور ہے تشریف فرما تھے حافظ صاحب نے کہا ارے دھوبی میاں جیو کا مکان کہاں ہے آپ نے فرمایا کہ میں کپڑوں کا دھونے والا نہیں دل کے دھونے والا دھوبی ہوں حضرت حافظ صاحب سمجھ گئے کہ یہ ہی حضرت میاں جیوؒ ہیں۔ قدم بوس ہوئے اس کے بعد آپ کا معمول ہوگیا کہ اگر ہفتہ میں دو تین یوم تھانہ بھون میں قیام فرماتے تو تین چار روز حضرت کی خدمت میں آخر پورے ساڑھے تین سال کے بعد حضرت میاں جیوؒ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو شرف مریدی بخشا۔

حضرت میاں جیوؒ کی عظمت کا احساس ان واقعات سے ہوتا ہے کہ حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ صحرا میں پھر رہا تھا۔ ایک جھاڑی میں کچھ آثار آدمی کے معلوم ہوتے غور کرنے سے معلوم ہوا کہ حافظ غلام مرتضٰے صاحب مجذوب پانی پتی ہیں مجھ کو دیکھ کر بیٹھ گئے میں بھی بیٹھ گیا مجھ پر توجہ کی دینا شروع کی جب مجھے آثار جذب معلوم ہونے لگے میں نے حضرت پیرومرشد کا تصور کیا اس وقت میرے اور ان کے درمیان حضرت پیرومرشد حائل ہوئے مجذوب صاحب تبسم کرنے لگے میں نے عرض کیا مجھ کو آپ کی طرح دیوانگی پسند نہیں ہے۔

اسی طرح حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حافظ محمود احمد تھانویؒ داماد مولانا مملوک علیؒ صاحب نانوتوی ایک مرتبہ حضرت میاں جیوؒ کی خدمت میں بعد بیعت کے حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ حضرت مجھے تصور شیخ کی اجازت دے دیجیے تاکہ تصور شیخ کیا کروں حضرت نے فرمایا کہ جب محبت غلبہ کرتی ہے تب تصور شیخ کون کرتا ہے۔ غلبہ محبت سے تصور شیخ خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ حضرت کے فرمانے سے ایسا تصور شیخ ان پہ غالب ہوا کہ ہر جگہ صورت شیخ کی نظر آتی تھی۔ چلتے پھرتے حیران ہوکر کھڑے ہوجاتے کہ صورت شیخ کی سامنے کھڑی ہے۔ جہاں قدم رکھتے ہیں وہاں بھی صورت شیخ موجود۔ نماز میں سجدہ میں صورت شیخ دیکھ کر نماز کی نیت توڑ دیتے تھے۔ حضرت سے عرض کیا کہ اب تو نماز پڑھنی بھی مشکل ہوگئی کس کی نماز پڑھیں جس طرح حضرت کی ادنیٰ توجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اسی طرح جاتی رہی اور ایک نظر میں صحیح حالت ہوگئی۔

حضرت میاں جیوؒ کی اس کیفیت باطنی کا حال مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کیفیت حضرت منصور پر صرف چند گھنٹہ بلکہ چند منٹ طاری رہی تھی اور وہ اس کو برداشت نہ کرسکے اور انا الحق کہہ دیا۔ وہی کیفیت حضرت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

پر کامل یقین ہے۔" یہ پہلی کرامت تھی جو مشاہدہ میں آئی میرا دل بکمال استحکام حضرت میاں جیو کی جانب مائل ہوگیا" ایک مدت پیر و مرشد کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میاں جیو پہ برابر تیس سال تک مسلسل طاری رہی مگر اس قدر اعلیٰ ظرف رکھتے تھے کہ اف تک نہ کی۔ یہ ہی آپ کا ظرف تھا کہ آپ اپنے زمانہ کے قطب الاقطاب تھے اور بقول مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے زمانہ میں ہندوستان کا دنیاوی پایہ تخت دہلی تھا اور روحانی پایہ تخت لوہاری تھا۔ اب جس کو روحانی دنیا کی بادشاہت مل گئی اور جو قبلہ روحانیاں بن گئے اس کے ہاتھ میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ مگر آپ نے اس کا اظہار بہت کم ہونے دیا اور کہیں کہیں تو ایسا بغیر ارادہ کے ہوا جیسے کہا جاتا ہے کہ حضرت میاں جیو کسی بات پر لوہاری کے خوانین (پٹھانوں) سے ناراض ہو کر جھنجھانہ تشریف لے گئے۔

حضرت کے لوہاری سے تشریف لے جانے کے بعد لوہاری کے اکثر محلوں میں آگ لگ جاتی تھی جس سے وہاں کے خوانین کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آگ کا لگنا حضرت میاں جیوؒ کی خفگی کا باعث ہے چنانچہ وہ لوگ جھنجھانہ پہنچے۔ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور حضرت کی خوشامد کر کے لوہاری واپس لے آئے حضرت کی مراجعت کے بعد پھر کبھی آگ نہیں لگی خوانین نے حضرت کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ حضرت جب آپ لوہاری والوں سے خفا ہو کر جھنجھانہ تشریف لے گئے تھے تو یہاں مختلف محلوں میں آگ لگ جاتی تھی اس کا کیا سبب ہے حضرت نے جواب دیا مجھے اور کچھ تو معلوم نہیں۔ صرف لوہاری سے محبت کے باعث مجھے اس کا ماحول اور محلے یاد آتے تھے۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے یہاں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میاں جیوؒ نور محمد علویؒ کی بعض بعض کرامتیں بھی عجیب و غریب ہیں فرمایا۔ جی ہاں ایک مرتبہ کسی کے کھیت میں آگ لگ گئی۔ کھیت والے نے آکر حضرت سے شکایت کی آپ نے اپنی ٹوپی اتار کر دے دی کہ جلدی سے جا کر آگ میں ڈال دو وہ لے جا کر آگ میں ڈال دی گئی اور آگ فوراً بجھ گئی۔

مولوی محمد میاں مرحوم سے جو حضرت میاں جیوؒ کے حقیقی بھتیجے اور غلام حیدر صاحب کے فرزند تھے روایت ہے کہ حضرت میاں جیوؒ کے زمانہ میں ایک مرتبہ بارش کی سخت کھینچ ہوئی چند حضرات میاں جیو کی خدمت میں بغرض دعا حاضر ہوئے حضرت اس وقت گنا چوس رہے تھے جب حضرت سے بارش نہ ہونے کی شکایت اور دعا کی درخواست کی آنے والوں سے جو صاحب حضرت سے انتہائی بے تکلف تھے آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم میرے گنے کے چھلکے چوس لو تو ان شاء اللہ بارش ہو جائے گی۔ ان صاحب کو پہلے تو گنے کے چھلکے چوسنے سے کچھ ندامت سی ہوئی۔ مگر آنے والوں کے اصرار پر ان صاحب نے حضرت کے چوسے ہوئے چھلکوں کو چوس لیا جس پر ابر رحمت اٹھا اور خوب زور سے بارش ہوئی۔

حصول دعا اور استمداد ہمت کا ایک اور دلچسپ واقعہ سنئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس وقت تھانہ بھون کی مسجد پیر محمد صاحب والی میں قیام فرمایا جو اب خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نام سے موسوم ہے اس وقت یہاں سہ دری نہ تھی کچھ قبریں تھیں کچھ درخت تھے اور اس جگہ ایک بزرگ بیٹھا کرتے تھے جن کا نام حسن علی شاہ تھا۔ صاحب سماع تھے۔ مگر دنیادار نہ تھے جب حضرت حاجی صاحب یہاں تشریف لائے تو انھوں نے انتہا ادب کیا کہ خود اٹھ کر شاہ ولایت میں چلے گئے حالانکہ اس وقت حضرت حاجی صاحب جوان تھے اور یہ بوڑھے۔ ان کے جانے کے بعد حاجی صاحب یہاں رہتے تھے۔ حضرت میاں جیوؒ بھی یہاں تشریف لایا کرتے تھے یہاں ایک خاندان تھا ان کی زمین ضبط ہو گئی تھی اور وہ کوشش کر رہے تھے۔ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی وہ لوگ دعا کے واسطے حاضر ہوتے حضرت نے فرمایا کہ میرے حاجی کو بیٹھنے کی تکلیف ہے یہاں ان کے لیے ایک سہ دری بنوا دو میں دعا کروں گا انھوں نے سہ دری بنوانے کا وعدہ کیا۔ انھوں نے دعا کی وہ مقدمہ الٰہ آباد جا کر موافق ہو گیا جس کی اطلاع ایک خاص خط سے ہوئی۔ حضرت میاں جیوؒ سے تذکرہ کیا گیا تو حضرت نے فرمایا وعدہ بھی یاد ہے؟ انھوں نے کہا کہ حضرت پوری سہ دری بنوانے کی طاقت تو نہیں آدھی

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

خدمت میں حاضر رہ کر ریاضت و مجاہدہ کے بعد سلوک کی تکمیل فرمائی اور خرقہ خلافت سے مشرف ہوئے۔

(بقیہ حاشیہ) بنا دیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا آدھی ہی سہی۔ پھر الہ آباد سے باضابطہ حکم آیا کہ تاحیات تو معاف تمہارے بعد پھر ضبط انھوں نے آکر حضرت میاں جیو سے عرض کیا حضرت نے فرمایا تم نے آدھا ہی وعدہ پورا کیا۔ پھر میں کیا کروں

یہ کرامات ایک ہلکی سی جھلک ہیں، ایک دھندلا سا پرتو ہے اس جلوہ طور اور مینارہ نور کا جس کا ذکر حاجی امداد اللہؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے میں ایک بار حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرقد انور پر تین روز تک مقیم (حالت مراقبہ میں) رہا میں نے دیکھا کہ حضرت قطب نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا دلی مقصد تم کو تمہارے مرشد سے ملے گا۔

ایک دن کرنال کے ایک عالم نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ حضرت بزرگوں کے قصے سنتے ہیں کہ لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں سر دھڑ کو الگ الگ (پارہ پارہ) دیکھا۔ آپ نے فرمایا میرے ماموں صاحب تذکرہ کر رہے تھے۔ کہ میں حضرت میاں صاحب کی خدمت میں ایک دن دوپہر کے وقت گیا۔ حجرہ شریف بند تھا، مگر کواڑ اچھی طرح لگے ہوئے نہ تھے۔ کواڑ جو کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت میاں صاحب کا دھڑ سارا الگ الگ ہے۔ مجھے دیکھتے ہی سب اعضاء باہم مل گئے اور حضرت میاں جیوؒ اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے کسی سے نہ کہنا۔

ایک طرف تو اہل وطن کی دنیا میں آپ کے مراتب و مدارج یہ تھے۔ دوسری طرف اہل حاضر کی نگاہوں میں آپ کے زہد و ورع اور پابند شرع ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ تیس برس تک کبھی حضرت کی تکبیر اولی قضا نہیں ہوئی۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی فرماتے ہیں کہ مولوی محمد صدیق صاحب بیان کرتے تھے کہ میری تیس سال سے حضرت میاں جیوؒ سے ملاقات ہے۔ اس تیس سال میں کبھی آپ کی تکبیر اولی قضا نہیں ہوئی معاملات و مسائل مذہبی میں بڑی احتیاط برتتے تھے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ یا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ایک شخص نہایت ہی خوش گلو تھا اور نعت وغیرہ پڑھتا تھا کسی نے حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا یہ شخص خوش گلو ہے اور نعت پڑھتا ہے آپ بھی سن لیں آپ نے فرمایا لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنا دیتے ہیں۔ اور غنا بلا مزامیر میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ اس کا سننا خلاف احتیاط ہے۔ لہذا میں اس کے سننے سے معذور ہوں۔ اللہ اللہ کس قدر ادب ہے منصب امامت کا۔

ایک اور واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ ایک بڑا پہنچا ہوا سادھو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت کا مہمان رہا جب جانے لگا۔ تو بولا میاں ہماری زنبیل میں تھوڑی سی اکسیر ہے۔ یہ لے لے تیرے پاس دھن کی کمی معلوم پڑتی ہے۔ اپنے کام میں لا۔ حضرت نے فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اپنے پاس ہی رہنے دو اس نے پھر کہا۔ حضرت نے اس بار بھی انکار فرما دیا جب اس نے تیسری بار یہی کہا تو حضرت نے ایک ڈھیلا اٹھا کر سامنے دیوار پر مار دیا اور فرمایا یہ دیکھو سادھو نے اس طرف دیکھا تو ساری دیوار سونے کی ہو گئی تھی یہ دیکھ کر وہ بولا تب تو میاں جی تجھے اس کی کو ضرورت نہیں۔

اس سادہ وضعی اور منکسر المزاجی کے باوصف کہ آپ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے سلف الصالحین کا بہترین نمونہ تھے۔ آپ کے چہرہ انور کے رعب و داب کا یہ عالم تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو آپ سے اس قدر قربت و نزدیکی کے باوجود یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ آپ کی شان میں لکھی ہوئی اپنی ایک نظم آپ کے سامنے پڑھ سکیں کہا جاتا ہے کہ جب کبھی حضرت میاں جی نور محمد صاحب بازار کی طرف نکلتے تو سب دکاندار تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور سلام کرتے ایک دفعہ باہر کے ایک غیر مسلم نے اس پر اعتراض کیا کہ تم لوگ کیوں کھڑے ہوتے ہو۔ ہرگز مت کھڑے ہوا کرو ان دکانداروں نے کہا اچھا آئندہ سے ہم ادب و تعظیم کے طور پہ کھڑے نہ ہوا کریں گے۔ ایک مرتبہ اتفاقاً حضرت میاں جیو صاحب بازار کی طرف تشریف لے گئے وہ شخص بھی آیا ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ معترض شخص ہی حضرت کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی سب دکاندار　　(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سفر حج ۱۲۶۰ھ میں آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو طلب فرما رہے ہیں۔ فرط شوق میں زاد راہ کا بندوبست بھی نہ کر سکے اور خالی ہاتھ روانہ ہو گئے بھائیوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے پیچھے سے مصارف بھجوائے۔ ۵ ذی الحجہ کو آپ کا جہاز جدہ کی بندرگاہ کے نزدیک لنگر انداز ہوا آپ جہاز سے اتر کر فی الفور عرفات کے لیے روانہ ہو گئے۔ ارکان حج کی ادائیگی کے بعد مکہ مکرمہ میں آپ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ کی خدمت میں کچھ عرصہ قیام فرما کر فیوض و برکات حاصل کیے اور بعد ازاں مدینہ منورہ میں روضہ اقدس پر حاضر ہو کر سوز دروں کو تسکین بہم پہنچائی۔ واپسی میں پھر چند دن مکہ مکرمہ میں قیام رہا ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں وطن مراجعت فرمائی۔

بقیہ حاشیہ: بھی حسب قاعدہ کھڑے ہو گئے حضرت کے گزر جانے کے بعد ان دکانداروں نے پوچھا تم تو اعتراض کیا کرتے تھے اور حضرت کی آمد پر سب سے پہلے ہی تم کھڑے ہو گئے۔ وہ شخص کہنے لگا میں مجبور تھا کیونکہ جس وقت حضرت تشریف لائے تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی شخص میرا کان پکڑ کر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت کو لباس فقیری تو عطا کیا ہی گیا تھا مگر ساتھ ہی رعب شاہانہ بھی بخشا گیا تھا۔

انتقال یہ تھے آپ کے نورانی زندگی کے چند اوراق لیکن بالآخر وہ وقت موعود آ گیا جو ازل سے ہی ہر ذی روح و ذی حیات کا مقدر ہو چکا ہے اور آپ نے ۵۸ برس اس دار فانی کی سیر کر کے سفر آخرت اختیار کیا۔ آپ کی وفات حسرت آیات کی تاریخ ۴ رمضان المبارک ۱۲۵۹ھ بروز جمعہ ہے۔

تجہیز و تکفین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں میرے حضرت پیر و مرشد کا مزار شریف ہے۔ وہاں ایک احاطہ امام سید محمود شہید سبزواری کا مشہور ہے اس احاطہ میں کسی نئی قبر بنانے کا حکم نہ تھا۔ آپ وہاں اکثر جایا کرتے تھے اور دیر تک مشغول رہتے تھے۔ انتقال کے وقت وصیت کی کہ اگر ممکن ہو تو مجھے اسی جگہ جہاں میں اکثر جایا کرتا ہوں دفن کرنا وہاں سے مجھے بوئے انس آتی ہے چنانچہ آپ وہیں دفن کیے گئے۔

حضرت نے مرنے سے پہلے فرمایا تھا فقیر مرتا نہیں صرف ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتا ہے چنانچہ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کی روح کی توجہ سے وہی فیضان و عرفان کا سرچشمہ جاری ہے۔ آپ کے ارشاد عالی کے مطابق آپ کے مزار مقدس سے دینی فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں جو آپ کی ذات بابرکات سے ہوتے تھے

حضرت کے مرید و خلفا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی تھانویؒ مہاجر مکی و مدنیؒ (خلیفہ) حضرت حافظ ضامن شہید فاروقی تھانوی (خلیفہ) حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ محدث فاروقی تھانوی (خلیفہ) حضرت شیر محمد خاں صاحبؒ لوہاری (خلیفہ) حضرت شیخ امام الدین صاحبؒ تھانوی (مرید) حضرت حافظ محمود صاحبؒ تھانوی (مرید) حضرت حافظ نور و صاحب جھنجھانوی (مرید)

(تلخیص نور محمدی)

حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانویؒ۔

صفائی اور تعمیر پر لوگوں کی توجہ ہوئی اور بہت جلد پانی کے چشمے بافراط مکہ مکرمہ کے گلی کوچوں میں جاری ہو گئے۔

اخلاق و عادات

شمائم امدادیہ میں آپ کا حلیہ اور اخلاق و عادات کی نسبت لکھا ہے کہ :۔

"سر مبارک کلاں اور بزرگ ہے پیشانی کشادہ، بلند اور نورانی ہے، ابرو وسیع اور خم دار آنکھیں بڑی اور ہمیشہ ذوق ربانی میں سرشار رہتی ہیں، رنگ گندم گوں ہے، جسم نحیف اور قد مائل بطوالت ہے، کلام میں شیرینی ہے، کثیر المروت اور عظیم الاخلاق ہیں، ہر ایک سے بکمال بشاشت پیش آتے ہیں اور گفتگو میں ہر وقت ہونٹوں پر تبسم کھیلتا رہتا ہے، اخلاق رذیلہ سے بالطبع نفرت ہے اور اتباع سنت تو گویا عادت بن گئی ہے۔ طریق سلوک آپ کا جذب و مجاہدہ ہے۔ اولیائے عصر کا آپ کی ولایت پر اجماع ہے اور علمائے زماں آپ کے علوم مرتبہ کے معترف ہیں۔ حق تعالےٰ نے علوم اسماء و صفات اور معارف خاص آپ کو مرحمت فرمائے ہیں، خلوت کو پسند فرماتے ہیں اور لوگوں سے کم ملتے ہیں۔ البتہ جو لوگ اخلاص کے ساتھ لوجہ اللہ حاضر ہوتے ہیں ان سے بکمال شفقت و اخلاق پیش آتے ہیں، باوجود کمالات باطنی اکثر اوقات اصحاب و مریدین سے فرماتے ہیں کہ "میرے پاس کچھ نہیں۔ البتہ خدا کی ذات سے امید ہے کہ تم لوگوں کے توسّل سے میری بھی نجات ہو جائے گی"

حضرت شیخ المشائخ کے استغنا کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکی جن سے سلطان المعظم کو بڑی عقیدت تھی، جب قسطنطنیہ سے باکرام و احترام مکہ معظمہ تشریف لائے تو آپ سے سلطان المعظم کی تعریف اور مناقب بیان کر کے درخواست کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں سلطان المعظم کے حضور میں آپ کا "تذکرہ کروں"۔ آپ نے فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ سلطان المعظم معتقد ہو جائیں گے پھر آپ نے دیکھ لیا کہ آپ کے معتقد ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرب سلطانی کی وجہ سے بیت اللہ سے بعد ہو گیا۔ البتہ آپ ان کی تعریف کرتے ہیں کہ بڑے عادل بادشاہ ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ سلطان عادل کی دعا قبول ہوتی ہے سو آپ سے ہو سکے تو آپ ان سے میرے لیے دعا کرا دیجیے مگر بادشاہ وقت سے یہ کہنا کہ ایک درویش کے لیے دعا کرو۔ یہ آداب سلطنت کے خلاف ہے اس لیے میں آپ کو اس کا ایک طریقہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ آپ ان کو میرا سلام پہنچا دیں وہ جواب میں وعلیکم السلام ضرور کہیں گے۔ پس میرے لیے اس طرح دعا ہو جائے گی۔　(کمالات امدادیہ ص ۶)

قیام مکہ مکرمہ کے مشاغل

حضرت شیخ المشائخ نے ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء میں ۴۳ سال کی عمر میں ہجرت فرمائی ۴۱ سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہے یہ پوری مدت مریدوں کی تربیت باطنی و افادہ میں گذری۔ آپ کے حلقہ ارادت میں ہندوستان و عرب کے علاوہ مختلف ممالک کے بکثرت لوگ شامل تھے مکہ مکرمہ میں ممالک اسلامیہ کے جس قدر مشائخ مختلف سلاسل کے مقیم تھے ان سب میں آپ کو نمایاں اور امتیازی مقام حاصل تھا۔ اکثر مشائخ حاضر ہو کر فیوض باطنی سے لطف اندوز ہوتے۔

تزکیۂ باطن کے ساتھ ساتھ اکثر ضیاء القلوب کا درس بھی جاری رہتا۔ ضیاء القلوب فن تصوف میں آپ کی بڑی معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ مثنوی شریف کے درس کا بھی التزام رہتا تھا۔ مثنوی شریف سے شغف کا یہ حال تھا کہ آخر عمر میں جب سیدھا بیٹھنا دشوار تھا۔ کوئی طالب مثنوی لے کر حاضر ہوتا تو فوراً پڑھانا شروع کر دیتے۔ ایک دو شعر کے بعد ہی بدن میں ایسی قوت آجاتی کہ تکیہ چھوڑ کر سیدھے بیٹھ جاتے اور اسرار و حقائق کا دریا جوش مارنے لگتا۔

ایک مرتبہ قسطنطنیہ کے ایک بڑے شیخ اسعد آفندی جو مولانا رومؒ کے خاندان اور سلسلے کے شیخ کامل اور مثنوی شریف کے زبردست

عالم تھے آپ سے ملنے کے لیے تشریف لائے اس وقت مثنوی شریف کا درس ہو رہا تھا۔ حضرت شیخ المشائخ بڑے جوش کے ساتھ حقائق و معارف بیان فرما رہے تھے۔ درس اردو میں ہو رہا تھا آپ کے ایک خادم مولوی نیاز احمد حیدرآبادی نے عرض کیا کہ اگر شیخ اسعد اردو سمجھتے تو بہت محظوظ ہوتے۔ شیخ المشائخ نے فرمایا کہ "حظ و لطف کے لیے زبان جاننے کی کیا ضرورت ہے۔" یہ فرما کر مثنوی شریف کے چند اشعار ایک خاص انداز سے پڑھے جن کو سن کر شیخ اسعد آفندی پر حال طاری ہو گیا۔ جب افاقہ ہوا تو انھوں نے آپ سے اشغال کی اجازت لی اور اپنی قبا پیش کر کے درخواست کی کہ آپ اس کو پہن کر تبرکاً مجھے عنایت فرما دیجئے۔"

(کمالات امدادیہ ص ۱۴۴)

حاجی صاحب کے علوم

جیسا کہ تعلیم کے باب میں گزرا۔ حاجی صاحب نے باقاعدہ تعلیم و تدریس کم حاصل کی تھی، لیکن عشق و محبت الٰہی اور سوز دروں نے آپ کا سینہ کھول دیا تھا جس طرح انبیاء علیہم السلام کا سارا علم وہبی ہوتا ہے کسبی نہیں۔ اسی طرح امتوں میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو بظاہر تو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں لیکن اتباع سنت اور اپنی عملی زندگی کی وجہ سے ایسا روحانی مقام حاصل کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء ان سے تربیت روحانی حاصل کرتے ہیں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے سینکڑوں افراد گزرے ہیں لیکن آفاقی شہرت کی حامل شخصیتیں دو ہوتی ہیں ایک مولانا جلال الدین رومیؒ کے مرشد حضرت شمس تبریزؒ اور دوسرے ہمارے ممدوح شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ۔ ص

شیخ المشائخ

اور یہ اسی خداداد دولت کی وجہ سے تھا کہ اپنے زمانہ کے بہترین علماء آپ کے گرد جمع ہو گئے اور ان سب نے آپ سے صفائی باطن اور تزکیۂ قلب حاصل کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے فرمایا "عالم ہونا کیا معنی اللہ کی ذات پاک نے آپ کو عالم کر فرمایا ہے۔"

(امداد المشتاق ص۱)

اسی کتاب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں:۔

گو ظاہری علم شریعت میں علامۂ دوراں اور مشہور زماں مولوی نہ تھے مگر علم لدنی کے جامۂ عنبر شمامہ سے آراستہ اور نور عرفان و ایقان کے زیورات سے سرتاپا پیراستہ۔

(امداد المشتاق ص ۱۵)

ارواح ثلاثہ میں حکیم الامت کا ایک قول یوں درج ہے؛

حضرت حاجی صاحب نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا اور ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ایک اور کافیہ لکھ دیں مگر حضرت کے علوم ایسے تھے کہ آپ کے سامنے علماء کی کوئی حقیقت نہ تھی ہاں اصطلاحات تو ضرور نہیں بولتے تھے

(ص ۱۸۹)

شیخ المشائخ "مرشدوں کے مرشد" کا لقب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر صحیح طور پر صادق آتا ہے بھلا جس آستانہ سے یکتائے روزگار انسانوں نے (جو اپنی اپنی جگہ علم کے دریا اور فضل و کمال کے سرچشمے ہوں) کسب فیض کیا ہو اور اس آستانہ کی غلامی پر انہیں فخر و ناز ہو اس کو شیخ المشائخ نہ کہا جاتے تو اور اسکو کیا کہا جاتے گا۔ گزشتہ کسی صفحے میں چند نامور ترین علماء و مشائخ کی ایک فہرست گزر چکی ہے جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ص پھر یہ بات بھی عجیب مماثلت رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ جیسے انسان کو شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی زبان بنا دیا اسی طرح حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت حاجی صاحب کی زبان بنا دیا بقول حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ مؤلف (یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ) نے اکثر زبان حق ترجمان حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا تھا۔ جیسے مولانا رومؒ کو حضرت شمس تبریز قدس سرہ کی (زبان) بنایا تھا

(امداد المشتاق ص ۱۱)

سے بیعت ہوئے اور ان کو خلافت سے سرفراز کیا گیا ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ کوہ گراں کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ ان علماء کی فہرست بینکڑوں تک جا پہنچتی ہے جو حاجی صاحب کے حلقہ ارادت میں شامل تھے اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ پوری امت میں کسی شیخ سے علماء کی اس قدر کثرت نے بیعت نہیں کی تو بے جا نہ ہوگا۔ صاحب تذکرۃ الرشید نے ان کی تعداد سات آٹھ سو بتائی ہے اور اس کی خوشخبری کہ (علماء آپ کے مہمان ہوں گے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب میں آپ کو دی تھی۔

ایک کشف

خواجہ پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی بھی مکہ معظمہ میں آپ کے تبرکاً بیعت ہوئے خواجہ صاحب حج پر گئے اور وہیں رہنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ حاجی صاحب نے آپ کو اس سے منع فرمایا۔ اس کا تذکرہ خود پیر صاحب مرحوم نے کیا ہے "تاریخ مشائخ چشت" میں ہے کہ:

"مکہ معظمہ میں ایک دن وہ (خواجہ مہر علی شاہ صاحب گولڑوی) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر تھے حاجی صاحب نے نہایت اصرار و تاکید سے ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا

در ہندوستان عنقریب یک فتنہ ظہور کند شما ضرور در ملک خود واپس بروید و اگر بالفرض شما در ہند خاموش نشستہ باشید تاہم آں فتنہ ترقی نکند و در ملک آرام ظاہر شود	ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ نمودار ہوگا تم ضرور اپنے وطن واپس چلے جاؤ اگر بالفرض تم ہندوستان میں خاموش بھی بیٹھے رہو تو وہ فتنہ ترقی نہ کرے گا اور ملک میں سکون رہیگا۔

(ملفوظات طیبہ ص ۱۲۶)

پیر صاحب حاجی صاحب کے اس کشف کو فتنہ قادیانی سے تعبیر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ان کو اس فتنہ کی مخالفت کا حکم دیا تھا چنانچہ خواجہ صاحب نے اپنی زبان اور اپنے قلم دونوں سے قادیانیوں کے عقائد باطلہ کی پرزور تردید کی" [۱]

خداداد علوم

جیسا کہ گزرا حاجی صاحب باقاعدہ عالم نہ تھے لیکن بمصداق "من عمل بما علم علمہ اللہ مالم یعلم" [۲] بعض علمی اشکالات اور مسائل کو اس طرح حل کرتے تھے کہ اس کو دیکھ کر علماء حیران رہ جاتے تھے اس کی دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

حسنات الابرار سیآت المقربین

مراتب یقین تین ہیں، علم الیقین مرتبہ ادنیٰ، عین الیقین مرتبہ وسطیٰ، حق الیقین مرتبہ اعلیٰ۔ عین الیقین سے علم الیقین میں جانا حسنات الابرار سیآت المقربین، حق الیقین مرتبہ فنا فی اللہ ہے۔ مثال اس کی یوں ہے کہ علم حرارت آتش کا "علم الیقین" ہے اور جب اس پر انگلی رکھی جاتے عین الیقین ہوا اور جب پورے لوہے کو خوب آگ میں سرخ کیا جائے اور اس وقت لوہا اَنَا النَّار (میں آگ ہوں) کہے بجا ہے۔ یہ مرتبہ حق الیقین ہے۔ (امداد ص ۴۲)

دو حدیثوں کی مطابقت

" فرمایا ایک دن دو طالب علم آپس میں بحث کرتے تھے ایک کہتا تھا کہ نماز بدون حضور قلب درست نہیں ہے کیونکہ لاصلوٰۃ الا بحضور القلب (نماز دل کی حاضری کے بغیر نہیں ہوتی) اور دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کرتا تھا کہ حضرت عمر فرماتے ہیں۔ انی اجھز الجیش وانا فی الصلوٰۃ (میں نماز پڑھنے کے دوران میں لشکر کا انتظام کرتا ہوں) اس سے ادہ کون امر منافی نماز ہو سکتا آخر الامر آپ (حضرت حاجی صاحب) سے محاکمہ چاہا تو ارشاد ہوا کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں ہے مقربوں کو جب بادشاہوں کی حضوری ہوتی ہے امور لاحقہ (پیش آمدہ) عرض کرتے ہیں اور استمزاج چاہتے ہیں اور بجا آوری خدمت کی کوشش کرتے ہیں پس ان

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت ص ۷۱۳، ۷۱۴ [۲] جو اپنے پڑھنے پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ایسے علوم سکھاتے ہیں جن کو وہ کسی سے نہیں پڑھتا۔

حضوری ہے نہ منافی حضوری"

(امداد ص ۵۱، ۵۲)

خدا کو دنیا میں دیکھنا

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب سے سوال کیا کہ خدا کو اس عالم میں آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے یا نہیں فرمایا

"ممکن ہے معنی آیۃ لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار کے یہ ہیں کہ اس بصارت ظاہری سے رویت حق تعالیٰ کی ممکن نہیں ہے اور جب نظر بصیرت (باطنیہ) حاصل ہو جاتی ہے۔ بصارت (ظاہری) پر غالب آتی ہے پس عارف حقیقت میں نظر بصیرت سے دیکھتا ہے اور اگر یہ سمجھے کہ آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اس کی غلطی ہے دلیل اس بات کی کہ اس نظر سے نہیں دیکھتا یہ ہے کہ آنکھ بند کرے رویت بدستور رہے دوسرے یہ کہ دید آنکھوں کی عارضی نور آفتاب کی محتاج ہے بخلاف اس دید کے کہ محتاج نور بصیرت ہے بدون پر تو اس نور کے غیر ممکن و محال ہے مولانا اشرف علی صاحبؒ نے کہ خطاب لن ترانی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیوں کہا گیا (حاجی صاحب نے) فرمایا کہ اس میں نفی رویت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور یہ درست ہے کہ عارف (خدا کا پہچاننے والا) اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا ہے بلکہ دیدۂ حق سے دیکھتا ہے اور نیز اس میں نفی رویت ذات ہے کیونکہ فنا نے عبد اس کو لازم ہے اور جب فنا ہوا پھر رویت کیا؟"

(امداد ص ۵۱)

الدعا مخ العبادۃ

دعا کی چار قسمیں ہیں اول دعائے فرض مثلاً نبی کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کے واسطے ہلاکی کی دعا کرے پس اس پر یہ دعا کرنا فرض ہے دوم دعائے واجب جیسے قنوت (وتروں میں) سوم دعائے سنت جیسے بعد تشہد التحیات پڑھنے کے بعد اور ادعیہ ماثورہ چہارم دعائے عبادت جیسا کہ عارفین کرتے ہیں اور اس سے محض عبادت مقصود ہے کیونکہ دعا میں تذلل ہے اور تذلل (عاجزی) حق تعالیٰ کو محبوب ہے لہٰذا الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) وارد ہوا ہے

(امداد ص ۵۰، ۵۱)

اتباع سنت و کرامات

اکابر دیوبند کے سلسلۃ الذہب میں اصل چیز اتباع سنت ہے یہی وجہ ہے کہ اس مشرب کے تمام مشائخ شریعت کے سخت پابند اور متبع سنت تھے اور اس سلسلہ کا ہر شیخ تقریباً ولی تھا۔ جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلے گا۔ کرامات کو برحق جانتے ہیں کہ ان کا صدور اہل کمال سے ہوتا ہے لیکن ولایت کا انحصار اس پر نہیں سمجھتے یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات صاحب کرامت ہونے کے باوجود اس قسم کی چیزوں کا بہت اخفا کرتے تھے کہ عوام اس طرح کے قصوں ہی کو بزرگی سمجھنے لگ جاتے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں تو کرامات کو ظاہر کرنا کم حوصلگی سمجھا جاتا ہے ایک دفعہ حاجی صاحب کے بہت سے مہمان آگئے کھانا کم تھا حضرت حاجی صاحب نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس کو ڈھانک دو کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھالیا اور کھانا بچ رہا۔ حضرت حافظ ضامن شہید کو خبر ہوئی حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت آپ کا رومال سلامت چاہیے اب تو قحط کیوں پڑے گا" حضرت حاجی صاحب شرمندہ ہوگئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہوگئی توبہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا۔

(بحوالہ امداد)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کرامت دکھا کر شرمندہ ہوئے اور ایسا کرنے کو اچھا نہ سمجھا۔

ایک اور کرامت

آپ کی ایک کرامت "تذکرۃ الرشید" اور دوسری کئی کتب میں موجود ہے کہ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں حضرت کے بھی وارنٹ جاری ہو چکے تھے کسی نے ضلع انبالہ کے کلکٹر کو اطلاع دی کہ حاجی صاحب راؤ عبداللہ رئیس پنجلاسہ ضلع انبالہ کے اصطبل میں مقیم ہیں۔ کلکٹر بذات خود اصطبل پر آموجود ہوا اور رئیس صاحب سے

کہنے لگا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس عمدہ گھوڑے ہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ اصطبل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ معتقدین سخت گھبراتے ہوئے تھے۔ انگریز کلکٹر جب اندر داخل ہوا بستر لگا ہوا اور مصلی بچھا ہوا تھا اور وضو کا لوٹا بھی موجود تھا اس کے پانی سے زبان تر تھی یہ سب کچھ تھا مگر حاجی صاحب غائب تھے، لیکن جب وہ چلا گیا تو حاجی صاحب کو مصلے پر پایا گیا۔

قطب ارشاد "نغاتِ مکیہ" کے مترجم "شمائم امدادیہ" میں لکھتے ہیں۔

اولیائے عصر آپ کی ولایت پر اجماع رکھتے ہیں اور علمائے زمان آپ کے علو منزل کا اعتراف کرتے ہیں حضرت حق سبحانہ نے علوم اسماء وصفات سے آپ کو مخصوص فرمایا ہے اور معارف خاص وخصوصیات علوم اعلیٰ سے مقامات مرحمت فرمائے ہیں (شمائم ص ۲۷)

آگے چل کر یہی مترجم لکھتے ہیں:

قطبوں کا ایک گروہ مامور بسکوت کلیہ نہیں ہوتا بلکہ اسرار معارف و دقائق تصوف ونکاتِ حروف واسماء وغیرہا سے کہ بظاہر حقیقت شریعت سے مخالف معلوم ہوتے ہیں ممنوع ہوتے ہیں ایسے لوگ تعلیم وارشاد میں مشغول رہتے ہیں اور بندگان خدا کو منافع پہنچاتے رہتے ہیں اور داعی الخلق الی الحق رہتے ہیں اور حقیقت میں قطب ارشاد یہی ہیں حضرت (حاجی صاحب) اسی جماعت سے ہیں۔ (شمائم امدادیہ ص ۶۰)

حضرت حاجی صاحبؒ کے قطب ارشاد اور شیخ المشائخ ہونے میں کیا شبہہ ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری، حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے اکابر علماء اور یگانہ روزگار فضلاء جس کی غلامی پر فخر کرتے ہوں اس کی بزرگی اور ولایت میں کیسے شبہہ ہو سکتا ہے۔

وفات مرض وفات میں استغراق کے ساتھ ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کروٹ تک بدلنا دشوار تھا، اشتہا بالکل جاتی رہی تھی آخر ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء کو چہارشنبہ کے دن فجر کی اذان کے وقت چوراسی سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا جنت المعلیٰ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے مادۂ تاریخِ وفات نکالا جیبی دخل الخلد ۱۳۱۷

کراماتِ امدادیہ

کرامت - حضرت حاجی صاحب یوں فرمایا کرتے تھے۔ کہ "بھائی ہم نے ایک باب اور دیباچہ گلستان کا اور ایک باب بوستاں کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المبتدی اور چند اوراق زلیخا کے پڑھے تھے"۔ اور بعض حصین حضرت مولوی قلندر صاحب سے پڑھی لیکن شوق ورد و وظائف کا ہوا۔ اور دہلی میں آکر حضرت شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت کی بعد ان کے وصال کے پھر کسی کامل کی جستجو ہوئی۔ ایک روز خواب میں بشارت ہوئی۔ اور آپ کا ہاتھ حضرت میاں جی صاحب (حضرت نور محمد جھنجھانویؒ) کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اور اس سے اور بھی بے قراری ہوئی ایک روز مولوی قلندر صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ کو بہت بیقراری ہے تو لوہاری جا کر حضرت میاں جی صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی تسکین کرو بموجب ارشاد مولوی صاحب کے آپ لوہاری پا پیادہ تشریف لے گئے۔ حضرت ممدوح المناقب نے دیکھتے ہی فرمایا کہ میاں خواب و خیال کا کچھ اعتبار نہیں اس فرمانے سے دل بیقرار کو کچھ قرار ہوا اور اسی وقت حضرت میاں جی صاحب نے آپ کو سلسلہ بیعت میں داخل کر لیا۔

کرامت :- ایک روز موسم سرما میں حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب لنگوٹا کسے ہوئے اور کمبل سر پر ڈالے ہوئے آگے تو اور پیچھے قاضی نجابت علی خان اور بہت سے ہمراہی پیر محمد والی مسجد کے روبرو گزرے اور شارع عام سے جانب شمال میں زمین پر بیٹھ گئے اس عرصہ میں جناب حاجی صاحب مسجد سے باہر تشریف لائے اسی وقت حافظ صاحب نے تمام بدن اپنا کمبل ڈھانک لیا اور ستر کو چھپا لیا۔ اور وہاں سے اٹھ کر اپنی جگہ شمالی دروازہ تشریف لے گئے۔

کرامت :- حضرت حاجی صاحب کبھی کبھی جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب موصوف کی ملاقات کے لیے جنگل میں تشریف لے جاتے اور پہلے سے بہت آدمی حافظ صاحب کی تلاش میں جمع ہو کر منتظر بیٹھے رہتے اور آپ کسی سے نہ ملتے جس وقت حاجی صاحب وہاں پہنچتے فوراً کسی جھاڑی میں سے نکل آتے اور ملاقات کرتے اور بہت نرمی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور پھر رخصت کر دیتے۔

کرامت :- ایک روز نصف شب کے وقت ایک سفید باف آیا اور آپ کو جگا کر عرض کیا کہ حضرت میری لڑکی کو آسیب کی خلش سے بہت تکلیف ہے۔ آپ تشریف لے چلیں اور اس کا علاج فرما دیں اسی وقت آپ اس کے ہمراہ ہوئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ میاں اللہ بخش اس کے سر پر موجود ہیں انہوں نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ آج اس نے اپنی زبان سے ایسے ایسے کلمات ہماری نسبت کہے تھے۔ اس لیے ہم یہاں آگئے تھے۔ آپ تشریف لے آئے ہم جاتے ہیں اور پھر کبھی یہاں نہ آدیں گے۔ آئندہ آپ کسی کی درخواست پر ایسے وقت تشریف نہ لایا کریں۔ صرف ایک تحریر اس کے ہاتھ بھیج دیا کریں موافق اس کے تعمیل کیا کروں گا۔ مجھ سے آپ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ پھر جب کہیں ایسی شکایت ہوتی آپ ایک پرچے پہ اپنا نام نامی لکھ کر دے دیتے وہ شکایت رفع ہو جاتی۔

کرامت :- بعض لڑکے بلا اطلاع کہیں چلے جاتے اور ان کے اقارب پریشان ہوتے۔ حضرت کے روبرو جس وقت کسی لڑکے کے چلے جانے کا ذکر آتا حضرت اسی وقت دستک دے دیتے وہ لڑکا اس وقت جس جگہ ہوتا تھا اُس سے آگے نہ بڑھتا وہاں ہی سے

واپس اپنے گھر چلا آتا آپ فرمایا کرتے کہ جس وقت فرار کا حال معلوم ہو اگر سے فوراً بیان کر دیا کریں جس قدر جلدی بیان کر دیا جائیگا اتنا ہی جلدی وہ لڑکا واپس آجاویگا اور جس قدر دیر کی جاوے گی اتنی ہی دیر سے واپس آوے گا۔

کرامت :- (بروایت حافظ قاری مولوی احمد مکیؒ) ۱۳۰۸ھ میں احقر جب سفر ہند کے قصد سے آگبوٹ میں سوار ہوا اور بعد گزرنے عدن کے چھ روز گزرے آگبوٹ کا کوئلہ تمام ہو گیا جس کے باعث انجنیئر مع کپتان و معلم کے بہت حیران و پریشان ہوئے حتیٰ کہ سارا تختے جلانے کی نوبت پہنچی۔ احقر نے انجنیئر سے پوچھا بھلا رسیوں اور تختوں کا جلانا کچھ مفید ہے۔ اور آگبوٹ موافق معمول کے چلتا ہے یا کم اس نے کہا موافق معمول چلنا تو درکنار پانی کے زور سے کسی قدر پیچھے ہٹ جاتا ہے تب احقر نے نہایت ملول ہو کر کہا پھر رسیوں کا جلانا کیا مفید ہے کہا فقط انجن گرم رہنے کے لیے یہ گفتگو بعد الظہر ہوئی اور وہ باقی روز نہایت قلت سے گزرا شب کے وقت ایک بجے نیم خوابی کی حالت میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت اعلیٰ مدظلہ العالی روئس المسترشدین احقر کو نہایت دلجوئی سے فرما رہے ہیں کہ تو کیوں گھبرا رہا ہے کل انشاء اللہ بندر بمبئی ساتھ سلامتی کے پہنچے گا۔ اسی وقت بیدار ہوا اور اپنے وظیفہ و ورد میں مشغول رہا۔ اور انجنیئر پھرتے پھرتے میرے پاس آن پہنچا اور کہا کہ اس وقت آگبوٹ ان ہی رسیوں اور لکڑوں کے زور سے کچھ آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک آگبوٹ نظر آیا اور روشنی صبح کی ظاہر ہوئی اپنی اصطلاح خاص میں اس کو کچھ کہا کہ وہ آگبوٹ نزدیک آیا اور تھوڑے کوئلے سے بیے کوئلے لینے کی دیر تھی کہ آگبوٹ کی رفتار ایسی ہوئی کہ وہی انجنیئر کہتا تھا۔ کہ جب سے میں اس آگبوٹ میں ہوں ایسی چال کبھی نہیں پھر میں نے پوچھا اب کب پہنچے گا۔ کہا کل صبح کو۔ احقر متحیر ہوا کہ حضرت نے فرمایا آج کے روز اور یہ کہتا ہے کہ کل۔ خیر اسی خیال میں ایک عرصہ گزر گیا بامداد اللہ تعالیٰ اسی روز مع الخیر والسلامۃ بمبئی پہنچے اور شہر میں اترے۔

کرامت :- اب بالفعل اسی ماہ میں مولوی محمد شفیع الدین صاحب واسطے نماز صبح کے غسل کے وقت جا رہے تھے راہ میں اتفاقاً گر گئے۔ اور پسلی میں کچھ تکلیف ہوئی حضرت اعلیٰ نے مکان پر صبح کے وقت چند بار فرمایا کہ مولوی شفیع الدین صاحب کو بہت تکلیف ہوئی اور ہنوز نہ کوئی آیا اور نہ کوئی گیا۔ جب مولوی صاحب تشریف لائے تب معلوم ہوا۔

(راوی حافظ قاری مولوی احمد مکیؒ) کرامات ۔۔

کرامت :- ایک مرتبہ یہ ناچیز بقصد حرمین شریفین وطن سے چلا بمبئی میں سوتا تھا خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت تشریف لائے اور فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ تو ہم ہی ہندوستان میں آگئے تم مکے نہ جاؤ میں نے عرض کیا کہ حضور اب تو یہاں آگئے۔ اور جہاز کا کرایہ بھی دیا اور کل جہاز روانہ ہو جائیگا فرمایا نہیں، جانا مناسب نہیں میں عرض کرتا رہا۔ ارشاد ہوا کہ نہیں اس سال نہ جاؤ آنکھیں کھلیں فی الجملہ تردد رہا۔ مگر اس دن جہاز کی روانگی تھی میں اس بھید سے واقف نہ تھا سوار ہو لیا اور جہاز روانہ ہوا اسی دن ایسا طوفان آیا کہ جہاز میں نقصان آگیا۔ اور جہاز واپس آیا۔

(راوی مولانا شاہ محمد حسین صاحبؒ الہ آبادی) کرامات امدادیہ

کرامت :- ایک دن ظہر کے بعد میں اور مولوی منور علی صاحب اور ملا محب الدین صاحب کو ضروری بات عرض کرنے کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت حسب معمول اوپر جا چکے تھے۔ کوئی آدمی نہ تھا نہیں کہ اطلاع کرائی جاتی آواز دینا ادب کے خلاف تھا۔ آپس میں مشورہ یہ کیا کہ حضرت کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جائیں یا بات کا جواب مل جائیگا یا حضرت خود تشریف لائیں گے۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ حضرت اوپر سے نیچے تشریف لائے ہم لوگوں نے معذرت کی کہ اس وقت حضرت لیٹے ہوئے تھے ناحق

تکلیف فرمائی۔ ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں نے پٹنے بھی دیا۔ کیونکہ یقینا ہم لوگ سخت نادم ہوئے۔ (ایضاً)

کرامت :۔ ایک مولوی صاحب نے ایک دن آکر پوچھا کہ الید العلیا خیر من ید السفلیٰ کی حدیث سے تو فقیر پر غنی کی ترجیح نکلتی ہے۔ فوراً ارشاد فرمایا کہ ید علیا اسی لیے افضل ٹھہرا کہ مال کو علیحدہ کرکے فقیر بننا چاہتا ہے۔ اور ید سفلیٰ اسی لیے مفضول ہوا کہ مال لے کر غنی بنتا ہے۔ (ایضاً)

کرامت :۔ ایک دن ایک فقیر صدا دیتا تھا کہ ما فی قلبی غیر اللہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ما نافیہ نہیں ما موصولہ ہے۔ ما نافیہ ہوتا اور اس کو اس کی حالت ہوتی تو کبھی سوال نہ کرتا۔ (ایضاً)

کرامت :۔ ایک دن اللھم متعنی بالسمع والبصر واجعلھما الوارث کی تفسیر مولویوں سے دریافت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ وارث تو وہ ہے جو مرنے کے بعد باقی رہ جائے سمع و بصر کے وارث ہونے کے معنی کیا ہیں لوگوں کو تامل ہوا تو خود ہی ارشاد فرمایا۔ کہ یہ کنایہ ہے کہ سمع و بصر میرے سمع و بصر حق ہو جائیں اور بی یبصر کا مرتبہ ہو کہ ان اللہ خبیر او تبلیغ۔ غرض اس قسم کی ہزاروں باتیں ہیں جو ہر دفعہ حضرت کی زبان اقدس سے ارشاد ہوتی ہیں کہ ضبط اُن کا دشوار ہے۔ (ایضاً)

کرامت :۔ باوجود پیرانہ سالی کے مجاہدہ کا حال یہ تھا۔ کہ ایک سال رمضان شریف میں مجھے حاضری خدمت اقدس کا اتفاق ہوا دیکھا۔ کہ تمام رات نماز پڑھنے اور قرآن سننے میں بسر ہوتی ہے۔ حافظ عبداللہ پنجابی ایک بزرگ تھے۔ تراویح میں ہر روز وہ حرم شریف میں محض حضرتؒ کے سنانے کو سات آٹھ سیپارے پڑھتے اس میں قریب نصف شب گزر جاتی۔ اس کے بعد حضور کبھی کبھی شیخ حسن عرب کا قرآن سننے جاتے۔ نصف شب سے حافظ عبدالحمید صاحب باب الرحمۃ پر تہجد میں پانچ چھ سیپارے روز پڑھتے۔ ان کا قرآن سننے فجر تک برابر یہی کیفیت رہتی۔ ایک دن حضرت کی طبیعت صحیح نہ تھی۔ کھانا تناول نہیں فرمایا۔ حافظ جی نے کم پڑھا۔ آپ نے سلام کے بعد ارشاد فرمایا۔ کہ حافظ جی طبیعت کیسی ہے۔ آج تم نے کم کیوں پڑھا۔ حافظ نے عرض کیا کہ آپ کے خیال سے آپ نے فرمایا کہ میں تو جب قرآن سننے لگتا ہوں تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہ جی چاہتا ہے۔ کہ بس یہ آواز برابر آتی ہی جائے اور اس وقت تک ذرا ضعف نہیں معلوم ہوتا۔ (از مولانا شاہ محمد حسین صاحبؒ الہ آبادی)

کرامت :۔ میرے والد صاحب قبلہ اس طرح فرمایا کرتے تھے۔ کہ حضرت قبلہ عمومی حاجی محمد امداد اللہ صاحبؒ نے علم عربی کم پڑھا ہے۔ ایک بار حضرت موصوف نے حجام کو کاندھلہ اپنے ماموں کے پاس واسطے منگانے کسی بڑی کتاب حدیث کے بھیجا اس کے جواب میں حضرتؒ کے ماموں صاحب نے فرمایا کیا میاں امداد اللہ اس کتاب کی زیارت کیا کریں گے۔ یا کسی سے پڑھوا کر سنیں گے حجام نے واپسی میں عرض کیا حضرت انہوں نے ایسے فرمایا کہ میری مجال نہیں کہ عرض کروں۔ حضور نے باصرار وہ لفظ سنا فرمایا کہ اسی وقت واپس کاندھلہ چلا جا اور میرا خط ماموں صاحب کے حضور میں پیش کرکے عرض کرو کہ جو حدیث مشکل ہو وہ آپ تشریف لا کر دریافت فرمالیں خدا کے حکم سے جواب دونگا سنا گیا ہے۔ کہ وہ بزرگ تشریف لائے اور مشکل مشکل احادیث دریافت فرمائیں بحکم خدا سے جواب درست پایا۔ کہ الحمد للہ علم باطنی سینہ مبارک پر کھل گیا۔ ظاہری علم اس کے سامنے کیا ہے۔ (از حکیم مقبول احمد صاحب تھانوی)

کرامت :۔ میں نے ثقات سے سنا ہے۔ کہ اس زمانے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ کہ آپ کے سامنے سے گزرتا اور متاثر نہ ہوتا اور اس پر رعب نہ ہوتا۔ پھر توجہ اور التفات کی حالت کا کیا ذکر۔ (از مولوی عبدالغنی بہاری)

کرامت :- فرمایا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے حالات کی چھان بین میں رہتے ہیں یہ امر مذموم اور ممنوع ہے تعالیٰ اللہ تعالیٰ لاتدخلو ابیوتا غیر بیوتکم بزرگوں کے حضور میں اپنے دل کی نگہداشت کرنا چاہیئے۔

ع پیش اصل دل نگہدار یاد دل

ایک دن ایک صاحب میرے پاس آئے اور اپنی نسبت سے میر اتفتیش حال کرنے لگے ہیں نے کہا کہ یہ امر بہت برا ہے حامل نسبت اگر اپنی پونجی چھپانا چاہے تو پتہ بھی نہ لگنے دے یہ سن کر میرے زانو پکڑ لیے اور عذر کرنے لگے۔

کرامت :- فرمایا کہ میرے بڑے بھائی شیخ ذوالفقار علی صاحب جب ملک پنجاب سے واپس آئے اور مجھ کو اوراد کا شائق پایا فرمانے لگے کہ مجھ کو ایک فقیر نے ایک عمل بتلایا ہے تم سیکھ لو میں نے اس کو ان سے لے لیا۔ ایک مرتبہ میرا دھلی جانا ہوا وہاں عبداللہ مسند نشین درگاہ حضرت صابر بخش نے تقریب عرس میں مجھ کو بلوایا اور کسی اپنے مرید کا ہاتھی سواری کو بھیجا جب میں ان کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ لوگ بڑی شان و شوکت سے جمع ہیں میں فقیرانہ حالت سے گیا مجھ کو دیکھتے ہی تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور دست بوسی کرکے مسند خاص پر بٹھایا۔ مجھ کو بڑا تعجب تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جب رات کو وظیفہ پڑھنے لگا تو معلوم ہوا کہ سب اسی وظیفہ کا اثر ہے خواب میں حضرت پیر و مرشد نے فرمایا کہ اس اعزاز سے کیا حاصل مجھے معلوم ہوا کہ آپ اس عمل سے ناراض ہیں اسی وقت ترک کر دیا پھر نہیں پڑھا۔

کرامت :- فرمایا کہ حافظ غلام مرتضیٰ مجذوب مقیم پانی پت سالک مجذوب تھے حالت سلوک میں ان کو جذب ہو گیا تھا۔ ہماری بستی میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک بار غل ہوا کہ غلام مرتضیٰ پتھر مار رہے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا۔ مجھ کو دیکھ انہوں نے پتھر مارنا چھوڑ دیئے اور مجھے قریب بلایا میرے ہاتھ میں کوئی کتاب عشق تھی اس کے اوراق کھلوائے گئے جب یہ شعر نظر پڑا ؎

عشق اول عشق آخر عشق کل عشق شاخ و عشق نخل و عشق گل!

مجھ کو اشارہ کیا اور بشارت غلبۂ توحید کی دی فرمایا کہ جو اسرار توحید میری زبان سے بے ساختہ نکل جاتے ہیں یہ اسی بشارت کا ثمرہ ہے

کرامت :- فرمایا کہ ایک دفعہ میں صحرا میں پھر رہا تھا ایک جھاڑی میں کچھ آثار آدمی کے معلوم ہوئے غور کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ مجذوب صاحب ہیں مجھ کو دیکھ کر بیٹھ گئے میں بھی بیٹھ گیا مجھ کی توجہ جذب کر دینا شروع کی جب مجھے آثار جذب معلوم ہونے لگے میں نے حضرت پیر و مرشد کا تصور کیا اسی وقت حضرت میرے اور ان کے درمیان حائل ہو گئے مجذوب صاحب تبسم کرنے لگے میں نے عرض کیا کہ تمہاری طرح مجھ کو دیوانگی پسند نہیں ہے۔

کرامت :- پنجلاسہ میں ایک بار آپ مکان میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک سکھ آپ کی خبر پا کر گرفتاری کے لیے آیا گھوڑے سے پیادہ اتر کر دروازے پر کھڑے ہو کر مکان کے اندر جھانکا اور آپ پر نظر پڑتے ہی لوٹنا شروع کیا اور تھوڑی دیر کے بعد سوار ہو واپس چلا گیا۔ از حضرت گنگوہی ؒ۔

تصنیفات

۱۔ مثنوی مولانا رومؒ حضرت حاجی صاحبؒ کو مثنوی مولانا روم سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اور اکثر اس کا درس دیا کرتے تھے۔ حاجی صاحب پر درس کے دوران میں عجیب کیفیت وارد ہوتی اور سامعین و شریک درس بھی اس کیفیت سے متاثر ہوتے۔ مکہ معظمہ میں بھی حاجی صاحب نے درس جاری رکھا۔ اس درس میں مختلف ممالک کے لوگ شریک ہوتے۔ لیکن باوجود اردو زبان سے لاعلمی کے درس سے پورا حظ اٹھاتے اور متاثر ہوتے۔ حاجی صاحب کا یہ درس کیمیا اثر ہوتا۔ حاجی صاحب نے مثنوی پر فارسی زبان میں حاشیہ لکھا۔ اس محشی مثنوی کے دو دفتر تو حاجی صاحب کی زندگی میں چھپ گئے تھے بقیہ بعد میں چھپے۔
مثنوی مولانا روم پر حاشیہ لکھنا۔ اور اس کی شرح کرنا معمولی کام نہیں۔ اس سے حاجی صاحب کے علوم کا سرسری اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ غذائے روح اس کتاب میں حکایات و قصص سے تعلیم و تلقین کی گئی ہے۔ نفس کے مغالطوں۔ شیطان کے وسوسوں اور جہالت کے نتائج بیان کئے گئے ہیں۔ شروع میں حمد و نعت اور منقبت خلفاء راشدین ہے پھر اپنے مرشد کا ذکر ہے۔ اس کے بعد جیسا کے کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ روح کی غذا کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور اس بارے میں تمام متعلقہ موضوعات پر سیر حاصل مواد فراہم کیا ہے پوری کتاب اردو نظم میں ہے۔ چھیاسی صفحوں پر سولہ سو اشعار ہیں۔ حاجی صاحب خود ہی اس کے سن تحریر اور نام کا ذکر فرماتے ہیں :-

سال ہجری بھی ہوا جب ختم یار — یک ہزار دو صد و شصت و چہار (۱۲۶۴)
جب ہوئی یہ مثنوی یارو تمام — رکھدیا اس کا "غذائے روح" نام

۳۔ جہاد اکبر یہ بھی اردو نظم میں ہے اور کسی دوسرے شخص کی فارسی نظم کا ترجمہ ہے۔ جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں :-

غرض جب ہوا یہ رسالہ تمام — "جہاد اکبر" اس کا رکھا میں نے نام
یہ مضمون تھا فارسی میں لکھا — کسی مرد حق نے بصد پر ضیا
کیا میں نے ہندی ملا کر کچھ اور — کرتا خاص اور عام سمجھیں بغور
سن و سال ہجری خیر الانام — تھے بارہ سو اڑسٹھ ہوا جب تمام

اس رسالہ میں نفس کی اصلاح وغیرہ پر مشتمل مضامین ہیں۔ اور ان کو تمثیلی اور حکایتی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ تئیس ۲۳ صفحات ہیں چھ سو اناسی اشعار ہیں۔

۴۔ مثنوی تحفۃ العشاق اس میں عاشقان الٰہ کے لیے مضامین ہیں کہ کس طرح اللہ کی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے اس کا سن تحریر ۱۲۸۱ھ ہے۔ اس کا بھی حاجی صاحب نے شعر میں ذکر کیا ہے ؎

بارہ سو تھے اور اکاسی سال ہجر — ہو چکا جب حضرت تحفہ کا ذکر
ہو چکی جب مثنوی تحفہ تمام — تحفۃ العشاق رکھا اس کا نام

اردو نظم کی یہ کتاب بتیس ۳۲ صفحات اور تیرہ سو چوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔

۵۔ دردنامۂ غمناک

یہ آٹھ صفحوں پر ایک سو پچھتر اشعار کی کتاب ہے۔ شاعر نے عشقِ حقیقی اور جذبۂ بے خودی کی ترجمانی کی ہے۔ کتاب اتنی موثر اور دردناک ہے کہ پڑھ کر دل چوٹ کھاتا اور بے تاب ہو ہو جاتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کی روایت کے مطابق ایک شخص یہ" دردنامۂ غمناک پڑھ رہا تھا حاجی صاحب اس پر گذرے اور پوچھا کیا پڑھ رہے ہو وہ بے ادبی سے پیش آیا۔ بعد میں جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے ناظم یہی ہیں تو بہت شرمندہ ہوا اور نہایت تعظیم کی۔

۶۔ ارشادِ مرشد

اردو میں یہ سولہ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس میں نمازوں کے بعد وظائف اوراد۔ مراقبات۔ طریق اثباتِ مجرد۔ طریق اسم ذات۔ طریق ذکر پاس انفاس ذکر اسم ذات ربانی اور لطائف ستہ کا ذکر۔ آخر میں چاروں سلسلوں کے شجرے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ آخر میں مثلث نظم میں چشتی شجرہ ہے۔ سب سے آخر میں نصائح ہیں۔ جمادی الاول ۱۲۹۳ھ میں یہ رسالہ مکمل ہوا۔

۷۔ ضیاء القلوب

یہ کتاب حاجی صاحبؒ نے حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے صاحبزادہ حافظ محمد یوسف کی فرمائش پر مکہ میں ۱۲۸۲ھ میں فارسی میں تحریر فرمائی۔ اور اس کا تاریخی نام "مرغوبِ دل" ہے اس کے متعلق حاجی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

" از و فورِ التماس عزیزاں چارہ ندیدہ و ملتجی بجناب قدس حق تعالیٰ گردیدم پس بدلم القا شد کہ بنویس " دوستوں کی کثرتِ خواہش پر کوئی چارہ نہ دیکھ کر خدائے قدوس کی بارگاہ میں ملتجی ہوا اور میرے دل میں القا ہوا کہ لکھ۔

یہ کتاب سلوک و تصوف کا جوہر اور خلاصہ ہے۔ اس میں ہر قسم کے وظائف، اشغال اور اذکار عبادات کے تحت بیان کئے گئے ہیں۔ اپنے عنوان پر نہایت عمدہ کتاب ہے۔ نماز اور تلاوتِ قرآن مجید کے متعلق بیش بہا معارف بیان کئے گئے ہیں۔

۸۔ وحدۃ الوجود

سات صفحات پر فارسی زبان کا طویل مکتوب ہے جس میں وحدۃ الوجود کے مسئلے پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

۹۔ فیصلہ ہفت مسئلہ

بارہ صفحات کے اس رسالے میں میلاد۔ فاتحہ۔ عرس و سماع۔ ندائے غیر اللہ۔ جماعت ثانیہ امکان نظیر اور امکان کذب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رسالے کی ضرورت و اہمیت یوں ہوئی کہ حضرت حاجی صاحب کے متوسلین میں ان مسائل پر نزاع ہو رہا تھا آپ نے اس نزاع کو روکنے اور اختلاف سے بچنے کے لیے یہ رسالہ تحریر فرمایا۔ مندرجات سے آگاہ ہونے کے لیے قارئین اس کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۰۔ گلزارِ معرفت

یہ حاجی صاحب کا اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ جس کو آپ کے مرید باصفا میاں نیاز احمد ناصح کرکے مرتب کیا ہے۔ حمد۔ نعت۔ عشقِ حقیقی کے متعلق غزلیات اور قیام مدینہ منورہ کے شوق وغیرہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ۲۱۹۔ اردو کے اور ۹۳۔ فارسی کے اشعار ہیں۔

۱۱۔ "مرقومات امدادیہ" اور "مکتوبات امدادیہ"

کے نام سے ایک سو گیارہ خطوط ہیں جو حضرت گنگوہیؒ۔ حضرت نانوتویؒ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب۔ مولانا حکیم ضیاء الدین اور حافظ عبد... کے نام ہیں۔ "مکتوبات امدادیہ" میں حکیم الامت کے نام پچاس خطوط ہیں جو تمام کے تمام اردو میں ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے نام آخری

۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ کا تحریر کردہ ہے۔ اس کے دو ماہ بعد حضرت کا انتقال ہو گیا بارہ خطوط حضرت گنگوہیؒ کے نام ہیں۔ ایک اور خط "وحدۃ الوجود" کے مسئلے پر جس کا اوپر ذکر ہوا شامل کر کے کل خطوط ایک سو چوبیس (۱۲۴) ہوتے ہیں۔ جو منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اب ہم آخر میں حضرت حاجی صاحبؒ کی نظم اور نثر دونو کا تھوڑا تھوڑا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

مجھے آگیا جو خیال ایک رات — لگا سوچنے اپنے دل میں یہ بات
کہ افسوس غفلت میں جاتی ہے عمر — سدا کوس رحلت بجاتی ہے عمر
مجھے فکر کل کی ہوئی آج یوں — کہ کی دولت عمر برباد کیوں
نہ سویا شب اسی فکر میں ایک دم — رہا رات بھر اس سے میں چشم نم (جہادِ اکبر)

کہا نفس کو آخرش میں نے رات — کہ کیا ہو گیا تجھ کو اے بدصفات
خبر حال کی تجھ کو اپنے نہیں — کہ آیا تھا یاں کس لیے اے لعیں!
بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا — یہاں آکے کیا کام تو نے کیا (جہادِ اکبر)

عاشق حق ہو کے دیکھے غیر کو — کعبہ میں چاہیے بنانا دیر کو
غیر کو نظروں سے تو اپنی نکال — چشم دل سے دیکھ پھر حق کا جمال
جو سوا حق کے ہے دے سب کو جلا — ایک دلبر سے تو دل اپنا لگا (غذائے روح)

حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کی شہادت پر جدائی کا نقشہ :-

ہم بچاروں کو تڑپتا چھوڑ کر — سوئے حق راہی ہوئے منہ موڑ کر
وصل سے حق کے ہوئے وہ بہرہ ور — پیتے ہیں حسرت سے ہم خونِ جگر
نازو نعمت میں ہیں وہ مشغول واں — خاک وخوں میں لوٹتے ہیں ہم یہاں
جام کوثر سے ہوئے وہ لب بلب — چاٹتے ہیں پیاس سے ہم اپنے لب
آپ تو راحت کے ساماں لے گئے — یہ رنج و الم یاں دے گئے

اور پھر اسی سلسلہ کے چند شعر اور :-

گرچہ ہم لائق نہ تھے درگاہ کے — کفش برداری میں رہتے شاہ کے
شاہ کو زیبا ہے کب تنہا روی — گو بہت خادم نہ ہوں تھوڑے سہی

اور پھر اظہار حسرت کرتے ہیں :-

آہ واویلا دریغا حسرتا ساتھ والے چل دئے میں رہ گیا
ساتھ کا اپنے ہر اک واصل ہوا مدعا دل کا اسے حاصل ہوا
پہنچا ہر اک منزل مقصود پر رہ گیا میں ہی پڑا بس دور تر (مثنوی تحفۃ العشاق)

تضمین

حاجی صاحبؒ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کی مشہور مناجات پر جوڑ لگا کر مخمس بنا دیا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے :-

کر سکیگا کیا کوئی وحدت میں تیری قیل و قال عقل و بحث و علت و معلول ہیں زار و علیل
اَنْتَ کَافِیْ فِیْ مُہِمَّاتٍ ذُنُوْبِیْ رِزْقِیْ قَلِیْل خُذْ بِلُطْفِکَ یَا اِلٰہِیْ مَنْ لَہٗ زَادٌ قَلِیْل
مُفْلِسٌ بِالصِّدْقِ یَاتِیْ عِنْدَ بَابِکَ یَا جَلِیْل

خود بخود ہو جائیں گے بیہودہ سارے دل سے دور جتنے مقصد ہیں بر آئیں گے الٰہی بالضرور
یہ تڑپ، یہ بے قراری، فکر بے جا ہے قصور اَنْتَ شَافِیْ اَنْتَ کَافِیْ فِیْ مُہِمَّاتِ الْاُمُوْر
انت حسبی انت ربی انت لی نعم الوکیل

پہلی رباعی کا تیسرا مصرعہ عربی حاجی صاحب کا ہے۔ اس سے عربی میں شعر کے ملکہ کا پتہ چلتا ہے۔

تاریخی مادے

عالم و عارف شہ عبدالغنی کرد چوں جملہ مراتب را طے
این ندا آمد ز ہر سو غم فزا داد جاں عبدالغنی با جلوہ حے

بست و ہشتم ذی قعدہ کو چلدئے جنت کو یعقوب
رو کے کہا سب نے کہ جہاں سے ماہ ہدیٰ ہوا آہ غروب

غزل کا نمونہ

عرش بریں پہ آپ ہیں زیر زمیں ہوں میں ملنا کہاں سے ہو کہ کہیں تم کہیں ہوں میں
گر تخت وحسن و ناز پہ ہیں آپ جلوہ گر اقلیم عشق میں شہ مسند نشین ہوں میں

رُخ سے کا کل اٹھا دیا کس نے رات میں دن دکھا دیا کس نے
نغمۂ سرمدی سنا کے ہمیں مست و بے خود بنا دیا کس نے

تقابل اور تضاد خیالی

عشق کے صحرا میں اپنا آپ کرتے ہیں شکار آپ ہی ہم صید ہیں اور آپ ہی صیاد ہم
ہو گئے جب محو دلبر عشق پھر کس کا رہا آپ ہی شیریں ہوئے اور آپ ہی فرہاد ہم

آپ ہی اچھے ہیں اور ہیں آپ ہی سب سے بُرے
الغرض جو کچھ ہیں پر ہیں جامعِ اضداد ہم

علم اپنا جہل ہے اور جہل اپنا علم ہے
ہیں اسی دانش سے یاروصاحب ارشاد ہم

اپنے دشمن آپ ہیں اور آپ ہیں اپنے دوست
آپ کو کرتے ہیں ویراں تاکہ ہوں برباد ہم

ہے بہار ہم کو خزاں میں اور خزاں اندر بہار
غم ہے شادی میں ہمیں اور غم میں ہیں بس شاد ہم

حمدیہ غزل

الٰہی یہ عالم ہے گلزار تیرا
عجب نقش قدرت نمودار تیرا

خوشی غم میں رکھی ہے اور غم خوشی میں
عجب تیری قدرت عجب کار تیرا

الٰہی عطا ذرۂ درد دل ہو
کہ مرتا ہے بے درد بیمار تیرا!

کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ چاہتا ہے
میں تجھ سے ہوں یارب طلبگار تیرا

نہیں دونوں عالم سے کچھ مجھ کو مطلوب
تو مطلوب، میں ہوں طلبگار تیرا

اٹھا غم ، رکھ امید ، امداد حق سے
تجھے غم ہے کیا رب ہے غم خوار تیرا

ایک غزل کے پانچ اشعار :۔

نہ دیکھا داغِ دل گلزار کو دیکھا تو کیا دیکھا
نہ دیکھا خار میں گل، خار کو دیکھا تو کیا دیکھا

نہ دیکھا برش تیغ نگاہِ یار کو تم نے
اگر شمشیر کی اک دھار کو دیکھا تو کیا دیکھا

نظر جب کھل گئی اپنی جسے دیکھا اسے دیکھا
نہ دیکھا آپ میں دلدار کو ، دیکھا تو کیا دیکھا

اِسے دیکھا اُسے دیکھا نہ یہ دیکھا نہ وہ دیکھا
نہ دیکھا ایک کو اغیار کو دیکھا تو کیا دیکھا

ہمارے شعر امداد الٰہی سے ہیں ٹک دیکھو
اگرچہ دفتر اشعار کو دیکھا تو کیا دیکھا

فارسی اشعار

اگرچہ بے خود و مستم و لے ہوشیار می گردم
بباطن شاہ کونینم لبظاہر خوار می گردم

چو شد منظور قتلِ من تعامل چیست اے قاتل
کہ سر بر کف کفن بر دوش، گرد دار می گردم

بحمداللہ پھر راحت یافت جانِ بیقرار من
کہ آمد نا گہاں نامہ زکوئے شہر یار من

بایں شکرانہ بر دیدہ نہادم پائے قاصد را
کہ از نامہ منور کرد چشم انتظارِ من

بعین گریہ من خنداں، وہم در خندہ من گریاں
بہار اندر خزاں بود و خزاں اندر بہار من

اُردو نثر کا نمونہ

طریقہ مراقبے کا یہ ہے کہ دو زانو نمازی کی طرح سر جھکا کر بیٹھے اور دل کو غیر اللہ سے خالی کر کے حق سبحانہ تعالیٰ کی حضوری میں حاضر رکھے۔ اول اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کے تین بار اَللّٰہُ حَاضِرِیْ۔ اَللّٰہُ نَاظِرِیْ۔ اَللّٰہُ مَعِیْ یعنی زبان سے تکرار کر کے پھر مراقب ہو کے ان کے معنوں کا دل سے ملاحظہ کرے اور تصور کرے یعنی جانے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ حاضر ناظر میرے پاس ہے اس جاننے میں اس قدر غوض کرے اور مستغرق ہو کہ شعور غیر حق کا نہ رہے یہاں تک کہ اپنی بھی خبر نہ رہے اگر ایک آن بھی اس سے غافل ہوا مراقبہ نہ ہوگا (ارشادِ مرشد ص۲)

فارسی نثر کا نمونہ

بداں کہ تلاوت قرآن افضل عبادت است و کدام طریق برائے تقرب الی اللہ سوائے فرائض بہتر از تلاوت قرآن نیست۔ پس آداب و استحباب او آنست کہ باخلاص تمام با طہارت کامل رو بقبلہ با ترتیل و خشوع و تحزن بعد از اعوذ (باللہ) و بسم اللہ بملاحظہ آنکہ کلام با خدا میکند و گویا او را می بیند و اگر نتواند بداند کہ او مرا بیند و با وامر و نواہی مرا حکم می فرماید و بر آیت بشارت فرحاں و بر آیت وعید ترساں و گریاں باشد و بجہر و الحان خوش کہ موجب جمعیت خاطر و رفع غفلت است بخواند و ایں عام است و طریق خاص آنکہ

....

سمجھو کہ قرآن کریم کی تلاوت عبادتوں میں افضل ہے اور اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کے لیے فرائض کے سوائے قرآن کی تلاوت سے بہتر اور کوئی نہیں ہے اس لیے اس کے آداب اور مستحبات یہ ہیں کہ پورے اخلاص اور پوری طہارت کے ساتھ قبلہ کی طرف منہ کر کے ٹھہر ٹھہر کر، عاجزی کے ساتھ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد اس خیال سے پڑھے کہ خدا کے سامنے باتیں کر رہا ہے گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا (تصور) نہ کر سکے تو یہ سمجھے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور اوامر و نواہی کا حکم دے رہا ہے اور خوش خبری کی آیت پر خوش اور سزا کی آیت پر خوف زدہ اور رونا ہوا ہونا چاہیے اور جہر خوش الحانی سے جس سے دل کو اطمینان اور غفلت دور ہو پڑھے اور یہ عام طریقہ ہے لیکن خاص طریقہ یہ ہے کہ ....

اس کے بعد حضرتؒ نے اس خاص طریقے کا مفصّل ذکر فرمایا ہے۔ اس کے لیے "ضیاء القلوب" کی طرف مراجعت فرمائی جائے۔

ہم نے اختصار کے ساتھ حضرت حاجی صاحب کے حالات پیش کر دئے ہیں۔ مفصل مطالعہ کے لیے "شمائم امدادیہ"، "کرامات امدادیہ"، "علماء ہند کا شاندار ماضی اور پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی کی تالیف "حیاتِ امداد" کی طرف رجوع فرمائیں۔ ہم نے اس مضمون کی ترتیب کے لیے سب سے زیادہ استفادہ "حیاتِ امداد" اور "نئی دنیا" کے "عظیم مدنی نمبر" سے کیا ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۴۸ھ ۱۸۳۱ء ○ ۱۲۹۷ھ ۱۸۷۹ء

(عکسِ تحریر حضرت نانوتویؒ)

وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس
چندہ مبنی معلوم ہوتی ہیں

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے آپ کوشش کریں
اور وں سے کرائیں خیراندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے
(۲) ابقاء طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیراندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں
(۳) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات
کی پچ نہ کی جائے خدانخواستہ جب اسکی نوبت آئیگی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رای اور اوروں کی رای
کی موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائیگا القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ
اور نیز اوسکی پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہ ہو اور اسی ضروری ہے کہ اہل مشورہ
اظہار رای میں کسی وجہ سے متامل نہوں اور سامعین بہ نیت نیک اوسکو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی
بات سمجھ میں آجائیگی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کرینگے اور نیز اسی وجہ سے یہ
ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ
مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیراندیش ہو اور نیز
اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت

اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کر لیا گیا ہو تو ہر دو سمجھے کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علما روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آئیگی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا اور امداد غیبی موقوف ہو جائیگی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگا القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے

(۷) سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے

(۸) تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جنکو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے

ادیب : عبدالرشید ارشد

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ پر یہ مضمون۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی تالیف سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا محمد سرفراز صاحب صفدر گکھڑوی کی کتاب "بانی دیوبند" مفتی عزیز الرحمٰن کی تالیف تذکرہ مشائخ دیوبند اور "علم مدنی نمبر" سے ماخوذ ہے۔ ہمارا کام صرف ترتیب ہے (ارشد)

نام و ولادت

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تاریخی نام خورشید حسن ہے۔ آپ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دوست حضرۃ مولانا محمد یعقوب مؤلف سوانح عمری مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں۔ مولانا صاحب کی پیدائش کا سن مجھے ان کے تاریخی نام سے معلوم تھا، مہینہ یاد نہیں تھا۔ ربیع الثانی یا جمادی الثانی ذہن میں تھا۔ جن حضرات کے بارے میں خیال تھا کہ ان سے مہینہ اور تاریخ معلوم ہو جائیں گی۔ وہ بھی ناواقف نکلے۔ ایک صاحب نے پندرھویں شعبان کہا۔ مگر اعتبار نہ آیا۔ ایک نے ۱۹ رمضان المبارک اور ایک صاحب نے ۲۷ محرم تاریخ ولادت بتائی۔ یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

نسب نامہ خاندان

مولانا کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب تھے۔ جو بامروت و صاحب اخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی و پرہیزگار تھے۔ مولانا مملوک علی صاحب کے ساتھ دہلی جا کر شاہنامہ وغیرہ بھی پڑھی تھیں۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ کھیتی باڑی میں گزرا۔ مولانا محمد قاسم کے دادا شیخ غلام شاہ تھے۔ ان کی بھی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ مگر بڑے ذاکر و شاغل بزرگ تھے۔ درویشوں کی خدمت کرتے تھے۔ خواب کی تعبیر دینے میں مشہور تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مختصر نسب نامہ یہ ہے۔ محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاؤ الدین بن فتح محمد بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی ہاشم نانوتوی [1]

ابتدائی تعلیم وغیرہ

مولوی محمد ہاشم شاہجہان بادشاہ کے دور میں مقرب شاہی تھے۔ چند دیہات اور مکان جاگیر میں تھے۔ لیکن تغیرات زمانہ نے خاندان والوں کے پاس کچھ نہ چھوڑا۔ مولانا محمد قاسم بچپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز وسیع حوصلہ، جفاکش، جری اور چست تھے۔ مکتب میں اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ اول رہتے تھے۔ قرآن مجید بہت جلد ختم کر لیا تھا۔ خط بھی سب ساتھیوں میں اچھا تھا۔ شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ اپنے کھیل اور بعض قصے نظم کر لیا کرتے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ننھیالی رشتہ مولانا محمد قاسم کے خاندان سے ملتا تھا اور حضرت کی بہن نانوتہ میں بیاہی ہوئی تھی۔ آپ اسی وجہ سے اکثر اپنی بہن سے ملنے نانوتہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے حضرت سے جلد سازی سیکھی تھی۔ اپنی اپنی کتابوں کی جلد خود باندھ لیا کرتے تھے۔ نانوتہ میں آپ کے خاندان میں ایک ایسا قضیہ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو نانوتہ سے دیوبند بھیجا گیا۔ شیخ کرامت حسین کے گھر پر شیخ نہال احمد صاحب پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کو انھوں نے عربی پڑھائی۔ پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس آ گئے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری

---

[1] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۲۱

سے کچھ پڑھا۔ فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں حاصل کیں۔ اس کے بعد مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ ۲ محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے۔ مولانا نے کافیہ شروع کی معقول کی مشکل کتابیں میرزاہد، قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسے پڑھا کرتے تھے۔ جیسے حافظ قرآن سناتا ہے۔ حدیث آپ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے تحصیل کی۔ اسی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے[۱] مولوی مملوک علی صاحب لے آپکو مدرسہ عربی یعنی دہلی کالج میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال پر معترض نہ ہونا۔ میں ان کو پڑھا دونگا۔ اور مولانا نے فرمایا کہ تم اقلیدس کو دیکھ لو اور حساب کے قواعد کی مشق کر لو۔ چند روز کے بعد مشہور ہوا کہ مولانا محمد قاسم نے حساب پورا کر لیا ہے۔ اور مقالے بھی دیکھ لیے۔ چنانچہ مفتی ذکاء اللہ صاحب کسی ماسٹر کے بتائے ہوئے چند سوال لائے جو نہایت مشکل تھے۔ مولانا سے پوچھے تو آپ نے فوراً حل کر دیئے۔ اس سے آپ کی حساب دانی کی بڑی شہرت ہوئی۔ دہلی کالج سے امتحان دیئے بغیر علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور مطبع احمدی میں کتب کی تصحیح فرمانے لگے تھے۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو آپ کے استاذ مکرم مولانا مملوک علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تو آپ اپنے استاذ زادہ مولانا محمد یعقوب رح کے پاس مقیم ہو گئے۔ مولانا مملوک علی صاحب کا مکان کوچہ چیلاں میں تھا۔

بخاری شریف

مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے والد کے بعد ایک سال دہلی میں رہے۔ جب اجمیر میں ملازمت مل گئی تو اجمیر چلے گئے۔ مولانا یعقوب صاحب کے اجمیر جانے کے کچھ دن بعد مولانا محمد قاسم نے مطبع احمدی میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر دار البقا میں چند روز رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری نے تحشیہ بخاری کا کام شروع کر رکھا تھا۔ پانچ چھ سپارے آخر کے رہ گئے تھے۔ وہ مولانا قاسم نانوتوی کے سپرد کر دیئے۔ مولانا نے ان کو لکھا اور قابل رشک لکھا۔ لیکن بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور مولانا احمد علی صاحب سے کہا۔ آپ نے یہ کیا کام کیا۔ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کر دیا۔ اس پر مولانا احمد علی صاحب نے فرمایا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بغیر سوچے سمجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ انھیں دکھلایا۔ تب لوگوں نے مولانا محمد قاسم کی قابلیت کو سمجھا اور جانا۔ یہ سپارے بخاری میں اور سپاروں سے مشکل ہیں۔ خاص طور پر مذہب حنفیہ کا جو التزام ہے۔ اس جگہ پر امام بخاری نے حنفیہ پر اعتراض کئے ہیں۔ ان کے جواب لکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس حاشیہ میں یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی بات بلا سند کے نہ لکھی جائے۔[۲]

بچپن کا ایک خواب

آپ نے ایام طفلی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا میں اللہ جل شانہٗ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں۔ تو ان کے دادا نے (جو تعبیر خواب میں مشہور تھے) یہ تعبیر بتائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہو گے۔[۳]

حضرت مولانا جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے۔ ہر کھیل میں خواہ ذہانت کا ہو خواہ محنت کا۔ سب سے اول اور غالب رہتے تھے۔ خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل جوڑ توڑ نام ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولانا نے جب اس کا قاعدہ معلوم کر لیا۔ پھر یاد نہیں کسی سے مات کھائی ہو۔ بہت ہوا تو برابر رہے۔ بلکہ ہر کھیل میں جو مرتبہ کمال ہوتا تھا۔ وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے تھے۔

---

[۱] سوانح عمری مولانا محمد قاسم صہ [۲] آج تک برصغیر پاک و ہند میں بخاری شریف جتنی دفعہ جہاں کہیں چھپی ہے۔ اسی حاشیے کے ساتھ چھپی ہے۔ دار العلوم کے علاوہ یہ بھی مولانا کا صدقہ جاریہ ہے۔

[۳] سوانحعمری مولانا محمد قاسمؒ از مولانا محمد یعقوب نانوتوی صہ [۴] ایضاً صہ ۵۔

طالب علمی میں خواب

"ایام طالب علمی میں آپ نے ایک اور خواب دیکھا تھا کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں۔ اپنے استاد حضرت مولانا مملوک علی[1] رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا[2] اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ دارالعلوم دیوبند نے برصغیر پاک و ہند میں خصوصاً پورے عالم اسلام میں عموماً جو کتاب و سنت و فقہ کی اشاعت کی ہے اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ توحید و رسالت، خدا خوفی اور فکر آخرت پیدا کر کے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کو باخدا بنا دیا۔ معاشرتی اور تمدنی زندگی حقوق العباد کا صحیح جذبہ پیدا کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ کسی بھی حال میں اسلام کے تیرہ سو سالہ تسلسل اور اسلاف کی وابستگی میں سر مو فرق نہیں آنے دیا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کی شاخوں سے کسب فیض کرنے والے علما و فضلاء کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کے لیے ایک ضخیم جلد درکار ہوگی۔ علم ظاہر اور باطن دونوں میں یکساں ماہر افراد تیار کیے۔ جن کے اجمالی تذکرہ کے لیے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ اسی چیز کو دیکھ کر اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے فرمایا تھا۔

ہے دل روشن مثال دیوبند — اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
گر علیگڑھ کی بھی تم تشبیہ لو — اک معزز پیٹ بس اس کو کہو!

مرشد کی زبان

حضرت مولانا محمد قاسم کی علمی قابلیت اور تقویٰ بے مثل و بے نظیر تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد قاسم کے بارے میں فرمایا تھا کہ ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے۔ اب مدتوں سے نہیں ہوتے۔ ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطا فرماتا ہے چنانچہ حضرت شمس تبریز کے واسطے مولانا روم رح کو لسان بنایا تھا اور مجھ کو مولانا محمد قاسم لسان عطا ہوئے ہیں اور جو میرے قلب میں آتا ہے بیان کر دیتے ہیں[3]۔

ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانی شروع کی جس سے سننے والوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کے سننے والوں میں ایک شخص ایسے بھی تھے جو رنگ باطنی رکھتے تھے۔ ان کی خواہش ہوئی کہ مولانا محمد قاسم کو فیض باطنی دیا جائے تو حضرت مولانا محمد قاسم سے درخواست کی کہ آپ کبھی تنہا ملیے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے چھاپہ خانہ کے کام اور طلبا کے پڑھانے سے فرصت نہیں ملتی۔ تنہائی کہاں میسر ہوتی ہے آپ جب چاہیں تشریف لائیں۔ ——— یہ بزرگ ایک روز مولانا صاحب کے پاس تشریف لائے اور آپ سے کہا کہ میری طرف متوجہ ہوں۔ آپ نے پڑھانا چھوڑ دیا۔ یہ بزرگ آنکھ بند کر کے مراقب ہوئے اور توجہ دینی شروع کی۔ ان بزرگ کی حالت عجیب تھی۔ کبھی گرنے کے قریب ہو جاتے تھے اور کبھی سنبھل کر بیٹھتے تھے۔ کچھ دیر یہ سلسلہ چلا۔ اس کے بعد یہ اٹھ کر اور نیچی نگاہ کر کے چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا سے معذرت کی۔

ایک اور خواب

ارواح ثلاثہ میں ہے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں دیکھا کہ ———
"میں خانہ کعبہ کی چھت پر کسی اونچی جگہ پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور ادھر سے ایک نہر سی

---

۱ مولانا مملوک علی رح حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رح کے والد اور حضرت گنگوہی۔ حضرت نانوتوی اور سر سید احمد خاں مرحوم کے استاد تھے۔

۲ سوانح عمری مولانا محمد قاسم رح۔

۳

ے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے۔

اس خواب کو انھوں نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ برادر شاہ محمد اسحاق صاحب المتوفی ۱۲۶۲ھ) سے
دان سے بیان فرمایا کہ حضرت ایک شخص نے اس قسم کا خواب دیکھا ہے تو انھوں نے یہ تعبیر دی کہ اس شخص سے مذہب حنفی کو بہت تقویت
اور وہ بہت پکا حنفی ہوگا اور اس کی خوب شہرت ہوگی۔ لیکن شہرت کے بعد اس کا جلد انتقال ہو جائے گا۔ اور اس خواب کی تعبیر پر دلیل لانے
رت نہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے تلامذہ اور دار العلوم دیوبند نے فقہ حنفی کی جو خدمت کی ہے۔ اسکا
نکار نہیں کرسکتا۔ خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض کتابیں فاتحہ خلف الامام پر توثیق الکلام اور الدلیل الحکم اور بیس رکعات تراویح پر مصباح التراویح
اور اسی طرح دیگر مسائل مختلف فیہا پر جو مضامین اور دلائل لکھے ہیں۔ وہ علمی دنیا میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔

دگی و کسر نفسی

مولانا محمد یعقوب تحریر فرماتے ہیں:۔

بہت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے۔ مزاج تنہائی پسند تھا اور اوّل عمر سے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت
فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے۔ اس لیے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ ان کے حال سے بھلا ہو یا برا۔ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے۔
ت کہ اگر بیمار بھی ہوتے۔ تب بھی شدت کے وقت کسی نے جان لیا تو جان لیا۔ ورنہ خبر بھی نہ ہوتی۔ اور دوا کرنا تو کہاں۔ حضرت مولانا احمد علی
سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے چھاپہ خانہ میں جب کام کیا کرتے تھے۔ مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں اور آپ بولتے نہیں
م لیکر پکارتا تو خوش ہوتے۔ تعظیم سے نہایت گھبراتے۔ بے تکلف ہر کسی سے رہتے۔ جو شاگرد یا مرید ہوتے ان سے دوستوں کی طرح رہتے۔ علماء کی
نہ یا کرتہ کچھ نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا۔ ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں۔ اس
پر بھی کسی نے کیا جانا جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے۔ کیا ان میں سے ظاہر ہوئے اور آخر سب کو خاک میں ملا دیا۔ اپنا کہنا کر دکھلایا۔ مسئلہ کبھی نہ
کسی کے حوالے فرماتے۔ فتویٰ پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو در کنار۔ اوّل امامت سے بھی گھبراتے۔ آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ وعظ
ہتے۔ جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی (جو اس آخری زمانہ میں قدماء کے نمونہ تھے) نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا۔ اور بہت
ئے لے

ر کی شکایت

مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے والد کی معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ ان کو رنج تھا کہ میرے بھائی پڑھ کر نوکر ہو گئے۔ کوئی
پچاس کا، کوئی سو کا۔ کوئی کم کوئی زیادہ سب خوش و خرم ہیں۔ آپ نے حاجی امداد اللہ مکی رحمۃ اللہ علیہ سے
ن کی کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا ہے اور مجھے اس سے کیا کچھ امیدیں تھیں۔ کچھ کماتا تو ہمارا یہ افلاس دُور ہوتا۔ تم نے اس پر خدا جانے کیا کر دیا
ہے اور نہ نوکری کرتا ہے۔ حضرت اس وقت تو ہنس کر چپ ہو گئے۔ پھر کہلا کر بھیجا کہ قاسم کو وہ مرتبہ ملے گا کہ وہ سو پچاس والے سب اس کی
کریں گے اور ایسی شہرت ہوگی کہ اس کا نام ہر طرف پکارا جائے گا اور تم تنگی معاش کی شکایت کرتے ہو۔ خدا تعالیٰ بے نوکری ہی اسے اتنا
ن نوکروں سے اچھا رہے گا۔ چنانچہ مولانا قاسم کے والد کی حیات میں مالی حالت ایسی ہو گئی کہ شکایت نہ رہی۔

سوانح عمری مولانا محمد قاسم ص ۸، ۹ ملخصاً۔

نکاح، سخاوت و مہمان نوازی

آپ کے والد ماجد کو بڑی فکر تھی کہ کچھ ذریعہ معاش اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی نکاح کرتے ہیں۔ بالآخر آپ کے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے ذکر کیا۔ حاجی صاحب نے حکم دیا تو ناچار نکاح پر راضی ہو گئے۔ مگر شرط یہ لگائی کہ میرے ساتھ جیسی حالت میں ہونگا۔ بیوی رہے گی۔ غربت ہو یا تنگدستی۔ سسرال نے یہ شرط قبول کی۔ ایک چھاپہ خانہ میں پانچ روپے ماہوار پر تصحیح کا کام کرنے لگے۔ مزاج میں مہمان نوازی اور سخاوت۔ بیچے کیا؟ جب گھر آتے مہمان بہت آتے۔ بالآخر بیوی کی اجازت سے اس کا زیور فروخت کر دیا۔ وہ بھی نہایت تابعدار تھیں۔ پہلے والدین کی بے حد خدمت کی۔ پھر شوہر کی۔ آخر میں اللہ جل شانہٗ نے کشادگی عنایت فرمائی تو جو کچھ ہوتا۔ بیوی کو لا کر دیتے۔ اور بیوی بھی ایسی کشادہ دست کہ حضرت مولانا کے جب مہمان آیا۔ اسی وقت کھانا پکا کر کھلایا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مہمان آیا اور فوراً کھانا نہ ملا۔ خود فرمایا کرتے کہ ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے جو میں قصد کرتا ہوں وہ مہمان نوازی میں لُٹ جاتی ہے۔ آپ نے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ میں مرگیا ہوں اور لوگ مجھے دفن کر آئے۔ تب میں حضرت جبرائیل تشریف لائے اور کچھ نگین سامنے رکھے۔ اور کہا یہ تمہارے اعمال ہیں۔ ان میں ایک نگین بہت خوشنما اور کلاں ہے۔ اس کو فرمایا یہ عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے۔ اس خواب کی تعبیر یہی سخاوت تھی[1]

جہادِ آزادی کا آغاز

انگریزوں کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد علماء کے طبقے یعنی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھ کر کہ یہ دوسروں ملک مذہبوں کو پامال کرنے اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لیے شرمناک ہتھکنڈے کر رہے ہیں۔ ان کے انسداد کی تدبیریں شروع کر دیں اور ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈال دی چنانچہ اس جماعت کے تیسرے امام حضرت شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ کے ۱۸۴۶ء میں انتقال کے بعد حاجی امداد اللہ کی رحمۃ اللہ علیہ چوتھے امام مقرر ہوئے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ابتدا ہوئی۔ یہ لوگ بھی تیار تھے۔ حضرت حاجی صاحب کے شریک کار مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبد الغنی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور شیخ محمد تھانوی سے جہاد حریت کے سلسلہ میں تبادلہ خیال ہوا۔ مولانا شیخ محمد تھانوی نے بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد حریت کی مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ ہم اصحاب بدر سے بھی بے سروسامان زیادہ ہیں۔ حضرت امیر امداد اللہ نے طرفین کی گفتگو سنی۔ فرمایا کہ الحمد للہ انشراح ہو گیا۔ اور جہاد کی تیاری شروع ہو گئی۔ امیر امداد اللہ نے امارت قبول کی اور مولانا نانوتوی سپہ سالار مقرر ہوئے۔ اور مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی مقرر ہوئے۔ اسی طرح قصبہ تھانہ بھون دار الاسلام قرار پایا۔ میرٹھ کے بعد دہلی اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ آزادی چھڑ گئی تھی۔ ان حضرات نے بھی مورچہ لگا لیا۔ قاضی عنایت اللہ خان اور ان کے چھوٹے بھائی عبد الرحیم ان کے ساتھ سہارنپور پہنچے اور سرائے میں ٹھہرے۔ ایک بنیے نے تنکی صاحب سے جو انتظام سہارنپور پر مامور تھا۔ کہا کہ تھانہ کا رئیس بھی کمپنی سے باغی ہو گیا ہے۔ اس کا بھائی دہلی میں کمک بھیجنے کے لیے ہاتھی خریدنے آیا ہے اور کئی دن سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ایک گارد بسمت سرائے روانہ کیا گیا اور عبد الرحیم اور ان کے ساتھیوں کو قید کر کے جیل خانہ بھیج دیا اور ان لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اگلے دن قاضی عنایت اللہ کو اپنے بھائی کی پھانسی کی اطلاع ہوتی۔ یہ اپنے رفقاء۔ اور رعایا کو چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور کی طرف جا رہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی وہ اپنے رفقاء اور رعایا کو ساتھ لیکر شیر علی باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور جب وہ سوار سامنے سے گزرے۔ ان پر حملہ کر کے میگزین چھین لیا۔ ایک سوار اس جنگ میں زخمی ہو کر بسمت جنگل بھاگا۔ مگر تھوڑے سے ہی فاصلہ پر گھوڑے

---

[1] سوانحِ عمری مولانا محمد قاسم ص ۱۰ - ۱۱ ملخصًا

گرکر مرگیا۔ اس واقعہ کی خبر مظفرنگر پہونچی توحاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہوگیا۔ جس پر عنایت علی خاں اور اس کے ساتھیوں نے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ ایک معرکہ میں حاجی امداداللہ رحمۃ اللہ علیہ مولانا رشید احمد گنگوہی مولانا قاسم اور حافظ ضامن ہمراہ تھے۔ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوا۔ یہ نبرد آزما جتھہ بھاگ جانے والا یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لیے پہاڑ کی طرح جم کر مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ اور دوسرا گروہ ہاتھوں میں تلواریں لیے بندوقچیوں کے سامنے ایسے جارہا تھا۔ گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے۔ چنانچہ ان حضرات پر فائر ہوئے اور حضرت ضامن رحمۃ اللہ علیہ نے زیر ناف گولی کھائی اور شہید ہوئے۔ حضرت مولانا قاسم یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی پر گولی لگی ہے اور دماغ پار کرکے نکل گئی۔ حضرت حاجی صاحب نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ کیا ہوا میاں۔ عمامہ اتار کر سر دیکھا۔ کہیں گولی کا نشان تک نہیں۔ تعجب یہ تھا کہ خون سے تمام کپڑے تر تھے۔ معرکہ جنگ جاری ہے۔ اسی گھمسان کے میدان میں حضرت حافظ ضامن شہید نے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو پاس بلایا اور فرمایا کہ میاں رشید! میرا دم نکلے تو میرے پاس ضرور رہنا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ حافظ ضامن صاحب دھم سے زمین پر گر پڑے۔ معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوگیا۔ حافظ صاحب زخمی ہوکر گرے کہ حضرت مولانا گنگوہی نے لپک کر نعش کو کندھے پر اٹھالیا اور قریب کی مسجد میں لائے اور حضرت کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہوگئے۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہاں تک کہ حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے زانو پر وصال ہوگیا۔ اہل کاران تحصیل اس جنگ میں کام آئے اور خزانہ پر مجاہدین نے قبضہ کرلیا۔ جب کچھ سکون ہوا تو تھانہ بھون کو انگریزی فوج نے گھیر لیا اور مشرقی جانب سے گولہ باری شروع کی۔ دن نکلتے ہی فوج قصبہ میں داخل ہوگئی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا رات کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے کھول دیئے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگادی گئی۔ اس کس مپرسی کے عالم میں لوٹ مار خوب ہوئی۔ غرض یہ کہ رات کی تاریکی ختم ہونے سے پہلے تھانہ بھون مٹی کا ڈھیر بن گیا تھا۔

گرفتاری کے وارنٹ

ان تینوں حضرات۔ حضرت حاجی صاحبؒ مولانا محمد قاسمؒ۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوگئے تھے کہ تھانہ بھون کے فساد میں شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والے یہی لوگ تھے۔ تھانہ کی بستی کی دکانوں کے چھپریوں نے تحصیل کے دروازے پر چھپر جمع کیے اور ان پر آگ لگادی۔ یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے نہ پائی تھی۔ ان نڈر مولویوں نے جلتی آگ میں گھس کر خزانہ لوٹ لیا۔

حضرت حاجی امداداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قصبہ میں مولانا محمد قاسم۔ مولانا گنگوہی کو الوداع کہا اور حجاز جانے کے روانہ ہوگئے۔ ان ایام میں مولانا محمد قاسم مرحوم احباب کے اصرار پر تین دن تک روپوش رہے۔

اتباع سنت در روپوشی

تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں چلنے پھرنے لگے۔ لوگوں نے مزید روپوشی کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زائد روپوش رہنا سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ جناب نبی کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین ہی دن تک روپوش رہے۔

(سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۷۰) مناظر احسن گیلانی)

قیام دارالعلوم دیوبند کے اسباب

دنیا کا کوئی کام بغیر کسی سبب، داعیہ اور محرک کے معرض وجود اور منصۂ شہود پر نہیں آتا۔ ہم جب ٹھنڈے دل کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں سرسری الیٹ کی مسخ شدہ تاریخ سے پہلے ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کسی اور صورت میں نظر آتی ہے۔ سیاست کی باتیں تو سیاسی حضرات بہتر جانتے ہیں۔ کیونکہ "لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ" ہم صرف مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں کم وبیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت اور دور

اقتدار رہا ہے جس میں نہایت فراخدلی سے (بلکہ بعض بادشاہوں کی طرف سے نرے ملحدانہ انداز میں) ہر فرقہ اور اہل مذہب کو اپنے مذہب پر پابند رہنے اور مذہبی رسوم بجالانے کی کھلی آزادی تھی۔ جب گردش زمانہ سے سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا اور راجوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے ظالم اور جابر برطانیہ قہر الٰہی کی صورت میں ہندوستان پر آچکا۔ تو اس کے مقابلہ کے لیے ہندوستان کی دیگر اقوام عمومًا اور مسلمان خصوصًا میدان میں نکلے اور عملی طور پر اس کے ساتھ جہاد کیا جس کو انگریز کے منحوس دور میں نمک خواران برطانیہ غدر ۱۸۵۷ء کے ساتھ تعبیر کرتے رہے ہیں۔ اس جہاد میں کون کون حضرات شریک تھے اور کس کس مقام پر لڑے؟ اور ہر مقام پر اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ یہ اور اسی قسم کے دیگر کئی امور ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہونے کے علاوہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمیں تو اثبات مدعٰی کے لیے بانیٔ دارالعلوم دیوبند اور ان کے چیدہ چیدہ بعض احباب و اصحاب کا تذکرہ کرنا تھا کہ انھوں نے کس حد تک انگریز کے خلاف جہاد کیا اور انگریز نے ان کے خلاف کیا رائے قائم کی اور اس وقت انگریز کے اہل ہند اور خصوصًا مسلمانوں کے خلاف کیا عزائم تھے؟ اور وہ ہندوستان میں کیا دیکھنا اور کرنا چاہتا تھا؟ اور کس حد تک وہ کر چکا ہے۔ جب ہم تاریخ کے اس موڑ پر آتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں وہ دلگداز واقعات پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ تو ہماری آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ میں قلم لرزتا ہے، دل سیماب کی طرح بے قرار ہو جاتا ہے۔ سانس رکنے لگتا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے — سب واقعات تو تاریخ میں پڑھیے، ہم مشتے نمونہ از خروارے چند حقائق کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں جن میں عقلمندوں کے لیے بڑی عبرت ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ - ع

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

جب لاکھوں انسانوں پر برطانیہ یہ مظالم کر چکا تو بیرونی دنیا کی مزید بدنامی سے بچنے کے لیے اور اہل ہند پر اپنا فرعونی احسان جتلانے کی خاطر کچھ عرصہ بعد ہزاروں علماء کو تختۂ دار پر لٹکانے۔ جلاوطن کرنے اور لاکھوں افراد کو تہ تیغ کرنے کے بعد کچھ جاری کردہ وارنٹ گرفتاری اور دیگر کئی سخت احکام واپس لے لیے گئے۔ اور اس طرح مظلوموں کی ظالم کے ہاتھ سے گلو خلاصی ہوئی ۱۸۵۷ء کے جہاد اور ہنگامہ میں اہل ہند اس قدر حق بجانب تھے کہ خود ظالم انگریز اس کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مسٹر لکی اس ہنگامہ کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمان کی بغاوت تھی (بحوالہ حکومت خود اختیاری ص۲۲) اور اس ہنگامہ میں انگریز نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کا بھی کچھ نمونہ دیکھتے جائیے۔ مسٹر رسل کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے پہلے خنزیر کی چربی ان کے بدن پر ملی گئی اور پھر انھیں جلایا گیا۔

(تمغہ کا دوسرا رخ مصنفہ ایڈورڈ ٹامس ص۴۸)

ملاحظہ کیجیے کہ ظالم برطانیہ نے کس قدر سفاکانہ اور حیا سوز حرکتیں مسلمانوں پر روا رکھیں اور کس طرح ان کے لیے گنگا خون سے ہولی کھیلی گئی۔ مگر وہیں یہ مسلمان مردانہ وار اس ظالم کے سامنے ایمان سے بھرپور سینے تان کر پیش ہوتے رہے اور بزبان حال اس سے یوں خطاب کرتے تھے کہ: ؎

گئے وہ دن کہ ہمیں زندگی کی حسرت تھی

فضول قتل کی دھمکیاں ہیں اے صیاد!

عزائم برطانیہ

انگریز کو جب ہندوستان پر سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو جس طرح اس کے دل میں حسد اور عناد [illegible] تحریر کے رنگ سے بھی ظاہر ہونے لگے۔

گورنر جنرل ہند لارڈ [illegible] نے [illegible] میں [illegible] آف [illegible] کو لکھا ہے کہ: —

"میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے۔
اس لیے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔
(ان ہیپی انڈیا صـ۳۹۹)

انڈیا کی سپریم کونسل کے باوقار رکن سر چارلس ٹریلیوین جو حکومت کی طرف سے گورنری کے بلند عہدہ پر فائز تھا۔ پورے وثوق سے یہ کہتے ہوئے یہ پُر الیقین ہے۔ یہ امیدیں قائم کیے ہوئے تھا کہ

"جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے۔ اسی طرح یہاں (ہندوستان) میں بھی ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔
(بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل صـ۱۴۳)

اور برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر مینگلس نے آغاز ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ کے دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ:۔

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے۔ تاکہ عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہیئے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیئے" (حکومت خود اختیاری صـ۱۳۶) اور علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول صـ۲۶)

اور لارڈ برٹس نے کہا کہ:۔

"ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔"
(علماء ہند کی شاندار ماضی کا آخری حصہ، تصویر کا دوسرا رخ صـ۴۷ طبع اول)

غور فرمائیے کہ سایۂ بوم (ظالم برطانیہ) کے منحوس دور اقتدار میں ہندوستان کی سرزمین پر کس طرح زبون حالی کا گھپ اندھیرا چھا گیا تھا اور جس میں ئے قائم کرنے والوں نے یہاں تک رائے قائم کی کہ:۔

"اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے"
(موج کوثر صـ۸ الشیخ محمد اکرم صاحب ایم اے)

اس نازک دور اور نامساعد حالات میں علماء دیوبند کثر اللہ جماعتہم نے جس طرح ہمت و استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں ان کا کوئی شریک ں ہو سکتا۔ آخر بتلائیے کہ اس وقت تمام گمراہ کن تحریکوں کا مقابلہ کس نے کیا؟ ظالم برطانیہ کے فولادی پنجہ سے کس نے ٹکر لی؟ جان عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر ن نے جہاد کیا ۱۸۵۷ء میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؟ آریوں اور پادریوں کا تعاقب کس نے کیا؟ ان کی تردید میں کتابیں اور رسالے کس نے لکھے؟ کس نے تقریروں کے ذریعے اسلام کی حقانیت واضح کرتے ہوئے ان باطل فرقوں کے مکائد اور دسیسہ کاریوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا؛ اور اس

ہنگامے میں کس طبقہ کے علماء کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا؟ اور نہایت بے دردی کے ساتھ درختوں پر کن کو لٹکایا گیا۔ اور ملک عزیز سے جلاوطنی کی وحشیانہ سزائیں کس طبقہ کی اکثریت کو دی گئیں اور تختۂ دار پر لٹکنے کے لیے زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے کس نے خوشیاں منائیں کہ ؎

فنا فی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے
جسے مرنا نہیں آتا، اُسے جینا نہیں آتا!

برطانیہ کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جس میں ان کا دعویٰ تھا کہ ہماری حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔ اگر ایک جگہ غروب ہوتا ہے دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے اور برطانیہ کے مغرور وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹون نے یہ کہا تھا کہ اگر آسمان بھی ہمارے سروں پر گرنا چاہے تو ہم سنگینوں کی نوک پر اسے تھام سکتے ہیں (معاذ اللہ) اس دور میں بھی علماء دیوبند نے اس ظالم برطانیہ کے خلاف صدائے حق بلند کی اور اس سے نبرد آزما رہے ہیں۔ چنانچہ یوپی کے گورنر سر جیمس آمیسٹن نے اسیرِ مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۳۹ھ) کے بارے میں ایک موقعہ پر کہا تھا کہ:-

"اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں اڑے گی جس میں کوئی انگریز ہو گا۔

نیز یہ بھی ان کا ہی مقولہ ہے کہ:-

اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف عداوت ٹپکے گی۔ (حاشیہ سوانح قاسمی جلد دوم، ص۹۴ مصنفہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۶ء)

غالباً ایسے ہی موقعہ کے لیے کہا گیا ہے کہ ؎

وہی مومن ہے جس کو باطل دیکھ کر پکار اُٹھے
کہ اس مردِ خدا پر چل نہیں سکتا فسوں میرا

عیسائی بنانے کے لیے طریق کار

آپ باحوالہ پہلے یہ پڑھ آئے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان میں زمامِ حکومت تھامتے ہی تمام ہندوستانیوں کو ایک ساتھ عیسائی بنانے کا خواب دیکھنا شروع کیا اور اس کے لیے ملازمتوں اور سیموں نوکریوں اور چھوکریوں کی پیش کش کے علاوہ اور بھی کئی حربے اختیار کیے گئے۔ ان میں ایک طریق یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اتنا غریب اور مفلوک الحال کر دیا جائے۔ کہ وہ عیسائیوں کی جھولی میں پڑنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ عوام کی غربت اس حد تک عمداً پہنچا دی گئی تھی کہ بقول سر سید صاحب ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج پر ہندوستانی اپنی گردن کٹانے پر خوشی تیار ہو جاتا تھا۔ (اسباب بغاوت ہند صفحہ نمبر ۴۰)

اور سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک طریقہ جو انگریز نے تجویز اور اختیار کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ قرآن پاک اور اس کی تعلیم اور علومِ اسلامیہ کو یکسر مٹا دیا جائے تاکہ ایمان و ایقان کی جو پختگی مسلمانوں کو حاصل ہے۔ بالکل ختم ہو جائے اور عیسائیت کا راستہ ان کے لیے سہل اور ہموار ہو جائے

اور اس کے مقابلہ میں انگریزی تعلیم کو اس قدر عام اور رائج کر دیا جائے کہ کوئی شخص اپنے لیے اس کے سوا چارہ کار نہ پائے۔ چنانچہ قرآن کریم جیسی جامع و مکمل، بے نظیر اور انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوت اور طاقت سے خائف اور بدحواس ہو کر برطانیہ کے مشہور ذمہ دار وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ :۔

" جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے۔ دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی "

(بحوالہ خطبہ صدارت ص۱۵۔ اجلاس پنجاہ سالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ از حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ)

اور ہنری ہرنگٹن طامس نے کہا کہ :۔

"مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو۔ اچھی رعایا نہیں ہو سکتے"

بحوالہ حکومت خود اختیاری ص۵۵

الغرض قرآن کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے اسلامی جذبات کو ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کے لیے ایسے ایسے حربے استعمال کیے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے اور لارڈ میکالے نے تو صاف لفظوں میں کہا کہ :۔

" ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے اعتبار سے انگلستانی "

(بحوالہ مدینہ بجنور ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء)

اور سچ پوچھئے تو اس میں ان کو کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ جیسا کہ کسی بھی صاحب علم پر یہ مخفی نہیں ہے۔

یہ طریقہ تو وہ تھا جو براہ راست حکومت برطانیہ اور اس کے ذمہ دار اصحاب نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ پادری صاحبان کی طرف سے (جن کی حفاظت و نگرانی اور مالی سرپرستی خود انگریز کر رہا تھا۔) عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ ہندوستان میں جو شروع کی گئی۔ وہ اپنے مقام پر ایک سانحہ عظیم اور آفات ارضی میں سے ایک بہت بڑی آفت تھی۔ مسلمانوں پر تو حکومت کی طرف سے صدہا آئینی پابندیاں عائد تھیں کہ وہ انگریز کے خلاف لب کشائی کرنے کے مجاز نہیں مگر (العیاذ باللہ) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پادریوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔

بقول کسے :۔

ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

تاریخ قیام دار العلوم دیوبند

یہ تھے وہ مختصر سے دل گداز اسباب و علل جن کی وجہ سے حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کار نے فراست ایمانی اور دیدہ بصیرت سے اندازہ کر لیا کہ اگر ان نازک حالات میں مذہبی اور دینی طور پر مسلمانوں کی حفاظت و تربیت کا کوئی معقول اور

خاطر خواہ انتظام نہ کیا گیا اور قرآن وحدیث، فقہ تاریخ اسلامی، اور سلف صالحین کے اعلیٰ کارناموں اور اقدار سے ان کو باخبر نہ رکھا گیا تو سخت خطرہ ہے کہ والعیاذ باللہ مسلمان کہیں نصرانیت اور دیگر فتنوں کے دامِ ہمرنگ زمین ہی میں نہ الجھ جائیں۔ جس جال کو بچھانے میں شاطرانِ افرنگ اور پنڈتوں اور دیگر باطل پرستوں کے عزائم ومساعی کوئی راز پنہاں نہ تھے مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کو پراگندہ کرنے اور آئندہ ان کو دینی ماحول وفنون سے بے بہرہ رکھنے کی جو کوشش وکاوشں اس ملک میں ہو رہی تھی۔ ان تمام پریشانیوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتویؒ اور آپ کے رفقاء کار کو نتیجہ رس دماغ اور سیماب کی طرح بے قرار دل مرحمت فرمایا تھا اور متلاشیانِ حق کے ایک ایک فرد کو زبانِ حال سے پکار پکار کر یہ کہہ رہے تھے ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء بروز جمعرات (اسی دن ہفتہ بھر کے نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہوتے ہیں۔) تاریخ کا وہ مبارک دن ہے جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی امانت کا چشمۂ علم سرزمین دیوبند سے پھوٹا اور رشد وہدایت کا پودا شجرۂ طوبیٰ بن کر پھیلا جس کے لذیذ پھل سے دنیائے اسلام کی علمی بھوک ختم ہوئی اور جس کی سرسبز وشاداب شاخوں کے سایہ کے نیچے جہالت اور غفلت کی بادِ سموم میں جھلسنے والوں کو چین اور اطمینان نصیب ہوا اور اس صاف اور شفاف چشمہ سے نہریں اور ندیاں پھوٹ پھوٹ کر نکلیں۔ اور ایشیا بھر کے مردہ دلوں کو زندہ اور اجڑے ہوئے قلوب کو لہلہاتا ہرا چمن بنا دیا۔

اس مبارک تقریب میں بہت سے باخدا بزرگ جمع ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کی موجودہ عالیشان عمارت کے متصل جنوب کی طرف مسجد چھتہ میں انار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ اور سب سے پہلے معلم حضرت مُلّا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور سب سے پہلے متعلم حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی قرار پائے۔

اس مبارک مدرسہ کے آغاز کی خبر جب بتانے والوں نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو بتائی اور یہ کہا کہ حضرت ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا فرمائی جائے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا:۔

"سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں۔ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی
پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی ہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقاء
اسلام اور تحفظِ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے"

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں تحفظ اور بقائے اسلام کا ذریعہ ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیاسوں کو سیرابی نصیب ہوئی ہے۔

۵۔ علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص۲۱ وسوانح قاسمی جلد ۲ ص۲۲۳ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔

سرسیّد اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو دہلی کالج کے تعلیم یافتہ حضرات نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ سرسیّد مرحوم و مغفور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ ڈپٹی نذیر احمد۔ شمس العلماء ذکاء اللہ۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ ماسٹر پیارے لال آشوب دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ مولانا محمد قاسم نے دیوبند میں اور سرسیّد نے علی گڑھ میں مدرسہ کالج قائم کیے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب ڈپٹی نذیر احمد۔ مولانا محمد حسین آزاد نے پنجاب میں وہ تعلیمی کارنامے انجام دیئے ہیں جو حیات جاوید کے مالک ہیں۔ سرسید مرحوم مولانا محمد قاسم کی بہت عزت کرتے تھے۔ بعض مذہبی مسائل کے علاوہ تعلیم پھیلانے میں دونوں متفق تھے۔ علوم جدیدہ اور علوم قدیمہ کے پڑھانے میں بھی دونوں ہم خیال تھے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مورخہ یکم ذی الحج سنہ ۱۲۹۰ھ میں مضمون بعنوان مدرسہ دیوبند "میں مولانا محمد قاسم کی تقریر اپنی علوم قدیمہ اور جدیدہ کے پڑھانے کے بارے میں درج ہے اور اس پر جزوی اختلاف کے ساتھ سرسیّد مرحوم نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ مضمون پورا نقل کیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی سالانہ مجلس میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب نے ایک نہایت لمبی اور دل میں اترنے والی اور صداقت سے بھری ہوئی گفتگو کی۔ اس کے پڑھنے سے ہم کو اس بات کی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جناب مولوی صاحب ممدوح بھی مسلمانوں کے حق میں علوم و فنون جدیدہ حاصل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔

سرسیّد مرحوم کو کسی دینی درسگاہ سے اختلاف نہیں تھا۔ اور خاص طور پر مدرسہ دارالعلوم دیوبند جس کے بانی مولانا محمد قاسم تھے۔ وہ اس کے حامی تھے اور اس کی کامیابی چاہتے تھے۔ چنانچہ جب مدرسہ دیوبند کے مہتمم صاحب نے سرسید کے پاس مدرسہ کی سالانہ رپورٹ بھیجی جس میں مدرسہ کی طرف سے مسلمانوں کی بے توجہی اور غفلت کا رونا رویا گیا تھا۔ اس کو پڑھ کر سرسیّد کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور انھوں نے یکم جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ کے تہذیب الاخلاق میں عربی مدرسہ دیوبند اور مسلمانوں کا جھوٹا دعویٰ دینداری کے عنوان پر تین صفحہ کا ایک مقالہ تحریر کیا۔ اس میں مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے بارے میں کیسے حقائق بھرے محبت آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کے خلوص پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون کے اقتباس میں پڑھیے۔

مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ عربی دیوبند نے اس مدرسہ کی رپورٹ سالانہ ۱۲۶۹ھ ہمارے پاس بھیجی ہے جس کے دیکھنے سے ہم کو نہایت ہی رنج ہوتا ہے اور مسلمانوں اور مسلمانوں کی حالت پر کس قدر افسوس آتا ہے۔ اب ہم اس رپورٹ پر متعدد طرح پر نظر ڈالتے ہیں۔

"اوّل بلحاظ مسلمانوں کے جوش مذہبی کے ہم سمجھتے تھے کہ جو مدرسہ ہم قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں علوم انگریزی اور دیگر علوم دنیاوی بشمول علوم دینی پڑھائیں گے۔ اس پر جو پکے مسلمان یا متعصب دیندار اعتراض کرتے ہیں اور اس کو کرسٹانی مدرسہ ٹھہراتے ہیں۔ اور اسی سبب سے لوگوں کو اسمیں چندہ دینے سے منع کرتے ہیں تو عربی مدرسہ دیوبند میں جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس میں وہی پرانے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ جن کو مسلمان چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے مسلمانوں نے ضرور مدد کی ہو گی۔ مگر رپورٹ کے دیکھنے سے ہم کو نہایت مایوسی ہوتی۔ بڑے سے بڑا چندہ فہرست میں آٹھ روپیہ ماہواری کا۔ اس کے بعد پانچ روپے ماہوار کا۔ اس کے بعد چار روپے ماہواری کا اور اس کے بعد تین روپے ماہواری کا اور یہ چاروں قسم کے چندے غیر وصولی ہیں۔ بعض

پر دو دو برس اور بعض پر ایک ایک برس کا باقی ہے۔ اس کے بعد بہت تھوڑے چندے دو روپیہ اور ایک روپیہ ماہواری کے ہیں اور اس کے بعد تو پھر روپیہ دو روپیہ تین روپے آٹھ آنے، چار آنے سال پر نوبت پہنچ چکی ہے اور وہ بھی باآسائش وصول نہیں ہوتا۔ مجبوری مہتمم نے تجویز کی ہے کہ چندہ لانے کے لیے ایک آدمی نوکر رکھا جائے۔ بس یہ کارروائی ہمارے لیے قطعی ثبوت اس بات کا ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں مقدس اور متقی اور پکا مسلمان ظاہر کر کے مدرسۃ العلوم مسلمانان میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اپنی دینداری ظاہر کرتے ہیں۔ صرف سخن ساختہ اور حیلہ ناشرو ع ہے وہ عربی دیوبند میں جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ کیوں مدد نہیں کی۔ حقیقت میں مسلمانوں پر نہایت افسوس ہے کہ ایسے مدرسہ میں جیسا کہ دیوبند کا عربی مدرسہ ہے اور جس میں مولوی محمد قاسم سا فرشتہ سیرت شخص نگران ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب سا شخص مدرس ہے۔ کچھ مدد نہ کریں۔

۲۔ بلحاظ استقلال مدرسے کے ۔ تمام رپورٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ خود اپنے پیر یا مسلمانوں کی ہمدردی پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ ایک شخص کی ذات پر اس کا مدار ہے مولوی محمد قاسم درحقیقت نہایت بزرگ و نہایت با درزادہ ولی ہیں۔ تمام ضلع سہارنپور اور میرٹھ ان کا معتقد ہے دوسرا بڑا سبب مولوی محمد یعقوب صاحب کا ہے۔ جو مدرس اول اس مدرسہ کے ہیں۔ اور انھوں نے صرف ۳۵ روپیہ ماہواری مدرسہ سے لینا قبول کیا ہے اور قناعت اور زہد سے اس قدر قلیل تنخواہ میں اوقات بسر کرتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو کیا کوئی دوسرا شخص اس قلیل مشاہرہ پر ان علوم کے پڑھانے کو ملے گا جو اس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ پس یہ مدرسہ صرف ان دو بزرگوں کی دعا پر قائم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں ۱۴۵ طالب علم ہیں۔ جن میں تراسی خاص دیوبند کے رہنے والے ہیں۔ اور باسٹھ بیرونجات کے ہیں اور ان میں سات طالب علم تو ایسے ہیں جو اپنے پاس سے روٹی کھاتے ہیں اور پچپن وہ ہیں جو دیوبند کے رہنے والوں سے یا مدرسہ سے روٹی کھاتے ہیں۔ کسی کو کچھ کپڑا اور رضائی بھی مل جاتی ہے۔

صورت تقسیم انعام یوں تجویز ہوئی کہ طلباء مکتب قرآن میں جو اعلیٰ دو حافظ اور ادنیٰ دو لڑکے۔ کل چار مستحق انعام ہوئے۔ ان کے لیے ڈیڑھ روپیہ تجویز ہوا۔ اور طلبہ فارسی ادنیٰ جو سات تھے۔ ان کے گیارہ انعامات کے لیے ایک روپیہ چھ آنے تجویز ہوا کہ تخمیناً ہر انعام کے موازی دو آنے ہوئے۔ اور فارسی کے طلبہ اعلیٰ جو چھ تھے۔ سات انعام ملے۔ بحساب فی انعام پانچ آنہ کل دو روپیہ تین آنے مقرر ہوئے اور عربی میں ادنیٰ درجہ کے چوالیس طالب علموں کو

تریپن انعام ملے۔ بحساب فی انعام پانچ آنہ۔ ان کا کل ۱۶ روپے ۹ آنے ہوئے اور اوسط کے گیارہ طلباء کو اکیس انعام۔ ان کو فی انعام سات آنہ تخمین کیے۔ کل نو روپے تین آنے ہوئے اور طلباء اعلیٰ عربی کے ۱۹ قابلِ انعام ہوئے اور چھیاسٹھ انعام انھوں نے پائے۔ فی کتاب چودہ آنے تخمین کیے تو کل روپیہ اکیاون روپے بارہ آنے ہوا۔ اول تو ہم مسلمانوں کی اس حالت پر افسوس کرتے ہیں کہ انکی قوم کا مسلمانی مدرسہ اور ایسی خراب اور محتاج حالت میں ہے۔ کہاں ہیں بڑے بڑے دینداری کا دعویٰ کرنیوالے اور کیوں مذہب اسلام کے مدرسہ کو ایسی حالت میں ڈال رکھا ہے۔

دیکھ لو تمہارے ہی ملک میں ایک تربیت یافتہ قوم یعنی پادریوں کے مذہبی مدرسے ہیں۔ ان کی تائید بھی غریب آدمی اور بیوہ عورتیں زیادہ تر کرتی ہیں اور خود انصاف کرو کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ اس کا سبب صرف یہی ہے کہ اس قوم میں تعلیم و تربیت عمدہ ہے۔ ان کے سب کام اچھے ہیں۔

ہماری قوم میں تعلیم و تربیت نہایت خراب ہے۔ گو تعلیم تو برائے نام ہے اور تربیت کا تو نام بھی نہیں ہے۔ اسی سبب سے ہمارے سب کام کیا دینی اور کیا دنیوی سب خراب اور برباد و ذلیل ہیں۔

ہماری غرض اس تحریر سے مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلانا ہے کہ ان کے دونوں کام دین و دنیا سب خراب و ابتر ہیں۔ انکو چاہیئے کہ اس مدرسہ کی ایسی مدد کریں اور ایسی اعلیٰ ترقی پر پہنچائیں۔ جو اسلام کی رونق و شان کا نمونہ ہو۔"

(راقم سید احمد)

ہم نے سر سید احمد خاں کا یہ طویل اقتباس اس لیئے نقل کیا ہے تاکہ قارئین کو معلوم ہو کہ وہ مدرسہ جس کی ابتدائی حالت وہ تھی۔ جس کا نقشہ مندرجہ بالا اقتباس میں کھینچا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا مدار سراسر اخلاص و للہیت اور نظریۂ اشاعت کتاب و سنت پر تھا۔ لہذا اس کو اتنی ترقی ہوئی کہ پورے عالم اسلام میں کوئی غیر سرکاری ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس مدرسہ اور اس قسم کے دوسرے مدارس میں تعلیم پانیوالے حضرات جو خدمت اسلام کی۔ اس کی مثال بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ سر سید کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد یعقوب کے علم و ذہانت اور ان کے خلوص و تقویٰ پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب سنہ ۱۲۹۱ھ میں علی گڑھ سکول کی ابتدا ہوئی تو اس کی مشاورتی کمیٹی میں ہر دو حضرات کے نام کو شامل کیا گیا۔ مگر ہر دو حضرات نے انکار فرما دیا کہ ہمیں معذور سمجھو۔ اس معذوری کی وجہ ابھی

خط میں پڑھیے۔ وہ خط یکم رمضان ۱۲۹۱ھ کے تہذیب الاخلاق میں سرسید نے شائع فرما دیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو خط متضمن عذرات شرکت مجلس مدیران تعلیم مذہب سنت والجماعت سے کیا ہے۔ بعینہٖ ذیل میں مندرج ہے۔

بخدمت منبع عنایات بے غایات مجمع الطاف بے نہایات سلامت۔

بعد سلام مسنون معروض ہے۔

پرچہ تجویز اصلاح قانون و رباب مدرسۃ العلوم جو متعلق علوم دینیہ سے ہے۔ پہنچا اور مجوزہ ہونا حاجی علی بخش خاں صاحب کا مہتمم اس امر کا واضح ہوا ہے۔ اب امید ہے کہ کوئی خلاف باقی نہ رہے گا۔ احقر کا نام اور جناب مولانا محمد قاسم صاحب قبلہ کا نام اس فہرست میں نظر آیا جن کو اہل شورای تجویز فرمایا ہے۔ ہر چند تائید مذہب اہل تشیع اس مدرسہ میں ایک جداگانہ چیز ہے۔ مگر ہم لوگوں کے دل میں یہ امر خلجان کرتا ہے کہ ایسے مجمع میں جس میں ایک شعبہ تائید ایسے لوگوں کی ہے جن پر فرض ہمارے مذہبی بزرگوں کو برا کہنا ہے۔ ایسے مجمع کے موئیدوں میں۔ شامل ہو کر خدا و رسول کو کیوں کر منہ دکھائیں گے۔ قال تعالیٰ و لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ آپ لوگوں کو بڑی ہمت اور نہایت قوی جرأت ہے۔ ہمارے حوصلے یہاں پست ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی پناہ میں محفوظ رکھے۔ ہر چند تجویز مذکورہ بالاہم ناقص عقلوں کے نزدیک سفسطہ محض ہے بات وہی کی وہی ہے۔ اور شامل ہونا جناب مولوی علی بخش خاں صاحب کا خلاف عقل تو نہیں کہہ سکتے مگر بلاشبک کسی مصلحت عقلی پر مبنی ہے۔ مگر یہ عمل قابل التفات تھا۔ البتہ اس میں اتنا ہی تھا اتقوا مواضع التہم۔ کتنے ہی مسلمان ہم لوگوں کی وضع اور عقائد اور اعمال اور رائے اور طرز کو ایک کیفیت خاص پر سمجھے ہوتے ہیں۔ اس صورت میں اگر متزلزل نہ ہو جاتے۔ مستور ہو جانے میں کچھ تردد نہ تھا۔ بالجملہ اب ہم خاک نشینوں کو آ گرشہ عنایت و توجہ سے الیا ظن .... نہ فرماویں کہ پھر کبھی بھولے سے بھی۔ یاد نہ آویں۔ جناب محمد قاسم صاحب نے منشی عارف سے بروقت ملاقات جب انھوں نے اس تجویز کا ذکر کیا تھا۔ بعینہٖ یہی مضمون ارشاد فرمایا تھا۔ انھوں نے آپ کی خدمت میں ذکر کیا ہوتا۔ اب بروقت پہنچنے ان پرچوں کے جناب مولانا یہاں تشریف رکھتے تھے۔ احقر کو ارشاد فرمایا کہ تو ہی یہ جواب لکھ بھیج چنانچہ حسب ارشاد معروض ہوا۔"

(محمد یعقوب)

پادریوں کی تبلیغ

ہندوستان میں مسلمان کے ہاتھوں سے سلطنت اور اقتدار جانے کی دیر تھی کہ مختلف قسم کے مذہبی فتنے عذاب الٰہی کی صورت میں نمودار ہوئے اور ساون کے مینڈکوں کی طرح بازاروں اور کوچوں، گلیوں اور محفلوں میں پادری صاحبان جوق درجوق رجماعت درجماعت گردش کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکے ڈالتے ہوئے نظر آنے لگے اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی قابل ر شہر اور خوش نصیب قصبہ ہوگا جس کو پادری صاحبان نے اس دور میں اپنے منحوس پاؤں سے نہ روندا ہو۔ اور اسلام کے خلاف خوب زہر ل کر مسلمانوں کی دل آزاری نہ کی ہو۔ اور جارحانہ رنگ میں عیسائیت کی تبلیغ میں کوئی کمی چھوڑی ہو اور مسلمانوں کو چیلنج نہ دیا ہو۔ ایسے تمام واقعات استیعاب اور احاطہ نہ تو ہمارے بس کا روگ ہے اور نہ ان پر ہمارا مدعیٰ موقوف ہے۔ اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف دو تین قعات بطور نمونہ عرض کیے دیتے ہیں۔ ہر عقلمند انسان ان سے بخوبی حقیقت کی تہ کو پہنچ سکتا ہے اور ناداں کے لیے تو دفتر کے دفتر بھی بے سود ہیں۔

چاند پور کا مذہبی اجتماع

ہندوستان میں عیسائیت کی وسیع پیمانہ پر تبلیغ کو دیکھ کر ہندوؤں کو بھی یہ جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے مذہب کا پرچار کریں اور عیسائیت کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مذہبی امور میں الجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ کی یک کڑی یہ ہے کہ مشہور شہر شاہجہان پور سے پانچ چھ میل کی مسافت پر ایک قصبہ تھا جس کا نام چاند اپور تھا۔ وہاں کے ایک ہندو رئیس منشی پیارے ل کبیر پنتھی نے ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں ایک مذہبی جلسہ بنام میلہ خداشناسی مقرر کیا۔ جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا باہمی مباحثہ طے پایا اور تینوں رق اس میں شریک ہوئے۔ مگر لالہ جی نے کمال ہوشیاری اور انتہائی چالاکی سے ایک مختصر سی لیکن نہایت بے معنی اور مہمل لکھی ہوئی تقریر کیا شروع ی کہ میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا اور ان کے پنتھ میں جاگتے سوتے سانس چلتا رہتا تھا۔ (الخ) جس کو چیستان اور پہیلی کہنا زیادہ مناسب وگا۔ اور اس طرح اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی جان چھڑالی اور اصل گفتگو مسلمانوں اور عیسائیوں میں رہی۔ عیسائیوں کی طرف سے ان سب کے نامی گرامی پادریوں کے علاوہ پادری نولس صاحب انگلستانی بھی تھے۔ جو بڑے لسان، عمدہ مقرر اور چوٹی کے مناظر تھے۔ پادری نولس صاحب کا یہ بے بنیاد دعویٰ تھا کہ مسیحی دین کے مقابلہ میں محمدی دین کی کچھ حقیقت نہیں (معاذ اللہ) اور اہل اسلام کی طرف سے جو حضرات اس موقع پر موجود تھے۔ ان میں مشاہیر میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رح حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رح اور حضرت مولانا سید ابو المنصور صاحب دہلوی رح امام فن مناظرہ اہل کتاب خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات علماء اور اہل دل اور دیندار مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ پہلے دن تو اس مباحثہ میں متعدد حضرات نے حصہ لیا اور پادری نولس صاحب کے مزعوم دلائل کے جواب دیتے رہے اور اپنے دعاوی کا اثبات کرتے رہے مگر دوسرے دن مناظرہ میں تنہا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حصہ لیا اور ایسے زبردست دلائل اسلام کی حقانیت پر پیش کیے کہ مجمع داد تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکا اور دین مسیحی کے منسوخ اور ناقابل اتباع ہونے پر ایسے ٹھوس براہین پیش کیے کہ پادری باہم کہتے تھے۔ آج ہم مغلوب ہو گئے۔ (گفتگوئے مذہبی الملقب تاریخی میلہ خداشناسی ص۳۵)

اس مناظرہ کی مکمل روئداد اس کی کتاب میں ملاحظہ فرمائیے کہ پادریوں کا مغرور سر کیسے سرنگوں ہوا۔ اور اسلام کی حقانیت اور صداقت کس طرح آشکارا ہوئی۔ سچ ہے کہ؎

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اس مناظرہ کے تقریبا دو سال بعد ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں شاہجہان پور میں اہلِ اسلام اور مختلف باطل فرقوں کا مناظرہ اور

شاہجہان پور مباحثہ طے ہوا جس میں پنڈت دیانند سرسوتی، منشی اندرمن، پادری اسکاٹ مفسر انجیل اور پادری نولس صاحب وغیرہ نے حصہ لیا اور اہلِ اسلام کی طرف سے متعدد علماء حق اور مشاہیر اس وقت، اور اس مقام پر حاضر اور موجود تھے۔ مگر مناظرہ پادریوں اور مسلمانوں کا ہوا۔ اور لالے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھا گئے۔ اس میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مناظر تھے۔ انھوں نے عقلی و نقلی رنگ میں ایسی صحیح اور قطعی دلیلیں پیش فرمائیں کہ پادری صاحبان سے انکا کوئی معقول جواب نہ بن سکا اور اس موقعہ پر بھی اسلام اور اہلِ اسلام کا بول بالا ہوا۔ مسلمانوں کی کھلی فتح کا مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ متعصب ہندؤوں نے بھی اقرار کیا چنانچہ منشی پیارے لال نے یہ کہا کہ مولوی قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال کیا بیان کیجئے؟ ان کے دل پر علم کی سرستی (علم کی دیوی) بول رہی تھی۔ (مباحثہ شاہجہانپور ص۹۳)

پورے بیانوے صفحات پر اس مناظرہ کی روئداد بارہا طبع ہو چکی ہے۔ اہلِ علم اس سے استفادہ کریں۔

اس کے علاوہ حجۃ الاسلام نے پادری تاراچند سے بھی مناظرہ کیا۔ چنانچہ سوانح قاسمی ص۱۵ از مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ہے،

"ایک پادری تاراچند نام تھا۔ اس سے گفتگو ہوئی۔ آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا۔ سچ ہے شیروں کا مقابلہ لومڑیاں کیا کر سکیں!!

پادری ڈاکٹر کارل فنڈر (جو ایک جرمنی مشنری تھا۔ جسے روسی سلطنت نے جورجیا کے قلعے شوشا سے بدر کر دیا

پادری فنڈر کا فتنہ تھا جس نے فارسی میں میزان الحق نامی ایک کتاب شائع کی اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ (ملاحظہ ہو اہل مسجد ص۳۱۴ مصنفہ ایل بیون جونز، بی اے، بی ڈی لندن۔ مترجمہ جے عبدالسبحان بی اے، بی ڈی۔ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور) نے ہندوستان میں پہنچ کر اور انگریز کی سرپرستی حاصل کر کے جس دریدہ دہنی سے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی اور اہلِ اسلام کے خلاف جوزہر اگلا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں جو جو بہتان تراشی اور اتہام بازی اس نے اختیار کی اس سے مسلمان تو آخر مسلمان ہیں منصف مزاج غیر مسلم بھی صدائے نفریں کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پادری فنڈر جو اپنی بے باکی میں مشہور تھا۔ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ میں سرگرم عمل تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی، کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۲ رمضان ۱۳۰۸ھ) جو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی قدس سرہ العزیز کی اولاد میں تھے اور سلسلہ ولی اللہی میں منسلک ہو کر دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے۔ (اور آپ کی ولادت جمادی الاولی ۱۲۳۳ھ میں کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ہوئی تھی)" نے پادری فنڈر کے ساتھ خط و کتابت کی اور مناظرہ کا چیلنج دیا۔ اور تمام ابتدائی مراحل طے کر لینے کے بعد اکبر آباد آگرہ میں کئی دن کے لیے مناظرہ طے ہوا۔ یہ مناظرہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۲ رجب ۱۲۷۰ھ کو ہوا تھا جو اسلام اور عیسائیت کی صداقت اور حقانیت واضح کرنے کے لیے فیصلہ کن اور تاریخ ہندوستان میں اس موضوع کا سب سے پہلا اور عظیم الشان مناظرہ تھا جس میں طرفین سے معزز مسلمان، ہندو اور انگریز اس مناظرہ کے جج اور منصف قرار دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے آخری دین کا حامی و ناصر ہے۔ اس نے اسلام کی صداقت کا ظاہری سبب اس موقع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کو بنایا جنھوں نے اپنی خداداد قابلیت، عمدہ ذہانت اور تبحر علمی سے تین روز کے متواتر مناظرہ میں دلائل قاہرہ اور براہین ساطعہ سے اس امر کو ثابت کر دیا کہ موجودہ انجیل جس پر آج پادری صاحبان کو فخر و ناز ہے، بالکل محرف ہے جس میں ذرہ

پھر شک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور خود عیسائیوں کے مایۂ ناز اور چوٹی کے مناظر پادری فنڈر صاحب کو عام جلسہ میں انجیل مقدس کی تحریف تسلیم کیے بغیر اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کی تاریکی ہی میں پادری فنڈر صاحب اپنے چیلوں سمیت بھاگ گئے۔ جب چوتھے دن حسب معمول مناظرہ کا وقت آیا تو پبلک اور منصف تو سبھی حاضر ہو گئے۔ مگر پادری فنڈر صاحب کا کہیں نام ونشان نہ ملا۔ ناچار تمام ججوں اور منصفوں کو جو طرفین سے حکم قرار دیئے گئے تھے۔ عیسائیت کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا اور پادری فنڈر صاحب نے ہندوستان کو چھوڑ کر دیگر ممالکِ اسلامیہ میں اپنے دجل کا جال پھیلانے کی سعی کی۔ چنانچہ وہ پھرتا پھراتا ترکی بھی جا پہنچا اور وہاں کے علماء کو چیلنج کرتا پھرا۔ چونکہ وہ بیچارے اس کے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے۔ اس لیے اس دریدہ دہن کے منہ نہ آتے تھے۔ بالآخر سلطان عبدالعزیز خاں ترکیؒ کی خواہش اور صدر اعظم خیر الدین پاشا ٹیونسی رح کی تحریک پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے عربی زبان میں ایک محقق اور مدلل کتاب تصنیف فرمائی۔ جس کا نام اظہار الحق رکھا جس کا ترکی فارسی اور یورپ کی مختلف اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ جب ۱۸۹۱ء میں انگریزی میں اس کا ترجمہ شائع ہوا۔ تو مشہور اخبار ٹائمز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائی مذہب کی ترقی بند ہو جائے گی۔

(ملاحظہ ہو علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص ۳۶)

راقم الحروف نے آج سے تقریباً سولہ سترہ سال پہلے اظہار الحق کے عربی[1] نسخہ کا مطالعہ کیا ہے۔ بلاشبہ ردِّ عیسائیت کے لیے بہترین اور لاجواب کتاب ہے مگر صرف اہل علم حضرات کے لیے۔

ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار
یہ حقائق ہیں تماشائے لب بام نہیں

حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب کے علاوہ اس وقت حضرت مولانا رحم علی صاحب منگلوریؒ، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری مولانا عنایت رسول صاحب چڑیاکوٹی اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اکبرآبادی رح نے بھی عیسائیت کا خوب رد کیا۔ اور اسلام کے ناقابل شکست قلعہ کو محفوظ رکھنے کی سعی بلیغ کی۔

آریہ کا فتنہ

آپ اوراق گزشتہ میں پڑھ چکے ہیں کہ انگریز نے اقتدار اور حکومت کے بل بوتے پر اور پادری صاحبان نے حکومت برطانیہ ہی کے زیر سایہ رہ کر تبلیغ کے ذریعے کس طرح مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا اور کیا کیا کوششیں کیں۔ یہ مصائب مسلمانوں کے لیے کیا کم تھے؟ مگر جب مصائب وآفات کے گھنگھور بادل چھا جاتے ہیں تو ان سے مصیبت کا صرف ایک ہی قطرہ نہیں ٹپکتا۔ بلکہ ایسی موسلادھار بارش ہوتی ہے کہ مشکلات و بلیات کے سیلاب امڈ آتے ہیں۔ ایک طرف انگریز اور پادریوں کا عظیم فتنہ تھا اور دوسری طرف انگریزوں کے چہیتے ہندوؤں اور آریاؤں کا کرتا دھرتا سوامی دیانند سرسوتی جو اپنے منطقیانہ اور فلسفیانہ استدلالات میں مشہور تھا۔ پورے ہندوستان میں لوگوں کو آریہ بنانے اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی (معاذ اللہ) مہم چلا رہا تھا۔ بیسیوں اس کے چیلے اور شاگرد تھے جو اسی کی ڈگر پر اسلام کے خلاف زہر اگلتے تھے۔ سرسوتی کی حماقت اور دریدہ دہنی کا اندازہ لگانا ہو تو اس کی کتاب ستیارتھ پرکاش کا چودھواں باب ملاحظہ کیجیے۔ جس میں اس نے بخیال خویش قرآن کریم کی بسم اللہ سے لے کر والناس تک کی تمام سورتوں پر اعتراضات کیے اور ان کی دخامی بتلائی ہے والعیاذ باللہ) سرسوتی ہر مقام پر اسلام اور اسلامی عقائد پر خوب برستا تھا۔ اور اہل اسلام کو جواب کے لیے للکارتا تھا۔ چنانچہ اپنا تبلیغی دورہ کرتا ہوا ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں وہ رڑکی جا پہنچا اور کئی دن وہاں قیام کر کے اسلام کے خلاف خوب دل کھول کر زہر اگلتا رہا۔ چونکہ

---

[1] یہ کتاب عربی میں ہے۔ اب اردو ترجمہ چھپ گیا ہے۔

وہاں اس وقت کوئی ایسا مستعد اور مناظر عالم نہ تھا۔ جو اس کے فلسفیانہ اعتراضات کا جواب دے سکتا۔ اس لیے میدان کو خالی دیکھ کر اس کی ہمت اور دو چند ہو گئی۔ حتیٰ کہ سر بازار اس نے اسلام کے خلاف نازیبا اور واہی تباہی باتیں کہنا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان دنوں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو پہلے ہی سے ضیق النفس کے موذی مرض سے دوچار تھے۔ بخار اور کھانسی کے شدید مرض میں مبتلا تھے۔ اور ان کی علالت کی خبریں ان کے احباب اور تلامذہ اور عقیدت مندوں کو پہنچتی رہتی تھیں۔ سرسوتی کے کانوں میں بھی حجۃ الاسلام کی بیماری کی خبر پہنچ گئی تھی۔ جب رڑکی کے کچھ دردِ دل رکھنے والے اور غیرت مند مسلمانوں نے سرسوتی کا حسب استطاعت جواب دینا ضروری سمجھا تو پنڈت صاحب یہ کہہ کر بات ٹال گئے (اور معلوم ہوتا ہے کہ پنڈتوں کو بات ٹالنے کا خاصا ملکہ اور نرالا ڈھنگ معلوم ہے۔ جیسا کہ اس وقت پنڈت نہرو اور انکی بیٹی مسئلہ کشمیر کو سالہا سال سے ٹال رہتے ہیں مگر ٹال سکے؟) کہ ہم تو جاہلوں سے گفتگو کرنے کے لیے بالکل آمادہ ہی نہیں۔ اپنے کسی بڑے مذہبی عالم کو بلاؤ۔ پھر ہم گفتگو کریں گے۔ پنڈت جی نے حالات سے یہ بھانپ لیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس شدید علالت میں کیونکر اور کیسے آسکتے ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسی شرط لگاؤ کہ گفتگو کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور نہ پنڈت جی کے مبلغ علم کا بھرم کھلے اور نہ شرمندگی حاصل ہو۔ بقول شخصے :۔ نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

جب لوگوں نے شدید اصرار کیا کہ پنڈت جی آپ مولانا نانوتوی رحمہ ہی سے گفتگو کرنے پر کیوں مصر ہیں۔ تو وجہ تخصیص یہ بیان کی کہ "میں تمام پورب میں پھرا اور اب تمام پنجاب میں پھر کر آیا ہوں۔ ہر اہل کمال سے مولانا کی تعریف سنی۔ ہر کوئی مولانا کو یکتائے روزگار کہتا ہے اور میں نے بھی مولانا رحمہ کو شاہجہاں پور کے جلسہ میں دیکھا ہے۔ ان کی تقریر دلآویز سنی ہے۔ اگر آدمی مباحثہ کرے تو ایسے کامل ویکتا سے کرے جس سے کچھ فائدہ ہو۔ کچھ نتیجہ نکلے۔ (بحوالہ مقدمہ انتصار الاسلام ص۴،۵ از مولانا فخر الحسن صاحبؒ)

اہل رڑکی نے جب حضرت نانوتوی رحمہ سے پرزور استدعا کی تو حضرت کے لیے خود شدت علالت میں وہاں پہنچنا تو ناممکن تھا۔ آپ نے اپنی طرف سے چند نمائندے بھیجے۔ جن میں خصوصیت سے حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ اور مولانا حافظ عبد العدل صاحب رحمۃ اللہ علیہ قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات پاپیادہ جمعرات کے دن مغرب سے پہلے روانہ ہوئے اور شام کی نماز دیوبند کے باغوں میں پڑھی گئی۔ علی الصبح رڑکی پہنچے حتیٰ کہ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد مقامی باشندوں کے ہمراہ پنڈت جی کی کوٹھی پر پہنچے اور بحث مباحثہ کی دعوت دی۔ مگر پنڈت جی اسی پرانی ضد پر مصر تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ آئیں تو مباحثہ کروں گا۔ اور کسی سے مباحثہ ہرگز نہ کروں گا جب وہ کسی صورت مباحثہ کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تو یہ حضرات واپس ہو گئے اور اہل رڑکی نے باوجود حضرت نانوتوی کی علالت کے محض اتمام حجت کے لیے وہاں پہنچنے کی استدعا کی تو مولانا رحمہ باوجود علالت، ضعف اور کمزوری کے جس طرح بھی ہو سکا رڑکی تشریف لے گئے۔

روڑکی میں اجتماع

حضرت مولانا معہ اپنے تلامذہ اور احباب کے شہر میں مقیم تھے اور سرسوتی صاحب روڑکی چھاؤنی میں براجمان تھے بحث ومباحثہ کے لیے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے خط وکتابت ہوتی رہی۔ مگر سرسوتی صاحب اور انکے معتقدین اس سے بھی گھبرا گئے اور بہانہ کیا کہ :۔

"ہمارے سارے کام بند ہو گئے۔ آج سے ہمارے پاس کوئی اور تحریر نہ آئے۔ ہم ہرگز جواب نہ دیں گے۔"

(بحوالہ مقدمہ انتصار الاسلام ص۵)

دوسرے روز حضرت مولانا رح بمعہ مولوی احسان اللہ صاحب میرٹھی اور اپنے چند رفقاء کے چھاؤنی چلے گئے اور کرنل صاحب کی کوٹھی پر انتظام کیا گیا۔ کپتان صاحب اور کرنل صاحب نے مولانا کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان سے مختلف مضامین پر تبادلہ خیال کیا اور داد و تحسین دیتے رہے۔ اور پنڈت سرستی کو وہاں بلاکر کرنل صاحب نے کہا کہ تم مولوی صاحب سے کیوں گفتگو نہیں کر لیتے؟ مجمع عام میں تمہارا کیا نقصان ہے پنڈت جی نے کہا۔ مجمع عام میں فساد کا اندیشہ ہے۔ (جب پنڈت جی سر بازار اسلام کے خلاف اعتراضات کرتے تھے اور لوگوں کو خوب سناسنا کر کہتے تھے۔ اس وقت تو کوئی خطرہ اور اندیشہ نہ تھا۔ مگر اب اندیشہ پیدا ہو گیا!) ——— اس پر کپتان صاحب نے کہا، اچھا، ہماری کوٹھی پر گفتگو ہو جائے۔ ہم فساد کا بندوبست کر لیں گے۔ پنڈت جی نے کہا کہ ہم تو اپنی ہی کوٹھی پر گفتگو کریں گے۔ اور پھر بھی اگر مجمع عام نہ ہو۔ جناب مولانا نے پنڈت جی سے کہا کہ لیجئے اب تو مجمع عام نہیں۔ دس بارہ ہی آدمی ہیں۔ اب بھی۔ آپ اعتراض کیجئے ہم جواب دیتے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا۔ میں تو گفتگو کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ (تو مولوی قاسم کو کاہے کو للکارتے تھے اور ان کے ساتھ گفتگو کرنے پر کیوں مصر تھے؟ صفدر) مولانا نے فرمایا اب ارادہ کر لیجئے۔ ہم آپ کے مذہب پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپ جواب دیجئے۔ یا آپ ہم پر اعتراض کیجئے اور ہم سے جواب لیجئے۔ پنڈت جی نے ایک نہ مانی۔ شرائط کے باب میں گفتگو رہی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجلس برخاست ہوئی۔ جناب مولانا بھی اپنی فرودگاہ پر تشریف لائے اور کئی روز تک شرائط میں ردّ و بدل رہی۔ آخر الامر مولانا نے یہ کہلا بھیجا کہ پنڈت جی کسی جگہ مباحثہ کر لیں۔ بر سر بازار کر لیں۔ عوام میں کر لیں۔ خواص میں کر لیں۔ تنہائی میں کر لیں۔ مگر کر لیں۔ پنڈت جی اپنی رہائشی کوٹھی پر مباحثہ کرنے کو راضی ہوئے اور وہ بھی اس شرط پر کہ دو سو سے زیادہ آدمی نہ ہوں۔ مولانا مرحوم پنڈت جی کی کوٹھی پر جانے کو تیار تھے۔ مگر سرکار کی طرف سے ممانعت ہو گئی کہ چھاؤنی کی حد میں کوئی شخص گفتگو کرنے نہ پائے۔ شہر میں جنگل میں جہاں کہیں بھی جی چاہے گفتگو کر لے۔ مولانا نے پنڈت جی کو لکھا کہ نہر کے کنارے یا عیدگاہ کے میدان میں یا اور کہیں مباحثہ کر لیجئے۔ مگر پنڈت جی کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے ایک نہ سُنی۔ یہی کہا کہ میری کوٹھی پر چلے آؤ۔ چونکہ سرکار کی طرف سے ممانعت ہو گئی تھی (بلکہ پنڈت جی اور ان کے حواریوں نے ممانعت کروا دی تھی) ——— اس لیے جناب مولانا رح کوٹھی پر نہ جا سکے۔ اور پنڈت جی کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔ (مقدمہ انتصار الاسلام ص۶ و ص۷)

حضرت شیخ الہند رح، مولانا محمود حسن صاحب رح اور مولانا حافظ عبد العدل صاحب رح نے کئی روز سر بازار پنڈت جی کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور پنڈت جی کے مذہب پر اعتراضات کیے اور پنڈت جی اور ان کے حواریوں کو غیرت دلائی کہ جواب دو۔ مگر پنڈت جی اور ان کے شاگردوں اور معتقدوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ اور ان کو کوئی ایسا سانپ سونگھ گیا کہ وہ سہمے ہی سے رہے۔ آخر مولانا نانوتوی رح نے فرمایا کہ اچھا پنڈت جی بمعہ اپنے شاگردوں اور معتقدوں کے میرا وعظ ہی سن لیں۔ مگر پنڈت جی وعظ میں تو کیا آتے۔ رڑکی سے بھی چل دیئے اور ایسے گئے کہ پتہ بھی نہ ملا کہ کدھر گئے۔ آخر ش مولانا نے بہ نفس نفیس بر سر بازار تین روز تک وعظ فرمایا۔ مسلمان ہندو عیسائی اور سب چھوٹے بڑے انگریز جو رڑکی میں تھے۔ ان وعظوں میں شامل تھے۔ ہر قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ مولانا نے وہ وہ دلائل مذہب اسلام کے حق ہونے پر بیان فرمائے کہ سب حیران تھے۔ اہل جلسہ پر سکتہ کا عالم تھا۔ ہر شخص متاثر معلوم ہوتا تھا۔ پنڈت جی کے اعتراضوں کے وہ وہ جواب دندان شکن دیئے کہ مخالف بھی مان گئے (مقدمہ انتصار الاسلام ص۸)

پنڈت سرسوتی صاحب نے بزعم خود اصولی طور پر اسلام پر گیارہ اعتراضات کئے ہیں۔ جن میں سے دس کے جوابات حجۃ الاسلام حضرت مولانا نانوتوی نے انتصار الاسلام میں اور گیارھویں اعتراض کا مجمل اور مفصل جواب قبلہ نما میں دیا ہے۔ دونوں کتابیں اہل علم حضرات کے

لیے غلیمت بار دہ ہیں۔

رڑکی کے بعد میرٹھ

جب پنڈت سرستوتی صاحب رڑکی سے بھاگ گئے تو پھرتے پھراتے میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی مذہب اسلام پر بے سرو پا اعتراضات شروع کر دیئے۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مرض اور ضعف میں مبتلا تھے۔ پھر بھی رضائے الٰہی حاصل کرنے اور مذہب اسلام سے مدافعت کرنے کے لیے آپ باہں ضعف و بیماری میرٹھ پہنچے۔ چنانچہ پنڈت جی وہاں سے کافور ہو گئے اور خود پنڈت جی تو وہاں سے چل بھی دیئے البتہ ان کے حواری لالہ انندلال نے مذہب اسلام کے خلاف ایک مضمون لکھا جس کا جواب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" میں دیا ہے۔ چنانچہ اسی کتاب "جواب ترکی بہ ترکی" میں لکھا ہے کہ پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی ان کے وہی دعوے تھے۔ اور نیز اسی میں تصریح ہے کہ "بہ چند مرض کے بقیہ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی۔ مگر ہمت کر کے (میرٹھ پہنچے) اور پھر لکھا ہے کہ مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرٹھ سے بھگا کر کہیں کا کہیں پہنچا دیا (صفحہ ۳۹" اور وہ (پنڈت جی) وہاں سے بہانہ کر کے کافور ہو گیا۔ اس سب واقعہ کی تفصیل سوانح قاسمی (جلد دوم ص ۵۱۲، ۵۱۳ مصنفہ گیلانی) میں مذکور ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کچھ ایسے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ ان کو نہ تو فرار کے بغیر اور کوئی راہ نظر آتی تھی۔ اور نہ سر چھپانے کے لیے کوئی اوٹ ؎

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

ان حضرات کی یہ اسلامی خدمات صرف ہندوستان ہی میں مشہور نہیں بلکہ مرکز ایمان مکہ مکرمہ وغیرہ میں بھی معروف ہیں۔ چنانچہ مکہ کے ایک رسالہ میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ:۔

> "اور حقیقت یہ ہے کہ آریوں کے دیانند سرستی کے مقابلہ کے لیے خاص طور پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور تائید غیبی ہی کا نشان ہے اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور رد بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں"۔
>
> (ملاحظہ ہو ایک مجاہد معمار ص ۲ شائع کردہ مرکزی دفتر دار العلوم حرم صولتیہ مکہ مکرمہ)

اور مورخ اسلام حضرت مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۸ء) نے حیات شبلی کے دیباچہ میں ان اکابر کی علمی اور اصلاحی خدمات کا عمدہ تذکرہ کیا ہے۔

کچھ اپنوں کے بارے میں

یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے کہ جابر برطانیہ پادریوں اور آریوں جیسے فتنے اسلام کے خلاف جو کچھ کرتے وہ تو انھوں نے کیا ہی۔ مگر صد افسوس ہے کہ پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے اور خون پسینہ سے سینچے ہوئے باغ کو ویران کرنے کی کوشش میں صرف دشمن ہی نہیں بلکہ محب نما دوست بھی مصروف تھے۔ معصیت اور جہالت کی گھنگھور گھٹائیں امنڈ امنڈ کر ہندوستان پر محیط ہو گئی تھیں۔ بھولے بھالے مسلمان ہندوؤں کی روش اور ان کے رسم و رواج کے کچھ ایسے غلام اور دلدادہ

بن چکے تھے کہ بجائے سنت نبوی (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ)، انہی رسوم و رواجوں میں ان کو جس کروٹ کوئی لٹاتا وہ لیٹتے اور جس پہلوان کو کوئی بٹھاتا وہ بیٹھتے۔ دین سے غفلت اور بے خبری اکثر مسلمانوں کے دلوں پر اس طرح چھائی ہوئی تھی جس طرح موسم برسات میں سیاہ اور گھنے بادل آفتاب کو ڈھانپ لیتے اور دن کو رات بنا دیتے ہیں۔ غرضیکہ دلوں کی کایا کچھ ایسے رنگ میں پلٹی ہوئی تھی کہ بربادی کا نام شادی، جہل کا نام علم، مشرکانہ رسوم کا نام دین اور خرافات و شعبدہ بازی کا نام کشف و کرامت تجویز کر رکھا تھا۔ ضلالت اور گمراہی کا طوفان، ہدایت و رشد کی مضبوط دیواروں سے ٹکراتا اور شور مچاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ علم شریعت کی تحقیر اور سنت نبویہ کی تذلیل و توہین بڑھتی جاتی تھی۔ عوام علماء حق سے اپنے آپ کو مستغنی اور بے نیاز سمجھتے محدثات اور بدعات کو جزو اسلام بنا لیا گیا تھا۔ کہیں نیچریت سر اٹھاتی تھی۔ تو کہیں اہل بدعت بدعات میں منہمک تھے۔ کہیں رفض و تشیع کا غلبہ تھا تو کہیں عدم تقلید جنم لے رہی تھی، کہیں ڈھول و سارنگی کھڑکتی اور قوالیاں ہوتی تھیں تو کہیں بازاری عورتوں کے گانے پر وجد و حال کی محفلیں گرم دکھائی دیتی تھی، کہیں گور پرستی اور تعزیہ پرستی کا عروج تھا تو کہیں حب جاہ و جلال اور طمع نفسانی کی امنگیں پورے جوبن پر تھیں۔ اس وقت ایسے حالات کو دیکھ کر اہل دل حضرات پر کیا گزرتی ہوگی۔ پوچھنا ہی کیا؟ ؎

بیمار غم کا حال خود آنکھوں سے دیکھ لو
کیا پوچھتے ہو دل پہ جو گزری گزر گئی!

یہ وہ حالات تھے جن میں دارالعلوم قائم ہوا اور اس نے بہتر خدمات سرانجام دیں۔ اس کا ایک خاکہ اس کتاب میں موجود ہے

عشق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر چند واقعات

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کار اور عقیدت مندوں کو جس درجہ اور جس قدر والہانہ عشق و محبت اور اخلاص و عقیدت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کا انکار بجز کسی متعصب اور سوائے کسی متعنت کے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ رومانی افسانوں میں مجنوں بنی عامر کے عشق و محبت کے بڑے بڑے افسانے زبان زد خلائق ہیں۔ لیکن اگر مجنوں سگ کوچہ لیلیٰ پر فدا تھا تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقائے کار مدینہ طیبہ کی مبارک گلیوں کے ذرات پر قربان و نثار تھے۔ اگر مجنوں لیلیٰ کے عشق میں مجبور و مقہور تھا تو یہ حضرات عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں بے چین و بے قرار تھے۔ اگر مجنوں لیلیٰ کی اداؤں پر مفتون تھا تو یہ حضرات اپنے آخر الزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری سنتوں کے شیدائی تھے۔ اگر مجنوں لیلیٰ کے انس والفت کے دام میں گرفتار تھا تو یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق و علاقہ پر نثار تھے اور آپ کے لگاؤ اور آپ کی پسند کو جان عزیز سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ یہ جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے کہ دینی اور دنیوی تمام لذتوں کا سرچشمہ ہی اس برگزیدہ ہستی کے ساتھ مودت اور عقیدت ہے جن کے ارشاد و فرمودہ ایک جملہ کے مقابلہ میں دنیا بھر کے لعل و گہر اور ہفت اقلیم کی دولت اور خزانے قطعاً کوئی قیمت وحیثیت نہیں رکھتے اور جن کے پیارے اقوال و افعال اور اسوۂ حسنہ کے مقابلہ میں کوئی لذیذ سے لذیذ اور خوش آئند سے خوش آئند چیز بھی ایک رتی بھر کا وزن نہیں رکھتی جن کا اسم گرامی دنیا کی تمام شیرینیوں اور شربتوں سے میٹھا اور جن کی ایک ادنیٰ سنت بھی جواہرات سے مرصع تاج شاہی

سے بھی زیادہ مرغوب و پسندیدہ ہے۔ کیا ہی خوش قسمت ہے وہ قوم جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا افضل المخلوقات نبی اور آپ کی شریعت جیسی بیش بہا شریعت مل گئی جس کے بعد کسی اور خوبی کی سرے سے کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہتی۔ کیا خوب کہا گیا ہے کہ ؎

شراب خوش گوارم ہست و یار مہرباں ساقی
ندارد ہیچکس یارے چنیں یارے کہ من دارم

حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عشق نبوی (علیٰ صاحبہ الف الف تحیۃ وسلام) کے واقعات قولی اور فعلی تو بہت کچھ ہیں جن کے بیان کرنے کے لیے دفتر درکار ہیں۔ ہم صرف چند واقعات بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ہندوستان میں بعض حضرات کیوٹ (سبز رنگ) کا جوتا بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ اور اب بھی پہنتے ہیں۔ لیکن حضرت نانوتویؒ نے ایسا جوتا مدت العمر کبھی نہیں پہنا اور اگر کوئی تحفۃً لا دیتا تو اس کے پہننے سے اجتناب و گریز کرتے اور آگے کسی کو ہدیہ دے دیتے۔ اور سبز رنگ کا جوتا پہننے سے محض اس لیے گریز کرتے کہ سرور کائنات آقائے دوجہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گنبد خضراء کا رنگ سبز ہے، پھر بھلا ایسے رنگ کے جوتے پاؤں پر کیسے اور کیونکر استعمال کیے جا سکتے ہیں؟ چنانچہ شیخ العرب والعجم حضرت استاذنا المکرم مولانا حسین احمد مدنی (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ:۔

"تمام عمر کیمخت کا جوتا اس وجہ سے کہ قبہ مبارک سبز رنگ کا ہے۔ نہ پہنا اگر کوئی ہدیہ لے آیا تو کسی دوسرے کو دے دیا۔"

(الشہاب الثاقب ص ۵۴)

اندازہ کیجیے اس نظر بصیرت اور فریفتگی کا گنبد خضراء کے ظاہری رنگ کے ساتھ کس قدر عقیدت والفت ہے جس کے اندر عظیم المرتبت مکین آرام فرما ہیں جن کی نظیر، جن کی مثال اور جن کا ثانی خدا تعالیٰ کی ساری مخلوق میں نہ آج تک وجود میں آیا اور نہ تا قیامت آسکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے شاید اسی کی ترجمانی کی ہے ؎

رخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزم خیال میں نہ دوکان آئینہ ساز میں

---

(۲) حضرت نانوتوی جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ سے کئی میل دور ہی سے پا برہنہ چلتے رہے۔ آپ کے دل اور ضمیر نے یہ اجازت نہ دی کہ دیار حبیب میں جوتا پہن کر چلیں۔ حالانکہ وہاں سخت نوکیلے سنگریزے اور چبھنے والے پتھروں کی بھرمار ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ جناب مولانا حکیم منصور علی خانصاحب حیدر آبادی رحمہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں جو اس سفر حج میں حجۃ الاسلام کے رفیق سفر تھے کہ:۔

"مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پا برہنہ پہنچ گئے۔" (سوانح قاسمی ج ۲ ص ۶۱)

اور نیز حکیم موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ ہی سے ارقام فرماتے ہیں کہ:۔

"جب منزل بہ منزل مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا جہاں روضہ پاک صاحب لولاک نظر آتا تھا۔ فوراً جناب مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم نے اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پا برہنہ چلنا شروع کیا" (ایضاً ص۱۵)

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو مدینہ طیبہ اور گنبد خضراء کے ساتھ کس قدر عقیدت اور کیسی فریفتگی تھی اور دیکھئے کہ تادب حسن کا کیا ہی بہترین طریقہ اختیار فرما کر اپنی فرط محبت کا اظہار فرمایا اور یہ ساری عقیدت و محبت جناب امام الرسل خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اس سنگلاخ رقبہ اور پتھریلی زمین کی فی نفسہ کیا قدر ہے؟ جو کچھ بھی ہے اور جتنی کچھ بھی ہے۔ وہ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت ہے۔ اور آپ ہی کے واسطہ سے ہے اور ایسے ہی موقعے کے لیے کسی شہید عشق نے یہ کہا ہے کہ:۔

وماحب الدیار شغفن قلبی

ولکن حب من سکن الدیارا

میرا اور میرے تمام اکابر کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کا وہ حصہ جو آپ کے جسد اطہر سے لگتا ہے۔ عرش سے بھی زیادہ مرتبہ اور فوقیت رکھتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ج ۱ ص۱۹، سیرت حلبی ج ۲ ص۳۲ اور روح المعانی ج ۱۵ ص۲۲۱ اور اس کی وجہ بھی صرف اور صرف یہ ہے کہ ؎

عرش پر گر فرش بھاری ہے تو ہے اس خاک سے

جس میں محو خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار

(۴) انگریز کے خلاف جہاد ۱۸۵۷ء میں دیگر اکابر کی طرح حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رح بھی بہ نفس نفیس خود شاملی وغیرہ میں شامل تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے اور تذکرۃ الرشید کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ جب ظالم انگریز کی طرف سے حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لیے صلہ تجویز ہو چکا تھا۔ اس لیے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے تھے تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو کمال شجاعت، استقلال اور ہمت قلب عطا فرمائی تھی۔ اس لیے وہ ہر قسم کے نتیجہ سے بے نیاز ہو کر کھلے بندوں پھرتے تھے۔ مگر اعزہ اور اقارب اور ہمدردوں کی طرف سے جب شدید اور بلیغ اصرار ہوا کہ حضرت وقت کی نزاکت کے پیش نظر ضرور روپوش ہو جائیں۔ تو ان کے اصرار کی وجہ سے تین دن روپوش رہے اور لکھا ہے کہ

"تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگے۔ لوگوں نے بہ منت روپوشی کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین ہی دن روپوش رہے ہیں۔"

(سوانح قاسمی ج ۲ ص۱۰۱ و ص۱۰۳ از مولانا گیلانی رح)

داد دیجئے اس جذبہ اتباع سنت کی کہ ظالم انگریز ان دنوں اہل ہند پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً سفاکانہ اور قاتلانہ حربے استعمال کر رہا تھا اور نہایت بے دردی کے ساتھ مظلوموں کے ناحق خون سے ہولی کھیلتا تھا۔ وہ کونسی حیاسوز اور دل آزار حرکت تھی جو اس ظالم نے مجاہدوں کے خلاف روا نہ رکھی تھی اور وہ کونسی غیر انسانی کارروائی تھی جو اس نے چھوڑ دی تھی؟ اس وقت انگریز کا ظلم و جبر اور تعدی و ستم اپنے نقطہ عروج پر تھا لیکن حجۃ الاسلام رح اپنی حیات سے بے نیاز ہو کر اس موقعہ پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اضطراری کو ترک کرنے پر باوجود شدید اصرار کے آمادہ نہ ہوئے اور تین دن کے بعد فوراً باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے لگے۔ اور اس روپوشی کی حالت میں بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا تعلق اور رابطہ مستحکم ہی رکھا اور اس نازک حالت میں بھی سنت پر نگاہ جمی رہی ؎

تھا اسیری میں بھی کچھ ایسا تعلق روح کو
ہم قفس میں روز خوابِ آشیاں دیکھا کیے!

---

(۴) حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے نظم اور نثر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مدح اور تعریف بیان کی ہے اور جس خلوص عقیدت سے اس کا اظہار کیا ہے۔ ان کی کتابوں کو پڑھنے اور دیکھنے والا بجز کسی متعصب کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمام کتابوں کی عبارتیں جو نظم میں آپ نے سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف و تعریف میں بیان فرمائی ہیں۔ نقل اور پیش کرنا تو کارے دارد صرف بطور نمونہ ہم قصائد قاسمی کے پہلے قصیدہ سے (جو ایک سو اکیاون اشعار پر حاوی ہے) صرف چند اشعار بلا رعایت ترتیب پیش کرتے ہیں: ؎

فلک پہ عیسیٰ و ادریس ہیں تو خیر سہی — زمیں پہ جلوہ نما ہیں محمد مختار
فلک پہ سب ہی پر ہے نہ ثانی ر احمد — زمیں پہ کچھ نہ ہو پر ہے محمدی سرکار

تو فخر کون و مکاں زبدہ زمین و زماں — امیر لشکر پیغمبراں شہ ابرار
خدا تیرا تو خدا کا حبیب اور محبوب — خدا ہے آپ کا عاشق تم اس کے عاشق زار
تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی — تو نور شمس اگر اور انبیا ہیں شمس نہار

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں — تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار
گرفت ہو تو ترے ایک بندہ ہونے میں — جو ہو سکے تو خدائی کا ایک تری انکار
بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی کمال — بغیر بندگی کیا ہے لگے جو تجھ کو عار

کہاں بلندی طور اور کہاں تری معراج — کہیں ہوتے ہیں زمین آسمان بھی ہموار
جمال کو ترے کب پہنچے حسن یوسف کا — وہ دل ربائے زلیخا تو شاہد ستار

رہا جمال پہ تیرے حجاب بشریت — نجانا کون ہے کچھ بھی کسی نے جز ستار!
سوا خدا کے بھلا تجھ کو کوئی کیا جانے — تو شمس نور ہے شپر نمط اولوالابصار!

ے

کفیلِ جرم اگر آپ کی شفاعت ہو — تو قاسمی بھی بطریقہ ہو صوفیوں میں شمار
ترے بھروسہ پہ رکھتا ہے غرہ طاعت — گناہ قاسم برگشتہ بخت بد اطوار
گناہ کیا ہے اگر کچھ گناہ کیے میں نے — تجھے شفیع کون کہے گر نہ ہوں بدکار
تمہارے حرف شکایت پہ عفو ہے عاشق — اگر گناہ کو ہے خوف غصہ قہار
یہ سن کے آپ شفیع گناہ گاراں ہیں — کیے ہیں میں نے اکٹھے گناہ کے انبار

ے

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا — نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار
دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی — کیا ہے سارے بڑوں چھوٹوں کا تجھے سردار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا — بنے گا کون ہمارا ترے سوا غم خوار

ے

امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید یہ ہے — کہ ہو سگان مدینہ میں میرا نام شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں — مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مرغ و مار
جو یہ نصیب نہ ہو اور کہاں نصیب میرے — کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کی تیرے قطار
اڑا کے باد مری مشتِ خاک کو پس مرگ — کرے حضور کے روضہ کے آس پاس نثار

ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا
کہ جائے کوچہ اطہر میں تیرے بن کے غبار

قصیدۂ قاسمی

(از صفحہ ۵ تا ۹ ملتقطاً)

تدبر فرمائیے کہ ایک ایک شعر میں کس طرح حضرت نانوتوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اور آپ ہی کی بدولت مدینہ طیبہ) سے

لہ مولانا مرحوم خود ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی مکان کی طرف ہو جاتا ہے تو مکین مقصود ہوتا ہے اس طرف کو آداب و نیاز بجالاتا ہے تو آداب و نیاز کو ہر شخص صاحب خانہ کے لیے سمجھتا ہے (صفحہ ۲ قبلہ نما)

اظہارِ عقیدت کیا ہے اور کس طرح ایک ایک مصرع سے عشقِ نبوی ٹپک اور جھلک رہا ہے اور کس شانِ جلالت کا اظہار ان اشعار (بلکہ قصیدہ) میں کیا ہے۔ ہر باخدا اور منصف مزاج آدمی اس سے صحیح طور پر اندازہ لگا سکتا ہے کہ حضرت نانوتوی رح کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح انتہائی عقیدت اور بے حد محبت تھی اور کس طرح سوز و گداز کے ساتھ وہ اپنی بے چارگی اور جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علوِ مرتبت کا ترانہ گاتے ہیں۔ اور آپ کے عشق میں کس بے تابی بے چینی اور بے قراری کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور کس خوش عقیدگی کے ساتھ مدینہ طیبہ کی گلیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۵) نثر میں حضرت نانوتوی رح نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں جو کچھ فرمایا۔ اس پر ان کی تمام کتابیں شاہد ہیں ہم ان کی تصنیف لطیف قبلہ نما کا ایک حوالہ عرض کیے دیتے ہیں۔ حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ پنڈت دیانند سرسوتی کو اس اعتراض کہ مسلمان بھی (معاذ اللہ) بت پرست ہیں کیونکہ وہ بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ جواب دیتے ہوئے چھٹا جواب یہ تحریر فرماتے ہیں۔

”چھٹے۔ اہلِ اسلام کے نزدیک مستحقِ عبادت وہ ہے جو بذاتِ خود موجود ہو اور سوا اس کے سب اپنے وجود و بقا میں اس کے محتاج ہوں اور سب کے نفع و ضرر کا اس کو اختیار ہو اور اس کا نفع و ضرر کسی سے ممکن نہ ہو۔ اس کا کمال و جمال و جلال ذاتی ہو اور سوا اس کے سب کا کمال و جلال اس کی عطا ہو۔ مگر موصوف بایں وصف ان کے نزدیک بشہادتِ عقل و نقل سوا ایک ذاتِ خداوندی کے اور کوئی نہیں یہاں تک کہ ان کے نزدیک بعدِ خدا سب میں افضل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، نہ کوئی آدمی ان کی برابر نہ کوئی فرشتہ نہ عرش نہ کرسی ان کے ہمسر نہ کعبہ ان کا ہم پلہ مگر بایں ہمہ ان کو بھی ہر طرح خدا تعالیٰ کا محتاج سمجھتے ہیں۔ ایک ذرہ کے بنانے کا ان کو اختیار نہیں ایک رتی برابر کسی کے نقصان کی ان کو قدرت نہیں، خالقِ کائنات خواہ فاعل خواہ افعال اہلِ اسلام کے نزدیک خدا ہے وہ نہیں۔ اسی لیے کلمۂ شہادت میں مدار کار ایمان ہے یعنی اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمدا عبدہ و رسولہ)۔ خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت اور رسالت کا اقرار کرتے ہیں اس صورت میں اہلِ اسلام کی عبادت سوائے خدا اور کسی کے لیے متصور نہیں۔ اگر ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوتی۔ مگر جب ان کو بھی عبد ہی مانا معبود نہیں مانا۔ بلکہ ان کی فضیلت کی وجہ ان کی کمالِ عبودیت اور عبدیت کو قرار دیا تو پھر خانہ کعبہ کو ان کا معبود اور مسجود قرار دینا بجز تہمت یا کم فہمی و جہالت اور کیا ہو سکتا ہے“۔ الخ (قبلہ نما ص)

اس سے پہلے حضرت نانوتوی رح پانچ جوابات اور بیان فرما چکے ہیں۔ جن میں سے بعض کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے کہ:-

”اہلِ اسلام کعبہ کی طرف منہ تو ضرور کرتے ہیں لیکن عبادت کعبہ کی نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی اس کو مسجود لہٗ سمجھتے ہیں۔ عبادت وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی کرتے ہیں۔ کعبہ تو صرف ایک

جہت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار مصلحتوں کے علاوہ ایک اس مصلحت کے لیے بھی متعین فرمایا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کا اس یک جہتی کی وجہ سے اتفاق و اتحاد قائم رہے۔"

(محصلہ تو ضیح)

قبلہ نما کی اس عبارت سے جہاں اللہ تعالیٰ کی خالص توحید اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان اور منصب رسالت ہوتا ہے اس سے نہ " مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا " وغیرہ اشعار و عبارات کا مطلب بھی بالکل عیاں و آشکار ہو جاتا ہے حضرت نانوتوی رح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نافع اور ضار سمجھتے ہیں۔ اور نہ اس ارادہ سے آپ کو پکارتے اور مدد مانگتے ہیں۔ جیسا اہل بدعت نے سوء فہم سے یہ سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ محض عشق و محبت کے طور پر یہ نداء اور خطاب ہے۔ نہ یہ کہ حاضر ناظر سمجھ کر ان سے ادا کی گئی ہے وہ تو اس کو کفر لکھتے اور سمجھتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو فیوض قاسمی ص۴۸)

حج

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے تین مرتبہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو حج کرنے کی توفیق اور حبیب کبریا علیہ وسلم کے گنبد خضراء کی زیارت سے متمتع ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ پہلا حج انھوں نے ۱۲۶۷ھ (۱۸۶۰ء) میں، دوسرا ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) تیسرا ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں کیا ہے اور ان اسفار میں جو روحانی لذت انھوں نے محسوس کی وہ صرف انکا قلب مبارک ہی ادراک کر سکتا دوسرا بھلا اس کو سمجھے تو کیونکر سمجھے اور بیان کرے تو کیسے بیان کرے ؎

واعظم ما یکون الشوق یوماً
اذا دنت الخیام من الخیام

حفظِ قرآن کریم

حضرت نانوتوی رح تصحیح کتب اور دینی بحث و مباحثہ اور سرگرمیوں میں ایسے منہمک رہتے تھے کہ ان اہم دینی کاموں سے فراغت کا ہاتھ نہ آتا تھا اور دل میں قرآن کریم کے حفظ کا جو شوق تھا۔ وہ کب چین لینے دیتا تھا۔ بالآخر دو سال کے صرف دو رمضان میں قرآن لیا اور ایسی روانی کے ساتھ سناتے تھے کہ کوئی کہنہ مشق پختہ کار حافظ بھی شاید ایسا نہ سنا سکتا ہو۔ چنانچہ خود انکا اپنا بیان (سوانح از مولانا محمد یعقوب صاحب رح میں) ہے۔

" فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے اور جب یاد کیا پاؤ۔ سیپارہ کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا اور جب سنایا۔ ایسا صاف سنایا۔ جیسے

اچھے پرانے حافظ "

اور یہ کلام اللہ کی عظمت اور اس کی طرف پوری توجہ اور محبت کا نتیجہ تھا کہ اس کا ایک ایک حرف سینہ میں نقش ہو گیا تھا

ترکی بھی شیریں تازی بھی شیریں
حرف محبت نہ ترکی نہ تازی،

مولانا محمد یعقوب نانوتوی تحریر فرماتے ہیں :۔

وفات حسرت آیات چوتھی جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ میں بارہ سو ستانوے ہجری جمعرات کو بعد نماز ظہر دم آخر ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (اور یہ سانحہ کئی ہفتوں کی مرض کے سبب تھا) ایک قیامت ہو گئی۔ گھر میں وسعت نہ تھی مدرسہ میں لاکر جنازہ رکھا اور بعد غسل کے باہر شہر ایک قطعہ زمین کا حکیم مشتاق احمد صاحب نے خاص قبرستان کے لیے اسی وقت وقف کر دیا۔ وہاں اول مولانا صاحب کو دفن کیا (اسی قبرستان میں شیخ الہند، حضرت مدنی وغیرہم کے مزار بنے۔ ارشد) باہر شہر کے میدان میں نماز ہوئی تا مجمع ان بستیوں میں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا بعد مغرب دفن کیا اور اس خزانہ خوبی کو سپرد زمین کر دیا۔ اور ہاتھ جھاڑ کر چلے آئے۔ مولوی صاحب کے انتقال کا سا غم والم کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک ماتم عام تھا۔ ہر چند شور وغوغا اور سر پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا نہیں تھا۔ کیونکہ بہ برکت صحبت مولانا جتنے لوگ تھے، حدود شرعی سے باہر نہ ہوتے تھے۔ مگر ایسا غم عام ہم نے دیکھا نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ درجات عالی جنت میں نصیب فرمائے اور جوار خیر میں جگہ دے۔

اور اس طرح ہندوستان کا یہ درخشندہ ستارہ انگریز کے خلاف لڑنے والا بہادر مجاہد، پادریوں کا تعاقب کرنے والا نڈر مناظر، آریوں کے چھکے چھڑانے والا بے باک ناقد۔ اسلام کے خلاف فتنوں کی سرکوبی کے لیے اپنی جان عزیز تک پیش کرنے والا جاں نثار مسلمان، سخاوت و ایثار کا پتلا، قوم وملت کا ہمدرد، علوم دینیہ کے احیاء کا علمبردار، حامئ سنت اور ماحئ بدعت، حکیمانہ انداز سے حقائق اسلام کو دل نشین کرنے والا فصیح مبلغ اور زاد قلیل پر قناعت کرنے والا بے نفس صوفی اس دار العمل سے دار الجزاء کو سدھار گیا۔

تاریخ ہائے وفات

کیا چراغ گل ہوا ————	مولانا محمد یعقوب نانوتوی
مصیبت پر مصیبت آئی ————	" " " "
وفات سرور عالم کا نمونہ ہے ————	مولوی فضل الرحمن دیوبندی
رضی اللہ عنہا دائما ————	عبد الرحمن خاں مالک مطبع نظامی کانپور

پیوند خاک زہد وسخاہوں ہزار حیف ۱۲۹۷

(یہی تاریخ دن اور وقت شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا ہے)

تصانیف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی متعدد تصانیف ہیں جو اپنے مرتبہ کی آپ ہی کی نظیر ہیں۔ حضرت تھانویؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر دیا جائے اور نام نہ بتایا جائے تو یہی کہا جائیگا کہ یہ کتابیں امام رازیؒ امام غزالی رحمۃ اللہ کی ہیں (قصص الاکابر) اور ان کتابوں کے متعلق بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جیسے زمانہ ملک آفتاب کرتا ہے۔ وہ چنگاری ان ہی ... میں پوشیدہ ہے۔ حضرت کی یہ تصانیف نہایت علمی ہیں۔ عام علماء کے بھی فہم سے بالاتر ہیں اور ان کتابوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علم ... کہتے ہیں۔

مشہور تصانیف یہ ہیں۔

(۱) تقریر دلپذیر۔ اسلام کے اصول کلیہ پر جامع مانع تقریر ——— اسرار قرآنی۔ اسرار الطہارۃ۔
(۲) تحذیر الناس عن انکار اثر ابن عباسؓ۔ زمینوں کے سات ہونے اور حضور کے خاتم النبیین ہونے پر عجیب بحث۔ جوابات محذورات عشر۔
(۳) آب حیات۔ حضورؐ کی حیات برزخی کا بیان
(۴) انتصار الاسلام۔ آریوں کے مقابلہ میں اسلامی اصول کی فلاسفی ——— جواب ترکی بترکی۔
(۵) تصفیۃ العقائد۔ سرسید احمد خاں سے خط وکتابت
(۶) حجۃ الاسلام۔ عیسائیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اصول۔ اس کا مقدمہ شیخ الہندؒ نے لکھا ہے۔ تتمہ حجۃ الاسلام میلۂ خدا شناسی،
(۷) قبلہ نما۔ نماز میں جہت کعبہ سے شرک کا ابہام اور اس کا شافی جواب
(۸) تحفۂ لحمیہ۔ آریوں کے شبہات کا جواب
(۹) مباحثۂ شاہجہان پور۔ آریوں سے، مناظرہ کی مفصل روئیداد ——— گفتگوئے مذہبی۔
(۱۰) جمال قاسمی (مکتوبات) ——— لطائف قاسمی، فیوضات قاسمیہ، الحق الصریح، مصباح التراویح
(۱۱) توثیق الکلام۔ مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر بحث ——— الدلیل المحکم، فتویٰ متعلقہ اجرت تعلیم۔
(۱۲) اجوبۃ اربعین۔ تحذیر الناس پر علمائے رامپور کے اعتراضات کا جواب
(۱۳) ہدیۃ الشیعہ۔ شیعہ عقائد پر مفصل بحث ——— انتباہ المؤمنین، قصائد قاسمی،

آپ کی سب سے بڑی علمی یادگار اور زندہ جاوید یادگار "دارالعلوم دیوبند" ہے۔ جس کا مفصل تذکرہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے قلم سے شریک اشاعت ہے۔

جناب مستطاب ادام اللہ ظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ قتل مسلم بظن حربی باجازت قرآن است وقولہ الا خطأ
استثناء متصل است زیراکہ در ماقبل عنوان عمد نیست کہ استثناء منقطع باشد بلکہ
عنوان وماکان لمؤمن ان یقتل مؤمنا ہست کہ مراد ازان قتل بالاختیار است
وقتل مسلم بظن حربی ہم باختیار است نص قرآن آنرا خطا قرار دادہ ۔ حقیقت خطأ
در عرف فقہاء آن دیدیم کہ فاعل فعلے می کرد بے اختیار وے فعلے دگر شد مانند آنکہ زد
نشانہ را رسید بر آدمی ۔ وقتل مسلم بظن حربی اینگونہ نیست بلکہ ہمان کار کرد کہ می خواست
وبہذا سرخسی میگوید کہ این قتل عمد بود لیکن شرع او را خطأ نہاد لاجرم حنفیہ در اقسام
قتل از اول جنایات این قسم را بقسم مستقل نہادند وتصریح کردند کہ دیت درین قسم
بر عاقلہ است ۔ مسئلہ قتل مسلم بظن حربی وقتل بصورت التقاء صفین در ہدایہ یک مسائلہ
است کہ دو بار ذکر کردہ وصاحب کنز بار دوم حذف کردہ چہ تکرار است ۔
وآنچہ صاحب احکام القرآن بر بودن این استثناء استثناء متصل اعتراض کردہ کہ این قتل
در زعم قاتل خطأ نیست لاجرم استثناء منقطع باشد در جواب آن گفتہ آید کہ چون در ذہن قاتل
مخطور است کہ اگر این مقتول مسلم بر آید شرع آنرا خطأ قرار دہد پس بر بنا تقدیر نزد وے ہم خطأ
تواند بود واستثناء متصل خواہد بود چراکہ مستثنیٰ منہ قتل بالاختیار است نہ بالعمد ۔
پس نزول آیت در امثال قصہ قتل یمان موجب افراز این قسم گردید بر خلاف قتل ابن وقتل مقضی علیہ بالرجم
کہ بے اجازت شرع وبے ضرورت است آن اقسام را عمد کہ بشبہہ قصاص ساقط شود قرار دادند ۔
قاتل مقضی علیہ بالرجم بجز رقبہ ہیچگونہ عامل للمسلمین نیست بسر خود میکند ۔ قاضی وجلاد خطأ
معروف در فقہ (کہ کارے می خواست شد ازان کارے دگر) نکردہ اند ونہ داخل نص تحول از بیت المال تا عاقلہ
خطأ قاضی وجلاد اگرچہ خطأ معروف در فقہ نیست تاہم اگر خطأ فی القصد داشتہ آید نیابت
از عامہ دارند بر خلاف قاتل مسلم بظن حربی کہ ہیچگونہ نیابت ندارد ۔ نیابت از کسے
چیز دگر است وعود نفع بسوئے وے چیز دگر والسلام محمد انور عفا اللہ عنہ

امامِ ربّانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء ○ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء

امام ربّانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

خلاصہ (تذکرۃ الرشید)
عبدالرشید ارشد

شادباش اے خستہ ہجرانِ بلا　　کز پئے درد تو درماں میرسد
تازہ باش اے تشنہ وادیٔ غم　　کز برایت آبِ حیوان میرسد
دردل افسردہ روحے میدمد　　مردہ تن را مژدہ جاں میرسد
دُور شو اے ظلمتِ شامِ فراق　　کافتاب وصل تاباں میرسد
شوق کن اے بلبلِ گلزار عشق　　کاں گل نواز گلستاں میرسد
بہرِ رُشد خلق می آید رشید　　قطبِ عالم بحر عرفاں میرسد

(از تذکرۃ الرشید ص۱۳)

ولادت

امام ربّانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء بروز سوموار چاشت کے وقت اس دنیائے آب و گل میں تشریف لائے۔ گویا سوموار کی ولادت میں غیر اختیاری سنت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شرف حاصل کیا۔ آپ کی پیدائش مشہور تاریخی مقام گنگوہ میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مزار مبارک سے مشرقی جانب تقریباً تیس قدم دُور اپنے جدی مکان میں ہُوئی۔

سلسلہ نسب

آپ والد ماجد اور والدہ ماجدہ دونوں کی جانب سے شریف النسب اور نجیب الطرفین شیخ زادہ انصاری اور ایوبی الن[سب ہیں]
اور آپ کا نسبی سلسلہ جدہ کی جانب سے گیارہویں پشت پر قطب العالم شیخ المشائخ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ [سے] ملتا ہے۔ اور روحانی سلسلہ بھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا حضرت شیخ موصوفؒ سے ملتا ہے۔ گویا آپ نسبی اور روحانی دونوں طور پر گنگوہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ہُوئے کہ آپ کی ذات گرامی قدر سے گنگوہ کا نام دوبارہ چار دانگ عالم میں پھیلا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گنگوہ کی گذشتہ شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ صاحب تذکرۃ الرشید حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ تذکرۃ الرشید میں رقم فرماتے ہیں :-

شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۲۳ جمادی الآخر ۹۴۵ھ ہجری کو اس عالم جسمانی سے انقطاع فرمایا اور تیسری صدی کا آخری سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس خاندان ایوبی کا نام باقی رکھنے والے اور قدوسی مسند کی عزت سنبھالنے والے نونہال نے اپنے وجود مسعود سے خانۂ عالم معمور اور وہی قصبہ گنگوہ آباد کیا جس میں قدوسی خانقاہ اپنے شیخ کے سچے جانشین کی تلاش میں تین سو برس سے پریشان حال و ویران پڑی ہُوئی تھی۔ یعنی تیسری صدی کے پُورے اختتام پر شیخ عبدالقدوس کے وصال کا سال اور مہینہ اور دن یعنی ۲۳ جمادی الآخر ۱۲۴۵ھ کا روز جب آیا ہے تو ہمارے حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ پُورے سات ماہ اور سات دن کی عمر پا چکے تھے۔ فالحمدللہ علی احسانہٖ (تذکرۃ الرشید ص۱۵)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دادھیال در اصل قصبہ رام پور ضلع سہارنپور میں تھی مگر حضرت کے دادا قاضی پیر بخش صاحب مرحوم نے گنگوہ کو وطن بنا لیا تھا۔ اس لیے آئندہ نسل کا انتساب گنگوہ کی جانب ہُوا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہُوا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح نسبی۔ رُوحانی اور وطنی طور پر ان کا جانشین ہو۔

والدین

حضرت مولانا کے والد ماجد مولانا ہدایت احمد صاحب گنگوہ ہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت ہوئی اور پھر یہیں انصار[یوں] میں مولانا محمد نقی صاحب کی ہمشیرہ سے شادی ہوئی۔ مولانا محمد نقی صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد شفیع صاحب ...

تحریک آزادی میں شہید ہوئے[۱]۔ مولانا محمد تقی صاحب حضرت مولانا گنگوہی کے خسر بھی ہیں اور ماموں بھی کیونکہ ان کی صاحبزادی حدیجہ حضرت مولانا کے عقد میں آئیں[۲]۔ حکیم مولانا مولوی مسعود احمد گنگوہی اور مولانا مولوی محمود احمد صاحبؒ (صاحبزادگان حضرت گنگوہی) اسی عفت مآب خاتون سے پیدا ہوئے۔

حضرت مولانا کے والد ماجد اپنے زمانہ میں مقدس عالم اور بڑے دینی مقتدار تھے۔ آپ نے تعلیم شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے علماء سے حاصل کی اور روحانی تربیت حضرت مولانا شاہ غلام علی مجددی[۵] دہلوی سے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ کامل سے مولانا ہدایت احمد مرحوم سلوک و تصوف سے بھی خاصہ حصہ پائے ہوئے تھے۔ نہایت خوشنویس اور زود نویس تھے۔ عملیات اور تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے اور بروایت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد سے مجاز بھی تھے[۳]۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پنتیس سال کی عمر میں ۱۲۵۲ھ میں اس جہاں سے اُٹھالیا۔ جبکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف سات سال کی تھی۔ اور حضرت مولانا صرف والدہ ماجدہ ہی کی تربیت میں رہ گئے اور سرپرستی جد امجد قاضی پیر بخش صاحب نے کی۔

والدہ ماجدہ

حضرت کی والدہ ماجدہ نہایت پارسا اور عابدہ زاہدہ تھیں۔ باوجودیکہ عورت ذات تھیں۔ اور ان کے شوہر تعویذ گنڈے بھی کر لیا کرتے تھے۔ مگر یہ ٹونے ٹوٹکوں سے طبعاً متنفر اور خائف تھیں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی والدہ ماجدہ سے سُنا ہوا ایک قصّہ سنایا کرتے تھے۔ کہ میری والدہ ماجدہ بیان فرمایا کرتی تھیں کہ:-

> رشید احمد جب تو بچہ تھا مجھکو اللہ بخش جن نظر آیا تھا میں نے دیکھا کہ وہ تیری چارپائی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے کہا کہ تو فلاں مزار پر عطر کے پھوئے چڑھا ورنہ میں تیرے لڑکے کو مار ڈالوں گا۔ والدہ فرماتی تھیں کہ میں نے اس سے کہا کہ اچھا مار ڈال تیرے سامنے لیٹا تو ہے ———— والدہ فرماتی تھیں کہ جب کبھی اللہ بخش نظر آتا اور یہ دھمکیاں دیتا اور ڈراوے دکھاتا تھا میں تو اس کو یہی جواب دیتی تھی کہ میں تو ہرگز کبھی نہ چڑھاؤنگی اگر تجھ سے مارا جائے تو مار ڈال اس کو رے اور صاف جواب پر بھی تیرا بال بیکا نہ کر سکا اور مارنا تو مارنا تجھے ڈرا بھی نہ سکا[۴]۔

حضرت مولانا کا بچپن

جن لوگوں نے آگے چل کر بڑا آدمی بننا اور لوگوں کی اصلاح و فلاح میں اپنی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ انہیں شروع ہی سے بیکار باتوں۔ لایعنی حرکتوں اور فضول کھیل کود سے دور بلکہ متنفر رکھتا ہے اور جن لوگوں نے تجدید و احیائے دین کا کام سرانجام دینا ہوتا ہے وہ بچپن ہی سے اپنی فطرت میں متبع سنت و شریعت ہوتے ہیں یہ نہیں کہ بڑے ہو کر محض لوگوں کے دکھاوے کے لیے یا طعن و تشنیع سے بچنے کے لیے شرعی شکل و صورت بنالی۔ تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں۔

لم تقولون مالا تفعلون (القرآن) کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

یہ لوگ اگرچہ تعلیم و تدریس حاصل کرتے ہیں لیکن وہبی طور پر سلیم الفطرت ہوتے ہیں کہ اگر ان کی تعلیم و تربیت نہ بھی ہوتی تو اپنی سلامتی طبع سے بہرحال صراطِ مستقیم پر چلتے چاہے شیخ و مرشد نہ ہوتے۔ حضرت مولانا گنگوہی بچپن ہی سے ؎

بالائے سرش زہوشمندی — می تافت ستارۂ بلندی

---

[۱] تذکرۃ الرشید ص[۱۱] ۔ [۲] ایضاً ۔ [۳] ایضاً ۔ [۴] تذکرۃ الرشید ص[۲۴] ۔ [۵] مولانا شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ پیدائش ۱۱۵۶ھ مطابق ۱۷۴۳ء وفات ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء۔ عارف کامل اور جامع علوم ظاہر و باطن تھے۔

کامصداق تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے بچپن کی بیسیوں حکایات میں سے دو چار پیش کی جاتی ہیں

تصویر سے نفرت

حضرت مولانا قدس سرہٗ چونکہ بچپن ہی سے بالطبع سلیم القلب اور شیدائی سنت تھے۔ اس لیے کبھی آپ نے اپنے مکان میں کوئی تصویر نہیں رہنے دی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ساڑھے چار برس چھوٹی آپ کی صرف باپ شامل علاتی بہن ــــ بچپن میں گڑیاں کھیلتی تھیں۔ حضرت قدس سرہٗ جس وقت باہر سے تشریف لاتے تو گڑیوں کو توڑ مروڑ کر پھینک دیا کرتے تھے [1]

خدا اور رسول پر پختہ یقین

ایک مرتبہ اثنائے وعظ میں فرمایا :-

"میں اپنے آپ کو کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے طفولیت ہی میں مجھے وہ یقین عطا فرمایا تھا کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا اور جمعہ کا وقت آجاتا تو کھیل چھوڑ کر چلا آتا اور لڑکوں سے کہہ دیتا تھا کہ ہم نے اپنے ماموں صاحب سے سنا ہے کہ تین جمعہ کا چھوڑنے والا (جہاں جمعہ فرض ہو) منافق لکھا جاتا ہے لوگوں کو کہتا ہوں آخر مسلمان ہیں خدا اور رسول پر تو یقین ہوگا ہی۔ پھر ایسے غافل کیوں ہیں [2]

اندازہ کیجیے کہ جس فرمان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر لوگ بڑے ہو کر عمل نہیں کرتے۔ حضرت مولانا بچپن میں اس کا کتنا خیال کرتے اور کیسا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ آدمی منافق ہو جائے گا۔ جو مسلسل تین جمعے چھوڑ دے گا۔ اور بچوں کے ساتھ کھیلنے وغیرہ میں اکثر ایسا ہوتا کہ اکثر ان کے ساتھ شریک نہ ہوتے بلکہ

"ایک طرف بیٹھ جاتے اور یوں کہہ دیا کرتے تھے کہ بھئی تم سب کھیلو۔ میں تمہارے کپڑوں کی حفاظت کروں گا" [3]

بچپن ہی میں عبرت و نصیحت آموزی

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ آپ کی عمر چار یا پانچ سال کی تھی کہ والدہ ماجدہ نے آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی عنایت احمد کو دودھ بانٹ کر دیا۔ آپ بتقاضائے عمر ضد کرنے لگے کہ مجھے دودھ کم دیا ہے۔ بڑے بھائی نے دونوں جگہ کا دودھ پی لیا۔ مولانا کو زیادہ تو کیا ملتا۔ اپنا حصہ بھی گیا۔ بس اسی عمر میں سبق حاصل کر لیا کہ بے جا ضد کرنا یا ہٹ کرنا اپنا نقصان اور حق کا ضائع کرنا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد پھر کبھی ضد نہیں کی۔ فرمایا کرتے کہ

"مجھے دودھ کے قصہ سے یہ تجربہ حاصل ہو چکا ہے کہ ضد کرنے کا نتیجہ اپنے اصل حصہ سے محروم ہو جانا ہے"

ایک تمغائے جوانمردی ہے ناسخ ترکِ حرص ۔۔۔ عمر بھر میں ہے دم آب اکتفا تلوار کو

بچپن میں قناعت و استقلال

جس عظیم ہستی نے لوگوں کو قناعت و استقلال اور صبر و شکر کی تلقین کرنا تھی۔ اور لوگوں کے دلوں سے حرص و طمع اور غرض و جاہ اور دنیا کی محبت کو نکال کر اس میں خدا اور رسول کی محبت پیدا کرنا تھی۔ ضروری تھا کہ وہ خود اس پر بچپن ہی سے عامل ہو۔ صبر و قناعت اور استقامت کا یہ جوہر بچپن میں کس قدر تھا اس کی مثال تذکرۃ الرشید سے پڑھیے :-

"ایام طفولیت میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بخار میں مبتلا ہوئے اور مرض کو اس قدر امتداد ہوا کہ کامل چار سال تک بخار نے

---

[1] تذکرۃ الرشید صفحہ ۲۴ [2] تذکرۃ الرشید صفحہ ۲۴ [3] حوالہ مذکور صفحہ ۲۴

بچھانہ چھوڑا۔ ایام مرض اور اثنائے معالجہ میں طبیب نے صرف مونگ کو غذا بنا دیا اور تمام اشیاء سے پرہیز کرا رکھا تھا چنانچہ حضرت نے اس طویل مدت تک مونگ ہی پہ اکتفا فرمایا۔ اور متواتر چار سال تک مونگ کی دال اور مونگ کی روٹی یا مونگ کی کھچڑی تناول فرمائی نہ کبھی اکتائے نہ گھبرائے نہ شکایت کی نہ رونی صورت بنائی نہ دوسری چیز کی خواہش کی اور نہ اس ایک قسم کے کھانے سے جی پر میل لائے۔"

ایک طعام پر گذران جوان اور پختہ عمر کے لوگوں کو چاہے وہ کتنا لذیذ ہی کیوں نہ ہو کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے۔ مگر یہاں ایک بچے کے صبر اور حوصلہ کو دیکھیے کہ کس طرح چار سال ایک کھانے پر اکتفا کی ہے۔

راستبازی و غیرت مندی

آپ چھ یا سات سال کے تھے کہ آپ کے چچازاد بھائی عبداللہ اور محمد حسن کھیلتے باتیں کرتے پانچ چھ میل دور انبیٹھ لے گئے۔ چچازاد بھائیوں کی ہمراہی اور طفولیت نے یہ سفر تو معلوم نہ ہونے دیا۔ لیکن جب وہاں پہنچے تو خیال آیا کہ بھائی تو اپنی خالہ کے پاس جا ٹھہریں گے۔ مگر اے طفیلی تو کہاں جائے گا (حالانکہ ان کی خالہ ان کی بھی خالہ تھی مگر دور کی) اور کس غیرت کے تقاضا سے کھانا کھائے گا۔ اور رات ٹھہرے گا۔ اس خیال سے آپ اس قدر پریشان اور نادم ہوئے کہ پسینہ میں نہا گئے۔ خیر رات گذری جس طرح گذری۔ اگلے دن واپسی پر جب والدہ نے غیر حاضری اور گمشدگی کی وجہ پوچھی تو سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا کہ

میں تو جاتا نہ تھا بھائی عبداللہ ضد کر کے لے گئے اور مجھے دوسرے گھر روٹی کھلائی۔ بلا تعلق مجھے اجنبی جگہ روٹی کھاتے جیسی شرم آئی ہے۔ میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ میں نے روٹی کیا کھائی روٹی نے مجھے کھایا[1]

نماز کا شوق اور غیبی حفاظت

ساڑھے چھ سال کی عمر تھی کہ آپ سے ایک ایسی کرامت حسیہ اور استقلال و توکل کا ظہور ہوا کہ جس سے آپ کے مقبول بارگاہ احدیت ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ آپ بچپن ہی میں نماز کے پابند تھے۔ جمعہ کا قصہ تو گزر ہی چکا۔ عام نمازوں کے اوقات کا بھی خیال رکھتے۔ ایک دن شام کو ٹہلتے ٹہلتے قصبہ سے باہر نکل گئے وہاں غروب آفتاب کا وقت ہو گیا تو احساس ہوا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ عباس کے پھولوں کی دو چھڑیاں ہاتھ میں لیے بسرعت پلٹے پہلے گھر آئے اور والدہ کو چھڑیاں پکڑائیں کہ یہ رکھو میں نماز پڑھنے جاتا ہوں۔ جھپٹتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے تو جماعت کھڑی تھی۔ وضو کے لیے لوٹوں کی طرف بڑھے تو خالی تھے۔ دیر میں دیر اور ہوئی۔ گھبرا کر پانی کھینچنے کے لیے کنویں میں ڈول ڈالا۔ ڈول وزنی تھا گھبراہٹ میں رسی پاؤں میں الجھ گئی تھی ہاتھ پاؤں جماعت کے فوت ہونے کے خدشہ سے پھولے ہوئے تھے۔ ذرا سا جھٹکا لگا اور دڑھم سے کنویں میں گر گئے۔ نمازیوں کو نماز میں احساس ہوا کہ کوئی کنویں میں گر گیا۔ امام صاحب نے جلدی نماز پوری کرائی۔ اور تمام نمازی جلد کنویں کی طرف لپکے۔ اب ہر ایک کنویں میں جھانکنے لگا۔ اندر سے آواز آتی ہے ——— "گھبراؤ نہیں میں بہت آرام سے بیٹھا ہوں" ——— قدرت حق تعالیٰ یہ ہوئی کہ ڈول الٹا پانی میں گرا آپ جب گرے تو حواس مجتمع کر کے فوراً اس پر بیٹھ گئے۔ جب آپ کو باہر نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ پاؤں کی چھوٹی انگلی میں خفیف سی خراش آئی ہے اور بس ——— اب اس قصہ سے استقامت و استقلال اور مصیبت سے نہ گھبرانا۔ اطمینان سے نماز کے ختم ہوئے تک بیٹھے رہنا۔ کشائش و فرج من اللہ کا انتظار۔ دوسروں کو اطمینان دلانا۔ خدا پر توکل و اعتماد اور مقدرات نماز میں تکالیف کا ایسا تحمل کہ کلمہ شکایت زبان پر نہ آئے یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ابتدا ہی سے آپ اللہ کی حفاظت و رہنمائی میں فطرت کی راہوں پر چلتے ہوئے عمدہ خصائل و عادات کے حامل تھے۔ غرضیکہ بقول صاحب تذکرۃ الرشید:۔

---

[1] تذکرۃ الرشید صـ۲۱

حق تعالیٰ شانہٗ نے علمائے زمانہ کے مقتدا بننے والے امام کو ابتدا ہی سے عادات حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کے ساتھ سنوارا اور آراستہ فرمایا تھا۔ بچپن ہی میں ایک خدا ترس، رحمدل، عابد، خوش خلق، متین و سنجیدہ غیور و باحیاء، صابر و مستقل مزاج، حلیم و بردبار، مہذب و باادب اور نہایت درجہ سلیم الطبع ثابت ہو چکے تھے آپ کو ضد اور اصرار، ہٹ دھرمی و شرارت چھچھوراپن اور بے تہذیب و غیر تربیت یافتہ بچوں کی عادتوں سے طبعاً نفرت تھی۔ آپ کا چھ سات سال تک ناز پروردگی اور لاڈ پیار کا زمانہ اور آٹھویں سال یتیمی یعنی سرپرست و مربی کا سایہ سر سے اٹھ جانا جن عادات کو مقتضی ہے۔ ان بدخصلتوں کا آپ میں نام بھی نہ تھا۔[۱]

تعلیم ۔ ذہانت

آپ کے قرآن پاک ناظرہ پڑھنے کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں سے پڑھا غالباً گھر ہی میں والدہ ماجدہ سے یا والد ماجد سے پڑھ لیا ہوگا۔ آپ کے سوانح میں آپ کے پہلے استاد کا اسم گرامی میاں جی قطب بخش صاحب مرحوم ہے۔ آپ نے ان سے چند دن بعد ہی اپنی ذہانت و ذکاوت کا اعتراف کرا لیا۔ میاں جی مرحوم حضرت کے ننھیال کی طرف سے رشتہ دار بھی تھے لہٰذا غایت شفقت کے ساتھ ساتھ استادانہ سختی و ڈانٹ ڈپٹ بھی رکھتے تھے۔ ان کے بعد فارسی آپ نے کرنال میں اپنے منجھلے ماموں مولوی محمد تقی مرحوم سے پڑھی جو فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ اسی طرح فارسی کا کچھ حصہ مولوی محمد غوث مرحوم سے پڑھا۔ فارسی پڑھنے کے بعد عربی کا شوق ہوا اور آپ نے ابتدائی صرف و نحو کی کتابیں جناب مولوی محمد بخش صاحب رامپوری سے پڑھیں۔ رامپور حضرت کی ددھیال اور آپ کے دادا قاضی پیر بخش کا اصل مسکن تھا۔ لہٰذا آپ کی روحانی تربیت کا سلسلہ بھی ادھر منتقل ہوا۔ مولوی محمد بخش موصوف آپ کے نہایت شفیق استاد تھے آپ کو حزب البحر اور دلائل الخیرات کی اجازت اپنے استاد مولوی محمد بخش صاحب ہی سے ملی۔ مولوی صاحبؒ نے ابتدائی کتب پڑھانے کے بعد مشورہ دیا کہ آپ تکمیل تعلیم کے لیے دہلی چلے جائیں۔ وہاں بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ موجود ہیں۔ یہ قصہ ۱۲۶۱ھ کا ہے جب کہ آپ ہدایت النحو پڑھتے تھے چنانچہ آپ نے استاد کے صائب مشورہ پر دہلی کا سفر کیا۔

ورودِ دہلی

ان دنوں دہلی میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، مولانا شاہ احمد سعید صاحبؒ اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب[۱] کی بہت شہرت تھی۔ آخر الذکر عربک سکول میں صدر مدرس تھے اپنی علمی قابلیت اور فکری صلاحیتوں کی وجہ سے آفاقی شہرت کے مالک مولانا مملوک علی نانوتہ کے رہنے والے تھے ۱۲۶۰ھ کو ایام تعطیل گذارنے گھر گئے تو واپسی پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو تعلیم کے لیے اپنے ساتھ لے آئے۔ حضرت گنگوہیؒ ۱۲۶۱ھ کو دہلی پہنچے۔ اِدھر اُدھر پھیر پھرا کر درسگاہوں کو جانچتے رہے لیکن کہیں تسلی نہ ہوئی ایک دن مولانا مملوک علی کے ہاں پہنچے تو آتے ہی دل لگ گیا اور فیصلہ کر لیا کہ یہیں پڑھوں گا۔ اللہ کو منظور تھا کہ اپنے زمانہ کے شمس و قمر ایک جگہ تعلیم حاصل کر کے برصغیر میں اشاعت

---

[۱] تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۹ ج ۱۔ مولانا مملوک علیؒ آپ حضرت مولانا یعقوب نانوتوی صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند کے والد ماجد تھے۔ آپ نے درسیات کا اکثر حصہ بلکہ یوں کہیے کہ جملہ علوم و فنون جناب مولانا رشید الدین خاں سے پڑھے۔ جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ارشد التلامذہ میں مولانا کریم الدین اپنی کتاب "طبقات الشعراء ہند" میں لکھتے ہیں:-

"بندے کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا۔ اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہا جائے تو بجا ہے۔ کوئی کتاب کسی کی مشکل سے مشکل ان کے پاس بے جاؤ حفظ پڑھائیں گے گویا ان کو حفظ ہے" الخ

حضرت نانوتویؒ مولانا محمد قاسمؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور سر سید احمد خاں مرحوم جیسے مشاہیر نے اکثر کتابیں حضرت مولانا مملوک علی ہی سے پڑھی ہیں۔ ۱۲۶۷ھ میں وفات پائی۔

کتاب وسنت کی ایسی تحریک چلائیں کہ تاقیامت اس کا سلسلہ چلتا رہے۔ چنانچہ محمد قاسم کو نانوتہ سے رشید احمد کو گنگوہ سے لاکر ایک استاد کے دامن سے باندھ دیا فرع ذہین شاگرد کو لائق استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح قابل استاد کو ذکی شاگردوں کی۔ اپنے دور کے دو سب سے ذہین لڑکے مولانا مملوک جیسے نادرہ روزگار استاد کو مل گئے۔ اور انہوں نے ان کو ایسی تعلیم دی کہ ان کی وجہ سے پورا ہندوستان علم دین سے جگمگا اٹھا۔

ذہانت وذکاوت

دونوں ساتھی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی میرزاہد۔ قاضی۔ صدرا شمس بازغہ ایسے پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے کبھی کہیں کوئی لفظ پوچھنا ہوتا تو پوچھ لیتے ورنہ ترجمہ تک نہ کرتے فرفر پڑھتے جاتے۔ دوسرے شاگردوں کو خیال ہوتا کہ یونہی عبارت پڑھے جاتے ہیں، سمجھتے کچھ نہیں۔ کتابوں کے ختم کر لینے کا نام چاہتے ہیں چنانچہ ایک دفعہ استاد سے شکایت کی۔ استاد نے فرمایا کہ ـــــ "میرے سامنے طالب علم بے سمجھے نہیں چل سکتا"۔

اساتذہ کرام

مولانا مملوک علی کے علاوہ آپ نے بعض علوم عقلیہ مولانا مفتی صدرالدینؒ[1] سے بھی پڑھے اور حدیث قدوۃ العلماء حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مہاجر مدنیؒ[2] سے پڑھی۔ نانوتوی وگنگوہی دونوں شاگرد یہاں بھی (یعنی حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے پاس) اپنی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے استاد کی خصوصی عنایات کے مستحق ٹھہرے۔

---

[1] مولانا مفتی صدرالدین۔ آپ کی اصل کشمیر سے ہے۔ پیدائش ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء بمقام دہلی۔ تلمیذ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ، مولانا شاہ عبدالقادرؒ و مولانا شاہ محمد اسحاقؒ۔ انگریز کی جانب سے دہلی کے صدر الصدور اور مفتی تھے ۱۸۵۷ء میں "فتویٰ جہاد" کے الزام میں جائداد ضبط ہوگئی۔ چند ماہ کی نظربندی اور تحقیق کے بعد رہائی ہوئی اور کچھ جائداد واپس مل گئی۔ اردو، فارسی، عربی کے اشعار لکھتے اور آزردہ تخلص کرتے تھے۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء روز پنجشنبہ وفات پائی "چراغ دو جہاں بود" سے تاریخ نکلتی ہے۔ نواب یوسف علی والیٔ رامپور۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی اور سرسید احمد خاں وغیرہ ان کے شاگردوں میں سے ہیں (قاموس المشاہیر ج ۲ ص ۳۷)۔

[2] شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ علم ظاہری وباطنی میں شہرۂ آفاق۔ علماء صلحاء میں زبدہ وخلاصہ وفقیہ اور معروف محدث تھے۔ "ابن ماجہ" حاشیہ بنام "انجاح الحاجۃ" آپ ہی کا ہے۔ اپنے وصال سے چند سال قبل ۱۸۵۷ء کے قصہ میں مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے۔ اکثر حرم اطہر میں مستغرق و مراقب رہتے۔ ادب سے خائف وترساں روضہ اطہر سے کچھ دور بیٹھتے۔ اور زائرین کے شور وغل پر کانپ اٹھتے اور نہایت آہستہ آہستہ فرماتے ـــــ "صاحبو شور نہ کرو دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں" ـــــ آپ وہاں حدیث کا درس بھی دیتے تھے۔ حجازی اور اطراف عالم کے علماء آپ کے علمی پایہ اور فن حدیث کے تبحر اور علو مرتبت کے قائل ومعترف تھے۔ جوار رسول میں بتاریخ چھ محرم الحرام ۱۲۹۵ھ بعمر ساٹھ سال انتقال فرمایا۔ اور جنت البقیع میں قبہ عثمانی کے متصل مدفون ہوئے رحمۃ اللہ علیہ۔ ـــ شاہ عبدالغنی کے دادا شاہ صفی القدر اپنے جد امجد کے مزار سرہند سے ہجرت فرما کر (سکھوں کے غلبہ میں) مع اہل وعیال مصطفیٰ آباد ریاست رامپور میں قیام گزین ہوگئے تھے۔ یہیں شاہ عبدالغنی ۲۵ شعبان ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے علمی وروحانی استفاضہ کے لیے اکثر دہلی آتے۔ حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفاضہ کیا۔ ان کے انتقال کے بعد علماء وفضلاء کے اصرار پر حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ کو آباد کرنے کے لیے دہلی تشریف لے آئے۔

شاہ عبدالغنی صاحب اپنے جد بزرگوار حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ نقشبندیہ کے متمسک اور اپنے والد ماجد شاہ ابوسعید قدس سرہٗ سے مجاز تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب وسلوک آٹھویں پشت پر حضرت مجدد صاحب سے جا ملتا ہے۔

(مفصل مطالعہ کے لیے تذکرۃ الرشید ص ۲۹ دیکھیے)

مریدوں میں حضرت شاہ کی توجہ کا مرکز زیادہ تر حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی مہتمم مدرسہ عالیہ دیوبند تھے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ احمد سعید صاحب قدس سرہٗ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل کیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے معقولات کی اکثر کتب اور تفسیر، اصول فقہ و معانی وغیرہ کی اکثر کتابیں مولانا مملوک علی سے ۔ اور صحاح ستہ کی کل کتابیں حرفاً حرفاً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ تھوڑا بہت تلمذ جو دوسرے اساتذہ سے رہا ان میں مفتی صدرالدین صاحب۔ مولانا شاہ احمد سعید صاحب اور قاضی احمد دین صاحب پنجابی ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین

تعلیمی مدت

آپ کی دہلی میں تعلیمی مدت تقریباً چار سال بنتی ہے اس مدت کو ملاحظہ کیجئے اور پھر آپ کے مبلغ علم اور استعداد کو دیکھئے کہ جس کا مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں۔ دونوں طرف کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے کہ علم کا اتنا سمندر آپ نے اس تھوڑی مدت میں کیسے پی لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت ذہین ذکی اور فطین تھے۔ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں بمشکل سونے کھانے اور دیگر ضروریات میں سات آٹھ گھنٹے صرف کرتے ہوں گے۔ باقی سارا وقت مطالعہ وکتب بینی میں صرف ہوتا تھا۔ اور مطالعہ میں آپ اس قدر منہمک ہوتے کہ پاس پڑا ہوا کھانا کوئی دوست اٹھا کر لے جاتا مگر آپ کو خبر نہ ہوتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ مطالعہ کرتے کرتے سو گئے۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ کھانا شام کا اسی طرح پڑا ہے رات کھایا نہیں ہے۔ مدرسہ کو آتے جاتے ادھر ادھر کبھی نہ دیکھتے۔

ایام طالب علمی

ایام طالب علمی میں آپ نے خورد و نوش کا کسی پر بار نہ ڈالا تین روپے ماہوار آپ کے ماموں بھیجا کرتے تھے۔ اس میں سوکھی روٹی اور دال ترکاری جو وقت پر مل جاتی کھا لیتے۔ اور انہی تین روپے میں صابن تیل۔ اصلاح خط وغیرہ ہوتی۔

آپ کے علمی ذوق اور انہماک کا خاصہ شہرہ تھا۔ اسی بنا پر کئی بڑے لوگ آپ سے محبت سے ملتے۔ اور ان لوگوں میں ہر طرح کے ہوتے کئی مہندس اور کیمیا گر تھے۔ انہوں نے فراست سے آپ کو پہچان کر بہ نیت محبت آپ کو کیمیا کا نسخہ بتانا اور سکھانا چاہا۔ مگر آپ نے صاف انکار کر دیا۔ آپ کی زاہد اور قانع طبیعت نے ایسی چیزوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی یہی وجہ تھی کہ آپ ایسی جگہ پر پہنچے کہ جس کے متعلق شاعر کہتا ہے ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند

فرماتے تھے کہ ایک شخص نے کیمیا بنا کر دکھلا بھی دی اور ایک نے نسخہ دے دیا فرمایا کہ وہ میری ترمذی میں پڑا رہا۔ گنگوہ آنے پر دیکھا کتاب سے نکل آیا لیکن یہاں بھی اسے آزمانے کا شوق نہیں چرایا۔ ایک شخص کا نام لے کر فرمایا کہ وہ پاس بیٹھے تھے انہوں نے نسخہ کی نقل مانگی ہم نے کہا بخل کی کیا ضرورت تھی۔ نقل دے دی۔ اور اصل کو اسی وقت پھاڑ ڈالا۔ اس کے بعد غالباً فرمایا کہ اس شخص نے نسخہ آزمایا تو صحیح نکلا۔

زمانہ طالب علمی میں اساتذہ کی دونوں حضرات پر جو شفقتیں تھیں۔ ان کو اگر بیان کیا جائے تو ایک دفتر درکار ہے۔ آپ کے استاد مفتی صدرالدین صاحب مولود۔ قیام وغیرہ کو جائز کہتے تھے۔ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ طالب علمی کے زمانے ہی سے ایسی رسوم و رواج اور بدعات سے سخت مجتنب تھے مفتی صاحب کو بھی پتہ تھا لیکن اس کے باوجود شفقت فرماتے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دفعہ دہلی آنا ہوا اور مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے ملے سب حالات پوچھے اور کہا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا مطبع میں آٹھ دس روپے ماہوار پر تصحیح کا کام کرتے ہیں، تو مفتی صاحب نہایت تعجب کے ساتھ بار بار ہاتھ مارتے تھے کہ "قاسم ایسا ستا۔ قاسم ایسا ستا" پھر کہ "فقیر ہو گئے فقیر ہو گئے"۔ اس کے بعد نہایت محبت اور شفقت سے پوچھا "میاں رشید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اور تم دونوں کھانا ایک جگہ کھا لیں" حضرت نے مناسب طرز پر جواب دیا اور آخر مفتی صاحب کے اصرار سے کھانا وہیں تناول فرمایا۔ مفتی صاحب فرمانے لگے کہ "میاں رشید تم ہی اچھے ہو کہ تارک دنیا ہو گئے۔ ہماری نوکری جائز نہیں تھی اور ہم خوب سمجھتے تھے کہ جائز نہیں مگر بزور علم اس کو جائز رکھتے تھے [1]

[1] تذکرۃ الرشید ص۳۲، مفتی صاحب دہلی میں انگریز حکومت کی طرف سے صدر الصدور تھے اور کافی تنخواہ پاتے تھے۔

پہلے شاگرد دار العلوم کے پہلے مدرس

زمانہ طالب علمی میں اپنی پڑھی کتابوں کو پڑھانے کا بھی شوق رکھتے تھے فارغ اوقات میں پڑھاتے تا کہ حرج نہ ہو۔ چنانچہ سب سے پہلی جماعت جو آپ سے پڑھنے لگی وہ ہے جس میں ملا محمود دیوبندی بھی شریک تھے۔ جو دار العلوم دیوبند میں سب سے پہلے مدرس مقرر ہوئے اور جن کے پہلے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے گویا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے شاگردوں میں سے ایک دار العلوم دیوبند کے پہلے مدرس ہوئے

نکاح

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے چار حقیقی ماموں تھے۔ جن میں بڑے ماموں مولانا محمد نقی صاحب کی صاحبزادی مسماۃ خدیجہ خاتون سے آپ کی منگنی ہو چکی تھی۔ مولوی محمد نقی صاحب سلسلہ قادریہ میں شاہ سیف اللہ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و مجاز تھے جو نہایت پابند شرع اور عاشق سنت شیخ تھے۔ مولانا محمد نقی کی یہ بات مشہور ہے کہ جس چیز کے متعلق علم ہو گیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے رغبت تھی۔ مولانا اس کو بلا تامل اپنے ہاں کھانے کا معمول بنا لیتے چاہے مضر ہی کیوں نہ پڑے۔ مولانا ممدوح ریاست جھجر میں فوجی ملازم تھے۔ اور اپنے آقا کے جان نثار خیر خواہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔

حضرت جب اکیس برس کے ہوئے تو ماموں نے آپ کے دادا سے تقاضا کیا کہ نکاح کر دیا جائے۔ اس لئے دہلی سے واپس آنے پر آپ کے نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ آپ جب کپڑے پہنا کر گھر لائے گئے تو ایک اندھی میراثن چندیا نامی نے دنیا کی رسم کے مطابق ایک بے تکا مصرعہ "گوندھ لائی مالن سہرا" منہ سے نکالا۔ حضرت کہ متبع سنت و شریعت تھے اس کے سننے کی کہاں تاب رکھتے بے اختیار جلال میں آ کر ایک دھول رسید کی۔ اس کا تو منہ بند ہو گیا مگر گھر کے چھوٹے بڑے اس میراثن پر روپے پیسے نچھاور کرنے لگے کہ خدا کے لیے دولہا کو کوسنے مت جو ہونا تھا سو ہوا بدشگونی کا کوئی لفظ منہ سے نہ نکلے۔

مردانہ جائے نکاح میں تشریف لائے تو مہر پانچ ہزار سکہ چہرہ شاہی سنکر دولہا بننے کی حالت ہی میں صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس مقدار کا متحمل نہیں ہو سکوں گا۔ آپ کے خسر اتفاق سے موجود نہ تھے بالآخر بڑے بوڑھوں کے اصرار پر راضی ہوئے۔ لیکن نکاح کے متصل ہی آپ کی زوجہ محترمہ نے سارا قصہ سنکر مہر معاف کر دیا۔ اس طرح حضرت کے صفا کیش قلب کو کلی راحت حاصل ہوئی۔ حضرت کی اہلیہ کی عمر پندرہ سال اور آپ کی اکیس سال تھی۔

حفظ قرآن

جوانی میں شادی کے دن ایسے ہوتے ہیں کہ ادھر ادھر کے تمام مشاغل بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عین ان دنوں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔ اپنے جدی مکان میں ایک کوٹھڑی میں سارا دن قرآن پاک یاد کرتے رہتے نماز کے اوقات میں کلام مجید پر رومال ڈال کر اٹھ کھڑے ہوتے اور مسجد میں نماز باجماعت ادا کر کے پھر اسی جگہ آ بیٹھتے۔ آخر اس لازوال دولت سے مالا مال ہوئے اور رمضان المبارک کی تراویح میں قرآن پاک سنایا۔

سلوک و تحصیل معرفت

خدا طلبی اور معرفت خداوندی کا شوق ازل سے آپ کے قلب مبارک میں ودیعت تھا۔ چنانچہ تحصیل علم اور نکاح کے بعد اب مرشد کامل کی تلاش ہوئی جو آپ کو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر لے آئی اور اس نعمت عالی سے سرفراز ہوئے کہ جس کی طلب میں سلاطین دنیا کو تخت و تاج کا چھوڑنا آسان معلوم ہوتا ہے

بازار عشق و شوق محبت کے جان فروش	لیکیں کر چل چلاؤ ہے دنیائے دون کا
سیکھیں طریق وصل و لقاء خدائے پاک	دل بیچ کر خرید لیں سودا جنون کا

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار دُربار میں

دہلی میں تعلیم کے دوران میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چار سال اس طرح یک جان و دو قالب رہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی چلے آرہے ہیں۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نانوتہ کے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ننھیال نانوتہ میں حضرت نانوتوی کے خاندان میں تھی اس طرح آپس میں خاندانی ربط بھی تھا، اور حضرت حاجی صاحب کی ہمشیرہ بھی نانوتہ بیاہی ہوئی تھیں اس لیے حضرت حاجی صاحب اکثر نانوتہ تشریف لاتے۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا محمد یعقوب دونوں حاضر خدمت ہوتے۔ حاجی صاحب کا ان دونوں نونہالان چمنستان علم کے ساتھ بچپن ہی سے غایت شفقت و محبت اور اخلاص کا معاملہ تھا۔ کتاب کی جزبندی دونوں بزرگوں نے حضرت حاجی صاحب سے سیکھی۔ حضرت نانوتوی جب وطن سے دہلی اور دہلی سے وطن جاتے تو تھانہ بھون ضرور حاضری دینے یہ ہمیشہ کا معمول تھا، اور اعلیٰ حضرت حاجی صاحب جب دہلی جاتے تو مولانا مملوک علی کے پاس قیام فرماتے۔ اس طرح شاگرد رشید مولانا مملوک علی حضرت نانوتوی کو حاجی صاحب کی زیارت ہوتی رہتی۔ حضرت نانوتوی تمام ساتھیوں سے عموماً اور خصوصی رفیق و محب حضرت گنگوہی سے خصوصاً حاجی صاحب کا تذکرہ کرتے رہتے۔

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی جو پہلی زیارت حضرت گنگوہی صاحب نے کی وہ یہیں دہلی میں مولانا مملوک علی کے ہاں کی۔ دونوں بزرگ دہلی میں جب پڑھتے تھے تو مولانا مملوک علی سے عرض کیا کہ مُسلّم پڑھا دیجئے۔ انہوں نے فرصت نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا۔ آخر شاگردوں کے اصرار پر ہفتہ میں دو دن مقرر ہوئے۔ ایک دن سبق ہو رہا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے یہ کون تھے یہ قصہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے بڑا لطف آئے گا

> ہفتہ میں (مُسلّم کے) دو سبق ہونے لگے تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی۔ ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آنکلے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب معہ تمام مجمع کے کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا کہ لو بھائی حاجی صاحب آگئے۔ حاجی صاحب آگئے اور (حضرت مولانا سے) مخاطب ہو کر فرمایا کہ "تو بھائی رشید اب سبق پھر ہوگا"۔ مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا۔ اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ "بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی رہ گیا"۔ مولوی محمد قاسم نے کہا ہا ہا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں اور "ایسے ہیں ایسے ہیں"۔ "ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈ لیں گے"۔ اوّل زیارت مجھے اس وقت ہوئی تھی اس کے بعد حضرت حاجی صاحب ہم دونوں کا حال دریافت فرمایا کرتے۔ اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں میں وہ دو طالب علم (مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی رحمہما اللہ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور بس [1]

حاجی صاحب کی کرامت

دوسری ملاقات تھانہ بھون میں ہوئی جبکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کئی طالب علموں کے ساتھ تھانہ بھون گئے اور سب طلبہ نے مسجد میں قیام کیا۔ حضرت گنگوہی کا جوتہ بدلا گیا اتنے میں حاجی صاحب آگئے اور فرمایا کہ جوتہ (بدلا ہوا) دکھاؤ۔ اور چراغ کے سامنے دیکھ کر فرمایا کہ "یہ تو حبیب حسن کا ہے"۔ (حالانکہ حاجی صاحب حبیب حسن کو بھی نہ جانتے تھے جوتا تو کیا پہچانتے) حضرت گنگوہی نے یہ ماجرا دیکھا تو کشش سی پیدا ہوئی کہ حاجی صاحب صاحب کشف آدمی ہیں (ان کی پہلی تعریفات ان کے ذہن میں تھیں) —— ویسے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ تھا کہ حضرت شاہ عبد الغنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونگا

---

[1] تذکرۃ الرشید ص۱۴

کیونکہ آپ صحاح کی کتب پڑھنے کے دوران ان کے تقویٰ و زہد اور اخلاص عمل کا خوب مشاہدہ کر چکے تھے مگر دل کی بات زبان پر نہ لا سکے اور بغیر کسی کے بیعت ہوئے تکمیل علوم کر کے گنگوہ آ گئے ۔[1]

تیسری ملاقات

ایک مرتبہ گنگوہ مسجد میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور پاس آ کر کھڑے ہو گئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے نظر اوپر اٹھائی تو ایک نورانی صورت نظر پڑی لیکن پہلی نظر میں پہچان نہ سکے اور پوچھا کون؟ جواب ملا ۔ امداد اللہ ۔ حضرت فوراً اٹھے اور تعظیم و تکریم سے پیش آئے اور اس سے زیادہ شفقت و محبت کا مظاہرہ حاجی صاحب کی جانب سے ہوا ۔[2]

چوتھی ملاقات

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی گنگوہ بالقصد آتے یا کہیں آتے جاتے گنگوہ اتفاقیہ قیام ہوتا تو مولوی سراج الدین کے مکان پر قیام فرماتے تھے جو ملازم ہونے کے باوجود نہایت پارسا اور متقی انسان تھے کبھی رشوت یا اس قسم کا کوئی پیسہ کسی سے نہیں لیا ۔ یہ حضرت گنگوہی کے رشتہ دار تھے ۔ ایک ملاقات ان کے ہاں ہوئی ۔ اسی ملاقات یا کسی اور ایسی ہی ملاقات میں حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "میاں رشید احمد اللہ کا نام سیکھنے اور کہیں مرید ہونے کی تمنا ہے یا نہیں ؟" مولانا نے جواب دیا کہ "حضرت جی تو بہت چاہتا ہے ۔" حاجی صاحب نے پوچھا کہ "کہاں اور کس طرف میلان ہے" ؟ مولانا نے جواب دیا کہ "اب تک جتنا غور و فکر کیا دو حضرات میں سے ایک کا غلام بنوں گا یا حضرت شاہ عبد الغنی صاحب کا یا آپ کا ۔" اعلیٰ حضرت مسکرائے اور یہ فرما کر ٹال دیا کہ "ہاں صاحب شاہ عبد الغنی صاحب عالم بھی مشہور ہیں محدث ہیں علماء تو علماء ہی کی طرف جھکتے ہیں مجھے کیوں شامل کرتے ہو ۔ میں بے چارہ پڑھا نہ لکھا" ـــــ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت نے بظاہر تو اپنی طرف سے رغبت کم کی مگر اندر ہی اندر دل کھینچ لیا ۔ اس گفتگو کے بعد آپ کا ارادہ حاجی صاحب کے متعلق پختہ ہو گیا ۔[3]

تھانہ بھون حاضری اور بیعت

تھانہ بھون میں ایک بڑے عالم ۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے : ان کی ایک تحریر کسی نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجی جس میں لکھا تھا کہ "روضہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں جو جگہ ایک قبر کے لیے چھوٹی ہوئی ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مدفون ہوں گے اور یہ امر قطعی ہے اس کا منکر ایسا ہے اور ویسا ہے ۔" ـــــ حضرت مولانا نے بجائے تصدیق و تصویب کرنے کے لکھ دیا کہ "سارا ثبوت باحادیث و اخبار احاد ہے اس لئے علم ظنی حاصل ہو گا قطعیت کا ثبوت دشوار ہے ۔" حضرت شیخ محمد صاحب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو غضب میں آ گئے کہ ایک طفل مکتب نے میرا رد کر ناچاہا اسی حالت میں ایک رسالہ اپنے موقف کی تائید میں لکھ کر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیا ۔ مولانا نے دیکھا تو سوائے ان احادیث و آثار کے ذکر اور اسناد کی تفصیل کے جن میں یہ مضمون وارد ہے اور کچھ بھی نہ تھا ۔ اور اس کا اقرار مولانا نے اپنی پہلی تحریر میں ہی کر لیا تھا ۔ مولانا نے اس رسالہ کے پشت پر لکھ دیا کہ

> میں نے نہ احادیث کا انکار کیا نہ اس کا دعویٰ کہ یہ مضمون ثابت نہیں ہاں میں نے یہ لکھا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اس بحث کی جملہ اخبار وارد احاد ہیں ان سے مضمون کی قطعیت کیونکر ثابت ہو جائے گی جو میرا شبہ ہے اس کا رسالہ میں جواب نہیں اور جو احادیث مذکور ہیں ان کا میں منکر نہیں ۔[4]

---

[1] تذکرۃ الرشید ص۴۱ ۔ [2] بحوالہ ایضاً ص۴۲ ۔ [3] ایضاً ص۴۳ ۔ [4] تذکرۃ الرشید ص۴۴ ۔

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب اگرچہ بہت نیک صالح اور فاضل شخص تھے علم کا غلبہ تھا اور علم کے لیے تفقہ لازم نہیں اس مسئلہ میں چوک گئے تھے۔ مگر اپنی غلطی سمجھ میں آئی لیکن چونکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بات مدلل تھی لہذا جواب بھی پھر نہ دے سکے۔ البتہ دو چار جگہ کہا کہ کل کا بچہ مجھے طفل لکھتا ہے۔ حضرت مولانا نے جواب دیا کہ نہیں میں نے تو آپ کی اس شعر میں تعریف کی ہے کہ شہ سوار ہونے کے باوجود گر گئے بچہ کیا گرے گا اور کہاں سے گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلتا ہے۔ بہر حال بات چل نکلی تھی حضرت مولانا کا علمی جوش جسے حمیت دین کہیے آپ کو تحریک کرتا تھا کہ آپ بالمشافہ تھانہ بھون جا کر حضرت مولانا شیخ محمد سے بات کریں ۔ ایک سفر برات کا پیش آیا۔ اس سفر میں حضرت مولانا سے بات چیت اور حضرت حاجی صاحب سے درخواست بیعت کا ارادہ کر لیا۔ رسالہ ساتھ لے لیا اور برات کی واپسی پر تھانہ بھون چلے گئے۔ جلدی واپس آنے کا خیال تھا لہذا جو کپڑے پہنے ہوئے تھے ان کے علاوہ کوئی اور جوڑا ساتھ نہ تھا۔ اور اس بات چیت کرنے کے لیے کئی دفعہ تصحیح نیت کی۔ استخارہ کیا اور غور و فکر کے بعد ارادہ کیا کہ حق کے اظہار کے لیے جا رہا ہوں۔

ظہر کی نماز کے بعد تھانہ بھون پہنچے حضرت حاجی صاحب سہ دری میں تلاوت قرآن کر رہے تھے حضرت مولانا حاضر ہوئے۔ سلام مسنون کر کے بیٹھ گئے۔ حاجی صاحب نے تلاوت قرآن کے بعد پوچھا کہ کیسے آئے آپ نے فرمایا مناظرہ کے لیے آیا ہوں۔ اعلیٰحضرت نے فرمایا! "نا نا! ایسا ارادہ نہ کرنا میاں وہ ہمارے بزرگ ہیں"۔ بس مباحثہ کا تو یہیں فیصلہ ہو گیا۔ مولانا نے عرض کیا کہ "حضرت اگر آپ کے بڑے ہیں تو میرے بھی بڑے ہیں"۔ اس کے بعد گفتگو ہوتی رہی اور مناسب الفاظ میں بیعت ہونے کی درخواست کی۔ حضرت حاجی صاحب نے تامل ہی نہیں کیا بلکہ طلب صادق دیکھنے کے لیے انکار فرما دیا۔ مولانا نے بہت اصرار کیا مگر آپ انکار کرتے رہے۔ مولانا کے ہاں علمی غرور و نخوت تام کو بھی نہ تھی سراپا شوق و اخلاص بنکر آئے تھے۔ حاجی صاحب استغنا ظاہر کرتے تھے اور یہ احتیاج و افتقار ظاہر کرتے رہے۔ دو تین دن گزر گئے کہ حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ[۵] نے آنے کا سبب اور حال دل پوچھا تو آپ نے بے اختیار فرمایا کہ "جدھر دل کا میلان ہے وہ قبول نہیں کرتے دوسرے اپنی طرف کھینچتے ہیں"۔ حافظ صاحب نے دلاسہ دیا کہ "ابھی جلدی کیا ہے چند روز ٹھہرو یہاں کے حالات دیکھو"۔ آخر جب آپ کی پختگی ہر طرح ظاہر ہو گئی تو حافظ صاحب نے اعلیٰحضرت کی خدمت میں سفارش کا اجر حاصل کیا اور دو تین روز بعد اعلیٰحضرت نے آپ کو سلاسل اربعہ میں بیعت فرما لیا۔

---

۵ حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت حاجی صاحبؒ۔ شیخ محمد محدث تھانویؒ اور حافظ محمد ضامن شہیدؒ ہم زمانہ اور باہم رفیق تھے۔ یہ تینوں حضرات عام طور پر اکٹھے رہتے۔ حافظ ضامن صاحب کی تاریخ پیدائش حاجی صاحب سے چند سال قبل ہو گی۔ صحیح معلوم نہیں ہو سکا۔ حافظ صاحب میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے اور سلوک و معرفت میں بہت اونچے مگر کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے اگر کوئی بیعت ہونے کے لیے آتا تو فرماتے

"بھائی اگر بیعت ہونا ہے تو حاجی صاحب کے پاس جاؤ وہ خانقاہ میں اندر بیٹھے ہیں اور اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہو تو مولانا شیخ محمد محدث کے پاس جا کر پوچھو اور اگر حقہ پینا ہے تو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

آپ کا حلیہ رنگ گورا سفید۔ چیچک کے کچھ داغ چہرے پر تھے لیکن خوشنما معلوم ہوتے تھے قد درمیانہ درجے کا تھا اور نہایت متناسب۔ خوبصورت اور چہرے سے رعب نمایاں۔ آنکھوں میں سرخی جھلکتی تھی سینے پر سیاہ بال تھے۔ بھویں کشادہ۔ سر منڈائے رہتے۔ گردن بلند چہرہ متبسم رہتا۔ بے تکلف سیدھے سادھے بزرگ اور ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے ——— اور عادات و اخلاق یہ تھیں کہ ظاہر و باطن بالکل ایک تھا۔ نادان و منافق سے کچھ باک نہ تھا۔

(باقی برصفحہ آئندہ)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ علماء میں سے پہلے آدمی تھے جنہوں نے حضرت حاجی صاحب سے بیعت کی تھی اس کے بعد تو اس کثرت سے علماء بیعت ہوئے کہ اس کی مثال شاید دنیا میں ایک آدھ ہی مل سکے۔ سات آٹھ سو کے قریب علماء حاجی صاحب کے مرید تھے عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ——— اور اس چیز کی بشارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاجی صاحب کو ایک خواب کے ذریعے دے چکے تھے اور یہ اسی بشارت کا ثمرہ تھا اور بشارت حاجی صاحب کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے تھی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ابھی تک بیعت نہیں ہوئے تھے: یہ عجب قصہ تھا کہ حضرت نانوتویؒ کے تعریف کرنے سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان ہوا۔ لیکن حضرت نانوتویؒ کو حضرت گنگوہیؒ نے سفارش کر کے بیعت کرایا۔

چالیس دن میں خلافت

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن کے ارادہ سے تھانہ بھون گئے تھے لیکن حضرت حاجی صاحب کے دربار میں پہنچ کر کچھ ایسے شیخ کی محبت میں گرفتار ہوئے کہ خود ہی ایک دفعہ فرمایا کہ "پھر تو مرمٹا" ظاہر ہے کہ جو محبوب محبوبِ حقیقی سے ملا دے۔ اس سے زیادہ محبوب اور کون ہوگا۔ اور بقول صاحب تذکرۃ الرشید حقیقت میں حضرت مولانا اس کے بعد مرمٹے آپ نے اپنے نفس کو مار دیا ہوائے نفس کو ملیامیٹ کر دیا۔ جس پاک نام کو سیکھنے کا قصد کیا تھا اس میں کھپ گئے: فنائیت حاصل کی اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ * باوصف خانہ داری اور اہل وعیال سے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے۔ گویا فکر دنیا پاس بھی نہ آیا تھا دانائے عصر اور علمائے زمانہ ہر ایک آپ کا مخلص و منقاد تھا۔ ہر وقت عشق الٰہی میں مست و سرشار رہتے تھے دل کی کیفیت چہرۂ مبارک پر معلوم ہوا کرتی تھی محبت الٰہی کا صورتِ شریف پر ہر آن ظہور تھا۔ میاں جی سے بیعت ہوئے تو آپ کے ارشاد پر کہ سوا لاکھ آیت کریمہ پڑھو۔ عصر سے لے کر دوسری عصر تک ورد پورا کر لیا اور تمام اشغال بہت جلد پورا کر لیے۔ کئی سال تک آدھ پاؤ کے قریب روزانہ کھانا کھاتے رہے۔ فنا فی الشیخ ہو گئے تھے۔ ۱۵ ار شعبان سے آخر رمضان تک ہر رات مشغول رہتے۔ شب کو سونا بالکل موقوف کر دیتے تھے۔ چند ہی دن میں کمال جذب کے ساتھ سلوک کی تمام منازل طے کر لیں۔ اور اس قدر کمال توحید اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از بیان ہے اس وقت تمام درویش اہل حال فن تصوف میں پیشوا سمجھتے اور خاص و عام دریافت حال و مقام میں حیران تھے ——— مولانا شیخ محمد محدث تھانوی نے پہلے حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سے کسب فیض کیا (آپ مولانا کے ماموں بھی تھے) آپس میں ہم عمر تھے۔ بعد ازاں میاں جیؒ سے بیعت ہوئے۔ حضرت حافظ اتباع شریعت اور زہد و تقویٰ میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ ادنیٰ بدعت کو بھی اکھاڑ پھینکتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں احتیاط پر عمل کرتے۔ اوامر و نواہی میں شان فاروقی عروج پر ہوتی تھی کہ نسباً فاروقی تھے۔ اخفائے حال کو پسند کرتے تھے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت پیران کو تنبیہ کی جیسا کہ حاجی صاحبؒ کے ذکر میں گزر چکا۔

شہادت اور کشف شہادت

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی کے جہاد میں حصہ لیا آپ کو اپنی شہادت کا کشف ہو چکا ہے۔ چنانچہ آٹھ دس روز پہلے اپنے ایک مریدؑ کو خط لکھا (فارسی میں) کہ " لازم کہ بغور مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچا دو ایسا نہ ہو کہ توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے باقی حال بروقت بیان کیا جائے گا۔"

شہادت کا دولہا

میدان شہادت میں جانے سے پہلے آپ نے خوب زیب و زینت کی۔ غسل کر کے نیا لباس زیب تن کیا جو کئی دن سے تیار کر رکھا تھا۔ نعلین اگرچہ بوسیدہ نہ تھیں، مگر وہ بھی نئی پہنیں۔ خوشبو ملی سرمہ لگایا دستار بیچدار، سپاہیانہ وضع شمشیر لے کر شربت دیدار کی تمنا میں علم جوانمردی اٹھا کر مردانہ اور مشتاقانہ بر سر معرکہ جان بحق تسلیم فرمائی۔ شہادت کے سال اکثر فرمایا کرتے ——— " دیکھو حوریں پیالے لیے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں جس کا جی چاہے لے لیوے" ——— حافظ صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

ؑ یہ مرید حکیم ضیاء الدین تھے

اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ فناء عن الفنا پر پہنچے کہ اپنی فنائیت سے بھی بے خبر اور فانی محض بن گئے۔" —— حاضری کے وقت مختصر قیام کا خیال تھا، مگر یہ خیال کرتے کرتے کہ آج نہیں کل چلا جاؤں گا پورا ایک چلّہ یعنی چالیس دن وہیں گزار دیئے۔ چالیس کے عدد کو تزکیہ قلب کے باب میں خاص دخل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا مگر دس راتیں اور ملا کر چالیس راتیں پوری کیں۔ حضور علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت کے مقام پر سرفراز کیا گیا۔ مدینہ منورہ کے قیامِ پیغمبر کو خلافتِ راشدہ کے تیس سال میں جمع کیا جائے تو چالیس کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ چالیس سال کے بعد انسان کو اعمال و کردار کے لحاظ سے مثالی شخصیت بن جانا چاہیے۔ اسی طرف شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے ؎

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت   مزاج تو از حالِ طفلی نگشت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ٭ بوقت شہادت یعنی نزع کے وقت میرے پاس رہنا۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ آپ کو گولی لگنے کے بعد قریب کی مسجد میں لے گئے۔ اور اپنے زانوؤں پر سر رکھا اور اسی عالم میں یہ شہید الفت اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملا جس سے ملنے کے لیے بے حد بے چین تھا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ؎

ان کے محاسن میں وہ چمکے عذار   شعلے کی جو دودِ سیہ میں بہار

سینے پہ کچھ بال سیہ ہیں نمود   ہیں یہ اسی آتشِ سوزاں کے دود

اور یہ سراپا شہادت کے وقت کا ہے گویا حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سینہ اور داڑھی کے بال اس وقت سیاہ تھے۔

تاریخ شہادت

آپ نے ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو سوموار کے دن ظہر کے وقت شہادت پائی۔ آپ کی شہادت پر جو تاریخیں کہی گئیں وہ یہ ہیں :-

شہادت مرشد ہادی ۱۲۷۴ھ   (از محمد علاؤالدین رام پوری)

مرزا غالب کے شاگرد مولوی عبد السمیع صاحب بیدل رام پوری نے یہ اشعار لکھے جس سے معرکۂ جہاد پر بھی تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے:-

شہید ہو گئے صد من علی پاک نہاد   جواب جن کا نہ تھا کوئی نسل آدم میں

شہید ہو گئے مگر اک تماشا دکھلا کر   لہولہان کیا دشمنوں کو اک دم میں

نہ چھوڑی نام کو گردن کہیں نصاریٰ کی   گلو بریدہ ہے سکہ بھی ان کا درہم میں

جو مارے تیر تو لگتے ہی جا لیا گوشہ   ہزاروں کافر بدکیش نے جہنم میں

خدا کو پیارے ہوئے آخرش شہید ہوئے   نہ دل میں تاب ہے باقی نہ کچھ تواں ہم میں

جو پوچھا سن شہادت کہا فلک نے کہ ہائے   ہوئے شہید وہ شاہ جری محرم میں

دوسری تاریخ بیدل صاحب نے یوں نکالی :-

بیدل آن وقت کہ حافظ ضامن   رفت و آراست بجنت مسند

شاہ رضواں شد و گفت ایں تاریخ   حافظ مصحف ایزد آمد !

میاں جی عبد الغفور :- حوریں سب مل کر کے بولیں واہ وا   پیر کے دن خلد میں آگئے پیر

(باقی بر صفحہ آئندہ)

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی ہی رات ذکر کیا تو صبح کو حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ
"تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کرنے والا ہو"۔
اگرچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کے وقت کہا تھا کہ
"حضرت مجھ سے ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہو سکتا"۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ؛ ان میں سے ایک یہ ہے :۔

شہ بہشت برین بود نیز از پئے سال　　بفال طرفہ برآمد شہ بہشت برین

حضرت ضامن شہید کے متعلق یہ تمام معلومات "حیات امداد" مولفہ پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی سے لی گئی ہیں۔ اور آپ نے رسالہ "مونس مہجور" مولفہ حکیم ضیاء الدین صاحب (یکے از مریداں حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ) سے اخذ کر کے اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ جو مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں موجود ہے۔ حکیم صاحب موصوف حضرت ضامن شہیدؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ اور مولانا شیخ محمد محدث تھانوی رحمہم اللہ اجمعین اصحاب ثلاثہ کی جدائی پر نثر میں جو لکھتے ہیں ملاحظہ ہو :۔

واحسرتا کدھر گیا اور کیا ہوا وہ مجمع خیر اور جماعت محبت آمیز اور وہ صحبت انگیز اور وہ مکاں دل آویز یعنی مسکن حضرت اقدس کہ اب ویران ہے باوصف اس خستہ حال کے دیکھو وہاں کیا جلوۂ حق ہے اور اس اجڑے مکان میں کیا دل کشادگی ہے خس و خاشاک سے بوئے گل اور نغمۂ بلبل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اکثر اہل دل وہاں جا کر مسرور ہوتے ہیں اور فیض اٹھاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے

بزمینیکہ نشاں کف پائے تو بود　　سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

حافظ صاحب کی جدائی میں خود مرید صادق (حکیم صاحب موصوف) کا کیا حال ہوا وہ بھی انہی کی زبانی سنیئے :۔

آتشِ مفارقت جی جلائے دیتی ہے دلِ مہجور گھبراتا ہے۔ سوزشِ دردونی کو بیان کیا چاہتا ہے اور کوئی ذکر خوش نہیں آتا اس ہنگامے میں جلال کبریائی کو جوش و خروش تھا اور مدہوشان شیون الٰہی کو بھی ایک ولولہ اور ذوق و شوق تھا چنانچہ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ نے بھی ضرر دنیائے دنیہ کا کچھ خیال نہ فرمایا کمر ہمت چست باندھ کر امرِ حق پر جان و مال کو قربان کیا اور ذوق و شوق دیدار الٰہی میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا تردد نہ ہوا اور تمنائے شربتِ شہادت و جام کوثر میں ہماری بے کسی کا بھی کچھ خیال نہ فرمایا سبحان اللہ! کیا ہمت مردان، مدد خدا کا تماشا دکھلا کر مردانہ اور مشتاقانہ چوبیسویں محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو برسر معرکہ ہو کر جام شہادت نوش فرمایا واہ! کیا خوب داد ہمت دے گئے (دوہڑہ)

ساجن دکھیا کر گئے اور سکھ کو لے گئے ساتھ　　ہم بچھوا دے کٹے اور پھر نہ پوچھی بات
رفتی و مرا خبر نکردی　　بر بیکسیم نظر نکردی

اسی رسالے میں حکیم صاحب لکھتے ہیں :۔

آہ! جس وقت وہ صحبت یاد آتی ہے اور وہ صورتِ شریف رحمۃ اللہ علیہ نظر میں پھر جاتی ہے اس دل ناشاد پر جو کچھ گزرتا ہے بیان نہیں ہو سکتا ہر چند تڑپ تڑپ کر جی چاہتا ہے کہ مر جاؤں۔ اس ہر دم کی جانکنی سے چھٹ جاؤں مگر کچھ بس نہیں چلتا اور از خود مرا نہیں جاتا، ناچار کلیجہ پکڑ بے اختیار اپنی زندگی پر رو دیتا ہوں جب کہیں صورت مراد کی نہ بندھی اور کچھ بس نہ چلا بجز عرض حاجت کوئی چارہ نہ دیکھا اب اکثر یہ دعا ورد زبان اور (باقی بر صفحہ آئندہ)

ر اعلیٰ حضرت نے تبسم کے ساتھ فرمایا تھا کہ "اچھا کیا مضائقہ ہے"۔ اور مولانا نے جواب دیا تھا کہ "پھر تو مرمٹا"۔ لیکن حاجی صاحب جب آخر شب بیدار ئے تو مولانا کی آنکھ بھی کھل گئی۔ دو چار کروٹیں بدلیں کہ نیند آجائے، مگر اعلیٰ حضرت کی توجہ کام کر چکی تھی۔ مضطربانہ اٹھے وضو کیا مسجد کے ایک گوشے میں اعلیٰ حضرت نوافل تہجد کے بعد ذکر و شغل میں مصروف تھے اور دوسرے گوشے ہمارے ممدوح حضرت گنگوہی اس کام میں مصروف تھے۔ کہ جس کام کے نہ کرنے کی اجازت شیخ سے لی تھی۔ ایک ہی رات میں ایسی کایا پلٹ ہوگئی کہ بقول حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

"تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کرنے والا ہو۔"

اور پہلی ہی شب محبوب کے ذکر سے ایسے لطف اندوز ہوئے کہ پھر ساری عمر کا وظیفہ بن گیا۔ خود فرماتے ہیں :-

"اس دن سے ذکر جہر کے ساتھ مجھے محبت ہوگئی پھر کبھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہا اور نہ کوئی وجہ شرعی اس کی ممانعت کی معلوم ہوئی۔"

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- مونس جاں ہے نہ

یہ غلام آپ کا اے شاہ محمد ضامن — کب تلک حسرتِ دیدار میں کاٹیگا دن۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے متعلق پینسٹھ اشعار کہے جن سے چند یہ ہیں :-

نہ پوچھو ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم جاں سے — ہمیں پالا پڑا ہے اب کے غمہائے دوراں سے
کہیں سے مول لے دے دل مجھے کچھ اور اے ہمدم — کہ اٹھنے کا نہیں بارِ غم اس قلبِ پریشاں سے
چھپا آنکھوں سے وہ نورِ مجسم خاک میں جب کر — کہ جس کا خالِ پا بہتر تھا اس مہرِ درخشاں سے
شہید راہِ حق حافظ محمد ضامن چشتی — بنایا تھا جسے حق نے ملا کہ عشق و عرفاں سے
فراقِ یار میں جینا تعجب ہے دلے ہمدم — اجل سے اٹھ سکے شاید نہ ہم بارِ گناہاں سے
نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو — سنیں گے پھر بھی وہ آواز ان لبہائے خنداں سے
کسی کا کیا گیا ہر رنج فرقت کی مصیبت کو — کوئی جا کے مگر پوچھے ضیاء الدین نالاں سے
ہوئی ہم سے خطا یا تھی کشش حبِ الٰہی کی — کوئی پوچھے سبب رحلت کا اس سالارِ خوباں سے
گناہوں کے سبب گر ہم نہیں تھے لائقِ صحبت — تو ہم کو بخشوا لینا تھا کچھ کہہ سن کے رحماں سے
اگر ممنوع تھا ہم سے گنہگاروں کا لے چلنا — تو تنہا اس طرح جانا بھی نازیبا ہے سلطاں سے
اگر قاصد مجھے کوئی وہاں تک کا بہم پہنچے — تو کہلا کر کے بھیجوں یوں میں اس سالارِ نیکاں سے
مبارک ہو تمہیں وصلِ خدا خلدِ بریں میں، پر — ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا تمہیں جانا نہ تھا یاں سے
غمِ فرقت میں یاں گذرے ہے پر کچھ بن نہیں پڑتی — تمہیں فرصت نہیں واں لذتِ دیدارِ یزداں سے
بنے تھے یوں تو ہم روزِ ازل سے غم اٹھانے کو — نہ تھی پر یہ خبر ہوں گے الگ بھی تیرے داماں سے
تمہارے ہجر میں جانِ جہاں کچھ بن نہیں آتا — دلِ حسرت زدہ گھبرائے ہے سیرِ گلستاں سے
دلِ مایوس کی کوئی نہیں صورت تسلی کی — مگر ہاں سر نکالو تم مگر گنجِ شہیداں سے
تمہاری بزم پر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو — تو اک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلبِ سوزاں سے

یہ تو پہلی شب کا صلہ تھا۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد آٹھویں دن ہی حضرت شیخ کی جانب سے دوسری خوشخبری یہ سنائی گئی کہ

"میاں مولوی رشید احمد جو نعمت حق تعالیٰ نے مجھے دی تھی وہ آپ کو دے دی آیندہ اس کو بڑھانا آپ کا کام ہے"

کپڑوں کا جوڑا ایک ہی تھا۔ میلا ہونے پر خود ہی دھو لیتے۔ آخری دنوں میں بخار ہوگیا اور مولانا گنگوہیؒ اس خیال سے کہ شیخ کو تیمار داری کی تکلیف دینا گستاخی ہے اور گھر سے تقاضے بھی شروع ہو گئے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے بخوشی اجازت دے دی اور آپ کو شیخ نے مع متعلقین دور تک مشایعت کر کے الوداعی کے وقت ایک طرف کر کے کہا کہ

"اگر تم سے کوئی بیعت کی درخواست کرے تو اس کو بیعت کر لینا"

حضرت امام ربانی مولانا گنگوہیؒ نے عرض کیا ——— مجھ سے کون درخواست کرے گا ——— اعلیٰ حضرت نے فرمایا ——— تمہیں کیا جو کہتا ہوں کرنا" ——— یہ تیسرا انعام تھا جو اس پہلی حاضری کی آخری ملاقات کے وقت عطا ہوا۔ لوگ برسوں مشائخ کی خدمت میں رہ کر مجاہدہ و ریاضت کی زندگی بسر کرنے میں پھر بھی کچھ ملا ملا نہ ملا۔ لیکن بمصداق

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ دولت ایک چلہ میں مل گئی۔ حضرت گنگوہیؒ گویا ایک صاف شفاف آئینہ تھے جو آفتاب کے مقابل رکھ دیا گیا۔ صاحب تذکرۃ الرشیدؒ رقم فرماتے ہیں :-

کیا خدا کی دین ہے کہ جس چلہ میں بیعت ہوئے اسی چلہ میں صاحب نسبت بنے خلیفہ ہوئے اور چلتے چلتے اصرار و تقاضہ کے ساتھ اعلیٰ حضرت کی زبان سے یہ مبارک ارشاد و حکم سنا کہ دیکھو جو درخواست کرے اسکو ضرور بیعت کر لینا۔ یہی سفر سفرِ بیعت تھا اور یہی سفر سفرِ حصول خلافت۔ یہی قلیل زمانہ زمانۂ سعی تھا اور یہی چند یوم ظفر و کامیابی، روانہ ہوئے تھے۔ مولانا شیخ احمد صاحب سے مباحثہ کرنے اور تبعاً و ضمناً انجان و ناواقف بن کر اللہ کا نام سیکھنے کے لیے، اور آئے پڑھے لکھے عالمِ طریقت مجاز حقیقت شیخ عصر بن کر دوسروں کو اللہ کا نام سکھانے اور گنگوہ کو مہبطِ انوار و مرجع خلائق بنانے سے

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال ——— کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے [1]

گنگوہ واپسی

حضرت مولانا گنگوہ واپس تشریف لائے تو حالت بالکل بدل چکی تھی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے پہننے کا ہر وقت استغراق و محویت اور تفکر کے عالم میں رہتے۔ اکثر تمام شب روتے گزر جاتی۔ والدہ ماجدہ نے نیلے رنگ کی رضائی تیار کی تھی کہ مسجد کو شب آتے جاتے خنکی سے محفوظ رکھے مولانا کی گریہ و زاری کے سبب آنسوؤں کی اس قدر کثرت تھی کہ رضائی سے پونچھتے پونچھتے اس کا کئی جگہ سے رنگ تبدیل ہوگیا۔ آپ آخر شب مسجد میں اس انداز اور جذب و کیفیت سے ذکر جہر کرتے

"ایسا معلوم ہوتا کہ ساری مسجد کانپ رہی ہے خود پر جو حالت گزری ہوگی اس کی تو کسی کو کیا خبر" [2]

---

[1] تذکرۃ الرشید ص ۵۱۔

[2] تذکرۃ الرشید ص ۵۲ یہ بیان مولانا ابوالنصر کا ہے جو حضرت مولانا کے ماموں زاد بھائی اور طفولیت کے پرانے رفیق و غمگسار تھے۔

شیخ کی گنگوہ آمد

اسی اثنا میں حضرت حاجی صاحب گنگوہ تشریف لائے اور مرید کو اپنے مرشد کی میزبانی اور خدمت کرنے کا موقعہ ملا۔ اور اب تو ساری زندگی کا تعلق قائم ہو گیا تھا اور مخلص مسترشد کا جو تعلق صحیح مرشد سے ہونا چاہیے اور اچھے شیخ کی جو عنایات قابل اور ذی استعداد مرید پر ہونا چاہئیں اس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ہفتہ گنگوہ میں گزرتا تو عشرہ تھانہ بھون میں۔ بغرض ہر دس پندرہ دن بعد کئی کئی دن کے لیے تھانہ بھون جا کر شیخ کی خدمت میں حاضری دیتے۔

معاش

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ طالب علمی کا دور گزار کر اب متاہل زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی ایسا کام چاہتے تھے کہ جس میں دین کی خدمت بھی ہو اور گزران کی صورت بھی۔ ایک جگہ سے ترجمہ قرآن پاک پڑھانے کی بمشاہرہ سات روپے ماہوار پیش کش ہوئی۔ مگر حاجی صاحب سے اجازت نہ ملی۔ اس کے بعد سہارنپور کے مشہور رئیس اعظم نواب شائستہ خاں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے دس روپے ماہوار پر آپ کو بلایا اور آپ اگرچہ اہل بصیرت کے نزدیک بڑے بیش قیمت تھے، مگر آپ نے اپنی ہستی کو ختم کر دیا تھا۔ دس روپے گذارے کے لیے کافی سمجھ کر چلے گئے اور اس کو منعم و رزاق خدا کا احسان سمجھ کر قبول فرما لیا۔ یہ ملازمت یا نوکری چھ ماہ کر کے چھوڑ دی۔ اور وہ توکل اختیار کیا جس کی نظائر دنیا میں کہیں نظر آئیں گی

رہن زمینوں کی واپسی

سہارنپور سے واپسی پر آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جن لوگوں نے زمین کے ٹکڑے آپ کے دادا کے پاس رہن رکھے ہوئے تھے وہ واپس کیے۔ رہن کی صورت یوں پیدا ہوئی تھی کہ آپ کے والد ماجد مولانا ہدایت اللہ جائے ملازمت گورکھپور سے اپنے والد قاضی پیر بخش کو پس انداز کی ہوئی رقم بھیج دیتے اور لکھ دیتے کہ مکان یا دوکان جو چاہیں خرید لیں۔ مگر دادا اتنے متشرع نہ تھے انہوں نے لوگوں کو رقم دے کر ان کی زمینیں وغیرہ رہن لینا شروع کر دیں ـــــــ حضرت مولانا جب پچیس سال کی عمر کو پہنچے اور خود مختار اور وارث ہوئے تو آپ نے تمام کاغذات وصولی و آمدنی اور رہن کے نکال کر حساب لگایا۔ اگر کسی کو دی ہوئی رقم کے برابر اس زمین سے آمدنی ہو گئی تھی تو کاغذات بیباک کر دیئے اور زمین واپس کر دی اور اگر آمدنی کم ہوئی تو زمین واپس کر دی اور رقم معاف کر دی اور اگر آمدنی زائد ہو گئی تو ان کو زائد رقم واپس کر دی کہ آپ نے جتنا قرضہ لیا تھا آپ کی زمین کی آمدنی اس رقم سے زائد ہو گئی ہے ہم اپنی رقم تو آپ سے کیا لیں کہ آپ کی زمین سے ہمیں اس قرض کے برابر آمدنی ہو کر یہ زائد ہو گئی ہے یہ آپ کی امانت ہے جو آپ کو واپس کرتے ہیں اور ساتھ ہی آپ کی زمین آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ اس محاسبہ و رہن چھوڑنے میں جو روپیہ دینا پڑا اس میں گھر والی کا سارا زیور فروخت کرنا پڑا۔ اس طرح تمام قرضدار بلا گمان و امید اپنی زمینوں کے دوبارہ مالک ہو گئے۔ اور حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے دیانت و امانت کے طفیل قرضوں سے سبکدوش ہو کر از سر نو اپنی زمینوں کے مالک ہو گئے [۱]

---

[۱] کسی ضرورت مند کو بغیر کسی لالچ یا مفاد کے محض ہمدردی اور انسان دوستی کے خیال سے رقم قرض دینا خیرات کے برابر بلکہ اس سے زیادہ ثواب کا باعث ہے اسے قرض حسنہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ضرورت مند کو قرضہ دیتے ہوئے خیال ہو کہ اس سے کوئی چیز بطور ضمانت لے لی جائے مثلاً زمین مکان وغیرہ تو اس شکل کو رہن کہتے ہیں۔ قرضدار جب قرض واپس کر دے تو اس کو اس کی ضمانت صحیح حالت میں واپس کر دی جاتی ہے اور اس دوران میں رہن کردہ چیز یا جائیداد سے کسی قسم کا مفاد حاصل کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح سود۔ اس رہن کردہ چیز سے ہونے والی آمدنی کا باقاعدہ حساب رکھا جائے اور جب قرضدار قرض کا روپیہ واپس کرے تو اس آمدنی کا حساب کر کے اتنی رقم چھوڑ دی جائے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں رہن کردہ چیز سے ہر طرح کے مفاد حاصل کرنے کو شیر مادر کی طرح جائز سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً زید اپنی دکان رہن کر کے بکر سے چھ ہزار قرض لیتا ہے تو بکر سو روپیہ ماہوار کرائے پر اس دکان کو دے کر وہ کرایہ اپنی جیب میں ڈالتا رہتا ہے پانچ سال کے بعد اگر زید قرض لی ہوئی رقم واپس نہیں کرتا تو بکر کو از خود زید کی دکان یہ کہہ کر واپس کر دینا چاہیے کہ میرا قرضہ تمہاری دکان کے کرایہ سے پورا ہو گیا ہے لیکن ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ رہن کردہ چیز کی آمدنی ہماری اور وہ روپیہ اسی طرح زید کے ذمہ جب تک وہ ادا نہ کرے۔ (ارشد)

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے زمینیں بغیر قرضہ لیے واپس کرکے کہ ان سے آمدنی قرضے کے برابر ہوگئی تھی۔ یا قرضہ سے زائد آمدنی کو
مع زمین واپس کرکے جو مثال قائم کی تھی اس زمانہ میں الشاذ کالمعدوم ہے اور اگر کہیں ہے تو وہ انہی حضرات کے تربیت کردہ افراد میں ہے اور شاید
ہی کہیں ملے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا جو حضرت کی بے حد پریشانی کا باعث تھا۔ وارث و خود مختار ہوتے ہی اس کا حل فرما کر رب العالمین کی عبادت
کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے پر ساری توجہ مرکوز کردی۔ اور اس میں اس قدر محنت کی کہ اس سے آپ کی جسمانی حالت ایسے درجے کو پہنچ گئی کہ دیکھنے
والے خیال کرتے تھے کہ کسی اندرونی بیماری اور مہلک مرض کا شکار ہیں۔ بے خبروں کو کیا علم کہ اس انسان نے ایسے شافیٔ مطلق اور حکیم سے لو لگا
رکھی ہے کہ جس سے لو لگانے کے بعد تمام روگ ختم ہوجاتے ہیں۔ اور وہ خود ایسے مقام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کہ بے شمار روگی لوگ اس کی توجہ سے
شفا پائیں گے۔

اب حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس مقام پر آگئے تھے کہ بلاخوف لومۃ لائم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کریں۔ ان میں ہمت
و دلیری۔ مروت و شجاعت اور صاف گوئی و حق گفتاری کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ اگرچہ وہ بچپن ہی سے اس کے حامل تھے۔ لیکن اب صحبتِ شیخ نے گویا سان
پر چڑھا کر آب و تاب کو تیز کردیا تھا ؎

صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف

جب انسان حق کی تلوار بن کر لوگوں کے سامنے آتا ہے تو اس میں قہاری و غفاری اور قدوسی و جبروت کا عکس نظر آتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے مقاصد و احکام
کا معیار و عکاس بن جاتا ہے۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں رہتا اس کی کوئی اپنی خواہش نہیں ہوتی۔ جو کچھ کرتا ہے کتاب و سنت کی روشنی میں کرتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان

حالات کی ناسازگاری اور تکالیف و مصائب کے پہاڑ اس کے وقار و تمکنت کے آگے سرنگوں ہوجاتے ہیں۔ خطرناک سے خطرناک حالات اس کے
عزائم کو متزلزل نہیں کرسکتے۔ وہ تاریکیوں میں ایمان کی شمعیں جلاتا اور طوفانوں سے ٹکراتا ہے۔ اس کے ابتدائی مراحل زندگی میں لوگ اس کو سمجھتے
ہیں کہ یہ غریب و تنگدست انسان کیا کرسکتا ہے یہ کیا اور اس کی بساط کیا۔ لیکن سچائی کا موقف۔ ایمان و عمل صالح کی دولت اسے حیاتِ جاوداں عطا
کرتی ہے اور وہ بالآخر لوگوں کا محبوب بن جاتا ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (القرآن الحکیم)

زمانے کی قسم! بے شک انسان یقیناً خسارے میں ہے۔ مگر وہ
لوگ (کامیاب ہیں) جو اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال
کئے اور حق کی وصیت کرتے رہے اور صبر کی وصیت کرتے رہے۔

قدوسی حجرہ میں خلوت نشینی

جیسا کہ سابق میں گذرا حضرت مولاناؒ شیخ کی چند روزہ صحبت ہی سے کندن ہوگئے۔ آپ کو محبوب کے
تصور و ذکر میں لذت آنے لگی اور اسی سرور و انبساط میں ہر وقت مگن رہنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت
میں جلوت سے گھبراہٹ اور خلوت سے پیار ہوجاتا ہے۔ یہی حال حضرت مولاناؒ کا تھا بقول صاحب تذکرۃ الرشید
الغرض امام ربانی کی وہ عالی اور بلند ہمت جو خدائی خزانۂ عامرہ سے فطرتاً آپ کو عطا ہوئی تھی سرتاپا تمام و کمال تحصیل قرب الٰہی
میں صرف ہونے لگی اور آپ کی عمر عزیز کا لحظہ لحظہ جو حق تعالیٰ نے تجارتِ آخرت کے لیے جواہرات بنا کر راس المال قرار دیا ہے
پائیدار منفعت کے کسب میں گزرنے لگا۔ رات کی سنسان گھڑیوں میں آپ اپنے نجات دہندہ کو پکارا کرتے۔ اندھیری شب کی سیاہ چادر

اوڑھکر اپنے پرورش کنندہ خالق کو سجدہ کرتے اس کے دربار میں حاضر ہوکر ناک رگڑتے، گڑگڑاتے اور روتے روتے بیتاب ہو جایا کرتے تھے لوگوں کے پاس بیٹھتے ہوئے اکتاتے گھبراتے اور تنگدل ہوا کرتے تھے۔ جنگل کے درختوں کی سنسناہٹ آپ کو پسند آتی اور ویران خالی گھروں کے گوشوں سے آپ کو انس حاصل ہوتا تھا۔ برادری کی کسی تقریب یا جلسہ میں آپ مدعو ہوتے تو آپ کی زبانِ حال یہ شعر پڑھتی ہے

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اور کوئی غیر آباد ڈھنڈر یا شکستہ و ہزیمت خوردہ کھنڈر نظر آتا تو بے اختیار آپ کی حالت پکارتی ہے

دیوانہ کو ویرانہ سے کیوں لطف نہ آئے آخر تو ہر اک شخص کا انجام یہی ہے

سب دھندے ہیں دنیا کے جوٹ جائینگے اکدن خلوت میں خدا ڈھونڈیئے بس کام یہی ہے

آپ کا نسب شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے جدہ کی جانب سے جاملتا تھا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت بلکہ خلافت پانے کے بعد آپ کا روحانی نسب بھی ان سے جاملا تھا۔ آپ کے دادا نے سابقہ سکونت کو ترک اور گنگوہ قیام کرکے سکنی نسبت بھی قائم کر دی تھی۔ حضرت امام چونکہ قطب العالم شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین بننے والے تھے۔ لہٰذا ابھی ایک مرحلہ کی تکمیل باقی تھی کہ امام ربانی اسی حجرہ اور خلوت گاہ کو اپنی خلوت گاہ بنائیں جہاں قطب العالم اپنے محبوب حقیقی کی یاد میں سال ہا سال تک ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے تھے قطب العالم کا یہ حجرہ آپ کے روضہ مبارکہ کے متصل مسجد کی پشت پر واقعہ تھا لیکن گردشِ زمانہ کی وجہ سے اب گدھوں گھوڑوں کا اصطبل بنا ہوا تھا۔ اور اگر اس کی حالت صحیح ہوتی تو متولیان خانقاہ اور دوسرے ظاہری جانشینوں کی شاید رال ٹپکتی اور اس پر ان کا قبضہ ہوتا چونکہ خدا کو منظور تھا کہ قطب العالم کا صحیح روحانی جانشین اس کو اپنی خلوت گاہ بنائے لہٰذا اس کی ایسی حالت ہوگئی تھی کہ متولی اس سے صرف نظر کرتے رہے۔ حضرت مولانا کی اب جو یہ حالت ہوئی تو خلوت نشینی کے لیے کسی ایسے مقام کی تلاش ہوئی۔ جہاں یک سوئی اور توجہ قلب سے خالقِ بے نیاز کی یاد کر سکیں۔ چنانچہ آپ نے اسی حجرے کو منتخب فرمایا جس کا اوپر ذکر گذر چکا ہے۔ آپ نے جب اس حجرے کا جائزہ لیا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رو دیئے۔ جہاں کسی زمانے میں اپنے وقت کا سب سے بڑا شیخ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہِ ناز میں اپنی جبین نیاز رگڑا کرتا تھا آج وہاں مچھروں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی اور گدھوں کا مسکن تھا اللہ تعالیٰ نے لعل کو گدڑی میں چھپا رکھا تھا۔ اب اس بے بہا لعل کا قدر دان جوہری سن بلوغ کو پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھیگی آنکھوں اور روتے دل کے ساتھ بہ نفس نفیس اپنے ہاتھوں سے اس حجرے کو غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے صاف کیا۔ کھرپے سے زمین کھود کر ہموار کی۔ صاف ستھری مٹی لاکر اس کو لیپا پوتا۔ نئی مٹی ڈلوائی۔ سوراخ بند کئے۔ زمین پر بوریہ کا فرش بچھایا۔ گوشوں میں لوبان کی دھونی دی۔ عطر چھڑکا اور اس مقدس حجرہ کو از سرِ نو آباد کیا جو سوا تین سو برس سے آپ کی آمد کا انتظار کرتے کرتے خستہ و تباہ ہو چکا تھا اور یہی خستگی و کہنگی اس کے آج تک محفوظ رہنے کا سبب بنی تھی تین سو برس میں گنگوہ میں ہزاروں افراد آئے لیکن وہ اس حجرہ کے اہل نہ تھے اور اب جو اہل آیا تو امانت اس کے سپرد ہوئی۔[۱]

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

---

[۱] تذکرۃ الرشید صد ۱۲-۱۳

طب

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ خاصہ عرصہ خلوت میں یادِ الٰہی سے اپنے قلب کو آباد کرتے رہے اور جب حرارت عشق الٰہی میں پگھل کر زرِ خالص بن گئے تو اب از خود لوگوں سے انس پیدا ہونے لگا۔ قدرت جن خوش نصیب افراد کو امت کی اصلاح و تربیت کے لیے چنتی ہے کم و بیش ہر ایک کو یہ مرحلہ ضرور پیش آتا ہے کہ قدرت پہلے ان کو کچھ عرصہ کے لیے اپنا قرب حاصل کرنے میں کوشاں و سرگرداں رکھتی ہے۔ جب ان کے ہر بُنِ مو سے اللہ ہُو۔ اللہ ہُو کی صدائیں نکلنے لگتی ہیں تب ان کے دل میں منجانب اللہ ٹھیراؤ پیدا کر کے ان کو تربیت خلق پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ اور لوگ رفتہ رفتہ ان کی جانب کشش محسوس پیدا کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں تاثیر اور ان کی صحبت میں اللہ کی یاد آتی ہے۔ حضرت گنگوہیؒ پر بھی یہ مرحلہ آیا۔ اور اس مرحلہ میں دلجمعی اور سکون حاصل کر کے پھر رفتہ رفتہ لوگوں سے مانوس ہونے لگے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے لگے اور قدرت کی طرف سے وُہ اسباب پیدا ہُوئے کہ جنہوں نے امام ربانی کو طب جسمانی کی طرف متوجہ کیا۔ اور وہ لوگ جو آپ کو کسی باطنی مرض اور مہلک بیماری میں مبتلا سمجھتے تھے ابتداً آپ کی طرف جسمانی بیماریوں کے لیے رجوع کرنے لگے اور چند ہی روز میں آپ کی معالج ہونے کی شہرت قرب و جوار میں پھیل گئی۔ اور اس طرح حضرت مولانا کسی قسم کے مالی احسان سے بھی بچے۔ ملازمت آپ کے فریضہ کی راہ میں رکاوٹ تھی اس لیے چھ ماہ کے بعد ہی اس کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ طبعاً اس سے وحشت تھی۔ اس کو چھوڑ کر متوکلانہ و زاہدانہ زندگی گزارنا شروع کر دی تھی لیکن اسباب و وسائل کے درجہ میں اہل و عیال کے لیے نان و نفقہ درکار تھا۔ اس کی طرف سے یہ غیبی سامان پیدا ہُوا کہ آپ کی والدہ کی خالہ بیمار ہوگئیں اور بقول حضرت مولانا حکیم صاحبزادہ مسعود احمد گنگوہیؒ (حضرت کے بیٹے)

> ایک بار حضرت مولانا قدس سرہٗ کی والدہ کی خالہ بیمار ہوئیں اور سخت تکلیف کا سامنا ہُوا۔ دست و قے کچھ نہ تھے اسفل معدہ میں درد تھا جس نے بے چین کر رکھا تھا۔ حکیم مولوی محمد تقی صاحب اپنی خالہ کے معالج تھے دوائیں پلاتے تدبیریں کرتے کئی روز گزر گئے۔ مگر مریضہ کو کوئی نفع محسوس نہ ہُوا۔ حضرت مولانا کی عمر اس وقت کم و بیش ۲۲ سال کی تھی۔ نانی نے آپ سے شکایت کی کہ مجھے محمد تقی کی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا بیٹے تو بھی بڑا عالم فاضل ہے تو ہی کچھ کر اور کوئی دوا ایسی بتا جس سے میری تکلیف رفع ہو۔ حضرت مولانا قدس سرہٗ نے اس وقت سکوت فرمایا اور کچھ جواب نہ دیا مگر نانی کی بے حد تکلیف، پر دل میں خیال ضرور پیدا ہو گیا کہ اس طرف توجہ کروں چنانچہ آپ وہاں سے اُٹھے اور میزان الطب میں معدہ کی بحث نکال کر مطالعہ شروع فرمایا۔ غرضیکہ حضرت مولانا نے نانی صاحبہ کا علاج فرمایا حکم خدا سے وُہ صحت یاب ہوگئیں۔ اس سے مستورات میں چرچا ہوگیا۔ اور پرانے پرانے مریض ٹوٹ پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دست مبارک میں شفا رکھ دی۔ جو مریض آتا آپ "اکسیر اعظم" اور "میزان الطب" کو غور سے دیکھ کر اس کی تشخیص و تجویز فرماتے۔ نتیجۃً اس کو آرام آجاتا۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خاصے واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ ہمیں اس پورے قصے میں جو بات نظر آتی ہے وُہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے چونکہ ایک بڑا کام لینا چاہیتے تھے۔ لہٰذا آپ کی طرف لوگوں کو متوجہ اور راغب کر دیا۔ اور یہ کہ آپ کو اپنی متوکلانہ زندگی میں کسی کا احسان نہ اٹھانا پڑے۔ اور بغیر کسی قسم کا کوئی دنیاوی کاروبار کیئے۔ آپ کی قوت لایموت کا سامان فراہم ہوتا رہے۔ چنانچہ آپ نے مطب کو بھی بطور پیشہ کے اختیار نہ کیا بلکہ خدمت خلق کا رجوع دیکھ کر السان دوستی۔ خدا ترسی اور شفقت کی نگاہ سے اس کو کرتے تھےؔ اور اس سے اتنا ہی شروع میں حاصل ہوتا

---

[۵] تذکرۃ الرشید صفحہ ۶۳ [۲] اور تھوڑی دیر کر کے پھر اس سے بھی چھوڑ دیا اور بالکل متوکل ہو گئے

تھا کہ مشکل گزارا ہوتا تھا۔ تذکرۃ الرشید میں آپ کے مشہور و معروف چند نسخوں اور ان کے اجزا کا بھی ذکر آیا ہے۔ دلچسپی رکھنے والے اصحاب تذکرۃ الرشید کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم نے یہاں اس کا مختصراً ذکر کیا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ علم طب کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی ہے اور یہ خدمت خلق اور غمگساری و ہمدردی کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے بشرطیکہ اسی نیت سے کیا جائے۔

بہتر ہے وہی خلق میں جو خلق خدا کو پونہچائے نفع عام ہے جان کا ہو کہ تن کا

بس علم تو دو ہی ہیں بحکم شہ لولاک ایک علم رہ دین دوم علم بدن کا

تحریک آزادی اور حضرت گنگوہی

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ سمیت ان حضرات نے جو حصہ لیا اس کا اجمالاً تذکرہ آچکا ہے تفصیل کی نہ وہاں گنجائش تھی نہ یہاں حضرت حاجی صاحبؒ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہی تینوں حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ حضرت نانوتویؒ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت غار ثور پر عمل کرتے ہوئے تین دن روپوش رہے اور چونکہ غار ثور میں روپوشی کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمن قابو نہ پا سکے تھے۔ اسی طرح اس ہندی نژاد محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کی روپوشی کے بعد (باوجودیکہ وارنٹ گرفتاری جاری اور پولیس تلاش کر رہی تھی) روپوشی سے خلاف سنت ہونے کی وجہ سے جب مزید روپوشی سے انکار کر دیا تو سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کے صدقے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت کا ارادہ فرمالیا اور خفیہ طریقے سے ساحل کی راہ لی

شیخ کی محبت

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے روانہ ہونے کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ کی مفارقت کا بے پناہ صدمہ تھا۔ آپ کو اس صدمہ میں نیند نہیں آتی تھی۔ یہی خواہش تھی کہ کسی طرح ایک مرتبہ اور زیارت کرلوں۔ لیکن شیخ کی جائے قیام کا علم نہ تھا بعد دقت پتہ چلا کہ آپ پنجلاسہ میں ہیں، چنانچہ وہاں پہنچے۔ ملاقات ہوئی زیارت سے مشرف ہوئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بے حد اصرار کیا کہ مجھ کو بھی اپنے ہمراہ لے لیجیے۔ مگر حضرت حاجی صاحبؒ راضی نہ ہوئے اور فرمایا

"میاں رشید احمد تم سے تو حق تعالیٰ نے بہتیرے کام لینے ہیں گھبراؤ مت، ہندوستان سے نکلتے وقت تم سے ضرور ملوں گا۔"

اور حاجی صاحب نے ملاقات کا یہ وعدہ پورا فرمایا

رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری کا قصہ آگے آرہا ہے حاجی صاحبؒ کا ذکر آیا ہے تو دو واقعات کا ذکر یہیں کر دینا مناسب ہے۔ حضرت مولاناؒ کی گرفتاری اور جیل جانے پر ایک دفعہ یہ خبر پھیلی کہ ان کو پھانسی کا حکم ہو گیا ہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کو بھی یہ خبر پہنچی تذکرۃ الرشید میں ہے:

بروایت مولوی ولایت حسین۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ "میاں کچھ سنا گیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا" خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں ابھی تک تو کوئی خبر نہیں آئی فرمایا "ہاں حکم ہو گیا چلو" یہ فرما کر اٹھ کھڑے ہوئے حکیم صاحب کا بیان تھا کہ برسات کا زمانہ تھا مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور غالباً مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی غرض تین آدمی چلے، شہر سے نکل کر تھوڑی دور جا کر اعلیٰ حضرت زمین کی گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکوت

فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا "پھر چلو مولوی رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا خدائے تعالیٰ کو ان سے ابھی بہت کچھ کام لینا ہے۔" چنانچہ چند روز بعد اس کا ظہور ہوگیا۔ ــــــــ والحمد للہ علیٰ ذالک [۱]

ایک اشکال اور اس کا حل

پچھلی سطور میں گزر چکا ہے کہ حاجی صاحبؒ نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اس استدعا پر کہ میں بھی آپ کے ہمراہ چلونگا۔ فرمایا تھا کہ "تم سے تو حق تعالیٰ نے ابھی بہتیرے کام لینے ہیں"۔ جب یہ بات منکشف ہو چکی تھی تو پھر پھانسی کی خبر کا کیوں یقین کیا۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کشف کا تعلق امور باطن سے ہے اور خبر احکامِ ظاہر سے تعلق رکھتی ہے کشف کے مقابلہ میں جب خبر آجائے تو اس کا تبیّن ایک فطری امر ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی تعلیم ہے۔ اگرچہ خبر دینے والا فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر کسی مطلق خبر کی تردید پھر کشف سے ہو جائے تو اس سے پہلے کشف کو اتنی قوت ضرور مل جائے گی کہ وہ مطلق خبر کی تردید کر سکے۔ جس خبر کی تردید نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف خبر عدل ہے علامہ خالد محمود عقیدۃ الامت کے حواشیہ پہ لکھتے ہیں :۔

"نبوت پر جس غیب کا اظہار ہو۔ اس میں قطعیت ہوتی ہے اور وہ اخبار غیبیہ یقینی طور پر معصوم ہوتی ہیں۔ جن میں شک، وسوسے یا شیطان کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہو سکتا اور نبوت کے علاوہ جتنے بھی مقامات ہیں جن میں کہ بعض اخبار غیبیہ کا اظہار ہوتا ہو ان میں وہ قطعیت نہیں ہوتی کہ ان پر احکام شرع یا احکام عدالت کی بنا رکھی جا سکے"۔ (عقیدۃ الامت صہ ۴۸)

اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ حضرت حاجی صاحب نے تو آپ سے حجاز روانہ ہونے سے پہلے ایک ملاقات کا وعدہ فرمایا تھا مگر آپ جیل میں رہے اور رہائی سے قبل حضرت عازم حجاز ہو گئے، یہ وعدہ کب پورا ہوا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت ہی ہلکی آواز میں فرمایا "اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے"۔ چنانچہ دوسرے طرق سے معلوم ہوا کہ حضرت حاجی صاحب باوجود سنگین پہرہ کے جیل میں حضرت مولانا سے جا کر ملے کئی گھنٹے باتیں کر کے شب ہی میں واپس ہوئے اور عرب کو روانہ ہو گئے۔

گرفتاری اور زنداں

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پنجلاسہ سے گنگوہ تشریف لائے۔ یہاں ان کے احباب نے اصرار کیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ نکل چکا ہے۔ چنانچہ اپنی دادھیال قصبہ رام پور چلے گئے۔ اور حکیم ضیاء الدین کے مکان میں مقیم ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد گارڈن کرنیل فرانسیسی غلام علی سکنہ قصبہ پلی پور ضلع سہارنپور مخبر کے ہمراہ ستر سواروں کے ساتھ گنگوہ پہنچا اور آتے ہی مولانا کی تلاش کی۔ سوار ادھر ادھر پھیل گئے مسجد اور خانقاہوں کے حجروں کو دیکھا۔ ان کے ملنے والوں کے مکان کی تلاشی بھی لی حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں زاد بھائی ابو النصر صاحب جو صورت و وضع میں حضرت سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ مسجد کے گوشہ میں گردن جھکائے مراقبہ میں بیٹھے تھے کہ دوڑ کر سپاہی نے گردن پر زور کا ہاتھ مارا اور قبضہ میں لے کر پکارا چل کھڑا ہو کیا گردن جھکائے بیٹھا ہے۔ مولوی ابو النصر نے گردن اٹھائی اور بے دھڑک اس نے کہا چل کھڑے ہوئے۔ حضرت مولانا کے دروازے پر ان کو لا کھڑا کیا اور کہا کہ گھر کی تلاشی دلوا اور دکھا کیا ہتھیار ہیں عرصہ تک مولوی ابو النصر مار کھاتے ذلت سہتے رہے مگر یہ نہیں بتایا کہ میں مولوی رشید احمد نہیں ہوں۔ جب فوجیوں کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا رشید احمد نہیں ہیں

---

[۱] تذکرۃ الرشید صہ ۸۵

اس وقت مولوی ابوالنصر کی رہائی ہوئی ۔
اور ان کو حکیم امیر بخش نے بتلایا کہ حضرت مولانا رام پور ہیں :
فوجی رام پور پہنچے اور مولانا گنگوہیؒ کو حکیم ضیاالدین صاحب کے مکان سے گرفتار کر لیا آپ کے چاروں طرف محافظ پہرہ دار تعینات کر دیئے گئے ۔
اور بند بہلی میں آپ کو سوار کر کے سہارنپور روانہ کیا ۔ بیل تیز رفتار تھے اور حکم یہی تھا کہ جلد سے جلد لے جاؤ ۔ اس لیے کچی سڑک پر وہ خاک اڑتی تھی کہ راہ گیروں
کی آنکھیں اندھی ہو جاتی تھیں ۔ مولوی ابوالنصر پریشان اور ان کے بوڑھے باپ مولوی عبدالغنی جنہوں نے مولانا کو پرورش کیا تھا ۔ ننگے پاؤں پاپیادہ سواروں
کی تیز رفتاری کا مقابلہ کرتے بہلی کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے ۔ صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا ۔ عالم پریشانی میں ڈوبے ہوئے ۔ غبار سے آنکھیں بند ببول کے
کانٹوں سے پاؤں زخمی خدا جانے کہاں جا رہے تھے ۔ اور کس طرف قدم اٹھ رہا ہے ۔ آخر ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر پڑے ۔ حضرت مولانا سہارنپور پہنچتے ہی
جیل خانے بھیج دیئے گئے ۔ اور جنگی پہرہ کی نگرانی لگا دی گئی ۔
مولانا عبدالغنی کو جب ہوش آیا وہ پھر دوڑے راستہ میں سہارنپور کے ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا سہارنپور کے جیل خانہ میں ہیں مولانا عبدالغنی
خود بھوکے پیاسے تھے ۔ مگر ان کو حضرت کی بھوک کا زیادہ خیال تھا ۔ چنانچہ انہوں نے نانوتہ کے کسی کیلی برادر کی معرفت حضرت کو کھانا پہنچایا ، وہاں سے
کنکریوں پر کوئلہ سے لکھا ہوا یہ فقرہ ان کے پاس پہنچا ۔ کچھ مت گھراؤ بحمد اللہ آرام میں ہوں ۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ کی اہلیہ محترمہ جن کے والد ماجد مولوی
محمد تقی صاحب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شہید ہو چکے تھے ۔ انہوں نے جب حضرت کی گرفتاری کی خبر سنی تو خدا کا شکر ادا کیا کہ حق کی راہ میں باپ شہید
ہوا اور خاوند جیل میں ہے ۔
حضرت مولانا گنگوہی تین چار یوم کال کوٹھڑی میں بند رہے اور پندرہ روز جیل خانہ میں رہے ۔ تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی ۔ آخر عدالت سے
حکم ہوا کہ واقعہ تھانہ بھون کا ہے اس لیے مقدمہ مظفر نگر منتقل کیا جائے ۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی ننگی تلواروں کے پہرہ میں دیوبند کے راستہ سے دو پڑاو کر کے
پاپیادہ مظفر نگر لائے گئے اور مظفر نگر کے جیل خانہ کی حوالات میں بند کر دیئے گئے ۔ دیوبند کے قریب سے جب مولانا گنگوہی گزرے تو مولانا محمد قاسم صاحب
مقررہ راستہ سے کچھ ہٹ کر بغرض ملاقات پہلے سے آکھڑے ہوتے تھے گو خود بھی ان کا وارنٹ تھا اور روپوش زندگی گزار رہے تھے ۔ بیتابی شوق نے
اسوقت انہیں چھپنے نہیں دیا دور سے سلام ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے ۔

ثابت قدمی اور رہائی

مظفر نگر کے جیل خانہ میں آپ کو تقریباً چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا اس زمانہ میں آپ کے استقلال ، عزم ، ہمت اور
ارادوں میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی ۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک آپ کی نماز ایک وقت بھی قضا نہیں ہوئی ۔ حوالات
کے دوسرے قیدی آپ کے معتقد ہو گئے تھے ۔ ان میں سے بہت سے آپ کے مرید ہوئے با جماعت جیل خانہ کی کوٹھڑی میں نماز ادا کرتے تھے ۔ ارشاد
ظاہری و باطنی سے آپ کسی دن غافل نہیں ہوئے ۔ وعظ و پند و نصیحت کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ لوگوں کو سناتے اور وحدانیت کا سبق دیا کرتے تھے
جب عدالت میں جاتے جو دریافت کیا جاتا بے تکلف اس کا جواب دیتے آپ نے کبھی کوئی کلمہ دبا کر یا زبان موڑ کر نہیں کہا ۔ کسی وقت جان بچانے کی کوشش
نہیں کی ۔ جو بات کہی سچ کہی اور جس بات کا جواب دیا خدا کو حاضر ناظر جان کر واقعات اور حقیقتِ حال کے مطابق دیا ۔ پوچھا گیا کہ تم نے سرکار کے مقابلہ
میں ہتھیار اُٹھائے ۔ تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا ۔ کبھی حاکم دھمکاتا ہم تم کو پوری سزا دیں گے ۔ آپ فرماتے کیا مضائقہ ہے ۔ بالآخر چھ مہینے جیل میں رہنے
کے بعد آپ کی رہائی ہوئی ۔

رہائی کے بعد خفیہ نگرانی

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ رہا تو ہو گئے تھے لیکن ان پر سی آئی ڈی کا پہرہ مرتے دم تک
تھا مریدوں کے روپ میں ۔ مہمان کی شکل میں ۔ مرید بننے کے بہانے سے آتے اور اپنا کام کر کے چلے جاتے

ایک مرتبہ ایک شخص تشریف لائے اور اس درجہ عقیدت کا اظہار کیا کہ کوئی ان پر شک نہیں کر سکتا تھا کہ یہ حضرت کے معتقد نہیں ہیں جس وقت حضرت کے سامنے آئے اور درخواست بیعت کی، تو حضرت نے جھڑک دیا۔ اور فرمایا جاؤ میرے یہاں تمہارا کام نہیں۔ میں ہرگز مرید نہیں کرونگا۔ یہ حضرت روئے اور حضرت کے متعلقین سے سفارش کرائی مگر جس نے بھی سفارش کی اس کو بھی یہی جواب ملا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ نہیں مرید کرونگا اس کو کہہ دو یہاں نہ ٹھہرے۔ اگر نہ جائے تو نکال دو، اور اسباب باہر پھینک دو۔ حضرت کی اس بے رخی پر لوگوں کو بھی افسوس ہوا، مگر سوائے تعمیل حکم کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کا اسباب خانقاہ سے باہر کر دیا۔ اس پر بھی وہ حسن عقیدت کا اظہار نہ چھوڑتا تھا۔ اور رو رو کر کہتا کچھ ہی ہو میں تو ضرور بیعت ہوں گا۔ حکیم محمد یوسف صاحب کو اس کی حالت دیکھ کر ترس آیا۔ اس کو اپنی بیٹھک میں ٹھہرا کر وعدہ کیا کہ میں حضرت سے سفارش کروں گا کہ تمہیں مرید فرمالیں۔ دوسرے دن حکیم صاحب حضرت کی خدمت میں گئے۔ کہنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ حضرت نے خود فرمایا کہ آنے والا کہاں ہے۔ تم نے اسے کیوں ٹھہرا رکھا ہے، کرایہ کا انتظام کر دو۔ اور کہہ دو چلتا بنے اب ان الفاظ کے بعد حکیم صاحب خاموش ہو کر چلے آئے۔ بیٹھک میں قدم رکھا تو دیکھا کہ مسافر کتاب کھولے کچھ لکھ رہا ہے۔ حکیم صاحب کے آتے ہی جلدی سے کتاب بند کر کے جزدان میں لپیٹ حمائل بنا کر گلے میں ڈال لی۔ اب حکیم صاحب مشتبہ ہو گئے۔ خیال پیدا ہوا کہ حمائل کو دیکھا جائے۔ اس میں کیا ہے۔ حکیم صاحب نے ایک رات مسافر کو باتوں میں لگائے رکھا۔ کافی رات تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ نیند کے غلبہ سے عاجز آگیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ سونا چاہتا ہے۔ تو یہ کہہ کر چلے آئے اچھا اب سو جائیے۔ مسافر لیٹا اور لیٹتے ہی گہری غفلت کی نیند سو گیا۔ اس وقت انہوں نے اس کی گردن میں سے حمائل نکالی لیمپ کے سامنے لا کر کھولی تو کہیں انگریزی کہیں فارسی کہیں اردو اور کہیں عربی لکھی ہوئی ہے۔ عجلت کے ساتھ ورق گردانی کی تو ایک صفحہ پر کسی انگریز حاکم کے نام چٹھی کی نقل پر نظر پڑی جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے گورنمنٹ کی خیر خواہی میں جان تو جان اپنے ایمان کی بھی پرواہ نہیں کی۔ مگر افسوس میری قدر جیسی ہونی چاہیئے تھی ویسی نہ ہوئی اس عبارت کو دیکھ کر حکیم صاحب کانپ اٹھے اور کتاب بند کر کے اسی طرح مسافر کے گلے میں حمائل ڈال کر چلے گئے۔ علی الصبح کرایہ کا ٹٹو لیا اور اس کو رخصت کر دیا۔ حکیم صاحب حضرت کی خدمت میں آئے تو حضرت مسکرائے اور آہستہ سے فرمایا ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ اس کو روانہ کر دو تم ہی نہیں مانے۔

درس و تدریس

گرفتاری سے رہائی کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود مسند آرائے تلقین و ارشاد ہونے کے، درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گویا علوم باطنی کے ساتھ ظاہری علوم شرعیہ و فنون کی تعلیم میں بھی مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں آپ نے تیسرا حج کیا اور اس کے بعد ایک سال میں صحاح ستہ کے دورہ کو ختم کرانے کا آپ نے التزام کیا اور اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ درس حدیث کا یہ سلسلہ ۱۲۶۵ھ سے لے کر ۱۳۱۴ھ انچاس سال تک چلتا رہا اور اس دوران میں تین سو سے زائد حضرات نے آپ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ آپ کے سب سے پہلے شاگرد (گنگوہ میں) سید مومن علی تھے۔ جنہوں نے آپ سے شرح جامی پڑھنا شروع کی اور آخری شاگرد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جس سال حضرت مولانا کاندھلویؒ نے دورہ حدیث پڑھا ہے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بینائی جا رہی تھی اور آنکھوں میں پانی اتر رہا تھا یہ آپ کا آخری سال تھا۔ اس کے بعد فتاوی اور ارشاد و تلقین کا مشغلہ تو جاری رہا لیکن تعلیم دینا ترک کر دیا۔ انچاس سالہ تعلیمی دور میں آپ سے پڑھنے والے۔ ہند۔ برما۔ کابل۔ افغانستان ہر جگہ سے آئے۔ بعض سالوں میں ستر اسی طلبہ کا مجمع رہا

طریقۂ تدریس

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے محدث تھے کہ جن میں اجتہاد و استنباط کی تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں حافظہ و ثقاہت، تقدیس و تبحر، فراست و فہم دانی، خوبی تطبیق و ارتباط، جودت ذہن اور اتقان و عدالت جتنے اوصاف

خوبیاں ایک اچھے محدث استاد میں پائی جانی ضروری ہیں۔ ان تمام سے آپ متصف تھے۔ آپ کے درس حدیث میں ایک خاص خوبی تھی کہ مضمون حدیث سے اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ یہ خاص اثر اس لیے تھا کہ اس دور میں آپ ہر فرد سے زیادہ متبع سنت تھے۔ آپ صحیح معنوں میں محب رسول اور متبع سنت تھے۔ آپ کی تدریس میں محویت کا ایسا عالم ہوتا تھا کہ ہر شریک درس کی یہ خواہش ہوتی کہ سلسلہ درس دراز ہو۔ اور جب سبق ختم ہوتا تو خیال ہوتا کہ ابھی باقی ہے۔ کاش سبق شروع رہتا۔ لیکن جب سبق اوراق و صفحات شمار کئے جاتے تو حیرت ہوتی کہ اس قدر سبق کیونکر ہوگیا۔ آپ کی تقریر کے بعد کتب شروح اور حواشی دیکھنے کی مطلق ضرورت نہ رہتی تھی۔ اور یوں خیال ہوتا تھا کہ تمام شرحوں اور تفصیلات کا خلاصہ حضرت نے سامنے کر دیا ہے۔

صحاح میں سب سے پہلے عموماً جامع ترمذی شریف شروع کراتے۔ ہر حدیث کا ترجمہ اور معنی سلیس اور عام فہم الفاظ میں بیان فرماتے اور تفصیل کو اس طرح کھول کر بیان کرتے کہ کوئی الجھن باقی نہ رہتی اس کے بعد اگر تلاوت کی گئی حدیث کا بظاہر کسی دوسری حدیث یا کسی آیت قرآن سے تعارض نظر آتا تو اس کو رفع فرماتے۔ بقدر ضرورت اسماء الرجال ذکر کرتے۔ رواۃ کی پوری تحقیق توثیق اور تضعیف بیان فرماتے۔ اگر سیاق و سباق میں کوئی مخفی ارتباط ہوتا تو اس کو کھولتے۔ طلبہ کے اعتراضات پر ذرا چیں بجبیں نہ ہوتے۔ ایک دفعہ ایک طالب علم قرآت کر رہا تھا "عطارة" کا لفظ آیا اس نے سمجھ لیا کہ یہ عطر سے مشتق اور اس کا فلاں معنی ہے۔ بلا تکان آگے پڑھتا چلا گیا۔ ایک پٹھان طالب علم کو سمجھ نہ آیا۔ اس نے قاری کے کہنی ماری اور کہا کہ ٹھہرو ہم نہیں سمجھا جی معنی چہ؟ حضرتؒ نے فرمایا "زوجہ عطر فروشندہ" قاری پڑھنے لگا اس نے پھر کہنی ماری اور کہا حضرت "عطارہ معنی چہ ہم نہیں سمجھا"۔ آپ نے فرمایا "عطر فروش کی بیوی" قاری پھر پڑھنے لگا پٹھان نے تیسری دفعہ کہنی ماری اور تیز نظر سے دیکھا۔ اور کہا "ٹھہرو ہم نہیں سمجھا عطارہ کا معنی"۔ اس پر امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے اونچی آواز سے فرمایا "عطر بیچنے والے کا جورو"۔ اب پٹھان خوش ہوا اور کہا "ہاں سمجھا ہاں بھائی چلو"۔ اس لطیفہ حکایت سے قارئین بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت کسی سوال پر خفا نہیں ہوتے تھے۔

ترمذی شریف کے ختم ہونے پر صحاح کی دوسری کتابیں ہوتیں ان میں ترجمہ نہ ہوتا البتہ کوئی نئی حدیث آتی یا مولف کی عبارت ہوتی تو اس کا ترجمہ و مطلب مثل سابق بیان فرماتے ———— حضرت تو ہر وقت ہی "الوضوء سلاح المومن"۔ وضو مومن کا ہتھیار ہے۔ کے نظریے سے متبع رہتے لیکن حدیث شریف کے درس میں تمام طلبا کو باوضو رہنے کی صراحتاً ہدایت فرمایا کرتے۔ پڑھاتے وقت خوش رو رہتے تاکہ سائل کو سوال کرنے میں حجاب نہ ہو۔ اگر کبھی طلبہ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو کوئی ایسی لطیف حکایت یا واقعہ بیان فرماتے کہ طلبہ کی تکان دور ہو جاتی۔

حضرت مولانا مذہب حنفیہ کی اگرچہ مدلل مکمل ترجیح کرتے جاتے مگر کیا مجال کہ کسی جگہ کسی دوسرے فقیہ یا امام کی ذرا سی تنقیص ہو جائے یا ظاہر کرتے کہ مجھے حنفی مسلک سے خاص محبت ہے اور اس کی حقانیت پر کلی اطمینان ہے۔ اگر کسی طالب علم نے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جس سے دوسرے مسلک کی توہین و تنقیص کا پہلو نکلتا تو قولاً عملاً اس کی اصلاح فرماتے۔ یہاں تک کہ نفس تقلید میں بھی تعصب کا حد سے بڑھنا آپ کو پسند نہ تھا بعض تشدد و عصبیت میں محدثین کے متعلق کوئی ذرا ناگوار کلمہ کہہ دیتے تو حضرت کے چہرہ پر کراہیت کے آثار پیدا ہونے اور فوراً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ کی ترجیح مذہب حنفیہ پر ظاہر کرتے اور فرماتے کہ ان حضرات نے ان وجوہ کی بناء پر اس مسلک کو اختیار کیا ہے۔ جب طلبہ کی بدظنی دور ہو جاتی تو پھر آگے چلتے۔

کسر نفسی اور تواضع

باوجود اس فضل و کمال کے آپ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے اور کبھی اپنے آپ کو کسی دوسرے پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت نے ایسی بلیغ تقریر فرمائی کہ طلبہ جھوم گئے اور بے اختیار درس ہی میں حضرت کے سامنے آپ کی تعریف کرنے لگے آپ نے بے ساختہ قسم کھا کر فرمایا ———— "میں اپنے کو تم میں سے کسی کے برابر بھی نہیں سمجھتا چہ جائیکہ زیادہ سمجھوں"۔ آپ کو قسم کھانے کی مطلق عادت نہ تھی۔ لیکن اس موقع پر بلا اختیار قسمیہ الفاظ آپ سے صادر ہو گئے۔

طلبہ کے جوتے اٹھائے

ایک دفعہ درس حدیث میں بارش شروع ہوگئی۔ طلبہ نے جلدی جلدی کتابیں اور تپائیاں (کتابیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے میز) اٹھائیں اور چل دیئے۔ اس کے بعد طلبہ نے دیکھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کندھے کی چادر میں طلبہ کی جوتیاں ڈالی ہوئی ہیں اور اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ طلبہ بہت نادم و حیرت زدہ ہوتے فرمایا کہ

"اس میں کونسی بری بات ہے۔ تمہاری خدمت کرنا تو میری نجات کا باعث ہے۔ طلبائے دین کے لیے تو حدیث شریف کے الفاظ میں مچھلیاں سمندر میں، چیونٹیاں بلوں میں دعا کرتی ہیں اور فرشتے تمہارے قدموں کے نیچے اپنے پر بچھاتے ہیں اور تم تو مہمانانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ کہ حدیث پڑھنے آئے ہو۔"

طلبہ پیارے نبیﷺ کے مہمان ہیں

حضرت طلبہ کی مدارات اور عزت و تکریم میں ہر وقت کوشاں رہتے اگر کسی کو کوئی غم یا فکر لاحق ہوتا تو صبر و تسلی کے کلمات سے تسکین بخشتے۔ جس طرح ان کے اپنے دل میں طلبہ دین کی عزت تھی چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ان کی اسی طرح عزت کریں۔ آپ کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ کوئی ان کو بنظر حقارت دیکھے۔ ایک طالب علم کا کھانا کسی جگہ لگایا ہوا تھا اس کو دیکھا کہ کھانا کھلا ہوا بغیر کسی کپڑے وغیرہ کے لا رہا ہے۔ پوچھا کہاں کھانا مقرر ہے؟ اس نے آپ کے کسی رشتہ دار کا نام لیا فرمایا کہ اچھا اب وہاں سے کھانا نہ لانا۔ ہمارے گھر سے آیا کرے گا۔ ادھر اپنے رشتہ دار سے ناراضگی کے کلمات کہلا بھیجے۔ کہ اس وجہ سے ان کو اس طرح کھانا دیتے ہو کہ یہ لیسی ہیں۔ ان کو دروازہ کا فقیر سمجھا گیا سو کیا مضائقہ ہے۔ "ملک خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست؛ تم اپنی روٹی اپنے پاس رکھو خدا ان کا اور جگہ انتظام کردے گا۔" وہ عفت مآب عورت جن کے گھر سے کھانا آتا تھا حاضر ہوکر معذرت خواہ ہوئیں اور خطا معاف کرائی۔ اور کہا آئندہ دسترخوان میں کھانا تک کر تعظیم کے ساتھ پیش کیا کروں گی۔ آپ نے منظور فرمالیا۔

طلبہ کے عقائد و اعمال کی نگرانی

آپ بیک وقت طلبہ کے استاد بھی تھے اور شیخ بھی۔ اگرچہ طلبہ آپ سے رسمی بیعت نہ کرتے ہوں تاہم آپ دونوں چیزوں کو ملحوظ رکھ کر طلبہ کی ہر طرح اصلاح و تربیت فرماتے تھے۔ آپ کی زندگی کا مشن ہی یہ تھا کہ لوگوں کے عقائد و اعمال درست کئے جائیں۔ شرک و بدعت کی رد کی جائے۔ تاہم سبق پڑھاتے وقت اس کا بہت زیادہ اہتمام تھا۔ شرک و بدعت کا جگہ جگہ قلع قمع فرماتے۔ توحید و اتباع سنت کی ترغیب دیتے۔ صرف زبانی نصیحت پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ ضرورت پڑنے پر تیزی اور سختی بھی فرماتے اور اس کے ساتھ توجہ قلبی اور روحانی فیضان سے تاریک دلوں کو منور کرتے اور زنگ دور فرماتے۔ بعض اوقات طلبہ کا پورا حلقہ محو حیرت ہوتا کہ جلسہ کا جلسہ آسمانی سکینت کے نزول کا احساس کر رہا ہے سلوک و معرفت کے حقائق دوران درس بیان فرماتے کہ طلبہ کو وجد آجاتا۔ غرضیکہ طلبہ کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے۔ ان کی نشست برخاست۔ چال ڈھال، گفتار و کردار، وضع قطع ہر چیز کا خیال رکھتے۔ اگر کسی طالب علم کو دیکھتے کہ وہ اپنے پڑھے ہوئے پر عمل پیرا نہیں ہے تو جب تک اس میں خوشگوار تبدیلی پیدا نہ ہو جاتی آپ بے چین رہتے۔

فراست ایمانی

حدیث شریف میں آتا ہے کہ "مومن کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ حضرت مولانا طلبہ کی ہر وقت کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم ایسا نظر آتا کہ اس کے متعلق یہ محسوس فرماتے کہ اس میں کچھ ایسا ہے جو درست نہیں ہو سکتی اور یہ پڑھ لکھ کر لوگوں کو گمراہ کرے گا یا پھر سلسلہ کی بدنامی کا باعث ہوگا تو اس کو سبق شروع نہ کراتے۔ بلطائف الحیل ایسے یار و کھاپن دکھاتے کہ وہ خود ہی چلا جائے۔ ہاں جس طالب علم کو سعید پاتے تو اس کی دلداری فرماتے۔ بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے۔

ہدایہ کی تعلیم

آپ کتب حدیث کے علاوہ دُوسرے فنون و علوم کی کتب بھی پڑھاتے لیکن فلسفہ و منطق سے آپ کو نفرت تھی۔ لہٰذا دورِ
تدریس ان کتابوں کو نہیں پڑھایا بلکہ ان علوم سے بے رغبتی دلانے کی کوشش کرتے۔ شروع میں آیا کہ سید مومن علی آپ کے
گنگوہ میں پہلے شاگرد تھے اور ان کو آپ نے شرح جامی پڑھانا شروع کی۔ مدرسہ مصباح العلوم بریلی کے ایک مدرس ذکر کرتے تھے کہ میں نے ہدایہ جلد
حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا۔ اور اس وقت حضرتؒ نے فرمایا کہ "یہ چودھویں مرتبہ ہے کہ تم کو پڑھا رہا ہوں"۔ جس انسان نے فطرتاً ذہنی اور د
صلاحیتوں سے بہرہ وافر پایا ہو اور پھر مولانا مملوک علی ایسے یگانہ روزگار استاد سے تعلیم حاصل کی ہو۔ اور ان سے اپنی ذہانت و ذکاوت کی تحسین
کرائی ہو۔ وہ انسان جب صحاح اور دیگر کتب کو بیسیوں مرتبہ پڑھائے گا تو اس کے تبحرِ علمی و فقہی کا کیا ٹھکانہ ہو گا۔

سہ دری کا قضیہ

گذشتہ اوراق میں معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت نے قدوسیہ حجرہ کو نشست کی جگہ بنا لیا تھا۔ اسی میں مطب تھا اور ا
میں اول اول پڑھانا شروع کیا جب طلبہ کی تعداد بڑھی۔ تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اب مزید کوئی کمرہ تعمیر ہو۔ آپ
بھی خیال ہوا اور خدام نے بھی اصرار کیا چنانچہ مخلص احباب کے اصرار اور کچھ امداد پر آپ نے اپنی طرف سے باقی رقم ڈال کر حجرہ کے سامنے ایک
سہ دری بنوالی۔ اس دوران میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت و ناموری ہو چکی تھی۔ جب آپ نے حجرہ قدوسیہ صاف کر کے اس میں نشست رکھی تو خانق
نسبت کرنے والے پیرزادے خاموش رہے۔ بلکہ خوش ہوئے کہ ایک غلیظ و گندی جگہ صاف ہو گئی۔ مگر اب جب دیکھا کہ حضرت کی طرف خلقِ خدا کا ر
ہو رہا ہے تو ان کو اپنی دکانداری ختم ہوتی نظر آئی۔ اور حسد و رقابت کی آگ میں جلنے لگے۔ حضرت کا ردِ شرک و بدعت بھی ان کو حد درجہ ناگوار تھا کہ
بیشتر اس قسم کی برائیاں گھر کر چکی تھیں۔ لیکن انہیں کوئی بہانہ ہاتھ نہ آتا تھا کہ آپ کی مخالفت کریں۔ سال گزر گئے۔ لیکن اب جب حضرت نے
بنوائی تو مشورے ہونے لگے کہ۔ "آج مولوی رشید احمد نے سہ دری بنوائی ہے کل کو کچھ اور عمارات بنوا کر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر دیں گے
کو اس مکان سے بے دخل کریں اور جو کچھ لاگت اس تعمیر میں لگی ہے وُہ ان کو دے کر قبضہ چھڑائیں"۔ چنانچہ پیرزادے اکٹھے ہو کر آپ کے پاس
حرفِ مطلب زبان پہ لائے۔ حضرت کی خداداد ہیبت اور خدام و طلباء کی تعداد کی بنا پر ایک خاصہ مجمع بنا کر آئے تھے کہ اگر لڑائی کرنا پڑے
حضرت کو جب علم ہُوا کہ یہ اس لئے آئے ہیں تو فرمایا

"بہت اچھا۔ اتنی سی بات کے لیے مجمع کے آنے کی کیا ضرورت تھی اگر کسی ادنیٰ آدمی اور اپنے یہاں کے نائی دھوبی سے بھی یہ پیام
کہلا بھیجتے تب بھی مجھ کو چھوڑ دینے میں تامل نہ ہوتا۔"

یہ فرما کر اتنی لاگت جو آپ کی جیب خاص سے خرچ آئی تھی لے کر اسی وقت طلبہ سے فرمایا کہ بستر کپڑے اور کتابیں وغیرہ سب نکال کر
خالی کر دو ——— اندازہ کیجیے کہ جب اس حجرہ میں گھوڑے اور گدھے باندھے جاتے تھے اور دھوبیوں نے اس پر قبضہ جما رکھا
وقت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے کسی پیرزادے کو خیال آیا نہ دل دکھا۔ مگر اب جب یہیں قال اللہ اور قال الرسولؐ کا نغمہ گونجا اور ر
بادِ نسیم سے لہرانے والے درختوں کا باغ جمایا گیا تو ان پیرزادگان کو قبضہ کی سوجھی۔

بہر حال حضرت نے فوراً جگہ خالی کر دی اور ایک منٹ بھی مہلت نہ مانگی۔ کپڑے وغیرہ گھر پہنچا دیئے۔ کتابیں مسجد میں لا کر رکھ دیں
عصا اور تسبیح ہاتھ میں لے کر مسجد میں قبلہ رُخ آ بیٹھے۔ ذرا بھی خیال نہ آیا کہ برسہا برس سے اس جگہ رہ رہا ہوں۔
آپ کے رشتہ داروں، عزیزوں اور جان نثار شاگردوں پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے
نے کسی کو زبان تک نہ ہلانے دی اور یوں فرمایا ——— کہ جس نے کوئی لفظ زبان سے نکالا وُہ میرا دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔"[1]

[1] حاشیہ بر صفحہ ۲۲۶

پہلا حج

آپ کے دن بڑی عسرت اور تنگدستی سے گذر رہے تھے۔ لیکن حرمین شریفین کی حاضری کے لیے آپ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔ لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ آپ کی اقتصادی حالت اس قدر کمزور تھی کہ بمشکل اہل و عیال کی گذران ہوتی تھی بلکہ یہاں تک کہ آپ کی خواہش یہ ہوتی کہ جس حال میں پڑا ہوں اسی گمنامی و گوشہ نشینی کی حالت میں پڑا رہوں کسی آنکھ یا کان کو اس کی خبر نہ ہو۔ ان حالات میں حرمین شریفین تک آنا جانا کیسے ہو؟ لیکن جب طلب سچی ہو تو اللہ تعالٰی اسباب پیدا فرما دیتے ہیں۔

ڈپٹی عبدالحق رامپوری کا قصدِ حج ہوا اور انہوں نے اپنے اہل و عیال اور متعلقین و وابستگان کا ایک جم غفیر ساتھ لیجانا چاہا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری جو حضرت حافظ شہیدؒ سے خلیفہ مجاز تھے۔ ڈپٹی صاحب کے احباب میں سے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے حکیم صاحب کو بھی ساتھ لیا حکیم صاحب حضرت گنگوہیؒ کے عشاق میں سے تھے کیونکہ انہیں علم تھا کہ میرے پیر و مرشد نے حضرت گنگوہیؒ کے زانو پر جام شہادت نوش فرمایا تھا حکیم صاحب نے حضرت گنگوہیؒ کا ذکر کیا تو ڈپٹی صاحب بلا اونیٰ تامل مان گئے بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ مولانا گنگوہی جیسا محبِ رسولؐ و متّبع سنّت ہمارے قافلے میں شریک ہو۔ مولوی ابوالنصر کو حضرت گنگوہیؒ کے ماموں زاد بھائی جو حضرت کے بچپن کے ساتھی اور جاں نثار تھے ان کو جب علم ہوا کہ مولانا سفر حج پر جا رہے ہیں تو انہوں نے اپنا اثاثہ اونے پونے بیچ کر مع اہلیہ معیت اختیار کی۔ ان دنوں سفر حج انتہائی دشوار تھا۔ اور فریضۂ حج کی ادائیگی سب فرائض سے مشکل تھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ دخانی کشتیاں تین تین چار چار ماہ سمندر میں ہچکولے کھاتی رہتیں۔ آپ کے سفر میں سخت طوفان آیا تمام مسافر گھبرا گئے۔ مگر آپ نہایت پرسکون تھے لوگوں کی گھبراہٹ پر انہیں یہ کہکر تسلی دی کہ "بھئی کوئی مریگا تو اپنے نہیں ہم تو کسی کے بلائے ہوئے جا رہے ہیں خود نہیں جا رہے"، اور جہاز جب اصلی حالت پر آیا تو کپتان نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس طوفان کی وجہ سے ہمیں آٹھ دن کی مسافت تین دن میں طے کرا دی ہے۔

رؤیائے صالحہ

آپ کے شریعت و طریقت دونوں کے شیخ یعنی حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت حاجی صاحب علی الترتیب مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں قیام کئے ہوئے تھے۔ حرمین شریفین کی حاضری اور شیخین کی زیارت کے تصور نے حضرت گنگوہیؒ کو بیخود بنا رکھا تھا۔ مکہ معظمہ میں حاجی صاحب کی زیارت ہوئی۔ حج کے دوران حضرت حاجی صاحب نے اپنے طالب صادق کو ہر وقت ہمراہ رکھا آپ نے مکہ معظمہ ہی میں خواب دیکھا:۔

"ابدال جیسے اہل خدمت اولیاء کا ایک گروہ جا رہا ہے اور آپ ان کو دیکھ رہے ہیں آپ فرماتے تھے کہ میں نے خواب ہی میں دعا مانگی کہ یا اللہ مجھے بھی ان سے لاحق کر دے۔ یہ دعا مانگ کر میں ان کے پیچھے دوڑا اور ان کی جماعت میں مل گیا۔"

صبح کو اعلیحضرت کو خواب سنایا تو مسکرا کر فرمایا۔ "پھر اب کیا چاہتے ہو لاحق تو ہو گئے"۔

مکہ معظمہ ہی میں دوسرا خواب دیکھا:۔

"آپ کے ہاتھ کی چاروں انگلیوں سے خون جاری ہے دو سے بکثرت اور تیسری سے کم اور چوتھی سے اور کچھ کم۔"

آپ نے یہ خواب مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے بیان کیا انہوں نے تعبیر دی کہ "تمہاری چاروں نسبتیں (چشتی سہروردی نقشبندی قادری) جاری ہوں گی دو کا جریان بہت ہوگا۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے ان چاروں نسبتوں کا جس طرح فیضان ہوا اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ لیکن آپ اپنی انکساری فرمایا کرتے تھے کہ "اس وقت سے اب تک منتظر ہوں۔ مولوی مظفر حسین زندہ ہوتے تو کہتا۔ کہ آپ ہی نے تعبیر فرمائی تھی لیجئے کچھ کیجئے"۔

مدینہ منورہ میں حضرت شاہ عبدالغنی کی زیارت کی۔ ڈپٹی عبدالحق مرحوم مدینہ ہی میں فوت ہو کر جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ جیسے نیک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بہتر سلوک فرمایا۔

واپسی میں آپ شدید بیمار ہو گئے جہاز ہی میں زندگی سے مایوسی ہو گئی اور یہ مایوسی بمبئی میں ایک ماہ برائے علاج اور ایک ماہ ان میں برائے علاج کے قیام میں مسلسل رہی۔ بالآخر اندور کے شاہی حکیم حکیم محمد اعظم[1] کے علاج سے افاقہ ہونا شروع ہوا۔ گنگوہ پہنچ کر سات آٹھ کے بعد مکمل صحتیابی ہوئی۔ اس پورے سفر اور طویل علالت میں مولوی ابوالنصر نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا۔ تفصیلات جاننے کے بعد خیال ہے کہ اس طرح کے تیماردار شاید انسانی تاریخ میں چند ہی گذرے ہوں حضرت گنگوہیؒ فرمایا کرتے کہ "ابوالنصر تو میری ماں ہے" اور "شاید حقیقی بھائی بھی اتنی خدمت نہ کرتا جتنی انہوں نے کی"

آپ سفر حج کو اوائل ۱۲۸۰ھ میں روانہ ہوئے اور محرم ۱۲۸۲ھ کو واپس گنگوہ پہنچے۔

دوسرا حج

آپ نے دوسرا حج ۱۲۹۴ھ میں کیا۔ اور اس سفر حج میں اللہ کے ایسے ایسے نیک بندوں نے شرکت کی کہ شاید ہندوستان میں اس سے پہلے اور اس کے بعد اس کی نظیر نہ مل سکے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حکیم ضیاء الدین صاحب۔ مولانا محمد مظہر صاحبؒ بانی مظاہر العلوم کے علاوہ تقریباً سو بڑے بڑے عالم و فاضل اس قافلے میں شریک تھے۔ اس سفر کی پورے ملک میں شہرت ہو گئی۔ لہذا گھر سے لے کر ساحل تک ہر جگہ فقید المثال استقبال ہوا۔ ایسے صلحاء و علماء کے سفر حج پر اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کی جو بارش ہوئی ہو گی اس کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب کو اطلاع مل چکی تھی۔ لہذا اعلیحضرت باوجود ضعف و نقاہت اور پیرانہ سالی کے مکہ معظمہ سے باہر استقبال کے لیے کتنی دیر سے انتظار کر رہے تھے۔ قافلے کے آنے پر ہر ایک سے مصافحہ کیا۔ اور سب کو تقریباً اپنے پاس ٹھہرایا۔ ۱۲۹۵ھ میں واپسی ہوئی۔

حضرت نانوتویؒ کی وفات

اسی سفر میں حضرت نانوتوی بیمار ہوئے اور اس بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ مرض الموت کا سبب بنی اور ۱۲۹۷ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ حضرت گنگوہیؒ کو اس کا شدید صدمہ ہوا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "مجھے مولوی محمد قاسم کی مفارقت کا اتنا صدمہ ہوا کہ اگر ایک بات نہ ہوتی تو اسی وقت میری جان نکل جاتی"۔ کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت وہ کیا بات تھی فرمایا" وہی جس کی وجہ سے تم مجھے بڑا سمجھ رہے ہو"

تیسرا حج

۱۲۹۹ھ میں آپ نے تیسرے حج کا دفعتہً ارادہ کیا اور ایسے وقت میں کیا کہ بظاہر حج کے دنوں میں پہنچنا مشکل تھا۔ ذی قعدہ کو گنگوہ سے روانہ ہوئے۔ بمبئی سے جب جہاز چلا ہے تو چودہ روز حج میں باقی تھے۔ خدا کا فضل شامل حال تھا۔ نویں دن جدہ پہنچ گئے۔ حالانکہ آج کے تیز رفتار وقت میں بھی چھ روز میں کراچی سے جدہ پہنچنا ہوتا ہے۔ اور بمبئی سے کراچی کی نسبت بہت دور ہے۔ کامران میں قرنطینہ کے لیے جہاز کا ٹھہرنا ضروری تھا لیکن غیبی کشش کی بناء پر جہاز کشاں کشاں چلتا رہا اور باوجود کامران میں رکنے کی ہدایات کے نہ رکا۔ جس کی وجہ سے جہاز کو تین ہزار روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ حضرت جب مکہ معظمہ پہنچتے ہیں تو اگلے دن ایام حج شروع ہو گئے۔

---

[1] حکیم محمد اعظم بمشاہرہ ایک ہزار روپیہ ماہوار اندور میں ملازم تھے۔ ان کی مشہور تصنیف "اکسیر اعظم" ہے۔ حضرت گنگوہیؒ برائے علاج اس سے استفادہ کیا کرتے حضرت اگرچہ غربت اور سفر ہی میں تھے تاہم حکیم صاحب نے ان کی جائے قیام پر آکر معاینہ کیا اور معجون عنبری علاج تجویز کیا۔

ایک گنگوہ کے شخص اس سال حج کے لیے روانہ ہوئے مگر حضرت کی خواہش کے باوجود پہلے چل دیئے اور واپسی میں بھی جلد چل نکلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ قسطنطنیہ کے لیے راستہ میں ٹھہرنا پڑا خرچ بھی زیادہ ہوا اور وقت بھی زیادہ لگا۔ حضرت کا بھانہ نہ آتے ہوئے رُکا اور نہ جاتے ہوئے۔
آپ کا تیسرا حج آخری حج تھا۔ اس کے بعد سفر حج کا اتفاق نہیں ہوا بالاستقلال تعلیم و تعلم میں مشغول ہو گئے۔

مدارس کی سرپرستی

حضرت گنگوہیؒ کا وجود کتاب و سنت کی اشاعت کے لیے وقف تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے تاحیات آپ سرپرست رہے۔ مظاہر العلوم سہارنپور کی بناء دارالعلوم دیوبند کے بناء کے چھ ماہ بعد ۱۲۸۳ھ میں رکھی گئی۔ اس کے بانی حضرت مولانا سعادت علیؒ اور مولانا محمد مظہر نانوتویؒ تھے۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ سرپرست تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا احمد علیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دونوں کا انتقال ہو گیا۔ اور یہ سال ہندوستان میں مدارس دینیہ کی تاریخ میں عام الحزن اور سال غم کہلاتا ہے۔ مظاہر العلوم اور دارالعلوم دونوں مدرسے یتیم ہو گئے۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ کی توجہ جو اس سے پہلے مدارس کی طرف مستور تھی اب علانیہ ہو گئی اور آپ ان کے مستقل سرپرست و نگران ہو گئے۔

دارالعلوم دیوبند کا جلسۂ دستار بندی

۱۳۰۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں چوتھا جلسہ دستار بندی ہوا۔ جو اس کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ حضرت گنگوہیؒ اس میں تشریف لائے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت مولانا محمد یحییٰ سمیت گیارہ حضرات کی دستار بندی ہوئی۔ اس جلسہ پر دیوبند میں اتنا بڑا اجتماع ہوا کہ اس سے قبل شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ حضرت گنگوہیؒ نے دستار بندی کی خوش نصیب حضرات کہ جن کی دستار بندی حضرت گنگوہیؒ نے فرمائی۔ جلسہ کے اگلے دن جمعہ تھا مولانا رفیع الدین صاحب و مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وعظ سننے کو بہت دل چاہتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ آپ کا چاہتا ہے تو جو کچھ مجھے آتا ہے کہہ دونگا۔ اگلے دن جامع مسجد میں وعظ فرمایا اس وعظ کی کیفیت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے الفاظ میں پڑھیے کہ جو روایتی قسم کے مہتمم نہ تھے۔ تکلف و تصنع سے بے نیاز۔ سادگی و خلوص کے پیکر۔ اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے جانشین۔ یقین نہیں آتا کہ انہوں نے روداد تقریر میں ذرا بھی مبالغہ کیا ہوگا سالانہ روئیداد مدرسہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

> وعظ کیا گویا سامعین کو مئے محبتِ الٰہی کے خُم کے خُم پلا دیئے در و دیوار تک مست تھے اور عجیب کیفیت ظاہر تھی کہ کہیں دیکھی نہ سنی اللہ اللہ! اس کے خاص بندوں کے سیدھے سیدھے الفاظ اور سادہ بیان اور ڈھیلی ڈھیلی زبان میں کیا کیا تاثیرات ہیں کہ بشر کیا شجر و حجر بھی مان جاتے ہیں مولانا نے کوئی دقیق مضامین علمیہ بیان نہیں فرمائے۔ یہی وضو اور نماز کے مسائل بیان کیے اور اخلاص کے بیان میں کسی تقریب سے ایک دفعہ باآواز بلند اللہ کہا معلوم نہیں کہ کس دل اور کیسے سوز و گداز سے اللہ کا نام لیا کہ تمام مجلس وعظ لوٹ گئی اور آہ و زاری کی آواز سے مسجد گونج اٹھی ہر شخص اپنے حال میں مبتلا تھا اس وقت بعض اشخاص نے مولوی صاحب کو دیکھا کہ کمال وقار سے منبر پر خاموش بیٹھے ہیں اور اہل جلس کی طرف متوجہ ہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ایسے متوجہ ہوتے تو اہل جلسہ کو دیر تک افاقہ نہ ہوتا مگر اللہ رے حوصلہ کہ خود ویسے ہی مشتغل رہے۔ ع
>
> سینہ میں قلزم کو لے قطرہ کا قطرہ ہی رہا [۵]

---

[۵] حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ۔
تذکرۃ الرشید صفحہ ۵۰-۲۵۱

جامع الصفات

اسلام اور ایمان کے الفاظ اور ان کے معنوں پر علماء نے بالتفصیل کلام کیا ہے۔ جس کا خلاصہ اور مفہوم یہ ہے کہ انسان اعضائے ظاہر اور قلب کو حق تعالےٰ شانہٗ کی اطاعت و فرمانبرداری میں مشغول رکھے۔ اس کی زبان اور دل میں مطابقت پائی جائے۔ جو کام اس کے ہاتھ پاؤں سے ظاہر ہوں اور جو باتیں اس کی زبان سے نکلیں اس پر اس کا دل راضی ہو۔ طبیعت کو اس کا خوگر بنانا کہ شریعت حقہ اور سنتِ نبویہ پر عمل کرنا مرغوب ہو جس طرح کہ تندرست اور صحت مند آدمی کو غذا کی رغبت ہوتی ہے مطلوب و محمود ہے۔ اس کے حصول کے لیے جو کوشش کی جائے اس کو سلوک و معرفت یا تصوف و احسان کہتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے پیار اور شریعت حقہ کے احکام پر عمل کرنا بن جائے۔ کسی تکلف کی حاجت نہ رہے۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے جب ایسے لوگوں کی صحبت و رفاقت میسّر ہو کہ جن کی ہر حرکت اور سکون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ہو۔ سنت نبویہ پر عمل کرنا ان کا طبعی شیوہ اور خلق و شعار بن چکا ہو۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل انسان تھے۔ آپ کی جملہ حرکات و سکنات جن کو عادات کہا جاتا ہے مکمل اعتدال پر تھیں۔ آپ ہر انسان کے دل کو معتدل بنا سکتی ہے۔ اعضائے ظاہر کو دل کے ساتھ خاص تعلق ہے اگر مسلمان اپنے ظاہری اعمال کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اور اپنی عادات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع کر دیگا۔ تو اس کے اعضاء اور عادات میں اعتدال پیدا ہو کر بے اعتدالی دور ہو جائے گی۔ نیکی سے اسے محبت اور گناہ سے نفرت ہوتی چلی جائے گی۔ عبادات بالطبع مرغوب و محبوب بن جاتی ہیں اور کسی امر میں اللہ کی اگر نافرمانی ہو جائے تو اس سے دلی کوفت اور ناگواری پیدا ہوتی ہے۔ اور ہوتے ہوتے معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ قلب کو اللہ وحدہٗ و احدوں۔ اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں وہ لذت محسوس ہوتی ہے کہ جس کے سامنے دنیا کی کسی لذت کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ اللہ کے ذکر اور فکر سے ایک لمحہ غفلت ہفت اقلیم کی دولت چھوٹ جانے سے زیادہ مغموم بناتی ہے۔ صبح کے وقت نوافل تہجد اور اللہ کے ساتھ مناجات سے جو انہیں دولت میسّر آتی ہے۔ پوری کائنات کی مادی دولت اس کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو خلیفہ نے سنجر کے علاقہ کا گورنر بنانا چاہا آپ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

چوں چتر سنجری رخِ بختم سیاہ باد ۔۔۔ در دل اگر بود ہوسِ ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

لیکن یہ زہد اور دنیا سے بے رغبتی ان کو غاروں اور صحراؤں کے گوشے میں نہیں بھیجتی کہ دنیا سے قطع تعلق ہو جائیں وہ دنیا میں دوسروں کے ساتھ رہکر اپنی تمام مساعی کو لوگوں کو خدا سے ملانے میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن دنیا میں رہ کر دنیا کے خواہش مند اور لوگوں سے مال کے طالب نہیں ہوتے۔ ان کی مثال کشتی اور دریا کی ہوتی ہے کہ کشتی دریا میں رہنے کے باوجود پانی کے اوپر تیرتی ہے پانی کو اپنے اندر نہیں آنے دیتی اگر پانی اس کے اندر داخل ہو جائے تو غرق ہو جاتی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم میں جو انہماک اور فنائیت تھی اس کی نظیر آپ کے زمانہ میں نہیں ملتی۔ بلکہ یوں کہیے کہ آپ اس بارے میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خوش قسمت افراد میں

جن پر پوری اُمت فخر کر سکتی ہے۔ آپ نے ایک جگہ طریقت و شریعت کی ماہیت بیان فرمائی ہے جو ہدیہ ناظرین ہے۔

"علم الصوفية علم الدين ظاهراً و باطناً وقوة اليقين وهو العلم الاعلى. حالهم اصلاح الاخلاق ودوام الافتقار الى الله تعالى. حقيقة التصوف التخلق باخلاق الله تعالى وسلب الارادة وكون العبد فى رضاء الله تعالى. اخلاق الصوفية ما هو خلقه عليه السلام بقوله انك لعلى خلق عظيم وما ورد به الحديث وتفصيل اخلاقهم هكذا۔ التواضع[1] ضده الكبر۔ المدارات[2] واحتمال الاذى عن الخلق المعاملة برفق و خلق حسن و ترك غضب وغيظ۔ المواساة[3] والايثار بفرط الشفقة على الخلق و هو تقدم حقوق الخلق على حظوظه۔ السخاوة[5]۔ التجاوز[4] والعفو طلاقة الوجه والبشرة۔ السهولة[8] و لين الجانب۔ ترك[9] التعسف والتكلف۔ انفاق[10] بلا اقتار و ترك الادخار۔ التوكل[11]۔ القناعة[12] بيسير من الدنيا۔ الورع[13]۔ ترك[14] المراء والجدال والعتب الا بحق۔ ترك[15] الغل والحقد والحسد۔ ترك الماه (المال) والجاه۔ وفاء[16] الوعد۔ الحلم[17] الاناءة[18]۔ التواد[19] والتوافق مع الاخوان والعزلة[20] عن الاغيار۔ وشكر[21] المنعم۔ بذل[22] الجاه للمسلمين۔ الصوفى يهذب الظاهر والباطن فى الاخلاق۔ والتصوف

صوفیہ کا علم نام ہے ظاہر و باطن، علم دین اور قوت یقین کا اور یہی علم اعلیٰ ہے۔ صوفیہ کی حالت اخلاق کا سنوارنا اور ہمیشہ خدا کی طرف لو لگائے رکھنا ہے تصوف کی حقیقت اللہ تعالےٰ کے اخلاق سے مزین ہونا اور اپنے ارادہ کا چھن جانا اور بندے کا اللہ تعالےٰ کی رضا میں بالکلیہ مصروف ہو جانا ہے۔ صوفیہ کے اخلاق وہی ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں بسبب فرمان خداوند تعالیٰ کہ بیشک تم بڑے خلق پر (پیدا کئے گئے) ہو اور نیز جو کچھ حدیث میں آیا ہے (اس پر عمل اخلاق صوفیہ میں داخل ہے) صوفیہ کے اخلاق کی تفصیل اس طرح ہے اپنے آپ کو کمتر سمجھنا اور اس کی ضد ہے تکبر۔ مخلوق کے ساتھ تلطف کا برتاؤ کرنا اور خلقت کی ایذاؤں کو برداشت کرنا۔ نرمی اور خوش خلقی کا معاملہ کرنا اور غیظ و غضب کا چھوڑ دینا۔ ہمدردی اور دوسروں کو ترجیح دینا خلق پر فرطِ شفقت کیساتھ جسکا یہ مطلب ہے کہ مخلوق کے حقوق کو اپنے حظِ نفسانی پر مقدم رکھا جائے۔ سخاوۃ کرنا۔ درگذر اور خطا کا معاف کرنا۔ خندہ روئی اور بشاشتِ جسم۔ سہولت اور نرم پہلو رکھنا۔ تصنع اور تکلف کا چھوڑ دینا۔ خرچ کرنا بلا تنگی اور بغیر اتنی فراخی کے کہ احتیاج لاحق ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھنا۔ تھوڑی سی دنیا پر قناعت کرنا۔ پرہیزگاری۔ جنگ و جدل اور عتاب نہ کرنا مگر حق کیساتھ۔ بغض و کینہ اور حسد نہ کرنا۔ عزت و جاہ کا خواہشمند نہ ہونا۔ وعدہ پورا کرنا۔ بردباری۔ دور اندیشی۔ بھائیوں کیساتھ موافقت و محبت رکھنا اور اغیار سے علیحدہ رہنا۔ محسن کی شکرگذاری اور جاہ کا مسلمانوں کے لئے خرچ کرنا۔ صوفی اخلاق میں اپنا ظاہر و باطن مہذب رکھتا ہے اور تصوف

ادب کلہ - ادب الحضرۃ الالٰھیۃ الاعراض عما سواہ حیاءً واجلالاً وھیبۃً - اسواء المعاصی حدیث النفس وسبب الظلمۃ"

(تذکرۃ الرشید صفحہ ۱۱ دوسرا حصہ)

سارا ادب ہی کا نام ہے - بارگاہ احدیت کا ادب یہ ہے کہ ماسوائے اللہ سے منہ پھیر لیا جائے - شرم کے مارے حق تعالیٰ کے اجلال و ہیبت کے سبب تحدیثِ نفس (یعنی نفس سے باتیں کرنا) بدترین معصیت اور ظلمت کا سبب ہے -

امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے صوفی اور اچھے انسان اور مسلمان کی جو تفصیل بالاجمال مندرجہ بالا عبارت میں فرمائی ہے - وہ ان تمام کتب کا خلاصہ ہے جو چودہ سو سال میں اسلام کی تعبیر و تشریح میں لکھی گئی ہیں اور ہر وہ مرشد یا شیخ یا معلم جو صحیح معنوں میں اس نام کا حامل ہوگا، اس میں ان صفات کا پایا جانا ضروری ہے - خود حضرت گنگوہیؒ میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اور وہ اپنے زمانے کے فردِ وحید تھے - جو صحیح معنوں میں شرک و بدعت کے مخالف اور احکام شرعیہ و سُنن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی تھے - سچ یہ ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں رنگ لیا تھا - مدح و ذم ان کیلئے یکساں تھی - نہ تعریف انہیں خوش کرتی تھی اور نہ ہی ان کی مذمت ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات چھوڑتی تھی -

شیخ کا امتحان

پہلی بار جب آپ ایک چلہ تھانہ بھون رہ کر آئے - چند دن ٹھیرنے کے بعد خیال ہوا کہ حضرت حاجی صاحب پر کھانے کا بوجھ ہے کوئی اور انتظام کرنا چاہیئے لیکن ایسا انتظام دشوار تھا لہذا جانے کی اجازت چاہی - حاجی صاحب نے فرمایا ابھی چند روز اور ٹھیرو - میں خاموش ہوگیا لیکن یہ فکر ہوا کہ کھانے کا کیا کروں گا - تھوڑی دیر بعد حاجی صاحب تشریف لائے اور میرے وسوسہ پر مطلع ہو کر کہا "میاں رشید احمد کھانے کی فکر مت کرنا ہمارے ساتھ کھاؤ" چنانچہ دوپہر کو گھر سے کھانا آیا ایک پیالہ میں لذیذ کوفتے تھے اور دوسرے میں معمولی سالن تھا - حاجی صاحب نے معمولی سالن کا پیالہ میری طرف کردیا - اتنے میں حافظ ضامن شہیدؒ آگئے اور فرمانے لگے "بھائی صاحب! رشید احمد کو اتنی دُور ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے اس پیالہ کو ادھر کیوں نہیں رکھ لیتے" - اعلیحضرت نے بے ساختہ جواب دیا "کہ اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ کھلا رہا ہوں - جی تو چاہتا ہے کہ چوڑہوں اور چماروں کی طرح ایک ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا" یہ فقرہ کہنے کے بعد حاجی صاحب نے مولانا گنگوہی کی طرف دیکھا - مولانا گنگوہی فرماتے ہیں کہ "حضرت کا یہ دیکھنا اس لئے تھا کہ کچھ تغیر تو نہیں - مگر الحمد للہ میرے قلب پر بھی اس کا کچھ اثر نہ تھا - میں سمجھتا تھا کہ حقیقت میں جو کچھ حضرت فرماتے ہیں بالکل سچ ہے - اس دربار سے روٹی ہی کا ملنا کیا تھوڑی نعمت ہے جس طرح بھی ملے بندہ نوازی ہے - اس کے بعد حضرت نے پھر کبھی میرا امتحان نہیں لیا" اس کے بعد فرمایا - "اسی لئے مجھ کو کچھ آیا نہیں"[1]

مجھے اس کی تمنا نہیں

ایک دفعہ آپ نانوتہ یا رام پور تشریف لے گئے - سردی کے موسم میں آپ گاڑھے کی میلی دوہر اوڑھے ہوئے بیٹھے تھے - آپ کے دائیں بائیں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور حکیم ضیاء الدین صاحب بیٹھے تھے - ایک صاحب آئے اور دائیں بائیں مصافحہ کرکے بیٹھ گئے - آپ کو باوجود درمیان میں بیٹھے ہوئے عام آدمی خیال

[1] تذکرۃ الرشید صفحہ ۸ جلد ۲

کر کے چھوڑ دیا۔ مولینا محمد یعقوب صاحب چونکہ آپ سے بے تکلف تھے۔ لہٰذا مسکرائے۔ امام ربّانی نے مطلب سمجھا اور فرمایا۔ "الحمد للہ مجھے اس کی تمنا نہیں کہ لوگ مصافحہ کریں"۔

بدعت اور ضلالت سے نفرت

اتباع سنت کا جذبہ جس قدر آپ کے قلب میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اُسی قدر شدید جذبہ بدعت و گمراہی کے خلاف تھا چنانچہ آپ کسی گمراہی یا خلاف شریعت کام کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ کرنال سے گنگوہ ایک برات آئی جس میں رقاصہ بھی تھی۔ اس برات میں کچھ لوگ آپ سے ملنے والے تھے۔ آپ اُس دن صبح اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد میں منہ ڈھانپ کر لیٹ گئے۔ واقف کار لوگ سلام کرنے کے لئے آئے۔ دیر تک آپ کے پاس بیٹھے رہے مگر آپ نے منہ نہ کھولا۔ بالآخر ایک صاحب بولے۔ کہ حضرت ہم تو زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ آپ نے منہ ڈھانپے غصہ میں جواب دیا کہ "میری زیارت میں کیا دھرا ہے"؟ چنانچہ ایک سفید ریش بزرگ نے معاملہ سمجھ کر عرض کیا کہ حضرت، ہم تو رنڈی کو ساتھ لائے نہیں، بیٹی والوں کی حرکت ہے۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ "میاں بیٹی والے کسی کے خدا تو نہیں ہیں کہ اُن کا کہنا ماناہی جائے"۔ اسی جملے سے بہت سے حاضرین کے دل بھر آئے۔ وہ لوگ جب چلے گئے تو آپ نے منہ کھولا اور اُٹھ بیٹھے۔

اس میں تلبیس تم تھے

آپ کے جدّ امجد شاہ عبدالقدوسؒ کا عرس ہوتا تھا۔ آپ اس کو بند کرنے پر قادر نہ تھے۔ اوّل اوّل آپ کو صبر کرنا دشوار تھا لہٰذا آپ ان دنوں رام پور چلے جاتے تھے۔ مگر جب آخر میں اس ایذا قلبی کی برداشت آپ کو دے دی گئی تو آپ یہ زمانہ خانقاہ ہی میں گذارتے۔ اگر کوئی آپ کا معتقد اُن دنوں آجاتا تو آپ کو تکلیف ہوتی۔ آپ اکثر ناراض ہوتے اور ترکِ تکلّم فرما دیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا حافظ محمد صالح صاحب[1] حضرت گنگوہی کی زیارت سے بے تاب ہو کر گھر سے نکل پڑے۔ اتفاق سے عرس کا زمانہ تھا۔ اگرچہ آنے والے کو اس کا وہم بھی نہ تھا مگر حضرت گنگوہیؒ اپنے شیدائے سنت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ آپ سے نہ ہو سکا کہ ان کی مزاج پُرسی کریں یا محبت و مدارات سے پیش آئیں۔ آپ نے بجز سلام

---

[1] حضرت مولینا حافظ محمد صالحؒ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ آپ صاحب فضل و کمال بزرگ تھے اور سلف صالحین کے زہد و تقویٰ کی تصویر ــــ مشرقی پنجاب کے مشہور و معروف مدرسہ عربیہ "مدرسہ رشیدیہ" رائے پور ضلع جالندھر کے آپ بانی تھے۔ یہ مدرسہ آج کل جامعہ رشیدیہ کے نام سے ساہیوال میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے دورِ قدیم کے صدر مدرس حضرت مفتی فقیر اللہ (جو متحدہ پنجاب کے نامی گرامی مفتی تھے) کے فرزند ارجمند مولینا حبیب اللہ اس کے ناظم اور مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے مولینا حافظ محمد عبد اللہ صاحب شیخ الحدیث ہیں۔ حضرت حافظ محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحب زادے حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب مقیم چک ۱۱ (۱۱-ایل) نزد چیچہ وطنی اور حضرت پیرجی عبداللطیف صاحب مہتمم مدرسہ تجوید القرآن چیچہ وطنی ہیں۔ دونوں بزرگ صاحبِ نسبت اور صاحب قال و حال بزرگ ہیں۔ اس مدرسہ رشیدیہ کے پہلے مہتمم مولانا فضل احمد صاحب نے چک ۱۱ (۱۱-ایل) چیچہ وطنی میں چند سال قبل تقریباً سو سال کی عمر میں وفات فرمائی۔

کے جواب دینے کے ان سے یہ بھی نہ پوچھا کہ روٹی کھائی یا نہیں اور کب آئے یا کیوں آئے۔ مولانا محمد صالح کو اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ حضرت کا رُخ پھرا ہوا دیکھنا جس طرح شاق گذر رہا تھا۔ اس کو انہی کے دل سے پوچھنا چاہیئے تھا۔ حاضرِ خدمت ہوتے اور خاموش بیٹھ کر رنجیدہ و محزون واپس ہو جاتے۔ آخر اس حالت کی تاب نہ لا کر حاضر خدمت ہوئے اور رو کر عرض کیا کہ حضرت مجھ سے کیا قصور ہوا جس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ میں تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، اللہ واسطے معاف فرما دیجئے۔ اسوقت حضرت نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا کہ ——— "میرا قصور نہیں کیا جس کو میں معاف کر دوں، خدا کی خطاء کی ہے اس سے معافی چاہو"۔ اس وقت مولانا سمجھے کہ عُرس کے دنوں میں آنا ناگوار گذرا ہے۔ چنانچہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا "کہ خدا شاہد ہے مجھے تو عرس وغیرہ کے ساتھ ابتدا ہی سے شوق نہیں اور نہ مجھے اس کا علم تھا۔

حضرت امام ربانیؒ نے فرمایا۔ اگرچہ تمہاری نیّت عُرس میں شرکت کی نہ تھی مگر جس راستہ میں دو آدمی عرس کے لئے آ رہے تھے اسی میں تیسرے تم تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

مَنْ كَثَّرَ سَوَادَ قَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ ۔ جو آدمی کسی قوم کی کثرت کا باعث ہوا وہ اُنہی میں سے ہے۔

عمل پر مداومت اور استقامت

اصل کرامت شریعت کے اعمال و احکام پر استقامت اور مداومت ہے یہ بڑا کٹھن اور مشکل کام ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں سنّتِ رسول کا خیال رکھنا اور ساری زندگی اس پر عمل کرنا سب سے بڑا مجاہدہ اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ حضرت گنگوہیؒ میں یہ بات کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اگر ایک آدمی آپ کو دس سال قبل مل کر گیا اور دس سال بعد پھر آیا تو آپ میں بلاکم و کاست اُسی طرح اتباعِ شریعت کی محویت اور فنائیت دیکھتا تھا اور اسی استحکام و استقامت کے ساتھ اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب کو پاتا تھا۔ آپ کے مخالفین نے آپ کے خلاف بہت زور لگایا اور بہت کچھ تحریریں شائع کیں مگر الحمد للہ مخالفین کو باوجود حد درجہ مخالفت کے آپ کی ذات پر کبھی کسی ایسے طعن یا الزام کا موقعہ عمر بھر نہ ملا جس کا عیب یا برائی ہونا عند الشرع مسلم ہو۔ آپ کے ہنروں کو عیب بنایا گیا اور سنت و اصل شریعت سے فرطِ محبت کی وجہ سے بدعات سے جو تنفر تھا اس کو معصیت بنا کر آپ کی تکفیر کی گئی۔ آج جب کہ آپ کو اس دنیا سے گذرے ہوئے پون صدی سے اوپر کا عرصہ ہو رہا ہے اگر پوری مخلوق جمع ہو کر بھی کوئی ایسا واقعہ نکالنا چاہے جس میں آپ کی نماز کا قضا ہونا یا جماعت سے کاہلی و سستی یا کسی شرعی پسندیدہ امر سے ذرا برابر بے رغبتی غفلت ثابت ہوتی ہو تو نہیں نکال سکتی۔

بائیس[۲۲] برس کے بعد تکبیرِ اولیٰ فوت

دیو بند کا جلسہ دستار بندی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اس میں ایک دن غالباً عصر کی نماز میں ایسا اتفاق پیش آیا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب نماز پڑھانے کو مصلے پر کھڑے ہوئے تو تکبیر اولیٰ کہی جا چکی اور امام نماز شروع کرا چکا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھا گیا کہ جو وجود بڑے بڑے حوادث اور اعزاء کی اموات، تنگ دستی و عزبت میں کبھی پریشان نہیں ہوا تھا، اُس کا چہرہ اداس اور پریشانی کا مظہر تھا اور آپ لم کے ساتھ یہ الفاظ فرما رہے تھے "افسوس بائیس برس کے بعد آج تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی"۔

ہوا میں اُڑنا، سمندر میں اپنے پاؤں پر چلنا یا اسی طرح کی دوسری خوارق عادت باتیں کم درجہ کی کرامات ہیں اصل کر

یہ استقامت و دوام ہے جو شاید کروڑوں میں سے ایک کو حاصل ہوتا ہے۔

شب بیداری و تہجد گزاری

"تذکرۃ الرشید" میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰنؒ کی زبانی حضرت گنگوہی کے انضباط اوقات درج ہوئے ہیں۔ ساری عمر تقریباً اس پر عمل کیا کبھی اس میں تبدیلی یا تغیر نہیں ہوا۔ مولانا منیر نانوتویؒ ایک سفر حج میں ساتھ تھے۔ ایک روز آدھی رات کے بعد ان سے کہا کہ ایک دو ڈول سمندر سے پانی کے نکال دو، غسل کروں گا۔ نانوتویؒ صاحب نے کہا کہ ابھی تو بہت رات باقی ہے۔ صبح ہونے دیجئے اگر ایک رات تہجد قضا بھی ہوگئی، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر حضرت کو یہ منظور نہ ہوا اور اسی وقت غسل فرما کر نماز تہجد ادا فرمائی اور حسب معمول فجر تک تلاوت قرآن اور وظائف میں مشغول رہے۔

او مردود تو اللہ ہے!

ایک فقیر صوفی آپ سے بہت پیار محبت رکھتا تھا۔ آپ بھی اُن کو فقیر درویش سمجھ کر ان کا ادب واحترام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس فقیر نے آپ سے کہا کہ جانتے ہو کہ یہ جو ذکر "اللہ ہو" کرتا ہوں کیا کہتا ہوں؟ یہ کہتا ہوں "اللہ ہوں"۔ یہ سُن کر آپ نے فوراً طیش میں آکر فرمایا کہ "او مردود تو اللہ ہے"۔ سابقہ دوستی یا مروت کا ذرہ بھر لحاظ نہیں کیا۔ اس کے بعد پھر اس فقیر کی کبھی صورت نہ دیکھی۔

گنگوہ بھی دیکھتا چلوں

داروغہ اسد علی صاحب انسپکٹر پولیس پشاور کو شیخ کی تلاش تھی۔ انہوں نے رخصت لے کر ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا۔ بیسیوں درویش حضرات سے ملے۔ افغانستان تک گئے مگر کسی جگہ کسی کو سنت کے اتباع میں کامل نہ دیکھا۔ رخصت ختم ہونے کو تھی۔ واپسی میں مظفر نگر ریل میں گنگوہ اور حضرت گنگوہی کا تذکرہ سُن کر گنگوہ چلے گئے کہ شاید یہیں مقصد حاصل ہو۔ دیکھوں کیا انداز ہے۔ گنگوہ پہنچے ایک ہی دن میں اُن کا غنچۂ دل کھلا، اور یاس اُمید سے بدل گئی۔ آپ کو داروغہ صاحب نے دیکھا کہ ہر ہر بات میں سنت کا کمال اتباع کرتے ہیں۔ چنانچہ بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔

جانب اَولیٰ کو بھی ترک نہ فرماتے

مولانا علی رضا صاحب حضرت گنگوہیؒ کے پاس برسوں رہے اور حضرت کی شاگردی کی اس کے بعد وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے اور کڑی نگاہوں سے حضرت گنگوہی کے ایک ایک فعل کو دیکھتے کہ شیخ کی تلاش تھی اور شیخ کامل کو دیکھنا چاہتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ برسوں میں ایک دفعہ بھی حضرت کا کوئی فعل خلافِ سنّت نہیں پایا بلکہ حضرت حتی المقدور مستحبات اور جانب اَولیٰ (بہتر) کو بھی ترک نہ فرماتے تھے لیکن مباح سے آگے قطعاً نہ بڑھتے تھے۔ مباح کاموں کو — یعنی جائز کاموں کو — کرکے آپ کو رُوحانی خوشی نہ ہوتی تھی مگر سنن و مستحبات اور واجبات و فرائض پر عمل کرکے آپ کی طبیعت میں ایسا انشراح اور مزاج میں ایسی لطافت و بشاشت پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر دیکھنے والا محسوس کر لیتا تھا۔

بدعات کو دیکھ کر آنسو بھر لاتے

دنیا میں ہدایت کا پھیلنا آپ کو اس درجہ محبوب و مرغوب تھا کہ اس سے زیادہ آپ کو کسی چیز میں لذت نہ آتی تھی اور مخلوق کی گمراہی و جہالت سے اُسی قدر آپ کو صدمہ اور رنج ہوتا تھا۔ حق کی اشاعت اور باطل کی تردید میں جی توڑ کر کوشش فرماتے تھے۔ اگرچہ آپ مناظرہ و مباحثہ سے طبعاً

متنفر تھے لیکن بدعات و معصیت کو پھیلانے والی تحریر دیکھ کر آپ غصّے کو ضبط نہ کر سکتے تھے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو اتر آتے بلکہ غصہ اور رنج کے باعث خون اتر آتا اور آپ کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے۔ چنانچہ آپ سنّت کا دامن تھام کر نہایت ضبط سے کام لے کر اس کی تردید میں جواب لکھتے۔ پھر اس کا طبع ہونا اور چھپنا آپ کو پسند آتا۔ جو آدمی اس کی ذمہ داری اٹھاتا اس سے بہت خوش ہوتے اور دعا کرتے۔

مجھے تحقیق نہیں اگر آپ کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا یا اس کے بارے میں آپ کی تحقیق مکمل نہ ہوتی تو لا ادری "میں نہیں جانتا" کہنے میں آپ کو کوئی جھجک یا گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ بلا تأمل یا بلا تکلف فرما دیتے کہ میں اس مسئلہ کو نہیں جانتا یا مجھے یہ مسئلہ نہیں آتا۔ اس بات کا ذرہ بھر خیال نہیں کرتے تھے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک پرچہ ایک شخص کے پاس دیکھا جس پر چند سوالات اور حضرت کی طرف سے اُن کے جوابات تھے۔ اسی پرچہ میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "بچوں کو نزع کی تکلیف زیادہ کیوں ہوتی ہے؟" اس کا جواب حضرت نے صرف یہ لکھا تھا کہ "مجھے تحقیق نہیں"۔

حوادثات اور صدمات پر صبر دنیاوی حوادث و صدمات میں آپ صبر کرنے میں کوہ استقلال تھے۔ ایک دفعہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے پانچ عزیز۔ آپ کا نواسہ[1]، بیٹا[2]، اہلیہ[3]، مرحوم بیٹے کی بیوی[4] شیر خوار بچہ چھوڑ کر، اور نواسی[5] یکے بعد دیگرے فوت ہوگئے لیکن حضرتؒ نے ایسا کمال صبر کا مظاہرہ کیا کہ لوگ انگشت بدنداں تھے۔ ان کا کبھی تذکرہ نہ کرتے۔ زندگی میں تین واقعات ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جانے والوں کا ذکر فرمایا ہے ایک مرتبہ مولانا یحییٰ کاندھلوی۔ (آپ اُن پر غایت درجہ مشفق و مہربان تھے) ۔۔۔ سے ایک موقعہ کی مناسبت سے فرمایا "مولوی یحییٰ تمہاری عقل کو ہیضہ تو نہیں ہوگیا" اُن کے جانے کے بعد مولانا دوسرے ساتھی سے فرمانے لگے کہ میں نے مولوی یحییٰ کو ویسے ہی کہہ دیا ورنہ ہمارے گروہ میں سبھی اُن کو عقل مند مانتے ہیں۔ انہوں نے اتنا تو جواب دیا تو فرمایا ۔۔۔ مزاج دانی تو مسعود احمد کی ماں ہی کو تھی ۔۔۔ اس سے قارئین یہ خیال نہ فرمائیں کہ شاید حضرت گنگوہیؒ کو ان حوادث کا صدمہ ہی نہیں ہوا۔ صدمہ تو ہر انسان کو ہوتا ہے مگر حضرت اظہار نہیں فرماتے تھے۔ بس اتنا ہی اظہار ہوتا جتنا سنت سے ثابت ہے ۔۔۔ ورنہ صدمہ تو بہت ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ۔۔۔ محمود احمد (بیٹے کی وفات) نے میری کمر توڑ دی ۔۔۔ آپ کے ایک خادم مولوی رحمت اللہ پانی پتی اپنے خطوں میں ہمیشہ محمود احمد کو سلام لکھتے۔ آخر دو سال کے بعد امام ربانی نے ان کے کسی خط کے جواب میں یوں تحریر فرمایا۔ "آپ خط میں حافظ مسعود احمد کو سلام لکھا کریں۔ حافظ محمود احمد مرحوم دو سال ہوئے کہ اس عالم سے رحلت فرما کر مجھ ناکارہ کو پریشان و حیران کر گئے ہیں۔ جب تم اس کو سلام لکھتے ہو مجھ کو بے قراری ہو جاتی ہے۔ آئندہ ان کا نام مت لکھنا"۔

جوابات میں جلدی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کچھ سوالات ایک آدمی کے ہاتھ لکھ کر بھیجے اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ جوابات جلدی عنایت فرمائیے۔ سوالات بہت سے اور خاصے دقیق تھے اور آپ کو آشوب چشم کی تکلیف تھی۔ مگر آپ نے دین کے بارے میں سوالات کے جواب میں تاخیر مناسب خیال نہ کی اور جوابات تحریر

کرادیتے۔ البتہ جوابات مختصر ہونے کی وجہ بیان فرمائی کہ آشوبِ چشم میں مبتلا رہوں چنانچہ چشم بند کردہ جواب لکھوا رہا ہوں۔

بسا اوقات ایسا ہوتا کہ بیس پچیس خطوط ایک دن میں آجاتے اور اکثر میں سوالات ہوتے اور اپنے حالات لکھ کر اُن کا علاج پوچھا ہوتا تھا۔ آپ ان سب کا جواب دن ہی میں عنایت فرماتے۔ کبھی مہمانوں کی کثرت، یا دوسری دینی خدمات کی مشغولیت کے سبب آپ کو فرصت کم ہوتی تو عشاء کے بعد ان کے جوابات تحریر فرماتے۔

دل جوئی اور تسلّی آپ دوسروں کی دل جوئی و تسلی جیسی مناسب انداز میں فرماتے، اس کی بہت کم نظیر ملتی ہے۔ ایک شخص نے خواب دیکھا کہ گویا آپ کی وفات ہوگئی ہے۔ اس خواب نے اس کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ "بھائی تمہارے سامنے زندہ تو بیٹھا ہوں اور آخر کبھی تو مروں ہی گا۔ مگر کیا ضروری ہے کہ خواب کے ساتھ ساتھ تعبیر بھی واقع ہو جائے؟"

حرمین اور اس کے متعلقات سے محبت انسان کو جس کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کے تمام متعلقات سے محبت ہو جاتی ہے۔ حضرت ربانیؒ کے دل میں حق تعالیٰ شانہٗ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت از حد راسخ تھی۔ اس لئے حرمین شریفین کے خس و خاشاک تک کو آپ محبوب سمجھتے اور سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ مدینہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں پسوا کر رکھتے اور ان کو کبھی کبھی پھانکا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "لوگ زمزم کے ٹمینوں اور گٹھلیوں کو یونہی پھینک دیتے ہیں یہ نہیں خیال کرتے کہ ان چیزوں کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی ہوا لگی ہے"۔ ایک مرتبہ مدنی کھجور کی گٹھلی پسی ہوئی حضرت نے مولانا عاشق الٰہی کو دی اور فرمایا کہ اس کو پھانک لو۔ اور ایک دفعہ مدینۃ الرسول کی مٹی عطا فرمائی کہ اس کو کھا لو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت مٹی کھانا تو حرام ہے۔ آپنے فرمایا "میاں وہ مٹی اور ہوگی"۔

اگر کوئی مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ سے آپ کے لئے کوئی تبرک یا تحفہ لاتا تو آپ اُس کو اس قدر خوشی سے قبول کرتے، کہ ہدیہ دینے والے کا جی خوش ہو جاتا اور آپ فوراً ہی تمام حاضرین میں اس کو تقسیم فرما دیتے اور اگر کوئی شخص کوئی چیز مانگ لیتا تو فوراً ہی اُسے عطا فرما دیتے اور خوش ہوتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے تسبیح مانگی۔ آپ کے پاس بیش قیمت خوبصورت تسبیح تھی۔ ان کے حوالہ کی اور فرمایا "پڑھتے رہنا ایسا نہ ہو کہ ویسے ہی رکھی ہوئی سجے"۔

حضرت امام ربانی کا جی چاہتا تھا کہ ہر شخص حرمین شریفین سے اور وہاں سے آئی ہوئی چیزوں سے اسی طرح محبت و پیار رکھے جس طرح خود اُن کو تھا۔ ایک مرتبہ مولینا محمد اسماعیل کو موم بتی کا ذرا سا ٹکڑا عنایت فرما کر کہا، اس کو نگل جاؤ اور ایک بار غلافِ کعبہ کے ریشم کا ایک تار ایثار کیا اور کہا "اس کو کھالو"۔

جناب آداب شعار اسلام کی ترویج آپ کو حد درجہ مرغوب تھی۔ اگر کوئی خلاف سنت سلام کرتا تو آپ غصّہ کو ضبط نہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب آئے۔ آپ بیت الخلاء گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مونڈھا اُٹھا، آپ کی چارپائی کے پاس رکھ کر بغیر مجمع کو سلام کئے بیٹھ گئے اور جب حضرت آئے تو دُور ہی سے انہوں نے پکارا۔ "جناب آداب" حضرت نے فوراً بے ساختہ جواب دیا "کون بے ادب ہیں جن کو شریعت کا ایک ادب بھی نہیں معلوم"۔ ایک مرتبہ ایک صاحب آئے اور بولے "حضرت سلامت"۔ آپ کے چہرہ پر غصّہ کا اثر ظاہر ہوا اور فرمایا "مسلمانوں والا اسلام

چاہیئے یہ کون ہے حضرت سلامت والا" اس شخص نے عرض کیا میں کچہری میں رہتا ہوں وہی عادت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ "یہاں تو کوئی کچہری نہیں ہے۔ بھائی میں تو فقیر آدمی ہوں"۔۔۔۔ وہ حضرات جو سنت کی محبت سے عاری اور محبت کے ثمرات سے نا واقف ہیں۔ وہ حضرت کے اس انداز کو بد خُلقی پر محمول کریں گے۔ جس زمین قلب میں محبتِ رسول کا بیج ہی نہیں پڑا، ان کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ یہ واقعات خلاصۂ اصلاحات قلب ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سنت مصطفویہ کے ساتھ عشق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ آپ کو عربی مہینے چھوڑ کر انگریزی مہینوں کا بلاضرورت استعمال کرنا سخت گراں گزرتا تھا۔ ایک صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر تھے کہ اُن سے کسی نے پوچھا گوالیار کب جاؤ گے؟ انہوں نے جواب دیا جولائی کی فلاں تاریخ کو۔ تو حضرتؒ نے تاسف کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ کہ اور ماہ و تاریخ نہیں ہیں، جو انگریزی مہینوں کا استعمال کیا جاوے"۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کی تحریرات میں کہیں انگریزی یا ہندی مہینوں کا نام نہیں۔

منطق و فلسفہ سے نفرت

اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میرا جو مرید اور شاگرد منطق اور فلسفہ کے ساتھ اشتغال رکھے گا وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کے نفع کی تو اُمید ہے۔ اور یہ سب کچھ کتاب و سنت کے ساتھ والہانہ شغف و عشق کا ثمرہ تھا۔ آپ کے بال بال اور رُوئیں رُوئیں سے لطحائی پیغمبر کی ہر ادا پر شیفتگی ٹپکتی تھی اور آپ کا ہر بُن مو گویا زبان بنا ہوا تھا۔ جس سے بجز اتباعِ شریعت کی آواز کے دوسری صدا نہ نکلتی تھی۔ آپ نے اپنا سب کچھ حبِ رسول کے سپرد کر دیا تھا۔ آپ کی زبان، آنکھ، کان۔ بولنے، دیکھنے، اور سُننے سے پہلے دیکھتے تھے کہ آیا اس بات کی اجازت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہے یا نہیں؟

بیٹے کو گھر سے نکال دیا

آپ کے صاحبزادے مولانا محمود احمد بُری صحبت کے اثر سے پہلوانی اور کسرت وغیرہ میں مبتلا ہو کر دینی تعلیم اور قیدِ شرع سے کچھ باہر ہو چلے تھے۔ آپ نے یہ حالت دیکھ کر خدا اور رسول کی محبت کو بیٹے کی محبت پر ترجیح دی اور بیٹے کو گھر سے نکال دیا اور کہلا بھیجا کہ محمود مجھے شکل نہ دکھلائے۔ آپ اس کے لئے دعا کرتے رہے۔ آپ کی دعا مستجاب ہوئی اور حق تعالیٰ کے فضل و توفیق نے صاحبزادہ کے دِل پر دستک دی، اور حالت اصلاح کے قریب ہوئی تو آپ نے اسے بُلا بھیجا اور فرمایا "محمود کیا ابھی تیرے سنبھلنے کا وقت نہیں آیا۔ خدا کے بندے اس بدن کے فربہ کرنے میں کیا دھرا ہے۔ اس وقت کو یاد کر جب گور میں کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جائے گا۔ سنبھل اور اپنی بد عادتیں چھوڑ"۔

اس مختصر مگر جامع نصیحت کا بیٹے پر وہ اثر پڑا کہ گویا کایا پلٹ گئی اور وہ ذاکر و شاغل بن گئے۔ قرآن پاک حفظ کیا اور عالم ہوئے مگر عمر نے وفا نہ کی۔ یا تو حضرت نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا اور یا یہ حالت ہوئی کہ اس کی اصلاح کے بعد مفارقتِ موت سے آپ اس کی یاد میں تلملاتے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ "آج کہتا ہوں، بارہ ۱۲ برس ہو گئے جب سے محمود مرا ہے مجھے ہنسی نہیں آئی"۔ اور یہ

محبت محمود کی صورت سے نہ تھی بلکہ اس کی عمدہ سیرت سے تھی جو بعد توبہ کے اُس نے بنا لی تھی۔ اگر وہ زندہ رہتے تو بہت بڑے بزرگ ہوتے۔ غرضیکہ حضرت مولانا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مطابق کہ "مومن کامل نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک مال و اولاد اور جان سے زیادہ عزیز و محبوب نہ بن جاؤں" صحیح اور کامل مومن تھے۔ آپ شریعت حقہ اور سنت بیضا کی محبت میں ایسے فنا تھے کہ اپنے نفس کی باگ ڈور مکمل طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ آپ کے جملہ اعضا شریعت کی سنگین قید میں مقید ہو کر آپ کے اختیار و ارادہ سے باہر ہو گئے تھے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن پا بہ دستے دگرے، دست بدستے دگرے

اطاب اللہ ثراہ وجعل الفردوس مثواہ

حسنِ صورت، حلیہ مبارک کمال حسنِ سیرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسنِ صورت میں بھی ممتاز مقام عطا فرمایا تھا۔ آپ کا سراپا نہایت خوش اندام اور خوبصورت تھا۔ آپ متناسب الاعضا حسین و جمیل اور اس درجہ وجیہ تھے کہ بھرے مجمع میں پہچانے جاتے تھے۔ قد میانہ، بدن دُہرا، سر درمیانہ، بال نرم اور جوانی کے زمانہ میں نہایت سیاہ تھے۔ پیشانی کشادہ اور صاف و شفاف، جس میں معبود کی عبادت کا نشان دمکتا تھا۔ بھویں گنجان اور کمان کی طرح خمیدہ لیکن ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں۔ آنکھیں بڑی، سرمگیں جن کی سفیدی کے اندر سُرخ ڈورے جھلکتے تھے، پتلی سیاہ اور بینائی کے زمانہ میں نظر دُور بین اور نہایت تیز تھی۔ حلقے بدر کے ہالہ کی طرح روشن اور چمکتے ہوئے۔ مژگان دراز اور رسیلی، رخسار نرم و نازک اور پُر گوشت۔ ناک ہموار اور درازی مائل۔ لب کشادہ سرخی مائل، دہن مردانہ اور دانت نہایت سفید اور چمکدار گویا موتیوں کی لڑی، زنخدان سیب جیسی۔ ریش مبارک گول گنجان۔ گردن چمکدار گویا چاندی کی صراحی۔ سینہ فراخ اور پیٹ کے برابر۔ ہاتھ سڈول بھرے ہوئے، ہتھیلی فراخ۔ انگلیاں سیدھی نرم۔ پُر گوشت پنڈلیاں۔ پاؤں چکنے صاف شفاف اور بلند۔ آواز لطیف لیکن بلند کہ بات سمجھنے میں کسی کو تکلف نہ ہوتا تھا۔ خوش الحان، تبسم کناں، راست گو اور فصیح و بلیغ تھے۔ شجاعت و قوت میں مشہور، تواضع اور حسنِ معاشرت میں امام و مقتدیٰ، ذکر و فکر میں ہر وقت مستغرق، عقیل و مدبر، صائب الرائے اور عادل، سخی و بہادر، حلیم و صابر، عفت مآب و شاکر جمیع اوصاف سے متصف اور تمام خصائل رذیلہ سے طبعاً متنفر تھے۔[1]

لطافتِ طبع اور ادراکِ حواس آپ خلقی طور پر لطیف المزاج تھے لیکن کثرتِ ذکر نے اس لطافت کو دو چند کر دیا تھا۔ آپ کے محسوسات اتنے قوی ہو گئے تھے کہ معمولی سی چیز کا بھی ادراک فرما لیتے تھے۔ ایک دن استنجا کے لئے جا رہے تھے۔ فرمایا کہ تمباکو کی بو آ رہی ہے۔ خادم نے بعد میں دیکھا تو وہاں پان کی پیک پڑی تھی۔ اس کو کھرچ کر صاف کر دیا گیا تو واپسی پر فرمایا اب نہیں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ضبط بھی کمال کا تھا۔ اگر اظہار سے کسی کو تکلیف پہنچنے کا احتمال ہوتا تو لطیف اشارے سے کہتے ورنہ خاموش رہتے۔ ایک مرتبہ چند آدمی بیٹھے تھے۔ جن کے کپڑے دل سے میلے اور عرق آلود ہونے کی وجہ سے بو آ رہی تھی۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "میاں یحییٰ کبھی نہا بھی

---

[1] تذکرۃ الرشید صفحہ ۵۳ حصہ دوم۔

لیا کرو۔ دیکھو جسم سے پسینہ کی بو آرہی ہے۔"

ایک دفعہ مولانا یحییٰ صاحب کے چھوٹے بھائی محمد الیاس (حضرت مولانا محمد الیاسؒ بانی تبلیغی جماعت) دس گیارہ برس کی عمر میں تھے۔ دبے پاؤں آئے اور چپکے سے حضرت کی مجلس میں بیٹھ گئے۔ معاً حضرت نے گردن اٹھائی اور فرمایا "بچے کا سا سانس ہے"۔ کسی نے عرض کیا محمد الیاس آئے ہیں۔ ایک بار مغرب کی نماز کے بعد واپسی پر ایک لڑکے کے پاس سے گذرے تو فرمانے لگے "نمبردار کی سی بُو آتی ہے"۔ عرض کیا گیا کہ "نمبردار کا لڑکا اکرام الحق کھڑا ہے"۔ ——— حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی روایت ہے کہ بھائی عبدالرحمٰن چائے پکایا کرتے تھے اور بڑے شوق سے عمدہ چائے پکاتے اور حضرت کو بھی پیش کرتے۔ حضرت اکثر فرماتے کہ "چائے میں کچے پانی کا ذائقہ آتا ہے"۔ عبدالرحمٰن صاحب ایک دن دل میں کہنے لگے کہ آج پانی اتنا پکاؤ کہ بھاپ بن کر اُڑ جائے۔ بہرحال بہت دیر تک پانی پکا کر چائے پیش کی گئی تو فرمایا کہ کچے پانی کا ذائقہ تو اس میں بھی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت وہم ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن صاحب نے جو دودھ گھر سے منگوا کر ملا لیا تھا اس میں گھر والوں نے کچھ پانی ملا دیا تھا ——— حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت کے لئے چائے پکاتے مگر یہی بات حضرت فرماتے۔ بڑا غور کیا بات سمجھ میں نہ آئی۔ بالآخر پتہ چلا کہ چائے کی پیالیاں ٹھنڈے پانی یا کچے پانی سے دھونے کے بعد خشک نہیں کی جاتیں۔ چنانچہ اس کے بعد اس کا اہتمام کر کے چائے پیش کی گئی تو فرمایا "آج کچے پانی کی بو نہیں ہے"۔

اس طرح کی حکایتیں بے شمار ہیں۔ سیرت کے باب میں ان کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے بڑے ذکی الحس، نازک مزاج اور معمولی معمولی اشیاء کا ادراک کرتے تھے۔ دنیاوی امور میں اظہار نہ کرتے تھے مگر دینی معاملات میں اظہار کر کے عیوب و معصیات پر گرفت کرتے اور اصلاحِ احوال کی سعی فرماتے تھے۔

سوادِ تحریر آپ کا خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا۔ ہمیشہ رواں دواں اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ کئی ایک لوگوں کے پاس اب تک ان کی تحریریں موجود ہیں۔ نمونہ کے طور پر اس کتاب میں بھی ایک تحریر کا عکس شامل کیا گیا ہے کہ تحریر سے بھی شخصیت کا عکس اور پرتو نظر آتا ہے۔ آپ کی طویل تحریریں باریک قلم سے لکھی ہوئی موجود ہیں۔ جن کے مضامین بھی علمی ہیں۔ ہمیشہ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی تھے اور لکھتے وقت حاضرین سے باتیں کرتے، ان کے سوالات کے جوابات دیتے تھے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود مجال ہے کہ کوئی لفظ غلط لکھ کر کاٹنا پڑا ہو۔ کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا گیا۔ جو فتوے و خطوط پریشانی و فکر کی حالت میں لکھے ہوتے ہیں۔ اُن کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ نہایت غور و فکر کے بعد اطمینان سے لکھے گئے ہیں۔

تقریر تحریر کے مثل تھی آپ کی تقریر بھی تحریر کے مثل صاف، جامع لیکن مختصر ہوتی تھی۔ جس میں جوامع الکلم کا اعکس نظر آتا ہے۔ آپ مسلسل تقریر فرماتے تو وہ گویا موتیوں کی لڑی ہوتی۔ ہر بات اپنے موقع ترتیب سے بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ تقریر اور تحریر میں اس چیز کا ہونا عالی دماغی اور یکسوئی ذہن پر دلالت کرتا ہے۔ پتہ دیتا ہے کہ اس انسان کا ذہن بالکل صاف ہے۔ اس میں کسی اُلجھن یا شک و ریب کا گذر نہیں۔

خوش آوازی آپ بہت خوش الحان تھے۔ جب ذکر بالجہر کرتے تو سننے والے وجد میں آجاتے اور دیر تک اُن پر محویت کا عالم طاری رہتا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری فرمایا کرتے تھے کہ آپ کی قرات قرآن اور خطبہ وغیرہ سُن کر بے اختیار زبان سے نکلتا تھا "لقد اوتیت مزماراً من مزامیر آل داؤد"۔ آپ کبھی شعر خوش الحانی یا ترنم سے نہیں پڑھتے تھے۔ اسی طرح خطبۂ جمعہ اور نمازوں میں قرات بھی رواں دواں پڑھتے تھے تاہم طبعی و خلقی خوش الحانی کی وجہ سے آپ کی تمام روح سمٹ کر گویا ایک جگہ آجاتی تھی۔ آواز میں آپ تصنع اور بناوٹ سے سخت احتراز فرماتے تھے۔

فروتنی و تواضع کوئی طالب علم کتنا ہی اُلجھا ہوا سوال کیوں نہ کرتا، آپ خوشی سے اس کا جواب مرحمت فرماتے۔ عام مسلمانوں سے اپنے لئے دعا کراتے اور فرمایا کرتے کہ "لوگوں کے حسن ظن کی وجہ سے نجات کی اُمید ہے"۔ آپ کے بیسیوں خطوط میں آپ کے یہ الفاظ موجود ہیں۔ "من آنم کہ من دانم"۔ مجھے دعا میں ضرور شریک کرنا۔ خدا کرے کہ تمہارے ظن کے مطابق مجھ سے حق تعالیٰ کا معاملہ ہو"۔——— ایک بار حکیم محمد حسن صاحب نے اپنے حال کے متعلق کہا کہ مجھے کچھ نفع نہیں محسوس ہوتا جی چاہتا ہے چھوڑ دوں۔ آپ نے تسلّی دی کہ میاں کام کئے جاؤ ہمت نہیں ہارا کرتے، چلتے کام کا چھوڑنا کس نے بتایا ہے، بہتیرا کچھ ہو رہا ہے۔ حکیم صاحب نے عرض کیا کہ حضرت مجھے کیونکر اطمینان ہو جب کہ میں دیکھتا ہوں، کہ قلب میں کچھ اثر نہیں ہے۔ اس وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں یوں کہا کہ:-

"خدا کے بندے تمہیں اپنے بڑے کے کہے پر بھی اعتماد نہیں ہے مجھے نہیں دیکھتے کہ عام لوگوں کے حسن ظن پر جی رہا ہوں۔"

ایک خط میں عبدالعزیز خاں کو تحریر فرماتے ہیں:-

"بخدا اپنے علم میں بحلف کہتا ہوں کہ تمہارے واسطے ہر روز تو دعا یقیناً کرتا ہوں مگر پانچ وقت میں شاید کسی وقت ترک ہوتی ہو۔ لیکن آپ کے اس حسن ظن سے سخت پریشان ہوتا ہوں کہ تم کو میرے ساتھ اس قدر عقیدت بے محل ہو گئی ہے۔ مجھ جیسے صدہا اس عالم میں موجود اور بہتر بھی بہت ہیں۔ بندہ کا حال تو اسی سے واضح ہو جائے گا کہ تا ایں دم شب و روز آپ کے باب میں دعا کرتا ہوں اور کچھ اجابت کے آثار نہیں۔ جس سے صاف روشن ہے کہ مثل دیگر عوام مؤمنین کے میں بھی ایک ہوں۔ کوئی شخص اپنی تعریف کو بُرا نہیں جانتا۔ میں بار بار اپنا عیب اور حقیقت جو ظاہر کرتا ہوں سو اس سبب سے کہ میرے سبب تم اپنے مقصود سے نہ رہ جاؤ۔ میری عقیدت تم کو مضر نہ ہو جاوے۔ ناقص کے ساتھ ہو کر اپنا نقصان ہوتا ہے۔ دوسرے قیامت کو جب اپنا حال ظاہر ہوگا، مجھ کو ندامت نہ ہو کہ خلاف توقع ظاہر ہو دے گا۔"[1]

روزانہ کے معمولات نماز فجر سے فارغ ہو کر آٹھ نو بجے تک ذکر و فکر میں خلوت کے اندر مشغول رہتے تھے۔ بعد ازاں نوافل پڑھتے اور طلبہ کو سبق شروع کرا دیتے۔ جب ظاہری بینائی جاتی رہی تو تدریس ترک کر دی اور اس کی جگہ ارشاد و تحقیق کا دروازہ کھُل گیا۔ اثنائے سبق میں اگر کوئی مریض دوا پوچھتا تو بتاتے (طب جیسا

---

[1] تذکرۃ الرشید حصہ دوم صـ۵ بحوالہ مکاتیب رشیدیہ

کر گذرا باقاعدہ نہیں پڑھی تھی مگر ذہن اور حافظہ قوی ہونے کی وجہ سے ایک دو کتب کے مطالعہ سے تمام امراض و ادویات مستحضر رہتی تھیں۔ اوّل باقاعدہ مطب فرمایا۔ بعد ازاں قارورہ دیکھنا چھوڑ دیا کہ نسبت اور لطافت طبع اس کی متحمل نہ سکی۔ صرف نبض اور بیان حال پر تشخیص و تجویز کا مدار رہا) جب آپ کے صاحبزادہ مولینا حکیم مسعود احمد دہلی سے طب حاصل کر کے آگئے تو مطب وہ کرنے لگے اور آپ نے یہ کام ترک کر دیا۔ تدریس سے فارغ ہو کر خطوط اور استفتاء کے جواب دیتے۔ جب تک بینائی رہی خود ہی جوابات لکھتے رہے۔ بعد ازاں مولینا محمد یحییٰ کو تحریر کرا دیتے۔ روز دوپہر کو دھوپ گھڑی سے گھڑی درست کرتے۔ اس کا بے حد اہتمام تھا۔ کھانا کھاتے اور تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ فرماتے (استراحت کرتے نماز ظہر سے فارغ ہو کر قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کرتے۔ بینائی جانے کے بعد زبانی تلاوت کرتے اور اس کے بعد پھر تدریس تعلیم ہوتی۔ عصر سے مغرب تک مجلس عام ہوتی تھی۔ حسب موقع کلمات نصائح اور قصص اکابر بیان فرما کر عوام و خواص کی تربیت فرماتے تھے۔ بعد مغرب نفل اوابین پڑھ کر مکان پر تشریف لے جاتے اور بعد نماز عشاء آرام فرماتے۔ علی الصبح تین بجے بیدار ہو کر تہجد پڑھتے۔ ابتداء میں آٹھ رکعت نفل پڑھتے تھے بعد میں دس کا معمول ہو گیا تھا۔ رکعات نفل بہت طویل ہوتیں۔ نوافل سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن پاک اور وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ اگر کچھ کسل ہوتا تو تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جاتے —— ہمیشہ آپ کا یہ معمول رہا۔ اس میں کبھی تغیر و تبدیل نہ ہوتا تھا۔ پوری زندگی اس پروگرام کے مطابق گذار دی۔ رمضان المبارک میں آپ کی عبادت میں مشغولی بڑھ جاتی تھی [۱]

اپنے معاملات میں تقویٰ اور احتیاط اس قدر تھی کہ مسائل مختلف فیہا میں قول راجح اور اقرب الی الاحتیاط اختیار فرماتے تھے چاہے اس میں دقت ہی کیوں نہ ہو، مگر عام لوگوں کے لئے سہولت کو مدنظر رکھتے تھے اور وہ پہلو اُن بتاتے تھے جس میں ان کو آسانی ہو۔ آپ کی احتیاط کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ آپ اپنی امراض میں چاہے وہ کتنی شدید کیوں نہ ہوتیں ہمیشہ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ مرض الموت میں جب تک اتنی سکت رہی کہ دو تین آدمیوں کے سہارے سے کھڑے سکیں، نماز کھڑے ہو کر پڑھی اور انہی کے سہارے رکوع سجود کئے۔ خدام نے عرض کیا کہ بیٹھ کر نماز گذاریئے مگر نہ کچھ جواب اور نہ ہی قبول فرمایا۔ ایک روز مولینا محمد یحییٰ نے کہا کہ حضرت اگر اس وقت بھی بیٹھ کر نماز جائز نہیں تو پھر اور کس وقت ہوگا اور وہ کونسی صورت ہوگی۔ آپ نے فرمایا —— کہ "امام صاحب کے نزدیک قادر بقدرۃ الغیر (غیر کے سہارے قدرت رکھنے والا) تو قادر ہوتا ہے اور جب میرے دوست ایسے ہیں کہ مجھ کو اٹھا کر نماز پڑھاتے ہیں تو میں کیونکر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں" اور جب ضعف اس قدر ہو گیا کہ دوسروں کے سہارے بھی کھڑے ہونے کی ہمت نہ رہی تو اس وقت چند نمازیں بیٹھ کر پڑھیں۔ گویا بتلا دیا کہ اتباع شرع اس کو کہتے ہیں۔ تقویٰ اس کا نام ہے اور اختیار اولیٰ اس طرح ہوتا ہے۔

لباس، غذا وغیرہ

لباس آپ ہر طرح کا پہن لیتے تھے۔ گاڑھا کھدر بھی پہنا اور اعلیٰ شال بھی استعمال کی۔ آپ کے نزدیک دونوں برابر تھے لیکن مرغوب لباس سادہ تھا البتہ ستھرائی کا بہت خیال رکھتے چاہے ہلکا کپڑا ہو چاہے بڑھیا ہو صاف ستھرا ہوتا۔ غسل کرنے کی عادت روز کی تھی اور کبھی کبھی گرمیوں میں عشاء کے بعد بھی غسل فرما لیتے تھے۔

[۱] تذکرۃ الرشید صفحہ ۶۱۳ تحریر مولانا خلیل احمد سہارنپوری (بادنیٰ ترمیم)

کبھی میلا لباس پہنا تو نماز کے وقت ضرور تبدیل کر لیا۔ میلے کپڑے سے نماز نہ پڑھتے تھے اور فرمایا کرتے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتیں اس کے دربار میں حاضر ہوتے وقت بدن پر ہونی چاہئیں۔

حلال و لذیذ چیزوں سے آپ کو نفرت نہ تھی۔ عمدہ، ادنیٰ کھانا بطیب خاطر کھاتے تھے اور ایک جلیسی خوشی و فرحت حاصل کرتے تھے۔ کبھی کسی خاص غذا کے پابند نہ ہوتے نہ کسی شئے کا بذات خود کوئی اہتمام فرمایا۔ البتہ ٹھنڈا پانی آپ کو بہت مرغوب تھا اور اس کا خانقاہ میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ ٹھنڈا پانی پی کر آپ بہت خوش ہوتے اور یوں فرماتے کہ یہ بڑی نعمت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا۔ اسی لئے آپ نے دعا فرمائی ہے۔

اللّٰھمّ اجعل حبك وحب من یحبك احب الیّ من مالی واھلی ومن الماء البارد۔

اے اللہ! اپنی محبت اور اپنی ذات سے محبت کرنے والے شخص کی محبت میرے مال، میرے اہل اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ مجھے محبوب کر دے۔

خمیری روٹی اور شوربے سے خاص رغبت تھی کہ یہ دونوں چیزیں سریع الہضم ہونے کی وجہ سے معدہ میں گرانی اور عبادت میں کسل پیدا نہیں کرتیں۔

خوشبو سے حد درجہ رغبت تھی۔ خصوصاً گلاب کا پھول اور عطر زیادہ پسند کرتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مولوی محمد قاسم کو گلاب سے بہت محبت تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ گلاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عرق سے بنا ہے۔ یہ حدیث — اگرچہ ضعیف ہے مگر ہے تو حدیث — چائے کی عادت نہ تھی۔ میسّر ہوتی تو پی لیتے ورنہ نہ پیتے۔ کبھی ہفتوں مسلسل پی اور کبھی ہفتوں نہیں پی۔ جب تک دانت تھے اصرار پر پان کھا لیتے تھے۔ بینائی جانے پر لاٹھی کے سہارے مسجد کو آتے جاتے مگر یہ عادت تھی کہ کوئی لاٹھی تھامے یا راستہ بتاتا چلے۔ آپ کو اوّل تو اٹکل تھی۔ دوسرے دیوار تھام کر اور ٹوہ کر چلتے تھے — کھلکھلا کر آپ ساری عمر کبھی نہیں ہنسے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت کا ہر وقت غلبہ رہتا۔ بعض دفعہ ایسے قصے بیان فرماتے کہ سننے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے مگر آپ تبسم کناں ہوتے۔

خوش طبعی اور ظرافت

ایک مرتبہ مولوی ولایت حسین آئے اور مصافحہ کیا۔ پوچھا کون؟ عرض کیا ولایت حسین۔ فرمایا سید ھادی کیوں نہیں کہدیتے۔ ایک دفعہ مولانا محمد یحییٰ کو ایک تعویذ بتایا اور فرمانے لگے کہ ایک پیرزادے نے ایک شخص سے کہا ہمارے ساتھ رہا کرو، جو کچھ ملے گا آدھا آدھا۔ راستے میں ایک چنا (یعنی چنے کا دانہ) پڑا ملا۔ پیرزادہ کہنے لگا کہ میاں اٹھاؤ، چھیلو۔ آدھا ہمیں دو آدھا تم لو اور اس کے بعد کہنے لگا کہ دیکھو یاروں کے ساتھ رہوگے تو مزے ہیں۔

آپ کے مزاح میں بھی اسی طرح صداقت ہوتی جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں ہوتی تھی۔ آپ کے پوتے سعید احمد جامن کھا رہے تھے۔ حضرت نے فرمایا۔ گٹھلی مت نگلیو۔ بچپن کے تقاضا و ناز کی وجہ سے پوتے نے جواب دیا کیوں؟ ہم تو گٹھلی بھی کھا جائیں گے۔ حضرت نے فرمایا "گٹھلی سے درخت اپجا وے ہے۔" سعید احمد ڈر گئے اور تھوکنے لگے۔

ایک دفعہ درس حدیث میں فرمایا کہ جنت میں مرد سبزہ آغاز بے ریش ہوں گے۔ ایک طالب علم نے عرض کیا کہ مرد کے چہرے کی زیبائش تو ریش سے ہوتی ہے۔ جنتیوں کے لئے یہ سن کیوں تجویز ہوا۔ بے ساختہ مسکرا کر جواب دیا کہ اس کا مزہ ان سے پوچھو

جو داڑھی منڈاتے ہیں۔ مولوی محمد سہول ایک بار کسی مسئلہ پر بحث کرنے لگے اور اعتراض پر اعتراض کرتے رہے۔ فرمایا۔ تمہارا نام سہول کس نے رکھا۔ تم میں سہولت تو ذرہ بھر نہیں۔ تمہارا نام مسئول چاہیئے کہ سوال بہت کرتے ہو۔

اشعار سے دلچسپی نہ تھی

آپ کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہ تھی۔ تاہم کسی خاص موقعہ پر بے ساختہ بچپن کا نظر سے گذرا ہوا شعر زبان پر آجاتا تھا۔ ایسے اشعار کی تعداد پوری عمر میں بلیس[۲] پچیس[۲۵] سے زائد نہ ہوگی۔ مرض الموت سے چند سال قبل آپ سخت مرض میں گرفتار ہوئے۔ اس شبہ پر کہ کہیں کسی نے سحر نہ کر دیا ہو۔ حضرت مولانا خلیل احمد نے ایک شخص کو دیوبند سے روانہ کیا جو اس فن میں کمال رکھتا تھا۔ جب وہ گنگوہ پہنچا تو حضرت کو من جانب اللہ معلوم ہوا کہ یہ آنے والا سحر کرنے والے کا مرید اور شاگرد ہے۔ اُس کو واپس کر دیا۔ جب حضرت مولانا خلیل احمد حاضر ہوئے، تو مصافحہ کرتے وقت آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب — اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ظہر کے بعد جب خلوت خانہ میں تشریف لے جاتے، حجرے کے کواڑ بند ہو جاتے تو آپ پر بعض دفعہ ایسا کیف غالب ہوتا کہ دیر تک وہیں رہتے۔ کسی کا آنا اچھا معلوم نہ ہوتا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب آکر کواڑ کھولتے اور یا حضرت خود ہی کھول دیتے اور مولانا یحییٰ حضرت کے کچھ اس طرح مزاج شناس ہوگئے تھے کہ از خود ان کی طبیعت میں وہی بات آتی جو حضرت کی منشاء ہوتی۔ اس بناء پر حضرت اکثر فرمایا کرتے کہ "مولوی یحییٰ تو میری آنکھیں ہیں" یا "یحییٰ تو میری لاٹھی ہیں"۔ بارہ[۱۲] سال اسی شفقت تلے مولانا یحییٰ نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محبِّ صادق کی خدمت کی۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ حضرت کو تا دیر خلوت میں رہنا پسند آیا تو مولانا یحییٰ بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ ایک بار ایسا ہی اتفاق پیش آیا۔ مولانا یحییٰ نے دیر کے بعد آکر کواڑ کھولا تو دیکھا کہ حضرت بیٹھے تسبیح پڑھ رہے ہیں۔ فرمایا اب تک کہاں تھے؟ انہوں نے کہا حضرت جی چاہا کہ ابھی حجرہ کھولوں۔ فرمایا پھر اب کیوں آئے۔ عرض کیا کہ اب دفعتہً جی چاہا کہ کواڑ کھولوں۔ آپ مسکرائے اور یہ شعر پڑھا ؎

وہ نہ آئیں تو تو ہی چل رنگیں — اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

ایک مرتبہ حضرت خمیری روٹی قورمہ سے کھا کر آئے۔ جیسا کہ گذرا یہ حضرت کی پسندیدہ غذا تھی۔ چہرہ پر بشاشت تھی اور قلب میں انبساط۔ مولانا یحییٰ سے پوچھا کہ میاں تمہیں بھی کچھ بھاتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت کچھ نہیں۔ ایک ارہر کی دال تو بھاتی نہیں۔ باقی جو کچھ مل گیا سب پسند ہے۔ آپ مسکرائے اور فوراً یہ شعر پڑھا ؎

کیا کہوں جرأت، کہ کچھ بھاتا نہیں — کچھ تو بھایا ہے کہ کچھ بھاتا نہیں

ایک بار آپ نے فرمایا بھئی ہمیں تو حضرت کے دردنالہ میں ایک شعر بہت بھایا ؎

مرا اِک کھیل خلقت نے بنایا — تماشہ کو بھی تو میرے نہ آیا

نماز سے شغف، خدا کے وعدوں پر یقین

عام طور پر بیمار ہونے پر رغبت علاج کی طرف نہ تھی۔ احباب و خدام ہی اس کا خیال فرماتے تھے۔ بینائی جانے پر متوسلین نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بنوا لی جائے مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ کبھی تو یہ فرمایا کہ "آدمی اپنے قویٰ کو دیکھے، آنکھ ہی درست

کیا کرے گی۔ دیکھو قاری عبدالرحمان نے آنکھ بنوائی، چھ ماہ کے بعد انتقال ہوگیا۔" کبھی فرماتے "آنکھ بنوانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اتنی تکلیف کون اُٹھائے"۔ کبھی یہ فرمایا کہ "کبھی میں نہیں بنواتا۔ سنتا ہوں کہ آنکھ بنانے پر طبیب چند روز حرکت کرنے کی ممانعت کر دیتا ہے اور مجھ سے بڑھاپے میں نماز نہیں چھوڑی جاتی"۔۔۔۔ لیکن جب سبحان علی خاں سول سرجن نے جو اس فن میں مشہور ڈاکٹر اور ماہر و سند یافتہ طبیب تھے خود حاضر ہو کر واثق وعدہ کیا کہ حضرت کوئی نماز قضا نہ ہوگی۔ چند گھنٹے حرکت سے پرہیز ہوگا جو فجر اور ظہر کے درمیان ممکن ہے۔ تو آپ نے فرمایا "کہ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو سکتی اور آنکھوں بغیر میرا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے۔" مولوی عبید اللہ نے از حد اصرار کیا تو آخر میں اصل بات فرمادی کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ جس کی آنکھ لے لے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کا بدلہ جنت ہے اور شاید یہی ایک ذریعہ حصول جنت ہو۔ مجھے تو اندھا رہنا ہی پسند ہے اور ایک مرتبہ خاص لوگوں سے یوں بھی فرمایا کہ میاں پہلے آنکھیں بند کرنی پڑتی تھیں۔ الحمد للہ اب خود بند ہو گئیں پھر ان کے کھلوانے کی تمنا کیسی؟

عوام کے لئے سہولت

اوپر گزرا کہ اپنی ذات کے لئے تو حضرت ہر حال میں احتیاط اور اولویت کو اختیار فرماتے تھے۔ مگر عوام کے لئے جہاں تک ہو سکتا سہولت مدنظر رکھتے۔ البتہ بدعات و معصیات میں آپ کو تشدد پسند تھا اور سدًا للباب مباحی و مقدمات پر بھی عدم جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔ مثلاً محرم کو شہادت حسینؓ کا واقعہ بیان کرنے کو منع فرماتے تھے کہ اس میں روافض سے تشبہ ہے۔ دوسرے موقع پر بیان کرو کیوں وہ ان دنوں اس واقعہ کے سہارے صحابہ پر سب و شتم بھی کرتے ہیں۔ لیکن عام مسائل میں جہاں تک سہولت نکلتی اس کو اختیار فرماتے اور عموم بلویٰ کا بہت خیال فرماتے۔ ایک دفعہ تمباکو نوشی کا ذکر آیا تو فرمایا کہ "مکروہ ہے کیونکہ منہ سے بدبو آتی ہے اور حقہ پر کیا منحصر ہے بدبو کی سب چیزیں مثلاً لہسن، پیاز، مولی وغیرہ سب کچھ کھانا مکروہ ہیں"۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ بعض مولویوں نے تو حرام کہا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ سب غلط ہے۔ تمباکو مثل اور ماکولات کے مباح ہے۔ اس پر کسی خادم نے عرض کیا کہ رمضان شریف میں بھی دم لگا کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمباکو نشہ آور ہے۔ آپ نے فرمایا خالی معدہ میں کالی مرچ سنگھادی جائے تو وہ بے ہوش کر دیتی ہے۔ میاں تمباکو نشہ نہیں کرتا بلکہ اس کی تیزی خاو معدہ کے وقت البتہ بے ہوش کر دیتی ہے۔

نظر کی تیزی

ایک دفعہ حکیم ضیاء الدین کے ہاں رام پور تشریف لے گئے۔ ایک شخص صبح کو قارورہ لے کر آیا، اور حکیم صاحب کے سامنے پیش کیا۔ حضرت فاصلہ پر بیٹھے تھے۔ آپ نے دور ہی سے قارورہ پر نظر ڈالی اور جب وہ شخص قارورہ پھینکنے گیا تو آپ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ "اس مریض کا علاج سنبھل کر کرنا"۔ حکیم صاحب نے پوچھا حضرت کیوں؟ آپ نے فرمایا کہ "اس کا حال ابتر ہے"۔ جب وہ شخص واپس آیا تو اُس نے مریض کی ہچکی وغیرہ کی وہ کیفیت بیان کی، جو عالم نزع میں ہوتی ہے چنانچہ حکیم صاحب نے اُسے ٹال دیا۔

عام پر ترغیب و ترہیب

کوئی شخص کیسا ہی قلب بگاڑ کر آپ کے پاس آتا، آپ اس کی اصلاح میں دریغ نہ کرتے بشرطیکہ اصلاح کی سچی طلب لے کر آیا ہو۔ خدام کی عیب پوشی میں آپ کو خاص ملکہ تھا خود بلند ہمت تھے۔ خدام متوسلین کو عالی حوصلہ بناتے، پست ہمتوں کو ابھارتے اور اکثر فرماتے کہ جو کچھ حق تعالیٰ توفیق دے، کئے

جاؤ۔ ہمت نہ ہارو۔ اگر قلب میں اثر نہ ہو نہ سہی۔ آخر زبان سے ذکر ہونا تھوڑا نفع ہے۔ جب زبان اللہ کے ذکر کے سبب دوزخ سے بچے گی تو دل بھی تو ساتھ ہی بچے گا۔ مریدین میں یاس و نا امیدی نہ پیدا ہونے دیتے۔ مگر ایک حالت پر قائم رہنا گوارا نہ تھا۔ تحریر، تقریر، ہر انداز سے غرض جس طرح بن پڑتا ہر پہلو سے خدام کو توجہ الی اللہ کی ترغیب دلاتے اور یوں فرماتے کہ جتنا بھی ہو سکے کرو اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اسی سے ترقی ہو گی۔

وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اور اگر تم شکر ادا کرو گے تو البتہ میں (نعمت) زیادہ کروں گا اور
إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۔ (قرآن حکیم) اگر کفران (نعمت) کرو گے تو بیشک میرا عذاب شدید ہے۔

اگرچہ گذشتہ سارا مضمون "تذکرۃ الرشید" سے ماخوذ ہے۔ اکثر جگہ اس کی عبارتیں خلاصہ کر کے پیش کر دی ہیں اور کسی جگہ جوں کے توں فقرے لے لئے ہیں تاہم یہاں ایک طویل اقتباس "تذکرۃ الرشید" سے من و عن نقل کیا جاتا ہے[1]

"آپ ذکر اللہ کی تحریص و ترغیب میں یکتائے زمانہ تھے۔ عالم ہو یا جاہل، خاص ہو یا عامی، شریف ہو یا وضیع، امیر ہو یا غریب، جو کوئی بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا فوراً ابدی اور رغبت الی الآخرت کا حسب مقدور کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے کر جاتا تھا۔ اس وقت خدا کی مخلوق کی کئی ہزار راست گفتار زبانیں اس مضمون پر متفق ہیں کہ آپ کی صورت دیکھ کر خدا یاد آتا اور آپ کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا سے نفرت پیدا ہوتی تھی۔ اتباع اور تمسک بالسنۃ کی تعلیم کے لئے صرف آپ کی زبان نہ تھی بلکہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک جو افعال آپ سے صادر ہوتے وہ سب یہ سبق پڑھاتے اور یاد کرایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کا نام انسان کا بڑا رفیق ہے اور بطحائی پیغمبر کا اتباع مسلمان کا اصل مقصود اور رضائے مخلوق کا مضبوط وسیلہ۔

حق تعالیٰ نے آپ کو جس مشغلہ میں لگایا تھا، اس کے اندر آپ کو اس درجہ پختگی عطا کی گئی تھی کہ کبھی فرق نہیں آیا۔ آفتاب عالمتاب صبح کو طلوع ہوتا اور شام کو افق مغرب میں غروب ہو جاتا تھا، ماہتاب کبھی ہلال بن کر نکلتا اور کبھی بدر بنتا، کبھی دکھائی دیتا اور کبھی عالم کی نظروں سے چھپ جاتا تھا، کبھی روز روشن ہوتا تھا اور کبھی شب تاریک، کسی وقت سردی جلوہ گر ہوتی اور کسی وقت گرمی، غرض عالم حادث ہر روز مختلف ہوتا اور دنیا اپنے انقلاب عظیم کو ہر لحہ پلٹتی اور بدلتی رہتی تھی مگر حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کا ایک دم تھا کہ مضمون واحد یعنی خدائے یکتا وحدہٗ لاشریک معبود کی عبادت میں یکساں مصروف تھا۔ آپ اپنے نفس نفیس کی حیثیت سے اس خاصیت میں فرد تھے کہ متغیر عالم کے تغیرات کا اثر آپ کے مستحسن مشغلہ پر نہ

---

[1] میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہر کے بار بار کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے ہیں کہ "تذکرۃ الرشید" بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے۔ میں نے سالک صاحب (عبدالمجید سالک) اور اپنے کئی دوسرے احباب کو یہ کتاب پڑھائی۔ اس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی عظمت دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے آدمی تھے۔" ملخصاً

[2] تذکرۃ الرشید حضرت امام ربانیؒ کی وفات کے دو سال بعد لکھا گیا تھا۔

پڑا۔ آپ کے حالات زمانہ کے ماتحت بن کر بیشک مختلف تھے مگر سنّت کے اتباع کا امر مشترک سب کو شامل اور ہر حالت میں موجود تھا۔ آپ کا دل اندر سے یوں چاہتا تھا کہ دنیا میں ایک متنفس بھی ایسا نہ ہو جس سے حق تعالیٰ کی معصیت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ظاہر ہو۔ آپ شفقت کے درجہ میں اپنے نفس ہی کے خیر طلب نہ تھے بلکہ تمام عالم کے ساتھ آپ کو یہ ہمدردی تھی کہ کاش دوزخ میں جانے والا ایک بشر بھی نہ رہے۔ آپ اس درجہ رقیق القلب تھے کہ کسی کی حالتِ تکلیف یا تنگی و بدحالی سنتے تو بے چین ہو جاتے تھے۔ واقف ہو یا ناواقف، یگانہ ہو یا بیگانہ، کسی شخص کی بدحالی و عسرت آپ کو گوارا نہ تھی۔ جس طرح دنیا کی عسرت و بدحالی آپ کو صدمہ پہنچاتی، اس سے زیادہ آخرت کے افلاس پر آپ تنگ دل و بے چین ہوتے تھے۔ کسی شخص کی معصیت اور بد دینی سن کر آپ کو جس درجہ حزن ہوتا اور اس کے لئے آپ کا دل روتا اور دعا کیا کرتا تھا شاید اپنے فقر و افلاس پر بھی کسی کو رنج نہ ہوتا ہوگا۔ دشمن سے دشمن کے لئے بھی آپ نے کبھی بد دعا نہیں کی"[1]

مولوی احمد رضا خاں کے متعلق مولوی احمد رضا خان بریلوی آپ کے سب سے بڑے مخالف تھے اور اگر ان کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے جو حضرت امام ربانیؒ کے متعلق لکھے ہیں تو ایک رسالہ بن سکتا ہے اور ان کی تمام کوششوں کو شمار کیا جائے جو انہوں نے حضرت امام ربانیؒ کی تکفیر کے متعلق روا رکھیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے کہ کاش وہ اس مشغلے کی بجائے بطحائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرنے پر صرف کرتے ــــ ان صاحب سے حضرت گنگوہیؒ کو اتنی ایذائیں پہنچیں کہ شاید انہوں نے کسی دوسرے کو نہ پہنچائی ہوں۔ مگر جو ہستی خلق پیغمبر کا نمونہ بن کر آئی ہو اور دنیا کو اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کی ترغیب و مشق پر جس نے ساری عمر اپنے آپ کو لگا رکھا ہو اس کی زبان سے بھلا کیوں اپنے مخالف کے لئے کوئی برا لفظ نکلتا۔ اس بارے میں حلف اٹھایا جا سکتا ہے کہ حضرت سے تا عمر کوئی ایسا لفظ نہیں سنا گیا کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ آپ ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ جس زمانہ میں مولوی احمد رضا صاحب کو مرض جذام ہوا اور خون میں فساد پیدا ہوا۔ بعض لوگوں کو مسرت ہوئی کہ سب و شتم کا ثمرہ دنیا میں ظاہر ہوا۔ مگر جس وقت کسی شخص نے حضرت سے عرض کیا کہ "بریلی مولوی کوڑھی ہو گئے" تو حضرت گھبرا اٹھے اور یہ الفاظ فرمائے کہ "میاں کسی کی مصیبت پر خوش نہ ہونا چاہیئے خدا جانے اپنی تقدیر میں کیا لکھا ہے" ــــ ایک دن ڈاک میں خط آیا جس میں اطلاع تھی کہ آپ کے ایک بڑے مخالف مولوی ہدایت رسول کو ایک منکوحہ عورت سے نکاح کرنے کے جرم میں عدالت سے سزائے قید کا حکم سنایا گیا۔ بعض سامعین کو مسرت ہوئی مگر آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ اِنّا للہ وانا الیہ راجعون۔

زیادہ سے زیادہ رنج زیادہ سے زیادہ رنج کا اثر جو کسی بدگو مبتدع کی طرف سے آپ کو پیش آتا یہ ہوتا تھا کہ آپ اس کے لئے دعا کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ مگر یہ بھی اس لئے کہ یہ ایذا رسانی حضرت سے تجاوز کر کے آپ کے مخلصین تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک بار کسی شخص نے آپ کو دعا کے لئے لکھا۔ آپ نے فرمایا ــــ کہ یہ وہی تو

[1] الرشید جلد ۲ صـ ۸۲

ہیں جنہیں مولوی خلیل احمد صاحب سے عداوت ہے۔ میرے دوستوں سے دشمنی رکھیں اور مجھ سے دعا کرانی چاہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اگرچہ کسی کے لئے بد دعا بھی نہیں کرتا۔

اور اس میں بھی حضرت کے پیش نظر آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ تھا۔ طائف کی وادی میں آپ کو کتنی تکلیف پہنچائی گئی مگر بد دعا کے لئے فرشتوں کی اپیل کے باوجود آپ نے ان کے ہدایت کی دعا فرمائی۔ لیکن احد میں جب آپ کے مخلص ساتھیوں کو شدید زخم لگائے گئے تو آپ کے ہاتھ بے اختیار بد دعا کے لئے اٹھ گئے، اللہ تعالے نے یہاں بھی منع فرما دیا کہ آپ تو سراپا رحمت ہیں۔ اور آپ کو یہ اختیار نہیں دیا گیا۔ اللہ تعالے یہ سب دیکھ رہے ہیں۔

عکس تحریر حضرت گنگوہیؒ

یہ خط مفتی فاروق احمد کے والد ماجد اور (تبلیغی جماعت والے) کے دادا مولانا صدیق نام ہے۔ لفافہ پر گنگوہ کی مہر ۳۰ اکتوبر ۱۸۸۸ء مالیر کوٹلہ کی ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۸ء کی ہے۔ لفافہ پر حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے بھی دستخط ہیں جو بھی تبرکاً شامل کر دیئے ہیں (ارشد)

برادرم مولوی صدیق احمد صاحب بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بیعت و ارشاد

گر ہوائے ایں سفر داری دلا	دامن راہبر بگیر و پس برآ
در ارادت باش صادق اے فرید	تا بیابی گنج عرفاں را کلید
بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق	عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق

بیعت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان کسی اچھے پرہیزگار، متقی، عالم باعمل اور باصلاحیت شخص کے ہاتھ پر توبہ کرے کہ میں آئندہ سے نیک کام کروں گا اور گناہوں سے اجتناب کروں گا۔ اور یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر اس طرح کا عزم وہ اکیلا کرے تو اس میں وہ استقلال و استقامت پیدا نہیں ہوتی جو ماضی کی عادات کو چھوڑنے اور استقبال میں اچھی عادات پیدا کرنے میں کام دے سکے۔ خلیق احمد نظامی نے "تاریخ مشائخ چشت" میں مقصد بیعت" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ چند سطروں میں بیعت کا فلسفہ بیان فرماتے ہیں۔

> حقیقت یہ ہے کہ بیعت میں ایک نفسیاتی مصلحت پوشیدہ ہے۔ جب انسان اپنے ماضی کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتا ہے تو بہت سی باتیں اس کو اخلاق و مذہب کے خلاف نظر آتی ہیں۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے وہ دل ہی دل میں اپنی معصیتوں سے توبہ کرتا ہے لیکن اُسے اطمینان نہیں ہوتا۔ اس سے قلب میں ایک بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ماضی کا تصوّر اس کے لئے سوہانِ رُوح بن جاتا ہے۔ اس کی توبہ اس تصوّر پر غالب نہیں آتی ——— اب وہ ایک پاک باطن، نیک نفس انسان کے ہاتھ پر ترک معاصی اور تقویٰ کا عہد کرتا ہے۔ شیخ یقین دلاتا ہے کہ ——"تائب با متقی برابر است"[1] —— اُس کے دل کے زخموں پر ایک پھایا سا لگ جاتا ہے وہ اپنے مستقبل کو نئی امیدوں، محکم یقین اور بیدار احساس کے ساتھ سنوارنے کی کوشش کرتا ہے[2]

بیعت کا لفظی معنی "دست بر دست یک دیگر نہادن و عہد بستن" کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرنا۔ (سبع سنابل ص ۳۶)

قرآن پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر صحابہؓ بیعت کیا کرتے تھے جس کا ذکر یوں آتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ	جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں (اے محمد) وہ اللہ سے
اللّٰهَ ط یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ج فَمَنْ	بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے سو
نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ ط وَمَنْ	جو عہد شکنی کرتا ہے تو اپنی ذات کی مضرت پر عہد توڑتا

---

[1] حدیث نبوی ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ توبہ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جس سے کبھی گناہ نہیں ہوا۔ (ابن ماجہ باب ذکر التوبہ) [2] تاریخ مشائخ چشت ص ۲۴۰۔

اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ (سورۂ فتح پارہ ۲۶)
ہے اور جس نے وہ عہد پورا کیا جو اللہ سے کیا تھا اُن کو عنقریب اجر عظیم ملے گا۔

تصوّف کے سلاسل اربعہ

چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ۔ چاروں سلسلوں میں بیعت کا طریق یہی تھا کہ ایک کامل شیخ کے ہاتھوں پر اپنے گناہوں کی کوئی توبہ کرے اور شیخ کے سامنے آئندہ کے لئے نیک کام کرنے کا عہد کرے لیکن مرشد اور شیخ کا عامل شریعت اور متبع سُنت ہونا ضروری ہے۔ یونہی رسمی طور کسی شہرت یافتہ پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا تاکہ ہم بھی اس کے مریدوں میں شامل ہو جائیں، بیعت کے مقصد کو پورا نہیں کرتا۔ بیعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان شیخ سے اپنے باطن کی اصلاح کرائے۔ جس طرح جسمانی امراض کے علاج کے لئے کسی ماہر معالج مستند طبیب اور کوالیفائڈ ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح رُوحانی امراض کے لئے بھی ماہر معالج کی ضرورت ہے۔ لاکھوں میں شاید کوئی ایسا آدمی ہو جو طب کی کتابیں پڑھ کر اپنا آپ علاج کر سکے۔ لیکن جو ایسا کر سکتا ہے وہ بھی ایسا نہیں کرتا بلکہ اچھے سے اچھے معالج کی تلاش کر کے علاج کراتا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بخار کی بیشمار اقسام میں وہ تمیز نہ کر سکے کہ مجھے کونسا بخار ہے۔ اسی طرح روحانی امراض میں وہ بعض امراض کو صفات سمجھ کر اس پر عمل پیرا رہے اور ساری عمر اس کو دُور کرنے کی کوشش نہ کرے۔ تکبّر اور غرور کو خودی اور خودداری سمجھ لے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسری بیماریوں کو خوبیاں سمجھتا رہے۔

یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر سلف وخلف نے بیشمار کتابیں لکھی ہیں۔ اگر آج کل بعض لوگ تصوف یا پیری مریدی کو اپنے دنیاوی مفاد کے لئے استعمال کرتے اور اس سے اپنی وجاہت بڑھاتے ہیں۔ اگر آج کل بے عمل صوفی یا بدکردار جاہل پیر اور گمراہ سجادہ نشین اس پاکیزہ راستے کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس کی اصلاح کرنا چاہیئے نہ کہ سرے سے سلوک و طریقت ہی کا انکار کر دیا جائے۔ یہ تو بالکل اسی طرح ہے جس طرح آج کل کے لوگوں کے اسلام کو محض چند رسوم اور عقائد فاسدہ و باطلہ کا مجموعہ دیکھ کر اسلام ہی کو ختم کرنے کی مذموم کوشش شروع کر دی جائے۔

حضرت مولینا گنگوہی کی ایک عربی عبارت سے اسی مضمون میں واضح ہو چکا ہے کہ صوفی کسے کہتے ہیں اور سلوک و طریقت کیا ہے۔ تصوّف دین و شریعت کی روح و معنی یا کیف و کمال کا نام ہے جس کا کام انسان کے باطن کو تمام رذائل اور بُرے اخلاق سے پاک صاف کرنا ہے اور ان باطنی امراض یعنی رذائل اور اخلاق ذمیمہ کو دور کرنے اور اپنی روحانی صحت کی اطلاع کے لئے ایک ایسے شخص سے رجوع کرنے کو کہ جو رذائل اور اخلاق ذمیمہ سے پاک ہو، بیعت کہلاتا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد "تذکرہ" میں تحریر فرماتے ہیں:- "الغرض توفیق الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں، ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں سب سے زیادہ آسان و نزدیک راہ یہ ہے کہ رہنمایان طریق میں سے کسی صاحب ارشاد کی ہمت و صحبت حاصل ہو جائے" (تذکرہ ص ۲۹۸) "نظام شمسی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں مگر ہم کو ان کا حال نہیں معلوم ہمکو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم انسانیت کے نظام و مراکز کے کشف کیلئے کتنا زمانہ درکار ہوگا تاہم اتنا معلوم رہے کہ ہر دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے اور جس طرح نظام شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اس لئے ہے کہ کعبۂ شمس کا طواف کرے اس طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں زمین والوں پر ہی موقوف نہیں آسمانوں میں بھی صرف ان

ے کارناموں کی پکار ہوتی ہے" (تذکرہ صفحہ ۶۶)۔

شیخ یا پیر منتخب کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح جانچ اور پرکھ لیا جائے کہ آیا وہ کتاب وسنت کا پابند اور معاملات معاشرت میں ٹھیک ہے۔ ایسے شیخ کا انتخاب کرلینے کے بعد پھر شیخ پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح کہ طبیب حاذق پر یا جاتا ہے۔ اپنے باطنی امراض کا ذکر کرکے انکا علاج پوچھا جائے اور شیخ جو حکم دے اس کو پورے طور پر نبھایا جائے۔

حضرت گنگوہیؒ — ایک مرشد کامل

حضرت گنگوہیؒ کے حالات اور ان کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیخ و مرشد میں جن خصوصیات و صفات کا ہونا ضروری ہے وہ حضرت گنگوہیؒ میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ کتاب وسنت کی تعلیمات اور احکامات کو پڑھتے جائیے اور حضرت گنگوہیؒ کی زندگی کو دیکھتے جائیے معلوم ہوگا کہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی حضرتؒ کی زندگی کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہے۔ طبیب کامل کے لئے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کرے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ خود پورا صحت مند ہی ہو تو علاج کرے لیکن روحانی معالج کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن امراض کا علاج کرتا ہے یا جن روحانی بیماریوں سے نجات پانے کے لئے لوگ اس کے پاس حاضر ہوں وہ خود ان امراض سے پاک ہو اور روحانی طور پر مکمل صحت یاب ہو۔ ایسا شیخ، شیخ کامل نہیں ہے جو خود امراض باطنی میں مبتلا ہو مگر دوسرے کی اصلاح و تزکیہ کا بیڑا اٹھائے۔ اس سلسلے میں یہ مثال بڑی بلیغ ہے کہ ایک بزرگ شخصیت کے پاس ایک عورت اپنے بچے کو لئے حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کو نصیحت کریں کہ گڑ نہ کھایا کرے اور دعا بھی کریں تو انہوں نے فرمایا کہ کل آنا۔ عورت دوسرے روز حاضر ہوئی تو آپ نے بچے کو نصیحت بھی فرمائی اور دعا بھی کی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ نصیحت کل کیوں نہ فرمائی۔ تو جواب دیا کہ کل میں نے بھی گڑ کھایا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر آج میں اسے نصیحت کرتا ہوں تو اس کا اثر نہ ہوگا۔ لہٰذا میں نے کہا کہ کل آنا۔ اندازہ فرمایئے کہ اگر ایک جائز امر میں نصیحت کے لئے اس ے خود احتیاط کی ضرورت شیخ کامل کے نزدیک ضروری ہے تو ترک سُنن، منکرات و فواحش اور باطنی امراض میں واعظ و ناصح یا شیخ کے لئے کتنا ضروری ہوگا کہ وہ ان کا مرتکب و فاعل نہ ہو۔ قرآن پاک اس کو اللہ کی ناراضگی کا موجب بتاتا ہے، کہ انسان خود تو عمل نہ کرے لیکن دوسروں کو نصیحت کرے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا	اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے۔
تَفْعَلُونَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا	بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز
مَا لَا تَفْعَلُونَ ○ (الصف: ۳)	جو نہ کرو۔

جسم ظاہر ہے لہٰذا اس کے امراض واضح اور علاج و تدبیر بھی ظاہر ہے لیکن روح باطن کی چیز ہے لہٰذا اس کی بیماریاں چھپی ہیں۔ ان کو دیکھنے اور علاج کرنے کے لئے بصیرت اور فقاہت کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں جس طرح ان پڑھ جاہل اور اناڑی بڑے بڑے القاب کے ساتھ اپنے حکیم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اسی طرح روحانی دنیا میں گمراہ، بدعقیدہ اور بے عمل لوگ مسند طریقت پر براجمان ہیں۔ ایک حکیم یا طبیب غلط تجویز و تشخیص سے بیماری کو طول دینے یا مریض کی جان لینے کا سبب بنتا ہے اور گمراہ پیر یا مرشد ایمان کی خرابی اور گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ بعض بڑے نامور اور مستند طبیب علاج کرتے

بھی ہیں اور علاج کرنا سکھاتے بھی ہیں۔ اسی طرح شیخ کامل عوامی تربیت بھی کرتا ہے اور اس سے زیادہ ایسے لوگوں کی اصلاح کرکے اُن کو امراض روحانی کا معالج بناتا ہے جو صحیح طور پر وسیع پیمانے پر لوگوں کا علاج کر سکیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت گنگوہی کا دربار اپنے وقت کا سب سے بڑا مطب بھی تھا کہ جہاں آنے والوں کی مرض دیکھ کر ان کی دوا تشخیص کی جاتی تھی اور ایسی تربیت گاہ بھی تھا کہ جہاں علاج کرنا سکھایا جاتا تھا۔

صدقِ طلب کا امتحان

کئی لوگ رسمی طور پر دیکھا دیکھی کسی بڑے پیر کا مرید ہونے کے لئے آجاتے ہیں یا کسی دنیوی غرض و مفاد کے لئے کسی بڑے شیخ سے بیعت ہوتے ہیں یا بعض امتحاناً آجاتے ہیں کہ دیکھیں شیخ کیسا ہے اصلاح مقصود نہیں ہوتی۔ حضرت گنگوہیؒ اس بارے میں اپنی خداداد حذاقت و فقاہت اور بصیرت و فراست ایمانی کو کام میں لاتے تھے اور دیکھتے تھے کہ آیا آنے والا طالب صادق سے واقعتاً اپنی اصلاح کرانا چاہتا ہے؟ اور اس کی طلب کہاں تک ہے۔ چنانچہ اس طرح کی مثالیں کثرت سے ہیں کہ ایک آدمی بیعت کے لئے حاضر ہوا لیکن حضرت نے انکار فرما دیا۔ دیکھنے والوں کو تعجب ہوا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ حضرت کا انکار ٹھیک تھا۔ لوگ آج کل بطور فیشن بیعت ہوتے ہیں مطلق غذا کے لئے سچی بھوک کی ضرورت ہے، اس کے بغیر غذا کتنی ہی لذیذ یا مرغن کیوں نہ ہو، کوئی فائدہ نہیں دیتی، بلکہ الٹا نقصان کرتی ہے۔ اسی طرح طلب صادق کے بغیر اذکار و اشغال وغیرہ کچھ فائدہ نہیں دیتے۔

مولوی ولایت حسین صاحب کہتے ہیں کہ فراغتِ علم کے بعد میں نے خیال کیا کہ بیعت کرنا چاہیئے۔ حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ دو بزرگ ذہن میں تھے۔ زیادہ عقیدت مولانا فضل الرحمٰنؒ سے تھی۔ لیکن حضرت گنگوہیؒ سے بذریعہ تحریر درخواست بیعت کی۔ تو فرمایا کہ اس وقت نہ بیعت جائز اور نہ نافع۔ ایک روز رہ کر جب میں وقت رخصت کے لئے حاضر ہوا تو فرمایا کہ یہ سب شیطانی وسوسے ہیں کہ مشغلہ علم سے باز رکھ کر اوراد و وظائف کی طرف مشغول کرتا ہے۔ تم نے حدیث میں پڑھا ہے کہ شیطان پر ہزار عابد سے ایک عالم بھاری ہے۔ جاؤ اور کتب درسیہ پڑھاؤ ——— اس کے بعد حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کا ارادہ پختہ ہوگیا اور یکسوئی ہوگئی تو درخواست منظور کرلی گئی اور بیعت کرلیا۔

ایک نوجوان جو شکل و صورت سے بڑے صالح نظر آتے تھے، بیعت کے لئے حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا میں تمہیں قطعاً بیعت نہیں کرونگا۔ مولانا محمد یحیٰی کی سفارش بھی کام نہ آئی۔ ایک دن ڈاک میں خط آیا جو گالیوں سے شروع تھا ایک دو فقرے مولانا محمد یحیٰی نے پڑھے پھر رُک گئے۔ حضرت نے پوچھا کہ تمہیں علم بھی ہے یہ کس کا خط ہے۔ اور پھر فرمایا کہ یہ انہی صاحب کا ہے جن کی بیعت کی سفارش تم نے کی تھی۔ سہارن پور پہنچ کر عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

ایک بزرگ آئے۔ دیکھا نہ آؤ بھگت ہے نہ تعظیم و تکریم۔ اس لئے بہت رنجیدہ ہوئے۔ بادل نخواستہ درخواست بیعت کی۔ آپ نے انکار فرمایا اور کہا "یہاں کیا دھرا ہے میں مرید نہیں کروں گا" یہ صاحب جب تک رہے نہ کوئی بات کی اور نہ کھلے۔ آخر چلے آئے اور پھر جس کسی سے ملے تو یوں کہا "میاں کیا دھرا ہے بس دُور کے ڈھول ہیں کہ نام مُلک ہے اس کا پتہ بھی نہیں۔ ہم تو امتحان لینے گئے تھے۔ جب یہ رنگ دیکھا تو چلے آئے۔ مرید ہو کر لیتے کیا؟"

ایک دن خانقاہ میں دو شخص آئے۔ حضرت سے مصافحہ کرکے بیٹھ گئے۔ آپ نے دریافت فرمایا کون؟ انہوں نے عرض کیا کہ "حضرت ہم آپ کے مرید ہیں"۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا "نہیں تم میرے مرید نہیں"۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ "حضرت آپ کو یاد نہیں رہا۔ مگر حضرت نے پھر وہی ارشاد فرمایا۔ انہوں نے پھر کہا۔ حضرت نے پھر کہا کہ "نہیں تم میرے ہرگز مرید نہیں"۔ آخر دونوں صاحب حجرہ سے باہر آئے اور مفتی کفایت اللہ صاحب کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے اسی اثناء میں کہنے لگے کہ مولوی صاحب یہاں کھانا بھی ملے گا یا نہیں؟ مفتی صاحب اس سوال پر چونکے اور کہا کہ میاں لنگر تو یہاں ہے نہیں کہ جس کا جی چاہے آئے۔ حضرت کے جو مہمان آتے ہیں وہ کھانا بھی کھا لیتے ہیں باقی خیر صلا ہے۔ مہمان صاف گو تھے یہ جواب سن کر کہنے لگے کہ ہم نے تو کھانے کے واسطے یہ ڈھنگ نکالا تھا مگر مولوی صاحب پہچان گئے۔

ایک قصہ اسی قسم کا پہلے گذر چکا ہے کہ ایک صاحب آئے اور بیعت کی درخواست کی۔ تو حضرت نے نہ صرف انکار کیا بلکہ ڈانٹا اور کہا کہ چلے جاؤ اور اگر نہ جائیں تو اسباب اٹھا کر پھینک دو۔ حکیم محمد یوسف کو ترس آیا۔ گھر لے جا کر تشفی دی۔ اگلے دن حکیم صاحب نے قصد کیا کہ اس کے بارے میں کچھ کہیں۔ لیکن حضرت نے ان کے کہنے سے پہلے ہی فرمایا کہ اُسے کیوں ٹھیرا رکھا ہے ٹٹو کرا دو اور کہہ دو کہ چلتا ہو —— اب حکیم صاحب کیا کہتے؟ عصر کے بعد تقریب پیدا کرنا چاہی تو حضرت نے بولنے سے پہلے ہی فرمایا کہ اس کو ابھی چلتا نہیں کیا؟ حکیم صاحب نے عرض کیا حضرت آئے مہمان کو کس طرح نکالا جائے۔ آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا کیسی مروّت؟ آخر پھر چپکے چلے آئے اور رات کو معلوم ہوا کہ وہ حکومت کا جاسوس ہے۔ اگلے دن صبح صبح روانہ کیا اور حضرت کی خدمت میں آئے۔ تو حضرت مسکرائے اور آہستہ سے فرمایا۔ "ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس کو چلتا کرو، تم ہی نے نہ مانا۔"

ایک بار ایک طالب علم بیعت کے لئے آئے آپ نے فرمایا تحصیل علم کرو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ طالب علم عموماً حجت کے عادی ہوتے ہیں کہنے لگے کہ حضرت فراغت کے بعد خدا جانے کیا ہو کون مرے کون جئے؟ آپ نے فرمایا کہ دین کا کام بند نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو توفیق ہوئی تو میرے بعد دوسرے تمہیں بیعت کرلیں گے۔ طالب علم نے پھر کہا ممکن ہے کہ میں ہی مر جاؤں۔ آپ نے فرمایا "طلب میں مر جاؤ گے تو اچھا ہے"۔ جب اس پر بھی طالب علم کی تقریر ختم نہ ہوئی اور بار بار سوال ہوا کہ میرا جی چاہتا ہے مجھے تو مرید کر ہی لیجئے تو آپ کو غصہ آگیا۔ لیٹے سے اُٹھ بیٹھے اور فرمایا۔ تم طالب علم ہو! اچھا بتاؤ مرید کے کیا معنیٰ؟ طالب علم نے جواب دیا کہ "کسی کام کا ارادہ کرنے والا"۔ آپ نے فرمایا "جبھی تو کہتا ہوں تمہیں ابھی مرید کے معنی بھی معلوم نہیں اور مرید ہونے آگئے۔ یہ باب افعال ہے، ہمزہ سلب کا ہے۔ مرید کے معنیٰ ہیں مسلوب الارادہ کہ جو پیر کہے وہی مان لے۔ اپنی طرف سے ارادہ ہی نہ کرے"۔ اس پر طالب علم خاموش ہوئے اور پھر نہیں کہا کہ مجھے مرید کرلو۔

آپ طالب علموں کو مرید نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت تھانوی جیسے ذکی، سلیم الفطرت اور ذہین طالبعلم کو بیعت نہیں کیا۔ اکثر طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ سند لی اور خیال کیا کہ چلو اب بیعت سے بھی فارغ ہولیں۔ حضرت انکار فرماتے تھے۔ اس طرح کے سینکڑوں واقعات پیش آئے۔ چند ایک مثالاً پیش کر دیئے ہیں۔

اگر کوئی مرید ہونے آتا تو اس کو استخارہ کرنے کا کہتے اور اکثر کو کئی کئی دفعہ استخارہ کرنے کا حکم دیا۔ ذی شعور یا پڑھے

لکھے جس وقت آپ سے بیعت ہونا چاہتے تو آپ اول ان کو ٹالتے اور یہ فرماکر کہ مجھے کیا آتا ہے اور یہاں کیا رکھا ہے اُن کی طلب کا پہلا امتحان لیا کرتے تھے۔ اور اگر اس پر بھی ان کی خواہش رہتی تو پھر اُن کو بیعت کی غایت بتاتے کہ بیعت کا مقصود تو یہ ہے کہ آدمی کچھ کرے اور دو مہینے یہاں آکر رہے۔ اگر یہ نہ کر سکے تو مرید ہونے سے کیا نفع؟ اس کے بعد بھی اگر سائل کہتا کہ حضرت حصول برکت سلسلہ بھی بڑا نفع ہے تو آپ اس کو داخل سلسلہ فرما لیتے ——— لیکن اس کے برعکس اگر ان پڑھ دیہاتی بیعت کے لئے آتے تو فوراً بیعت کر لیتے۔ عورتوں کو بھی عموماً جلد بیعت کر لیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کو اگر کچھ پڑھنے کو بتایا جائے تو اس کو فوراً معمول بنا لیتی ہیں۔

بیعت کا طریقہ بیعت ہمیشہ باوضو کرتے اور چونکہ آپ ہمیشہ باوضو رہتے تھے اس لئے بیعت بھی عموماً ہر وقت ہی کر لیتے تھے۔ کوئی خاص وقت متعین نہ تھا۔ جس وقت بھی آپ کا منشا ہوا، طالب کو وضو کرنے کا حکم ہوا تو آپ نے توبہ کرا دی مگر پھر بھی صلوٰۃ مکتوبہ کے بعد خصوصاً عصر یا جمعہ کے بعد آپ بیعت فرمایا کرتے تھے۔ جس وقت آپ کسی کو بیعت فرماتے تو گردن نیچے جھکا لیتے اور طالب کو مخاطب بنا کر یوں فرمایا کرتے تھے۔

"کہو ایمان لایا میں خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے نبیوں پر، اور تقدیر پر کہ بھلا بُرا سب خدا ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر، توبہ کی میں نے کفر سے، شرک سے، بدعت سے اور ساری معصیت سے۔ عہد کیا میں نے جھوٹ نہیں بولوں گا، چوری نہیں کروں گا، زنا نہیں کروں گا، کسی پر جھوٹا بہتان نہیں باندھوں گا، پانچ وقت کی نماز پڑھوں گا، رمضان کے روزے رکھوں گا، اگر مال ہوگا تو حج کروں گا، زکوٰۃ واجب ہوگی تو زکوٰۃ دوں گا، اگر کوئی قصور ہو جائے گا تو فوراً توبہ کروں گا۔

——— بیعت کی میں نے رشید احمد کے ہاتھ پر خاندان چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ میں"

اس کے بعد آپ ہاتھ چھوڑ دیتے اور مختصر مگر جامع نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ بیعت نام عہد کا ہے جو خدا سے کیا جاتا ہے سو اس کا دھیان رکھنا چاہیئے کہ ٹوٹنے نہ پائے۔ اصل بیعت یہی ہے کہ آدمی اپنے وعدے کا پکا رہے اور حق تعالیٰ کی رضا کا طالب رہے۔ سنّت کا اتباع ہر وقت ملحوظ رکھے، اس سے قدم نہ ہٹائے۔ اس کے بعد بزرگوں نے جو طریق ذکر شغل کا تجویز کیا ہے وہ اسی کی مضبوطی کے لئے ہے۔ جس کو ہمت ہو وہ کرے اور نہ ہو سکے تو اپنی نماز، روزہ کو درست رکھے یہی سب کچھ ہے۔

آپ اپنے متوسلین سے تعارف حاصل فرماتے اور کیسا ہی اجنبی کیوں نہ ہوتا، کم سے کم اس کا نام ضرور دریافت فرما لیا کرتے تھے۔ حدیث کے اوراد تعلیم کرنے کے بعد فرماتے کہ اپنی گنجائش دیکھ لینا جتنا ہو سکے اتنا کرنا چاہیئے۔ تھوڑا ہو مگر ہمیشہ ہو، نباہ بڑی چیز ہے۔ یہ بات ٹھیک نہیں کہ آج کیا اور کل چھوڑا۔ کوئی کام ٹھانے بغیر نہیں سنورتا، خاص کر دین کا کام اس میں تو بڑی پختگی کی حاجت ہے۔ پیر کی مٹھی میں کچھ نہیں دھرا ہوتا کہ مریدوں کو پکڑا دے۔ پیر کا کام تو بتا دینا ہے، کرنا اپنا کام ہے۔ بندہ سے جو کچھ ہو سکے کرے اور کوتاہی کی توبہ کرے کہ بشر ہر وقت خطا کار ہے۔

دیہاتی لوگ خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرت ان سے بہت ہی بشاشت سے گفتگو کرتے تھے اور چونکہ آپ کے ہاں کوئی رکھ رکھاؤ یا تکلّف نہیں تھا لہٰذا دیہاتی بھی بے تکلّف باتیں کرتے اور ہر طرح کے مسائل پوچھتے۔ آپ اُن سے دیہاتی

زبان میں گفتگو فرماتے۔ یہ نظارہ بڑا فرحت بخش ہوتا کہ مخلص اور بے ریا دیہاتی کس بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے۔ کئی لوگ شاید اسے گستاخی یا معیوب سمجھتے ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اصل تمدّن یہی ہے، اور یہی حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔

قبولِ ہدیہ منتسبین اور نیاز مندوں سے ہدیہ قبول کرنے میں آپ کا معمول مختلف تھا۔ بعض سے قبول کر لیتے اور بعض سے نہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ لوگوں نے خاصی رقوم پیش کیں مگر حضرت گنگوہیؒ نے ان کے اصرار کے باوجود قبول نہیں فرمایا۔ اگر حاجت مند خدّام کچھ پیش کرتے تو آپ انکار کر دیتے کہ مجھے حاجت نہیں اور تم حاجت مند ہو، اپنے صرف میں لاؤ۔ مگر جب دیکھتے کہ خادم کا دل ٹوٹتا اور روئے دیتا ہے تو قبول کر لیتے۔ بعض دفعہ کسی مخلص سے بہت تھوڑا ہدیہ بڑی بشاشت و انبساط سے قبول فرمایا۔

ایک دفعہ ایک مخلص خادم مولانا محمد اسماعیل نے نذر پیش کی اور بے حد اصرار کیا اور چونکہ بہت بے تکلف تھے اس لئے کہا کہ یہ تو آپ کو لینی ہی ہوگی۔ مگر آپ نے نہ مانا اور ہر بار یہی کہا کہ میاں مجھے ضرورت نہیں ہے۔ ایک دوسرے مخلص نے نذر گزرانی تو ان کو بھی انکار کر دیا اور فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا دیا ہے کہ مجھ سے اور میرے مہمانوں سے کھایا بھی نہیں جاتا میں لے کر کیا کروں گا۔ ایک سے کہا کہ کیا نفع کہ دوسرے روپوں میں ملا کر رکھ لوں گا، تمہارے تو اس سے بیسیوں کام نکلیں گے۔ آخر جب انکا اصرار بہت بڑھا تو آپ نے روپوں پر ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا۔ لو بس میں نے لے لئے، اب ان کو میری طرف سے اپنے بال بچوں پر خرچ کرو۔

متوسّلین و ممتاز خلفاء حضرت گنگوہیؒ کے متوسّلین میں ایسے منتخب حضرات شامل ہیں کہ ان میں سے ایک ایک فرد پر جماعت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً بعض علماء تو ایسے ہیں کہ جن کو حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ـــــ اور ـــــ فقیہٌ واحد اشد علی الشیطان من الف عابدٍ ـــــ کا مصداق ٹھیرایا جا سکتا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہانپوریؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیمؒ رائے پوری، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھویؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلویؒ، رحمہم اللہ اجمعین تو ایسے باکمال حضرات ہیں کہ جن کو عالمِ اسلام کا ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں بڑے بڑے جید علماء آپ کے حلقۂ ارادت میں شریک ہوئے اور پچاس ہزار کے لگ بھگ دوسرے متوسّلین ہیں۔ جن میں امراء، روٗساء، عوام غرضیکہ ہر طبقہ و جماعت کے افراد شریک ہیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے ریاست بھوپال حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہونا چاہتی تھیں مگر حضرت حاجی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت گنگوہیؒ کی طرف راغب ہوئیں اور مراسلت شروع ہوئی۔ اوّل تو حضرتؒ نے ملیح طرز سے امتحان طلب لیا۔ لیکن جب بیگم صاحبہ کی طرف سے اصرار و اخلاص کا مظاہرہ ہوا، تو آپ نے تحریر فرمایا:۔

"بیعت دو وجہ سے کی جاتی ہے۔ ایک تو بغرض تحصیل نسبت وحصول برکاتِ طریقت۔ اس کے لئے ایک مدت دراز مرشد کے پاس رہنا ضروری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ میں وہاں آسکتا ہوں نہ بیگم صاحبہ کی یہاں تشریف آوری مناسب ہے اور بدوں اس کے یہ بیعت بیکار ہے۔ دوسری بیعت بغرض شرکت وتعلق بزرگان جسمیں محض دخول سلسلہ ہوتا ہے پاس کو اول تو بندہ کچھ مفید نہیں جانتا۔ دوسرے اس وجہ سے رئیسہ دام اقبالہا کو جو میرے حال پر نظر عنایت و توجہ اور التفات ہوگی، اس سے مجھے سخت ندامت ہوگی۔ نیز اس کی شہرت سے اہل حاجات بھی بندہ کو روز روز تنگ کریں گے جن میں سے کسی کی سعی وسفارش مناسب ہوگی کسی کی غیر مناسب۔ پھر یہ کہ جب رئیسہ دام اقبالہا کو میرے ساتھ محبت واخلاص ہے تو یہ تعلق واتحاد حاصل ہے با ایں ہمہ اگر اصرار ہو تو دو شرط سے مجھے منظور ہے ایک یہ کہ میرے ساتھ قدیمی برتاؤ میں کوئی تفاوت نہ آوے اور میرے ساتھ کسی قسم کی مروت واحسان نہو۔ دوسرے اس امر کا اظہار نہ ہو۔ اگر یہ دونو امر منظور ہوں تو میں ان کی بیعت اس امر پر قبول کرتا ہوں کہ اتباع سنت اور اجتناب بدعت کو اپنا شعار رکھیں اور حق پرستی وعدل گستری و انصاف سے رعایا پروری میں مصروف ہوں۔ والسلام"

چنانچہ رئیسہ عالیہ مذکورہ نے حضرت گنگوہی کا یہ والانامہ پڑھ کر مولوی محمد محی الدین احمد صاحب قاضی ریاست کو خط دے کر بھیجا اور آپ نے ملکہ کو بیعت کر لیا۔ اس بیعت کے آٹھ ہفتہ بعد حضرت گنگوہی کا انتقال ہو گیا اگر اس بیعت میں بھی تاخیر ہو جاتی تو ممدوحہ کا وہ افسوس دوچند ہو جاتا جو ۱۲ر جمادی الاخری ۱۳۱۷ھ ہجری کو حضرت حاجی صاحب کی وفات پر ہوا تھا۔

تلقین و تربیت

ہیں کہ اسرافیل وقت اند اولیاء مردہ را از ایشان حیات است و نما
گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی
کار پاکاں روشنی و گرمی است کار دوناں حیلہ و بے شرمی است
از حدیث شیخ جمعیت رسد تفرقہ آرد دلِ اہلِ حسد
شیخ نورانی زرہ آگہ کند با سخن ہم نور را ہمرہ کند (مرشد رومیؒ)

حضرت گنگوہیؒ کو حق تعالیٰ نے جس طرح علم ظاہری میں مجتہدانہ استعداد عطا فرمائی تھی، اسی طرح تربیت باطنی میں بھی آپ کا انداز مجتہدانہ تھا یعنی آپ کی خداداد فہم و فراست اور ذکا و حذاقت کے آثار و ثمرات شریعت و طریقت دونو علم میں بدرجہ مساوات ظاہر ہوتے تھے۔

لغت عرب میں نسبت دو چیزوں کے ارتباط کا نام ہے۔ مخلوق کو خالق کے ساتھ ایک ایسا ربط ہے کہ جس کی انتہا نہیں۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے اسماء صفات ہیں اسی قدر حق تعالیٰ اور اس کے بندوں میں نسبتیں ہیں۔ خالق و مخلوق میں نسبتِ خلق اور رحیم و مرحوم میں نسبت رحمت ہے۔ علیٰ ہذا نسبت سے کوئی بھی خالی نہیں۔ اس نسبت کا سرسری علم جس کو نفسِ علم کہہ سکیں، ہر ذی العقول کو حاصل ہے۔ ورنہ ایمان ہی نہ رہے حتیٰ کہ اس ربط کا علم کسی درجہ میں کفار کو بھی حاصل ہے کہ اصل فطرت ہے اگرچہ اتنی نسبت و واقفیت عند اللہ معتبر نہیں سمجھی گئی۔

صوفیہ کے نزدیک لفظ نسبت کا مفہوم یہ ہے کہ یہی نسبت قلب میں راسخ اور پیوست ہو کر موثر بن جائے اور وہ علم جو سرسری تھا یقین بن کر حضور کے درجہ میں پہنچ جائے اور جب کوئی سالک یقین کے اس درجہ میں پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کو صاحبِ نسبت کہتے ہیں۔ اس کا حصول محض وہبی ہے اگرچہ طرق و وسائل کسبی اور اختیاری ہیں۔

انسانوں کی طبائع اللہ تعالیٰ نے مختلف بنائی ہیں اور طبیعت چونکہ فطری امر ہے لہٰذا اس کی تبدیلی تو انسان کے اختیار میں نہیں۔ نسبت معتبرہ پیدا ہونے پر بھی وہی رہتی ہے جو اس سے قبل تھی۔ مگر اس کے آثار و مقتضیات بدل جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی تشدد پسند ہے تو صاحبِ نسبت بن کر بھی تشدد کا مضمون قائم رہے گا۔ البتہ اوّل اہلِ حق کے ساتھ تشدد اور سختی کا برتاؤ تھا، نسبت پیدا ہونے پر نافرمانوں اور اہلِ باطل پر تشدد ظاہر ہوگا۔ مثلاً طبیعت میں لاپروائی تھی۔ پہلے یہ لاپروائی طاعات و فکرِ آخرت سے تھی، نسبت حاصل ہونے پر ایک خدا کی فکر ہو کر دنیا اور ساری مخلوق سے استغنار ہوگا مثلاً اگر کوئی کشادہ دست اور مال کو زیادہ خرچ کرنے کا عادی ہے۔ پہلے اس کی کشادہ دستی فضول خرچی اور لہو ولعب پر ہوگی نسبت ملنے پر یہ خرچ آخرت کی فکر اور اللہ کی رضا میں ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس تمام امور طبعیہ کو قیاس فرمائیں۔ اسی مضمون کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔
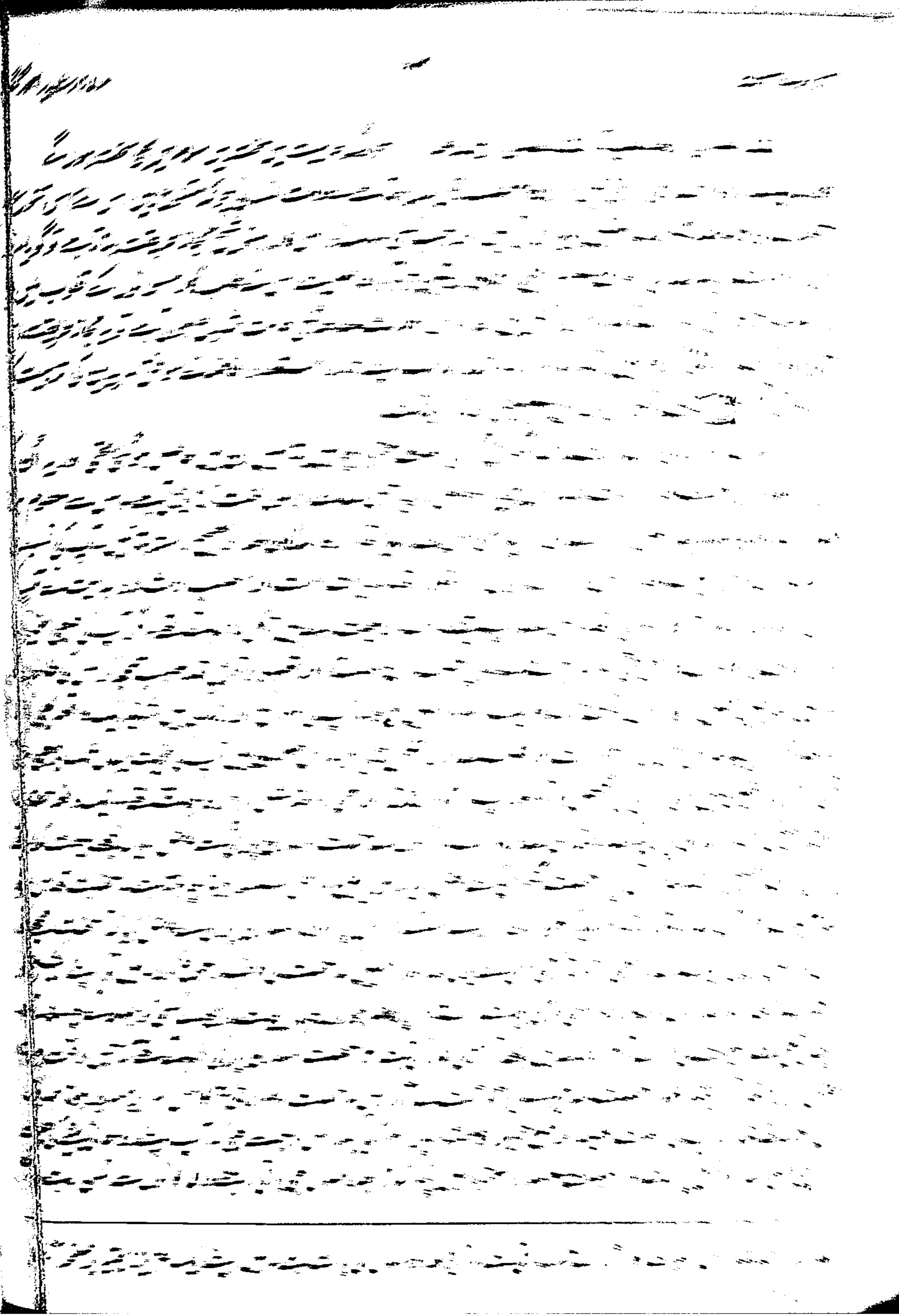
وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

آپ کے اس طبعی انداز اور رنگ نسبت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ متوسلین کی تعداد بہت ہی کم ہوتی اور پھر منتفع اور فائز المرام تو بہت ہی قلیل نکلتے۔ مگر یہ حق کا فضل اور آپ کی کرامت ظاہرہ تھی کہ متوسلین کا شمار ہزاروں بلکہ لاکھوں تک پہنچ گیا۔ آپ کے خلفاء در خلفاء کے متوسلین جو در اصل آپ ہی کے متوسلین ہیں، کا شمار کیا جائے تو ان کا شمار برصغیر پاک و ہند میں ایک کروڑ سے بھی زائد ہوگا۔

آپ عموماً متوسلین کو فجر و مغرب کی نماز کے بعد سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر سو سو بار اور ایک تسبیح استغفار کی جس وقت فرصت ہو، اور اگر سونے کے وقت ہو تو بہتر ہے، کی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ استغفار کوئی مخصوص نہ تھا۔ جو الفاظ بھی ہوں پڑھے جائیں۔ بعض کو آپ نے یہ بھی کہا کہ سوتے وقت کم از کم دس مرتبہ پڑھا کرو۔ اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ "یا اللہ میری توبہ ہے" اس طرح کہنا بھی کافی ہے۔ غرض جس طرح اور جن الفاظ سے توبہ استغفار کرے بہتر ہے۔ تاہم سید الاستغفار کے ساتھ آپ کو زیادہ اُنس تھا کہ وہ حدیث میں منقول ہے۔ استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ۔

نیز عموماً متوسلین کو درود شریف پڑھنے کی تلقین فرماتے کہ کم از کم تین سو مرتبہ روزانہ پڑھا جائے اور اتنا نہ ہو سکے تو ایک تسبیح میں تو کمی نہ ہونا چاہیئے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا احسان ہے۔ پھر آپ پر درود بھیجنے میں بخل ہو تو پھر بڑی بے مروتی اور خسران کی بات ہے۔ درود شریف آپ کو ابراہیمی زیادہ پسند تھا جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ الفاظ صلوٰۃ و سلام جو احادیث میں منقول ہیں۔ دوسروں کے مولفہ درود تاج و لکھی وغیرہ کو آپ عموماً پسند نہ کرتے تھے بلکہ الفاظ کو دوسرے معنی کا موہم ہونے کی وجہ سے خلاف شرع فرما دیتے تھے۔ یہ اوراد و وظائف آپ نے قریب قریب تمام متوسلین کو تعلیم فرمائے اور چونکہ متوسلین کی فراغت و مشغولیت کے حالات مختلف تھے۔ اس لئے مقدار کی بیشی و کمی اُن کے حسب حال فرما دیا کرتے تھے۔ البتہ دو امر پر آپ توجہ زیادہ دیتے تھے۔ ایک یہ کہ گو تھوڑا کام لیا جائے مگر نباہ کر بالالتزام کیا جائے۔ دوم یہ کہ جو وقت کسی ورد کا تجویز کیا جائے، اس کی پابندی کی جائے اور یہ وقت کا تعین عموماً متوسل پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔

اوقات مختلفہ میں آپ ادعیہ مسنونہ کے بے حد پابند تھے یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں اور کلمات مختلف اوقات در کاموں کے وقت منقول ہیں اُن کو آپ خود بھی نہایت پابندی سے کرتے اور اپنے متوسلین کا بھی ان کو پابندی سے کرنا پسند تھا۔

اذکار و اشغال میں آپ کسی خاص طریقے کے پابند نہ تھے۔ طالب کی طبیعت کا رنگ دیکھ کر اس کی تربیت فرماتے اور جو صورت اس کے لئے انفع و انسب معلوم ہوتی وہ عمل میں لایا کرتے تھے۔ کسی کو چشتیہ خاندان کی اور کسی کو نقشبندیہ کی اور کبھی

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کو اس کی طلب پر حضرت مولانا عبد العزیز گتھلوی ثم سرگودھوی جانشین حضرت اقدس رائے پوریؒ کی خدمت میں لے گیا اور عرض کیا کہ یہ توبہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے سختی سے پوچھا کہ کہیں تم تو بہکا کر نہیں لائے۔ (ارشد)

کسی کے لئے دو دو خاندانوں کی مجموعی تعلیم ترکیب کی صورت سے عمل میں لاتے اور مرکب شغل کا پابند بنایا کرتے۔ آپ کا مجتہدانہ انداز کسی خاص طرز میں محدود نہ تھا۔ آپ کی حذاقت و رسائی ذہن اور فراست و خداداد استعداد اس درجہ بڑھی ہوئی تھی، کہ طبیعت کی تشخیص میں غلطی نہ ہونے پاتی تھی۔ بہتیرے قصے ایسے پیش آئے کہ کسی شخص کو آپ نے چشتیہ تعلیم کے مناسب پا کر اس خاندان کی تعلیم شروع فرمائی۔ اثنائے تعلیم میں طالب کو کسی دوسرے اہل اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے یا تو اول ہی تصدیق فرمائی اور یا دوسری تعلیم شروع کرانے پر جب اثر خلاف طبع دیکھا تو پہلی تعلیم پر لوٹا کر یہ الفاظ فرمائے کہ تمہیں وہی تعلیم نفع دے گی جو حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمائی ہے

ایک مقصود کے حاصل کرنے کے متعدد و ان گنت طریقوں میں آپ کا طریق تربیت اس درجہ اسلم تھا کہ راہزنی و قطع کا اندیشہ کمزور پڑ گیا تھا۔ شاقہ محنتیں، چلہ کشیاں، ریاضات و مجاہدات اور کثرت نوافل و عبادات کا اہتمام آپ کی تعلیم میں نظر نہیں آتا۔ آپ کی عالی نظر سالک کو ذات حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف توجہ دلانے کی جانب زیادہ متوجہ تھی۔ جس کے طرق مختلفہ میں یہ طریق آپ نے زیادہ پسند فرمایا تھا کہ ذکر اللہ سے تمام تعلقات ماسوی اللہ مغلوب ہو جائیں اور ایسے دب جائیں کہ گویا کسی سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہے۔ آپ سالک کو دوازدہ تسبیح تعلیم فرماتے اور اتنا اہتمام کرایا کرتے تھے کہ شب کو نہ ہو سکے تو دن کو اور اگر آج نہ پوری ہو سکیں تو کل کو قضا کی جائیں، بالجہر نہ ہو سکیں تو آہستہ آہستہ ہوں، کہ نہ ہو سکیں تو لیٹ کر، وضو قائم نہ رہ سکے تو بے وضو پڑھ لی جائیں۔ غرض جہاں تک ممکن ہو اور جس طرح بھی ہو سکے نہ کی جائیں۔ اس کے بعد جب سالک کو ذکر اللہ کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی تو اسم ذات اللہ اللہ یا نفی اثبات لا الٰہ الا اللہ کی تعداد بڑھاتے اور ایک ہزار سے بارہ ہزار تک بلکہ چوبیس ہزار تک ذکر بالجہر کی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ پاس انفاس تلقین فرماتے اور سانس کی محافظت بذکر اللہ کا طریق سمجھاتے تھے۔

کسی طالب کو پاس انفاس کی جگہ ذکر قلبی تعلیم فرماتے اور چونکہ ذکر لطیفۂ قلب محدود نہیں۔ اس لئے بلا تعین عدد ہر وقت اس خاص دھیان میں لگا دیتے تھے۔ اس تعلیم کی چند روزہ تعمیل پر جو کیفیت کالبد خاکی کے اندرونی اور بیرونی گوشت پوست اور نیز قلب کو حاصل ہوتی تھی وہ بیان کی حد سے باہر ہے اور نہ اس کے بیان کی کسی میں قدرت ہے اور نہ اس کے اظہار کی ضرورت۔ یہ ابتداء تھی اس جمال جہاں آرا سے تعلق محبت کی جس کے لقا کی تمنا میں سینکڑوں بندگان خدا کو تخت و تاج پر خاک ڈالنی سہل معلوم ہوئی اور مقدمہ تھا اُس شہنشاہی اطاعت کی لذت کا جس کے پیچھے پڑ کر آباد جسم کی ویرانی کو ہزارہا مخلوق نے منتہائے مرادات سمجھا کہ ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة[۱]

---

[۱] بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر ڈالتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل بنا دیتے ہیں"۔ حضرت مولاناؒ کے یہاں اس آیت کے چسپاں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہنشاہ حقیقی و مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ جب دل کی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو صاحب دل کو پھر خدا سے زیادہ محبوب اور کوئی نہیں ہوتا۔ دل کی اس آبادی کے مقابلہ میں رعنائیات کی ہر چیز حقیر و ہیچ نظر آتی ہے اور لا موجود الا اللہ کا سماں نظر آتا ہے۔ (ارشد)

پاس انفاس یا ذکر قلبی کا اثر جب آپ متوسل سالک پر محسوس فرماتے تو مراقبۂ حضوری و معیت تعلیم فرماتے یا جو شغل اس کے نافع خیال فرماتے وہ اس کو بتلاتے تھے۔ اس مختصر و چند روزہ تعلیم سے آثار و ثمرات جو کچھ پیدا ہوئے وہ ان کے دلوں سے پوچھیئے جن پر یہ قصے گذرے۔ مگر ان کی زبانوں پر بھی قفل لگے ہوئے ہیں اُن کو حاجت کیا کہ بیان کریں۔ ہاں اتنا ظاہر ہے کہ طاعات کے ساتھ اُنس بڑھتا اور معصیت سے تنفر و استکراہ زیادہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ شرم و حیا کا مضمون پیدا ہو کر حق تعالیٰ شانہٗ کی نافرمانی میں چھُپے اور کھُلے تامل ہونے لگتا اور کوئی روکنے والا دربان بن کر قلب پر کھڑا ہو جاتا تھا کہ ماسوی اللہ کو آنے سے روکتا تھا۔ ذکر کا لطائف میں سریان ہوتا اور دل و دماغ ہی کو نہیں بلکہ روئیں روئیں اور بال بال کو ایک ایسا حظ ہونے لگتا تھا جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ اخلاق رذیلہ آہستہ آہستہ خود بخود کمزور ہو ہو کر معدوم ہوتے جاتے اور اخلاق حمیدہ سہج سہج قوت پا پا کر راسخ اور مستحکم الاصل ہوتے جاتے تھے۔ دل کو ایک بے کلی محسوس ہوتی تھی گویا کسی شئے کا متلاشی اور طلب گار ہے۔ قلب میں ایک ٹوہ اور تمنا محسوس ہوتی تا کہ خارج از فہم و ادراک ذات وراء الوراء کے بندہ بننے کی سچی آرزو ہے۔ یہاں تک کہ وہ نور حاصل ہو جاتا جس کو نسبت سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ حضور قائم ہو جاتا جس کو یاد داشت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے مخلوق کے انداز و خواص جُدا جُدا رکھے ہیں۔ کسی درخت کا نشو و نما کھُلے آفتاب کی شعاعوں کا محتاج ہے اس لئے عالم آشکارا ہونے سے اس کو مضرت نہیں اور کسی سایہ پرور درخت کی شادابی و سرسبزی اخفاء و کتمان کی حاجت مند ہے کہ کھُلی ہوئی دھوپ سے کملاتا اور مرجھاتا ہے۔ چونکہ قلبی واردات کتمان پسند اور ——— و اخفاء دوست ہونے کے سبب اسی درجہ میں ہیں کہ اُن کو زبان سے نکال کر عالم آشکارا نہ بنایا جائے اس لئے کسی صاحب حال کی حالت بیان نہیں کر سکتا۔ مولف ناکارہ کا منصب سوانح میں اپنے احباب سے سُنی سُنائی باتوں کے بیان کر دینے کا ہے مگر اس مبحث میں خود کچھ آیا نہیں اور دوسروں نے کچھ سُنایا نہیں اور اگر اِدھر اُدھر کچھ معلوم ہوا تو اس کے اظہار کی اجازت نہیں ملی۔ اس لئے واقعات غریبہ و لطائف عجیبہ و ثمرات نادرہ و واردات غیبیہ کے اظہار سے یہ عنوان خالی رہا۔ تکملہ عنوان کے لئے اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کے دامانِ عاطفت میں پرورش پانے والے متوسلین کے قلوب پر عجیب عجیب واردات ہوتے تھے۔ مبشرات نامیہ و رویائے صالحہ سے ان کی تسلی جُدا کی جاتی، اکابر سلاسل و راہنمایان خاندان کے فیوضات و برکات کے آثار جداجدا محسوس ہوتے۔ کہیں جوش و ولولہ اپنا رنگ دکھاتا اور کہیں تحیّر و سکر اپنا کیف دکھاتا تھا اور کسی پر گریہ و بکا کی حالت طاری ہوتی تھی ——— ایک شخص جن پر گریہ کا غلبہ تھا کہ مبہوت و متحیر مجنونانہ وار بیٹھتے اور چلاتے رہتے تھے۔ عاشقانہ اشعار پڑھتے اور زار زار بلبلا کر روتے تھے۔ گویا کسی غایت صدمہ سے مغموم اور کمال کلفت میں مبتلا ہیں کہ ضبط ناممکن اور صبر محال و ممتنع ہے۔ ——— ہر وقت یہ شعر پڑھتے رہتے تھے کہ:-

کتاب حسنِ تو روزے قضا میخواند در گوشم   شدم از خویش بیگانہ نہ عقلم ماند نے ہوشم

کوئی اس طلب میں پڑنا ہی حصولِ مراد سمجھتا اور اِس تمنا میں مرجانا ہی زندگی اور عین حیات یقین کئے ہوئے تھا سہ

بر روئیش تا نظر کردم دلی از کونین بر کندم　　بریدم از ہمہ عالم چو شد با دوست پیوندم
ز بستان وصال او اگر چہ نیستم حظے　　بتشریف خیال او بحمداللہ کہ خرسندم

دن کی چمکتی شعاعوں اور شب کی سنسان گھڑیوں میں اگر زبان سے کچھ نکلتا تو یہ نکلتا تھا کہ ؎

اگر فرہاد را حاصل نشد پیوند با شیریں　　ہم آخر جان شیرینش برآمد در تمنائش

بعض ایسے بھی تھے کہ حسرت و افسوس میں عمر کھپاتے اور اشتیاق لقاء محبوب میں فنا ہوئے جاتے تھے۔ بامراد ہوتے اور اپنے کو نامراد سمجھ کر تڑپتے اور بزبان حال کہتے ؎

آخر اے شاخ تر و تازۂ نو تا ہر چند　　خار حسرت خورم و جانب خرما بینم

کوئی کسی بھی حالت و کیفیت میں تھا لیکن مطاوعت امر محبوب اور تمنائے حصول مطلوب بصورت امر مشترک سب کے حالات میں قائم اور جملہ کیفیات میں موجود تھا۔ ہر سالک منتسب کسی حال میں مبتلا، اور کسی کیف میں مبتلا، اور کسی کیف میں مغلوب کیوں نہ ہو، زبان حال سے اپنے آقائے لاشریک کو مخاطب بنا کر یوں عرض کرتا تھا کہ ؎

تو بادشاہے من گدا ہر چہ کنی باشد روا　　من بندۂ فرمان تو ہاں تا چہ فرمائی کنم

امام ربانیؒ قدس سرہٗ کی مقدس و بابرکت جماعت میں ایسے نفوس بھی تھے جو آپ کی طبع کے مناسب طبع لے کر دنیا میں آئے اور نسبت عبدیت کے رنگ سے مانوس ہونے والے انداز پر ابتداء سے انتہا تک قائم رہے۔ نہ ان حضرات پر کبھی کسی حال کا غلبہ ہوا نہ کبھی کیفیت عارضہ کا طریان۔ ایک سادہ اور عالمانہ طرز پر طاعت میں مشغولیت اور درس و تدریس یا تعلیم و تعلم شریعت میں مصروفیت اور حضور و یادداشت قائم ہو کر نسبت حاصل ہو گئی۔ ان کی کیفیت قلبی کا ثمرہ بجز اس کے نہ تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے احکامات قضا و قدر کے سامنے سر تسلیم خم ہو گیا اور اپنی رضا و خواہش رضائے محبوب کے تابع ہو گئی ؎

اگر مراد تو اے دوست نامرادی ماست　　مراد خویش ازیں پیش من نخواہم خواست

مطاوعت و امتثال اوامر میں لذت آنے لگی اور بندہ نواز آقا کی بندگی سے رغبت ہو کر دل کا تقاضا یوں ہوا کہ ؎

از من گماں مبر کہ دل از دوست بر کنم　　تا جاں دریں تن است دم از عشق میزنم
گر بشنوی کہ قافلے مرد در غمست　　اول کسے کہ جاں دہد از بہر تو منم

آپ کے بعض متوسلین ایسے بھی تھے جن پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہوتی اور مسجد کے فرش پر گھنٹوں لوٹا کرتے اور مستانہ وار چیخیں مارا کرتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے کہ اپنے بھائیوں کی رقت و بے تابی کا عالم دیکھ کر حیران ہوتے اور سوال کرتے تھے کہ یہ حالت کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض اپنا اپنا جداگانہ انداز تھا۔ ایک حضرت امام ربانی تھے کہ ان مختلف الاحوال سب ذاکرین و شاغلین کی حالت دیکھتے اور ان کی نگرانی کرتے تھے اور ہر ایک کے حسب حال معاملہ کرتے تھے۔ آپ کی دلی تمنا ہوتی کہ اگر کسی پر کوئی کیفیت وارد ہو تو اس کا اخفاء کیا جائے اور شکر گذاری کی جائے۔ ایک مرتبہ ایک شخص کے قلب پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے ایک گونہ تفاخر کے ساتھ اس کا اظہار غیروں پر شروع کر دیا۔ لوگوں

اس کا چرچا ہوتا تھا کہ وہ کیفیت زائل ہو گئی۔ نعمت کا زوال ایسا نہیں کہ سالک کا قلب اس کا ادراک نہ کرے اور تلملائے نہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت کی خدمت میں اپنا حال لکھ بھیجا۔ آپ نے جواب تحریر فرمایا:-

"لطیفہ غیبی مہمانیست نازک مزاج کہ بادنیٰ بے التفاتی رو میگرداند"

آپ اپنے متوسلین کو حالات وکیفیات کی طرف متوجہ نہ ہونے دیتے کہ یہ امر مقصود نہیں اصل مقصود حق تعالیٰ شانہٗ کی اطاعت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا اتباع ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آپ کے متوسلین کیفیت حاصلہ پر بس نہیں کرتے تھے۔ جوں جوں واردات پیش آتے ان کو غیر مقصود سمجھ کر اپنے کام میں لگے رہتے اور آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہی سادگی کا انداز یعنی اذعان ویقین کے ساتھ بطوع ورغبت اتباع شریعت کا مضمون حاصل ہو جاتا تھا۔ آپ کے بعض متوسلین پر ابتدائی حالت میں وہ عجیب کیفیتیں پیدا ہوئی ہیں کہ دوسری جگہ بہت وقیع سمجھ کر مشہور ہوتیں مگر آپ کے یہاں کوئی کمال کا درجہ نہیں سمجھا گیا۔ اور آپ نے جب فرمایا یہی فرمایا، کہ توجہ نہ کرو۔

سالک کو آپ جو کچھ تعلیم ارشاد فرمایا کرتے تھے اس کا خلاصہ صرف اس قدر تھا کہ حق تعالیٰ کی سچی محبت سودائے قلب میں راسخ ہو جائے۔ جس کا ثمرہ ہر حال میں اتباع شرع اور قدم قدم پر محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع واقتدار ہے۔ پس اگر یوں کہا جائے کہ آپ کی تعلیم نائب رسول ہونے کی وجہ سے نیابۃً اسی امر کی تبلیغ وترویج تھی جس کو آیت مقدسہ میں بیان کیا گیا ہے:-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ اے محمدؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔

ایک دفعہ آپ کے کسی متوسل نے شکایت کی کہ ذکر شغل کرتے مدت گزر گئی مگر کچھ اثر بھی معلوم نہیں ہوتا۔ آپ نے یہ شعر پڑھا ؎

کار کن کار بگذار از گفتار
کاندریں راہ کار باید کار

آپ کے متوسلین میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ آپ ہر ایک کو اس کی طبیعت کے موافق ذکر وشغل بتاتے تھے۔ بعض حضرات تجرد اور تنہائی کی زندگی کو پسند کرنے لگتے تو ان کو اس سے روکتے۔ بعض متوکلانہ زندگی گزارنے کی طرف راغب ہوتے تو فرماتے کہ دیکھ لو اس کا تحمل بھی ہے یا نہیں۔ غرضیکہ ہر پہلو میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملحوظ رکھتے اور اسی کے مطابق تعلیم دیتے۔ اگر کسی متوسل کے متعلق پتہ چلتا کہ جادۂ شریعت یا سنتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹ کر بدعت کی طرف مائل ہے تو سختی فرماتے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کی تعلیم وتربیت کا منشا صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنے آقا ومولا وحدہٗ لاشریک کا ایسا بندہ بیچارہ بن جائے کہ اس کی رضا ہر مرغوب سے مرغوب شئے پر فائق وغالب ہو اور اس کی اطاعت ہر محبوب سے محبوب کے امتثال سے بڑھی چڑھی ہو۔ بندہ طفلِ نوزائیدہ ہو اور دستِ قدرت اس کی دایہ، یا اس طرح کہ جیسے مردہ کا بدن نہلانے والے کے ہاتھوں میں کہ جس طرح مرضی ہلاتا جُلاتا اور سرکاتا ہے۔ مسلمان بالکل اسی طرح دستِ قدرت میں اپنے آپ کو دیدے۔ یہ تھا ہی پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت سر تا پا اعضاء وجوارح کے حرکات وسکنات ہوں اور وقت ولادت سے لحد کی آغوش میں پہنچنے تک جو زمانہ حیات کہلاتا ہے نقشہ و مجسم تصویر بن جائے۔ اس عالیشان شاہی محل و مکان کا جس کی تعمیر فخر عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تئیس ۲۳ سالہ زمانۂ نبوت میں فرمائی ہے نہ اپنے ارادہ سے سکون ہو نہ اپنے قصد سے حرکت۔ اگر سوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی تعمیل میں سوئے، اگر جاگے تو امتثال ارشاد پیغمبر میں جاگے۔ اسی کا نام محبت ہے اور اسی کا نام عشق اور یہی سلوک کہلاتا ہے اور یہی طریقت ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
پا بدستے دگرے، دست بدستے دگرے

اگر مسلمان کو دعویٰ ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب رکھتا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کو معبود مانتا ہے تو پھر اس زندگی کی ہر ہر حرکت وسکون سے اس دعوے کی دلیل لانا چاہیئے۔

زندگانی نتواں گفت حیاتے کہ مرا
زندہ آنست کہ با دوست وصالے دارد

تزکیہ و تصرفات

انسانی فطرت ہے کہ وہ ہم نشیں سے متاثر ہوتی یا ہم نشیں کو متاثر کرتی ہے اور دنیا میں بعض لوگ مشقیں اور مجاہدے کر کے لوگوں پر اثر ڈالتے ہیں اور اس کا انکار مشکل ہے۔ مسمریزم وغیرہ قسم کی چیزیں اسی قبیل سے ہیں اور جب کوئی مسلمان تخلقوا باخلاق اللہ کے امر کے تحت اپنے باطن کو صاف و پاکیزہ بناتا ہے تو اس کی روحانی قوت اس قدر مؤثر ہو جاتی ہے کہ دنیا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ علامہ اقبال رحؒ نے اسی چیز کو بیان کیا ہے ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

مسمریزم وغیرہ کرنے والے تو وقتی طور پر افراد کو متاثر کرتے ہیں مگر صاف باطن لوگوں کی نگاہ جب اٹھتی ہے تو اس سے زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اکابر صوفیائے کرام مثلاً حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور مخدوم علی ہجویریؒ جیسے بزرگوں نے اپنی اسی باطنی قوت اور اخلاص کی وجہ سے لاکھوں لوگوں کی کایا پلٹ دی کہ ع

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس چودھویں صدی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی ایسے ہی پاک و صاف باطن لوگوں میں سے تھے کہ جن کی نظر کیمیا اثر تھی۔ آپ کی صحبت کی تاثیر تھی کہ تاریک و زنگ آلود قلوب لئے جب لوگ آپ کی مجلس میں پہنچتے تھے تو امام ربانی کے منور قلب کی شعاعیں ان کو صیقل کر دیتی تھیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں سے ایک فریضہ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ کے بعد "یُزَکِّیْھِمْ" بھی ہے۔ امام ربانی کو چونکہ حق تعالیٰ نے اس پر آشوب زمانہ میں تعلیم احکامات شرعیہ اور تزکیۂ تطہیر قلوب کے لئے نائب رسول بنا کر بھیجا تھا۔ اس لئے آپ کی قوت قدسیہ کا کیا پوچھنا کہ کس حد پر تھی۔ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تیرہ سو برس بعد پیدا ہونے والی امت جس کو زمانہ کی رسومات نے اکثر فرائض کی جگہ اپنا پابند اور غلام بنا لیا ہو، وہ جس درجہ بھی ادراک سے بے بہرہ ہو ظاہر ہے۔ خصوصاً جبکہ خواہشات نفس

بدعات کو عبادات بنا کر دلوں میں پلا دیا اور دنیا دار مولویوں نے مقدس اہل اللہ کے مجمع کو وہابی کے خطاب سے مشہور کر کے ی صورت دیکھنے سے مخلوق کو بیزار اور ان کے پاس بیٹھنے سے متنفر کر دیا ہو، ایسی حالت میں ان کے نفرت کھائے دلوں کا کھینچ اور ان سے بدعات چھڑا کر سنتوں کا والہ و شیدا بنا دینا بڑے قوی القلب شیخ کا کام ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ آپ کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وساوس ثرت کیوں نہ ہو، جونہی آپ کی صحبت میں بیٹھے اور قلب میں ایک خاص قسم کا سکینہ اور جمعیت حاصل ہوئی جس سے سب رات رفع ہو گئیں۔ اور قریب قریب آپ کے کُل مریدوں میں عقائد کی درستی، دین کی پختگی خصوصاً حب فی اللہ و بغض للہ بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے یہ ساری برکت آپ کی صحبت کی ہے اور ان کمالات کی شہادت میں بے شمار واقعات موجود ہیں ——— اس سے آگے خود حضرت تھانویؒ نے اپنے متعلق دو شہادتیں فراہم کی ہیں کہ کس طرح حضرت گنگوہیؒ نے ی (حضرت تھانویؒ کی) دو باتوں میں اصلاح کی۔ ایک علمِ ظاہر میں اور دوسری باطن میں ——— اور پھر ان کی تفصیل بیان ہے۔ اس کو دیکھنے کے لئے "تذکرۃ الرشید" میں مندرج وہ مراسلت مطالعہ کی جائے جو ان دونوں بزرگوں کے درمیان ہوئی طرح دوسرے واقعات کے لئے بھی تذکرۃ الرشید کی طرف مراجعت کی جائے۔

معنوی کمالات

ظاہر پرستوں کے نزدیک کرامات کسی کے ولی ہونے کی علامات ہیں۔ حالانکہ سب سے بڑی کرامت اتباعِ سنت اور قامت علی الدین ہے۔ کرامت تو مقصود ہی نہیں ہے، اصل مقصود تو اتباعِ سنت ہے۔ جو اس بارے میں جتنا زیادہ دستقیم ہوگا وہ اتنا بڑا صاحبِ کمال اور مقربِ الٰہی ہوگا۔ انسان افراط و تفریط کے درمیان احتیاط سے چلنے والا ہو تو وہ حب کمال کہلائے گا۔ حضرت گنگوہیؒ ایسے ہی معتدل المزاج، میانہ رو بزرگ تھے اور اس پر ان کی اس قدر استقامت و قلال تھا کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔

مجھے بھی یاد رکھنا

حضرت تھانویؒ حج کے لئے تیار ہوئے اور خدمت میں حاضر ہو کر رخصت و اجازت چاہی۔ اس کے بعد عین روانگی کے دن بذریعہ تحریر پھر حضرت کو اطلاع دی کہ بندہ آج روانہ ہو رہا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے جو تحریر بھیجی اس میں درج تھا کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مجھے بھی یاد رکھنا۔ اس کے بعد یہ شعر مسطور تھا ؎

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی — بیاد آر محبان بادہ پیما را

یہ اتباع ہے اس مضمون کا کہ جب سیدنا عمرؓ نے بارگاہِ رسالت سے عمرہ کی اجازت چاہی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ بھائی وہاں حاضر ہو تو دعا کے اندر ہمیں مت بھول جانا۔

یہی جزاء ہے

مولوی حکیم اسماعیل گنگوہیؒ نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ بے تکلف ہونے کی وجہ سے حضرت کے تنفر ظاہر کرنے کے باوجود باصرار سنایا۔ جب ختم کر چکے تو آپ جھکے اور زمین سے خاک اٹھا کر ان پر ڈال دی۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرے کپڑے خراب ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔ منہ پر مدح کرنے والوں کی یہی جزاء ہے۔ میں کیا کروں۔ بجناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔

دُوسرے کے پاس نہیں ہے

امام ربانیؒ کے پاس مقامِ ابراہیمؑ کا ایک ٹکڑا تھا۔خدام کی خواہش پر صندوقچی سے نکال کر پانی میں ڈال کر نکال لیتے اور پانی کو مجمع میں تقسیم کر دیتے۔ اس انمول تبرک سے آپ کو اس درجہ محبت تھی کہ کبھی کسی معتبر سے معتبر خادم کے بھی حوالہ نہیں فرمایا۔ جس وقت مجمع کو زیارت کراتے، مسرت سے باغ باغ ہو جاتے۔ بمقتضائے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ آپ یہ الفاظ بارہا فرماتے کہ مجھے حق تعالیٰ نے وہ شئے عطا فرمائی ہے کہ دوسرے کے پاس نہیں۔ آپ کے پاس بیت اللہ زاد اللہ شرفہا کی مقدس چوکھٹ کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ اس کی محبت و قدر دانی بھی اسی کی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

اتنے واسطوں سے میرا رشتہ دار ہے

آپ نے اپنے کنبہ و اقارب کے بہت سے رانڈ بیوہ عورتوں اور یتامیٰ کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی تھی اور اس سلسلے میں آپ کو اتنا شغف تھا، کہ دُور دُور کے رشتہ داروں کا آپ پتہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ فلاں ابن فلاں اتنے واسطوں سے میرا رشتہ دار ہے اور پھر ان تمام رشتہ داروں کے غرباء و مساکین افراد کا خیال رکھتے اور جتنی گنجائش ہوتی امداد کرتے۔

دُنیا بھری پڑی ہے

انکسار اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی تقریر سے اپنی خوبی کا کچھ بھی اثر ظاہر ہوا تو فوراً اس کی تاویل فرماتے اور اپنے سے اس انتساب کی نفی فرما دیا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے خرقہ کا تذکرہ فرما رہے تھے کہ پچاس برس حضرت کے بدن پر رہا ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا۔ اس حجرہ میں حضرت شیخ جلال تھانیسری رہا کرتے تھے، بیچ میں دیوار حائل تھی۔ سو کہاں تو فقر کا یہ حال تھا اور اب اس حجرہ میں دنیا بھری پڑی ہے۔

تمہارا منہ بھی نظر نہیں آتا

جن ایام میں غالباً سرحد پر جنگ واقع ہوئی۔ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد حضرت پلنگ پر لحاف اوڑھے استراحت فرما رہے تھے۔ چند خدام پاؤں دبا رہے تھے۔ ایک طالب علم نے بے تکلفی سے سوال کیا کہ "حضرت اس لڑائی کا کیا انجام ہونے والا ہے"۔ حضرت نے ترشی سے جواب دیا "میں کیا جانوں۔ مجھے تو اس لحاف میں سے تمہارا منہ بھی نظر نہیں آتا"۔

جمع کر کے کیا کروں گا

ایک دفعہ امیر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان نے اپنے سفیرِ تجارت متعینہ پشاور کے ہاتھ پانچ ہزار روپیہ آپ کی خدمت میں بھیجا۔ سفیر صاحب سہارن پور سے گنگوہ تک کا کچا راستہ بڑی دقت کے ساتھ طے کر کے پہنچے تو حضرت امام ربانیؒ نے نذر قبول نہیں فرمائی اور نہ سفیرِ سلطنت کو خانقاہ میں ٹھیرنے کی اجازت دی۔ ہاں فرمان پڑھوا کر سُنا۔ اس میں لکھا تھا کہ پنج ہزار روپیہ ہلدگانِ عالی میں پیش کرتا ہوں۔ آئندہ ہر سال اتنی رقم حاضر ہوتی رہے گی۔ اس کو قبول فرمائیں اور معاوضہ اس کا صرف دعا ہے"۔ ـــــــ سفیر نے جب اگلے دن واپسی کا قصد کیا اور خصوصی سلام کو حاضر ہوئے تو درخواست کی کہ امیر کبھی یقین نہ کریں گے کہ میں گنگوہ پہنچا اور حضرت نے نذر واپس فرمادی۔ ان کو ضرور یہ خیال ہوگا کہ گھر بیٹھے بات بنادی۔ اس لئے میرے حاضر ہونے کی رسید عطا فرمادیں کہ بارگاہ سلطانی میں پیش کروں۔ ورنہ نوکری بھی کے ساتھ میری جان بھی جاتی رہے گی۔ چنانچہ آپ نے بزبانِ فارسی جواب تحریر کرا کر اس کے حوالہ کیا۔ اس کا مضمون

...ت یہ تھی کہ ——— "بحیثیت اسلام مجھے آپ سے تعلق ہے اور میرا دل ہمیشہ آپ کو دعا دیتا ہے خصوصاً موجودہ حالت
...ت اسلام اور قدر و منزلت کی خبریں سُن کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ حق تعالیٰ برکت عطا فرماوے گا۔ آپ کی نذر پہنچی مگر چونکہ
بوڑھا ہو گیا ہوں اور حق تعالیٰ نے مجھے بہتیرا کچھ دے رکھا ہے، جمع کر کے کیا کروں گا۔ اس لئے واپس کرتا ہوں کسی دوسرے
...ف خیر میں خرچ کر دیا جائے اور مجھے بہر حال دعا گو سمجھئے۔"

...ڑھے اور دھوتر کے

ایک مرتبہ مولانا عبد المومن حاضر خدمت تھے۔ ان کے دل میں وسوسہ گذرا کہ بزرگوں کے حالات
میں تنگ دستی اور زہد و فقر دیکھا ہے مگر حضرت کے جسم پر جو لباس ہے، گو مباح ہے مگر بیش
...ت ہے۔ حضرت اس وقت کسی اور سے باتیں کر رہے تھے۔ دفعتاً متوجہ ہو کر فرمایا کہ ——— "عرصہ ہوا مجھے کپڑے بنانے
...لفاق نہیں ہوتا۔ لوگ خود بنا بنا کر بھیج دیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ تو ہی پہننا۔ ان کی خاطر سے پہنتا ہوں۔ چنانچہ
...وقت بدن پر جتنے کپڑے ہیں، سب دوسروں کے ہیں اور مستعار ہیں۔ چند روز بعد اپنے اپنے کپڑے آ کر لے جائیں گے۔
جب خود بناتا تھا تو گاڑھے اور دھوتر ہی کے بناتا تھا" ——— یہ فرما کر پھر پہلے شخص کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ حاضرین
...تقریر بے محل اور جملہ معترضہ معلوم ہوئی۔ مگر وہ مولانا جن کے خطرۂ نفس کا جواب تھا۔ ان کی پیشانی پر ندامت سے پسینہ
...یا۔

...ید بھی پیر کو ترا لیتا ہے

بحیثیت تبلیغ جو خدمت عالیہ آپ کے سپرد تھی یعنی ہدایت و راہبری، اس کو آپ انجام دیتے
بیعت کرتے۔ ذکر و شغل بتلاتے نفس کے قبائح و مفاسد بیان کرتے اور معالجہ فرماتے تھے۔
...ی ہمہ اپنے آپ کو متواضع، منکسر المزاج اور کمتر رکھتے تھے۔ شاید آپ پر کبھی وسوسہ بھی نہ گذرا ہو کہ میں پیر ہوں یہ مرید،
...عالم ہوں اور یہ جاہل۔ کبھی کسی نے نہ سُنا ہو گا کہ آپ نے اپنے خدام کو خادم، متوسل یا منتسب کے نام سے یاد کیا ہو۔ ہمیشہ
...ے لوگوں سے تعبیر کرتے، اور دعا میں یاد رکھنے کی ضرورت اپنے لئے طالبین سے بھی زیادہ ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تین
...ص بیعت ہونے کے لئے حاضر آستانہ ہوئے۔ آپ نے ان کو بیعت فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ "تم میرے لئے دعا کرو
...ں تمہارے لئے دعا کروں۔ لبعضا مرید بھی پیر کو ترا لیتا ہے"۔ یہ عمل ہے اس حدیث پر جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
...ساری امت کو عام حکم فرمایا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی سے دعا کرانی چاہیئے کہ اپنے نفس کی بہ نسبت دوسرے کی دعا
...دہ مقبول ہوتی ہے"۔ آپ حقیقت میں اپنے آپ کو خدام بلکہ عام مسلمانوں کی دعا کا جتنا محتاج سمجھتے تھے شاید عام خدام اپنے آپ
...اپ کی دعا کا اتنا محتاج نہ سمجھتے ہوں۔

...ریوں سے دریافت کرو

نفسانیت کے فروعی نزاع اور عصبیت و جہالت کے اختلاف سے آپ کو نہایت درجہ نفرت
تھی۔ جہالت کے مناظرے اور مباحثے میں آپ بنفس نفیس تو کیا دلچسپی لیتے، دوسروں کو اس
...مضمون میں مشغول پاتے تو تعجب فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ "ضواد" اور "دواد" کا جھگڑا آپ کے سامنے پیش ہوا تو اس طرح
...اب تحریر فرمایا کہ ت ط۔ ص س ث۔ ز ذ وغیرہ حروف کو ایک دوسرے کی جگہ پڑھتے ہیں اور کوئی اختلاف نہیں کرتا۔ ض
...ں اختلاف ہوا کہ کس طرح ادا کیا جائے۔ عجب بات ہے۔ یہ حرف نہ مشابہ دال [illegible] بنے نہ ظ کے۔ اس کو ایسا پڑھے کہ سب

سے الگ رہے۔ یہ جھگڑا نفسانیت کا ہے۔ ایسی باتوں کے پیچھے پڑنا دین کی بات نہیں۔ یہ مسئلہ علماء سے پوچھنے کا نہیں ہے۔ اگر تحقیق منظور ہو تو قاریوں سے دریافت کرو۔

سلام پر اکتفا کرتا ہوں

بدعات سے اس درجہ احتراز تھا کہ آپ نے وہ امور مباحہ بھی ترک فرما دیئے تھے جن سے دیکھنے والوں کو بدعت کی جانب میلان کا واہمہ پیدا ہو یا صورۃً استناد و استدلال ہو سکے۔ ایک بار خود ہی ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اوّل بارہا حاضر ہوا اور بیٹھا ہوں۔ مگر مبتدعین کے ہجوم سے عرصہ سے اس کو ترک کر دیا۔ اب حاضری کے لئے بہت طبیعت بے قرار ہوتی ہے مگر اس خیال سے نہیں جاتا کہ پیرزادے کہیں اب پھر ادھر کو جھک آئے اور بدعات کی طرف مائل ہو گئے۔ اس اندیشہ کے سبب یہیں سے سلام پر اکتفا کرتا ہوں اور اُدھر کا قصد بھی نہیں کرتا۔

صرف ناک کاٹنی تھی

جن دنوں حضرت جناب مولانا کریم بخش صاحب پنجابی کی خدمت میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک طالب علم دہلی آیا۔ جس کو دعویٰ تھا کہ مجھے یہاں کوئی عالم پڑھا نہیں سکتا۔ یہ شخص کافیہ پڑھتا تھا۔ مولانا کریم بخش صاحب کو طالب علم کا یہ دعویٰ پسند نہ آیا۔ سبق ہو رہا تھا۔ حضرت گنگوہی شریک جماعت تھے۔ سبق کے بعد آپ نے آپ سے کہا کہ یہ لو کافیہ ہے اس پٹھان کو سبق پڑھا آؤ۔ یاد رکھنا اگر نیچا دیکھ کر آئے تو سر گنجا کر دوں گا۔ مولانا گنگوہی کتاب بغل میں لے کر سیدھے اس طالب علم کے پاس پہنچے۔ باتوں باتوں میں کتاب کھولی اور بحث شروع کر دی۔ یہاں تک کہ پٹھان رہ گیا اور آخر کار یہ لفظ کہے کہ ہمیں پوری کتاب دہرا دو۔ اس وقت حضرت نے کتاب بند فرما دی اور کہا پڑھانا منظور نہ تھا صرف ناک کاٹنی تھی کہ دہلی میں جن علماء کے متعلق یہ خیال ہو کہ پڑھا نہ سکیں گے۔ ان کے ادنیٰ شاگرد نے عاجز کر دیا۔ یہ کہہ کر اپنے استاد کے پاس چلے آئے اور عرض کیا کہ حضرت پڑھا آیا اور مات دے آیا۔

بخدا میں اپنے آپ کو

آپ کی ذکاوت اور خداداد استعداد بجائے خود معنوی کمال تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ باایں علم و فضل آپ اپنے آپ کو ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کے برابر بھی نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ تدریس کے زمانہ میں جب کہ آپ کی حسن تقریر پر بعض طلبہ نے آپ کی کچھ تعریف کی تو بے ساختہ خلاف عادت آپ کی زبان سے قسم نکلی اور یوں ارشاد فرمایا کہ "بخدا میں اپنے آپ کو تم میں سے ادنیٰ طالب علم کے برابر بھی نہیں سمجھتا"۔ یہ ہے وہ کمال جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

میں نے سعادت حاصل کی ہے

ایک دفعہ صحن مسجد میں طلبہ کو درس دے رہے تھے کہ بارش ہونے لگی۔ طلبہ کتابیں اور تپائیاں لے کر اندر بھاگے۔ حضرت مولانا نے اپنی چادر بچھائی اور تمام طالب علموں کے جوتے اٹھا کر اس میں ڈال کر ان کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ طلبہ نے جب یہ صورت دیکھی تو وہ پریشان ہوئے اور بعض نے عرض حضرت یہ کیا۔ فرمایا کہ "حدیث میں آتا ہے کہ طالب علم کے لئے چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں پانی میں دعا کرتی ہیں اور فرشتے ان کے پاؤں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خدمت کر کے میں نے سعادت حاصل کی ہے۔ آپ مجھے اس سعادت سے کیوں محروم کرتے ہیں"۔

اکرام امیر قوم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم کا سردار تمہارے پاس آئے تو اس کا اکرام کیا کرو۔

ے امتثال امر میں حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں اگر مخالف جماعت کا کوئی بڑا شخص آتا تو آپ اس کے اکرام میں مطلق پہلو تہی نہ
ماتے تھے۔ مگر اس کے باوجود متنازع فیہ امر میں مداہنت یا نرمی ممکن نہ تھی کہ ذرہ برابر بھی ظاہر ہو۔ اور بات بھی یہی ہے کہ
سی کا اکرام جب امتثال امر پیغمبر میں کیا جاتا ہے تو اکرام پیغمبر سے چشم پوشی کیونکر صحیح ہو سکتی ہے۔ ایک بار مولوی عبد السمیع
صاحب (حضرت کے کٹر مخالف اور غالی بدعتی) کسی تقریب میں گنگوہ آئے ادھر حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تو آپ
نہایت خلق سے ملے اور فرمایا کہ آج کسی وقت کا کھانا میرے یہاں کھائیے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولوی صاحب "انوار ساطعہ"
حضرت کے خلاف لکھ چکے تھے اور ادھر سے بتصدیق حضرت اس کا جواب شائع ہو چکا تھا۔ فتنہ کے دبانے اور بدعات کی
دمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس امر کا مسلمان کو مامور بنایا ہے وہ آپ پورا فرما چکے تھے اور اب درجہ اکرام
ضیف اور اکرام امیر قوم کا تھا۔ سو اس کو آپ نے پورا فرمایا۔ مولوی صاحب نے دعوت قبول کی اور حضرت کے مہمان بن کر
کھانا کھایا۔ حضرت نے ایک مکتوب میں اس دعوت کا ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میرا خیال تھا کہ بدعات کا زبانی تذکرہ
ہوگا۔ مگر مہمان نے اشارۃً بھی کوئی لفظ نہیں کہا۔ سو میزبان کو کیا لازم تھا کہ یہ ذکر نکال کر مناظرہ کرے۔

جیسا کہ گذرا حضرت امام ربانیؒ سنت کے فروغ اور بدعت کی رد میں بہت کوشاں رہتے تھے۔ یہی وجہ کہ مبتدعین کی
نگاہ میں آج تک حضرت مورد عتاب ہیں۔ لیکن حضرت کو اپنے زمانے میں ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ
ور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت صحیحہ کے خلاف آپ کوئی بات نہ دیکھ سکتے تھے اور نہ سن سکتے تھے اور آپ
اس معاملہ میں اتنے سخت تھے کہ بعض مباح چیزوں کو ترک کر دیا تھا کہ مریدین اور طالبین اسی سے آگے راہ کو وسیع کر لیتے
ور بدعات کا باب کھول لیتے ہیں۔ اکثر بدعات کا رواج اسی طرح ہوا ہے۔ آپ کے نزدیک اصل اتباع و اطاعت اللہ اور
اس کے رسول کی تھی۔ اس کے بعد اگر دنیا میں کسی کا ادب، فرمانبرداری یا اطاعت ہے تو وہ اسی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم
ہے۔ مثلاً بڑے بھائی، والدین، استاد، شیخ سب اپنے بڑے اور مطاع ہیں مگر ان سب کے مراتب علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مخلوق
کے مراتب مختلفہ میں ماتحت کی وہ فرمانبرداری زیبا نہیں جس سے مافوق کی نافرمانی پیدا ہو۔ مثلاً بڑے بھائی کا وہ کہنا نہیں مانا
جانا جس میں والدین کی نافرمانی ہو۔ اسی طرح والدین یا استاد کے اس حکم کی تعمیل نہیں ہے جس میں روحانی باپ یعنی شیخ
طریقت کی نافرمانی لازم آئے۔ یہاں تک کہ پیر کے بھی اس حکم کی تعمیل جائز نہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت
کو ہاتھ سے چھڑا دے۔ اسیطرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات و خصوصیات کا حامل سمجھنا جو صرف خدائے تعالیٰ
کی ذات سے مخصوص ہیں، غلط ہے اور شرک ہے۔ یہی کمال جس کو حفظ مراتب کہا جاتا ہے تمام معتقدین کا [illegible] کی اصل ہے مگر عوام
کا تو کیا ذکر ان کے نزدیک تو اس کمال کا نام کفر ہے، بہت سے خواص بھی اس کا پورا حق ادا نہیں کرتے۔ جو آدمی جتنا بڑا ہے
اس کا اس باب میں اتنا ہی بڑا امتحان ہوتا ہے کہ اگر شیخ کے کسی قول و فعل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے
کچھ فرق نظر آتا ہو تو شیخ طریقت کے عمل اور سنت نبویہ کے اتباع میں ایک کی دوسرے پر ترجیح اور بصیرت و محافظت ادب
کے ساتھ حفظ مراتب میں کمی نہ آنے پائے۔ یہ چیز صرف کاملین میں پائی جاتی ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے حضرت گنگوہیؒ کا بعض فروعی مسائل میں کچھ اختلاف ہوا۔ حضرت حاجی صاحب

میلاد و قیام وغیرہ میں کچھ توسع رکھتے تھے اور حضرت گنگوہیؒ اس میں سخت تھے۔ لوگوں نے اس پر یہ افواہ اڑا دی کہ حاجی صاحب نے حضرت گنگوہیؒ کی بیعت فسخ کر دی ہے۔ اصل چیز یہ تھی کہ حضرت حاجیؒ صاحب کو وہ تشدّد پسند نہ تھا جس کو امام ربانی نے اصلاح خلق و احیاء سنت کی خاطر دانتوں سے مضبوط پکڑ رکھا تھا۔

اس تھوڑے سے شیخ و مرید باصفا کے اختلاف کو معاندین نے بہت ہوا دی اور یہاں تک خبر مشہور کر دی، کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت گنگوہی کی بیعت فسخ کر دی۔ حالانکہ جانبین کا حال یہ تھا کہ ادھر عقیدت و ادب میں اعلیحضرت حاجی صاحبؒ کی جانب سے ذرہ برابر تفاوت پیدا نہ ہوا تھا۔ اگر یہاں سے خط جانے میں توقف ہوتا اور خیریت معلوم ہونے میں چند روز کی دیر ہو جاتی تو حضرت حاجی صاحب بے تاب و بے قرار ہو جاتے اور خیریت طلب کرنے کے لئے بار بار خط لکھتے تھے اگر اعلیحضرت کا والا نامہ بغیر انتظار کے آجاتا تو حضرت امام ربانی خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور احباب کو بار بار مژدہ سنایا کرتے تھے کہ ہمارے حضرت کی عافیت مزاج بے موسم معلوم ہو گئی ——— اور بدگوئیاں جب حد سے گذر گئیں اور متوحش افواہیں چار طرف پھیلیں تو حضرت امام ربانی نے عریضہ لکھا اور دریافت کیا کہ ان باتوں کی اصل کیا ہے؟ اعلیحضرت کی طرف سے طویل والا نامہ آیا تھا اس کو ملخصاً ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ از فقیر امداد اللہ عفی عنہ بخدمت فیضدرجت جامع شریعت و طریقت عزیزم مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی متع اللہ بطول حیاتہ ودمرا اعدائہ ———

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مکتوب برکت اسلوب مورخہ چہار دہم رمضان شریف بدست مولوی ممتاز علی صاحب ورود سرور لایا۔ ممنون و مسرور ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو باین عنایت ومحبت مکروہات دارین سے محفوظ رکھ کر کونین میں درجات عالیات قرب ورضا عطا فرمائے۔ مولانا آپ کی تحریر باعث انشراح قلب وموجب جمعیت خاطر فقیر ہے اس لئے آرزو ہے کہ ہمیشہ اپنی خیر وعافیت وحالات ظاہر و باطن سے مسرور ومبتہج فرماتے رہو۔

آپ کے اس خط کے ہر لفظ اور ہر فقرہ سے عجب کیفیت و شگفتگی پیدا ہوئی ع اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کر دی۔ مولانا ضیاء القلوب[1] میں جو کچھ آپ کی نسبت تحریر ہے وہ آپ سے نہیں لکھا گیا جیسا القاء ہوا ہے ویسا ہی ظاہر کر دیا گیا ہے۔ پس بدیہیات کو نہ ماننا اور اپنے ذریعۂ نجات ووسیلۂ فلاح دارین سے علیحدگی کرنا سخت جہالت ومحرومی وادبار ہے، خارج کرنا چہ معنی؟ فقیر تو تم علماء صلحاء کی جماعت میں اپنا داخل ہو جانا موجب فخر دارین و ذریعۂ نجات وسیلہ فلاح کونین یقین کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بھی یہی دعا ہے کہ تم صالحین کی محبت میں جلا دے یا مارے۔ وہ شخص مُدبر ہے جو تم مقدس ومقتدائے زمان سے کچھ دل میں کینہ یا سوءِ ظن یا بدعقیدگی یا عداوت ورنج رکھے۔ فقیر تو آپ کی سب حرکات وسکنات واقوال وافعال کو منتج حسنات وبرکات وموافق شریعت وطریقت سمجھتا ہے اور کل امور میں مخلص وصادق یقین کرتا ہے۔" (الیٰ آخرہ)

اور ادھر حضرت امام ربانی کو اپنے شیخ کے ساتھ محبت کی جو حالت تھی، اس کو کیونکر ظاہر کیا جائے جب کہ ضبط داستان

---

[1] ہر کس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت دارد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ ومولوی محمد قاسم صاحب سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند وصحبت اوشان راغنیمت دانند کہ ایں چناں کساں دریں زمان نایاب اند (ملخصاً از ضیاء القلوب)

کا یہ عالم تھا کہ محبتِ رسولؐ جس میں آپ کو استغراق تھا اس کو اپنے سینہ میں چھپائے رکھتے تھے۔ البتہ فرمان ہائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کو ثمرۂ محبت سمجھ کر اپنی زندگی کو شریعتِ مصطفویہ کی خدمت میں ایسا گذارا کہ جس کی مثال آپ کے عصر میں ممکن نہیں۔ تاہم جس وقت اعلیحضرت کے وصال کی خبر وحشت اثر ہندوستان میں پہنچی اور حضرت امام ربانی کے کانوں میں پڑی، اس وقت صدمہ سے جو حال آپ کا ہوا وہ پاس رہنے والوں نے دیکھا۔ اپنے مشہور عالم استقلال و استقامت اور صبر و ثبات کے باوجود کئی وقت آپ کھانا نہ کھا سکے۔ کسی سے بات کرنا یا مجمع میں بیٹھنا آپ کو گوارا نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوتے اور ہر چند آپ ضبط فرماتے مگر بے تاب ہو ہو جاتے تھے۔

سالہا سال کے بعد آج یہ مضمون عام طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ امام ربانی کو اعلیحضرت کے وصال کا جو صدمہ ہوا شاید اس صدمہ کے بعد جو صحابہ رضؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ہوا، آج تک کسی اور کو نہ ہوا ہو۔ مہینوں آپ کی یہ حالت رہی کہ چارپائی پر لیٹتے ہی خدام کو رخصت فرما دیتے اور خلوت میں پلنگ پر پڑے ہوئے گھنٹوں رویا کرتے تھے۔ بعض مخلصین اتفاقیہ ایسی حالت میں جا پہنچے ہیں انہوں نے ایسی آواز سنی ہے جیسے دیگچی کو آگ پر رکھ دیا جاتا ہے اور وہ جوش مارتی ہے۔ یہ آپ کا ضبط تھا کہ آنے والے کی آہٹ پاتے ہی آپ غم کو پی جاتے تھے اور اسی حالت پر آجاتے تھے جو مطمئن اور صاحب راحت و سکون کی ہونی چاہیئے۔

رنج و غم کے متعلق آپ کی یہ حالت حالانکہ مہینوں رہی مگر جب اعلیحضرت کا تذکرہ فرماتے تو یہی فرمایا کرتے تھے کہ " مجھے حضرت کے ساتھ محبت نہیں ہے جو دوسروں کو ہے"۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ آپ اس محبت کو بھی کافی اور قابل اعتبار نہ سمجھتے تھے۔ اس حالت محمودہ میں بھی آپ اپنے آپ کو دوسروں سے کم اور دوسروں کو اپنے سے زیادہ سمجھے ہوئے تھے۔ اندر سے آپ کا جی چاہتا تھا کہ کاش اس سے بھی زیادہ تعلق و محبّت قلب کو عطا ہو۔

اعلیحضرت کے دنیاوی مفارقت کے حادثہ پر مخفی طور پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنا، آہ کرنا، رونا اور بے تاب ہو ہو جانا جو کچھ بھی عادت میں ہوتا تھا، اس کا تو خاص ہی لوگوں کو علم تھا۔ مگر عام لوگوں نے اتنا مضمون ظاہر بھی دیکھا ہے کہ جب مجلس میں اعلیحضرت کا تذکرہ ہوتا یا کوئی نو وارد مہمان تعزیت کے کلمات کہتا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور بے چین ہو جاتے تھے۔ آپ کا جی چاہتا تھا کہ چیخیں ماریں مگر ضبط کو کام میں لاتے تھے۔ اس کشاکشی سے آپ کی حرکات پر وہ تغیر نمودار ہوتا تھا جس کا رفع ہونا گھنٹوں میں مشکل پڑ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ کی یہ حالت دیکھ کر واقفین و حاضرین نے اس تذکرہ سے احتیاط کر لی۔ اور جو نو وارد یا اجنبی شخص آتا اس کو پہلے ہی منع کر دیا جاتا کہ اعلیحضرت کے وصال پر ملال کا ذکر نہ فرمائیں ——

میں نے اس تذکرہ کو خاصا طویل کر دیا لیکن پھر بھی دل یہ چاہتا ہے کہ اور لکھیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو کہ انسان کو اپنے مربی و محسن شیخ سے کتنی محبت کا علاقہ ہونا چاہیئے اور اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کو جو لوگ کہتے ہیں کہ بیعت نہیں کرتے اولیاء اللہ کو نہیں مانتے وہ کتنا غلط پراپیگنڈہ ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اولیائے اللہ کو اولیائے اللہ ہی مانتے ہیں، اللہ نہیں مانتے۔ اور پھر جو لوگ اولیاء اللہ یا اپنے ان ہادیوں سے اس لئے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ انہوں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ کیا یا وابستگی کو مستحکم کیا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی قدر سے انہیں کس قدر محبت ہو گی کہ جسکی ایک ایک

سنت کو زندہ و تابندہ کرنے کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت انہیں اپنے خالق و معبود کا پتہ چلا۔

فقر و استغناء

آپ زہد و قناعت، مجاہدہ و ریاضت میں، ہجوم مصائب پر صبر اور نعمتہائے ربانی پر شکر ادا کرنے میں تقویٰ و طہارت اور اخلاص و اظہار عبدیت میں، صدق و صفا اور حلم و وفا میں، رافت علی الخلق و شفقت علی الناس میں، اصلاح و شان تربیت میں، ایثار و سخاوت اور حیاء و عفت میں، قضائے خالق پر رضا اور رزاق عالم پر توکل میں، خوف و خشیت اور رجاء رحمت میں، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ، غرض ہر خصلت محمودہ اور کمال معنوی میں وہ مرتبہ پائے ہوئے تھے جو سرداران مذہب یعنی علماء کے امام و پیشوا کو حاصل ہونا چاہیئے۔ نبوی توکل کے آفتاب عالمتاب سے آپ اپنے زمانہ میں خصوصیت سے مستفید ہوئے تھے۔ آپ کے ارشاد و تربیت کا ابتدائی زمانہ چند ماہ کے لئے تعلیم اطفال میں گذرا فی الجملہ تحصیل معاش کا ذریعہ بھی تھا مگر اس میں بھی اتباع سنت تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی ابتدائی عمر میں بکریوں کی پاسبانی کا اتفاق ہو جائے اور آنے والے زمانہ میں اصلاح و تعلیم خلق اللہ اور بندگان خدا کی پاسبانی و نگہداشت کی عادت پڑ جائے۔ اس کے بعد جب آپ مسند ارشاد و تربیت پر بیٹھے اور نیابت نبوت کا عمامہ آپ کے سر پر رکھ دیا گیا تو اسباب معاش سے آپ نے کلی یکسوئی اختیار فرمائی۔ آپ کو یقین تھا کہ جو بندہ اپنے خدا کا ہو کر رہے گا، حق تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کے خود متکفل ہو جائیں گے۔ اس لئے آپ نے چاہا کہ آقا کے دین کی خدمت کو چھوڑ کر رزق موعود کی تلاش میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ فرمائیں۔

آپ کا تو اس بارے میں بڑا کڑا امتحان ہوا۔ فاقوں پر فاقے گذرے لیکن آپ کی عالی ظرفی اور بلند ہمتی نے اپنی لقمتا و تنگ حالی کا اپنے جیسے محتاج انسان پر ظاہر کرنا بھی بے عزتی اور محبوب کی شکایت سمجھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ آپ کے دولت کدہ میں آگ نہیں سلگی۔ مگر آپ نے کسی سے قرض نہیں لیا۔ آپ یوں سمجھتے تھے کہ اگر حق تعالیٰ نے اسی حالت پر رکھا تو قرض کیونکر ادا ہوگا اس لئے قرض لینے سے فاقہ کرنا بہتر ہے۔

ذریعہ معاش

اور جب فتوحات کا دروازہ کھلا تو حق تعالیٰ نے مخفی و قلبی نعمتوں کے ساتھ ظاہری تمول و تونگری سے مالا مال کر دیا۔ آپ دنیا سے بھاگتے تھے مگر دنیا اور دنیا کا مال و متاع آپ کے قدم پکڑتا اور جوتوں پر نچھاور ہوتا تھا۔ آپ خدام کی نذریں لیتے ہوئے گھبراتے اور انکار فرماتے تھے مگر وہ رو رو کر آپ کو لینے پر مجبور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مخالفین کی شکایات پر حکام نے ایک شخص کو اس پر مامور کیا کہ وہ آپ کا حال دریافت کرے۔ آپ درس حدیث کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے آپ کا ذریعہ معاش دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا۔ "توکل"۔ وہ نہ سمجھا کہ توکل کیا شے ہے اور معاش کا ذریعہ کس طرح ہے۔ اس نے معیشت کے اسباب گنوانے شروع کئے کہ زراعت کرتے ہو؟ تجارت کرتے ہو؟ زمیندار ہو؟ کسی کے نوکر ہو؟ کسی سے تنخواہ بندھی ہوئی ہے؟ کوئی حرفہ جانتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ آپ کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے پوچھا آخر کہاں سے کھاتے ہو اور کیا کرتے ہو۔ تو آپ نے فرمایا۔ خزانہ غیب سے ملتا ہے۔ توکل کرتا ہوں۔ بھلا وہ یہ اس نے گردن جھکا لی اور دیر تک کسی فکر و سوچ میں غرق رہا۔ خدا جانے کیا سمجھا کہ جیب سے بلیس روپے نکال کر آپ کی نذر کئے اور واپس ہوا۔ آپ نے بلا تامل لے لئے اور فرمایا۔ یہ ہے توکل جو میرا ذریعہ معاش ہے اور جس کا مجھ سے سوال

کیا جاتا ہے۔

حاضری دربار

سچے علم کا ثمرہ خدا خوفی اور خشیۃ الٰہی ہے۔ مگر آپ کے ضبط کی وجہ سے اظہار مشکل تھا۔ جس وقت آخر شب تحریم باندھ کر اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہوتے اور دست بستہ عرض و معروض شروع فرماتے تو آپ پر وہ حالت نمایاں ہوتی تھی جو شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہوتے وقت غلام پر ہونی چاہیئے۔ بسا اوقات آپ پر گریہ طاری ہو جاتا۔ آواز بھرّا جاتی، ہچکی بندھ جاتی اور سارے بدن پر ایک رعشہ طاری ہو جاتا۔ قرآن پڑھتے اور تغیر حال کی بناء پر رُک جاتے پھر شروع کرتے پھر ٹھیر جاتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک آیت شریفہ پر آپ نے صبح کر دی نہ اُسی کو بار بار دہراتے اور اعادہ فرماتے رہے۔

تلاوت قرآن میں محویت

ایک مرتبہ ظہر کے بعد حجرہ شریفہ میں آپ تلاوت قرآن کے اندر مشغول تھے کہ بندۂ نادان[1] و نادار مولوی محمد یحییٰ صاحب کے پاس اس طرح دبے پاؤں جا بیٹھا کہ حضرت نے آہٹ بھی نہ سُنی۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب کسی ضرورت سے باہر تشریف لے گئے اور میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ چند منٹ کے بعد حضرت کے لہجہ میں تغیر آنا شروع ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ آپ کا سارا جسم کانپنے لگا۔ بے اختیار آپ آٹھ آٹھ آنسو رونے لگے۔ آواز رُک گئی۔ ہر چند آپ پڑھنا چاہتے مگر گریہ کا غلبہ حلق کو پکڑ پکڑ لیتا تھا۔ خدا شاہد ہے وکفی به شهیدا۔ جو حالت اُس وقت حضرت پر طاری تھی شاید تند مزاج خونخوار شیر کے سامنے پڑ کر کسی کمزور و ناتواں ضعیف القلب شخص کی بھی یہ حالت نہ ہوتی ہوگی اور خشیۃ جو اس وقت آپ پر ہویدا تھا غالباً کسی جبار و قہار باقدرت شہنشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر کسی خطاوار سے خطاوار مجرم غلام پر بھی ظاہر نہ ہوا ہوگا۔ آپ کی یہ حالت اتفاقیہ اور عمر بھر میں پہلی بار میری نظر پڑی تھی۔ میں اب تک بھی نہیں جانتا کہ کس بات سے آپ ڈرتے تھے اور کیوں کانپ رہے تھے۔ یہی قرآن مجید ہے جس کو اوّل سے آخر تک مسلمان پڑھتے ہیں۔ خدا جانے وہ مضمون کونسا اور کہاں ہے جس پر خوف یا خشیۃ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے دفعتاً یہ تغیّر حال دیکھ کر میں تھرّا اُٹھا اور اس درجہ پریشان ہوا کہ اب تصور آتا ہے تب بھی گھبرا جاتا ہوں۔ دل میں خوفزدہ ہو کر کہنے لگا کہ یا اللہ آج کس مصیبت میں آ پھنسا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ اگر بیٹھا رہوں ممکن ہے کہ حضرت کو میرے بیٹھنے کا کشف یا اور کسی طرح علم ہو جائے تب معتوب ہوا اور اُٹھوں تو پاؤں کی آہٹ سے اطلاع ہونا ضرور ہے اور اس موہوم سے یہ غالب خیال زیادہ خطرناک۔ اس لئے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی۔ نہ میں آسمان پر تھا نہ زمین پر۔ ساکت و صامت بُت بنا بیٹھا رہا۔ اور دہشت زدہ دل بجائے اس کے کہ اس حالت سے مستفید ہوتا، کمال الحاح اور اخلاص کے ساتھ یوں دعا مانگتا رہا کہ یا اللہ! مولوی محمد یحییٰ جلد آ جائیں۔ دعا حقیقت میں دل سے نکلی اور عین اضطرار و توحش میں واقع ہوئی تھی۔ اس لئے چند لمحے ہی گذرے ہوں گے کہ جو ہر وقت آسکنے جانے کے مجاز تھے آ گئے۔ اُن کا حجرہ کی چوکھٹ پر قدم رکھنا تھا اور حضرت کا اس حالت کو ضبط کر کے سیدھا ہو بیٹھنا۔ خدا جانے یہ حالت عجیبہ دفعۃً پیدا کیونکر ہوتی اور اس طرح یک لخت ضبط کس طرح ہو گئی۔ بجز اس کے کہ بالاجمال اتنا سمجھا کہ یہ بھی کوئی حالت محمودہ ہے جو خاص سنت نبویہ میں اولیاء اللہ پر طاری ہوتی ہے۔ جو جوان کو بوڑھا اور قوی کو کمزور بنا دیتی ہے۔ اور کچھ نہ اس وقت سمجھا نہ اب سمجھ سکتا ہوں۔

---

[1] مؤلف تذکرۃ الرشید حضرۃ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کہ جن کی اس مفصل سوانح سے ہم نے یہ خلاصہ کیا ہے۔

ایک شب آپ نے تراویح شروع کیں۔ میں بھی جماعت میں شریک تھا۔ قرآن مجید پڑھتے پڑھتے آپ اس رکوع پر پہنچے، جس میں خوف و خشیت دلایا گیا تھا۔ جماعت میں حالانکہ نصف سے کم عربی جاننے والے تھے تاہم سب پر خوف کا اثر پڑ رہا تھا۔ ہر کوئی بیقرار اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دوسرے رکوع میں رحمتِ خداوندی کا ذکر تھا۔ اس کے شروع کرنے پر دفعتہً سب پر سرور طاری ہو گیا۔

ہم عصر علماء و احباب کا احترام

مشتے نمونہ از خروارے ایک مثال۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھانے کے لئے مصلّے پر کھڑے ہوئے کہ پیچھے سے کسی صاحب کا یہ کلمہ کان میں پڑا کہ "مولوی صاحب آگئے، مولوی صاحب آگئے" آپ نے منہ پھیر کر دیکھا تو مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی تشریف لا رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی مصلّے سے ہٹ گئے اور پوچھا کہ مولوی صاحب وضو ہے؟ مولانا نے اثبات میں جواب دیا اور اسی سادگی سے مصلّے پر کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے دیکھا کہ سفر کی وجہ سے پنڈلیوں پر غبار ہے۔ اپنے کپڑے کے دامن سے جھاڑنا شروع کر دیا۔ مولانا نانوتوی پر بھی کوئی حالت تھی آرام سے پاؤں صاف کراتے رہے۔ امام ربانی نے خوب اچھی طرح غبار صاف کیا اور بعد میں مسرت کے ساتھ فرمایا کہ مولوی صاحب کے پاؤں صاف کرکے میرا جی بہت خوش ہوا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ انہوں نے تکلف نہیں کیا۔

جرأت و صاف گوئی

نواب محمود علی خاں آف چھتاری کے ساتھ آپ کے گہرے مراسم اور خاصی محبت تھی۔ جس زمانے میں نواب صاحب یتیم پوتے کی ریاست کا انتظام کرنے کے لئے عرب سے ہندوستان واپس آئے تو زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اسی ریاست کی آمدنی میں سے حکام کی دعوتوں وغیرہ کے متعلق وہ اخراجات بھی ہوتے تھے جس کے نواب صاحب شرعاً مستحق نہ تھے۔ حضرت کے نیاز مندوں نے یہ صورت حال لکھی اور اپنی ملازمت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"یتیم کے مال میں غیر مشروع تصرف کا کسی کو حق حاصل نہیں، نہ اس کی معاونت جائز، اس لئے ایسی جگہ کی ملازمت کو بھی میں تمہارے لئے پسند نہیں کرتا۔ خدا رازق ہے وہاں سے چھوڑ دوگے دوسری جگہ سے ملے گا۔"

حضرت کے اس فرمان پر حاجی دوست محمد خاں وغیرہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ حضرت کی کرامت اور ان کی استقامت و پختگی تھی کہ بیکار نہ رہے۔ یہاں سے مستعفی ہوئے تو دوسری ریاست میں ملازم ہو گئے۔ اسی انتظام ریاست کے زمانہ میں نواب صاحب مرحوم نے حضرت کی خدمت میں حاضری کی اطلاع دی تو آپ نے لکھوا بھیجا کہ:۔

"ایسے آنے سے کیا فائدہ کہ نہ آپ مجھ سے مل کر خوش ہوں اور نہ میں آپ سے مل کر خوش ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ یتیم کے مال میں آپ بے احتیاطی بہت کرتے ہیں۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ آپ کو آخرت میں اس کا جواب دینا پڑیگا یتیم کی ریاست کا جبتک معقول انتظام اور مشروع تحفظ نہ ہو جائے، دور ہی دور سے ملاقات کافی ہے۔"

بندہ: رشید احمد

یہ تو معاملہ کا ایک پہلو تھا کہ جب دیکھا کہ نواب محمود علی خاں نے خلافِ شریعت کام کیا ہے تو ان کو صاف لکھ دیا گیا۔ مگر معاملے کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ ایک دفعہ نواب صاحب نے چپکے سے حضرت کو سو روپیہ نذرانہ پیش کیا۔ آپ نے باہر تشریف لا کر علی الاعلان ارشاد فرمایا کہ نواب صاحب نے مجھے اتنی رقم عطا فرمائی ہے۔ نواب صاحب نے گردن جھکائی تو آپ نے فرمایا کہ بھائی کوئی کسی پر احسان کرے تو کیا اُسے ظاہر بھی نہ کرے۔

حسّی کرامات

عوام کے نزدیک ایسی کرامات جو قانونِ عادت سے خارج اور صورۃً عجب ہوں بڑا کمال ہیں۔ مثلاً کسی کے مافی الضمیر پر مطلع ہو جانا، پانی پر چلنا، ہوا پر اُڑنا وغیرہ لیکن خواص کے نزدیک بڑا کمال کرامت معنوی ہے۔ جیسے شریعت پر مستقیم رہنا۔ مکارمِ اخلاق کا خوگر ہو جانا، نیک کاموں کا بے تکلف صادر ہونا، عاداتِ ذمیمہ سے قلب کا طاہر ہو جانا اور کوئی سانس غفلت میں نہ گذرنا۔ یہ وہ کرامت ہے جس میں استدراج کا احتمال نہیں اور وہ یکتائی ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں۔ اگر پہلی قسم کی چیزوں میں سے کوئی چیز پائی جائے اور دوسری صفات سے انسان خالی ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ البتہ اگر دوسری قسم کی صفات کے ساتھ پہلی چیزوں میں سے کوئی امر پایا جائے تو سونے پر سہاگہ ہے۔ تاہم یہ یاد رہے کہ ضروری نہیں کہ جو شخص کمالاتِ معنوی کا حامل ہو، اس میں کراماتِ حسّی ضرور پائی جائیں۔ ولایت اور عبدیت کے لئے دوسری صفات لبس کرتی ہیں۔ الحمدللہ ہمارے بزرگانِ دیوبند دونوں کے حامل ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ وہ ہر لحاظ سے جامع اور کامل ہیں عشق کی سرمستی اور جذب و شوق بھی پایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کتاب و سنت کے ساتھ تمسکِ عملی کی وہ شان ہے جو صرف خاصانِ خدا اور مقربانِ بارگاہ ہی کا حصہ ہے سہ

ہم سمندر[۱] باش وہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

کمالاتِ معنوی کے بعد کمالاتِ حسّی کا ذکر کرنا غیر ضروری سا ہے تاہم بعض لوگوں کے نزدیک بزرگوں کی سوانح کا یہ بھی ایک حصہ ہے۔ انہی کے ذوق کی خاطر چند ایسے واقعات کا ذکر کیا جا رہا ہے (اسی قبیل کے چند واقعات "مرشدِ کامل" کے عنوان کے تحت ذکر ہو چکے ہیں)

ہاتھ جھٹک دیئے

ایک دفعہ ایک نابینا شخص پا پیادہ میرٹھ سے گنگوہ پہنچا اور کہا کہ اللہ کا نام سیکھنے آیا ہوں۔ اہلِ خانقاہ اس کے عاشقانہ شوق سے بہت متاثر ہوئے اور خوب خاطر مدارات کی۔ حضرت مسجد میں تشریف لائے۔ اس نے مصافحہ کرنا چاہا تو آپ نے ہاتھ جھٹک دیئے اور بڑی لاپروائی کے ساتھ اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ ہر چند اُس نے اپنی طلب کا سچا ہونا اور مدّتِ دراز سے زیارت کا متمنی و آرزو مند ہونا ظاہر کیا۔ مگر حضرت نے مطلق التفات نہ کیا۔ اہلِ خانقاہ کو تعجب ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ مگر کسی کو پوچھنے یا کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بعض مخلصین نے بالآخر سفارش کر ہی دی تو آپ کو یہ بات ناگوار گذری اور غصے سے فرمایا "جب تمہیں دخل نہیں تو اس کام میں بولا کیوں کرتے ہو۔ اس کے قلب کو تو دیکھو دُنیا بھری پڑی ہے۔" خیر وہ نابینا چلا گیا۔ دس بارہ روز کے بعد عرس تھا کسی نے دیکھا کہ قوالی میں خوب خُوب حال لاتے تھے۔ جس نے خانقاہ میں اس کا ذوق شوق حضرت کے متعلق دیکھا تھا پوچھا کہ "میاں حضرت کے ساتھ شوق و ولولہ کہاں گیا"۔ وہ نابینا صاحب تھے راست گو۔ کہنے لگے ——— بھیا یہ تو یاروں کے دھندے ہیں۔ خیال تھا تمہارے میاں صاحب پر سکہ جم جائے گا تو آؤ بھگت ہو گی، عرس تک دن نکال لوں گا۔ پھر عرس میں حال قال میں بھرم

---

[۱] سمندر: ایسے جانور کا نام ہے جو آگ میں پیدا ہوتا اور آگ میں زندہ رہتا ہے۔

بندھے گا۔ باقی کیا شوق اور کیسی تمنائے زیارت، ہم تو سیاح آدمی ہیں یوں ہی گذارتے پھرتے ہیں ؎

نے خادم ہیچ کس نہ مخدوم کسے گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ابھی چائے موجود تھی

مولوی شریف حسین مدراسی جو حضرت کے شاگرد تھے، حضرت کے دیوبند تشریف لانے پر ایک سماوار میں بڑی عمدہ چائے بنا کر بڑے شوق سے لائے۔ دیکھا تو بیٹھک اشخاص سے بھری ہوئی تھی۔ سوچتے رہے کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔ آخر یہ سوچ کر کہ خاص خاص حضرات کو پلا دیتا ہوں، دہلیز پر بیٹھ گئے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا۔ مولوی شریف حسین ایک طرف سے پلانا شروع کردو۔ وہ پریشان تو ہوئے لیکن تعمیل ارشاد میں واپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا شروع کردی۔ تقریباً پچیس ۲۵ آدمی مجمع میں موجود تھے۔ سب نے چائے پی لی تو سماوار کھول کر دیکھا تو اس میں ابھی چائے موجود تھی اور یہ برتن صرف چھ پیالی کا تھا۔

آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا

حضرت کا معمول تھا کہ ہر روز ۱۲ بجے دوپہر کو حجرہ کی گھڑیاں دھوپ گھڑی سے ملاتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ متواتر کئی دن ابر محیط رہا اور دھوپ نہ نکلی۔ ایک دن دھوپ نکلی تو اس طرح کہ کبھی دھوپ کبھی بادل۔ حضرت بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے تشریف لائے اور مولوی علی رضا سے کہا کہ جب ۱۲ بجیں، مجھے خبر کرنا اور خود قریب ہی ایک جگہ لیٹ گئے۔ جب آئے تو دھوپ تھی لیکن جس وقت سایہ خط کے قریب (۱۲ کے خط کے قریب) پہنچنے لگا تو دفعتاً ایک بہت بڑا بادل سورج پر چھا گیا۔ گھبرا کر عرض کیا گیا کہ حضرت دھوپ چھپ گئی۔ آپ اٹھ کر دھوپ گھڑی کے پاس آگئے۔ آپ کا آنا تھا کہ بادل درمیان سے پھٹ گیا۔ آپ نے گھڑی ملائی اور حجرہ میں تشریف لے گئے یا تو ایسا تھا کہ ابھی دس بارہ منٹ آفتاب نہ نکلے گا یا آپ کے آتے ہی آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا اور ایسا ہو گیا جیسے کوئی برقع سے منہ کو نکال دے یا جھروکے سے جھانکنے لگے۔

چاچا پہاڑ پر چڑھ جا

مولوی عبدالسبحان صاحب انسپکٹر پولیس گوالیار کے ایک تحصیلدار دوست برخاست کر دیئے گئے۔ کوشش کی دوبارہ تقرری ہو مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر دعا کے لئے گنگوہ پہنچے۔ حضرت نے فرمایا "تمہارے کے قریب جو میدان ہے وہاں ایک مجذوب فقیر رہتے ہیں ان سے ہمارا سلام کہہ دینا" تحصیلدار صاحب سمجھے کہ ٹال دیا۔ دل برداشتہ ہو کر واپس ہو گئے اور فقیر کے پاس بھی نہ گئے۔ کچھ دنوں بعد اتفاقیہ ادھر سے گذر ہوا، تو فقیر مجذوب بیٹھا ہوا تھا۔ دور ہی سے ان کو دیکھ کر فقیر نے کہنا شروع کیا "بابا مولوی صاحب نے بھیجا ہے چاچا پہاڑ پر چڑھ جا" یہ سن کر انہوں نے حضرت کا سلام تو دیا مگر رنجیدہ و مغموم یہ سوچتے ہوئے مکان کو واپس ہوئے کہ مولانا نے یوں ٹالا اور انہوں نے اس طرح ٹالا۔ کام کچھ بھی نہ ہوا۔ پیچ و تاب میں تحصیلدار صاحب مکان پر پہنچے تو حکم آیا ہوا تھا کہ تم بحال کئے گئے اور نینی تال کا تبادلہ ہوا۔

تم گنگوہ ہی جاؤ

مولوی عبدالسبحان صاحب کے ایک دوست مولوی قاسم صاحب کمشنر بندوبست ریاست گوالیار سے ریاست کی جانب سے تین لاکھ روپیہ کا مطالبہ ہوا۔ ان کے بھائی مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کی خدمت میں گنج مراد آباد پہنچے۔ انہوں نے وطن دریافت کیا۔ عرض کیا گیا دیوبند۔ مولانا نے تعجب کے ساتھ فرمایا۔ گنگوہ حضرت مولانا کی خدمت میں کیوں نہ گئے، اتنا لمبا سفر کیوں اختیار کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے عقیدت لائی ہے۔ مولانا نے

تم گنگوہ ہی جاؤ۔ تمہاری مشکلکشائی حضرت گنگوہی کی دعا پر موقوف ہے۔ تمام روئے زمین کے اولیاء بھی اگر دعا کریں گے تو نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ واپس ہوئے اور بوسیلہ حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے سفارش کی تو حضرت امام ربانی نے ارشاد فرمایا کہ میرا کوئی قصور نہیں کیا، یہ صاحب مدرسہ عربی دیوبند کے مخالف ہیں جو اللہ کا ہے۔ سو قصور وار بھی اللہ پاک کے ہوئے۔ حق تعالیٰ سے توبہ کریں۔ بندہ دعا کرے گا۔ چنانچہ ادھر انہوں نے توبہ کی، اُدھر مطالبہ سے کمشنر صاحب کی برأت ہو گئی۔

دو رکعت پڑھو ایک مرتبہ دو اجنبی شخص آئے۔ سلام و مصافحہ کے بعد بیعت کی تمنا ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا "دو رکعت پڑھو"۔ حضرت کے اس ارشاد پر تھوڑی دیر تو دونوں صاحب گردن جھکائے بیٹھے رہے پھر چپکے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ جب دروازہ سے باہر ہو لئے۔ تو حضرت نے فرمایا دونوں شیعہ تھے۔ میرا امتحان لینے آئے تھے۔ حاضرین میں سے بعض آدمی اس کی تحقیق کو ان کے پیچھے گئے اور معلوم کیا تو واقعی رافضی تھے۔

ورنہ گمراہی کا احتمال ہے مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین لکھ رہے تھے اور ان کا اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا، اس وقت تک ان کو حضرت امام ربانیؒ سے عقیدت تھی۔ اس طرف جانے والوں کو پوچھا کرتے تھے کہ حضرت مولانا اچھی طرح ہیں؟ اور دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔ اسی زمانہ میں حضرت نے ایک دفعہ یوں فرمایا تھا کہ "کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے"۔ اس کے بعد ہی مجددیت، مہدویت و عیسویت کے خیالات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

اچھا جلدی کیا ہے افسر الاطباء حکیم احمد سعید امروہویؒ بیعت ہونا چاہتے تھے مگر کسی جگہ نظر نہ ٹکی۔ اسی خیال سے گنگوہ حاضر ہوئے۔ حضرت کے کمال اتباع سنت کو دیکھ کر عقیدت پیدا ہوئی۔ مگر پھر یہ خیال ہوا کہ جب تک ادھر ہی سے قلب کو نہ کھینچا جائے گا بیعت نہ کروں گا۔ کئی دن کے قیام میں معمولاتِ پسندیدہ اور اخلاقِ حمیدہ دیکھ کر ارادہ کر ہی لیا۔ بعض خدام کے واسطے سے درخواست کی۔ حضرت نے صاف انکار فرما دیا کہ نہیں بیعت نہیں کروں گا۔ بڑے لوگوں کو مرید بنا کر جان کو آفت میں ڈالنا ہے۔ کوئی سفارش کراتا ہے، کوئی الزام لگاتا ہے۔ غرض ٹھیک نہیں"۔ حکیم صاحب بڑے افسردہ ہوئے کہ مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ مرجع خلائق اور کامل راہبر کی دست بوسی نصیب ہو۔ اب اسی افسوس میں کئی دن گذر گئے۔ آخر ایک دن حضرت کو حجرہ میں تنہا دیکھ کر اندر چلے گئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے محرومی کی امید نہ تھی۔ گو میں ناقابل ہوں مگر حضرت تو سب قابل ہیں۔ حضرت نے ان کو فرمایا۔ "اچھا جلدی کیا ہے، ابھی اپنے قلب کا اطمینان تو کرلو"۔ حکیم صاحب اپنے وسوسہ پر بہت نادم ہوئے اور معذرت کی۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں نہیں۔ بیعت سے متعلق انسان کو ہر طرح قلب مطمئن کر ہی لینا چاہیئے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست   پس بہر دستے نباید داد دست

بالفعل تم واپس جاؤ اور اپنا کام شروع کرو۔ حق تعالیٰ برکت عنایت فرمائے گا۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے قلب پر سکون طاری ہونا شروع ہو گیا۔ بے چینی دُور ہو گئی اور وہ تعلق قائم ہو گیا جو مرید کو اپنے شیخ سے ہوتا ہے۔ وطن سے

حیدر آباد گئے تو دنیاوی برکات بھی حاصل ہوئیں۔ افسر الاطباء کا خطاب ملا، اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کے مقابلہ کے باوجود اعزاز دن بدن بڑھتا رہا۔

شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے حکم سے بیعت

حضرت منشی رحمت علی صاحب جالندھری خلیفہ ارشد حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری حضرت گنگوہیؒ کے بیعت ہوئے تھے۔ ان کو جب شیخ کی تلاش ہوئی تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خواب میں زیارت ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ گنگوہ جاؤ اور مولانا رشید احمد سے بیعت کرو۔ چنانچہ حضرت منشی صاحب حضرت کے بیعت ہوئے۔

خواب میں مرشد کی اطلاع

اسی طرح حضرت حافظ محمد صالح صاحب (نکودری جالندھری) کو جب مرشد کی تلاش ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں اس بزرگ سے بیعت لوں گا جس کی مجھے خواب میں زیارت ہو۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ کی زیارت ہوئی۔ پھرتے پھراتے گنگوہ پہنچے اور جاتے ہی پہچان لیا۔ غالباً ادھر بھی اطلاع ہو چکی تھی۔ درخواست بیعت پر فوراً بیعت کر لیا۔

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں۔ اول تو متوسلین بھی حضرت کی صحبت کیمیا اثر سے اس کو معمولی بات سمجھتے تھے کسی کو یاد رکھنے کی طرف توجہ ہوئی، نہ محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا، پھر بھی "تذکرۃ الرشید" میں حضرت مولانا عاشق الٰہی نے تقریباً اس سائز کے تیس ۳۰ صفحات میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے اس باب کی تکمیل کے لیے چند واقعات لے لئے ورنہ ؎

این شرح بے نہایت کز حسن یار گفتند حرفیست کز ہزاراں کاندر عبارت آمد

وصال

۱۲ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ کو آپ تہجد کی نماز میں مشغول تھے کہ آپ کے پاؤں کی دو انگلیوں کے درمیان کسی جانور نے کاٹا۔ آپ کو محویت نماز کے سبب احساس بھی نہ ہوا۔ جب فجر کی نماز کے لئے باہر آئے تو کپڑوں پر خون کی سرخی دیکھی۔ جلدی کپڑے تبدیل کر کے جماعت کرائی اور جب چارپائی پر جا کر لیٹے تو معلوم ہوا کہ انگلیوں پر خون جما ہوا ہے۔ اصل میں خون نکل چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعف و نقاہت اور کمزوری و غنودگی طاری رہنے لگی۔

۲۷ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ مطابق ۳۱ جولائی ۱۹۰۵ء آپ کو تپ لرزہ ہوا۔ پاؤں کے زخم کو معمولی سمجھ کر اس کا علاج نہ کیا تھا۔ اب اس جگہ نیلگوں چھالے پڑ گئے۔ یہ بھی خیال ہوا کہ کسی نے سحر نہ کیا ہو۔ ہر طرح کا علاج معالجہ کیا مگر جو وقت مقدر تھا وہ کب ٹل سکتا تھا۔ اسی زخم کی وجہ سے ورم ہو گیا جو بڑھتے بڑھتے اوپر کو چڑھتا گیا۔

حضرت امام ربانیؒ کو چھ روز سے جمعہ کا انتظار تھا۔ بیوم شنبہ دریافت فرمایا کہ آج کیا جمعہ کا دن ہے۔ خادم نے عرض کیا کہ حضرت آج تو شنبہ ہے۔ اس کے بعد درمیان میں کئی بار یوم جمعہ کو دریافت کیا۔ حتیٰ کہ جمعہ کے دن روز وصال ہوا۔ صبح کے وقت پھر دریافت فرمایا کہ کیا دن ہے؟ اور جب معلوم ہوا کہ جمعہ ہے تو فرمایا۔ انا للہ

اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن —— باختلاف روایت ۸ یا ۹ رجادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ راگست ۱۹۰۵ء کو یوم جمعہ بعد اذان یعنی ساڑھے بارہ بجے آپ نے دنیا کو الوداع کہا اور اٹھتّر ۷۸ سال سات ماہ تین یوم کی عمر میں رفیقِ اعلیٰ کی جانب ہنستے اور مسکراتے ہوئے سدھارے۔

تاریخ ہائے وفات

انّہ فی الآخرۃ لمنَ الصّالحین۔	شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
کُنْتَ حَمِیْدًا لُمُتَّ شہیدًا۔	حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ
مَوْلَانَا عاش حمیدًا مات شہیدًا۔	حکیم الامت حضرت تھانویؒ
حیٌّ دَخَلَ الْخُلْدَ۔	حضرت مفتی عزیزالرحمٰنؒ
اے دائے نہاں شد آفتابِ عرفان	مولینا محمد شفیع گنگوہیؒ
گفتند کہ وے شدہ خراماں بجنان	〃 〃 〃 〃

تصنیفات وتالیفات

۱۔ تصفیۃ القلوب: حضرت حاجی صاحب کی تصنیف ضیاء القلوب کا اردو ترجمہ۔

۲۔ امداد السلوک: تصوف کے رسالہ مکیہ کا ترجمہ جو اوائل شباب میں کیا۔

۳۔ ہدایۃ الشیعہ: ہادی علی شیعی لکھنوی کے اعتراضات کے جوابات۔

۴۔ زبدۃ المناسک: حج کے متعلق تمام مسائل ضروریہ۔

۵۔ لطائف رشیدیہ۔ چند آیات قرآنی کے نکات اور پردہ مروجہ شرفاء ہند کا حدیث سے ثبوت۔

۶۔ فتاویٰ میلاد و عرس وغیرہ مع تصدیقات دیگر علماء۔

۷۔ رسالہ تراویح: بیس رکعت تراویح کا احادیث سے ثبوت۔ الرای النجیح فی اثبات التراویح

۸۔ قطوف دانیہ: محلہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ کی کراہت کا فقہ سے ثبوت۔

۹۔ جمعہ فی القریٰ: اہلحدیث کے اس فتوے کا جواب ہے جس میں انہوں نے گاؤں میں جمعہ جائز ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اوثق العریٰ

۱۰۔ ردالطغیان: کلام مجید کے اوقاف کو بدعت ثابت کرنے والوں کا جواب۔

۱۱۔ احتیاط الظہر: اس کا ثبوت کہ جہاں جمعہ ہو جاتا ہے وہاں احتیاط ظہر کی ضرورت نہیں۔

۱۲۔ ہدایۃ المعتدی: قراءۃ فاتحہ خلف الامام کے جوابات۔

۱۳۔ سبیل الرشاد: رد عدم تقلید

۱۴۔ براہین قاطعہ: انوار ساطعہ کا جواب نیز رد بدعات وتحقیق سنت میں لاثانی کتاب جو حضرت کے حکم سے لکھی گئی اور آپ نے اول تا آخر بغور مطالعہ کر کے تصدیق فرمائی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۱)

خانقاہ اور شہر کے درمیان ایک بڑا تالاب حائل ہے۔ جس کی وجہ سے شہر بالکل جُدا ہو گیا ہے۔ جب شہر کے عمائدین کو خبر ملی تو وہ معہ لپکے ہوئے آئے دیکھا تو حضرت کے ہاتھ میں تسبیح ہے مغموم بیٹھے ہیں اور ذکر اللہ کر رہے ہیں۔ طلبہ اردگرد بیٹھے ہیں یہ نووارد مجمع اسلام بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ

اے ہمارے سرتاج دینی بادشاہ سرائے[1] والوں نے آپ کی قدر نہ پہچانی اب آپ ہم ناکارہ لوگوں کی عزت افزائی فرمائیں اور شہر چلے چلیں۔ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اہل مکہ نے مکہ سے باہر کیا تو حق تعالیٰ نے اہل مدینہ کو یہ عزت دی کہ انہوں نے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور انصار کہلائے۔ سچے نائب رسول کے لیے یہ واقعہ اسی کا نمونہ اور نیابت[2] کا جزو ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے اگر ہماری درخواست منظور اور تمنا پوری ہو۔

امام ربانی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ہمدردی کے لیے دُعا دی لیکن فرمایا کہ

"میں یہاں بہت راحت سے ہوں خُدا کا بندہ خدا کے گھر میں پڑا رہے گا نہ کوئی نکالنے والا ہو گا نہ اٹھانے والا"

اور ان کو رخصت فرما دیا۔

سرائے کے پیرزادے حضرت کے تحمل اور بے تامل چلے جانے پر دلوں میں لوہا مان گئے۔ منجانب اللہ ان کو تنبیہ ہوئی اور اپنی مکروہ حرکت پر نادم و منفعل ہوئے اب ایک دوسرے پر الزام دینے لگے کہ تم نے یہ گستاخ حرکت ہم سے کرائی۔ ہائے افسوس جدامجد کے آباد و معمور کوٹھڑی کو ویران کرایا — چنانچہ سب مل کر اپنی گستاخی کا عذر کرنے آئے۔ خطا کی معافی چاہی اور حجرہ کو پھر آباد کرنے کی درخواست کی۔ حضرت کو مسجد میں قیام کئے ہوئے تین چار دن گزر گئے تھے آپ نے مسجد چھوڑ کر حجرہ میں جانے سے انکار کیا۔ مگر جب ان لوگوں نے اصرار کیا اور اس میں ضعیف العمر بوڑھوں سفید ریش معمر بزرگوں نے بھی موافقت کی تو آپ نے گردن نیچے جھکا لی۔ اور بدستور سابق حجرہ میں رونق افروز ہوئے۔ حضرت کا ایک کمال اس وقت ظاہر ہوا کہ جب بغیر کسی ادنیٰ تامل اور رکاوٹ کے حضرت مولانا حجرہ سے حجرہ دان کے کہنے پر نکل گئے تھے۔ اور دُوسرا اس وقت ظاہر ہوا کہ جب آپ نے ان کی خطا معاف کر دی اور دوبارہ اسی حجرے میں آ گئے اور پھر تاحیات اسی حجرے میں فروکش رہے۔

حدیث جنی[3] کی اجازت

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ علمیہ کے موافق اگر علماء یا متعلمین میں سے کوئی (اس کا اہل ہو) پوری کتاب یا کسی خاص حدیث کی اجازت چاہتے تو آپ بلا دریغ عطا فرما دیتے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے حدیث الجنی کی اجازت چاہی آپ نے ان کو بے تامل اور ان سب کو جو خواہش رکھتے تھے (جو وہاں موجود تھے) رکھیں اجازت دے دی۔ ہم اس حدیث کی سند قارئین کے لیے یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ جو کوئی چاہے۔ اس سند کو اجازت سمجھ لے۔

حدثنی شیخی الشاہ احمد سعید المجددی قال حدثنی ابی الشاہ ابو سعید المجددی قال حدثنی شیخ الشیوخ الشاہ عبد العزیز دہلوی قال عمی الشاہ اہل اللہ الدہلوی عن القاضی الجنی المعمر قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قبل فی عمرہ زیارۃ قدمہ فلہ ...

وآنچہ قصہ آں منقول و مشہور است شنیدہ باشید و دیگر مسلسلات آنچہ منقول و مطبوع شدہ اند ازاں یا دیگر ندیدہ اجازت استاد بالاجمال است بہیئت کذائیہ اخذ نکردہ بودم فقط والسلام۔

---

[1] خانقاہ کا پورا علاقہ سرائے کے نام سے مشہور تھا۔ [2] شاہ اہل اللہ دہلوی نے دوران تلاوت قرآن چھوٹا سا سانپ مار دیا۔ ایک آدمی آپ کو یہ کہہ کر (بلا کر لے گیا کہ آپ کو) بلاتے ہیں۔ دہلی کے باہر ایک زمین دوز دروازہ سے اندر گئے دیکھا تو شاہ جنات کا دربار تھا۔ ایک جن نے شاہ صاحب پر اپنے بچے کے قتل کا دعویٰ کیا۔ چھوٹا سانپ اس جن کا بچہ تھا۔ اس پر جنوں ...

[illegible]

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء ○ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء

ترتیب
عبدالرشید ارشد

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے پہلے تک ملک میں کام کرنے والوں کا ایک ہی طبقہ تھا وہ علماء اور نئے مسلمانوں کا طبقہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں علی گڑھ سکول قائم ہوتا ہے (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنا)۔ اس وقت سے جدید و قدیم فرق ہونے لگتا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رح نے اس حقیقت کو پہلے دن سے سمجھ لیا تھا کہ ہندی مسلمانوں کی خیر نہیں اور اب ذہنی و دماغی۔ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے رجحانات میں ایسا فرق ہو جائے گا کہ اگر علی گڑھ سکول کے قیام کی تحریک میں اصلاحات نہ کی گئیں تو آئندہ چل کر دیوبند اور علی گڑھ کی وہ چپقلش پیدا ہوگی جو کبھی ختم نہ ہوگی اور اس خلیج کو پاٹنا مشکل ہوگا۔ مولانا نانوتوی کی فراستِ ایمانی اور نگاہِ مردِ مومن کے سامنے ہندوستان کی پچاس سال قبل اور پچاس سال بعد کی سیاست تھی۔ اِس لئے آپ نے سر سیّد مرحوم سے خط و کتابت شروع کی اور چاہا کہ جدید و قدیم تعلیم کے فرق کو بیچ سے نکال کر صحیح اسلامی فکر کو اصولِ تعلیم کر کے میدان کو جیت لیا جائے کیونکہ دین کی بنیاد صحیح علم و عمل پر ہے اور علم سے خود شناسی اور خدا شناسی کا۔ لیکن امور پر اتفاق کے باوجود کچھ حالات ایسے پیش آ گئے کہ جن کی وجہ سے ان دونوں کے اشتراک سے ہمارا منصوبہ تیار نہ ہو سکا اور دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ایسی کمائی تھے کہ جو علوم و فنون، افکار و خیالات میں اپنے استاد کے حقیقی جانشین اور چھوڑے ہوئے کاموں کے پورا کرنے والے تھے۔ یہ شیخ الہند تھے کون؟ ایک عالم ربّانی و عارفِ یزدانی جو اپنے کام کی دھن میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم۔ اس نے نہ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی تھی اور نہ رُوسو اور مانٹسکو کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا وہ نہ گلیڈسٹون کے مجموعہ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن اسپر کے افکار و نظریات سے۔ اس نے نہ کسی دل کشی کا نظارہ اٹھایا تھا اور نہ عشرت کدہ فرنگ کی کسی لذّت سے کام جوئی کی تھی ان سب چیزوں کے برعکس اس کا شیرازہ حیات قال اللہ و قال الرسول اور اس کی زندگی کا خمیر اتباع سنّت نبویہ تھا اس کے فکر و نظر کا تار و پود احکامِ الٰہی کے انوار سے بنا اور شریعت اسلام کے آفتاب جہان تاب کی شعاعوں سے گوندھا گیا تھا۔ سینہ میں صبر و استقامت کا ایک کوہ گراں رکھتا تھا۔ نظر وہ اپنے گوشۂ عزلت میں سب سے الگ تھا لیکن اس کی نظر جہاں بین میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل و نہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہو گئی تھیں۔ نیشنل کانگریس حکومت سے حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ لیکن شیخ الہند یہاں اس حکومت کا تختہ ہی الٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے۔ (مدینہ بجنور)

ہم کو تسلیم ہے کہ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کے زبان و قلم نے غفلت کدہ ہند کے خس و خاشاک میں آگ

ابھی تھی لیکن حریت طلبی کے ذوق کی خامی کا ابھی یہ عالم تھا کہ ملک کی سب سے بڑی ترقی پسند جماعت کا قدم بھی حقوق کی منزل سے آگے نہ بڑھنے پایا تھا۔ مگر علماء حق آنے والی جنگ آزادی کے لئے خاموشی سے بہادر سپاہی تیار کرنے کی مہم میں مصروف تھے۔ ان کا نصب العین نہ تو دین و دنیا باہم آمیز تھا اور نہ ان کا مطمح نظر "درمع الدہر کیف دار" تھا بلکہ ان کا طرۂ امتیاز "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" پر تھا۔ ان کے نزدیک دین کا مفہوم ایک مکمل نظام زندگی تھا جس کی پنہائی اور وسعت میں گوشہ زمین و آسمان ہے۔

ان، خاندان، تولد اور ابتدائی حالات

دیوبند کے چند مبارک اور ذی علم خاندانوں میں سے ایک خاندان شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہے۔ حضرت کے جد امجد شیخ فتح علی صاحب تھے۔ ان میں سے مولانا ذوالفقار علی صاحب ایک نہایت ہی صاحب اقبال اور دینی و دنیاوی حیثیتوں سے صاحب وجاہت و عالم تھے۔ باوجود کرم، اخلاق کے صورت سے سیادت اور رعب عیاں تھا۔ حق تعالیٰ نے اموال و اولاد صحت حیات سے بہرہ وافی عطا فرمایا تھا۔ اور مولانا اپنے شہر میں نہایت خوش قسمت اور بلند اقبال شمار ہوتے تھے۔ پچاسی سال کی عمر میں ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ساٹھ افراد اولاد ذکور و اناث چھوڑے۔ دہلی کے مشہور عربی کالج میں آپ نے شمس العلماء والمشائخ مولانا محمد مملوک علی صاحب سے تعلیم پائی تھی۔ آپ کی تمام عمر علمی خدمات میں بسر ہوئی۔ علوم ادبیہ عربیہ سے مناسبت تھی اور آپ کی نظم و نثر عرب العرباء کی یاد دلاتی تھی۔ دیوان حماسہ اور دیوان متنبی کی مفید شرح "تسہیل الدراسۃ اور البیان" آپ کی بہترین علمی یادگار ہیں اور قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت سعاد کی شرح میں عطر الوردہ اور الارشاد جس ذوق سے تحریر فرمایا ہے وہ حب نبویؐ کی علامت اور بہترین ذخیرۂ آخرت اور کمال ایمان کی دلیل ہے اسی طرز پر عرب کے مشہور معلقات کی شرح التعلیقات علی السبع المعلقات تحریر فرما کر طالبان ادب پر احسان فرمایا ہے۔ اور فن معانی و بیان کو نہایت سے اردو زبان میں لکھ کر تذکرۃ البلاغت نام رکھا ہے اور قواعد و ضوابط معانی کی مثالیں اساتذۂ اردو کے کلام سے دکھلا کر کمال کیا، بلکہ زبان اردو میں سب سے پہلے ممدوحؒ نے اس فن کو جاری کر کے دکھلایا ہے ایسے باکمال حضرات اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

جناب موصوف کے دو صاحبزادیاں اور چار صاحبزادے تھے۔

فخر آباؤ اجداد حضرت مولانا محمود حسنؒ۔

مولوی حامد حسن جن کی ملازمت کا اکثر حصہ ضلع بجنور میں گذرا۔

مولانا حافظ حکیم محمد حسن صاحب مدرس و طبیب دارالعلوم دیوبند۔ آپ نے حدیث شریف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے اور دیگر علوم دارالعلوم دیوبند میں اور اپنے بھائی حضرت شیخ الہند سے اور طب دہلی میں حکیم عبدالمجید خاں صاحب مرحوم و مغفور سے حاصل فرمائی۔

مولوی حافظ محمد محسن صاحب۔ اکثر عمر مشغلہ ملازمت رہا۔ اپنے بڑے بھائی شیخ الہندؒ سے والہانہ محبت و الفت تھی۔ ان کے ایام اسیری مالٹا میں یاد کر کے زار و قطار رویا کرتے تھے۔

حضرت مولانا ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں بمقام بریلی (جب کہ آپ کے والد ماجد بوجہ ملازمت مع اہل و عیال وہاں مقیم
عالم ظہور میں تشریف لائے۔ والد ماجد نے بطرز شائستہ اظہار مسرت کیا اور محمود حسن نام رکھا اور بعض ظریف حضرات نے
ذوالفقار علی بتلایا۔ چھ سال کی عمر میں پڑھنے بٹھائے گئے۔ قرآن مجید کا اکثر حصہ میاں جی منگلوری سے پڑھا۔ بقیہ قرآن پاک اور فارسی
کی ابتدائی کتابیں میاں جی مولوی عبداللطیف صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی کتب
اپنے معزز چچا اور مشہور استاد مولانا مہتاب علی سے پڑھیں۔ مولانا بچپن میں کھیل کود سے مجتنب و متنفر تھے۔ البتہ سیر و شکار
سے ایک مناسبت اور دلی شوق تھا۔

مولانا شیخ الہند کی عمر پندرہ سال کی تھی اور آپ قدوری تہذیب وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ کہ خدا تعالیٰ کے مقبول اور سچے
اخلاص بندوں کی تجویز سے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ ہجری کو دیوبند میں ایک عربی مدرسہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی
کی تجویز سے پہلے مدرس مولانا ملا محمود صاحب بمشاہرہ پندرہ روپے ماہوار مقرر ہوئے اور دیوبند کی مشہور مسجد چھتہ میں تعلیم
عربی شروع ہوئی۔

سبحان اللہ! کیا مبارک ساعت اور کیسے مخلص اور سعید حضرات تھے کہ ان کی معمولی آواز پر پہلے ہی سال بنارس، پنجاب
اور کابل تک کے طلبا رجوع ہو گئے۔ اکیس طالب علموں کی جمعیت پر مدرسہ کا اجرا ہوا تھا۔ اور اخیر سال اور وقت امتحان تک
طلبا کا اجتماع ہو گیا۔ اور اب وہی مدرسہ عربی دارالعلوم دیوبند کی شکل میں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا غیر سرکاری دارالعلوم
جہاں سے کتاب و سنت اور علوم اسلامیہ کے چشمے جاری و ساری ہیں۔ طلبہ کی کثرت ہوئی تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ابن
الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب دیوبند تشریف لے آئے۔ آپ اجمیر میں سو روپیہ مشاہرہ پر ملازم رہ چکے تھے۔ پھر بریلی میں
انسپکٹر مدارس ہو گئے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم کے ارشاد پر اس خدمت کو ایک اسلامی خدمت سمجھ کر اواخر ۱۲۸۳ھ میں بیس
ماہوار کے قلیل مشاہرہ پر کام کرنے لگ گئے۔

پہلا اُستاد و شاگرد

مولانا شیخ الہند دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ گویا پہلا استاد بھی "محمود" اور پہلا شاگرد بھی
"محمود"۔ ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنز۔ میبذی۔ مختصر معانی کا امتحان دیا۔ آئندہ سال مشکوٰۃ ہدایہ۔ مقامات
پڑھیں۔ ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نے اس
دوران میں میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع میں تصحیح کا کام بھی کیا اور اسی طرح کبھی دہلی میں۔ اور دیوبند بھی تشریف لا کر دارالعلوم دیکھ
بھال کرتے۔ مولانا شیخ الہند نے ان سب مقامات میں حضرت نانوتوی کے ساتھ رہ کر سفر حضر میں سلسلہ درس جاری رکھا۔

مولانا نانوتوی کی خدمت میں سبق پڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ عبارت میں غلطی کرنا یا ترجمہ سمجھنے کے خیال سے ٹھہرنا گناہ
کبیرہ تھا۔ اس قسم کے امور اور بے موقع سوال سے مولانا مکدر ہو جایا کرتے تھے۔ اور سبق کا لطف ہی جاتا رہتا۔ جو شخص ذہن
مستعد ہوتا اور سبق کو مطالع میں خوب ذہن نشین کر کے جاتا وہ مولانا کے مضامین سمجھنے کی امید کر سکتا تھا۔ اچھے اچھے ذی استعداد
مولوی اس شرط پر شریک کئے جاتے تھے کہ صرف سنتے رہیں عبارت پڑھنے یا کچھ دریافت کرنے کا حق نہ ہوگا۔ لوگ خوشی سے قبول
کرتے اور حاضر ہوتے۔ بہت عالی دماغ اور ذکی لوگ ہی پڑھتے اور سوال کرنے کی جرأت کرتے تھے۔

مولانا کا طرز ہی جدا تھا حدیث ہو یا منطق۔ کلام ہو یا معانی، ہر فن کے متعلق عجیب و غریب تحقیقات بیان فرماتے تھے جس سے ہر
ہند کی انتہائی تحقیق اور اختلافات کی تطبیق بدیہی اور مشاہد طور پر ہو جاتی تھی اور اس قسم کے عالی مضامین بیان فرماتے کہ نہ کسی
خیال میں آئے تھے نہ سننے میں۔ مولانا کی جو دو چار تصنیفات ہیں وہ بھی اسی شان کی ہیں۔

مولانا شیخ الہند کا مدت سے ان کے ساتھ رہ کر ان سے استفادہ کرنا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ان کے استعداد و صلاحیت
ٹی کے معترف تھے لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ یہ ذہین طالب علم مجھ سے جو کچھ حاصل کر سکتا ہے کر لے۔ مولانا شیخ الہند قدرتی طور پر
ے سلیم، ذہن رسا اور قوی حافظہ کے مالک تھے۔ یہ سب وجوہ مزید شفقت کا باعث تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا نانوتوی اپنی
رت اور نورِ فراست سے سمجھ رہے تھے کہ یہ شخص اپنے زمانہ کا مجاہد بنکر اور ملتِ اسلامیہ کا مایۂ ناز فرزند ہوگا لہٰذا اس کی جتنی بہتر
ے بہتر تربیت ہوسکے کی جائے۔

رس دارالعلوم

مولانا شیخ الہند ۱۲۸۹ھ میں صحاح ستہ اور دیگر علوم و فنون کی اعلیٰ کتابیں مولانا کی خدمت میں ختم فرما کر بطور معین
مدرس دارالعلوم میں پڑھانے لگے۔ ۱۹؍ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ کے جلسہ دستار بندی اور اہلِ اسلام
مجمع عام میں اسوقت کے اکابر شیوخ و علماء کی موجودگی میں مولانا شیخ الہندؒ کی دستار بندی ہوئی۔ اگرچہ مولانا اپنی تعلیم کے آخری
لوں ہی میں بطور معین مدرس کام کرنے لگ گئے تھے اور فراغ و تحصیل تعلیم کے بعد باقاعدہ مدرسین کی فہرست میں شمار ہونے لگے
تاہم ۱۲۹۲ھ میں طلبہ کی کثرت کی وجہ سے ایک مدرس چہارم جو تنخواہ دار ہو کی ضرورت محسوس فرمائی۔ دوسرے کئی ایک ذہین و فطین
العلوم کے فارغ حضرات بھی موجود تھے اور اپنی تعلیم کے زمانہ میں وہ بعض حیثیتوں سے مولانا سے فائق نظر آتے تھے۔ لیکن اس زمانہ کے مقدس
م اور سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نے فراست صادقہ سے نظر انتخاب مولانا شیخ الہند پر پڑی۔ اور
نا کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب سے ذکر کیا۔ آپ کے والد ماجد کو اللہ تعالیٰ نے وسعت اموال عطا فرمائی تھی اور یوں بھی
یت غیور و شریف تھے۔ اس لئے ان کو گوارا نہ ہوا کہ ان کا لڑکا مدرسہ سے معاوضہ لے کر کام کرے۔ لیکن دوسرے بزرگان مدرسہ
پنے بہت سے مصالح پیشِ نظر تھے۔ لہٰذا ان سب بزرگوں کے ادب کو ملحوظ رکھ کر خاموش رہے اور مولانا شیخ الہند ۱۲۹۲ھ میں
ماہرہ پندرہ روپیہ ماہوار مدرس چہارم مقرر ہوئے۔

مولانا اگرچہ درجہ چہارم کے مدرس تھے اور خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ "ابتدا میں قطبی اور قدوری پڑھا لینے کو بھی میں غنیمت سمجھتا
ا" لیکن طلبہ پہلے ہی سے آپ سے بڑی کتابیں پڑھ رہے تھے اور اب رفتہ رفتہ آپ کی علمی استعداد اور خداداد ذہانت ظاہر ہونے لگی اور
ڑی کتابیں بھی حسب موقعہ آپ کے زیر درس آنے لگیں۔ ۱۲۹۳ھ ہی میں آپ صحاح ستہ کی نہایت مشکل اور اہم کتاب ترمذی شریف،
شکوٰۃ شریف اور ہدایہ وغیرہ جیسی نو کتابوں کے اسباق روزانہ بے تکلف پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں تو صحاح ستہ کی دوسری
کتب کے علاوہ سب سے بڑی اور افضل کتاب اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف بھی آپ نے پڑھائی۔

بیت اللہ

۱۲۹۴ھ میں بزرگان ہندوستان نے بیت اللہ کا قصد کیا اور اس قافلے میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ حضرت مولانا
رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا رفیع الدین مہتمم دارالعلوم۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ اور دیگر بہت سے منتخب روزگار
لحاء و علماء شامل تھے۔ مولانا شیخ الہندؒ بھی زیارت حرمین شریفین نیز ان اکابر علماء کی معیت میں بڑی سعادت سمجھتے ہوئے ساتھ شامل

ہو گئے۔ ہندوستان سے ایسے نیک اور بلند پایہ علماء کا قافلہ حج کے لئے روانہ ہوا ہو اس کی نظیر نہ سابق میں ملتی ہے اور نہ آئندہ امید ہے جس سٹیشن پر گاڑی رکتی شوقِ زیارت میں سینکڑوں بندگانِ خدا مصافحہ اور دست بوسی کے لئے موجود ہوتے۔

بمبئی میں بیس روز جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔ پھر سب قافلہ جہاز میں سوار ہو کر تیرہ دن میں جدہ اور وہاں سے اونٹوں پر مکہ معظمہ پہنچ گیا مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ ان دنوں مکہ معظمہ میں تھے۔ طواف و زیارت کے بعد سارا قافلہ ان کی زیارت کو حاضر ہوا اور بعد فراغتِ حج مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور بیس دن وہاں قیام فرمایا۔

شاہ عبدالغنی دہلوی سے اجازت حدیث اور حاجی امداد اللہ سے شرفِ بیعت

استاذ الاساتذہ شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی مدینہ منورہ تھے۔ سب حضرات ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جناب ممدوح بھی کمال شفقت اور گوناگوں عنایات فرماتے اور باوجود انتہائی کم گوئی کے باخلاق و عنایات ہر ایک سے حسب درجات و مراتب گفت گو فرماتے۔ ہر عالم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اگر کسی مشہور محدث یا استادِ حدیث سے ملاقات ہو تو اس سے اجازت لیجائے اور پھر جن بزرگوں سے واسطے کم آتے ہوں ان سے اجازت لینے کو ہر کوئی سعادت سمجھتا ہے مگر مولانا شیخ الہندؒ کا استاد کا کمال ادب ملاحظہ کیجئے کہ مولانا نانوتوی رح کی موجودگی میں شاہ صاحب سے اجازت و سندِ حدیث لینا خلاف نیاز مندی سمجھا۔ لیکن واپسی کے قریب جب حضرت استاذ ہی نے تحریک فرمائی تو حضرت شاہ صاحب نے بکمال بشاشت مولانا شیخ الہند کو سندِ حدیث عطا فرمائی۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر ایک ماہ قیام ہوا تو حضرت نانوتوی کی استدعا خفیہ پر شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ رح نے نہ صرف مولانا شیخ الہند کو شرف بیعت عطا فرمایا بلکہ خلافت و اجازت بیعت سے بھی ممتاز کیا اور بعد میں تحریری اجازت نامہ ہندوستان روانہ

مراجعت وطن

بعض رفقاء کو مصارف کی دشواری ہونے لگی تو حضرت حاجی صاحب رح کے اشارہ پر مجبوراً یہ مقدس قافلہ مراجعت فرمائے ہندوستان ہوا۔ جدہ پہنچ کر کلفت انتظار سے بچنے کے لئے جلد ایک ایسے جہاز میں سوار ہو گئے جس میں مسافر کثیر اور جگہ تنگ تھی۔ باوجود باہمی مروت و ایثار کے سب کو نہایت دقت اور تکلیف پیش آئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم کو مقامات مقدسہ اور اپنے بزرگوں کی جدائی کی کلفت اور خانہ کعبہ کے ادب و احترام کی وجہ سے دور تک پاپیادہ چلنے کی تکلیف سے خاصی لگان تھی۔ جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان بدہ (حدہ) پہنچکر بخار ہوگیا۔ جہاز کی تنگی اور کشمکش سے اس پر مزید اضافہ ہوا۔ سوار ہونے کے بیس دن بعد صفراء کے دورہ سے بخار تیز ہوگیا۔ رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ ساتھی مایوس ہو گئے۔ جہاز میں وبا بھی تھی۔ دو تین آدمی روزانہ فوت ہو جاتے تھے۔ اس لئے اور زیادہ خطرہ تھا۔ نہ دوا تھی نہ علاج نہ جائے راحت نہ سکون۔ مولانا شیخ الہند نے خدمتگزاری میں دن رات ایک کر دیا اور استاد کا خوب خوب حقِ خدمت ادا کیا۔ تمام تمام رات بیدار رہے۔ عدن پہنچے تو بھاگ دوڑ کر کہیں سے کونین۔ گلاب اور لیموں وغیرہ تلاش کر کے لائے اور حضرت مولانا کو قدرے افاقہ ہونے پر قافلہ کی جان میں جان آئی۔ چودھویں روز جہاز بمبئی پہنچا۔ دو ایک روز وہاں قیام کر کے مولانا شیخ الہند اپنے استاد اور مربی و مرشد کو ان کے قصبہ نانوتہ میں پہنچا کر ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں دیوبند واپس آئے۔

شیخ الہندؒ کی غیر حاضری میں تقریباً چھ ماہ مولانا عبدالعلی ان کی جگہ کام کرتے رہے۔ واپسی پر آپ بدستور سابق درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت نانوتوی نے بھی دیوبند قیام فرما لیا اس لئے استفادہ کمالات استاذ کے لئے شیخ الہند کے مشاغل

بیہ میں دلچسپی اور زیادہ ہوگئی۔ نو نو دس دس اسباق روزانہ پڑھاتے۔ اپنی مشہور کتاب "ایضاح الادلہ" تحریر فرماتے اور حضرت استاد
ستاکر خوشنودی حاصل کرتے اور شب کا بہت سا حصہ علاوہ کتب بینی کے عبادت درود و وظائف میں گذارتے۔ انہی دنوں حکیم الامت
لانا اشرف علی تھانوی تحصیلِ علم کے لیئے دیوبند تشریف لائے۔ اور منجملہ اور اسباق کے ملاحسن اور مختصر المعانی حضرت شیخ سے پڑھیں۔
حضرت شیخ الہند اپنے ان مشاغل حسنہ میں جن کو وہ ذخیرۂ آخرت سمجھتے تھے نہایت محویت کے ساتھ مشغول تھے کہ ناگاہ ۱۲۹۷ھ میں
قعہ ہائلہ اور صدمہ جانفزا حضرت نانوتوی کی وفات کا پیش آیا۔ حضرت والپسی سفر حج میں مریض ہو کر صحت یاب ہو گئے تھے لیکن کھانسی کی
کایت رہ گئی تھی۔ اور کبھی کبھی تنفس کا دورہ ہو جاتا تھا۔ ۱۲۹۷ھ میں مرض میں زیادتی ہو گئی اور بہت ضعیف ہو گئے۔ پنجشنبہ (۴ جمادی الاول
۱۲۹ھ) کو انتقال فرما گئے۔ اس کے تیسرے دن بعد سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری نے بھی وفات پائی
ر صرف ایک دن کے فاصلہ سے دنیا اپنے وقت کے دو بہترین محدثوں سے خالی ہو گئی اور طبقہ صلحاء اور اہلِ علم پر غم پر غم اور صدمہ پر
دمہ پڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

لتِ استاد کا اثر

مخدوم استاد کی وفات کے حادثہ نے حضرت شیخ الہند کو بالکل پژمردہ کر دیا۔ تعلیم و تعلم سے دل سرد ہو گیا۔ رنج و غم تو تھا ہی، اس کے ساتھ یہ خیال بھی دل نشین ہو گیا تھا جس کو کبھی خود ہی اظہار فرمایا کرتے تھے کہ "ہمارے مشاغل
ی اور درس تدریس صرف اس لیئے تھے کہ کچھ استعداد و قابلیت پیدا ہو جائے۔ اور حضرت کے مضامین و ارشادات کو سمجھنے لگیں اب،
ضرت ہی رخصت ہو گئے اس قیل و قال اور بے نتیجہ اشتغال سے کیا فائدہ۔ فکر معاش نے ایسا ہی تنگ کیا تو گھاس کھود کر بسر کر لیں گے
نانچہ آپ نے مدرسہ آنا بھی چھوڑ دیا اور اپنے مکان میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ حضرت اس عزم پر مضبوطی سے قائم تھے مگر حق تعالیٰ نے آپکے
یعہ سے احادیث نبویہ کی نشر و اشاعت اور علوم دینیہ کی خدمت اور فیوض قاسمیہ کی افادت مقدر فرمائی تھی۔ حضرت مولانا رفیع الدین
احب مہتمم مدرسہ (قدس سرہ) کو خود بھی حضرت نانوتوی کی وفات کا صدمہ کچھ کم نہ تھا کیونکہ آپ سے زیادہ مولانا کا قدر شناس کون
و سکتا ہے لیکن حوادث و نوازل کے وقت اہلِ عزم و ثبات خود بھی سنبھلتے ہیں اور دوسروں کو سنبھالتے ہیں اور حق تعالیٰ کے علم میں جو امر
قدر ہوتا ہے باوجود ظاہری ناسماعدات کے اس کے لیئے ایسے ہی اسباب پیدا کر دیتا ہے۔

مہتمم صاحب نے ایک، دو مرتبہ سمجھایا اور تیسری مرتبہ اپنے ساتھ مدرسہ لے آئے۔ زاویہ نشینی اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں جو کچھ فرق ہے
ہ حضرت بھی خوب سمجھے ہوئے تھے مگر دوسری حالت کا غلبہ تفرید و تجرد کو ترجیح دیتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہ کے ارشاد نے
ہام ربانی اور لطیفہ غیبی کا کام دیا۔ بزرگوں کی عظمت اور ان کے اوامر کی وقعت حضرت کے قلب میں ہمیشہ بدرجہ کامل رہتی۔ مولانا ممدوح
کے ارشاد کی تعمیل کی اور چشم گریاں درس جاری فرما دیا۔

حضرت نانوتوی کے مخصوص تلامذہ میں سے دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن امروہوی رح بھی ترکِ تدریس میں حضرت مولانا کے ہم
خیال اور شریکِ حال تھے۔ ایک ماہ تک مغموم و محزون اور شغل تعلیم سے کنارہ کش رہے لیکن اہلِ دیوبند کے اصرار خصوصاً حضرت مولانا
محمد یعقوب صاحب کے ارشاد سے مجبور ہو کر بدستور سابق مراد آباد کی مسجد شاہی کے مدرسہ کی مدرسی میں مشغول ہو گئے۔

ربیع الاول ۱۳۰۲ھ دار العلوم کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول کی وفات کا سخت صدمہ پیش آیا۔ مولانا ممدوح
خود بھی ایک نمونۂ سلف، جامع العلوم، جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے۔ اور حضرت نانوتوی کے ہم عصر اور جانشین سمجھے جاتے۔

مدرسہ کے سرپرست اگرچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قرار پائے تھے مگر چونکہ آپ کا قیام اپنے وطن گنگوہ میں تھا اس لئے ہر وقت پر معاملہ میں شریکِ حال نہ رہ سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی ذات بابرکات سے کلی و جزوی ہر قسم کے امور میں نہایت قوی اعانت پہنچتی تھی اور ہر قسم کے فیوض و برکات سے متمتع ہوتا رہتا تھا۔ اور یہ کہ تمام علماء عصر مولانا کے والد ماجد مولانا مملوک علی صاحب کے خوشہ چین اور شاگرد تھے۔ ایسے قوی الاثر جامع الصّفات عالم کے سایہ سے محروم ہو جانا دارالعلوم کے لئے کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ لیکن سوائے صبر و تسلیم چارہ کار کچھ نہ تھا۔

اس حادثہ کے بعد مولانا سید احمد صاحب دہلوی جو فنون ریاضیہ میں خصوصیّت کے ساتھ امام کہلانے کے مستحق تھے بمشاہرہ چالیس ۴۰ روپے مدرس اول مقرر ہوئے۔ مولانا مُلّا محمود صاحب دیوبندی پینتیس ۳۵ روپے مدرس دوم اور حضرت مولانا تیس ۳۰ روپے مشاہرہ پر مدرس سوم اور مولانا عبد العلی صاحب مدرّس چہارم۔

اس تغیر سے تقریباً دو ہی سال کے بعد دارالعلوم کے سب سے قدیم اور بافیض عالم مُلّا محمود صاحب کی وفات ہو گئی۔ اور حضرت مولانا انہی کے مشاہرہ پر مدرس دوم ہو گئے۔ ترقی مدارج اور اضافۂ مشاہرہ سے حضرت مولانا کے کارِ تعلیم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا حضرت بخلوص وللّٰہیت تمام علوم کی کتابیں پڑھا رہے تھے اور طلبہ نہایت شوق اور گرویدگی کے ساتھ دن رات میں جب بھی موقع ملتا تھا حضرت کے فیوض حاصل کرتے رہتے تھے۔

دارالعلوم کے صدر مدرس

۱۳۰۵ھ میں مولانا سید احمد صاحب مدرّس اوّل اپنی ضروریات کے خیال اور بعض مصالح سے بڑی تنخواہ پر بھوپال تشریف لے گئے۔ تعلیم تو حضرت پہلے ہی سے بڑی جماعتوں کو دے رہے تھے اور جیسا کہ سابق میں گذرا اب سے بارہ سال پہلے ۱۲۹۲ھ و ۱۲۹۵ھ سے کتاب صحاح و بخاری شریف و دیگر علوم کی انتہائی درسیات پڑھا رہے تھے اب آپ مولانا سید احمد صاحب کے مشاہرہ پر باتفاق آراء اکابر و اصاغر مدرس اوّل نامزد ہوئے اس وقت سے آخر عمر یعنی ۱۳۳۹ھ تک تینتیس سال حضرت مولانا صدر مدرس رہے اور آپ کی ذاتِ بابرکات سے مدرسہ کو جو ترقی ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مولانا کو کبھی ترتیب درجات اور مقدار مشاہرات پر نظر نہیں ہوئی اور جیسا کہ ان کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے وہ ہمیشہ دارالعلوم کی خدمت کو خدائے تعالیٰ کا کام اور دینی فرض سمجھ کر بجالاتے رہے۔ مشاہرہ قبول فرماتے تھے مگر بضرورت و کراہت اگر آپ متاع دنیا کی طلب فرماتے تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرت کو سر آنکھوں پر بٹھاتے اور صالح روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت میں پیش کرتے لیکن آپ نے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے استاد (قدس سرہ) کے لگائے ہوئے باغ دارالعلوم دیوبند کی سرسبزی و شادابی کو مطمح نظر بنائے رکھا اور اسی دینی خدمت میں عمر تمام کر دی۔ دارالعلوم کے مخالفوں نے بدنیتی سے موقع بموقع دل میں رنجش ڈال کر علیحدگی پر آمادہ کرنا چاہا مگر ناکام رہے۔ پیر جی عبد الرزاق صاحب گنگوہی مدارس اسلامیہ دہلی نے محبت اور حسن نیت سے کوئی تحریک کا موقعہ نہ چھوڑا مگر دل میں حسرت ہی لئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ حضرت دہلی قیام فرما کر فیوض جاری فرمائیں۔ اور بجا طور پر الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان کی نیابت کا حق دہلی میں رہ کر ادا فرمائیں۔

استقامت، استقلال اور محنت و ریاضت

۱۳۱۲ھ میں جب بوجہ گرانی دیگر مدرّسین کے مشاہروں میں اضافہ ہوا تو بحکم حضرت گنگوہی قدس سرہ آپ کا مشاہرہ پچاس روپے ہو گیا۔ آپ نے خاموشی سے قبول فرما لیا۔ دو استاد شفیق حضرت نانوتوی رحؒ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں ——— "محمود حسن کب تک مدرسہ سے مشاہرہ لیتے رہو گے" — د

(پ)ر تبہ پورا عزم مشاہرہ چھوڑ دینے کا فرمایا لیکن حضرت گنگوہی رح کے ادب سے مجبور تھے۔ اجازت نہ دی بلکہ ہنس کر فرمایا کہ ——— "نہیں (ا)ن کو کہنے دو، ہرگز نہ چھوڑو" ——— مگر جب حضرت مولانا ممدوح کی وفات ہوگئی اور ماتحت مدرسین کے اضافہ کے ساتھ آپ کے (چ)ھتّر روپے مقرر ہوئے تو آپ نے اضافہ بالکل قبول ہی نہ فرمایا اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہرہ بالکل بند کر دیا پھر بھی اسی پابندی اور دلسوزی سے درس دیتے رہے۔

حضرات منتظمین کی جان فشانی اور تدابیر حسنہ اور مدافعت اعداء کو بھول جانا کفرانِ نعمت ہے۔ اور مناسب مواقع پر اسکا مفصّل (ا)ظہار واجب و لازم مگر اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت مولانا کی معنوی برکت کے ساتھ ظاہری مستعدی و تندہی اور دِل سوزی نے بھی (م)درسہ کے لئے بارانِ رحمت کا کام کیا اور مدرسہ دیوبند کو ایک عظیم الشّان دار العلوم کی حیثیت تک پہنچا دیا۔ صبح کی نماز ادا فرما کر درس کے لئے آجاتے۔ کبھی پیشاب یا وضو کے لئے درمیان میں اُٹھتے تو مضائقہ نہیں ورنہ متصل اور مسلسل درس دیتے ہوئے گیارہ بارہ بج (ج)اتے تھے۔ اور ظہر کے بعد پھر یہی مشغلہ موجود تھا ——— عشاء کے بعد بہت دیر تک کتب بینی کرنا اور پھر کچھ دیر آرام کر کے اپنے (م)ولیٰ کی عبادت اور بطرز مسنون ادائے تہجّد میں مشغول ہونا اور بعد تہجّد کے طلبہ کی ایک جماعت کو سبق پڑھانا اور نماز فجر کے بعد عصر تک تعلیم (م)یں مصروف رہنا آپ کا ہمیشہ معمول رہا۔

حضرت نے ۱۲۸۹ھ سے بحیثیت معین المدرّسین دار العلوم میں کارِ تعلیم شروع فرمایا تھا۔ اور ۱۲۹۲ھ میں آپ باقاعدہ مدرس (ہ)و گئے تھے۔ اس لحاظ سے چوالیس سال کامل خدمت تعلیم میں بسر فرمائے اور ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۲۳ھ تک نواڑتیس سال کامل علی الاتصال (ح)ضرت نے علم دین کی اشاعت فرمائی۔ اِس درمیان میں حضرت نے سوائے معمولی چند روزہ سفروں کے نہ کوئی طویل سفر فرمایا نہ اور کوئی ایسا (ش)غل پیش آیا نہ کوئی مرض لاحق ہوا جس سے کارِ تعلیم میں دو چار ماہ کا طویل حرج واقع ہوتا۔ یہ نصف صدی (تقریباً) کا زمانہ کچھ کم نہیں ہے۔ ہندوستان (م)یں کیا ان آخری قرنوں میں دنیا میں ایسے بہت کم علماء شمار ہو سکتے ہیں جنہوں نے اس قدر طویل زمانہ افادۂ تلامذہ اور علومِ اسلامیہ کی خدمات (م)یں گذارا ہو۔

حضرت سے چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ علمی کام لینا تھا۔ اس لئے ظاہری مختصر قد و قامت اور ضعیف بدن کے ساتھ اندرونی قویٰ نہایت (م)ضبوط بنائے تھے باوجود خدمتِ تعلیم میں اس قدر محنت کرنے کے اور باوصف شب بیداری اور کثرت ذکر اللہ کے نہ ضعفِ دماغ کی (ش)کایت رہتی تھی نہ ضعفِ بصر کا خلل نہ دواؤں کے محتاج تھے نہ مقویات کے خواہاں معمولی سادہ غذا استعمال فرماتے تھے اور وہ بھی بہت قلیل۔

اِس عرصہ میں تمام ہندوستان میں آپ کے علوم و کمال خصوصاً فنِ حدیث کے تبحر اور مہارت کی دنیا میں شہرت ہوگئی تھی۔ اور جا بجا آپ (ک)ے فیوض پھیل گئے تھے۔ ہر نواح میں آپ کے شاگرد یا شاگردوں سے فیض یافتہ عالم باعث اشاعتِ علوم و موجب ہدایتِ خلق اللہ بن (گ)ئے۔ دار العلوم میں دو قدیم بزرگوں کے سوا تمام مدرس آپ کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں۔ اور ہندوستان کی کوئی قابلِ اعتماد علمی درسگاہ (ا)یسی نظر نہیں آتی جہاں آپ کے بلا واسطہ یا بالواسطہ شاگرد مسند درس پر متمکّن نہ ہوں۔

کابل۔ قندھار۔ بلخ بخارا، مکہ معظمہ، مدینہ منوّرہ اور یمن تک کے لوگ آپ کے علوم و فیوض سے مالا مال ہو کر گئے۔ مولانا محمد اسحاق (ا)مرتسری ایک باخدا عالم نمونۂ اتقیائے سلف نے مدینہ منورہ جاکر درس جاری فرمایا۔ ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مولانا (م)حمد صدیق احمد صاحب اسی مقدس دار الہجرت میں مخصوص طور سے اپنے مکان اور مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں اشاعتِ علم کرنے

لگے اور ان کے چھوٹے بھائی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا حلقہ درس خاص مسجد نبوی میں سید العرب والعجم کے روضہ منورہ ومطہرہ کے سامنے ایسی عظمت وبرکت سے جاری ہوا کہ بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ کے حلقے مختصر رہ گئے اور شرفائے مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولاد مولانا موصوف کی خدمت میں زانوے ادب تہ کرنے لگی۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ حضرت نے تمام عمر چٹائی پر بیٹھ کر درس دیا۔ اخیر میں مرض بواسیر کا عارضہ ہوا تو بعض مخلصین نے کمانی دار گدّہ بنوا کر رکھ دیا تھا۔ اس پر بضرورت بیٹھتے تھے مگر کسی قدر گرانی وکراہت محسوس کرکے۔

تبحر علمی اور طریق درس

حضرت موصوف تفسیر، حدیث۔ اصول، فقہ، منطق، معانی کی کتب محنت اور شوق سے بے تکلف پڑھاتے تھے اور ابتدا میں تو بہت ہی زیادہ مشغولیت ومشقت برداشت فرماتے تھے مگر آخر میں بھی ۱۳۲۰ھ تک پانچ چھ گھنٹہ روزانہ درس دیتے تھے اس زمانہ کے بعد کچھ ضعف وامراض کے اور نیز اس لئے کہ حضرت کے ممتاز تلامذہ علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مدرسہ میں موجود تھے آپ حسب ضرورت روزانہ دو یا تین گھنٹے درس دیتے تھے اور ترمذی شریف وبخاری شریف تقریباً ساڑھے نو ماہ میں بہ طمانیت تمام کرا دیتے تھے۔

حضرت کا حلقہ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا دوسرے مدارس کے فراغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالب علم نہایت مؤدب طریق سے حاضر خدمت رہتے اور حضرت کمال عظمت ووقار سے درس دیتے۔ ادھر ادھر کی فضول باتوں کا ذکر تک نہ تھا۔ دوسروں کی تحقیر اپنی تعریف کا نام ونشان نہ تھا۔ ہنسی مذاق اور تفریح طبع کے جملے یا ذاتی حالات کا بیان بالکل مفقود۔ خطاب بالکل عام ہوتا تھا۔ کسی کی خصوصیت نہ تھی۔ کم سواد طالب علم قرأت کرنے سے خود ڈرتے تھے اور بے موقع سوال کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ مستعد طالب علم بار بار اور طرح طرح سے اپنے شکوک وشبہات پیش کرتے تھے۔ اس طرح کہ حلقہ درس بالکل مجلسِ مناظرہ بن جاتی تھی۔ کبھی حضرت کے الزامی جواب طالب علم کو ساکت کر دیتے تھے اور کبھی جامع مانع تقریر "شفاءٌ لما فی الصدور" کا کام دیتی تھی۔ الزامی جواب میں ملکہ تام تھا دو چار دفعہ اسی طرح ٹالتے رہے۔ بہت ردّ وبدل کے بعد تحقیق شروع فرماتے اور اس خوبی اور قوتِ استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرح صدر ہو جاتا۔

بہت سے ذی استعداد ذہین وفطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی استعداد سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اپنے شکوک وشبہات کے کافی شافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے معانی ومضامین عالیہ سن کر سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے۔

حلقہ درس دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے حلقہ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن وحدیث حضرت کو ازبر تھے اور ائمہ اربعہ کے مذاہب زبان پر۔ اور صحابہ وتابعین، فقہاء ومجتہدین کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں نہ منہ میں کف آتا تھا نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو ادق اور بھدّی بناتے تھے نہایت سبک اور سہل الفاظ میں با محاورہ اردو میں اس روانی اور تسلسل سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دریا امنڈ رہا ہے۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے اب بھی کئی دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ وہی منحنی جسم اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان ضعیف الجثہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ اور بارہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی لیکن سننے والے جانتے ہیں کہ جب صدر درسگاہ "نودرہ" میں تقریر فرماتے تو (باوجود درجہ قرآن مجید ومکتب فارسی کے بچوں کی بلند آوازی کے) مدرسہ کے دروازہ تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی۔

لہجہ میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہ تھی چہرہ بنا لینا یا آنسو بھر لانا حضرت کا کام نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا۔ بات دلنشیں ہو جاتی تھی اور سننے والا یہی سمجھ کر اٹھتا تھا کہ جو فرمار ہے ہیں حق ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ، جو دور ہی دور سے دشمنوں کے افترا کئے ہوئے عقائد فاسدہ سن کر بدعقیدہ ہو جاتے تھے، اپنی اولاد و عزیزوں کے دیوبند آکر تحصیل علم کرنے میں اس لئے مانع نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی اسی رنگ میں رنگے جائیں گے۔

استاد رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق و دقائق نقل فرماتے اور اپنی تحقیقات عجیبہ اور مضامین عالیہ سناتے مگر مفسرین و محدثین شراح و مصنفین کا ادب اس درجہ ملحوظ رکھتے تھے کہ کہیں شائبۂ تنقیص بھی نہ آنے پاتا۔

مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے لیکن جب امام ابوحنیفہ رح کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح چہرہ پر بشاشت، تقریر میں روانی، لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا۔ دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے تقریر رکتی ہی نہ تھی۔ اور اس خوبی سے مذہب امام اعظم رح کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف المزاج لوٹ جاتے تھے دُور دُور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدعا بیان ثابت فرماتے کہ بات دل میں اُتر جاتی تھی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے۔

ائمہ اسلام کا ادب و احترام اور ان کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک جزو لاینفک ہو گیا تھا خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ "مذاہب مجتہدین حق ہیں اور سب مستدل بالکتاب والسنۃ۔ ان کی تنقیص موجب بدبختی ہے اور سوء ادب باعث خسران"۔ بے شک حضرت رحمۃ اللہ علیہ مَنْ عَمِلَ بِمَا یَعْلَمُ اٰتَاہُ اللّٰہُ عِلْمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ کے مصداق اور اس شعر کے محمل تھے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

اس کے ساتھ ہی آپ نے نہایت محنت شاقہ اٹھا کر اور بقول شخصے دود چراغ کھا کر کتب بینی اور مطالعہ کا نہایت زیادہ اہتمام فرمایا تھا۔ خصوصاً شروح احادیث بکمال غور و فہم مطالعہ فرمائی اور بعض کو کئی مرتبہ دیکھنے کی نوبت آئی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ذرا "عینی" اٹھا لاؤ۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت بخاری کی شرح یا ہدایہ کی۔ فرمایا اس کو کئی مرتبہ دیکھ چکا۔ ہدایہ کی شرح لے آؤ۔

لیکن حضرت صرف شُرّاح کی تعلیم کے احاطہ میں محصُور نہ تھے بلکہ وہ مضامین عجیب انہیں شروح و حواشی کے مطالعہ سے آپ کے ذہن صفی میں آتے تھے جو دیدہ نہ شنید۔ حضرت نے شروح احادیث کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے اور ہمارے فقہا و شراح کے مجمل دلائل کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ باید و شاید۔ محدثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں سے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کیساتھ خاص تعلق تھا۔

امام بخاری کے علوم اللہ تعالیٰ نے آپ پر کھول دیئے تھے یہاں تک کہ نظر بندی مالٹا کی یکسوئی میں آپ نے خود بخود اس داعیۂ الٰہی سے مجبور ہو کر تراجم بخاری کے متعلق تحریرات لکھنی شروع فرمائی تھیں۔ بخاری کے متعلق کوئی شخص سوال کرتا تو خوش ہو جاتے اور بیان فرمانا شروع کر دیتے۔

امام مسلم رح نے اپنی کتاب کے خطبہ میں امام بخاری پر تعریض کر کے جو گرفت کی ہے اس پر فرمایا کرتے تھے کہ جب ملاقات ہوئی تو بخاری رح کے خادم و عقیدت مند ہو گئے کاش اسی طرح امام ابوحنیفہ رح اور امام بخاری رح کی ملاقات ہو جاتی تو امام بخاری اپنے تمام اعتراضات واپس لے لیتے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت کو شرح صدر کر دیا تھا اسی کا اثر طلبہ پر تھا۔ بمقتضائے آنچہ از دل خیزد در دل ریزد۔ وہ دقیق فرق، وہ لطائف و رموز سناتے کہ طالب علم بے ساختہ سبحان اللہ کہہ اٹھتے اگر امام صاحب کے مناقب بیان فرمانے لگتے تو ایک

از حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح

شیخ الہند رح کی سیاسی خدمات

آئندہ مضمون حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کی خود نوشت سوانح نقشِ حیات ج ۲ سے ماخوذ ہے۔ ہم نے بعض جگہ مضمون کو مختصر کر دیا ہے (ارشد)

تحریکِ انقلاب عرف ریشمی خطوط کی سازش

ہندوستان جب کہ سولہویں اور سترہویں صدی میں آسمانِ سیاست پر آفتابِ درخشاں بن کر چمک رہا تھا اسی زمانہ میں سامان کسوف بنکر منحوس یورپین قومیں پہلے پرتگیز پھر ان کی دیکھا دیکھی انگریز، فرنچ، ڈچ، جرمن وغیرہ ہندوستان آئیں۔ یہاں کے بادشاہوں اور حکام نے مہمان نوازی کے فرائض حسب عادت سلاطین ہند انجام دئیے۔ ان کو نہ صرف داخلہ کی اجازت دی بلکہ سکونت، تجارت اور حقوق شہریت وغیرہ بلا رکاوٹ دئے گئے۔ انگریز بھی مثل دیگر اقوام اس خوانِ نعمت سے فیض یاب ہوئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے انگریز تاجر اطراف و جوانبِ ہند میں پھیل گئے ان کو اپنے یورپین ہم وطن اقوام سے رقیبانہ کشمکشیں بھی پیش آئیں۔ بالآخر ۱۷۰۰ء میں ان کے تقریباً ایک سو تاجروں کی منظم جماعت بنام ایسٹ انڈیا کمپنی بن گئی جس نے تجارتی کاروبار اجتماعی قوت سے جاری کیا اور غدارانہ بلکہ ظالمانہ طریقہ سے بہت زیادہ کمایا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان کی نیتیں فاسد اور ارادے نہایت خباثت آمیز ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ آف بنگال پر حملہ کر دیا اور اس کے اراکین دولت میں سے میر جعفر اور رائے چند دو وزیروں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو کر ملک گیری اور حکومت شروع کر دی۔ یہ چسکا ان کو ایسا لگا کہ ہر وقت اور ہر آن یہی دھن لگی رہتی تھی۔ بالآخر ۱۸۰۳ء تک تقریباً اکثر ہندوستان میں ان کا مکمل اثر اور پورا اقتدار قائم ہو گیا اور اس قدر جرأت ہو گئی کہ بادشاہ دہلی سے جبراً اپنی حکومت پر دستخط کرا کر ملک میں اعلان کرا دیا کہ ——— "خلقت خدا کی ملک بادشاہ کا حکومت کمپنی بہادر کی" ——— ان حالات کو علماء اسلام دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے آخر کار حکام سلطنت کی غفلت، بے پرواہی، بے وفائی، بزدلی، اربابِ اقتدار کے آس پاس کے نفاق کے مظاہرہ وغیرہ نے مجبور کیا کہ عام مسلمانوں کو متنبہ کیا جائے (اس سے قبل شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے مخصوص انداز میں کتابی صورت میں تحریروں کے ذریعہ حکام و اربابِ اقتدار کو طرح طرح سے انتباہ کر چکے تھے لیکن یہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے) چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے جانشین و فرزند حضرت شاہ عبدالعزیز رح نے آزادی کے متعلق فتویٰ دے دیا اور عام مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد کرانے کے فریضہ کو سمجھایا۔ اس وقت سے مسلمانوں اور خصوصاً اہل علم میں یہ تحریکِ انقلاب شروع ہوئی اور تقریباً بیس برس کے عرصہ میں تمام ہندوستان میں شعلہ جوالہ بن کر یہ تحریک پھیل گئی اور ایک مکمل نظام اور مکمل قوت شروع ہو گئی۔ ۱۸۲۴ء میں مغربی سرحد (سابقہ صوبہ سرحد) میں پہنچ کر اس کی عملی کارروائی جاری ہو گئی جس کی امارت و قیادت حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہما نے کی (اس کی تفصیل دیکھنے کے لئے مولانا غلام رسول رح کی تصنیف سیرت شہید اور مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تصنیف "سیرۃ سید احمد شہید" ملاحظہ فرمائی جائے جن میں اس تحریک

کے متعلق سیر حاصل تفصیل پیش کی گئی ہیں) چھ برس تک کامیابیوں کے ساتھ یہ کاروائی جاری رہی مگر انگریزی چالبازیوں اور آپس کے نفاق اور غداریوں وغیرہ کی وجہ سے ۱۸۳۰ء میں شکست ہوئی اور تحریک تقریباً فیل ہوگئی۔ انگریزوں نے شر کار تحریک پر عرصہ دراز تک انتہائی آزار اور انتقامی تکلیف کے اعمال جاری رکھے اور ملک میں ہندوستانیوں کی عام لوٹ کھسوٹ اور ایذادہی میں وہ انسانیت سوز حرکتیں کیں جن کی وجہ سے انگریزوں سے ملک بھر میں عام ناراضگی پھیل گئی اور ۱۸۵۷ء کا مشترک واقعہ پیش آیا جس میں ہندو اور مسلمان آپس میں ہندوستان کی آزادی کے لئے سربکف ہو گئے تھے۔ بدقسمتی اور نوابوں کی بدعملی کی وجہ سے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان سب برباد کئے گئے مگر مسلمانوں پر بربادی اور مظالم بہت زیادہ ڈھائے گئے اور ہر قسم کے انتہائی مصائب سے ان کو دوچار ہونا پڑا چنانچہ شدید مظالم اور انگریزوں کی فوجی اور اسلحہ جدیدہ کی بے پناہ طاقت کی نمائش کی بنا پر ہندوستانیوں میں جنگ کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی ہمت نہ رہی خوف و ہراس کا دور دورہ ہوگیا اور مظالم شنیعہ کا اندھیرا بہ نسبت سابق کئی گنا زائد پھیلا دیا گیا۔ بالآخر تنگ ہو کر آئینی انقلاب کی تحریک ۱۸۸۵ء میں بصورت کانگریس جاری کی گئی۔ اس کی رفتار بہت دھیمی تھی اور بالمقابل انگریز ہر قسم کے توڑ کی کاروائی کر رہا تھا تاآنکہ بنگال کی تقسیم کی نوبت آگئی۔ لارڈ کرزن نے بنگال میں چاروں طرف افتراق کا جال پھیلا دیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑا کر حکومت برطانیہ نے مقصد خوب حاصل کیا مگر پھر مجبور ہو کر دربار کے موقعہ پر تقسیم کے منسوخ کر دینے کا اعلان کر دیا ۱۹۱۰ء میں یوپی میں ناگری کا اور اس کے کانپور میں مسجد کا اور کلکتہ میں توہین جناب سردار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر فائرنگ کا فتنہ برپا کر دیا۔ ادھر ٹرکی جو عرصہ دراز سے مسلمانوں کا قبلہ توجہ اور خلیفۂ دینی چلا آتا تھا اس کے ساتھ مظالم اور دردناک ناانصافیوں خصوصاً جنگ طرابلس اور بلقان اور تقسیم ممالک اسلامیہ کے واقعات لگاتار پیش آئے جنہوں نے تمام ملک میں عموماً اور مسلمانوں کے قلوب میں خصوصاً بے چینی پیدا کر دی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جن کی گہری نظر واقعات عالم اور بالخصوص ہندوستان اور ٹرکی پر زیادہ مرکوز رہتی تھی ان واقعات سے انتہائی متاثر ہوگئے کہ ان کے لئے آرام و چین تقریباً حرام ہوگیا۔ تاریخ دانی اور گذشتہ واقعات ہند و ممالک اسلامیہ ایشیا و افریقہ اور یورپ وغیرہ پر غائرانہ نظر نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان عمل میں نہ صرف خود نکلیں بلکہ ہندوستان کے ذی اقتدار قائدین کے ساتھ مل کر ایک ایسی تحریک چلائیں جس سے انگریز قوم کے منحوس قدم ہندوستان سے نکل جائیں تاکہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ممالک اسلامیہ و افریقہ وغیرہ سے بھی اس کا اقتدار ختم ہو جائے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی مختصر تاریخ میں ہم ذکر کر کے آئے ہیں کہ مولانا مرحوم کو تعلیم و تربیت کا شرف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہم اللہ اجمعین سے حاصل تھا۔ سالہا سال ان کی خدمت عالیہ انتہائی اخلاص اور نفس بلکہ عاشقانہ جذبات کے ساتھ رہنا ہوا تھا۔ اور ان حضرات کی وہ کامل و مکمل ہستیاں تھیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملی تھانہ بھون وغیرہ پر سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی مبارک آگ سلگتی رہتی تھی اس لئے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے دل میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر ہونا طبعی امر ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت کی فیاضیوں سے ایسا قلب عطا ہوا تھا جس میں انسانی غیرت، اخلاص اور للہیت، وطن اور قومی حمیت، اسلامی ہمدردی وغیرہ کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ دماغ ایسا قوی اور حافظہ عطا کیا گیا جس میں نہ صرف نقلیہ و عقلیہ کے بے شمار مسائل محفوظ رہتے تھے بلکہ واقعات تاریخیہ اور اشعار ادبیہ اردو، فارسی، عربی کے بے شمار خزانے بھی جمع رہتے تھے۔ ذکاوت اور سمجھ ایسی اعلیٰ درجہ کی عطا کی

یہ مشکل سے مشکل مسائل ادنیٰ توجہ سے حل فرما دیتے تھے۔ اس لئے بیرونِ ہند کے مذکورہ بالا واقعات خصوصاً بلقان اور طرابلس کے دل
دلدوز اور ہولناک مظالم اور اندرونِ ہند کی انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں اور شرمناک وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ کی
ارزانی نے انتہائی درجہ میں مایوس اور مضطرب کر دیا اور آمادہ کر دیا تھا کہ عواقب اور نتائج سے بے نیاز ہو کر میدانِ انقلاب میں سر بکف،
کفن بردوش نکل پڑیں۔ زمانہ کی تاریکیوں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں
رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ اسی غور و خوض میں گذرا مگر چونکہ پانی سر سے گذر چکا تھا اس لئے خوب سمجھ سوچ کر صرف قادرِ مطلق
پر اعتماد اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دیا۔

شروع شروع میں قیاس سے بھی زیادہ مشکلات سامنے آئیں سخت اور تند آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بادِ سموم کے جھلسا دینے
والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے۔ احباب و اقارب مارِ آستین بن گئے۔ ہر شخص ناصح اور خیر خواہ بنکر سدِّ راہ بنا اور کیوں نہ ہوتا۔ انگریز
نے اس قدر پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اٹھانا مسن ستادن کا سماں باندھتا تھا۔ آزادی اور انقلاب کا اگر کوئی خواب
بھی دیکھ لیتا تھا تو پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برقِ جہاں سوز سے زیادہ تباہ کن شمار کی
جاتی تھی۔ برطانی تشدّدات اور مظالم نے اس قدر قلوب اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ
پایا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا۔ خفیہ پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی میں ایسے ایسے لوگ کام کر رہے تھے کہ جن میں شبہ کرنا بھی
بے دینی اور کفر سمجھا جا سکتا تھا۔ چاروں طرف خفیہ پولیس کا جال بچھا ہوا تھا پھر کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ کوئی شخص بھی ہم خیال اور ہم
زبان باہم عمل ہو سکتا ہے خصوصاً جب کہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے بھی کان پر ہاتھ دھرتا ہو بہر حال مولانا نے تمام خطرات سے قطع نظر
ضروری سمجھا اور "ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم" کہتے ہوتے اللہ کا نام لے کر اس بحرِ ذخار اور ہولناک طوفان میں کود کر آگے بڑھے اور
لوگوں کو ہم خیال اور رفیقِ سفر بنانے لگے۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ سے چونکہ ناامید اور مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مشہور
مولویوں اور پیروں سے امیّد نہ رکھنی چاہیئے اور فرماتے تھے کہ بعض اہلِ اللہ نے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی) وجہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے
بہت زیادہ خطرات لاحق ہوتے ہیں اس لئے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھ دار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے، جن میں سے مولانا عبیداللہ[1] سندھی
مرحوم بھی ہیں۔ مولانا عبیداللہ صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص فدائی اور متوسل شاگرد تھے۔ سمجھ اور حافظہ اعلیٰ پیمانہ کا اور ہمت و استقلال،
بے نظیر قدرت نے عطا فرمایا تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں تعلیمی کام کرتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی
تعلیم سے نوجوانانِ اسلام کے عقائد اور خیالات پر جو بے دینی اور الحاد کا زہریلا اثر پڑتا ہے اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی
جائے کہ ان کے شکوک و شبہات دینِ اسلام سے دُور ہو جائیں اور وہ سچے پکے مسلمان بن جائیں۔ حضرت شیخ الہندؒ دہلی تشریف لے گئے
اور مولانا عبیداللہ صاحب سے ملاقات کی اور تذکرہ میں فرمایا کہ "جب کہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدت
تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنا دینگے"
اور واقعہ بھی یہی تھا (ڈبلیو ہنٹر کہتا ہی ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں سے پڑھا ہوا کوئی ہندو یا مسلمان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھی رح کا مفصل تذکرہ مستقل عنوان سے علیحدہ شامل ہے۔

بزرگوں کے عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو) چنانچہ مولانا عبید اللہ صاحب کی سمجھ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اسکیم آگئی اور وہ عالی ہمتی اور تن دہی کے ساتھ تمام ہولناک خطرات کو پس پشت ڈالنے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رولٹ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ ــــــ مولوی عبید اللہ نے (مولانا) محمود حسن کے خیالات پر اثر ڈالا حالانکہ مولوی عبید اللہ تو تعلیمی جد وجہد میں منہمک اور مشغول تھے میں نے ان کو ادھر سے کھینچ کر سیاسیات اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں ڈالا۔

الغرض حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بالکل اپنا ہم خیال اور اپنا ہم عمل بنالیا۔ چونکہ ان کے بہت سے احباب اور جان پہچان والے سندھ، پنجاب اور سرحد وغیرہ میں تھے انہوں نے اپنے معتمد علیہ حضرات کو بار بار سفر کر کے استوار کیا اور اس تحریک کا ممبر بنایا نیز دہلی میں رفتہ رفتہ ہم خیال لوگ ہوتے گئے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا محمد علی جوہر مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ حضرات کے لئے بھی مولانا عبید اللہ صاحب ذریعہ بنے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار مولانا عبید اللہ کو سرحد، یاغستان سندھ وغیرہ میں بھیجا اور اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے اس اسکیم کو جاری کیا (یہ اسکیم کیا تھی، اس کا مفصل تذکرہ مولانا عبید اللہ سندھی کے سیرتی خاکہ میں ملاحظہ کیجئے)

حضرت شیخ الہندؒ کی ابتدائی کارگذاری

اس تحریک کی ابتدا میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (وائلنس) ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا ممکن نہیں ہے[1] اس کے لئے مرکز اور اسلحہ سپاہی، مجاہدین وغیرہ ضروری ہیں۔ بنا بریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہئے اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل و جانباز ہوتے ہیں اس لئے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا اور انہی سے کامیابی کی امید قائم کی گئی۔ اس بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں:۔

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور شخصی و قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے۔

(ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

(ج) ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

(د) حضرت سید احمد شہید رح کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ستانہ اور چرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں عرصہ سے چلی آتی ہیں ان کو دور کرنا چاہئے) انہیں مقاصد کے لئے حاجی ترنگ زئی صاحب سے بھی بار بار استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مقاصد کے لئے کوشش کریں[2]۔ بالآخر حاجی صاحب موصوف جنگ عظیم چھڑنے پر آزاد قبائل میں گئے۔ مجاہدین کا جمگھٹا شاسے زیادہ ہو گیا

---

[1] اس وقت نان وائلنس کا حربہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور کانگریس کی جو کوششیں ۱۹۱۲ء تک تھیں ان سے کامیابی کی تمنا موہوم بلکہ عبث تھی کیونکہ اپنی ڈپلومیسی سے ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا تھا کہ برسوں کی جد وجہد ایک لمحہ میں ختم کر دیتا تھا۔

[2] یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عبید اللہ سندھی رح کے معتمد علیہ ساتھیوں کا اجمالاً تذکرہ کر دیا جائے کہ ان کے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

تحریکِ آزادی میں غیر مسلموں کی شرکت

حضرت شیخ الہند نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کرایہ پر لے رکھا تھا جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے اس میں ... رت کے غیر مسلم ہم خیال دوست اور رفقا ر انقلاب ٹھہرا کرتے تھے۔ ان کو رازداری کے ساتھ خدام خاص ٹھہرا دیتے تھے۔ تنہائی کے اوقات میں یا رات کو ان سے حضرت الہند کی باتیں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ سکھ یا بنگالی ہندو انقلابی (بنگال پارٹیشن ...) ہوتے تھے۔ چونکہ رازداری کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا اس لئے ان کے نام اور پتے معلوم نہ ہو سکے اور نہ حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تذکرے کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہے گا۔

حاجی ترنگ زئی رح ترنگ زئی تحصیل چارسدہ۔ ضلع پشاور میں اتمان زئی (خان عبدالغفار خاں کا گاؤں) کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے۔ حاجی صاحب اسی گاؤں کے تھے۔ اور اسی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کا نام فضل واحد تھا۔ نہایت متقی اور پرہیزگار المسلم تھے۔ صاحب علم و عمل اور مشہور پیران طریقت و سلوک میں سے تھے۔ حضرت مولانا شاہ نجم الدین معروف بہ بڑے ملا کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ مولانا نجم الدین صاحب بڑے ملا حضرت مولانا شاہ عبدالغفور صواتی معروف بہ حضرت صوات صاحب رح کے جانشین تھے۔ مولانا عبدالغفور صاحب ریاست صوات (سوات) کے والی تھے۔ موجودہ والی سوات جہاں زیب۔ مولانا عبدالغفور رح کے پڑپوتے ہیں (حضرت مولانا شمس الحق افغانی مدظلہ شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور حاجی ترنگ زئی مرحوم کے پیر بھائی مولانا غلام حیدر صاحب رح سے بیعت اور خلیفہ مجاز ہیں) مولانا عبدالغفور رح نے حضرت سید احمد شہید رح کے ساتھ مل کر جہاد میں حصہ لیا تھا اور ان کی کافی معاونت کی تھی۔ حاجی ترنگ زئی بھی اپنے پیران طریقت کے قدم بہ قدم چل کر غزا و سلوک دونو کے مرد میدان تھے۔ اس زمانہ میں ان سے زیادہ مقبول و معروف کوئی پیر اس علاقہ میں نہ تھا۔ یاغستان اور آزاد قبائل میں ان کے ہزارہا مرید تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا عبیداللہ سندھی شیخ الہند رح کے ایما پر بار بار ان کے پاس گئے اور ان کو مجبور کیا کہ وہ آزاد علاقہ ہجرت کر جائیں اور وہاں کمان سنبھالیں۔ کیوں کہ وہاں بے شمار مجاہد بن سکتے تھے۔ اور اسلحہ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جنگ عظیم کی وجہ سے انگریز کی مشاق پلٹنیں باہر گئی ہوئی تھیں لہذا یہاں آزاد قبائل میں ان کو حاجی صاحب کی وجہ سے بار بار شکست فاش ہوئی۔ بالآخر انگریز نے ڈپلومیسی اختیار کی اور امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کو درمیان ڈالا اور لکھو کھہا روپیہ سرداران قبائل میں تقسیم کر کے یہ مشہور کیا کہ بغیر امیر کے جہاد جائز نہیں لہذا امیر حبیب اللہ جو بادشاہ ہیں ان کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ اس دو دھاری تلوار کا اثر یہ ہوا کہ حاجی صاحب کے ساتھیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور ان کی طاقت کمزور ہوئی اور شکست پر شکست کھانے لگے۔ آخر کار حاجی صاحب مرحوم کو ان کے ساتھی علاقہ مہمند میں لے گئے۔ وہ وہاں محفوظ ہو کر اقامت پذیر ہو گئے اور وہیں وفات پائی (رحمۃ اللہ تعالیٰ و رضی عنہ و ارضاہ آمین)

مولانا سیف الرحمٰن اصل میں قندھار کے تھے۔ آباؤ اجداد نے پشاور کے پاس سکونت اختیار کی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح سے علم حدیث حاصل کیا۔ عرصہ دراز ریاست ٹونک میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اخیر میں مدرسہ فتح پوری دہلی میں مدرس اول ہو گئے۔ حضرت شیخ الہند رح نے ان کو ہم خیال بنایا اور یاغستان ہجرت کرنے کا مشورہ دے کر روانہ کیا۔ لوگوں کو وعظ و تقریر کے ذریعہ جہاد پر تیار کرتے رہے۔ نہایت ذہین، صاحب علم اور اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے۔ چونکہ حضرت شیخ کے کہنے پر (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

سے پوچھنے کی نوبت آئی۔ علاوہ مذکور بالا حضرات کے غیر مشہور حضرات اس تحریک کے ہم خیال اور مشن آزادی کے ممبر تھے۔ بہت تھے۔ جن کی تفصیل تطویل چاہتی ہے۔ اور نہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے نہایت سرگرم لوگوں کی فہرست بیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ملازمت چھوڑی تھی۔ لہذا حضرت ان کو ماہ بماہ خرچ بھیجتے رہتے تھے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی کے ساتھ میں شریک ہوئے شکست کے بعد کابل چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے آخری عہد میں انگریزوں کے احتجاج پر مولانا کے ساتھ یاغستان روانہ کر دئے گئے۔ مولانا کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے کر ہندوستانی معاملات علیحدگی کا وعدہ لے لیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ کی زندگی تک مستوفی الممالک کے ساتھ اور مستوفی کو جو کام انگریز دیتا اس میں اس کی امداد کرتے۔ سردار امان اللہ خاں کے عہد میں آزاد ہو کر کابل پہنچے اور بڑے عہدوں پر فا

۳ : مولانا منصور صاحب انصاری | ان کا اصلی نام محمد میاں تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نواسے اور پیرجی عبد اللہ انصاری دینیات علی گڑھ یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ انبیٹھہ کے متوطن تھے۔ دار العلوم معینیہ اجمیر میں صدر مدرس رہے شیخ الہند کے ساتھ ترجمہ قرآن میں معاون رہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے نائب بن کر جمعیتہ الانصار میں کام کرتے رہے شیخ کے ساتھ حجاز گئے۔ مکہ معظمہ میں گورنر حجاز غالب پاشا نے شیخ کی ملاقات کے بعد ہدایات لے کر ہندوستان لوٹے تاکہ یہاں کام کر حسب رپورٹ رولٹ غالب نامہ ان کے پاس تھا۔ پاک ہندوستان آئے تو ریشمی رومال انگریزوں کو مل چکا تھا پکڑ دھکڑ تھی۔ لہذا بھیس بدل کر یاغستان چلے گئے اور وہاں سے کابل۔ انگریز کے احتجاج پر مولانا سیف الرحمن کے ساتھ یاغ روانہ کر دیئے گئے۔ مگر یہ کسی طرح بھیس بدل کر اور نام محمد منصور انصاری رکھ کر گرفتاری سے بچ گئے اور سی۔ آئی۔ ڈی کی تمام کو ناکام رہیں۔ امیر امان اللہ کے زمانہ میں کابل چلے گئے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ امیر امان اللہ کے تخت نشین ہونے بعد کابل سے جو سرکاری وفد استنبول گیا تھا اس کے ایک رکن تھے۔ پھر ماسکو میں افغانی سفارت خانہ میں بطور مشیر تھے کئی ایک سیاسی اسلامی رسائل تصنیف کر کے شائع کئے۔ ان کے اہل وعیال کو ہندوستان میں ڈاکٹر انصاری تیس روپیہ ماہوار دیتے رہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد انصاری عرصہ دراز تک "مدینہ" بجنور کی ایڈیٹری نہایت قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ پھر بمبئی جا کر روزنامہ "جمہوریت" جاری کیا۔ مولانا منصور کا انتقال کابل میں ہوا (رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین)

۴ : مولانا عزیز گل | قصبہ زیارت کا کا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ۔ دیوبند کے فارغ اور حضرت شیخ الہند کے خادم خاص۔ حضرت اور یاغستان میں بار بار حضرت شیخ کے سفیر کی حیثیت سے گئے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور دیگر خوانین کو تحریک کے ہمنوا بنانے میں مولانا سندھی کے ساتھ ہوتے تھے۔ حضرت شیخ کے ہمیشہ ساتھ رہے اسارت مالٹا میں بھی ساتھ تھے۔ لوگوں نے بڑی مشہور کیا کہ حضرت شیخ ان سے بدظن ہوں لیکن نہ حضرت بدظن ہوئے اور نہ ہی ان کا دل میلا ہوا۔ آخر تک ساتھ رہے حضرت کے راز دار خزانچی اور معتمد علیہ رہے۔ حضرت کی وفات کے بعد بھی کتنا عرصہ حضرت کے مکان پر قیام پذیر رہے۔ ایام تحریک خلافت میں دیوبند خلافت کمیٹی کے صدر رہے۔ پھر مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس ہو گئے بعدہٗ وہاں ایک انگریز عورت سے اس کی خواہش پر تیسرا نکاح کیا اور پشاور چلے گئے۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

دی ہے اور یہ پانچ شاخیں بتلا دی ہیں جو کہ علاوہ مرکز دیو بند کے ہمارے علم میں آسکیں۔ ۱۔ دین پور۔ ۲۔ امروٹ۔ ۳۔ چی محلہ کہنڈہ ۴۔ دہلی ۵۔ چکوال ۔۔۔۔ ہر جگہ کام کرنے والے حضرات اپنی تیز تر مساعی کی اور انتہائی اخلاص کی بنا پر صدر

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مولانا احمد اللہ صاحب | پانی پت ضلع کرنال کے باشندے اور حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء رح کی اولاد میں سے تھے۔ فراغت دیو بند کے بعد مختلف جگہوں میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ پھر ترجمہ قرآن میں حضرت شیخ کے معین ہوئے۔ ان کی دیانت و امانت پر شیخ کو بہت اعتماد تھا۔ بسا اوقات حضرت کی ڈاک انہی کی سپرد ہوتی تھی۔ حضرت حجاز جاتے ہوئے انہیں اپنا نائب بنا گئے۔ ان کے پاس مشن کے ممبروں اور چندوں کا رجسٹر تھا۔ یہ ان کو لے کر پانی پت چلے گئے۔ اور وہیں سے تمام کاروائیاں عمل میں لاتے تھے۔ حضرت اونچے کاموں میں اپنا نائب حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کو بنا گئے تھے دونو حضرات مل کر مشن کا کام کرتے تھے۔ گرفتاریوں کے وقت پولیس کے آنے سے چند گھنٹہ قبل تمام کاغذات چھپا چکے تھے۔ ان سے بہت پوچھ گچھ کی گئی مگر انہوں نے کسی امر کا اقرار نہ کیا۔ اس کے بعد ان پر ایک مسلمان سی۔ آئی۔ ڈی مسلط کیا گیا۔ جو نہایت اخلاص کا اظہار کرتا اور احکام شریعت پر مستعدی سے عمل کرتا رہا اور دن رات ان کی خدمت کرتا رہا۔ ان کو اس پر اعتماد ہو گیا اس نے آہستہ آہستہ تمام باتیں پوچھ لیں اور مشن کا ممبر بن گیا۔ وہ تمام معلومات حاصل کر کے غائب ہو گیا۔ اس پر ان کو گرفتار کر لیا گیا مگر چونکہ الزامات کا کوئی تحریری ثبوت نہ تھا اور نہ ہی یہ اقرار کرتے تھے۔ لہٰذا ان کو پنجاب کے بعض علاقوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصہ کے بعد مولانا احمد چکوالی جو کہ اس سے قبل معافی مانگ کر آزاد ہو چکے تھے۔ وہ آئے اور انہوں نے کہا کہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ کے پاس متعدد تحریری ثبوت ہیں آپ بھی معافی مانگ لیں۔ ایک ہمدم و ہمراز کا مشورہ قبول کرنا پڑا۔ اس کے چند دن بعد ان کو آزاد کر دیا گیا۔ پانی پت واپس آکر تعلیمی مشاغل میں مشغول ہو گئے۔ اور تقسیم ہند سے کچھ پہلے بمرض ہیضہ پانی پت میں انتقال ہو گیا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ)

مولانا ظہور محمد خاں | سہارنپور کے باشندے اور حضرت شیخ الہند کے فدائی اور مخلص شاگرد تھے۔ نہایت زیادہ ساکت و صامت اور ٹھوس کام کرنے والے سرگرم ممبر تھے۔ مشن میں ابتدا سے داخل ہوئے اور ہمیشہ ممبر بنانے اور چندہ فراہم کرنے کا کام کرتے رہے۔ حضرت کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس تھے کہ ان کو گرفتار کیا گیا۔ الہ آباد لے جائے گئے۔ بہت پوچھ گچھ کی گئی۔ مگر یہ گونگے بن گئے۔ کوئی جواب نہ دیا۔ دو چار دن سختی کے بعد چھوڑ دیئے گئے۔ حضرت شیخ کی واپسی کے بعد چند سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے (رحمہ اللہ تعالیٰ)

شیخ عبدالرحیم مرحوم سندھی | حیدر آباد کے باشندہ اور مولانا سندھی کے مخلص وفادار نو مسلم دوست تھے۔ مشن کے سرگرم ممبر اور نہایت دیندار تھے۔ مولانا سندھی نے ان کو ہموار کیا تھا۔ اور مولانا سندھی کو سرحد افغانستان تک پہنچانے میں انہوں نے بہت زیادہ مدد کی تھی۔ آچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے۔ عرصہ دراز تک سندھ میں ہندوؤں کو تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ بہت سے لوگ اُن کی مساعی سے مسلمان ہو گئے جن میں ڈاکٹر شمس الدین بھی تھے۔ شیخ صاحب نے اپنی صاحبزادی کا نکاح ڈاکٹر صاحب (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

کہلانے کے مستحق ہوتے تھے ورنہ باقاعدہ تقریر صدر اور سیکریٹری وغیرہ کا مقتضائے وقت اور ماحول کی بنا پر نہ ممکن وقوع میں آیا۔ ہم نے جس جگہ پر بھی صدر یا ناظم وغیرہ کے الفاظ استعمال کیئے ہیں ان میں عملی استحقاق مُراد ہے رسمی کارروائی مُراد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جانے کے بعد مولانا سندھی کی خط وکتابت انہی سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کچھ خطوط گورنمنٹ کے ہاتھ لگ گئے اور فاش ہوگیا مگر یہ رُوپوش ہوگئے۔ اور پھر ہاتھ نہیں آئے۔ کہا جاتا ہے کہ سرہند میں بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ ان روپوش ہونے کے بعد مشن کی برانچ حیدرآباد سندھ کا کام تقریباً ختم ہوگیا۔

۸: حضرت مولانا غلام محمد صاحب۔ دین پوری | مرحوم موضع دین پور تحصیل خان پور سابقہ ریاست بہاول پور کے باشند مشہور شیخ طریقت حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی کے خلیفۂ اوّل تھے۔ بہت لوگ ان سے بیعت تھے۔ چونکہ مولانا سند پیر بھائی اور ان کے پیر و مرشد کے خلیفہ تھے۔ لہٰذا ان کا اور مولانا سندھی کا آپس میں بڑا گہرا تعلق و ارتباط تھا۔ گویا دین پور تحریک کا ثانوی مرکز تھا۔ مولانا عبیداللہ کابل جاتے ہوئے اپنی صاحبزادی کو انہی کے پاس چھوڑ گئے جن سے بعد میں مولانا صاحب کا نکاح ہوا۔ ان سے ایک فرزند ارجمند پیدا ہوئے۔

ریشمی خط مولانا غلام محمد صاحب کے پاس بھی پہنچا تھا۔ انقلاب کی تیاری کے جملہ سامان یہاں جمع کر لئے گئے تھے اور کوشش جاری تھی کہ فوج کی بڑی مقدار خان پور اسٹیشن پہنچی وہاں کے مخلصین نے فوراً مرکز کو خبر دی۔ راتوں رات تمام اور وغیرہ منتشر کر دیئے گئے۔ صبح کو انگریز افسر مع فوج دین پور پہنچا تو تفتیش کی کوئی چیز نہ تھی۔ ریشمی خط ایک ڈبہ میں بچوں کے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ افسر نے اس ڈبہ کو اٹھایا۔ مگر اوپر کے کھلونوں کو دیکھ کر رکھ دیا۔ غرضیکہ مخبری کے مطابق کوئی چیز اطراف وجوانب سے ہزاروں مخلص جمع ہو چکے تھے۔ دین پور میں گرفتار کرنے کی افسر کو جرأت نہ ہوئی۔ افسر نے اس کہ ہمارا بڑا افسر خانپور ہے اس سے مِل کر چلیئے۔ وہاں جانے پر کہا کہ یہاں سے وہ بہاول پور چلے گئے ہیں۔ اس لئے بہا تشریف لے چلیئے۔ غرضیکہ آپ کو اس طرح ورغلا کر لے جایا گیا۔ اور ضلع جالندھر ایک قصبہ نور محل میں نظر بند کر دیا گیا فراہم نہ ہونے پر چھوڑ دیئے گئے۔ مولانا کے کئی صاحبزادے فاضل دیوبند ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا عبدالہادی صا آج کل گدی نشین ہیں۔ نہایت صالح، متقی اور مرجع خلائق ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری مولانا غلام محمد صاحب کے خلیفہ

۹: مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب امروٹی | امروٹ ضلع سکھر کے باشندے اور سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈ دوسرے خلیفہ تھے۔ مولانا عبیداللہ صاحب کو ان سے بہت وابستگی تھی۔ انہوں نے ہی مولانا سندھی کا نکاح ماسٹر محمد یوسف تی کی لڑکی سے کرایا تھا اور مولانا سندھی نے امروٹ رہ کر بہت کچھ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ موصوف خدا رسیدہ اور نہایت بوتیلے بزرگ تھے۔ لاکھوں مرید تھے ان کی کرامات کا ان اطراف میں بڑا چرچا ہے۔ مولانا سندھی نے ان کا تعارف شیخ الہند سے کرایا۔ متعدد مرتبہ دیوبند آئے۔ اور حضرت شیخ بھی ان سے ملنے امروٹ گئے۔ اُن کا مقام سندھ کے اس علاقہ مرکز رہا۔ گرفتار ہوئے اور چند دن بعد رہا کر دیئے گئے۔ ایام تحریک خلافت میں انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی وارضا

۱۰: مولانا محمد صادق صاحب کراچوی | مولانا موصوف محلہ کھڈہ کراچی کے باشندے تھے۔ کتب عالیہ درسیہ اور (بقیہ حاش

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دورہ حدیث حضرت شیخ الہند سے پڑھا۔ ان میں اور مولانا سندھی میں گہرے تعلقات تھے۔ مشن کے ممبر بنے اور سرگرمی سے کام کیا۔ جنگِ عظیم میں جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انہوں نے لسں بیلا وغیرہ بلوچستانی علاقہ میں بغاوت کرا دی۔ کراچی سے ہر ہفتہ عراق کو جہاز میں فورس جایا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے مسٹر ٹاؤنشنڈ کمانڈر محاذِ عراق میں بڑھتا ہوا ہر پڑاؤ پر پیش قدمی کر رہا تھا۔ فوجیں یکے بعد دیگرے ایک ایک پڑاؤ کو سنبھالتی جاتی تھیں۔ اور پیچھے سے کمک پہنچتی رہتی تھی۔ اس طرح نظام پیش قدمی کا چلتا تھا۔ جب بلوچستان وغیرہ میں بغاوت ہوگئی تو وہ فورس اور فوج جو بصرہ کو جا رہی تھی اس داخلی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے سندھ میں اتار دی گئی۔ کئی ہفتہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسٹر ٹاؤنشنڈ اپنی فتح مندی کے نشہ میں آگے بڑھتا چلتا گیا۔ پیچھے سے کمک نہ پہنچی تو کوت العمارہ میں محصور ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد جب بغاوت فرو کرنے کے بعد ہندوستان سے فوج پہنچی تو ترکی فوجوں نے حصار نہایت مضبوط کرلیا تھا۔ نہ اندر سے کسی کو نکلنے دیتے نہ باہر سے جانے دیتے کئی ماہ تک محصور رہ کر بمجبوری ٹاؤنشنڈ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جب محصور ہوا تو اس کی فوج تیس ہزار تھی۔ جب آزاد کیا گیا تو کل تیرہ ہزار تھی۔ یہاں ہندوستان میں مخبری پر مولانا محمد صادق کو گرفتار کرلیا گیا۔ مگر خاطر خواہ ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کارواڑ (مہاراشٹر کا شہر) میں نظر بند کر دیئے گئے۔ جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد رہا کئے گئے۔ دار العلوم کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر اور جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی کے صدر مہتمم اور صدر مدرس رہے۔ خلافت کمیٹی سندھ اور جمعیۃ علماء سندھ کا کام نہایت اولوالعزمی سے کرتے رہے۔ ۱۸ر جون ۱۹۵۳ء کو وفات پاگئے (رحمہ اللہ تعالیٰ)

۱۱: **مولانا فضلِ ربی صاحب** | شیخ الہند کے شاگرد رشید اور جوشیلے لیکن مستقل مزاج تھے۔ اپنے وطن ضلع پشاور میں علمی مشاغل میں مصروف تھے کہ شیخ الہند کے حکم سے یاغستان میں چلے گئے اور لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی کے ساتھ جہاد میں برابر کے شریک رہے۔ شکست کے بعد کابل چلے گئے۔ اور اپنی علمی استعداد اور اعلیٰ قابلیت کی بنا پر علمی ڈیپارٹمنٹ، افغانستان میں ملازم ہوگئے۔ اور غالباً آج تک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ متعلقین ان کے ساتھ ہیں۔

۱۱: **خان عبد الغفار خاں** | موصوف اتمان زئی کے رہنے والے اور مشہور لیڈر ہیں۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ رہے ہیں۔ تعارف کے محتاج نہیں۔ حضرت شیخ سے ان کا بھی رابطہ تھا۔ جب کبھی ملاقات کرنی ہوتی تو دیوبند لائن کے کسی اگلے پچھلے سٹیشن پر ملاقات کرتے اور ٹکٹ کسی دور جگہ کا ہوتا۔ اور پھر وہاں جاکر اتر جاتے۔ اور اس طرح بارہا ہوا اور سی۔ آئی۔ ڈی کو مطلق علم نہ ہوسکا۔ آج کل افغانستان میں ہیں۔

۱۱: **ڈاکٹر انصاری مرحوم** | ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ تین بھائی تھے۔ حکیم نابینا (حکیم عبد الوہاب صاحب) مرحوم سب سے بڑے تھے۔ منجھلے حکیم عبد الرزاق تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب چھوٹے تھے۔ تینوں بھائیوں کو حضرت شیخ الہند سے بہت تعلق تھا۔ حکیم نابینا صاحب نے دیوبند میں تعلیم پاکر حدیث حضرت گنگوہی سے پڑھی۔ اور بیعت بھی ہوئے اور مرنے سے قبل وصیت کی کہ میری قبر حضرت گنگوہی کے پاس بنائی جائے۔ چنانچہ انتقال کے بعد ان کی لاش ایک کار میں گنگوہ لے جاکر ان کو حضرت گنگوہی کے قریب دفن کیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری بعض مصالح کی بنا پر ظاہری طور پر دیوبند آمد و رفت نہیں رکھتے تھے مگر ہمیشہ حضرت شیخ کی تحریک کے مالی معاون و سرپرست رہے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اپنے اثر و رسوخ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی وجہ سے گورنمنٹ کے اعلیٰ کارکنوں کے ذریعہ سے بہت سی خبریں معلوم کر لیتے تھے اور حضرت شیخ کو اطلاع دیتے تھے۔ جنگِ عظیم کے شروع پر انہوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ عنقریب شیخ الہند کی گرفتاری ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ حجاز چلے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے حضرت اور رفقاء کے ٹکٹوں کا انتظام کیا تھا۔ ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق بمبئی تک ساتھ گئے اور جملہ امور کی دیکھ بھال کی۔ اور مصارفِ حجاز نقد ادا کئے۔ اور اس خیال سے کہ حجاز میں گرانی شدید ہے اور وہ رقم ختم ہو گئی ہو گی اگلے سال شیخ الہند کے بھانجے اور داماد قاضی مسعود کو ایک ہزار روپے دے کر اپنے خرچ پر بھیجا۔ اور پیچھے گھر پر بھی تکفل فرماتے رہے۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے جب دہلی میں مدرسہ تعلیم القرآن قائم کرنا چاہا تو حضرت شیخ الہند خود دہلی تشریف لائے اور مولانا سندھی کا ڈاکٹر صاحب سے تعارف کرایا۔ اور وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے تعارف کا ذریعہ بنے۔ مولانا سندھی کے اپنے الفاظ ہیں:-

"حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند رکھ کر مرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا۔ اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے مرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مولانا ابوالکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔"

ایامِ جنگ بلقان میں ہلال احمر کے لئے جو وفد استنبول بھیجے گئے تھے اس کی ایک پارٹی کے صدر ڈاکٹر صاحب تھے۔ الغرض یہ حضرت شیخ الہند کے مشنِ آزادی کی چوتھی برانچ جو کہ دہلی میں تھی صدر تھے۔ اور نہایت رازداری اور سرگرمی سے کام کرتے تھے۔ البتہ مولانا عبیداللہ کے دہلی آ جانے اور نظارۃ المعارف قائم کرنے کے بعد ان کی ظاہری جدوجہد کچھ ڈھیلی ہوگئی جو ان کے کابل جانے کے بعد پھر قوی ہوگئی۔ ایامِ دار و گیر میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب کو سی آئی ڈی نے بلایا۔ اور بہت کچھ سوالات کئے گئے۔ سوائے مالی امداد کے اور کوئی گرفت کی چیز گورنمنٹ کے پاس نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی نے اقرار کیا اور کہا کہ مولانا ہمارے مذہبی پیشوا اور مرشد ہیں۔ ہم پر ان کی ضروریات مہیا کرنا اور خدمات بجا لانا فرض تھا اور ہے۔ ہم اس کو بجا لاتے رہے لاتے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے کہا گیا کہ مولانا گورنمنٹ کے باغی ہیں آپ اُن کی امداد کرتے ہیں۔ تو جواب دیا کہ مولانا باغی نہیں ہیں ان کو بغاوت کے ثبوت میں سی آئی ڈی کی رپورٹیں دکھائی گئیں تو انہوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے قابلِ یقین نہیں ہے۔ جب حکومت کی طرف سے ان رپورٹوں کی صداقت کا اصرار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے مذہبی پیشوا اور مرشدِ دین ہونے کی بناء پر امداد کی ہے۔ اگر حکومت مولانا کو ایسا سمجھتی ہے تو میں حاضر ہوں جو سزا مجھ کو دینا چاہتے ہو دو۔ چونکہ سچائی کے ساتھ اقرار کر لیا تھا ادھر یورپ کے تعلیم یافتہ اونچے طبقے سے بخوبی واقف تھے اس لئے حکومت نے ان پر دست درازی کرنا خلافِ مصلحت سمجھا۔ ان کو بھی اور ان کے بھائی کو بھی چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب اخیر تک سیاسی جدوجہد میں نہایت زدی اور مستعدی کے ساتھ شریک رہے۔ تحریکِ خلافت اور کانگریس کے ممبر رہے۔ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ جب تک زندہ رہے قومی لوگوں کا قیام اُن ہی کی کوٹھی پر ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ہزاروں کے لحاظ سے ماہوار ان کا قومی لیڈروں کی آؤ بھگت اور قیام و طعام پر خرچ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لگ جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک ایک وقت پر سینکڑوں رہنما ان کی کوٹھی پر ہوتے اور کھانا کھاتے۔ مشہور و معروف آدمی ہیں۔ مزید بیان کی حاجت نہیں۔ کئی دفعہ جیل گئے۔ حضرت شیخ آخری ایام انہی کے ہاں رہ کر علاج کراتے رہے اور یہیں انتقال فرمایا۔ ۱۹۳۶ء میں دہرہ دون سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں انتقال کیا۔ دہلی میں مدفون ہوئے۔ اس صدی میں ہندوستان میں جو چند بڑے مخلص لیڈر ہوئے اُن میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۱۱: مولانا محمد احمد چکوالی | چکوال ضلع جہلم پنجاب کے باشندے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل، حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مولانا سندھی کے مخلص دوست اور مشن کے سرگرم ممبر تھے۔ مشن تحریک آزادی کی پانچویں شاخ جو کہ پنجاب میں تھی، موصوف اس کے صدر تھے۔ نہایت استقلال اور بے جگری کے ساتھ شریکِ سفر رہے۔ ہزاروں کو ہم خیال اور ممبر بنایا۔ دیوبند میں ان کی آمد و رفت بارہا ہوئی۔ ایام دار و گیر میں ان کو بھی گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ ابتداء میں کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا۔ اور نہ آپ نے اقرار کیا مگر جب کاغذات گورنمنٹ کے ہاتھوں میں آگئے اور سی۔ آئی۔ ڈی۔ نے ان کو دکھلائے تو ان کی باتوں میں آکر اقرار کرنے اور آئندہ سیاسیات سے علیحدہ رہنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہو گئے چنانچہ ان کو رہا کر دیا گیا اور یہی مولانا احمد اللہ صاحب کے ذریعہ بنائے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے سیاسیات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لاہور میں ایک موٹر سے ٹکرا کر زخمی ہو کر انتقال فرما گئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان صاحب لاہور میں کام کر رہے ہیں اور ان کی صاحبزادی حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے عقد میں آئیں۔

۱۲: حضرت شاہ عبدالرحیم۔ رائے پوری، قدس سرہٗ العزیز۔ | قصبہ رائے پور۔ ضلع سہارنپور کے باشندے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ اکبر تھے، نہایت بزرگ، متقی، باخدا انسان تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر اور حضرت شیخ الہند کے معتمد دوست تھے۔ ابتداء میں حضرت شیخ الہند نے ان کو خبر تک نہیں کی اور سالہا سال تک اپنی سرگرمی عمل میں لاتے رہے اور انتہائی اخفا کو جیسا کہ مقتضائے وقت تھا کام میں لائے۔ مگر اس قسم کی کارروائی مخلص دوست سے کیسے چھپ سکتی تھی اور ان کو خبریں ملتی رہیں۔ ۱۳۳۰ھ میں میں (مولانا حسین احمد مدنی) ہندوستان آیا، تو رائے پور حاضری کے وقت حضرت نے فرمایا کہ شیخ الہند لوگوں سے بیعت جہاد لے رہے ہیں۔ یہ تو بہت خطرناک امر ہے۔ انگریز کو اگر خبر ہو گئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور مسلمانوں کا یہ مرکز علمی اجڑ جائے گا۔ چونکہ مجھ کو (حسین احمد مدنی) اس کی خبر نہ تھی لہٰذا لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ عرض کیا کہ میں خود شیخ الہند سے پوچھوں گا۔ مولانا عزیز گل نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ حسین احمد کو بھی اس مشن میں شامل کرنا چاہیئے تو آپ نے فرمایا کہ اس کو مشوش نہیں کرنا چاہیئے وہ چند دنوں کے لئے ہندوستان آیا ہے۔ میں نے رائے پور سے واپسی پر مولانا عبدالرحیم صاحب کا مقالہ ذکر کیا تو شیخ الہند نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحؒ نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے۔ سو بحمد اللہ پچاس برس گزر چکے ہیں اور دارالعلوم اپنی خدمات باحسن وجوہ انجام دے چکا ہے۔ یہ سن کر دم بخود ہو گیا اور سمجھ گیا کہ جو واقعات نقل کئے جا رہے ہیں وہ صحیح ہیں۔ اور حضرت کا اس امر میں پختہ خیال ہو چکا ہے اب اپنے ارادہ سے ٹل نہیں سکتے۔ اور نہ کوئی ہٹا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

حضرت شیخ الہندؒ کی ابتدائی کارگذاری

اس تحریک کی ابتدا میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (وائلنس) ہندوستان سے انگریزوں کا نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا ممکن نہیں ہے[1] - اس لئے مرکز اور اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں - بنا بریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جان باز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہئے - اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل اور جانباز ہوتے ہیں اس لئے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا اور انہیں سے کامیابی کی امید کی گئی - اس بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں:-

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور شخصی اور قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے (ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے (ج) ان میں جوشِ جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے - (د) حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم صاحب اور شیخ الہند کی آپس میں تنہائی میں کھل کر بات چیت ہوئی تو حضرت شیخ الہند نے ان کو اپنا ہم خیال اور ہمنوا بنا لیا - اور دونو حضرات یک جان و دو قالب ہوگئے - اور اخیر تک اسی پر قائم رہے - اعلانِ جنگ کے بعد جب شیخ الہند حجاز جانے لگے - تو انہیں کو اپنا قائم مقام بنا گئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کردی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم کو میرا قائم مقام سمجھنا اور مہتم بالشان امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمد اللہ انجام دیتے رہیں گے - چنانچہ اسی طرح عمل درآمد ہوا گیا - حضرت رائے پوری نہایت دل سوزی - استقلال اور عالی ہمتی سے انتہائی رازداری کے ساتھ امور مہم کو انجام دیتے رہے - اور ان کے خاص خدام بھی دل چسپی لیتے رہے مگر افسوس کہ ہمارے مالٹا میں اسیر ہونے کے کچھ بعد ہی مولانا رائے پوری مریض ہوئے اور عرصہ تک بستر مرض پر ناچارگی اور ضعف میں مبتلا رہے - ایام دار وگیر میں سی - آئی - ڈی کا افسر ان کے پاس بھی تفتیش تحقیق کے لئے گیا - مولانا مرحوم نے تمام الزام کی تردید کردی اور بعض میں لاعلمی کا اظہار کیا - جس پر وہ ناکام واپس آیا - اور کہنے لگا کہ مولانا جھوٹ بولتے ہیں -

(حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے جانشین حضرت مولانا شاہ عبدالقادر ہوئے جن کا لاہور میں انتقال ہوا ان کا مفصل تذکرہ مستقل عنوان سے علیحدہ آرہا ہے)

حضرت شاہ عبدالرحیم کے انتقال کی خبر حضرت شیخ الہندؒ کو بزمانہ اسارت مالٹا پہنچی اور حضرت شیخ کو بہت صدمہ ہوا اور عرصہ تک رہا - ان کے مرثیہ میں ایک قصیدہ بھی لکھا جو آپ کے قصائد میں موجود ہے - رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ

---

[1] اس وقت نان وائلنس کا حربہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا - اور کانگریس کی جو کچھ کوششیں اس وقت تک یعنی ۱۹۱۲ تک تھیں - ان سے کامیابی کی تمنا موہوم بلکہ عبث تھی کیوں کہ انگریز اپنی ڈپلومیسی سے ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا تھا کہ برسوں کی جدوجہد ایک لمحہ میں خاک میں مل جاتی تھی -

کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ستھانا اور چمرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں جو عرصہ سے چلی آتی ہیں، ان کو دور کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس لئے مولانا سیف الرحمان صاحب کو دہلی سے، مولانا فضل ربی اور مولانا فضل محمود صاحب کو پشاور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحب وغیرہ کو آمادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس علاقہ میں بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے۔ ان سبھوں نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہموار کی اور ایک عرصہ میں بفضلہ تعالیٰ بڑے درجہ تک کامیابی نظر آنے لگی۔ انہی مقاصد کے لئے بار بار حاجی ترنگ زئی صاحب سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مقاصد کیلئے کوشش کریں۔ ان کو مختلف مجبوریاں درپیش تھیں۔ ان کے حل کرنے کے خیال سے تاخیر فرما رہے تھے کہ جنگ عمومی چھڑ گئی اور کچھ عرصہ بعد ترک بھی مجبور کر دیئے گئے کہ جنگ کا اعلان کر دیں۔ ان کے دو جنگی جہاز جو انہوں نے انگلستان میں بنوائے تھے اور ان پر کروڑوں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں انگریزوں نے ضبط کر لئے اور اسی قسم کے دوسرے غیر منصفانہ معاملات ان سے پیش آئے جو کہ ان کو جنگ میں گھسیٹنے والے تھے۔ یہ ان معاملات کے علاوہ تھے۔ جو کہ طرابلس غرب اور بلقان، کریٹ، یونان وغیرہ میں قریبی زمانہ میں پیش آئے تھے۔ بہرحال ترکی حکومت سے مجبور ہو کر اعلان جنگ کر دیا تو اس پر تقریباً آٹھ یا نو محاذوں سے حملہ کیا گیا۔ انگریزوں نے عراق (البصرہ) پر عدن پر سویز پر چناق قلعہ پر اسی طرح روس نے متعدد تین چار محاذوں پر اس یورش کی وجہ سے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے چینی ہوتی کم تھی۔ چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہندؒ نے حاجی ترنگ زئی صاحب کو مطلع کیا کہ ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں اور وہ ضروری کاروائی عمل میں لائیں۔ اسی طرح مرکز یاغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا۔ چنانچہ جب حاجی مرحوم پہنچے مجاہدین کا جمگھٹا شمار سے زیادہ ہو گیا۔ مجاہدین چمرقند (حضرت سید احمد شہید) کی جماعت میں مل گئی۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور بفضلہ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی اور انگریزوں کو جانی اور مالی بے حد نقصان اٹھا کر اپنی سرحد پر لوٹ آنا پڑا اور اپنے استحکامات قدیمہ میں پناہ لینا ناگزیر ہو گیا۔ اس پر انگریز نے بالمقابل متعدد مذکورہ ذیل کاروائیاں شروع کر دیں۔ (الف) فوجوں کو اطراف ہندوستان سے جمع کر کے بڑی مقدار میں سرحد پار بھیجنا۔ (ب) عوام میں پروپیگنڈا کرنا کہ یہ جہاد نہیں ہے جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا۔ بغیر بادشاہ کے جہاد حرام ہے۔ (ج) پانی کی طرح روپیہ خرچ کرنا اور اپنے لوگوں کو قبائل کے سرداروں کے پاس بھیجنا اور مال و زر بے شمار دے کر ان کو جماعت مجاہدین اور حاجی صاحب موصوف سے توڑنا (د) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانان سرحد اور افغانوں کے بادشاہ میر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان ہیں، مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہئے۔ اور اس وقت تک انتظار ضروری ہے جب تک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں (ہ) اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کاغذوں پر بیعت جہاد کر کے دستخط کریں۔ اور امیر کابل کے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کے دفتر میں یہ کاغذات بھیجیں (و) امیر حبیب اللہ خاں کو مختلف وعدوں کے سبز باغ دکھلا کر اور بے شمار اموال اور نقد روپیہ دے کر اپنی طرف مائل کرنا اور جہاد کے لئے کھڑے ہونے سے روکنا اور یہ وعدہ کرنا کہ اس جنگ سے فارغ ہو کر تمہارے لئے فلاں فلاں وعدے پورے کر دیئے جائیں گے۔ ان اور ان جیسی دیگر ڈپلومیسیوں کا اثر ہونا طبعی طور پر لازمی تھا۔ چنانچہ اثر ہوا اور بہت برا

ہوا۔ مگر اتنا نہ ہوتا اگر مجاہدین کو رسد اور کارتوسوں کی نیز دیگر اسلحہ کی کمی کی مشکلات نہ پیش آجاتیں۔ ادھر یہ کیا گیا کہ مسلمانان ہند کے ہیجان اور اضطراب روکنے کے لئے ہندوستان میں اعلان کیا گیا۔ (الف) ترکوں کو جنگ کے لئے ہم نے مجبور نہیں کیا بلکہ ترک از خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں اور ہم تو ان کے اعلان کی وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ حالانکہ ترکوں کو جنگ پر انگریزوں نے مجبور کیا تھا۔ جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں۔ (ب) یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں ہے، حالانکہ فتح بیت المقدس پر وزیر اعظم انگلستان لائڈ جارج نے اپنے بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا۔ (ج) ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات۔ جدہ۔ مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ۔ بغداد وغیرہ پر بمباری نہ کریں گے اور نہ کوئی اثر جنگ کا ان مقامات مقدسہ پر پڑنے دیں گے۔ مگر بالکل اس کے خلاف عمل کیا گیا جس کا تذکرہ ہم مفصل طور سے عہد شکنیوں کے باب میں کر چکے ہیں۔ (د) ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں حالانکہ ۱۸۵۷ء میں سلطان عبدالحمید مرحوم کا فرمان مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے نہ لڑنے اور ان کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا اور ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا کہ خلیفہ کے حکم پر چلنا مذہبی حیثیت سے فرض ہے۔ چنانچہ امیر عبدالرحمٰن خاں والئی کابل مرحوم اپنی تزک میں لکھتے ہیں کہ اسی فرمان خلیفہ کی بنا پر سرحدی قبائل ٹھنڈے پڑ گئے۔ بہر حال ترکوں کے خلیفہ اسلام نہ ہونے اور عدم استحقاق خلافت پر فتوے لکھوائے گئے اور بار بار حضرت شیخ الہند کے سامنے دستخط اور تصدیق کے لئے پیش کئے گئے، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور بھرے مجمع میں پھینک کر لکھنے والوں کو بہت برے الفاظ کہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفر حجاز

حضرت شیخ الہندؒ کے پاس برابر کیفیات جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں ابتدائی کمزوریوں میں کارکنان مرکز کا پیغام آیا کہ رسد اور کارتوسوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں۔ جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہاد حریت جاری نہیں رہ سکتا۔ بحمد اللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں ہے مگر رسد اور اسلحہ کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں۔ ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے۔ اگر کارتوس اور رسد کافی مقدار میں ہو تو توپوں اور مشین گنوں ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے چنانچہ اس امر کی بناء پر حضرت شیخ الہند کا ارادہ بدلا اور مولانا عبیداللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہنچنا ضروری قرار دیا مولانا عبیداللہ صاحب کے کابل جانے کی تفصیل ہم ان کی ذاتی ڈائری سے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور حضرت شیخ الہند کے حجاز جانے کی تاریخی تفصیل ہم سفرنامہ مالٹا میں لکھ چکے ہیں [ل]۔ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں سیاسی کارناموں کو باقتضا

[ل] سفرنامہ "مالٹا" کا وہ مضمون جس کے متعلق اوپر اشارہ ہوا وہ یہ ہے:۔

مولانا مرحوم کا حجاز کو روانہ ہونا | ماہ شوال ۱۳۳۳ھ میں قصد فرمایا۔ چونکہ مولوی عزیز گل صاحب خاص خادم کو اپنے وطن کی طرف جانا تھا اور اپنے اکابر سے ملنا اور اجازت چاہنا ضروری تھا۔ اس لئے ان کی واپسی کا انتظار (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

وقت ہم نے اس میں چھپایا اور ذکر نہیں کیا۔ اور بعض امور کا جان بوجھ کر انکار کیا تھا۔ کیوں کہ ماحول اس وقت میں اسی کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فرمایا۔ اس مدت میں سامانِ سفر قدرے مہیا ہو گیا۔ عالی جناب حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر بزرگ جناب ڈاکٹر انصاری نے اس سفر میں نہایت زیادہ امداد دی جس کے حضرت مولانا مرحوم ہمیشہ ممنونِ منت رہا کئے حکیم صاحب موصوف مولانا سے پہلے بمبئی پہنچ گئے اور ہر قسم کا ضروری سامانِ سفر نہایت فراخ دلی کے ساتھ مہیا کر دیا۔ بلکہ جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ کا بھی انتظام کافی طور پر کر دیا۔

مولانا کے رفقائے سفر | مولانا کی روانگی ایک معمولی شخص کی روانگی نہ تھی۔ بہت سے اربابِ عقیدت استفاضہ بخدمت کے لئے ساتھ ہو لئے جن میں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں:۔

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوری۔ مولوی محمد میاں صاحب انبہٹوی۔ مولوی عزیز گل صاحب ساکن زیارت کاکا صاحب۔ حاجی خان محمد صاحب مرحوم۔ مولوی مطلوب الرحمان صاحب دیوبندی حاجی محبوب خان صاحب سہارن پوری۔ حاجی عبدالکریم صاحب سرونجی۔ مولوی وحید احمد صاحب۔ وغیرہ۔

مولانا کے سفر کی نسبت افواہ | عام لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ مولانا دیوبند سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ اور اب ہمیشہ حرمین شریف میں عمر بسر فرمائیں گے اور چونکہ مولانا مرحوم نے بخوف وفات اپنی جائیداد شرعی طریقہ پر ورثا میں تقسیم کر دی تھی۔ اس لئے اور بھی لوگوں کو اس خیال سے تقویت ہوئی۔ مولانا نے ایک عرصہ تک کے لئے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ اس خاص افواہ کی وجہ سے ہر اسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا مجمع زیارت کے لئے موجود رہتا تھا۔ طلباء و مدرسہ نے اپنے اپنے اعزا کو تاریخ روانگی سے تار کے ذریعہ مطلع کر دیا تھا۔ غرضیکہ اسٹیشن پر ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے مصافحہ کرنا بھی سخت دشوار تھا۔ مشایعت کرنے والے بھی بہت سے ساتھ ہو گئے تھے۔ دہلی میں مولانا مرحوم نے گاڑی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر جا کر چائے بھی نوش فرمائی اور بہت تھوڑی دیر قیام فرما کر گاڑی کے وقت اسٹیشن پر آ گئے۔ ناگرہ ریلوے سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں رتلام۔ راندیر میں بھی قدرے قیام فرمایا۔ کیوں کہ ان مقامات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خاص لوگ تھے جنہوں نے سخت اصرار فرمایا تھا۔

راندیر سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچے اور انجمن محافظ حجاج کے آفس میں جس کو حکیم عبدالرزاق صاحب نے پہلے سے آراستہ کر رکھا تھا۔ قیام فرمایا۔ وہاں بھی مولانا کے زائرین کا ایک بڑا مجمع رہتا تھا۔ اگر انجمن کے کارکن انتظام کافی نہ کرتے تو غالباً مولانا کو آرام کی صورت ممکن ہی نہ ہوتی۔

بمبئی سے مولانا کی روانگی | جو تاریخیں اکبر جہاز کی روانگی کی تھیں، اس کے ٹکٹ مولانا مرحوم اور ان کے ساتھیوں کے لئے کٹ گئے تھے۔ مولانا اور ان کے بعض خاص خدام کے ٹکٹ سیکنڈ کلاس کمرہ کے اور باقی ماندہ چھتری یا تتق کے تھے چنانچہ بروز شنبہ ۷ ذی القعدہ ۱۳۳۳ھ کو جہاز پر سوار ہو کر جدہ کو روانہ ہو گئے۔ چونکہ اکثر ہمراہیوں (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

چاہتا تھا۔ اب چونکہ موانع زائل ہو گئے ہیں اس لئے صرف اسی کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چونکہ اس وقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی طبیعت دریائی سفر سے مانوس نہ تھی۔ اس لئے عموماً ان کو بدمزگی اور چکر وغیرہ کی شکایت پیش آئی جس کی وجہ سے میوہ جات اور عمدہ غذائیں اپنے موقع پر صرف نہ ہوئیں جن کی بڑی مقدار حکیم صاحب نے مولانا اور ان کے رفقاء کے لئے مہیا کی تھی، بلکہ بہت سی چیزیں ضائع ہوئیں۔ بوجہ ظہور جنگ ان دنوں قرنطینہ جزیرہ کامران سے اٹھا لیا گیا تھا۔ اور قریب جدّہ کے مقام سعد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ وہاں جہاز نے لنگر ڈالا اور بخیر و خوبی مولانا اور ان کے رفقاء اترے۔ اور ایام قرنطینہ نہایت عافیت سے انجام دے کر جدّہ پہنچے۔

خفیہ پولیس کی افواہ | بمبئی میں سوار ہوتے وقت بعض لوگوں نے مولانا کے رفقاء سے یہ کہا کہ تقریباً آٹھ دس آدمی تمہارے ساتھ خفیہ پولیس کے ہیں۔ ان سے احتیاط رکھنا (ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بیان صحیح تھا یا غلط) چونکہ یہ بات اہل حجاز کو معلوم ہو چکی تھی۔ کسی شخص نے جو کہ غالباً جدّہ یا مکّہ معظمہ کا رہنے والا تھا۔ اس کو ٹرکی پولیس تک پہنچا دیا۔ اور جو لوگ مشتبہ تھے اُن کے نام ونشان بتا دیئے اور کہہ دیا کہ یہ لوگ مولانا پر مسلّط ہو کر آئے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کا خیال نہ مولانا کو تھا اور نہ اُن کے رفقاء کو۔ ٹرکی پولیس نے فوراً ان لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اور مولانا مرحوم کی خدمت میں پولیس کا افسر تصدیق کرانے کے لئے حاضر ہوا۔ مولانا خود تو آفس میں نہ گئے مگر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ کو بھیج دیا۔ چونکہ واقعی طور پر کوئی یقینی بات تھی ہی نہیں۔ اس لئے مولوی صاحب موصوف نے یہی بیان دیا کہ ہم کو کوئی یقین ان لوگوں کے سی۔ آئی۔ ڈی ہونے یا مولانا پر مسلّط کئے جانے کا نہیں ہے۔ ہم کوئی شہادت ایسی نہیں دے سکتے جس کا ہم کو علم نہیں۔ مگر پولیس ٹرکی نے اس جواب کو اس پر حمل کیا کہ چونکہ ان لوگوں کو پھر ہندوستان جانا ہے' اس لئے صریح طور پر اپنی معلومات کو ظاہر نہیں کر سکتے الحاصل ٹرکی پولیس نے ان لوگوں کو زیر حراست رکھا اور اسی طرح ان کو حج کرا کر یہ کہا کہ اگر تم اپنے محافظ سپاہیوں کا خرچ دو تو تم کو مدینہ منورہ کی زیارت کی اجازت مل سکتی ہے ورنہ تم کو ہندوستان واپس ہونا پڑے گا چونکہ ان لوگوں نے پاس اپنا خرچ نہ تھا۔ اس لئے وہ بمبئی واپس کر دیئے گئے۔

دُوسری افواہ | بعض خفیہ پولیس کے افسروں کا بیان ہے کہ جب مولانا مرحوم بمبئی پہنچے تو وہاں کے افسر پولیس کے پاس تار آیا کہ مولانا کو بمبئی میں گرفتار کر لیا جائے۔ اور آگے جانے نہ دیا جاتے۔ چونکہ مولانا کے پاس بہت بڑا مجمع رہتا تھا۔ اس لئے بمبئی کے مقامی حکام کو بلوہ کا خوف ہوا۔ اور اس وجہ سے انہوں نے عملدرآمد سے پہلو تہی کی پھر دوسرا حکم روانگی کے بعد جہاز کے کپتان کے پاس پہنچا کہ مولانا کو جدّہ میں اترنے نہ دیا جائے بلکہ جہاز پر ہی گرفتار کر لیا جائے۔ مگر یہ حکم اس کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ مولانا جزیرہ سعد میں برائے قرنطینہ اُتر چکے تھے۔ اس لئے ہمیں معذوری رہی (ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں بیان کہاں تک صحیح ہیں۔ مگر ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے۔

مولانا مرحوم کی جدّہ سے روانگی اور مکّہ معظمہ میں داخلہ | ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

سرحد کے واقعات ہو رہے تھے۔ حکومت ہند بوکھلائی ہوئی تھی اور وہ معمولی شبہہ پر بھی گرفتار کر کے نظر بند کر رہی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سی۔آئی۔ڈی کی اطلاعات خود ہندوستان میں اور سرحد یاغستان میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں۔ اس لئے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اسی وجہ سے زور دیا تھا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عملداری سے نکل جائیں۔

زمین خم بودم دیو اینجا در کمند آمد
نگاه حضرت محمود و یک دیو بند آمد
قیامت را بقامت بستے دام غلط کردم
قیامت ہا بلا گردان آں بالا بلند آمد
ادب ناآشنا قدر تماشائش چه میداند
که در درگاه حضرت ہر که آمد ارجمند آمد
چه خواهم از تماشائش چه گویم از تماشائی
تماشا خود فروش آمد تماشا خود پسند آمد
به پیش روی لیلی مهر و مه را بر فلک نالم
نگاه حضرت مجنوں چه مشکل پسند آمد
ز انفاس گرامی خاک پنجاب آبرو دارد
گرامی از مریدانش عظامی سر بلند آمد

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) اونٹوں کی سواری پر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور اٹھائیسویں کو مکہ معظمہ میں شب بخیر گذار کر شام کو داخل ہوئے۔ وہ زمانہ طبعی طور پر حجاج کے ہجوم کا ہوتا ہے۔ مگر چونکہ جنگ کی وجہ سے بہت ملکوں سے حجاج کی آمد و رفت بند یا کم ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے حسب دستور ہجوم میں کمی ضرور تھی، مگر تاہم مکہ معظمہ کی گلیاں اور مکانات مسافرین سے لبریز تھے حرم محترم میں بھی لوگوں کی کثرت تھی۔ مولانا مرحوم طواف قدوم وسعی وغیرہ کرنے کے بعد احباب سے ملنے اور ادائے عبادت میں بدل وجان مشغول ہو گئے۔

حضرت رحمۃ اللہ نے حجاز جانے کا ارادہ کرلیا۔ پہلے سے کوئی تذکرہ نہ تھا۔ فوراً روانہ ہوگئے۔ اب حکومت کا شبہ اور قوی ہوگیا چونکہ ترکی
جنگ کر رہی ہے۔ حضرت شیخ الہند وہاں جاکر ساز باز کرلیں گے۔ اس لیے ان کو روکنا اور گرفتار کرلینا چاہیئے۔ مگر وہ ملک کی اندرونی ہیجان ا
سے اس زمانہ میں بہت بچتی تھی۔ اس لیے ان کی گرفتاری کے احکام جاری کئے گئے۔ مگر اس طرح کہ ہیجان کی نوبت نہ آئے۔ حضرت کے سفر کی
نہ تھی۔ ہر جگہ تار چلے گئے تھے۔ ہر جنکشن پر آدمیوں کا جمگھٹا ہو جاتا تھا۔ اس لیے راستہ میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ بمبئی پہنچے تو وہاں بھی
لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ گرفتاری کے لیے گورنمنٹ بمبئی کے نام گورنر یوپی کا تار پہنچا تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ پھر گورنر یوپی نے بواسطہ مرکزی حکومت
کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن صاحب کو جہاز سے اتار لو۔ مگر یہاں بھی لوگ ڈاکٹر انصاری صاحب کے لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے تار میں
تاخیر کردی کہ جہاز عدن سے روانہ ہوگیا۔ پھر تار جدہ میں جہاز کے کپتان کو دیا گیا کہ ان کو جہاز میں گرفتار کرلو۔ اترنے نہ دو۔ مگر اس وقت گورنر حجاز
یہ تھا کہ جدہ سے پہلے حجاج کو جزیرہ سعد میں اتار کر مکہ معظمہ پہنچا پا جاتے۔ اس لیے وہ تار کپتان کو اس وقت ملا۔ جب کہ تمام حجاج جزیرہ سعد
اتر چکے تھے۔ البتہ حضرت شیخ الہند کے ساتھ متعدد سی آئی ڈی بمبئی بلکہ پہلے سے کردیئے گئے تھے۔ تاکہ وہ تمام حرکات و سکنات کی نگ
اور نوٹ کرتے رہیں۔ مگر جزیرہ سعد میں اترتے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولیس کو اطلاع کردی کہ فلاں فلاں شخص انگریزوں کے سی آئی ڈی ہیں
ترکی پولیس نے گرفتار کرلیا اور اپنی حفاظت میں حج کرا کے ہندوستان واپس کردیا تاہم کچھ مخفی لوگ باقی رہ گئے۔ بہر حال گرفتاری کی کوششیں پیچھے
حضرت شیخ الہند اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آگے آگے اس طرح محفوظ ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

حافظ عبد الجبار صاحبؒ دہلوی سے مولانا شیخ الہندؒ کی ملاقات

مکہ معظمہ میں بہت سے ہندوستانی تاجر کام کرتے ہیں۔ مگر دہلی کے تاجر حا
جان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے۔ تجارت بھی ان کی
پیمانہ پر ہے اور دینداری اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے
اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس خاندان کا
سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین مجاہدین ستیانہ وغیرہ سے بھی قدیمی تعلق ہے۔ اس لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حافظ عبد الجبار
صاحب سے جو کہ اس خاندان میں معمر اور سمجھدار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے، ملے اور ان سے

گورنر حجاز غالب پادشاہ سے ملاقات

معاملات ذکر کرکے گورنر حجاز غالب پادشاہ سے ملاقات کرانے کی
انھوں نے اسی وقت ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جو کہ
تجارت کرتے تھے اور ترکی اور عربی زبان سے خوب واقف اور
ترکی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے۔ بلایا۔ اور حضرت شیخ الہند کے
وہ گئے اور غالب پادشاہ سے ملاقات کرادی اور جو باتیں حضرت شیخ الہند نے کیں انکا ترجمہ کرکے غالب پاشا کو سمجھایا۔ غالب پاشا نہایت
سے تمام باتوں کو سنتے رہے۔ معمولی ملاقات کے بعد کہا کہ آپ کل اسی وقت تشریف لائیں۔ اس وقت میں جواب دونگا۔ حضرت شیخ الہند
روز واپس آگئے۔ غالب پاشا نے ہندوستان کے معزز تاجروں سے بالا بالا تحقیق کی کہ مولانا محمود حسن کی حیثیت ہندوستان میں کیا ہے
حضرت کی علمی اور عملی حیثیت، شہرت اور قبولیت کی بہت اونچی شان بتلائی۔ لہٰذا اگلے دن حضرت جب ملاقات کے لیے تشریف
زیادہ اعزاز کیا۔ اور نہایت تپاک سے ملے اور جو کچھ حضرت نے کہا، قبول کیا۔ دیر تک تحریک اور مشن آزادی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں

نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا۔ ان سے ملنے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے۔ مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے کا اصرار کیا تو انھوں نے ایک تحریر تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ کر دی اور ایک تحریر گورنر مدینہ بصری پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں۔ انکا احترام کرو اور ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچا دو۔ اور ایک تحریر انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں۔ ان کے مطالبات پورے کیجئے۔ پھر تحریک آزادی کے متعلق حضرت شیخ کو ہدایات کیں، کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا۔ ضرور کریں گے۔ عنقریب صلح کی مجلس منعقد ہوگی تو ہم اور ہمارے حلفاء جرمنی اور آسٹریا وغیرہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے پوری جدّ و جہد کریں گے۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستانی لیڈر سست پڑجائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آکر اس کے انتداب (مینڈیٹ) یا اس کی تابعداری پر راضی ہوجائیں۔ تمام ہندوستانیوں کو اخباروں، عام مجمعوں، تقریروں، تحریروں میں اندرون ہند اور بیرون ہند ایک زبان اور ایک قلم ہوکر یہی مطالبہ رکھنا چاہیئے اور جب تک مقصد حاصل نہ ہوجائے۔ ساکت نہ ہونا چاہیئے۔ اس کا پروپگنڈا پوری طرح جاری کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے آپ کو واپس جانا اور آپس میں اتفاق اتحاد کے ساتھ مطالبہ کرانا ازبس ضروری ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس وقت انگریز مجھ کو نہایت خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں اگر ہندوستان جاؤنگا تو راستے ہی میں گرفتار کرلیا جاؤنگا۔ مگر میں اپنے رفقاء کو اس کام کے لیے تیار کرکے ہندوستان بھیجتا ہوں۔ اگرچہ وہاں کی جماعتیں کانگریس وغیرہ اس پر للدر آمد کر رہی ہیں۔ مگر اب آپ کے حکم کے موافق کوشش زیادہ ہوگی اور پہلے سے زیادہ زوردار طریقے پر یہ مطالبہ جاری کیا جائے گا۔ میں بالفعل بالا بالا ہندوستان کی مغربی حدود میں جانا چاہتا ہوں۔ وہاں میرے مشن کے لوگ کام کر رہے ہیں۔ ان میں مل کر کام کرونگا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد جب تک وہ مکہ معظمہ میں رہے۔ دو تین ملاقاتیں نہایت رازدارانہ ہوئیں۔ مکہ معظمہ کے ہندوستانی باشندوں یا انگریزی سی آئی ڈی کو خبر نہ ہوسکی پھر غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کو روانہ ہوگئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں تھوڑے دن قیام کرکے استنبول روانہ ہوں گے۔ اپنے تمام ساتھیوں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب مولانا سہول صاحب وغیرہ کو آخری قافلہ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان کو روانہ کردیا۔ جدہ پہنچ کر ان کو کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا۔ اس لیے وہاں ٹھہرنا پڑگیا۔ جدا ہوتے وقت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو دیوبند کے مرکز پر کام کرنے کی ہدایات فرمائیں۔ اور بہت سے خفیہ امور پر مطلع فرمایا اور مولوی محمد میاں صاحب کو جو کہ بعد میں محمد منصور انصاری کے نام سے مشہور ہوتے۔ خاص شعبوں کی نگرانی سپرد کی۔ غالب پاشا کی تحریر بھی ان ہی کو دی گئی۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اگرچہ پہلے سے اس تحریک آزادی میں شریک نہیں تھے۔ مگر مدینہ منورہ میں پہنچ کر بالکل متحد اور ہمنوا ہوگئے تھے۔

میرا سیاسیات میں داخل ہونا

میں اس وقت تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہند کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد حضرت شیخ الہند نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرماکر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک علمی جدّ و جہد میں مشغول تھا۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جب کہ محاذ سویز کے لیے متطوعین (والنٹروں) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا۔ ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہوکر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لیے مدینہ منورہ سے گئے تھے۔ مگر اس کے علاوہ عملی جدّ و جہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہند کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتداء اور بسم اللہ کا وقت ہے۔ اور یہی وقت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین۔ اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب جب تک حجاز

میں رہے۔ بالکل متفق اور ہم نوا ہے۔ تقدیری امور پیش آکر رہتے ہیں۔ کچھ لوگ حضرت مولانا خلیل احمد کے ساتھ جہاز میں لاہور کے باشندے رفیق رہے تھے۔ ان میں سے دو نوجوان مدینہ منورہ میں رہ گئے۔ ہندوستان واپس نہیں ہوئے۔ جب تک عام حجاج مدینہ منورہ میں مقیم رہے کوئی تفتیش ترکی پولیس نے نہ کی۔ مگر قافلہ روانہ ہونے کے بعد تجسس شروع اور ہر باقی رہنے والے کی دیکھ بھال شروع ہوئی۔ وہ دونوں لاہوری نوجوان پولیس انسپکٹر کی نظر میں مشتبہ ثابت ہوئے۔ پولیس نے ان کو گرفتار کرلیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سیدھے سادھے بزرگ تھے ان کو ان دونوں کے متعلق حسن ظن تھا۔ مولانا نے ان کو گورنر مدینہ کے یہاں برأت کی۔ اس لیے پولیس کمشنر نے مولانا کو بھی مشتبہ قرار دیا اور گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کو نہ صرف ان دو نوجوانوں کی طرف سے بلکہ مولانا خلیل احمد صاحب کی طرف سے بھی بدظن کرنا شروع کیا۔ ادھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے جدہ سے ہر ڈاک میں طویل طویل خطوط پانچ پانچ چھ چھ ورقوں پر بھیجنے شروع کئے۔ وہاں ان کو کوئی کام نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند کو بلادھڑک مضامین لکھتے تھے اور چونکہ بوجہ جنگ ڈاک خانہ میں کوئی خط غیر عربی یا ترکی نہیں لیا جاتا تھا تو انھوں نے بدویوں کے ذریعے بھیجنا شروع کیا۔ وہی ڈاک لانے والا بدوی بھی طریقہ پر لاتا تھا۔ پوسٹ آفس کی مہر اور ٹکٹ ان پر نہیں تھے۔ یہ طریقہ حجاز میں جاری تھا۔ وہ ڈاک لانے والا بدوی کچھ اجرت لیکر مکتوب الیہ کو پرائیویٹ خط پہنچا دیتا تھا۔ کسی طریقہ سے وہ خطوط بدوی سے پولیس کمشنر نے حاصل کر لیے۔ وہ خطوط سنسر ہوئے۔ تو پولیس کمشنر کو ان کے ترجموں سے اور بغیر پوسٹ آفس آنے سے شبہ ہوا۔ اس نے گورنر مدینہ " بصری پاشا"، کو بدظن کر دیا۔ جب کہ ہم سب مطلمئن تھے۔ پولیس کمشنر کی طرف سے گورنر مدینہ طیبہ کے پاس یہ شکائتیں پہنچیں اور وہ ان سب حضرات سے بدظن ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت شیخ الہند صاحب اس سے ملنے اور استنبول جانے کے لیے تقاضا کرنے گئے۔ تو اس کا رخ بدلا ہوا پایا۔ اور دیکھا کہ وہ غیر اطمینان بخش باتیں کر رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کارروائی کی گئی کہ دونوں حضرات (شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب) کو آفس میں بلاکر پوچھ گچھ کی گئی کہ دونوں جوابات قلمبند کر کے شام کو بھیجے گئے۔ اس لیے سب کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی فتنہ سامنے نہ آجائے۔ جنگ کا زمانہ ہے، ہر ایک حکومت اس وقت انتہائی احتیاط سے کام لیتی ہے۔ حضرت شیخ الہند نے ان احوال کو دیکھ کر اسی ترجمان (مکی تاجر) کے واسطے سے غالب پاشا کو خط لکھا کہ یہاں گورنر مدینہ رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ پولیس کمشنر نے گورنر مدینہ کو مشتبہ کر دیا ہے۔ کیونکہ اس کو ہمارے مخالفین نے بدظن کر دیا ہے۔ اس خط کے پاتے ہی غالب پاشا نے گورنر مدینہ کو نہایت تاکیدی خط لکھا کہ مولانا محمود حسن صاحب بہت بڑے اور معتمد علیہ شخص ہیں۔ میں نے پوری تحقیق کر لی ہے۔ ان پر ہرگز شبہ نہ کرو۔ اور ان کے منشا کے مطابق ان کو انور پاشا کے پاس روانہ کردو۔ اس سے گورنر مدینہ منورہ کا رویہ اور خیال یک بارگی بدل گیا۔ اور اس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بلاکر معذرت کی اور پولیس کمشنر کو بلاکر تنبیہہ کی اور حضرت شیخ الہند کو کہا کہ آپ تیاری کرلیں۔ جب آپ تیار ہوجائیں گے۔ بھیج دیا جائے گا۔ اس کے ایک دو دن بعد ہی خبر آئی کہ انور پاشا اور جمال پاشا مدینہ منورہ آرہے ہیں۔

انور پاشا اور جمال پاشا کی مدینہ منورہ میں آمد اور ملاقات

اس وقت تک مدینہ حجاز ریلوے جاری تھی۔ ٹرین آتی جاتی تھی۔ تار بھی جاری تھا۔ یکایک تار آیا کہ یہ دونوں وزیران جنگ دورہ کرتے ہوئے کل کو مدینہ منورہ پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے بھی عرضی تیار کی۔ حکومت مدینہ منورہ بھی استقبال کی تیاری میں مشغول ہوگئی اور اہل شہر بھی استقبال کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ انور پاشا اس زمانہ میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا چوتھے فیلق (ڈویژن) کے جو کہ محاذ جنوبی اور غربی پر یعنی میدان سویز سینا، حجاز پر متعین تھا، کمانڈر تھے۔ اس لیے انور پاشا کا فریضہ تھا کہ مرکز کی خبرگیری رکھتے ہوئے ہر محاذ کی محافظت کریں اور جمال پاشا

برف اپنے محاذ کی خبرگیری ضروری تھی۔ اس لیے انور پاشا تمام محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے جب محاذِ جنوبی پر پہنچے اور سوریہ (سیریہ، شام) اور سوریہ
رہ سے فارغ ہوئے تو ضروری معلوم ہوا کہ بادشاہِ دوجہاں سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرلیں۔ اس لیے مدینہ
رہ کی حاضری کا ارادہ کیا گیا۔ اور جمعہ کا مبارک دن اس کے لیے مقرر کیا گیا چنانچہ جمعہ کی صبح کو تقریباً ۹ یا ۱۰ بجے وہ اسپیشل ٹرین جس میں یہ دونوں وزرا
ان کے رفقاء تھے۔ حسبِ اعلان مدینہ منورہ پہنچی۔ وقتِ معین سے پہلے مشتاقانِ ملاقات اور زائرین کی بے شمار تعداد نے تمام اسٹیشن اور اس کے
ب کو بھر دیا تھا۔ اہلِ شہر اور حکومت اور فوج کی طرف سے جلوس کا انتظام کیا گیا تھا۔ جب دونوں حضرات اترے تو اسٹیشن کے بڑے ہال میں
ے وہاں میونسپلٹی کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا۔ چائے کا پہلے سے انتظام تھا۔ رؤسائے شہر اور معززین کا تعارف کرایا گیا۔ ایڈریس کا جواب دینے کے
جدِ نبوی کی طرف روانگی ہوئی۔ چونکہ جمعہ کا وقت قریب آگیا تھا۔ اس لیے یہی قصد کیا گیا کہ زیارتِ حضور علیہ السلام سے فارغ ہوکر مسجد ہی میں ٹھہرے
۔ نماز جمعہ سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر جائیں۔ جلوس کی روانگی کے وقت، مثلاً سواری کے لیے پیش کی گئی۔ تو انور پاشا نے انکار کر دیا۔ اور
م غلامانہ طریق سے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اس لیے پیدل چلیں گے۔ اہلِ شہر نے پہلے ہی سے جلوس کی مندرجہ ذیل ترتیب
رکھی تھی۔ اربابِ طریقت کا مجمع مع اپنے اپنے مریدین کے سب سے آگے آگے زریں جھنڈے لیے ہوئے اور ذکر و تسبیح بالجہر کے ساتھ اشعار
پڑھتے ہوئے چل رہا تھا۔ ان کی سات یا آٹھ جماعتیں تھیں۔ اس کے بعد حرمِ محترم نبوی کے خدام کی علیحدہ علیحدہ مختلف جماعتیں تھیں۔ موذنوں کی
ت جاروب کشوں کی جماعت اماموں کی جماعت، خطیبوں کی جماعت علیحدہ علیحدہ تھیں۔ سب کے اخیر میں حجرہ شریفہ کے خصوصی خدام
ت (خواجہ سراؤں) کی جماعت تھی۔ سب کے سب اپنی اپنی یونیفارم (وردیاں) پہنے ہوئے حمد و صلوٰۃ دعا و ثناء پڑھتے ہوئے خراماں خراماں
تھے۔ ان کے پیچھے ان کے رفقاء اور حکامِ شہر تھے۔ ان کے بعد اہلِ شہر تھے۔ تمام جلوس کے دائیں بائیں مسلح فوجیوں کی قطار تھی۔ میں (کاتب
) تاک میں تھا کہ موقعہ ملے تو انور پاشا کے پاس پہنچوں اور عرضی پیش کر دوں۔ چنانچہ قطار چیر کر انور پاشا کے پاس پہنچا اور اس عرضی کو جس میں
شیخ نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی تھی، پیش کر دی۔ انھوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو دے دی۔ مفتی مامون بری کو جو کہ مدینہ منورہ
مذہبی اور دینی طبقات کے رسمی سردار تھے۔ اور نقیب الاشراف شامی رحمۃ اللہ علیہ کو جو کہ رفقاء انور پاشا میں سے تھے۔ میں نے پہلے سے
لیا تھا۔ ان کی اعانت اور ہمدردی کی وجہ سے مجھ کو کسی طرف سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ میں عرضی دے کر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر
یا اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی سعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب
قات پر پہنچے۔ ایک تنہا اور بند کمرہ میں ملاقات ہوئی۔ جمال پاشا سے باتیں ہوئیں۔ غالب پاشا کا خط ان کو دکھایا گیا۔ بہت خوش اخلاقی سے
ئے اور تمام باتیں غور اور اطمینان سے سنیں اور فرمایا کہ تحریک مطالبہ آزادی اہلِ ہند کو متفقہ طور سے جاری رکھنا چاہیے۔ جب تک مقصود
ادی کامل حاصل نہ ہو جائے۔ ساکت نہ ہوں۔ عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی۔ ہم اہلِ ہند کی آزادی کے لیے پوری جد و جہد عمل میں لائیں گے۔
من رہو اور جس طرح ممکن ہوگا۔ ہم انکی یعنی اہلِ ہند کی امداد و اعانت کریں گے۔ اس وعدہ اور عہد کے لیے انھوں نے کہا کہ تمہاری خواہش کے
تحریر بھی دیں گے۔ ہم نے عرض کیا کہ تحریر صرف ترکی زبان میں نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ہونی چاہیے۔ تاکہ اہلِ ہند سمجھ سکیں۔ انھوں
ر قبول کیا۔ مگر یہ کہا کہ چونکہ یہاں کا قیام حسبِ پروگرام تھوڑا ہے۔ اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے ہم شام (دمشق) جاکر تحریریں مکمل
ں گے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو حدود افغانستان تک بالا بالا پہونچا دیا جائے۔ ہندوستان کے راستے سے مجھ کو
سا مرکز تحریک یعنی یاغستان) اس وقت پہونچنا غیر ممکن ہے۔ انھوں نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران

میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور سلطان آباد تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے یہ امر ہمارے قبضہ سے اس وقت باہر ہے آپ جدہ ہی کے راستے سے اپنے وطن واپس جائیں۔ اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی کی عملداری میں کسی دوسری جگہ قیام گے۔ یہ اطمینان بخش باتوں کے ہوجانے کے بعد ہم واپس آگئے۔

مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں جلسۂ علماء اور حضرت شیخ الہند

مفتی مامون بری مرحوم صدر علماء مدینہ کے پاس انور پاشا کا حکم پہنچا کہ میں علماء مدینہ منورہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں۔ مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر ایک عالم کے حلقۂ درس میں علیحدہ علیحدہ جا کر تقریر سنوں اس لیے میری خواہش ہے کہ صبح کو بعد از اشراق مسجد نبوی میں علماء مدینہ جمع ہوجائیں اور اپنی اپنی تقریروں سے ہم کو مستفیض فرمائیں۔ مفتی صاحب موصوف چونکہ ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شیخ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس لیے کاتب الحروف اور حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نہایت دوستانہ بلکہ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے نقیب العلماء کو بھیجا کہ انور پاشا چاہتے ہیں کہ صبح کو اشراق کے بعد علماء کا اجتماع مسجد نبوی (حرم محترم) میں ہو اور علماء تقریر کر کے حاضرین کو مستفیض کریں۔ اس لیے تجھ کو اس وقت حاضر ہونا چاہیئے۔ اور میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر دو حضرات مشائخ بھی تشریف لائیں۔ ہمارے لیے یہ زریں موقعہ تھا۔ ہم نے قبول کیا چنانچہ اجتماع ہوا اور مقام صدارت انور پاشا کے لیے تسلیم کیا گیا۔ مفتی صاحب ان کے ساتھ وسط میں بیٹھے اور اپنے بائیں حضرت شیخ الہند اور انکے بائیں مولانا خلیل احمد صاحب اور ان کے بائیں کاتب الحروف کو بٹھایا گیا۔ مفتی صاحب نے اولاً انور پاشا اور جمال پاشا سے تمام علماء حاضرین کا تعارف اور مصافحہ کرایا۔ بعض حضرات نے کچھ نعتیہ اشعار بلند آواز سے پڑھے اس کے بعد تقریر کا حکم ہوا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمہم اللہ نے یہ عذر کیا کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ ہم کو عربی زبان میں تقریر کی عادت اور مہارت نہیں ہے۔ اس لیے ہم معافی چاہتے ہیں۔ پھر مجھ کو حکم کیا گیا۔ مجھ کو عربی زبان میں عادت تھی ہی۔ میں نے حسب مناسب وقت فلسفۂ جہاد پر مبسوط اور مفصل تقریر کی۔ جس سے عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی کہ نوع انسان کی فلاح اور بہبودی کے لیے جہاد عقلی طور پر ضروری ہے۔ اسی میں انسانوں کی ترقی اور بہبودی اور کمال مضمر ہے۔ اس کے علاوہ مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا۔ یہ تقریر تقریباً آدھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ جاری رہی۔ اس کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا اور نہایت توجہ اور غور سے سنتے رہے۔ بعد از تقریر سبھوں نے خوشی اور ممنونیت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد دوسرے علماء نے دوسرے موضوعوں پر تقریریں کیں۔ مگر افسوس کہ حاضرین مجلس نے ان کی تقریروں کو اس قدر استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔ تقریباً دو گھنٹہ کے بعد یہ جلسہ ختم ہوگیا۔ انور پاشا نے کچھ نقد حاضر ہونے والے علماء کے لیے مفتی صاحب موصوف بطور نذرانہ بھیجا جو کہ پانچ اشرفی فی کس تقسیم کیا گیا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب نے عذر کیا کہ ہمارے پاس خرچ کافی مقدار میں موجود ہے۔ ہم کو حاجت نہیں ہے تو کہا گیا۔ کہ یہ نقد صدقہ اور خیرات نہیں۔ یہ عطیہ شاہانہ ہے۔ اس کو قبول کرنا چاہیئے۔ تو دونوں حضرات نے قبول فرما کر مجھ کو دے ہی دیا۔

انور پاشا اور جمال پاشا کا شام کو روانہ ہونا اور تحریرات کا وہاں سے بھیجنا

اس جلسہ کے چند گھنٹہ بعد دونوں حضرات اور ان کے رفقاء اسپیشل ٹرین میں شام کو روانہ ہو گئے اور دو تین دن کے بعد تحریریں تینوں زبانوں میں مرتب شدہ دونوں وزیروں

دستخط سے حضرت شیخ الہند کے پاس بذریعہ گورنر مدینہ منورہ شام سے آگئیں۔ مضمون سب کا ایک ہی تھا۔ صرف زبان کا فرق تھا۔ جس میں ہندوستانیوں کے مطالبہ آزادی کے استحسان اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بارے میں امداد و اعانت کا وعدہ تھا اور ہر اس شخص کو جو کہ ترکی رعیت یا ملازم ہو حکم تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند پر اعتماد کرے اور ان کی اعانت میں حصہ لے۔

تحریرات اور وثائق کا ہندوستان پہنچانا،

چونکہ حضرت شیخ الہند کو دھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو۔ میں مرکز تحریک "یاغستان" جلد از جلد پہنچ جاؤں۔ اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ترکی آفیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلمرو میں قیام کرکے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں اس لیے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد لیے جائیں اور ہر مرکز اور برانچ پر پہنچا دیئے جائیں۔ مگر انگریزی عملداری میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تفتیش ہوتی تھی۔ کسی چیز کا نکال کر لے جانا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ اس لیے تجویز فرمایا کہ لکڑی کا صندوق کپڑے کے رکھنے کا بنوایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دیئے جائیں اور پھر تختوں کو اس طرح ملا دیا جائے کہ جوڑ ظاہر نہ ہو۔ اس وقت ایک نہایت ماہر اور استاد بڑھئی ہمارے مکان میں لکڑی کا کام کر رہا تھا۔ اس سے کہا گیا۔ اس نے اسی طرح جاوی لکڑی کا صندوق بنا دیا۔ اور کھدے ہوئے تختے میں کاغذ رکھ کر اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو، شبہ بھی نہ کر سکے۔ صندوق میں کچھ زائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اور کچھ نئے کپڑے اور شامی تھان ریشمی اور غیر ریشمین مشجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لیے رکھ دیئے گئے اور چونکہ ہر مہینہ میں تجارتی جہاز مغل کمپنی کا غلہ اور سامان لیکر آتا تھا اور واپسی پر بقیہ حجاج کو لے جاتا تھا۔ تجویز ہوا کہ اس میں حضرت شیخ الہند کے بقیہ رفقا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء روانہ کر دیئے جائیں۔ چونکہ زمانہ جنگ کا تھا۔ اس لیے جہازوں کی آمد و رفت عام دستور کے مطابق جاری نہ تھی۔ اس لیے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند کے رفقاء میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خانجہاں پور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی (جو کہ حیدر آباد سندھ کے باشندے اور مشن آزادی کے پہلے سے ممبر تھے) باقی رہ گئے تھے اور جانے کا قصد[1] فرما رہے تھے۔

اور ان کو وہ صندوق دے دیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ اپنے مکان پر پہنچ کر ان کاغذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن صاحب (رئیس موضع رتھیڑی ضلع مظفر نگر) کو دے دیں گے۔ وہ احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے ان تحریروں کے فوٹو اتروا کر چند کاپیاں لے لیں گے اور فلاں فلاں جگہ پہنچا دیں گے۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز اور آپ کے رفقاء مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ کو

حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کا قافلہ ۱۲ جمادی الثانی کو مدینہ منورہ

---

[1] بلکہ اس قصد سے دو مہینہ پہلے جدہ روانہ ہو چکے تھے۔ مگر بندرگاہ پر جہاز نہ ملنے کی وجہ سے وہ اور شاہ بخش صاحب موصوف مکہ معظمہ جا کر بانتظار جہاز ٹھہر گئے تھے۔ حضرت شیخ الہند معہ دیگر رفقاء جب مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ پہنچے تو اس وقت تک یہ وہیں تھے اور جہاز کے منتظر تھے۔

سے روانہ ہوکر اخیر ماہ مذکورہ میں مکہ معظمہ پہنچا۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز نے چند روز مکہ معظمہ میں قیام فرما کر طائف کا قصد
اور ۲۰ رجب کو آپ طائف روانہ ہوگئے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور دیگر رفقاء مکہ معظمہ میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہند شریف
کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہوگئے۔ جب دس شوال کو طائف سے واپس ہوکر مکہ معظمہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد
اور دوسرے رفقاء جہاز آجانے کی وجہ سے جدہ روانہ ہوگئے ہیں۔ چونکہ کوئی خبر حضرت شیخ الہند کے طائف سے واپس ہونے کی نہ
اس لیے یہ سب حضرات بغیر انتظار اور بلا ملاقات روانہ ہوگئے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے ضروری سمجھا کہ ان سے وداعی ملاقات کی جائے
اس لیے حضرت شیخ الہند بھی جدہ روانہ ہوگئے۔ جب جہاز سامان وغیرہ اتار کر اور اپنی ضروریات پوری کر کے تیار ہوگیا۔ تو جانے والے
ٹکٹ لے کر سوار ہوگئے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب
اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ[1] کے ساتھیوں میں سے مولانا ہادی حسن خانجہان پوری اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی تھے۔ ان سبھوں کو حضرت
شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ساحل (پورٹ) تک رخصت کیا اور جہاز روانہ ہوگیا۔

تحریرات کا ہندوستان پہنچنا اور سی آئی ڈی کی تفتیش سے بچ کر نکل جانا،

بمبئی میں سی آئی ڈی کو اور حضرت شیخ الہند کے مخلصین کو خیال تھا کہ اسی جہاز میں حضرت شیخ الہند تشریف لائیں گے۔ اس لیے انگریزی پولس سی آئی ڈی اور اہل شہر کا بڑا مجمع جہاز پر پہنچ گیا تھا۔ اسی مجمع میں سے ایک صاحب
نے جو حضرت شیخ الہند کے مخلصین میں سے تھے۔ مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو مجھ کو فوراً دے دیجئے
اس کو نکال دونگا اور جہاں پہنچانا ہو اس کا پتہ دے دیجئے۔ وہاں پہنچادونگا۔ مولانا ہادی حسن صاحب اگرچہ پہلے سے ان سے واقف نہ
تھے۔ مگر ان کے مخصوص انداز سے ان کے اخلاص و صداقت کا یقین ہوگیا اور صندوق ان کے حوالے کر دیا۔ یہ صاحب عام مسافر والے
سامان کے ساتھ یہ صندوق بھی قلیوں سے اٹھواکر لے گئے اور فوراً اسٹیشن لے جاکر بذریعہ پارسل چلتا کر دیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی حضرت
شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ڈھونڈنے میں مشغول تھی۔ جب یہ یقین ہوگیا کہ حضرت شیخ الہند نہیں ہیں۔ البتہ ان کے ساتھ کے کچھ لوگ ہیں۔ تو پولیس
نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا ہادی حسن صاحب کو حراست میں لے لیا اور نہایت سخت تلاشی لی۔ حتیٰ کہ ہاتھ کی چھڑی
توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ مگر بحمد اللہ کوئی مشتبہ چیز نہیں نکلی۔ پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں نینی تال پہنچا دیا گیا۔ حضرت مولانا خلیل
احمد صاحب سے پوچھ گچھ ہوئی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز سے فلاں تاریخ کو گیا تھا۔ مولانا محمود حسن صاحب کا ساتھ نہ جاتے میں تھا۔ نہ آنے
میں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح حج و زیارت میں میری شرکت بھی رہی۔ میں ان کی پارٹی میں نہیں ہوں۔ ایک ہفتہ یا عشرہ حضرت مولانا موصوف
کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مولانا ہادی حسن صاحب کو روک لیا گیا۔ ان سے بہت زیادہ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈرایا دھمکایا گیا۔ سختی بھی کی گئی اور لالچ

---

[1] حاجی شاہ بخش صاحب سندھی کے پاس ان انقلابی اخباروں کے پرچے تھے۔ جن کو خیری برادرس نے برلن سے جاری کیا تھا اور جو اعلانات
سے ترغیب جہاد وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔ ان سب کو انھوں نے زنبیل میں حفاظت سے رکھ رکھا تھا۔ جب جہاز پر پولیس کی یہ یورش دیکھی تو یہ
بھیڑ میں زنبیل ہاتھ میں لٹکائے ہوئے پھرتی سے نکل گئے چونکہ غیر معروف شخص تھے کسی کو شبہ بھی نہ ہوا۔ مگر جب وطن پہنچے تو گرفتار کر لیے گئے اور کچھ دنوں نظر بند رہ کر رہا

دیا گیا۔ مگر یہ نہایت مستقل رہے۔ کسی راز کی خبر نہیں دی۔ جب ہر قسم کی سختی اور طمع دینے پر بھی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی تو ایک ڈیڑھ دن بعد آپ کو بھی رہا کر دیا گیا۔

صندوق خانجہاں پور میں

مولانا محمد نبی صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی راز کی چیز ہے۔ جیسے ہی صندوق پہنچا۔ اس کے کپڑے نکال کر لکڑی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیئے گئے اور اس صندوق کو توڑنا شروع کر دیا۔ ان کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی اور ایک تختہ کے اندر سے یہ تینوں کاغذات برآمد ہوئے۔ فوراً ہی ان کو نکال کر محفوظ کر لیا۔

پولیس کی یورش تلاشی اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز کی کرامت

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک صاحب کے بیان سے سی آئی ڈی نے پتہ چلا لیا کہ وہ کاغذات ایک صندوق میں مولانا ہادی حسن صاحب کے یہاں ہیں۔ فوراً مولانا کے مکان پر پولیس کی دوڑ پہنچی اور مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عجیب و غریب اتفاق تھا کہ مولانا محمد نبی صاحب اس وقت ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کر رہے تھے۔ سپاہیوں کی دوڑ دیکھ کر جلدی میں ان کاغذات کو توڑ مروڑ کر صدری کی جیب میں رکھ لیا اور صدری مردانہ مکان میں ایک کھونٹی پر لٹکا دی۔

تلاشی دس بجے سے شروع ہوئی اور نہایت سختی کے ساتھ چار بجے تک جاری رہی۔ عورتوں کو ایک کمرہ میں الگ بند کر دیا تھا ہر شخص کی تلاشی لے کر مردانہ مکان سے بھی نکال دیا گیا۔ صرف ایک نمبردار صاحب پولیس کے ساتھ رہے تھے۔ ہر ایک چیز کی تلاشی لی گئی کھیل کھلونوں اور عورتوں بچوں کی ڈبیوں تک کو کھول کھول کر دیکھا گیا۔ کپڑوں کے صندوق کی کم بختی آئی۔ اس کا ایک ایک تختہ توڑ کر ریزہ ریزہ کیا گیا۔ مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ دستیاب نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ صندوق وہ صندوق ہی نہ تھا۔ اور عجیب اتفاق یا حضرت شیخ الہند کی کرامت یہ تھی کہ اس صدری پر کسی کی نظر نہ گئی جو مردانہ مکان میں سب کے سامنے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی اور جس میں وہ خزانہ تھا جس کی جستجو میں پولیس سرگرداں تھی۔

چھ گھنٹہ کی سرگرم تفتیش اور تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ موضع رتہیڑی ضلع مظفر نگر میں ہے۔ یہاں جناب حاجی نور الحسن صاحب رہتے تھے جن کے متعلق حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز نے یہ طے فرما دیا تھا کہ وہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر اور اس کی کاپیاں کرا کر فلاں فلاں مرکز میں بھیجیں گے۔ پولیس حاجی صاحب کے یہاں بھی پہنچی۔ مگر ناکام واپس ہوئی۔

حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر دہلی کے یہاں تلاشی اور ناکامی

سراغ رساں نے پولیس کو صحیح بتایا تھا کہ حاجی احمد مرزا صاحب کے یہاں تحریروں کے فوٹو لیے جائیں گے۔ چنانچہ پولیس نے حاجی صاحب کی دوکان پر چھاپہ مارا۔ مگر اب تک وہ تحریر یا حاجی صاحب کے یہاں نہیں پہنچی تھی حاجی نور الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی وقت ان کو لے کر پہنچے تھے جب حاجی صاحب فوٹو گرافر صاحب کی دوکان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ پولیس دوکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ حاجی صاحب

ان تحریروں کو جیب میں ڈالے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔

دوسرے وقت، حاجی نور الحسن صاحب مرزا صاحب کی دوکان پر پہنچے۔ مرزا صاحب کی ثابت قدمی اور پختگی ملاحظہ کیجئے کہ پولیس ایک دفعہ چھاپہ مار چکی ہے۔ خدشہ اور خطرہ موجود ہے۔ مگر خطرہ سے بے نیاز ہو کر حاجی صاحب نے فوٹو لیے۔ عین اس وقت کہ پلیٹ پانی میں پڑی ہوئی تھیں اور پانی کا طشت میز کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ پولیس پہنچ گئی۔ ساری دکان چھان ماری۔ ہر ایک البم ٹٹولا۔ مگر اس طشت پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اس کو حضرت شیخ کی کرامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال پولیس یہاں سے بھی ناکام واپس ہوئی۔

حاجی صاحب کا حسب ہدایت کام کرنا

فوٹو کی کاپیاں تیار ہو گئیں۔ حاجی نور الحسن صاحب نے ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور جہاں جہاں پہنچانے کا حکم تھا، پہنچا دیا۔ یہ غلط ہے کہ ان تحریرات کو جلا دیا گیا۔ جیسا کہ مولانا عبید اللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ وہ تو اس زمانہ میں کابل میں تھے۔ ان کو غلط خبر پہنچائی گئی۔ یہ تمام فوٹو ذمہ داران مراکز کے پاس پہنچا تو دیئے گئے تھے۔ مگر چونکہ حکام کی طرف سے تشدد اور چھان بین بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ تو ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے ان کو جلا دیا ہو۔ تاکہ کوئی خدشہ باقی نہ رہے،

ان تحریرات کا کار آمد نہ ہونا

یہ تحریرات اور وثائق بہت زیادہ کار آمد ہوتے اور حکومت ترکیہ اور اس کے حلفاء پوری طرح امداد کرتے رہتے۔ مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ جرمن اور ترکی کی فتحمندی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف بن گیا اور مسٹر ولسن کے پرفریب نکات سامنے آئے تو یکایک حالت بدل گئی۔ اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی۔ امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار جب اتحادیوں (انگریزوں اور فرانس وغیرہ) کی مدد پر آ گئے اور ادھر شریف حسین نے غدر اور خیانت کر کے انگریزوں کی حمایت میں ترکوں کو ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچایا۔ عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلا دی۔ تاآنکہ سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل و غارت کرتے تھے اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے۔ اور جد و جہد سے جان چرانے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی ہی نا کامی ہی سامنے آ گئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ واقع ہو گیا۔ تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا مالک ہے۔ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

حضرت شیخ الہند کا طائف روانہ ہونا اور محصور ہو جانا

انور پاشا اور جمال پاشا سے جب تحریری دستاویز حاصل کر لیں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا قصد تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالا بالا یاغستان (یعنی اپنی تحریک کے مرکز) پر پہنچ جائیں۔ مگر روسی اور انگریزی فوجوں نے راستہ روک لیا تھا۔ جنگی مورچے ان راستوں پر قائم ہو گئے تھے۔ اس لیے یہی قصد فرمایا کہ بحری راستے سے سفر کیا جائے اور بمبئی نہ جایا جائے۔ بلکہ بلوچستان کے کسی بندرگاہ (مکران وغیرہ) پر بھیس بدل کر بادبانی جہاز سے پہنچیں اور پھر یاغستان کو وہاں سے روانہ ہو جائیں۔ مگر چونکہ مختلف مصالح سے آخری ملاقات غالب پاشا سے ضروری سمجھتے تھے۔ چند ضروری باتیں ایسی ملاقات میں طے کرنی تھیں۔ اس لیے پہلے مکہ معظمہ اور پھر وہاں سے طائف کے لیے روانہ ہو گئے۔ غالب پاشا ان دنوں طائف میں تھے۔ حضرت نے عام لوگوں سے یہی ظاہر فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ان دنوں گرمی زیادہ ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی زیارت بھی کرنی ہے۔ اس لیے میں طائف جا رہا ہوں۔ نصف شعبان تک واپس آ جاؤں گا۔ چنانچہ ۲۰

مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر ۲۳ ربیع یا ۲۴ ربیع کو طائف پہنچے اور دو تین دن کے بعد غالب پاشا سے ملاقات کی۔ کچھ باتیں طے ہوئیں اور کے لیے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہ وقت آنے نہ پایا تھا کہ شریف حسین نے بغاوت کر دی۔ ہم سب طائف میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اس کی تفصیل ہم نے سفرنامہ میں لکھ دی ہے۔ ایام حصار میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ غالب پاشا سے ملے۔ پاشا موصوف نے چند

ؐ سفرنامہ اسیر مالٹا جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی عبارت درج ذیل ہے۔

حضرت شیخ الہند بمعیت سید امین عاصم صاحب آمد و رفت کا اونٹ کرایہ کر کے ۲۰ رجب ۱۳۳۴ھ کو روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہنچے۔ شہر پناہ کے باہر ایک باغ میں فروکش ہوئے جس کا انتظام سید صاحب نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ باغ کے بالائی حصہ مکان میں سید امین عاصم صاحب معہ اپنے متعلقین تھے۔ اور نیچے کے ایک حصہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس سفر میں مولانا کے ہمراہ فقط تین ہی تھے۔ مولوی عزیز گل صاحب، وحید احمد اور کاتب الحروف حسین احمد۔

طائف طائف حقیقۃً ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ مگر اس کا اطلاق بہت بڑے حصے پر کیا جاتا ہے جس میں بہت سے قصبات اور دیہات شامل ہیں۔ یہ قطعہ زمین کا بہت اونچائی پر واقع ہے۔ اونٹوں کے راستہ سے تین دن میں یہاں پہنچتے ہیں۔ کیونکہ دراز زیادہ ہے اور چڑھائی بآسانی طے ہوتی ہے اور جبل کرہ کے راستے سے جس میں خچر گدھے گھوڑے چلتے ہیں۔ ۲۴ گھنٹے بلکہ اس سے کم میں آدمی پہنچ جاتا ہے۔ مگر راستہ دشوار گزار ضرور ہے۔ آدھے راستے سے ہوا بالکل متغیر ہو جاتی ہے۔ جب کہ مکہ معظمہ میں سخت گرمی کی وجہ سے شب کو بھی آرام نہ آتا ہو۔ طائف میں ہلکی رضائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں کا موسم گرمیوں میں نہایت عمدہ رہتا ہے۔ جا بجا باغات ہیں۔ ہر قسم کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔ انگور، انجیر، شفتالو، (ناگ پھل)، انار، آڑو، آلوچہ وغیرہ وغیرہ جملہ سرد ملکوں کے میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں۔ زراعت اور سبزی ہر قسم کی پیدا ہوتی ہے۔ جا بجا نہریں بھی ہیں۔ کنوئیں میٹھے بکثرت ہیں۔ بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ حجاز کے لیے طائف، ہند کے لیے شملہ کی مانند ہے۔ ترکی کے گورنر گرمیوں کے زمانہ میں طائف میں رہا کرتے تھے اور بڑے درجہ کے حکام اور اہل عرب شریف وغیرہ بھی وہاں ہی چلے جاتے تھے۔

فتنہ حجاز جب ہم مکہ معظمہ میں پہنچے تو عجیب عجیب افواہیں مشہور تھیں۔ عام بدوؤں اور اہل شہر کی زبانی سنا جاتا تھا کہ عنقریب بدعملی ہونے والی ہے۔ شریف حسین انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور بغاوت کرنے والا ہے۔ مگر ترکی کے استقلال میں کوئی فرق نہ تھا۔ ترکی فوج تمام حجاز میں غالباً چار پانچ ہزار تھی۔ کیونکہ اکثر فوج دوسرے مقامات پر جنگ پر چلی گئی تھی۔ شریف نے باب عالی کو اطمینان دلا رکھا تھا کہ حجاز کا ذمہ دار میں ہوں۔ یہاں زیادہ قوت رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں ضرورت جنگ ہو اپنی قوت لے جاؤ۔ یہ موجودہ فوج بھی جدہ، مکہ، طائف پر منقسم تھی۔ ہم کو یہ بھی اس وقت کہا گیا کہ جلد طائف جانا اور لوٹ آنا چاہیے۔ مبادا بدعملی ہو جائے۔ مگر ہم کو یقین کامل نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں یہ خبر بھی مشہور ہوئی تھی۔ کہ گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے کوئی خط شریف کے نام آیا ہے۔ یا تو تم ترکوں کو حجاز سے نکال دو ورنہ ہم شریف علی کو (جو پہلے شریف حجاز تھا۔ اور شریف حسین کا بھتیجا ہے اور اس وقت مصر میں مقیم تھا۔ اس کو) حجاز کا شریف بنا کر بھیج دیں گے (نہ معلوم یہ خبر کہاں تک صحیح تھی)۔ جدہ میں ہمیشہ جنگی انگبوٹ آتے اور بندرگاہ میں تین تین چار چار اور کبھی کم زیادہ جمع ہو جاتے تھے اور کھڑے رہ کر چلے جاتے تھے۔ نہ وہ کچھ تعرض کرتے تھے اور نہ ترکی حکومت۔

ہم ان واقعات کو دکھلانا نہیں چاہتے جو کہ اس فتنہ کے زمانہ میں ہوئے۔ اس مقام پر فقط حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا سفرنامہ لکھنا ہے۔

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

اصولی باتیں بتانے کے بعد مجبوریاں ظاہر کیں اور کہا کہ آپ مکہ معظمہ جاکر ہندوستان کو جلد از جلد چلے جائیں۔ اور ہندوستانی عامہ کو آزادی کامل کے مطالبہ پر متفق کرلیں۔ مجلس صلح میں جو عنقریب منعقد ہونے والی ہے۔ انگریز پوری کوشش کرے گا کہ ہندوستان آج یا کم از کم ہندوستانیوں کو زیرِ سایہ برطانیہ اندرونی آزادی یعنی آدھی آزادی ملے۔ مگر ہندوستانی باشندوں کو چاہیئے کہ بغیر مکمل آزادی کے کسی چیز پر راضی نہ ہوں۔

تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد اہلِ طائف کے ساتھ ہم کو باہر آجانے کی سہولت حاصل ہوئی اور چھ شوال کو ہم وہاں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے) ہم کو طائف پہنچ کر کچھ طبیعت سیر ہونے کا موقعہ ہاتھ نہ آیا تھا۔ کہ شتربان آیا اور کہا کہ اگر چلتے ہو تو شتر حاضر ہے۔ ورنہ آٹھ دن بعد آؤں گا۔ مطوف صاحب اور ہم لوگوں کی رائے ہوئی کہ ایک ہفتہ اور یہاں قیام کرلیا جائے اس کے بعد مکہ معظمہ جانا چاہیئے۔ اتفاق وقت سے اس وقت طائف میں میوے بہت کم تھے۔ شہتوت اور خوبانیوں وغیرہ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ البتہ شہد خوب آتا تھا۔ دو چار دن بعد مولانا مرحوم نے تقاضا فرمایا کہ مکہ معظمہ جانا چاہیئے۔ مگر شتربان جاچکا تھا۔ ایک دو دن بعد پھر تقاضا کیا۔ ہم نے جب دوسری سواریاں تلاش کیں تو معلوم ہوا کہ آئندہ آنیوالے واقعات نے خلافِ عادت مولانا کو تقاضائے سفر پر مجبور کیا ہے۔ جن کو کشف سے مولانا نے معلوم کرلیا تھا۔ مگر چونکہ ضبط اور اخفا کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ ادھر مقام رضا میں قدم راسخ تھا۔ اس لیے چند مرتبہ ظاہری تقاضا کرلنے کے بعد چپ ہو رہے۔ اور پھر معلوم ہوا کہ طائف نہایت زیادہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس لیے جو لوگ باہر باغوں میں مقیم ہیں ان کو شہر پناہ میں چلے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ ہمارے مطوف سید امین عاصم صاحب معہ اپنے اہل وعیال سید علی حبشی کے مکان پر چلے گئے اور ہمارے لیے بھی وہاں ایک کوٹھری لے دی۔ تمام شہر میں اس وقت عجیب ہل چل تھی۔ ۹ رشعبان روز شنبہ کو ہم لوگ شہر میں چلے گئے تھے۔ ترکی افسروں کو بھی یہ بات محسوس ہوگئی۔ انھوں نے شہر کے اردگرد حسب قواعد مورچے بنائے اور جن جن باغوں اور مکانوں کو مورچہ کے لیے مناسب جانا ان کو خالی کرالیا۔ گیارھویں شعبان ۱۳۳۴ھ کی شب کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف کی فوجوں نے چڑھائی کی جو کہ زیر کمانداری عبداللہ بیگ کام کر رہی تھی۔ صبح صادق کے وقت ہم سب بہ معیت حضرت مولانا مرحوم صبح کی نماز کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جارہے تھے کہ ناگاہ ایک بندوق کی آواز آئی۔ پھر تو چاروں طرف سے توپیں چلنے لگیں۔ ترکی فوج جس نے چاروں طرف حسب قواعد جنگ مورچے بنا رکھے تھے۔ پورے طور سے جواب دیتی رہی۔ اگرچہ ترکی فوج کی تعداد ایک ہزار مسلح سپاہی کے تھی۔ باقیماندہ لوگ مسلح نہ تھے۔ مگر چونکہ منتظم جماعت تھی۔ اس نے بدوی فوجوں کو بہت زیادہ اور قوی نقصان پہنچایا بدوؤں کی مقدار بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ، جدہ، ینبع، مدینہ منورہ میں یہی واقعہ پیش آچکا تھا کیونکہ شریف نے انتظام کیا تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ یہ کام ہو۔ اس جنگ کی وجہ سے جو لوگ طائف میں غلہ اور ترکاری میوہ لاتے تھے ان کا آنا بند ہوگیا۔ ادھر فوجی حکام کو رسد کی فکر ہوئی۔ حسب قواعد جنگ انھوں نے تاجروں سے موجودہ غلہ کی نصف مقدار یعنی شروع کیا جس نے خوشی سے دے دیا۔ اس کی مقداریں سے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا اور لئے ہوئے نصف کی قیمت اس وقت کے حساب سے اس کو رسید دے دی۔ کہ حکومت ترکی بعد از جنگ یہ مقدار نجہ کو ادا کرے گی۔ البتہ جن لوگوں نے چھپایا۔ ان پر شدت کی گئی اور تمام مال تجارتی کھانا خورد ونوش اور ضروریات فوجی کی قسم کا لے لیا گیا۔ فقط بمقدار ان کے اہل وعیال کی ضرورت کے ان کو دے دیا گیا۔ ادھر تو شہر میں غلہ کی کمی ہو

بقیہ حاشیہ آگے صفحہ

نکل کر مکہ معظمہ پہنچے۔ شریف عبداللہ بن شریف حسین باغی کیمپ کا کماندار تھا۔ اس نے ایک شب ہماری مہمانداری کر کے صبح تک مکہ معظمہ تک جاری سواری کا انتظام کر دیا۔ ہم دس شوال کو مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ چونکہ زمانہ حج کا قریب تھا۔ اس لیے حضرت شیخ الہند کا ارادہ ہوا کہ حج تک یہاں قیام کیا جائے۔ آنے والے حجاج سے اہل و عیال کی خیر و عافیت بھی معلوم ہو جائے گی اور ممکن ہے کوئی متعارف یا رشتہ دار بھی آجاتے۔ تو اس سے اس کا بھی پتہ چل جائے گا کہ انگریزی پالیسی حضرت شیخ الہند کے متعلق اور دیگر سیاسیوں کے متعلق کیا ہے۔ اگر نرمی ہوئی تو بمبئی کے راستے سے واپس ہوں۔ ورنہ کوئی دوسری صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ اتفاقاً قاضی مسعود احمد صاحب آخری جہاز میں اوائل ذی الحجہ میں آگئے۔ ان سے احوال معلوم ہوئے۔

(بقیہ صفحہ سے آگے) آمد بالکل بند، غرض کہ اس وجہ سے شہر میں سخت گرانی ہو گئی۔ پھر شریف کے لوگوں نے نہر کو بھی اوپر سے بند کر دیا۔ اس وجہ سے پانی کی سخت تکلیف ہوئی۔ اگر قشلہ (فوجی قیام گاہ) کا کنواں نہ ہوتا تو بہت زیادہ اشکال کا سامنا کرنا پڑتا۔ اگرچہ شریف کی فوج کثیر التعداد بھی تھی۔ اور اس کے پاس نئی عمدہ انگریزی رائفلیں بھی تھیں اور انگریزی سامانِ جنگ نہایت کثرت سے تھا۔ مگر باوجود سعی بسیار ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ جب انھوں نے ہجوم کیا۔ منہ کی کھائی۔ دن رات برابر گولیاں چلتی رہتی تھیں۔ ترکی فوج ان کے مجبوں پر توپوں سے گولے برساتی تھی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد وہ مصری فوجیں جو جدہ میں اس کے لے لینے کے بعد اتاری گئی تھیں۔ اور جنہوں نے مکہ معظمہ کے قلعہ اور قشلہ کو توپوں کے ذریعے فتح کیا تھا۔ طائف میں مع توپوں کے پہنچیں اور طائف کے چاروں طرف سے توپیں سات یا آٹھ نصب کر کے قلعہ اور قشلہ پر گولہ باری کرنے لگیں۔ صبح صادق سے تقریباً ۱۲ بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ اس کے بعد توپیں ٹھہر جاتی تھیں۔ ترک بھی انکا جواب دیتے تھے۔ یہی حال عید مبارک تک رہا۔ افسوس کہ عید کے دن بھی شریف کے لوگوں نے جنگ کو موقوف نہ کیا۔

مولانا کا رمضان طائف میں

چونکہ رمضان کا مہینہ طائف میں نہایت بدامنی کی حالت میں واقع ہوا تھا۔ اس لیے نہ تو دن کو حسب خواہش لوگوں کو خوراک کا انتظام کرنا ممکن ہوتا تھا۔ نہ مساجد وغیرہ میں تراویح کا انتظام حسب ضرورت ہو رہا تھا۔ مسجد ابن عباسؓ وہاں کی بڑی مسجد ہے۔ اس میں بھی تراویح (الم ترکیف) سے ہوتی تھیں اور اس میں بھی بہت کم آدمی آتے تھے۔ باقی لوگ محلہ کی مسجدوں اور اپنے مکانوں پر پڑھتے تھے۔ کیونکہ ہر وقت گولیاں اوپر سے گزرتی تھیں۔ مولانا نے اولاً مسجد ابن عباس میں حسب سابقہ عادت تراویح پڑھنا شروع کیں۔ مگر چونکہ راستہ وہاں کا ایسا تھا۔ جہاں پر گولیاں برابر آتی رہتی تھیں۔ اس لیے اس مسجد میں جاتے وقت خطرہ ضرور رہتا تھا اور پھر ایک شب میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نماز مغرب پڑھ کر فارغ ہوتے ہی تھے۔ ابھی تک نفل وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ اندھیرا ہو چکا تھا کہ بدوؤں نے ہجوم کیا۔ مسجد ابن عباسؓ کی چھت اور میناروں پر بھی ایک بڑا دستہ ترکی فوج کا تھا۔ اور مسجد کے قریب جو دروازہ تھا۔ وہاں پر مورچہ بھی تھا۔ غرض کہ طرفین میں خوب تیز گولی اور گولوں کی بارش دیر تک ہوتی رہی۔ خود مسجد میں بھی برابر گولیاں برستی رہیں۔ جو لوگ مسجد میں باقی تھے۔ وہ ایک کونے میں جدھر گولیوں کے آنے کا گمان نہ تھا۔ بیٹھ گئے۔ اس روز تراویح بھی نہیں ہوئی۔ صرف چند آدمی بوقت نماز عشاء۔ فرض عشاء ایک طرف پڑھ کر جب سکون ہوا۔ چلے گئے۔ اس کے بعد احباب خصوصاً سید امین صاحب نے اصرار کیا کہ آپ مسجد ابن عباسؓ میں نماز کے لیے نہ جایا کریں۔ دروازہ مکان کے قریب جو مسجد ہے۔ اس میں ہمیشہ نماز جماعت پڑھا کریں۔ چنانچہ تمام رمضان اوقات خمسہ کی نماز وہاں پڑھا کرتے تھے۔ اسی میں تراویح فقط (الم ترکیف) سے ہی پڑھی گئیں۔ اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نوافل میں سحر کے وقت تک مسجد ...

ڈاکٹر انصاری اور حکیم عبد الرزاق صاحبؒ رحمہما اللہ کی غیر معمولی ہمدردی اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز کے ایک عزیزؒ ما

ڈاکٹر انصاری صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبد الر[زاق] صاحب رحمہم اللہ کو خیال ہوا کہ حجاز شریف میں گرانی ہے۔ حضرت شیخ الہند تنہا نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے سا[تھ] اور رفقاء بھی ہیں۔ ویسے بھی حضرت موصوف کا حوصلہ اور دستر خوان وسیع ہے۔ لہذا حضرت کے پاس جو اثا[ثہ] وہ ختم ہوگیا ہوگا۔ اب کوئی اور رقم بھیجنی چاہیئے۔ چا[ہے] تھا۔ حجاج جارہے تھے کسی معتمد حاجی کے ذریعے رقم بھیجی جاسکتی تھی۔ لیکن ان دونوں رہنماؤں کی غیر معمولی ہمدردی کا فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت کے ک[سی] قریبی عزیز کو جو خانگی حالات سے پوری طرح واقف اور خانگی امور میں بے تکلف ہو بھیجا جائے۔ تاکہ رقم کے ساتھ حضرت کو اپنے متعلقین کے [...]

(بقیہ صفحہ سے آگے) رہتے تھے۔ اور مولوی عزیز گل صاحب اور کاتب الحروف بھی اسی مسجد میں علیحدہ علیحدہ نفلوں میں وقت گ[زارتے] چونکہ گرمیوں کی رات تھی۔ جلد تر سحور کا وقت ہوجاتا تھا۔ پھر کچھ سحری پکاتے جو کہ میٹھے چاول ہوتے تھے۔ مگر چونکہ شکر وہاں نہ ملتی تھی۔ اس لیے شہد کو [...] شکر چاول اور چائے میں استعمال کرتے تھے اور اکثر نمکین چاول بغیر گوشت پکایا جاتا تھا۔ اس وقت طائف میں چاول وغیرہ بھی دستیاب ہونا [...] تھا۔ ایک آنہ والی روٹی آٹھ آنہ کو بمشکل ملتی تھی۔ مکہ دہلی کے تاجروں میں سے حاجی ہارون مرحوم نے تھوڑے چاول مولانا مرحوم کے لیے بذریعہ [...] طلب بھیج دیئے تھے۔ جو کہ عمدہ قسم کے تھے۔ انہوں نے بہت کام دیا۔ اس مدت میں جو کہ تقریباً دو ماہ تھی۔ ہم نے دس بارہ اشرفی طائف [میں بوجہ] سخت گرانی کھا ڈالیں۔

طائف سے روانگی

عید کے بعد چونکہ تمام اہل شہر بھوک سے مرنے لگے تھے۔ حکام کے پاس جاکر شکایت کی۔ کہ اب ہمارے پاس غلہ [...] کے لیے کچھ نہیں رہ گیا۔ ہمارے پاس جتنے حیوانات دودھ سواری کے تھے۔ کھا ڈالے۔ سب غلہ ختم ہوا۔ اب ہمارے لیے کوئی صورت کیجئے۔ ہم سب مرے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اچھا صبح کے آٹھ بجے سے بارہ بجے تک باب ابن عباسؓ سے روانگی کے لیے ہم تم کو اجازت دیں گے۔ ہم اپنی حد میں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ شریف کے آدمی تم کو نقصان پہنچائیں تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں۔

الحاصل لوگوں کو اس طرح ایک فارم معہ ان کے اہل وعیال کے نام دیا جاتا تھا اور ان سے عہد لیا جاتا تھا۔ کہ وہ کہیں جاکر ترکی حکومت سے جنگ نہ کریں گے۔ پھر ان کو معہ ان کے ضروری اسباب کے باہر نکلنے دیا جاتا تھا۔ جب اس طرح سے لوگ نکلنے لگے تو پھر ہم سبھوں کو ضروری [معلوم] ہوا کہ نکل چلیں۔ چنانچہ ۷ رشوال ۱۳۳۴ھ کو بوقت صبح ہم بھی باب ابن عباس سے نکلے اور وہاں سے چل کر پھرتے ہوئے۔ رقیم، میں پہنچے۔ وہ مقام ہے۔ جہاں پر شریف کا بیٹا عبد اللہ بیگ جو کہ کماندار بدوؤں کا تھا۔ مقیم تھا اور تمام فوجی حرکات کا یہی مرکز تھا۔ یہیں مصری فوج کے خیمے بھی تھے۔ چونکہ ہمارے پاس نہ سواری تھی اور نہ نقد وغیرہ اور راستہ دور تھا۔ ادھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نہایت ضعیف تھے۔ تین دن تک پہاڑی راستہ کو قطع کرنا آسان نہ تھا۔ علاوہ ازیں اسباب بھی تھا۔ اس وجہ سے وہاں جانا منظور ہوا۔ عبد اللہ بیگ سے ملاقات ہوئی۔ اعزاز واکرام سے پیش آیا۔ خیمہ کھڑا کرنے کا حکم دیا۔ ایک دنبہ ذبح کر کے دعوت پیش کی۔ عرب میں عادت ہے کہ معزز مہمان کی دعوت میں دنبہ ذبح کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ کامل اکرام مہمان کا شمار نہیں ہوتا۔ اور پھر انجیر وغیرہ میوہ جات بھیجے۔ اور ایک اشرفی نذر کی اور کہا کہ شب کو یہاں قیام کرو۔ علی الصبح تم کو روانہ کردیا جائیگا۔ مگر علی الصبح طائف پر چلا گیا۔ اس کے لوگوں نے خالی پشت شتر کا انتظام کر دیا۔ کرایہ بھی خود دیا اور زاد راہ بھی۔ اس طرح وہاں سے روانہ ہوکر [...]

بھی تفصیل سے معلوم ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت کے ایک خاص عزیز کو جن کا نام لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس خدمت کے لیے جو ان کے لیے سرمہ سعادت تھی۔ کیونکہ حضرت کی زیارت کے ساتھ حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو رہا تھا۔ نامزد کیا گیا۔ مزید برآں تار کے ذریعہ جہاز میں سیٹ بھی متعین کرالی۔ اور روانگی کے لیے ایسا وقت مقرر کیا کہ بمبئی پہنچ کر جہاز کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ بلکہ فوراً ہی جہاز پر سوار ہو جائیں۔ چنانچہ یہ عزیز دفعتاً دیوبند سے روانہ ہوئے اور بمبئی پہنچتے ہی بندرگاہ پر چلے گئے۔

اس عجلت اور رازداری کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا۔ کہ حکومت کو رکاوٹ پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ یہاں تک کہ عزیز موصوف کی روانگی کا علم بھی حکومت کو اس وقت ہوا۔ جب جہاز روانہ ہو چکا۔ لیکن اس طرح روانگی سے حکومت کو شبہ بھی ہو گیا۔ اس لیے حکومت ہند کی طرف سے عدن تار دیا گیا کہ جہاز پر تلاشی لی جائے اور مشتبہ کاغذات وغیرہ قبضہ میں کر لیے جائیں۔ چنانچہ جب جہاز عدن پہنچا تو پولیس کی جمعیت جہاز پر آئی۔ اور عزیز موصوف کی تلاشی لی۔ مگر کوئی چیز ایسی برآمد نہ ہو سکی۔ جس پر شبہ کیا جا سکے۔ لہذا پھر عزیز موصوف بخیریت جدہ اور پھر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ حضرت کو اہل و عیال کی خیریت معلوم ہوتی تو آپ بہت خوش ہوتے۔ پھر عزیز موصوف اور ان کے رفقاء نے جن میں مولانا ولی حسن صاحب حسنپوری بھی تھے۔ بیان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ کی پالیسی حضرت کے بارے میں بہت سخت ہے جب کوئی جہاز بمبئی پہنچتا ہے۔ تو سی آئی ڈی اور باوردی پولیس کا دستہ جہاز پر پہنچتا ہے اور ڈھونڈتا ہے کہ مولانا محمود حسنؒ صاحب کہاں ہیں۔ جب تک اطمینان نہیں ہو جاتا۔ کسی مسافر کو اترنے نہیں دیا جاتا۔ اس لیے کسی طرح مناسب نہیں کہ حضرت اس زمانہ میں بمبئی پہنچیں یا ہندوستان تشریف لے جائیں۔

عزیز موصوف نے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کا بھیجا ہوا۔ ایک ہزار روپیہ پیش کر دیا۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب کا راندیر سے ایک ہزار روپیہ بھیجنا

مذکورہ بالا رقم کے علاوہ ایک ہزار روپیہ مولانا محمد ابراہیم صاحب اور راندیر کے احباب نے تاجروں کے ذریعے بھیجے تھے۔ جو انھیں ایام میں پہنچے تھے۔ ان دونوں رقوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ عبدالجبار دہلوی کے یہاں بطور امانت جمع کرا دیا۔ چنانچہ مالٹا میں ضرورت پڑنے پر رقم منگائی گئی اور کام آئی۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء

عزیز موصوف کی واپسی

اس وقت تک مدینہ منورہ پر ترکوں کا قبضہ تھا اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود شریف حسین کی اور انگریزوں کی فوجیں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ جنگ جاری تھی اور حجاج کی آمد و رفت کے راستے مسدود تھے۔ لہذا عزیز موصوف مدینہ طیبہ نہیں جا سکے۔ اور حج سے فراغت کے بعد پہلے ہی جہاز سے آپ کو واپس ہونا پڑا۔ اس قدر عجلت سے واپسی کا ایک اور سبب بھی تھا جس سے انگریزی حکومت کے شبہات میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ جب واپسی کے لیے عزیز موصوف جہاز پر سوار ہوئے تو بہاء الدین محافظ حجاج اور سی آئی ڈی انسپکٹر نے بڑی سختی سے تلاشی لی اور ہر ایک چیز چھان ماری۔ مگر کوئی مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی۔ جہاز بمبئی پہنچا تو پھر ان کی تلاشی لی گئی اور ان کو حراست میں لے کر الٰہ آباد پہنچا دیا گیا۔

افشائے راز

یہ محترم عزیز حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے جو رشتہ رکھتے تھے۔ اس کا تقاضا تھا کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ تحریک ہی کے کام سے پوری رازداری کے ساتھ ایک کارکن کی حیثیت سے اتنا طویل سفر کر کے آپ حجاز شریف پہنچے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ مولانا ہادی حسن صاحب جو نکہ مذکورہ بالا "تاریخی صندوق" لے کر آئے تھے جہاز سے اترتے

۔ گرفتار کرکے نینی تال میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ لہٰذا تشویش اور بے چینی تھی کہ جس مقصد کے لیے اتنی کوشش کی گئی۔ اتنی مصیبتیں جھیلی گئیں اور جس راز کو اس طرح مخفی کیا گیا۔ یہ سب کچھ بے نتیجہ رہے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس کے اثرات تباہ کن ثابت ہوں۔ اس بنا پر حضرت شیخ الہند نے عزیز موصوف کو صندوق کا راز بھی بتا دیا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو لیکر فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں صاحب کے پاس بھجوا گئے ہیں دوسری طرف عجیب و غریب قصہ یہ تھا کہ عزیز موصوف کمزور دل، ناتجربہ کار اور نوگرفتار تھے۔ اور سی آئی ڈی کے وہ افسر[1] جنھوں نے الہ آباد میں ان سے گفتگو کی۔ وہ پولیس کے کہنہ مشق شاطر اپنے فن کے بہترین ماہر تھے۔ ان افسروں نے ڈرا دھمکا کر، پولیس کی جابرانہ کارروائیاں عمل میں لاکر اور متعدد اوقات میں طرح طرح جرح کرکے وہ تمام باتیں معلوم کرلیں جو عزیز موصوف کے حافظہ میں تھیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی تھیں کہ اگر ثابت ہوجاتیں تو نہ معلوم کتنوں کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑتا اور کتنے عبورِ دریائے شور اور حبسِ دوام کی سزا پاتے۔ صندوق کا قصہ بھی انھیں کے ذریعہ معلوم ہوا۔ گویا سی، آئی، ڈی کو دولت کا خزانہ مل گیا۔ فوراً مظفر نگر پولیس کو تار دیا گیا اور مظفر نگر سے دوش خاں جہانپور پہنچی اور مولانا ہادی حسن صاحب کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ پھر حاجی نور الحسن صاحب اور حاجی احمد مرزا فوٹوگرافر کی تلاشی بھی اسی انکشاف کا نتیجہ تھا۔ جس کا ذکر پہلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

حج کے بعد حضرت شیخ الہند کا مکہ میں قیام اور گرفتاری

حضرت شیخ الہند نے اس سفر میں پہلا حج ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ میں کیا تھا۔ پھر دوسرا حج طائف سے واپسی پر ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں کیا۔ قاضی مسعود احمد صاحب اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہوجانے کے بعد حضرت کو فکر ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہوکر یاغستان پہنچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ حضرت نے بار بار فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام مناسب نہیں۔ کیونکہ انگریزی حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلۂ کار ہیں۔ لہٰذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔ اس لیے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیے کہ یہاں سے روانہ ہوجائیں۔ لیکن اگر تنہا حضرت کی ذاتِ مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا۔ مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ چند رفقاء تھے جو اپنا سب کچھ قربان کرکے حضرت کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ حضرت کو کسی حال میں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے اور نہ حضرت کی جدائی پسند کرتے تھے۔ چونکہ ترجمہ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا کتابوں کا ایک ذخیرہ بھی ساتھ رہتا تھا۔ سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بنا پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھیں۔ اس قسم کی اور بھی ضروریات تھیں۔ ان سب کے حمل و نقل کے لیے چند سواریاں درکار تھیں۔ اور خاموشی سے دفعتاً روانہ ہونا

---

[1] یعنی، ۱۔ مسٹر سین ۲۔ تصدق حسین بالوٹری ۳۔ مظہر علی تھانوی۔ یہ تینوں افسر یوپی میں کام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کے مشن آزادی کے متعلق ان تینوں نے بہت سرگرمی سے کام کیا تھا۔ مسٹر سین انگریز تھا۔ یوپی سی آئی ڈی کا افسر اعلیٰ تھا۔ مگر مہذب قانون کا پابند تھا۔ اس میں کسی قدر انسانیت بھی تھی۔ لیکن تصدق حسین اور مظہر علی نہایت جابر و ظالم تھے ان میں انسانیت اور تہذیب نام کو نہ تھی۔ انھوں نے حضرت کے ساتھیوں پر نہایت وحشیانہ مظالم کئے۔ سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۔

فا۔ تاہم جب حضرت کا شدید تقاضا ہوا۔ تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے۔ چنانچہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے
تھے۔ تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ
محرم ۱۳۳۵ھ کی اخیر تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علماء مکہ عصر کے بعد آیا اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام
نے۔ اور حضرت شیخ الہند سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے۔ مولانا کے اس پر دستخط کرا دو۔ اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا "من علماء
مۃ المکرمۃ المدرسین بالحرم الشریف المکی" (مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں۔ اور
، تمام ترکوں کی تکفیر اس بناء پر کی گئی تھی۔ کہ انھوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو معزول کیا ہے۔ شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب
ن قرار دیا گیا تھا اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ حضرت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ چونکہ یہ محض ان
طرف سے ہے جو حرم مکی میں پڑھاتے ہیں۔ اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں۔ اس لیے مجھ کو کسی طرح
دستخط کرنا درست نہیں ہے۔ وہ واپس چلا گیا۔ حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ پھر
جاتے۔ نہ عنوان اجازت دیتا ہے اور نہ مضمون۔ مضمون میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں۔ وہ سراسر خلاف شریعت ہیں۔ اس کے بعد سنا گیا کہ
اسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے۔ خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔ دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں
لم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود الحسنؒ اور ان کے رفقاء اور سید ہاشم اور حکیم نصرت حسینؒ گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف
ں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر کچھ نفع نہیں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل سفرنامہؒ میں صحیح طور پر ذکر کر دی گئی ہے۔ اعادہ کی ضرورت

خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے۔ ۲۴ر صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف "سفرنامہ اسیر مالٹا" میں تحریر فرماتے ہیں :-
"ایام حج میں اورنگ آباد کے خان بہادر مبارک علی مکہ معظمہ تشریف لائے۔ سرکاری آدمی تھے۔ لن ترانیاں
خوب ہانکتے تھے۔ شریف صاحب کے یہاں پہنچے۔ ترکوں کو کو ہر مجلس میں برا کہتے تھے۔ حکومت موجودہ
کی مدح سرائی میں زبان خشک ہو جاتی تھی۔ انھوں نے ظاہر کیا کہ میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے بھیجا ہوا
آیا ہوں۔ تاکہ حجاز کے احوال کو دریافت کر کے واقعی باتیں اہل ہند کو بتاؤں۔ کیونکہ ہند میں اس وقت بے
چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اور عموماً اہل ہند برطانیہ پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بادشاہ حجاز کو برا بھلا کہتے ہیں
اس لیے ضروری ہے کہ ایک اعلان علمائے مکہ کی طرف سے مجھ کو دیا جائے جس میں ترکوں اور ان کی حکومت
اور خلافت کی برائیاں ہوں۔ ان کے استحقاق خلافت پر پُرزور مضمون سے رد کیا گیا ہو۔ اس موجودہ انقلاب اور
حکومت حاضرہ کی بھلائیاں ذکر کی گئی ہوں۔ چنانچہ ایک ایسا محضر تیار کیا گیا۔ اور وہاں کے ان علماء سے جن کو دربار
شریف میں دخل تھا۔ اور صاحب عزت و شوکت شمار کیے جاتے تھے۔ اس پر دستخط اور مہر کرایا گیا۔ بہتوں
نے خوشی سے اور بہتوں نے خوف سے دستخط اور مہر کر دیا۔ خان بہادر موصوف کے پاس جب یہ محضر پہنچا تو

رہے لئے۔ پھر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے اسی طرح زیر حراست سویز بھیجے گئے۔ ۲۲ ربیع الاول کو سویز پہنچے۔ وہاں گوروں کی حراست میں جو کہ پندرہ یا سولہ تھے۔ اور بندوق اور سنگینوں سے مسلح تھے۔ ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر کے بعد ہم کو سیاسی جیل (معتقل) میں داخل کر دیا گیا اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا۔ اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا۔ اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائل تھے۔ جن میں سی آئی ڈی کے بیان اور رپورٹیں درج تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے)

انھوں نے کہا کہ ان علماء کو کوئی ہندمیں نہیں جانتا۔ کون تصدیق کرے گا۔ مناسب ہوگا کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب جو کہ علماء ہند میں ایک مشہور اور مسلّم شخص ہیں۔ ان کے اور دیگر علماء ہند کے دستخط اور مہر ہوں۔ (نہ معلوم یہ اسی لیے وہاں بھیجے گئے تھے کہ اس ذریعہ سے مولانا مرحوم کو وہاں سے پکڑا جائے یا یہ قضیہ اتفاقیہ تھا۔)

الحاصل اس مضمون کو وہاں کے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج جو کہ زمانہ حکومت ترکیہ میں مفتی احناف تھے اور اب انقلاب کے بعد عہدہ قاضی الاسلامی اور وکالت شرافت پر مامور ہو گئے تھے۔ بذریعہ نقیب العلماء مولانا کے پاس بھیجا اور آخر محرم الحرام ۱۳۳۵ھ میں عصر کے بعد وہ اس محضر کو مکان پر آیا۔ اس زمانہ میں وہاں مکہ معظمہ سے جو لوگ مہاجرین ہند اور علم دوست تھے۔ انھوں نے ظہر کے بعد مولانا مرحوم سے بخاری شریف کو شروع رکھا تھا۔ مکانِ اقامت پر ہی درس دیا کرتے تھے اور جب وہ کاغذ آیا تو چونکہ اس کی سرخی تھی۔ من علماء مكة المكرمة المدرسين بالحرم الشريف المكی "۔ یعنی یہ تحریر مکہ مکرمہ کے ان علماء کی طرف سے ہے۔ جو حرم شریف مکی میں پڑھاتے ہیں۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ اولاً اس سرخی کے سے کوئی استحقاق نہیں کہ حضرت مولانا اس پر کچھ لکھیں۔ کیونکہ وہ علماء مکہ میں سے نہیں اور نہ حرم مکی یعنی مسجد الحرام میں مولانا نے کبھی تدریس کی۔

ثانیاً، اس میں قوم ترک کی مطلقاً تکفیر کی گئی ہے اور دوبارہ اس کے جو کچھ احتیاط اور سخت احکام ہیں۔ آپ کو معلوم ہے۔

ثالثاً، اس میں وجہ تکفیر (سلطان عبدالحمید خاں کا تخت سے اتار دینا لکھا گیا ہے۔ حالانکہ کسی فقیہ نے اس کو موجبات کفر میں سے قرار دیا۔ رابعاً، اس میں خلافت سلاطین آلِ عثمان کا انکار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ امر مخالف نصوص شرعیہ میں ہے۔

خامساً، اس میں اس انقلاب اور حرکت کو مستحسن دکھایا گیا ہے اور یہ بھی شرعاً نہایت قبیح واقع ہوا ہے۔" چونکہ کاتب الحروف کی نقیب العلماء سے کچھ پہلے سے معرفت تھی۔ اس لیے ان سے تمام کیفیتیں ظاہر کر دینے کے بعد یہ کہا گیا کہ تم شیخ الاسلام سے یہ کہہ دینا کہ مولانا نے اس پر دستخط اور مہر کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اس کا عنوان اہل مکہ اور مدرسین حرم کے ساتھ مخصوص ہے۔ میں آفاقی شخص ہوں۔ پردیسی ہونے کی وجہ سے مجھ کو استحقاق اس پر دستخط کرنے کا نہیں اور یہ کہا گیا کہ ابھی دوسری وجہوں کو ان پر ظاہر نہ کرنا۔ اگر پھر انھوں نے اصرار کیا۔ تب ان وجہوں کو پیش کیا جائے گا۔ وہ اس وقت واپس ہو گئے اور پھر کوئی جواب نہ لائے۔ اس محضر کا شہر میں پہلے سے چرچا تھا۔ جو لوگ حقانی تھے ان کو خوف لگا ہوا تھا کہ اگر ہمارے پاس آیا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اور کس طرح جان چھڑائیں گے۔ مولانا مرحوم کے رد کرتے ہی پورے شہر میں مشہور ہو گیا کہ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تو دوسروں کو بھی ہمت ہو گئی۔

ادھر شیخ الاسلام صاحب کو تنبیہ ہوئی۔ انھوں نے عبارت سابقہ بالکل بدل ڈالی اور اس طرح اس کو لکھا۔ کہ اس میں سے مبحث تکفیر بالکل خارج ہو گیا۔ مگر دستخط کرنے کو پھر نہیں بھیجا۔ جو عبارت دوسری مرتبہ بنائی گئی تھی۔ اس پر پہلے علماء سے فقط دستخط لیکر اخبار "القبلۃ" میں چھاپ دیا۔

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ وامدنا بامداد ہ فی الدنیا والآخرۃ آمین ۔

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء آگبوٹ اسکندریہ پہنچا اور ۲۶ جمادی الثانی مستیدی بشر من کو دار اسرار مصر میں تھا۔ داخل کردیئے گئے۔ تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۳ رجب ۱۳۳۸ھ کو مطابق ۲ اپریل ۱۹۲۰ء وہاں سے سویس کو روانہ کردیئے گئے۔ سویس میں بھی ہم تلنگیوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی بشر داخل کرکے پورے دو مہینہ کیمپ میں رہنا پڑا۔ ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہنچا یا گیا۔ ۱۲ رمضان ۱۳۳۸ھ جہاز عدن پہنچا۔ چونکہ عدن میں جہاز فقط ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کو دیئے۔ ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب دیوبند میں، دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں۔ تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دے دیا۔ جس سے تمام احباب کو اطلاع ہوگئی۔ تار کے حسب ذیل تھے۔

وہ ہم ۸ جون تک بمبئی پہنچیں گے۔ مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸ جون ۱۹۲۰ء کو تین برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔

بمبئی پہنچنے اور خلافت کمیٹی کے استقبال کرنے کی کیفیت

بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی آئی ڈی کا افسر انگریز مع افسروں کے آیا اور حضرت شیخ الہند سے کہا کہ میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت اس کے ساتھ کمرہ میں چلے گئے۔ وہ مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آپ ان کی بات ہرگز جہاز سے نہ اتریں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ہمیں جہاز پر ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں۔ ہم نے مولوی رحیم بخش صاحب کا بہت انتظار کیا۔ جب وہ پہنچے تو میں اور مولانا عزیز گل صاحب اسباب لیکر کنارہ پر چلے گئے۔ بعد کو مولوی رحیم بخش صاحب آئے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے لیے اسپیشل ڈبہ ریل میں میں ریزرو کرادونگا۔ آپ ابھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں۔ حضرت نے فرمایا آپ کرکے حسین احمد اور مولوی عزیز گل کنارے پر چلے گئے ہیں۔ وہ آجائیں تو روانگی ہو سکے گی۔ چونکہ ہمارے کنارہ پہنچنے پر زور کی بارش ہوتی میں طوفان آگیا۔ جہاز دریا میں کنارہ سے دُور لنگر انداز ہوا تھا۔ اس لیے اس روز کوئی ہوڑی حضرت شیخ الہند کو جہاز سے لانے کے لیے نہ مل سکی ۲۱ رمضان کو حضرت اتر سکے۔ مولوی رحیم بخش صاحب گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں۔ اور بالا بالا ریل پر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں۔ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں۔ اسی لیے وہ اگلے دن اتارنے کے لیے پہنچے۔ مگر جب لانچ کنارہ پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص ممبران خلافت کمیٹی نے زوردار استقبال کیا۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضا گونج اٹھی۔ اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور کار میں سوار کر کے اپنی قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجویز کر چکے تھے لے گئے۔ مولوی رحیم بخش صاحب ہجوم کی شدت کی وجہ سے حضرت کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ چونکہ خلافت کی تحریک اور اس کے جملہ کارکن، حضرت کے مذاق کے موافق ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے ہم نوا تھے۔ اس لیے بالطبع ان سے مل گئے اور مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم کا اثر قبول نہیں کیا۔

جلسۂ عام اور سپاسنامہ

مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر انتظام کھتری مسجد میں جلسہ عام کیا گیا۔ اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں "ایڈریس" پیش کیا گیا۔

دہلی، لکھنؤ، دیوبند وغیرہ سے استقبال کے لیے آنے والے حضرات

ان حضرات کی فہرست جنھوں نے دور دراز سے بمبئی پہنچ کر پورٹ پر حضرت کا استقبال کیا۔ بہت طویل ہے۔ خاص خاص اسماء گرامی یہ ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دار العلوم دیوبند معہ صاحبزادگان مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری مرحوم، جناب حکیم محمد حسن صاحب مرحوم (برادر خورد حضرت شیخ الہند) مولانا محمد حنیف صاحب مرحوم (خواہرزادہ و داماد حضرت شیخ الہند) حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری۔ برادر کلاں ڈاکٹر انصاری مرحوم، نواب محی الدین خانصاحب مرادآبادی قاضی بھوپال مرحوم۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم مہتمم و صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب عرف ڈاکٹر انصاری مرحوم، حاجی احمد مرزا صاحب مرحوم فوٹوگرافر دہلی۔

مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی اور مسٹر گاندھی

بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ اسی اثنا میں مسٹر گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے گفتگو کی۔

دہلی کو روانگی

بمبئی میں دو روزہ قیام فرما کر ۲۳ اور ۲۴ رمضان المبارک کی درمیانی شب میں ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوئے۔ اور ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۳ جون ۱۹۲۰ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ شب کے آخر حصہ میں دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶ رمضان المبارک کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہنچ گئے۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ

حضرت شیخ الہند کی عام مقبولیت اور راستہ میں اسٹیشنوں پر استقبال

ایک وہ زمانہ تھا کہ نہ صرف احباب بلکہ تلامذہ، مریدین اور عزیز و اقارب کو یقین تھا کہ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو پھانسی دی جائے گی۔ ورنہ کم از کم حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزائیں ہوں گی۔ اس لیے مریدین اور شاگردوں تک نے نہ صرف تعلق ارادت اور شاگردی سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ تعارف سے بھی منکر ہو گئے تھے۔ خاص خاص لوگ نہ صرف مکان پر آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ بلکہ اس محلہ اور کوچہ میں بھی نہیں گزرتے تھے۔ جہاں حضرت کا دولت خانہ تھا۔ اور حضرت کے لیے تحقیر و ملامت کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ بعض مدعیان اخلاص تو جان و عزت کے خطرہ سے انگریزوں کے سی آئی ڈی اور مخبر بن گئے تھے۔ اب یہ زمانہ بھی ان کے سامنے آگیا کہ ہندوستان اور بیرون ہند جہاں بھی حضرت شیخ پہنچتے۔ لوگ سر پر بٹھاتے۔ ہر ایک اسٹیشن پر عقیدت مند مخلصین کا ہجوم پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتا تھا۔ حضرت شیخ الہند تک پہنچنا اور آپ سے مصافحہ کرنا۔ جوئے شیر

لانے سے کم دشوار نہ تھا۔ دہلی، غازی آباد، میرٹھ، سہارنپور، میرٹھ چھاؤنی، مظفر نگر، دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا عوام کی زیارت کرانے کے لیے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے۔ اور انگشت بدنداں تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔

ذالك فضل الله يوتيه من يشاء يعز من يشاء و يذل من يشاء انه على كل شيئ قدير

رولٹ رپورٹ کے الفاظ

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ رولٹ کمشنر کے الفاظ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ دشمن جو اپنی سطوت و طاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر کہتا تھا کہ میں سمندروں کا مالک ہوں۔ میری حدود مملکت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ مجھ پر اگر آسمان ٹوٹ پڑے تو میں سنگینوں پر اٹھا لوں گا۔ اس مغرور اور جابر طاقت نے اس تحریک سے کیا اثر لیا۔ اس کی نظر میں اس تحریک کی کیا حیثیت تھی۔ اس کی بنیادیں کتنی مضبوط تھیں۔ اور کس طرح کامیابی کے کنارے پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے نتائج کیا ہوئے۔ اور اس تحریک نے ولیس کی کیا کیا خدمتیں سرانجام دیں اور اس کے کارکنوں نے کس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا۔

الفضل ما شهدت به الاعداء رولٹ کمیٹی رپورٹ کے پیرا نمبر ۱۲۴ میں درج ہے۔ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا۔ اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا یہ ایک منصوبہ تھا جو اس خیال سے ہندوستان میں تجویز کیا گیا تھا۔ کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش[1] سے اُسے تقویت دیکر برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔

اس منصوبہ کو مضبوط کرنے اور عمل میں لانے کے لیے مولوی عبیداللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں عبداللہ، فتح محمد، محمد علی کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا۔ عبیداللہ پہلے سکھ تھا۔ بعد میں مسلمان ہوا۔ اور دیوبند ضلع سہارنپور کے مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرکے مولوی بنا۔ وہاں اس نے اپنے باغیانہ اور برطانیہ کے خلاف خیالات کا زہر چند مدرسین اور طلبہ میں پھیلا دیا۔ جن لوگوں پر اس نے اپنا اثر ڈالا۔ ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن صاحب کی تھی۔ جو مدتوں تک درسگاہ دیوبند کے صدر مدرس[2] رہے۔ عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی (پان اسلامی)

---

[1] اگر فقط یہ مسلمانوں کے لیے منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرتاپ کو صدارت کیوں دی جاتی۔ اور حکومت موقتہ میں غیر مسلموں کے لیے ایسی جگہیں کیوں تجویز کی جاتی۔ جیسا کہ آئندہ آئیگا۔ (۲) اگر صرف مسلمانوں کے لیے یہ منصوبہ تھا تو ہردیال کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی اعانتیں کیا گواہی دیتی ہیں۔ دیکھو رولٹ رپورٹ فصل پنجاب (۳) جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ جیسا کہ آتے آگا اور وہ کرشنا ورما کا دوست اور انڈین غدر پارٹی کا ممبر تھا جس میں رام چند جیسا مشہور و معروف بھی ممبر تھا۔ تو اس میں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کی گئی۔ بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی۔ جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے۔ البتہ مسلم عنصر غالب تھا۔ جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمار سے میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبیداللہ صاحب اپنی ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔

[2] یہ بالکل برعکس معاملہ ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا عبیداللہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو متاثر نہیں کیا۔ بلکہ مولانا شیخ الہند انگریزوں کے مظالم شنیعہ اور مسلسل بے راہیوں واقعات ماضیہ اور حالات حالیہ سے متاثر ہوتے تھے اور انھوں نے مولانا عبیداللہ صاحب کو اس طرف کھینچا۔ جیسا کہ ہم نے حضرت شیخ الہند کے اس مقولہ کو پہلے بھی نقل کیا ہے اور مولانا عبیداللہ صاحب نے اپنی ڈائری میں بار بار اس کو ذکر کیا ہے

حاشیہ باقی آگے صفحہ پر

تحریک چلائے [1]

مگر مہتمم صاحب اور ارباب شوریٰ نے اس کو اور اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان میں ہی ختم کر دیا۔ مولانا محمود حسن صاحب ہر حال میں دیوبند میں ہی رہے اور عبید اللہ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ مولانا کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوتیں اور کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوا کرتے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے میاں محمد ایک شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے) بات محض اصحاب غرض نے گورنمنٹ کو سمجھائی تھی کہ مولانا عبید اللہ نے حضرت کو متاثر کیا ہے۔ یہ لوگ نہیں سمجھتے تھے کہ ہمارے سابقہ اور لاحقہ طرابلس اور بلقان کے معاملات اور ہندوستان کے مظالم اس کے باعث ہوتے ہیں۔ بیچارے مولوی عبید اللہ کو ہدف ملامت بنائے رہے۔

[1] یہ بھی بالکل غلط اور افترا ہے۔ ہندوؤں کو اس تحریک سے بھڑکانے کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے انگریزوں کی عادت رہی ہے۔ مولانا عبید اللہ صاحب اس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ وہ اپنی ڈائری ص۸ میں لکھتے ہیں۔ "میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا۔ لیکن مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔ ہاں عملی حصہ لینے کے لیے مجھے اس زمانہ میں کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا۔ تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلانی شروع کی اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی (ذاتی ڈائری ص۸) اور یہی مطمع نظر اور مشورہ حضرت شیخ الہندؒ کا مولانا عبید اللہ صاحبؒ کے لیے نشان راہ تھا۔ چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کے باب میں ص۹ پر لکھتے ہیں۔" مجھے یہاں صراحت اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر شیخ مغفور کا صحیح مشورہ نہ ملتا تو میری بات اس قدر موثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کرتا۔ بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے مسلک ہندوستانیت بنانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی" (ذاتی ڈائری ص۸۲) امیر حبیب اللہ خاں نے بھی یہی مشورہ مولانا عبید اللہ صاحب کو دیا تھا۔ چنانچہ ڈائری کے ص۱۲ میں لکھتے ہیں۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے ملکر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔ یہ بات عجیب معلوم ہو گی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی بنائی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس میں فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اسکا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔ (ذاتی ڈائری)

خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی اس تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اس کو ہندوستانی تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لیے موثر قرار دیتا ہے۔ یہی اس کا عقیدہ اس سے پہلے کا ہے۔ اور پان اسلامک اور اتحاد اسلامی تحریک کو امیر کابل کی ناپسندیدہ تحریک قرار دیتا ہے اور اسی کو حضرت شیخ الہند کا مشورہ قرار دیتا ہے۔ مگر رولٹ کمیٹی افتراق پھیلانے کے لیے اس کو پان اسلامک

مولوی عبید اللہ کی پیروی کی اور ہندوستان چھوڑ دیا۔ مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کے بجائے عرب کے خطہ حجاز میں پہنچ گئے۔ روانہ ہونے سے پیشتر عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور دو کتابیں شائع کی تھیں۔ جس میں اس نے باغیانہ تعصب کی تبلیغ کرکے ہندوستانی مسلمانوں کو فریضۂ جہاد سے متاثر کرنا چاہا تھا۔ اس شخص (مولانا عبید اللہ) اور اس کے دوسرے دوستوں اور مولانا شیخ الہند کا اہم مقصد یہ تھا کہ بہ یک وقت ہندوستان پر باہر سے بھی حملہ کرایا جائے اور ہندوستانی مسلمانوں میں بغاوت بھی پھیلائی جائے۔ ہم اس جد و جہد کی تفصیل بتلاتے ہیں جو وہ اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے عمل میں لائے۔ عبید اللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہنچے۔ وہاں عبید اللہ کی ملاقات ترکی جرمنی مشن سے ہوئی اور ان کے ساتھ اس نے بھائی چارہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا دیوبندی دوست میاں محمد بھی اس سے جا ملا۔ یہ شخص مولانا محمود حسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کرکے واپس آیا تھا۔ جو مولانا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے وصول کیا تھا۔ یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ محمد میاں نے اس کی کاپیاں راستہ میں ہندوستان اور سرحدی قبائل دونوں جگہ تقسیم کیں۔ مولوی عبید اللہ اور اس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لیے ایک تجویز تیار کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے اٹلی سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں بدنام زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا۔ وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا۔ اور اسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔ ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب ولہجہ کا ایک اخبار جاری کیا۔ جس کا نام اسلامک فرٹرنٹی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومت جاپان نے اس کو بند کرکے اسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدر برادری سے جا ملا۔ ۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومت موقتہ (پروویشنل گورنمنٹ) نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے۔ جن میں اس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستانی

کہتی ہے۔ ہم پہلے بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو مسلمان پارسی سکھ وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی سکیم چلائی جائے۔ پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے نہ صرف اس کو قبول فرمایا تھا۔ بلکہ پہلے سے اس پر عامل تھے ان کے مشن میں سکھ اور انقلابی ہندو شریک تھے۔ جن کی وجہ سے ایک مشتمل مکان دیوبند میں کرایہ پر لے رکھا تھا۔ رولٹ کمیٹی کی یہ رپورٹ جھوٹ اور افترا ہے تراور کیا ہے۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک ۱۸۲۴ء اور جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کام کر رہا تھا (حاشیہ گزشتہ صفحہ) ؎ یہ غلط ہے کہ یہ تجویز آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اس وجہ سے ختم ہوئی۔ یہ تجویز اس وقت تک ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ بعض مسائل دینیہ مختلف فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی سے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کرکے تضلیل و تکفیر پر آمادہ کیا گیا اور اسی اختلاف کی بنا پر مولانا سندھی کو دار العلوم دیوبند سے الگ کیا گیا۔ ان میں سے ایک بزرگ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ آپ نے مولانا سندھی

برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ
ہاتھ آگئے۔ زار کو جو خط لکھا گیا تھا۔ وہ سونے کی تختی پر تھا۔ اور اس کی ایک تصویر ہمیں (رولٹ کمیٹی کے ارکان کو) دکھلائی گئی تھی۔ حکومت موقتہ
ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود
ن (شیخ الہند) کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جو ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا
۔ ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبد الرحیم کے پاس حیدر آباد سندھ بھیجدیا گیا۔ شیخ عبد الرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں
ہ عبد الرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر
ئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سر انجام دیں۔ مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے نام
ئے ہیں۔ ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد جرمنوں
واپسی اور ترکوں کے معطل قیام[1] بھاگے ہوئے (مہاجر) طالب علموں کے واقعات، غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا اور حکومت
ئتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرلے تجویز ہوتی تھی۔ اور اس کا کام اسلامی،
ستوں کے درمیان سلسلہ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود الحسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہنچادیں
لانا عبید اللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب و مکمل نقشہ تھا۔ اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود حسن صاحب کو اس کا سالار بننا
۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بننا تھا۔ اس فہرست
ں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ لاہور کے طلبہ میں سے ایک کو میجر جنرل بننا تھا اور چھ کو

بقیہ حاشیہ صفحہ سے آگے) سے معافی مانگی۔ بہرحال اصلی سبب وہ امر ہے۔ جس کی بنا پر مسٹن گورنر یوپی دیوبند اور دار العلوم میں گیا تھا
ر مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا“۔

[1] ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء تاریخ کے لیے جو سازش تیار ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ایک رجمنٹ اور میگزین پر حملہ کرنا تھا۔ اس تاریخ کو ۱۴۰ آدمی
ن میں سے کچھ مسلم تھے۔ ریل کے ذریعے فیروز پور پہونچے۔ مگر فوج نے پیش بندیاں کی تھیں اور یہ سازش ناکام رہی۔ ان میں سے پندرہ مسلمان
طالب علم سرحد کے ہندوستانی متعصبین (مجاہدین) سے جا ملنے کے لیے نکل چکے تھے۔ (رولٹ کمیشن) رپورٹ فصل پنجاب) پیرا ۱۶۴، ہم نے پنجاب
سے متعلقہ فصل میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور کے ۱۵ طالب علموں نے کالج چھوڑا اور مجاہدین سے جا ملے۔ اس کے بعد وہ کابل گئے
ہاں ان کو پہلے تو سختی سے نظر بند رکھا گیا اور بعد میں رہا ہو کر نگرانی کے ماتحت نقل و حرکت کی اجازت دی گئی۔ وہ ہندوستان واپس آتے۔ تین
د حکومت روس نے گرفتار کرکے برطانوی حکومت کے حوالہ کیا۔ انھوں نے اپنے برتاؤ کے متعلق ندامت کا اظہار کیا اور انھیں بشرط معافی مل گئی
ن پندرہ طلباء کو ان کے مداحوں نے مہاجرین کا لقب دیا تھا۔ ان میں سے جو دو واپس ہوئے ان کے بیانات ہم نے پڑھے ہیں۔ ایک طالب علم تو ایک
مطبوعہ ٹریکٹ سے متاثر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سلطان ترکی نے اعلان کیا ہے کہ چونکہ برطانوی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر
ملہ کرکے ان مقامات کی بے حرمتی کا خطرہ ہے۔ اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو ہجرت کرکے کسی اسلامی ملک میں جانا چاہیے۔ دوسرے طالب علم کو بھی
سلطانی اعلان سے جوش آیا تھا اور انگریزی اخبار کی ۔۔۔ پر سے بھی اسے صدمہ پہنچا تھا۔ جو اس کے خیال میں نفرت کی لہریں پیدا کرنے والی تھی

پلینٹ کرنیل ان اعلیٰ عہدہ داروں کے لیے جن اشخاص کو تجویز کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ اس تقرر کے بارے میں ملاقات نہ ہوئی تھی۔ مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں دی گئی تھی، چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں۔ ۱۹۱۶ء میں محمود حسن اور اس کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضہ میں آگئے۔ اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں۔ غالب نامہ پر دستخط غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے۔ اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا اور میں نے اس پر دستخط کیے۔ اس خط کے مشہور حصوں کا ترجمہ یہ ہے:۔

"ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کے لیے کود پڑے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آگئے ہیں۔

اس لیے مسلمانو! جس عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو۔ اس پر حملہ کرو دشمن کو مرنے پر مجبور کرکے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جدوجہد عمل میں لانے کی جلدی کرو۔ ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مولوی محمود حسن آفندی (سابق مدرسہ دیوبند ہندوستان سے تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا۔ ہم نے اس بارے میں اس سے اتفاق کیا۔ اور اسے ضروری ہدایات دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئے تو تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اور آدمیوں اور روپیوں اور ہر اس چیز سے امداد کی جائے جس کی ضرورت اسے پیش آسکتی ہے۔"

(ذاتی ڈائری از ص۵۳ تا ص۶)

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ:

رولٹ کمیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح اور مکمل علم نہیں ہوسکا۔ تاہم ان تحریروں سے حضرت شیخ الہندؒ کی جلالت و عظمت اور ان کے بلند ارادوں اور استقلال و عالی ہمتی اور بلند پروازی کا کافی اندازہ ناظرین کو ہوگیا ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے فرمایا:

"حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان اور خیالات بھی وہاں تک نہ پہنچے تھے۔"

اور جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لیے دیوبند تشریف لائے اور رو کر کہنے لگے کہ:۔

"حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال نے ہماری کمر توڑ دی"

یورپین قومیں ہر اس شخص کو جو اپنی قوم اور وطن کا فدائی اور خیرخواہ ہو نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کا احترام کرتی ہیں۔ اگرچہ سیاسۃً وہ دشمن ہی ہو۔ مالٹا کی اسارت گاہ میں بڑے بڑے فوجی اور ملکی آفیسر انگریز آتے تھے۔ تو حضرت شیخ الہند کو دور سے دیکھ کر ہیٹ (انگریزی ٹوپی) اتار کر سلام کرتے تھے اور باادب کھڑے ہو کر گفتگو کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کھڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات اپنے ترجمہ قرآن کے لکھنے میں مصروف رہتے۔ مگر یہ فوجی اور ملکی بڑے بڑے انگریز

کھڑے ہو جاتے تھے اور آپ کی مصروفیتوں کو نہایت ادب سے دیکھتے رہتے تھے۔ حالانکہ معمولی گورا بھی بڑے بڑے گورنمنٹ پرستوں، ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں کی ادنیٰ درجہ کی تعظیم و تکریم عمل میں نہیں لاتا تھا۔ پرنس جرمنی (جرمن کا شاہزادہ) جو کہ امڈن جہاز سے گرفتار ہوا تھا اور مالٹا میں ایک عرصہ تک رہا تھا۔ ہمیشہ حضرت کی خدمت میں بالخصوص بقرعید کے موقعہ پر حاضر ہوتا تھا۔ اور مبارک بادی پیش کرتا تھا۔ اور یہی حال بڑے بڑے فوجی اور سول افسروں جرمنی، اسٹرین، بلگیرین اور ترکوں کا تھا۔ مسٹر برن جو کہ گورنر یوپی کا سیکرٹری انگریز تھا۔ مولانا عزیز گل صاحب سے بعض استادوں کے تذکرہ پر کہنے لگا کہ گڑ گڑ ہی رہا اور شکر چیلی بن گئی (یعنی تمہارے وہ اساتذہ کم ہمتی کی وجہ سے نیچے ہی رہے اور تم اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی وجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے) یہ تو دنیاوی عزت اور وقعت کا معاملہ ہے مگر ہم کو اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس سے مدرجہا زائد وقعت کی امیدیں ہیں ؎

سگ اصحاب کہف روزے چند
پے مردم گرفت مردم شد
پسر نوح با بدان بہ نشست
خاندان نبوتش گم شد

اسی پر جب شریف حسین نے دنیاوی لالچ میں آکر انگریزوں کا ساتھ دیا اور اسلامی ترکی حکومت کو جو کہ اس کی اور اس کے آباؤ اجداد اور اولاد و خاندان کی ولی نعمت بھی تھی۔ کفران نعمت کر کے برباد کر دیا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

با بداں یار شد شریف حسین خاندان شرافتش گم شد

چنانچہ تھوڑے ہی زمانہ کے بعد شرافت کا عہدہ اور امتیاز تمام مکہ معظمہ اور حجاز بلکہ عرب سے مٹا دیا گیا۔ شریف حسین کو اس کے آقاؤں نے ہی نظربند کر کے جزیرہ سائپرس (قبرص) میں پہنچا دیا۔ اور وہ اسی طرح وہاں بے چارگی کی حالت میں مرگیا۔ آخرت کی خبر خدا جانے۔ اس کے لڑکوں شریف عبداللہ کو شرق اردن کی بے برگ و بے گیاہ وادی کا چھوٹا سا ٹکڑا اور شریف فیصل کو ماسوپوٹامیا (عراق) کا برباد شدہ اور غیر آباد صوبہ دے دیا۔ اور پھر جو اس کے قتل وغیرہ کے واقعات پیش آئے۔ ان کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔ شریف کے ساتھ غدر کرنے والے سوریہ اور فلسطین کے عرب باشندوں کا جو حشر فرانس اور اسرائیل (یہودیوں) کے ہاتھ سے کرایا گیا۔ وہ تاریخ کے سیاہ اوراق اور عربوں کے زخمی اور گہری گھاؤ والے دلوں سے پوچھئے۔ جن پر یورپ کی تیر اندازی آج تک ختم ہونے میں نہیں آتی اور آئے دن قیامت پر قیامت ٹوٹتی رہتی ہے ان ربک لبالمرصاد۔

گندم از گندم بروید جو ز جو از مکافات عمل غافل مشو

ترک تو اپنے مقامات پر مستقل اور قابض و حکمران رہے۔ مگر عربوں کی پریشانیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ کہاں عربوں کی مستقل جمہوریت اور تمام عربی بولنے والوں کا صدر بائی و فاق اور شریف حسین کی سب پر صدارت، جمہوریت جس کا سبز باغ بلکہ خوش آئند خواب برطانوی ذمہ داروں نے دکھلایا تھا اور کہاں یہ تفرق اور یہودیوں کا یہ تسلط اور ظلم و جبر اور عربوں کے لاکھوں نفوس کی جلاوطنی یہ قدرت کے عجوبات میں سے نہیں ہے تو کیا ہے۔

قل اللهم مالك الملك تؤتي الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من

فتنشاء۔ مگر افسوس ہے کہ انسان اور مسلمان عبرت پکڑنے کے لیے آج بھی تیار نہیں ہے۔ اور نہ خدائے قدوس مالک الملک کی طرف رجوع کرتا ہے۔

نسوا اللہ فانساھم انفسھم والعیاذ باللہ۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس مدت مدید کی اسارت کی مشقتیں برداشت کر کے ہندوستان آئے تو ان کے جذبہ حریت اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی۔ بلکہ ہندوستانی مارشل لا اور رولٹ ایکٹ کے نفاذ جلیانوالہ باغ وغیرہ کے واقعات اور ترکی مملکت کی تقسیم اور معاہدہ سیورے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ بمبئی میں اترتے ہی مولانا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی لکھنؤ سے اور مسٹر گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہند کے استقبال کے لیے تشریف لائے۔ نیز دوسرے لیڈروں سے خلوت اور جلوت میں باتیں ہوئیں تو آپ نے بھی عدم تشدد دنان وائلنس کا پروگرام ہندوستان کے آزاد کرانے کیلئے ضروری قرار دیا۔ اور پھر اسی طریقہ پر تمام خلافت کمیٹی اور کانگریس کی تجویز کردہ باتوں کی موافقت کی۔ دیوبند پہنچ کر چند دنوں قیام فرما کر ضروری سمجھا کہ کوڑا جہان آباد ضلع فتح پور ہسوہ میں تشریف لے جائیں اور حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کی والدہ اور اہلیہ محترمہ اور ان کے بچوں کی تعزیت کریں۔

حضرت شیخ الہند کا سفر کرنا

حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مخلص خاص خادم تھے۔ اگرچہ مشن آزادی کے ممبر نہ تھے۔ مگر مکہ معظمہ میں بایں ارادہ ساتھ ہو گئے تھے کہ مدینہ منورہ ساتھ جائیں گے۔ برطانیہ کی غلط کاری سے ان کو بھی رفقاء میں سے شمار کر دیا گیا اور گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ قاہرہ مصر میں بیان لینے والے انگریز نے خود کہا کہ ان کاغذات (ڈائری اور سی آئی ڈی کی رپورٹوں) میں آپ کا کہیں تذکرہ نہیں پاتا ہوں۔ تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا۔ جن کو سی آئی ڈی نے ان کاغذات میں ذکر کیا ہے۔ مجھ کو گرفتار کرنا بالکل دھاندلی ہے (صفحہ ۵۶ سفرنامہ میں ان کے جوابات کی تفصیل درج ہے۔ مگر اندھیر نگری چوپٹ راج میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ ہمارے ہی ساتھ مالٹا میں نہایت اطمینان اور تسلی سے رہے اور پھر بیمار ہوتے اور وہیں انکا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند کو ان کے انتقال سے بہت صدمہ ہوا تھا۔ ان کی ضعیف العمر والدہ اور دیگر متعلقین سے حضرت کو بہت ہمدردی تھی۔ اس لیے یہ سفر ضروری خیال کیا گیا۔ الٰہ آباد[2] والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے وہاں اترنے کا اصرار کیا وہاں اچھا خاصا اجتماع قاری عبدالرحمن صاحب مرحوم کے مدرسہ میں ہو گیا۔ تو حضرت نے مولانا شبیر احمد کو تقریر کے لیے فرمایا۔ اس تقریر میں خلافت کمیٹی کی حمایت اور تائید پر زور طریقہ پر کی گئی تھی۔ پھر غازی پور فیض آباد لکھنؤ کو تشریف لے جانا ہوا۔ لکھنؤ میں فرنگی محل میں مولانا عبدالباری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے حسب ارشاد حضرت شیخ الہند رح لکھنؤ میں تقریر فرمائی۔ اس کے بعد مراد آباد ہوتے واپس ہو گئے۔

---

[1] اور نہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے۔ بلکہ اگلے سال وہ اور سید ہاشم صاحب سوڈان اور مکہ ہوتے ہوئے آئے تھے جب حضرت شیخ الہند مدینہ منورہ سے واپس آئے تو مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی۔

[2] مولانا فاخر صاحب الٰہ آباد سے ملاقات کرنے کے لیے دائرہ شاہ اجمل صاحب میں تشریف لے گئے اور مبلغ لہ ۱۰ تین (یعنی مولانا فاخر صاحب الٰہ آبادی) کو پیش کئے۔ یہ حضرت شیخ کی کرامت تھی کہ اس روز جس نے نذر پیش کی۔ گیارہ روپے ہی پیش کئے (بحوالہ مولانا سید رشید صاحب خلف مولانا سید فاخر صاحب) تاشیہ

شیخ الہند کا خطاب اور قدوم مبارک کی برکات

حضرت کی تشریف آوری اور خلافت کمیٹی کی شرکت اور تائید اور آزادی ملک کی تڑپ اور اس راستہ میں جان بازی اور استقلال و اخلاص، ایسے امور نہ تھے کہ قلوب کو مسخر نہ کریں۔ چنانچہ عام مسلمانوں کے قلوب آپ کی طرف نہایت اخلاص کے ساتھ جھک گئے اور عموماً لوگوں میں انی محبت اور قبولیت جاگزیں ہوگئی۔ چنانچہ خلافت کمیٹی کے زعماء نے آپ کے لیے شیخ الہند کا لقب تجویز کیا۔ جو کہ ہر طرف اور ہر جماعت مقبول ہوگیا اور بمنزلہ جزء اسمی بن گیا اور باوجودیکہ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ تقریر کے عادی نہیں تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں مقبولیت نے قت میں ایسی قبولیت پیدا کر دی کہ لوگ عموماً آپ پر پروانہ وار فدا ہونے لگے۔ اور یہ تحریک خلافت اور آزادی برقی طاقت کے ہ مسلمانوں کے دل اور دماغ پر چھا گئی۔

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری

حضرت شیخ الہندؒ اس سفر حجاز سے پہلے گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل میں مبتلا رہتے تھے۔ سردیوں میں یہ مرض ترقی کر جاتا تھا۔ سیڑھیوں پر چڑھنا اترنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ علاوہ ں کے بواسیر کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایات رہتی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اس سفر میں اس طرح شامل حال ہوا کہ تمام زمانہ اسارت یہ تکالیف بہت کم اور تقریباً معدوم ہوگئی تھیں۔ مالٹا نہایت سرد جگہ ہے۔ ہم کو ابتداءً خیموں میں رکھا گیا تھا۔ سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ پڑتی ہی تھی۔ مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کہ باوجودیکہ لکڑی کی چارپائیوں پر نیچے گدے اور اوپر دو کمبل ہوتے تھے۔ پھر بھی آدھی رات کے بعد سردی شدت سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے۔ پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے اور چونکہ پیشاب کے بار بار آنے کی بیماری تھی۔ ایک شب میں کئی کئی مرتبہ ضرورت پڑتی تھی۔ تاہم بلاتکلف بار بار وضو کرتے تھے۔ اگرچہ بعد میں ہم گرم پانی اور آگ کے مہیا کرنے کا انتظام بھی کر سکے۔ تاہم اس قسم کا انتظام عرصہ تک نہیں ہو سکا تھا۔ تب بھی بلاتکلف حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے مال بجالاتے رہے اور اس قدر بیماریوں کی شکایتیں تمام سفر میں مفقود رہیں۔ جو پہلے تھیں۔ البتہ ہندوستان پہنچ جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ ں شکایات لوٹ آئیں اور بڑھنے لگیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جذبۂ آزادیٔ ہند اور انگریزوں کے یہاں سے نکلنے کا نہ صرف قائم رہا۔ بلکہ در قوی اور ترقی پذیر ہوگیا ان ہی مصائب مالٹا وغیرہ سے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں پختہ ارادہ کیے ہوئے ہوں راس بیماری سے اچھے ہوتے ہی تمام ہندوستان میں دورہ کروں گا اور ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی مکمل جد و جہد کے لیے آمادہ کروں گا۔ اور یقیناً اگر عمر وفا کرتی تو ضرور وہ ایسا کرتے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ گوناگوں امراض ترقی کرتے رہے۔ باوجودیکہ یونانی ور ڈاکٹری معالجوں کی فراوانی تھی۔ اور ہر ایک نہایت فدائیت کا دم بھرتا تھا اور خلوص دل سے کوشاں تھا۔ مگر تقدیر کے سامنے تدبیر ہا کر سکتی ہے۔

میرا ایام بیماری میں غیر حاضر ہونا

چونکہ ۱۳۲۶ / ۱۳۲۷ھ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان بحکم والد صاحب مرحوم بوجہ وفات اہلیہ اولیٰ برائے عقد ثانی آیا تھا۔ اور فرصت کو غنیمت جان کر دورۂ حدیث شریف کی پرانی تمنا کو حاصل کر سکا تھا۔ چونکہ اور رشتہ دار کنبہ والوں نے نکاح کرنے سے بخوف سفر حجاز انکار کر دیا تھا۔ اس لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کی توجہ اور عنایت سے عقد ثانی قصبہ بھوجپور ضلع مراد آباد میں سید حکیم غلام احمد صاحب مرحوم کے یہاں ہوگیا تھا۔ اگرچہ حکیم صاحب نے بشرط واپسی یک سال اہلیہ مرحوم کو مدینہ منورہ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر مختلف ایسے مواقع آتے رہے کہ مجھ کو دیوبند میں تقریباً

تین سال ٹھہرنا پڑ گیا۔ پہلے سال میں میں بخاری شریف اور ترمذی شریف دوبارہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس دفعہ پڑھانے
میں خصوصی مراعات فرماتے تھے۔ جو کہ عام طلبہ کو حاصل نہیں ہوتی تھی۔ وجہ یہ بھی تھی کہ اس ۶ برس کے عرصہ قیام مدینہ منورہ میں یعنی ۱۳۲۰ھ سے
تک کتب درسیہ غیر درسیہ عموماً میں نے نہایت پڑھائیں۔ تقریباً چودہ پندرہ اسباق مختلف علوم درسیہ کے روزانہ پڑھاتا تھا۔ طلبہ کا
تھا۔ اکثر مضامین غامضہ پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس لیے مباحث علمیہ کی مشکلات زیر نظر ہو گئیں تھیں اور ان کی گتھیوں کو سلجھانا بجز حضرت شیخ الہند
کے کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی استحضار مسائل دیکھ کر نہایت کشادہ پیشانی سے بحث فرماتے تھے۔ اور مشکلات کو
توجہ سے حل فرما کر بہت سے ایسے مضامین ذکر فرماتے تھے کہ عام مستفیدین کو ان کے سننے کی نوبت بھی نہیں آسکتی تھی۔ علاوہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ
کے تمام اساتذہ اور ارباب اہتمام انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے اگلے سال معقول تنخواہ پہ خدمت تدریس پر مقرر کر دیا۔ اور ارباب
شوریٰ سے یہ تجویز پاس کرا دی کہ حسین احمد جب بھی ہندوستان میں آئے۔ بلا تجدید تقرر خدمات تدریسیہ انجام دیا کرے اور کتب درسیہ
اونچے درجے کی کتابیں حدیث و فقہ و تفسیر وغیرہ کی پڑھانے کے لیے دی گئیں۔ اسی عرصہ میں جلسہ دستار بندی بھی منعقد ہوا۔ اور اس
بھی حسب استطاعت انجام دینی پڑیں۔ چونکہ میں اپنی خواہش سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے اور پھر جدہ سے ہوا
سفر میں حضرت کی خدمات سرانجام دوں اور حتی الوسع تکالیف سفر کو کم کروں۔ اس لیے واپسی پر قصد مصمم تھا کہ بمبئی پہنچ کر حجاز کو واپس
بمبئی سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خدام کا بہت بڑا گروہ مل جائیگا۔ میرے خدمت میں حاضر رہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ اور نہ ضرورت
مگر اس خیال کو جب میں نے ایک روز سویز میں ظاہر کیا تو فرمایا کہ میں تراجم ابواب بخاری کی شرح لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ کام میں تنہا نہیں کر سکتا
سمجھ گیا۔ کیونکہ ایام اقامت دیوبند میں بھی ۱۳۴۷ھ میں یہ کام شروع کیا گیا تھا اور حضرت نے میری اس وقت کی خدمات کو پسند فرمایا تھا۔ میں نے عرض
کیا کہ جو وقت آپ اس کیلئے عطا فرمائیں۔ اس وقت میں چاہے کیسا ہی بلند رتبہ شخص آئے۔ اس کے لیے صرف نہ فرمائیں۔ فرمایا کہ قبول ہے۔ مگر میری
بھی ایک شرط ہے۔ میں نے عرض کیا وہ کیا ہے۔ تو فرمایا کہ پھر کہیں گے۔ اس لیے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ دیوبند میں حضرت کی خدمت میں تا اختتام تراجم ابواب
رہوں گا۔ مگر جب بمبئی پہنچا اور تحریک خلافت کا زور شور دیکھا اور دیکھا کہ حضرت کا طبعی رجحان تحریک آزادی کی جدوجہد کی طرف قوی تر ہو گیا ہے۔
اور وہی لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ تو یقین ہو گیا کہ کسی قریبی زمانہ میں تراجم ابواب کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں نے حضرت
سے عرض کیا کہ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ چلا جاؤں۔ اور یہاں سے ہی انتظام سفر شروع کر دوں تو فرمایا کہ تیرا جانا تو کسی طرح
اس زمانہ میں بھی مناسب نہیں۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے دونوں بھائیوں مولوی سید احمد مرحوم اور محمود احمد کو بھی لکھ دے کہ وہ یہاں ہی آجائیں تو پھر
میں نے عرض کیا کہ اچھا تو اتنی اجازت عطا فرمائیں کہ میں بمبئی میں ۳، ۴ دن ٹھہر کر آپ کے بعد دیوبند پہنچوں۔ میرے چند احباب یہاں ہیں ان
سے ملنے کی نوبت نہیں آتی ہے۔ تو اس کی بھی اجازت نہیں دی اور اسی پر اصرار فرمایا کہ ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ چنانچہ ساتھ ساتھ ہی دیوبند پہنچنا ہوا۔
حافظ زاہد حسن صاحب امروہی میرے خصوصی محسن ہیں۔ ان سے ہمیشہ بہت گہرے تعلقات چلے آتے ہیں۔ وہ بھی بمبئی تشریف لائے تھے کیونکہ وہ
مدرسہ امروہہ جامع مسجد کے مہتمم تھے اور مدرس مدرسہ مذکورہ۔ حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب مرحوم کی کسی وجہ سے مدرسہ امروہہ سے برداشتہ خاطر
ہو کر بلینڈھ یا چھپاری کے مدرسہ میں چلے گئے تھے۔ اس لیے حافظ صاحب موصوف نے مجھ پر زور دیا کہ وہاں کی ملازمت قبول کر لے بمقتضائے ضروریات
وقتیہ میں نے اس کو قبول کر کے عرض کیا کہ آپ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے لیں۔ انھوں نے دیوبند پہنچ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو راضی کیا۔ حضرت
مولانا حافظ احمد صاحب کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے دیوبند کے لیے فرمایا کہ اس کی مدرسی یہاں کی پہلے سے منظور شدہ ہے۔ بحث و تمحیص کے بعد وہ راضی

...لیے۔ چنانچہ میں پورب کے سفر کو ڑہ جہان، الہ آباد، غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ، مراد آباد سے واپس ہو کر امروہہ چلا گیا۔ اور کتب ...بیہ متعلقہ مدرس اول کی تدریس میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حضرت کا حکم محرم محمد کرملا کہ تم کو یہاں دیوبند میں میرے پاس رہنا چاہیے ...زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بیماریوں کی شکایت شروع ہو گئی تھی۔ مہمانوں کا بہت ہجوم رہتا تھا اور تحریک آزادی کے سلسلہ میں دورہ کی تیاری ...رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے ارشاد اور حکم سے میں امروہہ گیا ہوں اور وہ بھی آپ ہی کا مدرسہ ہے۔ اس کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ ...رمایا کہ مجھ کو یہاں تیری ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں تو خدمات انجام دینے والے بکثرت اور خصوصاً فلاں فلاں حضرات موجود رہتے ہیں۔ فرمایا کہ ...وہ تیرا ہی نگہداشت بھی نہیں کر سکتے۔ میری نگہداشت کیا کریں گے۔ اس کو سن کر میں چپ ہو گیا اور عرض کیا کہ میں حسب ارشاد حافظ زاہد حسن صاحب ...لکھتا ہوں۔ چنانچہ حافظ صاحب موصوف کو اطلاع دی۔ وہ فوراً آئے اور عرض و معروض کے بعد اس پر راضی کر لیا کہ ایک مہینہ کے لیے حسین احمد کو امروہہ ...اجازت دے دی جائے۔ تاکہ ہم اس مدت میں ہم دوسرے مدرس کا انتظام کر لیں۔ حضرت اس پر راضی ہوئے اور میں امروہہ جا کر تدریس ...مشغول ہو گیا۔ میرے جانے پر مرض میں زیادتی ہو گئی۔ کچھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ حضرت کا تار پہنچا کہ میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جا رہا ہوں۔ تم مجھ سے ...گڑھ میں مل۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سفر علیگڑھ اور جامعہ ملیہ

تحریک خلافت کا زور تھا۔ انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی۔ ترک موالات کا جوش تھا۔ اس لیے چاہتے تھے کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے ...تعلق کر لے۔ مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیاں یونیورسٹی کب اس کو گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے سخت مخالفت کی۔ جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی مرحوم اور ...کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلبا یونیورسٹی کی ایک بڑی اور معتد بہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی۔ اور آزاد درسگاہ قائم کرنے کے لیے جس میں ...مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو۔ تیاری کرنے لگی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا۔ اور اس میں نان کو اپریشن کی تحریک ...ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز بہت کمزور ہو گئی تھی اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آ گئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ...اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے ...لئی طلبا یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی۔ اور تمام ...مانوں اور طلبہ مسلم یونیورسٹی کو زوردار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں اور تمام کالج اور اسکول گورنمنٹ امداد ...کردیں۔ اور اگر کالجوں اور سکولوں کے زعماء اڑنہ چھوڑیں تو طلبہ ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں ...سے علیحدہ ہو جائیں۔ جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے۔ وغیرہ، وغیرہ۔ اس ہی فتویٰ کی وجہ سے گورنمنٹ نے سر رحیم بخش کو خصوصی طور پر ...سری مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھانے اور فتوا واپس لینے کے لیے بھیجا تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فتویٰ ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس ...ہیں لیا۔ جیسا کہ طلبا مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا۔ اسی طرف خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ ...چھپ کر شائع ہوا۔ فتویٰ مذکورہ کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ؐ
قال اللہ تعالیٰ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا انّ اللہ مع الصابرین ۝
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا بگڑ جائے

تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔

وتعاونوا علی البرّ والتقویٰ و لا تعاونوا علی الاثم و العدوان ط

اور تم کو نیکی اور تقویٰ کی معاونت کرنی چاہیئے اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو۔

ومن یتولهم منکم فانہ منهم ان اللّٰہ لا یهدی القوم الظالمین ہ

کفار کی موالات کی تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے ۔ اور جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی ۔ وہ شخص بھی ان ہی میں سے شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا۔ ۔

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف

آدمی کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

اما بعد آج جب کہ شرق و غرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے ۔ جب کہ اندیشہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ کا جہاز امنڈتے طوفانوں کی موجوں سے ٹکرا کر (خدانہ کردہ) پاش پاش ہو جائے ۔ جب کہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے ۔ بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے ۔ علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جد و جہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں ۔ کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے ۔ لیکن جو فرض شرعی قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے ۔ تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے ۔ میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں ۔ اور جیسا کہ میری طویل زندگی سے شاہد ہے ۔ میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے ۔ اور یہی وہ مطمح نظر ہے ۔ جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہنچایا ۔ پس میں ایک لمحہ کے لیے کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعتِ اسلام کی فوز و فلاح سے ہو ۔ یا دشمنانِ اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو ۔ مالٹا سے واپس آکر مجھ کو علم ہوا کہ ہندوستان کے اربابِ بسط و کشاد نے آخری طریقہ کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے ۔ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں ۔ اور نفع و ضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملیہ کی پوری جانچ کرکے اس کو بے خوف و خطر انجام تک پہنچائیں اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و موالات کو اعتقاداً و عملاً ترک کر دیں ۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابلِ انکار ہے ۔ اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیئے کہ وہ

۱۔ سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے ۔

۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے۔
۳۔ صرف اپنی ملک کی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے۔
۴۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں۔ ان پر عمل کریں۔ بشرطیکہ :۔
۱۔ اتباع شریعت کیا جائے۔ اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔
۲۔ نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقض امن کا اندیشہ ہو۔ ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچکر اعتدال مد نظر رہے۔
۳۔ ارشاد عثمان - اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساؤا فاجتنب اساتھم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو۔ اور جبکہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین

العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی ۲ ر ذلقعدہ ۱۳۳۸ھ

اس کے بعد یہی فتویٰ جمعیۃ علماء ہند کے متفقہ فیصلہ کی صورت میں تقریباً ۵ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا[1] الغرض اسی تحریک اور اسی فتوٰی اور اسی تحریر کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اگر زعماء مسلم یونیورسٹی پہلے سے آزاد اور قومی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق نہ ہوتا۔ بہر حال گورنمنٹ پرستوں نے انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور غداریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی کو ہی سراہا۔ جوشیلی روحیں کب اس کو گوارا کر سکتی تھیں۔ انھوں نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کیا۔ مگر جب اصلاح ممکن نہیں ہوئی۔ تو مجبوراً آزاد نیشنل یونیورسٹی کے لیے جلسہ کرنا چاہا اور اہل الرائے کو دعوت دی۔ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو صدر بنانا چاہا۔ حضرت اس وقت سخت بیمار تھے۔ چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ خدام نے اس سفر کو خطرناک اور نہایت تکلیف دہ ظاہر کیا۔ دوسری طرف دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری جد وجہد کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیر تک فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت کا جواب حسب ذیل تھا :۔

" اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو ضرور شریک ہوں گا "

---

[1] حضرت مولانا حافظ احمد صاحب صاحب زادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم اور مہتمم دار العلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب سرجیمس گورنر یوپی نے دلوایا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واپس کر دیا اور ایسی موثر تقریر مجمع خصوصی میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام مجمع متاثر ہو کر بیک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔

چنانچہ ۱۰ ارصفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء اجلاس کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبۂ صدارت کا مضمون شبیر احمد صاحب کو تبلاکر تحریر کا حکم دیا اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسودہ لکھ کر لائے تو اس کو سن کر حسب منشاء ترمیم فرماکر چھاپنے کا حکم دیا۔ اس مدت میں مرض اور ترقی کرتا گیا۔ ہر قسم کا علاج جاری تھا۔ مگر بجائے فائدہ زیادتی تھی۔ بخار لازمی صدرت اختیار کیے ہوئے تھا ضعف اور نقاہت ترقی پذیر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تقاضہ تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی لے جایا جائے۔ تاکہ میں پوری توجہ سے آنکھوں کے سامنے علاج کروں اور دوسرے اہل الرائے سے بھی مشورہ کرسکوں۔ مگر چونکہ علیگڑھ کی تاریخیں مقرر ہوچکی تھیں۔ اس لیے قرار پایا کہ علیگڑھ کے جلسہ سے فارغ ہوکر براہ راست دہلی روانہ ہوجائینگے اور برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمائینگے۔

میرا علیگڑھ اور پھر دہلی پہنچنا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اجلاس میں صدارت فرمانا

دیوبند سے تار آیا کہ میں فلاں گاڑی سے علیگڑھ جارہا ہوں مجھ سے وہاں مل۔ حسب الحکم میں وہاں پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ جناب عبدالمجید صاحب خواجہ کی کوٹھی پر قیام تھا۔ وہیں میں بھی قیام پذیر ہوا۔ اگلے روز جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ نے شرکت اور صدارت فرمائی۔ ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے۔ دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک کر چلنا ہوتا تھا۔ خطبہ جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے پڑھا جو مطبوع ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل فقرے قابل یادگار ہیں۔

۱۔ میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں۔ جن کے چہرہ پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ۔ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہوجاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا۔

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

۲۔ اے نونہالان وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔ تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علیگڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علیگڑھ کا رشتہ جوڑا۔

۳۔ آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا۔ کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے۔ جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں۔ یا حکومت

وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے

ہماری قوم کے سرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی بڑی اہم ضرورت کا احساس کیاہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی احساسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں قوم و ملک کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا۔ جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام عملی اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہند رح نے فرمایا ہے۔ منصف انگریز بھی یہی بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر صد ۲۰۲ میں ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے

"مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں۔ جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں دنیادار لوگ ہمیشہ قائم حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے بے لیس حقائق کے مقابلے میں آتے ہیں۔ تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں۔ اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں۔ لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے"

(صد ۲۰۲ ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین ایم بی بی ایس)

...سے واپسی اجلاس مذکورہ سے فارغ ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لاتے اور ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ سے علاج فرمایا۔ چونکہ اس سے پہلے امرتسر میں جمعیۃ ...نقاد مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ اور مولانا کفایت اللہ صاحب مولانا احمد سعید صاحب اور دیگر ...ہند دہلی سے ہو چکا تھا۔ اور پہلا جلسہ بھی وہیں ہو چکا تھا۔ اس لیے اہل الرائے حضرات نے ضروری سمجھا کہ اب اس کا دوسرا اجلاس ...ے پیمانہ پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں منعقد کیا جائے۔ تاکہ احوال حاضرہ میں علمائے اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتفاق ...چونکہ حضرت کو عام مقبولیت حاصل ہے۔ مسلمان سب سے زیادہ آپ کے گرویدہ اور آپ کے ساتھ حسن اعتقاد رکھتے ہیں

اور آپ پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی استدعا کی گئی تو آپ نے قبول فرمایا۔ اور ۷، ۸، ۹ ربیع الاول اجلاس کی تاریخ مقرر کی گئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی کفایت اللہ صاحب کو تحریر خطبہ صدارت پر مامور فرمایا اور مضامین ضروریہ ذکر فرما دیئے۔ مفتی صاحب مرحوم نے مسودہ تحریر کر کے پیش فرمایا اور حضرت کو سنایا۔ بعد ضروری اصطلاحات اور ترمیم کے حضرت نے چھپانے کا ارشاد صادر فرمایا۔ خود حضرت اس قدر بیمار اور ضعیف تھے کہ جلسہ میں باوجودیکہ وہ دہلی میں تھا، نہیں جا سکتے تھے۔ جلسہ میں خطبہ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے پڑھا۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی کتاب علماء حق ص۲۱۵ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ العزیز اگرچہ حیات مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے۔ مگر علماء ملت کی آرزو یہی تھی کہ جمعیۃ علما حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی امتیاز حاصل کرے اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کر لے جس پر کاربند ہو کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتی رہے۔

حضرت شیخ الہند کا خطبہ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا۔ مگر علماء ملت اور ملی سیاست کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے مکمل اور کافی تھا۔

حضرت شیخ کے اس خطبہ صدارت نے علماء ملت کو بہ ذیل اصولی نظریات کی ہدایت فرمائی۔

۱۔ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے۔ جس سے ترک موالات فرض ہے۔

۲۔ تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

۳۔ استخلاص وطن کے لیے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے۔ مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

۴۔ اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعداء کے لیے جائز ہو سکتا ہے۔ باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق ہوائی جہاز نہیں ہیں، یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔"

(ص۱۶ خطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

حضرت شیخ کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس کے چند جملے بلفظہ درج ذیل ہیں۔

"کچھ شبہ نہیں کہ اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے مقاصد کے حصول میں موید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو

محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں، اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حالات اگر اس کے مخالف ہو گی۔ تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے۔ تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہو۔ ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے دبا سکے گی۔ ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشیں کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں۔ کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں۔ کہ صلح و آشتی کی ترتیب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ نہ کیا جائے۔ جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن محکموں اور ابوابِ معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے در پے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے۔ کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے۔

اگر فرض کرو، ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پئے۔ یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لیے مہلک نہیں۔ البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں اتفاق کے حق میں سمِ قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔"

(صفحہ ۱۸ خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند مطبع قاسمی)

(از علمائے حق صفحہ ۳۱۸)

حضرت شیخ الہند کی بیماری اور وصال

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال کی تفصیل تو جناب مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ "حیات شیخ الہند" میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ جس کو نقل کرنے میں بہت تطویل ہے۔ بنا بریں ہم اس کا اختصار ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں۔

"حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ رجون ۱۹۲۰ء کو ایک بجے دن کو مالٹا سے بمبئی پورٹ پر تشریف فرما ہوئے۔ بمبئی میں دو دن قیام فرما کر ۲۳ رمضان شب جمعہ مطابق ۱۰ رجون بعد از مغرب روانہ وطن ہوئے۔ ۲۴ رمضان المبارک مطابق ۱۲ رجون ۱۹۲۰ء بوقت صبح دہلی پہنچے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔ ایک روز قیام فرما کر ۲۵ رمضان المبارک مطابق ۱۳ رجون ۲۰ء بروز یک شنبہ بوقت صبح دہلی سے روانہ ہوئے۔ اور اسی روز ۹ بجے دیوبند پہنچے استقبال کرنے والوں کا ہر اسٹیشن پر جس طرح نہایت زیادہ ہجوم تھا۔ یہاں پر بھی بہت زیادہ ہجوم تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے دارالعلوم تشریف لے گئے۔ مہمانوں کی اطراف و جوانب سے بہت زیادہ آمد تھی۔ بنا بریں ۱۰ شوال ۱۳۳۸ھ تک دیوبند ہی میں قیام فرمانا پڑا۔ ورنہ چونکہ ارادہ تھا کہ جلد از جلد مولانا حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کے مکان پر کوڑہ جہاں آباد ضلع فتح پور مرحوم کی تعزیت کے لیے پہنچیں جہاں ان کی والدہ ماجدہ اور دیگر متعلقین موجود تھے۔ وہاں سے الٰہ آباد، غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ، مراد آباد ہوتے ہوئے ۲۵ شوال کو دیوبند واپس ہوئے۔ چونکہ اہلیہ محترمہ سخت بیمار تھیں اس لیے درمیانی مقامات پر نہ جا سکے۔ اگرچہ عقیدتمندوں کے بہت تقاضے تھے۔ ۱۷ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کو اہلیہ محترمہ مرحومہ نے داغ مفارقت دیا۔ جس کا اثر طبع مبارک پر ہونا طبعی امر تھا۔ ماہ ذی الحجہ میں دیوبند میں موسمی بخار اور تپ و لرزہ کا بہت زیادہ شیوع ہوا۔ چنانچہ عشرہ محرم کے بعد خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی مبتلائے تپ و لرزہ ہو گئے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ کہ وجع مفاصل اور بواسیر کی تکلیف سابق ہندوستان پہنچنے کے بعد عود کر آئی تھی۔ مگر تاہم اس کا تحمل فرماتے تھے اور نشست و برخاست آمد و رفت پر زیادہ اثر نمایاں نہیں ہونے دیتے تھے۔ مگر اس تپ و لرزہ نے یکبارگی اتنا ضعیف کر دیا کہ نشست و برخاست آمد و رفت کی طاقت جاتی رہی۔ معالجہ یونانی اور ڈاکٹری جاری تھا۔ بعد انتہائی کمزوری اور مرض کے اواخر محرم سے افاقہ تدریجی طور پر شروع ہوا۔ مگر افاقہ کی رفتار بہت سست تھی۔ ۲ صفر کو بتقریب صحت احباب اور طلباء دارالعلوم کی دعوت کی گئی۔ جس کا اہتمام مخلصین نے از خود کیا تھا۔ افسوس کہ قدرت کو یہ خوشی باقی رکھنی منظور نہ تھی۔ ۶ صفر کو پھر بخار آیا اور پیچش بھی ہو گئی اور ضعف اور مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ اطباء نے ورم جگر تشخیص کیا۔ اسی زمانے میں سفر علیگڑھ کی تحریک ہوئی۔ جس کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ علی گڑھ میں جلسہ ہوا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ پڑھ کر صدارت فرمائی۔ کمزوری

اسقدر تھی کہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے۔ مولانا شبیر احمد مرحوم نے خطبہ پڑھا۔ اگلے روز علیگڈھ سے واپس ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے۔ معالجہ نہایت توجہ سے ہوا جس سے تخفیف کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۴ ربیع الاول تک اطمینانی حالت رہی۔ مگر ۱۵ ربیع الاوّل یوم شنبہ کو پھر لرزہ بخار آیا اور حالت نہایت نازک ہوگئی۔ بخار بہت تیز ہوگیا۔ حالت اگرچہ تشویشناک تھی مگر ہوش وحواس بجا تھے۔ آدمی پہچانتے تھے۔ بہت ضعیف آواز سے بات بھی فرماتے تھے مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم سوانح صـ۱۴۶ میں لکھتے ہیں: (۱۸ کی شب کے متعلق) رات بھر یہی حالت رہی۔ سینہ پر بلغم تھا جس کو ضعف کی وجہ سے دفعہ نہیں کرسکتے تھے۔ صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف امید حلق میں اتر گیا۔ ۶ بجے کچھ اجابت ہوئی۔ اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ ضعف لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور باوجود ہوش بجا ہونے کے ایک استغراقی، حالت تھی۔ مخصوص لوگ چارپائی کے گرد جمع تھے۔ دل دھڑک رہے تھے۔ طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ سات بجے کے بعد ۱۸ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۰ نومبر کو بہت تغیر ہوگیا۔ حضرت دنیا سے بالکل غافل ہوگئے۔ تنفس طویل اور غیرطبعی ہوگیا۔ اور انقطاع عن الدنیا و توجہ الی الرفیق الاعلیٰ کا گمان غالب آنے لگا۔ چارپائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکراللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اس غیرفانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا جس کے نام پر اپنے آپ کو محو کردیا تھا یعنی بلند آواز سے ۳ مرتبہ اللہ اللہ فرمایا۔

مولانا شبیر احمد مرحوم کا بیان ہے جس کو مولانا جلیل صاحب نے نقل فرمایا کہ حضرت نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں۔ تمنا تو یہ تھی کہ میدان جہاد ہوتا اور اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے۔ اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی۔ دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے سورۃ یٰسین شروع کی مگر وہ جوش گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس لیے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سورۃ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کرکے اپنا بدن سیدھا اور درست کرلیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کرلیں اور ۸ بجے جب کہ مولوی صاحب بالکل اخیر پر پہنچے تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کے لیے زبان کو حرکت دی اور خاص الیہ ترجعون کی آواز پر قبلہ رخ ہوکر ہمیشہ کے لیے آنکھ بند کرلی۔ کس اور سہولت سے سانس منقطع ہوگیا اور روح مقدس روح و ریحان وجنۃ نعیم

کی بہار دیکھنے کے لیے تمام اہل اسلام کو یتیم و بے کس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی۔ اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا الیہ راجعون۔ وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے۔"

(سوانح شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۴۷)

غمزدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق و بے قراری کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ کچھ دیر تو وہ حالت رہی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ کسی کی آہ نکلی کوئی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسے جانکاہ حادثات پر آہ و نالہ اور چیخ و پکار ایک معمولی بات ہے۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا فیض صحبت کام آیا اور رضا بالقضا کا مضمون غالب ہوا۔

نصف گھنٹہ کے بعد منزل اول (قبر) کا فکر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی صاحب (حکیم محمد حسن صاحب) اور خدام سے استفسار فرمایا کہ اگر دہلی دفن کرنا آپ مناسب سمجھیں تو محدثین (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور اخلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ) کے مزارات میں سامان کیا جائے اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آوے۔ جواباً کہا گیا کہ حضرت کی آرزو تھی کہ اپنے مخدوم (حضرت نانوتوی) کے جوار باکرامت میں جگہ ملے اور یہی آرزو اور کشش دوسری دنیا (مالٹا) سے کھینچ کر لائی تھی۔ نیز صاحبزادیاں بھی اب تک دہلی نہ پہنچیں تھیں۔ اس لیے یہی رائے ہوئی کہ دیوبند لے چلنا چاہیے۔[1]

(سوانح ص ۱۴۸)

دیوبند کو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مضمون کا مفصل تار روانہ کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو گئی۔ جنازہ شام کو ... اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم اطلاع دینے اور کفن و تابوت اور ریل کے انتظامات میں مصروف ہوئے۔ ادھر خدام نے غسل کا انتظام کیا۔ حکیم محمد ... صاحب نے مخصوص شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون غسل دیا۔ اور کفن پہنا کر تابوت میں رکھا۔ جو کہ نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کرایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہو گئے۔ جن کی تکمیل میں دوسروں کو بہت دقت اور تاخیر پیش آتی۔

ڈاکٹر صاحب ہی کا تار امروہہ میں میرے پاس وفات اور جنازہ کے دیوبند لے جانے کا اسی روز شام کو پہنچ گیا تھا۔ حالانکہ میں نے ادھر ... کی ان کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ ———— غالباً ... آئی[2]

---

[1] مگر مولانا جلیل صاحب کا بیان یہ ہے کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہی تھی کہ حضرت کو مقبرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں دفن کیا جائے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میں دو مشکلات میں ہوں ایک یہ کہ دیوبند لے جائیں تو مذہب حنفی میں یہ غیر مستحسن ہے اور دوم یہ کہ یہاں کے مقابر میں دفن کریں تو چونکہ اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تمام مسلمانوں کو انتہائی شغف اور محبت ہے لہٰذا خوف ہے کہ لوگ قبر کو پختہ کر دیں۔ اور ہم کتنا ہی صدائے احتجاج بلند کریں کچھ بھی نہ سنیں۔ پھر فرمایا کہ اھون البلیتین یہی ہے کہ جنازہ دیوبند ہی لیجایا جائے۔ وہاں قبر کے پختہ کرنے کا احتمال نہیں ہے اور صاحبزادیوں کی بھی اشتیاق پوری ہو جائے گی۔ اس لیے اسی کو اختیار کیا گیا۔

[2] حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

نے ان کو اطلاع دی ہوگی۔ دہلی میں آناً فاناً وفات کی خبر مشہور ہوگئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی دوکانیں فوراً بند کر دیں۔ ہزاروں
مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور جنازہ تیار ہوتے ہی نماز جنازہ کے متقاضی ہوتے۔ حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت رحمۃ اللہ علیہ
نے فرمایا کہ تم لوگوں کی خواہش اور اصرار ہے تو تم جنازہ پڑھ لو۔ میں شریک نہ ہوں گا۔ تاکہ مجھ کو نماز کے دہرانے کا اختیار رہے۔ اور میں دیوبند میں پھر
اعزہ واقارب کے ساتھ پڑھ سکوں۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے میدان میں ایک مرتبہ بہت بڑے مجمع کے ساتھ نماز ادا کی
۔ اس کے بعد جنازہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ لوگ بڑھتے جاتے تھے۔ اندازہ کیا جاتا تھا۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر
ہزار آدمیوں کی تعداد ہوگئی۔ وہاں پھر دوسری مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ڈھائی بجے کے بعد دہلی سے وہ گاڑی جس میں تابوت تھا۔ روانہ ہوئی
شہر میرٹھ اور چھاؤنی میرٹھ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شب کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہنچا۔ ازدحام نہایت عظیم الشان تھا۔
بمشکل تمام جنازہ اسٹیشن سے نکلا اور بہت دیر میں مکان پر پہنچا۔ چونکہ قبر پہلے سے تیار تھی۔ اس لیے بہت سے لوگوں کی رائے ہوئی کہ ابھی رات
میں دفن کر دیا جاتے۔ مگر چونکہ صاحبزادیاں اور داماد جو کہ تار ملنے کے بعد دیوبند سے دہلی کو روانہ ہو چکے تھے اور ابھی راستہ ہی میں تھے۔ کہ جنازہ
غازی آباد آگیا۔ اس لیے وہ غازی آباد اتر گئیں۔ مگر ہجوم کی زیادتی اور ٹرین کی جلدی سے روانگی اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ساتھ نہ ہو سکی تھیں۔ اس
لیے ترجیح اس کو دی گئی کہ صبح تک جنازہ دفن نہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اگلی ٹرین سے رات میں آگئیں۔ بہت سے عقیدت مند اور مخلصین کا

(حاشیہ گذشتہ صفحہ سے)

حضرت شیخ الہند کے قیام دہلی کے زمانہ میں مولانا
عبید اللہ مصری مولانا آزاد کا کلکتے سے ایک خط لیکر
آئے۔ جس میں لکھا گیا تھا کہ مدرسہ عالیہ کے طلباء نے ترک موالات کی
تحریک پر مدرسہ عالیہ سے علیحدگی اختیار کرلی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ
کلکتہ ہی میں ایک آزاد نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کر دیا جائے۔ لہذا آپ ہمیں
ایک مدرس دیں جو علم حدیث کی تمام کتابیں اچھی طرح پڑھا سکے۔ حضرت
شیخ الہند نے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کا نام تجویز
کیا۔ لیکن انہوں نے بعض مجبوریوں کی بناء پر عذر کیا۔ بالآخر حضرت مدنی کا
نام تجویز کیا گیا۔ حضرت مدنی جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ آپ کلکتہ جا رہے تھے کہ راستہ
میں امروہہ والوں نے آپ کو ایک جھگڑے کے تصفیہ کے لیے (جو کہ سنیوں اور شیعوں کے
درمیان تھا) اتار لیا۔ ابھی امروہہ ہی میں تھے کہ دہلی سے ڈاکٹر انصاری کا
تار آگیا کہ حضرت شیخ الہند کا وصال ہوگیا ہے۔

بے شمار اجتماع سہارنپور مظفر نگر وغیرہ اطراف وجوانب سے ہوگیا۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ اور دفن صبح کی نماز کے بعد کیا جائے تک یہ اجتماع اور بھی زیادہ ہوگیا۔ جنازہ صبح کی نماز کے بعد دارالعلوم دیوبند میں پہونچایا گیا۔ نودرہ اور باہر کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا تمام صف بندی ہوئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحب جنھوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی باقلب مضطر وچشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ تمام مجمع پر ایک پر کیف سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت ونورانیت مشاہدہ ہو رہی تھی اس کو جذبات حسرت سمجھئے یا واقعیت وحقیقت کہیئے۔

(سوانح ص ۱۵۲)

دیوبند میں اس وقت تک بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر مجمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازہ سے تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ جنازہ مقبرہ میں پہنچا یعنی بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے استراحت کے لیے فخر استاذ اپنے مقدس مرشد واستاد کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ قبر تیار تھی۔ جنازہ قریب لاکر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے۔ چاشت کا وقت تھا۔ نو بجے تھے۔ کہ قدوۃ الواصلین، امام المحدثین والعارفین، قطب کمالات، بطل حریت، آزاد کنندہ، ہندوستان، حاتم دوراں، بخاری زماں، کوہ وقار وحلم، آفتاب معرفت وعلوم، گنجینۂ حکمت خزینۂ احادیث، سنن نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) کو لحد میں اتار دیا گیا۔ اور شریعت وطریقت کے آفتاب عالم تاب کو ہمیشہ کے لیے چھپا دیا گیا۔ ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ؎

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو!
گنجینۂ علوم ہے، گنجینۂ زر نہیں،

انا للہ وانا الیہ راجعون ط رضی اللہ عنہ وارضاہ آمین۔

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر چھوڑ کر سب کو
چھپا ماہ لحد میں وائے قسمت ماہ کنعانی
جو تھا موصل الی اللہ ہوگیا واصل بحق ہم سے،
پھریں ہیں ڈھونڈتے سرگشتگان تیہہ حیرانی
زمانے نے دیا اسلام کو داغ اس کی فرقت کا،
کہ تھا داغ غلامی جس کا تمنائے مسلمانی
نہیں ہے سینۂ مجروح کم گنج شہیداں سے
تمنائیں جو تھیں دل میں ہوئی ہے سکی قربانی
فضائلہائے شیخ میں سے کوئی ایک دکھلا دے،
کئے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو ارزانی

فقط ایک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ
بخاری، غزالی، بصری و شبلی و نعمانی
جنھیں چھوڑا اتھا تم پر حضرت امداد و قاسم نے
کرے گا کون ان سب بیکسوں کی ہائے چوپانی

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد ــ روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

میرا دیوبند پہنچنا میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کلکتہ بھیجنے کے تیسرے دن اور وہ پہنچا اور اسی روز جلسہ اور تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تار پہنچا کہ حضرت کا وصال ہوگیا اور جنازہ دیوبند جارہا ہے میں نے دیوبند جانے کا ارادہ کرلیا۔ لوگوں نے منع بھی کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شام کی گاڑی نکل چکی تھی۔ اس لیے رات کی گاڑی ملی اور میں صبح کو تقریباً ۹ بجے دیوبند پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ کے دولت کدہ پر جب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہوکر واپس آرہے ہیں۔ اپنی بدقسمتی اور بے چارگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہاسال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کرسکا افسوس!

قسمت کی بدنصیبی کو صیاد کیا کرے
سر رگڑے پہاڑ تو فریاد کیا کرے!

کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ دو چار روز رہ کر کلکتہ کا عزم کیا۔ تو حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند مانع ہوئے اور دیوبند ہی کے قیام کا حکم فرمایا۔ مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت نے اپنی شدید بیماری کے دوران میں جب کہ خود حضرت میری حاضری کی ضرورت محسوس فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند اہم ضرورتیں درپیش تھیں۔ ان سب کو نظر انداز فرماکر کلکتہ روانگی کا حکم فرمایا۔ اور کلکتہ کے کام کو سب پر ترجیح دی۔ اب وفات کے بعد کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت کا حکم پس پشت ڈال دیا جائے اور تن آسانی اختیار کی جائے۔ خصوصاً جب کہ دارالعلوم میں بہتر کارکن حضرات موجود ہیں۔ میرا یہاں قیام کس طرح درست سمجھا جاسکتا ہے؟ الغرض میں نے کلکتہ کی روانگی پر اصرار کر کے حضرت مہتمم صاحب کو راضی کرلیا اور کلکتہ پہنچ کر اسباق حدیث شریف سنبھال لیے۔ مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ اطراف و جوانب کلکتہ میں بکثرت جلسے ہورہے تھے۔ ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں اندرون بنگال بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا۔ جن میں سے مولوی بازار کے مشہور جلسہ کانگریس و خلافت میں بھی جانے پر مجبور کیا گیا۔ اجلاس کانگریس کے صدر مسٹر سی آر داس آنجہانی تھے۔ اور جلسہ خلافت اور جمعیۃ کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ اور دوسرا جلسہ ضلع رنگ پور میں بڑے پیمانے پر ہوا تھا۔ دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہوچکے ہیں۔ اسی طرح دو مرتبہ ہندوستان یوپی میں بھی آنا پڑا۔ ایک جلسہ سیوہارہ ضلع بجنور کا تھا۔ اور اس جلسہ میں جمعیت کی صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم دارالعلوم نے فرمائی تھی اور جلسۂ خلافت کی صدارت کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی تھی۔ اس موقعہ پر بھی کانگریس کا اجلاس مشترک طور پر ہوا تھا۔ اس کے صدر دہرہ دون کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا۔ ان جلسوں کے ضروری اقتباسات حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند نے اپنے رسالہ[1] میں نقل کردیئے ہیں۔ اسی طرح سہارنپور کے مدرسہ مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔

---

[1] ملاحظہ فرمایئے رسالہ حیات شیخ الاسلام

اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسوں میں حاضر ہونا پڑا، جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا۔ اور دو سال قید بامشقت کی سزا مجھے اور مولانا محمد علی مرحوم و مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوتی اور کلکتہ کی ملازمت اس کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو یہاں ختم کر دیں۔ کیونکہ یہ احوال اکثر تحریروں میں آ گئے ہیں، خصوصاً مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے رسالوں میں ذکر فرما دیئے ہیں اور لوگوں کو معلوم بھی ہیں۔ نیز خطبات اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے مزید تحریر غیر ضروری سمجھ کر قلم فرسائی بند کرتے ہیں۔

تصانیف

۱۔ ترجمہ قرآن مجید۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے درس و تدریس اور سیاسی مشاغل کے باوجود کئی ایک کتب تحریر فرمائی ہیں۔ ان سب میں سر فہرست قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ قرآن پاک مالٹا جیل میں سرانجام پایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے شاید حضرت کو مالٹا جیل میں محبوس ہی اس لیے فرمایا تھا کہ وہ ترجمہ قرآن کی تکمیل کر سکیں۔ سورۃ مائدہ تک حواشی تحریر فرماتے تھے کہ رہائی ہو گئی۔ اور بقیہ فوائد و حواشی علامہ شبیر احمد عثمانی نے پورے کیے۔

اس ترجمہ و تفسیر کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مقبولیت عطا فرمائی کہ شاید کسی اور ترجمہ و تفسیر کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ یہی ترجمہ و تفسیر فارسی ترجمہ ہو کر حکومت افغانستان کے اہتمام سے کابل سے شائع ہوئی۔ تاج کمپنی لاہور نے اس ترجمہ و تفسیر کو اتنی عمدگی اور نفاست سے شائع کیا ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

۲۔ تراجم الابواب بخاری: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح بخاری کے تراجم کی تشریحات ہیں جو نہایت مشکل کام ہے۔
۳۔ تقریر ترمذی بزبان عربی: یہ تقریر ترمذی شریف کے حاشیہ پر چھپ چکی ہے اور مقبول خاص و عام ہے۔
۴۔ حاشیہ ابوداؤد شریف: یہ بھی حدیث پاک کی خدمت ہے۔
۵۔ حاشیہ مختصر المعانی: عربی معانی کی مشہور کتاب پر حاشیہ
۶۔ ایضاح الادلہ۔
۷۔ شرح اوثق العریٰ فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ۔ حضرت گنگوہیؒ کی کتاب کی شرح، مضمون نام سے ظاہر ہے۔
۸۔ جہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل
۹۔ ادلہ کاملہ۔ ۱۰۔ افادات محمود۔ ۱۱۔ کلیات شیخ الہندؒ۔

---

۱ ملاحظہ فرمایئے علمائے حق جلد اوّل و دوم و حیات شیخ الاسلام

سوادِ تحریر حضرت شیخ الہندؒ

شیخ الہندؒ کا یہ خط حضرت مولانا محمد انوری مدظلہ کے والد ماجد مولانا فتح الدین صاحبؒ نمبردار اوگی ضلع لائل پور کے نام ہے۔
حضرت مولانا محمد صاحب کے شکریے کے ساتھ ہم یہاں اس کا عکس دے رہے ہیں۔

مکرم سراپا فضل و عنایت زید مجدکم بندہ محمود مسنون کے بعد
ملتمس ہے آپکا گرامی نامہ مولوی عبداللہ صاحب کی وساطت سے پہنچا
مولوی صاحب نے چند بار جواب کا تقاضا اور یاد دہانی بھی کی مگر متعدد
سفر کی مشاغل کی وجہ سے جواب کی نوبت نہ آئی
سر بسر ہی غفلت سخت مضر اور ہے آپکو لازم ہے کہ ہمت کے
ساتھ اپنی مشاغل و اذکار کیطرف رجوع کریں اور بہتر
ہو جو شب جمعہ میں غسل کرکے اور دو رکعت خشوع کے
ساتھ ادا کرکے اپنی اللہ سے توبہ کریں اور توفیق حسنات
کی الحاح کے ساتھ دعا مانگیں اور اپنا کام التزام کے ساتھ
شروع کردیں اور عزم و ہمت کے ساتھ اپنے کام میں جیت
رہیں اور سمجھ لیں کہ بس نہ آنی دیں بندہ حقیر بھی آپکی
لئے دعا کرتا ہے عشا کے بعد یا حیّ یا قیوم برحمتک
استغیث ایک سو ایک مرتبہ جہر کے ساتھ پڑھ لیا کریں
اور یا حیّ کی ضرب قلب پر لگنی چاہیے

باقی از کار فرمودہ حضرت قدس رحمۃ اللہ علیہ کہیں جاؤ —
پریشان خوابوں کا فکر نہ کرو سوتے وقت آیۃ الکرسی
سورۂ فاتحہ معوذتین پڑھکر دم کر لیا کرو اور کوئی خواب
پریشان نظر آوے تو اعوذ اور لاحول اور تعوذ پڑھکر قلب پر
تھتکار دو اور کچھ پرواہ نہ کرو —
امر حق کے مقابلہ میں کسیکی پرواہ نہ کرو اور اللہ پر توکل رکھو اسکو
اللہ تعالیٰ شر مخالفین سے محفوظ رکھے البتہ یہ ضروری ہے کہ
لوگوں کے ساتھ خلق اور نرمی اور صبر و تحمل سے معاملہ کرو
کلمۃ الحق ضرور کہو مگر نہایت نرمی اور للہیت سے اللہ تعالیٰ
مردوں کو ہدایت کرے — اپنی اہلیہ سے کہدیجئے کہ مسنون کچھ نیا
کہ مہلت ہو تو تمام دن رات میں ایک دفعہ یا مختلف اوقات
میں اسم ذات یعنی لفظ اللہ کو چار ہزار مرتبہ پورا کرے
کرے — وہم اور وسوسہ بری بلا ہے ہرگز اسکا خیال
نہ کرے اور دل میں ٹہرالو کہ جو چیز شریعت میں پاک
ہے کسی وسوسہ سے وہ ناپاک نہیں ہوسکتی

بلکہ وسوسہ شیطانی خیال ہے جب وسوسہ آوے تو
لاحول پڑھو اور اسکو دفع کرو اوسکے موافق عملدرآمد
نکرو ورنہ اور زیادہ وسوسہ ترقی کریگا اور دفع کرنے
سے انشاءاللہ رفتہ رفتہ جاتا رہیگا — اپنی صاحبزادی
سے بعد سلام مسنون فرمادیجے کہ تلاوت قرآن حسب فرصت اور
صبح و شام درود — استغفار — سبحان اللہ — الحمدللہ
لا الہ الا اللہ — اللہ اکبر ایک ایک تسبیح پڑھ لیا کریں
بتاریخ عقد نکاح لڑکی کا کردیجے جہیز کی کوئی مقدار نہ کرنی
وقت ضروری جو سہولت میسر ہو اسی یا دوسرے وقت
دیدیا جاوے مہر کی مقدار کو کم رکھنا بہتر ہے لیکن کوئی
مصلحت درپیش ہو تو پانچ صد سے بڑھا دینا مضائقہ نہیں
باقی خیریت ہے والسلام فقط

بندہ
[illegible] محمود [illegible]

مرقع حیات

(رباعی)

محمود کہ زد قلم بحرف باطل
بربست احرام کعبۂ حضرت دل
مردانہ بزندان بلا رفت وے
باطل را حق نگفت حق را باطل

مولانا گرامی مرحوم

مرقع وفات

محمود کہ بود مرکز سر وجود
آں نقطہ قضا ز لوح ہستی نبزدود
ہر کس کہ باد رسد بجائے برسد
محمود رسید در مقام محمود

مولانا گرامی مرحوم

آہ شیخ الہند مولانائے محمود حسن
رفت زیں دار فنا ایں دوست در دار بقا

بہر تاریخ وصالش بر در ہاتف شدم
ناگہاں آمد بگوشِ من عظامی ایں ندا

بے سروپا گشتہ انداز دستِ بیداد اجل
علم و مجد و ورع و تقویٰ فقر و تسلیم و رضا

۱۳۳۹ ہجری

عظامی مرحوم

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء — ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء

حکیم الامت خود اپنی نظر میں

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھانہ بھون میں متعینہ ایک پولیس افسر نے بیعت کی درخواست کی تھی۔ جس کے جواب میں آپ نے انہیں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا۔

"میں ایک خشک طالب علم ہوں۔ اس زمانہ میں جن چیزوں کو لوازمِ درویشی سمجھا جاتا ہے۔ جیسے میلاد شریف۔ گیارہویں، عرس، نیاز، فاتحہ، قوالی و تصرف و مثل ذالک میں ان سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی اس خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں"

میں نہ صاحبِ کرامت ہوں اور نہ صاحبِ کشف۔ نہ صاحبِ تعریف ہوں اور نہ عامل۔ صرف اللہ اور رسولؐ کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلّف نہیں کرتا۔ نہ اپنی حالت۔ نہ اپنی کوئی تعلیم۔ نہ امور دینیہ کے متعلّق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں۔ عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں

میں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں۔ نہ کسی کی سفارش۔ اس لیے بعض اہل الرائے مجھ کو خشک کہتے ہیں میرا مذاق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں۔ خواہ حرفی ہی اذیّت ہو۔

سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کا اذیت نہ پہنچائی جائے۔ خواہ بدنی ہو جیسے مار پیٹ خواہ مالی ہو جیسے کسی کا حق مار لینا۔ یا ناحق کوئی چیز لے لینا۔ خواہ آبرو کے متعلق ہو جیسے کسی کی تحقیر کسی کی غیبت۔ خواہ نفسانی ہو جیسے کسی کو کسی تشویش میں ڈالنا یا کوئی ناگوار۔ رنجیدہ معاملہ کرنا اور اگر اپنی غلطی سے ایسی بات ہو جائے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔

مجھے ان کا اسقدر اہتمام ہے کہ کسی کی وضع خلاف شرع دیکھ کر تو صرف شکایت ہوتی ہے مگر ان امور میں کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس سے نجات دے۔ یہ ہے کچا چٹھا ورنہ لوگوں نے تو ــــ

منش کردہ ام رستم پہلوان ؛ وگرنہ یلے بود در سیستان

شمائل

حلیہ نورانی صورت۔ گندمی رنگ۔ شاہانہ چہرہ۔ گول اور بھرا ہوا۔ سر بڑا مگر موزوں پیشانی متوسط۔ آنکھیں نہایت شرمیلی نیچی اور اندر سرخ ڈورے۔ ابرو گنجان مگر خمدار۔ دہن متوسط۔ دندان پیوستہ۔ لب رسیلے۔ بینی موزوں۔ سینہ کشادہ۔ قد درمیانہ۔ ہاتھ قوی اور پُر گوشت۔ شانے اور بازو بھرے ہوئے۔ ہڈیوں کے جوڑ بڑے بڑے اور بھرے ہوئے۔ گردن نہ بہت پتلی نہ بہت موٹی نہ بہت اونچی۔ ہاتھوں کی انگلیاں نہ بہت موٹی نہ پتلی ہتھیلیاں نہایت نرم۔ پاؤں کی ایڑیاں بھاری۔ داڑھی بھری ہوئی اور گنجان۔

بال سر کے بال نہ بالکل سیدھے نہ بہت گھنگھریالے۔ ان کی وضع مختلف اوقات میں مختلف رہی۔ جوانی میں پٹھے تھے۔ اس وقت مانگ اور کنگھی وغیرہ کی عادت تھی ان کو دھونے وغیرہ کی پابندی سے پٹھے کٹوا دیئے۔ پھر صرف قینچی سے بال کٹوانے کی عادت آخر تک رہی۔ داڑھی کے بال کچھ سیاہ اور کچھ سفید۔ سینہ پر بال زیادہ۔

چال چال نہ بہت تیز نہ ہی بہت آہستہ۔ اور جب کوئی ہمراہی ہوتا۔ اس کی رعایت چال میں ضرور فرماتے۔ کیوں تمام افعال میں اپنے مقابلہ میں دوسرے کی آسائش کو ترجیح دیتے تھے۔ قدم نہ بڑے بڑے رکھتے تھے۔ نہ متضاد نہ چھوٹے چھوٹے۔ بناوٹ سے حضرت کی طبیعت کو مس ہی نہ تھا۔ اور ترک لایعنی اس درجہ طبیعت میں داخل تھی۔ اگر غور سے دیکھا جاتا تو چال و ڈھال۔ جملہ حرکات و سکنات اور تمام اقوال و افعال میں کوئی جزو بھی ایسا نہ تھا۔ جو وجہ اور غائر وجہ سے خالی ہو اور جس میں شرعی اور عقلی دونوں قسم کی حکمتیں جمع نہ ہوں یعنی حکیم الامت کا لقب حضرت کے لیے بالکل اسم بامسمیٰ تھا ؎

اے قبائے رہنمائے راست بر بالائے تو علم و حکمت را شرف از گوہر والائے تو

آواز آواز نہ اتنی پست تھی اور نہ اتنی بلند کہ ناگواری پیدا ہو جائے۔ بلکہ نہایت شیریں اور مردانی تھی۔ خشوع اور جذبہ محبت آواز سے ہی پیدا تھا چلا کر بات کرنے کی قطعاً عادت نہ تھی بقدر ضرورت جہر کے ساتھ کلام فرماتے اور وعظ میں تمام مجمع کو آواز پہنچتی تھی۔

مزاج مزاج دموی مائل بحرارت تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے اعضا کی خوشنمائی جسم کا دہرا ہونا۔ افعال کا اعتدال اس کے دلائل ہیں۔ مزاج میں حرارت کچھ تو طبعی زیادہ تھی۔ جیسا کہ دموی مزاج کا مقتضا ہے۔ اور کچھ اس درجہ سے کہ عنفوان شباب میں کسی طبیب نے سنکھیا کا دھواں پلایا تھا۔

اس وجہ سے بردات کا استعمال مفید اور مرغوب تھا۔ پھر ذکر الٰہی اور جوشِ محبتِ خداوندی نے حرارت میں اضافہ کر دیا۔ لیکن یہ حرارت چونکہ حرارت غریبہ نہیں ہوتی۔ بلکہ حرارت غریزی کی بھی روح ہوتی ہے۔ اس واسطے بجائے یبوست بڑھانے کے لطافت مزاج وقوت۔ صحت ادراک۔ سلامتِ فہم۔ نورانیتِ حواس اور اعتدال وافعال کا باعث ہو گئی۔

قوت ورنہ جس قدر کام حضرت کے دماغ سے لیا گیا تھا۔ قوی سے قوی خلقت کا انسان بھی کرتا تو دماغ کبھی کا ختم ہو جاتا اور اختلال حواس بلکہ جنوں کی نوبت آ جاتی۔ ماہرین اس امر پر متفق تھے۔ کہ ایسے قوی الجثہ۔ صحیح الفہم اور سلیم الحواس آدمی کم ہوتے ہیں۔

گفتگو نہ تیز نہ ٹھہر ٹھہر کر بلکہ بہت صاف کرتے تھے۔ جس میں تسلسل ہوتا تھا۔ گجلک مطلق نہ ہوتی تھی۔ اگر خود ضرورت سمجھتے یا کوئی سوال کرتا تو پھر بات دہرا دیتے تھے۔ ورنہ گفتگو اتنی واضح اور صاف فرماتے تھے کہ دہرانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اس لئے دہرانے کی عادت نہ تھی۔ مجالس میں بشاش اور گویا رہتے تھے۔ جیسے دریائے معارف وحقائق جوش وخروش سے بہہ رہا ہو۔ جس کی وجہ سے اتنے کثیر ملفوظات اور مواعظ جمع ہو گئے۔ جن سے لاکھوں انسان فیض یاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

تفکر عام مجالس میں کبھی متفکر نظر نہیں آتے تھے۔ البتہ حسب حالات باطنی خلوت میں کبھی کبھی متفکر رہتے تھے ویسے اکثر مسرور ہی دکھائی دیتے تھے۔

اشارہ اشارہ کرنے کے قطعی عادی نہ تھے۔ جو کچھ بھی کہنا ہوتا زبان سے صاف فرماتے۔

تبسم مجالس میں چہرہ پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ ہنسی کی بات پر ہنستے بھی تھے۔ ہنساتے بھی تھے۔ مگر مطابق سنت، قہقہہ مار کر کبھی نہ ہنستے تھے۔

ہیبت اعضا کے تناسب۔ چہرہ کی نورانیت اور آنکھوں کی سرخی نے جسمانی خوبی کے علاوہ ایسا رعب پیدا کر دیا تھا کہ جلدی کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مگر تہذیب و تواضع اور شرافت و بے تکلفی ہوتی تھی۔ کہ جو لوگ ہیبت کے مارے بات کرتے ڈرتے تھے وہ بھی بات کرنے کے بعد دل وجاں سے نثار ہونے لگتے تھے۔ گویا مَنْ لَمْ يُرِدْهُ هَابَهُ وَاِذَا سَاءَلَهُ اَحَبَّهُ کے پورے مظہر تھے۔ مجموعی حالت جسم کی خوش قطع واقع ہوئی تھی۔ کہ جو لباس پہنتے وہی موزوں ہو جاتا۔ جس وضع وحالت میں ہوتے زیبائی یکساں جلوہ گر ہوتی۔ جس مجمع میں جاتے نظروں کے کیمرے فوراً حضرت کی طرف رخ کر لیتے۔ در سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ اَثَرِ السُّجُودِ کا نظارہ ہونے لگتا۔ اقوال اور معمولات سے اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا ظہور ہونے لگتا۔

نور احمد اکیابی

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

نسب اور خاندان

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل راجہ بھیم نے ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ اپنے نام سے جو "تھانہ بھیم" کہلایا۔ پھر مسلمانوں کی آمد و سکونت پر اس کا نام "محمد پور" ہوا جس کا ثبوت اس وقت کے کاغذات سے ملتا ہے مگر یہ نام مقبول و مشہور نہ ہوا اور وہی پرانا نام معروف رہا۔ البتہ "تھانہ بھیم" سے "تھانہ بھون" ہو گیا۔ صوبہ جات متحدہ اودھ کا یہ قصبہ اپنی مردم خیزی میں مشہور چلا آ رہا ہے اور یہاں کے مسلمان شرفاء اہل شوکت و قوت اور صاحب فضل و کمال رہے ہیں۔

مجدد الملت شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے اجداد نے آج سے صدیوں پہلے اسی قصبہ "تھانہ بھون" میں ط... اقامت ڈالی تھی۔ ددھیال کے اجداد نسباً فاروقی تھے۔ ان میں ایک مولانا صدر الدین جہاں تھے۔ (جو قاضی محمد نصر اللہ خاں کے ہمعصر تھے اور جن کا ذکر عہدِ اکبری کے کاغذات میں ملتا ہے) ان کے قریبی اجداد تھانیسر ضلع کرنال سے نقل سکونت کر کے تھانہ بھون آئے تھے اس طرح ننھیالی اجداد نے (جو علوی تھے) پہلے پہل جھنجھانے میں سکونت اختیار کی تھی اور پھر یہاں آ گئے تھے۔

مجدد الملت کے والد ماجد شیخ عبدالحق صاحب مرحوم ایک مقتدر رئیس، صاحب نقد و جائداد اور ایک کشادہ دست انسان تھے کی ایک بڑی ریاست کے مختارِ عام تھے۔ فارسی میں اعلیٰ استعداد کے مالک تھے اور حافظِ قرآن تو نہ تھے لیکن ناظرہ بہت قوی تھا اور بہت صحت سے پڑھتے تھے۔ ذہنی اعتبار سے بڑے ہی صاحب فراست تھے جس کا ایک کھلا ثبوت یہ ہے کہ اپنے صاحبزادوں کی صلاحیت کو بچپن ہی سے تاڑ گئے تھے اور اسی بناء پر اپنے فرزند اکبر (یعنی حضرت مجدد الملت) کو عربی و دینیات میں اور فرزند اصغر (اکبر علی مرحوم) کو انگریزی اور علوم دنیوی میں لگا دیا تھا۔ اور اس پر مرحوم کو پورا پورا اعتماد تھا۔ ایک مرتبہ مرحوم کی بھاوج صاحبہ نے فرمایا "بھائی نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کھائے گا۔ بڑا عربی پڑھ رہا ہے، وہ کہاں سے کھائے گا اور اس کا گذارہ کس طرح ہو گا جا... تو ورثاء میں تقسیم ہو کر گذارے کے قابل نہ رہے گی" اس پر مرحوم کو جوش آیا اور فرمانے لگے :- "بھابی صاحبہ تم کہتی ہو کہ یہ عربی پڑھ... گا کہاں سے ؟ خدا کی قسم جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو اس جیسے اس کی جوتیوں سے لگے لگے پھریں گے۔ اور یہ ان کی جانب رخ بھی نہ کرے گا... کس بلا کی فراست ہے اور مزاج شناسی، یہی وجہ ہے کہ اکبر علی صاحب مرحوم سے کہیں زیادہ حضرت حکیم الامّت پر رحم... کرتے تھے۔ اور جب ایک مرتبہ بھاوج صاحبہ نے اس کی شکایت کی تو فرمایا :- "بھابی مجھے اس (مجدد الملت) پر رحم آتا ہے۔ وہ... سے لیتا ہے میری زندگی ہی تک ہے۔ میرے بعد یاد رکھو وہ میرے مال و متاع سے بالکل علیحدہ رہے گا" چنانچہ ان میں سے ایک... ایک قیاس حکیم الامّتؒ کی آئندہ زندگی میں پیکرِ حقیقت بن کر جلوہ نما ہوا۔

حضرت حکیم الامت کی والدہ ماجدہ بھی ایک صاحبِ نسبت بی بی تھیں۔

حضرت حکیم الامت کے ماموں پیرجی امداد علی صاحبؒ ایک زبردست حال وقال بزرگ تھے۔ یہ اپنے وقت کے مجذوب
ل حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتیؒ کے مشورہ سے حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں ملازم بھی ہوئے اور اسکے بعد حضرت صاحبؒ
ٖ کے ایماء سے مرزا سردار بیگ صاحب کی ارادت میں داخل ہو گئے۔ جنہوں نے نوابی وریاست کو ٹھکرا کر فقر و درویشی اختیار کر رکھی
۔ گو حضرت حکیم الامت کو مسائل وحقائق میں ان سے اختلاف تھا مگر ان کا جذبۂ عشق بہرحال قابل قدر تھا۔ حکیم الامت پیران کے
ار سے آگ برستی تھی۔ چنانچہ ان کا یہ شعر حضرت اقدسؒ نے بارہا نقل فرمایا ہے ؎

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا ٭ جب تو نے یہ مے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

حضرتؒ کے نانا میر نجابت علیؒ اعلیٰ درجہ کے فارسی دان، انشا پرداز اور حاضر جواب بزرگ تھے۔ مولانا شاہ نیاز احمد بریلوی کے
خلیفۂ خاص کے مرید اور حافظ غلام مرتضےٰ صاحب سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔

حضرت اقدس کے جدِّ اعلیٰ سلطان شہاب الدین "فرخ شاہ" کابلیؒ تھے۔ ان کی اولاد میں شیوخ تھانہ بھون کے علاوہ حضرت
مجدد الف ثانی قدس سرہٗ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اور شیخ فریدالدین گنج شکر جیسے کاملین ہوئے ہیں۔ خود حضرت فرخ شاہ پہلے تو
کابل رہے اور سلطنت غزنویہ کے زوال پر جذبۂ جہاد کے تحت کئی بار ہندوستان پر حملہ کرکے کافروں کو زیر کیا۔ اور بامراد لوٹے۔ جہادِ اصغر
فراغت پاکر جہادِ اکبر میں مصروف ہو گئے۔ کابل کے کہسار کو اپنا نشیمن بنایا۔ بزرگانِ چشت کے آگے زانوئے ارادت تہ کرکے مرتبۂ کمال
پہنچے۔ اور ایک عالم کو فیض یاب کیا اور پھر بعد وفات وہیں دفن ہوئے۔ یہ موضع آج تک "درۂ فرخ شاہ" نام سے مشہور اور زیارت گاہِ
عام ہے۔

تا گوہرِ آدم نسیم باز نہ استد ٭ زا بائے خود ار لشمرم اصحاب کرم را

دت اور بچپن

خاندان اشرف کا مجمل خاکہ نظروں میں آگیا۔ ایسے عالی خاندان میں جہاں دولت وحشمت اور زہد وتقویٰ
بغل گیر ہوتے تھے، حضرت مجدد الملت کی جامع شخصیت ظہور پذیر ہوئی۔ ولادت کا واقعہ بھی عجیب ہے
ت اقدسؒ کے والد مرحوم کے اولاد نرینہ زندہ نہ رہتی تھی۔ اس کی ظاہری وجہ یہ تھی کہ موصوف جب ایک مرتبہ مرض خارش میں بری طرح
تھے تو مجبوراً کسی ڈاکٹر کے مشورہ سے ایسی دوا کھالی تھی جو قاطع نسل تھی۔ مگر جب اس کی خبر مرحوم کی خوشدامن صاحبہ کو پہنچی تو وہ سخت پریشان
اور حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحبؒ پانی پتی سے عرض کیا کہ "میری لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے ہیں"۔ حافظ صاحب نے مجذوبانہ
ن فرمایا "عمرؓ و علیؓ کی کشاکش میں مر جاتے ہیں۔ اب کی باری علیؓ کے سپرد کر دینا"۔ اس معمہ کو کسی نے نہ سمجھا لیکن حکیم الامتؒ کی والدہ تاڑ گئیں
یا "حافظ صاحبؒ کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کی ددھیال ہے فاروقی اور ننھیال ہے علوی۔ اور اب تک جو نام بھی رکھے گئے وہ ددھیالی
تھے۔ اب کی بار جب لڑکا ہو تو ننھیالی وزن پر نام رکھا جائے گا جس کے آخر میں "علی" ہو۔ حافظ صاحبؒ یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا۔
ی کا ہشیار ہے امیر انشا ہی تھا" پھر فرمایا "انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور
ے کا نام اکبر علی۔ ایک میرا ہوگا اور وہ مولوی ہوگا۔ دوسرا دنیا دار ہوگا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا
مجدد الملت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو چہار شنبہ کے دن صبح صادق کے طلوع کے ساتھ جلوہ نما ہوئے۔
چونکہ حضرتؒ کی ولادت کے چودہ ہی مہینے بعد آپ کے چھوٹے بھائی اکبر علی مرحوم کی ولادت ہوئی اور ماں کا دودھ دو بچوں کے لیے

کافی نہ ہوتا تھا اس لیے ایک انا رکھی گئی۔ پھر حضرت کی عمر شاید پانچ ہی برس کی ہوئی تھی کہ مادری سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مگر محبت مادری کا سیلاب
شفقتِ پدری کے د... بن ضم ہو کر اب اس کی راہ سے امڈنے لگا۔ والدِ ماجد نے اپنے گوہرِ اشرف کی تربیت بڑے ہی پیار و محبت سے
اور تربیت میں اس کا خاص لحاظ رکھا کہ اس کی جلا میں فرق نہ آئے ــــــ تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر جب مٹھائی بٹتی تو اس
شریک نہ ہونے دیتے۔ بلکہ اس وقت خود بازار سے لاکر اپنے فرزند کو چکھا دیتے اور فرماتے کہ "مسجد کی مٹھائی لینا بے غیرتی کی بات
نو عمری میں ایک مرتبہ فرزند کی زبان سے مولانا رفیع الدین صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم) کے متعلق یہ نکل گیا کہ "مولانا تو پڑھے ہوئے
ہیں"۔ بس اس پر اس سختی سے ڈانٹا کہ گویا اب مارنا ہی باقی تھا۔ فرمایا کہ "بزرگوں کی شان میں یوں نہیں کہا کرتے"ــــــ حضرت
کی طبیعت خود ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ کبھی بازاری لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بچپن ہی سے حضرت کا مذاق دینی
کھیلوں میں بھی نماز باجماعت کی نقل اتارتے تھے۔ بازار کی طرف کبھی نکل جاتے اور راستہ میں مسجد نظر پڑتی تو سیدھے اندر چلے جاتے
پر چڑھ کر خطبہ کی طرح کچھ پڑھ پڑھا کر لوٹ آتے۔ گویا مستقبل کے نقشہ کا خاکہ اس نیم شعوری دور سے کھنچ رہے تھے۔

ابھی ۱۲-۱۳ برس ہی کی عمر ہو گی کہ "فغان صبحگاہی" کا چسکا لگا۔ پچھلی رات سے اٹھ بیٹھتے اور تہجد و وظائف میں منہمک ہو جاتے
تو تعجب نہیں۔ تائی صاحبہ کا دل بہت دکھتا کہ اس نو عمری میں یہ مشقت! ــــ لیکن عشق کی آگ تو بھڑک چکی تھی اور حضرت کے استاد
فتح محمد صاحب جیسے صاحب نسبت و اجازت بزرگ کی صحبت نے اپنا اثر جما دیا تھا

نظافتِ طبع کا یہ عالم تھا کہ بچپن میں ہی کسی کا ننگا پیٹ دیکھتے تو قے کر دیتے تھے۔ طبیعت کی اس لطافت سے بہت ستا
بڑے ہو کر بھی یہ عالم رہا کہ جس کمرہ میں تیز خوشبو ہوتی سو نہ سکتے تھے۔ ابتدا ہی سے بے اصولی ناقابلِ برداشت رہی۔ اس وجہ سے حضر
کی بڑی اہلیہ محترمہ فرمایا کرتی تھیں کہ "آپ تو کسی بادشاہ کے ہاں پیدا ہوتے"ــــــ حضرت مولانا شیخ محمدؒ صاحب محدثؒ
جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے پیر بھائی اور حضرت میاں جی نور محمدؒ صاحب کے خلیفۂ خاص تھے۔ حضرت حکیم
کے بچپن کے احوال و آثار ہی کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ "میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا"ــــــ حضرت حکیم الامت نے بچپن
میں ایک خواب دیکھا (جس سے پہلے کوئی خواب دیکھنا یاد نہیں) کہ بڑے مکان میں ایک پنجرہ رکھا ہوا ہے جس میں دو خوبصورت کبوتر
پھر دیکھا کہ شام ہو گئی اور تاریکی چھا گئی۔ ان کبوتروں نے حضرت سے کہا کہ "ہمارے پنجرہ میں روشنی کر دو" حضرت نے کہا "خود ہی کر
انہوں نے اپنی چونچیں رگڑیں اور ساتھ ہی ایک تیز روشنی ہوئی جس سے سارا پنجرہ منوّر ہو گیا۔ ایک مدت بعد جب حضرت نے اپنا یہ
ماموں واجد علی صاحب مرحوم سے بیان کیا تو انہوں نے یہ تعبیر دی کہ "وہ دو کبوتر روح و نفس تھے۔ انہوں نے تم سے درخواست کی
مجاہدہ کر کے ہم کو نورانی کر دو۔ مگر تم نے جو یہ کہا کہ تم خود ہی روشنی کر لو، اور انہوں نے اپنی چونچیں رگڑ کر روشنی کر لی۔ اس کا یہ مطلب
کہ انشاء اللہ بلا ریاضت ہی حق تعالیٰ تمہاری روح اور نفس کو نورِ عرفاں سے منوّر فرما دیں گے"ــــــ چنانچہ مستقبل
خواب حقیقت بن کر ظاہر ہوا۔

حضرت مجدد الملت کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھیں اور حافظ حسین علی صاحب
مرحوم دہلوی سے کلام پاک حفظ کیا۔ پھر تھانہ بھون آکر حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ سے عربی کی ابتدائی کتابیں اور فارسی کی متوسط کتابیں
پڑھیں اور اس کی کچھ انتہائی کتابیں ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو ادبِ فارسی کے کامل استاد تھے۔ پھر دیوبند پہنچ کر

کی تکمیل مولانا منفعت علی صاحب سے کی اور زبان فارسی میں پورا عبور حاصل کیا۔ ایک مرتبہ اسی زمانۂ طالب علمی میں خارش میں مبتلا ہونے کی وجہ سے چھٹی لے کر گھر تشریف لائے تھے تو بطور مشغلہ فارسی اشعار پر مشتمل ایک مثنوی "زیر و بم" لکھی۔ جس سے فارسی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔
اس وقت آپ کی عمر ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی۔ آخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں دار العلوم دیو بند میں داخل ہوئے اور پانچ سال تک یہاں مشغول تعلیم رہ کر شروع ۱۳۰۱ھ میں فراغت حاصل کی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ - ۲۰ برس کے لگ بھگ تھی۔

طالب علمانہ حیثیت زمانۂ طالب علمی میں حضرت میل جول سے الگ تھلگ رہتے۔ اگر کتابوں سے کچھ فرصت ملتی تو اپنے استاد خاص حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہٗ (صدر مدرس مدرسہ دار العلوم دیو بند) کی خدمت فیض درجت میں جا بیٹھتے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو ہر فن میں ماہر ہونے کے ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کے خلیفۂ رشید بھی تھے۔ ان کی اسی جامع حیثیت کی وجہ سے ان کا حلقۂ درس "حلقۂ توجہ" بھی ہوتا تھا۔ اور ذہن و قلب کی تعلیم و تربیت ایک ساتھ ہوتی تھی۔ افسوس کہ آج دینی درس گاہیں جامعیت فیض سے محروم ہیں ——— حضرت والا کی ابتدا ہی کو دیکھ کر اہل بصیرت انتہا کا پتہ چلا چکے تھے۔

چنانچہ جب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ طلبا کا امتحان لینے اور دستار بندی کے لیے تشریف لائے تو شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے اپنے اس ہونہار طالب علم کی ذہانت و ذکاوت کی بطور خاص مدح فرمائی۔ حضرت گنگوہیؒ نے مشکل مشکل سوالات کیے اور ان کے جواب سن سن کر مسرور ہوئے۔

حضرت اقدسؒ کو علوم عقلیہ سے خاص مناسبت تھی۔ فطرت نے حاضر جوابی، طلاقت لسانی اور ذہانت و فطانت کے جواہر سے پوری طرح آراستہ کیا تھا۔ منطق میں مہارت کا اعتراف یوں فرماتے تھے کہ "میں سچی بات کہوں نہ کہوں۔ نہ میں متواضع ہوں نہ متکبر۔ الحمد للہ مجھے منطق میں مہارت حاصل ہے" چنانچہ دیو بند میں جب کوئی مذہبی مناظرہ کے لیے آتا تو فوراً اشرفی تلوار خلوت کے نیام سے باہر نکل آتی اور مخالف کو گھائل کر جاتی تھی ——— لیکن طبیعت کے اعتدال کا یہ عالم تھا کہ معقولات کو ہمیشہ دینیات کے لیے علوم آلیہ سمجھتے تھے۔ آپ کی ہر تقریر و تحریر میں یہ جوہر نمایاں نظر آتا ہے۔ راس المناظرین مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ (استاذ دار العلوم دیو بند) حضرت کی اسی نو عمری کی تقریروں پر وجد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "حضرت کو فن مناظرہ میں اس قدر کمال ہے کہ بڑے سے بڑا مناظر بھی نہیں ٹھہر سکتا" اور خود حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "جتنا شوق مجھے اس زمانہ (طالب علمی) میں مناظرہ کا تھا، اب اس کی مضرتوں کی وجہ سے اتنی ہی نفرت ہے"
——— علوم عقلیہ و نقلیہ میں اس قدر رسوخ رکھنے کے باوجود تواضع کا حال قابل دید ہے۔ سنہ ۱۳۰۰ھ کا واقعہ ہے۔ خبر ملی کہ دستار بندی (تقسیم اسناد) کا جلسہ بڑے شاندار پیمانے پر ہونے والا ہے اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کے مقدس ہاتھوں یہ رسم طے پانے والی ہے، اپنے ہم سبقوں کو جمع کر کے اپنے استاذ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی "حضرت ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی ہوگی اور سند فراغ دی جائے گی حالانکہ ہم ہرگز اس کے اہل نہیں۔ یہ تجویز منسوخ فرمائی جائے ورنہ اس میں مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی ہے" یہ سن کر صاحب بصیرت استاد کو جوش آیا، اور فرمانے لگے "تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہاں چونکہ تمہارے استاد موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے باقی سارا میدان صاف ہے" ——— دنیا نے دیکھا کہ یہ پیشین گوئی

حرف بہ حرف صحیح نکلی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فتویٰ نویسی کا کام بھی اسی زمانے سے آپ کے سپرد فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک طویل استفتاء کا ویسا ہی مفصل اور مکمل جواب لکھ کر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کیا تو عارف کامل استاذ نے اس پر دستخط کرتے ہو فرمایا: "معلوم ہوتا ہے تم کو فرصت بہت ہے۔ ہم تو اس وقت دیکھیں گے جب خطوں کا ڈھیر تمہارے سامنے ہوگا اور پھر تم اتنے لمبے جواب لکھو گے۔" آئندہ پتہ چلے گا بصیرت یعقوبی نے جو کچھ دیکھا کس قدر صحیح تھا۔

حق تعالیٰ نے مجدد الملّت کو جمال اور محاسن ظاہری سے نوازا تھا وہاں خوش الحانی سے بھی سرفراز فرمایا تھا حضرت کی فن میں مہارت کے ساتھ حسنِ صوت نے مل کر سونے پر سہاگہ کا کام دیا تھا۔ حضرت نے قراءت کی مشق مشہور عالم قاری محمد عبداللہ صاحب مہاجر مکی سے بمقام مکہ معظمہ فرمائی تھی۔ جو قرائے عرب کے نزدیک بھی ایک ماہر فن قاری تھے۔ حضرت کی قوت اخذ کا یہ عالم تھا کہ ج شاگرد و استاذ قراءت کی مشق کرتے کراتے ہوتے تو یہ پہچاننا مشکل ہوتا کہ استاد پڑھ رہے ہیں یا شاگرد سنا رہے ہیں۔ کمالِ فن اور جمالِ ص نے مل کر عجیب دلفریبی پیدا کر دی تھی۔ بقول شخصے "قرآن کیا پڑھتے تھے لوگوں کو ذبح کرتے تھے۔" ایک مرتبہ نمازِ فجر میں مولانا عبد صاحب (جنہوں نے لکھنؤ میں قراءت کا ایک اعلیٰ مدرسہ قائم فرمایا تھا) شریک تھے۔ حضرت کا قرآن سنا تو بعد نماز بہت اشتیاق کچھ اور سنانے کی خواہش ظاہر کی۔

حضرت کی اثر پذیر طبیعت کا نتیجہ یہ تھا کہ دارالعلوم پہنچ کر تکلف اور معمولی باتوں کی طرف ضرورت سے زیادہ التفات رخصت ہو گیا تھا۔ سادی سی زندگی اور فقیرانہ رنگ اختیار فرما لیا تھا۔ حضرت والا طلباء کے بناؤ سنگار اور ان ادنیٰ چیزوں کی طر سے نفور تھے اور فرماتے تھے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو علم کا چسکا لگا نہیں۔

درس و تدریس

تکمیل تعلیم کے بعد اب وقت آتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی عام فضا سے جو فیض حاصل کیا تھا اور ا کی شفقتوں نے جس رنگ میں ڈبو دیا تھا اسی فیض کو عام کریں اور اسی رنگ میں ایک ایک کو سنِ ۲۰ کا آغاز ہے۔ حسنِ ظاہری اور جمالِ باطنی سے آراستہ ہیں۔ کمالِ علمی اور جذبۂ اشاعتِ دین سے معمو حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ بلا کی کشش و مقناطیس ہے۔ جہاں بھی بیٹھ گئے لوگ پروانہ وار آ گئے۔ اور ساری فضا اسی کے رنگ میں

شباب رنگین جمال رنگین وہ سر سے پا تک تمام رنگین
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگین بنا رہے ہیں

مسلسل ۱۴ برس تک اسی انداز سے درس و تدریس میں مشغول رہے اور ساتھ ہی مواعظ، تصنیفات اور افتاء کے کام کو فیضیاب کیا۔ کانپور میں ایک مدرسہ قدیم چلا آ رہا تھا۔ جو مدرسہ "فیض عام" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی صدر مدرسی کے لیے کو کانپور والوں نے طلب کیا تو اپنے استاد اور والد ماجد کی اجازت سے صفر ۱۳۰۱ھ میں ۲۵ روپیہ ماہوار پر یہاں تشریف نوجوان تھے لیکن بہت جلد وہاں کے سارے مدرسین میں آپ کے علم و فضل کا شہرہ ہو گیا۔

ادھر درس و تدریس سے طلباء و علماء گھائل ہوتے۔ ادھر مواعظ حسنہ نے سارے کانپور کو حضرت کا فریفتہ بنا دیا۔ یہ سب چار مہینے میں ہوا۔ اراکین مدرسہ نے حضرت اقدس کی مقبولیت سے مالی فائدہ حاصل کرنا چاہا اور وعظوں میں مدرسہ کے لیے چندہ کرنے کی خواہش کی۔ حضرت والا چونکہ اس قسم کے چندوں کو شرعاً ناجائز اور ویسے بھی غیرت دینی کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس

یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس پر ان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ حضرت نے اس کی اطلاع پاکر استعفا پیش کر دیا۔ اور باوجود اصرار کے اس مدرسہ میں رہنا گوارہ نہ کیا بلکہ واپسیٔ وطن کا ارادہ فرما لیا مگر واپسی سے پہلے حضرت فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کی خدمت فیض درجت حاضر ہوئے کہ شاید پھر اس کا موقع نہ ملے۔ حضرت تشریف لے گئے اور ادھر کانپور کے لوگوں میں اس نقصان عظیم سے ایک ہیجان بپا۔ جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب اور کفایت اللہ صاحب مرحوم نے یہ سوچ کر کہ ایسی جامع شخصیت جو معقولات و دینیات پر حاوی نایاب ہے اپنی طرف سے ۲۵ روپیہ تنخواہ کی سبیل کر کے مراد آباد سے واپسی پر حضرت اقدس کو روک لیا۔ اور اب حضرت اقدس جامع مسجد محلہ ٹپکا پور میں درس دینے لگے۔ اس طرح ایک نئے مدرسہ کی بنیاد پڑی۔ جس کا نام خود حضرت ہی نے مسجد کی مناسبت سے "جامع العلوم" رکھا جو آج تک قائم ہے۔ غرض پورے ۱۴ سال قیام کے بعد خود اپنے مرشد شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکیؒ قدس سرہٗ کے ارشاد پر آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں کانپور کا تعلق ترک کر کے تھانہ بھون کو رونق بخشی۔ اس مراجعت پر حضرت حاجی صاحبؒ ایک والا نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :—

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ خلائق کثیر کو آپ سے فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔ اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سرِ نو آباد کریں گے۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں"۔ (مکتوب امدادیہ) حضرت کو ابتداء سے لے کر آخر تک طلباء سے خاص محبت رہی اور ان کا خاص لحاظ فرماتے رہے۔ خود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم کہتے رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے پیر جیون والی درویشی نہیں آتی۔ میں تو ایک طالب علم ہوں۔ مجھ سے تو قرآن و حدیث کی باتیں پوچھی جائیں۔ مجھے تو سادہ سیدھا قرآن و حدیث ہی آتا ہے اور اسی کو اصل درویشی سمجھتا ہوں"۔ اور فرماتے کہ "صوفیاء سے زیادہ علماء کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انہی کی بدولت انتظامِ دین قائم ہے"۔ اسی وقعتِ علمی کا نتیجہ تھا کہ طلباء کے ساتھ ہر طرح کی رعایت فرماتے اور ان کی ہر طرح سے امداد کرتے تھے۔ ان کے وقار کا خاص لحاظ رکھتے اور دوسروں کو اس کی تاکید فرماتے تھے۔ اور خود طلباء کو ادنیٰ چیزوں کی طرف سے موڑ کر ان کے مقامِ اعلیٰ اور منصبِ جلیل پر فائز کرنے کی پوری سعی فرماتے تھے۔

اصولِ تعلیم

اب آیئے اس ہستی کے اصول تعلیم کو اجمالی طور پر سمجھیں جس کی چودہ سالہ تدریس میں سینکڑوں علماء کامل نکلے (۱) حضرت والا اس بات کے قائل تھے کہ استاد جو بھی مضمون پڑھائے اس میں خود زیادہ مشقت اٹھائے اور اس کو سہل ترین پیرایہ میں شاگردوں کے آگے پیش کرے گو اس میں استاد پر زیادہ بار پڑتا ہے لیکن جذبہ شفقت اس کو ہلکا کر دیتا ہے اور سچ یہ ہے کہ بغیر اس جذبہ کے یہ کام انجام ہی نہیں پا سکتا۔ (۲) حضرت اقدس کا یہ بھی اصول تھا کہ مشکل اور پیچیدہ مقام پہلے سلیس تقریر میں بیان کیا جاتے اور جب طلباء اس کو خوب سمجھ جائیں تو اس مقام کا تعارف کرایا جائے۔ چنانچہ مدرسہ "جامع العلوم" کے شاگرد اوّل مولوی فضل حق صاحب (جو بعد میں مدرسہ قنوج میں مدرس بنے) کو صدرا کا مشہور مقام "مثناۃ بالتکریر" درپیش ہوا۔ جو بہت ہی مشکل سمجھا جاتا ہے) تو حضرت نے پہلے اس کی آسان تقریر فرما دی اور پھر جب وہ اچھی طرح سمجھ گئے تو فرمایا کہ "یہ وہی تو مقام تھا جس کو "مثناۃ بالتکریر" کہتے ہیں۔ اس پر وہ دنگ رہ گئے اور ہم تو ڈرتے تھے لیکن یہ تو کچھ مشکل نہ نکلا۔ (۳) حضرت اقدس یہ بھی پسند نہ فرماتے تھے کہ طلباء کے آگے زائد از ضرورت تقریر کی جائے جس سے مقصود محض اظہار قابلیت ہو اور جس کی وجہ سے اصل مطلب خلط ملط ہو جائے چنانچہ نہ صرف خود اس اصول پر کاربند تھے بلکہ اور مدرسین پر بھی اسی نظر سے نگرانی فرماتے تھے (۴) ہفتہ واری تقریروں اور مناظروں سے بھی حضرت اقدس کو اختلاف تھا اور بیجا اختلاف فرماتے

کہ اس کی وجہ سے طلباء کی توجہ ہفتہ بھر ایک ہی موضوع تقریر و بحث کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل درس میں ہرج واقع ہوتا ہے۔ حضرت ا
فرماتے تھے کہ جب کتابیں اچھی طرح پڑھ لیں تو پھر تقریر و مناظرہ سب کچھ آجاتا ہے۔ حضرت اقدسؒ کی طالب علمانہ یکسو زندگی اور بعد کی
زندگی اس صحیح اصول کی کھلی آگاہ ہے (۵) فرماتے تھے کہ طلباء اگر تین باتوں کا التزام کریں تو استعدادِ علمی حاصل ہو جاتی ہے :- (ل) آئندہ سبق
مطالعہ کر کے معلومات اور مجہولات میں تمیز پیدا کریں۔ (ب) پھر جب استاد سمجھائے تو بغیر سمجھے آگے نہ بڑھیں۔ (ج) جب سمجھ چکیں تو ا
مرتبہ خود بھی اسی مطلب کی تقریر کریں۔ یہ تین باتیں تو واجب ہیں۔ ایک بات درجۂ استحباب کی ہے۔ وہ یہ کہ کچا آموختہ روزانہ پڑھ لیا کریں
یاد رہے نہ رہے استعداد انشاء اللہ پیدا ہو جائے گی۔ (۶) حضرت والا نے یہ اصول بھی بنایا تھا کہ اگر کوئی طالب علم عدم مناسبت یا عدم
کی وجہ سے معقولات نہ پڑھے لیکن دینیات کی درسی کتابیں تمام کرلے تو اس کو سند سے محروم نہ رکھا جائے بلکہ سند میں بجائے "درسیات
(جو منقولات و عقلیات کی جملہ کتب پر حاوی ہیں) "دینیات" لکھا جائے۔

بزرگانِ عصر کی خدمت میں

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کو حضرات اہل اللہ سے خاص عقیدت اور محبت تھی۔ فرماتے ۔
ان بزرگوں کے ناموں سے بھی روح میں تازگی اور قلب میں نور پیدا ہوتا ہے۔ بزرگوں ک
کو اس درجہ نافع سمجھتے تھے کہ "نزہۃ البساتین" کے نام سے ایک ہزار حکایات کا مجموعہ شائع کرایا اور بہت وثوق سے فرماتے تھے کہ یہ حک
عشاق ہیں۔ "ممکن نہیں کہ ان کے حالات پڑھے جائیں اور قلب میں محبتِ الٰہی پیدا نہ ہو"۔ خود اپنے متعلق بارہا فرمایا کہ "نہ کبھی طالب
میں نے محنت کی نہ اس طریق میں کبھی مجاہدات و ریاضات کیے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے سب اپنے حضرات اساتذہ و مشائخ
توجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب و عقیدت کا ثمرہ ہے"۔ بالخصوص اس وقت جب حضرت اقدس اپنے شفیق اساتذہ کے
ان کی علمی تحقیقات اور باطنی کیفیات کا ذکر فرماتے تو آپ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور دیر تک یہی حال قائم رہتا تھا۔
شعر پڑھتے :-

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع

حضرت اقدس اپنے وقت کے سارے بزرگانِ دین سے ملے ہیں اور ہر ایک سے دعا و توجہ، لطف و عنایت کے ذریعہ
کیا ہے۔ ع "تمتع ز ہر گوشۂ یافتم"

چنانچہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مجددی (مہتمم مدرسۂ دیوبند) کے حلقۂ توجہ میں شریک رہے تھے فرماتے تھے کہ "اس ر
محسوس ہوتا تھا کہ جیسے بالکل پاک صاف ہو گیا ہوں"۔ مولانا قدس سرہٗ کے ساتھ حضرت نے سرہند پہنچ کر شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہٗ
کی زیارت فرمائی۔ اور واپسی میں ریاست پٹیالہ میں ان مقامات کی بھی زیارت کا شرف ملا جہاں (بربنائے کشف) بعض حضرات انبیاء
کے مزارات ہیں۔ مولانا قدس سرہٗ کو حضرت سے اس درجہ محبت تھی کہ مدتوں آپ سے اپنی مسجد میں امامت کروائی۔ اسی طرح آپ
گنج مرادآبادیؒ اور شاہ ابو حامد صاحب بھوپالیؒ (جو سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے آفتاب تھے) کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے ہیں (مراد
حضرت نے خاص برتاؤ سے نوازا ہے۔ اول الذکر بزرگ نے تو اس درجہ محبت بڑھی کہ انہوں نے آپ کو اپنے وہ احوال بھی سنائے جو اوروں
نہ فرماتے تھے۔ مثلاً فرمایا کہ "کہنے کی تو بات نہیں لیکن تم سے کہتا ہوں کہ جب سجدہ میں جاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے
کر لیا"۔ یہ بھی فرمایا کہ "بھائی جنت کا مزہ برحق، کوثر کا مزہ برحق۔ لیکن نماز کا جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں بھی نہیں۔ بھائی ہم تو قبر میں نماز

(ر)ہیں گے۔ دعا ہے کہ ہمیں تو اللہ میاں قبر میں یہ اجازت دیں کہ بس نماز پڑھے جاؤ۔

صوفی شاہ سلیمان صاحبؒ لاجپوری ایک مشہور بزرگ ہوئے ہیں۔ خود ان بزرگ نے حضرت سے کئی بار ملاقات فرمائی۔ ایک مرتبہ حضرت (ر)اندیر سے سورت جا رہے تھے اور صوفی صاحبؒ سورت سے راندیر۔ راستہ میں ایک پل پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ صوفی صاحبؒ راندیر (پ)ہنچ کر دیر تک ایک مسجد میں بیٹھے روتے رہے۔ اور کسی کے استفسار پر حضرت کا نام لے کر فرمایا کہ "نہ جانے آنکھوں سے کیا کر گئے" حضرت مولانا (ش)یخ محمد صاحبؒ تھانوی تھے (جو ایک جید عالم اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے پیر بھائی تھے۔) لڑکپن ہی میں جب حضرت کو دیکھا تھا تو فرما(یا) تھا "میرے بعد یہ لڑکا ہوگا" چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہی ہوا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے تو (جو مدرسہ دیوبند کے مدرس اوّل ،(ح)ضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفۂ رشید اور حضرت کے استاذ تھے) اپنے شاگرد کو خوب دیکھا تھا۔ آپ کے زمانۂ طالب علمی ہی میں حضرت (ق)دس سرہٗ نے یہ فرما دیا تھا "خدا کی قسم جہاں تم جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے" سچ ہے "قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید" (حض)رت مولانا رشید احمد گنگوہی (ق)دس سرہٗ سے دنیائے اسلام ناواقف نہیں۔ اپنے وقت کے محقق عالم اور اہلِ دل کے نزدیک مسلّمہ طور پر قطب ارشاد تھے۔ چونکہ اوّلاً حضرت نے (آ)پ ہی سے بیعت کی درخواست کی تھی اس لیے تا آخر حیات آپ کے ساتھ شیخ ہی کا سلوک فرماتے رہے اور واقعی حضرت کو آپ سے بڑی (ع)قیدت و محبت تھی۔ فرماتے تھے "میں نے ایسا جامع ظاہر و باطن بزرگ کوئی نہیں دیکھا اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت استدلالی ہے اور (حضرت) مولانا رشید احمد گنگوہی) کے ساتھ غیر استدلالی۔ دلائل سوچنا بھی خلافِ ادب سا معلوم ہوتا ہے۔" قیام تھانہ بھون کے وقت حضرت تھانویؒ (ک)ے مواعظ و مشاغل کا حال سن کر بہت خوش ہوتے اور فرمایا کرتے تھے "یہ سب کچھ ہے مگر مجھے تو پوری خوشی اس وقت ہو گی جب کچھ اللہ اللہ (ک)رنے والے بھی وہاں جمع ہونے لگیں" حق تعالیٰ نے اپنے اس محبوب بندہ کی آرزو بھی پوری کر دکھائی۔ اور خوب ہی پوری فرمائی۔ شیخ الہند (م)ولانا محمود حسن صاحبؒ سے آج کا ہر مسلمان واقف ہے۔ حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفۂ خاص اور بانیٔ دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم (ص)احبؒ کے شاگرد خاص تھے۔ ہمارے حضرت کے استاد تھے اور اپنے شاگرد کا اس درجہ احترام فرماتے تھے کہ "سراپا فضل و کمال" اور "معدن حسنات و خیرات" کے عنوانات سے مخاطب کرتے تھے۔ شیخ الہند اور حضرتؒ میں جو سیاسی اختلاف رائے رہی ہے وہ عالم آشکار ہے۔ بعض بدخواہوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر حضرت شیخ الہندؒ کو آپؒ سے برگشتہ کرنا چاہا تو آپ نے جواب دیا "افسوس تم ایسے شخص کی شکایتیں کرتے ہو جس کو میں ایسا ایسا (مجدد الملت نے ازراہ تواضع وہ الفاظ نہیں بتائے) سمجھتا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا مجھ پر کوئی وحی آئی ہے۔ میری ایک رائے ہے اور ان کی ایک رائے۔ اس میں اعتراض و شکایت کی کیا بات ہے۔" اسی دور کے ایک اور بزرگ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ ہیں۔ جو حضرت گنگوہیؒ قدس سرہٗ کے خلیفۂ اعظم اور علم و عمل میں اپنی نظیر آپ تھے۔ حضرت تھانویؒ کے متعلق فرماتے تھے۔ "مجھ کو اشرف سے اس وقت سے محبت ہے جس وقت ان کو خبر بھی نہ تھی۔" آپ کے مواعظ کے متعلق یہ رائے رکھتے تھے "ان کے بیان میں (مراد مواعظ) انگلی رکھنے تک کی گنجائش نہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی کا وعظ کہنا منہ چڑانا ہے۔"

یہ تو ان چند بزرگوں کا بالکل اجمالی تذکرہ ہوا جو مطلع شہرت کے درخشندہ ستارے ہیں۔ ان کے علاوہ اور اکابرِ وقت مثلاً مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی، مولانا خلیل پاشا صاحب مکی قدس سرہٗ اور دیگر بیسیوں بزرگانِ دین سے ملاقاتیں رہی ہیں اور حضرت نے ان کے لطف و کرم کو اپنی جانب مبذول کرایا ہے۔ اور وہ حضرت کے علم و اخلاق سے متاثر ہوئے ہیں —— اہل حق میں یہ قبولیت اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

شیخ دوراں سے تعلق اور حج بیت اللہ

گذر چکا ہے کہ مجدد الملت کی پیدائش ایک مجذوب حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔ اور انہی بزرگ نے آپ کا نام "اشرف علی" رکھا تھا۔ اور آخر وقت تک اپنی محبت و توجہ سے سرفراز کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ غیر شعوری طور پر حضرت میں عشق کی جلوہ آرائیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک بار قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لاتے تو حضرت ایک ہی نظر میں گھائل ہو گئے۔ اشتیاق سے مصافحہ کے لیے آگے بڑھے۔ شوق نے بے قابو کر دیا تھا۔ پاؤں بے اختیار پھسل پڑا۔ حضرت قدس سرہٗ گنگوہی نے تھام لیا۔ گو بیعت اور اس کی حقیقت سے نا آشنا تھے مگر کشش اس بلا کی ہوئی کہ بیعت کی درخواست کر دی۔ حضرت قدس سرہٗ نے دوران تعلیم میں اس کو مناسب نہ سمجھا اور انکار فرما دیا لیکن خاطرِ اشرف میں یہ خیال بصورتِ حسرت برابر پرورش پاتا رہا اور رجب ۱۲۹۹ھ میں حضرت مولانا گنگوہی عازمِ حج ہوئے تو خود انہی کے ذریعہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں عریضہ گزارا کہ "آپ مولانا سے فرما دیں کہ مجھ کو بیعت کرلیں" نہ جانے دونوں عرفا میں کیا راز و نیاز رہا۔ بہ ظاہر یہی ہوا کہ حضرت حاجی صاحب نے جواب میں خود ہی بیعت فرما لیا۔ اس وقت مجدد الملت کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔

حضرت مجدد الملت تو ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے کہ شیخ العرب والعجم قدس سرہٗ نے مکہ معظمہ کی سکونت اختیار کرلی تھی۔ لیکن جب بصیرت کی آنکھ کھل جاتی ہے تو زمان و مکان کے سارے حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ عارف باللہ حضرت حاجی صاحب نے وہیں سے تھانہ بھون کے اس دُرِ شہسوار کا جلوہ دیکھ لیا تھا۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ حضرت قدس سرہٗ نے آپ کے والد ماجد کو کہلا بھیجا تھا کہ "تم حج کو آؤ، اور جب آؤ اپنے بڑے لڑکے کو لیتے آؤ"

غرض شوال ۱۳۰۱ھ میں جب کہ مجدد الملت طالب علمی کی زندگی ختم فرما کر کانپور میں اشاعت علوم میں مصروف تھے، سفر حج کے سامان پیدا ہو گئے، (تفصیل کے لیے دیکھو اشرف السوانح) حضرت والا اپنے والد ماجد کی معیت میں زیارت حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوئے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ جب کسی ملاقاتی نے آپ کے والد ماجد سے سمندر کے تلاطم کا ذکر کیا تو فوراً کہہ اٹھے۔ ؎

چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتی باں چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتی باں

اسی جذبہ و اشتیاق سے مکہ معظمہ پہنچے، حضرت حاجی صاحب سے نیاز حاصل کیا۔ شیخ قدس سرہٗ بہت خوش ہوئے اور دست مبارک سے بیعت کی نعمت سے سرفراز کیا۔ بعد فراغ حج خود فرمایا کہ "تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ" لیکن حضرت والا کے والد ماجد نے مفارقت گوارا نہ کی اور حضرت حاجی صاحب نے بر بنائے احترام شریعت فرمایا کہ "والد کی اطاعت مقدم ہے اس وقت چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا" چنانچہ ۲۰ سال کی عمر میں پہلی بار فریضۂ حج سے فارغ ہو کر ۱۳۰۲ھ میں ہندوستان لوٹ آئے۔ دوران قیام مکہ معظمہ حضرت والا پر ارض پاک کا احترام و ادب اس درجہ غالب رہا کہ وہاں تھوکتے ہوئے بھی تامل ہوتا تھا۔ اور جس وقت بیت اللہ شریف پر پہلی بار نظر پڑی ہے، ایسی کیفیت شوقیہ داخلیہ پیدا ہوئی کہ خود فرماتے تھے: "ایسی کیفیت مجھ پر عمر بھر طاری نہیں ہوئی۔"

حج ثانی اور صحبتِ شیخ

عشق کی چنگاری تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ حضرت حاجی صاحب کے تعلق نے اس کو خوب ہوا دی۔ اور ارض پاک کے قیام نے اس کو خوب بھڑکایا۔ لیکن واپسی پر پھر بھی اس شعلہ بلند کی سامانی کی صفت نہ آتی تھی۔ برابر مصروفِ درس و تدریس اور مشغولِ تقریر و تحریر رہے۔ سینکڑوں کو عالم بنایا اور ہزاروں کے دل میں دین

عظمت بٹھائی اور اس کا سکہ جمایا ـــــــ ادھر شیخ کامل سے خط و کتابت برابر جاری تھی اور توجہات شیخ برابر شامل حال تھیں اندر ہی اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ ان احوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ۱۳۰۸ھ سے زندگی نے دوسرا پلٹا کھایا۔ باطنی شغل سے اس درجہ دلچسپی بڑھی کہ سارے تعلقات سے دل سرد ہوگیا۔ اپنے شیخ سے ترک ملازمت کا مشورہ لیا مگر جواب ملا کہ :" نامہ محبت شمامہ آں عزیز تمیز رسید؛ از استماعِ حال ذوق و شوق آثار ترقی فہمید۔ مسرت بر مسرت افزود۔ حق تعالی برکت زیادہ کند۔ بہ خلق اللہ فیض دینی رسانیدن راہ قرب وصول الی اللہ است۔" (مکتوب ۲؎ ۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ) حضرت اقدس نے حسب ارشاد مرشد درس و تدریس کو جاری رکھا اور ۱۳۱۱ھ تک ضبط و سکون سے کام کرتے رہے لیکن اب شوق و اضطراب نے مجبور کر دیا اور اپنے شیخ کا ارشاد کہ "میاں اشرف علی تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ" کسی پہلو چین نہ لینے دیتا تھا۔ عزم فرمایا اور راہ کھل گئی۔ پھر کیا تھا مکہ معظمہ کو چل نکلے۔ عجب ذوق و شوق کا عالم تھا۔ قطب عالم حضرت حاجی صاحب تو چاہتے ہی تھے کہ چھ مہینے کے لیے حضرت والا آجائیں، دیکھ کر اس درجہ مسرور ہوئے کہ گویا حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ گم گشتہ پھر ہاتھ آگئے۔ اور بہت ہی عنایات و توجہات فرماتے رہے۔ ادھر قوت افاضہ کا وہ حال اور ادھر قابلیت استفاضہ اس درجہ۔ کچھ ہی عرصہ میں شاگرد و استاذ مرید و پیر ہم رنگ ہوگئے۔ خود حضرت شیخ بے ساختہ فرماتے تھے کہ "بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو" جب مجدد الملت کی کوئی تحریر نظر سے گزرتی یا تقریر سننے میں آتی تو بے اختیار کہہ اٹھتے "جزاکم اللہ تم نے تو بس میرے سینے کی شرح کر دی" علوم معارف سے متعلق کوئی کچھ پوچھتا تو مجدد الملت کی طرف اشارہ کرکے فرماتے۔" ان سے پوچھ لو، یہ خوب سمجھ گئے ہیں۔"

باطنی مناسبت تو خیر پیدا ہی ہو چکی تھی۔ حضرت شیخ ظاہری مناسبت کے بھی آرزومند تھے؛ مجدد الملت کے دوران قیام مکہ آپ کی زوجہ محترمہ اور خالہ صاحبہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ خالہ صاحبہ نے خدمت شیخ میں عرض کیا کہ "ان کے لیے صاحب اولاد ہونے کی دعا فرمایئے" حضرت شیخ نے اپنے مرید رشید سے باہر آکر فرمایا۔" تمہاری خالہ مجھ سے دعا کے لیے کہتی ہیں کہ تمہارے اولاد ہو۔ سو دعا تو میں نے کر دی لیکن بھائی میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی تم بھی رہو۔ جو حالت میری ہے وہی حالت تمہاری بھی رہے۔" مجدد الملت نے عرض کیا جو حالت حضرت کو پسند ہے وہی میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔" یہ سن کر حضرت حاجی صاحبؒ بڑے مسرور ہوئے ـــــــ

اس سے قطب عالم قدس سرہٗ کے اس جذبہ کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے قلب اطہر میں مجدد الملت کا کس درجہ لحاظ تھا اور کس طرح اس امر میں پوری قوت صرف فرمادی تھی کہ آپ کے مثنیٰ بن جائیں اور کبھی دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ "من دیگرم تو دیگری" یہ اختصاص کسی اور مرید یا کسی اور خلیفہ کے حصہ میں نہیں آیا ـــــــ دوران قیام مکہ معظمہ مجدد الملت پر "توحید" کا انکشاف بدرجۂ کمال ہوا جو شریعت و طریقت کی اساس اور درویشی کا ماحصل ہے اور جس کا لازمی نتیجہ "عبدیت" ہے جو سلوک کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ اور یہی وہ دولت ہے جو حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہٗ کا خاص حصہ تھی ـــــــ غرض چھ مہینے سے ایک آدھ ہفتہ کم قیام کے بعد مجدد الملت نے اپنے شیخ کامل سے رخصت چاہی۔ حضرت شیخ نے دو وصیتیں بطور خاص فرمائیں۔ (۱) " دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی، عجلت مت کرنا۔ (۲) کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا۔ توکلاً علی اللہ تھانہ بھون جاکر بیٹھ جانا۔" (گویا ۱۳۰۸ھ میں جس ترک تعلق سے منع فرمایا تھا اب بعد حصول "تمکین" خود اس کے ترک کا مشورہ دے رہے ہیں) ان وصیتوں اور باطنی دولت کو لے کر حضرت مجدد الملت ۱۳۱۱ھ میں پھر واپس وطن لوٹ آئے۔

واپسی اور قیامِ وطن

مکہ معظمہ گئے تھے اس حالت میں کہ شباب پھٹا پڑتا تھا اور دولہا سے بنے رہتے تھے اور قیام کے بعد جب لوٹے ہیں تو عشق کے ہاتھوں وہی حال ہو گیا تھا جس کا اظہار زمانہ طا... میں خود ہی یوں فرما چکے تھے ۔

عشق می سازد ز مال و جاں جُدا　　عاشقاں را نیست مطلب جز خدا
عشق عاشق را کند زار و نزار　　عشقِ عاشق را کند سوا و خوار
عشق سازد، زرد روئے عاشقاں　　ہم کند ژولیدہ موئے عاشقاں
عشق معشوق ست مر عشاق را　　من لہوب العشق ہم قالوا بلے　　(مثنوی زیر و بم)

کانپور میں ۱۳۱۵ھ تک قیام

ہندوستان پہنچ کر پھر مدرسہ جامع العلوم کان پور میں مصروف درس و تدریس ہوئے... ہی عرصہ گزرا تھا کہ پھر کیفیت "شوقیہ الیہ" نہایت جوش و خروش سے وارد ہوئی... اب کی دفعہ اس میں کلفت کے عوض لذت اور ناگواری کے بدلے خوشگواری تھی۔ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری سے قبل کی کیفیت شو... "سیر الی اللہ" کا نتیجہ تھی اور موجودہ کیفیت "سیر فی اللہ" کے باعث تھی۔ وہ حالت مشاہدہ سے قبل کی تھی اور یہ بعد کی۔ وہ اثرِ عشق تھا یہ ا... بقول حضرت مجدد الملت، اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو ذاکر و شاغل اور ولی کامل بنا دوں۔" چنانچہ شروع... حلقۂ توجہ بھی منعقد فرمانے لگے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا مدرسہ کانپور ذاکر و شاغل بن گیا تھا۔ اس کی اطلاع جب حضرت شیخ کو ہوئی تو جواب آیا... آپ اور آپ کے متعلقین کے ذوق و شوق کی کیفیت سن کر طبیعت نہایت ہی خوش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بایں ذکر و شغل دائم مشغول رکھے۔ دن... درترقی عطا فرمائے۔ مقصودِ اصلی تک پہنچائے۔ آمین ثم آمین۔" لیکن یہ کیفیت بھی عارضی نکلی اور جب "مقامات" میں رسوخ بڑھتا گیا تو اس... نے دوسرا ہی رنگ اختیار کیا یعنی متوقع مقامات کی طلب شدید ہوئی اور پھر ویسی ہی اضطرابی اور انتہائی کیفیت رونما ہوئی جیسی قبل قیام مکہ ہو... لیکن دونوں کی اصل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پہلی کیفیت "طلب ابتدائی" کا نتیجہ تھی اور موجودہ کیفیت "طلب مزید" کا۔ اور اسی وجہ سے... دفعہ حیرانی و پریشانی اور سخت لاحق ہوئی۔ یہ وہی کیفیت تھی جس کی پیشین گوئی حضرت شیخ نے اپنی پہلی وصیت میں فرمائی تھی۔ سارے... دل اچاٹ ہو گیا۔ درس و تدریس سے دلچسپی ختم ہوئی۔ وعظ کہنا چھوڑ دیا اور یکسوئی اختیار کر لی۔ اہل کانپور جو مجدد الملت کے وعظ کے پیاسے... مچلنے لگے۔ ایک دفعہ بڑا جلسہ تھا۔ بیرونی حضرات علماء بھی تشریف لائے تھے۔ اراکین مدرسہ ان علماء کو لے کر حضرت کی خدمت میں آئے... وعظ کے لیے اصرار کیا۔ اکابر علماء کو دیکھ کر نہ انکار بن پڑتا تھا نہ اپنی حالت کے مدنظر اقرار ممکن تھا۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو گردن جھکا لی اور... کی زبانی اپنا حال سنانے لگے۔ یہ دیکھ کر مولانا ظہور الاسلام فتح پوری کا دل پگھل گیا۔ اور بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلا۔ ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اپنے ساتھیوں سے کہا "بس بھائی بس اب انھیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ تنگ نہ کرو۔" ایک اور موقع پر جناب مولوی شاہ سلیمان... پھلواروی تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے بھی لوگوں نے اصرار کرنے کے لیے کہا تو انہوں نے عجیب جواب دیا۔" اگر ایسی حالت میں اس شخص... وعظ کہلوایا تو بس منبر پر بیٹھتے ہی اس کے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا وہ اَنَا الحق ہو گا۔ ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں۔" اس... خود حضرت نے بھی فرمائی کہ "اس زمانہ میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا۔ اس لیے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے اور...

ام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچے" مگر اس غلبۂ حال میں بھی مصلحتِ عامہ کا یہ خیال نادرات سے ہے۔

غرض یہ کیفیت اضطراب بڑھتی چلی گئی۔ پیرجی امداد علی صاحب کانپور ہی میں تھے اور موصوف نے بہتیری تدبیر کی مگر ے

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ز جب اضطراب والتہات حد سے گزرنے لگا تو ایک عریضہ اپنے شیخ باکمال قدس سرہٗ کی خدمت میں بھجوایا اور اس میں یہ بھی عرض کیا کہ لتِ اضطرار میں پیرجی امداد علی صاحب سے بھی چارہ جوئی کی، لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔ جب یہ عریضہ شیخ باکمال قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچا تو ضرت حاجی صاحب کبھی گھر کے اندر تشریف لے جاتے، کبھی باہر نکل آتے اور بار بار فرماتے کہ "جوان آدمی ہیں، غلبہ ہوگیا ہے، تحمل نہیں ہوسکا مگر ، تو اتنی دور ہوں کیا کروں" اس پر جو صاحب عریضہ لے گئے تھے انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میں جلد ہی جانے والا ہوں۔ بس یہ سن کر حضرت ب خالم مسرور ہوئے۔ اس عریضہ کا جواب ان کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ ان سے کہنا "جب تک تمہارا یہ خادم زندہ ہے کیوں کسی دوسرے کی ف رجوع کرتے ہو" جب یہ صاحب ہندوستان پہنچے اور حضرت مجدد الملت کو ان کے کانپور آنے کی اطلاع ملی تو مشتاقانہ علین دوپہری کے وقت کے گھر پہنچے۔ انہوں نے والانامہ پہنچایا اور زبانی پیام بھی۔ اس سے جو اثر ہوا اس کا حال خود حضرت اقدس یوں بیان فرماتے ہیں: "قبل ظہر دں نے مجھے حضرت کا یہ پیغام سنایا تھا۔ بس سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دہکتے ہوئے تنور پر کسی نے بھری ہوئی مشک چھوڑ دی ہو اور جلتے ہوئے ینہ پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو۔ عصر تک نصف سے بھی کم پریشانی رہ گئی۔ اور مغرب تک تو بس مطلع صاف تھا" اس طرح "شوق" کی کیفیت نس" میں بدل گئی۔ اور یہ "انس" "اس" "انس" سے اوقع تھا جو پہلی مرتبہ کے غلبۂ شوق کے بعد (حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری سے قبل) صل ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ ے

ہر کہ از حق انس گیرد از خلق وحشت گیرد

رفتہ رفتہ مجدد الملت کو تعلقات سے وحشت شروع ہوئی اور دن بدن اس میں ترقی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ کانپور جیسے محبوب مقام، اپنے ائم کردہ مدرسہ اور درس و تدریس سے بھی برداشتہ خاطر ہوگئے۔ حضرت شیخ کی نصیحت یاد آئی کہ "اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ ہوجاؤ تو پھر توکل ر تھانہ بھون ہی جاکر بیٹھ جانا" ۱۳۱۴ھ کے ختم پر ٹھان لی کہ خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون کو جو "دکانِ معرفت" کہلاتی تھی دوبارہ مسکن بنایا ئے لیکن کانپور کے فریفتہ و گرویدہ لوگوں سے بے مروتی تو نہ برتی جاسکتی تھی۔ اپنی خدا داد فراست سے کام لیا۔ اتفاقاً ان دنوں مدرسہ کی مالی الت کچھ خراب ہو چلی تھی۔ اس بہانے سے پہلے تنخواہ سے دست برداری حاصل کی۔ پھر اپنی جگہ مولوی اسحاق صاحب بردوانی کو مدرس اول بنایا ر خود برائے نام سرپرستی قبول فرمائی۔ اس طرح پورے حسن تدبر سے مدرسہ کو ہر طرح کے نقصان و حرج سے بچاتے ہوئے اور اہل کانپور سے کچھ ن آرام لینے کا عذر کرکے آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں خوش خوش کانپور سے چل نکلے۔ تھانہ بھون آکر حضرت شیخ کو مطلع کیا تو جواب آیا: "بہتر ہوا کہ آپ انہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیرہ کو فائدۂ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سرِ نو آباد کریں گے ں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے۔" (مکتوب ۳۶، ۱۲ ربیع ۲ ۱۳۱۵ھ)

ادھر مدرسہ کانپور کے حالات وقتاً فوقتاً دریافت فرماتے رہے اور ہدایات دیتے رہے تاکہ اہل کانپور کو ترکِ تعلق کا گمان نہ ذرے۔ مگر جب دیکھا کہ مدرسہ کی مشین ٹھیک ٹھیک نہج پر چل رہی ہے اور اب اظہارِ عزم سے اس میں خلل کا اندیشہ نہیں با تو لکھ بھیجا کہ ے

"از قیل و قال مدرسہ حالے دلم گرفت یک چند نیز خدمتِ معشوق می کنم"

اہل کانپور کو جب یہ خبر ملی تو عرض کی کہ مدرسہ کا کوئی کام حضرت کے ذمہ نہ ہوگا لیکن قیام تو کانپور ہی میں رہے۔ حضرت والا نے بتا دیا کیا ہے حضرت حاجی صاحبؒ کے حکم سے ہے۔ ان لوگوں نے پھر حضرت حاجی صاحب سے آپ کے قیام کانپور کی اجازت چاہی۔ لیکن حضر سرہ نے ان کو اور مجدد الملت کو یہ لکھ بھیجا کہ "فقیر کے نزدیک قیام آپ کا تھانہ بھون میں ضروری ہے باقی تعطیل وغیرہ کسی فرصت میں یا جب طبیعت گھبرائے تو کانپور کا دورہ بھی کریں اور ان لوگوں کی خبر گیری کریں اور طالب کے لیے تو تھانہ بھون، کانپور سے کچھ دور نہیں"

۱۳۱۵ھ سے مجدد الملت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو تا آخر حیات

۱۳۱۵ھ سے مستقل قیامِ تھانہ بھون

یعنی مستقل قیام تھانہ بھون۔ مجدد الملت اسی "دکان معرفت" میں جس کی رونق حاجی صاحبؒ کی ہجرت اور حضرت حاجی ضامن صاحبؒ و مولانا شیخ محمدؒ کی شہادت و رحلت کے باعث ماند ہو چکی تھی پھر فروغ رونق ہوئے۔ کانپور کو ترک کیا، درس و تدریس سے چھٹی لے لی۔ والد ماجد کے ترکہ کو مشتبہ پا کر خیرباد کہا۔ اپنے شیخ عالی مرتبت کی نصیحت استاذ ذی معرفت (مولانا رشید احمد گنگوہی) کی تسلی سے بالکل متوکلاً علی اللہ ہمہ تن مشغول بحق ہو گئے۔ پھر کیا تھا۔ کبھی "تجلی جمال" سے سکینت پاتے "تجلی جلال" سے "برق تپاں" بن جاتے۔ صبغۃ اللہ" کا رنگ چڑھتا رہا۔ جو آتے تھے ان کو بھی اسی رنگ میں ڈبوتے گئے۔ خانقاہ کی رونق لگ گئے۔ اس دور میں رنگ ہی اور تھا، خود سراپا سوز و گداز تھے اس لیے جو بھی آجاتا سوختہ، گداختہ بن جاتا ——— سلوک کی طے ہوتی رہیں۔ حق تعالے کو منظور ہوا کہ اپنے اس بندہ کو اعلیٰ ترین مقام پر فائز کرے اور اس راہ کی دشواریوں سے واقف کرائے تاکہ بندوں کی رہبری میں سہولت ہو اور ان کو لے چلنے میں حیرانی نہ رہے ——— ایک مرتبہ پچھلی رات کو تہجد کے لیے ہوئے یک بیک بلا اختیار ایک خطرۂ منکرہ کا ورود ہوا۔ جس کا حاصل چند الفاظ تھے۔ جو دفعۃً متخیّلہ میں واقع ہو گئے۔ گویا یہ کوئی نئی بات لیکن اس مرتبہ اس درجہ شدید و مدید اثر ہوا، کہ حضرت والا اپنی زندگی ہی سے بیزار ہو گئے۔ یہاں تک کہ خودکشی تک کے وسوسے فرماتے تھے "ایک بار ایک صاحب ملنے آئے۔ ان کے پاس اس وقت بھری ہوئی بندوق تھی۔ بار بار میرے جی میں آتا تھا کہ ان کہ خدا کے لیے فائر کر کے میرے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کر دو۔ کیونکہ میں فرعون و ہامان سے بھی بدتر ہوں۔ وہ جس بلا میں مبتلا ہیں ایمان لا کر ایک منٹ میں چھٹکارا ہو سکتا ہے اور میں جس بلا میں مبتلا ہوں اس سے سالہا سال میں بھی خلاصی ممکن نہیں"

حالت تو یہ تھی اور ساتھ ہی ساتھ دوسری مشکل یہ کہ خود بقول حضرت اقدسؒ اگر "ذکر کرنے بیٹھتا (جو کہ قرب کی حالت تھی تو سا وہ خطرۂ منکرہ بھی عود کر آتا اور عود خطرہ سے بچنے کی غرض سے ذکر کو منقطع کرنا چاہتا جو کہ بعد تھا) تو اس کو بھی دل کسی طرح گوارا نہ کرتا گویا یہ حا

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی سوزم گرت نہ بینم میرم چوں رخ نمائی

نزدیک آں چنانم دور آں چناں کہ گفتم نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

غرض سخت کش مکش میں مبتلا تھا اور ایسی شدید حالت تھی کہ باوجود صحت بدنی کے موت کو حیات پر ہزار درجہ ترجیح دیتا تھا" حسن اتفاق یہ خطرہ تہجد کے وقت قیام گنگوہ میں واقع ہوا۔ فوراً قطب ارشاد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں پہنچ کر حالت عرض کی ارشاد ہوا: "التفات نہ کیا جائے" مجدد الملت تھانہ بھون تشریف لے آئے، لیکن وہ خطرۂ منکرہ برابر زور پکڑتا گیا۔ جس سے انفعالی کیفیت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اختلاج قلب کے ایسے شدید دورے پڑنے لگے کہ چند دنوں میں نہایت نحیف و کمزور کر دیا ———

الم مولوی محمد صدیق صاحب گنگوہی اتفاقاً تھانہ بھون آئے ہوئے تھے۔ ان سے بغرض معالجہ رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے قارورہ دیکھ کر کہا: "مجھے یہ رت ہے کہ یہ شخص کیونکر زندہ ہے۔ قارورہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ حرارت عزیزیہ بالکل فنا ہو چکی ہے۔" بہتیرا علاج کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور فائدہ ہوتا ل حرج۔ "درد ہی وہ تھا جس کا علاج بجز "خزانہ غیب" کے اور کہیں نہ تھا۔ حکیم الامت نے خانقاہ چھوڑ سفر اختیار کیا۔ کبھی کبھی خالی بندوق لے کر فائر تے اور اسی سے فرحت پاتے۔ اس دوران میں حضرت گنگوہی سے برابر ملتے رہے اور اپنی حالت پیش فرماتے رہے۔ حضرت گنگوہیؒ تو "امام فن" و "قطب ارشاد" تھے۔ دعا و توجہ صرف فرمائی۔ لیکن جواب ہمیشہ وہی دیتے رہے کہ "خطرات کی طرف التفات نہ کرو۔" ساتھ ہی ساتھ حکیم الامت نے پنے شیخ باکمال کو بھی ان احوال سے آگاہ فرمایا۔ جواب آیا: "الحمدللہ آپ کے قلب کی حالت بہت اچھی ہے۔ یہ مقام "خوف و رجا" ہے۔ اسی کو ہیبت و انس" کہتے ہیں۔ کبھی "ہیبت" کبھی "انس" کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ دونوں کو ایک سمجھنا چاہیئے۔ فقیر دعا کرتا ہے جو کچھ قلب پر وارد ہو منجانب اللہ ال کرو۔ جو واردات مضر ہوں گے اس مراقبہ سے سب رفع ہو جائیں گے۔ اس قسم کی گھاٹیاں طالب کو آیا کرتی ہیں۔ انشاء اللہ سب سے پار ہو وگئے۔" (مکتوبات ۴۴ تا ۴۶ رجب و شعبان ۱۳۱۶ھ) پھر مکتوب ۴۹ ۵ از محرم ۱۳۱۷ھ میں تحریر فرماتے ہیں: "آپ کی حالت اب بحمداللہ بہت بھی ہے۔ فقیر دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ ترقی فرمائے۔" غرض تقریباً ایک سال تک یہ "غلبہ ہیبت" طاری رہا اور حضرت شیخ کی حیات ہی میں یہ دشوار گزار ہائی طے ہو گئی۔ اس ایک سالہ دور میں حضرت مجدد الملتؒ کو جو یہ حالت شدید پیش آئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے ن باطنی پریشانیوں کی تفصیل لکھ بھیجی تو جواباً تحریر فرماتے ہیں: "جو جو مضائق و مصائب و عقبات و بلیات آپ نے لکھی ہیں یہ تو سو حصوں میں سے ک حصہ بھی نہیں جو بعض کو پیش آتے ہیں۔ اس وقت مجھ کو بعض (مراد خود حضرت مجدد الملتؒ) کے احوال یاد آ گئے اور سر سے پاؤں تک اس نے جھے ہلا دیا۔" (۱۸ محرم ۱۳۳۲ھ) یعنی غلبۂ ہیبت کے فرو ہونے کے پندرہ برس بعد بھی محض اس وقت کے تصور نے سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔ اب ندازہ لگاؤ خود اس وقت کیا گزری ہوگی ——— اہل فن جانتے ہیں کہ اس "قبض" شدید کے بعد کس قدر اعلیٰ درجہ کا "بسط" اور س "ہیبت" قویہ کے بعد کتنا لازوال اور ترقی پذیر "انس" حاصل ہوا ہوگا اور کیسا "رسوخ" و "تمکن" میسر آیا ہوگا۔ کیونکہ یہ عادت جاریہ ہے۔ لحاصل حضرت مجدد الملتؒ کو وہ مرتبہ عطا ہوا جس کو "عبدیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی لازمی صفت بندگی اور سرافگندگی ہے۔ ذیل میں یک ملفوظ درج ہے۔ اس سے حضرت اقدسؒ کے مقام عبدیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"بہ قسم کہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو کسی مسلمان سے حتیٰ کہ ان مسلمانوں سے بھی جن کو لوگ فساق و فجار سمجھتے ہیں فی الحال، اور کفار سے بھی حتمالاً فی المآل افضل نہیں سمجھتا اور آخرت میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے وسوسہ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ مجھے تو جنتیوں کی جوتیوں میں بھی جگہ مل جائے تو اللہ کی بڑی رحمت ہو۔ اس سے زیادہ کی ہوس ہی نہیں ہوتی اور اتنی ہوس بھی بربنائے ستحقاق نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ دوزخ کے عذاب کا تحمل نہیں اور یہ جو میں بضرورت اصلاح زجر و توبیخ کیا کرتا ہوں تو اس وقت یہ مثال پیش نظر رہتی ہے کہ جیسے کسی شہزادے نے جرم کیا ہو اور بھنگی جلاد کو حکم شاہی ہوا ہو کہ اس شہزادے کو درّے لگائے تو کیا بھنگی جلاد کے دل میں درّے مارتے وقت کہیں یہ بھی وسوسہ ہو سکتا ہے کہ میں اس شہزادے سے افضل ہوں۔ غرض کوئی مومن کیسا ہی بداعمال ہو میں اس کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ نوراً یہ مثال پیش نظر ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حسین اپنے منہ پر کالک مل لے تو اس کو جاننے والا کالک کو برا سمجھے گا لیکن اس حسین کو حسین سمجھے گا اور دل میں کہے گا کہ جب کبھی بھی صابن سے منہ دھولے گا پھر اس کا وہی چاند سا منہ نکل آئے گا۔ غرض مجھ کو صرف فعل سے نفرت ہوتی ہے فاعل سے نہیں۔"

مجدد الملت مسند ارشاد پر

یوں توجِ ثانی کے بعد کانپور ہی سے رشد و اصلاحِ باطنی کا کام شروع ہو چکا تھا اور حضرت گنگوہیؒ قد بھی اپنے بعض بعض مریدین کو حضرت کی خدمت میں بھیجنے لگے تھے۔ اور پھر تھانہ بھون پہنچ کر ذا اور مریدین کی تعداد و نی بڑھ چکی تھی لیکن گذشتہ "مرحلہ ہیبت" کے تقریباً سال بھر میں اصلاحِ خلق کا سلسلہ رک گیا تھا اور خود آپ ہی اس کو یہ کہہ کر ملتوی کر دیا تھا کہ اس کی حالت میں کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جب اس شدید اور آخری مرحلہ سے بھی اللہ تعالیٰ گزار دیا تو اب "مسندِ ارشاد" پر پھر جلوہ فرما ہوئے اور تربیت کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ مولانا محمد محسن کاکوروی مشہور نعت گو کے فر مولانا انوار الحسن صاحب کاکوروی کا خواب درج ذیل ہے جس سے حکیم الامت کے منجانب اللہ اس مقام پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے "مجدد" ہونے کی بشارت ملتی ہے ———— خود تحریر فرماتے ہیں: ۔

میں نے سفرِ حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہٗ کے متعلق ایک خواب دیکھا۔ حالانکہ اس زمانے میں مجھ کو حضرت م سے کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی۔ البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا۔ اور میرا خاندان بھی علمائے اہلِ حق کا کچھ زیادہ معتقد نہ تھا۔ غرض حضرت مولانا کا کو مدینہ طیبہ میں کوئی بعید سے بعید بھی خیال نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھانوی تیمار داری فرما رہے ہیں۔ اور ایک بزرگ دور بیٹھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں جن کے متعلق خواب خواب میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں ———— آنکھ کھلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضورؐ تو کیا بیمار ہیں حضورؐ کی امت ہے اور حضرت مولانا اس کی تیمار داری یعنی اصلاح فرما رہے ہیں لیکن وہ بزرگ طبیب جو دور بیٹھے نظر آ رہے تھے وہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون تھے۔ و ہندوستان پہنچ کر میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی تھی وہ بھی لکھ دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ میری میں یہ نہیں آیا کہ وہ بزرگ طبیب کون تھے جو دور بیٹھے نظر آ رہے تھے حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں اور د ابھی زماناً بعید ہیں اس لیے خواب میں مکاناً بعید دکھائی دیے۔"

چنانچہ حضرت اقدسؒ نے قصبہ تھانہ بھون کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر، دولت وثروت اور دنیویات کو ٹھکرا کر وہ بادشاہت کی جو کم کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستان کے شمال وجنوب اور مشرق ومغرب سے لوگ پروانہ وار آئے اور اس شمع ضیا پاش سے اپنی اپنی حیثیت مطابق روشنی کے سامان حاصل کر گئے۔ وہ بھی آئے جن کی پیاس چشموں سے نہ بجھتی تھی اور یہاں آکر سیراب ہوئے۔ لوگوں اور مریدوں کی یہ عالم تھا کہ قصبہ تھانہ بھون کے لیے ایک مستقل ریلوے اسٹیشن بنا دیا گیا۔ اور خانقاہ امدادیہ کی "دکانِ معرفت" پر خریدارانِ علم وعرفان کا وہ ہوا جو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) رحمۃ اللہ علیہ کے بعد تاریخ ہند میں شاید اپنی نظیر آپ تھا۔ مریدین ومعتقدین سینکڑوں نہیں ہزاروں تھے صرف "مجازین" ہی کی تعداد (۱۲۹) ہے۔ جس میں (۷۰) مجازین بیعت یعنی خلفاء ہیں ا (۵۹) مجازینِ صحبت ہیں جن کو بیعت کی تو اجازت نہیں لیکن تبلیغ کی اجازت حاصل ہے پھر مذکورہ (۷۰) خلفاء نہ صرف وہ ہیں جو کتابی علم دین کم دسترس رکھتے ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو اپنے وقت کے علامہ اور اپنے دور کے اساتذہ کامل ہیں جیسے مرشدی حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مو محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند۔ حضرت مولانا علامہ سید سلیمان صاحب ند حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ مہتمم مدرسہ جامع اشرفیہ لاہور۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہٗ مہتمم خیر المدارس ملتان، حضرت اطہر علی صاحب سلہٹی مدظلہٗ، حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب کامل پوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارن پور (بھبودی ضلع کامل

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی سابق پروفیسر فلسفۂ اسلام جامعہ عثمانیہ۔

حضرت اقدس کو یہ شرف ملا تھا کہ جس طرح حضرت مجدد الف ثانی کے دور میں علماء و اتقیا آپ کے خوانِ فیض کے زلہ بردار تھے اسی طرح اس دور کے سارے علماء اسی "دکانِ معرفت" کے خریدار تھے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ضبطِ اوقات و تنظیم کار

حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ دینداری اور اُبالی پن مترادف دکھائی دینے لگے ہیں اور عوام تو عوام، اچھے اچھے پڑھے لکھے بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دیندار کے پاس نہ کسی ضابطہ کی حاجت ہے نہ قواعد کی۔ حالانکہ ایک سچے مومن ہی کی زندگی نظم و ضبط کا بہترین نمونہ ہو سکتی ہے۔ حکیم الامت کی مجددانہ شان کا یہ وصف بھی بہت ممتاز ہے۔ آپ نے خارجی زندگی اور داخلی زندگی کا ایسا اصولی نمونہ پیش کیا کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اہلِ حق ایسے بھی ہوتے ہیں اور اہلِ فہم نے سمجھ لیا کہ مصلحانِ دین ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بعض کم عقلوں نے اعتراض کیا کہ یہ تو بالکل انگریزیت ہے کہ ملنے کے اوقات مقرر، گفتگو کے طور طریق متعین۔ لیکن ان کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے۔

ع بریں عقل و دانش بباید گریست

چونکہ بغیر اس اصولی زندگی کے نہ خود کو راحت میسر آ سکتی ہے نہ غیر کو۔ نہ اپنی صلاحیتوں سے استفادہ و افادہ ممکن ہے نہ غیر کی تربیت و اصلاح اپنی صحت و توانائی برقرار رہ سکتی ہے نہ اس کی افادیت۔ اسی لیے خانقاہ امدادیہ میں ان زرّیں اصولوں کو جن کے ماخذ بہر حال اسوۂ و ارشاداتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے پامال نہیں کیا جاتا تھا۔

خارجی زندگی

حضرت کے اوقات اس طرح بٹے ہوئے تھے۔ صبح سے ۲ بجے تک اور نمازِ عصر سے عشاء تک کے اوقات اپنے انفرادی امور مثلاً تصنیف و تالیف وغیرہ کے لیے مختص تھے۔ البتہ اس میں یہ استثنیٰ تھی کہ نووارد جو پہلی بار ملاقات کرنا چاہے یا جو رخصتی ملاقات کا طالب ہو۔ وہ شخص جس کو کوئی فوری ضرورت لاحق ہو۔ ۱۲ بجے سے نمازِ ظہر تک بالکل تنہائی اور قیلولہ کا وقت تھا اور اس میں کوئی استثناء نہ تھا۔ نمازِ ظہر و قیلولہ سے فراغت کے بعد نمازِ عصر تک عام مجلس ہوتی تھی جس میں ہر شخص شریک ہو سکتا تھا اور بات چیت کر سکتا تھا۔ پھر بعد نمازِ عشاء کسی سے نہ ملتے تھے لیکن یہ تو ان کے لیے ہوا جو بر ملا اپنا مدعا ظاہر کر سکتے تھے۔ راز اور تنہائی کے طالبوں کے لیے اصول یہ تھا کہ سہ دری میں آویزاں لیٹر بکس کے اندر یا تو اپنا مدعا لکھ کر ڈال دیں یا اس کے عرض کرنے کے لیے تعینِ وقت چاہیں۔ اور ہر دو صورتوں میں اپنا پتہ ضرور لکھ دیں (یعنی خانقاہ کے کس کمرہ میں مقیم ہیں) تاکہ جواب بآسانی وہاں پہنچ جائے۔ نہ سائل کو تکلیف ہو نہ مسئول کو۔ خانقاہِ امدادیہ کا یہ بھی اصول تھا کہ کوئی شخص بلا اجازت صاحبِ خانقاہ کی خدمت نہ کرے نہ کوئی ان کے ہمراہ اور نہ راستے میں ان سے مصافحہ کرے۔ خود اپنے کام میں مشغول رہے اور حضرت شیخ کو اپنے امور و مشاغل میں آزاد رکھے۔

چونکہ پڑھے لکھے اور غیر تعلیم یافتہ، آداب سے واقف اور بے ادب سب ہی طرح کے لوگ آتے تھے اور ہر ایک کو بار بار تنبیہ میں کافی وقت ضائع ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے صحیح تعارف حاصل کرنے کے لیے حضرتؒ نے ایک جدول بنا رکھا تھا تاکہ اس کے مطابق خانہ پُری کر کے حضرت کو دے دیں۔ اس کے عنوانات یہ تھے :۔

نام، وطن اصلی، اس وقت کس مقام سے آنا ہوا۔ اور یہاں کی مدتِ قیام۔ شغل و ذریعۂ معاش۔ کوئی موروثی زمین کے مالک تو

نہیں۔ علمی استعداد اردو، عربی، یا انگریزی کس قدر ہے۔ آنے کا مقصد اصلی کیا ہے محض ملاقات یا کچھ کہنا بھی، لکھ کر دینا یا زبانی، مجمع میں یا تنہا کسی شے سے بیعت ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو کس سے؟ اگر مجھ سے بیعت ہیں تو اس کو کتنا عرصہ ہوا۔ اور تعلیم کس سے متعلق ہے۔ میرے مواعظ و رسا کیا دیکھتے ہیں؟ اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دکھلائیں۔ کتنا قیام ہوگا۔ کہاں قیام ہوگا۔ خانقاہ میں پہلی مر ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں۔ یہاں کے انتظام طعام کی خبر ہے یا نہیں۔ باہر والا بڑا قلمی اعلان دیکھ لیا یا نہیں؟ (یہ وہی اعلان ہے جس میں حض کے اوقات فراغت و مصروفیت کی تفصیل ہے)

اس کے علاوہ ہر ہر طبقہ کے افراد کے لیے اصول و ضوابط متعین تھے اور سب میں یہی روح کار فرما تھی کہ مرشد و مرید دونوں کو راحت رہے۔ تضییع اوقات نہ ہو اور بے جا اختلاط نہ رہے۔ اب کوئی بتائے، کیا بغیر اس نظم و ضبط کے مجدد الملت وہ کچھ کر سکتے تھے جو انہوں نے کر دکھا سینکڑوں کتابوں اور رسالوں میں حقائق و معارف کے ذخائر جمع فرمائے۔ ہزاروں خطوط کے گراں بہا جوابات لکھے۔ سینکڑوں مواعظ کے ذریعہ ہدایات کے دریا بہائے۔ ان گنت ملفوظات کے ذریعہ طریقت کے عقدے کھولے۔ ہزاروں تشنگان حب الٰہی کو سیراب کر گئے۔ یہ سب اسی اصولی زندگی کا نتیجہ تھا۔

داخلی زندگی

وعظ و پند، اصول و ضوابط صرف اغنیاء کے لیے نہ تھے۔ گھر کی نجی زندگی میں بھی ان پہ نگاہ رکھی جاتی تھی۔ البتہ مقام کے لحاظ سے اصول بھی جدا تھے اور ہونے بھی چاہئیں۔

حضرت کی دو ازواج مطہرات تھیں۔ اس لیے جو بھی نقد یا جنس کی صورت میں آتا مساوی مساوی کر کے اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے کا یہ عالم تھا کہ دونوں کے مہر ادا کر دیئے تھے اور باوجود فریق ثانی کی طرف سے واپس لینا گوارا نہ فرمایا۔ حضرت سخت گیر نہ تھے۔ کبھی گھر والوں و تحکم کا برتاؤ نہ کرتے، بلکہ ہمیشہ لطف و کرم سے پیش آتے اور بہت ہشاش بشاش رہتے تھے۔ اپنی ازواج کے مہمانوں کی پوری مدارات اور ان کے بچوں سے خوب مزاح فرماتے تھے۔

اہل خانہ پہ حتی الامکان کوئی بوجھ نہ ڈالتے تھے حتیٰ کہ کسی خاص کھانے کی فرمائش نہ کرتے۔ البتہ جب خود ادھر سے فرمائش کرنے کا ا ہوتا تو اس میں بھی ایسا اسلوب اختیار کرتے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، نہ ان پر بار پڑے۔ فرماتے "تم ہی چند کھانوں کے نام لو جو آسانی پک ان میں سے جو مرغوب ہوگا بتلا دوں گا۔"

باوجود کثرت مشاغل کے گھر پابندی سے تشریف لے جاتے تھے تاکہ ان کی دل آزاری نہ ہو۔ ان کی بیماریوں پر پوری طرح فراخدلی سے روپیہ صرف فرماتے اور ضرورت ہوتی تو دور دراز مقامات کو خود لے جا کر علاج کرواتے تھے۔ اس طرح تعلق مع اللہ کے بہانے حقوق تلف نہ ہونے دیتے تھے۔ یہ تو ان دکانداروں کا شعار ہے جو سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ناآشنا ہوتے تھے جن کے نزدیک عبادت تعلق مع اللہ کا رشتہ اتنا نازک ہے کہ مسجد خانقاہ کے باہر قدم رکھتے ہی تار تار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اتباع سنت کے تحت ہر فعل جو مسجد و خانقاہ ہو یا گھر اور بازار میں ہو عین عبادت اور ترقی قرب کا موجب ہے اور یہی صفت "بے ہمہ و باہمہ" کمال کی دلیل ہے۔

حضرت نے تو دو عقد کر کے عدل و انصاف کی وہ نظیر قائم کی کہ اب لوگوں کے لیے عقد ثانی کی جرأت مشکل ہو گئی۔ خود فرماتے تھے تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی۔ اور یہ اس کی حق تلفی ہے میں اپنے کپڑے خانقاہ ہی میں رکھتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت ہوتی کہ ہمارے یہاں اتنی

خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔"

مجدّد الملّت کے اس شعار کو غور سے دیکھو اور جان لو کہ دینداری میں معاشرت، معاملات و اخلاق اتنے ہی مہتم بالشان ہیں جتنے عقائد و عبادات، تکمیلِ دین کے لیے ان پانچوں پہلوؤں پر یکساں نظر ضروری ہے۔ حکیم الامت کو رنج ہوتا جب شوہروں کے ظلم وستم کی روداتیں آپ تک پہنچتیں۔ آپ ہر ایک کو اپنی بیویوں پر مہر و کرم، عفو و درگذر اور پاس مروت کی تلقین فرماتے تھے۔

علالت و رحلت

رشد وہدایت کا وہ آفتاب جو ۱۲۸۰ھ میں مطلع تھانہ بھون سے نمودار ہوا اور ۱۳۱۵ھ سے ہندوستان کے طول و عرض میں شریعت و طریقت سے انوار پھیلاتا رہا۔ بالآخر ۱۳۶۲ھ میں ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تاریخِ وفات سے شاید پانچ برس پہلے ہی سے معدہ و جگر کی تکلیفوں نے عاجز کر رکھا تھا۔ کبھی قبض ہوتا تو ہٹنے کا نام نہ لیتا۔ اور کبھی اسہال ہونے لگتے تو رکنے ہی نہ پاتے۔ مختلف اعضا متورم ہو چکے تھے۔ علاج برابر ہوتا رہا۔ اور حق تعالیٰ کی اس امانت کی حفاظت میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ لیکن تدبیر ہی تو بندہ کے اختیار میں ہے۔

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

لاآخر بھوک بھی تقریباً بند ہو گئی۔ نحیف و ناتواں اور صاحبِ فراش ہو گئے۔ اکثر غنودگی کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ مگر جب بھی ہوش آتا اور تھوڑی بھی دیر رہتا اپنے عارفانہ کلمات اور خطوط کے جواب اسی حکیمانہ انداز سے ادا فرماتے تھے۔ انہی باتوں کو دیکھ کر عقدہ کھلا کہ یہ غنودگی کے دورے نہ تھے بلکہ "ربودگی" کی کیفیات تھیں، ورنہ کسی کی عقل مان سکتی ہے کہ اس درجہ کے ضعف میں بار بار ایسے دوروں کے باوجود عقل و فکر کسی درجہ میں بھی متاثر نہ ہوں ؟ مثلاً دیکھو کہ اسی چل چلاؤ کی حالت میں ۳۰۰ روپیہ کا ایک منی آرڈر آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ "میں نے ایک منت مانی تھی کہ اگر کاروبار میں کامیابی ہو گی تو ۳۰۰ روپیہ حضرت والا کی خدمت میں بھیجوں گا چنانچہ حسب مرسل خدمت ہیں، آپ مالک ہیں، جہاں چاہیں صرف فرمائیں۔" اس کا جواب اپنی ناتواں انگلیوں سے بدقّت تمام یہ تحریر فرمایا: "پہلے تو تم نے لکھا ہے کہ آپ مالک ہیں۔ بعد کو اختیار خرچ کرنے کا دیا ہے اور یہ صیغہ توکیل ہے۔ چونکہ مالک بنانے اور وکیل بنانے میں شرعاً فرق ہے لہذا واپس کیا جاتا ہے۔"

حفظِ شریعت کا ایسا خیال اور اس کا اتنا اہتمام کسی غائب دماغ سے ممکن بھی ہے ؟ اور یہ تو ایک مثال ہے ورنہ وہاں تو شب و روز یہی کرامت جاری تھی۔ مرض الموت کے دن گزرتے گئے، دوشنبہ ۱۵ ر رجب ۱۳۶۲ھ کو صبح ہی سے مسلسل دست آنے لگے۔ کہ دوری ولقاہت نے رفع حاجت کے قابل کب رکھا تھا۔ مجبوراً بار بار کپڑے بدلے جاتے رہے۔ خود صاحبِ مرض کو صفائی و طہارت، نماز اور ادائگی حقوق کا تادمِ آخر اہتمام رہا۔ اسی دوشنبہ کو بعد نمازِ مغرب اپنی چھوٹی رفیقۂ حیات سے پوچھا "میں دونوں کا ماہوار خرچ دے چکا ہوں ؟" تسلی دلائی گئی۔ "ہمیں بہت کچھ مل چکا ہے۔ آپ دے چکے ہیں، بے فکر رہیں۔" پھر فرمایا "آج تو ہم جا رہے ہیں۔" رفیقۂ حیات نے عرض کی "کہاں ؟" فرمایا۔ "تم نہیں جانتیں" ———— اس کے بعد پھر جو غشی طاری ہوئی تو سوا گھنٹہ تک ہوش نہ آیا۔ سانس تیزی اور آواز سے چلتا رہا۔ جب سانس اوپر آتا تو کتنے دیکھنے والوں نے دیکھا، کہ آپ کی درمیانی اور شہادت کی انگلی کے بیچ ہتھیلی کی پشت سے ایک ایسی تیز روشنی نکلتی تھی کہ جلتے ہوئے برقی قمقمے ماند پڑ جاتے تھے۔ یہ روشنی سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ آتی جاتی رہی اور جب وہ ختم ہوا تو یہ غائب ہو گئی۔ کیا عجب کہ جن انگلیوں سے حقائق و معارف ایک عرصہ تک معرضِ تحریر میں آتے رہے ہوں یہ نور اسی کا ہو۔ بہرکیف محفل روشنیں کا وہ چراغ جو کئی برس کے مرض کے تند و تیز جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل سنبھل جاتا تھا۔ بالآخر سہ شنبہ کی (یعنی ۱۶، ۱۷ ر رجب ۱۳۶۲ھ ۱۹، ۲۰ ر جولائی ۱۹۴۳ء

کی درمیانی رات) ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۱ دن کی عمر پاکر ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سانحۂ عظیم کی اطلاع ہوا کی طرح پھیلی۔ اور بن کر عشاق کے قلوب پر گری۔ صبح ہوتے ہوئے ہزاروں محبت کے مارے جو پہلے ؎

درہوائے کوئے جاناں میروم سرخوش وشاداں وفرحاں میروم
او حکیم الامت ومن جاں بلب درحضورش بہر درماں میروم

کے نغموں سے مست و سرشار چلے آتے تھے۔ آج فریادی اشکوں کے ساتھ آئے کہ ؎

سیر وسیمایا بصحرا میروی سخت بیمہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو توکجا بہر تماشا میروی

دہلی اور دوسرے شہروں سے اسپیشل ٹرینیں آئیں۔ اور ہزاروں شیدائیوں کے ساتھ مجدد الملت رحمۃ اللہ تعالیٰ کا جنازہ نکلا۔

؏ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم دھام سے نکلے

عید گاہ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر آپ ہی کے وقف کردہ تکیہ میں جس کا تاریخی نام "قبرستان عاشق بازاں" تھا۔ جسم مبارک کو سپرد خاک کیا گیا۔ نور اللہ مرقدہ۔ سنا ہے۔ جو شریک جنازہ تھے ان کو پھر بھی چین وسکون آیا۔ لیکن جن کی قسمتیں "اویسی" بنی تھیں ان کی آتش فراق ایک عرصہ میں جاکر فرو ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی کرسکے گا جس نے کبھی عشق حقیقی کی چوٹ کھائی ہو۔ زبانِ قلم اس حسی کیفیت کے اظہار سے عاجز ہے

؏ اے آتشِ فراقت جانہا کباب کردہ

؎ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ❊ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

شہادتِ انام

گو بفضلہ تعالیٰ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات علمیہ وعملیہ وحالیہ آفتاب نصف النہار کی طرح روشن اور ایسے مشہور زمانہ ہیں کہ ان کے لیے اب کسی شہادت کی حاجت نہیں۔ بالخصوص شہادت انام کی۔ بفحوائے ؏ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ لیکن بخاری ومسلم حدیث انتم شہداء اللہ فی الارض جو ایسے ہی موقع پر ارشاد کی گئی تھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اگر کسی کے مرنے کے بعد عام طور سے لوگ اس کی تعریفیں کریں تو اس کی توقع ہے کہ وہ عنداللہ بھی اچھا تھا۔ کیونکہ حسب ارشاد نبوی انتم شہداء اللہ فی الارض عامۃ الناس بھی زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہوتے ہیں۔ یہی مضمون ایک روایت میں یوں آیا ہے۔ للہ ملائکۃ تنطق علی السنۃ بنی آدم مافی المرء الخیر والشر (فتح الباری ج ۳ ص ۱۸۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتے متعین فرما رکھے ہیں کہ وہ انسان کا خیر وشر لوگوں کی زبان پر جاری کردیں نیز اپنے محبوب کی ہر کس وناکس سے تعریفیں سن کر محبین کو خوشی بھی ہوتی ہے جس کی ان کو اس غم میں ضرورت بھی ہے اس لیے سینکڑوں واقعات اور تحریرات میں سے جو سننے یا دیکھنے میں آئیں صرف چند ہی بطور نمونہ پیش ہیں۔

ملک کی جتنی مسلم جماعتیں ہیں جن میں وہ بھی شامل ہیں جن کو حضرت سے کچھ سیاسی یا مشربی اختلاف بھی تھا۔ قریب قریب سب نے بالاتفاق اس خسارہ کو خسارۂ عظمیٰ محسوس کیا۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ تقریریں ہوئیں اور تقریروں کے وقت بعض مقررین وسامعین کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ریزولیشن پاس ہوئے۔ فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی ہوئی۔ بعض بعض جگہ مدارس بند ہوئے بلکہ دکانیں بھی بند ہوئیں اور بعض جگہ اس ڈر سے کہ کہیں ناجائز نہ ہو۔ اس ارادہ پر عمل کی ہمت نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ آزاد لوگ تھے۔ لیکن حضرت اقدسؒ کی دینی شخصیت کا اتنا اثر سب پر تھا کہ خود بھی حضرت کے معاملہ میں احتیاط کے خلاف کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اکثر جگہ بہت بہت ایصالِ ثواب کیا گیا۔ پانی پت سے اطلاع کی

۲۲ یا ۲۴ قرآن شریف ختم کیے گئے۔ وہاں حفاظ کی بہت کثرت ہے۔ متعدد جگہ تقسیم طعام کے ذریعہ بھی ایصال ثواب کیا گیا۔ غرض اپنے اپنے خیال اور مشرب کے مطابق سب ہی نے اظہارِ غم اور ایصالِ ثواب کیا۔ تمام ملکی جرائد میں جن میں غیر مسلم بھی تھے اس خبر کو خاص اہمیت کے ساتھ شائع کیا۔ بلکہ یہاں تک سننے میں آیا سب سے پہلے ایک غیر مسلم اخبار ہی نے اس خبر کو بہت اچھے عنوان کے ساتھ شائع کیا ——————
حضرت اقدس کی علالت ہی کے زمانہ میں جس نے سنا دل سے دعا دی اور تمنا ظاہر کی کہ اجی وہ تو بڑے شخص ہیں خدا کرے جلد اچھے ہو جائیں۔ یہاں تک کہ غیر مسلموں کے بھی یہی الفاظ ہوتے تھے۔ ایک بہت بوڑھے شخص نے جو مسلمان تھا اور جس نے کبھی حضرت اقدسؒ کی زیارت بھی نہ کی تھی جب خبر وفات سنی تو بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور کہنے لگا کہ اجی ان کی کیا بات تھی! اگر کسی مسئلہ کی ضرورت ہوتی تو پہلے ڈھونڈتے پھرتے تھے اور کوئی مسئلہ بتانے والا نہ ملتا تھا۔ اور اب ہمارے گھر کی لونڈیاں بھی بہشتی زیور دیکھ کر بتا دیتی ہیں۔

بعض جرائد نے یہاں تک لکھا تھا کہ اگر مولانا اپنی تصانیف کی رجسٹری کر لیتے اور خود اشاعت کرتے تو آج کم از کم چالیس پچاس لاکھ روپیہ چھوڑ کر جاتے۔ بعض نے اپنے الفاظ میں لکھا کہ بے نظیر ہستی تھی اور اب صدیوں ایسی ہستی دنیا نہیں پیدا کر سکتی۔ بعض نے لکھا کہ متعدد کتابیں تو ایسی تصنیف کی ہیں کہ جن کی نظیر سلف میں بھی نہیں پائی جاتی۔ بعض نے لکھا کہ مولانا نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، ان کی اولاد ان کی تصانیف کثیرہ ہیں' —— چنانچہ رسالہ "البرہان" دہلی ماہ اگست ۱۹۴۳ء میں اس حادثہ کا اظہار مضمون ذیل میں کیا گیا۔

آہ حکیم الامت! اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُم مَّيِّتُوْنَ یوں تو موت اس عالم آب و گل کی ہر اس چیز کے لیے ہی مقدر ہے جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساطِ ہستی پر نمودار ہوئی ہے لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے اسی طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ایسی اموات بھی واقع ہوتی ہیں جو صرف افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں بلکہ ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی عمارتِ حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت وارادت سے وابستہ ہیں۔ پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہ ہائے اشک سے نہیں ہوتا بلکہ ہزاروں دلوں کی پر سکون آبادیاں ایک مستقل غم کدۂ آمال و امانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ امیدوں اور دلوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ نشاط و کامرانی حیات کے آتش کدے سرد ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثہ جانکاہ نے کائناتِ عالم کی ہر ہر چیز کو اداس اور غمگین بنا دیا ہے اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا ؎

وما کان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

"قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں بلکہ ایک قوم کی بنیاد تھا جو منہدم ہو گئی" گزشتہ ماہ جولائی کی ۱۹-۲۰ر کی درمیانی شب کو تقریباً اس بجے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کا جو سانحہ ارتحال پیش آیا وہ اسی قسم کا سانحہ تھا۔ حضرت مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے۔ طریقت اور سلوک میں بھی مقام رفیع تک پہنچے تھے۔ ان کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی۔ علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔ تحریر میں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں۔ اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی۔ وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اسے برملا کہتے اور کرتے تھے۔ اور اس میں انہیں کسی لومۃ لائم کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گوشہ نشین تھے۔ مگر ان کا آستانہ بڑے بڑے ارباب ثروت و دولت اور اصحابِ علم و فضل کی عقیدت گاہ تھا۔ جو بات اور جو عمل تھا اخلاص اور دیانت کے ساتھ تھا۔ دنیوی وجاہت و شہرت، اور مالی حرص و آز کا شاید دل کے آس پاس بھی کہیں گزر نہ ہوا تھا۔ اپنے اصول اور اپنے عقیدے و خیال پر اس مضبوطی و پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کر سکتی۔ حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا چشمۂ صافی تھا کہ ہزاروں تشنہ کام آتے اور سیراب

ہو کر جاتے تھے۔ وہ جن کی زندگیاں معصیت کوشی اور عصیاں آلودگی میں بسر ہوتی تھیں یہاں سے پاک وصاف ہو کر اور گوہر مقصود سے دامانِ آرزو بھر کر واپس لوٹتے تھے۔ ان کی زندگی اتباعِ سنت کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموزِ طریقت کا دفتر گرانمایہ تھی۔ بعض مسائل میں علمائے ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف[ع] رہا۔ لیکن تقویٰ وطہارت، وتفقہ فی الدین، شرعی علوم میں مہارت وبصیرت، راست گفتاری اور مخلصانہ عمل کوشی، انابت الی اللہ، بے لوث خدمتِ دین، بے غرضانہ تلقینِ رشد وہدایت۔ حضرت مرحوم کے یہ اوصافِ عالیہ اور فضائلِ حمیدہ کے جوہر موافق ومخالف کے نزدیک برابر مسلّم رہے۔ بعض عوارض واسقام کی بنا پر گوشہ نشینی سے قبل اپنے مواعظِ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اصلاحِ عقائد واعمال اور ابطالِ رسوم وبدعات کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا واحد طرۂ امتیاز ہے۔ قوم نے ان کو حکیم الامت کا خطاب دیا تھا اور بالکل وہ بجا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا جو خزف ریزے تھے وہ گوہر آبدار بن گئے اور جو صرف پیتل تھے وہ زرِ خالص ہو گئے۔

چھوٹے بڑے رسالے اور مستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد تازہ ترین شمار کے مطابق آٹھ سو سے اوپر بیان کی جاتی ہے جن میں سے کثیر تصنیفات ملک میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور غالباً اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ مولانا کی تصنیفات جو اب تک طبع ہو چکی ہیں ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہے۔ مولانا کی سیر چشمی اور فیاضی، خلوص اور للّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کا حق اشاعت وطبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذنِ عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا صرف یہ ایک عمل ہی ایسا ہے جو آج کل کے بڑے بڑے نامور علماء کے لیے سرمایۂ عبرت اور درسِ موعظت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ تصانیف کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہیں۔ علماء اور فضلاء، اربابِ شریعت اور اصحابِ طریقت، مرد اور عورتیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اردو خوان ہر ایک ان سے استفادہ کر سکتا اور اپنے لیے اصلاحِ ظاہر وباطن کا سامان بنا سکتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اسرار ونکات کے علاوہ ایسا عجیب وغریب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق وتائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا۔ جس بات کو بیان کرتے ہیں نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ حضرت مرحوم کی تحریریں اور ان کی گفتگوئیں غیر معمولی ذکاوت وفطانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور ہر معاملہ کی اصل حقیقت کو پہچاننا ان کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

خواص کے لیے تفسیر بیان القرآن اور شرح مثنوی مولانا روم اور عورتوں کے لیے بہشتی زیور آپ کی ایسی گراں بہا اور کثیر النفع تصنیفات ہیں کہ جو اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور موخر الذکر کتاب تو اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اردو خواندہ ہوگا جس نے کم از کم اس کا نام نہ سنا ہو۔

ع یہ سیاسی اختلاف تھا کہ اول خلافت کمیٹی اور پھر کانگریس میں علمائے ہند کی ایک جماعت شریک رہی اور حضرت مولانا دونوں کے خلاف رہے اور جس طرح حقیقی جہاد میں کافروں سے امداد لینے کی اجازت نہیں۔ اس سیاسی جنگ میں بھی ان کے نزدیک اجازت نہ تھی۔ اسکے ثمرات پر اسوقت لوگوں کی نظر نہ ہو سکی تھی مگر آخر سب نے دیکھ لیا کہ حق وہی تھا کہ انسان جو کچھ کرے خدا پر بھروسہ کرکے کرے۔ کافروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے دونوں جہان کا خسارہ ہے اور یہی نظریہ حقیقت میں پاکستان کا ثمرہ لے آیا ہے۔ ۱۲ ج۔

مولانا کی ولادت باسعادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو ہوئی تھی۔ اس حساب سے آپ کی عمر تقریباً ۸۲ سال ہوئی ہے۔ آپ کی مفصل سوانح عمری اشرف السوانح کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں آپ کی حیات میں ہی شائع ہوگئی تھی۔ جس کی تصنیف کا شرف اردو زبان کے مشہور شاعر اور فاضل عزیز الحسن صاحب مجذوب اور مولوی عبدالحق صاحب کو حاصل ہے۔ اب اگرچہ حضرت مولانا کی وفات ہوچکی ہے لیکن وہ اپنی تصنیفات اور علمی کارناموں کے باعث آج بھی زندہ ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کے بعد ان کے زندہ جاوید یادگاروں سے روشنی حاصل کریں اور ان کی رہنمائی میں اسلام کے صراط مستقیم پر چلیں۔

حق تعالیٰ اعلیٰ علیین میں مولانا کے مدارج و مراتب بیش از بیش بڑھائے کہ وہ عمر بھر لوگوں کو اسی اللہ کی طرف بلاتے رہے اور قیامت میں ان کا حشر صدیقین و ابرار کے ساتھ کرے کہ انہوں نے اپنی زندگی ہمیشہ ایک مومن و قانت و صدیق کی ہی طرح بسر کی۔

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

مجدد الملت کے آثار علمیہ

از مورخ اسلام سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہوسکتا۔ اور یہی ان کی جامعیت ہے جو ان کے اوصاف و محامد میں سب سے اول نظر آتی ہے۔ وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں، وہ اس کے مفسر ہیں۔ اس کے علوم و حکم کے شارح ہیں۔ اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں۔ وہ محدث ہیں۔ احادیث کے اسرار و نکات کے ظاہر کرنے والے ہیں۔ وہ فقیہ ہیں۔ ہزاروں فقہی مسائل کے جواب لکھے ہیں۔ نئے سوالوں کو حل کیا ہے۔ نئی چیزوں کے متعلق انتہائی احتیاطوں کے ساتھ فتوے دیئے ہیں، .... وہ خطیب تھے۔ تصوف کے اسرار و غوامض کو فاش کیا ہے۔ شریعت و طریقت کی ایک مدت کی جنگ کا خاتمہ[1] کرکے دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔ اُن کی مجلسوں میں علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں وہ ملفوظات ہیں جن کی تعداد بیسیوں[2] تک پہنچتی ہے۔ وہ ایک مرشد کامل تھے۔ ہزاروں مسترشد و مستفیدین ان کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے۔ اور وہ ان کے تسکین بخش جوابات دیتے تھے۔ اور ہدایات بتاتے تھے۔ جن کا مجموعہ تربیۃ السالک ہے۔ انہوں نے بزرگوں کے احوال و کمالات کو یکجا کیا اور اس ذخیرہ سے سب کو آشنا کیا۔ ان کی متعدد کتابیں اس مضمون پر ہیں۔ انہوں نے حضرات **چشت** کے احوال و اقوال میں سے بظاہر اعتراض کے قابل باتوں کی حقیقت ظاہر کی اور اس کی تاویلات[3] کیں۔ ان کی کتابوں کے خلاصے،

---

[1] یعنی لوگوں کی رسمی نظر میں جو جنگ تھی۔ ورنہ شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے اور طریقت پورے دین پر آسانی سے عمل کر سکنے کا طریقہ ہے اس سے الگ ہونے یا اختلاف اور جنگ کا تو احتمال بھی نہیں ۱۲ ج

[2] یعنی بیسیوں جلد ۱۲۔

[3] یعنی واقعی حقیقت کا بے غبار ہونا ثابت کیا۔ ۱۲۔

اقتباسات اور تسہیلات ان سے الگ ہیں، جن کی ترتیب ان کے مسترشدین نے کی ہے۔ وہ مصلحِ امت تھے۔ امت کے سیکڑوں معاشرتی، رسوم و بدعات کی تردید، اصلاح رسوم اور انقلابِ حال متعدد کتابیں تصانیف کیں۔ وہ حکیم الامت تھے مسلمانوں کے علاج اور نشاۃ احیا پر حیات المسلمین وغیرہ رسائل تالیف فرمائے۔ غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی کم ہی کوئی مذہبی ضرورت ہوگی جس کی مدد اس حکیم الامت نے زبان اور قلم سے نہیں فرمائی۔ اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر میں آسکتا ہے۔

ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پھیلیں اور ہزاروں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کا باعث ہوئیں۔ اردو اور عربی مسلمانوں نے اپنے ذوق سے ان کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانوں میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ انکی کتابوں کے ترجمے انگریزی، بنگالی، گجراتی، سندھی اور پشتو میں شائع ہوئے۔

ان کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں آٹھ سو کے قریب ہے۔ ۱۳۵۴ھ میں ان کے خادم مولوی عبدالحق صاحب فتح پوری نے ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی۔ جو بڑی تقطیع کے پورے (۸۶) صفحوں کو محیط ہے۔ بعد کے نو برسوں میں جو رسائل یا تصانیف ترتیب پائیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ صدی مطبوعات و منشورات کے کمالات سے مملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و اظہار میں ہو یا باطل کی نشر و اشاعت میں، پریس اور مطبع ہی کے برکات ہیں۔ زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہیں اور رسائل و منشورات دعوت کے صحیفے ہیں، اس بنا پر مناسب تھا کہ اس صدی کے مجدد کی کرامت بھی ان ہی کمالات میں جلوہ گر ہو۔

علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں، جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد ان کے ایام پر فوقیت لے جائے۔ امام ابن جریر طبریؒ، حافظ خطیب بغدادیؒ، امام فخر الدین رازیؒ، حافظ ابن جوزیؒ، حافظ جلال الدین سیوطیؒ کے نام اس سلسلے میں لیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں اس سلسلہ کا اخیر نام حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا ہے۔

مولانا کی تصانیف کے انواع

مولانا کے رسائل اور تصانیف کی تعداد تو آٹھ سو کے قریب ہے مگر ان میں چھوٹے چھوٹے رسالے بھی جن کو نئی اصطلاح میں مضامین و مقالات کہتے ہیں، داخل ہیں۔ ان میں بعض مختصر ہیں کہ صرف صفحے دو صفحے ہیں۔ بعض ایسے ضخیم ہیں کہ کئی کئی جلدوں میں ہیں۔

زبان

بیشتر تصانیف نثر اور اردو زبان میں ہیں۔ البتہ تیرہ چودہ رسائل و کتب عربی زبان میں ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ سبق الغایات فی نسق الآیات انوار الوجود — التجلی العظیم — حواشی تفسیر بیان القرآن — تنویر المقطعات — التلخیصات العشر — مائۃ دروس المنتخب الماثورہ — وجوہ المثانی — سبع سیارہ — زیادات — جامع الآثار — تائید الحقیقۃ — خطبات الاحکام اور تین فارسی میں ہیں: — مثنوی زیر و بم — تعلقات فارسی — عقائد بانی کالج۔

نظم و نثر

نظم میں مولانا کی تصنیف صرف یہی ایک مثنوی زیر و بم ہے۔ اور یہ طالب علمی کے بعد ہی لکھی ہے۔ بظاہر اس میں ایک بوڑھے عاشق اور چالاک معشوق کا قصہ ہے۔ مگر درحقیقت یہ نفسِ انسانی کی بصیرت افروز کہانی ہے۔ ایک اور نظم ۲۲ اوراق ... کے آخر میں ہے۔ ایک تجوید کا منظوم رسالہ ہے۔

مولانا کو فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ حافظ اور مولانا رومی کے اشعار بیشتر نوک زبان تھے اور نظم کا ملکہ اور سلیقہ بھی ...

ں سے کام نہیں لیا۔

تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فقہی ہے۔ اور کم تر کتب درس کے متعلق۔ تاہم دو چار درسی کتابوں پر بھی رسائل ہیں۔ مذہبی تصانیف میں علوم القرآن
م الحدیث —— کلام و عقائد —— فقہ و فتاویٰ اور سلوک و تصوف اور مواعظ اکثر ہیں۔

قرآنِ پاک کی خدمت

اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے یعنی قرآن پاک، مولانا نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی۔ وہ بجائے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانۂ قیام
مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے۔ وہاں سب سے پہلے مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اللّٰھم علّمہ الکتاب کی دعا دی تھی۔ اور بشارت سنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس رؤیا کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور رؤیا
کی طرف اشارہ تھا۔ قرآن پاک کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی، بلکہ لفظ و معنے دونوں حیثیتوں سے۔ وہ حافظ تھے اور بڑے جیّد
ظ، وہ قاری تھے اور فنونِ تجوید و قرأت کے بڑے ماہر۔ اخیر زمانہ میں پانی پت کو قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتیؒ کی برکت سے قرأت سے ایک خاص مناسبت
ل ہوگئی تھی۔ مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے تو لوگوں نے ان کو بالقصد جہری نماز میں امام بنادیا۔ مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر قرأت فرمائی مگر
یوں نے تعریف کی کہ صحت مخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر مؤثر قرأت نہیں سنی۔ ایک اور مقام پر صبح کی نماز پڑھائی تو ایک صاحب نے کہا
وسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قرأت میں بھیرویں کی کیفیت تھی، جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے۔

مولانا کی قرأت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی لیکن لہجہ میں عام قاریوں کی طرح بناوٹ نہ تھی اور نہ تحسین آواز کے
تکلف آثار چڑھاؤ ہوتا تھا، بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسبِ موقع گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی۔ کہ ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

تجوید و قرأت و متعلقاتِ قرآنی

علوم القرآن میں یہ پہلا فن ہے۔ مولانا نے اس پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں:-

۱— جمال القرآن:— یہ فنِ تجوید کا رسالہ ہے جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل
مخارج اور صفاتِ حروف، اظہار و اخفاء ابدال و ادغام تفخیم و ترقیق۔ وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں۔

— تجوید القرآن:— اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کے لیے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں۔

— رفع الخلاف فی حکم الاوقاف:— اوقافِ قرآنی کے بارے میں قاریوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت
ل کی گئی ہے۔

— وجوہ المثانی:— اس میں قرآن شریف کی مشہور قرأتوں کے اختلاف کو قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے۔ اور
میں تجوید و قرأت کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں۔

— تنشیط الطبع فی اجراء السبع:— قرأت سبع اور اس فن کے رواۃ کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

— زیادات علی کتب الروایات:— اس میں قرأت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں۔ یہ "وجوہ المثانی" کے اخیر میں بطور ضمیمہ ہے۔

— ذنابات لمانی الروایات:— یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے۔

— یادگارِ حق القرآن:— اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے۔ یہ "تجوید القرآن" کا اختصار اور ضمیمہ ہے۔

— متشابہات القرآن لتراویح رمضان:— قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح میں قرآن سنانے میں بعض مشہور مقامات پر جو متشابہات لگتے ہیں

ان سے بچنے کے لیے اس میں چند قواعد کلیہ یعنی گر "بعض آیات کے ضبط فرما دیے گئے ہیں۔

۱۰۔ آداب القرآن:۔ قرآن پاک کی تلاوت کے آداب اور تلاوت کرنے والوں کی کوتاہیوں کی اصلاح کے لیے ہدایات و تنبیہات ہیں۔

ترجمہ و تفسیر و دیگر علوم قرآن

(۱) ترجمہ: قرآن پاک کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے جس سے بڑے بڑے تراجم خالی ہیں۔ قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے۔ اس لیے عام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یک جا ہیں۔ یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے۔ اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کے لفظوں سے عدول نہ ہونے پائے۔ اسی لیے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں۔ یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے (۲) تفسیر بیان القرآن۔ یہ بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر ہے۔ جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے۔ اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں:۔ سلیس و بامحاورہ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ، نیچے "ف" کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر۔ تفسیر میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کیے گئے ہیں۔ کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہل علم کے لیے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کیے گئے ہیں۔ ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی کی تفسیر روح المعانی پر اعتماد فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقۃً مفید ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے۔ اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یک جا مل جاتی ہیں۔

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیریں صرف اردو خوانوں کے لیے علماء لکھتے ہیں۔ یہی خیال مولانا کی تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحبؒ نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ "میں سمجھتا تھا کہ یہ تفسیر عوام کے لیے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے۔" قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولاناؒ کے پیش نظر رہا ہے۔ ساتھ ہی ربط آیات و سُوَر کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے۔ مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں اس لیے وجوہ ربط میں قیاس اور ذوق سے چارہ نہیں۔ اس لیے ہر مستند ذوق والے کے لیے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے[1]۔ اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیت اور ذوق و وجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے[2]۔ اس لیے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے۔

اصلاح ترجمۂ دہلویہ

چونکہ مسلمانوں پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی اس لیے وہ ہمیشہ ان کو گمراہی سے بچانے میں بجان و دل ساعی رہتے تھے۔ اردو میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے ترجمے شائع ہوئے تھے وہ بالکل کافی تھے۔ مگر نئے زمانہ میں پہلے سرسید نے بضمن تفسیر اور پھر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے نئے اردو ترجمے شائع کیے۔ تو انھوں نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کریں۔ اولین توجہ زبان کی

---

[1] نہ کہ انکار کی اور اختلاف بھی تحت اصول و اتباع اسلاف معتبر ہوگا ورنہ قرآن پاک کو کھیل بنانا ہوگا۔ ۱۲ ج۔

[2] زمانہ اور ذوق و وجدان سے تعلق نہیں روایات و اصول کی قوت و ضعف سے فرق ہوتا ہے۔ ورنہ ذوق کا اتباع، اتباع ہوا ہو سکتا ہے۔ ۱۲ ج۔

طرف رکھیں اور اقوالِ سلف کی پرواہ نہ کریں۔ اس طرزِ عمل نے علماء کو مضطرب کر دیا اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مولانا نے اپنا ترجمہ اسی ضرورت سے مجبور ہو کر کیا۔ مگر اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا۔ اور اس کے اغلاط پر نشان دے کر یہ رسالہ اس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا۔

(۳) اصلاح ترجمۂ حیرت مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت نے دہلی کے ایک بلند بانگ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا اور انہوں نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے پر اعتراضات شروع کئے اور پھر اپنا ترجمہ چھپوایا۔ جس کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ لکھنؤ کے ایک عالم کا کیا ہوا ہے لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے کیونکہ مرزا صاحب خود عربی سے نابلد تھے۔ بہرحال مولانا نے اس ترجمہ کے اغلاط پر یہ رسالہ تالیف فرمایا۔

(۴) التقصیر فی التفسیر بعض معاصر علماء نے اردو میں قرآن شریف پر حواشی لکھے ہیں جن میں ربطِ آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے۔ اور آیات کو بتاویل و اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے۔ اور اس تاویل و اعتبار میں کہیں کہیں حدِ اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے۔ مولانا نے ان تاویلاتِ بعیدہ پر تنبیہات لکھیں جن کا نام "التقصیر فی التفسیر" ہے۔

الهادی للحیران فی وادی تفصیل البیان لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدوں میں تفصیل البیان فی مقاصد القرآن" کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس کے مولف کی درخواست پر اس میں جو شرعی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے اس رسالہ میں ظاہر فرمائے۔

تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات مولانا کے خاندان کی بعض لڑکیوں نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا اور اکثر آیات کی تفسیر و تقریر کو ضبطِ تحریر میں کر لیا تھا وہ ایک مجموعہ ہو گیا۔ مگر چھپا نہیں۔

رفع البنا فی نفع السما اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً کی تفسیر ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کیا کیا فائدے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک سوال کے جواب میں ہے۔

احسن الاثاث فی النظر الثانی فی التفسیر المقامات الثلاث اس میں سورۂ بقرہ کی تین آیتوں پر نظرِ ثانی فرمائی ہے۔

اعمالِ قرآنی قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے تجربہ میں آئے، ان کو بیان کیا گیا ہے۔

خواصِ فرقانی اس کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس کا ایک اور حصہ ہے جس کا نام "آثار نبیانی" ہے۔ ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز، غیر شرعی تعویذ، گنڈوں اور عملیاتِ سفلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف

۱؎ عملاً خواہ لغت اور قرآن و حدیث سے وہ غلط ہی ہو۔

ملتفت کرنا ہے اور اس قسم کے بعض خواص احادیث میں بھی مروی ہیں۔

(۱۲) **سبق الغایات فی نسق الآیات** یہ قرآن پاک کی آیات و سور کے ربط و نظم پر عربی میں ۱۵۶ صفحوں کی کتاب ہے جو ۱۳۱۶ھ میں ڈھائی مہینوں میں تصنیف فرمایا۔ اس میں مولانا نے سورۂ فاتحہ سے ناس تک تمام سورتوں اور ان کی آیات کے ربط پر کلام فرمایا ہے۔

(۱۳) **اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن** مولانا کے چند مواعظ سے ان کے ایک معتقد و خادم نے ان اقتباسات کو یک جا کر دیا ہے جن میں آیات قرآنی اور احادیث کے متعلق نکات و تحقیقات ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو کئی حصے اس کے مرتب ہو سکتے تھے۔

(۱۴) **احکام القرآن** جس کی طرف ابتدائی توجہ ۱۳۵۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں دورہ تفسیر کے آغاز میں ہوئی اور اس کے لیے فقہ پر استدلال قرآنیہ اور مواضع خلاف میں دوسرے ائمہ کا جواب ایک مستقل کتاب میں ہونے کی بنا پر اور اسی بناء کے اعتبار سے اس کا نام "دلائل القرآن علی مسائل النعمان" تجویز فرما کر یہ خدمت حضرت نے اپنے مسترشد خاص سیدی و سندی مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی دامت فیوضہم کے سپرد فرمائی۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ مختصر۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنی فرصت کے شروع کر دیا۔ اسی عرصہ میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہ اعلاء السنن کی تصنیف کو مکمل کر کے فارغ ہو گئے تو حضرت والا نے یہ کام ان کے فرما دیا۔ لیکن اتفاقاً تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مولانا موصوف بھی ڈھاکہ میں ملازم ہو کر تشریف لے گئے اور یہ کام تعویق میں پڑ گیا۔ ۱۳۶۱ھ کو اس کام کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ اور چاہا کہ کوئی عالم فارغ ہو کر اسی کام میں لگ جائے تاکہ جلد مکمل ہو سکے۔ مگر اس کی صورت نہ ہوئی تو چند پر تقسیم کر دینے کا فیصلہ فرمایا۔ اور دو منزلیں قرآن کریم کی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہ کے اور دو منزلیں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ کے اور ایک منزل استاذی شیخ التفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے حصے میں دے دی۔ چنانچہ حضرت کے ایماء سے سیدی و سندی حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ تھانہ بھون میں ہی قیام کر کے اس کام میں مصروف ہو گئے۔ مولانا روزانہ کی مجلس میں کے متعلق جو جو نکتے ان کو یاد آجاتے تھے بیان فرماتے۔ اور حضرت مولانا مفتی صاحب مدظلہ اس کو اپنے مقام پر آ کر قلم بند فرما لیتے۔ یہ تصنیف اسی طور سے جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا۔ اب بفضلہ تعالیٰ حضرت مولانا مفتی صاحب مدظلہ نے اپنے حصہ کے مسودہ کو تکمیل کیا معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اپنے اپنے حصے تقریباً مکمل فرما لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تصنیف و تدوین اور اشاعت کا جلد کوئی انتظام فرما دیں۔ موجودہ وقت کے لیے نہایت اہم چیز ہو گی۔

(۱۵) **تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبارات** تفسیر بیضاوی میں حروف مقطعات کا جو مجمل و مغلق بیان ہے، اس رسالہ میں بزبان عربی اس کو سلیس کر کے بیان کیا گیا ہے جس میں حروف مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے۔

(۱۶، ۱۷) مولانا کے دو رسالے علم القرآن سے متعلق اور ہیں۔ اور ان دو کا تعلق

ع[1] کتاب کافی ضخیم ہے۔ ضرورت ہے کہ اصحاب خیر حضرات اس کی طباعت کی طرف توجہ کریں تو اسلام کی اہم خدمت اور حضرت کی تمنا کو پوری کرنے کا اجر عظیم حاصل ہو گا۔

ـ سے ہے ایک کا نام "مسائل السلوک من کلام ملک الملوک" اور دوسرے کا نام "تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ" ہے ان دونوں رسالوں
موضوع قرآن پاک کی ان آیتوں کی تفسیر سے ہے جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس دوسرے رسالہ کی بنا، ایک سابق مؤلف کی
تالیف ہے جس کا قلمی رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۲۷ھ میں بہاولپور میں ملا تھا۔ اس پر مزید اضافہ کر کے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے۔

علوم الحدیث

مجدد الملت کو علوم حدیث میں جو مہارت حاصل تھی اس کی شہادت ان کے مواعظ ورسائل وتالیف کے ہزاروں صفحات دے رہے ہیں جن میں بے شمار احادیث کے حوالے، اشارے اور تلمیحات، ان کے مشکلات کی شرح، ان
دقیق مطالب کے حل اور ان کے نکات ولطائف کا بیان ہے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کے مواعظ میں جو زبانی تقریریں ہیں، بر محل حدیثوں
کے حوالے اور اکثر احادیث کے بعینہٖ الفاظ مع ان کی تخریجات اور کتابوں کے حوالے کے اس کثرت سے ان میں ہیں کہ ان کو دیکھ کر کسی انصاف
پسند کو ان کے حافظ الحدیث ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد ان کی ان تصانیف کو لیجیے جو گو فقہ وفتاویٰ اور احکام ومسائل یا اصلاح رسوم اور سلوک میں ہیں، لیکن ان کی بنیاد احادیث پر ہے۔
ان میں احادیث کے حوالے، دلائل کی مضبوطی اور صحت بیان کی تائید وشہادت کے لیے آئے ہیں، جو مؤلف کے علم ومعرفت پر دلیل قاطع ہیں حضرت
مجدد الملت کو فن سلوک کی جو توفیق عنایت ہوئی تھی اس کا ایک مبارک اثر یہ ہے کہ حضرت نے احادیث کی کتابوں سے ان تمام حدیثوں کو یکجا کیا
جن میں اس فن شریف کے مسائل متفرق تھے۔ اگرچہ بعض حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں بعض ابواب زہد ورقاق کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہم ان کی
حیثیت فن کی نہیں۔ قدمائیں سے صرف ایک بزرگ امام عبداللہ ابن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے جنہوں نے "کتاب الزہد والرقاق"
کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے۔

اہل سلوک نے جن روایات واحادیث سے کام لیا ہے۔ وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع تک ہیں۔ اسی لیے علمائے سلوک کو اس فن میں کمزور
سمجھا گیا ہے اور اسی بنا پر بعض اہل حدیث وروایت نے یہ بر خود غلط خیال قائم کر لیا ہے کہ فن سلوک اور اس کے مسائل احادیث نبوی سے ثابت نہیں
ہیں۔ ان سے ان کا یہ اعتراض قائم تھا۔ گو بعض محدثین نے ادھر توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں کچھ کام انجام دیا۔ مثلاً امام ابن ابی جمرہ اندلسی المتوفی
۶۹۵ھ نے صحیح بخاری کی شرح بہجۃ النفوس کے نام سے لکھی جس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو چکی ہے اس میں اس کا التزام کیا ہے کہ احادیث کی
شرح میں سلوک کے مسائل ونکات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

حضرت مجدد الملت نے اس کام کو مستقل طور سے انجام دیا اور "حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ" "التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف"
کے نام سے دو کتابیں تالیف فرمائیں۔

حقیقت الطریقت

۱۳۲۷ھ میں تالیف پائی ہے اور یہ درحقیقت حضرت کی کتاب التکشف عن مہمات التصوف" کا آخری
جزو ہے اور ساتھ ہی مستقل تصنیف بھی ہے۔ اس میں تین سو تیس احادیث سے جو عموماً صحاح میں مذکور
ہیں سلوک والتصوف کے مسائل کو مستنبط کیا گیا ہے۔ اور ان کو اخلاق، احوال، اشغال، تعلیمات، علامات، فضائل، عادات، رسوم، مسائل،
توجیہات، اصلاح اور متفرقات کے دس ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ اہل علم کے مطالعہ کی خاص چیز ہے۔

التشرف

یہ کتاب چار حصوں میں ہے۔ ان میں ان احادیث کی تحقیق ہے جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیا کے کلام میں آتی ہیں۔
اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اصول وفن حدیث کی رو سے یہ حدیث کس درجہ کی ہے اور حدیث کی کس کتاب میں ہے۔ اور جو روایات

اسنادہیں دراصل حدیث نہ تھیں بلکہ عوام نے غلط فہمی سے ان کو حدیث سمجھ رکھا ہے اگر وہ اقوال نتیجہ کے طور پر کسی دوسری حدیث یا آیت پاک سے ہیں تو ان احادیث و آیات اور ان سے ان اقوال کی صحت کے طریق و استنباط پر گفتگو فرمائی۔

حصہ اوّل التشرف میں امام غزالی کی احیاء علوم الدین کی احادیث کی تخریج ہے۔ اس حصہ کا ماخذ زیادہ تر امام غزالیؒ کی تخریج احیاء العلوم ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں ہیں جن کا ماخذ ہر روایت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ یہ حصہ ۱۳۴۱ھ میں لکھا

حصہ دوم میں دفتر اوّل مثنوی مولانا روم اور اس کی شرح کلید مثنوی میں آئی ہوئی حدیث و روایات کی تخریج کی گئی ہے۔ ان احادیث کی تحقیقات زیادہ تر امام سخاوی کی المقاصد الحسنہ سے التقاط کی گئی ہے۔

حصہ سوم و چہارم، ان دونوں حصوں میں حافظ سیوطی کی جامع صغیر سے جو احادیث کی ساری کتابوں کا بہ ترتیب حروف تہجی مجموعہ ہے۔ ان کو یک جا کیا گیا ہے جن سے مسائل سلوک مستنبط ہیں اور ان کو بہ ترتیب حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تحقیقات خاصہ کا جا بجا اضافہ اور احادیث کے مطالب کی تشریح و تطبیق اور بعض مشکلات کا حل کیا گیا ہے۔ حصہ سوم صرف الف کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ۱۳۵۱ھ میں ترتیب پایا۔ اور حصہ چہارم میں بقیہ حروف کی روایتیں ہیں اور وہ محرم ۱۳۵۲ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے۔

حضرات اہل حدیث کے اس فرقہ کی طرف سے جو غالی ہے اکثر حضرات حنفیہ پر یہ طعن کیا گیا ہے کہ حنفی مسائل کی تائید میں احادیث نہیں ہیں اور چونکہ کتب حدیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی تالیف ہیں اس لیے ان میں حنفیہ کی موید حدیثیں یک جا نہیں ہیں۔ گو امام محمدؒ موطا اور کتاب الآثار اور قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار اور مسند ابی حنیفہؒ مرتبہ خوارزمی اور امام طحاویؒ کی تصانیف سے ان کا جواب دیا جاتا رہا ہے۔ مگر کتب صحاح و مصنفات سے جو رائج اور محدثین میں مقبول ہیں چن کر ان احادیث و روایات کو یک جا نہیں کیا گیا تھا جن سے مسائل حنفیہ کی تائید ہوتی تھی۔

یہ ضرورت تو ہمیشہ سے تھی مگر اس زمانہ میں اہل حدیث کے ظہور و شیوع سے اس ضرورت کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ چونکہ اس تحریک کا آغاز پورب (عظیم آباد پٹنہ) سے ہوا، اس لیے اس ضرورت کا احساس بھی پہلے یہیں کیا گیا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے شاگرد رشید مولانا محمد بن علی ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی نے "آثار السنن" کے نام سے کتب حدیث سے التقاط کر کے اس قسم کی حدیثوں کو جمع کیا۔ اس کے دو ہی حصے شائع ہو سکے۔ اس کا دوسرا حصہ ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا۔ علماء احناف نے اس کتاب کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا یہاں تک کہ مولانا انور شاہ کشمیری نے جو اس زمانہ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس تھے، اس کی مدح میں عربی قصیدے لکھے۔ افسوس ہے کہ مصنف کی وفات سے ان کا یہ کام ناتمام رہا۔

احیاء السنن — مجدد الملتؒ نے بھی اس ضرورت کو محسوس فرمایا۔ اور احیاء السنن کے نام سے اس قسم کی احادیث کا مجموعہ مرتب فرمایا اور اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر رکھی۔ لیکن افسوس کہ اس کا مسودہ ضائع ہو گیا۔

جامع الآثار — کچھ دنوں کے بعد پھر اس موضوع کا خیال آیا اور دوبارہ ایک جدید اسلوب پر اس قسم کی حدیثوں کا مجموعہ "جامع الآثار" کے نام سے مرتب فرمایا۔ لیکن یہ سلسلہ "ابواب الصلوٰۃ" سے آگے نہیں بڑھا تاہم جتنا مرتب ہو گیا تھا وہ چھپ کر شائع ہو گیا۔

تابع الآثار — یہ بھی اسی موضوع پر ہے اور اس کو "جامع الآثار" کا ضمیمہ بنا دیا گیا ہے۔

احیاء السُّنن کا احیاء ۱۳۳۱ھ میں یہ خیال ہوا کہ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ حضرت والا خود اس کام کو تنہا انجام نہیں دے سکتے۔ اس لیے یہ قرار پایا کہ اس کے لیے بعض مستند علماء کو رکھ کر کام لیا جائے۔ چنانچہ مولانا احمد حسن صاحب سنبھلی کو اس کام کے لیے مقرر کیا گیا۔ انہوں نے کام شروع کیا۔ جو کام کرتے جاتے۔ مولانا کی نگاہ سے گزارتے جاتے تھے۔ اس طور کتاب الحج تک کام ہوا۔ اور اس کا نام دوبارہ "احیاء السُّنن" رکھا گیا تاکہ مرحوم احیاء السُّنن کی یادگار رہو۔ اس کے دو حصے شائع ہوئے تھے کہ بعض اسباب سے اس کتاب کے بعض مضامین سے مولانا کی تشفی نہیں ہوئی اور اس پر استدراک لکھوانے کا خیال ہوا اور آئندہ کام کے لیے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی مدظلہٗ کا انتخاب ہوا۔

الاستدراک الحسن مولانا ظفر احمد صاحب نے مجدّد الملّت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر ہدایت اس کام کو بڑی دیدہ ریزی اور وسعت نظر اور تحقیق و تنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا۔ سب سے پہلے احیاء السُّنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر کر کے اس کو "استدراک الحسن" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اعلاء السُّنن اس کے بعد احیاء السُّنن" کے نام کو بدل کر "اعلاء السُّنن" کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا۔ اور اس وقت تک اس کی بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں مذہب حنفی کی موید حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا اور محدثین اور اہلِ فن کی تحقیقات کے شروح و حواشی میں یکجا کی گئی ہیں۔

الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ جمعہ و عیدین کے خطبوں میں اس درجہ تکلف و تصنع اور مضامین کے ابتذال سے کام لیا گیا ہے کہ یہ بازاری خطبے زبان اور طرز ادا، اور مضامین و مطالب کے لحاظ سے عہد نبوّت اور خلافتِ راشدہ کے اسلوب سے ہٹ کر بلغاء اور خطباء کے اظہار قابلیت کا دنگل بن کر رہ گئے ہیں۔ مجدّد الملّت کی اصلاحی نظر سے محراب و منبر کا یہ گوشہ بھی مخفی نہیں رہا۔ چنانچہ "الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ" کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع کر دیا۔ تاکہ خطبائے مساجد ان مسنون خطبوں کو پڑھ کر ان تکلفاتِ باردہ کے گناہ سے محفوظ رہیں۔

خُطباتُ الاحکام جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبوں کا یہ مجموعہ تالیف فرمایا جس میں احادیث و آیات سے ترغیب و ترہیب کے مضامین کے علاوہ عقائد و اعمال و اخلاق کے مضامین درج فرمائے۔

مُناجات مقبول احادیث میں وارد اذکار و ادعیہ کا دستور کے لیے "حصن حصین، حزب اعظم ملا علی قاری" وغیرہ کتابیں رواج پذیر ہیں۔ مگر وہ طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہیں۔ حضرت مجدّد الملت نے عام مسلمانوں کے فائدہ کے لیے ان سب سے تلخیص کر کے "مناجات مقبول قربات عند اللہ وصلوات الرسول" کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تالیف فرمایا ہے۔ جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بے حد مقبول ہے۔

عُلومُ الفِقہ مجدّد الملت" کو مسائل فقہیہ کی تلاش و تحقیق کا خاص ذوق تھا اور یہ ذوق ان کو اپنے شیوخ و اساتذہ کرام سے ورثہ میں ملا تھا چنانچہ ابھی وہ تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ان سے فتویٰ نویسی کی خدمت لینا شروع کر دی تھی۔ اگر حضرت مجدّد الملّت رحمۃ اللہ کی فقہی خدمات کا آغاز ۱۳۰۱ھ سے بھی لیا جائے تو ۱۳۶۲ھ تک بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ پورے ساٹھ سال اس فنِ شریف کی خدمت میں بسر کیے۔ اس طویل عرصہ میں ہزاروں مسئلوں کے جواب دیے۔ ہزاروں فتوے اور سینکڑوں

چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے۔ متعدد ضخیم جلدوں میں امداد الفتاویٰ اور تتمہ امداد الفتاویٰ کے نام سے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتاوے کے مجموعے جمع کئے گئے ہیں جس کی نظیر ہندوستان میں کم از کم نہیں ملتی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ

حوادث الفتاوےٰ کے نام سے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو اس زمانے کے نئے مسائل اور نئے مصنوعات سے متعلق ہیں جن کے جوابات گزشتہ کتب فتویٰ سے بآسانی حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

ترجیح الراجح یہ وہ مجموعہ ہے جس کی مثال سلف صالحین میں تو ملے گی، مگر متاخرین کے یہاں یہ سلسلہ بالکل مسدود ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت مجدد الملت نے اپنے ان مسائل کو جمع فرما دیا ہے جن میں از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا تو اس سے رجوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی۔ یہ سلسلہ حضرت کی انصاف پسندی، تواضع اور عدم نفسانیت کا بین ثبوت ہے۔ یہی حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، حضرات تابعین و تبع تابعین، اور مجتہدین عظام کا طریق تھا جس کو اس زمانہ میں حضرت مجدد الملت نے زندہ کیا اور اپنے کو بارِ آخرت سے بچایا۔

مکمل امداد الفتاویٰ کی از سرِ نو تبویب و ترتیب اہم خدمت حضرت کے فتاویٰ اس زمانہ کے فتاویٰ میں مستند اور علمائے ہند کا معتمد علیہ اور ضروریاتِ زمانہ پر گہری نظر، حوادث، جدید معاملات اور آلاتِ جدیدہ سے متعلقہ مباحث میں بے نظیر ہے۔ اس وقت اس کی اشاعت گیارہ حصوں میں اس طرح ہوئی کہ چار مستقل جلدیں۔ پانچ تتمے۔ ایک ترجیح الراجح۔ ایک حوادث الفتاویٰ۔ اور آخری زمانہ کے فتاویٰ کچھ ماہوار رسالہ النور میں شائع ہوئے، کچھ قلمی رجسٹر میں محفوظ تھے جو بارھواں حصہ ہوتا۔ سلسلۂ فتاویٰ جاری رہنے کے سبب ان تمام حصوں کی تبویب و ترتیب یکجائی نہ ہو سکتی تھی۔ ایک مسئلہ کے متعلقہ مباحث تمام حصوں میں منتشر اور ایک دوسرے پر موقوف تھے جس سے استفادہ آسان نہ تھا۔ اس وقت سیدی و سندی مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی دامت فیوضہم خلیفہ خاص حضرت ممدوح نے تمام کتاب کے بارہ حصوں کو محنتِ شاقہ برداشت کر کے ابوابِ فقہیہ پر مرتب کیا جس کی چند خصوصیات یہ ہیں:- (۱) ایک مسئلہ کے متعلق جتنے فتاویٰ مختلف جلدوں میں تھے یا ترجیح الراجح میں اس کی بحث تھی اس کو یکجا کر دیا۔ (۲) ہر مسئلہ کے ساتھ طبع قدیم کی جلد اور صفحہ کا حوالہ لکھا۔ (۳) جن مسائل میں متعدد فتاویٰ بظاہر متعارض نظر آئے اور ترجیح الراجح میں اس پہ کلام نہیں، ان کی تطبیق یا ترجیح کے لیے حاشیہ میں توضیح کی گئی۔ (۴) جن مسائل میں کوئی ابہام یا اختلاف تھا ان پر حواشی لکھ کر واضح کیا گیا۔ (۵) ترتیب میں قدیم طرز کے ابواب فقہیہ کے ساتھ اہم مسائل کے لیے جدید عنوانات و فصول بھی قائم کر دئیے۔ (۶) ہر جلد کے فتاویٰ پر ترتیبی نمبر ڈال دیئے (۷) فہرست مضامین نہایت مکمل اور واضح لگائی گئی وغیرہ وغیرہ اس کی دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ کل غالباً چھ ہوں گی۔

فتاوےٰ اشرفیہ کے نام سے مسائل دینیہ کے تین حصے الگ شائع ہوئے جو مختصر رسائل ہیں۔

بہشتی زیور کی دس جلدیں جو گو عورتوں کی ضروریات کے لئے ہیں مگر ان میں اسلامی معلومات کا مکمل ذخیرہ ہے۔ اور ان میں پیدائش سے لے کر مرنے تک کے تمام حالات اور مسائل جو ہر مسلمان کو پیش آتے ہیں مکمل طور پر درج ہیں۔ حقیقت میں بہشتی زیور دینی و دنیاوی معلومات کا مکمل کورس ہے۔

شتی گوہر بہشتی زیور کے سلسلہ کا مردانہ حصہ ہے جس میں خاص طور سے ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں جیسے جمعہ، جماعت، عیدین وغیرہ۔

ۃ الناجزہ للحلیلۃ العاجزہ جس میں مظلوم و مصیبت زدہ عورتوں کی مشکلات کا شرعی حل۔ جن عورتوں کے شوہر مفقود یا مجنون ہو جائیں یا نامرد ہوں یا باوجود قدرت رکھنے کے نان و نفقہ نہ دیں اور طلاق و خلع ہ دیتے ہوں، ان کی خلاصی کے لیے شرعی صورتیں، نیز جن صورتوں میں عورتوں کو اپنا نکاح باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ملتا ہے۔ ان کے تفصیلی احکام انے کی صورت میں فسخ نکاح ہونے نہ ہونے کی مکمل بحث فرمائی ہے۔ ان کے علاوہ مسئلہ حجاب، مسئلہ ربا، مسئلہ رشوت، مسئلہ بینک، م اور ریڈیو وغیرہ کے مسائل پر فقہی تحقیقات ہیں اور بعض موضوعوں پر بار بار کئی رسالے تالیف فرمائے۔

لام علم کلام و عقائد توحید پر متعدد رسالے قلمبند فرمائے جو شائع و ذائع ہیں۔ خاص نئے زمانے کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں اور دوسروں سے ترجمہ کرائیں۔ مثلاً "اسلام اور سائنس" کے نام سے الحصون الحمیدیہ کا ں صاحب سے ترجمہ کرایا۔ یہ عربی کی ایک جدید کلامی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف علامہ حسین جسر ہیں جنھوں نے سلطان عبدالحمید خاں کے ں کو ملک شام میں تصنیف فرمایا تھا اور جو نئے حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں تاویل فاسد کا دروازہ یا ہے۔

لح العقلیہ للاحکام النقلیہ تین حصوں میں ترتیب پایا ہے۔ جس میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و حکم بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں نماز و زکوٰۃ، دوسرے حصے میں روزہ، عیدین، صدقہ فطر، قربانی، حج، ، غلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ تیسرے حصہ میں خرید و فروخت و معاملات، حدود و قصاص، فرائض، عذاب قبر متعلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں۔

بات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ یہ بھی علم کلام کا باب ہے۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے مذہبی خدشوں اور وسوسوں کے تشفی بخش جوابات درج ہیں۔

ت الجواب یہ بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے جو مواعظ و ملفوظات سے جمع کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سے نئے اور پرانے شبہات و خطرات کے جوابات فراہم کیے گئے ہیں۔

وک و تصوف علم سلوک و تصوف روح شریعت کا نام ہے جس میں اخلاص دین اور اعمال قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کی جاتی ہے۔ قدما صوفیہ نے اس فن پر جو کتابیں لکھی ہیں مثلاً قشیریہ امام قشیریؒ، قوت القلوب ں، کتاب اللمع ابو نصر عبداللہ بن علی سراج الطوسیؒ، کتاب الصدق، ابو سعید خرازؒ، فتوح الغیب شیخ سہروردیؒ، اور غنیۃ الطالبین القادر جیلانیؒ اور متاخرین میں تصانیف امام شعرانی۔ ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مصنوعی صوفیہ اور مبتدعہ کی تلبیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ تو بدعات کا مجموعہ، بلکہ بطلان و ضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر یں ہندوؤں کے جوگ اور ویدانت کے اثر سے اس میں بہت سے ایسے مسائل شامل ہو گئے جو اسلام کی روح کے تمام تر منافی ، وحدت وجود، وحدت شہود و لطائف و دوائر کے مباحث و اشغال بھی اصل فن سے قطعاً الگ ہیں۔ جو یا تو علم کلام و فلسفہ یا اوہام و

خیالات و احوال سے وابستہ ہیں جن کا تعلق نفسیات سے ہے۔

اصل شئے جو اخلاص فی الدین، طلب رضا، حصولِ قرب اور اعمال و اخلاق قلب و مقامات ہیں اور جن سے مقصود رذائل سے اور فضائل سے آراستگی ہے تمام تر متروک ہوگیا ہے۔ صدیوں کے بعد حضرت مجدد الملت کے تجدیدی مساعی نے اس فن کو پھر سلف صالحین کے رنگ میں پیش کیا اور ہر قسم کے اضافوں اور آمیزشوں سے پاک کر کے کتاب و سنت کے نور میں اس تاریک زمانہ کے اندر پھر ظاہر کیا۔ قلم سے ان مسائل پر اتنا کچھ لکھا اور بیان فرمایا کہ اب طالب پر اصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا۔ و للہ الحمد۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز "قصد السبیل" ہے جو پچاس ساٹھ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے۔ لیکن اس کوزہ میں دریا بند ہے۔ فن سلوک کے حقائق اور تعلیمات، جو سالہاسال میں معلوم ہو سکتے ہیں اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستوں پر پڑ کر منزل مقصود کو گم کر دیتے ہیں، اس میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اگر کوئی طالب صادق صرف اسی ایک رسالہ کی تعمیل و تکمیل میں صرف کر دے تو اس کے لیے ان شاء اللہ کافی ہے۔

جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے کہ شریعت اور طریقت دو چیزیں ہیں اور اس زور و شور سے اس کو عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا ہے حالانکہ یہ تمام تر لغو اور بے معنی ہے۔ مجدد الملت نے تمام عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے۔ احکام الٰہی کی باخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے، دگر ہیچ۔ اور یہی خواص امت کا مذہب ہے اور جس نے کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے ناآشنا ہے۔

حضرت مجدد الملت نے اس فن کے مسائل کو سب سے پہلے کلام پاک سے مستنبط فرمایا اور اس کے متعلق دو "مسائل السلوک من کلام ملک الملوک" اور "تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ" کے نام دو رسالے تالیف فرمائے ہیں، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ پھر ان مسائل سلوک کی تشریح کا ماخذ احادیث نبوی اور سنت صحیحہ ہے اور یہ "التشرف" اور "حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ" میں مدون ہیں۔

اہل تحقیق کے لیے اس فن شریف پر ایک جامع کتاب "التکشف عن مہمات التصوف" تالیف فرمائی جو پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ یہ حقیقت، طریقت، حقوق طریقت، تحقیق کرامت اور دیگر مضامین تصوف پر مشتمل ہے۔

طریق اور سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ ذرا ان کے سمجھنے میں بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کی بجائے ضلالت کا ذریعہ بن جائیں۔ اس سلسلہ میں حضرت **مولانا رومی** کی جو مثنوی معنوی کے نام سے سرد لنواز حقیقت ہے کی خاص اہمیت ہے اس لیے وہ اس سلسلہ کے خانقاہی درس میں رہی ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے خاص ذوق تھا اور وہ بھی خاص خاص لوگوں کو اس کا درس دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے ایماء سے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے بڑے اہتمام سے اس کا حاشیہ لکھا اور منشی رحمت اللہ مرحوم کے مطبع نے اس کو چھاپا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی بحر العلوم کے بعد مثنوی کی حکیمانہ شرح اس سے بہتر نہیں لکھی گئی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے حضرت مجدد الملت نے اس مثنوی کی خدمت مخفی فن کی حیثیت سے کی اور سلوک کے مسائل، طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے اس خوبی کے ساتھ کلید مثنوی میں تطبیق فرمائی کہ فن کا مبتدی بھی چاہے تو اس کلید کے ذریعہ سے مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے۔

دیوانِ حافظ کی پرجوش و مردافگن شراب نے بھی بہت سے بے احتیاط نوشوں کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا۔ بدگمانوں کو اس تذکرہ پر شیراز کے بادۂ انگور کا شبہ ہوا۔ اور بے احتیاط خوش گمانوں نے اس سے اباحت کی کہ ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

حضرت مجدد الملت کی معرفت اس "نیز دتند شراب کے منافع دانم" سے پوری طرح باخبر تھی۔ حضرت نے "عرفانِ حافظ" کے نام سے اس کی شرح لکھی کہ اس پھول سے کانٹا الگ ہو گیا ۔ ع

ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت کے لیے "تربیۃ السالک و تنجیۃ الہالک" کا سلسلہ الگ مرتب فرمایا جس میں سالکین کی مشکلات راہ، فوائد، ذاکرین کے شبہات و خطرات راہ کے لیے ہدایات مندرج ہیں۔ یہ کتاب جامع ہے کہ علوم مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوالِ شخصی کی اس طرح کی کتاب کی نظیر تصوف کے سارے دفتر میں موجود نہیں ۷۲ صفحوں میں یہ کتاب تمام ہوئی ہے

ایک دوسرا اہم سلسلہ "ملفوظات" کا ہے۔ بزرگوں کے ملفوظات مرتب کرنے کی رسم قدیم زمانے سے قائم ہے۔ یہاں تک کہ چشتیہ حضرات حضرت خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ملفوظات بھی موجود ہیں۔ افسوس ہے کہ اہلِ شوق اس کام کو پورے استیعاب سے نہ کر سکے کیونکہ ان اکابر کے جو ملفوظات قلمبند ہو سکے وہ چند سال بعد بلکہ چند ماہ کے نہیں ہیں اور ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والوں نے ان کو ان بزرگوں کی نظرِ کیمیا اثر سے گزارنا بھی تھا۔ تاہم چونکہ لکھنے والے اہلِ کمال و اہلِ احتیاط تھے اس لیے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ اس اختصار پر بھی ہمارے لیے بڑی خیر و برکت ہیں۔

حضرت مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ مجلدات اور رسائل میں مدون ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کی نظر سے گزار کر چھاپا گیا ہے اور جن میں سے اکثر "حسن العزیز"[1] اور "الاضافات الیومیہ" وغیرہ نام سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان ملفوظات میں سلوک کے قصے، سنجیدہ لطیفے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائل فقہیہ کے بیانات، سلوک کے نکتے، اکابر کے حالات، طالبوں کی تنبیہات، آداب و اخلاق کے نکات، اصلاحِ نفس و تزکیہ کے تجربات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہلِ شوق کے دل دونوں آبِ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔

اصلاحیات حضرت مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کے معارف کا یہ آخری باب ہے اور خاصا اہم باب ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کی جو دقیق نظر ان کو بارگاہِ الٰہی سے عنایت ہوئی تھی اس کا اندازہ ان کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اصلاح کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں، عورتوں سے لے کر مردوں اور علماء و فضلاء کے حلقے تک پھیلا ہوا ہے اور سب کے لیے اصلاحات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔

دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس و مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شادی و غمی کے سوم اور روزمرہ کی زندگی کے گوشوں تک محیط ہیں۔ غرض ایک مسلم جدھر اپنی زندگی میں رخ کرے ان کے قلم نے شریعت کی ہدایت کا پروگرام تیار کر رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت کی سب سے اہم چیز "مواعظ" ہیں۔ مواعظ تو بحمد اللہ زمانہ خیر کے بعد اسلام کی دس بارہ صدیوں میں بیشمار

---

[1] یہ کتاب نو جلدوں میں چھپی ہے اور "حسن العزیز" دو جلدوں میں ۱۲۔

گزرے ہوں گے مگر شاید واعظین میں ابن جوزی اور ائمہ سلوک میں حضرت شیخ الشیوخ عبدالقادر جیلانی کے مواعظ کے سوا کوئی د
اور مفید مجموعہ موجود نہیں۔ لیکن یہاں بزرگوں کے صرف چند مواعظ پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس اخیر دور میں امت اسلامیہ کی اصلا
بہت بڑا فضل یہ فرمایا کہ حضرت کے مستفیدین کے دل میں یہ ڈالا کہ حضرت کے مواعظ کو جو شہر شہر ہوتے تھے عین وعظ کے وقت
قید تحریر میں لائیں اور حضرت کی نظر سے گزار کر ان کو دوسرے مسلمانوں کے عام فائدہ کی غرض سے شائع کریں۔ چنانچہ اس اہتم
کے ساتھ تقریباً ... مواعظ جو احکام اسلامی، رد بدعات، اصلاح رسوم و نصائح و لیڈران اور مسلمانوں کی مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں اور جن میں
ساتھ ساتھ دلچسپیوں کی بھی کمی نہیں، مرتب ہوئے اور اکثر شائع ہوئے اور مسلمانوں نے ان سے فائدے اٹھائے۔

سلسلہ اصلاح و تربیت میں حضرت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عموماً واعظین صرف عقائد عبادات پر گفتگو فرماتے
ان چیزوں کی اہمیت کے ساتھ مسلمانوں کے اخلاق و معاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی اصلاح پر زور دیتے ہیں بلکہ اپنی توج
کی تعمیر میں بھی ان پر برابر کی نظر رکھتے تھے حالانکہ عام مشائخ نے اس سبق کو صدیوں سے بھلا دیا تھا ____

علاوہ اس سلسلہ کی اہم کڑی **حیٰوۃ المسلمین** ہے جس میں قرآن پاک و احادیث نبویہ کی روشنی میں مس
دینی و دنیوی ترقی و فلاح کا پروگرام مرتب فرمایا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اپنی ساری تصنی
کتاب کی تالیف میں جو محنت اٹھائی وہ کسی میں نہیں پیش آئی اور اسی لیے یہ بھی ارشاد ہے کہ میں اپنی ساری کتابوں میں اس
سے ذریعہ نجات گمان کرتا ہوں۔

اس سلسلہ کی دوسری کتابیں ۱۔ اصلاح الرسوم ۲۔ صفائی معاملات ۳۔ اصلاح امت ۴۔ اصلاح انقلاب امت ۵۔ تعلیم
۶۔ بہشتی زیور وغیرہ ہیں اور ہر ایک کا منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی اجتماعی معاشرتی زندگی خالص اسلامی طریق اور شر
ان کے سامنے راہ مستقیم کھل جائے جو ہدایت کی منزل مقصود کی طرف جاتی ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تعلیمات۔ واقعات اور اقتباسات کے آئینے میں

حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ نے تعلیم و تربیت۔ سلوک و معرفت اور تلقین و ارشاد کے ذریعہ اس صدی میں جو خدمت کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی اس خدمت کی تفصیل کے لیے آپ کی سیرت و تعلیمات پر تحریر کی جانے والی کتب۔ حیات اشرف۔ جامع المجددین تجدید تصوف و سلوک۔ تجدید معاشیات۔ تجدید تعلیم و تبلیغ۔ حکیم الامت اور سیرت اشرف کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ منشی عبدالرحمٰن صاحب کی تالیف "سیرت اشرف" سے ہم کچھ چیزیں شکریے کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے، سوانح و سیرت کے باب میں یہ بہترین کتاب ہے۔

شرائط قبولیت ایک دفعہ ڈھاکہ کے مشہور معروف نواب سلیم اللہ خاں نے جن کی دعوت کے وائسرائے اور گورنر مشتاق رہتے تھے۔ اور بلا شرط منظور کرتے تھے۔ حضرت تھانوی ؒ کو بڑے اشتیاق سے مدعو کیا۔ تو آپ نے اس کی امارت و وجاہت کے پیش نظر قبولیت دعوت کے لئے حسب ذیل شرطیں لکھیں۔

۱۔ کسی قسم کا نقد یا غیر نقد ہدیہ نہ دیا جائے۔

۲۔ کسی خاص مضمون پر وعظ کہنے کی فرمائش نہ کی جائے

۳۔ قیام کا انتظام ایوان خاص سے جدا ایسی جگہ ہو۔ جہاں عام مسلمان بے تکلف آجا سکیں۔

۴۔ خود اپنی ملاقات کیلئے کوئی خاص وقت متعین کر لیں۔ جس میں کوئی اور شخص شریک نہ ہو۔ تاکہ جانبین سے بے تکلف افادہ و استفادہ ہو سکے

نواب صاحب بھی بڑے سمجھ دار۔ سلیم الفطرت اور اسم باسمیٰ تھے شرائط کو پڑھ کر ان کی حکمت و ندرت۔ صحت و مصلحت پر عش عش کر اٹھے اور غلبۂ اشتیاق میں بلا چون و چرا سب شرطیں منظور کر لیں۔

شاہانہ تزک و احتشام حضرت تھانوی ؒ عوامی یا مذہبی لیڈروں کی طرح شاندار استقبال۔ جلسہ و جلوس اور زندہ باد کے نعروں کے قطعاً دلدادہ نہ تھے۔ اگر کوئی از راہِ محبت ایسا انتظام بھی کرتا۔ تو حضرت منع فرما دیتے۔ نواب ڈھاکہ نے حضرت کا بھی اسی تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کرنا چاہا جس طرح وہ وائسرائے کا استقبال کرنے کا عادی تھے۔ کہ پلیٹ فارم پر مخملی فرش بچھایا جائے

تمام راستوں کو رنگ برنگ کی جھنڈیوں اور خوبصورت دروازوں سے سجایا جائے اور شاہانہ جلوس کی صورت میں حضرت کو دیوانِ خاص تک لایا جائے واقعی حضرت ایسے ہی استقبال کے مستحق تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کے۔ کیوں کہ یہ اپنے زمانہ کے مجدد تھے۔ مگر یہ سب کچھ چونکہ خلاف شرع تھا۔ اس لئے حضرت نے نواب صاحب کو اس کی اجازت نہ دی اب انہوں نے دوسری درخواست بھیجی کہ ہمیں ایک جم غفیر کے ساتھ استقبال کی اجازت دی جائے۔ جو عمال ریاست اور وزراء پر مشتمل ہوگا۔ حضرت نے لکھا کہ یہ بھی خلاف طبیعت ہے۔ جس سے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مگر قدم قدم پر حضرت کی مصلحت آمیز اور سبق آموز ہدایات نواب صاحب کی گرویدگی میں نہ صرف اضافہ کر رہی تھیں۔ بلکہ ان کے دل میں حضرت کی عظمت بڑھا رہی تھیں چنانچہ نواب صاحب بلا کسی اہتمام کے بہ نفس نفیس اسٹیشن پر پہنچے۔ اپنی خاص موٹر میں حضرت کو سوار کیا۔ حضرت کی خواہش کے باوجود حضرت کے ساتھ نہ بیٹھے کیونکہ حضرت اپنے ساتھ بیٹھنے کی ہمت نہ ہوئی اور فرمایا کہ حضرت کے ساتھ بیٹھنا خلاف ادب تھا۔ گھر پہنچ کر بھی نواب صاحب خود خادموں کی طرح حضرت کی خدمت میں کھڑے رہے یہاں تک کہ کھانے کے وقت پر ایک ایک چیز خود اٹھا اٹھا کر حضرت کے سامنے رکھتے رہے۔

منتظم کی نخوت اور اُس کا علاج

علامہ اقبال نے اس دور کو اپنے ایک مکتوب میں دور بدتمیزی قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نر دور فرعونیت کے زمانہ میں عام طور پر اہلِ دین اور علماء حق کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر حضرت تھانوی یہ برداشت نہیں کرتے تھے۔ کہ کوئی علماء حق کی شان میں ایسی ویسی بات کرے۔ کیوں کہ آپ اسے اہل دین کی اور دین کی توہین سمجھتے تھے۔ اس لئے اگر کسی سے ایسی غلطی ہو بھی جاتی۔ تو ایسا سبق پڑھاتے کہ پھر وہ عمر بھر نہ بھولتا۔

ڈھاکہ کے پہلے سفر کے بعد ایک کانفرنس کے سلسلہ میں نواب ڈھاکہ کے اشتیاق اور علماء دیوبند کے اصرار پر آپ کو دوبارہ ڈھاکہ جانا پڑا۔ مگر آپ نے فراست دیکھ لیا تھا۔ کہ وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آئے گا۔ جس کی ناگواری کی وجہ سے آپ کے لئے ان حضرات کا آخر وقت تک ساتھ دینا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے آپ نے وہ سفر اپنے ذاتی خرچ پر فرمایا تاکہ جس وقت چاہیں آزادی سے واپس آ سکیں۔

ان حضرات نے کلکتہ سے ہو کر ڈھاکہ جانا تھا۔ اس لئے نواب صاحب کی طرف سے ان کے قیام و طعام کا کلکتہ میں شایان شان انتظام تھا جس کے منتظم ایک رئیس ہوکہ نواب صاحب کے دوست تھے۔ باتوں باتوں میں وہ رئیس حضرت سے کہنے لگے کہ:۔

"آپ کے انکار کے بعد آپ کی تشریف آوری سے نواب صاحب کو بڑی مسرت ہوئی ہے۔ فرماتے تھے۔ کہ آپ کی شرطیں بڑی سخت ہیں۔ جن کو قبول نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک تو یہی کہ کوئی ہدیہ پیش نہ کیا جائے"

حضرت نے فرمایا:۔

"نہ دینے کی شرط کیا مشکل ہے۔ دینا تو دشوار ہو سکتا ہے۔ نہ دینا کیا مشکل ہے"

رئیس نے کہا:۔

"صاحب جس سے محبت ہوتی ہے۔ اس کو تو ہدیہ دینے کے لئے جی چاہتا ہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے محبوب کی خدمت نہ کی جائے"

حضرت نے جواب دیا۔

"یہ کیا ضروری ہے کہ محبوب کو اپنے گھر ہی بلا کر ہدیہ دیا جائے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے تو اس کے گھر جا کر یا گھر بھیج کر بھی تو ہدیہ دیا جا سکتا ہے"

رئیس ہونا اور بات ہے۔ سلیقہ سے گفتگو کرنا اور بات ہے۔ اس منتظم کو بات کرنی نہ آئی اور نخوت سے کہا کہ :-

" جناب معاف فرمائیے پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے کنواں پیاسے کے پاس نہیں "

حضرت تھانویؒ کو یہ کلمات سن کر بہت رنج ہوا مگر آپ نے ناگواری ظاہر کئے بغیر نہایت تہذیب سے اس رئیس کو مخاطب فرمایا کہ :-

" آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ حضرات کنواں ہیں اور ہم پیاسے اور ہمارے دماغ میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ہم لوگ کنواں ہیں اور آپ پیاسے۔ اور اس کی ہمارے پاس دلیل بھی ہے کہ ضرورت کی دو چیزیں ہیں دین اور دنیا ان میں سے ہماری حاجت کی ایک چیز تو آپ کے پاس تھی یعنی دنیا ! تو وہ اللہ تعالےٰ نے بقدر ضرورت ہمیں بھی دے رکھی ہے۔ لیکن آپ کی حاجت کی جو چیز ہمارے پاس ہے یعنی دین ! وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں۔ اس لئے آپ ہمارے محتاج ہوئے یا ہم آپ کے ؟ آپ پیاسے اور ہم کنواں ہوئے۔ یا ہم پیاسے اور آپ کنواں ہوئے۔ بس اس تازیانہ حکمت کے لگنے کی دیر تھی۔ کہ وہ رئیس شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے اس ناگواری کے بعد حضرت نے سفر کا ارادہ کر لیا کسی نے ٹیلیفون پر نواب صاحب کو بھی خبر کر دی۔ انہوں نے حضرت کو ٹیلیفون پر بلانا خلاف ادب سمجھ کر ضروری تار دیا رفقاء سفر کا اصرار کیا، کہ آپ واپسی کا ارادہ ترک کر دیں مگر آپ نے کسی کی خاطر اپنا اصول نہ چھوڑا اپنے کرایے پر تو گئے ہی تھے۔ بڑی آزادی سے واپس ہوئے اور الہ آباد پہنچ کر نواب صاحب کو تار کا جواب دیا۔ اس واقعہ سے فراست کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ جس کے مقابلہ میں کشف بہت ہے۔ اس لئے اس کی حدیث میں فضیلت آئی ہے (سیرت اشرف ۱۳۹ تا ۱۴۲)

تعلیم تہذیب

حضرت تھانویؒ نفسیات کے بڑے ماہر تھے۔ اور مدعیان تہذیب جدید سے منٹوں میں بدتہذیبی کا اقرار کرا لینے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ کی ناگواری، ناراضی، سختی اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ مناسب موقع پر تہذیب کیلئے ہوتی تھی۔ اور آپ دعوئے سے فرمایا کرتے تھے۔ کہ :-

" جس کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں اپنی جدید تہذیب کا دعوئے ہو کچھ دن میرے پاس رہ کر دیکھ لے۔ اللہ تعالےٰ کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالےٰ خود اسی کے منہ سے کہلوا دوں گا کہ واقعی ہم بدتہذیب ہیں اور حقیقی تہذیب وہی ہے جس کی شریعت مقدسہ نے تعلیم فرمائی ہے "

چنانچہ مظفر نگر کے سفر میں بھی آپ کو ایک ایسے ہی رئیس سے سابقہ پڑا جو بڑے بے باک۔ زبان دراز یہاں تک کہ بڑے بڑے حکام سے بھی نہ ڈرنے والے اور ان کے سامنے نہ جھکنے والے تھے۔ چونکہ ان کی عادت ہی ایسی بن چکی تھی۔ اس لئے انہوں نے کوتاہ اندیشی سے حضرت سے بھی بے ڈھنگی باتیں شروع کر دیں جس سے آپ کو از حد تکلیف ہوئی آپ نے انہیں مناسب الفاظ میں تنبیہ بھی فرمائی مگر ریاست کے نشہ میں وہ کچھ نہ سمجھ سکے اور نوبت ناگواری تک پہنچ گئی۔ حضرت نے انہیں مجلس سے اٹھ جانے کے لئے فرمایا مگر وہ بیٹھے رہے اس پر حضرت یہ فرماتے ہوئے خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے کہ :-

" اگر آپ نہیں اٹھتے تو میں خود اٹھ جاتا ہوں میں ایسے شخص کے ساتھ ہم نشینی بھی گوارا نہیں کرتا "

بس آپ کا اتنا فرمانا تھا کہ اُن پر ایسی ہیبت طاری ہوئی۔ کہ دست بستہ کہنے لگے " حضرت آپ بیٹھے رہیں میں خود ہی چلا جاتا ہوں "

اور اٹھ کر چلے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے حافظ صغیر احمد سے کہا کہ :-

" میرا تو عمر بھر کیلئے علاج ہوگیا۔ میں علماء اور ملازموں کو بہت ذلیل سمجھا کرتا تھا۔ اب ہر ایک مولوی اور ملاّ کا ادب و لحاظ کرتا ہوں۔

.... بیں بڑے بڑے حکام سے بھی مرعوب نہیں ہوتا۔ اس روز مولانا سے اتنا مرعوب ہوا کہ ڈانٹ پڑنے کے بعد ایک لفظ بھی میرے منہ سے نہ نکل سکا۔"

اس لئے حضرت مجذوب فرمایا کرتے تھے کہ اس ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے۔

نواب رام پور کو سبق

ایک مرتبہ نواب رام پور نے قادیانیوں سے مناظرہ کا انتظام کیا۔ اور اس غرض کے لئے علماء دیوبند کو مدعو کیا چنانچہ بہت سے اکابر علماء تشریف لائے۔ اور اپنے حضرات کے اصرار پر حضرت نے بھی بادل نخواستہ شرکت فرمائی۔ مناظرہ سے فراغت پانے کے بعد جب سب حضرات واپس ہونے لگے۔ تو نواب صاحب نے حضرت کو کچھ زیادہ رقم دینی چاہی جو حضرت نے بواسطہ پیام یہ کہہ کر واپس کر دی کہ:۔

" ریاست کو بیت المال سے زائد از ضرورت صرف کرنے کا شرعاً اختیار حاصل نہیں ہے "

اس سے نواب صاحب حضرت کے اصولِ شرعیہ کی پابندی سے بہت متاثر ہوئے خواہ ان سے اس پر بعد میں عمل نہ ہو سکا ہو۔ مگر حضرت نے انہیں ایک ایسا سبق دیا جو کوئی دوسرا نہ دے سکا۔ اور جس میں ان کی دینوی اور اخروی فلاح و نجات مضمر تھی۔

امیر بہاول پور کو تعلیم دین

ایک سلسلہ میں نواب بہاول پور کی طرف سے حضرات علماء کرام کو مدعو کیا گیا۔ ان میں حضرت تھانویؒ بھی شامل تھے۔ واپسی پر نواب صاحب کی طرف سے سب حضرات کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ بطورِ خلعت اور پچاس پچاس روپے بنام دعوت عطا کئے گئے اس وقت تو حضرت نے احترام نواب صاحب کے خیال سے سب کے ساتھ یہ رقم لے لی لیکن خلوت میں وزیر صاحب سے عذر فرمایا کہ:۔

" یہ رقم مجھ سے واپس لے لی جائے۔ کیوں کہ یہ بیت المال سے دی گئی ہے۔ جس کا میں مصرف نہیں "

انہوں نے عرض کیا کہ:۔

" چونکہ اس رقم کا کاغذات سرکار میں اندراج ہو چکا ہے اس لئے اب اس کی واپسی کی کوئی صورت نہیں "

حضرت نے فرمایا:۔

" خیر! اگر خزانہ میں واپسی نہیں ہو سکتی تو اس رقم کو مقامی علماء اور طلباء میں صرف کر دیا جائے۔ کیوں کہ شرعاً بیت المال کے مصرف کے وہ قریب ہیں "

غرض جو کچھ حضرت کو ملا وہ آپ نے سب کا سب واپس کر دیا۔ لیکن نہایت سلیقہ سے اور طریقہ سے۔ جب یہ بات نواب صاحب کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اس "عطائے تو بلقائے تو" پر خفگی کی بجائے مسرت کا اظہار فرمایا۔

خلعت کی واپسی

ایسا ہی واقعہ آپ کو ریاست خیر پور سندھ میں پیش آیا۔ وہاں بھی آپ نے خلعت کی واپسی کا یہی عذر فرمایا۔ اس پر وزیر متعلقہ نے کہا کہ نواب صاحب کو واپسی خلعت ناگوار ہو گی تو حضرت نے فرمایا۔

" اگر یہ اندیشہ ہے تو ان کو معلوم ہی کیوں کرایا جائے۔ بلکہ جو نقد بعنوان خلعت ملا ہے اس کو مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ کیوں کہ وہ لوگ اس کے صحیح مصرف ہیں "

چونکہ حضرت کی نیت نیک ہوتی تھی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے آپ کو ایسے اتفاقی سوالات کا برموقعہ ایسا جامع مانع جواب القا فرماتے تھے۔ کہ دوسرے کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"الحمد للہ مجھے کسی جگہ خلافِ شریعت یا خلافِ طبیعت کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا"

ایک نواب کا اقرارِ بدتہذیبی

ایک خاندانی۔ مقتدر۔ ذی وجاہت۔ رئیس اور نواب نے مبلغ دو سو روپیہ مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون کی امداد کے لئے بھیجے جو کسی چندہ کے بغیر توکلاً علی اللہ حضرت کی سرپرستی اور نگرانی میں خاص خانقاہ کے اندر قائم تھا۔ اس عطیہ کے ساتھ انہوں نے تشریف آوری کی درخواست بھی بھیج دی۔ حضرت نے یہ لکھ کر روپے واپس کر دیئے کہ :۔

"اگر اس روپیہ کے ساتھ بلانے کی درخواست نہ ہوتی تو مدرسہ کے لئے روپیہ لے لیا جاتا اب اس اقتران سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے۔ کہ شاید مجھ کو متاثر کرنے کے لئے یہ رقم بھیجی گئی ہے۔ آپ کی یہ غرض نہ سہی لیکن میرے اوپر توطبعی طور پر اس کا یہی اثر ہوگا کہ میں آزادی کے ساتھ اپنے آنے نہ آنے کے متعلق رائے قائم نہ کر سکوں گا کیوں کہ انکار کرتے ہوئے شرم آئے گی"

نواب صاحب بڑے فہمیدہ اور جہاں دیدہ تھے۔ فوراً سمجھ گئے کہ عطیہ اور درخواست اکٹھی نہ بھیجنی تھی۔ فوراً معذرت نامہ لکھا کہ :۔

"آپ کے تنبیہ کرنے سے اب یہ معلوم ہوا کہ واقعی مجھ سے یہ سخت بدتہذیبی ہوئی۔ میں اب اپنی درخواست تشریف آوری واپس لیتا ہوں اور روپیہ مکرر ارسال خدمت کرتا ہوں۔ براہِ کرم مدرسہ کے لئے قبول فرما لیا جاوے"

حضرت نے بخوشی قبول فرماتے ہوئے نواب صاحب کو لکھا کہ :۔

"ابھی تک تو آپ میری ملاقات کے مشتاق تھے۔ اور اب آپ کی تہذیب اور شرافت نے خود مجھ کو آپ کی ملاقات کا مشتاق بنا دیا ہے"

کچھ مدت کے بعد نواب صاحب کے ہاں اس شرط پر تشریف لے گئے کہ کسی قسم کا ہدیہ پیش نہ کیا جائے

محبت و مصلحت کا تصادم

جب آپ واپس آنے لگے تو نواب صاحب کی والدہ ماجدہ نے جو آپ کی پیر بہن تھی تقریباً سو روپیہ خدمت میں پیش کرنا چاہا اس پر آپ نے خلافِ شرط ہونے کا عذر فرمایا نواب صاحب نے عرض کیا کہ شرط تو میرے ساتھ تھی۔ یہ والدہ صاحبہ کی طرف سے ہے۔ فرمایا :۔

"والدہ اور والد میں کیا فرق ہے گھر تو ایک ہی ہے"

نواب صاحب نے مجبور ہو کر کہا :۔

"حضرت اگر کسی کا جی خدمت کرنے کو چاہے تو آخر وہ کیا کرے"

فرمایا :۔

"میں خانہ بدوش تو نہیں ہوں کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ میرے ٹھکانے پر بھی تشریف لانا ممکن ہے"

چونکہ نواب صاحب ماشاء اللہ بڑے سلیم الفطرت واقع ہوئے تھے۔ اور ایک پرانے دیندار خاندان کے مایہ ناز فرزند تھے۔ اس لئے انہوں نے حضرت سے عام لوگوں کی طرح کچھ اصرار نہ فرمایا اور خاموش ہو رہے پھر ایک معتدبہ مدت گزر جانے کے بعد تھانہ بھون گئے اور نذرانہ پیش کیں حضرت نے بڑی مسرت و احترام سے قبول فرمائیں۔

نواب صاحب کی یہ دانشمندی قابلِ داد تھی۔ کہ انہوں نے حضرت کے ذہن کو گذشتہ واقعہ کی طرف منتقل نہ کرنے کے لئے اور تلبس پر بار نہ ڈالنے کی غرض سے پہلی رقم کی مقدار بدل دی۔ تاکہ محض وضعداری نہ سمجھی جاتے۔ نواب کے مؤدب و مہذب ہونے کی وجہ سے اور ان کی اہلیت اور عقیدت کی بنا پر حضرت کے ان کے ساتھ خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ کیوں کہ حضرت کو با اصول انسان سے ملنے میں بڑی فرحت ہوتی تھی۔

سیرت اشرف

ایک رئیسہ کا علاج

حضرت تھانوی کو بحالت سفر چونکہ مختلف المزاج لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اس لئے ہر ایک کے مرض کا علاج بھی مختلف ہوتا تھا۔ ایک دنیادار رئیسہ نے دار الطلبہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور تیار کرایا۔ اور اس کے افتتاحی جلسہ کی تاریخ مقرر کر کے مہتمم صاحب کو لکھا کہ اپنے مدرسہ کے سرپرستوں اور دیگر اراکین کو اطلاع کر دیں۔ کہ اس تاریخ پر مدرسہ میں آجائیں مہتمم صاحب نے اس اطلاع کے ساتھ حضرت کو بھی شرکت کی دعوت دی تو آپ نے بدیں وجہ شرکت فرمانے سے انکار کر دیا کہ :-

"ان کو اس حاکمانہ لہجہ میں بلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس طرح حکمنامہ بھیج کر بلانا خلاف تہذیب ہے یہ بھی کوئی بلانے کا طریقہ ہے۔ میں نہیں آؤں گا۔ کیا وہ کسی رئیس کو ایسے طریقہ سے دعوت دے سکتی تھیں؟"

مہتمم صاحب نے مدرسہ کی مصالح کی بنا پر تاویلاً اصرار کیا کہ یہ اُن رئیسہ کا فعل نہیں اس کے میر منشی کا ہے اس پر حضرت نے لکھا :-

" پھر بھی یہ شکایت ہے کہ اس معاملہ کو بالکل میر منشی ہی پر کیوں چھوڑ دیا۔ مسودہ خود دیکھ کر منظوری دیتیں جس طرح حکام کے دعوت ناموں میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان کے بلانے پر تو اب میں نہیں آؤں گا البتہ اگر آپ حکم دیں تو جوتیاں چٹخاتا ہوا سر کے بل حاضر ہوں گا۔ مگر رئیسہ سے نہیں ملوں گا نہ اس سے کوئی گفتگو بلاواسطہ یا بالواسطہ کروں گا"

مہتمم صاحب نے اس مشروط شرکت کو ہی غنیمت سمجھا۔ اور حضرت کو تشریف آوری کے لئے لکھا۔ چنانچہ حضرت وہاں تشریف لے گئے۔ بڑا پُر اثر وعظ فرمایا جس سے رئیسہ بھی متاثر ہوئیں۔ مگر وعظ فرمانے کے فوراً بعد حضرت کسی کو ملے بغیر یہاں تک کہ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کو بھی ملے بغیر چلے آئے۔ تاکہ کسی کو کچھ کہنے سننے یا اصرار کرنے کا موقع نہ ملے۔ رئیسہ کو بھی اس واقعہ کا علم ہو گیا۔ اور انہوں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ علماء میں بھی خود دار لوگ ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے مدرسہ میں جو مٹھائی تقسیم کی تھی۔ اس میں سے اپنا حصہ حضرت کو اسٹیشن پر یہ کہلا کر بھیجا کہ یہ مٹھائی عام تقسیم کی نہیں خود میرے حصہ کی ہے۔ اس لئے ضرور قبول فرمائیں اور واپس نہ فرماویں چونکہ رئیسہ صاحبہ کو اپنے باطنی مرض کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے حضرت نے وہ قبول فرمالی۔ اور اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے حضرت نے علماء کو بنظر حقارت دیکھنے والی کا ایسا علاج فرمایا کہ پھر وہ علماء کی بڑی عزت کرتی رہی۔

انگریز کی دعوت

الافاضات الیومیہ کے ملفوظ ۳۷ میں حضرت کا ارشاد درج ہے۔ کہ مجھے اکثر اوقات انگریزوں کے ساتھ بھی سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر کبھی کوئی شریر نہیں ملا۔ ایک مرتبہ ایک دوست کے اصرار پر کلکتہ سے سیکنڈ کلاس میں سوار ہوا اسی ٹمبی ریلوے کا ایک انگریز افسر بھی سوار ہوا۔ جسے اوپر کے تختہ پر جگہ ملی کہنے لگا کہ ہم کو نیچے کے تختہ (سیٹ) پر تھوڑی سی جگہ کھڑکی کی طرف آپ دے دیں۔ ہم کو بار بار ریلوے کے انتظام کے لئے باہر آنا جانا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہمارا کوئی حرج نہیں۔ آپ بیٹھ جائیں وہ بیٹھ گیا۔ جب کھانے کا وقت آیا۔ میں نے ان دوست کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ آپ کھانا کھائیں گے۔ کہا مجھ کو کیا عذر ہے۔ ہم نے کھانا بازار سے خریدا تھا جو پتوں پر ملا تھا۔ ہم نے اُس کو بھی اس خیال سے کہ برتنوں کو کون دھوتا پھرے گا۔ انہی پتوں پر کچھ کھانا رکھ کر دے دیا جو اُس نے بڑی خوشی سے لیکر کھالیا۔ ایک صاحب پوچھنے لگے کہ برتن میں کھانا کیوں نہ دیا؟ میں نے کہا چونکہ پڑوسی تھا۔ اس لئے حق جوار ادا کیا۔ حق احترام ادا نہیں

کیا کہ اسلام سے محروم تھا۔ وہ بردوان کے اسٹیشن پر اترا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:۔

"آپ کو بہت تکلیف ہوا ہماری وجہ سے اور ہم کو آپ کی وجہ سے بہت آرام ملا"

ایک رفیق سفر کہنے لگے اگر آپ برتنوں میں کھانا دیتے تو زیادہ شکریہ ادا کرتا۔ میں نے کہا کہ یہ بھی ممکن تھا کہ نہ کرتا۔ برتن میں کھانا دینے سے اپنے کو بڑا سمجھتا کہ ہمارا احترام کیا گیا ہے۔ پھر شکریہ کی ضرورت ہی کیا محسوس ہوتی۔

تعظیمی رسوم کا خاتمہ

ہر علاقہ میں ملنے جلنے۔ کھانے پینے۔ اور تعظیم و تکریم کی مختلف رسومات رائج ہوتی ہیں۔ حضرت تھانویؒ اپنے سفر کے دوران میں جہاں جہاں بھی ایسی رسومات کو دیکھتے ان کے انسداد و استیصال کی طرف فوری توجہ دیتے اور اس تہذیب نذیر سے ان رسومات کے عادی لوگوں کو سمجھاتے کہ وہ فوراً حضرت کے فرمان سے متاثر ہو کر انہیں ترک کر دیتے۔

اعظم گڑھ میں یہ دستور تھا کہ حضرت کے ساتھ ایک جم غفیر کی دعوت بھی کی جاتی۔ حضرت تھانویؒ میزبان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کے عادی نہ تھے۔ اس لئے کبھی کسی سے کوئی فرمائش نہ کرتے پر تکلف کھانوں کی بجائے سادہ معمولی کھانوں سے خوش ہوتے۔ آپ نے وہاں کی اس رسم کے انسداد کی یہ ترکیب نکالی: کہ جو شخص بھی دعوت کرتا آپ شرط لگا دیتے کہ میں تنہا کھاؤں گا۔ اور محض خشکہ اور ارہر کی دال کھاؤں گا کیونکہ وہاں بیلن کی روٹیوں کا رواج ہے جو ذرا سخت ہوتی ہیں اور مجھے موافق نہیں آتیں اس طرح آپ میزبان کو بہت بڑے بار سے بچا لیتے۔

بنگال میں یہ رسم تھی کہ جو بھی ملنے آتا۔ آکر پاؤں کو چھوتا۔ جیسے پنجاب میں بھی اکثر پیروں کے ہاں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے روکنے کی یہ ترکیب نکالی۔ کہ اول آپ منع فرماتے۔ جو اس کے بعد بھی آپ کے پاؤں پکڑتا۔ تو اس کے لئے علاج بالمثل فرماتے یعنی آپ بھی اس کے فوراً پاؤں پکڑ لیتے اور جب وہ شرمندہ ہو کر روکتا تو فرماتے:۔

"اگر یہ کوئی اچھی بات ہے تو مجھے اس سے کیوں روکتے ہو۔ اور اگر بری بات ہے تو تم ایسی حرکت کیوں کرتے ہو"

بس دو چار مرتبہ ایسا کرنے کی دیر تھی کہ اس کی شہرت عام ہو گئی اور لوگوں نے اس بیہودہ رسم کو ترک کر دیا۔ ضلع اعظم گڑھ میں یہ دستور بھی تھا۔ کہ جب کسی بڑے آدمی کی سواری گزرتی تو چند لوگ آگے آگے ہٹو بچو کہتے ہوئے گذرتے جو کوئی آگے آتا ہوا دکھتے اسے ہٹا دیتے حضرت نے ان لوگوں سے فرمایا:۔

"راستہ کسی کی ملک نہیں ہے سب کو چلنے کا برابر حق ہے۔ یہ حرکت خلاف شرع ہے۔ اس کو چھوڑنا چاہیئے اور آئندہ ہرگز ایسا نہ کیا جائے"

بس لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور آئندہ کیلئے یہ رسم موقوف ہو گئی۔

ایک جگہ یہ دستور تھا کہ لوگ پالکی کے ساتھ دائیں بائیں دوڑتے ہوئے چلتے۔ حضرت نے منع فرمایا کہ مجھ کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ ہم تو محبت سے ایسا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ پھر مجھے دکھاتے کیوں ہو۔ دائیں بائیں نہ چلو۔ پالکی کے پیچھے چلو۔ جہاں سے مجھ کو نظر نہ آئے چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد جو حضرت نے مڑ کر دیکھا۔ تو کوئی بھی نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ رسم محض دکھلاوے کے لئے ہوتی ہے مگر وہ بچارے کیا کرتے کسی مقتدا نے کبھی انہیں ٹوکا ہی نہ تھا۔ وہاں یہ بھی دستور تھا کہ علماء ہندوؤں سے بات بھی نہ کرتے تھے۔ اور اگر کوئی علماء کی تعظیم کے لئے نہ اٹھتا تو اسے اہانت سمجھتے۔ حضرت جب ایک انگریزی سکول کے پاس سے گزرے تو دستور کے مطابق سب ہندو طلباء اور مدرسین تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ ان کا یہ سلوک دیکھ کر حضرت سکول کے اندر تشریف لے گئے۔ اور نہایت سادگی اور ملاطفت کے ساتھ سب سے ملے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے جس سے

وہ لوگ بہت مسرور ہوئے اور تعجب کرنے لگے کہ ایسے مولوی بھی ہوتے ہیں

ایک جگہ دستور کے مطابق گاؤں کے چوہدری نے چندہ کر کے دوصد روپیہ حضرت کو نذرانہ دیا۔ لیکن یہ ظاہر نہ کیا کہ یہ گاؤں والوں سے جمع کیا گیا ہے۔ اس کی مالی حالت سے حضرت کو شبہ ہوا کہ یہ از خود اتنا نہیں دے سکتا۔ اس لئے حضرت نے پوچھا یہ آپ کی طرف سے ہے یا اس میں اور بھی شریک ہیں جواب ملا اس میں دوسرے بھی شریک ہیں فرمایا :۔

" ہدیہ محبت کے لئے ہوتا ہے جب دینے والے کو میں نہیں جانتا تو مجھ کو اُن سے محبت کیسے ہوگی۔ اس لئے ہر ایک کی رقم اُس کو واپس کردو۔ پھر جس کو دینا ہوگا۔ ہر ایک خود آکر اپنے ہاتھ سے دے گا۔ جس سے مجھے پتہ چلے گا۔ کہ یہ میرا محسن ہے اور مجھے اس سے محبت ہے۔"

چوہدری صاحب نے عذر کیا کہ اب تو آپ جارہے ہیں فرمایا :۔

" میں بہت قریب مقام پر جارہا ہوں۔ جہاں پہنچنا سب کو آسان ہے۔ جس کو شوق ہو وہاں آکر ہدیہ دے "

مگر کوئی بھی ہدیہ دینے نہ آیا۔ کیوں کہ وہاں یہ رسم تھی۔ کہ اگر کوئی مولوی آتے اور اسے معقول نذرانہ نہ دیا جاتے تو وہ بُرا مناتا تھا۔ مگر جب لینے والا ہی نہ لے تو پھر کسی کو پیچھے دوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

اعظم گڑھ کے ان واقعات کے سلسلہ میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ :۔

" میں نے وہاں کی اور رسموں کو تو مٹا دیا۔ لیکن ایک رسم کے مٹانے میں کامیاب نہ ہوسکا وہ یہ کہ جب کوئی عالم آتا تو موضع کے اکثر لوگ یہاں تک کہ چھوٹے لڑکے بھی استقبال کے لئے دُور تک آتے اور ایسا ہی رخصت کے وقت کرتے۔ وہاں کے لوگوں میں بہت ہی صلاحیت اور دینداری ہے۔ وہاں کے انگریزی خواں خوش عقیدہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے صرف معاش کے لئے انگریزی پڑھتے ہیں "

آریہ کا اقرارِ کفر ایک سفر کے دوران میں آریہ سماج کے ایک لیکچرار نے حضرت کی باتیں سن کر آپ سے یہ سوال کیا کہ دو شخص ہیں۔ ان میں ایک مسلم ہے اور دوسرا غیر مسلم۔ دونوں نے نیک نیتی سے کوئی نیک عمل کیا تو اس عمل کا اجر دونوں کو یکساں ملے گا یا مختلف

حضرت نے فرمایا کہ :۔

" یہ سوال آپ کی دانشمندی اور تہذیب سے نہایت بعید ہے۔ کیوں کہ آپ نے ایک ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب آپ کے ذہن میں موجود ہے "

اس نے کہا :۔

" یہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ اس کا جواب میرے ذہن میں موجود ہے "

آپ نے فرمایا :۔

" جب اس جواب کے سب مقدمات آپ کے ذہن میں موجود ہیں تو وہ جواب بھی موجود ہے۔ کیوں کہ جب ملزوم موجود ہے۔ تو لازم کا وجود بھی ضروری ہے "

اُس نے پھر سوال کیا کہ :۔

" یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ سب مقدمات میرے ذہن میں موجود ہیں "

رمایا کہ :۔

"دیکھئے! میں آپ ہی کے منہ سے ان مقدمات کے موجود فی الذہن ہونے کا اقرار کرائے لیتا ہوں۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے۔ کہ مختلف مذاہب
ہب ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس کی بحث نہیں کہ حق مذہب کونسا ہے"

س نے کہا :۔

"بے شک حق تو ایک ہی مذہب ہو سکتا ہے"

حضرت نے فرمایا :۔

"ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہے۔ دوسری بات میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا مذہب حق والے کی مثال
مطیع سلطنت کی سی اور باطل والے کی مثال باغی سلطنت کی سی نہیں؟"

س کا بھی اس آریہ نے اقرار کیا اس دوسرے مقدمہ کو تسلیم کر لینے کے بعد حضرت نے پھر اُسے فرمایا۔

"کیا باغی کے سارے کمالات محض اس وجہ سے کہ وہ باغی ہے نظر انداز نہیں کر دیئے جاتے اور کیا باوجود صاحب کمالات ہونے کے
اس کو عدالت سے سزا نہیں ملتی اور کیا وہ سزا عقل و انصاف کے خلاف ہوتی ہے؟"

جب اُس نے ان سب باتوں کے صحیح ہونے کا اقرار کر لیا۔ تو اس پر حضرت نے فرمایا :۔

"بس یہ تینوں مقدمات آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہیں تو اس کا نتیجہ بھی ضرور آپ کے ذہن میں ہے۔ اور وہی
آپ کے سوال کا جواب ہے تو ایسی حالت میں آپ کے سوال کا صاف یہ مطلب ہوا کہ میں اپنے منہ سے آپ کو کافر کہوں سو ہماری
شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بلا ضرورت ہم کسی کو کافر کہیں"

اس آریہ نے خوش ہو کر کہا :۔

"واقعی مجھے اس کا شوق تھا۔ کہ میں اپنے بارے میں آپ کے منہ سے یہ لفظ سنوں سے منہ سے اپنے بارے میں کافر کا لفظ
سننے میں بھی مزہ آتا ہے"

حضرت نے جواب دیا :۔

"خیر یہ آپ کے لئے تو خوبی ہے۔ لیکن میرے لئے سخت بدنما بات ہے"

اہم سبق

لاہور کا سفر ایک ذاتی ضرورت کے ماتحت کیا جا رہا تھا۔ اس لئے آپ نے اپنی روانگی کو پردہ اخفا میں رکھا
اور شروع سے ایسے انتظام کر دیئے۔ کہ سوائے متعلقین کے دوسروں کا اس سفر کا علم نہ ہو سکے۔ چنانچہ سہارنپور
کے بعد آپ سیدھے اپنے بھتیجے حامد علی صاحب اور محمود علی کے ہمراہ جو اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ حامد علی صاحب کے مکان پر اترے
بات سے بلا اطلاع مدرسہ مظاہر العلوم میں تشریف لے گئے بس آپ کا وہاں پہنچنا تھا۔ کہ کسی پوشیدہ مقناطیسی کشش سے آناً فاناً مشتاقان
کا اتنا ہجوم ہو گیا۔ کہ مدرسہ قدیم کی عمارت ناکافی ہو گئی۔ اور حضرت کو چند قدم چلنا دشوار ہو گیا ہر شخص زیارت و مصافحہ کے لئے بیتاب تھا۔
حضرت کو ہاتھ بڑھاتے ہر ایک کو مصافحہ کی صورت بہم پہنچا رہے تھے۔ ہجوم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر حضرت بھی اتنی دیر ہاتھ بڑھائے رکھنے
سے دیکھ کر مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ نے مصافحہ کرنے والوں کو روکا۔ مگر حضرت نے خود ان کو روک دیا۔ کہ انہیں کسی کو نہ روکا جائے

میری محبت ان کو لے آئی ہے میں یہاں ملنے ملانے کو تو آیا ہوں، ناظم صاحب نے کہا کہ حضرت والا کو تکلیف ہوگی۔ فرمایا کبھی احباب کے ملنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ یہاں اور کام ہی کیا ہے۔ تھانہ بھون تو دوسرے مشاغل ہوتے ہیں اس لئے وہاں انضباطِ اوقات ضروری ہے۔ ورنہ کچھ بھی نہ ہو سکے یہ جو اتنا کام ہو گیا ہے وہ انضباطِ اوقات ہی کی بدولت ہے جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا۔ تب ناظم صاحب نے کچھ سختی کی تو حضرت نے پھر روک دیا اس پر ناظم صاحب نے کہا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اور لوگ ہیں کہ مانتے نہیں۔ اب سنتے ہیں یہ کوئی انسانیت اور تہذیب ہے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ :۔

" دیکھئے! جس کے سپرد انتظام ہوتا ہے۔ اس کو سختی کرنا ہی پڑتی ہے۔ بغیر اس کے کام نہیں چلتا۔ جو لوگ مجھ کو سخت کہتے ہیں اب دیکھلیں حقیقت میں میں سخت ہوں یا نرم حالانکہ حافظ صاحب بیچارے بہت نرم ہیں لیکن انتظام کے لئے ان کو سختی کرنا پڑ رہی ہے۔ کوئی اجنبی آدمی اس کو دیکھے تو تعجب ہوگا۔ کہ جس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ بہت سخت ہے وہ کتنا نرم ہے اور جو نرم ہیں وہ سختی کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ جب تک تھانہ بھون میں ہوں وہاں کے انتظام اور کام کا تعلق مجھ سے ہے۔ اگر میں سختی نہ کروں تو کچھ کام بھی نہ کر سکوں۔ اور یہاں ملنا ملانا ہی کام ہے اس لئے سختی کی ضرورت نہیں۔ نرم ہوں اور ناظم صاحب یہاں کے منتظم ہیں اس لئے وہ یہاں بہت سخت معلوم ہوتے ہیں "

(ارمغاں جاوداں ص۱۴)

دوسروں کی رعایت

حضرت نے اپنے پروگرام کے مطابق سہارنپور سے دو بجے رخصت ہونا تھا۔ احباب نے تقاضا کیا کہ دو بجے دن میں سخت گرمی ہوگی۔ لہٰذا بعد مغرب طوفان میل سے تشریف لے جائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مولوی شبیر علی سے مشورہ کر لیا جائے۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ لاہور کے لوگ اس گاڑی سے انتظار کریں گے۔ اہل مدرسہ کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تجویز کی جائے کہ زیادہ قیام کا موقع مل سکے۔ گھر میں آئی ہوئی نعمت و برکت کو جلد چھوڑنے کو کسی کا بھی جی نہ چاہے۔ اس لئے کسی نے تجویز کی کہ لاہور تار دے دی جائے اس کے ساتھ ہی یہ قباحت نظر آئی کہ رات کو گاڑی میں ہجوم زیادہ ہونے کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ اور اہل لاہور کی پریشانی علاوہ۔ اسکے اس لئے حضرت کی خواہش کے مطابق دو بجے دن کی ہی گاڑی سے روانگی طے پائی۔ جب حضرت کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا :۔

" بہتر آرام تسلیم و انقیاد ہی میں ہے "

چنانچہ سہارنپور سے وقت مقررہ پر روانہ ہوئے۔ یہاں سے حامد علی صاحب۔ مولوی ظہور الحسن صاحب مولوی ولی محمد صاحب بٹالوی اور مولوی حافظ محمد سلیمان صاحب رنگونی بھی حضرت کی اجازت سے رفقاء سفر میں شامل ہو گئے۔ اگرچہ خاص مصالح کی بنا پر حضرت نے پہلے سے اہل پنجاب عوام و خواص سب پر اس سفر کے مخفی رکھنے کا خاص اہتمام فرمایا تھا۔ اور حضرت کی آمد کا صرف ڈاکٹر عزیز احمد صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ امرتسری کو علم تھا۔ اور انہیں تاکید بھی تھی کہ آمد کو مخفی رکھنا ہے۔ مگر اس گاڑی میں دو ایسے آدمی بھی تھے۔ جو لاہور جا رہے تھے اور ان کو حضرت کے ہم سفر ہونے کا علم ہو چکا تھا۔ جب وہ حضرت سے ملنے آئے تو حضرت نے انہیں فرمایا کہ :۔

" لاہور میں کسی کو نہ کہنا کہ میں یہاں آیا ہوں۔ اگر تم نے کہا تو تمہیں گناہ ہوگا۔ اس لئے کہ تمہاری اطلاع پر لوگ میرے پاس آ جائیں گے اور ہجوم سے مجھے تکلیف ہوگی۔ اور میرے نہ مل سکنے سے ان کو تکلیف ہوگی اور مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے "

(ارمغانِ جاوداں ص۱۴)

اس پر وہ لوگ بڑے حیران ہوئے۔ کہ ہمارے مشائخ۔ علماء اور لیڈر تو جہاں جاتے ہیں روانہ ہونے سے پہلے اخبارات کے ذریعے اپنے پروگرام سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ شایانِ شان استقبال ہو۔ اور ان اپنے پروگرام کو شہرت دینے اور استقبال کرنے والوں کے ممنون ہوتے ہیں اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔

زیارتِ مزارات

قیام لاہور کے دوران میں آپ سب سے پہلے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بغرضِ فاتحہ خوانی تشریف لے گئے آپ وہاں صبح کو ایسے وقت پہنچے۔ جب کہ زائرین کی کثرت تھی۔ آپ حسبِ معمول صاحبِ مزار کی پائینتی کی طرف قدرے پیچھے ہٹ کر ہاتھ چھوڑے کھڑے کھڑے ایصالِ ثواب میں مشغول ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب حضرت کے پیچھے کھڑے تھے۔ کہ حضرت کو اس حالت میں کھڑے دیکھ کر ایک قوی ہیکل مجاور نے زور دار ہیبت ناک آواز سے پکار کر ہاتھ آگے باندھو مگر حضرت کو آواز کی طرف مطلق التفات نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر اُس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور تند آواز میں یہی پکارتا رہا اور ہر مرتبہ اپنی آواز کو پہلے سے بلند کرتا رہا۔ لیکن حضرت بدستور ادھر متوجہ رہے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ حضرت داتا گنج بخش:۔

"بہت بڑی شخصیت ہیں۔ عجب رعب ہے۔ وفات کے بعد بھی سلطنت کر رہے ہیں"

دوسرے روز صبح کے ناشتہ کے بعد آپ جہانگیر کے مقبرہ پر تشریف لے گئے۔ نورجہاں کے مزار کو دیکھ کر فرمایا کہ اوّل یہیں چلیں عوام تو اس قبر پر کم آتے ہیں گے۔ وہاں سے ہو کر جہانگیر کے مزار پر تشریف لے گئے۔ بعد ازاں لاہور کے دیگر تاریخی مقامات شاہی مسجد۔ قلعہ۔ شالامار باغ۔ خانقاہ میاں میر وغیرہ کو دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب ان کی تاریخی حیثیت۔ تاریخی واقعات و حالات بتاتے گئے اور حضرت ہر چیز پر محققانہ نظر دوڑاتے گئے اور اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔

محصول کی ادائیگی

آپ بلا ادائے محصول کوئی چیز نہ لے جاتے اگر ذرا بھی کسی چیز میں شبہ ہوتا کہ یہ مقررہ وزن سے زائد ہو گی تو آپ اُسے فوراً وزن کراتے اور اس کا محصول ادا کرتے۔ اس کا اتنا اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور جاتے ہوئے کچھ گنے ساتھ تھے۔ جب ادائیگی محصول کے لیے تلوانے لگے تو کوئی تولے نہیں۔ یہاں تک کہ غیر مسلم ملازمین ریلوے بھی کہیں کہ حضرت آپ یونہی لے جائیے۔ تلوانے کی ضرورت نہیں ہم گارڈ کو کہہ دیں گے۔ فرمایا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ کہا گیا غازی آباد تک فرمایا غازی آباد سے آگے کیا ہو گا۔ کہا گیا یہ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔ اور کانپور تک پہنچا دے گا۔ جہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا فرمانے لگے نہیں۔ وہاں ختم نہ ہو گا۔ بلکہ آگے ایک اور سفر آخرت بھی ہے وہاں کا انتظام کیا ہو گا۔ یہ سن کر سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ جن میں تعلیم یافتہ ہندو بابو بھی تھے۔ کہنے لگے کہ اس زمانہ میں بھی خدا کے ایسے ایماندار بندے موجود ہیں جو خدا سے ڈر کر احتیاط کرتے ہیں۔

کرایہ کی ادائیگی

اس میں بھی آپ بڑے محتاط تھے۔ بلا ٹکٹ اور بلا ادائے کرایہ سفر کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے۔ نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دیتے۔ ایک دفعہ ایک طالب علم حضرت کی زیارت کے لئے تھانہ بھون آیا۔ آپ اُس وقت سفر پر جا رہے تھے۔ اس لئے تنگی وقت کی وجہ سے گارڈ کو کہہ کر بلا ٹکٹ حضرت کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اور دوسرے اسٹیشن نانوتہ پر گارڈ کو کرایہ دینے لگا۔ تو اس نے کہا معمولی کرایہ ہے تم غریب آدمی ہو جاؤ۔ اُس نے آ کر حضرت سے کہا کہ معاملہ یہ ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ گارڈ ریلوے کمپنی کا ملازم ہے۔ ریل کا مالک نہیں ہے۔ اس لئے یہاں سے کا کرایہ برابر تمہارے ذمہ ہے داموں کا ٹکٹ لے کر اُسے پھاڑ دو تاکہ کمپنی کا حق ادا ہو جائے۔ اور تم حق العباد سے بری ہو جاؤ اس ڈبے میں ایک انگریزی خواں آریہ مبلغ بھی بیٹھا تھا۔ اس نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا۔ کہ میں تو خوش ہوا تھا۔ کہ اس نے غریب پر ترس کھایا ہے۔ مگر آپ کی تقریر سن کر اقرار کرتا ہوں کہ میری خوشی بے ایمانی کی تھی۔

استغناء استغناء بھی آپ کی طبیعت کا ایک خاصۂ خاص تھا۔ اور آپ اس ارشاد نبوی کے مظہر تھے۔ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔ کہ میں تم سے قطعاً کوئی اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر صرف اللہ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو امراء وزراء اور مال وزر تو کیا عوام سے بھی استغناء تھا۔

امراء سے استغناء کا یہ عالم تھا۔ کہ جہاں حیدر آباد دکن جانے والے اکثر علماء و مشائخ والیٔ دکن کی خدمت میں باریابی اور وظیفہ ومنصب کی آرزو لے کر جاتے تھے۔ وہاں حضرت کو ملنے سے بھی عار تھا۔ جس کی تفصیل خود حضرت کی زبانی لطف دے گی۔ فرماتے تھے کہ "اہل علم کے لئے یہ بات بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔ کہ وہ امراء سے خلط کریں۔ اس لیے کہ غربا کو جو مصلح سے نفع ہوتا ہے۔ امراء سے وہ بھی ضائع ہو جاتا ہے اسلیے قلوب پر مصلح کا وہ اثر نہیں رہتا۔ مجھ کو حیدر آباد دکن میں ایک دوست نے مدعو کیا دیوبند کے بعض احباب خاص اہل علم نے مشورہ دیا کہ وہاں نواب صاحب سے ملاقات ضروری ہے میں نے کسی کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہاں پہنچ کر سات ہی روز گزرے تھے۔ کہ فلاں نواز جنگ کا ایک پرچہ آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا۔ مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نہ ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے۔"

یہ فلاں نواز جنگ صاحب اُس وقت نواب کی ناک کے بال اور ارکانِ سلطنت میں سے تھے آپ نے انہیں لکھا۔

"بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی نسبت وعظمت ہے۔ مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا۔ جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا اس کو تو اپنے اوقات فرصت بتلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد رہے یہ کون سی فہم وتہذیب کی بات ہے۔"

اس پر نواز جنگ صاحب نے اپنی بدفہمی کی معافی مانگی اور لکھا کہ حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرما دیں حضرت نے اس پر ایک اور سبق دے دیا کہ:۔

"اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مردہ بدست زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لئے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر ضروری ہے۔ آپ ساتھ رہیں۔ جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں۔ ملاقات کر لیں۔" اس پر انہوں نے لکھا کہ بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں۔ جس وقت فرصت ہوگی حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا جب حضرت نے دیکھا کہ سبق کارگر ہوا ہے۔ تو پھر انہیں دلجوئی کے طور پر لکھا:۔

"اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آئیں ورنہ مجھ کو اجازت فرمایئے میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔"

اس افہام وتفہیم کی غرض آپنے مجلس میں یہ بیان فرمائی کہ:۔

"میرا طرز عمل اس لئے تھا۔ کہ یہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں۔ اہل دین کو بے وقوف سمجھتے ہیں ان کو یہ دکھلانا تھا۔ کہ اہل علم ودین کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تذلیل سے بچنا مقصود تھا۔ مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھینچنا تکبر تھا اللہ کا شکر ہے کہ دونوں سے محفوظ رکھا۔"

غرضیکہ وہ صاحب خود آئے اہل مجلس میں بعضوں نے دور سے دیکھ کر کہا کہ فلاں صاحب آرہے ہیں۔ حضرت ڈاک لکھ رہے تھے برابر لکھتے رہے جس وقت انہوں نے پہنچ کر السلام علیکم کہا تب حضرت مخاطب ہوتے فرماتے ہیں کہ:۔

میں نے سلام کا جواب دیا اور کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ بیچارے بہت ہی مہذب تھے۔ دوزانو ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے برابر جگہ دے کر کہا بھی کہ اس طرف آجائیے اس پر کہا کہ مجھ کو یہیں آرام ملے گا۔ کچھ دیر بعد میرے سوال پر نواب صاحب کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا کہ اگر آپ صاحب سے ملاقات ہوجائے۔ تو بہت مناسب ہے۔

میں نے پوچھا کہ یہ خواہش آپ کی ہے۔ یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے بعد کہا میری خواہش ہے۔ میں نے سوال کیا کہ جس وقت آپ نے ملاقات کے مناسب و نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا۔ اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہوگا۔ کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟۔ کہا نواب صاحب کا۔ میں نے کہا کہ نفع نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جارہی ہے۔ طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنایا جارہا ہے۔ اس پر کوئی جواب نہ دیا۔ اب میں خود اس کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں مضرت ہی مضرت ہے۔ نفع کچھ نہیں۔ اگر ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا۔ تو اس صورت میں ان کو مجھ سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ ہاں ان سے مجھ کو نفع ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ جو چیز ان کے پاس ہے وہ مجھے ملیگی یعنی دنیا۔ وہ لبقدر ضرورت بحمداللہ میرے پاس بھی ہے۔ اور جو میرے پاس ہے۔ وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین اور اگر میں گیا بھی۔ اور جو ان کے پاس ہے (یعنی دنیا منصب وظیفہ وغیرہ) وہ مل بھی گئی تو اس صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے۔ اگر قبول کرتا ہوں تو اپنے مسلک کے خلاف اگر قبول نہیں کرتا تو آداب شاہی کے خلاف کیونکہ قبول نہ کرنے میں ان کی سبکی اور اہانت ہوگی اور چونکہ میں اس وقت ان کے حدود میں ہوں اس کی پاداش میں (خراج وغیرہ) جو چاہیں میرے لئے تجویز کرسکتے ہیں تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا۔ اور میرا نقصان ہوگا۔

یہ امر بھی شان سلاطین کے خلاف ہے۔ کہ وہ اپنی رعایا کے مدعو کئے ہوئے شخص سے ملاقات کریں اس میں کم فہم لوگ ان کو تنگدلی کی طرف منسوب کریں گے جس میں ان کی اہانت ہے۔ کہ کیا خود نہیں مدعو کرسکتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ خیر اس میں ہے کہ نہ میں ان کے پاس جاؤں اور نہ وہ میرے پاس آئیں اگر ان کا جی چاہے تو تھانہ سے مجھ کو بلالیں ہیں خاص شرائط طے کرکے آجاؤں گا۔ کچھ عذر نہ ہوگا"

یہ سن کر نواز جنگ کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا کہ:۔

"ان چیزوں پر تو ہم لوگوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکتی"

اسی لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"امراء سے علماء کا خلط کرنا (ملنا جلنا) اس میں امراء کا کوئی (معتد بہ) نفع نہیں۔ بلکہ اہل علم اور عزباء کے دین کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس کو ناپسند کرتا ہوں"

(افاضات الیومیہ حصہ چہارم ص۵۶ تا ص۶۳)

حدت کی علت

"میں نے نفصائن کا دودھ پیا ہے اسی لئے بھی میرے مزاج میں حدت ہے مگر الحمدللہ تندت نہیں میرا دل اس قدر نرم ہے کہ مجھ سے کسی کی ذرا سی بھی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اگر کسی کو ادنیٰ تکلیف میں بھی دیکھ لیتا ہوں تو دل پگھل جاتا ہے اور پانی پانی ہو جاتا ہے۔" آپ نے اپنے طبعی تعلق اور اتباع سنت کی وجہ سے اس انا کی اولاد کا پتہ لگانے کی بعد ازاں بڑی کوشش کی کہ اس کے ساتھ سلوک کیا جاتے مگر اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

بچپن

"اللہ تعالےٰ کے فضل سے بچپن ہی سے میں جہاں کہیں رہا اعزہ و اقربا اپنے اور بیگانے سب ہی کا محبوب رہا۔ حالانکہ میں بچپن میں بہت شوخیاں کرتا تھا۔ مگر آج کل کے لڑکوں کی سی گندی شرارتیں نہ ہوتی تھیں۔ اس لئے سب کو بجائے ناگوار ہونے کے بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ دیوالی کے زمانہ میں میرٹھ چھاؤنی کے بازار میں سڑک پر دو رویہ چراغ جلائے جاتے تھے دونو طرف ہم دونوں بھائی چلنا شروع کرتے اور رومال کو حرکت دے کر سب کو ایک طرف سے بجھاتے چلے جاتے۔ مگر کوئی برا نہ مانتا۔ ہندوؤں کو بھی ناگوار نہ ہوتا۔"

لطافت طبع

"بچپن ہی سے میرا دماغ اس کا عادی ہے کہ اگر کوئی معمولی سے معمولی بات ہو مگر ترکیب کے ساتھ بیان نہ کی جائے تو میری سمجھ ہی میں نہیں آتی نہ خود الجھی ہوئی تقریر کر دں نہ دوسرے کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں۔ کیوں کہ بچپن ہی سے میرا دماغ ایک خاص ترتیب کا عادی ہو رہا ہے۔"

یہ اسی لطیف المزاجی کا اثر تھا کہ اگر کوئی شخص الجھا ہوا کلام یا بے اصول کام کرتا جس کا آپ سے تعلق ہوتا تو آپ کو اسی وقت تبخیر ہو کر درد سر ہونے لگتا حالانکہ دماغ اتنا قوی تھا کہ بلا تکان سارا دن اور سوتے وقت تک کام کرتے رہتے تھے اور بالکل نہ تھکتے تھے۔

مولانا مدنی کا معاملہ

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت تھانویؒ کے درمیان بھی ویسے ہی اختلافات تھے جیسے حضرت شیخ الہندؒ کے درمیان۔ مگر مخالفین نے کاندھلہ میں غالباً ۱۳۲۹ھ میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے حضرت تھانویؒ کے متعلق سوال کیا۔ تو مولانا بہت ناخوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ "یہ کیا واہیات سوال ہے ہم تو ان کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ اپنے دوسرے بڑوں کو" بعد ازاں معاندین نے ان اختلافات کو اتنی اہمیت دی کہ عبدالماجد دریابادی جیسی شخصیت بھی اس پروپیگنڈا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ:-

(۱) "کانوں نے بیشک یہی سنا تھا۔ کہ ان کے اور ان کے درمیان بے لطفی ہے ناچاقی ہے۔"
(حکیم الامت صہ ۱۶)

(۲) "دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دل دکھتا ہے خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف دیکھ کر۔"
(حکیم الامت صہ ۴۶)

لیکن جب عبدالماجد صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی معیت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے تو عبدالماجد صاحب کیا دیکھتے ہیں؟ اس کی تفصیل خود ان کی زبانی یہ ہے کہ:-

"نماز ختم ہوئی۔ سلام پھیرا۔ دعا مانگ کر جونہی حضرت (تھانویؒ) اٹھے۔ نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی۔ ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات سے ملے۔ لوگ تو کہتے تھے کہ بڑے خشک مزاج ہیں خشک مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں؟ یہ نرم بشاش چہرہ۔ یہ ہنستا مسکراتا ہوا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو

سکتا ہے !۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے ۔کہ ان کے درمیان بے لطفی ہے ۔نا چاقی ہے ۔کانوں نے بے شک یہی سنا تھا لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں دو دوست گلے مل رہے ہیں تعظیم و تکریم مولانا حسین احمد مدنی کی طرف سے تو خیر ہوتی بھی عادت طبعی ہونے کی بناء پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بناء پر بھی لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ ادھر سے بھی آداب و رواسم تکریم میں کوئی کمی نہ تھی" (حکیم الامت ص ۱۶-۱۷)

حضرت تھانویؒ کے آداب و احترام کے بعد حضرت مدنی کا اخلاص و اکرام بھی قابل قدر ہے ۔جب مولانا مدنی صاحب کے مرید با صفا عبدالماجد صاحب حضرت تھانویؒ کے ہاں چند دنوں کے لیے تھانہ بھون جا کر قیام فرماتے ہیں تو انہیں تھانہ بھون میں حضرت مولانا مدنی کا یہ خط موصول ہوا۔

محترم المقام زید مجدکم ۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ ۔

والا نامہ محررہ ۱۶ ر اکتوبر (۱۹۲۹ء) باعث سرفرازی ہوا تھا ۔اب تو جناب خانقاہ میں پہنچ گئے ہونگے خداوند کریم وہاں کی حاضری باعث برکات لامتناہیہ کرے آمین ؎

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی بیاد آر محبان بادہ پیما را

مجھ کو قوی امید ہے کہ آنجناب وہاں پر اپنے اوقات کو مشاغل حقیقیہ میں صرف فرمادینگے جن کے متعلق ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں ۔

البتہ ایک ضروری عرض محض اخلاص کی بناء پر کرتا ہوں اور امید وار ہوں کہ کسی غیر محل پر محمل نہ فرمائیں گے میں نے حسب الارشاد حضرت مولانا (تھانویؒ) دامت برکاتہم اور آپ حضرات کے اصرار پر اس وقت آپ کو بیعت کر لیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی ۔روسیاہی ۔ناکامی پر نہایت درجہ گریہ کناں ہوں اور سخت شرمندہ ۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دامت برکاتہم کے دربار میں پہنچا دیا ہے ۔اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے انس اور تعلق پیدا ہو گیا ہے ۔ وللہ الحمد اللّٰہم زد فزد ۔اب مناسب اور ضروری ہے کہ آپ مولانا سے بھی بیعت کر لیں ۔ مجھے قوی امید ہے کہ مولانا دامت برکاتہم آپ کو نہ ٹالیں گے میں نے خود ان دنوں جب حاضر ہوا تھا عرض کیا تھا کہ آپ جب تشریف لائیں اور درخواست کریں تو جناب ان کو ضرور بیعت کریں قواعد طریقت کے اصول پر بیعت کر لینا ہی زیادہ تر مفید اور کارآمد ہے اسی کی بناء پر فیض کی زیادہ تر امید ہے

مجھ روسیاہ کو بھی کبھی کبھی دعوات صالحہ سے یاد فرما لیا کریں نیز مولانا دامت برکاتہم سے بھی دعا کی التجا کر دیا کریں ۔

(ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ دیوبند ۲۰ ر جمادی الاول ۱۳۴۸ھ) (حکیم الامت ص ۹۰)

اس گرامی نامہ کا جواب عبدالماجد صاحب کی بجائے حضرت تھانویؒ نے یہ دیا :۔

"مخدومی و مکرمی مولانا حسین احمد صاحب دامت فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ ،

عبدالماجد صاحب کے نام پر گرامی نامہ آیا ۔اس میں مشورہ تحویل بیعت کا پڑھا گو اس وجہ سے کہ میں اس کا

مخاطب نہیں۔ مجھ کو جواب عرض کرنے کا استحقاق نہیں۔ لیکن چونکہ اخیر تعلق مجھ سے ہی ہے نیز اس میں مجھ کو مخاطب بنانے کی یاد دہانی بھی ہے۔ اس لیے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔
مجملاً تو وہی عذر ہے۔ جو زبانی عرض کیا تھا۔ اور قدرے مفصلاً یہ عرض ہے۔ کہ اس میں مولوی صاحب کا ضرر ہے اس لیے امید ہے کہ اس مشورہ سے رجوع فرمائیں گے۔ وہ ضرر یہ ہے کہ میری خشونت و سوء خلق تو مشہور ہے مگر مولوی صاحب کی یہ رعایت و دلجوئی جو صمیم قلب سے ہے وہ آپ ہی کے انتساب سے مسبب ہے کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ وہ اس رعایت سے محروم کر دیئے جائیں۔ دوسرے گو ان کو مجھ سے موانست کافی ہے لیکن نفع کا مدار اعظم مناسبت ہے۔ اس کو میں پہلی ملاقات میں طے کر چکا تھا۔ اور اسی بناء پر آپ نے میری سفارش کو قبول فرمایا۔ جس کا میں شکر گزار ہوں اور اگر ان بناؤں کو آپ ضعیف خیال فرمائیں تو میں بھی ان کی تقویت پر زور نہیں دیتا۔ لیکن جب اوّل بار میں بہ قول خود میری خاطر منظور تھی۔ سو اب بھی میری خاطر ملحوظ فرمائی جائے اور جس طرح کام چل رہا ہے چلنے دیا جائے کہ آپ ان کے مخدوم رہیئے اور مجھ کو خادم رہنے دیجئے۔ اس جدید تبدل میں میری اور ان کی دونوں کی پریشانی مضمر ہے۔ جس کا گوارا کرنا اخلاق سامی سے بعید اور بہت بعید ہے اور جب اس کا مجھ پر مدار ہے اور میری طرف سے محض انکار ہے تو مولوی صاحب کو ایسی بات کا حکم فرمانا جو ان کی قدرت سے خارج ہے۔ تکلیف مالایطاق ہے۔ جو ہر پہلو سے منفی ہے۔ والسلام

ناکارہ ننگ انام۔ اشرف برائے نام از تھانہ بھون جمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ (حکیم الامت ص ۹۲-۹۱)
یہ خط و کتابت عین اختلافات کے زمانہ یعنی ۱۹۲۹ء کی ہے۔ اس لیے عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ :-
"سیاسی اختلافات مولانا حسین احمد سے اس وقت بھی تھے۔ اس پر بھی اس وقت تک اُن کا پورا لحاظ و احترام قائم تھا"
(حکیم الامت ص ۱۴۳)
زمانہ گزرتا گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اختلافات کی خلیج بھی وسیع ہوتی گئی۔ پورے آٹھ سال بعد بھی ان ہر دو حضرات کے درمیان عزت، وعظمت کے وہی قابل رشک نظارے دیکھے گئے۔ عبدالماجد صاحب اس بات کی خود شہادت دیتے ہیں:
"تھانہ بھون اور دیو بند کے سیاسی مسلک میں اختلاف کچھ آج سے نہیں۔ مدت دراز سے بالکل واضح وغیر مخفی تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں بزرگوں کے ذاتی تعلقات بڑے خوشگوار اور شگفتہ تھے نہ شفقت میں کوئی کمی حضرت تھانویؒ کی جانب سے تھی اور نہ احترام و بزرگداشت میں کوئی فرق مولانا حسین احمد کی طرف سے
(حکیم الامت ص ۵۱۰)
یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ جن اکابر کو دانستہ یا نادانستہ ایک دوسرے کا سخت ترین مخالف ظاہر کیا جاتا تھا ان میں کس درجہ التفات و ارتباط تھا اور ان کے اختلافات بھی کیسے اصول صحیحہ کے موافق اور حدود شرعیہ کے اندر ہے جس کی کسی دوسرے مکتبہ فکر میں مثال ملنی مشکل ہے۔ بقول عبدالماجد صاحب دریا بادی :-

افراط و تفریط

"قوم عجیب افراط و تفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے۔ کسی سے خوش ہوئے تو اسے پوجنے لگے۔ خفا ہوئے تو گالیاں دینے لعنت برسانے لگے۔ گویا ان کا

یا امیر فرشتہ ہو۔ اگر فرشتہ نہیں ہے تو پھر شیطان کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ توازن و اعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے اور اشخاص و رجال کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں شیعیت اور خارجیت دونوں بےاعتدالی کی پیداوار ہیں اور اہل سنت کا مذہب جو بین بین اور سارے پہلوؤں کے درمیان ایک حکیمانہ توازن کے ساتھ قائم ہوا تھا افسوس کہ وہ خود اب اس بدبختی کا شکار ہوا جارہا ہے۔" (حکیم الامت صہ ۹۱)

جماعت اسلامی

لکھنؤ کے مشہور ماہنامہ "الفرقان" کے ایڈیٹر اور جماعت اسلامی کے سابق رکن مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے مودودی صاحب کی تحریک اسلامی میں شرکت اور اس کے موافق شریعت ہونے کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے حضرت کی خدمت میں بریلی سے آنا چاہا اور اجازت چاہی تو حضرت نے صاف لکھدیا کہ:۔

"اگرچہ کوئی اعتراض شرعی لحاظ سے بظاہر نہ وارد کیا جاسکے۔ لیکن مرا دل اس تحریک کو قبول نہیں کرتا۔ یہی زبانی بھی عرض کروں گا لہٰذا اس ضرورت کے لیے زحمت سفر نہ فرمائی جاوے۔"[1] (خاتمۃ السوانح صہ ۲۴)

اس صاحبِ قال کو کیا علم تھا۔ کہ "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا موصوف اس تحریک میں شریک رہ کر اور اس میں قابل اعتراض امور کا خود مشاہدہ کر کے ذاتی تجربہ کے بعد اس سے الگ ہوگئے اور بزبانِ حال اعتراف کر لیا کہ:۔

اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ

ان کی علیحدگی کی خبر سن کر خود ہم نے بھی انہیں اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے خط لکھا کہ کیا آپ اس جماعت کے امیر میں روحانیت کی بجائے انانیت دیکھ کر تو علیحدہ نہیں ہوئے تو مولانا موصوف نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۷ شوال المکرم ۱۳۶۴ھ میں لکھا کہ:۔

"محترمی سلام مسنون

"جماعت اسلامی کے نظام سے میری علیحدگی کے بارہ میں آپ کا فکر ایک حد تک صحیح ہے۔"[2]

تخیل پاکستان

پاکستان کے لفظ سے دنیا پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں چوہدری رحمت علی ہوشیار پوری کی زبانی آشنا ہوئی۔ جبکہ چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال علامہ اقبالؒ نے مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران میں ظاہر کیا جس کا ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں ملی نصب العین کے طور پر ایک قرارداد

[1] حضرت تھانویؒ کا انتقال ۱۹۴۳ء غالباً ۲۰ جولائی میں ہوا۔ [2] سیرت اشرف صہ ۵۴۶ تا صہ ۵۴۷

کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ مگر علامہ اقبالؒ کے خطبہ اور لاہور قرارداد میں لفظ پاکستان کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اسے ہندو اور برطانوی پریس نے تمسخر و استہزا کے طور پر اچھالا۔ جو قائداعظم کی کوششوں سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو حقیقت بن کر منصۂ شہود پر آگیا۔

تاریخی مغالطہ

"اسلامی سلطنت" کے قیام کا جو خیال علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے متذکرہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا بالکل وہی خیال ان سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجلس عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے۔ بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔ جون ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (جو ابتداً کانگرس کے بہت بڑے حامی تھے) کے معتمد خاص بلکہ دست راست اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مرید با تمیز مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے اور اپنی اس اولیں ملاقات کا حال اپنی کتاب "نقوش و تاثرات" میں ان الفاظ میں درج کیا:-

"۱۹۲۸ء تھا۔ اور مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت گورنمنٹی آدمی ہیں۔ لاحول و لاقوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا بے جانے۔ بہرحال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرت ملی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفسِ مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلوخلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومتِ وقت سے جو مخالفت تھی۔ وہ اس کے "کافرانہ" ہونے کی بنا پر تھی۔ نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر۔" (نقوش و تاثرات ص۲۳۰)

یہ اعتراف و انکشاف ہندوستان کے اس عظیم صحافی کا ہے۔ جو شروع شروع میں سیاسی لحاظ سے حضرت تھانویؒ کے ہم خیال نہ تھے۔ بلکہ کانگرس کی حامی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اور آج اربابِ کانگرس کو بالخصوص اور عام دنیا کو بالعموم "یہی ہیں" سنانے میں ہندو و پاکستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ممکن ہے آپ کے لیے ان کا یہ انکشاف موجب حیرت ہو۔ کیونکہ یہ بات علامہ اقبالؒ کے اظہار کے پورے پچیس سال بعد منظرِ عام پر لائی جارہی ہے مگر کسی بات کا علم میں نہ آنا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ اور نہ واقعات انسان کی طرح جھوٹ بول سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو عقیدت کے پردہ میں زیادہ دیر تک چھپایا جاسکتا ہے۔ [1]

نظامِ پاکستان کا خاکہ

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت تھانویؒ بھی ویسا ہی نظامِ پاکستان چاہتے تھے جس کا نقشہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اپنے خطبات و اعلانات میں پیش کیا تھا جس کا قوم آج تک مطالبہ کر رہی ہے۔

[1] سیرت اشرف از منشی عبدالرحمن ص۵۴۷ تا ص۵۴۸

اس سوال کا جواب عبدالماجد صاحب دریا بادی کی اس اولین ملاقات کی تفصیل سے ملتا ہے جو انہوں نے جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ سے کی اور جس کے ضمن میں انہوں نے لکھا ہے کہ :۔

"پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔" (نقوش و تاثرات صہ ۲۳)

مرکز اور امام کی ضرورت

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لیے کافی ہے۔ بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتال جہاد ہے۔ کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہؓ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے۔ لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی۔ قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اٹھا کر دیکھ لو۔ کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی۔ اگر نماز روزہ اور طاعت ہوگی۔ تو غلبہ ہوگا۔ اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے۔ اور جہاد فرض کفایہ ہے۔ مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔ بس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال نہ ہوگا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہو سکتی۔ اور جہاد کے لیے مرکز ضروری ہے۔ لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیرالمومنین ہو اور جس کو امیرالمومنین بنایا جائے۔ اس کے اندر تین صفات ہوں۔ ایک تدین یعنی وہ دیندار ہو۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔ اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔" (آثار رحمت صہ ۱۰۱)

چونکہ قائداعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت بھی۔ اس لیے آپ نے ان میں تدین پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی تاکہ وہ ان تمام ضروری صفات سے متصف ہو جائیں جو ایک امیرالمومنین کے لیے ضروری ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی یہ تمام جدوجہد ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس کے اندر قرارداد پاکستان پاس کرنے سے پہلے کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ نے نہ صرف سب سے پہلے پاکستان کا تخیل پیش کیا۔ بلکہ اس کے حصول کے لیے عملی جدوجہد کرنے والوں میں بھی آپ کا درجہ السابقون الاولون کا ہے۔

قائداعظم کی دینی تربیت

حضرت تھانویؒ کے مرید خاص اور قائداعظم کے یار غار نواب جمشید علی خاں صاحب جن کے پاس اکثر قائداعظم اپنی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کے ہمراہ موسم سرما میں باغپت جا کر رہا کرتے تھے اور جو انہیں حضرت تھانوی کے مواعظ و ملفوظات سنایا کرتے تھے کہتے ہیں :۔

"یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائداعظم کی تمام تر دینی تربیت حضرت تھانویؒ کا فیضان تھا اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا

کی بدولت تھا۔ مولوی شبیر علی صاحب تھانویؒ نے قائد اعظم کو حضرت والا کے قریب لانے میں بڑا کام لیا۔
قائد اعظم باغپت کے دوران قیام میں حضرت والا کا بہت خلوص اور ادب سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قائد اعظم کو تھانہ بھون حاضر ہونے کا انتہائی شوق تھا۔ لیکن افسوس کہ چند وجوہات کی بناء پر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی
قائد اعظم پر آخر زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا۔ اور جس کو ہم سب نے دیکھا وہ حضرت رحمۃ اللہ کی ہی جوتیوں کا صدقہ تھا"۔ (تعمیر پاکستان اور علماء ربانی) ص ۹۲

داستانِ شکوۂ لیگ

آنریری سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کی معرفت سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب نے حضرت تھانوی کو مسلم لیگی امیدوار شیخ صادق حسن کی حمایت کرنے کے لیے خط لکھا اس کا جواب حضرت نے یہ دیا

(یہ تاریخی اور بصیرت افروز مکتوب سر سکندر حیات خاں کے خط کا صرف جواب ہی نہ تھا۔ بلکہ ارباب مسلم لیگ کے شکوہ کی مکمل داستان بھی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا):۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ صادر ہوا۔ احقر تو مسلم لیگ کا ہمیشہ حامی ہے اور وہ حمایت الحمد للہ کہ کسی غرض سے نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی دنیوی اصلاح میں اس وقت مسلم لیگ ہی میں شامل ہونے میں سمجھ رہا ہوں۔ اور کانگرس میں داخل ہونے میں دینی و دنیوی دونوں کا نقصان خیال کرتا ہوں۔ لیکن ہر مسلمان جانتا ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے اور تاریخی واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک مسلمان دین اور مذہب پر قائم رہے اور اس قدر پختگی سے قائم رہے۔ کہ لوگ ان کو مجنوں سمجھنے لگے دین کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل کی دھن تھی۔ اس وقت تک دنیوی اعتبار سے بھی مسلمان ہر طرح کامیاب رہے اور تمام دنیا میں کوئی ان سے آنکھ ملانے والا کوئی نہ تھا۔ اور جب سے اس میں کمی آئی۔ اسی وقت سے ذلیل ہوتے ہوتے اب ان کی ذلت کی انتہا ہو چکی ہے۔ تمام سمجھدار حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی ماضی کی طرف لوٹنا چاہیئے۔ مگر نہ معلوم اس کا مفہوم کیا لیا ہے۔ کہ اس کو فرماتے سب ہیں۔ جانتے سب ہیں۔ مگر دین کی باتوں سے گریز ہے۔ کہتے ہیں۔ مگر عمل نہیں کرتے۔ سو اگر حضرات اس کی طرف توجہ فرماتے۔ تو آج لیگ کی ترقی سے تمام اقوام خائف ہوتیں۔ مگر نہ معلوم کون سی چیز مانع ہے۔ کہ اس طرف نہیں آتے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ پٹنہ میں ایک پیام بھیجا تھا۔ جو وہاں پڑھا بھی گیا تھا۔ اور سب حضرات کو تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ اس میں دو چیزوں کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی۔ اول نماز کی پابندی کو لیگ کے مقاصد میں شامل کیا جاوے۔ دوسرے وضع اسلامی ہر ممبر پر لازمی قرار دیا جاوے نماز کا ارکان اسلام میں اہم ترین رکن ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ اور وضع خاص رکھنا تو ایسی چیز ہے کہ دنیا کے تمام سیاست دان اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جرمنی کا لباس الگ ہے جاپان کا الگ ہے۔ فرانسیسی کا الگ وغیرہ۔ فوجی وردی تو لازمی طور پر الگ ہوتی ہے۔ اگر جرمنی سپاہی مثلاً انگریزی وردی پہن کر جرمن فوج میں شامل ہو۔ اور ویسے ہی اور مستعد ہو۔ لیکن صرف وردی کی تبدیلی کی وجہ سے وہ مستوجب سزا کا ہوگا وعلیٰ ہذا۔ تو کیا مسلمانوں کے لیے جو حق تعالے کی کوئی خاص وضع اور امتیاز ضروری نہیں ہے؟ ہے اور ضروری ہے۔!

لیکن افسوس کہ حضراتِ لیگ نے ان دونوں باتوں کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ اگر ان باتوں کی طرف توجہ فرماتے۔ تو دین کی اور باتیں بھی جو ترقی دنیا میں بھی مؤثر ہیں۔ میں اور بتلاتا۔ مگر مجھے واقعی حضرات لیگ سے یہ شکایت ہے کہ مولویوں کو صرف الیکشن کے وقت پوچھا جاتا ہے اور ان کے فتوٰی پر عمل کرنے کا دعوٰی کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کی بات کی طرف کوئی کان نہیں دھرتا۔ ہم اگر ذاتی منافع کے لیے کچھ بھی لکھیں تو بیشک نہ سنیے۔ نہ مانیئے۔ لیکن اگر ان حضرات کو ہم پر اعتماد ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم فتوٰی صحیح دیتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ الیکشن ہی کے لیے صحیح ہوتا ہے۔ دوسرے وقت وہ قابل عمل نہیں ہوتا۔ میری غرض لیگ کی حمایت سے یہی تھی کہ اس میں بحمداللہ سمجھدار۔ عالی دماغ مسلمان ہیں۔ تو ان حضرات سے جب دینداری کے لیے کہا جاویگا۔ تو بہت جلد مان لیا جاوے گا۔ تو گویا لیگ کی حمایت دین کی حمایت تھی اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اصل چیز یعنی دین ہی سے بے تعلقی اور بے توجہی ہے۔ تو بجز خاموشی کے اور کیا کروں۔ آپ ہی انصاف فرماویں کہ اب میرا کیا جی چاہے! یہاں تک تو وہ امور عرض کئے تھے۔ جن کی طرف حضرات لیگ کو متوجہ کر چکا ہوں اور پھر بھی انہوں نے عمل نہیں کیا۔

اب دو نئی چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ جن سے میں بہت پریشان ہو رہا ہوں ایک تو لیگ کا علامہ مشرقی سے تعاون اور دوسرا ذمہ داران لیگ کا علماء کے وقار اور ملّا ازم کے برباد کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ مشرقی کی کتابیں میں نے دیکھی ہیں اور جہاں تک ہو سکا میں نے اس کے قوال کی تاویل بھی کی۔ مگر وہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اس کے عقائد جن کی رفتہ رفتہ وہ خاموشی سے تبلیغ کر رہا ہے صریح کفر ہیں اور چونکہ مسلم لیگ اس وقت تک مسلمانوں میں مقبول جماعت ہے۔ مگر خاکساروں کی جماعت کی وجہ سے لوگ لیگ سے بھی بدظن ہو رہے ہیں۔ جس کا مجھے اس طرح علم ہے کہ اکناف ہند سے ان لوگوں کے سوالات میرے پاس آ رہے ہیں۔ جو اب تک مسلم لیگ کے سرگرم اور حامی ممبر تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ لیگ جب خاکساروں سے تعاون کرتی ہے۔ تو اب مسلم لیگ میں داخل رہنا جائز ہے یا نہیں؟ غرض ان خاکساروں سے ملنے کی وجہ سے بھی بدنام ہو رہی ہے۔ اور جو شخص اب لیگ کی جدید حمایت کرے گا۔ وہ بھی بدنام ہوگا۔ دوسری چیز لیگ والوں کا بلاکسی استثناء کے علماء کے وقار کو تباہ کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ اگر کانگرسی علماء سے بچایا جاتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اختلافِ مسلک کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر بلاکسی استثناء کے علماء کے اثر کو مٹانے کی سعی کے معنے تو مذہب کو مٹانے کی سعی کرنا ہے۔ اور جو جماعت دین کو مٹانے کی فکر میں ہو۔ آپ ہی انصاف فرماویں کہ اس سے میں کہاں تک تعاون کر سکتا ہوں۔

مجھے بھی افسوس ہے کہ مجھے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہے اور سر سکندر حیات خاں صاحب کے ارشاد کے بعد مجھے ایک ایسی تحریر لکھنا پڑی جو بظاہر خلاف تہذیب ہے۔ مگر مسلمانوں کی اصل تہذیب چونکہ دین ہے۔ اور دین کی خیر خواہی مجھے مجبور کرتی ہے۔ کہ ان حالات میں میں اس ارشاد کی تعمیل سے عذر کروں۔ اس لیے مجھے امید ہے۔ وہ معاف فرماویں گے۔ اور اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرماویں گے۔ تو شاید وقت آجائے اور لیگ خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام پر عمل کرنا شروع کر دے۔ تو میں لیگ کا ہر وقت خادم ہوں، خیر میں ایک دم تنزل کر کے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اور وزیر صاحب کی خدمت میں بھی جن سے مجھ کو ان کے غائبانہ اوصافِ خصوصی اسلامی حمیت سن کر مدت سے خاص محبت ہے وہ عرض یہ ہے اگر پابندی شرعی وضع کو مقاصد لیگ کا جزو بنانا کسی دنیاوی مصلحت کے خلاف کہا جاوے۔ یا ہمت سے بالاتر خیال کیا جاوے۔ تو کم از کم ان چیزوں کو تو ممنوع قرار دیا جاوے جن سے لیگ کی دنیوی قوت کو یا بلفظہٖ دیگر اسلامی مفاد کو صدمہ یا ضعف پہنچتا ہو۔ جن کی طرف میں نے اس خط میں اشارہ کیا ہے۔ اور اگر خدانہ کرے یہ بھی نہ ہو سکے۔ تو پھر میں کسی کی آزادی میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا

مگر یہ درخواست ضرور کروں گا کہ پھر میری آزادی میں بھی خلل نہ ڈالا جائے۔ اور مجھ کو اجازت دی جائے کہ اپنے لیے جو طریق عمل سمجھا جاوے تجویز کروں۔

میں جانتا ہوں کہ اس خط میں بہت سے ایسے امور عرض کیے گئے جو اصل سوال سے زائد ہیں۔ مگر اس کا باعث صرف یہ ہوا کہ خط سے اسلامی ہمدردی کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ پھر جناب وزیر صاحب کی توجہ بھی۔ اس لیے توقع ہوئی کہ شاید یہ توجہ کچھ ترقی کر میں مؤثر ہو جائے۔ لیکن اگر یہ بے محل سمجھا جاوے۔ تو آپ سے اور جناب وزیر صاحب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر توجہ صرف نہ ہو تو جواب کی تکلیف نہ فرمائی جاوے باقی دعا ہر حال میں اپنا فریضہ ہے ۔

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

(مشاہدات واردات صفحہ ۲۰۵ تا ۲۰۷)

لطافت طبع

حضرت تھانویؒ کی زبان فیض ترجمان اور قلم حقیقت رقم سے اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے فقرے نکلا کرتے جن کے ذریعہ آپ کثافت کو لطافت میں بدل دیتے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ مثالوں سے ظاہر ہے۔

(۱) ایک طالب علم نے لکھا کہ میں نے اپنے قلب کو آپ کی تنبیہ کے بعد ایسا پایا جیسے اس کے اندر گوہ در گوہ ہو رہا ہو۔ آپ نے جواب بھیجا کہ :-

”مبارک ہو! یہ گوہ خاکساری کی خاک سے مل کر کھاد کا کام دے گا۔ اور ایسی اجناس پیدا ہونگی کہ روحانی غذا ہو جاویں گی۔“

(۲) ایک طالب علم نے غلبہ خشیت میں لکھا کہ مجھے سخت خطرہ درپیش ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ یہ خطرہ تو بحر معرفت کا قطرہ ہے اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر دریا کر دے۔

(۳) اس سلسلہ میں ایک اور نے لکھا کہ سخت الجھن ہے۔ تحریر فرمایا کہ یہ الجھن تو مقدمہ ہے سلجھن کا انّ مع العسر یسرا

(۴) ایک طالب علم نے لکھا کہ میں بالکل کورا ہو گیا ہوں۔ فرمایا کورا ہونا برا نہیں کورہ ہونا برا ہے بلا سے کورا ہو کورہ نہ ہو۔

(۵) ایک مرتبہ فرمایا کہ اس طریق میں خود رائی نہ کرے بلکہ خود کو رائی کرے یعنی اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھے بس دھن اور دھیان یہ ہو

اہتمامِ سفرِ آخرت

اثاث البیت کے متعلق وصیت

اثاث البیت کے متعلق وصیت اشرف السوانح جلد سوم صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۷ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں آپ نے اپنی مملوکہ اشیاء اور وقف جائداد کی فہرست وغیرہ اسی تفصیل سے دی ہے جیسی مملکت اسلامیہ جمہوریہ کا محکمہ تشخیص موت (اسٹیٹ پراپرٹی ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۰ء) کی رو سے کسی لاکھ پتی کے مرنے پر طلب کرتا ہے۔ یعنی جس تفصیل سے متوفی کی فہرست پیش کرنے کا مذکورہ بالا ایکٹ ۱۹۵۰ء تقاضا کرتا ہے۔ وہی تفصیل قانون کے خوف سے نہیں۔ خدا کے خوف

آپ نے خود بخود اپنے وصیت نامہ میں درج کر دی تھی۔ جس سے ظاہر ہے کہ اگر طبائع میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔ تو قانون سازی کا نام بالکل برائے نام رہ جائے۔

اہل حقوق کو وصیت

حضرت تھانویؒ اپنے مذکورہ بالا وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ :-

"میرے بعض اخلاق سیئہ کے سبب بعض بندگان خدا کو حاضرانہ و غائبانہ میری زبان اور ہاتھ سے کچھ کلفتیں پہنچی ہیں۔ اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں۔ خواہ اہل حقوق کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ میں نہایت عاجزی سے سب چھوٹے بڑوں سے استدعا کرتا ہوں کہ للّٰہ دل سے معاف کر دیں۔ اللہ تعالےٰ ان کی تقصیرات سے درگزر فرماویں گے۔ میں بھی ان کے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ان کو دارین میں عفو و عافیت عطا فرماویں۔ معذرت کرنے والے کی تقصیر سے درگزر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اور اگر معاف کرنے کی ہمت نہ ہو تو حسب فتویٰ شرعی مجھ سے عوض لے لیں۔ خدا کے لیے قیامت پر مواخذہ نہ رکھیں کہ اس کا کسی طرح تحمل نہیں۔

اس قبیل کی کوتاہیاں جو دوسروں سے میرے حق میں ہو گئی ہوں۔ میں بطیب خاطر گزشتہ اور آئندہ کے لیے محض خدا تعالےٰ کے راضی کرنے کو اور اپنی خطاؤں کی معافی کی توقع پر وہ سب معاف کرتا ہوں۔"

دوستوں کو وصیت

میں اپنے سب دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے سب معاصی صغیرہ و کبیرہ عمد و خطا کے لیے استغفار فرماویں۔ اور میرے اندر جو عادات و اخلاق ذمیمہ ہیں۔ انکے ازالہ کے لیے دعا کریں۔

میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرض عین ہے۔ خواہ بذریعہ کتاب ہو یا بذریعہ صحبت۔ بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتنہ دینیہ سے حفاظت ہو سکے۔ جن کی آجکل بہت کثرت ہے۔ اس میں ہرگز غفلت یا کوتاہی نہ کریں۔

منتسبین کو وصیت

میں اپنے منتسبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی عمر بھر یاد کر کے سورہ یٰسین شریف۔ تین بار قل ہو اللہ شریف پڑھ کر مجھ کو بخش دیا کرے۔ مگر اور کوئی امر خلاف سنت و بدعات عوام ان میں سے نہ کریں۔

میرے ایصال ثواب کے لیے کبھی جمع نہ ہوں۔ نہ اہتمام سے نہ بلا اہتمام۔ اگر کسی دوسرے اتفاق سے بھی جمع ہو جاویں تو تلاوت کے وقت قصداً منتفرق ہو جاویں اور ہر شخص منفرداً بطور خود جس کا دل چاہے دعا و صدقہ و عبادت نافلہ سے نفع پہنچا دے۔ نیز مستعمل چیزوں کے ساتھ متعارف طریق سے تبرکات سا معاملہ نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی محبت سے شرعی طریق سے اس کا مالک بن کر بطور پر اپنے پاس رکھے تو مضائقہ نہیں۔ اس کا اعلان اور دوسروں کو دکھلانے کا اہتمام نہ کیا جاوے۔

حتی الامکان دنیا و مافیہا سے جی نہ لگاویں۔ اور کسی وقت فکر آخرت سے غافل نہ ہوں ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگر اسی وقت اجل آجاوے۔ تو فکر اس تمنا کا مقتضی نہ ہو۔ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ اور ہر وقت یقین کر کہ

شاید ہمیں نفس ۔ نفسِ واپسیں بود

علی الدوام دن کے گناہوں سے قبل رات کے رات کے گناہوں سے قبل دن کے استغفار کرتے رہیں اور حتی الوسع

حقوق العباد سے سبکدوش رہیں۔

سوانح حیات کے متعلق وصیت

چونکہ محبت میں اکثر مدائح غیر واقعیہ مشہور کر دئے جاتے ہیں۔ اس سے میں اپنی سوانح کا لکھا جانا پسند نہیں کرتا۔ اگر کسی کو بہت ہی بیتابی کا ہو۔ اور دوسرے اہل تدین وتحقیق بھی اجازت دیں تو روایت میں احتیاط شدید کو واجب سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ میں بری ہوں۔

آمادگیِ سفر آخرت

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

"حضرت کو ضبط وصبر اور استقامت سے اپنی تکالیف ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ اور نہ آئندہ کے خطروں کو زبان پر لاتے تھے کہ دوسروں کو بے صبری نہ ہو۔ مگر بات بات سے سفر کی آمادگی ظاہر ہوتی تھی۔ گو ان کی زندگی اور طرز زندگی جس صفائی اور باقاعدگی کی عادی تھی۔ اس کا اثر یہ تھا کہ وقت اخیر کے لیے کوئی کام اٹھا نہیں رکھا تھا۔ کہ سالک ہر لمحہ کو لمحۂ اخیر سمجھتا ہے۔ اور اسی کی تیاری رکھتا ہے یہی حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تھا کوئی چیز کرنی باقی نہ تھی تمام انتظامات اور حساب کتاب اور وصایا سے پوری پوری فراغت تھی۔ عادت شریف تھی کہ آج کا کام کبھی کل پر اٹھاکر نہیں رکھا۔ گویا ہر وقت آمادۂ سفر تھے"۔

آخری عطیہ

آپ کی آخری تصنیف لطیف بوادر النوادر کے ۲۵۰ نسخے آپ کی وفات سے چند روز قبل ہی عبدالکریم صاحب ریٹائرڈ سشن جج نے اپنے مصرف سے طبع کرا کر حضرت کی خدمت میں بھیجے۔ حضرت نے اسی وقت بعض خاص مقربین کی فہرست تیار کرائی۔ جو غالباً ۱۱۱ تھے اور ہر ایک کو بوادر النوادر کا ایک ایک نسخہ دینے کی ہدایت اس فہرست میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کا نام نامی بھی اس آخری تقسیم سے جو کتابیں بچ رہیں ان کے متعلق فرمایا :- کہ وہ سب بھیجنے والے سشن جج صاحب کو واپس کر دو۔ چنانچہ اسی طرح کیا گیا۔

(سیرت اشرف)

آخری عطیہ

۷ر جولائی ۱۹۴۳ء سے حضرت پر غنودگی طاری رہنے لگی اور استماع ملفوظات سے حاضرین محروم ہو گئے۔ وفات سے دو چار روز قبل خواجہ عزیز الحسن صاحب سے مصروف قیل وقال رہے۔ بہت ہی عجیب وغریب مضامین بیان فرماتے رہے اور بالآخر فرمایا کہ :-

"خواجہ صاحب یہ باتیں ہیں لکھنے کی۔ خواجہ صاحب پھر یہ باتیں سننے میں نہ آئیں گی کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں اس کا اہتمام نہیں"۔

پھر مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کا یہ مصرع پڑھا ع رانڈ ہو جائینگے قانون وشفا میرے بعد پھر مولانا عبدالسمیع صاحب بیدل کا یہ شعر پڑھا ؎

بیدل خستہ کو پاؤ گے کہاں کر لو اس کی مہمانی چند روز

وفات سے صرف ایک روز قبل عصر کے قریب انتہائی نقاہت کے باوجود ملفوظات کا سلسلہ یکایک شروع فرما دیا۔ گو آواز بمشکل نکلتی تھی۔ اور تقریر نہایت آہستہ آہستہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زبان فیض ترجمان سے صادر ہوتی تھی۔ اس میں

پ نے فرمایا کہ

"میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ میرے اعزہ مجھ سے لاکھ درجے بڑھ جائیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک کوئی بڑھا نہیں میں نے تو ہمیشہ اپنے کو مویشیوں سے بھی بدتر اور کمتر سمجھا۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کی جوتیوں کی برکت سے مجھے اول یوم ہی وہ بات نصیب ہو گئی۔ حضرت نے ایک ایسی بشارت دی۔ جس کو میں نے اس لیے کبھی ظاہر نہیں کیا کہ گالیاں پڑیں گی۔ بڑے بڑے اکابر کا نام لے کر فرمایا۔ جن کی جوتیوں کی خاک کے برابر بھی میں اپنے آپ کو نہیں سمجھتا کہ یہ اب ان سے بھی بڑھ چلے ہیں۔ میں ہمیشہ اس کو آئندہ کے لیے بشارت سمجھا کیونکہ اب تک تو میری حالت اس قابل کبھی نہیں ہوئی"

ری فکر

جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات الصلوٰۃ وما ملکت ایمانھم تھے۔ اسی طرح حضرت تھانویؒ کو بھی آخری فکر نماز اور حقوق کی تھی خواجہ صاحب سے آخری ایام میں فرماتے تھے مجھے دو چیزوں کا بہت خیال ہے نماز کا اور حقوق کا"۔ بالآخر جب سر کنے کی بھی سکت باقی نہ رہی تھی۔ تو لیٹے لیٹے تیمم اور روں سے نماز ادا فرمانے لگے۔ اور اخیر وقت تک ایک نماز بھی قضا نہ کی۔ یہاں تک کہ آخری غشی اور انتقال سے تھوڑی دیر پہلے دریافت فرمایا کہ مغرب میں کیا دیر ہے۔ عرض کیا گیا کہ دس منٹ ہیں۔ فوراً مکرر استفسار فرمایا کہ وقت کے آنے میں یا وقت جانے میں۔ آخری وقت میں بھی اس شانِ تدقیق نے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ (سیرت اشرف)

ب الارشاد کی وفات

خواجہ عزیز الحسن صاحب جو حضرت کے خاصانِ خاص میں سے تھے۔ لکھتے ہیں کہ :-

"میں وتر کی نماز کے تشہد میں تھا کہ دفعتہً مجھے اپنے قلب میں ایک تغیر عظیم محسوس ہوا۔ جس نے مجھے پریشان کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بالکل کورا ہو گیا میں سوچنے لگا کہ یہ وہی بات تو نہیں ہے۔ جو حضرت اقدس فرمایا کرتے تھے کہ جب قطب الارشاد کی وفات ہوتی ہے تو اس وقت اہل احساس کو اپنے قلوب میں تغیر محسوس ہوتا ہے اور کیفیات میں کمی محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس کا فیض عام ہوتا ہے۔ سب کو پہنچتا ہے۔ چاہے فیض پانے والے کو بھی یہ خبر نہ ہو کہ یہ فیض خاص کدھر سے آرہا ہے۔ بلکہ خود قطب الارشاد کو بھی کسی کی طرف فیض منتقل ہونے کا علم ہونا ضروری نہیں جیسے آفتاب کی روشنی بلا اس کے قصد کے سب کو پہنچتی ہے" یہ ارشاد یاد آ کر گمان تو ضرور ہوا کہ اس تغیر کا سبب یہی ہے کہ حضرت اقدس عالم نزع میں ہی ہوں گے۔ پھر خیال ہوا کہ ابھی تو زندہ ہیں۔ گو عالم نزع میں سہی یہ پہلے سے ہی اثر کیوں شروع ہو گیا۔ اس اشکال کا جواب ذہن میں یہ آیا کہ گو ابھی رحلت نہیں فرمائی۔ لیکن نزع میں اس عالم سے چونکہ بے توجہی ہو جاتی ہے ممکن ہے اسکا اثر مثل وفات ہی کے ہوتا ہو۔ لیکن جب میں نماز سے فارغ ہو کر در دولت پر واپس گیا۔ تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی پانچ منٹ ہوئے رحلت فرما گئے ہیں اس وقت مجھے گمان غالب ہوا کہ وہ جو ایک تغیر خاص مجھے وتر کے تشہد کے وقت محسوس ہوا تھا عجب نہیں عین پرواز روحِ مقدس ہی کے ہوا ہو کیونکہ فارغ ہو کر در دولت تک پہنچنے میں تقریباً اتنا ہی وقت صرف ہوا ہوگا۔ وہ تغیر مجھے اس درجہ کا محسوس ہوا تھا کہ سلام پھیرنے کے بعد میں سخت پریشان ہو کر بآواز کہنے لگا کہ یا اللہ اگر حضرت اقدس کے بعد میری یہی حالت رہی تو میرا ایمان کیسے سلامت رہے گا۔

(خاتمۃ السوانح صنا)

مرثیہ حکیم الامت مشتمل بر تاریخ

(۱)
ندانم آہ در آفاق ایں چہ صبح دمید
کہ ہست شور قیامت ز ذرّہ ذرّہ پدید

(۲)
ندانم از چہ شفق غرق شد بموجۂ خوں
ندانم از چہ سحر جامہ تار تار درید

(۳)
چہ شد کہ چنبر افلاک حلقہ حلقہ گسست
چہ شد گر ہمہ گہوارۂ زمیں لرزید

(۴)
کدام گل شدہ تاراج از جفائے خزاں
کہ خار غم برگ جان ما ہزار خلید

(۵)
زمانہ آہ نور دید فرش عیش و طرب
فلک لباس خودش را بہ خم نیل کشید

(۶)
فغان اہل زمیں شد بلند تا کیواں
ز چشم ماہ و ستارہ چہ خون ناب چکید

(۷)
چہ گویمت کہ چہ پیش آمدست عالم را
گراست طاقت گفتن کراست تاب شنید

(۸)
بباغ حضرت امداد تند باد اجل
چناں وزید عطائی کہ پیش ازیں نوزید

(۹)
ز فوت حضرت اشرف کہ نیست ثانئ او
چہ گویمت بخدائے بجان ما چہ رسید

(۱۰)
ز دلگدازئ ایں واقعہ مپرس کہ ایں
بجا نگدازئ محشر چہ خط نسخ کشید

(۱۱)
گسیخت صبر عناں و شکیب ام
دلم ز دیدۂ خونبار قطرہ قطرہ چک

(۱۲)
کدام حضرت اشرف علی نمی
حکیم امت مرحوم از قریب

(۱۳)
زمیں بسر زدہ خاکے بسو گواری
فلک بماتم آں پیرہن بجسم

(۱۴)
کلاہ زد بزمیں آفتاب زیر
ز گریۂ دیدۂ انجم سپید گشت

(۱۵)
شکست کاکل سنبل نجست
گرفتہ شد دل غنچہ زمیں غمے

(۱۶)
جنید وقت اگر گویمش مبالغہ
ہم آست راست اگر خوانمش مثیل

(۱۷)
چناں فقیہ و محدّث چناں مجدّ
ندیدہ است کسے و کسے نخو

(۱۸)
خلاف سنت خیر البشر صلعم
نہ سہو ہم عملے ز دنیا مداست

(۱۹)
ز پایگاہ علومش چہ گویمت
کسے ندیدہ و نے ہیچ کس آ

(۲۰)
ز پا فگند عمارات شرک و بدعت
بنائے سنت غرّا از و بماہ

(۲۱)
بحق امت مرحوم آں مسیحا بود
کہ از دمے بہ تن مردگانش روح دمید

(۲۲)
نیاورید مثالش بدہر آئینہ
نظیر او بجہانے نہ چشم احول دید

(۲۳)
سزد نہ نوحہ عطائی بہ نہندگان خاموش
بہر سہت نزد خرد کار تو زعقل بعید

(۲۴)
ہزار حضرت اشرف کہ گفت مرگ او
شہید گشت و شہید ست زندہ جاوید

بیاد سال وصالش شنو زمن کہ ہمہ — الف کشیدہ بگفتم شہید گشتہ ش

عطائی تلمیذ گرامی

۱۳۶۳ - ۱ = ۱۳۶۲ھ ی

رئیس المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء ○ ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۴ء

عبد الرشید ارشد

حضرت علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

سوادِ تحریر ص ۱۴۴ پر ملاحظہ کیجیے

ولادت، سلسلۂ نسب و تعلیم

حضرت علامہ انور شاہ صاحب محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ مسعود نروری کشمیری سے ملتا ہے۔ جن کے بزرگوں کا اصل وطن بغداد تھا۔ وہاں سے ملتان آئے۔ لاہور منتقل ہوتے ہوئے پھر کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ آپ نے خود اپنا سلسلۂ نسب اپنی تصانیف نیل الفرقدین وکشف الستر کے آخر میں اس طرح تحریر فرمایا ہے۔ محمد انور شاہ بن مولانا محمد معظم شاہ بن شاہ عبدالکبیر بن شاہ عبدالخالق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ حیدر بن شاہ محمد عارف بن شاہ علی بن شیخ عبداللہ بن شیخ مسعود نروری" اور شیخ مسعود کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ ابن شاہ جنید بن اکمل الدین ابن میمون شاہ بن ہرمان شاہ ہرمز۔ اس طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب حضرت امام اعظم کے خاندان سے ملحق ہو جاتا ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد معظم شاہ بڑے عالم ربانی، زاہد و عابد اور کشمیر کے نہایت مشہور خاندانی پیر و مرشد تھے۔

آپ ۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ بوقت صبح اپنے ننھیال بمقام موضع وودھواں (علاقہ لولاب کشمیر) میں پیدا ہوئے ۴½ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد معظم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن پاک شروع کیا اور چھ برس کی عمر تک قرآن کے علاوہ فارسی کے متعدد رسائل بھی ختم کر لیے۔ پھر مولانا غلام محمد صاحب (صوفی پورہ) سے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اور ابھی آپ کی عمر ۱۳-۱۴ سال کی تھی ۱۳۰۵ھ میں آپ نے لولاب کے مرغزاروں اور سبزہ زاروں پر غریب الوطنی کی علمی زندگی کو ترجیح دی۔ حضرت علامہ "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات" کے مصداق بچپن ہی میں بے حد ذہین ذکی اور فطین تھے۔ سچ ہے کہ جس نے آگے چل کر وقت کا رازی و غزالی بننا تھا۔ اس کی اعلیٰ علمی و عملی صلاحیتوں اور استعداد کا بچپن میں ضروری تھا۔

آپ کے والد مولانا محمد معظم شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جب انھوں نے مجھ سے مختصر القدوری شروع کی تو مجھ سے بعض ایسے مسائل دریافت کرتے تھے کہ مبسوط کتابوں کا مطالعہ کئے بغیر ان کا جواب دینا مشکل ہوتا تھا۔ میں انھیں ان موشگافیوں سے اکثر منع کیا کرتا تھا۔ اخیر میں اس قوت و ذہانت سے پریشان ہو کر میں نے انھیں ایک دوسرے عالم کے سپرد کیا۔ مگر دوسرے استاذ کو بھی یہی شکایت پیش آئی۔

آپ کے والد آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی لیسین شاہ مرحوم کو کشمیر کے پہاڑوں میں اعتکاف کرنے والے ایک عارف کے پاس حصول برکات کے لیے لے گئے۔ عارف نے جب اس ہونہار بچے کو دیکھا تو والد سے پوچھا کہ یہ تمہارا بچہ ہے؟ پھر کہا کہ یہ بڑا عظیم الشان عالم ہوگا اور مستقبل میں اس کی علمی شان مسلم ہوگی۔

ایک دفعہ منطق اور نحو کے چند رسائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک بڑے عالم اس وقت آپ کے پاس آ گئے۔ ان عالم نے ان کی کتاب لے کر

کتابوں پر خود حضرت مرحوم کے حواشی لکھے ہوئے تھے۔ بچپن کے زمانہ کی اس ذکاوت، تیزی طبع، جودت فہم اور طبیعت کی دُور رسی کا اندازہ کرکے بے اختیار انھوں نے کہا کہ یہ بچہ اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالی ہوگا۔

علمی مذاق اور ذکاوت و ذہانت کے ساتھ سلامتیٔ طبع، حسن اخلاق اور اعمال صالحہ کی دولتیں بھی شروع سے آپ کو وافر مقدار میں ملی تھیں۔ آپ کے غیر معمولی احوال کو دیکھ کر کشمیر کے عوام عام طور پر یہ شبہ کرتے تھے کہ کہیں آپ مہدی موعود نہ ہوں۔ آپ کے والدِ محترم اور خاندان کے دوسرے افراد کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید کرنا پڑتی تھی۔

آپ نے خود ایک دفعہ فرمایا کہ میں بارہ سال کی عمر میں فتاویٰ دینے لگا تھا اور نو سال کی عمر میں فقہ و نحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

تین سال تک آپ ہزارہ (سرحد) کے متعدد علماء و صلحاء کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے پھر جب علوم و فنون کی وہاں بھی تشنگی نہ بجھتی نظر آئی تو ہندوستان کے مرکز علوم دینیہ دار العلوم کی شہرت سن کر آپ ۱۳۰۷ھ یا ۱۳۰۸ھ میں بعمر سولہ سترہ سال ہزارہ سے دیوبند آگئے۔ دیوبند میں آپ نے چار سال رہ کر وہاں کے مشاہیرِ وقت و یگانۂ روزگار علماء سے فیوض علمیہ و باطنیہ کا بدرجۂ اتم استفادہ کیا اور ۲۰، ۲۱ سال کی عمر میں نمایاں شہرت و عزت کے ساتھ سندِ فراغ ۱۳۱۲ھ میں حاصل کی۔ جن علماء سے آپ کو شرفِ تلمذ رہا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مرشد عالم حضرت مولانا محمود حسن، شیخ الہند، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ۔

دیوبند سے فارغ ہو کر قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں گنگوہ تشریف لے گئے اور وہاں سے سند حدیث کے علاوہ فیضِ باطنی بھی حاصل کیے۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے اور تین چار سال تک مدرسہ امینیہ کے مدرس اول رہے۔

دہلی میں کئی سال قیام کے بعد بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کے باعث آپ کشمیر تشریف لے گئے اور ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ سفرِ حجاز میں طرابلس۔ بصرہ اور مصر و شام کے جلیل القدر علماء نے آپ کی بہت عزت کی اور سب نے آپ کی خداداد و بے نظیر لیاقت و استعداد دیکھ کر سندات حدیث عطا فرمائیں۔ جن میں آپ کا نام "الفاضل الشیخ محمد انور بن مولانا محمد معظم شاہ الکشمیری" لکھا گیا ہے۔

سفر حجاز سے واپس آکر خواجگان قصبہ بارہ مولا (کشمیر کا ایک مشہور مقام) خصوصاً خواجہ عبدالصمد ککرو رئیس اعظم کے اصرار پر آپ نے اسی شہر میں مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو فیض یاب فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں آپ کو دار العلوم دیوبند کے ایک جلسہ دستار بندی میں مدعو کیا گیا اور آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ دار العلوم میں آپ نے استفادۂ علوم و فنون کیا تھا اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی تھی۔ اب اسی دار العلوم میں مدرس مقرر ہو گئے۔ سنن ابوداؤد شریف اور صحیح مسلم شریف کا درس سالہا سال تک بغیر کسی تنخواہ کے دیتے رہے۔ چند سال کے بعد آپ کو اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی وجہ سے پھر کشمیر جانا پڑا لیکن دار العلوم کی طرف سے شدید تقاضا ہوا۔ اس لیے آپ جلد ہی واپس تشریف لے آئے۔

حضرت شاہ صاحب کا نکاح

حضرت مولانا انور شاہ صاحب پر شانِ تجردی کا کچھ عکس اور پرتو پڑا تھا۔ عالمِ شباب گزار کر عالمِ کہولت ہو چکے تھے۔ مگر نکاح نہیں فرمایا تھا۔ تجرد اور عزلت کو اپنے لیے پسند فرماتے تھے اور بار بار ارضِ حجاز ہجرت کا ارادہ فرماتے تھے۔ تاکہ ازدواجی تعلق اس راہ میں حائل نہ ہو۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اس وقت دارالعلوم دیوبند مہتمم ثانی تھے۔ وہ اس ارادے سے پریشان تھے کہ مبادا اگر یہ آفتابِ علم دیوبند سے ہجرت کر جائے تو فقط دیوبند ہی نہیں سارا ہندوستان ظلمت کدہ بن جائے گا۔ اس لیے شاہ صاحب کے روکنے کے لیے انھوں نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جو اہلِ یمن نے حضرت معمرؒ کے روکنے کے لیے کی تھی۔ معمرؒ بصرہ والے تبع تابعین میں سے ہیں۔ بڑے جلیل القدر عالم اور حافظِ حدیث ہیں۔ سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، شعبہؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ جیسے اکابر ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔

لما دخل معمر اليمن كرهوا ان يخرج من بينهم فقال رجل قيدوه فزوجوه ـ (شرح الامام النزاوی علی البخاری ص ۶۴ ج ۱)

معمر (بصرہ کے رہنے والے تھے) جب یمن میں داخل ہوئے تو اہلِ یمن کو گوارا نہ کیا کہ معمر یہاں سے چلے جائیں۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر ان کو روکنا ہے تو معمر کو یہاں قید کر لو۔ یعنی ان کا نکاح کر دو۔

حضرت شاہ صاحب کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب نے یہی کیا کہ حسنِ تدبیر سے گنگوہ کے سادات میں شاہ صاحب کا نکاح کرا دیا تاکہ معمر کی طرح شاہ صاحب دیوبند میں مقید ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے شاہ صاحب کے وجودِ مسعود کو اس طرح محفوظ فرمایا۔ نکاح کے ایک دو سال بعد ایک بچی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے بچے پیدا ہوئے تو ذمہ داریاں بڑھتی گئیں اور ہجرت کا ارادہ سست پڑتا گیا۔ جو بالآخر ترک کر دینا پڑا اور حضرت علامہ باطمینانِ خاطر دارالعلوم میں مسند نشینِ درس ہو کر علمی افادات میں مشغول ہو گئے۔ تجرد کے زمانہ میں دارالعلوم سے انھیں معاوضہ لینے سے انکار رہا۔ حضرت مولانا محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ والد ماجد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے بامشکل اس بات پر راضی کیا کہ وہ ان کے ساتھ کھانا کھایا کریں اور یہ صورت دس برس تک قائم رہی۔ اسی دوران میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند طلب کیا تھا۔ اور وہ بھی حضرت مولانا محمد احمدؒ کے مہمان کی حیثیت سے رہے۔ حضرت مہتمم صاحب مولانا محمد احمدؒ حضرت علامہ کشمیریؒ مولانا حبیب الرحمان صاحبؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حضرت سندھیؒ یہ تمام حضرات مل کر کھانا کھاتے اور عجیب علمی اور تحقیقی باتیں ہوتیں۔ نکاح اور اولاد کے بعد منتظمینِ مدرسہ کو موقع ملا کہ وہ حضرت شاہ صاحب کو دارالعلوم کی طرف سے کچھ مشاہرہ دلوائیں۔ چنانچہ باصرار حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس پر راضی ہوئے۔

اسی دوران میں حضرت شیخ الہندؒ نے حجازِ مقدس کا قصد فرمایا تو ان کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس سنبھال لیا۔ اور طلباء علوم کو یہ محسوس تک نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ ذخار (حضرت شیخ الہندؒ) سے محروم ہو گئے ہیں۔ بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں بعض ایسی امتیازی خصوصیات تھیں جو عام طور پر دوسرے حلقوں میں نہیں تھیں۔ حضرت علامہؒ کا اندازِ درس درحقیقت دنیائے درس و تدریس میں ایک انقلاب کا باعث ہوا۔ درس کی یہ امتیازی خصوصیات اور انداز اپنی جگہ پر ذکر ہو گا۔

۱۳۴۵ھ تک آپ دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس و جانشین شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ درسِ حدیث دیتے رہے۔ اس کے بعد جب منتظمین سے بعض اصلاحات کے سلسلہ میں اختلاف ہوا تو آپ نے ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم سے قطع تعلق فرما لیا اور آپ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان

یر احمد عثمانیؒ حضرت مولانا سراج احمد رشیدی رح ، مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہارویؒ ، مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھیؒ اور دیگر کئی علماء اور
سے طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ ڈابھیل جامعہ اسلامیہ تشریف لے گئے اور ۱۳۵۱ھ تک آپ نے جامعہ میں درس حدیث دیا ـــــــــ
ظفر ۱۳۵۲ھ کو شب کے آخری حصہ میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں دیوبند میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔

حضرت علامہ رح کے علمی و عملی کمالات میں سے جو چیز آپ کو اقران و اعیان میں سب سے زیادہ ممتاز کرتی تھی ۔ وُہ آپ کی جامعیت و تبحر علمی
ہے۔ علوم عقلیہ و شرعیہ میں سے ایک بھی ایسا علم نہیں ہے جس میں آپ کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو اور شاید یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ کہ علماء متقدمین
یثیت سے ایسی جامع علوم عقلیہ و نقلیہ ہستیاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

آپ سینکڑوں علماء و فضلاء کے مجمع میں بیٹھ کر ہر ایک علم و فن کے مسائل پر اس طرح تقریر فرمایا کرتے تھے کہ گویا آپ کو تمام مسائل فن مستحضر اور
ا الجوہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ اپنے ارادہ سے کلام نہیں کر رہے ہیں بلکہ الہامات و واردات سے ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور یہ تو بیشتر ہوتا تھا
وقت سے جب بعض دقیق و لاینحل یا مختلف فیہ مسائل کے متعلق پوچھا جاتا تھا تو وہ حضرت سے استفسار کرنے کو فرمایا کرتے تھے۔ اور اکثر علماء عصر
کسی علمی مسئلہ میں کوئی دقت پیش آتی تھی تو وہ خود بھی حضرت علامہ رح سے مراجعت فرماتے تھے۔ ذیل میں حکیم الامت، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
توب گرامی کا پہلا اور آخری حصہ مندرج ہے جو انھوں نے حضرت علامہ مرحوم کو ارسال فرمایا تھا۔ جس میں انھوں نے ان سے کسی مسئلہ پر تحقیق چاہی ہے۔
فحۃ العنبر حضرت علامہ محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک طویل اور جامع تاریخ حیات ہے جسے عربی زبان میں حضرت رح کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری
ور مجلس علمی نے ڈابھیل سے شائع کیا ہے۔ نفحۃ العنبر کا بیان ہے کہ حکیم الامت رح نے اکثر مسائل میں علامہ مرحوم سے استفادہ فرمایا ہے۔

"از ناکارہ آوارہ اشرف علی بخدمت بابرکت جامع الفضائل العلمیۃ العلیہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب دامت ابرکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ: تحقیق سابق کے متعلق بضرورت مکرر تکلیف دینا پڑی۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ ایک حادثہ
خود مجھ کو پیش آیا۔ اس کے متعلق جداگانہ تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ الخ وقال خاتمۃ اس میں روایۃ و درایۃ سے کچھ
حکم فرمائیں (حیاتِ انور)

زعیم احرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رح حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ :۔
"میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا امت مسلمہ میں وجود ہے اگر
دین اسلام میں کسی قسم کی کجی یا خرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے" (حیات انور)
ایت استاذی حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ، مہتمم مدرسہ خیر المدارس سے بھی سنی ہے کیونکہ اس وقت حضرت مدوح بھی مولانا سید
صاحب بخاری رح کے ساتھ تھے۔

شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت کی وفات پر جامعہ ڈابھیل کے ایک جلسہ میں فرمایا۔
"مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ تقی الدین ابن دقیق العیدؒ اور سلطان العلماء
حضرت شیخ عزالدین بن عبد السلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے۔ کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر
ہے۔ ورنہ اگر حضرت علامہ انور شاہ بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و محامد بھی اوراق تاریخ کا گراں
قدر سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہوا ہے۔"

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے۔

"واقعی حضرت شاہ صاحب "آیۃ من آیات اللہ" تھے"

زعیم احرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ایک دفعہ ڈابھیل تشریف لے گئے تو جامعہ اسلامیہ کے طلبہ نے تقریر کی درخواست کی اور یہ بھی چاہا کہ علامہ کے حالات پر تبصرہ کریں۔ تو بخاری صاحب نے فرمایا کہ:

"میرے جیسا کم علم ان کے حالات کیا بیان کرسکتا ہے۔ البتہ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا قافلہ جا رہا تھا یہ پیچھے رہ گئے تھے"

حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے حضرت علامہ کے جلسۂ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی۔ لیکن تبحر علمی، وسعت معلومات، جامعیت اور علوم نقلیہ وعقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی ثانی نہیں پایا۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ نے حضرت علامہ کے انتقال پر ایک مضمون میں تحریر فرمایا کہ:۔

"آہ قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولانا العلامۃ الفاضل الکامل، اکمل العلماء، افضل الفضلاء، البحر المقدام، البحر الطمطام رحلۃ العصر، قدوۃ الدھر، استاذ الاساتذہ، رئیس الجہابذہ، محدث وحید، مفسر فرید، فقیہ یگانہ، ماہر علوم النقلیہ والعقلیہ مولانا سید انور شاہ قدس سرہٗ کو آغوش رحمت میں کھینچ لیا اور ہم سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے۔ جن کا نظیر مستقبل میں متوقع نہیں۔ طبقۂ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر، کمال فضل، ورع وتقویٰ وجامعیت، استغنا مسلم تھا۔ موافق ومخالف ان کے سامنے تسلیم والقیاد سے سر جھکاتا تھا۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے شاہ صاحب مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر "معارف" میں کس قدر بلیغ بات کہی تھی۔

"مرحوم کی مثال اس سمندر جیسی ہے۔ جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو لیکن گہرائی موتیوں سے لبریز ہو"

ہم نے ایجاز واختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے "بیس بڑے مسلمان" کتاب کے بڑے انسانوں کے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ ورنہ ان حضرات کے علاوہ ہند بیرون ہند کے تمام جید علماء نے حضرت علامہ کے متعلق جس عقیدت وتاثر کا اظہار کیا ہے۔ اگر اس کو نقل کیا جائے تو اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ اب دنیائے اسلام کے چند نامور مفکروں کے خیالات پیش کیئے جاتے ہیں۔ جن کی علمی قابلیت واستعداد پر دیوبندی مکتب فکر کے علاوہ تمام مسلمان مسلمین دنیا کا اتفاق ہے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ مندرجہ بالا تاثرات میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں مکتب فکر کی جانبداری نہیں ہے۔ دوسروں کا بھی یہی حال ہے۔

علامہ سید رشید رضا جو مصر کی ایک معروف شخصیت اور علمی حلقوں میں ایک نادرۂ روزگار انسان سمجھے جاتے تھے۔ جب دیوبند آئے ہیں۔ تو انھوں نے حضرت علامہ سید انور شاہ رحمۃ اللہ کی ایک تقریر سنی جو عربی میں ان کی آمد پر ارتجالاً کی گئی تھی اور حنفیت کے بعض ایسے گوشے زیر بحث آگئے جن پر علماء محققین کی نظر تک نہ تھی تو بقول مولانا مناظر احسن گیلانی (بحوالہ نظام تعلیم وتربیت)، سید رشید رضا بار بار اپنی کرسی سے اٹھتے اور فرماتے تھے۔

"واللہ ما رأیت مثل ھذا الرجل قط" خدا کی قسم! میں نے ان جیسا آدمی ہرگز نہیں دیکھا

آپ کے استاد حضرت شیخ الہند نے آپ کو جو سند اجازت عنایت فرمائی تھی۔ اس میں تحریر فرمایا تھا کہ خداوند تعالیٰ نے مولانا انور شاہ میں

لم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہن ثاقب جمع کر دیا ہے اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ صاحب کو علامہ جیسے رفیع لفظ سے یاد فرماتے اور مسائل علمیہ میں جب کوئی دقیقہ سامنے آتا تو حضرت شاہ صاحب سے دریافت فرماتے۔ کہو علامہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول ہے۔ علامہ صاحب جواب دیتے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مسرت و اطمینان کا اظہار فرماتے۔ استاد کا شاگرد کو علامہ سے یاد کرنا حضرت علامہ کے کمال علمی پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ علی مصری حنبلی حافظ حدیث مصر سے سوات آئے وہاں سے دہلی اور دہلی سے دیوبند آئے اور حضرت شاہ صاحب کے درس بخاری شریف میں حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب رح نے علامہ کی رعایت کرتے ہوئے بلیغ عربی میں تقریر فرمائی۔ علامہ نے سوالات کئے۔ ادھر سے جوابات دیئے گئے۔ درس ختم ہوا تو علامہ نے سینکڑوں طلبہ کے ہجوم میں فرمایا۔

ٔمیں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علماء و اکابر سے ملاقات کی ہے۔ خود مصر میں سالہا سال درس حدیث دے آیا ہوں۔ میں نے شام سے لیکر ہند تک اس شان کا کوئی محدّث اور عالم نہیں پایا۔ میں نے ان کو ساکت کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ لیکن ان کے استحضار، تیقظ حفظ، واتقان، ذکاوت و ذہانت اور وسعت نظر سے میں حیران رہ گیا اور آخر میں کہا۔ "لو حلفت انہ اعلم بابی حنیفۃ لما حنثت" یعنی اگر میں قسم کھاؤں کہ یہ ابوحنیفہ کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ تو میں اس دعوے میں جھوٹا نہ ہوں گا"

ہندوستانی علماء کو اعجام قرار دینے والے علامہ علی مصری کا یہ اعتراف اور تاثر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شان علمی، جامعیت اور تبحّر کی معتبر شہادت ہے۔ اور علامہ علی مصری کا یہ اقرار اس بات کو بھی تصدیق کرتا ہے کہ علم کسی کی میراث نہیں۔ علم اپنے محل کے اعتبار سے عربی و عجمی کی قید سے بے نیاز ہے۔

علامہ زاہد الکوثری کی محیر العقول شخصیت سے اہل علم سے کون ناواقف ہوگا۔ علامہ ترکی کی ایک زبردست علمی شخصیت اور اس قحط الرجال کے زمانہ میں نادر حیثیت کے مالک تھے۔ قاہرہ میں جلاوطنی کے ایام گزار رہے تھے۔ وہیں حضرت شاہ صاحب مرحوم کی بعض تصانیف و تالیفات کا مطالعہ کیا تو فرمایا کہ: "احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدّث و عالم امت میں نہیں گزرا اور یہ کوئی زمانہ نہیں ہے۔

ترکی کے ایک دوسرے عالم سابق شیخ الاسلام جو قاہرہ میں جلاوطنی کے بعد مقیم تھے اور مادیین و دہریین کے رد میں بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ انہوں نے حضرت شاہ صاحب کے رسالہ "مرقات الطارم" کا مطالعہ کیا تو فرمایا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا۔ اب بھی کوئی دنیا میں موجود ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے لاہور کے اس تعزیتی جلسے میں جو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

ابھی اوپر گزرا کہ علامہ کوثری نے شاہ صاحب کو ابن ہمام رح کا نظیر ٹھیرایا۔ اور علامہ اقبال رح کا یہ کہنا کہ اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور ابن ہمام پانچ صد سال قبل کے محققین سے ہیں۔ علامہ اقبال اور علامہ کوثری کے رائے کا یہ توافق یا توارد کس قدر حیرت انگیز ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ایم اے مدیر برہان نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر اقبال اور علامہ کشمیری کے مابین چند واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جو ان کے

Religious

علم میں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:۔

علّامہ کشمیریؒ اور علّامہ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ ایک نامور مفکر اور مشہور شاعر ہونے کے علاوہ فلسفہ کے دقیق النظر عالم تھے۔ فلسفہ یونانی، فلس[فہ]
عہد حاضر و مغرب پر ان کی خوب نظر تھی۔ اس کے علاوہ ان کا اسلامیات کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی شاع[ری]
خطبات اور تصانیف سے اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے انگریزی زبان کے چھ لکچروں (R)ECONSTRUCTION
OF RELIJEOUS THOUGHT کی تیاری میں حضرت علامہ کشمیری رح سے کافی مدد لی ہے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ
حدوث عالم پر منظوم رسالہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن پتہ یہ ہے کہ اس مسئلہ (حدوث عالم) پر سارے قدیم وجدید فلسفہ کا عطر اور اس پر تنقید ہے۔ یہ رسالہ جب چھپا تو
ایک نسخہ حضرت کشمیری رح نے ڈاکٹر اقبال رح کے پاس تحفۃً ارسال فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے۔ اس کے اعتبار سے ان کے لیے کوئی
اس چند ورقی رسالہ سے زیادہ قیمتی نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور و فکر سے پڑھا۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی اس پوری عبارت کے ناقل و راوی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ :۔ "میں ان دنوں لسلسلہ طالب علمی لاہور میں مقیم تھا۔ ڈاکٹر صاحب [کو]
معلوم تھا کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحب کے ادنیٰ درجہ کے تلامذہ میں سے ہی ہونیکا شرف حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اس بارگاہ علم و عقل میں شخصی تقرب و اختصاص کا مرتبہ بھی [حاصل]
ہے۔ اس بنا پر ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ و قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فل[سفہ]
میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ آ[ج]
کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالے کیا اور فرمایا کہ اس میں چار شعر ایسے ہیں جن [کا]
مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ان پر نشان لگا دیا ہے۔ آپ دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کر[یں]
میں نے دیوبند آکر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کا پیام پہنچایا۔ لیکن حضرت الاستاذ نے مجھ کو ان اشعار کا مطلب [بتانے]
کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اس میں ان اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں۔ یہ خط میں ہی دستی لے کر لاہور [آیا]

اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا۔

یہ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال وہ ہیں جنھوں نے خود اپنے متعلق کہا تھا۔۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

ان کے دل میں حضرت الاستاذ کی کس قدر درجہ عظمت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب
حضرت الاستاذ نے اپنے عہدہ صدر الاساتذہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا [تو فرمانے]
لگے کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو۔ میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفے کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا کہ "آ[پ کو دارالعلوم]
دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں ہے؟ فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دارالعلوم کو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی۔ لیکن اسلام کے لیے اب [جو کام میں]
شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔
اس کے بعد انھوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں مسائل [کا]
کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو۔ جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین [ہے کہ اس]

وہیں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو۔ پھر فرمایا "یہ مسائل کیا ہیں ؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے۔ میں ایک عرصہ سے انکا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحبؒ کے سامنے رکھونگا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے ؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہِ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی" چنانچہ اصحاب کو معلوم ہے کہ اسی جذبہ کے تحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں اور وہیں مقیم ہو جائیں۔ لیکن افسوس ! حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا اور حضرت شاہ صاحبؒ لاہور کی بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے جس سے ڈاکٹر صاحب کو بڑا ملال اور صدمہ ہوا۔ [۱]

باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصاً اور ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قادیانی فتنہ کی شر انگیزی اور اسلام کشی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اس لکچر کا ہے جو ختم نبوت پر ہے اور ساتھ ہی اس مقالہ کا ہے جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع ہوا تھا لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دونوں تحریروں کا اصل باعث حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ ہی تھے۔ [۲]

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب انجمن خدام الدّین کے کسی سالانہ اجتماع میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لائے تو ڈاکٹر صاحب خود ملاقات کے لئے حضرت موصوف کی قیام گاہ پر آئے اور پھر ایک دن اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کا صرف بہانہ تھا۔ ورنہ اصل مقصد علمی استفادہ تھا۔ چنانچہ کھانے سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ختم نبوت اور قتل مرتد کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ جس میں کامل ڈھائی گھنٹہ تک گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی عادت یہ تھی کہ وہ کسی اسلامی مسئلہ پر کسی بڑے عالم سے گفتگو کرتے تھے تو بالکل ایک طالب علمانہ انداز سے کرتے تھے۔ مسئلہ کے ایک ایک پہلو کو سامنے لاتے اور اس پر اپنے تشکک و ... بے تکلفانہ بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اب اس وقت بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے تشکک و شبہات اور ایرادات و اعتراضات کو بڑے ... سے سنا اور اسکے بعد ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی کہ ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں مسئلوں پر کلی اطمینان ہو گیا اور کچھ خلش انکے دل میں تھی وہ جاتی رہی اور اسکے بعد انھوں نے ختم نبوت پر وہ لکچر تیار کیا جو ... لکچروں کے مجموعہ میں شامل ہے اور قادیانی تحریک پر وہ ہنگامہ آفریں مقالہ سپرد قلم فرمایا جس نے انگریزی اخبارات میں شائع ہو کر پنجاب کی فضا میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔

بہر حال یہ دو تین واقعات صرف اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ جن لوگوں کو براہِ راست یا تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ حضرت الاستاذ کے بحرِ ناپید اکنار علم سے ... کا موقعہ نہیں ملا۔ وہ ایک جوہر گرانمایہ کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی سے کر سکیں کہ دنیا کے جوہریوں کی رائے اس کے متعلق کیا تھی ؟" [۳]

حافظہ، ذکاوت، ذہن

حضرت علامہؒ کو قدرت نے بے نظیر حافظہ عطا فرمایا تھا۔ کسی فن کی کسی کتاب کو شروع سے آخر تک ایک دفعہ مطالعہ کر لیا اور جب کبھی سالہا سال کے بعد اس کے متعلق کوئی بات چھڑی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کیساتھ

---

[۱] ... مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند سے خود سنا۔ وہ فرماتے تھے کہ جب علامہ شاہ صاحب نے دارالعلوم سے استعفیٰ دیا۔ میں اُن دنوں لاہور آسٹریلیا جامع مسجد میں خطیب تھا ... صاحب نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ اب آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں۔ جوابی تار تھا جس کا کوئی جواب آیا۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ (مولانا ہزاروی کو) دیوبند بھیجا کہ تم جا کر زبانی عرض کرو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا جب ڈابھیل والوں نے اصرار کر کے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کا پیغام بعد میں ملا اور میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکا۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے جو بعض ثقہ حضرات نے بیان کی کہ ڈاکٹر صاحب نے شاہ صاحب کی متوقع آمد کے پیش نظر متمول دوستوں سے ساٹھ ہزار روپیہ کے وعدے لے لیے تھے کہ حضرت علامہؒ کیلئے شایانِ شان کوٹھی تعمیر کی جائے جہاں وہ قیام فرما ہوں (مرتب)

[۲] ڈاکٹر اقبال مرحوم قادیانی تحریک کے بعض دینی افادی قسم کے پہلوؤں سے کچھ متاثر تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحب کو تحریک قادیانی کے مضرات سے آگاہ کرنیکے لیے دو تین دفعہ لاہور کا سفر فرمایا جسکے بعد ... الہ اس کا اکابر پر ہو چکا (مرتب)، جس وقت یہ سطور تحریر کی گئیں، مولانا ہزاروی بقید حیات تھے مگر آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ بہت مخلص انسان تھے۔ غفرلہٗ

[۳] ماخوذ از تذکرہ انور

بیان فرمایا کہ سننے والے ششدر و حیران رہ گئے۔ ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی تھے۔ تو وہ آپ کو یاد ہوتے تھے۔ حوالہ ہائے کتب صحیحہ کے صفحات آپ کو ایک ہی دفعہ مطالعہ سے محفوظ ہو جاتے تھے اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تھے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے۔ آپ کی قوتِ حافظہ ان منکرین حدیث کا گویا جواب تھا جو محدثین کے حافظہ پر اعتماد نہ کرتے ہوئے ذخیرہ حدیث کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ :-

"جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا تب بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ ہو جاتے ہیں۔"

سرعتِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ مسند احمد (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دو سو صفحات کا مطالعہ فرمایا اور وہ بھی اس شان سے کہ اس عظیم الشان ذخیرہ میں سے احناف کی تائید میں جس قدر احادیث ہو سکتی تھیں۔ وہ بھی منتخب اور محفوظ کر لیں اور پھر جب کبھی درس میں مسند احمد کی احادیث کا حوالہ دینا ہوتا تھا تو بغیر مراجعت دے دیتے تھے اور رواۃ و طبقات پر بھی بے تکلف بحث فرماتے تھے۔ صرف آخر عمر میں ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات سے متعلق احادیث کو جمع کرنے کے لیے مطالعہ دوبارہ فرمایا تھا

شیخ ابن ہمام رح کی فتح القدیر معہ تکملہ (۸ جلد) کا مطالعہ بیس روز میں کیا تھا۔ اس طرح کہ کتاب الحج تک اس کی تلخیص بھی فرمائی۔ اور ابن ہمام نے صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کیے ہیں۔ اپنے خلاصہ میں ان کے مکمل جوابات بھی تحریر فرمائے۔ اور پھر مدت العمر فتح القدیر سے مذاہب و مباحث نقل کرنے میں مراجعت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک دفعہ خود بھی درس میں بطور تحدیث نعمت فرمایا کہ ۲۶ سال قبل فتح القدیر دیکھی تھی۔ الحمدللہ اب تک مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی جو مضمون اس کا بیان کرونگا۔ اگر مراجعت کروگے تو تفاوت بہت کم پاؤگے۔

سنن بیہقی قلمی کا مطالعہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے یہاں کیا تھا۔ تئیس سال بعد ڈابھیل میں ایک روز فرمایا کہ حافظ ابن حجر نے ایک جگہ کچھ دلائل حنفیہ کے خلافیات بیہقی سے جمع کیے ہیں۔ میں نے جو نسخہ بیہقی کا گنگوہ میں دیکھا تھا۔ اس میں وہ چیزیں نہ تھیں۔ پھر جب سنن بیہقی حیدر آباد سے چھپ کر آئی تو اس میں وہ چیزیں موجود تھیں لیکن اب میں اس نظریہ پر پہنچا ہوں کہ حضرت گنگوہی رح والا قلمی نسخہ زیادہ صحیح تھا اور اس کے شواہد و دلائل میں اپنی یادداشت میں جمع کر رہا ہوں۔

حضرت شاہ صاحب کی قوتِ حافظہ کے سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی رح کی یہ تحقیق بھی قابل ذکر ہے کہ مجموعی طور سے حضرت شاہ صاحبؒ کو کم سے کم پچاس ہزار عربی کے ایسے اشعار یاد تھے کہ جس وقت چاہتے ان میں سے سنا سکتے تھے۔ فارسی اشعار بھی بکثرت یاد تھے۔ بلکہ اردو کے بھی اونچے شعرا کا کلام یاد تھا ایک دفعہ غالب کے بہت سے اشعار سنائے۔

آپ کے وسعتِ مطالعہ پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے کہ کشمیر میں ایک دفعہ علماء کے درمیان اختلاف ہوا اور ہر ایک کا جواب دوسرے کے مخالف رہا۔ اس دوران میں حضرت شاہ صاحب بھی کشمیر تشریف لائے۔ فریقین شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے حاضر ہوئے اور دونوں نے مختلف فیہ مسئلہ آپ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا محمد یوسف صاحب سے فرمایا کہ میں نے فتاویٰ عاریہ کے "مخطوطہ" کا دارالعلوم کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے جس میں یہ عبارت ہرگز موجود نہیں۔ یہ لوگ تصحیف کر رہے ہیں یا ہذلیں۔ اس پر حاضرین متحیر ہوئے اور مستدلین مبہوت ہو کر رہ گئے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رح فرماتے تھے کہ فوائد التنزیل العزیز لکھتے وقت مجھے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق صحیح روایات جب حاصل نہ ہو سکیں تو چند روز تک اس ہیجان میں لگا رہا کہ کوئی ایسی حدیث ہاتھ آئے جو جناب کے شایان شان ہو۔ لیکن میری کوشش بیکار گئی۔ اس کے بعد میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ میں نے اس پیش آئی ہوئی الجھن اور دشواری کا اظہار کیا۔ حضرت نے بلا تامل فرمایا کہ

نے مستدرک کے اندر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اثر نقل کیا ہے۔ اس کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کی تمام الجھن ختم ہو جائے گی۔ حضرت مولانا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کے مطابق مطالعہ کیا تو میری تمام الجھنیں دور ہو گئیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا بیان ہے کہ تیرہ دفعہ آپ نے صحیح بخاری شریف کے صرف متن کا مطالعہ فرمایا تھا۔ جب کہ اس کے حاشیہ اور بین السطور پر بالکل نظر نہ تھی۔ ہر دفعہ ایسے علوم و حقائق کا انکشاف ہوتا کہ اس سے پہلے قلب میں گزرے ہی نہ تھے۔

حضرت شاہ صاحب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بے حد مداح تھے، ابن تیمیہؒ کو حافظ الدنیا اور جبال علم کے معزز القاب سے یاد کرتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ کے مقابلہ میں حافظ بدر الدین عینیؒ شارح بخاری کے علوم اور ان کی تحقیقات کو زیادہ دقیق سمجھتے تھے۔ درس میں ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے خواب میں حافظ بدر الدینؒ عینی کو دیکھا اور ان سے بطور شکایت کے کہا کہ ابن حجر کے مقابلہ میں جو طرز آپ نے اختیار کیا ہے، اس سے علماء کو بہت دقت ہوتی ہے حافظ عینی نے جواب دیا کہ حافظ ابن حجر سے دریافت کرو کہ انھوں نے یہ طرز کیوں اختیار کیا تھا؟ حافظ عینی کہنا چاہتے تھے کہ میں نے صرف مدافعت کی ہے ابتدا، ابن حجر سے ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں عینی کے اس جواب پر خاموش ہوا۔ ان مقامات پر عینی کے جوابات سے شاہ صاحب مطمئن نہ تھے۔ آپ تفسیر حدیث شرح الفاظ اور نقول کبار میں زیادہ مکمل سمجھنے کے باوجود نظم و ترتیب میں پسند نہ کرتے تھے۔

کئی ایک بزرگوں سے سنا کہ حضرت شاہ صاحب بعض دفعہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک شخص کعبۃ اللہ کے پردوں کو پکڑ کر دعا کر رہا تھا کہ خداوند تعالیٰ مجھے ابن حجر کا حافظہ عطا فرما۔ اس کی دعا قبول کی گئی۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ منٹگمری نے فرمایا کہ یہ شخص خود شاہ صاحبؒ تھے۔ یہ بات بطور تحدیث نعمت ان کی زبان پر آجاتی تھی مگر اپنے نام کا اخفا کر جاتے تھے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند ہمیشہ حضرت شاہ صاحب کو چلتا پھرتا کتب خانہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

> "مجھے جب مسئلہ فقہ میں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر کوئی چیز مل گئی تو فبہا ورنہ پھر حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا ہوں۔ شاہ صاحب جو جواب دیتے اسے آخری اور تحقیقی پاتا اور اگر حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ فرمایا کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا۔ اور تحقیق کے بعد ایسا ہی ثابت ہوتا۔"

مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا اور جو ایک مرتبہ سن لیا وہ ضائع ہونے سے محفوظ اور مامون ہو گیا گویا کہ اپنے زمانہ کے زہری تھے۔ امام زہریؒ جب مدینہ منورہ کے بازار سے گزرتے تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے کسی نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ میرے کانوں میں جو داخل ہو جاتا ہے۔ وہ نکلتا نہیں۔ اس لیے بازار سے گزرتے وقت کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں۔ تاکہ بازار کی یہ خرافات میرے کانوں میں داخل نہ ہو سکیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک دفعہ دیوبند کے قبرستان میں پھر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں علم کی قبر کے پاس پھر رہا ہوں۔ یہ قبر حضرت شاہ صاحب کی تھی۔ مطالعہ کے سلسلہ میں فنون عصریہ، فلسفہ جدید، ہئیت جدید حتیٰ کہ فن رمل اور جعفر کی کتابوں کو بھی بغیر مطالعہ کے نہ چھوڑا۔

حضرت شاہ صاحب کے درس کی خصوصیات

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت کے درس کی شان عجیب تھی جسے اب دکھلانا تو ممکن نہیں۔ البتہ بتلانا ممکن ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

۱۔ درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت و بلاغت واضح ہو جائے۔ حدیث

کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع بنانے کو بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ کیونکہ اصطلاحات بعد میں پیدا ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً و رتبۃً مقدم ہے۔ حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلافِ ادب ہے۔

۲۔ خاص خاص مواضع میں حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے اور اسی مناسبت سے بہت سی مشکلات قرآنیہ کا حل فرما دیتے تھے۔

۳۔ حسب ضرورت اسماء الرجال پر کلام فرماتے خصوصاً جن رواۃ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہوتا تو اس جرح و تعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنی طرف سے ایک قولِ فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابل قبول ہے۔ اس کی روایت حسن کے درجہ میں ہے یا صحیح کے، قابل رد ہے، یا قابل اغماض لائق مسامحت؟ اور اغماض و مسامحت میں جو فرق ہے۔ وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ زیادہ تر فیصلہ کا طریقہ یہ بھی رکھتے کہ جب کسی راوی کی جرح و تعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ بتلا دیتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذیؒ نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔

۴۔ فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولاً ائمہ اربعہؒ کے مذاہب نقل فرماتے اور پھر ان کے وہ دلائل بیان فرماتے جو ان مذاہب کے فقہا کے نزدیک سے قوی ہوتے پھر ان کا جواب اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے تھے۔ حنفیت کے لیے استدلال و ترجیح میں کتاب و سنت کے تبادر سیاق و سباق کو پورا ملحوظ رکھتے اور اس بات کا خاص لحاظ رکھتے کہ شریعت کا منشا و مقصد اس بارے میں کیا ہے اور یہ حکم خاص شریعت کے احکام کلیہ کے خلاف نہیں۔ شریعت کے مقاصد کلیہ کو مقدم رکھتے اور احکام جزئیہ میں اگر بے تکلف توجیہ ممکن ہوتی تو کر لیتے ورنہ قواعد کلیہ کو ترجیح دیتے جو طریقہ فقہائے کرام کا ہے۔

۵۔ نقل مذاہب میں قدماء کی نقل پیش فرماتے اور ان کو متاخرین کی نقول پر مقدم رکھتے۔ ائمہ اجتہاد کے اصل اقوال پہلے نقل فرماتے پھر مشائخ کے قول ذکر فرماتے تھے۔

۶۔ مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے۔ گویا وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلبہ کے لیے موجب طمانیت ہوتا۔

۷۔ درس بخاری میں تراجم کے حل کی طرف خاص توجہ فرماتے۔ اولاً بخاری کی غرض و مراد واضح فرماتے۔ بہت سے مواقع میں حلِ تراجم میں شارحین کے خلاف مراد منقح فرماتے تھے۔ ثانیاً یہ بھی بتلاتے کہ اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری رحمۃ اللہ نے ائمہ اربعہ میں سے کس امام کا مذہب اختیار کیا ہے اور پوری بخاری شریف آپ سے پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا کہ سوا مسائل مشہورہ کے اکثر جگہ امام بخاری رحمۃ اللہ نے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالک رحمۃ اللہ کی موافقت کی ہے۔

۸۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ چونکہ امام شافعیؒ کے مقلد ہیں۔ اس لیے امام شافعی رحمۃ اللہ کی تائید میں جابجا امام طحاویؒ کے اقوال اور استدلال نقل کر کے اس کی پوری سعی کرتے ہیں کہ امام طحاویؒ کا جواب ضرور ہو جائے جیسے امام طحاوی کا جواب دینے بیٹھیں۔ حافظ عسقلانیؒ سمجھتے ہیں کہ میں نے حق شافعیت ادا نہیں کیا۔ درس میں حضرت شاہ صاحب کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ مسائل فقہیہ میں حافظ کا جواب دیئے بغیر نہ گزریں۔

۹۔ اسرار شریعت میں شیخ محی الدین بن عربیؒ اور شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کا کلام زیادہ نقل فرماتے تھے۔

۱۰۔ درس کی تقریر موجز و مختصر مگر نہایت جامع ہوتی تھی (جس سے ذی علم مستفید ہو سکتے تھے) ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ دیوبند تشریف لائے۔ بڑے مہتمم صاحب یعنی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے یہاں تھے۔ بڑے مہتمم صاحب نے فرمایا:۔ مولانا آپ مدرسہ کے سرپرست ہیں۔ آپ ہمارے صدر مدرس کا درس تو سنیں۔ فرمایا! بہت اچھا۔ درس میں تشریف لے گئے۔ فراغت کے بعد حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ درس کا ہر ہر جملہ اس قدر موجز اور مختصر تھا کہ ہر جملہ کی شرح میں ایک مستقل رسالہ لکھا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ درس کو دیکھ کر محدثین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ جب متونِ حدیث پر کلام فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ بخاریؒ و مسلمؒ بول رہے ہیں اور جب فقہ الحدیث پر کلام فرماتے تو محمد بن حسن شیبانیؒ معلوم ہوتے اور جب حدیث کی بلاغت پر آتے تو تفتازانی اور جرجانی معلوم ہوتے اور جب شریعت کے اسرار بیان کرتے تو ابن عربیؒ اور

شعرانی معلوم ہوتے۔

بروایت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں جو کسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی روح رواں اور غیر معمولی عنصر سمجھے جاتے تھے جن دنوں علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی خلیج کی وسعت کم ہو رہی تھی تو صاحبزادہ مرحوم کبھی کبھی دیوبند تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آکر وہ بھی شریک ہو سکے واپس ہو کر میں نے خود اُن سے سُنا کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمرج کے لکچر ہال کا منظر میرے سامنے آگیا تھا۔ یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا۔ آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا۔

علامہ سید رشید رضا مرحوم مدیر "المنار" جانشین مفتی محمد عبدہٗ (مصر) کا شاہ صاحب کے متعلق مختصر تاثر پیچھے گزر چکا ہے۔ ان کی دیوبند آمد۔ دارالعلوم کا معائنہ اور حضرت شاہ صاحب کی تقریر کا مفصل واقعہ حضرت مولانا محمدؐ صاحب انوری خلیفہ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی زبانی سنیئے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔:

دو سنہ ۱۳۳۰ھ میں علامہ رشید رضا مصری مدیر المنار" وصاحب تفسیر مشہور بتقریب صدارت اجلاس دارالعلوم ندوۃ لکھنؤ ہندوستان تشریف لائے تو دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر یہاں بھی تشریف لائے۔ ان کے لیے خیر مقدم کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ اس وقت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ بھی موجود تھے۔ اتفاقاً علامہ رشید نے جلسہ سے قبل کسی استاذ دارالعلوم سے دریافت کیا کہ یہاں درس حدیث کا طرز کیا ہے؟ تو بتلایا کہ پہلے قاری حدیث پڑھتا ہے اور استاد اس حدیث سے متعلق تمام مباحث علمیہ اور حقائق و نکات بیان کرتا ہے۔ پھر اگر حدیث احکام سے متعلق ہوتی ہے تو استاد متبوعین کے دلائل بھی بیان کرتا ہے اور امام اعظم کا مذہب بظاہر حدیث کے مخالف ہوتا ہے تو استاد توفیق، تطبیق یا ترجیح راجح کے اصول پر تقریر کرتا ہے (یعنی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک جن دوسری احادیث سے مستند ہوتا ہے۔ ان احادیث کو بطور دلائل پیش کرتا ہے۔) اور حنفی مسلک کو مؤید و مدلل کرتا ہے۔ یہ بات علامہ کو بہت عجیب معلوم ہوئی۔ کہنے لگے کہ کیا ہر حدیث میں ایسا ہوتا ہے۔؟ کہا۔ ہاں! اس پر علامہ نے کہا۔ "کیا حدیث حنفی ہے"۔

یہ بات تو اسی طرح یہاں ختم ہوگئی۔ اور جلسہ کی شرکت کے لیے حضرت شاہ صاحب تشریف لا رہے تھے کہ راستہ ہی میں علامہ کی اس گفتگو کا حال سُنا۔ حضرت شاہ صاحب کا ارادہ علامہ کو خوش آمدید کہنے اور دارالعلوم کی تاریخ و دیگر عام امور پر تقریر فرمانے کا تھا۔ مگر اس گفتگو کا حال سن کر ارادہ بدل گیا اور راستے ہی قلیل وقفہ میں کہ جلسے میں پہنچے اور کچھ دیر بیٹھے۔ دارالعلوم کے اسی مذکورہ بالا طرز درس حدیث پر مضمون ذہن میں مرتّب فرما لیا۔ اور پھر وہ مشہور و معروف خالص محققانہ محدثانہ تقریر نہایت فصیح و بلیغ عربی میں فرمائی کہ اس کو سن کر علامہ اور تمام شرکاء اجلاس علماء و طلباء حیران رہ گئے۔

اس تقریر میں آپ نے فقہاء محدثین کے اصول استنباط، تحقیق مناط، تنقیح مناط، تخریج مناط کی وضاحت و تشریح احادیث و احکام سے فرما کر حضرت شاہ ولی اللہ رح سے لے کر اپنے اساتذہ دارالعلوم تک کے مناقب اور طرز و طریق خدمت علم و دین پر روشنی ڈالی۔ علامہ آپ کی فصاحت تقریر اور سلاست بیان و قوت دلائل سے نہایت متاثر تھے۔ ایک دفعہ سوال کیا کہ اے حضرت الاستاذ! آپ حدیث قلتین کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ ایک بار کہا حضرۃ الاستاذ آپ مسئلہ قرأۃ خلف الامام میں کیا فرماتے ہیں؟ اسی طرح بہت سے مسائل کو بے تکلف سوال میں لائے اور حضرت شاہ صاحب بھی نہایت انبساط و شرح صدر کے ساتھ کافی و شافی جواب دیتے رہے۔ مولانا مناظر حسن گیلانی کی روایت سے پیچھے گزر چکا ہے کہ علامہ بار بار کرسی سے اٹھتے تھے اور کہتے تھے:۔

وَاللہِ مَا رَأَیْتُ مِثْلَ ھٰذَا الرَّجُلِ قَطُّ۔
خُدا کی قسم! میں نے اس جیسا آدمی ہرگز نہیں دیکھا۔

حضرت شاہ صاحب کی تقریر مذکور کے بعد علامہ موصوف نے تقریر فرمائی اور اس میں حضرت شاہ صاحب کے غیر معمولی علم و فضل تبحر، وسعت مطالعہ، اور بے نظیر استحضار و حافظہ کی داد دی۔ نیز اعتراف کیا کہ جو طریقہ آپ کے یہاں درس حدیث کا ہے یہی سب سے اعلیٰ و افضل و انفع طریقہ ہے اور فرمایا کہ اگر میں ہندوستان اور اس جامعہ علمیہ کو نہ دیکھتا اور اس کے اساتذہ و علمائے اعلام سے نہ ملتا تو یہاں سے غمگین واپس جاتا۔ پھر مصر جا کر یہ سب حالات اپنے رسالہ "المنار" میں شائع کیے اور

اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ "میں نے ازہر الہند دیوبند میں وہ نہضت دینیہ علمیہ جدیدہ دیکھی ہے جس سے نفع عظیم کی توقع ہے۔ مدرسہ دیوبند دیکھ کر جس قدر میرے دل کو مسرت بے پایاں حاصل ہوئی وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوئی۔"

مجھ سے بہت سے لوگوں نے دار العلوم دیوبند کے فضائل و مآثر بیان کیے تھے اور کچھ لوگوں نے علماء دیوبند پر جمود و تعصب کا بھی نقد کیا تھا۔ مگر میں نے اُن کو اس شمار نقد سے بہت بلند پایا اور میں نے حضرت شاہ صاحب جیسا جلیل القدر کوئی عالم نہیں دیکھا" وللّٰہ الحمد

حضرت شاہ صاحب کی تقریر اور علامہ سید رشید رضا کی تقریر و بیانات دار العلوم میں موجود ہیں۔ فاضل محترم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دام فیضہم نے کافی حصہ "نفحۃ العنبر من ہدی الشیخ الانور" میں نقل فرمادیا ہے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

فقہ حنفی اور حضرت شاہ صاحبؒ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا بیان ہے کہ جس سال ہم نے حضرت شاہ صاحبؒ سے دار العلوم دیوبند میں دورہ حدیث پڑھا تھا یہ سال حضرت کا دار العلوم میں آخری سال تھا۔ ایک روز بعد عصر طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے لیے صرف کیے۔ کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارے میں اطمینان حاصل کیا جائے۔ الحمد للہ اپنی اس تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد میں اس بارے میں مطمئن ہوں کہ "فقہ حنفی" حدیث کے مخالف نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف جس درجہ کی حدیث سے استناد کرتے ہیں۔ کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لیے اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔

فقہ میں آپؒ کا ایک خاص اصول

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ ہی رقمطراز ہیں۔ کہ ایک موقع پر فرمایا۔ اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں اور مرجحین و اصحاب فتاویٰ مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر اُن میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ میں اس قول کو زیادہ وزنی اور قابل ترجیح سمجھتا ہوں جواز روئے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے مجتہدین کا اتفاق زیادہ ہو جاتا ہو۔ پھر فرمایا کہ میرا اپنا پسندیدہ اصول تو یہی ہے لیکن دوسرے اہل فتاویٰ جو اپنے اصول پر فتویٰ دیتے ہیں۔ ان کی بھی تصدیق اس لحاظ سے کر دیتا ہوں کہ از روئے فقہ حنفی وہ جواب بھی صحیح ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص ذہن یہ تھا کہ اگر کسی مسئلہ میں فقہا کی مختلف آرا ہوں تو اس پہلو یا مسئلہ کو ترجیح دی جائے۔ جس میں امت کو آسانی اور سہولت ہو۔ اور اس ذہن کی تائید قرآن پاک اور احادیث نبوی سے ہوتی ہو۔ یہ بات مولانا محمد منظور نعمانی نے ۱۹۶۲ء میں سفر حج کے موقع پر منیٰ میں احقر کو ایک مسئلہ کے پوچھنے کے دوران بتائی۔

بقول حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث میں محدثانہ رنگ غالب ہوتا تھا اور حدیث کو فقہ حنفی کے مؤید کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے منشار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ہاتھ در ہاتھ اس کے دلائل و شواہد سے اس دعویٰ کو مضبوط کیا جاتا تھا۔ متون حدیث کی مرویات کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارہ میں آپ جو دعویٰ کرتے۔ اُسے دوسری حدیث سے مؤید اور مدلل کرنے کے لیے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کر دکھاتے جاتے تھے اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہو جاتا تھا تو نتیجتاً فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقہ حنفی کو پیدا کر رہی ہے۔ یہ نہیں تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ احادیث کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جارہا ہے یعنی گویا اصل تو مذہب حنفی ہو جسے ہمویدات کے طور پر روایات حدیث سے مضبوط بنانے کی کوشش کی جارہی ہو۔ نہیں بلکہ یہ کہ اصل حدیث ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے مفہوم کو اس کے فحویٰ اور سیاق و سباق نیز دوسری، احادیث باب کی تائید و مدد سے اسے مشخص کر دیا جائے تو اس میں سے فقہ حنفی

درس ہونے لگتا ہے۔ اس لیے طلبائے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اُٹھتے تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں۔ حدیث کا جو مفہوم ابو حنیفہؒ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السلام کا منشا ہے جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے۔ بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس روایت حدیث میں امام ابو حنیفہؒ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہوم پیش کر رہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جویا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آیا جو اس مقام کے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار ایک مناظرہ میں جو حضرت ممدوح اور ایک اہل حدیث کے مابین ہوا۔ اہل حدیث عالم نے پوچھا۔ کیا آپ ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں؟ فرمایا نہیں۔ میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلہ میں فقہ حنفی ہی کی تائید کر رہے ہیں پھر مجتہد کیسے؟ فرمایا یہ حسنِ اتفاق ہے کہ میرا ہر اجتہاد کلیتہً ابو حنیفہ کے اجتہاد کے مطابق ہے۔ اس طرز جواب سے سمجھانا یہی منظور تھا کہ ہم فقہ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لیے حدیث کو استعمال نہیں کرتے بلکہ حدیث میں سے فقہ حنفی کو نکلتا ہوا دیکھ کر اُس کا ترجیح سمجھا دیتے ہیں۔ اور طریق استخراج پر مطلع کر دیتے ہیں۔ بہرحال اکابر دیوبند کے مذاق کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقلد بھی تھے۔ مگر اس میں محقق بھی تھے۔ وہ مسائل میں پابند فقہ حنفی بھی تھے۔ مگر اس پابندی کو بصیرانہ تحقیق سے اختیار کیے ہوئے تھے۔ جیسے مسئلہ تقدیر میں اہل سنت کا مذہب بندہ جبر و اختیار کو جمع کر کے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے۔ مگر مجبور فی الاختیار ہے۔ اسی طرح مسائل فقہیہ میں۔ حضرت شاہ صاحب کا رنگ یہ تھا کہ وہ مقلد ضرور ہیں۔ محقق فی التقلید ہیں اور تمام اجتہادی مسائل میں جہاں تقلید کرتے ہیں۔ وہاں مسائل کو تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کے ساتھ بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

ایک امریکن مصنف نے اپنی معروف کتاب "ماڈرن ان انڈیا" میں زیر عنوان "دیوبندیوں کا اسلام" اہل دیوبند کا یہی جامع اضداد طریقہ اپنے زیر عنوان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

"حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل دیوبند) اپنے کو مقلد کہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ کو پورے محققانہ انداز سے دیکھتے ہیں اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی تنقیح و تحقیق کرتے ہیں کہ اس دعوائے تقلید کے ساتھ وہ بے ساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ (انتہیٰ بمعناہ)

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ یہ حضرات مجتہد فی التقلید اور محقق فی الاتباع ہیں۔ کورانہ تقلید یا جامد اتباع کے جال میں پھنسے ہوئے نہیں اور لَم یخروا علیہا صُمّاً و عمیاناً کے سچے مصداق ہیں۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحر زخار ہونے کی وجہ سے درس حدیث صرف علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا۔ اس میں استطراداً لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم و فن کی بحث آ جاتی تھی۔ اگر معانی و بلاغت کی بحث آ جاتی تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم معانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لیے واضع نے وضع کیا تھا۔ معقولات کی بحثیں آ جاتیں اور معتزلیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو انداز ہوتا کہ یہ گویا معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لیے قلب نبوی پر وارد ہوئی تھی۔

غرض اس نقلی اور روایتی فن (حدیث) میں نقل و عقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی کہ علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی فی نفسہ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہو کر سامنے آ جاتا تھا۔

بہرحال حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور ہندسی وغیرہ تمام علوم جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا اور اس لیے جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم و فن کا مذاق لے کر اٹھتا تھا۔ اور اس میں یہ استعداد

پیدا ہو جاتی تھی کہ ذیبضمن کلام خدا اور رسول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جاتے اور یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر علامہ الکشمیری نے اختیار فرمایا۔ چنانچہ کبھی کبھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر فرمایا کرتے تھے۔ کہ" بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان ہے" بالخصوص فقہ حنفی کے ماخذ و مناشی کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں۔ کافی سے زائد جمع فرما دیا[1]"

تائید مذہب حنفی" کے اس غیر معمولی اہتمام کی توجیہہ کرتے ہوئے گاہ بہ گاہ فرماتے کہ عمر بھر ابو حنیفہؒ کی نمک حرامی کی ہے۔ اب مرتے وقت بھی نہیں اس پر قائم رہوں۔ چنانچہ کھل کر ترجیح مذہب کے سلسلہ میں اچھوتے اور نادرِ روزگار علوم و معارف اور نکات و لطائف ارشاد فرماتے۔ جس سے یوں محسوس ہوتا کہ من جانب اللہ آپ پر مذہبِ حنفی کی بنیادیں منکشف ہو گئیں تھیں۔ اور ان میں شرحِ صدر کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے اظہار پر گویا آپ مامور تھے۔ ان علوم و معارف کے ذخیرہ کو حضرت ممدوح کے دو رشید شاگردوں، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے الوان اوراق میں جمع کر کے اہلِ علم پر ایک ناقابلِ مکافاۃ احسان فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ ان دونوں محقق فاضلوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی روحانیت سے ان کی نسبت کو اور زیادہ قوی فرمائے"

---

[1] عظامی مرحوم جو فارسی کے گرامی شاعر۔ گرامی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اسی منقبت کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں۔

نامہ بدر رہ باوج مہر و ماہ
در مدیح شیخ انور مردِ راہ

۲

آسمانِ معرفت را آفتاب
شیخ انور شاہ آں عالیجناب

۳

نورِ چشمِ شیخ محمود الحسن
واقفِ اسرارِ ہر نو و کہن

۴

یک جہاں از حلقہ در گوشانِ او
جانِ پاکاں بستۂ دامانِ او

شیخ ما آں مہر شد عالیمقام
شیخ ما آں نائبِ خیر الانام

۶

خاک دیو بند از و پُر نور گشت
بلکہ از نورش جہاں معمور گشت

۷

آسماں چشت را بدرِ منیر
مرشدِ ما شیخِ ما روشن ضمیر

۸

از تصرف فہائی آں عالی گہر
شد عزیز الدین عظامی باخبر

مولانا عظامی

حضرت ممدوح کا یہ جملہ کہ عمر بھر ابوحنیفہ رح کی نمک حرامی کی شاید اس طرف مشیر ہے کہ حضرت ممدوح جہاں روایات حدیث میں تطبیق وتوفیق روایات کا اصول اختیار فرمائے ہوئے تھے۔ وہیں روایات فقہیہ میں بھی آپ کا اصول تقریباً تطبیق و توفیق ہی کا تھا، یعنی مذاہب فقہا کے اختلاف کی صورت میں حنفیہ کا وہ قول اختیار فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہو جائے اور دونوں فقہا باہم جڑ جائیں۔ اگرچہ یہ قول مفتیٰ بہ بھی نہ ہو اور مسلک معروف کے مطابق بھی نہ ہو۔ نظر صرف اس پر تھی کہ دو فقہی مذہبوں میں اختلاف جتنا کم سے کم رہ جائے وہی بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر خود امام کا قول بھی چھوٹ جاتا اور صاحبین کا قول زیر اختیار آجاتا تھا۔ یعنی فقہ حنفی کے دائرے سے تو کبھی باہر نہ جاتے تھے مگر ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بلا واسطہ قول سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے۔ خواہ وہ بواسطہ صاحبین ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول ہو شاید اس کو حضرت نے ابوحنیفہ کی نمک حرامی کرنے سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسع سے رجوع کر کے کھلے طور پر مذہب کے معروف و مفتیٰ بہ حصے بلکہ اقوال ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اختیار و ترجیح کی طرف طبیعت آچکی تھی اور بلاشبہ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات کے بارے میں حق تعالیٰ نے انہیں شرح صدر عطا فرما دیا تھا اور وہ بالآخر اسی راہ پر جم کر چلنے لگے تھے۔ جس پر ان کے شیوخ سرگرم رفتار رہ چکے تھے۔

میں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنا ہے۔ فرماتے تھے کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ متفرد ہوتے ہیں اور ائمہ ثلثہ میں سے کوئی ان کی موافقت نہیں کرتا اس میں میں ضرور بالضرور پوری قوت سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ضرور کوئی ایسا دقیقہ ہے جس تک امام ہی کی نظر پہنچ سکی ہے اور پھر حق تعالیٰ اس دقیقہ کو منکشف بھی فرما دیتا ہے۔ یہ مقولہ امام ابوحنیفہ کے اس مسلک کے ذیل میں فرمایا کہ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ اس مسئلہ میں بالضرور ابوحنیفہ ہی کی پیروی کروں گا۔ کیوں کہ اس میں صرف امام ہی منفرد ہیں اور یہ تفرد اس کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی دقیق بنیاد ان پر منکشف ہوئی ہے جہاں تک دوسروں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکی ہیں۔

اس قسم کا مضمون حضرت نانوتوی قدس سرہ، کے بارے میں میں نے حاجی امیر شاہ خان صاحب سے سنا کہ حضرت مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی (اہلحدیث) سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مقلد ہوں۔ صاحب ہدایہ اور درمختار کا مقلد نہیں ہوں۔ اس لیے میرے مقابلہ میں بطور معارضہ جو قول آپ پیش کریں وہ ابوحنیفہ کا ہونا چاہیے۔ دوسروں کے اقوال کا میں جواب دہ نہیں ہوں گا۔ اس سے بھی یہی نکتہ نکلتا ہے کہ فقہ حنفی میں اصل بنیادی قول ان حضرات کے نزدیک خود امام کا ہوتا تھا اور وہی درحقیقت فقہ حنفی کی اساس ہونے کا حق بھی رکھتا تھا۔

پس ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ، پر آخری عمر میں یہی نکتہ منکشف ہوا جو ان کے شیوخ پر منکشف ہوا تھا اور اس کے خلاف توسع کو وہ ابوحنیفہ کی نمک حرامی کرنے کی تعبیر سے اس مقصد کو ظاہر فرما رہے ہیں۔

غالباً مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کا یہ مذاکرہ حضرت نانوتوی رحؒ سے فاتحہ خلف الامام پر ہوا تھا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور حدیث سے جو فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ کے بارے میں اہل حدیث حضرات پیش فرماتے ہیں۔ مولانا محمد حسین مرحوم کے پیش فرمانے پر اسی حدیث کے جملہ طرق اور مباحث و معانی پر بحث فرماتے ہوئے ایسی تقریر کی کہ مولانا بٹالوی دنگ رہ گئے اور ان پر کہنے لگے کہ مولانا مجھے ایک اشکال ہے۔ وہ یہ کہ آپ جیسا محقق، فقیہ اور صاحب علم و نظر انسان جو خود مجتہدانہ بصیرت رکھتا ہے۔ وہ امام اعظم کی تقلید کیوں کرتا ہے۔ اس پر حضرت مولانا نانوتوی نے مجھے بھی ایک اشکال ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے فرمان کے مطابق جب میں باوجود اس علم و نظر کے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کو ضروری خیال کرتا ہوں تو آپ جیسے لوگ تقلید کیوں نہیں کرتے۔

گزشتہ اوراق میں گزرا کہ علامہ علی مصری حنبلی حافظ حدیث نے حضرت شاہ صاحب کے متعلق یہ کہا کہ اگر "میں قسم کھاؤں کہ علامہ انور شاہ" امام اعظم کے سب سے بڑے عالم ہیں تو حانث نہیں ہوں گا۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب ایسے عظیم انسان تقلید کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ تو پھر عامیوں کے لیے تو تقلید نہایت ضروری ہو گی اور اس سے حضرت امام اعظم رحؒ کی جلالت قدر کا بھی ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے۔ (ارشد)

اس کے ساتھ درس حدیث کے سلسلہ میں مذاہب اربعہ کے خلاف بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورت حال بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان مناظرانہ مباحث اور فرعیاتی اختلافات سے کتاب وسنت کے ہزارہا پوشیدہ علوم وانکشاف ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہ تھے اور پھر ان فرعیات کا تزاحم اور تزاحم کے بعد قول فیصل حضرت ممدوح کے قلب ولسان سے ظاہر ہوتا تو طرف کی خصوصیات لگ جانے سے عجیب وغریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوتے پھر ان تزاحمات میں محاکمہ اور ترجیح کے سلسلہ میں جو تنقیہات بیان ہوئیں۔ وہ خود مستقل علوم ومعارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔

بعض مواقع پر مثلاً حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے تفردات کا ذکر آتا تو پہلے ان کے علم وفضل اور تفقہ تبحر کو سراہتے ان کی عظمت وشان بیان فرماتے اور پھر انکے کلام پر بحث ونظر سے تنقید فرماتے جس میں عجیب رنگ برنگ کیفیات جمع ہوتی تھیں۔ ایک طرف ادب وعظمت اور دوسری طرف رد وقدح یعنی بے ادبی اور جسارت کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ سے بھی بچتے اور راجح اور صواب میں کتمان صواب سے بھی دور رہتے کبھی کبھی علمی جوش میں رنگ مزاح بھی رد وقدح فرماتے تھے جو بجائے خود ہی ایک مستقل علمی لطیفہ ہوتا تھا۔

(ماخوذ از نور الانوار قاری محمد طیب صاحب)

زہد وتقویٰ اور تصوف وسلوک

علمی اشتغال میں غیر معمولی انہماک اور شغف کے باوجود عمل بالکتاب والسنۃ اور اتباع سلف کے اہتمام میں ذرہ بھر کمی اور کوتاہی نہیں ہوتی تھی۔ ملنے والے بہت سی سنتوں کو حضرت شاہ صاحب کے عمل کو دیکھ کر معلوم کر لیا کرتے تھے۔ سنت نبوی علیہ التحیۃ والسلام کے مطابق کھانا اکڑوں بیٹھ کر کھاتے تھے اور کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کرتے اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے ہاتھ میں روٹی اور داہنے ہاتھ سے اُسے توڑ توڑ کر استعمال کرتے تھے۔ لقمے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے استعمال کرتے تھے۔ زہد وتقویٰ حضرت ممدوح کے روشن اور چمکتے ہوئے چہرے پر برستا تھا۔ ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقع پر حضرت ممدوح کا سُرخ وسفید رنگ کشادہ پیشانی اور ہنس مکھ چہرہ نیز چہرہ کی مجموعی وجاہت وعظمت دیکھ کر کہا تھا کہ "اسلام کے حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے جمعہ کے لیے جاتے تو فاسعوا الی ذکر اللہ کا منظر سب کو نظر آتا۔ حَسْبُنَا اللّٰہ تکیہ کلام تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اکثر وبیشتر حسبنا اللہ فرماتے اور ایسے ہی موقعہ بموقعہ اللہ اَجَلّ فرماتے رہتے تھے۔ درس میں بعض اوقات غایت خشیت سے آنکھوں میں نمی آجاتی۔ جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انشاد قصائد اور وعظ میں خوف وخشیت کے اشعار اکثر تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے چہرہ منظر الٰہی نظر آتا تھا اور سامعین کی آنکھیں تر ہو جاتی تھیں۔ ٹھیک طریقہ نبوی کے مطابق کن انکھیوں سے نہ دیکھتے اور جدھر متوجہ ہوتے پورے متوجہ ہوتے تھے۔

ادب علم کا یہ عالم تھا کہ خود ہی فرمایا کہ میں کتاب کو مطالعہ کے وقت اپنا تابع کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں۔ مطلب یہ کہ کسی کتاب پر حاشیہ ٹیڑھا چھپا ہے تو بجائے اس کے کہ کتاب کو حاشیہ کے مطابق پھیرلیں۔ کتاب کو بغیر ہلائے آپ اس طرح گھوم جاتے تھے۔ چنانچہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ لیٹ کر مطالعہ کرتے ہوں۔ یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں۔ بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مودب انداز سے بیٹھتے۔ گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے استفادہ کر رہے ہیں۔ گویا مشہور مقولہ کے مطابق کہ علم اپنا بعض بھی کسی کو نہیں دیتا جب تک اپنا کل اس کے حوالہ نہ کر دیا جائے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ "میں نے بلوغ کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا۔ سبحان اللہ کہنے کو تو یہ بات چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اس پر استقامت اور دوام ہر کس کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی کر سکتا ہے۔ جسے حق تعالیٰ نے ایسے کاموں کے لیے موفق ومیسر کر دیا ہے اور وہ گویا بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس سے آداب کے علمی نمونے پیش کرائے جائیں کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل اورا در دلش انداختند

ادب شیوخ و اکابر کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے کبھی آنکھ اٹھا کر یا آنکھ ملا کر گفتگو نہ فرماتے۔ حضرت شاہ صاحب اپنے باطنی کمالات کو ہمیشہ چھپائے رکھتے تھے اور یہ بھی بات ہے کہ علمی کمالات حضرت کے ساتھ ایسے خیرہ کن تھے اور علم کا حضرت پر ایسا غلبہ تھا کہ مجسمہ علم معلوم ہوتے۔ لیکن بفحوائے قرآن پاک انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء

آپ صحیح معنوں میں خدا ترس انسان تھے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے دوسرے پہلو اس کے آگے بالکل دبے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلندترین پہلو بھی جس کو سلوک و تصوف سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اس علمی کمال اور شغف علمی سے دبا ہوا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور آپ یقیناً آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مجاز تھے۔ مگر اس لائن کی باتیں کرنے کی عادت نہ تھی۔ ایک دفعہ واقعہ سنایا اور اس سلسلہ میں جو کچھ جوش آ گیا تو ایک آدھ بات کا پتہ چل گیا۔ فرمایا کہ :

"ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لیے چلا۔ راستہ کی کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنا پڑتی تھی۔ راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر صاحب کے مرید تھے۔ یہ مجھ سے اپنے پیر کے کمالات و کرامات کا تذکرہ کرتے رہے۔ ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی ان پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں بھی پڑتا تھا میں نے بھی ارادہ کر لیا۔ جب ہم دونوں پیر صاحب کی خانقاہ پہنچے تو ان صاحب نے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے۔ ان بزرگ نے اطلاع پا کر خود اپنے صاحبزادے کو مجھے لینے کے لیے بھیجا۔ اور اکرام سے پیش آئے۔ خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مریدین و طالبین نیچے فرش پر تھے۔ مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے طریقہ پر ان پر توجہ ڈالنی شروع کی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو ہو کر گرنے اور تڑپنے لگے۔ میں یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر بھی توجہ فرمائیں۔ انھوں نے توجہ دینا شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا۔ بے چاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی۔ لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا :۔

"یہ کچھ نہیں ہے لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں۔ معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے۔ ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں"۔

پھر اسی سلسلہ میں اور اسی جوش کی حالت میں فرمایا :۔

"اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو انشاء اللہ تین دن میں یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے۔ لیکن یہ بھی کچھ نہیں۔ اصل چیز احسانی کیفیت[1] اور شریعت و سنت پر استقامت ہے"[2]

حضرت علامہ اپنی اس جلالت قدر اور رفع منزلت کے باوجود اکابر دیوبند کے متعلق کیا خیال رکھتے تھے۔ اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دفعہ فرمایا:۔

"ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان)، تو دین حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا۔ اس کے بعد حضرت استاذ (یعنی شیخ الہندؒ) اور حضرت رائپوری (یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے تو وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب

---

[1] اشارہ پیغمبر علیہ السلام کے اس ارشاد کی طرف ہے۔ جس میں آپ نے اس سوال کے جواب میں ما الاحسان - احسان کیا ہے؟ فرمایا ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (بخاری) کہ تو اللہ کی اس طرح عبادت کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ یقین ہو کہ وہ (خدا) مجھے دیکھ رہا ہے۔

[2] الکلام۔ اہل دیوبند کا مسلک ہے کہ اصل چیز اتباع شریعت ہے (ارشد)

کے یہاں جاکر دیکھے [1]

اندازہ کیجیے جن حضرات کی تعریف و توصیف انور شاہ جیسے محدث و فقیہ کی زبان سے ہو رہی ہے۔ ان کا مقام کتنا بلند ہوگا۔ اس کا مجھ جیسے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اسی کتاب میں اپنے اپنے مقام پر آ رہا ہے۔ حضرت رائے پوری علیہ الرحمۃ حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے پیر و مرشد تھے۔ ان کا ذکر شیخ عبدالقادرؒ کے حالات میں ملاحظہ فرمائیے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری فرماتے تھے کہ کچھ دنوں میں نے بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا ہے۔ میں ایک دفعہ سنہری مسجد مدرسہ امینیہ میں گیا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب ایک حجرے میں دروازہ بند کیے ذکر دوضربی جہر کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اللہ اللہ، اللہ اللہ۔ دیر تک اسم ذات کرتے رہے۔ اس وقت عمر بیس اکیس سال کی ہوگی۔ نیز فرمایا جب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ باہر نکلتے تو سر پر رومال ڈال کر آگے سامنے پردہ کر کے نکلتے۔ مبادا کسی عورت پر نظر پڑ جائے۔

عارف باللہ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت شاہ صاحب کا علم اور شہرت سنی۔ دعا فرمایا کرتے کہ کسی طرح شاہ صاحب کی زیارت ہو جائے۔ ایک دفعہ لاہور حضرت کی تشریف آوری کی خبر سن لی۔ کار بھیج کر دعوت دی۔ حضرت نے پہلے تو انکار فرمایا لیکن میاں صاحب کے اصرار پر منظور فرما لیا۔ شرقپور پہنچے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرقپور کو مشرف فرمایا۔ حضرت میاں صاحب بہت ہی ممنون ہوئے۔ حضرت کے دونوں زانو پر بیٹھے اور کہا کہ آپ نائب رسول ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جناب کے چہرۂ مبارک پر نظر کر کے دیکھتا ہی رہوں۔ گفتگو فرماتے رہے اور حضرت شاہ صاحب خاموش سنتے رہے۔ کہیں کہیں کچھ ارشاد فرماتے رہے۔ میاں صاحب علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مجھے نجات کی انشاء اللہ توقع ہو گئی ہے۔ حضرت جب واپس چلے گئے تو بنفس نفیس سڑک تک ساتھ مشایعت کے لیے تشریف لائے۔ جب موٹر چلنے لگی تو پیچھے پاؤں واپس ہوئے فرمانے لگے کہ

"دیوبند میں چار نوری وجود ہیں۔ ایک ان میں سے حضرت شاہ صاحب بھی ہیں۔"

دیوبند میں شاہ صاحب سے کسی نے پوچھا آپ شرقپور گئے تھے۔ میاں صاحب کو کیسے پایا۔

فرمایا:

"میاں صاحب عارف ہیں اور صحیح معنوں میں عارف ہیں۔" (حیات انور بروایت مولانا محمد انوری)

حضرت مولانا محمد انوری ہی تحریر کرتے ہیں کہ

بہاولپور شہر میں جامع مسجد و دیگر مقامات پر قادیانیت کے خلاف تقریر کرنے کے لیے علماء کو بھیجتے رہتے تھے۔ دو دفعہ احقر کو بھی بھیجا۔ ان ایام میں اس قدر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے چہرۂ مبارک پر نور کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بارہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرماتے تھے لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں۔ حالانکہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی۔ بہاولپور جامع مسجد میں جب تقریر کا حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ پہلا دن تھا بعد نماز جمعہ بیان بھی ہوا تھا۔ ہزاروں ہزار کا مجمع بیٹھا تھا۔ پہلے جملے میں فرمایا کہ

حضرت: میں نے ڈابھیل جانے کے لیے سامان سفر باندھ لیا تھا کہ ایک مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ کا خط دیوبند موصول ہوا کہ شہادت دینے کے لیے بہاولپور آئیے۔ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بہاولپور کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے ہی، شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا جانب دار ہو کر بہاولپور میں آیا تھا۔

---

[1] یہ واقعہ حضرت میاں صاحب کے نعتی ... جناب صوفی محمد ابراہیم صاحب نے حضرت میاں صاحب کی سوانح عمری خزینۂ معرفت میں لکھی ہے۔ ... کہنا ہے کہ شرقپور کے موجودہ صاحبزادوں نے خزینۂ معرفت کی نئی اشاعت میں اس حکایت کو حذف کر دیا ہے۔

بس اس فرمانے پر تمام مسجد میں چیخ و پکار پڑ گئی۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ خود حضرت پر ایک عجیب کیفیت وجد طاری تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اختتام وعظ پر فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب کی شان ایسی اور آپ ایسے بزرگ ہیں۔ وغیرہ۔ حضرت فوراً کھڑے ہو گئے اور فرمایا:۔

حضرات! ان صاحب نے غلط کہا ہے ہم ایسے نہیں ہیں۔ بلکہ ہیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ ہم سے گلی کا کتا بھی اچھا ہے۔ ہم اس سے گئے گذرے ہیں۔ یعنی وہ اپنی گلی اور محلے کا حق نمک خوب ادا کرتا ہے۔ مگر ہمارے ہوتے لوگ ناموس پیغمبر پر حملہ کرتے ہیں۔

سبحان اللہ! انکسار اور تواضع کی حد ہو گئی۔

حضرت مولانا انوری مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ

"اسی سفر کے دوران لاہور میں دو روز قیام فرمایا تھا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا۔ علماء، فضلاء بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور ان کے ہی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ بیان ہوتا تھا۔ حضرت نے خطبہ شروع فرمایا۔ وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے۔ احقر کے دل میں وسوسہ گزرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی خلاف ادب ہو۔ حضرت نے فوراً خطبہ بند کر دیا۔ فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک کا جواب دینے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے۔ غالباً لوہے کے تھے۔ منبر کے قریب رکھی گئی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بیٹھ کر جوابات دیئے۔ یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما دیا۔ احقر ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گیا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اخلاق و شمائل کتب حدیث میں روایت کئے گئے ہیں۔ ان میں ایک عادت مبارکہ یہ بھی نقل کی گئی کہ آپ بہت زیادہ خاموش رہتے (گویا بلا ضرورت بولتے ہی نہ تھے) حدیث کے الفاظ ہیں:۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت۔

حضرت شاہ صاحب اس عادت مبارکہ کا کامل نمونہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو صرف علمی و دینی استفادہ و افادہ کے لیے اور ناگزیر ضروری باتوں ہی کے زبان دی گئی ہے۔

اور اس خاموشی میں تنفس کی منضبط کیفیت اور ایک خاص نوعیت "محسوس کرنے والے صاف محسوس کر لیتے تھے کہ پاس انفاس کے شغل میں برابر مشغول (صوفیہ کے اشغال میں سے صرف پاس انفاس کے متعلق آپ کا خیال تھا کہ اس کی اصل حدیث و سنت سے کچھ معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے خود اپنا شغل تھا اور رجوع کرنے والے نیاز مندوں کو تلقین بھی فرماتے تھے)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات مبارکہ میں صحابہ کرامؓ ذکر فرماتے ہیں کہ:۔

"مسکرانے کی تو بہت زیادہ عادت تھی۔ مگر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا"

یہی حال حضرت شاہ صاحبؒ کا تھا۔

اس زمانہ میں غیبت کی بیماری کس قدر عام اور متعدی ہو گئی ہے اور اس سے اس کے اڑتے ہوئے جراثیم سے محفوظ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کا اندازہ بہت سے کو شاید نہ ہو اور بہت کم لوگ ہیں جو اس سے بچتے ہوں اور اس دور میں جو بندہ غیبت سے محفوظ ہو وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے اور یہ اس کی بڑی کرامت ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا محفوظ فرمایا تھا کہ کبھی اشارۃً یا کنایۃً بھی غیبت کی کسی قسم کی کوئی بات کبھی کسی نے ان سے نہیں سنی۔ تھا کہ اگر حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی کوئی بات کی تو حضرت نے فوراً روک دیا۔ اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرنے آتا تو اس کا جواب دیتے۔ اور اگر وہ بیٹھا اور باتیں کرتا تو یہ فرماتے۔ جاؤ بھائی آرام کرو۔ آرام بہت اچھی چیز ہے۔ یعنی مالایعنی سے احتراز میں دنیا اور آخرت دونوں کی راحت ہے۔

بروایت حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی :-

نور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جو شخص بھی دیکھتا۔ وہ اوّل نظر میں یقین کر لیتا کہ یہ خدا کا کوئی نیک بندہ ہے حق یہ ہے کہ نورِ تقویٰ اجلی بدیہیات میں ہے مگر حقیقت کی تنقیح بہت دشوار ہے اور درجہ اتصاف کی دشواری کو تو پوچھو ہی مت۔ وانّھا لکبیرۃ الّا علی الخاشعین الذین یظنون انّھم ملٰقوا ربّھم وانّھم الیہ راجعون۔ شاہ صاحب اگر کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور باہر سے کوئی اجنبی مجلس میں داخل ہوتا تو یہ دیکھتے ہی سمجھ لیتا کہ مجلس میں سب سے بڑا عالم اور متقی یہی شخص ہے ؎

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور !
کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور !

یہ ناچیز (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) جب بھی حضرت شاہ صاحب کو دیکھتا تو یہ شعر زبان پر آتا ؎

اَلْمُسْلِمُوْنَ بِخَیْرٍ مَا بَقِیْتَ لَھُمْ وَلَیْسَ بَعْدَکَ خَیْرٌ حِیْنَ تُفْتَقَدُ

جب تک آپ زندہ ہیں۔ اس وقت تک مسلمان خیر و برکت میں ہیں اور تیرے گم ہونے کے بعد کوئی خیر نہیں۔ طبقاتِ شافعیہ میں ہے کہ یہ شعر کسی نے امام بخاری کو دیکھ کر پڑھا تھا۔ شاہ صاحب چونکہ اس زمانے کے امام بخاری تھے۔ اس لیے یہ ناچیز ان کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتا تھا۔

شکل و صورت اور لطافتِ طبع

قدرت نے جس طرح حضرت شاہ صاحب کو اقلیم علم و عمل میں تاجداری عطا فرمائی تھی۔ اسی طرح جسمانی ہیئت قد و قامت اور شکل و صورت میں بھی ایک خاص امتیاز عطا فرمایا تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ مجھ کو ہندوستان، مصر و حجاز اور دوسرے ممالک عربیہ کے بڑے بڑے علماء اور مشائخ کو دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ لیکن جو وجاہت، جو وقار و متانت جو دلکشی اور دلآویزی میں نے حضرت الاستاذ میں پائی۔ وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ ہزار علماء میں بھی بیٹھتے تو سب سے الگ اور سب سے نمایاں رہتے۔ دیکھنے والوں کی نگاہ ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہیں پر جا کر ٹھیرتی اور پھر جمتی تو اس طرح کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتی۔ کشمیری النسل تھے۔ اس لیے خوب کھلا ہوا سپید رنگ، کشیدہ و دراز قامت، چوڑا چکلا سینہ، دوہرا اور گداز جسم بڑی بڑی مگر رسیلی اور شرمیلی نگاہیں۔ کشادہ و فراخ پیشانی طویل مگر ستواں بینی، بڑے بڑے کان پر گوشت اور فربہ چہرہ ابریشم و حریر کی مانند نرم و سبک جلد، چلتے تھے تو معلوم ہوتے تھے کہ علم کا ایک کوہ گراں سبک گامی کر رہا ہے۔ بیٹھتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک آفتاب عالم تاب ہے، وابستہ ستاروں کو اپنے گرد لیکر بیٹھ گیا ہے۔ کبھی سفید اور کبھی سبز سر پر عمامہ اور قامت بالا پر سبز قبا! دیکھنے والے ڈر ڈر کے دیکھتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کہ فرمانِ نبوی ہے۔ العین حق۔ غرض کوئی ایک ادا ہو تو اس کا ذکر کیجئے۔ کوئی ایک خوبی ہو تو اس کو بیان کیا جائے۔ جہاں یہ عالم ہو کہ :-

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ! کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

وہاں خاموشی کو ہی ترجمانیٔ دل کا منصب تفویض کر دینے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔

اسی حسن و جمال ظاہری و باطنی کے باعث طبیعت میں لطافت بھی بہت زیادہ تھی۔ بہت صاف اور اُجلے کپڑے پہنتے تھے۔ غذا میں سادگی پسند تھی۔ تازہ پھلوں اور طیور کے عاشق تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ بیس سال میری زندگی میں ایسے گذرے ہیں کہ میں نے پرندوں کے علاوہ اور دوسرا گوشت کھایا ہی نہیں۔ میٹھے خربوزوں کے بہت شوقین تھے۔ اگر میٹھے خربوزے میسر آجائیں تو اور کھانا بہت کم کھاتے تھے۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بہت معترف تھے۔ ان کے علم کی عظمت و شان کو بہت وقیع اور عقیدت بھرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ یہ جبال علوم ہیں۔ ان کی رفعت شان اور جلالت قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں ان کی عظمت کو سر اٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی پیچھے سے گر جائیگی۔ لیکن

استاذ علی الحرشش میں اگر وہ یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں نہیں گھسنے دوں گا۔

ایک دفعہ عصر مغرب کے درمیان بخاری شریف کا درس زور وشور سے ہو رہا تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین ہی رخصت ہو گئے تو اب درس کا کیا لطف رہا۔ جاؤ تم بھی گھر کا رستہ لو۔ طلبہ حیران ہوئے کہ بھائی شمس الدین کون اور کب آئے اور کب رخصت ہو گئے ؟ حیرانی دیکھ کر فرمانے لگے۔ جاہلین! دیکھتے نہیں۔ وہ بھائی شمس الدین جا رہے ہیں۔ اب کیا اندھیرے میں پڑھو گے ؟ کیا وہ لطف کا سبق ہو گا ؟

ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے۔ فرمایا کہ جاہل تجھے معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں۔ جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہو گی ؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا۔ وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ مارے گا اور وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ رسید کرے گا۔ یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلہ سند تجھ تک پہنچ جائے گا۔

ایک دفعہ مسائل فقہیہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آ گیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ فرمانے لگے [illegible] ہے مگر بعض نابالغوں کے پیچھے ہو بھی جاتی ہے (اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب ہی مسجد دارالعلوم میں امامت کرتے تھے) فرمانے لگے تم نے کبھی پیر نابالغ بھی دیکھا ہے ؟ جو چالیس برس کا بھی ہو اور نابالغ بھی ؟ جاہلین وہ ۴۰ برس کا نابالغ میں ہوں (اس وقت تک حضرت کی شادی نہیں ہوئی تھی) اشارہ اسی طرف تھا۔

ایک دفعہ ملا علاؤ الدین میرٹھی قلفی کا برف لیکر آئے۔ حضرت مہتمم صاحب مولانا محمد احمد مرحوم نے اس کو بلایا اور شاہ صاحب سمیت دوسرے اکابر کھانے لگے۔ کھانے کے دوران شاہ صاحب نے پوچھا کہ ملا جی! اس برف میں کتنا کما لیتے ہو ؟ کہا کہ ساٹھ روپے۔ مسکرا کر فرمانے لگے کہ تو پھر تمہیں دارالعلوم کی صدر مدرسی کی ضرورت نہیں (ان دنوں حضرت کی تنخواہ ساٹھ روپے تھی)

بہرحال شاہ صاحب علمی وعملی کمالات رکھنے کے ساتھ ساتھ خوش طبع بھی تھے۔ مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھرپور ہوتی تھی جس میں غیر متعلق فضول اور لایعنی باتوں کا کوئی وجود نہ ہوتا تھا۔ اگر کسی نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو معاً فرماتے کہ بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے۔ کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو ورنہ جاؤ۔ ہمارا وقت ایسی باتوں کے لیے فارغ نہیں۔ وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت کرتے تھے۔

اوقات کا بڑا حصہ مطالعہ کتب میں گزرتا تھا۔ ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی ضروریات کے علاوہ کوئی وقت کتب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ فتح الباری کا (جو تیرہ جلدوں کی کتاب ہے) تیرھویں دفعہ مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لیے کبھی مطالعہ نہیں دیکھتا مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل۔ اس لیے ہر سال درس میں نئی نئی تحقیقات آتی رہتی ہیں۔

اخلاق

علم وفضل کی بلندی کے تناسب سے اخلاق بھی نہایت بلند اور پاکیزہ تھے۔ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی سائل حضرت کے پاس آیا ہو اور نامراد گیا ہو۔ جیب میں جو کچھ ہوتا۔ اٹھنی یا روپیہ سائل کے حوالہ کر دیتے۔ ایسی بات کرنے سے احتراز کرتے جس سے کسی کی دلآزاری ہو۔ ایک دفعہ امرتسر تشریف لے گئے۔ وہاں کے ایک نامی گرامی بیرسٹر بربنائے عقیدت حاضر ہوئے۔ لیکن داڑھی مونچھ صاف ہونے کی وجہ سے بھینچے بھینچے سے بیٹھے۔ شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ آپ نے بھانپ لیا اور فرمایا بیرسٹر صاحب آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں کا فعل اگرچہ مختلف ہے لیکن غرض وغایت دونوں کی ایک ہی ہے یعنی دنیا کمانے میں اگر مولوی ہو کر داڑھی نہ رکھوں تو کوئی مجھے کھانے کو نہ دے۔ اور اسی طرح اگر آپ بیرسٹر ہو کر داڑھی صاف نہ کرائیں تو ہر کوئی کہے کہ ابے ان کو بیرسٹر کس نے بنا دیا۔ یہ تو ملا جی ہیں۔ تو پھر آپ کو بھی بیرسٹری کے نام پر روٹی نہ ملے۔ جب ہم دونوں کی غرض ایک ہے، تو محض اختلاف فعل پر آپ شرمندہ کیوں ؟

خوُد داری

عام اخلاق و فضائل کے ساتھ حضرت شاہ صاحب میں خود داری بھی انتہا درجہ کی تھی۔ برار کے قضیہ کے سلسلہ میں نظام حیدرآباد دہلی آئے ہوئے تھے کہ خود نظام کی خواہش پر حضرت شاہ صاحب بھی دیوبند سے دہلی تشریف لائے اور وقت مقررہ پر نظام کی قیام گاہ پر پہنچے۔ خبر ہوتے ہی نظام نے اندر بلا لیا۔ حضرت شاہ صاحب پہنچے تو عام آداب و شرائط کا لحاظ اور نہ کسی شاہی دستور و آئین کی پابندی۔ روبرو ہوتے ہی شاہ صاحب نے پیش قدمی کی اور خالص اسلامی طریقہ پر "السلام علیکم" کہا۔ نظام پیشوائی کے لیے آگے بڑھے اور "وعلیکم السلام" کہہ کر شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھا کر بٹھا دیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر دائرۃ المعارف کے کام سے متعلق تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کی چند اہم کتابوں اور ان کے قلمی نسخوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر آپ ان کو بھی حاصل کر کے دائرۃ المعارف کی طرف سے شائع کر دیں تو یہ شعبہ علم حدیث کی اور اس کے واسطے اسلام کی یہ بڑی خدمت ہوگی۔ اس زمانہ میں دیوبند سے ایک ہفت روزہ اخبار "مہاجر" نکلتا تھا اس کے ایڈیٹر نے اس ملاقات کی خبر چھاپنے کا ارادہ کیا تو عام ذہنوں کے مطابق "بارگاہ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی"، یا اس مفہوم کی کوئی اور عبارت بطور عنوان خبر لکھی۔ چھپنے سے پہلے اتفاق سے شاہ صاحب کو خبر ہو گئی تو حد درجہ خفا ہوئے اور فرمایا کہ "میں ہر چند ایک فرد بے مایہ و بے بضاعت ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارا کر لوں۔ کیسی بارگاہ خسروی اور کیسی اس میں باریابی؟ صاف لکھیے کہ نظام اور انور شاہ کی ملاقات"

ایک مرتبہ حیدرآباد کے مولوی نواب فیض الدین صاحب ایڈووکیٹ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی لڑکی کی شادی میں بلایا چونکہ نواب صاحب اور ان کے خاندان کو علمائے دیوبند کے ساتھ قدیم رابطہ اور قلبی علاقہ تھا۔ دوران قیام میں بعض لوگوں نے چاہا کہ حضرت شاہ صاحب اور نظام کی ملاقات ہو۔ حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا مجھ کو ملنے میں عذر نہیں ہے لیکن اس سفر میں نہیں ملوں گا۔ کیونکہ اس سفر کا مقصد نواب صاحب کی بچی کی تقریب میں آنا تھا اور بس۔ اور میں اس کو خالص ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ ہر چند لوگوں نے کوشش کی اور ادھر نظام کا بھی ایما تھا مگر شاہ صاحب رضامند نہیں ہوئے

اسی قیام حیدرآباد کے زمانہ میں ایک روز سر اکبر حیدری کا فون آیا (جو بعد میں آسام کے گورنر بنے) کہ میں مولانا انور شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں فرمایا کہ انھیں کہہ دیں یہیں ہوں آ جائیں۔ حیدری صاحب کو پیام پہنچایا گیا تو انھوں نے کہا۔ بہت اچھا میں حاضر ہوتا ہوں۔ مگر میرے آنے پر حاضرین مجلس کو اٹھا دیا جائے۔ میں تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت کو پیام دیا گیا تو فوراً ارشاد فرمایا کہ ناممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لیے حاضرین مجلس کو چھوڑ کر الگ جا بیٹھوں یا ان لوگوں سے میں کہوں کہ چلے جائیں۔

اسلامی غیرت و حمیّت

حضرت علامہ کشمیری طبعاً بڑے حلیم اور بردبار تھے۔ لیکن اسلامی اور دینی معاملات میں وہ کسی طرح تساہل یا غفلت شعاری کو گوارا نہیں کرتے تھے۔

مقدمہ بہاولپور میں مرزائی وکیل ایک دفعہ کہنے لگا کہ فلاں بزرگ مرزا غلام احمد کو کافر نہیں کہتے۔ آپ نے فرمایا نہ کہتے ہوں گے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے اس نے اس بات کی تکرار کی۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس بزرگ سے نواب بہاولپور کا روحانی تعلق تھا۔ مرزائی وکیل چاہتا تھا کہ شاہ صاحب کوئی سخت بات کہیں جس سے مقدمہ پر کوئی اثر پڑے۔ شاہ صاحب سمجھ گئے تھے۔ اس لیے نرمی سے کہتے رہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب اس نے تکرار کی تو شاہ صاحب جلال میں آ گئے اور تن کر فرمایا۔ "اللہ کی جہنم بہت وسیع ہے اس میں (اس بزرگ کا نام لے کر) وہ بھی جل سکتا ہے۔ فبہت الذی کفر۔ مرزائی حیران دیکھتا رہ گیا۔

ایک دفعہ ڈابھیل سے دیوبند جا رہے تھے۔ دہلی سٹیشن پہ گاڑی بدلنا تھی۔ کافی دیر رکنا پڑا۔ دوران گفتگو حضرت کو معلوم ہوا کہ دہلی میں قادیانیوں کا تین دن تک جلسہ ہوتا رہا جس میں ہر قسم کی تقریریں کی گئیں۔ لیکن علمائے اسلام میں سے کسی شخص نے جلسہ میں پہنچ کر ان کو مناظرہ کی دعوت نہیں دی۔ حضرت علامہ غصہ میں آ کر مولانا سعید احمد ایم اے اکبرآبادی سے فرمانے لگے۔ "مولوی صاحب! کسی شریف آدمی کی توہین گالی سننے ہی سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر وہ کوئی اپنے مرتبے

ہزا کام کرے تو اس سے بھی اس کی توہین ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسی کہ گالی وغیرہ سے۔

اس پر ایک واقعہ سُنایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کے پاس ایک متمول اور باعزت آدمی نے ایک شخص زبرقان نامی کے خلاف شکایت کی کہ اس نے ایک
ر میں اس کی بڑی شدید ہجو کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے شاعر سے جواب طلب کیا تو اس نے کہا، امیر المومنین میں نے تو اس کی مدح کی ہے نہ کہ
ت۔ دیکھئے میں کہتا ہوں :۔

دع المکارم لا ترحل لبغیتہا　　واقعد فانک انت الطاعم الکاسی

ترجمہ:۔ تو چھوڑ بزرگیوں اور بڑی طاقتوں کو۔ مت سفر کران کی طلب میں۔ تو بیٹھا بھی رہ اپنے گھر کے اندر، کیونکہ
تو کھانے والا بھی ہے اور پہننے والا بھی۔ ماشاء اللہ خوب کھاتا پیتا آدمی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ شعر سنا تو فرمایا۔ استغاثہ بالکل صحیح ہے۔ درحقیقت ایک شریف آدمی کی اس سے بڑھ کر توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ حصول
ارم کو غریبوں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

بان اردو و انگریزی کی اہمیت

ایک دفعہ دورہ حدیث شریف کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں نے اپنے عربی و فارسی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیشہ اردو پڑھنے لکھنے سے احتراز کیا۔ یہاں تک کہ عام طور
ے اپنی خط و کتابت کی زبان بھی میں نے عربی فارسی ہی رکھی۔ لیکن اب مجھے اس پر بھی افسوس ہے۔ ہندوستان میں اب دین کی خدمت اور دین کا دفاع
نے کے لیے ضروری ہے کہ اردو میں مہارت پیدا کی جائے اور باہر کی دنیا میں دین کا کام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا جائے۔ میں
ں بارے میں آپ صاحبان کو خاص طور سے وصیت کرتا ہوں۔"

ختم نبوت اور حضرت شاہ صاحب

اس صدی کے دو چار عظیم فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کاذبہ کا فتنہ ہے اور یہ فتنہ اس لحاظ سے اور بھی شدید تھا کہ اس کو اسوقت حکومت کی سرپرستی کا شرف حاصل
ا جس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ اللہ کی شان ہے کہ آج دوپہر کے وقت بھی نظر نہیں آتا۔ کیونکہ انگریز کی اب موثر حکومت صرف اپنے
ملک پر ہے اور وہاں سورج سال میں کبھی کبھار ہی نظر آتا ہے۔ اور یہ بات صرف ہمارا قیاس ہی نہیں۔ خود متنبیٔ قادیان نے کہا ہے کہ وہ انگریزوں کا خود
شتہ پودا ہے۔ اور یہ بات اور بھی نمایاں ہو کر اس وقت سامنے آگئی۔ جب سقوط بغداد پر مرزائیوں نے قادیان میں گھی کے چراغ جلائے۔

غلام احمد قادیانی کی نبوت مذہبی سے زیادہ سیاسی تحریک تھی۔ مگر اس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا اور قادیانی اسلامی اصطلاحوں اور علمی مغالطوں
کے ذریعے مسلمان کی دولت ایمان کو لوٹنے لگے۔ اسلامیان ہندوستان اس سے برافروختہ ہوئے اور ہر مسلک وخیال کے سرآوردہ حضرات نے اس سلسلہ میں
ی کام کیا اور حق یہ ہے کہ پیر مہر علی شاہ صاحب اور ابوالوفا مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابراہیم سید سیالکوٹی رحمہم اللہ اجمعین نے رد مرزائیت میں خوب
کام کیا۔ جنگ عظیم میں سقوط بغداد پر قادیان میں گھی کے چراغ جلنے اور اس جنگ میں مرزائیوں کے علی الاعلان انگریزوں کی حمایت نے اس جماعت کے
رکنوں کے حوصلے بڑھا دیئے اور یہ لوگ کھل کر سامنے آنے لگے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب علیہ الرحمۃ جیسا محب رسول عالم اور نور بصیرت ودانش سے
ہر مند انسان کا سپر بلا تھا اور حضرت شاہ صاحب نے اس سلسلے میں سب سے جامع کام کیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
کا ذکر یوں فرمایا ہے۔

اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ كَانَ اُمَّةً ـــــ "بے شک ابراہیم امت تھے" یعنی اپنی ذات کے لحاظ سے تو ایک فرد تھے۔ لیکن کام کے لحاظ سے ایک

امت کے برابر انھوں نے کام کیا۔ بعینہٖ اسیطرح شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اس امّت محمّدیہ علیہ التحیۃ والصلوٰۃ والسلام کے ان جامعہ افراد میں سے ایک شخص
تھے جنھوں نے بیک وقت مختلف محاذوں پر کام کیا اور جن کے نور معرفت نے ہر شعبہ زندگی میں برقی لہر دوڑا دی۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم اجمالی طور پر ختم
ختم نبوت کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمات کا تذکرہ کرتے رہیں۔

ختم نبوت کے سلسلہ میں کام کرنے کے کئی تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ خالص علمی انداز میں ردّ مرزائیت کیلئے ایک جماعت ہو۔ جو نہایت سنجیدگی اور متانت
سے اس کام کو سرانجام دے۔ ایک صورت یہ تھی کہ شعلہ نوا مقرروں کی ایک کھیپ تیار کی جائے۔ جو اپنی شعلہ نوائی اور آتش بیانی سے عوام کو اس تحریک
کے مخفیہ مقاصد سے آگاہ کرے اور حسب ضرورت قربانی سے بھی گریز نہ کرے۔ ایک پہلو کام کرنے کا یہ تھا کہ کسی ایک بڑی شخصیت کو ردّ مرزائیت کا مبلغ بنا
جائے جس کا ایک ایک لفظ خرمن قادیانیت کے لیے صاعقۂ برق ثابت ہو۔ ایک انداز کام کرنے کا یہ تھا کہ اگر مرزائی متکلمین تحریر کے ذریعے تبلیغ کر
تو ان کے مقابلہ کرنے والے تحریر میں ان کا جواب دیں۔ ایک شعبہ کام کرنے کا یہ تھا کہ مناظروں میں انکو شکست دی جائے۔

بنظر غائر دیکھا جائے تو حضرت شاہ صاحب نے ان تمام محاذوں پر بطور خود سالار اعلیٰ کے فرائض انجام دے اور ہر موقعہ و جگہ کے لیے کام کرنے
والے افراد کی تربیت کی اور انکو آگے لائے۔

علمی میدان میں شاہ صاحب نے علماء کے لیے عربی اور فارسی میں مختلف رسائل لکھے۔ جو ردّ مرزائیت میں اصولی انداز پر حرف آخر ہیں اور اسی طرح علماء
کی تربیت کی کہ وہ اس محاذ پر علمی رنگ میں کام کریں۔ چنانچہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب
میرٹھی، مہاجر مدنی جیسے یگانہ روزگار اہل قلم کو اس طرف متوجہ کیا۔ عوامی سطح پر کام کرنے کے لیے مجلس احرار اسلام کو متوجہ کیا اور لاہور انجمن خدام الدّین کے جلسہ پر
اردو زبان کے سب سے بڑے عوامی خطیب اور شعلہ نوا جادو بیان مقرر مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کو اس بارے میں امیر شریعت کا خطاب دیا اور
سب سے پہلے خود ان کی بیعت کی اور اسی مجلس میں پانچ سو جیّد علماء نے حضرت کی اقتداء میں بخاری علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر بیعت کی اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت
امیر شریعت کی قیادت میں مجلس احرار نے ردّ مرزائیت پر جو کام کیا۔ وہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ اسی طرح فلسفی شاعر علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو
مرزائیت کے خدوخال سے آگاہ کیا اور انھوں نے جیسا کہ مولانا سعید احمد ایم۔ اے اکبرآبادی کے حوالہ سے گزشتہ سطور میں گزر چکا ——— ردّ مرزائیت
پر جو کام کیا۔ وہ حضرت علامہ کشمیری کی توجہ کا اثر تھا۔ جو حضرت شاہ صاحب کا اس مسئلہ پر خصوصی توجہ فرمانا علماء و خواص کے لیے کافی تھا۔ مزید برآں علامہ اقبال
جیسے عظیم مفکر و شاعر کی توجہ خصوصی اس طرف مبذول کر دینے نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ آخری کام یہ تھا کہ اگر کہیں مرزائی سطح مناظرہ کا کھیل کھیلیں۔ تو اس میدان
میں بھی ان کی سرکوبی کی جائے۔

فیروزپور میں مرزائیوں کے ساتھ ایک مناظرہ طے پایا اور عام مسلمانوں نے جو فن مناظرہ سے ناواقف تھے۔ مرزائیوں کے ساتھ بعض ایسی شرائط پر مناظرہ
طے کر لیا۔ جو مسلمان مناظرین کے لیے خاصی پریشان کن ہو سکتی تھیں۔ دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے صدر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت
شاہ صاحب کے مشورہ سے مناظرہ کے لیے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت
مولانا محمد ادریس کاندھلوی تجویز ہوئے۔ یہ حضرات جب فیروزپور پہنچے تو مرزائیوں کی شرائط کا علم ہوا۔ کہ انھوں نے کس طرح دجل سے من مانی شرائط سے مسلمانوں کو
جکڑ لیا ہے۔ اب دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو ان شرائط پر مناظرہ کیا جائے یا پھر انکار کر دیا جائے۔ پہلی صورت مضر تھی۔ دوسری صورت مسلمانان فیروزپور کے
لیے سبکی کا باعث ہو سکتی تھی کہ دیکھو تمہارے مناظر بھاگ نکلے۔ انجام کار انہی شرائط پر مناظرہ کرنا منظور کر لیا گیا اور حضرت شاہ صاحب کو تار دیدیا گیا۔ طے شدہ
مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا اور عین اسی وقت دیکھا گیا۔ کہ حضرت شاہ صاحب بنفس نفیس حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تشریف لا رہے

ہیں۔ انھوں نے آتے ہی اعلان فرمایا کہ جا کیے ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرائط مسلمانوں سے منوالی ہیں۔ اتنی شرائط اور منوالو۔ ہماری طرف کوئی شرط نہیں۔ مناظرہ کرو اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھو۔ چنانچہ اسی بات کا اعلان کر دیا گیا۔ اور مفتی صاحب، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا سید بدر عالم صاحب نے مناظرہ کیا۔ اس میں مرزائیوں کی جو درگت بنی۔ اس کی گواہی آج بھی فیروزپور کے در و دیوار دے سکتے ہیں۔ مناظرہ کے بعد شہر میں جلسہ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے تقریریں کیں۔ یہ تقریریں فیروزپور کی تاریخ میں یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے لوگ جو قادیانی دجل کا شکار ہو چکے تھے۔ اس مناظرہ اور جلسے کے بعد اسلام پر واپس لوٹ آئے۔

علامہ کشمیری کا دورۂ پنجاب

۱۳۴۳ھ میں حضرت شاہ صاحب نے پنجاب کا ایک وسیع دورہ کیا۔ تاکہ مختلف مقامات پر قادیانیوں نے قادیانی منطق کا جو جال پھیلا رکھا ہے۔ اس کا تار و پود بکھیرا جائے۔ چنانچہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا سید محمد بدر عالم صاحب، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا مفتی محمد نعیم صاحب اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی معیت میں حضرت شاہ صاحب پنجاب کے دورے پر نکلے۔ یہ علم و عمل کے پہاڑ اور فضل و ولایت کے سمندر لدھیانہ، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات اور راولپنڈی، ایبٹ آباد، مانسہرہ، ہزارہ اور کوئٹہ وغیرہ میں جلسوں میں مرزائیوں کو للکارتے پھرے۔ مرزائی دجال جو آئے دن اہل اسلام کو مناظروں کے چیلنج کرتے پھرتے تھے۔ ایسے چھپے کہ کسی ایک جگہ بھی چہرہ نہ دکھایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہان میں نہیں ہیں۔

بہاولپور کا معرکۃ الآرا تاریخی مقدمہ

۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ بہاولپور کی ایک مسلمان عورت نے بہاولپور کی ایک عدالت میں دعویٰ کیا کہ اس کا شوہر مرزائی ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کا نکاح فسخ کیا جائے۔ سات سال تک یہ مقدمہ بہاولپور کی ادنیٰ عدالتوں میں پیش ہوتا رہا۔ بالآخر دربار معلیٰ میں پہنچا۔ ۱۹۳۲ء میں دربار معلیٰ سے یہ تعمیل ہو کر کہ اس مسئلے کی دونوں طرف کے علماء کی شہادتیں لے کر تنقیح کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ پھر نچلی عدالت میں آیا۔ مدعیہ غریب عورت تھی۔ اس کے بس کی بات نہ تھی کہ اتنا لمبا چوڑا کام کرے۔ دراں حالیکہ دوسری طرف قادیان کا بیت المال اور رجال کا رسب کچھ اس کیلئے وقف ہو گیا۔ لیکن الحمدللہ بہاولپور کے غیور مسلمانوں کی انجمن موید الاسلام نے اسکا بیڑا اٹھایا اور شیخ الجامعہ بہاولپور کی زیر سرپرستی تمام مشاہیر علماء کو شہادت کے لیے دعوت دی۔ حضرت شاہ صاحب ان دنوں ڈابھیل صدر مدرس تھے۔ گو بوجہ علالت دیوبند میں فروکش تھے۔ لیکن جب اس مسئلہ کا علم ہوا تو اپنی صحت اور دیگر مصروفیتوں کی پرواہ کئے بغیر دیگر مشاہیر کی معیت میں تاریخ مقدمہ سے کئی روز پیشتر بہاولپور میں تشریف لائے اور تقریباً ۲۵ روز بہاولپور میں قیام فرمایا۔
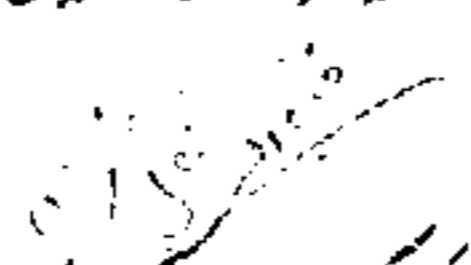
حضرت علامہ کشمیری کا تین دن مسلسل بیان ہوتا رہا۔ ناظرین و سامعین کا بیان ہے کہ حضرت کے بیان کے وقت احاطۂ عدالت میں سکتہ طاری رہتا تھا۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک سمندر ہے جس کی گہرائی کا سوائے قدرت باری تعالیٰ کے کسی کو علم نہیں۔ بیان ۹۰ صفحات پر قلمبند ہوا۔ لیکن سارا از اول تا آخر نہیں۔ صرف اتنا طبع ہوا جو حضرت جج صاحب کو لکھواتے تھے۔ جو جو عبارات اثناء بیان میں تشریحات و تفسیرات کے ساتھ پیش کی جاتی تھیں وہ قلم بند نہیں ہوئیں۔ نیز حوالہ جات میں حرف اوّل اور آخر لفظ لے لیا گیا۔ حالانکہ حضرت پوری عبارت مع تشریح و تفسیر سناتے تھے۔ اگر پورا بیان مفصل شائع کیا جاتا تو تقریباً ایک سو ساٹھ صفحات پر پھیل جاتا۔

بہرحال حضرت علامہ کشمیریؒ اور دوسرے محقق علماء کے بیانات ہوئے اور مقدمہ کا فیصلہ ۱۹۳۵ء ۷ فروری کو سنایا گیا۔ جو ایک سو باون صفحات پر اردو زبان میں شائع ہوا اور ڈسٹرکٹ جج نے مرزائی کو مرتد قرار دیتے ہوئے نکاح فسخ کر دیا۔ وللہ الحمد والمنۃ۔ عدالتی سطح پر اہل اسلام کی اتنی بڑی فتح یہ حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی قدر کی بدولت ہوئی۔ اس مقدمہ کی مفصل کارروائی مطبوعہ ملاحظہ کی جائے۔ یا پھر حیات انور نامی کتاب میں حضرت

مولانا محمد انوری صاحب کا مضمون پڑھا جائے جس میں اس روداد کا اجمالی سا خاکہ آگیا ہے۔

قادیان میں اعلانِ حق

"اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی" کے مصداق حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اعلانِ حق کرنے کے لیے نیز قضیۂ زمین برسرِ زمین کی خاطر کئی دفعہ قادیان تشریف لے گئے اور وہاں پبلک جلسہ کرکے اعلاءِ کلمۃ الحق کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ مرزائیوں نے حکام سے مل کر بہت کوشش کی کہ ان جلسوں پر پابندی لگادی جائے۔ مگر یہ جلسے جس متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس کی بنا پر پابندی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ جب قادیانی جلسے بند کرانے میں کامیاب نہ ہوسکے تو پھر جلسہ سے قبل حضرت شاہ صاحب کو دھمکی آمیز خطوط لکھا کرتے کہ اگر تم یہاں آئے تو قتل کردیئے جاؤ گے اور واپس نہ جاسکو گے اور یہ صرف دھمکی ہی نہ ہوتی تھی بلکہ کئی ایک دفعہ عملاً کوشش کی گئی مگر

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

تصانیف

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی تربیت سے ایسے متبحر اور عظیم عالم پیدا ہوگئے۔ کہ جن کی نظیر کم از کم اس برصغیر میں ملنا مشکل ہے۔ حضرت کے حافظہ، فہم و ذکا، اور جودتِ ذہن کے متعلق سابق میں گزر چکا ہے کہ حضرت اس بارے میں آیۃ من آیات اللہ تھے۔ اگر چاہتے تو ایک ہی نشست میں جس موضوع پر قلم اٹھاتے بیش قیمت کتاب ترتیب دے لیتے مگر اس کے باوجود حضرت کی افتادِ طبع کچھ اس طرح کی واقع ہوئی تھی کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کی طرف کم توجہ دی اور کسی بڑے عالم کی تصانیف نہ ہونا یا کم ہونا۔ اس کی عظمت و جلالت میں کمی نہیں کرتا۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی جلالتِ قدر و فضل و علم سے کون ناواقف ہے کہ آج دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کی پیروکار ہے اس کے باوجود حضرت امام کی تصانیف نہ ہونے کے برابر ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہ کے دور کی طرف چلئے تو حضرت ابوہریرہ رض کی روایات سب صحابہ رض سے زیادہ نظر آئیں مگر حضرت صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض کی مرویات انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ کیا یہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ درجہ اور مرتبہ کے اعتبار سے صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض کم تھے کیونکہ ان کی مرویات کم ہیں۔ ان کی دوسری مصروفیات اور شغل حل و تدبیر نے ان کو اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اس بارے میں بھی توجہ کرسکیں۔

حضرت مولانا سید محمد بدر عالم نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح تالیف فرمادیتے تو پسماندگان کے لیے سرمایہ ہوتا۔ غصہ میں آکر فرمانے لگے کہ زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھا کر پیٹ پالا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی حدیث کی خدمت بکتی رہے۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اس کے باوجود علمی اور دینی تقاضوں کی وجہ سے چند رسائل ایسے یادگار چھوڑ گئے جن کی رہتی دنیا تک قدر ہوتی رہے گی۔ اور

زمانہ جسے لے کر آفتاب کرتا ہے
انھی کی رگ میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

کے مصداق علماء کو مشعل راہ کا کام دیں گے۔

حضرت کی یہ چند مایۂ ناز تصانیف یہ ہیں۔

1. عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام
2. التصریح بما تواتر فی نزول المسیح
3. اکفار الملحدین فی ضروریات الدین
4. تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام
5. خاتم النبیین (فارسی)
6. فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب

۸ خاتمۃ الخطاب فی فاتحۃ الکتاب (فارسی)
۸ نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین ۱۵ اللمعہ فی صلوٰۃ الجمعہ
۹ بسط الیدین لنیل الفرقدین
۱۰ کشف الستر عن صلاۃ الوتر ۲۰ خزائن الاسرار
۱۱ ضرب الخاتم علیٰ حدوث العالم
۱۲ مرقاۃ الطارم لحدوث العالم
۱۳ ازالۃ الرین فی الذب عن قرۃ العینین
۱۴ سہم الغیب فی کبد اہل الریب

ان کتابوں کے علاوہ حضرت کی وہ تقریریں جو درس کے وقت املا کراتے تھے اور جن کو حضرت کے اجلہ تلامذہ نے تحریر کیا ہے۔ ان میں مشہور ترین تقریر فیض الباری کے نام سے جو مولانا سید بدر عالم میرٹھی نے تحریر کی ہے۔ چار جلدوں میں چھپ چکی ہے اور تمام علماء کے حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ بخاری کی تقریر ہے۔ اسی طرح العرف الشذی درس جامع ترمذی کی املا ہوئی ـــــ جس کو مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ نے اور انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد جس کو مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی مرحوم نے منضبط کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم کی املائی شرح منضبط کردہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور حاشیہ سنن ابی داؤد منضبط کردہ مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی غیر مطبوعہ ہیں۔ اور اب اردو میں شرح بخاری بنام انوار الباری حضرت شاہ صاحب کے افادات ۴۲ حصوں میں ساڑھے چھ ہزار صفحات پر شائع ہو رہے ہیں۔ ان سب شرحوں کو دیکھا جائے تو یہ شرحیں بے شمار نئی پرانی شرحوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جو حضرت کے شاگردان رشید میں سے ایک ہیں۔ نے حضرت کی حیات طیبہ پر ایک کتاب بنام نفحۃ العنبر بزبان عربی لکھی ہے۔ اس میں حضرت کی خصوصیات نیز ان کے علمی شہ پاروں کی مکمل تفصیل بیان کی ہے شائقین اس طرف مراجعت فرمائیں۔ نیز حیات انور کے نام سے ایک کتاب اردو میں شائع ہو چکی ہے جس میں حضرت کے اجلہ تلامذہ نے حضرت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مطالعہ کے قابل ہے۔

حیدر ایں قصہ عشق است در دفتر نہ گنجد

اجلہ تلامذہ دار العلوم کے تقریباً ۱۸ سالہ قیام میں کم از کم دو ہزار طلبہ حضرت شاہ صاحب سے بلا واسطہ مستفید ہوئے۔ ان کی مکمل فہرست کیلئے ایک دفتر درکار ہے۔ ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو گوشہ گمنامی میں خدمت دین میں مصروف ہیں اور وہ بھی ہیں جو علم کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور چمک رہے ہیں مختصر فہرست درج ذیل ہے۔

۱ حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری قدس سرہٗ
۲ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند
۳ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
۴ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سیوہاروی
۵ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان
۶ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۷ حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب مہاجر مدنی رح
۸ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
۹ حضرت مولانا محمد میاں صاحب، مصنف علماء کا شاندار ماضی وغیرہ

۱۰ حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب بانی وناظم ندوۃ المصنفین

۱۱ حضرت مولانا فخرالدین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

۱۲ حضرت مولانا محمد انوری صاحب لائل پور

۱۳ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی شیخ الحدیث

۱۴ حضرت مولانا محمدؒ موسیٰ صاحب سملکی بانی مجلس علمی

۱۵ حضرت مولانا محمدؒ صدیق صاحب نجیب آبادی

۱۶ مولانا سعید احمد ایم اے اکبر آبادی

۱۷ حضرت مولانا محمدؒ یوسف صاحب بنوری

۱۸ حضرت مولانا محمد چراغ صاحب گوجرانوالہ

۱۹ مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈوی

۲۰ حضرت مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادیؒ

۲۱ " " مولانا میرک شاہ صاحب

۲۲ " " مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی

۲۳ " " مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ

۲۴ " " مولانا مفتی محمود صاحب شیخ الحدیث

۲۵ " " مولانا مفتی محمد یوسف صاحب میر واعظ کشمیرؒ

۲۶ " " مولانا عبدالحنان صاحب ہزارویؒ

۲۷ " " مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی

۲۸ " " مولانا عبدالرحمان صاحب کیمبلپوریؒ

۲۹ " " مولانا حامد الانصاری غازی

۳۰ " " مولانا مصطفےٰ حسن علوی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

۳۱ " " مولانا فیوض الرحمان صاحب

۳۲ " " مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری

۳۳ " " مولانا عبداللہ صاحب رحؒ خانقاہ سراجیہ کندیاں

۳۴ " " مولانا سلطان محمود صاحبؒ سابق صدر مدرس شیخ الحدیث فتح پور دہلی۔

۳۵ " مولانا قاضی شمس الدین گوجرانوالہ

۳۶ " مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ

۳۷ " مولانا محمد وصی اللہ صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ

۳۸ " مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب بی ایس سی ایم بی بی ایس

۳۹ " مولانا طفیل احمد صاحب قادری بانی دارالتصنیف کراچی

۴۰ " مولانا عبدالحق صاحب نافع

۴۱ " مولانا شمس الحق صاحب افغانی شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

۴۲ " مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مکیؒ خطیب چاٹگام

۴۳ " مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری

۴۴ " مولانا غلام اللہ خان صاحب راولپنڈی

۴۵ " مولانا اسماعیل یوسف گارڈی ڈابھیلی

۴۶ " مولانا سید جلیل الدین انسپکٹر آف سکولز بہاولپور رحؒ

۴۷ " مولانا اطہر علی صاحب سلہٹ

۴۸ " مولانا خواجہ عبدالحی صاحب سابق استاد جامعہ ملیہؒ

۴۹ " مولانا محمد امین صاحب جنڈانوالہ

۵۰ " مولانا شبیر علی صاحب تھانوی۔

۵۱ " مولانا لطف اللہ صاحب پشاوری

۵۲ " مولانا ابوالحسن شیرکوٹی

۵۳ " مولانا مفتی ابراہیم صاحب سنبالوی

۵۴ " مولانا ڈی-ای-بیرا صاحب

۵۵ " مولانا محمد اسماعیل صاحب کاچھوی

۵۶ " مولانا صالح محمد منگیرا

۵۷ " مولانا محمد ایکھلایا صاحب ڈابھیلی

۵۸ " مولانا موسیٰ بھام جی

۵۹ " مولانا لغانی

آخری سات حضرات نے افریقہ میں بہت زیادہ علمی دینی کام کیا ہے۔ مندرجہ بالا حضرات وہ گرامی قدر شخصیات ہیں جنکی علمی دینی تبلیغی خدمات

بڑی علمی دنیا متعارف ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک ادارہ۔ ایک انجمن ایک جماعت ہے۔ اور پھر ان کے مسترشدین اور تلامذہ لاکھوں کی تعداد میں دنیا کے کونہ کونہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیه من یشاء

علامہ کشمیری کی اولاد و اعزہ

حضرت مولانا محمد معظم شاہ صاحب کے سات صاحبزادے اور پانچ صاحب زادیاں تھیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے مولانا یٰسین شاہ صاحب تھے۔ وہ بڑے ذکی، فہیم، عالم و شاعر تھے۔ انکا انتقال بعمر ۲۳ سال حضرت شاہ صاحب کے قیام مدرسہ امینیہ کے زمانہ میں ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ ۱۳۲۰ھ میں دہلی سے کشمیر واپس ہو گئے تھے۔ دوسرے بھائیوں کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

مولانا عبداللہ شاہ صاحب، مولانا سلیمان شاہ صاحب، محمد نظام الدین شاہ صاحب، مولانا سیف اللہ شاہ صاحب فاضل دیوبند، محمد شاہ صاحب حضرت شاہ صاحب کی وفات سے کچھ عرصہ بعد حضرت والد ماجد کی وفات ایک سو کچھ سال کی عمر میں ہوئی۔ پھر چند سال بعد مولانا سلیمان شاہ صاحب کا وصال ہوا۔ اب الحمدللہ باقی بھائی اور ایک دو بہن بھی زندہ ہیں۔

حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے تین صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔ ان سب میں بڑی صاحب زادی عابدہ خاتون تھیں۔ انکا اور منجھلے صاحب زادے محمد اکبر شاہ کا بعمر جوانی انتقال ہوا۔

بڑے صاحب زادے حافظ محمد ازہر شاہ صاحب قیصر عرصہ سے دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہ نامہ "دارالعلوم" کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ کامیاب اور کہنہ مشق صحافی ہیں۔ قلم میں خوب جولانی و روانی ہے۔ ان کے تین صاحبزادے محمد اطہر، محمد راحت، محمد نسیم، اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ سلمہم اللہ تعالیٰ

چھوٹے صاحبزادے مولانا محمد انظر شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند میں لائق استاد اور فاضل محقق و مصنف ہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے احمد اور دو صاحب زادیاں ہیں۔ سلمہم اللہ تعالیٰ

چھوٹی صاحب زادی راشدہ خاتون مولانا سید احمد رضا بجنوری مولف "انوار الباری" کے عقد میں ہیں اور ان سے پانچ بچے اور دو بچیاں ہیں سلمہم اللہ تعالیٰ

⁂ ⁂ ⁂

اس مضمون کی ترتیب و تدوین ہماری ہے۔ لیکن اس کے تمام مندرجات حضرت علامہؒ کے ارشد تلامذہ مولانا مناظر احسن گیلانی، علامہ قاری محمد طیب صاحب مدظلہ۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ مولانا محمد انوری، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا سید محمد میاں صاحب حضرات کے مضامین سے ماخوذ ہیں۔ جو حیات انور کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ انوار الباری سے بھی استفادہ کیا گیا ہے!

محمد ضیا الرحمٰن ضیا بھاگلپوری

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ

گلستانِ وادیٔ لولاب کا تازہ گلاب ۱ چہرۂ انور تھا شرحِ آئینۂ نور و کتاب

تھا جبینِ پاک پہ سیمائے من اثر السجود ۲ دیکھ کر ہوتے نگوں سر دین ہوئے اہلِ جحود

مسلکِ قرنِ اوّلیں کا گم شدہ دُرِّ فرید ۳ جانِ محمود الحسنؒ، نورِ دلِ احمد رشیدؒ

دین کی حقانیت کا حجت و برہاں رہا ۴ تھا فرشتہ اور گمانِ حضرتِ انساں رہا

چلتا پھرتا وہ کتب خانہ تھا مثلِ زیلعیؒ ۵ نکتہ دانِ فقہ و مہر اذکیاء و ترمذی

فلسفی و آشنائے رمزِ قرآنِ مبین ۶ شارحِ علمِ حدیثِ پاک و نکتہ آفریں

بوعلیؔ وقت فخر الدین رازیؒ زماں ۷ شہ ولی اللہ دوران و غزالیِ زماں

قالبِ روحِ بخاریؒ، ہمسرِ ابن الحجرؒ ۸ جانشینِ بوحنیفہؒ، رشکِ یعقوبؒ و زفرؒ

تھا لبیدؒ و سعدیؒ پُر گو نظیرِ بونواس ۹ خوش ادا و خوش مزاج و باجمال و خوش لباس

قولِ مرداں جان میدارد، کی جو تفسیر تھی ۱۰ فرقۂ باطل کے آگے وہ زبان شمشیر تھی

بے نیازِ خانہ و جاہ و جلال و سیم و زر ۱۱ محو تھا درس و بیان و وعظ میں شام و سحر

تھا دلِ شیشہ میں انوارِ جمالِ کبریا ۱۲ اشرف و اورع سراپا دانشِ حلم و حیا

علم کے چرخِ چہارم پر ضیا افشاں رہا ۱۳ ہر ستارہ کا سبب انوار بے پایاں رہا

نفحۃ العنبر مکمل داستاں ہے آپ کی ۱۴ فیض باری بارگاہِ جاوداں ہے آپ کی

آپ ہی کی ذات تو صد نازشِ کشمیر ہے ۱۵ فخر کے قابل ازل سے آپ کی تقدیر ہے

اے خوشا دیوبند جلوہ زارِ حسنِ عالماں ۱۶ مکۂ ہندی، زیارت گاہِ اربابِ دلاں

امامِ انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۸۹ھ — ۱۳۶۳ھ

۱۸۷۲ء — ۱۹۴۴ء

مسودہ تحریر مولانا عبید اللہ سندھی

کے اقتصادی اور سیاسی پروگرام کو اس درجہ منظم کر دیا ہے۔ کہ نہ کوئی سوشلسٹ
پارٹی اور نہ کمیونسٹ پارٹی اسلام کی اس پالیسی سے جنگ کرنا ضروری سمجھے گی۔

اس پر اعتماد اس لئے کیا جا سکتا ہے۔ کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل ہماری اسکیم ماننے والے مسلمانوں کے
ساتھ لڑنا ضروری نہیں جانتا۔ بلکہ بعض پروفیسر تو جلسوں میں کہتے ہیں۔ کہ اگر ایسے
مذہبی جماعت منظم موجود ہوتے تو ہم اس مذہب کو قبول کر لیتے اور کاشتکاروں کے
مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بیحد مفید ہوتا

محترم پریزیڈنٹ! میں نے آپکا بہت سا وقت اپنی سرگذشت سنانے میں لے لیا۔
میرا خیال ہے۔ کہ جبتک کوئی متکلم ہمیں خاص طور پر پہچاننے کی کوشش نہ کرے
وہ ہماری جوابات پر مطمئن نہیں ہوگا۔ آجکل ڈپلومیٹک سیاسیات میں جھوٹ سچ کا امتیاز نہیں کیا جاتا

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

خود نوشت حالاتِ زندگی

۱۹۳۹ء میں مولانا عبیداللہ سندھی کو واپس وطن آنے کی اجازت ملی۔ قدرتی بات تھی کہ اس موقعہ پر ہندوستان کے اخبارات مولانا مرحوم کے متعلق کچھ لکھتے، بعض اخبارات نے اس سلسلہ میں بڑی مبالغہ آرائی کی۔ ایک مضمون میں یہاں تک لکھا گیا کہ جب مولانا ماسکو میں تھے۔ تو لینن کی بیوی ان کے وضو کے لیے پانی خود گرم کرتی تھیں۔ ایک مضمون نگار نے مولانا مرحوم کا نسب ریاست جموں وکشمیر کے شاہی خاندان سے جا ملایا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں مولانا کے متعلق اور بھی بہت کچھ چھپا۔ جس میں مرحوم کی بہت زیادہ تعریف کی گئی۔

مولانا نے مکہ معظمہ میں یہ سب اخبارات دیکھے اور روانہ ہونے سے قبل خود اپنے حالاتِ زندگی لکھ کر ان اخبارات کو شائع کرنے کے لیے بھیجے جو اسی زمانہ میں چھپ گئے تھے۔

"لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ مقالہ نگار عزیزوں کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر فحش غلطیاں موجود ہیں کہ میں بدون شرم محسوس کئے پڑھ نہیں سکتا۔ اس لیے تصحیح کے لیے چند واقعات مختصراً لکھنے پر مجبور ہوں۔" (عبیداللہ سندھی)

میرا خاندان اور مولد

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری تھا۔ لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے۔

میں عموماً سلمان فارسی کے اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے جب اپنا نام والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام "جیونی" تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبید اللہ بن رام بن رام سنگھ لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش اور یتیمی

میں بہ شب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا، میرا باپ ۴ ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد میرا دادا بھی فوت ہو گیا تو میری والدہ مجھے ننھیال لے آئی۔ یہ ایک نانس سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔

میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازیخاں میں پٹواری تھے۔ جب نانا فوت ہوا تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل سکول میں شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ اس دوران میں دو سال کے لیے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا۔ اس لیے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا ورنہ اپنے سکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعہ اسلام

۱۸۸۴ء میں مجھے سکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ سے تحفۃ الہند ملی۔ میں اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا۔ اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری سکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انھیں کے توسط سے مجھے مولانا اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان ملی۔ اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور پرانک شرک اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ اس کے بعد مولوی محمد لکھوی کی کتاب احوال الآخرۃ پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبید اللہ خود تجویز کیا۔ احوال الآخرۃ کا مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں۔ یہی دو چیزیں ہیں جو جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی سکول میں آخری سال تعلیم کے لیے جاؤں گا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

اظہار اسلام

۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کو توکل علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سید العارفین کی صحبت

اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہو گئی۔ اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھرچونڈی والے) کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے۔ چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا۔ (غالباً مولانا ابوالحسن امروٹی اس مجمع میں موجود تھے) کہ عبید اللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے۔ اس کلمہ مبارک کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں۔ اور محض اس لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔

تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لیے رخصت ہوا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت نے میرے لیے خاص دعا فرمائی۔ خدا کرے کہ عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے واسطہ پڑے۔ میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور مجھے اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

سیّد العارفین کے خلیفہ

"بھرچونڈی" سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بہاولپور کی دیہاتی مساجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا اس نقل و حرکت میں دین پور پہنچا۔ جہاں سیّد العارفین کے خلیفہ اول مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو کتابیں یہیں میں نے عبدالقادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آگئیں اور واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی)۔ شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل خانپور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ یہیں ایک نو وارد طالب علم سے ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

دارالعلوم دیوبند

صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔

حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہند

دیوبند دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہندؒ کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ میں ہدایہ، تلویح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا۔ اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمدؒ صاحب لوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا "اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہوگا"۔

چند دوستوں نے بشر خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں دیکھا۔

رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا۔ جسے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے۔ جن میں جمہور اہل علم کے لاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں بلکہ راسخین فی العلم انھیں علم سے جانتے ہیں۔

شوال ۱۳۰۷ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابوداؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔

جہان آباد دہلی

بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں اور سراجی دو گھنٹے میں ختم کر لی۔ لوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر احمد صاحب کی خدمت میں گیا۔ صحیح بخاری ر جامع ترمذی میں دو سبق بھی ان سے سنے۔

حالاتِ سندھ

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ کو دہلی سے سیدھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہنچا۔ اس تمام سفر میں (یاد رہے) لاہور نہیں اترا اور مسجد چینیاں نہیں گیا۔ میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سنن ابی داؤد پڑھی۔

سیّد العارفین کے دوسرے خلیفہ

شوال ۱۳۰۸ھ میں سید العارفین کے دوسرے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ وہ میرے لیے بمنزلہ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خان یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس اخیر وقت تک میرے گھر پر رہیں۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں

ان کے ظلِ عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔

کتب خانہ پیر صاحب العلم

گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدرآباد میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا کتب خانہ تھا۔ میں دورانِ مطالعہ میں وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا۔ میرے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانے کے فیض کا بڑا دخل تھا۔

حضرت پیر صاحب العلم کی صحبت

اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں۔ ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے انہیں سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید وجہاد کے ایک مجدد تھے۔

حضرت مولانا ابو التراب رشد اللہ صاحب العلم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے بڑے جید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی محمد صاحب کی علمی صحبت ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز

اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمت عظمیٰ جس کا شکریہ میں ادا نہیں کر سکتا۔ یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور ایسا ہی قرآن عظیم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کر کے امام دہلوی تک سلسلۂ علماء میرا رہبر بنا اور میں نے اپنا امام بنا لیا۔

مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منظم ہو گئیں اور میں اسلام کو فلاسفی سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

میں نے دہلی میں قبلہ نما کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری رُوح سے پیوست ہو گئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ کا تعارف مولانا شیخ الہند نے کرایا۔ آخر میں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہُوا۔ میں نے علماء کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد شیخ الہندؒ سے پڑھی۔

طریقہ قادریہ

اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال و اذکار بھی حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے خلیفہ اعظم مولانا ابو السراج دین پوری سے سیکھتا رہا۔ اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کر لیتا۔ اس طرح سے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہُوئی۔

میرا سیاسی میلان

دورانِ مطالعہ میں نے مولانا محمد اسماعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبد الکریم دیوبندی کے سقوطِ دہلی کی [illegible] آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کی تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا۔ اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنایا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح اپنے خیال کے مطابق آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔

معاودت دیوبند

۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں اور دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا نے رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ شفہاً اجازت حاصل کی۔

بعض مسائل جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اسے اتحاد

ایک کڑی بنادیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ سے وابستہ رہے۔

دارالارشاد گوٹھ پیر جھنڈا

امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی و سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ الاخوان چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسہ کے نہیں چل سکتا تھا۔ اس دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا رشد اللہ صاحب العلم الرابع نے ۱۳۱۹ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا میں اس شریک ہوگیا۔ سات سال تک علمی و انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن یمانی امتحان لیے تشریف لائے اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو بھی خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند

۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہند نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیت کی تحریک تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارۃ المعارف دہلی

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا۔ اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے ابوالکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

ہجرت کابل

۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہنچ گیا۔

دہلی کی سیاسی جماعت کو بتلایا گیا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتلا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ جس جماعت کے نمائندہ تھے۔ اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے صرف اسی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحادِ اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی۔ جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ یہ ہندوستان سے باہر پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔

سیاحتِ روس

۱۹۲۳ء میں ترکی جاتا ہوا۔ سات مہینہ ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا۔ اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولیات بہم پہنچائیں۔ یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ کامریڈ لینن اس وقت بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہ پہچان سکتا تھا۔

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی شاخ ہے۔ اس زمانہ کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کامیابی پر اوّل انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقا، جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی، سوشلسٹ بھی ہیں اور نیشنلسٹ بھی، سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ممنون اور شکرگزار رہوں گا۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔ فللہ الحمد و

جدید ترکیا

۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا۔ میرے لیے سفیر ترکیا متعین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا اور برطانوی کارندے اس کے لیے تھے۔ یہ غلط ہے کہ میں اس زمانہ میں پہنچا جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے تخمیناً تین سال ترکی میں رہا ہوں۔ میں نے تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز منظر نہیں آیا۔ اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا۔ جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

ہمارا پروگرام

یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاذ الاستاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک علمی جامہ پہنانا چاہتا ہوں۔

اس پروگرام کو ترکی پریس سے شائع کرنے کے لیے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک حرف حرف نہیں پڑھ لیا اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اردو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی سہولت کے لیے میں نے انگریزی ترجمہ بھی شائع کر دیا۔ استنبول چیت رائے سے تبادلہ افکار ہوا اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے ہیں نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں۔ وہ کوشش کر ہمیں ہزار دو ہزار برس پہلے زمانہ میں لا کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے۔ وہ میرے لیے باعث سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدم تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا۔ لیکن اس بنا پر پالیسی کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلامی دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ کلمة الحكمة ضالة الحو حيث وجدها فهواحق بها۔

مکہ معظمہ

۱۳۴۴ھ موسم حج پر مکہ معظمہ میں مؤتمر خلافت منعقد ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر میں مؤتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اس وجہ سے میں ایک طرح محفوظ ہو گیا۔ اگر کبھی کسی جزوی طور پر امداد کی درخواست میں نے کی تو حکومت نے اسے پورا کر دیا۔ میرے پر رہنے میں معمولیاً امور حارج نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔ جزاهم الله خيرًا

علمائے مکہ سے استفادہ

مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبد الرب دہلوی (حاجی علی جان والے) دوسرے عبد الستار بن عبد الوہاب (دہلی) مرحوم تیسرے ابو الاشرف مجیدی۔ ان سب سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبد الرزاق بن حمزہ شیخ الحدیث مکہ اور شیخ ابو السمح عبد الظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ

میں تقریباً ۱۲-۱۳ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے میں انھیں امام ولی اللہ دہلوی کے اصول پر باطمینان حل کر سکا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دہلوی کو نہیں مان سکتے۔ ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک علمی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑے میں نے امام ولی دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیمات الٰہیہ، سطعات، الطاف القدس، لمعات وغیرہ ان کی کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عبقات اور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ کی

(قاسم العلوم اور تقریر دلپذیر اور آب حیات کو استعمال کیا۔

مجھے لڑکوں کے پڑھانے کا موقعہ بھی ملتا رہا۔ اور ساتھ ہی مدرسہ قرآن حکیم بھی جاری رہا۔ اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے۔ للہ الحمد

امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا مدرسہ اگر مجھے موقعہ دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلوی کو حکمت کا مجتہد مستقل تسلیم کروں اور امام عبد العزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمت کے منتسب اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم کو مجتہد فی المذہب کے رتبہ پر تسلیم کروں تو میں اس حکمت کا ایسا مدرسہ قائم کر سکتا ہوں جس میں (الف) قرآن عظیم (ب) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنت خلفائے راشدین (ج) تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔ اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحلیل و تطبیق۔ اس اصول پر آسان ہو جائے۔ ذالک من فضل اللہ واللہ ذوالفضل العظیم۔

مراجعت وطن ۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کر دی اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے۔ اس میں سیاسی مسلک کے اتحاد و اختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۸ء کو اجازت واپسی وطن کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔ حج کا موسم سر پر آ گیا۔ اس لیے ادائے مناسک کے بعد سے فراغت پر واپسی کا ارادہ ہے (و اللہ الرزاق)

ہندوستان میں پروگرام ہندوستان پہنچ کر میرا پروگرام اس کے قریب قریب ہوگا۔

(۱) انڈین نیشنل کانگریس کا معمولی ممبر تو ہمیشہ رہوں گا۔ تاکہ عدم تشدد کے متعلق میری ذمہ داری میرے قومی قانون کے اندر منضبط رہے اور میں پریشان دوستوں کے مشوش حرکات سے محفوظ رہ سکوں۔ لیکن کانگرس کی کسی پارٹی کے عملی حصہ میں شرکت نہیں کروں گا۔

(۲) میرا محبوب مشغلہ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہوگا میں اعلیٰ طبقہ اہل علم کو اس طرف متوجہ کرتا رہوں گا۔ اس میں دینی عالم اور دانشمند دونوں مخاطب ہوں گے اور اگر کوئی غیر مسلم ہندو، مسیحی آزاد منش اس فلسفہ کا مطالعہ پسند کریگا تو اس کی پوری مدد کروں گا۔

(۳) جب کبھی حالات مناسب ہوئے تو میں نیشنل کانگریس میں فلسفہ ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کروں گا۔

واللہ المستعان و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

جبال العوذبۃ
بلد اللہ الحرام

عبید اللہ

مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۔ ایم اے

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا عبید اللہ سندھی کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا۔ ان کے علم وفضل اور مجاہدانہ کارناموں کا ذکر لوگ بڑے جوش وخروش سے کرتے تھے اور اُ
کو سن سن کر دل میں جذبہ اور ولولہ اُٹھتا تھا کہ اسے کاش مولانا اس زندگی میں کہیں مل جائیں اور آنکھیں ان کے دیدار سے شاد کام ہوں۔ آخر خدا
دل کی یہ مراد پوری کی اور ۱۹۳۹ء میں اچانک سنا کہ مولانا تیئس ۲۳ برس کی جلاوطنی کے بعد ہندوستان تشریف لارہے ہیں اور جہاز سے کراچی اُتر کر
دلی تشریف لائیں گے۔ اب ایک ایک گھڑی گننی شروع کر دی اور مولانا کی آمد کا سخت بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا۔
سب لوگ مولانا کے استقبال کے لئے دلی اسٹیشن پر پہنچے۔ علماء اور ملک کے زعماء جس طرح رہتے تھے اس کے پیش نظر میں نے اس وقت مو
کی نسبت جو تخیل قائم کیا تھا وہ یہ تھا کہ عمامہ سر پر ہوگا۔ جبہ زیب تن ہوگا۔ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ایک خادم کم ازکم
ضرور ہوگا۔ دو تین بھاری بھاری سوٹ کیس، ایک بھاری بیڈنگ، دو تین تھرماس کی بوتلیں، تین چار بھاری اور وزنی ناشتہ دان
ہوں گے۔ چہرہ پر تمکنت اور وقار ہوگا۔ لیکن جب ٹرین پہنچی تو یہ تمام تخیلات اوہام باطلہ ثابت ہو کر رہ گئے۔ لوگ پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر فر
اور سیکنڈ کلاس کے درجوں میں گھورتے پھر رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھا۔ ایک صاحب ننگے سر، صرف کھدر کا کرتہ اور پاجامہ پہنے اور ایک سفید
کی چادر گلے میں ڈالے ہوئے، ایک دم میں تھرڈ کلاس سے پھدک کر پلیٹ فارم پر آ کھڑے ہوئے۔ پہچاننے والوں نے پہچانا اور ان کی طرف لپکنا
کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی مولانا عبید اللہ سندھی ہیں۔ سر اور داڑھی کے بال بالکل سپید تھے۔ عمر ۶۵ و ۷۰ سال کے درمیان ہو گی۔ مگر جسم مضبوط ا
تھکا ہوا۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک، پیشانی پر مجاہدانہ عزم وہمت کے کس بل، آواز میں طنطنہ اور چہرہ پر بزرگانہ معصومیت کے ساتھ ایک
جلال کہ گویا ایک سپاہی ایک میدان جنگ سے منتقل ہو کر ایک دوسرے میدان جنگ کی طرف آ گیا اور اس نے ایک دوسرا اور نیا مورچہ سنبھال
ہے۔ لوگوں کو تلاش ہوئی کہ مولانا کا سامان اُتاریں مگر وہاں سامان کہاں تھا۔ جو کچھ مولانا کے جسم پر تھا بس وہی ان کا سامان تھا اور باقی خدا
نام۔ میں نے دنیا میں علماء بھی دیکھے ہیں اور درویش بھی۔ تارکین دنیا بھی دیکھے اور کسانوں اور مزدوروں کے غم میں مرنے والے بھی۔ لیکن دنیا ا
اس کی چیزوں سے اس درجہ بے تعلقی، بے نیازی اور مکمل قسم کا قلندر آج تک نہ کوئی دیکھا ہے اور نہ شاید دیکھوں گا۔

دلی پہنچنے کے بعد مولانا نے ابتداءً قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں کیا تھا۔ یہ جگہ میرے پڑوس میں تھی۔ اسلئے مغر
بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حسب معمول حاضر ہوا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں رخصت
تو مولانا بھی ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرہ سے نکل آئے اور سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک موٹر کار ہمارے پاس آ کر رکی مو
کا دروازہ کھلا تو اس میں سے کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون باہر نکلے۔ انہوں نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ مولانا کراچی میں ایک ضروری کام ہے جس
آپکو میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا۔ مولانا نے پوچھا "کب؟" سیٹھ صاحب نے کہا "بس ابھی" سیٹھ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ مولانا فوراً ایک اُن کیساتھ مو
بیٹھ روانہ ہو گئے۔ نہ کمرہ میں واپس گئے اور نہ وہاں سے کوئی چیز لی اور نہ کمرہ کا دروازہ بند کیا۔ میں اُن کے اس انداز پر حیران رہ گیا مگر واقعہ یہ ہے
مولانا اگر کمرہ میں واپس جاتے بھی تو لیتے کیا۔ وہاں انکا سامان تھا ہی کیا؟ وہاں جو بستر پڑا ہوا تھا یا کچھ برتن تھے تو وہ جامعہ کے مہمان خانہ کے تھے مولانا کا کچھ نہ تھا۔

قرول باغ کے مہمان خانہ میں چند روز قیام فرمانے کے بعد مولانا جامعہ نگر اوکھلا میں منتقل ہو گئے۔ اس زمانہ میں مولانا کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کی نماز
بندی کیساتھ اوکھلے سے آکر دلی کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے مغرب جنوب میں حکیم نابینا مرحوم کا مشہور مطب تھا اور اس مطب سے
ل متصل ہمارے ایک دوست مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی کا بڑا مکان تھا جس کے ایک وسیع کمرہ میں ادارہ شرقیہ کے نام سے مولانا موصوف نے ایک
یمی ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ اس ادارۂ شرقیہ میں جمعہ کی نماز کے بعد سے لے کر عصر تک احباب کا اچھا خاصہ اجتماع رہتا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی بھی جمعہ
ماز سے فارغ ہو کر سیدھے یہیں تشریف لاتے تھے اور عصر تک رہتے تھے۔ چند روز کے بعد ہم لوگوں کی درخواست پر مولانا نے اس مجلس میں حجۃ اللہ البالغہ
رس دینا شروع کر دیا۔ درس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ کتاب کی کوئی اہم بحث نکال لی اور اس پر تقریر شروع کر دی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد ہم لوگ سوالات
تے تھے اور مولانا ان کے جوابات دیتے تھے۔ اس مجلس میں دیوبند کے فضلاء جو دلی میں مقیم تھے وہ اور ان کے علاوہ جامعہ ملیہ کے کچھ اساتذہ اور چند اور ارباب
شریک ہوتے تھے ——— اس سلسلہ میں ایک مرتبہ کیا ہوا ؟ مولانا سندھی حسب معمول اوکھلے سے دلی آئے۔ جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی اور پھر ادارہ
یہ میں تشریف لا کر حسب معمول حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا۔ اس وقت چہرہ پر تھکان کا کوئی اثر تھا اور نہ آواز میں کسی قسم کا اضمحلال اور ضعف۔ کمال بشاشت
وانائی سے تقریر کی اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی پوری توجہ اور حاضر حواسی کیساتھ حصہ لیا۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت
یا تو ہم سب کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا رخصت ہو گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد کسی ضرورت سے چتلی قبر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک
بارہ کی دکان پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ کھانا بھی بہت معمولی یعنی دو آنہ کا سالن ایک آنہ کی روٹی۔ میں نے کہا "حضرت یہ بے وقت کھانا کیسا"۔ فرمایا "اوکھلے
کھانا تیار نہ تھا اگر انتظار کرتا تو جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا تھا اس لئے کھانا کھائے بغیر ہی چلا آیا تھا۔"

یہ تو خیر ہوا ہی اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس واقعہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہ گرمیوں کے کسی مہینہ میں پیش آیا تھا
چونکہ مولانا کے پاس اوکھلے اور دلی کی آمد و رفت کا بس کا کرایہ ادا کرنے کیلئے پیسے نہ تھے اس لئے اس روز مولانا سخت تپش اور گرمی کے عالم میں اوکھلے
دلی پا پیادہ آئے اور اسی طرح آٹھ میل پا پیادہ واپس تشریف لے گئے۔ اس کے متعلق بھی مولانا نے نہ از خود ہم سے کچھ کہا اور نہ چہرہ دیکھ کر کوئی سمجھ سکا
جامع نگر کے ایک صاحب نے جو بس میں سفر کر رہے تھے مولانا کو پیدل آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اُن سے جب مجھ کو یہ معلوم ہوا تو میں نے مولانا سے دریافت
در مولانا نے اس کی تصدیق کی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ اُس روز مولانا کو پیدل آنا تھا اس لئے اوکھلے سے ان کو بہت پہلے روانہ ہونا تھا۔
چونکہ اسوقت تک کھانا تیار ہوا نہیں تھا اس لئے دلی میں عصر کے بعد کھانا کھایا اور چونکہ جیب میں صرف تین آنہ پیسے تھے جو بس کے کرایہ کیلئے کافی
نہ ہو سکتے تھے اس لئے ان پیسوں سے کھانا کھایا اور اوکھلے سے دلی تک کا سفر پیدل کیا۔

ایک مرتبہ میری موجودگی میں مولانا عتیق الرحمان صاحب عثمانی نے مولانا سے پوچھا "حضرت! آپ نے اپنی زندگی میں کبھی نوکر بھی رکھا ہے؟" حسب
عادت مسکرا کر بولے "مفتی جی آپ یہ کیا پوچھتے ہیں۔ کیا کوئی انسان بھی کسی انسان کا نوکر ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کرتا ہے۔ میری
مدد بھی میرے دوست احباب کرتے تھے اور میں ان کی خدمت کرتا تھا"۔ اسی نشست میں مفتی صاحب نے پوچھا "حضرت! تئیس برس کی جلاوطنی کے
زمانہ میں آپ پر عیش و مسرت کے بھی کچھ دن آئے ہیں؟" فرمایا "مفتی صاحب! یقین کیجئے اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی ہے جس میں
چین اور آرام سے سویا ہوں۔ ہندوستان پہنچنے پر تئیس برس کے بعد میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند سو سکا ہوں۔"

مولانا ہمیشہ ننگے سر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا دلی کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کے نیچے کھڑے ہوئے تھے کہ میں پوچھ بیٹھا "مولانا
آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے ہیں اسکی کیا وجہ ہے؟" فوراً لال قلعہ کی طرف اشارہ کر کے کچھ غصہ اور کچھ حسرت کے ملے جلے لہجہ کیساتھ فرمایا "میری ٹوپی تو اُس دن

سر سے اُتر گئی جس دن کہ یہ لال قلعہ میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اب جب تک یہ مجھ کو واپس نہیں مل جاتا میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں ٹوپی سر پر رکھوں۔

مولانا کافی عمر رسیدہ تھے۔ عمر کا بڑا حصہ جلاوطنی کی تکالیف اور مصائب میں بسر کیا تھا اور بے زر و سرمایہ تھے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی روشنی میں انہوں نے اس پر مسلسل غور و فکر کیا تھا کہ اسلام کو دنیا کے موجودہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات میں کس طرح ایک عالمگیر طاقت بنایا جائے جس کا کہ وہ دینِ فطرت ہونے کے باعث بجا طور پر مستحق ہے اور جو اس کا طبعی حق ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اسلام کے اجتماعی اقتصادی و سماجی نظام کا بڑی دقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا اور دوسری جانب انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو دنیا میں عظیم صنعتی انقلاب ہوا، اور اس انقلاب کے جو اثرات انسانی فکر و تخیل اور عام معاشرہ پر پڑ رہے ہیں ان سب کا دیدہ وری اور عمیق بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے ایک نتیجہ پر پہنچ کر اپنا ایک مستقل فکر قائم کیا تھا۔ مولانا کا یہ فکر بڑا مستحکم اور غیر متزلزل تھا اور اس پر ان کو کامل درجہ وثوق اور اعتماد تھا۔ جلاوطنی سے واپسی کے بعد ان کی زندگی کا سب سے بڑا اہم اور مقدس مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کے اس فکر کو سمجھیں اور اس کی بنیاد پر سوسائٹی کی از سرِ نو تشکیل و تعمیر کریں۔ چنانچہ انہوں نے وطن آنے کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں جو مقالات و مضامین لکھے اور جو رسالے تالیف کیے ان کے عمق اور ضخامت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی فکر کو عام کرنے اور اپنے ہم خیال پیدا کرنے کی کیسی دُھن تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا جتنے بڑے مفکر اور مخلص تھے، اتنے بڑے نہ تو مقرر تھے اور نہ بڑے انشا پرداز۔ بات بہت گہری اور پتہ کی کہتے تھے مگر اندازِ بیان کچھ ایسا گنجلک اور اشتباہ انگیز ہوتا تھا کہ بعض اچھے اچھے اہلِ علم اور مفکر ان سے بدظن ہو جاتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فکر میں اس درجہ پختہ تھے کہ کسی مسئلہ پر بحث و گفتگو کے وقت ان کا لب و لہجہ درشت اور غیر مصالحانہ ہو جاتا تھا۔ مولانا خود بھی کبھی کبھی اس کا اعتراف کرتے اور اس پر افسوس کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی بڑی تمنا اور آرزو تھی کہ میں کسی طرح ان سے سبقاً سبقاً حجۃ اللہ البالغہ پڑھ لوں اور پھر ان کے ارشادات کی روشنی میں حجۃ اللہ البالغہ کی شرح اپنے الفاظ میں لکھ ڈالوں۔ اس اہم کام کے لئے مجھ ایسے ہیچمداں کا مولانا کی نظر میں انتخاب میری سب سے بڑی خوش قسمتی تھی۔ اس بنا پر میرے لئے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں فوراً اس کے لئے آمادہ ہو گیا اور قرارداد یہ ہوئی کہ مولانا روزانہ مغرب کے بعد اوکھلے سے دلّی آئیں گے اور مسجد فتحپوری کے ایک حجرہ میں شب بھر قیام کریں گے ادھر میں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے مکان قرول باغ سے مسجد فتحپوری میں آجاؤں گا اور وہاں مولانا مجھ کو دو تین گھنٹے درس دیں گے۔ دوسرے دن میں مولانا کی تقریرِ درس کو اپنے الفاظ میں قلمبند کر کے ان کو دکھاؤں گا۔ یہ قرارداد ہو چکی تھی اور ابھی اس پر عمل شروع نہیں ہوا تھا کہ مولانا کو پنجاب کا سفر پیش آگیا۔ فرمایا کہ ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، جلد واپس آجاؤں گا اور آتے ہی یہ پروگرام شروع ہو جائے گا۔ لیکن کسے خبر تھی کہ مولانا کا دلّی سے یہ سفر آخری سفر تھا جس سے واپس آنا مقدر نہیں تھا۔ پنجاب اپنی صاحبزادی کے پاس گئے تھے جو لاہور میں مقیم تھیں۔ وہاں پہنچنے کے چند روز بعد ہی بیمار ہوئے اور اس قدر شدید کہ جانبری ممکن نہ ہوئی اور واصل بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا مشیتِ ایزدی میں کسی کو کیا مجال دم زدن ہے۔ آج مولانا دنیا میں نہیں ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنی تحریروں کا گراں بہا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ وہ اس لائق ہے کہ اسلامیات کا ہر طالب علم اس کا غور و فکر سے مطالعہ کرے۔ اس سے فکر کی نئی راہیں سامنے آئیں گی اور تنازع للبقا کے موجودہ دور میں ایک ایسی روشنی ملے گی جو ہمت اور عزم پیدا کرے گی۔

مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء — ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۳ء

سوالات بیضاوی شریف سنہ ۱۳۲۸ھ

(۱) والهداية دلالة بلطف ولذلك تستعمل فى الخير وقوله تعالى فاهدوهم الى صراط الجحيم على التهكم - ومنه الهداية وهوادى الوحش لمقدماتها - والفعل منه هدى واصله ان يعدى باللام اوالى فعومل معه معاملة اختار فى قوله تعالى واختار موسى قومه

اس عبارت کا صاف مطلب اور ہدیہ اور ہوادی کی وجہ اشتقاق بیان کرو -

(۲) والعالم اسم لما يعلم به كالخاتم والقالب غلب فيما يعلم به الصانع وهو كل ما سواه من الجواهر والاعراض فانها لامكانها وافتقارها الى موثر واجب لذاته تدل على وجوده - اس عبارت کا صاف مطلب تحریر کرو -

(۳) والايمان فى اللغة عبارة عن التصديق ماخوذ من الامن كان المصدق امن المصدق من التكذيب والمخالفة واما فى الشرع فالتصديق بما علم بالضرورة انه من دين محمد صلى الله عليه وسلم كالتوحيد والنبوة والبعث والجزاء -

اس عبارت کا صاف مطلب تحریر کرو -

محمد کفایت اللہ
۲۸ شعبان ۱۳۲۸ھ

عکس تحریر حضرت مفتی صاحب

حافظ سید رشید احمد ارشد

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کا سلسلہ نسب یہ ہے ۔
حضرت مفتی کفایت اللہ بن شیخ عنایت اللہ بن فیض اللہ بن خیر اللہ بن عباد اللہ ۔

مورثِ اعلیٰ

آپ کا سلسلہ نسب شیخ جمال یمنی سے جا کر ملتا ہے ۔ اس طرح آپ کے آباؤ اجداد کا اصلی وطن سرزمین عرب کا جنوبی ساحلی خطہ یمن ہے ۔ آپ کے اجداد موتیوں کی تجارت کرتے تھے اور بحرین سے موتی خرید کر ہندوستان [سری] لنکا وغیرہ کے ساحلی علاقوں میں فروخت کرتے تھے ۔ قدیم زمانہ میں یمن سے اس قسم کے تاجروں کا ایک قافلہ بادبانی کشتی پر سوار [ہو] کر بحری سفر پر روانہ ہوا ۔ ابھی یہ بحری قافلہ برصغیر پاک و ہند کے ساحل پر پہنچنے نہیں پایا تھا کہ ایک زبردست طوفان آیا جس نے [کشتی] کو تباہ و برباد کر دیا اور اس کے مسافر غرق ہو گئے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس بحری قافلہ کے سردار کا ایک نوعمر لڑکا جس کا نام [شیخ] جمال تھا ، طوفان سے بچ نکلا وہ ایک تختہ پر بہتا ہوا ساحل تک پہنچ گیا ۔ ساحل پر اُسے بھوپال کے ایک شخص نے دیکھا ۔ اُس نے [اس] کی دستگیری کی اور اسے اپنے وطن ساتھ لے آیا ۔ یہ نوعمر شیخ جمال اس شخص کے گھر میں پرورش پاتا رہا اور آخر کار اُسی کے خاندان [میں] اس کی شادی ہو گئی ۔ یہی شیخ جمال یمنی حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے مورثِ اعلیٰ تھے[1] ۔ اندازہ ہے کہ کشتی کی تباہی کا [واقعہ] تقریباً تین سو برس پہلے کا ہے ۔

شیخ عنایت اللہ

شیخ جمال یمنی کے بعد آپ کے دیگر اجداد کے حالات دستیاب نہیں ہوتے ۔ بھوپال سے یہ خاندان شاہجہان پور منتقل ہو گیا تھا ۔ آپ کے والد محترم شیخ عنایت اللہ نہایت شریف اور پرہیزگار بزرگ [تھے] ۔ راقم الحروف نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ان کی زیارت کی تھی کیونکہ وہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ کبھی کبھی مدرسہ امینیہ [میں تشر]یف لاتے تھے ۔ انہوں نے بہت طویل عمر پائی اور شکل و صورت میں حضرت مفتی صاحب کے مشابہ تھے ۔ شیخ عنایت اللہ [بہت] کثیر العیال اور غریب تھے ۔ حضرت مفتی صاحب دو لڑکیوں کے بعد پیدا ہوئے تھے اور حضرت مفتی صاحب کے تین بھائی اور [تھے] ۔ ان میں سے ایک بھائی کا اسم گرامی حافظ قاری نعمت اللہ تھا جو شاہ جہان پور ہی مقیم رہے ۔ انہوں نے درس و تدریس کا [مشغ]لہ اختیار کر رکھا تھا ۔ نہایت عابد و زاہد تھے ——— دوسرے بھائی حافظ سلامت اللہ شاہ جہان پور کے تاجر تھے ۔ تیسرے [بھا]ئی جناب قدرت اللہ صاحب نے قصور (پاکستان) میں رہائش اختیار کی تھی ۔ وہ ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی تحریکِ آزادی میں

---

[1] مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی از مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب ۔

شریک رہے اور نہایت سرگرمی کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ وہ مقامی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری بھی رہے۔ تین چار مرتبہ سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کے جرم میں جیل گئے۔ سیاسی تحریکوں میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کاروبار بھی کرتے تھے۔ آخر میں انہوں نے آٹے کا مل کھول رکھا تھا[1]۔

تاریخ پیدائش حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب شاہ جہان پور (روھیل کھنڈ۔ یوپی) کے محلہ زئی میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۲ھ آپ کا سن پیدائش ہے۔

ابتدائی تعلیم آپ نے پانچ سال کی عمر میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب شاہ جہان پور میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ اس مکتب میں آپ نے ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی۔ اُس کے بعد اردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم حافظ نسیم اللہ کے مکتب واقعہ محلہ درگ زئی میں حاصل کی۔ اس کے بعد آپ مولوی اعزاز حسن خاں صاحب کے مدرسہ اعزازیہ میں جو محلہ خلیل زئی میں واقع تھا داخل ہوئے۔ یہ مدرسہ اپنے قابل اساتذہ کی بدولت بہت مشہور تھا۔ اس لئے حضرت مفتی صاحب کی علمی بنیاد اس مدرسہ نے مستحکم کیا۔ چنانچہ فارسی نصاب کی اعلیٰ ادبی کتاب "سکندر نامہ" اور عربی کی ابتدائی کتابیں حافظ بدھن خاں صاحب نے شروع کرائیں جو نہایت ہی ذہین اور قابل استاد تھے۔

آپ کے دوسرے استاد محترم اس مدرسہ میں مولانا عبید الحق خاں صاحب تھے جو افغانستان سے ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے تھے اور مولانا مفتی لطف اللہ رح علی گڑھی جیسے شہرۂ آفاق عالم کے شاگرد تھے[2]۔ مولانا عبید الحق کی جوہر شناس نگاہ نے جلد معلوم کر لیا کہ ان کے نوعمر مگر ہونہار شاگرد کو نہایت اعلیٰ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے اس لئے انہوں نے آپ کے والد محترم شیخ عنایت اللہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو دارالعلوم دیوبند بھیجیں۔ آپ کے والدین اپنے غریبانہ حالات کے ماتحت اپنے کم سن لڑکے کو اس قدر دور بھیجنے پر رضامند نہیں ہوئے کیونکہ اس وقت حضرت مفتی صاحب کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ آخر کار مولانا موصوف نے انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے نوعمر صاحبزادے کو قریب کے مدرسہ شاہی مراد آباد کی طرف ایک اور طالب علم کے ساتھ بھجوا دیں جن کا نام حافظ عبد المجید تھا۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب حافظ عبد المجید کے ساتھ مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔

مولانا عبید الحق خاں صاحب نے اپنے دونوں شاگردوں کو مدرسہ عربیہ شاہی مسجد مراد آباد کے مہتمم مرزا حافظ نبی بیگ کے نام خط دے کر بھیجا تھا۔ مہتمم صاحب مولانا عبید الحق خاں صاحب کے پیر بھائی تھے۔ مگر جب یہ دونوں شاگرد مراد آباد پہنچے تو وہ بمبئی گئے ہوئے تھے تاہم ان کے نائب مہتمم حاجی محمد اکبر خاں صاحب سوداگر نے بھی ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں مولوی عبد الحق

---

[1] فرنگیوں کا جال از مولانا امداد صابری۔ مطبوعہ دہلی یکم جنوری ۱۹۴۹ء۔ ص ۲۸۹ - ص ۲۹۰۔

[2] مولانا عبید الحق خاں صاحب مولانا افضل اللہ خاں صاحب شاہ جہان پوری کے والد بزرگوار تھے جو بمبئی کے بعد کراچی میں بھی رہے۔ مولانا عبید الحق خاں صاحب، مولانا سیف الرحمن صاحب اور مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری کے معاصر تھے انہوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت کی تھی۔ اُن کی وفات بتیس ۳۲ سال کی عمر میں ۱۳۲۱ھ میں شاہ جہان پور میں ہوئی۔

...صاحب کے پاس ہاتھی خانہ میں عارضی طور پر رہنے کا بندوبست کیا۔ مولوی عبدالخالق صاحب بھی مدرسہ اعزازیہ میں مولوی ...بیدالحق خاں صاحب کے پاس پڑھتے رہے تھے اور ایک سال قبل اس مدرسہ میں داخل ہوئے تھے۔

بعد میں حضرت مفتی صاحب اور حافظ عبدالمجید مراد آباد کے مشہور وکیل حافظ محمد اسمٰعیل صاحب کے دیوان خانہ میں مقیم ...ہو گئے۔ حافظ محمد اسمٰعیل صاحب مشہور سیاسی لیڈر سر محمد یعقوب ممبر اسمبلی کے والد بزرگوار تھے۔ وہ شاہ جہان پور میں وکالت کرتے ...اس لئے وہیں رہتے تھے۔ البتہ اپنے وطن مراد آباد ہر مہینے دو تین دفعہ آیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا دیوان خانہ جو محلہ مغل پورہ ...مراد آباد میں تھا، خالی پڑا رہتا تھا اس لئے وہ ان دونوں طلبہ کے لئے موزوں مقام ثابت ہوا۔

حافظ محمد اسمٰعیل صاحب کے بار بار مراد آباد آنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کے ہاتھ تینوں ہم وطن طلبہ کے والدین اپنے ...بچوں کے لئے ضروریات کی چیزیں بھیج دیا کرتے۔ مفتی صاحب جب مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں تعلیم حاصل کرتے تھے تو اس زمانے میں ...کھانے کا انتظام مدرسہ کی طرف سے تھا تاہم تعلیم کے اخراجات اور دیگر ضروریات کے اخراجات حضرت مفتی صاحب خود ہی ...برداشت کرتے تھے۔ آپ کے والد صاحب بہت غریب آدمی تھے اس لئے وہ تعلیم کے پورے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے ...تھے۔ ایسی صورت میں آپ نے اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ کیا۔ آپ دوسروں کے عطیات اور بخشش قبول نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ...مراد آباد اور دیوبند کے قیام کے زمانے میں تاگے کی ٹوپیاں کروشیا سے بنتے تھے۔ آپ بہت عمدہ مختلف رنگ کے ریشمی پھول، ...بوٹیوں میں بنایا کرتے۔ دو تین دن میں ایک ٹوپی تیار ہوتی اور دو روپے میں فروخت ہو جاتی۔ یہ ٹوپیاں آپ کی کاریگری اور ہنر ...مندی کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں۔ ٹوپیاں بننے سے پہلے آپ اپنے قلم سے ٹوپیوں کے مختلف ڈیزائن اور نمونے بناتے تھے۔ چنانچہ ...ٹوپیوں کے نمونوں اور ڈیزائن کا یہ مجموعہ ان کے صاحبزادے صاحب کے پاس موجود ہے[1]۔

مراد آباد کے تعلیمی دور کے کچھ واقعات مولانا سید فخر الحسن صاحب استاد دارالعلوم دیوبند نے اپنے والد مولانا سید فیض ...الحسن صاحب مرحوم کی زبانی بیان فرمائے ہیں[2]۔ ان کے والد صاحب بیان کرتے ہیں :۔

"مراد آباد میں حضرت مفتی صاحب اور میں نے ساتھ پڑھا ہے۔ غالباً مولانا احمد حسین امروہی سے جو کچھ عرصہ تک شاہی مسجد مراد آباد میں مدرس رہتے ہیں نیز حضرت مولانا محمد حسن صاحب مراد آبادی (منگلوری) سے ہم دونوں نے کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ ان میں شرح وقایہ ایک کتاب مجھے یاد ہے جو ساتھ پڑھی ہے۔ مفتی صاحب سبق میں بالکل الگ ہو کر پیچھے بیٹھے رہا کرتے تھے اور کبھی کبھی سبق کے وقت بھی ٹوپی بُنتے رہتے تھے لیکن سمجھ اور حافظہ کا یہ حال تھا کہ جب مجھے ضرورت ہوتی اور کتاب سمجھ میں نہ آتی تو مفتی صاحب کے پاس حاضر ہوتا۔ مفتی صاحب کتاب کی بعینہٖ وہی تقریر فرما دیتے جو حضرت اُستاد سے سُنی تھی۔"

طالب علمی کے زمانے میں (آپ کا) حضرت مولانا محمد حسن مراد آبادی ثم بھوپالی (آپ بعد میں ریاست بھوپال کے ناظم اوقاف ہو گئے تھے) کے یہاں قیام تھا اور کھانا مولانا ممدوح کے یہاں کھایا کرتے تھے۔ یہ صورت حضرت

---

[1] مفتی اعظم کی یاد صـ۳، صـ۷ [2] مفتی اعظم کی یاد صـ۱۴۹

مفتی صاحب نے اپنے محترم استاد موصوف کے اصرار پر قبول فرمائی تھی —— اُوپر کے خرچ کے لئے اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں بُن کر بازار میں فروخت فرماتے تھے، اور نہایت خودداری کے ساتھ طالب علمانہ زندگی بسر فرماتے تھے۔"

مولانا عبدالعلیؒ مراد آباد میں مدرسہ شاہی کے مدرس اوّل حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھی تھے جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد تھے۔ آپ بعد میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث ہوگئے تھے اور حضرت مفتی صاحب نے دیوبند میں بھی شیخ الہندؒ کے زمانے میں ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

حضرت مولانا عبدالعلی صاحب دیوبند کے بعد دہلی کے مشہور مدرسہ عبدالرب میں بھی صدر مدرس تھے اور ان کے دور میں یہ مدرسہ بہت مشہور ہوا۔ آپ کو اس مدرسہ سے اس قدر والہانہ شغف تھا کہ جب بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں کی وجہ سے تعلیمی خدمات سے سبکدوش ہوگئے تھے تو اس حالت میں آپ نے یہیں قیام رکھا اور لبِ سڑک مدرسہ کے ایک چھوٹے سے حجرہ میں محوِ استراحت رہتے تھے۔ راقم الحروف اپنے دورِ طالب علمی میں جب اپنے گھر سے مدرسہ امینیہ جاتا تھا، تو آتے جاتے اس فرشتہ صورت بزرگ کی زیارت کرتا تھا —— مذکورہ بالا اساتذہ کے علاوہ آپ نے مولوی محمود حسن سہسوانی سے بھی مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھا تھا۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں آپ کی تعلیمی مدت دو سال ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۱۲ھ میں حضرت مفتی صاحب مولوی عبدالخالق اور مولوی عبدالمجید کے ساتھ دیوبند پہنچے اور دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے۔ اس زمانہ میں دارالعلوم کے مہتمم مولوی محمد منیر صاحب تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس تھے۔

دیوبند میں حضرت مفتی صاحب نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

۱ : مولانا منفعت علی صاحب۔ جو بعد میں مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس ہوگئے تھے۔
۲ : مولانا حکیم محمد حسن صاحب۔ (برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ)
۳ : مولانا غلام رسول صاحب۔ ۴ : حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی ثم سہارن پوری۔
۵ : حضرت مولانا عبدالعلی صاحب۔ ۶ : حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب۔

آخر الذکر دونوں حضرات سے آپ نے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

خصوصی رفقاء آپ کے دورِ طالب علمی میں وہ حضرات تعلیم حاصل کر رہے تھے جو آگے چل کر علم و فضل کے آفتاب بن کر چمکے ان میں سے کچھ حضرات مثلاً حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ آپ سے آگے تھے اور کچھ درجۂ تعلیم میں پیچھے تھے۔ تاہم تعلیمی زمانہ ایک تھا۔ اس طرح یہ دور دیوبند کی تاریخ کا ایک زرین دور تھا۔ ان خصوصی رفقاء میں سے آپ کے ہم وطن ساتھی مولوی عبدالخالق اور مولوی عبدالمجید کے علاوہ یہ حضرات بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

۱ : حضرت مولانا علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ۔ ۲ : شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
۳ : ان کے بھائی سید احمد فیض آبادی۔ ۴ : مولانا ضیاء الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ امینیہ۔

۵: مولانا محمد شفیع دیوبندی شیخ الحدیث وصدر مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی۔
۶: مولانا محمد قاسم دیوبندی مدرس مدرسہ امینیہ۔ ۷: مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ دہلی۔
دارالعلوم میں آپ کی تعلیمی مدت تین سال رہی۔ آپ دارالاقامہ (ہوسٹل) ہی میں کمرہ ۲۲ احاطہ مولسری میں رہتے تھے۔ چونکہ آپ کا حافظہ بہت تیز تھا اور آپ بلا کے ذہین تھے اس لئے اسباق میں بہت کم محنت کرنے کے باوجود امتحانوں میں اپنے ہم سبقوں سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ کیونکہ آپ اساتذہ کے حلقہ درس میں جو پڑھتے تھے وہ اسی وقت یاد کرلیتے تھے اور باقی وقت اپنے تعلیمی اخراجات پورا کرنے کے لئے ٹوپیوں کے بننے ہی میں مصروف رہتے تھے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ان کی اور اپنی طالب علمی کے دور کا ایک واقعہ اسطرح بیان فرماتے ہیں
"ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ اپنے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کروں۔ امتحان کے موقع پر "میرزاہد رسالہ" کا پرچہ تھا۔ ایک سوال کا جواب میں نے نہایت عمدگی کے ساتھ دو صفحے میں لکھا اور اسی سوال کا جواب مفتی صاحب نے آدھے صفحے میں لکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس پرچہ کے ممتحن تھے۔ آپ نے دونوں کو برابر نمبر دیئے یعنی آدھے صفحے کا مضمون اپنے وزن کے لحاظ سے دو صفحے والے مضمون سے کم نہ تھا۔"
حضرت مفتی صاحب بالعموم رات کو زیادہ مطالعہ نہیں کرتے تھے اس کے باوجود وہ ہر امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے تھے۔ آپ بائیس ۲۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کی تعلیم سے فارغ ہوگئے تھے۔

سلسلۂ تدریس دارالعلوم کی تدریس سے فارغ ہوکر مفتی صاحب دہلی آئے اور اپنے رفیق خاص مولوی امین الدین صاحب کے پاس ٹھہرے۔ ان دنوں مولوی امین الدین صاحب ایک مذہبی مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اور مسجد چھتہ شاہ حسین پہاڑی بازار دہلی میں قیام پذیر تھے۔

مدرسہ عین العلم آپ اپنے وطن شاہجہان پور پہنچے تو اس زمانے میں آپ کے اولین مربی اور استاد مولانا عبید الحق خان صاحب مدرسہ اعزازیہ میں مبتدعین کے غلبہ سے بیزار ہوکر اس مدرسہ سے الگ ہوچکے تھے اور ۱۳۱۴ھ میں ایک نئے مدرسہ "عین العلم" کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ لہٰذا جب آپ شاہجہان پور پہنچے تو انہوں نے آپ کو اپنے مدرسہ میں مدرس مقرر کرلیا۔ اور اس کے ساتھ مدرسہ کے دفتر کا سارا کام بھی آپ کے سپرد کردیا۔ اس وقت آپ کی تنخواہ غالباً صرف پندرہ ۱۵ روپے ماہوار تھی۔
مدرسہ عین العلم کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ مدرسہ کے تمام انتظامی امور مفتی صاحب انجام دیتے تھے۔ آپ سب سے پہلے مدرسہ پہنچتے اور سب کے بعد وہاں سے رخصت ہوتے تھے۔ آپ مدرسہ کا حساب بہت عمدہ اور باقاعدہ رکھتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی کام کے ساتھ ساتھ آپ نے فتویٰ نویسی کا کام بھی سنبھال لیا تھا۔ آپ نے سب سے پہلا فتویٰ اسی مدرسہ عین العلم میں تحریر کیا جو بہت مدلل اور مبسوط تھا۔ اس فتوے کو شاہجہان پور کے تمام علماء اور بالخصوص مولانا عبید الحق خان صاحب نے بہت پسند کیا تھا۔ آپ فتویٰ نویسی میں بہت محنت کرتے تھے اور اس میں بہت احتیاط اور جانفشانی سے کام لیتے تھے۔

رسالہ البرہان کا اجراء مدرسہ عین العلم کی مدرسی کے زمانے میں آپ نے "فتنہ قادیانیت" کی تردید میں ایک ماہوار رسالہ "البرہان" جاری کیا اس کے مدیر آپ خود تھے، اور منیجر مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کے بڑے بھائی منشی سلطان حسن

ساتھ ہم نے ایک مسجد میں پانی کے ساتھ روزہ افطار کرلیا تھا۔ مگر اب بھوک زیادہ لگی مجھے یہ خیال بھی آیا کہ مجھے قرآن شریف تراویح میں پڑھنا ہے (اس لئے) میں چلا آیا۔ مگر یہ حضرات وہاں شب کے بارہ ۱۲ بجے تک رہے۔

اسلام کی لاج یہ جلسہ کس وقت ختم ہوا، مجھے معلوم نہ ہوا، لیکن صبح کو ہر کہ ومہ کی زبان پر یہ تھا کہ ان دونوں مولویوں نے اسلام کی لاج رکھ لی، خدا جانے یہ کہاں سے آگئے تھے (ان دونوں صاحبان سے شاہ جہاں پور کے لوگ ناواقف تھے) میں بہادر گنج کے بازار میں پہنچا تو مسلمانوں کی ٹولیاں اس کا تذکرہ کر رہی تھیں کہ ایک شخص نے کہا:

"مگر ان میں جو ایک دبلا پتلا سوکھا سا آدمی تھا۔ تم نے دیکھا وہ شیر کی طرح غراتا تھا اور اس کی ہر بات پر پادری صاحب کو پسینہ آجاتا تھا"

قادیانیت کا رد اسی زمانے میں شاہ جہان پور کے ایک تاجر جیونہ حاجی ـــــ عبدالقدیر اور حافظ سید علی اور حافظ مختار احمد کے ذریعہ سے فتنۂ قادیانیت نے ہاتھ پیر پھیلانا شروع کئے۔ مولوی اکرام اللہ خان مرحوم نے حضرت مفتی صاحب ہی کے زیر سرپرستی اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کئے جن کی جلد شہرت ہوگئی۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کو ناکافی سمجھ کر خود ایک رسالہ البرہان جاری کیا جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ وہ زمانہ تحریر و تقریر کی آزادی کا نہ تھا۔ اس رسالہ کی بمشکل اجازت ملی۔ غالباً یہ رسالہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ آپ نے دہلی میں اقامت طے نہ فرمائی۔[1]

حضرت مفتی صاحب کے گریجوایٹ شاگرد حافظ اکبر علی ایڈووکیٹ کے حوالے سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بھی اس قسم کے ایک مناظرہ کا تذکرہ اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔[2]

عین العلم میں تدریسی مدت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ عین العلم کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ اسی وجہ سے ارکان مدرسہ اور مدرسین کافی مشکلات میں مبتلا رہے اور وہ ایثار سے کام لے کر کم تنخواہ پر کام کرتے رہے۔ ان مالی مشکلات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں مدرسین کی تنخواہ میں تخفیف کر دی گئی اور آپ کی تنخواہ بھی اٹھارہ ۱۸ روپے سے کم کر کے سولہ ۱۶ روپے کر دی گئی تاہم آپ مدرسہ عین العلم میں اپنے استاد مولانا عبید الحق خاں کی وفات تک تقریباً پانچ سال رہے۔

ازدواجی زندگی آپ کی پہلی شادی اس وقت ہوئی جب کہ آپ مدرسہ عین العلم میں مدرس تھے۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے مگر دونوں بچے بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ اس کے بعد پہلی زوجہ محترمہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد آپ کا دوسرا عقد جناب شرف الدین صاحب کی صاحبزادی سے ہوا۔ ان سے سات بچے پیدا ہوئے۔ مگر بقید حیات دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

دہلی کا دور حضرت مفتی صاحب کے رفیق خاص مولانا امین الدین صاحب نے اس عرصے میں سنہری مسجد چاندنی چوک مدرسہ امینیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کرلی تھی جس کے صدر مدرس حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ مقرر ہوئے تھے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کچھ عرصہ تک وہاں درس دیتے رہے۔ اس کے بعد بعض خانگی وجوہات کی بناء پر استعفاء

---

[1] مفتی اعظم کی یاد صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ [2] مفتی اعظم کی یاد صفحہ ۱۲۷-

دے کر اپنے وطن کشمیر واپس چلے گئے۔ اس وقت مولانا امین الدین صاحب نے مفتی صاحب کو خط لکھا کہ وہ ان کے مدرسہ میں آکر کام کریں۔

اس زمانے میں مدرسہ عین العلم کی مالی حالت کمزور ہو رہی تھی اور تنخواہ میں اضافے کی بجائے تخفیف ہو رہی تھی۔ حضرت مفتی صاحب کو مالی ترقی کی زیادہ خواہش نہ تھی تاہم وہ سمجھتے تھے کہ دہلی جیسے مرکزی مقام میں مذہبی اور دینی خدمت کے مواقع زیادہ میسر ہوں گے۔ اسلئے انہوں نے اپنے استاد مولانا عبید الحق صاحب سے دہلی جانے کی اجازت طلب کی۔ مولانا نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا :-

> آپ ترقی پر جا رہے ہیں اللہ مبارک کرے لیکن اگر خدا نے مجھ سے آخرت میں یہ پوچھا "تم نے مولوی کفایت اللہ کو کیوں چھوڑ دیا تو کیا جواب دوں گا"

استاد کی اس گفتگو پر مفتی صاحب نے دہلی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ استاد مرحوم کے اصرار پر مفتی صاحب اسی مدرسہ میں کام کرتے رہے مگر جب ماہ رمضان ۱۳۲۱ھ میں مولانا عبید الحق صاحب فوت ہوگئے تو مولانا امین الدین صاحب، مفتی صاحب کو لینے کے لیے خود شاہجہان پور تشریف لے آئے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب شوال ۱۳۲۱ھ میں دہلی تشریف لے آئے اور مدرسہ امینیہ میں کام کرنے لگے۔

مدرسہ امینیہ کا قیام

مولانا امین الدین صاحب نے ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو سنہری مسجد چاندنی چوک میں اسلامی علوم کی یہ درس گاہ "مدرسہ امینیہ" کے نام سے قائم کی۔ اس وقت علامہ انور شاہ کشمیری اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ مدرس دوم مولانا عبد القادر ہزاروی تھے۔ مدرس سوم مولانا ضیاء الحق دیوبندی تھے[1]۔ مدرس چہارم مولوی محمد قاسم دیوبندی اور مدرس پنجم مولوی سید انظار حسین صاحب ہنس پوری تھے۔ فارسی کے مدرس اور نائب مہتمم مولوی عبد الغ

---

[1] مولانا ضیاء الحق دیوبندی مفتی صاحب کے ہم جماعت تھے۔ آپ راقم الحروف کے استاد بھی تھے۔ میں نے درس نظامی کے آخری دو سال کی بعض کتب انہی سے پڑھی تھیں۔ آپ تا وفات اٹھاون برس تک مدرسہ امینیہ میں درس دیتے رہے۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات پر آپ مدرسہ امینیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آپ نے ۱۹۴۷ء کے خونین انقلاب میں مدرسہ امینیہ میں محصور رہ کر اس کی عمارت اور طلبہ کی جان بچائی۔ آپ کی وفات ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ مولانا سید انظار حسین بھی میرے استاد تھے۔ میں نے قدوری، کنز الدقائق اور ان رسالوں کی متعلقہ کتب انہیں سے پڑھیں۔ آپ میرے زمانے میں مدرسہ امینیہ کے سب سے بوڑھے مدرس تھے۔ مگر بہت بوڑھے اور کمزور ہونے کے باوجود نہایت زندہ دل اور خوش طبع تھے اس وجہ سے مبتدی طلبہ ان سے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے۔

مولانا عبد الغفور عارف دہلوی میرے زمانے میں بھی مدرسہ میں صرف فارسی کتب پڑھاتے تھے۔ مدرسین میں وہی دہلی کے باشندے تھے۔ میرے زمانے میں وہ بہت بوڑھے ہوگئے تھے اور ان پر تصوف کا غلبہ تھا۔ فارسی کے نہایت خوش گو اور قادر الکلام شاعر بھی تھے ان کا کلام عارفانہ ہوتا تھا۔ میں نے ان سے یوسف زلیخا جامی تک سبقاً سبقاً فارسی کی مشہور کتابیں پڑھی تھیں۔ آپ کی وفات دہلی میں ہوئی۔

دہلوی تھے۔ مدرس قرآن حافظ عبداللہ بلاسپوری اور حافظ رحیم بخش فیض آبادی تھے۔ مولانا امین الدین صاحب مہتمم تھے۔ ان سب حضرات نے اعزازی طور پر بلامعاوضہ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت ان میں کسی کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں تھی۔

جب علامہ انور شاہ کشمیریؒ ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو اپنے والد محترم کے حکم کے مطابق اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے تو اس مدرسہ کی صدر مدرسی کی جگہ خالی ہو گئی، اس وقت سے مولوی امین الدین صاحب مفتی کفایت اللہ صاحب کو دہلی بلانے کی کوشش کرتے رہے۔ آخرکار حضرت مفتی صاحب مولانا عبیدالحق صاحب کے انتقال کے بعد دہلی منتقل ہو گئے۔

یکم شوال ۱۳۲۱ھ سے آپ کی تنخواہ بیس۲۰ روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ گو مولانا امین الدین صاحب مدرسہ کے مہتمم تھے مگر عملی حیثیت سے درس حدیث اور افتاء کے علاوہ مدرسہ کے تمام انتظامی امور و معاملات مفتی صاحب ہی انجام دیتے تھے۔ مدرسہ کے جلسوں کا انتظام، رودادوں اور مضامین کی ترتیب، تعمیرات اور دیگر انتظامات آپ ہی کے سپرد تھے۔

مقبولیت

دہلی آکر حضرت مفتی صاحب بہت جلد اہل دہلی میں مقبول ہو گئے۔ شہر کے معزز حضرات اور شرفاء اپنے سیاسی اور مذہبی معاملات میں آپ سے مشورہ کرنے لگے اور آپ کے صائب اور درست مشوروں سے مستفید ہونے لگے برصغیر کے مرکزی شہر دہلی میں آپ کی اتنی جلد شہرت و مقبولیت منجانب اللہ تھی۔ آپ کی ذات سے دہلی کی عدالتوں کو بھی بہت فائدہ پہنچا کیونکہ آپ کی آمد سے پیشتر علمائے دہلی کے جو فتوے عدالتوں میں پیش ہوتے تھے وہ بہت الجھے ہوئے ہوتے تھے۔ یا تو عبارت سمجھ میں نہیں آتی تھی یا وہ فتوے غلط ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف علماء کے فتووں میں اختلاف ہوتا تھا ــــ مگر جب حضرت مفتی صاحب نے دہلی میں آکر فتوے لکھنے شروع کئے تو دہلی کی عدالتوں کو بہت سہولت ہو گئی۔ کیونکہ آپ کے فتوے نہایت مختصر، صاف اور واضح عبارت میں ہوتے تھے اور ان کے سمجھنے میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں ہوتی تھی۔

تعلیمی اصلاحات

مدرسہ امینیہ میں آنے کے بعد آپ نے رفتہ رفتہ اس درس گاہ کے تعلیمی نظام میں مفید اصلاحات نافذ فرمائیں ــــ آپ نے اپنی طالب علمی کا زمانہ نہایت خودداری میں گذارا تھا۔ آپ کے والدین انتہائی غریب اور تنگ دست تھے مگر آپ نے اس تنگدستی کے زمانے میں بھی کبھی کسی مال دار شخص کی خیرات کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ اپنے قوت بازو اور ہنر سے ٹوپیاں بُن کر اپنا ذریعہ معاش پیدا کرتے تھے اور اسی کے ذریعہ سے اپنے تمام اخراجات پورے کرتے تھے۔

مگر جب آپ دہلی آئے تو آپ نے مشاہدہ کیا کہ مخیر حضرات مذہبی مدارس کے طلبہ کو گھر بلا کر شادی بیاہ اور موت و غمی کی تقریبات میں انہیں کھانا کھلاتے ہیں۔ مخیر حضرات غریب طلبہ کی امداد اور ہمدردی کے جذبے سے ایسا کرتے تھے۔ اُن کی طرف سے یہ جذبہ قابل قدر تھا۔ مگر اس طرح علم دین کی بے حرمتی ہوتی تھی۔ اس لئے آپ نے گھروں پر جا کر کھانے کے اس سلسلے کو بالکل ختم کر دیا۔

اصلاح مدارس کی تجاویز

مدرسہ امینیہ کے آٹھویں سالانہ اجلاس میں مدارس عربیہ کی اصلاح کے لئے آپ نے ایک مقالہ میں چند تجاویز پیش کیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

ا: تمام مدارس اسلامیہ کا مقصد ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کی جائے۔ اس لئے تمام اسلامی

اور عربی مدارس کو انتظامی حیثیت سے ایک ہی نظام میں منسلک ہونا چاہیئے یعنی تعاون و اتحاد کے ساتھ کام کیا جائے انہیں ایک دوسرے کا مخالف نہیں ہونا چاہیئے۔

۲: یہ اسلامی مدارس اس وجہ سے ترقی نہیں کر رہے ہیں کہ ان کے کارکن یعنی اہلِ شوریٰ اور منتظمین، دین دار اور عالم ہیں بلکہ ان میں سے اکثر نئی وضع کے پابند اور جدید مغربی طرز کے شیدائی ہیں۔ وہ دینی علوم سے بالکل بے بہرہ ہیں بعض کے اہلِ شوریٰ اہلِ علم اور دیانت دار ہوتے ہیں مگر ان کے مہتممین بدنیت ہوتے ہیں۔ وہ تعلیمی معاملات کو خوب سمجھتے ہیں مالی معاملات میں دیانت دار نہیں ہوتے اور مدارس کے چندوں کو اپنا مال اور اپنی جائیداد سمجھتے ہیں —— اس لئے بات کی اشد ضرورت ہے کہ مدارس عربیہ کے ارکان شوریٰ اہلِ علم اور دیانت دار ہوں اور تمام انتظامی اور تعلیمی معاملات کے مشوروں اور فیصلوں کے مطابق انجام پذیر ہوں۔ مدارس عربیہ کے مہتممین کے دلوں میں خدا کا خوف ہونا چاہیئے۔ وہ فرائض کو ذمے داری کے ساتھ محسوس کریں اور مدارسِ عربیہ کے مال کا بے جا استعمال نہ کریں اور اگر ضرورت مند ہوں تو قومی امانت کو اپنی ذات پر بقدر ضرورت خرچ کریں۔

۳: جو شخص کسی اسلامی مدرسہ کا مہتمم بنے اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی پوری توجہ اور تمام اوقات مدرسہ کے انتظام کریں۔ مدرسہ کے کاموں کے علاوہ اور کام اپنے ذمے نہ لے۔ بلکہ اپنی تمام زندگی اس کے کاموں کے لئے وقف کرے کیونکہ شخص پوری توجہ کے ساتھ دو کام نہیں کر سکتا۔

۴: مہتممین اور مدرسین کو چاہیئے کہ وہ خدا کے ان مہمانوں (طلبہ) کے ساتھ نہایت نرمی اور خیر خواہی کا سلوک کریں۔ ان کی مشکلات کو دور کریں اور ان کے اندر تعلیم کا ذوق و شوق پیدا کریں۔

۵: طلبہ کے داخلے کے وقت نہایت احتیاط سے کام لیا جاوے۔ صرف انہی طلبہ کو داخل کیا جاوے جو دینی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کا ذوق و شوق رکھتے ہوں۔ نیز انہیں داخل کرنے سے پیشتر سابقہ مدرسہ کی طرف سے ان کی نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا جائے۔

۶: طلبہ میں عزتِ نفس برقرار رکھنے کے لئے انہیں مدرسہ سے باہر کسی دعوت میں نہ بھیجا جاوے۔ اگر اہلِ خیر طلبہ کی دعوت کرنا چاہیں تو ایک دن قبل مہتمم صاحب کو اطلاع دیں اور وقت مقررہ پر کھانا لا کر مدرسہ کے اندر ہی اپنے آدمیوں کے انتظام میں طلبہ کو کھلائیں۔

انجمن اصلاح الکلام

اصلاح مدارس کی مذکورہ بالا تجاویز کے ساتھ ساتھ آپ نے طلبہ کی تعلیمی کمزوریاں دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آپ نے محسوس کیا کہ طلبہ اپنے خیالات کو عوام کے سامنے اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے اور وعظ و تقریر کی بھی عمدہ قابلیت نہیں رکھتے اور نہ بوقتِ ضرورت غیر مسلموں کے مقرروں کے ساتھ بحث و مناظرہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی اِن خامیوں کو دُور کرنے کے لئے آپ نے ۱۳۲۸ھ میں ایک مجلس تقریر و مباحثہ قائم کی جس کا نام کچھ عرصے کے بعد "انجمن اصلاح الکلام" تجویز کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو تقریر و مناظرہ سکھایا جائے ہر آٹھویں دن طلبہ تقریر اور مناظرہ کیا کرتے تھے اور آپ بذاتِ خود ان کی راہنمائی فرماتے تھے۔

ابتدائی جماعت

اس انجمن اصلاح الکلام نے اپنے فارغ التحصیل طلبہ کی بدولت آگے چل کر بہت ترقی کی اور اس کے زیرِ نگرانی ایک جدید قسم کی ابتدائی جماعت قائم ہوئی۔ جس میں جدید طرز پر عربی کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی، اور اردو املاء، حساب، اور خوش خطی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس ابتدائی جماعت کی شہرت سُن کر راقم الحروف کے والد محترم نے مجھے یہاں داخل کرایا۔ اس ابتدائی جماعت کے اُستاد مولوی احمد دین تھے جو سرحد کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مجھے اس انجمن کے معزز کارکن مولوی عبدالہادی خان صاحب کی نو تالیف کتاب مرقاۃ العربیہ حصہ اوّل شروع کرائی۔ جس کے ذریعے میں نے اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کی مشقوں سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور بہت جلد میں عربی کی ابتدائی گردانوں پر حاوی ہوگیا۔ سال بھر کی تعلیم کے بعد مفتی صاحب نے ہمارا امتحان لینے کے لئے دہلی کے مشہور سینٹ سٹیفنس کالج کے عربی اردو کے پروفیسر شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب کو بُلوایا اور انہوں نے ہمارا امتحان لیا۔ اس ابتدائی جماعت سے بھی اہل دہلی نے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ وہ دہلی کے عربی مدارس میں اپنے بچوں کو نہیں بھیجتے تھے۔ بیرونی طلبہ صرف درسِ نظامی کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ان میں سے بھی کوئی ان میں شریک نہیں ہوا اس لئے یہ جماعت بند کر دی گئی۔

تنظیمِ مدارس

مدرسہ امینیہ دہلی میں آنے کے بعد آپ نے اس امر کی کوشش کی کہ تمام مدارس اسلامیہ کی تنظیم کی جائے اور اس کے انتظامی قواعد اور نصاب یکساں ہوں اور داخلے کے لئے بھی تمام مدارس میں مشترکہ قواعد کا نفاذ ہو اور اگر ممکن ہو تو تمام یا اکثر مدارس عربیہ کا سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد ایک مرکزی مقام پر ہوا کرے ——— اس تحریک کو بروئے کار لانے کے لئے دہلی آنے کے دوسرے سال یعنی ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء مدرسہ امینیہ کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں آپ نے اتحاد اور تنظیم و اصلاحِ مدارس پر نہایت عمدہ تقریر کی۔ اس جلسے میں آپ نے وہ اصلاحی تجاویز پیش کیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

آپ کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاک و ہند کے سب سے بڑے دارالعلوم ——— دارالعلوم دیوبند کے منتظمین نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ دوسرے مدارس کے طلبہ کو اس وقت تک داخل نہیں کریں گے جب تک کہ وہ اپنے مدارس کی طرف سے نیک چلنی کی سند پیش کریں۔

مشترکہ دستار بندی

اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے منتظمین اس بات پر بھی رضامند ہوگئے کہ وہ مدرسہ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل طلبہ کی اپنے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں دستار بندی کریں گے چنانچہ ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء دارالعلوم دیوبند کے سالانہ اجتماع میں مدرسہ امینیہ دہلی کے دس فارغ التحصیل طلبہ کو بلایا گیا اور تمام مجمع کے سامنے ان کی دستار بندی کی گئی ان دس فارغ التحصیل طلبہ میں مولانا حافظ سید محمد حسین شاہ صاحب (فرزند ارجمند پیر جماعت علی شاہ صاحب مرحوم) اور مولانا حافظ سید مہدی حسن صاحب (موجودہ مفتی دارالعلوم دیوبند) بھی شامل تھے۔

جنگِ بلقان

دہلی کے ابتدائی زمانے میں مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے جنگِ بلقان کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر مسلمانانِ ہند میں اسلامی اخوت اور غیرتِ ملی کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ ترکی کے مسلمانوں کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں

نے جنگ بلقان کے مظلوموں کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ ایسے نازک موقع پر حضرت مفتی صاحب کی طرف سے دو اہم شائع کئے جس میں ایک فتوی یہ تھا کہ "ایسے موقع پر جب کہ ترکی کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں مساجد کی بارگاہ میں اُن کے لئے دعائیں مانگی جائیں اور قنوت نازلہ پڑھی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے یہ مصیبت دور کرے" فتویٰ حرم قربانی کے بارے میں ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا گیا۔

علاوہ ازیں حضرت مفتی صاحب نے ترکوں کی حمایت میں ایک جلسہ منعقد کرایا جس میں آپ نے ترکوں کے المناک حا بیان کئے اور طلبہ کو ان کی اعانت کرنے پر آمادہ کیا۔ آپ کی تقریر کا اس قدر اثر ہوا کہ ان غریب اور مفلس طلبہ کے پاس جو کچھ سب کچھ انہوں نے پیش کر دیا جن کے پاس کچھ نقد نہ تھا انہوں نے اپنے کپڑے، کتابیں اور برتن دیدیئے۔ اس کے بعد آپ مدرسین اور طلبہ کو چندہ جمع کرنے کے لئے شہر بھیجا۔ اس طرح جو سامان جمع ہوا اس کو بذات خود حضرت مفتی صاحب نے سیڑھی کھڑے ہو کر نیلام کیا۔ اس وقت لوگوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر وہ سامان خرید تھے۔ اس طرح نقد اور نیلام میں سامان فروخت کر کے جو چندہ جمع ہوا وہ سب ترکی کی رفاعی انجمن "ہلال احمر" کو روانہ کی اس کی کل میزان تین ہزار آٹھ سو چورانوے روپے آٹھ آنے نو پائی (۹-۸-۳۸۹۴ روپے) تھی۔

ابتدائی سیاسی سرگرمیاں

۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد کی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور دونوں اتحاد کی ضرورت کو محسوس کر رہے تھے کیونکہ انگریزی حکومت نے متحدہ مطالبات پر اصلاحات کا وعدہ کیا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ تھی اور ہندوؤں کی بڑی اکثریت کانگریس تھی اور علمائے کرام باقاعدہ کسی جماعت میں حصہ لے کر یا علیحدہ سیاسی تنظیم کے طور پر کام نہیں کر رہے تھے بلکہ انفرادی طور پر دیوبند کام کرتے تھے۔ ایسے موقع پر کانگریس کے بمبئی میں ۱۹۱۵ء میں اجلاس ہوئے۔ اس میں مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتے کی تجویز منظور کی گئی تھی۔ اس کے متعلق ہندو اور مسلمان لیڈروں میں مشورے ہونے لگے اور آخر کار ایک متحدہ سمجھوتہ ہو گیا جسے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں منظور کرایا گیا جو دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا تھا اور اسی مناسبت سے یہ متحدہ سمجھوتہ "میثاق لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سمجھوتہ میں مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں، اُس وقت مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں کو محسوس نہیں ہو سکیں۔ جمعیتہ علماء ہند اس وقت تک قائم نہیں ہوئی تھی مگر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر سیاسی بصیرت عطا کی تھی کہ آپ کی فکر دُور بیں نے اس کی خامیاں بھانپ لی تھیں۔ چنانچہ آپ نے اسی زمانے میں اس کی خامیاں اپنی ذاتی حیثیت سے واضح کیں۔ آپ کی سیاسی بصیرت اور سُوجھ بُوجھ اس قدر مسلم تھی کہ آپ کے استاد محترم حضرت شیخ الہندؒ جب کبھی کسی سیاسی لیڈر سے گفتگو کرتے تھے تو سب سے پہلے حضرت مفتی صاحب کو بُلا کر اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ اس موقع پر آپ کے رفقاء اور مخصوص تلامذہ آپ پر رشک کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بہت اصرار کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے رفقاء کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"بے شک تم لوگ سیاستدان ہو لیکن مولوی کفایت اللہ کا دماغ سیاست ساز ہے۔"

حضرت شیخ الہندؒ سے عقیدت سیاست میں حضرت مفتی صاحب شیخ الہندؒ کے ہم نوا تھے۔ اپنے استاد سے آپ کا قلبی تعلق عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ آپ نے اپنے مشہور قصیدہ "روض الریاحین" کے ...نو میں حضرت شیخ الہندؒ کی تعریف میں ایک مستقل نظم لکھی ہے۔ اس قصیدہ میں علماء ہند کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حواشی میں مفتی صاحب نے مذکورہ علماء کے مختصر حالات بھی تحریر کئے ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے ...رے میں اصل قصیدہ کے عربی اشعار میں آپ کے بارے میں جو تحریر کیا ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"خلق خدا کے محمود، نیک فضائل، حسین وجمیل اور صاحبِ اخلاقِ حمیدہ ہیں۔ میں آپ کی کس کس خصلت کی تعریف کروں۔ آپ کے جملہ اوصاف احاطۂ شمار سے متجاوز ہیں۔ آپ کے علم کی وسعت اور صفائی قلب میرے اس دعوئے کے بہترین گواہ ہیں"

...ربی قصیدہ اس عام قصیدہ کے علاوہ رسالہ "روض الریاحین" کے آخر میں ایک قصیدہ نونیہ ہے۔ اس قصیدہ کے پانچ صفحات صرف حضرت شیخ الہندؒ کی منظوم مدح پر مشتمل ہیں۔ اس میں رسمی تشبیب کے بعد اپنی علمی پریشانی ...حال بیان کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحب یوں رقم طراز ہیں:۔

اچانک آسمان سے ایک آواز آئی کہ — جا اُس مُرشدِ روحانی کی خدمت میں حاضر ہو جو تمام مخلوق میں بہت بڑے عالم اور ہدایت وتقویٰ کے کوہ گراں ہیں۔ وہ شرفاء کے سردار ہیں اور وہ واضح اور روشن دلائل پیش کرتے ہیں" لہٰذا میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی دہلیز پر حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے — رُوحانی اور علمی — شفا دی اور مجھے امن کی جگہ پر اُتار دیا۔ آپ علم کے وسیع متلاطم سمندر ہیں، جس میں گوہر ہائے نایاب کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس (سمندر) کی موجیں تمام زمینوں اور وادیوں تک پہنچ رہی ہیں — آپ کا سرچشمہ دیوبند ہے اور اس کا وسیع پانی بلادِ عجم اور ہندوستان کے شہریوں کو سیراب کر رہا ہے۔"

روض الریاحین سے اقتباس رسالہ روض الریاحین کے اردو حواشی میں حضرت مفتی صاحب نے شیخ الہندؒ کے بارے میں یوں تحریر فرمایا ہے:۔

حضرت مولانا ومقتدانا ومرشدنا مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی، علم کے بحرِ ذخار، معرفت وحقیقت کی موسلا دھار بارش، تواضع وانکساری کی صحیح تصویر، مواساۃ اور مہمانی میں فردِ اکمل، مشائخ ہند کے شیخ اعلیٰ، سلسلہ روایت کے منتہی، مدرسہ عالیہ دیوبند کے مدرس اعلیٰ، طلبہ کے لئے میدانِ طلب کے مقصود اقصیٰ کریم النفس، صافی السریرہ، ذکی القلب (نہایت ذکی) ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے منظور نظر ومقرب باختصاص، علم حدیث کے امام، قدوۂ اعلام ائمۃ الکرام، سلالہ خاندان اتقیاء عظام، آپ کا وجود طالبین علوم کے لئے رحمت ہے۔ خاکسار کو بھی حضرت اقدس سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کے وجود باجود نا دیر سلامت رکھے اور مستفیدین ظاہر وباطن کو آپ کے انفاس قدسیہ سے منتفع فرمائے۔ (آمین)

جس کا نتیجہ اس وقت اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین کے قبضہ و اقتدار سے انکے ممالک نکال لئے گئے ہیں اور اسلام کی دنیاوی طاقت و اقتدار کو زائل کیا جا رہا ہے۔"

آخر میں آپ نے فرمایا:۔

"میں طبقۂ علماء سے ہوں اور شرعی نقطۂ نظر سے کہتا ہوں کہ مسلمان کسی ایسی صلح میں شریک نہیں ہو سکتے اگر ہوں گے تو شرعاً گنہ گار ہوں گے۔"

اس تجویز کی تائید میں دیگر علماء کے علاوہ سیٹھ چھوٹانی اور مسٹر گاندھی نے بھی تقریر کی تھی[1]

اتحادِ علماء کا احساس دہلی میں خلافت کمیٹی کے قیام کے بعد حضرت مفتی صاحب نے یہ محسوس کیا کہ علماء کا ایک جداگانہ مرکز قائم ہونا چاہیئے کیونکہ آپ نے یہ خطرہ محسوس کیا تھا کہ اگر کسی سیاسی جماعت میں علماء انفرادی طور پر شریک ہوئے اور اس سیاسی جماعت نے کوئی غیر محتاط قدم اُٹھایا تو اس موقعہ پر سب سے زیادہ آفت علماء پر آئے گی۔ اس لئے اُنھوں نے اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے اس خلافت کانفرنس کے زمانے میں ہی اپنے ہم خیال علماء سے اس مقصد کے لئے گفت و شنید کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر انصاری کا خطبہ صدارت جمعیۃ علماء ہند کے قیام کا خیال آپ کے ذہن میں اُسی وقت سے موجود تھا جب کہ مسلم لیگ کے گیارھویں اجلاس دسمبر ۱۹۱۸ء میں (جو کرشنا تھیٹر لال کنواں دہلی میں مولوی فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں بڑی تعداد میں علماء شریک ہوتے تھے جیسا کہ سابق میں گذرا) ۔ اس اجلاس کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے اس اجلاس میں جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا تھا اس میں خلافت اور جزیرہ عرب کے بارے میں مسلمانوں کے مذہبی خیالات کو نہایت بیباکی کے ساتھ ظاہر کیا گیا۔ اس خطبۂ استقبالیہ کے اس اہم حصہ کو حضرت مفتی صاحب نے تحریر کیا تھا کیونکہ اس میں خلافت اور جزیرہ عرب کے مسائل پر حضرت مفتی صاحب نے فقہی اور اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی تھی۔

خطبۂ استقبالیہ کی ضبطی اس خطبۂ استقبالیہ میں ایسی پُرجوش مدلل بحث کی گئی تھی کہ صوبہ متحدہ (یو۔ پی) کی حکومت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں مسلمان گورنمنٹ برطانیہ کے جنگی مقاصد کے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔ اس لئے اس نے یہ خطبہ ضبط کر لیا تھا۔

اتحاد کی کوششیں اس کے بعد جب مفتی صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے حالات پر ایک کتابچہ بعنوان "شیخ الہند" لکھ رہے تھے (جو طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے) تو اس وقت بھی آپ کے ذہن میں یہ تجویز تھی کہ تمام علماء ہند ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے شیخ الہند کی رہائی کے لئے کوشش کریں۔

خفیہ اجتماع مگر مختلف الخیال و مختلف العقائد علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا بہت مشکل کام تھا، اندیشہ تھا کہ حکومت علماء کے باہمی فرقہ وارانہ اختلاف سے فائدہ اٹھا کر علماء کو ایک مرکز پر جمع نہ ہونے دیگی۔ اس لئے اس

---

[1] مسئلہ خلافت و جشن صلح

اجتماع کو خفیہ رکھا گیا۔ ۱۹۱۹ء کے اس زمانے میں خلافت کمیٹی کا اجلاس سنگم تھیٹر متصل ایڈورڈ پارک دہلی (حال جگہ) میں ہو رہا تھا۔ اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ اجلاس ختم ہونے کے بعد صرف علماء کو اسی جگہ بلایا جائے۔ چنانچہ حضرت مفتی کی ہدایت کے مطابق مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا آزاد سبحانی نے تمام علماء کی قیام گاہوں پر خفیہ طور پر اس اجتماع میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

درگاہ سیّد حسن کا معاہدہ

جس روز یہ اجتماع ہونے والا تھا اُسی روز صبح کو نماز فجر کے بعد بہت سے علماء درگاہ حسن رسول نما میں جمع ہوئے جو اس زمانے میں ایک ویران اور دُور افتادہ مقام تھا (مگر آج کل نئی دہلی کے آباد اور پُر رونق علاقہ میں شامل ہے) ان تمام علماء نے اس بزرگ کے مزار کے قریب حاضر ہو کر عہد و قرار کیا:

"موجودہ گورنمنٹ کے خلاف ہماری کارروائیاں صیغۂ راز میں رہیں گی۔ حکومت کی جانب سے جو سختیاں ہم پر کی جائیں گی اُن پر ہم ثابت قدم رہیں گے نیز آپس میں عقائد کے اختلاف کو نہیں آنے دیں گے۔"[1]

حضرت مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم جو اس معاہدہ میں شریک تھے فرماتے ہیں:

یاد نہیں کہ اس عہد و پیمان میں کون کون حضرات شریک تھے۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابو محمد سجاد، مولانا آزاد سبحانی اور مولانا منیر الزماں کی موجودگی تو یاد ہے مگر ان کے علاوہ اور بھی حضرات تھے مطبوعہ رپورٹ میں سرگذشت نہیں لکھی گئی کیونکہ اس وقت کے حالات کے پیش نظر ان باتوں کا شائع کرنا مناسب نہ تھا۔ میں نے درگاہ سید حسن رسول نما سے واپس آکر حضرت مفتی اعظم کو تمام کیفیت سُنادی تھی اور حضرت نے اطمینان و مسرت کا اظہار فرمایا تھا۔[2]

جمعیۃ علماء ہند کا قیام

اسی روز عشاء کی نماز کے بعد علماء کا جلسہ ہوا جس میں تقریباً پچیس ۲۵ علماء شریک ہوئے۔ اس وقت سب علماء نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ تمام علمائے ہند کی ایک جداگانہ جماعت قائم کی جائے اور اُس کا نام "جمعیۃ علماء ھند" رکھا جائے۔ اُنہوں نے جمعیۃ علماء ہند کا عارضی صدر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو اور عارضی ناظم مولانا احمد سعید دہلوی کو مقرر کیا اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی دعوت پر یہ طے پایا کہ جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں بمقام امرتسر بصدارت مولانا عبدالباری منعقد ہوگا۔

یوں نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سب سے پہلا دفتر مدرسہ امینیہ میں حضرت مفتی صاحب کے کمرہ میں قائم ہوا۔ اس وقت کوئی محرر اور چپراسی نہیں تھا بلکہ آپ خود اور مولانا احمد سعید صاحب اپنے ہاتھوں سے تمام کام کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کا بنیادی جلسہ ہوا تھا۔ اسی سال ۱۹۱۹ء کے آخر میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں ہوئے۔ اس زمانے میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس بھی امرتسر میں منعقد ہوا۔ اس میں ستر ۸۰ (اسّی) [illegible] کے مشہور علماء شریک ہوئے۔ یہ جلسہ بھی عام جلسہ نہ تھا تاہم اس جلسہ میں جمعیۃ علماء کا آئین اور آئندہ طریق کار [illegible]

---

[1] مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ ص ۴۴-۴۵ [2] مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ ص ۴۶

۔ اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔

آئین اور دستور کی تشکیل اور آئندہ طریق کار میں علماء کا اختلاف تھا مگر اس موقع پر مفتی صاحب نے اپنے تدبر اور بے مثال
ات کا ثبوت دیا۔ آپ نے ان اختلافات کو رفع کر کے چند گھنٹوں میں جمعیۃ علماء ہند کے لئے متفقہ آئین و دستور اور آئندہ کے
ریق کار پیش کر دیا جسے تمام علماء نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔

اس زمانے میں امرتسر ہی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس بھی کانگریس کے پنڈال میں منعقد ہوا۔ ان جلسوں میں علی
ان / مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) بھی شریک ہوئے تھے جو نظر بندی سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے تھے اور
ان کی پہلی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی تھی۔

حضرت مفتی صاحب اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی میں جمعیۃ علماء ہند کے عارضی صدر رہے وہ مالٹا میں نظر بند
ی وجہ سے صدارت نہیں کر سکے اس لئے حضرت مفتی صاحب ان کی وفات تک عارضی صدر رہے اور ان کی زندگی میں
ل صدر بننا قبول نہیں کیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک مسلسل ۲۰ برس تک صدر رہے۔ مگر
رصے میں کبھی آپ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کے صدر نہیں بنے بلکہ ہم عصر دوستوں کی صدارت میں کام کرنا آپ
یت کا خاص وصف رہا۔

حضرت مفتی صاحب کی زیر قیادت جمعیۃ علماء ہند نے برصغیر پاک و ہند کی آزادی کو اپنا نصب العین اپنے پیش نظر
ور اس مقصد کے لئے آپ نے علماء کو متحد کرنے اور ان میں صحیح قسم کا سیاسی شعور پیدا کرنے میں انتھک محنت کی۔ چنانچہ
ے سالانہ اجلاس اسی مقصد کے لئے ہوتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے یہ اجلاس تقریباً ہر سال ہندوستان کے مختلف بڑے
ں میں ہوتے تھے۔ اس کے بعض اجلاس بڑے شاندار اور تاریخی اہمیت کے تھے۔ ان میں سے کانپور کے اجلاس میں
الملک حکیم اجمل خاں نے خطاب کیا تھا۔ نیز اس کے جو اجلاس مراد آباد، جون پور، دہلی، گیا اور امروہہ میں ہوئے تھے
ا اہم تھے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کے پشاور میں اجلاس ہوئے وہ بہت معرکہ آرا تھے۔ ان اجلاس میں برٹش گورنمنٹ
بکاٹ اور بازار قصہ خوانی میں حکومت کی فائرنگ کی سخت مذمت کی گئی۔ اس کے نتیجہ میں اس فائرنگ کے خلاف جو
رکاری تحقیقات کرنے والی پٹیل کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس کے ایک رکن حضرت مفتی صاحب تھے۔

ٹ ایکٹ

حضرت مفتی صاحب نے اپنے ملک کی ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ بل کے
خلاف جب ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی تھی تو آپ نے اس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ آپ اس مقصد
لئے حکمت عملی کے ساتھ پوشیدہ کام کرتے رہے۔

ھی کی تحریک

تحریک خلافت کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک جاری کی،
اور ہزاروں ملکانوں کو جو مسلمان تھے مرتد کر کے ہندو بنا لیا تو حضرت مفتی صاحب کانگریس اور ہندوؤں سے
بعض معاملات میں اتحاد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی فرائض سے غافل نہیں رہے۔

غی وفد

آپ نے اس موقعہ پر سب سے پہلا تبلیغی وفد ان علاقوں میں روانہ کیا جہاں آریہ سماج کی شدھی کی تحریک

کا زور تھا۔ اس وفد کے صدر مولانا محمد عرفان مرحوم (مدیر اول اخبار الجمعیۃ) اور نائب صدر مولانا وحید حسن صاحب ٹونکی (مدرس مدرسہ امینیہ) تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ خود بھی ایک وفد لے کر بمقام اجمیر جا پہنچے اور وہاں کے مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچایا۔

تبلیغی خدمات

حضرت مفتی صاحب کا انداز خطابت اور طرز تخاطب اس تبلیغی دورہ میں دیہات والوں کی سطحی ذہنیت کے مطابق ہوتا تھا۔ وہ آپ کی دل نشیں اور سیدھی سادی گفتگو سے متاثر ہو کر دوبارہ قبول کر لیتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس فتنۂ ارتداد کے زمانے میں حضرت مفتی صاحب کو یہ خبر ملی کہ فلاں گاؤں کا پورا مرتد ہو گیا ہے لہٰذا حضرت مفتی صاحب نے مولانا احمد سعید کو حکم دیا کہ وہ فوراً گاؤں پہنچ کر صورت حال معلوم کریں۔ اس زمانے میں ملکانہ قوم کے دیہاتوں میں آریہ سماج کی شدھی کا بہت زور تھا، اس لئے مسلمانوں کی تبلیغی جماعت کا وہاں پہنچنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا تھا تاہم مولانا احمد سعید صاحب جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ آریہ سماج ان سے یہ کہتے تھے تمہارے باپ دادا سب ہندو تھے۔ مسلمانوں نے اگر تم کو زبردستی مسلمان بنایا اور تمہاری چوٹیاں کاٹیں ——— یہ سن کر حضرت مفتی صاحب وہاں پہنچے اور جلسے کا اعلان کرا کر ان سب لوگوں کے سامنے آپ نے یوں تقریر ارشاد فرمائی۔

مؤثر تبلیغی تقریر

آج اس گاؤں میں آ کر اور ایک بہادر قوم کے سپوتوں سے مل کر میں بے انتہا خوش ہوتا ہوں ملکانہ قوم دنیا کی چند بہادر قوموں میں سے ایک ممتاز قوم ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ تمہارے باپ دادا نے ہمیشہ ہندوستان کی حفاظت کی ہے۔ دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی لوگ تمہیں آ کر بہکاتے ہیں کہ تمہارے باپ دادا کو مسلمانوں نے مار مار کر زبردستی مسلمان بنایا تھا اور ان کی گردنیں پکڑ پکڑ چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ کیا واقعی تمہارے باپ دادا ایسے ہی کمزور اور ڈرپوک تھے؟ مجھے یقین نہیں آتا دیکھو بھئی! یہ لوگ جھوٹ بولتے اور دھوکا دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے باپ دادوں سے کوئی آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اسلام کو ایک اچھا اور سچا دین سمجھ کر اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے تھے۔ کیا تم اپنے سچے دین کو چھوڑ کر اپنے باپ دادوں کی روحوں کو صدمہ نہیں پہنچا رہے ہو؟

آپ کی اس تقریر نے نفسیاتی طور پر ان کے دلوں پر اس قدر اثر کیا کہ اس گاؤں کے تمام اشخاص از سر نو مسلمان ہو گئے۔

مذہب کی حمایت میں کلمۂ حق

شدھی اور سنگٹھن کی تحریک کی وجہ سے تمام ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے لہٰذا گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ستمبر ۱۹۲۴ء کو اکیس ۲۱ دن کا برت شروع کیا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں تمام فرقوں کی ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں حضرت جلیـ

لہ مولانا وحید حسن خاں صاحب بہت بڑے عالم اور معقولات، منطق اور علم کلام کے زبردست فاضل تھے اس لئے عقلی دلائل سے اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے بہت موزوں تھے۔ وہ مولانا محمود حسن خاں مؤلف معجم المصنفین اور مولانا وحید احسن خاں محدث ندوۃ العلماء کے بھانجے تھے اور بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ راقم الحروف کے نہایت شفیق استاد تھے۔ آخر زمانے میں وہ کرنال کے ایک تبلیغی کالج کے مبلغوں کی ایک جماعت تیار کر رہے تھے کہ اچانک انتقال کر گئے۔

ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزائے مرتد اور تبلیغ کے احکام خارج کر دیں۔ اس موقعہ پر اکثر ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اس تجویز کی حمایت کی ——— مگر ہزاروں کے اس مجمع میں صرف مفتی صاحب کی ذات تھی جس نے اس متفقہ تجویز کی پُرزور مخالفت کی اور شریعت کے صحیح احکام کی حمایت میں آپ عظیم ترین شخصیتوں سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ چنانچہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:-

اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے۔ تبلیغ اس کے خمیر میں داخل ہے۔ بیشک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ اسلام کا کھلا ہوا روشن اصول ہے۔ ہمیں اس کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہے۔ مگر ہندوستان کے موجودہ فسادات اس عقیدہ کے نتائج نہیں ہیں کیونکہ اس سزا کو جاری رکھنے کا حق صرف سلطانِ اسلام کو ہے۔ پس موجودہ حالات میں اسلامی حدود کے جاری ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے[1]

اس طرح آپ نے تمام مخالفتوں کے باوجود حکم حق کہہ کر علمائے حق اور اسلام کی لاج رکھ لی۔ بقول اقبال رح ؎

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مؤتمر حجاز

جب سلطان ابن سعود نے حجاز مقدس میں سے شریف مکّہ کی حکومت ختم کر دی تو دنیائے اسلام کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد کرنے کی تجویز پیش ہوئی اور اسی کے مطابق ایک مؤتمر عالم اسلامی مورخہ ۲۶ ذی قعدہ ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء کو شریف شرف عدنان کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں تمام اسلامی ممالک کے منتخب وفود شریک ہوئے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کے ارکان مندرجہ ذیل تھے۔

۱: حضرت مولینا مفتی کفایت اللہ (صدر وفد) ۲: مولانا عبدالحلیم صدیقی (پرائیویٹ سیکرٹری صدر وفد)
۳: مولینا محمد عرفان رح (سیکرٹری وفد) ۴: علامہ شبیر احمد عثمانی رح (رکن وفد)
۵: مولینا احمد سعید رح (رکن وفد) ۶: مولانا نثار احمد (رکن وفد)

حضرت مفتی صاحب نے سلطان ابن سعود سے مطالبہ کیا کہ مؤتمر عالم اسلامی میں حجاز کے لئے حکومت کی تشکیل کا مسئلہ بھی زیر بحث آئے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بھی ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا۔ آخر کار ۱۴ مئی ۱۹۲۵ء کو جمعیۃ علماء کا وفد اور جمعیۃ خلافت کا وفد بذریعہ اکبر جہاز بمبئی سے روانہ ہوا۔ خلافت کے وفد مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

۱: مولانا سید سلیمان ندوی رح (صدر وفد) ۲: مسٹر شعیب قریشی (سیکرٹری وفد)
۳: مولانا شوکت علی رح رکن ۴: مولانا محمد علی رکن

اس عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس میں ہند، مصر، جاوا، فلسطین، بیروت، شام، سوڈان، نجد، حجاز، روسی ترکستان، افغانستان، ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے وفود شامل تھے۔

مؤتمر عالم اسلامی کی سبجکٹ کمیٹی میں مندرجہ ذیل ارکان کو شامل کیا گیا۔

---

[1] مفتی اعظم کی یاد ص ۹۱-۹۲
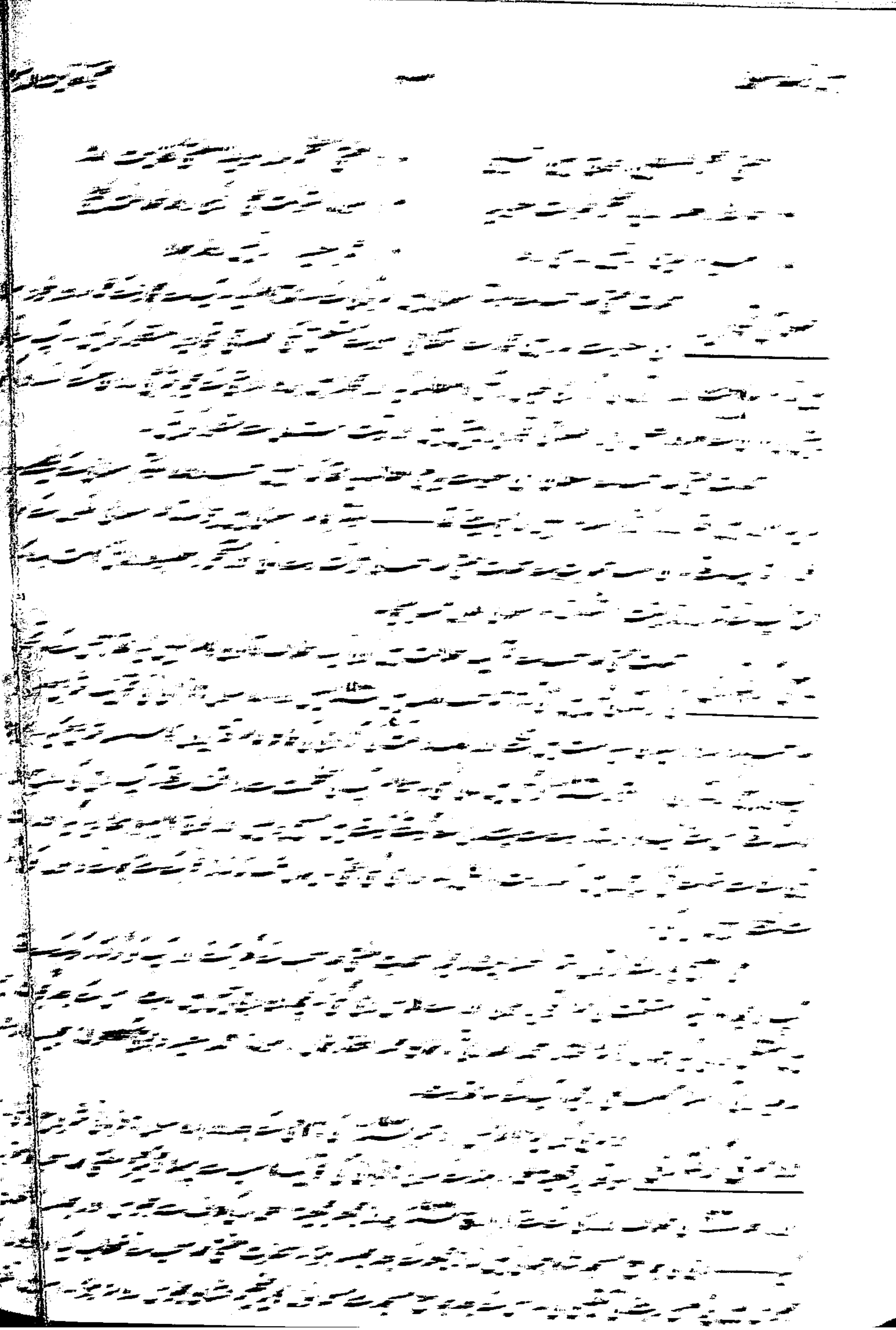
ایک لاکھ افراد شامل تھے۔ جلوس کی راہنمائی حضرت مفتی صاحب خود فرما رہے تھے۔ یہ جلوس مختلف سڑکوں اور بازاروں سے ہوتا ہوا ٹاؤن ہال کے پیچھے آزاد پارک پہنچ گیا۔ وہاں ایک جلسہ ترتیب دیا گیا جہاں کوتوال شہر اور دیگر پولیس افسران پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ موجود تھے۔ مفتی صاحب سٹیج پر کھڑے ہو کر اپنا طوفانی بیان پڑھنا چاہتے تھے کہ پولیس نے بے تحاشہ لاٹھی چارج شروع کر دیا اور نہتے عوام کو بری طرح زد و کوب کیا۔ لاٹھی چارج سے سینکڑوں افراد سخت زخمی ہوئے مولانا عبدالحلیم صدیقی اور دیگر ممتاز علماء بھی شدید مجروح ہوئے۔

ملتان جیل جب پولیس کے ظالمانہ لاٹھی چارج سے عوام منتشر ہو گئے تو کوتوال شہر آپ کو گرفتار کر کے کوتوالی لے گیا اور وہاں سے آپ کو جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ کے خلاف جیل میں عدالت قائم کی گئی اور آپ کو اٹھارہ ۱۸ ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی اور آپ کے لئے اے کلاس منظور کی گئی۔ اس کے بعد آپ کو نیو سنٹرل جیل ملتان میں رکھا گیا۔ ملتان جیل میں مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حبیب الرحمٰن دہلوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، لالہ دیش بندھو گپتا چوہدری شیر جنگ، ڈاکٹر انصاری وغیرہ آپ کے ساتھ تھے۔

جیل کے مشاغل حضرت مفتی صاحب گجرات اور ملتان جیل میں بیکار نہیں رہے بلکہ اس حالت میں بھی گوناگوں مشغول رہے۔ وہ حضرات جو جیل میں آپ کے ساتھ تھے انہوں نے آپ کے جیل کے مشاغل کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں[1]

> فتح الباری شرح بخاری کا آخری پارہ میں نے حضرت (مفتی کفایت اللہ) سے گجرات جیل میں پڑھا۔ اس وقت جیل میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر انصاری مرحوم، خان عبدالغفار خان، مولانا نورالدین صاحب لائل پوری، مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ اور بہت سے ہندوستان کے چیدہ حضرات موجود تھے۔ وہاں بھی مختلف صحبتیں، مذہبی اور سیاسی منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ خاص کر مولوی نورالدین لائل پوری تو ہر وقت ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ جیل خانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ اے کلاس کے قیدیوں کو "مشقتی" دیئے جاتے تھے۔ یہ مشقتی اخلاقی قیدیوں میں سے ہوا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ ان قیدیوں سے کام لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ —— "یہ لوگ بھی ہماری طرح کے قیدی ہیں۔ ان سے ہم خدمت کس طرح لے سکتے ہیں"—— مفتی صاحب اپنا ہر کام اپنے ہی ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔

جیل میں تعلیم (ملتان جیل میں) حضرت مفتی صاحب اپنی عادت کے موافق کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ کچھ وقت، لالہ دیش لالہ دیش بندھو کو فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے (مولانا احمد سعید نے) مفتی صاحب سے سراجی اور دیوان حماسہ جیل میں پڑھا اور جب ملتان جیل میں مشاعرہ کا دور شروع ہوا، تو مفتی صاحب قبلہ اکثر غزلوں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔

پھٹے ہوئے کپڑے سینا قیدیوں کے پھٹے ہوئے کپڑے عام طور پر مفتی صاحب ہی سیا کرتے تھے۔ جو قیدی آیا اس کا پھٹا ہوا کرتہ یا پاجامہ دیکھا تو اس سے فرمایا "لاؤ تمہارا کرتہ درست کر دوں"۔

[1] مفتی اعظم کی یاد ص ۱۰۸-۱۰۹

یہ پھٹے ہوئے کپڑے سینا صرف سیاسی قیدیوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ اخلاقی قیدیوں کے کپڑے بھی (آپ) سیا کرتے تھے۔

اسی ملتان جیل میں آپ نے عربی زبان میں ایک فصیح و بلیغ نظم لکھی جس میں آپ نے جیل کے افسر میجر فضل الدین کو تہنیت عید بھیجی اور اس میں آپ نے سچے جذبات کا وہ پورا نقشہ کھینچا ہے جو عید کے موقع پر ایک قیدی کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنی اسلامی حمیت اور آزادی حاصل کرنے کے مصمم عزم کا اظہار بھی کیا ہے [1]

مارچ ۱۹۳۳ء میں ملتان جیل سے مولانا احمد سعید صاحب حضرت مفتی اعظم سے پہلے رہا ہوئے تو حضرت مفتی صاحب نے اردو نظم میں اپنے جذبات کا اظہار فرمایا۔

استغناء اور خودداری

اس زمانے میں مخالف حضرات یہ کہا کرتے تھے کہ مفتی صاحب اور جمعیۃ العلماء کے دیگر اکابر کو کانگریس سے تنخواہ ملتی ہے اور ان کی تمام تحریکات کانگریس کے فنڈ سے چلتی ہیں مولانا ابو الغیاث شیخ کریم الدین میرٹھی جو جنوبی ہند میں پندرہ سولہ برس بطور سفیر جمعیۃ کا کام کرتے رہے ہیں، اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

مالی امداد سے انکار

۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند پر ایسا تنگی کا دور آیا کہ فنڈ میں بالکل پیسہ نہ رہا۔ کئی ماہ کی تنخواہیں چڑھ گئیں۔ اس وقت موتی لال نہرو نے کانگریس فنڈ سے مالی امداد کرنے کی پیشکش کی اس زمانے میں حضرت مفتی صاحب گرفتار ہو چکے تھے مگر ابھی دہلی جیل ہی میں تھے۔ اس سلسلے میں جب آپ سے ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

"جنگ آزادی کے میدان میں ہم کسی دوسرے کے سہارے پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ استخلاص وطن کی جدوجہد ہمارا مذہبی فریضہ ہے اگر ہم جماعت کو نہیں چلا سکیں گے تو دفتر کو بند کر دیں گے۔"

اور ویسے بھی حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اور دیگر اکابر جمعیۃ کی زندگیوں کو دیکھا جائے، تو ان کی زندگی اس الزام کا قطعی انکار کرتی نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کا تقویٰ، کردار، خلوص، للہیت اور ملی و قومی غیرت بے مثال تھی۔ اس کی ایک مثال وہ ہے کہ جب آزادی کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ کو ہندوستان کا سب سے بڑا سول اعزاز پدم بھوشن دیا جانے لگا تو آپ نے انکار کر دیا حالانکہ آزادی کے بعد اپنے ملک کی حکومت سے اس طرح کا اعزاز ملنا آپ کی خدمات کا اعتراف تھا اور آپ کا یہ حق بنتا تھا، لیکن جو لوگ ہمیشہ سنت پیغمبر پر عمل پیرا رہے ہوں اُن کی نگاہ ہر وقت اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے) پر رہتی اور زخارف دنیا کی، ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ہفت اقلیم کی دولت بھی پیش کرے تو ٹھکرا دیتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اور حضرت مدنی رحمہ ایسے ہی خوددار اور اللہ والے لوگ تھے۔

---

[1] مفتی اعظم کی یاد ص ۱۶۴ - ۱۶۵

حضرت مفتی صاحب کے لئے کانگریس سے مالی امداد لینا تو بہت بڑی بات ہے۔ آپ خود جمعیۃ العلماء کی تحریکات اور اس کے دیگر کاموں کے لئے اس کے فنڈ سے کوئی پیسہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے بلکہ جمعیۃ العلماء کے کاموں، اس کی تحریکات اور جلسوں کے لئے جو سفر کرتے تھے اس کے مصارف بھی آپ خود اپنی جیب سے ادا کرتے تھے اور اگر کبھی ہاتھ تنگ ہوتا تو سفر ملتوی کر دیتے تھے۔

حکومت کی پیش کش جب آپ نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا اور اس میں روز افزوں ترقی ہونے لگی تو آپ کے ساتھ آپ کے لاکھوں معتقدین اس تحریک میں شریک ہو گئے تھے۔ اس لئے حکومت برطانیہ نے آپ کو تحریک سے الگ رکھنے کے لئے ہر قسم کے دباؤ ڈالنے شروع کئے۔ آخر میں حکومت کی طرف سے وائسرائے کونسل کے ایک ممبر میاں سر فضل حسین نے یہ پیام آپ تک پہنچایا۔

"حکومت برطانیہ یہ درخواست کرتی ہے کہ آپ سیاسی تحریکات سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس کے صلہ میں حکومت آپ کو بطور ہدیہ مدرسہ صفدر جنگ کی شاہی عمارت اور اس کا ملحقہ میدان پیش کرے گی اور آپ کی ذات خاص کے لئے ہبہ کرے گی۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ حکومت برطانیہ کی حمایت یا پراپیگنڈہ کریں۔ نہیں بلکہ آپ صرف اتنا کریں کہ خاموش رہیں اور سیاسیات سے الگ رہیں۔"

حضرت مفتی صاحب کے فرزند اکبر مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب آصف اپنے ایک مضمون میں مذکورہ بالا پیام کی یہ عبارت تحریر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:۔

یہ ایک رازدارانہ پیام تھا جو والد مرحوم نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے بیان کیا تھا اور آج پہلی مرتبہ صفحۂ قرطاس پر آرہا ہے۔[1]

ضمیر فروشی سے انکار میاں سر فضل حسین کے اس پیام کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:۔

"میں آزادیٔ وطن کی تحریک میں ذاتی منفعت کے لئے شریک نہیں ہوا ہوں۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ۔ کوئی لالچ میرے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔"

پہلے مسلمان پھر ہندوستانی حضرت مفتی صاحب اور دیگر ارکان جمعیۃ العلمائے ہند کے بارے میں یہ غلط فہمی اب تک پائی جاتی ہے کہ وہ دیگر بعض کانگریسی مسلمانوں کی طرح کانگریس کے اندھا دھند

---

[1] مفتی اعظم کی یاد ص ۲۲۲

متعلد تھے اور انہی کی طرح "پہلے ہندوستانی اور بعد میں مسلمان تھے"۔ مگر یہ الزام قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ آپ کے فرزند مولانا حفیظ الرحمٰن واصف اپنی مرتبہ کتاب "مفتی اعظم کی یاد" میں پُر زور طریقہ سے اسکی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

حضرت مفتی صاحب کی کسی تحریر یا تقریر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے برخلاف اُن کا نظریہ یہ تھا کہ ـــــ مسلم پبلک کا اولین فرض ہے کہ وہ سیاسی ترقی کی رفتار میں مذہبی آزادی کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھے اور پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی یا عربی، ایرانی، چینی وغیرہ کے اصول کو لازم سمجھیں۔
(ملاحظہ ہو) مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت مطبوعہ دی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۱۷ء۔

اور آخر عمر تک آپ اس پر قائم رہے۔

مصر کی مؤتمر فلسطین

جب برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کیا اور ایک حصہ میں یہودیوں کی سلطنت قائم کر دی تو فلسطین کے لو... میں سخت بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے برطانیہ کے خلاف سخت تحریک چلا... کی، جسے حکومت برطانیہ نے تشدد آمیز مظالم سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا حضرت مفتی صاحب نے جمعیۃ علماء ہند کے زیر نگ... "مجلس تحفظ فلسطین" قائم کی اور فلسطین کے مظلوموں کے لئے چندہ جمع کیا۔

علاوہ ازیں تمام ہندوستان میں تقسیم فلسطین کے خلاف ۲۶ اگست ۱۹۳۸ء کو "یوم فلسطین" منایا گیا۔ احتجاجی ... ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ اس کے بعد قاہرہ میں عالم اسلام کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش ہوئی مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ میں جناب علی علویہ پاشا کی صدارت میں یہ مؤتمر فلسطین منعقد ہوئی۔ اس مؤتمر میں مصر، شام عراق، ایران، ہندوستان، لبنان، حجاز، اردن، یوگوسلاویہ، پولینڈ، رومانیہ، ترکی غرضیکہ تمام عالم اسلامی کے تقریباً ساڑھے تین ہزار نمائندے شریک ہوئے۔

جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کے نمائندے مندرجہ ذیل علماء تھے۔

۱: حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب (صدر) ۲: مولانا عبدالحق مدنی (رکن) ۳: مولانا محمد یوسف بنوری (رکن)

مصر کا سفر

حضرت مفتی صاحب اپنے ارکان وفد کے ساتھ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۸ء کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ پہنچ گئے۔ قاہرہ میں حضرت مفتی صاحب کا بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ مولانا محمد یوسف فرماتے ہیں کہ:

"ہم نے حضرت مفتی صاحب کے استقبال کا جو نظارہ قاہرہ میں دیکھا (ہمارے دل مسرت کی وجہ سے اُچھل رہے تھے اور ہمارے سر فخر کی وجہ سے بلند ہو رہے تھے) اتنا عظیم الشان استقبال دنیا کے کسی نمائندے کا نہیں کیا گیا مفتی اکبر زندہ باد، ہندی وفد زندہ باد کے فلک بوس نعرے لگائے جا رہے تھے۔ ایک عظیم الشان جلوس کی صورت میں آپ کو قیام گاہ تک لے جایا گیا۔"

۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو شام کے ۵ بجے مؤتمر شروع ہوئی۔ اتنے بڑے اجلاس میں یہ شرف آپ کے حصہ میں آیا کہ صدر کے دائیں جانب جو کرسی تھی وہ آپ کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ سبجکٹ کمیٹی کے ارکان میں آپ کا نام سب سے پہلے رکھا گیا تھا۔ سبجکٹ کمیٹی کے ۱۸ ممبر تھے جن میں سے تین ہندوستانی تھے۔ یعنی حضرت مفتی صاحب، مولانا محمد عرفان اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی

ارکان وفد خلافت کمیٹی۔

علالت حضرت مفتی صاحب سفر مصر کے دوران جہاز ہی میں علیل ہوگئے تھے اور مصر پہنچ کر بھی شدید بخار میں مبتلا رہے۔ اس لئے آپ بیماری کی وجہ سے اس مؤتمر فلسطین میں خود شریک نہیں ہوسکے۔ اس لئے حضرت مولانا عبدالحق مدنی نے مؤتمر میں آپ کا بیان پڑھا اور آپ کی نمائندگی کی۔

شیخ ازہر کی عیادت حضرت مفتی صاحب کی علالت کے دوران شیخ ازہر علامہ مصطفی المراغی کئی مرتبہ آپ کی عیادت کے لئے آپ کی قیام گاہ میں تشریف لائے۔ مصر میں شیخ الازہر کی پوزیشن مذہبی حیثیت سے شاہِ مصر سے بڑھ کر ہے یعنی شیخ الازہر کی ملاقات کے لئے شاہ مصر خود ان کی خدمت میں جاتے ہیں اور شیخ الازہر کسی سے ملنے کے لئے کہیں تشریف نہیں لے جاتے ہیں مگر وہ حضرت مفتی صاحب کی علمی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ خود چل کر حضرت مفتی صاحب کی عیادت کے لئے آئے۔ یہ خاص امتیاز تھا جو انہوں نے حضرت مفتی صاحب کے لئے اختیار کیا۔

حضرت مفتی صاحب اپنی علالت کی وجہ سے مؤتمر کے جلسے میں شریک نہیں ہوسکے تاہم آپ کا جو بیان پڑھ کر سنایا گیا وہ اور نمائندوں سے زیادہ جرأت مندانہ اور حقیقت پسندی پر مبنی تھا۔

مصر سے واپسی مصر سے واپسی سے ایک دو روز قبل آپ کا بخار اُتر گیا تھا مگر نقاہت اور کمزوری بہت تھی۔ اس لئے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ جب تک مکمل طور پر صحت نہ ہو اس وقت تک آپ قاہرہ میں قیام کریں۔ مگر ہندوستان کے مشاغل اور دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب باوجود بیماری اور نقاہت کے پروگرام کے مطابق واپس تشریف لے آئے۔

فوٹو سے انکار واپسی کے وقت کافی تعداد میں علماء اور عمائدین مصر آپ کو رخصت کرنے کے لئے آئے۔ اس وقت مصر کے عمائدین نے فوٹو لینے کی خواہش کا اظہار کیا مگر حضرت مفتی صاحب نے فوٹو کھچوانے سے انکار کر دیا۔ چونکہ علماء مصر کا ایک طبقہ فوٹو کو جائز قرار دیتا ہے اس لئے ان حضرات نے بحث شروع کر دی۔ علماء مصر کا نقطۂ نگاہ یہ تھا، کہ شریعت میں اس تصویر کی ممانعت ہے جو انسان خود اپنے ہاتھ سے بناتا ہے جیسا کہ پہلے زمانے میں اور اب بھی مصوری کی جاتی ہے مگر فوٹو میں یہ بات نہیں ہے یہ تو صرف عکس ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی ان حضرات سے جو گفتگو ہوئی حضرت مولانا عبدالحق مدنی کے بیان کے مطابق اس کے الفاظ یہ تھے۔

علماء مصر	علماء مصر
التصویر الممنوع انما هو الذی یکون بصنع الانسان و معالجة الایدی و هذا لیس کذالك انما هو عکس الصورة۔	ممانعت تو صرف اس تصویر کی ہے جو انسان کے عمل اور ہاتھوں کی کاریگری سے ہو فوٹو میں کچھ نہیں کرنا پڑتا یہ تو صورت کا عکس ہوتا ہے۔
حضرت مفتی صاحب	**حضرت مفتی صاحب**
کیف ینتقل هذا العکس من الزجاجة الی الورق۔	یہ عکس کیمرہ لینس سے کاغذ پر کس طرح منتقل ہوتا ہے۔

علماء مصر

بعد عمل کثیر۔

حضرت مفتی صاحب

ای فرق بین معالجة الایدی و صنع الانسان والعمل کثیر ؟

علماء مصر

نعم ھو شئی واحد۔

حضرت مفتی صاحب

اذا حکمھا واحد۔

علماء مصر

بہت کچھ کاریگری کرنا پڑتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب

انسان کے عمل، ہاتھوں کی کاریگری اور بہت کچھ کاریگری میں کیا فرق ہے ؟

علماء مصر

کوئی فرق نہیں صرف الفاظ کا اختلاف ہے مفہوم ایک ہے

حضرت مفتی صاحب

لہذا حکم بھی اس کا ایک ہے۔

علمائے مصر حضرت مفتی صاحب کی حاضر جوابی اور صحیح جواب سے بے حد متاثر ہوئے اور کچھ ایسے خاموش ہوئے کوئی جواب نہ دے سکے۔

مدرسہ امینیہ دہلی

حضرت مفتی صاحب نے جمعیۃ العلماء میں رہ کر جو سیاسی اور قومی خدمات انجام دیں ان کا مختصر بیان کیا جاتا ہے مگر مدرسہ امینیہ میں رہ کر آپ نے جو درس و افتاء کی خدمات انجام دی ہیں وہ آپ کا لافانی کارنامہ ہے۔ اس لئے مختصر طور پر مدرسہ امینیہ کو ترقی دینے کے لئے جو کام آپ نے انجام دیئے ہیں، اُن کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔

مدرسہ امینیہ کی ابتداء ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ مولانا امین الدین صاحب اس کے بانی اور مہتمم تھے اس لئے ان کے نام پر مدرسہ امینیہ نام رکھا گیا۔ حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ اس کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے مگر ۱۹۰۲ء میں وہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے کشمیر تشریف لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد حضرت مفتی صاحب شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں دہلی تشریف لائے اور اس مدرسہ امینیہ میں جو سنہری مسجد چاندنی چوک میں قائم تھا شیخ الحدیث اور مفتی کا عہدہ سنبھالا۔

سنہری مسجد میں مدرسہ کے لئے جگہ تنگ تھی اس لئے یہ بندوبست کیا گیا کہ کشمیری دروازہ کی مسجد پانی پتیاں اور اس سے متعلقہ اراضی اس کے متولیوں سے حاصل کرکے وہاں مدرسہ امینیہ کی عمارت تعمیر کی جائے چنانچہ متولیوں نے یہ مسجد اور اس سے متعلقہ اراضی مدرسہ کے مہتمم صاحب کو منتقل کردی اور اس اراضی پر ۱۹۱۵ء سے مدرسہ کی تعمیر شروع کردی گئی اور ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں مدرسہ چاندنی چوک سے کشمیری دروازہ کی مسجد پانی پتیاں کی اپنی عمارت میں منتقل ہو گیا۔

ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں مہتمم مدرسہ امینیہ مولانا امین الدین صاحب فوت ہو گئے۔ انہی دنوں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان تشریف لے آئے تھے اس لئے اُنہوں نے اپنی موجودگی میں ۹ شوال ۱۳۳۸ھ میں ایک بڑے جلسے میں حضرت مفتی کفایت اللہ کو مدرسہ کا مہتمم بنایا۔

تعمیر مسجد مسجد پانی پتیاں جہاں مدرسہ امینیہ واقع ہے، تاریخی حیثیت رکھتی ہے جسے نواب لطف اللہ خاں صادق پانی پتی نے ۱۱۳۸ھ مطابق ۱۷۲۵ء کے شاہی زمانہ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تعمیر کو تقریباً دو سو سال ہوئے تھے۔ اس لئے یہ بہت بوسیدہ ہوگئی تھی اور نشیب میں آگئی تھی۔ لہٰذا جب عین پورے دو سو سال بعد حضرت مفتی صاحب کے زیر انتظام و اہتمام آئی تو آپ نے اس تاریخی مسجد کو از سرِ نو ۱۳۵۲ھ میں نہایت خوبصورت اور سنگین تعمیر کرایا۔

حضرت مفتی صاحب نے اس مدرسہ کے سرپرستوں کی وفات کے بعد ۱۹۴۲ء میں ایک مجلس منتظم قائم کی جو مدرسہ اور مسجد دونوں کے انتظام کی ذمہ دار بنی اور مجلس میں علماء، اور مخیر تجار اور معززین شہر کی نمائندگی تھی۔

تعلیمی خدمات مدرسہ امینیہ کے ذریعے حضرت مفتی صاحب نے علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں زبردست خدمات انجام دیں۔ یہیں سے آپ پاک و ہند کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے فتاویٰ کا جواب تحریر فرماتے تھے اور یہیں آپ علمِ حدیث کا درس دیتے تھے۔ دور دراز ممالک کے طلبہ بھی آپ کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ بالخصوص پاک و ہند کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے فارغ التحصیل علماء اسلامی خدمات سرانجام دیتے ہوئے نظر نہ آئیں۔ ان ممتاز علماء میں مشہور ترین علماء حسبِ ذیل ہیں۔

۱: شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اُستاد دارالعلوم دیوبند۔
۲: مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند۔
۳: سحبان الہند حضرت مولانا حافظ احمد سعید صاحب دہلوی سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند۔
۴: حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد عبدالغنی صاحب پٹیالوی حال شیخ الحدیث و مفتی مدرسہ امینیہ۔
۵: استاد محترم مولانا خدا بخش صاحب سابق مدرس مدرسہ امینیہ و حال شیخ الحدیث دارالعلوم سرگودھا۔
۶: حافظ سید محمد حسین فرزند ارجمند پیر جماعت علی شاہ۔
۷: حضرت مولانا مفتی عبدالصمد صاحب مکرانی قاضی القضاۃ سابق ریاست قلات۔
۸: مولانا محمد تقی صاحب امینی مؤلف "اسلام کا زرعی نظام" وغیرہ
۹: مولانا محمد شفیع صاحب ملتانی
۱۰: مولانا محمد اسماعیل بسم اللہ مفتی علاقہ گجرات (ہند) و سابق مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات۔

حضرت مفتی صاحب نے مدرسہ امینیہ میں ایک مہمان خانہ بھی تعمیر کرایا تھا جہاں اکثر مشہور علماء ٹھیرا کرتے تھے۔ بالخصوص حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ جب دہلی تشریف لایا کرتے تھے تو وہیں قیام فرماتے تھے۔ میں نے شاہ صاحب کی زیارت وہیں کی تھی اور کئی دفعہ حضرت شاہ صاحب کی نورانی شکل و صورت کے دیدار سے مشرف ہوا۔

طریقۂ تعلیم آپ کے درس اور بالخصوص درسِ حدیث کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ طویل تقریر سے پرہیز کرتے تھے بلکہ اہم اور اختلافی احادیث کی تشریح نہایت سادہ اور آسان زبان میں ملخص طریقے سے کیا کرتے تھے۔ آپ اپنے طریقۂ تعلیم میں اپنے اُستاد کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند کی طرح آپ کی تقریر مختصر ہوتی تھی۔ کسی حدیث کی مخالفت سے

توجیہات میں سے آپ نہایت مختصر، جامع اور آخری توجیہہ بیان فرماتے تھے۔ جو آپ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول ہوتی تھی۔ اس طرح احادیث کا خلاصہ طلبہ کو اچھی طرح ذہن نشین ہوجاتا تھا۔

مدرسہ امینیہ میں آپ نے تقریباً پچاس سال تک علم حدیث کا درس دیا اور اتنے ہی عرصہ تک آپ فتویٰ نویسی کا کام کرتے رہے۔ راقم الحروف نے اپنے زمانے میں صحیح بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس آپ کی خدمت میں بیٹھ کر حاصل کیا۔ سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ آپ کا واضح اور دل کش طرز بیان تھا۔ میں اس زمانے میں نوعمر تھا اس لئے پیچیدہ بیان کو پسند نہیں کرتا تھا اس لئے حضرت مفتی صاحب کی سلیس اور دلکش تقریر مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔

تنخواہ آپ ابتداً جب مدرسہ امینیہ میں مدرس ہو کر آئے تو اس وقت آپ کی تنخواہ بیس ۲۰ روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ آخر میں ترقی پاکر آپ کی تنخواہ جمادی الاول ۱۳۷۰ھ میں دو سو پچاس روپے (-/۲۵۰) تھی۔ یکم جمادی الثانی ۱۳۷۰ھ سے مجلس منتظمہ نے پچیس ۲۵ روپے کا اضافہ کرکے آپ کی تنخواہ دو سو پچھتر روپے (-/۲۷۵) کردی۔ آپ نے فرمایا:۔

مدرسہ کی آمدنی کم ہو رہی ہے اس لئے میں اضافہ نہیں لوں گا چنانچہ آپ اپنی وفات تک پچیس ۲۵ روپے ماہوار مدرسہ کو واپس کرتے رہے۔

اس زمانے میں آپ کی شہرت بین الاقوامی ہوگئی تھی اور آپ کو بڑی سے بڑی ملازمت اور بڑے سے بڑا اعزاز مل سکتا تھا مگر آپ نے مدرسہ امینیہ کے لئے زندگی وقف کر رکھی تھی اس لئے آپ نے کسی پیش کش کو قبول نہیں کیا۔

جس زمانے میں آپ کی تنخواہ چالیس ۴۰ روپے سے زیادہ نہ تھی اس وقت مدرسہ عالیہ کلکتہ سے آپ کو مبلغ پانچ سو روپے ماہوار پر تدریس کے لئے بلایا گیا۔ مگر آپ نے وہ پیش کش مسترد کردی۔ آپ نے فرمایا:۔

"وہاں ضمیر کی آزادی میسّر نہیں ہوگی اور یہ بات دین کی خدمت میں رکاوٹ بنے گی"

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی تحریک سے نظام دکن نے آپ کا کچھ منصب اور وظیفہ مقرر کیا تھا آپ نے اس کا اجراء نہیں کرایا۔ اس سے بھی آپ کے نزدیک یہی مصلحت تھی کہ یہ چیز آپ کے ضمیر اور حق گوئی اور بے باکی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

دیگر تعلیمی اور قومی خدمات آپ اکثر قومی، علمی اور مذہبی مجالس میں مشورے کے لئے بلائے جاتے تھے اور کئی علمی اداروں کے ممتحن بھی تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور اکثر و بیشتر مجالس شوریٰ کی صدارت آپ ہی کے لئے مخصوص رہتی تھی۔

آپ مسجد فتحپوری کی مجلس منتظمہ کے رکن تحریک خلافت کے دور میں بنائے گئے تھے۔ آپ کی شرکت سے مسجد کا انتظام بہتر ہوگیا۔ آپ کے دور میں مسجد سے ملحقہ دکانوں کی تعمیر ہوئی نیز جیون بخش ہال بنا اور فتح پوری مسلم ہائی سکول آپ ہی کے دور میں قائم ہوا۔

مدرسہ فتحپوری مدرسہ عالیہ فتح پوری مفتی صاحب کے اہتمام سے قبل ایک معمولی حیثیت کا مدرسہ تھا۔ اس کے مصارف پانچ صد ۵۰۰ روپے سے زائد نہ تھے، مگر جب حضرت مفتی صاحب اس کے مہتمم بنے تو آپ نے اس کی بھی مالی

ن قدر بلند کیا کہ مولوی فاضل کے امتحان میں اسی مدرسہ عالیہ کے طلبہ ہر سال اوّل درجے پر کامیاب ہوتے تھے اور پنجاب یونیورسٹی سے وظیفہ اور تمغہ حاصل کرتے تھے۔ آپ کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی علوم کی کلاسیں یعنی مولوی فاضل منشی فاضل اور ادیب فاضل کی جماعتیں اس مدرسہ میں جاری ہوئیں۔ اس طرح یہ دہلی کا بہت بڑا اورنٹیل کالج بن گیا۔ ان جماعتوں کی تعلیم و تدریس کے لئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی (حال صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، مولوی محبوب ن صاحب اور مولانا قاضی سجاد حسین صاحب جیسے اہلِ علم حضرات کا انتخاب کیا۔ اس طرح مدرسہ امینیہ کے دوش بدوش مدرسہ عالیہ فتحپوری نے بھی زبردست تعلیمی خدمات سرانجام دیں اور اس کے تعلیمی مصارف دو ہزار روپے ماہانہ تک ہو گئے۔

فتوےٰ نویسی یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب نے شاہ جہاں پور کے زمانے ہی سے فتویٰ نویسی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی جب آپ مدرسہ امینیہ میں آئے تو وہاں آتے ہی یہ کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ کی فتویٰ نویسی کی وجہ سے یہ مدرسہ تمام دہلی میں بہت جلد مشہور ہو گیا۔ چنانچہ بقول مفتی صاحب مولانا ابو محمد عبد الحق مؤلف تفسیر حقانی نے اس مدرسہ کے سالانہ جلسے میں مجمع کثیر کے روبرو فرمایا:۔

"میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ مدرسہ، مدارسِ دہلی میں تعلیمی حالت اور طلبہ کی تہذیب و متانت، مدرسین کی لیاقت اور مہتمم مدرسہ کی دیانت کے اعتبار سے اعلیٰ پیمانے پر ہے۔ دہلی میں فقط یہی ایک مدرسہ ہے جس میں فتویٰ نویسی کی اعلیٰ مہتم بالشان اسلامی خدمت انجام دی جاتی ہے۔"[1]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً پچاس سال کے عرصے میں آپ نے لاکھوں فتووں کے جوابات دیئے۔ اس طرح آپ کے فتاویٰ عظیم الشان ذخیرہ، جزئیات فقہ اسلامی کا لازوال خزانہ ہے جو اگر مرتب ہو جائے تو اسلامی فقہ و فتاویٰ میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کے فرزند ارجمند مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی مختلف اربابِ علم کی مدد سے ان کی ترتیب و تبویب کر رہے ہیں اور اس کی پہلی جلد شائع ہونے والی ہے تاہم یہ کام مخیر حضرات کی وسیع مالی اعانت یا کسی بڑے ناشر کا طلب گار ہے اور مناسب سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اشاعت کی رفتار سست ہو رہی ہے۔

فتویٰ نویسی کے لئے آپ ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے۔ بالعموم فتویٰ نویسی کا وقت مدرسہ امینیہ میں تدریس کے بعد ہوتا تھا اور دوپہر کا کھانا کھانے سے پہلے آپ ضروری فتووں کے جوابات تحریر فرما دیا کرتے تھے۔ تاہم اگر کوئی شخص مقررہ وقت کے علاوہ آپ کے گھر فتویٰ کا جواب حاصل کرنے کے لئے پہنچتا تھا تو آپ فوراً اس کا کام پورا کر دیتے تھے۔ اس کام کے لئے آپ کھانا چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی راستے میں مل جاتا تو وہیں قریب میں بیٹھ کر فتوے کا جواب تحریر کر دیا کرتے تھے۔

آپ کی فتویٰ نویسی پر آپ کے اساتذہ بھی اعتماد کرتے تھے۔ چنانچہ جب انگریزوں سے ترک موالات کے زمانے میں لوگوں نے حضرت شیخ الہندؒ سے فتویٰ طلب کیا تو آپ نے اس مسئلہ پر فتویٰ دینے کے لئے جن تین حضرات کے نام تجویز کئے تھے ان میں حضرت مفتی کفایت اللہ کا نام سرفہرست تھا۔

حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ نہایت مختصر مگر مدلّل جواب سائل کی منشا کے مطابق دیتے

---

[1] حاشیہ قصیدہ روض الریاحین و روداد مدرسہ امینیہ بابت ۲۵-۱۳۲۶ھ۔

تھے ۔ مطلب یہ کہ جو سوال پوچھا جاتا تھا اس کا جواب "ٹو دی پوائنٹ" (TO THE POINT) ہوتا تھا ۔ اس کی عبا
عام مفتیوں کی طرح زیادہ پیچیدہ اور طویل نہیں ہوتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا فتویٰ نویسی کا انداز نہ صرف عوام میں مقبول
سرکاری عدالتیں بھی اسے بہت پسند کرتی تھیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی اور نکاح طلاق کے معاملات میں حضرت مفتی صاح
فتووں کو ترجیح دیتی تھیں ۔ ذیل میں آپ کے فتووں کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔

بلیک مارکیٹ

ایک دفعہ بلیک مارکیٹ کے بارے میں یہ استفتاء آیا :۔

"بلیک مارکیٹ کے متعلق شرع کیا کہتی ہے ۔ یعنی بلیک کرنا جائز ہے یا ناجائز ؟ اور یہ کسی حالت میں بھی جائز ہے یا نہیں ؟ مثلاً آج کل کپڑے اور آٹے پر راشن ہے تو اس کی بلیک کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ مفصل تحریر فرمائیں ۔

آپ نے اس کا سلیس اور مختصر یہ جواب تحریر فرمایا :۔

"بلیک مارکیٹ کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس میں مخلوق کے ساتھ ناانصافی اور بے رحمی ہے اور جھوٹ بولنے کا بھی قوی امکان ہے ۔"

اللہ محمدؐ کے سپرد

ایک بات یہ دریافت کی گئی :۔

" بہت سے لوگ کسی چیز کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے یہ کلمے کہتے ہیں "اللہ محمد کے سپرد" مثلاً کوئی خطرہ کی جگہ جاتا ہے تو اس کے عزیز و اقارب کہتے ہیں "اللہ محمد کے سپرد" یہ کلمات کہنے درست ہیں ؟ (ایسے موقع پر) کیا کہنا چاہیے ؟"

الجواب : "اللہ محمد کے سپرد" یہ الفاظ نہ کہنے چاہئیں ۔ صرف "اللہ کے سپرد" کہنا ٹھیک ہے ۔

فوٹو کھینچنا

فوٹو کھینچنے کے متعلق حضرت مفتی صاحب سے فتویٰ اس طرح دریافت کیا گیا :۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے متعلق کہ فوٹو کھینچنا اور کھینچوانا شرعی نقطہ نظر سے کیوں حرام ہے جب کہ زید یہ کہتا ہے کہ متحرک کو ہم ساکن کر دیتے ہیں یعنی شیشے میں دیکھنے سے جو ہماری صورت نظر آتی ہے اُسے ہم مستقل کر دیتے ہیں تو وہ فوٹو کہلاتا ہے ۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیوں حرام ہے ؟ اس سے ایک یادگا بھی قائم رہتی ہے ۔

الجواب : "تصویر بنانا اور اس کو استعمال کرنا شریعت مقدسہ نے ناجائز قرار دیا ہے ۔ فوٹو لینا بھی تصویر بنانے کا ایک طریقہ ہے ۔ پس وہ ناجائز ہے جب کہ اس سے جان دار کی تصویر بنائی جائے ۔ ہاں مکانات اور غیر ذی روح مناظ کا فوٹو لینا جائز ہے جیسا کہ ان کی ہاتھ سے تصویریں بنانی جائز ہیں ۔ شریعت مقدسہ نے جان داروں کی تصویر بنانا اور فوٹو لینا ایک مصلحت سے حرام فرمایا ہے کہ غیر اللہ کی تعظیم اور توقیر کا شائبہ بھی مسلمانوں میں نہ رہے ۔"

ان دو تین مثالوں سے واضح ہوگا کہ مفتی صاحب فتویٰ دیتے وقت کوئی لمبی چوڑی اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ آسان سے آسان الفاظ میں شریعت کا حکم واضح فرما دیتے تھے اور یہی ان کا کمال تھا ۔

نیف وتالیف — حضرت مفتی صاحب کو ابتداء عمر ہی سے لکھنے پڑھنے کے کام سے دلچسپی رہی ہے۔ جب وہ دیوبند سے فارغ ہو کر شاہجہان پور واپس آئے اور وہاں مدرس ہو گئے تو اس زمانے میں آپ نے قادیانیت کی یہ میں ایک رسالہ "البرہان" نکالا تھا اس میں قادیانیت کی تردید میں جو مضامین آپ نے شائع کئے تھے وہ آپ کی تحریر تالیف کی کڑی ہے۔ اگر اس کے پرانے فائل مل جائیں تو اس سے قادیانیت کی تردید میں آپ کے مضامین کے مجموعہ کو کتابی صورت شائع کیا جا سکتا ہے جو آپ کی پہلی علمی و مذہبی یادگار ثابت ہوں گے۔

ں الریاحین — آپ کا مشہور قصیدہ (عربی) روض الریاحین آپ کی ابتدائی تصانیف کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے یہ قصیدہ ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں مطبع افضل المطابع دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ اس سے ۱۳۲۶ھ میں یعنی ایک سال پہلے یہ عربی قصیدہ مدرسہ امینیہ کے سالانہ جلسے میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اس عربی قصیدہ میں حضرت صاحب نے قدیم مذہبی مدارس اور علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے مشاہیر اساتذہ دیوبند کے علمی اور مذہبی کارناموں کا خصوصی طور پر ت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ قصیدہ اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے اس قدر پسند کیا گیا کہ حاضرین جلسہ درسہ امینیہ کے سرپرستوں نے یہ فرمائش کی کہ اسے اردو ترجمہ اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے۔ نیز ان حواشی میں ان ذہ دیوبند کے مختصر حالات بھی بیان کئے جائیں جن کے اسماء گرامی کا تذکرہ قصیدہ میں آیا ہے۔

لہٰذا حضرت مفتی صاحب نے خود ان اشعار کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ کیا اور حواشی بھی خود اپنے قلم سے تحریر فرمائے۔ لے بعض مشکل الفاظ کی وضاحت بھی حواشی میں بزبان عربی کی ہے۔ آپ نے علماء دیوبند کے حالات اردو میں تحریر فرمائے ہیں مختصر ہونے کے باوجود جامع ہیں۔

یہ رسالہ شائع ہوتے ہی نایاب ہو گیا تھا۔ مجھے بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس کا علم تک بھی نہ تھا اور نہ بعد میں یہ میری ے گذرا۔ خوش قسمتی سے حضرت مفتی صاحب کے فرزند اکبر مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف نے اس مضمون کی تیاری کے سلسلے درسہ امینیہ کی گذشتہ پرانی رودادوں کے ساتھ اسے بھی ارسال فرمایا۔ جب میں نے اُسے مطالعہ کیا تو اصل عربی قصیدہ کے علاوہ کا فصاحت و بلاغت میں کوئی جواب نہ تھا اس کے حواشی بھی اردو کی نادر تحریر اور علمائے دیوبند کے بارے میں نادر معلومات خیرہ نظر آئے۔ لہٰذا میں نے برائے افادۂ خاص و عام ان اردو حواشی کو مربوط متن بنا کر انہیں ماہ نامہ "بینات" کراچی کے شمارہ قعدہ ۱۳۸۶ھ و شمارہ ذوالحجہ مطابق مارچ و اپریل ۱۹۶۷ء میں دو قسطوں میں شائع کرایا۔ مزید توضیح اور افادہ کے لئے اس ان کے حواشی میں متعلقہ حضرات سے متعلق عربی اشعار کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ان حواشی کو ایک مربوط شکل دینے کے لئے ذیلی انات خود میں نے قائم کئے اور ارتباط قائم رکھنے اور مناسب وضاحت کے لئے قوسین میں کہیں کہیں کچھ الفاظ بھی میں نے بڑھائے تھے اصل عبارت خود مفتی صاحب کی تحریر کردہ ہے۔

سوی اور المصفّٰی کی اشاعت — حضرت مفتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شرح المسوی کو جو موطا امام مالک کی شرح ہے شائع کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اس عظیم الشان کارنامے ان کی فارسی شرح المصفّٰی کے حاشیہ پر صحت و اہتمام کیساتھ ۱۳۴۷ھ میں شائع کرایا۔ اس طرح قارئین بیک نظر حضرت شاہ ولی اللہ

کی دونوں شرحوں عربی اور فارسی سے استفادہ کرسکتے تھے۔

تعلیم الاسلام آپ کی سب سے مشہور تصنیف "تعلیم الاسلام" ہے جو آپ نے بچوں کے لئے نہایت سلیس اور آسان میں بطور سوال وجواب چار حصوں میں تحریر کی تھی۔ یہ نہایت ضروری اسلامی عقائد پر مشتمل ہے۔ یہ مقبول ہوئی اور برصغیر پاک وہند میں اسلامی مدارس میں بچوں کے لئے داخل نصاب ہوئی۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ناشروں نے اسے ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا اور ابھی تک ہر کوئی ناشر اس کے نئے نئے ایڈیشن شائع کر رہا ہے۔ چونکہ آپ اس کے حقوق قانونی طور پر اپنی ذات یا اپنی اولاد کے لئے محفوظ نہیں کئے تھے اس لئے بلا مبالغہ اس کے لاکھوں نسخے شائع ہیں کہ اگر اس کی رائلٹی حضرت مفتی صاحب یا ان کی اولاد لیتی تو اب تک کم از کم پچاس ساٹھ ہزار روپیہ حاصل ہوتا۔ اس کا پشتو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

دیگر متفرق رسائل آپ نے ان کے علاوہ متفرق مذہبی رسائل بھی تحریر کئے تھے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ نایاب ہیں۔ آپ نے اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کے حالات پر ایک رسالہ جمعیۃ علماء ہند کے پہلے ۱۹۱۸ء میں تحریر کیا تھا اور اسی طرح ایک رسالہ بعنوان "مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت" لکھا جو "دی پرنٹنگ ورکس دہلی" میں چھپا تھا اور اس رسالہ میں آپ نے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا تھا کہ "پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی۔"

تصنیفات کی کمی حضرت مفتی صاحب جیسا کہ قارئین کو معلوم ہو چکا ہے بہت بڑے مفتی، متبحر عالم اور قادر الکلام تھے لیکن ان کی تالیفات وتصنیفات بہت کم ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ کی تدریسی، سیاسی اور فتویٰ نویسی کی مصروفیات اور پھر دہلی جیسے شہر میں مختلف اداروں کی سرپرستی اور رکنیت کی وجہ سے آپ اس قدر مشاغل میں گھرے رہتے تھے کہ تصنیف وتالیف کے لئے وقت نکالنا بہت مشکل بلکہ محال تھا۔ اگر آپ کو فرصت کے اوقات ملتے تو اس دور کے بہت بڑے مصنف ہوتے۔ تاہم اگر آپ کے فتاویٰ شائع کر دیئے جائیں تو ان کی پندرہ بیس بڑی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں جو ایسا مواد ہوگا کہ اس کے سامنے ہزاروں کتابیں ہیچ ہوں۔

خطبات ومکتوبات آپ کے خطبات ومکتوبات کا بہت بڑا ذخیرہ منتشر ہے۔ اگر ان سب کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو یہ بہت وسیع معلومات کا مجموعہ بن سکتا ہے۔

اشعار وقصائد حضرت مفتی صاحب عربی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کا قصیدہ "روض الریاحین" جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں آپ کی قادر الکلامی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک رسالہ القاسم شائع ہوتا تھا۔ اس کے دور اوّل میں حضرت مفتی صاحب کافی عربی قصائد شائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مدرسہ امینیہ دہلی کی روداد میں آپ کے عربی قصائد شائع ہوتے ہیں۔ آپ نے ملتان جیل میں وہاں کے ایک افسر میجر فضل الدین صاحب کے نام پر جو عربی قصیدہ تحریر فرمایا تھا وہ بھی نہایت فصیح وبلیغ اور موثر قصیدہ ہے۔ نیز آپ نے اپنے رسالہ "شیخ الہندؒ" مطبوعہ ۱۹۱۸ء میں حضرت شیخ الہند کے مالٹا میں قید ہونے پر جو عربی قصیدہ تحریر کیا تھا وہ بھی نہایت عمدہ اور موثر ہے۔ حکیم اجمل خان کی وفات پر بھی آپ نے عربی قصیدہ تحریر کیا تھا۔ آپ کے عربی قصائد متفرق طور پر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان سب کو جمع کر کے کتابی صورت

بن شائع کرنے کی ضرورت ہے ۔

اردو اشعار آپ نے اُردو میں بھی اشعار کہے ہیں مگر عالمانہ وقار کی وجہ سے خود پڑھ کر نہیں سُناتے تھے ۔ چنانچہ جب آپ ملتان جیل میں تھے تو وہاں کے سیاسی قیدیوں میں شعراء کا اچھا خاصہ مجمع ہو گیا تھا اور جیل ہی میں ہفتہ وار مشاعرے منعقد ہونے لگے تھے ۔ ان میں آپ خود شریک نہیں ہوتے تھے تاہم ان مشاعروں کے لئے آپ کچھ اشعار لکھ لیتے تھے جنہیں مولانا احمد سعید پڑھ کر سُناتے تھے ۔

وفات آخری زمانے میں آپ معاشرہ کی روز افزوں بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور ہندو مسلم فسادات اور اس طرح کے دوسرے حالات سے بیزار ہو کر سیاسیات سے بالکل الگ ہو گئے تھے اور تقریباً دس سال تک آپ بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے اور کسی جلسے میں شریک نہیں ہوتے تھے ۔ ملک کے تباہ کن حالات آپ کے جگر کا ناسُور بن گئے تھے اور آپ کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی تھی جو آخر کار جان لیوا ثابت ہوئی ۔

جب مجھے کراچی میں آپ کی خطرناک بیماری کی اطلاع ملی تو میں نے اپنے ہم جماعت رفیق اور حضرت کے فرزند اکبر ــــ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کو ایک خط لکھا جس میں حضرت مفتی صاحب کی خیریت دریافت کی گئی ۔ اس خط کے جواب میں انہوں نے مجھے یہ خط بھیجا ۔

محبّ محترم ! وعلیکم السّلام ۔ بجواب گرامی نامہ ۲۴ ر نومبر ۱۹۵۲ء گذارش ہے کہ والد صاحب تین ماہ سے علیل ہیں ورمِ جگر کی شکایت ہے باوجود بہتر سے بہتر علاج اور کافی توجہ اور غور و پرداخت کے مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہے ۔ غذا بھی ہضم نہیں ہوتی ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے اور دیگر احباب متوسلین سے درخواست کیجئے ۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا ۔ والسّلام

آپ کا ــــ حفیظ الرحمٰن ۳/۱۲/۵۲

خط کے تھوڑے عرصہ کے بعد حضرت مفتی صاحب کی وفات کی خبر پاکستان پہنچی اور ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت مفتی صاحب ، بتاریخ ۲۱ ر دسمبر مطابق ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ بوقت ½۱۰ بجے شب عازم ملک بقاء ہو گئے ۔ دوسرے دن دہلی کے لاکھ مسلمانوں نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی اور آپ کا جنازہ مہرولی لے جایا گیا ۔ آپ کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے احاطہ کے قریب دفن کیا گیا ۔

اخلاق حمیدہ آپ کے اخلاقِ حمیدہ کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے ۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ایک سچے اور مخلص عالم کا نمونہ تھے ۔ آپ نہایت باوقار اور سنجیدہ طبیعت کے انسان تھے مگر اس کے ساتھ احباب اور عوام کے لئے خوش اخلاق مرنجاں مرنج تھے ۔ سنّتِ رسول پر عامل تھے اور اپنا کام خود اپنے آپ کیا کرتے تھے ۔ آپ حاجت مندوں کا کام سرانجام دینے کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے ۔ بچپن ہی سے آپ کی خود داری اور غیرت مندی کا یہ حال تھا کہ آپ نے تنگدستی کے باوجود کسی سے کوئی مدد نہیں لی اور بچپن ہی سے خود کما کر اور ٹوپیاں کاڑھ کر اور اُنہیں سی کر اپنی روزی کماتے رہے ۔ مراد آباد اور دیوبند کے تعلیمی زمانے میں آپ اسی کام سے روزی کما کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتے تھے ۔ اس کے بعد بھی جب آپ مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس اور مہتمم تھے ، تو شروع میں نہایت ہی قلیل تنخواہ پر گذارہ کیا اور ضمیر فروشی کر کے کسی بڑے عہدہ کو قبول نہیں کیا ۔ آپ کے اخلاق حمیدہ کے اعلیٰ نمونہ اُن

حضرات نے مفصل طور پر بیان کئے ہیں جو سفرِ حج اور سفرِ مصر میں آپ کے ساتھ تھے یا جو گجرات جیل اور ملتان جیل میں آپ کے ساتھ تھے۔ جو لوگ سفرِ حج میں آپ کے ساتھ تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ سفرِ حج میں اپنے ہم سفر حاجیوں کی بے حد خدمت کرتے تھے ان کے کپڑے دھو کر دھوپ میں پھیلاتے تھے اور خشک ہونے کے بعد اُنہیں تہہ کر کے اپنے ساتھیوں کو پہنچاتے تھے۔ حج کے موقع پر آپ پوشیدہ طور پر تہجد کی نماز پڑھتے تھے اور خاموشی کے ساتھ عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ آپ رات کو پوشیدہ طور پر اور مدینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم کرتے تھے۔ آپ نہایت سادہ طبیعت کے تھے۔ اپنے گھر کا سودا بلکہ پڑوسیوں کا سودا بھی بازار جا کر لایا کرتے تھے۔ آپ کی زنبیل سامان سے بوجھل ہو جاتی تھی تاہم آپ اُسے اُٹھا کر خود پڑوسیوں کے گھر سامان پہنچاتے تھے اپنا کھانا خود پکایا کرتے تھے اور اپنے کپڑے خود سی لیتے تھے بلکہ جب آپ جیل میں تھے تو اپنے ساتھی قیدیوں کے کپڑے بھی سیتے تھے۔

مفتیٔ اعظمؒ واقعات کے آئینہ میں

پیغامِ تعزیت

از مسٹر شعیب قریشی　(اخبار الجمعیۃ شمارہ ۴ جلد ۲۸ مورخہ ۴ جنوری ۱۹۵۳ء)

ہندوستان میں مقیم پاکستانی ہائی کمشنر مسٹر شعیب قریشی نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی وفات کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔ مسٹر قریشی کا پورا بیان حسبِ ذیل ہے۔

حضرت مولانا الحاج مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی غم انگیز خبر سُن کر مجھے انتہائی رنج و الم ہوا۔ میں سالہاسال سے مفتی صاحب سے واقف رہا ہوں۔ مفتی صاحب کا غم نہ صرف ہندوستان اور پاکستان میں منایا جائے گا، بلکہ تمام اسلامی دنیا میں ان کی وفات پر ماتم کیا جائے گا کیونکہ اُن کی وفات سے ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جس کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زبردست عالم فاضل مفتی تھے۔ اُن کے جاری کردہ فتووں کی ـــــ جو علم و عقل کے اعتبار سے مُستند ہوتے تھے ـــــ قدر کی جاتی تھی اور اُنہیں اٹل سمجھا جاتا تھا۔ ایک مذہبی راہنما ہونے کے علاوہ مفتی صاحب نے ہندوستان کی قومی جد و جہد اور بین الاقوامی مسلم سیاست میں نمایاں کام کیا تھا۔ ہندوستان میں اُنہوں نے تحریکِ خلافت میں ایک اہم پارٹ انجام دیا اور عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے صدر رہے۔

ہندوستان سے باہر انہوں نے عالمی مسلم کانفرنس میں شرکت کی جو مکہ معظمہ میں شاہ ابن سعود نے بلائی تھی۔ بعد میں انہوں نے قاہرہ میں فلسطین کانفرنس کی صدارت کی۔

میں مفتی صاحب کے عزیزوں کے ساتھ رنج و غم میں دل سے شریک ہوں اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ اُنہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کی رُوح کو سکون پہنچے۔

مسٹر شعیب قریشی اور اُن کے عملہ کے افسران نے مفتی صاحب کے جنازہ کی نماز میں شرکت کی۔ اسٹاف کے ممبران بھی تھے۔

یاد رہے کہ مسٹر شعیب قریشی اپنے عہدہ پر مامور ہو کر جب دہلی تشریف لائے تھے تو سب کاموں سے پہلے آپ مفتی صاحب کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

از حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
(روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۵ جنوری ۱۹۵۳ء شمارہ ۵ جلد ۳۸)

میں ان خوش قسمتوں میں سے ہوں جنہیں حضرت مفتی صاحب مرحوم کا قرب حاصل تھا۔ تحریک عدم تعاون کے زمانہ یعنی ۱۹۱۹ء ہی سے میں اُن کے قریب ہو گیا تھا اور جب ۱۹۲۶ء میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ سفر حج کا موقعہ ملا اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں اُن کے ساتھ گجرات اور ملتان کی جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا تو مجھے اُنہیں سمجھنے کا بہت اچھا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا۔ یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ مفتی صاحب نہ کسی سے خدمت لیتے ہیں اور نہ کسی کو ڈانٹتے ہیں لیکن میں ان خوش نصیبوں سے ہوں جس کو مفتی صاحب ڈانٹ بھی لیتے تھے اور خدمت بھی لیتے تھے اور میں اس میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس کرتا تھا۔ وہ در اصل مجھے اپنے بیٹے کی طرح جانتے تھے۔

جیل میں میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کس قدر بلند کردار کے مالک ہیں۔ ہم لوگوں کو وہاں اخلاقی قیدی بطور خاص ملا کرتے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ اُن کے پھٹے ہوئے کپڑے بیٹھ کر سیا کرتے تھے اور اس کے علاوہ بھی اُن کے دوسرے کام کر دیا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ جواب دیا کہ اُن سے کام لینا ظلم ہے۔ وہ میرا کام کرتے ہیں اس کا معاوضہ ادا کرتا ہوں۔ حکومت کو ان سے کام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۱۹۲۶ء کے دوران حج میں جب حضرت مفتی صاحب جمعیۃ علماء کا ایک وفد لے کر مؤتمر اسلامی میں شرکت کرنے کیلئے تشریف لے گئے تھے جو اس موقع پر سلطان ابن سعود نے طلب کی تھی۔ میں نے حضرت مفتی صاحب کی جو کیفیت دیکھی اُس کا اثر تمام عمر میرے دل پر رہے گا۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان اونٹوں کا سفر تھا۔ جب سب ساتھی تھک کر سو جاتے تو حضرت مفتی صاحب سب کے لئے کھانا تیار کرایا کرتے تھے۔ خرچ میں اگر گڑبڑ ہوتی تو اپنے پاس سے ادا کر دیتے اور جمعیۃ کے فنڈ پر بار نہ ڈالتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے واقعات ہیں جن سے ان کی بے لوث زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک مجموعۂ کمالات تھے اور مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ قلمبند کر سکوں۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان سے وابستگی رکھنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مفتی اعظم کی خصوصیات

از مولانا محمد منظور نعمانی مدیر رسالہ الفرقان لکھنؤ (بابتہ دسمبر ۵۲ء و جنوری و فروری ۵۳ء)

قارئین الفرقان اب سے بہت پہلے اخبارات میں مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ (علیہ الرحمۃ والغفران) کی خبر پڑھ چکے ہوں گے۔ اگرچہ کسی کی بھی موت اس حیثیت سے غیر معمولی حادثہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں آنے والے ہر انسان اور ہر جاندار کی آخری منزل موت ہے اور یہ ہر شخص کی جانی بوجھی بات ہے لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جن بندوں کی زندگی غیر معمولی ہوتی ہے اُن کی موت بھی اپنے اثرات کے لحاظ سے عام لوگوں کی موتوں کے مقابلے میں غیر معمولی ہی ہوتی ہے، اور دور و نزدیک والے اُس سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح کہ غیر معمولی واقعات و حوادثات سے متاثر ہوا کرتے ہیں۔ علم دین

میں حضرت مفتی صاحبؒ کی بلند مقامی اور خاص کر فقہ اور فتویٰ میں ان کی مرجعیت اور سیاسیات میں اُن کی خاص بصیرت اور فہم کو سمجھا تو یہ تو دو چیزیں ہیں جن سے کسی درجے میں وہ لوگ بھی واقف ہوں گے جن کی واقفیت کا ذریعہ اخبارات یا دوسرے وسائط ہوں گے لیکن ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے غیر معمولی کمالات سے بھی نوازا تھا جن سے صرف وہی لوگ واقف ہوں گے جنہیں نزدیک رہنے اور قریب سے دیکھنے اور برتنے کا زیادہ موقع ملا ہوگا۔ یہ عاجز حضرت مفتی صاحب کی علمی عظمت کا پوری طور پر قائل ہونے کے باوجود اُن کے دوسرے کمالات سے زیادہ متاثر رہا۔ اُن میں سے ان کے جس کمال کا نقش میرے دل پر زیادہ گہرا ہے وہ ان کی بے انتہا تواضع اور بے نفسی ہے۔ اس بارے میں اس عاجز کا جو تاثر اور احساس ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ نے ان کو جتنی بلندیاں عطا فرمائی تھیں وہ اتنے ہی متواضع اور بے نفس تھے۔ ان سے ملنے والے اُن کے کسی نیاز مند نے بھی کبھی محسوس نہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے کو کچھ بھی سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات اپنے بہت چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے اور ایسا معاملہ کرتے کہ اُنہیں شرم آتی۔ اس عاجز نے اس مقام کی کسی شخصیت میں کبھی اس درجہ کا تواضع نہیں دیکھا۔

دوسری جس خصوصیت سے یہ عاجز بہت متاثر ہوا وہ یہ ہے کہ سفر و حضر کی سینکڑوں صحبتوں میں میں نے کبھی ان کی زبان سے نجی گفتگو میں اور نہ مجلسی بحثوں میں اور گفتگوؤں میں کسی بڑے سے بڑے اپنے مخالف کے متعلق بھی کوئی سخت لفظ کبھی نہیں سنا اسی طرح کبھی غیبت کا کوئی کلمہ یاد نہیں۔

تیسری خاص بات جس سے یہ عاجز بہت متاثر ہے یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آیا ہے کہ کان یَخْدِمُ نَفْسَہٗ (آپ خود ہی اپنے خادم تھے، اپنے گھر اور اپنی ذات کے معمولی معمولی کام خود کر لیا کرتے تھے) حضرت مفتی صاحبؒ اس اسوۂ نبوی کے خاص نمونہ تھے۔ اس بلند مقامی کے باوجود اپنے گھر کے اور بچوں کے ایسے معمولی اور حقیر کام خود کیا کرتے تھے جن کے کرنے میں ایک معمولی آدمی بھی اپنی توہین سمجھے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عاجز حضرت مفتی صاحبؒ کی ان سیرتی خصوصیات سے اتنا متاثر ہے کہ اگر ان کے ہاتھ پر چلتی کرامتیں دیکھتا تو غالباً اس سے زیادہ متاثر نہ ہوتا۔

حضرت مفتی صاحب اُن اکابرِ دین میں سے تھے جن کی علمی عظمت و عقیدت اور اُن کے علم پر اعتماد کی وجہ سے بہت سے لوگ غلطیوں اور فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں اس لحاظ سے آپ کی وفات اس دورِ فتن میں ایک بڑا دینی سانحہ ہے۔

سچی باتیں

از مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی —— (صدقِ جدید ۲۴ جنوری ۱۹۵۲ء)

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم الدہلوی نور اللہ مرقدہ کی وفات کو کئی ہفتے ہو چکے اور ملک کا گوشہ گوشہ اب تک اُن کے ماتم و شیون سے گونجا ہوا ہے۔ خود پاکستان تک سیاسی اختلاف کے باوجود تعزیت میں پیچھے نہیں۔ زندگی بھر معزز و مکرم و محترم رہے۔ سالہا سال جمعیۃ علماء کے صدر، ایک بڑی دینی درسگاہ کے روح رواں اور مجلسِ خلافت کے اہم رکن و کارکن، لیکن آپ کو علم ہے کہ اتنے بڑے مقتدا، جید عالم اور شیخِ وقت کیا تھے؟ نہ سید نہ شیخ، نہ حسنی نہ حسینی، نہ صدیقی نہ فاروقی نہ علوی نہ عثمانی، باوجود اس کے آپ نے دیکھا کہ بڑے بڑے عالی نسب شیخ اور سید اُن کے علم و فضل، تقویٰ اور تدین کے آگے جھکتے رہے۔ بڑے سے بڑے علماء اور مشائخ اُن کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ ان کے دینی فتوے سب پر چلتے رہے۔ مخالفوں اور دشمنوں

میں بھی کبھی کسی کو انگشت نمائی کرنے بلکہ ادھر اشارہ کرنے کی بھی جرأت نہ پڑی۔ یہ فیض اگر اسلام اور شارع اسلام کا نہ تھا تو اور کس کا تھا؟ اس بیسویں صدی کے گئے گذرے ہوئے اسلام کا بھی!

امتیازات نسب را پاک سوخت — آتش او ایں خس و خاشاک سوخت

بر نسب نازاں شدن نادانی است — حکم او اندر تن و تن فانی است

اور خود اقبال جنہوں نے یہ ترانہ گایا ہے وہی کونسے سید زادے یا شیخ زادے تھے؟ اور اسلام کی ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں یہ مثالیں نئی اور انوکھی کب ہیں؟

بشکریہ ــــ حکیم عبدالقوی صاحب منیجر "صدق جدید"

جنازہ کا منظر

(ماخوذ از اخبار "نئی دنیا" وغیرہ مورخہ ۲، ۳ر جنوری ۱۹۵۲ء)

یکم جنوری ۱۹۵۳ء۔ ستر کروڑ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا حضرت مفتی اعظم کی وفات کی خبر رات کو جونہی شہر میں پھیلی، ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ شہر کے تمام مسلم علاقوں میں کاروبار بند ہو گئے اور ہر قسم کی دکانیں مفتی صاحب کے غم میں آج بند ہیں یہاں تک کہ کھانے پینے کی دکانیں بھی بند ہیں۔ شہر میں بعض جگہ ماتمی سیاہ جھنڈیاں بھی اظہار غم کے طور پر لگا دی گئی ہیں۔ ہر طرف سناٹا ہے اور اداسی چھائی ہوئی ہے۔ آج مذبح بھی بند ہے۔

نماز فجر کے بعد ہی مفتی صاحب کے مکان کے باہر لوگوں کا ہجوم ہو گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک طرف بازار چتلی قبر تک، اور دوسری طرف دریا گنج تک سڑکیں بھر گئیں تھیں۔ مجمع کی طرف سے آخری دیدار کی خواہش کی جا رہی تھی۔ زنانہ مکان خواتین سے بھر گیا تھا اور اس طرف کی گلی میں بھی خواتین کا ہجوم تھا۔ غرضیکہ ۷ بجے زیارت شروع ہوئی۔ چہرہ مبارک سے کفن ہٹا دیا گیا۔ مردانہ مکان کے چھوٹے سے صحن میں جنازہ رکھا تھا۔ لوگ ایک قطار کی صورت میں آ رہے تھے۔ یہ قطار بازار چتلی قبر سے مکان تک مسلسل رواں تھی۔ زیارت کے وقت منتظمین کی ہدایت تھی کہ کوئی صاحب ٹھہر کر زیارت نہ کریں۔ برابر چلتے رہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس لائن کو روک دیا جاتا تھا اور خواتین کو اسی طریقے سے زیارت کا موقع دیا جاتا تھا۔ یہ دیکھا جا رہا تھا کہ لائن میں زیادہ آدمیوں کے آنسو رواں تھے۔ غرضیکہ ایک عجیب سکون و وقار اور محیر العقول نظم و ضبط کے ساتھ یہ لائن ۱۲ بجے تک چلتی رہی۔ اس کے بعد میت کو زینہ پر سے اتارا گیا اور گلی میں لا کر مسہری پر رکھا گیا۔ تقریباً سوا بارہ بجے جنازہ اٹھا اس وقت ایک عجیب رقت انگیز منظر تھا۔ کوچہ چیلاں سے جامع مسجد تک سڑکیں اور گلیاں ہزاروں روتے ہوئے انسانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کچھ تو بڑے زور زور سے رو رہے تھے، اور بعض کے چہرے نہایت غمگین اور اداس تھے۔ عورتیں مکانوں کی چھتوں پر رو رہی تھیں۔ مرحوم کے مکان سے جامع مسجد تک آدمی ہی آدمی تھے۔ لوگ غم و یاس کے عالم میں اپنے مذہبی پیشوا کے آخری دیدار کے منتظر کھڑے تھے۔

جنازے کو جن چار حضرات نے پہلے اٹھایا ان میں آگے مفتی اعظم کے خلف اکبر مولوی حفیظ الرحمٰن واصف اور حکیم شریف الدین صاحب بقائی تھے۔ جب جنازہ چلا تو بارش شروع ہو گئی۔ تقریباً سوا بجے جنازہ پریڈ گراؤنڈ (میدان درمیان لال قلعہ و جامع مسجد) پہونچا۔ باوجود سخت سردی اور بارش کے لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جنازہ کی مسہری میں لمبے لمبے بانس باندھ دیئے گئے تھے پھر بھی ہزاروں آدمی کندھا نہیں دے سکے۔ جنازے کے ہم[illegible] میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر فرقے کے لیڈر اور عوام شریک

تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نماز جنازہ پڑھائیں گے مگر وہ وقت پر دہلی نہ پہنچ سکے۔ شب گذشتہ کو دہلی کی مشہور درگاہ صابریہ کے سجادہ نشین شیخ طریقت پیرجی کرار حسین صاحب کی بھی وفات ہو گئی تھی۔ اُن کا جنازہ بھی یہیں پہنچ چکا تھا اور مفتی اعظم کے برابر ہی رکھا ہوا تھا۔ ایک سالک طریقت کا اور ایک عالم شریعت کا۔ دونوں جنازوں کی نماز ہوئی جو حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے پڑھائی۔ جنازہ کے بالکل قریب اگلی صف میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور ان کے فرسٹ سکرٹری مسٹر عبدالرحمٰن اور اسٹاف کے کچھ اور لوگ کھڑے تھے۔ نماز جنازہ ایک لاکھ آدمیوں نے پڑھی۔ اس کے بعد وقت جنازہ چلا تو دہلی دروازہ تک ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے۔

جنازہ کا فقیدالمثال منظر قابلِ دید تھا۔ ہر شخص اس ہستی کی عظیم الشان موت پر رشک کر رہا تھا۔ جس کی عقیدت میں لوگ جوق در جوق دہلی اور بیرونِ دہلی سے چلے آرہے تھے۔ پریڈ گراؤنڈ سے دہلی دروازہ تک کی وسیع سڑکیں انسانوں کا ایک سمندر ہو رہی تھیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف ہندو، مسلمان، سکھ عورتیں اور بچے کھڑے تھے اور جامع مسجد کی سیڑھیوں اور مشرقی دروازہ اور دو طرفہ دالانوں میں ہزاروں مسلم خواتین اپنے مرحوم پیشوا کے جنازے کے آخری دیدار کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ اتنے عظیم الشان ہجوم کا کنٹرول قدرت ہی کر رہی تھی، نہ فوج کی ضرورت پیش آئی اور نہ پولیس کی۔

دہلی دروازہ کے باہر پہنچ کر جنازہ ایک بڑی سی ایمبولنس کار میں رکھا گیا اور مہرولی کی طرف چلا۔ گورنمنٹ کی طرف سے فری بسوں کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ لوگ اپنے پیسے خرچ کر کے بسوں، کاروں اور تانگوں میں مہرولی جا رہے تھے (دہلی دروازہ سے مہرولی کا فاصلہ گیارہ میل ہے) ساڑھے چار بجے جنازہ مہرولی پہنچا اور ظفر محل کے پاس جا کر رکا۔ بعد نماز عصر میت کو قبر میں اُتارا گیا۔ قبر میں اُتارنے سے پہلے نماز عصر کے بعد حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی جو دیوبند سے دہلی پہنچ چکے تھے، آخری دیدار کے لئے تشریف لائے۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور مولوی حفیظ الرحمان واصف نے قبر میں اتر کر میت کو قبر میں رکھا۔ تقریباً مغرب کے وقت ہزاروں انسان اپنی اس جلیل القدر اور گراں مایہ دولت کو سپرد خاک کر کے واپس ہوئے۔

تجہیز و تکفین اور مہرولی تک کے تمام انتظامات میں شہر کے تمام محلوں کے سرکردہ حضرات نے اور خاص کر جمعیۃ علماء کے جانثار اور عقیدت مندوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے شہروں میں مفتی اعظم کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔

اب مفتی اعظم نمبر کے مضامین شروع ہوتے ہیں۔

تاثرات

از شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم۔

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد　　ولکنہ ارکان قوم تھدما

زمین ماتم ازسپہر بتاتوان گریستے　　از چشم اختراں ہمہ شب خون گریستے

حضرت مولانا المفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس

سرہٗ العزیز کے مخصوص تلامذہ سے تھے۔ اگرچہ ہزاروں علماء نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز سے علوم نقلیہ و عقلیہ کا استفادہ کیا، مگر قدرت کی فیاضیوں نے جو خاص جامعیت اور سابقیت مفتی صاحب مرحوم کو عطا فرمائی تھی، وہ بہت ہی کم نصیب ہوتی ہے۔ مفتی صاحب مرحوم ابتداء ہی سے نہایت ذکی، سمجھ دار، مستقل مزاج، عالی حوصلہ، معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ آپ کو علوم نقلیہ اور عقلیہ سے طبعی مناسبت تھی۔ تقریر و تحریر کے میدانوں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اور دوسروں کے مقابلہ میں بازی لے گئے۔ اخلاقِ فاضلہ میں خداوند عالم نے کمال عطا فرمایا تھا۔ دریائے سیاست کے بہترین شناور تھے۔ تدبر و تفکر کے انمول موتیوں سے آپ کا دامن بھرا رہتا تھا۔ ہر معاملہ کی گہرائی اور آخری تہ تک پہنچنا آپ کی عادت کا ہمیشہ شاہکار رہا ہے۔

جس طرح آپ بلند پایہ مفتی، وسیع النظر عالم، دوراندیش، زیرک، دقیقہ رس سیاست داں تھے، ایسے ہی آپ بہترین مدرس اور اُستاد بھی تھے۔ دقیق اور غامض مضامین سمجھانے کا بہترین ملکہ خداوند عالم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ علمی کمالات کے ساتھ حُسنِ خط کی دولت بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ خطاطی گویا فطری جوہر تھا۔ چنانچہ نسخ اور نستعلیق دونوں قسم کے خطوں پر آپ بے نظیر مہارت رکھتے تھے۔

تحریکِ آزادیٔ وطن اور خلافت کمیٹی کی تائید اور جمعیت علماء ہند کی راہنمائی میں آپ نے جس فراست اور استقلال کا ثبوت ۱۹۱۸ء سے لے کر وفات کے وقت تک دیا۔ ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں کی زندگی اس کی مثال سے خالی ہے۔ شہرت طلبی اور نام و نمود کی خواہش کی ہوا بھی آپ کے پاس ہو کر نہ گذری تھی۔ فروتنی اور تواضع میں آپ بالکل اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کے قدم بقدم اور آسمانِ تقویٰ کے چمکتے ہوئے ستارے تھے۔ باوجود اعلیٰ قابلیتوں کے جن کے ذریعے سے بڑی سے بڑی عزت، شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے آپ نے یکسوئی اور گمنامی کے گوشہ میں ساری زندگی گذار دی۔ بہرحال حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی وفات اور جُدائی نے ہم خدام جمعیۃ کی کمر توڑ دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

لَا یدرکُ الواصفُ المُطرِی خصائصَه وَ لَو مَا بقَا فِی کُلِّ مَا وَصَفَا

حلَفَ الزمانُ لیَأتِیَنّ بِمِثْلِهٖ حَنِثَتْ یمینُک یا زمانُ فَکَفِّرِ

فرضی اللہ وارضاہ وخلف علینا بخیر

ننگِ اسلاف ——— حسین احمد غفرلہ

تقریر باجلاس کانگریس کمیٹی ——— منعقدہ ۴؍جنوری ۵۳ء بمقام اُردو پارک دہلی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ——— وزیر تعلیم حکومت ہند

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اس مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کر ڈالتے ہیں۔ ان کی زندگی کا عظیم مقصد دین، علم اور ملک کی خدمت کرنا تھا۔ وہ ایک مستند عالم تھے اس لئے قدرتی طور پر اُن کا یہ فرض تھا کہ وہ دینی خدمات کرتے رہیں۔ چنانچہ تمام زندگی انہوں نے اس مقصد کے لئے

گزار دی۔ مفتی صاحبؒ شاہجہان پور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت بھی شاہ جہان پور میں ہی ہوئی۔ اس کے بعد دیوبند میں انہوں نے اپنی تعلیم کو تکمیل تک پہنچایا۔ دہلی آئے اور اپنی تمام زندگی علم دین کی خدمت کرنے میں گزار دی۔ مدرسہ امینیہ میں وہ درس دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان کی تنخواہ بیس پچیس روپے ماہوار تھی۔ اس وقت مدرسہ امینیہ سنہری مسجد میں تھا۔ بعد میں جب مدرسہ امینیہ کشمیری بازار منتقل ہوگیا تو وہاں درس دینے لگے۔ وہ ایک معمولی تنخواہ پر اپنا گذر کرتے رہے۔ (درحقیقت حضرت مفتی صاحب نے اُن علماء کو آنکھوں سے دیکھا تھا جو اپنی خوشی سے غریبی کی حالت میں اپنی زندگیاں بسر کیا کرتے تھے) وہ عالم دین تھے اور دین کا اشارہ تھا کہ وہ ملکی اور قومی کام بھی کریں۔ چنانچہ اس کام میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں اُس وقت سے برابر ان کی زندگی کو پرکھتا رہا۔ اُن کی ہمت، جرأت اور استقامت کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ یہ وہ طوفانی دور تھا کہ بڑی بڑی شخصیتیں اس دور میں بہہ گئیں لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے عزم، ہمت اور استقلال میں ذرا فرق نہ آیا اور ان طوفانوں کی پرچھائیں بھی ان پر نہ پڑی۔ انہوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگریس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک انہوں نے اس راستہ سے قدم نہیں ہٹایا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی رُوح ہم سے قریب ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہندوستان کی تاریخ میں اُن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اخلاق و عادات اور کچھ متفرق حکایات

آپ نہایت سادہ طبیعت، خاموشی پسند تھے۔ وقار اور متانت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے آپ کے رعب سے کانپتے، احباب و رفقاء آپ کی ہیبت سے ڈرتے تھے۔ خوش اخلاق اور مرنجاں مرنج تھے۔ اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے۔ ہنرمند ایسے تھے کہ کوئی کام آپ کے لئے مشکل نہ تھا۔ خط نہایت عمدہ اور دلفریب تھا۔ آپ کا کمال خوشنویسی بالکل وہبی اور محض عطیۂ ربانی تھا۔ خوشنویسی کی مشق آپ نے کبھی نہیں کی۔ منشی محمد دین خوش نویس کے صاحبزادے مسٹر ضیاء الدین نے اپنی کسی کتاب میں مفتی اعظم کے حالات لکھے ہیں۔ سُنا ہے کہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ مفتی اعظم خوشنویسی میں میرے والد کے شاگرد تھے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ حساب میں بڑی عمدہ مہارت تھی۔ سادہ لباس پہنتے تھے۔ شہرت و نمائش سے ہمیشہ متنفر رہے۔ عربی اور فارسی میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ اردو میں بھی کچھ تھوڑی سی شاعری کی ہے۔ عربی ادب میں اور عربی مکالمے میں فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ عرب کے علماء نے آپ کی زبان دانی کی تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان کے علماء میں ہم نے آپ کو اہلِ زبان کی طرح شستہ زبان بولتے سُنا۔

شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی مرحوم نے آپ کے متعلق فرمایا: یتبلج الحلم والوقار فی جبینه۔

عالم اسلام کے اکثر زعماء سے آپ کے تعلقات اور خط و کتابت تھی۔ مفتی اعظم فلسطین آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سید توفیق شریف مرحوم (شامی لیڈر) جب ہندوستان آتے تھے تو اکثر آپ کے دولت خانہ پر قیام کرتے تھے۔ ہندوستان کے لیڈر

آپ کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی وغیرہ کی دعوت کی۔ دستر خوان پر چنے کی دال کا بھرتہ بھی تھا۔ حکیم صاحب نے اس کو بہت پسند کیا، اور فرمایا کہ مفتی صاحب یہ دال ضرورت سے زیادہ لذیذ کیوں ہے۔ فرمایا کہ یہ میں نے اپنے ہاتھ سے پکائی چونکہ خلوص کے ساتھ پکائی ہے اس لئے لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ آہ! اب وہ خلوص والے نہ رہے، نہ خلوص کی قدر پہچاننے والے رہے۔ حکیم صاحب مرحوم اپنی مجلس اور مطلب میں کسی والئی ریاست کے واسطے کھڑے نہ ہوتے تھے لیکن جب آپ تشریف لے جاتے تو سرو قد کھڑے ہو جاتے اور دوڑ کر دروازے سے آپ کو اپنے ساتھ لاتے تھے۔

حضرت مولانا انور شاہ نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کفایت اللہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح سے بیعت تھے مگر خود کسی کو بیعت نہیں کیا۔ جب کوئی عقیدت مند بیعت کی درخواست کرتا تھا تو حضرت مولانا تھانوی رح، یا مولانا عبدالقادر رائے پوری رح یا مولانا حسین احمد مدنی رح یا مولانا محمد الیاس رحمہم اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہدایت کرتے۔

اہل حاجت اور مستفتی لوگوں کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ بسا اوقات رات کے بارہ بجے اور ایک بجے آپ سے فتوے لینے آتے تھے۔ آپ بستر استراحت سے خود اٹھ کر تشریف لاتے تھے اور پیشانی پر بل بھی نہ آتا تھا۔ آپ کے ایک شاگرد مولوی محمد فاروق کہتے ہیں کہ ایک روز مدرسہ امینیہ سے واپسی کے دوران کاٹھ کے پل پر ایک صاحب ملے اور کہنے لگے کہ حضرت مجھے ایک ضروری فتویٰ لینا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے ان سے فتویٰ لیا اور کمپنی باغ کے دروازے کے سامنے پٹرول پمپ کے پاس ایک چارپائی پر اجازت لے کر بیٹھ گئے اور فتویٰ کا جواب لکھ کر اسی وقت ان کے حوالہ کیا۔

یہ چیز آپ کی فطرت میں داخل تھی کہ آپ کسی ملاقاتی کو انتظار کی زحمت نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کا نہیں ہزاروں مرتبہ کا تجربہ ہے کہ کھانا کھانے کے دوران اگر کوئی آجاتا تھا تو آپ کھانا چھوڑ دیتے تھے اور جا کر ملاقات کرتے تھے۔ اور اگر کوئی فتویٰ لے کر آتا تھا تو فتویٰ بھی لکھ دیتے تھے۔ غرضکہ فتویٰ لکھنے کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا۔ چوبیس گھنٹے اور آرام و راحت، حتیٰ کہ پوری زندگی افتاء اور اہل حاجت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

طبیعت بے انتہا غیور تھی۔ کبھی کسی کے سامنے اپنی ضرورت یا اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔ ایک دفعہ ایک دکاندار سے کوئی چیز خریدی۔ جس کی قیمت حقیقت میں دس روپے تھی۔ اس نے کہا کہ حضرت ویسے تو میں پندرہ روپے لیتا ہوں مگر آپ سے دس روپے لوں گا۔ آپ کے پاس اس وقت صرف دس روپے تھے۔ دکاندار کو کچھ نہیں دیا۔ گھر آکر اپنے شاگرد (مولوی ضیاء الحق دہلوی) کو پندرہ ۱۵ روپے دیئے اور فرمایا کہ اگر پندرہ روپے نہ لے تو پھینک کر آجانا۔

مکان کے لئے زمین خریدی تھی مگر بنوانے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ دہلی کے ایک رئیس نے آپ سے درخواست کی کہ میں روپیہ پیش کروں گا آپ تعمیر شروع کرا دیجئے۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر انہوں نے اصرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کچھ روپیہ قرض دے دو اور پرونوٹ لکھوا لو۔ انہوں نے ضابطہ کے مطابق پرونوٹ انگریزی میں ٹائپ کرا کر پیش کر دیا۔ فرمایا کہ اس کا ترجمہ مجھے سناؤ۔ انہوں نے ترجمہ سنایا۔ آپ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس میں شرح سود بھی لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے بہت کچھ سمجھانے اور

تسلّی دلانے کی کوشش کی کہ حضرت یہ تو صرف ضابطہ کی خانہ پری ہے ورنہ ہم نے عمر بھر میں نہ کسی سے سود لیا اور نہ کسی کو سود دیا فر
کہ مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں، آپ مجھے معاف کیجئے۔ آخر انہوں نے دوسرا پرونوٹ ملا ٹائپ کرایا جب آپ نے دستخط فرمائے
قرض سے ہمیشہ بچتے تھے۔ وفات کے وقت آپ کسی کے مقروض نہ تھے۔

چند متفرق حکایات

ایک مرتبہ والیٔ چترال نے حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں ایک تار بھیجا جس میں دریافت کیا گیا
دہلی میں عید کا چاند ہوگیا یا نہیں۔ حضرت مفتی صاحب موجود نہ تھے۔ مدرسہ امینیہ میں چند چترالی طلبا
تھے۔ انہوں نے تار کا جواب دے دیا کہ چاند ہوگیا۔ اس کے مطابق صبح کو چترال میں عید کر لی گئی۔ والیٔ چترال نے حضرت کو خط لکھا
میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے ایک بہت بڑے اختلافی مسئلے کو حل فرما دیا یعنی یہ کہ اگر چاند کی اطلاع بذریعہ تار کے معتبر
ہوتی تو آپ تار کا جواب نہ دیتے۔ حضرت مفتی صاحب نے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے تار اور اُس کے جواب کی مجھے
خبر نہیں۔ کب آپ نے تار دیا اور کب میں نے اس کا جواب دیا۔ یہی بات تار کی خبر کے غیر معتبر ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

سب سے چھوٹی صاحبزادی زبیدہ خاتون تھی جو اٹھارہ سال کی عمر میں وفات پاگئی۔ اس سے آپ کو بہت محبت تھی۔ جب
وہ چار پانچ سال کی تھی، ایک مرتبہ گھر میں شلجم منگائے گئے۔ زبیدہ نے ان میں سے مٹی اور ریتہ جھاڑ کر رکھ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد والد
وہ مٹی کوڑے پر پھینک دی۔ جب بچی کو اس کا علم ہوا تو مچل گئی۔ بلک بلک کر رونے لگی۔ والدہ نے بہت بہلایا منایا، پھسلایا۔
نے بھی بہت کچھ چپکا کرنے کی کوشش کی۔ گود میں لے کر بازار سے مٹھائی دلوائی مگر کسی طرح اُس کی ضد نہ گئی۔ گملوں میں سے مٹی نکال کر
اُس کو دی گئی مگر وہ کہتی تھی کہ میں تو شلجم کی مٹی لوں گی۔ آخر آپ اس کو گود میں لے کر سبزی فروشوں کی دکانوں پر گئے اور کئی دکانوں سے
شلجم کی مٹی جمع کر کے لائے جب وہ بہت خوش ہوئی۔ گھر میں آکر فرمایا کہ ماں باپ ان پھول سے بچوں اور خاص کر بچیوں کی کس قدر
ناز برداری کرتے ہیں۔ کس محنت اور محبت سے پالتے ہیں۔ جب یہ دوسرے گھر جاتی ہیں تو وہ لوگ ان تمام محنتوں پر پانی پھیر دیتے
ہیں۔ لڑکی کے ماں باپ کے دلوں کو کس قدر صدمہ اور دکھ پہنچاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک استفتار آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جا رہی تھی۔ ایک شخص کا مکان اس کے متصل تھا۔ وہ اس کی
توسیع میں حائل ہوتا تھا۔ مالک مکان سے کہا گیا کہ اپنے مکان میں سے تھوڑا سا حصہ مسجد کو دے دو۔ اس نے مسجد کی شان میں
نامناسب الفاظ استعمال کئے۔ آیا وہ شخص کافر ہوا یا نہیں؟ مولوی محمد فاروق صاحب نے اس کا جواب لکھا کہ چونکہ مسجد شعائر اللہ
ہے اور شعائر اللہ کی توہین کفر ہے لہٰذا وہ شخص کافر ہوگیا۔ جواب دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ ابھی سے کافر سازی شروع کر دی ہے تو
بن جاؤ گے تو کیا کرو گے۔ کیا تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ جس شخص میں ننانوے باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات ایسی ہو جس سے
اس کے اندر ایمان ثابت کیا جا سکتا ہے تو اُس کو کافر نہ کہو۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ اس سوال میں تو کھلی ہوئی توہین ہے
پھر کفر کیوں نہیں ثابت ہوگا۔ فرمایا کہ پہلے اس بات کو ثابت کرو کہ وہ مسجد حقیقت میں مسجد ہی ہے۔ فرض کرو کہ وہ مسجد مغصوبہ زمین
پر بنائی گئی ہو اور اس شخص کو یہ بات معلوم ہو گئی ہو۔ اس لئے اُس نے نامناسب یا توہین آمیز الفاظ کہے ہوں۔ اس لئے آسانی سے
ایک مسلمان کے کفر کا حکم نہیں دینا چاہیئے۔

ایک دفعہ راقم الحروف (واصف) ریل کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہم رکاب تھا۔ جس ڈبے میں ہم دونوں تھے

میں دہلی کے سوداگروں میں سے دو معزز دولت مند حضرات بھی ہم سفر تھے اور ان کے قریب بھاری بھرکم قادیانی مولوی بھی بیٹھے تھے اور مرزا غلام احمد کی صداقت اور نبوت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک بڑا مولوی بڑے زور شور سے بول رہا تھا۔ بڑا لسّان اور طرار معلوم ہوتا تھا۔ حضرت والد ماجد کچھ فاصلے پر تھے اور ان لوگوں کی گفتگو سُن رہے تھے۔ قادیانیوں کے مخاطب کبھی کبھی جواب دیتے تھے مگر پھر لاجواب ہو جاتے تھے۔ آخر حضرت نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر یہاں معاملہ دین کا ہے اس لئے خاموش نہیں رہ سکتا۔

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ابھی یہ جو فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور مرزا صاحب کی نبوت سے ختمِ نبوّت میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا کیونکہ مرزا صاحب کی نبوت حضورؐ ہی کی نبوت کا ایک جزو اور ضمیمہ ہے تو یہ فرمایئے کہ نبی علیہ السلام کے اس قول لَا نَبِیَّ بَعْدِی میں تو کسی قسم کی نبوت کی تخصیص نہیں ہے۔ مطلق نبوت کی نفی ہے۔ ضمنی، غیر ضمنی، ظلی، بروزی کی تخصیص کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ لائے نفی جنس نے نبوّت کے تمام اقسام اصناف کی نفی کر دی ہے۔ پھر بیچ میں نبوت ضمنی کیسی؟ قادیانی مولوی نے جواب دیا کہ جس طرح سچّا خواب نبوّت کا چالیسواں حصّہ ہے۔ اسی طرح ضمنی نبوّت بھی ہوتی ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا دائرہ عمل قیامت تک ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لئے آپ ہی کے دین کی تجدید کے لئے نبی آ سکتا ہے اور اس سے آپ کے ختمِ نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضرت مفتی اعظم نے فرمایا کہ نبوت کا چالیسواں حصّہ اگر کسی کو عطا فرمایا جائے تو وہ شخص نبی نہیں بن جائے گا۔ انسان کی ایک اُنگلی کو انسان کا لقب نہیں دیا جا سکتا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ کے دعویٰ کے مطابق قیامت تک کے لئے نبی ہیں۔ پھر حضور کا یہ فرمانا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ بولئے جواب دیجئے۔

حضرت نے کئی مرتبہ فرمایا۔ بولئے جواب دیجئے۔ مگر ادھر ایسا سناٹا تھا کہ صدائے برنخاست۔ قادیانی اک دم مبہوت ہو گئے، بالکل جواب نہ دے سکے۔

پھر فرمایا کہ آپ لوگوں کا یہ کہنا کہ حضورؐ قیامت تک کے لئے نبی ہیں، خود اس امر کا اقرار ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد نبوت کا عہدہ کبھی کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا۔ دوران نبوّت میں کسی اور نبی کی بعثت کے کیا معنی اور اس کی ضرورت کیوں۔ بولئے جواب دیجئے مگر صدائے برنخاست۔ قادیانیوں پر اوس پڑ گئی اور شکست خوردگی کی وجہ سے چہرے زرد اور ہونٹ خشک ہو گئے اور بالکل ساکت وصامت ہو گئے۔ تو حضرت والد ماجد نے تقریباً ایک گھنٹے تک قادیانیت کے رد میں مسلسل تقریر فرمائی اس کے بعد دہلی کے ہم سفر حضرات نے دریافت کیا کہ حضرت آپ تعارف تو فرمایئے۔ فرمایا کہ مجھے کفایت اللہ کہتے ہیں۔ مدرسہ امینیہ کا مدرس ہوں۔ اس وقت کا منظر بڑا عجیب تھا۔ ڈبے کے تمام ہم سفر مسلمانوں نے یہ تقریر سُنی تھی۔ بہت شکریہ ادا کیا اور ان دولتمند حضرات نے کہا کہ حضرت ہم تو مذبذب تھے۔ آپ نے بروقت ہماری دستگیری کی اور اپنی اس کوتاہی پر بڑے نادم ہوئے۔ کہ دلّی میں رہتے ہوئے ہم شرف ملاقات سے محروم تھے۔ ادھر قادیانیوں کا حال یہ تھا کہ اِدھر اُدھر کی باتوں کا خیال بھی بھول گئے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب انگریزوں سے ترک موالات کا استفتا پیش کیا گیا۔ تو نہایت انکسار نفس

اور حدود شناسی کے ساتھ فرمایا کہ مجھے انگریزوں سے غیر معمولی بغض اور نفرت ہے۔ ان کے بارے میں فتویٰ دینے میں مجھے اپنے نفس پر اعتماد نہیں کہ وہ حدود کی رعایت رکھ سکے قرآن حکیم کا فیصلہ ہے اعدلوا ھو اقرب للتقوىٰ اور یہ فرما کر اپنے مخصوص تلامذہ میں سے فتویٰ لکھنے کے لئے جن تین حضرات کا نام لیا ان میں اول نام حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ گویا حضرت اپنے نفس پر اس بارہ میں اعتماد نہ تھا جتنا اُن پر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے نفس پر بے اعتمادی یہ عین کمال بلکہ منتہائے کمال اور اتقاء ولتقویٰ کی اعلیٰ ترین مثال ہے اور اس لئے فتویٰ صادر فرمانا درحقیقت ایسے ہی اہل اللہ کا حق تھا۔ مگر اسی سے ظاہر ہے کہ اکابر جن پر خود اعتماد فرمائیں اور اپنے مقابلے میں اعتماد کا اظہار کریں وہ کتنے محتاط اور متدین ہوں گے؟ کسی کے مقبول عند اللہ ہونے کی علامت ہی یہ ہے کہ خواص اہل اللہ کے قلوب میں اس کی وقعت اور منزلت قائم ہو۔

پان کا لنگر حضرت مفتی صاحب کے لئے دہلی سے اعلیٰ درجے کے پانوں کے ٹوکرے آیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کی کی کوٹھڑی ایک لنگر خانہ تھی۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی حتیٰ کہ بھنگی بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں پان کے سائل ہو کر آیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نہایت خندہ پیشانی سے ہر ایک کو پان دے دیا کرتے تھے۔

عجیب واقعہ نیو سنٹرل جیل ملتان میں فجر کی نماز کے بعد میں جیل خانہ میں بالائی منزل پر ٹہل رہا تھا۔ احرار کے کشن ایجی ٹیشن کا ایک قیدی جو بی کلاس میں تھا، ڈاڑھی منڈایا کرتا تھا اور نماز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے اس کے سر میں درد تھا اور مفتی صاحبؒ چارپائی سے نیچے کھڑے ہو کر اُس کا سر دبا رہے ہیں۔ امام العلماء مفتی اعظم ہندوستان کا یہ واقعہ میرے لئے حیران کن تھا اور آپ کے اخلاق عالیہ کا ایک بہترین نظارہ تھا۔

ایک تاریخی اور ادبی نکتہ از جناب حفیظ الرحمان صاحب واصف

آخری مغل بادشاہ سراج الدین ظفر کی تاریخ وفات

بجھا ہے چراغ دہلی

۱۲۷۹ھ

کہی گئی تھی۔

حکیم اجمل خاں مرحوم کی تاریخ وفات کسی نے کہی تھی:۔

دلّی کا چراغ گل ہوا ہے

۱۳۴۴ھ

حضرت مفتی اعظم کی تاریخ وفات مولوی مقبول الرحمٰن خیال سیوہاروی نے نکالی:۔

ہو گیا گل آہ دہلی کا چراغ

۱۳۷۲ھ

یہی مادۂ تاریخ لوحِ مزار پر لکھوایا جا رہا ہے۔

———— ... ————

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۹۶ھ — ۱۳۷۷ھ
۱۸۷۹ء — ۱۹۵۷ء

عبدالرشید ارشد

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ کی طرح حضرت مولانا مدنی کی شخصیت مسلمانوں میں مختلف فیہ ہے۔ اگر ایک جماعت کے نزدیک مولانا موصوف
محبوب ترین مخدوم و رہنما تھے تو دوسرے گروہ کے نزدیک مبغوض ترین انسان۔ اور یہ بات ویسے کچھ فطری سی دکھائی دیتی ہے کہ جو انسان جتنا
بڑا ہوگا اتنی ہی اس کی مخالفت زیادہ ہوگی   حضرت سید احمد شہیدؒ مسلمانوں کی ایک جماعت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کی نشانی تھے ان کا اخلاق،
کردار، خلوص و عمل اس پایہ کا تھا کہ صحابہؓ کے بعد اس کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے۔ اور دوسرے گروہ کے نزدیک وہ ہر کافر و مشرک اصلی سے بُرے
دی تھے۔ یہی صورت حال مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ امت مسلمہ میں سے جس نے بھی کتاب و سنت کی راہوں پر چلنے کی
شش کی ہے۔ اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی اپنے علم و عمل کے اعتبار سے اس صدی کے نابغۂ روزگار انسانوں سے
تھے۔ اور انہوں نے بچپن سے لیکر وفات تک جہد و عمل سے بھرپور زندگی گذاری ہے۔ ان کی ہمت مردانہ اور استقلال و استقامت کا ہر کہ و مہ
رف ہے۔ دشمن و دوست سبھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مولانا غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اور عزم و ثبات کے اعتبار سے کوہ گران
ے۔ تحریک آزادی کے آخری دور میں مسلمانوں کی باہمی نظریاتی کشمکش اور سیاسی پیچیدگیاں کچھ اس طرح پیدا ہوگئیں کہ اس خارزار وادی میں
ں کا دامن ایسا نہیں رہا جو کانٹوں سے نہ الجھا ہو اور کسی کے تلوے زخمی ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اور پھر ہنگامی دور میں چونکہ جذبات کی فراوانی
ا ہے فضا میں ارتعاش ہوتا ہے۔ ہر کوئی تگ و دو میں مصروف ہوتا ہے لہذا کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ سکون کے ساتھ کسی فرصت
حالات کا جائزہ لے کر کوئی صحیح فیصلہ کر سکے۔ مثل مشہور ہے کہ آٹھ دس دانشور ایک جگہ بیٹھے تھے۔ کہ اچانک دو آدمی ان کے سامنے آکر لڑنے
۔۔ ایک نے پستول چلایا اور دوسرا گر پڑا اس کے بعد دو تین آدمی آئے اور اس مقتول کو اٹھا کر لے گئے اور یہ سب کچھ آنا فانا ایک دو منٹ
ہوا، یہ تمام دانشور اس مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہوئے تو ہر ایک کا بیان مختلف تھا۔ تقریباً یہی حال تحریک آزادی پاک و ہند کے آخری
کا تھا جس میں جو کچھ ہوا وہ سب کچھ ان حالات کا تقاضا تھا ورنہ یہ صورت ممکن ہی نہیں کہ ایک طرف کے سارے لوگ بے ایمان، خود
ا مفسد اور دوسروں کے آلہ کار ہوں اور دوسری طرف کے سارے لوگ مخلص، نیک اور ایماندار ہوں۔ ایک نظریاتی کشمکش تھی۔
ابا تیں اپنے اپنے دلائل کے ساتھ قوم کے سامنے آ رہی تھیں۔ ایک فیصلہ تھا جس کو قلم لکھ چکا اور سیاہی سوکھ چکی ان حالات کا
رائے کر مدت بعد تک ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اخلاق و کردار، علم و عمل اور جہد و ایثار کو سامنے
شخصیات کا مطالعہ کیا جائے۔ نظریات و خیالات میں ہمیشہ سے اختلاف چلا آیا ہے اور اگر یہ اختلاف نہ ہو تو زندگی ایک جمود
یادہ کچھ نہیں۔ اس دنیا کی رونق اور آبادی اختلاف کی مرہون منت ہے۔

آئندہ سطور میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے حالات آ رہے ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت مولانا کو
دور سے دیکھا اور دور سے سنا وہ بھی سرسری۔ امید ہے کہ حضرت مولانا کے صحیح حالات جاننے کے بعد ان کی بہت
سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

خاندانی تعارف خود حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے ایک خط سے جو انھوں نے ایک سائل کے جواب میں کہ کیا آپ

حضرت مولانا کا خاندان

لکھا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"محترم المقام زیدمجدکم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج شریف۔ والانامہ باعث سرفرازی ہوا۔ یادآوری کا شکرگزار ہوں۔ میرے متعلق نسبی حیثیت سے سید ہونے کا انکار جن حضرات نے کیا ہے۔ وہ اس کے ذمہ دار ہیں میں تو اپنے نام کے ساتھ سید لکھتا بھی نہیں ہوں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مدارِ نجات نسب نہیں ہے۔ عمل ہے اگر نسبی حیثیت سے کوئی اعلیٰ درجہ کا عالی نسب ہے۔ مگر اعمال قبیح ہیں تو مثل پسرِ نوح علیہ السلام وہ راندہ درگاہ خداوندی ہے اور اگر چمار، یا بھنگی زادہ ہے۔ مگر وہ مسلمان متقی ہے تو اس کی فرزو فلاح مثل حضرت بلال وصہیب رضوان اللہ علیہما ہے۔ میرے عمل اس ادعا کی اجازت نہیں دیتے۔ مجھے شرم آتی ہے

محترما ! میں اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کا باشندہ ہوں۔ اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ کے بالکل متصل ہے تقریباً چار سو برس یا اس سے زائد سے ہمارے خاندان کی جائے سکونت ہے۔ وہاں کے اطراف وجوانب میں ضلع سلطان پور، اعظم گڑھ، اور فیض آباد کے دیہات اور قصبات میں صرف سادات اور بڑے ذات کے شیخ زادوں میں ہماری رشتہ داریاں صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ ہمارا آبائی پیشہ زمینداری اور پیری مریدی ہے۔ شاہانِ دہلی مغلیہ خاندان کے ابتدائی بادشاہوں نے یا ان سے پہلے بادشاہوں نے ہمارے اعلیٰ مورثوں کو ۲۴ گاؤں دیئے تھے جن میں سے ۱۸۵۷ء تک ۱۳ باقی رہ گئے تھے ۱۸۵۷ء میں ایک ہندو راجہ نے جس سے پہلے سے عداوت چلی آتی تھی۔ بڑوں کے انتقال اور بدعملی کی شامت کی وجہ سے سب پر قبضہ کرلیا۔ اور اللہ داد پور لوٹ لیا۔ ہمارے قدیمی کاغذات پر بھی قبضہ کرلیا۔ بے شمار خزانے، غلہ اور سامان اس نے لوٹا۔ جس کو وہ ایک ماہ تک گاڑیوں میں منتقل کرتا رہا۔ اس کے حصار کے زمانہ میں عورتیں اور بچے بھیس بدل کر رشتہ داروں کے یہاں شہر ٹانڈہ کے بعض محلوں میں مامون تھے۔ پناہ گزین ہوگئے تھے اور دوسرے لوگ بھی نوکروں اور رعایا کو چھوڑ کر منتشر ہوگئے تھے بہرحال اگر کسی کو تفتیش کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد دور نہیں ہے۔ وہاں جاکر تفتیش کرکے حال معلوم کرسکتا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد صرف دو گاؤں ہمارے خاندان کے پاس رہ گئے تھے جن میں والد مرحوم کا ایک آنہ آٹھ پائی تھا جس کو فروخت کرکے والد مرحوم نے حجاز کا قصد کیا تھا۔

ہمارے مورث اعلیٰ جو کہ اللہ داد پور میں اوّلاً پہنچے ہیں۔ انکا نام شاہ نورالحق قدس سرہ العزیز ہیں۔ ان سے لیکر مجھ تک سترہ پشتیں گزری ہیں جن کا سلسلہ حسب ذیل ہے۔

حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی بن سید جہانگیر بخش بن شاہ نوراشرف بن شاہ مدن بن شاہ محمد ماہ شاہی بن شاہ خیر اللہ بن شاہ صفت اللہ بن شاہ محب اللہ، بن شاہ محمود، بن شاہ لدھن بن شاہ قلندر بن شاہ منور بن شاہ راجو بن شاہ عبدالواحد بن شاہ محمد زاہد بن شاہ نورالحق قدس اللہ تعالیٰ اسرارھم۔

یہاں تک ہمارا شجرہ نسبی موجود ہے۔ اس کے بعد کا شجرہ طریقت ہے۔ نسبی موجود نہیں ہے۔ شاہ نورالحق صاحب خلیفہ ہیں شاہ داؤد چشتی کے۔ وہ شاہ عتاب الدین چشتی کے۔ وہ شاہ نجم الدین چشتی کے۔ وہ شاہ رومی چشتی کے۔ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے۔ وہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمہم اللہ تعالیٰ و قدس اسرارہم کے۔ اس کے بعد شجرہ میں وہی اسمار بزرگان طریقت درج ہیں جو حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تمام شجروں میں مذکور ہیں۔

بہرحال یہ احوال مختصر ہیں۔ والحقیقۃ عند اللہ محترما! اگر قبولیت عند اللہ نصیب ہو تو نجاح و فلاح ہے ورنہ سب ہیچ ہے۔ اخباروں وغیرہ میں ایسے مضامین لانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو ضرورت ہے کہ اپنی قوم کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ترقی دیں نسبی حیثیت سے غرور اور تکبر بے موقعہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ ترقی سے مانع ہوجاتا ہے۔ سادات پر تمام مسلمانوں کی خدمت گزاری ضروری ہے نہ یہ کہ سادات تمام مسلمانوں کو اپنا غلام سمجھیں اور ان سے خدمت کی خواہش کریں۔

تذکرۃ الاولیاء میں ہے کہ ایک روز امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بغداد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے فرمانے لگے کہ بھائیو تم میں سے جس کو روز قیامت میں اللہ تعالیٰ بخش دے تو میری شفاعت کرنا۔ لوگوں نے تعجب کیا اور کہا کیا ہم آپ کی شفاعت کریں۔ حالاں کہ آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ہیں تو فرمانے لگے کہ یہی چیز میرے لیے باعث بے چینی ہے۔ امت کے تمام مسلمان میرے نانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں اور میں ان کے خاندان کا بچہ ہوں۔ قاعدہ ہے کہ مہمانوں کی خدمت گزاری خاندان کے چھوٹوں پر ضروری ہوتی ہے اگر وہ کوتاہی کرتا ہے تو صاحب خاندان بہت خفا ہوتا ہے اور چھوٹوں کی سرزنش کرتا ہے۔ اگر قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے سوال کیا کہ جعفر! تم نے میرے مہمانوں کی کیا خدمت کی تو میں شرم کی وجہ سے منہ نہ اٹھا سکوں گا۔

یہ ارشاد حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا صحیح ہے اور سادات کے لیے نہایت عبرت کا فرمان ہے مگر افسوس کہ ہم انتہائی غفلت میں مبتلا ہیں۔ میں نے جب سے یہ ارشاد دیکھا ہے۔ بہت فکرمند رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

ہمیں فخر نسبی کا موقع صرف اسی وقت حاصل ہوگا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور ہمارے آقا ولی نعمت نانا جان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہوجائے۔ اس سے پہلے یہ مفاخرت جہالت اور نادانی ہے۔

سادات کا فرض سب سے زیادہ اور اولین ہے کہ آقائے نامدار علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت کو زیادہ اپنے عمل سے کریں اور آپ کی سنتوں پر نہایت مضبوطی سے چلیں اور ہر امتی کا خیر خواہ۔ خواہ وہ کیسا ہی غریب اور جاہل اور چھوٹی ذات کا مسلمان ہو احترام کریں اور اس کی خدمت گزاری کریں۔ وہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا بلایا ہوا مہمان ہے۔

حضرت مدنی کا یہ طویل مکتوب ہم نے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ قارئین کو اس رجل رشید کی افتادِ طبع کا اندازہ ہو اور وہ معلوم کر سکیں کہ حسین احمد کس شخصیت کا نام ہے۔

ولادت و تعلیم و تعلم

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ولادت ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی شب میں بوقت ۱۱ بجے بمقام بانگرمئو ضلع اناؤ میں ہوئی جہاں آپ کے والد ماجد مولانا حبیب اللہ صاحب خلیفہ مجاز مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی مدرس تھے۔ تاریخی نام چراغ محمد رکھا گیا۔ آپ نسباً حسینی سید ہیں۔ آپ کے والد ماجد بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ذاکر، شاغل، بڑے پاکباز و باخدا انسان تھے۔ مستجاب الدعوات ایسے کہ خود حضرت شیخ مدنی نقش حیات میں لکھتے ہیں:

> "ایسے بہت سے واقعات پیش آئے کہ جس نے انکو ستایا اور اس کے واسطے انھوں نے بد دعا کی اور وہ کبھی پنپنے نہیں پایا" ــــ اور ایک جگہ لکھتے ہیں ــــ "کشف ان کا بہت قوی اور زیادہ تھا۔ متعدد بار مکاشفات ان کے صحیح ثابت ہوئے۔ ایک دفعہ انھوں نے مدینہ منورہ میں فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص کو ہندوستان جانا ہوگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام نکلے گا۔"

حضرت کی والدہ محترمہ رابعۂ وقت، پابند شریعت، بڑی صابر اور قانع خاتون، سارے اوقات ذکر و شغل سے معمور و مشغول۔

شیخ مدنی تین سال کے تھے کہ آپ کے والد محترم پنشن لے کر اپنے وطن ٹانڈہ تشریف لے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔ تیرہ سال کے ہوئے تو آپ کو دار العلوم دیوبند حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ گویا ایک شفاف آئینہ کو آفتاب عالمتاب کے سامنے رکھ دیا گیا۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" حضرت شیخ الہند نے ہونہار شاگرد کو پہلی نظر میں پہچان لیا کہ جوہر قابل ہے۔ لہٰذا حضرت شیخ نے ابتدائی کتابیں بھی مولانا مدنی کو خود ہی پڑھائیں۔ جب کہ حضرت کے مشاغل بڑی جماعتوں کو بھی اوقات مدرسہ کے علاوہ پڑھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اگر سونا تیز اور ذہین طالب علم کو شروع ہی سے لائق فائق استاد مل جائیں تو کیا کہنے۔ سونے پر سہاگہ۔

حضرت مدنی کو اپنے وقت کے بہترین اور یگانہ روزگار اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ استاذ العلوم حضرت شیخ الہند، مولانا ذوالفقار علی صاحب والد ماجد حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا عبد العلی صاحب محدث دہلوی، شیخ الحدیث حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمہم اللہ اجمعین۔ تعلیم کے دوران آپ ہمیشہ اعلیٰ نمبر لے کر پاس ہوتے رہے۔ عربی مدارس میں انتہائی نمبر پچاس ہوتے ہیں۔ مگر آپ اکثر کتابوں میں ۵۱، ۵۲، ۵۳ نمبر لیتے رہے۔ اور صدرا جیسی مشکل اور ادق کتاب میں ۵۵ نمبر حاصل کیے۔

۱۳۱۶ھ میں آپ کے والد ماجد بقصد ہجرت بمعہ اہل و عیال عازم حجاز ہوئے۔ تو حضرت مولانا مدنی کو بھی اپنی معیت سے سرفرازی بخشی اور اس نے حجاز مقدس پہنچ کر رحمۃ للعالمین کے جوار رحمت کو اپنے لیے فلاح دارین سمجھا اور وہیں پر اقامت فرمائی۔ اسی طرح حضرت مدنی کو مشیت ایزدی نے اکتساب فیض نبوت اور تحصیل مجد و شرف کے وہ گراں قدر مواقع عطا فرماتے جو سب کو نہیں ملا کرتے۔ صرف ان ہی کو ملا کرتے ہیں جنھیں خداوند باری تعالیٰ اپنی رحمت کے لیے مخصوص کر لیتے ہیں۔

اس وقت مدینہ منورہ میں دو کتب خانے غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔ ایک کتب خانہ شیخ الاسلام اور دوسرا محمودیہ۔ ان دونوں ہی کتب خانوں میں علاوہ مطبوعات کے مختلف علوم و فنون پر نایاب قلمی کتابیں بھی تھیں۔ جن سے حضرت کو استفادہ کا پورا موقعہ ملا۔ عسرت اور معیشت کی تنگی قیام مدینہ میں آپ کے شامل حال رہی۔ اس لیے بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ آپ نے کتابیں نقل کر کے اپنی معیشت کے سامان مہیا کیے۔ مگر کوئی ایسا ذریعہ اختیار نہ فرمایا جس سے خودداری اور

ہیں لگے۔ مدینہ منورہ میں آپ کا خانوادہ تیرہ افراد پر مشتمل تھا۔ مگر صرف بارہ چھٹانک مسور کے پانی پر یہ تمام حضرات قناعت فرماتے تھے۔

ادبیات کی تکمیل آپ نے مدینہ منورہ کے مشہور ادیب مولانا الشیخ آفندی عبدالجلیل برادہ رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائی جو علمائے حجاز میں اپنی ادبیت کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے ہے۔ ہندوستان میں ساڑھے چھ سال کی مدت میں آپ نے سترہ فنون کی ۶۷ کتابیں اپنے مشفق اساتذہ کرام سے پڑھیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو جو خصوصی ذاور تعلق تھا۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل کتب سے ہو سکتا ہے جن کو حضرت شیخ نے حضرت شیخ الہند سے پڑھا۔

دستور المبتدی، زراوی، زنجانی، مراح الارواح، قال اقول، مرقات، شرح تہذیب، تہذیب، قطبی، تصدیقات، تصورات، مجسطی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ اخرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد شریف، تفسیر بیضاوی، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی، حاشیہ خیالی، موطا امام مالک، موطا امام محمد، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اگر استاد اور شاگرد قابل ہوں تو استاد ایک دو کتابوں میں ہی شاگرد کی ساتھ ساتھ تربیت کر دیتا ہے اور یہاں تو ۲۲ کتابیں شیخ الاسلام بننے والے اردنے اپنے وقت کے سب سے بڑے استاذ و انسان سے پڑھیں اور ساڑھے چھ سال شرف تلمذ حاصل کیا۔

تکمیل علوم کے ساتھ ساتھ ہی آپ نے مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ شوال ۱۳۱۸ھ تک آپ کا درس امتیازی حیثیت سے لیکن ابتدائی درجہ پر رہا۔ ۱۳۱۸ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور ماہ محرم ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ واپس حاضری ہوئی۔ اس کے بعد آپ کا حلقہ درس بہت وسیع ہو گیا۔ اور طلبا کا جم غفیر آپ کے گرد جمع ہو گیا۔ اہل علم میں حسد اور رقابت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے خصوصاً مدینہ منورہ میں کوئی ہندی نژاد عالم کا حلقہ درس وسیع ہو جائے تو اس پر اہل عرب کی رقابت قدرتی طور پر زیادہ ہوتی تھی۔ چنانچہ آپ کی طرف آنکھیں اٹھنے لگیں۔ ان کا خیال تھا ایک عجمی عالم زیادہ دیر تک ہماری تنقید و جرح کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ مگر ایک ذہین استاد جس نے شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری جیسے کامل الفن اور وحیدان عصر سے استفادہ کیا ہو۔ وہ کسی سے کب مات کھا سکتا ہے۔ علماء کے حسد و رقابت اور تنقید و جرح کے باوجود حضرت کے حلقہ درس میں توسیع ہوتی گئی اور اس قدر توسیع ہوئی کہ مشرق وسطی، افریقہ، چین، جزائر، مشرق الہند کے تشنگان عالم آپ کی طرف کھنچے کھنچے چلے آنے لگے۔ اور آپ کے زیر درس درسیات ہند کے علاوہ مدینہ منورہ، مصر، استنبول کی کتابیں۔ مثلاً

اجرومیہ، دہلان، کفراوی، الفیہ، ابن عقیل، شرح الفیہ ابن ہشام، شرح عقود الجمان، استعارات رسالہ وضعیہ، للقاضی عضد، بدایۃ ابن حجۃ الحموی فی الاجر، درر، شرح جمع الجوامع للسبکی، شرح مستصفی الاصول، ورقات، شرح منتہی الاصول، مسامرہ شرح مسایرہ، شرح طوالع الانوار، جوہرہ، الفیہ اصول حدیث، بیقونیہ و دیگر کتب اصول حدیث وغیرہ ادق علمی کتابیں رہیں۔

قدرت نے آپ کو دماغ و ذکاوت وہ اعلیٰ درجہ عطا فرمایا تھا کہ جس کی نظیر خود آپ ہی تھے۔ نیز آپ کوئی سبق بغیر مطالعہ کے نہ پڑھاتے تھے۔ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں صرف ۳ گھنٹے آرام کرتے اور بقیہ درس و مطالعہ نیز ذکر و اوراد میں گزارتے۔ آپ دوران درس اپنے سامنے کتاب کبھی نہ رکھتے تھے۔ بلکہ طالب علم کی قراۃ کے بعد مسائل پر تقریر فرماتے۔ حالانکہ علمائے مدینہ نہ صرف کتاب کو دوران درس سامنے رکھتے۔ بلکہ اس کی شرح بھی ہاتھ میں لے کر پڑھاتے تھے اور تقریر کے وقت عبارت شرح یا حاشیہ کی سناتے تھے۔ مگر حضرت سب زبانی کرتے تھے۔

اس طرح آپ نے روزانہ چودہ پندرہ اسباق کا درس دیا جس میں کتب عالیہ حدیث و تفسیر، عقائد و اصول بھی شامل تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر آپ کی دھاک بیٹھ گئی اور یہ صرف مطالعہ و محنت کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ ساتھ ساتھ مجاہدہ و ریاضت اور ذکر و شغل بھی جاری تھا اور بفحوائے من عمل بما علم علمہ اللہ بما لا یعلم (جو پڑھے پر عمل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ خاص سے ایسے علوم عطا فرماتا ہے جو کسی سے پڑھنے میں نہیں آتے) آپ کو علم لدنی کا ظاہر اتھا۔ خود فرماتے ہیں کہ منزل رابغ کی شب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خواب میں نصیب ہوئی۔ یہ سب سے پہلی زیارت آنحضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر پاؤں میں گر گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ مانگ کیا مانگتا ہے ؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ ہو جائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں۔ ان کے متعلق اتنی قوت ہو جائے کہ مطالعہ میں نکال سکوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تجھ کو دیا۔ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر خیزی،

این سعادت بزورِ بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ !

حق تعالیٰ نے آپ کو حجاز میں وہ عزت و وجاہت فرمائی جو ہندی علماء کو تو کیا مصری، شامی، مدنی علماء کو بھی حاصل نہیں تھی اور آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کر کے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی اور آپ کو ۲۴ سال کی عمر میں شیخ العرب والعجم کے معزز القاب کے ساتھ سرفراز کیا گیا اور ان اطراف میں آپ ان القاب کے ساتھ مشہور و معروف ہو گئے۔

عرب کے چند ممتاز شاگرد آپ کے شاگردوں میں سے بہت سے تعلیم و تدریس قضا اور انتظامی محکموں کے بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے ان ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

مولانا عبدالحفیظ کردی جو مدینہ منورہ میں محکمہ کبریٰ (ہائی کمانڈ) کے رکن تھے۔

مولانا احمد بساطی جو مدینہ طیبہ میں نائب قاضی رہے۔

محمود عبد جواد مدینہ میونسپلٹی کے چیئرمین

مشہور الجزائری عالم و مجاہد شیخ بشیر الابراہیمی[1]

راہِ سلوک و تزکیہ نفس ۱۸۹۸ء کو ماہ شعبان میں کتب درسیہ اور ان کے امتحان سے فراغت کے بعد مولانا مدنی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے اشارہ پر اپنے برادر بزرگ مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم کے ساتھ آستانہ عالیہ قطب الاقطاب سید العارفین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں استدعا بیعت طریقت وارشاد پیش کی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بلا چون وچرا درخواست قبول فرما کر سلاسل اربعہ میں بیعت فرما لیا۔ ان دنوں مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد نے ہجرت حجاز کا قصد فرما لیا تھا اور فرمایا کہ چونکہ تم مکہ معظمہ جا رہے ہو۔ لہٰذا وہاں حضرت مرشد قطب العالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی موجود ہیں ان ہی سے ذکر و شغل کی تلقین حاصل کر لینا۔ خدا کے فضل و کرم سے اس بیعت مبارکہ کے آثار اسی دن سے میں اپنے میں پانے لگا۔ رویائے صالحہ کا سلسلہ بھی جب ہی سے شروع ہو گیا۔

مکہ معظمہ پہنچ کر حسب ارشاد شیخ طریقت، مولانا مدنی حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور حاجی صاحب سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تلقین وارشاد والی بات نیز انکا سلام و پیام پہنچایا۔ حضرت حاجی صاحب نے نہایت شفقت فرمائی اور فرمایا کہ وہ ہر روز صبح یہاں ہمارے پاس آکر یہ عمل کیا کریں چنانچہ مولانا مدنی روز حاضر ہوتے رہے۔ اسی سال حج وعمرہ اور دیگر مناسک سے فارغ ہونے پر اواخر ستمبر ۱۸۹۹ء میں حاضر ہوئے۔ اگرچہ وقت عام ملاقات کا نہ تھا تاہم باریاب ہوئے۔ باوجود نقاہت وضعف کے اٹھ کر بیٹھ گئے اور غایت وشفقت سے مولانا مدنی اور انکے برادر خورد مولانا سید احمد کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔ اس ارشاد پر مولانا اور انکے بھائی خاموش رہے۔ فرمایا کہو کہ ہم نے قبول کیا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے حسب ارشاد یہ کلمات کہے۔ اسی سال جمادی الثانیہ میں حاجی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ درمیان میں کچھ عرصہ حاجی صاحب کے بتائے ہوئے اشغال ترک ہو گئے تھے۔ حضرت کے وصال کے بعد پھر پیدا ہوا۔ اور مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تعلیم کردہ ذکر کرنے لگے۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں :-

---

[1] افسوس کہ یہ سطور تحریر کرتے اخبار کا مطالعہ کیا تو ان کے انتقال دوران نظربندی کی خبر پڑھی

"چونکہ بدن میں حرکت پیدا ہوتی تھی۔ اس لیے لوگوں کے مطلع ہونے کا خیال اس امر کے باعث ہوا کہ بیرونِ شہر قریب مسجد اجابہ بعض افتادہ کھجوروں کی جھاڑیوں میں جا کر تنہائی میں جب تک جی لگے ذکر کیا کروں۔ چنانچہ اس حالت پر ایک زمانہ گزرا۔ اس اثنا میں جو رویائے صالحہ اور حالتیں پیش آتی تھیں۔ گنگوہ شریف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں بذریعہ مکاتیب پیش کرتا رہتا تھا۔ الطاف بکراں کے ساتھ ہمیشہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جوابات میں مفید ارشادات کے ساتھ اعانت فرماتے رہے۔ اسی اثنا میں ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ گیارہ حضرات اولیاء اللہ میں سے تشریف لائے ہیں اور فرمایا کہ ہم تجھ کو اجازت دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ حضرت خواجہ ابراہیم ابن ادھم رحمۃ اللہ علیہما ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ ایک تہائی کھجور کا عنایت فرمایا اور کہا کہ باقی دو ثلث دوسرے مشائخ طریقت کے ذریعے سے تجھ کو دیئے جائیں گے۔ اس قسم کے بہت سے خواب دیکھے بالآخر جنوری ۱۹۰۱ء کے رمضان یا شوال میں کرامت نامہ پہنچا کہ تجھ کو ایک مہینہ کے لیے گنگوہ آنا چاہیئے۔ اس پر حضرت والد صاحب مرحوم نے ارادہ فرمایا کہ صرف مجھ کو گنگوہ شریف بھیجیں۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کو وہاں کی حاضری کا بہت زیادہ شوق تھا۔ وہ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ میں خفیہ طریقہ پر بقصد حاضری گنگوہ شریف روانہ ہو گئے۔ اگرچہ حضرت والد صاحب کا مقصد یہ تھا کہ بعد از حج جب کہ قوافل (قافلے) مدینہ منورہ سے جدہ واپس ہوں گے۔ اس وقت مجھ کو بھیجیں گے۔ مگر بھائی صاحب کی تنہائی کی بنا پر حکم فرمایا کہ تو ابھی چلا جا۔ بھائی صاحب حج قریب ہو لے اور جہاز نہ ملنے پر مکہ معظمہ چلے گئے۔ چنانچہ ہم دونوں نعمت حج اور عمرہ سے فیضیاب ہونے کے بعد جدہ واپس ہوئے مگر دخانی جہازوں کا کرایہ زیادہ تھا جس کے ہم متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ بالآخر اوائل محرم ۱۳۱۹ھ میں بادبانی جہاز دلغلہ (مسقط جانیوالا) جس نے تقریباً سوا مہینہ کے بعد مسقط پہنچایا۔ مسقط سے ہر ہفتہ میں دخانی جہاز کراچی جاتا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد وہ جہاز آیا۔ دو دو روپیہ فی ٹکٹ پر کراچی پہنچا ہوا اور پھر اوائل ماہ ربیع الاول میں گنگوہ شریف کی حاضری نصیب ہوئی۔ اس اثناء میں تمام راہ میں میرے مشاغل سلوک برابر جاری رہے اور بفضلہ تعالیٰ رویائے صالحہ اور مختلف احوال وارد ہوتے رہے۔ گنگوہ شریف پہنچنے پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت زیادہ عنایات فرمائیں۔ والد صاحب مرحوم کے خطوط سے چونکہ حضرت کو پوری کیفیت معلوم ہو چکی تھی۔ اس لیے یہاں انتظار تھا۔

بھائی صاحب مرحوم سہارنپور سے بالا بالا حاضر خدمت ہوئے اور میں نے عرض کیا کہ میں پہلے دیوبند جاؤں گا۔ اور وہاں سے خدمت اقدس میں حاضر ہونگا۔ بھائی صاحب مرحوم سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں کے لیے ہم نے ایک ایک جوڑا کپڑا تیار کرا رکھا ہے۔ مگر حسین احمد کے حاضر ہونے کے بعد دونگا۔ چنانچہ جب میں دیوبند سے براہ نانوتہ پیدل حاضر ہوا۔ تو وہ جوڑے جو کہ ابھی جدید تھے۔ ہر ایک کو عطا کئے گئے۔ چونکہ اس میں کرتا پاجامہ ٹوپی ہی تھی۔ اس لیے بھائی صاحب مرحوم نے عرض کیا کہ حضرت ہم دونوں اپنے اپنے عمامے لاتے ہیں اور پیش کر دیتے ہیں۔ جناب انکو بھی ہمیں دے دیں۔ فرمایا کہ اس کو پھر دیکھا جائے گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بکمال شفقت آخری شغل سلوک تلقین فرمایا۔ میں نے اپنے رویاء کو جو کہ راستہ میں دیکھے تھے۔ تنہائی میں پیش کیا جن میں سے ایک یہ تھی کہ میں حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں اور اس سے پہلے ایک مقدار کھجوروں کی حضرت کے یہاں بطور ہدیہ پیش کر چکا ہوں۔ تو

حضرت نے فرمایا کہ تو خود آ کر ان کھجوروں کو تقسیم کر دے۔ میں نے عرض کیا حضرت یہ کھجوریں تو میں آپ کے لیے لایا ہوں میرے یہاں تو اس کی دوکان ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا، نہیں میں جانتا ہوں کہ کن مشقتوں سے کھجوریں حاصل ہوتی ہیں۔ مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اس خواب کو سن کر فرمایا۔ حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے یہاں سے تجھ کو اجازت ہو گئی۔ میرے یہاں سے بھی عنقریب ہو جائے گی۔

چونکہ اجازت و خلافت میرے گمان میں بھی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو اس کا خواستگار نہیں ہوں۔ اس پر غالباً سکوت فرمایا۔ بارگاہ رشیدی کی حاضری میں بفضلہ تعالیٰ معنوی نعمتیں بہت حاصل رہیں۔ ایک شب پندرہ دن کے بعد۔ بعد عشاء میں حضرت کی کمر دبا رہا تھا۔ بین النوم والیقظہ کی حالت ہوئی اور سُنا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ تجھے چالیس دن بعد اجازت ہو گی۔ اس کے ٹھیک ۴۰ دن بعد حضرت نے بعد عصر فرمایا کہ اپنے عمامے لے آؤ۔ بھائی نے دو عمامے حاضر کئے۔ حضرت نے ہر دو کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے دست مبارک سے باندھے۔ اس کے بعد بھائی صاحب نے فرمایا، جانتے ہو یہ کیسی دستار تھی؟ بھائی صاحب نے فرمایا۔ یہ دستار فضیلت تھی۔ فرمایا نہیں یہ دستار خلافت ہے تم دونوں کو مجھ سے اجازت ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ خدمت میں رہنا ہوا، مگر بہت جلد افتراق جسمانی کی نوبت آ گئی۔ افسوس کہ اپنی تن پروری اور نفس پرستی ہمیشہ میدان عمل میں سدِ راہ ہوتی رہی۔ جس کی بنا پر ناقص رہا۔ ورنہ نعماء الٰہیہ نے کبھی بخل نہ فرمایا اور نہ حضرت مرشدی قدس سرہ العزیز کی توجہات اور حضرت شیخ الہند کی برکات نے افاضہ سے کوتاہی کی

سودہ گشت از سجدۂ راہتاں پیشانیم　٭　چند برخود تہمت دین مسلمانی نہیم
از نکتۂ مقصود نہ شد فہم حدیثے　٭　لا دین و لا دنیا بیکار بما ندیم

حضرت شیخ الہند کی خدمت میں اگرچہ زیادہ رہنا نصیب ہوا۔ مگر باوجود ان کی توجہات کے اپنی نالائقیوں نے گل کھلانے میں کمی نہ کی۔ غرضیکہ میں اپنے اسلاف اور اکابر کرام کے لیے ننگ و عار ہی رہا اور حضرات اہل چشت اور دیگر مشائخ اہل طریق کا صحیح معنوں میں بدنام کرنیوالا۔ تاہم مجھ کو افضال خداوندی سے امیدیں ہیں کہ مثل سگ اصحاب کہف مجھ کو اپنے اولیائے کرام کے فیوض سے مستفید ہونیکا موقعہ عنایت فرمائیں گے اور اپنے بھائیوں سے امیدوار ہوں کہ دعوات صالحہ اور توجہات و ہمم سے اس روسیاہ کی دستگیری فرمائیں گے۔

والسلام
ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

(از سلاسل طیبہ)

اسارت مالٹا اور حضرت شیخ الہند کی معیت

؎ مشک از خون چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتا ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تقریباً سولہ سترہ سال مسجد نبوی درس حدیث دیتے رہے۔ تشنگان علوم دین ہزاروں کی تعداد میں اس چشمہ صافی سے سیرا

ہوئے۔ حرمین، نجد و حجاز اور دیگر مقامات پر اب بھی آپ کے تلامذہ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ دوسرے علما تو اپنے اپنے علاقوں میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر درس حدیث دیتے ہیں۔ مگر حضرت مدنی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ قال صاحب ہذا القبر[1] صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر حدیث پڑھایا کرتے ۱۳۳۲ھ میں حضرت شیخ الہند بھی حجاز تشریف لے گئے۔ ادائیگی حج کے بعد دربار نبوت میں حاضری دی۔ اسی سال جمال پاشا، انور شاہ مرحوم بھی دربار رسالت میں حاضری دینے آئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد شریف حسین نے انگریزوں کی شاطرانہ اور پرفریب سازش میں آکر ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ حضرت شیخ الہند نے اپنے خدام اور رفقا کی معیت میں اس موقع پر ترکوں کی حمایت میں سرحدی قبائل کو آراستہ کیا۔ انور پاشا اور جمال پاشا کو نقشہ کار کی تشکیل میں کافی مدد پہنچائی۔ حاجی ترنگ زئی مرحوم مولانا لطف الرحمٰن، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود، مولانا محمد میاں عرف محمد منصور، مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر اشخاص سے اس سلسلہ میں بہت کچھ کام لیا جاتا۔ مگر مشیت ایزدی کسی اور ہی نقشہ کی تشکیل کر رہی تھی۔ ادھر عرب کی بساط سیاست الٹ جانا قضائے مبرم بن چکا تھا۔ اور ادھر ان مردان کار کے لیے ابتلا و آزمائش کی نئی راہیں باز ہو رہی تھی۔ انگریزی چالیں کامیاب ہو گئیں۔ شریف حسین کی حکومت نے ترکوں کے خلاف "جہاد" شروع کیا تو علمائے سے فتاویٰ لیے اور جیسا کہ ہر زمانہ میں ہوتا آیا ہے کہ علمائے سوء اقتدار کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتے ہوئے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان کی مرضی کے مطابق فتویٰ دے دیتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہوا۔ نہ صرف حجاز و نجد کے علماء نے بلکہ ہندوستان کے بیشتر علمائے سوء نے ترکوں کے خلاف جنگ کو جائز قرار دیا۔ انگریز ہر قیمت پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ حضرت شیخ الہند کے وارنٹ گرفتاری ہندوستان میں ان کی موجودگی میں جاری ہو چکے تھے۔ مگر بوجوہ اس پر عملدرآمد نہ ہو سکا اور حضرت شیخ حدود حرم میں داخل ہو گئے۔ اب وہاں شریف حسین کی حکومت ہی گرفتار کر سکتی تھی اور شریف حسین ان دنوں انگریزی کی انگلیوں پر ناچ رہا تھا۔ بعض سرکاری حامد شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی یہ فتویٰ حاصل کرنے کے لیے گئے۔ حضرت شیخ نے انکار فرما دیا۔ اس پر کتنے سو علماء کا ایک فتویٰ دکھایا گیا تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ ان بندگان طمع و زر کے فتوے کو میں پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں دیتا اور اپنے پاؤں کے جوتے سے ٹھکراتا ہوں۔ گرفتاری کے لیے ایک بہانہ مطلوب تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند کو معہ ان کے رفقا حضرت مدنی، مولانا عزیز گل اور دیگر ساتھیوں کے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں بھیج دیا گیا۔ یہ حضرات وہاں تقریباً ساڑھے چار سال مقید رہے۔ ان حضرات کے تقویٰ و زہد اور صبر و استقامت کا دوسرے قیدیوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ کئی قیدی جرمن تھے۔ وہ تو بندہ بے دام بن گئے تھے۔ حضرت مدنی نے زمانہ اسارت قرآن پاک حفظ کیا اور حضرت شیخ کے ساتھ شب و روز گزار کر کندن بن گئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس دوران میں قرآن پاک کا ترجمہ مکمل کر لیا اور سورۃ مائدہ تک حواشی تحریر فرمائے۔ اور یہ ترجمہ قرآن پاک اپنی افادی حیثیت سے اپنی مثل آپ ہے۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ان حضرات کو سیاسی و درسی مشاغل سے دور رکھ کے کہیں دور بھیج دیا جائے۔ تاکہ ترجمہ قرآن پاک مکمل ہو سکے کہ جس سے مسلمانان عالم تا قیامت مستفید ہوتے رہیں[2]

حضرت مدنی نے زمانہ اسارت حضرت استاد کی وہ خدمت کی کہ جس کی نظیر و مثال ممکن نہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ معمر اور مریض تھے۔ ٹھنڈا پانی استعمال کرنے سے تکلیف ہوتی تھی اور مالٹا میں بلا کی سردی پڑتی ہے۔ مگر گرم پانی کہاں سے آئے۔ حضرت استاد کو گرم پانی مہیا کرنے کے لیے مولانا مدنی عشاء اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد برتن میں پانی ڈال کر پیٹ سے لگا کر ساری رات بیٹھے رہتے اور تہجد کے وقت بکمال ادب و احترام استاد محترم کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ بہت عرصہ کے بعد منتظمین جیل نے گرم پانی کا اہتمام کیا تو مولانا مدنی کو استاد کی اس خدمت سے محروم ہونا پڑا۔

---

[1] فرمایا اس قبر والے نے صلی اللہ علیہ وسلم

[2] اس سلسلہ میں اسیر مالٹا مصنفہ مولانا حسین احمد مدنی، علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے مصنفہ مولانا محمد میاں اور ریشمی خطوط کی سازش وغیرہ کتابیں پڑھی جائیں۔ ان میں حالات کی تفصیل ہے۔ یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں کچھ تذکرہ گزر چکا ہے۔

مولوی ہدایت اللہ میاں چنوں ضلع ملتان راوی ہیں کہ میں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ پوچھا کہ حضرت آپ ساڑھے چار سال حضرت
کی خدمت میں رہے کہ آپ کی اس صحبت میں کوئی دوسرا حائل ہونے والا نہیں تھا۔ آپ نے اس دوران میں بہت کچھ حاصل کیا ہوگا تو آبدیدہ ہو کر فرمانے
مولوی صاحب! میں نکما تھا کچھ حاصل نہیں کر سکا۔ میں نے بہ بار بار عرض کیا تو فرمایا کہ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ میں نے نیند پر قابو پالیا۔ اب جب خیال
سوجاتا ہوں۔ اور جس وقت اٹھنا چاہوں۔ بیدار ہو جاتا ہوں۔ پانچ دس منٹ کے لیے بھی سو سکتا ہوں۔ ارادہ کروں اور نیند آجاتی ہے اور اس قسم کی بہت سی
حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہیں کہ کسی جگہ گئے وہاں پانچ دس منٹ فرصت ملی سو گئے اور خود بخود اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہرحال نہ صرف نیند پر قابو پایا
استاد کی خدمت کرنے سے حاصل ہوا۔ بلکہ معرفت کے وہ دریا ہضم کیے ہوئے تھے جس کا ایک جرعہ بھی اپنے کو خود کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اسارتِ مالٹا سے رہائی

بالآخر ۲۲ جمادی الثانی ۱۹۱۹ء کو حضرت شیخ الہند مع اپنے خدام کے مالٹا سے رہا کیے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان
میں تحریک خلافت اور استخلاص وطن شروع ہو چکی تھی۔ حضرت مدنی اپنے شیخ محترم کی ہر کابی میں ہندوستان
حکومت ترکی جو جنگ عظیم سے پہلے دول عظمیٰ میں شمار ہوتی تھی۔ اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس کے ممالک محروسہ پر عمل جراحی کر کے ہر ایک حصۂ جسم کو یورپ کے کفن فروشوں نے
تقسیم کر لیا تھا، حجاز، عراق، شرق اردن کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے بنا کر برطانوی تولیت میں دے دیئے گئے تھے۔ حضرت مدنیؒ کے نزدیک آزادئ ہند ملت
کے نقطۂ نظر سے ممالک اسلامی کی آزادی کا واحد ذریعہ تھی۔ اس لیے آپ نے مدینہ طیبہ جانا مفید نہیں سمجھا اور یہیں مصروف کار ہو گئے۔ جیسا کہ آپ کے عربی کے
اس فقرہ سے وجہ اقامت ہند مترشح ہوتی (وانی ایضا حسب الارادۃ الالٰهیۃ سافرت الی اقصی الدیار الهندیہ) آپ
کلمۃ الحق ارض مقدسہ سے آزادی ہند کا پروانہ لے کر وارد ہندوستان ہوئے اور کارکنان قضا و قدر کے فیصلہ ازلی کے مطابق حضرت شیخ الہند کی تحریک آزادی
مشن کی کامیابی کا سہرا ان حضرات کے سر بندھا۔ ان میں سرفہرست نام شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ کا ہے۔

مولانا آزاد کے دارالعلوم کلکتہ کی صدارت

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر اپنے شیخ اور مرشد کی اطاعت کا وہی غلبہ ہے جو سلف صالحین
کا ابن حجرؒ کے ساتھ اور علامہ ابن قیمؒ کا علامہ ابن تیمیہ کے ساتھ اور علی ہیثمی کا اپنے شیخ
کے ساتھ تھا۔ علماء رسوم کو بڑا دھوکا ہوا کہ انھوں نے حاشیہ نشینی اور حاضر باشی کا نام ارادت و محبت رکھا۔ حالانکہ ارادت و محبت کا معیار اطاعت شعاری اور
رضاجوئی اور مرضئ محبوب کے سامنے تسلیم و رضا کے سوا دوسری اور کوئی چیز نہیں ہے۔ شیخ الہند نے اپنے بجائے حضرت مدنی کو دارالعلوم کلکتہ کی صدارت کے لیے
اور رخصت کرتے وقت شیخ الہند نے حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لگایا، سینے سے چمٹایا اور تمام بدن پر اس کو پھیرا۔ اس وقت کا منظر بھی
جو ان ناسوتی آنکھوں سے وراء الورا، واقفین رموز طریقت کے نزدیک عطار فیض روحانی کی خاص صورت تھی، جس کے شواہد سلف سے متوارث ہیں۔ حضرت مدنی
خدمت شیخ سے جدا ہونا حد درجہ شاق تھا جس کے لیے سب کچھ قربان کر چکے تھے۔ زندگی کے آخری لمحات میں اس سے جدائی دردانگیز سانحہ تھا۔ بعض حضرات
شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق کے دعویدار تھے۔ جب شیخ الہند نے مامور فرمانا چاہا تو یہ عذر کر کے جان چھڑالی کہ اس حالت میں جدائی شیخ سخت دل پر
ہے۔ حالانکہ اسارت مالٹا میں اس مفارقت کو خندہ پیشانی سے برداشت کر چکے تھے۔ بلکہ بعض تو وہ تھے کہ جنھوں نے ذلت آمیز جد و جہد کر کے خطرۂ رفاقت سے
جان بچائی تھی یہ واقعات نہ صرف شیخ الہند کی جانشینی کی غمازی کرتے ہیں بلکہ نص ہیں کہ آپ کے سوا کسی اور پر یہ منصب نہ صادق آیا اور نہ آنا چاہیے تھا خود وا
قصہ کس کو یاد نہیں۔ اصل محبت اطاعت و وفاکیشی میں ہے۔ چنانچہ آپ کی مجاہدانہ زندگی، خلوص، ایثار، صداقت، حق پرستی، فراخ حوصلگی، ملنساری، تواضع
وخاکساری اور آپ کا علم و عمل، زہد و تقویٰ وغیرہ ایسے اوصاف و کمال تھے کہ جو لوگ شیخ الہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے حضرت مدنی کو حقیقی جانشین قرار دیا
سچ ہے " یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا " عربی شاعر کہتا ہے۔

بِجِدٍّ لا بِجَدٍّ کُلُّ مَجْدٍ ؛ وَمَا جَدٌّ بلا مَجْدٍ بِجِدٍّ

ہرطرح کی بزرگی کوشش سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ اس کے باپ دادا بزرگ تھے۔ اور نہ کوئی دادا بزرگی کے بغیر دادا بننے کے قابل ہے۔

صدارت دار العلوم دیوبند شیخ الحدیث

دار العلوم دیوبند کی مسند صدارت اور منصب شیخ الحدیث ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس کے سامنے دنیا کی تمام وجاہتیں اور اعزازات ختم ہیں۔ دار العلوم دیوبند کی بنیاد جب رکھی گئی تو خدا جانے وہ ساعت کتنی سعید تھی اور بانیان دار العلوم کا کتنا خلوص تھا کہ دار العلوم کی منصب صدارت پر اور منصب شیخ الحدیث پر جو حضرات فائز ہوتے رہے ہے۔ وہ علم وعمل جہد وایثار، اخلاق وکردار کے لحاظ سے عالم اسلام کے ممتاز ترین اور منتخب روزگار انسان ثابت ہوئے۔ ان کی سیرت وکردار اور علمی وعملی شان کو دیکھ کر بے اختیار سلف صالحین کی یاد تازہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرون اولیٰ میں پہنچ گئے ہیں۔ پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے تو دوسرے شیخ الہند ان کے بعد علامہ انور شاہ محدث کشمیری کی باری آئی تو ان کے بعد قرعہ فال حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی پر پڑا۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے وقت کے جامع الصفات انسان تھے۔ ان کے علم وتحقیق کو دیکھ کر جہاں غزالی ورازی یاد آتے ہیں۔ وہاں زہد وتقویٰ کو دیکھ کر احمد بن حنبل رح کا زہد وتقویٰ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ سلوک وتصوف میں جنید رح وشبلی رح نظر آتے ہیں۔ جہد وایثار میں سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ غرضیکہ دار العلوم دیوبند میں درس وتدریس کا سلسلہ ایسے یگانہ روزگار افراد میں رہا جو جامع الصفات تھے اور مختلف الانواع کمالات رکھتے تھے۔

۱۳۲۶ھ میں ایک اجلاس جس میں دار العلوم کی ترقی پر غور وخوض ہو رہا تھا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد قاری محمد طیب صاحب) نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اگر مولوی انور شاہ صاحب کشمیری، مولوی سید سہول بھاگلپوری، مولوی سید حسین احمد مدنی، مولوی عبد الصمد کرت پوری وغیرہ یہ حضرات یہاں آکر جمع ہو جاتے تو دار العلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوتی۔ حضرت شیخ الہند نے یہ بات بہت پسند فرمائی۔ اگرچہ اس بارے میں سکوت فرمایا لیکن نہ جانے کیا باطنی تصرف کیا کہ یہ سب اشخاص بغیر کسی ظاہر جد وجہد کے یکے بعد دیگرے دار العلوم پہنچ گئے۔

چونکہ مبداء فیاض کو حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرے وقت عظیم الشان کام لینا تھا۔ لہٰذا آپ مستقل طور پر ابتداء میں دار العلوم سے متعلق نہ رہ سکے چنانچہ جب حافظ محمد احمد وشیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما کی خواہش کے پورا ہونے کا وقت آیا تو خداوند قدوس نے ۱۹۲۷ء میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو دار العلوم دیوبند کی رفیع مسند علم پر مستقل طور پر جلوہ افروز فرمایا اور دار العلوم دیوبند نے آپ کی سرپرستی وصدارت میں جو علمی ترقی کی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ دار العلوم کی مسند علم پر دوسرے اکابر علماء ومحدثین عظام جلوہ افروز رہے اور اس دور میں بھی دار العلوم کے دار الحدیث میں حدیث کی شمع روشن ہوئی اور اس پر جان نثار پروانے آئے اور انہوں نے اپنی جان شمع حدیث پر نثار کی۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اس مدنی محدث نے جب شمع حدیث روشن کی تو اس پر اسقدر پروانوں کا ہجوم ہوا اور دار الحدیث علم وعرفان کے تابناک ستاروں سے اس قدر جگمگایا کہ دیوبند کی تاریخ میں اس کی نظیر ممکن نہیں۔

دار العلوم نے اپنی مدت ۹۴ سال میں جو فضلاء پیدا کئے ان کی تعداد (۶۶۳۰) ہے۔ اس میں سے (۵۶۰۸) صرف مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ باقی (۲۷۴) دیگر مشائخ رحمہم اللہ کے برصغیر پاک وہند کا شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہوگا۔ جہاں پانچ دس جید علماء حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد موجود نہ ہوں۔

درس حدیث

۱۳۴۶ھ سے قبل آپ نے دار العلوم دیوبند میں مختلف اوقات میں متعدد اونچی کتابوں کا درس دیا اور ہزاروں تشنگان علوم کو سیراب کیا لیکن ۱۳۴۶ھ سے آپ نے مستقل طور پر درس حدیث ہی دیا۔ ۳۲ سال کا یہ عرصہ دار العلوم میں علوم نبویہ کی خدمت میں گزارا آپ

نے صحاح ستہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۵۶ھ) کی صحیح بخاری اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۷۹ھ) کی سنن ترمذی۔ دو کتابوں کو اپنے کے لیے منتخب فرمایا۔ صحیح بخاری کی وجہ انتخاب تو ظاہر ہے کہ وہ بالاتفاق اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ رہا سنن ترمذی کا انتخاب تو اس کتاب کی چند خصوصیات ہیں جو بقیہ کتب صحاح ستہ میں نہیں۔

خصوصیاتِ سننِ ترمذی

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ روایت کو بیان کرنے کے بعد اس کے درجہ کو ذکر کرتے ہیں یعنی صحیح، حسن غریب وغیرہ، روایت کے سلسلہ میں جرح و تعدیل کرتے ہیں۔ اگر کسی راوی میں کوئی ضعف ہے تو اس کو ذکر کرتے ہیں۔ احادیث میں اگر کوئی لفظ نادر غریب الاستعمال آتا ہے تو اس کے معانی کو ذکر فرماتے ہیں۔ تعارض روایات کو دور کرتے ہیں۔ اگر روایات میں الفاظ فقہیہ ہوں تو مذاہب اربعہ کو ذکر کرتے ہیں پھر آپ ترجیح دیتے ہیں، اگر کوئی راوی کنیت کے ساتھ معروف ہے تو اس کا نام ذکر کرتے ہیں۔ انکے قبائل کو ذکر کرتے ہیں۔ وجوہ استدلال کو ذکر کرتے ہیں اور اس میں مکررات بہت کم ہیں۔ آخر میں کتاب العلل ہے چونکہ ترمذی میں منافع بہت زیادہ ہیں اور اس کی ترتیب الواب فقہیہ پر ہے۔ اس کے مؤلف شافعی المسلک ہیں علمائے ہند حنفی ہیں۔ اس وجہ سے ان روایات پر جو بظاہر حنفی مذہب کے خلاف ہیں مکمل بحث کرنا پڑتی ہے اور حدیث کو فقہی انداز سے پڑھانے کے لیے سنن ترمذی کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس لیے سنن ترمذی کو بقیہ کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اسباق میں اکثر ترمذی کو شامل رکھتے تھے۔ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی لیے سنن ترمذی باقاعدہ اپنے درس میں رکھی۔

سلسلۂ سندِ حدیث

استاد جب شاگردوں کو پڑھاتا ہے تو اس سلسلہ میں اپنی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے اساتذہ کا سلسلہ سند اور امام المحدث شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں سے امام بخاری رح، امام ترمذی اور دوسرے محدثین تک پہنچتا ہے۔ پھر تیسرا سلسلہ ائمہ حدیث سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور یہ تیسرا سلسلہ صحاح ستہ کی کتابوں میں مذکور ہوتا ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا سلسلہ سند اس طرح ہے۔

۱۔ مولانا حسین احمد مدنی عن محمود حسن دیوبندی عن محمد قاسم نانوتوی و رشید احمد گنگوہی عن شیخ عبد الغنی دہلوی عن شاہ محمد اسحاق دہلوی عن شاہ عبد العزیز دہلوی عن الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلوی۔

۲۔ مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ محمود حسن عن مولانا محمد قاسم نانوتوی و مولانا رشید احمد گنگوہی (دونوں) عن شیخ عبد الغنی دہلوی و شیخ احمد سعید دہلوی و مولانا احمد علی سہارنپوری (تمام) عن شاہ محمد اسحاق دہلوی، عن شاہ عبد العزیز دہلوی عن شاہ ولی اللہ قدس اللہ اسرارہم۔

۳۔ مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ محمود حسن دیوبندی عن علامہ محمد مظہر نانوتوی و مولانا قاری محمد عبد الرحمٰن انصاری (دونوں) عن شاہ محمد اسحاق رحمہم اللہ آخر تک۔

۴۔ مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ مولانا عبد الغنی و مولانا خلیل احمد سہارنپوری (دونوں) عن مولانا رشید احمد گنگوہی و مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ آخر تک

۵۔ قال الشیخ الاجل السید حسین احمد مدنی عن شیخ التفسیر حسب اللہ الشافعی المکی و مولانا عبد الجلیل براده و مولانا عبد السلام داغستانی مہاجر مدینہ منورہ و مولانا سید احمد برزنجی مفتی الشافعیہ مدینہ منورہ رحمہم اللہ اجمعین۔

راس المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نور اللہ مرقدہٗ سے امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ و امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلۂ مشہور

لے کتاب میں کسی دوسری جگہ سند حدیث کا ذکر نہیں ہوا۔ اکثر علماء دیوبند کی سند یہی ہے

معروف ہیں۔ اور کتب مذکورہ میں طبع ہو چکا ہے اور اس سے اگلا سلسلہ سند روایت میں مذکور ہوتا ہے۔ اس طرح حضرت مدنی پانچ طریقیں سے اپنا سلسلہ سند نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہنچاتے تھے۔ اور یوں سلسلہ سند محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو جاتا ہے۔

رعایت آداب علوم نبویہ علوم کتاب وسنت کے عظیم الشان آداب ہیں جن کی رعایت کرنا ہر معلم کو ضروری ہے چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ ان تمام آداب کی مکمل رعایت فرماتے۔ مختصر طور پر چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

آپ کا مقصد علوم نبویہ سے شہرت، عزت وجاہ واحترام نہ تھا۔ بلکہ آپ کا مقصد فقط جناب باری تعالیٰ کا امتثال امر اور خوشنودی تھا۔ نیز آپ چاہتے تھے کہ علوم نبویہ کی نشر واشاعت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا کہ امت میں علماء زیادہ تعداد میں پیدا ہوں اور جہلاء کی تعداد کم ہو۔ اللہ کے بندوں کو راہ راست پر لایا جائے اور دین الٰہی وسنت نبوی کی خدمت کی جائے۔

دوسری چیز معلم کے لیے ضروری ہے کہ معلم وہ طریقہ اپنے شاگردوں کے ساتھ اختیار کرے جو جناب رسول اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اپنے شاگردوں کے ساتھ اس قدر شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے کہ جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

تیسری چیز معلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے متعلمین سے کسی معاوضہ واجر کا طالب نہ ہو۔ کما قال اللہ تعالیٰ۔ قل لا اسئلکم علیہ اجرا۔ (اے پیغمبر! کہہ دیجئے، میں تم سے کسی معاوضہ اجر کا طالب نہیں ہوں) چنانچہ آپ نے مدت العمر اپنے کسی شاگرد سے کسی قسم کا طمع اور لالچ نہ کیا۔ ان اجری الا علی اللہ پر عمل پیرا رہے۔

چوتھی چیز یہ ضروری ہے کہ اپنے شاگردوں کو اخلاق حسنہ کی جانب رغبت دلائے اور برائیوں سے بچنے کی تاکید کرتا رہے۔ چنانچہ آپ درس میں ہمیشہ سختی کے ساتھ ان دونوں باتوں کا حکم دیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت پڑتی تو ترش لہجہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرماتے۔ ایک طرف تو شاگردوں پر شفقت کا یہ عالم کہ ان کے جوتے تک سیدھے کرتے۔ دوسری طرف اگر کوئی خلاف شرع امر اس سے سرزد ہو جاتے تو پھر عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔

پانچویں چیز یہ ضروری ہے کہ شاگردوں کو موعظہ حسنہ کے ذریعہ سے نصیحت کرے چنانچہ آپ ہمیشہ موعظہ بالحسنہ ہی فرماتے تھے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ معلم متعلمین کی قوت اذہان کے موافق علوم بیان کرے جس قدر کہ وہ تحمل کر سکیں چنانچہ آپ بحکم آقائے نامدار انا معشر الانبیاء امرنا ان ننزل الناس منازلھم ونکلم الناس بقدر علومھم پر پوری طرح عمل فرماتے تھے۔

نیز یہ سب سے زیادہ ضروری اور اشد ہے کہ معلم کے قول وفعل میں مطابقت ہو۔ دوسروں کو جس کی تعلیم دے تو پہلے خود اس پر عامل ہو۔ آپ کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا فرمان لم تقولون ما لا تفعلون کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو ہوگا جس کے علم نے اسے نفع نہیں دیا۔ نیز قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت اس آدمی کو ہوگی۔ کہ جس کے علم کے سبب دوسرے لوگ جنت میں داخل ہو جائیں اور یہ اس پر عمل نہ کرنے کی بناء پر دوزخ میں ڈالا جائے — ہمیشہ رہتا تھا۔ لہٰذا آپ کے قول وفعل میں اعلیٰ درجہ کی مطابقت تھی۔ آپ کا عمل تفسیر شریعت تھا۔ جس کو دنیا نے دیکھا۔ آپ کی زندگی ایک کھلی کتاب کے مانند دنیا کے سامنے ہے۔ کسی قول وفعل میں تخالف نہیں پایا۔

علوم نبویہ کی نشر واشاعت کرنے والے کے لیے یہ بھی سب سے ضروری ہے کہ وہ دوسرے اہل علم کا احترام کرے اور سلف صالحین سے عقیدت رکھے اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرے۔ چنانچہ آپ پوری زندگی اس پر عمل پیرا رہے

درس کے وقت ضحک، ہزل نہ ہوتا بلکہ حلم، وقار، رفق اور عادات کے ساتھ پیش آتے تھے۔ درس میں ہمیشہ باوضو رہتے اور خوشبو استعمال فرماتے تھے۔ متعلمین سے دوران درس بے تکلفانہ خطاب فرماتے اور بحکم حدیث نبوی۔ انما انا لکم مثل الوالد لولدہٖ۔ میں تمہارے لیے مثل

والد کے ہوں۔ انتہائی شفقت سے پیش آتے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ دارالحدیث میں ایک مشفق باپ اپنی اولاد سے مخاطب ہے۔ دوران درس لطیف مذاق بھی فرماتے لیکن اس کے باوجود دارالحدیث میں مکمل سکوت و سکون ہوتا۔ اور طلبہ اس طرح ہمہ تن متوجہ ہو کر بیٹھتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔

درس کی احادیث میں جب آپ تلاوتِ حدیث کرتے تو اس سے پہلے یہ خطبہ مسنونہ پڑھتے تھے۔

طریقۂ درس

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونومن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ اما بعد فان اصدق الحدیث کتاب اللہ واحسن الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالہ وکل ضلالۃ فی النار۔

قرأۃ حدیث کے بعد اسناد حدیث کے متعلق تحقیق فرماتے۔ راویوں پر فن اسماء الرجال کی حیثیت سے بحث فرماتے اور جرح و تعدیل کرتے۔ مناسب موقعہ پر رواۃ کے حالات بیان فرماتے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سے اگر کسی کا نام آتا تو ان کی خصوصیات ذکر فرماتے۔ اس کے بعد متن حدیث کا مفہوم اس طرح سمجھاتے کہ اچھی طرح سے ذہن نشین ہو جاتا۔ حدیث میں جو مشکل الفاظ آتے۔ ان کی لغوی تحقیق فرماتے۔ حدیث کے مراتب صحیح حسن وغیرہ بیان فرماتے۔ حدیث پر اگر کوئی اعتراض وارد ہوتا تو اس کی وضاحت فرما کر چند قوی اور مستند جواب دیتے۔ تعارض حدیث کو اس طرح دور فرماتے کہ یقین کرنا پڑتا کہ ان میں کبھی تعارض تھا ہی نہیں۔ ہر حدیث کا صحیح اور عمدہ محل بیان فرماتے۔ اگر کوئی حدیث کسی جگہ مختصر آتی تو دوسری جگہ جو تفصیل آتی ہے۔ وہ بیان فرماتے۔ تراکیب نحویہ، تعیین مقامات، خصائص کتب۔ فن حدیث کی اصطلاحات کی تشریح، علل احکام، امور شرعیہ کے عقلی و مشاہداتی دلائل، صحابی کی احادیث مرویہ کی تعداد، وجہ تخصیص مذاہب ائمہ اربعہ دیگر علوم و فنون کی اصطلاحات کی تشریح، احادیث منسوخہ کی مکمل بحث، فرضیت احکام کی تواریخ و شان نزول، فرق حقہ و باطلہ کے مذاہب کی تشریح معہ دلائل، تفسیر آیات، تشریح معجزات، مستند قصص انبیاء۔ ابحاث متعلقہ ایمان، وجہ تسمیہ سور قرآنی، عصمت انبیاء، احوال ائمہ حدیث، شرائط معمول بہا محدثین۔ اثبات قدرۃ الہیہ۔ احادیث کے عنوان سے تحت عنوان احادیث کی مطابقت شعب ایمان وغیرہ کو مفصل بیان فرماتے۔ اگر کوئی حدیث متعلق فقہ آتی تو تفہیم حدیث کے بعد اختلافات ائمہ بیان فرماتے اور ہر امام کے جملہ دلائل بالتفصیل بیان فرماتے اور سب سے آخر میں مذہب حنفی کو قوی دلائل سے مزین فرماتے اور دلائل کو معہ حوالہ جات بیان کرتے اور دیگر ائمہ کے دلائل کے چند قوی جوابات دے کر مذہب حنفیہ کو حدیث سے مطابق فرماتے تھے۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا کہ حنفی مذہب احادیث نبویہ کے بالکل مطابق ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو تفقہ فی الدین میں دستگاہ کامل حاصل ہے۔

مراتب صحابہؓ، تابعین و تبع تابعین، فقہ، حدیث، مذاہب محدثین، اسامی محدثین، رواۃ حدیث کے مساکن و اوطان، انساب محدثین۔ کنیات صحابہ و تابعین و اتباعہم، قبائل رواۃ، محدثین کی عمریں، ان کی ولادت، وفات، القاب فی الاسانید، زیادۃ الفاظ فقہیہ بزیادہ راوی، اولاد صحابہؓ، علل حدیث رواۃ شاذ، الفاظ غریبہ کی تشریح، طبقات محدثین، ذکر مدلسین، مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ جملہ لوازم درس حدیث کا آپ دوران درس التزام فرماتے تھے۔ غرضیکہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث کتاب و سنت اور اس کے پورے متعلقہ علوم و فنون پر حاوی ہوتا تھا۔

خصوصیاتِ درس

۱۔ دورانِ درس جب کسی نبی کا اسمِ گرامی آتا تو علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والتسلیم فرماتے اور اگر کسی صحابی کا نام تنہا آتا تو رضی اللہ عنہ، اور اگر سندِ حدیث میں دوسرے اکابر کے ساتھ آتا تو رضی اللہ عنہ، وعنہم فرماتے اور اگر ائمہ مذہب علماء و اولیاء سلف کا نام آتا تو بالالتزام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے۔ بشرطیکہ وہ اہلِ سنت والجماعت سے ہوں۔ اس پابندی سے خود بھی عمل فرماتے اور طلبہ کو بھی تاکید فرماتے تھے۔

۲۔ دورانِ درس طلبا جس قدر بھی سوالات کرتے۔ آپ ان کے تسلی بخش جوابات عنایت فرماتے۔ حالانکہ روزانہ اوقاتِ درس کا ایک کثیر حصہ اسمیں صرف ہوتا تھا۔ ان سوالات میں درس سے غیر متعلق سوالات بھی ہوتے تھے۔ مگر آپ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیتے اس سے یہ مقصد ہوتا تھا کہ متعلقین کو مسائل کماحقہ ذہن نشین ہو جائیں اور کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔ سوالات وجوابات کا یہ طولانی سلسلہ آپ کے درس کے علاوہ اور کسی درس میں نہیں ہوتا تھا۔

۳۔ کسی موقعہ پر اگر استشہادِ کلامِ عرب کی ضرورت واقع ہوتی تو آپ متعدد اشعار اور بے شمار عبارتیں کتب لغت کی بلا تکلف بیان فرماتے۔ اس وقعہ پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ لغت وادب کی کتابیں کھلی ہوئی ہیں اور بلا تکلف انکو پڑھتے جا رہے ہیں۔

۴۔ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری شریف کے ختم کے موقعہ پر جب آپ اپنے مخصوص لہجہ میں آخری حدیث حدثنا احمد بن اشکاب قال حدثنا محمد بن فضیل عن عمارۃ بن القعقاع عن ابی زرعۃ عن ابی ہریرۃ (رضی اللہ عنہم) قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلمتان حبیبتان الی الرحمن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔ کی تلاوت شروع فرماتے تو قلوب پر رقت طاری ہونے لگتے تھے اور آپ حاضرین پر روحانی توجہ فرماتے تو تمام لوگ زار و قطار رونے لگتے تھے اور دل کانپ جاتے تھے اور لوگ توبہ و استغفار اس طرح سے کرتے تھے گویا کہ دربارِ خداوندی میں حاضر ہیں اور رو رو کر اپنے گناہوں سے معافی چاہ رہے ہیں اور اس موقعہ پر جو دعا مانگی جاتی تھی۔

آنکھیں اشکبار، دل مضطرب، زبان لڑکھڑاتی ہوئی، رونگٹا رونگٹا کانپتا ہوا۔ غرض، ہر شخص ماہی بے آب کی طرح تڑپتا تھا اور توبہ و استغفار اور دعا کرتا تھا۔ عجیب منظر ہوتا تھا۔ اس کا بیان کس طرح سے کیا جائے۔ اس کے اظہار کے لیے الفاظ کہاں سے لائے جائیں۔

خدا گواہ ہے کہ دار العلوم کے ہر دور میں بخاری ختم ہوئی۔ مگر اس انداز کا ختم بخاری کہاں۔ دار العلوم کی تاریخ میں اس کی نظیر ملنا ممکن نہیں۔ روحانیت کا یہ عظیم الشان منظر شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ آپ کی وفات کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا۔

۵۔ دورانِ درس امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اعتصام بالکتاب والسنۃ کی تلقین ہمیشہ فرماتے۔ متعلمین کے عقائد، اخلاق، اعمال کی اصلاح کے جو مواعظ و نصائح ضروری ہوتے، سب کی تلقین فرماتے۔

شیخ الاسلام اور تحریکِ آزادیٔ ہند

فرنگی اقتدار سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ کئی سو سال سے مسلمان بادشاہ اس ملک کے نظم و نسق پر بلا شرکت غیرے قابض چلے آ رہے تھے۔ انگریز کے اقتدار کے شروع ہی میں انگریزی حکومت کے خلاف علمی اور عملی جدوجہد مسلمانوں نے ہی شروع کی۔ یہ تاریخی حالات تفصیل طلب ہیں اور اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس جدوجہد آزادی میں سب سے نمایاں کردار علمائے حق نے ادا کیا اور گزشتہ دو صد سالہ تحریکاتِ آزادی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ ان تمام تحریکوں کی سرپرستی اور قیادت علمائے حق نے ہی کی۔ اگرچہ بعض امراء و رؤساء اور عوام بھی اس میں حصہ لیتے رہے۔ تاہم یہ ثمرات بھی علمائے حق کی جدوجہد کا نتیجہ تھے۔ علماء پر غیر ملکی سامراج کے خلاف کام کرنے کا دوہرا فرض عائد ہوتا تھا۔ ایک کتاب وسنت کے عالم ہونے کی حیثیت سے۔ دوسرا ہندوستانی اور

محب وطن ہونے کی حیثیت سے۔ اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں بلکہ جہاں کہیں بھی مسلمان بستے ہیں مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی مشکلات کا علاج علما حضرات نے کیا کہ علما کسی خاص نسل یا خاص ملک کے لیے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ حاملین قرآن اور مجاہدین نے قرآن کی روشنی میں انسانیت کی غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کیا ہے اور تنگ خیالی کے طلسم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھول دی ہیں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مجدد الف ثانی ؒ، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، اپنے اپنے زمانے میں نہ صرف علم و فضل کے امام رہے۔ بلکہ دینی سیاست کے مقتضیات کے مطابق دنیا کی رہنمائی اور حجروں سے نکل کر میدانوں کی جادہ پیمائی و نبرد آزمائی انکا اہم کارنامہ ہے۔ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا دربار رشید میں ہونا اور امام زہری کا عبدالملک کے زمانہ سے لے کر یزید بن عبدالملک کی حکومت تک آل عبدالملک کے دربار سے امام شعبی کا قیصر روم کی طرف سفیر ہو کر جانا۔ علامہ ابن حزم کا پانچویں صدی میں وزارت کے بار خطیر کو برداشت کرنا۔ یہ سب واقعات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ علمائے حق ہمیشہ سے عامۃ المسلمین کی سیاسی رہنمائی کرتے چلے آئے ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ابتدائے تعلیم ہی سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ کا مرکز بن چکے تھے اور وہ انھیں اس نہج سے تربیت دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہو کر اسلامیان ہند کی قیادت کر سکیں۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں غربت و تنگدستی نے ان میں جفاکشی اور صبر و تحمل کا مادہ پیدا کیا۔ مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خاص توجہ نے مزید جلا بخشی۔ برسہا برس مدینہ منورہ روضہ اطہر کے پاس بیٹھ کر کتاب و سنت کے درس نے انکو مصفا کر دیا۔ قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خلعت و دستار خلافت بخش کر ان کو جوہر قابل بنایا۔ اور آخر میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں اسارت مالٹا نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اب وہ صرف حضرت مولانا حسین احمد مدنی نہیں رہے تھے کہ کسی خانقاہ کے حجرے میں یا کسی مدرسہ و مسجد کے گوشہ میں بیٹھ کر تنہائی میں اپنا وقت گزار دیں۔ وہ اپنے زمانہ کی تین مایہ ناز شخصیتوں کے پروردہ تھے کہ جن کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ تینوں اپنے زمانے کے سب سے بڑے مسلمان تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے جنید وقت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی بزم عرفان سے بادۂ یثربی سے سرشار ہوئے۔ قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی محفل ارشاد و ہدایت کے صدر نشین قرار پائے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجاہد اعظم کے قدموں میں بیٹھ کر جاں بازی و سر فروشی کا سبق سیکھا۔ اب آپ بیک وقت بزم علم و عرفان کی شمع روشن، محفل ارشاد و ہدایت کے صدر نشین، میدان خدمت و سیاست کے شہسوار، دائرہ تاریخ و اقتصاد کے مرکز، جامعہ شعر و ادب کے پیش رو غرض علم و عمل کی جملہ خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ آپ کا وجود گرامی بن کر رہ گیا تھا۔ اس ابر کرم سے ہر طالب تحقیق بقدر استعداد فیض یاب اور ہر تشنہ کام معرفت بقدر ظرف و پیمانہ سیراب و شاداب ہوتا تھا۔

جوہر علم و صداقت گوہر یکتائے فن	شب چراغ آگہی، سوز و گداز انجمن
مشعل راہ طریقت شمع تہذیب کہن	آبروئے بزم امکاں، عظمت خاک وطن

مرد میدان شجاعت پاسبان عقل و ہوش
سرخی خون شہیداں، سرفراز و سرفروش

پیکر زہد و تقدس، جانشین انبیاء	شان تقدیس امم، ناموس دین مصطفےٰ
رہنمائے عالم اسلام، فخر ایشیاء	یعنی مولانا حسین احمد اسیر مالٹا!

جن کے اٹھتے ہی جبین حادثہ خود جھک گئی
ایک ساعت کے لیے نبض دو عالم رک گئی

اسارت مالٹا سے رہائی کے بعد اسلامیان ہندوستان کے سب سے محبوب قائد حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جنکو لوگ متفقہ طور پر اب شیخ الہند کہنا شروع کر دیا تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد تمام خاندان تمام معتقدین، تمام شاگردوں کا اس پر اتفاق تھا حضرت شیخ الہند کے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں۔

اس زمانہ میں سیاسی تحریکات کا شباب تھا۔ لیڈروں کا شمار نہ تھا۔ مگر تمام سیاسی لیڈروں نے حضرت شیخ الحرم کو شیخ الہند کا جانشین تسلیم کیا اور ہر اخبار جو حضرت مولانا مدنی کا نام شائع کرتا تھا تو آپ کے نام کے ساتھ جانشین شیخ الہند ضرور لکھتا تھا۔

چنانچہ آپ نے صحیح صحیح جانشین ہونیکا پورا پورا ثبوت دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح سنبھال لیا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ کی طرح خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دینے لگے اور عدم تشدد کے راستے پر چل کر حکومت برطانیہ کے خلاف ملک وقوم کی سیاسی تحریکات میں جوش عمل کی روح پھونکنے لگے۔

مقدمہ کراچی

اگرچہ ابھی مالٹا سے تشریف لائے ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے۔ مگر یہ سرفروش رہنما اور کتاب وسنت کا ترجمان پھر ملک وملت کے لیے عظیم قربانی دینے کے لیے تیار تھا۔

چنانچہ ۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی خلافت کانفرنس ہوئی جس میں حضرت شیخ نے ایک تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ

"گورنمنٹ برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی اعانت کرنا سب حرام ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے"

شرکاء کانفرنس نے یہ تجویز پسند کی اور پاس کر دی۔ یہ تجویز اخبارات میں آئی۔ کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ غرض پورے ملک میں شور مچ گیا۔ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ اب حضرت شیخ اور شرکائے کانفرنس گرفتار کر لیے جائیں گے۔ مگر فوری گرفتاری عمل میں نہ آئی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند میں گرفتاری کی افواہ پھیلی اور دیوبند کے تمام لوگ مضطرب و بے چین ہو گئے۔ ہر شخص کی زبان پر تھا کہ ہم حضرت کو گرفتار نہیں ہونے دیں گے۔ بعد دوپہر ایک انگریز افسر کچھ مسلح پولیس لے کر دیوبند پہنچا اور شام کو حاکم پرگنہ اور مقامی تھانیدار کو لے کر مسلح پولیس کے ساتھ نکلا۔ عوام کو فوراً پتہ چل گیا سارا بازار بند ہو گئے اور لوگ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں میں انگریز افسر کے خلاف اتنا اشتعال پھیلا کہ وہ اس کو قتل کرنے پر تیار ہو گئے اور سرکاری افسر جو وارنٹ لے کر آئے تھے، مکوں اور تھپڑوں سے حملہ کر دیا۔ اتنے میں حضرت شیخ اور دوسرے ذمہ دار حضرات آگئے اور انھوں نے بمشکل تمام افسروں کو بچا کر تہہ خانہ میں بند کر کے تالہ لگا دیا۔ پولیس باہر تھی۔ مگر ان کو حکم دینے والے بند تھے۔ مجمع مطالبہ کر رہا تھا کہ انکو ہمارے حوالے کر دو۔ حضرت مدنی نے ان جوشیلے عوام کو پند ونصیحت کے سرد جام پلا کر ٹھنڈا کیا اور ان کو اس شرائط پر راضی کیا کہ پولیس اب رات کو گرفتار نہیں کریگی۔ بلکہ صبح کو ہم خوشی خوشی اپنے محبوب قائد کو جلوس کی شکل میں اسٹیشن پہنچا کر ریل میں بٹھائیں گے۔ ڈپٹی کلکٹر اور انگریز افسر نے یہ شرائط مان لیں اور لوگ رات کے گیارہ بجے منتشر ہو گئے۔

لیکن انگریز افسر نے سہارنپور اطلاع بھیجدی کہ دن میں مولانا مدنی رح کو گرفتار کرنا ناممکن ہے۔ فوراً گورا یا گورکھا فوج بھیجدی جائے تاکہ رات ہی رات انکو گرفتار کر کے دیوبند سے لے جایا جاسکے۔ ورنہ قصبہ میں اتنا بڑا ہنگامہ ہوگا جس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملے گی۔ چنانچہ سہارنپور سے رات ہی ایک سپیشل گاڑی میں گورا اور گورکھا فوج پہنچ گئی۔ سب ہی لوگوں کو یقین تھا کہ رات کو بڑی فوج آئے گی کچھ لوگ پہرہ دے رہے تھے۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہو گیا کہ فوج نے شہر کے اہم مقامات اور شاہراہیں روک دی ہیں اور حضرت شیخ　　کے مکان کا پورا محاصرہ کر لیا۔ حضرت شیخ گھر سے باہر تشریف لائے اور اپنے

آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء سے خالق دینا ہال کراچی میں حضرت شیخ اور دوسرے شرکاء کانفرنس کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی اور حضرت شیخ نے عدالت کے روبرو وہ تاریخی بیان دیا جو ہندوستان کی سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ میں مولانا آزاد کے قول فیصل کی طرح ایک عظیم مقام رکھتا ہے۔ اس بیان میں حضرت شیخ نے مولانا محمد علی جوہر کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان ایک مذہب پرست ملک ہے۔ یہاں کے باشندے مذہبی تعصب میں دوسرے ملکوں سے بہت آگے ہیں۔ اسی لیے ہندوستان کی حکومت کے لیے مذاہب کی رعایت کرنا نہایت ضروری سمجھا گیا ہے۔ مدبرین برطانیہ اور ملکہ وکٹوریہ نے اس کو راز سمجھا اور یقین جان لیا کہ ہندوستان میں امن امان قائم رکھنا مذہبی آزادی پر مبنی ہے۔ اس لیے ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے وہ اعلان شائع کیا گیا جس کا حوالہ مسٹر محمد علی نے دیا ہے۔ جس میں مذہبی آزادی پوری پوری تسلیم کی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کی مداخلت کسی وقت بھی جائز نہیں رکھی گئی۔ اس میں صاف کہا گیا ہے کہ کسی مذہبی کام کرنے والے کو ستایا نہیں جائے گا۔ اسی وجہ سے اب تک امن و امان قائم رہا ہے۔ میں اس اعلان پر توجہ دلانے کے بعد اپنی شخصیت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

میں دو حیثیتیں رکھتا ہوں۔ میری ایک حیثیت یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور دوسری حیثیت یہ ہے کہ میں عالم دین ہوں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں قرآن کریم کے تمام ٹکڑوں، حرفوں اور کلمات پر پورا ایمان رکھوں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام پر یقین رکھوں۔ چنانچہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر کوئی بھی دنیاوی طاقت قرآن کریم کے کسی حرف یا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم سے کسی کو روکے تو وہ ہرگز ہرگز نہ رکے۔ جب کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے۔ تو اس کو قرآن کریم کے تمام احکام پر یقین کرنا اور عمل کرنا ضروری ہوگا"

سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے قرآن پاک اور سنت رسول اللہ سے دلائل و براہین پیش کرتے ہوئے کہ ہر مسلمان پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت لازمی اور ضروری ہے اور یہ کہ ہر ایسی حکومت کی اطاعت نہیں کرنا چاہیے جو خدا اور رسول کی مخالفت کرتی ہو فرمایا۔

"میری حیثیت عالم اور مذہب اسلام کے محافظ ہونے کی ہے۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں اپنا فرض پورا کروں۔ یہ فرض ہر عالم پر فرض ہے کہ قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام ہر شخص تک پہنچائے۔ چنانچہ قرآن کریم کی کئی آیتیں پڑھ کر ترجمہ کر کے بتایا کہ خدا کا حکم یہ ہے اور کہا۔

"پیغمبروں کے بعد علماء کا یہی طریقہ ہے۔ علماء کی بات پر کوئی توجہ کرے یا نہ کرے۔ علماء کا فرض ہے کہ حق بات لوگوں تک پہنچائیں۔

حضرت شیخ نے فرمایا۔

کہ "اب میں اس ریزولیوشن کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قرآن شریف میں مسلمانوں کے قتل کرنے کی سزا

جس قدر سخت ذکر کی گئی ہے۔ کفر کے بعد کسی گناہ کی اس قدر سخت سزا ذکر نہیں گئی۔ حضرت نے اس جگہ دس بارہ قرآنی آیات اور اسی قدر احادیث اس کی دلیل پیش کیں۔

اس مقام پر مجسٹریٹ نے حضرت شیخ سے کہا کہ اب بھی کچھ باقی ہے۔ میں نے آپ کا وعظ خوب سن لیا۔ بس اب ختم کیجئے۔

حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے نوٹ لکھ لیے ہیں۔ ان کے متعلق عرض کر رہا ہوں اور یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ رزیولیشن خالص مذہبی ہے۔

مجسٹریٹ نے کہا کہ اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ آپ پورا قرآن شریف سنا دیں۔

حضرت نے فرمایا کہ میرا بیان تو سننا پڑے گا اور بیان شروع کر دیا۔

بخاری شریف اور دیگر کتب صحاح سے کئی احادیث پڑھیں اور مطلب بیان فرمایا۔

ہال میں عجب کیفیت پیدا ہو گئی۔ تمام سامعین حضرت کا منہ تک رہے تھے اور ہر آدمی کی زبان پر تھا مرحبا! جزاک اللہ! یہ تیرا ہی کمال ہے کہ تو تلواروں کے سائے میں حق کی صدا بلند کر رہا ہے۔

مجسٹریٹ — میں نے بہت غور سے آپ کی تقریر سُنی۔ اب ختم کر دیجئے۔

حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا کہ میں نے ابھی خلافت اور ترک موالات کا مسئلہ نہیں چھیڑا۔ صرف فتوی ہی کا ذکر کر رہا ہوں۔ پھر فرمایا کہ اچھا میں اپنا بیان جلد ہی ختم کرتا ہوں اور بیان شروع فرما دیا۔ بہت سی حدیثیں پڑھ کر ثابت کیا کہ

"انگریز کی فوج میں بھرتی ہونا، بھرتی کرانا، انگریز کی فوج میں بھرتی ہونے کا مشورہ دینا، انگریز کی فوج کی امداد کرنا، یعنی جنگی قرضہ دینا سب حرام ہے۔"

سامعین حضرت والا کی تقریر سن کر رزگئے۔ ان دنیا والوں کو تو یقین تھا کہ حضرت اپنے بچنے کی فکر فرمائیں گے۔ اپنی تجویز کی تاویل کریں گے۔ بڑے بڑے وکیل حضرت شیخ الاسلام کی صفائی میں بحثیں کریں گے۔ مگر ملت اسلامیہ کا یہ عظیم فرزند اپنی بات کا پکا تھا۔ وطن کی جلیل القدر شخصیت کی زبان سے جو بات نکلی تھی اس پر جاز تھا حضرت مولانا نہ صرف اپنی تجویز کا اقرار کر رہے تھے اور اسے مضبوط و محکم بنا رہے تھے۔ آج امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی سنت کو زندہ کر رہا تھا۔

حضرت شیخ نے فرمایا:۔

"یہ رزیولیشن کوئی نئی بات نہیں ہے مجسٹریٹ صاحب! ہمیشہ سے مذہب اسلام کا یہی فیصلہ ہے اور اٹل ہے۔ اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ یہ ہمارے خدا اور رسول کا حکم ہے۔ اس کی اشاعت کو روکنا مذہب میں کھلی مداخلت ہے۔"

مجسٹریٹ نے کہا۔ اس کی اشاعت کا کیا یہی وقت تھا؟

حضرت والا نے فرمایا:۔

"مجسٹریٹ صاحب! اس کی اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا یہی تقاضہ ہے جس طرح مریض کی سخت حالت دیکھ کر طبیب دوا اور پرہیز میں سختی کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح علماء کا فرض ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی حالت کو گرتا دیکھ کر بہت جلد اس کو سنبھالنے

"دوسری وجہ یہ ہے کہ فتح بیت المقدس کے وقت مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اس جنگ کو صلیبی جنگ کے نام سے موسوم کیا ہے اور مسٹر چرچل نے بھی اس کو صلیبی جنگ کہا ہے"

اب میں ایسی حالت میں صاف صاف کہتا ہوں کہ جو مسلمان عیسائیت کا ساتھ دے گا۔ وہ صرف گنہ گار نہ ہوگا بلکہ کافر ہو جائے گا"

یہ آخری فقرے سن کر لوگ دہاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ بلا خوف عدالت، پولیس اور فوج "حسین احمد مدنی" زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور ہر شخص خواہ یا مسلمان، بے چین و بے قرار نظر آرہا تھا۔ عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت شیخ نے فرمایا۔

"اگر گورنمنٹ کا منشا مذہب آزادی سلب کرنا ہے تو صاف صاف اعلان کرے تاکہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کریں کہ ان کو مسلمان رہنا منظور ہے۔ یا گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا۔ اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی سوچ لیں کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ کیونکہ جب مذہبی آزادی چھینی جائے گی تو سب کی چھینی جائے گی۔ اگر لارڈ ریڈنگ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کریم کو جلادیں، احادیث کو مٹادیں اور کتب فقہ کو برباد کریں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں۔

مولانا محمد علی جوہر بھی اس مقدمہ میں ماخوذ تھے۔ اور اس وقت کمرۂ عدالت میں موجود تھے۔ اس موقعہ پر جب حضرت شیخ مدنی نے اپنی بے مثال [illegible] کا مظاہرہ کیا تو انھوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جا کر حضرت مدنی کے پاؤں چوم لیے۔

بگیر راہ حسین احمد از خدا خواہی ٭ کہ نائب است نبی را و ہم ز آل نبی است

مختصر یہ کہ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی معہ دوسرے رفقاء کے سیشن سپرد کر دیئے سیشن میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء سے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو حضرت شیخ نے مسٹر کینیڈی جوڈیشنل کمشنر سندھ کی عدالت میں بیان [illegible] حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا:۔

"جو قرارداد میں نے پیش کی ہے وہ قرارداد نہیں۔ بلکہ تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے اور مذہبی فرض ہے۔ یعنی خدا کے رسول کا حکم ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا لارڈ ریڈنگ کا کام نہیں۔ بلکہ علماء کا کام ہے۔

آج انگریزی گورنمنٹ کی فوجی بھرتی اس لیے حرام ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کے مارنے کے لیے بھرتی کیا جارہا ہے۔ عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ ہے۔ قرآن شریف میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی سخت ممانعت ہے مسلمان کے لیے مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے۔ اس لیے یہ ملازمت بھی حرام ہے"۔

حضرت نے فرمایا:۔

"ہم اس تجویز کو خدا اور خدا کے رسول کا حکم جانتے ہیں۔ ہم کسی طرح مجرم نہیں ہیں۔ بلکہ ہماری یہ کمزوری ہے کہ ہم اب تک فوجوں میں جا کر خدا کا یہ حکم بیان نہیں کر سکے۔

کمشنر کینیڈی نے کہا بعض علماء کہتے ہیں کہ فوج کی نوکری جائز ہے۔

حضرت شیخ پر انتہائی جلال کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور فرمایا:۔

"اگر کوئی مسلمان عالم دین ہمیں احکام قرآنی کی تعمیل سے روکے گا تو ہم اس کی بات بھی ہرگز ہرگز نہیں مانیں گے۔ کیونکہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے لاطاعة للمخلوق فی معصية الخالق۔
(خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت درست نہیں)

اس پر سرکاری وکیل اور جج نے کہا کہ ہم تعزیرات ہند کے پابند ہیں۔ ہم قرآن و حدیث کو نہیں جانتے۔
حضرت نے فرمایا۔ مَیں قرآن و حدیث کا پابند ہوں اور تمام مسلمانوں کو پابند ہونا چاہیئے۔ مزید فرمایا۔

"مَیں اس بات پر خوش ہوں گا کہ لارڈ ریڈنگ اور لارڈ جارج آج اس بات کا اعلان کر دیں کہ مسلمانوں کو قرآن اور حدیث پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ بات ہمارے لیے خوش آئند ہو گی اور ہندوستان چار ماہ کے بجائے دو ماہ میں آزاد ہو جائے گا اور گورنمنٹ برطانیہ کا پول کھل جائے گا۔

یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو فیصلہ سنایا گیا۔ اسیران اور جیوری کے ارکان نے فوج میں بغاوت پھیلانے یا کسی فوجی کو ملازمت سے باز رکھنے کے جرم سے بری قرار دیا اور جج نے بھی اتفاق کیا۔ البتہ زیر دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ تعزیرات ہند دو سال قید بامشقت کا حکم سنا دیا گیا۔ اور چند دن بعد حضرت کو سابرمتی جیل میں بھیج دیا گیا۔

دو برس کی قید بامشقت کاٹنے کے بعد اب رہائی کا وقت آیا۔ دیوبند میں استقبال کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ہر گھر میں عید کی سی خوشی تھی۔ مگر حضرت شیخ بغیر کسی اطلاع کے رات کی تاریکی میں تن تنہا تشریف لے آئے۔ لوگوں میں جوش تھا۔ جلوس نکالنے پر اصرار تھا۔ لیکن حضرت شیخ نے فرمایا

"جلوس کیسا؟ کیا برطانیہ کو ہم نے شکست دے دی۔ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں۔ بلکہ اس بات کا رنج ہے کہ برطانیہ جیتا اور ہم ہارے۔ کبھی شکست خوردہ لوگ بھی جلوس نکالا کرتے ہیں۔ ماتم کرو ماتم وغیرہ وغیرہ"

ان الفاظ کو سن کر لوگ رنجیدہ ہوئے اور چپ ہو گئے۔

اسی طرح ہندوستان کے دوسرے مقامات پر حضرت کی آمد پر جلوسوں کے پروگرام بنائے گئے۔ مگر حضرت نے تمام کو سختی سے منع کر دیا کہ شیخ نمود و نمائش کی خاطر کوئی کام نہ کرتے تھے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا مدنی نے دیکھا کہ ملک کی حالت ابتر ہو چکی ہے۔ فرقہ وارانہ سیاست پروان چڑھ رہی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ چند دن پہلے تک ملک کے تمام باشندے ایک پلیٹ فارم پر جمع تھے اور متحد تھے۔ مگر آج سب جدا جدا ہو چکے تھے۔ انگریزی حکومت جو عوام کے اتحاد سے کل تک پریشان تھی۔ آج بے حد مضبوط اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بڑے بڑے علمبردار فرقہ واریت میں مبتلا ہو چکے تھے اور انگریز کی ذلیل پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کامیابی سے چل رہی تھی۔ ملک کے بہت سے مقامات پر ہندو مسلم بلوے ہو رہے تھے چنانچہ حضرت شیخ نے ملک کا اندازہ پوری طرح فرمایا تو سہارنپور کی جامع مسجد میں تقریر فرمائی جس میں وطن کی محبت تھی۔ آزادی کی لگن تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات قلبی رنج کے اثرات تھے۔ اتحاد کا پیام تھا۔ مگر ہندوستانی عوام انگریز کے جال میں پھنس گئے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ نے فرمایا:۔

"یہ تمام قصّے انگریز کے اشارے پر ہو رہے ہیں۔ بہت جلد اس جال سے نکلو اور ملک کی آزادی کی جدوجہد کرو یہ بات قابل غور ہے کہ ان تحریکات سے تم کمزور اور حکومت طاقتور ہو رہی ہے۔ تمہاری نااتفاقیاں تم سب کو مصائب میں مبتلا کر دیں گی۔ اگر تم نااتفاقی کے جال میں پھنسے رہے تو تم ہمیشہ غلام رہو گے اور پوری دنیا

تم کو ذلیل سمجھے گی۔"

اس تقریر کے بعد حضرت شیخ نے غازیانہ انداز میں پورے ملک کا دورہ کیا اور عوام کے جلسوں میں جوشیلی تقریریں کیں۔ مگر پورے ملک پر تحریک خلافت کی ناکامی کا گہرا اثر تھا۔ ملک کا ہر لیڈر مایوسی سے تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل سے تک رہا تھا۔ خود حضرت شیخ بھی بعض حالات سے متاثر تھے۔ قید کی مشقت کا بھی اثر تھا کہ جیل سے رہا ہوئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے اور قید و بند کے مصائب کا اثر زائل نہ ہوا تھا۔ مگر ملک کے حالات کا تقاضہ تھا کہ آپ کوکناڈا" میں جمعیۃ علماء کے اجلاس کی صدارت کریں۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی کہ حکومت برطانیہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور سخت ہو چکی ہے۔ مگر کوکناڈا کے اجلاس میں حضرت شیخ نے ثابت کر دیا کہ شیر زخمی ہونے کے بعد ہمت نہیں ہارتا۔ بلکہ ہر ضرب کے بعد پہلے سے زیادہ بہادر اور دلیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس اجلاس کا خطبہ صدارت انتہائی سخت ہے اور جس جرم پر دو سال کی سزا ہوئی تھی۔ اسی کو پوری قوت سے دہرایا گیا ہے۔

حضرت شیخ نے اپنے خطبۂ صدارت میں اعلان فرمایا:۔

اجلاس کوکناڈا کی صدارت

"برٹش گورنمنٹ کی ناپاک پالیسی، ہندوستانی فوجوں سے اپنی اغراض کے لیے مسلمان قوموں اور ان کے دار و دیار، مال و منال اور عزت و آبرو پر ہتھیار اٹھواتی ہے۔ انکو قتل کرواتی ہے۔ انکو ہر طرح پامال کراتی ہے۔ اگر کوئی فوجی اس امر کو حلال جان کر کرے گا تو حسب احکام شریعت کافر ہو جائیگا۔ اگر حرام جانتا ہوا خوف یا دنیاوی طمع کی وجہ سے اسکا مرتکب ہوا ہے تو سخت گنہ گار اور فاسق ہوگا۔ وہ استحقاق اس کا رکھتا ہے کہ نہ اس کی توبہ قبول ہو اور نہ اس کو کبھی دوزخ سے نکالا جائے۔ چنانچہ متعدد آیات بے شمار احادیث اور فقہائے کرام کے اقوال موجود ہیں۔ مگر چونکہ حاجات معاشیہ نادار ہندوستانی مسلمانوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر ان گناہوں میں مبتلا ہوں۔ اس لیے ان کے اور پولیس وغیرہ کے ایمان اور دین کی سلامتی فقط اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہندوستان آزاد ہو۔

حضرت شیخ الاسلام نے مزید فرمایا:۔

ضروری اور فرض ہے کہ متذکرہ پالیسی کی بنا پر اس گورنمنٹ سے مقابلہ کیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی عزت و شوکت کو کم اور اس کی قوت کو توڑنا کیا جائے اور یہی اعلیٰ درجہ کی جنگ اس گورنمنٹ کے ساتھ ہوگی۔ ہندوستان کی مکمل آزادی، سوراج انگلستان کی موت کے مترادف ہے۔

حضرت شیخ نے سوال فرمایا:۔

"لیکن کیا یہ انگریز سے مقابلہ صرف مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے کیا جائے۔ یا صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے لیے؟"

پھر آپ نے خود ہی فرمایا:۔

"نہیں۔ پورے ہندوستان کے لیے۔ مغرب کے مقابلہ میں تمام مشرق کے لیے یہ جنگ ہونا چاہیئے۔"

نہ صرف ہندوستان کی مکمل آزادی بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کا مطالبہ

حضرت شیخ نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا یہ اعلان دسمبر ۱۹۲۳ء کو کناڈا میں جمعیۃ العلمائے ہند کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے اس وقت فرمایا جب کہ بڑے سے بڑا لیڈر ہوم رول قبول کرنے کے لیے قریب قریب تیار ہوگیا تھا مگر حضرت نے ملک کے لیڈروں سے الگ ہندوستان کی مکمل آزادی ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ کانگرس نے مکمل آزادی کا مطالبہ اس کے چھ سال بعد اپنے لاہور کے اجلاس میں کیا۔ مگر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے کمال جرات کرتے ہوئے ۱۹۲۳ء میں اس کا مطالبہ کر دیا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آج جب سیاسی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اس میں بڑی شدومد سے یہ لکھا جاتا ہے کہ کانگریس نے ۱۹۲۹ء میں مکمل آزادی کی قرار داد پیش کی اور مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

سائمن کمیشن کی آمد، نہرو رپورٹ اور حضرت مدنیؒ

۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا کہ ہندوستان کی دستوری حکومت کے لیے سفارشات کرے۔ مگر حضرت شیخ نے جگہ جگہ تقریریں کیں اور بتایا کہ دستور تو ہندوستان کی حکومت کا اور بنائے انگریز۔ ایسے دستور کو کسی طرح پسند نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا سب سے پہلے فیصلہ اور تحریر حضرت مدنی نے کیا۔ بالآخر کانگریس اور دوسری تمام جماعتوں کا بھی یہی فیصلہ ہوا کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور بائیکاٹ کیا گیا۔ اس کے بعد ملک میں ایک جماعت بنی اور اس نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کا دستور حکومت ہندوستانیوں ہی کو بنانا چاہیے چنانچہ کانگریس اور دوسری جماعتوں نے مل کر ایک کمیٹی بنائی۔ اس کا صدر موتی لال نہرو کو چنا گیا اور یہ نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی نے جو دستور حکومت بنایا وہ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ مگر اس رپورٹ میں بھی ہندوستان کی مکمل آزادی کا تصور نہ تھا۔ اس لیے حضرت شیخ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دستور ناقص اور ناقابل عمل ہے۔ ہم مکمل آزادی کے سوا کسی دستور کو نہیں مانیں گے اور کسی طرح مکمل آزادی سے کم پر راضی نہ ہوں گے۔

ساردا ایکٹ اور اس کی مخالفت

ابھی مذکورہ بالا سیاسی کشمکش چل رہی تھی کہ برطانیہ نے ایک قانون ساردا ایکٹ کے نام سے پاس کیا جس میں نکاح کے لیے عمر کی تحدید کر دی گئی تھی کہ اس سے کم عمر میں نکاح نہیں ہوگا۔ چونکہ یہ صریحاً اسلامی تعلیمات کے منافی تھا۔ لہٰذا اس کے بارے میں حضرت مدنی کی سرپرستی میں علمائے فیصلہ کیا اس کو نافذ نہ ہونے دیا جائے اور پورے ملک میں اس کی مخالفت کی جائے۔ جمعیۃ علماء ہند میدان میں آئی اور سول نافرمانی کا ریزولیشن پاس کیا اور پورے ملک میں علماء نے اس قانون کو بے اثر بنانے کے لیے مخالفت کرتے ہوئے بے شمار چھوٹے چھوٹے بچوں کے نکاح پڑھوا دیئے اور جیل جانے پر راضی ہوگئے۔ چنانچہ ساردا ایکٹ تھوڑے دنوں میں بے اثر بنا دیا گیا اور اب تک ہندوستان میں بے اثر ہے۔

۱۹۲۸ء ہندوستان میں سیاسی دور کا سن ہے۔ اس میں بے شمار سیاسی جماعتیں بنیں اور انھوں نے مختلف مطالبات کئے۔ مگر شیخ الہند کے سچے جانشین کو صرف ایک ہی دھن تھی کہ ہندوستان کو مکمل آزادی ملے چنانچہ اگلے سال ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور میں مکمل آزادی کی قرار داد منظور کی اور یوں کانگریس نے چھ سال بعد وہی کام کیا جس سے حضرت مدنی ۱۹۲۳ء میں فارغ ہو چکے تھے۔

---

* نخی جناب حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ مرقدہٗ نے اپنے بیٹوں کے کمسنی میں نکاح پڑھائے اور یوں اپنے گھر میں اس قانون کی مخالفت کی۔

کانگریس کے ساتھ باضابطہ تعاون برائے مکمل آزادی

حضرت شیخ نے اس دوران پانچ چھ برس بنگال اور آسام میں بسر کیے
آپ جس زمانہ میں سلہٹ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اسی
میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم انقلاب آیا اور بزرگوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور یہ اختلاف
اتنا بڑھا کہ حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن
حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیتیں دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئیں۔ ان حالات میں دارالعلوم میں جو اتنا بڑا خلا پیدا ہوا۔ اُسے پُر کرنے کے لیے حضرت مہتمم
صاحب مولانا حافظ محمد احمدؒ، اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم کی نظر حضرت شیخ پر پڑی۔ ان حضرات نے حضرت کو دارالعلوم
بلا کر بے حد اصرار کیا کہ آپ دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئیں۔ حضرت کا انکار تھا۔ مگر ان حضرات کے بے حد اصرار پر صدر مدرسی کا منصب اس شرط پر قبول
پر تیار ہو گئے کہ آپ سیاسی تحریکات میں بدستور حصہ لیتے رہیں گے۔ دارالعلوم کی جانب سے اس پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ بہرحال آپ دیوبند تشریف لے آئے
پورے ہندوستان میں اسلامیانِ ہند کی سیاست کی سرپرستی و قیادت کرتے رہے۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر فرماتے تھے کہ مکمل آزادی کے بغیر ہندوستانی
مصائب کا حل ناممکن ہے۔

چنانچہ کانگریس یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نازک وقت میں حضرت مدنی کی ذات گرامی قدر تھی۔ جو آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے
کہا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے۔ وہی برسرِ اقتدار آتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے باشندوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ اور مسلمانوں کو
کے لیے کانگریس کی شرکت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جمعیت علماء ہند کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مراد آباد میں کیا گیا۔ جنگِ آزادی کی خاطر کانگریس میں شرکت کا
گیا۔ کہ اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اس بارے میں تعاون کیا جائے اور جمعیۃ علماء ہند نے ایک مستقل دائرہ حربیہ قائم کیا۔

حضرت مدنی اور سلوک و تصوّف

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حیاتِ طیبہ جب ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے
میں اکثر صحابہؓ بہت سی صفات کے جامع تھے وہ بیک وقت صف شکن مجاہد تھے
مدبر و سیاست دان تھے۔ عمال حکومت تھے، مرشد و شیخ تھے۔ اپنی گوناگوں صفات و خصوصیات کی بنا پر ان میں۔ ایک ایک کئی کئی کے برابر تھا یہی وجہ ہے کہ
میں قلیل ہونے کے باوجود کسی شعبہ حیات میں کسی کلیدی جگہ کے لیے بھی کام کے افراد کی کمی نہ تھی۔ انھیں حضرات کرام کے بارے میں علمائے امت کا بیان ہے

بالليل رهبان وبالنهار فرسان - رات مصلے پر گزرتی اور دن گھوڑے کی پیٹھ پر

اس امت مرحومہ میں بعد میں بھی ایسے ایسے جامع لوگ پیدا ہوتے رہے۔ جو بیک وقت زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کر سکتے تھے اور کرتے رہے
اس آخری دور میں حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید انہی لوگوں میں سے تھے۔ جو بیک وقت مسند ارشاد و ہدایت کے نشین بھی تھے اور معرکہ حق و باطل کے
جانباز سالار بھی۔ دارالعلوم دیوبند نے بھی ایسی کئی شخصیتیں پیدا کیں۔ جن میں سرفہرست نام بانیان دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید
احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی
حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ امت میں ایسے لوگ تو بے شمار پیدا ہوتے۔ جنھوں نے کسی خاص شعبے کمال
مہارت حاصل کی اور شہرت و عزت کے بلند مقام پر فائز ہوئے۔ مگر جامع انسان خال خال پیدا ہوئے۔
دوسرے بزرگوں کے حالات اسی کتاب میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ یہاں پر حضرت مدنی کے حالات اختصاراً ذکر کئے جا رہے ہیں۔ حضرت مدنی
رسوخ فی العلم والسیاسۃ کے متعلق شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا شعبہ تہذیب اخلاق کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی بہت عالم ہو

بشکر ہو۔ مگر اس کی اپنی زندگی نمونہ کی زندگی نہ ہو۔ اور دنیا کے اکثر و بیشتر لیڈر اور نام نہاد علماء اسی زمرے میں آتے ہیں۔ انسان کو ذاتی طور اپنی تہذیب کرنے کے لیے تزکیہ نفس کرنا پڑتا ہے۔ جسے آج کل کی اصطلاح میں سلوک و تصوف کی راہ بھی کہا جاتا ہے چونکہ آج کل یہی اصطلاح معروف ہے۔ لہٰذا ہم نے اسی کو عنوان بنایا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن میں چار ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم

اٰیٰته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة

تلاوت قرآن، تزکیہ نفس، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت۔ تزکیہ کو دل کی صفائی، اعمال کی پاکیزگی، اصلاح باطن، خلوص نیت اور تہذیب اخلاق بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

"بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"۔۔۔ "میں اس لیے آیا ہوں تاکہ عمدہ اخلاق کا اتمام اہتمام کروں۔"

عالم یا لیڈر بننا بڑا آسان ہے۔ لیکن اپنے آپ کو اس ڈھنگ میں ڈھال لینا کہ سر مو سنت نبویہ علیہ التحیۃ والصلوٰۃ سے انحراف نہ ہو نا بڑا مشکل ہے۔ بہت کم ہیں جو از خود اپنی اصلاح کر سکیں۔ اگر جسمانی امراض کا علاج کوئی خود بخود طب کی کتابیں پڑھ کر نہیں کر سکتا تو باطنی امراض کا بھی خود علاج نہیں ہو سکتا۔ بہت سی امراض ہیں کہ انسان جن کو مرض ہی نہیں سمجھتا۔ تکبر اور غرور کا نام خودداری اور عزت نفس رکھ دیتا ہے۔ اس کو خودی کا رنگ دے دیتا ہے۔ بعینہ جس طرح ایک پاگل اپنے آپ کو پاگل نہیں کہتا۔ بلکہ اپنے آپ کو عقل مند اور دوسروں کو پاگل قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ کسی صاحب نظر سے تعلق پیدا کیا جائے بات تھی کہ کتاب کے ساتھ صاحب کتاب کو بھیجا گیا۔ ورنہ صرف کتاب ہی تو بھیجی جا سکتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہاں کس قدر لطیف انداز میں اس کی ح کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"توفیقِ الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔ مگر سب سے پُرامن اور آسان راہ یہ ہے کہ رہنمایانِ طریق میں سے کسی صاحب ارشاد کی ہمت و صحبت حاصل ہو جائے۔ (تذکرہ)

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے۔ جو ان کا اپنا تجربہ و مشاہدہ ہے اور امر واقعہ۔

؎ مولوی ہرگز نہ شد مولائے رُوم　　٭　　تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اور یہ بھی غالباً انہی کا فرمودہ ہے:۔

؎ یک زمانہ صحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سابق میں گزرا کہ انھوں نے یہ راہ ابتدا ہی میں طے کر لی تھی اور اس سلسلہ میں انھیں اپنے وقت کے سب سے بڑے شیوخ مرشدوں کے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی نہ صرف صحبت و بیعت حاصل ہوئی۔ بلکہ یہ ان کی آرزو و مراد کا ثمرہ ہیں۔ لیکن حضرت مولانا کی زندگی کا یہ پہلو عام لوگوں کی نگاہوں میں نمایاں نہ ہو سکا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں شیخ الحدیث اور دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس سمجھا اور بہت سے لوگوں نے انھیں ایک سیاسی لیڈر خیال کیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تیسری حیثیت شیخ و مربی ہونے کی ان دونوں حیثیتوں سے بڑی تھی۔ مگر انھوں نے اس کو بہت کم ظاہر ہونے دیا اور اس روپ میں بہت کم ظاہر ہوتے اور اپنے آپ کو ہمیشہ اخفا میں رکھا۔

درویشی اور ولایت

درویشی اور ولایت کیا ہے ؟ درویشی نبوت کا عکسِ جمیل ہے۔ فضائلِ نبوت کا روشن مظہر ہے۔ لیکن نبوت کیا ہے ؟ شاید آپ یہ سوال کریں تو نبوت کی تعریف میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول سامنے رکھیے کہ نبوۃ الی الحق توجہ الی الخلق کی صفت کے کمال کا نام ہے۔ اُسے اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ نبی وہ ذات ہے جو ہر وقت خدا کی طرف متوجہ رہے اور خلقِ خدا پر بھی نظر حق کی طرف توجہ کرنے سے خلقِ خدا کی طرف سے اس کی توجہ کم نہ ہو اور خلقِ خدا کا خیال حق کی لگن میں خلل انداز نہ ہو۔ نبی ہر آن حق سے بھی واصل ہوتا ہے خلق میں بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی ایک نکتہ میں نبوت کے سارے کمالات و فضائل جمع ہیں۔

اب دیکھیے ولایت کیا ہے ؟ جو انسان اس صفت میں جتنا زیادہ نبی سے قریب ہوتا ہے۔ وہ درجہ ولایت کے اتنے ہی بلند مقام پر فائز ہوتا ہے اسلام سے پہلے — اور ایک طبقہ آج بھی — یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے بندوں کو چھوڑ کر۔ خدا کی دنیا کو چھوڑ کر حق کی لگن میں پہاڑوں اور ویرانوں میں مراقبہ کرنا ہے۔ یا سسکتی ہوئی انسانیت ظلم و استبداد میں دبے ہوئے سماج اور ریاست کی بے انصافیوں میں تڑپنے والے عوام سے بے تعلق ہو کر بے نیاز ہو کر کرنا دلوں کے تزکیہ کے لیے روحانی اوراد و ظائف کی تعلیم دینا۔ بے روزگاری اور جن بھوت اتارنے کے نقش تقسیم کرنا — بس یہی ولایت ہے۔

حالانکہ نبی جہاں توجہ الی الحق کی وجہ سے عبادت اور ریاضت کرتا ہے۔ شب بیداری میں خدا کو یاد کرتا ہے۔ ذکرِ الٰہی کے لیے خلوتوں کی تلاش کرتا ہے۔ وہاں وُہ خلقِ خدا پر بھی کامل نظر رکھتا ہے۔ انسانوں کے دکھ درد میں ان کے کام آتا ہے۔

فرعونی اقتدار ہو یا قریش کا استبداد — اس سے مظلوم انسانیت کو نجات دلانے کے لیے ہر قسم کی جدوجہد کرتا ہے۔ سماجی بے انصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ لوگوں میں عادل جج بن کر بھی بیٹھتا ہے اور اچھا معلم بھی۔ اچھا شہری بننے کی بھی تعلیم دیتا ہے اور یہودی جیسے دشمن حق پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کی بھی تلقین کرتا ہے۔

جب نبوت میں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا مکمل احساس شامل ہوتا ہے تو پھر ولایت کو بھی ہمیں اسی معیار پر پرکھنا پڑے گا۔ کیونکہ اولیاء کرام تک اپنا سلسلہ پہنچاتے اور ان کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔

ہم ولی اور درویش اسے نہیں مان سکتے جو اجتماعی ذمہ داریوں سے بھاگتا ہو جو ملک پر قبضہ جمائے ہوئے ظلم و استبداد کے خلاف کشمکش کرنے سے گریز کرتا ہو جو عوام کی خدمت کے کاموں کو دنیاداری کہتا ہو۔ تمدن و سیاست کے ہنگاموں سے گھبراتا ہو۔ جب یہ بات صاف ہوگئی کہ ولایت کیا ہے کہ اللہ الٰہی ہو اور عوام کی خدمت بھی۔ اور خدا کی محبت بھی ہو اور بندگانِ الٰہی کا درد بھی۔ آخرت کا فکر بھی ہو اور ملک و قوم کا خیال بھی۔ تو آئیے۔ اسی معیار پر مدنی درویش کو دیکھیں موجودہ دور کے اس درویش کامل کی شان ہے کہ عبادت و ریاضت میں وہ جنیدؒ و شبلیؒ ہے۔ علم و فضل میں بخاری و رازی ہے۔ اصلاح و تدبیر میں وہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے۔ خدمتِ خلق میں وہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ اور بہت کچھ ہوتے ہوئے بے حد متواضع اور خاکسار ہے۔

مدنی درویش — سفروں میں جاڑے کی راتوں میں پلیٹ فارم پر کسی کونہ میں مصلے پر کھڑے ہو کر تہجد میں مشغول ہے۔ خدام گزارش کرتے ہیں حضرت ویٹنگ روم میں کیوں نہ ٹھہرے ہو گئے ؟ تو جواب ملتا ہے لوگوں کی نیند خراب ہوتی۔ مجھ جیسے شیخی خورے اور روسیاہ انسان کو کیا حق ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو پریشان کرے۔

۱۲ بجے رات کو بخاری شریف کا درس دے کر فارغ ہوتے ہیں۔ سیدھے مہمان خانے میں تشریف لاتے ہیں۔ مہمانوں کے بستر اور تکیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ایک دیہاتی مہمان کو تکلیف میں پاتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص حقہ کا عادی ہے۔ فوراً چلم لے کر جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اسے حقہ بھر کر دیتے ہیں

حق کی طرف توجہ کا یہ حال کہ ایک قدم شریعت و سنت کے خلاف نہیں اٹھتا۔ منہ پر اگر کوئی تعریف کرتا ہے تو کھڑے ہو کر اسے روک دیتے ہیں۔ مجال نہیں کہ سٹیج پر کوئی شاعر شیخ کی مدح میں کوئی قصیدہ پڑھے جہاں کسی نے تعریف میں زبان کھولی اور جمالی درویش کا جلال بھڑک اٹھا۔ بندگی کا اتنا گہرا رنگ کہ اگر کوئی عقیدت کے جوش میں ہاتھ چومنے کے لیے ذرا جھکے تو ہاتھ کھینچ لیں۔ کسی کو پیر دبانے کی اجازت نہ دیں اور خود رات کو سوتے میں اپنے مہمانوں کو ہمیشہ دبانے رہیں۔ پھر توجہ الی الخلق کا یہ عالم کہ بندگانِ الٰہی کو انگریزی سامراج نے ظلم کی چکی میں پستا ہوا دیکھا تو پوری قوت سے آزادیِ وطن کے لیے میدان میں اتر آئے۔ ذکرِ الٰہی اور محبتِ رسول پر وعظ فرمایا تو دلوں کو نورِ ایمان سے روشن کر دیا۔ برطانوی سامراج کے مذموم ارادوں اور انسانیت سوز مظالم پر تقریر کی تو کروڑوں میں حریت و آزادی کی تڑپ پیدا کر دی۔

پھر آزادی کی جدّ و جہد، کسی لالچ میں نہیں، کسی عہدے کے لیے نہیں۔ صرف بندگانِ الٰہی کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے۔ وطنِ عزیز کی پیشانی سے غلامی کا داغ مٹانے کے لیے اور صرف "حبِ وطن" کی سنتِ رسول کو زندہ کرنے کے لیے!

کسے معلوم تھا کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بت پرستی سے ناپاک وطن کو ظلم و ستم سے بھرے دشمن۔ وطن یعنی مکہ کو پاک اور محبوب فرمایا تھا۔ مکہ کو چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

ما اطیبک بلد واحبک مکہ! تو کس قدر پاک ہے اور مجھے محبوب ہے۔

یہ محبتِ وطن کا اعلان تھا۔ اسی سنت کو، اس مجاہد نے زندہ کر کے دکھایا۔ اس پر ملک و وطن میں بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ مگر وہ اپنی جگہ مطمئن تھا اور مطمئن رہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہودیوں اور مسلمانوں کو حفاظتِ وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم بن سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادیِ وطن کے لیے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے وطنیت اور قومیت کے نعرہ پر اس شیخ مجاہد کو مطعون کیا تھا۔ انھوں نے پاکستان میں پاکستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم کہا۔ کیا تاریخ اس حقیقت کو فراموش کر سکتی ہے؟

یہ مدنی درویش کی جامع صفات شخصیت کے چند نقوش ہیں۔ جب کوئی اللہ کا بندہ اس ولی کامل مردِ مجاہد، غازیِ اسلام کے حالات پر کچھ لکھنے بیٹھے گا تو وہ بتائے گا کہ :۔

حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کون تھے اور کیا تھے؟

مسندِ ارشاد و ہدایت پر بیٹھ کر شیخ مدنی نے جو کام کیا۔ وہ اتنا زیادہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے کہ ایک شیخ الحدیث، سیاسی لیڈر، اور مدبر و مفکر اپنی ان بے پناہ مصروفیات سے اتنا وقت کیسے نکال لیتا تھا کہ مسترشدین پر بھی توجہ دے سکے اور اپنے لاکھوں مریدوں کے حالات کوائف معلوم کر کے ان کی تربیت کر سکے لیکن یہ ہماری بھول ہے اللہ تبارک و تعالیٰ جب اپنے کسی بندے سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کے وقت میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ نہ صرف برصغیر و پاک و ہند بلکہ دوسرے اسلامی ممالک تک حضرت مدنی کے مرید پھیلے ہوئے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ حضرات جنھیں حضرت سے آگے مرید کرنے کی اجازت ہے جنھیں خلفائے مجاز کہتے ہیں۔ صرف ان کی تعداد ایک سو ساٹھ تک پہنچتی ہے۔

مکارمِ اخلاق

حضرت مدنی کی زندگی کا یہ باب بہت وسیع ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کے فضائل و محاسن کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔ حضرت نے لمبی عمر پائی اور اتنے لمبے عرصہ میں کروڑوں انسانوں سے ملاقات ہوئی۔ ہر کہ و مہ آپ کے حسن و اخلاق کا مداح نظر آتا ہے اور ہر کوئی حضرت کی تواضع، انکساری اور حسنِ خلق کا نیا قصہ سناتا ہے اور اگر ان تمام واقعات کو جمع کیا جائے جو مختلف لوگ بیان کرتے ہیں۔ تو صرف انھی کو قلم بند کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیئے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کا تاثر ملاحظہ فرمائیے۔

"شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین مدنی مدظلہ العالی کے فضل وکمال مرتبہ ومقام پر گفتگو تو وہ کرے، جو خود بھی کچھ ہو۔ مجھے ذاتی تجربہ اور علمی مشاہدہ تو مولانا کے ایک ہی کمال اور ایک ہی کرامت کا ہے اور وہ آپ کی بے نفسی، سادگی، تواضع اور انکساری اور خدمت خلق کا عشق ہے۔ کہتا ہوں اور گویا خانہ شہادت میں کھڑا ہوا بیان دے رہا ہوں کہ وہ بہترین دوست ہیں، بہترین رفیق سفر ہیں، مہمان ہو تو آپ کی میزبانی میں اپنے معمولات کو ترک کر دیں گے۔ روپیہ پیسہ کی ضرورت پیش آئے تو خود قرضدار ہو جائیں گے لیکن آپ کی حاجت ضرور کہیں سے پوری کر دیں گے۔ خدانخواستہ بیمار پڑ جائیے تو تیمار داری میں دن رات ایک کر دیں گے۔ نوکری کی ضرورت پیش آئے۔ کوئی مقدمہ کھڑا ہو، کسی امتحان میں بیٹھ جائیے تو سفارشناموں میں اور عملی دوڑ دھوپ میں نہ اپنے مرتبہ کا لحاظ کریں گے۔ نہ اپنی صحت کا اور نہ خرچ کا۔ جس طرح بھی ہوگا۔ آپ کا کام نکالنے پر تل جائیں گے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ جو معاملہ بھی رکھتے ہوں۔ اپنے خوردوں شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ یہ روش رکھتے ہیں کہ خادم کو مخدوم بنا کر ہی چھوڑتے ہیں۔ حالی کے شعر کے معنے اب جاکر روشن ہوئے ہیں ؎

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا۔ خاکساری اپنی کام آئی۔ بہت سُنا ہے کہ یہ شان محمود الحسن شیخ الہند دیوبندی کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو جانشینی کا حق ان سے زائد کسی کو نہیں پہنچتا۔ فرصت میسر آتی تو اس متن کی شرح بھی اپنے قلم سے کرتا اور پھر نوبت شرح پر حواشی آتی۔ اور ایک مختصر المعانی پر کئی کئی مفصل اور مطول تیار ہو جاتے۔ "

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

جو لوگ علم الاحسان یعنی تصرف وسلوک سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسانی شرف ومجد اور کمال انسانیت کا مدار قوائے فکری وعملی کے اعتدال پر ہے۔ اور فن سلوک میں جن اصول اخلاق سے بحث کی جاتی ہے وہ چار ہیں۔ طہارت، عجز ونیاز، سماحت اور عدالت۔ آخر الذکر وہ ملکہ ہے جب انسان افراط وتفریط سے بچکر فکر وعمل دونوں میں اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ تو عطیہ خداوندی خوش قسمتی سے نصیب ہوتا ہے۔ اس ملکہ کے پیدا ہو جانے کے بعد ایک انسان مجموعہ اضداد بن جاتا ہے۔ لیکن ہر جذبہ اور ہر فعل کا محل الگ الگ ہے اور اس بنا پر اس میں موزونیت اور حسن تناسب پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت امام العصر کی شخصیت کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کا یہی وصف جامعیت سب سے زیادہ نمایاں ہو کر نظر آتا ہے اور اسی بنا پر بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ امام العصر اپنے زمانہ میں انسانی شرف ومجد کے ایک اعلیٰ پیکر ہیں اور ایسے لوگ روز نہیں پیدا ہوا کرتے۔ بلکہ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور بقول مولانا سعید احمد ایم اے اکبرآبادی۔ صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ:۔

کہ میں ہندوستان کے باہر عالم اسلام کے بہتیرے علماء اور مشائخ سے اور ان کے حالات وسوانح سے باخبر ہوں اور ان میں کتنے ہیں جن سے مجھ کو ذاتی ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ اس کے باوجود موجودہ زمانہ میں جامعیت اوصاف فضائل کے اعتبار سے اگر کوئی شخصیت پیر ومرشد بنانے کے قابل ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ہی شخصیت ہے۔ لیکن باایں ہمہ مجھ کو

آج تک نہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل ہوا ہے اور نہ شرف تلمذ۔ اس بنا پر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ وہ محض اندھی عقیدت کا نتیجہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ امام العصر دامت برکاتہم ان افراد میں سے ہیں جو اپنی جامعیت میں ایک پوری امت ہیں۔ اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے پیچھے ہیں لیکن مرتبہ کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔"

داری

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم سے فراغت پاتے ہی اپنے والدین کے ساتھ مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں۔ وہاں پہلے سے نہ کوئی جائداد ہے اور نہ وہاں اپنا کوئی کاروبار چل رہا ہے اور نہ کوئی ذریعہ معاش ہے۔ لوگ ہجرت کر کے جاتے ہیں تو حکومت سے وظیفہ پانے کے خواہش مند ہیں۔ دوسروں کی خیرات و صدقات پر نگاہ رکھتے ہیں۔ مگر مولانا اور مولانا کے والد محترم اسے پسند نہیں کرتے۔ مولانا ایک مدرسہ کی خدمت کرنے لگتے ہیں۔ ل کرتے ہیں اور مولانا کے والد محترم ایک چھوٹی سی دکان کھول لیتے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ ان کے والد ماجد ڈاکٹر رفافت علی نے جو مدینہ طیبہ کے کامیاب ڈاکٹر تھے۔ حد درجہ اصرار کیا کہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالحق صاحب کو بطور ٹیوشن تعلیم دیں۔ لیکن عین اس زمانہ میں جب یہ حالت تھی کہ گھر کے نو آدمی ۳ پاؤ مسور کے پانی پر قناعت کرتے تھے ٹیوشن گوارا نہ کی۔ البتہ اس کے لیے آمادہ تھے کہ بلا کسی معاوضہ حسبۃً للہ جیسا کہ حرم اور طلبہ کو درس دیتے ہیں مولانا عبدالحق کو بھی درس دیتے رہیں۔ طرفین سے یہ امر عجیب تھا۔ اور اس میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب کو سپر انداز ہونا پڑا نا اور بلا کسی معاوضہ کے پڑھاتے رہے۔ اتنی بے تکلفی اور یگانگت کے باوجود ان حضرات کو یہ علم نہ ہو سکا کہ گھر اکثر فاقے ہوتے ہیں اور معلوم اس وقت ہوا جب خوشحالی میں بدل چکی تھی۔

عبادت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شان بندگی اور عبادت تھی۔ اسی لیے عبدہٗ ورسولہٗ کے ممتاز خطاب سے آپ کو نوازا گیا۔ جیسا کہ اللہ رب العزت اپنی شان ربوبیت اور معبودیت میں یکتا اور بے مثل ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبدیت اور بندگی میں کامل اور بے مثال تھے۔ اسی کامل عبدیت نے کمال رسالت اور رسولوں کی سیادت کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ باوجودیکہ آپ محبوب ترین بندے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ساری ساری رات قیام و سجود میں گزار دیتے۔ پاؤں پر ورم آجاتا۔ سوال کرنے پر ارشاد ہوتا۔

افلا اکون عبداً شکوراً —— کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں

اس بیسویں صدی میں محب رسول اور متبع سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم مولانا حسین احمد مدنی کے ذوق عبادت کا وہ لوگ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جنہوں نے ان کی نمازوں کو دیکھا ہے۔ ان کی نماز حقیقی نماز ہوتی تھی۔ جس کو حدیث پاک میں معراج المومنین کے نام سے فرمایا گیا ہے اور جس کو احسان کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے کہ

"وہ اللہ کی اس طرح عبادت کر گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" (بخاری شریف)

جب آپ نماز میں مشغول ہوتے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بندہ سارے عالم سے دستبردار ہو کر اپنے معبود کے ساتھ سرگوشی میں مشغول ہے اور بارگاہ خداوندی ما راب ہے جو آیت بھی نماز میں تلاوت ہوتی تھی۔ سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا وحی نازل ہو رہی ہے اور وہ کیفیت و رقت طاری ہوتی کہ جس کا بیان دشوار ہے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سفر میں ہیں۔ یا سفر کی مشقت برداشت کر کے آئے ہیں۔ اور پھر سفر کرنا ہے۔ مگر جب نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تو شان کے ساتھ پڑھتے کہ گویا نہ پہلا تعب تھا۔ نہ آئندہ کوئی سفر کرنا ہے۔

ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے اور "دل بیار و دست بکار" کے پورے مصداق تھے اور اس کا اندازہ اسوقت ہوتا تھا جب انتہائی سوز و گداز

کے ساتھ۔ یاحییّ یا قیوم برحمتك استغیث باربار پڑھتے تھے۔ وصال سے ایک روز قبل کوئی صاحب دم کروارہے تھے کہ حضرت نے ان قاری سے باربار یہی پڑھا۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا کوئی تکلیف یاد رہی ہے؟ ارشاد فرمایا کہ یہی کیا تکلیف کم ہے کہ آپ حضرات مشغول ہیں اور میں پڑا ہوں۔" عرض کیا گیا حضرت آپ نے تو بہت کام کیا ہے۔ اتنا کام تو ایک جماعت بھی نہیں کر سکتی۔ ارشاد فرمایا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

یک لحظہ غافل ازاں شاہ نباشی ‌ ‌ شاید کہ نگاہے کند و آگاہ نباشی

رمضان کے مہینہ میں ۱۲ بجے تک خود تراویح پڑھاتے۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ آرام فرماتے اور پھر تہجد میں مشغول ہو جاتے اور سارا دن تلاوت قرآن کریم

ایک مکتوب میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اتباعِ شریعت وسنّت

"آپ ذکر اور اتباع شریعت وسنت پر مداومت کرتے رہئیے انشاء اللہ تعالیٰ اصلاح رفتہ رفتہ ہو جائے گی"

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس دور میں شریعت محمدی اور سنت نبوی کا بہترین نمونہ تھی۔ اس لیے ان کی ہر ادا سے انسانیت نمایاں تھی۔ انسانیت دنیا کے سب سے بڑے انسان کے نقش قدم پر چلنے میں ہے۔ جو آدمی دنیا کے سب سے بڑے انسان کی جتنی اتباع کرے گا۔ وہ اتنا انسانیت ہو گا۔ حضرت مدنی چونکہ متبع سنت تھے۔ لہٰذا دیکھنے والا پہلی نگاہ میں بھانپ لیتا تھا کہ واقعی انسان ایسے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی آپ سے ملتا تو آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

وہ ہزاروں لاکھوں ارادت مند جو حضرت سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتے ہیں۔ اس بات کی شہادت دینے میں قطعاً تامل نہیں کریں گے کہ جس مرشد عالم کے ہاتھ سے وہ وابستہ ہیں، اس کے تعلقات کی خوشگواریوں کا معیار صرف یہی ایک تھا یعنی اتباع سنّت۔ اس قطب عالم کے یہاں رسومات قبیحہ کا تو مسئلہ ہی ختم تھا رسومات میں بھی شرکت کے لیے یہ شرط ہوتی تھی کہ مباح کو سنت کا جامہ پہنایا جائے۔ مثلاً تقریبات نکاح میں شرکت کے لیے ضروری تھا کہ سادگی کا پورا لحاظ رکھا جائے حضرت مرحوم سے نکاح پڑھوانا ہے تو لازمی تھا کہ مہر "فاطمی" ہو۔ علماء نے اس میں بہت کچھ بحثیں کیں۔ مگر حضرت کے طرز عمل میں تبدیلی نہ کرا سکے۔ کیونکہ یہ بحث خواہ کچھ ہی مگر اس محبوبیت سے محروم ہے جو مہر فاطمی کی مسنونیت کو حاصل ہے۔

ولیمہ مسنونہ کے لیے حضرت کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ وہ صرف ایک بکری کی مقدار میں محدود رہے۔ گوشت کا شوربہ کیجئے یا پلاؤ پکا لیجئے۔ مگر اس کی مقدار ایک بکری سے زیادہ نہ ہو اور اسی کے بموجب عزیز و اقربا کو دعوت دیجئے۔ کیونکہ سنت مبارکہ کی تائید اسی کو حاصل ہے۔ اس قسم کے معاملات میں فقیہانہ اور مبصرانہ لطافت یہ ہوتی کہ اور زجر و توبیخ غصہ اور خفگی مکروہات تک محدود رہتی تھی۔ مباح پر چشم پوشی ہوتی تھی اور جہاں نشاط اور انبساط کا تعلق تھا۔ وہ صرف مسنون صورت کے لیے مخصوص تھا قریب سے تعلق رکھنے والوں کو بھی یہ فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ اگر مراسم میں احتیاط نہیں برتی جا سکتی تو حضرت شیخ کی خوشنودی میسر نہیں آ سکتی۔ البتہ اگر تقریب میں سنت مبارکہ کی پابندی کا عزم ہے تو دور دراز گاؤں کے باشندے کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ حضرت کو اپنے یہاں نکاح مسنون کی تقریب میں مدعو کرے۔ حضرت بڑے ذوق سے اس کی دعوت منظور فرماتے۔ اس کے یہاں پہنچنے کو پروگرام میں خاص اہمیت دیتے۔ پھر اس پیرانہ سالی میں کچے راستوں اور بیل گاڑیوں کی زحمت برداشت کرتے ہوئے اس کے یہاں پہنچتے۔ نہ بارش کی پرواہ ہوتی نہ گرمی یا سردی کی۔

داہنے ہاتھ سے کھانا۔ چھوٹا نوالہ لینا، اس طرح کھانا کہ برابر کے آدمی کو تکلیف نہ ہو، پلیٹ میں اپنے آگے سے کھانا، منہ اس طرح چلانا کہ آواز نہ ہو، بسم اللہ سے شروع کرنا، دعا مسنونہ پر ختم کرنا، اوّل اور آخر ہاتھ دھونا، کلی وغیرہ کرنا، ہر سنت کا لحاظ تھا اور اگر کسی کو معلوم نہ ہو۔ کہ فلاں کام یا فلاں وقت میں کونسی سنت ہے تو وہ اس وقت حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل دیکھ لے۔ بس وہی سنت ہو گا۔ کھانا کھاتے وقت ساتھ ساتھ ذکر ہوتا رہتا تھا۔ ہر لقمہ پر بسم اللہ کھاتے ہوئے سبحان

...نہ ہمیشہ کا معمول تھا کہ کوئی لقمہ بغیر ذکر کے حلق سے نیچے نہیں جاتا تھا۔ اگرچہ قرآن حکیم نے اجازت دی ہے کہ اکیلے کھاؤ یا ملکر۔ مگر آپ ہمیشہ اپنے ساتھ والے کو اپنی پلیٹ میں ...ک کر لیتے تھے۔ یہ معمول جیل میں بھی رہتا تھا۔ اگر وہاں کوئی ساتھی نہیں ہے تو اے اور بی کلاس والوں کو جو اخلاقی قیدی خدمت کے لیے ملتا ہے۔ اس کو شریک کر لیتے تھے ...لیخ شیخ الاسلام کی زندگی کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالیے۔ اتباع سنت۔ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم محو استغراق فی ذکر اللہ کی وہ روشنی نظر آئے گی جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے ...اس کی ترجمانی سے قاصر اور قلم اس کی نگارش سے عاجز۔

میز کرسی پر کھانا یقیناً سنت کے خلاف ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی وزارت کے ابتدائی دور میں چند حضرات کی دعوت کی اور میز کرسی پر کھانا کھلایا حضرت مدنی کی طبیعت ...میں بشاشت نام کو نہ تھی اور آخر میں اشارہ بھی کر دیا۔ اب مولانا آزاد کا لطیف اور پاکیزہ احساس ملاحظہ کیجیے۔ چند دنوں بعد ان ہی حضرات کی پھر دعوت کی اور فرش ...کھلایا۔ اس دن حضرت مدنی کی طبیعت میں فرحت و بشاشت تھی۔

کوئی شخص سوائے انبیاء علیہم السلام کے پیٹ سے بڑا بن کر نہیں آتا۔ البتہ بڑا بننے کی قابلیت و صلاحیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے۔

...زم و استقلال پھر جو ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور عزم و استقلال اور ہمت و حوصلہ سے کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے۔ وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق ٭ باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

حضرت مدنی کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو عزم و استقلال اور ہمت و حوصلہ کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں۔ جو کام بھی انجام دیا۔ پورے عزم و استقلال اور انتہائی ...ت و حوصلہ کے ساتھ انجام دیا جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ وہ بوڑھے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود ہمت و حوصلہ میں جوان تھے جو تمام جوانمردوں سے سبقت ...لے گئے تھے۔ برطانیہ کا جس شان سے مقابلہ کیا۔ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ حصول آزادی کے لیے جو جدوجہد کی۔ اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں ...حیثیت و وقعت برقرار رکھنے کے لیے جو کارنامے انجام دیئے وہ آپ ہی کا حصہ تھا اور ابھی کچھ اور زندہ رہتے تو بہت کچھ کرتے۔ جو برطانیہ کی سنگینوں سے ڈرنے والا ...نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی حکومت سے کسی طرح مرعوب نہیں ہو سکتا تھا۔ حصول آزادی کے بعد ایک ساتھی نے عرض کیا کہ اب تو حکومت اپنی بن گئی۔ ہنس کر فرمایا:۔ ...ہمارے لیے تو پہلے بھی جیل خانہ تھا۔ اب بھی جیل خانہ ہے۔"

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مدنی کے عزم و استقلال کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ورنہ مظلوم مسلمانوں کی تباہی، مسجدوں، خانقاہوں، ...مدرسوں کی بربادی کس حد تک پہنچتی اور نقشہ کیا سے کیا ہو جاتا ——— ۱۹۴۷ء کے خونی ہنگامہ میں جب ہر شخص کو اپنی اپنی پڑ رہی تھی اور ...مسلمان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ حضرت مدنی پورے حوصلہ کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کو جمانے کی کوشش کر رہے تھے اور پورے وثوق کے ساتھ مسلمانوں کو ...ہند میں رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ایک آہنی دیوار بن کر سہارنپور کی سرحد پر جم گئے اور اس تباہی کے آگے بڑھنے کی پوری روک تھام کی۔ آپ یہاں مسلمانوں کو ہمت و استقلال کا سبق پڑھا رہے تھے۔ وہاں حکومت کی کوتاہیوں پر بھی سخت تنبیہ اور باز پرس فرما رہے تھے۔

اسی دوران آپ نے پنڈت پنت وزیر اعلیٰ یوپی سے سخت غضب ناک لہجہ میں حکومت کے رویہ کے خلاف ڈانٹ دی تو پنڈت پنت نے کہا ۔ "دارالعلوم کی حفاظت کے لیے فوج بھیج دی جائے تو حضرت مدنی نے سخت غصہ میں فرمایا:۔

"دارالعلوم تو خدا کا ہے۔ وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ آپ سہارنپور کی خبر لیجیے۔ اگر آپ مسلمانوں کا تحفظ

٭ اس معمول میں شدت اس لیے بھی تھی کہ چھوت پسند برہمن اور تہذیب نو کا پرستار دونوں ہی اس بارے میں چھوت چھات کے قائل ہیں۔ وجہ جداجدا ہے برہمن کی اور ہے۔ اور اس کی اور مگر عملاً دونوں ایک ہیں۔

کرنے کے بارے میں مذبذب ہیں یا اس میں ناکامی کا اندیشہ ہے تو آپ مجھے اجازت دیں۔ میں مسلمانوں سے
کہدوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کرلیں۔

ان تہدیدی کلمات کے بعد جدید انتظامات مکمل کئے گئے اور فسادات کی بھڑکتی ہوئی آگ آگے بڑھنے سے رکی۔

انہماکِ مشاغل جب انسان بڑے کارناموں سے بڑا بنتا ہے۔ تو جس قدر بڑا انسان ہوگا۔ اسی قدر اس کے مشاغل کثیر ہونگے اور ان ہی کے بقدر انہماک اشتغال ہوگا۔ جو واقعی انسان ہیں وہ ہر وقت انسانی کارناموں میں مشغول رہتے ہیں۔ کھیل کود میں بے کار وقت نہیں گزارتے اور نقلی انسان صرف کھانے پینے والا حیوان ناطق ہوتا ہے۔ ہر انسان چل دیتا ہے اور اس کے اعلیٰ مشاغل اور کارنامے اس کی یادگار رہ جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے روزانہ معمولات اور مشاغل اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

روزانہ شب کو تین بجے تہجد کے لیے بیدار ہوتے اور نماز فجر تک تہجد اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ نماز فجر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک تلاوت کریم اور مطالعہ کتب اس کے بعد مہمانوں کی معیت میں چائے اور ناشتہ پھر تقریباً بارہ بجے تک دارالعلوم میں درس حدیث اور صدر مدرسی کے فرائض کی انجام دہی کے بعد مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماکر تھوڑی دیر قیلولہ فرماتے اور ان کی مختلف ضرورتوں اور گوناگوں مشکلات کو رفع فرماتے۔ کبھی کو سلوک کی تلقین ہو رہی اور کسی کو تعویذ دیا جا رہا ہے اور کسی کے سوالات کا جواب دیا جارہا ہے۔ یہ سلسلہ نماز عصر تک جاری رہتا اور اسی دوران سادی چائے کا دور بھی چلتا تھا۔ عصر سے مغرب تک دارالعلوم میں درس حدیث ہوتا تھا۔ نماز مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ نوافل میں صرف ہوتا جس میں سوا پارہ یومیہ تلاوت فرماتے۔ نوافل کے بعد مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے۔ اسی اثنا میں عشاء کا وقت ہوجاتا۔ نماز عشاء کے بعد دارالعلوم میں تقریباً تین گھنٹے بخاری شریف کا درس ہوتا۔ اس کے بعد مہمانوں کا پتہ فرماتے ہیں یا جاگتے ہیں۔ کسی کو تکلیف تو نہیں۔ اگر کوئی بیمار ہوتا یا کمزور اور تھکا ماندہ ہوتا تو آہستہ سے اس کو دباتے رہتے اور اس کے بعد خود سوتے تو گویا رات کے تین بجے سے لے کر رات کے بارہ۔ ایک تا اکیس بائیس گھنٹے مشغولیت میں گزارتے تھے۔ صرف آدھ گھنٹہ، پون گھنٹہ دوپہر کو آرام ملتا تھا۔ سب سے زیادہ مشغولی کا وقت ظہر عصر کے درمیان ہوتا تھا۔ ڈاک کا انبار سامنے ہوتا تھا اور مہمانوں کا ہجوم پیش نظر جو چالیس پچاس سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک کی ضرورت کا معلوم کرنا۔ پھر اس کو نہایت بشاشت و خندہ پیشانی سے جواب دینا یا پورا کرنا۔ ہر ایک کے حقوق مہمانی کو ادا کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ڈاک بھی اتنی کثرت سے ہوتی تھی کہ بعض دفعہ سینکڑوں خطوط کا انبار سامنے آجاتا تھا۔ اس لیے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ بیک وقت شیخ طریقت بھی تھے اور عالم دین بھی۔ عامل کامل بھی تھے اور سیاسی پیشوا بھی اور ان ہی سب امور کے متعلق تحریری اور زبانی لوگوں کی فرمائش اور استفسارات بھی ہوتے تھے۔ جن کو حضرت پورا فرماتے تھے۔

یہ روزمرہ کے مشاغل تھے جن کو کوئی جوان دو بھی چند روز نہیں نبھا سکتا جو ایک پیر مرد ضعف و بیماری کی حالت میں سالہا سال نبھا گیا اور کر کے دکھلا گیا۔ علی کرامت ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت مدنیؒ اپنے ان تھکا دینے والے مشاغل سے نہ کبھی گھبراتے تھے اور نہ اکتاتے تھے اور نہ کبھی اس کا احساس ہوتا تھے۔ در اصل انکا یقین تھا کہ انسان کام ہی کے لیے بنا ہے اور کام ہی سے انسان بنتا اور سنورتا ہے۔ کثرت اسفار کے باوجود ان مشاغل پر مداومت کسی نے نہ کی ہو اور کیا ہے۔ شاید ہی حضرت مدنی کے برابر کسی نے سفر کیے ہوں۔ سال کا تقریباً نصف حصہ سفر میں گزرتا تھا اور سفر کے مشاغل اور سحر فیض حضر سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں۔

احساسِ فرضِ منصبی وہ شخص بھی بھلا کیا ہے جس میں اپنے فرض منصبی اور ذمہ داری کی ادائیگی کا احساس نہیں۔ جو شخص بھی جس قدر انسانیت سے آراستہ ہوگا۔ اسی قدر اپنے فرض منصبی اور ذمہ داری کی ادائیگی میں چست و چالاک ہوا۔ حضرت مدنی ۲۸ برس دارالعلوم دیوبند کی صدر

ہی کے منصب پر فائز رہے۔ اس دوران جس انہماک اور سرگرمی کے ساتھ آپ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ نے اس عرصہ کے دوران اپنی دوسری بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود دارالعلوم کے انتظامی، تبلیغی اور تنظیمی کاموں میں اس قدر حسن وخوبی کے ساتھ دلچسپی لی کہ دارالعلوم کی ترقی اوج کمال کو پہنچ گئی اور دنیا میں اس کے نام کو روشن کر دیا۔

اسی طرح اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور آخیر میں تو کئی برس سے جمعیۃ کے مستقل صدر تھے۔ یہ صدارت محض خطبہ صدارت پڑھ دینے والی صدارت نہیں تھی۔ بلکہ اس صدارت کی ذمہ داری کا آپ کو پورا پورا احساس تھا اور اسی احساس نے جمعیۃ علماء ہند کو ایسے دور میں بھی سنبھالے رکھا جب کہ اپنے بھی اس کے وجود کو ختم کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس دوران جمعیۃ نے جو سیاسی کارنامے آپ کی سرپرستی میں سرانجام دیئے۔ ان ہی کی بدولت آج عالم اسلام میں مسلمانانِ ہند کا سر بلند رہا ہے۔ اگر حضرت مدنی کی ہستی سیاسی سرگرمیوں میں اسقدر سرگرم عمل نہ رہتی تو کس کو معلوم ہوتا کہ اس تحریک آزادی میں مسلمانوں کا پورا حصہ ہے۔ جس کی بنیاد خود مسلمانوں نے ڈالی۔ اور اپنی جانبازیوں اور سرفروشیوں سے اس کو منتہی تک پہنچایا۔ اور خاص طور پر جب مسلمانوں کی۔ اکثریت نے پاکستان کا مطالبہ کر کے الگ ملک قائم کر لیا۔ اگر حضرت مدنی اور ان کے ساتھی نہ ہوتے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حالت سے اسقدر ابتر ہوتی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پھر دارالعلوم میں صدر مدرسی کے علاوہ شیخ الحدیث ہونے کی وجہ سے درس سب سے اہم سبق بخاری اور ترمذی شریف ہمیشہ آپ کے پاس رہتے تھے۔ روزانہ قیام میں سات آٹھ گھنٹے درس دینا آسان کام نہیں اور پھر دو ڈھائی سو طلبہ کے سامنے بغیر لاؤڈ سپیکر کے آواز پہنچانا معمولی بات نہیں۔ پھر درس بھی پورے انبساط کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر ہر مسئلہ کی تحقیق وتدقیق ہوتی تھی اور ہر طالب علم کے سوال کا جواب تسلی بخش دیا جاتا تھا جس میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ قیام کے دوران کبھی سبق کا ناغہ ہو یہ تو کیا ہوتا سفر میں بھی سبق کا خیال رہتا تھا اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ جلد از جلد واپس پہنچ کر سبق پڑھایا جائے۔ سینکڑوں میلوں کے سفر سے واپسی ہوتی۔ سبق کا وقت ہوتا تو آتے ہی اعلان فرما دیا جاتا کہ سبق ہوگا۔ اب نہ کوئی تکان ہوتی نہ اضمحلال حتیٰ کہ سفر حج سے ایک دفعہ واپسی ہوئی جس کی تکان ہفتوں نہیں اترتی اور دماغ یکسو نہیں ہوتا اور واپسی بھی اس طرح ہوئی کہ جس ٹرین کے ذریعے تشریف لائے۔ وہ دیوبند نہیں رکتی تھی۔ اس لیے رات کو ۱۲ بجے مظفر نگر اترنا ہوا اور وہاں سے بذریعہ لاری دیوبند پہنچے۔ اس طویل سفر سے واپسی رات کی بیداری اور ملاقات کے لیے آنے والوں کا ہجوم پھر بھی سبق کا اعلان ہو گیا اور مسلسل کتنی دیر درس جاری رہا اور اس شان سے بخاری شریف شروع کرائی گئی جو آپ ہی کا حصہ تھی۔

سادگی و بے تکلفی

سادگی اور بے تکلفی بھی اعلیٰ انسانی جوہر ہے۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ سادگی اور بے تکلفی میں یکتائے روزگار تھے۔ شیخ طریقت عالم ربانی ہونے کے علاوہ حضرت مدنی کی ظاہری شخصیت ایک بڑے سیاسی رہنما کی تھی اور ہر سیاسی لیڈر مسلم ہو یا غیر مسلم ملکی ہو۔ یا غیر ملکی۔ آپ کے آستانہ پر حاضری کو ضروری اور باعث فخر سمجھتا تھا۔ اس ظاہری عزت ووقار کے باوجود اپنی درویشانہ شان اور بوریہ نشینی کو برقرار اور سنت نبوی کے موافق سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا۔ صرف آپکا ہی حوصلہ تھا۔ یہاں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ حضرت مدنی کا لباس، وضع قطع، رہائش، بود وباش سب لطیف اور سادہ تھا اور سنت نبوی کا بہترین نمونہ، آپ سنت کے موافق چمڑے کا تکیہ، استعمال کرتے تھے اور چمڑے کا گول دسترخوان استعمال ہوتا تھا جس پر ہمیشہ ایک سالن ہوتا تھا اور دائرے کی شکل میں کم از کم دس بارہ آدمی دسترخوان کے گرد بیٹھ کر ایک ہی برتن میں کھاتے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت بھی ہوتے تھے۔ اور ساتھ کھاتے تھے صبح کو ناشتہ کے ساتھ باسی روٹی اور مرچ کا اچار ہوتا تھا۔ یہی حضرت کا ناشتہ تھا اور یہی تمام مہمانوں کا۔ ایک دفعہ حضرت نے کھانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ہم آپ حضرات کے ہاں جاتے ہیں۔ تو آپ مرغ اور حلوے کھلاتے ہیں اور یہاں باسی روٹی اور مرچ کھانا پڑتی ہے۔ اس پر مولانا احتشام الحسن کاندھلوی جو ان تمام باتوں کے راوی اور محرر ہیں۔ نے فرمایا کہ حضرت باسی روٹی

اور لچار مرغ سے زیادہ مزیدار ہے۔

تواضع اور انکساری

انسان کی انسانیت اور برتری و سربلندی کا اصلی راز تواضع اور انکساری میں مضمر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور رفعت و سربلندی عطا فرماتے ہیں" یہ تواضع و انکساری اصل شان عبدیت ہے۔ جو شخص بھی اپنی حقیقت کا شناسا ہو گا۔ وہ مجسمہ تواضع ہو گا اور کبر و غرور سے بالکل مبرا ہو گا جو عبدیت کے بالکل منافی اور متضاد ہے۔

حضرت مدنی کے متعلق گزشتہ سطور میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر گزر چکی ہے کہ خادم کو مخدوم بنا کر چھوڑتے تھے۔ واقعۃً حضرت مدنی تواضع و انکساری کا ایک مجسمہ تھے۔ کبھی صدر مقام پر نہ بیٹھتے تھے اور ہمیشہ نشست کے لیے مجلس کا گوشہ اختیار فرماتے تھے۔ ہر ایک چھوٹے بڑے کو "آپ" کہہ کر خطاب فرماتے تھے اور ہمیشہ اس انداز سے گفتگو فرماتے تھے کہ "گویا چھوٹا اپنے بڑے سے گفتگو کر رہا ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ گفتگو کا یہی انداز تھا۔ گویا ان کی نظر میں سب بزرگ تھے اور یہ خورد۔ ہر کام کے لیے خود سبقت کرتے اور ہر محنت و مشقت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے۔

بہت تواضع اور انکساری کی وجہ سے اپنے مخالفین و معاندین کا بھی ہمیشہ اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور کسی کو بُرے لفظ سے یاد نہیں کرتے تھے۔ گورنمنٹ برطانیہ جس کی عداوت و نفرت آپ کی فطرت بن چکی تھی۔ اس کو بھی ہمیشہ "ہماری مہربان گورنمنٹ" فرمایا کرتے تھے۔ اگرچہ اس لفظ "مہربان گورنمنٹ" میں طنز ہوتا تھا اور بعد کی تقریر میں گورنمنٹ برطانیہ کی تمام مہربانیوں کا راز فاش ہوتا تھا۔ حضرت مدنی کی یہی خاکساری اور انکساری تھی جس نے مخلوق خدا کو گرویدہ اور شیدائی بنا رکھا تھا اور آپ ہر ایک کے سردار اور سرتاج بنے ہوئے تھے۔

اس انتہائی خاکساری کے باوجود حضرت مدنی وقار و تمکنت کا کوہ طور یا کوہ نور تھے۔ ایک خاص نوع کا ہیبت و جلال چہرے پر عیاں تھا۔ باوجودیکہ حضرت مدنی ہنس ہنس کر باتیں فرمایا کرتے تھے۔ مگر مخاطب کا دل اندر سے لرزتا رہتا تھا اور بمشکل بات کی جا سکتی تھی۔ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی فرماتے ہیں۔ بہر حال میں اپنی نالائقی کی وجہ سے تمام بزرگوں سے بات کرنے کا عادی تھا۔ حتیٰ کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی بلے دھڑک جو جی میں آتا تھا کہہ دیتا تھا اور حضرت کی جانب سے کبھی کسی گرانی یا ناگواری کا کبھی اظہار نہیں ہوا۔

میں نے اکثر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر بزرگوں کی زبان سے یہ فقرہ سنا ہے "حضرت مدنی سے ڈر لگتا ہے" بارہا ایسا ہوا کہ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کسی خاص مقصد اور بات کے لیے دیوبند گئے۔ وہاں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بے تکلف ملاقات ہوئی اور ہنس ہنس کر باتیں ہوئیں۔ مگر مقصد کی بات زبان پر نہ آئی اور واپسی کے بعد فرمایا۔ "حضرت مدنی رحمۃ علیہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی"

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ لباس کے معاملہ میں سخت گاڑھا کھدر پہننے میں بہت متشدد تھے۔ اور ہمیشہ ساری عمر کھدر پہنا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی اشیاء استعمال دیسی استعمال کرتے تھے۔ اور ملنے جلنے والوں سے بھی یہی پسند کرتے تھے کہ وہ دیسی کپڑا پہنیں اور دیسی اشیاء استعمال کریں۔ اس کی ایک وجہ تو غیر ممالک سے درآمد اشیاء سے نفرت مقصود تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت کا منشا تھا کہ ہمارے معاشرہ میں سادگی اور بے تکلفی آ جائے تاکہ زینت و لباس کے معاملہ میں ہمارے ہاں بے اندازہ اخراجات اٹھ جاتے ہیں۔ وہ کم ہوں اور اس دیسی لباس کے بارے میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی میت کو لٹھے وغیرہ کا کفن دیا جاتا تو اس کا جنازہ پڑھ تو لیتے تھے۔ مگر پڑھاتے نہیں تھے۔

بعض جلیل القدر مشائخ طریقت محض اس لیے گاڑھا پہننے کا اہتمام فرماتے تھے کہ شاید حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہو جائے اور ولایتی کپڑے سے ان کو گرانی اور ناگواری ہو۔

ایثار و قربانی

ایثار و قربانی بھی ایک اعلیٰ انسانی جوہر ہے جس سے انسانیت پروان چڑھتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں مومنین قانتین کا وصف بیان کیا گیا ہے۔

"ویوثرون علی انفسہم ولوکان بہم خصاصۃ"

"اور ایثار کرتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر اگرچہ خود ان کے لیے تنگی ہو۔"

حضرت مدنی بھی ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے۔ ان طلبا کے اخراجات کی خود کفالت فرماتے تھے۔ جن کا دارالعلوم سے وظیفہ نہیں ہو سکتا تھا اور اپنے ملنے والوں کی ضرورتوں کو خفیہ طور پر پوری فرماتے تھے۔ بارہا یہ معلوم ہوا کہ اپنے رفقاء سفر کے تمام اخراجات حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ خود برداشت فرماتے تھے۔ سفر کی ضروریات کے وقت سب سے پہلے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ جیب میں جاتا تھا اور بٹوا نکال کر زبردستی جملہ اخراجات وہ اپنے پاس سے پورے فرماتے تھے اور ضرورتوں کو اپنے پاس سے پورا فرماتے تھے اور اس معاملہ میں بہت سختی برتتے تھے اور جو ہدایا دوسروں کی طرف سے آتے تھے، بے دریغ ان کو رفقاء پر خرچ کرتے تھے۔

فیاضی و مہمان نوازی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے

"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس کو چاہیئے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے" (مسلم وشریف)

پس معلوم ہوا کہ مہمان کا اعزاز و اکرام ایمان کا خاصہ ہے اور یہی انسانیت و شرافت کا اصلی تقاضہ ہے کہ اپنے پاس آنے والے کا ہر طرح اعزاز و اکرام کیا جائے اور فیاضی و فراخدلی برتی جائے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی فیاضی اور مہمان نوازی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اپنی آپ ہی مثال تھی جس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں۔ جن کو کبھی حضرت کے آستانہ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ روزانہ کم و بیش چالیس مہمان حضرت کے دسترخوان پر ہوتے تھے جو مختلف خیالات اور مختلف اطراف کے ہوتے تھے۔ حضرت ہر ایک کا پورا پورا اعزاز و اکرام فرماتے تھے اور نہایت فیاضی اور فراخدلی کے ساتھ خرچ کرتے تھے۔ کھانا اگرچہ ایک ہی ہوتا تھا مگر لذیذ اور مزیدار ہوتا تھا۔ حضرت دونوں وقت کا کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے اور خود بھی وہی کھاتے جو مہمانوں کو کھلاتے تھے۔ کھانے میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ جو ہوتا سب کے لیے یکساں ہوتا تھا اور اگر کوئی خاص چیز پکائی جاتی تھی تو سب کے لیے پکائی جاتی تھی۔

رمضان المبارک میں چونکہ مہمانوں کی تعداد سینکڑوں ہوتی اور سب کے لیے دودھ کی کسی چیز کا انتظام نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے حضرت خود بھی دودھ استعمال نہیں فرماتے تھے اور متعلقین کے اصرار پر فرما دیتے۔ اتنا کہاں ہے جو سب کے لیے دودھ کا بندوبست کیا جاتے۔ اگر مہمان بے وقت بھی پہنچ جاتے تھے تو اسی وقت ان کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا۔ اور کبھی مہمانوں کی کثرت سے گھبراتے یا کتراتے نہیں تھے۔ بلکہ کبھی کوئی واقف دوسری جگہ ٹھہر جاتا تھا تو گرانی ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی ناواقف بلکہ مخالف بھی دسترخوان پر بیٹھ جاتا تو اس کے ساتھ بھی پوری بشاشت کا اظہار ہوتا تھا۔

خود کم کھاتے تھے اور دوسروں کو زیادہ کھلاتے تھے اور بعد میں بچے ہوئے سالن کی پلیٹوں کو خود اپنی انگلیوں سے چاٹتے تھے اور دسترخوان پر گرے ہوئے ریزے اٹھا کر تناول فرما لیتے تھے۔ خود آہستہ آہستہ کھاتے تھے تاکہ سب مہمان خوب پیٹ بھر کر کھالیں اور جب سب کھا چکتے تو فرماتے کہ میں ابھی تک کھا رہا ہوں اور تم پہلے ہی فارغ ہو گئے۔ یہ تو اچھا نہیں ہے۔ باصرار اور کھلاتے تھے۔ غرضیکہ اس بارے میں آپ اپنی مثال آپ تھے۔

اس بارے میں ہندوستان کے مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

۱۹۴۶ء میں کمیونسٹ پارٹی کو مسلمان سوال کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر پر سوچنا پڑا اور مجھے اس کام پر مقرر کیا گیا کہ اس کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کروں۔ میں اس مواد کی فراہمی میں دیوبند بھی حاضر ہوا۔ محراب و منبر کے جلوے تو میں نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے۔ خلعت کے مطالعہ کا موقعہ اب ملا۔

جنگِ عظیم کے بعد اشیاء کی گرانی، مولانا کی قلیل آمدنی، بلیک مارکیٹ کا زور، مگر اس سے حضرت مولانا کی مہمان نوازی میں کیا فرق آسکتا تھا اور جب مجھ جیسے انجان اور بے دین کو مولانا نے باصرار اپنے مکان میں ٹھیرایا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ریاست، رشتہ داری، دوستی اور درس و تدریس کے واسطے سے مہمانوں کا کیا ہجوم رہتا ہوگا۔ جب میں مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا تو مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ میں نے بھی مہمانوں کے بڑے کمرے میں ایک چارپائی پر بستر لگا دیا۔

دینداروں کے معمولات سے میں یوں بھی گھبراتا ہوں۔ مگر پہلے دو دن میرے اوپر واقعی بڑے سخت گزرے۔ نمازِ پنجگانہ تک تو خیر میں صبر کر لیتا۔ مگر مولانا کے یہاں تقریباً سبھی قائم اللیل تھے۔ کیفیت یہ کہ عشاء کی نماز کے بعد میں بمشکل گھنٹے بھر سویا ہوں گا کہ کسی کونہ سے تکبیر بالجہر بلند ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کوئی ذکر خفی میں منہمک ہے تو کوئی تسبیح وظیفہ میں۔ تھوڑی دیر میں یہ حضرات تہجد کے لیے اٹھ بیٹھے پھر فجر سے پہلے اور بعد قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جب دوسری رات بھی اسی کیفیت کی نذر ہوئی۔ تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضور کے ساتھ رہنے سے میری عاقبت درست ہو یا نہ ہو مگر میری صحت کو خطرہ ضرور لاحق ہو چلا ہے۔ حضرت نے تبسم فرمایا اور تیسرے دن سے مجھے ایک علیحدہ اور آرام دہ کمرہ مل گیا۔ یعنی اب میں آزادی سے اپنے کمرہ میں رہتا تھا جو مجھے اپنے گھر میں حاصل تھی چنانچہ میں نے مواد کی فراہمی کا وہ کام جس کے لیے میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں مجھے دیوبند کی مجاہدانہ تاریخ کے بہت سے نئے واقعات کا علم ہوا۔

دیوبند کے قیام کی غالباً چوتھی شام تھی کہ میں اپنے بستر پر دراز تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ گھومنے پھرنے کی وجہ سے کچھ تھکن زیادہ تھی چنانچہ لیمپ گل کیا اور سونے لگا۔ دروازہ کھلا رہتا تھا۔ مجھے کچھ غنودگی سی تھی کہ میں نے ایک ہاتھ اپنے ٹخنے پر محسوس کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے کسی نے میرے پاؤں دبانا شروع کر دیئے۔ میں چونکنا ہو گیا۔ دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا بہ نفسِ نفیس اس گنہ گار کے پاؤں دبانے میں مصروف ہیں۔ میری بدحواسی اور شرمندگی کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ میں نے پاؤں جلد جلد سکوڑے اور بڑے ادب اور لجاجت سے حضرت کو روکا۔ مولانا نے اس پر حسرت سے فرمایا۔ آپ مجھے اس ثواب سے کیوں محروم کرتے ہیں۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ آپ جیسے مہمان کی خدمت کر سکوں۔ مجھ پر اس ارشاد کے بعد جو گزری میرے لیے اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ واقعہ یہ بھی سنئے کہ میں بارہ برس بعد آج پہلی بار اس واقعہ کا انکشاف کر رہا ہوں اور اگر حضرت زندہ ہوتے تو اس راز کو فاش کرنے کی ضرورت نہ

ہوتی۔ ان کی فراخدلی اور انکے اخلاق کا یہ ادنیٰ نمونہ تھا۔"

ڈاکٹر صاحب بڑے تعجب اور حیرانی سے بارہ برس بعد اس کا انکشاف کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت نے سوتے میں انکو دبایا۔ اور ان کو معلوم بھی نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت نے جسم دبانے کی باقاعدہ ایک استاد سے مشق بہم پہنچائی تھی کہ اس طرح عمدگی کے ساتھ سوتے ہوئے شخص کو دبایا جائے کہ اس کی آنکھ نہ کھلے۔

احتیاط و تقویٰ مولانا عوام اور پبلک کے مال سے ضرورت اور واجبی مصارف کے علاوہ اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ مولانا کی کفایت شعاری اور احتیاط کا اس سے اندازہ لگائیے کہ مولانا کلکتہ میں ہوتے ہیں۔ انھیں ایک جلسہ میں لمبے سفر کی دعوت دی جاتی ہے۔ دوسرے مدعوین کی طرح مولانا کے لیے سیکنڈ کلاس کے کرایہ ایک خادم ساتھ لانے اور کچھ زائد خرچ کے لیے روپیہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۶ گھنٹے کا سفر ہے۔ مولانا تنہا آتے ہیں۔ کوئی خادم ساتھ نہیں ہوتا۔ تھرڈ کلاس سے سفر کرتے ہیں اور راستہ میں ناشتہ وغیرہ میں کل سات آنے خرچ ہوتے ہیں۔ جلسہ میں پہنچ کر ناظم جلسہ کا دفتر معلوم کرتے ہیں اور وہاں پہنچ کر اپنے اخراجات کو ایک کاغذ پر لکھ کر بقیہ روپیہ جمع کرانے کے لیے رکھ آتے ہیں اور جب واپسی کا وقت آتا ہے تو منتظمین جلسہ سو روپیہ بطور رخصتانہ پیش کرنا چاہتے۔ مولانا انکار فرماتے ہیں اور اتنا ہی لینا گوارا کرتے ہیں۔ جتنا آنے میں خرچ ہوا تھا جب اور زیادہ مجبور کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ کمیٹی کی منظوری اور خوشی سے پیش کیا جا رہا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ کمیٹی میں کتنے ممبر ہیں جواب دیا جاتا ہے۔ ۷ ممبر ہیں۔ مولانا پھر پوچھتے ہیں کہ اس جلسہ میں جو روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ وہ آپ ہی لوگوں کا ہے۔ یا عام چندے سے ہے۔ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ عام چندے سے ہے۔ مولانا فرماتے ہیں پھر آپ حضرات کو اس طرح صرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ لوگ عرض کرتے ہیں۔ پبلک نے ہم کو اختیار دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ پبلک نے آپ کو یہ سمجھ کر اختیار دیا ہے کہ آپ کفایت شعاری کے ساتھ واجبی خرچ کریں گے۔ آپ اس بے دردی سے خرچ کرنے کے مختار و مجاز نہیں ہیں۔ لوگوں کے اس قیل و قال اور پیہم اصرار کے باوجود مولانا نے واجبی خرچ کے علاوہ نہ لیا۔

آج کی دنیا میں ایسے لیڈر اور عالم مشکل ہی سے ملیں گے جو عوام اور پبلک کے سرمایہ میں اس طرح احتیاط کرتے ہوں اور لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل پر عمل کرتے ہوں۔ آج کل اچھے اچھے لوگ ایسے مواقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے بلکہ اگر اعتراض کا ڈر ہوتا ہے تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی تاویل ڈھونڈ رکھی ہوتی ہے۔ کہیں پانے کی امید ہوتی ہے تو کسی نہ کسی طرح اشارہ و کنایہ ہی سے اظہار طلب بھی کر دیتے ہیں۔ مگر مولانا ہیں کہ ایسے مواقع سے نہ صرف فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نہ صرف اپنے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ بلکہ اس کی شناعت و کراہت کا بھی اظہار فرما دیتے ہیں۔ ایک بار مولانا مقروض ہو جاتے ہیں۔ پاس ادائیگی کے لیے رقم نہیں ہوتی۔ کچھ دوستوں اور عقیدتمندوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ حیدر آباد میں نواب فخر یار جنگ معتمد مملکہ فنانس اور چند با اختیار حکام سے مل کر خیرات و ثواب کی مد سے پانچ ہزار روپیہ دلانا چاہتے ہیں۔ مولانا کو اس بارے میں جب اطلاع ملتی ہے۔ تو آپ صاف کہہ دیتے ہیں کہ مجھے اس ذلت کے ساتھ ایسی رقم کا لینا منظور نہیں ہے۔

قناعت و استغنا حضرت مولانا کو برٹش حکومت ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے لیے کثیر مشاہرہ پر (اس وقت کے پانچ صد روپے ماہوار) بلاتی ہے۔ مگر آپ اسے قبول نہیں کرتے۔ حکومت مصر جامع ازہر میں شیخ الحدیث کی جگہ دے کر ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرہ، مکان، موٹر اور سال میں ایک دفعہ ہندوستان آنے جانے کا کرایہ دینے کی پیش کش کرتی ہے۔ مگر مولانا وہاں تشریف لے جانے سے صاف انکار فرما دیتے ہیں۔ اور دیوبند کی معمولی تنخواہ پر قناعت کرتے ہیں۔

مولانا کے پاس مال آتا تو بہت جلد مستحقین کے پاس پہنچ جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی زندگی میں کبھی اتنا مال جمع نہ ہوا کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہو۔

مولانا کے زہد و تقویٰ کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ مولانا دارالعلوم کی مدتوں سے خدمت کرتے تھے۔ ۳۲ سال کی طویل مدت دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں گزاری۔ مگر ان دنوں کے علاوہ جن میں پڑھاتے۔ بقیہ ایام کی تنخواہ نہ لیتے اگرچہ مدرسہ ہی کے سلسلہ میں کہیں آنا جانا ہوتا۔ یا مدرسہ ہی ضرورت سے کہیں سفر کرنا ہوتا۔ مگر پھر بھی ایام تدریس کے علاوہ ان دنوں کی بھی تنخواہ نہ لیتے۔ مرض الوفات میں ایک مہینہ کی رخصت بیماری وغیرہ اور اس کے کچھ چھٹیاں جو قانوناً حق تھا اور نہیں لی تھیں۔ وہ بیماری میں شمار ہوئیں۔ ان سب دنوں کی تنخواہ جو ایک ہزار روپے سے کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ مدرسہ نے بھیجی آپ نے یہ فرما کر واپس کر دی کہ جب میں نے پڑھایا نہیں تو تنخواہ کیسی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد مہتمم صاحب قبلہ گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ حضرت کا زہد و تقویٰ اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا۔ مگر اب میں شرعاً کوئی سقم نہیں ہے اگر آپ فرماویں تو وہ رقم میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں؟

خالہ صاحبہ نے عرض کیا۔ جس چیز کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پسند نہیں فرمایا اس کو میں کس طرح پسند کر سکتی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ بس آپ کی ضرورت ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

حضرت کی زندگی کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں بڑے نڈر واقعہ ہوئے تھے۔ یہ انکا ایک ایسا وصف تھا کہ علماء کی جماعت میں بڑے بڑے ارباب جبہ و دستار انکا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیا مجال کہ داڑھی منڈا کر کوئی ان کے سامنے آجائے۔ کس کی جرأت کہ سر پر انگریزی طرز کے بال ہوں اور ننگے سر حضرت کے روبرو جائے اور ان چیزوں پر اس لیے زیادہ شدت تھی کہ لوگ سنت نبویہ کا مذاق اڑانے لگے ہیں۔ داڑھی منڈانا، سر پر انگریزی بال رکھنا اور پھر اس پر فخر کرنا اور اس وضع لوگوں کو حقیر جاننا گویا سنت نبویہ کی تحقیر و توہین ہی نہیں اپنے آپ کو کفر کی سرحدوں پر لاکھڑا کرنا ہے۔ بدیں وجہ حضرت ایسے لوگوں پر سخت ناراض تھے۔ اور ان باتوں پر ان کی گرفت سے نہ رؤسا بچ سکتے تھے نہ ممتاز طبقہ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی اس ادا کے نتیجہ میں ہزارہا چہروں پر داڑھیاں نظر آنے لگیں اور ہزارہا سروں سے انگریز پرستی کا بوجھ اتر گیا۔ معروف کی اشاعت اور منکرات سے اس شدت سے روکنے والا جماعت علماء میں اب کے کو پیدا ہو گا۔ باطل پرست جماعتوں کا مقابلہ جس پامردی سے کرتے اور اس راہ میں ہر سب و شتم، طعنہ و تعریض کو جس خندہ پیشانی سے قبول کرتے۔ یقیناً اس کے اجر مضاعف سے عالم اخروی میں انکا دامن مراد بھر دیا جائے گا۔ عمل و ہمت کی ایک چٹان تھی جس نے کبھی تھکنا نہ جانا۔ عزم و بلند حوصلگی کا ایک کوہ گراں تھا جس کو حوادث روزگار اور انقلابات زمانہ اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے تھے۔

کون اس باغ سے اے باد صبا جاتا ہے!
رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے!

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحب قلم

حضرت مدنی دنیائے علم کے آفتاب تھے جہاں آپ نے چمنستان روحانیت کو تازگی بخشی اور علم کے سبزہ زاروں کو سینچا۔ سیاسی دنیا کو بھی صبر و استقامت، متانت فکر، اصابت رائے یقین محکم اور جہد مسلسل کا سبق دیا۔ سیاست کو ایک بلند کردار اور پاکیزگی دی۔ مذہب کو ایک نیا جوش اور نئی امنگ دی۔ علم کو عظمت اور وقار عطا کیا۔ مولانا کی مقدس زندگی کے یہی وہ پہلو ہیں جن پر دنیا کی نگاہ پڑتی ہے۔ لیکن آپ متبحر عالم، ممتاز سیاست دان قومی رہنما اور روحانی دنیا کے

امام ہونے کے ساتھ ساتھ "صاحب قلم" بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے جو علمی مذہبی روحانی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں۔ انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جو لوگ مولانا کے قریب رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ حضرت مولانا کے بے پناہ سیاسی و مذہبی مشاغل اس بات کی اجازت ہی نہ دیتے تھے کہ وہ کوئی علمی کام کریں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تصنیفات چند سے زیادہ نہیں اور یہ تصنیفات بھی اس لیے وجود میں نہیں آئیں کہ لوگ انھیں پڑھیں اور تعریف کریں۔ بلکہ قلم اس وقت ہاتھ میں لیا گیا۔ جب اس کی شدید ضرورت محسوس کی گئی اور لوگوں نے مسلسل اصرار اور بار بار تقاضے کئے۔ تصنیفات میں "اسیر مالٹا"، "متحدہ قومیت"، "نقش حیات"، "الشہاب الثاقب" ہیں ان کے علاوہ کچھ رسائل اور خطبات ہیں۔ "الشہاب الثاقب" آپ کی پہلی تصنیف ہے۔

"اسیر مالٹا"، غالبًا　　تصنیف ہے۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی۔ جب آپکا قلم اور آپ جوان تھے۔ اس میں آپ کا قلم ایک طرف شمع آزادی کے پروانوں کو جدوجہد کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف اس کی نوک سامراجیت کے قلب میں پیوست ہو رہی ہے" اسیر مالٹا"، میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مدرس اور انقلابیوں کے امام شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فداکارانہ زندگی کا ایک ایک گوشہ نمایاں کیا گیا ہے۔ "اسیر مالٹا" کے شروع کے چند اوراق میں بہت دل کش اور پسندیدہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کا گلدستہ اس قابل ہے کہ بار بار دیکھا جائے۔ اس کے لفظ لفظ سے خلوص ٹپکتا ہے۔ اس کے جملے جملے میں محبت و عقیدت کی پیچ و تاب کھاتی ہوئی لہریں، جذبات کا گرجتا ہوا بادل اور انقلابات کی گونج ہے۔ اس کے نقطے نقطے میں احساسات کی دبی ہوئی چنگاریاں اور اس کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی غور و فکر کی دعوت صبر و استقلال کا درس، یقین محکم اور عمل پیہم کی تلقین تشکیل سیرت اور تعمیر حیات کا ایمانی پہلو بھی ہے مثلاً

"اس نے بحر امدادی سے فیوض حاصل کیے۔ لیکن ڈکار نہ لی، اس نے قاسمی نہریں پی لیں۔ مگر ہضم کر گیا۔ اس نے رشیدی گھٹاؤں اور دھواں دار بادلوں کو چوس لیا مگر بے اختیار نہ ہوا۔ دعویٰ نہ کیا شطحیات نہ سنائیں، استقامت سے نہ ہٹا۔ شریعت کو نہ چھوڑا، عشق میں گھل کر لکڑی ہو گیا۔ مگر دم نہ مارا سے

"در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن"

یہ انداز شروع کے چند اوراق میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا کا قلم حالات و کوائف اور تجربات و مشاہدات کی اتھاہ گہرائیوں میں بہت احتیاط کے ساتھ اتر گیا ہے اور مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روانگی حجاز سے لے کر اسارت مالٹا اور ہندوستان کی واپسی تک تسلسل واقعات کی ایسی تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ہندوستان، عرب ممالک ترکی کی مظلومیت اور اتحادیوں کے روباہی کرشمے اور ظالمانہ رویے کھل کر سامنے آگئے ہیں۔

"نقش حیات" یوں تو مولانا کی خود نوشت سوانح ہے۔ لیکن اس میں تجربات کے علاوہ سیاسی معلومات کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ اس میں آپ کا خاص اسلوب نگارش ہے جو بہت ہی سنجیدہ، بہت ہی جامع اور بہت ہی پاکیزہ ہے۔ آپ کا قلم بس وہیں تک چلتا ہے۔ جتنا اسے چلنا چاہیئے۔ نہ اتنی تفصیلات و جزئیات ہوتی ہیں کہ پڑھتے پڑھتے قاری کا جی اکتا جائے اور نہ اتنا اختصار کہ مطلب ہی معلوم نہ ہو۔ جس بات کی تفصیل ضروری ہوتی ہے۔ اسے پھیلا کر لکھتے ہیں اور جہاں اختصار ہونا چاہیئے۔ وہاں مختصر ہی لکھتے ہیں۔

"نقش حیات"، میں کثرت سے انگریزی اور اردو کی تاریخی کتابوں سے حوالہ جات پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو حدیث،

تفسیر، فقہ، معقولات کے علاوہ فن تاریخ پر بھی پورا عبور ہے۔ جب کوئی بات لکھتے ہیں۔ بے دلیل نہیں لکھتے۔ مذہبی اور علمی مضامین ہوں تو ان میں جابجا
واحادیث پیش کی جاتی ہیں۔ اور تاریخی حالات کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے تو تاریخی کتابوں سے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ
کے ذہن میں یقینی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اور نتیجہ پر پہنچ کر کسی قسم کا شک و تردد باقی نہ رہے۔ اس کے سامنے ایک متعین اور کشادہ راہ کھول دی جائے۔

نقش حیات میں زیادہ تر انگریزوں کی تصنیفات اور تحریروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ہندوستان پر ظلم کیا۔ اس کی دولت لوٹی اور پھر اپنے
بھی جتائے اور ہر طرح اپنے عیب وجرم چھپانے کی کوشش کی۔ مولانا نے ان کو ان ہی کی تحریروں سے بے نقاب کر دیا۔ اور ان کی تمام قلعی کھول دی یہ
بات ثابت کر دی کہ انگریز ظالم تھے۔ انھوں نے ہندوستان کا خون چوسنے میں پورا ثبوت دیا۔

"نقش حیات" کوئی ناول نہیں۔ افسانوں کا مجموعہ نہیں، شعر و ادب کی کوئی کتاب نہیں۔ بلکہ ایک ایسے انسان کی خود نوشت سوانح ہے جو
دیوبند جیسے عظیم دینی مدرسہ کا صدر مدرس و شیخ الحدیث ہے۔ جو ہندوستان کی تحریک آزادی کا ہراول رسالار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شیخ طریقت اور
نبویہ کا محب صادق ہے۔ اسلام کے دشمن نمبر ایک "انگریز" کا ہندوستان میں نہیں بلکہ ایشیا بھر میں سب سے بڑا مخالف ہے۔ مصنف کی ان تمام صفات
کو سامنے رکھ کر کتاب پڑھیں تو آپ کتاب کو ایک قیمتی دستاویز خیال کریں گے۔ ایک شیخ طریقت اور عالم باعمل کس طرح اپنی سوانح لکھ سکتا ہے
کتاب کی دونوں جلدیں گذشتہ ڈیڑھ صدی کے حالات، تحریکات آزادی اور انگریزوں کی ہندوستان اور دنیا میں دسیسہ کاریوں کی ایک ایسی
ہے جس کو پڑھنے کے بعد قاری بہت کچھ حاصل کرتا ہے۔ انداز بیان سادہ اور بے تکلف ہے۔ مثلاً

> "لبا اوقات میں مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھاتا ہوتا تھا اور آدمی آتا کہ والد صاحب بلا رہے ہیں۔
> طلبہ کو رخصت کر کے حاضر ہوتا تو فرماتے کہ مٹی اٹھانے والا یا اینٹ اٹھانے والا مزدور نہیں آیا۔ تم
> اس کام کو انجام دو۔ بہ مجبوری تمام دن یہ کام کرنا پڑتا اور تمام اسباق کو معطل کرنا پڑتا۔ لبا اوقات ایک
> ایک دو دو ہفتہ اسباق کو معطل کر کے تمام اوقات اسی تعمیری خدمات میں صرف کرنے پڑتے۔
>
> (ص ۱۷ ج ۱)

اتنی سی مختصر تحریر میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک نقشہ ہی کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ لیکن اخلاص و انکسار کے ساتھ۔ زندگی کی یہی وہ کٹھن منزل ہوتی ہے جس
عبور کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ چند سطروں نے ہمیں بتا دیا کہ انھیں کتابوں سے فطری تعلق اور دلی رابطہ تھا۔ لیکن والد صاحب کا حکم پہنچا۔ فوراً اس کی تعمیل
ایک طرف اطاعت والدین کی اور دوسری طرف سرکار دو عالم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ادا کی۔

مولانا کی تحریروں میں پاکیزگی، ستھرائی کے علاوہ یقین و عزم کی کیفیت ہر جگہ ملتی ہے۔ کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جہاں بزدلی، خوف اور تذبذب
کا احساس ہو۔ ہر لفظ میں ٹھیراؤ ہے۔ ہر جملے میں وقار ہے۔ ہر سطر میں ایک تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صاحب طرز ادیب یا انشاء پرداز تھے
لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی تحریر میں ایک انفرادیت ضرور جھلکتی ہے۔ ادھر ادھر کی باتوں کی بجائے انھوں نے اپنے مقصد اور موضوع پر ٹھوس اور
باتیں پیش کیں ہیں۔ جن سے انکا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والا فکر و عمل کا جذبہ لے کر اٹھے۔

مکتوبات شیخ الاسلام

"اسیر مالٹا"، "نقش حیات"، "متحدہ قومیت"، "الشہاب الثاقب"، اور دیگر چھوٹے چھوٹے رسائل کے
علاوہ آپ کے مکتوبات کو جمع کیا گیا ہے اور یہ خدمت ملک کے نامور عالم مولانا نجم الدین اصلاحی نے "مکتوبات شیخ الاسلام" کے نام سے انجام دی ہے

یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو حضرت والا مختلف خطوط لکھنے والوں کے جواب میں تحریر فرماتے رہے ہے۔ مکتوبات فقہی، علمی، تبلیغی اور سیاسی ہیں۔ یہ علم و معلومات کا ایک ذخیرہ ہیں۔ جن میں حضرت کی مقدس شخصیت اور شخصیت کا بلند اور پاکیزہ کردار کھل کر سامنے آگیا ہے۔ یہ مکتوبات رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔

مکتوبات کا کونسا اسلوب پسندیدہ ہے یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ کسی نے غالب کے خطوط کو ان کی سادگی بے تکلفی اور ظرافت کی وجہ سے پسند کیا ہے تو کسی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط "غبار خاطر" کو بار بار اس وجہ سے پڑھا کہ ان میں ادب کی چاشنی، الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی خوب صورت ترتیب ہے۔ اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ معلومات کا دریا موجزن ہے۔ لیکن مکتوبات شیخ الاسلام کو اس لیے پسند کیا جاسکتا ہے۔ کہ ان میں خالص علمی، اخلاقی اور روحانی باتیں ہیں۔ ایسے خطوں جن میں صرف زبان و بیان کی خوبی ہو۔ لیکن کوئی بنیادی فکری و عملی افادیت نہ ہو۔ ان کے مطالعہ سے قاری حظ تو اٹھا سکتا ہے مگر اپنے فکر و عمل کے لیے کوئی سرمایہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ مگر مولانا کے خطوط پڑھ کر ہم بہت کچھ حاصل کر پاتے ہیں۔ ان خطوط کے متعلق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدیر دار العلوم دیوبند کی تحریر سے جو بطور مقدمہ مکتوبات کے شروع میں ہے۔ ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب مدظلہ فرماتے ہیں۔

"ان مکاتیب اور ان کے مکنون علوم و احوال کی فہرست پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے ہی سے اس جامعیت کا اندازہ لگالینا مشکل نہیں رہتا۔ جو حضرت ممدوح کی ذات میں ودیعت کی گئی ہے۔ اور جو تمام ہی دینی طبقوں کے لیے یکساں شفا بخش ہے۔ حال و قال والے حضرات ہوں۔ یا براہین و استدلال والے ہوں۔ طالبان مسائل ہوں۔ یا عاشقان دلائل، سب ہی کے لیے اس مختصر مگر جامع ذخیرہ میں سامان سیرابی موجود ہے۔ ان جامع ہدایات سے اگر ایک طرف طریقت و معرفت کے مسائل حل ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف شریعت کے حکمیات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور جہاں شریعت و طریقت کے مقامات کھلتے ہیں وہیں سیاست و ادارات اور قومی معاملات کے دقائق بھی وانشگاف ہوتے ہیں۔ غرضیکہ بیک وقت شریعت و طریقت اور سیاست کے دقیق اور حیات بخش نکتے اس طرح زیب قرطاس ہوگئے ہیں۔ کہ ایک جویائے حقیقت و معرفت ایک متلاشی احوال طریقت اور طلبگار شریعت و سیاست کے لیے یکساں شفا اور سکون و روح کا سامان بہم پہنچا سکتے ہیں"

کہا جاتا ہے کہ مکاتیب شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جس کی شخصیت معلوم کرنا ہو۔ اس کے خطوط دیکھے جائیں۔ خطوط کے آئینہ میں شخصیت کی تصویر اپنے اصلی خدوخال میں صاف جلوہ گر نظر آتی ہے۔ مکتوبات شیخ الاسلام کے مطالعہ کے بعد ہر شخص حضرت مولانا کی شخصیت سے متعارف ہوجائے گا اور اسے مولانا کی علمیت، پاکیزگی اور عالی ہمتی کا قائل ہونا پڑے گا اور ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ مولانا داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے بہت بہت معروف، نہایت مخلص اور بلند کردار کے حامل تھے۔ مکتوبات زبان کے اعتبار سے بوجھل ضرور ہیں اور ہونا بھی چاہئیں۔ کیوں کہ جن مکاتیب سے تعلیم و ہدایت کا کام لیا جائے۔ علمی، فقہی، سیاسی اور باطنی مسائل کو سلجھایا جاتا ہے۔ ان میں عربی کے مخصوص الفاظ اور اصطلاحات کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ مکتوبات کی دو ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت کے تمام مکتوبات ان دو جلدوں میں آگئے ہیں۔ مرتب کو جو مکاتیب میسر آسکے۔ انہی کو انھوں نے جمع کر دیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کی طرح "مکتوبات شیخ الاسلام" کی حیثیت بہت بلند ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ رشد و ہدایت

کے سلسلے میں ان دونوں حضرات نے مکتوبات کے ذریعہ جو کام سرانجام دیا ہے۔ تاریخ میں بہت کم لوگ اسکا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں تو تیسری شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی ہے جو چوتھی مثال شاید پوری تاریخ میں نہ ملے۔

تدابیر صحت اور مدنی

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ صحت اور حفظان صحت کے اصولوں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ کیونکہ ایک تندرست جسم دل و دماغ اور اعصاب بھی تندرست ہوں گے اور تندرست انسان اپنے متعلقہ کاموں کو حسن و خوبی اور چالاکی کے ساتھ سرانجام دے گا اور پھر ایک مسلمان کو تو ہمیشہ جہاد اور موت شہادت کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ علمی اور عملی جہاد کے لیے جسمانی صحت کا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت مدنی نے دارالعلوم میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ تین شعبہ جات تعلیم نئے کھلوائے۔ اور ان کے لیے فوراً ہی معلمین کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ۱۔ انگلش تعلیم کے لیے ایک معلم ۲۔ ہندی تعلیم کے لیے ایک معلم ۳۔ جسمانی ورزش اور تدابیر صحت کے لیے تیسرا معلم مقرر کیا گیا۔ جسمانی ورزش اور تدابیر صحت کے اس نگراں کو استاد فن کہا جاتا تھا۔ اس شعبہ کے استاد محمد ظہیر مظفر نگری مقرر ہوئے۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ کھلے میدان اور تازہ ہوا میں اس کے اوقات صبح بعد نماز فجر اور شام کو بعد نماز عصر مقرر ہوتے تھے۔

ایک خط میں مولانا ایسی ہی چیزوں پر زور دے رہے ہیں۔ وہ ملاحظہ کیجئے:۔

میرے عنایت فرما بزرگو! ہم کمزور ہیں۔ ہم میں اتفاق نہیں، ہم ہتھیار نہیں رکھتے۔ ہم مال نہیں رکھتے۔ ہمارا دشمن قوی ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کا سامان ہے۔ ہم کو اسے سیدھا کرنا اور اس سے بدلہ لینا ہے۔ مگر ہمیشہ مقابلہ سمجھ اور طاقت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ یہی طریقہ قرآن، حدیث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔ اس لیے ہم کو جب تک ہمارے مقصد حاصل نہ ہو جائیں۔ یعنی خلافت کی آزادی، جزیرۃ العرب، ہندوستان کی آزادی، پنجاب کی تلافی، اس وقت تک ہم کو نہ چین سے بیٹھنا ہے اور نہ بیٹھنے دینا ہے۔ آپ یہ سوال کریں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟

میں کہوں گا کہ آپ پر شرعاً فرض ہے کہ اگر ایک مری ہوئی چیونٹی کی طرح آپ کاٹ سکتے ہیں تو ضرور کاٹ لیجئے۔ اس کے معنی یہ نہ سمجھئے کہ خلاف امن کوئی بات کریں۔ خونریزی کریں۔ نہیں۔ نہیں۔ صلح اور مشورہ کے ساتھ جس قدر ممکن ہو۔ نقصان پہنچائیں۔ دوسروں کو آمادہ کریں۔ دشمن کو کمزور کریں۔ ان کی تجارت کو گھٹائیں۔ ان کی محبت ان کے خوف کو دلوں سے دور کر دیں۔ لوگوں میں جرأت پیدا کریں۔ سچ کہنے سے نہ جھینپیں۔ لوگوں کو نرمی اور حکمت سے سمجھائیں۔ شدت کو کام میں نہ لائیں ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملائیں۔ ملے ہوؤں کو نہ توڑیں۔ اسی دھن میں رات دن لگے رہیں۔

لوگوں میں سپہ گری پھیلائیں۔ بانک، پٹہ، لکڑی، تلوار، گھوڑے کی سواری وغیرہ جو ہمارے بزرگوں کا طریقہ تھا جس کو تمام شریف خاندانوں کے لوگ سیکھنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس کی طرف لوگوں کو ترغیب دیں۔ کم از کم روزانہ ایک آدھ گھنٹہ اگر یہ عمل جاری رہے تو ہم خرما و ہم ثواب کا کام دے۔ جسمانی صحت حاصل ہو۔ ایک فن ہاتھوں میں رہے۔ وقت بے وقت کام آئے اور مال و اولاد کی حفاظت ہو۔

شیخ الاسلام کے پسندیدہ اشعار کسی شخصیت کا اندازہ ان اشعار سے بھی ہوتا ہے جن کو وہ عام طور پر استعمال کرتا ہو۔ یا بے اختیاری میں اس کے منہ سے نکل جاتے ہوں۔ یہاں ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں جو حضرت مدنی کی زبان پر تقریر و تحریر یا مجالس میں بے اختیار آجاتے تھے۔

نازپروردہ تنعم نہ برد راہ دوست ۔ عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

عشق چوں خام است باشد بستہ ناموس ننگ

عشق میں تیرے کوہ غم سر پر لیا جو ہو سو ہو ۔ عیش و نشاط زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

نوبہار است جنوں چاک گریباں مددے ۔ آتش افتاد بجاں جنبش داماں مددے

ہم نے تو اپنا آپ گریباں کیا ہے چاک ۔ اس کو سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

با درد بساز چوں دوائے تو منم ۔ در کس منگر کہ آشنائے تو منم

گر کشتہ شوی مگو کہ من کشتہ شدم ۔ شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

یقین مے دان کہ آں شاہ نکو نام ۔ بدست سر بریدہ مے دہد جام!

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست ۔ بر کریماں کارہا دشوار نیست

یابم او را یا نہ یابم جستجوئے می کنم ۔ بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

بجز تو شاہا دگر ندارم بجز در تو درے ندارم ۔ الیک اشکی و منک ارجو و ان سالتہ بجم سوالی

فراق و وصل چہ خواہی رضائے دوست طلب ۔ کہ حیف باشد از و غیر ازیں تمنائے

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است — جز سرِ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

سعدی بشوے لوحِ دل از نقشِ غیرِ حق — علمے کہ راہِ حق نہ نماید جہالت است

دنیا و آخرت بگذار حق طلب کن — کیں ہر دو لولیاں را من خوب می شناسم

یک لمحہ غافل ازاں شاہ نباشی — شاید کہ نگاہے کند و آگاہ نباشی

بڑے ہی درد سے یہ پڑھا کرتے تھے :-

بابا رشتہ سب سے ، توڑ

بابا رشتہ رب سے ، جوڑ

بابا رشتہ حق سے ، جوڑ

ہر آں کہ غافل از وے یک زمان است — ہماں دم کافر است اما نہان ست

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم — در حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

ذَهَبَ الَّذِينَ يُعَاشُ فِي أَكْنَافِهِمْ — بَقِيَ الَّذِينَ حَيَاتُهُمْ لَا تَنْفَعُ!

(وہ لوگ تو چلے گئے جن کے سایہ میں زندگی گزاری جاتی تھی۔ وہ لوگ رہ گئے جن کی زندگی کچھ کار آمد نہیں)

حلیہ شیخ الاسلام

موجودہ دور میں کسی شخصیت کی سوانح یا سیرت تب مکمل سمجھی جاتی ہے جب اس کا فوٹو بھی لگا دیا جائے۔ شرعی نقطہ نظر سے فوٹو کا جواز نہیں۔ لوگ فوٹو سے اس کے خد و خال دیکھ کر اس کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم یہاں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا حلیہ بیان کرتے ہیں۔ تاکہ اس کے بارے میں یہ مضمون تشنہ نہ رہے۔

آپ کا رنگ گندمی تھا۔ قد درمیانہ ، گٹھا ہوا مضبوط جسم ، آنکھیں بڑی بڑی سیاہ ، کشادہ پیشانی ، گھنی داڑھی ، ناک نہ زیادہ اٹھی ہوئی اور نہ زیادہ ہی ، متوسط اور درمیانی ، سینہ نہایت چوڑا ، دوہرا بدن ، انگلیاں پر گوشت ۔

ہمیشہ دینی اصلاح ، اشاعتِ علوم اور پست ہمتوں کو ابھارنے اور پسماندہ طبقے کو آگے بڑھانے میں چست و مستعد۔ آپ کی مجلس نہایت باوقا

تی تھی۔ لغو اور بے ہودہ بات کوئی نہیں۔ سب خاموش اور مؤدب، وہی شخص بولتا تھا جس کو کچھ پوچھنا ہوتا تھا۔ یا کوئی خاص بات کہنا ہوتی تھی تو وہ اس کا
اب تواضع، انکسار اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ حضرت کی طرف سے سنتا تھا۔
شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

ادب الوقار وعز سلطان التقی

فھو المھیب ولیس ذا سلطان

(یہاں سنجیدگی اور وقار بھی با ادب ہے اور تقویٰ کا اقتدار مسلط ہے۔ شان و شوکت کچھ بھی نہیں پھر بھی رعب شاہانہ ہے)

حضرت کی گھریلو زندگی بعض لوگ سوسائٹی میں بڑے بارعب اور سیرت و کردار کے مالک ہوتے مگر ان کی گھریلو زندگی نہایت گھناؤنی اور ناقابلِ رشک ہوتی ہے۔

ایک شہنشاہ زندگی کے اس میدان میں گدا نظر آتا ہے۔ علماء فضلاء یہاں پہنچ کر علمی وقار اور فضیلت کی شان سے مبرا نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے جرنیل
کاروان اس دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ اپنے امتیازات و ملبوسات منصبی اتار پھینکتے ہیں۔ سیاسیین و مدبرین یہاں عمومی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔
دنیا اور زندگی کی اس کمزور ترین منزل میں جن کا باطن و ظاہر یکساں نظر آتا ہے۔ وہ عارفین و واصلین الی اللہ ہی ہوتے ہیں۔

علمائے ربانی اور مشائخ حقانی کا اندر اور باہر یکساں نظر آتا ہے۔ گھریلو زندگی دیکھو تو باہر کی زندگی سے کھری۔ اور باہر کی زندگی دیکھو تو گھریلو زندگی سے کھری
زندگی کی زندگی کا جو خاکہ آپ کو لاکھوں انسانوں کے بحر مواج میں معتقدین و متوسلین کے بے پناہ اور عقیدت مندانہ ہجوم میں، کانفرنسوں اور اجلاسوں کی مسند
ہی میں نظر آئے گا۔ بعینہٖ یہی نقوش گھر کی چار دیواری میں۔ بچوں اور اہل خانہ میں رونق افروز ہوتے ہوئے آپ ملاحظہ فرمائیں گے یہی بڑائی کا معیار اور عظمت
کا راز ہے۔ حضرت شیخ مدنی کی پوری زندگی خلوت و جلوت میں یکساں رہی اور یوں سمجھئے کہ حضرت "کن فی الخلوات کما انت فی الجلوات"
کا مصداق تھے۔ بحمد اللہ حضرت کی زندگی کا کوئی گوشہ راز یا پوشیدہ نہیں ہے۔

دیہات کی خواتین کبھی کبھی اہل خانہ کی نظریں بچا کر مطالعہ گاہ تک پہنچ جاتیں اور سامنے کھڑی ہو جاتیں۔ ایسی صورت میں حضرت بہت پریشان اور سراسیمہ
ہو جاتے تھے اور اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ اور ملازم لڑکے یا صاحبزادیوں یا بیگم صاحبہ کو آواز دیتے تھے جو فوراً منشا سمجھ جاتی تھی اور یہ صورت
ٹل جاتی تھی۔

گھر میں بھی شریعت کی پابندی کا بے حد لحاظ رکھتے تھے اور سب ہی افراد خاندان کو تاکید بلکہ ضرورت کے وقت تنبیہہ فرماتے رہتے۔ اس باب میں
کسی کی ادنیٰ رعایت ملحوظ نہ تھی۔

ایک خاص الخاص عزیز ضیاء الحسن صاحب فاروقی لکچرار جامعہ ملیہ دہلی گریجو مانٹریال یونیورسٹی کینیڈا سے ڈاکٹر کی ڈگری لیے ہوتے ہیں۔ انھوں
نے حضرت کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں شادی کر کے داڑھی منڈا دی۔ رشتہ بڑا نازک تھا۔ لیکن حضرت ناراض
ہو گئے اور اس وقت تک راضی نہ ہوئے جب تک انھوں نے داڑھی رکھنے کا عہد نہ کر لیا۔ اور پھر دعا کرنے کا وعدہ کیا۔

اعزاء و اقارب میں جو لوگ مفلوک الحال ہوتے۔ ان کی نہایت توجہ سے خبر گیری رکھتے۔ عید، بقرہ عید کے موقعہ پر جب کبھی آبائی وطن ٹانڈہ جانا
ہوتا نماز سے پہلے اعزا کے ہر ہر گھر میں بنفس نفیس تشریف لے جاتے اور ہر ہر فرد کو عیدی تقسیم کرتے۔ اس دور میں نفسا نفسی میں کئی لوگ حقیقی لوگوں
کے سر پر بھی شفقت کا ہاتھ نہیں پھیرتے۔ لیکن حضرت اپنے بھائی کی اولاد اور ان کے پوتوں کی بھی اپنے بیٹوں کی طرح پرورش و نگرانی کرتے۔ گھر کے افراد سے

اپنے کام کے لیے کبھی نہ فرماتے۔ بدن دبوانے، سر پر تیل لگوانے یا گرمیوں میں پنکھا کرنے یا سخت سے سخت گرمیوں میں بجلی کا پنکھا کھولنے کی کبھی فرمائش نہ کرتے اور جلیبا باہر کے مریدوں یا شاگردوں سے کوئی کام نہ لیتے۔ ایسا ہی گھر کے افراد سے کام نہ لیتے۔ بلکہ اپنا کام اور دوسروں کا خود کرتے۔ اگر کوئی پنکھا لے کر کھڑا ہو گیا تو منع فرماتے ہوئے کہتے:۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی پنکھا کروانا ثابت ہے؟ اگر کوئی گھر کا فرد کوئی کام کرنے پر بہت زیادہ اصرار کرتا تو اجازت فرما دیتے۔

ہر متوسل و متعلق سے بچوں کی شادی کے سلسلے میں عجلت کی تاکید فرماتے تھے۔ لیکن اپنے گھر کے بچوں کے سلسلے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ پیدائش کے دن ہی سے دن گننا شروع کر دیتے تھے۔ جونہی کوئی بچہ حد بلوغ کو پہنچا۔ پھر کوئی حجت کام نہ دیتی تھی۔

صاحبزادہ اسعد میاں اور بھائی مولانا محمد صدیق صاحب کے پوتے سید فرید الوحیدی کی شادیوں کے لیے ۱۹۴۲ء کو نینی جیل سے قاری اصغر علی صاحب معتمد خاص کو تحریر فرمایا کہ میری رہائی کا ہرگز انتظار نہ کیا جائے اور ان کی شادیاں کر دی جائیں۔ چنانچہ صاحب زادہ اسعد میاں کی شادی فوراً تعمیل ارشاد کے لیے کر دی گئی۔ مولانا فرید الوحیدی لکھتے ہیں کہ میرے متعلق جیل ہی سے میرے بڑے ماموں سید توکل حسین صاحب وکیل سہارنپور سے نسبت طے کر لی ہے۔ اور اب صرف نکاح باقی ہے۔ چنانچہ رہا ہوتے ہی کہا کہ اسکا نکاح کر دیا جائے۔ میں نے گھر عرض کیا کہ ابھی زیر تعلیم ہوں۔ تو فرمایا اس کو اس بارے میں بولنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ اگر پھر میں نے سُنا تو سر توڑ دوں گا۔ اور نکاح میں اتنی جلدی دراصل معاشرہ کی حد سے بڑھی ہوئی خرابی کی طرف دیکھ کر تھا کہ بالغ ہونے کے بعد جلد شادی کر دی جائے اور لڑکیوں کی جلد شادی کا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔

اعزا و اولاد حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۵ بھائی اور ایک بہن تھے۔

۱۔ حضرت مولانا محمد صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں پہلی بیوی سے ایک بیٹے مولانا سید وحید احمد پیدا ہوئے۔ جو اسارت مالٹا میں حضرت کے ساتھ قید رہے اور ان دنوں صغیر سن تھے۔ چنانچہ دونوں حضرات شیخ الہند اور شیخ الاسلام نے ان کی تربیت کی۔ ان کی شادی مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ماموں زاد بہن کی لڑکی سے ہوئی۔ آپ نے ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی اور تین صاحبزادے، دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا حافظ سید فرید الوحیدی سلمہٗ ہیں جو دار العلوم دیوبند میں مبلغ اور ناظم شعبہ امور خارجہ ہیں۔ عربی کی تکمیل دار العلوم سے کی اور انگریزی میں اعلیٰ تعلیم علیگڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اچھے مقرر اور انشا پرداز ہیں۔ متعدد کتابوں کے ابھی سے مصنف ہیں۔

دوسرے لڑکے مولانا حافظ حاجی سید رشید الوحیدی فاضل دیوبند ہیں۔ نیک صالح اور اچھے شاعر اور انشا پرداز ہیں۔ چھوٹے لڑکے مولانا سید سید سعید الوحیدی صاحب بھی فاضل دیوبند نہایت ذہین طباع اور تیز ہیں۔ بڑی صاحب زادی کی شادی جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی سے ہوئی۔ کینیڈا مانٹریال یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری اسلامیات پر لئے ہوئے ہیں۔ چھوٹی صاحبزادی کی شادی عنایت اللہ صاحب منظر اعظمی سے ہوئی۔ جو علیگڑھ کے ایم۔اے ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی میں استاد ہیں۔

۲۔ دوسرے بھائی مولانا سید احمد رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن کی شادی بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری بیوی جو مولانا عبد الحق مدنی کی بہن تھیں۔ سے ہوئی۔ پہلی بیوی کا انتقال ہوا تو یہ دوسری شادی بھائی کی بیوہ سے کی۔ ان پر مدینہ منورہ میں بہت سے مصائب ٹوٹ پڑے۔ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ مولانا سید حسین احمد مالٹا میں نظر بند تھے۔ حضرت کے والد سید حبیب اللہ شاہ اور انکے دو لڑکے مولانا سید احمد اور مولانا سید محمود

کو قید کر کے اپڈیانوپل روانہ کر دیا گیا۔ ان پریشان کن حالات میں مولانا سید احمد کی بیوی۔ مولانا سید محمود کی بیوی اور حضرت مدنی کی صاحبزادی، مولانا عبدالحق مدنی کے ساتھ ترکی جانے کے لیے روانہ ہوئیں۔ اثنائے سفر میں مولانا سید احمد کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور شام ہی میں مولانا سید احمد صاحب کی تیسری شادی ہوئی۔ ان سے ایک صاحب زادی عائشہ مرحومہ ہوئیں۔ جن کی شادی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے صاحبزادے مولانا اسعد سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک لڑکا ہوا تھا۔ جو مدینہ منورہ مدرسہ علوم شرعیہ میں زیر تعلیم ہے

۳۔ مولانا سید حبیب اللہ شاہ کے تیسرے لڑکے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ کی پہلی شادی موضع قتال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی تھی۔ اس نکاح سے دو لڑکیاں ہوئیں۔ ایک صغرسنی میں فوت ہو گئی۔ دوسری کا انتقال شام میں ہوا۔

حضرت کی دوسری شادی قصبہ چھپرالیوں ضلع مراد آباد میں حکیم قاری غلام احمد کی بڑی لڑکی سے ہوئی۔ دو لڑکے اخلاق احمد و اشفاق احمد ہوئے اول الذکر آٹھ سال کی عمر میں اور موخر الذکر ڈیڑھ سال مدینہ منورہ میں فوت ہو گئے۔ ان بچوں کی والدہ کا انتقال بھی مدینہ منورہ میں ہوا۔ جب کہ حضرت مالٹا میں نظر بند تھے۔ اس کے بعد تیسری شادی دوسری اہلیہ کی چھوٹی بہن سے ہوئی۔ جن سے دو بچے ہوئے۔ ایک صاحب زادہ مولانا اسعد اور دوسری لڑکی ماجدہ خاتون جو بچپن میں سلہٹ میں فوت ہو گئی۔ مولانا اسعد میاں کی شادی کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ صاحب زادہ کی دوسری شادی مولانا حمیدالدین صدر مدرس عالیہ کلکتہ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ صاحب زادہ مولانا اسعد کی والدہ کا انتقال ۱۳۵۵ھ میں دیوبند ہوا اور ان کی قبر حضرت مدنی کی پائین ہے۔ حضرت کی چوتھی شادی حضرت کے چچازاد بھائی سید بشیرالدین کی منجھلی لڑکی سے ہوئی۔ جن سے دو صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں۔ بچوں کا نام ارشد اور اسجد ہے۔ اس طرح سے حضرت کے تین صاحب زادے اور پانچ صاحب زادیاں ہیں۔

صاحب زادہ مولانا اسعد میاں فاضل دیوبند ہیں اور آج کل دارالعلوم میں مدرس ہیں۔ نہایت صالح، متقی اور پرہیزگار ہیں۔ اچھے مقرر اور بہترین مدرس ہیں۔ مہمان نوازی، ایثار توکل، تواضع انکسار غرضیکہ جملہ اخلاق میں اپنے والد ماجد کے صحیح جانشین ہیں۔ حضرت مدنی کی وفات کے بعد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ نے دوسرے خلفاء کی موجودگی میں بیعت کرنے کی اجازت دی۔

۴۔ حضرت کے تیسرے اور مولانا سید حبیب اللہ شاہ صاحب کے چوتھے لڑکے مولانا سید محمود احمد مدظلہ بقید حیات ہیں اور مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ صدر مجلس اوقاف اور بہت بااثر اور ذی ثروت شخصیت ہیں۔ اس سے قبل گورنر مدینہ کی کیبنٹ کے ممبر اور مختلف سرکاری کمیٹیوں کے ممبر رجسٹرار قاضی القضاۃ رہ چکے ہیں۔ اب خرابی صحت اور دیگر مشاغل کی بنا پر تمام سرکاری کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

مولانا سید محمود صاحب کے ایک صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں ہیں۔ صاحب زادہ سید حبیب نہایت دانشمند، جفاکش ہیں اور قابل ہیں۔ عربی کے علاوہ ترکی اور اردو میں مہارت تامہ ہے۔ گورنر مدینہ کی کیبنٹ کے ممبر اور دیگر کئی سرکاری کمیٹیوں کے ممبر ہیں۔ بعض اوقات گورنر مدینہ کی عدم موجودگی میں گورنری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

۵۔ پانچوں بھائیوں میں سب سے چھوٹے سید جمیل احمد مرحوم تھے۔ جنھوں نے بعمر ۱۵ سال انتقال فرمایا۔ عمر کی اس قلیل مدت میں مرحوم نے ترکی عربیہ کالج میں تعلیم پائی اور آخری امتحان میں سب سے اول آئے۔ حکومت ترکی نے مخصوص وظیفہ دیا مگر عمر نے وفا نہ کی۔

۶۔ چھوٹی ہمشیرہ تھیں۔ جن کی شادی سید فاروق احمد ساکن ہنسور ضلع فیض آباد سے ہوئی۔ مدینہ منورہ میں تھے۔ وہاں سے آئے تو بیوی اور دو بچیوں کا ہند میں انتقال ہو گیا۔ ان فاروق احمد کے حقیقی ماموں مولانا عزیز احمد قاسمی فاضل دیوبند بی اے۔ جامعہ ملیہ دارالعلوم دیوبند میں شعبہ تبلیغ کے ناظم ہیں۔"

یہ حضرت مدنی کے اخلاف اور صلبی اقارب کا تذکرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہندی نژاد مولانا سید حبیب اللہ شاہ کی اولاد میں کتنی برکت عطا
کہ ایک لڑکا شیخ العرب والعجم حسین احمد مدنی ہوا جو اپنے عہد کا غزالی و جنید ہوا اور جس کی یاد سے امام حنبل اور امام مالک کی یاد تازہ ہوئی اور د
لڑکوں میں سے مولانا سید محمود دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے مدینہ منورہ کی سب سے بااثر اور ذی وقار شخصیت ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تش
بیدک الخیر انک علیٰ کل شیءٍ قدیر

سفرِ آخرت

۱۹۵۷ء گرمی کا موسم تھا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ڈیڑھ ماہ کے دورے پر مدراس کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر جمعہ کے دن اگست
تاریخوں کو صرف بیس دن بعد لوٹ آئے۔ دارالعلوم والوں اور اعزاء اقارب کو خوشی تھی کہ حضرت قبل از وقت تشریف لے آ
ساتھ ہی حیرانی اور تعجب بھی تھا کہ حضرت اپنے پروگرام کو کسی بھی واقعہ یا ارضی سماوی حادثہ کے باعث ملتوی نہیں کرتے تھے۔ بعد میں مولانا اسعد میاں جو
سفر تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت زیادہ تکلیف ہو گئی تھی کہ آئندہ سفر جاری رکھنا خطرناک تھا۔ زیادہ چلنے یا تقریر سے سانس پھول جاتا تھا جس
حضرت مجبور ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ دیوبند میں تشریف آوری کے بعد اس خطرناک بیماری میں بھی باوجود منع کرنے کے آٹھ نو دن سبق پڑھاتے رہے۔ بالآخر
ہو کر سبق بند کیا اور بڑے دکھ کے ساتھ باضابطہ دارالعلوم سے رخصت لے لی اور سہارنپور جا کر ایکسرے کرایا اور سفر میں حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے
سے رائے پور جا کر ملاقات کی۔ ایکسرے سے پتہ چلا کہ پھیپھڑے ٹھیک ہیں مگر گردے میں خرابی ہے۔ اس اثنا میں خطوط کے جواب تصنیف مطالعہ وغیرہ سبھی
رہے اور نماز کے لیے مسجد میں آتے رہے۔ بعد میں ڈاکٹروں کے شدید اصرار پر پندرہ روز کے لیے جملہ مشاغل ترک فرما دیئے۔ مگر نماز ایک دن بھی بیٹھ کر نہیں پڑ
اور مسجد میں جانے سے رکنا اتنا شاق گزرا کہ ہر وقت اس کی کوفت چہرے پر عیاں رہتی تھی۔ اس پندرہ روزہ آرام کے زمانہ میں بھی مطالعہ کرتے رہے یعنی حکیم الام
(مؤلفہ مولانا عبد الماجد دریابادی) محمد علی کی ذاتی ڈائری۔ حیات شبلی (سلیمان ندوی)، اور بخاری ترمذی وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ اول الذکر تینوں کا
مکمل مطالعہ فرمائیں۔ اگر کوئی اس دوران جاتا تو مطالعہ میں مصروف و منہمک ہوتے توجہ بھی نہ کرتے۔ اگر کوئی زور سے سانس لیتا۔ تاکہ موجودگی کا علم ہو جائے
بھی متوجہ نہ ہوتے اور اگر از خود کوئی خدمت پوچھتا اور پرسانِ حال کرتا تو فرماتے:۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے۔ الحمد للہ بہت اچھا ہوں" اور پھر مطالعہ کرنے
لگ جاتے۔ وہیں کمرے سے اٹھ کر چارپائی سے اتر کر اپنے حجرے میں آتے۔ باجماعت نماز پڑھتے۔ فرائض تو ایک طرف۔ سنن اور نوافل بھی کھڑے ہو کر
تہجد بھی ادا فرماتے۔ ۳، ۴ روز کے بعد اصرار کرنے لگے۔ مگر کسی نے نہ مانا۔ ایک دن خود ہی ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر باہر تشریف لے گئے۔ اس دوران حضرت
شیخ الحدیث مولانا زکریا تشریف لے آئے۔ ان سے مسئلہ پوچھا کہ یہ لوگ چارپائی پر نماز پڑھنے کے لیے کہتے ہیں۔ مسجد چھڑا دی، باہر جانا چھڑا دیا۔ بتائیے کیا
انھوں نے فرمایا: چونکہ چارپائی کی سطح برابر ہے۔ لہٰذا اس پر پڑھ لینی چاہیئے۔ البتہ تیمم کی جگہ وضو ہی کریں اور حضرت وضو ہی کیا کرتے تھے۔ اللہ اللہ الحب لل
اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے۔

ایک دن کہا کہ قاری اصغر علی صاحب (خادمِ خاص و مجاز حضرت جو حضرت کا حساب کتاب رکھتے تھے۔) کے پاس جانا ہے۔ ہم نے قار
کو بلا لیا۔ ان سے پوچھا حساب کر لیا؟ (تقریباً ہر ماہ ہزار ڈیڑھ ہزار کا حساب معمولی بات تھی۔) ان کو معمولی رقم دی۔ انھوں نے کہا۔ اس سے کیا ہو گا۔
لے جاؤ تمہیں کیا۔ اس کے بعد شیروانی منگائی اور اس میں سے ۲۰، ۵۰ نکلے۔ وہ ان کو بھجوا دیئے۔

ایک دن مولانا رشید احمد نبیرہ حضرت حاضر ہوئے تو ان کو بلا کر کہا کہ یہ چار منی آرڈر فارم لے اور منی آرڈر کر آؤ۔ ان میں سے ایک کسی لڑکی کے نام تھا۔ ن کا خط آیا تھا۔ کہ میرے پاس سکول کی اس ماہ کی فیس نہیں ہے۔ اگر جمع نہ کرا سکی تو نام خارج ہو جائے گا۔ آپ بہت سخی میں ملتجی ہوں۔

حضرت نے فیس کی رقم معہ کچھ زائد بھیجی تھی اور تسلی دی تھی۔ اور اسی طرح مستقل امداد چاہنے والوں کو اس سخت بیماری کی حالت میں نہیں بھولے تھے۔ مہمانوں کے متعلق مسلسل صاحب زادہ کو ہدایت دیتے رہتے تھے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔

وصال سے تین دن قبل تنفس اور سینے کی تکلیف ختم ہو گئی۔ عام خیال تھا کہ صحت ہو گئی۔ اب کمزوری باقی ہے۔ مگر کسے معلوم تھا کہ حق تعالیٰ نے ارح کے تزکیہ کے بعد حیات مقدس کی شمع کو ذرا بھڑکا دیا ہے اور کچھ دیر بعد اس تاریک دور میں علم و عرفان کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے گا۔

تین چار دن قبل کھانے پینے سے رغبت ختم ہو گئی۔ ایک دو چمچے کسی چیز کے کھا لیتے۔ ان ہی دنوں ایک دن فرمایا۔ سردا نہیں ملتا۔ عرض کیا جائے گا۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود کہیں سے نہ مل سکا۔ فرمانے لگے: زندگی میں پہلی بار کسی چیز کی خواہش کی تھی ــــ

اللہ اللہ کتنی بڑی بات فرمادی۔ دراصل حضرت کی زندگی اس قسم کی خواہشات سے بہت بلند و بالا تھی۔ بالآخر یہ خواہش پوری ہو گئی۔ کراچی اور لاہور ے سردا آگیا۔ کراچی سے مولانا سجاد حسین کی معرفت اور لاہور سے مولانا حامد میاں نے بھیج دیا۔

ایک دن حضرت کو معلوم ہوا کہ ارشد سلمہ روزے رکھتے اور چار بجے مخلصین کے ساتھ دعائے صحت کرتے ہیں۔ اس پر مولانا اسعد کو بلا کر ڈانٹا۔ کہ ری صحت کے لیے یہ لوگ اپنی صحت کیوں خراب کرتے ہیں۔ ایک رات قبل بترنم آواز سے یہ شعر گنگناتے رہے۔

الٰہی میری زندگی ہے کیسی ــــ نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

آخری دن صحن میں چارپائی لائی گئی۔ اور یوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ غیر اختیاری طور پر پوری کرائی۔ کہ

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتقال سے چند گھنٹے قبل دو صحابیوں کے ہمراہ مسجد نبوی تک تشریف لائے تھے اور جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ اس جہان سے تشریف لے گئے۔ تقریباً اسی وقت اس محب رسول ہندی نژاد حسین احمد مدنی کا تین بجے بعد ظہر انتقال ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ہ

عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال بھی ۱۳ جمادی الاول بروز جمعرات بعد نماز ظہر ہوا۔ اور یہی وقت و تاریخ و مہینہ حضرت نی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کا ہے۔

قرب و جوار کے شہروں میں اسی وقت فون پر یہ وحشت ناک خبر پہنچ گئی۔ لوگ دیوانہ وار دیوبند پہنچ گئے۔ دور دراز کے لوگوں کا خیال تھا کہ جبہ کر بوجہ تدفین عمل میں آئیگی۔ مگر صاحب زادہ مولانا محمد اسعد نے فرمایا کہ ابا جان ساری عمر سنت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اور حضور کا ارشاد ہے کہ تدفین میں عجلت کی جائے۔ ہمیں جلدی کرنا چاہیئے۔ اگرچہ حضرت کی یہ وصیت نہیں ہے۔ تاہم ان کی خوشی اسی میں ہے اور اس متبع سنت کی میت کے حترام کا تقاضہ ہے کہ آخری راحت گاہ پر جلد سے جلد پہنچا یا جائے۔ دیر لگا کر مسافر کی منزل کھوٹی کرنا مسافر کا احترام نہیں۔ بلکہ اس کی شان میں ایک قسم کی ستاخی ہے۔

بہر حال صاحبزادہ محترم نے فرمایا کہ تاخیر سے حضرت کی روح کو اذیت دینا نہ قرین انصاف ہے نہ تقاضائے احترام۔ مختصر یہ کہ اگرچہ مرکز علماء یعنی دارالعلوم کی شان اور خود حضرت مرشد رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق اتباع سنت کا لحاظ کرتے ہوئے جلدی کی گئی۔ مگر تب بھی اپنے ہوش و حواس سنبھالنے اور غسل و کفن کے انتظام میں تقریباً ۴ گھنٹے لگ گئے۔

آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو سے وفات کے تھوڑی دیر بعد خبر نشر ہو گئی تھی۔ پورے ملک سے لوگ آ رہے تھے۔ قریب کے گئے دُور کے آ رہے تھے۔ مگر تاخیر سے بچنے کے لیے ½ ۲ بجے شب حضرت قاری محمد طیب صاحب کے ایما پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ نے جنازہ پڑھائی۔ قبرستان اگرچہ ایک فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ تاہم بیس پچیس ہزار انسانوں کے جم غفیر کو میت کے ساتھ وہاں پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ گئے اور بالآخر شیخ الاسلام کا جنازہ اپنے دو عظیم پیش روؤں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی قبروں کے پاس پہنچ گیا۔ اور پھر عین وقت کہ ہر روزانہ شیخ الاسلام تہجد میں اپنے رب کے حضور پیش ہوتے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حاضر ہو گئے۔ شاید کم ہی اس امت میں ایسے افراد ہوئے ہوں گے کہ خاص تہجد کے وقت جو خدا کا اپنے بندوں سے ملاقات کا خصوصی وقت ہے۔ دفن ہوئے ہوں گے۔ بہرحال ہماری شنید کے مطابق تو حضرت شیخ الاسلام ہی کو یہ اعزاز نصیب ہوا۔ کہ وہ خاص اس وقت میں، روزانہ کی طرح اپنے آقا کی خدمت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حاضر ہو گئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت کے متعلق معاصرین کی آراء

حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات مدنی رح کے متعلق ان کے بعض خلفا کی زبانی :۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کی روایت سے :۔

"بھائی میں ان جیسی (مولانا مدنی جیسی) ہمت مردانہ کہاں سے لاؤں۔ میں مولانا حسین احمد صاحب کو ان کے سیاسی کاموں میں مخلص اور متدین جانتا ہوں۔ البتہ مجھے ان سے تحقیق کے ساتھ اختلاف ہے۔ اگر وہ تحقیق رفع ہو جائے تو میں ان کے ماتحت ایک ادنیٰ سپاہی بن کر کام کرنے کو تیار ہوں۔

بروایت حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہٗ خیر المدارس ملتان حضرت تھانوی رح نے فرمایا۔

"ہمارے اکابر دیوبند کے بفضلہ تعالیٰ کچھ کچھ خصوصیات ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیخ مدنی کے دو خداداد خصوصی کمال ہیں۔ جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ایک تو مجاہدہ جو کسی دوسرے میں اتنا نہیں ہے دوسرے تواضع چنانچہ سب کچھ ہونے کے باوجود آپ کو کچھ نہیں سمجھتے"

بروایت مولانا عبد المجید بچھرایونی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"مجھ کو اپنی موت پر بھی فکر تھا کہ بعد باطنی دنیا کی خدمت کرنے والا کون ہوگا۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی کو دیکھ کر تسلی ہوئی کہ یہ دنیا ان سے زندہ رہے گی"

حضرت مولانا حسین احمد مدنی بہت شریف طبیعت کے ہیں۔ باوجود سیاسی اختلاف رکھنے کے بھی کوئی کلمہ خلاف حد و ان سے نہیں سنا گیا۔　(اشرف العلوم)

رائے گرامی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ :۔

میرے نزدیک ابو حنیفہ زمانہ، بخاری اوانہ، جنید و شبلی عصر حضرت اقدس شیخ العرب والعجم حضرت

مولانا سید حسین احمد مدنی کی مدح میں کچھ کہنے والا «مادح خورشید مادح خود است» کا مصداق ہے۔ میرا خیال ہے کہ حضرت کے فضل و کمال تبحر فی العلم والسلوک سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔ آپ نے سنا ہوگا کہ مولانا کی اسارت کی خبر سن کر حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے کس قدر رنج و حزن کے ساتھ فرمایا تھا۔

"مجھے علم نہیں تھا کہ مولانا مدنی سے مجھے اتنی محبت ہے۔ اس پر حضار مجلس میں سے کسی نے عرض کیا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو اپنی خوشی سے گرفتار ہوئے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا تھا کہ آپ مجھے اس جملہ سے تسلی دینا چاہتے ہیں۔ کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ۔ یزید کے مقابلہ میں اپنی خوشی سے نہیں گئے تھے۔ مگر آج تک کون ایسا شخص ہے جس کو اس حادثہ سے رنج نہ ہوا ہو"

بروایت حضرت قاری محمد طیب صاحب۔ ارشاد حضرت تھانوی رح۔

"میں اپنی جماعت میں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کے حسن تدبر کا اور مولانا حسین احمد صاحب کے جوش عمل کا معتقد ہوں"

بروایت حضرت موصوف۔ ایک صاحب نے حضرت تھانوی کی مجلس میں حضرت مدنی کے کسی مجاہدانہ عمل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ نے یہ عمل نہیں فرمایا:۔

"بھائی میں ان جیسی (مولانا مدنی جیسی) ہمت مردانہ کہاں سے لاؤں۔"

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی کا ارشاد:۔

"حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی ثم المدنی آسمان علم و ہدایت کے آفتاب اور زہد و ورع میں یگانۂ زمانہ اور جہاد تخلیص وطن کے ایک ممتاز شہسوار ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان ان کی ذات گرامی پر جس قدر بھی فخر کریں بجا ہے۔ وہ عَلَمِ ہدایت اور مستحق منصب قیادت ہیں۔ ان کی مذہبی اور وطنی خدمات سے تمام مسلمانان ہند واقف ہیں اور ان کے اخلاص و دیانت کے مخالف بھی معترف ہیں۔ اور ان کی بے غرضانہ محبت کا لطف وہی حاصل کر سکتا ہے جو ان کی صحبت و معیت سے بہرہ ور رہا ہو۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اور مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف کے تاثرات آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مولانا نصر اللہ خاں عزیز لاہور کا سچا تاثر

"امام برحق حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو لوگ ان کے علم و فضل اور تقویٰ طہارت کی بنا پر جانتے ہیں اور، عقیدت و احترام کا سر ان کے سامنے خم کرتے ہیں۔ لیکن مولانا کی حقیقی عظمت ان کا محض علم و فضل عبادت و اشتغال وغیرہ نہیں۔ بلکہ ان کی پاکیزہ شخصی سیرت ہے۔ اس معاملہ میں ہندوستان تو درکنار غالباً عالم اسلام میں بھی ان کی مثال نہیں ملے گی۔ جس طرح مولانا مدنی مدظلہٗ کی طرف دل کھنچتا ہے۔ اس طرح کسی اور کی طرف نہیں کھنچتا:۔

مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سیوہاروی فرماتے ہیں۔

"شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات ستودہ صفات نہ صرف ہندوستان کے لیے بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک بے بدل سعادت تھی۔ قدرت الٰہی کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ فساد و فتن سے معمور اس دنیا میں انسانی سوسائٹی کی اصلاح و ارشاد، تنبیہہ و رہنمائی کے لیے ہر صدی و قرن میں مصلحین او ر ریفارمر پیدا ہوتے ہیں جن کی پوری زندگی اصلاح و خدمت کے لیے وقف ہوتی ہے اور جو اپنے عمل و کردار کے لحاظ سے عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند و برتر ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کی شخصیت ان مصلحین و مرشدین کی صف میں بھی بہت بلند موقف و امتیاز کی حامل تھی۔ حق تعالیٰ نے آپ کو علم و عمل، اعلیٰ کردار و اخلاق، عزم و استقلال اور ہمدردی خلائق کے وہ تابناک جوہر عطا فرمائے تھے۔ جو صدیوں کے بعد کبھی کسی انسان کو عطا ہوتے ہیں۔"

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن ناظم ربانی ندوۃ المصنفین دہلی کا ارشاد گرامی:۔

"حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کیلئے موجب افتخار تھی۔ ان کا شمار دنیائے اسلام کے چند گنے چنے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ آپ کی ہستی میں خلوص و شفقت عظمت و وقار، حلم و عفو، عزم و ہمت، عجز و فروتنی، صبر و استقلال، غرضیکہ شریعت و طریقت کے تمام جوہر کچھ اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ ایک فرد میں ان خصوصیتوں اور کمالات کا اجتماع مشکل ہوتا ہے۔ آپ کو دیکھ کر صحابہ کرام رضی کی زندگی کی خصوصیات کا نقشہ سامنے آجاتا تھا۔"

سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی رح کے تاثرات:۔

"حضرت شیخ الاسلام آزادئ وطن کے جانباز جرنیل تھے اور بین الاقوامی شخصیت اور علم و عمل اور زہد و تقویٰ اور ایثار و قربانی کے مجسم پیکر اور اخلاق و انسانیت کا سب سے بلند و بالا مظہر اور سلف صالحین کی ایک زندہ یادگار تھے۔"

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس اللہ سرہ العزیز کا تاثر:۔

"بھائی حضرت شیخ مدنی کا ذکر کیا پوچھتے ہو پہلے تو ہم یوں ہی سمجھتے رہے مگر وقت کی نزاکتوں اور ہنگامہ آرائیوں میں جب ہم نے اس مرد مجاہد کو آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ تو جہاں شیخ مدنی کے قدم تھے وہاں اپنا سر پڑا دیکھا۔ ابھی حضرت اس وقت ملک و ملت کی خاطر باطل کے مقابلہ میں حق کا دامن تھام کر جس مردانہ وار صورت میں، استقامت اور استقلال کے ساتھ قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ یہ شان حسینیت کا مظاہرہ ہے۔"

بروایت جناب احسان قریشی پرنسپل گورنمنٹ کمرشل انسٹیٹیوٹ سیالکوٹ:۔

۱۹۴۵ء میں میں امرتسر میں بطور لیکچرار متعین تھا۔ حضرت مفتی محمد حسن مرحوم، راقم الحروف، مرحوم شیخ صادق حسن اور ایم۔اے۔او کالج امرتسر کے چند دوسرے پروفیسر مسلم لیگ کو مستحکم بنانے میں دن رات کوشاں تھے اور قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ ایک دن سنا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح اپنے سفر لاہور کے دوران

امرتسر ریلوے اسٹیشن سے گزرنے والے ہیں۔ اور مسلم لیگی طلباء نے یہ سکیم بنائی ہے کہ امرتسر ریلوے سٹیشن پر ان پر گندے انڈے پھینکے جائیں۔ جب اس کی خبر مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کو پہنچی تو وہ بہت متردد ہوئے۔ مجھے فوراً بلایا اور کہا۔ تم پر لازم ہے کہ تم اس دن صبح کی گاڑی پر جالندھر جا پہنچو اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ڈبے میں سوار ہو جاؤ تو جب گاڑی امرتسر پہنچے تو تم (معہ اپنے دو تین شاگردوں کے) حضرت مولانا کے لیے ڈھال بن جاؤ۔ جو کچھ پھینکا جائے تم اپنے بدن پر سہنا۔ خبردار! حضرت مولانا کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اگرچہ انکا اور ہمارا اختلاف قیام پاکستان کے متعلق ہے لیکن وہ ہمارے اکابر میں سے ہیں۔ سیاست میں انکا مطمح نظر خواہ کچھ ہی ہو تم کوشش کرنا کہ کوئی اینٹ، روڑا، پتھر یا گندا انڈا ان کو نہ چھوئے۔ چنانچہ میں اس دن اپنے تین چار چہیتے اور قابل اعتماد شاگردوں کے ساتھ جالندھر پہنچا۔ اور اسی ڈبہ میں مولانا مدنی کے ساتھ امرتسر تک آیا۔ امرتسر اسٹیشن پر چند بدقماش طلباء نے گندے انڈے پھینکنے کا پروگرام بنا یا ہوا تھا۔ وہ مجھے ڈبہ میں دیکھ کر بہت ہی حیران ہوئے۔ اور کہا کہ "تم مسلم لیگی ہو کر کیوں مولوی مدنی سے انتقام لینے کو منع کرتے ہو" میں نے کہا نہیں اپنے جیتے جی مولانا مدنی کو کوئی روڑا، اینٹ، گندا انڈا یا اور کوئی چیز لگنے نہیں دونگا۔ اس جواب پر آدھے شریر طلباء تو چلے گئے مگر باقی بدذاتوں نے گندے انڈوں کی بوچھاڑ کردی۔ وہ تمام میں نے اپنے بازوؤں، لباس، منہ پر لی۔ میرا حلیہ عجیب بن چکا تھا۔ میرے کٹر مسلم لیگی ہونے کے باوجود انہوں نے مجھ پر بہت سے انڈے پھینکے تھے۔ وہ مجھے گالیاں بھی دیتے تھے۔ لیکن الحمد للہ کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ البتہ میں معمولی سا زخمی ہوا۔ دو روڑے میرے گھٹنوں پر لگے تھے۔ جب میں اس حال میں حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا:-

"احسان! تم نے جنت میں اپنے لیے جگہ بنالی"

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ بانی تبلیغی جماعت

"حضرت مدنی کی سیاست میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آجاتی تو میں ان کے پیچھے دوڑا دوڑا پھرتا۔ تاہم اللہ پاک کے نزدیک آپکا جو درجہ و مقام ہے۔ میں جانتا ہوں آپ سے سیاست میں اختلاف کر کے میں دوزخ کی آگ نہیں خریدنا چاہتا۔"

مولانا مدنی واقعات کے آئینے میں

میں سب کو معاف کرچکا ہوں

بنگال کے سفر میں ایک جگہ لوگ حضرت کے ساتھ سخت گستاخی سے پیش آئے اور اخبارات میں اس کا چرچا ہوا تو چودھری مقبول الرحمن خان سیوہاروی نے ان کی ہجو میں ایک نظم لکھی اور انکے لیے کچھ بددعائیں بھی دیں۔ اس نظم میں انھوں نے مجھ سے بھی مشورہ لیا۔ غرض اس کو صاف کر کے میں نے بجنور کے مشہور اخبار "مدینہ" کو برائے اشاعت بھیج دیا۔ جب وہ شائع نہ ہوئی تو میں نے مولوی مجید حسن مالک اخبار کو بطور شکایت خط لکھا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ جب وہ نظم یہاں پہنچی تو حضرت یہاں دفتر میں تشریف فرما تھے۔ ان کو علم ہو گیا اور انھوں نے سختی سے شائع کرنے سے روک دیا۔ اگلے مہینے حضرت سیوہارہ تشریف لائے تو میں نے کہا۔ آپ نے ہماری نظم کو شائع ہونے سے کیوں روک دیا۔ فرمایا کہ:-

ئے۔ فوراً چند سگریٹ کی ڈبیاں ادھر ادھر سے اکٹھی کیں اور لوٹا لیکر پاخانہ میں گئے اور اچھی طرح صاف کر دیا اور ہندو دوست سے
ے لگے کہ جائیے پاخانہ تو بالکل صاف ہے۔ نوجوان نے کہا کہ مولانا میں نے دیکھا ہے۔ پاخانہ بالکل بھرا ہوا ہے۔ قصہ مختصر وہ اٹھا اور جا کر دیکھا
نہ بالکل صاف تھا۔ بہت متاثر ہوا۔ اور بھرپور عقیدت کے ساتھ عرض کرنے لگا۔ یہ حضور کی بندہ نوازی ہے جو سمجھ سے باہر ہے۔
راقم الحروف کو یہ بات بھی پہنچی ہے کہ اسی واقعہ کو دیکھنے پر یا اس طرح کے کسی دوسرے موقعہ پر اسی ڈبہ میں خواجہ نظام الدین تونسوی
نے اس ڈبہ میں ایک ساتھی سے پوچھا کہ یہ کھدر پوش کون ہے جواب ملا کہ یہ حسین احمد مدنی ہیں تو خواجہ صاحب مرحوم بے اختیار ہو کر
مدنی کے پاؤں سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ حضرت نے جلد پاؤں چھڑائے اور پوچھا کیا بات ہے تو خواجہ صاحبؒ نے کہا۔
اختلافات کی وجہ سے میں نے آپ کے خلاف فتوے دیئے اور برا بھلا کہا۔ اگر آج آپ کے اس اعلیٰ کردار کو دیکھ کر تائب نہ ہوتا
سیدھا جہنم میں جاتا۔

حضرت نے فرمایا:— میرے بھائی میں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا ہے۔ اور وہ سنت یہ ہے کہ حضور صلی
وسلم کے ایک یہودی مہمان نے بستر پر پاخانہ کر دیا تھا صبح جلدی اٹھ کر چلا گیا۔ جب اپنی بھولی ہوئی تلوار لینے واپس آیا تو دیکھا۔ کہ حضور
اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنے دستِ مبارک سے بستر کو دھو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔

ے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ جوابِ رسول سے مسجد نبوی میں درس حدیث دیتے ہیں) دورہ
میں شریک تھے۔ کسی گستاخ نے ایک رقعہ بھیجا جس کا جواب حضرت نے دوسری نشست میں نہایت نرم و شائستگی سے دیا
یا کہ کسی دوست نے مجھ کو یہ رقعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے۔ تمام مجلس میں ہیجان برپا ہو گیا۔ اور ہر طالب علم غیض و غضب
ز لیا۔ آپ نے فرمایا۔ خبردار! کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا حق ہے کہ میں اس کی تسلی کر دوں۔
فرمایا۔ "میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ محلہ الہداد پور کا رہنے والا ہوں اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ
خط بھیج کر پتا کر سمجھ لیا جائے"۔ العظمۃ للہ۔ بردباری کی انتہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ پہلوان وہ نہیں ہے جو
پچھاڑ دے۔ بلکہ بہادر وہ ہے کہ غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے اور اپنے نفس کو مغلوب کر دے۔

(او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

رت میں نے کیا غلطی کی ہے؟

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یو۔پی
جگہ میری تقریر تھی۔ رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہو کر لیٹ گیا۔ بین الیقظہ والنوم مجھ کو محسوس ہوا کہ کوئی میرے پاؤں
ہے۔ میں نے کہا کہ لوگ اس طرح دباتے رہتے ہیں کوئی مخلص ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ میٹھی ترغیب قسم کی ہے
راحت کے نیند رخصت ہوتی جا رہی ہے۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنی ہیں۔ فوراً جھٹک کر چارپائی سے اتر پڑا اور ندامت سے
لگا۔ حضرت کیا ہم نے اپنے لیے جہنم جانے کا خود سامان پہلے سے کم کر رکھا ہے۔ کہ آپ بھی ہم کو دھکا دے کر جہنم بھیج رہے ہیں
نے جواباً فرمایا آپ نے دیر تک تقریر کی تھی۔ آرام کی ضرورت تھی اور آپ کی عادت بھی تھی اور مجھ کو سعادت کی ضرورت تھی ساتھ

ہی نماز کا وقت قریب تھا۔ میں نے خیال کیا۔ آپ کی نماز نہ چلی جائے تو بتایا ہے۔ حضرت میں نے کیا غلطی کی ہے۔ سچ فرمایا گیا ہے

فروتنی است دلیل رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

مولانا عبد اللہ فاروقی ؒ حضرت رائے پوری سے بیعت

عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہ اٹھاؤ گے

لاہور دہلی مسلم ہوٹل میں برسہا برس خطیب رہے۔ انکا بیان
میں مدینہ منورہ حاضر ہوا اور مولانا مدنی کے ہاں قیام کیا۔ ایک روز جب مولانا کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے گیا۔ تو میں نے مولانا کا
اٹھا لیا۔ مولانا اس وقت تو خاموش رہے۔ دوسرے وقت جب ہم نماز پڑھنے کے لیے گئے۔ تو مولانا نے میرا جوتا اٹھا کر سر پر رکھ لیا
پیچھے ہو گا۔ مولانا نے تیز چلنا شروع کر دیا۔ میں نے کوشش کی کہ جوتا لے لوں۔ نہیں لینے دیا۔ میں نے کہا کہ خدا کے لیے سر پر تو نہ رکھئے۔
عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہ اٹھاؤ گے۔ میں نے عہد کر لیا۔ تب جوتا سر پر سے اتار کر نیچے رکھا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ملتان تشریف لائے۔ میں نے دعوت کی۔ گھر والوں نے

جگہ جگہ صلیب نما نشان ہے

اوپر دری بچھا دی۔ دری چوخانی تھی مگر اس طرح کہ جمع کی شکل + اس کے خانوں
جاتی تھی۔ حضرت کی نظر پڑی تو گدے پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ فرمایا اس میں جگہ جگہ صلیب نما نشان ہے۔ میں اس پر نہیں بیٹھوں گا
(مولانا خدا بخش ملتان)

مولانا خدا بخش ہی راوی ہیں کہ حضرت کی خدمت میں پیش کرنے

اس کا سوت انگریزی مشین کا کتا ہوا ہے

میں نے کھدر لے کر کہروڑ پکا ضلع ملتان بہت عمدہ چھپوایا اور
پیش فرمانے کے لیے دونوں ہاتھوں پر رکھا۔ دیکھا تو فرمایا۔ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا حضرت رومال پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا
سوت انگریزی مشین کا کتا ہوا ہے۔ میں ایسی چیزیں استعمال نہیں کرتا۔ میں ایسا کھدر استعمال کرتا ہوں۔ جس کے دونوں سوت ہاتھ کے
ہوئے ہوں۔ حضرت کی اس تصریح کے بعد دیسی کا مفہوم متعین ہوا۔

میاں چنوں ضلع ملتان میں مولانا ہدایت اللہ کا سالانہ تبلیغی جلسہ تھا۔ حضرت تشریف لائے۔ رات

وہ کھدر نہیں تھا

لیے سٹیج پر آئے اور بیٹھ گئے۔ بیٹھے بیٹھے کچھ غنودگی آ گئی۔ پان کی پیک ہاتھ پر گر گئی۔ حضرت فوراً چونک گئے
صاف کرنا چاہی۔ خدام نے مختلف رومال پیش کیے۔ مگر اتفاق سے جس کے پاس جو کچھ کپڑا تھا۔ وہ کھدر نہیں تھا۔ حضرت نے قبول نہیں فر
اور اس وقت اتفاق سے حضرت کے پاس اپنا رومال نہیں تھا۔ اپنی جیب سے کھدر کی جراب نکالی اور اس کے کنارے سے
پیک صاف کی۔
یہ ہے صداقت اور قول و عمل میں مطابقت کہ کھدر کے استعمال کا عہد ہے۔ تو ہر موقعہ پر کھدر ہی کا استعمال کیا

ملتان کانگریس کے جلسہ پر ۱۹۴۶ء میں تشریف لائے اور واپسی پر اپنا ٹکٹ خود لے

دیوبند سے ملتان کا کرایہ تھرڈ کا

اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا ٹکٹ خریدا اور ساتھ بیٹھ گیا تو میں نے ایک

منتظمین جماعت نے جو پیش خدمت کرنے کے لیے دی تھی۔ پیش کی تو جھنک کر فرمایا یہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ منتظمین نے یہ مصارف سفر دیے ہیں۔ فرمایا کہ میری اجازت کے بغیر لیے کیوں؟ جب میں نے کافی معذرت کی اور اصرار کیا تو فرمایا میں دیوبند سے چلا ہوں۔ وہاں سے یہاں تک کا تھرڈ کلاس کرایہ آمد و رفت لے لو۔ باقی واپس کر دو۔ اس کے بعد مجھے بیٹھا ہوا دیکھ کر کہا کہ اب تم جاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ دوستوں نے اصرار کیا ہے کہ ساتھ جاؤں۔ اس پر اور زیادہ بگڑے اور فرمایا ٹکٹ واپس کر دو۔ دام ان کے ادا کر دو۔ میرے ساتھ کسی کے جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تعمیل ارشاد کرنا پڑی۔ اور حضرت اللہ کی حفاظت میں اس پر آشوب دور میں تنہا واپس ہوئے۔

(مولانا خدا بخش ملتان)

اللہ محافظ ہے حضرت سیالدہ ایکسپریس سے مراد آباد اترے۔ اسی وقت پسنجر گاڑی سے سہارنپور کا قصد تھا۔ ایکسپریس سے ڈبے کٹ کر پسنجر کو لگ جاتے تھے۔ نماز عصر کا وقت آگیا۔ پلیٹ فارم پر جماعت ہونے لگی۔ تو ایک خادم جو ڈبے لے جا رہا تھا۔ حضرت نے اس کو بھی بلوا لیا۔ میں نے عرض کیا۔ سامان کی حفاظت کون کرے گا۔ فرمایا۔ اللہ محافظ ہے۔

(مولانا انصار الحق شیخ التفسیر جامعہ قاسمیہ مراد آباد)

اپنے ذبح کرنے کے لیے اپنا ہتھیار تمھیں دوں ۳۲ء میں جمعیت علمائے ہند کی طرف سے آپ ڈکٹیٹر بنائے گئے۔ ہر ایک ڈکٹیٹر کو دہلی جاکر سول نافرمانی کرنا اور گرفتار ہونا تھا۔ آپ کی طبیعت سخت علیل تھی۔ ٹانگوں میں زخم تھا۔ چلنا پھرنا دشوار تھا۔ مولانا انور شاہ محدث کشمیری رح کو مقصد روانگی کا علم ہوا۔ تو کہلا کر بھیجا کہ اس حالت میں سفر نہ کریں۔ تاریخ بدل دیجئے۔ حضرت نے گوارا نہ فرمایا۔ اسی حالت میں روانہ ہو گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی طرف سے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا تھا۔ دیوبند سٹیشن پر کثرت ہجوم کے باعث پولیس کو جرأت نہ ہوئی۔ دیوبند سے اگلے سٹیشن پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے وہ نوٹس پیش کیا۔ آپ نے فرمایا میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس نے کہا قلم دیجئے تاکہ اردو میں ترجمہ کر دوں۔ حضرت نے فرمایا کیا خوب؟ اپنے ذبح کرنے کے لیے اپنا ہتھیار تمھیں دے دوں۔ وہ خاموش ہو گیا اور گاڑی چل پڑی۔ مظفر نگر سٹیشن پر ترجمہ کر کے لایا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ حاکم سہارنپور کی طرف سے آپ کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ آپ آگے نہ جائیں ورنہ آپ اپنے آپ کو گرفتار سمجھیں۔ فرمایا اب میں سہارنپور کی حدود سے آگے ہوں۔ نوٹس قابل تعمیل نہیں۔ افسران یہ جواب سن کر حیران ہوئے۔ بعد میں مجسٹریٹ نے جو ساتھ تھا۔ کہا کہ آپ کو اپنے خصوصی اختیارات کی بنا پر نوٹس دوں گا۔ چنانچہ اس نے اسی اسٹیشن پر دوسرا تحریری نوٹس پیش کیا۔ اور گرفتاری عمل میں آئی۔ حضرت کی یہ حالت تھی کہ گاڑی سے اتر کر دو قدم بھی چلنا دشوار تھا۔ اسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے کرسی بچھا دی گئی۔ اس پر حضرت بیٹھ گئے۔ اس تمام تکلیف کے باوجود فریضۂ جہاد آزادی کو چھوڑنا یا ملتوی کرنا گوارا نہیں فرمایا۔

(مولانا انصار الحق جامعہ قاسمیہ مراد آباد)

خداوند تعالےٰ کو کیا جواب دوں گا خشیۃ اللہ کی یہ کیفیت تھی کہ لبا اوقات نماز میں جب آیات عذاب کی قرأۃ فرماتے تھے تو بے اختیار رونے لگتے تھے۔ وفات سے ایک روز قبل مولانا سید فخر الدین احمد (حال صدر مدرس دار العلوم) کو بلایا اور فرمایا۔ کہ چند روز سے نماز بیٹھ کر تیمم سے پڑھ رہا ہوں۔ بڑی کوتاہی ہوئی ہے۔ خداوند تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا۔ یہ فرما کر بلند آواز سے رونا شروع کر دیا اور اس قدر روئے کہ اس سے پیشتر کبھی اتنا روتے ہوئے نہیں

دیکھا گیا۔

بہر حال اللہ تعالےٰ حافظ و ناصر ہے

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر جس زمانہ میں سر سکندر حیات کی حکومت نے ایک مقدمہ چلا رکھا تھا جس میں پھانسی کی سزا کا اندیشہ تھا اور لوگ سخت پریشان تھے۔ اس وقت کچھ لوگ نہایت متفکرانہ انداز میں حضرت کی خدمت میں دعا کے لیے پیش ہوتے۔ حضرت سب کی سنتے رہے۔ آخر میں کچھ فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ راہِ حق میں قربان ہونا تو بہت بڑی سعادت ہے۔ اس میں فکر کی کونسی بات ہے۔ "بہر حال اللہ تعالیٰ حافظ و ناصر ہے" ان الفاظ سے بخوبی حضرت کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے کہ راہِ حق میں یہ خوفناک سزا بھی حضرت کے لیے ایک مرغوب شے ہے۔ بہر حال کچھ ہی دنوں بعد حضرت کی یہ اجمالی پیشن گوئی پوری ہوئی اور شاہ صاحب موصوف رہی ہو گئے۔

آپ اطمینان سے اچھی طرح کھائیے

چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست کے مصداق آپ کا خوانِ کرم اپنے پرائے ہر ایک کے لیے کشادہ رہتا تھا۔ مہمانوں کا ہمیشہ جھمگٹا رہتا تھا اور لطف یہ کہ چھوٹا بڑا، امیر، غریب، حاکم محکوم بلا امتیاز بندہ و آقا سب ایک دسترخوان پر حلقہ کی شکل میں بیٹھے ساتھ ساتھ کھاتے نظر آتے تھے۔ حضرت کی عجب شان ہوتی تھی۔ سنت کے مطابق نماز کی سی شکل میں بیٹھے بیٹھے کھانا تناول فرماتے رہتے تھے اور نگاہیں چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں۔ جس مہمان کے سامنے روٹی ختم ہونے لگتی تھی۔ فوراً اپنے پاس سے گرم روٹی اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ مہمان نوازی کے سنت کے مطابق اور اس خیال سے کہ کوئی مہمان بھوکا نہ رہ جائے۔ کھانا آخر تک کھاتے رہتے تھے۔ حالانکہ سب سے کم کھاتے تھے۔

ایک مرتبہ کھانے کے موقعہ پر ایک صاحب جو بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس بیٹھے تھے۔ دوسرے حضرات کے سفید پوش اور معززین کی وجہ سے مرعوب ہو کر کھانے کے حلقے سے پیچھے بیٹھ گئے۔ حضرت نے دیکھا تو ساتھ کھانے کے لیے فرمایا۔ اتفاق سے وہ ایسے صاحب کے پاس آبیٹھے جو بہت معزز اور سفید پوش تھے۔ اور ان کے ساتھ بیٹھنے سے کچھ کبیدہ سے معلوم ہوتے تھے۔ اول الذکر اس چیز کو محسوس کر کے کچھ پریشانی کے ساتھ مرعوب ہو کر کھاتے رہے۔ حضرت نے اس کو بھانپ لیا اور ان سے فرمایا کہ آپ اُٹھیے۔ وہ نہ اُٹھے۔ تو دوبارہ فرمایا اٹھیے آپ اٹھیے۔ اب وہ اٹھے۔ تو حضرت نے ان کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور فرمایا۔ آپ اطمینان سے اچھی طرح کھائیے۔ پھر فرمایا کسی کو کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان بوسیدہ حال لوگوں کا کتنا اونچا درجہ ہوگا۔ سفید پوشوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ نہایت شرمندہ ہوئے اور بعد میں ان صاحب سے معافی مانگی۔

پچاس روپلے ماہوار بھیجتے رہے

مہمان نوازی کی اس وسعت پر ہی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ بہت سے ضرورت مندوں، یتیموں، اور بیواؤں کی امداد کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا تھا۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ جب تک حجاز میں رہے۔ حضرت ہمیشہ ان کو پچاس روپلے ماہوار ارسال فرماتے رہے۔ جود و سخا کا یہ سلسلہ اس قدر پوشیدہ رہتا تھا کہ بہت سے قریبی حضرات کو بھی اطلاع نہ ہوتی تھی۔

یہی کھانا کافی ہو جائے گا

حضرت مولانا عبد السمیع صاحب مدرس دار العلوم نے مشکوٰۃ شریف کے درس کے دوران کتاب المعجزات کے ضمن میں حضرت کا یہ ایک واقعہ قسم کھا کر سنایا تھا۔ اس موقعہ پر سو سے زیادہ

طالب علم موجود تھے۔ انھوں نے بیان فرمایا کہ میں نے ایک روز حضرت کی دعوت کی۔ اتفاق سے اس وقت مہمان تھوڑے سے تھے۔ حضرت شیخ نے دعوت قبول فرمائی۔ جب کھانے کا وقت آیا تو مہمان زیادہ آگئے۔ حضرت شیخ تمام مہمانوں کو لے کر تشریف لے آئے۔ مہمانوں کی کثرت دیکھ دیکھ میں پریشان ہوا۔ حضرت نے محسوس فرمالیا۔ مجھے علیحدہ لے گئے۔ میں نے عرض کیا۔ تھوڑی دیر ٹھہریں۔ میں اور انتظام کرلوں۔ حضرت نے فرمایا یہی کھانا کافی ہوجائے گا اور آپ کے ارشاد کے مطابق تمام روٹی اور ترکاری آپ کے پاس لاکر رکھدی گئی۔ روٹیوں پر کپڑا ڈھک دیا گیا۔ اب حضرت شیخ اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیتے رہے۔

مولانا عبدالسمیع صاحب قسم کھاکر فرماتے تھے کہ وہی کھانا سب کو کافی ہوگیا۔ گھر والوں نے بھی کھالیا اور کچھ بچ بھی رہا۔

(مولانا قاری حافظ سید طاہر حسن صاحب مدرس مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ)

میں تنہا نہیں کھا سکتا

تقسیم ہند کے بعد حضرت مدنی رح سلہٹ کی بجائے ٹانڈہ میں مقیم تھے۔ مئی اور جون کا رمضان تھا۔ گرمی شباب پر تھی۔ لو چل رہی تھی۔ اوسطاً ستر مہمان روزانہ آتے تھے۔ اہل خانہ نے آپ کی پیرانہ سالی اور موسم کے تقاضہ کے بموجب یہ مطالبہ کیا کہ آپ سحر کے وقت کوئی میٹھی چیز نوش فرمالیا کریں۔ تاکہ تشنگی کا غلبہ نہ ہو۔ مگر پیکر سنت نے برجستہ فرمایا کہ میرے مہمان صرف روٹی اور سالن کھائیں اور میٹھی چیزیں کھاؤں۔ اگر مہمانوں کے لیے انتظام ہوسکتا ہے تو میں بھی کھا سکتا ہوں۔ ورنہ میں تنہا نہیں کھا سکتا۔ بدرجہ مجبوری گھر والوں نے سب کے لیے کبھی میٹھے چاول، کبھی دن شیر اور کبھی دن سویّوں کا انتظام کیا۔

اور سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ بخار اور کسی مرض میں مبتلا ہو کے پر حکیم یا ڈاکٹر نے پرہیز بتلایا۔ پیہم اصرار پر چند دنوں تو پرہیزی کھانا کھالیتے۔ چند دن بعد اگر پرہیزی کھانا دسترخوان پر آتا تو اس کو دوسرے کھانوں میں ملادیتے اور وہی کھانا نوش فرماتے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے۔ جو دنیا میں بالکل انوکھی ہے۔ اتباع سنت اگر ولایت ہے تو حضرت مدنی اس دور کے سب سے بڑے ولی تھے۔

ساری رات عبا اوڑھ کر گزار دی

استاد العرب والعجم کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد سے بارہ بجے تک حدیث کی سب سے بڑی مہتم بالشان کتاب بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔ مولانا فیض اللہ، حضرت کو لالٹین دکھانے پر مامور تھے۔ انکا بیان ہے۔ ایک رات حضرت نصف شب کو سردی کے موسم میں مہمان خانہ میں تشریف لائے۔ دیکھا کہ ایک خستہ حال بوسیدہ کپڑے میں ملبوس چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ان سے پوچھو کہ کیوں بیٹھے ہیں۔ اور پھر خود ہی جاکر پوچھا تو اس مہمان نے جواب دیا کہ کسی صاحب نے مجھے دسترخوان سے اٹھادیا اور میرے پاس لحاف بھی نہیں ہے۔ حضرت پر بڑا اثر پڑا۔ بار بار انکا نام پوچھا۔ مگر پتہ نہ چلا۔ فوراً اندر تشریف لے گئے اور کھانا لیکر خود باہر تشریف لاتے اور جب تک اس مہمان نے کھانا نہیں کھایا۔ آپ باہر ہی بیٹھے رہے۔ سارے مہمان اور اہل خانہ سو چکے تھے۔ حضرت اندر گئے اور اپنا بستر اٹھالائے اور اس کو بچھادیا اور خود ساری رات عبا اوڑھ کر گزار دی۔ مولانا فیض اللہ جو حضرت کے شاگرد ہیں۔ کا بیان ہے کہ میں نے بہت اصرار کیا اور چاہا کہ اپنا بستر لے آؤں اور حضرت آرام فرمائیں۔ مگر اس پیکر سنت نے گوارا نہ کیا۔

مراد ما نصیحت بود و گفتیم

آپ ایک دفعہ بریلی تشریف لائے کہ جلسہ سے خطاب کریں۔ موتی پارک میں بعد مغرب تقریر تھی۔ پنڈال بھر چکا تھا۔ صرف حضرت کی انتظار تھی۔ مولانا تشریف لائے۔ معززین شہر ساتھ تھے۔ پارک سے باہر معاندین کا زبردست ہجوم تھا۔ جو اپنے مخالفانہ فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا۔ اور حضرت کو روکنا چاہا۔ مگر حضرت برابر بڑھتے

رہے اور جلسہ گاہ میں بعد تلاوت قرآن کریم وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھذا القرآن الخ پڑھ کر تقریر شروع کی مخالفین کنستر اور تار کول کے خالی ڈرم پوری قوت سے بجانے لگے اور کیلوں کے ڈنٹھل پھینکنے شروع کیے۔ تقریر پھر بھی جاری رہی۔ حضرت نے مجمع کو کوئی دفاعی کارروائی کرنے سے قطعاً روک دیا۔ بالآخر پتھر برسنے لگے اور لوگ منتشر ہونے لگے۔ پتھروں کی کوئی کمی نہ تھی کہ سڑک بن رہی تھی۔ ضلع کا افسر اعلیٰ مسلم لیگی تھا۔ لہٰذا پولیس بجائے اس کے کہ ان کی سرکوبی کرتی۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ جانبازوں نے چاہا کہ حضرت کے گرد گھیرا کر سایہ کرلیں۔ مگر واہ رے صبر و استقامت کے پتلے حسین احمد نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور انتہائی محبت و شفقت سے فرمایا۔ کہ حسین احمد کا سر آپ کے سروں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ آخر کار مخالفین نے روشنی کے قمقموں کو پتھروں کا نشانہ بنایا۔ اور فضا تاریک ہوگئی اور اپنے خیال میں جلسہ کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا۔ حضرت اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے اور قبل اس کے کہ بریلی سے واپس ہوں۔ آپ کی جانب سے ایک ہینڈ بل شائع ہو کر تقسیم ہوا۔ جو دعاؤں اور نصیحتوں سے پُر تھا اور جس کا مضمون اس شعر پر ختم ہوا تھا۔

مرادِ ما نصیحت بود و گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

میں کافی احتیاط اور خیال رکھتا ہوں

درس میں بعض دفعہ ذاتی نوعیت کے سوال پوچھتے تھے۔ جن کا لہجہ سخت ہوتا تھا۔ ایک دفعہ پرچی آئی کہ "حضرت آپ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتے ہیں۔ یہ تو از روئے حدیث حرام اور ممنوع ہے۔" حضرت نے یہ پرچی سنائی اور فوراً کھڑے ہو گئے۔ اور پائنچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "حضور کون کہتا ہے کہ میں ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتا ہوں۔ دیکھیے میرا پاجامہ کہاں ٹخنوں سے نیچے ہے۔؟ ہو سکتا ہے کہ کبھی غیر شعوری طور پر اور غیر ارادی طور پر توند کی وجہ سے نیچے چلا جاتا ہو۔ پھر بھی کافی احتیاط اور خیال رکھتا ہوں۔ بھلا میں اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ جب کہ حدیث میں اس کی صریح ممانعت آئی ہے۔

حضرت نے چار روپے دے دیئے

حضرت جمعیۃ کے پروگرام کے سلسلہ میں رنگون گئے۔ جہاں سے بذریعہ بحری جہاز کلکتہ آئے۔ میزبان نے خادم کو بھی ساتھ کر دیا تاکہ آرام رہے۔ حضرت کا ٹکٹ اوّل درجہ کا اور خادم کا تیسرے درجہ کا۔ خادم اوّل درجہ میں کبھی چلا جاتا۔ جب کہ وہ کمرہ بالکل خالی تھا تو جہاز کا ملازم "سارہ" جب کبھی دیکھتا تو اعتراض کرتا (شاید مولویانہ وضع قطع سے)۔ چنانچہ حضرت نے یہ کیا کہ خادم کے ساتھ تیسرے درجہ میں اکثر وقت گذارنے لگے۔ سفر ختم ہونے پر وہ ملازم حضرت کی خدمت میں بخشش اور انعام لینے حاضر ہوا۔ حالانکہ اس نے راستہ میں تکلیف ہی تکلیف پہنچائی تھی۔ آرام بہم نہیں پہنچایا تھا۔ خادم نے کہا کہ اس کو کچھ نہ دیجئے۔ حضرت نے فرمایا نہیں۔ اس کا حق اسکو دیا جائے گا۔ ان دنوں بڑے سے بڑا انگریز بھی ایک روپیہ سے زیادہ انعام نہیں دیتا تھا کہ وہ ایک روپیہ آج کل کے سات آٹھ کے برابر تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ نے چار روپے گن کر اس کو دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا حضرت نے اس کی پشیمانی اور ندامت محسوس کرتے ہوئے فرمایا۔ لو یہ تمہارے ہی ہیں۔ چنانچہ اس نے لے لیے۔ خادم نے اس کے بعد کہا یہ کیا کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ بھائی اصل بات یہ ہے کہ یہ بے چارہ سمجھتا تھا کہ انعام و بخشش ہمیں صاحب بہادروں اور انگریزوں سے ملتی ہے۔ ہماری جیسی "مولویانہ" صورتوں سے شاید اسے انعام کی توقع نہ تھی۔ اس لیے اس نے ہم سے یہ برتاؤ کیا۔ ہمارا سفر تو ختم ہو گیا۔ لیکن میں نے اسے یہ روپے اس لیے دیئے ہیں۔ کہ اسے معلوم ہو جائے کہ ہم جیسے لوگ انگریزوں سے زیادہ دے

سکتے ہیں۔ اب مجھے امید ہے کہ ہماری ایسی صورت والے اللہ کے کسی بندہ کو انشاء اللہ آئندہ نہیں ستائے گا۔ بلکہ اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اس واقعہ سے حضرت کی عالی ظرفی اور مزاج ایمانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(مولانا محمد منظور نعمانی)

چالیس ہزار روپیہ نقد اور پانچ صد ماہوار

ایک سلسلہ میں فرمایا کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے ترک تعلق نہ ہونا چاہیئے اور اسی مجلس میں فرمایا کہ جب میں کراچی جیل سے ۲۲ء میں رہا ہو کر آیا تھا تو بنگال کونسل کے ایک ممبر نے کہا کہ چالیس ہزار روپیہ نقد اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں پانچ سو روپیہ ماہانہ کی پروفیسری آپ کے لیے ہے۔ اس کو منظور فرمالیں۔ میں نے کہا۔ کام کیا کرنا ہوگا۔ ممبر صاحب نے فرمایا کچھ نہیں۔ صرف تحریکات میں خاموش رہیں۔ میں نے کہا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جس راستہ پر لگا گئے ہیں۔ اس سے نہیں ہٹ سکتا۔ حضرت شیخ نے اس واقعہ کو بیان کرکے فرمایا۔ کہ آپ صاحبان اس کام میں لگے رہیں۔ تعلقات خراب نہ کریں (یہ بات نظر انداز نہ ہونا چاہیئے کہ یہ ۲۳ء کی بات ہے۔ اس وقت حضرت کے لیے ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد سلہٹ تشریف لے جانے پر مشاہرہ ڈیڑھ صد روپیہ تھا۔)

(مولانا مقصود علی۔ مدرس مدرسہ تعلیم الدین آنند ضلع کھیڑا)

مخدوم خود خادم بنا ہوا تھا

مولانا عبدالماجد دریابادی نے "نقوش و تاثرات" میں کیا خوب لکھا ہے۔

"مخدوم خادم بنا ہوا تھا اور جس کا منصب آمر ہونے کو تھا۔ وہ فخر و مسرت اپنی ماموریت میں محسوس کر رہا تھا۔ دیوبند جائیے تو مولانا سٹیشن پر پیشوائی کے لیے موجود، چلنے لگے تو سٹیشن تک مشایعت پر آمادہ۔ کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو وہ لوٹا لیے ہاتھ دھلانے کو کھڑے۔ پانی مانگیے تو گلاس لیے حاضر۔ سفر میں ساتھ ہو تو تانگہ کا کرایہ اپنے پاس سے دے دیں۔ ریل کا ٹکٹ وہ دوڑ کر لے آئیں۔ ہوٹل میں کھائیں تو بل وہ خود ادا کریں۔ آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں پیسے ٹٹولتا ہی رہ جائے۔ بستر بھی وہ کھول کر بچھا دیں۔ غرض یہ کہ مالی اور بدنی چھوٹی بڑی خدمت کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ان سب میں آپ کو پیش پیش دیکھا۔ مولانا محمد علی جوہر نے شعر کہا تو تھا۔ اپنے شیخ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کے حق میں۔ مگر صادق مولانا دیوبندی پر بھی لفظ بہ لفظ آ رہا تھا۔

ان کا کرم ہی ان کی کرامت ہے ورنہ یہاں
کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی!

آپ کے لوٹے میں پانی لے آئیں۔ آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اٹھانے لگیں۔ تین دن قیام دیوبند میں روایتیں مشاہدہ بن کر رہیں۔ اور "شنیدہ دیدہ" میں تبدیل ہو گئیں۔ تکلفات اور خاطر میں، مہمان نوازیاں کھانے پر کھلانے جانے پر جائیے۔ دوسروں کو شاید کام لینے میں وہ لطف نہ آتا ہو۔ جو مولانا کو دوسروں کا کام کرنے میں آتا تھا۔"

آپ میری طرف سے معافی چاہ لیں

ایک مرتبہ ایک بنگالی طالب علم صاحب کو ایک ضرورت سے احقر نے ٹانڈہ حضرت کے پاس بھیجا۔ حضرت جلسہ میں جا رہے تھے۔ وہ راستہ میں ملا۔ فرمایا۔ آپ گھر چلیں۔ میں جلسہ سے ہو کر آؤں گا۔ وہ طالب علم گھر نہ پہنچ سکے۔ کسی مسجد میں سو رہے۔ حضرت نے بہت تلاش کرایا جلسہ سے واپسی پر مگر وہ نہ ملے۔ جب صبح کو حاضر خدمت ہوئے تو حضرت نے بہت افسوس ظاہر فرمایا اور معذرت کی۔ دوسرے دن طالب علم

واپس ہوئے اور ساتھ ہی ڈاک سے حضرت کا گرامی نامہ پہنچا کہ ان بنگالی طالب علم کو تکلیف پہنچی۔ آپ میری طرف سے معافی چاہ لیں۔ (مولانا شمس الدین صاحب نائب ناظم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور)

غریب کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا

حضرت کے ساتھ بارہا کھانے کا اتفاق ہوا۔ حضرت ہمیشہ کھانا بعد میں ختم فرماتے اور جب میں کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا تو ارشاد ہوتا۔ آپ مرغن کھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ غریب کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ ایک دفعہ میں نے طے کیا کہ کچھ بھی ہو آج کھاتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ حضرت فارغ ہوں۔ بس میں نے شروع ہی سے بہت آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ سب لوگ اٹھ گئے۔ میں کھاتا رہا۔ حضرت بھی کھاتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ حضرت اب نظاہر جائیں گے کہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔ تب میں نے کھانا بند کیا تو حضرت نے اب بھی مسکرا کر یہی فرمایا۔ "غریب کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ اور ہاتھ کھینچ لیا۔ (بحوالہ مذکور)

رمضان المبارک

رمضان شریف کا مہینہ قیام اللیل کا مہینہ ہے۔ آپ ساری رات یادِ الٰہی میں کھڑے ہو کر گزار دیتے جب کوئی آیت تہدید وعید کی آتی تو لرز جاتے اور دعا کی آیت کو بار بار لوٹاتے۔ ایک ختم تراویح میں فرماتے اور ایک تہجد میں۔ آپ کے ساتھ سلوک و طریقت کے منازل طے کرنے والوں کا ایک جم غفیر رہتا۔ ذکر الٰہی سے وہ جگہ گونجتی رہتی۔ خاص رمضان المبارک میں تعداد ہزار ڈیڑھ ہزار تک پہنچ جاتی جس میں پانچ چھ سو ذاکرین ہوتے تھے تقسیم سے قبل رمضان المبارک سلہٹ میں عموماً گزرتا تھا۔

عیدی

جوں ہی عید کا چاند نظر آیا۔ خوشی کی لہر روئے مبارک پر دوڑ گئی۔ لیکن وہ رات خاص اہتمام سے یادِ الٰہی میں بسر کرتے اور صبح کو تمام چھوٹے بڑے رشتہ داروں میں عیدی تقسیم کرتے اور انبساط سے عید کی مبارک بادی دیتے۔

اجازت و بیعت

تقسیم سے ایک سال قبل سلہٹ میں بعد رمضان المبارک چھ ہزار افراد نے بیعت کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کیا گیا۔ یہ وہی حضرات تھے جو آپ کے دشمن اور نام سن کر جلتے تھے۔ لیکن آج گرویدہ ہو کر حلقۂ حسینیہ میں داخل ہو رہے تھے۔

وظائف

آپ ہمیشہ صلہ رحمی اور رشتہ دار کی نگہداشت فرماتے۔ اعزاء اقرباء کی نگہداشت۔ آپ کی خاص شان تھی رشتہ داروں میں سے جو کوئی آتا یا دارالعلوم میں طالب علم ہوتا تو اسے کبھی اجازت نہ تھی۔ کہ اس گھر کے علاوہ کہیں اور قیام کرے اور کھانا کھائے ڈ سبھوں کو خاص طور سے تاکید تھی کہ گھر پر کھایا کریں۔ اور اگر پیسہ کی کمی ہو تو مجھ سے لے لیا کریں یہاں تک کہ ضروریات مختلفہ وقتاً فوقتاً پوری کرتے۔ نادار رشتہ داروں، بیوگان اور پڑوسیوں کو تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار امداد فرماتے اور گھر میں ہر چھوٹے بڑے کے لیے جیب خرچ ماہانہ مقرر کر دیا تھا۔ جسے وقت پر خود سے تقسیم فرماتے۔ اکثر و بیشتر علماء کرام جن کی تنگی معلوم ہوتی۔ انھیں تنہائی میں لے جا کر ایک خطیر رقم سے امداد فرماتے اور منی آرڈر کر کے سرپرستی اور غم گساری فرماتے۔

وُہ فروخت کرنے میں جھوٹ بولے گا

حضرت دہلی جمعیۃ کے دفتر میں قیام فرماتے تھے۔ خدام نے جماعت کیلئے چٹائیاں بچھادیں حضرت نے دیکھا تو فرمایا۔ ناظم اعلیٰ (مولانا حفظ الرحمٰن) کا انتظام بہت اچھا ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے جواب دیا۔ یہ ناظم اعلیٰ کا انتظام نہیں۔ بلکہ آپ کے خادم چوہدری عبدالرحمٰن کی عقیدت ہے وُہ چٹائیاں فروخت کرتے ہیں۔ اس وقت نماز کے لیے بچھادی ہیں۔ حضرت نے جونہی یہ سُنا۔ فوراً رنگ بدل گیا۔ اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور فرمایا نہیں۔ ان کو اٹھادو۔ خدام نے عرض کیا کہ عبدالرحمٰن نے اپنی خوشی سے بچھائی ہیں۔ فرمایا۔ نہیں وہ انھیں غیر مستعمل نئی بنا کر فروخت کرے گا۔ حالانکہ وہ استعمال میں آچکی ہوں گی۔ وہ فروخت کرنے میں جھوٹ بولیگا۔ یہ کب درست ہے؟ اس کے بعد دفتر کی چٹائیوں پر نماز پڑھی۔ (حمداللہ جان رفیق خاص دفتر جمعیۃ علمار ہند)

یہ خرچ جماعت کے مالیہ پر نہیں پڑسکتا

قیام کرنے کے بارے میں معمول یہ تھا کہ جہاں آمد ورفت بار بار ہوتی۔ ایک جگہ متعین کرلیتے تھے اور سیدھے وہیں پہنچتے تھے۔ مرادآباد میں ہمیشہ سے مولانا محمد صدیق مرحوم کا گھر معین رہا۔ مختلف لوگوں نے بار بار کوشش کی۔ مگر آخر وقت تک وہیں جاتے رہے ۱۹۳۶ء میں مرادآباد میں مجلس عاملہ کا اجلاس و قیام اور جگہ تھے۔ اور حضرت کا اپنی جگہ پر۔ اجلاس کے موقعہ پر تانگہ میں مقام اجلاس پر تشریف لائے تو ناظم جمعیۃ نے تانگہ کے مصارف ادا کرنا چاہے تو فرمایا میرا وہاں قیام اپنی رائے سے ذاتی طور پر ہوتا ہے۔ اصولی طور پر مجھے دفتر میں رہنا چاہیئے۔ اگر نہیں رہتا تو دفتر آنے کے مصارف میرے ذمہ ہوں گے۔ نہ کہ جماعت۔ یہ خرچ جماعت کی مالیہ پر نہیں پڑسکتا۔ نیز ناظم مولانا محمد میاں صاحب کو ہدایت فرمائی کہ جماعتی اور غیر جماعتی خرچ میں ہمیشہ امتیاز رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ سب کو یہ توفیق بخشے مگر یہ کام درحقیقت بہت مشکل ہے۔ لیٹر فارم ایک عام چیز ہے۔ بارہا درخواست کی گئی کہ حضرت جمعیۃ کا لیٹر فارم استعمال کریں۔ بحیثیت صدر آپ کو حق حاصل ہے اور یہی بات موزوں بھی ہے۔ مگر بہت کم ہی اتفاق ہوا۔ ہوگا۔ کہ جماعتی کام کے لیے بھی جمعیۃ کا لیٹر فارم استعمال کیا ہو۔ ورنہ اپنے پیڈ پر جو اعلیٰ قسم کے کاغذ پر انکے اپنے خرچ سے تیار ہوتا تھا۔ استعمال ہوتا تھا۔ اپنے کام کے لیے بھی اور جمعیۃ کے کام کے لیے بھی۔ (مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ علمار ہند)

لاش نہیں ملے گی

واقعہ کے راوی جالندھر کے ایک نوجوان مولوی محمد اکرم قریشی ہیں۔ جو حمید نظامی مرحوم (مدیر نوائے وقت) کے جگری دوست مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں ان کے دست و بازو۔ اسلامیہ کالج کے فارغ التحصیل اور لیگ کے آغاز سے آج تک حامی چلے آتے ہیں۔ وہ مولانا مدنی رح اور ان کے مدرسۂ فکر کے کبھی ہم خیال نہیں رہے۔ بلکہ ان نوجوانوں میں سے تھے جنھیں مسلم لیگ کا ہراول دستہ کہا جاتا تھا اور جن کا کام لیگ سے اختلاف رکھنے والے عناصر کی ہر لحاظ سے مدافعت و مزاحمت تھا۔ بلکہ نوجوانوں کا یہ طائفہ احرار اور جمعیۃ کے جلسوں پر یلغار کیا کرتا تھا۔ اس واقعہ کے راوی یہی محمد اکرم قریشی ہیں جنھیں لاہور کے احباب ڈاکٹر بھی کہتے ہیں اور آج کل بیڈن روڈ لاہور میں رہ رہے ہیں۔ ان کی روایت کے مطابق اس واقعہ کے کئی راوی اب بھی بقید حیات ہیں اور یہ واقعہ انھوں نے کافی ہاؤس میں بارہا بیان کیا ہے۔

وہ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات کا زمانہ تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی پنجاب یا سرحد

کے سفر سے واپس جارہے تھے۔ جالندھر کے سٹیشن پر یہی نوجوان مسٹر شمس الحق کی ہمراہی میں اپنے رہنماؤں کے استقبال کے لیے گئے ہوئے تھے۔ راہنما کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ شمس الحق کی نظریں مولانا مدنیؒ پر پڑگئیں وہ اپنے ساتھ کے نوجوانوں کو لیکر ان کے ڈبہ پر چڑھا۔ نعرے لگائے۔ سب و شتم کیا۔ حتیٰ کہ ان کی داڑھی کو پکڑ کر کھینچا۔ ایک بیان کے مطابق رخسار پر طمانچہ مارا۔ مولانا صبر کی تصویر بنے تھے آہ تک نہ کی۔ اس کارنامے کے بعد شمس الحق یا ان کے کسی ساتھی نے یہ واقعہ مولانا غلامی (جانشین گرامی علامہ اقبال کے جگری دوست تھے) سے بیان کیا۔ جو جالندھر مسلم لیگ کے نائب صدر اور تحریک پاکستان کے مقامی طور پر معاون رہنما تھے۔ انھوں نے سنتے ہی کانپ کر پوچھا:۔

"کیا یہ صحیح ہے" جب تصدیق کی گئی تو ان پر ایک رعشہ ساطاری ہوگیا۔ اکرام قریشی کہتے ہیں۔ وہ کانپ رہے تھے۔ انھوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اگر یہ سچ ہے تو جس نے حضرت مدنی کی داڑھی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس کی لاش نہیں ملے گی۔ اس کو زمین نہیں جگہ دے گی"

غلامی کانپ رہے تھے ان کا چہرہ اشکبار تھا۔ ان کے دیدے پرنم تھے۔

آپ جانتے ہیں یہ شمس الحق کون تھا۔ یہ وہی نوجوان ہے جو لائل پور میں قتل و خون کا شکار ہوگیا۔ جس کی نعش کا نہ پتہ چلا۔ اور اس واقعہ کو تقریباً گیارہ بارہ سال ہو چلے ہیں۔ کفن بلا نہ قبر۔ روایتوں پر روایتیں آتی رہیں۔ خود لیگ کے زعماء مہر بلب رہے۔ کسی نے کہا بھٹہ میں زندہ جلا دیا گیا۔ کسی نے کہا لاش کے ٹکڑے کر کے دریا برد کر دیئے گئے۔ (کسی نے کہا قیمہ کر کے جانوروں کو کھلا دیا گیا۔ ارشد) جتنے منہ اتنی باتیں۔ پولیس نے انعام بھی رکھا۔ سب کچھ کیا۔ مگر شمس الحق کا سراغ نہ ملا۔

یک حرف کا شکے کہ بصد جا نوشتہ ایم

(شورش کاشمیری ہفت روزہ "چٹان" ۴ مارچ ۱۹۶۳ء)

※ ※ ※ ※

ملفوظاتِ حضرت مدنیؒ

(۱)

سالک کو جو واقعات پیش آئیں۔ ان کو نامحرموں سے ہرگز نہ ظاہر کرنا چاہیئے۔ اپنے شیخ سے ظاہر کرے۔ یا ایسے شخص سے جو طریقت کا ہمراز اور سالک کا ہمدرد ہو اور بس! یہ چیز سالک کے لیے مضرت رساں ہوتی ہے اور اکثر اوقات فیضِ ربانی کے انقطاع بلکہ کبھی کبھی سلب کا باعث بن جاتی ہے جو راز و نیاز عاشق و معشوق کے درمیان ہو۔ اگر عاشق ان کو ظاہر کر دیتا ہے تو معشوق کے عتاب کا اس قدر ظہور ہوتا ہے کہ بعض اوقات انقطاع کامل کا باعث ہو جاتا ہے عجب کہ یہ حال مجازی معشوق کا ہے تو محبوبِ حقیقی کا کیا حال ہوگا۔ اس لیئے ایسے امور سے بچنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ سے صدق دل سے توبہ کرنا چاہیئے۔

(۲)

محبوبِ حقیقی ہر چیز کو جانتا ہے۔ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ ہر چیز کو سنتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ شدید الغیرت ہے۔ اس کے سامنے بجز خشوع و خضوع اور رازہائے سربستہ کے اخفا اور اظہار عبدیت کاملہ اور اتباع سید العشاق علیہ السلام، کوئی چیز کارآمد نہیں ہے۔

(فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا و لا یشرک بعبادۃ ربہ احدا)

جاہ طلبی، مال طلبی، اس کی سخت غضب ناکی کا باعث ہے۔

حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔ ما اشغلک عن الحق فھو طاغوتک قرآن فرماتا ہے:" فمن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ (الآیۃ)

(۳)

معاصی کی بنا پر بھی قبض ہوتا ہے اور کبھی طبعی طور پر بھی ہوتا ہے۔ بہرحال بندہ کا کام عبدیت کا اظہار اور تضرع و زاری ہے۔

(۴)

ذکر کرتے وقت طبیعت پر زور ڈال کر کے معنی اور مذکور کی عظمت اور محبوبیت کا دھیان رکھا کریں، اسباب و افکار دنیاویہ میں حتی الوسع حصہ

دلچسپی نہ لیا کریں۔ ان امور کا خیال رکھیں۔ اس کا بھی التزام کریں کہ جب کوئی خطرہ آئے اس کو ٹھہرنے نہ دیں۔ اور دلچسپی پیدا ہونے نہ دیں۔ فوراً دفع کریں اگر آپ کو اپنی دعاؤں اور اذکار میں نقصانات نظر آرہے ہیں۔ ان کو مکمل کرنے کی جدوجہد رکھنی چاہیئے۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ ہم کتنی بھی کامل عبادت کریں شانِ الٰہی کے سامنے وہ نہایت حقیر اور ناقص ہے۔ جب کہ سرورِ کائنات سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

"ما عبدناك حق عبادتك ولا عرفناك حق معرفتك"

توہم آپ کس قطار میں ہیں۔ اپنے آپ کو ہمیشہ ذلیل وخوار سمجھنا اور اپنے اعمال واخلاق کو ناقص سمجھنا واقعیت اور ضروری ہے اور اس پر نازکرنا اور کامل سمجھنا خوفناک ہے۔ لن ینجو احدکم بعملہ الا ان یتغمد اللہ برحمتہ (اوکما قال علیہ السلام) تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل کی بنا پر نجات نہیں پاسکتا۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں چھپالے۔

(۵)

ذکر میں کوتاہی کرنا اور پاس انفاس کو دن رات میں صرف دس پندرہ منٹ انجام دینا۔ انتہائی کسالت اور بے ترجیحی ہے۔ الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبہم کا سماں کس طرح پیدا کریں گے۔ کیا یا ایہا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً وسبحوہ بکرۃ واصیلا ۔ پر اسی طرح عمل ہوسکتا ہے۔؟؟

(۶)

مراقبہ میں دھیان اور خیال ذات مقدسہ خداوندیہ کی طرف لگائیے، وہی اسمِ ذات اللہ کی مسمیٰ ہے۔ وہی تمام عالموں کو پیدا کرنے والی اور سب کو پالنے والی، ہر چیز کو جاننے والی اور تمام عالم میں تصرف کرنے والی ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ ہر قسم کے عیوب سے پاک ہے اور تمام کمالات سے موصوف ہے۔ نور اور نار سب اس کے پیدا کیئے ہوئے ہیں۔ تو ہمیشہ اس تصور اور دھیان کو جمائے رکھئے کہ وہ ذات مقدسہ میرے قلب میں موجود اور جلوہ گر ہے۔ وہ مجھ کو دیکھتی اور جانتی ہے۔ کوئی حالت اور کوئی خطرہ یا خیال یا ادراک یا کام اس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اسی تصور کو دل میں جمائیے۔ دوسری اور چیزیں خواہ روشنی اور . . . . نور ہو یا بزرگ ہستیاں وغیرہ۔ ان کی طرف دھیان نہ کیجئے؛ فقط ذات خداوندی جل وعلا شانہٗ کی طرف دھیان رکھیئے ؎

ہست رب الناس را با جان ناس !
اتصالے بے تکیف بے قیاس !

(۷)

طریقہ بیعت لینے کا یہ ہے۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہٗ

فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ و رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وصحبہٖ وبارک وسلم۔

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون ۔ ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ ومن اوفی بما عاھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجراً عظیماً۔

دکہیئے!) اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ واشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ۔

گواہی دیتا ہوں میں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی عبادت کیے جانے کے قابل نہیں، اکیلا ہے وہ، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے سردار اور ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ ایمان لایا میں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنی ذات میں اور اپنی صفات میں اور اپنے افعال میں اکیلا ہے اور کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں اور ایمان لایا میں اللہ تعالیٰ کے سب پیغمبروں پر اور اس کے سب فرشتوں پر اور اس کی سب کتابوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر۔

داخل ہوا میں دین اسلام میں سچے دل سے۔ بری اور بیزار ہوں میں سب دینوں سے۔ سوائے دین اسلام کے۔ بیعت کی میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بواسطہ ان کے خلفاء کے، عہد کرتا ہوں کہ شرک نہ کروں گا، کفر نہ کروں گا۔ چوری نہ کروں گا۔ زنا نہ کروں گا۔ کسی کو ناحق قتل نہ کروں گا۔ کسی پر بہتان نہ باندھوں گا۔ جہاں تک ہو سکے گا خدا اور اس کے رسول کی ہمیشہ ہمیشہ اطاعت اور فرمانبرداری کرتا رہوں گا۔ اپنی طاقت بھر گناہوں سے بچتا رہوں گا۔ اگر کبھی کوئی گناہ ہو گیا تو بہت جلد توبہ کروں گا۔

توبہ کرتا ہوں میں ان سب گناہوں سے جو اگلے ہوں یا پچھلے، چھوٹے ہوں یا بڑے، ظاہر ہوں یا پوشیدہ، جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو میں نہیں جانتا۔ اے اللہ تو سب کچھ سنتا ہے۔ تو سب کچھ دیکھتا ہے۔ تو سب کچھ جانتا ہے۔ تجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تو گناہوں کا بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ تو بار بار توبہ قبول کرنے والا اور کریم ہے۔ توبہ قبول فرما اور میرے گناہوں کو بخش دے۔ بیعت کی میں نے ...... ہاتھوں پر۔ طریقہ چشتیہ، صابریہ، طریقہ چشتیہ نظامیہ اور طریقہ نقشبندیہ اور طریقہ قادریہ اور طریقہ سہروردیہ میں۔ اے اللہ میری بیعت قبول فرما اور مجھ کو ان سلسلوں کے بزرگوں کے طفیل میں اپنی سچی محبت اور کامل ایمان عطا فرما۔ میرا خاتمہ ایمان پر ہو اور آخرت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اور آپ کی شفاعت اور جنت نصیب ہو۔

۸

ہم عبد ہیں، ہمارا کام عبودیت اور امتثال حکم ہے۔ عاجزی اور نیازمندی ہے خواہ ہمت افزائی اور اجابت ہو یا نہ ہو سہ

یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے می کنم!
بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم!

۹

دورانِ ذکر میں آنکھوں کا کھلا رہنا شرط نہیں۔ جہاں تک ممکن ہو دل لگا رہنا چاہیئے اور معنوں کا خیال رہنا چاہیئے۔ خواہ آنکھ کھلی ہو یا بند۔ اگر کھلنے سے تشویش ہو تو بند رکھیں۔

۱۰

اثنائے ذکرِ جہری میں ہر پندرہ یا بیس، یا پچیس مرتبہ کے بعد سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا محبوب حقیقی ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے لیے درود شریف بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں۔

۱۱

قلب اور بدن میں ذکر کی قوت سرایت کرتی ہے اور اس کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کا اثر جسم وغیرہ پر زور سے پڑتا ہے اور اس قسم کی حرکتیں رونما ہوتی ہیں۔ دنیا سے نفرت بھی ذکر کا اثر ہے۔ اہلِ دنیا سے علیحدہ رہنے کو چاہنا "حُبِّبَ اِلَیْہِ الْخَلَاءُ" کا منظر ہے۔

۱۲

واقعہ یہ ہے کہ حضرات چشتیہ رحمہم اللہ تعالیٰ (جن کا طریقہ ہمارے مشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند قدس اللہ اسرارہم کا طریقہ اور اصلی سلوک ہے) ان کی خاص نسبت گریہ و بکا، تڑپ و بے قراری، عشق و ولولہ ہے۔ جب اس نسبت کا کسی پر اثر ہوتا ہے تو بے اختیار گریہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور جس قدر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ وہی مفید سمجھا جاتا ہے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کبھی ان کے متوسل کو مدتوں محنت کے بعد ایسی حالت پیش آتی تھی تو فرما دیتے تھے۔ کہ الحمد للہ فلاں شخص کو رونا آنے لگا۔ خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ آخیر تک بہت رویا کرتے تھے اور بالخصوص ابتداء میں تو اس قدر روتے تھے کہ تمام لحاف پر دھبے پڑ جاتے تھے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں کچھ لکھتا ہوا رہ گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے۔ وہ سمجھے کہ کمرہ خالی ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت فرمانے لگے۔ اور قرآن شریف کی تلاوت کے درمیان اس قدر بے قراری سے روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں یہ حالت دیکھ کر آہستہ سے دالان سے اُٹھ آیا۔

۱۳

اگر ستر برس کی محنت و ریاضت کے بعد بھی تھوڑی سی توجہ محبوب حقیقی اور بارگاہ لم یزلی کی حاصل ہو جائے تو نعمت غیر مترقبہ اور احسان غیر متناہی ہے ؎

اگر بدانم کہ خواہی آمد بتربت من تو گاہے گاہے !
اِنِ اخْتَرَقْتُ بِنَارِ عِشْقِكَ وَمِنْكَ هَجْرًا فَلَا اُبَالِیْ !

(۱۴)

معاشی ضروریات اگرچہ باعث تخریب توجہ الی اللہ اور موجب تنغص ہیں مگر ان کے بغیر اس دار فانی میں چارہ بھی نہیں ہے۔

اگر دنیا نہ باشد دردمندیم!
وگر باشد بمہرش پائے بندیم!

بہتر یہی ہے کہ "دل بیار و تن بکار" کا معاملہ رکھا جائے۔ جہاں تک ہو سکے توجہ قلبی اور شغل لسانی ذکر کے ساتھ ہو اور ہاتھ پیر اور ظاہر ان اشغال دنیاویہ کے ساتھ ہو۔

از درون شو آشنا و از برون بیگانہ وش!
این چنیں زیبا روش کم تر بود اندر جہاں!

(۱۵)

عبادت اور ذکر پر مداومت، اتباع سنت و شریعت پر قیام، یہی امور ہیں جن کے ہم مکلف ہیں۔ اور جن پر استقلال سے عمل پیرا ہونا اور درجات احسان کا حاصل ہونا کمال ایمان ہے۔ خوف خداوندی اور رجاء دونوں ایمان کے کمال کی نشانیاں ہیں۔

(۱۶)

وساوس گزرتے رہیں۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں، سیلاب چلتا ہے اور اس پر خس و خاشاک چھائے رہتے ہیں۔ کچھ پروا نہ کیجئے۔ ہاں نماز میں یہ کوشش کیجئے کہ جو کچھ زبان سے پڑھا جا رہا ہے۔ وہ کیا ہے۔ اس کے معانی کا دھیان رکھتے ہوئے جناب باری عز اسمہ کو سامنے سننے والا، دیکھنے والا تصور کیجئے۔

قرآن مجید میں ہے۔ وما تکون فی شأن وما تتلو منہ من قرآن ولا تعملون من عمل الا کنا علیکم شھودا اذ تفیضون فیہ (الآیۃ) کے مطابق خیال باندھا کیا کیجئے۔ غیوبت ہو جانے پر بھی بار بار کوشش کیجئے۔ آہستہ آہستہ حالت درست ہو گی۔

(۱۷)

یہ رضائے الٰہی اگر ہزار برس عبادت کے بعد بھی حاصل ہو تب بھی عظیم الشان کامیابی ہے۔

(۱۸)

متصوفین پر کنٹرول کرنا اور ان کو قیود شرعیہ اور کتاب و سنت کی حدود میں مقید کر دینا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ عام مسلمانوں میں سخت "فرق الحادکے" پھیل جانے کا قوی امکان ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ جوش عشق خداوندی اور غلبہ سکر میں صوفیہ سے ایسے ایسے افعال و اقوال صادر ہو

جاتے ہیں۔ جن کی شریعت کے احاطہ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر ان کی روک تھام نہ کی گئی تو انتہائی فتنوں کا سامنا ہوگا۔ علماء کا فریضہ ہے کہ ظاہر شریعت کی مکمل حفاظت کریں۔

(۱۹)

جناب باری عز اسمہ ہماری عقل و ادراک سے نہایت ہی زیادہ بلند اور بالا ہے۔
لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ " ـــ

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم!
وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم!

مگر تقریب و تفہیم کے لیے مندرجہ ذیل مثال پیش کرتا ہوں۔

ہر انسان میں ایک مرتبہ ذات کا ہے۔ اس وجہ سے وہ سب سے بے پروا اور غیر متعلق ہے۔ دوسرا درجہ صفات کا ہے جو کہ تمام تعلقات خارجہ کا سبب ہے۔ اس کا وصف کرم اس کو داد و دہش پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی پر وہ غریبوں اور فقراء ارباب حاجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ وصف اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان کی حاجت مندیوں پر بے چین ہو جائے اور اپنے مال و زر کو ان تک پہنچانے میں دریغ نہ کرے۔ وصف شجاعت قتل و قتال قہر و غلبہ پر مجبور کرتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس تمام اوصاف یہی معاملہ رکھتے ہیں۔ تیسرا درجہ جوارح کا ہے۔ جن کے وسیلہ سے وہ مقتضیات صفات کو خارج میں ظاہر کر دیتا ہے۔ کریم شخص میں داد و دہش کی نوبت آتی اور ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شجاع میں قتل و قتال قہر و غلبہ کی عالم خارج میں صورت بنتی ہے۔ اگر یہ جوارح نہ ہوتے تو مقتضیات صفات کے ظہور کی صورت نہ بنتی۔ اسی طرح بلا تشبیہ تمام ذات باری عز اسمہ تمام خلائق سے مستغنی اور غیر متعلق ہے۔ اس کی صفات جو کہ لاعین اور لاغیر ہیں۔ واسطہ بین القدیم والحادث ہیں۔ وہی تعلقات پیدا کرنے والی ہیں۔ اس کے بعد مرتبہ اسماء کا ہے۔ یہ اسماء عالیہ اپنے اپنے اقتضاءات کے موافق تمام عالم میں تصرف کرتے ہیں۔ جیسے کہ انسان کے جوارح اپنی قابلیت کے موافق تصرف کرتے ہیں۔ اسم رزاق مخلوق کو رزق دیتا ہے۔ جیسے کہ انسان کا ہاتھ داد و دہش کا کام انجام دیتا ہے۔ اسم خلاق ماہیات معلومہ بالعلم الازلی کو نعمت وجود بخشتا ہے اور اسی طرح تمام اسماء مقدسہ کے تصرفات ہیں۔ اسماء باری عز اسمہ ہمارے اسماء کی طرح تاثیر و قوت سے خالی نہیں۔ لاعین ولا غیر از ذات مقدسہ ہیں۔ ان میں وہ قدرت جو صفات ذاتیہ میں سے ہے۔ ظہور پذیر ہے۔ جس سے ان کے تصرفات عالم میں جاری ہیں۔ جیسے کہ ہمارے جوارح ہماری صفات کے مظاہر ہیں۔ اسماء باری تعالیٰ کا تعلق ہر انسان کے ساتھ علیحدہ ہے۔ کسی شخص کا مربی اسم علیم ہے۔ کسی کا مربی اسم قدیر ہے۔ کسی کا دوسرا اسم ہے۔ اہل اللہ کا ارشاد ہے۔ "طرق الوصول الی اللہ بعدد انفس الخلائق" اس کا راز بھی یہی ہے جو اسم کسی کا . . . . مربی ہے۔ اس اسم کے ذکر اور تصور وغیرہ سے اس کو جلد ترقی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا تمیز کرنا ماہرین کو بھی مشکل ہے۔ اس لیے اسم جامع لفظ اللہ سالک کو تعلیم دیا جاتا ہے۔ سالک کی ترقی اس کے مربی اسم تک ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲۰)

غور فرمائیے کہ آیا علم خداوندی کی وجہ سے انسان کا ارادہ اور اختیار چھن جاتا ہے اور وہ اپنے کاروبار میں رعشہ والے اور اوپر سے نیچے گرنے والے

رح بے اختیار اور بے قدرت ہو جاتا ہے یا نہیں ؟ بلکہ وہ اپنے اندر پورا اختیار رکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ مجھ کو قدرت ہے خواہ چراؤں یا نہ چراؤں۔ اس کو مجبور اور معذور کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ خداوند کریم کا علم صحیح ہے اور تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نکل سکتی۔ اور نہ اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ایسا ہے کہ جیسے ایک اعلیٰ درجہ کا ماہر نجومی، جوتشی، کاہن رمال، یا اعلیٰ کشف والہام والا ہی آنے والی باتوں کو جانتا ہے اور جیسی پیشن گوئی وہ کرتا ہے۔ ویسا ہی دنیا میں ہوتا ہے۔ تو کیا اس کی پیشن گوئی کی وجہ سے، اس کے علم کی وجہ سے جو کسی چوری، یا ظلم وغیرہ کے متعلق ہوتی ہے۔ چور، یا ڈاکو، یا ظالم مجبور ہو جائے گا۔ اور اس کے قدرت و ارادہ میں ذرہ بھر بھی کمی ہو گی؟ ٹائم ٹیبل میں گاڑیوں کے وقت ہیں۔ ہم اس کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ فلاں گاڑی فلاں وقت اتنے منٹ پر علی گڑھ پہنچ جائے گی تو کیا اس کی وجہ سے انجن ڈرائیور مجبور ہو جائے گا۔ اور اس کی قدرت مسلوب ہو جائے گی۔ نہیں نہیں۔ اگرچہ اس مثال میں کمی ہے۔ مگر علم کی حقیقت سمجھنے میں موید ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کے علم کی وجہ سے لوگ مجبور نہیں ہوتے۔ انکا اختیار اور ان کی قدرت پوری طرح باقی رہتی ہے۔ اسی کی بنا پر لوگوں سے مواخذہ ہوتا ہے۔ کہ تم کو ہم نے حکم دیا تھا چوری مت کرو۔ تم نے اپنے ارادہ و اختیار سے چوری کی، نیز خدا کے علم کو نہ تو چور کو چوری سے پہلے علم تھا نہ کسی نافرمان کو، بلکہ اس کو چوری اور نافرمانی کے بعد یہ علم ہو گا۔ تو جب کہ اس نے گناہ اور چوری کا ارادہ اور عمل اپنے ارادہ و اختیار سے کیا ہے۔ اس پر مواخذہ کرنا بالکل صحیح ہو گا۔

میرے محترم! علم کی حقیقت ذہنی اور قلبی روشنی سے کسی چیز کو جان لینا ہے۔ جیسے کہ ابصار کی حقیقت ان آنکھوں کی روشنی سے کسی چیز کو دیکھ لینا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم نہایت قوی ہے۔ اس لیے وہ تمام اشیاء کو حقیقی طور پر جانتا ہے اور اس میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ جیسے قوی بصارت والا چیز کو صحیح دیکھ لیتا ہے۔ اس میں غلطی نہیں ہوتی۔ علم کی حقیقت یہ نہیں کہ کرنیوالوں کے ارادہ اور اختیار کو چھین لے تو چور نے جس طرح چوری کی۔ اس طرح سے اس نے اپنے قوی علم سے جان لیا کہ چور نے اپنے ارادہ و اختیار و قدرت سے چوری کی۔ اس لیے اس پر گرفت کرنا صحیح اور ضروری ہے۔

(۲۱)

الدعاء مخ العبادۃ صاف طور سے بتا رہا ہے کہ دل لگا کر تضرع وزاری کرنا عبادت ہی ہے بلکہ افضل تر ہے۔ اس کو عمل میں لائیے۔

دعا میں دل لگنا ضروری ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان اللہ لا یقبل الدعا بقلب لاہٍ " لہذا دعا میں، دل لگنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظلوم کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خلوص دل سے نکلتی ہے۔ تاہم اگر دل نہ لگے۔ تب بھی، فائدہ سے خالی نہیں۔ لیکن کوشش کرنا ضروری ہے۔

(۲۲)

ایمان کو ہمیشہ بین الخوف والرجاء ہونا چاہیئے۔ "ادعوہ خوفا و طمعا" نص قرآنی ہے اور اس معنی میں مختلف آیت صریح وارد ہیں۔ مگر حالت زندگی میں غلبہ خوف کا ہونا چاہیئے اور قرب موت میں غلبہ رجاء کا ہونا چاہیئے۔ لقولہ علیہ السلام فی الحدیث القدسی انا عند ظن بی و قال سبحانہ تعالیٰ افامن اہل القریٰ ان یاتیہم بأسنا ضحی وہم یلعبون افامنوا مکر اللہ فلا

یامن ـــــــ اللہ الا القوم الخاسرون (وقال) لا تیئسوا من روح اللہ (الآیۃ)

(۲۳)

جس طرح تمام اعضاء و جوارح عطاء خداوندی ہیں اسی طرح ارادہ و مشیت بھی ہے۔ جس بنا پر اس انسان کو صاحب الاعضا کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس کو بے زبان و بے عقل بے ہاتھ بے پیر وغیرہ نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح اس کو بے ارادہ، اور بلا مشیت کہنا غلط وہ شخص ہوگا جو کہ بلا ارادہ ہے اور وہی افعال جبری افعال کہے جا سکتے ہیں جن میں تداخل ارادہ کا نہیں ہوتا۔ جیسے مرتعش کی حرکت اور اس جس کو پھینکنے والے نے پھینکا ہے اور جس طرح جسم انسانی جب بلا ارادہ فوق سے اسفل کو آتا ہے، یہ حرکت البتہ جبری اور بلا اختیار انسان اپنی حرکت رعشہ اور حرکت جسمانی میں (فوق سے تحت کو) کسی قسم کا ارادہ نہیں محسوس کرتا خود کو مجبور محض پاتا ہے، بخلاف افعال اختیاریہ کہ وہ ان میں اپنے ارادہ و اختیار کو صدور افعال تک محسوس کرتا رہتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اگر میں چاہوں اس حرکت کو روک دوں۔ اس افعال اختیاریہ میں مجبوری کا ادعا محسوس و مشاہد کے خلاف ہے۔ ثواب و عتاب ان ہی افعال اختیاریہ میں ہے۔ جن میں انسان کا ہے کہ میرے اختیار و ارادہ سے پائے جا رہے ہیں۔ افعال کو تحقق سے پہلے جب چاہوں روک دوں۔ یہ اختیار جبری، جس کو ہر فعل اختیاری کا منشا اور مصدر محسوس کیا جاتا ہے۔ کسب کو کہا جاتا ہے۔ جس کو ماتریدیہ اور دیگر متکلمین اثر قدرت حادثہ کہتے ہیں۔ بہرحال تخلل ارادہ و اختیار ہوئے جبر کہنا خلاف مشاہدہ ہے۔

جناب کا ارشاد کہ مشیت تابع مشیت رب ہے۔ خود اس کا اقرار ہے کہ مشیت عبد موجود ہے۔ پھر اس کو منعدم قرار دینا اور جبر تعبیر کرنا کیونکر غلط نہ ہوگا اور جب اختیار جبری موجود و مسلم ہے تو ثواب و عقاب یقیناً عدل ہوگا۔

(۲۴)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ غلطیاں جن کو آپ امکان بلکہ وقوع کے درجہ میں دکھلا رہے ہیں۔ اگر روایات تاریخیہ اور احادیث سے ہیں تو وہ ان قطعیات قرآنیہ کے سامنے کسی طرح کوئی حقیقت نہیں رکھتیں اور اگر ان کی کوئی حقیقت ہو بھی تو وہ نیت ہائے فاسدہ سے صادر ہوتی ہیں۔ یا نیت ہائے صالحہ سے، کیونکہ بسا اوقات غلط فہمی اور خطا سے کوئی عمل صادر ہوتا ہے۔ مگر وہ (قباحت میں) ان اعمال قبیحہ سے بہت گرا ہوا اور خفیف شمار ہوتا ہے۔ جو کہ عمداً اور بہ نیت فاسدہ بوقوع میں آئے ہوں۔ قتل عمد اور قتل خطا کی جزاؤں میں کس قدر تفاوت ہے حالانکہ دونوں میں مقتول کی جان ہلاک ہوتی ہے۔

(۲۵)

ائمہ اہل سنت والجماعت مشاجرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو خطاء اجتہادی قرار دیتے ہیں۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کے ارتکاب اکل شجرہ کو ارشاد (فنسی ولم نجد لہ عزما)، ذنب خفیف اور غیر موجب مواخذہ اور داخل فی العصمۃ قرار دیتا ہے۔ تو حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مشاجرات کو ان کے مناقب کی آیات اور آیات صحیحہ کیوں نہ ہلکی اور غیر قابل مواخذہ اور داخل فی الحسنات

گی اور کیوں نہ ان کے دامن کو خطائے اجتہادی قصداً دے کر منزہ اور پاک سمجھا جائے گا۔

(۲۶)

لفظ معیار حق ایک لغوی لفظ ہے کسی فن کا اصطلاحی لفظ نہیں ہے۔ لغت عربی میں معیار ہر اس شے پر بولا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی جانچ کی جائے خواہ ناپ وکیل ہو یا وزن وغیرہ، اس لیے ہر وہ شخص جس کے فعل قول، عقیدہ حال پر پورا اعتماد اس طرح ہو جائے کہ اس میں قصداً درازدانی کی گنجائش نہ ہو وہ معیار حق ہوگا اور اس کے ذریعہ سے حق پہچانا جائے گا۔ خواہ اس پر وحی الٰہی آتی ہو، یا نہیں۔

(۲۷)

اگر رسول یا نبی نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے کلام قطعی اور قدیم میں اس شخص کے متعلق خبر دیتا ہے کہ ہم اس سے راضی ہیں۔ تو یقینی بات ہے کہ اس سے قصداً کوئی گناہ سرزد نہیں ہوگا۔ ورنہ اس کے علم قدیم میں جو کہ لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ - کا مصداق ہے خلل لازم آئے گا۔ یا یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ قصداً گناہ کرنے والے سے بھی راضی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ حق وہ ہی امر ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں۔ قرآن مجید میں ولا یرضی لعبادہ الکفر اس لیے کسی ایسے شخص کے معیار حق ہونے پر تامل کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کلام اللہ میں اپنے راضی ہونے کی خبر دی ہو۔ جیسے سابقین اولین مہاجرین اور انصار اور تابعین بالاحسان کے لیے سورہ توبہ میں اور اصحاب حدیبیہ کے لیے سورہ فتح میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

(۲۸)

تمام اہل سنت والجماعت مسلمان ہمیشہ سے اس امر پر متفق ہیں کہ جو شخص کلمہ طیبہ یا اشہد ان لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ صدق دل سے کہے۔ اس کا ایمان اجمالی متحقق ہو جاتا ہے اور جو شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتلائی ہوئی تمام یقینی باتوں وحدانیت ذات، ملائکہ، کتاب ہائے خداوندیہ، قیامت، تقدیر، ختم نبوت وغیرہ قطعیات) کو دل سے مان لے اور اقرار کر لے۔ اس کا تفصیلی ایمان ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ مسلمان اور ملت اسلامیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اعمال کی کوتاہی سے یہ اسلام اور ایمان ضائع نہیں ہوتا۔ اعمال مذکورہ میں کوتاہی کرنے سے فسق آتا ہے، کفر نہیں آتا۔ ہاں اگر ان امور ایمانیہ کا انکار و حجود پایا جائے۔ تب بے شک استحقاق کفر ہوتا ہے۔ اعمال خواہ کسی درجہ کے ہوں ان کا ترک کرنے والا کافر نہیں ہوتا۔ البتہ گمراہ فرقے خوارج، معتزلہ وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ اعمال فرضیہ کے ترک کرنے سے یا کبیرہ گناہ کے کرنے سے انسان ایمان سے نکل جاتا ہے۔

(۲۹)

بدأ الاسلام غریبا والحدیث، کا ترجمہ یہ کرنا کہ اسلام غریبوں سے پھیلا۔ اور پھر غریبوں میں لوٹ کر آئے گا۔ لغت عربی کے خلاف ہے۔ زبان اردو میں غریب کا ترجمہ مسکین اور فقیر سے کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص غریب ہے جس کے پاس مال و دولت نہ ہو۔ مگر عربی میں یہ معنی نہیں ہیں

اور واقعہ بھی یہی ہے۔ سب سے پہلے ایمان لانے والے مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ جو کہ مکہ میں بہت بڑے تاجروں مال داروں میں سے تھے۔

غریب عربی میں اوپرے شخص کو کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو کہ مشہور اور معروف نہ ہو۔ لوگ عام طور پر اس کو جانتے اور پہچانتے نہ ہوں۔ مالدار ہو یا مسکین و نادار، اسی وجہ سے مسافر کو غریب کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بدیسی ہونے کی وجہ سے لوگوں کی پہچان میں نہیں آتا، جو چیز نادر الوقوع ہو اس کو بھی غریب کہتے ہیں۔ کیونکہ قلیل الوقوع ہونے کی وجہ سے وہ معروف و مشہور نہیں ہوتی اور اس میں غرابت اور ندرت آجاتی ہے۔ سے مانوس نہیں ہوتے۔

نیز اس حدیث میں اسلام کو ذوالحال قرار دیا گیا ہے۔ جو کہ مجموعۂ احکام عقائد و اقرار و اعمال سے عبارت ہے۔ یعنی دین اسلام تھا نہ کہ اہل اسلام۔ اگر اہل اسلام کی غربت مراد ہوتی۔ جیسا کہ اردو والے اور آپ کے یہاں کے لوگ کہتے ہیں تو جانب ذوالحال میں لفظ اہل کہا جاتا۔ بدأ المسلمون کہا جاتا اور جانب حال میں غرباء کہا جاتا۔

(۴۰)

صبر کا ثواب اور اس کا کمال صدمہ کے اوائل میں ہے۔ زمانۂ دراز گزرنے کے بعد تو طبعی طور پر صبر آہی جاتا ہے۔ لہٰذا وہ عظیم الشان خلق کی تاکید اور تعریف میں قرآن شریف میں تیس سے زیادہ آیات موجود ہیں۔ اس کو اور اس کے ثواب کو ہرگز نہ ضائع ہونے دینا چاہیے۔ والصبر عند الصدمة الاولیٰ۔

(۴۱)

سجدہ دو قسم کا ہے (۱) سجدہ عبادت (۲) سجدۂ تحیۃ۔ سجدۂ عبادت بالاتفاق تمام امتوں میں غیر اللہ کے لیے حرام اور ممنوع تھا اور سجدۂ تحیۃ امم سالقہ میں مباح، اور جائز تھا۔ امت محمدیہ میں اس کو بھی منع کر دیا گیا۔

(۴۲)

عشاء کے بعد کسی وقت نماز پڑھنا تہجد ہے۔ کیونکہ اس میں ترک نوم ہے اگر مطالعہ سے فراغت پانے کے بعد قبل استراحت دو رکعت پڑھ لیں تو یہ بھی تہجد ہو جائے گی۔

(۴۳)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مجاورت مدینہ کو چھوڑ دیا۔ ہزاروں صحابہ کرام اور کروڑوں اولیاء اللہ غیر عرب میں ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ کیا ان کو عشق نبوی نہ تھا۔ کیا ان کو ایمان اور غیرت ایمانی نہ تھی۔ وہاں رہنا فرض نہیں، واجب نہیں۔ مقصود اصلی رضائے الٰہی ہے۔ جہاں حاصل ہو جائے کارآمد ہے۔

(۲۴)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ میں اپنا نہایت جامع اور فصیح خطبہ پڑھا۔ جس میں اجمالاً تمام شرائع اسلامیہ کو ذکر کیا گیا تھا۔ تو ابو شاہ نے اس کے لکھوا دینے کی استدعا کی۔ آپ نے فرمایا۔ اس کو لکھ دو! (بخاری)

زکوٰۃ حیوانات اور نقود وغیرہ کے متعلق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تفصیلات اپنے عاملوں کو لکھوا کر دیں۔ جو کہ کتاب ابن حزم وغیرہ کے نام سے مشہور ہے۔ دیت کی اقسام اور ان میں اونٹوں کی عمریں وغیرہ درج ہیں۔ جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ کے پاس کتاب اللہ کے علاوہ کوئی چیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے موجود ہے۔ فرمایا کہ نہیں۔ مگر جو کاغذ ہماری تلوار کے میان میں موجود ہے۔ پوچھا گیا۔ اس میں کیا ہے؟ کہا:۔ دیت کے اونٹوں کی عمریں اور احکام اہل ذمہ وغیرہ (بخاری)

(۲۵)

جناب باری عز اسمہ کی وہ صفات جو کہ مقتضیٔ معبودیت ہیں۔ انکا مرجع دونوں کی طرف ہوتا ہے۔ اول مالکیت نفع وضرر، دوئم محبوبیت اوّل کو جلال سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور ثانی کو جمال سے مگر یہ تعبیر ناقص ہے۔ جلال محض مالکیت ضرر پر متفرع ہوتا ہے۔ جس طرح جمال اسباب محبوبیت میں سے ایک سبب ہے۔ وجوہ محبوبیت علاوہ جمال کے کمال قرب و احسان بھی ہیں۔ سبب اول یعنی مالکیت نفع و ضرر کا اقتضاء معبودیت حدود عقل میں رہ کر ہونا ضروری ہے۔ اس معبودیت میں عابد کی ذاتی غرض چونکہ باعث عبادت ہے۔ یعنی طمع یا خوف یا دونوں، اس لیے یہ عبادت اس قدر کامل نہ ہوگی۔ جس قدر وہ عبادت جس میں محض رضائے معبودیت مقصود ہو۔ ظاہر ہے کہ محبوب کی جو کچھ اطاعت اور فرمانبرداری کی جاتی ہے۔ اس سے محض اس کی رضا مطلوب ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ دونوں قسموں کی عبادتیں دین کامل میں ملحوظ ہوں قسم اول پر متفرع ہونے والی عبادتوں میں اصل الاصول نماز اور زکوٰۃ ہیں۔ اور قسم ثانی پر متفرع ہونے والی عبادتوں میں اصل الاصول روزہ اور حج ہیں۔ روزہ محبوبیت کی منزل اولیٰ اور حج منزل ثانی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عاشق پر اولین فریضہ یہی ہے کہ اغیار سے قطع تعلق کیا جائے جو کہ روزہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے، دن کو اگر صیام کا حکم ہے تو رات کو قیام کا، اور اخیر میں اعتکاف نے آکر رہے سہے تعلقات کا خاتمہ بھی کر دیا۔ بحکم "من شہد منکم الشہر فلیصمہ" اور "من قام رمضان ایماناً (الحدیث)" اگر استیعاب صوم رمضان کا پتہ چلتا ہے تو بحکم "احیی لیلۃ ومن صام رمضان (الحدیث)" وغیرہ سے استیعاب قیام رمضان کا بھی پتہ چلنا ضروری ہے اور چونکہ کمال صومی کے لیے محض مالوفات ثلثہ کا جو کہ اصل الاصول ہیں۔ ترک مطلوب نہیں۔ بلکہ انکے علاوہ معاصی اور شہوات نفسانیہ کا ترک بھی مقصود ہے۔ من لم یدع قول الزور (الحدیث) اور رب صائم لیس لہ من صومہ الا الجوع (الحدیث) اس کے شاہد عدل ہیں۔ جب ترک اغیار کا اثبات (جو کہ منزل عشق کی پہلی گھاٹی ہے) ہو گیا۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ دوسری منزل کی طرف قدم اٹھایا جائے، یعنی کوچۂ محبوب اور اس کے دار و دیار کی جبہ سائی کا فخر حاصل کیا جائے۔ اس لیے ایام صیام کے ختم ہوتے ہی ایام حج کی ابتدا ہوتی ہے جن کا اختتام ایام نحر (قربانی) پر ہے۔

کوچۂ محبوب کی طرف عاشق کا سفر کرنا جس نے تمام اغیار کو ترک کر دیا ہو۔ اور سچے عشق کا مدعی ہو۔ معمولی طریقے پر نہ ہوگا۔ نہ اس کو سر کی خبر ہوگی نہ پیر کی۔ نہ بدن کی زیب و زینت کا خیال ہوگا۔ نہ لوگوں سے جھگڑا اور نہ لڑنے کا ذکر فلا رفث و لا فسوق و لا جدال فی الحج۔ کہاں،

عشق اور کہاں آپس کے جھگڑے اور لڑائیاں۔ کہاں قلبی اضطراب اور کہاں شہوت پرستی اور آرام طلبی، نہ سرمہ کی فکر ہوگی نہ خوشبو اور تیل کا۔ دھیان، اس کو آبادی سے نفرت، جنگلی جانوروں اور جنگل سے الفت ہونی ضروری ہے۔ وحرم علیکم صید البر ما دمتم حرما سیر و شکار جو کار بیکاراں ہے۔ ایسے عشاق اور مضطر نفوس کے لیے بے حد نفرت کی چیز ہوگی۔ و اذا حللتم فاصطادوا ،، اس کی تو دن رات کی سرگرمی معشوق کی یاد، اس کے نام کو جپنا۔ اپنے تن بدن کو بھلا دینا۔ دوست، احباب، عزیز و اقارب، راحت و آرام کو ترک کر دینا نہ نیند آنکھوں میں بھلی معلوم ہوگی۔ نہ لذائذ اطعمہ، اور خوشبودار اور خوش ذائقہ اشربہ والبسہ کا شوق ہوگا۔

یداری ھواہ ثم یکتم سرہ ویخشع فی کل الامور ویخضع

جوں جوں دیار محبوب اور ایام وصال کی قربت ہوتی جائے گی۔ اسی قدر ولولہ اور فریفتگی اور جوش جنوں میں ترقی ہوتی رہے گی۔

وعدہ وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد،

ان دنوں جوش جنوں ہے ترے دیوانے کو

لوگ ہر سو سے چلے آتے ہیں سمجھانے کو

نو بہار است جنوں چاک گریباں مددے

آتش افتاد بجاں جنبش داماں مددے

قریب پہونچتے ہیں تو (میقات پر) اپنے رہے سہے میلے کچیلے کپڑوں کو پھینک دیتے ہیں۔ اس وادیٔ عشق میں گریباں اور دامن سے کیا کام

ہم نے تو آپ اپنا گریباں کیا ہے چاک

اس کو سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

اگر غم ہے تو محبوب کا۔ اگر ذکر ہے تو معشوق کا۔ اگر طلب ہے تو پیا کا۔ اگر خیال ہے تو دلبر کا ؎

عشق میں تیرے کوہ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو!

عیش و نشاط زندگی چھوڑ دیا۔ جو ہو سو ہو!

کوچۂ محبوب میں پہونچتے ہیں تو اس کے در و دیوار کے ارد گرد دیوری فریفتگی کے ساتھ چکر لگاتے ہیں۔ سر جو کھٹ پر ہے تو لب دیواروں پتھروں پر!

امر علی الدیار دیار لیلیٰ اقبل ذا الجدار و ذا الجدارا

وما حب الدیار شغفن قلبی ولکن حب من سکن الدیارا

کسی نے اگر جھوٹی سی خبر دی کہ معشوق کا جلوہ فلاں جگہ نمودار ہونے والا ہے۔ تو بے سر و پیر ہو کر دوڑتے ہوئے وہاں پہونچتے ہیں۔ نہ کانٹوں کا خیال ہے نہ راستہ کے پتھروں کی فکر۔ نہ گڑھوں میں گرنے کا خوف ہے۔ نہ پہاڑوں کی سختیوں کا ڈر ہے۔ مجنون بنی عامر کا سماں بندھا ہوا ہے۔ بالوں اگر جوں ڈھیروں پڑی ہوئی ہیں تو کیا پرواہ ہے۔ اہل عقل اور اہل زمانہ اگر پھبتیاں اڑاتے ہیں تو کیا شرم آتی ہے۔ ؎

جب پیت بھئی تب لاج کہاں سنسار ہنسے تو کیا ڈر ہے!

دکھ درد پڑے تو کب اچھا ! اور سکھ نہ رہے تو کیا ڈر ہے

اگر ناصح نادان عشق سے روکتا ہے ... تو آتش عشق اور بھڑک جاتی ہے۔ نادان ناصح کو پتھر مارتے ہوئے اپنے آپ کو
بے ہو جاتے ہیں ؎ ناصحا ! مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے

فومن احب لاعصینک فی الھویٰ قسما بہ وبحسنہ وبہائہ

اے ملامت گر ! اپنے محبوب کی ذات اور اس کے حسن وجمال کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہوں کہ لسلسلۂ محبت میں ضرور تیرے حکم کی خلاف
ری کروں گا،

میرے محترم !- یہ تھوڑا سا خاکہ حج اور عمرہ کا ہے۔

(۳۶)

ترمذیؒ نے اس رحدیث انا مدینۃ العلم وعلی بابہا) کی تحسین کی ہے جس میں حسن نعیرہ ہونے کا احتمال بھی ہے اور ممکن ہے کہ
ی نے اس کی تصحیح بھی کی ہو.... تاہم یہ حدیث ان روایات سے مقابل ہونے کی طاقت نہیں رکھتی۔ جو بالاتفاق صحیح ہیں۔ پس بوقت تعارض ساقط
ہی جائے گی۔ اگر اس کے مفہوم میں تعارض نہ ہو۔ تو البتہ قابل اعتماد قرار دی جا سکتی ہے۔ مگر جب ہم لفظ مدینہ اور لفظ باب میں غور کرتے ہیں۔ تو
ہیں آتا ہے کہ مدینہ اس جگہ کو کہتے ہیں۔ جہاں بہت سے مکانات مجتمع ہوں۔ ایک مکان بلکہ دس پندرہ مکانات والی آبادی کو مدینہ نہیں کہا جاتا۔ خود لفظ
ینہ کا لغوی معنے بھی اجتماع پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس علمی مدینہ میں بہت سے علمی گھر ہوں گے اور بہت زیادہ آبادی اس کے
ر ہو گی۔ ادھر دروازہ خواہ مخواہ مکان کا ہو یا شہر کا ہمیشہ خارج ہوا کرتا ہے۔ شہر کا اندرونی حصہ یا مکان کا اندرونی حصہ شمار نہیں کیا جاتا۔ اور کم از کم اتنا تو ضرور
ر تا کہ من وجہ خارج ہو۔ اور من وجہ داخل ہو۔ اس بنا پر اور صحابہ کرام رض بالخصوص ان میں سے خواص رضی اللہ عنہم، اس مدینۃ العلم کے اندر والے ہوں گے
ر حضرت علی رضی اللہ عنہ بحیثیت باب اندر داخل نہیں ہوں گے۔ لہٰذا ان کی فضیلت دیگر صحابہؓ پر ثابت نہ ہو گی۔ ہاں باہر سے آنے والوں یعنی غیر صحابہ
لکن ہے کہ فضیلت ثابت کی جائے کہ ان کو اس مدینہ میں بغیر توسط حضرت علی رضی اللہ عنہ کا داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے اشکال کی وجہ باقی نہیں رہتی۔

(۳۷)

ہر نص میں بہت سی قیود بوجہ ظہور ملحوظ ہوتی ہیں جن کو بسا اوقات ذکر نہیں کیا جاتا اور وہ بالاتفاق ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً حدیث میں قلبی لیقین
اور تصدیق کا تذکرہ نہیں ہے۔ فقط یہی کہا گیا ہے کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ تو کیا اگر یہ کلمہ استہزاء اور مذاق کے طور پر
یا کسی کلام کی نقل کے طور پر کہا تو وہ بھی اس کا مستحق ہو گا۔ یا کسی نے مسلم جیش کے سامنے جان بچانے کے لیے یہ کلمہ کہا اور قلب میں تصدیق نہیں ہے
تو کیا وہ اس اجر کا مستحق ہو گا۔ یا اس کلمہ کے کہنے کے بعد انکار کر دیا۔ یا کلمہ شرک کا بول دیا۔ تو، یقیناً معلوم ہے کہ وہ توحید نجات کے لیے کافی نہیں ہے
اور حسب تصریحات روایات وآیات قید تصدیق قلبی کی ضرور لگانی ہو گی اور عدم انکار کی بھی قید ضرور ہو گی۔ اسی طرح اس روایت میں ایمان بالرسالت
کی بھی قید لگانی ضروری ہو گی۔

سورۂ حجرات میں ہے : انما المومنون الذین اٰمنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم

فی سبیل اللہ اولئک ھم الصادقون" ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر شبہ نہ لائے اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں، اپنے مال اور اپنی جانوں سے۔ وہ لوگ جو ہیں وہ ہی سچے ہیں۔ لفظ انما جو کہ صیغہ حصر ہے۔ یہاں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لیے حدیث جبرائیل علیہ السلام میں اور حدیث وفد عبدالقیس میں ایمان کی تفصیل اور تعریف بیان کرتے ہوئے ایمان بالرسل والملائکہ والکتب والقیمۃ والقدر کو ذکر فرمایا گیا ہے۔

توحید کا دعویٰ تو یہود، نصاریٰ، مشرکین عرب اور ہنود ہند سب کرتے ہیں۔ مگر اسی توحید کے ساتھ یہود عزیر علیہ السلام ابن اللہ اور ید اللہ مغلولۃ اور ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء" اور تجسیم وغیرہ کے قائل ہیں۔ نصاریٰ اسی توحید کے ساتھ تثلیث اور ابن اور روح القدس اور زوجہ وغیرہ کے قائل ہیں۔ بت پرستان ہند "نرانکار" صرف خدا کے قائل ہوتے ہوئے اوتاروں اور عبادت غیر اللہ کے قائل ہیں۔ تجسیم اور حلول وغیرہ ان کے عقائد میں۔ کیا ایسی توحید قابل اعتبار ہو گی۔ اس لیے قائل من قال لا الہ الا اللہ سے جو تفسیر توحید منقول ہے۔ وہی موجب نجات اور جب اس کی تعلیم کا اعتبار کیا گیا تو تصدیق رسالت لازم آگئی ورنہ توحید حقیقی نہیں لفظی ہے جو کہ قابل اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم

اسی روایت میں من قال لا الہ الا اللہ (الحدیث) کے جملہ طرق اگر جمع کیے جائیں۔ تو معلوم ہوگا کہ روایت مختصر واقع ہوئی ہے۔ اس میں کچھ اور بھی زیادتی ہے۔ جو کہ راوی نے بوجہ ظہور یا اختصار، یا نسیان یا عدم ضرورت بعض اوقات میں چھوڑ دی ہے۔ اور بعض اوقات میں ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً مخلصا من قلبہ بخاری شریف وغیرہ میں اسی روایت میں موجود ہے۔ دوسری روایتوں میں وانی رسول اللہ موجود ہے۔ اسی لیے آئمہ فن فرماتے ہیں کہ جب تک کسی روایت کو اس کے تمام طرق سے نہ دیکھا جائے۔ اس کے معنی متعین کرنے میں دشواری ہے۔

(۴۸)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جب پوچھا گیا۔ کہ عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا معاویہ رضی اللہ عنہ، تو فرمایا کہ امیر معاویہ کے اس گھوڑے کے نتھنوں کی خاک جس پر سوار ہو کر انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔

(۴۹)

رفتہ رفتہ اس (مروجہ طریقہ ایصال ثواب) میں بہت سی غیر مفید اور ناجائز باتیں داخل کر لی گئی ہیں۔ جو کہ ایصال ثواب کے لیے ضروری مثلاً اس کو تبرک سمجھنا اور خود کھانا، احباب میں تقسیم کرنا، اغنیاء کو کھلانا اور یہ اعتقاد کرنا کہ کھانا اس بزرگ کا پس خوردہ ہے۔ جس کے نام پر ایصال ثواب کیا گیا ہے۔ قرآت قرآن اور فاتحہ کو ضروری سمجھنا اور اسی طرح دیگر امور مثلاً جگہ کا لیپنا، خوشبو کا لگانا۔ پڑھنے والے امام یا موذن یا مولوی کا ہونا اور پڑھنا عوام کے اعتقاد میں یہ امور اگر نہ ہوں تو ایصال ثواب ہی نہیں سمجھا جاتا اور عموماً یہ چیزیں نام ونمود اور شہرت کی غرض سے ریاء وسمعہ کی جاتی ہیں۔ یا لوگوں کے لعن طعن سے بچنے کی غرض سے ہوتی ہیں۔ اخلاص ہوتا ہی نہیں۔ علی ہذا القیاس بسا اوقات مال ہی حلال نہیں ہوتا۔ یا میت کے وصال کے بعد اس کے ترکہ میں سے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ عموماً ورثاء سے اجازت نہیں لی جاتی۔ بالخصوص جب کہ وارث بعض یا کل نابالغ ہوں۔ مسکینوں اور غریبوں کو یہ مال دیا ہی نہیں جاتا۔ اور اگر دیا جاتا ہے تو بہت ہی کم اور ادنیٰ قسم عمدہ اور اکثر حصہ طعام اغنیاء اور اہل ہی کھاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کھانے میں کسی ثواب کی امید نہیں ہے۔

اصحاب حقوق کے مال کی مقدار میں خیرات کی جائے۔ (یعنی اگر وہ فوت ہو چکے ہیں، یا کوئی مانع ہے اور ان کے حق کی وصولی و ادائیگی کی نیت ہو۔ یعنی اس کا ثواب صاحب حق کو پہونچے اور ان لوگوں کے لیے استغفار اور دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے انعامات ان کو دے کر مجھ سے راضی کرا دے تاکہ وہ اپنے اپنے حقوق معاف کر دیں۔

ایسی نمازیں جو کہ شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ہوتی ہیں۔ انکا اعادہ واجب نہیں ہے۔ کوشش کرنی چاہیئے کہ خیالات نہ آئیں اور جب آئیں تو ان کو دفعہ کر دینا چاہیئے اور یہ تصور کرنا چاہیئے کہ میں اس شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوں جو دلوں کو دیکھ رہا ہے۔ اور میرے قلب کی باتوں پر مطلع ہے۔ وہ میری باتوں کو سنتا اور میری حرکات وسکنات کو دیکھتا ہے۔ اس دھیان کو بڑھانا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ انشاء اللہ خطرات وخیالات کم ہو جائیں گے۔ نیز سورۂ ناس کو شام یا صبح معنی کے خیال کے ساتھ ایک تسلیم روزانہ پڑھ لیا کریں۔

جو نمازیں قضا ہیں ان کو پڑھ لینا چاہیئے۔ اور صحت نماز کی شرائط کو جہاں تک ممکن ہر محفوظ رکھتے ہوئے ادا کر لینا چاہیئے۔ قابلیت قبول کی امید پر مؤخر کرنا ہرگز ہرگز نہ چاہیئے۔

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "میری ماں کے بیٹے! میری داڑھی اور میرا سر مت پکڑ۔ لاتاخذ بلحیتی ولا براسی اگر حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی قبضہ مشت سے چھوٹی ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح پکڑ سکتے تھے۔

عن انس ابن مالک رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکثر دھن راسہ وتسریح لحیتہ۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر میں تیل کی مالش اور کنگھی سے ڈاڑھی کی آرائش بکثرت کرتے تھے۔ کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ خشخشی داڑھی میں نہ کنگھی ہوتی ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کو سنوارا جائے اور یہی حال چھوٹی داڑھی کا ہے۔

عن عائشہ رضی اللہ عنہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشر من الفطرۃ قص الشارب واعفاء اللحیۃ والسواک والاستنشاق بالماء وقص الاظفار وغسل البراجم ونتف الابط وحلق العانۃ وانتقاص الماء یعنی الاستنجاء

یعنی دس چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ مونچھوں کا کترنا، ڈاڑھی کا بڑھانا اور مسواک کرنا الخ ابن ماجہ ص۲۵ مسلم ص۱۲۹ ابوداؤد ص۸
اس حدیث میں جو کہ نہایت قوی روایت ہے۔ دس چیزوں کو جن میں سے داڑھی کا بڑھانا اور مونچھوں کا کتروانا بھی ہے۔ فطرت بتلایا ہے اور فطرت عرف شرع میں ان امور کو کہا جاتا ہے جو کہ تمام انبیاء اور رسولوں کے معمول اور متفق علیہ ہیں اور ہم کو ان پر عمل کرنے کا حکم ہے۔

بہ غمِ شیخ

قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین
۱۹۵۷ء

۱۹ ع ۵۷

حیف در چشم زدن دورِ خیار آخر شد　　حسرتا ساعتِ تسکین وقرار آخر شد
دورِ علامہ حسین احمد شیخ الاسلام　　خلف راشد اسلافِ کبار آخر شد
نازشِ طائفہ حاجی امدادِ اللہ　　رونقِ معرکہ منبر و دار آخر شد
آیۂ ان صلوٰتی نصب العین کرداشت　　خلوت وجلوتِ آں لیل و نہار آخر شد
محورِ حسنِ عمل نقطۂ پرکار خلوص　　پیکر زہد وتقا آخر کار آخر شد
وائے بر ہند کہ از رفتنِ شیخ الاسلام　　دعوتِ دینِ متین سرو بہار آخر شد

گفت حاوی بہ صد افسوس سن رحلتِ شیخ
رُوِ گل سیر ندیدیم بہار آخر شد!

(عبدالباری حاوی مدراس)　　۱۹ ء ۵۷

قطب الاقطاب محی السنۃ والدین مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز
۱۹۵۷

صدر العلماء دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیت علماء ہند
۱۹۵۷

از جمہور محمود حسن آرٹسٹ میرٹھ.

۱۹۵۷ سن

اس کو بیس رخ سے پڑھ سکتے ہیں لیکن شمار دائیں بائیں سے

	حسین احمد ۱	او رہبر ما ۳	جنید دوراں ۷	او شبلی دیں ۷
ھ	بسوئے بقا ۱	برفت زدنیا ۹	فقیہ حق ہیں ۵	میں محدث ۷
ء	جلیل کملاء	ہمیں مورخ	بجود ایزد ۷	حسن دعاکن ۷
ھ	بروز فردا ۱	بہشت یابد ۹	حسین احمد ۵	امام ملت ۷
ء				

حسین احمد کہ بودے شیخ الاسلام　　چو از دارِ فنا سوئے جناں رفت
بوقتِ دعوتِ وصلِ الٰہی!　　ہمہ بگذاشتہ خندہ کناں رفت
زگلزار رشید و شیخ محمود　　دریغا، حسرتا، آں باغباں رفت

بفوتش گفت از راغب سروشے
جنیدِ وقت وہادیِ زماں رفت

مولانا سید نور العلی راغب چھنار　　۱۳ ھ ۷۷

تھا جن کی زندگی کا ہر ایک نقش ایک مثال　　وہ شیخ آج جانب فردوس چل دئے
احقر نے حسبِ حال یہ تاریخ عرض کی　　نقشِ حیات چھوڑ کے افسوس چل دئے

۱۳ ھ ۷۷

(محمد جمیل الرحمٰن سیوہاروی دیوبند)

تاریخ ہجری
عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا
۱۳۷۶

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۵ھ
۱۸۸۵ء

۱۳۶۹ھ
۱۹۴۹ء

عکس تحریر علامہ عثمانی

مکرم و محترم جناب مولانا محمد حسن صاحب
السلام علیکم

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ آپ نے از راہ کرم جو دوا تکلیف فرما کر بذریعہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب بھیجی تھی وہ میں نے استعمال کر لی۔ اسی دوران میں ایک سنگ سیر کی گٹھلی کے برابر خارج ہوئی لیکن الحمد للہ کوئی تکلیف درد وغیرہ کی نہیں ہوئی۔ اس سے قبل ۴۰ - ۵۰ سنگریزے نکل چکے ہیں لیکن یہ سب سے بڑا تھا۔ آپ کی مرسلہ دوا ختم ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید تو یہی ہے کہ آئندہ اس تکلیف سے محفوظ فرما دے۔ لیکن احتیاطاً میں چاہتا ہوں کہ تھوڑی سی دوا رکھی رہے۔ اگر آنمحترم نسخہ ارسال کر دیں تو بہت ہی بہتر ہے۔ ورنہ کم از کم اسی قدر دوا مزید روانہ فرما دیں ممنون ہوں گا۔ آپ کیلئے دعا کرتا ہوں اور دعا کا طالب ہوں۔

از شبیر احمد عثمانی

روز دوشنبہ
۱۰ محرم ۶۶

محمد انوار الحسن شیرکوٹی

پروفیسر اسلامیہ کالج — لائل پور

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

یوں تو دار العلوم دیوبند کا ہر فرزند اپنے رنگ میں کچھ نہ کچھ نمایاں خصوصیت کا مالک ہے۔ تاہم ایسا بھی ملنا دشوار نہیں جنہوں نے اپنے سرمایہ علم سے دوسروں کو فیض نہ پہنچایا بلکہ اس متاعِ گرانمایہ کو ضائع کر دیا ہو جو انہیں مادرِ علمی سے وراثت میں ملی تھی۔ لیکن اکثر و بیشتر علماء دار العلوم دیوبند کا چشمۂ فیض نہ صرف پاک و ہند میں ایک صدی سے مسلسل جاری ہے بلکہ دیگر ممالک مثلاً افغانستان، ایران، حجاز، برما، ترکستان، جاوا، ملایا وغیرہ وغیرہ تک کام ہو رہا ہے۔ دار العلوم دیوبند نے دنیائے اسلام کو علم دین، تقویٰ، فلاح کار، عمل، اخلاق، انسانیت اور سیاست سے ہر ہر منزل پر نوازا اور ہر ہر گام پر مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کی۔ اگر چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے اور دار العلوم کی مجموعی خدمات اور ہیئت ترکیبی پر نظر ڈالی جائے اور تعصب کی عینک کو اتار کر اس کی ملی و ملکی خدمات کا صحیح معنی میں جائزہ لیا جائے۔ تو آپ کو اس نتیجے پر پہنچنا آسان ہو گا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند کا یہ لگایا ہوا چمن قدرتِ ربانی رحمتِ حقانی نے ازل میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے چن لیا تھا۔

چمنستان دار العلوم دیوبند میں یوں تو ہر قسم کے رنگ برنگ پھول کھلے۔ لیکن ان پھولوں میں کتنے ہی پھول نہایت ہی جاذبِ نظر، بے حد نور افزا اور بے انتہا معطر تھے۔ ان میں شیخ العرب مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، یگانۂ روزگار محدث مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری، مفکر اسلام مولانا عبید اللہ سندھی، فقیہ زمانہ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی، سرمایۂ افتخار مولانا حسین احمد صاحب مدنی، ادیب یگانہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی، شامی ثانی مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور مایۂ ناز مفسر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سدابہار پھول ہیں۔

اپنے اس مقالہ میں میرا مطمحِ نظر مؤخر الذکر علامہ عثمانی کی شخصیت اور ان کے علمی مقامات سے بحث کرنا ہے اور جن کی ذات میرے دماغ اور قلم کی زبردست جولانگاہ رہی ہے اور ہے۔ ۱۳؍ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ان کے انتقال کے بعد میرے متعدد مضامین اب تک اخبارات اور رسالوں میں ان کے متعلق شائع ہوئے اور ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں قدرت نے ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے مجھے منتخب کر رکھا ہے۔ میرے اکابر اور شیوخ علم میں یوں تو امام عصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری ربانی اور ترمذی کے شیخ ہیں جن کی عقیدت و محبت کے پھول میرے دل کے چمن میں سدابہار رہیں گے۔ اور جن کو فراموشی کی خزاں کبھی بھی مرجھانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی

لیکن جس ہستی نے مجھے ان کے بعد سب سے زیادہ متاثر کرکے میرے دل و دماغ اور تحریری سخن آفرینیوں نے میرے قلب و نظر کو نور و ضیا بخشی، میری زبان کو طاقت اور میرے قلم کو زبان عنایت کی۔ وہ حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم المرتبت شخصیت تھی۔ کسی سے عقیدت اور محبت، اس ہستی کی خود ذاتی عظمت و کمال کا نشان ہیں۔ اگر آفتاب سے خود ضیا کے چشمے نہ پھوٹیں اور چاند سے خود نور کے دھارے نہ بہیں تو کون ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے۔ علامہ عثمانی کے علمی کمالات نے مجھ پر جو اثر ڈالا۔ اس کا بیان میرے قلم کی جولانگاہ سے باہر ہے۔ تاہم اسی عقل کے ماتحت جذبات سے پاک عقیدت نے مجھ سے "تجلیات عثمانی" جیسی ۱۲ صفحات کی ضخیم کتاب لکھوائی۔ جو چھپ کے اہل علم کے سامنے آچکی ہے اور جس پر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، سعید احمد صاحب ایڈیٹر برہان، ماہر القادری ایڈیٹر فاران، شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان رہبر جیسے نے کشادہ دلی سے تبصرے اور تقریظیں لکھیں۔ اس کتاب میں علامہ عثمانی کے علمی کارناموں یعنی تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، اردو، فارسی، عربی، ادب، تحریری، اور تقریری کمالات اور سیاسی بصیرت پر سیر حاصل تبصرے ہیں۔ "تجلیات عثمانی" کی دوسری جلد سمجھیے یا اسے پہلی جلد کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ "حیات عثمانی" کے نام سے تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے جو ۲۶/۸×۲۰ سائز کے ۸۰۰ سو صفحات تک چھپ کر انشاء اللہ مستقبل قریب میں قارئین کے سامنے آجائے گی۔ علامہ کے اسی علمی کمال سے تاثر کا یہ نتیجہ ہے۔ جن کے لکھنے میں میں نے کئی مہینوں کے سامنے کئی سال اپنی آنکھوں کو پگھلایا، دل کو گرمایا اور قلم کو چلایا ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ مجھے اپنے ان اکابر سے جو علمی جواہر پارے زندگی میں کسی اور جگہ سے نہ ملتے۔ اسی لیے اپنے اکابر کے حقوق ادا کرنے کے لیے دل میں ہمیشہ ایک خاص تڑپ رہی ہے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ چند سال کی محنت سے میری لکھی ہوئی "مشاہیر دیوبند" کے نام سے ایک اور کتاب انشاءاللہ تعالیٰ مستقبل قریب میں جلد منصۂ شہود پر آنے والی ہے۔ جو اپنے اکابر کے ابتدائی دور کی ہے۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اس مقالے کے موضوع ہیں۔ دار العلوم دیوبند کے عظیم الشان، بلند مقام، محقق اور نامور فرزند تھے۔ ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کی علمی مجلسوں اور درس حدیث و تفسیر کی محفلوں میں بیٹھا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ علوم و فنون، تحریر و تقریر میں اپنی نوعیت کے واحد اور منفرد شخص تھے۔ ان کے علم و فضل کے شجرۂ طوبیٰ کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں دور تک راسخ تھیں اور دوسری طرف اس درخت کی شاخیں اور برگ و بار کی بلندی آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے علوم و فنون میں حقیقت کی روشنی اس قدر تیز ہوتی تھی۔ کہ دلوں اور دماغوں میں تاریکیوں کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہتا تھا جو جگمگا نہ اٹھے۔ قرآن ہو یا حدیث پاک، منطق ہو یا فلسفہ، علم معانی و بیان ہو یا علم کلام جس علم کے مشکل مسائل کی گتھیاں اہل علم کو پریشان کر رہی ہوں اور انکا سلجھانا ان کے بس کی بات نہ ہو۔ انکا حل علامہ عثمانی کے لیے ایک معمولی بات تھی۔ بڑے بڑے علما کو ان کے سامنے مشکل مسائل کا حل معلوم کرنے کے لیے زانوئے استفادہ تہ کرتے دیکھا ہے۔ اور یہی ہے کہ ان کی طرف سے اس قدر شافی و کافی محققانہ جواب ملتا تھا کہ سننے والا یہ سمجھ کر اٹھتا تھا کہ اس سے بہتر پیرایۂ بیان میں اس مسئلے کی آخری تحقیق بس یہی ہے جو علامہ عثمانی نے پیش کی ہے۔

شفائے قلب

ان کی علمی عظمتوں کے آثار ان کے وہ تحقیقی تقریری یا تحریری بیانات ہوتے تھے جو تشنہ دلوں کو شفا بخشتے تھے۔ میں نے ایسی کئی علمی مجالس دیکھی ہیں جن کی محفلوں میں علمی سوالات ہوتے۔ مگر جوابات میں دل کی گرہیں کھلتی نظر نہ آتیں۔ درحقیقت یہ ان کی علمی کمند کی نارسائی کا نتیجہ ہوتا تھا۔ ورنہ سب انسان کی علمی طاقتیں بے پناہ ہوں تو پھر مسائل مشکلہ میں دل کو شفا نصیب نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ اپنے اس بیان کی تصدیق میں ہم مولانا نعمانی ایڈیٹر الفرقان کی حسب ذیل تحریر پیش کرتے ہیں جو انھوں نے علامہ کی وفات پر رسالے کے ایڈیٹوریل میں سپرد قلم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"استاذ جلیل حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ الابرار الصالحین، ہندوستان و پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی جن چند ہستیوں کے علمی رسوخ اور دینی بصیرت پر اس دور میں اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ بلا شبہ حضرت مولانا

ان میں سے ایک تھے۔ نظر و مطالعہ کی وسعت فکر کی دقت و سلاست اور زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت و حلاوت کی صفات اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان میں جمع کردی تھیں۔ کم از کم اس عاجز نے تو ابھی تک ان میں ان کا ثانی نہیں دیکھا بارہا اپنے پر یہ گزرا ہے کہ کسی علمی اشکال کو لے کر حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضری ہوئی اور اس وقت برجستہ جو کچھ فرمادیا۔ وہی اس اشکال کا آخری اور شافی جواب تھا کبھی کسی مسئلے کی سند کی تلاش و جستجو میں رجوع کیا گیا تو فوراً جواب ملا کہ فلاں فلاں کتاب میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ جن حضرات کو حضرت موصوف سے علمی استفادے کا موقعہ ہوا ہوگا انھیں اس میں شک نہیں ہوسکتا۔ کہ ذہانت و ذکاوت، فکر کی دقت و متانت اور دماغ کے سلجھاؤ میں۔ وہ آپ ہی اپنی نظیر تھے۔ اسی طرح اپنے مدعا کو بہترین اسلوب اور نہایت دلنشین انداز میں بیان کرنے اور دقیق سے دقیق، علمی حقیقتوں کو آسان کر کے سمجھا دینے کا جو خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو عطا فرمایا تھا۔ وہ ان کے لیے ان کے رب کا خاص عطیہ تھا۔

ایک مبصر نامدر نے مولانا کی بعض تقریریں سن کر ایک زمانہ میں کہا تھا اور بالکل صحیح کہا تھا کہ جب مولانا غیبی حقیقتوں کو دلیلوں اور مثالوں سے سمجھانے اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیب اب شاید غیب نہیں رہیگا بلکہ شہود بن کر سامنے آجائیگا۔" (الفرقان ماہ صفر ۱۳۶۹ھ دسمبر ۱۹۴۹ء ص ۴)

یہ ہیں وہ خیالات، جو مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے علامہ عثمانی کے متعلق تحریر کیے ہیں اور جو حقیقت سے لبریز ہیں۔ ہم نے ان کی اس عبارت کو اسی لیے پیش کیا کہ ان کے متعلق ہمارے اس مقالے کو شاعری یا کتاب المدائح نہ سمجھ بیٹھے۔

شریعت کے مزاج کلی سے علامہ کی واقفیت

علامہ کی یہ علمی شان کہ ہر مشکل سے مشکل شریعت کے مسئلے کو وہ پیش نظر اور واحقیقت کی طرح سمجھا دیتے تھے۔ اس لیے تھی کہ وہ شریعت کے مزاج سے پورے طور پر واقف تھے ان کی انگلیاں قرآن و سنت، فقہ اور کلام کی نبضوں اور ان کی دھڑکنوں سے بخوبی شناسا تھیں۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

" دو چار جڑی بوٹیوں کی خاصیت جاننے سے کوئی شخص طبیب نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ طب کے مزاج کلی سے پوری طرح واقفیت نہ ہو۔ وہ طبیب کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح چند مسائل جاننے سے انسان عالم نہیں بن جاتا۔ جب تک کہ شریعت کے مزاج کلی سے واقفیت حاصل نہ کرے۔"

ابتدائی تعلیم

علامہ عثمانی حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب عثمانی دیوبندی کے فرزند جلیل القدر تھے۔ ان کے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بنیاد دارالعلوم دیوبند میں برابر کے شریک تھے۔ ان کی تمام تر زندگی علمی زندگی تھی جس زمانے میں علامہ عثمانی ۱۰ محرم الحرام ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت مولانا فضل الرحمان صاحب خاص ضلع بجنور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ اس محکمے سے پنشن لینے کے بعد وہ دیوبند مقیم ہوگئے اور ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء تک انھوں نے بیالیس سال تک مدرسے کی خدمات انجام دیں۔

علامہ عثمانی کی ۱۳۱۱ھ میں بسم اللہ ہوئی اور حافظ نامدار صاحب دیوبندی کے سران کی بسم اللہ کا سہرا بندھا۔ اردو کی کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا محمد یٰسین صاحب فارسی درس فارسی کی تمام کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں عربی کا آغاز کیا اور ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں تمام مدرسے کے طلبہ میں اول رہ کر فراغت حاصل کی۔

علامہ اپنے عہد طالب علمی ہی میں بڑے ذہین اور فطین مشہور ہوگئے۔ اسی زمانے میں طلبہ کو منطق وغیرہ کی مختلف کتابیں پڑھاتے تھے۔

گویا طالب علمی کے زمانہ میں طالب علم بھی تھے اور مدرس بھی۔ اس زمانے ہی میں دار العلوم کی چہار دیواری میں ان کی شہرت پھیل نکلی تھی۔ دیوبند میں صدیقی اور عثمانی خاندان اپنی علمی سرگرمیوں کے باعث دو مشہور خاندان تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ علامہ عثمانی خاندان کے ذی وجاہت چشم و چراغ ثابت ہوئے اور اپنے ماحول سے انھیں پورا پورا اٹھانے کا موقع ملا

اساتذہ

یوں تو آپ کے مختلف اساتذہ تھے۔ لیکن ان میں سب سے بڑے استاذ حدیث حضرت شیخ الحدیث مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا تھے۔ استاذ آفتاب اور شاگرد ماہتاب ہو تو استفادہ اپنا رنگ لاکر رہتا ہے جس شاگرد کو ایسا جلیل القدر استاذ مل جائے اور جس استاذ کو ایسا ذہین و فہیم شاگرد نصیب ہو وہ دونوں نورٌ علیٰ نور نہ ہوں تو اور کون ہوگا

یوں تو حضرت مولانا محمود حسن صاحب خود حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے علمی اور روحانی فیض یافتہ تھے۔ مزید برآں علمی دار العلوم دیوبند کی ذمہ دارانہ صدر مدرسی اور محنت و مطالعہ نے انکو آسمان علم کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی زیادہ تر طالب علمی کے زمانہ ہی سے متاثر ہوئے۔ علاوہ ازیں منطق و فلسفہ میں مولانا غلام رسول صاحب سرحدی سے انھوں نے فیض حاصل کیا جو دار العلوم دیوبند کے اعلیٰ مدرسین میں سے شمار ہوتے ان کے علاوہ حکیم محمد حسن صاحب، مولانا محمد لیسین صاحب شیرکوٹی بھی ان کے اساتذہ میں سے تھے۔ علامہ عثمانی پر عہد طالب علمی ہی سے اساتذہ بے حد شفیق تھے شروان کے چہرے سے ذکاوت و ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی ٭ می تافت ستارۂ بلندی

فراغت کے بعد

چونکہ علامہ کی علمی شہرت طالب علمی کے زمانہ میں ہی ہو چکی تھی اور ان کی لیاقت کا سکہ اس کی چہار دیواری میں چل پڑا تھا۔ اس لیے آپ بعد آپ نے چند ماہ دار العلوم میں اونچے درجے کی کتابیں پڑھائیں۔ بعد ازاں فتح پوری مسجد دہلی کے عربی مدرسے میں صدر مدرسی کے پر ۱۹۰۹ء میں تشریف لے گئے۔ وہاں کے قیام میں دہلی میں آپ کی تقریریں ہوئیں اور اہل دہلی میں آپ کی علمی اور بیانی شہرت نے زبردست خراج حاصل کیا۔

تقریر و تحریر

قدرت نے جہاں ان کی ذات میں ذہانت اور فطانت ودیعت کی تھی۔ وہاں عہد طفلی سے ہی تحریر اور تقریر کا ذوق و شوق بھی پہلو میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ اکابر دیوبند کی نظر میں ان کی علمی لیاقت اور تقریر و تحریر کے اوصاف کھلے جا رہے تھے اور سب بڑے ان کے فہم و فراست سے متاثر ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے متعلق سب کی خواہش یہی تھی کہ ان کو دار العلوم دیوبند ہی میں واپس بلا لیا جائے۔

جمعیۃ الانصار

علامہ کے دوران قیام دہلی میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایما سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی جو خود حضرت مولانا محمود حسن کے راز دار سیاست شاگرد تھے۔ دیوبند پہنچ چکے تھے اور انھوں نے وہاں جمعیۃ الانصار کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس کی انتظامیہ کی مجلس بنی۔ علامہ دہلی سے دیوبند مجالس میں شرکت کے لیے تشریف لاتے۔ جمعیۃ الانصار کی مجلس منتظمہ میں آپ کو بھی خصوصیت سے شامل کیا گیا اور جہاں اس میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی، حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب جیسے حضرات تھے۔ ان میں مولانا عثمانی صاحب جیسے نوجوان عالم و فاضل کی شمولیت اور انتساب بہت ہی باعث شرف ہے۔ اس انجمن کا مقصد مسلمانان ہند میں مذہبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔ مدرسہ جمعیۃ الانصار کے پہلے جلسے میں جو مراد آباد میں منعقد ہوا۔ اور جس میں علی گڑھ، ندوۃ، دیوبند اور تمام ہندوستان سے اکابر علما نے شرکت کی۔ اپنا زبردست مقالہ پڑھا جس کو سن کر تمام اہل علم اور ممتاز اشخاص انگشت بدنداں رہ گئے۔ اگلے سال میرٹھ میں جمعیۃ الانصار کا دوسرا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں بھی علامہ نے زبردست تقریر کی اور دنیا و آخرت کے نام سے اپنا مقالہ پڑھا۔ ان جلسوں میں تقریر و تحریر سے شرکت کرنے نے حضرت عثمانی کو ہندوستان کے اعاظم رجال سے متعارف کرا دیا۔ علامہ

آدمی بھی بن گئے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں سے تقریر کے لیے دعوتیں اور بلاوے آنے لگے۔ اس طرح وہ ہندوستان کے مشہور عالم بن گئے

سلسلۂ درس و تدریس اور دارالعلوم دیوبند

ابھی حضرت عثمانی کو دارالعلوم میں آئے ہوئے چند سال کا تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ان کی علمی عظمتوں کو سب نے تسلیم کر لیا اور دارالعلوم کے اندر اور اس کے باہر ان کے علمی کارناموں کے چراغوں کی روشنیوں سے خطۂ ہند جگمگا اٹھا۔ وہ دارالعلوم میں فی سبیل اللہ تعلیم دیتے رہے اور انھوں نے اس طرح دارالعلوم کے خزانے پر اپنا بار ڈالنا گوارا نہ کیا۔ میں نے خود ان کی زبانی سنا کہ ایک دفعہ وہ فرما رہے تھے کہ دارالعلوم سے تنخواہ لے کر خدمت درس میں کوتاہی کی جواب دہی خدائے رب العزت کے سامنے میرے لیے سخت دشوار ہے۔ ان کے اس طرح خدمات کے معاوضے سے دست کش ہونے کی اکابر نے موافقت نہیں کی، کیونکہ اور کوئی بھی ذریعہ معاش بظاہر نہ تھا۔ لیکن شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ نے تحسین آفرین سے ان کی تسلی فرمائی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پھر حضرت عثمانی کے متوکلانہ پائے استقامت میں قطعاً تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ پر جو بندہ اس طرح توکل کرے کہ اس کے دین کی خدمت کا معاوضہ لینے سے حیا کرے تو خداوند تعالیٰ بھی اس کی غیبی امداد کرتا ہے۔ چنانچہ بحمد اللہ اقتصادی طور پر انہیں کبھی تکلیف نہیں رہی۔

بے اولادی

چونکہ آپ کو قدرت نے صلبی اولاد سے محروم رکھا اور اس کے عوض علوم و فنون کے خزانوں سے ان کو نوازا۔ اس لیے ایک اہل و عیال اپنے خرچ کے لیے انھیں معاشی دقت پیش نہیں آئی۔ البتہ لا اولادی کا احساس کبھی کبھی ان کے دل پر چرکے لگاتا۔ اس کے مداوے کے لیے انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی فضل حق صاحب کے بچے کو لے لیا لیکن قدرت حق سے اس کا اوائل عمر میں انتقال ہو گیا اور اس کے بعد آپ نے مذکورہ برادر اصغر کی لڑکی منیبہ خاتون کی پرورش اپنے ذمہ لی۔ بلکہ اس لڑکی کو خود ان کے والدین نے حضرت عثمانی کی خدمت میں پرورش کے لیے پیش کر دیا۔ چنانچہ موصوف نے اس کی تربیت اور شادی کے تمام اخراجات خود اپنی جیب سے اٹھائے اور اس کے لیے دیوبند میں ایک اچھا مکان بھی تعمیر کرایا۔ بلکہ دس روپے ماہوار خود بھتیجی کو عنایت فرماتے رہتے

میں اس سلسلۂ مضمون سے ذرا دور ہٹ گیا۔ میں یہ لکھ رہا تھا کہ علامہ نے دارالعلوم میں ہر قسم کے علم و فن کی کتابیں پڑھائیں۔ آغاز درس میں آپ کو معقولات یعنی منطق و فلسفہ سے بے حد شغف تھا۔ یہ دیکھ کر آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی نے جو اس زمانہ میں نائب مہتمم تھے، آپ کو حدیث و فقہ کے اسباق دے کر خصوصیت کے ساتھ علوم منقولات کی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے تفسیر، حدیث اور فقہ میں بھی بڑا کمال حاصل کیا۔ بلکہ فن تفسیر کا آپ کو ہندوستان میں امام تسلیم کیا جانے لگا۔ اس طرح آپ معقولات اور منقولات دونوں میں یکساں مہارت کے مالک ہو گئے۔

فن تفسیر

فن تفسیر میں کمال پر آپ کا زبردست شاہکار قرآن کریم کے پر تفسیری فوائد میں جو تمام ملک پاک و ہند میں چھپ کر بے حد مقبول ہوئے۔ بیسیوں ایڈیشن تمام ہندوستان میں چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئے۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے علامۂ زماں محقق دوراں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کو چمن اسلام کا درخشندہ آفتاب بنایا ہے۔ مولانائے موصوف کی بے مثل ذکاوت، بے مثل تقریر، بے مثل تحریر، عجیب و غریب حافظہ، عجیب و غریب تبحر وغیرہ کمالات علمیہ ایسے نہیں ہیں کہ کوئی شخص منصف مزاج ان سے انکار کرسکے۔ قدرت قدیمہ نے مولانا شبیر احمد صاحب موصوف کی توجہ تکمیل فوائد اور ازالۂ مغلقات کی طرف منعطف کرا کر تمام اسلامی بالخصوص اہل ہند کے لیے عدیم النظیر حجت بالغہ قائم کر دی ہے۔ یقیناً مولانا نے بہت سی ضخیم ضخیم تفسیروں سے مستغنی کر کے سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے۔"
>
> (قرآن کریم تفسیر عثمانی مدینہ پریس بجنور)

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ ان کے تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اردو میں ان کے قرآنی حواشی ہیں جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ترجمہ قرآن کے ساتھ چھپے ہیں۔ ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی اور تفسیروں پر عبور اور عوام کے دلنشیں کرنے کے لیے ان کی قوت تفہیم حد بیان سے بالا ہے۔ (معارف اپریل ۱۹۵۰ء)

ان دونوں عظیم المرتبت علماء کے علاوہ اور بہت سے علماء کی رائیں ان کے مفسر اعظم ہونے کا بیّن ثبوت ہیں۔ جن کو ہم اختصار کے باعث چھوڑتے ہیں البتہ یہ کہنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ حکومت افغانستان نے علامہ کی تفسیر کا فارسی میں ترجمہ کرا کر اپنے ملک میں چھپوایا اور دوسری کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

علامہ عثمانی اور فنِ حدیث وفقہ

فن حدیث میں بھی ان کا مقام بہت ارفع تھا۔ وہ سالہائے دراز تک دارالعلوم دیوبند میں ابوداؤد اور مسلم شریف پڑھاتے رہے اور ڈابھیل کے دوران قیام میں بخاری اور مسلم کا درس دیتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی مسلم کی شرح فتح الملہم کی تین جلدیں نہ صرف مسلمانان ہند و پاک کے لیے باعث فخر ہیں۔ بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ وہ عہد جوانی سے ہی علم حدیث میں معمر اور محدثین کا سا تبحر رکھتے تھے۔ فتح الملہم سے ان کے عظیم المرتبت ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب فتح الملہم کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

لاجرم علامۂ عصر خود مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی کہ محدث و مفسر و متکلم ایں عصر اند و در علم ایں احقر ہیچکس بخدمت ایں کتاب بہتر و برتر از ایشاں نتوانستے کرد۔ متر جہ ایں خدمت شدا حسان بر رقاب اہل علم نہادند (آخر فتح الملہم جلد اول)

یقیناً اپنے زمانے کے علامہ مولانا مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی کہ اس زمانے کے محدث و مفسر و متکلم ہیں احقر کے علم میں کوئی شخص اس کتاب (مسلم) کی خدمت زیادہ بہتر اور برتر نہ کر سکتا۔ اسکی خدمت (شرح) کی طرف متوجہ ہو کر انہوں نے اہل علم کی گردنوں پر احسان کیا ہے۔

علامہ کوثری نے علامہ عثمانی کی شرح مسلم یعنی فتح الملہم کے متعلق اپنے الاسلام رسالہ میں تحریر فرمایا۔

ومولفه ذالك الجهبذ الحجة الجامع لاشتات العلوم محقق العصر المفسر المحدث الفقيه البارع النقاد الغواص مولانا شبير احمد عثمانی شيخ الحديث مدير دارالعلوم الديوبندية (الاسلام)

اور اس فتح الملہم کے مؤلف، لائق وفائق اور حجت مختلف علوم کے جامع، زمانے کے محقق، مفسر، محدث فقیہ، بارع، نقاد و غواص، بحر علم مولانا شبیر احمد عثمانی شیخ الحدیث اور مدیر دارالعلوم دیوبند ہیں۔ (الاسلام)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ کوثری کی ان دونوں عبارتوں میں حضرت عثمانی کو مفسر، محدث، فقیہ، متکلم اور علامہ کے لفظوں سے یاد کیا ہے جو اپنی جگہ مولانا عثمانی کی عظمتوں کے لیے کافی ہیں۔ جن کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

م الکلام

تفسیر و حدیث اور فقہ کے علاوہ حضرت عثمانی کا مایۂ ناز فن، علم کلام تھا اور اس میں ان کا گہرا مطالعہ تھا جو اپنے تمام ہم عصروں میں ان کو امتیازی شان بخشتا ہے۔ وہ اپنے دور کے جس طرح مفسر اعظم تھے۔ اسی طرح بلند پایہ متکلم تھے۔ شریعت کا وہ کون سا مسئلہ یا اصول تھا جس کو عقلی یا دوسرے طریقہ سے سمجھانے پر قادر نہ تھے کہ ان کے دور کا کوئی بھی عالم اس قدر قادر الکلام نہ تھا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ کوثری نے ان کو زبردست متکلم اور محقق کہا ہے۔

نشین قاسم

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند اپنے زمانے کے امام علم کلام تھے۔ انھوں نے قدیم علم کلام سے ہٹ کر ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی اور اپنے عہد کے تقاضوں کو اپنی ذاتی بصیرت اور دور رس نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ قدیم علم کلام کے متکلمین اگر صرف یونان کے فلاسفر، معتزلہ اور باطل فرقوں کی تردید پر اپنی قوت علمی و استدلالی کو صرف کرتے تھے۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کے لیے نیا علم کلام، عیسائیوں، آریوں، ملحدوں، ناستکوں اور دیگر اپنے دور کے ملل باطلہ کے مقابلے میں پیش کیا۔ حضرت موصوف کا برہانی استدلال یا اکثر و بیشتر اپنا ہوتا تھا۔ قدرت ربانی نے ان کو علم و عقل کا ایک دریا بنا دیا تھا جس میں ہر وقت موجیں اٹھتی اور رواں دواں رہتیں۔ ان کے علوم بہت عمیق اور دقیق ہوتے تھے۔ چنانچہ سطحی اور وسطی درجہ کے اہل علم تو کیا کچھ اونچے درجے کے اہل علم بھی ان کی بعض تصنیفات مثلاً آب حیات، تقریر دلپذیر اور ہدیۃ الشیعہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ فخر العلماء حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مدرس و معاصر مولانا محمد قاسم صاحب سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں۔

> "مولانا محمد قاسم صاحب، اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ کسی نے نہ سنے نہ دیکھے عجائب غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے جس سے تطبیق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلے کی بیخ و بن تک ہو جاتی تھی۔"
>
> (سوانح قاسمی صفحہ ۲۱ - ۲۲)

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے علوم کس قدر عمیق اور دقیق ہوتے تھے۔ لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو قاسمی علوم پر ایسا عبور حاصل تھا کہ پانی کی طرح ان کے مضامین درس اور تقریروں میں بہاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ مولانا جلال الدین رومی شمس تبریز کی زبان تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مکی نے فرمایا کہ مولانا روم کی طرح اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد قاسم صاحب کو میری زبان بنایا ہے کہ قدرت ربانی ان کی زبان اور قلم سے جو مضامین ظاہر فرماتی ہے۔ وہ میرے دل کی ترجمانی کرتے ہیں۔

> "میں کہتا ہوں کہ مولانا رومی اور مولانا محمد قاسم صاحب کی طرح علامہ شبیر احمد صاحب مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی زبان تھے اور اس لیے اگر ان کو جانشین قاسم کہا جائے تو بالکل بجا اور درست ہے۔"

چنانچہ حلقہ دارالعلوم دیوبند میں علامہ عثمانی کو برملا جانشین قاسم کہا جاتا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے آپ کی وفات پر تعزیتی بیان میں تحریر فرمایا:-

> "حکیم الامت تھانوی کے بعد علامہ عثمانی کی ذات اب اپنے رنگ میں منفرد رہ گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ آج یہ بڑی نعمت بھی پاکستان و ہندوستان سے اٹھ گئی۔ آپ اپنے وقت کے زبردست متکلم نہایت خوش تقریر واعظ، محدث و مفسر سب ہی کچھ تھے۔" (صدق دسمبر ۱۹۴۹ء)

ابو سعید بزمی ایم۔ اے مرحوم ایڈیٹر اخبار احسان لاہور نے تحریر کیا ہے۔

> "مولانائے عثمانی کی ذات گرامی ہی وہ واحد ذات تھی جس نے عقل و دانش کی روشنی میں اسلامی احکام کی مصلحتیں آشکارا کیں اور متحدہ ہندوستان کے طول و عرض سے متفقہ طور پر متکلم اسلام کا لقب حاصل فرمایا۔"
>
> (احسان ۱۴ دسمبر ۱۹۴۹ء)

اور مولانا محمد میاں صاحب مصنف "علمائے ہند کا شاندار ماضی" نے تو آپ کو صاف طور پر قاسم ثانی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ علامہ عثمانی کے تفسیری فوائد کے متعلق لکھتے ہیں۔

"یہ تفسیر ایک ایسے متبحر عالم نے لکھی ہے جس کے متعلق مسلمانان ہند کا صحیح علم یہ ہے کہ فہم قرآن، غور و فکر اور سلاست کلام، دلچسپی تحریر، دلپذیری تقریر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا یعنی شیخنا و استاذنا مفسر اعظم قاسم ثانی حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی شارح مسلم۔" (قرآن کریم مطبوعہ مدینہ پریس بجنور)

مذکورہ بالا مقتدر علمائے پاک و ہند کے بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ عثمانی علوم و فنون یعنی تفسیر و حدیث، فقہ، علم کلام اور دیگر معقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور تمام علما میں ان کا علم و فضل بے داغ اور مسلم تھا۔

تقریر و تحریر

جہاں مذکورہ بیانات میں ان کے علم و فضل پر تبصرے موجود ہیں۔ وہاں ان کی ادیبانہ تحریر اور انشا پردازی اور شعلہ مقالی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی تصنیفی خدمات یعنی کتابوں سے ان کے ادبی کمال اور انشا پردازی کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے ان شعلہ مقال مقررین میں سے تھے جو تقریر کے وقت سامعین کے دلوں پر جادو کر تے تھے۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ دوران تقریر اٹھ کر چلا جائے۔ نہیں بلکہ ان کی تقریر دلوں کو گرماتی چلی جاتی تھی اور اتنی موثر ہوتی تھی کہ جسمانی مشین کے پرزوں کو عمل کے لیے متحرک کرنے کا پورا کرنٹ چھوڑ دیتی اور اہل مجلس کا شوق اور زیادہ ہو جاتا تھا۔ ان کی طلاقت لسانی اور فصاحت لفظی اور بلاغت و معانی پر دل قربان ہونے کو چاہتا تھا۔

پاک و ہند کے وہ کون سے پنڈال ہیں جو ان کی تقریروں سے نہیں گونجے۔ دار العلوم کی درسگاہ آج تک اس جیسے شعلہ مقال مقرر کی گونج پر مجذوب و شوق آمیز برآواز ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر اقبال، سر محمد شفیع اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہندوستان و پاکستان کے تمام بڑے علما ان کی تقریر کا لوہا مانتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں جب مولانا عثمانی کی تقریر مکی مسجد حیدر آباد دکن میں میر عثمان علی خاں نظام دکن نے سنی تو حیرت سے علامہ کے چہرے کو تکتے رہ گئے ۱۹۲۴ء میں جب علامہ نے موتمر مکہ میں شرکت فرمائی تو شاہ حجاز ابن سعود بے حد متاثر ہوئے اور فرمانے لگے کہ ان کے علم میں بہت وسعت اور ان کے خیالات میں بہت رفعت ہے۔

یہی طمطراق اور چمک ان کی اردو انشا پردازی میں بھی تھا۔ چنانچہ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی نے ان کی تفسیری اردو اور زبان کے متعلق فرمایا۔

"معارف قرآنیہ کو اردو زبان میں اس خوبی، خوش نمائی، شگفتگی، متانت، سلاست، فصاحت، بلاغت کے ساتھ منصۂ شہود پر لانا حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا ہی حصہ ہے۔" (قرآن کریم مطبوعہ بجنور)

علامہ بحیثیت مدرس

ہم علامہ کی تدریسی و درسی خدمات اور علوم و فنون میں مہارت و کمال پر بحث کر رہے تھے۔ علامہ جہاں بہترین عالم تھے۔ وہاں بہترین مولانا و انشا پرداز ہونے کے علاوہ بہترین مدرس بھی تھے۔ میدان درس ایک جدا میدان ہے۔ جس میں ہر عالم کامیاب نہیں ہوتا۔ آپ کا درس بے شمار منصوصیات کا حامل ہوتا تھا۔ سبق پڑھاتے وقت پورے ذوق و شوق کو عمل میں لاتے تھے۔ طلبہ بے حد متاثر ہوتے تھے۔ اس طرح تقریر فرماتے کہ کتاب کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا جاتا۔ مشکل سے مشکل مضمون کو اس طرح بیان فرماتے کہ مشکل مسئلہ مشکل نہ رہتا بلکہ آسان ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ ان کی طرز بیان میں تمثیل کا رنگ اتنا ہوتا تھا کہ مسئلہ استواء علی العرش اور شریعت کے دوسرے مشکل مسائل آسان ہو جاتے تھے۔ طلبہ کی اکثریت ایسے دشوار مسائل کے حل کے لیے علامہ کی طرف رجوع کرتی تھی۔ وہ سبق کی زیادہ مقدار پڑھانے کے قائل نہ تھے بلکہ مقدار سبق کی بجائے سبق کی نوعیت اور معلومات کی فراوانی اور تحقیقات کی افزونی پر زور دیتے تھے۔ ایک سبق معلومات اور تحقیقات کا اتنا بڑا خزانہ ہوتا تھا کہ دوسرے اساتذہ کے دس سبقوں کی برابر حیثیت رکھتا تھا اور طلبہ کے دل پر ایسا نقش ہو جاتا کہ گویا دل پر کندہ کیا گیا ہے۔

بڑے شہروں میں آپ کی زبردست تقریریں ہوئیں تحریک خلافت میں حصہ لینے اور جلسوں میں تقریروں سے علامہ کی ملک میں اور دھوم مچ گئی۔

جمعیۃ العلماء میں شرکت

تحریک خلافت جب شباب پر آئی تو جمعیۃ العلماء ہند کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں ڈالی گئی۔ ان میں ہندوستان کے ہر فرقے اور طبقے کے علماء شامل ہوئے۔ علامہ عثمانی کی شخصیت کے پیش نظر ان کو جمعیۃ العلماء ہند کی ورکنگ کمیٹی اور مجلس منتظمہ کے لیے منتخب کیا گیا۔ آپ جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے۔ ۱۹۲۰ء کے دہلی کے سالانہ جلسے میں علامہ عثمانی نے ترک موالات پر اپنا زبردست خطبہ دیا جو اس وقت چھپ چکا تھا۔ یہ جلسہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا جو ابھی مالٹا کی اسارت سے آزاد ہو کر ہندوستان واپس ہوئے تھے۔ ملک میں خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس لیے آپ نے اس میں حصہ لیا۔

شیخ الہند کے ہمراہ علامہ عثمانی اور دورۂ ہند

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان کے تمام شہروں سے جلسوں میں شرکت کے لیے باصرار دعوت دی جاتی تھی۔ ان تمام جلسوں میں تقریباً علامہ عثمانی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ دہلی، میرٹھ، مرادآباد، علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، غرضیکہ ہر جگہ علامہ بحیثیت نمائندہ تقریریں فرماتے اور یہ شرف ان کے لیے استاذ محترم کی نیابت کا بہت بڑا شرف تھا۔

جامعہ ملیہ کے افتتاح پر شیخ الہند سخت بیمار تھے۔ اسی عالم میں علیگڑھ پہنچے۔ علامہ عثمانی نے ہی خطبہ لکھا اور انھوں نے ہی پڑھا۔

خلافت اور جمعیۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت اور تقریروں نے علامہ کی شخصیت میں اور چار چاند لگا دیئے۔ اس طرح موصوف جمعیۃ العلماء میں شریک رہے۔ تاآنکہ مسلم لیگ کے نصب العین نے کانگریس سے علیحدہ اپنا زبردست محاذ قائم کر لیا۔

علامہ عثمانی اور مسلم لیگ

حضرت موصوف کا رجحان ابتدا سے ہی اس طرف تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی نمائندہ جماعت باوقار طور پر کانگریس سے علیحدہ اپنے حقوق کی نگرانی کرے اور ایسی جماعت مسلم لیگ ہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا علامہ کانگریس میں اس وقت تک شرکت کرنے کو گوارا نہیں فرماتے تھے۔ جب تک کہ ان سے حقوق نہ منوا لیے جائیں۔ لیکن جمعیۃ العلماء جو کانگریس کے ساتھ متحد تھی۔ وہ آزادی ہند کی خاطر یہ نصب العین رکھتی تھی کہ ہندوستان کی دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمانوں کو متحد ہو کر انگریزوں سے آزادی حاصل کر لینی چاہیئے۔ دشمن کو گھر سے نکالنے کے بعد آپس میں حقوق کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اور جمعیتی علماء کا یہ خیال بھی تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے بعد اسلامی حکومتوں کو ہندوستان پر قبضہ دلانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

لیگ اور کانگریس کا اختلاف

لیکن لیگ کے قائد مسٹر محمد علی جناح نے بالآخر ہندو اور کانگریس کے حالات کے پیش نظر ۱۹۴۵ء کے الیکشن کے لیے مسلم لیگ کو علیحدہ الیکشن لڑنے اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ کی تحریک نے زور پکڑ لیا اور اس طرح دونوں کا سخت مقابلہ ٹھن گیا۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نظریۂ پاکستان پیش کر چکی تھی۔ علامہ عثمانی بھی لیگ میں شریک ہو گئے۔

حضرت عثمانی اور مسلم لیگ کو ترقی

ہندوستان میں علماء کی دو جماعتیں بن گئیں جن میں سے بہت سے کانگریس میں شامل جمعیۃ علمائے ہند دہلی قطعی طور پر کانگریس کی مؤید تھی۔ ان حالات میں جب کہ بڑے بڑے علماء کانگریس میں شامل تھے۔ مسلم لیگ کو مذہبی طور پر سخت وقت کا مقابلہ پڑا۔ لیکن ایسے نازک وقت میں کسی مؤثر اور مستند عالم کی تائید کی سخت ضرورت تھی۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب ہمیشہ سے ہی کانگریس کے مخالف تھے۔ شبیر احمد صاحب بھی کانگریس سے منقبض ہی رہتے تھے۔ اس لیے آپ نے لیگ میں شرکت کا بروقت اعلان فرمایا۔ جس سے لیگ کو بہت تقویت پہنچی۔

جمعیۃ العلمائے اسلام کی صدارت

۱۹۴۵ء میں جمعیۃ العلماء کے مقابلے میں کل جمعیۃ العلماء اسلام کی بنیاد پڑی اور اس کا شاندار اجلاس کلکتے میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس اپنی نوعیت کا نہایت شاندار اور تاریخی اجلاس تھا۔ بے شمار عوام و خواص اس میں شامل ہوئے۔ علامہ عثمانی بیماری کی وجہ سے خود تشریف لے جا سکے۔ البتہ آپ نے اپنا ایک تحریری پیغام جو جلسے میں پڑھا گیا۔ محض اس پیغام سے مسلمانوں پر جو اثر ہوا۔ وہ بجلی کی طرح تمام مسلمانان ہند میں پھیل گیا۔ اس بیان کو چھپوا کر ہندوستان کے طول و عرض میں، پھیلا گیا جس سے مسلمانوں میں کانگریس کے خلاف اور لیگ کے موافق جوش پھیل گیا۔ علامہ کی شرکت نے مسلم لیگ کو بے حد تقویت پہنچائی اور کانگریس کو زبردست اور جمعیۃ علماء ہند کو بھی سخت نقصان پہنچا اور اکثر مسلمانوں کی نظر میں اس کا وقار پہلا سا نہ رہا۔

میرٹھ کانفرنس پھر میرٹھ میں لیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت علامہ شبیر احمد صاحب نے کی۔ آپ نے اس میں ایک زبردست خطبہ صدارت پڑھا جس نے ملک کی کایا ہی پلٹ کر رکھدی، اور آپ نے مسلم لیگ کو ووٹ دے کر کامیاب بنانے کا فتویٰ دیا جس کے لیگ کو زبردست کامیابی ہوئی اور لیاقت علی خاں مرحوم بھی آپ کی کوششوں کے نتیجے میں الیکشن میں کامیاب ہوئے۔

جمعیۃ العلمائے اسلام کا اجلاس لاہور میں

۱۹۴۶ء میں علامہ عثمانی کی صدارت میں جمعیۃ العلمائے اسلام کا اجلاس لاہور اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں ہوا۔ یہ اجلاس اس لیے زبردست اہمیت کا مالک تھا کہ پنجاب میں یونینسٹوں کی وزارت تھی اور وزیر اعظم خضر حیات تھے علامہ عثمانی نے اس اجلاس میں ہمارا پاکستان کے نام سے ایک بسیط و طویل خطبہ صدارت پڑھا جس سے مسلمانان پنجاب کو صحیح راہ نظر آئی اور انکا جوش مسلم لیگ کے حق میں ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ہندوستان کا دورہ تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کو تقویت پہنچانے کے لیے آپ نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور تقریریں کیں جس سے اب لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مان لی گئی اور مسلمانوں کی اکثریت لیگ کے ساتھ ہو گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر علامہ عثمانی لیگ میں شامل نہ ہوتے تو مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے یہ باور کرانا دشوار ہو جاتا کہ مسلم لیگ نہ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے۔ بلکہ مذہبی حیثیت سے اس میں شرکت کرنا ضروری ہے۔

بہرحال علامہ عثمانی کی لیگ میں شرکت بہت ہی بابرکت ثابت ہوئی۔

لیگ میں شرکت کی وجہ علامہ عثمانی نے قائد اعظم سے تعاون کرنے کا جو اقدام کیا۔ اس میں جو عوامل کار فرما تھے۔ ان میں سے سب سے بڑا یہ تھا کہ وہ لیگ میں اس بنا پر شریک ہوئے کہ پاکستان بننے کے بعد، وہاں اسلامی حکومت قائم کی جائیگی

دستور ساز اسمبلی میں مولانا عثمانی کی ممبری

متحدہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے لیے علامہ عثمانی بنگال سے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ اس لیے آپ دستور ساز اسمبلی کے وقیع ممبر بھی تھے پاکستان کی منظوری برطانیہ کی پارلیمنٹ نے دیدی تو یہ بات طے ہو گئی کہ مسلم لیگ کی حمایت اور تائید کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے ان صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے، پاکستان بنا دیا جائے اور جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ ہندوستان میں شامل کر دیئے جائیں۔ اس فیصلے سے کانگریس اور لیگ

کی کشمکش ختم ہوگئی۔

علامہ عثمانی اور سرحد کا ریفرنڈم

اسی نظریئے کے ماتحت کانگریس نے مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد میں چونکہ کانگریس کی وزارت ہے اور وہاں کے لوگ کانگریس میں شرکت کو پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا ان سے اس معاملے میں استصواب کر لیا جائے کہ آیا وہ ہندوستان میں شامل ہیں یا پاکستان میں۔

یہ مرحلہ پاکستان کے لیے بڑا نازک تھا۔ اس مقصد کے لیے قائداعظم کی نظرِ انتخاب علامہ عثمانی پر پڑی۔ آپ نے صوبہ سرحد کا سخت گرمی میں دورہ کیا اور اس کے بڑے بڑے شہروں میں تقریریں کر کے ان کو وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ چنانچہ ریفرنڈم ہوا اور صوبہ سرحد کی اکثریت نے پاکستان میں اپنی شمولیت کا ووٹ دیا اور سرحد کی فتح کا سہرا علامہ عثمانی کے سر بندھا۔

علامہ کی یوم آزادی پر کراچی میں آمد

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پہنچ رہے تھے۔ تاکہ پاکستان کو آزادی کا حکم سنا کر حکومت کی ذمہ داری مسلم لیگ کے سپرد کر دی جائے۔ علامہ چونکہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ اس لیے اس جگہ سے آپ انڈیا واپس نہ جا سکے اور جانا مناسب بھی نہ تھا۔ ورنہ شہید کر دیئے جاتے۔ بہرحال آپ نے پاکستان میں مستقل قیام کیا۔

مہاجروں کی آمد اور علامہ کی خدمت

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں ہندوستان سے مسلمانوں کا زبردست انخلاء شروع ہوا۔ اور قتل عام ہو گیا۔ آپ نے مہاجرین کی زبردست خدمات انجام دیں۔ علاوہ ازیں حکومت کا بھی بہت ساتھ دیا اس طرح آپ حکومت اور قوم دونوں کے ہردلعزیز ہو گئے۔

مسئلہ کشمیر

ستمبر ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان کے لیے یہ مسئلہ نہایت ہی نازک صورتحال اختیار کر گیا۔ علامہ نے شرعی حیثیت سے کشمیر میں جہاد کا فتویٰ دیا۔ مجاہدین کشمیر کے لیے امداد کی اپیل کی۔ اور ان کی طبی اور مالی اعانت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

قرار داد مقاصد

آپ مسلسل پاکستان اور اہل پاکستان کی رہنمائی فرماتے رہے۔ لیکن آپ کا سب سے بڑا جو منتہائے نظر تھا۔ وہ پاکستان میں اسلامی قانون کا اجراء تھا۔ اس کے لیے آپ نے دستور ساز اسمبلی میں رہ کر اور باہر پبلک میں بڑی کوشش کی۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے۔ آپ نے ڈھاکے میں جمعیۃ العلمائے اسلام پاکستان کا جلسہ منعقد کرایا اور اس جلسے میں ایک معنی خیز خطبہ صدارت دیا جس کے نتیجے میں مسٹر لیاقت علی نے "قرار داد مقاصد" کی تشکیل کی کہ پاکستان کا قانون اسلامی قانون ہوگا۔ علامہ نے اسمبلی میں اس ریزولیوشن اور تجویز کی زبردست تائید کی۔ غرض یہ ہے کہ قرار داد مقاصد کا سہرا بھی علامہ شبیر احمد عثمانی کے سر بندھا۔

وفات

دنیا میں کوئی رہا نہ رہ جائے گا۔ علامہ عثمانی اس پیری میں کام کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس پر آئے دن بیماری کے حملے۔ چنانچہ قدرت نے آپ سے جو کام لینا تھا۔ اس کی تکمیل کے بعد آپ کو بتاریخ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا۔ جب کہ آپ وزیر اعظم بہاولپور کی دعوت پر جامعہ عباسیہ کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے بہاولپور تشریف لے گئے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط اللہ تعالیٰ حضرت علامہ عثمانی کی تربت اطہر پر ہزار ہزار رحمتوں کی بارش نازل فرمائے۔ اور ان کو جنت الفردوس میں صالحین و ابرار کے زمرے میں جگہ عنایت فرمائے کہ ایسے عالم لاکھوں میں کوئی کوئی ہوتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

علامہ عثمانی کے تفسیری نکات

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ کی تفسیر

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ[1] بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے۔

نماز کا برائیوں سے روکنا دو معنی میں ہو سکتا ہے۔ ایک بطریق تسبب یعنی نماز میں اللہ تعالیٰ نے خاصیت و تاثیر یہ رکھی ہو لہٰذا نمازی کو گناہوں اور برائیوں سے روک دے جیسے کسی دوا کا استعمال کرنا۔ بخار وغیرہ امراض کو روک دیتا ہے۔ اس صورت میں یاد رکھنا چاہیے کہ دوا کے لیئے ضروری نہیں کہ اسی ایک ہی بیماری کو روکنے کے لیئے کافی ہو جائے۔ بعض دوائیں خاص مقدار میں مدت التزام کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ اس وقت ان کا نمایاں اثر ظاہر ہوتا ہے بشرطیکہ مریض کسی ایسی چیز کا استعمال نہ کرے جو اس کی خاصیت کے منافی ہو۔ پس نماز بھی بلا شبہ بڑی قوی التاثیر دوا ہے جو رُوحانی بیماریوں کے روکنے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے البتہ ضرورت اس کی ہے کہ ٹھیک مقدار میں اس احتیاط اور بدرقہ کے ساتھ جو اطبائے روحانی نے تجویز کیا ہو خاصی مدت تک مواظبت کی جائے۔ اس کے بعد مریض خود محسوس کرے گا کہ کس طرح اس کی پرانی بیماریاں اور برسوں تک کے روگ کو دُور کرتی ہے۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ نماز کا برائیوں سے روکنا بطور اقتضاء کے ہو یعنی نماز کی ہر ایک ہیئات اور اس کا ہر ایک ذکر مقتضی ہے کہ جو انسان ابھی ابھی درگاہِ الٰہی میں اپنی بندگی فرمانبرداری خضوع و تذلل اور حق تعالیٰ کی ربوبیت الوہیت اور حکومت و شہنشاہی کا اظہار و اقرار کر کے آیا ہے۔ مسجد سے باہر آ کر بھی بدعہدی اور شرارت نہ کرے اور اس شہنشاہ مطلق کے احکام

---

[1] بے شک نماز بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے۔ (قرآن پارہ ۲۱)

سے منحرف نہ ہو۔ گویا نماز کی ہر ایک ادا مصلّی کو پانچ وقت حکم دیتی ہے کہ او بندگی اور غلامی کا دعویٰ کرنے والے واقعی بندو غلاموں کی طرح رہ اور بزبان حال مطالبہ کرتی ہے کہ بے حیائی اور شرارت و سرکشی سے باز آ۔ اب کوئی باز آئے یا نہ آئے نماز بلاشبہ اسے روکتی اور منع کرتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ خود روکتا اور منع کرتا ہے جیساکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتآء ذی القربیٰ وینہیٰ عن الفحشآء والمنکر۔ پس جو بدبخت اللہ تعالیٰ کے روکنے اور منع کرنے پر بھی نہیں رُکتے، نماز کے روکنے پر بھی ان کا نہ رکنا محل تعجب نہیں۔ ہاں یہ واضح رہے کہ ہر نماز کا روکنا اور منع کرنا اسی درجہ کا ہوگا جہاں تک اس کے ادا کرنے میں خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ کیونکہ نماز محض چند مرتبہ اٹھنے بیٹھنے کا نام نہیں۔ سب سے بڑی چیز اس میں خدا کی یاد ہے۔ نمازی ارکان صلوٰۃ ادا کرتے وقت قرأت، قرآن یا دعا و تسبیح کی حالت میں جتنا حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کو مستحضر اور زبان و دل کو موافق رکھے گا۔ اتنا ہی اس کا دل نماز کے منع کرنے کی آواز کو سنے گا۔ اور اسی قدر اس کی نماز برائی کو چھڑانے میں مؤثر ثابت ہوگی۔ ورنہ جو نماز قلب لاہی و غافل سے ادا ہو وہ نماز منافق کے مشابہ ٹھہرے گی جس کی نسبت حدیث میں فرمایا

(قرآن کریم، تفسیر عثمانی ص ۵۲۱ ف ۲)

یُسبّح الرّعد کی تفسیر

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ج — اور گرجنے والا اس کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور سب فرشتے اس کے ڈر سے (تحمید و تسبیح کرتے ہیں)۔

(تفسیر) یعنی گرجنے والا بادل یا فرشتہ زبان حال یا قال سے حق تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتا ہے . . . . اور تمام فرشتے ہیبت و خوف کے ساتھ اس کی حمد و ثنا اور تسبیح و تحمید میں مشغول رہتے ہیں (تنبیہ) رعد و برق وغیرہ کے متعلق آج کل کی تحقیق یہ ہے کہ بادلوں میں "قوت کہربائیہ موجبہ" (برقی طاقت مثبتہ انگریزی (POSITIVE) پائی جاتی ہے اور زمین میں "کہربائیہ سالبہ" (NEGETIVE) ہے جو بادل زمین سے زیادہ نزدیک ہو اس میں گاہ بگاہ زمین کی "سالب کہربائیہ" سرایت کر جاتی ہے پھر بادل کے اوپر بسا اوقات وہ بادل گذرتے ہیں جن میں "کہربائیہ موجبہ" موجود ہے اور یہ قاعدہ تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ مختلف قسم کے کہربائیہ رکھنے والے دو جسم جب محاذی ہوں تو ہر ایک اپنے اندر دوسرے کی کہربائیہ کو جذب کرتا ہے تاکہ دونوں کی کہربائیہ متحد ہو جائے۔ اسی قاعدہ سے نیچے اوپر والے بادل جب ایک دوسرے کی قوت کہربائیہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو دونوں کے ملنے سے شدید حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور اس حرارت شدیدہ سے دونوں بادلوں کے حجم کے مناسب ایک آتشیں شعلہ اٹھتا ہے جو صاعقہ کہلاتا ہے۔ اسی صاعقہ کی چمک اور روشنی برق کہلاتی ہے اور ہوا میں اس کے سرایت کرنے سے جو آواز نکلتی ہے وہ رعد ہے کہربائیہ کا یہی آتشیں شرارہ کبھی بادلوں اور ہواؤں کو پھاڑ کر نیچے گرتا ہے جس کے نہایت عجیب و غریب افعال و آثار مشاہدہ کئے گئے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ وہ مکانوں کو گراتا، پہاڑوں کو شق کرتا اور جانداروں کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس نے نہایت احتیاط سے ایک آدمی کے بدن سے کپڑے اتار کر کسی درخت کی شاخ پر رکھ دیئے ہیں مگر پہننے والے کے جسم کو کچھ صدمہ نہیں پہنچا (دائرۃ المعارف فرید وجدی) جسے دیکھ کر خیال گزرتا ہے کہ

بجلی کے اس آتشیں شعلے میں کوئی ذی شعور اور ذی اختیار قوت غیر مرئی طریقہ سے کام کر رہی ہے ہم کو ضرورت نہیں کہ اوپر بیان کئے ہوئے نظریہ کا انکار کریں لیکن یہ بیان کرنے والے خود اقرار کرتے ہیں کہ روح کی طرح قوت کہربائیہ کی اصل حقیقت پر بھی اس وقت تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ انبیاء کرام اور دوسرے ارباب کشف و شہود کا بیان یہ ہے کہ تمام نظام عالم میں ظاہری اسباب کے علاوہ باطنی اسباب کا ایک عظیم الشان سلسلہ کار فرما ہے جو کچھ ہم یہاں دیکھتے ہیں وہ صرف صورت ہے لیکن اس صورت میں جو غیر مرئی حقیقت پوشیدہ ہے اس کے ادراک تک عام کی رسائی نہیں، صرف باطنی آنکھ رکھنے والے اسے دیکھتے ہیں۔ آخر تم جو نظریات بیان کرتے ہو (مثلاً یہی قوت کہربائیہ کا موجبہ سالبہ ہونا وغیرہ) اس کا علم بھی چند حکمائے طبیعیین کے سوا بلا واسطہ کس کو ہوتا ہے۔ کم از کم اتنا ہی وثوق انبیاء کے مشاہدات و تجربات پر کر لیا جائے تو بہت سے اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے نوامیس طبیعیہ کی طرح بادلوں اور بارشوں کے انتظامات پر بھی فرشتوں کی جماعتیں تعینات ہیں جو بادلوں کو مناسب مواقع پر پہنچانے اور ان سے حسب ضرورت و مصلحت کام لینے کی تدبیر کرتی ہیں اگر تمہارے بیان کے موافق بادل اور زمین وغیرہ کی کہربائیہ کا مدبر کوئی غیر مرئی فرشتہ ہو تو انکار کی کون سی وجہ ہے جس کو تم تارہ کہربائیہ کہتے ہو۔ چونکہ وہ فرشتے کے خاص تصرف سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے وحی کی زبان میں "مخاریق من نار" (فرشتہ کا آتشیں کوڑا) کہہ دیا گیا تو کیا قیامت ہو گئی۔ اس کی شدت اور سخت اشتعال سے جو گرج اور کڑک پیدا ہوئی اگر حقیقت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے فرشتہ کی ڈانٹ سے تعبیر فرمایا تو یہ نہایت ہی موزوں تعبیر ہے۔ بہرحال "سائنس" نے جس چیز کی محض صورت کو سمجھا وحی نے اس کی روح اور حقیقت پر مطلع کر دیا۔ کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ دونوں کو ایک دوسرے کا حریف یا مقابل قرار دے لیا جائے۔ علامہ محمود آلوسی نے بقرہ کے شروع میں اس پر معقول بحث کی ہے۔

(بحوالہ مذکورہ پارہ ۱۳ ۔ رکوع ۸)

عدل، احسان، ایتاء ذی القربیٰ

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔

اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کے دینے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

(تفسیر) اس آیت کی جامعیت سمجھانے کے لئے تو ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ تاہم تھوڑا سا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ آیت میں تین چیزوں کا امر فرمایا ہے (یعنی) عدل۔ احسان اور ایتاء ذی القربیٰ (رشتہ داروں کے ساتھ سلوک) عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال و انصاف کے ترازو میں تلے ہوئے ہوں۔ افراط و تفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو جو بات اپنے لئے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لئے بھی پسند نہ کرے۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذات خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل و عفو اور تلطف و ترحم کی خو اختیار کرے فرض ادا کرنے کے بعد تطوع و تبرع کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا۔ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ

فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ "—— (صحیح بخاری) "هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ" —
(رحمٰن رکوع ۳) ہر دو نوں خصلتیں یعنی عدل واحسان یا بالفاظ دیگر انصاف ومروت تو اپنے نفس اور ہر ایک غ
بیگانہ اور دوست دشمن سے متعلق تھیں۔ لیکن اقارب کا حق اجانب سے کچھ زائد ہے۔ جو تعلقات قرابت قدرت
باہم رکھ دیئے ہیں۔ انہیں نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اقارب کی ہمدردی اور ان کے ساتھ مروت واحسان اجانب
بڑھ چڑھ کر ہونا چاہیئے۔ صلہ رحم ایک مستقل نیکی ہے جو اقارب وذوی الارحام کے لئے درجہ بدرجہ استعمال ہونی چ
گویا احسان کے بعد ذوی القربیٰ (رشتہ داروں) کا بالتخصیص ذکر کرکے متنبہ فرمادیا کہ عدل وانصاف تو سب کے لئے
ہے۔ لیکن مروت واحسان کے وقت بعض مواقع بعض سے زیادہ رعایت واہتمام کے قابل ہیں۔ فرق مراتب کو فراموش
کرنا ایک طرح مقدرت کے قائم کیے ہوئے قوانین کو بھلادینا ہے اب ان تینوں لفظوں کی ہمہ گیری کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھ دار آدمی
کر سکتا ہے کہ وہ کون سی فطری خوبی، بھلائی اور نیکی دنیا میں ایسی رہ گئی ہے جو ان تین فطری اصولوں کے احاطہ سے باہر ہو۔ اور
بھی تین چیزوں سے منع فرمایا (یعنی) فحشاء، منکر اور بغی سے کیونکہ انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے بے موقع اور غلط استعمال سے
برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں (وہ تین قوتیں) قوت بہیمیہ شہوانیہ، قوت وہمیہ شہوانیہ، قوت غضبیہ سبعیہ ہیں۔
"فحشاء" سے وہ بے حیائی کی باتیں مراد ہیں جن کا منشاء شہوت وبہیمیت کی افراط ہو۔ "منکر" معروف کی ضد ہے یعنی وہ
کام جن پر فطرت سلیمہ اور عقل صحیح انکار کرے۔ گویا قوت وہمیہ شیطانیہ کے غلبہ سے قوت عقلیہ ملکیہ دب جائے۔
"البغی" ہے یعنی سرکشی کی حد سے نکل جانا ظلم وتعدی پر کمربستہ ہوکر درندوں کی طرح کھانے پھاڑنے کو دوڑنا اور دوسروں
جان ومال یا آبرو وغیرہ لینے کے واسطے ناحق دست درازی کرنا۔ اس قسم کی تمام حرکات قوت سبعیہ غضبیہ کے تسلط
سے پیدا ہوتی ہیں۔ الحاصل آیت میں تنبیہ فرمادی کہ انسان جب تک ان تینوں باتوں کو قابو میں نہ رکھے اور قوت عقلیہ
کو ان سب پر حاکم نہ بنائے مہذب اور پاک نہیں ہوسکتا۔ (بحوالہ مذکورہ صفحہ ۳۵۸-صفحہ ۳۵۹ ف ۱ ف ۱)

مفسر اور تاریخ وجغرافیہ

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ — مغلوب ہوگئے رومی ملتے ہوئے ملک میں اور وہ اس مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے۔

(تفسیر) "ادنی الارض" (ملتے ہوئے ملک یا پاس والے ملک) سے مراد اذرعات وبصریٰ کے درمیان کا خطہ ہے جو شام کی
سرحد پر حجاز سے ملتا ہوا مکہ کے قریب واقع ہوا ہے یا فلسطین مراد ہو جو رومیوں کے ملک سے نزدیک تھا۔ یا جزیرہ ابن
عمر جو فارس سے اقرب ہے۔ ابن حجر نے پہلے قول کی تصحیح کی ہے۔ (۲) یعنی نو سال کے اندر اندر رومی غالب ہو جائیں گے
کیونکہ لغت میں اور حدیث میں بعض کا اطلاق تین سے نو تک پر ہوا ہے۔ ان آیات میں قرآن نے ایک عجیب وغریب
پیشین گوئی کی ہے جو اس کی صداقت کی عظیم الشان دلیل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی بڑی بھاری سلطنتیں فارس یا ایران

کی سو

کہتے ہیں اور روم مدّت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آتی تھیں ۔ ۶۰۲ء سے لے کر ۶۱۴ء کے بعد تک ان کی حریفانہ نبرد آزمائیوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ جیساکہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تصریحات سے ظاہر ہے ۵۷۰ء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور چالیس سال بعد ۶۱۰ء میں آپ کی بعثت ہوئی ۔ مکّہ والوں میں جنگِ روم و فارس کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں اسی دوران میں نبی کریم صلعم کے دعوئے نبوت اور اسلامی تحریک نے ان لوگوں کے لئے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی ...... آخر ۶۱۴ء کے بعد جب کہ ولادت نبوی کو قمری حساب سے تقریباً پینتالیس ۴۵ سال اور بعثت کے پانچ سال گزر چکے خسرو پرویز (کیخسرو ثانی) کے عہد میں فارس نے روم کو ایک مہلک اور فیصلہ کن شکست دی ۔ شام، مصر، ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گئے ۔ الخ (قرآنِ کریم بتفسیر عثمانی ص ۵۲۴ ص ۶۰۷)۔

ضالّ کی حقیقت

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ط

اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سجھائی اور پایا تجھ کو مفلسی میں پھر بے پروا کر دیا ۔

(تفسیر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی آپؐ کے والد وفات پا چکے تھے ۔ چھ سال کی عمر تھی کہ والدہ نے رحلت کی ۔ پھر آٹھ سال کی عمر تک اپنے دادا عبدالمطّلب کی کفالت میں رہے ۔ آخر اس دُرِّ یتیم اور نادرۂ روزگار کی ظاہری تربیت و پرورش آپؐ کے بے حد شفیق چچا ابو طالب کے حصّہ میں آئی ۔ انہوں نے زندگی بھر آپؐ کی نصرت و حمایت اور تکریم و تبجیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ۔ ہجرت سے کچھ پہلے وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے چند روز بعد یہ امانت الٰہی ، اللہ کے حکم سے انصار مدینہ کے گھر پہنچ گئی ۔ اوس اور خزرج کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا ، اور انہوں نے اس کی حفاظت اس طرح کی جس کی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی ۔ جب حضرت جوان ہوئے تو قوم کے مشرکانہ اطوار اور بیہودہ رسم و راہ سے سخت بیزار تھے ۔ اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ پورے زور کے ساتھ موجزن تھا عشقِ الٰہی کی آگ سینہ مُبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی ۔ وصول الی اللہ (اللہ تک پہنچنے) اور ہدایت خلق کی اس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفس قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا ۔ اندر ہی اندر جوش مارتا تھا ۔ لیکن کوئی صاف کھلا ہُوا راستہ اور مفصّل دستور العمل بظاہر دکھائی نہیں دیتا تھا جس سے اس عرش و کرسی سے زیادہ وسیع قلب کو تسکین ہوتی ۔ اِس جوشِ طلب اور فرطِ محبت میں آپ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جاکر مالک کو یاد کرتے اور محبوب حقیقی کو پکارتے ۔ آخر اللہ تعالیٰ نے غارِ حرا میں فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا ۔ اور وصول الی اللہ اور اصلاح خلق کی تفصیلی راہیں آپ پر کھول دیں یعنی دین حق نازل فرمایا ۔ وما کنت تدری ما الکتاب ولا[1]

[1] اور آپ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب اور ایمان کیا ہیں ۔ لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس کے ذریعے اپنے بندوں میں سے ہم جس کو چاہیں ہدایت دیں ۔

الایمان ولکن جعلناہ نورًا نہدی بہ من نشاء من عبادنا ۔ (شوریٰ رکوع ۵)
ضالاً کے معنی کرتے وقت سورہ یوسف کی آیت قالوا تاللہ انک لفی ضلالک القدیم کو پیش نظر رکھنا چاہئے
(تفسیر عثمانی، سورہ الضحیٰ)

علامہ کا صرف و نحو میں درک

وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۵﴾   اور نہ تم کو پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں ۔

(تفسیر) یعنی آئندہ بھی میں تمہارے معبودوں کو کبھی پوجنے والا نہیں اور نہ تم میرے معبود واحد کی بلا شرکت غیرے پرستش کرنے والے ہو ۔ مطلب یہ ہے کہ میں موحد ہو کر شرک نہیں کر سکتا ۔ نہ اب نہ آئندہ اور تم مشرک رہ کر موحد نہیں قرار دیئے گئے ۔ نہ اب نہ آئندہ اس تقریر کے موافق آیتوں میں تکرار نہیں رہا ۔ (تنبیہ) بعض علماء نے یہاں تکرار کو تاکید پر حمل کیا ہے اور بعض نے پہلے دو جملوں میں حال اور استقبال کی نفی اور اخیر کے دو جملوں میں ماضی کی نفی مُراد لی ہے (کما صرح بہ الزمخشری) اور بعض نے پہلے دو جملوں میں حال کا اور اخیر کے جملوں میں استقبال کا ارادہ کیا ہے ۔ کما یظہر من الترجمہ ۔ لیکن بعض محققین نے پہلے دو جملوں میں ما کو موصولہ اور دوسرے دونوں جملوں میں ما کو مصدریہ لیکر یوں تقریر کی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان نہ معبود میں اشتراک ہے نہ طریق عبادت میں ۔ تم بتوں کو پوجتے ہو وہ میرے معبود نہیں ۔ میں اس خدا کو پوجتا ہوں جس کی شان و صفت میں کوئی شریک نہ ہو سکے ۔ ایسا خدا تمہارا معبود نہیں ۔ علی ہذا القیاس تم جس طرح عبادت کرتے ہو مثلاً ننگے ہو کر کعبہ کے گرد ناچنے لگے یا ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانے لگے ' میں اس طرح عبادت کرنے والا نہیں اور میں جس شان سے اللہ کی عبادت بجا لاتا ہوں تم کو اس کی توفیق نہیں لہٰذا میرا اور تمہارا راستہ الگ الگ ہے ۔

اور احقر کے خیال میں یوں آتا ہے کہ پہلے جملے کو حال اور استقبال کی نفی کے لئے رکھا جائے یعنی میں اب یا آئندہ تمہارے معبودوں کی پرستش نہیں کر سکتا جیسا کہ تم مجھ سے چاہتے ہو ۔ اور ولا انا عابد ما عبدتم کا مطلب (بقول حافظ ابن تیمیہ) نے یہ لیا کہ (جب میں خدا کا رسول ہوں تو) میری شان یہ نہیں اور نہ کسی وقت ممکن ہے (بامکان شرعی) کہ شرک کا ارتکاب کروں حتیٰ کہ گذشتہ زمانے میں نزول وحی سے پہلے بھی جب تم سب پتھروں اور درختوں کو پوج رہے تھے میں نے کسی غیر اللہ کی پرستش نہیں کی ۔ پھر اب اللہ کی طرف سے نور وحی اور بینات و ہدیٰ وغیرہ آنے کے بعد کہاں ممکن ہے کہ شرکیات میں تمہارا ہم نوا ہو جاؤں ۔ شاید اسی لئے یہاں ولا انا عابدٌ میں جملہ اسمیہ اور ما عبدتم میں صیغہ ماضی کا عنوان اختیار فرمایا ۔ رہا کفار کا حال اس کا بیان دونوں مرتبہ ایک ہی عنوان سے فرمایا ۔ ولا انتم عابدون ما اعبد یعنی تم لوگ تو اپنی سوءِ استعداد اور انتہائی بدبختی سے اس لائق نہیں کہ کبھی وقت اور کسی حال میں خدائے واحد کی بلا شرکت غیرے پرستش کرنے والے بنو ۔ حتیٰ کہ عین گفتگوئے صلح کے وقت بھی شرک کا دُم چھلا ساتھ لگائے رکھتے ہو ۔ ایک

لہ خدا کی قسم تُو تو اپنی پرانی غلطی میں مبتلا ہے ۔

بلکہ ماتعبدون بصیغۂ مضارع اور دوسری جگہ ماعبدتم بصیغۂ ماضی لانے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ان کے معبود ہر روز بدلتے رہتے ہیں جو چیز عجب سی نظر آئی یا کوئی خوب صورت سا پتھر نظر پڑا اس کو اٹھا کر معبود بنا لیا اور پہلے کو رخصت کیا۔ پھر ہر موسم کا اور ہر کام کا جدا معبود ہے۔ ایک سفر کا ایک حضر کا، کوئی روٹی دینے والا کوئی اولاد دینے والا وقس علی ہذا۔ (قرآن کریم بتفسیر عثمانی ص ۷۸۹ سورہ کافرون ف ۳)

طبّی تحقیق شہد

فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اس (شہد) میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔

(تفسیر) یعنی بہت سی بیماریوں میں صرف شہد خالص یا کسی دوسری دوا میں شامل کر کے دیا جاتا ہے۔ جو باذن اللہ مریضوں کے لئے شفایابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ ایک شخص کو دست آرہے تھے۔ اس کا بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے شہد پلانے کی رائے دی۔ شہد پلانے کے بعد اسہال میں ترقی ہو گئی۔ اس نے پھر حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت زیادہ آنے لگے۔ فرمایا "صدق اللہ وکذب بطن اخیک" (اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے) پھر پلاؤ۔ دوبارہ پلانے سے بھی وہی کیفیت ہوئی۔ تو آپ نے پھر وہی فرمایا۔ آخر تیسری مرتبہ پلانے سے دست بند ہو گئے۔ طبیعت صاف ہو گئی۔ اطباء نے اپنے اصول کے موافق کہا ہے کہ بعض اوقات پیٹ میں کیموس فاسد ہوتا ہے جو پیٹ میں پہنچنے والی ہر ایک غذا اور دوا کو فاسد کر دیتا ہے اس لئے دست آتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے مسہلات دی جائیں تا وہ "کیموس فاسد" خارج ہو۔ شہد کے مسہل ہونے میں کسی کو کلام نہیں گویا حضورؐ کا مشورہ اس طبّی اصول کے موافق تھا۔

مامون رشید کے زمانہ میں ثمامہ عبسی کو جب اس قسم کا مرض لاحق ہوا تو اس زمانے کے شاہی طبیب یزید بن یوحنا نے مسہل سے اس کا علاج کیا اور یہی وجہ بتلائی۔ آج کل کے اطباء شہد کے استعمال کو استطلاق بطن کے علاج میں بے حد مفید بتلاتے ہیں۔ (قرآن کریم بتفسیر عثمانی ص ۳۵۵۔ فائدہ ۳)

بشارت احمد صلی اللہ علیہ وسلم

(تفسیر) یوں تو دوسرے انبیائے سابقین بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا مژدہ برابر سناتے آئے ہیں لیکن جس صراحت سے وضاحت اور اہتمام کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام نے آپ کی آمد کی خوش خبری دی وہ کسی اور سے منقول نہیں۔ شاید قرب عہد کی بنا پر خصوصیت ان کے حصے میں آئی ہوگی۔ کیوں کہ ان کے بعد نبی آخر الزماں کے سوا کوئی دوسرا نبی آنے والا نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہود و نصاریٰ کی مجرمانہ غفلت اور متعمدانہ دستبرد نے آج دنیا کے ہاتھوں میں اصل تورات و انجیل کا کوئی صحیح نسخہ باقی نہیں چھوڑا جس سے ہم کو ٹھیک پتہ لگ سکتا کہ

انبیائے سابقین خصوصاً حضرت مسیح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبت کن الفاظ میں اور کس عنوان سے بشارت دی تھی اور اسی لئے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآن کریم کے صاف اور صریح بیان کو اس تحریف شدہ بائیبل میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے جھٹلانے لگے۔ تاہم یہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ سمجھنا چاہئے کہ حق تعالےٰ نے محرفین کو اس قدر قدرت نہیں دی کہ وہ اس کے آخری پیغمبر کے متعلق تمام پیشین گوئیوں کو بالکلیہ محو کر دیں کہ ان کا کچھ نشان باقی نہ رہے۔ موجودہ بائیبل میں بھی بیسیوں مواضع میں جہاں آنحضرت صلعم کا ذکر قریب تصحیح کے موجود اور عقل وانصاف والوں کے لئے اس میں تاویل وانکار کی گنجائش قطعاً نہیں اور انجیل یوحنا میں تو فارقلیط یا پیر کلوطوس (۱) لا بشارت اتنی صاف ہے کہ اس کا بے تکلف مطلب بجز احمد (بمعنی محمود وستودہ) کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ بعض علمائے اہل کتاب کو بھی ناگزیر اس کا اعتراف بانیم اقرار کرنا پڑا ہے کہ اس پیشین گوئی کا انطباق پوری طرح روح القدس پر اور نہ بجز سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور پر ہو سکتا ہے۔ (بتفسیر عثمانی پارہ ۲۸، سورہ صف، رکوع ۱)

مولانا کی دقت نظر مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکمت ونبوت بخشے وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔
(آل عمران پارہ ۳ رکوع ۱۶)

(تفسیر) وفد نجران کی موجودگی میں بعض یہود ونصاریٰ نے کہا تھا کہ اے محمدؐ! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری اس طرح پرستش کرنے لگیں جیسے نصاریٰ عیسیٰ ابن مریم کو پوجتے ہیں۔ آپ نے فرمایا معاذ اللہ کہ ہم غیر اللہ کی بندگی کریں یا دوسروں کو دعوت دیں حق تعالےٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی جس بشر کو حق تعالیٰ کتاب وحکمت اور فیصلہ اور پیغمبری کے منصب جلیلہ پر فائز کرے اس کا یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو خالص ایک خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دوسری مخلوق کا بندہ بنانے لگے۔ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ خداوند قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا ہے فی الواقع وہ اس کا اہل نہ تھا۔

دنیا کی کوئی گورنمنٹ بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدہ پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے۔
(۱) یہ شخص گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض کو انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں۔
(۲) گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادۂ وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جا سکتی ہے کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کر سکتی۔ جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اس کی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا شبہ ہو۔ بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا وفاداری کا اندازہ صحیح طور پر نہ ہو سکی ہو لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی احتمال نہیں۔ (قرآن کریم بتفسیر عثمانی ص ۷۷ فائدہ ۵)

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ج فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ تو کہہ دے بس اللہ کا الزام پورا ہے سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت کر دیتا تم سب کو

(تفسیر) گذشتہ رکوع میں مشرکین سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن حلال وطیب چیزوں کو تم نے حرام ٹھہرا لیا ہے اور اس تحریم کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اس کی سند اور دلیل لاؤ۔ یہاں ان کی دلیل بیان کی گئی ہے جو وہ پیش کرنے والے تھے

اللہ چاہتا تو اس کی قدرت تھی کہ ہم کو اور ہمارے اسلاف کو اس تحریم سے بلکہ تمام مشرکانہ افعال واقوال سے روک دیتا۔

جب نہ روکا اور یونہی ہوتا چلا آیا تو ثابت ہوا کہ اس کے نزدیک ہماری کاروائیاں پسندیدہ ہیں، ناپسند ہوتیں تو ان کرنے میں ہم کو اب تک کیوں آزاد چھوڑتا۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایک نیک نام اور مدبّر گورنمنٹ کسی باغیانہ تحریک میں حصّہ لینے والے کو باوجود یقینی اطلاع اور کافی قدرت کے پہلے ہی دن پکڑ کر پھانسی نہیں دے دیتی وہ اس کی حرکات کی نگرانی رکھتی ہے کبھی نہ درست رکھنے کی ہدایت کرتی ہے اور موقع دیتی ہے کہ آدمی ایسی حرکات کا انجام سوچ کر خود سنبھل جائے کبھی اصلاح سے مایوس ہو کر ڈھیل چھوڑتی ہے کہ اس کی بغاوت کا ایسا باضابطہ اور مکمل مواد فراہم ہو جائے جس کے بعد اس کی انتہائی مجرمانہ غدّاری قانونی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد ثابت کی جاسکے۔ ان تمام صورتوں میں مجرم باگ ڈھیلی چھوڑ دینے اور فوراً سزا نہ دینے سے کیا یہ ثابت ہوگا کہ گورنمنٹ کی نظر میں وہ کاروائی جرم و بغاوت نہیں ہے۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں ان افعال کا جرم ہونا اوّل تو اس کے شائع کئے ہوئے قانون سے ظاہر ہے۔ دوسرے جب یہ مجرم مہلت پوری ہونے پر عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ اور باضابطہ اثبات و اظہار جرم کے بعد پھانسی یا حبس دوام کی سزا بھگتے گا۔ تب برأی العین مشاہدہ ہو جائے گا کہ گورنمنٹ کی نظر میں کتنا بڑا مجرم تھا۔ بہرحال گورنمنٹ کا کسی جرم پر باوجود علم و قدرت رکھنے کے کسی مصلحت سے فوری سزا جاری نہ کرنا اس کی دلیل نہیں کہ وہ جرم کو جرم نہیں سمجھتی اس پر قیاس کر لیجئے کہ وہ احکم الحاکمین ابتدائے آفرینش سے آج تک بتوسط اپنے صادق القول اور پاکباز نائبین کے ہر قسم کے قوانین واحکام سے بندوں کو مطلع فرما رہا ہے۔ (قرآن حکیم۔ سورہ الانعام۔ رکوع ۱۸)

فرقہ قادیانیت اور ختم نبوّت

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا

(تفسیر) یعنی جب خدا کا دین اسلام اپنی مکمل صورت میں آپہنچا تو کوئی جھوٹا یا نامکمل دین قبول نہیں کیا جاسکتا۔ طلوع آفتاب کے بعد مٹی کے چراغ جلانا یا گیس، بجلی اور ستاروں کی روشنی تلاش کرنا محض لغو اور کھلی حماقت ہے۔ مقامی نبوتوں اور ہدایتوں کا عہد گزر چکا ہے۔ اب سب سے بڑی آخری اور عالمگیر نبوّت و ہدایت سے ہی روشنی حاصل کرنی چاہیئے کہ یہی تمام روشنیوں کا خزانہ ہے جس میں پہلی تمام روشنیاں مدغم ہو چکی ہیں۔ (آل عمران ۳)

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ۔ اور بنایا ہم نے مریم کے بیٹے اور اس کی ماں کو ایک نشانی اور ان کو ٹھکانا دیا ایک ٹیلہ پر جہاں ٹھہرنے کا موقع تھا اور پانی نتھرا۔

(تفسیر) شاید یہ وہی ٹیلا یا اونچی زمین ہو جہاں وضع حمل کے وقت حضرت مریمؑ تشریف رکھتی تھیں .... و. جگہ

بلند تھی۔ نیچے چشمہ یا نہر جاری تھی اور کھجور کا درخت نزدیک تھا (ابن کثیر) لیکن عموماً مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ مسیح کے بچپن کا واقعہ ہے۔ ایک ظالم بادشاہ ہیرودس نامی نجومیوں سے سُن کر کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سرداری ملے گی، لڑکپن ہی میں ان کا دشمن ہو گیا تھا اور قتل کے درپے تھا۔ حضرت مریمؑ الہام ربانی سے انہیں لے کر مصر چلی گئیں اس ظالم کے مرنے کے بعد پھر شام واپس چلی آئیں۔ چنانچہ انجیل متی میں بھی یہ واقعہ موجود ہے۔ اور مصر کا اونچا ہونا باعتبار رودِ نیل کے ہے ورنہ غرق ہو جاتا اور ماءِ معین رودِ نیل ہے۔ بعض نے "ربوہ" اونچی جگہ سے مراد شام یا فلسطین لیا اور کچھ بعید نہیں کہ جس ٹیلے پر ولادت کے وقت موجود تھیں۔ وہیں اس خطرہ کے وقت بھی پناہ دی گئی ہو۔ بہرحال اسلام میں سے کسی نے ربوہ سے مراد کشمیر نہیں لیا ورنہ حضرت مسیحؑ کی قبر کشمیر میں بتلائی۔ البتہ ہمارے زمانے کے بعض نے "ربوہ" سے مراد کشمیر لیا ہے اور وہیں عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بتلائی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت تاریخی نہیں۔ "محلہ خان یار" شہر سِری نگر میں جو قبر "یوزاسف" کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بابت تاریخ عظمی کے مصنف نے محض عام افواہ نقل کی ہے کہ لوگ اس کو کسی نبی کی قبر بتاتے ہیں وہ کوئی شہزادہ تھا اور دوسرے ملک سے یہاں آیا ہے اس کو عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بتانا پرلے درجہ کی سفاہت اور بے حیائی ہے۔ (قرآن حکیم۔ سورہ المؤمنون۔ رکوع ۳)

فرقہ شیعہ اور مودّت قربیٰ

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط تو کہہ میں مانگتا نہیں تم سے اس پر کچھ بدلا مگر دوستی چاہیے قرابت میں

(تفسیر) یعنی قرآن جیسی دولت تم کو دے رہا ہوں اور ابدی نجات و فلاح کا راستہ بتلاتا اور جنت کی خوش خبری سناتا ہوں۔ یہ سب محض لوجہ اللہ ہے۔ اس خیر خواہی اور احسان کا تم سے کچھ بدلا نہیں مانگتا۔ صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ تم سے جو میرے نسبی اور خاندانی تعلقات ہیں، کم از کم ان کو نظر انداز نہ کرو۔ آخر تمہارا معاملہ اقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان کی بے موقع بھی حمایت کرتے ہو۔ . . . کم از کم قرابت و رحم کا خیال کر کے ظلم و اذیت رانی سے باز رہو اور مجھ کو اتنی آزادی دو کہ میں اپنے پروردگار کا پیغام دنیا کو پہنچاتا رہوں۔ کیا اتنی دنیوی اور فطری محبت کا بھی مستحق نہیں ہوں . . . . . بعض علماء نے "مودت فی القربیٰ" سے اہل بیت نبوی کی محبت مراد لے کر معنی یوں کئے ہیں کہ میں تم سے تبلیغ پر کوئی بدلا نہیں مانگتا۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ میرے اقارب سے محبت کرو۔ کوئی شبہ نہیں کہ اہل بیت اور اقارب نبی کریم صلعم کی محبت و تعظیم اور حقوق شناسی امت پر لازم و واجب اور جزو ایمان ہے۔ اور ان سے درجہ بدرجہ محبت رکھنا حقیقت میں حضور کی محبت پر متفرع ہے۔ لیکن آیت ہذا کی تفسیر اس طرح کرنا شان نزول اور روایات صحیحہ کے خلاف ہونے کے علاوہ حضور کی شان رفیع کے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ (قرآن کریم صفحہ ۶۴۳، فائدہ ۵)

فرقہ نیچری اور معجزات

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ پاس آ لگی قیامت اور پھٹ گیا چاند۔

(تفسیر) ہجرت سے پیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ کفار کا مجمع تھا۔ اُنہوں نے آپ سے
کوئی نشانی طلب کی آپ نے فرمایا کہ آسمان کی طرف دیکھو۔ ناگاہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا ان میں
سے مغرب کی اور دوسرا مشرق کی طرف چلا گیا۔ بیچ میں پہاڑ حائل تھا۔ کفار کہنے لگے کہ محمدؐ نے چاند پر یا ہم پر جادو
کر دیا ہے۔ اس معجزہ کو شق القمر کہتے ہیں۔ اور یہ ایک نمونہ اور نشانی تھی قیامت کی کہ آگے سب کچھ یونہی پھٹے گا۔
(طحاوی اور ابن کثیرؒ وغیرہ نے اس واقعہ کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے اور کسی دلیل عقلی سے آج تک اس طرح کے واقعات
کا محال ہونا ثابت نہیں کیا جاسکا۔ اور محض استبعاد کی بناء پر ایسی قطعی الثبوت چیزوں کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ
استبعاد تو اعجاز کے لیئے لازم ہے۔ روزمرہ کے معمولی واقعات کو معجزہ کون کہے گا۔ ۔ ۔ ۔ باقی یہ کہنا کہ شق القمر اگر واقع ہوا
تھا تو تاریخوں میں اس کا وجود کیوں نہیں۔ تو یاد رہے کہ یہ قصہ رات کا ہے۔ بعض ملکوں میں تو اختلاف مطالع
کی وجہ سے اس وقت دن ہوگا اور بعض جگہ آدھی رات ہوگی۔ لوگ عموماً سوتے ہوں گے۔ اور جہاں بیدار ہوں گے اور کھلے
میدان کے نیچے بیٹھے ہوں گے تو عادۃً یہ ضروری نہیں کہ سب آسمان کی طرف تک رہے ہوں۔ زمین پر جو چاندنی پھیلی
ہوئی ہے بشرطیکہ مطلع صاف ہو۔ اس میں دو ٹکڑے ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر تھوڑی دیر کا قصہ تھا ہم دیکھتے
ہیں کہ بارہا چاند گہن ہوتا ہے اور خاصہ ممتد رہتا ہے لیکن لاکھوں انسانوں کو خبر بھی نہیں ہوتی اور اس زمانہ میں آج کل
کی طرح رصد وغیرہ کے اتنے وسیع ومکمل انتظامات اور تقاویم (جنتریوں) کی اس قدر اشاعت بھی نہ تھی۔ بہر حال تاریخوں
میں مذکور نہ ہونے سے اس کی تکذیب نہیں ہوسکتی۔ بایں ہمہ "تاریخ فرشتہ" وغیرہ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ہندوستان
کے مہاراجہ مالی بار کے اسلام کا سبب اسی واقعہ کو لکھتے ہیں۔ (القمر پارہ ٢٧ رکوع ٨)

بُت پرستوں، عیسائیوں، شیعوں، بریلویوں، پیر پرستوں اور قبر پرستوں کی فہمائش

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔ — اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں۔

تفسیر: یعنی زبان سے سب کہتے ہیں کہ خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدائی کا حصہ دار بناتا ہے کوئی اس کے
لئے بیٹے بیٹیاں تجویز کرتا ہے، کوئی اسے روح و مادہ کا محتاج بناتا ہے۔ کسی نے احبار و رہبان کو خدائی کے اختیارات دے دیئے
ہیں۔ بہت سے تعزیہ پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی کے خس و خاشاک سے توحید کے صاف چشمہ کو مکدر کر رہے ہیں۔ ریا اور ہوا
پرستی۔ کتنے موحدین ہیں جو پاک ہوں گے۔ غرض ایمان کا زبانی دعویٰ کرکے بہت کم ہیں جو عقیدہ یا عمل کے درجہ میں شرک جلی
یا خفی کا ارتکاب نہیں کرتے۔ (قرآن کریم صفحہ ٣٢٢، سورہ یوسف، ف۔ تفسیر عثمانی، پارہ ١٣، رکوع ٦)

سلیمان علیہ السلام اور منطق الطیر

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا — اور قائم مقام ہوا سلیمان داؤدؑ کا اور بولا

النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ط اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ -

لوگو! ہم کو سکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی اور دیا ہم کو ہر چیز میں سے بے شک یہی ہے فضیلت صریح -

(تفسیر) اس بات کا انکار کرنا بداہت، کا انکار ہوگا کہ پرندے جو بولیاں بولتے ہیں ان میں ایک خاص حد افہام و تفہیم کی شان پائی جاتی ہے - ایک پرندہ جس وقت اپنے جوڑے کو بلاتا یا دانہ دینے کے لئے اپنے بچوں آواز دیتا یا کسی چیز سے خوف کھاکر خبردار کرتا ہے - ان تمام حالات میں اس کی بولی اور لب و لہجہ یکساں نہیں چنانچہ اس کے مخاطبین اس فرق کو بخوبی محسوس کرتے ہیں - اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرے احوال اور ضرو کے وقت بھی انکے چہچہوں میں (گو ہمیں کتنے ہی متشابہ و متقارب معلوم ہوں) ایسا لطیف و خفیف تفاوت ہو جسے وہ آپس میں سمجھ لیتے ہوں گے - تم کسی پوسٹ آفس میں چلے جاؤ اور تار کی متشابہ کھٹ کھٹ گھنٹوں رہو تمہارے نزدیک محض بے معنی حرکات و اصوات سے زیادہ وقعت نہ ہوگی - لیکن ٹیلیگراف ماسٹر فوراً گا کہ فلاں جگہ سے فلاں آدمی یہ مضمون کہہ رہا ہے یا فلاں لیکچر کی تقریر انہی تاروں کی کھٹ کھٹاہٹ میں صا دے رہی ہے کیونکہ وہ ان فقرات تلغرافیہ کی دلالت وضعیہ سے پوری طرح واقف ہے - علی ہذا القیاس کیا کہ واضع حقیقی (اللہ) نے لغات طیور کو بھی مختلف معانی و مطالب کے اظہار کے لئے وضع کیا ہو اور جس طرح کا بچہ اپنے ماں باپ کی زبان سے آہستہ آہستہ واقف ہوتا رہتا ہے - طیور کے بچے بھی اپنی فطری استعداد اپنے ہی نوع کی بولیوں کو سمجھنے لگتے ہوں اور بطور ایک پیغمبرانہ اعجاز کے حق تعالٰی کسی نبی کو بھی ان کا علم عطا فر حیوانات کے لئے جزئی ادراکات کا حصول تو پہلے سے مسلم چلا آیا ہے - لیکن یورپ کی جدید تحقیقات اب بوا کی عاقلیت کو آدمیت کی سرحد کے قریب کرتی جاتی ہیں - حتٰی کہ حیوانات کی بولیوں کی ابجد تیار کی جارہی - یاد رہے کہ ہم اسرائیلی خرافات کی تائید نہیں کر رہے، ہاں جس حد تک، اکابر سلف نے بلا اختلاف کلام الٰہی بیان کیا ہے اس کو ضرور تسلیم کرتے ہیں خواہ وہ اسرائیلی روایات کے موافق پڑ جائیں یا مخالف - (تفسیر عثمانی)

چیونٹی اور سلیمان علیہ السلام

حَتّٰى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ج لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ -

یہاں تک کہ جب پہنچے چیونٹیوں کے میدان پر کہا ایک نے اے چیونٹیو گھس جاؤ اپنے گھروں میں نہ پیس ڈالے کو سلیمان اور اس کی فوجیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو -

(تفسیر) ..... یعنی سلیمان علیہ السلام کا اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ایسے میدان کی طرف گزر ہوا جہاں چیونٹیوں کی بھاری بستی تھی (تنبیہ) بعض چیونٹیاں مل کر خاص سلیقہ سے اپنا گھر بناتی ہیں، اسے زبان عرب میں قریۃ النمل کہتے ہیں - (چیونٹیوں کی بستی) مفسرین نے مختلف بلاد میں کئی ایسی بستیوں کا پتہ بتلایا ہے جہاں چیونٹیوں کی بستی

بکثرت تھیں۔ ان میں سے کسی ایک پر حسب اتفاق حضرت سلیمان علیہ السلام کا گزر ہوا۔
علمائے حیوانات نے سالہا سال جو تجربے کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حقیر ترین جانور اپنی حیات اجتماعی اور نظام سیاسی میں بہت ہی عجیب اور شئون بشریہ سے بہت قریب واقعہ ہوا ہے۔ آدمیوں کی طرح چیونٹیوں کے خاندان اور قبائل ہیں ان میں تعاون باہمی کا جذبہ تقسیم عمل کا اصول اور نظام حکومت کے ادارات نوع انسانی کے مشابہ پائے جاتے ہیں محققین یورپ نے مدتوں ان اطراف میں قیام کرکے جہاں چیونٹیوں کی بستیاں بکثرت ہیں بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔
(قرآن کریم بتفسیر عثمانی صفحہ ۴۹۹ فائدہ ۳۰۲)

شہد کی مکھی کا شعور

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۙ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۔

اور حکم دیا تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ بنا لے پہاڑوں میں گھر اور درختوں میں اور جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں۔ پھر کھا ہر طرح کے میووں سے، پھر چل راہوں میں اپنے رب کی صاف پڑے ہیں۔ نکلتی ہے ان کے پیٹ میں سے پینے کی چیز جس کے مختلف رنگ ہیں۔ اس میں مرض اچھے ہوتے ہیں لوگوں کے، اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو دھیان کرتے ہیں۔

(تفسیر) شہد کی مکھی کو حکم دینے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ باوجود ادنیٰ حیوان ہونے کے نہایت کاری گری اور باریک صنعت سے اپنا چھتہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں تیار کرتی ہے۔ ساری مکھیاں ایک بڑی مکھی کے ماتحت رہ کر پوری فرمانبرداری کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ ان کے سردار کو یعسوب کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مکھیوں کا جلوس چلتا ہے۔ جب کسی جگہ مکان بناتی ہیں تو سب خانے مسدس متساوی الاضلاع کی شکل پر ہوتے ہیں۔ بدون مسطر اور پرکار کے اس قدر صحت اور انضباط کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ایک ہی شکل پر تمام خانوں کا رکھنا آدمی کو حیرت زدہ بنا دیتا ہے۔ حکماء کہتے ہیں کہ مسدس کے علاوہ کوئی دوسری شکل اختیار کی جاتی تو لامحالہ درمیان میں کچھ جگہ فضول خالی رہتی۔ فطرت نے ایسی شکل کی طرف رہنمائی کی جس میں ذرا سا فرجہ (کشادگی) بھی بے کار نہ رہے۔ کلی اور ذاتشکلی سب اوامر تکوینیہ ہیں یعنی قطرۃ نے اسکو ہدایت کی کہ اپنی خواہش واستعداد و مزاج کے مناسب ہر قسم کے پھلوں اور میووں میں سے اپنی غذا حاصل کرے۔ چنانچہ مکھیاں اپنے چھتے سے نکل کر رنگ برنگ کے پھول پھل چوستی ہیں جن سے شہد اور موم وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں غذا حاصل کرنے اور کھا پی کر چھتے کی طرف واپس آنے کے راستے صاف کھلے پڑے ہیں کوئی روک ٹوک نہیں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ مکھیاں غذا کی تلاش میں بعض اوقات بہت دور نکل جاتی ہیں اور پھر بے تکلف اپنے چھتے میں واپس آ جاتی ہیں۔ ذرا راستہ نہیں بھولتیں۔ بعض نے فاسلکی سبل ربک ذللا سے یہ مطلب لیا ہے کہ قدرت نے تیرے عمل و تصرف کے جو

فطری راستے مقرر کر دیئے ہیں ان پر مطیع و منقاد بن کر چلتی رہ ۔ مثلاً پھول پھل چوس کر فطری قویٰ و تصرفات سے شہد تیار کر ۔ پھر شہد مختلف رنگ کا ہوتا ہے ، سفید ، سُرخ ، زرد ۔ کہتے ہیں کہ رنگوں کا اختلاف موسم ، غذا اور مکھی کی عمر کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے ۔ (پارہ ۱۴ ، رکوع ۱۵)

آبِ شور اور آبِ شیریں کا باہم ملنا اور جدا رہنا

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا۔

اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے چلائے دو دریا ۔ یہ میٹھا ہے پیاس بجھانے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا اور رکھا ان دونوں کے بیچ پردا اور آڑ رُکی ہوئی ۔

(تفسیر) مجھ سے باریسال (بنگال) کے بعض طلبہ نے بیان کیا کہ ضلع باریسال میں دو ندیاں (بلشر اور . . . .) ایک ہی سے نکلتی ہیں ۔ ایک کا پانی کھاری بالکل کڑوا اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے ۔ یہاں گجرات میں راقم الحروف (مفسر تفسیر عثمانی) جس جگہ آج کل مقیم ہے (ڈابھیل سملک ۔ ضلع سورت) سمندر تقریباً دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے ۔ ادھر کی ندیوں میں برابر مدّ وجزر (جوار بھاٹا) ہوتا رہتا ہے ۔ بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مدّ کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے ۔ اوپر کھاری رہتا ہے نیچے میٹھا ۔ جزر کے وقت اوپر سے کھاری اُتر جاتا ہے اور میٹھا جوں کا توں رہتا ہے (واللہ اعلم) ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی خدا کی قدرت دیکھو کھاری اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں مل جانے کے باوجود بھی کس طرح ایک دوسرے سے ممتاز رہتے ہیں ۔ (فرقان ص ۴۷۲ ، ف ۴)

تحقیقاتِ جدیدہ

وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ

اور جب کہاں اُس سے کو کیا اتارا ہے تمہارے رب نے تو کہیں کہ کہانیاں ہیں پہلوں کی

(تفسیر) یعنی خدا تعالےٰ نے زمین پر بھاری پہاڑ رکھ دیئے کہ زمین اپنی اضطراری حرکت سے تم کو لے کر بلبلا نہ جائے ۔ روایات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین ابتدائے آفرینش میں مضطربانہ طور پر ہلتی اور کانپتی تھی ۔ خدا تعالےٰ نے اس میں پہاڑ پیدا کیئے جن سے اس کی کپکپی[1] بند ہوئی ۔ آج کل سائنس نے بھی اقرار کیا ہے کہ پہاڑوں کا وجود ایک حد تک زلزلوں کی کثرت سے مانع ہے ۔ بہرحال زمین کی حرکت وسکون کا مسئلہ جو حکماء میں مختلف فیہ رہا ہے اس سے کا لفیاً یا اثباتاً کچھ تعلق نہیں کیونکہ پہاڑوں کے ذریعے سے جس حرکت کو بند کیا ہے وہ یہ دائمی حرکت نہیں جس میں اختلاف ہو رہا ۔ (تفسیر عثمانی صفحہ ۳۴۸ سورۂ نحل پارہ ۱۴)

[1] زمین از تپ لرزہ آمد ستوہ
فرد کوفت بر دامنش میخ کوہ ؛

وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا (ہم نے پہاڑوں کو زمین کی میخ بنادیا)

ی خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا۔ جس اللہ نے سات آسمان تہہ بہ تہہ پیدا کئے۔

سیر) حدیث میں آیا ہے کہ ایک آسمان کے اوپر دوسرا آسمان، دوسرے پر تیسرا، اسی طرح سات آسمان اوپر نیچے ہیں۔ ہر ایک آسمان سے دوسرے تک پانسو برس کی مسافت ہے۔ نصوصِ آیات واحادیث میں یہ تصریح نہیں کی گئی کہ یہ جو نیلگوں چیز ہم کو نظر آتی ہے وہ ہی آسمان ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ساتوں آسمان اس کے اوپر ہوں اور یہ نیلگوں چیز آسمان کی چھت گیری کا کام دیتی ہو۔ (قرآن کریم پارہ ۲۹۔ سورہ ملک۔ صفحہ ۷۲۹۔ فائدہ ۴)

سماعِ موتیٰ

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى۔ سو تو سُنا نہیں سکتا مُردوں کو۔

سیر) مفسرین نے اس موقع پر سماعِ موتیٰ (مُردوں کے سُننے) کی بحث چھیڑ دی ہے۔ اِس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کے دور سے اختلاف چلا آتا ہے اور دونوں جانب سے نصوصِ قرآن وحدیث پیش کی گئی ہیں۔ یہاں ایک بات سمجھ لو کہ یوں تو دنیا میں کوئی کام اللہ کی مشیت وارادہ کے بدوں نہیں ہوسکتا مگر آدمی جو کام اسبابِ عادیہ کے دائرہ میں رہ کر باختیار خود کرے وہ اس کی طرف منسوب ہوتا ہے اور جو عام عادت کے خلاف غیر معمولی طریقے سے ہوجائے اُسے براہِ راست حق تعالے کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ مثلاً کسی نے کسی کو گولی مار کر ہلاک کردیا یہ اس قاتل کا فعل کہلائے گا اور فرض کیجئے ایک مٹھی کنکریاں پھینکیں جس سے لشکر تباہ ہوگیا۔ اسے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے تباہ کردیا حالانکہ گولی سے ہلاک کرنا بھی اس کی قدرت کا کام ہے ورنہ اس کی مشیت کے بدوں گولی یا گولہ کچھ بھی اثر نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا فلم تقتلوا ھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی (انفال رکوع ۲) یہاں خارقِ عادت ہونے کی وجہ سے پیغمبر اور مسلمانوں سے "قتل ورمی" کی نفی کرکے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی۔ ٹھیک اسی طرح انک لا تسمع الموتٰی کا مطلب سمجھو یعنی تم یہ نہیں کرسکتے کہ کچھ بولو اور اپنی آواز مُردے کو سُنادو کیوں کہ یہ چیز ظاہری اور عادی اسباب کے خلاف ہے البتہ حق تعالے کی قدرت سے ظاہری اسباب کے خلاف تمہاری کوئی بات مُردہ سُن لے اس کا انکار کوئی مومن نہیں کرسکتا اب نصوص سے جن باتوں کا اس غیر معمولی طریقہ سے سننا ثابت ہوجائے گا۔ اس حد تک ہم کو سماعِ موتیٰ کا قائل ہونا چاہئے محض قیاس کرکے دوسری باتوں کو سماع کے تحت میں نہیں لاسکتے۔ بہرحال آیت میں اسماع (سنانے) کی نفی سے مطلقاً سماع (سننے) کی نفی نہیں ہوتی (واللہ اعلم)۔ (قرآن کریم پارہ ۲۱۔ سورہ روم۔ صفحہ ۵۳۱)

علم الغیب

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ

ملہ قرآن وحدیث میں نیلگوں چیز کے آسمان ہونے کے متعلق کچھ ذکر نہ ہونے کے متعلق حضرت عثمانی کا اظہار ان کی شرعی اور اسلامی بے پناہ وسعتوں اور معلومات کا پتہ دیتا ہے۔ (انور)

(تفسیر) مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں، نہ کسی ایک کا علم کسی شخص کو بالذات بدون عطائے الٰہی کے ہو سکتا
اور نہ مفاتیح غیب اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو دی ہیں۔ ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر باختیار خود مطلع کر دیتا ہے جس
وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرما دیا یا غیب کی خبر دے دی۔ لیکن اتنی بات کی وجہ سے قرآن
نے کسی جگہ ایسے شخص پر عالم الغیب یا فلاں "یعلم الغیب" کا اطلاق نہیں کیا۔ علمائے محققین اجازت نہیں دیتے کہ اس طرح
الفاظ کسی بندہ پر اطلاق کئے جائیں۔ واضح رہے کہ علم الغیب سے ہماری مراد محض ظنون و تخمینات نہیں اور نہ وہ علم
قرائن و دلائل سے حاصل کیا جائے۔ بلکہ جس کے لئے کوئی قرینہ اور دلیل نہ ہو وہ مراد ہے (النمل ــ رکوع ۵)

ولو کنت اعلم الغیب کے ماتحت لکھتے ہیں:۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کوئی بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو نہ اپنے اندر اختیار مستقل رکھتا ہے نہ علم محیط۔ سیدالانبیاء
جو علوم اولین و آخرین کے حامل اور خزائن ارضی کی کنجیوں کے امین بنائے گئے تھے۔ ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم ہے کہ میں دوسروں
کو کیا خود اپنی جان کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں مگر جس قدر اللہ چاہے اتنے ہی پر ملک
ہے اور اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا تو بہت سی وہ بھلائیاں اور کامیابیاں بھی حاصل کر لیتا جو علم غیب نہ ہونے
سے کسی وقت فوت ہو جاتی ہیں۔ نیز کبھی کوئی ناخوشگوار حالت مجھ کو پیش نہ آیا کرتی۔ مثلاً "افک" (بہتان عائشہ) کے قصہ
کتنے دنوں تک حضور کو وحی نہ آنے کی وجہ سے اضطراب و قلق رہا۔ حجۃ الوداع میں تو صاف ہی فرما دیا استقبلت من امری ما استدبرت
سقت الھدی واگر میں پہلے سے اس چیز کو جانتا جو بعد میں پیش آئی تو ہرگز ہدی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا۔ اس قسم کے بیسیوں واقعات
ہیں جن کی روک تھام علم محیط رکھنے کی صورت میں نہایت آسانی سے ممکن تھی۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب تر واقعہ حدیث
جبرئیل کی بعض روایات میں آپ نے تصریحاً فرمایا کہ یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے
جبرئیل کو واپسی کے وقت تک نہیں پہچانا۔ جب وہ اٹھ کر چلے گئے تب علم ہوا کہ جبرئیل تھے۔ یہ واقعہ بتصریح محدثین آخر
عمر کا ہے۔ اس میں قیامت کے سوال پر ما المسئول عنھا باعلم من السائل ارشاد فرمایا ہے گویا بتلا دیا گیا کہ علم محیط خدا کے سوا
کسی کو حاصل نہیں۔ اور "علم غیب" تو درکنار محسوسات و مبصرات کا علم ہی خدا ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ
کسی وقت نہ چاہے تو ہم محسوسات و مبصرات کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔ بہر حال اس آیت میں کھول کر بتا دیا گیا کہ
اختیار مستقل یا علم محیط نبوت کے لوازم میں سے نہیں۔ جیسا کہ بعض جہلاء سمجھتے تھے۔ ہاں شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام
کے منصب سے متعلق ہے۔ کامل ہونا چاہئے اور تکوینیات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس
نوع میں ہمارے حضور تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں آپ کو اتنے بے شمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں
جن کا شمار کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔　(پارہ ۹، سورہ اعراف، رکوع ۱۳)

ان دونوں آیات کے علاوہ وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو کے ماتحت حضرت مفسرؒ لکھتے ہیں کہ:۔
مفاتح کو جن علماء نے مفتح بفتح المیم کی جمع قرار دیا ہے انہوں نے مفاتح الغیب کا ترجمہ غیب کے خزانے کیا
ہے اور جن کے نزدیک مفتح بکسر المیم کی جمع ہے وہ مفاتح الغیب کا ترجمہ مترجم رحمہ اللہ کے موافق کرتے ہیں۔ یعنی غیب
کی کنجیاں"۔ مطلب یہ ہے کہ غیب کے خزانے اور ان کی کنجیاں صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ ہی ان میں سے جس خزانہ کو جس

درجا ہے کسی پر کھول سکتا ہے۔ کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اپنے حواس و عقل وغیرہ آلات ادراک کے ذریعہ سے علوم غیبیہ تک رسائی پا سکے یا جتنے غیوب اس پر منکشف کر دیئے گئے ہیں ان میں از خود اضافہ کرنے کو علوم غیبیہ کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں خواہ لاکھوں کروڑوں جزئیات اور واقعات غیبیہ پر کسی بندے کو مطلع کر دیا گیا ہو تاہم غیب کی اصول و کلیات کا علم جن کو مفاتح غیب کہنا چاہیئے حق تعالےٰ نے اپنے ہی لئے مخصوص رکھا ہے۔ (پارہ ۷، رکوع ۱۳)

منطقیانہ مگر حکیمانہ استدلال میں وحی کی ضرورت

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۝ یہ کہا ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا اور نہیں ہے یہ کہا کسی شاعر کا۔

(تفسیر) بلکہ یہ قرآن ہے اللہ کا کلام جس کو آسمان سے ایک بزرگ فرشتہ لے کر ایک بزرگ ترین پیغمبر پر اترا جو آسمان سے لایا وہ اور جس نے زمین والوں کو پہنچایا۔ دونوں رسول کریم ہیں۔ ایک کا کریم ہونا تم آنکھوں سے دیکھتے ہو اور دوسرے کی کرامت و بزرگی پہلے کریم کے بیان سے ثابت ہے (تنبیہ) عالم میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ ایک جن کو آدمی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ دوسری جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی عقل وغیرہ کے ذریعہ سے ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ مثلاً ہم کتنا ہی آنکھیں پھاڑ کر زمین کو دیکھیں وہ چلتی ہوئی نظر نہ آئے گی لیکن حکماء کے دلائل و براہین سے عاجز ہو کر ہم اپنی آنکھوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔ اور اپنی عقل کے یا دوسرے عقلاء کی عقل کے ذریعہ حواس کی ان غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کر لیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کی عقل بھی غلطیوں اور کوتاہیوں سے محفوظ نہیں۔ آخر اس کی غلطیوں کی اصلاح اور کوتاہیوں کی تلافی کس سے ہو۔ بس تمام عالم میں ایک وحی الٰہی کی قوت ہے جو خود غلطی سے محفوظ و معصوم رہتے ہوئے تمام عقلی قوتوں کی اصلاح و تکمیل کر سکتی ہے جس طرح حواس جہاں پہنچ کر عاجز ہوتے ہیں وہاں عقل کام دیتی ہے۔ ایسے ہی جس میدان میں عقل مجرد کام نہیں دیتی یا ٹھوکریں کھاتی ہے اس جگہ وحی الٰہی اس کی دستگیری کر کے ان بلند حقائق سے روشناس کراتی ہے۔ شاید اس لئے یہاں ماتبصرون وما لاتبصرون کی قسم کھائی۔ یعنی جو حقائق جنت و دوزخ وغیرہ کی پہلی آیات میں بیان ہوئے ہیں اگر دائرۂ محسوسات سے بلند تر ہونے کی وجہ سے تمہاری سمجھ میں نہ آئیں تو اشیاء مبصرات اور غیر مبصرات یا بالفاظ دیگر محسوسات و غیر محسوسات کی تقسیم سے سمجھ لو کہ یہ رسول کریم کا کلام ہے جو بذریعہ وحی الٰہی دائرہ حس چیزوں کو اپنی عقل یا دوسروں کی تقلید سے مان لیتے ہیں تو بعض بہت اونچی چیزوں کو رسول کریم کے کہنے سے ماننے میں کیا اشکال ہے۔ (سورہ الحاقہ۔ رکوع ۲)

مستثنیات و تنبیہات

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔ اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے۔

(تفسیر) مشورہ سے کام کرنا اللہ کو پسند ہے۔ دین کا ہو یا دنیا کا۔ نبی کریم صلعم مہمات امور میں برابر صحابہؓ

سے مشورہ فرماتے تھے۔ اور صحابہ آپس میں مشورہ کرتے تھے۔ حرب وغیرہ کے متعلق بھی اور بعض مسائل اور احکام کی نسبت بھی بلکہ خلافت راشدہ کی بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت کا امور میں ہے جو مہتم بالشان ہوں اور جو قرآن و سنت میں منصوص نہ ہوں جو چیز منصوص ہو اس میں رائے اور مشورہ کے کوئی معنی نہیں اور ہر چھوٹے بڑے کام میں اگر مشورہ ہوا کرے تو کوئی کام نہ ہو سکے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ ایسے شخص سے لیا جائے جو عاقل و عابد ہو ورنہ اس کی بے وقوفی یا بد دیانتی سے کام خراب ہو جانے کا اندیشہ رہیگا۔ (سورہ شوریٰ۔ رکوع ۴)

تفسیر نمبر ۲ (دو)

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ط وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ

اور گھوڑے پیدا کئے اور خچریں اور گدھے کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

(تفسیر) یعنی سواری کرتے ہو اور (سوار ہو کر ایک طرح کی) عزت و شان ظاہر ہوتی ہے (تنبیہ) عرب میں گدھے کی سواری معیوب نہیں۔ وہاں کے گدھے نہایت قیمتی خوبصورت، تیز رفتار اور قدم باز ہوتے ہیں۔ بعض گدھوں کے سامنے گھوڑے کی کچھ حقیقت نہیں رہتی۔ ایک زندہ دل ہندی نے خوب کہا تھا کہ حجاز میں "گدھا نہیں چلتا ہوتا ہے"۔ (سورۃ النحل۔ رکوع ۱)

ادب

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ۔　　قسم ہے تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں

(تفسیر) ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے نبی کریم صلعم کو ہے۔ یعنی تیری جان کی قسم لوطؑ کی قوم غفلت اور مستی کے نشہ میں بالکل اندھی ہو رہی تھی وہ بڑی لاپرواہی سے حضرت لوطؑ کی نصیحت بلکہ لجاجت کو ٹھکرا رہے تھے۔ ان کو اپنی قوت کا نشہ تھا۔ شہوت پرستی نے ان کے دل و دماغ مسخ کر دیئے تھے وہ بڑے امن و اطمینان کے ساتھ پیغمبر خدا سے جھگڑ رہے تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ صبح تک کیا حشر ہونا ہے۔ تباہی اور ہلاکت کی گھڑی ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ وہ لوطؑ علیہ السلام کی باتوں پر ہنستے تھے۔ اور موت ان کو دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ (سورۃ الحجر۔ رکوع ۵)

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا ط　　اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا۔

(تفسیر) موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بچے کو دریا میں ڈال تو آئیں لیکن ماں کی مامتا کہاں چین سے رہنے دیتی۔ رہ رہ کر موسیٰ کا خیال آتا تھا دل سے قرار جاتا رہا۔ موسیٰ کی یاد کے سوا کوئی چیز دل میں باقی نہ رہی۔ قریب تھا کہ صبر و ضبط کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے اور سب کے سامنے ظاہر کر دیں کہ میں نے اپنا بچہ دریا میں ڈال دیا ہے۔ کسی کو خبر ہو تو لاؤ۔ لیکن خدائی الہام کو یاد کر کے تسلی پاتی تھیں۔ یہ خدا ہی کا کام تھا کہ اُن کے دل کو

...مضبوط باندھ دیا کہ خدائی راز قبل از وقت کھلنے نہ پائے اور تھوڑی دیر بعد خود موسیٰؑ کی والدہ کو عین الیقین
...حاصل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ضرور پورا ہو کر رہتا ہے۔ (پارہ ۲۰ ۔ رکوع ۲)

روحانیت و نورانیت

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ط نشانی ان کی ان کے منہ پر ہے سجدہ کے اثر سے۔
ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ج وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ ج یہ شان ہے ان کی تورات میں اور مثال ان کی انجیل میں۔

(تفسیر) نمازوں کی پابندی خصوصاً تہجد کی نماز سے ان کے چہروں پر خاص قسم کا نور اور رونق ہے گویا خشیت و خضوع ... حسن نیت اخلاص کی شعاعیں باطن سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر کو روشن کر رہی ہیں۔ حضرت کے اصحاب اپنے ... ان کے نور اور متقیانہ چال ڈھال سے لوگوں میں الگ پہچانے جاتے تھے۔ پہلی کتابوں میں خاتم الانبیاء صلی اللہ ... علیہ وسلم کے ساتھیوں کی ایسی شان بیان کی گئی تھی۔ چنانچہ بہت سے غیر متعصب اہل کتاب ان کے چہرے اور طور ... طریق دیکھ کر بول اٹھتے تھے واللہ یہ تو مسیحؑ کے حواری معلوم ہوتے ہیں۔ (سورہ فتح ۔ رکوع ۱۴)

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ج بہکا نہیں تمہارا رفیق اور نہ بے راہ چلا۔

(تفسیر) انبیاء علیہم السلام آسمان نبوت کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور رفتار سے دنیا کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اور ... جس طرح تمام ستاروں کے غائب ہونے کے بعد آفتاب درخشاں طلوع ہوتا ہے ایسے تمام انبیاء کی تشریف بری کے ... بعد آفتاب محمدی مطلع عرب سے طلوع ہوا۔ پس اگر قدرت نے ان ظاہری ستاروں کا نظام اس قدر محکم بنایا ہے ... اس میں کسی طرح کے تزلزل اور اختلال کی گنجائش نہیں تو ظاہر ہے کہ ان باطنی ستاروں اور روحانی آفتاب ... ماہتاب کا انتظام کس قدر مضبوط و محکم ہونا چاہیئے جن سے ایک عالم کی ہدایت و سعادت وابستہ ہے۔ (النجم ۔ رکوع ۱)

قیامت میں اعمال کا ریکارڈ اور وزن

حضرت عثمانی مرحوم سائنس کے دور کے نئے تقاضوں کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے قابل تھے۔ نیز ... تمثیلات کے ذریعہ باریک اسلامی مسائل کو سلجھانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مثلاً قیامت میں ہمارے اعمال تولے ... جائیں گے۔ یہ قرآن کریم اور اسلام کا ایک اہم نظریہ ہے۔ اور ہمارے اعمال مثلاً جھوٹ۔ چوری۔ سود وغیرہ تولے ... جائیں گے۔ لیکن ایک مخالف اسلام جو منکر قیامت بھی ہے یہ اعتراض کرتا ہے کہ جھوٹ بولنا۔ غیبت کرنا چغلی ... کھانا تہمت باندھنا یہ ایسے اعمال ہیں جن کا جسم نہیں اور ظاہر ہے کہ جسمانی اشیاء اور مادی چیزوں کو ہی تولا جا ... سکتا ہے لیکن جو گناہ مادی نہیں جسمانیت نہیں رکھتے وہ کس طرح تولے جا سکتے ہیں۔ علامہ عثمانی اپنے کلامی دلائل ... سے کس طرح اس کا جواب دیتے ہیں۔ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں جو حسب ذیل ہے:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ج فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهٗ اور اعمال کا وزن اس دن ٹھیک ہوگا۔ پس جس کے وزن

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۔

بھاری ہوں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جن کے وزن ہلکے ہوں گے کہ جنہوں نے اپنا نقصان کیا کیوں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں ۔

علامہ عثمانی مذکورہ آیت کی تفسیر کے بعد اعتراض بالا کا جواب دیتے ہیں :۔

"کہا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال تو غیر قارالذات اعراض (نہ قائم رہنے والے غیر جسمانی) ہیں جن کا ہر جز وقوع میں آنے کے ساتھ ہی ساتھ معدوم ہوتا رہتا ہے پھر اس کا جمع ہونا اور تلنا کیا معنی رکھتا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر گراموفون میں آج کل جو لمبی چوڑی تقریریں بند کی جاتی ہیں کیا وہ تقریریں اعراض میں سے نہیں جس کا ایک حرف ہماری زبان سے اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب اس کا پہلا حرف نکل کر فنا ہو تو پھر یہ تقریر کا سارا مجموعہ گراموفون میں کس طرح جمع ہو گیا ۔ اسی سے سمجھ لو کہ جو خدا گراموفون کے موجد کا موجد ہے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ ہمارے کل اعمال کے مکمل ریکارڈ تیار رکھے جس میں سے ایک شوشہ اور ذرہ بھی غائب نہ ہو ۔ رہا اس کا وزن کیا جانا تو نصوص (آیات) سے اس قدر معلوم ہو چکا ہے کہ ایسی میزان (ترازو) کے ذریعہ سے ہوگا جس میں کفتین (دو پلڑے) اور لسان (رسیاں) وغیرہ موجود ہیں ۔ لیکن وہ میزان اور اس کے دونوں پلڑے کس نوعیت و کیفیت کے ہوں گے ۔ اور اس سے وزن معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہوگا ۔ ان باتوں کا احاطہ کرنا ہماری عقل و اوہام کی رسائی سے باہر ہے ۔ اس لئے ان کے جاننے میں ہمیں تکلیف بھی دی گئی بلکہ ایک میزان کیا ۔ اس عالم کی جتنی چیزیں ہیں بجز اس کے کہ اس کے نام ہم سن لیں اور ان کا مجمل مفہوم جو قرآن و سنت سے بیان کر دیا ہو عقیدہ میں رکھیں ۔ اس سے زائد تفصیلات پر مطلع ہونا ہماری حد پرواز سے خارج ہے کیوں کہ جن نوامیس و قوانین کے ماتحت اس عالم کا وجود اور نظم و نسق ہوگا ان پر اس عالم میں رہتے ہوئے کچھ دسترس نہیں پا سکتے ۔ اسی دنیا کی میزانوں کو دیکھ لو کتنی قسم کی ہیں ۔ ایک میزان ہے جس سے سونا ، جواہری یا موتی تلتے ہیں ۔ ایک میزان سے غلہ اور سوختہ وزن کیا جاتا ہے ۔ ایک میزان ریلوے اسٹیشنوں پر ہوتی ہے جس سے مسافروں کا سامان تولتے ہیں ۔ ان کے سوا "مقیاس الہوا" یا مقیاس الحرارت وغیرہ بھی ایک طرح کی میزانیں ہیں جن سے ہوا اور حرارت وغیرہ کے درجات معلوم ہوتے ہیں ۔ تھرمامیٹر ہمارے بدن کی اندرونی حرارت کو جو اعراض میں سے ہے ۔ تول کر بتلاتا ہے کہ اس وقت ہمارے جسم میں اتنے ڈگری حرارت پائی جاتی ہے ۔ جب دنیا میں بیسیوں قسم کی جسمانی میزانیں ہم مشاہدہ کرتے ہیں جن سے اعیان و اعراض کے اوزان و درجات کا تفاوت معلوم ہو جاتا ہے تو اس قادر مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ ایک ایسی میزان قائم کر دے جس سے ہمارے اعمال کے اوزان و درجات کا تفاوت صورتاً و حساً ظاہر ہوتا ہو" ۔

(تفسیر عثمانی پارہ ۸ ۔ الاعراف رکوع ۱ ف ۴)

اللہ حمد و نعت میں آنے والے باری تعالیٰ کے اسمِ اعظم "اللہ" پر علامہ عثمانی لکھتے ہیں:-

ثم من المعلوم ان الاسم الجليل اعنی الله خاص بواجب الوجود[1] الخالق للعالم المستحق لجميع المحامد بل هو اخص اسمائه الحسنىٰ والصحيح انه عربي كما عليه عامة العلماء لا انه عبری او سریانی کما ذهب اليه ابوزيد البلخي ثم علىٰ انه عربي هل هو علم او صفة فقيل صفة والصحيح الذی عليه المعظم انه علم[2] ثم علىٰ انه علم هل هو مشتق[3] او غير مشتق فقيل مشتق علىٰ اختلاف بينهم فی المادة التی اشتق منها وفی ان علمية حينئذ بطريق الوضع او الغلبة وقيل غير مشتق بل هو علم مرتجل من غير اعتبار اصل اخذ منه وعلىٰ هذا الاكثرون منهم ابوحنيفة ومحمد بن الحسن والشافعی والخليل والزجاج وابن كيسان والحليمي وامام الحرمين والغزالی والخطابی ثم روی هشام عن محمد ابن الحسن قال سمعت اباحنيفة رحمه الله يقول اسم الله اعظم هو الله وبه قال الطحاوی وكثير من العلماء واكثر العارفين حتىٰ انه لا ذكر عندهم لصاحب مقام فوق الذكر به وقد علم من هذا وجه تخصيص الحمد به دون غيره من اسمائه تعالىٰ۔

پھر یہ بات مشہور ہے کہ اسمِ جلیل یعنی اللہ واجب الوجود[1] عالم کے خالق تمام تعریفات کے مستحق کے لئے خاص بلکہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں اخص ہے (پھر کیا لفظ اللہ عربی ہے یا نہیں) اس میں صحیح یہ ہے کہ وہ عربی ہے جیسا کہ عام علما کا خیال ہے نہ وہ عبرانی زبان کا لفظ ہے نہ سریانی کا جیسا کہ سریانی ہونے کا خیال ابوزید بلخی کا ہے پھر اس کے علاوہ کہ وہ عربی ہے آیا وہ نام ہے یا صفت ہے تو بعض نے کہا کہ صفت ہے لیکن جیسا کہ اکثر کا خیال ہے صحیح یہ ہے کہ وہ علم[2] یعنی نام ہے۔ پھر علم ہونے کے علاوہ کیا وہ مشتق[3] ہے یا غیر مشتق۔ بعض نے کہا کہ وہ مشتق ہے اس مادہ کے اختلاف کی بنا پر جس سے لفظ اللہ نکلا ہے اور اس شق پر اس کی علمیت اس وقت بناوٹ یا غلبہ کی وجہ سے۔ بعض نے کہا (کہ اللہ) غیر مشتق ہے بلکہ وہ بغیر کسی اصل کے کہ اس سے یہ لفظ نکلا ہو، واضح طور پر علم ہے اور اسی خیال پر اکثر ہیں جن میں سے امام ابوحنیفہ، محمد بن حسن، شافعی، خلیل، زجاج، ابن کیسان، حلیمی، امام الحرمین، غزالی اور خطابی۔ پھر ہشام نے محمد بن حسن سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ اللہ کا اصلی نام وہ اللہ ہی ہے۔ یہی بات طحاوی نے اور بہت سے علما اور اکثر صوفیا نے کہی ہے۔ یہاں تک کہ کسی صاحبِ مقام کے پاس صوفیا میں سے اللہ کے ذکر سے بڑھ کر کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی وجہ سے حمد کی تخصیص لفظ اللہ کے سوائے اور کسی دوسرے اسمار کے ساتھ نہیں کی گئی۔

(فتح الملہم۔ صفحہ ۱۰۹۔ جلد ۱)

---

[1] وجود کی دو قسمیں ہیں واجب الوجود یعنی جس کا وجود ضروری اور قدیم ہو اور جو ہمیشہ سے ہمیشہ ہو جیسے اللہ کی ہستی اور اس کا وجود۔ لہٰذا اللہ کو واجب الوجود کہتے ہیں دوسرا وجود ممکن الوجود کہلاتا ہے یہ وہ وجود ہوتا ہے جو پہلے نہ تھا بعد میں ہوا اور پھر فنا ہو جائیگا۔ خدا کے سوا سب مخلوقات ملائکہ، انسان، جن، آسمان و زمین سب ممکن الوجود اور حادث ہیں۔ ——— [2] علم گرامر میں کسی شخص یا چیز یا جگہ کے نام کو کہتے ہیں لہٰذا خدا۔ اللہ کا علم یعنی نام ہے۔

[3] مشتق اس لفظ کو کہتے ہیں جو کسی مصدر سے نکلا ہو جیسے نَصَرَ سے ناصر، منصور، نصیر وغیرہ۔

محمدؐ | یہ ہے علامہ عثمانی کی لفظ اللہ پر تحقیق، تو گویا ان کی شرح کی خصوصیات میں سے الفاظ کی تحقیقات بھی ہے وضاحت کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں، اب اللہ کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی آتا ہے اس کی تحقیق میں لکھا

اشهر اسمائه الاعلام صلى الله عليه وسلم وانما سمى به لكثرة خصاله المحمودة كذا قاله ابن فارس وغيره من اهل اللغة قالوا ويقال لكل كثير الخصال الجميلة محمّد ومحمود، وقال في شرح التحرير انما سمى به لانه محمود عند الله وعند اهل الارض جهلة او عنادًا وهو اكثر الناس حمدا الى غير ذلك وقد منع الله تعالى بحكمته ان يسمّى به احد غيره الى ان شاع قبيل اظهاره للوجود الخارجى ان نبيًا يبعث اسمه محمّد فسمى قليل من العرب ابناءهم به رجاء من كل ان يكون ابنه وذالك ثم منع الله تعالى كلا منهم ان يدعى النبوة او يدعيها احد له او يظهر عليه سبب يشكك احدًا فى امره كذا فى شرح التحرير۔

آنحضورؐ کے مبارک ناموں سے محمدؐ اصلی نام ہے اور یہ نام آپ کے عمدہ عادات کثرت کے باعث رکھا گیا ہے جیسا کہ ابن فارس اور دیگر اہل لغت نے کہا ہے کہ ہر اچھی بکثرت خصلتوں والے انسان کو محمدؐ اور محمود کہا جاتا ہے اور شرح تحریر میں کہا ہے کہ آنحضرت کا نام محمدؐ اس لئے رکھا گیا ہے کہ آپ اللہ اور آسمان و زمین والوں کے نزدیک محمود ہیں اگرچہ بعض اہل زمین نے جہالت یا دشمنی کے باعث کفر کیا۔ لیکن آنحضور کی مخلوقات میں تعریف کرنے والوں کی اکثریت ہے بہ نسبت تعریف نہ کرنے والوں کے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے کسی اور کو یہ (محمدؐ کا نام) رکھے جانے سے روک دیا تا آنکہ یہ نام آں حضور کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے مشہور ہو گیا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے کہ اس کا نام محمد ہوگا۔ اس لئے بعض عربوں نے (اس شہرت کے بعد) اپنے بیٹوں کا نام اس امید پر محمدؐ رکھ لیا کہ شاید ان کا بیٹا ہی یہ نبی ہو۔ پھر اللہ نے (اپنی قدرت سے) ہر ایک نبوت کا دعویٰ کرنے سے یا اس کے لئے کسی اور کو ایسا کرنے سے روک دیا، یا اس پر کسی ایسے سبب کو جو کسی کو اس کے معاملہ میں شک میں ڈال دے روک دیا۔ جیسا کہ شرح تحریر میں ہے۔

(فتح الملہم۔ صلا علا)

شادباش وشادزی اے سرزمین دیوبند

دارالعلوم دیو بند کی خدمات کی ہمہ گیری اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ شبلی کے جانشین سید سلیمان ندویؒ دارالعوم دیو بند کے سرپرست حکیم الامت تھانوی سے مجاز ہوئے۔ شیخ الہندؒ نے جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ برصغیر پاک و ہند کے سب سے بڑے اشاعتی علمی ادارے کی بنیاد مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی نے رکھی۔ آجکل ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم سید ابوالحسن علی ندوی دارالعلوم کے ایک سرپرست حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے مرید باصفا ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے صدر شعبہ دینیات، دیو بند کے ایک معنوی فرزند مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے تحریک آزادی میں اتنا اہم رول ادا کیا کہ جس کی مثال مشکل ہی سے ملیگی اس دارالعلوم سے وابستہ ایک فرد سید عطاء اللہ شاہ بخاری اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب ہوئے۔ اور اسی دارالعلوم دیو بند کے ایک نامور بزرگ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی بدولت تحریک پاکستان کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور پھر جب پاکستان بنا تو اس نئی مملکت اسلامیہ کی پرچم کشائی کیلئے قائداعظم نے علامہ شبیر احمد عثمانی کو منتخب کیا۔ اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانی منتخب ہوئے۔ اور علامہ شبیر احمد عثمانی پاکستان کے شیخ الاسلام قرار پائے۔ اور انکے بعد آج تک کسی کو یہ لقب قوم نے نہیں دیا۔

سنگِ مزار

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

تاریخ الوصال

۱۳۶۹ھ

مفسر محدث اعظم ۱۹۴۹ء

قدسی اساس شیخ الاسلام ۱۳۶۹ھ

زاہد پاک نفقیہ ملک جامع علوم مولانا شبیر احمد عثمانی

۱۹۴۹ء

امام العلماء المتقین رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۶۹ھ

۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء۔ روز سہ شنبہ بمقام بغداد الجدید۔ بہاول پور

مادۂ تاریخ وفات حسرت آیات حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

از نتیجۂ فکر جناب مولانا محمد ادریس صاحب مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری۔ دہلی

علم و عمل، بذل و بحث، حکمت، کلام و اتقا
دستِ قضا نے آہ سب کو بے سر و پا کر دیا

ل	=	۳۰	کم	=	۶۰
م	=	۴۰	لا	=	۳۱
ذ	=	۷۰۰	تق	=	۵۰۰
ح	=	۸			۱۳۶۹ھ

مبلغ اسلام حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء — ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء
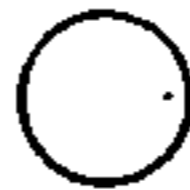
دریا بہ حباب اندر

حلیہ | پست قد، گندمی رنگ۔ دبلا جسم۔ گھنی داڑھی، چہرہ پُرنور اور عالی ہمت۔ زبان میں قدرے لکنت آ
طاقت ور۔ آخر عمر میں چند بال سفید ہو گئے تھے۔ انتقال سے قبل فرمایا: ـــــ لوگ آدمی چھوڑ جاتے ہیں۔
پورا ملک (میوات) چھوڑنے جاتا ہوں۔

پہاڑیوں پر چڑھتے، تیز دھوپ اور گرم لُو برداشت کرتے، مئی جون کی گرمی میں میوات کا دورہ کرتے
میں شہر بہ شہر اور گاؤں گاؤں پھرتے اور فرماتے ـــــ

"محنت کے پہاڑ کے پیچھے خدا ہے جس کا جی چاہے مل لے۔" محنت انسان کی فطرت ہے مگر موجودہ دور میں انسان دن
کے لئے بے انتہا جدوجہد کرتا ہے جو ناپائیدار ہے اور دین کے لئے کچھ بھی نہیں کرتا جو پائیدار اور باقی ہے۔"

ایک ساتھی کو تبلیغی سفر میں بخار آ گیا فرمایا:۔

"ایسے زمانے میں کہ روٹیوں کے لئے جانیں جا رہی ہوں دین کی کوشش میں بخار آ جاتا کچھ بڑی بات نہیں

مولانا ابوالحسن علی ندوی کو تبلیغی سفر میں بخار آنے پر لکھا:۔

"دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ صحتِ عاجلہ کاملہ سے ممنون فرماویں اور خود بیماری بھی جو صلحاء کے لئے ایک نعم
جب تک یہ مقدر رہے اس وقت تک بیماری سے رضا بالقضاء اور بذریعہ تکفیر سیئات کے یقین کے متمتع فرماویں میرا جی چا
ہے کہ اس پر مبارکباد دوں کہ اس چودہویں صدی میں محض خلوص جہد فی سبیل اللہ والا سفر مرض کا سبب ہوا"

هَلْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ مَالَقِيْتِ

۱۳۱۵ھ میں گنگوہ حاضر ہوئے اور امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے مرشد سے بے انتہا محبت
تھی بعض اوقات راتوں کو اٹھ کر صرف چہرہ دیکھنے کے لئے جاتے مرشد بھی بے حد شفقت فرماتے تھے۔
ابتداء عمر سے دبلے پتلے اور کمزور تھے گنگوہ کے قیام میں آپ کی صحت اور زیادہ خراب ہو گئی آپ کو درد سر
تو حکیم مسعود احمد گنگوہیؒ نے علاج شروع کیا اور پانی بند کر دیا چنانچہ آپ نے سات سال تک پانی نہیں پیا
تاریخی نام "اختر الیاس"۔ ۱۳۲۶ھ میں دیوبند حاضری اور شیخ الہندؒ سے بخاری شریف و ترمذی شریف
کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔ ۱۳۲۸ھ دورہ حدیث کی تکمیل مظاہر العلوم سہارنپور میں مولانا گنگوہیؒ کے بعد مولانا خلیل ا
سہارنپوریؒ سے تجدید بیعت کی اور خلافت حاصل ہوئی۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور حکیم الامت
شرف علی تھانویؒ سے بھی کسب فیض کیا۔ حج ۱۳۴۴، ۱۳۵۱، ۱۳۵۶ اور ۱۳۵۷ھ میں نظام الدین
۱۳۶۳ھ پسماندگان۔ مولانا محمد یوسفؒ۔ دختر جو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ سے بیاہی گئیں۔
علی الصبح خالق حقیقی سے جا ملے۔

مفصل مطالعہ کے لئے "مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت"[1]۔ "مکاتیب[2] مولانا محمد الیاسؒ۔ ملفوظات مولانا
محمد الیاسؒ" مرتبہ مولانا سید ابوالحسن ندوی۔

مولانا محمد حسین للّٰہی ایم۔ اے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

حضرت مولانا محمد الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ابوداؤدؒ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے:

له عزوجل يبعث لهذه الامة على رأس
ى مائة سنة من يجدد لها دينها۔

اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لئے ہر سو سال کے سر پر ایسے بندے پیدا کرے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو نیا اور تازہ کرتے رہیں گے۔

٭ ٭ ٭

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

له صلى الله عليه وسلم يبعث الله لهذه
لة على رأس كل مائة سنة من
ـد لها دينها" تفسيره في حديث
ريحمل هذا العلم من كل خلف
علاوله ينفقون عنه تحريف
الغالين وانتحال المبطلين
وتاويل الجاهلين

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد کہ "اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لئے ہر صدی کے سر پر ایسے بندے پیدا کرتا رہے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو تازہ کرتے رہیں گے" آپ کے اس ارشاد کی تشریح آپ کی دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ اس علم یعنی دین کو ہر زمانے کے اچھے اور نیک لوگ سنبھالیں گے۔ وہ مبالغہ کرنے والوں کی تحریف سے، جھوٹوں کی جعل سازیوں سے اور جاہلوں کی غلط تاویلوں سے اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

٭

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ان ارشادات کی روشنی میں اسلام کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد اس اُمت میں ہر زمانے میں اللہ کے ایسے سچّے اور مخلص بندے پیدا ہوتے رہے جو اس دین کو افراط و تفریط کی راہ سے بچا کر نہایت معتدل اور متوازن انداز میں اسے اپنی اصلی شکل میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اس دین کے تجدید و احیاء کے لئے مختلف ادوار اور مختلف ماحول میں ضروریاتِ زمانہ کے مطابق مختلف طریقوں سے کام کیا گیا۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق بعض حضرات نے دین کے جزوی حصّوں کی تجدید کی، اور بعض ایسی جامع اور مکمل شخصیتیں عالم وجود میں آئیں جنہوں نے بیک وقت دین کے تقریباً تمام شعبوں کو نئے سرے سے زندہ کیا جیسا کہ حضرت شیخ احمد سرہندی

مجدد الف ثانی رحؒ کی ذات گرامی، جن کے عظیم الشان کام کی بدولت آپ کو پورے ہزارے کا مجدد مانا گیا۔ کبھی یوں بھی
قرآن اور ایک زمانہ میں تجدید واحیائے دین کے لئے متعدد حضرات سے کام لیا گیا کیوں کہ حق تعالے نے اپنے دین
کا خود ذمہ لے لیا ہے اور فرمایا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون قرون اول میں صحابہ رضوان ان
اجمعین نے اپنی بے پناہ قوت ایمانی کے باعث اپنی جانوں اور مالوں کی قربانی دے کر دین کے درخت کی آبیاری
راشدہ کے بعد جب خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا گیا تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عیش وآرام کی قربانی دے کر
کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ میں بدل دیا، بنو عباس کے دورِ خلافت میں عجمیوں کا غلبہ ہوا اور قدیم یونانی فلاسفہ کے
عربی میں منتقل ہوئے تو حق تعالے نے ان کے توڑ کے لئے مسلمان فلاسفر غزالیؒ و فارابی وغیرہ پیدا کئے جنہوں نے
بے مائیگی کو عالم آشکارا کر کے علوم نبوت کی برتری ثابت کی۔ پھر اشراقیت اور ہندی ویدانت کا چرچا ہوا تو رومیؒ
عطارؒ جیسے صاحبِ دل صوفی اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ، اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ
مشائخ پیدا کئے جنہوں نے اپنی روحانی قوت کے ذریعے جوگیوں اور سادھوؤں کے دجل وتلبیس کا پردہ چاک کیا
کو سربلند کیا، پھر جب اسلامی تصوف میں بھی غلو کیا جانے لگا اور جاہل صوفی اسلام ہی کی تحریف کرنے لگے تو حق
امام ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ کلیم اللہ دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ کے ذریعہ شریعت وطریقت کے تما
تجدید کرائی۔ پھر ان کے متبعین میں شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ جیسے مجاہد پیدا فرمائے جنہوں نے دینی بے حسی
کے دور میں ایک بار پھر صحابہؓ کے دور کی یاد تازہ کر دی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

غرضیکہ جس زمانہ میں جس قسم کے کام کی ضرورت تھی حق تعالے نے اس زمانہ میں اُسی قسم کا کام اپنے خاص بندوں
لیا۔ مرشدنا حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ نے ایک مرتبہ ایک مجلس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

”ہر زمانہ میں جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی لوگ اس طرف توجہ کرتے رہے ہیں۔ فرمایا ہمارے ایک استاد
تھے انہوں نے فرمایا کہ صحابہ کے زمانہ میں لوگ دلائل کو نہیں جانتے تھے بس لڑائیاں ہی جانتے تھے اس زمانہ
میں صحابہؓ نے اسلام پر دلائل نہیں بیان فرمائے صرف جنگ ہوتی تھی جنگوں ہی سے لوگ مسلمان ہوتے تھے ان
دلائل نہیں پیش کئے جاتے تھے۔ بعد میں فلسفیوں کا زمانہ آیا، یونان میں فلسفی پیدا ہوئے وہ دلائل سے بات
کرتے تھے ایسے زمانہ میں اللہ تعالے نے فارابی وغیرہ کو پیدا فرمایا انہوں نے یونان جا کر پہلے ان کے فلسفہ
کو سیکھا پھر عربی میں اس کا ترجمہ کیا۔ پھر لوگوں کو اس طرز سے دلائل کے ساتھ اسلام سکھایا۔“

ہمارے اس دور میں مغربی و مادی علوم وافکار اور سائنسی ایجادات، وانکشافات کا دنیا بھر میں چرچا ہوا تو حق تعالے
نے اپنے دین کی حفاظت کا یہ انتظام کیا کہ اپنے بعض مخلص بندوں کی اس طرف رہنمائی فرمائی کہ وہ بڑے پیمانے پر دینی مدارس
اور دارالعلوم قائم کریں۔ چنانچہ برصغیر پاک وہند میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، اور دہلی، رام پور، ندوہ، بھ
بھون، بنگلور، لکھنؤ وغیرہ میں مختلف دارالعلوم قائم ہوئے جن کے ذریعے دین کی حفاظت واشاعت کا کام لیا گیا۔ اسی طرح
کے بعض مخلص بندوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں، اپنے عبقری دماغوں اور روحانی قوتوں سے کام لے کر انفرادی طور پر

جتنا بہت سے ادارے اور جماعتیں اکٹھے مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کے اخلاص اور سوزِ دروں نے اس دور میں عرصہ تک اسلام کے چراغ کو روشن رکھا اور ان مردانِ خدا نے مغربیت و مادیت کی تند و تیز ہواؤں اور الحاد وارتداد کے ہولناک طوفانوں کے خلاف سینہ سپر ہو کر رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو زندہ رکھا۔ اس مقالہ میں حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کے حالات اور ان کے کام پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

مولانا کا وطن اور خاندان

مولانا محمد الیاس دہلویؒ کا دادھیالی اور ننھیالی شجرہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے آپ کے والد ماجد مولانا محمد اسماعیل صاحب جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ آخر میں جھنجھانہ کی سکونت ترک کر کے دہلی میں آ کر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ مولانا محمد الیاس کی والدہ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی نواسی تھیں، مولانا مظفر حسین صاحبؒ مفتی الٰہی بخش صاحبؒ کے حقیقی بھتیجے، حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ کے عزیز شاگرد اور حضرت شاہ محمد یعقوبؒ کے مجاز تھے۔ ان کے تورع اور تقویٰ کا یہ حال تھا کہ آپ کے معدہ نے عمر بھر کوئی مشتبہ چیز قبول نہیں کی۔ حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ممتاز شاگرد، صاحب دل، صاحبِ تصنیف، حکیم حاذق، اعلیٰ مثل ادیب اور عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا شجرہ نسب چھٹی پشت پر مفتی صاحب کے شجرہ نسب سے مل جاتا ہے۔ مولانا محمد الیاس صاحب کی ولادت ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ آپ کا تاریخی نام اختر الیاس ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بہادر شاہ ظفر کے سمدھی مرزا الٰہی بخش کے بچوں کو پڑھانے کے لئے دہلی تشریف لائے اور بستی نظام الدین کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے بنگلہ والی مسجد کہتے تھے قیام پذیر ہوئے، چونکہ آپ ایک صوفی منش اور زاہد و عابد شخص تھے اس لئے تمام عمر عزلت و گمنامی میں رہ کر عبادتِ الٰہی میں مصروف رہے۔ ذکر و عبادت سے جو وقت بچ جاتا اسے قرآن کی تعلیم و تدریس میں صرف کرتے۔ دس بارہ میواتی طالب علم ہمیشہ آپ کے پاس مقیم رہتے تھے جن کا کھانا مرزا الٰہی بخش صاحب کے ہاں سے آتا تھا، تواضع اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ گرمی کے موسم میں جو مزدور لوگ پیاس کے مارے ہوئے ادھر آ نکلتے آپ ان کا بوجھ اتار کر رکھ لیتے اور اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر ان کو پانی پلاتے، پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اے اللہ تو نے مجھے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق دی میں اس قابل نہ تھا۔[1] آپ کے گھر میں شب بیداری کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا ہمیشہ رات بھر گھر میں سے کوئی نہ کوئی جاگتا رہتا۔ آپ کی اس بے نفسی، اخلاص اور للہیت کا نتیجہ تھا کہ دہلی کے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ آپ سے برابر محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں میوات کے علاقہ کے لوگوں سے آپ کا تعلق قائم ہوا۔

---

[1] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت مؤلفہ سید ابوالحسن علی ندوی۔
[2] تذکرۃ الخلیل مؤلفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی۔

غریب میوانیوں کی بڑی دل جوئی کرتے، ان کی جانی ومالی خدمت کے علاوہ ان کو دینی تعلیم بھی دیتے اس وجہ سے میوا
کے دل میں آپ کی بڑی عقیدت پیدا ہوگئی۔ حق تعالیٰ نے آپ کو احسانی اور عرفانی کیفیت اس درجہ کی عطا فرمائی
ایک مرتبہ جب آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں اذکار واشغال تصوف کے سیکھنے کی درخواست
تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ آپ کو اس کی حاجت نہیں جو اس طریق اور ان اذکار واشغال کا مقصود ہے وہ آپ کو حا
ہے۔" شوال ۱۳۱۵ھ مطابق فروری ۹۸ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے منجھلے صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ صاحب نے
نماز جنازہ پڑھائی۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے تین صاحبزادے تھے۔ پہلی بیوی سے مولانا محمد صاحب جو سب سے
تھے اور مولانا کے جانشین ہوئے، دوسری بیوی سے جو کہ مولانا مظفر حسین صاحب کی نواسی تھیں دو صاحبزادے م
محمد یحییٰ صاحب اور مولانا محمد الیاس صاحب تھے۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے بڑے حقیقی بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب ایک جامع بزرگ تھے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کو آپ کے ساتھ خصوصی تعلق اور بدرجۂ غا
محبت تھی۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی آپ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"آہ مولوی محمد یحییٰ مرحوم میرے محسن اور مخلص دوست تھے جن کے کمالات مخفیہ اور حالات حسنہ بیان
کرنے کو مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔ آخر کوئی چیز تھے کہ امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) کو اولاد سے
زیادہ پیارے ہوئے کہ حضرت ان کو بڑھاپے کی لاٹھی اور نابینا کی آنکھیں فرمایا کرتے اور کسی ضرورت سے
دو چند منٹ کے لئے اِدھر اُدھر ہو جاتے تو امام ربانی بے چین اور بے کل ہو جایا کرتے۔ بارہ برس کامل
اس لاڈ اور پیار میں گزرے کہ کوئی اس کی نظیر نہیں بیان کر سکتا۔"

مولانا محمد یحییٰ صاحب اپنی عمر کے آخری سالوں میں مظاہر العلوم سہارن پور میں مدرس مقرر ہوئے اور سات یا
سال تک بلا تنخواہ پڑھاتے رہے۔ آخر ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ کی شب میں بعارضہ ہیضہ انتقال فرمایا۔ آپ کے جانشین آپ کے
صاحبزادہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ ہیں جن کی ساری عمر تدریس وتصنیف اور طالبین حق کی تعلیم وتربیت میں
بسر ہوئی۔ ساری عمر مظاہر العلوم میں پڑھایا ہے مگر آج تک مدرسہ سے بطور تنخواہ کے ایک پائی تک نہیں لی۔ غالباً ابتدا میں
کچھ تھوڑا بہت ضرورتاً لیا تھا وہ بھی واپس کر دیا۔

گھر کا ماحول

یہ تو تھے مولانا کے والد اور بڑے بھائی۔ اب مولانا کی والدہ کا حال سنئے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"آپ کی والدہ محترمہ صفیہ بڑی جید حافظہ تھیں۔ انہوں نے قرآن مجید شادی کے بعد مولانا یحییٰ صاحب
کی شیر خوارگی کے زمانہ میں حفظ کیا تھا۔۔۔۔ معمول تھا کہ رمضان میں روزانہ پورا قرآن مجید اور دس پارے

پڑھ لیا کرتی تھیں اس طرح ہر رمضان میں چالیس قرآن مجید ختم کرتیں۔

رمضان کے علاوہ آپ کے روزمرہ کے جو معمولات تھے اور جن کی تفصیل مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الخلیل میں درج کی ہے، اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آج کل بڑے سے بڑا مجاہد اور مرتاض صوفی بھی بڑی مشکل سے اتنے اوراد و وظائف کی پابندی کر سکتا ہے۔ اسی طرح آپ کی نانی بی امۃ الرحمٰن بھی ایک رابعہ سیرت خاتون تھیں۔ غرضیکہ تمام بڑے صالحین و مصلحین امت کی طرح مولانا کو بھی ایسی آغوش تربیت نصیب ہوئی جس کے اثر سے آپ کو اپنے دور کے مشائخ اور صلحاء میں ایک امتیازی شان نصیب ہوئی۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ آپ کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ میں جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہؓ یاد آ جاتے ہیں۔[1]

تعلیم و تربیت سب سے پہلے آپ نے خاندانی دستور کے مطابق قرآن مجید حفظ اور ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں شروع کی۔ بعدہٗ کبھی اپنے والد ماجد کے پاس دہلی اور کبھی کاندھلہ رہ کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہی دنوں آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گنگوہ قیام پذیر ہو گئے۔ چنانچہ ۱۴ھ یا ۱۵ھ میں وہ آپ کو اپنے ساتھ گنگوہ لے آئے اور خود پڑھانا شروع کیا۔ اس وقت مولانا محمد الیاس کی عمر بمشکل دس گیارہ برس کی ہوگی۔ حضرت گنگوہیؒ کے دم سے اس وقت گنگوہ قطب کے بڑے بڑے علماء و صلحاء کا مرکز بن گیا تھا اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ روحانی علوم کے فیوض سے بھی ایک دنیا فیضیاب ہو رہی تھی۔ مولانا محمد الیاسؒ نے اس مقدس ماحول میں اپنی زندگی کے دس گیارہ برس گزارے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب اس بات کا اہتمام کرتے کہ مولانا محمد الیاس کے اوقات سبق کے علاوہ حضرت گنگوہیؒ اور دوسرے صلحاء کی صحبت میں بسر ہوں اور مولانا سے فرماتے کہ ان حضرات کی صحبت میں بیٹھو اور ان کی باتیں سنو۔

مولانا محمد الیاسؒ خلقی طور پر نحیف و ضعیف تو تھے ہی اور بچپن سے عبادت کا بھی بہت شوق تھا، پھر اس کے ساتھ تعلیمی انہماک، نتیجتاً آپ بیمار ہو گئے۔ حضرت گنگوہی کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحب آپ کے معالج تھے ان کی ہدایت کے مطابق ان کو پانی سے پرہیز کرنا ضروری تھا چنانچہ ثقہ بزرگوں کی روایت ہے کہ آپ نے اپنی بے مثال قوت ارادی اور عزیمت کی وجہ سے متواتر سات سال تک پانی نہیں پیا۔[2] اسی بیماری کی وجہ سے آپ کا سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ لیکن آپ کو تعلیم کے مکمل نہ ہونے کا بڑا رنج تھا۔ ادھر اعزہ کا تقاضا تھا کہ آپ مسلسل آرام کریں۔ آخر ایک روز مولانا محمد یحییٰ صاحب نے کہا کہ "آخر پڑھ کر ہی کیا کرو گے" آپ نے جواباً فرمایا کہ "جی کر ہی کیا کروں گا"۔[3] چنانچہ جوں ہی آپ کی صحت قدرے بہتر ہوئی آپ نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ابتدائی کتابیں مولانا محمد یحییٰ سے پڑھ کر ۱۳۲۶ھ میں دیوبند تشریف لے گئے اور شیخ الہندؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر ترمذی اور بخاری شریف کی سماعت کی۔ اس

---

[1]، [2] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

[3]، [4] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

؎ کئی سال بعد دوبارہ آپ نے مولانا محمد یحییٰ صاحب سے حدیث کا دورہ کیا۔

تعلق بیعت گنگوہ کے قیام کے دوران ہی آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ محبت و عشق کی چنگاری آپ کے خمیر میں تھی، حضرت گنگوہیؒ سے ایسا تعلق پیدا ہوگیا کہ زیارت کے بغیر آپ کو چین نہ آتا۔ کبھی کبھی رات کو اٹھ کر صرف چہرہ دیکھنے کے لئے جاتے اور آکر سو رہتے۔ حضرتؒ کو بھی آپ کے حال پر بڑی شفقت تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ جب میں ذکر کرتا تھا تو مجھے ایک بوجھ سا محسوس ہوتا تھا، حضرت سے کہا تو حضرت تھرا گئے اور فرمایا کہ مولانا محمد قاسم نے یہی شکایت حضرت حاجی صاحبؒ سے کی تو حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ اللہ آپ سے کوئی کام لے گا[1] ۱۳۲۳ھ میں حضرت گنگوہیؒ کا انتقال ہو گیا، مولانا کے حساس دل پر اس حادثہ نے گہرا اثر چھوڑا، فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے تو ساری عمر کا رونا اسی روز رو لیا جس روز حضرتؒ دنیا سے رخصت ہوئے[2]" حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے بعد آپ کا وقت زیادہ تر خلوت اور مراقبہ میں بسر ہوتا۔ اکثر اوقات حضرت شاہ عبدالقدوسؒ کے مزار کے قریب مراقب رہتے اور رات کا بیشتر حصہ نوافل میں گزارتے۔ اس عرصہ میں حضرت گنگوہیؒ کے بڑے بڑے خلفاء سے برابر کا تعلق رہا۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اور دوسرے بزرگوں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہم سے بھی برابر استفادہ کرتے رہے اور ان حضرات کا بھی مولانا سے خصوصی تعلق قائم رہا۔ اس زمانہ میں آپ نے بڑا مجاہدہ کیا۔ مرشدنا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری فرمایا کرتے تھے کہ حضرت دہلویؒ کو بعد میں جو بے پناہ مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی اور آپ سے تبلیغ و اشاعتِ دین کا جو کام لیا گیا وہ اس زمانے کے مجاہدہ کا نتیجہ اور اس کا ثمرہ تھا۔

خدمتِ تدریس اور قیام دہلی ۱۳۲۸ھ میں مظاہر العلوم سہارن پور کے بعض اساتذہ کے حج پر چلے جانے کی وجہ سے بہت سی آسامیاں خالی ہوئیں تو آپ کا تقرر بھی بطور مدرس کے عمل میں آیا۔ متوسط کتابیں آپ کچھ عرصہ یہاں رہ کر یہاں پڑھاتے رہے، اس عرصہ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کا انتقال ہوگیا اور ان کے انتقال کے دو سال بعد آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب جو کہ دہلی میں مقیم تھے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ مولانا صاحب کی وفات پر دہلی کے محبین اور معتقدین نے مولانا سے دہلی ہی میں مستقل طور پر قیام پذیر ہونے کے لئے اصرار کیا اور درخواست کی کہ اپنے والد صاحب اور بھائی صاحب کی مسند اور مدرسہ کو خالی نہ رہنے دیں بلکہ ان کے کام کو سنبھالیں۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے اجازت لے کر آجاؤں گا۔ چنانچہ حضرت سہارنپوری نے بخوشی اجازت فرما دی اور آپ دہلی آکر مقیم ہوگئے۔ بستی نظام الدین کے ایک سرے پر ایک مختصر سی مسجد تھی جس کے ساتھ ایک بنگلہ اور ایک حجرہ تھا، بس یہی مسجد اور یہی خانقاہ تھی، اس کے آس پاس جنگل ہی جنگل تھا کوئی آبادی نہ تھی۔ کچھ میواتی طلبا اس مدرسے میں

---

[1] ، [2] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

پڑھتے تھے۔ مدرسہ کی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی بس توکلاً علی اللہ سارا کام چلتا تھا۔ اکثر اوقات فاقوں کی نوبت آجاتی تھی مگر مولانا کے توکل اور اطمینان میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا تھا۔ اس تنگی اور سختی کے زمانہ میں مولانا اللہ کے فضل وکرم کے بڑے امیدوار تھے اور اس فارغ البالی اور کشائش سے جو اس امتحان کے بعد آنے والی تھی ہمیشہ خود بھی ڈرتے رہے اور ساتھیوں کو بھی ڈراتے رہتے[۵]۔ یہ زمانہ بھی مولانا کے مجاہدہ اور ریاضت کا زمانہ تھا۔ اکثر اوقات خلوت میں گزارتے اور مشاہیر مشائخ کے مزارات پر جاکر پہروں مراقب رہتے۔ جو وقت بچ جاتا اس میں طلبا کو درس دیتے۔ حدیث کا درس بڑے اہتمام سے دیتے اس میں ہمیشہ باوضو رہتے۔ کوئی کیسا ہی معزز آدمی کیوں نہ آجاتا اس وقت سبق چھوڑ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے۔ آہستہ آہستہ طلباء کا رجوع عام شروع ہوا اور طلباء کی تعداد ستر اسی تک پہنچ گئی۔

میوات سے تعلق آپ کے والد صاحب اور بھائی صاحب کے اکثر میواتی لوگ شاگرد اور مرید تھے اور ایک عرصہ سے میواتیوں کا اس خاندان سے تعلق تھا، مولانا کے دہلی قیام پذیر ہونے کے بعد بھی میواتیوں کی آمد و رفت برابر رہی اور پرانے معتقدین نے مولانا کو اپنے علاقہ میں تشریف لے چلنے کی دعوت دی، یہ علاقہ متمدن دنیا سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے اب تک تعلیم سے بالکل محروم چلا آرہا تھا، اسلام بھی برائے نام تھا اور دینی مدارس ومکاتب کا تو یہاں کوئی نشان ہی نہیں تھا۔ مولانا نے میوات چلنے کے لئے یہ شرط پیش کی کہ آپ لوگ اپنے اپنے علاقہ میں دینی مدارس قائم کریں۔ پہلے تو ان لوگوں کو یہ بات بہت ہی دشوار معلوم ہوئی کیوں کہ اول تو معلمین ہی کا ملنا مشکل پھر ان کی تنخواہوں کا انتظام ناممکن اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پڑھنے کے لئے لوگ اپنے بچوں کو کام کاج سے ہٹا کر مکتبوں میں بھیجنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بالآخر لوگوں کا جذبۂ عقیدت غالب آیا اور چار و ناچار انہوں نے مولانا کی اس شرط کو تسلیم کر لیا اور مولانا میوات تشریف لے گئے۔ اس علاقہ میں پہنچ کر مولانا نے دینی مدارس کے قیام کی پوری کوشش کی، لوگوں نے ہر طرح سے تعاون کیا۔ معلمین کی تنخواہوں کے بندوبست کا خود مولانا نے ذمہ اٹھایا چنانچہ پہلے سفر میں دس مکتب قائم ہوگئے۔ بعد میں سفروں کا سلسلہ جاری رہا اور تھوڑی مدت کے بعد میوات کے علاقہ میں کئی سو مدرسے قائم ہوگئے۔ یہ سب مولانا کے اخلاص اور سوز دروں کا نتیجہ تھا کہ بظاہر بالکل بے سروسامانی کے عالم میں دینی اعتبار سے ایک بنجر اور ویران زمین میں دینی علوم کے جگہ جگہ باغات لگا دئیے جن کا فیض اب تک جاری ہے۔

مکاتب سے دل برداشتگی مولانا کی بے قرار طبیعت مکاتب کے اس کام سے مطمئن نہ ہو سکی اور آپ نے اپنی مومنانہ بصیرت سے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ الحاد و مادیت کے موجودہ دور میں چند مکاتب اور خانقاہوں کے ذریعہ جو دینی کام ہو رہا ہے یہ بہت ناکافی ہے اول تو اب دینی مدارس کی طرف ملت کا زرخیز طبقہ رجوع ہی نہیں کر رہا، جو لوگ آتے بھی ہیں ان میں اعلیٰ استعداد والے بہت کم ہوتے ہیں، پھر جو لوگ ان مدارس سے فارغ ہو کر جاتے ان میں سے اکثر معاش کی فکر میں پڑ کر دینی کام سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ قوم میں دین سے تعلق نہ ہونے کی

---

[۵] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

سے دین اور اہلِ دین کی قدر ہی نہیں۔ اس لیے بہت سے لوگ بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں اور جو لوگ تھوڑا بہت کام کرتے بھی ان کا حلقۂ اثر طالبین علوم تک ہی محدود رہتا ہے۔ عوام اور زندگی کے کاروبار میں مصروف لوگوں کی اصلاح و تربیت کا کوئی کام یہ لوگ نہیں کر پاتے، ان حالات کے پیشِ نظر اور مسلسل غور و فکر کے بعد مولانا اس نتیجہ پر پہنچے کہ کوئی اس قسم کا کام ہونا چاہیے جس سے عوام الناس اور غافلوں اور بے طلبوں تک دین اور اس کا پیغام پہنچایا جا سکے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ سے فرمایا:۔

"شاہ صاحب! میں نے شروع میں مدرسہ پڑھایا (یعنی مدرسہ میں درس دیا) تو طلبہ کا ہجوم ہوا اور اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کثرت سے آنے لگے، میں نے سوچا کہ ان کے ساتھ میری محنت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ جو لوگ عالم مولوی بننے ہی کے لیے مدرسہ میں آتے ہیں، مجھ سے پڑھنے کے بعد بھی وہ عالم مولوی ہی بن جائیں گے اور پھر ان کے مشاغل وہی ہوں گے جو آج کل عام طور سے اختیار کیے جاتے ہیں۔ کوئی مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہی رہے گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر مدرسہ پڑھانے سے میرا دل ہٹ گیا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ میرے حضرت نے مجھ کو اجازت دے دی تھی تو میں نے طالبین کو ذکر کی تلقین شروع کی اور ادھر میری توجہ زیادہ ہوئی۔ اللہ کا کرنا، آنے والوں پر اتنی جلدی کیفیات اور احوال کا ورود شروع ہوا اور اتنی تیزی کے ساتھ حالات میں ترقی ہوئی کہ خود مجھے حیرت ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس کام میں لگے رہنے کا نتیجہ کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہ کچھ اصحاب احوال اور ذاکر شاغل لوگ پیدا ہو جائیں پھر لوگوں میں ان کی شہرت ہو جائے تو کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کے لیے آئے، کوئی اولاد کے لیے تعویذ کی درخواست کرے کوئی تجارت اور کاروبار میں ترقی کی دعا کرائے اور زیادہ سے زیادہ ان کے ذریعے بھی آگے کو چند طالبین میں ذکر و تلقین کا سلسلہ چلے، یہ سوچ کر ادھر سے بھی میری توجہ ہٹ گئی اور میں نے یہ طے کیا کہ اللہ نے ظاہر و باطن کی جو قوتیں بخشی ہیں ان کا صحیح مصرف یہ ہے کہ ان کو اسی کام میں لگایا جائے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتیں صرف فرمائیں، اور وہ کام ہے اللہ کے بندوں کو اور خاص طور سے غافلوں بے طلبوں کو اللہ کی طرف لانا اور اللہ کی باتوں کو فروغ دینے کے لیے جان کو بے قیمت کرنے کا رواج دینا"[1]

کام کی ابتداء

شوال ۱۳۴۴ھ میں آپ دوسرے حج کے لیے مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی معیت میں تشریف لے گئے۔ حج کے بعد کچھ عرصہ مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ مولانا فرماتے تھے کہ مدینہ طیبہ کے اس قیام کے دوران میں مجھے اس کام کے لیے امر ہوا اور ارشاد ہوا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ کچھ دن میرے اس بے چینی میں گذرے کہ میں ناتوان کیا کر سکوں گا۔ ایک عارف[2] سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ "پریشانی کی کیا بات ہے یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کرو گے کہا

---

[1] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ [2] حضرت مولانا سید احمدؒ برادرِ بزرگ حضرت مدنیؒ۔ طبع ثالث روایت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ

گیا ہے کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ بس کام لینے والے کام لیں گے"۔ اس سے آپ کی تسکین ہوئی اور ۱۳۴۵ھ میں حج سے واپسی کے بعد آپ نے تبلیغی گشت شروع کر دیا اور لوگوں کو بھی دعوت دی کہ عوام میں نکل کر اسلام کے اولین ارکان کلمۂ توحید اور نماز وغیرہ کی تبلیغ کریں۔ چونکہ کام نئی طرز کا تھا اس لئے شروع شروع میں تو لوگوں کو حجاب رہا۔ رفتہ رفتہ میواتی لوگ اس کام سے مانوس ہوئے اور میوات کے علاقہ ہی سے بہت سی جماعتیں باہر نکلنے کے لئے تیار ہوگئیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ عام لوگ گھروں اور کاروبار میں مصروف رہ کر نہ تو دینی علم بقدر ضرورت سیکھ سکتے ہیں نہ ان کی زندگی میں کوئی انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ اس کی بس ایک ہی تدبیر ہے کہ لوگ اپنے اپنے گھروں اور مصروفیتوں سے علیحدہ ہو کر کچھ عرصہ باہر رہیں، کچھ خود سیکھیں کچھ دوسروں کو سکھائیں۔ چنانچہ میوات کی ابتدائی جماعتیں علمی مراکز یعنی کاندھلہ، رائے پور، سہارن پور، تھانہ بھون وغیرہ کی طرف روانہ کی گئیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میوات کے سادہ لوح اور جاہل لوگ، اہلِ دین کی خدمت میں بیٹھ کر اور ان سے اسلامی شعائر سیکھ کر جب وطن واپس ہوئے تو میوات کی فضا ہی بدل گئی۔ ایک عام علمی و دینی ذوق پیدا ہو گیا۔ جگہ جگہ مدرسے اور مسجدیں بننے لگیں، بدعات اور ہندوانہ رسوم سے لوگوں کو نفرت ہونے لگی اور ایک عام دینی فضا پیدا ہو گئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

> "قاری داؤد صاحب نے ایک بوڑھے میواتی سے اس کا عندیہ لینے کے لئے پوچھا کہ تمہارے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ بوڑھے میواتی نے کہا اور تو میں کچھ جانتا نہیں، اتنا جانوں کہ جن باتوں کے لئے پہلے بڑی کوششیں کی جاتی تھیں اور ایک بات بھی نہیں ہوتی تھی وہ اب آپ ہی آپ ہو رہی ہیں اور جن باتوں کو بند کرنے کے لئے پہلے بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاتی تھیں اور بڑا زور لگایا جاتا تھا اور ایک بات بھی بند نہیں ہوتی تھی وہ اب بے کہے سنے خود بخود بند ہوتی جا رہی ہیں"۔[۱]

طریقِ کار

مولانا کا خیال تھا کہ جس طرح دنیا میں معاش کے لئے کچھ کرنا ہر شخص اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے، اس طرح دین کا ضروری علم سیکھنے اور اپنی اصلاح کے لئے ہر شخص کا گھر سے کچھ عرصہ کے لئے باہر نکلنا ضروری ہے۔ قرنِ اوّل میں بھی لوگوں نے دین اسی طرح حاصل کیا تھا کہ صحابہ کرام دنیا کے ہر قسم کے کاروبار اور مشاغل کے باوجود حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مجلس میں بیٹھتے تھے اور اہلِ دین اور اہلِ علم کے ساتھ ہر وقت کے اختلاط کی وجہ سے ان کی زندگی کے اعمال و اشتغال اور ان کی روزمرّہ کی حرکات و سکنات کو دیکھ کر اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔ مشغولیت اور دین سے دُوری کے اس دَور میں بھی مولانا کے نزدیک دین کا شعور حاصل کرنے کی فقط یہی ایک صورت تھی کہ عام اور مشغول لوگوں کو اپنے اوقات میں سے کچھ وقت فارغ کرنے کی دعوت دی جائے اور ان کو اس ماحول سے نکلنے کو کہا جائے جس میں کافی عرصہ رہنے کے باوجود ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکی۔

---

[۱] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

اس دینی بصیرت کے حصول کے لئے مولانا دو باتوں پر بہت زور دیا کرتے تھے ایک علم، دوسرے ذکر، علم سے مراد مولانا کے نزدیک محض کتابی علم نہ تھا بلکہ وہ علم جس کے حصول کے بعد زندگی میں انقلاب آجائے اور وہ ذکر جس سے غفلت دور ہو اور اخلاص وللہیت پیدا ہو۔ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے ایک دفعہ آپ نے فرمایا:-

"علم وذکر کو مضبوطی سے تھامنے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ مگر علم وذکر کی حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ ذکر کی حقیقت ہے عدم غفلت اور فرائض دینی کی ادائیگی میں لگا رہنا۔ یہ اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ اس لئے دین کی نصرت اور اُس کے فروغ کی جدوجہد میں مشغول رہنا ذکر کا اونچا درجہ ہے، بشرطیکہ اللہ کے اوامر اور مواعید کا خیال رکھتے ہوئے ہو........ اور علم سے مراد دینی مسائل اور دینی علوم کا صرف جاننا نہیں ہے۔ دیکھو یہود اپنی شریعت اور اپنے آسمانی علوم کے کیسے عالم تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخنوں تک کے حُلیئے اور نقشے حتیٰ کہ ان کے جسموں کے تل کے متعلق بھی اُن کو علم تھا۔ لیکن کیا ان باتوں کے صرف جاننے نے اُن کو کوئی فائدہ دیا...... فرمایا علم کے لیئے جو وضع محمدی تھی (یعنی طلب اور عظمت ومحبت کے ساتھ صحبت واختلاط سے علم حاصل کرنا اور زندگی سے زندگی سیکھنا) اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ جتنا علم بڑھتا تھا اُسی قدر اپنے جہل اور اپنی علمی درماندگی کا احساس ترقی کرتا تھا۔ اور علم حاصل کرنے کا جو طریقہ اب رائج ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم جتنا آتا ہے زعم اس سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر زعم سے کبر پیدا ہوتا ہے اور کبر جنت میں نہیں جانے دے گا، علاوہ ازیں علم کے زعم کے بعد تحصیل علم کی تڑپ نہیں رہتی۔ جس کی وجہ سے علمی ترقی ختم ہوجاتی ہے۔"[1]

کام کا استحکام اور تائید ایزدی

شروع شروع میں عوام اور اہل علم اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ بہت سے سطح بین لوگوں کو اس اصلاحی تحریک کے نام یعنی دو تبلیغی جماعت، سے بہت دھوکا ہوا۔ لیکن جب لوگوں نے قریب تر ہوکر اس کو دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ کام محض تبلیغی کام نہیں ہے بلکہ عمومی اصلاح کا ایک ٹھوس پروگرام ہے جماعت کے لئے جو لوگ وقت دیتے ہیں وہ صرف دوسروں کو کلمہ اور نماز ہی نہیں سکھاتے بلکہ خود بہت کچھ سیکھتے ہیں اور ان کی زندگیوں میں فی الواقع ایک انقلاب آجاتا ہے۔ خود مولانا کا نقطۂ نظر بہت بلند تھا۔ مولانا کے سامنے فقط اتنا ہی نہیں تھا کہ بس عوام الناس نماز روزہ سیکھ جائیں اور کچھ ذکر واذکار کے پابند ہوجائیں بلکہ مولانا پوری ملت اسلامیہ کو بیدار کرکے انفرادی زندگی سے لیکر اجتماعی زندگی تک کو اسلامی بنانے کی فکر رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک صحبت میں فرمایا:-

"ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو ما جاء بہ النبی سکھانا یعنی اسلام کے پورے علمی وعملی

---

[1] ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔

نظام سے ابیت کو وابستہ کر دینا۔ یہ تو ہے ہمارا اصل مقصد رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ و نماز کی تلقین و تعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی الف ب ت ث ہے۔"[1]

دینی مراکز میں جو لوگ جاتے ان کو یہ بھی ہدایت کی جاتی کہ بزرگوں کی مجلسوں میں تبلیغ وغیرہ کا کوئی ذکر نہ کریں بلکہ ...گوں کی مجلسوں میں بیٹھ کر فیض یاب ہوں اور کچھ وقت مقرر کرکے آس پاس کے علاقوں میں تبلیغی گشت بھی کریں چنانچہ ...ں طریقہ سے کام ہوتا رہا اور اہلِ بصیرت اور مشائخ وقت کا اس کام کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ یہ کام وقت کا اہم ...ضا ہے اور اس کا طریق کار ہر لحاظ سے مناسب اور صحیح ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، مولانا ...بل احمد صاحبؒ سہارن پوری، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ رائے پوری، حضرت ...نا عبدالقادر صاحبؒ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ اور دوسرے بزرگوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی توثیق و تصدیق ...بلکہ اس کی تائید و حمایت کی اور اپنے مریدین و احباب کو ہر طرح سے اس جماعت کے تعاون کی تلقین فرمائی۔ اسی ...رح بہت سے واقعات ایسے بھی پیش آئے جن سے واضح ہوا کہ تائید ایزدی اس جماعت کے شامل حال ہے۔ ایک واقعہ ...رشدنا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ نے رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ میں گھوڑا گلی کی ...ک مجلس میں بیان فرمایا۔ یہ ہے :-

"فرمایا ایک دفعہ مبلغین کی ایک جماعت حضرت کے بلانے پر جا رہی تھی۔ گاڑی سے اترے تو یہ معلوم نہیں تھا کہ کس طرف کو چلیں۔ آخر ایک نے کہا "جی ایک طرف کو منہ کر کے چل دو۔ چنانچہ چلتے رہے ایک جگہ سے آواز آئی ٹھہرو، ٹھہرو! رستہ بھول گئے ہو۔ چنانچہ ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی آئے اور کہنے لگے کہ تم رستہ چھوڑ کر جا رہے تھے، ادھر ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔ یہ ان کے پیچھے ہو لئے۔ ایک جگہ پہنچے تو دور سے روشنی نظر آ رہی تھی، کہنے لگے کہ وہ جو روشنی نظر آ رہی ہے ادھر ہی کو ہو جاؤ، ہم اب جاتے ہیں' ان لوگوں نے پوچھا کہ جناب اپنا نام تو بتاتے جاؤ' اس پر ایک نے کہا کہ میرا نام رحمت ہے۔ دوسرے نے کہا میرا نام ہمت ہے۔ چنانچہ یہ کہہ کر غائب ہو گئے، یہ لوگ ہنسنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ تم کہہ رہے تھے ہمت کرو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے پہنچا دیں گے، یہ ہمت اور رحمت ہی آ گئے۔ اُن کی بتائی ہوئی روشنی پر پہنچے تو وہاں حضرت کے لوگ کھانا کھا رہے تھے اور ان کی انتظار کر رہے تھے۔ فرمایا کیا یہ نصرت نہیں تھے۔"

...ریک کی عالمگیری

اس تحریک کا ابتدائی کام میوات کے علاقہ سے شروع ہوا، جوں جوں اس کے نتائج سامنے آتے گئے اور اہلِ علم و صاحبانِ بصیرت اس کی طرف متوجہ ہوتے گئے نوں نوں

[1] ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔

اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ میوات کے بعد دہلی میں کام کیا گیا اور لوگ جماعتوں کی شکل میں باہر نکلنے لگے اس کے بعد یو۔پی کے تمام علمی مراکز، دیوبند، سہارن پور، کانپور، لکھنؤ، تھانہ بھون، گنگوہ میں جماعتیں گئیں، پھر تو یو۔پی کا چپہ چپہ تبلیغی جماعتوں نے چھان مارا۔ رفتہ رفتہ یو۔پی سے باہر پنجاب، سندھ، سرحد، صوبجات متحدہ، بہار بنگال، مدراس اور بمبئی تک جماعتیں جانے لگیں اور وہاں سے لوگ نکل نکل کر مشہور علمی مراکز اور تبلیغی مرکز نظام الدین دہلی کی طرف آئے اور یہاں سے دین سیکھ کر جانے لگے۔ حتّٰی کہ چند ہی سالوں کے اندر اندر برصغیر ہند و پاک کے بڑے شہروں اور قصبات اور لاتعداد دیہاتیوں میں جماعتیں پہنچیں جنہوں نے وہاں کے لوگوں کو باہر نکلنے کی دعوت دی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طرح سے اللہ کی کتنی مخلوق گھروں سے دین سیکھنے کے لئے نکلی اور کتنی تعداد کے لوگوں کی زندگی میں انقلاب رونما ہوا۔ مولانا کی زندگی میں ہندوستان سے باہر حجاز، شام، بحرین وغیرہ میں بھی اس کام کی دعوت دی گئی اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ آخر ۱۲ رجولائی ۱۹۴۴ء کو مولانا رحؒ کا انتقال ہو گیا اور آپ کے صاحبزادہ مولانا محمد یوسف مدظلہٗ کی جانشینی عمل میں آئی۔ کام جاری تھا۔ چلتا رہا اور تحریک کا سلسلہ پھیلتا گیا۔ اس وقت تک ہند و پاکستان سے جن جن ممالک میں جماعتیں جا چکی ہیں ان کی فہرست سے تحریک کی عالمگیری کا اندازہ ہو سکے گا۔ راقم کے عم محترم عبدالقادر صاحب ساکن جھاوریاں (جن کا شمار جماعت کے اہم ارکان میں ہوتا ہے) نے ایک انٹرویو میں راقم الحروف کو بتایا کہ اس وقت تک جماعتیں ہند و پاکستان سے باہر جاپان، فلپائن، انڈونیشیا، جاوا، برما، سنگھاپور، جبل، ایران، ٹرکی، شام، عراق، اردن، لبنان، مصر، سوڈان، سعودی عرب، حجاز، بحرین، کویت، حضر موت، یمن، اسماعیلیہ اسپین، مشرقی افریقہ، نائیجیریا، انگلینڈ، امریکہ، فرانس، لیبیا، ٹیونس، الجزائر اور مراکش میں جا چکی ہیں امریکہ کو پہلی جماعت ۱۹۵۴ء میں گئی تھی جس کے ساتھ قاضی صاحب موصوف بھی گئے تھے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ جماعتیں اب تک امریکہ جا چکی ہیں۔ اسی طرح قاضی صاحب نے بتلایا کہ جاپان، امریکہ، انگلینڈ، شام، برما، حجاز اور سعودی عرب سے جماعتیں بن کر مرکز میں کئی دفعہ آ چکی ہیں اور یہاں کے دینی مرکزوں میں رہ کر اور یہاں کے کام کو دیکھ کر علمی و عملی استقامت واستقامت کی دولت اپنے ساتھ واپس لے گئی ہیں۔ باقی ہدایت تو اللہ جلّ جلالہٗ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ واللہ یہدی من یشاء الیٰ صراطٍ مستقیم۔

مولانا کی اہم خصوصیات

افسوس ہے کہ اس مختصر مقالہ میں مولانا کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ چونکہ اس کی گنجائش نہیں ہے اس لئے مختصر طور پر یہاں مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی رحؒ کے چند خصوصی صفات کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا کا آخرت پر کامل یقین اور ہر وقت اس کا استحضار ہے۔ جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے ان کا زبانی اور تحریری بیان یہی ہے کہ مولانا کی تمام حرکات و سکنات سے واضح ہوتا تھا کہ جنت اور دوزخ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی لکھتے ہیں:-

"جسمانی لحاظ سے اگرچہ نہایت نحیف و ناتواں تھے مگر اس مقدس مقصد کے لئے ایسی ان تھک اور دائمی جدو

بے پناہ جد وجہد کرکے دکھا گئے کہ میرا اندازہ ہے کہ اگر بالفرض کسی شخص کے سامنے جنت اپنی ساری نعمتوں اور دل فریبیوں کے ساتھ اور جہنم اپنی ساری ہولناکیوں سمیت منکشف کر دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اگر یہ کام کرو گے تو یہ جنت ملے گی اور نہیں کرو گے تو اس جہنم میں ڈالے جاؤ گے تو شاید اس کی سعی وجہد اس سے زیادہ نہ ہو سکے گی جو مولانا محمد الیاسؒ کی بالخصوص آخری زمانہ میں تھی۔"

یہ تو آپ کا حال تھا اب قال کی بات سنئے مولانا النعمانی آپ کے ملفوظات میں لکھتے ہیں:۔

"فرمایا ہائے! اللہ کے وعدوں پر یقین نہیں رہا۔ اللہ کے وعدوں پر یقین اور اعتماد پیدا کرو اور پھر اس یقین و اعتماد ہی کی بناء پر کام کرنے کی مشق کرو۔ اور اللہ کے وعدوں کے معنی بھی خود نہ گھڑو۔ تمہارا علم اور تجربہ بہت محدود ہے۔ اس کے وعدوں کا مطلب اس کی شان کے مطابق سمجھو اور اس سے یوں ہی مانگو کہ اپنی شان اور قدرت کے شایان ان وعدوں کو پورا فرما۔ اُخروی نعمتوں کی معنویت اور اصل حقیقت کا تم اس دنیا میں کیا اندازہ کر سکتے ہو اور کیونکر وہ صحیح ہو سکتا ہے جب کہ حدیث قدسی میں ان نعمتوں کی صفت ہی یہ بیان کی گئی ہے۔ لا عینٌ رأت ولا اذنٌ سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر۔"[1]

مولانا کی دوسری اہم صفت مولانا کا سوزِ دروں اور بلند ہمتی ہے۔ مولانا کا دل اس زمانہ کی دینی ویرانی کو دیکھ دیکھ کر جلتا تھا اور مخلوقِ خدا کی عام گمراہی اور جہالت و بدعملی کی ہمہ گیری کا تصور کرکے آپ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ گویا کہ اس شعر کی مجسم تفسیر تھے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر　　سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ "کبھی کبھی دین کے اس درد اور اس فکر میں بستر پر کروٹیں بدلتے اور بے چینی بڑھتی تو اُٹھ اُٹھ کر ٹہلنے لگتے۔ ایک رات والدہ مولانا محمد یوسف صاحب نے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے کہ نیند نہیں آتی فرمایا کیا بتلاؤں اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے تو جاگنے والا ایک نہ رہے دو ہو جائیں"[2]۔ اسی سوزِ دروں کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنی ساری زندگی کا اوڑھنا بچھونا دین اور اشاعتِ دین ہی کو بنا لیا تھا اور آپ کی ساری زندگی کی دلچسپیاں اسی تبلیغی کام میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان کو اس راہ میں قربان کر دینا اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اس راہ کی تمام تکلیفوں اور مشقتوں کو نہایت عالی حوصلگی اور بلند ہمتی سے برداشت کرتے تھے۔ مئی ۳۶ء کے ایک سفر میوات کے موقع پر مولانا محمد زکریا صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب کو تحریر فرمایا:۔

"اس قدر ضعف ہے کہ خلاف طبع الجھی ہوئی بات سے اختلاج اور خفقان ہوتا ہے اور آرام کے ساتھ موٹر کی دہلی تک کی سواری سے بخار آتا ہے۔ اس پر الحمد للہ ایک مہینہ کی مسافت کیلئے میوات کی سخت تر ین

---

[1] ملفوظات مولانا محمد الیاس مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔

[2] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

بادِ سموم اور جہال کی باتوں کے الجھاؤ کا نشانہ بن کر موت کے لئے اپنی جان کو پیش کرنے کی نیت سے اس سفر کو کارزار کا میدان تصور کرتے ہوئے مصمم ارادۂ سفر ہے۔ گویا یہ سفرِ جہاد ہے۔ مگر اپنے ضعف سے اور اپنی مجرّبہ کم ہمتی سے نہایت خوف ہے کسی جگہ یہ نفس شریر کرب و شدائد کے مقابلہ سے فرار کر کے نامردی سے واپس ہوگا دعا کرو کہ جان کے جانے تک تحمل حق تعالیٰ نشانہ شدائد وکرب کا نصیب کریں وما ذالك علی اللہ العزیز۔ اور یا کام کو پورا کر کے سلامتی کے ساتھ بغنیمت عود نصیب فرمادیں۔ اپنے اس سفر کو اہم فریضہ اور صحت کی رعایت کو سنگین ترین معصیت سمجھ کر اپنی زندگی سے مایوس ہوکر سفر کر رہا ہوں[1]۔"

مولانا کی تیسری اہم خصوصیت مولانا کی وسیع القلبی ہے۔جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے ہر مکتب خیال اور ہر دائرۂ فکر کے لوگ آپ سے قریب ہوگئے اور اس تحریک کے ساتھ جُڑ گئے۔ تمام اہل حق کی طرح آپ کو بھی حق تعالیٰ نے ایسی وسیع نظری اور عالی ظرفی عطا فرمائی تھی کہ جس مسلمان کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان تھا اس کی بھی آپ عزت کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ہند و پاکستان کے تقریباً تمام مشہور دینی مدارس و مکاتب کے لوگوں کے دوش بدوش انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لوگوں کو اس جماعت میں کام کرتے ہوئے پایا گیا اسی طرح مختلف اذواق اور مختلف طرق کے مشائخ کے منتسبین نے اس جماعت میں برابر کا حصہ لیا۔ کیوں کہ مولانا کے دل میں ہر ایک کی قدر اور عزت تھی۔ مدارس، یونیورسٹیوں، اداروں اور خانقاہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے علاوہ ہر قسم کے کاروباری اور ملازمت پیشہ لوگ بھی آپ کی تحریک میں منسلک ہوگئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔ اکرام مسلم مولانا کی دعوت کا اہم اصول تھا اور تمام تبلیغی کارکنوں کو اس کی تاکید کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی تمام دینی جماعتوں اور مذہبی اداروں کے ایک دوسرے سے بُعد و نفرت اور عام مسلمانوں کے افتراق و تشتت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہر جماعت اور ہر شخص اپنے کو سب سے افضل اور تمام خوبیوں کا مجموعہ سمجھتا ہے اور دوسرے شخص اور دوسری جماعت کو تمام خوبیوں سے محروم اور تمام خرابیوں کا سرچشمہ خیال کیا جاتا ہے۔ مولانا نے فتنوں کی اس بنیاد پر اس طرح تیشہ چلایا کہ جماعت کے بنیادی اصولوں میں اکرام مسلم کو داخل کر دیا اور ہر اُس شخص پر اس کی پابندی لازمی قرار دے دی گئی جو جماعت میں شامل ہوکر تبلیغی کام کرنا چاہتا ہو۔

زمانہ کے اس دستور کے برعکس کہ لوگ اپنی ذات کو مجموعۂ محاسن اور دوسروں کو مجموعۂ معائب سمجھتے ہیں مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ اپنے عیوب کا تو محاسبہ کیا جائے اور دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھی جائے۔ ایک

---

[1] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابو

ن کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

"ہر کوئی شخص اور کوئی مسلم ہرگز ایسا نہیں کہ کچھ خوبیوں اور کچھ خرابیوں سے خالی ہو۔ ہر شخص میں یقیناً کچھ خوبیاں اور کچھ خرابیاں ہوتی ہیں۔ اگر خرابیوں کے ساتھ نظر اندازی اور ستر (پردہ پوشی) کا اور خوبیوں کی پسندیدگی اور اُن کے اکرام کا ہم مسلمانوں میں رواج ہو جائے تو بہت سے فتنے اور بہت سی خرابیاں اپنے آپ دنیا سے اُٹھ جائیں اور ہزاروں خوبیوں کی اپنے آپ بنیاد پڑ جائے"[1]

مولانا کی یہی وہ اہم خصوصیات اور زرّیں اصول ہیں جنہوں نے مولانا کو چشتی سلسلہ کے جلیل القدر مشائخ کی صف میں لاکر کھڑا کیا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:

"مولانا محمد الیاسؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور جذبہ اللہ نے انہیں عنایت فرمایا تھا اس کی مثال اس عہد میں مشکل سے ملے گی۔ گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاس نے کیا تھا"[2]

"اس اہم کام (تبلیغ دین) کی انجام دہی کا جو نظم حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے قائم فرمایا ہے۔ اس کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ مجھے پچھلے دنوں نصیب ہوا۔ اس کام کی سچی روح مجھے اس نظم میں کار فرما دکھائی دیتی ہے۔ ایمان اور یقین بحث اور دلیل سے پیدا نہیں ہوتے کسی کو یہ دولت نصیب ہو تو دوسروں تک بھی اسے منتقل کر دیتا ہے اپنے دل کی آگ سے دوسروں کے سینے بھی گرماتا ہے اور اپنے عمل کی بے چینی سے بے عملوں کی عروقِ مُردہ میں بھی خون زندگی دوڑا دیتا ہے"[3]

(ڈاکٹر ذاکر حسین، سابق صدر جمہوریہ ہند)

---

[1] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

[2] تاریخ مشائخ چشت از پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ [3] یہ تاثر ڈاکٹر صاحب کا اس وقت کا ہے جب حضرت مولانا بقید حیات تھے۔ بروایت حضرت مولانا عبید اللہ انور حضرت مولانا گشت کے لئے خصوصی دعوت دینے کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے تو ڈاکٹر صاحب بلا تکلف ساتھ چل دیے مندرجہ بالا تاثر کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کے نام ایک خط میں کیا ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ ابن حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ

علم وفضل کی دنیا میں ایسا بہت کم اتفاق ہوا ہے کہ والد اگر علم وعمل، زہد وتقویٰ، جہد وہمت اور سلوک میں یگانہ روزگار ہے تو بیٹا بھی انہی اوصاف میں فردِ وحید ہو۔ ہندوستان میں اس کی نظیر خاندان ولی اللہی میں ملتی ہے۔ کہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے گھر شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے تو شاہ ولی اللہؒ کے ہاں شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالغنی رحمہم اللہ اجمعین جیسے عارفین وکاملین پیدا ہوئے جن کی نظیر ومثیل مجدد الف ثانیؒ اور الامام المحدث شاہ ولی اللہؒ کے علاوہ پورے اسلامی ہندوستان میں نہیں ملتی۔ اور اپنے زمانے میں عالم اسلام میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ اور پھر ان صاحبزادگان والاتبار کی اولاد بھی علم وفضل کے اعتبار سے کچھ کم نہیں رکھتی۔ اسی قبیلہ کے ایک فرد شاہ اسماعیل شہید اور اسی خاندان کے تربیت یافتہ حضرت سید احمد شہیدؒ ذ صحابہ کرام کے بعد اپنے جہد وعمل اور ایثار وخلوص کی بدولت پوری امت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ بلا کسی تشبیہ وتمثیل کے انبیاء علیہم السلام کے مقدس گروہ میں جو امتیازی مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا ہے۔ یہی مقام امت محمدیہ علیہ التحیۃ والسلام میں خاندانی لحاظ سے شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کا ہے ـــــ اور پھر اسی خاندان کی معنوی وروحانی اولاد مشائخ واکابر دیوبند ہیں کہ اس جماعت کے علماء نے اپنے علم وفضل سے کتاب وسنت کی خدمات جلیلہ وعظیمہ کی جو تاریخ قائم کی ہے۔ اس کی مثال بھی مشکل ہی سے ملے گی[1] ـــــ اس جماعت کے آخری دور کے علماء ومشائخ میں سے ایک نامور شخصیت حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی ہے۔ جن کا مختصر تذکرہ گذشتہ اوراق میں گذر چکا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب اس کتاب کی ترتیب شروع کی گئی تو ان دنوں حضرت مولاناؒ کے صاحبزادہ محمد یوسف صاحب بقید حیات تھے اور ہم نے ان کے تذکار کا قصد کیا تھا وہ سب واصل بحق ہو چکے تھے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ۱۹۶۵ء میں اپنے مالک سے جا ملے اگر کتاب کی ترتیب ان کے وصال کے بعد ہوتی تو حضرت مولاناؒ کی مبارک زندگی اپنے علم وعمل کے اعتبار سے یقیناً اس قابل تھی۔ کہ ان کا مستقل تذکرہ اس کتاب میں کیا جاتا۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اپنے تمام علم وفضل کے باوجود ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ مگر ان کے فرزند ارجمند اپنے گرامی قدر والد کی چلائی ہوئی تحریک کی قیادت وامارت کرتے ہوئے عالمگیر شہرت کے مالک ہوتے[2]۔ اور دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہوگا جہاں تبلیغی جماعت کے افراد کے مبارک قدوم نہ پہنچے ہوں پچاس برس کی عمر ہی پا ہوئی

---

[1] اس اجمال کی کسی قدر تفصیل کے لئے کتاب "بیس بڑے مسلمان" ترتیب دی گئی ہے۔ (ارشد)

[2] تاہم الفضل للمتقدم و من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرہا واجر من عمل بہا (الحدیث)، کے مصداق مولانا محمد یوسفؒ اور ان کے ساتھیوں کا خدمت اور فضل وشرف بھی انہی کا حصہ ہے اور نیک بیٹے کے اعمال کے اجر باپ کو بھی برابر ملتے رہتے ہیں۔

ان میں سے بھی اکیس برس مولانا نے تحریک کی سیادت کی۔ لیکن برق رفتاری کا یہ عالم تھا کہ ؎

ہیں مردِ مجاہد کے بھی انداز نرالے ۔۔۔ رفتار قیامت کی ہے پاؤں میں ہیں چھالے

حضرت مولانا گفتار و کردار میں اس زمانہ میں اللہ کی برہان تھے۔ دریا و صحرا ان کی ٹھوکر سے دو نیم تھے پورا عالم ۔۔۔ و دو کے سامنے سمٹ کر رہ گیا تھا۔ ان کا اپنا کوئی ارادہ نہیں تھا کوئی خواہش ان کی اپنی خواہش نہیں تھی۔ وہ ۔۔۔ تبارک و تعالٰی کے مقاصد و احکام کے معیار و عکاس تھے۔ ان کی پوری زندگی کتاب و سنّت کی تبلیغ کے لئے ۔۔۔ تھی ـــــ ان کا مقصد زندگی ایک ہی تھا کہ غیر مسلم مادی آسائش اور زندگی کی راحت و آرام کے لئے جیتا ہے۔ ۔۔۔ دشمنی بھی نفسانی، محبت بھی نفسانی۔ لیکن مسلمان کی تخلیق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ہوئی ہے۔ وہ اللہ کی ۔۔۔ لئے جیتا ہے اور اسی کی رضا کی خاطر جان دیتا ہے۔ مادی اغراض اس کا مطمح نظر نہیں ہوتیں ـــــ یہی وجہ ہے کہ وہ ۔۔۔ میں بھی مسکراتے رہے جہالت مغربی تہذیب کی چکا چوند اور راہ کی تاریکیاں ان کا راستہ نہ روک سکیں حالات کی ۔۔۔ ی کو وہ کبھی خاطر میں نہ لاتے۔ تکالیف و مصائب کے پہاڑ ان کے وقار و تمکنت میں فرق نہیں ڈال سکے۔ وہ تاریکیوں ۔۔۔ کی شمعیں جلاتے۔ مردہ دلوں میں حیات تازہ دوڑاتے دنیاوی امور میں غرق انسانوں کو فکر آخرت دلاتے اور ۔۔۔ اخلاقی اقدار کو زندہ کرتے ہوئے ایک تبلیغی سفر میں اس جہان سے اور اپنی جان سے گذر کر زندہ جاوید ہو گئے۔

نوٹ: جس وقت ہم نے اس کتاب کے لیے مشاہیر کا انتخاب کیا تھا۔ حضرت جی اس وقت بفضلِ تعالٰی بقیدِ حیات تھے۔ اس لیے اس کتاب میں تو ان کا مفصل تذکرہ نہ آسکا۔ البتہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہم نے حضرت کے متعلق ایک جامع کتاب تذکرہ مولانا محمد یوسف دہلوی کے نام سے علیحدہ طبع کروائی جس میں حضرت جی کے مفصل حالات درج ہیں۔

(ارشد)

مولانا محمد یوسفؒ اپنی تحریروں کے آئینے میں

(مکتوبات سے اقتباسات)

اللہ جل شانہٗ کی ذاتِ عالی سے تعلق پیدا ہو جائے اور ان کی قدرت سے براہِ راست استفادہ ہو اس کے لئے حضرت
علیہ وسلم، اللہ کی طرف سے طریقے لیکر آئے ہیں جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ جل شانہٗ ہر نقشے میں کام
دکھائیں گے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں اپنے یقین اور اپنے جذبے اور اپنے طریقے بدلنے کا مطالبہ ہے۔[۱]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہؓ کی نماز کو سنانا خود اپنی نماز کو اچھا کرنے کی مشق کرنا۔ اہتمام سے وضو کرنا دھ
قیام میں، قعدہ میں، رکوع میں اور سجدے میں بھی دھیان کم از کم تین مرتبہ جمایا جائے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں نماز کے بعد
کہ اللہ کی شان کے مطابق نماز نہ ہوئی اس پر رونا اور کہنا کہ اے اللہ ہماری نماز میں حقیقت پیدا فرما۔[۲]

علم سے مراد یہ ہے کہ ہم میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہو جائے میرے اللہ مجھ سے اس حال میں کیا چاہتے ہیں اور پھر اللہ
کے ساتھ اپنے آپ کو اس عمل میں لگا دینا یہ ذکر ہے۔[۳]

ہر مسلمان کا بحیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کے اکرام بھی کرنا ہے۔ ہر امتی کے آگے بچھ جانا
حقوق کو ادا کرنا ——— جو آدمی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ جل شانہٗ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے جب تک آدمی
بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے اللہ جل شانہٗ اس کے کام میں لگے رہتے ہیں۔[۴]

ہر عمل میں اللہ جل شانہٗ کی رضا کا جذبہ ہو۔ کسی عمل سے دنیا کی طلب یا اپنی حیثیت بنانا مقصود نہ ہو اللہ کی رضا کے جذ
عمل بھی بہت انعامات دلوائے گا اور اس کے بغیر بہت بڑے بڑے عمل بھی گرفت کا سبب بنیں گے۔[۵]

صحابہ کرامؓ ہر حال میں اللہ کی راہ میں نکلے ہیں۔ نکاح کے وقت اور رخصتی کے وقت، گھر میں ولادت کے موقع پر او
موقعہ پر۔ سردی میں، گرمی میں، بھوک میں، فاقے میں، صحت میں، بیماری میں، قوت میں، ضعف میں، جوانی میں اور بڑھاپے میں
نکلے ہیں۔ دین کے دوسرے اعمال کی طرح ہمیں یہ محنت بھی کرنی نہیں آئی۔ خود اپنے آپکو قربانی کی شکلوں اور ہجرت و نصرت والے اعمال میں
دعوت کے بعد دوسرا کام تعلیم کا ہے جب تعلیم کیلئے بیٹھیں تو ادب سے بیٹھیں۔ دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے علم کی عظمت سے
فضائل کا مذاکرہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمائی ہوئی دعائیں یاد کی جائیں۔ جو وقت دعوت اور تعلیم سے خالی ہو اور کوئی دوسرا ضروری کا
نہ ہو اس میں نوافل پڑھے جائیں یا قرآن مجید کی تلاوت کی جائے یا ذکر و تسبیح میں مشغول ہو جائے یا اللہ کے کسی بندہ کی خدمت میں جا
پورے تبلیغی سفر میں بطور اصل مقصد کے کیے جائیں گے اور اتنے کئے جائیں گے کہ یہی عادت و مزاج بن جائے (اللہ کے راستے میں) چار
ضرورت کے طور پر کیے جائیں گے اور صرف بقدر ضرورت ہی کئے جائیں گے وہ چار یہ ہیں: (۱) کھانا پینا (۲) قضاء حاجت (۳) سونا (۴)
کرنا ——— یہ ناگزیر ضرورتیں ہیں ان کو بس اتنا ہی وقت دیا جائے جتنا ضروری اور ناگزیر ہو۔ سونے کیلئے دن رات میں بس چھ گھنٹے کا
چار باتیں وہ ہیں جن سے پورے اہتمام کے ساتھ بچا جائے ——— (۱) کسی سے سوال نہ کیا جائے بلکہ کسی کے سامنے اپنی کوئی
بھی نہ کی جائے یہ بھی ایک طرح کا سوال ہے (۲) اشراف سے بچا جائے کہ زبان سے تو سوال نہ ہو لیکن دل میں طمع ہو کہ کسی بند
ہو جائے (۳) اسراف فضول خرچی سے بچا جائے (۴) بغیر اجازت کسی ساتھی کی بھی کوئی چیز استعمال نہ کی جائے۔[۶]

۱؎ تا ۵؎ مکتوب جو عمرہ کرنے والی جماعت کے نام لکھا گیا (ماخوذ "الفرقان") ۶؎ راہ خدا میں نکلنے والے قافلوں کے لئے ہدایت مضمون مولانا محمد یوسف

قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۹۵ھ
۱۸۶۸ع

۱۳۸۲ھ
۱۹۶۲ع

سوادِ تحریر حضرت رائے پوریؒ

۷۸۶

مکرم و محترم حضرت شاہ صاحب

از عبدالقادر السلام علیکم ورحمۃ اللہ التماس آنکہ حضرت مولانا سے رخصت ہو کر بخیریت تمام مکان پر پہنچا ہوں یہاں پر سب خیریت سے ہیں امید ہے کہ حضرت بھی بعافیت بالخیر ہونگے

کل صوفی نور احمد کے خط سے معلوم ہوا حضرت دیوبندی رحمہ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون افسوس صد افسوس ہم خدام کی امید دعا فاتحہ کر لیں اب زندگی کا کچھ مزا نہ رہا [illegible] شریف [illegible] و محمد حسن صاحب السلام علیکم

عبدالقادر از ڈھڈیاں ضلع شاہ پور ڈاکخانہ خاص [illegible]

لانا محمد حسین ایم۔ اے

حضرۃ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

مولانا عبدالرشید صاحب ارشد کے ارشاد کی تعمیل میں حضرت مرشدی عبدالقادر رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ کا یہ سیرتی خاکہ زیرِ ترتیب کتاب "بیس بڑے مسلمان" کے لئے قلمبند کیا گیا ہے۔ حضرتؒ کی مفصل سوانحعمری برادر مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ترتیب دی ہے جو لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔ (محمد حسین)

جن لوگوں کو دین وعلم میں رسوخ حاصل ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ دین کا ایک اہم شعبہ احسان واخلاص ہے جو کہ ت مطہرہ کے تمام اعمال کی روح ہے، اور یہ بھی مسلّم ہے کہ دین کے اس شعبہ کی خدمت وحفاظت اس اُمّت کے بقات میں سے صوفیاء کرام نے سب سے بڑھ کر کی ہے۔ خیر القرون کے بعد دین کی اس روح اور رسول اللہ صلی اللہ دسلم کے سینہ مبارک کی امانت یعنی "نورِ عرفان" کو محبت وصحبت کے ذریعہ حاصل کر کے "محبت وصحبت" ہی کے ے دوسروں تک منتقل کرنے اور اس روحِ اسلام اور نورِ عرفان کو دنیا میں باقی رکھنے کی جو مساعی جمیلہ صوفیاء کرام نے ں ان کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طبقہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح جانشینی کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر ے اس دور میں مشائخ دیوبند کے حصے میں یہ سعادت آئی کہ تمام مشہور سلاسلِ طریقت کے فیوض وبرکات اور ان بتیں ان کو حاصل ہوئیں، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے واسطہ سے مشائخ چشت کا جذبۂ درد ق وفنائیت حاصل ہوئی، خاندان ولی اللّٰہی کے ذریعے نسبت نقشبندیہ اور اتباعِ سُنّت کا ذوق نصیب ہوا اور ابیر حضرت سید احمد شہیدؒ کے واسطے سے مجاہدانہ اور سرفروشانہ سپرٹ (SPIRIT) ملی، عشق وطریقت اور شریعت اد بجہاد کے اس حسین امتزاج نے میخانۂ یثرب کی شرابِ اخلاص وعرفان کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ کر کے حلقۂ دیوبند کے منوالوں کو ایک امتیازی شان بخش دی ہے اور اب بجا طور پر ان کے متعلق کہا سکتا ہے ؎

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

انہی مشائخ دیوبند کی آخری نشانی سیدنا ومرشدنا حضرت مولانا الشیخ عبدالقادر رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ ۔ تمام مشائخ متقدمین ومتاخرین کی نسبتوں کے جامع اور امین تھے، جن کے مقدّس چہرہ کو دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ رت ابوبکر شبلیؒ اور حضرت ابراہیم ادہم بلخیؒ کی نورانی صورتیں چشمِ تصور کے سامنے آجاتی تھیں۔ مجلس مبارک میں جب ضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ وملفوظات پڑھے جا رہے ہوتے تھے تو ہو بہو حضرت غوث الاعظمؒ کی مجالس

کا نقشہ کھچ جاتا اور جب موجودہ اسلامی و ملکی سیاسیات پر گفتگو ہو رہی ہوتی تو سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہید اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی یاد تازہ ہو جاتی۔ علماء کرام کے مجمع میں جب علمی نکات بیان کئے جا رہے ہوتے اس وقت خاندان ولی اللّٰہی کے درس کی کیفیات کا نقشہ سامنے آجاتا، اور جب اذکار و اشغال اور مراقبات کی تلقین جا رہی ہوتی۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے فیوض و برکات کے آثار نمایاں ہوتے، جب کبھی کوئی نو وارد حضرت کے ہاں مہمان بن کر آتا تو آدھی رات کے بعد اطراف و جوانب سے ذکر اللہ کی پیہم صدائیں سن کر اسے حضرتؒ کی تیاری پر شیخ کبیر شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اور شاہ ابوالمعالی قادری کی خانقاہوں کا گمان ہوتا۔ وسیع دستر خوان، کامل توکل و اور عالمگیر اخلاق و مروّت کو دیکھ کر حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین دہلویؒ کی خانقاہ کا سماں اہل بصیرت کی آنکھوں کے سامنے آجاتا غرضیکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس دَور کی ایسی جامع الصفات شخصیت تھی جس نے ہند و پاکستان کے المزاج اور مختلف الاستعداد مریدین و مسترشدین کی رائے پور کی خانقاہ میں بیٹھ کر تربیت فرمائی اور نصف صدی تک مشائخ سلاسل کی یاد کو تازہ رکھا اس مختصر تمہید کے بعد حضرتؒ کی زندگی کا ایک اجمالی نقشہ ذیل میں کھینچا جاتا ہے کہ مضمون میں شرح و بسط کی گنجائش نہیں ہے:

ولادت و خاندان

حضرتؒ کے آباء و اجداد کا اصلی وطن موضع تھوہا محرم خان ضلع کیمبل پور (مغربی پاکستان) ہے، حضرتؒ کے والد ماجد حضرت حافظ احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے تین بھائیوں کے ساتھ تھوہا محرم خان سے موضع ڈھڈیاں ضلع سرگودہا میں آکر آباد ہوئے، اس خاندان میں کئی پشتوں سے علم و تقویٰ چلا آرہا تھا۔ حضرتؒ کے تایا مولانا کلیم اللہؒ حضرت اخوند صاحبؒ سوات والوں کے خلیفہ تھے اور عوام میں ٹوپی والے کے نام سے مشہور تھے، حضرتؒ کے ایک دوسرے تایا مولانا محمد احسنؒ بہت بڑے عالم تھے اور علم کے ایسے شیدائی تھے کہ دینی کتب کے حصول کے لئے اگر اپنے گھر کا سارا اثاثہ بھی قربان کرنا پڑتا تو اس سے دریغ نہ فرماتے۔ حضرتؒ کے والد ماجد حضرت حافظ احمدؒ نے تمام عمر قرآن پاک کی خدمت کی، ہزاروں کو قرآن مجید کی تعلیم دی اور ساری عمر اپنے ہاتھ سے کاشت کاری کر کے طیّب و پاکیزہ روزی حاصل کی اور اس سے اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کی حضرتؒ کی ولادت موضع ڈھڈیاں میں ۱۲۹۵ھ کے قریب ہوئی۔

تعلیم و تربیت

حضرتؒ کے تایا مولانا کلیم اللہؒ کھیوڑہ ضلع جہلم میں رہائش رکھتے تھے، انہی کے پاس رہ کر حضرتؒ نے سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور فارسی کے چند رسالے انہی سے پڑھے، صرف و نحو کی کتابیں مولانا محمد رفیق صاحب بھاوُریاں ضلع سرگودھا والوں سے پڑھیں، مولانا محمد رفیقؒ قطب الارشاد حضرت رشید احمد گنگوہیؒ کے تلمیذ تھے۔ بعدہٗ علمائے سلف کی طرح رحلت کا مرحلہ پیش آیا اور شوقِ علم نے اپنے وطن اور اعزہ و اقارب کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا چنانچہ بچپن ہی میں تحصیلِ علم کے لئے ہندوستان کا لمبا سفر کیا اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے رام پور پہنچے کچھ عرصہ وہاں رہ کر درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر پانی پت، سہارنپور کے مقامات پر قیام کر کے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور منطق و فلسفہ میں مہارت حاصل کی۔ حدیث کی کتابیں مدرسہ

دہلی میں مولانا عبد العلیؒ سے پڑھیں، مولانا عبد العلی مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے شاگرد تھے، دہلی کے قیام کے دوران ہی بخاری وقت حضرت مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں حاضر ہو کر ترمذی شریف کے چند اسباق کی سماعت کی۔ بچپن ہی سے حضرتؒ کی طبیعت بہت قانع واقع ہوئی تھی، جہاں کہیں بھی رہے جو کچھ میسر آ گیا اسی پر قناعت کی، اساتذہ یا کسی اور دوست آشنا سے کبھی اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں حضرتؒ نے بڑی بڑی مشقتیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ خود فرمایا کرتے تھے "جب میں رام پور سے دہلی گیا تھا صرف ایک اکنی میرے پاس تھی، تمام راستہ پیدل طے کیا تھا، ٹکے کے چنے لے کر چبا لئے تھے اور ٹکہ کشتی والوں کو دے کر دریا عبور کیا تھا" حضرتؒ کے متعلقین سے یہ بھی سنا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں کئی کئی وقت کا فاقہ برداشت کر لیتے تھے لیکن کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ منطق و فلسفہ اور فقہ و حدیث کی تکمیل کے بعد حضرتؒ نے طب یونانی کی باقاعدہ تحصیل کی اور ضلع بجنور کے ایک قصبہ افضل گڑھ میں مطب بھی کیا، کچھ عرصہ بریلی اور دوسرے مقامات پر رہ کر قرآن و حدیث کا درس بھی دیا لیکن حضرتؒ کی بے چین طبیعت کسی حال میں بھی مطمئن نہ ہوئی۔ فرماتے تھے میرے والد ماجد چاہتے تھے کہ میں ایک بڑا مولوی اور واعظ بنوں لیکن میری طبیعت اس طرف نہیں چلتی تھی اور طبیعت میں ایک خلش تھی جو کہیں چین نہیں لینے دیتی تھی۔

تلاشِ حق علم کلام کی موشگافیوں اور منطق و فلسفہ کے مسلمات (AXIOMS) سے جب کسی طرح طبیعت کی خلش دور نہ ہوئی تو حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ کی کتاب "المنقذ من الضلال" کا مطالعہ کیا، اس سے متاثر ہو کر طبیعت نے یہ فیصلہ کیا کہ اندرونی خلش کا علاج اگر کہیں ہے تو صرف صوفیاء کرام کے پاس ہے اور صوفیہ کے بارے میں امام غزالیؒ ہی کی طرح حضرتؒ کے دل و دماغ میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ:

ان سیرتھم احسن السیر و طریقتھم اصوب الطریق و اخلاقھم ازکی الاخلاق بل لو جمع عقل العقلاء و حکم الحکماء و علم الواقفین علی اسرار الشرع من العلماء لیغیروا شیئًا من سیرھم و اخلاقھم و یبدلوہ بما ھو خیر منہ لم یجدوا الیہ سبیلاً و ان جمیع حرکاتھم و سکناتھم فی ظاھرھم و باطنھم مقتبسۃٌ من نور مشکوٰۃ النبوۃ ولیس وراء نور النبوۃ علی وجہ الارض نورٌ یستضاءُ بہ۔
(المنقذ من الضلال ص۳۲)

انہیں (صوفیہ) کی سیرت خوب تر ہے، انہیں کا راستہ زیادہ سیدھا ہے اور انہیں کے اخلاق زیادہ پاکیزہ ہیں، بلکہ اگر تمام عقلا کی عقلیں، سب حکماء کی دانائیاں اور علماء شریعت اور واقفانِ دین کے علوم اکٹھے کئے جائیں تب بھی اس قابل نہ ہوں کہ ان کے اخلاق و سیرت کے مقابلہ میں کسی اخلاق و سیرت کو پیش کر سکیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تمام حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے روشن ہیں اور نور نبوت کے علاوہ روئے زمین پر اور کوئی نور ہے ہی نہیں جس سے روشنی حاصل ہو سکے۔

(امام غزالیؒ کے تغیرِ حال اور نظامیہ بغداد کی صدارت کو چھوڑ کر تصوّف کے دامن میں پناہ لینے کا مفصل واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بڑے مزے سے اپنی مجالس میں بیان فرمایا کرتے تھے اور اس طرح "سِرِّ دلبراں" کو "حدیثِ دیگراں" کی صورت میں ظاہر فرماتے تھے)

آخر عنایت ربانی نے دستگیری فرمائی اور درس وتدریس کے مشاغل کو چھوڑ کر تلاشِ حق میں دیوانہ وار نکل کھڑے ہوئے اور ایک عرصہ تک سرگرداں رہے حتٰی کہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ کی خدمت میں پہنچے، بڑے حضرتؒ کو سلسلہ قادریہ نقشبندیہ[1] میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارن پوری سے اجازت وخلافت حاصل تھی، اور سلسلہ چشتیہ صابریہ اور نقشبندیہ میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے، اور اس وقت کوہ شوالک کے دامن قصبہ رائے پور میں نہر کے کنارے ایک باغ میں متوکلانہ گذران کرکے طالبین حق کی تربیت میں مصروف تھے۔ پہلی ملاقات میں ہی حضرت عالیؒ کے اخلاق کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے انہیں کا ہو رہنے کی تمنا کا اظہار کیا اور بیعت ہونے کی درخواست کی۔ اس وقت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بقیدِ حیات تھے، بڑے حضرتؒ نے حضرتؒ کو گنگوہ حاضر ہونے کا مشورہ دیا لیکن حضرتؒ نے عرض کیا کہ مجھے جناب ہی سے پوری مناسبت ہے میں اور کہیں جانا نہیں چاہتا فرمایا اچھا! اتنی کیا جلدی ہے استخارہ وغیرہ کرکے اپنی طبیعت کا اطمینان کرلیں۔ چنانچہ ذکر وغیرہ بتلاکر حضرتؒ کو رخصت فرمادیا۔ حضرت والا اپنے وطن تشریف لے آئے اور چند روز وطن میں قیام کرکے دوبارہ ہندوستان کا سفر کیا۔ اتفاق سے بھیرہ کے حکیم نورالدین سے کہیں ملاقات ہوگئی تھی چونکہ حضرتؒ کا ہم وطن تھا اس نے حضرت کو قادیاں آنے کی دعوت دی۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ میں ہندوستان جاتے ہوئے قادیان سے ہو کر گیا، وہاں حکیم نورالدین سے ملاقات ہوئی، اس وقت تک مرزا نے نبوّت کا دعوٰی نہیں کیا تھا اور اس کی خوشنما تحریروں کی وجہ سے ملک میں اس کا عام چرچا تھا، لیکن اس کے مریدوں کو دیکھنے کے بعد میرے دل میں یہ آتا تھا کہ میں نے پہلے جس شخص (حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ) کو دیکھا ہے حق تو اسی کے ساتھ ہے اگر وہ شخص حق پر نہیں ہے تو پھر دنیا میں

---

[1] حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ رائے پوری۔ اصل وطن موضع تگری ضلع انبالہ ہے۔ بعد میں موضع رائے پور ضلع سہارن پور سکونت اختیار کرلی تھی۔ اپنے زمانہ کے اولیاء کبار میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شورٰی کے ممبر اور حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص تھے۔ شیخ الہندؒ کے حج پر جانے اور اسارتِ مالٹا کے زمانہ میں ان کی چلائی ہوئی تحریک کی سرپرستی اور قیادت انہی کے ذمہ تھی۔ پہلے شاہ عبدالرحیم سہارن پوریؒ سے بیعت ہوئے۔ اور سلسلہ قادریہ میں ان سے خلافت ملی اور ساری عمر یہی نسبت غالب رہی۔ بعد میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے اور دو چار بڑے خلفاء میں شمار ہوئے۔ (تذکرہ مشائخ دیوبند از مفتی عزیز الرحمٰن)

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر قدس سرہٗ نے بیعت ہونے کے لئے خط لکھا تو تحریر فرمایا ——— "حدیث میں آتا ہے المستشار مؤتمن۔ میں آپ کو لکھتا ہوں کہ میں کوئی چیز نہیں ہوں آپ میں تو طلب ہے مجھ میں یہ بھی نہیں احضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی طرف رجوع کریں"۔ طالبِ صادق نے اس کے جواب میں مکرر لکھا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو جو کچھ ملا حضرت گنگوہیؒ سے ملا۔ مگر میرا رجحان آپ کی طرف ہے

میری طرف سے اگر مہمانداری کی فکر ہے تو میرے حقوق حضرت کے ذمہ نہیں ہیں۔ میں اپنے طعام و قیام کا خود ذمہ دار ہوں"۔ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ یہ خط دیکھ کر بہت خوش ہوئے لوگوں کو یہ خط دکھایا اور فرمایا ـــــ دیکھو یہ ہیں طالب۔ اخیر کے رمضان میں دونوں وقت کا کھانا چھوڑ دیا تھا۔ رات کا کھانا تو رمضان میں پہلے بھی نہ کھاتے تھے۔ ساری رات صبح تک قرآن مجید سنتے صبح سحری کے وقت سادی چائے کا ایک گھونٹ اور بالکل ذرا سا ایک نوالہ چپاتی کا سنت کی خاطر اور نواب کی خاطر کھا لیتے مولانا شاہ عبدالقادرؒ جو خدمت کرتے تھے تین چار روز تک عرض کرتے رہے کہ حضرت کچھ نہ کچھ تو تناول فرمایا کریں اس طرح ضعف بہت بڑھ جائے گا۔ تیسرے چوتھے روز فرمایا ـــــ مولوی صاحب! اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذائقہ نصیب فرما دیا ہے اس کھانے کی ضرورت نہیں۔ (سوانح حضرت شاہ عبدالقادرؒ ابوالحسن علی ندویؒ)

موت کا بہت شوق تھا بڑے ذوق سے فرمایا کرتے کہ اگر اللہ تعالیٰ وہ وقت نصیب فرمائے۔ سنت کے مطابق تجہیز و تکفین کرنا ـــــ ایک دن فرمایا کوئی عمل تو ہے نہیں خبر نہیں موت کا شوق کیوں ہے۔

نکاح بیوگان کے سلسلہ میں بہت کوشش کرتے تھے۔ خود اپنا نکاح بیوہ سے کیا۔ صاحبزادہ عبدالرشید کا انتقال ہو گیا تو بہو کو سمجھایا کہ دوسرا نکاح ضرور کرنا چاہیئے۔ پھر عبدالرشید کے خسر کے پاس گئے اور اس کو بھی سمجھایا۔ عبدالرشید کا نام آنے پر وہ رونے لگے تو فرمایا ـــــ حاجی عبدالعزیز! رونے کا مقام ہے یا ہنسنے کا؟ آج خدا نے وہ دن نصیب فرمایا ہے کہ اس کے محبوبؐ کی مردہ سنت ہم ناکارہ گنہ گاروں کے ہاتھوں زندہ ہو یہ سخی کی نچھاور کا وقت ہے کہ اتفاق سے میسر آگیا ہے، پس لوٹ لو جتنا لوٹنا ہے نہ ہوتا عبدالرشید پیدا یا نکاح سے قبل ہی مرجاتا تو ہم کیا کرتے اور کیوں کر یہ نعمت پاتے ـــــ بہو کا دوسرا نکاح ہوا اور خود بھی اس میں شریک ہوئے حالانکہ اپنے بیٹے عبدالرشید کے نکاح میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے احباب کو بھیج دیا تھا۔ (تاریخ مشائخ دیوبند)

وفات سے قبل حضرت مولانا شاہ عبدالقادر قدس سرہٗ کو بلایا اور جو روپیہ ان کے پاس لنگر کے خرچ کا تھا سارا تقسیم کردیا۔ تاکہ ترکہ نہ بنے۔ (سوانح حضرت رائے پوریؒ)

حضرت مولانا محمد عبداللہ دھرم کوٹیؒ کی روایت ہے کہ اپنے جسم پر جو کپڑے تھے وہ بھی وفات سے قبل حضرت ہی کی ملک کر دئے اور فرمایا ـــ کہ اب میں تم سے مستعار لیتا ہوں مجھے شرم آتی ہے کہ اپنے اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ کسی چیز کی ملکیت کی نسبت میری طرف ہو۔

حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارن پوریؒ نے خواب دیکھا کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہے ـــــ بدحواس ہو کر رائے پور پہنچے تو دیکھا کہ آخری سانسیں جاری ہیں۔ اپنے پیچھے تین خلیفہ چھوڑے جو تینوں کے تینوں رشد و ہدایت کے آفتاب تھے۔ ۲۶ ربیع ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو وفات پائی اور رائے پور ہی مدفون ہوئے۔

۱؎ حضرت مولانا اللہ بخش بہاولنگری۔ ۱۰ رجب ۱۳۵۳ھ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء ۲؎ حضرت منشی رحمت علیؒ جالندھری ۲۱ جمادی الآخر ۱۳۵۱ھ۔
۳؎ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ۔

حق کہیں موجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں سے بھاگا اور سیدھا رائے پور پہنچا، حضرتؒ نے بیعت فرمایا اور ذکر اذکار کی تلقین فرمائی، فرماتے تھے، ایک روز میرے حضرتؒ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا پیچھے بھی کوئی ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں میرے والدین ہیں، بھائی بہن اور رشتہ دار موجود ہیں فرمایا اوہو! میں تو چاہتا تھا کہ زندگی کے دن اکٹھے ہی گذاریں گے! عرض کیا حضرت! میں ایسے ہی ہوں جیسے کسی کا کوئی نہ ہو۔ اگرچہ میرے سب رشتہ دار موجود ہیں لیکن میں نے سب سے یکسو ہو کر حضرت ہی کا ہو رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ سن کر حضرتؒ نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا"

ریاضت و مجاہدہ

رائے پور کی خانقاہ کے قیام کے دوران میں حضرتؒ نے بڑا مجاہدہ کیا، طالب علمی کے زمانے کے مصائب جھیلنے سے پہلے ہی بہت کچھ تزکیۂ نفس ہو چکا تھا۔ اب شیخ طریقت کی رہبری میں سلوک کی باقاعدہ منزلیں طے کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ بڑے حضرتؒ بالکل متوکلانہ گذران کرتے تھے اور رائے پور کی خانقاہ کا وہ زمانہ نہایت عسرت کا زمانہ تھا، عام طور پر مکی، باجرے یا چنے کی خشک روٹی کھانے کو ملتی تھی حضرتؒ فرماتے تھے "روٹی پکانے والے نہایت لاپرواہی سے روٹی پکاتے تھے اور کچی پکی جیسی مل جاتی ہم اسی پر گزارہ کر لیتے، ایک بار خیال آیا کہ حضرتؒ سے اس کی شکایت کریں لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں حضرتؒ یہ نہ فرمادیں کہ یہاں تو یہی کچھ ہے اگر اچھی روٹی کھانی ہے تو کہیں اور تشریف لے جائیے یہ سوچ کر خاموش ہو گئے" متواتر کئی سالوں تک خشک روٹی کھانے اور اس کے ساتھ ساتھ پہروں ذکر بالجہر کرنے کی وجہ سے حضرتؒ کو مختلف اقسام کے امراض لاحق ہو گئے جن کا اثر آخری دم تک رہا لیکن ہمیشہ صبر واستقامت کے ساتھ یادِ حق اور خدمت شیخ میں مصروف رہے۔ ذکر اذکار کے ساتھ ساتھ بڑے حضرتؒ کی خدمت بھی حضرتؒ ہی کے ذمے تھی اور رات دن میں آرام کرنا بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ فرماتے تھے "پہلے پہل جب میں رائے پور گیا میرے پاس کوئی بستر نہیں تھا۔ سردیوں کا موسم آیا تو میں نے خانقاہ کے چھپر کے ایک کونے کو صاف کر کے اپنے لئے سونے کی جگہ بنائی اور ایک پھٹا پرانا کمبل کہیں سے دستیاب ہو گیا جس کو میں نے دھو کر صاف کر لیا، اسی کو میں آدھا نیچے بچھا لیتا اور آدھا اوپر اوڑھ لیتا تھا"

ان تمام مرحلوں کو حضرتؒ نے بڑی خندہ پیشانی سے طے کیا اور کبھی کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے بڑے حضرتؒ کی توجہات بھی ہمیشہ حضرتؒ پر مبذول رہیں اور آخری دم تک حضرتؒ سے راضی رہے۔ بوقت وصال حضرتؒ کو اپنا خلیفہ وجانشین بنایا اور رائے پور قیام رکھنے کی تلقین فرمائی۔

مسند ارشاد پر جلوہ افروزی

چودہ پندرہ سال مسلسل حضرت عالی کی خدمت میں رہ کر اور سخت مجاہدات کر کے سلوک کی انتہائی منزلیں طے کیں اور چاروں سلسلوں کے فیوض وبرکات حاصل کئے، چونکہ بڑے حضرتؒ پر نسبت نقشبندیہ قادریہ کا غلبہ تھا اس لئے حضرتؒ بھی اسی رنگ میں رنگے گئے آخر ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ کو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا اور حضرتؒ مسند ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور پورے پینتالیس سال تک رونق تلقین وارشاد کا باعث بنے رہے۔ ابتداء میں حضرتؒ کو بڑی مشکلات کا سامنا ہوا لیکن فضل خداوندی نے ہر حال میں دستگیری فرمائی اور کبھی پائے استقامت

آئی۔ فرماتے تھے "حضرت عالی کے وصال کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ قوتِ لایموت حاصل کرنے کے لئے کر سہارن پور جا کر بیچ آیا کروں گا اور اپنے کام میں مشغول رہوں گا لیکن الحمد للہ کہ ایسی نوبت کبھی نہیں آئی کے فضل سے ہمیشہ غیب سے روزی کے تمام سامان مہیا ہوتے رہے۔"

سینتالیس سال کے اس عرصہ میں دنیا میں سینکڑوں انقلابات رونما ہوئے، اسلامی ممالک کے حصے بخرے ہوئے، ی شہنشاہیت کا نہ غروب ہونے والا سورج آخر غروب ہو گیا، برصغیر پاک و ہند نے برطانوی سامراج کی غلامی سے رہائی، بیسیوں مذہبی و سیاسی تحریکیں چلیں، بہی خواہانِ ملک نے ہزاروں رنگ بدلے، دردمندانِ قوم نئے نئے اور طرح طرح کے لباسوں میں ظاہر ہوئے۔ نام نہاد مشائخ و سجادہ نشینان نے عوام کو خوب خوب بیوقوف ر دنیا کو لوٹا مگر واہ رے پیکرِ صدق و اخلاص کہ کبھی بھولے سے بھی شہرت و ناموری کی خواہش نہیں کی اور دنیا کے بات کو عمر بھر نظرِ التفات سے نہیں دیکھا۔ دنیا کی کوئی چیز حتیٰ کہ استعمالی پارچات تک کبھی اپنی ملکیت میں نہیں رکھنے دنیا لِ دنیا سے بے غرض ہو کر اپنے مالک کے آستانہ پر جس توکل و تبتل کے ساتھ سر رکھا تھا ہمیشہ اسی طرح رکھے ، اور بزبانِ حال یہ کہتے رہے ؎

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے　　　یہ میری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

عمل و اخلاص سے خُلقِ محمدی کو دُنیا میں عام کیا اور اشاعت و ترویج میں ہر ممکن کوشش کی، سینکڑوں علماء کو نی منازل طے کرائیں، لاکھوں مسلمانوں کو فسق و فجور اور بدعات سے توبہ کرائی۔ علاوہ ازیں ہر طبقہ کے لوگوں دباریوں، ملازموں، ادیبوں، شاعروں، مقرروں اور سیاستدانوں کو اپنے اخلاق و محبت سے اپنا گرویدہ بنائے اور ہر ایک کی استعداد کے مطابق سب کی اصلاح و تربیت فرماتے رہے، سیاسی لیڈروں کی اپنی خداداد سیاسی یرت سے رہنمائی فرمائی، جمعیۃ العلماء، کانگرس، احرار، مسلم لیگ اور دوسری مذہبی و سیاسی جماعتوں کے لیڈرں نازک مواقع پر نہایت مناسب ہدایات دیں جن پر عمل کرنے سے ملک و قوم کے حق میں نہایت مفید نتائج کا ظہور ا۔ کئی ایک دینی فتنوں کی روک تھام کی اور اہلِ حق و صداقت کی جلائی ہوئی شمع کو آخر دم تک روشن رکھا۔

مکارم اخلاق

حضرتؒ کے مکارم اخلاق کی پوری تصویر تو حضرتؒ کی مستقل سوانح حیات ہی میں مل سکتی ہے۔ یہاں حضرتؒ کے چند نمایاں اوصاف کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

عالی ظرفی اور عالمگیر مروّت

یوں تو حضرتؒ کے سارے ہی اخلاق و عادات خُلقِ محمدی کے پورے پورے آئینہ دار تھے لیکن سب سے نمایاں وصف جسے ہر کہ و مہ محسوس کرتا تھا حضرتؒ کی عالی ظرفی اور عالمگیر اخلاق و مروّت کا ہے جس کی بدولت حضرتؒ کے اندر ایک ایسی مقناطیسی کشش معلوم ہوتی تھی جو انسانوں کو بے اختیار کر کے اپنی طرف کھینچ لیتی تھی اور اپنا والہ و شیدا بنائے رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ کے متوسلین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہند و پاکستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو اور لاوہ حضرتؒ کے دامن سے وابستگی کا شرف　کو حاصل نہ ہو یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ کے متوسلین میں ہر قسم اور ہر قماش کے لوگ مل جاتے ہیں، حضرتؒ کی مجلس مبارک میں ہم نے بارہا متفاد

خیالات رکھنے والوں اور مختلف المزاج اشخاص کو ایک جگہ جمع دیکھا ہے۔ ایک ہی مجلس میں ایک طرف پکے لیگی بیٹھے ہیں اور دوسری طرف کٹر کانگرسی، ایک طرف احراری رہنماؤں کا حلقہ ہے اور دوسری طرف جمیعۃ العلماء کے مشائخ جلوہ افروز ہیں۔ احرار رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور کانگرس اور احرار کے مشہور لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ حضرت ہی کے دامن سے وابستہ تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے رہنما صوفی عبدالحمید صاحب (سابق وزیر زراعت پاکستان) کو حضرتؒ ہی کا خادمِ خاص ہونے پر ناز ہے۔ آزاد فتح پوری اور مولانا عبدالمنان دہلوی جیسے قادر الکلام شعراء اور مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے وسیع النظر ادباء کو حضرتؒ ہی کے آستانہ مبارک پر سرِ ارادت خم کرنے کا فخر حاصل ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارن پوری، استاذ العلماء مولانا محمد ابراہیم صاحب میاں چنوں والے، مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری، مولانا محمد صاحب انوری لائل پوری اور راقم کے استاذی حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب درخواستی جیسے مقدس و متقی علماء آپ کو حضرتؒ ہی کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان کے ساتھ ساتھ بدنام کنندۂ نکو نامان راقم السطور جیسے ننگِ اسلاف کو بھی آپ حضرتؒ کے دامنِ عفو میں پناہ لیتے ہوئے پائیں گے۔

بڑے بڑے مشائخ اور علماء، صلحاء اور حکماء کی سیرتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے عالی ظرف اور عالی استعداد جن کے ہاں ہر چیز کی سمائی ہو دنیا میں بہت ہی قلیل لوگ ہوئے ہیں۔ حضرتؒ کا معمول تھا کہ مجلس میں جس قسم کا کوئی آدمی آجاتا حضرت والا اُس سے اس کے مزاج اور افتادِ طبیعت کے مطابق ہی گفتگو فرماتے۔ راقم السطور کے آباؤ اجداد چشتی تھے اس لئے جب کبھی حاضر خدمت ہوتا حضرت رحمۃ اللہ علیہ مشائخ چشت کا تذکرہ فرماتے۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مشائخ کی دو خصوصیات ایسی ہیں جو انہی کا حصہ ہیں ایک تو عشق و محبت ہے اور دوسری جذب و فنائیت"۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں احقر نے اپنی کتاب "تذکرہ سلیمان تونسویؒ" کا ایک نسخہ حضرتؒ کی خدمت میں رائے پور شریف روانہ کیا تھا۔ حضرتؒ نے مجلس میں پڑھوا کر سُنا، جب آخری دورے میں پاکستان تشریف لائے اور راقم السطور حاضر خدمت ہوا تو فرمایا "مَیں نے آپ کی کتاب سُنی ہے ماشاء اللہ خوب لکھی ہے، پھر فرمایا "ہمارے تو سارے ہی بزرگ ہیں، خواجہ محمد سلیمان تونسوی، خواجہ شمس الدین سیالویؒ اور پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ سبھی کو ہم مانتے ہیں اور یہ سب نہایت سچے لوگ تھے"۔

بعض اوقات صاحب استعداد مریدین کی مخفی استعدادوں کو اجاگر کرنے کے لئے اُن کے کسی صحیح وصف کی جو واقعی ان میں پایا جاتا تعریف فرماتے اور اس طرح ان کو اپنے ساتھ جوڑ کر نہایت حکیمانہ طور پر ان کی تربیت فرماتے۔ مشہور ماہر نفسیات ڈیل کارنیگی نے اپنی مشہور عالم کتاب "میٹھے بول میں جادو ہے" میں لوگوں کو دوست بنانے کا ایک اصول یہ بھی لکھا ہے کہ "ہر شخص کی جائز تعریف کیجئے اور اسے دوست بنائیے"۔ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے تمام اصول جو علم الاخلاق کے ماہرین بڑی کدوکاوش کے بعد محض علمی طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں ہم کو عملی طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کے اسوۂ حسنہ میں مل جاتے ہیں لیکن افسوس کہ لوگ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کے دروازوں پر بھیک مانگتے جاتے ہیں جو خود اخلاق و عمل سے عاری اور اس معاملہ میں دوسروں کے محتاج ہیں اور جن کے پاس تھوڑا بہت جو کچھ

بھی ہے ہمارے ہی گھر (اسلام) سے مستعار لیا گیا ہے یا چرایا گیا ہے۔

سیاسی بصیرت، عالی دماغی اور سلامت فہم

حضرتؒ کا دوسرا نمایاں وصف حضرتؒ کی خداداد فہم و فراست، عالی دماغی اور سیاسی بصیرت کا ہے نصف صدی کی موجودہ اسلامی سیاست پر حضرتؒ بہت گہری نظر رکھتے تھے، اس دور کی تمام تحریکوں، سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کے متعلق ایسی جچی تلی رائے رکھتے تھے جس سے زیادہ معقول و مناسب رائے دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مدبر بھی قائم نہیں کر سکتا۔ زمانہ حال میں دنیا کے تمام اسلامی ممالک نے جن میں ابتدائی حالات کا سامنا کیا سب کی تاریخ حضرتؒ کے حافظہ میں پوری طرح محفوظ تھی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ، مسٹر محمد علی جناحؒ، پنڈت نہرو اور گاندھی وغیرہ اس دور کے بڑے سیاست دان مانے جاتے ہیں ان لوگوں نے کچھ تو اپنی ذہانت اور کچھ سیاسی تجربات سے سیاسی بصیرت حاصل کی۔ یہ لوگ عملاً سیاست کے میدانوں میں اتر کر ٹھوکریں کھانے اور نشیب و فراز کا تجربہ کرنے کے بعد مدبر بنے لیکن حضرتؒ نے دنیا سے الگ تھلگ خانقاہ کے ایک گوشے میں زندگی گذاری، نہ کبھی کسی ماہر سیاسیات کی شاگردی اختیار کی اور نہ کوئی سیاسی جماعت بنا کر کوئی عملی تجربہ کیا اس کے باوجود حضرتؒ کا ذہن سیاسی معاملات میں وہاں تک پہنچتا جہاں تک بڑے بڑے سیاستدانوں کے اذہان کی رسائی ناممکن ہے اور یہ نتیجہ ہے ریاضات و مجاہدات کے ساتھ ساتھ کامل اتباع سنّت کا جسے اگر کوئی چاہے تو علم لدنّی کا نام دے لے۔

حضرتؒ نے اپنی مومنانہ فراست سے ہمیشہ سیاسی زعماء کی رہبری فرمائی، جمعیتہ العلماء، مجلس احرار اسلام اور کانگرس وغیرہ کے بعض لیڈروں کو بروقت نہایت مفید اور قیمتی مشورے دئے گو خود عملاً سیاست کے میدان میں کبھی نہیں اترتے تاہم سیاسی معاملات میں ہمیشہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ہمنوائی کی اور بارہا فرمایا کہ "ہم تو حضرت مدنیؒ کے ساتھ ہیں"۔ حضرت مدنیؒ کو بھی حضرتؒ کے ساتھ ایسا اخلاص تھا کہ ہر اہم قدم اٹھاتے وقت حضرتؒ سے مشورہ لیتے اور اکثر حالات میں اس پر عمل کرتے۔

اس سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ حضرتؒ کی سلامتی فہم بھی اس درجہ کی تھی کہ کبھی فکری مبالغے سے کام نہیں لیا، جس چیز کا جو مقام و درجہ ہوتا اس کو اُسی درجہ میں رکھتے، نہ کبھی سیاسیات کے معاملے میں افراط سے کام لیا اور نہ کبھی عبادات و معاملات کے معاملہ میں تفریط سے، نہ کبھی عشق و محبت کے پہلو پر اتنی توجہ دی کہ دین کے دوسرے پہلوؤں سے بالکل اغماض ہی ہو جائے اور نہ کبھی خشک فقاہت ہی کو اتنا درجہ دیا کہ اخلاص و احسان اور ذوق و شوق کے جذبات بالکل مردہ ہو کر رہ جائیں۔ ایسی سلامتیٔ فہم صرف انبیاء کرام ہی کو نصیب ہوتی ہے جن کی پوری زندگی کانٹے پر تلی ہوئی ہوتی ہے یا پھر ان لوگوں کو جن کے قلوب و ارواح کو انبیاء علیہم السلام کے قلوب و ارواح سے پوری پوری مناسبت ہوتی ہے ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور ایسے جامع الصفات لوگ صدیوں کے بعد وجود میں آیا کرتے ہیں بقول اقبالؒ ؎

سالہا در کعبہ و بتخانہ مے نالد حیات   تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

الحمدللہ کہ ہمارے حضرتؒ کا شمار ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں ہے۔

فنائیت

حضرتؒ کا ایک تیسرا امتیازی وصف اپنے آپ کو بالکل مٹا دینے کا ہے، جن لوگوں نے اپنی حضرتؒ کے ساتھ بسر کی ہیں اُن کا بیان ہے کہ حضرتؒ کے کسی قول و فعل سے کبھی یہ ظاہر نہیں کہ حضرتؒ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں، تمام عمر میں کبھی بھولے سے بھی اپنی کسی خوبی یا وصف کا ذکر نہیں فرمایا حتیٰ کہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بھی کبھی کوئی بات بیان نہیں فرمائی جیسا کہ بعض بزرگ بعض مصالح کے پیشِ نظر اپنے خصوصی حالات بیان فرمادیا کرتے ہیں۔ جاننے اور پرکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ دل و دماغ کے ایک ایک گوشہ سے حبِ جاہ کو نکال حضرتؒ نے صدیقین کے مقام میں رسوخ حاصل کر لیا تھا ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

امتیازی کارنامے

مذکورہ بالا بے مثال اوصاف کے باوجود اور سینکڑوں طالبین حق کی اصلاح و تربیت اور ہزاروں گم گشتگانِ بادیۂ ضلالت کی رہنمائی و دستگیری کرنے کے علاوہ حضرتؒ کے چند ایسے امتیازی کارنامے بھی ہیں جن کا ذکر کرنا حضرتؒ کے سوانح نگار کا فرض ہے۔ اول یہ کہ تقسیم ملک کے بعد ملک کے دونوں حصوں میں ایک عام افراتفری اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی بالخصوص علماء دین پر ایک مایوسی و بددلی کی سی کیفیت طاری تھی، حضرتؒ نے انہی ایام میں ہند و پاکستان میں مسلسل دورے کر کے علماء کو تسلی و تشفی دی اور جگہ اور جس حال میں کوئی بیٹھا تھا اسی کو اسی جگہ اور اسی حال میں اللہ پر توکل کر کے کام کرنے کی تلقین فرمائی، اس سے علماء کی ہمتیں بڑھیں اور جگہ جگہ نئے دینی مدارس قائم ہوگئے، دیکھا دیکھی پرانے دینی مدارس کے بے جان و مردہ ڈھانچوں میں بھی زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس طرح اشاعت دین کا کام وسیع تر ہوگیا۔ دوسرے یہ کہ تقسیم ملک کے ساتھ ہی پاکستان میں چند پامال مذہبی فرقوں نے سر اٹھایا مرزائیت، شیعیت، عیسائیت اور بدعت کے علمبرداروں نے چاروں طرف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ حضرتؒ نے ایک طرف تو احرار رہنماؤں کو مناسب ہدایات دے کر ایک کام پر لگایا اور اس طرح مرزائیت کے بڑھتے ہوئے فتنے کا سدِباب ہوا ساتھ ساتھ دوسرے علماء سے شیعیت، عیسائیت، پرویزیت اور بہائیت وغیرہ کی تردید کروائی۔ دوسری طرف اہلِ قلم علماء سے باطل فرقوں کے رد میں کتابیں لکھوائیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے "قادیانیت" اسی سلسلہ میں لکھوائی جس کا علمی اور سنجیدہ حلقوں میں خاطر خواہ اثر ہوا۔ یہ ہیں حضرتؒ کے وہ کارنامے جن کی وجہ سے حضرتؒ نے اہلِ حق و صداقت کے دلوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے اور اب ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ؎

اولٰئك آبائی فجئنی بمثلهم　　　اذا جمعتنی یا جریر المجامع

وفات و جانشین

آخر یہ آفتابِ حکمت و ہدایت زندگی کی تقریباً نوے منزلیں طے کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا، ۱۴ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو لاہور کے مقام پر حضرتؒ کا انتقال ہوا جنازہ لاہور سے ڈھڈھیاں لایا گیا، نماز جنازہ لاہور، لائل پور، سرگودھا اور ڈھڈھیاں چار مقامات پر پڑھی گئی اور پنجشنبہ جمعہ کی درمیانی شب میں ڈھڈھیاں شریف کی مسجد کے پہلو میں سحری کے وقت دفن کئے گئے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

*

بحُوْنَ۔

رائے پور شریف میں حضرتؒ نے اپنی زندگی میں ہی مولانا عبدالعزیز صاحب گم تھلوی مدظلہ العالی کو اپنا جانشین
کردیا تھا، اِدھر ڈھڈھیاں میں حضرتؒ کے برادرِ خورد مولانا محمد خلیل صاحب مدظلہٗ اور ان کے صاحبزادے مولانا
جلیل صاحب اور حضرتؒ کے بھانجے مولانا حافظ عبدالوحید صاحب جو کہ حضرتؒ ہی کے تربیت یافتہ ہیں موجود
در حضرتؒ ہی کے نقشِ قدم پر چل کر لوگوں کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرتؒ کے بہت سے خلفاء
پاک و ہند میں موجود ہیں جن کے ذریعے حضرتؒ کے فیوض و برکات دنیا میں عام ہو رہے ہیں۔

احقر محمد حسین اللہی
بمقام چکوال۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء

مولانا سید ابوالحسن ندوی

رائے پور کے شب و روز

شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

انسانیت کی صحت گاہیں

جنھوں نے ہندوستان میں فقر و تصوف کی تاریخ پڑھی ہے۔ یا کبھی اس مقصد و ذوق کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جس طرح شیر شاہ سوری نے اپنی تاریخی شاہ راہ پر دور دور یہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کارواں سرائیں تعمیر کی تھیں۔ جہاں مسافر قیام کرتے، خوراک، حفاظت اور آرام کی جگہ پاتے اور راہ کی خستگی و ماندگی دور کرکے تازہ دم ہو کر سفر کرتے۔ اسی طرح فیاض دل اور فیاض رُوح درویشوں اور انسانیت کے چارہ سازوں نے زندگی کے تھکے ہارے مسافروں اور روایت کے تقاضوں سے پامال کئے ہوئے انسانوں کے لیے جن کو اپنے دل کی زندگی دم توڑتی اور رُوح کا شعلہ بجھتا نظر آتا تھا۔ ایسی پناہ گاہیں اور کارواں سرائیں بنائی تھیں جہاں کچھ دن ٹھہر کر دل کے چراغ کی لو نیا روغن اور روشنی پاتی۔ افسردہ قویٰ میں تازگی اور رُوح میں جلا پیدا ہو جاتی۔ غفلت اور مادیت کے مارے ہوئے اسلام کے پل صراط پر احتیاط و ثبات کے ساتھ چلنے کا عزم اور قوت پیدا ہوتی۔ قوی الارادہ اور صاحب عزیمت لوگوں کو ہمت محسوس ہوتی۔ فرائض کے پابند بنتے، غافل، ذاکر، نمازوں میں سستی کرنے والے شب بیدار بن جاتے، اسباب کے پرستار اور مادیت کے گرفتار جو مستقبل کے خوف اور فقر و فاقہ سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے اور تدبیر و وسائل کو رزاق حقیقی سمجھتے وہ "ایک درویش خدامست" کے توکل و تبتل کا منظر اور اللہ تعالیٰ کی مسبب الاسبابی دیکھ کر توکل کے مفہوم سے آشنا اور یقین کی دولت سے بہرہ یاب ہوتے۔

دہلی، نواحِ دہلی اور دوآبہ میں متعدد ایسی خانقاہیں اور رُوحانی تربیت کے مرکز تھے۔ جو پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے۔ دہلی کی ان خانقاہوں کے دور انقلاب کے بعد آخری دور میں گنگوہ اور تھانہ بھون کے روحانی و تربیتی مرکز مرجع خاص و عام بنے ہوئے تھے۔ پھر جب ایک اور انقلاب آیا اور سنت اللہ کے مطابق رشد و ہدایت کی یہ شمعیں بھی (اپنے مشائخ کی وفات کے بعد) خاموش ہو گئیں تو اسی سلسلۂ رُوحانی کی ایک خانقاہ رائے پور کی خانقاہ نہ صرف اس نواح بلکہ صوبہ جات متحدہ سے لے کر پنجاب تک کا رُوحانی و تربیتی مرکز بن گئی۔ ملک میں بڑے بڑے انقلاب آئے۔ بڑے بڑے طوفان اُٹھے اور آندھیاں چلیں، ملک تقسیم ہوا لیکن ان تیز و تند ہواؤں میں بھی یہ چراغ جلتا رہا۔ نہ رائے پور میں ذکر اللہ کی سرگرمی میں کوئی فرق آیا، نہ یہاں کے طریقہ اور موضوع میں کوئی تبدیلی ہوتی۔

ئے پور کی خانقاہ

رائے پور کی بستی[1] اور خانقاہ کے درمیان نہر حائل ہے بستی سے جانب غرب نہر کے کنارے کچھ فاصلہ پر وہ کوٹھی ہے جس میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس اللہ سرہٗ العزیز کا قیام تھا۔ اس سے جانب غرب مسجد اور مدرسہ کی پختہ عمارت یت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات تک یہی خانقاہ اور اسی کے گرد وپیش طالبین خدا کا قیام تھا۔ جب حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کے لیے ، محمد صدیق صاحب نے اپنے باغ میں جو مسجد سے مغربی جانب واقع ہے، نئی قیام گاہ تعمیر کرادی تو نئی خانقاہ وہیں منتقل ہوگئی[2]۔ اس کے سامنے چند چھپر ڈال کر ی کثرت کی وجہ سے چارپائیوں کا خاص اہتمام کیا گیا، حضرت کی ہمیشہ تاکید ہوا کرتی تھی کہ رات کو لوگ چارپائیوں پر ہی آرام کیا کریں اور نوافل بھی حتی الامکان کسی پڑھیں۔ جانب شمال ٹین کا ایک لمبا سائبان تھا اور ایک بڑا دالان اور برآمدہ اس طرح کثیر تعداد کے لیے رہائش اور بقدرِ ضرورت آسائش کا سامان تھا۔ گرمیوں ں میں رات بڑی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی۔ پہاڑ کے دامن اور جمنا کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے بڑی ٹھنڈی ہوا آتی خصوصاً شمالی ہوا بڑی خنک اور لطیف ہوتی ں بستروں اور لحافوں کا خاصا ذخیرہ تھا جو ایسے مسافروں اور طالبین کے کام آتا جو اپنا بستر نہ لاتے۔

عرصہ تک گنڈیور کے پل سے رائے پور کی خانقاہ تک کسی سواری کا انتظام نہیں تھا طالبین وزائرین عام طور پر نہر کی پٹڑی پر ۲½ میل کی مسافت پیادہ پا ، بالکل آخر زمانہ میں بہٹ سے (جو سہارنپور سے ۱۶ میل اور رائے پور سے ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور ایک مرکزی مقام ہے)۔ رکشے مل جاتے اور ام سے کار بھی آجاتی، ایک زمانہ میں سہارنپور سے بہٹ تک بھی آنے کے لیے تانگہ کے علاوہ کوئی سواری نہ تھی۔ بعد میں سہارنپور سے بکثرت لاریاں چلنے بہٹ یا گنڈیور کے پل پر اتار دیتیں۔ سواریوں کی دشواری ونایابی اور سواریوں کی کثرت وسہولت کے ہر دور میں طالبین صادق دور دور کی مسافت طے کر کے رق سے آتے اور ایک ایک وقت میں ذکر وتربیت کی نیت سے طویل قیام کرنے والوں اور مقیمین خانقاہ کے علاوہ) مہمانوں کی بڑی تعداد ہوتی۔

ئے پور کا نظام الاوقات

نظام الاوقات یہ تھا کہ رات کے پچھلے حصے میں بالعموم سب ہی جاگ جاتے اور طہارت و وضو سے فارغ ہو کر مشغول ہو جاتے بعض لوگ مسجد میں چلے جاتے اکثر وہیں چٹائیوں اور چارپائیوں پر نوافل ادا کرتے۔ پھر ذکر جہری یا مراقبہ میں مشغول ہو جاتے۔ اس وقت رات ، سناٹے اور جنگل کی اس خاموش فضا میں خانقاہ اللہ کے نام کی صداؤں اور ذکر کی آوازوں سے گونج جاتی اور حسب استعداد وتوفیق لوگ اس فضا ثر ہوتے اور سرور ومستی کی ایک عام کیفیت ہوتی۔ اس وقت ہر ایک آزاد اور اپنے حال میں مشغول ہوتا۔ کوئی کسی سے تعرض نہ کرتا۔

صبح صادق کے طلوع کے ساتھ ہی مسجد میں اذان ہو جاتی، اذان وجماعت کے مابین جو اچھا خاصا وقت ہوتا - چائے آجاتی۔ خانقاہ کے ناظم مطبخ حاجی ظفر الدین دجن کا خس پوش مکان یا جھونپڑا خانقاہ ہی میں جانب جنوب واقع ہے) ایسے سویرے وقت میں محض اپنے مختصر گھرانے کی مدد سے چائے کا انتظام اور سب کو فارغ کر دیتے۔ حضرت بھی جب تک چائے نوش فرماتے تھے۔ اسی وقت چائے سے فارغ ہو جاتے۔ پھر چائے کی بجائے دودھ کا معمول اسی وقت

---

[1] رائے پور شہر سہارنپور سے بجانب شمال ۲۳ میل پر واقع ہے۔ سہارنپور سے چکروتہ کو جو پختہ سڑک جاتی ہے۔ اس کے ۱۸ -- ۱۹ میل پر گنڈیور کے پل سے شمال ۴ میل پر رائے پور کی بستی آتی ہے۔ یہ راجپوت مسلمانوں اور مسلمان شرفاء کی بستی ہے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہٗ انہیں کے نواسے تھے۔ اور اپنے دادا نانہال سے آپ یہاں منتقل ہو گئے تھے اور اسی کو آپ کے روحانی فیوض کا مرکز اور مدفن بننے کا شرف حاصل ہوا۔

[2] وفات سے قریباً ڈیڑھ ایک سال پیشتر پھر آپ کا قیام حضرت کی سابقہ کوٹھی میں ہو گیا۔ اور مقیمین خانقاہ کی بڑی تعداد اس کے آس پاس مقیم ہو گئی۔ حضرت دس روپیہ ماہوار کے حساب سے کرایہ ادا کرا دیا کرتے تھے۔

پوچھنے کے لیے جاتے اور آکر صحیح صحیح وقت بتلاتے۔

مغرب کے بعد اہل خانقاہ نوافل و ذکر میں مشغول ہوجاتے۔ مغرب کے بعد کا یہ وقت زیادہ تر ان طالبین و سالکین کے لیے مخصوص تھا جن کو اپنے ذکر سلوک کے سلسلہ میں کچھ دریافت کرنا یا اپنی کسی خاص کیفیت و حالت کو عرض کرنا ہوتا۔ بالعموم ایسے حضرات پہلے سے عرض کرکے وقت مقرر کر والیتے اس وقت کسی دوسرے کی آمد نہیں فرماتے تھے۔ نہایت شفقت و کرم کے ساتھ حال دریافت فرماتے۔ توجہ سے بات سننے اور بڑے اہتمام سے اس کا جواب دیتے۔ اور رہنمائی فرماتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ یہاں کے قیام و اہتمام کا خاص موضوع اور حضرت کی مبارک زندگی کا خاص مقصد ہے۔ اسی وقت میں اکثر لوگ بیعت و توبہ سے بھی مشرف ہوتے عشاء کی اذان اول وقت ہوجاتی۔ معذوری اور ضعف کے زمانہ میں اس کا اہتمام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ عشاء کا وقت ہوتے ہی اذان ہوجاتی۔ آخیر زمانہ میں حضرت مغرب کے بعد ہی کھانے سے فارغ ہوجاتے، عام مقیمین خانقاہ اور مہمان عشاء کے بعد کھانا کھاتے۔ کھانے کے بعد جلد سونے کا عام اہتمام اور کوشش ہوتی۔ تاکہ رات کو اٹھنے میں آسانی ہو۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا نظام الاوقات بیان کرتے ہوئے حضرت کے ایک خاص متوسل لکھتے ہیں۔

"رات کو تقریباً دو بجے اٹھتے۔ تہجد، ذکر (نفی اثبات)، مراقبہ وغیرہ میں فجر تک مشغول رہتے تھے۔ فجر کی سنتیں خانقاہ شریف میں پڑھ کر مسجد میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں فرض فجر پڑھ کر سیر کے لیے (۳ میل ڈیڑھ میل جانا ڈیڑھ میل واپسی) نہر جمن غربی کے کنارے کنارے تشریف لے جاتے تھے۔ واپسی پر وضو کرکے پھر ذکر و مراقبہ وغیرہ میں مصروف رہتے حتیٰ کہ تقریباً ۱۰ بجے باہر تشریف لاتے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک طعام سے فراغت ہوتی۔ تقریباً ۱۲ بجے حضرت آرام فرماتے اور ڈیڑھ دو بجے کے قریب بعد دوپہر حضرت پھر اٹھ بیٹھتے، استنجا، طہارت و وضو سے فارغ ہوکر ظہر کی سنتیں خانقاہ شریف میں پڑھتے اور فرض ظہر مسجد میں ادا کرکے واپس تشریف لاتے اور پھر ذکر و مراقبہ میں مصروف ہوجاتے۔ بعض خدام نے حضرت کے کمرہ کے باہر کان لگا کر سنا تو حضرت کو نفی اثبات کا ذکر آہستہ آواز سے کرتے ہوئے سنا۔ اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ذکر لسانی صرف ایک ذریعہ ہے۔ مقصود نہیں ہے۔ مقصود محض یاد ہے۔ اگر یاد نصیب ہوجائے تو ذکر لسانی چھڑا دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ یہ بھی فرمایا تھا کہ لقا کے بعد بھی ترقی عبادات سے ہی ہے، یعنی قرآن پاک کا پڑھنا، ذکر الٰہی کرنا، اس سے ہی ترقی ہے۔ خاموش بیٹھنے اور محض تدبر سے نہیں۔ غرضیکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ عصر کے وقت تک اسی طرح مصروف رہتے۔ عصر کی نماز کے بعد عام مجلس ہوتی۔ حضرت عموماً خاموش رہتے، لیکن جب کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب مفصل اور مکمل بسط سے عنایت فرماتے جس سے سامعین کی اور سائل کی مکمل تسلی ہوجاتی۔ مجھے ایک بھی واقعہ ایسا یاد نہیں جس میں کسی سائل نے سوال کیا ہو اور حضرت کے جواب سے اس کی یا دیگر سامعین کی تسلی نہ ہوئی۔ مغرب کی نماز کے بعد عشاء تک کا وقت ان سالکین کے لیے مخصوص تھا جو علیحدگی میں کچھ عرض کرنا چاہیں۔ عشاء کے بعد کھانا تناول فرماکر حضرت آرام فرماتے تھے اور تقریباً ۴، ۵ گھنٹے آرام کے بعد اٹھ بیٹھتے تھے"۔

"———— زہد و توکل، اخلاص بات بات سے عیاں تھی۔ کوئی چاہے کتنا ہی امیر ہو۔ حضرت کے دربار میں بچھی ہوئی چارپائیوں کے سرہانے کی طرف نہیں بیٹھ سکتا۔ امراء پائنتی کی طرف ہی بیٹھتے تھے اور علماء کرام کے لیے سرہانے کی طرف مخصوص تھی"[1]

کتابوں کی خواندگی کا سلسلہ

رائے پور کی خانقاہ کی ایک بڑی خصوصیت جو باہر کے جانے آنے والے کو محسوس ہوتی اور جو حضرت کے ایک خاص ذوق اور تقاضائے طلبی کا نتیجہ تھا۔ مجلس عام میں ان مفید و منتخب دینی کتابوں اور مواعظ پڑھنے کا سلسلہ تھا۔ جو

جو زندگی کے آخری برسوں میں حضرت کے یہاں کا ایک ضروری معمول اور ایک وظیفہ اور خانقاہ کی زندگی کا لازمہ سا بن گیا تھا۔ اس پابندی تسلسل اور اہتمام کے ساتھ کسی خانقاہ یا دینی مرکز میں کتابوں کے سننے اور پڑھے جانے کا رواج نہیں دیکھا۔

کئی برس سے یہ معمول ہو گیا تھا کہ عصر کی مجلس میں جو خانقاہ اور حضرت کے یہاں کی سب سے بڑی عمومی اور وسیع مجلس ہوتی تھی، کوئی ایک قابل اعتماد منتخب دینی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی۔ سردی گرمی، تندرستی، بیماری کسی معزز و ممتاز مہمان یا کسی جلیل القدر عالم کی آمد کے موقعہ پر بھی اس میں تخلف نہ ہوتا۔ جو کتابیں اس مجلس میں زیادہ تر پڑھی گئیں وہ حسب ذیل ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی تصنیفات عام طور پر بخصوصیت کے ساتھ خصائل نبوی اور کتاب ہائے فضائل بار بار اور مکرر سہ کرر پڑھی گئیں حضرت نے کئی بار فرمایا کہ ان کتابوں میں بڑی نورانیت ہے۔

واقدی کی فتوح الشام کا ترجمہ، تاریخ دعوت و عزیمت کا پہلا حصہ بار بار اور دوسرا حصہ ایک دو بار اور تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کئی بار پڑھا گیا۔ سیرت سید احمد شہیدؒ بھی (مطبوعہ و قلمی) لاہور، ولائل پور کے قیام میں پڑھی گئی۔ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی مقبول کتاب سیرۃ رحمۃ اللعالمینؐ کے تینوں حصے بڑے ذوق اور توجہ سے سنے اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

شیخ کی کتابوں کے علاوہ سب سے زیادہ جو کتابیں پڑھی گئیں۔ وہ دو تھیں۔ مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصوم تلخیص و ترجمہ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی (مطبوعہ مکتبۃ الفرقان لکھنؤ) اور حضرت سیدنا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ ترجمہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، اول الذکر کتاب بار بار رائے پور میں مولانا عبدالمنان صاحب[1] نے سنائی اور آخر الذکر مہینوں رائے پور اور لاہور کے آخری قیام اور مرض وفات میں آزاد صاحب[2] نے پڑھی اور حضرت نے بار بار بڑے جوش کے ساتھ اس پر اپنے قلبی تاثر کا اظہار فرمایا۔ اس کی تصدیق فرمائی اور لوگوں کو متوجہ کیا اور آپ پر رقت طاری ہوئی۔

ان کتابوں کے علاوہ جن کے متعلق کہنا مشکل ہے، کہ کتنی بار پڑھی گئیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی تاریخ و سیر کی کتابیں، سیرت کے مختلف مجموعے، مولانا محمد منظور نعمانی کی کتابیں جو رد اہل بدعت اور مسلک دیوبندی کے دفاع میں ہیں۔ بڑے شوق اور دلچسپی سے سنی گئیں اور مولانا کو اس سلسلہ کے جاری رکھنے کی ہدایت بھی فرمائی۔

عصر کی نماز کے بعد سے مغرب کی اذان تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ بعض اوقات اذان سے چند منٹ قبل بند ہوتا۔ بعض مرتبہ بند ہونے پر دریافت فرماتے کہ کیوں خاموش ہو گئے۔ قاری پھر پڑھنا شروع کر دیتا۔ کتاب شروع ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا کہ حضرت عالم استغراق میں چلے گئے ہیں۔ کبھی کبھی متوجہ ہو کر فرماتے۔ کیا فرمایا؟ یا پھر پڑھو۔ ورنہ بالعموم آپ پر سکوت و استغراق طاری رہتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوگوں کے نفع اور ان کو مشغول رکھنے کے لیے اور ان کی مشغولیت کی حالت میں خود مشغول ہونے کے لیے یہ سلسلہ جاری فرماتے تھے۔

کسی زمانے میں اس معمول میں اتنی ترقی اور انہماک ہو جاتا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو کتاب سنے بغیر چین نہیں آتا۔ بھٹ ہاؤس سہارنپور کے قیام میں دیکھا گیا کہ نماز فجر کے بعد جو آرام فرمانے کا معمول تھا۔ اس سے بیدار ہو کر فوراً آزاد صاحب کی طلبی ہوتی۔ فتوح الشام یا صحابہ کرام کے حالات کی کوئی کتاب پڑھنے

---

[1] حضرت کے خادم خاص دوا، غذا، ڈاک کے مہتمم اور سفروں کے رفیق خاص، تقریباً ۱۹ سال حضرت کی خدمت میں رہے اور اسی خدمت میں رہے اور اس خدمت کے لیے ہندوستان گیر شہرت اختیار کی۔ گوجرانوالہ پنجاب کے رہنے والے اور مدرسہ مظاہر العلوم کے فارغ ہیں۔

[2] سید مسعود علی نام، حکیم سید محمود علی صاحب فتح پوری کے فرزند اخیر زمانہ میں (جب سے حضرت کو مسجد تشریف لے جانے سے معذوری ہوئی) خانقاہ اور حضرت کے امام الصلوٰۃ

حکم رہتا آزاد صاحب کسی ضرورت سے اٹھتے تو دوبارہ ان کی طلبی اور تلاش ہوتی۔ خاموش ہوتے تو فرمایا جاتا کہ کیوں خاموش ہوئے۔ کھانا کے نے تک جو ہمیشہ ۸½ ۹ بجے آجاتا، یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس میں انقطاع یا توقف یا ناغہ آپ کو گوارا نہ تھا۔ ان کتابوں کے ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ راقم سطور نے اکتوبر ۱۹۶۰ء میں اپنے وطن رائے بریلی سے اطلاع دی کہ تاریخ دعوت وعزیمت کے تیسرے حصہ کے سلسلہ میں حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ مرتب ہو گیا ہے۔ اس خط کے کچھ عرصہ بعد رائے پور حاضری ہوئی مصافحہ کے ساتھ ہی کتاب کا مسودہ طلب فرمایا اور اسی وقت پڑھنے کا حکم ہوا۔ ظہر کے بعد سے عصر تک اور عصر کے بعد مغرب تک برابر یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کبھی کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے لالٹین جلا کر کتاب پڑھی جاتی۔ جب تک کتاب ختم نہیں ہو گئی۔ کوئی دوسرا کام ان وقتوں میں نہیں ہوا۔

ڈاک

اخیر زمانہ حیات میں ظہر کے بعد (جب تخلیہ کا معمول تھا) تو تخلیہ کے بعد اور جب یہ معمول نہیں رہا۔ تو ظہر کے بعد، ڈاک سنی جاتی، اخیر زمانہ میں اسی وقت اخبارات کے سننے کا بھی معمول ہو گیا۔

بیعت کا سلسلہ

آرام وطعام اور نماز وغیرہ کے علاوہ بیعت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا، بالعموم جانے والے فجر کی نماز یا ظہر کی نماز کے بعد بیعت ہو جاتے۔ اسی وقت مسافر رخصت ہوتے۔ مغرب کے بعد بالعموم بیعت کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اکثر بیعت کرنے والوں کی کثرت سے کسی چادر یا دستار کو تھام کر بیعت ہونے کی نوبت آتی۔ اخیر دنوں میں تو یہ سلسلہ بہت وسیع اور طویل ہو گیا تھا اور ایک ایک وقت سیکڑوں آدمی بیعت ہوتے۔ اور کئی کئی آدمی بیچ بیچ میں کھڑے ہو کر مکبرین کی طرح توبہ کے الفاظ دہراتے اور بیعت کرنے والے ان کو ادا کرتے [1]

ختم خواجگان

حضرت کی زندگی کے آخری ۵، ۲ سال ختم خواجگان کی بڑی پابندی رہی۔ رائے پور قیام ہو یا پاکستان یا کہیں اور، بالعموم فجر یا ظہر کی نماز کے بعد آزاد صاحب کے اہتمام میں ختم خواجگان ہوتا [2]

ختم کے آخر میں آزاد صاحب طویل دعا فرماتے۔ جس میں تعلق رکھنے والے مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور جن لوگوں نے فرمائش کی ہوتی۔ ان کی کاربرآری اور مقاصد کے لیے اجتماعی دعا ہوتی۔

رائے پور کی فضا

رائے پور میں ہر وارد و صادر کو سب سے پہلے جو چیز متوجہ کرتی تھی وہ ذکر کی کثرت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پتہ پتہ سے اللہ کے نام کی آواز اور ذکر کی صدا آرہی ہے۔ دن اور رات کے کم اوقات ذکر کی آواز سے خالی نظر آتے۔ رائے پور کی فضا اور حضرت کے دامن عاطفت میں کم استعداد سے کم استعداد آدمی کو یہ بات محسوس ہوتی کہ سکون واطمینان کی ایک چادر پوری فضا اور ماحول پر تنی ہوئی ہے۔ وہاں پہنچ کر ہر غم غلط اور ہر تردد اور فکر فراموش ہو جاتی تھی۔ اہل نظر و اصحاب بصیرت کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات نقشبندیہ کی نسبت سکینت ہے۔ جو پورے ماحول پر محیط اور غالب ہے۔ اس میں حضرت سے جتنا قرب ہوتا۔ اتنا ہی اس کیفیت واحساس میں قوت پیدا ہوتی۔ گویا مرکز سکینت وہ ذات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفس مطمئنہ اور یقین و رضا کی دولت سے نوازا ہے۔

رائے پور کے پورے ماحول اور گرد وپیش پر ضبط وتحمل وقار وسکینت اور خاموشی کی فضا طاری رہتی اور یہ آپ کے ضبط وتحمل، عالی ظرفی اور نسبت کا رنگ تھا لیکن کبھی کبھی وجد وشوق اور سرور ومستی کی وہ کیفیت جس کو ضبط وتحمل اور تمکین نے مغلوب کر رکھا تھا۔ اپنے وجود کا احساس دلا دیتی اور پر وقار اور عالی ظرف دریا کی کوئی

---

[1] پاکستان کے آخری سفر کے موقع پر اس میں بہت زیادہ وسعت اور بیعت کرنیوالوں کا ہجوم ہو گیا تھا۔ اس کی تفصیل (پاکستان کا آخری سفر کے ذیل میں ملاحظہ ہو)

[2] یہ ختم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہ کے زمانہ سے معمول بہ ہے، ترکیب یہ ہے کہ پہلے تمام شرکائے ختم دس دس مرتبہ درود شریف پڑھیں اس کے بعد سب مجموعی طور پر ۳۱۰ بار لاملجاء ولا منجاء من اللہ الا الیہ، پھر ۳۶۰ بار الم نشرح مع بسم اللہ، پھر لاملجاء ولا منجاء من اللہ الا الیہ [illegible]

کوئی موج ساحل سے آکر ٹکرا جاتی اور نسبت چشتیہ اپنا رنگ دکھاتی۔ کبھی کبھی آپ خود مولوی عبدالمنان دہلوی کو (جن کو اللہ نے درد وسوز وخوش الحانی بھی عطا کی ہے اور انکو عربی فارسی اردو کے بکثرت شعر یاد ہیں) یا آزاد صاحب کو جو سخن شناس بھی ہیں اور سخن سنج بھی اور ان کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی ہے۔ طلب اور خواجہ حافظ امیر خسرو حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کی کوئی عاشقانہ یا عارفانہ غزل پڑھوا کر سنتے اور عجب کیف وسرور پیدا ہو جاتا۔ مولوی عبدالمنان صاحب اکثر حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے:۔

؎ بے کار و یا کارم چو مدبہ حساب اندر		گویا نم و خاموشم چوں خط بکتاب اندر

اور قصیدہ بانت سعاد وغیرہ عربی، فارسی، اردو کے اشعار سنتے۔ نیز خواجہ حافظ رح اور امیر خسرو کی متعدد غزلیں پڑھی گئیں۔
کبھی کبھی طلوع صبح سے پہلے کسی ذکر کرنے والے نے ذوق وشوق میں آکر خواجہ حافظ کی یہ غزل پڑھنی شروع کر دی تو مناسب حال ہونے کی وجہ سے اس معنویت اور تازگی پیدا ہو گئی۔ ؎

من کہ باشم کہ در آں خاطر عاطر گزرم	٭	لطفہا می کنی اے خاک درت تاج سرم
اے نسیم سحری بندگی ما برساں	٭	کہ فراموش مکن وقت دعائے سحرم
بنم بدرقہ راہ کن اے طائر قدس	٭	کہ دراز است رہ مقصد ومن نو سفرم

لیکن بہت جلد پھر محفل اور ماحول پر ضبط وتحمل اور سکینت کی فضا طاری ہو جاتی اور سب اپنے اپنے کام میں لگ جاتے اور معلوم ہوتا کہ جام شریعت سے یہ سندان عشق کی عارضی کار فرمائی تھی۔ پھر دور جام چلنے لگا۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق؎

ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

ایک حاضر خانقاہ اپنا ایک واقعہ سناتے ہیں۔
"ایک دفعہ خیال آیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ بزرگوں کی مجلس میں حال ہو جاتا ہے۔ مگر میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔ یہ میرے قیام کا اخیر دن تھا۔ دوسرے روز واپسی تھی۔ اب کے بعد جب ذکر میں بیٹھا تو بیٹھتے ہی عجب حالت شروع ہو گئی۔ گریہ اور محویت اور توجہ الی اللہ ایسی کہ اللہ تعالیٰ سامنے ہے اور حضرت میرے جانب ہیں اور تسلی فرما رہے ہیں۔ تمام ذاکرین پر عجب حالت طاری تھی۔ اس حالت میں میں نے ذکر بڑی رقت سے پورا کیا اور آخر مجبوراً چھوڑ کر حاضر خدمت ہوا۔
راؤ عطاء الرحمان خان نے عرض کیا کہ حضرت آج تو عجب حالت تھی۔ آزاد صاحب نے توقوالی ہی شروع کر رکھی تھی لے۔ آپ نے فرمایا۔ اوہو لا حول ولا قوۃ الا باللہ بس تمام حالت دگرگوں ہو گئی ۲"

آزاد صاحب سے اکثر ان کے والد کی نظم فرمائش کر کے سنتے۔ اور جب آزاد صاحب اپنے مخصوص انداز میں پڑھتے۔ تو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں سامنے پھر جاتا اور سناٹا چھا جاتا۔ نظم کا مطلع یہ ہے۔

؎ یہ سرائے دہر مسافرو! بخدا کسی کا مکاں نہیں!
جو مقیم اس میں تھے کل، یہاں کہیں آج انکا نشاں نہیں

لے یعنی ذکر کے ساتھ شوق انگیز اشعار پڑھ رہے تھے		۲ے تحریر صوفی غلام فرید صاحب ساکن سجادیاں۔

رائے پور کا رمضان رمضان المبارک میں خاص بہار ہوتی۔ لوگ بہت پہلے سے اس کے منتظر رہتے اور تیاریاں کرتے۔ ملازمین چھٹیاں لے کر آتے۔ مدارس دینیہ کے اساتذہ اس موقعہ کو غنیمت جان کر اہتمام سے آتے، علماء وحفاظ کی خاصی تعداد جمع ہو جاتی۔ تقسیم سے پہلے مشرقی پنجاب کے اہل تعلق اولوالعزمی اور عالی ہمتی سے مہمانوں اور مقیمین خانقاہ کے افطار، طعام وسحر کا انتظام کرتے۔ رمضان المبارک میں اپنے شیخ کی اتباع میں مجلسیں سب ختم ہو جاتیں۔ باتوں کے لیے کوئی خاص وقت نہ تھا۔ ڈاک بھی بند رہتی تخلیہ ونماز کے اوقات کے علاوہ تقریباً ۲۴ گھنٹے کبھی ایسے شخص کے آنے سے گرانی ہوتی جس کے لیے وقت صرف کرنا پڑتا۔ افطار علالت سے پیشتر مجمع کے ساتھ ہوتا جس میں کھجور اور زمزم کا خاص اہتمام ہوتا اور یہی پورا افطار تھا۔ مغرب کے متصل کھانا، علالت سے پہلے مجمع کے ساتھ، اس کے بعد چائے، عشاء کی اذان تک یہی وقت ۲۴ گھنٹے میں مجلس کا تھا۔ اذان کے بعد نماز کی تیاری، اس سلسلے میں حضرات علماء جن کا مجمع اگلی صف میں رہتا بعض اہم اہم سوالات کرتے اور حضرت ان کا جواب دیتے۔ عشاء کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ کبھی نشست اور کبھی لیٹ جاتے۔ خدام بدن دبا ئے درج کر دیتے۔ مسجد وخانقاہ میں تراویح ہوتی۔ مسجد میں بھی قرآن مجید ہوتا اور خانقاہ میں بھی۔

یوں تو حفاظ کی کثرت ہوتی۔ مگر حضرت اچھے پڑھنے والے بہتر حافظ کو پسند کرتے۔

حضرت نے ایک سال (۵۳ء میں) منصوری پر رمضان مبارک کیا۔ ۵۰، ۶۰ خدام ساتھ تھے۔ مولوی عبدالمنان صاحب نے قرآن مجید سنایا۔ تراویح کے بعد حضرت کے تشریف رکھنے اور مجلس کا معمول تھا۔ طبیعت میں بڑی شگفتگی اور انبساط تھا۔ متعدد حضرات رات بھر بیدار اور مشغول رہتے۔ غرض دن اور رات ایک کیف محسوس ہوتا تھا۔ ضعفاء وکم ہمت بھی سمجھتے تھے کہ ؎

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

ایک حاضر خدمت نے جس کو آخری عشرہ گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور جو اپنی صحت کی کمزوری اور ہمت کی پستی کی وجہ سے مجاہدہ سے قاصر رہا۔ اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا ؎

دکان مے فروش پہ سالک پڑا رہا
اچھا گزر گیا رمضان بادہ خوار کا!

باطنی کیفیات اور نمایاں صفات

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز　　کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
ایں مدعیاں در طلبش بے خبر انند　　آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

محبت و شوق کامل الاحوال بزرگوں کی باطنی کیفیات کا اندازہ عامی کیا لگا سکتے ہیں۔ ان حضرات کا اصول و مسلک یہ ہے کہ

عشق عصیاں امت گر مستور نیست

لیکن پھر بھی پیمانہ جب لبریز ہوتا ہے تو دو چار قطرے ٹپک پڑتے ہیں۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ضبط گریہ اور اخفائے حال کی کوشش اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے جس سے سینہ معمور اور دل مخمور ہے۔ کسی حقیقت شناس نے عرصہ ہوا کہا تھا:

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اصحاب احوال جب کسی شعر کا انتخاب کرتے ہیں یا اُس سے ان کو خاص کیف اور ذوق حاصل ہوتا ہے۔ تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان کے حقیقت حال کی ترجمان اور ان کے دل کی سچی ترجمانی اور تعبیر ہے۔ ایک مرتبہ راقم سطور نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے

دل ڈھونڈتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

حضرتؒ کو اس شعر پر بڑا ذوق آیا۔ اور کئی بار فرمائش کر کے مجھ سے سنا، میں سمجھ گیا کہ اس پسندیدگی اور کیف کی وجہ یہ ہے کہ شعر مطابق حال ہے، حضرتؒ کے خمیر میں شروع سے محبت و عشق کی چنگاری تھی۔ اور یہ ان کا فطری ذوق اور حال تھا۔ اس لیے مشائخ اور بزرگوں میں بھی جن کے یہاں یہ عنصر نمایاں اور غالب نظر آتا تھا۔ ان سے خصوصی مناسبت اور عقیدت تھی، اسی بنا پر محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے عشق

تعلق تھا۔ اور ان کے حالات سے خاص شغف اور شیفتگی تھی۔ اور کسی طرح ان کے حالات سے سیری نہیں ہوتی تھی۔[1] دور آخر میں حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے حالات اور تذکرہ میں یہ جنس بہت ملتی ہے اور اہل عشق کو ان کے واقعات، ان کی کیفیات اور ان کے منتخب و پسندیدہ اشعار سے بڑی چاشنی حاصل ہوتی ہے۔ لاہور کے دوران قیام ۱۹۵۹ء میں حاجی متین احمد صاحب کی کوٹھی پر کسی دوست کی تحریک و تذکرہ پر تذکرہ مولانا فضل رحمٰنؒ عصر کے بعد کی مجلس میں پڑھا جانے لگا۔ اس وقت تک کتاب چھپی بھی نہیں تھی اور میرے پاس اس کا ناقص مبیضہ تھا۔ کتاب شروع ہوئی اور مولانا کے سادہ لیکن دل کو تڑپا دینے والے حالات اور واقعات پڑھے جانے لگے تو ساری مجلس پر ایک کیف سا طاری ہو گیا۔ جو درحقیقت حضرت کی کیفیت باطنی کا عکس تھا۔ زبان حال گویا کہہ رہی تھی:-

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ھزار نمکداں کئے ہوئے

بعض اہل احساس نے بیان کیا کہ ایسا کیف مجلس میں اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا کہ "بڑی پیاری باتیں ہیں۔" پھر فرمایا "پیاروں کی باتیں پیاری ہی ہوتی ہیں۔"

اسی بنا پر حضرت مولانا ہی کے ایک معاصر اور صاحب محبت شیخ سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی کا تذکرہ بھی بڑے ذوق و کیف کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں بھی کشش کی یہی وجہ تھی۔ حضرت کے شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور دونوں نے خصوصی توجہ فرمائی تھی۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ اور دوسرے مشائخ چشتیہ سے مناسبت اور خصوصی تعلق کی وجہ بھی یہی تھی۔

اہل درد و محبت کے یہاں ہمیشہ سے عشق و محبت کے اشعار سے تسکین و قوت حاصل کرنے کا دستور رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف دل کی آنچ کا (جو بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتی ہے) نکالنا یا اس پر آنسوؤں کے چھینٹے دینا ہوتا ہے۔ اپنے زمانہ کے مشہور نقشبندی شیخ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے اسی ضرورت و حقیقت کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

الٰہی درد و غم کی سرزمین کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینھ نہ برساتی

اس کے لیے اہل دل رسوم و ضوابط کے پابند کبھی نہیں رہے، کبھی سادگی کے ساتھ، کبھی ذرا ترنم سے کوئی عارفانہ عاشقانہ شعر سن لیا اور تسکین حاصل کرلی۔ اس لیے کہ:-

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

حضرت بھی بعض اوقات اضطراراً کسی صاحب دل اور صاحب نسبت کا کلام سن لیتے، بعض اوقات اپنی اس باطنی کیفیت و ضرورت کی بنا پر فرمائش کرتے۔ اور سادگی و بے تکلفی کے ساتھ عربی، فارسی، اردو اور زیادہ تر فارسی یا پنجابی کا عاشقانہ کلام پڑھا جاتا۔ ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں جب سہارنپور سے پاکستان تشریف لے جا رہے تھے۔ تو یہ خادم سہارنپور سے لدھیانہ تک اسی کار میں تھا جس پر حضرت تشریف رکھتے تھے سہارنپور

---

[1] حضرت کے بار بار تقاضے اور تاکید ہی سے راقم نے تاریخ دعوت و عزیمت کا تیسرا حصہ جو حضرت خواجہ کے حالات پر مشتمل ہے مرتب کیا۔ حضرت نے اتنے بار اس کا تقاضا فرمایا تھا کہ بغیر اس ارمغان کے حاضر ہونے سے شرم آنے لگی تھی۔ بالآخر اللہ نے اس کی توفیق دی اور حضرت نے اس کو حرف بحرف سنا۔ جب تک وہ ختم نہیں ہوا کوئی دوسری چیز شروع نہیں ہو سکی۔

سے جب کار روانہ ہوئی اور سوادِ شہر سے نکلی تو حضرت کی بے کلی و بے تابی کی عجیب کیفیت دیکھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کل چین نہیں آتا، پیچھے کی سیٹ پر خود بدولت اور مولانا عبدالجلیل صاحب اور مولانا عبدالمنان صاحب تھے۔ آگے کی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ یہ خادم بیٹھا تھا۔ مجھ سے ارشاد ہوا کہ کچھ سناؤ۔ یہ خادم اگرچہ مختلف وقتوں میں عارفانہ و عاشقانہ اشعار پڑھا کرتا تھا، لیکن اس وقت کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ سوائے دو اشعار کے کچھ یاد نہ آیا۔ حضرت کی طبیعت مبارک اسی وقت اس کی متقاضی تھی کہ ترنم سے پڑھا جائے۔ وہ بھی اس وقت نہ ہوسکا۔ اس سے تسکین نہ ہوئی تو فرمایا کہ بزرگوں کے واقعات سناؤ۔ اتفاق سے وہ بھی کچھ یاد نہ آئے۔ اس اضطراب کو دیکھ کر بار بار اس کا خیال آیا کہ کاش اس موقع پر مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی ہوتے اور حضرت کو خوش کرتے۔

پاکستان کے قیام میں بعض زمانوں میں یہ ذوق زیادہ غالب آجاتا۔ اور جب مانوس و فہیم لوگ ہوتے تو پنجابی کے اشعار سنتے۔ ایک زمانہ میں سونے سے پہلے بہت دن تک یہی معمول رہا۔

محبتِ رسولؐ

ان بزرگوں کے اس تعلق و محبت کا اندازہ جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ان کو حاصل ہے، ان کو قریب سے دیکھے اور کچھ دن صحبت میں رہے نہیں ہوسکتا۔ دور سے دیکھنے والے تو ان کو "زاہدِ خشک" اور معاذ اللہ بے ادب اور محبت سے نا آشنا سمجھتے ہیں۔ مگر ان کا حال وہ ہوتا ہے جو آسی غازی پوری نے پوری احتیاط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

صبا یہ جا کے کہیو مرے سلام کے بعد!
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اس محبت اور جذبہ کی تسکین بھی نعتیہ اشعار سے ہوتی تھی۔ حضرت خاص طور پر صحابہ کرامؓ کے نعتیہ اشعار زیادہ شوق اور فرمائش سے سنتے تھے خصوصاً کے ساتھ قصیدہ بانت سعاد حضرت کا بڑا محبوب قصیدہ تھا۔ اور اکثر مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی سے اس کے سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ کے اشعار:

فینا رسول اللہ یتلوا کتابہ	اذا انشق معروف من الفجر ساطع
اَرانا الھدی بعد العمی فقلوبنا	بہ موقنات ان ما قال واقع
یبیت یجافی جنبہ عن فراشہ	اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

حضرت کو خوب یاد تھا اور خود پڑھ کر سناتے تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب قصیدہ جس کا مطلع ہے

صبا بسوئے مدینہ روکن ازیں دعاگو سلام برخواں
بگرد شاہ مدینہ گرد و بصد تضرع سلام برخواںؑ

اکثر پڑھوا کر سنا، اسی طرح

دلم زندہ شد از وصالِ محمد
جہاں روشن است از جمالِ محمد

ؑ یہ شعر دراصل غازی الدین خاں نظام کا ہے۔

اسی طرح پنجابی اور ملتانی کے نعتیہ اشعار محمد شفیع صاحب اور مکتر صاحب سے اکثر سنا کرتے تھے۔ اور اس وقت اکثر آنکھیں پرنم ہوتیں۔
ایک مرتبہ حضرت مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے۔ اس خادم نے عرض کیا کہ حضرت اس مسجد میں بعد کے لوگوں نے بڑی زیب وزینت پیدا کر دی۔
یمتی قالین بچھائے۔ کاش یہ مسجد اپنی پہلی سادگی پر ہوتی۔ معلوم نہیں اس وقت حضرت کس حال میں تھے۔ جوش آگیا۔ فرمایا "حضرت اور زیب و زینت ہو
میں جہاں کہیں جمال اور زیب و زینت ہے انھیں کے صدقہ میں تو ہے۔" مجھے شرمندگی ہوئی اور احساس ہوا کہ یہ حضرات کس قدر محبت سے بھرے
تے ہیں۔

مرض وفات میں مدینہ طیبہ کا ذکر سن کر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ اور بعض اوقات بلند آواز سے رونے لگتے۔ مولانا محمد صاحب انوری
کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ حضرت سے رخصت ہونے کے لیے آئے۔ مدینہ طیبہ کا ذکر ہوا تو حضرت دھاڑیں مار کر روئے۔ مولانا محمد صاحب
تے ہیں، کہ "میں نے کبھی حضرت اقدس کو اس سے پہلے بلند آواز سے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔" بالو عبدالعزیز صاحب آئے تو ان سے فرمایا "دیکھو
دینہ جا رہے ہیں" یہ کہہ کر حضرت کی چیخیں نکل گئیں۔[۱]

صحابہ کرامؓ سے تعلق و محبت حضرت پر ابتدائے شعور سے صحابہ کرامؓ کی محبت و عظمت کا بڑا غلبہ تھا اور حضرت کو ان کے حالات اور تذکرہ سے بڑی مناسبت اور شغف تھا۔ اکثر انھیں کا تذکرہ کرنا اور سننا پسند فرماتے تھے۔ ان کی فتوحات
غازی کی کتابوں سے سیری نہیں ہوتی تھی، فتوح الشام واقدی سے خاص شغف تھا، خلفائے راشدینؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے مناقب
دلچسپی اور لطف سے سنتے تھے۔ اور اس داستان کو زیادہ سے زیادہ طول دینا پسند کرتے تھے۔

بجرمے تو اں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوق حضوری طول دادم داستانے را

پاکستان میں بالخصوص (وہاں کے حالات کی بنا پر) یہ ذکر و تذکرہ ضبت بڑھ جاتا تھا۔ ایک روز ایک مجلس میں فرمایا:-
اگر شیعہ کے اصول کو دیکھا جائے۔ تو پھر اسلام میں تو کچھ نہیں رہ جاتا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی کمال ہی نہیں معلوم ہوتا، ہم
دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ کی صحبت سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور صحبت کی برکت سے پکے دیندار بن
جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے کوئی بھی پکا مسلمان نہیں بنا۔"[۲]
مرتبہ ان حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے جو سادات کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں اور تشیع کی طرف مائل ہیں فرمایا:-
"بھائی میں تو سیدوں سے عرض کرتا ہوں، کہ مجھے تو آپ حضرات پر اعتبار نہیں رہا۔ ہم تو اچھے خاصے مندروں میں پوجا پاٹ
میں لگے رہتے تھے۔ آپ کے بڑوں نے ہمارے بڑوں کو اسلام کی دعوت دی، ہم لبیک کہتے ہوئے ان کے پیچھے ہو لیے۔
اب آپ ہمیں یہیں چھوڑ کر کوئی شیعہ ہو رہا ہے، کوئی مرزائی اور کوئی عیسائی اور کوئی منکر حدیث، بس بھائی ہمیں یہی اسلام
کافی ہے۔ یہ ہمارے بس کا نہیں کہ تم جہاں جاؤ ہم تمہارے پیچھے پیچھے بھاگے پھریں، اگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم مسلمان
نہیں ہیں تو ہمیں تو اور کوئی مسلمان نظر نہیں آتا۔"[۳]

---

[۱] مکتوب مولانا محمد صاحب انوری۔　[۲] مجلس ۶، جمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ کوٹھی صوفی عبدالحمید صاحب۔
[۳] تحریر صوفی غلام فرید ساکن جھاوریاں۔

مولانا محمد صاحب انوری لکھتے ہیں :۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات سننے کا بڑا ذوق و شوق رہتا تھا۔ مولانا محمد یوسف صاحب کی کتاب حیاۃ الصحابہ[1] سن کر بہت رقتے تھے۔ اور پنجاب کے اسفار میں لاہور اور لائل پور میں تو ہم نے دیکھا ہے کہ محمد شفیع کبیر والا ضلع ملتان سے آجاتے تو ان سے مناقب صحابہؓ کے متعلق پنجابی نظمیں سنتے اور رقت طاری ہو جاتی۔ اکثر اوقات حضرت اقدس کی زبان مبارک پر پنجابی کا یہ شعر رہتا تھا۔

او دیوانے محمدؐ دے میں دیوانہ صحابہؓ دا

او پروانے محمدؐ دے میں پروانہ صحابہؓ دا

پھر محمد شفیع کے انتظار میں رہتے۔ جب آتے تو یہ شعر ضرور سنتے[2]۔

اپنے شیخ اور اکابر سے تعلق

شریف الفطرت اور کریم النفس انسان جس سے کوئی نعمت پاتا ہے۔ ساری عمر اس کا مانتا ہے۔ اور اس کے گن گاتا ہے۔ پھر جس شخص کو کسی شیخ کامل اور مقبول بارگاہ کی میں طویل صحبت اور خصوصی قرب حاصل رہا ہو۔ اور اس نے شب و روز جلوت و خلوت میں بنظر غائر اس کی زندگی کا مطالعہ کیا ہو اور اس کمالات اس پر منکشف ہوئے ہوں، اس کا دل کس طرح اس کی محبت و عقیدت سے لبریز اور اس کی زبان کس طرح اس کے محامد و فض بیان کرنے میں مشغول نہ ہو۔

حضرت اپنے شیخ و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہٗ کی محبت و عقیدت سے لبریز تھے۔ اور یہ آپ کا ایک دا اور ذوق بن گیا تھا۔ جس وقت آپ کا ذکر فرماتے تھے اس شعر میں ذرا مبالغہ اور شاعری نہیں معلوم ہوتی تھی۔

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

حضرت کے اخلاص و للّٰہیت، حضرت کی بے نفسی و فنائیت، حضرت کے اجتہاد و بصیرت پر آپ کو پورا اعتقاد و اعتماد تھا۔ ایک میں اپنے حضرت کی تعریف اس لیے نہیں کرتا کہ اس میں بھی اپنی ہی تعریف ہے۔ ورنہ ہمارے حضرت تصوف کے امام تھے اور تو کچھ عرض نہیں کرتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں چودہ سال حضرت کی خدمت میں رہا۔ اس طویل مدت میں کبھی ایک کل بھی حضرت کی زبان مبارک سے نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو۔ حبِّ جاہ ایک ایسی چیز ہے جو سب سے آخ میں اولیاء اللہ کے قلوب سے نکلتی ہے۔ جب سالک صدیقین کے مقام تک پہنچتا ہے تب اس سے پیچھا چھوٹتا ہے یہ بات میں نے اپنے حضرت میں خوب اچھی طرح سے دیکھی کہ حب جاہ کا وہاں سر کٹا ہوا تھا[3]۔

---

[1] حیاۃ الصحابہؓ مولانا محمد یوسف صاحب کی جلیل القدر تصنیف ہے۔ کتاب عربی میں ہے۔ یہ صحابہؓ کرام کے حالات و واقعات اور تبلیغ دعوت کی روئداد کا نہایت ضخیم مجموعہ ہے۔ دو ضخیم حصے مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد سے طبع ہو چکے ہیں۔ تیسرا حصہ زیر طبع ہے۔

[2] مکتوب مولانا محمد صاحب انوری۔

[3] تحریر مولانا عبدالوحید صاحب۔

حضرت کو اپنے شیخ اور شیخ سے نسبت رکھنے والی چیزوں سے اتنا اُنس اور محبت تھی کہ فرمایا کرتے تھے کہ "ہمیں تو رائے پور کا کتا بھی پیارا [illegible] کوئی حضرت کا دور سے دور کا رشتہ دار بھی ہوتا تو اس سے اس طرح جھک کر ملتے کہ گویا اپنے کسی معزز قریبی عزیز سے مل رہے ہیں [illegible]سے اس درجہ اظہار تعلق فرماتے کہ نہ جاننے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ یہ لوگ حضرت کے کوئی قریبی عزیز اور خصوصی تعلق والے ہیں [illegible]ریبی عزیزوں کو ان کے مقابلہ میں ہمیشہ پیچھے رکھا۔[1]

اس غایت تعلق کا نتیجہ یہ تھا کہ کامل مناسبت اور اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "میرے اور شیخ کے تعلق کا کیا پوچھتے ہو [illegible]ات حضرت کے قلب میں آتی وہی بات میرے دل میں آجاتی تھی"۔[2]

حضرت سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے۔ اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس کو اپنے [illegible]نہایت مفید و موجب ترقی سمجھتے تھے۔ ایک بار فرمایا کہ :۔

رائے پور میں شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم کی بیماری کی خبر آئی۔[3] میں نے سوچا کہ یہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خادم تھے، خالص لوجہ اللہ بغیر بلائے ان کی عیادت کو جانا چاہیے۔ اس لیے رائے پور سے پیدل بہٹ گیا۔ اس جانے میں عجیب کیفیت رہی۔ اور ایک ایسی خوشبو آتی رہی کہ پھر وہ نہیں آئی۔ یہ اس صحیح نیت کی برکت تھی۔[4]

یہ تعلق مرور ایام اور طویل مدت سے مضمحل اور کمزور نہیں ہوا تھا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا اور وقت آخر قریب آتا جاتا تھا۔ اس محبت و تعلق [illegible] روز ترقی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں حضرت لکھنؤ میں مولانا محمد منظور صاحب کے مکان پر تشریف رکھتے تھے۔ عمائد شہر بھی حاضر تھے۔ حضرت اپنے [illegible]نا شاہ عبدالرحیم صاحب کے مرض وفات اور انتقال کا حال بیان فرما رہے تھے۔ جب انتقال کا ذکر فرمایا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ [illegible]م ہوتا تھا کہ زخم تازہ اور حادثہ بالکل قریب کا ہے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں مرض وفات میں حضرت کا ایک مکتوب بنام شاہ زاہد حسن [illegible] تھا۔ جب آخر میں حضرت کا اسم گرامی "احقر عبدالرحیم" آیا تو ضبط نہ ہو سکا رقت طاری ہو گئی۔

حضرت اپنے شیخ جن سے براہ راست تعلق تھا اور جو ولی نعمت تھے بلکہ اپنے سلسلہ کے تمام شیوخ بالخصوص سلسلہ ولی اللّٰہی اور [illegible]کے مشائخ اور اہل سلسلہ سے نہایت درجہ عقیدت مندی اور عشق و محبت کا تعلق تھا۔ ان حضرات کے بارے میں کسی طرح کی تنقیص [illegible] طبیعت متحمل نہیں تھی۔ اور یہ ایک ایسی غیر اختیاری کیفیت تھی جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو سچی محبت، کامل اعتماد اور شرافت [illegible]کرگزاری کا جذبہ فطرت میں ملا ہے۔ صوفی محمد حسین صاحب راوی ہیں :۔

ایک دفعہ ڈھڈیاں میں شام کا کھانا ہو رہا تھا۔ حضرت والا خود دسترخوان پر تشریف فرما تھے۔ ایک صاحب سرگودھا سے تشریف لائے۔ جن کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کو کھانے میں شریک ہونے

---

[1] تحریر مولانا عبدالوحید صاحب۔

[2] تحریر مولانا عبدالجلیل صاحب۔

[3] اس بیماری کے بعد حضرت شاہ صاحب عرصہ تک زندہ رہے۔ حضرت شاہ صاحب کی پشت پر سرطان ہو گیا تھا اور وہ اچھا ہو گیا۔ اس مرض تک شاہ صاحب کو حضرت سے کچھ زیادہ موانست و عقیدت نہ تھی لیکن اس کے بعد ان کو حضرت سے عاشقانہ و نیازمندانہ تعلق پیدا ہو گیا۔ جو آخر تک رہا۔

[4] تحریر مولانا عبدالجلیل صاحب۔

کو کیا، چنانچہ کھانے میں شریک ہو گئے۔ ان کو حضرت کے ساتھ ہی جگہ ملی۔ ابھی ایک ہی لقمہ اٹھایا ہوگا کہ انہوں نے حضرت اقدس سے سوال کیا (سوال بھی بڑے اکھڑپن سے کیا)، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کیوں ناکام ہو گئی تھی؟ ناکامی کی وجوہات کیا تھیں؟ حضرت اقدس نے بڑی ناگواری کے ساتھ بلکہ غصہ کے ساتھ فرمایا کہ ہم کوئی بزرگوں کے عیب نکالنے کے لیے تھوڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی سعی بہرحال مشکور ہے۔ اس سے وہ صاحب خاموش ہو گئے۔"

بے نفسی و فنائیت

حضرت نے اپنے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فنائیت و بے نفسی کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ و تاثر جو کچھ بیان فرمایا حضرت کے یہاں رہنے والوں کا بعینہٖ یہی تاثر حضرت کی ذات سے متعلق ہے۔ کہ کبھی ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو۔ حبّ جاہ کا یہاں سرکشا ہوا تھا۔ اس نادم کو ۱۹ کے آخری سفر حج میں ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اور تقریباً تین مہینے شب و روز ساتھ رہنا ہوا۔ بعض خدام نے اپنے ادراک و الطاف الٰہی واقعات بھی سنائے۔ پورے سفر میں حضرت نے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس سے حضرت کے علو مرتبہ یا کسی کشف و ادراک کا احساس حج کے علاوہ بھی کبھی کوئی ایسی بات قصداً نہیں فرمائی۔ جس سے لوگوں کی عقیدت میں اضافہ یا آپ کی بزرگی کا احساس ہو۔ خدام نے جب نفی، اپنا انکار، اپنی بے حسی اور عبادت کا اظہار سنا۔ مشیخت کی باتیں یا متصوفانہ نکات یا سلوک و معرفت کی تحقیقات بیان کرنے کا حضرت کے دستور ہی نہ تھا۔ مسئلہ علماء سے پوچھتے۔ تصوف کی کوئی بات پوچھتا تو اگر حضرت شیخ الحدیث یا کوئی دوسرا صاحب علم و صاحب نظر قریب اس کی طرف محوّل فرما دیتے۔ اگر اصرار کیا جاتا اور بات ضروری ہوتی تو نہایت نپے تلے لفظوں میں مغز کی بات فرما دیتے۔ ایسی بات سے گر جس سے آپ کی ژرف نگاہی باریک بینی کا اندازہ ہو۔ لیکن اہل حقیقت سمجھ جاتے کہ

غواص کو مطلب ہے گہر سے کہ صدف سے

کسی بھری مجلس میں خواہ اس میں کیسے ہی نشستے اور سربرآوردہ اشخاص کیوں نہ ہوں اپنی لاعلمی اور اپنے عامی ہونے کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا، خواہ اس کا اثر حاضرین مجلس اور خاص طور اہل علم طبقہ پر کچھ پڑتا ہو۔ راولپنڈی میں ایک مرتبہ قریشی صاحب کی کوٹھی پر صحن عصر کے بعد بڑی وسیع مجلس تھی بعض اعلیٰ عہدہ دار، ممتاز علماء اور عمائد شہر جمع تھے۔ پروفیسر عبدالغنی صاحب جے پوری نے غالباً اس خیال سے حضرت کچھ ارشاد فرمائیں، اور لوگ مستفید ہوں، سوال کیا کہ حضرت صبر کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت نے بڑی بے تکلفی سے راقم کی طرف اشارہ کیا کہ مجھے تو معلوم نہیں، اُن سے پوچھو۔ میں نے اپنے نزدیک بڑی کسر نفسی اور تواضع سے کام لیتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس کے لغوی معنی کے سوا کچھ معلوم نہیں، نہایت سادگی اور اطمینان سے فرمایا کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں! مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ حضرت کو اس کا احساس نہیں معلوم ہوتا تھا کہ مجلس کے خواص حضرت کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ جن کو علماء اور عمائد کے ایک بڑے گروہ نے اپنا شیخ و مربی تسلیم کر رکھا ہے۔

ایک مرتبہ لائل پور کے دوران قیام میں اس بارے میں خدام و احباب کے درمیان بڑی کشاکش تھی۔ کہ حضرت رمضان کہاں کریں۔ اہل تعلق لائل پور کے لیے کوشاں تھے لاہور کے احباب لاہور کے لیے مصر تھے۔ اور قریشی صاحب وغیرہ راولپنڈی کے لیے عرض کرتے تھے۔ حضرت نے ایک روز سحور کے وقت تینوں گروہوں کے خاص خاص اشخاص کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی دیکھو میں ایک غریب کاشتکار کا لڑکا ہوں میرے گھر میں ایسی غربت تھی کہ میں جب طالب علمی میں آیا کرتا تھا تو میری والدہ کو فکر ہوتی تھی۔ کہ گیہوں کی روٹی کا انتظام کس طرح کریں؟ علم بھی میں نے تو کچھ زیادہ پڑھا نہیں۔ پھر جو کچھ پڑھا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔ اب تم جو مجھے کھینچے کھینچے پھرتے ہو اور کوئی ادھر لے جانا چاہتا ہے کوئی ادھر

برکت ہے کہ کچھ روز اللہ کا نام لیا۔ تم خود اخلاص کے ساتھ چند روز اللہ کا نام کیوں نہیں لیتے کہ خود مطلوب بن جاؤ، یہ تقریر کچھ ایسی سادگی اور اثر کے ساتھ فرمائی کہ بعض حضرات کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

لکھنؤ سے بریلی جاتے ہوئے سفر میں مجھ سے فرمایا کہ آپ لوگ اہل علم ہیں آخر آپ نے مجھے کیوں آگے کر دیا اور کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ ایک مسترشد خادم کو جو اپنی حقیقت اور احتیاج سے کسی قدر واقف تھے۔ اس کا جو جواب دینا چاہیے تھا۔ وہ عرض کیا گیا۔

ایک مرتبہ آزاد صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے ایک غزل کہی جس کا مقطع تھا۔

یہ کیا ستم ہے کہ آزاد تیرے ہوتے ہوئے
ہے میکدہ میں بھی اور تشنہ کام ہے ساقی

یہ شعر سن کر فرمایا کہ بھائی میرے پاس تو پانی بھی نہیں، یہ شعر تو شیخ الحدیث کو سنانا۔ یہ در اصل حضرت کا حال تھا جس میں کسی تصنع اور بناوٹ یا خود بینی کا دخل نہیں تھا۔ بداہتہً اور وجدانی طور پر اپنے کو ہر کمال سے عاری سمجھتے تھے۔ اور اہل نظر کے نزدیک یہ مقام ہزار کرامتوں اور ہزار معارف سے ارفع ہے۔

توکل اور بذل وسخا

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس دور انحطاط و مادیت میں مشائخ متقدمین اور گزشتہ عہد کے اصحاب یقین کے زہد و توکل کی یاد تازہ کر دی۔ آپ کو دیکھ کر اور آپ کی صحبت میں کچھ رہ کر ان کے ان واقعات کی تصدیق ہو جاتی تھی۔ جو اس زمانہ کے ناآشنا اور ظاہر بین اشخاص کو مبالغہ آمیز اور مشکوک معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں آکر مال و دولت اور روپیہ پیسہ کی حقیقت کھل جاتی تھی۔ اور صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس مرد خدا کی نظر میں کنکریوں اور ٹھیکریوں سے زیادہ نہیں۔ یہاں نہ کسی امیر کا اعزاز تھا نہ اس کی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کا تذکرہ۔ بعض مرتبہ وزرائے حکومت آتے اور چلے جاتے کبھی مخصوص خدام سے بھی جو بعد میں ان کی آمد کا تذکرہ تک نہ فرماتے۔ ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ اس طرح استقبال یا وداع ہوتا جو بڑے بڑے وزراء و امراء کو نصیب نہیں لیکن ایک جگہ کے استقبال یا وداع کا دوسری جگہ ذکر بھی زبان پر نہ آتا۔ معلوم ہوتا کہ یہ سب تماشہ ہے یا یہ سب اعزاز کسی دوسرے کا ہو رہا ہے ایسے سفر میں کاروں کا ایک کارواں پیچھے ہوتا۔ لیکن معلوم ہوتا کہ اس سب اعزاز و احترام سے بے تعلق اور علیحدہ کسی اور حقیقت پر نگاہ جمی ہوئی ہے۔ سب سے مانوس اور سب سے مستغنی تھے۔ مگر چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا تو ایسا تکفل ہوتا کہ عقل ظاہر بین انگشت بدنداں رہتی۔ چیزیں انگلستان تک سے آتیں۔ موسم کے پھل اور میوے اور خاص طور پر جن کی حضرت کو غذا یا دوا میں ضرورت ہوتی۔ وہ سہارنپور و دہلی و پاکستان تک سے بڑے اہتمام سے آتے اور اتنے جمع ہو جاتے کہ ان کا ختم کرنا مشکل ہو جاتا۔ اکثر دیکھا گیا کہ ادھر حضرت کو معالج نے کوئی چیز بتایا۔ ادھر کوئی خادم بڑی مقدار میں نذر لے آیا۔ ایک مرتبہ رائے پور سے پاکستان کے لیے روانگی ہوئی۔ سہارنپور میں فرمایا کہ غلطی ہوئی موم نہیں لیا، پاکستان میں دقت سے ملتا ہے۔ موم روغن کی ضرورت ہوگی۔ کچھ ہی دیر کے بعد دیکھا گیا کہ ایک شخص بہت سا موم لیے چلا آ رہا ہے اور پیش کر رہا ہے[1]۔

ادھر غیب سے ضرورت کی اشیاء کی آمد تھی۔ ادھر ان کا فوری صرف۔ روپیہ کا رات کو رکھنا اور اس پر رات کا گزرنا طبیعت پر بڑا بار تھا۔ اور جو کام کچھ پیش فرماتے تھے۔ فوراً دوسرے خدام مقیمین خانقاہ اہل حاجت اور آنے والوں کو پیش کر دیتے۔ حاجی فضل الرحمٰن خاں کہتے ہیں کہ

---

[1] روایت مولانا آزاد صاحب۔

صرف میرے ہاتھوں سے کئی لاکھ روپے حضرت نے دوسروں کو دلائے ہیں۔ بعض اہلِ علم کو کرایہ کے نام سے سوسو دو دو سو کی
فرمانے کا عام دستور تھا۔ کبھی ان کی آمد پر بڑی شفقت سے فرماتے کہ بیں تو بہت دن سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ اور تمہارے لیے رکھ
ہوئے تھا۔ پھر فوراً کچھ عنایت فرماتے۔ ایک خادم جو سفرِ حج میں ساتھ تھے۔ حجاز سے مصر و شام چلے گئے تھے۔ ان کے ایک رف
ہزار کی رقم عنایت فرمائی۔ اور فرمایا کہ ان کو بھیج دو اور لکھ دو کہ تمہاری صحت بحری سفر کی متحمل نہیں۔ تم ہوائی جہاز سے سفر کرنا۔[۱] یہ
دیکھا ہے۔ کہ بعض اوقات منی آرڈر سے کوئی معتد رقم آئی۔ وصول کرتے ہی کسی کے حوالہ کر دی۔ جو لوگ اس عادت سے واقف تھے
موقع پر موجود رہنے سے احتیاط کرتے تھے۔

صوفی محمد حسین صاحب لکھتے ہیں:-

"مولانا عبد اللہ صاحب دھرم کوٹی نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ لاہور میں صوفی عبد الحمید صاحب کی کوٹھی پر حضرت والا قیام
پذیر تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، اور سب لوگ سو رہے تھے۔ میں ساتھ کے کمرہ میں تھا۔ حضرت چارپائی پر آرام فرما رہے
تھے۔ لیکن بیدار تھے۔ اور سب خدام سو رہے تھے۔ ایک نووارد آئے۔ حضرت سے ملے اور کچھ نذرانہ پیش کر کے
رخصت ہوگئے۔ حضرت نے ان کے جانے کے بعد فرمایا۔ "ارے بھائی کوئی ہے"۔ چونکہ سب خدام سوئے ہوئے تھے
صرف ایک صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے (جن کا نام مولانا نے مصلحتاً نہیں بتایا) انہوں نے حضرت کی بات کا جواب
دیا۔ فرمایا یہاں آؤ دیکھو یہ کیا ہے؟ انہوں نے دیکھ کر بتلایا کہ حضرت مبلغ سات سو پینتیس روپے ہیں۔ فرمایا اچھا ان کو
جیب میں ڈال لو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے ضرورت نہیں ہے۔ مجھ پر اللہ کی مہربانی ہے۔ اور میں اس کے
حضرت کی خدمت میں حاضر بھی نہیں ہوا۔ فرمایا۔ "اجی بس ڈال بھی لو، کہیں کام آجائیں گے"۔[۲]

ڈاکٹر محمد اختر صاحب (نومسلم) بیان کرتے ہیں کہ:-

"ایک دفعہ مجمع لگا ہوا تھا۔ بہت سے حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی شخص نے مصافحہ کرتے وقت بے تکلف عرض کیا
حضرت دس روپیہ کی ضرورت ہے۔ حضرت نے فرمایا اللہ سے دعا کرو۔ پھر خاموش ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص آیا
روپیہ کا نوٹ حضرت کے ہاتھ پر رکھا۔ حضرت نے آواز دے کر فرمایا "ارے بھائی وہ شخص کہاں گیا جو دس روپیہ مانگ
تھا"۔ وہ بولا، جی حضرت بیٹھا ہوں۔ فرمایا "لے یہ دس روپیہ"۔ اس نے عرض کیا حضرت یہ تو سو روپیہ ہیں، فرمایا "لے جا
موج ہوگئی"۔

رقم کی مقدار اور تعداد میں ان حضرات کے نزدیک کوئی فرق اور اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بعض مرتبہ حقیر سی رقم قبول اور بعض مرتبہ
رقم واپس فرما دیتے مولانا منظور صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے سامنے دو منی آرڈر آئے۔ ایک پانچ روپے کا تھا ایک
پانچ کا قبول فرما لیا۔ لانے والے کو یہ کہہ کر واپس فرمایا کہ میں انہیں پہچانتا نہیں ہوں۔
رائے پور کا دسترخوان بہت وسیع تھا بالعموم ۵۰ - ۶۰ اور بعض دنوں میں کئی کئی سو آدمی مہمان ہوتے دسترخوان پر بالعموم

---

[۱] روایت مولانا منظور صاحب نعمانی۔
[۲] روایت مولانا آزاد صاحب۔

حضرت اس سادگی اور اہل خانقاہ اور اہل ذکر کے لیے جفاکشی اور سادہ غذا کو پسند فرماتے اور تکلفات و تنعم کو ان لوگوں کے لیے سمجھتے جو اپنی اصلاح و تربیت کے لیے آئے ہوئے ہیں. پھر بھی اس میں تنوع اور تکلف ہوتا رہتا. خصوصاً خصوصی مہمانوں کی آمد وقع پر تو ہر وقت ایسا تنوع ہو جاتا کہ بڑے بڑے امرا کے یہاں دیکھنے میں نہ آتا.

منظور صاحب نعمانی لکھتے ہیں :-

اب سے چار پانچ سال پہلے کی ایک دن کی بات ہے ہم دونوں (یعنی عاجز اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) بھی حاضر تھے. لگ بھگ سو مہمان ہوں گے. دسترخوان پر خود میں نے گنا چار قسم کی تو کھیر تھی. تین قسم کی مچھلیاں تھیں. گوشت بھی کئی قسم کا تھا. یہ سب قرب و جوار کے دیہات تک کے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے محبین و مخلصین حضرتؒ کے مہمانوں ہی کی نیت سے خود اپنے گھروں سے پکوا کر لے آتے تھے. اور رائے پور کے خوش نصیب بھائی تو روزانہ ہی اپنے گھروں سے ناشتہ دانوں میں بھر بھر کے کئی کئی قسم کے کھانے لاتے تھے. "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" کا یہ ظہور ادھر چند برسوں سے مسلسل ہو رہا تھا. حق یہ ہے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ. لیکن یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب حضرت اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے خود اس میں سے کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے."

حضرت شیخ الحدیث کی آمد پر جتنا تکلف و اہتمام ہو حضرت کو بجا اور برمحل معلوم ہوتا تھا. اس کا سامان بھی اللہ تعالیٰ بروقت اور غیب یتا اور اس کے لیے کبھی کسی تردد کی ضرورت نہ ہوتی. غرض انہیں اہل توکل و یقین کو دیکھ کر آیت قرآنی وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ اور مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کی تصدیق و تفسیر ہوتی.

مقبولیت و محبوبیت

دین سے استغنا اور معاشی بحران و دنیا پرستی کے اس دور میں آپ کی ذات کی طرف ایسا رجوع ہوا. اور محبین و معتقدین کا ایسا ہجوم ہوا جس سے مسلمانوں کے عہد عروج اور دینداری و خدا طلبی کے دور ترقی کی لکی سی جھلک نظر آگئی، آپ کہیں ہوں گاؤں میں یا شہر میں، ہندوستان میں یا پاکستان میں، اہل طلب و اہل ارادت، آپ کی ذات رہتے تھے اور بغیر کسی اعلان و اشتہار کے پروانہ وار جمع ہو جایا کرتے تھے. غالباً ۱۹۵۸ء میں آپ پاکستان جانے کے لیے رائپور راہ ہو کر گانگرول والی کوٹھی پر بہٹ میں مقیم تھے. یہ جگہ آبادی سے باہر نہر کے کنارے الگ تھلگ ہے. راقم لکھنؤ سے رخصت کرنے لیے حاضر ہوا تو دیکھا ایک میلہ سا لگا ہوا ہے ناواقف آدمی دیکھتا تو سمجھتا کہ واقعی کوئی میلہ ہے. روانگی کے وقت مصافحہ و سلام کرنیوالوں ہجوم ہوا کہ بڑی مشکل سے آپ کی راحت اور باطمینان روانگی کا انتظام کیا جاسکا. مولانا اکرام الحسن صاحب کاندھلوی نے اس منظر کو دیکھ مایا:

حسن کی جنس خریدار لیے پھرتی ہے
ایک بازار کا بازار لیے پھرتی ہے

ہی پاکستان میں حال ہوتا. کہیں تشریف رکھتے کئی کئی سو کا مجمع حاضر رہتا. وسیع کوٹھیوں کا چپہ چپہ ذکر کرنے والوں اور دور دور سے والوں سے آباد و معمور ہوتا. آپ کی ذات نے ثابت کر دیا کہ زمانہ کے انقلاب کا بہانہ ہے. اخلاص و کمال کہیں مخفی و مستور نہیں رہ سکتے. ہو وہاں بلبل اور جہاں شمع ہو وہاں پروانے ضروری ہیں.

محبت و شفقت

حضرت کی زندگی اور اپنے خدام اور اہل تعلق کے ساتھ تعلق میں جو ادا سب سے زیادہ نمایاں اور روشن حضرت کی غیر معمولی محبت و شفقت تھی، جس کو بعض خدام (جن کو اس محبت کا تجربہ ہوا تھا) شفقت سے تعبیر کرتے تھے، اور اس کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور تشبیہ نہیں ملتی۔ اس شفقت کو دیکھ کر زمانہ سابق کے شیوخ کاملین (حضرت نظام الدین اولیاء وغیرہ) کی شفقت کے واقعات یاد آتے تھے۔ اور اس کی تصدیق ہوتی تھی، کہ ان کے خدام اگر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے دھوپ میں کھڑے ہوتے تھے تو فرماتے تھے سایہ میں آجاؤ۔ دھوپ میں تم کھڑے ہو اور خلا میں جارہا ہوں۔ ان کے دسترخوان پر لوگ کھانا کھاتے فرماتے کہ تم کھاتے ہو اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کھانا میرے حلق میں جا رہا ہے۔ اور اندازہ ہوتا تھا کہ جب ان حضرات کی شفقت یہ ہے تو انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء علیہ السلام (عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ) کی رافت و شفقت کا کیا عالم ہوگا!

حضرت کی یہ ادا اور مزاج اتنا نمایاں اور ان کی زندگی اور اخلاق و معاملات پر اتنا غالب اور حاوی تھا کہ کوئی خادم بھی جس کو کچھ تعلق ہو اس کی لذت و حلاوت سے ناآشنا نہیں رہ سکتا تھا۔ اور وہ بلا تصنع کہتا تھا کہ حضرت کی شفقت نے ماں باپ کو یاد دلا دیا اور بہت سے لوگ تو اس پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ حضرت کے ایک مسترشد اس شفقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" حضرت ایسے شفیق تھے کہ ماؤں کی شفقتیں ان پر قربان، میں نے اپنی باون سالہ عمر، ۲۰ سالہ تعلق میں نہ کسی کی ماں اور نہ استاد، نہ کوئی دوست، نہ کوئی بزرگ ایسا مہربان دیکھا۔ مہمانوں میں سے اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو حضرت کو تمام رات نیند نہیں آتی تھی[۱]۔ اس ڈر کی وجہ سے خدام کسی مہمان کے بہت زیادہ بیمار ہونے کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔

حضرت کے ملنے والے تمام حضرات فرداً فرداً یہ سمجھتے تھے کہ حضرت کو جتنی مجھ سے محبت ہے اوروں سے نہیں ہے، سب سے زیادہ محبت مجھی سے ہے۔ آپ کے اندر کوئی ایسی بجلی کی سی محبت تھی کہ جتنا بھی کوئی مصیبت زدہ اور فکر مند ہو حضرت کو دیکھ کر تمام تکلیفیں دور ہو جاتیں۔ بہت سے جو لوگ پیدل چل کر جاتے یا جھاڑیوں سے جو ڈھڈیاں یا پیادہ جاتے ان میں بوڑھے اور امیر لوگ ہوتے جو بیچارے بالکل تھک جاتے، بس حضرت کو دیکھتے ہی تمام تکان دور ہو جاتا۔ یہ تو میرا بارہا کا تجربہ اور مشاہدہ ہے[۲]۔"

ایک دوسرے صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

میں نے اپنی تمام عمر میں ایسا شفیق شخص نہیں دیکھا۔ کوئی شخص اپنے بیٹوں سے اتنی محبت نہیں کر سکتا، جتنی حضرت لوگوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کھانے کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ بھی نہ کھایا، حضرت نے کمال شفقت سے فرمایا کہ تم کھاتے ہو تو میں ہی کھاتا ہوں[۳]۔"

---

۱ مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی لکھنؤ کے زمانہ قیام مرکز میں درد گردہ میں مبتلا ہوئے۔ حضرت کو ان کی وجہ سے سخت بے آرامی رہی، بے چارہ مرتبہ آپ خاموشی سے اٹھ کر ان کی جائے قیام پر تشریف لے جاتے اور ان کا حال دیکھتے، ہر طرح کے علاج و تدابیر کا اہتمام فرماتے۔

۲ مکتوب مولانا سعید احمد صاحب (ڈونگہ بونگہ) ضلع بہاول نگر۔

۳ مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب ایم۔ اے۔

مولانا محمد صاحب الانوری تحریر فرماتے ہیں کہ :-

" جب میں حضرت اقدس کے حکم سے (تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں) جیل گیا تو حضرت سرگودھا سے میرے گھر (لائل پور) تشریف لائے اور بچوں کو تسلی تشفی دیتے رہے۔ فرمایا میں فقط تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں، ملک واحد بخش صاحب نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ وہ تو حضرت کے حکم کی دیر تھی، حکم ہوا فوراً جیل چلے گئے۔ اس پر حضرت اقدس پر بہت رقت طاری ہوگئی۔ فرمایا وہ پہلے بھی میرے ہی کہنے پر ڈھاکہ تبلیغ پر چلے گئے تھے۔ وہاں بھی ہم نے ہی بھیجا تھا[۱] "

مولوی محمد یحییٰ صاحب بہاول نگری اپنی پہلی حاضری اور حضرت کی شفقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" حضرت نور ارتھ تشریف لائے ہوئے تھے۔ احقر بھی والد ماجد کے ساتھ چلا گیا۔ والد صاحب نے پہلے مصافحہ کیا۔ حضرت نے فوراً احقر کا نام لے کر دریافت فرمایا کہ برخوردار نہیں آئے؟ والد صاحب نے عرض کیا آیا تو ہے وضو کر رہا ہے۔ اتنے میں احقر بھی حاضر ہوگیا۔ مجلس بھری ہوئی تھی۔ حضرت نے بڑی شفقت سے مصافحہ فرمایا، اور بڑی ہی محبت فرمائی حتیٰ کہ فرمایا برخوردار تم تو میرے پاس ہی بیٹھ جاؤ۔ میں تعمیل ارشاد میں بیٹھ گیا۔ حضرت والد صاحب اور نانا صاحب کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ برخوردار کا میرے پاس خط آیا تھا کہ میرے فلاں فلاں سبق ہیں میرے لیے دعا کریں اور میری اصلاح کرنی آپ پر واجب ہے ورنہ قیامت کے دن دامن گیر ہوں گا۔ تو میں نے بڑا غور کیا کہ یحییٰ کے نام کا کون لڑکا ہے؟ آخر خیال آیا اور ہو یہ تو حضرت بہاول نگری رحمۃ اللہ علیہ کا پوتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ الحمد للہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد دین کی طرف تو چل نکلی۔ پھر تقریر ہوتی رہی جو تقریر فرماتے اس کا خطاب مجھ کو فرماتے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی مجلس سے الگ ہوتا تو فوراً بلا لیا جاتا، نماز کے وقت پر حاضری میں دیر ہو جاتی تو فوراً یاد فرماتے۔ اور اپنے برابر ایک ہی چارپائی پر بٹھلاتے، احقر کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا۔ جیسے کہ اپنے بڑے محسن سے کیا جا سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جس پر کوئی اتنا خوش ہوتا ہے تو وہ انعام بھی دیا کرتا ہے مجھے اتنی خوشی ہے کہ برخوردار کو انعام دیا جائے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی جیب سے پچاس روپیہ نکال کر عنایت فرماتے۔ والد صاحب سے فرمایا دیکھو یہ رقم برخوردار کی ہے اسی پر خرچ کرنی ہوگی۔ کھانے پینے کی جو چیز آتی، اسی وقت مجھے اپنے ساتھ ملا کر کھلاتے اور فرماتے بھائی یہ تو برخوردار کے لیے ہے اور مجھ سے فرماتے برخوردار خوب کھاؤ[۲] "

حضرت کے ایک خادم صوفی محمد حسین صاحب لکھتے ہیں :-

" ۱۹۵۲ء میں جب کہ احقر دفتر ڈپٹی کمشنر جہلم میں ملازم تھا حضرت اقدس لاہور سے راولپنڈی تشریف لے جا رہے تھے جب جہلم سے گزرے تو کار کے ڈرائیور سے فرمایا کہ کار کو شہر کی طرف لے چلو۔ جب شہر پہنچے تو فرمایا کچہری کا راستہ پوچھ کر کچہری کو چلو، چنانچہ کچہری پہنچے اور گراؤنڈ میں کار کھڑی کر کے کار سے باہر اترے۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ نو بجے دفتر کھلتے تھے۔ کوئی آدمی کچہری میں موجود نہ تھا۔ آخر ایک چپڑاسی ملا۔ اس سے راقم کے مکان کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور بتایا کہ نو بجے دفتر کھلے گا۔ چنانچہ کچھ دیر کچہری کے میدان میں حضرت والا ٹہلتے رہے اور تقریباً آدھ گھنٹے تک

---

[۱] تحریر مولانا محمد صاحب الانوری۔

[۲] تحریر مولوی محمد یحییٰ صاحب بہاول نگری۔

انتظار کرکے راولپنڈی تشریف لے گئے۔

نو بجے جب احقر شہر سے دفتر کو آرہا تھا۔ وہی چپراسی ملا اور کہنے لگا۔ کچہری میں ایک کار میں چند سفید ریش بوڑھے آئے تھے اور تجھے پوچھتے تھے۔ احقر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ بوڑھے کون لوگ ہوں گے؟ آخر بار بار حلیہ پوچھنے پر یقین ہوگیا کہ حضرت اقدس نے کرم فرمایا ہوگا۔ اپنی بے نصیبی پر اگرچہ افسوس ہوا لیکن فوری طور پر دفتر سے رخصت لے کر اسی دم احقر راولپنڈی حضرت والا کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جب حضرت اقدس کی خدمت میں پہنچا تو حضرت بار بار ہنس کر فرماتے "آج تو ہم نے تمہاری برکت سے کچہری بھی دیکھ لی۔ احقر شرمندہ ہوکر عرض کرتا کہ سب حضرت کی عنایت ہے، یہ ذرہ بے مقدار ان نوازشات کے قابل کہاں ہے[1]۔"

اگر اس طرح کے ذاتی واقعات جن سے حضرت کی پدری و مادری شفقت اور عنایت خصوصی کا اظہار ہوتا ہے اور مختلف خدام والا ان کو بیان کرتے ہیں نقل کیے جائیں تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اخلاق و شفقت نبوی کی یہ روایت مشائخ کبار کو ملتی ہے کہ یہ سمجھتا اور یقین کرتا ہے کہ انہٗ اکرم علیہ من صاحبہٗ (میں دوسرے سے زیادہ معزز و محبوب ہوں)

یہ شفقت اتنی خورد نواز اور دقیقہ رس تھی کہ جن لوگوں سے خصوصی شفقت تھی، ان کی مرغوبات کا بھی اہتمام اور اس کی تاکید بلیغ فرمائی۔ پورب کے ایک خادم جو چاول (خشکہ) کے عادی اور شائق ہیں، بیان کرتے ہیں کہ میرے لیے ہمیشہ خواہ ہندوستان ہو خواہ پاکستان خشکہ کا اہتمام کی تاکید فرمائی جاتی۔ اور میزبان سے دریافت فرماتے کہ ان کے لیے خشکہ بھی تیار کیا ہے۔ ایک روز رمضان مبارک کے آخری عشرہ کے بعد کی مجلس تھی۔ کتاب ختم ہو چکی تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن کو (جو اس زمانہ میں لنگر کے مہتمم تھے) یاد فرمایا عرض کیا گیا کہ مولانا صاحب گھر پر ہیں فرمایا بلاؤ، ان کے آنے میں کچھ دیر لگی، دریافت فرمایا کہ آئے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ آدمی بلانے گیا ہوا ہے۔ یہ اہتمام دیکھ کر ایک صاحب پھر لوگ منتظر تھے کہ حضرت اس اہم وقت میں کون سی اہم بات مولانا سے فرمانے والے ہیں۔ اور کس لیے اس اہتمام کے ساتھ ان کی طلبی اور یاد گاری۔ مولانا تشریف لائے تو ان صاحب کا نام لے کر فرمایا کہ آپ نے ان کے لیے خشکہ بھی تیار کیا ہے؟ پھر بڑی شفقت سے ہدایات دیتے رہے فرماتے رہے کہ خشکہ ضرور تیار کیا جائے۔ اور روٹی بھی ہونی چاہیئے۔ اس لیے کہ یہ دونوں چیزوں کے عادی ہیں۔

۱۹۵۰ء میں سفر حج میں راقم سطور مکہ معظمہ میں دوستوں اور وہاں کے علماء سے ملنے چلا جاتا یا کسی اجتماع میں شرکت ہوتی، ظہر کے بعد جب حرم شریف سے خلوت میں حاضر خدمت ہوتا تو دیکھتا حضرت کے پاس کھانا رکھا ہوا ہے اور حضرت منتظر ہیں۔ بڑی شفقت کے ساتھ فرماتے کہ تمہیں تو کھانے کا بھی ہوش نہیں۔ دیکھو تمہارے لیے یہ روٹیاں رکھی ہیں یہ کھانا تمہاری صحت کے مطابق ہے۔

ان جزئیات اور واقعات لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس شفقت بے پایاں کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ جو خدام و اہل تعلق کے ساتھ تھی ان خصوصی اہل تعلق کے آنے سے بڑے مسرور ہوتے، کبھی فرماتے کہ "تم نے حد کر دی۔ بڑا انتظار کرایا۔" کبھی کسی سے رخصت کے وقت فرماتے "دیکھئے اب کب نصیب ہوتے ہیں"۔ ایک خادم کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ مراد آباد سے رخصت ہونے لگا۔ مولوی عبدالمنان صاحب سے فرمایا۔ کہ اسٹیشن جاکر گاڑی پر سوار کرانا اور سیکنڈ[2] کلاس کا ٹکٹ خرید دینا۔ خود بدولت سیر کو تشریف لے گئے۔ کچھ دیر کے بعد تشریف لائے چلتے وقت دیکھا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ تحمل و ضبط کہتا ہے کہ ٹپکنے نہ پائیں اور محبت کہتی ہے کہ کیا حرج ہے؟

---

[1] مسودہ صوفی محمد حسین صاحب ایم اے۔

[2] جو آج کل فرسٹ کلاس کہلاتا ہے۔

والدمع بینھما عصیٰ طبعٌ[1]

نومسلموں سے خصوصی تعلق اور شفقت

ان سعید روحوں سے جو اپنی طلب صادق اور ذاتی جذبہ سے دین حق کو قبول کرتے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ اور ان پر اولاد کی سی شفقت فرماتے تھے۔ ان قابل حضرات کی اتنی قدر اور ان سے محبت کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رائے پوری[2] اور اختر صاحب کے ساتھ آ کا معاملہ نہایت شفیق باپ اور بڑے چاہنے والے مربی کا تھا۔ ان کی دل جوئی ان کے آرام و صحت کا خیال تھا۔ ان کی ضروریات کا تکفل، ان کی اولاد شفقت اور ان کی تعلیم و تربیت و معاش کی فکر، ان کی شادیوں کا اہتمام، غرض محبت کرنے والا باپ اور سرپرست خاندان جو برتاؤ اپنی مح اولاد اور افراد خاندان کے ساتھ کرتا ہے اور ان کے بارے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے۔ وہی برتاؤ حضرت کا ان عزیزوں کے ساتھ جنہوں نے آغوش اسلام میں پناہ لی تھی۔ اگر کوئی ناواقف شخص حضرت کا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے ساتھ برتاؤ اور رائے پوری ح رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ان کو جو خصوصیت، اعتماد اور تقرب حاصل تھا دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ تو حضرت کے فرزند ہیں یا حقیقی بھتیجے، بھانجے کے ایماء اور تعلق خصوصی کی بنا پر مولانا اشفاق احمد صاحب کی وفات کے بعد مدرسہ کے متولی مقرر ہوئے۔ نہ صرف مولانا بلکہ ان کے صا حکیم محب الرحمٰن پر بھی خصوصی شفقت تھی، مولانا کے اگر غیر مسلم بھتیجے کبھی ملاقات و زیارت کو حاضر ہوتے تو حضرت بڑی شفقت فر

حقیقت پسندی اور حالات زمانہ سے باخبری

حضرت کی طبیعت میں حقیقت پسندی، عملیت اور زمانہ کے تق کی رعایت بہت تھی۔ آپ کی طبیعت میں وہ افراط تفریط اور تخیل نہیں تھی، جو اکثر فرط ذہانت یا شدت مجاہدہ یا رجائیت (ضرورت سے زیادہ پُر امید اور نیک گمان ہونا) پیدا کر دیتی ہے۔ آپ کا ذہن بڑا منہ اور عملی تھا۔ حقائق و واقعات پر (خواہ وہ کیسے ہی تلخ اور تشویش انگیز ہوں) آپ کی نظر رہتی تھی۔ معاملہ کا کمزور اور تاریک پہلو بھی دیکھتے تھے کی نئی تبدیلیوں اور تقاضوں پر آپ کی نظر تھی۔ اور آپ ان کو پوری اہمیت دیتے تھے۔ اور ان کی طرف متوجہ اور متنبہ فرماتے رہتے تھے باوجود ایک مخصوص و محدود ماحول میں نشوونما پانے اور زندگی گزارنے اور ایک خاص دینی طبقہ سے تعلق و وابستگی رکھنے کے آپ کا ذہن ف پر اتنا وسیع، نمو پذیر اور نفاذ تھا کہ قدیم دینی طبقہ میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

حضرت اسلامی ممالک کے لیے مادی ترقی، نئے علوم کا اکتساب، جدید صنعتیں، سائنس میں ترقی، مالی استحکام اور خود کفالتی ب ضروری سمجھتے تھے۔ اور عام طور پر (خصوصاً پاکستان کے زمانۂ قیام میں) اپنی مجلسوں میں خاص طور پر جب جدید تعلیم یافتہ حضرات

---

[1] آنسو ان دونوں احکام اور تقاضوں کے درمیان کش مکش میں مبتلا ہے۔

[2] مولانا ایک معزز سکھ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پرانا نام بلونیدر سنگھ تھا۔ جمال (جواب ضلع سنگرور ریاست پٹیالہ میں ہے) کے والے تھے، فرید کوٹ میں تعلیم پائی۔ وہیں ۱۹ — ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی صاحب نزد ہر شریف ریاست جے پور) کی تلقین سے مسلم ۱۹۲۴ء میں حضرتؒ سے بیعت ہوئے۔ اور آنا جانا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں ماہ رمضان میں رائپور مستقل قیام اختیار کیا، ۳۷ - ۱۹۲۸ حزب الانصار قائم کی جس کی سرپرستی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قبول فرمائی اور سرپرست کی حیثیت سے نام کے اعلان کی اجازت

فضل تشریف رکھتے ہوں (۱۱۰) کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ عالم اسلام کے اس سلسلہ میں تساہل و غفلت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

" مسلمان اپنے اغراض میں مبتلا ہو کر کچھ ایسے سوتے ہیں کہ جاگنے کا نام نہیں لیتے، جس وقت یورپ جاگ رہا تھا، مسلمان ترک گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے ہر قسم کا سامان جنگ بنایا۔ لیکن مسلمان غفلت میں پڑے رہے۔ جب تک سامان پاس نہ ہو لڑائی کس طرح لڑی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں کی ساری سلطنتیں اسلامی بھی بن جائیں تو جنگ کے لیے ایک دن کا خرچ دینے کی بھی طاقت نہیں، انگریز جن کے پاس اتنی بڑی سلطنت ہے کہ اس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا، یہ بھی جنگ کا خرچ برداشت نہیں کر سکا۔ چنانچہ اپنے ملک کے بیشتر حصے قرض میں دیدیئے۔ لڑائیاں لڑنا آسان نہیں ہے[1]۔"

ایک مرتبہ ایک مسلمان ملک کے ایک بڑی سلطنت سے امداد لینے کا تذکرہ تھا اور بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، فرمایا:-

" کیا کریں! اس کے بغیر چارہ ہی نہیں، ان میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ اپنی جملہ ضروریات کی اشیا خود مہیا کر سکیں، بہرحال اپنی ضروریات کے لیے ان کو ان سے تعلقات رکھنے ضروری ہیں۔ عرب سلطنتوں میں سب سے زیادہ طاقت ور مصر شمار ہوتا ہے، وہ بھی ان کا محتاج ہے۔ عرب شریف ہے تو وہ محتاج ہے۔ امریکہ سب کو اپنے قبضہ میں لے رہا ہے۔ اگر پاکستان والے سو سال تک سامان تیار کرنے میں لگے رہیں اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے نہ لڑیں تو ممکن ہے کہ اتنی طاقت حاصل کر سکیں کہ ان سے مستغنی ہو سکیں اور ان کا مقابلہ کر سکیں[2]۔"

ایک مرتبہ فرمایا:-

" نیک نیتی سے ملک کی طاقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی جائے۔ سب دین ہی ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ اگر ریا بانیت فاسد سے نماز بھی پڑھی جائے تو وہ عبادت ہے۔ اسی طرح نیت صالح سے حکومت کی ترقی کا جو بھی کام کیا جائے سارے کا سارا دین ہی دین ہے۔ ایسا نہ ہو کہ "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود"۔ افراد کے اخلاق کی اصلاح بھی ضروری ہے لیکن ملک کی حفاظت بھی ضروری ہے[3]۔"

ایک مرتبہ فرمایا:-

" اسلامی نظام خالی باتوں سے قائم نہیں ہو سکتا، اگر دنیا کے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم و فنون سیکھنے ہوں گے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین و مذہب کو خیرباد کہہ دیتے ہیں جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پہ کھڑا نہ ہو۔ اس زمانہ میں دین و دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا[4]۔"

حضرت اکثر اسلامی ممالک بالخصوص حجاز کے متعلق بڑے افسوس اور قلق کے ساتھ اظہار خیال فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے ابھی تک صنعت و حرفت اور اپنی ضروریات کو اپنے ملک ہی میں پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور ان کی دولت زیادہ تر باہر سے ضروریات زندگی کے در آمد

---

[1] مجلس ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ (۲۷ مئی ۱۹۵۴ء گھوڑا گلی (کوہ مری) بیاض مولوی احمد علی صاحب مرحوم۔
[2]، [3] ۲۲، ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ (۲۶ مئی ۱۹۵۴ء گھوڑا گلی (کوہ مری) بیاض مولوی احمد علی صاحب مرحوم۔
[4] مسودہ صوفی محمد حسین صاحب مجلس بر مکان مولوی عبد المنان صاحب گجرانوالہ۔

کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ شعبان ۱۳۸۱ھ جنوری ۱۹۶۲ء میں راقم نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ کویت و قطر وغیرہ کا سفر کیا۔ جب اجازت اور رخصت کے لیے رائے پور حاضر ہوا۔ تو بڑی عنایت و محبت سے رخصت فرمایا۔ چلتے وقت خصوصیت کے ساتھ فرمایا: "ان بھلے مانسوں سے کہنا کہ اپنی دولت کا صحیح استعمال کریں۔ کارخانے بنائیں اور صنعتوں کو رواج دیں۔ کویت میں مغربی تہذیب کا تسلط اور مادیت کا طوفان دیکھ کر دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ ان عرب ریاستوں کے حالات کے گہرے مطالعہ سے اندازہ ہوا۔ کہ یہاں کی زندگی کی ڈوری ان ملکوں کے قائدین کے ہاتھوں میں نہیں۔ بلکہ یورپ کے سربراہوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہاں کی ساری روشنی اور جگمگاہٹ کا بٹن (سوئچ) یورپ میں ہے۔ یہاں کی زندگی اور رجحان مغربی زندگی اور رجحان کا عکس ہے۔ میں نے حضرت کی خدمت میں وہاں سے مفصل عریضے لکھے۔ جن میں وہاں کے حالات کا تذکرہ اور اپنے تاثرات بھی تھے۔ ایک عریضہ میں یہ جملہ بھی آیا کہ یہاں کے حالات دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک خود یورپ میں کوئی انقلاب۔ نہ ہو، یہاں انقلاب نہ ہوگا۔ حضرت کے حقیقت پسند اور نفاذ ذہن کو غالباً یہ جملہ پسند آیا اور اس میں حقیقت حال کی صحیح ترجمانی محسوس ہوئی۔ میں واپسی پر رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں حاضر ہوا۔ میری آمد کی اطلاع ہوتے ہی یاد فرمایا گیا اور مصافحہ کے ساتھ ہی فرمایا کہ آپ نے اپنے خط میں وہ کیا جملہ لکھا تھا کہ جب تک یورپ میں انقلاب نہ ہو؟ میں نے اس کی تشریح کی باوجود اس کے کہ رمضان مبارک حضرت کے ہاں دن میں گفتگو کرنے کا معمول نہیں تھا۔ لیکن بہت دیر تک بہت تفصیل کے ساتھ کویت کے حالات دریافت فرماتے رہے۔ اور بڑی غور و توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے۔ اس ایک مجلس سے سیری نہیں ہوئی۔ متعدد بار مختلف وقتوں میں بلا بلا کر پوچھتے رہے۔ اسی سال جب ذیقعدہ میں حجاز جانا ہوا اور رخصت کے لیے رائے پور حاضر ہوا۔ تو پھر اسی قسم کی ہدایات دیں اور ملک کے ذمہ داروں اور سربراہوں کو اپنے ملک کی اصلاح و ترقی کی طرف متوجہ کرنے کی تلقین فرمائی اور واپسی پر باوجود انتہائی نقاہت اور ضعف کے وہاں کے حالات دریافت فرمائے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ پیغام کہاں تک پہنچانے کا موقع ملا؟

پاکستان کے اہل ثروت کو بھی کارخانے قائم کرنے اور صنعتوں پر اپنا سرمایہ لگانے کی تلقین فرماتے رہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو بالخصوص تنسیخ زمینداری کے بعد صنعتوں کو اختیار کرنے اور اپنی اولاد کو کوئی ہنر یا صنعت سکھانے کی بڑی تاکید کرتے تھے، فرماتے تھے کہ اب ہندوستان میں بغیر اس کے شریفانہ زندگی گزارنا مشکل ہے۔ جن مسلمانوں کو ایسے پیشے اور صنعتیں اختیار کرنے سے (جو پسماندہ اقوام اور اہل حرفہ کا شعار سمجھی جاتی تھیں) عار اور ننگ محسوس ہوتا تھا۔ اس کی ہمیشہ اصلاح اور تردید فرماتے تھے اور اس احساس کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے رائے پور کے حضرات اور دوسرے زمیندار طبقہ کے افراد کو ہمیشہ مشورہ دیتے تھے کہ اپنے سرمایہ کو کسی تجارت یا صنعت پر لگا کر کمپنیاں بنا لیں بعض لوگوں کے لیے جو حضرت کو صرف ایک شیخ طریقت اور روحانی مربی سمجھتے تھے اور آپ سے صرف اسی سلسلہ کی ہدایات اور رہنمائی کے متوقع رہتے تھے اس طرح کا مضمون سننا (جو اُن کے نزدیک مشیخت و ارشاد کے خلاف تھا) ایک نیا تجربہ اور غیر متوقع سی بات تھی۔ لیکن حضرتؒ اس کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے اور نہایت زور اور جوش کے ساتھ کبھی کبھی اس پر تقریر فرماتے تھے۔

حضرت ان لوگوں کے لیے جو فریضہ، حج سے فارغ ہو گئے ہیں باربار حج نفل کرنے کی (سوائے خاص حالات کے) ہمت افزائی نہیں فرماتے تھے۔ اس کے بجائے ایسے کاموں میں روپیہ صرف کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ جن میں دین کی ترقی اسلام و مسلمانوں کا استحکام ہے۔ حضرت کو (ایک طبیب حاذق اور مبصر کی حیثیت سے) اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ کہ اس میں نفس کا حصہ نہیں ہے۔

" ایک صاحب حج نفل کے لیے تیار تھے حضرت نے بلایا اور ہنس کر فرمایا کہ " اگر لوگوں سے کہا جائے کہ نماز خشوع و خضوع سے پڑھو

تو بار ہو گا اور نہیں ہو سکے گا لیکن حج کے لیے کہا جائے تو فوراً تیار ہو جائیں گے۔" [1]

حالات زمانہ اور بیرونی دنیا میں اور ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے واقف رہنے کا بڑا اہتمام تھا۔ اخبارات کی اہم خبروں اور اہم مضامین اور جدید معلومات کے سننے کا ساری عمر اہتمام رہا۔ رائے پور میں یہ خدمت راؤ فضل الرحمٰن خاں صاحب کے اور پاکستان میں رفیق احمد خاں کے سپرد تھی۔ بہت سے نو وارد اس معمول اور اہتمام کو دیکھ کر متعجب ہوتے، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان تاثرات سے بالاتر اور مستغنی تھے۔ حضرت کی وفات پر "نوائے وقت" میں رفیق احمد خاں صاحب نے حضرت کے اس شعبۂ زندگی سے متعلق اپنے کچھ تاثرات شائع کرائے تھے۔ جن میں انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ حضرت کے اس ذوق و اہتمام پر روشنی ڈالی تھی۔ یہاں اس کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

"بعض لوگوں کے لیے یہ بات حیران کن ہو گی کہ حضرت اقدس جیسے بلند مرتبہ بزرگ اور بظاہر دنیاوی علائق سے لاتعلق انسان کو زمانہ کی خبروں اور سیاسی امور اور ملکی وغیر ملکی حالات و واقعات اور سائنسی تحقیق اور ایٹمی ایجادات و انکشافات سے کیا غرض و دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مگر شریک محفل رہنے والے احباب پر یہ بخوبی واضح ہے کہ حضرت اقدس یہ حالات کس درجہ توجہ و انہماک سے سنا کرتے تھے۔ ملنے والوں سے اکثر تازہ خبریں سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

کبھی کبھی کسی خبر پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نہایت پُر لطف انداز میں تبصرہ فرماتے جس سے اُن کی دور بینی، نکتہ شناسی اور گہری فہم و فراست کا ثبوت ملتا۔ اس وقت حضرت کے ارشادات گرامی کو سننے کے لیے محفل ہمہ تن گوش ہو جاتی، مگر حضرت کی آواز بوجہ حد درجہ نقاہت دور تک نہ پہنچتی۔ اس لیے قریب بیٹھنے والے احباب بھی بمشکل ہی سمجھ پاتے، تاہم حضرت کے چہرے سے فکر و استعجاب یا خوشی و مسرّت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ حضرت کو پاک اور بھارت کے باہمی تعلقات کی خبروں سے گہری دلچسپی تھی۔ دونوں ملکوں کے تعلقات کی بہتری و اصلاح کی کوئی خبر سنتے تو بہت خوش ہوتے اور فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں سے پریشان و فکر مند ہوتے۔ دونوں ملکوں کے چوٹی کے لیڈروں کی فرقہ وارانہ مذمت کی کوئی خبر سنتے تو بڑی تسلی کا اظہار فرماتے حضرت اقدس بھارت اور پاکستان کے باہمی بہتر تعلقات کو دونوں ملکوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ضروری خیال فرماتے۔

سائنس کی کھوج اور تحقیق اور معلوماتی خبروں سے خاص شغف تھا۔ مصنوعی سیاروں کی زمین کے مدار پر گردش اور چاند تک پہنچنے کی کوششوں کے متعلق ہر خبر کو وہ غور سے سنتے۔ ایٹمی آلات، میزائل، راکٹ اور نئی نئی سائنسی ایجادات وغیرہ کے بارے میں معلوماتی خبروں کی طرف پورا دھیان فرماتے۔ مختلف ایجادات اور ایٹمی سرگرمیوں کو عالمی بھلائی کے کام میں لانے کی کسی خبر سے وہ مسرور و مطمئن ہوتے۔ چاند کے متعلق سائنس دانوں نے جو انکشافات کیے ہیں، اور کھوج اور تحقیق کی جو سعی جاری ہے۔ اس کے تازہ کوائف کے بارے میں اکثر دریافت فرماتے رہتے۔ چاند کے علاوہ اجرام فلکی سے متعلقہ سائنسدانوں کی تحقیق اور کاوش کی دوسری خبروں سے بھی دلچسپی کا اظہار فرماتے۔ اور اس قسم کی معلوماتی خبروں کو بڑے غور سے سنتے، چاند تک انسان کی رسائی کے بارے میں سائنسدانوں کی تگ و دو اور حیرت انگیز کارکردگی، نئے نئے راکٹوں کی تیاری اور اس ضمن میں آئندہ کی کوششوں کے بارے میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہ فرماتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا یہ مغربی لوگ اولوالعزمی اور ہمت کے لحاظ سے جن ہیں۔ جو دن رات نت نئے تجربات سے کھوج اور تحقیق میں لگے رہتے ہیں۔ اور عجیب و غریب کارہائے نمایاں سرانجام

---

[1] مجلس ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ۔

اسلام کی فکرمندی اور مسلمانوں کے لیے دل سوزی

اسلام کی فکرمندی اور مسلمانوں کے حالات سے دردمندی طبیعت ثانیہ اور پورے نظام زندگی کی روح رواں بن گئی تھی۔ اس کے لیے نہ زندگی کا کوئی شعبہ مخصوص تھا، نہ عمر کا کوئی وقت، یہ درد جسم اور قوائے فکریہ میں اس طرح جذب ہو گیا تھا۔

شاخ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم

جس گروہ[1] سے آپ کا تعلق تھا اس کا ذکر و شغل، اس کا انقطاع الی اللہ، اس کی یکسوئی و بے نیازی اس کو مسلمانوں سے جدا اور بے فکر نہیں بناتی بلکہ اور زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے درد میں مضطرب و بے قرار بناتی ہے اور اس گروہ کا ہر فرد زبان حال سے کہتا ہے:

مرا دردیست اندر دل چو می گویم زبان سوزد
اگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہی درد کبھی زبان پر آکر آہ و فغاں میں تبدیل ہو جاتا، کبھی مسلمانوں کی کوتاہیوں، اور ناسمجھیوں پر درد و قلق کا اظہار اور ملامت و تنبیہ پر آمادہ کرتا، کبھی تنہائی میں آنسوؤں میں تبدیل و تحلیل ہو جاتا۔ لیکن وہ دم کے ساتھ تھا۔ اور اس سے کسی وقت قرار نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ تقسیم اور زمانہ فسادات میں جب بہت سے مسلمان بے ہمتی کے ساتھ اسلاف کے خون اور پسینہ سے سینچے ہوئے اس باغ کو چھوڑ کر اپنے لیے پناہ کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور اس ملک میں بظاہر اسلام کا زوال نظر آرہا تھا۔ اس درد نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ اس زمانہ کی بے قراری کی تفصیل ایک گزشتہ باب میں گزر چکی ہے۔

ایک مرتبہ ایک ایسے اہم اور نازک موقع پر جس میں دعا کی سخت ضرورت تھی۔ یہ خادم شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کی ہمرکابی میں رائے پور حاضر ہوا۔ اور اس موقع کی نزاکت و اہمیت کی طرف متوجہ کرکے خصوصی دعا کی درخواست کی۔ حضرت نے اپنے تعلق خاطر اور فکرمندی کا اظہار فرمایا۔ اور تنہائی میں مجھ سے فرمایا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تخلیہ میں معلوم نہیں کن عبادات میں مصروف ہوتا ہوں، بعض مرتبہ پورا وقت مسلمانوں کی فکر اور رنج و قلق میں گزر جاتا ہے۔

---

[1] محقق و متبع سنت صوفیہ کا وہ گروہ جس کی نسبت حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی طرف ہے اور جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہند جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

مقام تحقیق و اجتہاد

حضرتؒ کے طریقہ سلوک و تربیت، تصوف، طریقت، ذکر و صحبت، معرفت و محبّت کے بارے میں بجائے اس کے کہ خود کوئی چیز پیش کی جائے اور اس پر عملی اور فنی طریقہ پر روشنی ڈالی جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں کے بارے میں حضرت کے خود اپنے خیالات و تحقیقات پیش کی جائیں جن کا وقتاً فوقتاً اصلاح و تربیت کے لیے کسی مجلس میں اظہار فرمایا اور جن کا بہت تھوڑا حصّہ (نہ ہونے کے برابر) قید تحریر میں آسکا ہے۔ انہیں منتشر، متفرق ملفوظات پر نظر ڈالنے سے حضرت کے اصلی خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اس کا بھی کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت کو اس فن میں کیسی مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی اور آپ کی نظر رسوم و آداب، جزئیات و تفصیلات کے بجائے اصل مقاصد اور لُبِ لُباب پر کس قدر تھی۔ ان مقاصد کے لیے آپ طبائع، اختلاف مزاج اور زمانہ کی تبدیلیوں کی کس قدر رعایت فرماتے تھے۔ اور آپ کی نظر کس قدر عمیق، دقیقہ رس اور حقیقت بین تھی۔

مقصودِ کار

فرماتے تھے کہ:-

" اصل کیفیت یقین کا پیدا ہو جانا ہے۔ جب کوئی سالک اپنی کیفیات کا ذکر کرتا تو یہی فرماتے کہ اصل کیفیت یقین ہے۔ ایک دفعہ فرمایا، کمرے میں اندھیرے میں شیر ہے، نظر نہیں آتا۔ ایک آدمی وہاں ہے۔ وہ بے فکری میں وہاں بیٹھا ہے اچانک روشنی ہوئی، شیر اس کو نظر آگیا۔ اس پر خوف طاری ہو جائے گا۔ اسی طرح یقین نصیب ہونے کے بعد خوف خدا آجاتا ہے اور یہ خوف خدا بنیاد ہے تمام اعمال حسنہ کے کرنے کی اور تمام اعمال بد سے بچنے کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اجرائے لطائف سلطان الاذکار، انوار حتّٰی کہ فنائیت کی کیفیت کو بھی کچھ اتنا بڑا مرتبہ نہیں دیتے تھے۔ حضرت کے نزدیک استدلالی یقین کا وجدانی اور ذوقی یقین میں تبدیل ہو جانا اصل چیز تھی۔ اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا بھی خدا کی ہستی کا انکار کرے تو یہ وجدانی یقین والا شخص کبھی بھی انکار نہیں کرتا۔[1] "

" حضرت راستہ کی کیفیات مثلاً وجد، انوار، اجرائے لطائف، سلطان الاذکار، حتّٰی کہ فنائیت کی اہمیّت کو بھی خاص اہمیّت نہیں دیتے تھے۔ حضرت کے یہاں کیفیت قابل حصول صرف ایک تھی، یقین، کامل یقین اور اس کا نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیات مثلاً خوف، خشیت، محبت الٰہی، تعلق مع اللہ کا دوام، کامل اخلاص، اتباع شریعت، اخلاق عالیہ مثلاً توکل رضا و تسلیم، صبر و شکر وغیرہ۔ لوگ بڑے بڑے اُونچے حالات حضرت کو سناتے تھے۔ لیکن حضرت یہی فرماتے تھے کہ اصل مقصود یقین کا پیدا ہو جانا ہے۔ حضرت کے ہاں تصوف کا مقصود صرف یہی تھا کہ استدلالی یقین، وجدانی، ذوقی اور کشفی یقین میں پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہو، تعلق مع اللہ کو دوام و استقلال حاصل ہو۔[2] "

" کسی نے کسی لطیفہ کے جاری نہ ہونے کی شکایت کی، آپ نے اس سے یقین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ تو ہے فرمایا کہ پھر لطیفہ کے پیچھے نہ پڑو، مقصود حاصل ہے۔[3] "

---

[1] و [2]:- مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب ایم اے۔
[3]:- تحریر مولوی عبد الجلیل صاحب۔

آہ قطب الارشاد گزشت ۱۳۸۲

نظم فراق

سلطان العرفاء سید طائفہ حضرت اقدس مولانا و مرشدنا شاہ عبدالقادر رائپوری نور اللہ مرقدہٗ

از

کمترین متوسلین مدعو بہ نفیس الحسینی غفرلہٗ

اے غمِ جاناں، اے غمِ جانم | دل ہے پُرخوں، آنکھیں پُرنم
اللہ اللہ، اُن کا عالم | عشق سراپا، حسن مجسّم
حضرتِ عبدالقادرِ ثانی | قبلہ نما و قبلۂ عالم
قطبِ زمانہ، غوثِ یگانہ | رشکِ جُنیدؒ و شبلیؒ و ادہمؒ
فانی فی اللہ، باقی باللہ | ختم ہے اُن پر اُن کا عالم
جامعِ سُنّت، قامعِ بدعت | نائبِ حضرتِ فخرِ دو عالم
عسکریِ اصحابِ مقدّس | لشکریِ پیغمبرِ خاتم
نورِ شریعت، فیضِ طریقت | جاری ساری باہم باہم
ایسا عارف، ایسا مرشد | ڈھونڈھ نہ پائے عالم عالم
تجھ سا نہ دیکھا، تجھ سا نہ پایا | اُتّر، دکّھن، پورب، پچّھم
لاکھوں دلبر، لیکن پھر بھی | تیرا عالم، تیرا عالم
حسنِ تکلّم، رنگِ تبسّم | غم کا مداوا، زخم کا مرہم
گاہ اشارہ، گاہ کنایہ | مجمل مجمل، مبہم مبہم
سوزِ مروّت لطف لطف | دردِ محبّت پیہم پیہم
اپنے پرائے، یکساں یکساں | سب کا مونس، سب کا ہمدم
استغنا کا عالم، واللہ | خاک برابر لاکھوں درہم
اُف رے دبی چنگاری دل کی | آگ لگا دی پورب پچّھم
آہ ترا اندازِ محبّت | عشق میں شعلہ، حسن میں شبنم

یاد رہیں گے تیرے جلوے | روشن روشن، مدّھم مدّھم
آہ کہ تجھ سے گرم تھی محفل | آہ کہ اب ہے درہم برہم
اُجڑا اُجڑا، ویراں ویراں | ق ہائے وہ رائپور کا عالم
ساحلِ جمنا پر کیا گزری | آہ وہ طوفاں برہم برہم
تم ہی کہو کچھ غم کی کہانی | اے لبِ راوی اے لبِ جہلم
آہ نفیسِ زار کی حالت | بیکل بیکل، بیدم بیدم
اللہ اللہ دیکھ لیا ہے! | حشر سے پہلے حشر کا عالم
سینہ بریاں، دیدہ گریاں | آہ کہ اب کس حال میں ہیں ہم
ذکر کی دنیا سونی سونی | فکر کا عالم درہم برہم
دنیا دنیا عقبیٰ عقبیٰ | عالم عالم تیرا ماتم
دل کہ شہیدِ ناز ہے تیرا | زندہ ہے اب بھی لیکن کم کم
آہ کہ تجھ بن چین نہیں ہے | یاد ہے تیری پیہم پیہم
ان شاء اللہ، ان شاء اللہ | آج سے ہے یہ وعدہ محکم
وہ جو عزیزِ جاں ہے تمہارا | وہ ہے ہمارا اس کے ہیں ہم
آہ کہ زادِ حشر نہیں ہے! | آہ ندامت سے ہے سر خم
اے مرے مشفق اے مرے محسن! | تم ہو جو کہیے پھر مجھے کیا غم
ہاتھ میں تیرے ہاتھ دیا ہے | لاج بھی تیرے ہاتھ ہے ہمدم
حشر میں ہم کو بھول نہ جانا | یاد کے لائق گرچہ نہیں ہم

حشر تلک تربت پہ تیری
نور کی بارش برسے چھم چھم

۱ وصال مبارک: بہ ۱۴ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ روز پنجشنبہ! مطابق ۱۶ اگست ۱۹۶۲ء، بوقت چاشت، در بلدہ لاہور

۲ [illegible]

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء

۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۲ء

انجمن خدام الدین
شیرانوالہ دروازہ لاہور

۲ صفر ۱۳۷۴ھ

مخدومی و مخدوم العلماء والفضلاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم

از احقر الانام احمد علی عفی عنہ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ الحاد اور زندقہ کا طوفان پاکستان میں بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کا سد باب فقط مضبوط اور علماء کرام کی متحدہ جمعیۃ علماء اسلام ہی سے ہو سکتا ہے اور حکومت بھی ایسی ہی جمعیۃ علماء اسلام کو قابل اعتبار سمجھیگی۔ اور عام مسلمانوں میں بھی یہی جمعیۃ مقبول ہو سکتی ہے۔ اسلئے مجھے آپ کی معاملہ فہمی اور اخلاق حمیدہ سے امید واثق ہے۔ کہ ہمارے پنجاب کے وفد کو جو حضرت مولانا خیر محمد صاحب اور حضرت مفتی مولانا محمود صاحب پر مشتمل ہے۔ کامیاب و سرفراز فرما کر واپس فرمائیں گے۔

فقط

عکس تحریر حضرت لاہوریؒ

شید ارشد

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا احمد علیؒ پر یہ مضمون ماسٹر لال دین صاحب کی مبسوط کتاب "انوارِ ولایت" کی ملخص ہے ترتیب وغیرہ سب ان کی ہے۔ ہم نے اس کا اختصار کر دیا ہے۔ (ارشد)

جلال نامی قصبہ ضلع گوجرانوالہ میں ۲ رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ کو جمعۃ الاولیٰ کے دن ایک مقدس گھرانے میں ایک بچہ پیدا
بس کا اسم گرامی احمد علی رکھا گیا۔ یہ قصبہ ریلوے اسٹیشن گکھڑ سے چار میل مشرق میں واقع ہے۔ مشیتِ ایزدی نے
بے کو کس صاحبِ کمالات اور منبع سعادات کی ولادت سے نوازا۔ اس وقت کی ایک زبان بھی ایسی نہ تھی، جو اس حقیقت
بار کر سکے، اور اس وقت کی ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو اس مہرِ ولایت کے طلوع پر خلقِ خدا کو آگاہی بخشے لیکن فرشتگانِ فضاو
ں لبتی کے ہر کوچہ و بازار میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔ ع

آمد آں یارے کہ ما مے خواستیم

کس کو خبر تھی کہ یہ بچہ جو آج ایک گمنام قصبے کے ایک غریب گھرانے میں جنم لے رہا ہے کسی دن آسمان ولایت پر آفتاب
اب بن کر چمکے گا۔ اس کے فیوض و برکات کی سوتیں زمزم و کوثر کی آئینہ دار بنیں گی، اور یہ مشرق سے طلوع کرنے والا نیرّ
ت مغرب کی وادیوں میں بھی ضیا پاشیاں کرے گا۔ جیسا کہ علامہ علاؤالدین صدیقی صدر شعبۂ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی کی شہادت
"میں نے مغربی ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران میں اس حقیقت کو ہزار تعجب سے جگہ بہ جگہ دیکھا ہے کہ سید العارفین، عالمِ
ی حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے ارجمند شاگردوں، عقیدت مندوں یا خوشہ چینوں میں سے کسی نہ کسی مردِ
انے قرآن پاک کے درس و تدریس اور نشر و اشاعت کو اپنا لائحہ عمل بنا رکھا ہے۔" اور اسی طرح ہمارے محترم بابو منظور سعید
احب جنھوں نے حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے آپ کے سوانح حیات سن کر نقل فرمائے ہیں۔ اپنی بیاض کی
ہذا میں رقم طراز ہیں:

"چنانچہ میرا اپنا واقعہ ہے کہ اپریل ۱۹۴۴ء میں جب میں دہلی ریلوے اسٹیشن سے علی گنج صفدر جنگ کی طرف پیدل جا رہا تھا تو ایک آدمی راستے میں بلا باتوں باتوں میں ہماری ایک دوسرے سے شناسائی ہو گئی۔ جب اس شخص کو معلوم ہوا کہ میں لاہور سے آیا ہوں تو اس نے مجھ کو بتایا کہ ہم ایران میں حضرت مولانا احمد علی صاحب کو مفسرِ قرآن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟ میں نے ان کو حضرتِ والا شان کے متعلق کافی واقفیت دلائی۔ لیکن میں خود حیران تھا کہ ہمارے حضرتؒ کی علمی شہرت بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔"

حضرت اقدس کے والدین ماجدین: حضرتِ اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت میں اسباب و علل کے چہرے پر کوئی

نقاب نہ تھا اور ماحول میں ایسے آثار نہیں پائے جاتے تھے جس سے آپ کا ابد میں سیدالاولیاء ہونا خارجی م...
حیرت و استعجاب سے دیکھا جاتا بلکہ یہاں تو خالق ارض و سماء نے حسنِ اتفاقات کو اکٹھا کر دیا تھا۔ آپ کے والدین...
زندہ جاوید تصویر تھے۔ شریعتِ طاہرہ کے احکام کی پابندی ان کی سرشت میں سمائی ہوئی تھی۔ یخ دعا، صوم و...
انہماک ان کے خمیر میں داخل تھا۔ اللہ اللہ! پاک باز اور نیک فطرت والدین جب کسی بچے کو اپنی عارفانہ نگاہ...
کی دعاؤں میں پرورش دیتے ہیں تو اس بچے کی زندگی اپنے ماحول میں ایک روحانی انقلاب بپا کر سکتی ہے۔ کی...
کردار سے افراد کی نجات کا مسئلہ وابستہ ہوتا ہے۔

تائیدِ ایزدی کا ظہور: حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم کا نام نامی شیخ حبیب اللہ تھا، اور آپ سا...
تھے۔ ہمارے حضرت مرحوم اپنے والدین کی امیدوں کا ثمرِ اوّلین تھے۔ اس مقام پر تائیدِ خداوندی نے ایک نیا...
کے والدین نے دینِ حقہ کی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے ثمرِ اوّلین کی ولادت سے پیشتر حضرت مریم عل...
والدین کی طرح آپ کو کتاب و سنت کی خدمات کے لئے وقف (محرّر) کر دیا تھا۔ خداوند عالم کو یہ نذرانہ اس نذر...
کرنے والوں نے اس قدر صدق و اخلاص سے پیش کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں پر ...
ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ غفلت میں گذارا ہو۔ احقر تو حلفیہ کہا کرتا تھا کہ حضرت والا جاہ کے ...
عمل کرنا ہماری سہل انگار زندگی سے کوسوں دور ہے۔

خیر! آپ کے خوش نصیب والدین نے حضرت مریم علیہا السلام کے والدین کی طرح حسرت سے نہیں بلکہ...
سے آپ کی پیدائش پر اپنی تمناؤں کو پورا ہوتے دیکھا اور فرطِ احسان مندی سے جھومتے ہوئے آپ کا نام احمد...
فرمایا۔ والدین کے پاکیزہ ارادے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس وقف شدہ (محرّر) نومولود کی پرورش کے ایام م...
رضائے الٰہی کے حصول کو پیش نظر رکھا ہوگا۔ والدِ مکرم کو ذوقِ عبادت کے ساتھ ساتھ اپنی روزی کے پاکیزہ ہونے کی فکر...
رہتی ہوگی، اور والدہ محترمہ کو اس نذرانۂ الٰہی کی حسنِ تربیت کے لئے شبانہ روز تسبیح و تہلیل کا استغراق لازم...
حلال کی برکت اور جذبۂ عبادت کا کیف نورِ ایمان بن کر ہونہار بچے کی رگ رگ میں سما جائے۔

علم و حکمت زاید از نانِ حلال
عشق و رقت آید از نانِ حلال

حضرت رحؒ کے حقیقی بھائی: حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے تین حقیقی بھائی ہیں: حافظ محمد علی صاحب ...ستان
پذیر تھے، اور کئی سال تک وہیں رہے، اور اب قضائے الٰہی سے فوت ہو چکے ہیں۔ اِنّا للہ وَاِنّا الیہ راجعون۔ مولانا عزیز...
کراچی میں رہتے ہیں۔ ان سب حضرات سے چھوٹے حکیم رشید احمد صاحب ہیں۔ جو زبدۃ الحکماء کی اعزازی ڈگری...
ہیں۔ اور طبیہ کالج لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام چل رہا ہے میں بطور پروفیسر کام کرتے رہے ہیں ا...
معذور ہیں، اور حضرت اعلیٰ کی زندگی میں درسِ قرآن مجید میں تشریف لایا کرتے تھے۔ طبیعت کا تقاضا ہے کہ ان ایام...
بھی عرض کر دوں، کہ درس قرآن مجید کے بعد عقیدت مند لوگ حضرتؒ سے مصافحہ کرتے اور چلے جاتے حکیم صاحب خوش

ب وقت پاکر حضرت اقدس کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے اور بعض اوقات آنسو بھی بہائے۔ یہ منظر دیکھ کر احقر کی آنکھوں سے نسو اُبل پڑتے۔ اور خیال آتا کہ الٰہی! دنیا میں اب تک اخوتِ اسلامی کا یہ نقشہ موجود ہے۔ کہ ایک بھائی اپنے بڑے بھائی ں پر بوسہ دے رہا ہے۔ جب کہ اس زمانے میں یہ منظر لاکھوں میں بھی نظر نہیں آتا ہے۔ بلکہ حرص و آز۔ شکوک۔ وشبہات بطالی۔ عداوت۔ بغض۔ حسد۔ کبر و نخوت اور جاہلانہ ہٹ دھرمی رشتہ داروں میں اس قدر گھر کر گئی ہے کہ شاید ہی کوئی ب برادری ہوگی جس کے افراد ایک دوسرے کے وقار کا خیال رکھتے ہوں یا ایک دوسرے سے حسنِ مروت سے ہوں۔

تعلیم : ہم حضرت لاہوریؒ کی ابتدائی تعلیم کے متعلق عرض کرنے بیٹھے ہیں۔ آپ نے جب اپنی والدہ ماجدہ کی آغوشِ شفقت نو ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کے لیئے اپنی عصمت مآب والدہ ماجدہ کے سامنے ہی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ وہ بچے جن کی پرورش روردگارِ عالم کے لطفِ خاص نے گھر کے ماحول کو اسلامی بنا رکھا ہو' ان کی قسمت کی بلندیوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ لم بھولے پن کے دنوں میں فردوسی نعمتوں کی طرح دل و دماغ میں نور افشانیاں کرتی ہے۔ کیونکہ والدہ سے بڑھ کر تربیت و ا جذبہ اور کہیں نہیں ہوتا۔

حضرت لاہوریؒ ابھی اپنی والدہ ماجدہ سے پڑھ ہی رہے تھے کہ آپ کو ایک مدرسہ میں داخل کرا یا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر ل تھی۔ یہ مدرسہ قصبۂ جلال سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا' اور وہ جگہ کوٹ سعداللہ کے نام سے مشہور تھی۔ حضرت اقدس سرّہٗ لتب طلبہ کے ہمراہ کوٹ سعداللہ میں پڑھنے کے لیئے تشریف لے جاتے تھے۔ آپ نے تیسری جماعت تک اس جگہ تعلیم حاصل کی۔

کی تبدیلی : حضرت اعلیٰ کے پدر بزرگوار شیخ حبیب اللہ مرحوم تجارتی کاروبار کرتے تھے۔ آپ کا کاروبار بابو نامی چک ماتھی گاؤں میں تھا۔ یہ گاؤں قصبہ جلال سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ لہٰذا آپ نے اپنے کاروبار کی سہولت کے پیشِ جلال کی بجائے چک بابو میں رہائش اختیار کرلی' اور اپنے اہل و عیال کو وہاں ہی لے گئے۔ اس جگہ آپ کو دوبارہ سکول ل کیا گیا۔ آپ کا موجودہ سکول قصبۂ تلونڈی کھجور والی ضلع گوجرانوالہ میں تھا۔ آپ نے پانچویں جماعت تک وہیں تعلیم حاصل کی۔

سے مسجد کی راہ : وہ خوش اختر نونہال جس کی پیدائش سے اس کے والدین نے دینِ متین کی خدمت کے لیئے وقف کر نا اس کو سکول میں بھیجنے کا مقصد صرف اُردو میں نوشت و خواند کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لہٰذا اب وقت آگیا کہ اللہ عزّ اسمہٗ ا کیا ہوا وعدہ اپنی پوری نیاز مندیوں کے ساتھ ایفا کیا جائے۔ اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے والدین نے آپ کو شہر والا میں ایک درویش صفت بزرگ صورت مولانا عبدالحقؒ کے پاس بھیج دیا۔ مولانا موصوفؒ آپ کے والد محترم کے مخلص احباب میں سے تھے۔ حضرت لاہوریؒ اپنے استادِ اوّل سے انتہا درجے کی محبت کرتے تھے۔ یہ آپ کی خدا داد حسنِ خدا داد آپ زمانہ انقیاد کا نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا عبدالحق مرحوم آپ کو اپنے صاحبزادوں کی طرح شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا تھے۔

حضرت لاہوریؒ کا یہ ارشاد کہ میرے استاد مشفق مجھ کو اپنے بچوں کی طرح اپنے گھر پر رکھا کرتے تھے۔ اس زندگی کی ایک مختصر تصویر ضرور پیش کرتا ہے۔ ہر جگہ ایسا ہی ہوا ہے۔ اگر ہم خود اپنی اولاد میں بھی فرمانبرداری کے آثار نہ پائیں۔ تو ان سے

نفرت کرنے لگتے ہیں اور اگر شاگردوں میں سے کسی میں خدمت کا مادہ دیکھیں۔ تو اس سے محبت سے پیش آتے ہیں۔
حضرتؒ والا کی خدائی نوازش نے عین کمسنی میں بھی آپ کی دستگیری فرمائی' اور آپ کے لئے والد روحانی کا
ہمیشہ کھلا رکھا۔ حضرت مولٰنا عبد الحقؒ اپنے ہونہار روحانی فرزند کو اپنا تیسرا بیٹا خیال فرماتے تھے۔ اور یہ سعید گھڑیاں
گیئں۔ آپ آٹھویں دن اپنے والدین کو ملنے کے لئے گھر واپس آیا کرتے تھے۔

امامِ انقلاب حضرت مولٰنا عبید اللہ سندھی کے حضور میں: ہمارے آقائے روحانیؒ نے گوجرانوالہ میں
ہی گزارے تھے کہ حضرت مولٰنا عبید اللہ سندھی وہاں تشریف لائے۔ آپ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ حضرت مولانا
رشتہ ولد تھے۔ لہٰذا آپ کے والد ماجد نے آپ کو حضرت سندھیؒ کے سپرد کر دیا' اور یہ الفاظ فرمائے۔ کہ "ہم نے یہ لڑکا دین
خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے"۔ اب آپ کو حضرت سندھی نے اپنی شاگردی میں قبول فرمالیا۔

توقف: دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے مفکر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے فرنگی تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت
کا یوں ذکر کیا ہے: ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ بچہ جس کا جنم کسی مسلمان گھرانے میں ہو اس کے کان میں یقیناً
کلمۂ شہادت کی آواز آتی ہے۔ چند سالوں کے بعد اسلام کی بعض ابتدائی چیزیں اور بھی اخذ کر لیتا ہے۔ مگر جب وہ
اور وہاں سے کالج کی راہ لیتا ہے۔ تو بے دینی کے اثرات آہستہ آہستہ اس کی روح کو مکدر کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ دین
سے وہ کلیتہً بیگانہ ہو جاتا ہے۔ ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے کہ دیتے ہیں سبق شاہیں بچوں کو خاک بازی کا

ان اشعار میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کہ تربیت سے خداداد صلاحیتوں پر غیر شعوری طور پر اثر پڑتا ہے اور
پذیری کا مادہ نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بُرے ماحول میں اکثر اوقات اچھا ہو جاتا ہے۔ ہم کو اس مسئلہ کے پیش نظر
لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی زندگی پر غور کرنا ہے۔

حضرت سندھیؒ جو اپنے وقت کے امام انقلاب تھے اور انہوں نے اسلام سے باقی اوصاف کے علاوہ انگریز دشمنی کا
اتم حاصل کیا ہوا تھا۔ ان کے حلقۂ اثر میں رہ کر ایک ہونہار بچہ کیا کچھ نہیں بن جاتا۔ باپ کی سپاہیانہ زندگی اگر کسی بچے کا
مدد دیتی ہے۔ تو اس طرح حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی انگریز دشمنی نے ہمارے مربی و محسن کو ایام تربیت ہی سے
انگریزوں سے اس قدر نفور کر دیا تھا۔ اور انگریزی تہذیب سے اس درجہ دور کر دیا تھا۔ کہ جس کی مثال ڈھونڈنے سے
ہے۔ امامِ انقلاب کے مکتب کا درسِ حریت حضرت لاہوریؒ کی زندگی کا ایک ہمہ گیر جذبہ بن گیا' اور ہم نے
وہدایت پر بیٹھے بیٹھے عین پیرانہ سالی میں بھی جب انگریزی تہذیب کے خلاف زبان کھولتے تھے تو یوں معلوم ہوتا
وقت یا فاروقِ دوراں ہے۔ جو تمام دنیا کی ابلیسی طاقتوں کو چیلنج دے رہا ہے۔ وہ لوگ جن کو آپ کے ساتھ
حاصل ہوا۔ ان سے آپ کی حریت نواز فطرت۔ خطر پسند طبیعت۔ بے باک جذبۂ صداقت اور شبانہ روز غلبہ للہیت

وہ آپ کا ذکرِ خیر سن کر ہی نہایت مسرت سے آبدیدہ ہو کر پکار اٹھیں گے۔ ؎

مردِ حُرّ محکم ز وردِ لاتخف — ما بمیداں سربجیب او سربکف
مردِ حُرّ چوں اشتراں بارے برد — مردِ حُرّ بارے برد خارے برد
ماکلیسا دوست۔ ما مسجد فروش — او ز دستِ مصطفےٰ پیمانہ نوش (اقبال مرحومؒ)

ہم انشاء اللہ کسی اور موقعہ پر اس موضوع پر چند واقعات حوالۂ قلم کریں گے۔ اب مندرجہ بالا اشعار کا ترجمہ لکھتے ہیں۔

(۱) جذبہ حُریّت سے سرشار انسان غیر اللہ سے خائف نہیں ہوتا۔ ہم مصائب میں گھبرا جاتے ہیں۔ لیکن وہ ہر وقت سرفروشی کے لئے تیار رہتا ہے۔

(۲) جیسے لق و دق صحرا میں اونٹ بوجھ اٹھا کر بے آب و گیاہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ اسی طرح آزاد انسان ملک و دین کی خدمت کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کو مستعد رہتا ہے۔

(۳) ہم غیروں کی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ اور اپنی تہذیب سے نفور ہیں۔ لیکن اس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ وہ اپنی زندگی کو اسوۂ نبویؐ کے تابع کر چکا ہے۔ لہٰذا کامرانی ہر موقعہ پر اس کے قدم چومتی ہے۔

حضرت لاہوریؒ حضرتِ اعلیٰ مولانا غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں: ہم حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہٗ کی روحانی تربیت کے ابتدائی مدارج پر غور کرتے ہیں۔ تو بے ساختہ یہ آیت زبان پر آتی ہے۔ کہ اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (اللہ تعالےٰ جس کو چاہے بلا حساب رزق عطا فرماتا ہے) ہم تو خدا تعالےٰ کی عنایاتِ عظیمہ پر جب نگاہ کرتے ہیں تو احسان مندی کے نشے میں جھومنے لگتے ہیں۔ حضرت اقدس کا لڑکپن میں ہی ایک عارف باللہ کی صحبت میں جانا تائید غیبی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہمارے مربیّ حضرت شیخ التفسیر حضرتِ اعلیٰ پیر کامل ہادیٔ دوراں پیکرِ حُسنِ عمل سیدنا غلام محمد دین پوری کے مکتبِ معرفت میں کیا گئے۔ انہوں نے تو وہاں ہدایت و معرفت کا ایک دائمی سرچشمہ پا لیا۔ گویا آج ضَرَبَ یَضْرِبُ ضَرْبًا کے ساتھ ولایت کا پہلا سبق بھی پڑھا۔ ؎

دمِ عارف نسیم صبحدم ہے — اسی سے ریشۂ معنیٰ میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے (اقبال مرحومؒ)

دراصل عالم اسباب کے مالک نے اس نظام کو اس طرح چلایا۔ کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ان دنوں مرکزِ ہدایت امروٹ شریف ضلع سکھر میں قیام پذیر تھے۔ وہ حضرت لاہوریؒ کو اپنی معیت میں لے کر سندھ روانہ ہو گئے۔ راستے میں بہاولپور گذرنا ضروری تھا۔ ریلوے اسٹیشن خان پور سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر دین پور شریف ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اس بستی میں حضرت سندھی کے شیخ طریقت حضرت مولانا غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ رہائش پذیر تھے۔ یہ بستی دراصل حضرت ممدوح کی مسجد کی وجہ سے ہی مشہور تھی۔ کیوں کہ حضرت اعلیٰؒ کی قیام گاہ کے سوا وہاں کوئی چیز بھی قابلِ ذکر نہیں تھی۔ حضرت سندھیؒ اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کے لئے دین پور شریف حاضر ہوئے۔ اور وہاں دو دن ٹھہرے۔ حضرت

لاہوری رحمۃ اللہ علیہ جو طفلِ مکتب کی صورت میں ہمراہ تھے ۔آج زندگی کے ایک نئے میدان میں قدم رکھ رہے تھے ۔آپ کی کاستارہ بلندی پر تھا۔حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو حضرتِ اعلیٰ کے حضور میں بیعت کے لئے پیش کیا۔توجنیدِ دوراں آپ کو اپنے حلقۂ رشدو ہدایت میں داخل فرمالیا۔اس ساعت کی برکات کا کیا کہنا؟ زمانے بھر کی بے بدل ہستی ایک بچے کو نگاہوں سے جانچ رہی ہے، اور اپنی آغوش ولایت میں جگہ دے رہی ہے ۔ ع

تیری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

بعد ازاں حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو امروٹ شریف لے گئے ۔حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے اہل و عیال بھی وہاں تھے۔کیوں کہ اس جگہ کوئی دینی درس گاہ نہیں تھی۔لہٰذا حضرت سندھیؒ نے خود ہی حضرت لاہوریؒ کو فارسی اور نحو کی تعلیم دینا شروع کردیا۔

امروٹ شریف میں حضرت سندھیؒ کے قیام کے وجوہات: امروٹ شریف ضلع سکھر صوبہ سندھ میں ان دنوں اجل، عارف اکمل، مجاہد کبیر، مستجاب الدعوات حضرت تاج محمود رحمۃ اللہ علیہ جلوہ افروز تھے ۔آپ ہر وقت جذبۂ جہاد سے سرشار رہتے تھے ۔آپ سرخیلِ اولیائے کرام بھی تھے ۔اور غازی جانباز بھی تھے۔آپ کا تعارف علامہ اقبال مرحوم کے ان سے قدرے کروایا جاسکتا ہے ۔ ؎

آں کہ بخشد بے یقیناں را یقیں — آں کہ لرزد از سجودِ او زمیں
آں کہ از خونش بروید لاالٰہ — آں کہ زیرِ تیغ گوید لاالٰہ

ترجمہ:(جس کی صحبت ناقصوں کو دولتِ یقین عطا کرتی ہے ۔جس کے مخلصانہ سجود سے زمین میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ تیغ ستم کے نیچے بھی کلمۂ توحید پیش کرتا ہے ۔اور یہ وہ مجاہد ہے جس کے خون کے ٹپکنے سے بھی لاالٰہ الا اللہ کی کھیتی سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے ۔) یا یوں سمجھئے کہ سیدنا تاج محمود امروٹی مرحوم کے متعلق ہزار عقیدت سے یہ کہا جاسکتا ہے ۔

خاکی و از نوریاں پاکیزہ تر — از مقام فقر و شاہی باخبر
بندۂ حق وارثِ پیغمبراں — او نگنجد در جہانِ دیگراں

آپ جب تک جئے مجاہد فی سبیل اللہ بن کر جئے ۔آپ کے شیخ طریقت حضرت حافظ محمد صدیقؒ تھے ۔جو بھرچونڈی سے متعلق تھے ۔بھرچونڈی شریف کراچی ریلوے اسٹیشن خیرپور ڈھیرکی سے قریباً دو میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بچپن میں حضرت حافظ محمد صدیق مرحوم کے دستِ اقدس پر بیعت کی تھی ۔اور انہی کے ہاتھوں پر اسلام بھی قبول کیا تھا ۔اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے ۔آخر جب آپ (حضرت سندھیؒ) مدرسہ دیوبند سے سند فراغت لے کر واپس پہنچے ۔تو بھرچونڈی میں حاضر ہونے سے دس گیارہ دن پہلے بایزیدِ دوراں حضرت حافظ محمد صدیقؒ داعئ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے ۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اب حضرت مولٰنا تاج محمود نوراللہ مرقدہٗ نے حضرت سندھیؒ کی علمی قابلیت ۔للّٰہیت اور مخلصانہ جذبہ خدمتِ دین دیکھا اور علاوہ ازیں ان کو اپنے شیخ کامل (حضرت حافظ محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلقین میں سے خیال فرما کر دعوت دی۔کہ وہ ٹ

شریف کو اپنی مستقل قیام گاہ بنائیں۔ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امروٹی کے اس ارشاد کو بسر و چشم قبول کیا، اور امروٹ شریف میں رہائش پذیر ہو گئے۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی شادی خانہ آبادی: مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی استعداد اور عملی کمالات نے حضرت امروٹیؒ مرحوم کی عارفانہ نگاہوں سے اس قدر فیوض و برکات حاصل کئے۔ کہ خود ان کی نظروں میں محبوب بن گئے۔ چنانچہ حضرت امروٹیؒ نے اپنی پدرانہ شفقت سے حضرت سندھیؒ کو دامادی کا شرف عطا فرمایا۔ اور آپ کی زندگی کے تمام مصارف کی ذمہ داری بھی خود لے لی۔

نوٹ: حضرت سندھیؒ کے ان حالات کا تذکرہ (مذکورہ بالا تذکرہ) حضرت مولانا لاہوریؒ کو اپنے ہمراہ سندھ لے جانے سے پہلے کا ہے۔

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی عمر تقریباً دس سال تھی۔ جب آپ حضرت سندھیؒ کی معیت میں امروٹ شریف پہنچے۔ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ بطور طالب علم پانچ سال تک امروٹ شریف میں رہے۔ حضرت سندھی کی وساطت سے حضرت امروٹی کی عارفانہ نگاہوں کو حضرت لاہوریؒ کی تربیت کی طرف منعطف کر دیا۔ اگرچہ آپ کے خور و نوش کا انتظام حضرت سندھیؒ کے گھر میں تھا مگر پھر بھی حضرت امروٹیؒ مرحوم نے لنگر کے منتظم اور حرم سرا کی خادمہ کو تاکیداً فرما دیا تھا کہ ہمارے عزیز احمد علی کو جس چیز کی ضرورت ہو مطالبہ پر فوراً پیش کی جائے۔ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو، آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو، تو ہم شان کئی دیتے ہیں — ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

حضرت لاہوریؒ مرحوم اپنے والد روحانی کے سایۂ عاطفت میں ایام طفولیت بسر کرتے تھے۔ تو انہی حجروں میں فرشتگانِ قضاء و قدر آپ کے لئے قطبیت کا خلعتِ مرصّع تیار کر رہے تھے۔ دنیا والو! یقین کیجئے کہ اللہ والوں کے سرسری التفات سے بھی دلوں کی سُونی بستیاں پھر سے آباد ہو جاتی ہیں۔ ؎

پرورش دل کی اگر مدِّ نظر ہے تجھ کو — مردِ مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

حضرت شیخ التفسیرؒ بار بار اپنی محفلوں میں فرمایا کرتے تھے کہ میری بیعت کے بعد میرے روحانی مربّی چالیس سال تک زندہ رہے۔ اور جب میں حضرت امروٹیؒ کی بارگاہ ولایت میں حاضر ہوتا تو آپ بے حد مسرور ہوتے، اور بار بار خیر و عافیت پوچھا کرتے تھے اور نہایت درجے کی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے دو مربّی تھے۔ میں جس کے پاس جاتا تھا وہ ہر بار میرے کاسۂ گدائی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتا تھا، اور وہ لوگ جو اس کوچہ کے راہ نورد ہیں۔ ان کا تو یہ بھی کہنا ہے۔

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں — دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

حضرتؒ عین پیرانہ سالی میں بھی جب اپنے خضرانِ طریقت کا ذکر فرماتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کسی خوش نصیب کو جنت فردوس کے داخلے کی بشارت مل رہی ہے۔

حضرت سندھی کی امروٹ شریف سے روانگی: حضرت لاہوریؒ امروٹ شریف کے قیام میں حضرت سندھیؒ سے فارسی، عربی،

صرف ونحو اور منطق کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت امروٹیؒ کے زیر تربیت اللہ اللہ کرنے والوں کی جماعت تھی۔ ان کی زندگی اور اصحابِ صُفّہ کی زندگی میں بڑی حد تک مشابہت پائی جاتی تھی۔ لنگر میں جو کچھ اللہ تعالےٰ بھیج دیتا تھا۔ وہی ان لوگوں کی شبانہ روز خوراک ہوتی تھی۔ بعض اوقات دونوں وقت فاقہ ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات سوکھی روٹیاں چبائی جاتی تھیں۔ احقر نے حضرت لاہوریؒ کی زبانِ مبارک سے خود سُنا کہ بعض دفعہ ستّوؤں کی قسم کی خوراک ہوتی تھی۔ جس سے ستارے بھی نظر آتے تھے اور اس کا نام تارا پلاؤ ہوتا تھا۔ بارک اللہ۔ متوکلین کی جماعت ایک قطب الاقطاب کی سرپرستی میں تمام کائنات سے منہ موڑ کر تسلیم و رضا کے ابواب یاد کر رہی تھی۔ یہ حنیف کے شہسوار ہیں۔ جو کہ ہر زمانے میں کائنات کے کسی نہ کسی گوشے میں اسی طرح پرورش پاتے ہیں۔

بر درِ میکدہ آں مرد قلندر بانسند کہ ستانند و دہند تاج شہنشاہی را

حضرت امروٹیؒ علیہ الرحمۃ کی سرپرستی میں جو جماعت پرورش پا رہی تھی اس کو مدارس عربیہ کے طلباء سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ لیکن حضرت علامہ عبید اللہ سندھیؒ ایک ایسا مدرسہ چلانا چاہتے تھے جس میں تمام علوم متداولہ کی تحصیل کا انتظام ہو جائے۔ چوں کہ امروٹ شریف کا ماحول اس مدرسے کے لیئے سازگار نہ تھا۔ لہٰذا آپ گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد تشریف لے گئے۔

مدرسہ دارالارشاد : حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے گوٹھ پیر جھنڈا میں قدم رکھتے ہی دینی درس گاہ کی تعمیر و اساس کے لیے وہاں کے حالات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ زہے قسمت۔ زہے نصیب! اس وقت گوٹھ پیر جھنڈا میں حضرت مولانا رُشد اللہ ایک متبحر عالمِ دین موجود تھے۔ انہوں نے علمِ حدیث کے چند اسباق حضرت سندھیؒ سے پڑھے تھے۔ لہذا حضرت سندھیؒ کے ارادے کی تکمیل میں مولانا موصوف کا وجود بے حد سُود مند ثابت ہوا۔ چنانچہ ۱۳۱۹ھ میں گوٹھ پیر جھنڈا کے مقام پر مولانا رشد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدوں سے چندہ لے کر مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ علاوہ ازیں طلبہ کی ضروریات، اساتذہ کرام کی تنخواہوں اور دیگر اور باقی مصارف کی فراہمی میں بھی مولانا مذکور حضرت سندھیؒ کے ہر طرح ممد و معاون رہتے۔ ابتدا میں حضرت سندھیؒ اکیلے پیر جھنڈا میں تشریف لے گئے تھے۔ بعد ازاں حضرت لاہوریؒ کو بھی وہاں ہی بلا بھیجا۔ وہاں پہنچ کر حضرت والا شانؒ نے اپنی خداداد استعداد، شغفِ علم و فضل اور اساتذہ کرام کی خصوصی التفات سے بتوفیق ایزدی چھ سال کے عرصے میں تمام علوم مروجہ متداولہ میں پوری پوری دسترس حاصل کر لی۔

فارغ ہونے والی پہلی جماعت : مدرسہ دارالارشاد سے فارغ ہونے والی پہلی جماعت میں صرف پانچ علماء شامل تھے۔ ان میں ایک کھدر پوش مجاہدِ کبیر، جلال و جمال کا جامع بلکہ بقول سیّد الساداتِ حضرت امیرِ شریعت سیّدنا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ صحابہ کرام کے قافلے میں سے ایک پیچھے رہ جانے والا اسوۂ نبوی کا علمبردار بھی موجود تھا۔ جس کو مستقبل قریب میں شیخ التفسیر کے علاوہ قطبیت کے فرائض بھی انجام دینے تھے۔

یہ کون تھا؟ : ہاں ہمارا آقا، ہمارا مولا، ہمارا ہادی۔ وسیلتنا فی الدارین۔ جو لاہور کے اُم القریٰ میں بیٹھ کر نصف صدی تک دینِ حنیفہ کی خدمت کرتا رہا، اور اپنے آپ کو سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کا غلام بتاتا رہا۔ اللہ! اللہ! اخدا

سے بے نیاز، خالق کا محتاج، حلم و بُردباری کا پیکر، صدق و صفا کا مجسمہ، پیغمبرانہ کردار کا حامل۔ داعیٔ خیرات اور اپنی قوم کو پکار پکار کر کہنے والا یَا قَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا ۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۔ (اے میری قوم رشد و ہدایت کے پرچار کے صلے میں میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا ہوں۔ میری مزدوری کا تعلق دروازہ الٰہی سے ہے) ؎

اک شرح مسلمانی۔ اک جذب مسلمانی ہے جذب مسلمانی۔ سرِ فلک الافلاک
اے رُہرو فرزانہ بے جذب مسلمانی نے راہِ عمل پیدا نے شاخِ یقیں نمناک

دستار بندی کا عظیم الشان جلسہ: اور دوسرے حضرت مولانا ضیاء الدین تھے۔ جو کہ اپنے والدِ محترم کے بعد گوٹھ پیر جھنڈا میں مسندِ رُشد پر جلوہ فرما ہوئے۔ ان کے علاوہ تین اور خوش نصیب علماء کرام تھے۔ جن کے تذکرے کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کے حالات پر ہم کو چنداں آگاہی ہوئی۔

چوں کہ حضرت پیر رشد اللہؒ اس وقت گوٹھ پیر جھنڈا میں گدی نشین تھے۔ اور ان کے صاحبزادے مولانا ضیاء الدین اس فارغ ہونے والی جماعت میں شامل تھے۔ لہٰذا پیر مرحوم نے ایک عظیم الشان جلسے کا انتظام کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اصحابِ خیر و یُمن کی شمولیت اور باقی سعید روحوں کے ورود و اجتماع سے دستار بندی کی تقریب کو ہر لحاظ سے بابرکت بنایا جائے۔

صدارت کے فرائض: الحمدللہ! کہ اس جلسے کی صدارت کے لئے حضرت سید المشائخ حسین ابن محسن انصاری یمنی ریاست بھوپال سے تشریف لائے۔ یہ وحید العصر بزرگ نواب صدیق حسن خاں والیٔ بھوپال کے استاد مکرم تھے اور نواب موصوف کی استدعا پر ہی یمن سے ہجرت کر کے مع اہل و عیال بھوپال میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہوئے تھے۔ چوں کہ آپ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ کمزور تھے۔ اس لئے آپ کو پالکی میں بٹھلا کر گوٹھ پیر جھنڈا میں لایا گیا۔ اور جلسے میں پانچ مذکورہ بالا فارغ التحصیل علماء کو سندِ فراغت دی گئی۔ جہاں تک حضرت لاہوریؒ کو اپنی مبارک یادداشت کا تعلق ہے۔ دستار بندی کی یہ مبارک تقریب ۱۳۲۰ھ کے آخر میں یا اسی سن کے شروع میں وقوع پذیر ہوئی۔

معلّمی کا منصبِ جلیلہ: حضرت لاہوریؒ کی زندگی کے منازل اور مراحل اگرچہ طالب علمانہ مصائب اور غریب الوطنی کے تفکرات سے خالی نہیں تھے۔ لیکن آپ کی زندگی کے عام واقعات پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قدرت کا دستِ کرم ہر موقعہ پر آپ کے فرقِ اقدس پر رہا۔ اور ربّ العٰلمین کی شان پروردگاری نے ہر آن آپ کی دستگیری فرمائی۔ اب حضرت قدس اللہ روحہٗ ایک فارغ التحصیل عالمِ دین کی حیثیت سے حضرت سندھیؒ کے ارشاد کے مطابق مدرسہ دارالارشاد میں معلّمی کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ آپ نے جس انہماک اور قلبی طمانیت سے طالبِ علمی کے دن بسر فرمائے تھے۔ اسی استغراق اور کامیابی سے معلّمی کے اوقات گذارنے شروع کئے۔ اس وقت آپ کو اسباق کی تیاری استادانہ اور مصلحانہ روش کی حفاظت، بزرگانہ سنجیدگی، سنتِ طاہرہ کی پابندی گویا خلیق و شفیق معلم کے فرائض کی ادائیگی کا خیال بڑی حد تک دامنگیر رہتا تھا۔ تاکہ تو خیز طالبِ علموں کی شوخ و شنگ طبیعتوں کی اصلاح کا سامان مہیا ہوتا رہے، اور مدرسہ کے ماحول میں روحانی انوار کی جھلک عام نظر آئے۔

القصہ آپ نے مسلسل تین سال تک حضرت سندھیؒ کی سرپرستی میں مدرسہ مذکور میں معلّمی کے فرائض سرانجام دیئے۔

اللہ اللہ! ہمارے آقا کی زندگی! ؎

حقائقِ اَبدی پر اساس ہے اس کی یہ زندگی ہے۔ نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں۔ روح القدس کا ذوقِ جمال عجم کا حُسنِ طبیعت۔ عرب کا سوزِ دروں

دراصل وہ اوصافِ حریّت جو آپ نے امامِ انقلابؒ کی صحبت میں حاصل کئے تھے اب اُن کو خلقِ خدا میں تقسیم کرنے کے دن تھے۔

حضرت لاہوریؒ کی شادی: حضرت مولانا سندھیؒ جب آپ کو سندھ لے گئے تو انہوں نے اپنی صاحبزادی کو آپ سے منسوب کرنے کا ارادہ کرلیا۔ لہٰذا جب آپ مدرسہ دارالارشاد میں معلّمی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تو مولانا موصوفؒ نے اپنی منسوبہ صاحبزادی کی شادی آپ سے کردی۔

آپ کے برادرانِ حقیقی کا حال: فارغ التحصیل ہونے سے پانچ چھ سال پہلے آپ کے والدِ محترم شیخ حبیب اللہ صاحب نے داعیٔ اجل کو لبّیک کہا۔ اُس وقت آپ کے والدِ مرحوم چک بالو ضلع گوجرانوالہ میں تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے صاحبزادے حافظ محمد علی کو بھی گوٹھ پیر جھنڈا میں علومِ دینیہ کی تحصیل کے لئے بھیج دیا تھا۔ حافظ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر اس وقت قریباً چھ سال تھی۔ حضرت سندھیؒ کی شفقت کا اندازہ کیجئے۔ کہ آپ نے اپنی چھوٹی صاحبزادی کی نسبت مولانا محمد علیؒ سے کردی۔ حالانکہ حضرت لاہوریؒ کے والدین کی طرف سے اس ضمن میں کوئی تحریک نہیں کی گئی تھی۔ مولانا محمد علی مرحوم کو پہلے حضرت سندھیؒ نے قرآنِ حکیم حفظ کروادیا۔ اور بعد ازاں دینی تعلیم دینا شروع کی۔ جب حضرت لاہوریؒ کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا تو چک بالو میں حضرت لاہوریؒ کے دو چھوٹے بھائی عزیز احمد اور رشید احمد اور آپ کی والدہ مکرمہ رہ گئی تھیں۔ لہٰذا حضرت ان سب کو اپنے ہمراہ گوٹھ پیر جھنڈا میں لے آئے تھے۔ محترم عزیز احمد کی عمر اس وقت چار سال تھی اور رشید احمد صاحب کی عمر دو اڑھائی سال تھی۔ آپ کی شادی کا ذکر جو پہلے گذر چکا ہے۔ وہ دراصل اس موقعہ پر ہوئی۔ جبکہ آپ کے والدِ محترم کی فوتیدگی کے بعد باقی افرادِ خانہ گوٹھ پیر جھنڈا میں مقیم تھے۔

آپ کی اہلیہ محترمہ اور کمسن بچے کی وفات: حضرت والا مرتبت ابھی اپنے والدِ محترم کی ابدی مفارقت پر کبیدہ خاطر ہی تھے۔ جب کہ غم واندوہ نے ایک اور روح فرسا صورت اختیار کرلی۔ آپ کی شادی کے تقریباً ایک سال بعد آپ کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام حسنؔ رکھا گیا۔ چنانچہ اس مبارک نومولود کے نام کی وجہ سے حضرتِ والا کی کنیت ابوالحسن ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مشیّت یہی تھی کہ نووارد اپنے والدین کی آنکھوں کے سامنے صرف سات دن تک آغوشِ مادر میں جیئے، اور بعد ازاں اپنی ناشگفتگی کے دامن میں زندگی کی تمام بہاروں کو لپیٹے ہوئے راہی ملکِ عدم ہوا اور اگلے دن ننھے حسن کی مغمومہ و مجہورہ والدہ اپنے لختِ جگر کی تلاش میں وادیٔ فردوس میں جا پہنچیں۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ راجِعُون۔

اہلیہ کی موجودگی دینی وجاہت اور قلبی تسکین کا باعث ہوتی ہے، اور پھر وہ بیوی جس کی پرورش حضرت سندھیؒ جیسے مجاہدِ کبیر کی پدرانہ نگاہوں کی مرہون ہو۔ اس کی رفاقت یقیناً سرمایۂ افتخار تھی۔ لہٰذا حضرت لاہوریؒ کو اپنی اہلیہ مرحومہ کی فوتیدگی پر عجیب قسم کے غموم وہموم سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت سندھیؒ کی دامادی کا شرف ختم ہوا اور ساتھ ہی بچے کی وفات نے عین شباب میں

باپ نے دل کو مجروح کر دیا۔ اب زندگی کا بنا بنایا کھیل بگڑا اور مستقبل کی ایک نامعلوم تنہائی کا بھیانک تصور خوف و ہراس پیدا کرنے لگا۔ مگر حضرتِ اقدس کو باوجود ان حالات کے پروردگارِ عالم نے قلبِ ابراہیمی کے انوار دے رکھے تھے تاکہ بیوی اور بچے کی جدائی میں بھی دینِ حقہ کی خدمت میں کوئی فرق نہ آئے۔ لہٰذا اب آپ اپنے یتیم کمسن بھائیوں اور والدہ ماجدہ کے تمام اخراجات کے کفیل بن کر زندگی بسر کرنے لگے۔

جمعیۃ الانصار کا قیام: حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد سندھ سے دوبارہ دیوبند تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر آپ نے جمعیۃ الانصار کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک عالمگیر تحریک تھی جس کی وسعت سرزمین ہند سے آگے کشمیر، افغانستان، ایران، ترکستان، بخارا، عرب اور قسطنطنیہ کی حدود تک پہنچی ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل علماء کی ایک ہمہ گیر تنظیم کی جائے، اور ان سب میں "مجاہدانہ ناموس اور وحدت فکری" پیدا کی جائے۔ وہ جہاں جہاں رہیں مرکز کی آواز کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ بدلتے رہیں۔ علماء خیر کا یہ سوادِ اعظم کتاب و سنت کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مغربی سامراج کی بیخ کنی میں ہمہ وقت کوشاں رہے۔ تمام اسلامی ممالک کو ایک مرکز پر اکٹھا ہونے کی دعوت دی جائے۔ یہ وہ عظیم الشان سکیم تھی جس کی تکمیل کے لئے حضرت سندھیؒ ہر وقت بے قرار رہتے تھے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھتے ہی اس تجویز کو پورا کرنے کی مساعی جمیلہ شروع کر دیں۔ مگر مدرسہ مذکور کے بعض ذمہ دار حضرات کو آپ کی تجویز کے بعض پہلوؤں سے اختلاف تھا اور یہی وہ لوگ تھے جو درحقیقت دارالعلوم کے رُوحِ رواں تھے۔ لہٰذا آپ کو آخر کار دیوبند کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس موقعہ پر قارئین کرام کو یاد رہے کہ حضرت اعلیٰ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ انوارِ جامعیت کے مظہرِ اتم مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے ہر طرح ہمنوا اور موئید تھے۔

نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی

چہ شور است ایں کہ در آب و گل افتاد ‎ ‎ ز یک دل عشق را صد مشکل افتاد
قرارِ یک نفس بر من حرام است ‎ ‎ بمن رحمے کہ کارم با دل افتاد

ترجمہ (انسانی خمیر میں سوز دروں اور عمل پیہم کا ایک بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ اللہ! اللہ! دل کے لوتھڑے کو عشق سے لگاؤ ہے۔ جس کے سبب سے انسانی زندگی میں ہزاروں مشکلات پیدا ہو چکی ہیں، عشق کے سبب لمحہ بھر بھی چین نصیب نہیں ہے۔ خدائے کریم مجھ پر نظر ترحم فرمائیے۔ کیونکہ میرا آفت پسند دل سے واسطہ پڑا ہے۔)

حضرت سندھیؒ کی بیتاب زندگی کا یہ فطری اقتضا تھا۔ کہ وہ حضرت عمرؓ کی طرح عین نماز میں بھی فوجیں تیار کرتے رہتے تھے۔ ہجرت ان کا مشغلہ بن چکا تھا۔ وہ ارض اللہ کی برکات فراہم کرنے کے لئے اس کے ہر گوشے کو اپنا وطنِ مالوف سمجھ کر چلے جاتے تھے۔ جب دیوبند شریف میں چند حضرات کی اختلاف رائے نے آپ کے مقاصد کو پورا ہونے نہ دیا۔ تو آپ اسی جذبہ سے سرشار ہو کر سرزمین دہلی میں چلے گئے اور مسجد فتح پوری کے شمالی کمروں میں سے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور وہاں نظارۃ المعارف القرآنیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ نے اس جگہ علماء کرام اور گریجویٹ حضرات کی ایک مخلوط جماعت تیار کی جن کو حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق تبلیغی مشن چلانے کی تربیت دی جانے لگی۔ ابتداء میں اس جماعت میں پانچ علماء اور پانچ گریجویٹ شامل۔

بعض بڑے مسلمان

جب یہ جماعت مجاہدانہ زندگی کی تعمیرِ نو کے اصول و آئین سیکھ رہی تھی تو حضرت سندھیؒ نے حضرت لاہوریؒ کو دہلی میں اپنے پاس بُلالیا۔
اور آپ کو بھی اس نادرۂ روزگار جماعت میں شامل فرمالیا۔

حضرت مولانا کا نواب شاہ میں قیام: یہ سطور آپ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات میں ربط پیدا کرنے کے لئے حوالۂ قلم کی جاتی ہیں۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں شمولیت کرنے سے پہلے حضرت لاہوریؒ مدرسہ دارالارشاد میں معدودِ معاونین خدمتِ دین کا کام کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت سندھیؒ اور پیر راشد اللہ مرحوم میں اختلافِ رائے ہوگیا۔ تو اوّل الذکر نے حضرت لاہوریؒ کو مدرسۂ مذکور سے واپس بلالیا۔ چوں کہ نواب شاہ میں بھی ایک مدرسہ عربیہ موجود تھا۔ جس کی بنیاد بھی حضرت سندھیؒ نے ڈالی تھی لہٰذا حضرت لاہوریؒ کو اب وہاں کا نگرانِ اعلیٰ مقرر فرمایا۔ اور آپؒ جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے۔ دہلی روانہ ہونے سے پہلے وہاں ہی دینِ حقہ کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

حضرت اقدس کی دوسری شادی: جب حضرت لاہوریؒ کی پہلی اہلیہ محترمہ فوت ہوچکی تھیں تو آپ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق نواب شاہ میں تشریف لے گئے تھے، اور حضرت سندھیؒ جمعیۃ الانصار کی لگن میں مدرسہ دیوبند میں مقیم تھے حضرت سندھی کو اپنے ارجمند داماد کی مجرد زندگی کو متاہلانہ حیات سے بدلنے کا خیال ہروقت دامنگیر رہتا تھا۔ اگرچہ رشتے بہت مل سکتے تھے۔ مگر آپ طبعی اور رُوحانی مناسبت کا بہت زیادہ خیال فرماتے تھے۔ آخر کار پروردگارِ عالم کی مشیّت نے اپنی رحمتِ واسعہ کا ظہور اس طرح فرمایا کہ حضرت مولانا ابو محمد احمد فاضل دیوبند نے حضرت سندھیؒ کو تحریر فرمایا کہ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں اپنی لڑکی کا عقد آپ کے عزیز مولانا احمد علی صاحب سے کردوں"۔ یہ وہ پیغام تھا جس کی منظوری بارگاہِ ایزدِ متعال میں ہوچکی تھی۔ لہٰذا حضرت سندھیؒ نے بہ ہزار مسرّت اس دعوت کو قبول فرمایا۔

حضرت مولانا ابو محمد احمد مرحوم چکوال ضلع جہلم کے باشندے تھے لیکن کافی عرصے سے لاہور میں مستقل طور پر قیام پذیر تھے اور ان کے فضل و شرف کا ایک امتیازی نشان یہ بھی تھا کہ آپ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہند مرحوم سے تلمذ حاصل تھا۔ اور زمانۂ طالب علمی میں آپ نے حضرت سندھیؒ کے ساتھ بڑی محبت کے دن گزارے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت مولانا ابو محمد احمد حضرت سندھیؒ کی جمعیۃ الانصار کے سرگرم رُکن تھے۔ لہٰذا آپ ان دنوں دیوبند میں تشریف فرما تھے۔ چنانچہ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ میں حضرت لاہوریؒ کی شادی کا معاملہ طے پایا۔ محرم الحرام ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں حضرت شیخ الہند نے حضرت لاہوریؒ کا خطبۂ نکاح پڑھا۔ یہ تاریخی سعادت تھی جس کو فضلِ ایزد تعالیٰ سے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ نکاح کے بعد حضرت مولانا مرحوم ایک دفعہ پھر نواب شاہ تشریف لے گئے، اور حضرت مولانا ابو محمد احمد مرحوم دوبارہ لاہور واپس آ گئے۔ یہ ایک ضمنی واقعہ تھا جس کا اس موقعہ پر نقل کرنا ضروری تھا۔

علیگڈھ کا قیام: حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں علماء کرام کے علاوہ گریجویٹ بھی شامل تھے جیسا کہ پیشتر ازیں بھی لکھا جاچکا ہے۔ ان میں ایک اُنیس احمد بی۔اے بھی تھے۔ وہ اپنے عام جماعتی اسباق کے علاوہ حضرت مولانا لاہوریؒ سے صرف و نحو بھی پڑھا کرتے تھے۔ مولوی اُنیس احمد بی۔اے کو اپنے علمی مشاغل کے علاوہ ایک ایسے خاص عالمِ دین کی ضرورت تھی۔ جن کو وہ اپنی رفاقت میں علیگڈھ لے جانا چاہتے تھے۔ مولوی مذکور کے والدِ محترم مولانا ادریس احمد

رحوم علیگڑھ کالج میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھے۔ اب مولوی انیس احمد نے حضرت سندھیؒ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ کہ وہ حضرت لاہوریؒ کو اس کے ساتھ علیگڑھ بھیج دیں۔ لہٰذا حضرت سندھیؒ نے آپ کو علیگڑھ بھیج دیا۔ چونکہ آپ مع اہل وعیال تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنا قیام تو شہر میں ہی رکھا۔ اور دن کے وقت مولوی انیس احمد کے ساتھ کالج تشریف لے جاتے۔ رف ایک ماہ کے قیام کے بعد آپ مع اہل وعیال دہلی واپس آ گئے۔ دہلی میں بھی حضرت لاہوریؒ مرحوم مدرسے میں رہنے کی بجائے یک علیحدہ مکان میں رہا کرتے تھے۔

تحدیث نعمتِ الٰہی: حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کو خالقِ ارض وسما نے دل ودماغ کی ایسی قوتوں سے نوازا تھا جن کی برکت سے آپ ہر موقعہ پر اپنے باقی شرکاء کار سے ممتاز نظر آتے تھے۔ جب آپ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں تعلیم حاصل کرنے یں منہمک تھے۔ تو۔ خصوصی امتیازات نے آپ کو باقی ہم سبقوں سے نمایاں حیثیت دے رکھی تھی۔ آپ نے ابتداء میں ہی حضرت سندھیؒ کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا تھا کہ وہ آپ کو درس کے وقت اپنی تقریر ضبط تحریر میں لانے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ انہوں نے ازراہِ شفقت اجازت دے دی۔ اس لئے آپ کا معمول تھا کہ آپ ایک دستہ کاغذ اور چار پنسلیں لے کر درس میں بیٹھ جاتے، اور اس سُرعت اور بیدار مغزی سے حضرت سندھیؒ کی تقریر کے الفاظ احاطۂ تحریر میں لاتے کہ حضرت سندھیؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ آپ میرے الفاظ کو ۹۸ فی صد نقل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خداوندِ عالم کی یہ خصوصی عنایات کا ظہور تھا۔ کہ ایک نشست میں حضرت سندھیؒ جیسے متبحر عالمِ دین کی تقریر کے تیس تیس اور بعض اوقات چالیس چالیس صفحات نقل کئے جاتے تھے۔ لیکن نہ ہاتھوں کو تھکاوٹ پریشان کرتی تھی۔ اور نہ ہی دماغی توجہ میں فرق آتا تھا۔ ہم نے عین پیرانہ سالی میں آپ کو اپنے حجرے میں بعض مضامین تحریر کرتے دیکھا ہے تو جس جودت وسرعت سے آپ اپنے کام کو مختصر وقت میں ختم کرتے تھے اس کی مثال ہماری زندگیوں میں کہیں نہیں ملتی۔ کیوں نہ ہو۔ یہ ظاہری وباطنی کمالات اولیائے کرام کی صحبت میں رہنے کا نتیجہ تھے، اور خصوصیت سے امامِ انقلابؒ حضرت سندھی کی تربیت نے آپ کی تمام قوتوں کو وہ جلا بخشی تھی کہ جس کے فیوض وبرکات صدیوں تک باقی رہیں گے۔ ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں (مرزا غالب)

حضرت کی تحریر کی اہمیت: جب حضرت سندھیؒ ہندوستان سے ہجرت کر کے (جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا) افغانستان جانے لگے تو آپ نے اپنے عزیز القدر شاگرد حضرت لاہوریؒ سے فرمایا کہ آپ اپنی تحریر شدہ کاپیاں مجھے دے دیں۔ تو حضرت لاہوریؒ نے نہایت متواضعانہ انداز میں عرض کیا کہ حضور! تعمیلِ ارشاد میں ذرا بھی تامل نہیں ہے۔ مگر اتنی سی التماس ضرور ہے کہ یہ کاپیاں آپ کے دل ودماغ کا حاصل ہیں۔ آپ جب چاہیں گے ان سے بدرجہا بہتر تیار کروا سکتے ہیں۔ مگر کمترین کی بے بضاعتی کا تو یہ عالم ہے کہ کمترین کے پاس ان کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر آپ ازراہِ تلطف ان اوراق کو میرے پاس ہی رہنے دیں تو مربیانہ عنایت ہوگی۔ حضرت سندھیؒ نے نہایت شفقت سے اس کو حُسنِ قبول عطا فرمایا۔ یہ کاپیاں جن میں حضرت سندھیؒ کے بیان کردہ نکات ورموز موجود تھے۔ تعداد میں سولہ تھیں۔ اور قرآن مجید کے فقط تیرہ ۱۳ پاروں کا نچوڑ تھیں۔ کیوں کہ ابھی یہاں تک

ہی نوبت پہنچی تھی۔ جب کہ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو نظارۃ المعارف القرآنیہ کو چھوڑ کر افغانستان کی طرف ہجرت کرنا پڑی ضمنی طور پر اس جگہ بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ چند اشارات باقی ہیں جن کا بیان کرنا ضروری ہے۔

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ خواجہ باقی باللہ مرحوم والے قبرستان میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں کئی ایک مساجد موجود تھیں۔ آپ کسی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو جاتے' اور تصور میں حاضرین کو سامنے بٹھا کر درس قرآن مجید شروع اور ہر روز اسی طرح آپ حضرت سندھیؒ کے درس کی تقاریر از بر فرمایا کرتے' اور اپنے جسم کی تمام قوتوں کو قرآن سمجھنے میں وقف کر چکے تھے۔

پنڈہ کی اہلیہ کا بیان ہے کہ حضرت باباجی اور اماں جی کسی صورت میں بھی نمازِ تہجد قضا نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ تک سنِ شعور کے بعد حضرت مرحوم کے گھر میں رہی ہیں۔ دراصل اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ (تحقیق رات کا جاگنا نفس کو کچلنے والا ہے اور پختہ بات ہے) کے مطابق حیاتِ عارفانہ کو زہد و ریاضت کی کٹھالی میں جا رہا تھا۔ یہ امر ہر لحاظ سے قابل تسلیم ہے۔ کہ نبوت و رسالت کا عطیہ وہبی طور پر ملتا ہے اس میں کسبیاتِ بشر کا نہیں ہوتا۔ مگر ولایتِ عظمیٰ کے حصول کے لئے زہد و ریاضت تو شرطِ اوّل کا حکم رکھتے ہیں۔ کثرتِ نوافل پر جو نتائج ہیں۔ ان کی تائید احادیثِ قدسی سے ہو چکی ہے۔ لہٰذا مولانا مرحوم کی طالب علمانہ زندگی میں استغراق و انہماک کا عنصر تھا۔ کیونکہ ان کے کاسۂ گدائی کو ولایت کی نعمتوں سے پُر کیا جانا مقدر ہو چکا تھا۔ ع

قسمتِ بادہ باندازۂ جام اے ساقی

امتحان اور نتیجہ: حضرت مولانا سندھیؒ مرحوم نے افغانستان تشریف لے جانے سے پہلے نظارۃ المعارف القرآنیہ کی جماعت کا امتحان لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ قاضی ضیاء الدین ایم۔ اے کو اپنی معاونت کے لئے اس کام میں شامل کر لیا۔ قاضی صاحب درسِ قرآن مجید میں روزانہ تشریف لاتے تھے اور اس جماعت کو انگریزی پڑھانا بھی آپ کی ڈیوٹی (DUTY) تھی انہوں نے تمام طلباء کا امتحان لیا۔ جس میں بفضل ایزد تعالےٰ حضرت لاہوریؒ اپنے ہم سبقوں میں اوّل آئے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَعَالٰی عَلٰی ذٰلِكَ

آگرہ کا تبلیغی دورہ: اب بعض احباب کے مشورے پر حضرت سندھیؒ نے علماء کی اس جماعت کو دیہاتوں میں تبلیغی دورے کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ ضلع آگرہ میں دورہ کرنے کے لئے تین علماء کرام کا انتخاب ہوا۔ حضرت مولانا علی اسد اللہ' مولانا فضل الرحمن اور حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کو اس کارِ خیر پر مامور کیا گیا۔ یہ تینوں حضرات امامِ انقلاب حضرت سندھی میں آگرہ پہنچے۔ آپ نے ان حضرات کے علاقوں کا علیحدہ علیحدہ تعین فرما دیا اور خود دہلی واپس آ گئے۔ اب یہ تینوں مذکور بالا اپنے مجوزہ دورے کی تکمیل کے بعد دہلی واپس پہنچ گئے۔

حضرت سندھیؒ کا کابل تشریف لے جانا: ہم نے اس سے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ ابھی تیرہ پارے ہی مدرسہ نظارۃ القرآنیہ دہلی میں ختم ہوئے تھے۔ جب کہ مدرسہ کو حالات کی ناسازگاری سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۴ء کا تھا جب کہ تمام دنیا کے بسنے والے پہلی جنگِ عظیم کے شعلوں کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ اس جنگ میں ترک بھی شامل تھے۔ ترکی ایک اسلامی حکومت

اور برطانیہ اسکے خلاف برسرپیکار تھا حضرت مولانا سندھیؒ پران واقعات نے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ وہ انگریزوں کے خلاف ترکوں کی مدد کرنا چاہتے تھے یا یوں سمجھئے کہ اسلام کے ساتھ جو ان کا تعلق تھا اس کا حق ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے ایک اور حجرہ نشین لیکن عصر حاضر کے ایک مجاہد کبیر حضرت مولانا محمود حسن مرحوم سے مشورہ کیا۔ جنہوں نے حضرت سندھیؒ کو حکماً فرمایا کہ "آپ کابل میں ہجرت کرکے چلے جائیں"۔ ابھی ہجرت کا معاملہ صیغۂ راز میں رکھنا ضروری تھا چنانچہ آپ بھیس بدل کر صوبہ سندھ سے ہوتے ہوئے کوئٹہ پہنچے۔ اگرچہ مولانا سندھیؒ نے تمام سفر ریل سے طے کیا۔ اور حکومت کی سی۔ آئی ڈی سایہ کی طرح آپ کے تعاقب میں تھی۔ لیکن اہل اللہ کی عقل دنیا داروں کی عقل سے تیز ہوتی ہے۔ گورنمنٹ کے اہل کاروں نے ہزار تلاش کی مگر مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ بفضل ایزد متعال کوئٹہ سے کابل پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

عشق کامل ہو تو ناکامی نہ ہو اے دل تجھے　　ڈھونڈھ لے ساحل تجھے آواز دے منزل تجھے

حضرت شیخ التفسیر اور نیابت کے فرائض: حضرت سندھیؒ جب مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے تمام انتظامات کی ذمہ داری حضرت لاہوریؒ مرحوم کے کندھوں پر ڈال دی اور تحریری طور پر حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ مرحوم کو مدرسۂ مذکورہ کا نگران اعلےٰ بنا دیا۔ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ہجرت غالباً ۱۹۱۵ء کے شروع میں ہوئی۔ اور ان کے کابل تشریف لے جانے کے بعد ہمارے حضرت نے دو سال تک درس و تدریس کا کام پوری دلجمعی اور مجاہدانہ مستعدی سے سرانجام دیا۔

بیگم صاحبہ والئ بھوپال کا وظیفہ: مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے ابتدائی ایام میں حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات بیگم صاحبہ والئ بھوپال سے ہوئی۔ محترمہ موصوفہ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے تبحر علمی اور مدرسے کے اغراض و مقاصد کی تفصیل سن کر اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے حضرت سندھیؒ کے لئے دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا اور یہ وظیفہ حضرت سندھیؒ کے ذاتی اخراجات کے لئے مخصوص تھا۔

وظیفہ کا حضرت لاہوریؒ کے نام منتقل ہونا: حضرت سندھیؒ کی ہجرت کے متعلق جب بیگم صاحبہ کو خبر پہنچی تو ساتھ ہی یہ بھی اطلاع دی گئی کہ مولانا کابل جاتے ہوئے ایک عالم دین کو اپنا قائم مقام بنا گئے ہیں۔ اس وقت اللہ والوں کی شان استغنا ملاحظہ ہو۔ کہ ہجرت کی اطلاع نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کی طرف سے نہیں کی گئی بلکہ بیگم صاحبہ کو یہ خبر کسی اور ذریعے سے ہوئی۔ لہذا محترمہ موصوفہ نے اس خبر کی تصدیق کے لئے حضرت مولانا مفتی انوار الحق اور خلف الرشید حضرت مولینا عبداللہ ٹونکی کو دہلی روانہ کیا اور یہ بھی تاکید کی کہ وہ حضرت سندھیؒ کے قائم مقام کی علمی حیثیت اور عملی قوت کا پورا پورا جائزہ لیں۔ مقصد یہ تھا کہ کیا مدرسے کے انتظامات مولانا کی غیر حاضری میں بطریق احسن سرانجام دیئے جا رہے تھے یا نہیں؟ اس وقت حضرت لاہوریؒ کے درس میں مشن کالج دہلی کے طلبہ کی ایک جماعت قرآن مجید کا ترجمہ پڑھ رہی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نہایت خاموشی سے درس میں آکر بیٹھ گئے۔ اور کافی دیر تک قرآن مجید کے ترجمے کی سماعت فرمانے کے بعد تشریف لے گئے۔ اب بیگم صاحبہ نے جناب مفتی صاحب کی رائے کے مطابق دو صد ماہانہ وظیفہ حضرت مولانا لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام منتقل کر دیا۔

دہلی سے حضرت مولانا کی گرفتاری: امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کابل میں بیٹھ کر چند ضروری تفصیلات کو پیغام

ارسال فرمائے۔ یہ خطوط حضرت لاہوریؒ کے پاس دہلی پہنچائے گئے۔ آپ نے حضرت سندھیؒ کی ہدایت کے مطابق مکتوب الیہم کو خفیہ انتظام فرمایا۔ مگر سرزمین ہند کی تیرہ بختی کا کیا کہیئے ۔ے

طائروں پہ سحر ہے صیاد کے اقبال کا اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

یہ خطوط جن میں انقلاب کا پیغام تھا۔ غلام اذہان پر کماحقہٗ اثر ڈالنے سے قاصر رہے۔ اگر حضرت سندھیؒ کے ارشاد پر پروگرام مرتّب کیا جاتا تو یقیناً انگریزوں کے لیئے ہندوستان کے قیام میں صد ہزار الجھنیں پیدا ہوتیں۔

اب ان خطوط کے تقسیم ہونے کے چھ ماہ بعد امام تجدید و انقلاب حضرت سندھیؒ نے ایک آدمی کے ذریعے پھر اسی کے خطوط ارسال فرمائے۔ سوءِ اتفاق سے وہ خطوط پکڑے گئے اور اس لانے والے آدمی کی وساطت سے سابقہ خطوط افشا ہو گیا۔

اور کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان نئے فرستادہ خطوط میں مولانا سندھیؒ کے متعلقین خاص کا ذکر تھا۔ یہ لوگ ہند اور بہاول پور میں پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ خطوط کے پکڑے جانے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک ہی دن میں اور وقت پر مولانا موصوف کے تمام متعلقین کو گرفتار کر لیا۔

نگاہِ عشق دِل زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مُردہ سزاوارِ شہباز نہیں
(اقبالؒ)

ایک دن حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ حسب معمول نماز صبح کے بعد مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں درس قرآن دے رہے تھے اور تعلیم یافتہ نوجوان آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دو آنریری مجسٹریٹ درس گاہ میں آدھمکے۔ سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز تھا وہ آگے بڑھا اور اس نے وارنٹ گرفتاری حضرت مولانا کے ہاتھ میں دے کر تمام کو مدرسے سے باہر نکال دیا اور کمرے کو مقفّل کر کے حضرت والاشان کو حراست میں لے لیا۔ ع

ایں سعادت ہمرہِ شہباز و شاہیں کردہ اند

اب آپ کو ساتھ لے کر آپ کے مکان پر پہنچے جو فتح پوری مسجد سے قاضی حوض جانے والی سڑک پر کٹڑہ بیڑیاں میں تھا۔ وہاں جا کر حضرت کے اہل و عیال کو مکان کی چھت پر چڑھا دیا اور خانہ تلاشی شروع کی گئی۔

ایک میرے آشیاں کے چند تنکوں کے لیئے
برق کی زد میں گلستاں کا گلستاں رکھ دیا

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وہ قلمی تحریرات جو قرآن مجید سے متعلق تھیں، اور وہ کتب جن کو اس عملے نے مشکوک سمجھا ایک ٹرنک میں بھر لیا۔

ےلہ مولانا سندھیؒ نے کابل کا سفر شیخ الہندؒ کے حکم سے ایک مشن کے لئے کیا تھا۔ اس کی تفصیل مولانا سندھیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے مضمون میں ملے گی۔

دہلی سے شملہ کو روانگی: چند دنوں کے بعد آپ کو ہتھکڑی لگا کر رات کے وقت دہلی ریلوے اسٹیشن پر لایا گیا، اور وہاں سے شملہ لے گئے۔ شملہ پہنچ کر آپ کو ہتھکڑی کی حالت میں ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ملزم کو شملہ کی حوالات میں رکھا جائے۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

جب آپ کو شملہ کی حوالات میں نظر بند کیا گیا۔ تو ان دنوں حوالات کا نگران انسپکٹر آف پولیس نہایت شریف الطبع، علم دوست اور فطرتاً نیک خو تھا۔ اس کے ضمیر نے حضرت قدس اللہ سرہٗ کے متعلق حکم دیا کہ اَکْرِمِیْ مَثْوَاہُ (اس کو عزت آبرو سے رکھیے) لہٰذا اس نے حضرت والا تبار کو خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ جو حوالاتیوں کو قانونی طور پر نہیں مل سکتی تھیں۔ اس نے اپنے ماتحت عملے کو حکم دے رکھا تھا کہ جب حضرت مولانا کو وضو کی ضرورت ہو۔ تو آپ کو ہتھکڑی کے بغیر جانے دیا جائے۔ لہٰذا آپ بغیر ہتھکڑی اپنی حوائج سے فارغ ہوتے۔ اور جب وضو فرمانے کے بعد واپس تشریف لاتے تو آپ کو پھر حوالات میں بند کیا جاتا۔ دوسری رعایت یہ تھی۔ کہ انسپکٹر آف پولیس آپ کو بازار سے مٹھائیاں منگوا کر پیش کیا کرتا۔ اور یہ رقم اپنی جیب سے ادا کرتا تھا۔ اور اس کی طرف سے تیسری مروّت بفضلِ ایزد متعال یہ ہوئی کہ جو کمبل حوالاتیوں کو ملتے تھے۔ حضرتِ اعلیٰ کو ان کمبلوں کی بجائے انسپکٹر مذکور نے اپنے گھر سے صاف ستھرے کمبل منگوا کر بھیجے تھے۔ اور اسی عقیدت مندی سے ایک دن آپ کو اپنے گھر بھی لے گیا اور نہایت تواضع سے پیش آیا۔ آپ کو قالین پر بٹھا کر گاؤ تکیہ پیش کر کے آپ نہایت اَدب سے سامنے بیٹھ گیا اور آپ کی بڑی پُر تکلف ضیافت کی اور کہا کہ اگر اس وقت ہمارا افسر آئے اور آپ کو حوالات میں نہ پا کر مجھ سے پوچھے تو میرے پاس اس کا تسلّی بخش جواب ہے۔ اس موقعہ پر یہ حقیقت قابلِ ذکر ہے کہ وہ انسپکٹر آف پولیس بحیثیت نگران مقرّر تھا۔ تفتیش کے لئے مسلط نہیں تھا۔ کہ جس کے متعلق یہ گمان ہو سکے۔ کہ وہ حضرت عالی مقام کے ساتھ ایسی خاطر و مدارات سے اس لئے پیش آتا تھا کہ وہ آپ کا دِل بہلا کر اصل معاملے کی تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ دراصل یہ کارروائی خداوند عالم کی رحمتِ واسعہ کا ظہور تھا۔ اور اس میں وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ کی شان پائی جاتی تھی۔ اور اسی کو اقبال مرحوم نے ایک موقعہ پر اپنے خاص انداز میں یوں بیان کیا۔ ع

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

شملے سے لاہور کو روانگی: کچھ عرصے تک حضرتِ عالی وقار کو شملہ جیل میں رکھا گیا۔ بعد ازاں آپ کو ہتھکڑی لگا کر لاہور لے آئے حضرت ان دنوں عربی لباس پہنا کرتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن لاہور سے آپ کو پیدل امرت دھارا روڈ پر میاں عبدالعزیز پولیس افسر کے مکان پر لائے۔ اب حکم ہوا کہ آپ کو ریلوے اسٹیشن لاہور کی حوالات نولکھا میں محصور کیا جائے۔ لہٰذا آپ کو کئی دن وہاں رکھا گیا۔

لاہور سے جالندھر کو روانگی: سیّد الاولیاء حضرت شیخ التفسیر مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کو اب ہتھکڑی لگا کر لاہور سے جالندھر لے گئے۔ اور وہاں جالندھر شہر کے ریلوے اسٹیشن کی جیل میں بند کر دیا۔ اس جگہ بعض پولیس افسر گاہے گاہے آتے جاتے۔ تقریباً پچیس

دن کے بعد آپ کو جالندھر شہر کی جیل میں منتقل کیا گیا، اور دوپہر کے وقت جیل کی ایک کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ نمازِ جب آپ کوٹھڑی سے باہر لائے تو آپ نے دیکھا کہ کافی فاصلے پر داروغہ جیل کے پاس آپ کے مربّی و محسن حضرت محمد دین پوری نور اللہ مرقدہٗ بھی تشریف فرما ہیں۔ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ پر یہ راز اس وقت منکشف ہوا دین پوری رحمۃ اللہ علیہ اس مقدمے میں ماخوذ ہیں۔ فرزندِ رُوحانی نے اپنے والدِ محترم کو دُور سے بہ ہزار حسرت دیکھا حاضرِ خدمت ہو کر قدم بوسی کی اجازت کب مل سکتی تھی۔ ؎

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دُور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دُور اور شکستہ پر (ذوق)

احقر نے حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی زبانِ مبارک سے خود سُنا ہے کہ ہم تو اپنے بچوں کو ہدایت کیا کرتے ہیں حاصل کرنے وقت، پچاس فی صد تعلیم اور پچاس فی صد اساتذہ کرام کے ادب کو ملحوظ خاطر رکھا کرو۔ لیکن راہِ طریقت میں سو فی صد کی تعظیم کا خیال رکھا جائے۔ ہم نے حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ہمعصر علماء کرام کے ساتھ اس قدر حسنِ سلوک سے ملاقات کرتے دیکھا ہے کہ جس کی مثال اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، اور صوفیائے وقت کے ساتھ تو آپ کا تعلق نہایت صادقانہ اور عقیدت مندانہ حامل تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔ میں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جاتا ہوں۔ مگر سوائے علیک سلیک کے اور کی گفتگو نہیں کرتا ہوں۔ اگر تین گھنٹے تک بھی بیٹھنا ہو تو دوزانو ہو کر بیٹھتا ہوں۔ پھر فرمایا کرتے تھے کہ اللہ والوں کو اپنا حال دکھلانا ہوتا ہے۔ اور ان کا حال دیکھنا ہوتا ہے۔ اور بس! فی الواقع ایسے موقعوں پر ع

خاموشی معنے دارد کہ در گفتن نمے آید

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ فطری طالبِ صادق کی قلبی کیفیت کا حال کوئی صاحبِ دل ہی بیان کر سکتا ہے "ولی را ولی مے شناسد" کے مطابق حضرتؒ کے خیالات کی ترجمانی وہی کر سکتا ہے جس کو اپنے روحانی مربّی کے ساتھ اتنی محبت ہو جتنی آپ کو اپنے آقائے روحانی سے تھی!

حضرت شیخ المشائخؒ مولانا غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے بعد آپ جب وضو کرنے کے لئے نکلے کے پاس آئے تو مولانا عبد الحق لاہوری رحمۃ اللہ علیہ رفاہِ عام سٹیم پریس کے مالک کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی اس مقدمہ میں گرفتار ہو کر آئے ہیں۔

راہوں ضلع جالندھر میں آپ کی نظربندی: جالندھر شہر کی جیل سے۔ اب ہمارے خضرِ طریقت کو راہوں ضلع جالندھر کی جیل میں لے گئے وہاں آپ نے ابھی چوبیس گھنٹے ہی بسر کئے تھے کہ ڈپٹی کمشنر ضلع جالندھر ولارے پر آ گئے۔ اب آپ کو جیل سے نکال کر ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ گورنمنٹ آپ کو اس مقدمے کے جرم میں راہوں ضلع جالندھر میں نظر بند کرتی ہے آپ اس قصبے کی حدود سے باہر نہیں جا سکتے۔ اور نہ ہی کوئی بیرونی آدمی آپ کو یہاں آ کر مل سکتا ہے۔ اگر آپ نے کوئی خط لکھنا ہو تو خط لکھ کر سب انسپکٹر پولیس کے حوالے کیجئے۔ سرکاری افسر معائنہ کے بعد مکتوب الیہ کو بھیج دیا کریں گے۔ علاوہ ازیں آپ کو گورنمنٹ کی طرف سے پندرہ روپے وظیفہ ملا کرے گا۔ چنانچہ یہ حکم سنا کر آپ کو حوالات سے رہا کر دیا گیا۔

گُفر ٹوٹا خُدا خُدا کر کے

میں مولانا کا معمول: راہوں کے پولیس اسٹیشن کے پاس خاندانِ مغلیہ کے وقت کی ایک شاہی مسجد تھی۔ مسجد اور گلی کے قریباً اڑھائی فٹ کا فاصلہ تھا۔ قادرِ مطلق کی نوازشات کا اس جگہ بھی عجیب ظہور ہؤا۔ وہ طبیعت جس کو خالقِ دوجہان نے اپنی عبادت مخصوص کیا ہؤا تھا۔ اُس کے لئے خلوت کدوں کا انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں تھا۔ خلوت کے انوار نے آپ کے دل و دماغ کو عطا فرمایا جس کی الہامی جلا سے آپ کا دل ہمیشہ عبادت الٰہی کے جذبہ سے سرشار و بیدار رہتا تھا، اور یہ حقیقت ہے۔

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

آپ تمام دن اس مسجد میں پورے سالکانہ انہماک سے اشغال و اوراد میں مشغول رہتے۔ قرآنِ حکیم میں تدبر و تفکر اور کے علاوہ نفلی عبادات میں استغراق کا ایک سنہری موقعہ مل گیا۔ ایک دنیا پرست انسان کے لئے یہ وقت ہزار حسرت و یاس تھا۔ مگر اس عارفِ باللہ کے لئے یہ تنہائیاں راہِ معرفت میں تیز گامی کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ ع

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

رات کے وقت آپ تھانے میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں کا سب انسپکٹر پولیس ایک سکھ تھا اس نے مسلمان سپاہیوں سے رکھا تھا کہ وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کھانے کا انتظام اپنے کھانے کے ساتھ ہی کریں۔ لہٰذا وہ کچا راشن بازار سے لاتے، اور اپنے ساتھ ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کھانے کا انتظام بھی کرتے۔ مقصد یہ تھا کہ مہینے کے اختتام پر آپ کے وظیفے ان کی قیمت ادا کی جائے گی۔

تکلی اللہ: راہوں میں آپ نے نومبر اور دسمبر کے مہینے گذارے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دہلی میں جب آپ کو گرفتار کیا گیا تھا نے آپ کا کوٹ اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ ان کو شبہ تھا کہ شائد ان کی سیونوں میں سازشی کاغذات ہوں۔ اب یہاں وہ آپ کو واپس کر دیا گیا۔ یہ گرم کوٹ نہیں تھا اور اس کے واپس ملنے سے پہلے آپ کے مبارک بدن پر ململ کا ایک کُرتہ اور اس کے عربی عبا تھی۔ علاوہ ازیں آپ کے پاس کوئی کپڑا نہ تھا، اور سردی دن بدن شدت پکڑ رہی تھی۔ جو لوگ مسجد میں نماز کی غرض تے تھے ان میں سے ایک شخص آپ سے متعدد دفعہ سوال کر چکا تھا۔ کہ میں آپ کے لئے ایک بستر لاؤں مگر حضرت اقدس للہ علیہ ہر بار انکار ہی فرماتے رہے۔ حقیقت یہ تھی کہ آپ باوجود سخت ضرورت کے بستر لینے سے اس لئے انکار فرماتے اگر آپ اس کے پوچھنے پر "ہاں" فرما دیں تو یہ بھی ایک طرح کا سوال بن جاتا تھا، اور اللہ تعالےٰ کے سوا دوسروں پر اپنی احتیاج رنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا آپ کو یقین تھا کہ اگر میں اس شخص کے پوچھنے پر یہ کہوں کہ آپ بستر لا دیں تو یہ عمل بھی تعلق باللہ ور پیدا کر سکتا تھا۔ اس لئے آپ اس چیز سے اجتناب فرماتے رہے۔ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے تھا

الٰہی بندہ نوازی: آخر کار پروردگارِ عالم کو اپنے متوکل و صابر بندے پر رحم آیا اور اپنے ایک مخلص ترین بندے کے دل میں ذوالاجاہ کی اس ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ لہٰذا ایک معمر، متقی، مخیر شخص ایک دن نمازِ عشاء کے بعد مسجد میں آیا اس وقت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ بالکل تن تنہا تشریف فرما تھے۔ اس شخص نے ایک نیا لحاف اور ایک نئی توشک نہایت تواضع

سے پیش کرکے عرض کیا کہ حضور! آپ اس ناچیز تحفہ کو قبول فرمائیں۔ یہ بستر ہ فقط آپ کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ
اس عطیہ الٰہی کو نصرتِ غیبی سمجھ کر قبول فرمایا۔

راہوں میں حضرتؒ کے کھانے کا انتظام

کارِ مرداں روشنی و گرمی است کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

پیشتر ازیں بیان ہو چکا ہے کہ راہوں میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کھانے کا انتظام مسلمان سپاہیوں کے ذریعے کیا گیا
وہ بازار سے کچا راشن لاتے اور خود پکاتے تھے۔ آپ نے تقریباً چار دن کھانا تناول فرمایا ہو گا جبکہ آپ کو معلوم ہوا کہ کھانا پکانے
جو ایندھن استعمال ہوتا ہے وہ رشوت کا ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ نے کھانا تناول فرمانا بند کر دیا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

چوں کہ چوکیدار لوگ جو دیہاتوں سے اموات و پیدائش کے اعداد و شمار لے کر ہفتہ وار تھانے میں آتے تھے۔ سپاہی ان
اُن سے اُوپلے یا باقی قسم کا ایندھن منگوا لیتے تھے۔ جب آپ کو اس نقص کا پتہ چلا تو آپ نے سب انسپکٹر پولیس کو کہہ
کہ آپ ان کا پکا ہوا کھانا نہیں کھائیں گے۔

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

اب آپ کے کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا مگر آپ نے بزرگانِ سلف کے صبر و تحمل کی داستانیں پڑھی ہوئی تھیں۔ آپ کو
یقین تھا کہ اسلام کی روح رواں اپنی خواہشات پر قابو پانے کو ہی کہتے ہیں۔ مجاہدانہ زندگی دنیوی لذّات سے بیگانہ ہوتی ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

آپ نے کھانا بند کروا دیا تھا۔ اور پروردگارِ عالم کے بھروسے پر فاقہ کشی کے لئے ہمہ تن تیار تھے۔ اور یہ منزل ہی
جو بندے کو محبوبِ خدا بننے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جس کے بل بوتے پر بندہ موت سے نہیں ڈرتا کیوں کہ
رگ و پے میں رُوحِ مصطفےٰ جاری و ساری ہو جاتی ہے۔

اقبال علیہ الرحمۃ نے ایک خاص موقعہ پر اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا رُوحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

جب آپ کے کھانے کا بظاہر کوئی انتظام نہ رہا۔ تو ایک اجنبی عورت مسجد سے باہر کھڑے ہو کر آپ کو مکّی کے بھنے ہوئے دانے
دے جاتی۔ اور اس کے ساتھ کچھ گڑ بھی ہوتا تھا۔ یہ عورت حضرت قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ سے ناآشنا اور حضرت رحمۃ اللہ
علیہ بھی اس سے بالکل ناواقف تھے۔ آپ یہ دانے چبا لیتے۔ اور پانی پی لیتے۔ لہٰذا راہوں کے قیام میں اسی رزق پر بسر
اوقات ہوتی رہی۔

مردِ حر چوں اشتراں بارے برد مردِ حُر بارے برد خارے خورد

تائیدِ الٰہی: راہوں میں ایک دن ایک بزرگ تشریف لائے۔ وہ اس قصبے کے باشندے نہیں تھے۔ حضرت مولاناؒ اس وقت ا

تھے۔ اور یادِ خدا میں مستغرق تھے۔ اس بزرگ نے بلاتقریب آپ کو ایک وظیفہ بتایا اور کہا کہ اگر آپ یہ وظیفہ پڑھیں گے۔ تو اللہ نے آپ کو نظر بندی کی زحمت سے نجات دے گا۔ لہٰذا حضرتؒ نے یہ وظیفہ سات دن پڑھا۔ تو ملہم غیبی نے رات کو خواب میں آپ کو رہائی کا مژدہ سنایا۔

برطانوی سیاست اور علماءِ حق: جب ۱۸۵۷ء میں برطانوی ریشہ دوانیاں کامیاب ہو رہی تھیں، حضرت سراج الدولہ مرحوم نے کفر کی یلغار کے سامنے نازیبا نہ اقدام فرمایا۔ مگر اس مجاہد کا خونِ حریت پلاسی کے میدانِ جنگ میں گر کر ہمیشہ کے لئے خشک ہو گیا۔ اس کے لئے مجاہدِ کبیر حضرت سلطان شہیدؒ نے سگانِ برطانیہ سے ارضِ ہند کو پاک کرنے کا مکمل تہیہ کیا تو مشیتِ ایزدی نے اس باز مجاہد کا نام تو یقیناً شہدائے بالاکوٹ کی فہرست میں سب سے نمایاں جگہ پر لکھ دیا۔ مگر اس کی غدار، دین فروش، پست اور عیاش قوم کے افراد کو برسوں کی نحوست میں گرفتار کر دیا۔

بالِ بازاں راسوئے سلطان بُرند بالِ زاغاں را بگورستان بُرند

اس زوال و انحطاط کے دور میں علماءِ خیر اپنی تمام کوششیں دینِ الٰہی کے احیاء کے لئے صَرف کرتے رہے۔ برطانوی حکومت کے جبر و استبداد اور اسلام دشمنی کے تمام منصوبوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے کمزور بندوں کے ہاتھوں اپنے دین کی حفاظت کروائی۔ بلکہ روزِ اوّل سے یہی عادت اللہ اور سنّۃ اللہ جاری و ساری رہی ہے کہ وہ ابابیلوں کی چونچوں میں سنگریزے پکڑوا کر ہاتھیوں کو تباہ کرواتا ہے۔ اسی طرح اور عین اسی طرح برطانوی ابرہہ کے مقابلے میں ہندوستان میں دین کے کعبے کی حفاظت کا کام لیا گیا۔ ان علماءِ خیر پر کروڑوں رحمتیں ہوں جنہوں نے سوکھے ٹکڑے چبا چبا کر اور قید و بند کی سختیاں برداشت کر کے قرآن حکیم کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا۔ ورنہ انگریز جیسے شاطرِ وقت نے اسلام کی تذلیل و تضحیک میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور سہارنپور کے فارغ التحصیل علماء کو پانچ روپے کی ملازمت بھی نہیں دی جاتی تھی۔ مگر سرکاری سکولوں کے پانچویں پاس نااہلوں کو ہر جگہ ملازم رکھا جاتا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت سید انور شاہ کاشمیریؒ، حضرت مولانا محمود الحسنؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی خداداد ہمتوں نے بفضلِ ایزد متعال کَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ...... کا منظر پیش کیا۔ اور اسی قافلے کے ساتھ ساتھ سید السادات زعیم احرار اسلام حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور قطبِ دوراں ممدوحِ جہاں حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جن کی شبانہ روز کوششوں نے کفر و بدعت کے ہر وار کو اپنے ہاتھوں پر لیا۔ اور پُرخطر ماحول کا ہر موقع پر منہ چڑایا اور دینِ مصطفویؐ کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کر دی۔ دنیا کے حقیقت پسند مؤرخین جب اس دور کی تاریخ لکھیں گے تو ان کو ماننا پڑے گا کہ سید المجاہدین سید عطاء اللہ شاہ بخاری پروردگارِ عالم کی طرف سے مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ و بقاء کے لئے آئے تھے اور اسی راہ میں شہید ہوئے۔ لہٰذا آپ کو شہیدِ ختمِ نبوت کہنا ہر لحاظ سے بجا ہے اور حضرت مولانا و سیدنا شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ خدمتِ قرآن کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اور اسی پیغمبرانہ خدمت میں جاں بحق ہوئے۔ اس لئے آپ کو شہیدِ قرآن کا لقب ہر دلیل سے زیبا ہے۔

لاہور میں ورودِ مسعود: خداوند عالم نے تمام ظاہری اسباب کی موجودگی میں اپنی قدرت کاملہ کے معجز نما ظہورات مختلف

موقعوں پر پیش فرمائے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ظاہر پرست انسان کو دعوت دی جائے کہ وہ دنیا میں اپنی فائز المرامی اور کامرانی کا دار و مدار اسباب و علل کے ظاہری سلسلے پر نہ رکھے۔ بلکہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ پر یقینِ کامل کر کے اپنی زندگی کی تمام تر قوتوں کو رضائے الٰہی کے حصول کے لیئے صرف کر دے۔ کیونکہ انسانی حیات کا یہی معراجِ کمال ہے کہ وہ فتح و شکست کے وقت خدائے دو جہاں کا دروازہ نہ چھوڑے۔

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

حضرت شیخ التفسیر مرحوم رحمۃ اللہ علیہ برطانوی حکومت کے نزدیک باغی تھے، مجرم تھے۔ مگر آپ کا ہر قدم راہِ راست پر پڑتا تھا، اور مشیتِ ایزدی کا تقاضا تھا کہ لاہور جیسے تہذیبِ نو کے مرکز میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ جیسے پختہ کار انسان کو خدمتِ دین کا موقعہ دیا جائے۔ اور شیرانوالہ محلہ جو کسی وقت راہزنوں کی بستی تھی۔ رُشد و ہدایت کا سرچشمہ بن جائے، اور اس زمزمِ قرآنی سے سرزمین ہند باقی بیرونی ممالک اور جزائر حتیٰ کہ عرب و عجم بھی اپنی تشنگی بجھائیں۔ علماء خیر کے گروہ در گروہ آئیں اور علوم و معارف سے اپنے دل و دماغ کو منوّر کر کے دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل جائیں۔ سالکانِ راہِ طریقت حاضر ہوں اور ریاضت کے لیئے لائن سبحان خاں کی جامع مسجد کے حجروں اور چٹائیوں پر شام و سحر عبادت گزاریں اور اصحابِ صفہ کی سنّت کے مطابق ذکر الٰہی اور فکر عاقبت میں مستغرق رہیں، اور جب یہاں سے اپنے اپنے اوطان کو واپس جائیں تو دینِ مصطفوی کی خدمت کا ایک پاکیزہ جذبہ لے کر جائیں۔ جہاں رہیں اور جب تک دنیا میں رہیں۔ والہانہ انداز میں کتاب و سنّت کی نشر و اشاعت میں منہمک رہیں۔ علماء تو علماء تہذیبِ مغرب کے پرستار چند دنوں میں اسلامی معاشرے کے گرویدہ بن جائیں اور فرشتگان قضا و قدر قلوب و ارواح کے دروازوں پر دستک دیتے پھریں۔

دَرِ فیضِ محمدؐ وا ہے آئے جس کا جی چاہے خدائے دو جہاں سے لَو لگائے جس کا جی چاہے

حضرتِ اقدس رحمۃ اللہ علیہ کو راہوں سے لاہور لایا گیا اور سی، آئی، ڈی کے ایک انگریز افسر کے سامنے جس کے ساتھ ایک مسلمان افسر بھی تھا۔ پیش کیا گیا، آپ سے اس افسر نے کہا کہ "حکومت آپ کو صوبہ سندھ یا دہلی واپس بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کا یقین ہے کہ صوبہ سندھ اور دہلی میں آپ کا واپس جانا کسی لحاظ سے ٹھیک نہیں۔ لہٰذا آپ کو لاہور میں ہی رہنا ہوگا۔" لیکن مشیتِ الٰہی نے اس فیصلے پر بھی تبسم فرمایا۔ اور اپنی قدرت کا ظہور ایک عجیب انداز میں کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ع

عدو شرے بر انگیزد کہ خیر ما دراں باشد

البتہ آپ کو یہ شرط بھی پیش کی گئی کہ آپ اپنے دو ضامن پیش کریں، اور وہ ہزار ہزار روپے کی ضمانت دیں، تب گورنمنٹ آپ کو رہا کرنے کے لیئے تیار ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ پنجاب میں میرا کوئی واقف نہیں ہے۔ میں دہلی یا صوبہ سندھ سے ضامن پیش کر سکتا ہوں مگر افسروں نے کہا کہ ہم وہاں سے ضامن لینے کے لیئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ جب آپ نے غور کیا تو قاضی ضیاء الدین مرحوم ایم۔ اے فاضل دیوبند ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کا نام نامی یاد آیا۔ قاضی موصوفؒ آپ کی اہلیہ محترمہ کے چچا زاد بھائی ہونے کے علاوہ

نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں علماء کی جماعت کے انگریزی پڑھانے کے اُستاد تھے۔ اب حضرت اعلیٰ قاضی مرحوم کے پاس گئے تو وہ اس کارِ خیر کے لیئے فوراً تیار ہو گئے، اور دوسرے ضامن ملک لال خاں (مینجر انجمن اسلامیہ گوجرانوالہ) کو تجویز کیا گیا۔ چنانچہ ملک صاحب نے بھی اپنی آمادگی کا اظہار فرمایا جزاھم اللہ خیر الجزاء فی الدارین جب یہ دونوں حضرات ضمانت دینے کے لیئے لاہور تشریف لائے تو سی۔ آئی۔ ڈی پولیس نے زرِ ضمانت میں تخفیف کر دی اور ہر ایک صاحب کو پانچ پانچ سو روپیہ ضمانت دینے کی اجازت ہو گئی۔ یہ ضمانت صرف ایک سال کے لیئے تھی۔ اب حضرتِ والاجاہ لاہور میں قیام پذیر ہونے کے لیئے پابند ہو گئے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ دریائے راوی کی گہرائیوں سے لے کر شاہی مسجد کے بلند میناروں کی تمام فضاؤں نے ہزار مسرت و عقیدت سے انہیں پکارا تھا۔ ع

آمد آں مردے کہ ما مے خواستیم

رُوحِ لاہور استقبال کرتی ہے

مری باتوں کو سن کر اک ندا اُٹھی فضاؤں سے
صدائے حبذا و مرحبا گونجی ہواؤں سے

صدا آئی کہ جان و دل سے استقبال کرتی ہوں
میں اِن کی راہ اپنے چمن پامال کرتی ہوں

مرے دامن میں لاکھوں نا ہنجار بستے ہیں
بہت فُرّاق بستے ہیں بہت میخوار بستے ہیں

فحاشی کے مراکز ہیں، سینماؤں کی بستی ہے
مری قسمت اکہ برسوں سے یہاں لعنت برستی ہے

شیاطین کا تسلط ہے، یہاں کی درسگاہوں پر
متاعِ دین بھی قربان ہے فرنگی پیشواؤں پر

کتاب اللہ پہ طعنہ زنی کی یاں اجازت ہے
تماشا کھیل ان کے دین میں عین عبادت ہے

مگر فضلِ خداوندی سے اب صورت بدلتی ہے
شبِ تاریک جاتی ہے مری قسمت چمکتی ہے

بحمد اللہ مری بستی میں فخرِ اولیاء آئے
مثیلِ بایزیدؒ آئے امام الاتقیاء آئے

مجھے تہلیل کے نغمات کا سننا مبارک ہو
کتابُ اللہ کی آیات کا سُننا مبارک ہو

ہزاروں اس جگہ حُسنِ عبادت آکے سیکھیں گے
ہزاروں اس جگہ درسِ صداقت آکے سیکھیں گے

حضرت کا لاہور میں مستقل قیام: آپ کو لاہور میں رہنے پر پابند کیا گیا تو آپ نے اپنے اہل وعیال اور اپنے بھائی رشید احمد صاحب کو اپنے پاس بُلا لیا۔ حکیم صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کے لیئے طبیہ کالج لاہور میں داخل کیا گیا۔ آپ نے وہاں سے زبدۃ الحکماء کی اعزازی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی کالج میں بحیثیت پروفیسر کام کرنے لگے۔ لہٰذا آپ کئی سال تک وہاں کام کرتے رہے۔ آپ بڑی مستعدی، تندہی اور دیانتداری سے کام کرتے تھے۔ اس لیئے آپ کی جماعتوں کے نتائج بہت اچھے نکلتے تھے۔

لاہور میں حضرت کے مشاغل: امام انقلاب حضرت مولانا سندھیؒ نے حضرت مولاناؒ سے دہلی کے قیام میں وعدہ لیا تھا کہ وہ ساری زندگی قرآنِ حکیم کا درس دیتے رہیں گے۔ اس وعدہ کی پابندی کی وجہ سے حضرت مولانا مرحوم رہا اگرچہ لاہور میں ایک سال تک نظر بند ہی تھے مگر آپ نے دو آدمیوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھانا شروع کر دیا جن میں سے ایک مولانا عبدالعزیز جو کہ بازار سرپانوالہ میں دکاندار تھے۔ اور دوسرے میاں عبدالرحمٰن شاہ صاحب تھے جو سرپانوالہ بازار میں ایک مسجد کے امام

تھے۔ یہ دونوں حضرات آپ کے خسر حضرت ابو محمد احمدؒ کے مخلص احباب میں سے تھے۔ اس لئے ان پر اعتماد رکھتے ہوئے آپؒ نے ان کو ترجمہ پڑھانا شروع کر دیا۔ آپ کی اکثر کوشش ہوتی کہ درس میں کوئی مشتبہ آدمی نہ آئے تاکہ آپ کے خلاف کوئی رپورٹ نہ ہو۔ اور نہ ہی آپ کے ضامنوں کو زرِ ضمانت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ بعد ازاں جب آپ کی صداقت، اخوتِ اسلامی اور کتاب وسنت پر استقامت کے راز لوگوں پر کھلنے لگے۔ تو مخلص احباب کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان دنوں آپ کا مکان، "اللہ دتہ کا کٹڑہ" کی بالائی منزل پر تھا۔ اگرچہ آپ نماز پنجگانہ مسجد لائن سبحان خاں میں ادا فرماتے تھے، مگر یہاں درس نہیں دیتے تھے۔ درس کا انتظام ان دنوں مستری اللہ دتہ کے کٹڑہ کے متصل ایک چھوٹی سی مسجد میں ہوتا تھا۔ یہ مسجد شیرانوالہ دروازہ سے فاروق گنج کو جاتے ہوئے جرنیلی سڑک کے نیچے اتر کر دائیں ہاتھ پر واقع ہے۔ جب سامعین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور مسجد میں گنجائش نہ رہی تو آپ نے مسجد کی ملحقہ دکانوں کی چھت پر درس دینا شروع کر دیا۔ یہ جگہ سڑک کے اوپر شیرانوالہ دروازہ سے بالکل سامنے تھی۔ لہٰذا جب شائقین حضرات نے وہاں درس ہوتے دیکھا تو مجمع اور بھی بڑھنے لگا۔ اب آپ کے دل میں سابقہ اندیشہ لاحق ہوا۔ کہ کوئی سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی آپ کے خلاف رپورٹ نہ کر دے اور آپ کے ضامنوں کی ضمانت ضبط نہ ہو جائے۔ لہٰذا آپ نے اس جگہ درس دینا بند کر دیا اور اب مولانا عبدالحقؒ کی بیٹھک میں درس دینا شروع کر دیا۔ جو ان دنوں اندرون شیرانوالہ دروازہ، نواں محلہ میں مقیم تھے۔ درس کا سلسلہ کافی عرصہ تک وہاں ہی جاری رہا۔

مسجد لائن سبحان خاں میں درس کی ابتداء: غرض کافی عرصہ تک مولانا عبدالحقؒ صاحب کی بیٹھک میں درس ہوتا رہا۔ بعد ازاں درس گاہ کا یہ کمرہ مولانا عبدالحق صاحب کو اپنی ذاتی ضرورت کے لئے استعمال کرنا پڑا۔ لہٰذا حضرتِ اقدس نے مولانا موصوف کے اشارے کے بغیر ہی مسجد لائن سبحان خاں میں درس دینا شروع کر دیا۔ دراصل یہ مسجد پولیس لائن کی مسجد تھی۔ اس وجہ سے اس مسجد کا نام لائن والی مسجد تھا۔ خدا جانے پولیس کے اٹھ جانے کے بعد اس مسجد کی آبادی کا کیا ذریعہ رہا۔ البتہ جب ہمارے حضرتؒ نے اس جگہ درس کا سلسلہ شروع فرمایا تو اس وقت حاجی فضل دین نواں محلہ شیرانوالہ دروازہ حسبتاً للہ اس مسجد کی ہر طرح خدمت سرانجام دیتے تھے۔ حاجی موصوف ایک صحیح العقیدہ شب بیدار اور متقی شخص تھے۔ اس کے علاوہ ایک بزاز بھی۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ان کے دل میں درس قرآن مجید کی عظمت اور حضرت مولانا کی محبت پیدا کر رکھی تھی۔

سلسلۂ معاش: حضرت مولانا مرحوم کے خسر حضرت مولانا ابو محمد احمدؒ مدت مدید سے لاہور میں قیام پذیر تھے وہ کشمیری بازار صوفی مسجد مولا داد میں رہا کرتے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش طبع ہونے والی کاپیوں کی تصحیح کرنا تھا۔ ان کی زندگی کے تقریباً آخری چالیس سال اسی کام میں گزرے۔ اسی بناء پر لاہور کے کتب فروشوں کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے اچھے تھے چونکہ وہ ابھی تک روپڑ ضلع انبالہ میں نظر بند تھے۔ اور حضرت اقدس کو لاہور میں رہنے پر پابند کیا گیا تھا۔ لہٰذا آپ نے بھی کاپیوں کی تصحیح کا کام شروع کر دیا۔ بعد ازاں جب آپ قرآن مجید کی نشر و اشاعت میں زیادہ مصروف ہو گئے۔ اور خداوند عالم نے فتوحاتِ غیبیہ سے رزق پہنچانا شروع کیا تو آپ نے تصحیح کے کام کو ترک فرما دیا۔ اب حضرت والا تبار نے روزانہ متعدد

جگہ درس دینا شروع کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے رزق پہنچاتے رہے۔ (والحمد للہ علےٰ ذالک)

پہلے حج بیت اللہ کی تیاری: حوالات اور نظر بندی کے پیہم مصائب برداشت کرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں جب حضرت لاہور میں تشریف لائے تھے تو اسی سال کے آخر یا ۱۹۱۸ء کے ابتداء میں جب حج کا زمانہ آیا۔ تو حضرت اعلیٰ سفر حج کے لئے تیار ہوئے۔ یہ سفر صرف حج کی غرض سے ہی نہ تھا بلکہ آپ نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آپ اپنے اہل و عیال سمیت حجاز پاک میں ہجرت کر کے تشریف لے جائیں اور بقیہ زندگی مدینۃ الرسولؐ میں ہی گزاریں۔ لہٰذا آپ نے پاسپورٹ کی تحریر میں اپنے بال بچوں اور اپنے بھائی حکیم رشید احمد کا نام بھی لکھ دیا۔ درخواست کے وقت آپ کے مخلص دوست خواجہ محمد رشید صاحب وائس مسجد آسٹریلیا بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ نے اس معزز رئیس زادہ کو فرمایا کہ وہ ان کی ہجرت کے ارادے کو کسی پر آگاہ نہ کریں۔

تائیدِ غیبی کا ظہور: جب بدھ کے دن آپ نے حج کے لئے درخواست دی تو آپ کے گھر میں فقط دس روپے تھے مگر خدائے مسبب الاسباب نے اپنی رحمتِ واسعہ سے ہفتے تک آپ کے پاس انیس صد روپیہ بھیج دیا۔ اس عرصے میں آپ نے کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے بندے آتے۔ دروازہ کھٹکھٹاتے اور کوئی دو سو کوئی چار سو روپے دے کر چلے جاتے۔ گویا تین چار دن کے اندر اندر حضرت کے اہل و عیال کے تمام مصارفِ حج کی رقم فراہم ہو گئی۔ کیونکہ ان دنوں ایک حاجی کے لئے تقریباً دو سو روپیہ کافی سمجھا جاتا تھا۔

استخارہ: سفرِ حرمین الشریفین کے بعد حضرت اقدس نے بارگاہ حق تعالےٰ میں بطور استخارہ کے استدعا کی کہ اے اللہ تعالےٰ اگر اس احقر العباد کا ارضِ مقدس کو ہجرت کر کے جانا ہر لحاظ سے مفید ہے تو اپنے فضلِ عمیم سے اعانت فرما۔ اور اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو اپنے حکم سے روک دے۔ جس دن پاسپورٹ آیا اسی دن آپ تیار ہو گئے۔ ایک بستر باندھ لیا۔ برتن بوری میں ڈال لئے اور بقیہ سامان کچھ تو فروخت کر دیا، اور کچھ اِدھر اُدھر لوگوں کو دے دیا۔ لیکن مشیّتِ ایزدی کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ حضرت مولانا کا ہجرت کا ارادہ باری تعالیٰ کو منظور نہ تھا۔ عین اسی دن آپ کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہو گئیں۔ اور سفر کے ہرگز قابل نہ رہیں۔ لہٰذا آپ کے مکرم المقام خسر حضرت محمد احمد مرحوم باقی اقرباء و اعزا کے ہمراہ تشریف لائے۔ اور اپنی صاحبزادی کی حالت کے پیش نظر ان کو ہمراہ نہ لے جانے کے متعلق گفتگو ہوئی۔ اس لئے آپ بال بچوں کو سپردِ خدا کر کے تن تنہا حج پر تشریف لے گئے اور ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور حج کرنے کے بعد بخیر و خوبی واپس تشریف لائے۔

تحریکِ خلافت: حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جب سفرِ حجاز سے مراجعت فرما کر کراچی پہنچے۔ تو آپ کو معلوم ہوا کہ تحریک خلافت کا پورے زور سے آغاز ہو چکا تھا۔ امیر امان اللہ کے خسر محمود طرزی انگریزوں کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنے کے لئے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور ادھر ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے خلاف مشتعل ہو چکے تھے۔ کیوں کہ فرانسیسی اور انگریزی افواج نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور خلیفۃ المسلمین مع اہل و عیال گرفتار ہو چکے تھے۔ اس موقعہ پر امیر امان اللہ خاں نے مسلمانانِ ہند کو دعوت دی کہ وہ ہجرت کر کے افغانستان آ جائیں۔ چوں کہ مسلمان انگریزوں کے خلاف

پہلے ہی سے برافروختہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس دعوت پر فوراً لبیک کہا۔ اور ہزاروں کی تعداد میں کارواں در کارواں افغانستان کو روانہ ہونے لگے۔ اگر وہ ہجرت کامیاب ہو جاتی تو اس کے دور رس نتائج حکومت انگلشیہ کے حق میں ضرور مہلک ثابت ہوتے۔ مگر قیاس چاہتا ہے کہ امیر امان اللہ خاں نے اپنی پیش کردہ شرائط کو منوانے کے لئے انگریزوں کو فقط دھمکی دی تھی۔ اور ہجرت کی دعوت کا حربہ استعمال کیا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت: ہم نے جس قدر تحقیق و تفحص سے نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسلمہ حقیقت اپنی پوری تابانی سے اُجاگر ہو گئی ہے کہ ولایت اپنے ہر درجے میں نبوت سے مستنیر ہوتی ہے۔ حضرتؒ کا جذبۂ ہجرت اگر اس سے پیشتر چند حکمتوں کے پیش نظر پورا نہ ہو سکا تو آخر کار آپ کو ہجرت کی سعادات و برکات سے نوازا جانا بھی مقدر ہو چکا تھا۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت والاشان ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز مقدس کو جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ مگر وہ پورا نہ ہو سکا۔ مگر ہجرت کی فضیلت کے ملنے کے اب ایام آ چکے تھے۔ ہندوستان کے مختلف صوبجات سے مہاجرین جوق در جوق کابل جانے شروع ہو گئے۔ لہٰذا آپ بھی اپنی تمنا کے مطابق ہمہ تن تیار ہو گئے۔ اس سے پہلے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ مرحوم کی معیت میں آپ کے دو چھوٹے بھائی کابل پہنچ چکے تھے۔ حافظ محمد علی صاحب کو امام انقلاب حضرت سندھیؒ اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ اور مولوی عزیز احمد صاحب کو مولانا سندھیؒ نے پہلے ہی مولوی محمد علی قصوری کی معیت میں طبیہ کالج میں حصول تعلیم کے لئے داخل کرا دیا تھا۔

لاہور پنجاب کا ام القریٰ ہے۔ لہٰذا مضافات لاہور سے مہاجرین یہاں اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ اور انہوں نے حضرت مولانا مرحوم کو اپنا امیر قافلہ منتخب کر لیا۔ پنجاب کے بعض شہروں سے پانچ ہزار روپے کی ایک رقم فراہم کی گئی جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تحویل میں دی گئی۔ اور فیصلہ یہ طے پایا۔ کہ یہ رقم امیر امان اللہ خاں کی خدمت عالیہ میں پیش کی جائے اور یقین کیا جاتا تھا کہ یہ رقم خطۂ پنجاب کی طرف سے پہلی قسط تھی جو پیش کی جانے والی تھی۔ جو وقت آنے پر سونے کی صورت میں پیش کی گئی۔

کابل میں داخلہ: کابل میں آپ کے دو چھوٹے بھائی اور حضرت سندھیؒ پہلے سے ہی موجود تھے۔ یہ حضرات رحمت خداوندی سے امیر افغانستان کی شاہی کوٹھی عین الامارۃ میں رہا کرتے تھے۔ یہ جگہ شہزادگی کے زمانے میں مکرم المقام جناب امیر صاحب کی قیام گاہ تھی۔ تخت نشینی کے بعد انہوں نے یہ شاہی قیام گاہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تحویل میں دے دی۔ چونکہ حضرت مرحوم کے قافلے کے بہت سے آدمی آپ سے پہلے کابل پہنچ گئے تھے۔ لہٰذا آپ کے بھائیوں کو آپ کی آمد کی اطلاع ہو چکی تھی۔ انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر آپ کے لئے ایک کشادہ مکان کرایہ پر لے لیا۔ آپ نے کابل میں قدم رنجہ فرماتے ہی اسی مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ یہ مکان بڑا وسیع تھا۔ لہٰذا آپ نے شیخ میراں بخش صاحب اور میاں عبد اللہ صاحب کو بھی اپنے ساتھ رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت الور بالائی منزل میں مقیم تھے۔ اور دونوں حضرات اپنے اہل و عیال سمیت نچلے حصے میں آباد تھے۔

حضرت قطب الاقطاب کا پشاور میں ورودِ مسعود: پشاور سے دو تین میل کے فاصلے پر گورنمنٹ نے ایک فوجی افسر مقرر کیا ہوا تھا جو کہ واپس آنے والے مہاجرین کی سرسری دیکھ بھال کر کے ان کو پشاور بھیج دیتا تھا لہٰذا جب حضرت مولانا حدودِ ہند میں تشریف لائے تو آپ کے رفقاءِ سفر کو حکم ہوا کہ تمام مرد نیچے اتر آئیں اور عورتیں تانگوں میں بیٹھی رہیں۔ پولیس نے تمام مردوں کے نام پوچھنے شروع کئے جب حضرتِ اقدس سے نام پوچھا تو آپ پر سوال کیا گیا کہ کیا آپ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے رشتہ دار ہیں۔ جس کا آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد آپ کو پشاور بھیج دیا گیا۔ آپ دیگر مہاجرین کے ہمراہ ایک سرائے میں ٹھہرائے گئے اور اگلے دن صبح آپ کو ایک انگریز افسر کے سامنے پیش کیا گیا اس نے حضرتِ انور کو بغور دیکھا اور پوچھا کہ آپ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے عزیز ہیں آپ نے فرمایا کہ ہاں میں حضرت مولانا سندھیؒ کا عزیز ہوں۔ بعد ازاں آپ کو سرائے میں بھیج دیا گیا۔ سرائے میں دو تین دن کے قیام کے بعد آپ کو لاہور کا ٹکٹ دیا گیا اور آپ تقریباً ۱۹۲۰ء کی ابتداء میں مع اہل وعیال لاہور میں رونق افروز ہوئے۔ آتے ہی درسِ قرآن مجید شروع کر دیا۔ اور انجمن خدام الدین کی بنیاد رکھی۔

انجمن خدام الدین کا قیام: حضرت والا تبار نے بفضل ایزد متعال درسِ قرآن مجید کا سلسلہ نہایت خلوص وانہماک سے شروع کر دیا تھا۔ ایک دن درس کے بعد حکیم فیروز الدین صاحب حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ آپ حضرت مولانا سے اشاعت قرآن کی اہمیت کے متعلق ہمیشہ سنتے ہی رہتے ہیں۔ لہٰذا آپ لوگوں کی خدمت میں التماس ہے کہ ہم لوگ اس کارِ خیر کے لئے کوئی منظم طریق پر اقدام کریں تاکہ اس کے اثرات دُور رس ہوں۔ اس وقت حاضرین نے ایک انجمن کی تشکیل کا فیصلہ کیا۔ اور حضرتِ اقدس کی تجویز پر انجمن کا نام "انجمن خدام الدین" رکھا گیا۔ اس تجویز کے بعد حضرت مولانا نے ایک دن چند احباب کرام کو جنہوں نے انجمن کے لئے دینی خدمات پیش کرنے کا وعدہ فرمایا تھا دعوت دی۔ لہٰذا حضرت مولانا ابو محمد احمد شاگردِ رشید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور شیخ الہند محمود الحسنؒ۔ حضرت مولانا نجم الدینؒ جو کہ حضرت مولانا کے استادِ مکرم تھے۔ اور حضرت شیخ الہند کے شاگرد عزیز تھے اور مولانا فضل الحق جو حضرت نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے اس مجلس میں علاوہ باقی حضرات کے شامل ہوئے۔

انتخابِ امیر: جب ان سعید روحوں پر مشتمل انجمن کا پہلا اجلاس شروع ہوا تو تجویز پیش ہوئی کہ انجمن کے کاروبار کی تعمیل کے لئے کوئی امیر انجمن ہونا چاہیئے اور حضرت مولانا مرحوم نے اس موقعہ پر وضاحت فرما دی کہ صدر اور امیر میں ایک نمایاں فرق ہو گا۔ صدر مجلس منتظمہ کی تجاویز کو اپنی سرپرستی میں عملی جامہ پہنانے کا ذمہ دار ہو گا اور مجلس منتظمہ جو فیصلہ کرے صدر کے لئے اس کی پابندی لازمی ہو گی۔ صدارت کی صورت میں ممکن ہے کہ انجمن کے اراکین میں پارٹی بازی کا غلط احساس پیدا ہو اور کام میں رکاوٹ پیدا ہو۔ اس کے برعکس امیر مجلس منتظمہ سے ضرور مشورہ لے گا لیکن مشورہ کے بعد اگر وہ انجمن کے مفاد کے پیش نظر منتظمہ کی رائے کو مسترد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اس طرح دونوں احزاب مخالف کاروبار کے نفوذ و اجراء میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتے اور امیر اپنے کام کو مسلسل چلا سکتا ہے۔ چنانچہ تمام اراکین انجمن نے حضرت مولاناؒ کی اس رائے سے اتفاق کیا۔ حضرت مولاناؒ نے اس موقعہ پر امارت کے منصب جلیلہ کے اوصاف بھی مختصراً بیان فرمائے۔ اب تمام حضرات نے مل کر امیر کے انتخاب پر رجوع فرمایا اور تمام نے بیک زبان حضرت مولانا مرحوم کے نام نامی اور اسم گرامی پر اتفاق کیا۔ حضرت نے اکابر کی موجودگی میں اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ حاضرین میں ایسے اصحاب موجود ہیں جن کو میرے اساتذہ ہونے کی فضیلت حاصل ہے۔ لہٰذا نظرِ انتخاب ان پر ڈالی جائے۔ لیکن اس کے باوجود تمام حاضرین محفل حضرت مولانا مرحوم کے انتخاب پر مصر رہے۔ اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ اکابر میں سے بعض نے حضرت مولانا کے انکار پر اظہارِ ناراضگی بھی فرمایا۔ اس وقت حضرت اپنے بزرگوں کا حکم سمجھ کر تعمیل ارشاد پر راضی ہو گئے۔ اس طرح اتفاق رائے سے آپ کو امیر انجمن مقرر کیا گیا۔ حضرت مولانا

فضل الحقؒ ناظم، خواجہ محمد رشید صاحب وائیں آسٹریلیا مسجد والے خزانچی مقرر ہوئے۔ اس بابرکت کاروائی کے بعد اجلاس برخاست ہوا۔ ا
کے دین کا کام نہایت اخلاص وللّٰہیت سے چلنے لگا۔

قرآنِ حکیم کے دو درس: حضرت اقدس نے جہاں تمام اوقاتِ شبانہ روز اشاعتِ کتاب وسنت کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ و
دن میں دو دفعہ قرآن حمید کا درس دینا شروع فرمایا۔ ہر روز نماز فجر کے تقریباً پون گھنٹہ بعد ایک عام درس قرآن مجید ہونے لگا۔ جس کو آپ
تادمِ واپسیں نبھاتے رہے۔ دوسرا درس تعلیم یافتہ طبقے کے لئے مخصوص تھا۔ اس میں گریجویٹ ملازمین دفاتر اور کالج کے طلباء شامل تھے۔ ح
اعلیٰ اس درس کو پچیس سال تک بنفسِ نفیس چلاتے رہے۔ بعدازاں دس سال تک آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ
آپ کی بجائے نہایت محنت پژوہی سے کام کرتے رہے اور حضرت مولانا صرف صبح کا درس ہی دیتے رہے اور حافظ حبیب اللہ کے بعد حضرت کی
تک حضرت مولانا عبیداللہ انور پڑھاتے رہے۔

مدرسہ قاسم العلوم کا اجراء: انجمن خدام الدین کی تشکیل وتعمیر کے بعد ایک عربی مدرسہ کے اجراء کی تجویز پیش ہوئی۔ اس پر ہر طرف
اتفاق وتائید کی آوازیں بلند ہوئیں۔ المختصر بفضل ایزدی مدرسہ جاری ہوگیا اور اس کا نام قاسم العلوم رکھا گیا۔ متعلّمین کی رہائش کے لئے
پاس کوئی جگہ نہ تھی لہٰذا اندرون شیرانوالہ دروازہ نواں محلہ کے باہر لبِ بازار ایک مکان کرایہ پر لیا گیا۔ طلبہ کی رہائش کے لئے اس جگہ کو مع
گیا اور اسباق کا انتظام مسجد لائن سبحان خاں میں کیا گیا۔ عربی کے تمام طلبہ کے علاوہ فارغ التحصیل علماء کرام بھی قرآن حکیم کی تفسیر پڑھنے ک
ہونے لگے۔ اب حضرت والاجاہ تین ماہ میں مکمل قرآنِ عزیز کا ترجمہ مع ربطِ آیات، رکوعات کا خلاصہ اور باقی ضروری موضوعات وعنوانات
اور ان پر سیر حاصل روشنی ڈالنا شاملِ درس کر کے ختم فرماتے تھے اس لئے بفضل خدا تعالیٰ تمام ہندوستان کے متداولہ مدارس بالخصوص دا
دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، مدرسہ شاہی مراد آباد کے فارغ التحصیل علماء کی جماعتیں آنے لگیں۔ یہ لوگ یکم شوا
ذیقعدہ کے اخیر تک قرآن پاک کی تفسیر پڑھتے تھے۔ ان کی خوراک اور رہائش کا انتظام انجمن خدام الدین کے ذمہ ہوتا تھا۔ علماء کرام کا یہ دو
اعلیٰ نے زندگی کے آخری رمضان المبارک تک جاری رکھا۔ ۱۷ رمضان ۱۳۸۲ھ کو جب حضرت شیخ التفسیر عالم جاودانی کو سدھارے تو آ
میں باہر سے آئے ہوئے علماء کی ایک معتدبہ جماعت شامل تھی۔ کامیاب ہونے والے علماء کو مطبوعہ اسناد مرحمت کی جاتی تھیں۔ ان کی سند پر
مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا انور شاہ مرحومؒ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مرحوم کے دستخط ثبت ہوتے تھے۔ تمام اطراف
ہند ہزاروں علماء کرام سند فراغت حاصل کر کے جا چکے ہیں۔ اور اب حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب جانشین حضرت شیخ التفسیرؒ
کے مبارک ومسعود طریق پر عام درس کے علاوہ علماء کرام کے درس کا اہتمام بھی کر رہے ہیں۔

مدرسہ قاسم العلوم کی عمارت: علماء کرام کی جماعت کی رہائش کے لئے مکان کرایہ پر لیا جاتا تھا جس سے سخت مشکلات کا سامنا
پڑتا تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر انجمن نے ایک اپنا مدرسہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ لائن سبحان خاں میں ایک قطعہ اراضی خرید کیا گیا اور
قاسم العلوم کی عمارت تعمیر کی گئی۔ تعمیر عمارت کے بعد حضرت رئیس المفسرین مولانا شبیر احمد عثمانی مرحومؒ کو تشریف لانے کی دعوت دی۔ آ
تشریف لائے اور اپنے دستِ سعید سے مدرسے کا قفل کھولا۔ مدرسہ کی اوپر نیچے کی منزلوں میں قرآن حمید کے نسخے رکھ دیئے گئے
نے مل کر قرآن پاک کی تلاوت کی اور حضرت مولانا عثمانی مرحومؒ بھی بڑی دیر تک تلاوت فرماتے رہے۔ بعدازاں علماء کرام کی جماعت کا ا
اسی مدرسہ میں کیا جاتا ہے۔ مطبخ کا انتظام بھی اسی جگہ ہوتا ہے۔

قیام گاہ: تفصیلاً گذارش ہے کہ جب حضرت مولاناؒ کا قافلہ کابل میں پہنچا۔ تو سب سے پہلے ایک عیدگاہ میں ٹھہرے یہ عیدگاہ مسقف تھی۔ ان کی آمد سے پیشتر بھی مہاجرین یہاں موجود تھے انہوں نے حضرت مولانا اور باقی اہل قافلہ کو یہ ہمت شکن اطلاع دی کہ یہاں مہاجرین نہایت کس مپرسی کی حالت میں ہیں، حکومت افغانستان نہایت بے اعتنائی سے کام لے رہی ہے اور مہاجر حضرات جو اپنے ہمراہ نان و نفقہ لائے تھے ختم کر چکے ہیں۔ اب ان کے پاس نہ کھانے کا سامان ہے اور نہ ہی واپس جانے کے لئے کرایہ ہے۔ قافلہ نے حضرت مولانا مرحوم کو ان حالات سے مطلع کرنے کے بعد واپس جانے کی اجازت طلب کی حضرت نے اس عجلت سے ان کو باز رکھنے کے لئے بڑا سمجھایا بجھایا۔ مگر وہ پھر بھی واپس جانے پر مصر ہی رہے۔

مہاجرین اور حکومتِ افغانستان کا فیصلہ: حکومت افغانستان نے فیصلہ کیا کہ مہاجرین کو افغانستان کے مختلف صوبوں میں آباد کیا جائے اور کاشت کاری کے لئے زمین دی جائے۔ تاکہ یہ لوگ مستقبل میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں اور حکومت پر بھی بوجھ نہ بنیں۔ حقیقت ہے کہ یہ فیصلہ دانشمندی اور مروّت کے جذبات کا حامل تھا کیونکہ حکومت اپنے خزانۂ عامرہ سے ہزارہا مہاجرین کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا حکومت نے مہاجرین کو ضلع کابل کے مختلف مقامات پر منتقل کر دیا۔

اِدھر مہاجرین میں ایسے افراد موجود تھے جو زراعت کے تصور سے بھی نفور تھے۔ لہٰذا وہ اس طرح کی زندگی کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہ تھے، جب ان کو مختلف مقامات پر گئے ہوئے چند دن گزرے اور ان کی خورد و نوش کا سامان ختم ہونے لگا تو ان کو بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان کی شہری آبادی کے لوگ بھلا کاشت کاری جیسی کٹھن محنت پر وہی میں کب زندگی بسر کر سکتے تھے اور ادھر افغانستان کی برفانی آب و ہوا ان کی ہمتوں کی حرکت کو سرد کرنے کے لئے کافی تھی۔

مہاجرین کی بے بسی کا عالم: مہاجرین میں اکثر اپنے آبائی پیشے کے لحاظ سے کاشت کاری سے بالکل نابلد تھے ان شہری باشندوں کو بھلا کاشت کاری سے لگاؤ بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں سردی کی شدت کی وجہ سے مرنے لگے۔ مرنے والوں کے لئے کفن تک مہیا کرنا از بسکہ مشکل تھا۔ خان آباد مہاجرین کی بستی سے تین دن کی مسافت پر تھا اور ادھر افسروں کی بے اعتنائی بھی اس مصیبت میں جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ لہٰذا بعض اوقات چھ چھ دن تک لاشے بے گور و کفن پڑے رہتے تھے۔

ڈاک، منی آرڈرز اور دیگر رسل و رسائل کا کام نہایت غیر یقینی تھا جس سے مشکلات میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا اور آخر کار لوگ افتاں و خیزاں ماتمی قافلے کی صورت میں کابل جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان دنوں حکومت افغانستان اور برطانیہ کے درمیان معاہدہ ہو گیا جس کی ضروری شرط یہ بھی تھی کہ مہاجرین کو دوبارہ ہندوستان بھیجا جائے مہاجرین نے اس مژدۂ جاں بخش پر بہزار مسرت سے ہندوستان واپس جانا منظور کر لیا۔

حضرتؒ کی کابل سے واپسی: اگرچہ حضرت مولانا مرحوم کے دو چھوٹے بھائی اور عم محترم حضرت سندھیؒ افغانستان میں موجود تھے اور ان کی موجودگی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہاں رہنا چنداں دشوار نہیں تھا۔ مگر حضرت سندھیؒ نے حکومت کے رویّہ کو بھانپ کر اور اپنے استغنا کے پیش نظر حضرتؒ کو ہندوستان واپس جانے کے متعلق ارشاد فرما دیا۔ اس لئے حضرت اقدس یہ اشارہ پاتے ہی ہندوستان واپس تشریف لے آئے۔ ہم کو حضرت کی مراجعت کے متعلق چنداں حالات نہیں مل سکے۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے۔ کہ حضرت نے اپنے چھوٹے بھائی حافظ محمد علی صاحب کو یاغستان بھیج دیا اور اپنے برادر عزیز رشید احمد صاحب کو اپنے ہمراہ لاہور واپس لے آئے۔

سیدنا شیخ الہند ثانی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ : شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کا ذکر خیر ہے۔ جن کی شخصیت پر حضرت لاہوریؒ کو بہت ناز تھا۔ لاہور کی فضائیں اور انسانی سبھائیں اس حقیقت کی گواہ ہیں۔ کہ جب کبھی حضرت شیخ التفسیر کی زبان مبارک پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی آتا تو آپ کا چہرہ فرط عقیدت سے تمتما اٹھتا آنکھوں میں ایک نہورانہ چمک ہوتی اور آپ کے ضعیف رگ و پے میں حریت فکر و عمل کی ایک بجلی دوڑنے لگتی۔ حضرت لاہوری نے حریت کا درس اولین حضرت سندھیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھا تھا۔ اور مکتب حریت میں آپ کو حضرت مدنیؒ کے ہم سبق ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حضرت مدنیؒ کی صدارت کے وقت انڈین نیشنل کانگرس مسلم لیگ، احرار اور جمعیۃ علماء ہند سیاسی اور مذہبی جماعتیں تھیں۔ جو اپنے اپنے صوابدید کے مطابق آزادی ہند کا کام کر رہی تھیں۔ حضرت مدنیؒ کی صدارت سے لے کر آپ کی وفات تک کے حالات اگر دیکھنے مقصود ہوں تو علماء حق کتاب سمہ اول و دوم کے کم از کم ۸۳۰ اصفحات کا مطالعہ کیجئے تاکہ آپ پر واضح ہو سکے کہ اس شیر بیشۂ حریت اور دور ماضی کے قائد انقلاب نے ہندوستان کی سرزمین میں مکمل پیکر اسلام بن کر کن کن براہیمی اور اسماعیلی کارناموں کو سرانجام دیا۔ اور حضرت لاہوریؒ اور آپ کے باقی رفقاء کار نے ان میں کیا کیا حصہ لیا۔ ۱۹۴۰ء میں جبکہ دوسری عالمگیر جنگ میں ہندوستانیوں کی شرکت کا سوال پیدا ہوا۔ اور حضرت مدنیؒ کی صدارت میں ۲۹-۳۰ ستمبر ۱۹۴۰ء اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ انگریزوں کی مدد کے لئے کوئی وجہ جواز نظر نہیں تو اس وقت علماء کرام نے اپنے اس فیصلے کو تقاریر کے ذریعے اعلان کرنا شروع کیا۔ تو علماء کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ ان میں حضرت شیخ التفسیرؒ کا نام سرفہرست ہے اور الفاظ یہ ہیں "حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور، جو تفسیر و ترجمۂ قرآن کے درس میں غیر فانی شہرت کے مالک ہیں۔ اور جن کے تلامذہ اور مستفیضین کی تعداد جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہزاروں سے بھی متجاوز ہے۔ (کتاب علماء حق حصہ دوم ص۱۵۰)

تحریک خاکساراں : حق و صداقت کی تائید حریت و جہاد کی جان ہے۔ ہر شخص اس مجاہدانہ اقدام کی جرأت نہیں رکھتا۔ لیکن اگر صداقت کی تائید جو مخالف پارٹی میں پائی جائے یقیناً پیغمبرانہ فعل کے مشابہ ہے۔ اپنوں کی مدحت سرائی لاکھوں کا شیوہ ہے مگر لاکھوں میں شاید ایک آدھ زبان ہوگی جس سے مخالفت کی خوبی کی تحسین نکل سکتی ہو۔ بڑے بڑے جبہ پوش فرقہ پرستی کو اپنا امتیازی نشان لئے بیٹھے ہیں۔ اغیار کے حسینؓ کی تعریف اس مسلک میں حرام ہے۔ اور اپنے یزید کی قصیدہ خوانی ثواب ہے مگر اللہ تعالٰے کی کرم فرمائی ہے خلق خدا میں ایسے انسان بھی قیامت تک موجود رہیں گے جو دشمن کی زبان سے نکلے ہوئے کلمۂ خیر کو کلمۂ خیر ہی کہیں گے اور دوست کی برائی کو برائی سے ہی تعبیر کریں گے۔

خاکسار تحریک کا بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی دماغی قوتوں کے اعتبار سے ایک بے نظیر شخصیت کا حامل تھا لہٰذا اس کی طالب علمی کا زمانہ انتہا درجے کی ناموری اور جاذبیت رکھتا ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے مسٹر عنایت اللہ مشرقی کو علامہ بننے پر آمادہ کیا اور آخر کار علامہ صاحب کو مذہبی رہنمائی کا شوق پیدا ہوا۔ "تذکرہ اور اشارات" وغیرہ تصانیف لکھیں۔ مولوی کا غلط مذہب بڑے اہتمام سے شائع ہونے لگا علماء حق نے اس تعلی آمیز روش پر نظر غائر ڈالی تو دین حقہ کی توہین و تضحیک کی صورت سامنے آئی۔ اخبارات اور رسائل اور عام حلقوں میں علامہ صاحب کی بیباکی کے تذکرے ہونے لگے۔ جہاں باقی علمائے ملت نے علامہ کی لن ترانیوں اور انا الموجود لاغیری کے نعروں کی مخالفت کی وہاں حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس غلط قیادت کی چیرہ دستیوں سے عوام کو آگاہ کیا اور ایک چھوٹا سا رسالہ بھی اس ضمن

میں چھپوایا۔

حضرت شیخ التفسیرؒ کی زندگی کا یہ واقعہ اور پھر اس دور تعصب و فتن میں اس بے لاگ تائید حق کی مثال شائد کسی دوسری جگہ نہ مل سکے۔ آپ علامہ مشرقی کی روش کی شکایت تو کرتے تھے۔ مگر ان کے بھولے بھالے رضا کاروں کی موت کو شہادت اور ان کی زندگی کو مجاہدانہ زندگی سے تعبیر کرتے تھے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اس مبارک زندگی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

اسی ضمن میں یہ واقعہ ہر لحاظ سے قابل بیان ہے کہ حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی نے (جن کی اسلامی سرگرمیوں میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی مجذوبانہ جھلکیں نظر آتی ہیں) سرحد میں ایک جلسے کا انتظام کروایا۔ اس جلسے میں اس وقت کے مقتدر علماء کرام نے شرکت کی۔ علماء کی مجلس مشاورت میں یہ بات کافی دیر تک جاری رہی کہ علامہ مشرقی کے مخالفانہ رویہ کی تردید کس کے ذمہ ڈالی جائے۔ آخر کار تمام علماء نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب اس جرأت مندانہ کام کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ لہٰذا آپ نے اسٹیج پر تشریف لا کر ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں تذکرہ پکڑ کر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ آپ ان دونوں میں سے کس کی پیروی کریں گے۔

حاضرین نے کہا کہ ہم قرآن مجید کی پیروی کریں گے۔ بعد ازاں آپ نے تذکرے کی چند عبارات پڑھ کر کتاب و سنت کی روشنی میں ان کی تردید کی۔ حاضرین جلسہ آپ کی ایمان افروز تقریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سرحد کے اکثر لوگ علامہ صاحب کی جماعت سے نکل گئے۔

محولہ بالا واقعات کے باوجود احقر نے حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب سے سنا ہے کہ علامہ مشرقی کئی دفعہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد شیرانوالہ میں تشریف لاتے اور میرے سامنے صاف اقرار فرماتے تھے کہ "مولانا! میں آپ کا مخالف نہیں ہوں بلکہ علماء سوء کا مخالف ہوں"۔ اس رجوع و انابت کے پیش نظر ہم خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل عمیم سے ہمارے محترم بھائی کی فروگزاشتوں سے درگزر کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔

جہادِ کشمیر: قیام پاکستان کے فوراً بعد کشمیر میں بعض وجوہات پر جنگ چھڑ گئی۔ کشمیر کی اس صورت حال کو مکاتیب فکر (SCHOOLS OF THOUGHTS) کے رہنماؤں نے جہاد کا نام دیا۔

لاہور کے ام القریٰ سے جو آواز بلند ہوتی ہے وہ ملک کے گوشے گوشے میں زندگی بن کر پھیل جاتی ہے حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جنگ کو جہادِ اسلام کے نام سے تعبیر فرمایا اور نہایت مجاہدانہ مستعدی سے اس میں حصہ لیا۔ کئی دفعہ روپے، کپڑے اور باقی ضروریات کی چیزیں مجاہدین کشمیر کے لئے فراہم کی گئیں اور لاہور ہی میں کشمیری نمائندوں کے حوالے کی گئیں۔ روزانہ درس قرآن مجید، جمعہ کی تقاریر اور باقی مختلف مقامات پر ریزولیشنوں اور تقریروں کے ذریعے حضرت مرحوم نے مسلمانان پاکستان کو اس اسلامی جہاد کی ترغیب دلائی۔ الغرض آخر کار دس ہزار کی ایک رقم خطیر لے کر خود راولپنڈی تشریف لے گئے اور یہ رقم کشمیر کے پہلے صدر سردار ابراہیم صاحب کے حوالے کی۔ اس مبارک سفر میں آپ کے ہمراہ آپ کے صاحبزادے قاری عبید اللہ انور صاحب بھی موجود تھے۔

راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ کمترین نے جب اپنے آقائے روحانی کو لاہور میں مجاہدین کشمیر کی امداد کے لئے رات دن کام کرتے دیکھا تو اپنے گاؤں تھوہ والا میں جا کر اپنے احباب سے مشورہ کیا تو انہوں نے نہایت سرگرمی سے ہنگامی چندے کی فراہمی شروع کر دی پہلی دفعہ مبلغ گیارہ سو روپے اکٹھے کر

بہیں بڑے مسلمان

جن کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق خدام الدین کے دفتر میں منشی سلطان احمد کے پاس جمع کرایا گیا۔ اور اُن کی رسیدات اب تک کمترین کے پاس موجود ہیں۔ دوسری دفعہ جب کمترین اپنے گاؤں میں واپس گیا۔ تو انہی احباب کے مشورے سے کپڑوں کی فراہمی کا کام شروع کیا گیا۔ تمام کپڑوں کا وزن ساڑھے پانچ من تھا۔ ان کو ننکانہ اسٹیشن کے راستے لاہور پہنچایا اور حضرتؒ کے ارشادِ گرامی کے مطابق وہاں سے ہی کشمیر بھیجے گئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخیّر حضرات کی کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

انجمن حمایت اسلام کی سرپرستی:۔ سرزمینِ ہند میں اسلامی اقدار کو ملیا میٹ کیا جا رہا تھا۔ اور مغربی تعلیم و تہذیب کو اہلِ ہند نے اپنانے میں ایک دوسرے سے پیش قدمی کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ہندو لوگ جن کی سرشت میں غلامی کی خو بس گھر چکی تھی۔ خاندانِ مغلیہ کے زوال کے بعد اپنے نئے دیوتاؤں (انگریز لوگ) کے جان و دل سے پجاری بن چکے تھے۔ اور حکومت کی نظروں میں اپنا وقار بڑھا رہے تھے۔ اور ادھر فرنگی لوگ اپنی سلطنت کا استحکام اور دوام اسی حکمتِ عملی میں دیکھ رہے تھے۔ کہ ہندوستانیوں کے تہذیب و تمدن بلکہ مذہب کو بھی ختم کیا جائے۔

چونکہ ہندوازم فطرت کے اصولوں کے خلاف چند ایک من گھڑت تصورات کا نام ہے۔ لہٰذا ہندوؤں کے لئے مذہب فروشی کا سودا بڑا منفعت بخش ثابت ہوا۔ مگر اس کے برعکس مسلمانوں کو اس قدم میں بڑا خسارہ نظر آیا۔ محبانِ مذہب و ملت نے افرادِ قوم کو اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کی حفاظت کی تاکید فرمائی۔ علامہ اقبال مرحوم جو اپنے دل میں مذہب اسلام کی بقا کے لئے ایک بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ مختلف طریقہ سے باقی ناصحانِ ملت کے ساتھ مسلمانوں کی ناؤ کو گرداب بلا سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے مذہب کے عنوان سے تین اشعار لکھے۔ اور مسلمانوں کو حفاظتِ مذہب کا پیغام دیا۔

مذہب

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر	خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار	قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں	اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

خیر! علماء تو علماء عام مسلمان بھی انگریزی تہذیب سے اکثر نفور تھے مگر زمانے کا تقاضا تھا کہ اس غلامی کے دور میں مسلمان ہند بھی ہندوؤں کے دوش بدوش شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں۔ لہٰذا ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سرسید مرحوم نے یہ مسئلہ مسلمانوں کے سامنے بڑی شدومد کے ساتھ پیش کیا اور ان کی شبانہ روز کوششوں نے عام مسلمانوں کے رجحان کو بدل دیا۔ چنانچہ بنگال، پنجاب اور سرحد میں انگریزی تعلیم کا عام چرچا ہو گیا۔ اس وقت پنجاب میں انجمن حمایت اسلام نے مسلمانوں کی بیداری اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ان کو تعلیم و تربیت دینے کا بیڑا اٹھایا۔ اس موقعہ پر ہمارے آقائے روحانی حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی انجمن حمایت اسلام کی رکنیت قبول فرمائی حضرتِ اقدس کا رونگٹا رونگٹا انگریزی تہذیب و تمدن کے خلاف تھا۔ مگر حالات زمانہ کے اقتضا کے مطابق آپ اکثر کہتے تھے کہ ہم چاہتے ہیں کہ جہاں ہندو اور سکھ ڈاکٹر موجود ہوں وہاں مسلمان نوجوان بھی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (M.B.B.S.) کی اعزازی ڈگری سے سرفراز ہوں اگر ہندو وکیل عدالتوں میں ججی کے عہدے سنبھال لیں تو مسلمان بھی ان کے مقابلے میں دستارِ فضیلت پہن کر کھڑے ہوں۔

القصہ! آپ انجمن حمایت اسلام کے ہمیشہ وائس پریذیڈنٹ (VICE PRESIDENT) رہے۔ دینی مشاغل کی کثرت کی بنا پر آپ اس انجمن کی صدارت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور کئی دفعہ نائب صدر کے عہدے سے استعفیٰ بھی پیش کیا مگر آپ کے رفقائے کار آپ کے وجودِ مسعود کی برکات سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا آپ لاہور کے تقریباً سارے قیام میں اس عہدہ پر سرفراز رہے۔

اس جگہ پر یہ واقعہ بھی ضرور قابل ذکر ہے کہ آپ انجمن حمایت اسلام میں کسی مرزائی کی شمولیت کو شرعاً ناجائز سمجھتے تھے اور اس مسئلے پر مجلسِ شوریٰ میں بحث و تمحیص بھی ہوئی۔ اور آخر کار حضرت کا تبحّرِ علمی اور بے باک صداقت غالب آئی۔ اور ایک عجیب واقعہ نے اس بحث کو اپنے پُر اسرار انداز میں ختم کر دیا اور بعد ازاں مرزائیوں کو اس انجمن میں قدم رکھنے کا موقعہ نہ ملا۔ ایک دن جب مرزائیوں کی رکنیت کے متعلق بحث ہو رہی تھی تو مرزا یعقوب محفل سے اٹھا اور سیڑھیوں پر سے نیچے جا رہا تھا تو اس پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور سیڑھیوں پر ہی گر گیا اور کچھ عرصہ بعد اس عارضہ سے راہی ملکِ عدم ہوا۔

میکلیگن انجنیئرنگ کالج: ۱۹۳۱ء کے شروع میں میکلیگن انجنیئرنگ کالج لاہور کے انگریز پرنسپل نے رسولِ انس و جان صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں زبانِ تشنیع دراز کی۔ مسلمان طالب علموں نے اس اخبث الناس کی حرکت ناروا کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ مگر ان کی عقیدت سے بھری ہوئی آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔ آخر کار انہوں نے ہڑتال کر دی۔ اب شہر کی آبادی دو گروہوں میں تقسیم ہو نے لگی۔ ہندو، سکھ اور عیسائیوں نے پرنسپل کی حمایت شروع کر دی اور جب اس واقعہ کی خبر مجاہد کبیر حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کو ہوئی تو آپ فوراً میدانِ عمل میں کود پڑے اور طلبہ کی حمایت کا بہانگ دُہل اعلان کر دیا۔

علامہ اقبال مرحوم نے بھی طالب علموں کی پورے زور سے پشت پناہی فرمائی۔ اس وقت کے اقتضا کے مطابق ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور اس واقعہ نے تمام شہر میں ایک نمایاں تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ حضرت مولانا مرحوم اور آپ کے رفقائے کار کی سرگرمیوں سے تمام مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس وقت اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کیا گیا۔ مگر آپ کی گرفتاری عوام کے جذبات پر جلتی کا کام کر گئی۔ آخر کار بفضل ایزد تعالیٰ ارباب حکومت کو اپنی خباثت سے تائب ہونا پڑا طلبہ کو نہایت عزت سے واپس بلایا گیا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور باقی گرفتار شدگان کو رہا کیا گیا۔

تحریک مرزائیت: تحریک مرزائیت پر قلم اٹھانے سے پیشتر فرنگی حکومت کی شاطرانہ روش کی طرف چند اشارات کا پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جنگ پلاسی اور بکسر میں اسلامیانِ ہند کی شکست اور میسور کی چوتھی لڑائی میں سلطان شہید کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ کوششوں کا خاک و خون کی نذر ہو کر رہ جانا دراصل غلامی کی ایک پوری تاریک صدی کا پیش خیمہ تھا۔ لارڈ ولزلی کے سفاکانہ عزائم نے خونِ مسلم کی حرارت کو برسوں تک ٹھنڈا کرنے کے لئے سب سڈی ایری سسٹم (SUBSIDIARY SYSTEM) جاری کیا جس کی رو سے مسلم اور ہندو حکمران طاقتوں کو یکے بعد دیگرے بے دست و پا کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں زیر دام پرندوں کی طرح اہل ہند نے آزادیٔ وطن کی ایک ناتمام سی کوشش کی۔ مگر اس جنبش نے جال کے حلقوں کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ اور ارباب فرنگی شکاری ہمیشہ کے لئے چوکنا ہو کر سوچنے لگا کہ آئندہ اسیرانِ قفس کو غلامی کی ذلت کے احساس سے کسی نہ کسی طرح محروم کر دیا جائے

اس نے قفس کی تیلیاں طلائی اور نقرئی بنا رکھیں۔ اور سمندر پار سے پھولوں کے گلدستے لاکر پنجروں کے اِردگرد ڈھیر لگا دیئے۔ وہ پرندے جن کو کئی دنوں سے ایک حبّہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ شکاری کے رحم وکرم پر اپنی اسیری کے دن بسر کرنے لگے۔ اس پُرفن سامری وقت نے جذبۂ آزادی کو ختم کرنے کے لئے اہل قفس پر ایک خاص انداز میں دادودہش کی بارش شروع کر دی۔ اس موقعہ پر نبّاضِ اقوام علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اہل ہند کو انگریزوں کی پُرفریب چال سے آنسو بہا بہا کر آگاہ فرمانے لگے۔ اور کہا کہ : ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
دیو استبداد ہے نیلی قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو — آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

انگریز حکوم ہندوستانیوں کو ظاہراً مراعات دے رہے تھے لیکن درحقیقت ان کے رگ وپے سے جذبۂ جمیّت اور احساسِ حریت نکال رہے تھے۔ ہندوؤں کو اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ ملازمتوں کی تھپکیوں سے سُلا کر مسلمانوں کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ جہاں باقی ہزاروں فریب کاریوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں بگاڑ پیدا کیا گیا وہاں مرزا غلام احمد قادیانی کے ذریعے نئی نبوت کا دروازہ بھی کھول دیا گیا۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ اسلامیانِ عالم کی مرکزیت کا راز دار ہے چودہ سو برس سے تمام کلمہ گو حضرات اس پر متفق ہیں۔ اب اجرائے نبوت کے اعلان سے ملتِ بیضا کے دامن کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ چونکہ اس نبوت کو برطانیہ کی حمایت حاصل تھی۔ لہٰذا مسلمانوں کی پوری مخالفت کے باوجود بھی اس جماعت کو ہمیشہ پھلنے کا ہی موقعہ ملا۔ جہاں اپنے نبی، مجدد، مسیح موعود، کرشن اور اوتار ہونے کا دعوےٰ کیا۔ وہاں غیر احمدیوں کو سُوروں اور کتوں سے بدتر بھی کہا۔ (نجم الہدیٰ ص۱ مرزا صاحب)

اس نبوت نے حکومتِ برطانیہ کے استحکام و دوام کی دعائیں مانگیں، جہاد کو یکسر حرام قرار دیا حالانکہ مسلمانوں کا ابتداء ہی سے عقیدہ چلا آتا ہے کہ جہاد اسلام اور اسلام جہاد ہے۔ (تریاق القلوب ص۱۵ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

تمام مسلمانوں نے عموماً اور مجلسِ احرار اسلام نے خصوصاً اس قادیانی نبوت کی روک تھام میں ہر قسم کی قربانی پیش کی۔ حضرت مولانا قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ نے ہر موقعہ پر احمدیت کی مخالفت میں جمہور علما کا ساتھ دیا۔ قید و بند سے بھی گریز نہ فرمایا۔ ۱۹۵۳ء میں جب آپ تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں گرفتار ہوئے۔ کسی باخبر انسان نے آپ کو لاہور کے اسٹیشن پر ہتھکڑی لگے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھا کہ یہ پیرانہ سالی میں جھکی ہوئی کمر والے حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ تو نہیں ہیں بلکہ عصر حاضر کے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا صاحب کی طرح اپنے مخالفوں کو سب وشتم سے کبھی یاد نہیں کیا تھا بلکہ نہایت احسن طریق سے اپنی رائے کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے تحریری اور تقریری پرحسنِ مجادلت سے کام لیا اور ہمیشہ دلائل و براہین سے حقانیت کی دعوت دیتے رہے۔

پس منظر: اسلام میں فتنوں کا آغاز کب سے ہوا ان کی تاریخی زندگی اور ان کے اسباب و علل کیا ہیں؟ اور ان سے کون لوگ اور کس حد تک متاثر ہوئے؟ یہ اور اس قسم کے باقی سوالات پر سرسری نظر ڈالنے کے لئے بھی ہزاروں صفحات کی وسعت درکار ہے نصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ ابلیس رجیم لوگوں کو گمراہ کرنے پر ڈٹا ہوا ہے اور ادھر قرآنِ عزیز نے بھی فتنہ بازوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ارشادِ خداوندی ملاحظہ ہو۔

هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (سورہ آل عمران پارہ ۳ رکوع ۱)

ترجمہ: (وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس میں بعض آیات واضح المعانی ہیں، وہی آیات دراصل کتاب اللہ کے بنیادی پتھر ہیں اور دوسری آیات وہ ہیں جن کے معانی معلوم و معین نہیں۔ اب جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں ان کی غرض و غایت گمراہی اور فتنہ پھیلانا ہوتی ہے اور ساتھ ہی وہ تاویل کی تلاش کرتے ہیں حالانکہ ان آیات کی تاویل کوئی نہیں کر سکتا سوائے باری تعالےٰ کے۔ اور وہ لوگ جو علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب منزل من اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس کا ہر جزو ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جن کو حق تعالےٰ نے عقلِ سلیم عطا فرما رکھی ہو)

آیات محولہ بالا سے یہ حقیقت روزِ روشن کیطرح واضح ہے کہ تمام فتنہ جو علماء (علماء سُوء) گمراہی پھیلانے کے لئے من گھڑت تاویلات کا سہارا لیتے ہیں حالانکہ احکامِ خداوندی کا انحصار آیاتِ محکمات پر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ارشادِ نبویؐ بھی ملاحظہ ہو مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ. مسلم) جس نے میری اطاعت کی اس نے حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے یقیناً خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی۔)

لہٰذا وہ لوگ جو دینِ حقہ کے متلاشی ہیں کتاب و سنت کے اتباع میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کرتے ہیں۔ وہ احادیث نبوی کو کتاب اللہ کی تشریح و توضیح یقین کرتے ہیں اور اسلاف کرام سے یہی مذہب چلا آتا ہے مگر سابقہ ہزاروں فتنہ پرور علماء کی طرح اب سے کچھ عرصہ پیشتر عبداللہ چکڑالوی کے دل میں شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ "احادیث مقدسہ کا سلسلہ (نعوذ باللہ من ذالک) سراسر بے بنیاد ہے۔ دین کو اگر صحیح معنوں میں سمجھنا ہو تو صرف قرآن مجید کافی ہے۔ قرآن مجید کی مجمل آیات کی تشریح مفصل آیات کر دیتی ہیں۔ لہٰذا احادیث کی چنداں ضرورت نہیں ہے"! اس منکرِ حدیث بدنصیب انسان کے چیلے چانٹوں نے اس معاملے کو یہاں تک طول دیا۔ کہ غلام جیلانی برق نے دو قرآن کے بعد دو اسلام ایک کتاب لکھی جس میں احادیث مقدسہ، سلسلۂ روایت و درایت اور ثقہ رواۃ پر وہ سوفیانہ حملے کئے کہ خدا کی پناہ امام بخاریؒ (جن کی وفات پر کسی بزرگ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت تیزی سے کہیں جاتے دیکھا تو عرض کیا حضور آپ اتنی جلدی کدھر تشریف لے جا رہے ہیں، تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ امام زماں فوت ہو گیا ہے اس کے جنازے کے لئے جا رہا ہوں) جیسے عظیم المرتبت امام فن کو لغو اور بازاری آدمی کا مقام دیا ہے، موضوعات کی آڑ میں متواتر اور صحیح احادیث پر پوری شقاوت سے پھبتیاں کسی ہیں۔ اور آج کل غلام احمد پرویز (پرویز کے نام سے ہی انکارِ حدیث بلکہ انکارِ رسالت کا واقعہ سامنے آ جاتا ہے) نے اسی نابکار سلسلے کی تائید میں اپنے ادیبانہ انداز میں انکارِ حدیث کے فتنے کو

اس قدر ہوا دے رکھی ہے کہ تمام مسلمانانِ پاکستان کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ علماء کرام نے اس فتنے کا ہر جگہ بڑی شدّومد سے مقابلہ کیا۔ ضمن میں دیال سنگھ کالج واقعہ نسبت روڈ لاہور میں حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے تقریباً ۲۲ دن پہلے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں لاہور اور مضافات کے صاحبِ علم و فضل کو تقاریر کے لئے مدعو کیا گیا۔ ہر بزرگ نے اپنی علمی استعداد کے مطابق سنت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اور منکرینِ حدیث کی معاندانہ روش پر کتاب و سنت سے دلائل پیش کئے۔ حسنِ اتفاق سے اس جلسے کی صدارت کے فرائض سید العلماء، امام الاتقیاء، حضرت شیخ التفسیر علیہ الرحمۃ سرانجام دے رہے تھے۔ جلسے کے اختتام پر اپنی جگہ سے اٹھے اور نہایت مؤثر لب و لہجہ اور خوبی سے فرمانے لگے۔ کہ منکرِ حدیث منکرِ قرآن ہے اور منکرِ قرآن خارج از اسلام ہے۔" یہ آواز اگرچہ سابقہ تقاریر کا حاصل تھی۔ لیکن زبانِ قطب الاقطاب کی تھی۔ تمام مجمع کے قلوب میں اس مختصر مگر جامع صوتِ ہادی نے وہ تاثیر پیدا کی۔ کہ تمام مغربی پاکستان میں حضرتِ اقدس کے الفاظ زبانِ زدِ خاص و عام ہو گئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفاتِ حسرت آثار کے چند دن بعد لاہور کے گلی کوچوں میں قدآدم اشتہار نظر آئے۔ کہ "غلام احمد پرویز بفتوائے حضرت شیخ التفسیرؒ خارج از اسلام ہے۔"

اللہ اللہ! باطل نے جہاں کہیں بھی سر اٹھایا حضرت رحمۃ اللہ نے وہاں ہی اس کو دبانے کی پوری کوشش کی۔ آپ کا وجود مسعود مصطفوی کا محافظ تھا اور آپ کی روح پاک ہر وقت قوم کے نوجوانوں کو پیغام دیتی رہتی ہے۔

عزتِ ملتِ بیضا کی حفاظت کے لئے
دوش پر لاکھ بھی سر ہوں تو کٹاتے جاؤ		(ظفر علی مرحوم)

اگلے دن اخبارات میں پڑھا گیا اور پھر موقر جریدہ ہفت روزہ خدام الدین میں اخبارات کے اقتباسات دیکھے گئے کہ چند سر پھروں نے غلام احمد پرویز کو دیال سنگھ کالج میں کسی موضوع پر تقریر کے لئے مدعو کیا۔ اس سازش کی خبر جب باقی طلبۂ حق پرست کو ہوئی تو انہوں نے سخت احتجاج کیا۔ کہ جس کالج کو حضرت شیخ التفسیرؒ کے قدوم میمنت لزوم کی آمد سعید نے شرف و مجد عطا کیا ہو۔ وہاں پرویز جیسا منکر حدیث قدم نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا تائید ایزدی سے احتجاج کنندگان اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک! یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے کے غلاموں کی فتح ہے جو قیامت تک مہرِ عالمتاب کی طرح ضوفشانی کرتی رہے گی۔

ہفت روزہ خدامُ الدّین: مبیح الامۃ حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ انجمن خدام الدین نے ہفت روزہ خدام الدین کو جاری کر کے اشاعتِ دین کے سلسلے میں نہایت احسن اقدام کیا ہے۔ اور اس انجمن سے اللہ تعالیٰ نے اس رسالہ کا اجراء کروا کر وہ مہتم بالشان کام لیا ہے جو اس سے پیشتر کبھی نہیں لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ جس کو پروردگار عالم نے آخری عمر میں پورا فرمایا اور اب کم از کم ایک لاکھ افراد کو ہر ہفتہ اس جریدۂ ارشاد سے متمتع ہونے کا موقع میسر آتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے تمام اوقات اس ہفت روزہ کی تیاری کے لئے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ خالق دوجہاں آپ کے حلقہ بگوشوں کے لئے بھی یہ نعمت ہدایت و نجات کا باعث بنی ہوئی تھی۔

اگرچہ یہ موقر جریدہ اپنی صوری حیثیت سے پاکستان کے باقی جرائد و رسائل کا لگا نہ کھا سکتا تھا مگر اس کی معنوی حیثیت تمام ملک میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

وفات حسرت آیات: کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۚ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ (سورہ رحمٰن پارہ ۲۷)

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک زندگی کی پچھتر بہاریں اپنی قُدسی و ملکوتی فضاؤں سے ہمکنار ہو کر ختم ہوئیں۔ اور یکم رمضان ۱۳۸۱ھ سے آخری بہار تتمۂ حیات بن کر آئی اور پوری صدی کے فیوض و برکات کی تمام وسعتوں کو اپنے دامن میں لپیٹ کر ۱۷ رمضان المبارک کو چلتی بنی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ حضرت شیخ المشائخ کے اس سانحۂ ارتحال سے لاکھوں قلوب مجروح ہوئے۔ اور بڑے بڑے صبر و استقلال والے یتیموں کی طرح آنسو بہاتے اور آہیں بھرتے ہوئے دیکھے گئے۔ وہ قیامت خیز لمحات بار بار دل کو آتشِ غم سے جلاتے ہیں۔ احقر بہاپکے ریلوے اسٹیشن سے آنسو بہاتا ہوا حضرت کی ولایت کدہ تک پہنچا۔ مگر جب آپ کے ملک شمائل چہرے پر نظر ڈالی تو کسی زائرین پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ آنسو خشک ہو چکے تھے، حیرت زدہ نگاہیں حضرت اقدس کے نورانی چہرے پر تھیں، اور دل عالم محسوسات سے کسی باہر کی دنیا میں معلوم ہوتا تھا۔ مگر چند منٹوں کے بعد قلب کا احساس واپس ہوا، آنسو اُمڈ آئے اور دل کی بربادی کی ترجمانی کرنے لگے۔ اتنے میں فیصلہ ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اٹھا کر دروازے سے باہر بازار میں لے جایا جائے۔ خدائے ذوالمنن کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مجھ احقر الانام کو اس امام الاتقیاء کے فرقِ اقدس کے نیچے اپنے گنہگار ہاتھوں کا سہارا دینے کی سعادت نصیب ہوئی جس کا مثیل شاید اس دور میں نہ ملے۔ صحن سے گلی تک تقریباً سات قدم کا فاصلہ ہے جو لاکھوں مجروح احساسات سے طے کیا گیا۔ اس دن میری رُوح پر کسی عاشق صادق کے اس لطیف احساس کا راز افشا ہوا۔ جس کو اس نے مندرجہ ذیل شعر میں پیش کیا ہے۔

ساربان آہستہ ران، کاں رامِ جاں در محمل است　　اشتراں را بار بر پشت است ما را بر دل است

خیر المسجد لائن سبحان خاں کے دروازے سے لے کر حضرت اقدس کے دروازے تک زائرین کا ایک ہجوم تھا۔ اور نماز ظہر کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازے کے ساتھ ہر قسم اور ہر فرقے کے لوگ تھے۔ حفّاظ، حکماء، وُکلا، عوام، حُکام، فقراء، اولیائے کرام اپنے اور بیگانے غرضیکہ مغربی پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں سے جس قدر عقیدت مند حاضر ہو سکتے تھے حاضر ہوئے۔ جن کی تعداد لاہور کے باخبر حلقوں نے لاکھوں تک بتائی ہے۔

احقر اس وقت حضرت والا جاہ کے جنازے کی تفصیل پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ ابھی کل کی بات ہے کہ لاکھوں انسانوں نے اس مردِ حق آگاہ کے جنازے کو اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اللہ! اللہ! انسانی نفوس کے اس تلاطم کی سوگواری میں ملائکہ بین ارض و سما کی شرکت معلوم ہوتی تھی، میانی صاحب کے مبارک قبرستان تک جنازے کی فضاؤں میں لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا (لوگ وہاں نہ دھوپ دیکھتے ہیں اور نہ ہی سردی کی شدت محسوس کرتے ہیں) کا مقدس سماں نظر آتا تھا۔ چند دفعہ ہوا نے سرد آہیں بھریں اور اسی طرح بادل نے عقیدت کے آنسو بہائے مگر جنازے کے اہتمام میں قدرت کے یہ خدام ممد و معاون ثابت ہوئے۔ بازار انسانوں کے سروں سے سیل رواں بنے ہوئے تھے اور چھتوں اور منڈیروں پر بے شمار مرد و زن اپنے ام القریٰ کے ہادی کے آخری دیدار کے لئے جمع ہو گئے تھے یونیورسٹی گراؤنڈ کی پہنائیاں اس وقت تنگ معلوم ہوتی تھیں جب اسلامیانِ پاکستان نے اپنے روحانی باپ کے وجودِ مسعود کو وہاں جا کر رکھا، صفیں سیدھی ہوئیں آواز آئی کہ مغربی پاکستان کے اکثر علماء حاضر ہو چکے ہیں اور ان سب کا فیصلہ ہے کہ حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب نماز جنازہ پڑھائیں۔ جنازہ پڑھایا گیا اور میانی صاحب تک لے جایا گیا۔ المختصر سیدنا و مخدومنا کا جسدِ اطہر غروب آفتاب کے فوراً بعد لاہور کے اس جنت نشان قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا اگرچہ ظاہری آنکھیں بند تھیں مگر شہیدِ قرآن حضرت شیخ التفسیرؒ کا دل تجلیاتِ الٰہی سے سرشار تھا۔

قبر سے فردوسی خوشبو تاریخ میں تین چار ایسے بزرگ ملتے ہیں کہ جن کی قبروں سے بعد از دفن ایسی خوشبو کا شروع ہوئی کہ لوگ اس کو محسوس کر کے حیران ہوئے کہ ایسی عمدہ خوشبو ہم نے دنیا میں کبھی نہیں سونگھی - ان میں پہلا نام حضرت امام بخاریؒ کا اور دوسرا نام میاں شہید اصغر حسین دیوبندی کا ہے تیسرا اور چوتھا واقعہ پنجاب میں پیش آیا۔ ساہی وال میں حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب اور لاہور میں حضرت شیخ التفسیرؒ کی قبر سے یہ نتیجہ ہے کمال اتباع سنت کا۔ لاہور کے باشندوں نے یک زبان ہو کر پکارنا شروع کر دیا۔ کہ حضرت مولانا سید الابرار والاخیار کی تربت پاک سے فردوسی خوشبوئیں آنے لگی ہیں۔ نہایت معتمد افراد نے جا کر پتہ لگایا۔ حضرت کی مرقد اقدس کی پاکیزہ مٹی کا ہر طرح کیمیکل EMICAL معائنہ کیا گیا لیکن یہ معلوم ہونا تھا نہ ہوا۔ کہ اس شمیم جانفزا کو کس چیز سے منسوب کیا جائے۔ لہٰذا یہ بات زبان زدِ خاص و عام ہو کر قدسی حقیقت کی صورت اختیار کر گئی کہ حضرت شیخ التفسیر مرحوم کی لحد پاک رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ بن چکی ہے۔ جس طرح آپ کی زندگی آيَةٌ مِّنْ آيَاتِ اللهِ تھی۔ اس طرح آپ کی موت بھی صداقت اسلام کا ایک نشان بن گئی اور اب کس کے کان سن سکتے ہیں کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کی تعبیر اور مشارکت معنوی یوں بھی ہو سکتی ہے کہ سیدنا و مولانا کی روح پاک کہہ رہی ہو گی۔ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ رب پروردگار عالم کا مجھ پر یہ مخصوص احسان و امتنان ہے کہ اس نے میرے وجود کو شیرانوالہ میں بھی طالبانِ حق کے مشامِ جان کو معطر کرنے کے لئے سامانِ فرحت بنایا تھا اور اب بھی میانی صاحب کے مرکز میں سالک راہ ہدایت کے لئے یقین و اطمینانِ قلبی کی دولت بنایا ہے۔ سیدنا عیسٰے علیہ السلام کی زبان سے ارشادِ خداوندی سنیئے کہ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا۔

اب ارشادِ نبویؐ کی روشنی میں حضور پُر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے علماء خیر کے کمالات و صفات اور حیات و ممات کے حالات بنی اسرائیل کے انبیاء کرام کے لگ بھگ ہوں گے۔ تو اب ظاہر ہے کہ امتِ مرحومہ کے علمائے ربانی جو کہ ولایت کبریٰ کے منصب جلیلہ پر فیض المرام ہوتے ہیں مِنْ جَانِبِ اللهِ ان سعادتوں اور رحمتوں سے نوازے جاتے ہیں جو انبیاء سابقین پر رب نے نچھاور فرمائی تھیں۔

دعا ہے کہ خدائے کون و مکان حضرت قدس اللہ سرہٗ کی روح پاک کو وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ کا مژدہ سنائے اور اس نعمت نبویؐ کا سہیم و شریک بنائے۔

حضرتؒ کے معمولات: اس موقعہ پر حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے معمولات کو نہایت اختصار سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کو اس ربانی شخصیت کی عملی زندگی سمجھنے میں آسانی ہو۔ آپ کے منجھلے صاحبزادہ حضرت مولانا قاری عبید اللہ انور صاحب۔ آپ کی بڑی صاحبزادی صاحبہ اور آپ کے نواسہ حافظ عبدالوحید صاحب نے اندرونِ خانہ معمولات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

حضرت کے جانشین مولانا قاری عبید اللہ انور صاحب کا بیان: "ہم نے اپنی والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا سے کئی دفعہ سنا تھا کہ جب ہم ابھی بچے ہی تھے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ بازار سے سودا سلف خرید کر لایا کرتے تھے۔ والدہ محترمہ کے بیمار ہونے کی صورت میں اپنے ہاتھوں سے آٹا گوندھتے، سالن تیار کرتے اور بیمار کے خاص کھانے کی تیاری بھی خود ہی فرماتے تھے۔ ساری زندگی گھر میں کوئی خا

خادمہ رکھنے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ والدہ محترمہ تندرستی کی حالت میں گھر کا تمام کام کاج خود ہی کر لیتی تھیں اور ہماری بہنیں آپ کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ جب ہم قدرے بڑے ہوگئے تو سودا سلف کی خرید ہماری ذمہ داری پر چھوڑ دی گئی۔

ہمارے بچپن کے زمانے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مکان کے نچلے حصے سے تیسری منزل تک پانی خود لے جایا کرتے تھے۔ اور والدہ محترمہ کا بیان ہے کہ قیام سندھ کے ایام میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ دونوں وقت باہر کنویں سے پانی اٹھا کر لاتے تھے اور کنواں گھر سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ہفتے میں دو تین دفعہ نماز عصر کے بعد جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے تھے جو جلانے کے کام آتی تھیں۔ اور اسی طرح طالب علمی کے دنوں میں جب آپ امروٹ شریف اور پیر جھنڈا حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رہتے تھے تو حضرت سندھیؒ کے گھر کے لئے پانی بھرنا، جنگل سے لکڑیاں لانا، حضرت سندھیؒ اور اپنے چھوٹے بھائیوں (محمد علی صاحب، عزیز احمد صاحب اور رشید احمد صاحب) کے کپڑے دھونا آپ کا عام معمول تھا۔

احقر کی اہلیہ اور ان کی والدہ محترمہ نے کمترین سے بیان فرمایا ہے کہ حضرت باہر کا دروازہ بند کر لیتے اور جمعہ کی صبح ہمیشہ اپنے کپڑے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے تھے۔

گھر میں چھوٹے بچوں کے کپڑے اماں جی مرحومہ دھویا کرتی تھیں۔ اور جوں جوں بچے اپنی عمر کو پہنچتے گئے اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے رہے۔

حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب کا ارشاد ہے کہ کبرسنی میں جب آپ کو فالج اور وجع المفاصل جیسی موذی امراض نے پریشان کیا۔ اور کثرتِ مشاغل، نقاہت اور ملاقاتیوں کے انبوہ در انبوہ آنے لگے۔ تو آپ نے مجبوراً کپڑے دھونے کے معمول کو ترک فرما دیا۔ لیکن آپ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ دھوبی کپڑے صاف کر لیتے ہیں۔ مگر پاک نہیں کرتے ہیں۔

ایک نیک طبیعت دھوبی نے آپ کے کپڑے صاف کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا مگر پھر بھی دھوبی کے دُھلے ہوئے اور استری کئے ہوئے کپڑے گھر پر پانی میں تین دفعہ ضرور پاک کئے جاتے تھے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائے عمر سے سفید کھدّر کا لباس زیب تن فرمایا تو زندگی کے آخری دن تک وہی لباس رہا بلکہ اپنے کفن کی چادریں بھی سفید کھدر سے تیار کروائیں۔ حج اور عمرہ سے واپس تشریف لاتے تو احرام کی چادروں کا کفن کر رکھ لیتے اور ان پر اپنے دستِ مبارک سے تحریر فرمایا کرتے تھے۔ "یہ احمد علی کا کفن ہے"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۴ دفعہ حج وعمرہ کی سعادت حاصل کی اور زندگی کے آخری دنوں میں مع اہل وعیال سفر حجاز پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ نے ساری زندگی حتی الامکان اس بات کی پوری احتیاط فرمائی ہے کہ بے نماز کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا نہ کھایا جائے اس سلسلے میں بے شمار واقعات موجود ہیں۔ جن سے آپ کی اس عادت مبارکہ کی تائید ہوتی ہے مگر اس جگہ صرف ایک دو واقعات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مع اہل وعیال بحری جہاز پر حج کے لئے تشریف لے گئے۔ جہاز میں کھانا پکانے والا عملہ بے نماز تھا۔ حضرت ہر روز پون گھنٹہ درس قرآن مجید دیا کرتے تھے۔ جہاز میں سندھی حجاج کرام بھی تھے۔ ان کی استدعا پر آپ سندھیؒ میں بھی تقریر فرمایا کرتے تھے۔ اکثر وبیشتر آپ کو فارسی زبان میں بھی مسائل بیان کرنے ہوتے تھے۔ کیوں کہ افغانستان کے لوگ بھی آپ کے ہم سفر تھے۔

علاوہ ازیں آپ اپنے اوراد و وظائف میں مستغرق رہتے تھے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ حضرت نے جہاز میں آٹھ دن تک نہیں کھایا۔ کھانا پکانے والوں کو نماز پڑھنے کی ہدایت کرتے رہے اور وہ نماز پڑھنے کا وعدہ کرتے رہے مگر آخری دن تک انہوں نے نماز نہیں پڑھی اور نہ ہی حضرت نے ان کا پکا ہوا کھانا کھایا۔ جب یہ جہاز جس کا نام ایس ایس انگلستان تھا جدہ شریف میں پہنچا تو آپ بھوک سے نڈھال ہو رہے تھے ساحل پر اترتے ہی آپ نے ایک بھنی ہوئی مچھلی کھائی۔ جس کے نتیجے میں آپ کو پیچش کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اور تقریباً ایک ماہ تک آپ اس تکلیف میں مبتلا رہے۔ لیکن حضرت اس بات پر خوش تھے کہ ہم اس سفر میں کچھ حاصل کرنے آئے ہیں۔ کھونے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ الحمد للہ بے نمازوں کا پکا ہوا کھانا نہ کھانے سے دل سیاہ ہونے سے بچ گیا۔ اور عبادت میں خشوع و خضوع بھی محفوظ رہا۔

ایک اور واقعہ ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔ جو کہ آپ کی مبارک زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ جب کبھی آپ تبلیغی دورے پر تشریف لے جاتے تھے تو دعوت دینے والے سے مشروط وعدہ فرماتے تھے "خدا تعالیٰ نے توفیق دی۔ کرایہ ہوا، تو آؤں گا۔ ورنہ نہیں آؤں گا۔" قابل ذکر بات یہ ہے کہ دوسروں سے کرایہ نہیں لیتے تھے۔ بعض خاندانوں سے آپ کے تعلقات برسوں سے چلے آتے تھے اور آپ ان کی دعوت پر ان کے ہاں متعدد دفعہ تشریف بھی لے جا چکے تھے مگر ان کے گھر کا پانی تک بھی نہیں پیتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ نواب محمد حیات خاں صاحب (ذاکر قریشی کے والد بزرگوار) حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس سے پہلے بھی آپ کے پاس آتے جاتے تھے۔ اس دفعہ انہوں نے عرض کیا کہ آپ پانچ چھ دن تک ہمارے ہاں قیام فرمائیں۔ کیونکہ ہمارا علاقہ دینی لحاظ سے بہت ہی پسماندہ ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجھ کو آمد و رفت کے کرایہ اور کھانا کھانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ نواب صاحب نے جواب دیا کہ حضور! آپ فکر نہ کریں۔ ہم گنہگار آپ کے کھانے کا انتظام اپنے گھر پر نہیں کریں گے۔ بلکہ کسی پابند صوم و صلوٰۃ آدمی سے کروا دیں گے۔ لیکن حضور نے فرمایا کہ آپ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں میں خود ہی بندوبست کر لوں گا۔ ان دنوں حضرتؒ سفر میں اپنے ہمراہ چمڑے کا ایک مصلّٰے اور ایک بہاول پوری کوزہ رکھا کرتے تھے۔ باقی کوئی سامان آپ کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ اس سفر پر آپ نے چنے بھنوا لئے اور مصلّے کے اندر باندھ لئے اور نواب محمد حیات کے ہاں تشریف لے گئے دن بھر درس و تدریس اور ذکر اللہ کرنے کرانے میں گذرتا۔ رات کو آپ ان چنوں میں سے کچھ چبا لیتے اور پانی پی لیتے۔ لہٰذا آپ نے وہاں کے قیام میں چنوں پر ہی گزارا کیا۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا دار کی غرور کی گردن کو کاٹنے کے لئے میں نے استغنا سے تیز دھار آلہ نہیں دیکھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں دنیا داروں سے تحفے تحائف لیتا اور مرغ پلاؤ کھاتا تو شیطان ان کو سکھاتا کہ حضرت صاحب خاطر مدارات بھی کروا گئے اور کرایہ کے نام سے پیسے بھی لے گئے اور ہمیں وعظ بھی سنا گئے۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ اس طرح سے میرے یہ سارے اوقات رائگاں جاتے، نہ ان کی آخرت سنورتی اور نہ میں ہی عند اللہ ماجور ہوتا۔"

المختصر! حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ طریق تبلیغ ہر جگہ کامیاب رہا اور آپ کے ایک دفعہ تشریف لے جانے سے اصلاح حال کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے! لاہوریو! اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو قرآن سنانے کے لئے مجھ کو دہلی سے ہتھکڑی لگوا کر بھجوا دیا ہے کوئی دہلی والا یا افغان نہیں بھیجا ہے۔ میں پنجابی ہوں۔ آپ کی فطرت اور عادات و اطوار کو خوب جانتا ہوں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ مجھ سے اصلاح حال کا کام لے رہا ہے۔

اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عبادتِ شبانہ روز کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں تاہم معمولات میں ان طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ تمام زندگی نمازِ تہجد کی پابندی فرماتے رہے۔ اکثر آٹھ رکعت نماز پڑھی جاتی۔ اور ازاں حفظ کردہ آیات قدرے بالجہر پڑھی جاتیں۔ باجماعت نماز پڑھنے کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور اکثر اقامت سے پہلے ان اوّل میں تشریف لے آتے تھے اور جلدی جلدی اپنی جگہ پہنچ جاتے تھے۔ منشی سلطان احمد صاحب کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جناب لا بخش سمرو وزیر اعظم سندھ حضرتؒ کی ملاقات کے لئے حاضرِ خدمت ہوئے۔ تو آپ نے رستے میں چلتے چلتے ان سے بات چیت کی۔ نکہ جماعت کا وقت ہو رہا تھا۔ رانا شیر جنگ جیسے معزز خدّام آتے۔ لیکن نماز کی پابندی میں ہرگز فرق نہ آتا تھا۔

نماز فجر کے بعد اپنے خاص حجرے میں تشریف لے جاتے تھے۔ تفسیر خازن یا اور ضروری عبارات پر نظر ڈالتے تھے۔ کچھ مخصوص خدّام ساتھ اندر چلے جاتے تھے۔ آخری عمر میں اگر اس وقت چند منٹ آرام فرماتے۔ تو خدّام میں سے اپنی گھڑی کسی کے حوالے کر دیتے تھے۔ یادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ آرام کیا جاتا اور پھر تازہ وضو فرما کر سیدھے درس گاہ کی مسند پر تشریف لے جاتے تھے۔ قرآن مجید کا ایک رکوع تلاوت فرماتے۔ سلیس ترجمہ کرتے اور پھر نزولِ آیات کے ماحول کے پیش نظر سالقہ مفسرین کی تشریح و توضیح کی روشنی میں بیان فرماتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہدِ مبارک میں ان آیات کا یہ مطلب سمجھا گیا ہے۔ بعدازاں الاعتبار والتاویل کے طور پر ان آیات کی زمانہ حاضرہ کے حالات پر تطبیق فرماتے تھے۔ پروردگارِ عالم نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو نصوصِ قرآنی سے معانی کے استخراج مطالب و مفاہیم کے استنباط اور پھر عصرِ حاضر کے ساتھ ان کی تطبیق کا وہ ملکہ عطا فرما رکھا تھا کہ جس کی مثال شاید و باید ہی مل سکتی ہے۔ احقر نوان دنوں کہا کرتا تھا کہ شہد کی مکھی کی طرح پروردگارِ دوجہاں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جبلّت میں وہ استعداد رکھی ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ سے صحیح معانی نکالنے میں آپ کو ید طولےٰ حاصل ہے۔

درس قرآن مجید کے بعد تمام حاضرین حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ کرتے۔ حضرتؒ نہایت متانت و شفقت سے لوگوں کے چہروں پر نظریں ڈال کر مصافحے کا جواب دیتے۔ چند ضروری امور کی تکمیل کے لیے تھوڑے وقت تک آپ مسند پر ہی تشریف فرما رہتے۔ بعدازاں اٹھ کر حجرے میں تشریف لے جاتے اہلِ حاجت مرد و زن حضرات کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آپ سب لوگوں کو نہایت شفقت سے ملاقات کا موقعہ مرحمت فرماتے تھے۔

گھر کو تشریف لے جاتے تھے تو بعض خدّام ساتھ ہو لیتے تھے۔ اگر کسی نے کچھ عرض کرنا ہوتا تو وہ قدرے قریب ہو جاتا۔ رستے میں چھوٹے چھوٹے بچے آبا جی کہہ کر سلام کرتے اور آپ نہایت محبت سے ان کو جواب دیتے تھے۔

نماز عشا کے بعد گھر تشریف لاتے تھے۔ چند خوش نصیب خدّام آپ کی معیّت میں درِ ولایت تک آتے تھے۔ ان کو رخصت کرنے کے بعد دروازہ کھولا جاتا۔ تقریباً تمام افرادِ خانہ آپ کے استقبال کے لئے نیچے دروازے تک آتے تھے۔ حضرتؒ چھوٹے بچوں کو اپنا ٹوا ایکڑ وا دیتے تھے۔ اوپر جا کر ان کو انعام دیتے تھے۔ گھر میں اکثر ایک بلّی ہوتی تھی وہ بھی افراد خانہ کے ساتھ دوڑ کر دروازے تک آتی تھی۔ کھڑکی میں بیٹھ کر بار بار تکتی رہتی تھی۔ حضرتؒ اس سے پیار کیا کرتے تھے۔ اگر حافظ حمید اللہ صاحب یا قاری عبید اللہ انور صاحب کے گھروں میں کسی کو تکلیف ہوتی تو آپ ان کی پہلے عبادت فرماتے تھے۔ اور پھر اوپر کی منزل میں تشریف لے جاتے تھے۔ کھانا آ جاتا تو اپنے دونوں

صاحبزادوں کے ساتھ بیٹھ کر عشائیہ تناول فرماتے تھے۔ اس موقعہ پر بعض ضروری باتیں بھی قبول ہوتی تھیں۔ اگر کوئی تحفہ وغیرہ ہوتا تو اس کو تین برابر حصوں میں تقسیم فرماتے تھے اور دو حصے اپنے صاحبزادوں کے گھروں میں بھیج دیتے تھے اور ایک حصہ گھر رکھتے تھے۔ روٹی کے بعد ہاتھ دھونے کا وقت آتا تھا تو گھر کا ہر فرد کوشش کرتا تھا کہ یہ سعادت مجھ کو نصیب ہو۔ بچوں اور کو بھی جمعہ کے دن پیسے دیا کرتے تھے اپنے صاحبزادوں اور اپنے گھر میں ماہوار روپے مرحمت فرمایا کرتے تھے۔

جمعہ کے دن چند روپوں کی ریزگاری بازار سے لائی جاتی اور اماں جان کے حوالے کی جاتی تھی۔ تاکہ کوئی سائل محروم نہ جائے۔

حضرتؒ کے ملفوظات

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی تقاریر میں بار بار دُھرائے جانے والے حکیمانہ ملفوظات میں سے چند ایک ملفوظات قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) اللہ والوں کی جوتیوں میں وہ موتی ملتے ہیں جو بادشاہوں کے تاجوں میں نہیں ہوتے۔

(۲) لاہوریو! میں اتمام حجت کر رہا ہوں۔ میں اپنے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بری الذمہ کر رہا ہوں تاکہ آپ لوگ قیامت کو یہ نہ کہیں کہ ہمیں کوئی ڈرانے والا اور سنانے والا نہیں آیا تھا۔ رَبَّنَا مَا جَآءَنَا مِنۡ نَذِیۡرٍ!

(۳) میں آپ کو بیدار کر رہا ہوں۔ پٹواری سے گورنر تک آپ کا کوئی بھی خیر خواہ نہیں ہے۔ اگر آپ کا کوئی خیر خواہ ہے تو وہ اللہ والا ہے۔ جو آپ سے کھانے کو نہ مانگے۔ دروازۂ محمدیؐ کا غلام ہو۔ اس کے ہاتھ میں قرآن ہو۔ اور دوسرے ہاتھ میں مشعلِ حدیث خیر الانامؐ ہو۔ اور وہ ان دونوں نوروں کی روشنی میں آپ کی رہنمائی کرے۔

(۴) اللہ والوں کی صحبت میں استغنا عن الخلق اور احتیاج الی اللہ کے صفات پیدا ہوتی ہیں۔

(۵) جو نماز نہ پڑھے وہ بدمعاش، جو روزے نہ رکھے وہ بدمعاش۔ میں فتویٰ دیتا ہوں۔ جاؤ علماء سے جاکر کہہ دو کہ احمد علی اس طرح کہتا ہے۔ عربی میں دو لفظ ہیں۔ فاسق و فاجر۔ ہماری زبان میں ان کا ترجمہ ہے۔ بدمعاش، وہ بدمعاش ہے جس کی زندگی اسلامی قوانین کے خلاف ہو۔

(۶) جب لال قلعے کے سامنے عصمتیں لٹنے لگیں۔ تو اللہ تعالے کو غیرت آئی وہ لاکھوں میل دور سے چوہڑے لایا اور ہم پر مسلط کر دیئے۔

(۷) اللہ تعالے نہایت ہی نازک مزاج محبوب ہے اگر تم لینے نہیں آؤ گے تو وہ دینے نہیں جائے گا۔

(۸) ہر کام میں حصول رضائے الٰہی مطلوب ہونا چاہیئے۔

(۹) قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ کی تشریح دو جملوں میں کی جا سکتی ہے۔ خدائے تعالیٰ کو عبادت اور خلق خدا کو خدمت سے راضی رکھو۔

(۱۰) رشتہ داروں اور دوستوں کو راضی رکھنے کا یہ طریقہ ہے کہ ان سے اپنا حق نہ مانگو اور ان کا حق بغیر مانگے ادا کرتے رہو۔

۱) حقوق اللہ اور حقوق العباد پر قرآنِ مجید سے بہتر کوئی کتاب نہیں بولتی ہے۔

۱) تم کو مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھ کر قرآن مجید سننے میں عار آتی ہے۔ تو تمہاری کوٹھیوں میں چل کر جانا ہمارے جوتے کی بھی توہین ہے۔

۱) جو تم سے روٹی مانگے وہ تم کو حق بات نہیں کہہ سکتا۔ تم کتنے ہو ملّا بے ایمان! تم نے انگریزوں کے سامنے اپنی لڑکیاں پیش کیں۔ تمہارا منہ کالا، چکلے تمہارے دم سے آباد، سینماؤں میں تمہارا اتفاق، وہاں وہابی، سنی اور شیعہ تمام متفق، وہاں تم بیویاں اور بیٹیاں لے کر جاتے ہو، یا مولوی جاتے ہیں؟ اگر مولوی سوکھے ٹکڑے کھا کر قرآن کو سینے سے نہ لگاتا تو ہندوستان میں اسلام ختم ہو جاتا، سرکاری سکول کا پرائمری پاس ملازم ہو جاتا تھا۔ مگر علمائے کرام دیوبند اور سہارن پور سے فارغ التحصیل ہو کر آتے تو ان کو دفاتر میں کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ تمام علوم متداولہ کے فارغ ملّا ملونٹے اور کالج میں عربی کے چند لفظ پڑھ کر تم لوگ علاّمہ بن جاتے ہو۔

۱) جو ہنڈیا میں ہوتا ہے وہی رکابی میں آتا ہے۔ پیٹ میں حرام ہو تو نیک عمل نہیں ہوتا۔

۱) عالمِ دین ہو، حافظ قرآن ہو، حج بھی کر آیا ہو، زکوٰۃ کی پائی پائی ادا کرے اور مر جائے اور ضعیف والدین ہاتھ اٹھا کر بددعا کریں۔ کہ الٰہی ہم تو اس پر راضی نہیں ہیں۔ تو اس پر جنت کے آٹھوں دروازے بند اور اس کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔

۱) جن لوگوں نے لارڈ کارنوالس کے عہد میں قرآن مجید کی بجائے رواج پر عمل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ میں فتویٰ دیتا ہوں کہ وہ لوگ کافر ہیں۔ اور اگر وہ بغیر توبہ کے مرے ہیں۔ تو ان کی قبریں جہنم کا گڑھا بنی ہوئی ہیں اگر دیکھنا چاہو تو فسٹ کلاس کا کرایہ خرچ کرو اور ہندوستان سے ایسے بزرگ لاؤ جو قبر پر کھڑے ہو کر تم کو بتا دیں کہ یہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ تم نے سمجھ رکھا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امت اندھی ہے قرآن مجید کے پورے ڈیڑھ صفحے کا انکار ہے حالانکہ ایک لفظ کا انکار بھی کفر ہے۔

(۱۷) تم ایک دانہ زائد نہیں کھا کر مرو گے اور نہ ہی ایک دانہ چھوڑ کر مرو گے۔ رات دن روٹی روٹی کی پکار ہے۔

(۱۸) میں نے اپنے تینوں بیٹوں کو تین وصیتیں کیں:

(ا) کیمیاگری میں مبتلا نہ ہونا۔

(ب) عملیات کے پیچھے نہ پڑنا، اور

(ج) کسی کی ضمانت نہ دینا۔

کیوں کہ خواہ مخواہ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے اور اس طرح سے دین کی خدمت میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔

(۱۹) آج کل مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ اور معاملات میں بددیانتی کی شکایت کرتے ہوئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ آج کا مسلمان وہ ہے جو لے کر نہ دے۔ اگر لے کر دے دے تو صورت و سیرت سے اس کو مسلمان سمجھئے۔ مجھ سے اکثر لوگوں نے کم و بیش رقم مستعار لی۔ اور لینے کے موقعہ پر کہتے رہے کہ جاتے ہی بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں گے۔ مگر آج تک شاید ہی کسی نے کچھ واپس کیا ہے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ مجھ کو ملنے والے بھی علماء و طلباء ہی میری برادری ہے۔ میرے پاس شبابی اور رکابی تو آتے سے رہے

جب میں ان کی جگہوں میں اتفاق سے جاتا ہوں۔ وہ لوگ مجھ کو ملتے بھی ہیں لیکن دیتے کچھ نہیں۔ اور میں بھی شرم کی وجہ سے نہیں مانگتا۔

(۲۰) میں ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری کوئی نماز قضا نہ کرے اور صبح کا درس قرآن مجید کبھی نہ چھوٹے۔ اللہ تعالیٰ مجھ کو چلتا پھرتا لے جائے۔ اپنے فضل سے سوء الکبر سے بچائے۔ مجھ کو چارپائی پر نہ لٹائے تاکہ میرے لئے اور میرے تیمارداروں کے لئے تکلیف کا باعث بنے۔ صبح کی نماز پڑھ کر درس قرآن مجید کے بعد اللہ تعالیٰ مجھ کو دنیا سے اٹھا لے لوگ مجھ کو میانی صاحب میں پہنچا کر ظہر کی نماز واپس آکر با جماعت پڑھیں۔

(۲۱) آخری دنوں میں کبھی کبھی آواز سے فرمایا کرتے تھے اے اللہ! میں تجھ سے راضی ہوں تو جب چاہے مجھ کو بلا لے۔

حضرت مولانا **محمد شعیب** صاحب جو آپ کے ممتاز خلفاء میں سے ہیں۔ انہوں نے حضرت کے چند **ملفوظات** نقل کروائے ہیں۔

(۱) میرا اپنا سلسلہ قادری ہے مگر میں سلاسل اربعہ کے بزرگوں کا ادب کرتا ہوں۔

(۲) حضرت مدنی مرحوم میرے شیخ نہیں ہیں لیکن میں اپنے مشائخ کی طرح ان کا ادب کرتا ہوں۔

(۳) طالب تین تاروں کے ساتھ اپنے شیخ سے کشش پیدا کرے تو کامیاب ہوتا ہے۔ عقیدت، ادب اور اطاعت۔

(۴) لوگ کہتے ہیں۔ بینا سارے اندھا کوئی کوئی۔ میں کہتا ہوں۔ اندھے سارے بینا کوئی کوئی۔

(۵) مجھے جو موتی اپنے حضرات سے ملے ہیں وہ اتنے قیمتی ہیں۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ دنیا کے تمام خزانے میرے ہاتھ پر رکھ کر فرمائے کہ یہ تمام خزانے لے لو اور ایک موتی دے دو تو میں یہی عرض کروں گا کہ اے اللہ! مجھ کو دنیا کے خزانوں کی طلب نہیں جس کو ان کی طلب ہے یہ ان کو دے دے اور میرے پاس یہ موتی رہنے دے۔

(۶) نعم الامیر علی باب الفقراء۔ وبئس الفقیر علی باب الامراء

(۷) اطلبوا الاستقامة ولا تطلبوا الکرامة فان الاستقامة فوق الکرامة۔

(۸) اگر کوئی ہوا میں اڑتا آئے اور لاکھوں مرید پیچھے لائے مگر سنتِ نبوی کا مخالف ہو تو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا حرام۔ اس کی بیعت کرنا حرام اور اگر کوئی کر چکا ہو تو توڑنا فرض عین ہے۔

(۹) دل کتنا ہی سخت ہو ذکر الٰہی کی متواتر ضربوں سے نرم ہو جاتا ہے۔ جس طرح سخت پتھر میں پانی کے ٹپکنے سے نشیب ہو جاتا ہے۔

جماعت اسلامی

شیخ التفسیرؒ کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ وہ بلا خوف ــــ ہر جگہ اور ہر ایک کے متعلق صاف اور واضح بات کہتے تھے۔ ان کے کسی عمل میں ابہام یا اینچ پیچ نہیں ہوتا تھا۔ دو اور دو چار کی طرح ان کی پالیسی واضح متعین رہی۔ اگر کسی کی حمایت کو انہوں نے ضروری سمجھا تو بغیر اس بات کا خیال کئے کہ اپنے کیا کہیں گے اور بیگانے کیا۔ حمایت کی اور اسی طرح ان کی خداداد بصیرت نے اگر سمجھا کہ فلاں کی مخالفت اور اس سے اختلاف شرعاً ضروری ہے تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا اور بے جھجک روک ٹوک بات کہی۔ علامہ مشرقی کے افکار و نظریات سے انہیں اختلاف تھا برملا کیا۔ لیکن جب سکندر کی وزارت نے خاکساروں پر ظلم کیا

نے خاکساروں کی کھل کر حمایت کی اور کہا کہ ملک کے شہریوں پر بیجا ظلم کیوں ؟ اسی طرح جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی
ت نے بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھا تو حضرت مولانا نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ لیکن جب امیر جماعت کے قلم کی گستاخیاں
بڑھ گئیں کہ اس کی زد میں علماء و صلحاء سے لے کر صحابہ کرامؓ اور انبیائے علیہم السلام بھی آنے لگے تو آپ نے اس کے خلاف بھی جہاد
مسلسل کیا۔ شیخ التفسیر جب اپنی بصیرت و فراست کی بناء پر مودودی صاحب کی مخالفت کر رہے تھے۔ تو بہت سے علماء ان کے اس فعل
اور حیرانی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آج جب یہ سطور سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے تمام جید علماء مودودی صاحب
ت میں ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ جب شیخ التفسیرؒ نے مخالفت کی ہے تو مودودی صاحب پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں
تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان سے پردہ اٹھتا چلا گیا۔ اور آج ان کے پورے خد و خال سامنے ہیں۔ جماعت کے بیشتر اولین ممتاز ساتھی
چکے ہیں۔ اور وہ مودودی صاحب کی مخالفت میں شیخ التفسیر سے بھی آگے ہیں۔ اب بالکل آخر میں حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب
جب زادے مولانا تقی عثمانی بھی مجبور ہو گئے کہ مودودی صاحب سے کھل کر اختلاف کریں۔ چنانچہ مودودی صاحب کی کتاب
ت و ملوکیت" کی رد میں اپنے ماہ نامہ "البلاغ" میں مسلسل مضمون لکھ رہے ہیں جس کی چار قسطیں چھپ چکی ہیں۔ ان حالات کو
بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ ؏

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

ے حق کے مودودی صاحب سے ناراضگی اور مخالفت کے کیا اسباب ہیں۔ اس کی تفصیل کا پتہ کرنا ہو تو اس سلسلے کی کتابوں کا
کیا جائے۔ ہمیں تو یہاں یہ بتانا اور عرض کرنا مقصود تھا کہ شیخ التفسیرؒ نے ملک میں ہر برائی اور گمراہی کے خلاف آواز اٹھائی
سلسلے کی ایک کڑی امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ سے اختلاف ہے۔ حضرت شیخ التفسیرؒ کی اس مخالفت میں کوئی ذاتی غرض
شامل نہ تھا بلکہ عالم ربانی اور رہبر امت ہونے کی حیثیت سے ان پر جو فرض عائد ہوتا تھا۔ اس کی ادائیگی کے لیے انہوں
سب کچھ کیا۔

کمالات حضرت شیخ التفسیرؒ نے بھرپور علمی زندگی گذاری۔ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ بیکار ضائع نہیں ہوا بلکہ اگر یہ کہا جائے
کہ آپ کی پوری زندگی اللہ کی یاد میں گذری اور کوئی سانس غفلت میں نہیں گذرا تو بے جا نہیں ہوگا۔ آپ
ی۔ تدریسی۔ سیاسی اور تبلیغی مصروفیت کے باوجود تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہتے تھے۔

قرآن پاک آپ کا اس سلسلہ میں سب سے بڑا کارنامہ قرآن پاک کا سلیس و رواں دواں ترجمہ ہے۔ اور حاشیہ پر آپ
نے ربط آیات و سور اور قرآن پاک کے مضامین کا خلاصہ اردو زبان میں تحریر فرمایا ہے اور یہ اپنی
مثال منفردانہ خدمت ہے جو اردو میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ سے لی۔ آپ کا یہ مترجم و محشی قرآن پاک انجمن خدام الدین نے شائع
اور اس کا ہدیہ اتنا تھوڑا رکھا ہے کہ ہر کوئی اس کو خرید سکتا ہے۔ آج تک ہزار ہا کی تعداد میں یہ قرآن پاک چھپ کر ملک کے کونے کونے
شائع ہو چکا ہے۔

رسائل آپ کے چھوٹے چھوٹے رسائل جن کی تعداد چونتیس[۳۴] تک پہنچتی ہے لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر
انجمن کی طرف سے مفت تقسیم ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اگر ان کو کوئی قیمتاً خریدنا چاہے تو ان کی

قیمت تقریباً لاگت پر رکھی گئی ہے۔ حضرت مولانا کوئی رسالہ تحریر کرتے تو ہم عصر علماء و مشائخ کی اس پر تصدیق و تقریظ حاصل کر
تاکہ عوام کو ان کے بارے میں پورا یقین ہو کہ وہ عین کتاب و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ ان میں اہم رسائل یہ ہیں :۔

۱۔ تذکرۃ الرسوم الاسلامیہ ۲۔ شہادۃ النحاریر علی حرمۃ المزامیر ۳۔ اسلام میں نکاح بیوگان ۴۔ ضرورۃ القرآن
۵۔ اصلی حنفیت ۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے وظیفے ۷۔ مال میراث میں حکم شریعت اور اختیار
کی سزا ۸۔ توحید مقبول ۹۔ فوٹو کا شرعی فیصلہ گلدستہ صد احادیث نبوی۔ تفسیر سورۂ قریش وغیرہ ہیں۔

حق یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ نے آسان و شگفتہ زبان میں کتاب و سنت کی تعلیم و تبلیغ کا بہترین انداز اختیار فرمایا ہے۔ اور لاکھوں
خدا ان رسائل کی وجہ سے صراطِ مستقیم پر چلنے لگے ہیں۔

خلاصۃ المشکوٰۃ

اس عنوان و نام سے آپ نے ایک مختصر کتاب ترتیب دی جس میں ایسی احادیث کا انتخاب کیا
کہ جن سے انسان اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو۔ کتاب الرقاق فضل الفقراء و عیش النبی صلی اللہ
باب الامل والحرص، باب التوکل والصبر۔ باب الریاء والسمعۃ، باب الانذار والتحذیر، کتاب الفتن وغیرہ کے عنوانات
احادیث درج کی گئی ہیں۔

تکبیرِ اولیٰ اور نماز باجماعت

آپ نماز باجماعت کا ہر چیز و کام سے زیادہ اہتمام کرتے اور ہمیشہ تکبیرِ اولیٰ
شریک ہوتے۔ گرمی و سردی کی شدت آپ کو مسجد کی حاضری سے نہیں روک
سکتی۔ بیماری اور فالج کی حالت میں بھی آپ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے رہے اور جب بالکل ہی معذوری ولاچاری
تو البتہ گھر میں نماز پڑھی۔

ایک دفعہ جناب مولا بخش صاحب سمرو مرکزی وزیر بحالیات آئے اذان ہو چکی تھی تو آپ نے چلتے چلتے ان سے
بات چیت کی اس ضمن کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے جو حضرت کے روحانی مقام رفیع کا بیّن ثبوت ہے۔ ایک دن درس
کے بعد ایک شخص علیحدگی میں ملا۔ اور کہنے لگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خواب میں حکم دیا ہے کہ اپنے مکانوں میں سے ایک مکان آپ
کو دیدوں۔ اس کے بعد دو ماہ تک نہ آیا دوبارہ پھر آیا اور یہی کہا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے آپ چل کر مکان دیکھ لیں
دن بعد پھر آیا اور عرض کرنے لگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر خفا ہو رہے ہیں کہ مجھ سے تعمیل ارشاد میں سستی ہو گئی ہے لہٰذا آپ تشریف
لے چلیں چنانچہ آپ ان کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ اور ایک مکان پسند کر لیا۔ لیکن وہ کچھ مسجد سے دور تھا۔ آپ کو مسجد کو روانہ ہوتے راستے
میں مصافحہ وغیرہ کرنے کبھی دیر لگ جاتی اور رکعت رہ جاتی۔ آپ نے اس شخص کو بلایا اور کہا کہ اپنا مکان واپس لے لیں۔ اس نے کہا
کہ میں تو آپ کو ہبہ کر دیا ہے آپ جو مرضی کریں چنانچہ آپ نے وہ مکان بیچ کر موجودہ مکان خضری محلہ میں بنوالیا۔

اس سلسلے میں آپ کے ہمیشہ یہ حدیث مدنظر رہتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا
گیا کہ جو دن کو ہمیشہ روزے رکھتا ہے اور رات کو ہمیشہ عبادت کرتا ہے مگر جماعت پنجگانہ اور جمعہ کے لیے حاضر نہیں ہوتا فرمایا کہ
وہ جہنمی ہے ۔ حضرت شیخ التفسیر ہمیشہ جماعت سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے صفِ اول میں کھڑے ہوتے

ۓ سئل عن رجل یصوم النھار ویقوم اللیل ولا یشھد الجماعۃ ولا الجمعۃ فقال ھذا فی اھل النار (ترمذی شریف)

...تے اور ہمیشہ با جماعت نماز پڑھتے۔

...م میں اتباع سنت

حضرت شیخ التفسیرؒ کی پوری زندگی اتباع سنت میں بسر ہوئی۔ آپ نشست برخاست سونے جاگنے کھانے پینے۔ لباس وغیرہ ہر جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن کا اتباع ...اری عمر کھدر پہنا اور اسی کی لوگوں کو تلقین کی۔ سینکڑوں بڑے بڑے آفیسرز۔ تجار۔ روٴوسا آپ کے حلقۂ ارادت میں آئے ...ندگی کی کایا پلٹ ہو گئی اور وہ اپنے ہاں شادی بیاہ وغیرہ میں سادگی کے خوگر ہو گئے۔ خود حضرت مولانا کی زندگی اسی بارے ...ی زندگی تھی۔ چند واقعات ملاحظہ فرمایئے۔

...حمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "نکاح میں چار چیزوں کا خیال رکھا جاتا ہے (۱) مال (۲) حسب (۳) ذاتی کمال ...دین" ـــــ پھر فرمایا تم دین کو پسند کرو۔ ہر چند اس حدیث کے ظاہری الفاظ میں عورتوں کی طرف اشارہ ہے۔ کہ عورتیں ...ات اربعہ میں سے کسی وجہ سے پسند کی جاتی ہیں مگر مردوں کو پسند کرنے کا بھی یہی معیار ہے ـــــ

...ضرت شیخ التفسیرؒ نے دین کو معیار بنا کر اپنی اولاد کا نکاح کیا۔ خود برائے تعلیم یہ واقعہ کئی دفعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ "جب ...ری لڑکی سن بلوغ کو پہنچ گئی تو میرے پاس علماء کرام کی ایک جماعت دورۂ تفسیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ جب وہ جماعت فارغ ...یں نے ایک مولوی صاحب کو علیحدہ لیجا کر پوچھا کہ کیا آپ شادی کریں گے؟ انہوں نے کہا کہ پردیس میں مجھے کون رشتہ دیتا ...ں نے کہا کہ میری لڑکی ہے اگر آپ راضی ہیں تو ابھی نکاح کر دیتے ہیں ورنہ اس کی تشہیر نہ کرنا۔ مولوی صاحب راضی ہو گئے ...ر جلسہ ہوا کامیاب علماء کو سندیں دی گئیں اور مولوی نور اللہ صاحب کو سند دے کر میں نے اپنی بیٹی کا ان سے نکاح کر دیا ...ل ہو گئے ہیں مجھ کو ابتک معلوم نہیں ہے کہ مولوی نور اللہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں"

دوسری دختر نیک اختر مرحومہ کے نکاح کا واقعہ یہ ہے کہ ـــــ مولانا عبدالمجید مرحوم سوہدروی (مسلکاً اہلحدیث) ...دفعہ ملنے کے لیے آئے بوجہ پہلی بیوی کی فوتیدگی کے انہوں نے نکاح ثانی کی ضرورت ظاہر کی۔ شیخ التفسیرؒ نے فرمایا۔ ایک لڑکی ...ہ قرآن اور فلاں فلاں کتاب پڑھی ہوئی ہے وہ یہ سن کر بولے کہ سکول کی پڑھی ہوئی منظور نہیں ہے مولانا نے فرمایا کہ اپنے گھر میں ...لدہ سے یہ سب کچھ پڑھا ہے انہوں نے کہا کہ ہم کسی بی بی کو دیکھنے کے لیے بھیجیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ میری لڑکی ہے کسی کو بھیجنے ...ضرورت نہیں ہے اگر آپ کو قبول ہے تو ابھی نکاح کر دیتے ہیں ورنہ شہرت نہ کرنا۔ وہ یہ بات سن کر راضی ہو گئے اور کچھ مہلت ...ل پھر آئے اور نکاح ہو کر رخصتی ہو گئی۔

مولانا عبید اللہ انور جو آپ کے جانشین ہیں۔ ان کا نکاح ان کے ماموں ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے گھر ہوا جو لاہور میں بڑی ...رت و شہرت کے مالک ہیں۔ انہوں نے برات پر سو آدمی طلب کئے۔ مگر ادھر سے باپ۔ بیٹا اور مولانا عبدالمجید صاحب تین ...راد گئے اور نکاح ہو گیا۔ البتہ گھر آ کر دعوت ولیمہ کیا جس میں اعزہ و اقربا تمام مدعو تھے یہی طریقہ سنت نبویؐ کے مطابق ہے۔

غمی کے موقعہ پر بھی یہی اتباع سنت ہے۔ آپ کے بچے بھی فوت ہوئے اور بچیاں بھی۔ رات کو بچی فوت ہوئی کسی کو چنداں ...طلاع نہیں دی گئی صبح نماز فجر کے بعد حسب معمول درس قرآن دینے کے بعد فرمایا کہ میری لڑکی رقیہ فوت ہو گئی ہے اب اس کا جنازہ اٹھایا ...ائیگا۔ آپ نے اپنی وفات سے پہلے حضرت مولانا عبید اللہ انور کو وصیت فرمائی تھی کہ صبح کا درس کسی حالت میں قضا نہ ہوا لہذا آپ

کے فرمانبردار بیٹے نے آپ کی ہدایت کے مطابق آپ کی نعش مبارک کو نہلا دھلا کر کفنانے کے بعد صبح کے وقت د
دیا اور نماز ظہر کے بعد آپ کا جنازہ اٹھایا گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون

مجلس ذکر ذکر دوسری عبادات کے لیے معین و مددگار ہے اس کی کثرت سے ہر عبادت محبوب بن جاتی ا
میں لذت آنے لگتی ہے اور کسی بھی عبادت میں مشقت اور بار نہیں رہتا قرآن پاک میں اس کے م
آیات وارد ہیں۔ مثلاً

فاذکرونی اذکرکم ——— پس تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کرونگا۔
ولذکر اللہ اکبر ——— اور البتہ اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔
الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ——— خبردار! اللہ کے ذکر ہی سے قلوب مطمئن ہوتے ہیں۔
وذکر اسم ربہ فصلّی ——— اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پس نماز پڑھی۔
واذکر ربک فی نفسک تضرعاً وخیفۃ ودون — اے بندے اپنے دل میں گڑگڑا کر اللہ کو یاد کیا کر اور خفیہ
الجہر من القول بالغدو والاصال ولا تکن — دھیمی آواز سے شام و سحر اس کو یاد کیا کر۔ اور غافل لوگ
من الغافلین۔ ——— میں سے نہ ہونا۔

اسی طرح بے شمار احادیث ذکر کی اہمیت اور فضائل میں بیان ہوئی ہیں جن کا احاطہ دشوار ہے۔ ایک حدیث میں
خدریؓ آتا ہے کہ اللہ کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ لوگ تم کو مجنوں کہنے لگیں ——— حضرت انسؓ سے روایت ہے
علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جنت کے باغوں پر گذرو تو خوب سیر ہو کر کھاؤ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! جنت کے باغ کیا ہیں ! فر
ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جن سات آدمیوں کو عرش کا سایہ کریگا ان میں ایک وہ ہوگا جو تنہائی
کا ذکر کرتا اور روتا ہے۔

جن لوگوں نے ذکر کیا اور اس کی لذت سے لطف اندوز ہوئے انھوں نے ذکر کے فوائد گنوائے ہیں چنانچہ حافظ ابن قیم
ایک رسالہ "الوابل الصیب" میں ذکر کے متعلق فرمایا کہ ذکر میں سو سے زیادہ فوائد ہیں اور پھر ان کا شمار کیا ہے۔ ان کو پڑھا
ہے کہ یہ فوائد دین اور دنیا کو بس کرتے ہیں بشائقین اس کتاب کا مطالعہ کریں یا پھر انوار ولایت حصہ دوم مطبوعہ "خدام الدین"
فرمائیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا ذکر دل کے لیے ایسا ہے جیسا کہ مچھلی کے لیے پانی۔

حضرت شیخ التفسیرؒ نے اپنی زندگی میں اتنا ذکر کیا کہ اگر اس کا ذکر کیا جائے تو سننے والا یقین نہ کرے کہ آیا ایک آدمی
ذکر کر سکتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ حضرت شیخ التفسیرؒ نے ایک ایک دن میں کئی اذکار سوا لاکھ مرتبہ کئے اور متواتر
اور اتباع سنت کا اثر تھا کہ آپ کا دل اس قدر پاکیزہ اور مصفا ہو چکا تھا کہ اس کی طرف متوجہ ہو کر کشف حالات کر لیتے
کے لیے آپ نے مجلس ذکر کا اہتمام کیا چنانچہ ہر جمعرات بعد از مغرب مجلس ذکر منعقد ہوتی جس میں حضرت مولانا حاضرین مجلس
اور بعد میں کسی ضروری عنوان پر کتاب وسنت کی روشنی میں خطاب فرماتے "خدام الدین" میں ہر ہفتہ آپ کی مجلس ذکر کا بیان
شائع ہوتا رہا اور اب کئی جلدوں میں علیحدہ کتابی صورت میں یہ تقریریں شائع ہو چکی ہیں۔ حضرت شیخ التفسیرؒ کا ایک معمول

جمعہ کی باقاعدہ تیاری کرتے اور اس کے لیے نوٹس تیار کرتے۔ اور "خدام الدین" کے اجراء سے لیکر تا وفات آپ کا خطبہ اس میں شائع ہوتا رہا۔ حضرت کی وفات کے بعد آپ کے جانشین حضرت مولانا عبید اللہ انور دونو معمول باقاعدہ نبھا رہے ہیں اور آپ کا درس ذکر کا وعظ اور خطبہ جمعہ باقاعدگی سے ہفت روزہ خدام الدین میں شائع ہوتا ہے۔

کشف و کرامات مولوی حافظ نصیر الدین فرماتے ہیں کہ ایک صحبت میں میں نے ارادہ کیا کہ وقت تھوڑا سا رہ گیا ہے اب حضرت کچھ بیان فرمائیں تو اچھا ہے۔ میرے یہ عرض کرنے سے پیشتر ہی فرمانے لگے کہ اللہ والوں کے پاس خاموشی سے بیٹھنا زیادہ بہتر ہے ان کو چشم بصیرت سے دیکھنا اور اپنے آپ کو دکھانا ہوتا ہے فرمایا میں اپنے حضرات کے پاس کئی کئی دن بیٹھا کرتا تھا لیکن نہ تو کبھی بات کی تھی اور نہ ہی زانو زمین سے اٹھایا تھا اس کے بعد فرمایا حضرت رائے پوریؒ میرے پیر نہیں ہیں لیکن میں اپنے پیروں کی طرح ان کا ادب کرتا ہوں ان کے پاس جب تک بیٹھتا ہوں نہایت احترام۔ ادب اور خاموشی سے بیٹھتا ہوں حاضر ہو کر سلام کیا اور رخصت پر سلام و مصافحہ کیا۔ ع

اے لقائے تو جواب ہر سوال

آپ فرمایا کرتے تھے کہ تمام ریاضات کا مقصد یہ ہے کہ دل میں جلاء پیدا ہو جائے اور دل کی آنکھیں اللہ پاک کے نام سے روشن ہو جائیں۔ ظاہری آنکھوں کا کیا ہے یہ تو کتوں اور بلیوں کی بھی ہوتی ہیں۔ پھر اس کے بعد قرآن پاک کی یہ آیات تلاوت فرماتے اور ترجمہ کرتے۔

ولقد ذرأنا لجهنم كثيرًا من الجن والانس لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغافلون	اور ہم نے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور انسان پیدا کئے ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں اور کان ہیں ان سے سنتے نہیں وہ لوگ چارپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے وہی لوگ غافل ہیں

مولانا احمد دین ٹھٹھہ میاں علی کا بیان ہے کہ وہ ایک دفعہ ملتان مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے سلام کے لیے حاضر ہوگئے وہاں حضرت لاہوری کی خیر و عافیت پوچھی میں نے عرض کیا کہ باوجود فالج اور وجع المفاصل شبانہ روز مشاغل نہایت تندی سے جاری ہیں یہ سن کر شاہ جی مرحوم روئے اور والہانہ انداز میں فرمانے لگے:-

"وارے! سکھ دیا پُتّا۔ بخاری جیسے لکھاں سید تیرے قدماں اتوں وار دیواں۔"

حضرت لاہوریؒ اپنے ہم عصر علماء کا بہت احترام و اکرام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ گاڑی میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری ساتھ تھے وہ لوٹا لیکر ٹٹی کی طرف جانے لگے تو حضرت اٹھ کر کھڑے ہو گئے جب انہوں نے دروازہ بند کر دیا تو اپنی جگہ پہ بیٹھے جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو دوبارہ فوراً کھڑے ہو کر اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے بیٹھنے پر اپنی جگہ پہ بیٹھے۔

ایک دفعہ ملتان کسی جگہ فروکش تھے۔ اطلاع ملی کہ حضرت سید سلیمان ندویؒ ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ وہ نزدیک ہی کسی دوسرے کمرے میں تشریف فرما تھے۔ شیخ التفسیر یہ سن کر نہایت سرعت سے سید صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوگئے آپ کی والہانہ فطرت کا یہ تقاضہ تھا کہ سید صاحب میرے پاس آنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔

سلطان بابا چک شہامد تحصیل جڑانوالہ ابتداء سے اپنے بیان کے مطابق چور۔ بدمعاش اور بدکردار تھے اور عقیدتاً بدعتی تھے۔ حضرت شیخ التفسیر روڈ والا روڈ اسٹیشن پر آ رہے تھے۔ ان سے کسی نے کہا کہ ایک بڑے مولوی صاحب آ رہے ہیں انہوں نے نہایت بے پروائی سے کہا کہ ہمارا مولویوں سے کیا تعلق؟ اور اس وقت چوری کے کسی پروگرام کے مطابق جا رہے تھے استنے میں گاڑی آگئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ گاڑی سے نمودار ہوئے۔ سلطان بابا کی نظر حضرت پر پڑی اور رقت طاری ہو گئی کا پروگرام ترک کیا اور حضرت کی قیام گاہ پر جا کر بیعت ہوگئے۔ سابقہ گناہوں سے توبہ کی اور اب متشرع صورت نیک مسلمان انجمن خدام الدین کے مرحوم — عبدالاحد بیگ برسوں تک سینما گھروں میں ملازمت کرتے رہے فحاشی اور بدمعاشی کے تمام پبلسٹی کرتے رہے۔ ملتان قاسم العلوم کے جلسہ میں شیخ التفسیرؒ کی تقریر تھی عنوان تھا "پاگل پن اور اس کا علاج"۔ آپ نے علاج فرمایا (۱) تعلیم دین (۲) رزق حلال (۳) صحبت صالحین۔ بیگ صاحب نے تقریر سنی سابقہ طریق زندگی سے توبہ کی۔ رزق حلال دامن گیر ہوا۔ باوجود مفلسی اور ناداری کے خدا کے دین کی خاطر دو دفعہ جیل گئے۔ قوانین کے نفاذ کے بعد مارشل لا کے دور میں درہمے۔ قدمے۔ سخنے مخالفت کرنے لگے پہلی پیشی میں سپیشل ملٹری کورٹ میں کہا گیا کہ بیگ صاحب جانتے ہو کہ اس جرم کی سزا سخت ہو گی تو مجاہدانہ جرأت سے جواب دیا کہ "میں اسی چیز کی تلاش میں اس جگہ پہنچا ہوں"۔ اپنے اقرباء کو منع کر دیا کہ کوئی ضمانت کا انتظام نہ کرے کہ باہر آ کر پھر وہی کام کروں گا۔ حضرتؒ نے سنا کہ بیگ صاحب جیل میں چلے گئے ہیں تو نہایت سے فرمایا کہ:۔

"الحمدللہ بیگ صاحب نے تمام مسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا اور ساتھ ہی آپ نے اڑھائی سو روپیہ بیگ صاحب کے بچوں کی خاطر بھیجا"

بیگ صاحب میٹرک فیل تھے اور چودھری عبدالرحمٰن صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی۔ بیگ صاحب کی آمد پر چودھری صاحب بیمار تھے حضرت ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو باتوں باتوں میں فرمایا کہ چودھری صاحب اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیمار کیا تھا اور آپ کی جگہ کام کرنے کے لیے پہلے سے ہی ایک آدمی بھیج دیا۔ بظاہر حضرت کا یہ ارشاد حیران کن تھا مگر جب بیگ صاحب نے دفتر کے کام میں اپنی دیانت۔ محنت دانشمندی اور فرض شناسی کا ثبوت پیش کیا تو حضرت کے ارشاد کا راز سب پر ظاہر ہو گیا۔

قاضی احسان احمد صاحب مرحوم و مغفور تحریک ختم نبوت میں شیخ التفسیرؒ کے ساتھ ملتان جیل میں محبوس تھے۔ قاضی صاحب کا بازو قیام پاکستان سے قبل ٹوٹ گیا تھا جس کے نتیجے میں ان کا ہاتھ منہ تک نہیں جاتا تھا۔ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ ملتان جیل میں حضرت نے مجھے حکم دیا کہ تم جماعت کرایا کرو ایک دن جماعت میں حضرت کی ٹوپی کی نوک میرے پاؤں سے لگی میں نے یوں محسوس کیا جیسے مجھ پر کوہ گراں گر پڑا ہے میں نے جماعت کرانا چھوڑ دیا دوسرے تیسرے دن حضرت نے فرمایا کہ قاضی صاحب آپ نماز پڑھایا کریں میں نے معذرت کی کہ حضرت اور اچھے اچھے علماء موجود ہیں دوسرے یہ کہ میرا بازو ٹوٹا ہوا ہے اور میں تو منہ بھی اچھی طرح نہیں دھو سکتا یہ سن کر نہایت پدرانہ شفقت سے میرا بازو پکڑ کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ وہ ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔ شفا اسی کی رحمت سے وابستہ ہے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ میں رات کو سویا صبح اٹھا تو دونوں بازو ٹھیک تھے اور میں نے بلا تکلف دونوں ہاتھوں سے وضو کیا۔

بیگم مودہ لناری نے مولانا عبیداللہ انور کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا واقعہ خود سنایا کہ ان کے پیٹ میں دکنبر، پھوڑا تھا۔ سخت اذیت اور تشویش تھی۔ ایکسرے لیا گیا اور اگلے دن ہسپتال میں داخلے کا انتظام کیا گیا اگلے دن داخلے کے وقت مجھے خیال آیا میں خطرناک بیماری میں مبتلا ہوں اپریشن ہوگا ——— حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قدمبوسی کے بعد ہسپتال کا ارادہ کیا۔ حضرت دعا فرمائیں گے اللہ تعالیٰ جلد صحت دیں گے یہ خیال کر کے میں حضرت کے ولایت کدہ پر حاضر ہوئی۔ حضرت نے بڑی شفقت اور مربیانہ التفات سے میری گذارش سنی بعد میں میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے شفا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے شفا بھی اسی کی جانب سے ہے۔ بہرحال جب میں بادل نخواستہ حضرت سے رخصت ہوئی تو مجھ کو یقین ہو چکا تھا کہ میں تندرست ہو چکی ہوں میں نے گھر آکر اعلان کر دیا کہ علاج نہیں کراؤنگی چنانچہ میں ہسپتال نہ گئی شام کو ڈاکٹر صاحب آئے میں نے اس کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا اور کہا کہ علاج ان دنوں بہتر ہے ورنہ مرض بڑھ جائے گا۔ فیصلہ ہوا کہ ایکسرے کرایا جائے۔ ایکسرے کرایا گیا بفضلہ تعالیٰ پھوڑے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اور میں پہلے ہی دن سے تندرست ہو چکی تھی۔

ایک دفعہ ایام حج میں شدت تمازت سے منیٰ میں بہت لوگ مرگئے مولانا حافظ حبیب اللہ (شیخ التفسیر کے بڑے لڑکے) کے متعلق ان کی والدہ کو تشویش ہوئی حضرت تسلی دینے انجام کار بذریعہ تار پتہ کرنیکا فیصلہ ہوا حضرت نے اللہ کی رحمت سے بچشم باطن دیکھا اور فرمایا کہ حافظ صاحب بالکل صحیح سالم ہیں گھر میں جا کر بیگم کو تسلی دی۔ دو دن کے بعد تار کا جواب آگیا۔ تو حافظ صاحب بخیر و عافیت تھے۔

خواجہ نذیر احمد کا بیان ہے کہ ان کی لڑکی ماسکو میں تھی۔ اس کی خیریت کی اطلاع میں دیر ہو گئی ہم کو بڑی تشویش تھی حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا تو آپ نے فرمایا بفضل تعالیٰ بخیریت ہے خط بھی آجائے گا۔ بعد ازاں میری پریشانی دیکھ کر مزید فرمایا کہ لڑکی بالکل تندرست ہے چارپائی پہ آرام کر رہی ہے اور فون اس کی فلاں سمت پر ہے۔ حضرت کے ارشاد کے مطابق دو تین دن کے بعد خیریت نامہ آیا۔ اور دوسرا واقعہ بھی تحقیق کرنے پر حرف بحرف صحیح نکلا۔

مولوی احمد دین صاحب ڈوگر (موضع میاں علی) شیخوپورہ کہتے ہیں کہ ایک نوجوان حضرت کی خدمت میں آیا اور بیعت کی درخواست کی آپ نے فرمایا ابھی کچھ اور سوچ لو پھر کئی دن کے بعد آیا آپ نے پھر لوٹا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا عزیز! تمہارا دل تو مانتا نہیں۔ تم کس مجبوری پر میری بیعت ہونا چاہتے ہو۔ یہ سن کر اس نوجوان نے کہا کہ جہاں میں شادی کرانا چاہتا ہوں وہ سب آپ کے مرید ہیں ان کی شرط ہے کہ میں آپ سے بیعت ہو جاؤں۔ تو رشتہ ملیگا۔ پہلے واقعی مجھے آپ سے عقیدت نہ تھی مجبوراً آتا تھا مگر اب دل کی کایا بدل گئی ہے سچے دل سے بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے ہاتھ بڑھا دیا فرمایا واقعی اب ٹھیک ہے۔

اس طرح کے سینکڑوں واقعات کشف و کرامت کے اور ہیں جو حضرت کے مکمل سوانح کی کتابوں اور احباب سے مل سکتے ہیں۔ یہ چیزیں کثرت ذکر اللہ اور اتباع سنت کی وجہ سے خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں کسی کو زیادہ کسی کو کم۔ لیکن جب کہ اس کتاب کے دوسرے صفحات پر کئی جگہ لکھا گیا کہ یہ چیزیں مطلوب و محبوب نہیں ہیں۔ اور ہمارے سلسلہ کے بزرگوں میں ان چیزوں کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

سراپا و حلیہ

کشادہ پیشانی پر سیمابی انوار کی جھلکیں (من اثر السجود) نازک بھویں۔ خوبصورت آنکھوں میں عارفانہ چمک مناسب بینی۔ مردانہ پر وجاہت رخسار۔ سپید گندمی رنگت۔ لب مبارک موزوں۔ دندان مبارک آبدار۔ ریش مبارک دراز اور سفید۔ عام چہرۂ انور کی کیفیت نضرۃ النعیم کا پتہ دیتی تھی۔ گردن متوسط۔ شانے کشادہ۔ چھاتی مبارک پر بالوں کی لکیر۔ بازو اور کلائیاں پیرانہ سالی میں قدرے کمزور۔ ہتھیلیاں اور انگلیاں نہایت نرم و نازک۔ پاؤں مبارک قد و قامت کے عین مطابق سر مبارک موزوں۔

سردیوں اور گرمیوں میں کھدر کا پاجامہ۔ کھدر کا کرتہ۔ کھدر کی ٹوپی اور اس پر کھدر کی چار پیچ والی دستارِ فضیلت۔ سردیوں میں رنگ اور کبھی سیاہ رنگ کا چغہ۔ منعلین جرابیں اور ہمیشہ سرخ چمڑے کا پاپوش مبارک۔ وقت ضرورت ہاتھ میں عصا۔

اہل وعیال

اہلیہ محترمہ آپ کی عابدہ زاہدہ رابعۂ وقت تھیں۔ مرحومہ فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان ہمیشہ گیارہ دفعہ سورۃ اور گیارہ سو مرتبہ یا مُغْنِیُ۔ بعد نماز فجر پانچ یا سات پارے تلاوت قرآن مجید۔ ہر دن بارہ ہزار مرتبہ یا بدیع بالخیر یا بدیع علاوہ ازیں تمام نمازوں کے بعد تسبیحات۔ ذکر قلبی اور بہت سے معمولات تھے۔ جن میں آپ مشغول رہتی تھیں۔ مرحومہ کی بہت بڑی عاملہ تھیں۔ اس کی اجازت انہوں نے حضرت تھانویؒ سے حاصل کی تھی۔ اور آپ کا یہ عمل بڑا با اثر تھا۔ ان معمولات سے مرحومہ قلب مطمئنہ رکھتی تھیں۔

مرحومہ کو فارسی زبان میں خاصی دسترس حاصل تھی۔ امام غزالیؒ کی کیمیا سعادت سے خاص شغف تھا۔ موسم سرما میں پوری ضخیم کتاب مرتبہ ضرور ختم کرتی تھیں۔ شیخ سعدیؒ کا اکثر کلام حفظ تھا مولانا حالی کی مدس از بر تھی۔ اکبر الہ آبادی کے اکثر اشعار یاد تھے۔ آپ نے فارسی علم اخلاق پر ایک کتاب بھی تالیف فرمائی جس کی طباعت نہیں ہو سکی۔ حضرت تھانویؒ کی تصانیف اصلاح الرسوم۔ تعلیم الدین۔ اور بہشتی زیور بچوں کو پڑھایا۔ فقہی مسائل نوک زبان تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے بہت عقیدت

مولانا حافظ حبیب اللہ مہاجر مدنی

شیخ التفسیر کے بڑے صاحبزادے مولانا حافظ حبیب اللہ مدظلہ قیام پاکستان کے وقت سے مدینہ منورہ مقیم ہیں اور آپ نے ہجرت کی نیت کر رکھی ہے۔ مسجد نبوی میں باب صدیقؓ میں بیٹھ کر عربی زبان میں درس دیتے ہیں۔ ایام حج میں مسجد حرام میں پاک و ہند کے حجاج کو اردو میں درس قرآن بہت متواضع۔ منکسر المزاج اور مہمان نواز ہیں اتنی دیر سے وہاں رہنے کے باوجود کسی سے خاص روابط نہیں پیدا کئے۔

مولانا عبید اللہ انور

شیخ التفسیرؒ کے جانشین ہیں۔ خطبہ جمعہ۔ مجلس ذکر کا التزام و اہتمام شیخ التفسیرؒ کے معمول جمعیۃ علماء اسلام کے نائب امیر ہیں۔ عقیدت کیشوں سے ملاقات اور اندرون شہر و بیرون شہر پاکستان کے مختلف مقامات کے لیے اکثر تبلیغی دوروں پر رہتے ہیں۔ بہت شیریں مقال اور حیا کا مجسمہ ہیں۔ مرنجان مرنج قسم کے بزرگ ہیں۔ انتہا درجہ کے ہیں۔ اور آپ کے اس حلم و بردباری کی وجہ سے کئی لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اطوار و کردار میں مربیانہ مروت۔ بشرہ پر آنکھوں میں پاکیزگی فطرت کی جھلک۔ اقربا و اعزاء میں ہر دلعزیز۔ اغیار میں ممدوح و موصوف۔

مولانا حافظ حمید اللہ صاحبؒ

سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ نوجوانی کے عالم میں بڑے عابد و زاہد متقی ہیں۔ نماز باجماعت کا بہت اہتمام رکھتے ہیں۔ والد ماجد کی طرح اور ہاتھ میں بہت بڑا عصا رکھتے ہیں۔ حضرت کے عطا کردہ پروگرام کے مطابق آپ بچوں کو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھاتے اور لیتے رہتے ہیں۔ دو بچوں اور بچیوں کے باپ ہیں۔

حضرت شیخ التفسیرؒ کے مکمل حالات معلوم کرنے کے لیے مرد مومن مطبوعہ فیروز سنز لاہور اور انوار ولایت حصہ اوّل و دوم خدام الدین لاہور مطالعہ کی جائیں۔

از ڈاکٹر سید عبداللہ

حضرت مولانا

میں ۱۹۲۰ء میں تعلیم کے لیے لاہور آیا۔ میرے چچا صاحب جن کے سایۂ عاطفت میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ہر روز صبح کے وقت مولانا احمد علی صاحب
درس قرآن میں شریک ہوتے تھے۔ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔
کھدر کے لباس میں ملبوس، لمبا کرتا، اکہری شلوار، سر پر کھدر کی ٹوپی، یا کبھی کبھی عمامہ۔ لانبا قد، چوڑے شانے، جسم گٹھا ہوا۔ داڑھی جو بعد میں بہت لمبی ہو گئی
اس زمانے میں مناسب حد تک بڑھی ہوئی، قد و قامت رعب دار، رنگ سانولا، مگر چہرے پر بڑی نورانی کیفیت۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ دیکھنے والا متاثر
نہ ہو۔ بات میں نرمی و شفقت، مگر جب جذبے میں آتے تو آواز گرج دار ہو جاتی۔
یہ تھے حضرت مولانا احمد علی صاحب جن سے میں لڑکپن میں روشناس ہوا اور آخری دم تک عقیدت کم نہ ہونے پائی۔
حضرت مولانا، علماء کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے ہاتھ میں قرآن و حدیث اور دل میں جذبہ جہاد — ان بزرگوں کی پیروی کی آرزو رکھتے تھے
باطل کے مقابلے میں ہمیشہ تیغ بدست رہے۔ یہ سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے جا ملتا ہے جن کے خانوادے کے فیض تربیت سے جہاد کا فریضہ ادا کرنے والے
کبھی سرحد پر جا کر جمے اور کبھی بنگال میں صف آرا ہوئے۔ کبھی سکھوں کے سامنے سینہ پلائی ہوئی دیوار بنے۔ کبھی انگریزوں کے مورچوں میں ہلچل مچا دی۔ غرض حضرت
مولانا انہی مجاہدین صف شکن کے وارث اور پیرو تھے۔
مولانا عبید اللہ سندھی اس صدی کے بلند پایہ دینی مفکرین میں سے تھے۔ مولانا احمد علی ان کے شاگردان خاص میں سے تھے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں۔ اس
زمانے میں تو وہ ہندوستان سے باہر تھے۔ مگر مولانا احمد علی کی صورت میں ان کے افکار کی نمائندگی یہاں برابر ہوتی رہی۔
مولانا عبید اللہ سندھی نے دہلی میں جنگ عظیم اول سے قبل ایک ادارہ نظارۃ المعارف قائم کیا تھا۔ اس کے تین بڑے مراکز توجہ تھے۔

اوّل : درس قرآن و حدیث

دوم : شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات کی نشر و اشاعت

سوئم : برطانوی استعمار کی مخالفت اور آزادی پسند گروہوں سے تعاون

مولانا احمد علی صاحب نے مرکز لاہور میں بیٹھ کر ان ہی تین اہم مقاصد کی پیش رفت میں عمر صرف کی۔

حضرت مولانا شاید مولانا سندھی کے زیر اثر ہمیشہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کی تربیت پر نظر رکھتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے خیالات دور دور تک پہنچیں۔ انھیں اس گروہ سے بے حد توقعات تھیں یہی وجہ ہے کہ ان کے درس میں شرکت کرنے والوں کی اکثریت۔ اسی جماعت سے متعلق تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس جماعت کے سلسلے میں مولانا جو توقعات رکھتے تھے، وہ کبھی پوری نہ ہوئیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔ مگر میں اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔

تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ انگریزوں کے خلاف شدید نفرت و حقارت کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے اور معاملہ یہاں تک آ گیا کہ غیور مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ انگریزوں کی غلامی میں ایک دن بھی سرزمین ہند میں بسر کریں۔ ہجرت کا فیصلہ ہوا اور ہجرت کرنے والوں میں حضرت مولانا بھی تھے۔ لاہور سے قافلہ ریل میں رخصت ہوا۔ تو لاکھوں آدمی سٹیشن پر موجود تھے اور جب اس قافلے نے سرحد پار کی تو لاکھوں آدمی ترک وطن کر چکے تھے۔

افغانستان اس قافلے کی منزل تھی ...... مگر کیا منزل تھی؟ اسلام کی حالت زبوں، دین کی صورت مسخ، وہی حالت ہوئی کہ

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔

ادھر انگریزوں کے زر خرید مسلمانوں نے وسوسہ انگیزیاں کیں اور کہا کہ یہ لوگ ہندوؤں کے لیے سب کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ ہندوؤں کی چال ہے۔ انگریز ... یہ جاسوس سردار خان بہادر انگریز کے کسی ظلم کو ظلم نہ کہتے تھے۔ لیکن آزادی کی صفوں میں رخنہ ڈالنے کے لیے ذرا ذرا سی بات کو کفر اور طغیان کہہ کر مسلمانوں کو جنگ سے روکتے تھے۔ ہمارے ملک میں ایک سو سال سے یہ وسوسے بہت کامیاب رہے ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے مسلمانوں کی واحد قدر نفع پرستی ہے۔ یہ انگریزی تعلیم والوں کی متاع اور واحد عقیدہ ہے ـــ اور اب تو ساری قوم اس میں شریک ہے۔ اسلام کے ہر عقیدے کو اسی فلسفے کے کلہاڑے سے فنا کیا گیا۔ متاع دنیا ہی حب ... تو پھر ... کے لیے سرفروشی اور قرآن و سنت کے لیے جان گدازی کون کرے گا؟

بہر صورت ہجرت ناکام ہوئی اور حضرت مولانا بھی بصد حسرت و یاس اپنے مرکز میں واپس آ گئے۔ اور اسی دار الحرب میں رہ کر، کام کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

قبیلہ سے واپس آ کر درس و تدریس کے ان قدیم سلسلوں کو پھر زندہ کیا۔ اس زمانہ میں نے صحیح مسلم اور حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شرکت کی۔ میں زیادہ شعور نہ رکھتا تھا۔ گو یہ بات میرے ذہن نشین ہو جاتی تھی کہ رسول مقبول ﷺ کے سب اقوال حکمت اور معقولیت سے مرکب ہیں اور دین کے سب احکام ہر زمانہ میں قابل عمل ہیں۔ بشرطیکہ ہر زمانہ میں، اس کی ہدایات کے مطابق زمانے کی تعبیر و توجیہہ کی جائے۔

میں ۱۹۲۶ء کے بعد انگریزی تعلیم کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ فارسی کا ایم۔ اے کر چکا تھا اور مزید تعلیم کی آرزو تھی۔ بڑا مقصد یہ تھا کہ اپنے لیے مناسب ذریعہ معاش پیدا کر سکوں۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کے طلسم کدے میں جو کچھ ہے۔ اُسے بھی اندر سے دیکھ سکوں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت مولانا نے کبھی میری حوصلہ شکنی نہیں کی۔ پہلے تو اس پر تعجب رہا۔ مگر ایک واقعہ کے بعد وہ تعجب جاتا رہا۔

میں نے جامعہ ملیہ سے واپس آ کر داڑھی بڑھالی تھی۔ یہ سلسلہ بڑے عرصے تک رہا۔ تاآنکہ کالے بالوں کے اندر سفید بال (میرے خیال میں قبل از وقت) آ گئے جوانی کے ان دشمنوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے بھی ان کا منہ کالا کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ دشمن بڑے سخت جان تھے۔ جھٹ سیاہی کو دھو کر اپنا سفید منہ دکھا ...

دیتے تھے۔ کوئی اچھا سمجھے یا بُرا۔ میں نے بڑھاپے کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اگرچہ ننگ پیری ہے جوانی میری۔ پھر بھی جوانی کا محض خیال بھی بڑا ہی حیات بخش خیال ہے آخر ایک دن سلیٹی برش سے کالے چٹے بال سفید کر دیئے۔

واقعہ سخت تھا نصرؒ شامیرے لیے کہ میں علما کے حلقوں سے متوسل تھا۔ سب سے زیادہ اذیت یہ تھی کہ اپنے والد ماجد اور اپنے استاذ مکرم حضرت مولانا کو منہ کس طرح دکھاؤں گا چنانچہ عرصہ دراز تک چھپتے چھپانے کی کوشش کی۔ والد صاحب وطن میں تھے۔ اس لیے آسانی رہی۔ مگر حضرت مولانا، وُہ تو یہیں تھے۔

خبریں پہنچیں بلکہ پہنچائی گئیں۔ میری طلبی ہوتی۔ میں ٹال گیا۔ پھر طلبی ہوئی۔ پھر بہانہ تراش لیا۔ انھوں نے فراست سے اندازہ کرکے طول نہ دیا۔ میں سمجھا سب کچھ فراموش ہو گیا اور مسجد شیرانوالہ کو اب میری یاد اور میرا حلیہ تک بھول گیا ہوگا۔

ایک دن ایک مجلس میں پکڑا گیا۔ حضرت مولانا دُور بیٹھے تھے۔ اٹھ کر میرے پاس آگئے۔ میں نے کہا "سنگ آمد و سخت آمد"۔ مگر نہیں۔ شفقت سے بھری ہوئی آواز کانوں میں گونجی۔

"میاں عبداللہ شاہ! آپ اپنے مرکز سے کٹ گئے۔ کیا وجہ؟

پھر خود ہی کہا۔

"دیکھئے سپاہی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک باوردی۔ دوسرے بے وردی"۔

پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"ہم باوردی ہیں اور آپ بے وردی۔ اور آج کے دَور میں بے وردی سپاہی زیادہ مفید اور کارآمد ہیں۔ آپ اپنے مرکز کو چھوڑیں۔ پھر یہ مصرعہ پڑھا۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

آواز کی نرمی دل کی گہرائیوں میں اتر گئی اور نفسانے قلبی میں عجیب قسم کی رقت اور عجب قسم کا سکون محسوس ہوا۔ سچ کہا اقبال نے:

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا!

حضرت مولانا کئی باتوں میں عام علما سے مختلف تھے۔ انھوں نے بعض رسیاتِ زندگی، جدید لوگوں سے اپنائی تھیں۔ سائیکل کی سواری عموماً وقارِ عالمانہ کے خلاف سمجھی جاتی ہے۔ لیکن حضرت مولانا بوقتِ ضرورت سائیکل سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

وقت کی باقاعدگی میں بے مثال، ضوابط و آداب میں بے نظیر، ان میں ڈھیلا پن نام کو بھی نہ تھا۔ سخت کوشی، جفا طلبی میں اپنے استاد کے نقش قدم پر تھے۔ جہاں کے لیے جس قسم کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار رکھتے تھے۔

حضرت مولانا یوں عقائد میں بڑے پکے تھے۔ مگر مسلمانوں کے اتحاد کے مسئلوں میں، ان کے طریقوں میں بڑی لچک تھی حزب الاحناف کے لوگ انھیں اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ مگر وہ ضروری موقعوں پر مولانا سید دیدار علی شاہ سے بھی جو ان دنوں احناف کے سرخیل تھے۔ مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب پنجاب میں ایک مسلمان وزیر اعظم نے خاکساروں پر ظلم ڈھایا تو حضرت مولانا نے (جو اصلاحاً احرار کے مسلک کے آدمی تھے) سخت احتجاج کیا اور اس کی پاداش میں نظر بند کر دیئے گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں محض اس لیے شرکت کرتے تھے کہ یہ انجمن تعلیم کی خادم انجمن ہے۔ اور انجمن کے بعض ارکان کی سرکار پرستی کو نظر انداز کر دیتے۔

حضرت مولانا نے مسلسل چالیس برس تک قال اللہ وقال الرسول کی شمع روشن رکھی۔ مطالعۂ قرآن کی تحریک کو تقویت دی۔ علم اسرار دین رموز سے عوام وخواص کو آگاہ کیا ــــ دینی ذوق کے ساتھ مسلمانوں کی آزاد سیاست کو اپنے پرزور خطبات کے ذریعے مستحکم کیا اور یہ سب کچھ ایسے حالات کہ عمر بھر بے زری کا شکار رہے۔ مگر فکر وقناعت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

زمانے میں بڑے بڑے لوگ آتے رہیں گے۔ مگر احمد علی کم پیدا ہوں گے۔ خدا تعالیٰ حضرت مولانا کی روح کو آسودہ رکھے اور ان کی برکات کے طفیل ہم پر بھی کرم کرے۔

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت

بحوالہ ڈاکٹر مناظر حسین صاحب نظرؔ

علامہ انور صابری

یہاں نگاہ سے چلتا ہے کاروبارِ حیات   زبانِ عشق ہے ناواقفِ کلام اے دوست

یہاں سے سلسلۂ سخن حضرت اقدس مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ صاحب قدس سرہٗ کی طرف مڑا۔ اور خاندانِ ولی اللہی کا ان الفاظ میں فرمایا:۔

"ولی اللہی خاندان میں یہ ادا روزِ اوّل سے چلی آتی ہے کہ وہ دن کو گھوڑے کے سوار ہوتے ہیں اور رات کو مصلّے کی پشت پر بارگاہِ رب العزت میں مصروفِ راز ونیاز۔"

اور ایک سرد آہ کھینچ کر کہا:۔

"مولانا کی وفات صدیوں کے دین وعمل کی تاریخ کی موت ہے۔"

"حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ اس دور کے شاہ ولی اللہؒ مجاہدین میں سید احمد شہیدؒ اور تصوف میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ تھے۔"

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے مزار پُر انوار کے متعلق کہا:۔

اس چھوٹی سی قبر میں جسے حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر شیخ مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تک ضیاء سنی تدبر اسلامی تفقہ، بصیرتِ قرآنیہ اور معرفت الٰہیہ کی پوری تاریخ دفن ہے۔ ــــ

دلیلِ اسوۂ پیغمبری کو دیکھا تھا   زفرق تا بقدم زندگی کو دیکھا تھا

نہیں ہے کم یہ سعادت میری نظر کیلئے   بہت قریب سے احمد علی کو دیکھا تھا

مخدوم الملت حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۶۵ھ
۱۸۷۸ء

۱۳۸۰ھ
۱۹۶۱ء

مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

مفتی محمد حسن —— تاثرات

یہ اعجوبہ بفیض و فضلِ مولانا حسن دیکھا — کہ امرتسر میں ہم نے آج اک تھانہ بھون دیکھا
سنا وہ درسِ قرآں دل کی آنکھیں کھول دیں جسنے — معارف ہائے قرآنی کا دریا موجزن دیکھا
شریعت میں طریقت کو طریقت میں حقیقت کو — کھلی آنکھوں سے ہر سامع نے گویا ہم قریں دیکھا
منادیِ حرم کی، پھر سنی آواز مستانہ — پھر ان آنکھوں سے گویا وہ مدینہ کا چمن دیکھا
جزاک اللہ کہ چشم باز کردی یادِ حق دادی — مسلماں را بطرزِ نو تو دیرینہ سبق دادی

الٰہی پھر مسلمانوں میں پیدا ذوقِ قرآں ہو
اسی میں انکا جینا ہو اسی میں انکا مرنا ہو

عکسِ تحریر مفتی حسن صاحب

صوفی محمد اشرف ایم۔ اے سیالکوٹ

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ نے اس دارِ فانی میں ۸۳ برس قیام فرما رہا اور یکم جون ۱۹۶۱ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ بروز جمعرات ساڑھے بارہ بجے دوپہر محبوب حقیقی کے بلاوے پر دار البقا کو انتقال فرما گئے۔ ہمارے یہاں تاریخ پیدائش کے بارے میں چنداں اہتمام نہیں کیا جاتا البتہ جب کوئی بڑی عظیم شخصیت اس دنیا سے کوچ کرتی ہے تو سوانح نگاری کے سلسلہ میں تاریخ پیدائش مہیا نہ ہو سکنے پر حسرت سی رہ جاتی ہے کہ کاش تاریخ پیدائش کا پتہ چل جاتا سرسری حساب سے ظاہر ہے کہ آپ ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے اس سے ایک سال قبل ہندوستان میں ملکہ وکٹوریہ کے قیصرۂ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا گویا کہ انگریزی کی سامراجی سیادت کا جوا جو اہل ہند کی گردن پر اور بھی زیادہ مضبوطی سے کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ جب کہ انگریزی حکومت اور عیسائی تہذیب کی آمد آمد اور اس کے روز افزوں کے استیلاء سے دین کا شیرازہ بکھرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ دینی مدارس کے لئے ایسے پرفتن دور میں علوم اسلامیہ اور قرآن وحدیث کی صحیح تعلیمات کو محفوظ رکھنا کوئی آسان کام نہ رہا تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑ چکی تھی اور شاہ ولی اللہی دعوت کا کام اس پر آشوب دور میں جاری ہو چکا تھا۔ یہ ہے اس دور کی دھندلی سی تصویر،

حضرت مفتی صاحبؒ غلام اٹک کے قصبہ واہ کے قریبی گاؤں موضع مل پور میں پیدا ہوئے مشہور تاریخی مقام حسن ابدال سے آپ کا گاؤں کوئی سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ جس وادی میں یہ گاؤں واقع ہے اس کو دریائے ہرو کی وادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس پرسکون وادی نے کئی تہذیبیں دیکھی ہیں جن کا ریکارڈ پاس ہی کے آثارِ قدیمہ کے عجائب خانہ واقعہ ٹیکسلا میں محفوظ ہے۔ شمالی ہند میں بدھ تہذیب کا یہ وادی سب سے بڑا مرکز تھی۔ اور قبل مسیح میں روحانی قسم کے لوگ اس پرفضا وادی میں اپنے چلّے کاٹا کرتے تھے۔ سکندر اور پورس کا آمنا سامنا بھی اس وادی میں ہوا تھا گویا کہ یہ علاقہ ہزارہا قسم کی اہم رومانی و روحانی روایات کا حامل ہے اور رب العزّت کی بارگاہ میں یہی منظور ہوا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اسی وادی کی مٹی کے خمیر سے قالب عطا فرمایا جائے۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا اللہ داد صاحب مرحوم بھی اپنے وقت کے ایک معروف محدّث خادم دین اور اپنے گرد ونواح میں ایک معزز ہستی اور جانی پہچانی شخصیت تھے۔ اور خاندان کے بیشتر اجداد و افراد بھی دین ہی سے خصوصی شغف رکھنے والے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں پائی۔ قرآن پاک اور ابتدائی فارسی تعلیم موضع سنگ جانی ضلع راولپنڈی میں قاضی محمد نور صاحب سے پائی۔ عربی صرف نحو قاضی گوہر دین موضع کھوڑی ضلع اٹک سے اور مکھڈ شریف ضلع اٹک کے عربی مدرسہ سے اور علوم عقلیہ یعنی منطق اور فلسفہ کی تعلیم اپنے زمانہ کے ایک بے بدل عالم مولانا محمد معصوم سے ڈھینڈہ ضلع ہزارہ میں پائی۔ جب مولانا محمد معصوم امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں مدرس مقرر ہوتے تو حضرت مفتی صاحب کو اپنے پاس ہی بلا لیا۔ یہاں پر آپ نے بقیہ علوم مثل تفسیر وحدیث، فقہ وفلسفہ وغیرہ کی پوری تکمیل فرمائی۔ اور دورۂ حدیث کیا

طبیعت ابتدا سے ہی مائل بہ تصوّف تھی۔ اور اس روحانی ذکاوت کے علاوہ ذہنی ذکاوت کا بہرۂ وافی بھی عطا ہوا تھا۔ محنتی بھی حد درجہ کے تھے اسباق پر ایسے حاوی ہوتے تھے گویا کہ ان اسباق کے متعلّم نہیں بلکہ معلّم ہیں ہر بڑا ریفارمر اور مصلح ایک بڑا معلّم بھی ہوتا ہے۔ یہی رنگ آپ پر بھی غالب تھا بات کو ذہن نشین کرانے میں اتنے جزئیات بیان فرما جاتے کہ غبی سے غبی ہم سبق کو بھی اپنے سبق پر حاوی فرما دیتے۔ ساری عمر معلّم رہے اور آپ کا یہ ملکہ آپ کے زندگی کے ہر شعبہ میں پیش پیش نہایت نمایاں طور پر ظاہر و باہر رہتا رہا۔ مجلس میں بھی اور مکتب میں بھی، مجلسِ درس میں بھی اور مجلسِ وعظ میں بھی سمجھانے کے بعد پھر فرماتے کہ خوب سمجھ لو۔ کوئی غلط فہمی یا اشکال نہ رہ جاتے۔

خوش قسمتی سے امرتسر میں بھی آپ کو نہایت اعلیٰ درجہ کے ولی اور ولی گر استاد نصیب ہوئے پہلے استاد حضرت مولانا عبدالجبار غزنویؒ اپنے زمانہ کے بڑے جلیل القدر روحانی بزرگ تھے اسی طرح مولانا نور احمد صاحبؒ جن کے نام کی مناسبت سے امرتسر کی مسجد نور مشہور تھی۔ اور جو حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے نہایت قریب نسبت رکھتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی ہی میں حضرت مفتی صاحب کو مسجد نور میں امام و خطیب مقرر فرما دیا تھا۔ اسی طرح تیسرے استاد حضرت مولانا مفتی پیر غلام مصطفیٰ صاحب قاسمیؒ جو ۱۹۳۳ء میں فوت ہوتے نہایت متبحر عالم اعلیٰ درجہ کے معلّم اور منجھے ہوئے درویش بزرگ تھے۔ حضرت مولانا بہاؤ الحق صاحب قاسمی انہی کے صاحبزادہ ہیں۔

حضرت مفتی صاحب وطن سے ایسے آئے کہ پھر گویا امرتسر ہی وطن بن گیا۔ لیکن وطن کے ساتھ تعلق کا رخ طرح قائم رہا۔ چونکہ صلہ رحمی کی رعایت اس کے بدوں محال تھی اور حضرت صلہ رحمی کو جان سے عزیز جانتے تھے سلسلہ میں آپ نے اپنی وصیت میں اپنی اولاد کو فرمایا کہ:۔

"میرے دو بھائی اس وقت زندہ ہیں ان کا ادب باپ کی طرح کریں" اسی طرح آپ نے نکاح کے معاملہ بھی صلہ رحمی کی رعایت کرتے ہوتے بڑے بھائی کی بیوہ سے نکاح کرنا قبول کر لیا۔ شوہر کے فوت ہو جانے پر انہوں نے حضرت مفتی صاحب سے درخواست کی تھی کہ اگر آپ مجھے اپنے حرم میں لے لیں تو انشاء اللہ میری اولاد کی تربیت اچھی ہو جائے گی۔ حضرت نے بھائی کے یتیم بچوں کا خیال فرما کر ان کی درخواست کو قبول فرما لیا اور ایسا کرنے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت مبارکہ پر بھی عمل کی توفیق نصیب ہو گئی۔ جوانی میں پہلا نکاح اور بیوہ کے ساتھ۔ یہاں تذکرہ یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ حضرت نے بیک وقت دو نکاح والی متاہل زندگی بھی بسر فرمائی کیونکہ بڑے بھائی صاحب کی بیوہ کو حرم میں لینے سے پہلے حضرت کی نسبت بھی ہو چکی تھی۔ نسبت والا نکاح بعد میں کیا اور وہ کے حرم ہیں اب بھی بفضلِ تعالےٰ حیات ہیں۔ پہلا حرم عرصہ اٹھارہ سال کا ہوا اللہ کو پیارا ہو چکا گویا اوائل نکاح سے سال کی عمر تک حضرت مفتی صاحب کے دو ہی حرم رہے اس میں بھی سنّت کا التزام ہے اور اپنے شیخ طریقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا قدم بقدم اتباع ہے۔ اس وجہ سے بھی حضرت مفتی صاحب کو فنا فی الشیخ کے خصوصی امتیاز کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

امرتسر کو وطن ثانی بنانے کے بعد حضرت کو محسوس ہوا کہ کسی مردِ حق آگاہ سے اصلاحِ باطن کے لئے کوئی مرشد خلیق

اور مجھ کو اپنا پتہ جس سے ڈاک پہنچ سکے لکھ بھیجیں میں اپنی یادداشت میں درج کر لوں گا فقط"۔
خلافت ملنے کے بعد آپ بھی خلفاء اور مصلحین امت میں شمار ہونے لگے اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر اپنے شیخ سے وہ مناسبت پیدا ہوئی کہ آخر دم تک اس میں ہر آن برکت ہی ہوتی رہی۔
خلافت کا شرف حاصل ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحب کو ۷ ربیع الاول ۱۳۰۳ھ مطابق ۲۷ مئی ۱۹۳۹ء کو حضرت حکیم الامتؒ نے مسجد حوض والی تھانہ بھون میں دوبارہ بیعت کا شرف بخشا۔ یہ اس موقع کی بات ہے جب ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک زیارت کے لئے تھانہ بھون میں لائی، زیارت کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، صاحبزادہ عبید اللہ صاحب، حضرت مولانا خیر محمد صاحب، سب حضرات کو اس شرفِ خصوصی سے نوازا گیا۔ چونکہ حضرت مفتی صاحبؒ کو جامع المجددین کے خلیفہ اعظم ہونے کا خصوصی شرف حاصل ہونا تھا آپ کو دورۂ حدیث مکرر کا مکلف فرمایا گیا اور بیعت مکرر کے شرف کا امتیاز بخشا گیا۔
حق تعالیٰ کے ان مقرب بندوں اور ہم ایسے خطاکاروں کی زندگی میں یہ فرق ہے کہ ہماری زندگیوں میں دینی امور کا التزام ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور دنیاوی امور میں ایسا انہماک ہوتا ہے کہ گویا کبھی مریں گے ہی نہیں اور ادھر اللہ والوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ دینی امور میں جان کو ہر وقت ایسے کھپائے رکھتے ہیں گویا کہ وہ محض دین کے قیام کیلئے پیدا ہوئے تھے اور دنیا طلبی محض ایک ثانوی اور ادنیٰ حیثیت کی شے رہ جاتی ہے وہ دین کے لئے اور ہم دنیا کے لئے۔ حضرت مفتی صاحب کی تمام عمر دین کی خدمت میں گذری دین آپ کا دن رات کا محبوب مشغلہ اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔ ان کے لئے دین سے لمحہ کی غفلت گویا کہ " محبوب حقیقی سے بے نیاز ہو جانے کا حکم رکھتی تھی۔ آپ کے سامنے اگر کبھی دین کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا جاتا تو بڑے یقین سے حکم لگاتے کہ دین مٹانے والے خود مٹ جائیں گے دین بفضلہ تعالیٰ ہمیشہ قائم رہے گا یوں معلوم ہوتا گیا کہ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ کی تفسیر بیان فرما رہے ہیں۔ فوراً ڈھارس بندھ جاتی کہ ہم تو دین کے بارے میں قنوطی ہو رہے تھے۔ دین کی تقسیم میں بڑے انوکھے قسم کے معلمانہ انداز میں فرماتے کہ دین کی جان یُؤْمِنُونَ بِالْغَیْبِ پر ایمان ہے جس سے دنیا بے نیاز ہو رہی ہے اور شریعت کا نفاذ پہلے اپنے اوپر کرو اور بعد میں دوسروں پر، اور حضرت نے شریعت کو اپنی ذات پر من کل الوجوہ صادق طور پر وارد فرمایا ہوا تھا۔ جتنا عرصہ اس دنیا میں قیام فرمایا دین ہی کے لئے فرمایا بچپن ہی سے دین سیکھنا شروع کر دیا اور پھر جوانی کا سارا زمانہ بھی دین سیکھنے سکھانے میں گذرا بڑھاپا بھی اس دھن میں گذرا۔ دین سے عشق گویا کہ اللہ رب العزت کی ذات سے عشق تھا۔ شریعت کے قیام کا اہتمام تھا۔ خلافت ارضی سے مقصود بھی یہی ہے اصلاح طبائع اور انتظام شرائع کا اہتمام جاری رکھا جاتے۔ یہی شریعت کا مقصد اور یہی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا راز ہے۔ احکام شریعت کا اتباع نصیب ہو جائے تو قلب میں ایک خاص قوت پیدا ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا رسوخ بڑھتا ہے اور آہستہ آہستہ انسان کو اپنے آپ پر اور اپنے ماحول پر غلبہ نصیب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔
اولیاء اللہ کوئی لمبے چوڑے پروگراموں کے قائل نہیں ہوتے۔ ان کا کام صرف افراد سازی ہوتا ہے وہ مسلمان

مومن ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہوتا ہے صاحبِ سیرت اور صاحبِ کردار لوگ تیار کرنا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سنت اور حضرات اولیائے کرام بھی اسی سنّت سے تمسک فرمائے رکھتے ہیں۔

انگریز کا زمانہ بڑا پرفتن دور تھا ان فتنوں کے مقابلہ میں دین کی شمع کو روشن رکھنا اولیاء اللہ ہی کے بس کا روگ تھا ورنہ مسلمان اسلاف کی روایات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو ہاتھ سے دے بیٹھتے۔ دین کے تصورات کو عملاً اپنے اخلاق و کردار سے کرتے رہنا ہی خلافت کے قیام کا انتظام کرتے رہنا ہے ورنہ وہ دن دور نہیں تھا کہ مسلمان "گنگا دین" اور "ماتا دین" کی طرح "فردین" اور "وکٹر دین" بنا لئے جاتے، شمع رسالت کے پروانے باری باری اس سلسلہ کی کڑیاں بنتے رہے اور دین کی دلیل ان رہی اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ علاماتِ قیامت والی ٹھنڈی ہوا کے چلنے تک چلتا ہی رہے گا۔

ولی اور عالمِ دین بننے کے بعد اولیاء گری اور علماء سازی کا دور شروع ہوتا ہے۔ درسِ نظامی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۴۷ء تک مدرسہ نعمانیہ میں مدرس رہنے کے ساتھ قرآنِ حکیم کا درس، ہر روز بعد از صلوٰۃ فجر شروع ہوتا ہے۔ امرتسر کے مُصر ہیں کہ حضرت قرآنِ حکیم کا درس شروع فرمائیے لیکن آپ فرماتے ہیں حضرت حکیم الامتؒ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد ہی یہ مبارک کام شروع ہو سکے گا۔ حضرت حکیم الامتؒ جواب دیتے ہیں کہ ضرور آپ ہی درس شروع کریں خطرہ ہے ئی اور کرے گا تو تفسیر بالرائے سے کام لے گا اور آپ سے یہ امر ناممکن ہے یہ تھا حال حضرت حکیم الامتؒ، پسندیدگی کا۔

پھر حضرت نے قرآنِ حکیم کا درس جو شروع فرمایا تو پورے دس سال میں قرآنِ حکیم کا پہلا ختم فرمایا۔ درس تھا کہ غزالیؒ و رازیؒ یاد تازہ ہو رہی تھی۔ خشیت و خضوع کی بارش ہوتی رہتی۔ اور قدر دان حضرات چیخیں اور دھاڑیں مار مار کر رو اٹھتے وہ وہ رموز غامض حل ہوتے کہ بڑے سے بڑا فلسفی حقائق کو اس دلنشیں انداز میں پیش کرنے سے عاجز تھا۔ درس پر آپ نے کبھی ت لینا گوارا نہ فرمایا اور نہ ہی کسی دوسرے رنگ میں کوئی دنیاوی اجر ہی قبول فرمایا۔ اس درس کے لئے حضرت میں کوئی تقطیع بلادٹ نہیں ہوتی تھی کئی نکات اور اسرار کی باتیں نوٹ فرما کر ساتھ لے جاتے اور انہیں دوران درس میں بیان فرماتے جاتے، یہ س کا سلسلہ مسجد نور میں جاری تھا اور تمام حضرات نورٌ علی نور قسم کے رموز و حکم سے اپنے قلوب کو منور کرتے رہتے خوش قسمت ایہ بزرگ حضرات جنہیں مخلوقِ خدا کا خالقِ حقیقی سے رابطہ اور تعلق کا بندھن مضبوط کر دینے کی سعادت نصیب ہوتی ہے رتت استحضار احکام شریعت کی سعادت سے بہرہ ور رہنا اور کسی بھی موقعہ پر دین کے کسی بھی حکم کا ذہن سے ذھول نہ ہونے کتنا بڑا قابلِ صد رشک بلند درجہ ہے۔

تقریباً اڑتالیس سال تک امرتسر میں اور دس سال تک جامعہ اشرفیہ لاہور میں درسِ قرآنِ پاک کا التزام صرف مُنہ سے کہہ دینے کی بات ہے عملاً اس کام کو ہاتھ میں لیا جائے تو نفس کو پتہ چل جاتا ہے کہ کیسے بیت رہی ہے۔ بڑے بڑوں کے رے آپ ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں بھی اس وقت تک دم نہیں لیا جس وقت کہ صحت جواب نہیں دے گئی کیا مجال کہ وقت یادان میں ناغہ ہو جاتے۔ وقت کی آپ بڑی قدر فرماتے تھے فرمایا کرتے تھے "کہ وقت کی قدر کرو"، "مرتے وقت آدمی زمین مان کے خزانے بھی پیش کرے تو ایک منٹ بھی زندگی کا نہیں مل سکے گا" آپ اس زندگی کو سراپا رحمت سمجھتے تھے۔ راس میں عمل صالح کا موقعہ نصیب ہوتا ہے جس پر آخرت کی ابدی زندگی کی بنیاد قائم ہوگی

ملتان اور منظر میں نے بھی دیکھا جب کہ حضرت مفتی صاحبؒ خیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسہ پر بعد فجر درس قرآن دے رہے تھے۔ (ارشد)

یہی حال درس وتدریس کا تھا وہ اس سے بھی زیادہ عمر جاری رہا۔ درس نظامی سے فارغ ہونے سے لیکر وصال سے دن پہلے تک کوئی ساٹھ سال کا زمانہ ہے۔ درس وتدریس میں آپ خارج از بحث موضوعات کو قطعاً جزو سبق نہ بننے دیتے تھے تمام تر توجہ متن پر مرکوز فرما کر تھوڑے ہی وقت میں طلباء کو مضمون سبق پر حاوی فرما دیتے۔ یہ بات الشاذ کالمعدوم کا حکم ہے اور حضرت کے یہاں اس بات کا التزام تمام عمر رہا۔ بات سمجھانے میں طالب علم کی جان بن جاتے تھے استاد شاگرد کے تکلف ماحول کا پیدا فرلیتا تاکہ شاگرد کے قلب پر کوئی پر ہیبت اثرات مرتب نہ ہونے پائیں آپ کا ایک خاص کرشمہ تھا اور دوران سبق میں کسی وقت پُرمزاح قسم کی بات فرمادینا اکثر نظر آتا تھا جس سے شاگرد سبق سے اکتا نے نہ پاتے تھے آپ سے یوں تو ہزاروں شاگرد فارغ التحصیل کرائے لیکن صاحب تذکرہ حسن نے کوئی ستر کے قریب ایسے جید علماء کی فہرست دی ہے جو اپنے زمانہ کے قیم دین کہلانے کے مستحق ہیں۔

حق تعالےٰ نے حضرت مفتی صاحب کو جہاں اور نعمتوں سے سرفراز فرمایا وہاں صالح اور دیندار اولاد سے بھی نوازا آپ کے وصال کے وقت چھ صاحبزادے اور صاحبزادی صاحبہ زندہ تھے اور بفضلہٖ تعالےٰ ایسے نیک اور سعادت مند کہ ایک بزرگ باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھے۔ ان میں سے ماشاء اللہ چار تو حج کے شرف سے بھی مستفیض ہو چکے اور پانچ قرآن حکیم کے حافظ اور بیشتر علوم دینیہ کے مستند ماہر، نیک اولاد کا چھوڑ جانا بھی ایک بڑا صدقہ جاریہ ہے۔ اولاد کو اور حضرت کے حرم کو کیا، سب کو حضرت سے والہانہ محبت تھی اور سب کے سب حضرت پر جان دیتے تھے۔ حضرت معاملہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا پورے پورے مصداق تھے۔ خیرکم خیرکم لاھلہ و خیرکم لاھلی۔ بہت کم حضرات کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ جب دو حرم تھے تو دونوں ایک دوسرے پر بھی باہم حضرت پر بھی جان دیتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں تعدادازدواج کی سنت پر عمل کوئی کوئی کرتا ہے لیکن جو کرتا ہے عدل وانصاف کی وہ تربیت حاصل کرتا ہے جو دوسروں کے نصیب ہونا محال ہوتی ہے۔ سنت پر عمل تو ہمیشہ ہی باعث برکت ہے جب بھی کوئی کرے اور جہاں بھی کرے البتہ قلب کا مومن ہونا ضروری ہے۔ یہ اولاد کی محبت ہی تو تھی جو آپ اواخر زندگانی میں کراچی لے گئی آپ کے صاحبزادگان حج کے سفر پر گئے ہوئے تھے اور آپ ان کے استقبال کے لئے کراچی میں ان کی آمد آمد میں دن گذار رہے تھے۔ ہر بات میں کوئی نہ کوئی راز ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کو یہی منظور تھا کہ آپ کو کراچی کی سرزمین پاک کی گود میں سپرد کیا جاتے اور آخری ایام میں کراچی کے بسنے والے فدائی حضرات بھی خدمت کی سعادت سے بہرہ ور ہولیں۔

اللہ رب العزت کے ساتھ تعلق رکھنے والے حضرات کی ہر بات میں ایک شانِ محبوبی ہوتی ہے۔ حضرت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ زحمت زحمت نہیں ہوتی بلکہ رحمت ہوتی ہے اور پھر فرمایا کرتے کہ اللہ رب العزت جس وقت جیسا کوئی بظاہر ناگوار تصرف اپنے کسی بندہ پر فرمائیں اس میں بندہ کے لئے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں رحمتیں ہوتی ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی حیات طیبہ اس کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ حضرتؒ کو ۵۸ برس کی عمر میں دائیں پاؤں پر داء الفیل یا دوسرے الفاظ میں فیل پاؤں کی بیماری لاحق ہوگئی۔ آپ کے پاؤں میں ایک پھوڑا نکل آیا جو بڑھتا بڑھتا اتنا بڑھ گیا کہ بالآخر ستر برس کی

ں حضرتؒ کو ساری دائیں ٹانگ کٹوا دینا پڑی ۔ یہ پھوڑا بھڑ کے چھتہ کی طرح تمام پاؤں پر بڑھتا گیا ۔ سخت قسم کا
ذاک پھوڑا تھا ۔ حضرتؒ اس کی بدبو کی وجہ سے اس کی مرہم پٹی بھی خود ہی فرمالیا کرتے اور نہیں پسند فرماتے تھے کہ
ی وجہ سے کسی کو تھوڑی بہت بھی اذیت پہنچے ۔ بیماری کے لاحق ہونے کی عمر ملاحظہ ہو جب کہ جوانی کے تمام آثار ایک
کر کے طبیعت سے رخصت ہونے لگتے ہیں ۔ حرارت عزیزیہ رو بہ زوال ہونا شروع ہو جاتی ہے مزاج میں برودت کا غلبہ
نے لگتا ہے اور جب انسان میں فطری طور پر تھوڑا بہت دوسروں سے خدمت حاصل کرنے کا ایک طبعی تقاضا پیدا ہوتے
ہے ۔ حضرت ایسے وقت اس مرض کا مقابلہ شروع کر دیتے ہیں ۔ اللہ رب العزت سے تعلق خصوصی میں ڈھیل گوارا
ں ۔ فرائض ضروریہ روزمرہ سرانجام دیتے رہے ہیں مدرسہ نعمانیہ میں تعلیم و تدریس کا فریضہ حسب سابق پورے اہتمام سے
ی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مسجد نور میں درس قرآنِ پاک بھی جاری ہے ۔ فتویٰ نویسی کے فریضہ سے بھی عہدہ برآئی ہو رہی ہے
طرح علیٰ ۱۹۴۷ء تک ہجرتِ پاکستان سے پہلے پورے بارہ سال یہ سلسلہ جاری رہا اور پاؤں کی دردناک کیفیت بڑھتی
جا رہی ہے ۱۹۴۷ء میں لاہور تشریف لے آتے ہیں ۔ اور مولچند بلڈنگ واقعہ سائیکل مارکیٹ ، نیلا گنبد کو مدرسہ
انیہ کے عوض میں الاٹ کرا کر " جامعہ اشرفیہ " قائم فرما دیتے ہیں ۔ دین کی دھن میں ایک لمحہ کی بھی غفلت گوارا نہیں فرمائی ۔
ہ کا درس یہاں پر بھی جاری ہے اور جامعہ اشرفیہ میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہے اور پاؤں پٹی سمیت بظاہر
معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پانچ سیر کا گوشت کا ٹکڑا ہو اور ساتھ ہی پنڈلی بھی گلتی جا رہی ہے ۔ حضرت کے چہرۂ مبارک
ہی بشاشت اور وہی صباحت ہے اور وہی شکر گزاری ہے صرف زبان کی نہیں بلکہ قلب کی انتہائی گہرائیوں سے ظاہر ہوتے
ی خوشی کی شکر گزاری ہے جو صبرِ ایوبیؑ کا نقشہ پیش کرتی ہوئی آپ کے متبسم لبوں پر آباد کرتی تھی ۔ لاہور پہنچ کر بھی چھ
ل علاج کا سلسلہ جاری رکھا گیا اور جب تمام ڈاکٹر حضرات جواب دے بیٹھے کہ حضرت اس روگ کا علاج اب ہمارے
کا روگ نہیں رہا اور اب تو خطرہ ہے کہ اگر ران سے ساری ٹانگ مبارک نہ کاٹی گئی تو سارے بدن میں اس کا زہر پھیل
ائے گا تو حضرتؒ ٹانگ کو ران سے کٹوا دینے پر رضامند ہو گئے ڈاکٹر حضرات بھی ایسے مخلص ، شفیق اور جاں نثار کم
ا کسی مریض کے نصیب ہوئے ہوں گے ۔ ٹانگ کا کٹنا بھی تو امتحان تھا ۔ اٹھارہ سال تو داء الفیل کا عارضہ ایک
تحان ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تمام دینی امور کا اہتمام و انصرام جاری ہے اور علیٰ اس طرح جیسے کہ ایک صحت مند
احب عزیمت بزرگ سے توقع ناممکن ہے ۔ ڈاکٹر حضرات کا اصرار ہے کہ کوئی بے ہوش کرنے والی مخدر دوا سے
ضرت کو بے حس اور بے ہوش بنا دیا جاتے اور عمل جراحی شروع کیا جاتے ۔ ادھر حضرت مفتی صاحب اپنے آپ پر بے ہوشی
ا غلبہ طاری کر کے اللہ رب العزت کے ذکر سے غافل رہنا ایک لمحہ بھر کے لئے بھی گوارا نہیں فرماتے اور یہ بھی گوارا نہیں
ا اتنے بڑے اپریشن میں بے ہوشی کے عالم ہی میں روح پرواز کر جائے ۔ اور اگر اس نے پرواز کرنا ہی ہے تو خواہ مخواہ
خری وقت کلمہ طیبہ سے محرومی کیوں از خود مول لی جاتے ۔ اس لئے جب ڈاکٹر حضرات نے بہت اصرار فرمایا تو ارشاد
رمایا کہ آپ اپنے کام میں لگے رہئے میں اپنے کام میں لگا ہوں گا ۔ بالآخر ڈاکٹر حضرات نے کاٹی جانے والی جگہ کو ایک ٹیکہ
معمولی سا بے حس کر کے ران مبارک کو اوپر سے کاٹنا شروع کیا پورے ایک گھنٹہ تک یہ عمل جراحی جاری رہا اور جب

ڈاکٹر حضرات فارغ ہو چکے تو حضرت مفتی صاحبؒ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فرمایا اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ بس میری تو آج عید ہے
عید ہی کہ نہ جانے ران کی ہڈی کے کولہے سے جُدا کر کے تمام نسوں، پٹھوں، عضلات، اور گوشت کو کاٹنے کے ا
ایک گھنٹہ کے لمبے عمل میں اللہ رب العزت نے اس صبر پر اپنی بارگاہ سے کتنے بڑے اور کیسے کیسے رضوانی خزانوں کی
دولتوں سے مالا مال فرمایا ہو گا کہ ان کی خوشی میں زخم کی تکلیف ایک ہیچ اور لاشے محض تکلیف بن کر رہ گئی ہو گی حضرت
فرمایا کرتے تھے کہ بعض دفعہ کٹی ہوئی جگہ پر اتنا شدید قسم کا درد ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے بیک وقت ہزاروں چھریوں
سے حملہ کر دیا ہو۔ صاحبِ تذکرہ حسن کے بیان کے مطابق ایسا صبر ماضی میں تاریخی طور پر صرف دو ہی شخصیتوں سے منقول
ہے۔

ایک تو ہیں حضرت عروہؓ بن زبیر رضی اللہ عنہ، جب وہ خلیفہ عبدالملک کے پاس ملک شام تشریف لے گئے تو وہاں
پر آپ کو کسی زہریلے جانور نے پاؤں پر ڈس دیا۔ زہر کے پھیلنے کا خدشہ لاحق ہوا اور اطباء نے پاؤں کٹوا دینے کا حکم لگا دیا
اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ تھوڑی سی شراب پی لی جائے تاکہ نشہ میں درد کا احساس کم ہونے پائے اس حادثہ سے عین کچھ
زمانہ پہلے آپ کا جوان بیٹا فوت ہو چکا تھا۔ جس کے صدمہ کا بھی آپ پر بوجھ تھا آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ "جس مرض
میں مجھے صحت کی امید ہو اس کے علاج میں حرام شے سے مدد نہ لوں گا" پاؤں کو باہوش ہونے کی حالت میں کٹوا دیا۔

اور دوسرا واقعہ ہے امیر عبدالرحمٰن مرحوم والئ کابل کا، ڈاکٹر ان کو بے ہوش کر کے جراحی کا عمل کرنا چاہتے تھے
جناب امیر نے پوچھا کہ اپریشن کتنے گھنٹے جاری رہے گا جواب ملا کوئی دو گھنٹہ پھر آپ نے فرمایا کہ اگر میں دس منٹ
امورِ سلطنت سے غافل رہا تو افغانستان میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ ٹانگ پھیلا دی اور کہا کہ اس کو جس طرح چاہو
چیر پھاڑ کرو۔ مجھے بے ہوش نہ کرو اور پھر اف تک نہ کی۔ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کے وا
صبر کی داستان بالکل ہی نرالی ہے ایک لفظ بھی تو شکایت نہ نکلنے پایا اور نہ احساسِ کرب و اضطراب کی کوئی "سی"
تک ہی نکلنے پائی۔ حضرت مگن تھے کہ "ہر چہ از دوست رسد نکوست"۔ اور پھر سب سے تعجب کی بات یہ کہ اپریشن اور وہ
ایسا لرزہ انگیز اپریشن ستر سال کی عمر میں کرایا جا رہا ہے جبکہ حیوانی قویٰ قطعاً مضمحل ہو چکے ہوتے ہیں۔ خون صالح کی بحالی
کے امکانات کا کوئی احتمال نہیں اور یہ محض اس لئے کہ زندگی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے ماہرین فن کی رائے کے مطابق اس کے
قیام کا اہتمام فرض ہے۔ اور علاج نہ کرانا قنوط اور نعمت عظمیٰ کا کفران ہے جونہی اپریشن کی تکلیف سے افاقہ نصیب ہوا
اپنے معمولات یعنی تعلیم و تدریس، درس قرآن پاک، اور فتویٰ نویسی پھر سے شروع فرما دیئے۔ صرف آخری تین سال کے
دوران میں حضرتؒ نے ان معمولات سے چھٹی فرمالی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور اس کے دوران میں حضرت کو دو دفعہ فالج
کا حملہ بھی ہوا۔ خون کے دباؤ کی تکلیف بھی رہنے لگی اور آخری ایام میں مرض ذیابیطس بھی آ نمودار ہوا۔ لیکن ان تمام عوارض
کو فرائض کے مقابلہ میں کبھی کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت حوصلہ اور صبر کے ایک پہاڑ تھے۔

اپریشن کے بعد مصنوعی ٹانگ لگوانے کے لئے جب حضرت سیالکوٹ تشریف لے گئے اور وہاں پر ٹانگ
فٹ کرانے کے سلسلہ میں سیشن جج میاں عبدالرحمان صاحب جالندھری کی کوٹھی پر مقیم رہے تو کچھ نہ پوچھئے ہر طرف روا

رونق رہتی تھی۔ زائرین کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ملک کے مختلف اور دور دراز گوشوں سے لوگ پروانہ وار آ رہے تھے۔ اور
پر "دربارِ اشرفیہ" کا وہی نمونہ جو جامعہ اشرفیہ لاہور کی بالائی منزل پر دیکھنے میں آتا، وہ سیالکوٹ میں آپ کی عارضی
رہائش پر بھی نظر آ رہا ہے۔ اور حضرت ہیں کہ باوجود اپنی تمام بدنی کمزوری کے دین کے اسرار و رموز پر کلام فرماتے
رہے ہیں۔ بعض اوقات تو آپ کا کلام یہ صورت اختیار کر جاتا کہ گویا آپ تداخل فی البرزخ کے ماتحت کلام فرماتے چلے
جاتے ہیں۔ عجیب و غریب نکات ہوتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ لیکن ایک بات جو حضرت میں تھی۔ اور
حضرت اس کا اظہار قصداً نہ ہونے دیتے تھے وہ خرقِ عادت چیزوں کا صدور اور آپ کا تداخل برزخ اور کشف
کا سبب تھے۔ لیکن بعض لوگ بعض باتوں میں خاص ذہن رسا بھی تو رکھتے ہیں۔ بعض زیرک طبع احباب اس بات کو بھانپ
جاتے تھے ایک دفعہ سیالکوٹ کی مجالس کا ذکر جو آیا تو حضرت کی زبانِ مبارک سے بے ساختہ نکل گیا کہ "وہاں بڑی
ہستیاں بستی ہیں" ایک مائی صاحبہ آئی تھیں اور میری پشت پیچھے بیٹھی رہتیں۔ وہ اللہ رب العزت کے عشق میں
ایسے جل رہی تھیں۔ کہ جتنی مدت بیٹھی رہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرے پیچھے کوئی تپتا ہوا تنور رہا ہے۔ جس کی حرارت اس
بڑے میں پشت اور قلب کو گرما رہی ہے۔ اس قسم کی حرارت کا احساس ہر ایک کو تھوڑا ہی ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کے ادراک
کے لئے تو حضرتؒ ہی کی ذات تھی۔ اس مجلس میں کئی اور لوگ بھی تو تھے۔ مگر کسی کو کیا معلوم ہو سکتا تھا، یہ موقع نہیں ہے
اس مختصر سے مضمون میں ایسے واقعات کو بیان کیا جاوے۔ صاحبِ تذکرہ حسن اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں آ...
بھی کئی واقعات کا اضافہ فرما رہے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ حضرت سنت کے ساتھ شدت کا تمسک رکھنے کے
باعث یہ گوارا نہیں فرماتے تھے خرقِ عادات امور بیچ میں آ حائل ہوں۔ اور پھر دین میں انہی کے باعث کوئی بدعات کا
سلسلہ چل نکلے۔ یہ اہتمام تھا مقتضیات شریعت کے قیام کا اور اپنی ذات کی نفی کرتے رہنے کا:

جامعہ اشرفیہ واقعہ مولچند بلڈنگ کی جگہ کفایت نہ کرتی تھی۔ اور حضرتؒ کی خواہش تھی۔ کہ کہیں باہر کھلی جگہ میں مدرسہ
کے لئے کوئی کشادہ عمارت مہیا ہو جائے۔ اللہ رب العزت جیسے اپنے خصوصی بندوں کی دعاؤں کو نہیں لوٹاتے۔
ایسے ہی ان کی تمناؤں کو بھی قبول فرماتے رہتے ہیں۔ تمنا کا پیدا ہونا تھا کہ اسباب کا حرکت میں آنا بھی ظاہر ہو گیا۔ حضرتؒ
نے سو کنال یعنی ساڑھے بارہ ایکڑ زمین کے حصول کا قصد فرمایا سودا ہو گیا۔ سوا لاکھ روپیہ کی ادائیگی کا سوال پیدا ہوا۔ جگہ بہت نفیس
اور حسبِ پسند تھی۔ لیکن جامعہ اشرفیہ کے فنڈ میں چند ایک ہزار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور حضرت دعا فرما رہے تھے۔ مالک
زمین نے صرف ایک ماہ کی مہلت دی ہے۔ حضرت کے مخلص خادم الحاج محمد شفیع صاحب مرحوم آ پہنچے۔ حالات کا جائزہ
لینے کے بعد فرمانے لگے کہ اچھا مہینہ کی فلاں تاریخ تک جتنا روپیہ جمع ہو جائے۔ اس میں باقیماندہ رقم کی کمی میں پوری
کر دوں گا۔ ایک ہی ہفتہ کے اندر اللہ رب العزت نے نوے ہزار کا بندوبست کر وا دیا۔ باقی رقم حاجی صاحب مذکور نے
ادا فرما دی۔ اور مدرسہ کے لئے زمین عطا فرما دی گئی۔ پھر سب سے پہلے واقعہ یہ ہوا کہ جامعہ اشرفیہ کی عمارت سے پہلے
مسجد کی تعمیر کا کام ہاتھ میں لے لیا جاتے۔ مسجد کے لئے اتنے بڑے رقبہ میں سے موزوں جگہ تلاش کرنا بھی ایک مرحلہ تھا۔
حضرت ہی کے ایک مخلص کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور حضورؐ نے خواب میں مسجد کی جگہ متعین

فرمادی۔ ایسا ہی واقعہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو پیش آیا تھا۔ جب اس امر کا تردد ہو رہا تھا کہ دیوبند میں دار العلوم کے قیام کے لئے کونسی جگہ تجویز کی جائے۔ اور ایسے مبارک واقعات ہمیشہ اللہ رب العزت کی تائید خاص ہی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ مورخہ ۱۴ شعبان ۱۳۷۴ھ کو بروز جمعہ بعد از نماز عصر حضرت کے خلوص کی برکت سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔ وہ مبارک اجتماع جو اس موقعہ پر دیکھنے میں آیا۔ اللہ رب العزت کی رحمت کا خاص نشان تھا پاک و ہند کے سبھی اکابر اس میں جمع تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ اپنے زمانہ کے اولیاء اللہ میں سے ایک سب سے بڑا برقی مقناطیس ہیں جو جس وقت چاہئیں تمام اولیاء اللہ کو اپنے پاس جمع فرمالیں۔ اس کی نظیر اپنے زمانہ میں ا آنکھوں سے اور کہیں نہیں دیکھی گئی۔

جامعہ اشرفیہ کی نئی عمارت صرف بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھی کہ کہیں صرف ہاتھ لگا دو دیکھو کہ ہم غیاب سے حضور کیسے متمثل ہوتی ہیں۔ آٹھ دس لاکھ روپیہ کی رقم کا خرچہ کوئی معمولی خرچہ نہیں تھا۔ توکلاً علی اللہ کام شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے سلسلہ کہیں سے کہیں چلا گیا۔ حضرت کی بڑی خواہش ان جدید عمارت میں جامعہ اشرفیہ کا سالانہ اجلاس منعقد فرما کی تھی چنانچہ پھر حضرت نے اپنی حیات مبارکہ کے دوران ہی پانچ سالانہ اجلاس منعقد ہوتے ملاحظہ فرماتے۔

امرتسر میں رہے تو جامعہ نعمانیہ کا قیام فرمایا اور عمارات تعمیر فرمائیں۔ پھر لاہور میں ورود فرمایا تو یہاں بھی جامعہ اشرفیہ کی عمارات کا وہ سلسلہ قائم فرمایا کہ تقسیم ہند کے بعد دار العلوم دیوبند کے ہند میں چلے جانے کی کمی کو پورا فرما کر حضرت نانوتوی کی روح کو تسکین کا سامان پوری طرح مہیا فرمادیا یہ سلسلہ عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیان سے نہیں بن چلتا ہے۔ کہ اللہ والوں کی زندگی کن مہماتِ امور میں کھپتی رہتی ہے۔ اور مردانہ دنیا کے طلبگار اپنی خواہشات کے ا سے اپنے آپ کو کتنا زبوں بنائے رکھتے ہیں

حضرت کے مقام کو بیان کرنا محض ایک صریح جسارت ہو گا۔ ایک شخص پہاڑ میں کھڑے دوسرے شخص کے بارے میں جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا مختلف النوع کیفیات سے لطف اندوز ہو رہا ہو دوسروں کو کیا تصوّر دلا سکتا ہے حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد دل حسرت کے آنسو رو کر کہتا ہے کہ وَمَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ اس مبارک کام کیلئے مذکرہ نگار حضرات ہی موزوں رہیں گے۔

حضرت کی مجلس کا یہ حال تھا کہ وزیر بھی ہوتے تھے اور گورنر بھی کمشنر بھی اور ڈپٹی کمشنر بھی علماء بھی صوفیاء بھی مگر سب دم بخود ہو کر حضرت کے ارشادات سنتے رہتے تھے۔ اور سر جھومتے رہتے۔ بعض مرتبہ تو آپ کے پیر بھائی جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز بھی تھے مجلس میں حاضر ہوتے۔ حضرت ان پر نگاہ ڈالتے تو کیفیت حال کا غلبہ طاری فرمادیتے اور وہ مدتوں مجلس میں استغراق کی حالت میں با یک سی آواز میں "اوں۔ اوں کرتے رہتے یہ کاملین کا حال تھا۔ ہم ایسوں کے لئے یہ سعادت کہاں تھی۔

گفتگو میں اپنی ذات کی نفی کا یہ حال تھا۔ کہ جب بھی کوئی بات شروع فرماتے۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کی طرف منسوب کر کے فرمایا کرتے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ ہے...... اپنی ذات کا ایسا فقدان جیسے آپ کوئی چیز نہیں

ہیں۔ مخلصین نے عرض کیا کہ حضرت ہم آپ کے ارشادات کو قلم بند نہ کر لیا کریں۔ تو فرمایا کہ حضرت رحمۃ اللہ (یعنی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) کے ملفوظات کی موجودگی میں میری کوئی بات قلمبند ہو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اواخر عمر میں یہ بھی معمول تھا۔ کہ کمزوری کے باعث جب حضرت کلام کرنے کی سکت سے عاجز رہنے لگے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات پڑھوانے شروع کرا دیئے۔ حضرت ہی کے صاحبزادہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب حضرت کے قریب ہو کر بیٹھ جاتے اور ملفوظات پڑھنے جاتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ بعض دقیق مقامات کی حضرت وضاحت فرماتے جاتے۔ بس جتنا عرصہ بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد دنیا میں گزارا اسی حال میں گزارا۔ اور فنافی الشیخ کے مقام کی امانت کو نہایت مضبوطی کے ساتھ محفوظ فرماتے رکھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگی کا احساس آپ کے نامزد خلفاء کی ملاقات سے خوب ہوتا ہے۔ صاحب تذکرہ حسن نے ایسے بیس بزرگوں کی ایک فہرست دی ہے۔ جن کو حضرت نے اپنے آخری سفر کراچی کی روانگی سے دو دن پہلے اپنے معتمد خاص حضرت پیر جی عبداللطیف کے سپرد فرمایا تھا۔ حضرت نے سپردگی بھی ایسے ہی انداز میں فرمایا۔ گویا پھر لاہور تشریف نہ لائیں گے۔ اور حضرت پیر جی کے دل میں یہ بات اسی وقت کھٹک گئی تھی۔ یہ بیسوں کے بیس بزرگ اپنی اپنی جگہ روشنی کا مینار ہیں۔ اور امت مسلمہ کے لئے ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ ہیں ان میں سے کسی ایک کی کچھ عرصہ کی ملاقات اور صحبت یہ واضح کر دے گی کہ حضرت نے ان بزرگوں کو تیار فرما کر امت مسلمہ پر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے۔ ان میں سے ہر ایک محبت الٰہی کی آگ میں جل رہا ہے۔ اور اپنے اثرات کو اپنے ماحول پر غالب کر رہا ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" والا معاملہ ہے۔

حضرت کے وصایا کا جائزہ لیا جاتے تو ہم وصیتوں میں سے صرف ایک ہے جو نفس دین سے تعلق نہیں رکھتی لیکن صلہ رحمی کے اعتبار سے وہ جزو دین ہے۔ اور وہ وہی اپنے دونوں بھائیوں کے متعلق کہ، کہ میری اولاد میرے بعد ان کا ادب ایسا کریں جیسا باپ کا۔ تو گویا حضرت کا تعلق صرف دین ہی سے تھا۔ دنیا کے ساتھ دنیا کی خواہش کے اعتبار سے مطلق نہ تھا۔ اور یہی حالت آپ کے بیسوں خلیفوں کی ہے۔ ان میں سے ایک نوجوانی کے ایام میں رحلت فرما گئے ہیں ان کا نام نامی تھا۔ مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب جو وزیر آباد میں غلہ منڈی کے آڑھتی تھے ان میں سے ہر کوئی دین کے لئے ایسے ہی سرگرداں ہے جیسا خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہوا کرتے تھے۔ اور یہی زندگی کی سب سے بڑی فائز المرامی ہوا کرتی ہے۔ کہ جو آگ اپنے کو لگی ہو وہ آگ اس دنیا سے رخصت ہونے سے پیشتر بیس اور کو لگا دی جاتے۔ تاکہ دین کا کام بیس گنا اور چمکنا شروع ہو جاتے۔

کراچی کا آخری سفر بھی یاد ہی رہے گا۔ حضرت جانا بھی چاہتے ہیں اور نہیں بھی۔ لیکن مشیت ربی پوری قوت سے کارفرما ہو رہی ہے۔ دونوں صاحبزوگاں کو حج کے لئے تشریف لے جا چکے تھے دل میں ان کے استقبال کا شوق بھی ہے۔ اور نہیں بھی جانا چاہتے۔ جب ڈاکٹر حضرات فتویٰ لگا دیتے ہیں کہ حضرت ہوائی جہاز کا سفر

ختیار فرما سکتے ہیں۔ تو عجیب حسرت بھرے انداز میں فرماتے ہیں "اچھا اب ہمیں کوئی یہاں پر رکھنے لئے تیار نہیں ہے۔ اب کراچی جانا ہی پڑے گا" جیسے مشیت ربی کے سامنے اپنی کوئی تدبیر نہ چل سکی اور مشیت الٰہی کے مقتضیات کا ادراک بھی ہو چکا ہو۔

اور پھر جب ائرپورٹ والوں کی گاڑی کے اندر ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لئے تشریف لے چ اور صاحبزادہ عبدالرحمن پیچھے پیچھے چلنے لگے تو حضرت نے صاحبزادہ صاحب کو قریب بلا کر چار پانچ مرت تکرار کے ساتھ فرمایا کہ "اچھا عبدالرحمن سب کچھ اللہ کے حوالے مدرسہ بھی اللہ کے حوالے اور تم بھی اللہ حوالے" الفاظ خود بزبان حال پکار رہے تھے۔ کہ حضرت کے یہ الفاظ آخری سپردداری تھی۔ جو اللہ رب الع کے حضور میں دعا و فریاد کے رنگ میں گزار رہے تھے۔ گویا بظاہر تخاطب طبعی تقاضا کے تحت صاحبز صاحب سے ہو رہا تھا۔ حضرت کوئی تین روز تو کراچی میں بہت خوش خوش رہے۔ چند احباب سے ملاقات بھی نصیب ہوئی۔ لیکن چوتھے روز اچانک ساڑھے دس بجے قلب کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ اور ساڑ بارہ بجے حضرت نے اس عالم فانی سے کوچ کیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

وفات: آپ کی وفات یکم جون ۱۹۶۱ء بروز جمعرات ساڑھے بارہ بجے محترم میاں جناب نور محمد صاحب کے مکان پر واقع ہوئی۔ میاں نور محمد صاحب آپ کے ان بیس خلفاء میں سے ہیں جن کا ذکر اوپر آچ ہے۔ حضرت اگرچہ تشریف لے جا چکے ہیں۔ لیکن آپ نے جس پاکیزہ مشن کے لئے اپنی حیات طیبہ وقف فرمائے رکھی وہ مشن بفضلہ تعالےٰ پوری رونق اور برکت سے جاری ہے اور انشاءاللہ قیامت تک جار رہے گا۔ دین جاری رہے گا۔ البتہ اس سے عناد رکھنے والے مٹتے رہیں گے۔

وَکَلِمَۃُ اللّٰہِ هِیَ الْعُلْیَاء

تاریخ وفات	وَاذْکُرْ رَبَّکَ کَثِیْراً وَّسَبِّحْهُ
۱۹۶۱ء

لوحِ مزار

تاریخ وفات و سجع

چوں مفتی محمد حسن رخت بست	رواں شد برائے جہانے دگر
بجاں گشتہ تیغ تسلیم شد	کہ از غیب جان ہر زمانے دگر
بگفتم بہ یک مصرع تاریخ و سجع	بدست آمدہ صنعتِ خوب تر

زروئے بشارت بگو اصطفا
شفیعش محمد، حسن راہبر
۲+۷۸ = ۱۳- ۱۳۸۰ھ

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۵ھ
۱۸۸۸ء

۱۳۷۷ھ
۱۹۵۸ء

خواجہ حسن نظامی

ابوالکلام آزاد

دہرا بدن، گورا رنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، سفید چھوٹی ڈاڑھی، آواز سریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار طبیعت میں شوخی اور ظرافت، دہلی کے رہنے والے ہیں، ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں مگر پیری مریدی کے زیادہ دلدادہ نہیں ہیں، قوم سید، پیشہ آزادی اور بے نیازی، حافظہ کی قوت بے مثال تصور کی حالت چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی تقریر و تحریر کے خودمختار بادشاہ نازک مزاجی میں نانا شاہ سیاست دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے۔

بیرونی ہند کے مسلمانوں میں اور امریکیوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں اور گوروں میں حسرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور لیوریین طرح سوچتے ہیں کہ ان کو یوریین کیوں کر ثابت کیا جائے۔ اگرچہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں تاہم ظاہرداری اور نمود کاری سے بیزار ہیں مسلمانوں میں اگر کوئی گاندھی جی ہو سکتے تو ابوالکلام ہوتے بلکہ سر اسٹیفرڈ کرپس کے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جواب ملے کہ ہندوستان میں گاندھی جی سیاسی درویش ہیں، جواہر لال یورپ کی سیاست کا عکس ہیں کیونکہ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان سے کہتے ہیں حالانکہ نئے زمانے کی سیاست میں یہ گناہ کبیرہ ہے صرف مولانا ابوالکلام آزاد چالیس کروڑ باشندوں میں ایسے ہندوستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ جاننے کے باوجود بھی سمجھتے ہیں اور اس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں اور مسکرا کر ایک نکیلا سیاسی نشتر حریف کے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لیے بہت ہی مفید ہے۔

قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اس کے مقاصد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔ ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انہوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا سب باتیں منظور ہیں بہ استثنائے شرکت مسلم لیگ" گویا ۳۴ سال پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آج کل ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک رازدار دوست سے کہا کہ جب مولانا ابوالکلام اور سر کرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعہ کرتے تھے کہ سر کرپس کچھ دیر جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔ اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے سوائے ان کے جو ان کی بادشاہی کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھیں۔ بہرحال مولانا آزاد موجودہ ہندوستان کیلئے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں ان کو سیاسی چراغ بھی کہا جا سکتا تھا اگر دوسرے سیاسی چراغ بھی روشن کر سکتے جس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی بظاہر سفید ڈاڑھی کے بوڑھے آدمی ہیں مگر مزاج کی شوخی اور بذلہ سنجی کہتی ہے کہ اب تک نوجوان اور زندہ دل نوجوان ہیں۔

شریف الحسن ناظر لکھنوی

بچپن، تعلیم اور صحافت

ولادت

حضرت مولانا ستمبر ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے عجب اتفاق ہے کہ وہی سرزمین وادی گنگ وجمن کا مسکن ولادت بنی جس کی رفعت وعظمت کا ایک سرا دامن عصمتِ خلیل سے ملتا ہے اور دوسرا سرا اس چوکھٹ پر ختم ہوتا ہے جس کی بلندی کی حد انسان کے خیال وفہم کی رسائی سے باہر اور مقام دنیٰ فتدلّٰی کے قریب ہے خاک مکہ سے ابوالکلام کو پیدا کرنا ان لوگوں کے لیے مشیت کا ایک تازیانہ عبرت، ودرس تھا جو عہدِ حاضر میں اسلام کے خلاف ابوجہل کی سنتوں کو تازہ کر رہے تھے اس لیے نگاہِ قدرت نے ابوالکلام کی ولادت کے لیے وہی سرزمین انتخاب کی جس پہ کلام نور نے نطقِ جہالت کو شکست دی تھی اور زمزم نے کشت ضمیر وفکر کو سیر وسیراب کیا تھا۔

تاریخی نام

امام الہند کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا گیا اور مصرع ذیل سے ہجری سال استخراج کیا گیا۔

جواں بخت ، جواں طالع ، جواں بار

ہندوستان کا سفر

سات آٹھ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آگئے اور اسی زمانہ میں آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔

بسم اللہ کی رسم شیخ عبداللہ مرداد نے صحن حرم میں ادا کرائی اور قرآن شریف اپنی خالہ سے پڑھا جو بڑی خوش آوازی سے تلاوت کرتی تھیں۔ اور اچھی طرح لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ مکہ معظمہ کی روانگی سے قبل قرآن پاک ختم کرلیا تھا، اور حرم کے سب سے بڑے قاری شیخ حسن سے قرأت سیکھ رہے تھے کہ اتنے میں ہندوستان کا سفر پیش آگیا۔

ابتدائی تعلیم

مشرقی علوم کی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا خیرالدین سے حاصل کی، ابتدائی معلموں میں دلی کے ایک فاضل مولوی محمد یعقوب اور مولوی عبدالحق خیرآبادی کے ایک شاگرد مولوی نذیرالحسن مرحوم امیٹھوی کا نام بھی شامل ہے۔ لیکن تحصیل علم کا حقیقی ذریعہ خود حضرت مولانا کے والد تھے۔ تھوڑے دنوں تک مولانا ہدایت اللہ جونپوری کے ایک معتمد شاگرد مولوی محمد ابراہیم اور ایک بالکل پرانی وضع کے شخص مولوی محمد عمر کے علاوہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس دوم شمس العلماء مولانا سعادت حسین مرحوم سے بھی حضرت مولانا کو کتب درسیہ پڑھنے کا اتفاق ہوا لیکن اس وقت کے بڑے بڑے علماء سے تحصیل علم نہ کرسکنے کے بارہ میں مولانا ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" میں جو شکایت حضرت مولانا کی زبان سے بیان کی ہیں ان میں سے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ حضرت مولانا کے والد کو علمائے وقت سے عام طور پر مذہبی سوء اعتقاد کی بدگمانی تھی اور یہ ڈر تھا کہ ان کی اولاد پہ وہابیت کا کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ علمی حیثیت سے بھی حضرت مولانا کے والد کی طبیعت میں ایسی بلندی واقع ہوئی تھی کہ کوئی بھی عالم وفاضل شخص ان کی نگاہ میں نہ جچتا تھا، خود طرح طرح کے مشاغل جاری کر رکھے تھے۔ اس لیے پورا وقت نکالنا مشکل تھا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ہر طرح کی مالی فراغت وبےفکری کے باوجود حضرت مولانا بہترین علماء اور نامور درسگاہوں سے تحصیل علم نہ کرسکے۔

بچپن میں شوق مطالعہ

حضرت مولانا کے والد کی زندگی چونکہ بزرگی، عظمت اور عوام پر ان کے غیر معمولی اثر سے مرکب تھی۔ لہذا قدرتی طور پہ بچوں کی زندگی بھی اسی سانچے میں ڈھل گئی اور طبعی طور پر کھیل کود کے جذبات ان کی فطرت

...گئے تھے کہ ان کی جگہ قبل از وقت سنجیدگی نے لے لی، کتابیں کھلونا بن گئیں، اور مطالعہ کھیل کود کے جذبات پر غالب آگیا۔ چنانچہ دس برس کی عمر میں حضرت مولانا کو کتابوں کا اتنا شوق ہو گیا تھا کہ ناشتے کے جو پیسے ملتے تھے ان کو جمع کیا کرتے تھے اور ان سے کتابیں خرید لیتے تھے، لیکن حضرت مولانا کے والد، اردو کتابوں کا مطالعہ چونکہ سخت تعلیمی بدچلنی تصور کرتے۔ لہٰذا اس جرم کا ارتکاب تو ضرور کیا گیا لیکن مخفی طور پر، چنانچہ حضرت مولانا اپنے ...ر کے نیچے کتابیں رکھتے اور موم بتی جلا کر مطالعہ کرتے۔ اکثر ایک ایک دو دو بجے رات تک مشغولیت رہتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا کی صحت میں اسی وقت سے فتور آنے لگا جب یہ راز کھلا کہ درسی کتابوں کے علاوہ حضرت مولانا اور کتابیں بھی دیکھا کرتے ہیں تو حضرت مولانا کے والد ...ت سختی سے مانع ہوئے اور ان کی نگرانی کرنے لگے۔

اردو کی تعلیم

اردو مکہ معظمہ ہی سے شروع ہو گئی تھی لیکن حروف ہجی کی مشق کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوا۔ کلکتہ پہنچ کر جب حضرت مولانا کے والد نے تعلیم کی طرف توجہ کی تو فارسی اور عربی شروع ہو گئی اور اردو کا معاملہ بالکل رہ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اردو پڑھنے کا شوق خود بخود پیدا ہوا۔ کچھ قصے حضرت مولانا کی بڑی بہن کے پاس تھے اور ایک مجموعہ پرانی قسم کی مثنوی کا تھا جس میں ابراہیم بن ادہم وغیرہ کے ...ے درج تھے وہ پڑھتی تھیں اور حضرت مولانا سنتے تھے۔ اس سے زیادہ شوق ہوا اور پھر وہ ان کے پاس زیادہ بیٹھنے لگے اور اردو پڑھنے لگے۔ اس کے بعد بطور خود پڑھنا شروع کیا اور لکھنے بھی لگے۔ اس طرح آہستہ آہستہ استعداد حاصل ہوتی گئی۔

شاعری کا شوق

اسی زمانہ میں حضرت مولانا کو شاعری کا بھی شوق ہوا اور پہلے اردو پھر فارسی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ اسی سلسلہ میں آب حیات، حیات سعدی، یادگار غالب اور شعراء کے کلیات و دواوین کا مطالعہ کیا اور پہلی غزل جو حضرت مولانا نے لکھ کر دوسروں کو سنائی، کلکتہ کے مشہور مشاعرہ کی اس طرح میں تھی۔

”پوچھی آسماں کی تو کہی آسماں کی“

عبدالواحد خاں نے یہ غزل مشاعرہ میں بھی پڑھی جن کی تحریک پر حضرت مولانا کو شاعری کی طرف توجہ ہوئی تھی۔ اس وقت تک کوئی تخلص ...ں رکھا تھا، عبدالواحد خاں نے ”آزاد“ تخلص تجویز کیا، اور سب سے پہلی غزل ارمغان فرخ میں شائع ہوئی جو بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ سے دو گلدستے علاوہ ”پیام یار“ کے نکلتے تھے۔ ایک لڑن صاحب خورشید مرحوم کا انتخاب دوسرا منشی نوبت رائے نظر کا ”خدنگ نظر“ انتخاب خورشید مرحوم کی ثقاہت و شہرت کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول تھا۔ ان دونوں میں بالالتزام حضرت مولانا کی غزلیں ہر ماہ چھپتی تھیں ...ماہوار مشاعروں کی زمینوں میں ہوتی تھیں۔

اصلاح سخن کی ضرورت محسوس ہوئی تو پہلے دو غزلیں منشی امیر احمد مرحوم کو بھیجیں اور انہوں نے اصلاح کر کے فوراً واپس بھیج دیں۔ لیکن حضرت مولانا کی طبیعت کچھ زیادہ خوش اور مطمئن نہیں ہوئی اور پھر جب شاعری کے متعلق مولوی ظفر احسن شوق دیوی کی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا تو حضرت مولانا نے ان سے خط و کتابت کی اور اصلاح لینا شروع کر دیا۔

نیرنگ عالم کا اجرا

اب شاعری کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ایک گلدستہ نکالنے کا خیال ہوا اور نیرنگ عالم کے نام سے ایک گلدستہ جاری کر دیا جو آٹھ ماہ جاری رہا یہیں سے حضرت مولانا کی اخبار نویسی کا آغاز ہوا، شاعری کے اس شوق کی تکمیل کے لیے شروع کی گئی۔

قوتِ بیانیہ

بیان کی قوت اور گویائی کا جوش کچھ فطرت نے عطا کیا تھا اور کچھ ورثہ میں ملا تھا، یہ دو آتشہ تھا، جس کے سرور نے مرید و معتقد بلکہ حضرت مولانا کے اساتذہ کو بھی مبہوت و متحیر کر دیا تھا، چنانچہ مولوی نذیر الحسن مرحوم نے جو حضرت کو درس دیتے تھے یہ التزام کر لیا تھا کہ کسی طالب علم کو اپنے سامنے نہ لاتے تھے۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا عجز و حیرت ان کے دوسرے طلباء پر ظاہر نہ ہو البتہ یہ ضرور تھا کہ غیر معمولی طور پر اتنی کم سنی میں حضرت مولانا کا ان کتابوں کو پڑھنا، ان پر تقریر کرنا اور اپنے اعتراضات سے لاجواب کر ان کے دل پر شاق نہیں گزرتا تھا بلکہ ایک خاص دلچسپی پیدا کر دیتا تھا۔

عمر میں شبہ

حضرت مولانا کی معلومات اور قوت بیانیہ جب اساتذہ کو متحیر کر دیتی تھی تو لوگ حضرت مولانا کی عمر کے بارہ میں شبہ ظاہر کرتے تھے، "عمر کی مشکل" کے زیر عنوان مولانا ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" میں لکھا ہے کہ طور پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ بعض لوگوں کا ہیکل ایسا ہوتا ہے کہ ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے مگر دیکھنے میں معلوم نہیں ہوتی، میں (حضرت مولانا) بھی ان لوگوں میں ہوں جس زمانہ کا میں حال بیان کر رہا ہوں اس زمانے میں میرے اساتذہ نے میرے والد مرحوم تک سے جرأت کر کے پوچھ لیا۔ انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کا نام فیروز بخت تاریخی ہے لیکن مولوی نذیر الحسن، مولوی محمد ابراہیم وغیرہ نے کبھی تسلیم نہیں کیا وہ ہمیشہ ہنستے اور کہتے کہ تمہاری عمر کم سے کم اٹھارہ انیس برس کی ہے لیکن بونے ہو بڑے دکھائی نہیں دیتے۔"

اسی زمانہ میں شاہ سلیمان صاحب (مرحوم) سے ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ تمہاری عمر ۲۵ برس کی ہے۔ مولوی ظہیر الحسن جن سے میں نے شاعری میں اصلاح لینی شروع کی تھی عرصہ کی خط و کتابت اور معائنہ کلام کے بعد جب کلکتہ آئے اور اسٹیشن پر میں ان سے ملا، مکان تک راستہ بھر وہ بالکل گم سم رہے، اور بار بار اس طرح پوچھتے رہے گویا ان کو بھی اس میں شک ہے کہ جو کلام میں ان کو بھیجتا ہوں وہ میرا ہی ہے یا کسی اور کا کہا ہوا ہے لیکن جب وہ دو چار دن رہے اور ہر طرح کی گفتگو اور مباحث میرے سنے اور اسی زمانہ میں ایک مختصر مشاعرہ بھی ترتیب پایا، میں خود انہوں نے دوپہر کے وقت مصرع طرح مجھے دیا اور مغرب تک میں نے اکتالیس شعر لکھ کر انہیں دیئے تب ان کی بدگمانی تو دور ہو گئی مگر تعجب باقی رہا۔"

" مولانا شبلی نعمانی سے میں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا، جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا "تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں" میں نے کہا "نہیں میں خود ہوں" ۱۹۰۴ء میں جب یہ دقت آئی تھی تو ۱۸۹۹ء سے لے کر ۱۹۰۴ء تک اس بارہ میں میری پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے (آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی)"

اسی زمانہ میں حضرت مولانا نے جب محمد حسین آزاد، سرسید خاں، اور دوسرے جدید مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو روشن خیالی میں اضافہ ہوا اور حضرت مولانا نے امام غزالی، ابن رشد اور دوسرے فلسفیوں کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور علم و حکمت کی طلب و جستجو میں طبیعت ہر وقت سرگرم رہنے لگی۔ اگرچہ خود حضرت مولانا اپنی اس زمانہ کی حالت کو مذہبی بے اعتنائی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن شاید اسی بے اعتنائی کا دوسرا نام جستجو اور تنقید و تحقیق ہے۔

ترکی، فارسی اور عربی

تحریر و تقریر کے شوق اور مطالعہ کے ذوق کے ساتھ باکمال شخصیتوں کا تعارف بھی حضرت مولانا کی شخصیت کی تعمیر اور ذہنی و فکری انقلاب کی تکمیل میں معاون و مددگار ثابت ہوتا رہا، چنانچہ آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی میں حضرت مولانا فارسی کے باکمال استاد مرزا محمد حسین اور شیخ الرئیس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آخر الذکر فارسی عربی اور قدیم معقولات

بے نظیر تھے عربی میں فصیح و بلیغ تقریر برجستہ کرتے تھے اور حضرت علی کے خطبات نہج البلاغۃ کی انہوں نے ایک بے نظیر شرح لکھی تھی شیخ الرئیس عربیہ کو بھی بہت شوق تھا، نجوم، رمل، جفر، حروفیات اور کیمیائے قدیم میں کافی دخل رکھتے تھے۔ اسی ذوق کی وجہ سے انہیں علم معادن اور عناصر کے بارہ میں نیز مختلف متحول اور انقلاب عناصر کے عملیات میں بہت دخل بہم ہو گیا تھا۔ شیخ الرئیس سے حضرت مولانا نے ان علوم بھی استفادہ کیا تھا۔

ان ہی ایام میں ایک اور مفید صحبت میسر آئی جو حضرت مولانا کی تعلیمی زندگی میں بے اثر نہیں کہی جا سکتی، ایران کے فاضل اور نئے علوم سے نے آشنا اور نئے طریق تحقیق و نظر کا ذوق رکھنے والے مرزا فرصت شیرازی اس زمانہ میں بمبئی آئے تھے۔ انہوں نے اگرچہ ایران کی نئی گاہوں میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ایک جرمنی مشن کے ساتھ آثار قدیمہ ایران کی تحقیقات کرنے کی وجہ سے انہوں نے جرمنی، فرانسیسی انگریزی زبانوں کے علاوہ نئے علوم اور خیالات میں بھی اچھی واقفیت بہم پہنچائی تھی، حضرت مولانا نے ان سے استفادہ کیا، فارسی ادبیات بعض دوسرے علوم میں بھی حضرت مولانا کو ان سے نہایت قیمتی فوائد حاصل ہوئے۔ چنانچہ مولانا ملیح آبادی کی کتاب آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی مرزا فرصت شیرازی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ انہوں نے مولانا کو نہایت قیمتی واقفیت بہم پہنچائی۔ اور وساتیر ان سے سبقاً پڑھی۔ قدیم ایرانی زبان و علوم ب و رسوم اور مصطلحات کے بارہ میں ان سے وہ نکات حاصل ہوئے جو لغت و ادب کے لیے نہایت قیمتی ہیں۔ فارسی اور سنسکرت کے کے نظریہ کے وہ بھی حامی تھے اور اس بارہ میں جو نئے نظریات مقبول ہوئے ان کا بڑی شدت سے رد کرتے رہے اور اس بارہ میں ں نے بہت مواد جمع کیا تھا۔

مولانا فرماتے تھے: ـ "میرے پاس ان کی دی ہوئی بہت قیمتی اور یادگار اشیاء ہیں مثلاً ان کے قلمی نقشے اور تصاویر، تخت جمشید کا ت کا خاکہ جو اصول ہندسہ کے مطابق انہوں نے تیار کیا تھا۔ قدیم فارسی کتب کے متعلق ان سے مجھے نہایت قیمتی اطلاعات ملیں۔ ان کے طہران جانے کے بعد بھی برابر خط و کتابت جاری رہی اور ان کے توسط سے مجھے وہاں بکثرت کتابیں میسر آئیں۔"

تقریباً اسی زمانہ میں حضرت مولانا کو ترکی زبان سیکھنے کا بھی موقع ملا اگرچہ اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ایک بہت قابل ترک طاہر بک حسن اتفاق سے کلکتہ پہنچے اور حضرت مولانا نے اپنے یہاں ان کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ سات آٹھ مہینے تک یہ وہیں رہے اور اس کے بعد قسطنطنیہ واپس چلے گئے۔ ان کی صحبت سے بھی حضرت مولانا کو بہت سے تعلیمی فوائد حاصل ہوئے، ان کے خیالات بالکل فلسفیانہ تھے اور حضرت مولانا کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ تمام مذہبی مباحث میں بجنسہٖ وہی خیالات رکھتے تھے اور ان کے اثبات کے لیے بعینہٖ وہی دلائل لاتے تھے جو اپنے خیال کے اصلاح پسند ہندوستان میں ظاہر کر چکے تھے، یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ ایک ہی جیسے حالات میں ایک ہی طرح کے خیالات پیدا ہونا ایک قدر مشترک ہے جو تمام ملکوں اور قوموں میں یکساں طور پر ظہور میں آئی ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ حضرت مولانا خود بھی سرسید مرحوم کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے اس لیے متوقع طور پر حضرت مولانا ان کی قدر کرنے لگے۔ ترکوں کے حالات، ترکی ادب، ترکی شاعری کے قدیم و جدید دور، مشاہیر ادیبوں اور نئی سیاسی جماعتوں کے نظریات اور طریق کار کے متعلق بہت سی مفید باتیں حضرت مولانا کو طاہر بک ہی سے معلوم ہوئیں اور آگے چل کر بہت کام آئیں۔

کتابوں کا شوق

سرسید کی تصنیفات کے مطالعہ نے نہ صرف علوم جدیدہ سے آشنا کیا بلکہ نئے علوم کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ یہ شوق پیدا ہوا کہ اردو، فارسی اور عربی میں نئے علوم کی جتنی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں انہیں جمع کیا جائے اور یہ شوق

اس قدر بڑھا کہ مصر و شام اور لبنان سے بھی علوم جدیدہ کی کتابیں منگاتے لگے۔ کئی کتب خانے بھی ہاتھ لگے جن میں ایک کتب خانہ حکیم عبدالرحیم دہلوی جن کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ نے اسے فروخت کر دیا تھا۔ اور دوسرا کتب خانہ مولوی کبیرالدین مالک اردو گائیڈ پریس کلکتہ کا تھا جو مولانا نے خرید
غرضیکہ اس طرح کتابوں کا شوق بڑھتا اور برابر مطالعہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں جب حضرت مولانا بمبئی میں گئے اور کچھ عرصہ تک مستقل قیام
تو یہاں شوق کتب کے لئے زیادہ بہتر مواقع میسر آئے کیونکہ یہاں کئی ایرانیوں کی کتابوں کی دکانیں تھیں اور مصری مطبوعات کے بھی کتب خانے تھے جن کی
سے مطالعہ اور انتخاب کتب کا بہترین موقع ملا۔ اتفاق سے ایک صاحب ذوق شخص نے اسی زمانہ میں کتابوں کی تجارت شروع کی تھی۔ اس کا نام عبدالله
جینیکر تھا۔ عربی ادب کی خود بھی اچھی استعداد رکھتا تھا۔ اور عربی میں شعر کہتا تھا۔ انہوں نے شیخ امین نامی مصر و قسطنطنیہ کے ایک تاجر کے ساتھ مل
کی تجارت کے لئے شرکت بھی کر لی۔ ان کے یہاں علوم و فنون کی بے نظیر کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا نئی قسم کی تصانیف کا۔ حضرت مولانا کے تعلیمی عہد کے
اس دکان کا وجود بھی بہت مفید ثابت ہوا۔ حضرت مولانا گھنٹوں اس دکان میں رہتے اور ہر علم و فن کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے اور پھر اپنی
حالت کے مطابق جتنی کتابیں خرید سکتے خرید لیتے۔ حضرت مولانا نے اعتراف کیا ہے ان کی تعلیمی زندگی پر عبداللہ کا یہ ایک احسان ہے۔

تحریر و تقریر اور ترجمہ

تحصیل علم کے اس ذوق و شوق کے ساتھ تحریر و تقریر اور ترجمہ کی مشق بھی جاری رہی۔ سب سے پہلے جو حضرت مولانا نے ترجمہ کیا وہ علامہ کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں جمعہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۰۱ء میں تحریر و تقریر کے ذوق کی ترویج و ترقی کے لیے مولوی رضا علی وحشت نے ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام انیس الاسلام تھا۔ سب سے پہلے ایک باقاعدہ لکچر کی صورت میں حضرت مولانا کو دہلی اتفاق ہوا، حضرت مولانا کا سب سے پہلا مضمون کب اور کس اخبار میں شائع ہوا اس بارہ میں کوئی قطعی بات اگرچہ نہیں کہی جاسکتی لیکن گمان غالب یہ ہے کہ حضرت مولانا کا پہلا مضمون جو شائع ہوا قدیم اقوام کی عجیب و غریب رسوم سے متعلق تھا جو حضرت مولانا نے قسطنطنیہ کے فارسی رسالہ سے اخذ کیا تھا، اسی زمانہ میں ندوۃ العلماء کے مباحثات شروع ہوئے اور ندوہ اور مخالفین ندوہ کے متوازی کیمپ قائم ہو گئے۔ ساتھ ہی رسائل و مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ ندوہ کے سفراء میں ایک شخص مولوی نظام الدین جھجری تھے۔ وہ مخالفین کے رسائل و مضامین حضرت مولانا کو دکھا کر ان کے جوابات لکھواتے تھے اور پھر ندوہ کی استقبالیہ کمیٹی ان کو چھاپ کر شائع کر دیتی تھی۔ اس قسم کے دو تین چھوٹے چھوٹے رسائل شائع ہوئے اور غالباً مذہبی رسائل کے بعد نئی قسم کی چیزوں میں یہ پہلا قطع تھا جن کی اشاعت تک کی نوبت آئی۔

عربی اخبارات کا مطالعہ

عربی اخبارات کے مطالعہ نے عالم اسلامی کے مسائل سے پوری اور گہری دلچسپی پیدا کر دی جو خاندانی علائق کی وجہ سے پہلے ہی سے طبیعت میں موجود تھی۔ یہ دلچسپی اس کے بعد برابر ترقی کر گئی اور اس قدر کثرت کے ساتھ حضرت مولانا عالم اسلامی کے حالات و مباحث کا مطالعہ کرنے لگے کہ شاید ہی ہندوستان میں اور کسی شخص کو اس کثرت کے ساتھ مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔

جامعۃ الازہر میں تعلیم نہیں پائی

یہی زمانہ ہے جب حضرت مولانا نے عالم اسلام کی سیر کی اور مصر میں کچھ عرصہ قیام کیا لیکن یہ روایت درست نہیں ہے کہ انہوں نے قاہرہ کی مشہور درسگاہ جامعۃ الازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ چنانچہ وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے بھی اس مشہور روایت کے متعلق پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا تھا کہ آج میں ایک غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں جو مجھ سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ یہ غلطی اس سرکاری ریزولیوشن میں بھی ہے جو مولانا کی وفات کے بارے

...اری ہوا ہے۔

عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مولانا نے قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ...ہرہ گئے تھے لیکن انہوں نے وہاں تعلیم نہیں پائی لیکن وہ کئی برس تک عرب میں رہے وہ وہیں پیدا ہوئے اور دوسرے مغربی ایشیا کے ممالک ...ح وہ مصر بھی گئے تھے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہلکات و موانع کے باوجود علم کے شوق نے طفولیت ہی سے ساتھ دیا تھا اور ابتدا ہی سے ...ت کی رفتار کچھ ایسی پڑی کہ بلا کسی خاص خیال و تشریح کے حضرت مولانا تحصیل علم میں مصروف رہے اور یکے بعد دیگرے حصول علم کی نئی نئی راہیں ...یں اور مطالعہ مولانا کا طبعی مشغلہ بن گیا۔ تحصیل علم کی اس دھن میں بلاشبہ حضرت مولانا کی خاندانی حالت، نسلی توارث، آبائی روایات ...زلی ماحول کو بہت کچھ دخل ہے۔ جس میں حضرت مولانا کے والد کا وہ غیر معمولی تشدد بھی شامل کر دینا چاہیے جو اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں ...ی رہا اور جس نے لہو و لعب کی کوئی راہ کھلنے ہی نہ دی لیکن حضرت مولانا خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ طبیعت ثانیہ جو خاندانی ریاست و پیشوائی کی ...اور انسانوں کی پرستش سے پیدا ہو گئی۔ اس کی غیر مسخر طاقت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اللہ کا فضل و کرم دستگیری نہ کرتا اور خود ...ہ مولانا کو وہ ذہنی و فکری بحران نہ پیش آتا جو ایک زمانہ میں مرض اور دوسرے زمانہ میں شفا کا ذریعہ بنا تو پھر علم و حکمت کے اس سمندر میں حضرت ...ا کی ذہنی بربادیوں کا نہ جانے کیا حال ہوتا جس میں ناخدا کی امداد کے بغیر ساحل مقصود پالے کے لیے شناوری کر رہے تھے۔

...بے نظیر صحافت

نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:۔

لائڈ جارج سے ایک بار کسی نے پوچھا "صحافی بننے کے لیے ایک انسان کو کیا کیا جاننا چاہیئے"؟

انہوں نے جواب دیا "سب کچھ اور کچھ نہیں" یعنی صحافی دراصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے لیکن ماہر کسی کا نہ ہو۔ لیکن مولانا ...جیب و غریب خصوصیت تھی کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے یہ ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیا کے ...ت میں مشکل سے مل سکتی ہے۔

نیاز فتح پوری مولانا کی صحافت کو عہدِ حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف قرار دیتے ہیں، اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے مادرائے ...لت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔ موصوف کی رائے میں مولانا کی صحافت خود ان کی صحافت تھی جسے خود انہوں نے ایجاد ...ور جو انہیں کے ساتھ ختم ہوئی اور جس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جس میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ تھی۔

...افت کی ابتداء

صحافتی زندگی کی ابتدا کب ہوئی؟ تاریخ کا تعین اگرچہ دشوار ہے، لیکن مولانا ملیح آبادی کی تالیف "آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری کے ذوق میں حضرت مولانا نے ...ب سے پہلا رسالہ "نیرنگِ عالم" جاری کیا تھا جو پچاس روپے کے مختصر سرمایہ سے ان کی ادارت میں آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ اس کے علاوہ ...ار "المصباح" "تحفہ محمدیہ، خدنگِ نظر، احسن الاخبار، رسالہ مخزن، الندوہ، اخبار وکیل اور کلکتہ کا ہفتہ وار اخبار دارالسلطنت حضرت مولانا کی صحافتی ...ا کے ابتدائی عنوانات ہیں جن میں نہ صرف یہ کہ مولانا نے مضامین لکھے بلکہ ان میں سے الندوہ، اخبار وکیل اور خدنگ نظر کے حصہ نثر کی ادارت ...فرائض بھی انجام دیئے لیکن عنوانات کی اس فہرست میں سرنامہ کی جگہ لسان الصدق کو حاصل ہے جسے حضرت مولانا کی صحافتی زندگی کا سنگِ میل ...لمنا چاہیے جسے حضرت مولانا نے خود جاری کیا۔ لسان الصدق پہلا رسالہ تھا جس نے حضرت مولانا کی صحافتی و علمی عظمت کو علماء کے طبقہ میں نظر ...ایا اور شبلی اور حالی جیسے ادیبوں اور دانشوروں نے محسوس کیا کہ علم و ادب اور صحافت و سیاست کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہو رہا

ہے جو خواص و عوام کی زندگی کے تاریک گوشوں میں اجالا پھیلائے گا اور زندگی کی نئی سحر کا پیام دے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ لسان الصدق جس فضا اور ماحول میں رہ کر جاری کیا گیا تھا وہ حضرت مولانا کے لیے بہت تنگ تھی اور بہت سی باتیں تھیں جنہیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے لیکن اس کے بند ہونے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ ان باتوں کے کہنے کے حضرت مولانا کھل کر کہنا چاہتے تھے۔ فضا ناساز گار اور ماحول تنگ تھا بلکہ اس کی دوسری وجہ عراق کا سفر بھی ہے جو ایسے حالات میں پیش جو ناگزیر تھے۔

الندوہ کی ادارت

لسان الصدق کا سکہ اہل علم کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا، چنانچہ جب مولانا شبلی کی قدر شناس نگاہوں کی ادارت کے لیے حضرت مولانا کو منتخب کیا اور ان کے اصرار پر حضرت مولانا نے الندوہ کی ادارت ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی، ماحول کچھ اور تھا لیکن یہ فضا اور ماحول بھی مولانا کو نہ بھایا کیونکہ ایک طرف مدعیانِ فضل و کمال کی حاسدانہ ز... تھیں اور دوسری جانب اہلِ سیاست کی سازشیں جو ندوہ اور اہل ندوہ سے حضرت مولانا کی بیزاری کا سبب بن گئیں، اور سات آٹھ ماہ کے بعد ہی آ... واپس چلے گئے تاہم اس دورِ ناخوشگوار میں بھی انہوں نے الندوہ کو جس بلندی پر پہنچایا وہ "الندوہ" کا دور زریں کہلاتا ہے اور نیاز فتح پوری کے "معاملہ عوام کا نہیں بلکہ خواص کا تھا اور خواص میں بھی جماعت علماء کا، لیکن مولانا نے انہیں بھی اپنی انفرادیت کا اعتراف کرائے نہیں چھوڑا ——"

اخبار وکیل

اسی زمانہ میں شیخ غلام محمد مرحوم امرتسر سے ایک اخبار نکالتے تھے جس کا نام وکیل تھا۔ حضرت مولانا بھی گاہ گاہ مضامین... تھے، لکھنؤ میں شیخ غلام محمد مرحوم کا خط آیا کہ حامد علی صدیقی جو اس وقت ایڈیٹر تھے اپنی اصلی ملازمت پر واپس چلے... کوئی ایڈیٹر نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ آجاتے۔ اگر آپ آجائیں تو میں اخبار بالکل آپ کے سپرد کر دوں جس میں پوری آزادی... اپنے خیالات ظاہر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کر کے حضرت مولانا امرتسر گئے اور محض عارضی طور... اخبار کی ترتیب شروع کر دی مگر اس کے بعد طبیعت بگڑنی شروع ہو گئی جس کی وجہ غالباً اس کے سوا کچھ نہیں کہ "وکیل" اس وقت کے ام... اخبارات میں سب سے زیادہ متین و سنجیدہ اور قومی مسائل میں صاحب رائے و نظر اخبار تسلیم کیا جاتا تھا اور متعدد معاملات میں اس نے ا... وقیع درجہ بھی نمایاں کر دکھایا تھا۔

اخبار دار السلطنت

وکیل کی ادارت کے زمانہ میں حضرت مولانا کے بڑے بھائی مولانا ابوالنصر کا انتقال ہو گیا۔ مولانا خود بھی علیل تھے، اس... لیے دل برداشتہ ہو گئے اور والد کے اصرار پر کلکتہ واپس چلے گئے۔ یہاں کچھ عرصہ تک اخبار دار السلطنت کا مشغلہ رہا، لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ اخبار کے مالک مرحوم عبد اللطیف دوسرے لوگوں کے اغراض سے متاثر ہو کر اخبار کی پالیسی میں دخل دینے ... ہیں تو حضرت مولانا نے اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر اخبار ہی بند ہو گیا۔

اخبار وکیل سے علیحدگی

آٹھ نو ماہ بعد پھر وکیل ہاتھ میں لیا، لیکن اتنے عرصے میں بہت سی باتوں میں تغیر پیدا ہو گیا تھا ا... تغیرات کا سلسلہ پوری سرعت کے ساتھ جاری تھا اس مرتبہ حضرت مولانا کے سیاسی خیالات ... خاص مسائل ہند کے متعلق وہ تبدیلی ہوئی جس نے آگے چل کر حضرت مولانا کے "عہدِ الہلال" کے مسلک کی طرف رہنمائی کی۔ شیخ غلام محمد مرحوم جو ... ان خیالات سے نہ تو متفق ہو سکتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے لہٰذا نو دس ماہ کے بعد حضرت مولانا پھر دل برداشتہ ہو گئے اور امرتسر سے بھوپال ...

اس زمانہ میں حضرت مولانا نے یہ رائے قائم کی کہ جو مقاصد اب پیش نظر ہیں وہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتے جب تک ایک طاقت ور
مع انتظام واہتمام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے اور ذاتی پریس نہ ہو۔

لال کا اجراء

"۱۹۰۶ء کے موسم گرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں حضرت مولانا کی چشم بیداری نے یہ خواب دیکھا اور کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہوگئے۔ امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش
یشہ مضطرب رکھا اور یاس وقنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ وعزم پر غالب آگیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں اس خوابِ عزیز کی تعبیر ملی اور الہلال عالم
ں آیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔"

نا کا مسلک

نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ "مولانا نے الہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے نہایت غائر مطالعہ کا نتیجہ تھا وہ یہ فیصلہ تو الہلال کے اجرا سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیے
ی تسلط کو ختم۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اور یہ وہ راہ ہے
ں شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی۔" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام و مشترک جذبہ
ت بیدار نہ ہو۔ مذہب وملت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصول مقصود ممکن نہیں۔ لیکن ملک کی آئندہ سیاست کا جو نقشہ ان کے سامنے
ں کا تقاضا یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے عملِ تخریب سے کام لیا جائے کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچہ اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح
ممکن نہ ہو تو ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچہ کو توڑا جائے اور پھر از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کج مج خطوط
کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پر عمارت قائم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہنِ انسانی رسوم وروایات سے اس
ب داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن ودماغ کو سادہ
اس پر دوسرے نقوش قائم کئے جائیں۔

ہنی جوانی

قاضی عبدالغفار مرحوم آثار ابوالکلام میں لکھتے ہیں "مولانا کی ذہنی جوانی کا سب سے زیادہ موثر مظاہرہ الہلال تھا جس کی اشاعت کے وقت تک ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا پس منظر کم وبیش وہی تھا جس کا نقشہ سرسید احمد نے
۵ء کی جنگِ آزادی کے بعد بنایا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا جب تقسیم کرو اور حکومت کرو کا سرکاری مسلک اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا۔
اسی زمانہ میں مسلم لیگ کی پیدائش ہوئی۔

وامی افکار میں انقلاب

الہلال نے اپنی مختصر زندگی میں عوامی افکار کے ایسے نقشے بنا دیئے جو نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی اہمیت رکھتے تھے اور اس لیے تعلیم یافتہ گروہ سے زیادہ مسلم عوام کے لیے دلپذیر تھے، الہلال
لمات پر بعض اہم قومی اور مذہبی مسائل زیر بحث آتے رہے جنہوں نے ملتِ اسلامی کے ذہنی نقشوں کو بالکل بدل دیا ان مباحث میں
الادم مفسرین ومتکلمین کے طریق استدلال سے ہٹ کر اپنی اجتہادی قوت کو اس طرح واضح کرتے تھے کہ ہر قدم پر انہوں نے تقلید جامد کی
ریاں توڑیں اور صاف صاف فرمایا کہ دنیا کی کوئی تعلیمی صداقت بھی ایسی نہیں ہے جس کے پیرو اس کا دروازہ آگے کی تعمیل وتحقیق کے لیے بند کرسکیں
لکہ ہم حقیقت کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتے۔ وہ تمام لوگ جو حقیقت وصداقت کے متلاشی نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص خیال اور جذبہ سے اپنی کوئی بات منوانی
اور دوسرے کی کوئی بات گرانی چاہتے ہیں طریق "جدل" پر عامل ہوتے ہیں۔ ہمیشہ اس ڈھونڈھ میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوائی

دیں، مذاہب عالم کے پرجوش حامیوں، مذہبی مجالس کے زبان دراز مناظروں اور مذہبی بحث ونظر کے بنائے ہوئے نام نہاد علوم میں دسترس والوں کا غالب حصہ اسی طریق جدل کی پیداوار ہے ..... مذاہب کی تعلیم اور پیروانِ مذاہب کا فہم و عمل دو مختلف چیزیں ہو گئی ہیں چیز نہیں ہیں۔

پنڈت نہرو کی رائے

بقول پنڈت نہرو (ڈسکوری آف انڈیا) مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الہلال میں مسلما نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا اندازِ تخاطب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے اور سرسید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتبِ خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو رہا تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے ہندوستان کی ایک متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ اس کی دعوت سے ہندوستان کا اسلامی ذہن وقت تک بیگانہ تھا۔

مولانا نے قدامت پرستی کے مخالف قومیت کے قلعہ پر حملہ کیا، لیکن یہ خطِ مستقیم نہیں بلکہ ایسے افکار کی اشاعت کر کے علی گڑھ کی بنیاد کو ہلا دیا۔

علی گڑھ کی تحریک

مولانا اس وقت علی گڑھ کے مسلک سے کس قدر دور تھے، اس کی ایک مثال اجودھیا میں قربانی گاؤ کا جس پر مولانا نے عام مسلمانوں کے جذبات کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی حتیٰ کہ ان کے دوست حکیم اجمل بھی جو اس وقت علی گڑھ کی تحریک کے حامی تھے، الہلال کی رائے کے خلاف آواز اٹھانی پڑی۔ ملک کی صحافت میں اس بحث کا لہجہ بہت اور مولانا محمد علی سے بھی مولانا کے نظریات کا غالباً یہ پہلا تصادم تھا۔ (قاضی عبدالغفار)

مولانا محمد علی سے اختلاف

مولانا محمد علی اکثر مولانا کو ضدی مولوی کے نام سے یاد کرتے تھے لیکن غور کیجئے تو مولانا کی ضد ہی میں ان کی شخصیت کا اصل استحکام نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی اور مولانا کی انفرادیت میں ایک بہت بڑا فرق تھا۔ مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر تھے ———— مولانا مفہوم اور انداز کی عمومیت سے تقریباً بیگانہ رہے۔ ان کی انفرادیت کے دائرہ میں سب سے نمایاں عنصر عوام کی مقبولیت نہ تھی، بلکہ خود بجائے خود تھی۔ مولانا بسا اوقات اپنے نقاد اور مخالف سے دست و گریباں ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت ان کی کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا۔ لیکن مولانا بعض اوقات دوسروں پر اسلئے تنقید یا تعریض نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ احساسِ کمتری نہیں بلکہ ایک مزدوری اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدانِ جنگ میں اس لیے نہیں کھاتی کہ اسے برابر کا حریف نظر نہیں آتا۔

(ابو سعید بزمی)

الہلال کی دعوت

اس طرح درحقیقت حضرت مولانا نے الہلال کے ذریعہ مذہب اور اخلاق کے معاملہ میں غفلت کے بند دروازے کھولے اور ان کی آواز عوام کی زندگی میں گونجی۔ چنانچہ الہلال کی تحریک، دعوت اور اس کے نتائج کے متعلق خود فرماتے ہیں "الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی پہلے وہ اپنے بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لیے بیہودہ کر لیسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے

...رنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انہیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہوگیا ...گورنمنٹ قائم ہوجائے گی مگر الہلال نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی ...دی اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت و سوراج ہے . . . . میں بتلانا چاہتا ہوں کہ الہلال تمام تر ...یا موت کی دعوت تھی۔"

...یت وصداقت کا پیغام

"میرے عقیدہ میں ضرورت اور وقت جب حق کے ساتھ جمع ہوجائیں تو پھر خدا کی بنائی ہوئی اس سقفِ نیلگوں کے نیچے کوئی شے ایسی نہیں جو اعلانِ حق کے لیے مجبوری ہوسکے اور اگر ہو تو وہ تمہارے قصور ہے اعلانِ حق کے وجوب کا بطلان نہیں۔"

"میں موجودہ حالات کو کبھی بھی ایسی تعبیرات باطلہ سے مخفی نہیں کرسکتا جس سے اس کی اصلی حقیقت پر پردے پڑ جائیں۔ اگر تم کسی خونچکاں ...ایک ریشمیں لحاف ڈال دوگے تو کیا یہ ثابت کرسکوگے کہ وہ مردہ نعش نہیں ہے۔"

"الہلال ابتدا سے حق کی قوت کا واعظ ہے اور اللہ علیم ہے کہ مجھے سورج اور چاند کے وجود کا اتنا یقین نہیں جتنا کہ حق کی کامیابی اور باطل کے ...پر ایمان ہے، یہ میرے محسوسات اور مرئیات ہیں اور ان میں کسی کو مجھ سے لڑنے کی ضرورت نہیں۔"

"کوئی سچی بات اس لیے نہیں ترک کی جاسکتی کہ لوگ اس کا استقبال کریں گے پہ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں اس کا ایک بھی دوست ..."

"...سچائی کی فاتحانہ حقیقت پر میرا اعتماد ہے اور اعلانِ حق اور امر بالمعروف کا فرض شرعی خوف، ظنون وہجوم شبہات سے ساقط نہیں کیا جا ...اگر دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کو چراغ کی روشنی دھندلی نظر آتی ہے تو یہ ان کی "آنکھوں کا ضعف" ہے۔ ان کی خاطر چراغ گل ...کئے جاسکتے۔"

"جب تک میرے عقیدہ کی غلطی مجھ پر واضح نہ کر دی جائے میں اس کے مطابق کام کرنے پر مجبور رہوں اور کسی اعتراض اور کسی مخالفت ...تزلزل نہیں ہوسکتا۔"

...جدید لٹریچر کا اثر

حق وصداقت اور حریت پسندی کا یہ غیر متزلزل مسلک تھا جس پر الہلال اپنی زندگی کے آخری پرچہ تک گامزن رہا۔ حضرت مولانا نے درحقیقت مصر و عراق کی سرزمین پر قومی آزادی کے دلفریب چہرہ کی ایک جھلک دیکھ ...لی اور وہ یہ بھی دیکھ آئے تھے کہ بعض اسلامی اور مشرقی ممالک میں کس طرح اندھیری رات کے بعد آزادی اور حریت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ ...نہیں اگر مصر کے جدید لٹریچر اور مصری صحافت کے نمایاں رجحانات نے نوجوان آزاد کے گرم خون کی گردش کو بھی پہلے سے زیادہ تیز کر دیا ہو۔ ...وہ اپنے دل کے سوز کو ابنائے وطن بالخصوص مسلمانوں کے دل میں منتقل کرنے کی تمنا رکھتے ہوں اس لیے جن راہوں سے انہوں نے مسلمانوں ...تک پہنچنے کی کوشش کی ان میں سب سے زیادہ روشن اور واضح راہ مذہب کی تھی چنانچہ آپ الہلال کے فائل اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ...زندگی سیاست کی تعلیم کے سلسلہ میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی ایسا پہلو نہ تھا جس کی تائید میں انہوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کیے ہوں ...ملّت کی ہدایت کے لیے احکام الٰہی کی حجت سے کام نہ لیا ہو۔ دوسری راہ جو مسلمانوں کے کلچر اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لیے ...قابل قبول ہوسکتی تھی ادب و انشا کی راہ تھی۔ سو اس باب میں الہلال کی یہ خصوصیت کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ اس نے اتنا بڑا ذخیرہ

شعر و ادب کا جمع کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعراء فارسی کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اس کا بڑا استھرا انتخاب آپ الہلال کی مدد سے پیش کر

(نیاز فتح پوری اگست ۱۹۵۷ء)

ملتِ اسلامیہ کی بیداری

ملتِ اسلامیہ کی روح انفراد کی غفلت میں سو رہی تھی، ذہن و دماغ کے تغیرات میں خواب و... تھی جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدل رہی تھی۔ الہلال کی تحریک و دعوت پر بالآخر وہ جدو... میدان میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ جدوجہد ایسا سفر تھی جس کی بندھی ہوئی منزلیں تھیں، ٹھیرائی ہوئی رسم و راہ تھی۔ حضرت مولانا نے الہلال کے... ملتِ اسلامیہ کو اس سفر کی بندھی ہوئی منزلوں کی طرف رہنمائی کی، ٹھیرائی ہوئی رسم و راہ سے آگاہ کیا۔ بے شمار رکاوٹوں کی نشان دہی کی... مشکلات کے مقابلہ کی سکت اور برداشت کی توانائی پیدا کی۔ الہلال درحقیقت نالہ جرس تھا، لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

تقسیم بنگالہ کی تنسیخ

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ نے مسلمانوں کی قدیم سیاست پہ اگرچہ ایک سخت ضرب لگائی جس کی اسا... کی جنگِ آزادی میں حریت پسندوں کی ناکامی کے بعد سرسید نے علی گڑھ میں رکھی لیکن مسلمانوں کی... اب بھی برطانوی حکومت کے دامن سے لپٹی ہوئی تھی اور برطانوی سامراج کی چوکھٹ پر نیازمندانہ سجدہ کر رہی تھی۔ یہی زمانہ تھا جب... کی بے پناہ شخصیت پوری قوت کے ساتھ الہلال کے صفحات پر نمایاں ہوئی اور بہت جلد پرانی سیاست کے پرانے نقشے بدلنے میں کامیاب... گی۔ یہاں تک کہ جسٹس نذیر حسن مرحوم نے جو اس وقت مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا اور بالآخر ۱۹۱۳ء... کے پلیٹ فارم پر "سرکار" کی وفاداری کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے لیے موزوں حکومتِ خود اختیاری کا نام بھی زبان پر آیا اور مولانا نے... وفاداری و حکومت خود اختیاری کے ساتھ موزوں کی شرط پر اعتراض کیا جس نے سرکار پرست لیگ کی قدیم قیادت کی طرف سے مسلمانوں کے... پسند عناصر کو بدگمان و بدظن کر دیا۔

ضبطئ ضمانت

انگریزوں کی حکومت مسلمانوں کی سرکار پرست قیادت کے اس اضمحلال کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہی تھی... مولانا نے حالات کو بہتر دیکھ کر جدوجہد کو تیز کر دیا اور حکومت آپ کو تشویش... نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

نتیجتہً

الہلال اور مولانا کا وجود حکومت کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ اور... کانپور کے سلسلہ میں الہلال کے مضامین نے صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کے گورنر کو بے چین کر دیا۔ انجام کار پہلے تو الہلال کی ضمانت ضبط... گئی اور پھر ۱۹۱۵ء میں مولانا بھی بنگال سے خارج البلد کر دیئے گئے۔ الہلال کا یہ انجام مولانا کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

البلاغ کا اجرا

الہلال کے بعد حضرت مولانا نے البلاغ جاری کیا۔ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں، اس کا لقب العین بھی وہی تھا جو الہلال... کا لیکن طریقِ البلاغ کچھ مختلف تھا، تیور وہی تھے لیکن رخ دوسرا تھا۔ انداز فکر وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال... نفسیات عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیاتِ ذہنی کا۔ الہلال حرکت و عمل جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی... دنیا...

اخبار پیغام

البلاغ کا سلسلہ اشاعت منقطع ہوا تو ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا نے کلکتہ سے ایک اور اخبار پیغام جاری کیا جس... کے مسلک کی نگرانی وہ خود کرتے تھے اور اکثر اس میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں احباب کے اصرار پر... الہلال کو دوبارہ جاری کیا لیکن اس بار بھی الہلال کے خرمنِ حیات کو حکومت کی نگاہ گرم نے پھونک ڈالا۔

دار و رسن کی آزمائش

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک تعزیری عدالتیں اور قرون وسطیٰ (مڈل ایجز) کی پراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے اُن سے ہمارے زمانہ کو نجات مل گئی۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں جن کے اندر وہ خوفناک اسرار بند تھے لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں۔ اس جگہ (عدالت میں) کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابل رشک ہوں۔ ان کو اپنی خواب گاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے۔ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک بھی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے۔"

اہم سیاسی موڑ

گذشتہ نصف صدی میں دو موڑ ایسے آتے تھے جہاں پر انقلابی قوتیں بیدار ہوئی تھیں۔ پہلا موڑ تو وہی حادثہ مسجد کانپور کا تھا اور دوسرا جلیانوالہ باغ کا قتل عام۔ مسجد کانپور کا انہدام گویا ایک شدید ٹھوکر تھی جس نے علی گڑھ قدیم سیاست کو مسمار کر دیا اور اسی نقطہ سے مولانا نے بھی اپنی ملت کے لیے طالب حق کا ایک راستہ معین کیا۔ مسجد کانپور کے انہدام کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اپنے ایک اداریے میں لکھا تھا کہ:۔

"تعجب ہمیشہ اس واقعہ پر ہوتا ہے جو نادر و عجیب ہو اور شکایت ہمیشہ اس سے ہوتی ہے جس سے توقع ہو۔ مجھ کو نہ اس واقعہ پر تعجب ہوا اور نہ شکایت پیدا ہوئی۔ میرے سامنے تاریخ ہے اور قوموں کی سرگذشتیں ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ طاقت نے ہمیشہ غرور کیا ہے اور حکومتوں نے ہمیشہ حق و حیات کے سائلوں کو ایسا ہی جواب دیا ہے۔ میں روز اول ہی سے جانتا تھا کہ یہ سب کچھ یکے بعد دیگرے ہونے والا ہے اور وقت اور موسم کے "تغیر" کا انتظام کیا جا رہا ہے۔"

جو آگ اس وقت لگی ہوئی تھی مولانا نے اسی کے انگاروں سے اپنی قوم کے دلوں کے آتش خانوں کو گرم رکھنے کی کوشش کی:

"وقت نازک ہے اور موسم مخالف ہے، غفلت کے جھونکے چلنے لگے ہیں اور جھنجھوڑنے والے ہاتھ بے حرکت ہو گئے ہیں حریف قوی و شاطر، مقابل فریب خوردہ وسائل و مطامع دلفریب اور ایمان کی آزمائش امتحان طلب ہے۔ سفر ابھی شروع ہی ہوا ہے اور تجربہ کی زاد راہ سے مسافر تہی دست ہیں ایسا نہ ہو کہ قدرت کی بخشی ہوئی ایک فرصت ہشیاری ضائع کر دی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جو برسوں کی جگہ مہینوں میں حاصل ہوا تھا پھر غفلت و سرشاری پر قربان کر دیا جائے۔"

ہر ایسے قومی حادثہ کو حضرت مولانا الہلال کی سیاسی دعوت کا پس منظر بنا لیتے تھے اور جب تک الہلال جاری رہا وہ اس کے صفحات پر حریت فکر و نظر متحدہ قومیت اور حب الوطنی کا پیام دہراتے رہے۔

چند روز بعد جب ہندوستان میں ایک استبدادی حکومت کی دار وگیر شروع ہوئی تو مولانا نے اپنی "دعوت" کے رُخ کو زیادہ زیادہ واضح کرنا شروع کر دیا۔ کلکتہ کی عدالت میں انہوں نے اپنا جو مشہور بیان تحریری پیش کیا اس میں الہلال کی تحریک اور اس کے کا ذکر "قول فیصل (مولانا آزاد کا کلکتہ کی عدالت میں تحریری بیان) کے ایک اقتباس کی صورت میں گذشتہ سطور میں چکا ہے۔

رانچی میں نظر بندی

۱۹۱۵ء میں مولانا بھی بنگال سے خارج البلد کر دیئے گئے۔ "الہلال" بھی بند ہو چکا تھا۔ یہاں سے مولانا کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔

بنگال سے جلا وطن ہو کر مولانا رانچی گئے اور بعد میں وہیں نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا کی زندگی میں یہ ایک ایسی تنہائی اور خاموشی کا دور تھا جس میں بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے کاموں کے لیے تیار ہوا کرتے ہیں۔ ——— اس کے بعد مولانا نے اپنے عزائم کے نقشے میں رنگ بھرا اور وہ اس فیصلہ کن کش مکش کے لیے تیار ہوئے جس کا نتیجہ بیس سال بعد نکلنے والا تھا

رولٹ ایکٹ

ہندوستان کی سیاست میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک کا دور ایک غلام ملک کی زندگی کے نشیب میں اس کے فراز کا ایک انقلاب انگیز منظر ہے جس وقت ۱۹۲۰ء میں مولانا نظر بندی سے آزاد ہو کر باہر آئے تو رولٹ ایکٹ کا نفاذ ملک میں آگ لگا چکا تھا اور مسٹر گاندھی اپنے عدم تشدد اور عدم تعاون کے تمام ساز و سامان کے ساتھ میدان میں آ چکے تھے جس دن جلیانوالہ باغ کے دروازے پر جنرل ڈایر نے اپنی فوج کی رائفلوں اور کلدار توپوں سے برطانوی اقتدار کے استحکام کی ایک آخری کوشش کی تو اس کے ساتھ ہی ملک میں ایسا طوفان آیا جس کے جوش و خروش کی کوئی مثال ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں دیکھی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے تشدد کو اب مہاتما گاندھی نے اپنے اہنسا سے بدل دیا تھا اور یہ ایک ایسا اخلاقی حربہ انہوں نے ایک غلام قوم کے ہاتھ میں دیا تھا جس کی قوت کا کوئی اتنا بڑا مظاہرہ اس سے پہلے دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوا تھا۔ اس وقت گاندھی جی نے اپنی قوم کے اندر خیالات ارادوں اور جذبات کا جو بے پناہ ہیجان پیدا کر دیا وہ ایک ایسی اخلاقی اور روحانی مہم تھی جس کے مقابلہ میں قدیم انگریز پرستی کے بہت سے زاویئے مسمار ہو گئے۔ مولانا محمد علی جو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں علی گڑھ کے سیاسی مسلک کے ہمنوا تھے۔ اب صاف صاف کہنے لگے کہ :-

"یہ کام جنرل ڈایر ہی کے لیے مخصوص رکھا گیا تھا کہ وہ اس دیوار کو گرا دے جو عارضی مصالح کے تحت سر سید احمد خاں نے کئی سال پہلے کھڑی کی تھی۔ اور اس کام کا سہرا جنرل ڈائر ہی کے سر ہے کہ انہوں نے ۱۹۱۹ء کی کانگرس میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک مشترکہ قومیت کے علمبردار کی حیثیت سے شرکت کی ترغیب دی۔ اس کے سپاہیوں کی گولیوں نے ہندو اور مسلمان کا کوئی امتیاز قائم نہ کیا اور یقیناً قدرت نے یوں ہی مقدر کیا تھا کہ ایک ایسی قوم بھی جو مسلمانوں سے بھی زیادہ انگریزوں کی وفادار تھی (ہمارے سکھ بھائی) اپنے مذہب کے مقدس شہر امرتسر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ خود اپنے خون سے بھی رنگین کر دیں اس واقعہ میں خدا کا ہاتھ تھا۔"

حالات کا جو ردِعمل ہو رہا تھا اسی کے ساتھ ساتھ جب برطانیہ نے ترکوں کو بھی دنیا سے مٹا دینے کا ارادہ کر لیا اور گلیڈسٹن کے خواب کی تعبیر حاصل کرنی چاہی اور اسلامی اماکن مقدسہ کے لیے بھی ہر طرف سے خطرات پیدا کر دیئے گئے تو ہندوستان میں جلیانوالہ باغ کے خون کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا اور علی برادران تحریک خلافت کا علم بلند کر کے مہاتما گاندھی جی کے پہلو بہ پہلو مشترکہ قومیت ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی آزادی کے داعی اور ترجمان بن کر میدان میں اتر آئے۔

گاندھی جی سے ملاقات

ہندوستان کی سیاست کے اس انقلابی دور میں حضرت مولانا کی پہلی ملاقات مہاتما جی سے ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جہاں مسئلہ ترکی و خلافت کے متعلق وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لیے تمام ممتاز ہندو مسلمان لیڈر جمع ہوئے تھے۔ اس موقعہ پر آنجہانی تلک بھی موجود تھے۔ اور وہی دن تھا جب مولانا اور گاندھی جی کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو گاندھی جی کے آخری دم تک قائم رہا۔

یہ پہلی ملاقات ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ لیڈروں کے اس اجتماع میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کو قبول کر لیا گیا۔ البتہ وائسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز سے مولانا نے اختلاف کیا۔ وہ گفت و شنید اور عرض و معروض کے قدیم طریقوں سے بہت بے زار تھے۔ اور اس لیے اس مجلس میں انہوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ کسی وفد کا وائسرائے کے پاس جانا فضول ہے۔ البتہ وہ پہلے مسلمان لیڈر تھے جنہوں نے اس تاریخی اجتماع میں گاندھی جی کے پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ اس وقت دوسرے مسلمان لیڈر جو مولانا کے ہم خیال تھے حکیم اجمل خان مرحوم تھے۔

میرٹھ اور کلکتہ کی کانفرنسوں میں گاندھی جی کا پروگرام مکمل کیا گیا اور ناگپور میں بالآخر کانگریس نے اس پروگرام کی منظوری دیدی۔ اس کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر قومی تاریخ کے جو روح پرور نظارے دیکھے گئے وہ ہماری قومی تاریخ کے لازوال نقوش ہیں۔ اسی تحریک کے دوران میں مولانا کے لیے گرفتاریوں اور سزاؤں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ قلعہ احمد نگر کا دروازہ کھلنے اور آزادی کی پہلی منزل طے ہونے تک جاری رہا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کا دور تحریک خلافت کا دور تھا جو ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام اور امرتسر کے اجلاس کانگرس کے بعد شروع ہوا۔ مولانا کی زندگی کا یہ اس قدر مصروف زمانہ تھا کہ اس سیلاب میں ان کے لیے صبح اور شام کا امتیاز باقی نہ رہا تھا شمال سے جنوب تک سینکڑوں جلسوں اور کانفرنسوں میں اُنہیں تقریریں کرنی پڑتی تھیں اور ان کے اوقات کا ایک لمحہ نہ تھا جو اس تحریک سے بے تعلق ہو ہر موقعہ پر اور ہر جلسہ میں زندگی اور استقامت کا ایک ہی پیام تھا جو وہ ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دے رہے تھے ان خطبات اور تقریروں کے اگر کم سے کم اقتباسات بھی نقل کیے جائیں تو وہ بجائے خود ایک ضخیم کتاب بن جاتے۔

تحریک ترک موالات

اکتوبر ۱۹۲۱ء میں صوبائی خلافت کانفرنس آگرہ کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے اس تحریک کی ۱۸ ماہ کی روئداد پر ایک نظر ڈالی اور مسلمانوں کو گاندھی جی کے اصول ترک موالات اختیار کرنے کی دعوت دی انہوں نے فرمایا:۔

"تحریکِ خلافت کی بدولت ہندوستان کی آزادی کا سویا ہوا مسئلہ
اس قوت سے جاگ اٹھا کہ آج اس کا غلغلہ دنیا میں بلند ہے۔"

لیکن اب اس جدوجہد کی تیسری اور فیصلہ کن منزل آگئی تھی اور وہ یہ تھی کہ ترکِ موالات کے اصول کو اختیار کر کے وطن کی آزادی کا مطالبہ شروع کیا جاتے۔ انہوں نے فرمایا کہ:۔ "یہ چیز جو ہمارے سامنے آرہی ہے پہلے ہی تیرہ سو سال سے موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔ اصل میدان ہندوستان کا میدان ہے اصل فتح و شکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا ہے اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان اور ترک موالات کے میدان بلکہ مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیں تو دنیا کی کون سی طاقت ہے جو آپ کو شکست دے سکے۔

اگر آسمان کی تمام بجلیاں اُتر آئیں، ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کرلیں تو وہ ایک منٹ کے لئے ایمان کو شکست نہیں دے سکتیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے دِلوں کے میدان کو فتح کرلیں، ایمان کے میدان کو، استقامت کے میدان کو، قربانیوں کے میدان کو، اور ملک کے اتفاق کے میدان کو... تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے...."

مولانا نے اس زمانے کے تمام خطبات میں بار بار وقت کی اسی حقیقت پر زور دیا کہ خلافت کی تحریک ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے دوسری بات جس پر مولانا نے اُن علماء کو جو تحریک خلافت میں حصّہ لے رہے تھے متواتر جس امر کیطرف توجہ دلائی وہ ایک نظام شرعی کے قیام کی تجویز تھی۔ مولانا اس وقت کے لحاظ سے ضروری سمجھتے تھے کہ ایک ایسی امارت شرعیہ قائم کی جائے جو مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کو حقیقی مذہب کے سانچے میں ڈھالے۔

کراچی کا مقدمہ

سنہ ۱۹۲۱ء میں علی برادران اور ان کے ساتھ بعض دوسرے لیڈروں پر کراچی میں مقدمہ چلایا گیا ان ملزموں پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے سرکاری فوج اور پولیس کو جادۂ وفاداری سے منحرف کرنے کی کوشش کی ملزموں کو یہ الزام تسلیم تھا جو لیڈر گرفتار نہیں ہوتے تھے انہوں نے بھی اس جرم کا ارتکاب شروع کیا چنانچہ تمام لیڈروں نے اعلانات اور بیانات شائع کرکے پولیس اور فوج کو مخاطب کیا۔ بمبئی کے ایک اجتماع میں لیڈروں نے اس مسئلہ کے متعلق جو مشہور اعلان شائع کیا وہ حکومت کو ایک کھلا چیلنج تھا۔ اس پر پہلے دستخط مہاتما گاندھی کے تھے اور دوسرے حضرت مولانا کے۔ لیڈروں کے اس متحدہ اقدام نے گرفتاریوں کا سلسلہ روک دیا لیکن حکومت کے دست دراز کا یہ تعطل محض عارضی تھا۔ جس وقت برطانوی ولی عہد کی آمد کے سلسلہ میں بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوئی اور تمام ملک میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک ہر گوشہ احتجاج اور بیزاری کے نعروں سے گونجنے لگا تو پھر ایک دفعہ حکومت نے لیڈروں کو پکڑنا شروع کیا۔ چنانچہ بنگال میں مولانا اور سی۔ آر۔ داس گرفتار کرلیے گئے۔ اس مقدمہ میں مولانا نے عدالت کے روبرو جو بیان تحریری پیش کیا۔ وہ ان کے سیاسی افکار کی ایک ایسی دستاویز ہے جس کے آئینہ میں ان کا سوانح نگار مولانا کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا صحیح عکس دیکھ سکتا ہے۔ اس دستاویز کو مولانا کے ادبی شاہکاروں میں بھی ایک مخصوص مقام حاصل ہے اس موقعہ پر مولانا کے اس بیان کے بعض اقتباسات صرف ان کے سیاسی افکار کی وضاحت کرنے کے لیے نقل کیے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے ان حالات کے پس منظر کا ایک گوشہ پیش کردینا مناسب ہوگا جن حالات میں مولانا نے حکومت کو اپنے اوپر وار کرنے کی دعوت دی تھی۔

مارچ سنہ ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا نے گاندھی جی کے ساتھ پنجاب کا تیسرا دورہ کیا۔ اس وقت اضلاع لاہور اور امرتسر میں پبلک جلسوں اور تقاریر کی ممانعت تھی۔ بادجودیکہ مہاتما جی نے ان امتناعی احکام کی خلاف ورزی نہیں کی اس لیے کہ خلاف ورزی کا پروگرام معطل کیا جا چکا تھا، لیکن مولانا نے اپنے متعلق یہ استدلال کیا کہ شخصی طور پر خلاف ورزی کرنے کا حق انہیں حاصل ہے اور افضلیت اسی میں ہے کہ وہ ایسا کریں۔ مہاتما جی نے بھی مولانا کے اس طرزِ عمل کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ جمعہ کے دن شاہی مسجد میں خطبہ کے بعد مولانا نے ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی۔ اس تقریر کے متعلق اس زمانہ میں لاہور کے نیم سرکاری اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے لکھا کہ اس تقریر میں مولانا نے اہلِ پنجاب کو علانیہ خلاف ورزئ قانون کی دعوت دی ہے اور اگر حکومت نے کوئی کارروائی نہ کی تو پنجاب کے شورش پسندوں کی ہمتیں بہت بڑھ جائیں گی۔ اس اداریہ کا عنوان "صحن مسجد میں باغیانہ لکچر" تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد مولانا نے ایک ایسی ہی تقریر امرتسر میں کی۔ پھر جب علی برادران گرفتار کرلیے گئے تو اس گرفتاری کے دو دن بعد کلکتہ کے ایک بہت بڑے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ:-

"جس ریزولیوشن کی بناء پر علی برادران گرفتار کیے گئے ہیں وہ اسلام کا ایک مانا ہوا اور مشہور و معروف مسئلہ ہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا اعلان کرے۔ وہ ریزولیوشن دراصل میرا ہی تیار کیا ہوا ہے اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے وہ اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منظور ہوا تھا۔ میں اس سے بھی زیادہ تفصیل اور صفائی کے ساتھ اس وقت اس کے مضمون کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سی۔آئی۔ڈی کے رپورٹر بیٹھے ہیں اور میں ان سے کہتا ہوں کہ حرف بحرف قلمبند کر لیں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا۔"

حضرت مولانا کی گرفتاری

پھر دہلی میں جمعیتہ علماء اور خلافت کمیٹی کے جلسوں میں بھی مولانا نے اس اعلان کو دہرایا۔ اور ہر موقعہ پر بار بار دہراتے رہے، لیکن بمبئی میں برطانوی ولی عہد کی آمد کے موقعہ پر جو فساد ہوا اس سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے چند روز کے لیے اپنی تحریک کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ نے اہل ملک کے حوصلوں کو پست کر دیا پھر بھی چند روز بعد ایک دوسری سمت سے خود حکومت کی سخت گیری نے قومی تحریک کے لیے نئے نئے دروازے کھول دیئے۔ کلکتہ میں جس وقت رضاکاروں کی جماعتوں اور مجالس کو خلافِ قانون قرار دیا گیا تو اس حکم کی خلاف ورزی کے لیے فوراً ہی نئی نئی جماعتیں پیدا ہونے لگیں۔ حکومت نے بھی روزانہ سینکڑوں اور ہزاروں رضاکاروں سے اپنے جیل خانے بھرنے شروع کر دیئے۔ ان حالات میں پھر ایک دفعہ مولانا کے لیے سرکاری مہمان خانے کا دروازہ کھلا جب مولانا کو اپنی گرفتاری کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اپنا ایک مختصر بیان عام اشاعت کے لیے لکھ کر رکھ دیا جو ان کی گرفتاری کے بعد شائع ہوا۔ اس بیان میں انہوں نے لکھا تھا کہ:۔

"گورنمنٹ نے میری گرفتاری کا فیصلہ کر کے مجھے ایک بہت بڑے بوجھ سے نجات دے دی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جو چلے جاتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے؟ محمد علی، شوکت علی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، سب کا سفر پورا ہو گیا اور میں اب تک منزل کے انتظار میں تھا۔ اب منزل میرے سامنے ہے اور میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ ایک آخری مگر فتح مند میدان اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے کلکتہ کے موجودہ میدانِ عمل کو "آخری اور فتحمند میدان" کہا۔ یہ میرا یقین ہے اور عنقریب تمام ملک دیکھ لے گا کہ جو کام دو سال کے اندر تمام ملک میں انجام نہ پا سکا وہ ان چند دنوں کے اندر کلکتہ میں انجام دیا جائے گا... اگر میں گرفتار ہو گیا تو مہاتما گاندھی جی کو میرا یہ پیام پہنچا دیا جائے کہ میں آپ کو آپ کی کامیابی پر سب سے پہلے مبارکباد دیتا ہوں۔ اس مبارکبادی کے لیے آپ مجھے جلدباز نہ سمجھیں۔ میں اس اٹل وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس کی مبارکباد دینے میں کوئی دوسرا مجھ پر سبقت نہ لے جائے۔"

عوام کو مولانا نے اپنے پیام میں چار سچائیوں کی طرف دعوت دی تھی۔

"ہماری فتح مندی کی تمام بنیاد چار سچائیوں پر ہے اور میں اس وقت بھی ملک کے ہر باشندے کو ان ہی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔"

(۱) ہندو مسلمان کا کامل اتفاق۔

(۲) امن (۳) نظم

(۴) قربانی اور اس پر استقامت۔

میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے تو اسے بخش دیں۔ اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اس مبارک اتحاد کو صدمہ پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں ــــــــ جو اسلام کے خلاف ہو اس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ ان کے مشوروں پر کاربند رہیں۔"

"فتنہ و فساد کی ابتدا"

احمد مصطفٰی[1] صدیقی راہی

حضرت مولانا کی سیاسی زندگی میں متحدہ قومیت کا یہ باب بلاشبہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک شاندار اور روشن باب ہے لیکن حضرت مولانا کے شخصی اعتقادات کی یہ روشنی اور بھی زیادہ روشن اس تاریک زمانہ میں ہوتی ہے جب ۱۹۲۱ء کے بعد پھر انگریزی حکومت نے تفرقہ پردازی کا حربہ استعمال کیا اور فرقہ داری فتنہ و فساد کی تاریکی میں بڑے بڑے لیڈروں کے تصورات منتشر ہو گئے اور بڑے بڑے محبان وطن کا لنگر ٹوٹ گیا۔ حضرت مولانا کی شخصی اور معنوی عزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا جتنی کہ وہ آزمائش تھی جس میں حضرت مولانا اس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گذر چکا، وہ تعمیر ایک دفعہ پھر مسمار ہو گئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ داری تعصبات کی آگ روشن کر دی اس آگ میں مہاتما جی، مولانا حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، موتی لال نہرو اور ایسے بہت سے عوامی لیڈر جھونک دیئے گئے۔ حضرت مولانا کے عزم کی بلندی کے امتحان کا یہی وقت تھا۔ بہت سے بلند آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے نہ اتر سکے لیکن حضرت مولانا خود اپنی قوم کے ہاتھوں جبکہ وہ خلاف ہو چلی تھی، وہ سب کچھ جھیل گئے۔ برطانوی حکومت کا فولادی پنجہ ان کے وجودِ معنوی کو اس قدر مجروح کبھی نہ کر سکا جتنے زخم کہ خود ان کی اپنی قوم نے ان کے دل و دماغ پر لگائے مگر انہوں نے ان تمام جراحتوں کو شکوہ شکایت کا ایک بھی لفظ زبان پر لائے بغیر گوارا کر لیا۔ یہی حضرت مولانا کی اصل بڑائی ہے

سیاست سے کنارہ کشی کا ارادہ

جس وقت حضرت مولانا رانچی سے واپس تشریف لائے تو یہ ارادہ کر کے آئے تھے کہ وہ خالص علمی زندگی بسر کریں گے اور سیاسی ہنگاموں سے کنارہ کش ہو جائیں گے لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ حضرت مولانا کو پھر اس آگ میں کودنا پڑا۔ حضرت مولانا نے اپنے خاص انداز میں اس وقت کے حالات کے متعلق اپنے قلب کی کیفیات کو واضح فرمایا ہے۔

عین ۱۹۱۸ء کے اواخر عہد میں جب کہ امیدوں اور آرزوؤں کی پوری دنیا الٹ چکی تھی اور اس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حوادث پورے زور و شور کے ساتھ گزر چکا تھا تو میں رانچی کے گوشہ عزلت میں بیٹھا ہوا ایک نئی دنیائے امید کی تعمیر کا سر و سامان دیکھ رہا تھا گو دنیا نے دروازہ کے بند ہونے کی صدائیں سنی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے:۔

تفاوت ست میاں شنیدن من و تو!
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

۱۸ء کے رمضان المبارک کا پہلا ہفتہ اور اس کی بیدار و معمور راتیں تھیں۔ جب میں نے ان ہی ہاتھوں سے امیدوں اور ارادوں کے نئے

نقشوں پر لکیریں کھینچیں جن سے تمام پچھلے نقشے چاک کر چکا تھا۔

ہمت نگر کہ صد ورق دفتر امید
صد پارہ کردہ ایم و بہ خوناب شستہ ایم!

جنوری ۱۹۲۰ء میں جب میں نظر بندی کے گوشۂ قید و بند سے نکلا تو دو سال پیشتر کا یہ نقشۂ عمل میرے سامنے تھا اس لیے نہ تو مجھے واقعات کی رفتار کا انتظار تھا نہ مزید غور و فکر کا بلکہ صرف شغل و عمل شروع کر دینا تھا۔ میں نے آئندہ کے لیے جن امور کا ارادہ کیا تھا ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ رانچی سے نکلتے ہی کسی گوشۂ عزلت میں رفقاء طالبین کی ایک جماعت لے کر بیٹھوں گا اور اپنی زبان و قلم کی خدمات میں مصروف ہو جاؤں گا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ جو جماعتی اعمال پیش نظر تھے ان کے لیے بھی سیر و گردش اور نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی قیام استقراری مطلوب تھا۔

چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد سیدھا کلکتہ کا قصد کیا اور اگرچہ تمام ملک سے پیام ہائے طلب و دعوت آ رہے تھے اور ہر طرف نظر بندوں کی رہائی کا ہنگامۂ تہنیت و تبریک گرم تھا لیکن میں کہیں نہ جا سکا۔ اور سب سے عذر خواہ ہوا۔ میری طبیعت و جستجو نے مجھے مہلت نہ دی کہ اپنے وجود کو لوگوں کی طلب و جستجو کا سراغ بنا سکوں۔

آکہ شیشۂ دل و زیارت سنگ ست ❊ کرا دماغ مئے ناب و شیشۂ و چنگ ست

شکست عزائم

لیکن عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ بالآخر مجھے سیلاب میں بہنا ہی پڑا! مگر الحمدللہ کہ یہ حوادث و واقعات کے سیلاب کی مخالفانہ روانی تھی جو عزائم کو بہائے جاتی اور قصد کو تاراج کر دیتی ہے، بلکہ خود عزم و عمل ہی کی ایک رو تھی جس کے اندر سے مشیت الٰہی کی صدا اٹھتی ہے اور انسان کو اس کے فیصلہ کی جگہ اپنے فیصلہ کی طرف بلاتی ہے۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ط

میں نے جنوری ۱۹۲۰ء کے آخر تک پوری جدوجہد کی کہ موجودہ تحریک کی خدمات کو اس عنوان سے انجام دوں کہ یہ قرار دادہ اسلوب عمل بھی قائم رہے اور اقلاً سیر و گردش کے کاموں سے الگ رہوں لیکن حالات کی نزاکت، مقاصد کی ناگزیر احتیاجات اور اشخاص کے فقدان نے میری کوششوں کو کامیاب ہونے نہ دیا، کچھ عرصہ تک کشمکش جاری رہی اور بالآخر مجھے فیصلہ کر لینا پڑا کہ اصلی فیصلہ وہی ہے جو وقت اور ضرورت نے کر دیا ہے اور اب تمام تر اسی کے لیے وقف ہو جانا ہے۔ اس حالت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوری ۱۹۲۰ء سے اس وقت تک کا زمانہ جو ۱۸ ماہ سے زیادہ ہو چکا ہے تمام تر پے در پے دوروں اور عام تحریک کی فکروں اور کاوشوں میں بسر ہو گیا اور تمام دوسرے مشغلے یک قلم ملتوی کر دینے پڑے۔ نہ تصنیف و تالیف کی تکمیل ہو سکی، نہ طباعت و اشاعت کی فکر کر سکا۔ نہ "البلاغ" جاری کیا جا سکا۔ نہ اپنے پیش نظر مہمات کار و لجمعی کے ساتھ انجام پا سکے، ساری باتیں قیام و سکون پر موقوف تھیں اور وہ ان اٹھارہ مہینوں میں ایک شب و روز کے لیے بھی میسر نہ آ سکا زندگی وہی زندگی ہے جو سب کے لیے مقدر ہوئی ہے۔ وقت وہی شب و روز کا وقت ہے جو ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے نہ سورج میرے لیے زیادہ دیر ٹھہر سکتا ہے نہ رات میری خاطر اپنا معمول بدل سکتی ہے۔ ایک زندگی ہے لیکن سینکڑوں زندگیوں کا حوصلہ دل میں پنہاں ہے۔ کیونکر دنیا کو پلٹ دوں؟ اور کہاں سے اس طاقت کو بلا لوں جو ایک دل و دماغ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں ہاتھوں کو جوڑ دے۔

کمند کوتہ، بازوئے سست، بام بلند
بہ من حوالہ، دلم میدہم کمند گیر ند

موجودہ حالت یہ ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ حالت کب تک جاری رہے گی

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پہ ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوراج پر اتحاد کو ترجیح

۱۹۲۲ء میں جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا اور آزمائش اور امتحان کا وہ دور شروع ہوا جو بالآخر ۱۹۴۷ء میں ختم ہوا۔ جب حضرت اور گاندھی جی کے رگ و پے میں ایک ناقابلِ بیان نیشِ غم اتر گیا تھا۔ تقریباً ۲۵ سال تک ان دونوں اور ان کے ساتھ دوسرے لیڈروں کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقل و فہم کی بربادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر روز زلزلے آتے تھے اور متحدہ قومیت کی لوٹی ہوئی عمارت کی دیواروں کو مسمار کر جاتے تھے۔ تاہم امیدوں اور تمناؤں اور مضبوط ارادوں کی ایک لوٹی ٹوٹی ہوئی محراب کے نیچے ملک کے یہ بلاکش سپاہی بیٹھے رہے اور آزادی کی ایک نئی عمارت کے نقشے بناتے رہے۔

۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں جب بھی کسی موقعہ پر حضرت مولانا نے اپنے ہم وطنوں اور خصوصاً مسلمانوں کو مخاطب کیا تو انہوں نے یاد دلایا اس ملک کی آزادی اور زندگی کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد میں ہے۔

گاندھی جی کی نظر بندی

۱۹۲۲ء میں گاندھی جی پھر محبوس کر دیئے گئے اور ملک میں عدم تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کے تصورات کو فرقہ پرستی کے مفاسد نے بری طرح مجروح کر دیا۔ حتیٰ کہ خود گاندھی جی نے اپنے ہم مذہبوں سے یہ طعنے سنے کہ تم نے خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دے کر ہندوؤں کے مفاد کا خون کیا ہے۔

کانگریس میں اختلافات

۱۹۲۳ء میں جب ایک دفعہ پھر اپنی زندگی کا کچھ زمانہ قید فرنگ میں گزارنے کے بعد حضرت مولانا باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ خود کانگریس کے اندر بعض اصولی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ گاندھی جی نے قید میں جاتے وقت کانگریس کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی رہی سہی طاقت تعمیری پروگرام کے لیے وقف کر دے۔ ان کے جانے کے بعد مسٹر راجگوپال اچاری، سردار پٹیل، راجندر بابو اور ڈاکٹر انصاری اس امر پر زور دے رہے تھے کہ گاندھی جی کا تعمیری پروگرام جاری رکھا جائے اور کانگریس اپنی تمام قوت کو اس کام میں صرف کرے لیکن پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں ناکام رہ کر اب یہ چاہتی تھی کہ انگریز سے جنگ کرنے کا ایک محاذ دستوری مجالس کے اندر بھی قائم کیا جائے۔ عرف عام میں یہ جماعتیں "چینجر" CHANGER اور "نو چینجر" NO CHANGER کہلائیں اور ایک عرصہ تک ان کے اختلافات نے صحافت اور عوامی جلسوں کے محاذ پر ایک ہنگامہ برپا رکھا، اس وقت جب حضرت مولانا نے جیل سے باہر آکر نظریات کے اختلاف کا یہ ہنگامہ بپا دیکھا تو انہوں نے محسوس کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش تو رہی ایک طرف اب تو خود کانگریس کے اندرونی اختلافات کو مٹانے کی کوئی تدبیر ضرور ہے۔ حضرت مولانا کے سامنے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ علماء کی جماعت دستوری مجالس میں شرکت کے خلاف ایک امتناعی فتوےٰ دے چکی اور اب اس فتوے کے ہوتے ہوئے "چینجرس" کے پروگرام کی تائید کرنا بہت مشکل تھا۔ دسمبر ۱۹۲۳ء میں حضرت مولانا کے زیرِ صدارت اس مسئلہ کے طے کرنے کے لیے کانگریس کا ایک خاص اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جب حضرت مولانا پہلی دفعہ کانگریس کی صدارت کے لیے منتخب ہوئے تو ان کی عمر ۳۵ سال سے بھی کم تھی اور اس طرح یہ خیال غلط نہیں کہ ان سے پہلے یا بعد کانگریس کے کسی صدر نے اتنی کم عمر میں یہ قومی اعزاز حاصل نہیں کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ "اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ میں کانگریس کا سب سے کم عمر صدر ہوں۔ میرا

ام سال کے قریب تھی جب میں پہلی دفعہ کانگریس کا صدر منتخب ہوا۔ گو کہنے کی یہی تقریباً یہی عمر تھی مگر مولانا ابوالکلام آزاد مجھ سے عمر میں کم تھے بلکہ وہ صدر منتخب ہوئے اگر تصور کیجئے ان حالات کا اور زندگی کے اس مدوجزر کا جس سے گزشتہ ۲۵ سال میں حضرت مولانا گذرے تو ایک حد تک ان کے دل و دماغ کی ان واردات کا اندازہ ہوسکتا ہے جن سے ان کی معنوی زندگی معمور ہے۔ اسی کیفیت کو پنڈت جواہر لال نہرو نے "تلاش حق" کی چند سطروں میں کس قدر خوب بیان کیا ہے:-

میرا ورثہ کیا ہے؟ وہ سب کچھ جو بنی نوع نے حاصل کیا، وہ سب دکھ جو اس نے سہے ہیں، وہ سب خوشیاں جن سے اس نے لطف اٹھایا ہے اس کی فتح کے نعرے اور شکست کی تلخیاں۔ انسان کی وہ عظیم الشان مہم جو آپ سے مدتوں پہلے شروع ہوئی تھی، اور اب تک جاری ہے۔ یہ وہ میراث ہے جو مجھ میں اور دنیا کے انسانوں میں مشترک ہے۔"

حضرت مولانا کی عمر کے چالیس سال بھی انسانیت کی اسی مشترک میراث کا ایک گراں قدر حصہ ہیں۔ زندگی کی اس شاہراہ پر بڑے بڑے انسانوں کی زندگی جو نشانِ راہ قائم کرتی ہے ان ہی میں ایک نشان راہ حضرت مولانا کی وہ زندگی اور بصیرت ہے جسکی راہ میں ان کا وطن موت و زیست کی کش مکش اور فتح کے نعروں اور شکست کی تلخیوں کا مزہ چکھتا رہا۔

دہلی کے اس اجلاسِ خاص کے خطبۂ صدارت میں حضرت مولانا نے کانگریس کے انتشار کو ایک آزمائشی دور سے تعبیر کیا اور از سرِ نو گاندھی جی کے عدمِ تشدد اور عدمِ تعاون کے پروگرام کی توضیح فرمائی اور اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ موجودہ پسپائی کے بعد پھر ایک دفعہ جدوجہد کے میدان میں کانگریس آگے بڑھے گی۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ تعطل صرف ایک وقفہ ہے۔

یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

گاندھی جی کا برت

لیکن اس زمانے میں اندرونی اختلافات اور ہندو مسلم منافشات کی وجہ سے کانگریس کی ساکھ بہت گر چکی تھی اور یہ بگڑی ہوئی بات کچھ زیادہ نہ بن سکی۔ آخر کار ۱۹۲۴ء میں جب گاندھی جی جیل سے باہر آئے تو انہوں نے اکیس دن کا برت رکھا اور اس کے زیرِ اثر ایک اتحاد کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس میں تقریباً ۱۵۰ ہندو مسلمان لیڈر شریک ہوئے۔ اس موقع پر مولانا نے اتحاد اور سمجھوتہ کی فضا پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ مولانا کے شرکاءِ کار نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ کانفرنس کے مباحث میں مولانا کی خطابت اور اخلاقی قوت نے بہت بڑا کام کیا ہے۔

قربانی گاؤ کا مسئلہ

اس گفتگو کے دوران میں جب سب سے زیادہ جھگڑا قربانی گاؤ کے مسئلہ پر ہو رہا تھا تو مولانا نے فریقین کو مخاطب کر کے صلح اور مفاہمت کا ایک ایسا بنیادی اصول پیش کیا جو آج بھی وہی وزن اور وہی قیمت رکھتا ہے جو آج سے ۳۰ سال پہلے رکھتا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ:-

"اس تمام قضیہ کا حل صرف اس بات میں ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق پر زور دینے کی بجائے اپنے فرائض کی تکمیل کے لیے تیار رہے۔"

گاندھی سے عہد

اپنا برت ختم کرتے وقت گاندھی جی نے حاضرین سے یہ عہد لیا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ اس دن جن لیڈروں نے یہ عہد کیا تھا ان میں سے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، ریورینڈ اینڈروز اور سی آر داس آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن سب سے پہلے خود گاندھی جی نے اپنے اس عہد کو پورا کر دیا اور ہندوستان کی آئندہ نسلوں کے لیے وہ اپنا ایک ایسا نقشِ قدم چھوڑ گئے جو قرنوں اور صدیوں تک نشانِ راہ رہے گا۔ لیڈروں کی اس جماعت میں

سے جن سے اس دن گاندھی جی نے عہد لیا تھا ۔۔ اب دور میں تنہا حضرت مولانا باقی رہ گئے تھے جنہوں نے گاندھی جی کی طرح ہندو مسلم
کے عقیدے کو اپنے سیاسی، ایمان اور انسانی اخلاق کی ایک محکم بنیاد بنا لیا تھا لیکن افسوس کہ اس گذرے ہوئے قافلہ کی یہ تنہا یادگار بھی اب
موت کی وادیوں میں گم ہو چکی ہے۔

سائمن کمیشن

بہر حال سیاسی جمود اور فرقہ داری کشت و خون کے اس زمانہ میں سائمن کمیشن کے ہندوستان آنے کا اعلان کیا گیا
یہ معلوم ہوا کہ غلامی کی زنجیروں کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے ایک نیا دستور اس ملک پہ عائد کیا جانے والا ہے
چنانچہ تمام ملک میں کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوگئی اور اس نقطہ پہ کانگریس کی تمام قوت از سرِ نو مرکوز ہونے لگی۔ اس محاذ پر
کے دونوں فریق پوری طرح متحد ہو گئے اور پھر ایک متحدہ محاذ قائم ہو گیا۔ اس تحریک کے مظاہروں میں موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو
لیڈروں نے پولیس کے ڈنڈے کھائے۔

برطانوی تدبیر بضد تھا کہ دستوری اصلاحات کا ایک نیا کھلونا پیش کر کے ہندوستان کی آنکھوں میں دھول ڈالے۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ
سے جو جنگ شروع ہوئی وہ ایک فیصلہ کن منزل تک اس وقت پہنچی جب ۲۹ء میں ایک نئے دستور کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت کانگریس
نے "کامل آزادی" کے بنیادی نصب العین پہ اپنا مورچہ قائم کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ فرقہ پرستی کا زہر تمام ملک میں سرایت کر چکا تھا اور
کے زیر اثر ایسے بڑے بڑے مسلمان لیڈر بھی۔ جیسے کہ علی برادران تھے کانگریس سے جدا ہو چکے تھے۔ گو کہ بظاہر نہرو رپورٹ علی برادران
بعض دوسرے مسلمان قائدین کی کانگریس سے جدائی کا باعث سمجھی گئی لیکن اس افتراق میں بعض شخصی عناصر کو بھی بہت دخل تھا۔ ان عناصر کو
غیر ملکی حکومت نے نہایت چالاکی کے ساتھ تقویت پہنچائی تھی۔ بہر حال یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے آل انڈیا کانگریس نے کامل آزادی کی
تفتیح پہ ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کا فیصلہ کیا

آل پارٹیز کانفرنس

اس سے پہلے ۲۷ء میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کے ذریعہ سے ایک دفعہ پھر فرقہ داری اختلافات کو دور کرنے
کی کوشش کی گئی۔ نتائج کے اعتبار سے شملہ کی سرزمین بھی بنجر ثابت ہوئی اور ڈاکٹر مونجے اور مولانا محمد علی
دونوں اپنے ڈنڈے ہوا میں گھمانے کے بعد مخالف سمتوں میں واپس ہو گئے۔ اس ناکام کوشش کے بعد فرقہ داری منافرت کے شعلے اور زیادہ
بلند ہونے لگے اور ہر طرف خونریز ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس وقت کلکتہ میں بعض لوگوں نے یہ خواہش کی کہ حضرت مولانا ایک جلسہ عام میں تقریر کریں
لیکن عالم یہ تھا کہ کسی قوم پرست انسان کے لیے جلسہ عام میں ہندو مسلم اتحاد کا نام لینا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ دونوں فریق اس جلسہ میں اپنے
غنڈے اور بدمعاش لے کر آئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مولانا پہ حملہ کرنے اور جلسہ کو منتشر کرنے کی نہایت جنگجویانہ تیاریاں کی
گئی ہیں۔ ایسے ہی مواقع پر حضرت مولانا کی بے خوف اور بے پروا "انفرادیت" نمایاں ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا جلسے میں تشریف
لے گئے اور مجنون اور پاگل مجمع کے روبرو دو گھنٹہ تک تقریر کرتے رہے۔ وہ تقریر مولانا کی خطابت کا ایک شاہکار اور معجزہ تھی۔ جلسے
کے تماشائیوں نے دیکھا کہ جو غنڈے مولانا اور ان کے شرکا پہ حملہ کرنے گئے تھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں اور مولانا کے الفاظ تیر و
نشتر کی طرح ان پہ برس رہے ہیں! حضرت مولانا کی زندگی میں ان کی بے پناہ انفرادیت کے امتحان کا یہ بہت بڑا اور یادگار موقعہ
تھا۔ دوسرا موقعہ وہ تھا جب ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد دہلی کے خونریز ہنگامے میں حضرت مولانا دن اور رات خطرات کی پروا کئے بغیر
آگ کے شعلوں میں گھستے تھے اور مظلوموں کی حفاظت و اعانت کا ممکنہ سروسامان کرتے تھے۔

ستیہ گرہ

جدوجہد اصلاحات کی اسکیم کے مقابلہ میں کانگریس نے ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کیا ۱۹۳۰ء کی یہ ستیہ گرہ کانگریس کی جدوجہد کا ایک اور نمایاں نشانِ راہ ہے۔ اسی نشان راہ سے کامیابی کی طرف پہلا موڑ آیا گو کہ گاندھی جی اور لارڈ اروِن کے سمجھوتہ کے بعد بھی لندن کی گول میز کانفرنس کامیاب نہ ہو سکی۔

لیکن اس کانفرنس کا نتیجہ اتنا تو ہوا کہ دنیا کو ایک دفعہ پھر یہ حقیقت یاد آگئی کہ سیاسی گفت وشنید میں برطانیہ کی نیت نہ کبھی پہلے بخیر تھی اور نہ اب ہے۔ ——— گاندھی جی

بادلِ نخواستہ کانفرنس میں شریک ہوئے اور خالی ہاتھ واپس آئے۔ ہندوستان کے انگریزی حلقوں اور اینگلو انڈین صحافت میں ان کے خالی ہاتھ آنے پر اظہار مسرت کیا گیا اور علانیہ جداگانہ حقوق کے حامیوں کی حمایت کر کے اس حقیقت کے چہرہ سے نقاب اٹھا دی گئی کہ انگریز فرقہ پرستوں کو آڑ بنا کر آزادی کے مطالبہ سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ انگریزی حکمتِ عملی سے ہندو مسلم فسادات ہوتے رہے جس کے نتیجے میں مسلمان مجبور ہوئے کہ وہ ایک علیحدہ مسلم ریاست کا مطالبہ کریں۔

نمک ستیہ گرہ

گول میز کانفرنس سے واپس آتے ہی گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے تمام ملک میں "یوم آزادی" کے مظاہرے کیے اور ماہ مارچ میں گاندھی جی نے نمک کی ستیہ گرہ کا اعلان کیا۔ اس طرح حکومت کے تشدد کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا اور ۵ مئی کو گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد لیڈروں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا لیکن سول نافرمانی کی اس تحریک نے تمام ملک میں آگ لگا دی۔ حضرت مولانا کی شخصی قیادت نے پھر ایک دفعہ اپنے نفوذ و اثر کا حیرت انگیز ثبوت دیا حتیٰ کہ بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ——— لاکھوں مسلمانوں نے ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۹۰ ہزار اشخاص گرفتار ہوئے اور سینکڑوں مارے گئے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد حضرت مولانا بھی گرفتار ہو گئے۔

مسلم قوم پرستوں کی جماعت

۱۹۳۰ء کی ستیہ گرہ کے شروع ہونے سے پہلے کانگریس کے مسلمان قوم پرست لیڈروں اور کارکنوں نے ایک کوشش یہ بھی کی تھی کہ مسلمان عوام سے قریب تر رابطہ پیدا کریں۔ ڈاکٹر انصاری اس وقت زندہ تھے۔ ان کے اور حضرت مولانا کے مشورے سے ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے اندر مسلم قوم پرستوں کی ایک جماعت منظم کی گئی۔ حضرت مولانا اس کے صدر تھے اور تصدق احمد خان شروانی سیکرٹری اور ڈاکٹر انصاری ٹریژرر۔ جماعت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام حریت پرست اور ترقی پسند جماعتوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔

اس پارٹی کی راہ میں ایک مشکل یہ حائل تھی کہ علی برادران اب کانگریس کے میدان سے ہٹ رہے تھے۔ وہ سائمن کمیشن اور نفاذ اصلاحات کے خلاف سول نافرمانی کے مخالف تھے اور ان کی وجہ سے بعض دوسرے مسلمان لیڈر بھی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس وقت بھی مسلمان قوم پرستوں کے سب سے بڑے قائد مولانا ہی تھے جو کانگریس کی تحریک کی پوری پوری تائید کر رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد اور قیام پاکستان کے بعد خصوصاً قوم پرست مسلمانوں کی قوم پرستی کے سب سے بڑے قلعہ دار صرف حضرت مولانا ہی رہ گئے تھے اور انہی کی رہنمائی میں ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں نے جو متحدہ قومیت میں عقیدہ رکھتے ہیں اور ہندوستان کو اپنا حقیقی وطن تصور کرتے ہیں۔ ہندو اکثریت کے بعض طبقات کی شدید مخالفت کو انگیز کرتے ہوئے سیکولر نظام حکمرانی کی بنیاد کو مضبوط بنانے کے لیے جس حد تک ممکن ہوا اپنا کام جاری رکھا۔ اس وقت جب کہ ہندو اکثریت کی فرقہ پرستی اور مشترک کلچر و متحدہ قومیت کے مخالف عناصر کی

تخریبی سرگرمیاں پوری قوت سے جاری ہیں۔ بہرحال حضرت مولانا کی رہنمائی وقیادت پہلے سے بھی زیادہ ضروری تھی لیکن مشیت الٰہی اور کا مقررہ وقت انسان کی ضرورت ومصلحت کے مطابق نہ بدلا ہے نہ کبھی بدلے گا۔

۴۰ء سے ۴۷ء تک

۴۰ء میں حضرت مولانا نے پھر ایک دفعہ کانگریس کی صدارت کی ذمہ داریاں قبول کر لیں تو گاندھی جی کی غیر مشروط بین ستیہ گرہ کی ایک مہم اور شروع ہوئی اور پھر حضرت مولانا ۱۸ ماہ کی سزا پا کر جیل چلے گئے۔ ستیہ گرہ کی یہ مہم ۴۱ء میں بھی جاری رہی۔ مگر جب پرل ہاربر پر جاپانیوں کے کامیاب حملے نے جنگ کو تقریباً عالمگیر بنا دیا اور یہ سیلاب مشرقِ بعید کی سمت براہ راست ہندوستان کی طرف بڑھنے لگا تو برطانیہ نے جس کی قوت جنگ کے پہلے ہی سال میں بہت مجروح ہو چکی ہندوستان کی ہمدردانہ تائید کا حاصل کرنا اپنے لئے ناگزیر سمجھا۔ اور حضرت مولانا بھی دوسرے رہنماؤں کے ساتھ رہا کئے وائسرائے نے تمام ملک سے اپیل کی کہ اس بڑھتے ہوئے خطرہ کے مقابلے میں ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ اس محاذ کو مستحکم بنانے کے لئے کانگریس اور لیگ کا اتحاد بھی ضروری تھا۔ لیکن قائد اعظم نے ایک دفعہ پھر صاف کہ لیگ اور کانگریس کا اشتراک عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کانگریس پاکستان کے نظریہ کو قبول نہ کر لے۔ چند بعد رنگون پر دشمن نے قبضہ کر لیا اور اب حالت اضطراب میں برطانیہ نے اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ کرپس نے اور لیگ کے لیڈروں کے سامنے آزادی کی یہ تجویز رکھی کہ ہر صوبہ کو یہ اختیار تمیزی دے دیا جائے کہ وہ اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرے۔ اور ہندوستان کے دفاع کی نگرانی برطانیہ کے سپرد رہے۔ لیکن یہ پیش کش کانگریس کے مطالبہ سے بہت کم تھی چنانچہ حضرت مولانا نے اعلان کیا کہ وہ خود ملک کے دفاع کے لئے تلوار اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ ملک کی آزادی کا فوری اعلان کر دیا جائے۔ لیکن نہ تو کانگریس اور نہ خود مولانا کسی ایسی تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ تھے جس کے تحت صوبوں اور ریاستوں کو ملک کی آزادی کے مطالبہ میں کسی قسم کی ترمیم کرنے کا اختیار دیا جائے۔ وہ ایسی ہر تجویز کو آزادی کی نفی قرار دیتے تھے۔

کرپس مشن کی ناکامی

چنانچہ کرپس مشن کے بارے میں امریکی وقائع نگار لوئیس فشر کے بیان کے مطابق حضرت مولانا کے تاثرات تھے کہ سر اسٹیفورڈ کرپس نے حضرت مولانا اور کانگریس کے رہنماؤں سے جو وعدے تھے لندن سے ان کی اجازت نہیں ملی لہٰذا اب برطانوی حکومت سے مزید گفت وشنید بیکار تھی کیونکہ وہ اپنے اقتدار سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ تقسیم ملک کی تجویز کے متعلق حضرت مولانا نے لوئیس فشر سے فرمایا تھا میں شادی سے پہلے طلاق کے کچھ معنی نہیں سمجھتا۔ اگر ہندو اور مسلمان یکجا زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں اور ناکام رہیں تب بھی جدائی کا سوال پیدا ہو ہے۔ لہٰذا حضرت مولانا نے کرپس کی تجویز کا مطالعہ کرنے کے بعد کانگریس کی طرف سے یہ جواب دیا کہ وہ نہ تو ان کی بنیاد قبول کر سکتے ہیں ——— اور نہ کسی ایسی مقامی حکومت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ جس میں مرکز

اختیارات عوامی نمائندوں کے بجائے بدستور وائسرائے کو حاصل رہیں۔

ہندوستان چھوڑ دو ریزولیوشن۔ جولائی ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں ایک ریزولیوشن کے ذریعہ انگریزوں سے کہا گیا کہ اب وہ ہندوستان سے فوراً ہی نکل جائیں۔ گاندھی جی نے بھی اس موقع پر صاف کہہ دیا کہ اگر آزادی کا تحفہ آسمان سے نہیں گرتا تو ہم لڑ کر آزادی لیں گے مجلس عاملہ کے اس جلسہ کے فوراً بعد حضرت مولانا اور تمام کانگریسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے یہ نظربندی ۹ اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۵ جون ۱۹۴۵ء تک جاری رہی۔ حضرت مولانا نے اس زمانے کے تاثرات کا بہت ہی دلچسپ خاکہ "غبار خاطر" کے اوراق پر پیش کیا ہے۔

چند روز بعد جب لنلتھگو کا دور ختم ہوا اور لارڈ ویول وائسرائے بنا کر بھیجے گئے تو انہوں نے پھر از سر نو گفت و شنید کا آغاز کیا اور گاندھی جی پھر رہا کر دیئے گئے۔

اس کے بعد متعدد تجاویز پیش ہوتی رہیں لیکن گفتگوئے مفاہمت کی ہر ناؤ مطالبۂ پاکستان کی چٹان سے ٹکرا کر غرق ہوتی رہی خود گاندھی جی نے مسٹر جناح سے طویل ملاقاتیں کیں لیکن قائد اعظم اپنے مطالبہ و مؤقف میں اتنے مضبوط تھے کہ ایک انچ نہ ہٹے۔ کرپس کی ابتدائی تجویز میں یعنی یہ کہ ہر صوبہ کو اپنے لئے .... فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے میں مطالبہ پاکستان کی تائید کسی نہ کسی طرح موجود تھی۔ نہ تو راج گوپال اچاریہ کا فارمولا اس کا بدل ہو سکتا تھا اور نہ تیج بہادر سپرو کا فارمولا۔ الغرض قائد اعظم کے تصورات کی وہ بنیاد کسی سے نہ ہٹ سکی جو ہندو مسلم فسادات نے قائم کر دی تھی۔

شملہ کانفرنس جون ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مرکزی عاملہ تشکیل دی جائے جس میں ہر منظم جماعت کو نمائندگی حاصل ہو لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ فوج اور دفاع کے محکمے اس عاملہ کے اختیارات سے باہر رہیں گے اور ان کی ذمہ داری صرف وائسرائے سے متعلق ہو گی مقصد یہ تھا کہ "آل پارٹیز" حکومت جاپان کے مقابلہ میں جنگ جاری رکھے اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے ملک کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں کی حمایت حاصل کر سکے اس تجویز کے اعلان کے ساتھ ہی وہ سب کانگریسی لیڈر جو بمبئی کی آخری قرارداد کے ساتھ ہی گرفتار کر لئے گئے تھے ۳ ماہ کی نظربندی کے بعد رہا کر دیئے گئے شملہ میں ایک کانفرنس شروع ہوئی اور اس میں کانگریس نے حضرت مولانا کو پورے اختیارات کے ساتھ شریک ہونے کی اجازت دی۔ لیکن یہ کانفرنس بھی بالآخر ناکام رہی۔ حضرت مولانا مرکزی عاملہ کی رکنیت میں کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک نمائندے کو بھی نامزد کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ کانگریس اپنے اس دعوے سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھی کہ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ اور تمام فرقوں کی قومی جماعت ہے۔ کانگریس کا دعویٰ قائد اعظم کے مؤقف کے خلاف تھا۔ اس لئے انہوں نے کانگریس کی جانب سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی نمائندگی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کانفرنس کے آغاز ہی میں ایک وقت تو ایسا بھی آگیا تھا کہ قائداعظم حضرت مولانا کے ساتھ ایک ہی میز کے گرد بیٹھنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔

قائداعظمؒ کے رویہ سے مایوسی قائد اعظمؒ سے مایوس ہو کر مولانا نے چاہا کہ اگر لیگ شریک ہونے پر آمادہ نہیں تو جو دوسری جماعتیں مرکزی حکومت کی تشکیل میں شریک ہونے پر آمادہ ہوں۔ ان ہی کو شریک کر کے

مرکزی حکومت بنائی جائے۔ لیکن اس کے لئے وائسرائے تیار نہ تھے۔ وائسرائے کے اس انکار کا ردعمل کانگریس کے حلقوں میں ہوا اس سے قطع نظر کر کے بھی عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ برطانوی تدبر کوئی ایسی مرکزی حکومت قائم کرنا پسند نہیں کرتا۔ جس میں اختلاف تفریق کے امکانات باقی نہ رہیں!

پارلیمانی مشن۔

اسی زمانے میں برطانوی پارلیمنٹ کا مشن آیا۔

انیٹرِیم گورنمنٹ

جس وقت عارضی حکومت میں شرکت کا سوال زیر بحث تھا تو لیگ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ تنہا مسلمانوں کی نمائندہ ہے اس لئے کانگریس کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو کابینہ کی رکنیت کے لئے اپنی طرف سے نامزد کر دے۔ لیکن جب نام کا وقت آیا تو خود اس نے اس اصول سے قطع نظر کر کے اقوام مندرجہ فہرست کے ایک غیر مسلم کو نامزد کیا۔ اور راجہ غضنفر علی خاں نے صاف کہہ دیا کہ ہم "انیٹرِیم گورنمنٹ میں صرف پاکستان کے لئے جنگ کرنے جا رہے ہیں"۔ اور یہ بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ اس لیاظ کانگریس کی بازی ہر گئی۔

آزادی کے بعد

۱۵ اگست کو ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوا اور اسی کے چند روز بعد بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ یہ اعلان ایک چنگاری تھی جو پنجاب کے بارود خانہ میں گری اور اس کے بعد دنیا نے انسانوں بہیمیت اور وحشت کے جو مناظر پنجاب اور دہلی میں دیکھے وہ انسانیت کے دامن پر ایک ایسا دھبہ ہے جو صدیوں تک باقی رہے ان دو مہینوں کی تاریخ ان وحشیانہ افعال کے لحاظ سے جن کا ارتکاب کیا گیا انقلاب فرانس کے عہد تشدد کی تاریخ ہے بلکہ اس سے بھی ہندوستان کی تہذیب پر سب سے زیادہ شرمناک دھبہ وہ مظالم ہیں جو عورتوں اور بچوں پر کئے گئے اور اس فرقہ پرستی کے فتنہ کا آخری شعلہ وہ تھا جس نے خود گاندھی جی کے رخت حیات کو ایک آن واحد میں پھونک دیا، لیکن یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے ان کے خون کے ایک ہی چھینٹے نے ان انسانیت سوز آگ کے شعلوں کو اس طرح ٹھنڈا کر دیا جس طرح کہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکی تھی۔ یکم ستمبر کو کلکتہ میں اور پھر جنوری ۴۸ء میں دہلی میں انہوں نے آخری مرتبہ ——— ہندو مسلم اتحاد کے لئے برت رکھا ا ۳۰ جنوری کو بالآخر اپنے مقصد کی آخری اور انتہائی قیمت ادا کر کے وہ اپنی زندگی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

سخت ترین امتحان۔

۴۷ء کے آخری اور ۴۸ء کے ابتدائی مہینے حضرت مولانا جیسے حساس انسان کے زندگی کے........ سخت ترین امتحان کا زمانہ تھا۔ مرکزی حکومت کے رکن کی حیثیت سے بھی ان کو اس آگ میں گذرنا پڑا۔ اہل دہلی جو بہت قریب سے حضرت مولانا کو دیکھ رہے تھے اس حقیقت پر گواہ ہیں۔ کہ اس دور میں مولانا کی انسانیت کس طرح اس امتحان میں پوری اتری وہ دن رات حالات کا مقابلہ کرنے میں مصروف رہے اور امن و امان کے ان کی جد و جہد کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی شخصیت کے بہترین قویٰ برسر کار نہ آئے ہوں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دہلی کے دور میں وہ اپنے سخت سے سخت مخالفین اور دشمنوں کی بھی پوری پوری مدد کر رہے تھے ان کا مکان ہر شخص کے لئے پناہ گاہ ان کے دنوں اور ان کی راتوں کا ہر لمحہ مصیبت زدوں اور مظلوموں کی خدمت اور امداد کے لئے وقف تھا۔ اس زمانہ میں وہ گا

کے دست راست تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ہنگامہ کی مایوس کن تاریکی میں وہ اور گاندھی جی ایک دوسرے کا سہارا تے۔ گاندھی جی کا دفعتاً دنیا سے رخصت ہوجانا حضرت مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے لیکن ان کی باوقار شخصیت کو باہر سے دیکھنے والے لوگ اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے کہ سنجیدگی اور تمکین کی اس خاموش سطح کے نیچے ان کی زندگی میں یہ کتنا گہرا زخم تھا زندگی کی آخری سانس تک رستا رہا۔

ایک عالم

عزم ہمالیہ کی طرح استوار، دل آب زمزم کی طرح پاک وصاف، دماغ آسمان کی طرح بلند، نظر آفتاب کی طرح روشن، فکر دریاؤں کی طرح رواں، علم سمندر کی طرح وسیع، عقل چراغوں کی طرح نور افروز، فضل اشجار کی طرح سایہ دار و ثمر ریز، کلام شہد کی طرح لذیذ و شیریں، مزاج پھولوں کی طرح نازک اور شگفتہ۔

حکمت میں عقدہ کشا، سیاست میں صاحبِ تدبیر، حکومت میں فیض رساں، بزم میں صاحب علم و کمال، رزم میں مجاہدِ وطن۔ سر پر قیادت کا تاج، پیشانی پر شرافت کا عکس، آنکھوں میں ایمان کا نور، زبان پر نعرۂ حق اور پیامِ امن۔ سینہ پر محبت کی آئینہ بندی، دل میں انسانیت کا درد، کمر میں صبر کی تلوار، دوش پر شکر کی عبا، ہاتھ میں استقامت کی عصا، پاؤں میں عزم و ثبات کے موزے ...... اور اتحادِ ملی کی راہ پر وہ سفر جس کی ہر منزل پر انسانیت کی فلاح کا پیغام اور جس کی آخری منزل پر یہ آواز کہ اب مجھے خدا پر چھوڑ دو۔ اس حالت میں خدا مجھ سے راضی ہے اور میں اپنے خدا سے راضی ہوں۔

کروڑوں برس کی بوڑھی دنیا نے اپنی زندگی میں ان گنت ابوالکلام دیکھے ہوں گے لیکن جس ابوالکلام کو دنیا ڈھونڈھ رہی ہے اور ڈھونڈتی رہے گی وہ ایک ذات نہیں، انسانیت کے ایک دور کی تاریخ اور انسانی تمدن کے ایک زمانہ کی داستان تھی جسے ۲۲ رفروری ۱۹۵۸ء تک دیکھا گیا، سنا گیا، دوہرایا گیا، لیکن اب پڑھا جائے گا کہ وہ خاک میں مل کر کیمیا بن گیا ہے، اب وہ عالم نہیں سراپا علم بن گیا ہے، جس کی تکمیل کے لیے درگاہیں بنیں گی، کتابیں تحریر ہوں گی، تحقیق کے باب کھلیں گے اور مستقبل کا انسان ابوالکلام کا علم بھی عقلوں کو مانجھنے اور دلوں کو صاف کرنے والے علوم کی طرح حاصل کرے گا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ابوالکلام کو ایک عالم کی صورت میں کھو کر دنیا نے زیادہ کھویا ہے یا ابوالکلام کو ایک علم کی صورت میں پاکر دنیا نے زیادہ پایا ہے۔

ابوالکلام اور اقبال دونوں کے اعتقادی مسلک میں عشق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ـــــ اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ اقبال نے اپنے محبوب نمونے اہل طریقت سے حاصل کئے ہیں۔ مثلاً رومی، سنائی وغیرہ اور ابوالکلام کے نمونے اہلِ دین میں سے ہیں۔ مثلاً امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ، حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ ـــــ اس سے یہ تو ظاہر ہو ہی جاتا ہے کہ ان کے درمیان تھوڑی حد تک وہ فاصلہ ضرور ہے جو مسجد و خانقاہ میں ہونا چاہیئے ـــــ ان میں سے ایک براہِ راست مسجد سے فیضیاب ہو رہا ہے اور دوسرا براہِ راست خانقاہ سے استفادہ کرتا ہے مگر جذب و جنوں کی حد تک دونوں مذہب عشق کے معترف و معتقد ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

مولانا غلام رسول مہر

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک بے مثال شخصیت کی چند جھلکیاں

چگونہ مے بہ میاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوز است و جملہ بدمستند

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے متعلق کچھ لکھنے کی نوبت آتی ہے تو گہری سوچ میں پڑ جاتا ہوں، کہ بات چیت کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ اور کہاں اسے ختم کیا جائے۔ پھر یہ امر بھی خاص غور و فکر کا محتاج ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں علم و عمل کے جتنے بھی دائرے اور ان کے جتنے بھی گوشے ہیں، ان میں سے کس کس کا ذکر دورِ حاضر کے خوانندگان کرام کے لئے موزوں و مفید ہوگا۔ مولانا نے کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جہاں اپنی عظمت و برتری ہی نہیں بلکہ یگانگی کے گہرے اور کبھی نہ مٹنے والے نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ کوئی بھی میدان نہیں جس میں وہ کم از کم ہمارے عہد کے اندر سبقت و اولیت کے پھریرے اڑاتے ہوئے سب سے آگے نہ نکل گئے ہوں۔

عظمت و سربلند برتری

گذشتہ صدی یا اس کے پیشتر کے ادوار کو نظر انداز کر دیجئے۔ موجودہ صدی کا آغاز ہوا تھا تو ہماری قوم میں نہایت بلند پایہ اصحاب کی ایک عظیم القدر صف موجود تھی جن میں سے ہر ایک وقت کے ممتاز ترین قائدوں اور رہنماؤں میں محبوب ہوا۔ اور ان کے محض نام ہی لے لئے جائیں تو ہر فرد کی گردن فرطِ احترام سے بے اختیار جھک جائے گی۔ مولانا ابوالکلام ۱۹۱۲ء تک ان میں بہ اعتبارِ عمر سب سے چھوٹے اور بہ لحاظ صلاحیتِ قیادت بالکل بے مایہ تھے یا کہہ لیجئے کہ چند محدود افراد کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ ان میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔ ۱۹۱۲ء کے وسط میں کلکتہ سے "الہلال" نکلا تو اس میں بھی وقت کے عوام و خواص کے لئے بظاہر کوئی خاص جاذبیت و کشش نہ تھی۔ عام لوگ نستعلیق کے عادی تھے۔ "الہلال" نے ٹائپ اختیار کیا۔ لوگ سادہ عبارتوں سے مستفید ہو سکتے تھے۔ لیکن "الہلال" ایک دعوت کے آرگن کی حیثیت میں ایسے اسلوب تحریر و نگارش کا پیکر تھا جس کا کوئی نمونہ اس سے پیشتر دیکھا نہیں گیا تھا۔ اور بعد میں بھی ویسا کوئی موقع بروئے کار نہ آسکا۔ تاہم دیکھئے کہ عوام اور مولانا کے درمیان ربط و تعلق پیدا ہونے میں مشکلات کی ایسی دیواریں حائل ہونے کے باوجود کیا صورت رونما ہوئی۔ ابھی "الہلال" کے اجراء پر چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ مولانا قیادت کی اولین صف میں ایک ممتاز حیثیت پر فائز ہوگئے تھے۔ ان کی عمر اس وقت صرف چوبیس سال کی تھی شاید ہی کوئی ایسی مثال پیش کی جاسکے کہ کسی فرد نے صرف چوبیس ۲۴ سال کی عمر میں یکایک قعر گمنامی سے ابھر کر چند ہفتوں یا چند مہینوں میں وہ مقام بلند حاصل کر لیا ہو جو مولانا ابوالکلام آزاد کو اللہ تعالےٰ نے عطا کیا۔ اور اعزاز و احترام میں ایسی والہیت کے مناظر بھی شاید ہی کسی دوسری شخصیت کے تعلق میں جلوہ افروز ہوئے ہوں جیسے مولانا کے تعلق میں دیکھے گئے۔

ری کا معین لائحہ عمل

یہاں پر ایک خاص معاملے کا ذکر بھی ضروری ہے جس سے بہت کم اصحاب کی نظریں روشناس ہوئیں
ہمارے اکثر لیڈر ایسے تھے جنہیں ملک و ملت کا بے پناہ درد کھینچ کھینچ کر خدمت کے میدان میں لایا تھا
ہیں سے خاص بڑی تعداد نے اپنا سب کچھ اس راستے میں بے دریغ لٹا دیا۔ اور ان کے انتہاء خلوص میں کسی بھی فرد کے لئے کلام
یا گنجائش ہوسکتی ہے۔ تاہم جس حد تک مجھے علم ہے ان میں سے کسی نے بھی پہلے سے مختلف اہم مسائل و معاملات کے متعلق کوئی نقشہ
ں تیار نہیں کیا تھا۔ جیسے جیسے حالات پیش آتے گئے، وہ اپنے قوائے فکر و عمل سے کام لے کر عوام کی رہنمائی کرتے رہے۔
میرے علم کی حد تک تنہا مولانا ابوالکلام کی شخصیت ایسی تھی جنہوں نے میدان عمل میں قدم رکھنے سے بیشتر تمام بنیادی مسائل کے
سلے میں سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اور وہ زندگی کے آخری سانس تک ان فیصلوں پر قائم و استوار رہے۔
مولانا محمد علی مرحوم و مغفور فرمایا کرتے تھے۔ لیڈر وہ نہیں جس کی گردن پھولوں کے ہاروں سے لدی رہے۔ لیڈر وہ ہے جو عوام کے
بات و احساسات سے بالکل بے پروا ہو کر وہی کہے جس میں قوم و ملت کی فلاح و بہبود ہو، اگرچہ اس سلسلے میں اسے جوتوں کے ہار
نے پڑیں، اگرچہ اس سلسلے میں اس کے سر پر ڈنڈے برسیں۔

ثبات و استقامت

مولانا آزاد کے افکار و مواقف سے آج بھی اختلاف کی گنجائش ہے جیسا کہ ان کی زندگی کے آخری دور
میں ان سے شدت کے ساتھ اختلاف کیا گیا ان کے آراء کی محکمیت کے بڑے بڑے مدعی بھی زیادہ سے
یادہ ان کے لئے صحت و اصابت رائے کا دعوے کر سکتے ہیں۔ عصمت کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ معصومیت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ
یہ وسلم کی ذات بابرکات پر ختم ہوگیا۔ مولانا کی برتری یہ ہے کہ انہوں نے اپنے معتقدات پر ثبات و استقامت میں ہر دعزیزی کی
متاع گراں بہا بے تامل قربان کر ڈالی جو انہیں اس پیمانے پر یکایک حاصل ہوگئی تھی جس کی مثالیں ملنا مشکل ہے۔ لیکن وہ
س موقف کو اسلام، ملت اور ملک کے لئے صحیح سمجھتے تھے اس سے ایک لمحے کے لئے بھی ہٹنا انہیں گوارا نہ ہوا۔ حقیقت حال کیا
تی؟ اس کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ وہ آخری معاملہ اس وقت پر موقوف رہنا چاہیئے جب بھی وہ قضا و قدر کی بارگاہ سے صادر
و کر غیر مشتبہ طور پر سامنے آجائے گا۔

ہر دائرے میں شان امتیاز

مولانا ابوالکلام کی صحیفہ نگاری کا دور حقیقتہً بہت مختصر ہے۔ کم و بیش سوا دو سال الہلال (دور
اوّل) جاری رہا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء سے ۲۴ مارچ ۱۹۱۶ء تک ساڑھے چار مہینے کا دور البلاغ
ہے۔ اسی طرح چند ہفتے ان کے زیر نگرانی "پیغام" جاری رہا۔ غالباً ایک سال کی عمر الجامعہ (عربی) کی تھی۔ اور چھ مہینے الہلال دور
ثانی کے شامل کر لیجئے۔ دیکھئے اس مختصر سی مدت میں انہوں نے تحریر و نگارش، فکر و نظر، مقاصد و مطالب کے اعتبار
سے صحافت کی دنیا کا رنگ ڈھنگ بدل ڈالا۔ ان سے پیشتر بھی اخباروں سے ضمانتیں طلب کی جاتی رہیں اور ضبط بھی ہوتی رہیں
ر ضمانتوں کے سلسلے میں جو انداز "الہلال" نے اختیار کیا، وہ بالکل یگانہ اور سراسر نادیدہ تھا۔ "الہلال" سے ضمانت طلب کی گئی
و مولانا نے اوّل اس کا ذکر ہی ایسے انداز میں نہ کیا جس طرح عام اخبار نویس کرتے رہتے تھے۔ پھر نیاز مندوں نے پے در پے خط لکھے
و حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے تو ایک مختصر سی تحریر "الہلال" میں چھاپی جس کا عنوان تھا "ابتدائے عشق"۔ اس میں لکھا
ضمانت کی رقم تو ہم نے اسی دن الگ رکھ لی تھی، جس دن اخبار جاری کیا تھا۔ اور اس رقم کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے

تھے۔ سوچتے تھے کہ یہ ابتدائی منزل طے ہونے میں اتنی دیر لگ گئی تو اگلی منزلوں کی نوبت کب آئے گی؟ غرض ہم نے دو ہزار کی رقم اس تاریخ سے پیشتر ہی داخل کر دی جو اس کے ادا کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔

داعیٔ حق کا وظیفہ

گویا سبق یہ دیا کہ ایسے حوادث پر پریشان ہونا بے معنی ہے۔ جو لوگ قوموں میں نئی رُوح پھونکنا چاہتے ہیں، تو یہی جہاد آزادی میں کامیاب بنانے کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں۔ انہیں پہلے یقین ہونا چاہیئے کہ یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ اس میں ہر نوع کے مصائب سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ ہر لحظہ ان کے خرمن پر بجلی گر سکتی ہیں۔ جب تک ایسے حوادث کو صبر جمیل کے ساتھ جھیل لینے کا دل گردہ پیدا نہیں کیا جائے۔ اصل کام کیوں کر پورا ہو؟ ایسے حوادث بہرحال مصیبت خیز ہوتے ہیں اور حقیقتہً ضمانتوں کی ضبطی کسی کے لئے بھی خوشگوار نہیں ہو سکتی اور ہونی چاہیئے۔ لیکن مجاہدین آزادی کا معاملہ تو میدان جنگ کا معاملہ ہوتا ہے۔ وہاں تیغ و تفنگ کے زخموں یا جان و مال کے نقصان کا شکوہ کرنے کا کون سا موقع ہے؟ یہ حقیقت کسی سے بھی مخفی نہیں ہوتی لیکن اسے دعوت کا رنگ دے کر ایسے انداز میں پیش کرنا جس سے دار کا خوف و ہراس یک قلم زائل ہو جائے اور ہر فرد بے تابانہ اصل نصب العین کی طرف پیش قدمی جاری رکھنے کے سوا ہر فکر و تشویش کو پس پشت ڈال دے۔ یہ ہر فرد کا کام نہیں۔ صرف انہیں داعیانِ حق کا کام ہے جنھیں اللہ تعالیٰ قوموں اور محکوموں کی تقدیر بدلنے کے لئے میدان عمل میں کھڑا کر دیتا ہے۔

قربانیوں کا سراسر خاکہ

مولانا نے اپنی بیش بہا زندگی کے گرانمایہ اوقات قید و بند میں گزار دیئے۔ ان اوقات کا مجموعہ دس سال سے کم نہیں۔ انہیں اللہ تعالےٰ نے علم و فضل کے جو بے پایاں خزانے عطا کئے تھے ان کی بنا پر وہ تصانیف کے انبار لگا سکتے تھے۔ چونکہ ان کی تحریریں موافقوں اور مخالفوں دونوں کے نزدیک مستحق مطالعہ تھیں۔ اس لئے اپنی زندگی حد درجہ خوشگوار انداز میں بسر کر سکتے تھے۔ لیکن وہ جن مقاصد و عزائم کے لئے زندگی وقف کر چکے تھے ان کی خاطر قید و بند کے مرحلے ناگزیر تھے۔ لہذا جب کبھی ان مرحلوں سے سابقہ پڑا انہوں نے اسے صابرانہ قبول کر لیا۔ یہاں تک کہ آخری قید میں ان کی بیگم سخت بیمار ہو گئیں، حکومت خاص شرطوں پر انہیں رہا کرنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن انہوں نے مشروط رہائی منظور نہ کی اور بیگم کا انتقال کلکتہ میں ہو گیا۔ مولانا اس وقت احمد نگر کے قلعے میں قید تھے۔ یہ داستان سُنا لینا یا سُن لینا شاید ایک حد تک سہل ہو لیکن جس فردِ عظیم پر یہ سانحہ جانگداز گزرا۔ اس کے قلب کی حالت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے اور خود بیگم کی کیفیت زندگی کے آخری لمحوں میں کیا ہو گی؟

یہ نہ سمجھئے کہ مردان کار کے دل حساس گوشت کے ویسے ٹکڑے نہیں ہوتے جیسے عام انسانوں کے پہلوؤں میں ہوتے ہیں نہیں، مردانِ کار کے دل زیادہ نرم، زیادہ حساس اور زیادہ رقیق ہوتے ہیں۔ وہ ایک چیونٹی کی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھتے ہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

آں دل کہ پریشاں شود از نالۂ بلبل   در دامنش آویز کہ با وے خبرے است

تاہم وہ زندگی کے اہم و بلند مقاصد اور ان کے اہم و بلند اصول کی عزیز داری اپنے ہر نازک جذبے اور ہر فطری احساس پر پلنے کی صلاحیت بخشتی ہے۔ اس وادیٔ پُرخار کو طے کرنا سہل نہیں۔ لیکن مردان کار حُبِ مقاصد کی سرخوشی میں ایسے منکر

وادیوں سے بے خودانہ گزر جاتے ہیں اور پاؤں کے چھلنی ہو جانے کا انھیں خیال بھی نہیں آتا۔

علم پر بجلیاں مولانا کے لئے یہ مصیبت کم نہ تھی کہ قید و بند کے سلسلے میں پیش آنے والی تلاشیوں اور ہر قسم کے کاغذات کی ضبطی کے باعث اُن کی گراں بہا علمی متاع بُری طرح تلف ہوئی۔ ان میں مسودے بھی تھے، ادھوری چھپی کتابوں کے فرمے بھی۔ کتابت شدہ کتابیں بھی اور بے شمار یادداشتیں بھی جو زندگی بھر کے مطالع کا نچوڑ تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز واپس نہ ملی۔ جو کاغذات سالہا سال کے بعد ہاتھ آئے، وہ کسی بھی کام کے نہ تھے۔ مولانا نے خود اس افتاد کا ذکر کرتے ہوئے ہے:

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا، دونوں کو بہ یک وقت جمع کردوں۔ میں نامراد ایک طرف متاع فکر کے انبار لگاتا رہا۔ دوسری دوسری طرف برق خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرف شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:

زاں شکستم کہ دنبال دل خویش مدام
درنشیب شکن زلف پریشاں رفتم

تصانیف مولانا کی تصانیف میں سے مندرجہ ذیل کتابوں کا علم سب کو ہے:

۱۔ ترجمان القرآن جلد اوّل و دوم مع تفسیر فاتحہ، جسے اب الگ بھی چھاپ دیا گیا ہے۔
۲۔ "تذکرہ"
۳۔ قول فیصل، جو سیاسی مقدموں کی سرگزشت میں بے مثال ہے۔
۴۔ مسئلہ خلافت وجزیرۃ العرب۔
۵۔ جامع الشواہد ۶۔ غبار خاطر

بعض رسالے یا خطوط کے مجموعے یا وہ مجموعہائے مضامین و مقالات جو مختلف لوگوں نے "الہلال" و "البلاغ" سے لے کر کسی قسم کی ترتیب کا لحاظ رکھے بغیر چھاپ دیئے۔ اس وجہ سے ان کی اشاعت کا مقصود بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا اور نہیں ہوا مقالات و مضامین تو رہے ایک طرف خود "ترجمان القرآن" بھی غیر مناسب انداز میں چھاپ دینا غیر مناسب نہ سمجھا گیا۔

بے سراغ ذخیرہ اب ان تصانیف کا سرسری حال بھی سن لیجئے، جن کا ذکر خود مولانا نے جابجا کیا تاہم اب ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

۱۔ ایک رسالہ جس میں بتایا گیا تھا کہ از روئے قرآن اقوام و ملل کے مراتب ہدایت و شقاوت کیا ہیں۔ یہ رسالہ ۱۹۱۲ء میں بغرض طباعت حوالۂ مطبع ہو چکا تھا (الہلال، ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۲ء ص: ۶، حاشیہ)
۲۔ سورۂ واقعہ کی تفسیر (الہلال، ۲۴ جولائی ۱۹۱۲ء ص: ۷، حاشیہ)
۳۔ تاریخ معتزلہ (الہلال ۲۴ جون ۱۹۲۷ء ص: ۴) شاید اسی کتاب کے بعض اجزا "البلاغ" کے چوتھے پانچویں اور چھٹے

ساتویں نمبر میں بہ عنوان "تاریخ" وغیرہ چھپے تھے۔

۴ - سیرۃ شاہ ولی اللہ (الہلال ۲۴ جون ۱۹۲۷ء ص : ۴)

۵ - میرزا غالب کے اُردو دیوان پر تبصرہ (ایضاً)

۶ - خصائص مسلم (ایضاً)

۷ - امثال القرآن (ایضاً)

۸ - دیوان شرف جہاں قزوینی پر تبصرہ (ایضاً)

۹ - سیرۃ حضرت مجدد، شیخ احمد سرہندی - اس کی ترتیب ۶ - یا ۷ - اگست ۱۹۱۶ء کو شروع ہوئی جب مولانا رانچی (صوبہ بہار) میں نظر بند تھے اور ۱۲ اگست کو پورے ایک ہفتے میں مکمل ہوگئی - اس کی ضخامت کا اندازہ کیا گیا تو متوسط تقطیع کے ایک سو نہتر صفحے ثابت ہوئی (تذکرہ طبع اوّل ص ۲۴۱)

۱۰ - اتحاف الخلف بطریقۃ السلف : اس میں سلف امت اور اصحاب تفویض کے مذہب حق وطریق حکمت اور عقلیات صادقہ و فاضلہ کا اثبات کیا گیا تھا۔ اور اصحاب تاویل و رائے نیز متکلمین واتباع فلاسفہ کی بے حاصلی واضح کی گئی تھی - یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں بہ زمانہ قیام رانچی مکمل ہو چکی تھی -

۱۱ - الکلم الطیب (تذکرہ طبع اول ص : ۲۲۰)

۱۲ - (ایضاً) ان کتابوں کا موضوع بظاہر یہ تھا کہ علوم سماویہ کے خلاف انسان کے شکوک وشبہات کے لئے ایسے اصول دریافت کئے جائیں جن سے تمام جزئیات کا استقصاء ہو جائے، نیز ان کے جواب -

۱۳ - سیرۃ طیبہ، ماخوذ از قرآن حکیم (تذکرہ طبع اوّل، ص : ۱۴۲، ۱۸۷، ۱۸۸)

۱۴ - سیرۃ امام احمد بن حنبل، جس کے ساتھ ان کے وصیت نامے کی شرح بھی کر دی تھی - (تذکرہ طبع اوّل ص : ۱۹۵ - ۱۹۶)

۱۵ - سیرۃ ابن تیمیہ و اصحابہ، جس کی تکمیل کے لئے مولانا نے سید سلیمان مرحوم سے الرّد علی المنطقیین کا قلمی نسخہ عاریتہً مانگا تھا - اس وقت تک یہ کتاب چھپی نہیں تھی بعد میں چھپ گئی -

۱۶ - شرح حدیث غربت (بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ فَطُوبَىٰ لِلْغُرَبَاءِ) مولانا فرماتے ہیں یہ حدیث بھی منجملہ جوامع الکلم نبویہ ہے - اس میں جس طرح اوائل کا حال دیا ہے اس ہی طرح اواخر کی بھی کوئی بات نہیں چھوڑی - حافظ ابن رجب نے چند صفحوں میں اس کی شرح لکھی ہے - لیکن اس میں صرف ایک ہی پہلو پر نظر ڈالی ہے -

اپنی شرح کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ ایک سو صفحہ سے زائد میں ختم ہوئی ہے - شرح ہائے غربت تا بہ عہد و تفصیل اسباب غربت و بحث و تحقیق احادیث فتن کے باب انشاء اللہ جامع اور سانح ہو گی - اشاعت سے پہلے نظر ثانی کا موقع ملا تو بعض مطالب بڑھا دیئے جائیں گے - جو کتابیں موجود نہ ہونے کی وجہ سے بالفعل سرانجام نہ پا سکے (تذکرہ طبع اول ص ۲۵۴)

ترجمان القرآن

اب تین بڑی کتابیں رہ گئیں جن پر الگ الگ بحث ضروری ہے - ان میں سب سے پہلے ترجمان القرآن جلد سوم آتی ہے -

"ترجمان" انہیں کم از کم دو مرتبہ لکھنا پڑا - کیونکہ پہلی مرتبہ کا مرتب کیا ہوا "ترجمان" جس کی طباعت بھی شروع ہو چکی تھی - ان کاغذات میں حکومت کے پاس چلا گیا تھا جب مولانا کو صوبہ بنگال سے اخراج کا حکم ملنے کے بعد ان کے مکان اور چھاپے خانے کی تلاشی لی گئی تھی - اس تلاشی میں بے شمار قیمتی مسودے اور چھپے ہوئے فرمے نیز اہم یادداشتیں بھی پولیس ساتھ لے گئی -

مولانا تین سال چند مہینے کی نظر بندی کے بعد رہا ہو کر رانچی سے کلکتہ پہنچے تو ۱۹۲۰ء میں حکومت نے جو کاغذات مولانا کو واپس کئے وہ متفرقہ کاغذات کا محض ایک جزو تھے - اور وہ بھی بار بار کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے بعد اس طرح رل مل چکے تھے اور پھٹ گئے تھے کہ ان میں سے کام کی کوئی چیز نکال کر الگ کر لینا ممکن ہی نہ تھا -

مولانا نے دوبارہ "ترجمان" کی ترتیب و تسوید شروع کی - اور جولائی ۱۹۳۰ء میں وہ آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو چکے تھے - ترجمان کی پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں چھپی - اور دوسری ۱۹۳۶ء میں چھپی - تیسری جلد کی طباعت نہ ہو سکی - شیخ غلام علی اینڈ سنز نے میری درخواست پر تینوں جلدوں کی از سر نو اشاعت کا پروگرام بنایا تھا - اور ایک مفصل منصوبہ مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا تھا لیکن رائلٹی کی رقمیں اس وقت کے حالات میں دوگونہ انکم ٹیکس کا موجب بنتی تھیں - لہذا مولانا نے شرف الدین کتبی اینڈ سنز بمبئی سے معاملہ کر لیا - اس نئے معاملہ کے مطابق کاروبار شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا - اور ترجمان کی تیسری جلد کا کوئی سراغ تا حال نہیں مل سکا - حالانکہ اس کی ترتیب کے شواہد جا بجا ملتے ہیں

کام کا تتمہ

میں نے ایک مرتبہ ترجمان کی محض دوسری جلد اس خیال سے دیکھی کہ اس میں کہاں کہاں تیسری جلد کے حوالے موجود ہیں - ان کی کیفیت ملاحظہ فرمایئے :

۱ - الحجر کے ایک تشریحی نوٹ میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر نوع انسانی کی پیدائش کا ذکر کیا ہے - ان تمام مقامات پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالنا ضروری ہے - چونکہ سورۂ "ص" میں بھی یہ بیان آیا ہے - اس لئے (سورۂ الحجر میں) صرف ربط مطالب کی تشریح پر اکتفا کی جاتی ہے - باقی تمام تشریحات سورہ "ص" کے نوٹ میں ملیں گی (جلد دوم ص ۳۰۴)

۲ - "الحجر" - آیت ۲۷ میں "جان" کی پیدائش کا ذکر فرماتے ہیں - "جان" اور "جن" کے لئے سورۂ "جن" کا نوٹ دیکھنا چاہیئے - (جلد دوم ص : ۳۰۴)

۳ - سورۂ کہف کے حواشی میں واقعہ کہف پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ رہبانیت کا ذکر آگیا ہے - لکھتے ہیں کہ مسیحی رہبانیت اضطراری حالات کا نتیجہ تھی - آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کر لی - اس کی مزید تشریح سورہ "حدید" کے حواشی میں ملے گی (جلد دوم ص : ۳۹۷)

۴ - سورۂ انبیاء کی تشریحات کے اواخر میں لکھتے ہیں : باقی رہا حضرت ابراہیمؑ "انی سقیم" (میں بیمار ہوں) والا اور

تو اس کی تشریح سورۂ صٰفٰت میں ملے گی (جلد دوم ص ۵۰۱)

۵ - سورۂ یونس کے تشریحی حواشی میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ پہلی نشأت سے دوسری نشأت پر استدلال تفصیل سورۂ حج کی آیت ۵ اور سورۂ قیامہ کی آخری آیات میں ملے گی (جلد دوم ص: ۱۴۸)

۶ - سورۂ مومنون کی تشریحات میں فرماتے ہیں کہ آیت ۷ سے معلوم ہوا، قرآن کے نزدیک اتحاد تناسلی کا جائز صرف ایک ہے اور وہ ازواج کا طریقہ ہے - اس کے سوا جو طریقہ اختیار کیا جائے گا، وہ ناجائز ہوگا - دنیائے عرب میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی - چونکہ وقت کی سوسائٹی میں آزاد اور غلام افراد کی دو قسمیں موجود تھیں اس کا ذکر ناگزیر ہوا - باقی رہی یہ بات کہ خود قرآن نے رسم غلامی کے باب میں کیا حکم دیا، اور کس طرح اسے مٹانا چاہا کا جواب سورۂ محمد کی تشریحات میں ملے گا (جلد دوم ص: ۵۲۶)

۷ - میں نے ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ کے بعض مطالب کے متعلق لکھا تھا کہ ان سے دل میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے شاید ایمان ضروری نہیں اور اسلام کا نظام عبادات ہنگامی تھا - مولانا نے میرے شبہات کا مفصل جواب دیتے ہوئے فرمایا طرح اصل دین کی دعوت کامل ہو چکی اسی طرح شرع و منہاج کا معاملہ بھی کمال کو پہنچ گیا - البتہ یہ ظاہر ہے کہ اس کا محل تفسیر سورہ فاتحہ یا سورۂ بقرہ نہیں سورۂ احزاب ہے - (ملاحظہ کیجئے میری کتاب "نقش آزاد")

غور فرمائیے کہ آیا ارباب علم و فضل مباحث کے ان حوالوں اور نشانوں کو محض خیالی اور قیاس قرار دے کر سکتے ہیں ؟

عجیب امر یہ ہے کہ تیسری جلد میں سے "سورہ نور" کتابت شدہ مل گئی ہے اور وہ اب ترجمان کی تیسری جلد (کے مطابق دوسری جلد) کے ساتھ چھپ رہی ہے - گویا حقیقتہً تیسری جلد کی کتابت شروع ہو چکی تھی - لیکن مبہم و معلوم موانع کی بنا پر معرض التوا میں پڑ گئی -

تفسیر البیان کے شواہد

دوسری اہم کتاب "البیان" تھی - جسے قرآن مجید کے بعض اہم مقامات کی مفصل تفسیر قرار دینا چاہئے - اس کے صرف دو نمونے "ترجمان" میں ملتے ہیں - اوّل سورۂ فاتحہ کی تفسیر - دوم اس امر کی تحقیق کہ "ذوالقرنین" کون تھا - مولانا کی تحریرات سے متعدد شہادتیں ملتی ہیں - جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ "البیان" نہایت اہم حقائق پر مشتمل ہے - چند شہادتیں ملاحظہ فرمائیے :-

۱ - سورہ توبہ کی تشریحات میں ایمان، کفر اور نفاق کی اجمالی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں - اس باب میں بہت سے امر تفصیل طلب ہیں اور مباحث تفسیر و حدیث کے متعدد مقامات ہیں جن کی تحقیق ضروری ہے، لیکن مزید تحقیق کا یہ موقع نہیں "البیان" کا انتظار کرنا چاہیئے - (جلد دوم ص ۱۴۳)

لہ فمن ابتغی وراء ذٰلک فاولٰئک ھم العادون یعنی اپنی بیبیوں یا غلامی کی حالت میں پڑی ہوئی عورتوں سے جو ان کے نکاح میں آگئیں، علاوہ زناشوئی ٹھیک ہے - ان کے سوا کوئی دوسری صورت نکالنے والے حد سے باہر ہو گئے -

۲ - سورہ توبہ ہی کی تشریحات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اہل کتاب اخلاص کھو چکے تھے۔ جب کبھی دیکھتے کہ شریعت کا کوئی حکم ان کی دنیا پرستیوں میں روک ہے تو کوئی نہ کوئی شرعی حیلہ نکال لیتے۔ سود کے لین دین سے بھی انہیں روکا گیا تھا علمائے یہود نے جو حیلے نکالے ان کی تشریح البیان میں ملے گی۔ (جلد دوم ص ۱۲۷) ایسی تشریحات کے بعد ہی اس حدیث کی پوری حقیقت واضح ہو سکے گی جس میں پیشگوئی فرمائی گئی تھی کہ تم پیشروؤں کے طریقے اختیار کرو گے۔

۳ - احتکار و اکتناز پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور ہوگا۔ یہ بات کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کس طرح اجتماعیت پیدا ہو سکتی ہے جس درجہ اہم ہے اتنی ہی زیادہ دقیق بھی ہے۔ "البیان" میں بہ ضمن تفسیر سورہ بقرہ اس کی مفصل بحث و تحقیق ملے گی (جلد دوم ص ۱۳۲)

۴ - رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں سابقون الاولون نے اللہ اور اس کے کلمۂ حق کی راہ میں جو کچھ پیش آیا، اسے جھیلا ہی نہیں بلکہ کمال محبت ایمانی سے اس میں خوشحال و خوشنود رہے۔ یہی مقام ہے جو ان کے درجے کو تمام مدارج ایمان و عمل میں ممتاز کر دیتا ہے۔ تعجب ہے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مفسروں کی نظر اس صاف و واضح بات کی طرف نہ گئی۔ "البیان" میں مزید تفصیل ملے گی۔ (جلد دوم ص ۱۴۵)

۵ - سورۂ ہود کی تشریحات میں اس اعتراض کا ذکر آگیا ہے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے متعلق آثار مصر میں اب تک کوئی چیز نہیں ملی۔ اس بنا پر بیسویں صدی کے علمائے تاریخ کا عام رجحان اس طرف ہے۔ کہ ان دونوں واقعوں کی تاریخی حیثیت قابل تسلیم نہیں۔ لیکن کیا آثار مصر کا سکوت اس کے لئے کافی ہے کہ اسے تاریخ کی منفی شہادت تسلیم کر لیا جائے؟ نیز کیا فی الحقیقت آثار مصر میں ان واقعات کے لئے کوئی روشنی نہیں؟ یہ سوالات ضرور حل کرنے چاہئیں لیکن ان کا محل "البیان" ہے۔ ترجمان القرآن نہیں۔ (جلد دوم ص: ۲۱۸)

۶ - سورۂ الحجر کی تشریحات میں یہ ذکر آگیا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت ہے یا نہیں۔ فرماتے ہیں اس پر مفصل بحث "البیان" میں ملے گی۔ جلد دوم ص: ۱۳۰۷)

البصائر یعنی مقدمہ تفسیر

سب سے آخر میں تیسری اہم کتاب یعنی مقدمہ قرآن کا معاملہ آتا ہے۔ جس کا نام ایک جگہ مولانا نے "البصائر" لکھا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی اہمیت کا پورا احساس نہیں کیا گیا اس کے مباحث کی سرسری کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

۱ - "تذکرہ" میں ایک مقام پر یہ بحث پیش نظر ہے کہ فلسفۂ عقل پرستی کی راہ یقین و طمانیت تک نہیں پہنچا سکتی علم و بصیرت اور یقین و نور حقیقت صرف قرآن اور حامل قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے۔ فرماتے ہیں:

> یہ مقام منجملہ روح الروح معارف کتاب و سنت و حقیقۃ الحقائق قرآن و شریعت کے ہے مگر اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تفسیر البیان میں ایک سے زیادہ مواقع پر اس کی تشریح ملے گی۔ اور اس سے زیادہ مقدمہ تفسیر موسوم بہ "البصائر" میں بہ عنوان حقیقت ایمان و کفر۔ با ایں ہمہ طبیعت اب تک اس طرف سے سیر نہیں ہوئی۔ روز بہ روز یہ مقام اپنی مزید وضاحت اور وسیع تر اطراف و مباحث کے

ساتھ نمایاں ہو رہا ہے۔ شاید دامن بیان اس سے بھی کہیں زیادہ پھیلے جس قدر "البیان" میں سمیٹا جا چکا ہے۔
(تذکرہ طبع اول ص: ۱۷۳)

علوم سماویہ اور انسانی شکوک

"تذکرہ" میں ایک مقام پر اس مسئلے کے متعلق متفرق اشارات کے بعد فرماتے ہیں:
مطلب متعدد مقامات پر لکھا جا چکا ہے، سب سے زیادہ مقدمہ تفسیر میں۔
اس کے (یعنی مقدمہ کے) ایک باب کا موضوع ہے کہ علوم سماویہ کے خلاف انسان کے تمام شکوک و شبہات کے لئے اصول و مقالید معلوم کئے جائیں جن سے تمام جزئیات کا استقصاء ہو جائے۔ اور کوئی قسم شبہ و اعتراض کی اس سے باہر نہ ہو۔ پھر ان شبہات و اعتراضات کو جمع کیا ہے جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے۔ نیز ان جوابات مندرجۂ قرآن پر دکھلایا ہے کہ جس وقت سے انسانی علوم اور علوم سماویہ کی آویزش کا حال معلوم ہے، اس وقت سے لے کر آج تک کوئی شبہ اور اعتراض ایسا نہیں کیا گیا، جس کا اصولاً جواب قرآن نے نہ دے دیا گیا ہو۔ (تذکرہ جلد دوم ص: ۲۱۹ - ۲۲۰)

تحریف شریعت کی حقیقت

"تذکرہ" میں ایک مقام پر یہ معاملہ زیر غور آ گیا تھا کہ تمام علوم و فنون میں جدل و خلاف "تاویل الجاہلین" اور "تحریف الغالین" کے برگ و بار ہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں:
شرح حقیقت تحریف شریعت علی الخصوص فتنتین عظیمتین یونانیہ عجمیہ کے لئے مقدمہ تفسیر کا باب بست و یکم اور تفسیر فاتحۃ الکتاب کو دیکھنا چاہیئے (تذکرہ طبع اول ص: ۱۹۲)

ظاہر ہے کہ "تذکرہ" مولانا نے ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا۔ "مقدمہ تفسیر" اس سے بہت پہلے شروع کر چکے تھے۔ اور تذکرہ کے لکھتے وقت مقدمہ کے کم از کم اکیس باب ضرور مکمل ہو چکے تھے۔ آخری دور میں مولانا سے میری جس قدر گفتگو ہوتی اس میں تفسیر کا ذکر ضرور آ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے مقدمہ عربی میں لکھا ہے، کیونکہ اس کی زیادہ ضرورت پوری ہوتی ہے کو ہے جس میں عربی دان زیادہ ہیں بعد ازاں اسے اردو میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا:
دیکھیئے میں نے قرآن کے متعلق تمام اصولی مطالب کو "مقدمہ" کے چوبیس ابواب میں اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ تمام اصولی مطالب کو چوبیس عنوانوں کے ماتحت تقسیم کر دیا ہے۔ پھر ان پر ایسے انداز میں بحث کی ہے کہ کوئی چیز رہ نہ جائے جسے قرآن کو سمجھنے کے سلسلے میں جاننا ضروری ہو۔

خطبات صدارت اور تقریریں

یہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے علم و فضل کی سرسری سی سرگزشت تھی۔ ان کی زندگی کا خاصا بڑا حصہ آزادی کی تگ و دو میں گزرا۔ ساڑھے دس سال کی مدت تو قید و بند میں گزار دی۔ بہ ایں ہمہ فرصت کے جتنے بھی اوقات میسر آئے ان میں تصنیف و تالیف کے انبار بھی لگا گئے۔ "الہلال" "البلاغ" اور "جامعہ" کے مضامین و مقالات ان کے علاوہ ہیں۔ جن میں سے اکثر مقالات مستقل اور جامع رسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یا اصل موضوع کے کسی نہ کسی نہایت اہم گوشے پر بالکل نئی روشنی پڑتی ہے۔ پھر ان کے خطبات ہیں جو مختلف مجالس کے

حیثیت میں دیئے گئے۔ مثلاً دہلی میں کانگرس کے اجلاس خاص (۱۹۲۳ء) کا خطبہ صدارت، کانگرس کے اجلاس رام گڑھ کا خطبہ صدارت۔ مختلف خلافت کانفرنسوں کے خطبہ ہائے صدارت۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس لاہور (نومبر ۱۹۲۱ء) کا خطبہ صدارت۔ ان بے شمار تقریروں کی فہرست مرتب کرنا مشکل ہے۔ پھر ان کی زبان پر کبھی ایسی چیز نہ آئی جس میں ذہنی و روحانی منفعت کا کوئی کوئی اہم پہلو موجود نہ تھا۔

جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ پولیس نے ۱۹۱۶ء میں مولانا کے چھاپے خانے اور مکان کی تلاشی لے کر جو کچھ اٹھایا تھا اس میں چھپے ہوئے فرمے، مسودے اور یادداشتیں بھی تھیں۔ فرموں میں سے ایک کسی وجہ سے اِدھر اُدھر پڑا رہ گیا اور کرم خوردگی کے بعد اسے پا کر محفوظ کر لیا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ مقدمۂ تفسیر کا کوئی باب تھا۔ اس کا آغاز ایسا ہوتا ہے:

"مقدمہ کے پانچویں باب میں قرآن حکیم کے طرز نزول اور ترتیب و انضباط کی بحث تم پڑھ چکے ہو......

اب یہ فرمہ چھپ گیا ہے لیکن نامکمل ہے تاہم اس سے اتنا پتہ ضرور چل گیا کہ مولانا نے "البلاغ" کے اجرا کے ساتھ ہی "ترجمان القرآن" اور مقدمۂ تفسیر (البصائر) کی طباعت شروع کرا دی تھی۔ اور مقدمہ تفسیر کے کم از کم پانچ باب اس نامکمل فرمے سے پیشتر چھپ چکے تھے۔ گویا مقدمہ مکمل موجود تھا تدریجاً اس کی طباعت ہو رہی تھی کہ حکومت کی طرف سے تلاشیوں کی بلا اور کلکتہ سے مولانا کے اخراج نے تمام سلسلے درہم برہم کر ڈالے:

غور و فکر کے زاویے

اس سرگزشت پر غور و فکر کے اہم زاویے یہ ہیں:

۱۔ اصل سلسلے کی وسعت اور تنوع کا معاملہ۔

۲۔ اس کا یہ پہلو کہ بعض نہایت اہم مسائل کی عام حیثیت پیشتر کیا تھی اور مولانا نے ان میں غور و فکر کے کون سے نئے پہلو پیدا کر دیئے۔

۳۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا اصلاً داعی حق تھے۔ جب انہوں نے میدان دعوت میں عملی قدم رکھا تو کتاب و سنت کے سلسلے میں اعتقاد اور عمل کی کیفیت کیا تھی اور مولانا کی دعوت نے اعتقاد و عمل میں کیا بنیادی انقلاب پیدا کر دیا۔

ان میں سے ہر پہلو سیر حاصل بحثوں اور مثالوں کا محتاج ہے۔ اور مثالوں کے بغیر حقیقت بخوبی ذہن نشین نہیں ہو سکتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ایک مقالے کی تنگنائے میں نہیں سما سکتا۔ اگرچہ اسے کتنی ہی وسعت دے دی جائے اس کا حق ادا کرنے کے لئے کتابوں کی ترتیب کا سروسامان ناگزیر ہے۔ یہاں صرف اشارہ و کنایہ پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔

دعوت حق کے لئے سروسامان

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مولانا نے کتاب و سنت کی دعوت کے لئے بنیادی استعداد کے سلسلے میں علوم کے کتنے دائروں اور شعبوں میں کمال حاصل کیا۔ جس کے میدان کے علم و معرفت میں زیادہ سے زیادہ جامعیت پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے خود ۱۹۳۰ء میں ترجمان القرآن کا دیباچہ مرتب فرماتے ہوئے لکھا تھا:

کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت۔ ایک ایک مقام۔ ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں۔ تفسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو......

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اوّل روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کردیا۔ اور تحقیق کی بندشیں کسی بھی گوشے میں روک نہ ہو سکیں۔ اور تحقیق کی تشنگی نے کسی بھی میدان میں ساتھ نہ چھوڑا......

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں۔ اور میری رُوح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں جو انکار کی ساری آزمائشوں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دارالشفاء سے آزمائے ہیں۔

یہ الفاظ بار بار پڑھیئے۔ پھر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے تو آپ پر آشکارا ہو جائے گا کہ دینی مباحث میں مولانا کے ایک لفظ کا باطن یقین و ایمان کی جس قدوسی رُوح سے سرشار محسوس ہوتا ہے، وہ ان مراحل سے گزرے بغیر نصیب نہیں ہو سکتی سے مولانا گزرے۔

علوم کے مختلف شعبے

پھر کتاب و سنت سے حقیقۃً لذت اندوز ایمان ہونے کے لئے متعدد علوم میں خصوصی مہارت کرنا ضروری تھا اور ان میں سے اکثر علوم ایسے ہیں جنھیں ہمارے علمائے کرام میں سے اکثر نے ضروری ہی نہیں سمجھا۔ مثلاً تاریخ، جغرافیہ، آثارِ قدیمہ، بائبل کے متعلق وہ وسیع ذخیرہ تحقیق و تفتیش جو یورپ نے پیدا کیا اور ہمارے ہاں کے اربابِ علم کو شاید اس کی خبر تک نہ ہو۔ اسی غرض سے مولانا نے انگریزی اور فرانسیسی سیکھی کہ ان کے بغیر وہ ان علوم تک براہِ راست پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔

ادبیات

پھر انہوں نے ادبیات (عربی، فارسی اور اُردو ہی نہیں انگریزی اور فرانسیسی میں بھی) کے تمام ضروری شعبوں میں مہارت پیدا کی۔ اس کے بغیر بیان و اسلوب میں وہ حسن و جاذبیت اور کشش پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جو کتاب و سنت کے حقائق منظرِ عام پر لانے کے لئے ضروری تھی۔ ان تمام مشقتوں اور ریاضتوں پر مستزاد ذہن اور حافظہ و استحضار کے وہ نادر اوصاف تھے جو انہیں قدرت نے عطا کئے تھے۔

یہ بھی واضح رہے کہ دَورِ حاضر میں علم کی کتنی مسندیں آراستہ ہوئیں۔ جنھیں زینت دینے والوں نے تفسیر، حدیث، رجال وغیرہ کو قدیم اصول کے مطابق پڑھا اور ان پر غور و فکر کیا۔ پھر دَورِ حاضر کے علوم کا پورا ذخیرہ کھنگال ڈالا کہ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے۔ میرے علم میں تو اب تک کوئی ایسی مسند نہیں آئی۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس جامعیت کے بعد جس فردِ جلیل و عظیم نے درس

عاصر کے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر سب سے بڑھ کر دینی اثر ڈالا - اور ان کے دل میں اسلام کے لئے ایک خاص تڑپ پیدا کر دی، وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور اقبال کے بعد کون تھا؟ ہمارے زمانے کے احیاء دین کی تاریخ اقبال کے کلام "الہلال" کے اجراء ہی سے شروع ہوتی ہے

راہ حق و صداقت میں علمداری ایک اہم معاملہ صاحب دعوت کے اوصاف و خصائل کا بھی ہے - مثلاً مسائل کے ہر گوشے پر گہری نظر، راہ و طریق کے ہر مرحلۂ ابتلا و آزمائش سے آگاہی - اثبات حق کے لئے ایسی استقامت جو کم از کم ہمارے زمانے میں یقیناً مثالی تھی - باطل کے ردو انکار میں انتہائی بے باکی اور اس کے نتائج سے کامل بے پروائی ہر قدم اٹھایا انتہائی غور و فکر کے بعد اٹھایا - اور جب اٹھایا تو دنیا بھر کی مخالفت سیل بے پناہ بن کر بھی اسے نہ روک سکی ورنہ پیچھے ہٹا سکی - راہ حق و صداقت میں یہ شان سلطانی و ملوکی - قرآن کے بنیادی حقائق پر اٹل یقین و ایمان ہی کا کرشمہ تھی قرآن لعت ہے کہ اللہ کی سنت کبھی نہیں بدلتی - فتح و کامرانی اور ثبات صرف حق کے لئے ہے - باطل آنی جانی، بے بنیاد اور ناپائیدار ہے سوال یہ ہے کہ کتنے آدمی اس پر حقیقۃً یقین رکھتے ہیں - سورج کے ہر طلوع و غروب کا وقت مقرر ہے - ہر رات دن کے پہروں ور گھڑیوں کا شمار سب کو معلوم ہے - لاکھوں کروڑوں آدمی سوتے ہیں تو اگلے دن کا پروگرام پہلے سے بنا لیتے ہیں تاکہ صبح کو اٹھتے ہی اس میں مصروف ہو جائیں - مگر حق و باطل کے متعلق قرآن حکیم کے اصول پر ویسا ہی اعتقاد کتنے دلوں میں موجود ہے؟ اگر سب یں واقعی ایسا اعتقاد موجود ہو تو ہزاروں لوگ بے بنیاد اور ناپائیدار اغراض کی خاطر باطل کی حمایت کے لئے اس طرح کیوں جمع ئے جس طرح مکھیاں شہد پر جمع ہو جاتی ہیں؟

مولانا کا یقین محکم مولانا کا قلب صافی ایسے ہی یقین و ایمان کے نور سے معمور تھا - اور ان کی پوری زندگی اس کی ایک سراپا روشن شہادت ہے - انہوں نے اسی طرح حق کو محکم و استوار اور باطل کو راکھ کی دیوار سمجھا اور ویسے ہی یقین کے ساتھ جس طرح صبح کو سورج کے طلوع اور شام کو سورج کے غروب کا یقین ہوتا ہے - بلکہ مولانا کا عقیدہ یہ تھا، کہ طلوع و غروب آگے پیچھے ہو سکتا ہے مگر حق کی کامیابی اور باطل کی شکست آگے پیچھے نہیں ہو سکتی تھی - انہوں نے قربانیاں کیں، تکلیفیں جھیلیں، مشقتیں اٹھائیں - کیونکہ ان کی رُوح ایمان پکار رہی تھی کہ رات کی تاریکی ہمیشہ مسلط نہیں رہے گی - اس کا پردہ ضرور چاک ہوگا - صبح کی روشنی لازماً جبین مشرق پر رقصاں نظر آئے گی - عزم راسخ کے ساتھ جد و جہد جاری رکھی جائے تو محکومی کی زنجیروں کے لئے ٹوٹنے کے سوا چارہ نہ رہے گا - اور آزادی ضرور ملے گی، وہ ملی - اگرچہ بعض خاص اسباب کی بناء پر لاکھوں انسانوں کے لئے ماتم و سوگواری بن کر آئی - محکومی بہر حال ختم ہوگئی - اور جس برطانوی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہ ہونے کا دعویٰ کر و فخر سے کیا جاتا تھا - وہ آج اس چھوٹے سے جزیرے میں محدود نظر آتی ہے جہاں سے ابھر کر اس کے شجر استعمار کی شاخیں دنیا کے ہر حصے میں پھیل گئی تھیں -

پاک و ہند کی آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی بحری راستے کے ساتھ ساتھ جتنی اسلامی سرزمینیں مدت سے محکوم چلی آتی تھیں وہ بھی یکے بعد دیگرے آزاد ہو گئیں - کم از کم ایشیا اور افریقہ سے برطانوی استعماری منحوس سایہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا -

العاقبۃ للمتقین یہ دنیا ایک پردہ ہے جس پر سیمیائی شکلیں پے در پے نمودار ہوتی ہیں اور اپنے وظیفے انجام دے کر ناپید ہو جاتی ہیں - سب کے وظیفے یکساں نہیں ہوتے - بعض وجود اپنے دامن میں حسن عمل اور اتباع حق کے شہوار موتی بھر

پھیلتے جاتے ہیں۔ بعض کے حصے میں دہکتے ہوئے انگارے آتے ہیں۔ آخرت کے گھر کی راحت وطمانیت انہی کے لئے ہے جو دنیا میں فتنہ اور فساد نہیں چاہتے جن کی زندگی کا ہر لمحہ رضائے باری تعالیٰ میں گزرتا ہے۔ اور انسانوں کی فلاح واصلاح، خیروبہبود اور امن سکون کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ سب لوگ خدا کے نیک، صالح اور حق گزار بندے بن جائیں۔ ان دشمنی کے بجائے دوستی، نفرت کی بجائے محبت، بُعد کی بجائے قرب پیدا ہو، تاکہ نیکی اور خیر خواہی کی روح رفتہ رفتہ سب میں سرایت کر جائے، ظلم وجور مٹ جائے، حق کُشی اور حق سوزی نیست ونابود ہو جائے۔ اسلام کا نصب العین یہی تھا کہ بنی نوع بشر ایک گھرانے کے افراد کی حیثیت میں زندگی بسر کرنے لگے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ومغفور کی زندگی اسی نصب العین کے لئے وقف رہی۔ اللہ تعالےٰ ان کی خواب گاہ ارضی کو ہمیشہ نورِ رحمت سے معمور رکھے والعاقبۃ للمتقین۔

یہ بھی کھلا راز ہے کہ ۱۹۵۷ء کے عام انتخابات سے پہلے جن لوگوں کے نام ہندوستان کی صدارت کے لئے زیر غور تھے ان میں آزاد کا نام نامی شامل تھا لیکن مولانا کا رجحان دوسرا تھا۔ وہ عہدے اور منصب سے زیادہ کام کے قائل تھے اور اسی لئے صرف وہ عہدہ قبول فرماتے تھے جس میں اپنے ذوق کے مطابق زیادہ سے زیادہ مفید خدمت انجام دے سکتے تھے چنانچہ اسی زمانہ میں ایک اخباری نامہ نگار نے ان سے سوال کیا کہ کیا نئے انتخابات کے بعد آپ ہندوستان کے صدر رہوں گے؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا صدارت میں ایک وسیع باغ اور آرام دہ مکان کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ اس مختصر سے جواب میں استغنا وبے نیازی کے دفتر کے دفتر سمٹ کر آگئے ہیں۔ سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اخباروں میں یہ جواب پڑھ کر اعتراض کیا تھا کہ مولانا نے صدارت کے اس منصب کی توہین کی ہے اور اس لئے انہیں ہندوستانی عوام سے معافی مانگنی چاہیئے۔ لیکن مولانا کا مقام اس طرح کے عامیانہ اعتراضات سے بہت بلند تھا۔ وہ اس طرف کیا توجہ فرماتے؟

ریاض الرحمٰن شروانی

"ایک دن ایسا ہوا کہ کوئی پانچ بجے گاندھی جی آپہنچے۔ میں نے استقبال کیا اور دوڑ کر مولانا کو خبر کی۔ انہوں نے سنا مگر جیسے سنا نہیں۔ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ فرمانے لگے "کہہ دیجئے اس وقت ملنے سے معذور ہوں۔ کل نو بجے تشریف لائیں" عرض کیا "غور فرمالیجئے کیا یہی پیغام پہنچا دوں!" کسی قدر تیکھے تیوروں سے فرمایا: "اور کیا؟ گاندھی جی میں سرخاب کے پر تو لگے نہیں"

عبدالرزاق ملیح آبادی

پنڈت جواہر لال نہرو

ایک غیر معمولی سیاستدان

کسی آشنا ہستی کے متعلق کچھ اظہار خیال کرنا ایک مشکل کام ہے اور پھر یہ مشکل اور بھی مشکل ہو جاتی ہے جب وہ ہستی
بیاسی رفیق ہو کر قومی کاموں کی تمام قسم کی ذمہ داریوں اور تکالیف میں ساتھی رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے
ق قدم اٹھانا میرے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تقریباً بائیس سال ہوتے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی لیکن مولانا کی حمیت قومی کاموں میں عزم و ثبات اور
عظیم کے دوران میں ان کی نظر بندی کے متعلق میں اس سے پیشتر ہی بہت کچھ سن چکا تھا اور اُن سے ملنے کے لئے بیتاب تھا۔
اعتبار سے ان کا ابھی عالم شباب تھا لیکن اُن کے چہرے پر پختہ کاری اور بالغ نظری کے گہرے نقوش تھے اور اس طرح
ی جگہ بزرگان کانگرس کے درمیان ناگزیر تھی۔ چونکہ مجھے خود بھی اس وقت کانگرس کے اندرونی حلقوں سے اتنا گہرا ربط و ضبط
تھا اس لئے اس وقت انہیں صرف دور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا لیکن اس کے بعد کانگرس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں
اُن کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور بالخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے اُن سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہمارے
قید و بند اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے زمانہ کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کانگرس کے اندر مشاغل اور اس
عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں ان کی مسلسل رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے۔ کانگرس کی تاریخ میں اور بنا بریں ہندوستان
تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کانگرس کی تجاویز اور عزائم کی تراش خراش اور وضع قطع میں ان کا زبردست
کس طرح مصروف کار ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ پریذیڈنٹ ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ایک عام ممبر ان کے آزاد مشورے
زائی طور پر وقیع سمجھے جاتے تھے کیونکہ ان راؤں اور مشوروں کے پس پردہ دانش و تدبر اور فہم و فراست کی غیر معمولی پختگی
کھلاوٹ روز بروز نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔

مولانا عام دنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاست دان ہیں۔ آپ ایک کامیاب سیاست دان کے طبعی مزاج سے معرا
بھوس اور بے حس ہو کر حملے کرنے اور حملے سہنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ کی افتاد طبیعت سرتاسر اس کے خلاف ہے۔ وہ
شرمیلے اور خلوت پسند ہیں اور مزید برآں ان کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل ہے۔ باوجود ایک مقرر اور باوقار
ہونے کے شور و شغب اور ہنگامہ خیزیوں سے بہت گھبراتے ہیں۔ ان کو عوام میں تقریر کرنے کے لئے آمادہ کرنا کوئی آسان

کام نہیں، حق یہ ہے کہ ان کی اصلی خصوصیت علم و فضل تھی۔ حالات کی نزاکت نے انہیں حرکت و گردش کی زندگی پر مجبور کر دیا۔
مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی فاموسی یاد آجاتے ہیں جو انقلاب فرانس سے کچھ عرصہ پہلے وہاں موجود تھے۔ تاریخ ماضیہ میں ان کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے اور پھر یہ وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود ہے ان کا ذہن مدلل، باضابطہ اور سلجھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کا عام رویہ معقولیت پسند ہے۔ بایں ہمہ ان میں ایک ایسا انسان پس منظر میں تھا جو علم کے پہاڑوں کو نرم و نازک کر کبھی کبھی بلند مگر خشک ظرافت پیش کرتا ہے۔
اگر اس قدر خلوت پسندی اور شرمیلا پن ان کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا تو وہ ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بڑھ کر حصہ لیتے کیونکہ ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز ہے جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت و عمل کی طرف راغب کر سکتا ہے۔ ہم نے یہ اعجاز پرور آواز اب پبلک میں شاذ و نادر ہی سنی ہے اور بدقسمتی سے انہوں نے اپنے جادو نگار قلم سے بھی پہلے کی دل آویزیاں اور رنگینیاں پیدا کرنی چھوڑ دی ہیں۔
مجھے ہمیشہ ان کی تصنیفی زندگی سے بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے کیونکہ جو زبان وہ لکھتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ پر معنی الفاظ سے مملو ہوتی ہے۔ وہ جو عنفوان شباب ہی میں انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا، عربی ممالک اور مصر سے خراج تحسین حاصل کر لیا تھا محض اُن کے قلم کی بدولت تھا اور اب تک یہ حالت ہے کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیاح ہندوستان سے جاتا ہے تو اس سے ابوالسلام آزاد کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔ اگر انہوں نے اپنا یہ جہاد قلمی جاری رکھا ہوتا تو آج قوم کو صاف اور سلجھے ہوتے طرز فکر اور بنا بریں صحیح راہ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی۔
یہ محض حالات کا تقاضا ہے کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لینے کے لئے مجبور ہو گئے اور یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ انہوں نے یہ سب کچھ کس طرح بوجوہ احسن ادا کیا۔ لیکن ہم کو جنہیں ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع حاصل ہے تاریخ کے فیصلے کے واسطے زحمت کش انتظار کیوں ہوں؟ وہ ہمارے لئے اور ملک و قوم کے لئے قوتوں کا ایک پہاڑ رہے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ہم نے ان کی رائے سے اختلاف کیا یا اتفاق۔ ہم ہمیشہ یہ ملحوظ خاطر رکھتے رہے کہ ان کی رائے سب سے زیادہ وقیع ہوتی ہے اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صاحب دماغ کی پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی و حال کے علم و فضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہو اور یہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں۔
اس عظیم المرتبت ہندوستانی میں نئی پود کے اخذ و جذب کے واسطے بہت کچھ ہے۔ وہ ایک ہی وقت زبردست عالم اور ہندوستانی اتحاد کے نمائندہ اور شارح ہیں اور ان دونوں چیزوں کے اتحاد میں انہوں نے مطلقاً دقت محسوس نہیں کی۔ اکثر کم لوگوں کو ہندوستانی زندگیوں کے اختلافات میں ایک باہمی آویزش نظر آتی ہے لیکن مولانا اس عام سطح سے بہت بلند واقع ہیں اور ان پابندیوں سے انہوں نے نہ صرف اس تنوع کے پس پردہ حقیقی اتحاد و یک جہتی کو دیکھ لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان اور اس کی قومی زندگی کی مختلف روحوں کی نجات اسی یک جہتی اور اتحاد سے وابستہ ہے۔

خطبۂ احیائے ملّت

(اگست ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی میں مولانا آزاد کا ایک شاہکار)

عزیزان گرامی ! آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہ جہان کی اس یادگار مسجد
یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانہ میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا
ے تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد، اور آج تمہارے چہروں کا
راب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے!
نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے
ں کاٹ دیئے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ
ی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی راہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض
بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ہی ان خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ
مستقیم سے دُور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دُور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری
ے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے گئے ہیں یا میرے آشیانے
لئے جگہ نہیں رہی بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور
رے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کونسی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ خوف کی زندگی نہیں۔ آہ کیا
ہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔ یہ ٹھیک
ے کہ وقت نے تمہاری خواہش کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور
ہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شئے چھن
ئی اور اس کی جگہ بُری شئے آگئی۔ ہاں تمہاری بے قراری اسی لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شئے کے لئے تیار نہیں کیا تھا
اور بُری شئے کو ملجا و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا
بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب کسی قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے اور آج تم اس جنگ کے انجام
سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی
پیش آگیا۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں، کہ
تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار
سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سُنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے۔ اس پر غور کرو۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغ

کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟
یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالاں کہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔ عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔
اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمی کی معرفت فرمایا تھا "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"۔ ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔
میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر ——— بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوتی، تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی تو پھر اس طرح بدلو، جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔
میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا اشعار رہا ہے میں کہتا ہوں جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کیلئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی ——— آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود اک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا۔ یہ پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اُٹھی تو اس کا رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو اُن سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان نہیں تھا۔ عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے وہی پرانا نسخہ ہے جو چودہ سو برس پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کیساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں۔ اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل ہی کی دکان سے اعمال صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے والسلام

بولتی ہوئی تحریریں

"قبل اس سے کہ ہم پر شہادت دی جائے، بہتر ہے کہ خود آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں۔"

"میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گذری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گذرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدہ کو نہ جھٹلاؤں، میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا۔ میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان کے نوکروڑ مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انہیں دعوت دی۔"

"میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندوستانی ہوں اور ناقابل تقسیم اور متحدہ ہندوستانی قومیت میں شامل ہوں۔ گیارہ صدیاں گذر گئی ہیں اور ہندوستان کی سرزمین سے اسلام بھی اسی طرح وابستہ ہے جس طرح ہندو دھرم۔ اگر اس ملک کے باشندوں کا ہندو دھرم کئی ہزار سال سے یہاں موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندوستانیوں کا مذہب بن چکا ہے۔ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں میں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں لیکن ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اُسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔"

"سمندر میں جب طوفان خیز لہروں کا تلاطم برپا ہوتا ہے تو اس کے دردانگیز نتائج کا حال ان لوگوں کو معلوم نہیں جو شام کے وقت ساحل کے کنارے اس لئے جمع ہو جاتے ہیں کہ سطح سمندر کے ہر جدید تغیر سے ایک نیا لطف اٹھائیں۔ ان کی حقیقت سے وہی خانہ ویران واقف ہو سکتے ہیں جن کے گھر کی دیواروں سے یہ سیلاب ٹکرا کر گذر گیا ہے۔ بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔"

"ہماری فتح مندی کی تمام بنیاد چار سچائیوں پر مشتمل ہے۔ میں اس وقت بھی اس ملک کے ہر باشندہ کو صرف انہی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ ہندو مسلمانوں کا کامل اتفاق، امن، نظم، قربانی اور اس کی استقامت۔"

"عفو و درگذر، آشتی و محبت، نرمی و عاجزی انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی ہے۔ لیکن کن کے سامنے؟ عاجزوں اور درماندوں کے سامنے نہ کہ ظالموں اور مجرموں کے آگے۔ ایک مسکین و فلاکت زدہ پر رحم کیجئے تو سب سے بڑی نیکی ہے اور ایک

ظالم پر کیجئے تو سب سے بڑی بدی ہے۔ گرے ہوؤں کو اٹھائیے تاکہ وہ چل سکیں۔ لیکن اگر سرکشوں کو ٹھوکر نہ لگائیے گا تو وہ گرے ہوؤں کو اور گرا دیں گے۔"

"دنیا تو نہیں بدلی مگر دنیا کی ہر چیز کا غلاف بدل گیا ہے۔"

"دراصل یہی ہمارا "جرم حقیقی" ہے کہ قرآن نامی ایک کتاب ہے جسے ہم ترک نہیں کر سکتے۔"

"مسلمان کا یہی وظیفہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے۔ اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص کہ جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعہ سے اعلان حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں چپ ہو نا گوارا کر لیا جائے اور ۲ اور ۲ کو اس لئے چار نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جا ہے، تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لیے خطرہ میں پڑ جائے اور حق کے اُبھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے، نہ اس لئے بدلا جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گذرتی ہے۔ وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔ صرف اس لئے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا، آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی پیدا نہیں ہو سکتی۔"

"اس تمام قضیہ کا حل صرف اس بات میں ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق پر زور دینے کے بجائے اپنے فرائض کی ادائی کے لئے تیار رہے۔"

تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی۔ تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھپ گئے۔ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں تمہاری غفلت مر جائے۔ یہ کیا ہو گیا کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو اور کیوں تمہاری عقلوں پر طاعون چھا گیا ہے کہ سب کہتے ہو اور سمجھتے ہو، پر نہ تو راستبازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہوں کے نقشِ قدم چھوڑتے ہو۔"

"تمہارا روگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہوا ہے۔ تم وقت پر سامنے آنے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھلے جاتے ہو اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ کیوں درست نہیں کر لیتے۔ جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہو گا، روز نئے نئے روگ لگتے رہیں گے۔"

"میں کسی کے دل تو نہیں بدل سکتا اور نہ کسی کے سر میں نیا دماغ رکھ سکتا ہوں۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے جس چیز کو میں صحیح سمجھتا ہوں اُس کو ان کے سامنے رکھ دوں۔"

"تم بارش کے وجود سے انکار نہیں کرتے لیکن منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے، تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہوا میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کا دیکھ لینا میرے علم کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔"

"راہ مقصد کی خاک بہت غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ راہرو کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے پھر

ی چو کھٹ کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔"

"اس بارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں جو کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلالِ صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا جو دُردِ کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ خزاں کا شیون برپا رہا۔"

"یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے۔ یہاں پانے کا راہ اُن ہی کو مل سکتا ہے جو کھونا چاہتے ہیں۔"

"زندگی کی حالتوں کو ہم راحت و الم سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہو گی کہ اضافت کے کرشموں کی صورت گری ہے۔ یہاں نہ مطلق راحت ہے نہ مطلق الم۔ ہمارے تمام احساسات سراسر اضافی ہیں۔ دو یدن، رفتن، ایستادن، نشستن، خفتن و مردن، اضافتیں بدلتے جاؤ، راحت و الم کی نوعیتیں بھی بدل جائیں گی۔ یہاں ایک ہی ترازو لے کر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس تولا نہیں جا سکتا۔ راحت و الم کا احساس ہمیں باہر سے لا کر کوئی نہیں دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے اور کبھی مرہم بن جاتا ہے۔"

"دعوت و اعلانِ حق کا کام کرنے والوں کو اپنے لئے نہیں مگر اپنے کام کی عزت کی خاطر بادشاہوں کی سی نظر اور سلطانوں کا سا دماغ رکھنا چاہیئے۔ جو لوگ خدا کے دروازہ کے سائل ہیں دنیا میں کس کی ہستی ہے کہ وہ انہیں سامنے سائل دیکھ سکے۔ ان کی جیب میں ایک کھوٹا سکہ بھی نہ ہو لیکن ان کے دل میں وہ خزینہ مخفی ہے جس سے بڑے بڑے مغرور شہنشاہوں کو خریدا جا سکتا ہے۔"

"اگر دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کو چراغ کی روشنی دھندلی نظر آتی ہے تو یہ ان کی آنکھوں کا ضعف ہے جس کو دُور کرنا چاہیئے، اُن کی خاطر چراغ گل نہیں کئے جا سکتے۔"

"میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُرپیچ فریب نے انہیں قید کر رکھا تھا۔"

"افسوس! اس دورِ جوش و خروش اور بیداری و ہشیاری میں بھی میں دیکھتا ہوں تو میرے دل کی غمگینی اور اضطراب کا علاج کہیں نظر نہیں آتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ یا تو غفلت کی سرشاریاں ہیں یا اگر بیداری کی کروٹیں بھی ہیں تو آنکھوں سے غفلت دوشیں کا خمار ابھی دور نہیں ہوا ہے۔ خوابِ غفلت کی سرشاری اور چشمِ نیم باز کی کروٹیں یہ تو دو پہلی حالتیں ہیں لیکن ان کے بعد ایک تیسر اگر وہ بھی نظر آتا ہے جو بستر سے تو اُٹھ چکا ہے مگر منزلِ مقصود کے نشان سے بے خبر ہے۔"

"تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو۔ میں سچ کہتا ہوں، تمہارے اس ملک میں، میں ایک بے یار و آشنا اور غریب الوطن ہوں۔"

"جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے، تو ہمارے حصّہ میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انہوں نے پھول چن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے اور ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے۔"

ایک مکتوب

...... درحدیثِ دیگراں

مولانا غلام رسول مہر نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خط لکھا کہ غالب کے متعلق بعض تذکروں میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ان کا ابتدائی کلا[م]
میر تقی میر کے پاس کسی نے پیش کیا تھا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اسے اگر کوئی کامل رہبر مل گیا تو صاحبِ کمال بن جائے گا، نہ ملا تو مہمل بکنے گ[ے گا]
میں اس واقعہ کو اب تک افسانہ سمجھ رہا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں روشنی ڈالئے۔

اس سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے جو طویل مکتوب لکھا تھا اسے من و عن شائع کیا جا رہا ہے۔

کلکتہ ۳ $\frac{12}{46}$

"عزیزی خط پہنچا۔ میر تقی میر والی حکایت کی مندرجہ بالا یادگار غالباً عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے، لیکن خا[ص]
خاص حالات میں چنداں مستبعد نہیں۔ غالب نے خود لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی جب ملا عبدالصمد میرے مکان میں آکر مقیم ہوا ا[ور]
فارسی زبان کے اصول و قواعد میرے دل و دماغ میں پیوست کر دیئے۔ عبدالصمد دو سال تک ٹھہرا تھا، اگر تیرہ برس کی عمر میں آ[یا]
ہو گا تو گویا زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقع ملا ہو گا۔ اگر غالب کی قدرتی استعداد و مناسبت کا یہ حال تھا [کہ]
چودہ برس کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و غوامض کا متحمل ہو سکتا ہے جن پر سراج الدین خاں آرزو، شمس الدین فقیر اور ٹیک چند [بہار]
جیسے دماغ سوختگان مدرس عمر بھر درس و تدریس کے بعد بھی آشنا نہ ہو سکے تو یہ بات کیوں مستبعد تصوّر کی جائے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں [شعر]
کہنا شروع کر دیا اور ندرت و غرابت کی وجہ سے اس بات کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا، حتیٰ کہ میر صاحب تک کسی نے یہ تذکرہ پہنچا[یا]

اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا ہے لیکن محض رفعِ غرابت کے لئے لکھتا ہوں [کہ]
خود میں نے اس عمر میں شعر و شاعری شروع کر دی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا غالباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے [کہ]
بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو پنچ بہادر نکالا کرتے تھے۔ ایک گلدستہ ارمغان فرخ کے نام نکالا اور کلکتہ میں بعض شعرا اس [کی]
ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس کی طرح تھی ؎

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی، تین شعر ان خرافات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کئے ہیں:۔

نشتر یہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی　　نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد　　شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ　　پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں لیکن اس وقت انہیں لغویات نے لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی جبکہ ۳۶ برس گذر
چکے ہیں، اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہے جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی۔ جب "ارمغان فرخ" میں یہ غزل چھپ
کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

اس زمانہ میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخ۔ رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے انہیں کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا جو غزلیں میں سناتا ہوں وہ میری ہی کہی ہوئی ہیں۔

ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے جس کی دوکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔

میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی "یاد نہ ہو۔ شاد نہ ہو"۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر لکھ دیئے۔ کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات — میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے "صورت سے دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی"۔

اس وقت سوچتا ہوں یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ اس کے بعد یہ خبط اور بڑا، اور خیال ہوا کہ ایک گلدستہ نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ نیرنگ عالم کے نام سے ایک گلدستہ جاری کیا۔ میری عمر اس وقت تیرہ برس سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ پھر اس زمانہ میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ مخزن نیا نیا نکلا تھا، میں نے چند تحریریں بھیجیں۔

لکھنؤ سے نوبت رائے نظر، فرنگ نظر نکالتے تھے۔ اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا۔ انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کردیں اور اس کی ترتیب اپنے ذمہ لی۔

اس زمانہ میں مولوی احمد حسین صاحب فتحپوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور "تحفۂ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین نویسی ہونے لگی تھی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں۔ ایک رسالہ خود نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ "اللسان الصدق" جاری کیا یہ تمام معاملات ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۴ء کے ہیں۔ اس وقت میری عمر سولہ برس سے کم نہ تھی۔

تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں اس لئے والد مرحوم نے چند طلبا کی کفالت کرکے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ان میں قندھار کے ایک خاں صاحب تھے ان کی ڈاڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی۔ اس زمانہ میں طبیعت تقریر کی طرف مائل ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۲ء میں کی۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

بہرحال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا کوئی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں۔ اگر میں اس عمر میں تک بندی کرنے لگا تھا غالب جیسی شخصیت کے لئے جسے قدرت نے شاعری ہی کے لئے پیدا کیا تھا یہ بات کیوں مستبعد تصوّر کی جائے۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسام الدین حیدر، مرزا سلیمان شکوہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر یہ خیال صحیح ہو تو اُن کا آگرہ سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ مرزا سلیمان شکوہ کی جب قمر چہرہ کے معاملے میں نورالدین حیدر سے اَن بن ہو گئی تو وہ لکھنؤ سے چلے گئے تھے۔ کچھ دنوں جنرل گارڈن کے یہاں پھر آگرہ کا رُخ کیا۔

ہو سکتا ہے کہ حسام الدین حیدر اور غالب کے ابتدائی تعلقات اس زمانہ میں شروع ہو گئے ہوں یہ محض قیاس ہے وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ بعض کتابوں کے مراجعہ سے تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں۔

دیکھیئے بے خبری میں کتنے صفحے لکھ گیا، یا تو خطوں کے جواب میں دو سطر لکھنا بھی دوبھر ہوتا ہے یا یہ عالم ہے کہ دس بارہ صفحے سیاہ ہو چکے ہیں اور ابھی تک کہانی ختم نہیں ہوئی۔ اصل یہ ہے رمضان کی آمد نے یکایک بجھی ہوئی طبیعت میں تازگی پیدا کر دی ہے۔ عشاء کے بعد بیٹھتا ہوں تو صبح تک دماغ کے کیف و سکون میں کوئی خلل اندازی نہیں ہوتی۔ اس وقت تین بج چکے ہیں اعلیٰ درجے کی سبز چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے جو ایک جاپانی دوست نے حال ہی میں بھیجا ہے۔

آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور دل میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ایسی چائے کے فنجان میسر ہوں تو پھر اور کون سی نعمت باقی رہ جاتی ہے جس کی انسان خواہش کرے۔ میرے لئے یہی چائے سحری کی صبوحی بھی ہے۔ اور افکار کا جام خمار شکن بھی۔

آپ خواجہ حسن نظامی کے روزنامچہ ہائے غدر کا حوالہ دیتے ہیں۔ میں نے اخباروں میں ان کا نام دیکھا تھا۔ مگر کبھی یہ خیال نہیں گذرا کہ ان میں کوئی قابل اعتنا بات ہوگی۔ کیا واقعی غدر کے زمانے کی تحریریں اس میں استناد کے ساتھ جمع کی گئی ہیں اگر واقعی ایسا ہو تو لکھیئے کون کون سے رسالے ہیں۔ بہادر شاہ مقدمے کی روئیداد پرانی بھی چھپی ہوئی موجود ہے اور پنجاب میں نئی بھی چھپ گئی ہے۔ مرزا حیرت نے "چراغ" دلی میں اس کا خلاصہ اردو میں بھی چھاپ دیا ہے۔ اودھ کی بعض تحریروں اور روزنامچوں کا انگریزی ترجمہ سٹیٹ پیپرز کے سلکشن میں شائع ہو چکا ہے۔ معین الدین کا نا تمام روزنامچہ اور نیز مرزا کی تحریریں چھپ چکی ہیں۔ کیا خواجہ حسن نظامی کے رسالوں میں ان کے علاوہ بھی کچھ مواد ہے۔

والسّلام۔ (ابوالکلام)

غلام رسول مہر

ایک بے مثال شخصیت

(مولانا غلام رسول مہر کے ایک طویل مضمون سے اقتباسات)

مولانا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے۔ بہت کم بڑے آدمی ہیں کہ متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہوں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روز و شب کا سلسلہ دور و دیر جاری ہے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ تاہم حقیقت حال پر نظر رکھئے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ ؎

نزا، چنانکہ توئی۔ ہر کسے کجا داند۔! بہ قدر طاقتِ خود مے کنند استدراک

اہم مولانا کی چند نمایاں خصوصیات بیان کی جا رہی ہیں۔

ہر دائرے میں مستقل قدریں

"الہلال" سے پیشتر تمام جرائد و رسائل (اِلّا ماشاءاللہ) امرا و رؤسا سے اعانتی رقوم لے لینا غیر مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ قیمت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا تو اُمرا و رؤسا کے لئے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے درجہ امتیاز میں کوئی خلل نہ آئے۔ "الہلال" نکلا تو اس کا پہلا ہی نمبر دیکھ کر ایک مشہور صاحبِ ریاست نے خاص رقم کا چیک مولاناؒ کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ لکھ دیا کہ ہر مہینے اتنی رقم باقاعدہ پہنچتی رہے گی، سال بھر کے لئے تو وعدہ سمجھئے۔ اس کے بعد بھی اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

سیر چشمی اور خودداری

مولانا نے شکریے کے ساتھ چیک واپس کر دیا اور لکھا:۔

"ہم نے جس قدر کام اپنے ذمہ لے لئے ہیں، وہ روپلے کے بل، پبلک کی قدردانی اور رؤسائے قوم کے جود و سخا کے بھروسے پر نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اعتماد پر جو اپنے دروازے کے سائلوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سُن لیتا ہے تو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا"۔

پھر فرمایا:۔

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاشِ زیان و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دُنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ الیسوں کی اعانت سے آپ کا جی کیا خوش ہو گا۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت میں گھاس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں ۔۔۔ ہاں اگر اس سے میری رائے اور میرا ضمیر خریدنا مقصود ہو تو بہ ادب واجب عرض ہے کہ ان خزف ریزہ ہائے طلائی کی تو کیا حقیقت ہے۔ کوہِ نور اور تختِ طاؤس کی دولت بھی جمع کر لیجئے تو مع آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہیں۔ یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شہنشاہِ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ خرید چکا"۔

کم از کم اُردو اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق عظمت و خودداری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس اخبار نویسی کے معیار کو آسمان پر پہنچایا۔

"الہلال" کی ضمانت کا واقعہ

طلب ضمانت کا خیر مقدم "الہلال" سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔

"الہلال" سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولاناؒ نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا۔ جب اطرافِ ملک سے پَے در پَے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۲۴ ستمبر کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا "ابتدائے عشق"۔ ساتھ ہی فرماتے ہیں:۔

"انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ بس اس کو چاہیئے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنیٰ درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکام وقت اسے کیا سمجھتے ہیں"۔

اس ضمن میں یہ اصول پیش کر دیا کہ حق و صداقت کے لئے کامیاب و منصور ہونا لازم ہے۔ باطل کے ساتھ دنیا کی طاقتوں کا کتنا ہی ساز و سامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دیں لیکن آخر وہ خاسر و نامراد رہے گا۔
آخر میں لکھتے ہیں کہ ۱۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی جسے ۲۷ تک داخل کرنے کی مہلت تھی، لیکن ۲۳ ہی کو داخل کر دی گئی۔ "ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا جس دن "الہلال" پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے۔ اور اب تو وقت آ گیا تھا اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے ... بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومیٔ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آئندہ کی فکر کے لئے ہمیں وقت کیسے ملے گا۔"

شانِ استقامت

عزیمت و استقامت مولانا کے آئینہ طبع کے درخشاں ترین جوہر تھے۔ انہوں نے جن اصول و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ چٹان کی طرح جمے رہے۔ اس سلسلہ میں اُن کی صحت کو نقصان پہنچا، کاروبار تباہ ہوا۔ ان کی نہایت قیمتی تصانیف کے مسوّدے ضائع ہو گئے۔ انہوں نے علمی یادداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے، وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے لیکن ان کی شانِ عزیمت ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔
ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ایک نہایت دشوار و دل گداز مرحلۂ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر میں اسیری کے زمانے میں ان کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہوئیں۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ اگر حکومت سے کچھ کہنا ہے تو میں اُسے فوراً بمبئی پہنچا دوں گا۔ مطلب غالباً یہ تھا کہ اگر رفیقۂ حیات کی شدید علالت کی وجہ پر مشروط رہائی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دی جائے گی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرنٹنڈنٹ نے پنڈت جواہر لال کی وساطت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:
"جونہی خطرناک صورتِ حال کی پہلی خبر ملی ... میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اُسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔
میں نے تمام معمولات جاری رکھے لیکن .... اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھا جس سے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا۔ اور اس لئے کھیلتا تھا کہیں اس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے"۔
اس کے باوجود مولانا نے حکومت سے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحب عزیمت رفیقۂ حیات اس حالت

اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ جب وہ سینکڑوں میل دُور اپنے اہم اصول و مقاصد کی خاطر احمد نگر کے قلعے میں محبوس تھے۔ اصول و مقاصد کی قربان گاہ پر عزیز ترین رشتوں کو وہی ہستیاں اس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنہیں بخشندۂ حیات سے عزیمت و استقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارزاں ہوئی ہوں۔

استغنا اور بے نیازی تاہم مولانا کی ایک نادر خصوصیت کا ذکر کئے بغیر اسے ختم نہیں کر سکتا یہ ان کی شانِ بے نیازی تھی۔ "الہلال" کے دورِ اوّل ہی میں دنیا نے تسلیم کر لیا تھا کہ علم و فضل میں ایسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ان سے وابستہ ہو گیا تھا۔ بار ہا ان سے التجائیں کی گئیں کہ اپنا سوانح مرتب فرما دیجئے اور اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا بندوبست کر دیجئے انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ نیاز مندوں کی التجاؤں کو شرف پذیرائی بھی بخشا۔ پھر ہر سکیم، ہر منصوبہ اور ہر ارادہ ان کی بے نیازی کی نذر ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو علوم و معارف کا ایک زمانہ حلقہ قائم کر سکتے تھے اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا جن کی کوئی مثال اس وقت تک سامنے نہیں آئی اور خود ان کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے تھے مگر انہوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استغنا، یہ بے نیازی تمام نیاز مندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی رہی معلوم ہوتا ہے، وہ طے کئے بیٹھے تھے کہ اگر انہوں نے علم و عمل کی کوئی قابل ذکر متاع چھوڑی ہے تو زمانہ خود اسے محفوظ کر لے گا۔ پھر اسے محفوظ کر دینے کا وقت کتنی صدیوں کے بعد آئے۔ اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو پھر اس کی حفاظت میں چند لمحے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت کا ضیاع ہو گا۔

عادات و خصائل مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع تھا۔ اور اپنے علمی و عملی جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے اُن کی فطرت ثانیہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ اول وقت اُٹھتے تھے گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر تھے۔

عبادت سحری را مکن نظیری کم ــــ کہ ہر چہ کرد دُعا ہائے صبح گاہی کرد

ایک مرتبہ سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں لاہور آئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے عرض کیا کہ "ملاقات کے لئے کوئی وقت بتائیے" "صبح کے چار بجے سے آٹھ بجے تک مل سکتے ہو"۔ وہ آٹھ دن یہاں مقیم رہے اور میں زیادہ سے زیادہ پانچ بجے اُن کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ تین گھنٹے اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے مل جاتے تھے۔ پچھلے دنوں میں دہلی گیا۔ تو اس وقت بھی وہ اپنے انتظامی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ دس روز ان کے پاس ٹھہرا رہا، یہی صبح کا وقت گفتگو کے لئے مقرر تھا۔ سیاسی ہنگاموں میں عمر گزارنے کے باوجود انہیں خلوت و تنہائی بہت پسند تھی۔

تنہائی و خلوت طلبد عشق نظیری ــــ ایں خیل و خدم را بہ امیر حشمے بخش

وہ ایک زمانہ میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً ۱۹۲۰ء سے کھدر پہننا شروع کیا اخیر تک اسی پر قائم رہے وہ ابتدا ہی سے ہلکی غذا کھانے کے عادی تھے اور بہت کم کھاتے تھے۔ آخری عمر میں تو غذا کی تقلیل غیر معمولی صورت اختیار

کر چکی تھی۔ لطیف چینی چائے وقتاً فوقتاً ضرور پیتے تھے اور اس کے دلکش تذکرے "غبار خاطر" میں موجود ہیں۔
انہوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ بآسانی قبول نہیں کرتے تھے جنہیں انتہائی شفقت و نوازش سے انہوں نے عزیزوں کا درجہ دے دیا تھا۔ ایک مرتبہ انہیں عرق النساء کا عارضہ ہوا۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا عقیدت مندی کے مفصّل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ، میں ایسا نسخہ تجویز کر دوں گا کہ بفضلِ خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہو۔ میں نے حالات منگوائے، حکیم صاحب مرحوم نے غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور یہاں سے دوائیں کلکتہ بھیج دیں۔ ان سے فائدہ ہوا۔ حکیم صاحب کی رائے تھی کہ دوائیں کچھ دیر جاری رہنی چاہئیں۔
مولانا نے لکھا "مجھے حکیم صاحب کی دوائیں استعمال کرنے میں ہرگز تامل نہیں اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہو کہ مرکبات وغیرہ استعمال کرنا چاہئے تو ضرور کروں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ دواخانہ کو حکم دے دیا کریں۔۔۔ تاکہ مجوزہ مرکبات وی۔ پی کے ذریعہ پہنچتے رہیں اس صورت میں شکر گزار ہوں گا اور انشراح خاطر سے علاج کروں گا ورنہ طبیعت رک جاتی ہے کہ تحفہ ایک ہونا چاہئے نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہ کریں تو پھر میں نہ تو فراغِ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کر سکوں گا نہ امتداد دوا اجر کی حالت گوارا ہو سکے گی۔
ایک مشہور عالم دین نے مولانا کی تفسیر فاتحہ کے بعض حصّوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ اختیار کیا گیا۔ ایرادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ ضمناً یہ بھی لکھا کہ کتاب آپ نے نہیں دیکھی تو بھیج دوں۔ فرمایا "کتاب ہرگز نہ بھیجو بہی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں"۔
۱۹۱۸ء سے میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا۔ پنجاب کے ایک سیاسی لیڈر نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک یکسر بے اصل تھیں، انہوں نے مجھے لکھا کہ:-
"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا جب "الہلال" نکالتا تھا، تو یہ ایسا صریح کذب ہے جو بہت معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اپنا نفس سامنے آجاتا ہے، میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں برا نہ کہوں۔"
آخر میں فرماتے ہیں "اگر ایک مدعی اسلام میں صدقِ مقال نہیں تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں ولیس وراء ذٰلک من الایمان حبۃ خردل"۔ ایک مرتبہ دیر تک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک عریضے پر شعلہ اصفہانی کا شعر لکھا:

آں بخت نہ داریم کہ ہم بزم تو باشیم ... ما و سرِ راہِ تو داب ہے ونگا ہے

انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شعر کا یہاں کیا موقع ہے۔
ایک حدیث قدسی ہے مَنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْہُ ذِرَاعًا (جو ایک بالشت میری طرف آئے میں...)

یک ہاتھ اس کے قریب جاتا ہوں) عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تخلق سے محروم نہ رہوں ۔ اسی پر
عامل ہوں اور عامل رہوں گا ۔ ؏

ہزار بار بشو وصد ہزار بار بیا

مضمون بہت طویل ہوگیا ہے ۔ لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا ۔ وہی عرفی والی بات ہوئی کہ ؎

زبان زنکتہ فرو ماند و راز من باقیست بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

آخر میں مولانا کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان کے طویل مکتوب سے ماخوذ ہے ۔ کچھ علمی بحثیں فرما رہے
تھے کہ خلافِ عادت ان کے قلم سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے ۔ فرماتے ہیں "افسوس ہے زمانہ میرے دماغ سے کام
لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا ۔ غالب کو تو صرف اپنی شاعری کا رونا تھا" ۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائینگی

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنس وفا رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عالم طاری ہو جاتا ہے ۔ مذہب علوم و فنون،
دب، انشاء، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بے شمار نئی راہیں مبدءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول
دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ بخششوں سے دامن مالا مال نہ ہوا ہو ۔ کہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر
پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی
ان دولتوں سے گرانبار کیا ۔ اس نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا ۔ میری زندگی کا سارا ماتم
یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا ۔ مگر اس کے حوالے کر دیا گیا" ۔ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے نہ سخن گستری ہے نہ تعلی
بلکہ سراسر حقیقت ہے ۔ کاش مجھے اندازہ شناسی میں سنائی کا درجہ نصیب ہوتا تو اس کی زبان سے کہتا :۔

دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

میں اپنے علم کی بے مائگی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا ۔ چند محسوسات و مشاہدات
تھے جو بے اختیار زبانِ قلم پر آ گئے ۔ یہ بے رنگ و بے خوشبو پھول ہیں جنہیں دامن میں سمیٹ کر مولانا کی بارگاہ عظمت و جلال
میں حاضر ہوا ہوں ۔ ایک بے نوا فقیر سلطان علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے ۔ خدا کرے یہ نذر حقیر شرف
قبول سے محروم نہ رہے ۔ اس ذکر کو غالب کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کی ردیف ضرورتاً بدل لی ہے ۔

ہند را رندِ سخن پیشہ گمنامے بود اندریں دیر کہن مے کدہ آشنامے بود

مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدار سخن تھے ۔ مولانا علم و عمل دونوں کے یگانہ تاجدار تھے ۔ مرزا بھی گمنام نہ تھے اور مولانا کے بارے
میں بھی کسی کو گمنامی کا وسوسہ نہیں ہو سکتا لیکن مرزا نے اپنے مقام کی برتری اور اس کے شایانِ شان قدر شناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ
کو گمنام کہنا پسند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھئے ۔ زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں ہے اسی طرح غیر معلوم
مستقبل میں گردش کرتا رہیگا ۔ عام لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور بلند مرتبہ شخصیتوں کے ظہور کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا لیکن ہم تیرہ ذوقی کے جس عہد سے
گزر رہے ہیں اسے مدنظر رکھتے ہوئے کیا امید ہو سکتی ہے کہ مولانا سے پا کی یا ان سے ملتی جلتی شخصیت پھر پیدا ہوگی ! اس کائنات کی کوئی بھی شے فنا کی دسترس سے باہر نہیں
بقا صرف اللہ کے لئے ہے اور بس ۔ (غلام رسول مہر)

قولِ فیصل اس تاریخی بیان کے چند اقتباسات جو نقل کئے جاتے ہیں مولانا کے اُن احساسات کی پوری تصویر تو پیش نہیں کرتے جو بحیثیت مجموعی پورے بیان کو پڑھ کر قلب و دماغ میں مرتب ہو سکتی ہے تاہم اس موقع پر مولانا کے افکار کے چند گوشے اِن اقتباسات میں بھی واضح ہوتے ہیں۔

اپنے بیان میں عدالتوں کی قدیم تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ :-

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک تعزیری عدالتیں اور قرونِ وسطیٰ (مڈل ایجز) کی پُراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے اُن سے ہمارے زمانہ کو نجات مل گئی۔ وہ عمارتیں ضرور گرادی گئیں جنکے اندر وہ خوفناک اسرار بند تھے لیکن اُن دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں .... اس جگہ (عدالت میں) کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصّہ آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹھرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابلِ رشک ہوں۔ اُن کو اپنی خوابگاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے۔ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک بھی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے"

جو الزام اس مقدمہ کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اس کی نسبت فرماتے ہیں :-

"ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے جیسا کہ اقتدار ملک و قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں .... یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی ہی قابلِ ملامت ہو لیکن زندگی کی خواہش تو قابلِ ملامت نہیں۔

ہندوستان میں بھی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق قرار دے جو انصاف کے نام سے اُس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ اُن لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی

کی ہے اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی۔ اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے اُن کا رخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُرپیچ فریب نے انہیں مبتلا کر رکھا تھا ....

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف ان ہی دو موقعوں پر بلکہ گذشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں اس فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ دفعہ ۱۲۴ (الف) کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے سامنے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں .... اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۱۲۴ (الف) کا جرم ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ صرف پہلی اور پندرھویں جولائی ہی کا ارتکاب کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ میں تو اس کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ فی الواقعہ اس کا شمار میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گذشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۲۴ (الف) کی خلاف ورزی کے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔"

قانون اور فرض اور سچائی کے فلسفہ پر مولانا نے اپنے نقطۂ نظر کو اس طرح پیش کیا :-

"مسلمانوں کا یہی وظیفہ ہے (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اُسے علم ویقین دیا گیا ہے ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم وجور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر وتشدد کے ذریعہ سے اعلانِ حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہونا گوارہ کر لیا جائے اور دو اور دو کو اس لیے چار نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لیے خطرہ میں پڑ جائے اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے۔ نہ اس لئے بدلا جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گذرتی ہے۔ وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے صرف اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا۔ آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی۔"

اس بیان کے آخری جزو میں مولانا کے افکار اُن بلندیوں سے نیچے کی طرف دیکھ رہے ہیں جہاں سے حکومت کا تمام ساز وسامان قانون اور عدالت بہت چھوٹا اور ادنیٰ نظر آیا کرتا ہے فرماتے ہیں کہ :-

"مجھ پر سڈیشن کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے بغاوت کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا بغاوت آزادی کی اس جد وجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں

کہ۔ اسی کا نام قابل احترام حُب الوطنی بھی ہے، جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے، لیکن آج ڈی ویلرا اور پارنل کے لیے برطانیہ عظمیٰ ...... کونسا لقب تجویز کرتی ہے؟

پارنل Parnel نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ:۔

" ہمارا کام ہمیشہ ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔"

میں مسلمان ہوں اور میرے یقین کے لیے وہ بس کرتا ہے جو میری کتاب و شریعت نے بتایا ہے۔ جس طرح مادہ اور اجسام میں انتخاب طبیعی Natural seleation اور بقاء اصلح Seurival of The Fittest کا قانون جاری ہے اور فطرت صرف اسُی وجود کو باقی رہنے دیتی ہے جو صحیح اور اصلح ہو۔ ٹھیک اسی طرح تمام عقائد و اعمال میں بھی یہی قانون کام کر رہا ہے، آخری فتح اسُی عمل کی ہوتی ہے جو حق اور سچ ہو اور اسی لیے باقی اور قائم رہنے کا حقدار ہو۔ پس جب کبھی انصاف اور ناانصافی میں مقابلہ ہوگا تو آخر جیت انصاف ہی کے حصہ میں آئے گی .... پس آج جو کچھ ہو رہا ہے اُس کا فیصلہ کل ہوگا انصاف باقی رہے گا اور ناانصافی مٹادی جائے گی۔ ہم مستقبل کے فیصلہ پر ایمان رکھتے ہیں البتہ یہ قدرتی بات ہے کہ بدلیوں کو دیکھ کر بارش کا انتظار کیا جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موسم نے تبدیلی کی تمام نشانیاں قبول کر لی ہیں، افسوس ان آنکھوں پر ہے جو نشانیوں سے انکار کریں۔ میں نے اپنی تقریروں میں جو میرے خلاف داخل کی گئی ہیں کہا تھا کہ آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک جبر و تشدد کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو۔

لیکن گورنمنٹ نے آبیاری شروع کر دی ہے...... مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت ناک باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہیگا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے، وقت اُس کا جج ہے، وہ فیصلہ لکھے گا اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔"

آج جبکہ وہ بدلیاں جن کی طرف مولانا نے اشارہ کیا تھا برس گئی ہیں اور موسم کے بدلنے کی جو نشانیاں مولانا دیکھ رہے تھے وہ ٹھوس اور غیر متزلزل حقیقتوں میں منتقل ہو چکی ہیں خدا کے قانون کی عدالت نے اپنا آخری فیصلہ دیدیا ہے اور حاکم و محکوم نے اپنی جگہوں کا تبادلہ کر لیا ہے مولانا کا یہ عدالتی بیان غیب کی ایک آواز معلوم ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جبر و استبداد اور محکومیت کے اس گذرے ہوئے دور میں وہ کس قدر دور تک اور کسقدر صحیح دیکھ رہے تھے۔

بیگم صاحبہ مولینا کا تار بنام مہاتما گاندھی

ہم ذیل میں بیگم صاحبہ مولینا کا وہ تار درج کرتے ہیں جو انہوں نے مولینا کی سزایابی کے بعد مہاتما گاندھی کو احمد آباد اور بردولی کے پتوں پر دیا تھا، لیکن سنٹرل ٹیلیگراف آفس کلکتہ نے اُسے روک لیا۔

میرے شوہر مولینا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کا فیصلہ آج سُنا دیا گیا۔ انہیں صرف ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت ب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سُننے کے لئے ہم تیار تھے۔ اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ لیم کریں گے کہ اس معاملہ میں بھی ان کے ساتھ سخت نا انصافی برتی گئی۔ یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ میں آپ کو لاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوئی ہے، اُن کے لئے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش دی ہیں، اور وہ تمام بدستور جاری رہیں گے جو ان کی موجودگی میں انجام پاتے تھے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہے ن میں خدا سے مدد کی پوری اُمید رکھتی ہوں، البتہ ان کی جگہ صرف بنگال میں ہی خالی نہیں ہے بلکہ تمام ملک میں، اور ں کے لئے سعی کرنا میری دسترس سے باہر ہے:

میں پہلے چار سال تک ان کی نظربندی کے زمانہ میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں، اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس وسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ گذشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہو گئی ہے، دماغی محنت سے کل مجبور ہوں، اس لئے باوجود میری خواہش کے مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح کی محنت اور مشغولیت کے ام میں حصہ لوں، لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لئے وقف کر یا چاہیئے۔ میں آج سے بنگال پراونشل خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔

انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ان کے پُر محبت و احترام سلام کے بعد یہ پیغام آپ کو پہنچا دوں کہ اس وقت دونوں فریق ں سے کسی فریق کی حالت بھی فیصلہ یا صلح کے لئے تیار نہیں ہے، نہ گورنمنٹ نہ ملک۔ اس لئے ہمارے آگے صرف اپنے تئیں تیار کرنے ہی کا کام درپیش ہے۔ بنگال جس طرح آج سب سے آگے ہے، آئندہ منزل میں بھی پیش پیش رہے گا۔ براہ عنایت بردولی تعلقہ پر بنگال پراونس کے نام کا بھی اضافہ کر دیجیئے، اور اگر کوئی وقت فیصلہ کا آئے تو ہم لوگوں کی رہائی کو اتنی اہمیت ہ دیجئے، جتنی آج کل دی گئی ہے۔ رہائی کو بالکل نظر انداز کر کے مقاصد کے لئے شرائط کا فیصلہ کرائیے۔

مولانا آزاد کی وفات پر تعزیتی پیغامات

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد ہندوستان ایک عظیم عالم، ایک بلند پایہ مقرر، ایک تجربہ کار سیاست دان، ایک مس
قوم پرست، ایک مایۂ ناز محب وطن، جنگ آزادی کے ایک سپہ سالار اور ایک ایسے عظیم راہنما کی خدمات سے محروم
ہے جس کا مشورہ مشکل اوقات میں قوم کے لئے ہمیشہ ہی مشعل راہ کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ آخر وقت تک وطن کی جس
انہیں بے حد پیار تھا، آبیاری اور خدمت کرتے رہے۔

گذشتہ چالیس پچاس برس کی زندگی کا تعلق مولانا کی زندگی کے ساتھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فرق کرنا چا
بھی کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ ایسے وقت میں جب ہم نے جانا نہیں تھا کہ ملک کی آزادی کے لئے کتنی مشکلیں برداشت کرنا پڑیں گی
نے اپنی زبان اور اپنے قلم سے کروڑوں لوگوں کو جگایا، صرف جگایا ہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا کہ ملک کی آزادی کے لئے کس طرح قربا
پڑتی ہیں۔ یہ تو سب لوگوں پر ظاہر ہے کہ جب اس کے شروع میں مولانا نے اپنا کام شروع کیا تو انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی
کو سمجھ لیا تھا۔ ان کا یقین تھا کہ ملک کے اندر دونوں کو ہمیشہ رہنا ہے اور اگر رہنا ہے تو مل جل کر ہی رہنا ہے۔ تب ہی سب
خیریت اور عافیت کی بات ہو سکتی ہے اور جب اس کام کو شروع کیا تو زندگی کے آخر تک تندہی اور ہوشیاری کے ساتھ
راستہ میں مشکلیں آئیں لیکن انہوں نے پرواہ نہ کی اور جو اصول طے کر لیا تھا آخر وقت تک اس پر قائم رہے۔ بہت سے لوگ
آکر ملے پھر الگ ہو گئے لیکن حضرت مولانا نے پھر بھی پرواہ نہ کی اور جو اصول طے کر لیا تھا آخر وقت تک اسی پر قائم رہے۔ ال
اور زبان میں اتنی طاقت تھی کہ کروڑوں کو آزادی کے راستہ پر چلایا، کروڑوں کو قربانی کے لئے تیار کیا۔ یہی وجہ تھی کہ پورا
گرویدہ تھا۔ عوام نے دکھلا دیا کہ انہیں مولانا کے ساتھ کتنی محبت تھی۔

مولانا بیمار پڑنے سے پہلے کام کرتے رہے۔ انتقال سے قبل چند ہفتوں تک انہیں پہلے سے زیادہ کام کرنا پڑا مگر وہ اس کا
تھکے نہیں، کام کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اندر نئی طاقت اور نئی زندگی آگئی ہے۔ مگر آخر میں وہی نتیجہ ہوا جو سب
جانتے ہیں اور وہ یہ کہ جو زبان کروڑوں کو جگاتی تھی، وہ قلم جو انسانوں میں نئی روح پھونکتا تھا، ہمیشہ کے لئے رک گیا۔ ہمیں چا
کہ ہم ان کی قربانی اور ان کی زندگی سے سبق سیکھیں۔ اسی میں ملک کی بہتری ہے اور اسی سے ہم اپنی آزادی محفوظ رکھ سکیں گے
ہمیں تہیہ کر لینا چاہیئے کہ ہم مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے اور جس طرح انہوں نے اپنے ملک کی بھلائی کے
سب سے مقدم رکھا، اسی طرح ہم بھی اس بھلائی کو مقدم سمجھیں گے اور اس بات کو سمجھیں گے کہ آپس کے جھگڑے ملک کے لئے نقصا
ہیں۔ اگر ہم مولانا کی زندگی سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ملک میں اتحاد دیکھنے کے لئے کام کریں۔

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشن مولانا آزاد ایک بہت بڑے سیاست دان تھے۔ مفکر اور اسکالر تھے، پکے مسلمان
اور پرجوش محب وطن۔ انکی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا ممکن نہیں

نے محض اپنے نظریات کی خاطر بڑی مصیبتیں سہی ہیں لیکن پرواہ نہ کی۔ ایک سیاستدان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے خطرات مول لیتا ہے۔ انہوں نے یہ خطرہ مول لیا اور سختی سے اپنے نظریات پر قائم رہے۔ اپنے ذاتی تعلقات میں مشفق رحم دل تھے۔ مولانا مرحوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوم اس نصب العین کو کلیجے سے لگائے رکھے جسے مولانا نے ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات، رواداری اور اتحاد کی روح کو یاد رکھنا چاہیے۔

وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو

یہی نہیں کہ میں نے مولانا کے علم و فضل سے استفادہ کیا ہے بلکہ بسا اوقات حضرت مولانا کے علم و مطالعہ کے سامنے مجھے اپنا علم، دریا کے سامنے پانی کا قطرہ دکھائی دیا ہے۔ ہندوستان کارواں ہے اور مولانا میر کارواں تھے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ماضی اور حال کے مابین پُل بن جائیں۔ یہ برگزیدہ شخصیت ہم سے جُدا ہو گئی ہے۔ مگر اس کی زندگی کا پیغام جاوداں ہے اور وہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ہمیں راستہ دکھاتا رہے گا۔

ممتاز افراد کے انتقال پر یہ کہنا بڑی رسمی سی بات ہو کر رہ گئی ہے کہ اب ان کی جگہ پُر نہ ہو سکے گی۔ بڑی حد تک یہ بات صحیح ہوتی ہے مگر جہاں تک مولانا آزاد کے انتقال کا تعلق ہے یہ بات سو فی صدی صحیح ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اب ہندوستان میں کوئی عظیم شخصیت پیدا نہ ہوگی۔ ہندوستان میں بڑے آدمی پیدا ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی پیدا ہوں گے۔ لیکن مولانا آزاد جیسی شخصیت کا دوبارہ پیدا ہونا ممکن نہیں۔

مولانا مرحوم کی شخصیت قدیم و جدید قدروں کا سنگم تھی۔ ماضی و حال کی تمام خصوصیات ان میں پائی جاتی تھیں۔ خاص طور سے ان میں پرانے دنوں کا اخلاق، وضع داری، رواداری اور صبر و تحمل کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہ وہ قدریں ہیں جو اس زمانے میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ سائنس اور ٹیکنیکل معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگ چاند پر پہنچنے کی فکر میں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر زندگی سے اخلاق اور رواداری کی قدریں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

مولانا کی ذات اس مشترکہ کلچر کی نہایت ہی مخصوص اور ممتاز نمائندہ تھی جو ہندوستان میں برسوں کی تبدیلیوں سے وجود میں آیا ہے۔ اس ہندوستانی کلچر پر مغربی ایشیا اور ایران کے کلچر کی گہری چھاپ پڑی ہے اور مولانا اس کے صحیح نمائندہ تھے۔

میں اب کسی ایسے شخص کا تصور نہیں کر پا رہا ہوں جو اُن کی جگہ لے سکے۔ کیونکہ وہ جس عہد کی پیداوار تھے وہ عہد ختم ہو چکا ہے۔ ہم میں چند اس عہد کی یادگار، دھندلی سی یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نئی نسل جذباتی طور پر اس بات کا اعتراف کر سکے گی یا کہ نہیں۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کی بصیرت اور دانش وری کا مقابلہ یورپ کی نشاۃ الثانیہ کے دانش وروں سے کیا جا سکتا ہے۔

شورش کاشمیری

سفرِ آخرت

۱۹ر فروری ۱۹۵۸ء کو پانچ بجے صبح حسب معمول امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد چائے پی کر غسل خانہ میں گئے کہ یکایک جسم کے دائیں پر فالج نے حملہ کیا اور بے بس ہو گئے اور بالآخر ۲۱ اور ۲۲ر فروری کی درمیانی شب میں دو بج کر دس منٹ پر موت نے اس عظیم انسان کو اپنا دامن وا کر دیا جو اس دور میں سب سے بڑا ہندوستانی، سب سے بڑا انسان اور سب سے بڑا مسلمان تھا۔

تمام ہندوستان نے اشکبار چہروں کیساتھ اپنے جھنڈوں کو سرنگوں کر دیا۔ جہاں جھنڈے سر جھکا رہے تھے وہاں لوگوں نے اپنے کے پرچم جھکا دیئے کہ اس دور کا ابن تیمیہ رحمت خداوندی کی گود میں چلا گیا ہے۔ دم بھر میں موت کی خبر ہندوستان کی وساطت سے دنیا میں نکل گئی۔ ہندوستان دیکھتے ہی دیکھتے تعزیت کدہ نظر آنے لگا۔ کاروبار بند ہو گئے حتیٰ کہ بنکوں میں بھی ہڑتال ہو گئی۔

رحلت کا اعلان ہوتے ہی تین چار لاکھ انسان کوٹھی کے باہر جمع ہو گئے۔ گریہ و بکا کا طوفان بڑھتا رہا۔ لوگوں کے غول لگا تار تک قطار اندر قطار کوٹھی کے صحن میں اپنے عظیم الشان راہنما کی زیارت کے لئے آتے ہی گئے۔ ہر مذہب، ہر عقیدہ، ہر فرقہ کے انسانوں کا جوار بھاٹا دینے لگا۔ ہندو اور سکھ عورتیں اور مرد نعش کے پاس سے گذرتے تو دونو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے، ہر آنکھ میں آنسو تھے۔ راجندر پرشاد صدر جمہوریہ، ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے عمائدین ملک و قوم تصویر ماتم بنے کھڑے جیسے وہ اس دن جینا نہیں چاہتے تھے دوسری طرف لوگ آنسوؤں کی مالائیں چڑھاتے گذرتے جاتے تھے۔ کئی ہزار برقعہ پوش مسلمان خواتین آزادی کے بعد پہلی مرتبہ نئی دہلی میں اس طرح یکجا اور اشکبار نظر آ رہی تھیں۔ حضرت مولانا تاریخ انسانی کے تنہا مسلمان تھے جن کے ماتم میں کعبہ و بت خانہ اس شدت سے سینہ کوب تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو سراپا گریہ تھے۔ انہیں سنبھالنے والے ہزاروں تھے۔ لیکن وہ لوگوں کو سنبھالنے کے لئے دوڑے پھرتے تھے تمام کوٹھی کے وسیع باغات انسانوں سے اٹ چکے تھے، لیکن لوگ اندر آنے کے لئے دروازہ پر ہجوم کرتے رہے۔ پنڈت نہرو پورٹیکو کے باہر لوگوں کو ایک عام رضاکار کی طرح ہاتھ پھیلا کر روکتے رہے ——— اور جب جنازہ اٹھانے کیلئے ان کو بلایا تو انکی نظریں ہمرکاب سکیورٹی افسر پر رک گئیں۔ استفسار کیا "آپ کون؟" جواب ملا "سکیورٹی آفیسر، آپ کی حفاظت کے لئے" پنڈت نہرو نے کہا "کیسی حفاظت؟ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ بچا سکتے تو مولانا کو بچا لیتے۔" یہ کہہ کر پنڈت نہرو بلک بلک کر رونے لگے۔

پونے بجے میت اٹھائی گئی۔ پہلا کندھا عرب ملکوں کے سفیروں نے دیا۔ جب کلمہ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی امراء کاندھا دیتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، خان محمد یونس خان، مسٹر کرشنا مینن، مسٹر پربودھ چندر اور بخشی غلام محمد نے احاطہ سے باہر میت کو توپ گاڑی پر رکھا۔ راجندر بابو دمہ کے مریض ہونے کے باوجود صبح ہی سے تصویر یاس بنے کھڑے تھے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ "آج ۳۸ سال کی دوستی اور رفاقت کا انت ہو گیا۔" پنڈت پنت نے درد سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔"

پنڈت نہرو کی ہچکی بندھ گئی۔ مولانا احمد سعید کی سفید داڑھی پر آنسوؤں کے موتی جگمگا اٹھے۔ تمام فضا میں نالہ ہائے ستون

لگے۔ مولانا کی بڑی بہن آرزو بیگم نے کوٹھی کی چھت سے بھائی کی میت پر آخری نظر ڈالی اور کہا۔ اب کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔
جنازہ کی گاڑی میں سرہانے کی سمت دائیں رُخ پر پنڈت نہرو اور بائیں طرف پر صدر کانگریس ڈھیبر بھائی کھڑے تھے۔ ان کے
جنرل شاہ نواز، ڈھیبر بھائی کے ساتھ بخشی غلام محمد اور پروفیسر ہمایوں کبیر موجود تھے۔
جسم پر کھدر کا کفن تھا۔ میت ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپٹی ہوئی تھی جس پر کشمیری شال پڑا تھا۔ جنازہ کے پیچھے صدر
یہ اور نائب صدر کار میں بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے پارلیمنٹ کے ارکان، مختلف صوبوں کے وزراء اعظم، اکثر صوبائی گورنر اور غیر
فارتی نمائندے چلے آرہے تھے۔ بھارتی افواج کے چیف آف سٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے ـــــ جب جنازہ کا جلوس انڈیا
اور ہارڈنگ برج ہوتا ہوا، لاکھوں انسانوں کی عقیدت ومحبت کے لئے دریا گنج کے علاقہ میں داخل ہوا، تو سڑک کے دونوں کناروں
نی فٹ پاتھ اور دراز قد مکانوں کی چھتوں سے پھول ہی پھول برسنے لگے۔ یہاں پھولوں اور پنکھڑیوں کی موسلادھار بارش کے سوا
رہی نہیں آتا تھا اور جب جنازہ جامع مسجد کے قرب وجوار میں پہنچا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ جامع مسجد کی بالائی چھت، سیڑھیوں
سلسلے، محرابوں کی پیوست زنجیریں، حجروں کی ہم آغوش صفیں، مکانوں کی منڈیریں، اور دوکانوں کے چھجے انسانی سروں سے
پڑے تھے۔ پریڈ گراونڈ میں محتاط سے محتاط اندازہ کے مطابق بھی پانچ لاکھ افراد جمع تھے۔ قبر کے ایک طرف علماء وحفاظ قرآن مجید پڑھ
تھے اور دوسری طرف اکابر وفضلاء سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہاں سب سے پہلے بری فوج کے ایک ہزار سپاہیوں، ہوائی فوج کے
جانبازوں اور بحری فوج کے پانچ سو نوجوانوں نے اپنے عسکری بانکپن کے ساتھ میت کو سلام کیا۔ پھر مولانا احمد سعید نے دو بجکر
ں منٹ پر نماز جنازہ پڑھائی ـــــ ادھر نماز جنازہ پڑھائی جا رہی تھی اُدھر پنڈت نہرو قبر کے قریب فرش زمین پر بیٹھے ٹک ٹک دیکھ
تھے ـــــ امام نے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا اور میت لحد کے قریب لائی گئی تو ہزارہا ہندو سکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوج نے
ی بگل بجائے ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں پھر اشکبار ہو گئیں۔ مولانا احمد سعید نے لحد میں اُتارا۔ کوئی تابوت نیا نہ کیا
ھا۔ ایک یادگار جسم سفید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔ راجندر بابو نے آنسوؤں کی سیل میں بھگو کر پھول نچھاور کئے۔ پنڈت نہرو
لاب چھڑکا تو بے اختیار ہو گئے۔ لوگوں نے سہارا دیا اور جب مٹی دینے لگے تو بلک بلک کر رو رہے تھے ہر چہرہ روتا ہوا نظر آتا تھا۔
مسلمانوں کی عہد آفریں ہستیوں پر خود مسلمانوں کے ہاتھوں جو گذری اس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہمیشہ بڑوں کی عظمت پر اُنکی موت نے
ارت دی ہے۔ آج جن لوگوں پر ہمارے علم وعمل اور فکر ونظر کی عمارتیں استوار ہیں، اپنی حیات میں ان پر نبری کیا گیا۔ قید میں ڈالا گیا۔ زنجیریں
ائی گئیں۔ بسا اوقات وہ عوام کے سب وشتم اور خواص کے جور وستم کی تاب نہ لا کر موت کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے انہیں گور
ں سے بھی محروم رکھا۔ غرض رسوائی اور تشہیر کا تمام گرد وغبار انکی ہستی پر ڈالا گیا ـــــ مگر جب وقت نے کروٹ لی تو ان کی ذات سورج کیطرح ابھر
ملنے لگی اور تاریخ کی پیشانی اُن کے آستانۂ عظمت پر ہمیشہ کیلئے جھک گئی ـــــ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی ان جانکاہ راستوں
گذرنا پڑا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں وقت کی کوئی گالی نہ تھی جو ایک زمانہ میں مسلمانوں نے اُنکے خلاف استعمال نہ کی ہو مگر وہ تحمل کے اعتبار
ہار تھے، انہوں نے ہمیشہ صبر کیا۔" انکی اور ابن تیمیہؒ کی زندگی میں حیرت انگیز مماثلت ہے اور یہ مماثلت موت کے بعد بھی نظر آتی ہے جسطرح
ابن تیمیہؒ کی رحلت پر زندگی کا کوئی شعبہ ماتم سے خالی نہ رہا تھا اسیطرح حضرت مولانا کی وفات پر زندگی کا ہر شعبہ ماتم گسار ہے۔ جب تک حیات
۔ وقت کی سیاسی مصلحتیں اُن کے گریبان پر ہاتھ اُٹھاتی تھیں آج اُٹھ گئے ہیں تو مزار، عوام وخواص کا مرجع ہے ؎

"مر گئے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا"

پنڈت گوبند ولبھ پنت (وزیر داخلہ ہند)

عوام اور حکومت کا رہنما

"آنے والی نسلیں حضرت مولانا کی شرافت نفس کو یاد رکھیں گی"

گاندھی جی کی شہادت کے بعد سے ملک کبھی ایسا متزلزل نہیں ہوا جیسا کہ مولانا صاحب کی حسرتناک موت سے۔ مولانا مرحوم نے ۴۵ سال سے بھی زیادہ ملک کی خدمت کی ہے۔ ماضی قریب کے بہت سے برسوں کی ہندوستانی تاریخ مولانا مرحوم کے اس کردار کو ایک وسیع صورت میں پیش کرے گی جو مرحوم نے اس تاریخ کی تعمیر میں ادا کیا ہے۔

مولانا مرحوم ہمارے دیس کی مجسم ثقافت تھے جو ہمارا بیش بہا ورثہ ہے اور اس اعتبار سے وہ تمام لوگوں سے رواداری، خیرسگالی اور دوستی کے جذبات سے پیش آتے تھے۔ مرحوم ایک دانا مدبر، پُرجوش محب وطن، جری اور ایک ایسے فاضل اجل تھے جن کے علم کی قدر نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی کی جاتی ہے۔ مرحوم نے ملک کی جدوجہد میں برسوں انڈین نیشنل کانگرس کی رہبری کی۔ مولانا مرحوم نے کرپس مشن، دیگر اداروں اور لارڈ ویول سے ملک کی آزادی کے اہم مسئلہ پر گفت و شنید کی تھی۔

وہ ایسی ہستی تھی جس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی اور جس کے قدم سچائی اور راستی کی راہ میں کبھی نہ ڈگمگائے۔ اس ہستی نے اپنی زندگی دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس ہستی نے بنی نوع انسان کی آزادی کے لئے اور ہندوستان کی آزادی اور اس ملک میں بسنے والے تمام لوگوں کی یگانگت کے لئے محنت و مشقت کی۔

بڑی حد تک ہماری آزادی مرحوم جیسے لیڈروں کی مرہون منت ہے۔ مرحوم کی یاد محبت سے تازہ رہے گی اور لوگ مرحوم کی زندگی سے فیضان حاصل کرتے رہیں گے۔ مرحوم نے تمام لوگوں کے لئے ایک نقش قدم چھوڑا ہے اور آنے والی نسلیں مرحوم کی شرافت نفس کو یاد رکھیں گی۔

مرحوم صحیح معنوں میں ایک عظیم شخص تھے۔ ہمیں ان جیسا آدمی پھر نہ مل سکے گا۔ قوم ایسی عظیم ہستیوں کو یاد رکھے گی۔ وہ امید کا ایک روشن مینار تھے۔ وہ آج ہم میں سے اٹھ گئے ہیں۔ نہ صرف لوگوں بلکہ حکومت کا بھی ایک ایسا رہنما چلا گیا جو تمام حالات میں دل و جان سے سینہ سپر رہتا تھا۔ مرحوم نے حکومت کے اندر رہ کر اور باہر بھی تنہا دل و دماغ اور نہایت انہماک سے کام کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ملک اس صدمہ کو سہہ لے بلکہ وہ مقاصد جن کے لئے وہ کھڑے ہوتے اور جو مقاصد ہمیشہ ان کے پیش نگاہ رہے اور ان پر وہ کاربند رہے وہ ہماری رہبری کرتے رہیں۔

آفرینندۂ عہد مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں وہ آفرینندۂ عہد تھے۔ اس لیے ان کی کشاکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدہ عہد ہوتے وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب، اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے اس کا احساس آج ہو رہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے وقت میں ہوتا ہے،

مولانا کا ایک فقرہ اس وقت یاد آ رہا ہے جو کہیں نظر سے گذرا ہے یا سننے میں آیا ہے کچھ اس طرح کی بات کہی ہے کہ "تم لوگ پانی اور کیچڑ کو دیکھ کر بارش کا یقین کرتے ہو میں اس کو ہوا میں سونگھ کر جان لیتا ہوں"۔ دنیا کے کم لیڈروں کو یہ درجہ نصیب ہوا ہے۔

مولانا نے جس طرح جس حد تک جن دشواریوں سے دوچار رہ کر کامیابی کے ساتھ ہندستان کے تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور تقویت پہنچانے کی خدمت سرانجام دی اس سے بڑی خدمت اس سیکولر جمہوریہ کی ساکھ اندرون و بیرون ملک قائم کرنے میں کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا ہندوستان کی حکومت مولانا کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی کس عظمت اور کس حیرت کا یہ مقام تھا کہ یہ فریضہ یکہ و تنہا اس مسلمان کے حصے میں آتا جس سے زیادہ ملعون اور مغضوب تقسیم ملک کی رات سے پہلے مسلمانوں ہی کے نزدیک دوسرا مسلمان نہ تھا۔ (رشید احمد صدیقی)

میں نے اپنی زندگی میں دو ہی انسانوں کی نمازیں دیکھی ہیں جن سے مجھے پتہ چلا کہ نماز کسے کہتے ہیں ایک ابوالکلام کی اور دوسری مولانا محمد الیاس رحؒ کی۔ (سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

خدا کی طرف پکار

یٰقَوْمَنَا اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ ۔ اے برادران ملت اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار کا جواب دو

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا

آہ! کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا، جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس کی ایک صدائے رعد آسائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ "اٹھو! کیونکہ بہت سو چکے، اور بیدار ہو، کیونکہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے! پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے، جو تمہیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے"!!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۸:۲۴)

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی صدا کا جواب دو جبکہ وہ تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تم کو موت سے نکال کر زندگی بخشے یاد رکھو کہ اللہ جب چاہتا ہے انسان اور اس کے دل کے اندر آڑے آ جاتا ہے اور پھر خواہ تم اُس سے کتنا ہی اعراض کرو مگر تم کو سر پھیر کے اسی کے آگے ایک دن جانا ہے۔

مولانا آزادؒ کی زندگی

۱۸۸۸ء ۱۱- نومبر کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔

۱۸۹۸ء مکہ معظمہ سے کلکتہ آئے۔

۱۹۰۲ء رسالہ لسان الصدق جاری کیا۔

۱۹۰۴ء انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں خطبہ پڑھا۔

۱۹۰۹ء آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوا۔

۱۹۱۲ء اُردو اخبار 'الہلال' جاری کیا۔

۱۹۱۴ء حکومت نے 'الہلال' کی ضمانت ضبط کرلی، اور اخبار بند ہوگیا۔ 'البلاغ' جاری کیا۔

۱۹۱۵ء حکومت بنگال نے بنگال سے جلا وطن کردیا۔

۱۹۱۶ء رانچی (بہار) میں نظر بند کردیئے گئے۔

۱۹۲۰ء رہا کردیئے گئے۔ دہلی میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں تحریکِ عدم تعاون میں حصہ لیا۔ گرفتار ہوئے اور دو سال کے لئے قید کردیئے گئے۔

۱۹۲۳ء ستمبر میں انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر ہوئے

۱۹۳۰ء کانگریس کے قائمقام صدر ہوئے پھر گرفتار کرلئے گئے، اور ۱۹۳۲ء تک جیل میں رہے

۱۹۳[illegible]ء کانگریس پارلیمنٹری سب کمیٹی کے ممبر ہوئے

۱۹۴۰ء پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک اس عہدے پر رہے۔

۱۹۴۲ء کانگریس کے خصوصی ترجمان کی حیثیت سے سر سٹیفورڈ کرپس سے بات چیت کی اگست میں 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کے سلسلہ میں گرفتار کرلئے گئے اور تین سال تک نظر بند رہے۔

۱۹۴۳ء بیگم آزاد کا انتقال ہوا

۱۹۴۵ء دوسرے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ رہا ہوئے وائسرائے کی طرف سے منعقدہ شملہ کانفرنس میں کانگریس کے ترجمان کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

۱۹۴۶ء کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لیا۔

۱۹۴۷ء دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ عبوری حکومت میں تعلیم اور فنون لطیفہ کے ممبر ہوئے۔ ملک آزادی کے بعد ۱۵ راگست سے حکومت ہند کے وزیر تعلیم ہوئے۔

۱۹۵۱ء پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے

۱۹۵۲ء پہلے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ تعلیم قدرتی ذرائع اور سائنسی تحقیقات کے وزیر مقرر ہوئے۔

۱۹۵۵ء دوبارہ پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔

۱۹۵۵ء دو ماہ کے لئے یورپ اور مغربی ایشیا کے خیر سگالی دورے پر تشریف لے گئے۔

۱۹۵۶ء یونیسکو کی نویں عام کانفرنس منعقدہ دہلی کی صدارت کی

۱۹۵۷ء دوبارہ گوڑگاؤں کے حلقہ انتخاب سے لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ وزیر تعلیم، سائنسی تحقیقات کے عہدے پر برقرار رہے۔

۱۹۵۸ء ۲۲ رفروری کو دہلی میں رحلت فرما گئے۔

حروفِ اسمِ مبارک کے صفاتی و معنوی اشارے

"احمد محی الدّین ابوالکلام آزاد"

ت مولانا کے اسمِ مبارک کے حروف اوصاف و محاسن کی بھی نشانیاں ہیں جن میں ولادت و وفات کے سنہ بھی مضمر تھے چنانچہ "احمد محی الدین" کے ت جن صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان سے ولادت کا سنہ نکلتا ہے اور ابوالکلام آزاد کے حروف جن محاسن کی نشانیاں ہیں ان سے ت کا سنہ نکلتا ہے "ابن الحسین مورخ" کی یہ علمی و ادبی کاوش ذیل میں درج کی جا رہی ہے

احمد محی الدین

ولادت سنہ ١٨٨٨ء

حرف	لفظ		عدد
ا	احسن	=	119
	و	=	٦
ح	حاسن	=	١١٩
	مفسّر	=	٣٨٠
	دین	=	٦٤
	و	=	٦
	معلّم	=	١٨٠
	حمد	=	٥٢
	و	=	٦
	یقین	=	١٦٠
	امین	=	١٠١
	و	=	٦
	لطیف	=	١٢٩
	داعیٔ حق	=	١٩٣
	و	=	٦
	یاور	=	٢١٧
	و	=	٦
	نگہبان	=	١٢٨

احسان مفسرِ دین و معلم حمد و یقین، امین و لطیف داعیٔ حق و یاور و نگہبان

١٨٨٨

ابوالکلام آزاد

وفات سنہ ١٩٥٨ء

حرف	لفظ		عدد
ا	ادیب	=	١٧
ب	بلند و اعلیٰ	=	٢٠٣
	و	=	٦
و	وکیل	=	٦٦
ا	اُردو	=	٢١١
	و	=	٦
ل	لسّان	=	١٤١
	و	=	٦
ک	کلیم	=	١٠٠
	و	=	٦
ل	لبیب	=	٤٤
ا	امام	=	٨٢
م	ملت	=	٤٧٠
	و	=	٦
ا	انسان	=	١٦٢
ز	زیرک	=	٢٢٧
	و	=	٦
ا	آزاد	=	١٣
د	دمساز دین	=	١٧٦

ادیبِ بلند و اعلیٰ و وکیل اردو، لسّان و کلیم و لبیب، امامِ امت و انسانِ زیرک و آزاد و دمسازِ دین

١٩٥٨

لوحِ مزارِ تاریخی

اے سلامتی بر خاکش مدام باد
۱۹۵۸ء

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ
۱۹۵۸ء

قبرِ خدا دوست
۱۳۷۷ھ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الرَّزَّاقِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
۱۹۵۸ء

بِسْمِ اللّٰہِ الْاَوَّلِ الْبَاسِطِ التَّوَّابِ الرَّحْمٰنِ الرَّ...
۱۳۷۷ھ

رَضِیَ اللّٰہُ الْمُھَیْمِنُ عَنْہُ
۱۳۷۷ھ

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم ہند
۱۳۷۷ھ

صد دریغا اے امام الہند میرِ قافلہ
۱۹۵۸ء

اے امام الہند جرأت، تاجدارِ حُریّت
سمت ——— ۲۰۱۴ ——— بکرمی

کائنات نیک طینت، رہبر ہندوستاں
سمت ——— ۲۰۱۴ ——— بکرمی

اوجِ ایواں اے دبیر عِلمش دیدہ صد دریغ
سمت ——— ۲۰۱۴ ——— بکرمی

بے تکلف خاک میں جاکر ہوا تو اب نہاں
سمت ——— ۲۰۱۴ ——— بکرمی

ھدیہ محمد ادریس نسیم دھلوی تاریخ گو کان اللہ لہٗ
سمت ——— ۲۰۱۴ ——— بکرمی

ایک مطلب ہوگیا ہے دو زبانوں میں ادا

زندگی میں بھی رہے فیروز بخت ان کے قدموں پر نچھاور تاج و تخت

غیب سے ہاتف نے دی صادق صدا آج بھی وہ ہوگئے فیروز بخت

۱۳۷۷ھ

صادق بستوی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء ○ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء

علی از رئیس احمد جعفری
عبد الرشید ارشد

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ　　　تا شرر بر ہم زنیم از ماہ و پرویں در گذشت
اے خوشا مشت غبار او کہ از جذب حرم　　　از کنار اندلس و از ساحل بربر گذشت
خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت　　　سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت
می نگنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست　　　بندہ کو از تمیز اسود و احمر گذشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشم آسیا است!
گرچہ آں نور نگاہ خاور از خاور گذشت

"محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے۔ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی، بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں، میں نے کبھی دیکھا نہیں، اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں"

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

جس انسان کے متعلق حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنے تاثرات کا مندرجہ بالا الفاظ میں اظہار فرمایا ہے۔ آئندہ سطور میں اس کی شخصیت و کردار کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ پڑھے لکھے لوگوں میں چند افراد ہی ایسے ملیں گے جو محمد علی جوہر سے نا آشنا ہوں گے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب راس کماری سے لے کر ہمالیہ کی چوٹیوں تک اور آسام سے لے کر درہ خیبر تک ہندوستان کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا (مسلمانوں ہی کا سوال نہیں ہندو اور دوسرے غیر مسلم بھی اس میں شریک ہیں۔) جو محمد علی جوہر سے نا واقف ہو۔ اور پورے ہندوستان میں یہ رجز گونج رہا تھا۔

بولی اماں محمد علی کی　　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو

پیدائش۔ وطن۔ خاندان

مولانا محمد علی جوہر کے والد عبد العلی خاں یوسف علی خاں ناظم فرمانروائے کے مقرب و معتمد تھے۔ آپ کے وطن میں اختلاف ہے کہ وہ مراد آباد کے تھے یا نجیب آباد ضلع بجنور ان کا وطن تھا۔ لیکن مولانا مرحوم کے اپنے ایک مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی وطنی نسبت نجیب آباد (بجنور) سے ہے۔ آپ ۱۸۷۸ء کے آخر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے منجھلے بھائی کا نام (مولانا) شوکت علی اور بڑے کا ذوالفقار علی گوہر تھا۔

ؔ ذوالفقار علی گوہر قادیانی ہوگئے تھے۔ ان کا اکثر قیام قادیاں ہی رہا۔

دو سال کی عمر کے تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ ماجدہ باہمت و مستقل مزاج تھیں۔ تینوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ معمولی اردو، فارسی وغیرہ گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد بریلی ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ مولانا جوہر کی ذکاوت و ذہانت اور فطانت اسی زمانہ میں اجاگر تھی۔ میر محفوظ علی اور کے صاحب طرز ادیب، جو اس زمانے میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے، لکھتے ہیں :-

"محمد علی بریلی میں بلا کے ذہین مگر کم محنت تھے۔ استاد سب خوش رہتے تھے۔ مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی بہت تھی۔"

مولانا شوکت علی بھی ساتھ ہی پڑھتے تھے لیکن بڑے ہونے کی وجہ سے تمام کام محمد علی سے کرایا کرتے تھے۔

بھائی کا احترام

محمد علی اگرچہ تیز تھے لیکن بھائی کا احترام پورا پورا کرتے تھے۔ میر محفوظ علی کے بیان کے مطابق :

"شوکت خوش گپ اور یار باش ہونے کے ساتھ کاہل اور خوگر حکمرانی ہو چلے تھے۔ طالب علموں کے مجمع میں بیٹھے محمد علی پانی لاؤ، کتاب اٹھاؤ، اچکن رکھ آؤ کہا کرتے تھے۔ ایک دن خطیب جی نے (مولوی سخاوت حسین مرحوم اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس) محمد علی کو "سگ باش برادر خورد مباش" کے معنی سمجھائے۔ میں نے کہا ایک دوسرا جملہ بھی ہے، خر باش برادر بزرگ مباش، خطیب جی نے اس کے معنی سمجھا کر کہا تو محمد علی سگ ہوئے اور شوکت خر۔ محمد علی نے فوراً جواب دیا جناب! میں تو سگ بننا پسند کروں گا مگر شوکت بھائی کا خر بننا پسند نہ کروں گا۔ خطیب جی نے کہا 'شاباش!'

علی گڈھ میں داخلہ

اس زمانے میں سرسید کے 'مدرسۃ العلوم' کا (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ بنا) بڑا شہرہ تھا۔ ہندو میں جو لوگ اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلانا چاہتے اور خرچ برداشت کر سکتے تو ان کی یہ خواہش ہوتی کہ لڑکوں کو علی گڈھ داخل کرائیں۔ جس طرح دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کا منتہائے نظر دارالعلوم دیوبند تھا۔ اسی طرح دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والوں کا منتہائے نظر علی گڑھ تھا۔۔۔۔ اور جو طلبا ان جگہوں میں پڑھتے وہ ہر جگہ فخریہ انداز میں بیان کرتے کہ ہم علی گڈھ یا دیوبند پڑھ رہے ہیں۔

بقول رئیس احمد جعفری :-

"سینکڑوں 'مرزا پھویا' علی گڈھ میں داخل ہوئے۔ جب وہاں سے نکلے تو تیز و طرار بن کر، بات بات میں شوخی، چال ڈھال میں رنگینی، کسی سادہ لوح کو دیکھا ایک فقرہ چست کر دیا۔ ریل میں سوار ہوئے تو آفت مچا دی۔ ڈپٹی کلکٹری اور اسی قسم کے سرکاری عہدے تو اس زمانے میں گویا ایک 'علیگ' کے لئے نہایت سہل الحصول ملازمت تھی، جب چاہتا وہ ان پر قبضہ کر سکتا تھا۔" ؎۱

اور دارالعلوم دیوبند کی فضا کے متعلق تو یہ مشہور تھا کہ کوئی وہاں باقاعدہ پڑھے یا نہ پڑھے اگر دو چار دن وہاں رہ آئے تو اسے انگریز دشمنی کا جذبہ اور حریت پسندی پیدا ہو جاتی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر اپنے بڑے بھائی شوکت علی کے ہمراہ علی گڈھ میں اسی زمانے میں داخل ہوئے۔ مولانا کا سارا سال کھیلوں اور تفریحات میں گذرتا۔ ڈیڑھ دو ماہ امتحان سے قبل ہر طرف سے یکسو ہو کر کتابوں کے ہو کر رہ جاتے اور امتیازی نمبر سے کامیاب ہو جاتے۔ میر محفوظ علی فرماتے ہیں :

؎۱ سیرت محمد علی صد ۲۹، ۳۰

"محمد علی قابلِ رشک اہلیت کے ساتھ کلاس میں لیکچر سنتے، فیلڈ میں کرکٹ کھیلتے اور یونین میں تقریریں کرتے تھے۔"

ان دنوں علی گڑھ میں خواجہ غلام الثقلین، مولانا ظفر علی خاں، چودھری خوشی محمد ناظر، مولانا حمید الدین فراہی اور اردو کے مشہور ادیب مصنف سید سجاد حیدر یلدرم پڑھ رہے تھے۔ سید سجاد حیدر اسی زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"شوکت علی خاں کرکٹ کے کپتان ہیں، اور کرکٹ کا کپتان اس وقت کے علی گڑھ میں اپنی قلمرو دبور ڈنگ، کا مسولینی ہے۔ طلبا اس کے تابع فرمان، پروفیسر اس کے اقتدار کو ماننے والے اور بڑھانے والے، کپتانی اوروں نے بھی کی اور کر رہے ہیں لیکن شوکت علی کی کپتانی یادگار زمانہ ہے۔ اسی نے کپتان کے کمرے کو ایک دربار کی حیثیت دے دی تھی۔"

آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:۔

"جب میں علی گڑھ کالج کے اسکول کی نویں جماعت میں داخل ہوا تو شوکت علی کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی محمد علی بھی رہتا تھا یہ لڑکا کلاس میں ذہین، کلاس کے باہر لڑاکا اور ہر فن میں مولا تھا۔ محمد علی اپنی بہت مختصر دنیا میں اپنے ہم عمر لڑکوں کی سرداری کرتا تھا۔ مگر یہ اس طنطنے کے ساتھ جو اس کے بڑے بھائی شوکت علی کو حاصل تھی اور پھر غضب یہ کہ اس چھوٹے سے سردار کی محدود سرداری دھری رہ جاتی تھی۔ بارہا ہم نے دیکھا کہ بڑے بھائی نے محمد علی کو ڈانٹ کر اپنے حضور میں بلایا اور اس بزم احباب اور دربار عام میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ دو ایک سوال جواب کے بعد رخساروں پر تھپڑ مار کر سزا دی گئی۔" صلے

سید سجاد حیدر ہی کا بیان ہے:۔

"اپنی انگریزی قابلیت کے لئے وہ اب بھی ممتاز تھے کہ ہم دونوں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج کی کلاسوں میں آئے یہاں پہنچ کر اُن کے کردار کی وہ خصوصیات نمایاں ہوئیں جس نے دنیا میں محمد علی کو آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل دی وہ اکثر اپنے پروفیسروں سے اختلاف کرتے تھے۔ یونین میں ایسے مباحث پر تقریر کرتے تھے جس جانب تقریر کرنا پروفیسروں کی جبیں پر چیں کا باعث ہوتا تھا۔ تقریریں اُن کی زوردار، زبان شستہ اور اپنے سن و سال کے لحاظ سے نہایت مؤثر ثابت ہوتی تھیں۔"

شاعری

مولانا بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے۔ عبد الماجد دریا آبادی کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم میں شعرائے باکمال نے حاجی اسماعیل خاں صاحب کی دعوت کے شکریہ میں نیاز کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب[لے] آنریبل و "آزمودہ کار" سیکرٹری مسلم لیگ کے برادر اصغر[ک] خیر ایک سال کالج میں خوب گذر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعد کو حسرت (مولانا حسرت موہانی) نے رونق بخشی ہم ہی لوگوں کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو پیش ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک چودھویں کو بارش ہو گئی تو ۳-۴ دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر یونین ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرحی غزل میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا:

سیرت محمد علی مرتبہ رئیس احمد جعفری صہ ۳۲ لے سر وزیر حسن جواودھ چیف کورٹ کے جسٹس رہے کے اصغر حسین بی اے ایل ایل بی (علیگ) سیشن جج

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں لطفِ مشاعرہ تو گیا چاندنی کے ساتھ

(محمد علیؒ۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق صـ ۵۱)

آکسفورڈ

۱۸۹۹ء میں مولانا نے علی گڑھ سے بی۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کیا۔ صوبہ متحدہ کے کامیاب طلبہ میں اول نمبر آئے اور آکسفورڈ کی تیاری شروع کر دی۔ علی گڑھ سے رخصتی اور آکسفورڈ کی روانگی کے متعلق سید سجاد حیدر لکھتے ہیں:۔

"علی گڑھ کی طالب علمی اس چمک دمک کے ساتھ ختم کرنے کے بعد محمد علی علی گڑھ سے رخصت ہوئے مگر کس طرح؟ پرنسپل خوش تھے کہ ایک جھگڑالو طالب علم جا رہا ہے۔ عام طلبہ کو رنج تھا کہ ایسا خوش گپیاں کرنے والا، مگر ساتھ ہی موقع پڑنے پر لڑائی بھڑائی میں ان کی سرداری کرنے والا اور ان کے لئے پروفیسروں سے بے دھڑک اور بے جھجک لڑنے والا جا رہا ہے علم دوست اور لائق طالب علم حیران تھے کہ محمد علی ان سے کیوں دور رہتا تھا بلکہ وہ کیوں ان کی ہنسی اڑاتا تھا۔ انگلینڈ روانہ ہونے سے قبل وہ علی گڑھ آئے اور احباب نے انہیں ایک رخصتی ڈنر دیا۔"

خود سید سجاد حیدر نے الوداعی نظم پڑھی:۔

اے خلعتِ سروری کے شایاں اے عازمِ مصر، فخرِ کنعان

سی ایس کی مصر کر لو تسخیر ایسی کرو جا کے کوئی تدبیر

یہ عزمِ سفر تمہیں مبارک یہ بابِ ظفر تمہیں مبارک

ایں نقد بہ کیسہ درمیاں کن زیں بعد ہر آنچہ خواہی آں کن

سجاد صاحب کہتے ہیں:

"اس وقت یہ دعا دل سے نکلی تھی مگر شکر ہے یہ دعا قبول نہ ہوئی، خدا کو ان سے زیادہ شاندار، زیادہ اہم اور زیادہ نتیجہ خیز کام لینے تھے۔"

بڑے بھائی کا ایثار

آپ کے والد ماجد کی جائیداد کافی تھی لیکن ان کی زندگی ہی میں مقروض ہو چکی تھی اور علی گڑھ کی تعلیم کے دوران میں اور زیادہ ہو گئی۔ اب آکسفورڈ جانے کے لئے اخراجات و مصارف کی ضرورت تھی۔ مولانا شوکت علی نے (جو محکمہ افیون میں آفیسر لگ چکے تھے) دورے کے سفر خرچ سے اپنا گذر کیا اور تنخواہ چھوٹے بھائی جو ان کا محبوب بھی تھا کے لئے وقف کر دی اور ایسا ایثار تاریخ میں کم ہی ملے گا۔

داخلہ

مولانا محمد علی آکسفورڈ کے کالج میں داخل ہوئے تو آئی سی ایس میں کامیاب ہونے والے مضامین کی بجائے اپنے پسندیدہ علمی مضامین سے دلچسپی لیتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئی سی ایس میں ناکام رہے۔ مولانا شوکت علی کو خبر پہنچی تو بہت پریشان ہوئے مگر بی اماں والدہ ماجدہ نے صبر و تحمل کا ثبوت دیا، اور چہرے پر کسی قسم کا اثر ظاہر نہ ہوا اور مولانا شوکت سے کہا کہ محمد علی کو بلا لو، منگیتر بیٹھی ہوئی ہے شادی کر دو، بعد میں دیکھا جائے گا، چنانچہ مولانا واپس آئے اور شادی کر دی گئی۔ اس کے بعد دوبارہ انگلینڈ گئے اور وہاں بی۔ اے کی تیاری کی اور "آنرز گریجویٹ" کی حیثیت سے کامیاب ہو کر واپس آئے۔

عفت و پاکیزگی

مولانا جب انگلستان گئے تو خوش پوشش اور خوبصورت و وجیہہ نوجوان تھے اور انگلستان کا معاشرہ جیسا ہے سب کو معلوم ہے لیکن وہاں کی رنگینیاں، شوخیاں اور ہر ہر قدم پر دلفریب نظارے اس نوجوان کو بہکا نہ سکے۔ ہر کوئی اس کا اعتراف کرتا ہے خود مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہیں تھی مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و تورع کی طرف تھا"

انگریزی میں قابلیت

علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں "علی گڑھ منتھلی" میں ایک مضمون لکھا جس کو پڑھ کر کالج کے پرنسپل نے کہا کہ:

"تم ایک زمانے میں انگریزی کے بے مثل ادیب ہو گے"

میر محفوظ علی تحریر کرتے ہیں:۔

"محمد علی کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب اور انشا، مصطلحات و محاورات طرز ادا و طریقۂ بیان پر اس درجہ عبور و تبحر حاصل کیا کہ ان کے قلم و زبان دونوں کو جاہلوں سے لے کر امیروں اور مزدوروں سے لے کر وزیروں تک کے الفاظ و عبارات ادا کرنے پر یکساں کامل قدرت و مہارت حاصل تھی۔ ملاحوں کے سرود انہیں یاد تھے۔ اناؤں کی لوریاں انہیں یاد تھیں۔ لیمرک LAIMRIC انہیں یاد تھیں۔ لندن کے مشرقی حصے EAST END کے آوارہ گرد چھوکروں کی پھبتیاں انہیں یاد تھیں۔ بل BULL انہیں یاد تھے۔ معمے اور چیستان انہیں یاد تھے اس کے علاوہ انگریزی کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرا اور مصنفین کے بہترین علمی و ادبی جواہر پارے ان کی زبان پر یا ان کی نظر میں تھے انجیل کی کتب عتیق و جدید پر ان کی نگاہ تھی۔ سینکڑوں علمی لطیفے نوک زبان تھے۔ طبیعت پر چونکہ بذلہ سنجی، ظرافت اور شوخ نگاری کا رنگ غالب تھا لہذا اس صنف میں ایسا بے ساختہ اور اتنا بہتر لکھ سکتے تھے کہ لبا اوقات ان میں اور 'لندن پنچ' کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز ہو سکتا تھا۔ یہ ایک جاہل اور ہیچمدان ہندی کا خیال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدار رائے ہے"

مسٹر میکڈانلڈ جو بعد میں برطانیہ کے وزیر اعظم بنے ۱۹۱۳ء میں لارڈ ازلنگٹن کے پبلک سروس کمیشن میں ایک ممبر تھے یہ کمیشن جب لکھنؤ گیا تو مولانا جوہر شہادت دینے گئے۔ دوران گفتگو میں بقول مولانا جوہر "مسٹر میکڈانلڈ نے بالالتزام اپنے کامریڈ پڑھنے کا ذکر کیا، اور میری (محمد علی) شوخیٔ تحریر کی بہت کچھ تعریف فرمائی"

ٹائمز آف انڈیا کا لندنی وقائع نگار مولانا کی وفات پر لکھتا ہے:۔

"مجھے افسوس ہے کہ ان کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا اس میں ان کی یہ خوبی نظر انداز کر دی گئی ہے کہ وہ انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے، کوئی ہندوستانی اس میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور انگریزوں میں شاید بہت ہی کم ان سے بہتر لکھ سکتے تھے۔ مرحوم نے صحافت کی زندگی شروع کرنے سے پیشتر مجھ سے بہت طویل مشورے کیے تھے"

یہ لندنی وقائع نگار ٹائمز آف انڈیا کا ایڈیٹر بھی رہ چکا تھا اور انگریزی زبان کے زندہ جاوید ادیب و انشا پرداز

مصنف، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار نے مولانا جوہر کے حضور جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ اسی کی طرح زندہ جاوید ہے:۔

"محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، اس کا قلم میکالے کا قلم تھا، اس کی زبان برک کی زبان تھی"

افسر اعلیٰ برائے تعلیمات رامپور

انگلستان سے واپسی پر نواب رام پور نے آپ کو اپنی ریاست میں تعلیمات سب سے بڑا افسر بنا دیا اور رام پور ہائی سکول کا پرنسپل بھی۔ مولانا بڑی خوش اسلوبی سے یہ کام سرانجام دے رہے تھے کہ ریاستی قاعدے کے مطابق آپ کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ مولانا جب آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھے تو ان کے ساتھ نواب رام پور کے چھوٹے بھائی بھی پڑھتے تھے۔ یار لوگوں نے اسی سے فسانہ بنا ڈالا کہ محمد علی اپنے دوست کو گدی پر لانے کے لئے نواب صاحب کو اتارنا چاہتے ہیں۔ نواب صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے حالات کو دیکھا تو تار دے کر بڑے بھائی شوکت علی کو بلایا۔ ان سے نواب صاحب کے اچھے تعلقات تھے۔ ان کے آنے سے نواب صاحب تقریباً مطمئن ہو گئے، لیکن حاسد آڑے آتے۔ مولانا شوکت علی کے مشورہ سے مولانا محمد علی مستعفی ہو گئے اور بڑے بھائی کے پاس رہ کر وکالت کی تیاری کی لیکن ایک مضمون میں فیل ہو گئے۔

ریاست بڑودہ میں

ریاست بڑودہ کے ولی عہد کنور فتح سنگھ کے تعلقات بھی مولانا سے دوران انگلستان بہت گہرے ہو گئے تھے۔ کنور صاحب موصوف کی تمنا تھی کہ وہ مولانا کو اپنی ریاست میں بلائیں اور بالآخر انہوں نے اپنے والد کو مجبور کیا کہ وہ مولانا کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ مہاراجہ نے مولانا کو نہایت شفقت سے محکمہ افیون میں اعلیٰ منصب پر مقرر کر دیا۔ آپ نے تقریباً سات سال ملازمت کی۔ ساڑھے چار سال میں سترہ لاکھ روپے کا منافع جو گذشتہ سالوں کے مقابلہ میں دو ہزار پندرہ فیصد زیادہ تھا۔ یہ حسن تدبر و انتظام دیکھ کر مہاراجہ نے آپ کو ضلع نوساری کا کمشنر بنا دیا۔ آپ نے اپنے اس نئے منصب پر اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیں اور ہر کہ و مہ کی نظروں میں مقبول و محبوب بنا دیا۔ ایک [illegible] کے سلسلے میں آپ کو ایک بہت بڑا اہد یہ یہ کہہ کر دیا جا رہا تھا کہ یہ ریاست کا قدیم دستور رہے۔ آپ نے نہ صرف بہت سختی سے انکار کر دیا بلکہ دوسرے افسروں کو بھی اس لقمۂ تر کے اگلنے پر مجبور کر دیا۔

پرسنل اسسٹنٹ

اس کے بعد آپ کو ولی عہد کا پرسنل اسسٹنٹ مقرر کر دیا گیا اور یہ تقرری اس لئے ہوئی تھی کہ ولی عہد کنور فتح سنگھ بہت زیادہ شراب کا عادی تھا۔ آپ کو سیکرٹری مقرر کیا گیا کہ شاید اپنے دوستانہ تعلقات کی بنا پر اس کی عادت ترک کرا دیں مگر یہ بری عادت کب چھٹتی ہے۔ بالآخر کنور کثرت شراب نوشی کی وجہ سے مر گیا۔

گپ

اپنی ملازمت کے دوران میں مولانا وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات کے لئے مضامین لکھتے رہتے تھے۔ [illegible] ملازمت سے پیشتر ایک تفریحی انگریزی رسالہ "گپ" کے نام سے الہ آباد سے جاری کیا مگر اس کے صرف دو پرچے نکل سکے۔

ملازمت سے بیزاری

مولانا جوہر کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑے کام یعنی رہنمائی ملک و ملت کے لئے پیدا کیا تھا۔ وہ اس لئے نہیں تھے کہ کسی ریاست میں کمشنر یا سیکرٹری بن کر رہ جائیں۔ خود بخود کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے جن کی بنا پر ان کا دل ملازمت سے بیزار ہو گیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۱۰ء کو میر محفوظ علی کو خط لکھتے ہیں جس میں ملازمت سے بیزاری کا اظہار کیا۔

LOU PIDOU
SAINT MATHIEU
GRASSE A.-M.

17. 4. 32.

My dear Sir

I met Mohammed Ali on several occasions & liked him very much personally. But I don't think I could produce anything very illuminating to tell about him. We differed & argued about all sorts of things but we sympathised mainly about the British "governing class".

Very sincerely yours

H. G. Wells

ایچ جی ویلز کے خط کا عکس محمد علی کے متعلق ۔

جارج برنارڈ شا کے خط کا عکس محمد علی کے بارے میں ۔

یہ دونوں خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ہیں ۔

TELEGRAMS, SOCIALIST, PARL-LONDON.
TELEPHONE, WHITEHALL 3160.

4, WHITEHALL COURT, LONDON, S.W.1

6th May 1932.

Dear Sir,

My acquaintance with Mohammed Ali was limited to a conversation at my house at which we discussed the possibility of a Reformation in Islam somewhat like the Christian reformation led by Martin Luther. We agreed, I think, that a Back to Mahomet movement was needed to rescue Islam from the ruts which it has been digging for itself for some centuries past. I found M.A's company very congenial; and as your letter encourages me to believe that mine was not altogether disagreeable to him, I flatter myself we parted friends.

His personality left such an impression on me that when the news of his death came I felt that Islam had lost a very valuable living force.

That is all I can say about him from personal knowledge.

Mr Abdul Majid.
P.O.Daryabad
Bara Banki, India

Faithfully
G Bernard Shaw

اجراء کامریڈ کا خیال

سنہ ۱۹۱۰ء کے اختتام تک یہ طے کر لیا کہ اب ملازمت نہیں کریں گے، بلکہ اخبار نکالیں گے، چنانچہ لکھنؤ میں فیصلہ ہوا کہ کلکتہ سے اخبار نکالا جائے۔ مولانا ایڈیٹر، میر محفوظ علی منیجر ہوں۔ اس اثناء میں سرمائیکل اڈوائر کے توسط سے نواب صاحب جاورہ نے وزارت کی پیش کش کی۔

بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنی ریاست میں چیف سیکرٹری کا منصب پیش کیا، لیکن آپ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ہر دو جگہ انکار کر دیا، اور کامریڈ کے اجرا کا انتظام کرنے لگے۔ چنانچہ آپ نے بڑودہ سے دو سال کی رخصت لی اور اس کے بعد وہ مستعفی ہو گئے۔ مہاراجہ استعفیٰ منظور نہ کرتے تھے۔ آپ جب علیحدہ ہوئے تو افسر بالا نے حسن خدمات کے صلہ میں سات ہزار روپے بطور انعام دینے کی تجویز کی، لیکن مولانا نے یہ رقم نہیں نکلوائی۔ بقول عبدالماجد دریا آبادی:۔

"کامریڈ کے ایڈیٹر کے لئے دنیوی ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع تھے۔ ہندوستان کا ذکر نہیں۔ انگلستانی صحافت میں بلند سے بلند کرسی ادارت اس کے لئے خالی تھی۔ مناصب سرکاری میں بڑی سے بڑی رفعت اس کے لئے چشم براہ تھی، عزت، ثروت، اقتدار، وجاہت کے اصنام کبیرہ نے قدم قدم پر اسے لبھایا لیکن اس کشتۂ عشق نے ماسوا کی جانب نظر اٹھانا بھی گناہ سمجھا۔ اور سارے رشتے چھوڑ کر صرف ایک کا ہو رہا۔"

کامریڈ ہفتہ وار پرچہ تھا۔ اس کی انگریزی ایسی عمدہ ہوتی تھی کہ انگریز تک خرید کر اسے پڑھتے یہاں تک کہ وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی بیگم نے اپنے نام پر پرچہ علیحدہ جاری کرایا۔ وائسرائے کے نام جو اعزازی پرچہ جاتا تھا وہ جلدی فارغ نہ ہوتا تھا۔ ان دنوں جرمن کے ولی عہد وائسرائے کے مہمان تھے۔ انہوں نے اپنا پرچہ علیحدہ جاری کرایا۔ اسی طرح دوسرے تمام قابل ذکر مناصب پر متمکن انگریز کامریڈ کو پڑھتے تھے۔

پرچہ خاصی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا کہ پریس ایکٹ کے ذریعہ بند ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں بیجاپور جیل سے رہائی کے بعد دوبارہ نکالا، مگر اب مولانا کی مصروفیات اس قدر ہو چکی تھیں کہ پرچہ کو وہ معیار پر نہ لا سکے اور نہ ہی ہمیشہ وقت پر نکال سکے جس کی ایک وجہ قابل اور منتظم سب ایڈیٹر کی کمی تھی۔ بہت تلاش کی مگر کوئی قابل سب ایڈیٹر نہ مل سکا۔ اس کے باوجود مولانا نے ہمت نہ ہاری اور اکیلے اس کام کو سرانجام دیتے رہے۔ لیکن جس آدمی نے دنیا جہان کے کام اپنے سر لے لئے ہوں وہ اسے کیسے پہلے معیار اور وقت پر نکالتا لیکن ان کی ہمت قابل داد تھی۔ بلگام کانگریس سنہ ۱۹۲۴ء کے موقع پر پورا مضمون بذریعہ تار بھجوایا لیکن تار بابو کی انگریزیت اور دفتر کے آدمیوں کی ترامیم نے مضمون کی ایسی درگت بنائی کہ جب چھپا تو مولانا محمد علی نے جو کچھ لکھا اس کے سوا سب کچھ تھا۔

بی اماں کی وفات اور کامریڈ

بی اماں کو اپنے بیٹے سے اور بیٹے کو اپنی والدہ ماجدہ سے جتنا پیار تھا وہ ضرب المثل بن چکا ہے۔ بی اماں کی وفات ہوئی تو کامریڈ کو وقت پر نکالنے کے لئے ایک کونہ میں بیٹھے روتے کے ساتھ ساتھ کامریڈ کے پروف کی تصحیح بھی کر رہے ہیں۔ بالآخر کوئی قابل ساتھی نہ ملنے کی بنا پر سنہ ۱۹۲۶ء کو اس امید پر بند کر دیا کہ جب کبھی ساتھی مل گیا سہ بارہ نکالیں گے لیکن نہ ساتھی ملا نہ کامریڈ نکلا۔

مسلم یونیورسٹی

سرسیدؒ نے جب علی گڈھ سکول قائم کیا ہے تو اس کے متعلق ان کے کیا عزائم تھے؟ ان کا اندازہ ان کے اس فقرے سے کیا جا سکتا ہے :-

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔"

لیکن عملاً وہاں ہوا کیا اس کے متعلق ہمارے دور کے مشہور مصنف و ناقد شیخ محمد اکرام ایم اے تحریر فرماتے ہیں :

"اگر علی گڈھ یونیورسٹی کی موجودہ صورت کو دیکھا جائے اور سرسید کے ان ارادوں اور منصوبوں سے اس کا مقابلہ کیا جائے جو ابتدا میں علی گڈھ کے متعلق ان کے دل میں تھے تو خیال ہوتا ہے کہ علی گڈھ علمی حیثیت سے سرسید کے زریں خواب کی ایک نہایت معمولی سی تعبیر ہے اور کئی ایسی ضروری باتیں تھیں جن کے سرسیدؒ دل سے خواہاں تھے، لیکن وہ علی گڈھ کو نصیب نہ ہوئیں" ؎

آگے چل کر لکھتے ہیں :

لیکن علی گڈھ میں ان صاحب کمالوں کا سکہ نہ چلا۔ وہاں مادیت اور ظاہر پسندی کا دور دورہ تھا۔ اساتذہ میں علمی اہلیت اور فنی قابلیت تو ساری تھی لیکن ان کی نگاہیں بلند نہ تھیں۔ انہوں نے یہ تو نہ کیا کہ دولت دنیا میں سے مختصر سے مختصر پر کفایت کریں اور اپنے علمی شوق کی تکمیل، تصنیف و تالیف اور نام نیک کو حاصل زندگی سمجھیں۔ ان کے نزدیک علم و فن کھانے کمانے کا ذریعہ تھا اس لئے بالعموم یہی خواہش ہوتی ہے کہ علمی زندگی پر مردنی چھا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن مادی زندگی کی بہار ضرور لوٹی جائے۔ جو لوگ اس قابل تھے کہ اگر وہ بلند نظری کو کام میں لاتے تو شہرت دوام اور قومی خدمات میں حالی اور آزاد۔ شبلی اور نذیر احمد کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے۔ ان کا منتہائے زندگی یہ ہو گیا کہ کسی طرح ظاہری ٹھاٹھ اور خوش معاشی میں وہ ایک سیکنڈ گریڈ ڈپٹی کلکٹر کا مقابلہ کر سکیں۔

علی گڈھ کے پروفیسروں میں علمی قابلیت، مذاق کی شستگی اور نیک ارادوں کی کمی نہیں لیکن جب خیالات کا رخ پھر گیا اور ہمتیں پست ہو گئیں تو یہ خوبیاں بیکار ثابت ہوئیں اور اساتذہ کا وقت عزیز ڈرائنگ روم کی تزئین خوش معاشی، ضیافت بازی، کلب بازی، گپ بازی اور یہاں پارٹی بازی، کی نذر ہونے لگا۔ اس فضا میں علمی زندگی کا فروغ پانا محال تھا چنانچہ ان پروفیسروں کی ساری صلاحیتوں کے باوجود ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ہمارے علمی محسنوں کی صف میں شبلی اور سرسید نہیں۔ سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق کے قریب ہو جانے کا مستحق ہو۔

مادی نقطۂ نظر کے فروغ سے نہ صرف یہ ہوا کہ اساتذہ اور طلبہ ایسے علمی کاموں کی تکمیل سے معذور ہو گئے جنہیں پورا کرنے کی خاطر ایثار و قربانی اور مستعدی کی ضرورت تھی؛ بلکہ خیالات میں ایک عجب طرح کی ڈھلمل یقینی یعنی روحانی کمزوری اور ذہنی (؟) گئی۔ سرسید کا خیال تھا کہ علی گڈھ والے ان کے کام کو جاری رکھیں گے۔ وہ اسلامی ہندوستان کی شاندار روایات کے وارث

؎ موج کوثر ص ۱۴۶

ہوں گے اور اسلام اور مسلمانوں پر جو اعتراض ہوتے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے لیکن یہاں یہ عالم تھا۔ ع

در لعل تیر و کماں کشتہ تخچیہ شدیم

کسی طرف سے اسلام یا مسلمانوں یا علی گڈھ کے خلاف کوئی آواز اٹھے اس پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے علی گڈھ

نکلیں گے ع

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

جہاں تک مسلمانوں، مسلمان بادشاہوں یا اسلام کے خلاف اعتراضات کا تعلق ہے ان کے جواب میں کوئی قابل ذکر کتاب

کالج کے بانیوں کی نسل ختم ہو جانے کے بعد علی گڈھ سے آج تک شائع نہیں ہوئی بلکہ حالت یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان بادشاہ

سلطان محمود غزنوی یا اورنگ زیب کے خلاف کچھ لکھے تو علی گڈھ کے خوش خواو خوش اخلاقوں کا یہی جواب ہوتا ہے۔ ع

مجھے تو خوہے کہ جو کچھ کہو، بجا کہیئے!

بلکہ وہ تو کہیں گے کہ نہ صرف محمود اور عالمگیر تعصب کے پتلے تھے بلکہ اسلامی حکومت کا موسس اعلیٰ سلطان محمد غوری

اناڑی جرنیل اور بھونڈا سپاہی تھا اور یہ تقط نیرنگیٔ قدرت کا کرشمہ ہے کہ وہ ایک سلطنت کی بنیاد ڈال گیا۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے خود ہی معلوم کیا

کہ اس ادارے پر انگریز ملازموں کی تہذیب و تمدن اور ان کے خیالات کا کس قدر اثر ہوگا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مولانا محمد علی

احوال پر آمادہ کیا۔ ان کی مادر علمی کی خستہ حالت ہر اور وہ دیکھا کریں۔ یہ محمد علی کی سرشت کے خلاف تھا۔ سیرت محمد علی کے

رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

"سب سے زیادہ جس جماعت نے علی گڈھ کو محمد علی کے معیار سے نقصان پہنچانے میں حصہ لیا وہ وہاں کا انگریز

شاف تھا۔ انگلش شاف تنخواہ دار ملازم تھا لیکن اس ہیبت آفریں نام کی ہیبت خود اس کے ٹرسٹی صاحبان پر طاری

ہوئی تھی اور اس کے وجوہ بھی تھے۔ اس جماعت کو نظم و انتظام کا دعویٰ تھا۔ یہ غرہ تھا کہ علی گڈھ کی ساری شہرت ان

کے دم سے وابستہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ گھمنڈ تھا کہ اس کا تعلق حکمران قوم سے ہے اور حکمران قوم نے بھی اپنی کرتوں

سے ثابت کر دیا تھا کہ علی گڈھ کی سیاسیات میں اگر وہ دخل دے سکتی ہے تو اس معاملہ میں جب انگریز شاف کے ارکان

تنا کی ہوں "ہز ایکسی لنسی ٹپرن" کی توجہ اس وقت پورے ادائے حکمرانی سے منعطف ہوتی تھی۔ جب ٹرسٹیوں اور شاف

شاف کے درمیان کشمکش ہو رہی ہوتی۔"[2]

آگے چل کر جعفری لکھتے ہیں:۔

اندرونی حالات

دوسری طرف اندرونی حالات نہایت نازک ہو رہے تھے۔ فرقہ بندیاں تھیں۔ ناقدم پرچیتے تھے، تفرقے تھے، ہنگامے تھے۔ ایک جماعت چاہتی تھی کہ علی گڈھ میں اس اقتدار

---

[1] موج کوثر ص ۱۴۹، ۱۵۰ [2] سیرت محمد علی صفحہ ۲۳۴، ۲۳۵

رہے۔ دوسری جماعت کی خواہش یہ تھی کہ پہلی جماعت کو زک دے کر خود برسرِ اقتدار ہو جائے۔ غرض مقصد حقیقی خدمت کسی کا بھی نہیں تھا۔ سب اپنا اقتدار اور اپنا تسلط چاہتے تھے [1]

ان سب حالات کا مولانا محمد علی نے مقابلہ کیا۔ انہوں نے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں رہ کر کام کیا۔ پھر کورٹ کے ممبر بنے۔ ٹرسٹی مقرر ہوئے اگرچہ دوسرے ٹرسٹیوں کی طرح دوامی نہیں بلکہ ان کی رکنیت دوامیوں سے صرف پانچ سال کے لئے تاہم اس عرصہ میں انہوں نے جو کام کیا وہ لائق صد تحسین و تبریک ہے۔ علی گڈھ کو کالج سے یونیورسٹی بنانے کے لئے انتھک کام کیا۔ ان کاموں اور خدمات کی تفصیل جو مولانا نے اپنی مادر علمی کی خاطر انجام دیں۔ سیرت محمد علی وغیرہ میں مکمل موجود ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ مولانا کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اگر قرطبہ اور غرناطہ کے معیار پر نہیں آسکتی تو کم از کم آکسفورڈ اور کیمبرج کا معیار تو اسے حاصل ہو جائے اور اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

جامعہ ملیہ کا قیام

ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریک میں مولانا جوہر کی نیک خواہش تھی کہ ملک گیر تحریک میں میرا کالج علی گڈھ بھی حصہ لے۔ جس کے متعلق مسلمان بڑے خوش کن تصورات لئے ہوئے ہیں کہ وہ وقت پڑنے پر ملک کی خدمت سر انجام دے گا۔ علی گڈھ کالج کے طلبہ تو اس تحریک سے کچھ متاثر ہوئے لیکن حکام اور خداوندان علی گڈھ ٹس سے مس نہ ہوئے الٹا ان کا قہر نازل ہوا کہ انگریز کی مخالفت کیوں؟ وہ عدم تعاون تو کیا کرتے ان کا دستِ تعاون گورنمنٹ کی جانب اور دراز ہو گیا۔ مولانا جوہر نے حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری کے ساتھ کورٹ میں تقریر کی لیکن چانسلر اور وائس چانسلر نے یہ دعوت رد کر دی، بلکہ کورٹ میں ان عظیم رہنماؤں کے خلاف قرار داد ملامت پاس کی کہ گویا یہ غداران اسلام ہیں۔ اس کے بعد ان حضرات نے براہ راست طلبہ کو دعوت دی کہ وہ تحریکِ ترکِ موالات اور عدمِ تعاون میں حصہ لیں۔ اور یونین میں تقریر کی۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین (وائس پریذیڈنٹ یونین) مخالفت کے لئے یونین میں آئے تھے مگر پورے طور پر ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب اور چند مخلصوں کو ساتھ لے کر یہ حضرات اولڈ بوائز لاج میں مقیم ہو گئے جو کالج کے قبضہ میں نہ تھا۔ اگرچہ اس کی زمین میں تھا اور شوکت علی محمد علی کی کوششوں کا نتیجہ۔ لیکن حکام کالج کی طرف سے ان کا مکمل مقاطعہ کیا گیا۔ پانی بند کر دیا۔ بھنگی جانے بند ہو گئے۔ روشنی کا رابطہ توڑ دیا۔ جب اس پر بھی یہ سخت جان ثابت ہوئے تو پولیس کی امداد سے ان لوگوں کو اولڈ بوائز لاج سے زبردستی نکالا گیا۔

یہاں سے نکل کر تھوڑی دور جا کر ان حضرات نے خیمے لگائے اور درخت کے نیچے تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ علی گڈھ کالج سے طلبہ نکل نکل کر ادھر آنے لگے۔ خیمے ناکافی ثابت ہوئے تو پاس ہی چند کوٹھیاں کرایہ پر لے لی گئیں۔ اس نئے کالج کے پرنسپل مولانا محمد علی تھے۔ خوش قسمت ہیں وہ افراد جو ان دنوں ملت کے عظیم سپوت سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نئے کالج کا نام "جامعہ ملیہ" رکھ دیا گیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن باوجود اپنے ضعف و نقاہت کے اس کے افتتاح کے لئے علی گڈھ تشریف لائے علامہ عثمانی نے ان کی جانب سے خطبہ پڑھا۔ خاصی دیر علی گڈھ میں جامعہ چلتا رہا۔ مولانا محمد علی کی سیاسی مصروفیات بے پناہ تھیں۔ حکیم محمد اجمل خاں ہی اس کے سب کچھ تھے لیکن وہ دہلی میں تھے اور جامعہ علی گڈھ میں۔ آخر کار جامعہ ملیہ کو حکیم صاحب دہلی میں لے آئے۔ ڈاکٹر

[1] بحوالہ مذکور ص ۲۳۶

ذاکر حسین تقسیم ملک کے بعد تک اس کے شیخ الجامعہ رہے اور اس جامعہ نے ملک و ملت کی بہت خدمات سر انجام دیں۔ مولانا جوہر تا حیات اس سے متعلق رہے۔ ہمیشہ جامعہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے رہے۔ تا آنکہ آپ کی وفات ہو گئی۔

طبی وفد

۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ ہوئی تو ڈاکٹر انصاری کا خیال ہوا کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد وہاں مقتولوں، مجروحوں وغیرہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی مدد کرے۔ مولانا محمد علی نے اس کے لئے بہت کام کیا کامریڈ میں اس کے لئے ایک زبردست مضمون لکھا جس کی وجہ سے ہزار ہا روپیہ اکٹھا ہوا اور اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسروں نے کام کیا۔ غرضیکہ غلام ہندوستان کے بیدار مسلمانوں نے اپنی بھائیوں کی اس طرح مدد کی جو ہمیشہ کے لئے تاریخ کا ایک جزو بن گیا۔

ہمدرد کا اجراء

کامریڈ مولانا نے کلکتہ سے نکالا تھا کیونکہ ان دنوں دارالحکومت کلکتہ تھا لیکن جب دارالحکومت دہلی قرار پایا اور حکومت کلکتہ سے دہلی آ گئی تو مولانا نے بھی تعاقب کرتے ہوئے یہاں دہلی سے اجراء کے انتظامات شروع کر دیئے۔ بیروت سے ٹائپ منگوایا مگر وہ پورا نہ تھا۔ اس لئے ہمدرد نہ نکل سکا۔ حکیم اجمل خاں کے توجہ دلانے پر کہ خبروں کی بہم رسانی کی اشد ضرورت ہے۔ مولانا نے نقیب ہمدرد ایک ورق پر ۲۳ فروری ۱۳ء سے چھاپنا شروع کیا۔ ہمدرد کے سٹاف میں قابل ترین لوگوں کو شامل کیا گیا۔ میر محفوظ علی۔ سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، سید جالب، مولانا شرر وغیرہ اس کے عملہ ادارت میں شریک تھے۔ قاضی عبدالغفار صاحب اس زمانے کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"میری زندگی میں وہ یادگار صبح تھی یعنی وہ پہلا دن جب بحیثیت استاد و شاگرد میرے اور محمد علی کے مستقل تعلقات شروع ہوئے ہیں۔ اس زمانہ کو بھول نہیں سکتا کیا زمانہ تھا جب ہمدرد و کامریڈ کے دفتر میں صبح اور شام تمام ممبران اسٹاف اخبار کے متعلق مشورے میں شریک ہوتے تھے۔ شوکت علی، محمد علی، سید محفوظ علی، راجہ غلام حسین میں اور دو چار، ہم سب زیر بحث مسائل پر بحث کرتے تھے اور محمد علی صاحب ایک ایک کو اس کے کام کے متعلق ہدایت دیتے تھے۔ ان کے دماغ کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ جب چھوٹا سا لوٹ لکھنے کے لئے بحث کے خاص خاص پہلو بتانا شروع کرتے تھے جو سب اگر حیطۂ تحریر میں لائی جائیں تو ہمدرد کے آٹھ دس کالم پُر ہو جاتے"۔[1]

مولانا جوہر نے اس اخبار کو اس سج دھج کے ساتھ چلایا کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ہندوستان کا یہ پہلا روزنامہ تھا جس نے براہِ راست ایسوسی ایٹڈ پریس اور رائٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔[2]

اپنی گوناگوں صفات و امتیازات کی وجہ سے ہمدرد بہت مقبول ہوا اور ان دنوں اس کی اشاعت اتنی ہوئی کہ آج بھی دو تین اخبارات ہی اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

گورنمنٹ کا خراج تحسین

مولانا کی نظر بندی کے بعد صوبہ کے چیف کمشنر نے اردو پریس اور صحافت پر سخت تنقید کی لیکن ہمدرد کو نہ صرف اس سے مستثنیٰ قرار دیا بلکہ ہمدرد کے مقالات کی تحسین و توصیف کی الفضل ما شہدت بہ الاعداء فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں اکی یہ کیسی اعلیٰ مثال ہے۔

[1] سیرت محمد علی ص ۲۶۹ [2] بحوالہ مذکور ۲۷۲

لطیفہ

جنگ کے بعد ہمدرد پر سنسر بٹھا دیا گیا۔ ایک دفعہ انہی دنوں چڑیا چڑے کی کہانی لکھی گئی تو سنسر نے اسے کاٹ دیا۔ دریافت کیا گیا تو جواب ملا کہ ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ معلوم اس چڑیا چڑے کی کہانی میں کیا بھر دیا گیا ہو، جواب وہی ہمارے سر پہ آ پڑے۔

مولانا کی نظر بندی پر ہمدرد کی اشاعت بھی ملتوی ہو گئی؛ اگرچہ اس کے عملہ ادارت نے بہت کوشش کی کہ شائع ہوتا رہے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

دوبارہ اجراء

بیجا پور سے رہائی کے بعد دوبارہ ہمدرد جاری کیا گیا۔ اگرچہ نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہونا چاہیئے تھا لیکن وہی مولانا کی بے پناہ مصروفیتیں کا مرٹیہ کی طرح یہاں بھی آڑے آئیں۔ پھر پہلے جیسا اخبار نہ نکل سکا۔ خودداری، اصول کی پابندی وہی رہی۔ نہ غلط اشتہارات لئے نہ دوسرے اخبارات کی طرح راجوں مہاراجوں سے دھمکا کر یا خوشامد کرکے بھاری رقمیں وصول کیں بلکہ اپنے پاؤں پر جو کچھ ہو سکا کیا، حالانکہ ان دنوں دلّی کے دوسرے اخبارات راجوں، مہاراجوں اور مختلف حیلوں بہانوں سے بیش بہا رقوم وصول کرتے تھے۔ خصوصاً دہلی کے دو اخبار تو اس بارے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک دو دفعہ تو بعض احباب نے اس بارے میں سلسلہ جنبانی یا تحریک شروع کی تو ان کو ڈھونڈ کر ان سے حلف اٹھوائے کہ وہ اس طرح کی کوئی نازیبا حرکت نہیں کریں گے۔ مولانا کی صحت زیادہ خراب ہو گئی تو مہاراجہ الور نے اپنے خرچ پر انہیں انگلستان برائے علاج بھیجا تاکہ کچھ علاج سے اور کچھ آرام و سکون سے صحت بحال ہو۔

ان دنوں عبدالماجد دریا بادی نے اور ظفر الملک صاحب نے ہمدرد کو سنبھالا دیا۔ مولانا واپس آئے تو رنگون چلے گئے رنگون قیام کے دوران میں مہاراجہ الور کی جوبلی پر 'ہمدرد' کا سپیشل نمبر نکالنے کی تجویز بعض مخلصین کی طرف سے ہوئی کہ اس طرح ہمدرد کی امداد ہو جائے گی۔ عبدالماجد دریا آبادی نے بذریعہ تار مولانا سے استصواب کیا تو مولانا نے مہاراجہ الور کی تمام کرم فرمائیوں اور رعنایات کے باوجود صاف انکار کر دیا۔ اور لکھا کہ ہمدرد کا سپیشل نمبر آج تک نہیں نکلا اس لئے معذرت ہی ہے۔

ہنگامہ کانپور

۱۹۱۳ء میں کانپور میں مسجد کی جزوی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ قصہ یہ تھا کہ کانپور کی میونسپلٹی ایک سڑک تعمیر کر رہی تھی۔ ایک مسجد سنگ راہ بنی ہوئی تھی۔ متولیوں نے رواداری سے کام لے کر غسل خانہ اور بیت الخلاء وغیرہ کے گرانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ میونسپلٹی نے گرانے کا انتظام شروع کر دیا۔ ہندوستان کے تمام علماء اور تقریباً جمہور مسلمانوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی کہ متولی اس قسم کی اجازت نہیں دے سکتے مگر کمیٹی نے وہ جگہ گرا دی۔ مسلمانوں کے قلوب زخمی ہوئے۔ پورے ملک میں آگ لگ گئی۔ چنانچہ کانپور کے مسلمان دوبارہ تعمیر کے لئے آ گئے۔ پولیس آئی نہ رکے، بالآخر فوج آئی۔ ہوائی فائر ہوئے۔ مسلمان ڈٹے رہے۔ بالآخر منصف اور عادل حکومت نے گولی چلائی اور مسلمان سینوں پر گولیاں کھا کھا کر شہید ہوتے رہے۔ بیسیوں شہید ہوئے۔ سینکڑوں زخمی ہوئے۔ پورے ملک میں آگ لگ گئی۔ اس پر مسلمانوں کے غم و غصہ میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ مولانا آزاد کے الہلال میں ان دنوں ایسے آتشیں مقالات شائع ہوتے کہ آج بھی ان کو پڑھ کر خون کھول جاتا ہے۔ ایجی ٹیشن ہوئے مگر یوپی کی حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔

مولانا محمد علی نے گورنر صوبہ سر جیمس مسٹن سے نجی طور پر خط و کتابت کی کہ شاید ذاتی تعلقات کی بنا پر وہ نرم ہوں مگر ان کا نشہ نا مقا

ستمبر ۱۹۱۳ء کو بمبئی جاکر میکڈانلڈ کو ایک تار دیا کہ وہ اس مسئلہ کو پارلیمنٹ میں پیش کریں۔ مگر انہوں نے بھی تار کا کوئی جواب نہ دیا۔ بالآخر مولانا نے مسٹر وزیر حسن سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو ساتھ لیا اور ۱۰ اکتوبر ۱۳ء کو نہایت خفیہ طریقہ سے انگلستان پہنچ گئے۔ اپنے جانے کو خفیہ اس لئے رکھا کہ کہیں گورنر صاحب کوئی رکاوٹ نہ ڈال دیں۔ پتہ اس وقت چلا جب آپ جہاز پر سوار ہوگئے۔ انگلستان جاکر تقریریں کیں۔ مضامین لکھے، ممبران پارلیمنٹ سے ملے، وزراء سے ملاقاتیں کیں۔ ہندوستان میں بھی کافی زور و شور سے تحریک چل رہی تھی اس نے وہاں کام کیا۔ سر جیمز لاٹوش (سابق گورنر یوپی) رکن مجلس وزیر ہند مولانا کے دلائل سے کافی متاثر ہوئے اور وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کو ہدایت بھجوائی اور انہوں نے یہ مسئلہ اپنے ہاتھ میں لیا اور کانپور پہنچے۔ ہسپتال میں زخمیوں کا معائنہ کیا۔ قیدیوں سے ملنے جیل گئے انہیں رہا کیا۔ سب کو رہا کیا اور مسجد کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ اس نمایاں کامیابی کے بعد مولانا دسمبر ۱۳ء میں واپس آئے۔ ان کا پرخلوص شاندار استقبال کیا گیا۔

نظر بندی

۱۹۱۴ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو لندن ٹائمز نے ایک اشتعال انگیز مضمون میں ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ جنگ سے علیحدہ رہ کر دور سے تماشہ دیکھیں یہاں تک کہ یونان پر بھی ان کی پیش قدمی نہ ہو۔ ان دنوں بیگم محمد علی سخت بیمار تھیں۔ مولانا دن رات جاگتے گذارتے تھے لیکن یہ مضمون پڑھ کر جوش کو قابو میں نہ رکھ سکے، مسلسل چالیس گھنٹوں کی لگاتار محنت و جدوجہد سے ایک مضمون لکھا۔ اس دوران نہ کچھ کھایا نہ سوئے، نہ آرام کیا۔ خود لکھتے تھک جاتے تو سیکرٹری کو لکھواتے، پھر آپ لکھتے۔ اس دوران میں چند پیالیاں قہوہ پیا اور بس۔ اس مضمون پر کامریڈ اور ہمدرد کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ آپ نے اپیل کی خود ہی پیروی کی اور جرح کر کے حکومت کے آرڈر کی دھجیاں اڑائیں۔ عدالت میں اور عدالت سے باہر وکیلوں اور بیرسٹروں کا ہجوم تھا۔ ہر آدمی دم بخود تھا۔ جب آپ باہر نکلے تو بے ساختہ ہر ایک کی زبان سے نکلا۔ کاش آپ بیرسٹر ہوتے۔ مولانا نے فوراً جواب دیا۔

"اب بھی جو کچھ ہوں اس کی کونسی قدر ہو رہی ہے جو بیرسٹری میں ہوتی"

بالآخر ضمانت ضبط ہوگئی اور کامریڈ ایسا موت کی آغوش میں گیا کہ پھر نہ ابھرا۔

مولانا نے دوبارہ ذیابیطس کی شکایت محسوس کی۔ حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے مشورہ دیا کہ ہر طرح کی مصروفیت ختم کر دو، چنانچہ آپ رام پور چلے گئے مگر وہاں پہنچتے ہی ڈائریکٹر جنرل پولیس یوپی رامپور آئے اور نواب صاحب کی معرفت آپ کو طلب کر کے قضیہ کانپور کے متعلق سوالات کئے اور اس دوران میں سخت تلخ کلامی ہوئی۔ ڈائریکٹر کے جانے کے بعد آپ کو بتایا گیا کہ نواب صاحب کی اجازت کے بغیر آپ کہیں نہیں جا سکتے۔ ۴۸ گھنٹے آپ اس طرح نظر بند رہے۔ اس کے بعد نینی تال شکار کھیلنے گئے۔ وہاں سخت بخار ہوگیا۔ ڈاکٹر انصاری نے نینی تال میں آپ کے لئے موسم گرما گذارنے کے لئے مکان کا بندوبست کیا۔ مولانا شوکت علی دہلی سے رامپور گئے اور دونوں بھائیوں کا ارادہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے عرس میں شرکت کے بعد نینی تال موسم گذارنے کا تھا۔ اجمیر شریف گئے ہوئے آپ کو دو دن ہوئے تھے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کے حکم سے آپ کو اور مولانا شوکت علی کو بتایا گیا کہ اپنے آپ کو نظر بند سمجھیں۔ اس حکم کی رو سے آپ پر وہ تمام پابندیاں عائد کر دی گئیں جو کسی جرائم پیشہ پر عائد کی جاتی ہیں جب کہ پھر مہرولی (دہلی) میں نظر بند کر دیا گیا۔ مہرولی سے آپ باہر نہ جا سکتے تھے مگر لوگ مل سکتے تھے لیکن چند دن بعد لینڈ...

گیا اور آزادی سلب کر لی گئی۔ قلم پر سنسر لگا دیا گیا اور ہمدرد اخبار پر بھی سنسر بٹھا دیا گیا۔ لینڈ ڈون سے آپ کو دور دراز مقام 'چھنڈواڑہ' بھیج دیا گیا۔

اسیری میں مسلم لیگ کی صدارت

ستمبر ۱۹۱۷ء میں (نظر بندی کے ڈھائی سال بعد) آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس پر آپ نے کہا:

یہ صدر نشینی ہو مبارک نہیں جوہر — لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

جب حکومت کی جانب سے جلسہ میں شرکت کی اجازت نہ ملی۔ تو بی اماں مرحومہ اجلاس میں شریک ہوئیں اور کرسئ صدارت پر مولانا جوہر کی تصویر رکھ دی گئی۔ بی اماں نے لیگ کے اجلاس میں اپنا پیغام عمل پڑھا۔ جس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام دے رہا تھا اور جس نے اجلاس لیگ کو مجلس ماتم بنا دیا۔ اس سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور لیڈر مسٹر تلک نے قرار داد پیش کی، جس میں حکومت کی توجہ علی برادران کی فوری رہائی پر مبذول کرائی گئی۔

اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی کوششیں کی گئیں کہ علی برادران کو رہا کر دیا جائے مگر کامیاب نہ ہوئیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے رہائی کی یہ شرط تھی کہ وہ باہر آ کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے جنگ اور جنگ کے متعلقات پر کوئی اثر پڑے۔ مولانا محمد علی نے جواب دیا کہ اگر حکومت مذہبی معاملات میں دخل اندازی کرے گی تو ہم سے بڑھ کر اس کا کوئی دشمن نہ ہو گا۔ یہ بات پہلے بھی کہی گئی جب ایک سرکاری ٹریبونل مقرر کیا گیا اور وہ چھنڈواڑہ پہنچا۔ مولانا نے مندرجہ بالا الفاظ کے علاوہ یہ بھی کہا کہ حکومت اس نقصان کی تلافی کرے جو اس جبری نظر بندی کے عرصہ میں ان کی تجارت اور اخبار کو ہوا ہے۔ کمیشن نے نظر بندی کو جائز قرار دیا۔ نقصانات کے معاوضہ کو غلط ٹھہرایا اور پھر سفارش کی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ بھلا ایسی سفارش کس کام کی!

چھنڈواڑہ میں علی برادران کی کوشش سے ایک جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد مولانا محمد علی نے زبردست تقریر کی۔ حاضرین پر اس کا خاصا اثر ہوا۔ حکومت اس کو کیسے برداشت کرتی لہٰذا اس نے چھنڈواڑہ سے منتقل کر کے بیتول جیل پہنچا دیا اور جو تھوڑی بہت آزادی تھی سلب کر لی گئی۔

بی اماں اور مولانا محمد علی کے بچے وغیرہ چھنڈواڑہ میں تھے کہ ایک رات سحری کھانے کے بعد ڈپٹی کمشنر، ڈی آئی جی پولیس مع خاص فورس کے ساتھ آئے اور ان دو حضرات کو بلا کر تلاشی لی حالانکہ دونوں حضرات بنیان اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے، لیکن پھر بھی خیرہ چشم افسروں نے اس لباس کو خوب ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں کوئی خفیہ اور نو ایجاد ہتھیار الیسانہ ہو جو ان ہلکے کپڑوں میں چھپا ہوا ہو اور کہا کہ ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ غسل وغیرہ کرنے کی اجازت نہ دی اور پانچ منٹ کے اندر تیار ہونے کا حکم دیا۔ بی اماں بھی برقعہ پہن کر تیار ہو گئیں اور کہا کہ میں بھی ساتھ چلوں گی مگر ان کو سمجھا بجھا کر روک دیا گیا۔ علی برادران کا وفادار ملازم محمد حسین مولانا شوکت علی سے گلے ملتے وقت رونے لگا۔ مولانا نے ایک زور کا چانٹا رسید کیا اور فرمایا کہ خبردار اگر کافر کے سامنے آنسو نکلا۔ وہ بے چارہ سنبھل گیا۔

جیل سے امرتسر

۱۹۱۹ء ہندوستان کی تاریخ آزادی میں بڑا اہم سال ہے۔ اس سال گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف اپنی مشہور عالم تحریک ستیہ گرہ کا آغاز کیا اور ملک میں حکومت سے عدم تعاون کی تحریک عدم تشدد کے اصولوں کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس پر حکومت بوکھلا اٹھی اور پورے ملک میں دار و گیر و تشدد شروع کر دیا۔ تقریباً ہر بڑے شہر میں

لوگوں پر گولیاں چلائی گئیں اور امرتسر جلیانوالہ باغ میں تو اس تشدد کی انتہا ہو گئی جب کہ اس باغ میں ہندو مسلم اور سکھوں کے اجتماع پر اندھا دھند فائرنگ کر کے سینکڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس واقعہ نے پورے ملک میں آگ لگا دی اور حکومت کے خلاف اس قدر نفرت اور غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کہ بایدو شاید۔ حالات بے قابو ہوئے جا رہے تھے کہ حکومت نے سنبھالا لیا اور دفعتہً تمام سیاسی قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام چار سال کی قید کے بعد رہا ہوئے اور علی برادران ساڑھے چار سال کی نظر بندی و قید سے آزاد ہوئے۔ جن دنوں گرفتار شدگان رہا ہوئے ہیں امرتسر میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاس ہو رہے تھے۔ جمعیت علمار ہند کا سالانہ اجلاس بھی یہیں ہو رہا تھا اور یہ سب جلسے جلیانوالہ باغ میں (کہ جہاں انگریز حکومت نے اپنی درندگی و وحشت کا بد ترین مظاہرہ کیا تھا) ہو رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کا یہ روح پرور نظارہ تھا جو شاید اس کے بعد کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔

علی برادران رہائی کے بعد سیدھے امرتسر پہنچے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوں۔ ۲۹ دسمبر کو دونوں بھائی امرتسر پہنچے، راستہ میں جس جس سٹیشن سے آپ کا گذر ہوا، ہندو مسلمانوں نے پرجوش اور والہانہ خیر مقدم کیا۔ امرتسر سٹیشن پر ہزارہا افراد آپ کے منتظر تھے۔ وہیں سے جلوس بن کر کانگریس کے پنڈال کی طرف روانہ ہوا۔ پنڈال کے دروازے پر مسٹر گاندھی، پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے رہنماؤں نے آپ کا استقبال کیا۔ جب یہ حضرات جلسہ گاہ میں پہنچے تو پندرہ منٹ نعرے لگتے رہے اور کارروائی رکی رہی۔ پنڈت موتی لال نہرو صدر کانگریس نے ہر دو حضرات کا تعارف کراتے ہوئے قومی خدمات کا تحسین و توصیف کے ساتھ ذکر کیا۔ مولانا جوہر نے کانگریس کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"میں کہتا ہوں اس آزادی کے لئے مسٹر تلک کو پھر جیل چلا جانا چاہیئے۔ مجھے دوبارہ اپنی عمر بھر کے لئے نظر بند ہونا چاہیئے، مسٹر لیسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیئے۔ مگر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہونا چاہیئے جیسا کہ پنجاب میں ہو چکے ۔"

کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے بعد علی برادران مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔

دہلی میں

امرتسر اور بعض دوسری جگہ ہو کر علی برادران دہلی پہنچے۔ یہاں ان کے استقبال کی کیا شان تھی، اس کی تفصیل حالات علی برادران اسے ملتی ہے۔

"دہلی سو برس کے بعد دلہن بنی ہوئی تھی۔ قریب قریب تمام چھوٹے بڑے بازاروں میں جھنڈیوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ استقبالیہ کمیٹی کے عالیشان دروازوں کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے بازاروں اور تمام گلی کوچوں کے سروں پر صدہا خوش نما دروازے نصب تھے۔"

آزادی کا جہاز

چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے نیچے، جہاں وائسرائے اور شہزادوں اور خود ہز امپیریل میجسٹی کو ایڈریس دیا گیا تھا ایک خوشنما آہنی چادروں سے منڈھا ہوا جہاز بنایا گیا تھا اور جلی حرفوں میں "آزادی کا جہاز" لکھا ہوا تھا جس پر قومی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس جہاز کی تعمیر صرف چوبیس گھنٹوں میں ہوئی اور پانچ سو روپے سے زائد (اس زمانے کے پانچ سو روپے آج کے بیس ہزار کے برابر تو یقیناً ہوں گے) اس پر خرچ ہوئے تھے۔ اس پر ایک درجن آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اس کے نیچے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن کے لئے دو دو روپیہ اور چار روپیہ ٹکٹ تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے دونوں بھائی تشریف لائے۔

مجمع نے "اللہ اکبر" اور "بند ے ماترم" کے نعروں سے خیر مقدم کیا، اور پھولوں کی بارش شروع کر دی۔[1]

وائسرائے کے ہاں وفد

امرتسر اور دہلی میں خلافت کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ مسلم نمائندوں کا ایک وفد بعض اہم ممالک میں جاکر مسلمانوں کے مذہبی فرائض کو نہایت خوش اسلوبی اور معقولیت سے گوش گذار کرائے، حکومت نے وفد کو باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ اس وفد سے پیشتر ایک اور وفد ہند و مسلمانوں کا نمائندہ بن کر وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ سے ملا تھا، جس کی قیادت مولانا جوہر نے کی۔ اس وفد نے حکومت کو وہ مواعید یاد دلائے جو اس نے اپنی مسلم رعایا سے کر کے توڑے تھے۔

ارکان وفد

اس وفد میں خاصے سرکردہ حضرات شریک تھے۔ چند ممتاز نام یہ ہیں۔
مسٹر گاندھی، سیٹھ چھوٹانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی، راجہ محمود آباد۔ پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر محمد علی جناح   دونوں موخر الذکر بزرگ وقت پر دہلی نہ پہنچ سکے اور بذریعہ تار اپنے کامل اتفاق کا اظہار کیا۔ اس وفد کا ایڈریس مولانا جوہر نے تیار کیا جس کا ترجمہ یہ ہے:

"ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چاہے کتنا ہی بڑا اور زرخیز حصہ زمین ہو یا کیسا ہی زبردست سیاسی نفع ہو مگر وہ اس اخلاقی عزت کے نقصان کا معاوضہ نہیں ہو سکتا جو برطانیہ کو حرف بحرف وعدے پورے نہ کرنے پر ہوگا۔ اخلاقی رعب کا خاتمہ اس لئے اور گراں ہوگا کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائے گی جو حضور والا کے پیشرو وائسرائے نے ترکی کی لڑائی ہونے پر شائع کئے تھے۔"

وفد خلافت برائے یورپ

بالآخر یورپ جانے کے لئے ایک وفد ترتیب دیا گیا اور اس کو جانے کی اجازت مل گئی۔ اس وفد میں قائد وفد مولانا جوہر کے علاوہ مسٹر حسن محمد حیات سابق سیکرٹری کونسل بھوپال، سیکرٹری مسٹر سید حسن، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالقاسم ارکان وفد تھے۔ مسٹر شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی ان دنوں آکسفورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، بھی اپنی تعلیم چھوڑ کر پورے دنوں ساتھ رہے۔

اس وفد نے وہاں جاکر اکثر عمائدین اور زعما سے ملاقاتیں کیں۔ وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملاقات کی "حزب العمال" کے سالانہ جلسہ میں مولانا جوہر نے معرکتہ الآراء تقریر کی جس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ پانچ منٹ وقت ملا تھا مگر سامعین کے اصرار پر بیس منٹ تقریر جاری رہی اور اس دوران میں تین بار صدر جلسہ نے تقریر ختم کرنے کے لئے گھنٹی بجائی مگر سامعین کے شدت تاثر کا یہ عالم تھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ تقریر جاری رہے، بالآخر چوتھی دفعہ گھنٹی بجاتے ہوئے صدر نے کہا: "اب تقریر بیس منٹ ہو چکی ہے، ابھی اور کام باقی ہیں، خود معزز مقرر کو ابھی اور سننا چاہتا ہوں مگر کیا کروں مجبور ہوں"
اس کانفرنس کے سیکرٹری مسٹر ریمزے میکڈانلڈ تھے جو بعد میں برطانیہ کے وزیر اعظم بنے اور وہ مولانا کے ذاتی دوست بھی تھے

---

[1] سیرت محمد علی صہ ۳۱۴، ۳۱۵   [2] خلافت کے پہلے صدر

تاہم انہیں بڑا غصہ تھا کہ ارکان وفد ممبران پارلیمنٹ اور دیگر عمائدین سے پہلے کیوں ملے، پہلے مجھے کیوں نہ ملے اور
کی بنا پر انہوں نے مولانا کو کانفرنس میں تقریر کا وقت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مولانا جوہر فرماتے تھے "جو شخص ایک
برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا، حیرانی تھی کہ وہ اس قدر تنگ دل اور کم ظرف تھا۔" بہر حال سیکرٹری نے اجازت
دوسرے بعض بزرگوں نے صدر کانفرنس سے کہہ کر پانچ منٹ لے کر دیئے جو بیس منٹ کی جگہ لے گئے۔

ارکان وفد نے نجی ملاقاتوں، مختلف جگہوں میں تقریروں اور اخباری بیانات کے ذریعے وہ تمام وعدے حکومت برطانیہ
دلائے جو اس نے کئے تھے۔ معقولیت اور دلائل سے مطالبات پیش کئے۔ ان تمام نتائج و عواقب سے آگاہ کیا جو وعدے پورا
کرنے پر پیش آسکتے تھے۔ خلیفہ اور خلافت کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے پیش کی۔ پاپائے روم سے مولانا نے ملاقات کرکے
المسلمین کی حیثیت بیان کی۔ مگر معاملہ وہی 'ڈھاک کے تین پات' کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس لئے کہ حکومت برطانیہ کو علم تھا کہ اس
ملک اور حکومتیں کمزور رہیں اور برطانیہ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا کہ وہ کمزوروں کو آنکھیں دکھاتا، طوطا چشمی کرتا اور طاقت در
سیدھے کرتا ہے۔

یہ وفد جو ہندوستان سے گیا اس کا نام "انڈین خلافت ڈیلیگیشن" تھا۔ اس وفد کے علاوہ ان دنوں مصری قومی وفد، حجا
البانی وفد، جارجین وفد، آذربائیجانی وفد، اسلامی قازانی وفد بھی وہاں گئے ہوتے تھے۔ ہندوستانی وفد تقریباً آٹھ ماہ یور
اتنے عرصہ میں چھ ارکان کا خرچ تقریباً ۶۵ ہزار روپے ہوا اور تقریباً فی کس گیارہ ہزار روپیہ پڑا لیکن ایک وفد جو حکومت
پر سیٹھ چھوٹانی کی قیادت میں گیا اس کے مصارف صرف ڈھائی ماہ میں فی کس دس ہزار ہوئے اور پھر مولانا جوہر والے وفد
اخراجات بھی خاصے ہوتے جو سرکردہ اصحاب کو ڈنر پر بلانے، پریس کانفرنس کرنے، اخبارات میں اشتہارات وغیرہ
خرچ ہوتے۔

وفد کی واپسی

بالآخر آٹھ ماہ یورپ کا دورہ کرکے مولانا ہندوستان واپس تشریف لائے اور بمبئی میں ا
ارکان کا استقبال نہایت شاندار طریقے سے کیا گیا، مگر وفد کی ناکام مراجعت نے مسلمانوں میں
اشتعال پیدا کر دیا اور ان کے لئے یہی صورت باقی رہ گئی کہ وہ حکومت سے کسی معاملے میں تعاون نہ کریں اور ترک موالات کر
چنانچہ شیخ الہند نے ترک موالات کا مفصل مع دلائل فتویٰ دیا اور پورے ہندوستان میں سکول، کالج ہڑتال میں شریک ہو گئے
سرکاری ملازمین دھڑا دھڑ مستعفی ہونے لگے اور مستعفی ہو کر ایسا محسوس کرتے تھے گویا نعمت عظمیٰ پا گئے اور یہ تو گزشتہ سطور میں
ہی چکا ہے کہ ترک موالات کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری علی گڑھ کالج میں اس نیت سے گئے کہ
اور ملی ادارہ بھی ساتھ دے لیکن جب وہاں کی منتظمہ نے جو انگریز سٹاف کے زیر اثر تھی، ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو انہوں
نے طلبہ سے اپیل کی اور اولڈ بوائز لاج میں منتقل ہو گئے اور جب ان حضرات کو بظاہر سختی اور ایک قسم کی بے عزتی سے د
دیا گیا تو انہوں نے ایک متوازی درس گاہ جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی اور اس کا سنگ بنیاد حضرت مولانا شیخ الہند محمود حسن نے ا
اور انہی کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ حضرت شیخ الہند ان دنوں اپنی طویل قید کے بعد مالٹا سے رہا ہو کر آئے تھے۔ ضعف
لیکن ان حضرات کی استدعا پر کہ آپ ہماری سرپرستی کریں کہ ہم آپ کے بغیر کچھ نہیں ہیں، چنانچہ حضرت نے فرمایا جیسا کہ ا

گذرا:
"اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔"
اور دو آدمیوں کے سہارے سے جلسہ گاہ میں تشریف لاکر صدارت کی۔

اور کانگریس

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ انہی دنوں ترک موالات کا زور تھا۔ حضرت شیخ الہند کے فتوے پر پانچ سو علماء نے دستخط کئے اور یہ فتویٰ سارے ہندوستان میں قریہ قریہ بستی بستی ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے ترک موالات کا پروگرام منظور کر لیا اور اس کا نام گاندھی جی کے سپرد کر دی گئی۔ حضرت شیخ الہند نے ترک موالات کا جو فتویٰ دیا تھا، تمہیدی کلمات کے بعد اس پروگرام کی یہ تفصیل کہ مسلمان

۱۔ سرکاری اعزازوں اور خطابوں کو واپس کر دے۔
۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے۔
۳۔ صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے۔
۴۔ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرائے۔

اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کریں بشرطیکہ:

۱۔ اتباع شریعت کیا جائے اور عملدرآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔
۲۔ نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقض امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال مدنظر رہے۔
۳۔ ارشاد عثمانؓ اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساؤا فاجتنب اساءتھم (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب وہ برا کریں، برائی سے بچتے رہیں) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین۔

(العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی ۲ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ)

خلافت کانفرنس

جن دنوں کانگریس کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا انہی دنوں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی ہوا اور اس میں بھی ترک موالات کا ریزولیشن منظور کر کے مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لئے گاندھی جی کو منتخب کیا

اختلاف

بقول رئیس احمد جعفری مؤلف سیرت محمد علی:

"اس وقت تک کانگریس سے لبرل حضرات علیحدہ نہیں ہوئے تھے اور وہ بھی اس میں شریک ہوتے تھے (یعنی کانگریس کے اجلاس میں)، انہیں چونکہ یہ غیر آئینی [illegible] پسند نہیں تھی اس لئے وہ بھی پوری طاقت کے ساتھ کانگریس میں شریک ہوئے اور تجویز ترک موالات و ترک تعاون کو نامنظور کرانا چاہا۔"

" ہندوؤں میں پنڈت مالویہ اور مسلمانوں میں مسٹر جناح پیش پیش تھے۔ مسٹر سی آر داس بھی اس وقت تک پریکٹس کر رہے تھے اور مقاطعہ اور ترک موالات کے وہ بھی شدید مخالفین میں تھے اس لئے بظاہر بڑی پریشانی تھی کہ دیکھئے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

" مولانا محمد علی نے اپنے آپ کو اس تجویز کے منظور کرانے کے لئے وقف کر دیا تھا، کبھی گاندھی جی سے گفتگو کر رہے ہیں، مالوی جی سے مل رہے ہیں۔ کبھی مسٹر جناح کو سمجھا رہے ہیں اور کبھی سی آر داس کو مجبور کر رہے ہیں، کبھی اور دوسرے لوگوں سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔"

سی آر داس کی رضامندی

" محمد علی کو سب سے بڑی فکر سی آر داس کی تھی۔ ان کی نگاہِ دوررس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ جوہر قابل ہے اگر ہاتھ آگیا تو تحریک کو چار چاند لگ جائیں گے اس لئے ان کا سارا زور سی آر داس پر صرف ہو رہا تھا۔ وہ انہیں دلائل سے، براہین سے، محبت سے، پیار سے، خفگی سے، غصہ سے، خوشامد سے، ہر طرح ہموار کر رہے تھے کہ وہ اپنی لاکھوں روپیہ سالانہ کی پریکٹس پر لات مار دیں۔ ایک رات کو وہ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں گاندھی جی سے واپس آ رہے تھے کہ داس نے محمد علی کا ہاتھ پکڑا اور الگ لے جا کر کہا، محمد علی! تمہاری رائے صحیح ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ تحریک کی حمایت کروں اور اپنی پریکٹس چھوڑ دوں۔ محمد علی یہ سنتے ہی وفور محبت سے داس کے گلے لپٹ گئے اور ان کی پیشانی چوم لی۔ محمد علی کو ہمیشہ اس خدمت پر فخر رہا کہ داس جیسی شخصیت کو میدان عمل میں لانے والے وہی تھے۔"[1]

ہم نے یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کیا ہے تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ مولانا محمد علی اپنے مقاصد و عزائم سے کس قدر مخلص تھے اور ملکی و قومی مفاد کی خاطر کس طرح بے تابانہ، مضطربانہ غیر مسلم افراد تک کی خوشامد و منت کرتے تھے۔

اس ہندو مسلم اتحاد کی وجہ سے پورا ملک تحریک آزادی کی تڑپ میں دیوانہ ہو گیا اور مولانا محمد علی، مسٹر گاندھی، مولانا آزاد اور دوسرے مشاہیر نے پورے ملک میں جگہ جگہ جا کر بیداری کی لہر پیدا کر دی۔ ان مشاہیر کی مساعی سے لوگوں کے لئے جیل ایک کھیل بن گیا۔ لوگ گھروں میں بے قرار رہتے لیکن جیل میں جا کر سکون و راحت محسوس کرتے تھے۔

تحریک خلافت

تحریک خلافت کے دنوں میں ہندوستان میں جذبہ آزادی کی روح پیدا کرنے میں علی برادران کا بڑا ہاتھ رہا۔ تحریک ختم نبوت کے دنوں میں راقم الحروف شہر میاں چنوں کے ایک دوست مالک برادران (جو جلوس کی قیادت کر رہے تھے) کی ایک بات مجھے بڑی پسند آئی جب انہوں نے ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے کہا:

" ہندوستان نے تین محمد علی پیدا کئے محمد علی جوہر، محمد علی جناح، محمد علی جالندھری[2] (مولانا) پہلے نے آزادی کی تڑپ پیدا کی، دوسرے نے ہمیں دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان لے کر دیا اور تیسرے (مولانا محمد علی جالندھری)

---

[1] سیرت محمد علی مولفہ رئیس احمد جعفری

[2] مولانا محمد علی جالندھری تحصیل نکودر ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کی راعی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل مدرسہ عربی خیر المدارس میں مہتمم مدرسہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے دست راست اور مشیر اعلیٰ تھے

موسس ختم نبوت کی خاطر تمام مسلمان فرقوں کو متحد کر دیا۔"
د عجیب حسن اتفاق ہے کہ تینوں محمد علی جس نسبت سے مشہور ہیں اس کا پہلا لفظ "ج" سے شروع ہوتا ہے یعنی جوہر
جناح، جالندھری - تینوں لفظ "جیم" سے شروع ہوتے ہیں -
ت مولانا جوہر کی ہو رہی تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو قوم و ملک کے لئے وقف کر رکھا تھا - صبح کہیں شام کہیں - تمام ہندو مسلمان
، اور ہر ایک کی زبان پر خلافت کا نعرہ ہے لیکن ہندو مسلم اتحاد کا یہ جوش کن زمانہ بقول رئیس احمد جعفری :-
"ہوا کی طرح آیا اور بادل کی طرح نکل گیا"

کا افسانہ　انھی دنوں جب کہ علی برادران کی شہرت شباب پر تھی پورے ملک میں بڑے زور و شور کے ساتھ یہ افواہ مشہور
کر دی گئی کہ "علی برادران" نے حکومت سے معافی مانگ لی اور اس افواہ کے اڑانے میں سب سے زیادہ
قت کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کا تھا اور بقول مولانا جوہر :-
"لارڈ ریڈنگ سے زیادہ کوئی چالاک وائسرائے اس صدی میں ہندوستان نہ آیا تھا"
ہر حال اس معافی نامہ کے افسانے کا مسٹر گاندھی اور مولانا جوہر نے خوب خوب پردہ چاک کیا اور اصل میں یہ سب کچھ غلط فہمی مولانا
کے بیان سے ہوئی تھی جو اخبارات میں شائع ہوا تھا - اور اس بیان کے شائع ہونے پر مولانا حسرت موہانی[لے] مرحوم نے مولانا
لکھا

حاشیہ صد ۸۰۴ سے آگے

یام پاکستان کے پانچ چھ سال بعد تک یہی حیثیت رہی پھر ان کی مصروفیات کی بنا پر یہ حیثیت کم ہوتی چلی گئی اور پنجاب
جلس احرار اسلام کے صدر رہے قیام پاکستان کے بعد مجلس احرار اسلام نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تو آپ نے اپنی
ساری خدمات اور مساعی تحفظ ختم نبوت پر مرکوز کر دیں - اگر سیاست میں حصہ لیتے رہتے تو آج ملک کے سرفہرست
یاستدانوں میں ہوتے - شاید یہ کہنا بجا ہو کہ آپ پنجابی کے سب سے بڑے خطیب ہیں - عوام کی بولی ٹھولی میں ختم نبوت
ور سیاسی و دینی مسائل سمجھانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں - تقریر کے بادشاہ لیکن تحریر کے کوچہ سے تقریباً نا آشنا - اس دور
یں بہت غنیمت شخصیت ہیں - بڑے عالم فاضل، آجکل سلوک و تصوف کا مزاج پر غلبہ ہے - بہت سادہ - کبھی زمانہ تھا کہ
جب سٹیج پر چڑھتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی سادہ دیندار دیہاتی ہے لیکن جب تقریر کرتے تو یوں محسوس ہوتا گویا قرن اول کا
کا مسلمان جہاد پر تقریر کر رہا ہے - اب جبکہ عمر ستر کے قریب ہے، ماضی کی کبھی کبھی جھلک دکھا دیتے ہیں - تحریک ختم نبوت
کے تعلق "منیر انکوائری رپورٹ" میں آپ کے متعلق ریمارکس پڑھنے کے قابل ہیں - ۴
لے مولانا حسرت موہانی مشہور دینی، سیاسی رہنما اور شاعر - بے حد مخلص اور بے باک و نڈر انسان تھے - سادگی میں کوئی
لیڈر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا - ہر وقت جیل جانے کے لئے تیار - یہ مشہور شعر انہی کا ہے ؎
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی　　ہے مشق سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی

"اگر مہاتما جی نے تمہیں اس بیان کو شائع کرنے سے پہلے اطلاع دے دی تھی کہ وائسرائے نے اس شرط پر تمہیں معاف کیا ہے تو تم سے بڑھ کر بزدل کوئی نہیں اور اگر انہوں نے اس کی اطلاع تمہیں نہیں دی تھی تو ان سے بڑھ کر کوئی بے ایمان نہیں"

اور مولانا محمد علی جوہر نے اس پر یہ تبصرہ کیا:

"لیکن میرے ان جوشیلے بھائی کو یہ نہ سوجھا کہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ لارڈ ریڈنگ نے ملاقات کا خلاصہ غلط دیا ہو۔ بہر حال جب میں نے چیمسفورڈ کلب والی تقریر سنی تو سارا بدن پھنک گیا اور میں نے مہاتما جی سے اس قدر کہا کہ اجازت ہو تو اس کا جواب دے دوں۔ جلسہ خلافت کا تھا، میں صدر تھا، تقریر صدارت کچھ اور ہونے والی تھی مگر اس کے بعد میں نے صرف لارڈ ریڈنگ کی تلبیس کا پردہ چاک کیا اور مشکل ہی سے میں نے ساری عمر اس سے زیادہ سخت کوئی اور تقریر کی ہو گی ہر اس سربرآوردہ شخصیت کے ساتھ جس نے ملک وملت کی رہنمائی کے لئے قدم اٹھایا ہے، یہ معاملہ ہوتا چلا آیا ہے کہ اس کا وہ کیا ہے۔ اگر محمد علی جوہر بڑے آدمی تھے اور یقیناً اپنے دور کے عظیم ترین قائد تھے تو ان کے ساتھ یہ معاملہ اور اس طرح کے معاملات پیش آنا لازمی تھے، اگر اس طرح کے معاملات پیش نہ آتے تو حیرانی ہوتی۔

مقدمہ کراچی

۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، پیر غلام مجدد سندھی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا شوکت علی مرحوم سوامی شنکر اچاریہ جی وغیرہ شریک ہوئے۔ دیوبند اور دیگر مقامات کے پانچ سو علما کا فتویٰ پہلے شائع ہو چکا تھا جس میں حکومت سے ہر قسم کے اشتراک اور تعاون کو حرام قرار دیا جا چکا تھا۔ سکول، کالج، کچہریوں کی ملازمت اور وکالت کا پیشہ، خطابات داعزازات کا قبول کرنا منع کیا گیا تھا۔ نیز تحریک خلافت میں حصہ نہ لینے والوں کو میدان جہاد میں بھاگ جانے والے کی حیثیت میں ثابت کیا گیا تھا۔ انہی حالات میں کراچی خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ کرسی صدارت کی اجازت سے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اس کانفرنس میں قرارداد پڑھ کر سنائی جس کا حاصل یہ تھا:

"حکومت برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین اور ہر قسم کی اعانت کرنا از روئے شرع حرام ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے"

اور یہ حرمت اس طرح ثابت کی گئی تھی کہ فوج میں شریک لوگوں کو اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر گولی چلانا پڑتی ہے

مولانا محمد علی جوہر ان دنوں پوری طرح مسٹر گاندھی کے ہمنوا تھے اور دونوں میں اتحاد و یکجانیت اس قدر تھی کہ ...جیرا ہے۔ ہر ایک کو دوسرے پر پرخلوص اعتماد تھا، چونکہ تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ تھی اس لئے مولانا اپنے لیڈر پر بھی اعتماد

حاشیہ صفحہ ۸۰۵ سے آگے

اور یہ مشہور شعر بھی انہی کا ہے:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر — نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

اور یہ ہندوستان کے واحد لیڈر رہیں جن کے متعلق نہ تو کسی نے معافی کا افسانہ گھڑا، نہ چندہ ہضم کرنے کا الزام لگا بلکہ سب معتقد و معترف رہے۔

کراچی جیل سے مولانا جوہر بیجاپور جیل منتقل کر دیئے گئے۔ راستے میں کسی سٹیشن پر کسی نامہ نگار نے تحریک کے متعلق ان سے سوال کیا؟ اس سوال جواب کی روداد عبد الماجد دریا بادی نے نقل کی ہے:

"عین اسی زمانہ میں محمد علی کراچی سے بیجاپور جیل منتقل کئے گئے تھے۔ کسی سٹیشن پر کسی انگریزی اخبار کے ایک منچلے وقائع نگار نے انہیں جا لیا اور سوال تحریک ترک موالات کی موجودہ حالت کے متعلق کر دیا۔ محمد علی نے جواب میں کہا کہ تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں۔ میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ "میں اپنے لئے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں"

لکھنؤ سے اجمیر جاتے وقت ایک بڑے سٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں نے خریدا، اتفاق سے اس میں یہی مکالمہ درج تھا۔ مولانا عبد الباری (مولانا جوہر کے مرشد) نے انہیں پڑھوا کر سنا۔ ان کے ایک رفیق سفر و حضر جو اس وقت بھی ان کے ہمراہ تھے بول اٹھے کہ بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا۔ یہ گاندھی جی کیا معنی؟ مولانا نے برجستہ جواب دیا" مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں۔ وہ تو رسول ہی کا نائب ہوتا ہے، جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اسی میں شامل ہو گئے۔ گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ نام ان ہی کا لینا مناسب تھا[1]

اس اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد ایک بات اصولی انداز میں سامنے آتی ہے کہ جب کسی کو تحریک کا قائد بنا لیا جائے تو پھر اس پر پورا اعتماد کرنا چاہیئے، مولانا محمد علی جوہر کے گاندھی جی کے متعلق اس قسم کے نظریہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے نقد و نظر کا دروازہ کھولا ہے اور بات کو دور تک لے گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا جوہر کا یہ نظریہ کسی بھی نقطہ نظر سے غلط نہیں ہے۔

سزا کے بعد مولانا محمد علی جوہر اور ان کے دوسرے رفقا پر مقدمہ اور سزا نے تحریک پر جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ مسٹر گاندھی اور مولانا ابو الکلام آزاد نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور ترک موالات اور عدم تعاون کے متعلق اسی قرارداد کو ہر جگہ پیش کرنا شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت تھوڑے عرصے میں بیس تیس لاکھ روپے چندہ تحریک کے لئے جمع ہو گیا حالانکہ مولانا جوہر کی گرفتاری تک دو تین لاکھ ہوا تھا۔ مولانا جوہر کی بیگم اور بی اماں نے اس سلسلہ میں انتھک کام کیا۔ مولانا ابو الکلام کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر کلکتہ میں مقدمہ چلا۔ عدالت میں مولانا نے تاریخی بیان دیا جو" قول فیصل" کے نام سے شائع ہوا، جو اسی کتاب میں مولانا کے حالات میں ملخصاً نقل کر دیا گیا ہے۔

علی برادران کی گرفتاری کے بعد گاندھی جی سول نافرمانی کے لئے تیار ہو گئے اور بردولی سے اس کے آغاز کا پروگرام بنایا گیا۔ لیکن انہی دنوں "چوری چورا" کا واقعہ پیش آ گیا۔ جس کی وجہ سے گاندھی جی نے بردولی جا کر تحریک کے التوا کا اعلان کر دیا۔[2]

---

[1] "محمد علی" ذاتی ڈائری کے چند اوراق حصہ اول صہ۱۰۱ مؤلفہ عبد الماجد دریا بادی

[2] "چوری چورا" گورکھپور کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں کے لوگوں نے پولیس کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر پولیس سٹیشن کو آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے کئی سپاہی جل کر راکھ ہو گئے۔

گاندھی جی کا خیال تھا کہ اب تحریک تشدد کی نذر ہو جائے گی، مگر کانگریس، خلافت کمیٹی کے ارکان نے مسٹر گاندھی پر زور دیا کہ تحریک جاری رکھی جائے۔ اس پر گاندھی جی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی جو ملک کا دورہ کر کے یہ معلوم کرے کہ آیا ملک سول نافرمانی کے لئے ہے اور کیا اس تحریک میں دوبارہ تشدد تو نہیں ہوگا۔ ملک تو پہلے ہی سول نافرمانی کے لئے تیار تھا۔ اس التوا نے لوگوں میں اضمحلال کر دیا اور لوگوں نے گاندھی جی کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار شروع کر دیا، کہ یہ مہاتما نہ جانے پھر کس وقت اپنی مخصوص حکمت عملی بنا پر کوئی خاص حکم جاری کر دے۔ تاہم مسٹر گاندھی تحریک کو اکثر لیڈروں کے جیل جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہے تھے ایک دن گاندھی جی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور اب کوئی بڑا لیڈر باہر نہ رہا اور تحریک تقریباً بالکل ہی ختم ہوگئی۔

شدھی کی تحریک

انگریز بڑی شاطر قوم ہے۔ تحریک خلافت پر اس نے ہندو مسلم اتحاد کا جو نظارہ دیکھا اس کو دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح متحد رہے تو ہم چند دنوں کے مہمان ہیں لہٰذا حکومت نے سوامی شردھانند کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ جنہوں نے باہر آکر شدھی کی تحریک چلائی اور ملکانہ کے راجپوتوں کو "شدھ" کرنا شروع کر دیا۔ یہ نام کے تو مسلمان تھے لیکن رسم و رواج کے لحاظ سے ہندوؤں کی طرح۔ لہٰذا شردھانند کی شدھی تحریک کا ان پر جلد اثر ہوا اور وہ مذہب میں داخل ہوگئے (اس کی کچھ تفصیل حضرت مفتی کفایت اللہؒ اور بعض دوسرے مقامات پر گذر چکی ہے) اور انہی دنوں مالابار ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ان سب حالات کی بنا پر ہندو مسلم جو متحد ہو کر انگریز کے خلاف تھے اب ایک دوسرے کے خلاف بر سر پیکار گئے اور دونوں قوموں کی پوری توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔

کانگریس کی صدارت

مولانا جوہر کو جیل میں منجھلی لڑکی آمنہ بیگم کی شدید علالت کی اطلاع ملی۔ آپ نے وہیں سے ایک نظم لکھ کر بھیجی جس کا ایک شعر یہ تھا:

تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن اس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

مولانا دو سال کے بعد جیل سے رہا ہوئے تو دہلی میں کانگریس کے سپیشل اجلاس میں شرکت کے بعد سیدھے کوہ بھوالی سینی ٹوریم میں آمنہ بیگم کے پاس تشریف لے گئے جہاں وہ بستر علالت پر دراز تھیں۔

مولانا نے پریس کے نمائندہ کو بیان دیتے ہوئے کہا:۔

"میں ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیل خانے میں آگیا ہوں۔ مجھے بڑے جیل کی کنجی کی تلاش ہے تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کر سکوں اور اس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔"

اس سال مولانا جوہر کو آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا۔ ان نئے حالات میں مولانا نے جس غیر معمولی قابلیت، ذہانت اور حکمت عملی سے اجلاس کو کامیاب کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ ہندو مسلم اتحاد

استقلال و استقامت

مولانا جب جیل سے رہا ہوئے تو ملک کی حالت بدل چکی تھی۔ اتحاد و اتفاق کی جگہ افتراق و انتشار نے لے لی تھی اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک کے سامنے ترک موالات اور عدم تعاون کا جو پروگرام رکھا گیا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ شدھی نے لے لی اور ادھر مسلمانوں نے مجبور ہو کر مدافعت تبلیغی مہم شروع کر دی۔ تقریباً تمام دینی جماعتیں اور علما شدھی کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ علما کا موقف یہ تھا کہ سوامی شردھانند کی تحریک

کا اگر مقابلہ یا دفاع نہ کیا گیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو اس کا بہت بڑا دینی نقصان ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر کے بیشتر ساتھی بھی اسی تبلیغی مہم میں لگ گئے۔ موتی لال نہرو اور دوسرے وکلا پریکٹس شروع کر کے اپنی اپنی وکالت و بیرسٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے لیکن ایک مولانا محمد علی تھے جنہیں یہی دھن تھی کہ اسی پروگرام و نصب العین کو اپنایا جائے جس کے لئے نہ صرف وہ جیل گئے بلکہ ملک کے تمام بڑے بڑے لیڈروں اور چالیس پچاس ہزار افراد نے ہنسی خوشی تمام کام چھوڑ کر جیل کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔

مولانا جوہر اگر چاہتے تو اسی رَو میں بہہ کر عوامی احساسات کا ساتھ دیتے مگر انہوں نے بلاخوف لومۃ لائم ان حالات میں بھی کانگریس سے پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور کانگریس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے اور اس کی مقبولیت بحال کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ مولانا جوہر پر ایک بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ بڑے جذباتی تھے اور عوام کے جذبات سے کھیلتے تھے لیکن ایسا نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو مولانا ان دنوں کانگریس کا ساتھ نہ دیتے بلکہ عوامی جذبات کا ساتھ دیتے ہوئے اسی پروگرام کو لے کر چل پڑتے جس کو دوسرے لوگ کر رہے تھے مولانا کے متعلق یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے ان دنوں تبلیغی کام کی زمام کار کیوں نہ سنبھالی اور اس بارے میں اختلاف کرنے والے اختلاف کر سکتے ہیں مگر یہ کہنا قطعاً درست نہیں کہ وہ عوام کے جذبات سے کھیلتے تھے البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ جس کام کو وہ ملک وملت کے لئے دیانتداری سے مفید سمجھتے تھے اس کے لئے وہ انتہائی شدید جذبات رکھتے تھے اور اپنی شعلہ بیانی، گرم گفتاری اور اپنی ادبی تحریری صلاحیتوں کو اس کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ اس کے لئے مولانا جوہر ہی کی ایک تحریر ملاحظہ کیجئے جو اس سلسلے کی ایک طویل تحریر سے اقتباس ہے۔

مہاتما گاندھی خاموش ہو گئے اور ہمارے بعض ساتھیوں نے تو سکوت ہی اختیار نہ فرمایا بلکہ ایک نقارہ لے کر اسی نقار خانے کے نقارچی وہ بھی بن بیٹھے لیکن ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نہ کوئی سکوت کیا، نہ کوئی نیا سر الاپنا شروع کیا اور سامعین کی قلت اور بے پروائی کا مطلق پاس نہ کر کے ہم نے حافظ ہی کے شعر پر اپنا عمل جاری رکھا ؎

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بند ایں مباش کہ نشنید یا شنید

ہم نے اور ہمارے چند ساتھیوں نے ذوق نغمہ میں کمی محسوس کر کے جس قدر تلخ نوائی کی اور محمل کو گراں پا کر جس قدر حدی کو تیز تر کیا اسے یا ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا۔[1]

اس بارے میں ان کی مستقل مزاجی کے متعلق یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ بلگام خلافت کانفرنس کے صدر انکے کراچی مقدمہ کے ساتھی ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے جو ہندوؤں سے سخت بیزار اور ایک الگ تنظیم کا علم جہاد لے کر کھڑے ہوئے تھے انہوں نے خطبۂ صدارت تند و تیز لہجے میں رقم کیا جس میں ہندوؤں پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ مولانا جوہر کو خطبہ کے مندرجات کا اس وقت پتہ چلا جب اگلی صبح اجلاس ہونے والا تھا۔ مولانا نے ساری رات جاگ کر خطبہ سے ناروا اور تلخی آمیز حصوں کی قطع و برید کی اور اس میں سے وہ حصہ نکال دیا جس میں ہندوؤں پر حملہ کیا گیا تھا۔

[1] سیرت محمد علی صد ۴۰۷، ۴۰۸

۱۹۲۴ء ہی میں بلگام میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ اس کے صدر گاندھی جی تھے۔ اس جلسہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا کانگریس کی ممبری کے لئے کھدر کاتنے کی شرط رکھی جائے یا نہ رکھی جائے؟ اکثر لوگ اس کے خلاف تھے اور جو حامی تھے وہ چرخہ کاتنے کو رواج دینے کے تو حامی تھے مگر اس کے خلاف تھے کہ اس کو شرط کے طور پر رکھا جائے۔ مولانا جوہر نے اس شرط کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"چرخہ کو شرط ممبری ہونا چاہیئے جو انتہائی مقدار کی کم از کم قربانی ہے۔ اگر کوئی جرمن پروفیسر اپنے طویل نام کے ساتھ کہہ دے کہ چرخہ آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے تو چرخہ کاتنے میں جوش پیدا ہو جائے اور اس وقت ہندوستان بلاپس و پیش چرخہ کو قبول کرلے مگر چونکہ یہی بات ایک ہندوستانی نے کہی ہے اس لئے لوگ شک کرتے ہیں۔[1]"

فسادات کوہاٹ

کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ ہندوؤں کو شکایت تھی کہ مسلمانوں نے زیادتی کی اور مسلمانوں کو شکایت تھی کہ ہندوؤں نے زیادتی کی۔ کانگریس کا ایک وفد جو گاندھی جی اور مولانا شوکت علی پر مشتمل تھا کوہاٹ روانہ ہوا۔ حکومت نے وہاں جانے نہ دیا۔ چنانچہ راولپنڈی میں وفد نے شہادتیں لینی شروع کیں۔ مسلمان دو چار مگر ہندوؤں کی ایک جماعت نے گواہی دی۔ رپورٹ شائع ہوئی تو گاندھی جی نے مسلمانوں کو قصوروار ثابت کیا اور مولانا شوکت نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیانات مساوی طور پر نہیں لئے جا سکے لہٰذا اس رپورٹ کی بنا پر مسلمان قصوروار ثابت نہیں کئے جا سکتے۔ بقول مؤلف سیرت محمد علی:-

"گاندھی جی نے اس اختلاف کو شرافت کے ساتھ برداشت کیا اور شوکت صاحب نے وفاداری کے ساتھ اختلاف کیا مگر ہندو پریس میں اک آگ لگ گئی اور آفت برپا ہو گئی۔[2]"

مولانا محمد علی جوہر نے اس معاملے میں بھی بہتر کردار ادا کیا اور وہ بات کہی جو ہر اس سچے محب وطن کو کہنا چاہیئے جس کے سامنے ملک کی آزادی کا سوال ہو۔ آپ نے پنجاب پراونشل خلافت کانفرنس میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ وقت نہیں ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے سر الزام تھوپے بلکہ موزوں یہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کرے۔ اس لئے فسادات کوہاٹ کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں کے سر ہے میں انہیں ملامت کرتا ہوں۔"

مولانا جوہر کا یہ کردار بلاشبہ قابل تعریف و تحسین تھا اور حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو پریس مولانا کے اس رویے کو بنظر استحسان دیکھتا اور خراج عقیدت ادا کرتا مگر ہندو زعما اور پریس ہمیشہ مصلحت آمیز سکوت اختیار کرتا رہا اور مسلمان یہ کہتے رہے کہ مولانا جوہر پر گاندھی جی کا سحر ہے اور رہاں اسی سر میں سُر ملا کر ہندو پریس یہ ضرور کہہ دیا کرتا تھا کہ علی برادران نے گاندھی جی پر جادو کر دیا ہے۔ لیکن مولانا اپنے اور بیگانوں کا یہ سلوک دیکھنے اور سننے کے باوجود ہمالہ کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور یہ اعتراف کرنے میں بھی بخل نہیں کرنا چاہیئے کہ گاندھی جی کا رویہ بھی منصفانہ رہا۔ انھوں نے بھی 'تحریک خلافت' میں جو خالص اسلامی تحریک تھی بھرپور ساتھ دیا اور مسلمانوں نے ان کی قیادت میں کام کیا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کا نقطہ معراج تھا بات مولانا جوہر کی استقامت اور اپنے موقف پر پختگی کی ہو رہی تھی جس کی بنا پر وہ ہندو اور مسلم دونوں کی نظر میں غیر مقبول ہو رہے تھے

پہاڑ کی طرح قائم ہیں

۱۲ اپریل ۱۹۲۵ء کو قومی ہفتہ کے سلسلے میں دھرم سالہ چھیدی میں کانگریس کا ایک جلسہ منعقد ہوا حاضرین کی تعداد حیرت انگیز حد تک کم تھی۔ مولانا جوہر نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

[1] سیرت محمد علی صفحہ ۴۰۸-۴۰۹ [2] بحوالہ ایضاً صفحہ ۴۱۳ [3] بحوالہ ایضاً صفحہ ۴۱۴

" آج کے جلسہ میں بہت کم حاضری ہے مگر اس افسردگی کا اثر ان لوگوں پر کچھ نہیں پڑ سکتا جو اپنے عقیدہ اور رائے پر پہاڑ کی طرح قائم ہیں۔ اگر آج صرف یہاں دو آدمی ہوتے تب بھی جلسہ کیا جاتا اس وقت تک ہم لوگ برابر اپنی کوششوں میں مصروف و مشغول رہیں گے جب تک ہم اپنی رائے اور عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ آج جو افسردگی اور اضمحلال آزادی کی تحریک میں پیدا ہوگیا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہمیشہ ہر ملک میں تحریک آزادی کو نشیب و فراز سے گزرنا اور پستی و بلندی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔"

اور سیاسی میدان میں یہ جمود اور افسردگی کیوں پیدا ہوئی اس کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔

ریاست کا اعتراف

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کا مولانا سے اکثر اختلاف رہتا اور کئی دفعہ اس اختلاف میں خاصی تلخی اور کشیدگی پیدا ہو جاتی۔ لیکن اس کے باوجود مفتون صاحب نے مولانا جوہر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے وہ لکھتے ہیں :۔

" گو آج عدم تعاون کی تحریک ہو جانے کے باعث ہندوستان کے سیاسی آسمان پر مہاتما گاندھی اور ان کے رفیقوں کا علم بلند نہیں ہو رہا ہے اور ملک کے اندر شدھی و تبلیغ کی موجودہ افسوسناک گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں مگر ملک کے محترم لیڈر مولانا محمد علی کی قابلیت، خلوص اور قومی خدمات کی یاد لوگوں کے ذہن میں اس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک کہ ہندوستان کے رہنے والوں کے دلوں میں حریت و آزادی کے خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔"

مولانا محمد علی جوہر کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب انہیں علامہ اقبال رح سے بھی سخت اختلاف ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ہمدرد کے کالموں میں مسلسل لکھا ان صفحات میں اس کے خلاصے کی بھی گنجائش نہیں۔ اس کے لیے ہمدرد کے فائل اور "سیرت محمد علی" کا مطالعہ کیا جائے بطور نمونہ صرف دو مختصر عبارتیں پیش کی جاتی ہیں :۔

" اب اگر غلامی سے نکلنا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم تم ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں ایک دوسرے کی طرف سے جو اذیت زبان سے یا ہاتھ سے پہنچتی ہے اس پر صبر کریں مگر اس غلامی کو ہرگز برداشت نہ کریں جس میں تم بھی سوڈیڑھ سو برس سے مبتلا ہوا اور ہم بھی اور جو یقیناً ہندو راج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اور مسلم رواج سے بھی۔

دشمن منتخب کرلو

نہ ڈاکٹر اقبال صاحب اسے ہمارے مرض کا علاج سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کریں اور ان سے کہیں کہ گو یہ یقینی امر ہے کہ تمہیں خدا کی خاطر ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتے دشمنوں میں سے ایک کو چھانٹ لو جسے تم " اَلَدُّ الْخِصَامِ[۱] " سمجھتے ہو جو تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی ہے اگر ہو سکے

---

[۱] یعنی سب سے بڑا دشمن۔

تو اس کے خلاف اوروں کو اس طرح اپنا حلیف بنا لو جس طرح رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنا لیا تھا، اگر کوئی جماعت بھی تمہارے سیاسی تدبر سے رام ہو کر تمہاری حلیف نہ بن سکے تب بھی ہر محاذ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو اور جس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہے پورا زور صرف کر دو اور جگہ صبر و ضبط سے کام لو، جب سب سے بڑے محاذ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے گی اور اس وقت ایک ایک کر کے سر دشمن سے دل کھول کر انتقام سے لینا یہ نامردی نہیں ہے بلکہ اس کو "عزم" کہتے ہیں۔

الدالخصام کون ہے

اگر چین و عرب بھی تمہارا ہے اور ہندوستان بھی تمہارا ہے اور تم سب مسلمان ہو اور سارا جہان تمہارا وطن ہے تو اس دشمن کو الدالخصام سمجھو جو سارے جہان پر حادی ہونا چاہتا ہے یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے اس غریب کی تگ و دو تو سمندر کے کنارے تک ہے یہ گولر کا بھنگا ہے جس کی ساری دنیا اس گولر میں محدود ہے ایمان سے کہو کیا تم اس سے خائف ہو؟ ریل میں کسی ڈبہ میں چھ سات ہندو ہوں اور ان میں تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ تو کیا تمہیں ان سے ڈر لگے گا بعض اوقات تو انہیں کو تم سے ڈر لگتا ہے البتہ اگر اس ڈبہ میں دو چار گورے ہوں تب تو تم کو اور ان کو دونوں کو ڈر لگتا ہے کہ یہ ماریں گے یا سامان پھینک دیں گے یا گالی دیں گے یا پاؤں دبوائیں گے"۔ [1]

اب اس پر رئیس احمد جعفری کا تبصرہ پڑھیئے :-

"کانگریس کی حمایت ہیں، انگریزوں کی مخالفت ہیں، ہندو مسلم اتحاد کی موافقت میں اس سے بڑھ کر کچھ کیا جا سکتا ہے؟ یا کسی بڑے سے بڑے مدبر نے ایسے نفسیاتی دلائل کبھی پیش کیے ہیں"؟ [2]

اختلاف بڑھتا گیا

مولانا محمد علی کی انتھک کوششوں اور مساعی کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کم ہوتا گیا اور اختلافات خلیج وسیع ہوتی چلی گئی اس کے لیے ایک "یونٹی کانفرنس" دہلی میں اور ایک شملہ میں منعقد ہوئی جس میں اکثر ہندو مسلم زعماء شریک ہوئے۔ کئی کئی دن اس کے اجلاس ہوتے رہے مولانا نے بیحد کوشش کی کہ کسی طرح وہ فضا پیدا ہو جو تحریک خلافت میں تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ فسادات ہوتے رہے اور ہندو مسلم تعلقات میں تلخی و کشیدگی بڑھتی رہی۔ گاندھی جی آدمی بھی یہ کہکر کہ "اب میری بات کوئی نہیں سنتا" اپنے آشرم میں چلے گئے۔

مسئلہ حج و حجاز

شریف حسین نے پہلی جنگ عظیم میں جس طرح ترکوں، اسلام اور قبلۂ اسلام سے غداری کی اس کا ہر ایک کو علم ہے۔ اس کی غداریوں سے عالم عرب ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ ان حالات کو دیکھ کر عبدالعزیز ابن سعود نے شریف حسین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انگریز شریف حسین کے طرفدار تھے۔ انگریز کی شاطرانہ چالوں۔ شریف کی ہر طرح حمایت کے باوجود ابن سعود کامیاب ہوئے اور حجاز کے باشندوں نے شریف حسین کے مظالم سے تنگ آ کر ابن سعود کو سایہ رحمت

[1] سیرت محمد علی صفحہ ۴۱۹-۴۲۰ (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء) [2] سیرت محمد علی ص ۴۲۲

کران کا سامنا رہا۔ حج کا موسم آرہا تھا۔ انگریزی حکومت چاہتی تھی کہ اس سال ہندوستان سے حاجی حج کے لیے نہ جائیں کیونکہ وہاں فسادات ہیں اور لڑائی ہورہی ہے اور اس سلسلے میں ایک اعلان جاری کیا۔ مولانا محمد علی نے اس اعلان کی مخالفت کی اور کہا کہ حاجیوں کا جانا کسی صورت میں ملتوی نہیں کیا جاسکتا حجاج کرام بمبئی پہنچنے لگے بالآخر حکومت کو جھکنا پڑا اور اس نے حاجیوں کو جانے کی اجازت دی۔ شاہ ابن سعود مرحوم نے حجاج کرام کی جان و مال کے تحفظ کا وعدہ کیا اور حجاج بخیر و عافیت واپس آئے۔

آویزش نجد و حجاز

شاہ ابن سعود مرحوم اور شریف حسین کی لڑائی کا ہندوستان پر بھی اثر پڑا۔ ہندوستان میں "بریلی اور فرنگی محل" سے فتوے شائع ہوتے لگے کہ شریف حسین سید زادہ اور نجیب الطرفین ہے اور شاہ ابن سعود جو "وہابی" ہے اس کو ہٹا کر خود حجاز پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ مولانا محمد علی شاہ ابن سعود کے حامیوں میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شریف حسین کو اس کی بدکرداریوں کی سزا ملنا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو اس حمایت کرنے پر "بریلی" اور "فرنگی محل" دونوں جگہ کی مخالفت کرنا پڑی۔ "بریلی" سے مخالفت تو خیر ان کو آسان تھی۔ لیکن فرنگی محل سے مخالفت کارے دارد، تھی کیونکہ یہ ان کا پیر خانہ تھا۔ فرنگی محل کے علماء نے تحریک خلافت میں جو حصہ لیا تھا اس کی بناء پر یہاں کے علماء و مشائخ کی عظمت کا سکہ عوام کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ لیکن مولانا کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ انہوں نے حق کی خاطر بریلی سے لڑائی تو خیر لڑی ہی فرنگی محل سے بھی لڑائی لڑی۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ مولانا جوہر کے مرشد تھے اور مرشد و شیخ سے اختلاف و مخالفت کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں اور مخلص احباب سے اختلاف بھی مشکل ہوتا ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں اپنے مرشد سے بھی اختلاف کیا اور اپنے مخلص احباب مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا نثار احمد کانپوری اور اپنے محسن دیرینہ راجہ محمود آباد سے بھی مخالفت مول لی۔ اور اپنے دعوے کو خوب صفائی اور مضبوطی سے پیش کیا اور ان کے موقف و مسلک کے دلائل کو پارہ پارہ کیا اور مذہبی اختلاف میں لوگ جہاں تک جاتے ہیں مولانا کے بارے میں لوگ وہاں تک گئے گالیاں دی گئیں۔ پٹوانے کا سامان کیا گیا۔ ہر طرح ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ قتل تک کے منصوبے بنے۔ لیکن مولانا جوہر تھے کہ اپنے مسلک و موقف پر سوجان سے اڑے ہوئے تھے اور اس میں کسی قسم کی لچک لانے کے لیئے تیار نہ تھے۔ یہ ان کے اپنے اشعار ہیں اور ان کے مطابق ان کا عمل تھا ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے | یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف | کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

پنجاب میں احرار کا گروہ بھی ان کا حمایتی اور احرار کو بھی ان سب مراحل سے گزرنا پڑا جس سے جوہر گزرے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولانا ظفر علی خان، مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا غلام رسول مہر نے اس سلسلے میں جو کام کیا وہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

یہ سلسلہ بدستور چل رہا تھا اور افواہوں پر افواہیں اڑ رہی تھیں۔ یہاں تک افواہ گرم ہوئی کہ وہابی حکومت نے وہاں مآثر قدیمہ گرانے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گنبد خضرا بھی گرا رہا ہے۔ اس بات کے پھیلنے اور سننے پر مولانا جوہر کو شاہ ابن سعود سے اختلاف ہوگیا۔ شریف حسین کی مخالفت میں وہ شاہ ابن سعود کے ساتھ تھے۔ قبے اور مزارات گرانے پر شاہ ابن سعود کے مخالف ہوگئے۔ اس طرح احرار، مولانا آزاد اور مولانا جوہر میں اختلاف ہوگیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں دہلی میں مجلس

ملت ... بڑے مسلمان

اعزاء اسلام کے تمام زعماء شریک تھے) خلافت کمیٹی سے یہ تجویزیں منظور کرائیں کہ مکہ میں تمام عالم اسلام کی کانفرنس بلائی جائے اور اور اس میں یہ مسئلہ رکھا جائے اگر مؤتمر کا متفقہ فیصلہ ہو کہ مزاروں کی مرمت کرائی جائے تو شاہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کا فیصلہ مانے نیز یہ کہ حجاز پر ملوکیت نہ ہو۔ شاہ ابن سعود نے وعدہ کیا کہ وہ عالم اسلام کے نمائندوں کی بات مانیں گے۔ اور انہوں نے یہ بھی عذر کیا کہ مزارات کی شکست وغیرہ میرے حکم سے نہیں ہوئی بلکہ داخلہ فوج کے وقت اضطراراً ہو گئی۔

بہرحال اس قسم کی افواہوں کی بناء پر پورے عالم اسلام میں ایک کہرام بپا تھا۔ برصغیر ہندوستان میں بھی یہی کیفیت تھی جوشیلے، جذباتی مسلمان یہ کہتے تھے کہ یہ لوگ کشتنی اور قابل گردن زدنی ہیں شریف حسین کی ناکامی اور شاہ ابن سعود کی کامیابی سے چونکہ حکومت برطانیہ کے وقار و غلبہ کو کافی دھکا لگا تھا۔ لہذا اس کی حکمت عملی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ شاہ ابن سعود کی مخالفت زیادہ ہو اور عالم اسلام میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کا ابن سعود مقابلہ نہ کر سکے۔ اور اس کی فتح شکست میں تبدیل ہو جائے اور پھر اس کی جگہ اپنے خاص مہروں کو آگے لایا جائے۔ ابن سعود کے وعدہ پر مولانا محمد علی جوہر نے (جو اس کی حمایت سے ہٹ کر مخالفت پر آگئے تھے) یہ کہکر رفع نزاع کی کوشش کی کہ ابن سعود کو موقع دو کہ وہ اپنے وعدہ کا ایفا کر سکے۔ اسے مؤتمر اسلامی بلانے دو۔ وہاں جا کر اس سے مطالبہ کریں گے۔

اس دوران میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں مخالفین سعود نے برابر کئی جلسے کر کے مسلمانوں کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ شاہ کی حمایت میں جلسہ کرنا مشکل تھا۔ ایک ایسے ہی جلسہ میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مولانا آزاد کے خاص نیاز مند) کو تقریر کرنے کے دوران میں دھکے دئے گئے ایک بڑے آدمی نے کہا کہ اس کا سر قلم ہو تو ان کا جی خوش ہوگا۔ ایک جلسہ دونوں گروہ کا مشترکہ قرار پایا مولانا محمد علی اس میں تقریر نہ کر سکے۔ ایک جلسہ اور ہوا اور اس کو خراب کرنے کی بیحد کوشش کی گئی۔ بقول رئیس احمد جعفری :-

> اتنے میں ہزاروں کی تعداد میں چماروں اور پاسیوں کا ایک لٹھ بند گروہ آیا۔ سینہ پر "خدام الحرمین" کے بلے لگے ہوئے تھے۔ وہ سب بدزبانیاں کرتے ہوئے آئے اور رفاہ پارک کو گھیر کیا اور داخلہ کی کوشش کی جس کی مدافعت کی گئی اور وہ داخل نہ ہو سکے۔[۲]

بالآخر یہ جلسہ بھی ملتوی ہو گیا۔ لیکن آخر مولانا نے قابو پا ہی لیا اور لکھنؤ کی اکثریت مولانا کی ہموا ہو گئی۔

خلافت کمیٹی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں اپنی پالیسی متعین کر دی کہ وہ یعنی خلافت کمیٹی حجاز پر ملوکیت اور شخصیت نہیں چاہتی نیز منہدم شدہ مقابر کی از سر نو مرمت کرائی جائے۔ تاکہ یہ ہنگامہ فرو ہو اور شاہ سعود کو عالم اسلام کی تائید و حمایت سے شریف حسین کے اثرات ختم کرنے کا موقع مل سکے ....

---

[۱] مخالفین سعود نے ایک جماعت بنائی تھی جس کا نام "خدام الحرمین" تھا [۲] سیرت محمد علی ص ۴۲۴

لیکن کچھ عرصہ کے بعد خبر آئی کہ سلطان ابن سعود نے حجاز کے باشندوں کے مجبور کرنے پر بادشاہت قبول کر لی ہے۔ مولانا نے "ہمدرد" میں اس خبر کو سیاہ حاشیہ لگا کر شائع کیا اور اس کے بعد وہ سلطان کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے۔ لیکن اس مرحلہ پر مولانا ابوالکلام آزاد اور پنجاب کی خلافت کمیٹی نے مولانا جوہر سے اختلاف کیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہمارے پاس اخلاقی قوت تھی جس کے سہارے ہم اس کو بادشاہت سے روک سکتے تھے۔ اب جبکہ اس نے اس اخلاقی دباؤ کو قبول نہیں کیا اور اپنی سلطانی کا اعلان کر دیا تو سوائے اس کے کیا کیا جا سکتا ہے کہ اپنی کوششیں برابر جاری رکھی جائیں لیکن ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جس کی وجہ سے شریف حسین جیسے لوگوں کو دوبارہ برسر اقتدار آنے کا موقع مل سکے۔ یہ بجا کہ سلطان نے وعدہ خلافی کی لیکن وہ شریف حسین سے بدرجہا اچھا ہے۔

مؤتمر عالم اسلامی

۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود نے عالم اسلام کی موتمر بلانے کا اعلان کیا اور تمام عالم اسلام کے نمائندے شاہ کی دعوت پر گئے۔ شاہ نے موتمر کا افتتاح کیا مولانا محمد علی نے اس موتمر میں سلطان کو اس کے مواعید یاد دلائے اور پرزور الفاظ میں یہ بیان کیا کہ اسلام میں شورائیت ہے ملوکیت ذقیصریت نہیں۔ اور ہر وہ بات جو مولانا کے نزدیک حق و صواب تھی۔ اس کا برملا اظہار کیا اور اس میں سلطان کے جلال و جبروت سے ذرا متاثر نہیں ہوئے۔ اس موتمر میں خلافت کمیٹی کے وفد کی قیادت سید سلیمان ندوی نے کی علی برادران اس کے ممبر اور شعیب قریشی سیکرٹری تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے وفد کی قیادت حضرت مولوی کفایت اللہ دہلویؒ نے کی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی بھی اس موتمر میں شریک ہوئے۔ ان ہر دو حضرات کی علمی و فقہی تقریروں نے پورے عالم اسلام کے نمائندوں کو متاثر کیا۔

اسپیشل خلافت کانفرنس

پیچھے گذر چکا ہے کہ شدھی کی تحریک اور اس مقابلہ میں مسلمانوں کی جانب سے تبلیغی مہم کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور حالات ایسے بگڑ گئے تھے کہ گاندھی جی بھی اپنے آشرم میں "معتکف" ہو گئے تھے۔ مہا سبھا کے لیڈر شدھی تحریک کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔ کانگریس کے ہندو زعماء ان حالات میں مہر بلب تھے۔ لیکن ایک مولانا محمد علی اپنے مشن میں لگے ہوئے تھے اور برابر ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دیے جا رہے تھے۔ یونٹی کانفرنسیں کیں۔ اپنوں کی مخالفت مول لی۔ ہندو لیڈروں سے اپنے درجہ سے گرے ہوئے الفاظ میں منت کی کہ ملک کی آزادی کے لیے اتحاد کی راہ اختیار کرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ مہر سکوت کو توڑ کر مہا سبھا کے لیڈروں کو سمجھانے کوشش کریں۔ لیکن کوئی ہندو لیڈر اپنی قوم کی مخالفت کے خوف کی بناء پر یہ جرأت نہ کر سکا کہ وہ مولانا محمد علی کی راہ اختیار کرے۔ ان حالات میں مولانا محمد علی نے ہی یہ جرأت کی کہ وہ ڈاکٹر مونجے۔ پنڈت مدن موہن مالوی۔ اور دوسرے ایسے لیڈروں کے نفاق کا پردہ چاک کریں۔ چنانچہ انہوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا اور خوب انجام دیا۔ ہندو پریس جو پہلے مولانا کی اتحاد پرور کوششوں پر سکوت اختیار کیے ہوئے تھا اب صرف اس قصور پر کہ وہ ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالوی کی نقاب کشائی کرنے لگے تھے۔ مولانا کے خلاف زہر چکانی کرنے کے لیے پورے ساز و سامان سے مسلح ہو کر میدان میں آ گیا اس پر مجبور ہو کر مولانا نے خلافت کانفرنس کا سپیشل اجلاس بلایا۔

جو حکیم اجمل خاں کی تحریک اور مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا شوکت علی کی تائید سے مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں شروع ہوا۔ اور اس میں مسلم زعماء نے بالاتفاق اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور کہا گیا کہ آزادی کی خاطر ہم ہندو دوستوں کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے ہیں اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو دوست کا ہاتھ سمجھیں جو مصافحہ کے لیے بڑھا ہے یا ایک پہلوان کا جو اکھاڑے میں اتر کر اپنے حریف پہلوان کی طرف بڑھاتا ہے —— اس کانفرنس کے بعد مولانا جوہر وفد حجاز میں شامل ہو کر دہلی سے عرب کو روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ :-

"یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلاء آزمائش کا زمانہ ہے نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہنود کو مشتعل ہونے کا موقعہ دیں میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر وہ چھری اٹھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔"

آل پارٹیز کانفرنس

مولانا محمد علی جوہر عمر کے لحاظ سے اب اس دور میں ہیں۔ جب کہ انسان کے قویٰ مضمحل اور کمزور شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو ذہنی مستقل عارضے تھے۔ خانگی پریشانیاں تھیں ان حالات کے باوجود وہ اپنے مشن میں برابر کوشاں تھے۔ لیکن ہندو مسلم فسادات اور اتحاد کو نقصان پہنچانے والے حوصلہ شکن واقعات و حالات نے مولانا کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ لیکن آپ نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ مولانا اور مولانا کے خیال ساتھیوں نے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ آل پارٹیز کانفرنس بلائی جائے۔ جس میں ملک کی تمام قابلِ ذکر جماعتوں کے زعماء ہوں۔ یہ کوششیں ہوتی رہیں۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہر طرف سے حوصلہ شکنی ہوئی۔ مسٹر گاندھی ابھی تک اپنے آشرم میں معتکف ہیں اور تقریباً مایوس ہو چکے ہیں۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد ہر مرحلے پر نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ پورے ہندوستان میں مولانا جوہر اور مولانا آزاد دو شخص ایسے ہیں جو روح فرسا حالات کے باوجود نہ مایوس ہوئے اور نہ کام کرنا چھوڑا۔ اگر چہ دونوں بزرگوں کے کام کرنے میں تھوڑا بہت فرق رہا۔ لیکن مشن دونوں کا ایک رہا۔ شملہ یونٹی کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی ملتوی ہوئی۔ اور اس کو ملتوی کرنے کے لیے بہانہ بنانے والوں نے یہ بہانہ بنایا کہ حالات ابھی سازگار نہیں ہیں۔

سائمن کمیشن

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن آیا۔ اور اس کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان نے گذشتہ اصلاحات سے کتنا فائدہ اٹھایا اور آئندہ جدید اصلاحات کیا کی جائیں مطلب یہ کہ انگریز ہندوستان کو اصلاحات وغیرہ کے چکر میں رکھنا چاہتے تھے بقول رئیس احمد جعفری :-

"ہندوستان کو پھر "مجلس آئین و اصلاح و رعایت حقوق" کا شیریں مگر "خواب آور" شربت پلا دیا جائے تاکہ ایک عرصہ دراز تک یہ مرغ زرین بال اسیر دام رہے"

کانگریس نے اس کمیشن کا مکمل طور پر بائیکاٹ کیا لبرل حضرات جو اب تک تذبذب میں تھے وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ اس کا بائیکاٹ کرنا چاہیئے حتیٰ کہ تعلقدار قسم کے لوگ مہاراجہ محمود آباد اور راجہ کالا کانکر بھی اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ حکومت نے

دیکھا کہ ہر طبقہ و خیال کے لوگوں نے اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی ہے۔ تو اسمبلی کونسل آف سٹیٹ اور ہر ہر صوبہ کی طرف سے ایک دوسرا "سائمن کمیشن" بنا دیا جس کے صدر سر سنکرن نائر تجویز ہوئے۔ حکومت کو امید تھی کہ اب اس کمیشن سے کم از کم لبرل حضرات پھر معتدل ہو جائیں گے مگر اس کی بھی ہر جانب سے شدید مخالفت ہوئی۔

سر شفیع مرحوم کمیشن کے حامی تھے اور انہوں نے تعاون کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ اسی زمانہ میں سر شفیع مسلم لیگ کی صدارت کے لیے منتخب ہو چکے تھے۔ لیگ کونسل کے صدر قائداعظم تھے۔ اور اجلاس کے صدر سر شفیع مقرر ہوئے دونوں کے افکار میں سخت تضاد تھا قائداعظم سائمن کمیشن کے مخالف تھے۔ مقام اجلاس کلکتہ مقرر ہوا تھا مگر سر شفیع لاہور کے لیے مصر تھے۔ دونوں میں صلح کرانے کی کوشش کی گئی مگر نتیجہ بے سود رہا مسلم لیگ دو ٹکڑے ہو گئی۔ سر شفیع نے لاہور میں اجلاس بلایا اور اپنی جماعت کا نام آل انڈیا مسلم لیگ رکھا۔ جو بعد میں شفیع لیگ کے نام سے مشہور ہوئی۔ قائداعظم نے کلکتہ میں اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت سر محمد یعقوب نے کی۔ قائداعظم اس بٹوارہ سے سخت پریشان تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں اجلاس ناکام نہ ہو۔ مولانا محمد علی جوہر کو بھی خوف تھا کہ کہیں کلکتہ میں سر شفیع کے حامی غلبہ نہ پالیں۔ چنانچہ وہ مدراس کانگریس کا اجلاس نامکمل چھوڑ کر کلکتہ پہنچے اگرچہ مولانا ان دنوں حکیم اجمل خاں کی وفات کی خبر سے دیوانہ تھے تاہم "دیوانہ بکار خویش ہوشیار" کے مصداق آپ کلکتہ پہنچ گئے۔ اور دوسرے تیسرے ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی "مدد" کے لیے پہنچ گئے۔ اور تینوں حضرات نے مل کر مسلم لیگ کے اجلاس میں نہ صرف سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کرائی بلکہ (بشرائط) مخلوط انتخاب کی حمایت بھی منظور کرالی کہ جس سے بقول رئیس احمد جعفری:۔

"ابھی مسٹر جناح بھی مانوس نہیں ہوئے تھے"

قائداعظم نے مولانا جوہر سے بہت کہا کہ مخلوط انتخاب کی تجویز نہ کرائیے کہ اس سے مزید انتشار ہو گا مگر مولانا جوہر کا موقف یہ تھا کہ جو تجویز مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے اور جسے ہم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے خاص طبقوں میں بمشکل منظور کرایا ہے اب مسلم لیگ کے جلسہ عام میں کیوں نہ پیش کر کے منظور کرائیں ——— سائمن کمیشن کا پورے ہندوستان نے بائیکاٹ کیا مگر شفیع لیگ کی وجہ سے پنجاب میں اس کا بائیکاٹ نہ ہوا بلکہ استقبال کیا گیا۔ اخبارات ان حمایتیوں کی ہجو سے بھرے پڑے تھے مگر یہ لوگ رمضان شریف میں سائمن کمیشن اور اس کے رفقاء کو ڈنر دیتے رہے تھے۔ مولانا محمد علی یہ حالات دیکھ کر پنجاب آئے اور انہوں نے جگہ جگہ جلسے کر کے اپنا پیام عوام تک پہنچایا۔ پنجاب کے احرار ہر جگہ ان کے ساتھ رہے ———

اسی طرح مہاراجہ محمود آباد کی دعوت پر مولانا لکھنؤ گئے اور انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی کی معیت میں جلسہ کیا اور کامیاب رہے۔

سفر یورپ برائے بحالی صحت

ملکی مسائل کی کثرت۔ اور دن رات کے مسلسل کام نے مولانا کو بہت کمزور کر دیا ان کی صحت جواب دینے لگی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ آرام کریں لیکن آرام قسمت میں کہاں۔ بالآخر احباب کے مجبور کرنے پر یورپ جانے کا ارادہ کیا مگر اس کے وسائل نہ تھے۔ مہاراجہ محمود آباد جو مولانا کے ہو کر رہ گئے تھے انہوں نے مصارف کی ذمہ داری اٹھائی مولانا اس کے لیے تیار نہ تھے لیکن ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت کا فیصلہ یہی ہوا کہ اس پیشکش کو قبول کر لینا چاہیئے کہ ایک محب مخلص کی جانب سے ہوئی ہے چنانچہ آپ آمادہ ہو گئے ....

روانگی سے پیشتر اجمیر شریف کے آستانہ پر حاضری دی۔ پھر احمد آباد گاندھی جی سے اور آبو پہاڑ پر مہاراجہ الور سے کچھ ضروری

باتیں اور مشورے کر کے بمبئی سے روانہ ہو کر پیرس پہنچ کر ڈاکٹروں سے ضروری معلومات اور طریقہ علاج دریافت کیا چونکہ علاج ابھی شروع نہ ہوا تھا لہذا کھانے پینے کے معاملے میں خوب بد پرہیزی کی ——— اور پھر ایک ڈاکٹر سے علاج شروع کیا۔ ذیابیطس میں اگر پھوڑے پھنسیاں نکلنا شروع ہو جائیں تو ہلاکت کا سبب بنتی ہیں۔ کیونکہ شوگر کی کمی کی وجہ سے زخم بھرتے نہیں آپ کے دبناله نکل آیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور آپ صحتیاب ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن مولانا اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے کیونکہ اسی عمر، اسی مرض اور اسی حالت میں ان کے چچازاد بھائی اور خسر کا انتقال ہوا تھا۔ اور اسی مایوسی کی بناء پر آپ نے بیگم اور مولانا شوکت علی کو بلا بھیجا کہ اگر وہ پہنچ جائیں تو آخری دیدار ہو جائے۔ وہاں رہنے والے اعزا کو نماز جنازہ بھی سکھا دی کہ میری نماز جنازہ اس طرح پڑھانا۔ لیکن اللہ کو ابھی منظور نہ تھا۔ آپ کی اکثر شکایات رفع ہو گئیں۔ اگر چند دن اور ٹھہر کر علاج کراتے تو مکمل صحتیاب ہو جاتے۔ لیکن ہوا یہ کہ ملک میں نہرو رپورٹ کے شائع ہونے پر جو سخت اختلاف ہوا اس نے آپ کو مجبور کر دیا کہ فوراً وطن واپس ہوں۔ آپ نے اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زار و نزار حالت میں ممالک عرب کے راستے عازم وطن ہو گئے۔

نہرو رپورٹ

دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس کے التواء پر فیصلہ ہوا تھا کہ مئی کے آخر میں بمبئی میں ایک بار پھر اس کا اجلاس بلایا جائے۔ چنانچہ اجلاس بلایا گیا۔ لیکن اس میں ملک کی جماعتوں نے حصہ نہ لیا۔ اور صرف گاندھی جی۔ موتی لال نہرو۔ ڈاکٹر انصاری۔ مسز اینی بسنٹ اور مولانا شوکت علی شریک ہوئے۔ گاندھی جی نے پھر تجویز التواء کر دی اور کہا کہ ایک کمیٹی بنا دی جائے جو لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا جواب تیار کرے اور ایسا دستور اساسی وضع کرے جس پر سارے طبقے متحد و متفق ہو سکیں۔ مولانا شوکت علی نے اس کی زبردست تائید کی۔ چنانچہ ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کے صدر موتی لال نہرو اور ارکان میں مسٹر شعیب قریشی، مسٹر اینے۔ مسٹر جیکر۔ سبھاش چندر بوس اور سردار منگل سنگھ شامل تھے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ تیار کی اس کے تیار ہونے پر "آل پارٹیز کانفرنس" لکھنؤ طلب کی گئی اور خلاف توقع اس میں اکثر جماعتوں کے نمائندے شامل ہوئے ——— ہندو مہاسبھا کے اقانیم ثلاثہ لالہ لاجپت رائے، پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مونجے بھی ان میں شامل تھے۔ اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں شروع ہوا۔ پہلے اجلاس میں رپورٹ تیار کرنے والوں کی محنت و عرق ریزی پر انہیں مبارکباد دی گئی۔ اور دوسرے اجلاس میں یہ رپورٹ جو "نہرو رپورٹ" کے نام سے مشہور ہوئی منظوری کی غرض سے پیش ہوئی۔ رپورٹ جب پڑھ کر سنائی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں مسلمانوں سے پورا انصاف نہیں کیا گیا۔ مولانا شوکت علی نے اس رپورٹ سے اختلاف کیا اور ماننے سے انکار کر دیا[1] ——— مولانا محمد علی جب یورپ سے واپس آئے تو انہوں نے بھی مخالفت کی اور ہندوستان پھر ایک دفعہ معرکہ کا زار بن گیا۔ تمام ہندوؤں نے رپورٹ کی تائید کی۔ مگر مسلمانوں میں دو جماعتیں بن گئیں (اس آل پارٹیز کانفرنس میں) نہرو رپورٹ کی حمایت میں کانگریس تھی۔ لبرل حضرات تھے۔ ہندو مہاسبھا تھی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت تھی گاندھی جی جو اب تک خاموش تھے اس مرحلے پر نہرو رپورٹ کے منظور ہوتے ہی وہ اس کے حامی ہو گئے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی جنہوں نے ہر مرحلے پر کانگریس کا ساتھ دیا تھا اور اپنوں کی گالیاں سنی تھیں اب ان کے اختلاف کو کانگریس نے پرکاہ کی حیثیت بھی نہ دی اور ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔

---

[1] نہرو رپورٹ کے مندرجات کیا تھے؟ اس کی تفصیل ہم یہاں پیش کرنے سے قاصر ہیں کہ کتاب ضرورت سے زیادہ بڑھ رہی ہے۔

کلکتہ کانگریس

۱۹۲۸ء میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس کی تیاریاں کلکتہ کے بیے شروع ہوئیں۔ کانگریس کے اجلاس کے صدر موتی لال نہرو، مسلم لیگ کے مہاراجہ محمود آباد اور خلافت کے مولانا محمد علی مقرر ہوئے مسلمانوں کی مسلسل چیخ و پکار پر صدر کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ اس زمانہ میں ایک نیشنل کنونشن کا اجلاس بلاکر تمام اختلافات رفع کرنے کی کوشش کریں گے۔ کنونشن میں تمام جماعتوں کو نمائندے منتخب کرکے بھیجنے کی اجازت دی گئی تھی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیتہ علماء ہند نے متفقہ طور پر مولانا جوہر کو اپنا نمایندہ بنا کر بھیجا۔ سب سے پہلے مباحثہ ڈومینین اسٹیٹس کے اصول پر ہوا کہ آیا اسے قبول کیا جائے یا نہ۔ سین گپتا نے اس کی حمایت میں تقریر کی اور کہا کہ اسے درمیانی منزل سمجھ کر قبول کر لیا جائے اور مکمل آزادی کی طرف قدم بڑھایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا جوہر نے تقریر کی اور اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے آزادی کامل کی حمایت کی اور کہا کہ کانگریس نے گذشتہ سال آزادی کامل کی جو تجویز پاس کی ہے اسے ہرگز فراموش نہ کیا جائے اور تقریر کی رو میں یہ بھی منہ سے نکل گیا کہ "جو لوگ آزادیٔ کامل کے مخالف اور درجہ استعمرات کے حامی ہیں وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں بلکہ بزدل ہیں" اس پر ایک شور اٹھا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ "محمد علی بیٹھ جاؤ" "ہم نہیں سننا چاہتے" مگر مولانا نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اس کے بعد اور تقریریں ہوئیں جن میں سے اکثر درجہ مستعمرات کی حمایت میں تھیں۔ مباحثہ ابھی جاری تھا کہ مغرب کا وقت آگیا مولانا نماز پڑھنے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ درجہ مستعمرات پاس ہو گیا۔ اور بحث ختم ہو گئی۔ مولانا نے انا للہ پڑھا اور الٹے پاؤں واپس گئے۔ —— اس کے بعد ہالیڈے پارک میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں مولانا نے زبردست تقریر کی۔ سفر یورپ کے حالات بیان کیے۔ ممالک اسلامیہ کے تاثرات پیش کیے۔ اس کے بعد سیاسیات وطنی نہرو رپورٹ وغیرہ پر مفصل تبصرہ کیا اور کانگریس سے اپنی علیحدگی کے اسباب بتائے۔ اور فرمایا کہ اب ہم اس وقت تک کانگریس سے تعاون نہ کریں گے جب تک کہ وہ ... تجاویز دہلی، منظور نہیں کر لیتی —— قائداعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس تک نہرو رپورٹ کی مخالفت نہیں کی تھی مسٹر چھاگلا نے نہرو رپورٹ کی زبردست حمایت کی تھی (مسٹر چھاگلا مسلم لیگ کے سرکردہ رکن تھے)، مہاراجہ محمود آباد بھی بہت حامی تھے۔ اور وہ مولانا جوہر کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی کرسی صدارت پر اس لیے کامیاب ہوئے کہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں سے منوا سکیں۔ سر علی امام بھی نہرو رپورٹ کے حامی تھے۔ اب ان سب حامیوں نے مل کر قائداعظم کی سرکردگی میں "نیشنل کنونشن" کے آخری اجلاس میں شرکت کی کہ تجاویز دہلی کنونشن کے سامنے منظوری کے لیے پیش کریں۔ قائداعظم نے اپنے موقف پر زبردست تقریر کی اور محنت و اخوت کے نام پر اپیل کی کہ ان تجاویز پر غور کرکے انہیں منظور کرکے اختلافات کا خاتمہ کر دیجیے کہ اسوقت قوم کی ضروریات کا تقاضہ یہی ہے —— آپ کے بعد مسٹر جیکر (مہاسبھائی لیڈر) نے تقریر کی جب ووٹنگ ہوئی تو قائداعظم کو شکست اور جیکر کو فتح ہوئی۔ سر تیج بہادر سپرو نے کوشش کی کہ ایسا نہ ہو مگر ان کی ایک نہ چلی اور تجاویز دہلی منظور نہ ہو سکیں۔

آل مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی

کانگریس اور کنونشن وغیرہ سے جب مولانا جوہر مایوس ہو گئے تو انہوں نے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس بلائی جائے۔ جس میں تمام مسلم جماعتوں کے نمایندے مل کر ایک لائحہ عمل مرتب کریں اور اب اس کے سوا مولانا کے لیے اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کیونکہ کانگرس میں ان کی اس درجہ مخالفت ہو گئی تھی کہ کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں جب مجلس عاملہ کے ارکان کا انتخاب ہو رہا تھا تو مدارس کے ایک ممبر نے مولانا کا نام بھی پیش کر دیا۔ اس پر اجلاس میں "نہیں نہیں" کے شور نے گرمیٔ محفل کا سامان پیدا کر دیا۔
ان حالات کے بعد دہلی میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس سر آغا خاں کی صدارت میں شروع ہوئی۔ کونسلوں، اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ

کے علاوہ مسلم لیگ۔ خلافت کمیٹی اور جمعیتہ علماء ہند کے سربرآوردہ ارکان نے شرکت فرمائی۔ سر شفیع نے دعویٰ کیا کہ یہ کانفرنس پوری نمائندہ ہے اور بات بھی ٹھیک تھی جس کانفرنس میں علی برادران اور جمعیتہ علماء ہند کے ارکان شریک ہوں۔ سر شفیع جیسے بھی موجود ہوں اور سر آغا خاں کی صدارت ہو وہ کانفرنس یقیناً نمایندہ کانفرنس ہوگی۔ رئیس احمد جعفری کے الفاظ میں

"کانفرنس میں سب سے بڑا مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کانفرنس کا نصب العین کیا ہو؛ سر شفیع اور ان کے ہمنوا حضرات کا جہاں تک تعلق تھا وہ تو اس پر بھی راضی ہو سکتے تھے کہ "ڈومینین اسٹیٹس"، بھی نہ رکھا جائے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کم از کم درجہ" مستعمرات کے طلبگار ضرور تھے ان کے ذوق کی رعایت بھی ضروری تھی اور ایسا ممکن بھی تھا لیکن سب سے زبردست مرحلہ یہ تھا کہ محمد علی مکمل آزادی کے علمبردار تھے اور یہ وہ چیز تھی جسے کانفرنس میں بطور نصب العین پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا اور بالفرض اگر ایسا ہوتا بھی تو سر آغا خاں دہلی میں نہ نظر آتے نہ سر شفیع کی یہ سرگرمیاں ظاہر ہوتیں نہ مسلم لیگ کے سیاستدان بزرگ اس پلیٹ فارم پر تشریف رکھ سکتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ محمد علی اس "درمیانی راستہ"، کو قبول کر سکتے یہ ایک ایسا مسئلہ آن پڑا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں کانفرنس ہی نہ ختم ہو جائے" [۱]

آخر یہ طے پایا کہ کانفرنس آزادی کے بارے میں کوئی نصب العین مقرر نہ کرے جو جماعتیں یہاں اکٹھی ہوئی ہیں وہ اس بارے میں اپنے اپنے نظریہ کے مطابق کام کریں اگر خلافت اور جمعیتہ علماء ہند مکمل آزادی کی علمبردار ہیں تو وہ اس کی کوشش کریں اگر دوسری جماعتیں کسی اور نصب العین کو اپنانا چاہیں تو وہ اس کو اختیار کریں۔ یہاں صرف مسلمانوں کے حقوق اور ان کے موجودہ سیاسی لائحہ عمل کے لیے کوئی مشترکہ پروگرام بنا لیا جائے چنانچہ پھر اس نکتہ کو سامنے رکھ کر اجلاس کی کاروائی شروع ہوئی۔ اور ایسی مشترکہ جدوجہد کے لیے مولانا جوہر تیار ہو گئے۔ اور ایک مشترکہ تجویز منظور ہوئی جس کی تفصیل" سیرت محمد علی مولفہ رئیس احمد جعفری"، میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ تجویز سر شفیع نے پیش کی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی۔ مفتی کفایت اللہ۔ مولانا محمد علی جوہر ڈاکٹر اقبال۔ سر یعقوب۔ حاجی عبداللہ ہارون اور شفیع داؤدی نے تائید کی

مولانا جوہر کی تائید

مولانا جوہر نے تائیدی تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال بن جائیں میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لیے ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو میں اسے قبول کر لونگا میں

(حاشیہ گذشتہ صفحہ) تجاویز دہلی مختصراً یہ تھیں: اکثریت کو کسی جگہ اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے۔ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت حقیقی نہیں ہے بلکہ ہے اس لیے ان میں ان کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں۔ ان کی اکثریت کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ دوسرے۔ دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انہیں رعائتیں دی جائیں۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے وہ ہندو اقلیت کو اسی طرح کی مراعات سے مستفید ہوں کریں۔ مرکزی اسمبلی ان کی سو سہ فیصد نمایندگی ہوگی۔ اس کے علاوہ صوبہ سرحد کو مساوی اصلاحات دی جائیں صوبہ سندھ کو مستقل اور جداگانہ صوبہ بنایا جائے۔ بلوچستان کو ...

اس مسلمان کو بزدل سمجھتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ مسلمانوں کی زندگی ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوگی، میں اس اندیشہ کو اہمیت نہیں دیتا میرے نزدیک ایک سچا مسلمان دس آدمیوں پر بھاری ہوتا ہے کیا جنگ بدر اور جنگ احد میں مسلمانوں کی تعداد قلیل نہ تھی لیکن کامیابی و کامرانی کس کو حاصل ہوئی؟ مسلمانوں کو! میری خواہش یہ ہے کہ مصالحت ہو، امن ہو، اتحاد ہو، میری تحریروں اور تقریروں کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے، میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن و اتحاد کا حامی ہوں" (سیرت محمد علی صفحہ ۵۴۳)

[مو]لانا کانگریس سے نکل چکے ہیں۔ کانگریس کے لیڈران سے بیزار ہیں لیکن اس کے باوجود مولانا شریف دشمن کا کردار ادا کرتے ہیں۔ [ج]س کام کے لیے انہوں نے اپنی ساری زندگی جدوجہد کی تھی۔ ابھی تک اسی موقف پر قائم ہیں۔ اور پھر کس جذبۂ ایمانی سے "مسلمان [آز]اد ہوتا ہے" کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ "پیش لفظ" کے مفہوم کے مطابق مولانا جوہرؒ۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ہر مسلمان کو اپنے آئینہ [میں] دیکھتے تھے اور حضرت تھانویؒ۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مسلمانوں کو حالات کے آئینہ میں نیز ان کی کمی کوتاہیوں کو دیکھتے تھے۔ اور یہی وجہ [ط]رز آزادی میں اختلاف کا باعث ہوئی —

[م]فتی کفایت اللہ صاحب کی تائید

"میں جس ریزولیوشن کی تائید کے لیے حاضر ہوا ہوں وہ ایک نہایت اہم ریزولیوشن ہے اور یہ ریزولیوشن ایک ایسے جلسے کی طرف سے ہے جو مسلم قومیت کے حقوق کی حفاظت کا ایک نمائندہ جلسہ ہے اس میں ہر خیال اور ہر طبقے کے مسلمان شریک ہیں۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کو تسلیم کیا ہے اگر کوئی شخص ایسا ہے تو اس کا کہنا غلط ہوگا اور یہ طرز عمل ایسا ہی ہوگا جس طرح کوئی شخص آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش و سعی کرے۔ میں جمعیتہ علماء ہند کی طرف سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں" (سیرت محمد علی صفحہ ۵۴۴-۵۴۵)

[ج]نوبی افریقہ

مولانا جوہر نہ صرف ہندوستان کے محبوب راہنما تھے بلکہ بیرون ملک جہاں کہیں ہندو یہاں موجود تھے اور عالم اسلام میں ان کی قیادت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی باشندوں کی عموماً [او]ر مسلمانوں کی خصوصاً پے در پے دعوتیں آئیں کہ آپ تشریف لائیں۔ آپ نے اس خیال سے کہ تبدیلی آب و ہوا کا صحت پر خوشگوار اثر [پ]ڑے گا اور وہاں کے لوگوں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ جانے کا ارادہ کر لیا اور اپنے احباب کو اطلاع دے دی۔ پہلے [مو]لانا شوکت علی کو روانہ کیا بعد میں بیگم کے ہمراہ خود جانے کی تیاری تھی بمبئی پہنچ کر ٹکٹ لے لیا سامان بندھ گیا کہ جنوبی افریقہ کے گورنر [نے] شرط لگائی کہ داخلہ اسی وقت ممکن ہے جب چند پونڈ بطور ضمانت جمع کرائیں۔ مولانا یہ اہانت آمیز شرط کیسے قبول کر سکتے تھے آپ [نے] یہ شرط قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور گورنر کو تار دیا کہ اس قسم کی مہمل شرط کے بغیر اجازت دی جائے اور ایک عجیب تار [تھ]ا لیکن گورنر نے شرط بحال رکھی۔ اس کے بعد مولانا نے ایک تار وائسرائے کو اور ایک تار سر فضل حسین ممبر حکومت کو دیا لیکن [ح]کومت ہند نے کسی قسم کی مداخلت سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس کے بعد مولانا نے جنوبی افریقہ کے گورنر کو آخری تار دیا جو پڑھنے [ک]ے قابل ہے:۔

ہندوستان کی حکومت کو یہ سبق دینے پر کہ دوستانہ معروضات سے کس قدر توقع ہو سکتی ہے،

بہت بہت شکریہ، ہم اب اسوقت آئیں گے جب آپ کو یہ سکھا دیا جائیگا کہ اسلام اور ہندوستان کا کس طرح احترام کیا جاتا ہے ——— محمد علی صدر خلافت

اکتوبر ۲۹ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا جس میں آئندہ صدارت کے لیے پنڈت جواہر لال انتخاب ہوا تھا۔ اس جلسہ میں مسز سروجنی نیڈو نے ایک تجویز پیش کی جس کا مفاد یہ تھا کہ علی برادران پر جنوبی افریقہ کے دا جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں انہیں واپس لیا جائے۔ مسٹر پٹیل اور دوسرے لیڈروں نے اس تجویز کی پر زور تائید کر کے اسے کرایا۔

ساردا ایکٹ

ایک ہندو مسٹر ہر بلاس نے اسمبلی میں ایک تجویز پیش کی کہ چونکہ علی العموم ہندوؤں میں یہ عادت پائی جاتی ہے کہ وہ نہایت کم سنی میں بچوں اور بچیوں کی شادی کر دیتے ہیں جس سے ان کی صحت نشو و نما پر اثر پڑتا ہے لہذا ایسا قانون بنایا جائے جس سے اس طرح کی شادیاں نہ ہو سکیں ——— اس بل کی غرض و غایت ہندوؤں کی ایک غلط رسم کو ختم کرنا تھا مگر ایک مسلمان ممبر نے کہا کہ اس کو ہندوستان کی تمام قوموں پر بلا استثناء نافذ کی یہ بل مجلس منتخبہ کے سپرد ہو کر سارے ہندوستان پر نافذ کر دیا گیا۔ جب یہ بل مجلس منتخبہ کے سپرد ہوا اسی وقت سے مولانا جوہر ہمدرد میں مسلسل اس کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن آپ اور جمعیتہ علماء ہند علماء کے احتجاج کی کوئی پرواہ بغیر بل نافذ ہو گیا۔ بل کے پاس ہونے پر پورے ملک کے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہو گیا عام مسلمانوں اور علماء کو یہ ہرگز نہ تھی کہ مسلمان ممبروں کے ہونے ہوتے ایسا بل بھی پاس ہو سکتا ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ اعلیٰ سوسائٹی میں فطری بن جاتی ہے جو یورپ وغیرہ سے آئی ہو۔

مولانا محمد علی جوہر نے قائم مقام وائسرائے کو (لارڈ اروِن وائسرائے، ولایت چھٹی پر گئے ہوئے تھے) ایک طویل مراسلہ لکھا جس میں از روئے شریعت اسلام یہ ثابت کیا کہ کوئی مسلمان از روئے شریعت مجبور نہیں ہے کہ ایک خاص عمر میں شادی کرنے اور ایک خاص سن میں نہ کرے۔ آپ کے مراسلے کا مفہوم یہ ہے:۔

"اسلام نے مسلمانوں کو اس باب میں بالکل آزاد رکھا ہے اور انسان کے مصالح اور ضروریات پر چھوڑ دیا ہے مثلاً ایک ضعیف العمر باپ بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے اس کے صرف ۱۰ سال کی لڑکی ہے اور کچھ جائیداد ہے وہ چاہتا ہے کہ اپنے سامنے کوئی ایسی صورت پیدا کرے کہ وہ اپنی بچی کی طرف سے مطمئن ہو جائے چنانچہ وہ اس لڑکی کا نکاح ایک لڑکے سے کر دیتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ اب ضروری انتظامات مکمل ہو گئے وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

اور پھر اس نکاح کے یہ معنی نہیں کہ لڑکی اور لڑکا مجبور ہیں کہ اسے "پیمان وفا" سمجھیں بلکہ بلوغ کے بعد ان دونوں میں سے ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اگر اپنی اس ازدواجی زندگی کو پسند نہیں کرتا ہے تو نکاح منسوخ کر دے اور آزاد ہو جائے ——— مسلمانوں کو اس قانون کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ شرعاً آزاد ہیں جو پابندیاں یا آسانیاں ضروری تھیں ان کا بھی شریعت نے کافی لحاظ رکھا ہے آخر میں اس پر تعجب کا اظہار کیا گیا تھا کہ میاں سر فضل حسین نے مسلمان ہونے کے باوجود اس قسم کے قانون کو کیسے منظور

قائم مقام وائسرائے نے قانون کو منسوخ کرنے سے معذوری ظاہر کی حالانکہ وائسرائے اگر چاہے تو وہ بغیر کسی تحریک کے بھی ویٹو استعمال کر سکتا ہے۔

لارڈ ارون سے ملاقات

کچھ عرصہ کے بعد لارڈ ارون واپس آئے تو مولانا نے ان سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ یہ مداخلت فی الدین ہے۔ وائسرائے نے جو جواب دیا وہ وہی ہے جس کو آج تک مغربی تہذیب و تمدن کے دلدادہ دہراتے چلے آ رہے ہیں گویا "زباں میری ہے بات ان کی" ——— وائسرائے نے کہا:-

"کہ مذہب و معاشرت کی حدود جہاں متصادم ہوں وہاں ایک مہذب اور متمدن حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرت کا خیال رکھے"

مولانا محمد علی اس جواب سے برہم ہو گئے اور آپ نے فرمایا کہ ہم آپ کے قطعاً ہمنوا نہیں ہو سکتے ہماری آپ کی جنگ ہے میں جاتے ہی اس قانون کی خلاف ورزی کرونگا اور لوگوں کو بھی اس پر آمادہ کرونگا۔ اس تقریر اور چیلنج سے مولانا کے سرکاری رفقاء کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ وائسرائے نے یہ کہا کہ جو کچھ کیجئے اور کہئے قانون کے اندر رہ کر کیجئے ——— لیکن مولانا نے جواب دیا کہ:-

"مذہب کے معاملہ میں قانون اور آئین میرے سنگِ راہ نہیں بن سکتے اگر ضرورت ہوگی تو میں مذہب کے لیے قانون شکن بن سکتا ہوں اس لیے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا"

اس طرح وائسرائے سے گرما گرم بحث کر کے مولانا نے واپس آ کر اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اور پورے ہندوستان میں حق پسند علماء نے اس بارے میں قانون شکنی شروع کر دی تھی۔ مسلمان اس جدوجہد میں کامیاب ہوئے اور وہ بل منسوخ کر دیا گیا۔ لیکن مولانا جوہر اس تنسیخ سے قبل واصل بحق ہو گئے۔

لاہور کا قومی ہفتہ

دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس اور خلافت کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ملک کی آزادی کامل کے مطالبہ کی قرارداد پاس ہونے والی تھی اور دریائے راوی کے کنارے آزادی کامل کا پرچم لہرایا جانے والا تھا ——— مولانا جوہر نے گاندھی جی سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا تاکہ آخری بار ان سے مسلمانوں کے حقوق و مراعات کی بات چیت کی جا سکے چنانچہ یہ ملاقات ہوئی مولانا نے گاندھی جی سے کہا کہ اگر آپ ہمارے مطالبات منظور کر لیں تو پھر تمام مسلمان کانگریس کے شانہ بشانہ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔ گاندھی جی نے کہا کہ غیر مشروط طور پر شامل ہو جاؤ آزادی ملنے کے بعد یہ سب باتیں ہوتی رہیں گی۔ اور حقوق کی تقسیم ہو گی۔ لیکن ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔ مولانا یہ سن کر مایوس ہو گئے۔ اور انہوں نے کوشش شروع کر دی کہ تمام مسلمان مل کر کوئی لائحہ عمل مرتب کریں ——— لاہور ان دنوں قومی ہفتہ منایا جا رہا تھا۔ اس ہفتے کے دوران بہت کوشش کی گئی کہ روٹھے ہوئے محمد علی کو منایا جائے لیکن مولانا کی جو شرط تھی وہ ان کے لیے ناقابل قبول تھی اور مولانا غیر مشروط پر اب ساتھ ملنے کے لیے تیار نہ تھے۔

گول میز کانفرنس

۱۹۳۰ء میں گاندھی ارون پیکٹ ہوا اور طے پایا کہ لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے زعما شریک ہوں۔ مولانا محمد علی جوہر کا نام اس کانفرنس کے ممبروں میں سر فہرست آنا چاہیئے تھا لیکن مختلف گروہوں اور دہلی کے ایک مشہور معاند کی پیہم کوششیں جاری رہیں کہ مولانا اس کو

لیے منتخب نہ ہوں۔ لیکن وہ گول میز کانفرنس کیا ہوتی جس میں مولانا ممبر نہ ہوتے۔ بالآخر مولانا گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے نامزد کر لیے گئے اور آپ شروع اکتوبر بمبئی سے جہاز میں بیٹھ کر برطانیہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولانا ان دنوں بیحد علیل اور نہایت کمزور تھے۔ برطانیہ کا سفر تو بہت طویل تھا۔ اندرون ملک کی چھوٹے سفر کے بھی متحمل نہ ہو سکتے تھے لیکن ملک و قوم کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مولانا وہاں جا کر کس قدر مصروف رہے ہوں گے۔ مستعدی اور کارگزاری کی انتہا کر دی اخبارات کے ایڈیٹروں۔ وزراء۔ امراء اور سیاسی لیڈروں سے طویل طویل ملاقاتیں کیں۔ اور جب چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تو پھر چارپائی پر لیٹے لیٹے ٹیلی فون کرتے رہے۔

شیر کی آخری گرج

مولانا کے ضعف و نقاہت کا حال معلوم ہو چکا ہے اتنی قوت نہ تھی کہ کھڑے ہو کر تقریر کر سکیں لہذا گول میز کانفرنس میں بیٹھے بیٹھے جو تقریر کی اس کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:۔

ڈیلی ہیرلڈ کا جواب

" جب میں اس ملک میں پہنچا تو یہاں کے ایک اخبار ڈیلی ہیرلڈ نے جس کے استحکام میں میں نے بھی حصہ لیا تھا میری تصویر شائع کی اور میری نسبت لکھا کہ میں نے اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا ہے"۔

" میری رگوں میں وہی خون ہے جس سے لارڈ ریڈنگ کی رگیں معمور ہیں۔ جنہوں نے مجھے قید کیا تھا میں سامی نسل سے تعلق رکھتا ہوں اور اگر لارڈ ریڈنگ نے صہونیت سے برگشتگی اختیار نہیں کی (قہقہہ) تو میں نے بھی اسلام کو ترک نہیں کیا۔ میں جہاں پہلے تھا وہیں اس وقت تک ہوں"

ضرورت ہے ایک انسان کی

میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ آپ ہمارے لیے کون سا دستور سیاسی تیار کرتے ہیں لیکن کاش! آپ کے پاس انگلستان میں ایک آدمی بھی ہو (یہاں آپ نے مشہور برطانوی مدبر لارڈ برک کے الفاظ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ۔ تجاویز کی ضرورت نہیں آدمیوں کی ضرورت ہے) جو درحقیقت انسان ہو اور جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے " اے خدا! ایسا انسان دے جو دل و دماغ اور ہاتھ رکھتا ہو وہ ان بعض بڑے آدمیوں کی طرح ہو جو ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں ایک شور و غوغا سے لبریز سرزمین میں ایک طاقتور آدمی کی ضرورت ہے وہ خواہ امیر ہو، خود مختار ہو، جمہوریت پسند ہو، کچھ بھی ہو، مگر ایسا ہونا چاہیے جو حکومت کر سکے اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرے" مجھے امید ہے کہ میرے قدیم دوست مسٹر میکڈانلڈ کم از کم اپنے نہیں اس حکمران آدمی کو ثابت کر دکھائیں گے اور وہ اپنی جماعت اپنے ضمیر، اپنی مردہ بیوی کی روح اور اپنے زندہ ملک سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کریں گے"

آزادی یا موت

آج جس ایک مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو، میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤنگا، میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے

مولانا کی یہ تقریر خاصی طویل ہے۔ شائقین کو اس کے لیے "سیرت محمد علیؒ" اور ان ایام کے اخبارات کے فائل مطالعہ کرنا چاہئیں۔

وفات

مولانا نے گول میز کانفرنس میں عجیب و غریب معرکۃ الآرا تقریر کی اور اس کے بعد ان کی صحت گرتی چلی گئی اور سنبھلنے کا کوئی امکان نہ رہا تاہم وہ کام کرتے رہے وفات کی رات سے پہلی شب ساری رات کام کرتے رہے۔ ہندو مسلم تعلقات کے متعلق ایک مفصل سکیم کی ترتیب دیتے رہے جو وزیر اعظم کو پیش کرنا تھی۔ مسودہ تیار ہو گیا تو آپ بے ہوش ہو گئے مولانا شوکت علی ایک دوست کو ملنے کے لیے انگلینڈ چلے گئے تھے ہوش میں آئے تو بوڑھے بھائی شوکت علی سرہانے بیٹھے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں مند گئیں۔ یوں ملک کی آزادی اور ملت اسلامیہ کے لیے ساری دنیا سے لڑنے والا مجاہد موت سے عاجز آ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تاریخ وفات ۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء

زاں راہ ہے کہ پیغمبر گذشت

مولانا کی وفات کی خبر ہندوستان پہنچنے پر پورے ملک میں کہرام بپا ہو گیا۔ جس کی مثال لانا مشکل ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مولانا کی تدفین کہاں ہو۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ لندن ہی میں دفن کر دئیے جائیں لیکن بیگم ملک لانے پر مصر تھیں اور خود ملک میں مختلف شہروں ۔ رام پور ۔ لکھنؤ ۔ اجمیر ۔ کلکتہ ۔ علیگڑھ اور دہلی سے علیحدہ علیحدہ دعوتیں آ رہی تھیں کہ ہمارے شہر کو یہ استحقاق حاصل ہے۔ لیکن ہوا کیا اسے ہم "سیرت محمد علیؒ" کے اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

"لیکن بیت المقدس کی سرزمین نے اپنے مقدس بازوؤں کو پھیلایا اور محمد علی سے کہا تیری ساری زندگی اور ساری جد و جہد، تیری دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے تھی، دیکھ یہ برگزیدہ انبیاء اور مرسلین کے جسد پاک اور بے شمار اولیاء مقبولین کے اجسام مطہرہ میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ آ میں تجھے ایک گوشۂ عافیت اسی سرزمین یمن و سلام کا دیتی ہوں بول منظور ہے ؟ محمد علی کی روح مسکرائی اور آگے بڑھی مسجد عمر نے اپنا سینہ شق کیا اور محمد علی اس میں سما گیا۔ کیا قسمت تھی"!

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے

آپ کا تابوت ایک جہاز کے ذریعے مصر لایا گیا۔ وزیر اعظم اور مشائخ پورٹ سعید پر استقبال کے لیے موجود تھے شہزادہ محمد علی نے غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا تابوت پر رکھنے کے لیے مرحمت فرمایا۔ آپ کا کفن خالص کھدر کا تھا۔ قاہرہ سے آپ کا تابوت بیت المقدس پہنچایا گیا اور بعد از جمعہ نماز جنازہ پڑھ کر آپ کو دفن کر دیا گیا۔

قابل رشک

مولانا کی وفات پر مشاہیر عالم، پریس اور ملک و ملت نے جو خراج عقیدت ادا کیا اس کا کچھ حصہ بھی خاصا طویل ہو سکتا ہے۔ شروع میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ۔ علامہ اقبالؒ کا تاثر قلمبند کیا جا چکا ہے۔ آخر میں صرف سید سلیمان ندویؒ کا رقت انگیز تاثر ملاحظہ کیجیے۔

تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے غمزدہ، بلقان کیلئے اشکبار، شام پہ گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختۂ غم اور بیت المقدس کے لیے وقف الم،

اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلام کے چپے چپے پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے"

بیان ـــ مقدمہ کراچی

"ایک حامیٔ عدم تعاون کی حیثیت سے میں نے اس عدالت کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے بجز اس مقدمہ کے کہ اس مقدمہ کے سمجھنے کی کوشش کروں جس کی حقیقت کے چہرے سے روز بروز پردہ اٹھ رہا ہے میں نے اس امر کو گوارا کیا کہ استغاثہ اپنے مطلب کے لیے جو شہادت چاہے پیش کرے۔ میں نے اس کے جواز یا عدم جواز کے متعلق کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ میں نے آپ کے اصول شہادت کے مطابق کارروائی میں نہیں کی نہ کسی گواہ پر جرح کی اور اپنے دوست سرکاری وکیل کو اجازت دی کہ جب اسے کوئی جواب اپنی منشا کے مطابق نہ مل سکتے تو وہ جرح کرے۔ حامیان عدم تعاون کی حیثیت سے ہم عدالت کی کارروائی میں جو حصہ لے سکتے ہیں وہ صرف اسی قدر ہے کہ ہم عدالت کے سامنے بیان پیش کریں جو واقعات پر مشتمل ہو اور یہ بھی اپنی بریت کی غرض سے نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ جو لوگ واقعات سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں وہ کشمکش پیچ میں نہ پڑ جائیں۔

جہاں تک کہ موجودہ مقدمہ کا تعلق ہے مجھے اس بیان کی بھی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی میرا مقصود صرف اسی قدر ہے کہ میں ان غیر ضروری گواہیوں کی بیکار باتوں کا قصہ ختم کردوں جو لائے گئے تو اس غرض سے ہیں کہ حقیقت کا انکشاف ہو لیکن ممکن ہے کہ حقیقت کے چہرہ پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

میں اپنے بھائی اور دیگر اصحاب کے ساتھ کراچی میں آیا۔ میں بیشک کینا شالہ میں کوئی بیس اور آدمیوں کے ساتھ فروکش ہوا اور جب تک وہاں رہا ہزاروں لوگ وہاں دن اور کبھی کبھی رات کے وقت کینا شالہ میں آتے جاتے رہے۔ جس سے مجھے اور دوسرے بھائی کو بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن ایسی تکلیف انسان کو گوارا کرنی چاہئے چونکہ یہ قید خانہ نہ تھا اس لیے مجھے اس امر کے تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں کہ میں کینا شالہ سے چلا گیا اور بعض اوقات اپنے بھائی کے ساتھ اور تنہا کینا شالہ میں واپس آتا رہا۔ میرے دوست ڈاکٹر کچلو شاذونادر ہی میرا ساتھ دیتے کیونکہ وہ پراونشل اور لوکل معاملات میں بہت منہمک رہتے تھے۔ میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ڈیڑھ بجے رات کے کبھی واپس نہیں آیا جیسا کہ ایک بچارے گواہ نے اپنی شہادت میں بیان کیا ہے اور شاید اس لئے کہ اس کی ڈیوٹی رات کے بارہ بجے سے شروع ہوتی تھی اور اسے اپنی کچھ کارگزاری دکھانی مقصود تھی اس وقت کہ چاروں طرف خاموشی کا عالم چھایا ہوا تھا میں اپنے بھائی سے سازش کر رہا تھا یعنی میں لفظی معنوں میں اپنے بھائی سے اس وقت سازش کر رہا تھا جبکہ وہ خوب گھری نیند

میں سویا پڑا تھا۔ لیکن خراٹے نہیں لے رہا تھا۔ میں بھی اسی حالت میں تھا۔ گویا اس غرض سے نہیں سویا تھا۔ کہ نیند کی حالت میں میرے منہ سے دفعۃً ہائے کا سانس نکلے۔ سازش کی جو کھچڑی ہم پکاتے ہیں وہ ہم بالعموم دن کی روشنی میں پکاتے ہیں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں کراچی کی خلافت کانفرنس کا صدر نشین تھا۔ انگورا گورنمنٹ سے جنگ کے چھڑ جانے کے متعلق قرار داد کا مسودہ میں نے ہی مرتب کیا تھا جیسا کہ ضلع بلگام میں گوڈل کانفرنس کے موقعہ پر ایسا مسودہ مرتب کیا گیا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے یہ قرارداد کانفرنس میں پڑھی اور میں نے اپنے محترم آقا مولانا حسین احمد مہاجر مدنی کی خدمت میں بغرض تجویز پیش کی (یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے پیغمبر خدا کے روضہ مبارک کی طرف جس پر خدا کی رحمت اور برکت ہو ہجرت کی) میں نے اس قرارداد کے متعلق کارروائی ختم کرنے سے پہلے اپنی تقریر کے خاتمہ پر ان لوگوں سے جو قرارداد کے حق میں تھے اور جو درحقیقت ہمارا ایک مقدس فرض تھا درخواست کی کہ وہ کھڑے ہو جائیں اور اپنی اس تائید کی شہادت پیش کریں۔ لیکن جیسا کہ ہر گواہ نے جھوٹ بولا ہے صرف یہی قرارداد نہیں تھی جو کھڑے ہو کر پاس کی گئی۔ کم سے کم دو اور قرار دادیں اسی طرح پاس کی گئیں اور اخبارات میں ان کی اطلاعیں بھیجی گئیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیوں ان گواہوں نے بیفائدہ جھوٹ بولا ہے۔

مسلمان کی حیثیت میں اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور صراط مستقیم سے میرا پاؤں ڈگمگا جائے تو مجھے میری غلطی کا یقین دلانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ میرے عمل و فعل کے خلاف قرآن مجید یا نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مستند حدیث پیش کی جائے۔ یا زمانہ ماضی و حال کے مسلمہ علمائے اسلام کے وہ مذہبی فتاوے دکھائے جائیں۔ جو احکام اسلام کے انہی دونوں ماخذوں یعنی قرآن و حدیث پر مبنی ہوں۔

میں دعویٰ کرتا ہوں کہ آج میں غلطی پر نہیں ہوں۔ کیونکہ قرآن و حدیث موجودہ حالات میں مجھ سے ایسے عمل کے مقتضی ہیں جس کی پاداش میں آج وہ حکومت جو شیطانی حکومت کہلانا پسند نہیں کرتی مجھے گرفتار کئے بیٹھی ہے اگر میں اس عمل سے غفلت کروں تو گنہگار ہوا جاتا ہوں اور اگر غفلت نہ کروں تو مجرم ٹھہرتا ہوں۔"

ایسی حالت میں کیا میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ میں اس ملک میں محفوظ ہوں، اگر میں برطانی وزیر اعظم کو پسند کروں یا وزیر ہند اور ویسرائے کو عزیز رکھوں تو مجھے یا تو گنہگار بننا پڑے گا یا مجرم بننا پڑے گا۔ لیکن میں اس عجز و درماندگی کے باوجود ملائکہ کی طرف ہونا چاہتا ہوں۔ اسلام صرف ایک شہنشاہی کو تسلیم کرتا ہے۔ اور وہ شہنشاہی خدا کی ہے جو سب سے عالی و رفیع قطعی اور غیر مشروط حکمرانی ہے اور جس میں کسی قسم کے اختلاف یا مخالفت کا دخل نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھی قیدیوں سے جو

گفتگو کی وہ قرآن کے بارہویں پارہ میں اس طرح مذکور ہے۔

اے میرے ساتھی قیدیو۔ کیا متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک واحد القہار خدا اچھا ہے تم اس کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش نہ کرو جنکے نام تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے مقرر کر رکھے ہیں۔ خدا کی حکومت کے سوا اور کوئی حکومت نہیں اس نے تمہیں حکم دیا ہے کہ صرف اس کی عبادت کرو۔ یہی دین قیم ہے لیکن اکثر لوگ اسے نہیں سمجھتے۔"

میں دیکھتا ہوں۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ ارشاد آج پہلے سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ آج کل کی حالت تو یہ ہے کہ جب ایک صوبیدار میجر کے پاس قرآن کی ایک آیت اور رسول خدا کی حدیث پہنچتی ہے۔ جس میں اسے فرض کی اطلاع دی جاتی ہے جو خدا کی طرف سے اس پر عائد ہوتا ہے تو وہ گھبرایا اور بوکھلایا ہوا بھاگا بھاگا اپنے کمان افسر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ خدا کی اس شہنشاہی کا اعلان وقتاً فوقتاً مختلف قوموں میں بھیجا جاتا رہا۔ اور جب محمدؐ الرسول اللہ نبی آخر الزماں تمام بنی نوع انسان کو خدا کی رحمت کا آخری پیغام سنا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو حضورؐ کے بعد حضور کے خلفا یعنی جانشین مقرر ہوتے رہے۔ جنکا لقب "امیر المومنین" ہوتا تھا۔ ہمارے عقیدے کے مطابق موجودہ امیر المومنین اعلیحضرت سلطان المعظم ترکی ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان کو خواہ وہ مصافی ہو یا غیر مصافی کسی مسلم حکومت کے ماتحت رہتا ہو یا غیر مسلم کی رعایا ہو۔ قرآن مجید کا حکم یہی ہے کہ خدا و رسول کی فرمانبرداری کرے اور اولی الامر منکم یعنی مسلمان بادشاہوں کی اطاعت کرے۔ جن میں سب سے بڑا بادشاہ جانشین رسول اور امیر المومنین ہے لیکن، خدا اور رسول کی اطاعت تو قطعی و حتمی ہے۔ اور خلیفہ کی اطاعت خدا اور رسول کے بعد مشروط طور پر فرض ہے۔ قرآن مجید کی چوتھی سورت "النسا" میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ" اے ایمان والو خدا۔ اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اور اس کی اطاعت کرو۔ جو تم میں سے اولی الامر ہو۔ لیکن جب تمہارے درمیان کسی معاملے پر تنازع ہو جائے تو خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ تم خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھو۔ کیونکہ یہی عمدہ اور احسن تاویل ہے۔"

اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر امیر المومنین جانشین رسول کریمؐ بھی کسی مسلمان کو ایسا حکم دیں جس کی تعمیل پر وہ آمادہ نہ ہو۔ تو اسے نہ صرف یہ حق حاصل ہے۔ بلکہ اس پر واجب ہے کہ جو اختلاف اسے دنیا کے سب سے بڑے حاکم کے حکم کے متعلق ہو اس کی نسبت قرآن مجید اور رسول کریمؐ کی مستند احادیث کو ثالث بالخیر بنائے۔ یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ جو کلمہ طیبہ یعنی" لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ" میں مرموز ہے۔ یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ یہ عقیدہ توحید کوئی ریاضی یا منطق کا دعویٰ نہیں جو پیچیدہ اندیش فلسفیوں نے وضع کیا ہو۔ بلکہ ہر عالم و جاہل مسلمان کا عام اور معمولی عقیدہ ہے اسی عقیدہ کی وضاحت و پاکیزگی آزمانے کے لیے۔ ایک

دفعہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد میں بر سر منبر مسلمانوں سے استفسار کیا تھا۔ کہ میں جو خلفائے رسولؐ میں سب سے بڑا فاتح تصور کیا جاتا ہوں اگر تم کو کوئی ایسا حکم دوں۔ جو خدا کے اور رسولِ خداؐ کی احادیث کے خلاف ہو تو تم کیا کرو گے؟

لیکن یہ ایک اصول مسلمہ ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں۔ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے دنیاوی حکمرانوں کے صرف وہی احکام مان سکتے ہیں۔ جن کی ذیل میں خدائے تعالےٰ کے احکام کی نافرمانی کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔ کیونکہ خدائے تعالےٰ قرآن مجید کی اصطلاح میں احکم الحاکمین اور شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ اطاعت کی یہ واضح اور قطعی حدود صرف غیر مسلم حکومت ہی پر منطبق نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس کے برعکس ان کا اطلاق ہر جگہ ہونا لازمی ہے۔ اور ان حدود و قیود میں کسی قسم کا اضافہ یا کسی قسم کی تخفیف نہیں ہوسکتی۔ یہاں تک کہ اعلیحضرت حضور نظام دکن۔ اعلیحضرت نواب صاحب رامپور۔ بلکہ خود جلالتمآب حضرت سلطان المعظم ترکی بھی اپنی مسلمان رعایا سے اپنے کسی ایسے حکم کی تعمیل کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔ جو اسلامی احکام کے خلاف ہو۔ اس اصول اسلامی کی توضیح و تشریح میں رسول اکرمؐ کی بہت سی مستند احادیث موجود ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔" مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ حکم سنے اور تعمیل کرے۔ خواہ وہ حکم اس کے نزدیک دلپسند ہو یا نہ ہو لیکن شرط یہ ہے کہ اس حکم کا کوئی منشا ایسا نہ ہو جس سے خدا تعالےٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ اگر مسلمان کو کوئی ایسا حکم دیا جائے۔ جو خدا کی مرضی اور خدا کے حکم کے خلاف ہو تو اس پر نہ اس حکم کا سننا فرض ہے۔ نہ اس کی تعمیل واجب ہے۔ تعمیل و اطاعت اسی حکم کا لازم ہے جو تقویٰ پر مبنی ہو۔

یہی خیال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث میں ظاہر کیا گیا ہے جس کی منطق لاجواب ہے، فرمایا" کسی مخلوق کی اطاعت واجب نہیں۔ جبکہ اس اطاعت میں خالق کی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہو"

ہم پر خدائے تعالےٰ کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے تھے اور سلطنت کی طرف سے بھی لیکن آخر کار برطانیہ کی حکومت شاہی کے مطالبات اور خدائے حی و قیوم کی ربوبیت عامہ کے احکام میں تصادم ہونے لگا تو ہمارے ذمے صرف وہی فرائض رہ گئے۔ جو خدا کی طرف سے عائد ہوتے تھے ایسی حالت ہم صرف خدا ہی کے حکم کی تعمیل کرسکتے تھے۔ چنانچہ اپنی حقیر طاقت اور ہیچ کارہ استعداد کے مطابق اس تعمیل کی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ مسلمان کی نفرت و محبت کا سرچشمہ خدا کی خوشی اور ناخوشی ہے۔ کما قال رسول اللہ صلعم الحب للہ والبغض للہ"

اگر ہندوستانی مسلمانوں کے پاس حکومت سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ایک طاقتور فوج موجود ہوتی۔ اور اگر وہ سچے اور مخلص مسلمان ہوتے۔ تو آج اسلام کے قانون سے مجبور ہوکر حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کرتے۔ اور ہمارا یہ جھگڑا اخلاق دنیا طلل میں نہیں بلکہ

کسی اور مقام پر فیصل ہوتا جب بد قسمتی سے ایسی طاقت اور ایسی فوج میسر نہ ہو تو احکام اسلامی کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے جتنے ہجرت کی استطاعت رکھیں وہ کسی محفوظ ملک میں چلے جائیں جہاں کوئی سرکاری استثنا نے مذہب کی توہین و ہتک نہ کر سکیں۔ اس کے بعد جب ان کا ملک اس قابل ہو جائے یا وہ اپنے ملک کو اس قابل بنالیں کہ وہاں خدا کی عبادت بے خلل کی جا سکے۔ تو انہیں اختیار ہے کہ اپنے ملک کو مراجعت کر آئیں۔

یہ وہ کفر ہے جس کے لیے حکومت مسلمانوں کو اب ایک دعوت دے رہی ہے اور جب ہم مسلمانوں کو اس نازک موقعہ پر ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک نصیحتیں سناتے ہیں تو وہ حکومت جو پیغمبر اسلام کی آخری وصیت (یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو) کے لیے ہم یہ چاہتی ہے کہ ہم وصیت کی پرواہ نہ کریں۔ ہمیں گرفتار کرتی ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ تمام برطانی حکمران ہمیشہ یہی اعلان کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے اعتقادات اپنے مذہب کے احکام کو ہم پر عاید کرنے کا نہ حق رکھتے ہیں اور نہ یہ ان کی تمنا ہے۔

میں صرف ایک اور امر حق کا ذکر کروں گا جس سے شرح اسلام سب پر روشن ہو جائے گی ہندوستان کے غدر کا باعث جس کے بعد ملکہ معظمہ کا اعلان شاہی نافذ ہوا۔ یہ تھا کہ کارتوسوں پر چربی لگی ہوئی تھی جس کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے کہ گائے اور سور کی چربی تھی۔ لیکن مقتدر فقہ اسلام کے خیالات کے مطابق جو میں پیش کر سکتا ہے۔

> مسلمان کو اجازت ہے کہ اس کی زندگی معرض خطر میں ہو تو وہ سور کا گوشت کھالے۔ یہ ہی نہیں بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ اگر جان بچانے کی پرواہ نہ کر کے وہ ایسی حالت میں سور کے گوشت کھانے سے انکار کرے گا تو وہ گنہگار کی موت مرے گا لیکن اگر اس کی معرض زندگی خطرہ میں ہو اور وہ خطرہ اس طرح ٹل سکتا ہو کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے تو وہ مر جائے اور مسلمان کے قتل سے انکار کر دے ایسے حالات کی موجودگی میں وہ اسلام کو ترک کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دل سے مومن ہو لیکن مسلمان کو ہرگز ہرگز قتل نہ کرے۔

بایں ہمہ وہ حکومت جو اس درجہ نازک دماغ ہے کہ فوج کے بھرتی ہونے سے پہلے سپاہیوں سے پوچھ لیتی ہے کہ وہ چیچک کا ٹیکہ لگوانے پر راضی تو نہیں کریں گے۔ مسلمان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ سور کا گوشت کھالے یا کافر ہونے سے بدتر فعل کر دکھائے۔ اگر مذہبی آزادی کی ڈینگ اور نام بادشاہوں کے اعلانات شاہی کی کچھ قدر و قیمت ہے تو ہم نے حالات موجودہ میں مسلمان سپاہیوں کو فوج کی ملازمت ترک کرنے کی دعوت دے کر ایک مذہبی اور قانونی فرض پورا کیا۔ اس لیے نہ ہم خدا کے گنہگار ہیں اور نہ حکومت کے مجرم۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے ۔۔۔ پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ؓ ابن علی ؓ کو ۔۔۔ خوش ہوں وہی پیغام بقا میرے لیے ہے
میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا ۔۔۔ سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے ۔۔۔ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ۔۔۔ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
ہیں یوں تو فدا ابرِ سیہ پر سبھی میکش ۔۔۔ پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لیے ہے

مؤرخ اسلام حضرت مولانا سید محمد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۰۲ھ
۱۸۸۴ء

۱۳۷۳ھ
۱۹۵۳ء

عکس تحریر

سید سلیمان ندوی رح

مکرمی   السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۶ جون کا جواب ۲۳ جولائی کو اتنا
ہر چند آئینِ اخلاق سے دور ہے، مگر چند سال سے یہ عذر کیا ہے کہ
ڈھائی مہینے گرمیوں کے کسی کوہ دامن میں بسر کروں جو تمدن جدید کی
رعنائیوں سے خالی ہو، چنانچہ یکم مئی سے ۱۵ جولائی تک وہیں بسر ہوا
اسی زمانہ میں عنایت نامہ آیا،
مشرقی صاحب کے تذکرہ پر تبصرہ میں نے لکھا تھا جو زمیندار میں
چھپا تھا اور شاید مولانا قاسمی صاحب نے چند رسالوں کے ساتھ اس
مضمون کو بھی چھاپا ہے، ان سے طلب فرمائیے، میرے پاس نہیں
یہ صاحب سرحد سے بھی آگے ہیں، اور کم از کم تذکرہ کا فلسفہ
ایسی جہالت کی بنیاد پر قائم ہے جس کا ڈھانا ہر سمجھدار مسلمان کا
فرض ہے، باقی مسلمانوں کی عسکری تنظیم کے متعلق سے مجھے اختلاف
نہیں، سطح اتنی ساکن ہے کہ اس میں حرکت پیدا کرنے کے لیے کوئی
نہ کوئی تنظیمی قوت جو غیر استبدادی عسکریت پر مبنی ہو بعید
ضروری ہے

والسلام   سید سلیمان   ۲۳ جولائی ۱۹۳۹

خالد یزمی ایم اے
(عربی۔ علوم اسلامیات۔ اردو)

علامہ سید محمد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نام ونسب

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا اصلی نام انیس الحسن تھا اور یہ نام ان کی پیدائش پر ان کے دادا نے تجویز کیا تھا اُن کی کنیت ابوالنجیب تھی۔ بعد میں رنگون کے ایک تاجر سلیمان کے نام سے متاثر ہو کر اہل خانہ انہیں سلیمان کہنے لگے۔ جب مولینا خود سن شعور کو پہنچے تو انہوں نے اپنا نام سید سلیمان بتانا اور لکھنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ان دنوں پانچ سلیمان یکجا ہو گئے۔

شاہ سلیمان پھلواری۔ (مشہور عالم، واعظ اور صوفی)

قاضی سلیمان منصورپوری۔ (مصنف "رحمۃ للعالمین" صلی اللہ علیہ وسلم)

مولانا سلیمان اشرف (سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سر شاہ سلیمان (سابق صدر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

اور ہمارے زیرِ موضوع سید سلیمان۔

سید سلیمان کہنے سے بعض اوقات اوپر کے ناموں میں سے کسی ایک کے ساتھ التباس کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لئے پہلے مولانا مرحوم نے اپنے نام کے ساتھ اپنی علاقائی نسبت دلیسنوی کا اضافہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ لفظ اُن کے دل سے اتر گیا۔ اور وہ ندوہ کی نسبت سے ندوی ہو گئے اب کا نام ہمیشہ کے لئے سید سلیمان ندوی ہو گیا۔

سید سلیمان ندوی مرحوم نسب کے اعتبار سے ودھیال کی طرف سے "حسینی" اور ننہال کی طرف سے "زیدی" سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاندان اور وطن

وصدیوں سے زائد عرصہ گذرا کہ اُن کے اجداد جزیرۃ العرب سے نکل کر سندھ کے ساحل پر اُترے اور یہاں سے اجمیر کے راستے یوپی سے گذر کر بہار کو اپنا مسکن بنایا۔ علامہ مرحوم کا وطن بہار کے ضلع پٹنہ میں دیسنہ کا علاقہ ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے رسالہ "ریاض" کے سلیمان نمبر میں "سید الملت کی مکتبی زندگی" کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے اُس میں ان کے وطن کے بارے میں جو الفاظ لکھے ہیں، اُن سے ہماری بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

" علامہ سید سلیمان ندوی غفراللہ لہٗ صوبہ بہار کے مشہور و معروف قریۃ السادات والملوک " دسنہ " میں پیدا ہوئے جو سادات کرام کے وطن و مسکن ہونے کے بعد اطراف و نواح کی ممتاز بستیوں میں شمار ہوتا رہا۔ عموماً اہل علم اور صاحب دل بزرگوں کو ہر زمانہ میں اسی بستی میں ہم پاتے ہیں "

سید صاحب کے والد ماجد مولینا حکیم سید ابوالحسن (متوفی ۱۳۳۵ھ) ایک ممتاز و متبین عالم دین تھے۔ وہ ریاست "اسلام پور" میں شاہی

بیں بڑے مسلہ

طبیب تھے اور سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ کامل تھے۔ اُن کا ظاہر باوقار اور اُن کا باطن تقوی کا آئینہ دار تھا۔ سید صاحب کی والدہ ماجدہ بھی ایک عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ اور بڑے بھائی مولینا سید ابو حبیب (متوفی ۱۳۴۴ھ) اُن سے عمر میں اٹھارہ سال بڑے تھے انہیں بھی سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت لینے کی اجازت تھی۔

1884

پیدائش

سید سلیمان ندوی (مرحوم) جمعۃ المبارک ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ (مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء) کو صبح کے وقت پیدا ہوئے اُن کی پیدائش پر اُن کے جدِ امجد (حکیم محمدیؒ) کو خاص طور پر بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے فرطِ مسرت میں ذیل قطعہ موزوں فرمایا:۔

سید حسن ہست فرزندِ من — شدہ نام بوالحسن نام نیکوخصال
خدایش عطا کرد نورِ بصر — کہ یعنی پسر شد بہ حسن و جمال
بہ شہرِ صفر چوں شدہ بود سنہ — جواں بخت آمد چو ماہ ہلال
بروزِ آدینہ بوقتِ سعید — بیامد مثالِ گلِ نونہال
ز آزار و آشوبِ چشم بدش — نگہدارش آں ایزدِ لایزال
بدولت قوی باد و عمرش دراز — کند شادمانی بہ ہر ماہ و سال
بہ اقبال و دولت کند سروری — سرِ دشمنانش شود پائمال
نہادیم نامش "انیس الحسن" — بود حافظش حضرت ذوالجلال
چو جستیم تاریخ او از خرد — یکا یک سروشے ز تاریخ و سال
بگفتا کہ بے داد شد مصرعہ
شدہ مہر تاباں ز برجِ کمال

سنہ ۱۳۰۲ھ

عہدِ طفولیت

سید سلیمان ندوی (مرحوم) سنِ شعور کو پہنچے تو انہیں ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے کچھ عرصہ تک گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ ان کے اپنے گھر کا ماحول علمی و دینی تھا۔ اُن کے برادرِ بزرگ ابو حبیب مجددی نے انہیں بعض ضروری کتب پڑھائیں اور کبھی کبھی پیرِ طریقت کی حیثیت سے انہیں اپنے حلقۂ توجہ میں بھی بٹھاتے تھے۔ سید صاحب نے اپنے ان بڑے بھائی کے بارے میں فرمایا ہے :۔

"میں اپنے بھائی صاحب کے فیضِ صحبت سے اپنے قلب میں پاکی محسوس کرتا تھا"

یہ گویا ابتدا تھی، جس کی تکمیل بعد میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھوں انجام پائی۔ سید صاحب کے بزرگ مولانا ابوحبیبؒ وعظ و تلقین کے سلسلہ میں شاہ محمد اسمٰعیل شہید کی شہرۂ آفاق کتاب "تقویۃ الایمان" کو خاص طور پر نظر رکھتے تھے علامہ مرحوم کو بھی یہ کتاب، عہدِ طفولیت ہی میں دی، وہ اس کتاب کی خالص توحید و سنت کے مطابق تعلیمات سے استفادہ...

تھے کہ انہوں نے ایک بار ان الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا :۔

"یہ (تقویۃ الایمان) پہلی کتاب تھی، جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں ۔ اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی اور ابنِ رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ قائم رہی ۔"

باقاعدہ تعلیم

سید صاحب اپنے برادر بزرگ سے ابتدائی تعلیم اور بنیادی تربیت پا کر اپنے والد ماجد کے پاس اسلام پور پہنچے۔ کچھ کتابیں یہاں رہ کر ختم کیں ۔ اس کے بعد پھلواری (پٹنہ) کی خانقاہِ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین (سجادہ نشین خانقاہِ پھلواری) سے کچھ اور کتابوں کی تکمیل فرمائی ۔

اس ماحول میں ان کی توحید پسندی کے بعض قابلِ ذکر واقعات دیکھنے میں آئے کہ وہ اس دوران خانقاہ کی بعض غیر شرعی رسوم اور ہفتہ وار قوالیوں سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ۔ یہاں کے بارے میں ایک بار انہوں نے یہ بات اپنے ایک ارادت مند کو بتائی :

" جو رنگ بھائی صاحب کی مجالس میں چڑھ چکا تھا، اُس کا اثر یہ تھا کہ طبیعت کو یہاں کے رسوم سے ذرا بھی مناسبت نہ ہو سکی ۔"

پھلواری کے بعد سید صاحب کو مدرسہ امدادیہ (دربھنگہ) بھیج دیا گیا ۔ جہاں انہوں نے ایک سال تک رہ کر درسِ نظامیہ کی بعض اور کتابیں ختم فرمائیں ۔

سید صاحب عہدِ طفولیت کے ایام میں بھی نہایت متین اور خاموش طبیعت تھے ۔ مولینا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اُن کے ایک ہم درس مولوی سید محمد حنیف کی یہ روایت نقل کی ہے کہ :۔

"ایامِ طفلی ہی سے فطرتاً سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے ۔ بچوں کی عام شرارتوں سے اُن کی طبیعت کو جبلّتہً کسی قسم کی کوئی مناسبت نہیں تھی ۔ اِس لئے شرارت وغیرہ کے قصّوں میں سید الملّت تنبیہ کے بہت کم محتاج تھے ۔"

اُن کے بارے میں اُن کے ایک اور ہم درس اور بے تکلّف ساتھی مولوی جواد علی خان کہتے ہیں :۔

" اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے ۔ کبھی کلام یا لب و لہجہ سخت نہ ہوتا ۔ درسی کتابوں کی تکرار میں لب و لہجہ البتہ زوردار ہوتا ۔ اور بیان کی قوت و روانی سے شرکاء کے دل پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا ۔ متانت ہر انداز پر غالب رہتی کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے ۔ بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے ۔ اس میں بھی متانت قائم رہتی ۔ کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے مگر زبان پر قابو رہتا ۔"

سید صاحب کے گھر کا ماحول تربیت کے سلسلے میں کچھ ضروری پابندیوں کا حامل تھا ۔ ان کے اطوار و عادات کی سنجیدگی میں اس ماحول کا بھی کافی حصہ معلوم ہوتا ہے ۔ ایک مثال ملاحظہ ہو :۔

ایک روز جب وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ دسترخوان پر کھانے میں مشغول تھے تو کھانا چباتے ہوئے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی ۔ اُن کے والد نے بے ساختہ ایک چپت رسید کر دی اور کہا کہ آدمی کے بچوں کو آدمی کے بچوں کی طرح کھانا چاہیئے ۔ کھاتے ہوئے منہ سے آواز تو کُتّے نکالتے ہیں ۔

ندوۃ العلماء

سیّد صاحب ۱۹۰۱ء میں ذہن وفکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل کرائے گئے جہاں سے انہیں پانچ سال تک حصولِ تعلیم کے بعد ۱۹۰۶ء میں فراغ و تکمیل کی سند ملی۔

ماحول میں انہیں علامہ شبلی جیسے مشہورِ زمانہ ادیب، مؤرخ، متکلّم، فلسفی، محقق و مفکر کی تربیت و نگہداشت کا ماحول میسّر آیا۔ اس دارالعلوم میں قیام کے دوران میں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا اس میں بعض دیگر اساتذہ کرام کا بھی حصہ ناقابلِ نظر اندازی ہے۔

اس سلسلہ میں مولینا محمد فاروق چڑیا کوٹی، مولینا حفیظ اللہ مرحوم، مفتی عبداللطیف اور مولینا عبدالحیؒ فرنگی محلّی کے اسمائے گرامی خصوصاً ذکر ہیں۔

طالب علمانہ امتیاز

جس زمانے میں سیّد سلیمان ندوی مرحوم ندوۃ العلماء میں علم حاصل کر رہے تھے۔ اُن دنوں شاہ سلیمان پھلواری (مرحوم) مدرسے کے مہتمم وہ اگرچہ علامہ موصوف کے اساتذہ میں شامل نہ تھے لیکن وہ بھی اکثر ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ علامہ موصوف نے خود شاہ صاحب مرحوم کے ذکر میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ جو حسبِ ذیل ہے:-

"یاد ہے کہ اسی زمانے میں نواب محسن الملک (مرحوم) دارالعلوم ندوہ کے معاینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ شاہ صاحب نے مجھے اور میرے ہم درس مولینا ظہور احمد صاحب وحشی شاہجہان پوری کو امتحاناً پیش فرمایا تھا۔ میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ شاہ صاحب نے یہ کہہ کر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور آپ کو قصیدہ سنائیں گے۔ نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ یہ جب آپ کے عزیز ہیں تو میں امتحان نہیں لوں گا۔ کہ امتحان سے پہلے ہی ایمان لاچکا۔ شاہ صاحب نے فرمایا: یہ میرے ہم نام بھی ہیں۔ نواب صاحب نے فرمایا، تو اور بھی یہ امتحان سے بالاتر ہیں۔

میں نے اپنا قصیدہ پڑھا تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس پرانی ادب دانی کا قائل نہیں۔ عربی کا کوئی اخبار منگوایئے۔ اس کو یہ پڑھیں تو البتہ! اس زمانے میں اللواء اور المؤید عربی کے مشہور اخبار تھے۔ وہ منگوائے گئے۔ میں نے ان کو پڑھا اور صحیح ترجمہ کیا۔ تو بے حد خوش ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بے حد محظوظ ہوئے۔ اور اس زمانے کے وکیل۔ وطن اور کرزن گزٹ میں نواب صاحب کے اس معاینے کی جو کیفیت چھپوائی اس میں میرا ذکر خاص طور سے فرمایا:۔

یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا۔ ان کی اس تحریر میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ملک و ملّت کی خدمت کے لئے انشاء اللہ صوبہ بہار ہر دَور میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا۔" (یادِ رفتگان صفحہ ۱۸۳)

عطائے سند

یہ حیرت انگیز واقعہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب "حیاتِ شبلی" میں اِن سطور کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

"یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے اس لئے بے اختیار نوکِ قلم پر آگیا ہے۔ اگر ناظرین کو اس سے خودستائی کی بو آتی ہو تو چشم پوشی فرمائیں۔"

"دارالعلوم ندوہ کو کھلے ہوئے نو دس برس گذر چکے تھے۔ مگر ابھی تک اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ، جس کا رواج ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہے، نہیں ہوا تھا۔ اس غرض سے مارچ ۱۹۰۶ء مطابق محرم ۱۳۲۴ھ میں رفاہِ عام لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسۂ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا غلام محمد فاضل ہوشیار پوری نے کی۔ جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے۔ اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی

نہایت اچھی تعداد شریک تھی جو دارالعلوم کے بلند بانگ دعووں کا امتحان لینا چاہتے تھے۔
مولینا شبلیؒ نے اس جلسے میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند محنتی طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لئے تیاری کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اس ضمن میں مولوی ضیاء الحسن علوی (رجسٹرار انسپکٹر مدارس عربیہ الٰہ آباد) نے "قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت" اور راقم نے "علوم جدیدہ و قدیمہ" کے موازنہ پر تقریر کی۔ اس تقریر کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسے کو تماشا گاہ اور سامعین کو آئینۂ حیرت بنا دیا۔ عین راقم کی تقریر کے اثنا میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کر لیں۔ مولینا حسب قاعدہ جلسے سے باہر چلے گئے تھے مولوی سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ "تم کر سکتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی۔ جلسے پر ایک سماں چھا گیا۔ مولینا کو یہ خبر باہر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ "اگر تم کو اس وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟" میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولینا نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے۔ اس رفع بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اس وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں۔ یہ اس پر تقریر کریں گے۔
چنانچہ موضوع کے تقرر کے لئے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا۔ جو اس زمانے میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے یہ موضوع مقرر کیا کہ
"ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی؟"
میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے۔ ہر طرف سے اَحْسَنْتَ اور آفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں۔ استاد مرحوم نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لئے طرۂ افتخار بن گیا۔"
(حیات شبلی۔ صفحہ ۴۵۶)
مذکورہ واقعے سے مولینا شبلی کا فرط مسرت و محبت ظاہر ہی ہے۔ مگر مولینا نے اپنے مایۂ ناز شاگرد کے کرشمۂ علمی و لسانی کی اطلاع مولینا حبیب الرحمٰن خان (شیروانی) مرحوم کو جن الفاظ میں فرمائی ہے۔ اُس سے تاثر کی انتہا ظاہر ہوتی ہے۔ شبلی لکھتے ہیں۔
"......سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اس وقت عربی زبان میں اس پر لیکچر دوں گا۔ غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل، فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی۔ تمام جلسہ محو حیرت تھا۔ اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہو گئی۔" (حیات شبلی صفحہ ۴۵۸)
مندرجہ بالا واقعہ جہاں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی عظمت و فضیلت کا ایک ناقابل تردید ثبوت ثابت ہوا وہاں اس کے بعد خود مولانا شبلیؒ کے دل میں اس شاگرد کی اہلیت و صلاحیت کے لئے بہت زیادہ اعتماد و اعتراف پیدا ہو گیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب زندگی کے آخری ایام میں مولانا شبلی مرحوم کو اس بزم رنگ و بو سے اپنے چل چلاؤ کا وقت نزدیک محسوس ہوا تو انہیں سب سے زیادہ اپنی معرکہ آرا تصنیف سیرت نبوی کی ناتمامی کا رنج اور اس کی تکمیل کی فکر تھی۔ انہوں نے کتاب کے تمام مسوّدات کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کرا دیئے اور تیمارداری میں مصروف عزیزوں کو یہ وصیت فرمائی کہ:۔
"یہ مسودے حمیدالدینؒ[1] اور سید سلیمان کے سپرد کئے جائیں۔ ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیئے جائیں"

---

[1] مولانا حمیدالدین فراہی مرحوم جو مولانا شبلی مرحوم کے ماموں زاد بھائی تھے۔

بس رفتہ ملتان

پھر انتقال سے تین روز پیشتر علامہ مرحوم کو پونا کے پتے پر تار دلوایا کہ فوراً چلے آئیں چنانچہ تار پہنچتے ہی علامہ موصوف اعظم گڑھ مضطربانہ آپہنچے۔ اس کے بعد کی کیفیت خود علامہ مرحوم کی زبان قلم سے سنیئے:۔

"آہ! جب ۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی میں سرہانے کھڑا تھا میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے مولینا نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ "اب کیا رہا" پھر زبان سے دوبارہ فرمایا! "اب کیا! اب کیا!!" لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ دیا۔ تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی، معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا:۔

"سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کردو۔"

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "ضرور! ضرور!!"

ان سطور سے استاد اور شاگرد کے ذہنی تعلق کی گہرائی اور گہرائی کا ایک حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ استاد کے دل میں اپنے شاگرد کا یہ مقام و مرتبہ یقیناً کی عظمت و فضیلت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سعادت مند شاگرد کو بعد میں یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ اس نے استاد کے نیک کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی مرحوم کی کتاب سیرت النبیؐ کی باقی جلدیں لکھ کر یہ بہت بڑا فریضہ سرانجام دے دیا۔

مختلف علوم کے حصول سے فارغ ہونے کے بعد چالیس برس کی عمر تک سید سلیمان ندوی (مرحوم) سرتا سر علمی، تحقیقی اور تصنیفی مشاغل میں مصروف رہے۔ اس بیچ اجتماعی امور و معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ اور اپنے مرکز توجہ کو بدلنے نہیں دیتے تھے۔ اور حتی الامکان اپنی علمی مشغولیات کو سیاسی امور پر ترجیح دیتے تھے ۱۹۲۰ء میں رئیس الاحرار مولینا محمد علی جوہر (مرحوم) کے اصرار پر وفد خلافت کے رکن خاص بن کر یورپ روانہ ہونے لگے تو انہوں نے ایک خط میں اپنے چچا مولینا عبدالحکیم [illegible]

"ڈر ہے کہ کہیں پالیٹکس میرے علمی مشاغل کو تہ و بالا نہ کر دے۔"

ان الفاظ سے یہ بات ظاہر ہے کہ انہیں اپنا منتہیٰ مقصد درس و تدریس کس قدر زیادہ عزیز تھا۔

علمی شہرہ

سید صاحب مختلف علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ انہیں "الندوہ" جیسے بلند پایہ خالص علمی ماہنامے کا نائب مدیر بنا دیا گیا۔ رسالے کی ادارت تو برائے نام تھی، اصل میں یہ ایک شعبۂ تصنیف و تالیف تھا۔ اس رسالے کا معیار اس قدر اونچا تھا کہ ملک کے چیدہ چیدہ اہل قلم کے مضامین ہی اس میں زیب اشاعت ہو سکتے تھے۔

سید صاحب کے معاصر شہیر مولینا عبدالماجد دریا آبادی نے اُن کے بارے میں لکھا ہے:۔

"نگاہیں جس شوق اور بے تابی سے مولانا شبلیؒ کی تحریروں کی منتظر رہتی تھیں، اس سے کچھ کم اشتیاق حضرت سلیمان کے بھی علمی افادات کا نہیں رہتا تھا۔" (صدق جدید ۲۲ جنوری ۱۹۵۴ء)

سید صاحب نے اس زمانے میں جس قسم کے مضامین سپرد قلم کئے۔ اُن کی اہمیت، دقت پسندی اور گوناگونی کا اندازہ آپ کے عنوانات ہی سے کر سکیں گے۔

• اشتراکیت اور اسلام • علم ہیئت اور مسلمان • اسلامی رصد خانے • مسئلۂ ارتقاء • برنابا کی انجیل • مکررات القرآن • ابن سعد کا تعارف • قیامت • ایمان بالغیب وغیرہ۔

سید سلیمان ندوی مرحوم کی علمی قابلیت و جامعیت کا اعتراف صرف اُن کے ہم پایہ یا علم میں اُن سے فروتر لوگوں ہی کو نہ تھا بلکہ خود مولینا شبلی اس سلسلہ میں اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء

میں اپنے خطبے میں برملا فرما دیا :۔

"ندوہ نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، صرف ایک سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے :"

اسی زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں جدید عربی اور علم کلام کے ایک اعلیٰ استاد کی ضرورت پیش آئی۔ مولینا شبلیؒ نے یہ اہم مسند درس اپنے اِسی جوان عمر لیکن پختہ علم شاگرد کے سپرد کر دی اور وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب بلاشبہ لاجواب تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب سید صاحب موصوف کی عمر صرف پچیس۲۵ برس کے لگ بھگ تھی۔

تدریس و تعلیم کا یہ سلسلہ وقفوں کے ساتھ عرصے تک جاری رہا۔ اِس دوران میں سید صاحب سے جن طلبہ نے علم حاصل کیا ان میں مولانا مسعود عالم ندوی۔ مولانا محمد اویس نگرامی اور شاہ معین الدین ندوی (مدیر معارف) کے اسماء سے شاید کوئی بھی تعلیم یافتہ ناواقف نہ ہو۔

ادارۂ "الہلال" میں شرکت

مندرجہ بالا بعض واقعات سے بہت پہلے ۱۹۱۲ء میں برصغیر کی سیاست میں اسلامی اتحاد کی تحریک پیدا ہوئی اُن دنوں امام الہند مولینا ابوالکلام آزاد کلکتہ سے اپنا شہرۂ آفاق رسالہ ہفتہ وار "الہلال" نکال رہے تھے۔ انہوں نے ان حالات میں سید صاحب کی معاونت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے الہلال کے ادارۂ تحریر میں شامل ہونے کے لئے زور دیا۔ مولینا آزاد کی اس خواہش و کوشش پر علامہ شبلی مرحوم نے خود سید صاحب کو یہی مشورہ دیا اور سید صاحب مولینا آزاد مرحوم کے ساتھ مل کر تحریر کے میدان میں علمی، ادبی اور سیاسی خدمات سرانجام دینے لگے۔

آج تک چار دانگِ عالم میں "الہلال" کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کا جو شہرہ ہے، بلاشبہ اُس میں سید سلیمان ندوی مرحوم کی کوششوں کا بھی ایک حصہ ہے۔

کچھ عرصہ بعد سید صاحب "الہلال" کی معاونت چھوڑ کر پونے میں درس و تعلیم کی غرض سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ادارت کا کام اس قدر متاثر ہوا کہ مولینا ابوالکلام آزاد ان الفاظ میں سید صاحب سے واپس چلے آنے کی درخواست کرنے پر مجبور ہو گئے۔

"آپ نے پونا میں پروفیسری قبول کر لی۔ حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے۔ خدا کے لئے میری سنیئے۔ آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت دل میں رکھتا ہوں۔ کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طلبہ کو عربی فارسی سکھلا دی۔ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں۔

آپ آکر "الہلال" بالکل لے لیجئے۔ اور جس طرح جی چاہے اسے "ایڈٹ" کیجئے۔ میں صرف اپنے مضامین دے دیا کروں گا اور کچھ تعلق نہ ہو گا۔ آپ مگا وہاں استعفا دے دیں اور کلکتہ چلے آئیں۔"

یہ اس طویل خط کا ایک حصہ ہے جو مولینا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۹ جنوری ۱۹۱۴ء کو سید سلیمان ندوی مرحوم کو لکھا تھا۔ دیکھئے مولینا آزاد ایسے نابغۂ روزگار اور عبقریٔ زمانہ کو سید صاحب کی معاونت کی کتنی ضرورت محسوس ہوئی۔ بلاشبہ سید صاحب کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ ورنہ ابوالکلام آزاد کسے خاطر میں لاتے تھے! "الہلال" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہونے کے زمانے میں سید صاحب نے جو مضامین سپردِ قلم کئے۔ وہ "مضامینِ سید سلیمانؒ" کے نام سے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان مضامین میں سے اُن دنوں جو خاص طور پر مشہور ہوئے اور اہلِ طلب علم نے ان سے معتدبہ استفادہ کیا۔ اُن میں حسب ذیل عنوانات کے مضامین بھی شامل تھے۔

الحریت فی الاسلام　تذکارِ نزولِ قرآن　حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق　تفصیص بنی اسرائیل　مشہدِ اکبر وغیرہ وغیرہ

علامہ شبلی کی جانشینی

نومبر ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ علامہ شبلی کا وقتِ آخر نزدیک سے نزدیک تر آ گیا۔ انہوں نے سید صاحب کو تار دے کر پونا سے طلب فرمایا اور ہمیشہ کے لئے اپنے لب اور آنکھیں بند کرنے سے پہلے انہیں نہایت شفقت و محبت سے اپنی زیر تکمیل علمی مہمات بالخصوص "سیرت النبی" کو مکمل کرنے کی وصیت فرمائی اور یہ عہد مستحکم کر کے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو اس بزم رنگ و بو کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیائے پائیدار کی طرف رحلت فرما گئے۔

اب علامہ شبلیؒ کی مسند خالی تھی۔ مگر کس کا حوصلہ تھا کہ اس شہ نشین کی طرف بڑھنے کی جرأت کرتا۔ اگرچہ سید صاحب موصوف ہر اعتبار سے اس منصب بلند کے اہل تھے لیکن انہی کو سب سے زیادہ استاد کی عظمت و فضیلت اور ان کی مسند کے احترام و وقار کا خیال تھا۔ آخر علامہ شبلی مرحوم کے وابستگان ارادت نے متفقہ طور پر استادِ مرحوم کی جانشینی کا تاج سید صاحب کے سر پر رکھا اور اس طرح گویا سید صاحب کی علمیت اور فضیلت کا برملا اعتراف کیا۔ یہ جون ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت سید صاحب دکن کالج پونا سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ پہنچ چکے تھے۔

دارالمصنّفین کی بنیاد

جب سید سلیمان ندوی اعظم گڑھ تشریف لائے تو یہاں ابھی تک "دارالمصنّفین" کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ کوئی ایک سال پہلے علامہ شبلی مرحوم نے اس کا نقشہ ضرور تیار فرمایا تھا لیکن یہ ایک تصوّر ہی تھا جس کا ابھی تک کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ صرف اور صرف سید صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک روز شبلی مرحوم کا خواب شرمندۂ تعبیر و تعمیر ہو گیا اور پھر اسے ترقی دینے کے سلسلے میں انہوں نے اپنے قلب و دماغ کی جملہ صلاحیتوں کو اس طرح مرکوز کر دیا کہ کچھ ہی عرصہ بعد علمی دنیا میں "دارالمصنّفین" اور اس کی علمی خدمات کا شہرہ دور و نزدیک پھیل گیا۔

سیاسیات سے گریز

"دارالمصنّفین" کے قیام کے بعد سید صاحب کے روز و شب پہلے سے بھی بڑھ کر علمی مشاغل میں صرف ہونے لگے۔ اس دور میں کچھ موقعوں پر بعض قومی رہنماؤں نے وقتاً فوقتاً انہیں سیاسی سرگرمیوں کی طرف دعوت دی لیکن سید صاحب حتی الامکان خارزارِ سیاست میں آنے سے اجتناب کرتے رہے۔ ورنہ اگر وہ سیاست کے میدان میں کبھی پوری طرح داخل ہو جاتے تو شاید ملک و قوم کی سیاسی رہنمائی میں بھی وہ چوٹی کا مقام حاصل کر لیتے۔ سیاسی سرگرمیوں سے بہت حد تک الگ تھلگ رہنے کی خواہش و کوشش کے باوجود اُن کے اکثر ہم عصر ان کی سیاسی بصیرت و فراست کے قائل و معترف تھے۔

ایک بار مہاتما گاندھی نے ان کے بارے میں کہا تھا۔

"یہ بڑا چاتر مولوی ہے۔"

کچھ مسلمان سیاست والوں نے بھی بعض موقعوں پر سید صاحب کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ اپنا دامن چھڑا لیتے رہے۔ سید صاحب نے ایک موقع پر سیاست کے بارے میں خود کہا تھا۔

"میں نے کبھی یہ خرقہ سے آلود خود نہیں پہنا۔ کبھی محمد علی (جوہر) نے پہنا دیا اور کبھی شوکت علی نے۔ اور جب کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا۔"

سیاسیات سے اس گریز کا سبب انہوں نے خود ایک بار ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا۔

"ڈپلومیسی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو دیانت دار مانا جائے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو اچھا اور دیانت دار سمجھا جائے۔ پھر اگر اس کی بددیانتی ثابت

ہو جائے تو اس سے قطع تعلق کیا جائے۔"

سید صاحب اسی بنا پر عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرتے رہے اور اگر مجبور ہو کر اس میں حصہ لینا بھی پڑا تو وہ زیادہ سے زیادہ مشورہ اور رائے کی حد تک تعاون کرتے تھے۔ اپنے اس مسلک کے بارے میں انہوں نے ازراہِ مزاح فرمایا تھا کہ۔

"بھئی! مجھے چیمبر پریکٹس تو آتی ہے، پبلک پریکٹس نہیں آتی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب سیاست کے اس مفہوم اور طریق کار سے گریز کرتے تھے جس میں فریب اور بد دیانتی کا شائبہ ہوتا ہے۔ بہرحال انہوں نے اپنی زندگی میں بعض ایسے کارہائے نمایاں بھی انجام دیئے جنہیں ہم ان کی شاندار ملکی و قومی خدمات قرار دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند واقعات درج ذیل ہیں۔

• سید صاحب نے ۱۹۱۷ء میں مجلس علمائے بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت فرمائی اور اس میں انگریزی حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود ایسا جرأت آموز خطبہ دیا جس سے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں سے انگریز کی مرعوبیت اٹھ گئی۔

• وہ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ کے اصرار پر وفدِ خلافت کے ساتھ علمائے ہند کے واحد نمائندے کی حیثیت سے یورپ تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔

• ۱۹۲۶ء میں سید صاحب نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس اجلاس کے شرکا میں اُستاذ العلما مولانا محمد انور شاہ کشمیری مرحوم ایسے جلیل القدر عالم دین بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں انہوں نے جو خطبۂ صدارت دیا۔ وہ مسلمانوں کی سیاست میں قابلِ یادگار رہے۔

• ۱۹۲۷ء میں انہوں نے انجمن حمایتِ اسلام کی دعوت پر "عہدِ رسالت میں اشاعتِ اسلام" کے عنوان پر تقریر فرمائی۔ اس اجلاس میں علماء و فضلاء کے علاوہ علامہ اقبال مرحوم ایسے مشاہیر بھی شامل تھے۔ جنہوں نے سید صاحب کی علمیت و فضیلت اور اہلیت و صلاحیت کا اعتراف فرمایا۔

ہندوستان کی آزادی اور متحدہ حکومت کی صورت میں جو مسائل پیدا ہو سکتے تھے اور جو خدشات پیش آ سکتے تھے، انہیں اپنی خداداد بصیرت و فراست سے بھانپ کر انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ

"سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیشِ نظر جو معاملات ہیں، اُن میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آئندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی، اصلاح اور استحکام کے لئے علیحدہ انتظام ہونا چاہیئے۔"

ان چند مثالوں سے اُن کی قومی و ملکی خدمات کے دائرۂ کار اور اُن کے مزاج و طبیعت کے مطابق اقدامات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حسن اخلاق سید صاحب مرحوم حسنِ اخلاق میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی کوشش کرتے تھے۔ حلم، غیرت، مروّت، حیا، تواضع، انکسار وغیرہ سب نیک اوصاف ان کی سرشت میں شامل تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک بار اپنی گفتگو میں اُن کے بارے میں گواہی دی تھی کہ:

"رذائلِ اخلاق بالطبع اُن میں موجود ہی نہ تھے۔"

پھر سید صاحب کی وفات پر مولانا دریابادی موصوف نے صدقِ جدید (۴ دسمبر ۱۹۵۳ء) میں جو پہلا تعزیتی مضمون سپردِ قلم کیا۔ اس میں

بھی لکھا تھا کہ:

"خدا ترسی، نرم مزاجی، فروتنی پہلے ہی سے تھی اور مروت کے تو گویا پتلے تھے۔ پھر تصوف کے اثر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا!"

سید صاحب مرحوم کے ایک اور دیرینہ رفیق مولینا عبدالباری ندوی نے تحریر کیا تھا:

"سید صاحب بطنی سید ہی نہیں، ماشاء اللہ بڑے بطنی سعید بھی تھے...... مرحوم معصوم نہ تھے لیکن اُن کی زندگی کا جو رُخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم و بیش ہر نوع کے سابقین میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خودرائی وخود پسندی دُور دُور نظر نہیں آتی تھی۔"

مولینا سعید احمد اکبرآبادی نے اپنے ایک طویل مضمون میں یہ سطور بھی لکھی تھیں:

"مولینا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ اُن کو مولینا سید سلیمان ندوی کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مِل گیا، جو وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی اور علم و فن میں استاد کا صحیح جانشین تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا۔ جو اس کا اپنا حصہ تھیں....... تشرّع، تدیّن بلکہ تقشّف اس کے قبائے علمی کا تکمۂ زرین تھا، جس کے باعث کسی مسئلے میں اختلاف کے باوجود جماعتِ علماء کو بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی۔ ان خداداد اوصاف و کمال کے باعث وہ جس محفل میں بھی بیٹھا، صدر بزم ہو کر رہا، جس انجمن میں بھی شرکت کی، شمعِ انجمن کہلایا۔"

آخر میں اردو کے صاحبِ طرز انشاپرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی کے قلم سے اُن کی عظمت کا اعتراف ملاحظہ ہو:

"سید صاحب کو کوئی مشتعل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی حال میں بھی برہم یا بے اختیار نہیں ہوتے تھے...... شکل و صورت، وضع قطع، چال ڈھال، ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دلآویز اور قابلِ احترام تھی۔ ان کو دیکھ کر اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے۔ رسوا نہ کریں گے۔ اور جب تک ساتھ رہیں گے۔ زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی۔"

ہم عصروں کی زبان اور قلم سے حسنِ اخلاق کے سلسلے میں اعترافِ عظمت بلاشبہ سید صاحب کی رفعت کردار کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ سید صاحب کے اخلاق و عادات میں جہاں اور متعدد اوصاف و محاسن موجود ہیں، وہاں ان کی علمی فراخدلی اور تحمل خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔ ان کی سیرت میں اس نوعیت کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

ایک شخص نے سید صاحب کے ایک تاریخی مقالے کا لفظ بہ لفظ جرمن زبان میں ترجمہ کر کے برلن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ کچھ عرصہ بعد افشائے راز کے اندیشے یا ضمیر کی خلش سے مجبور ہو کر ملک میں واپس آکر معذرت کا اظہار کیا۔ سید صاحب نے نہایت فراخدلی سے معاف کر دیا اور فرمایا:

"کچھ ہرج نہیں۔ میرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اور آپ کا فائدہ ہو گیا۔"

یہ قصہ ایک دنیا دار کا تھا۔ ایک دیندار کہلانے والے صاحب نے سید صاحب کی کتاب "رحمتِ عالم" کے عنوانات میں رد و بدل کر کے اسے "رحمتِ دو عالم" کے نام سے شائع کر دیا، اور اس پر کسی قسم کی معذرت کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اسی طرح ایک اور مشہور "اہلِ قلم" نے "سیرۃ النبی" کی پانچویں اور چھٹی جلدوں کا بہت سا مواد پیرایۂ بیان تبدیل کر کے اپنے نام سے چھاپ دیا اور اس میں سید صاحب کے ایک بھی حوالے کی ضرورت

میں بڑے مسلمان نہیں سمجھی۔ ممکن ہے اس قسم کی کچھ اور مثالیں بھی موجود ہوں۔ جن سے ایک بات ظاہر و باہر ہے کہ سید صاحب مرحوم کی ذاتِ گرامی علمی کمالات کے سلسلے میں اپنوں اور بیگانوں سب کے لئے افادیت کا موجب تھی اور ہے۔

حُبِّ رسالت

سید صاحب اس اعتبار سے واقعتاً نہایت خوش نصیب تھے کہ انہیں مولینا شبلی مرحوم کی شہرۂ آفاق تصنیف "سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کی تکمیل کا شرف حاصل ہوا۔ گویا جو سعادت علامہ شبلی کو آخر عمر میں حاصل ہوئی وہ سید صاحب کو بہت پہلے مل گئی۔

"سیرۃ النبی" میں سوانح کی ترتیب کا کام تو بہت حد تک شبلی مرحوم کر گئے تھے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے ہر پہلو کو قرآن کے مطابق کر دکھانا ایک دقّت طلب کام تھا۔ سید صاحب نے سالہاسال تک روز و شب کی عرق ریزی کے بعد یہ فخر بھی حاصل کر لیا اور قرآن وحدیث کے مطابق تحقیق میں محو ہو کر اور اپنی مفسّرانہ، محدّثانہ، فقیہانہ، متکلمانہ اور فلسفیانہ غرض تمام انسانی اہلیتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر الفاظ کی مدد سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ثابت کر دی کہ

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن ط

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن (کے عین مطابق) تھا۔

سید صاحب کے دل میں پیغمبر اسلام، سید الانبیاء، رحمۃ للعٰلمین، حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس قدر موجزن تھی کہ وہ سلوک کی منزل طے کرنے سے پہلے بھی آپ اور آپ کے پیغام کے خلاف سوءِ ادب کا کوئی کلمہ سُن کر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سوءِ اتفاق سے اگر کوئی ایسا مرحلہ آ جاتا تو اُن کا قلم تلوار بن جاتا تھا۔

اُن کی زندگی میں یورپ کے مستشرقین نے اُس محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو محاذ قائم کیا تھا، اُس محاذ کو شکست دینے کے سلسلے میں سید صاحب کی کوششوں کو تاریخِ اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اُس زمانے میں سید صاحب نے "رسولِ وحدت" کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا جس میں وحدتِ الٰہی، وحدتِ کتاب، وحدتِ انسانیت اور آخر میں دین و دنیا کی وحدت کو نہایت موثر اور مدلل انداز میں پیش کیا تھا۔ اس کتاب کی ایک ایک سطر میں صاحبِ قلم کا جذبِ دروں اور خلوص ونیت کارفرما تھی۔ اس لئے "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق جہاں اس سے اہلِ اسلام مستفید ہوئے وہاں بعض غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

تلاشِ مُرشد

سید سلیمان ندوی مرحوم ایک جید عالمِ دین ہونے کے باوجود نہایت منکسر المزاج شخص تھے۔ اگرچہ وہ خود علم و معرفت کے بلند مقام پر فائز تھے لیکن اس کے باوجود انہیں کسی ایسے رہبرِ طریقت کی تلاش تھی جو اُن کی آتشِ نسبت کو تیز تر کرنے میں مدد دے سکے۔ اس مقصد کے لئے وہ تقریباً دس برس تک شیخ کی تلاش میں رہے۔ آخر حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ساتھ دلی لگاؤ کے باعث اُن کے خلیفہ ارشد مولینا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ جس میں اُن سے پہلے مولینا عبد الماجد دریابادی اور مولینا عبد الباری ندوی وغیرہ بھی شریک ہو چکے تھے۔

مولینا اشرف علی تھانویؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کے اس واقعے سے پہلے بھی سید صاحب کے دل میں اُن کے بارے میں نسبت و عقیدت کے جذبات موجود تھے۔ لیکن اس سلسلۂ ارادت میں منسلک ہو جانے کے بعد ان میں جس قدر اضافہ ہو گیا، وہ قابلِ رشک و تقلید ہے۔ اس کے بعد سید صاحب مولینا تھانوی علیہ الرحمہ سے زندگی کے ہر معاملے اور ہر مسئلے میں ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے آرزومند رہتے تھے۔ سید صاحب نے

خود مولینا عبدالباری ندوی کو ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

"حضرتِ تھانویؒ میرے ہر معاملہ حتیٰ کہ ذاتی معاملات سے بھی باخبر ہیں۔ یہ میرا جوشِ محبت ہے کہ اپنے والدِ شفیق کی طرح اُن کو ہر معاملہ لکھے بغیر چین ہی نہیں ملتا۔"

یہ الفاظ اپنے مرشد کے ساتھ سید صاحب کے ذہنی اور دلی لگاؤ کا اندازہ کرنے کے لئے بہت حد تک مدد دے سکتے ہیں۔

اعزازِ خلافت

سید سلیمان مرحوم نے اپنے شیخ کی زندگی ہی میں سلوک و معرفت کے جملہ مراحل طے کر لئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مرشد کی نظر میں اس راستے کے سب نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر ہو گئے۔ جب یہ مقام آگیا تو مولینا اشرف علی تھانوی مرحوم کے دل میں دانشوروں کی رہنمائی کے لئے سید صاحب کو ہر طرح لائقِ اعتبار دیکھ کر انہیں اپنا خلیفہ بنانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے استخارہ فرمایا جب اس ذریعے سے تائید و تقویت حاصل ہوئی تو سید صاحب کے نام ایک مکتوب تحریر کیا جس میں یہ تحریر تھا کہ:

"میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دُوں۔ میں نے اس سلسلہ میں استخارہ بھی کر لیا ہے۔ اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

سید صاحب دو تین روز میں خود ہی اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے والے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس گرامی نامہ کا جواب نہیں لکھا جب حاضرِ خدمت ہوئے تو بھی خاموش رہے۔ آخر ایک دن خود حکیم الامت مرحوم کی طرف سے ایک کاغذ پر مرقوم یہ الفاظ ملے کہ:

"آپ نے میرے استشارہ کا جواب نہیں دیا۔"

اِس اصرار پر سید صاحب نے جواباً عرض کیا کہ:

"حضرتِ والا کا مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ کہاں مَیں اور کہاں یہ ذمہ داری!"

جب حضرتِ والا کو یہ جوابِ باصواب پہنچا تو نہایت مسرور ہوئے اور حاضرین سے فرمایا کہ:

"الحمد للہ! وہی جواب آیا۔ جس کی توقع تھی۔"

اس کے بعد مرشد تھانویؒ نے مرید ندویؒ کو خلافت عطا فرمادی اور اُن کو مسندِ ارشاد پر متمکن فرمادیا:

حضرت مولینا اشرف علی تھانویؒ علیہ الرحمۃ کے فیضِ صحبت سے سید صاحب کی زندگی میں اس قدر واضح انقلاب رونما ہوا کہ وہ ایک طرح دنیائے علم سے دنیائے معرفت کی طرف آگئے۔ اس زمانے کی کیفیات کا اندازہ سید صاحب کے اپنے مکاتیب وغیرہ سے بھی ہوتا ہے۔

مولینا عبدالباری ندوی کے نام وہ ایک خط میں رقمطراز ہیں:

"دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور پر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ عملاً سمجھ میں آگئی اور اب تلافیٔ مافات میں مصروف ہوں۔"

اسی طرح مولینا مسعود عالم ندوی (مرحوم) کو ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

"واہ واہ کا مزہ بہت لوٹا۔ چکا اور اب یہ رنگ اُتر چکا۔ اب تو آہ آہ کا دَور ہے۔ اور اپنی پچھلی تباہی پر ماتم اور آئندہ کی فکر درپیش ہے۔"

(مکاتیبِ سلیمان مرتبہ مولینا مسعود عالم ندوی۔ مکتوب ۱۱۹)

سید سلیمان ندوی کی زندگی میں یہ جو انقلاب آیا تھا۔ اُس کی شہادت دار المصنفین کے دیگر رفقاء کے بیانات سے بھی ملتی ہے۔ اس سلسلہ درجِ ذیل دو اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"اس تعلق کے ساتھ سید صاحب کے لیل ونہار ہی بدل گئے۔ اگرچہ اُن کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گذری تھی لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دینداری میں تورّع وتقویٰ کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہوگیا، عبادت وریاضت بڑھ گئی۔ ذکرِ خفی کے ساتھ ذکرِ جلی بھی کرنے لگے۔ تقریر وخطابت نے وعظ وپند کی شکل اختیار کر لی۔ زیادہ وقت علمی مذاکروں کے بجائے رشد وہدایت میں صرف ہونے لگا۔" (معارف "سلیمان نمبر" صفحہ ۳۴)

اور مولینا شاہ معین الدین احمد ندوی مدیر "معارف" نے لکھا ہے۔

"وہ صبغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے۔ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً اور ان میں بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوگیا تھا ان کے خیالات میں بھی بڑا تغیّر آگیا تھا۔ اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا۔"

اس زمانے میں سید صاحب نے جو منظوم کلام کہا۔ اُس میں بھی اِس انقلاب کے مظاہر موجود ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نغمۂ اللہ سے طبعِ حزیں موزوں ہوئی ۔ جو کبھی گاتی نہ تھی، وہ وجد میں گانے لگی۔
فیض ہے یہ کس ولیٔ وقت کا ۔ اب جو میرا شعر ہے، الہام ہے۔
سمجھیں میرے کلام کو جو ہوش مند ہیں ۔ مستی میری یہ بادۂ انگور کی نہیں۔
جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں ۔ سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں۔
دیوانگانِ عشق کو دے کر صلائے عام ۔ آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں۔

مولینا اشرف علی تھانوی مرحوم کے ایک اور خلیفۂ مجاز مولینا الحاج حافظ محمد عثمان خان مرحوم راوی ہیں کہ:

"ایک مرتبہ حضرت سید صاحب کے کمالات کا ذکر آگیا تو حضرت مولینا تھانوی نے فرمایا کہ جو لکڑی سوکھی ہوتی ہے، دیا سلائی دکھاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے اور جو گیلی ہوتی ہے اس کو عمر بھر بھی پھونکتے رہیئے تو سوائے دھوئیں کے کچھ نہیں اٹھتا ــــــ ان (سید سلیمان ندوی) میں کس بات کی کمی تھی۔"

مرشد کی زبانِ حقیقت بیان سے یہ الفاظ مرید کی عظمت کے لیے یقیناً سب سے بڑی سند ہیں۔

تصنیفات وتالیفات

سید صاحب کی بعض تصنیفات اور علمی مقالات کا ذکر ضمنی طور پر ابتدائی سطور میں آچکا ہے۔ ان صفحات میں ان کی چند ایک شہرۂ آفاق کتابوں کا ذکر نسبتاً تفصیل سے پیش خدمت ہے۔

اس سلسلے میں جن کتابوں کا ذکر خاص طور پر مطلوب ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

- سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)
- خطباتِ مدراس۔
- سیرت عائشہؓ
- ارض القرآن

- عرب و ہند کے تعلقات۔
- خیّام
- حیاتِ شبلی رح
- مضامین، مقالات و خطبات۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اصل میں علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق اور بے مثال تصنیف ہے۔ علامہ مرحوم کتاب اس شرح وبسط سے لکھنے کے خواہش مند تھے کہ اس موضوع پر جملہ ضروری معلومات ایک جگہ فراہم ہو جائیں۔ لیکن وہ اس کتاب کے پہلے دو حصے ہی لکھ سکے تھے کہ اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن انہیں اس کتاب کی تکمیل کا اس قدر خیال اور اشتیاق تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری ایام میں اپنے شاگرد ارشد سید سلیمان ندوی کو خود بلا بھیجا اور موت سے پہلے انہیں اپنی زندگی کی آخری خواہش یعنی اس کتاب کی تکمیل سے آگاہ کیا اور اپنے بعد اس کام کو مکمل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ سید صاحب نے استاد کی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا اور پھر سالہا سال کی کدوکاوش کے بعد اس کے چار حصے اور لکھ کر اس کتاب کو مکمل و اکمل کر دیا۔ بلاشبہ شبلی مرحوم کے بعد اس کتاب کی تکمیل سید صاحب کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

جہاں تک محض سیرت و سوانح کا تعلق ہے، وہ پہلی دو جلدوں میں مکمل ہو گئے تھے لیکن اس کتاب کی تالیف اور تصنیف کا مقصد پیغمبر کے حالاتِ حیات کے ساتھ ساتھ آپ کے پیش کردہ دین کو بھی اجاگر کرنا تھا۔ اس لئے باقی حصوں میں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات ہیں۔ جن سے ضروری مسئلہ دلائل و معجزات کا پہلو ہے۔ تیسری جلد خاص طور پر دلائل و معجزات ہی پر مبنی ہے۔

چوتھی جلد میں اسلام کے بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ جن میں نبوّت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزا اور جنت و دوزخ ایسے مابعد الطبیعاتی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

پانچویں جلد عبادات سے متعلق ہے۔ اس میں اسلامی عبادات کی خصوصیات اور اس کے اعتدال و توازن پر روشنی ڈالی گئی ہے پہلے ارکانِ اسلام یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کی تفصیل اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کی تفصیل و تشریح سے بحث کی گئی ہے پھر قلبی عبادات مثلاً تقویٰ، توکل، صبر، شکر وغیرہ کا ذکر ہے۔

چھٹی جلد اخلاقیات کے موضوع پر ہے۔ جس کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے۔ اس میں اسلامی اخلاق کے امتیازی پہلوؤں کو اجاگر کر کے اسلام اور اخلاقِ حسنہ کا تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ علامہ شبلیؒ کی پہلی دو جلدوں کے بعد سید سلیمان ندوی مرحوم کی باقی چار جلدوں پر ایک نظر ڈالنے سے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ مجموعی طور پر سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جدید علم کلام کی نہایت معرکہ آرا کتاب ہے۔ جس میں اسلام کے ضروری خدوخال اجاگر کر دیئے گئے ہیں۔

خطباتِ مدراس یہ خطبات دراصل سیرتِ نبوی ہی کے سلسلے کی ایک اور اہم تصنیف ہے۔ یہ خطبات مدراس کے دیندار مسلمانوں کی فرمائش پر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر دیئے گئے تھے۔ جو بعد میں کتاب کی صورت میں یکجا کئے گئے۔ یہ کتاب زیادہ ضخیم نہیں بلکہ کل ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن اپنی معلومات کی وسعت، مباحث کی ندرت اور افادیت کے اعتبار سے یہ کئی کتابوں پر بھاری ہے۔ ان خطبات میں سیرتِ نبوی کے مختلف پہلوؤں پر ایک نئے نقطۂ نظر اور نئے اسلوب سے بحث کی گئی ہے۔

- پہلے خطبے میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیائے کرام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے۔

● دوسرے خطبے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دائم اور عالمگیر نمونۂ عمل ہونے پر بحث کی گئی ہے۔

● تیسرے خطبے میں سیرتِ نبویؐ کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جس قدر تاریخی مواد موجود ہے، اس قدر مواد دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انسان کے حالات میں نہیں مل سکتا۔ اس سلسلہ میں سیرت کے تمام مآخذ قرآن، حدیث، مغازی، سیرت، تاریخ اور دلائل و شمائل نبوی کے پورے ذخیرے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

● چوتھے اور پانچویں خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت و کاملیت پر بحث کی گئی ہے۔ جامعیت کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں مختلف انسانی طبقات اور ان کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر انسانی ضرورت کے متعلق اسوۂ عمل موجود ہے۔ اور کاملیت سے مراد یہ ہے کہ شروع زندگی سے لے کر انتقال تک آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا ہر واقعہ محفوظ ہے۔

● چھٹے خطبے میں سیرتِ نبویؐ کا عملی پہلو دکھایا گیا ہے کہ آپؐ جو اخلاقی تعلیمات پیش کرتے تھے، آپؐ کی سیرت اس کا عملی نمونہ ہے۔

● ساتویں خطبے میں دیگر مذاہب کے مقابلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی جامعیت، عالمگیری، اس کی پیش کردہ اصلاحات اور دوسری انقلاب انگیز خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔

● آٹھویں خطبے میں آپؐ کے پیغام کی بنیادی تعلیمات کا ذکر ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام سے پیشتر کسی بھی مذہب میں خالص توحید نہیں تھی اور جن مذاہب میں کسی حد تک تھی، وہ غلط تعبیرات و تاویلات کے باعث شرک میں بدل گئی تھی۔

"خطباتِ مدراس" کے اس اجمالی خاکے سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سیرۃ عائشہؓ

یہ کتاب سیرت کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے۔ اگرچہ یہ بظاہر حضرت عائشہؓ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے لیکن ایک حیثیت سے یہ بھی سیرتِ نبویؐ ہی کا ضمیمہ ہے۔ حضرت عائشہؓ کی زندگی کے بیشتر حالات کا تعلق کسی نہ کسی طرح چونکہ خود رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے بھی ہے۔ اس حیثیت سے اُن کے سوانح ایک طرح سیرتِ نبویؐ کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ گویا "سیرتِ عائشہؓ" کو سیرت ہی کی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔

ارض القرآن

اگرچہ بظاہر اس کتاب کا موضوع سیرت سے الگ ہے لیکن مصنف کے قول کے مطابق اس کو سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دیباچہ سمجھنا چاہیے۔ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد قرآن مجید کے بعض تاریخی اور جغرافیائی بیانات پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب اور عرب کی قدیم تاریخ اور جغرافیہ پر تحقیق و تنقید ہے۔

قرآن پاک میں عبرت و بصیرت کی غرض سے عرب کی قدیم اقوام، اُن کے انبیاء و رُسل اور اُن کے شہروں، آبادیوں، مسکنوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ بعض مستشرقین نے اُن کے بارے میں غلط سلط تحقیقات پیش کیں، جو بعض مفسرین کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کا باعث بنیں۔ ایسے بیانات کی تفسیر میں عربوں کی بہت سی زبانی روایات اور اسرائیلیات بھی شامل ہیں۔ ایسی باتوں سے مستشرقین کو اعتراضات کے اور بھی موقعے ملے۔

"ارض القرآن" ایسے اعتراضات کے جوابات اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق میں لکھی گئی ہے۔ اور اس کا اندازِ بیان بھی سیرتِ نبویؐ کی طرح مناظرانہ کے بجائے محققانہ اور ناقدانہ ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات

یہ کتاب سید سلیمان ندوی مرحوم کی مذکورہ دینی تصانیف سے ہٹ کر خالص علمی تصنیف ہے۔ لیکن اس میں متکلمانہ مقصد موجود ہے۔ یہ کتاب اگرچہ خالص علمی و تاریخی ہے۔ لیکن اس [illegible] ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کے سلسلے میں بعض

غلط فہمیوں کا ازالہ اور ساں دونوں کے تعلقات کی قدامت اور اس کی خوشگواری دکھانا ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف کے پیش نظر خاص طور پر ان غلط فہمیوں کا انسداد و تدارک بھی تھا جو انگریز حکومت اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر عام کر رہی تھی۔

خیّام یہ کتاب علمی تصنیفات کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ خیام ایک نامور فلسفی اور جلیل القدر فاضل تھا لیکن اہلِ یورپ اسے ایک عیاش اور رندِ مست کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ان کی "تحقیقات" کے مطابق ہمہ تن شاہد و شراب میں مستغرق رہتا اور اس کی زندگی کا مقصد رندی اور عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ نیز وہ اسی مشرب کا مبلغ تھا۔

سیّد صاحب کو اہلِ یورپ کی اس تحقیق سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے زمانے کا عظیم فلسفی، ہیئت، نجوم اور ریاضیات کا علاّمہ اور صوفی مشرب سمجھتے تھے۔ نیز وہ ان کے خیال میں ایک دیندار مسلمان تھا اور مذہبی علوم میں مکمل دست گاہ کا حامل تھا۔

سید صاحب کی تحقیق کے مطابق جس طرح مولینا رومی، شمس تبریزی اور ابوسعید ابوالخیر جیسے بزرگوں کے کلام میں بھی شاہد و شراب کی رنگینیاں آتی ہیں اور خواجہ حافظ شیرازی کا کلام بھی ایک طرح پورا "میخانہ" ہے اسی طرح بقولِ غالب

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

خیام بھی محض استعارات و کنایات کے طور پر ایسے الفاظ کے استعمال پر مجبور تھا۔ بہرحال اگر اس سلسلے میں خیام کی شخصیت کو "مختلف فیہ" بھی مان لیا جائے تو زیرِ نظر کتاب کے گوناگوں علمی مباحث، مختلف النوع تاریخی معلومات اور مصنف کی وسعت و دقّتِ نظر اور تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔

حیاتِ شبلیؒ یہ کتاب مختلف حیثیتوں سے نہایت اہم تصنیف ہے۔ جو ایک جلیل القدر اور شفیق استاد کی خدمت میں ایک لائق شاگرد و رشید کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ مصنف نے اس میں اپنا پورا زورِ قلم اور تصنیفی کمال صرف کر دیا ہے۔

روایت ہے کہ علامہ شبلی کی زندگی میں جب کسی نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال ظاہر کیا تو انہوں نے حوصلہ افزائی نہ کی اور اسی قسم کی ایک خواہش کے سلسلے میں انہوں نے اپنے شاگرد رشید کو لکھا تھا کہ:۔

"دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے۔ تم ہی جب کبھی دنیا کے دوسرے کاموں سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا"

اِن الفاظ کا نتیجہ یہ تھا کہ علامہ شبلی کی زندگی کے حالات کی ترتیب و تالیف ہمیشہ سیّد صاحب کے پیشِ نظر رہی۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ اِن کو یہ کتاب لکھنے کا موقع اس وقت مِل سکا جب وہ دنیا کے اور کاموں سے بہت حد تک فرصت پا چکے تھے۔ "حیاتِ شبلی" سید صاحب کی آخری تصنیف ہے۔ جس کے ساتھ اُن کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

دیگر مضامین، مقالات اور خطبات مذکورہ اور دیگر تصانیف کے علاوہ سید صاحب نے زندگی کے مختلف موقعوں پر متفرق موضوعات پر جو مضامین، مقالات اور خطبات سپردِ قلم کئے، وہ وقتاً فوقتاً مختلف جرائد و رسائل کے ذریعے سے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ کتابی صورتوں میں بھی اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ جن میں سے مکتوبات، فرہنگ، سیرِ افغانستان، نقوشِ سلیمان، یادِ رفتگاں وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مولینا ابوالکلام آزاد مرحوم کی طرح سیّد سلیمان ندوی مرحوم کو بھی شعر و شاعری سے ایک گونہ دل لگی تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ جس طرح مولینا آزاد کے بارے میں یہ بات اکثر لوگوں کو معلوم ہے، سیّد صاحب کے بارے میں یہ بات عام کیوں نہیں ہو سکی۔ لہٰذا

الذکر شعر فہمی کا بلند ذوق رکھنے کے علاوہ خود بھی اچھے شعر گو تھے۔ اس زمانے کے شاعرانہ ماحول اور سید صاحب کے ذوقِ شاعری کے سلسلے میں مولینا عبدالماجد دریاآبادی نے اپنے انداز میں بات کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"۔۔۔۔ جب شوقِ مطالعہ جوان تھا اور دن بھی جوانی کے تھے تو اردو کی غزلیات کیا معنیٰ ہزلیات تک کا دفتر بے معنی و بامعنی ان کی انگلیوں کی نوک پر تھا۔ دیوان کے دیوان پڑھ ڈالے۔ کلیات پر کلیات ختم کر دیئے اور گلدستہ کا تو اب لفظ بھی تشریح طلب ہو گیا ہے۔ وا اپنے وقت میں تازہ غزلوں کے ماہنامہ کو کہتے تھے، ایک زمانے میں ان گلدستوں کی بہار تھی۔ لکھنؤ تو پھر لکھنؤ ہے بڑے شہروں بلکہ قصبوں تک میں ان کے ورق، ورقِ گل کی طرح کھلے ہوتے اور سید صاحب تھے کہ ان خوشبوؤں میں بسے ہوئے۔ پھر شاعروں کی باہمی نوک جھونک کے رسالے، اپنی پوتلمونیوں میں مولوی صاحبان کے مناظرانہ رسالوں سے ٹکر لیتے ہوئے۔ اس نے اس کی زبان پکڑی۔ اس نے اس سے محاورے کی سند مانگی اس نے اس کے کلام میں ایطائے جلی نکالا، اس نے اس کے استادوں تک کو چن کے رکھ دیا۔ انہوں نے ان پر سرقہ مضمون کا الزام رکھ کر ان کی موتی سی عزت آتار لی۔ انہوں نے ان کے شعر میں پہلوئے ذم و فحش نکال کر ان کی گردن ناپ لی۔ پٹنہ، سید صاحب کا وطن خود ہی اردو شعر و سخن کے حق میں گلزار اور پھر سید صاحب کا لکھنؤ میں سالہا سال قیام، جو کور کسر رہ گئی تھی، پوری ہوگئی۔ سید صاحب اس چمن کے ایک چہکتے ہوئے بلبلِ خوشنوا خود بن گئے۔"

شاعر بھی تھے، تخلص رمزی کرتے تھے۔ کبھی قطعہ، کبھی رباعی کہتے اور تفریحاً ہر بحرِ سخن میں شناوری کر لیتے۔ غزل کبھی کبھی چوری چھپے کہہ لیتے۔ صرف دو چار شعر نمونہ کے حاضر ہیں۔

دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں ۔ جو نہ بیخود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں۔
مدرسہ چھوڑا، خرابات میں آکر ٹھہرا ۔ دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں۔
توبہ توبہ، مری توبہ بھی ہے کوئی توبہ ۔ ٹوٹ جائے جو نہ ھد بار کہاں سے لاؤں

تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ ۔ لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ۔
انکار تھا تجھ کو میری تاثیرِ دعا سے ۔ اب میری طرف دیکھ تو تاثیرِ دعا دیکھ۔
آزاد مکاں سے ہے اُسے قیدِ مکاں کیا ۔ گر آنکھ ہو، بتخانے میں بھی نورِ خدا دیکھ۔

سید صاحب کی شاعری کی یہ چند مثالیں مولینا عبدالماجد دریاآبادی ہی کی فراہم کردہ تھیں۔ ان کی شاعری کے موضوع پر اگر تفصیل سے کچھ لکھنے کی خواہش کی جائے تو اس سلسلہ میں مزید بہت مواد مل سکتا ہے۔ ایک دور سید صاحب پر ایسا بھی آیا، جب ان کی طبیعت صرف عارفانہ کلام کی طرف مائل تھی۔ ایسے کلام کی اکثر مثالیں ان کی کتابوں اور تذکروں میں موجود ہیں۔ ان مثالوں سے تصوف میں ان کا مقام سمجھنے میں بھی بہت مدد ملتی ہے۔
حسبِ ذیل غزل سید صاحب نے ایک سفر کے دوران میں کہی۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل کس حد تک ان کے اس وقت کے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ابھی تو مشقِ فغاں کنج میں ہزار کرے ۔ اثر کے واسطے کچھ دیر انتظار کرے۔

جو آج لذتِ دردِ نہاں کا جویا ہے ۔ وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے ۔
انہی کے دینے سے ملتا ہے، جس کو ملتا ہے ۔ وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے ۔
ادب سے دیکھ لیں عشاق دور سے اُن کو ۔ محال ہے جو انہیں کوئی ہمکنار کرے ۔
سنا تو دے انہیں افسانۂ غمِ ہجراں ۔ وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے ۔
وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں کو ۔ وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بیقرار کرے ۔
پلا دے ساغرِ سرشار مجھ کو وہ ساقی ۔ خزاں کو ایک اشارہ میں جو بہار کرے ۔
تری نظر میں ہے تاثیرِ مستیٔ صہبا ۔ تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے ۔

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے، چاہے ہوشیار کرے ۔

غور کیجئے، یہ ساری غزل آثارِ جذب و عشق کی کیفیت سے لبریز ہے! یہ غزل اعظم گڑھ سے الہ آباد جاتے ہوئے راہ میں کہی گئی۔ پھر جب سید صاحب الہ آباد سے لکھنؤ کا سفر فرمایا تو اس سفر کی یادگار یہ غزل ہے :۔

صدقِ احساس کی دولت میرے مولا دے دے ۔ غمِ امروز بھلا دے، غمِ فردا دے دے ۔
دُھن کچھ ایسی ہو، فراموش ہو ہستی اپنی ۔ دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دے دے ۔
اپنے میخانے سے اور دستِ کرم سے اپنے ۔ دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دے دے ۔
کھول دے میرے لئے علمِ حقیقت کے در ۔ دلِ دانا۔ دلِ بینا، دلِ شنوا دے دے ۔
قول میں رنگِ عمل بھر کے بنا دے رنگیں ۔ لبِ خاموش بنا کر دلِ گویا دے دے ۔
دلِ بے تاب ملے۔ دیدۂ پُرآب ملے ۔ تپِ آتش مجھے دے دے دلِ دریا دے دے ۔

دردِ دل سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے۔
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دے دے۔

بعض مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید شعر گوئی کیلئے مناسب ترین وقت وہی ہوتا تھا جب سید صاحب سفر میں ہوتے تھے۔ حسبِ ذیل غزل لکھنؤ اعظم گڑھ جاتے ہوئے اثنائے راہ میں موزوں ہوئی۔ غزل کے تیور دیکھئے :۔

ہر بات میں جس کی کیفیتِ مستانہ ۔ آباد رہے یارب تا حشر وہ میخانہ ۔
چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر ۔ حیرت ہے یہ گھر اے دل، مسجد ہے کہ میخانہ ۔
زاہد نے کہاں پائی، زاہد نے کہاں پی لی ۔ گفتار ہے رندانہ، رفتار ہے مستانہ ۔
دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو ۔ ہوتا ہے اسے اک دن نذرِ مے و میخانہ ۔

ہر قطرۂ ندامت کا جو دیدۂ تر میں ہے ۔ ہے دامنِ خالی کا وہ گوہر شاہانہ ۔
وہ چشمِ محبت تو جو پائے محبت ہے ۔ دیکھے تو ذرا کر کے کوئی اس سے یارانہ ۔
معشوق یگانہ ہے، عاشق بھی یگانہ ہو ۔ یعنی کہ جو ان کا ہو وہ سب سے ہو بیگانہ ۔
حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی ۔
آ دل میں چھپ جا، اے صورتِ جانانہ ۔

اعظم گڑھ پہنچ کر طبیعت کئی روز تک حاضر رہی جس کے نتیجہ میں ایک اور غزل ہو گئی، جو حسب ذیل ہے :-

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے ۔ جو تری محفل میں بیٹھا، وہ سراپا ساز ہے ۔
باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ ۔ اب مرے جوشِ جنوں کا اور ہی انداز ہے ۔
پاؤں تو حد ادب سے عشق میں باہر نہ رکھ ۔ وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے ۔
نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا ۔ تن سے جیسے روحِ بسمل مائلِ پرواز ہے ۔
دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی ۔ ہاؤ ہو ہوئے جوش تو سرمایۂ آغاز ہے ۔
گاہ دیکھا تھا مری چشمِ تصور نے انہیں ۔ اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے ۔
جو نہیں معلوم ہے، اس کو کوئی جانے گا کیا ۔
جب کہ جو معلوم ہے، وہ بھی سراپا راز ہے ۔

اور یہ غزل بھی ملاحظہ ہو، جو سید صاحب نے حضرت مولینا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بیعت کرنے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی کہی تھی۔ اس زمانے میں ان پر جو کیفیات طاری تھیں، ان کی ترجمانی اس سے بہتر اور کسی غزل میں نہیں پائی جاتی :-

پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں، ۔ ہر سود و زیانِ دوسرا بھول گیا ہوں ۔
جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے ۔ ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں ۔
آتا ہے خدا بھی ترے صدقے میں مجھے یاد ۔ گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں ۔
عالم کے تماشے نہیں اب جاذبِ دل ہیں ۔ ہر لذتِ ہستی کا مزا بھول گیا ہوں ۔
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو ۔ دوریٔ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں ۔
اب مسئلۂ کثرت و وحدت کو میں سمجھا ۔ پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں ۔
سجدہ طرفِ کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے ۔ اب قبلہ بھی اے قبلہ نما! بھول گیا ہوں ۔
حل جب سے ہوا فلسفۂ حسنِ حقیقت ۔ ہر مسئلہ اے ذہن رسا! بھول گیا ہوں ۔
ہے آہِ سحر گاہ میں وہ ذوقِ لبِ دل گرشتہ ۔ چنگ و نے بربط کی صدا بھول گیا ہوں ۔
منظورِ تری چشمِ رضا جب سے ہوئی ہے ۔ امیدِ جزا، خوفِ سزا بھول گیا ہوں ۔

اے رہبرِ توفیق! مجھے راہ بتا دے - نقشِ قدمِ راہنما بھول گیا ہوں۔
اے خضر! میرا قافلہ کس سمت گیا ہے - تمیزِ صداہائے درا بھول گیا ہوں۔
الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا۔
افسانۂ پارینہ ولا! بھول گیا ہوں۔

سید صاحب کے قلم سے ایک نعت بھی ملاحظہ کیجئے۔ اس سے آپ کو ان کی حبِ نبوی کا ایک حد تک اندازہ ہو سکے گا۔ یہ نعت محرم ۱۳۶۹ میں مدینہ منورہ میں کہی گئی تھی:-

آدم کے لئے فخریہ عالی نسبی ہے - مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے۔
پاکیزہ تراز عرش و سما جنت و فردوس - آرام گہِ پاک رسولِ عربی ہے۔
آہستہ قدم، نیچی نگاہ، پست صدا ہو - خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے۔
اے زائرِ بیتِ نبوی! یاد رہے یہ - بے قاعدہ یاں جنبش بے ادبی ہے۔
کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی - محبوبِ خدا ہے وہ، جو محبوبِ نبی ہے۔
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے۔

قرآنِ حکیم کی سورۃ الشعراء کے آخر میں دو قسم کے شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک وہ جن کی پیروی گمراہ کرتے ہیں اور وہ ہر وادی میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ایسے شاعر جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں۔ گویا ان کے قول اور عمل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس دوسری قسم کے شاعر وہ ہیں جو ایماندار ہیں اور نیک اعمال پر کاربند رہتے ہیں۔

سید صاحب نے اپنے شعروں میں جو کچھ کہا یا لکھا، وہ دوسری قسم کے شاعروں کی فہرست میں آتا ہے۔ ان کی شاعری اسلامی شاعری ہے۔ وہ جس طرح اپنی نثر کے ذریعے سے اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور مخالفین سے اس کی مدافعت کرتے رہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی منظومات کے ذریعے سے بھی اسلام کی اشاعت یا مدافعت کا کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک تاریخی واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

جن دنوں سید صاحب بھوپال میں مقیم تھے، اس دوران میں بھوپال کے شعراء نے بڑے وسیع پیمانے پر ایک محفل شعر و سخن کا انعقاد کیا۔ اس میں جوش ملیح آبادی کو بھی مدعو کیا گیا۔ بھوپال کی عام فضا دینی تھی۔ اس ماحول میں جوش نے جو نظم پڑھی، وہ اس کے ہفوات میں شامل کی جاتی ہے۔ جوش کی مذکورہ نظم درجِ ذیل ہے:-

جب کہ بچے خواب سے ہنگام تھے گرمِ خروش
باپ کی صرف ایک "ہوں" نے کر دیا سب کو خموش

"ہوں" بزرگِ خاندان کی آہنی دیوار ہے۔
ہر فساد و غلغلہ کو ایک "ہوں" درکار ہے۔
سنتے[1] ہیں انسان کا ہے باپ[2] ربِّ کائنات
اس لئے اے دوست! تجھ سے پوچھتا ہوں میں یہ بات،
جب ہلاکو نے بہائی تھیں لہو کی ندیاں،
کوئی "ہوں" اس وقت کیا گرجی تھی زیرِ آسماں۔
تحفۃً آتے تھے جب مقتول انسانوں کے سر
پھٹ پڑی تھی کیا کوئی "ہوں" خیمۂ چنگیز پر۔
شعلہ ہائے حکمِ نیرو جب کہ تھے بھڑکے ہوئے۔
ڈانٹ کی کوئی صدا آئی تھی بامِ عرش سے۔
لے اڑا تھا جب کہ راون ایک دیوتا کا "گھر"
کوئی "ہوں" گرجی تھی اس وقت اوجِ چرخ پر۔
جب بہا تھا کربلا کی خاک پر دریائے خوں،
دہر پر نازل ہوئی تھی کوئی ہیبت ناک "ہوں"
کر رہا تھا زہر جب سقراط کے دل پر اثر،
عرش سے اتری تھی "ہوں" کوئی بساطِ فرش پر
عیسیٰ[3] مریم کو جب کھینچا گیا تھا دار پر،
ہوگئی تھی کیا کسی "ہوں" سے زمیں زیر و زبر
ایٹم نے رکھ دیا تھا بھون کر جب ایک شہر،
قلزمِ تنبیہہ میں آئی تھی کیا اس وقت لہر
بستیاں غلطیدہ تھیں جب موت کے گرداب میں
کوئی "ہوں" کڑکی تھی کیا بنگالہ و پنجاب میں
جب ہوئے تھے آخری اوتار گاندھی جی ہلاک،
آئی تھی کوئی ندائے خشمگین و قہر ناک،

---

[1] طنز ملاحظہ ہو۔ [2] عیسائیوں کا تصور ہے۔ [3] قرآن نے اس واقعے کو غلط قرار دیا ہے۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ۔

اتنی چپ سادھے ہوئے ہے کس لیے عرشِ بریں
کیوں ہمارا آسمانی باپ[۱] "ہوں" کرتا نہیں؟

آپ نے دیکھا ہوگا کہ مجموعی طور پر اس نظم میں اسلام کی تعلیمات اور خود خدا کے تصور کی کس طرح نفی کی گئی ہے۔ سید صاحب اس قسم کی خرافات کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس نظم کے بارے میں سنا تو فوراً اس کے جواب میں یہ نظم لکھی جو جوش ایسے کم بصروں کے لیے سرمۂ بصیرت ہو سکتی ہے۔ سید صاحب عرفِ عام میں شاعر نہیں تھے۔ بلاشبہ جوش کی نظم کا جواب کسی اسلام پسند شاعر کو لکھنا چاہیے۔ بہرحال سید صاحب کی نظم ملاحظہ فرمائیے:

باپ کی "ہوں" سے سنبھل جاتے ہیں فرزندِ سعید
ناخلف جو ہیں نہیں سنتے ہیں تہدید و وعید

اس جہاں میں جو مصیبت پیش آئی ہے کہیں
وہ بجز تنبیہہ رب العلمیں کچھ بھی نہیں،

تازیانہ غافلوں کو فتنۂ چنگیز تھا!!
رہوارِ نظمِ ملّت کے لیے مہمیز تھا

نسل سے چنگیز کی سلطانِ دیں پیدا ہوا،
ظلمتِ تاتار سے نورِ مبیں پیدا ہوا۔

ظلمِ نیرو سے کھلیں آنکھیں عوامِ روم کی،
ہل گئی بنیاد اُس کی عظمتِ موہوم کی،

راونِ بدکیش ظلم و جور کا فرماں روا،
ہند کے دیوتا کا جو "گوھند" اڑا کر لے گیا،

اس سے جوہر کھل گیا سیتا کے پاک اخلاق کا،
رام کی حرمِ بلند و شہرۂ آفاق کا،

کربلا کی خاک سے اُٹھا تھا جو سیلِ بلا،
ظلم پیشہ بادشاہوں کو بہا کر لے گیا

جو پیالہ زہر کا سقراط پی کر مرگیا،
عقل کے وہ تا ابد جینے کا ساماں کر گیا،

---

[۱] عیسائیانہ عقیدہ

عیسیٰ مریم کی مظلومی کا یہ اعجاز دیکھ،
روم کے ظالم ہوئے یوں حق سے سرافراز دیکھ
ایٹم بم سے ہوا جو شہر کل ویران دیکھ،
چین کی آہوں کا شرارہ اندرون جاپان دیکھ
خرمنِ پنجاب و بنگالہ پہ جو بجلی گری،
اس سے جل کر خاک ہے سامانِ فرقہ پروری
کشتۂ بیداد گاندھی کے بدن کا سرد خوں،
ہے زبانِ فطرتِ خاموش کی خاموش "ہُوں"
جاگ اُٹھی اِس "ہُوں" کے بیم شور سے خوابیدہ رُوح
رو پڑی چشمِ ستم گر، ہنس پڑی غمدیدہ رُوح۔
بے بصر کو کیا خبر ہوتا رہا ہے بار بار،
"تیرگی" سے نور، "شر" سے "خیر" یونہی آشکار

اردو اور فارسی کے علاوہ عربی میں سید صاحب کا منظوم کلام اتنا زیادہ ہے کہ وہ دیوان کی صورت میں مرتب ہو کر مشرقِ وسطیٰ میں زیرِ اشاعت ہے۔

اعترافِ عظمت

برّصغیر پاک و ہند کی مردم خیز سرزمین کو اہلِ اسلام میں سے جو مشاہیر پیدا کرنے کا فخر و شرف حاصل ہے، اُن کی تعداد اگرچہ کم نہیں، لیکن ان میں ایسے بلاشبہ کم ملیں گے، جنہیں اپنی زندگی ہی میں ہم عصر علماء و فضلاء کی اکثریت کی طرف سے اعترافِ عظمت کا انتخار حاصل ہو۔ بلاشبہ سید سلیمان ندوی مرحوم انہی چند عظیم القدر شخصیات میں شامل ہیں جنہیں یہ نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوئی۔ سید صاحب موصوف کی شخصیت اور اُن کی سیرت و اخلاق کے بارے میں خود اُن کی زندگی میں اور ان کی وفاتِ حسرت آیات پر مشاہیر ملک نیز عالمِ اسلام کے مختلف حلقوں میں جس خلوص اور فراخ دلی سے اُن کی علمیت، فضیلت اور عظمت کا اعتراف کیا گیا، وہ سید صاحب کی شخصیت کے لیے بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔

سید سلیمان ندوی مرحوم کی عظمت کا اعتراف کرنے والوں میں جہاں اور نامور شخصیات شامل ہیں، وہاں حکیم الامت، ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال مرحوم خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ان کے علاوہ اس سلسلے میں حق شناسوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

ان سطور میں چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آپ انہی کو "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق ایک نظر میں ملاحظہ کیجیے۔ اس سے سید صاحب موصوف کی بلند و عظیم شخصیت اور بالخصوص ان کی سیرت و عظمت کی ایک جھلک ضرور آپ کے سامنے آ سکے گی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے علامہ اقبال مرحوم ہی کی زبان و قلم سے اعترافِ عظمت کی مثالیں دیکھیے۔ علامہ اقبالؒ سید صاحب کے گہرے رفقاء میں شامل تھے اور انہیں سفر و حضر میں سید صاحب کی سیرت و فضیلت کے مطالعہ و مشاہدہ کا موقع حاصل ہوا تھا۔

مکاتیبِ اقبال (جلد اوّل) میں علامہ اقبال کے ستر (۷۰) خط ایسے ہیں، جو انہوں نے سید صاحب کے نام لکھے تھے۔ ان خطوں میں اقبال نے مسئلہ زمان و مکان، ختمِ نبوت، حقیقت وحی، قرآن میں ناسخ و منسوخ اور اسلام میں خلیفہ کے اختیارات وغیرہ ایسے فلسفیانہ اور متکلمانہ قرآنی اور فقہی مسائل میں استفادہ کیا ہے۔

علامہ اقبال کے مکاتیب میں سید صاحب کی علمیت و فضیلت اور ان کی عظمت کا واضح اعتراف موجود ہے۔ ایک خط میں علامہ کے الفاظ یہ ہیں:

"مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔"

(مکاتیبِ اقبال جلد اوّل صفحہ ۸۰)

اور دوسرے خط میں اقبال مرحوم نے لکھا:

"علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔"

(مکاتیبِ اقبال جلد اوّل صفحہ ۱۶۶)

علامہ اقبال نے ایک مکتوب میں سید صاحب کے مقامِ علمیت و عظمتِ کردار کا اعتراف ان الفاظ میں بھی کیا ہے:

آپ قلندر ہیں، مگر قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے:

قلندراں کہ براہِ تو سخت می کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بخلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
دریں جہاں کہ جمالِ تو جلوہ ہا دارد
ز فرق تا بہ قدم دیدہ و دل و گوشند
بروزِ بزم سراپا چو پرنیاں و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

(مکاتیبِ اقبال جلد اوّل صفحات ۱۳۹، ۱۴۰)

پروفیسر رشید احمد صدیقی، سید صاحب سے متعلق اپنے ایک مضمون "گنج گرانمایہ" میں تحریر کرتے ہیں:

حسب و نسب، علم و فضل، اخلاق و عادات، خدمتِ ملک و ملت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پورے طور پر مسلّم ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پرانے طریقوں پر پرانے استادوں اور بزرگوں کے سایۂ شفقت میں پرانی فضاؤں میں ہوئی تھی۔ جدید علوم و فنون سے براہِ راست انہوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا تھا۔ لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقوں سے انہوں نے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آگاہ کیا تھا کہ وہ کہیں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ چاہے وہ اہلِ علم کا حلقہ ہو، چاہے اربابِ سیاست کی مجلس، خواہ طالب علموں کی جماعت ہو، خواہ عامۃ الناس

کا اجتماع۔ جدید افکار اور رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیوں نہ ہوتا، سید صاحب سے تبادلۂ خیال کرنے میں اسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے، جس کی معلومات روایتی ہیں یا جس کا ذہن بندھے ٹکے خانوں میں اسیر ہے یا جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے۔

علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلّح اور مرصّع نوجوانوں کو میں نے دیکھا کہ خالص اور ذہنی سطح پر مولینا کی ہمسری نہ کر سکتے تھے اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب سے کچھ سیکھ کر ہی واپس گئے۔"

("معارف" سلیمان نمبر صفحات ۱۱۰،۱۱۱)

مولینا سعید احمد اکبر آبادی مدیر "برہان" لکھنؤ اپنے مضمون "مولینا سید سلیمان ندوی — میری نظر میں" کے زیرِ عنوان ابتدائی سطور میں لکھتے ہیں :۔

" مولینا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ بہت بڑے محقق، نامور مصنّف، بلند پایہ عالم اور صاحبِ طرز انشاپرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرائۂ بیان ہے؛ جس سے مولینا کا اصل مقام اور مرتبہ متعیّن نہیں ہوتا اور نہ ان کا صحیح حق ادا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان (برصغیر پاک و ہند) کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرزِ قدیم کا ہو یا طرزِ جدید کا، نصف صدی کے اندر اندر مذاقِ تصنیف و تالیف، طریقِ فکر و استدلال اور تہذیبی امیال و عواطف کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولینا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے اور یہ انقلاب جس طرح پیدا ہوا اور اس نے ذہنی و فکری دنیا میں قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو سہیات بخشی ہے، اس کی نظیر انہیں پورے عالمِ اسلام میں کہیں نظر نہیں آئے گی۔ اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے آخری دور بیسویں صدی کے اوائل کے علمی و تصنیفی حالات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔"

("معارف" سلیمان نمبر صفحہ ۱۵۷)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مدیر "معارف" نے اپنے مضمون بہ عنوان "حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی دینی خدمات" کے آغاز میں لکھا ہے :۔

"حضرت استاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی جیسی جامع کمالات شخصیتیں کہیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں وہ اپنے کمالات میں آئمہ سلف کی یادگار تھے، جملہ اسلامی علوم پر ان کی نظر نہایت گہری اور وسیع تھی اور بعض علوم میں امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ ان میں اپنی علمی و دینی بصیرت اور تلاش و تحقیق کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جو مدتوں علمی دنیا کی راہنمائی کا کام دیتی رہیں گی۔ ان کا علمی درجہ اس قدر بلند اور ان علمی و دینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور گوناگوں اور اتنا متنوع ہے کہ اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔"

(معارف سلیمان نمبر صفحہ ۱۷۳)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے مضمون میں اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

"مرحوم غفر اللہ لہ دینیات و اسلامیات کے عالم تھے لیکن اسی کے ساتھ عربی، فارسی، اردو زبانوں کے ادب کا بھی صالح ذوق رکھتے تھے، اسی لیے ان کے تمام علمی کارناموں کا تعلق اگرچہ اسلامیات و دینیات ہی سے ہے لیکن اس کے ساتھ ادبیات کے متعلق کبھی کبھی ان کو کچھ لکھنے کا موقعہ اگر مل گیا تو اس میں بھی انہوں نے ہمیشہ نئی راہیں پیدا کیں اور ایسے اچھوتے نتائج ان کی بدولت اس سلسلے میں بھی دنیا کے سامنے آتے کہ ہر طرف مرحبا و آفرین کے ساتھ ان کا استقبال کیا گیا۔

قرآن و حدیث، فقہ، کلام و التصوف اور سب سے زیادہ تاریخ اسلامی اور ان سب کے سوا جس جس موضوع پر سید صاحب نے قلم اٹھایا ہے اور اس سلسلے میں نئی معلومات یا نئے نقاطِ نظر سے دنیا کو انہوں نے روشناس کیا ہے، بنانے والے اگر ان کی فہرست بنائیں گے تو میرا خیال ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں نہیں تو ہزاروں تک ضرور پہنچ جائے گی۔ یہ ان کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ اس مطمح نظر سے ان کی تصانیف اور شائع کردہ مقالات و مضامین کا جائزہ لے۔ دنیا کو حیرت ہوگی کہ کتنے قلیل عرصے میں اس بندۂ خدا نے جدید معلومات اور متعلقہ علوم کے سلسلے میں کتنے نئے پہلوؤں کا اضافہ فرمایا۔ بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں میں بمشکل گنی چنی چند ہی نئی چیزیں ہاتھ آتی ہیں لیکن سید صاحب کی کتابوں میں قدم قدم پر نئے انکشافات، اچھوتی معلومات سے پڑھنے والوں کا دامنِ تحقیق بھرتا چلا جاتا ہے۔"

(معارف سلیمان نمبر صفحات ۲۱۶، ۲۱۷)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی ان الفاظ میں علمیت و فضیلت کا اعتراف کرتے ہیں:۔

"سید صاحب کے فاضلِ اجل اور عالم بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے۔ دنیا کو مسلّم ہے کہ وہ فنِ تاریخ میں امام وقت تھے اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ۔ لیکن آخر تک کم ہی لوگوں نے ان کے ادبی، شعری اور تنقیدی مرتبہ کو جانا اور کم تر ہی لوگوں نے انہیں ادیب، انشاپرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے پہچانا۔
علم و ادب کی تاریخ میں ایسی ناشناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معدوم۔"

(معارف سلیمان نمبر صفحہ ۲۳۰)

مولانا محمد ادریس ندوی (استاذ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) سید صاحب مرحوم کے علمی کاموں کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

"سید صاحب اس دنیا سے تشریف لے گئے اور اپنے ساتھ علوم و معارف اور کمالات کا ایک خزانہ لے گئے لیکن جو کچھ چھوڑ گئے ہیں، وہ بھی کم نہیں ہے۔ ان کی تصنیفات، مقالات، خطبات اور مکاتیب ایک گنج گرانمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ اور آئندہ نسلوں کی دینی، اخلاقی، علمی اور ذہنی راہنمائی کے لیے اس سے بڑا قیمتی سامان موجود ہے۔"

(معارف سلیمان نمبر صفحہ ۲۴۵)

اعترافِ عظمت کی مثالوں کے آخر میں جناب مالک رام کے جذبات بھی ملاحظہ کر لیجیے جو انہوں نے معارف کے سلیمان نمبر کے لیے اپنے مضمون بہ عنوان علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے اختتام پر الفاظ کی صورت میں سپرد قلم کئے ہیں۔
"وہ جو جگہ خالی ہوئی ہے، وہ تو اب خالی ہی رہے گی۔ اس سے پہلے کس کی پُر ہوئی ہے، جو ان کی ہوگی لیکن ان کے اف

اتنا تو کر سکتے ہیں کہ جو شمع انہوں نے جلائی تھی اگر وہ اس کی روشنی میں اضافہ نہیں کر سکتے تو کم از کم اس میں جان لڑا دیں۔ کہ اس کی تابناکی میں کمی نہ آنے پائے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کا اپنے آپ پر احسان ہوگا کہ اس بہانے ان کا اپنا نام زندہ جاوید ہو جائے گا۔ ورنہ مرنے والے کے کارنامے تو ایسے ہیں کہ اگر کوئی انہیں بھلانا بھی چاہے تو بھلائے نہیں جا سکتے ـــ"

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

مرض الموت

حیاتِ مستعار کے آخری ایام میں سید صاحب کی صحت کافی گر گئی تھی۔ خوراک برائے نام رہ گئی تھی جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ قویٰ مضمحل ہوتے گئے۔ علالت کا آغاز استسقائے قلب کے عارضے سے ہوا عرصہ لبعد تنفس کی شکایت پیدا ہو گئی جو بعد میں ہمیشہ کے لیے رہ گئی اور آخر کا جان لے کر گئی۔

اتوار ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ (مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء) کی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ اگلا دن شام تک مرض مد و جزر میں گزرا اور آخر اسی ساڑھے چھ بجے شام کے وقت سانس میں ایک جھٹکا سا محسوس ہوا جیسے ہچکی آئی ہو۔ یہ ہچکی زندگی کی آخری یا موت کی ہچکی تھی جس کے ساتھ ہی یہ علامۂ روزگار اس دنیائے رنگ و بو کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے عالم باقی کی طرف رحلت کر گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ماتم سلیمانی

مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ کے مصداق ہند و پاکستان کے علاوہ تمام اسلامی و غیر اسلامی ممالک میں بھی سید صاحب کے انتقال پر ملال پر دلی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا اور مشاہیر وقت نے مختلف بیانات دیے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

"علامہ ندوی جیسے صاحبِ علم کی موت سے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کو نقصان پہنچا ہے۔ وہ قاہرہ کی عرب اکیڈیمی کے ممبر بھی تھے۔ جہاں وہ عربی کے ایک بہت بڑے عالم کی حیثیت سے بڑی رفعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے"

عبدالوہاب عزام (سفیر مصر)

"ہم کو علامہ سید سلیمان ندوی کی موت سے دکھ ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کا دکھ ہے کہ جو علوم و فنون ان کے سینے میں تھے، وہ بھی ان کے ساتھ دفن ہو گئے۔"

شیخ الوالخیر (سفیر شام)

"مولانا سید سلیمان ندوی کے پایہ کا عالم صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام میں بھی کوئی نہ تھا۔"

گورنر جنرل پاکستان

"انہوں نے اسلامی تاریخ کی تدوین میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں انہیں تا ابد قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔"

سردار عبدالرب نشتر

"سید سلیمان کی وفات سے قوم ایسے جید اور فاضل عالم سے محروم ہوگئی ہے جس نے اپنی تمام زندگی اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔"

محترمہ فاطمہ جناح

نذرانۂ شعرا سید صاحب کے انتقال پر پاکستان اور ہندوستان کے متعدد شعراء نے منظومات میں خراج پیش کیا اس قسم کی نظموں اور تاریخی قطعوں کی فہرست طویل ہے ذیل میں صرف دو شاعروں کے قطعے درج کیے جاتے ہیں:-

سلیمانِ سریرِ علم و حکمت ✤ رواں شد سوئے عرشِ ربِّ اعلیٰ
بآب دیدہ سالش نوشتم ✤ علیہ رحمتہ اللہ تعالیٰ

(امجد حیدرآبادی)

۱۳۷۳ھ

کشودہ پر بہ تمنائے عالم باقی ✤ زخاکدانِ فنا رخت زندگی بربست
نشانِ صاحبِ عرفاں بہ زیر خاک مجو ✤ ببیں کہ تخت سلیماں باوجِ فردوس است

(حفیظ ہوشیارپوری)

۱۹۵۳ء

امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۱۰ھ
۱۸۹۱ء

۱۳۸۱ھ
۱۹۶۱ء

سواد تحریر امیر شریعت رح

(بشکریہ برادرم بشیر احمد خاور۔ ایڈووکیٹ)

علامہ خالد محمود۔ ایم اے

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ نے ہمارے سامنے کچھ ایسی شخصیتیں بھی پیش کیں ہیں جن کا اچھا کردار ان کے نام کا معنی لازم ہو کر رہ گیا رستم کا نام آتے ہی بہادری کا نقش ابھرنے لگتا ہے اور حاتم کے نام سے ہی سخاوت مفہوم ہوتی ہے سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تاریخ کے ان چند گنے چنے بزرگوں میں سے تھے جن کا نام آتے ہی جرأت و ہمت ایمان و غیرت اور بلاغت و خطابت کے نقوش نام کے معنی لازم بن کر آنکھوں کے سامنے نکھرتے ہیں اور تاریخ کے اس عظیم نام سے مردہ رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے ؎

مجتہد لوگ مر نہیں سکتے		وہ صرف راستہ بدلتے ہیں
ان کے نقشِ قدم سے صدیوں تک		منزلوں کے چراغ جلتے ہیں

آپ شہزادہ صلح و صفا سیدنا امام حسنؓ کی اولاد میں سے تھے مگر طبیعت پر شہید جور و جفا حضرت امام حسینؓ کا رنگ غالب تھا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی آپ کے اجداد میں سے تھے آپ کے والد کا اسم گرامی ضیاءالدین احمد تھا ان کی شادی حکیم سید احمد اندرابی کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ سے ہوئی اور انہیں سے ۱۸۹۱ء میں عطاء اللہ شاہ بمقام پٹنہ پیدا ہوئے یہیں آپکے ننھیال تھے۔

ابتدائی تعلیم پٹنہ میں ہی حاصل کی اور یہیں شعر و سخن کا ذوق بیدار ہوا اردو گھر کی زبان تھی فارسی ادبیات کی تکمیل نے اس ذوق کو نکھارا اور عربی ادب نے مقصدیت کے خاکے میں علم و حکمت کے رنگ بھرے۔

سترہ برس کی عمر میں پنجاب آئے اور اسلامیات کا رخ کیا حافظ قرآن تھے ہی امرتسر کی دینی فضاؤں نے وراثت نبوت کی دعوت دی ان دنوں ادیب اریب اور فاضل لبیب مولانا محمد عالم آسی حضرت مولانا العلامہ مفتی غلام مصطفےٰ قاسمی اور عالم باعمل عارف اکمل حضرت مولانا نور احمد صاحب امرتسری کے علم و فضل کا بہت شہرہ تھا آپ نے ان اکابر سے ادب۔ فقہ اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی ازاں بعد حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب خلیفہ اعظم حضرت مولانا تھانویؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن چاٹگامی سے حدیث پڑھی اور امام العصر حضرت مولانا انور شاہؒ سے بھی حدیث کے اسباق تبرکاً سنے قرآن کریم کا گہرا مطالعہ آپ کا امتیازی نشان تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر سیاست میں قدم رکھا برطانوی سامراج اور فرنگی سیاست پر گہری نظر تھی "الہلال" اور "ستارہ صبح" نے فکر کی تعمیر کی اور اکابر دیوبند نے ذہن کو جلا بخشی انگریز سے اتنے متنفر تھے کہ ولایتی نسل کی مرغی اور انڈے تک کو ناپسند کرتے فرماتے تھے کہ یہ انتساب بھی مجھ پر گراں گزرتا۔ مرزائیت کی مخالفت بھی دراصل ان کی انگریز دشمنی کا ہی انعکاس تھا یہ صحیح ہے کہ ختم نبوت اسلام کا مرکزی عقیدہ ہے لیکن وہ مرزائیت کے مخالف زیادہ تر اس لیے تھے کہ یہ انگریز کا ایک خودکاشتہ پودا ہے جس کا مقصد مسلمانوں کے جذبہ حریت کو دبانا اور انگریزی عملداری کو خدا کا سایہ رحمت قرار دینا تھا شاہ صاحب اس فرنگی سازش سے یہاں تک متاثر تھے کہ مرزائیت کی تردید پوری زندگی کا موضوع بن گیا اور بھرپور زندگی اس میں صرف کر دی انگریز کے خلاف وہ مجلس احرار کے داعی تھے۔ تو آزادی وطن کے بعد وہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر رہے۔

شجر امت سے پیوستگی

صف علماء میں یہ عزت تھی کہ محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب مفتی اقلیم ہند مولانا کفایت دہلوی اور قطب وقت حضرت مولانا احمد علی لاہوری جیسے بزرگوں نے آپ کو امیر شریعت تسلیم کیا اور ہاتھ پر بیعت کی پاک و ہند کا خطیب اعظم اپنی سحر بیانی اور طلاقت لسانی سے عوامی نفسیات کا بھی بلاشرکت غیرے مالک تھا تاہم آپ نے مفتدائے مفتی کے انداز میں اظہار شخصیت سے ہمیشہ پرہیز کی آپ کی سیاسی بصیرت کا فیصلہ تھا کہ ہندوستان میں تفسیروں فتنوں اور اختلافی مسائل کی کمی نہیں دبے ہوئے اختلافات کو اچھالنا اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد ڈالنا پرانے فرقوں میں ایک نئے فرقے کا اضافہ تو ہے مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں ان پر ایک ظلم ہے ہاں پچھلوں کے انتساب سے تفسیر و فقہ کا بیان فرقہ آرائی نہیں شجر امت سے پیوستگی ہے۔

تحریک آزادی کے پلیٹ فارم پر آپ کے ساتھ شیعہ، سنی، اہلحدیث، حنفی، دیوبندی، بریلوی سب مکاتب فکر جمع تھے آپ کی کوشش تھی کہ پہلے مکاتب فکر سے اشتراک کیا جائے لیکن اس بات کی بھی پوری کوشش کی جائے کہ کوئی نیا مکتب فکر یا فرقہ پیدا ہونے نہ پائے آپ کی خواہش تھی کہ قرآن و سنت کی تعبیر میں نئی اختلافی راہیں نہ نکالی جائیں اور جو اختلافات کتابوں میں سوئے ہوئے ہیں اور اس دور میں عملاً مؤثر نہیں انہیں کتابوں سے اچھال اچھال کر نئے سرے سے زندہ نہ کیا جائے۔

آپ کہا کرتے تھے کہ زمانہ حال کے مفکرین نے پرانے اختلافات ابھار ابھار کر جو نئے مکاتب فکر سامنے لا کھڑے کئے ہیں نئی گروہ بندی سے فرقوں میں ـــــ ایک نئے فرقے کے اضافے کے سوا مسلمانوں کو کچھ حاصل نہیں ہوا اگر یہ مفکرین اپنی سرگرمیاں تعمیر اور عملی خدمات تک محدود رکھتے رسائل و مسائل کی خار دار وادی میں نہ اترتے تو ان کا وجود مسلمانوں کے لیے ایک سعادت ہوتا آپ خود اس امر کی پوری کوشش کی کہ نئے مفسر یا مفتی کے جلو میں کبھی جلوہ گر نہ ہوں جب بھی مسائل کی نوبت آتی آپ اکابر علماء کی طرف رجوع کا مشورہ دیتے اور انہی علماء کی طرف متوجہ کرتے جو پہلے علماء اور سلف صالحین سے انتساب رکھتے ہوں آپ کی رائے تھی قلعہ اسلام کے لیے علمائے دین کے اعتماد کو قائم رکھنا از حد ضروری ہے اس اعتماد کے رہتے ہوئے کوئی زندقہ اور الحاد راہ نہیں پا سکتا۔ ایک مجلس میں آپ سے پوچھا گیا کہ مرزا غلام احمد کو اسلام سے خارج کیوں سمجھتے ہیں؟ آپ اس کے جواب میں ختم نبوت اور مرزا صاحب کے عقائد پر بڑی مفصل بحثیں کر سکتے تھے لیکن آپ نے اس کی بجائے یہ جواب دیا

> اکابر علماء جن پر امت کے تمام فرقوں کا اعتماد ہے مرزا غلام احمد کو اجماعاً دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں
>
> " میں علمائے دیوبند کے مسلک پر ہوں اور وہ مرزا صاحب کو انکے عقائد کی وجہ سے مسلمان نہیں سمجھتے "

شجر امت سے پیوستگی آپ کے ایمان کی دولت تھی اخلاص و انکسار نے انا ولا غیری کی جاہلی آگ بالکل بجھا رکھی تھی اپنے جماعتی فیصلوں کی مجسم تعمیل تھے حضرت رائپوری قدس سرہ کے حلقہ ارادت نے آپ کے اخلاص و انکساری کو اور نکھار دیا تھا آپ پر آپ کی جماعت کے کسی پرانے یا نئے کارکن نے کبھی آمر اور ڈکٹیٹر ہونے کا الزام نہیں لگایا علم اور منصبی ذمہ داری میں آپ نے جس کو بڑا سمجھا اس کے تعمیل حکم سے آپ نے کبھی انحراف نہ کیا اپنے اکابر کی تعظیم و توقیر آپ کی روح کی پکار اور آپ کے عمل کا منہاج تھی۔

تقسیم ملک کے بعد زعمائے احرار میں بھی اختلافات ابھرے بعض ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوئے اور بعض میں قلمی جنگ بھی ہوئی لیکن جس شخص کے خلاف کبھی کسی کی زبان نہ کھلی اور جس کا پرعظمت کردار اور ضمیر کی بلندی ہر کارکن کے دل و دماغ پہ برابر چھائی رہی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں احرار کے ہر فرد اور گروپ کا دل آپ کے اجلال و اکرام اور والہانہ عقیدت سے سرشار ہے

شاہ جی کے اس عظیم کردار کا پتہ چلتا ہے جس نے اپنوں کو تو درکنار غیروں کو بھی آپ کا متوالا بنا دیا تھا آپ پر یہ ارشاد نبوت ہر وقت تجلی ریز تھا کہ امت محمدیہ کا نشان بڑوں کی توقیر اور چھوٹوں پر شفقت ہے۔

تھانہ بھون میں حاضری

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاں حاضری اور ملاقات کے بہت آداب و ضوابط تھے عام آدمی آسانی سے حاضری کی جرأت نہ کر سکتا تھا پہلے بذریعہ خط اجازت لینی ہوتی تھی جن دنوں شاہ صاحب پر وہ مقدمہ چل رہا تھا جس میں لدھا رام سرکاری گواہ تھا ان دنوں آپ دعا کی درخواست کے لیے تھانہ بھون حاضر ہوئے آپ نے استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب مہتمم خیر المدارس جالندھر کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ انہیں پیشگی اجازت لیے بغیر تھانہ بھون لے جائیں ہر دو بزرگ جب وہاں پہنچے تو حضرت حکیم الامت خانقاہ میں تشریف نہ رکھتے تھے گھر گئے ہوئے تھے، حضرت مولانا خیر محمد صاحب شاہ جی کو وہیں بٹھا کر حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے اور شاہ جی کے آنے کی اطلاع دی حضرت حکیم الامت اپنی روایتی سختی سے احتراز فرماتے ہوئے بڑی شفقت سے پیش آئے اور خانقاہ تشریف لا کر شاہ صاحب سے بڑی بے تکلفی سے ملے شاہ صاحب کے لیے مقدمے کی بریت کے لیے دعا بھی فرمائی اور واپسی پر شاہ صاحب کو تیس روپے بھی ہدیہ پیش کیے اور فرمایا:۔

> "ان تیس روپوں کو اپنے کاموں میں میری شرکت تصور کر لیجئے میں جس طریق سے دین کا کام کر رہا ہوں میرے لیے یہی مناسب ہے۔ آپ کے لیے میری ہمدردیاں پوری طرح موجود ہیں مجھے خط لکھنا ہو تو اس کی آپ کو پوری طرح اجازت ہے ہاں آپ اپنا ایک اور نام تجویز فرمالیں جو میرے اور آپ کے مابین ایک راز ہو اور مجھے اسی نام سے خط لکھا کریں اس طرح یہاں آپکی خط و کتابت کسی کو معلوم نہ ہو سکے گی"

جن حضرات کو تھانہ بھون کی حاضری کے آداب پوری طرح معلوم ہیں وہ اس واقعہ سے شاہ صاحب کی شخصیت کا بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ بھی اس سے واضح ہے کہ حضرت حکیم الامتہ کے ہاں محنت و قربانی کا ذرہ رکھنے والے کارکنوں کی کتنی قدر و منزلت تھی۔

آپ حضرت مولانا پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے بھی بڑے معتقد تھے پیر صاحب کا ذکر آتے ہی بسا اوقات آنکھیں ڈبڈبا جائیں فرمایا کرتے تھے کہ مرزا غلام احمد کی تردید میں حضرت پیر صاحب کی خدمات ہم سب کے لیے سرمایۂ فخر ہیں آپ حضرت پیر صاحب کے علوم اور ان کی باطل شکنی ہمت کے بھی پوری طرح قائل تھے۔

آپ کی سیرت کا یہ پہلو بھی بہت دلکش ہے کہ آپ نے اپنے چھوٹوں کو خوب ابھارا ان کی اچھی طرح تربیت کی معرکۃ الآراء جلسوں میں انہیں تقریر و جرأت کی داد دی کمزوروں کے حوصلے بڑھائے گمنام گوشوں کو روشنی بخشی اور اپنے رضاکاروں تک کو سلامی دی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ربع صدی میں آپ کے گرد ایسے مقررین کا حلقہ بندھ گیا تھا جو اپنے اپنے انداز میں بلاغت و خطابت کے نہایت روشن ستارے تھے شاہ صاحب کی ایک ایک تقریر سے ان کی بیسیوں تقریریں بنتیں اور شاہ صاحب کے الفاظ اور آپ کی خطیبانہ ادائیں جملوں اور انداز میں اترتیں اور یوں محسوس ہوتا کہ شاہ جی پر ان کے وسیع حلقوں میں محبوبیت کی تجلی پوری طرح جلوہ ریز ہے ملک کے ہر گوشے اور ہر علاقے میں اب تک آپ کے ایسے جانثار احباب موجود ہیں جن کے دل کی دھڑکنوں پر ابھی تک شاہ جی کا ہاتھ ہے اور جن کی قربانیوں کی

صدائے بازگشت اب بھی کبھی کبھی ختم نبوت کے جلسوں میں سنی جاتی ہے۔

یادش بخیر قاضی احسان احمد شجاع آبادی حضرت شاہ صاحب کی نہایت کامیاب تصنیف تھے۔ شاہ صاحب مخلصین جب کبھی آپ سے تصنیف کرنے کی درخواست کرتے تو آپ فرماتے کہ میں کتابوں کی بجائے شخصیتیں تصنیف کرنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک یہی فکر سنت کے زیادہ قریب ہے قاضی صاحب کی سحر آفرین خطابت شاہ صاحب کی زبان سے "واہ قاضی" اور اشعنت یا قاضی کی تحسین بہار بے مجمع کو زعفران بنا دیتی قاضی صاحب نے شاہ صاحب کی ہی ہمت افزائی کا فیض تھی قاضی صاحب جب تقریر کرتے تو شاہ صاحب نے شاہ صاحب کے حلقہ ارادت میں آکر قید کی صعوبتیں بھی برداشت کیں مرزائیت کی تردید اور ختم نبوت کی نشر و اشاعت میں بھی ایک مرکزی کردار کی حیثیت میں تحریک آزادی ہند کا جانباز سپاہی ختم نبوت کا عظیم مجاہد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مشن کا یہ مخلص رضا کار بھی کو اللہ کو پیارا ہو چکا ہے

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

قاضی صاحب شاہ صاحب کی وفات کے بعد مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے صدر تھے اور اپنے استاد کی ... پر آپ نے لبیک کہا۔

شاہ صاحب کی شانِ استغناء

شاہ صاحب استغناء کی دولت سے بھی مالا مال تھے دولت ... آپ کی طبیعت ثانیہ تھی آپ کے ایک نہایت مخلص خادم کا بیان ... میں نے شاہ صاحب سے بارہا سنا تھا کہ منتظمین جلسوں کے موقعہ پر جو مصارف سفر پیش کرتے تو آپ انہیں کبھی ... تھے کہیں سفر خرچ نہ بھی ملا تو شاہ صاحب کو اس کی کوئی پروا نہ تھی عقیدت مند ہدیہ پیش کرتے تو اسے بھی اسی طرح قبول فر لیتے۔ اس مخلص خادم کا بیان ہے کہ میں نے آپ کے اس بیان کی تحقیق کے لیے ایک دفعہ جب کہ شاہ صاحب وضو کر رہے تھے اچکن سے چالیس روپے نکال لیے بعد میں منتظر رہا کہ شاہ صاحب کہیں چوری کی شکایت کریں مگر معلوم ہوا کہ شاہ صاحب اس گمشدگی کا پتہ نہیں چند ماہ گزرنے کے بعد میں نے وہ رقم پھر آپ کی جیب میں ڈال دی تو بھی آپ کو اس اضافے کا نہ سکا میں نے جب پوری بات بتائی تو آپ نے بڑے تعجب سے فرمایا:۔

"بھائی پچیس سال سے جماعت کے ساتھی ہو ابھی تک تمہیں میرے ایمان کا پتہ نہیں چلا۔ دولت انسان کی خدمت کے لیے ہے مخدوم بننے کے لیے نہیں۔ مال جمع کرنے اور گننے میں لذت محسوس کرنا اہل جہنم کا نشان ہے جَمَعَ مَالاً وَعَدَّدَہ اچھے لوگوں کے حق میں نہیں"

لکھنو کے تبرا ایجی ٹیشن میں شاہ جی ناموس صحابہؓ کے لیے تڑپے آپ کی بس ایک کروٹ نے ملک میں یہ احساس پیدا کر کہ ناموس صحابہؓ کے لیے ایک مستقل پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جناب محمود خاں لغاری اور سردار احمد خاں پتافی کی ... کردگی

...لیم کا قیام اس مرد قلندر کی اسی ایک کروٹ کا ثمرہ تھا۔

شاہ جی صاحب کے ملفوظات برجستہ جوابات اور ان کی شخصیت کے متعلق علماء و زعماء کے بیانات آپ کے سامنے ہیں ... برادر عزیز حافظ عبدالرشید ارشد نے ترتیب دیا ہے۔ ان میں ان حضرات کی آراء بھی شامل ہیں جن کی اپنی سوانح اور ملفوظات ... میں ظاہر ہے کہ یہ اظہار عقیدت کسی ایک فرد ایک گروہ یا ایک مسلک کا نہیں پوری قوم اور پریس کی ایک مجموعی آواز ہے۔

۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو کاروان آزادی کا یہ سالار بھی اپنے پیشرووں سے جا ملا اور نصف صدی کا یہ زریں باب بھی تاریخ ...ـے جزو ہو کر رہ گیا۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند

...گرفتاری = زیر دفعہ ۱۲۴-الف (تحریک بغاوت) ۲۴ مارچ ۱۹۲۱ء مدت تین سال جیل میانوالی

...ی گرفتاری = " " ۱۰۷ ضابطہ فوجداری (نقض امن و آئین شکنی) ۶ جولائی ۱۹۲۷ء مدت سزا ایک سال بورسٹل جیل لاہور (بہ سلسلہ سدباب فتنہ شاتم رسول راجپال)

...ی گرفتاری = زیر دفعہ ۱۰۸-الف ۳۰ اگست ۱۹۳۰ء مدت سزا چھ ماہ۔ علی پور جیل۔ ڈم ڈم جیل (بہ سلسلہ تحریک حقوق خود اختیاری و آئین آزادی)

...ی گرفتاری = زیر دفعہ ۱۲۴-الف (غالباً) ۱۹۳۱ء۔ مدت سزا۔ ایک سال دہلی جیل بہ سلسلہ تحریک کشمیر

...ی گرفتاری = زیر دفعہ ۱۵۳ الف نومبر ۱۹۳۴ء مدت سزا چھ ماہ بعد از اپیل سیشن کورٹ سزا پندرہ منٹ تا برخاست عدالت ۶ دسمبر ۱۹۳۰ء (بہ سلسلہ تحریک استیصال مرزائیت بربنا تقریر احرار کانفرنس قادیان)

...ی گرفتاری = بوجہ خلاف ورزی دفعہ ۱۴۴۔ عائد شدہ بر داخلہ قادیان۔ مدت سزا چھ ماہ۔ گورداسپور جیل و نیو سنٹرل جیل ملتان (بہ سلسلہ ادائے نماز جمعہ در سرزمین قادیان)

...یں گرفتاری = زیر دفعہ ۱۱۷-۱۲۱-۱۲۴-۱۵۳-۳۰۲ وغیرہ ستمبر ۱۹۳۹ء دوران سفر برلاری۔ بربنائے تقریر راولپنڈی

...یں گرفتاری = زیر دفعہ ۱۲۱/۱۲۴ ۱۱۷/۱۵۳ ۲۸ جون ۱۹۳۹ء مدت سزا بہ شکل حوالات ایک سال سات ماہ چار دن۔ راولپنڈی گجرات اور نیو سنٹرل جیل لاہور فیصلہ مقدمہ پر دونوں مقدموں میں باعزت بریت در رہائی (بہ سلسلہ تحریک حصول آزادی و فوجی بھرتی بائیکاٹ)

...ی گرفتاری = ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء مدت سزا بطور نظر بندی ایک سال ساڑھے آٹھ ماہ مقام سزا۔ کراچی۔ حیدرآباد (ہائی کورٹ میں اپیل اور رٹ، سجا جرم ثابت نہ ہونے پر پہلی پیشی پر رہائی) سکھر۔ سنٹرل جیل ملتان

...ی گرفتاری۔ بہ صورت حکم پابندی کل مدۃ ملتان شہر میں چھ ماہ کی نظر بندی۔ بہ سلسلہ تحریک مقدس تحفظ ختم نبوت

...یں گرفتاری ۲ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۹۵۶ء۔ مدت حراست ۲ گھنٹے قریب افطار ضمانت۔ مقدمہ کی کارروائی قریباً پانچ ماہ

...گرفتاریاں گیارہ ۱۱۔ کل مدت قید و نظر بندی۔ نو سال دو ماہ چوبیس دن (تقریباً)

ایک دنیا جسے خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے

نمبر	نام	قول
۱	حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ	" ان کی باتیں عطاء الٰہی ہوتی ہیں "۔
۲	علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ	" قادیانیوں کے خلاف ان کی ایک تقریر ہماری پوری تصنیف سے بڑھ کر
۳	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	" ان کا دل صرف اسلام کے لئے دھڑکتا ہے "۔
۴	شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ	" وہ کسی ایک کے نہیں سب کے ہیں ۔ وہ اسلام کی مشین ہیں
۵	مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ	" وہ ولی کامل اور اسلام کی برہنہ شمشیر ہیں ۔ جب تک وہ ز کو کوئی خطرہ نہیں "۔
۶	مولانا ابوالکلام آزادؒ	" ملک و ملت کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے "۔
۷	شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ	" شاہ جی اسلام کی چلتی پھرتی تلوار ہیں "۔
۸	مولانا محمد علی جوہرؒ	" مقرر نہیں ساحر ہیں ، تقریر نہیں جادو کرتے ہیں "
۹	مولانا ظفر علی خاںؒ	" بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں "۔
۱۰	نواب بہادر جنگؒ	" اے کاش میں اس شخص کو مسلم لیگ میں لا سکتا ۔ اگر یہ میرے تو چھ ماہ کے اندر ملک میں انقلاب برپا کر دوں "۔
۱۱	مولانا شوکت علیؒ	" وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں "۔
۱۲	مولانا داؤد غزنویؒ	" بخاری مرحوم جیسا اسلام کا شیدائی دنیا میں پیدا ہونا مشکل
۱۳	سردار عبدالرب نشترؒ	" وہ باغ و چمن سے اٹھے اور دار و رسن سے گذرے "۔
۱۴	شیخ حسام الدینؒ	" وہ فنِ خطابت کے امام تھے ان کی موت سے اس محفل کے گل ہوئے ہیں ۔ اب وہ ہمیشہ روشنی کو ترستے رہیں گے "۔
۱۵	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ	" ان کی زندگی کے روشن نقوش نہ صرف تاریخ کے صفحات بلکہ کروڑوں انسانوں کے دماغوں پر مل سکتے ہیں "۔
۱۶	مولانا حسرت موہانیؒ	" وہ خطابت کے شاہسوار ہیں "۔
۱۷	خواجہ حسن نظامی دہلویؒ	" انہیں دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے مسلمان یاد آتے ہیں "۔

قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادیؒ : "وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے"۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب۔ (دارالعلوم۔ دیوبند۔) : "ان کی پاکیزہ نورانی صورت ان کی پاکیزہ سیرت کی ترجمانی تھی"۔

مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی۔ : "ان کی موت سارے عالم اسلام کے لئے نقصان عظیم ہے"۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کراچی۔ : "ان کی موت سے علماء کی صف میں پیدا ہونے والا خلا مدتوں پر نہ ہوگا"۔

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری۔ : "ایک ایسی شخصیت جس نے ایسا کام کیا جو ایک صدی میں ایک ادارے سے مشکل ہو سکتا ہے"۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ : "وہ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب تھے"۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی (لکھنؤ بھارت) : "وہ اسلام اور مسلمانوں کے وفادار تھے"۔

مولانا محمد علی صاحب جالندھری۔ : "وہ فقر و استغنا کا پہاڑ تھے"۔

علامہ علاؤ الدین صدیقی۔ : "اسلام اور آزادی پر دل و جان سے قربان ہو جانا ان کی زندگی کا منتہا تھا"۔

ماسٹر تاج الدین انصاری۔ : "وہ علم و ادب، فکر و دانش، سیاست و تدبر کی محفلوں کا چراغ تھے"۔

مظفر علی شمسی۔ : "وہ حقیقتاً فنا فی الرسول تھے"۔

شیخ عثمان آزاد کراچی۔ : "وہ برطانوی سامراج کے خلاف طویل جنگ کے عظیم رہنما تھے"۔

حافظ حبیب اللہ خاں وائس چیئرمین۔ : "ان کا برطانوی استعمار کے خلاف جنگ آزادی میں بہت بڑا حصہ ہے"۔

ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ۔ : "ان کے معرکوں کی گونج تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ سنی جائیں گی"۔

مولانا غلام رسول مہر۔ : "ان کے وجود کی ماہیت اور معنویت کا ذرہ ذرہ اسلامیت سے سرشار تھا"۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔ : "وہ واقعی عظیم اشخاص میں سے تھے۔ جن کی ہستی کی ترکیب و تعمیر میں قدرت کے غیر معمولی قوانین نے کارفرمائی کی"۔

آغا شورش کاشمیری۔ : "قرون اولیٰ میں پیدا ہوتے تو یقیناً ایک جلیل القدر صحابی ہوتے"۔

احمد ندیم قاسمی۔ : "ان کے بے داغ اور بے لوث خلوص کی قسمیں صدیوں بعد کھائی جاتی رہیں گی"

حافظ علی بہادر (ایڈیٹر "دور جدید" بمبئی بھارت) : "ایک فقیر جس کے دامن میں اللہ کے خوف اور رسول کے عشق کے سوا کچھ نہ تھا جسکو ہمیشہ زنجیروں نے سلام کیا"

مولانا عبدالرحمٰن صاحب میانوی۔ : "جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم"۔

مولانا تاج محمود صاحب لائلپوری۔ : "ان کے کل محاسن خطابت کے لئے اور ان کی خطابت عشق رسول کیلئے تھی"

محمد ایوب خاں، سابق صدر پاکستان۔ : "وہ جنگ آزادی اور اسلام کے زبردست مجاہد تھے"۔

محمود علی قصوری۔ : "ان کا چلن زندگی کے سفر میں چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے"۔

۴۱ : مولانا مظہر علی اظہر ۔ " ان کی سیاسی بصیرت کے علاوہ، ان کی دینی، علمی اور ادبی بصیرت کی مثال دنیا کے کسی انسان میں نہیں مل سکتی ۔"

۴۲ : مولانا کوثر نیازی ۔ " پاک و ہند کی تاریخ آزادی میں ان کی زندگی ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے " ۔

۴۳ : عبدالحمید عدم ۔ " اخوت کا پیکر لگن کا ضمیر " ۔

۴۴ : انور صابری (دیوبند ۔ بھارت) ۔ " کرے گی ناز تجھ پہ حشر تک تاریخ انسانی " ۔

۴۵ : علامہ لطیف انور ۔ " تعظیم محمد کی ادا مر نہیں سکتی "

۴۶ : شفیر افضل جعفری ۔ " اس کا جنون دانش کا بدل "

۴۷ : حبیب جالب ۔ " تجھ سے پہلے عام کہاں تھی دار و رسن کی بات " ۔

۴۸ : عبداللہ ملک ۔ " وہ لیلائے حریّت کی تلاش میں سیاست کی پرخار وادی میں دیوانہ وار مصروف رہا " ۔

۴۹ : میاں محمد شفیع (مدیر ہفت روزہ "اقدام") ۔ " میں ان کی سادگی اور ان کی خطابت کا قلب و جگر سے معترف ہوں "

۵۰ : ابن گیلانی ۔ " جیسے خورشید کوئی اس کے گریبان میں ہے " ۔

۵۱ : جانباز مرزا ۔ " تیرے قدموں میں رہا تاجِ فرنگی کا وقار " ۔

۵۲ : لالہ بھیم سین سچر ۔ " وہ ان چند بے خوف شخصیتوں میں سے ہیں جن کے لئے میرا دل بے پناہ احترام کے جذبات سے معمور رہا ہے " ۔

۵۳ : دیوان سنگھ مفتون (بھارت) " وہ تاریخِ آزادی کے ایک بہادر، نڈر، بے باک اور حق گو شخصیت کے ...

پریس کا خراجِ عقیدت

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چوں مسیح   باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

جی چاہتا ہے آج جی بھر کر رو لوں ۔ بالآخر وہ بھی رخصت ہو گیا جو اس زمانے میں اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھا جس نے دم تک فقر و استغناء کے پرچم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ جس کی زندگی بہت سی زندگیوں کا مجموعہ تھی ۔ جس کا وجود ایک تاریخ تھا، ایک تھا، ایک ادارہ تھا، ایک انجمن تھا، ایک تحریک تھا ۔ غرض ایک ایسا محور تھا جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے ۔ وہ ایسا خطیب تھا کہ اس کی آتش بیانی کا لوہا اس کے حریف بھی مانتے تھے ۔ اردو زبان نے اس مرتبہ کا خطیب نہ کبھی پیدا کیا اور نہ آئندہ کر سکے گا ۔ وہ ایک مجاہد عظیم تھے ۔ انہوں نے اعلائے کلمۃ الحق سے کبھی گریز نہیں کیا ۔ ۷۰ سال کی عمر مستعار میں انہوں نے ...

...دبند میں گذارے اور ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں شاید ان کے ارادوں کی بابت شک ...ا ہو مگر انہیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شبہہ نہیں ہوا وہ اس مدرسۂ فکر کے علم بردار تھے جن کی بنیادیں محمد قاسم نانوتویؒ ...ور محمود حسنؒ کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھیں۔ تمام زندگی ایک ہی مشن رہا کہ برصغیر سے انگریز کی حکومت کیوں کر نکالی جا سکتی ہے۔ ...ہ علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ میرے سامنے دو چیزیں ہیں اولاً انگریز کی حکومت یہاں سے ختم ہو جائے ثانیاً وہ ختم نہیں ہوتی تو میں اسکے ...لاف تبلیغ کرتے کرتے تختہ دار پر لٹک جاؤں۔ پھر ان کا دل عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جلوہ گاہ تھا۔ حضورؐ کے عشق میں وہ اس ...ندر سرشار تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی عشق تھا اس عشق ہی نے ...انہیں ختمِ نبوت کے عقیدے کا مجاہد بنا دیا۔ پھر جس عشق و ایثار کے ساتھ انہوں نے اس راستے کا سفر کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ بہت سی ...غلطیوں کو معاف کرتے رہے مگر دو چیزوں سے وہ نہ کبھی سمجھوتے پر آمادہ ہوئے اور نہ اس بارے میں وہ عفو و درگذر کو پسند کیا کرتے تھے

اوّل ——— انگریز کی غلامی اور اس کے گماشتوں سے دوستانہ۔

دوم ——— ختم نبوت کے قزاقوں کے تعاقب میں ذرا بھر کوتاہی۔

وہ کہا کرتے تھے میں توشۂ آخرت کے طور پر یہی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ یہی لے گئے۔

وہ اپنے عہد کے ابوذر غفاری تھے۔ فقر و فاقہ ان کا شعار تھا۔ انہوں نے کبھی کسی تحریک و تنظیم قائد و جماعت کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے ...وہ خطابت و ضمیر کی سودا بازی کے بازار سے ہی ناآشنا تھے۔ ان پر زمانے نے بہت سا گرد و غبار پھینکا اور خود فروشوں نے الزامات کے چولہے ...ے چنگاریاں لے کر بار ہا ان کی دستار فضیلت پر پھینکیں مگر وہ تہمتوں کے بازار سے کنکریاں کھاتے ہوئے نکل گئے۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بارگاہ میں سرخرو ہو گئے ہیں۔ انشاء اللہ قیامت کے روز بھی سرخرو ہی اٹھیں گے۔

تذکروں میں ہے کہ جب امام تیمیہؒ کا جنازہ اٹھا تھا تو پورا شہر اشکبار ہو کر نکل آیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی مظلومیت نے لوگوں کے دلوں کو احاطہ کر لیا ہے اور بے چین عوام وقت کی اس عظیم الشان دولت کو آخری خراج ادا کرنے کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔

شاہ جیؒ کا جنازہ بھی اسی دھوم دھام سے اُٹھا۔ ایک انسان جو عمر بھر مہاجر رہا اور جب امرت سر سے مہاجرت کر کے ملتان میں پناہ گزین ہوا تو ایک کچا مکان کرائے پر لے کر اس میں رہا۔ بارہ برس اس میں رہا۔ آخر وہیں اس کی روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کیا۔ وہیں سے اس کا جنازہ اٹھا۔ لیکن فقیر کا جنازہ شاہوں کے جنازے کو مات کر گیا۔ ایک شخص جو بالطبع فقیر تھا۔ جس کے دامن میں اللہ کے خوف اور رسولؐ کے عشق کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس کو ہمیشہ زنجیروں کو سلام کیا۔ جس کا سیم و زر کے بت خانوں میں ذکر تک مفقود رہا جس نے ایک لحظہ کے لئے بھی اخبارات اور کتابوں کے صفحوں میں اپنا نام ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی جو آخر تک چٹائی پر بیٹھا، لیٹا اور سوتا رہا جو اس مقام میں بھی رسولؐ کی زندگی کا عکس تھا اور جب اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تو ایک، اور ڈیڑھ لاکھ کے درمیان لوگ اشکبار چہروں کے ساتھ اس کی میت کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں ایک تہائی لوگ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ اور بعض بے ہوش ہو گئے۔ کیا اس فقیر نے یہ آنسو خریدے تھے؟ وہ تو شاید دوسرے وقت کی روٹی خریدنے پر بھی قادر نہ تھا۔

یہ سب کچھ اس کی بے غرضی اور بے نفسی کا صلہ تھا۔ وہ اگر لاہور، لائل پور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ میں رحلت فرماتے تو ہجوم ...کئی لاکھ تک پہنچ جاتا۔ لیکن دور افتادہ اور پسماندہ ملتان میں بھی ان کا ماتم اس شدت سے کیا گیا کہ ملتان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں۔

ہم نے اپنے اس وطنِ عزیز میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں، ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے علماء اور فضلا آغوشِ لحد میں اتارے گئے لیکن شاہ جیؒ کی میت کے گرد عشاق کا جو ہجوم تھا اور لوگوں نے جس بے اختیاری کے ساتھ ان کا ماتم کیا، فقراء و علماء کی پوری صف اس سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب دماغوں اور دلوں کے حکمران تھے۔ اپنی بے سروسامانی کے باوصف انہیں اس اقلیم میں جو وقار اور اقتدار حاصل تھا اس کا اقرار و اعتراف ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستان میں وہ ایک ہی شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رفاقت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ سر دینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ ان کے فدائیوں کا قبیلہ ملک کے ہر گوشے میں موجود ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے جو خلاء پیدا ہو گیا وہ کبھی پُر نہ ہو گا۔ خطابت بیوہ ہو گئی۔ لوگ کبھی اس طرف سے گذریں گے جہاں شاہ جی گرجتے اور گونجتے رہے ہیں تو دلوں سے ہُوک اُٹھا کرے گی کہ یہاں کبھی وہ مردِ مجاہد صرصرِ آغوش راتوں میں اپنا چراغ جلایا کرتا تھا جس کی نوا پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ قرونِ اولیٰ کا کوئی غزوہ نقاب الٹ کر سامنے آگیا ہے یا پھر لوگ غارِ حرا کے ارد گرد کھڑے ہیں۔ قرآن اُترا آیا ہے اور قند و نبات کی طرح گھلتا ہُوا کانوں کے راستے سے دلوں کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح بیٹھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن اب وہ رعنائی خیال کہاں؟ (ہفت روزہ "چٹان")

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جن کا ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہُوا۔ اس پورے برصغیر کی ممتاز اور محترم شخصیت کی حیثیت سے لاکھوں انسانوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز رہے۔ وہ ایک جادو بیاں مقرر اور برصغیر کی تاریخ کے سب سے زیادہ مؤثر خطیبوں میں شامل تھے۔ مولانا سید عطاء اللہ بخاریؒ کی ساری عمر قومی خدمت میں گذری۔ پندرہ سال تک وہ قید افرنگ میں رہے اور سامراجی طاقت کے ساتھ لڑنے میں اپنا تن من دھن لٹاتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ایک مخلص، دیانت دار، اصول پرست اور عوام دوست رہنما کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا حق یہ ہے کہ ایک عظیم شخصیت تھی جو ہم سے جُدا ہو گئی۔ ایک مخلص رہنما سے یہ قوم محروم ہو گئی لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور انہوں نے قوم کو آزاد کرنے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لئے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے گا۔ ان کی مجلسِ احرار نے آزادی سے پہلے جس خلوص اور جذبہ سے کام کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور اسے اس ملک کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اس قوم کے نوجوانوں میں وہ خلوص وہ جذبہ اور وہ کردار پیدا کرے جس کا مظاہرہ اس مجاہد نے عمر بھر کیا۔ (روزنامہ "جنگ" کراچی)

وہ شعلہ نوا اُٹھ گیا ہے جس نے ربع صدی تک سپاہ آزادی کا دل گرمائے رکھا اور حوصلے بڑھائے۔ دنیائے خطابت کو اس پر ناز تھا اور ان کی یہ صلاحیت ملک و ملت کی خدمت کے لئے وقف رہی لیکن وہ صرف خطیب ہی نہیں تھا عمل کا دھنی بھی تھا۔ وہی کچھ کہتا جس پر کاربند اور وہی کچھ کرنے کی تلقین کرتا۔ اگر ہم ان بزرگوں کی فہرست مرتب کریں جنہوں نے دورِ غلامی میں برطانوی سامراج کے خلاف گفتار و کردار سے رائے عامہ کو بیدار کیا تھا تو امیرِ شریعت کا نام سب سے پہلے آئے گا۔

شاہ صاحبؒ کی زندگی کا یہ پہلو خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ وہ صرف سیاست کے ہو کر نہیں رہ گئے تھے، اسلام کی تبلیغ کا فرض بھی ہمیشہ ان کی نظروں میں رہا تھا۔ دین فطرت کی سربلندی ان کی سب سے بڑی تمنا تھی اور ناموسِ رسولؐ کی پاسبانی اور ملت کا استحکام ان کا مقصدِ حیات تھا۔ زہد و پاکبازی اور مذہب کے گہرے مطالعہ اور علم کی بناء پر وہ امیرِ شریعت کے منصب پر فائز ہوتے تھے اور ان

منصب پر اپنا حق ثابت کر دیا تھا۔ (روزنامہ "امروز" - لاہور)

ملک میں سید عطاء اللہ بخاریؒ کی موت کی خبر انتہائی رنج و ملال سے سنی جائے گی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو ہماری آزادی کی شاہراہ ربع صدی قبل کے ان تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں سے جا ملتی ہے جہاں چند اولوالعزم انسان درماندہ مسافروں کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کبھی ان کی شعلہ نوائی سے مردہ زندگی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے اور اپنے حال سے پریشان اور مستقبل سے مایوس یکایک نئے حوصلوں اور ولولوں سے سرشار ہو کر ان کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی کڑی آزمائشوں کے دور میں ان کے پیچھے چلنے والے قافلوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے لیکن ان کوہ پیکر انسانوں کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آزادی کی تمنا کرنے کے جرم کی پاداش میں ان کے لئے قید خانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان کی زبانوں پر سنگینوں کے پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہر مصیبت، ہر ناکامی اور ہر آزمائش ان کے سینے میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتی ہے۔

سید عطاء اللہ بخاریؒ کی زندگی کا مقصد کروڑوں انسانوں کو آزادی کی تڑپ عطا کرنا تھا۔ اگر ہم آزادی کے ایک نڈر مبلغ کی حیثیت سے ان کے حالات پر غور کریں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ہمیں ان کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی ان کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی تو اس وقت سید عطاء اللہ بخاریؒ کو فراموش نہیں کر سکیں گی۔ (روزنامہ "کوہستان" لاہور)

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم کی صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تقریر کا جادو استعارہ نہیں۔ مرحوم کی ذات میں ایک حقیقت تھا۔ وہ اپنی سحر بیانی سے لاکھوں کے مجمع کو گھنٹوں محوِ حیرت رکھتے، ہنساتے، رلاتے، تڑپاتے اور آمادۂ عمل کرتے۔ اتنا بڑا شعلہ نوا اور معجزہ بیاں اب پیدا نہ ہوگا اور وہ اس لئے کہ بقول ایک معاصر "وہ روایت جس میں لفظ گرمیٔ آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا اور وہ روایت جس نے خطابت کو جنم دیا۔ کمزور ہو چکی ہے۔ (ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور)

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اردو اور پنجابی کے بے مثل خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت، خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز شاہی قلعے پر مرکوز کئے تھے۔ انہیں اختلاف عقیدہ کے علاوہ احمدیوں سے غیر فانی کد کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بانی سلسلہ نے انگریز سلطنت کو ابرِ رحمت قرار دے رکھا تھا "خدا تعالیٰ ابرِ رحمت کی طرح ہمارے لئے انگریزی سلطنت کو دور سے لایا اور ہم پر اور ہماری ذریت پر یہ فرض ہو گیا کہ اس مبارک گورنمنٹ برطانیہ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں" اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولی باری جاری رکھی اور دونوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔ (ہفت روزہ "اقدام" - لاہور)

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم جامع کمالات شخصیت تھے۔ برصغیر میں اس پائے کا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ جنگ آزادی میں شاہ صاحبؒ نے نمایاں طور پر حصہ لیا اور عمر عزیز کا ایک حصہ تقریباً ۱۸ سال جیل میں بسر کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری زندگی بھی کیا ہے

چوتھائی ریل میں گئی اور ایک چوتھائی جیل میں ـــ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ صاحب مرحوم نے اپنی شعلہ بیانی تقریروں کے ذریعے عوام میں وہ مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل کی جو بہت کم لیڈروں کو نصیب ہوئی۔ ان کی تقریر سراسر اعجاز تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد تقریر شروع کرتے اور فجر کی نماز تک تقریر جاری رہتی۔ ان کی تقریر کے دوران کسی شخص کو جلسہ سے اٹھ کر جانے کا ہوش نہ رہتا تھا۔ مخالف سے مخالف کے مجمع کو شاہ صاحب اپنی سحر بیانی سے مسحور کر لیتے تھے۔ ہزار ہا افراد کو بیک وقت رُلا دینا اور ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ (ہفت روزہ "ایشیا" لاہور)

حضرت شاہ صاحبؒ حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل پر پڑتی اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔ وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھی کہ کفر ضلالت کے جس خرمن پر گرتی اس کو راکھ کر دیتی۔ وہ لحن داؤدی کا اس دور میں نمونہ تھے کہ دوست و دشمن سب کو مسحور کر لیتے وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان پڑ جاتی جس کی ایک آواز پر ۵ ہزار رضا کار آزادی کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر چل پڑتے جن کے ایک اشارے پر متحدہ ہندوستان کے برطانوی جیل خانے بھر جاتے جن کا داخلہ قادیان ایوان مرزائیت میں زلزلہ ڈال دیتا جو علم و عمل، شعر و ادب، اخلاق و مزاج، ظرافت و لطافت، شریعت و طریقت اور رزم و بزم کے مجمع کمالات تھے۔ (ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور)

امرتسر کے عظیم سیاسی اجتماع میں شاہ جی کی شرکت اور ان کی پہلی گرفتاری۔

سامعین میں ہمارے شاہ جی بھی لیڈران کی زیارت کے شوق میں سراپا محویت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں قائدین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور رضا کاروں کی معیت میں یکے بعد دیگرے مسلمانوں کی آرزوؤں کے مظہر اپنی اپنی جگہوں پر براجمان ہوئے۔ صدارت کی کرسی پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم فروکش تھے اور ان کے دائیں بائیں بیٹھنے والوں میں علی برادران، ڈاکٹر مختار انصاری، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، میاں فضل حسین، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد داؤد غزنوی، ملک برکت علی، پیر تاج الدین اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد حضرت علامہ اقبالؒ نے علی برادران کو مخاطب کر کے وہ مشہور قطعہ پڑھا "اسیری" کے نام سے مشہور ہو چکا ہے۔ اس اجلاس میں جب چیمسفورڈ اصلاحات کو رد کرنے کی قرار داد تحریک و تائید وغیرہ کی منازل طے کر چکی تو رئیس الاحرار حضرت مولانا حسرت موہانی نے رائے شماری سے پہلے ذیل کے شعر میں انگریزوں سے بیزاری کا اعلان کیا۔

تو جو جانے پہ ہو راضی تو تیرے سر کی قسم ۔۔۔ کر کے چندہ ابھی لے دوں تجھے لنڈن کا ٹکٹ

اس پر ہال نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا جس میں ہمارے شاہ جی کی پرمسرت داد بھی کسی سے کم نہ تھی۔ واضح رہے کہ اس وقت شاہ صاحب صرف اصلاح رسوم پر ہی وعظ کہتے تھے یا دوستوں کی محفلوں میں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی تک ہی اپنے اوقات کو محدود کئے ہوئے تھے جس کی دو وجوہات تھیں۔ اوّل تو شاہ جی مذہبی لٹریچر سے بہت زیادہ شغف رکھنے کی وجہ سے اخبار بینی کی طرف بہت کم راغب تھے۔ دوسرے وعظ و خطیب کی حیثیت میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سوئے اتفاق یا سوچی سمجھی سکیم کے تحت ...

کا تعلق ایک تھانیدار سے اس قدر زیادہ ہوگیا اور باہمی اعتمادی کیفیت یہاں تک بڑھی کہ نوجوان شاہ جی اس کو اپنا مخلص دوست اور بہی خواہ سمجھتے ہوئے اس کی پسند و ناپسند کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ شاید ایک لمبے عرصے تک جاری رہتا لیکن درمیان میں مولانا داؤد غزنوی اور دوسرے سیاسی ذہن رکھنے والے دوستوں سے تبادلہ خیالات نے اپنا اثر چھوڑنا شروع کیا جس کے نتیجہ میں شاہ جی یکایک خلافت کمیٹی کے سٹیج سے مسلمانوں کی آواز بن کر سیاسی اور مذہبی افق پر چمکنا شروع ہوگئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۱ء میں مسجد خیرالدین کی ایک تقریر کی پاداش میں تین سال کے لئے میانوالی جیل میں بھیج دیئے گئے۔ جس کے بعد جیل سے ریل اور ریل سے جیل کا وہ لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو مسلسل چالیس برس تک جاری رہا۔ میرے خیال میں شاہ صاحب وہ منفرد زعیم تھے جو امراء کی کوٹھیوں میں بہت کم اور غرباء کی جھونپڑیوں میں بہت زیادہ قیام میں راحت محسوس کرتے اور شاید اس خصوصیت میں اپنا کوئی مدمقابل نہیں رکھتے تھے۔ ان سے زیادہ کسی قومی کارکن یا قائد نے سفر نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو یقیناً اس کے تجربے میں وہ تمام نئے اور پرانے طریقہ ہائے شامل نہیں تھے۔ پیدل سے لے کر اونٹ، گدھا، گھوڑا، موٹر کار، موٹر بس، ریل، بیل گاڑی اور موٹر چھکڑے سب کے سب آپ کے مشن کی تکمیل میں استعمال کئے گئے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ شاہ صاحب نے عام طور پر تھرڈ کلاس کے سفر کو پسند کیا۔ سیکنڈ یا فسٹ کلاس میں کبھی سفر اختیار نہ کیا۔ نہ ہی آپ نے کبھی ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کو ترجیح دی۔ بلکہ عام طور پہ دوستوں کو یہ کہہ کر اس سفر سے روکتے رہے "کہ میاں یہ تو صریح ہلاکت ہے بھلا اس کو بھی موت کہا جاسکتا ہے جہاں گور و کفن تو ایک طرف سرے سے لاش کا ہی پتہ نہ ہو" اس قسم کے جفاکش، مخلص اور اپنی دھن کے پکے خادم اب کہاں ملیں گے۔ بقول حضرت اقبال ؎

آئے عشاق، گئے وعدہ فردا لے کر		اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

شاہ جی کی تقریر

"اے مسلمانانِ لاہور آج جناب رسول صلعم کی آبرو تمہارے شہر کے ہر ہر دروازے پر دستک دے رہی ہے اے امتِ رسول صلعم آج ناموسِ محمدی کی حفاظت کا سوال درپیش ہے اور یہ سانحہ سقوط بغداد سے بھی زیادہ غمناک ہے۔ زوالِ بغداد سے ایک سلطنت پارہ پارہ ہوگئی تھی مگر توہین رسولؐ کے سانحہ سے آسمانوں کی بادشاہت متزلزل ہو رہی ہے۔

قادیاں کانفرنس

اس کانفرنس کا انعقاد اکتوبر ۱۹۳۴ء کے تیسرے ہفتے میں ہوا۔ اور اس کانفرنس کے لئے ۲۱، ۲۲، اور ۲۳ اکتوبر کی تاریخوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے لئے ایک سکھ زمیندار کی اراضی حاصل کی گئی تھی۔ اس زمیندار کا نام ایشر سنگھ تھا۔ اس اراضی پر پنڈال بھی تیار ہونا شروع ہوگیا تھا لیکن مرزائیوں نے اس اراضی پر قبضہ کرلیا۔ اب احراریوں کیلئے اور کوئی راستہ نہیں تھا یا تو وہ اراضی کے لئے لڑتے یا شہر سے دور کانفرنس منعقد کرتے۔ احرار نے جھگڑا کرنے سے گریز کیا۔ کیونکہ اس وقت مرزائیوں کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ فساد کرایا جائے اور اس بنیاد پر کانفرنس کو امن عامہ کے خلاف ثابت کر کے بند کروایا جائے۔ مجلس احرار مرزائیوں کے اس ارادے کو بھانپتی تھی۔ چنانچہ اس اشتعال کے باوجود مجلس احرار نے ایشر سنگھ کی اراضی پر کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے بعد قادیاں سے ایک میل کے فاصلے پر ڈی۔ اے۔ وی۔ سکول کے پہلو میں پنڈال تیار کیا گیا۔

کانفرنس کے دو دن پہلے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار نے قادیاں سے یہ خبر بھیجی تھی کہ جس میں اس کانفرنس کے خدوخال اور اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ "مجلس احرار ۲۱، ۲۲، اور ۲۳ اکتوبر کو ایک تبلیغی کانفرنس قادیان میں منعقد کررہی ہے۔ اس کانفرنس کیلئے

بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مرزائیوں کی طرف سے مسلسل یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ اس کانفرنس سے ان کا جان و مال خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ چنانچہ مرزائیوں نے اپنی حفاظت کے لئے لاتعداد دیہاتیوں کو اور اپنے مریدوں کو قادیان میں جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ادھر احرار کی اس کانفرنس میں ۲۰ سے لے کر ۵۰ ہزار کا ہجوم ہے۔ مزید برآں کانفرنس کے منتظمین کا مطالبہ ہے کہ ان کو کانفرنس کے صدر کا جلوس نکالنے کی اجازت ہونی چاہئے اور یہ جلوس قادیان شہر میں سے گزرے۔

اس کانفرنس کے پیش نظر آج صبح پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس خود بہ نفس نفیس قادیان آئے۔ ان کے ہمراہ پولیس کی بھی ایک بھاری جمعیت تھی چنانچہ انسپکٹر جنرل پولیس نے کانفرنس وغیرہ کا موقع دیکھا اور احکام جاری کر دیئے کہ اگر اس کانفرنس کے دوران قادیانیوں نے کوئی اجتماع منعقد کرنے کی کوشش کی تو یہ اجتماع خلاف قانون متصور ہوگا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے احراریوں اور ان کی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو بھی متنبہ کیا کہ وہ کانفرنس میں کسی قسم کے ہتھیار کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ لاٹھیوں کو بھی ساتھ لانے کی ممانعت کر دی گئی۔ مزید برآں کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والے لوگوں کے لئے ایک خاص راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ نیز اگر کسی قسم کا جلوس نکالا جائے تو اسے شہر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج تک قادیان میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے چار سو پولیس کے سپاہی پہنچ جائیں گے۔ احراری ہر حالت میں کسی قسم کے جھگڑے سے اجتناب کریں گے۔ اس کانفرنس کا پنڈال ڈی۔ اے۔ وی۔ سکول میں بننا شروع ہو گیا ہے اور ارد گرد کے تمام علاقے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے۔ اور لاٹھیاں ساتھ نہ لانے کی بھی منادی کرا دی گئی ہے"۔

امیر شریعت کی کانفرنس میں آمد اور تقریر

اس اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے پنجاب میں اس کانفرنس کے کس قدر چرچے تھے اور کتنے گوشوں سے اس کانفرنس کی کامیابی اور ناکامی کی خبروں کا انتظار کیا جا رہا تھا اس فضا میں یہ کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تھے چنانچہ رات جب اپنا پورا سایہ ڈال چکی لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے تو اس کانفرنس کے صدر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تشریف لائے۔ ہزار ہا انسانوں کا ہجوم اور امیر شریعتؒ کی پنڈال میں آمد۔ اور کون سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ملتان کی سرزمین میں دفن ہونے والا سید عطاء اللہ بخاریؒ نہیں۔ وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نہیں جس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ جس کے چہرے کا جھریوں نے احاطہ کر لیا تھا جس کے بالوں میں بڑھاپے کی سفیدی آ گئی تھی یہ وہ سید عطاء اللہ بخاری تھا جس کا شباب اور شعلہ بیانی دونوں اپنے عروج پر تھے جو لاؤڈ اسپیکر کے بغیر لاکھوں کے مجمع کو مسخر کر سکتا تھا جس کا حسن اور بیان دونوں الگ الگ جادو جگاتے تھے۔ پچاس ہزار کا مجمع، رات کی خاموشی، قمقموں کی روشنی اور اتنے میں حسن و نور کے پیکر، شعلہ بیاں خطیب اور شریعت کے امیر کی آمد ؎

"تم آ گئے تو از سر نو زندگی ہوئی"

بس پھر کیا تھا مجمع میں کہاں ایک خاموشی اور ہُو کا عالم تھا اور اب وارفتگی اور دیدار یار کی بے تابی نے سب کو آن گھیرا ہے اور اس بے تابی اور وارفتگی کا اظہار نعروں کی گونج میں ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ ہیں کہ مسکراتے ہوئے مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اسٹیج پر پہنچے، چاروں طرف نگاہ مست انداز سے دیکھا۔ بس پھر کیا تھا، نعروں کا ایک اور سیل ٹوٹ پڑا ——— اور امیر شریعت فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے تھے مجمع خاموش ہوا، تلاوت ہوئی، نظم ہوئی۔ اب سے پچیس برس پہلے کی تفصیلوں کو دہرایئے اور ا[illegible]

تفصیلوں کو جن پر شاہ صاحبؒ کی تاریخی تقریر کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے بھی کوئی ساڑھے نو بجے تقریر شروع کی ہوگی اور رات بھی کہ وہ بھی دم بخود گزرے جارہی تھی۔ لیکن شاہ صاحبؒ کی شعلہ بیانی بڑھتی جارہی تھی اور اس شعلہ بیانی اور آتش نوائی کو قدم قدم پر نعروں، قہقہوں اور آنسوؤں کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش ہو رہا تھا۔ یہی وہ تقریر ہے جس میں شاہ صاحبؒ نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔

"وہ (مرزا محمود) نبی کا بیٹا ہے اور میں نبیؐ کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے اور مجھ سے اردو، پنجابی، فارسی، عربی ہر زبان میں بحث کرے۔ یہ جھگڑا آج ہی طے پا جاتا ہے۔ وہ پردے سے باہر نکلے، نقاب اٹھائے، کشتی لڑے، مولا علی کے جوہر دیکھے، ہر رنگ میں آئے۔ میں ننگے پاؤں آؤں اور وہ حریر و پرنیاں پہن کر آئے۔ میں موٹا جھوٹا پہن کر آؤں وہ مزعفر کباب یا قوتیاں اور اپنے ابا کی سنت کے مطابق پلومر ٹانک وائن پی کر آئے۔ میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں، ہمیں میدان ہمیں گو"۔

یہ تقریر جو رات کی خاموشی میں شروع ہوئی تھی جو عشاء کی نماز کے بعد جب ابھی رات کا آغاز تھا لوگوں نے سننا شروع کی تھی۔ یہ تقریر پوری رات ہوتی رہی اور مجمع محو کا عالم طاری تھا ایک بھی ذی نفس ایسا نہیں تھا جس نے تھکن کا اظہار کیا ہو جس کے چہرے سے اکتاہٹ کی غمازی ہوئی ہو۔ اتنے میں صبح کا نور پھیلنا شروع ہوگیا اور موذن نے اذان دے دی۔ تقریر تھی کہ اس وقت بھی اپنے عروج پر تھی۔ لیکن موذن نے اس سیلِ رواں کو روک دیا اور خطابت کے دریا کو بند مار دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں بہت کم خطیب اور مقرر ایسے گذرے ہیں جنہوں نے رات رات بھر تقریر کی ہو جنہوں نے لوگوں کو اس قدر مسحور کیا ہو۔ جیسا کہ امیر شریعت نے کیا ہے۔

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن ۔۔۔ کیا کریں گر نہ انتظار کریں

اور غالباً اسی موضوع کو حسرت موہانی نے کہا ہے :۔

بلاکشانِ غمِ انتظار ہم بھی ہیں ۔۔۔ خرابِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں

انجینئرنگ کالج لاہور پر یلغار

یہ ایک رات کا واقعہ ہے تیس اکتیس برس پہلے کی ایک رات کا! نصف شب کو جب چاروں طرف خاموشی تھی تو تقریباً دس بارہ ہزار افراد کا ہجوم نعرۂ تکبیر اللہ اکبر اور نعرۂ رسالت یارسول اللہ دہرا کر باغبانپورہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس سے آگے آگے سرخ و سفید نورانی چہرے، لمبی داڑھی اور لمبے بالوں والا چالیس برس کا ایک بزرگ قدم بڑھا رہا تھا، یہ قائد سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تھے۔ اسی رات وہ اپنی شعلہ بیانی کا ادنیٰ کرشمہ دکھا رہے تھے۔ وہ موچی دروازہ کے باغ سے پورے جلسے کو مغلپورہ انجینئرنگ کالج کی طرف لے نکلے تھے۔

"(اسی زمانے میں مغل پورہ انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل کے خلاف تحریک زوروں پر تھی۔ آج اس تحریک اور اس قسم کی دوسری تحریکوں پہ کوئی قلم نہیں اٹھاتا اور ان تحریکوں کے پس پردہ ہاتھوں کی نشان دہی کرنے والے اب بھی خاموش ہیں وگرنہ کئی پرلطف داستانیں سننے میں آئیں اور کئی دلچسپ محرکات کا پتہ چل سکے۔ بہرحال یہ تحریک مغل پورہ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کے خلاف تھی۔ یہ پرنسپل انگریز تھا اور اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے حضور اکرمؐ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اس پر مسلمان طلبہ میں اشتعال پیدا ہوگیا بس پھر کیا تھا شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ تحریک چل نکلی۔ شہر کے کئی ایک علماء نے آگے بڑھ کر اس تحریک کی قیادت سنبھالی

اور گرفتار کر لئے گئے۔ ان میں مولانا احمد علیؒ، مولانا داؤد غزنویؒ اور مولانا مخدوم مرشد بھی تھے۔ ان گرفتاریوں کے بعد موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام منعقد ہوا عشاء کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا اور تقریباً نو بجے کے قریب شاہ صاحبؒ جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ ان کی آمد نے پورے جلسہ میں ہیجان برپا کر دیا۔ ابھی لاؤڈ اسپیکر عام نہیں ہوا تھا اور مقرر کو اپنے گلے اور پھیپھڑوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ جلسہ گاہ میں بلا کی خاموشی تھی۔ سید عطاء اللہ بخاریؒ صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ یہ خاموشی، یہ ہجوم اور ناموسِ رسولؐ کا موضوع۔ پھر کیا تھا شاہ صاحب کی شعلہ نوائی انتہا پر تھی۔ ایک ایک لفظ سحر بنتا چلا گیا اور جب تین چار گھنٹے گذر گئے تو دس بارہ ہزار کا یہ ہجوم سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ رات کے ایک بجے وہ مسحور مجمع کو اپنے ساتھ لئے مغل پورہ انجینئرنگ کالج کی طرف بڑھنے لگا تاکہ جب مؤذن فجر کی نماز کے لئے دعوت دے تو یہ ہجوم مغل پورہ کالج کے سامنے ہی نماز ادا کرے اور وہیں ناموس رسولؐ کی حفاظت کے لئے پکٹنگ شروع کر دے۔ اس ہجوم میں ایک ذی نفس بھی ایسا نہ تھا جس نے شاہ صاحب کی آواز پر لبیک نہ کہی ہو یا اس کے قدم مغلپورہ کالج کی طرف اٹھنے کی بجائے گھر کی طرف اٹھے ہوں۔

(عبداللہ ملک)

مارشل لاء کے قیدیوں سے ملاقات

لاہور سنٹرل جیل میں شاہ جیؒ کی آمد کی اطلاع جب مارشل لاء کے قیدیوں کو ملی تو انہوں نے حکام جیل کی اجازت سے شاہ جیؒ سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ ایک دن صبح سویرے ہم اسیرانِ قفس ناشتہ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دیوانی احاطہ کے انچارج نے آکر شاہ جی سے درخواست کی کہ مارشل لاء کے چند قیدی باہر کھڑے ہیں اور وہ آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ اگر اجازت ہو تو انہیں اندر بلا لوں۔ ابھی اس کی بات مکمل نہ ہو پائی تھی کہ شاہ جیؒ ننگے سر اور ننگے پاؤں ان قیدیوں کے استقبال کے لئے دیوانہ وار کمرے سے باہر نکل گئے۔ دیوانی احاطہ کے دروازے پر قیدی خراماں خراماں آرہے تھے۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار اور شاہ جی کا استقبال ایک عجیب پر کیف منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ شاہ جی نے سب کو گلے لگایا۔ ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو بوسہ دیا۔ پھر آپ نے اشکبار آنکھوں اور غمناک لہجے میں فرمایا:-

"تم لوگ میرا سرمایۂ نجات ہو۔ میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی اور پیٹ یا کسی مادی مفاد کے لئے نہیں پکارا۔ لوگ اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں۔ میں نے تو اپنے نانا حضرت خاتم النبیینؐ کی عزت ناموس کے تحفظ کی دعوت دی ہے اور تم لوگ صرف اور صرف اسی مقدس فریضہ کے لئے قید و بند اور طوق و سلاسل کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہو۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ سیاسی شہرت یا ذاتی وجاہت جس کا مقصود ہو۔ تم یہاں جیل میں بھی غیر معروف ہو اور جب تم اس دیوار زنداں سے پرے جاؤ گے تو باہر تمہارا استقبال کرنے والا اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر نعرہ لگانے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ نیت اور ارادے کے اعتبار سے جس کی آمد اس مقصد کے لئے ہوئی ہے وہ یہی مقصد لے کر واپس چلا جائے گا۔ میرے لئے اس سے بڑا سرمایۂ افتخار اور کیا ہو سکتا ہے"؟

شاہ جیؒ یہ چند جملے فرما چکے تو کسی نے ایک قیدی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ تحریک میں اس کا بھائی گولی کا نشانہ بن چکا ہے۔ آپ نے دعا فرمائیں۔ شاہ جیؒ نے تحریک کے دوران متشددانہ کارروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:-

"بھائی ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت یا عوام تشدد پر اتر آئیں۔ اور کوئی ناخوشگوار صورت نمودار ہو جائے۔ میں نے

کراچی جیل میں جب لاہور اور دوسرے مقامات پر گولی چلنے کے واقعات سُنے اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے باپوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ ماؤوں کے چراغ گُل ہو گئے ہیں اور کئی سہاگ اجڑ گئے ہیں تو مجھے اس کا بڑا صدمہ پہنچا۔ میں نے وہاں کہا تھا کہ کاش مجھے کوئی باہر لے جائے یا اربابِ اقتدار تک میری یہ آرزو پہنچا دی جائے کہ تحفظ ناموسِ رسولؐ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا ضروری ہو تو گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائے اور کاش اس سلسلہ میں اب تک جتنی گولیاں چلائی گئی ہیں وہ مجھے ٹکٹکی پر باندھ کر میرے سینے میں پیوست کر دی جاتیں"۔ (مجاہد الحسینی)

کمشنر اور ڈپٹی کمشنر شاہ جیؒ کے مکان پر

دس بجے کے قریب کمشنر ملتان مسٹر بی رائے، قریشی تعزیت کے لئے شاہ جیؒ کے مکان پر پہنچے۔ انہوں نے حکومتِ مغربی پاکستان کی طرف سے پیشکش کی کہ اس جلیل القدر رہنما کو ملتان کے تاریخی قلعہ میں دفن کیا جائے۔ لیکن مرحوم کے صاحبزادوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مرحوم نے زندگی بھر اپنے لئے کبھی کوئی رعایت حاصل نہیں کی۔ مرنے کے بعد بھی سرکاری رعایت حاصل کرنا ان کے مسلک کے خلاف ہے۔ لیکن عقیدتمندوں کی خواہش تھی کہ شاہ صاحبؒ کو ان کی شان کے مطابق قلعہ میں دفنایا جائے۔ انہیں مرحوم کے صاحبزادوں کے انکار سے مایوسی ہوئی، اس موقعہ پر مولانا محمد علی جالندھری نے مدرسہ قاسم العلوم میں اکٹھے عقیدت مندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم اکثر اپنی موت کا ذکر کرتے اور کہا کرتے تھے اب تو چل چلاؤ کا وقت ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ایسے مقام پر قبر نصیب کرے جو سرِ راہ ہو اور آتے جاتے لوگ فاتحہ پڑھ جایا کریں۔ (خواجہ صادق کاشمیری)

اسلامی معیارِ عظمت

شاہ صاحب بہرحال انسان تھے فرشتہ نہ تھے، انکے ساتھ بھی زندگی کی وہ تمام ضرورتیں وابستہ تھیں جن سے ہر انسان محصور رہتا ہے۔ لیکن صلے کی طلب میں کیوں وہ ہزاروں سے الگ ہو گئے، اس لئے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وُہ اسلامی زندگی کا اہم فرض تھا اور اہلِ حق کے نزدیک فرض اسی لئے ہوتا ہے کہ اسے بے چون و چرا ادا کیا جائے۔ اگرچہ اس راہ میں کتنی ہی تکلیفوں، مشقتوں اور قربانیوں سے سابقہ پڑے۔ یہاں تک کہ جان بھی دے دینے کی نوبت آ جائے تو ایک لمحہ کیلئے ادائے فرض سے روگردانی گوارا نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ ہمیں کیا بتاتا ہے یہ کہ قوم کو دعوتِ ہدایت دینے کے لئے اٹھے تو فرمایا "ہم تم سے کچھ اجر نہیں مانگتے ہمارا اجر تو اللہ کے پاس ہے جس نے ہمیں پیدا کیا"۔ جن بزرگ ہستیوں نے اس اسوۂ حسنہ کو اپنا شعار بنایا وہ بھی ہم قوموں یا ہم رفیقوں سے کبھی کسی اجر کے روادار نہ ہُوئے۔ انہوں نے جو کچھ کیا فرض سمجھ کر کیا ان کا مقصد ایک تھا اور وہ یہ کہ خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔ اس رضا اور خوشنودی کے طلب گار اپنے کارناموں کی پاکیزہ دولت کو دنیوی صلوں کی تمنّا سے آلودہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ کاش ہم لوگ سمجھ سکیں اور اندازہ کر سکیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا تعلق اسی حقانی گروہ سے ہے۔ یہی انسانی عظمت و برتری کی حقیقی اساس ہے۔ افسوس کہ اس مقدس گروہ کے افراد آہستہ آہستہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ لینے والے یہاں پیدا نہ ہُوئے، شاہ صاحبؒ اس وجہ سے بھی حد درجہ عزیز ہیں کہ وہ اس گروہ سے متعلق ہیں اور اس وجہ سے بھی قابلِ صد احترام ہیں کہ جماعتی اور قوت ——— کے سلسلہ میں صحیح اسلامی معیار کے آخری نمائندوں میں سے ہیں۔

(مولانا غلام رسول مہر)

یہ کشش محض الفاظ کی نہ تھی اور محض الفاظ میں یہ جاذبیت ہو بھی نہیں سکتی جب تک کہ الفاظ میں گہری معنویت نہ ہو اور مبہم معنویت بھی زنجیرِ کشش نہیں بن سکتی جب تک کہ اس معنویت میں معرفت نہ ہو اور محض معرفت بھی کشش کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتی

جب تک کہ اس میں محبت نہ ہو۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بے مثال خطیب ہونے کے ساتھ معنویت، صاحب دل اور صاحب عشق و محبّت تھے۔ بالفاظ دیگر وہ محض صاحب لسان نہ تھے بلکہ صاحب دل انسان تھے۔ محبت نبویؐ ان کے دل کی رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ اسی سے ان کے جوش کا تعلق تھا اور اسی سے ہوش کا اور اسی سے ان کی خطابت کا چشمہ اُبلتا تھا جس میں دوسروں کی رگ و پے میں سما جانے کی خاصیت ہوتی تھی۔

آدمی صاحب دل خود سے نہیں بنتا کسی صاحب دل سے بنتا ہے۔ ارباب لسان کے بس کی بات نہیں کہ باتوں سے کسی کو صاحب دل بنا دیں، دل سے دل بنتا ہے دل جب کسی دل والے سے ملتا ہے جب ہی صاحب دلی بنتی ہے۔ عطاء اللہ بھی ایک صاحب دل سے وابستہ ہو کر ہی صاحب دل بنے۔ اگر رائے پور کی خانقاہ میں ان کا گذر نہ ہوتا تو ان کا لفظی کمال معنویت کی روح اختیار نہ کرتا وہ رائے پور کے مقدس درویش حضرت اقدس مولانا عبد القادر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں تک نہ پہنچتے تو اُن سے دوسروں کے سروں پر نہ ہوتے انہیں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا دست مبارک ملا تو دست بدست وہاں پہنچ گئے جہاں دست گیری کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا۔ یہ خدا کی دین ہے کہ پہنچے تھے مرید بن کر اور لوٹے مراد بن کر۔

ہر مرید اپنے شیخ کا اور ہر شاگرد اپنے استاد کا محب ہوتا ہے لیکن عطاء اللہ کو مقام محبوبیت یہ ملا کہ خود شیخ ہی ان کے گرویدہ ہو گئے۔ سید عطاء اللہ کی وفات کی خبر پہنچی تو شیخ بے اختیار رو پڑے اور رونے میں آوازیں تک نکل پڑیں ——— جس کا شیخ ایسا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ اس کی محبوبیت کی کیا انتہا ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شیخ کی شیفتگی، مرید کی اعلیٰ تربیت ہوتی ہے اور قابلیت بھی قلب کی نہ کہ محض لفظوں کی ——— اس لئے ماننا پڑے گا کہ سید عطاء اللہ بے مثال صاحب لسان ہی نہ تھے بلکہ ایک بے نظیر صاحب دل عارف بھی تھے۔ (قاری محمد طیب صاحب)

مولانا محمدؒ علی جوہر کی شخصیت سے پاک و ہند کا بچہ بچہ واقف ہے ان کی خطابت و قیادت دونوں مسلم الثبوت ہیں، انہوں نے لاہور میں ایک موقع پر شائد "زمیندار" کے دفتر میں سب کے سامنے شاہ صاحبؒ کے متعلق فرمایا۔

"اس ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جا سکتی ہے، نہ بعد میں۔ اس کے بعد تقریر کرنے والے کا رنگ نہیں جمتا۔ اور اس سے پہلے جو تقریر کرے اس کے اثر کو یہ آ کر مٹا دیتا ہے"۔ (علامہ طالوت)

بخاریؒ نہ ہوتے تو زمانۂ حال کے اسّی فی صد بہترین خطیبوں کو فن تقریر سے منفی کیا جا سکتا تھا۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی تقریروں میں الفاظ بخاریؒ کے ہیں۔ اشعار بخاریؒ کے انتخاب کردہ ہیں اور آیات و حدیث تک بخاری کی دی ہوئی ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں بخاری کی تقریریں ازبر ہیں۔ اور اپنے اپنے مقام پر وہ ایسے زناٹے کی تقریر کر سکتے ہیں کہ اگر لوگ بخاریؒ کو نہ جانتے ہوں یا ان کی تقریر سُنی ہو تو براہ راست ان کی خطابت پر ایمان لے آئیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جنہیں آپ نقل برابر اصل کہتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جنہیں بخاری کا پاکٹ ایڈیشن کہا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی نقل راہم عقل بایدتک بھی رسائی ممکن نہیں مگر بخاری بننے کے شوق میں غلط شعر ہی جھوم جھوم کر سنائے جا رہے ہیں، یہ لوگ اپنی جگہ پر اور سب کچھ ہو سکتے تھے لیکن اگر بخاری نہ ہوتا تو یہ واعظ یا خطیب ہرگز نہ ہو سکتے اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ بخاریؒ کے حافظ (یعنی بخاری کی تقریروں کے حافظ) سب بخاری کے ہم نوا یا ہم مشرب ہیں ان سے اکثریت بخاری کی مخالف ہے۔ بخاریؒ کے الفاظ، بخاریؒ کے انداز اور بخاریؒ کے منتخب اشعار، بخاریؒ کے خلاف استعمال

رنا باعث فخر سمجھتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر بخاریؒ نہ ہوتے تو ان لوگوں کا وجود بھی نہ ہوتا۔ غرض جس طرح لوگ اقبال بننے کی کوشش لاحاصل کر رہے ہیں، ی طرح بخاریؒ بننے کی بھی کوششیں کر رہے ہیں۔ اقبال اور بخاری کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

یمت اور شاہ صاحب | غنیمت کنجاہی نے پنجاب کی تعریف کی ہے اور شاہ صاحب نے بھی۔ دونوں رنگ ملاحظہ ہوں۔

غنیمت

ندیدم کشور غارت گر تاب
بخوبی ہائے حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم خوردہ بخاکش آبِ کوثر
فضائے نشئہ ہستی ہوایش
زمینے کاسمانہا خاک پایش
بنائے کعبۂ دلہا ز خاکش
عروج نشئہ معنی ز ناکش
غبارش آب و رنگِ چہرہ گل
گیاہش دلربائے زلفِ سنبل
بہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ
رخِ خوباں بہ پشتش خط کشیدہ
زلالش بادہ ساز مستی عشق،
نسیمش روح بخش ہستی عشق
گلش بر خاک ہر جا سایہ انداخت
زمیں از آتشِ یاقوت بگداخت
بخاکش سایۂ پر ہائے بلبل
جواب یک چمن خندیدن گل
شفق سرمایۂ چشم از دیدن گل
چمن ساماں نگہ از چیدن گل
ز شوق آں کہ تا آمد بہ پنجاب
دل کشمیر صد رہ میشود آب
خنک ہر کس کہ در ہنگام سرما
دریں گلشن بود گرم تماشا

شاہ صاحبؒ

ندیدم کشورے مردود و مرتاب
بہ شومی ہائے کفر آباد پنجاب
چہ ملکے ننگ و عارِ ہفت کشور
ز شرق و غرب بادش خاک بر سر
خمیر طینتش مردم کشی ہا
ز قتل مسلمش باشد خوشی ہا
چہ پیرانش مریدان فرنگی
لقب کافور و ذاتِ پاک زنگی
ز نوآب و رئیسانش چہ پرسی
سگ و سگ زادگان کرسی بکرسی
چناں فرزند ناہموار زاید
کہ از خرقیمتش برتر نیاید
چکد از لالہ اش خوں مسلمان
از نالاں حجاز و مصر و ایراں
جوانانش غلامان فرنگی
پناہِ شاں بداماں فرنگی
چہ پنجاب آں فرنگی را معسکر
معسکر را غلام احمد پیمبر
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب
فرنگی را معسکر ہست پنجاب
فضائش کفر ریز و کفر بیز است
بہ آئین الٰہی در ستیز است
زمین فتنہ زائے فتنہ خیزے
کہ شیطاں پیش پائش سجدہ ریزے

دونوں رخ کس قدر صحیح اور درست ہیں۔ غنیمت نے جغرافیائی اور عمرانی رخ کا جائزہ لیا ہے اور شاہ صاحبؒ نے پنجاب کے اس زمانے کا سیاسی رُخ دکھایا ہے۔ جب انگریز یہاں حاکم و قابض تھا۔ دونوں نظمیں عنقریب تاریخ کا باب بننے والی ہیں اور مستقبل کا رُخ بتلائے گا کہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ صحیح منظر کشی کی تھی۔ (علّامہ طالوتؒ)

شاہ جیؒ اور علامہ اقبالؒ

"آج او ہوندا تے اینہاں کرگساں نوں دسدا کہ بخاری غدار اے کہ فدا کار۔ میں کنوں کواں، میرے تے ساتھی ای میرے کولوں وچھڑ گئے تے یا پچھڑ گئے نیں"۔

علامہ اقبال کا ذکر ہو رہا تھا، شاہ جی نے اک سرد آہ بھری اور کہا:۔

"اقبال زندہ ہوتا تو ان کرگسوں کو بتاتا کہ بخاری غدار ہے یا فدا کار، میں کیسے کہوں کہ میرے ساتھی ہی مجھ سے بچھڑ گئے، اور پچھڑ گئے ہیں"۔

شاہ جی فرماتے تھے جب کبھی میں ان کے ہاں حاضر ہوتا تو وہ چارپائی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھے ہوتے، حقہ سامنے ہوتا، دو چار کرسیاں بچھی ہوتیں۔ صدا دیتا، یا مرشد۔ فرماتے "آ بھئی پیرا بہت دناں بعد آیا ایں" (بہت دنوں بعد آئے ہو) علی بخش سے کہتے حقہ لے جاؤ تے کلی کے لئے پانی لاؤ، کلی فرماتے، پھر ارشاد ہوتا، ایک رکوع سناؤ، میں پوچھتا! کوئی تازہ کلام؟ فرماتے ہوتا ہی رہتا ہے، عرض کرتا لایئے، کاپی منگواتے، پہلے رکوع سُنتے، پھر وہ اشعار سنتے جو حضورؐ سے وابستہ ہوتے، قرآن پاک سنتے وقت کانپنے لگتے تھے، لیکن جب حضورؐ کا ذکر ہوتا یا ان سے متعلق کلام پڑھا جاتا تو چہرہ اشک بار ہو جاتا۔

حضور کا ذکر ہمیشہ باوضو شخص سے سنتے اور خود ان کا نام بھی باوضو ہو کر لیتے تھے۔ حضورؐ کے ذکر پر اس طرح روتے جس طرح ایک معصوم بچہ ماں کے بغیر روتا ہے۔

ایک دفعہ بروایت شاہ جیؒ، جلسوں کی رونق پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے۔ عامتہ المسلمین میں بڑی جان ہے۔ اس قوم کا مزاج حرارت سے بنا ہے، یہ سمجھنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی ——— ساری خرابی لیڈر شپ کی ہے۔ خواص تو خیر عضو معطل ہیں، انہیں اپنے جسم کا عیش چاہئے لیڈر گم کردہ راہ ہیں، لوگوں کو صحیح راستہ پر نہیں لاتے، عرض کیا، حضرت یہ بھی آپ نے مفروضہ قائم کر لیا ہے۔ قوم خود ہی صحیح راہ پر نہیں آتی۔ آپ کیلئے عامتہ المسلمین کس طرح تڑپتے ہیں لیکن آپ مجمع میں آتے ہی نہیں۔

"نہیں پیر جی، یہ بات نہیں ——— میرا مجمع میری کتابیں ہیں، میں ہجوم و اذکار میں اس طرح گھِرا رہتا ہوں کہ بسا اوقات فرصت کے اوقات ہی عنقا ہو جاتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے مرشد! میں نے تو کبھی اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی ہے"۔

"او شاہ جی انساناں تے دلاں تے دماغاں دی مٹی جھاڑ دے او"۔ (شاہ جی آپ، تو دلوں اور دماغوں کی گرد جھاڑتے ہیں)

شاہ جی نے یہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمایا ہائے کیا انسان تھے، جدید دانش اور قدیم حکمت کا نقطۂ عروج چودھری میاں سے محبت کرتے تھے اس لئے اللہ نے ان پر علم و دانش اور ذکر و نظر کے سبھی راستے کھول دیئے تھے۔ وہ میدان کا کھلاڑی نہیں لیکن علم کا نہانہ نہاد تھا۔ (شورش کاشمیری)

شاہ جیؒ اور میاں شرقپوریؒ

غالباً شاہ جی کی سیاسی زندگی کے آغاز کا زمانہ تھا کہ ایک دفعہ ——— شرقپور حضرت شیر محمدؒ سے ملاقات

لئے تشریف لے گئے ملاقات کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ حضرت اپنے حجرے میں تشریف لے جا چکے تھے۔ خدام نے عرض کیا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ شاہ جی لاری کے اڈے پر واپس تشریف لے گئے۔ حضرت شیر محمد اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ عطاء اللہ شاہ نام کا کوئی آدمی ہے؟ خدام نے عرض کی چونکہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لئے واپس تشریف لے گئے۔ انہوں نے یہ سن کر شاہ جی کو واپس بلوایا، بغل گیر ہوئے اور فرمایا تمہارا مرتبہ بہت بلند ہے، بہت اونچا ہے۔ الفاظ دہراتے جاتے اور اپنا ہاتھ اونچا کرتے جاتے۔ پھر پیٹھ ٹھونک کر رخصت کیا۔

روحانی فیض ان کو اپنے والد سے ورثے میں ملا۔ جو اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ شاہ جی اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بے حد وظائف کئے۔ طبیعت میں بے حد جلال تھا۔ جب میں کسی راستے سے گزرتا تو مجھے درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

(حافظ لدھیانوی)

شخصیتیں توفیقاتِ ایزدی سے پیدا ہوتی ہیں ــــ ان کا وجود قدرت کے معمولی قوانین کا کرشمہ نہیں ہوتا ــــ وہ تو قدرت کے کسی غیر معمولی اور پر اسرار عمل سے ظہور میں آتی ہیں ــــ یوں قدرت (نیچر) کی اپنی کار فرمائی بھی تو قلموں گل کاریاں کرتی رہتی ہے اور اس کے ہاتھ کی ہم زوری کے عام عجوبے بھی کچھ کم نہیں ــــ صرف پھولوں کی کائنات پر ہی غور کیجئے۔ آپ قلمرو گل کی وسعتوں کو دیکھ دیکھ کر محو حیرت تو لازماً ہوں گے۔ مگر آپ بالیقین اس کی پہنائیوں، اس کی رنگ رنگیوں، کرشمہ آفرینیوں اور دل فریبیوں کے اندازہائے بے شمار کو دیکھ کر تھک ــــ جائیں گے اور بالآخر کہہ اٹھیں گے ؎

ہمہ جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

یہ تو ہوا حال نیچر کی عام تخلیقات کا ــــ اور اس کے ادراک کی کوشش کچھ کامیاب بھی ہے مگر نیچر کی تخلیقات فائقہ کی کائنات کہ عظیم انسان بھی اسی کا ایک حصہ ہیں۔ خدائے مصور الاجسام والارواح کا ایک بھید ہے، یعنی ایک جہاں راز جس کا مرکز خود خدا کی ذات مجردہی ہے، جس کے انعکاسات عظیم فائق انسانوں کا روپ دھارتے رہتے ہیں ــــ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق میر تقی نے سادہ سے الفاظ میں پتے کی بات یوں بتادی تھی ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اور جب بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ذکر سنتا ہوں اور ان کے کمالات فائقہ کا تصور کرتا ہوں تو میر تقی کا مندرجہ بالا شعر فوراً میری زبان پر وارد ہو جاتا ہے ــــ اللھم اغفرہ وارحمنہ !

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

قیامِ پاکستان کے بعد شاہ جی نے قائد ملت خاں لیاقت علی خاں صاحب مرحوم کے "مکہ" کی تائید میں دفاع و استحکام وطن عزیز کے لئے ہنگامی طوفانی دورے کئے۔ ہر موڑ پر دشمنان وطن کو ڈانٹا اور انہیں خبردار کیا کہ رسول عربی صلعم کے نام پر حاصل کی گئی سرزمین کی طرف جو نگاہ بد اٹھے گی اسے نکال دیا جائے گا۔ اور جو ہاتھ اٹھے گا اسے کاٹ دیا جائے گا۔ وہ ایک صاف دل اور صاف گو قائد تھے۔ انہیں مذہب اور وطن دونوں سے پیار تھا۔ وطن انگریز سے چھیننا اور مذہب دشمنان رسالت سے محفوظ کرنا ان کا نصب العین تھا۔ ان کی زندگی میں دونوں کام ہوئے اور یہ ملت اسلامیہ کا مایۂ ناز سردار اطمینان اور کامیابی کے ساتھ اس دار فانی سے سرخرو اٹھا۔

اگر چھرا جائز ہے تو گولی کیوں نہیں سلطان ابن سعود پر عین احرام میں ایک حاجی نے چھرے سے حملہ کر دیا۔

ہیں بڑے مسلمان

توسلطان کے محافظ نے چھرا مارنے والے کو گولی سے اڑا دیا۔ لاہور کے ایک جلسے میں شاہ جی تقریر کر رہے تھے، کسی نے دوران تقریر سوال کر دیا کہ شاہ صاحب! کیا حرم مقدس میں گولی چلانا جائز ہے، کوئی اور ہوتا تو گھبرا جاتا مگر شاہ صاحب نے فوراً جواب دیا۔ ارے میاں! جب چھرا مارنا گناہ نہیں تو گولی چلانا کیوں جائز نہ ہوا۔ معترض شرمندہ ہو کر بیٹھ گیا۔ (مظفر علی شمسی)

قائد اعظم کے بعد شاہ جی

اگرچہ آج ہم میں شاہ جی نہیں مگر ان کا مشن ان کے معتقدین کے لئے مشعل راہ ہے۔ قائد اعظم کے بعد وہ پہلے محبوب رہنما ہیں جن پر سارا ملک رو دیا۔ اور ہر طبقے نے تعزیت کی اور ان کی موت کو زبردست قرار دیا۔ شاہ جی کی خدمات جلیلہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی زندگی کا ورق ایک تاریخ ہے تحفظ ختم نبوت کے لئے ان کی قربانیاں یادگار عالم ہیں۔ شاہ صاحب نے مذہب وملت کے لئے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ جن سے شاہ جی تاقیامت زندہ رہیں گے۔ (مظفر علی شمسی)

مالی مفاد سے لاپرواہی

کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی جلسہ میں شرکت کے لئے میں اور امیر شریعتؒ ایک ساتھ گئے ہیں۔ منتظمین نے مجھ سے مشورہ کیا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں سفر خرچ کتنا پیش کیا جائے۔ شاہ صاحب نے اپنی فراست سے سمجھ لیا کہ میں نے کوئی رائے دی ہے۔ ناراض ہو کر فرمایا محمد علی آخری عمر میں مجھے بے ایمان کر کے مارنا چاہتے ہو۔ تم نے مقدار رقم کی رائے دی ہے حالانکہ میں نے تمام عمر اس کا خیال بھی نہیں کیا۔ آمد و رفت کا کرایہ گھر سے لے کر چلتا ہوں اور خیال بھی نہیں کرتا کہ کوئی ضرور دے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کے ذریعے دے بھی دیا تو میں نے دیکھا بھی نہیں کہ کیا دیا۔ (مولانا محمد علی)

شاہ جی کے کردار کا ایک حسین پہلو

ایک جلسہ میں بعض منتظمین کو شک ہوا کہ جس کے سپرد شاہ صاحب کا سفر خرچ ادا کرنا تھا اس نے پورا نہیں دیا بلکہ خیانت کی ہے۔ اب انہوں نے تحقیق کی صورت نکالی۔ عرض کیا کہ جو سفر خرچ پیش کیا گیا ہے اس میں ایک نوٹ کو تیل لگا ہوا ہے لائیے ہم اسے بدل دیں۔ مسکرا کر فرمایا اللہ تعالیٰ نے پردہ دری کی اجازت نہیں دی۔ سب خاموش ہو گئے۔ (مولانا محمد علی)

شاہ جی کے کردار کا ایک پہلو

میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ آپ میں حسد، عجب، کبر نام کو نہ تھا۔ البتہ خودداری کے پہاڑ تھے۔ کوئی شخص جس فن میں کمال رکھتا ہو، اس فن میں سوائے اپنی اولاد کے کسی اور کو برداشت نہیں کرتا لیکن حضرت شاہ صاحبؒ فن تقریر میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے مگر جب دوسرے شخص کو تقریر کرتے سنتے تو خوشی سے جھومتے اور چہرہ مبارک چاند کی طرح چمکتا، ماشاء اللہ فرماتے، اور فرماتے اب میری ضرورت نہیں۔ چنانچہ دو دفعہ ایسا ہوا، آپ کی تقریر کا اعلان تھا، جلسہ میں ہجوم کی وجہ سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، لوگ چشم براہ تھے اور ان سے پہلے میری تقریر تھی، میری تقریر کے بعد اعلان کر دیا کہ اس تقریر کے بعد میں تقریر کرنا مناسب نہیں سمجھتا، جلسہ برخاست کرتا ہوں۔ انہوں نے ایسا ایک دفعہ نسبت روڈ لاہور اور دوسری بار کمیٹی باغ سرگودھا میں کیا۔ (مولانا محمد علی)

شاہ جی کی انکساری اور فراخدلی

اپنے آپ کو بڑا بنانے سے گریز فرماتے۔ جب لیاقت علی خاں ملاقات چاہتے تھے۔ اس وقت مرکزی جماعت کے صدر ماسٹر تاج الدین اور صوبے کا صدر میں تھا، ہم نے بہت کوشش کی کہ آپ ملاقات قبول فرمالیں لیکن آپ نے بار بار یہی جواب دیا کہ صدر کو ملاقات کرنی چاہیئے۔ دونوں صدروں میں سے کوئی لے اللہ اللہ ایسے وقت جماعتوں میں ہر رکن یا عہدیدار دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر آپ ضابطہ پیش فرما کر پیچھے ہٹ جاتے اور

کرتے میں ایسی جماعت میں رہ نہیں سکتا جہاں کہنی مار کر دوسرے کو پیچھے کرنے کی عادت ہو۔ (مولانا محمد علی جالندھری)

حضرت امیر شریعتؒ عالم باعمل اور صوفی رمز شناس تھے، ہزاروں افراد نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور اپنے نفس کی اصلاح کا اہتمام کیا، ان کی زندگی کے اس پہلو پر بہت کم حضرات کی نظر گئی ہے۔ اصلاح باطن میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کو پیر عبدالقادر صاحبؒ المعروف حضرت رائے پوری سے فیض تھا۔ جادۂ تصوف کے راہبر واس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اس جہان میں حضرت رائے پوری کی نسبت سے بلا مبالغہ لاکھوں طالبان صادق نے روحانی منازل طے کیں "رائے پور" کی خانقاہ سے برسوں تصوف کا نورانی چشمہ رواں دواں رہا۔ یہ خانقاہ منازل سلوک میں اپنے وقت کی سب سے بڑی تربیت گاہ رہی ہے۔

آن کس ست اہل بشارت کہ اشارت داند　　　نکتہا ہست بسی محرم اسرار کجا است

شاہ جی نے پیری کی اور سجادگی کی دکان کبھی نہ سجائی، پیری مریدی کو کاروبار کا درجہ نہ دیا۔ ان کی غیرت مند طبیعت کبھی کسی مرید سے ایک پائی کی روادار نہ ہوئی۔ ان کی ارادت مندوں نے بھولے سے بھی ان کی پیشوائی و اولیائی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا، شاہ صاحبؒ دلق اویسؒ اور کلیم بوذرؓ کے امین تھے۔ انہوں نے بڑوں کا کفن نہیں بیچا اور آبا کی قبروں کی اینٹوں کو فروخت نہیں کیا کیونکہ وہ دھن دولت کے بندے نہ تھے، وہ تو بطل حریت تھے۔ انہوں نے وادی سیاست کے خارزار کی عمر بھر جادہ پیمائی کی، اپنے عقیدت مندوں کو بھی ساتھ لے کر چلے، انہوں نے مریدوں کے ہاتھ میں تسبیح کی بجائے کلہاڑی پکڑائی، غلامی کی زنجیروں سے نبرد آزما رہے، وہ قافلہ احرار کے سرخیل تھے۔ (اقبال اسد)

وہ آدمی تھا مگر

سید عطاء اللہ بخاریؒ اس دنیا سے رخصت ہوتے تو اپنے ساتھ نیکیوں اور سعادتوں کی ایک دنیا لے گئے جو گوناں گوں اوصاف و خصائل اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے تھے وہ پہلے بھی ایک وجود میں جمع ہوتے رہے۔ اب تو زمانہ ان اوصاف و خصائل کی تربیت ہی سے بظاہر محروم نظر آتا ہے۔ پھر کس بنا پر امید رکھی جا سکتی ہے کہ ویسی کوئی شخصیت ہمیں دوبارہ دیکھنی نصیب ہوگی۔ جس دور سے میں گزر کر آیا ہوں اس میں ہر طرف عظیم القدر شخصیتوں کی صفیں نظر آتی تھیں جن میں سے ایک ایک فرد علم و فضل، ہمت و شجاعت، ایثار و نظریات اور عمل و سرگرمی کا ایک ایسا عجیب و غریب پیکر تھا کہ اسے دیکھتے ہی فرط ادب و احترام سے گردنیں جھک جاتی تھیں۔ آج ویسے وجود کہاں نظر آتے ہیں؟ اگر ہوں گے تو وہی جو اکا دکا باقی رہ گئے، جیسے طوفان گزر جاتا ہے تو اپنے پیچھے بادلوں کے چند ٹکڑے چھوڑ جاتا ہے۔ سید عطاء اللہ بخاری مرحوم و مغفور کو بھی اس مجمع عظیم میں، ایک معزز مقام حاصل تھا۔ میں آج ان کی مثال کہاں تلاش کروں؟ ایک وسیع ظلمت زار میں روشنی کی کرنیں کس امید پر ڈھونڈوں؟

گزری ہوئی دنیا

حضرت امام بخاریؒ سے ایک شعر منسوب ہے۔ جس کا مفہوم اردو میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگر زندگی طویل ہوگئی تو لازماً تمام احباب کی موت کے غم برداشت کئے بغیر تیرے لئے چارہ نہ رہے گا۔ اس وجہ سے تیری زندگی اندوہ و قلق کا ایک درد انگیز مرقع بن جائے گی۔ اس اندوہ و قلق کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے احباب و رفقا کا قافلہ منازل حیات سے تیزی سے گزر گیا اور وہ گرد و پیش کاروان کی حیثیت میں پیچھے رہ گئے۔ میں کیا عرض کروں کہ کن کن بزرگوں، محبوں اور ہمدموں کی مفارقت کے داغوں سے سینہ و دل شعلہ زار بنے ہوئے ہیں۔ کان جن صداؤں سے عمر بھر آشنا رہے۔ وہ اب کہیں سننے میں نہیں آتیں۔ نگاہیں جن مناظر کی اس درجہ خوگر ہو چکی تھیں کہ انہیں کو زندگی کے طبعی اور حقیقی مناظر سمجھتی تھیں، ان کی زیارت کے لئے اب دور دور تک جاتی ہیں اور ناکام واپس آتی ہیں۔ کوئی گزری ہوئی دنیا کو کہاں سے لوٹا لائے اور کیوں کر لوٹا لائے؟

زندگی کا دھارا انتہائی تیزی سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس میں رجعت ممکن نہیں، اس کا پیچھے کی طرف لوٹنا خارج از بحث ہے، اور جو موجیں اپنی فطری بے تابیوں کو دھارے کی سطح پر بکھیرتی ہوئی آگے جا چکی ہیں۔ وہ پلٹ کر نہیں آسکتیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہر موج کے بعد دوسری ویسی ہی یا اس سے ملتی جلتی موج آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی اور منظر میں شکست یا انقطاع ہی نہیں بلکہ تغیر و تبدل کا بھی احساس کم ہوتا تھا۔ مگر اب؟ ـــــ میں کیا عرض کروں؟ اب دوسری دنیا ہی وجود میں آگئی ہے۔ وہ دنیا یقیناً باقی نہیں رہی جس میں ہم نے زندگی کے بیشتر اوقات گذارے۔ (مولانا غلام رسول مہر)

بے نفسی اور بلند ہمتی

پھر آپ نے دیکھا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے راہِ حق کے لئے قربانیوں میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہیں کیا وہ اپنی ذات یا اہل و عیال کے لئے کبھی کسی اجر یا معاوضے کا طلب گار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ زندگی کے بالکل آخری اوقات میں بھی وہ چپ چاپ کرائے کے ایک کچے مکان میں مقیم ہو گیا اور کبھی کوشش نہ کی کہ اسے کوئی درمیانہ درجہ کا مکان ہی الاٹ ہو جائے حالانکہ اس کے گرد و پیش بارہ تیرہ سال تک الاٹ منٹوں کا ایک ہنگامہ بپا رہا۔ وہ غیر معروف فرد نہ تھا ہزاروں آدمیوں کے دل فرطِ عقیدت سے اس کے لئے برابر تڑپتے رہے۔ اربابِ حل و عقد میں بھی اس کے شناساؤں بلکہ عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی مگر اس نے اپنے لئے زندگی کا جو سانچہ تجویز کر لیا تھا اس میں ایسی باتوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اہل حق اپنی ہر متاع اہل علم کی فلاح و بہبود کے لیے لٹاتے رہتے ہیں۔ مگر خود کبھی کوئی چیز لینے کے روادار نہیں ہوتے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے لیے عزیز ترین متاع اس کی درویشی تھی۔ وہ اسی متاع پر اس طرح قانع اور مطمئن رہا کہ اربابِ اقتدار کو اپنی بلند پایہ مسندوں پر بیٹھ کر بھی کبھی وہ اطمینان شاید ہی نصیب ہوا ہو اسی مقام کے باب میں عرض کیا گیا ہے۔

گر دولت ایں بود کہ بہ درویش مے دھند ـــ با یادگر لیستن جم و کے را بہ تختِ خویش (مولانا غلام رسول مہر)

توحید کی پرجوش اشاعت اور سنت کی ترویج میں جس والہانہ انداز سے انہوں نے حصہ لیا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا عشق رسول کی نزاکتوں اور توحید کے اسرار و رموز کو اس کامیابی سے بیان کرتے تھے جو صرف انہی کا حصہ تھا۔

اردو بولتے تھے تو معلوم ہوتا کہ:۔

غالب، ذوق اور داغ نے شاعری کو چھوڑ کر خطابت اختیار کر لی ہے اور پنجابی میں تقریر کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ:۔

چناب اور راوی نے اپنی روانیاں انہیں بخش دی ہیں ـ!

آہ! آج ہم ایسی جامع صفات شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ (محمد حنیف ندوی)

شاہ جی بعض اوقات بڑے بڑے علمی و دینی مسائل کی گرہیں کھولتے ہوئے شعر و شاعری سے ایسا کام لیا کرتے تھے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی۔ مثلاً ایک مرتبہ حج کے بارے میں تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ اچانک مزاج کا دھارا شعر و سخن کی طرف مڑ گیا کہنے لگے:۔

کوئی تو بات ہے ساقی کے میکدے میں ضرور ـــ جو دور دور سے میخوار آ کے پیتے ہیں

یہ فیضِ میکدہ دیکھو کہ چار ہی دن میں ـــ ہم ایسے رند بھی پینا بتا کے پیتے ہیں

شاد عظیم آبادی کے یہ اشعار شاہ جی کے نفیس لب و لہجہ میں سن کر حاضرین بے ساختہ جھوم اٹھے۔

میں نے شاہ جی کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں اور خطیبوں کے چراغ گل ہوتے دیکھے ہیں۔ ایک جلسے میں شاہ جی کے علاوہ مولا

محمد علی اور دیگر زعمائے بھی تقریریں کیں۔ لیکن شاہ جی کی تقریر کا رنگ، در وخن ہی کچھ ایسا تھا کہ ان کے بعد اس فن کے بعض نامی گرامی لوگوں کی تقریریں بھی عوام کو متاثر نہ کر سکیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہرؔ نے شاہ جی سے کہا:۔

"بخاری! تم اپنی تقریریں لوگوں کو جب قورمہ اور پلاؤ فراہم کرتے ہو تو بعد میں انہیں یہ بھی کہہ دیا کرو ________ کہ محمد علی کی روکھی سوکھی روٹی بھی قبول کر لیا کریں"۔

اس پر شاہ جی فوراً بولے:۔

"حضور! ایک جرنیل ایک سپاہی کے بارے میں یہ بات کہہ رہا ہے۔ سپاہی کی شہرت تو دراصل جرنیل کی عظمت کا آئینہ ہوتی ہے"۔

یہ الفاظ سن کر مولانا محمد علی نے مزید بحث و تمحیص کی گنجائش نہ پاتے ہوئے یکسر چپ سادھ لی۔

بخاری جیسے خطیب کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا محمد علی جوہرؔ جیسے جادو بیاں مقرر نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں شاہ جیؒ کے بارے میں نہایت جلی طور پر لکھا تھا کہ:۔

"یہ شخص مقرر نہیں، ساحر ہے"۔ (شیخ حسام الدین)

دہلی دروازے کے باہر ایک بہت بڑا جلسہ تھا، شاہ صاحب ہی صدر اور وہی مقرر تھے۔ دس بجے شب کے بعد تشریف لائے اور بیٹھ کر تقریر شروع کر دی، کہ آغاز میں ایک جوئے نرم رو کی سی کیفیت رکھتی تھی۔ لیکن جوں جوں رات بھیگتی گئی۔ آواز میں بلندی، کلام میں نرمی اور تخاطب میں روانی برابر بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر زمین و آسمان میں سناٹا تھا، اور ..... ؏

اک شبیر تھا جو گونج رہا تھا کچھار میں

میں نے مولانا محمد علی جوہرؔ کو بھی سنا ہے، مولانا ابوالکلام آزادؔ کی خطابت سے بھی فیضیاب ہوا ہوں مولانا ظفر علی خاں کے سحر گفتار میں آج بھی اسیر ہوں لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے زورِ بیان اور نیرنگیٔ گفتار زمانہ کا ایک اپنا مقام بلند تھا۔ کہ آج تک جس کی مثال نایاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربت کو عنبریں فرمائے، اور اپنے دامانِ رحمت میں جگہ دے۔ (صلاح الدین احمد)

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ زندہ باد

۱۳ھ ۸۱

اِنتقال پُر ملال سیّد عطاء اللہ شاہ

۱۳۸۱ ہجری المقدس

خطیبانہ شہ پارے

وفاداری کے طالب ۱۹۴۸ء

میں نے جو کچھ کیا اللہ اور اس کے رسول کے لیے کیا۔ مجھے ایک لحظہ کے لیے بھی کسی حرکت پر ندامت نہیں۔ میرا دماغ غلطی کر سکتا ہے۔ لیکن میرے دل نے کبھی غلطی نہیں کی۔ مجھ سے وفاداری کا ثبوت مانگنے والے پہلے اللہ اور اس کے رسولؐ کو اپنی وفاداری کا ثبوت دیں۔ میں ان لوگوں میں نہیں، جو اپنے ضمیر کی سوداگری کرتے ہیں۔ میں اس شخص کو دھوپ اور چھاؤں کی اولاد سمجھتا ہوں۔ جو قوم کو بیچتا پھرتا، ملک سے غداری کرتا، اور جس ہنڈیا میں کھاتا ہے اسی میں چھید ڈالتا ہے —— میں نے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکنا سیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کا وارث نہیں جنہوں نے درباروں کی دہلیزیں چاٹی ہیں۔ میں ان کا وارث ہوں۔ جو شہادت کے راستہ میں سروں کو ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔

پاکستان کی حفاظت ۱۹۵۲ء

میں ان لوگوں میں سے نہیں، جو یہ صدا دیتے پھریں۔ کہ میں توشۂ وفاداری لیے پھرتا ہوں میری انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلو، اور جس مقتل میں چاہو، مجھے ذبح کر دو، —— کبھی نہیں ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا۔ میری خوشی بیکراں ہے۔ کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصہ میں بھی سامراج کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں —— تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو، میری رائے ہار گئی۔ اور اس رائے کو نہیں ختم کر دو اب پاکستان نے جب بھی پکارا، واللہ باللہ میں اس کے ذرّے ذرّے کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے —— میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو وہ پھوڑ دی جائے گی کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائیگا —— میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلہ میں نہ اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد۔ میرا دل پہلے بھی تمہارا تھا۔ اب بھی تمہارا ہے۔

ختم نبوت کا سپاہی ۱۹۵۰ء

ختم نبوت کی حفاظت میرا جزو ایمان ہے۔ جو شخص بھی اس ردا کو چوری کرے گا، جو نہیں چوری کا حوصلہ کرے گا۔ میں اُس کے گریبان کی دھجیاں پھاڑ دوں گا۔ میں میاں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہ جی میاں کہا کرتے تھے) کے سوا کسی کا نہیں۔ نہ اپنا نہ پرایا۔ میں انہیں کا ہوں وہی میرے ہیں۔ جن کے حسن و جمال کو خود رب کعبہ نے قسمیں کھا کھا کر آراستہ کیا ہو۔ میں اُن کے حسن و جمال پہ نہ مر مٹوں۔ تو لعنت ہے مجھ پہ اور ان پر جو اُن کا نام تو لیتے ہیں لیکن سارقوں کی خیرہ چشمی کا تماشا دیکھتے ہیں۔

لاہور کے تماشائی ۱۹۳۸ء

صدر محترم اور تماشائی بھائیو! لاہور آئے ہوئے مجھے بیس سال ہو گئے ہیں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بال سفید ہو چکے ہیں۔ آج تک مجھے یہ پتہ نہیں چلا کہ آپ کیا ہیں غوث ہیں، قطب ہیں، ابدال ہیں، ولی ہیں، کیا ہیں سمجھ میں نہیں آتا، کہ آپ کو کس خطاب سے مخاطب کروں —— کہ میری بیوی کے حق مہر میں جیل جانا لکھا ہوا ہے، اگر تم نہیں چاہتے، کہ ہم تمہارے سامنے آئیں، تو پھر تم ہمارے سامنے کیوں آتے ہو! اگر کٹی کرتی ہے تو پکی کر لو، یہ کیا کہ عطاء اللہ نے کی تقریر، تم نے کہا، واہ شاہ جی واہ، عطاء اللہ ہو گیا قید، تم نے کہا، آہ شاہ جی آہ

تمہاری ہی آہ اور واہ میں شاہ جی ہو گئے تباہ۔

قرآن مجید ۱۹۴۶ء

اللہ کی کتاب کی بلاغت کے صدقے جائیے، خود بولتی ہے کہ میں محمدؐ پر اتاری گئی ہوں۔ بابو لوگو! اس کی قسمیں نہ اٹھایا کرو، اس کو پڑھا کرو۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیلؒ کی طرح نہ سہی اقبال کی طرح پڑھا کرو —— دیکھا، اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا، تو مغرب پر ہلّہ بول دیا، پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ تمہارے بت کدے میں اللہ اکبر کی صدائیں۔

عقاب کی آنکھ ۱۹۳۹ء

تم میرے بارے میں جو چاہو، سوچ لو، مسلمانوں کا یہ شعار ہو گیا ہے، کہ وہ برائیاں عقاب کی آنکھ سے چنتا اور صبا کی رفتار سے پکڑتا ہے۔ کبھی کبھی نیکیوں پر بھی نگاہ کر لیا کرو —— ! تمہاری فطرتیں اس سے خوبصورت ہوتی چلی جائیں گی۔

راجپال کی گستاخی ۱۹۲۷ء

(اس جلسہ میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید موجود تھے۔ یہ جلسہ راجپال کی کتاب (عالم مذہن) رنگیلا رسولؐ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا)
آج مفتی کفایت اللہ، اور مولانا احمد سعید کے دروازے پر ام المومنین عائشہؓ اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ آئیں اور فرمایا ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں، کہ کافروں نے ہمیں گالیاں دی ہیں —— (پھر اس زبردست کروٹ کے ساتھ لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا، کہ جلسہ دہل گیا) ارے دیکھو تو —— ام المومنین عائشہ صدیقہؓ دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں (جلسہ میں کہرام مچ گیا لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے)، دیکھو، دیکھو سبز گنبد میں (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تڑپ رہے ہیں۔ خدیجہ و عائشہ پریشان ہیں۔ امہات المومنین تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ عائشہ پکارتی ہیں، وہ عائشہ، جنہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیار سے حمیرا (رضی اللہ عنہ) کہا کرتے تھے جنہوں نے رسول اللہ (فداہ امی وابی) کی رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ انکے ناموس پر قربان ہو جاؤ سچے بیٹے ماں پر کٹ مرا کرتے ہیں۔ ۷ / جولائی ۱۹۲۷ء

میں پہاڑوں سے مخاطب ہوتا ۱۹۴۵ء

چالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا، پہاڑوں کو سناتا، تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے، غاروں سے ہمکلام ہوتا، تو جھوم اٹھتے، چٹانوں کو جھنجوڑتا، تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا، تو ہمیشہ کے لیے طوفان بلند ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا، تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا، تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا، تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا، تو اس کے سینہ میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے۔ صحرا سرسبز ہو جاتے۔ میں نے ان لوگوں کو خطاب کیا جن کی زمینیں بنجر ہو چکی ہیں۔ جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے۔ جن کے ضمیر عاجز آ چکے ہیں۔ جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں۔ جن کی پستیاں انتہائی خطرناک ہیں۔ جن کا ٹھہرنا المناک، اور جن سے گزر جانا طرب ناک ہے۔ جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے۔

مراجعت ۱۹۶۰ء

میں وہاں چلا جاؤں گا۔ جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا، پھر تم مجھے پکارو گے —— مگر تمہاری پکار تمہارے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر تمہیں ہلکان کر دے گی —— اور تم مجھے نہ پاؤ گے ——

شاہ جی کی عادتیں

شورش کاشمیری

شاہ جی خوبصورت عادتوں کے ایک دلفریب انسان تھے۔ قرون اولیٰ میں ہوتے، تو صحابہ کی صف اوّل میں ہوتے —— اور کربلا میں سید الشہداءؓ کے ساتھ شہید ہوتے۔ ان کی درویشی اور فقیری میں بوئے اسد اللہی بھی تھی، اور غیرت شبیری بھی —— وہ ابو ذر غفاری (رضی اللہ عنہ) کی طرح املاک پیدا کرنے کے ہر طریق کو ناجائز سمجھتے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحمتوں بھیجتے بے پناہ ارادت رکھتے تھے —— عہد عتیق کے روم و یونان میں ہوتے، تو ڈیما ستھیز یا سرو ہوتے جنہوں نے خطابت کے اصول مدّون کئے۔ اور لوگوں کی عقلوں کا شکار کرتے رہے۔ گمشدہ یونان میں ہوتے، تو عجب نہ تھا کہ سقراط کی طرح انہیں بھی زہر کا پیالہ پینا پڑتا۔ ویدوں کے ہندوستان میں ہوتے تو ہمالیہ کے غاروں میں رشیوں کے ساتھ فلذ ملا کر چلتے، اور گیتا کے ورق اچھالتے پھرتے، یا پھر گوتم بدھ کے ساتھ ہوتے، جن کی یادیں ایلورا اور اجنتا کے محیّر العقول غاروں میں نہ مٹنے والی خطابت کا شاہکار محسوس ہوتی ہیں ——

شاہ جی ایک عجیب و غریب تصویری مرقع تھے۔ ان کے چہرے مہرے پر فقرائے اسلام کا طنطنہ اور دانشوران یونان کا ہمہمہ ہالہ کئے ہوئے تھا۔ آدمی ان کے نزدیک آکر اور نزدیک ہو جاتا تھا۔ ان کے مخالف وہی لوگ تھے جو ان سے دور رہتے تھے۔ یا پھر انگریزوں کے پٹھو، مسلمانوں کے دشمن اور قادیانیت کے متبنی، وہ نور کا تڑکا تھا کہ اندھیری رات اس کی گرفت میں آکر نقرئی ہو جاتی ہے۔ یا پھر اوس کا قطرہ تھے، کہ غنچوں کا منہ دھلاتے اور پھول کھلاتے تھے۔ ان کی عادتیں جو ان کے انفاس کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں، اتنی سادہ اور عجیب تھیں، کہ عظیم کتابی انسانوں کے سوا ان کا وجود فی زمانہ شاذ ہی ملتا ہے۔ مثلاً۔

(۱) ۔ وہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے تھے۔ ہر چیز کو اللہ کی رضا کے تابع سمجھتے، حال سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ اس کو جھنجھوڑتے، اُس پر کڑھتے یا کبھی کبھار اس پر قہقہے لگاتے تھے، البتہ وہ ماضی کے انسان تھے۔ امور ماضی ہی سے محبت کرتے تھے —— ان کا اوڑھنا بچھونا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، سوچنا سمجھنا، بولنا ہنسنا، سب ماضی کا مرہون تھا —— اور اسلام کے ماضی کے سوا کسی بھی ماضی کے قائل نہ تھے —— وہ تہمند اس لئے باندھتے تھے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تہمند باندھا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی غذا کے عادی نہ تھے —— ساگ ستو جو ملا، خدا کا شکر کیا اور کھا لیا۔ میں نے ہری مرچوں کی رغبت کے سوا ان میں کسی شئی کے لیے رغبت نہیں پائی! انہیں بغیر پکائے کھا جاتے اور قیمے میں بھون کر بھی —— ٹھنڈا پانی کثرت سے پیتے، بلکہ تقریر کرتے وقت تھرماس ساتھ رکھتے تھے برف ہی چباتے چلے جاتے، ان کا گلا برفاب سے اور کھلتا، بلکہ کرارا ہوتا تھا —— اکثر فرش ہی پر بستر کھول کر سو جاتے یا پھر بان کی کھردری چارپائی پر۔ وضو کے لیے لوٹا ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ جب پان کھانے کی عادت پختہ ہو گئی، تو تھیلے کی ایک غریب الحال ٹوکری میں پانوں کی ڈھولی، چونا، کتھا اور سپاری کی گولیاں، کھدر کے ٹکڑوں میں پیٹ لپاٹ کر رکھتے تھے

(۲) ۔ سحر خیز تو تھے ہی، یعنی صبح کی نماز قضا نہ ہونے دیتے۔ نماز ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ مگر رات گئے دیر سے سوتے، اور

ان کی فطرت ثانیہ ہو چکی تھی۔ جلسوں میں آخری مقرر وہی ہوتے۔ اور ان کا کوئی جلسہ بارہ ایک بجے رات سے پہلے ختم نہ ہوتا تھا۔ اور صبح ہو جانا تو عام معمول تھا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد بھی عقیدتمندوں کا ہجوم گھنٹہ دو گھنٹہ گھیرے رکھتا جس روز جلسہ نہ ہوتا، یا گھر پہ ہوتے تو محفل آرائیاں فرصت نہ دیتیں۔ وہی دو بجے شب کا سونا مقدر ہوتا۔ البتہ رمضان شریف کے مہینے میں یہ معمول نہ رہتا ——— تراویح پڑھ چکنے کے بعد محفل جمانتے اور سحری سے کچھ ہی عرصہ پہلے ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے آخری برسوں میں حال یہ تھا کہ صحبت آرائیاں بالکل مختصر کر دی تھیں۔ وقت کا بڑا حصہ یاد الٰہی میں بسر کرتے، باکصورت حال یہ تھی کہ عبادت کے لئے قریب ہونے تو دوستوں سے کہتے کہ بھائی میری گدائی کا یعنی اللہ سے مانگنے کا وقت ہے۔ محفل برخاست ہونی چاہئے۔ پھر خود ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔

(۳) - ہمیشہ ہی موٹا جھوٹا پہنتے فقر و غنا کی بچی تصویر تھے۔ مغربی تہذیب کے خفی و جلی اثرات کا سایہ بھی ان سے میلوں دور رہتا۔ میں نے ان کے گھر میں مغربی مصنوعات، مغربی تصورات اور مغربی نظریات کا گذر تک نہیں پایا۔ انکی فرنگ دشمنی اور یورپ بیزاری کا یہ عالم تھا کہ بس میں ہوتا تو اپنے گھر میں بجلی اور پنکھا بھی نہ لگواتے۔ ان دو چیزوں کے سوا میں نے ان کے ہاں کبھی کوئی یورپی چیز نہ دیکھی۔ ریڈیو کے وہ اتنے مخالف تھے کہ سینکڑوں مرید تھے جنہوں نے ریڈیو سیٹ پیش کرنا چاہا مگر جھنجلا کر انکار فرما دیا ——— گھر میں استاد جی لانا چاہتے ہو؟

(۴) - راقم الحروف نے عرض کیا، شاہ جی زمانہ بہت بڑھ چکا ہے اپنے بچوں کو انگریزی مدرسوں میں داخلہ دیں انگریزی کے بغیر تعلیم مکمل نہیں ہوتی، زمانہ کا تقاضا ہے فرمایا بابا مجھے معاف رکھو، میں اس زمانہ کا آدمی نہیں۔ تم مجھے محمد قاسم نانوتوی اور محمود الحسن دیوبندی کی روحوں سے بغاوت کرنے کی ترغیب دیتے ہو؟ - یہ کیوں نہیں کہتے، کہ تمہارے بچے مر جائیں یا اپنے ہاتھوں بچوں کو قتل کر دو۔

(۵) - انگریزوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ "لعنت بر پدر فرنگ" ان کا نعرہ قلندری تھا۔ اور موڈ میں آ کر اس زور سے بلند کرتے تھے۔ کہ در و دیوار گونج اٹھتے تھے۔

(۶) - کبھی کسی شخص کی غیبت نہیں کی۔ نہ دشمن کی نہ دوست کی۔ صرف خیالات سے اختلاف کرتے یا ان پر سخت قسم کی جرح و قدح۔ انکے نزدیک عیب ہی سب سے بڑا عیب تھا جس شخص کی قومی غداری پر طبیعت منغض ہوتی فرماتے جو فصل بوئی ہے دعا کرتا ہوں کہ خود کاٹ کے مرے ——— میں نے ان کی زبان سے کبھی کوئی گالی نہیں سنی۔ البتہ فرنگیوں اور انکے خانہ زادوں کے بارے میں درشت سے درشت الفاظ بھی کہہ جاتے تھے

(۷) - بظاہر ان کا کوئی کاروبار نہ تھا۔ انکے خاص معتقدین مدد فرماتے تھے۔ مگر نہ تو کبھی چھپ کر ہدیہ قبول فرماتے اور نہ اس پردہ پوشی ہی کے قائل تھے۔ جب کوئی مٹھی بند کر کے کچھ دینا چاہتا تو مٹھی کھول دیتے، کہ چھپاتے کیوں ہو، کیا چوری کا مال ہے؟ جماعت سے ایک دمڑی نہ لیتے، یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے کسی جماعت سے کبھی نہ کرایہ وصول کیا، نہ وظیفہ لیا، نہ قرض حسنہ اور نہ امانت قبول کی۔ ان کے مداح انہیں خود ہی بے نیاز رکھتے۔ اور وہ ہر لحاظ سے بے نیاز (دنیاوی طور پر) تھے۔ ——— ع

جو بے نیاز کا بندہ ہے بے نیاز رہے

(۸)۔ انکے پاس ایک بہت پرانا بٹوہ تھا جو ملتان کے ایک مجذوب نے دے رکھا تھا، یا وہ بٹوہ انکا اپنا تھا۔ مگر اس میں کچھ اور پائیاں پڑی تھیں۔ جو اس مجذوب نے دی ہوئی تھیں۔ انہیں بٹوہ میں تبرکاً رکھ چھوڑا تھا، فرماتے ان کے برکت بٹوہ کبھی خالی نہیں رہا۔

(۹)۔ فرماتے جو لوگ روٹی کے لیے جدوجہد کرتے اور اسی کیلئے جیتے ہیں۔ ان میں اور ایک کتے میں کوئی فرق نہیں وہ بھی روٹی کے لیے بھونکتا اور دُم ہلا کر مالک کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ روٹی کوئی چیز نہیں اصلی چیز عقیدہ اور اس کے مطابق بسر کرنے کی دھن ہے۔

(۱۰)۔ مذہباً پکے مسلمان اور بہ لحاظ مسلک حنفی العقیدہ تھے۔ دیوبند مدرسۂ فکر کے پیرو۔ لیکن طبیعت میں کسی کے لئے تنفّر نہ تھا، ہر کسی کی اچھائیوں سے محبت کرتے، میرزائیوں کو تو مسلمان ہی نہ سمجھتے تھے ——— صوفیا اور اولیاء کا بے حد احترام کرتے، مزے میں آکر فرماتے، بھئی میں تو چشتی بھی ہوں، نقشبندی بھی، قادری بھی، صابری اور سہروردی بھی ———

(۱۱)۔ اپنے دائرے سے باہر عام مجلسی دعوتوں میں شاذ ہی شریک ہوتے تھے، میں نے انہیں اپنے بھائی یورش کاشمیری کے دعائے مغفرت مانگنے کو کہا، تو فرمایا اجی چھوڑو! اس ننھی کلی سے کون حساب لے گا۔ خدا ہماری اور تمہاری طرح نہ قیامت کے روز چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، مسولینی وغیرہ کا حساب ہی لمبا ہوگا۔ ہماں شماں سے کون پوچھتا ہے۔ ———

(۱۲)۔ وعدہ ہر حال پورا کرتے، سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو تیس دن تقریریں فرماتے۔ لیکن وقت کی پابندی ان کی رگ نہ تھا، جلسہ میں دیر سے پہنچتے، اور جس کے ہاں جا کر ملنا ہو وہاں وقت مقررہ کا دو چار گھنٹے اوپر ہو جانا تو معمولی بات تھی۔ مولانا آزاد سے ملنے کا وقت طے کیا۔ وہ سیکنڈوں پر نگاہ رکھنے والے کوئی دو گھنٹے لیٹ پہنچے ——— وقت ہو رہا نے متوجہ کیا، مگر قیلولہ کرنے لگے۔ مسٹر گاندھی سے بھی یہی کہا۔ مولانا حبیب الرحمٰن کہا کرتے تھے، کہ شاہ جی نے انگریزوں کا اتنا جہاد کیا ہے۔ کہ کئی انسانوں کا مجموعہ بھی یہ نہیں کر سکتا، مگر وقت کے اسراف کا یہ حال ہے کہ آج اگر انگریز یہ کہہ دے روز ٹھیک اتنے بجکر اتنے منٹ پر شاہ جی کو وائسریگل لاج بھجوا دو۔ تو ہم آزادی کا پروانہ دینگے، تو آزادی کبھی نہیں ملیگی۔ کیونکہ شاہ جی اور وقت کی پابندی دو متضاد چیزیں ہیں ———

(۱۳)۔ اپنی تعریف سے کبھی خوش نہ ہوتے، نہ پسند کرتے، نہ اجازت دیتے، اخباروں میں چھپنے چھپانے کے سخت خلاف تھے، انہوں نے پریس کانفرنس کا وجود ہی نہ دیکھا تھا۔ اخبارات کو عمر بھر کبھی کوئی بیان نہیں دیا نہ مضمون لکھا۔ آزاد میں ان کے نام سے دو ایک مضمون چھپے، وہ راقم الحروف کے لکھے ہوئے، لیکن ان کی گفتگوؤں کا عکس تھے۔ اس معاملہ میں وہ عام لیڈروں کی کمزوریوں سے اتنے بالا تھے کہ ان کی ملکوتی صفات پر حیرت ہوتی تھی ———

(۱۴)۔ پان خود بناتے، چائے بھی خود ہی تیار کرتے، خود پیتے اور دوسروں کو پلاتے تھے۔ اللہ سے حد درجہ ڈرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ ارادت رکھتے تھے ———

(۱۵)۔ ان کے پاس کوئی وسیع لائبریری نہ تھی بلکہ تھی ہی نہیں۔ فرماتے ایک قرآن کے سوا میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی اتنا بعض

کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر مطالعہ کا یہ ذوق کچھ دنوں ساتھ رہا۔ آخر قرآن پاک ہی کو رفیق بنا لیا مولانا محمد طفیل منگلوری کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ایک زمانہ میں ساتھ رکھتے اور ساتھیوں کو اسکے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے ——— مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال"، ظفر علی خاں کا "ستارہ صبح"، انہوں نے ڈوب کر پڑھے تھے ——— علامہ اقبال کے کلام کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا تھا۔ "بال جبریل" تو سفر وحضر میں ساتھ رکھتے ———

(۱۶)۔ اپنی ذات کی ہر حال میں نفی کرتے اور جماعت کے دوستوں یا جماعت سے باہر کے انگریز دشمنوں کے قصیدے پڑھاتے اور دعائیں دیتے تھے۔ ———

(۱۷)۔ خط و کتابت کے مطلق عادی نہ تھے۔ بہت کم خطوں کا جواب دیتے اور شاذ ہی کسی کو خط لکھتے تھے۔ البتہ بعض جوابات بیٹوں سے املا کرا دیتے تھے۔ مضمون نگاری کا شوق مطلق نہ تھا۔ صرف بیاض رکھتے تھے۔

شورش کاشمیری

انکی باتوں میں گلوں کی خوشبو

شاہ جی تحریر کے سخت مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کوئی مضمون نہیں لکھا۔ وہ خط بھی شاذ ہی لکھتے تھے۔ وہ خود ایک بڑے آدمی تھے۔ لیکن اپنے عہد کے بڑے آدمیوں سے انکی مطلق خط و کتابت نہ تھی۔ فرماتے، انسانی سوسائٹی میں سب فتنے تحریر سے پیدا ہوتے ہیں۔ تلواروں نے انسانوں کے جسموں کو قتل کیا لیکن قلموں نے انسانوں کی روحیں فنا کر ڈالی ہیں۔ اس معاملہ میں ان سے زیادہ بے نیاز آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ جن دنوں میں ان کی سوانحعمری لکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ذرہ بھر تعاون نہیں کیا۔ بلکہ جب میں سوانحعمری مکمل کر کے ان کے خاندانی حالات کا باب سنانے کے لیے حاضر ہوا۔ تو فرمایا چھوڑو اس کو، کس راہ پر پڑ گئے ہو، صاف انکار کر دیا گو اسکے اور بھی وجوہ تھے۔ جنہیں میں یہاں قلم بند کرنا نہیں چاہتا تاہم انکی بے نیازی معراج کمال پر تھی وہ کسی کو اپنی فوٹو کھچنے نہیں دیتے تھے۔ اور کھنچوانے کا تو سوال ہی خارج از بحث تھا۔ انکا ایک فوٹو جو کیلنڈر میں دیا جا رہا ہے عام ہے اور شاید کسی طرح ان کی اجازت سے کھنچ گیا ہے۔ تاہم اس پر سخت ناراض تھے۔ باقی تمام تصویریں ان کی منشاء مرضی اور ارادے کے خلاف ہیں۔ اور فوٹو گرافروں کی اپنی ہوشیاری کا نتیجہ ——— ان کی بعض تصویریں "چٹان"، کے فوٹو گرافروں کی حاصل کردہ ہیں۔ جو انہیں گفتگو میں مشغول رکھ کر بنائی گئی ہیں۔ راقم الحروف کی تحریر کردہ سوانحعمری میں انکی جو تصویر ہے۔ کتاب کا پہلا نسخہ ان کے ہاں پہنچا۔ تو کسی معتمد یا بزرگ نے اعتراض نما سوال کیا۔ تصویر پھاڑ کر اسکے والے کر دی۔ اور کہا اس کو جوتے مارو، ضرور مارو، سوچتے کیا ہو، یہ بے نفسی اب کہاں؟ اور اس استغنا کے نمونے کوئی کہاں سے لا سکتا ہے؟

فی الحقیقت وہ ایک عہد، ایک ادارہ، ایک انجمن اور ایک تاریخ تھے۔ گفتگو طرازی میں انکا مثیل ملنا مشکل ہے۔ وہ خاص صحبتوں

ہیں بالکل ایک ادیب، ایک فقیر، ایک شاعر، ایک درویش، ایک متکلم، ایک صوفی، ایک نقاد، ایک عالم اور ایک دوست ہوتے تھے — ان میں سے جس تار کو بھی چھیڑ لو وہی نغمے پھوٹنے لگتے۔ پھر گلفشانی گفتار، بہار کی طرح پھیلتی جاتی تھی۔ ایک نقص یہ سرزد ہوتا، کہ اپنی گفتگو لکھنے نہیں دیتے تھے۔ ورنہ انہوں نے تمام زندگی الفاظ وتراکیب کے اتنے انبار لگائے، اور لطائف وظرافت کے انکے موتی بکھیرے ہیں، کہ ایک شاہکار دماغ ہی سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ پھر حکمتوں اور بذلہ سنجیوں میں تو وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد تھا، کہ —— شاہ جی کی باتیں عطاء اللّٰہی ہوتی ہیں

---

(۱) - شاہ جی کی ساری زندگی سیاسیات کے چکر میں بسر ہوئی۔ گو عمر کا غالب حصہ دین ہی کی خدمت میں گزرا مگر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سیاسیات سے دستبردار ہونے کی خواہش کے باوجود چودہ اگست ۱۹۴۷ء تک اپنے آپ کو سیاسیات سے الگ نہ کر سکے۔ لیکن مسجد شہید گنج کے انہدام کے بعد انکا یہ عقیدہ پختہ ہوچکا تھا، کہ سیاست کا مطلب فتنہ خیزی، فتنہ پروری، اور فتنہ انگیزی ہے۔ فرماتے، سارے قرآن میں پالیٹکس کے مفہوم میں سیاست کا لفظ نہیں؛ اس کے معنی ہی مکر کے ہیں اور فرنگی مقامروں کی ایجاد ہے۔ جسکا مطلب ہی فریب وہی ہے۔ سیاسئین کے وعدے پورا ہونے کے لیے نہیں کئے جاتے بلکہ ٹالنے کے لیے کئے جاتے ہیں۔

---

(۲) - حضرت امام حسین کی شہادت پر کبھی تقریر نہیں فرمائی۔ ان جیسا سحبان جو خطابت کے سحر سے وقت کو گوش برآواز کرلیتا تھا سانحہ کربلا پر بولنے سے طرح دیتا رہا۔ کئی دفعہ دوستوں نے اصرار کیا کہ عاشورہ کے دنوں میں سانحہ کربلا پر تقریر فرمائیے انکار ہی کرتے رہے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا تو کہا۔ کس طرح بیان کروں؟ کہ نانا کا کلمہ پڑھنے والوں کے ہاتھوں، نواسے پر کیا بیتی؟ مجھ میں حوصلہ نہیں کہ اس سانحہ کو بیان کر سکوں اپنے اندر طاقت نہیں پاتا۔ البتہ اپنے حال پر غور کرکے دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ مسلمانوں کی "پرانی سنت" ہے۔

---

(۳) - جن دنوں بعض سیاسئین کی بدولت مدح صحابہ اور تبرا ایجی ٹیشن کا زور بندھا ہوا تھا۔ شاہ جی نے دہلی دروازہ کے باہر ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کیا اور فرمایا قدح صحابہ کرنے والو! خدا کے خوف سے ڈرو۔ اتنے میں کسی نے دور کونے سے آواز دی:-

"شاہ جی خدا کا خوف کریں۔ سیّد ہوکر خلافت کے غاصبوں (معاذ اللہ) کی مدح کرتے ہو"۔

بس یہ ایک جملہ بخاری کو جلال پر لے گیا۔ فرمایا کیا کہتے ہو؟ میں علی کا بیٹا ہوں۔ اور صدیق، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم کی مدح کرتا ہوں، پہلے بھی کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا، تم کون ہو؟ —— ہائے وہ لوگ جنہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں جگہ ملی ہو۔ تم انہیں گالی دیتے ہو۔ ظالمو! حشر کے دن آقا کو کیا جواب دوگے؟ پھر اسکے بعد خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب پر وہ تقریر کی کہ جیسے شہپر جبریل انکی خطابت کا ہالہ کئے ہوئے ہو۔

---

(۴)- کسی شیعہ دوست نے سوال کیا۔ علی اور عمر (رضی اللہ عنہما) میں کیا فرق ہے۔ فرمایا بڑا فرق ہے۔ علیؓ مرید تھے، عمرؓ مراد حضورؐ نے خود انکی آرزو کی اور اللہ سے دعا مانگی تھی۔ فرمایا میں علیؓ کا بیٹا ہوں۔ نفس میرا بھی چاہتا ہے کہ سب کچھ انہیں کی جھولی میں ڈال دوں، مگر چھوڑتے نہیں وہ خود منواتے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ کو نکال دو اور سوچو تاریخ میں رہ کیا جاتا ہے؟

---

(۵)- اسی دوست نے پوچھا حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہما) میں کیا فرق ہے۔ فرمایا خدیجہؓ کا نکاح محمدؐ بن عبداللہ سے ہوا تھا۔ عائشہ کا عقد محمد الرسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ ہیں۔ یہ نبوت کی۔ یہ گویا ایک نافس سوال کا شگفتہ جواب، لیکن ان لوگوں کے لیے مسکت جواب تھا۔ جو ازواج مطہرات میں بھی اختلافات کے حاشیے باندھتے ہیں

---

(۶)- انہی صاحب نے لگے ہاتھوں یہ سوال بھی کیا کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور ان کی دوسری صاحبزادیوں رقیہؓ، ام کلثومؓ اور زینبؓ میں کیا فرق ہے؟- فرمایا فاطمہ نبوت کے بعد کی بیٹی ہے۔ اور باقی نبوت سے پہلے کی بیٹیاں تھیں۔ (مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں سرے سے مسئلہ ہی نہیں ہیں۔ انہیں سوال کی صورت دینا بے سود تھا۔ تاہم "غنچہ طرازوں"، کو کس بانکپن سے جواب دیتے تھے۔

---

(۷)- صاحبزادہ فیض الحسن شاہ ایک زمانے میں جماعت احرار کے اکابر میں سے تھے۔ آجکل بریلوی عقائد کے مبلغ ہیں اور نوری دنیا کی کے چکر میں محصور ——— کسی نے سوال کیا، شاہ جی، صاحبزادہ صاحب آپ کو کیوں چھوڑ گئے۔ فرمایا

"بھائی وہ نوری ہیں ہم خاکی ہیں ان نوریوں سے وفا کی امید ہی کیا سب سے بڑے نوری (جبریل علیہ السلام، میرے نانا کو (شب معراج) راستہ میں چھوڑ گئے تھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا کہ آگے چلو کہا اس سے آگے پر جل جائینگے۔ نتیجۃً نوری رہ گیا، خاکی آگے نکل گیا۔"

ہائے نہ ہوا بخاری، میاںؒ کا حکم مان لینا، خواہ پر ہی جل جاتے، میاںؒ کی طاعت اور آقا کی دہلیز پر تو چلتے اس سے بہتر کون سا موقع تھا۔ ؎

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر
کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

---

(۸)- درگاہ امام ناصر جالندھر کے جلسے میں کسی نے اس وقت کے اختلافی مسئلے زیارت قبور کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ مخالفوں نے شاہ جی کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا۔ کہ وہابی ہیں۔ سوال کیا گیا۔ کہ آپ کا زیارت قبور کے بارے میں کیا خیال ہے فرمایا۔

"اپنے اپنے ظرف اور ذہن کی بات ہے۔ کچھ لوگ انگور نعمت خداوندی سمجھ کر کھاتے ہیں کچھ اس میں سے شراب نکالتے، اور عقل کی بازی ہارتے ہیں۔ میں بھی اس مزار کی زیارت کر کے آیا ہوں اور تم بھی زیارت کرتے ہو۔ خدا کے فضل و کرم سے کچھ لے کر آیا ہوں اور تم ایمان میں سے کچھ دے کر آتے ہو

ع
سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا"

---

(۹)۔ سیرت کے ایک جلسہ میں فرمایا یہ بڑا نازک مضمون ہے ۔ سیاسی تقریر ہو، ایک آدھ جملہ نیچے اوپر یا ادھر اُدھر ہو جائے تو ڈر نہیں لگتا ۔ زیادہ سے زیادہ قید ہو جاتی ہے ۔ سال، دو سال، پانچ سال، لیکن سیرت یا حدیث کے مضمون پر بولتے ہوئے ایک آدھ جملہ بھی کم و بیش ہو جائے تو ایمان کا ضیاع ہے ۔ اور دوزخ کی آگ، اس میدان میں بخاری بزدل ہے ۔ جہنم کی قید خانے کی تاب اس میں نہیں ہے ۔

---

(۱۰)۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بشریت کے منکرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ۔

"بھائی لوگو! آپ کے کبوتروں کی بھی نسل ہو اور بٹیروں کی بھی ——— لیکن ایک ہم سیّد ایسے ہیں کہ جن کی نسل نہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تم بشر نہیں مانتے ہو، تو پھر ہم کس کی اولاد ہوئے!"

---

(۱۱)۔ فرمایا (بحوالہ مولانا قاری محمد طیب مدظلہ) علماء، اسلام کی پولیس ہیں ۔ ان کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کرائیں ۔ اہل حال بزرگوں کو جو کچھ کہنا ہے ۔ اپنے تک محدود رکھیں اگر وہ کھلم کھلا قانون اسلام کی خلاف ورزی کے مرتکب ہونگے تو ہم انہیں پکڑ لیں گے ۔ خواہ عدالت میں چھوٹ ہی جائیں ۔

---

(۱۲)۔ کسی نے سوال کیا ۔ شاہ جی یہ مردے سنتے ہیں کہ نہیں فرمایا "سنتے ہونگے جن کی سنتے ہونگے ہماری تو زندے بھی نہیں سنتے ہیں" حاضرین ہنس پڑے ۔ مسئلہ ختم ہو گیا ۔

---

(۱۳)۔ موری دروازے کے باہر کندن شاہ کا تکیہ ہے ۔ جسے عام لوگ گدو شاہ کہتے ہیں اس سے پیوست کبھی ایک باغ تھا یہاں کانگرس کے جلسے ہوتے تھے ۔ سائمن کمیشن کے زمانے میں شاہ جی نے یہاں ایک تقریر کی ۔ سرکاری لوگوں نے اس تکیے کے چرسیوں، بھنگیوں اور سلفہ بازوں کو رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے اکسایا ۔ وہ سلفہ کا کش کھینچ کر یا علی مدد کے نعرے لگانے لگے ۔ شاہ جی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا ۔ او چرسیو! یہ غلاظت پی کر میرے باپ علی (رضی اللہ عنہ) کا نعرہ کیں لگاتے ہو کیا تمہارے باپ دادا نہیں ہیں ۔ (کیا بات کس شگفتگی سے کہی ہے)

---

(۱۴)۔ ایک وکیل نے رمضان کے دنوں میں شاہ جی سے بزعم خویش مذاق کرتے ہوئے کہا ۔ حضرت علماء تعبیر و تاویل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیے، کہ آدمی کھاتا پیتا رہے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے ۔ فرمایا ۔ سہل ہے قلم و کاغذ لیکر لکھو!

"ایسا مرد چاہیے جو اس وکیل صاحب کو صبح صادق سے مغرب تک جوتے مارتا جائے ۔ یہ جوتے کھاتے جائیں اور غصے کو پیتے جائیں اسطرح کھاتے جائیں اور پیتے جائیں ۔

فرمایا ۔ جاؤ اس طرح کھاتے پیتے رہو ۔ روزہ کبھی نہ ٹوٹے گا ۔"

---

(۱۵)۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے کہا شاہ جی کالج میں ڈاڑھی رکھ کر جانا مشکل ہے۔ فرمایا۔ ہاں بھائی اسلامیہ کالج میں مشکل ہے خالصہ کالج میں آسان ہے۔

---

(۱۶)۔ مسلم کانفرنس کے ٹوڈیوں کا زمانہ تھا، کسی تحریک میں لوگ جیل جا رہے تھے۔ شاہ جی، مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں تقریر کر رہے تھے۔ "زمیندار" کی ضبطی پر چندہ کی فراہمی کا ذکر آ گیا۔ ایک شخص نے دور سے کہا۔ "چندہ کھا جاتے ہیں" فرمایا بھائی چندہ ہی کھاتے ہیں سور تو نہیں کھاتے اور مجمع زعفران زار ہو گیا۔ پھر فرمایا ان تنظیموں کو چندہ دو۔ یہ لوگ قربانی کے بکرے ہیں کھائیں گے تو جیل جائینگے قربانی کے بکروں کو بھوکا مارنا چاہتے ہو؟"

---

(۱۷)۔ کسی نے کہا شاہ جی۔ مجلس کے بعض لوگ اب لیگ میں چلے گئے ہیں۔ یعنی اس سے تعاون فرما رہے ہیں فرمایا ہاں بھائی کچھ حسین (رضی اللہ عنہ) کے پیروکار تھے۔ کربلا میں ذبح ہو گئے۔ کچھ حسن (رضی اللہ عنہ) کے پیرو ہیں۔ انہوں نے صلح و آشتی کی راہ اختیار کی دونوں کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہو گئی۔

---

(۱۸)۔ پاکستان بن جانے کے فوراً بعد راولپنڈی میں کسی دینی جماعت کا ایک جلسہ تھا شاہ جی بھی مدعو تھے راجہ غضنفر علی خاں وزیر تھے اور جلسہ کے صدر۔ انہوں نے شاہ جی کو دعوت تقریر دیتے ہوئے کہا۔ کہ شاہ جی جس لیگ کے مخالف تھے اسی لیگ نے انہیں پناہ دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طنزیہ جملہ تھا، شاہ جی نے اٹھتے ہی جواب دیا۔ ہاں بھائی یہ پناہ آج سے نہیں مل رہی اس کی بڑی لمبی تاریخ ہے میرے آبا کو بھی پٹنے کے بعد تمہارے آبا کے گھر میں پناہ ملی تھی اور مجمع پر ایکا ایک سناٹا چھا گیا۔

---

(۱۹)۔ فرمایا ہمارے ہاں نوجوانوں کا عجیب مزاج ہو گیا ہے، بلکہ فطرت ——— جو لڑکا میٹرک میں فیل ہوتا ہے باٹا شو کمپنی میں سیلزمین ہو جاتا ہے۔ یا سی۔ آئی۔ ڈی کے ملائکہ، مقدسین کا انفارمر بن کر ٹاپتا پھرتا ہے۔

---

(۲۰)۔ ختم نبوت کی تحریک کے دنوں میں سندھ کی کسی جیل میں محبوس تھے۔ ایک بہت بڑا سرکاری افسر ملنے کے لئے گیا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ شاہ جی، اب اسلامی حکومت ہے، پہلے جیل جاتے تھے تو لوگ قدر کرتے تھے۔ اب تو وہ دن نہیں رہے۔ لوگ بھول جائینگے۔ چھوڑیئے اس قضیہ کو باہر آکر کوئی اور کام کیجئے۔ فرمایا ——— ٹھیک ہے بھائی، لیکن میں کبھی لوگوں کے لیے جیل نہیں گیا۔ میں تو اسلام اور آزادی کے لیے جیل جاتا رہا ہوں۔ رہا اسلامی حکومت کا سوال تو مجھے تم سے اتفاق ہے۔ مگر یہ نہ بھولو کہ اسلامی حکومتوں میں کچھ لوگ جیل میں رہا کرتے ہیں اور کچھ لوگ تخت پر۔ کچھ گوالیار کے قلعہ میں، کچھ دلی کے قلعہ میں۔

---

(۲۱)۔ کسی نے ایک بڑی گدی کے سالانہ عرس پر سوال کیا۔ مزاروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔ فرمایا میں اس سوال کی بنیاد کو

سمجھتا ہوں۔ بہرحال ایک مزار اقدس میرے آقا۔ میرے ہادیؐ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں بن چکا ہے۔ اب دوسرا مزار میرے نزدیک شرک فی النبوۃ ہے۔

مولانا تاج محمود

اب کہاں دُنیا میں ایسی ہستیاں

ایک ریٹائرڈ پولیس افسر نے بتایا کہ ایک مرتبہ شاہ جی مسجد خیر دین امرتسر میں تقریر کر رہے تھے۔ میں ڈیوٹی پر تھا۔ دو بجے شب مجھے اعلیٰ حکام نے طلب کیا۔ اور میری جگہ ایک دوسرا رپورٹر بھیجا۔ میں نے جب اپنی ڈائری ختم کی تو اس میں یہ الفاظ درج کر دیئے۔

"شاہ جی رات کے ۱۱ بجے سے تقریر کر رہے ہیں اب رات کے دو بجے ہیں ان کی تقریر سے حاضرین جلسہ تو درکنار مسجد خیر دین کے در و دیوار اس کے گنبد و محراب اور حوض کے پانی تک مسحور ہو چکے ہیں"

خان غلام محمد خاں لونڈ خور نے سنایا کہ میں نے نہ تو شاہ جی کو دیکھا ہوا تھا۔ اور نہ ان کا خاص معتقد تھا۔ میرا سیاسی مسلک بھی ان سے جدا تھا۔ ایک دفعہ عشاء کے وقت دلی دروازہ کے باہر سے گزرا تو شاہ جی تقریر کر رہے تھے۔ میں بڑے ضروری کام میں تھا۔ اس خیال سے رک گیا۔ کہ جس مقرر کی اتنی شہرت ہے اسے پانچ منٹ سن لوں۔ میری عادت یہ ہے۔ کہ میں جلسہ میں ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ خود اپنے جلسے میں بھی گھوم پھر کر دیکھتا اور سنتا ہوں۔ میں پانچ منٹ تک شاہ جی کی تقریر سنتا رہا۔ پھر سوچا تھوڑی دیر اور سن لوں ان کا سحر تھا کہ کھڑے کھڑے بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا۔ اور لیٹے لیٹے ساری رات تقریر سنتا رہا۔ اور ایسے تو اس گم ہوئے کہ اپنا کام ہی بھول گیا۔ یہاں تک کہ صبح کی اذان بلند ہوئی۔ شاہ جی نے تقریر کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ تو مجھے خیال آیا کہ ادھر ساری رات ختم ہو گئی۔ یہ شخص تقریر نہیں کر رہا۔ جادو کر رہا تھا۔

حاجی قائم دین لائلپور میں کپڑے کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین و دنیا دونوں بڑی فیاضی سے عطا کی ہیں۔ شاہ جی کے مخلص دوستوں میں سے تھے تقسیم سے قبل آگرہ میں تھے انہوں نے واقعہ سنایا۔ کہ ایک دفعہ شاہ جی آگرہ میں مارکیٹ کی چھت پر منعقد جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔ حجازی لَے میں قرآن مجید کی آیات پڑھیں۔ تو ایک نوجوان تڑپ کر چھت کے کنارے کی دیوار سے چھت پر آن گرا۔ بر سے تو بچ گیا۔ لیکن وجد اور جذب کی حالت میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ لوگوں نے اٹھایا تو اس کے چہرا پر آبد ہوا اسے شاہ جی کے پاس لایا گیا۔ شاہ جی نے اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا کچھ پڑھ کر پھونکا اور محبت سے پاس بٹھلا لیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس انکشاف کیا کہ مجھے تو شاہ جی کے قتل کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن شاہ جی کا خطبہ اور قرآن مجید سن کر میں بے تاب اور بے ہوش ہو گر پھر اس کے بعد کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔

ایک دفعہ شاہ جی علی گڑھ کے کسی جلسہ میں تقریر کرنے تشریف لے گئے۔ کالج کے طلباء نے تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ ایسا ہنگامہ با کیا کہ تقریر کرنا محال ہو گیا۔ شاہ جی نے دیکھا کہ بچے برافروختہ ہیں کوئی اور نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو فرمایا اچھا بیٹا قرآن مجید کا ایک رکوع پڑھ دیتا ہوں اور جلسہ تمہارے احترام میں ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ طلبہ خاموش بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے انتہائی دل سوزی سے نیم خوردہ آواز میں قرآن مجید پڑھنا شروع کیا چشم و گوش اور در و دیوار جھوم گئے۔ تلاوت ختم ہوئی تو فرمایا بیٹا کیا خیال ہے اس کا ترجمہ بھی کر دوں آواز آئی ضرور ترجمہ بھی کر دیجئے۔ اب ترجمہ شروع ہوا۔ پھر ترجمے کے تفسیر و تشریح کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ شاہ جی نے تقریر ختم کی طلبہ نے شور مچایا۔ شاہ جی خدا کے لیے کچھ اور بیان کیجئے۔ فرمایا بیٹا کبھی پھر آؤں گا تو تقریر سناؤں گا۔

گجرات کے مشہور مقدمہ میں جب لدھا رام رپورٹر سی آئی ڈی نے حقیقت حال کا انکشاف عدالت عالیہ میں کیا اور شاہ جی کی رہائی ہو گئی تو لدھا رام سے پوچھا گیا کہ آخر تو نے سرکاری ملازم ہوتے ہوئے یہ جھوٹی شہادت دینے سے گریز کیوں کیا اور سچی شہادت سے اپنے آپ کو خطرے میں کیوں ڈالا۔ تو اس نے بتایا کہ میں نے سرکاری ملازمت میں ہمیشہ سچی جھوٹی شہادتیں دی ہیں۔ اور اس دن بھی شاہ جی کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ ڈائری میں رد و بدل اگرچہ اعلیٰ حکام کے حکم سے کیا تھا۔ لیکن اس میں بہرحال میری بھی رضامندی شامل تھی۔ ہوا یہ کہ میں جب گواہی دینے عدالت میں آیا تو شاہ جی کو دیکھا کہ رشیوں اور منیوں کی شکل و صورت کا ایک سچا انسان کھڑا ہے۔ مجھے کسی مخفی طاقت نے ٹوکا کہ یہ شخص اب میری جھوٹی شہادت پر پھانسی کی سزا پائیگا۔ میرا دل لرز گیا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی۔ اور عہد کر لیا کہ دنیا کی ہر مصیبت برداشت کروں گا لیکن اس عظیم انسان کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کا پاپ نہیں کماؤں گا۔ تب میں نے شاہ جی کے وکیل کو علیحدگی میں سارا ماجرا بیان کیا۔ ساتھ ہی اپنا ارادہ بھی بتایا لدھا رام نے ہائی کورٹ میں شہادت دی اس کی ملازمت گئی تین سال سخت کی سزا ہوئی۔ لیکن شاہ جی کی معجزانہ رہائی کا باعث بن گیا۔

اس مقدمہ میں شاہ جی ۹ ماہ کے قریب جیل میں رہے۔ جب رہا ہو کر آئے۔ تو تقریروں میں اکثر فرمایا کرتے کہ ایک طرف میں بے نوا تھا میرے غریب ساتھی جیلوں میں مقید تھے۔ میری اولاد کمسن اور والد ضعیف العمر تھا۔ دوسری طرف فرنگی کی صولت و حشمت تھی۔ خزانے اس کے، پولیس اس کی، عدالتیں اس کی، جیل خانے اس کے، سب اختیار و اقتدار اُسی کا تھا۔ پھر ترنم سے پڑھتے

روحِ بخت ملاقی ان کا   چرخِ ہفت طبقاتی ان کا

حضرت یوسف علیہ السلام کے زندانی ہونے کا واقعہ دہراتے، زلیخا کی الزام تراشیوں کا تذکرہ کرتے۔ قرآن مجید کی آیت شریفہ — وشھد شاھد من اھلھا پڑھ کر لدھا رام کو انگریزوں کا گھر یلو گواہ قرار دیتے۔ اس مقدمہ سے رہائی کو وہ اللہ کا عظیم احسان کہتے۔ آخر میں فرماتے۔ اے اللہ اس نعمت کے شکرانے میں میں تیری خدمت میں کیا پیش کر دوں۔ کیونکہ جو نعمت سوچتا ہوں وہ سب تیرے خزانوں میں موجود ہے۔ ایک دن تقریر کرتے کرتے جھولی پھیلا دی اور فرمایا میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جو تیرے شکر نعمت کے لیے پیش کرتا ہوں اور وہ میرے گناہ ہیں میرے پاس ان کے سوا کچھ نہیں۔ پھر یہ بیان کچھ اس عجز و انکسار اور رقت انگیز منظر میں ہوا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے سلسلہ میں انکا اخلاص کس درجے کا تھا اس کا اندازہ ان کی ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کی تقریر سے ہوتا ہے۔ جو انہوں نے لاہور (بیرون دہلی دروازہ) میں کی تھی۔ اس دن خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے تقریر کرتے اپنی ٹوپی اتار لی اور فرمایا کوئی ہے جو میری یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین کے پاؤں پر رکھدے اور انہیں میری طرف سے یقین دلا دے۔ کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں۔ اگر وہ محسن کائنات جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس اور عزت کا تحفظ کر دیں تو میں اپنی زندگی ان کا خدمتگار رہوں گا حتیٰ کہ ان کے گلے میں اگر سؤر بھی ہوں گے تو انہیں بھی چرا تا رہوں گا۔ اس سے مجمع میں ایک کہرام مچ گیا۔

وہ حدیث پاک اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کو صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے فضائل میں بیان کر کے سعدی شیرازی (رحمۃ اللہ علیہ) کے مشہور شعر پڑھا کرتے تھے ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے
رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من ناچیز بودم
ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

شاہ جی مختلف اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فضائل کے سلسلہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی صداقت کا دو صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کو بہترین گواہ قرار دیا کرتے تھے۔ پہلے جناب حضرت عمر بن خطاب اور دوسرے حضرت خالد بن ولید (رضی اللہ عنہما) کو۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی اور ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) فرمایا۔ ان کی اس مقدمے میں سرکاری گواہ کی حیثیت تھی۔ وہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پہلے ہی سے دوست تھے۔ لیکن یہ دونوں بہادر دشمن اور سخت دشمن تھے۔ لیکن نبوت کی صداقت یقین کر کے شرف ایمان حاصل کر گئے۔ وہ حدیث رسول کو نبوت کی شمع فرمایا کرتے تھے۔ اور کہتے کہ اب کچھ لوگ اس شمع ہی کو غتر بود کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

شورش کاشمیری

جامع الصفات انسان

(سید عطاء اللہ شاہ بخاری بلاشبہ ایک جامع الصفات انسان تھے۔ قدرت نے انہیں دل و دماغ کی بے شمار خوبیوں سے ا

تھا۔ انسان الفاظ کے استعمال میں عموماً فیاض ہوتا ہے۔ مدح ہو قدح۔ قلم و زبان اکثر بے روک ہو کر چلتے ہیں۔ لیکن شاہ جی کا معاملہ یہ تھا۔ کہ کمالات و محاسن کے جتنے الفاظ بھی فراہم ہو سکتے ہیں۔ انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے پلڑے میں شاہ جی کے حسن و خوبی کا سرمایہ ہو تو یقیناً دوسرا پلڑا ہی جھکے گا۔ شاہ جی ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے یہ سانچہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اور اس عہد کے لوگ بھی رفتہ رفتہ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔

اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ شخصیتیں ہی تہذیبی و معاشی حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں کا مظہر ہوتی ہیں ان کا وجود عوام سے کہیں بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ عوام کی پیروی کے لیے نہیں۔ عوام کی رہنمائی کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور زمانہ سے ماوریٰ نہ ہو کر بھی اس سے مستثنیٰ ضرور ہوتے ہیں۔ شاہ جی فکر و نظر اور جہد و عمل کے ایک خاص عہد کی پیداوار تھے۔ اس عہد نے واقعتہً ہماری قومی صفوں میں بڑے بڑے آدمی پیدا کیے، شاہ جی گویا اس محفل کے آخری چراغ تھے۔ ایک دو نشانیاں اور ہو نگی لیکن وہ بھی مہمانِ نفس یک دو نفس ہیں۔ ؎

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

یہ لوگ جس زمانے میں اپنے بلند آہنگ حوصلوں کے ساتھ سامنے آتے تھے۔ جب تک ہمارے سامنے اس دور کی صحیح تصویر نہ ہو۔ اُس وقت تک ہم اس مٹی کے محاسن کا اندازہ ہی نہیں کر پاتے جس مٹی سے ان لوگوں کے پیکر تیار ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ ماضی اپنی خاص روایتوں کے ساتھ گور کنارے آ چکا تھا۔ اور اس کے روبرو ایک نیا دور اپنی تمام شدتوں کے ساتھ نشوونما پا رہا تھا۔ جہاں تہاں برطانوی سامراج کے خلاف خیالات بڑی تیزی سے کروٹیں لے رہے تھے۔ دماغوں میں بہمہ وجوہ احتجاج موجود تھا پہلی جنگ عظیم کے نتائج نے اس احتجاج کا راستہ صاف کر دیا۔ پورے ملک کی خواہش (آزادی رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ اور تحریک خلافت کے داخلی و خارجی اثرات کے تحت ایک مرکز پر آ گئی۔ اس مرکز نے رہنمائی اور اس کے مظاہر کا ایک نیا قافلہ پیدا کیا۔ شاہ جی اس قافلے کے ممتاز حدی خوانوں میں سر فہرست تھے۔ ادھر غور کرنے سے یہ عجیب و غریب بات کھلتی ہے۔ کہ جو لوگ اس قافلہ میں شریک تھے۔ وہ کسی تنہا خوبی ہی میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ ان کی شخصیت بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ احوال کی رفتار کا یہ عالم تھا۔ کہ زندگی کا ہر گوشہ تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا تھا نہ صرف دنیا نے ایک نیا سانچہ قبول کر لیا تھا۔ بلکہ فکر و نظر کے سبھی دوائر ایک نیا روپ اختیار کر رہے تھے شاہ جی معناً ان علماء و صلحاء کے وارث تھے جنہوں نے اسلام کی اساس پر انگریزوں کی بیخ کنی کا عہد کیا تھا اور دیوبند کا مدرسہ جن کے امتیازی معتقدات کی علامت تھا۔ اس ذہن کی تعمیر میں بہت سے عوامل کا ہاتھ کار فرما رہا۔ اب جو قومی احتجاج کی اجتماعی روح عدم تشدد کے طریق اور عدم تعاون کی تکنیک سے پرچم کشا ہوئی۔ تو عثمانی خلافت کا سکوت اور عرب ملکوں کے حصے بخرے اس ذہن کے لیے مہمیز ثابت ہوئے اسلامیت اور وطنیت کے ملے جلے جذبات نے ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۱۹ء میں آزادی کا ایک ایسا ولولہ پیدا کیا۔ کہ ذہنی طور پر انگریز سارے ملک کے دماغوں اور دلوں سے نکل گیا (رہا) ان لوگوں کے دلوں میں جو انگریزی بساط کے مہروں کی حیثیت رکھتے اور اپنے گرد و پیش انسانوں کی اقلیتی کھیپ کے وفاداری بشرط استواری کے تحت سوداگر تھے۔

انگریزی حکومت کے دبدبے نے ۱۸۵۷ء کے بعد اس برصغیر کو نہ صرف مفتوح کر لیا۔ بلکہ مغلوب لوگوں کے ساتھ

مرعوب دماغوں کا بازار بھی رونق پر تھا۔ مگر تحریک لاتعاون کے برگ و بار نے مسلمانوں کی عنانِ رہنمائی دفعتاً ان لوگوں کے حوالے
جنہیں قدرت نے شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی دے کر پیدا کیا تھا۔ اور جن میں اکثر ماضی مرحوم کے خلوت خانہ تخیل
زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اسی ماضی کا تخیلی پیکر تھے۔ الکا ہر وار ایک بانکے پھکیت کی طرح چوکس
کبھی نہ تھکنے والی روح لے کر آئے تھے۔ آج چونکہ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ اور اس عہد کی ادا شناس پود بھی قریب قریب
ہو چکی یا ہو رہی ہے۔ پھر قلم و زبان کے نئے نئے رستم و اسفند یار پیدا ہو رہے ہیں لہٰذا یہ سمجھنا یا سمجھانا ذرا مشکل ہے کہ ان لوگوں
ملک و قوم کو کیا کچھ عطا کیا؟ صبح ضرور ہوتی ہے اور سورج بھی وقت پر نکلتا ہے۔ لیکن طلوع و غروب کا فاصلہ یونہی طے نہیں
ستارے ابھرتے۔ رات کٹتی۔ پھر پو پھٹتی ہے۔ اس حقیقت کو جاننا اور پہچاننا اشد ضروری ہے۔ کہ قومی آزادی تاریخی اعتبار
فرد واحد کی تنہا فراست اور تنہا ہمت کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ اس کا پودا آناً فاناً بار آور ہوتا ہے۔ یہ حکایت طویل عمل اور ایک
عہد سے مرتب ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قومی خواہشوں اور ملکی ولولوں کا مظہر بسا اوقات ایک ہی وجود ہوتا ہے۔ اور عامۃ الناس
اس کے قدموں کے ساتھ اٹھنے لگتے ہیں۔ لیکن اصلاً حریت و استقلال کا یہ قصر بے شمار لوگوں کی جگر کاوی، سرفروشی اور فراست
سے اٹھتا اور بنتا ہے۔

مثلاً بھوک ہے اس کے تقاضا پر انسان روٹی کھاتا ہے۔ لیکن بھوک پہلے لقمہ سے نہیں مٹتی۔ بلکہ یکے بعد دیگرے بہت
کھانا پڑتے ہیں آخر میں ایک لقمہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھوک نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ یہ آخری لقمہ ہی بھوک کا مداوا نہیں
لقمے سے لیکر آخری لقمہ تک جتنے لقمے بھی پیٹ میں جاتے ہیں ان کی اجتماعی طاقت سے پیٹ بھرتا ہے۔ یہی مثال آزادی
کہ یہ عمارت سنگ و خشت کی نہیں ہوتی۔ لیکن سنگ و خشت سے بنی ہوئی عمارتوں ہی کے اصول اس پر عائد ہوتے ہیں بنیادیں
دیواریں اٹھانے، اینٹیں لگاتے، گارا بنانے اور رنگ و روغن کرنے کے بیسیوں مرحلے پیش آتے ہیں تب ایک عمارت کھڑی ہوتی

شاہ جی بیالیس سال قبل جس ہراول دستے کے ساتھ نکلے تھے وہ لازماً قومی آزادی اور قومی استقلال کی جدوجہد کا مقدمۃ
تھا۔ ان کے سامنے صرف آخری مرحلہ ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ ابتدائی مرحلے میں تھے اور اس مرحلے کو پیدا کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔
بنجر زمینوں میں ہل جوتنا۔ انہیں ہموار کیا پھر بیج بویا، کھیت سینچا۔ موافق موسم کی نگہداشت کی۔ مخالف موسم کے تاڑ سے فضا
اب کیا ضروری تھا۔ کہ بجائی کرانے والے ہی کٹائی کے وقت موجود ہوتے قافلہ چلتا اور بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ منزل سامنے آگئی اور آزاد
گئے اب نصف صدی پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ان بنجر زمینوں کو سیراب کرنے کی مشکلات کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

غرض پاکستان اور ہندوستان کا کوئی گوشہ ہو گا۔ جہاں شاہ جی کی آواز نہ گونجی ہو اور ان کی آواز کا علم نہ لہرایا ہو۔ بر صغیر کے
عظیم رہنما کا قول ہے کہ یہاں کا چپہ چپہ شاہ جی کے جہد آشنا قدموں کا شکر گزار ہے۔ مگر مغربی پاکستان چونکہ ان کا مسکن اور ان کے
کا مولد رہا۔ اس لیے مرحوم دلّی سے لے کر مرحوم پنجاب کے دور افتادہ علاقوں ہی کو انہوں نے اپنی نوا پیرائیوں کے لیے منـ
کیا۔ اور یہیں اکثر و بیشتر انگریزی حکومت کے مختلف الاصل قلعوں کو مسمار کرتے رہے پنجاب اور اس طرف کے علاقے
عسکری ضرورت کے تحت برطانوی سامراج کا بازوئے شمشیر زن تھے۔ انگریزوں نے ان علاقوں میں مختلف مفادات کے تحت
کر کے یہاں کبھی سیاسی شعور اور قومی آزادی کے ولولوں کو بڑھنے یا پنپنے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم اس علاقے کی

سیاسی معاشی اور معاشرتی صورت حال سے واقف نہ ہوں اس وقت تک ہم ان محرکات کو جاننے سے قاصر رہیں گے۔ جن کا منطقی نتیجہ ہماری قومی آزادی کا وجود ہے۔ یا جس معنوی طاقت کی اساس پر یہ ساری عمارت کھڑی ہے۔

حالت یہ تھی کہ آنجہانی ہندوستان میں مرحوم پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ تھا جہاں انگریزی مفادات کی بوقلمونیاں مضبوط بنیادوں پر قائم تھیں اور انگریز کسی حالت میں بھی یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اس صوبے کے لوگوں میں حریت خواہی کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے لیے اس نے پنجاب کے تین فرقوں یا قوموں (ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں) کو مفادات کے خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ہندوستان کا مسئلہ اگر... ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ تھا تو پنجاب میں یہ مسئلہ سکھوں کی موجودگی کے باعث سہ رخا تھا اور تینوں کے معاشی و معاشرتی مفادات کچھ اس طرح بٹ گئے تھے۔ کہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا ہی ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔ پھر چونکہ ہندوستان کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی اس لیے ان کا ذہن ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور بعد کے اثرات سے منتقمانہ ہو چکا تھا۔ علماء کے خلاف... جنگ امبیلا (۱۸۶۳ء) کے بعد خان عزن خان کی مخبری پر جو پانچ مقدمہ ہائے سازش انبالہ (۱۸۶۴ء) پٹنہ (۱۸۶۵ء) راج محل (۱۸۷۰ء) مالوہ (۱۸۷۰ء) اور پٹنہ (۱۸۷۱ء) قائم کئے گئے۔ ان کے عمیق مطالعہ سے انگریز نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے معاملہ میں خوفزدہ ہو چکے تھے۔ بلکہ وہ انہیں مختلف واسطوں سے زیر کرنے کی فکر میں تھے۔

اس ضمن میں تاریخ کا یہ افسوسناک پہلو ہے۔ کہ مرحوم پنجاب نہ صرف ان کا سب سے بڑا معاون ہو گیا۔ بلکہ بہت سے راستے ان کے حق میں ہموار ہوتے چلے گئے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال تھا۔ کہ ان کا سواد اعظم ان مٹھی بھر مسلمانوں کے قبضہ قدرت میں تھا۔ جو برطانوی امپریلزم کے شعوری یا غیر شعوری طور پر فرستادہ تھے۔ حتیٰ کہ برطانوی شاطروں نے خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مذہب کی ان بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے جن بنیادوں پر برطانوی ملوکیت کے خلاف جدوجہد کا قلعہ ایستادہ تھا ایک بڑا ہی دردناک سانحہ ہے کہ علمائے حق کے خلاف یہیں سے فتوے جاری ہوئے۔ جہاد کی تنسیخ کا الہام بھی یہیں تصنیف کیا گیا۔ دنیائے اسلام کے خلاف تعویذوں کا انبار بھی یہیں تیار ہوتا رہا اور خلافت عثمانیہ کی شکست پر اس صوبے ہی کے خانہ زادوں نے چراغاں کیا۔

اب غور کیجئے جو صوبہ برطانوی ملوکیت کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہو جہاں سے لوگ تین قومی دائروں میں مختلف و متضاد سیاسی مفاد رکھتے ہوں اور وہ مفاد ان کے لیے موت و حیات کا مسئلہ ہو حتیٰ کہ قومی بیداری یا ملی استقلال کے راستے میں سب سے بڑی روک خود مسلمانوں کی معاشی اور دینی گدیوں کا وجود ہو اور پست ہمتی کے پہلو بہ پہلو دینی گمراہیاں ان کے خون میں سرایت کر چکی ہوں اس فضا میں شاہ جی کا نعرہ جہاد بلاشبہ قدرت کے انعامات میں سے تھا۔ اور ان کا وجود آیت من آیات اللہ۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ محل نہیں لیکن اس تاریک دور میں مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" "ستارۂ صبح" اور دو چار برس کے فاصلے سے سید عطاءاللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت اور ایک خاص موڑ پر ان کے ہمنواؤں کی جماعت ایسی بے مثال طاقت اور گراں بہا سرمایہ ہیں کہ تاریخ ان کا اعتراف کئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔

ادھر یہ بات بڑے زور سے کہی گئی ہے۔ کہ شاہ جی اردو کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کے بیان میں جادو اور ان کی زبان میں سحر تھا۔ ان کے حرف حرف پر لوگ سر دھنتے اور موتی چنتے تھے۔ ان کے خدا۔ رسول اور اسلام سے عشق کی حکائتیں بھی زبان زد عام

ہیں اور الگ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ مگر ان کی خطابت نے جن بتوں کو توڑا۔ اور ان کی فراست نے جن نوجوں کو پسپا کیا ان کا ذکر پس منظر میں چلا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری اہم چیزیں پس منظر کی تھی ان کا سب سے بڑا کمال ہی یہ تھا کہ انہوں نے ملک کے جمود کو توڑا۔ اور قوم کی سیاست میں مردانگی کا جوہر پیدا کیا فی الجملہ ان کا وجود مغتنمات میں سے تھا۔ اس پورے ملک میں وہ اپنی ہمہ گیر خوبیوں کے باعث ایک ادارہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ قیادت و سیادت اور خطابت و سیاست کی ایک انجمن تھے۔ مغربی پاکستان میں شاید ہی کوئی شخص ان خصائص کے اعتبار سے ان کا ہمسر ہو۔ انہوں نے ۵۰ رسال کا عرصہ صلہ و اجر کی ہر خفی و جلی خواہش کے بغیر بسر کیا یہ شرف انھیں کو حاصل رہا۔ کہ:۔

(۱) اس برصغیر میں ان کی آواز کا جادو تسخیر کرتا رہا اور خلاف سامراج ذہن نے ان کے آتش کدے سے نشوونما کی حرارت پائی۔

(۲) مسلمان نوجوانوں میں برطانوی ملوکیت سے وابستہ رہنے کا جذبہ ایک عرصہ سے راہ پا رہا تھا۔ انہوں نے اس جذبے کو بیخ و بن سے اکھاڑا۔ جن نوجوانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا وہ زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ تھے۔ جن سے عوامی تحریکوں میں لیڈر شپ پیدا ہوتی ہے۔

(۳) غریبوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو امراء کے استحصالات سے برافروختہ ہو کر نہ صرف طبقاتی شعور کی راہ پر آگئی۔ بلکہ بازار سیاست کے معرکہ ہائے خرید و فروخت سے بلند و بالا ہو کر کام کرتی چلی گئی۔

(۴) عوام کے دلوں میں نہ صرف استحصالی گروہ کے خوف کو دور کیا بلکہ ان کے جوہر خودی کو یہاں تک پروان چڑھایا کہ قربانی و ایثار کا تاریک راستہ روشن ہو گیا۔

(۵) مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا۔ جس کا عام حالات میں قحط تھا اس کھیپ ہی سے اعلیٰ پایہ کے وہ مقرر پیدا ہوئے جنہوں نے انقلابی ذہن کی نقش آرائی میں قابل قدر حصہ لیا۔

(۶) مسلمانوں میں جن سیاسی و دینی بدعات کو بالالتزام راسخ کیا جا رہا تھا ان کا سانچہ توڑ ڈالا اور بعض معاشرتی خرابیوں کا سدِّ باب کیا۔

(۷) خطابت میں نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ قیادت کے کاسہ لیس ذہن کو ختم کیا۔ سیاست کو امراء کی جیبی گھڑی یا ہاتھ کی چھڑی بننے سے روک دیا اور اس کا ایک عوامی مزاج بنا ڈالا اگر تحقیق کی جائے تو یہ بات بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ نشوونما کے اعتبار سے اردو کا دامن ان کی خود گفتاری کا منّت پذیر ہے۔

یہ حقائق اتنے واضح ہیں کہ نصف صدی کے سیاسی شب و روز کا وقائع نگار خود شاہ جی کے سوانح و افکار میں سے تاریخ کی بعض گمشدہ کڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس فرض سے کون عہدہ برآ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کی اولاد

حضرت امیر شریعت کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔

مولانا حافظ سید عطاء المنعم شاہ بخاری | یہ آپ کے والدین کا رکھا ہوا نام ہے۔ لیکن عام طور پر سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری قلمی نام استعمال کرتے ہیں۔ متبحر عالم۔ ادیب صحافی اور شاعر ہیں۔ اکثر عادات و خصائل میں اپنے والدِ بزرگوار کی تصویر ہیں۔ اگر تقسیم ملک کے قبل کے دور میں ہوتے تو بہت بڑے لیڈر ہوتے کیونکہ ان دنوں سیاست "سیاہ ست" نہیں تھی۔ ایک ایسے دور میں اپنی زندگی کے دن گذار رہے ہیں کہ جس میں نفاق و نعرہ بازی کا بازار تو گرم ہے لیکن خلوص و ایثار کی کمی ہے اور اگر کوئی اس متاع کو لے کر بازار میں نکلتا ہے تو اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ شاید میرے سکے کھوٹے ہیں۔ جن کی کوئی قیمت نہیں۔

جلسوں میں چار چار پانچ پانچ گھنٹے علمی اور دقیق مضامین پر بلا تکان تقریر کر لیتے ہیں۔ شاہ صاحب کی طرح جس مجلس میں ہوں میر مجلس ہوتے ہیں۔ اور مجلس کو باغ و بہار بنائے رکھتے ہیں اگر اکابر علماء و مشائخ کی مجلس ہو تو پھر خاموش مودب بیٹھے رہتے ہیں۔ اعلیٰ علمی ذوق پایا ہے لیکن افسوس کہ زمانے کی سرد مہری اور ناہمواری کی بناء پر اس سے استفادے کی کوئی شکل نہیں۔ اب کچھ عرصہ سے مکتبہ احرار اسلام ملتان کی طرف سے مفید تاریخی اور علمی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اگر اسی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے رہے تو تھوڑے عرصے میں تحریک آزادی خصوصاً مجلس احرار اسلام اور شاہ جی کے متعلق بہت سا مواد موجودہ اور آئندہ نسل کے لیے محفوظ کر دیں گے۔ مجلس احرار اسلام کی نظامت آجکل انہی کے پاس ہے۔ حافظ سید عطاء المحسن شاہ بخاری | حافظ و عالم ہیں۔ ذہین و فطین اور بے باک و جری نوجوان ہیں۔ ہر جگہ لگی لپٹی رکھے بغیر جو دل میں ہوتا ہے زبان پر لاتے ہیں۔ سرو قد اور بالا و بلند نوجوان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی جوانی کو ملک و ملت کے لیے نفع بخش بنائے۔ آجکل "بخاری اکادمی" کے نام سے ملتان میں کتابوں کا کام کر رہے ہیں۔

حافظ سید عطاء المومن شاہ بخاری | شاہ جی کے تیسرے فرزند ہیں۔ دوسرے بھائیوں کی طرح خوش شکل نوجوان ہیں۔ جرأت و بے باکی اس گھر کی میراث ہے اس سے مالا مال ہیں آجکل ملتان کے ایک ہفت روزہ اخبار "تحریک" کی ادارت کر رہے ہیں جس میں علمی دینی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

حافظ قاری سید عطاء المہیمن شاہ بخاری | سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ اگرچہ سب سے چھوٹے ہیں۔ لیکن اس خوردگی کے باوجود سلوک و تصوف کی طرف مائل ہیں۔ تجوید و قرأت میں خاص مشق بہم پہنچائی ہے۔ ان کے متعلق بھی یہ کہا جائے کہ جری ہیں تو یہ تحصیل حاصل ہے۔

صاحبزادی صاحبہ کا نکاح سید وکیل احمد شاہ صاحب ایم۔ اے کے ساتھ ہوا جو میونسپل کالج اوکاڑہ میں لیکچرار ہیں پابند صوم و صلوٰۃ اور متشرع و متورع شخصیت ہیں

شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ بفضلہ تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ عابدہ، زاہدہ، رابعۂ وقت ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی اولاد کو تمام عمر بیں دینی تعلیم دلائی۔ سکول کا راستہ نہیں دکھایا۔ اور بیٹوں سے اکثر کہا کرتے کہ جو کچھ مجھ سے پوچھنا ہو بے تکلف پوچھا کرو۔ میں تمہارا [illegible] محبوب بھی سمجھو۔ تم میرے بیٹے بھی ہو اور محبوب بھی۔ باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے محبت کرے تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔

امیرِ شریعت، قلندر، فقیر، — اخوت کا پیکر، لگن کا ضمیر
خطابت کی اقلیم کا شہریار — ندیمِ محبت، نقیبِ بہار
سخن جس طرح آبِ کوثر کی دھار — چلن جس طرح لہجۂ آبشار
طبیعت میں موجِ صبا کا خرام — ارادوں میں خیریتِ صبح و شام
مشیّت کی مشاطگی کا جمال! — ہمہ کیف و برکت، ہمہ کیف و حال
ہدایاتِ سادہ کا دلکش نصاب — علومِ درخشاں کا بہتا چناب
تبسم سے تحجیر کرتا ہوا! — نگاہوں سے تسخیر کرتا ہوا
حقیقی مربی حقیقی رفیق — ملے گا کہاں ایسا مردِ خلیق
ادا کر کے قرض اپنی خدمات کا — سحر دم، وہ جاگا ہوا رات کا
ابد کے نگر کو روانہ ہوا
مکمل سفر کا فسانہ ہوا

بزمِ جہاں میں سب ہیں لیکن نہیں بخاری
عالم کو کر گیا ہے اندوہ گیں بخاری

پیدا نہ ہوگا کوئی ایسا خطیبِ دانش
ایوانِ خلد میں ہے محفل نشیں بخاری
۸۱ ھ ۱۳

(۱) علامہ عطاء اللہ شاہ بخاری — ۸۱ ھ ۱۳
(۲) شمعِ محفل بخاری — ۸۱ ھ ۱۳
(۳) امیرِ شریعت والا نسب — ۸۱ ھ ۱۳
(۴) بخاری قومی امیرِ شر[یعت] — ۸۱ ھ ۱۳

کبھی پستیوں میں چمکا تو فرازِ آسماں سے — کبھی رفعتوں سے الجھا تو نشیبِ کارواں سے
جو مٹے گا دینِ حق پر وہی رہ سکے گا زندہ — یہ سبق ملا ہے مجھ کو تری مرگِ ناگہاں سے
تھکے ہارے قافلے نے تجھے خضرِ وقت جانا — تو چلا ہمیشہ ہٹ کر رہ و رسمِ کارواں سے
گلِ سرمدی بکھیرے تیرے خامہ و زباں نے — تو خراج لے رہا ہے ابھی خامہ و زباں سے
یہ خلوص یہ عقیدت یہ حضورؐ سے محبت — تجھے نسبتِ خصوصی تھی نبیؐ کے آستاں سے
تیری آہِ صبح گاہی، تیرا نالۂ شبانہ — یہی یاد رہ گیا ہے شبِ غم کی داستاں سے
تیرا ذوقِ حق پسندی تجھے لے گیا رسن تک — بنے خار بھی گلستاں تیرے شوقِ بیکراں سے
تیری بے غرض قیادت تیرا علم اور خطابت — تیری داستاں کو چھیڑیں مگر کہاں کہاں سے

ایک چست فقرہ کس کے بخاری نے کس دیا — ڈھیلا پن آ گیا جو مسلماں کی چول میں
حریتِ ضمیر کا ڈنکا بجا دیا — ہندوستاں کے عرض میں اور اس کے طول میں
ارکانِ دین ہیں بستۂ آزادیٔ وطن — یہ سب فروع آ گئے اک اس اصول میں
کہہ دو یہ اس سے تم کو "خودی" کا جو درس دے — رکھا ہی کیا ہے تیری فعولن فعول میں
کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

مولانا ظفر علی خاںؒ
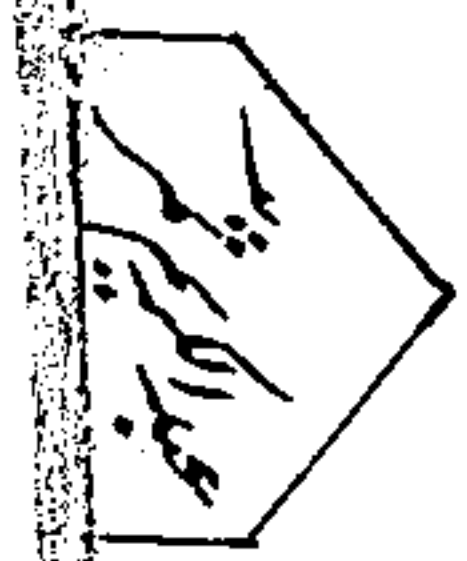
مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۱۸ھ
۱۹۰۱ء

۱۳۸۲ھ
۱۹۶۲ء

عکس تحریر

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے ایک مکتوب کا عکس ملاحظہ فرمایئے۔

یہ مکتوب حضرت مولانا نے ۵ / دسمبر ۱۹۴۰ء کو بحالت اسیری، راولپنڈی جیل سے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب (موجودہ جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند) کے نام ارسال فرمایا تھا۔ اسوقت کی قانونی پابندیوں اور حکومت کے تعاقب اور سخت گیری کے باعث اس مکتوب میں حضرت مولاناؒ نے اپنا مقصد کچھ اشاروں میں ظاہر فرمایا ہے۔ "الہ آباد کی کل ہند کمپنی" سے مراد آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہے جس کا صدر دفتر اس زمانہ میں الہ آباد میں تھا۔ "ایجنٹ" سے مراد ممبر اور "ڈیوٹی" کا اشارہ گرفتاری کی طرف ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اُن دنوں کسی اعلان کے ذریعہ اپنے تمام ممبران کی خواہ وہ اس وقت جیل میں ہوں یا پہلے سزا یاب ہو چکے ہوں۔ فہرست اور حالات زندگی طلب کئے تھے۔ حضرت مولانا بھی اے آئی سی سی کے ایک سرگرم رکن تھے۔

۷۸۶

از راولپنڈی جیل

معظم و محترم مولانا محمد میاں صاحب زاد فضلکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی

امید کہ آپ مع متعلقین بخیر ہونگے، اور سب بزرگ احباب بھی [illegible]

اس وقت یہ عریضہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ الہ آباد کی "کل ہند کمپنی" نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو ایجنٹ کمپنی کے اس وقت سے ڈیوٹی پر لگے ہیں اُن کی بھی فہرست اور جو اس سے پہلے ڈیوٹی دے چکے ہیں اُن کی بھی فہرست مع حالات زندگی صدر دفتر میں بھیجی جائے، میں چونکہ آپ کے ضلع میں کمپنی کا ایجنٹ ہوں لہذا آپ براہ کرم بحیثیت انچارج مراد آباد میرے متعلق یہ [illegible] اطلاع کر دیں، اگرچہ شخصی تعارف کے اعتبار سے اس کی مطلق ضرورت نہیں لیکن ضابطہ کے لحاظ سے آپ کے ضلع کے ایجنٹوں کی فہرست میں نام شمار ہونا چاہئے۔

امید کہ ہر صورت سے خیریت [illegible] کرتے رہیں گے [illegible] سب کو سلام مسنون۔ [illegible]

۵ / دسمبر ۴۰ء محمد حفظ الرحمٰن [illegible]

مکرم و معظم محترم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب [illegible]

مراد آباد شاہی مسجد (یوپی)

مضمون : مولانا سید محمد میاں
تلخیص : عبدالرشید ارشد

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

تاریخ میں بہت کم لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جن کی وفات بلاتمیز مذہب وملت ہر ایک کے لیے سوگواری اور صدمے کا باعث ہوئی ہو۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا شمار تاریخ کے ایسے ہی معدودے چند افراد میں ہے اور ایسا بھی اتفاق کم ہوا ہے کہ ایک انسان بیک وقت بے مثال خطیب ـــ بے لوث ومخلص رہنما ـــ بلند پایہ مصنف ـــ عظیم فلاسفر وسکالر، نڈر مجاہد اور اونچے درجہ کا منتظم ہو اور اس کے ساتھ ساتھ خدا ترس، متقی اور پرہیزگار اتنا ہو کہ اس کے دامن پر کوئی بدنمائی کا داغ نہ ہو۔ اپنی زندگی کا راحت وسکون، عیش وآرام قوم وملک پر تج دیا ہو۔

مندرجہ بالاصفات وخصوصیات کے انسانوں کو اگر شمار کیا جائے تو ان کی پہلی صف میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کا اسم گرامی ہوگا۔ مولانا مرحوم نے جس شدید بے چین روح کے ساتھ ملک وملت کی خدمت کی اس کی مثال مشکل ہی سے کہیں مل سکتی ہے بے تکلف وسادہ وضع کے اس پیکر خاکی میں جس کا نام حفظ الرحمٰن تھا، مسلمانوں کو سربلند کرنے اور دیکھنے کی اس قدر تڑپ تھی جس نے ان کو ہر وقت متحرک و فعال رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمانوں کا سہارا اور ان کا دماغ تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھارت میں مظلوم وبے کس ہر دکھی اور زخمی انسان کے لیے ہر وقت امداد کرنے کے لیے مستعد رہتے تھے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ ۱۹۴۷ء میں فسادات کے دوران جس بے جگری وہمت بے باکی وجرأت کے ساتھ کام کیا ہے۔ دلّی کے کوچہ و بازار اس کے شاہد ہیں۔ اس کے بعد پبلک سٹیج پر۔ پارلیمنٹ کے ایوان میں۔ صوبوں کے وزراء اعلیٰ کے سامنے پولیس کے اعلیٰ حکام کے روبرو انھوں نے جس بے خوفی کے ساتھ مسلمانوں کی نمائندگی کر کے بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا خوف وہراس دور کیا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جو ان کو تاریخ اسلام کے بہادر اور اولوالعزم قائدین کے ساتھ ملا دیتا ہے پاکستان کے بہت کم مسلمان مولانا حفظ الرحمٰن سے واقف ہیں اور جو واقف ہیں انہیں بھی ان کے کارناموں کا بہت کم علم ہے۔ ہم نے جب اکابر کے سوانح لکھنے کا قصد کیا اور سوچا کہ کن کن بزرگوں کے سوانح ہونے چاہئیں تو مولانا حفظ الرحمٰن کا نام نامی ہر فہرست میں میرے ذہن میں موجود رہا۔ (نوٹ: حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم عمومی جمعیتہ علماء ہند نے الجمعیتہ کے "مجاہد ملت نمبر" کے لیے مولانا پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا ہم نے اسی مضمون کی تلخیص کی ہے۔

بچپن طالب علمی

آپ ۱۳۱۸ھ میں سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے اور آپ کا نام معزالدین رکھا گیا اور مستقبل نے ثابت کر دیا کہ آپ واقعی اسم بامسمیٰ تھے۔ اللہ تبارک وتعالےٰ نے آپ سے دین حق کی سربلندی و خدمت کا کام لیا۔ "حفظ الرحمٰن" آپ کا تاریخی نام ہے جبکہ اس کو حفظ الرحمان یعنی رحمان کے الف کے ساتھ لکھا جائے۔ آپ کے والد ...بد مولوی شمس الدین صدیقی اپنے قصبہ کے معزز و متدین اور عالم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بھوپال اور ریاست بیکانیر میں اسسٹنٹ انجنیئر ...عہدہ پہ مامور رہے اور مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے دو بھائی، بہنوئی اور بھتیجے سب علی گڑھ یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور یہ سعادت مولانا کے حصے میں ...ی کہ انھوں نے شروع سے آخر تک تمام تعلیم عربی مدارس میں پائی لیکن اس کے باوجود وہ علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی اور دیگر اکثر جدید و قدیم ...ی اداروں کے رکن و سرپرست رہے اور ان کی علمی و فکری قابلیت و صلاحیت کے سامنے جدید درسگاہوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہمیشہ ...سرنگوں رہے آپ کی والدہ ماجدہ (جو بڑی عابدہ زاہدہ پابند صوم وصلوٰۃ خاتون تھیں) کی درخواست پر آپ کے والد ماجد نے آپ کو سیوہارہ ...کے عربی مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ اس مدرسہ کا نام فیضِ عام تھا آپ نے کچھ کتابیں مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد سے بھی پڑھیں، لیکن درسِ نظامی کی ...اکثر کتب کی تکمیل سیوہارہ کے فیض عام مدرسہ ہی میں کی سیوہارہ میں آپ کے مخصوص اساتذہ حضرت مولانا سید عبدالغفور سیوہاروی تلمیذ رشید حضرت مولانا سید احمد حسن امروہویؒ اور الحاج حافظ مولانا احمد حسن صاحب چشتی نیز مولانا سید آفتاب علی صاحب شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی یہ تمام حضرات اخلاق فاضلہ سے متصف اور اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا بچپن ہی میں اپنے خوش خصال اساتذہ کی وجہ سے نیکی پسند بن گئے خداوند کریم نے آپ کو وافر ذہانت و ذکاوت سے نوازا تھا۔ لہٰذا آپ ہمیشہ اپنی جماعت میں ممتاز رہے اور اپنے دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں اپنی اس ذہانت و ذکاوت کی بدولت مشہور ہو گئے۔ آپ بچپن ہی سے مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ نیز ہفتہ وار مجالس میں طے شدہ عنوان پر مدلل تقریر کرتے۔

سیوہارہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ایشیا کی مشہور علمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ جہاں آپ کو علامہ انور شاہ محدث کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور میاں اصغر حسین صاحب جیسے نادرۂ روزگار اساتذہ و شیوخ سے استفادہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور دارالعلوم دیوبند کی اس تعلیم و تربیت نے آپ کی قابلیت میں چار چاند لگا دیے۔

آپ سیوہارہ ہی میں تھے کہ سیوہارہ سے پانچ میل دور کانٹھ کے مقام پر ایک ایکسپریس گاڑی کو شدید حادثہ پیش آیا۔ بیسیوں آدمی لقمۂ اجل بن گئے اور سینکڑوں افراد زخمی و مجروح ہوئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی۔ بےتابانہ و مضطربانہ جائے حادثہ پر پہنچے۔ اور جلتی ہوئی آگ سے بیسیوں آدمیوں کو نکالا۔ اگرچہ خود اس آگ میں جھلسے گئے۔ لیکن ایک دن رات بغیر کچھ کھائے پیئے زخمیوں کی دیکھ بھال۔ تیمارداری اور تجہیز و تکفین کا اہتمام و انتظام کرتے رہے۔ خدمت خلق کا جذبہ مولانا کی فطرت میں ودیعت ہوا تھا۔ سیوہارہ ہی میں ایک جذامی (کوڑھی) کی وفات ہوگئی سارے قصبہ میں اس کو کوئی غسل دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ مولانا نے اپنی کم عمری میں اس کو غسل دیا اور کفن دفن کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کیا۔

سیاسی سرگرمیوں کا آغاز

۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کی تاریخ کا اہم سال ہے۔ اس سال کانگریس نے ستیہ گرہ کا آغاز کیا اسی سال جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں لایا گیا اور اسی سال جلیانوالہ باغ کا و... خونیں حادثہ پیش آیا جس میں سینکڑوں بے خطا افراد کو فرنگی استعمار نے گولیوں کا نشانہ بنایا۔ امرتسر میں ان دنوں تحریک خلافت کا زو...

تھا اگر اس سال کو ہندوستان کی تحریک آزادی کی صبح آزادی کہا جائے تو بجا ہوگا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس دور میں اپنے قصبہ سے تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ ملکی حالات کا تقاضا دیکھا تو بلا تامل سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں آپ کی گرفتاری ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

دارالعلوم دیوبند کی شہرت اور وہاں کے اساتذہ وشیوخ کی کشش آپ کو دیر سے کھینچ رہی تھی۔ لیکن ملکی حالات نے آپ کو سیاست میں لا کھڑا کیا تاہم ۱۹۲۲ء میں خلافت کا بحرانی دور ختم ہوا۔ آپ کی رہائی پوری ہوئی اور آپ علوم وفنون کی تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے اور وہاں پہنچتے ہی اپنا مقام پیدا کر لیا حضرت مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (صاحبزادہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن مفتی اعظم دارالعلوم) ان دنوں حضرت علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ کے مخصوص تلامذہ اور مقربین سے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن بھی چند ہی دنوں میں حضرت علامہ کے مقرب، معتمد اور مخصوص تلامذہ میں شمار ہونے لگے۔ اس کے علاوہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن، حضرت مولانا میاں اصغر حسینؒ جیسے عارف باللہ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے فاضل ان کی صحبتوں نے مولانا کی قابلیت وصلاحیت اور نیکی پسند طبیعت میں چار چاند لگا دیے۔ آپ میں قدرتی اور فطری صلاحیتوں کا اندازہ کر کے حضرت علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ کے مشورہ سے آپ دارالعلوم میں معین المدرسین کے طور پر کام کرنے لگے اور ساتھ ساتھ اعلیٰ فنون کی کتابیں اور دوبارہ بخاری کی سماعت کرتے رہے۔ دورہ حدیث تو آپ نے پہلے سال ہی کر لیا تھا، لیکن بخاری شریف کی سماعت دوبارہ دوبارہ کی مولانا سعید احمد اکبرآبادی (آپ کے خالہ زاد بھائی) حال صدر شعبہ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی ان دنوں دارالعلوم میں دورہ حدیث کر رہے تھے۔ آپ ان کے لیے بخاری شریف کی تقریر تحریر کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب حضرت مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنیؒ۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی یہ طالب علمانہ دوستی تاحیات قائم رہی موت ہی نے اس کا علاقہ ختم کیا۔

مصنف معلم اور مبلغ

مدراس سے ایک فرمائش پر حضرت علامہ کشمیری نے آپ کو وہاں بھیج دیا اور آپ پیرامیٹ میں کم وبیش سال بھر تدریس وتبلیغ میں مصروف رہے اور یہیں سے آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا چنانچہ آپ نے اس مختصر قیام میں دو مختصر رسالے "حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان" اور "مالا بار میں اسلام" تحریر کیے۔ آپ نے وہاں بچت کر کے اتنی رقم اکٹھی کر لی کہ جس سے حج کر سکیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں آپ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حج وزیارت سے بہرہ ور ہوئے

دارالعلوم دیوبند میں ایک تحریک اصلاح اٹھی جس کی بنا پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید محمد بدر عالم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ڈابھیل (علاقہ بمبئی) میں تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ اسلامیہ میں سب حضرات کام کرنے لگے۔ مولانا حفظ الرحمٰن بھی اپنے ساتھیوں اور مشفق ومربی استاد کے ساتھ ڈابھیل میں آ رہے۔

دوبارہ سیاست میں

ڈابھیل کے قیام کے دوران آپ ہفتہ میں ایک دو دن گرد ونواح کے قصبات میں وعظ وتقریر اور تبلیغ کی خاطر جاتے اور ہر جگہ اپنی مؤثر خطابت سے سامعین کو کتاب وسنت پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے جس کا خاطر خواہ اثر ہوتا آپ کی فکری، عملی اور نظری صلاحیتیں شباب پر پہنچ چکی تھی اور قدرت آپ کو اس مقام کی طرف لے جا رہی تھی۔ جو ازل سے آپ کے لیے مقدر کر دیا گیا تھا یعنی خارزار سیاست میں اور ملک وملت میں آپ کی خدمت اور تحریک آزادی کی سپہ سالاری۔

ان دنوں گاندھی نے ڈانڈی مارچ کی تحریک شروع کی اور نمک پر محصول کے بائیکاٹ کا پروگرام پیش کیا۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو

معلوم ہوا چنانچہ وہ مولانا حفظ الرحمٰن کو لے کر دھراسنہ پہنچے جہاں گاندھی کا قیام تھا۔ گاندھی سے مل کر اپنا تعاون پیش کیا اور گاندھی جی اس سے بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی ایسی ہدایت ہے کہ نمک پانی اور گھاس رفاہ عام کی چیزیں ہیں اس لیے اسلام میں بھی ان کو سرکاری محصول سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ مولانا مرحوم اور مفتی صاحب نے اس کی تصویب کی اور ساتھ ہی حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک معہ ترجمہ لکھ کر گاندھی کو دی جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ان ہی دنوں باردولی میں سردار پٹیل نے کانگریس کے کارکنوں کا ایک بہت بڑا اجتماع کیا تھا جہاں یہ طے کیا گیا کہ عدم ادائیگی ٹیکس کی صورت میں پبلک کی جو جائیداد حکومت نیلام کرے اس پر کوئی آدمی بولی نہ دے۔ اس پر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے اسلامی نقطہ نظر سے اپنا مشہور فتویٰ صادر کیا جس میں ضبط شدہ جائیدادوں کو نیلام میں خریدنے کی شرعی ممانعت کا حکم تھا، کیونکہ برٹش حکومت کی طرف سے جائیدادوں کی ضبطی ایک صریح ظلم تھا۔ مفتی صاحب کا یہ فتویٰ سورت کے مشہور "مسلم گجرات پریس" میں چھپا جس کی بنا پر پریس ضبط کر لیا گیا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن پہلے گرفتار ہو چکے تھے مفتی صاحب کے بھی وارنٹ جاری ہوئے مگر اس اثنا میں "گاندھی ارون پیکٹ" ہو چکا تھا۔ بنابریں مفتی صاحب گرفتار نہ ہوئے اور جو گرفتار ہو چکے تھے وہ بھی رہا کر دیے گئے۔ ان دونوں بزرگوں کی سیاسی سرگرمیوں سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے منتظمین پریشان تھے۔ مفتی صاحب مستعفی ہو کر وطن آ گئے۔ مولانا بھی جیل سے رہا ہو کر ڈابھیل واپس نہ گئے۔

۱۹۳۳ء میں انجمن تبلیغ الاسلام کی دعوت پر جس کے سرپرست مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ آپ کلکتہ تشریف لے گئے۔ مفتی صاحب بھی ان دنوں وہیں تھے۔ یہاں روزانہ صبح کو دفتر تبلیغ سراج بلڈنگ اور عشاء کے بعد مسجد جمال میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ کلکتہ کی وسیع و عریض آبادی میں ان دونوں بزرگوں نے بہت جلد اپنا سکہ منوالیا۔ اور دل نشین انداز میں قرآن کے مطالب و معارف کو لوگوں تک پہنچایا۔ ان دنوں مولانا حفظ الرحمٰن کو مولانا آزاد کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا اور ان کی اس رفاقت و صحبت نے مولانا حفظ الرحمٰن کے سیاسی ذوق و لگن کو آتشہ کر دیا۔ ان دنوں کلکتہ میں ایک بڑی سیاسی شخصیت سبھاس چندر بوس تھے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔

ندوۃ المصنفین کی بنیاد

مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن اگرچہ اپنے وطن سے بہت دور تھے لیکن اسلام کی تاریخ اگر پڑھا جائے تو اس سے معلوم ہوگا کہ مبلغین نے کتاب و سنت کی خاطر ہمیشہ اپنے گھر بار چھوڑ کر دور دراز کے سفر اختیار کیے اور تبلیغ میں مشغول رہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی صحت کچھ خراب ہو گئی چنانچہ آپ کچھ عرصہ امروہہ میں مقیم رہ کر وہاں کے عربی مدارس کے اہتمام و نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ابتدا ہی سے ایک ایسے تالیفی و تصنیفی ادارے کی بنا کرنا چاہتے تھے جس میں کتاب و سنت، فقہ و تاریخ اسلامی کی مستند اور معیاری کتب شائع کی جائیں گی۔ اسباب و وسائل کی کمی کی بنا پر اس ادارہ کی تکمیل سے عاجز و قاصر تھے۔ کلکتہ میں رہائش کے دوران مفتی صاحب کو خاصی رقم مل گئی۔ جس کی وجہ پہلے کسی جگہ مسطور نہیں ہوئی۔ راقم الحروف نے ایک ثقہ شخصیت سے جو برسوں ندوۃ المصنفین میں کام کرتی رہی ہے سنا ہے مفتی صاحب سے ایک بہت بڑے صنعت کار یا سرمایہ دار نے کلکتہ میں ایک کام کے لیے تعویذ مانگا مفتی صاحب نے تعویذ لکھ کر دے دیا۔ خدا کا کرنا کہ اس سرمایہ دار کا وہ کام ہو گیا جس کے لیے اس نے تعویذ لیا۔ چنانچہ اس نے خوش ہو کر غالباً پندرہ ہزار روپیہ (صحیح تعداد یاد نہیں) مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ مفتی صاحب نے اس کے سامنے اپنے ارادہ کا بے تکلفی میں اظہار کیا کہ اس رقم سے یہ کام شروع کیا جائے گا اس کی عقیدت میں اور اضافہ ہوا چنانچہ اس نے کچھ رقم اپنی طرف سے اور ملاقی کچھ احباب سے لی اور تیس پینتیس ہزار روپیہ جمع کر کے مفتی صاحب کے حوالے کر دیا۔

مشورہ دیا کہ یہیں کلکتہ میں اس ادارہ کی داغ بیل ڈالی جائے لیکن مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن کا مشورہ ہوا کہ دار الحکومت دہلی میں قائم کیا جائے چنانچہ دونوں حضرات دہلی آگئے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی ؒ کو شریک مجلس ادارت کرکے چاروں استاد بھائیوں نے دہلی میں آکر بنیاد رکھی اور اس کی ساخت پرداخت میں مشغول ہوگئے اس ادارہ نے اردو زبان میں تالیفی طور پر کتاب و سنت پر اور تاریخ و فقہ اسلامی کی اشاعت کے سلسلے میں جو معیاری کتب شائع کی ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں رہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی مشہور عالم کتابیں قصص القرآن (چار جلد) "اخلاق اور فلسفہ اخلاق" اور "اسلام کا اقتصادی نظام" اسی ادارے کے زیر اہتمام کئی دفعہ زیور طباعت سے آراستہ ہوکر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی ہیں۔ مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی کی اردو زبان میں حدیث کی سب سے وقیع شرح ترجمان السنۃ ۳ جلد بھی اسی ادارے کی جانب سے شائع ہوئی ہے

تحریک آزادی میں قائدانہ رول

۱۹۲۱-۲۰-۱۹ء کے دوران میں عظیم تحریکیں شروع ہوئی۔ ان میں سے ترک موالات۔ لا تعاون اور تحریک خلافت مشہور تھیں۔ تحریک خلافت میں مسلمان اور ہندو بلکہ ہندوستان کی تمام قوموں نے حصہ لیا اور یہ تحریک عین شباب پر تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تحریک کامیاب ہوگئی کہ "چورہ چوری" کا واقعہ پیش آیا اور وہ واقعہ یہ تھا کہ "چوری چورہ" میں مشتعل ہجوم نے چھ سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ گاندھی کا فلسفہ عدم تشدد اور "اہنسا" کا اصول اس سے مجروح ہوا چنانچہ انھوں نے لا تعاون تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور اس سے پورے ملک میں گاندھی جی کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہوگئے جواب تک باقی ہیں۔ معترض حضرات گاندھی کی نیت پر شک کرتے تھے کہ انہیں مسلمانوں کی پیش قدمی پسند نہیں تھی۔ کیونکہ تحریک خلافت سراسر مسلمانوں کی تحریک تھی۔ اگرچہ کانگریس نے اس میں پورا حصہ لیا تھا۔ گاندھی نے جو عذر اس تحریک کو ختم کرنے کا بیان کیا وہ سی آر داس جیسے ہندو لیڈروں کو بھی مطمئن نہ کر سکا اور وہ یہی تھا کہ ملک کے عوام ابھی عدم تشدد اور "اہنسا" کے اصول کے مطابق تحریک چلانے کے قابل نہیں ہیں۔ اگرچہ گاندھی جی نے اس کے بعد کئی بیانوں میں اپنے دامن پر بدنامی کے اس داغ کو دھونے کی کوشش کی، لیکن پھر آج تک اس کا مداوا نہ ہو سکا اور جو زور اور اعتماد ہندو اور مسلمانوں میں تحریک خلافت میں پیدا ہوگیا تھا اس اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ پھر کبھی نہ ہوا۔ بلکہ کئی ایک واقعات ایسے ہوتے رہے جو ہندو مسلم کو ایک دوسرے سے دور کرتے رہے۔ تا آنکہ تحریک پاکستان کا آغاز ہوا ــــــــــــ قارئین حیران ہوں گے کہ گاندھی نے اس تحریک کو کیسے ختم کر دیا۔ دوسرے زعماء کہاں تھے ان دنوں سب لیڈر جیل میں تھے۔ مولانا آزاد کا گاندھی جی کے اس فعل پر تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

> "گاندھی جی کے علاوہ اور سب لیڈر (مولانا آزاد سمیت) جیل میں تھے گاندھی جی نے چورہ چوری کے حادثہ کی وجہ سے تحریک کو معطل کر دیا سیاسی حلقوں میں اس کا شدید ردّ عمل ہوا اور سارے ملک میں شکست کی فضا پیدا ہوگئی۔ مسٹر سی آر داس کو یقین تھا کہ تحریک بند کرنے میں گاندھی جی نے ایسی غلطی کی ہے جس سے شدید نقصان ہوگا۔ اس نے سیاسی کام کرنے والوں کی ہمتیں پست کر دی ہیں کہ اب پبلک میں وہ جذبہ برسوں تک پیدا نہ کیا جا سکے گا۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد پھر وہ جوش و خروش عوام میں برسوں تک پیدا نہ ہو سکا اور مسلمان تو خاص طور پر اس سے متاثر ہوئے ایک بہت بڑا گروہ جو تحریک آزادی کا حامی تھا، لیکن وہ گاندھی کی قیادت میں کام کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ انھیں یہ خدشہ تھا کہ یہ مہاتما اپنے مخصوص نظریات کی بنا پر پھر بھی ایسی غلطی کا اعادہ کر سکتا ہے۔ ان تحریکوں سے انگریز بری طرح لوکھلا گیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں اس کا لیے اندازہ

نقصان ہوا تھا. جنگ کے خاتمہ پر اس کے مقبوضہ علاقوں کے سب سے بڑے ملک ہندوستان میں یہ تحریکیں شروع ہوئی تھی جس نے اس کے اور
کو خطا کر دیا تھا، لیکن تحریک کے معطل ہو جانے پر اسے سکھ کا سانس نصیب ہوا اور اب حکومت کے ایجنٹ اور پوری مشینری بھی اس پالیسی پر چل رہی
کہ اس کے بعد عوام خصوصاً مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شریک نہ ہونے دیا جائے، کیونکہ ان کے مخصوص مذہبی نظریات و جذبات کسی تحریک کو
دنوں میں کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں. تحریک تقریباً ختم ہو گئی۔ حکومت مستعد ہو گئی اور وہ پوری قوت اور ڈپلومیسی سے لیس ہو گئی کہ اول
کسی کو آزادی کا نام ہی نہ لینے دیتی تھی اور اگر کوئی آزادی کا نام لے تو حکومت اس کی زبان گدی سے کھینچ لے۔ حکومت کے جملہ ذرائع عوام کو تحریک آ
سے برگشتہ کرنے میں مصروف و منہمک تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پانچ طبقے پیدا ہو گئے۔

۱. انگریز
۲. انگریز کے بہی خواہ
۳. وہ طبقہ جو تحریک خلافت کی ناکامی سے مایوس ہو کر جدوجہد آزادی کو عبث خیال کرنے لگا۔
۴. وہ طبقہ جو اگرچہ محب وطن اور حریت پسند تھا، لیکن مشروط کام کرنے کے لیے تیار تھا غیر مشروط نہیں۔
۵. پانچواں طبقہ وہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ تحریک آزادی میں قائدانہ حصہ لیا جائے اور اپنے وطن کو دوسری جماعتوں کے دوش بدوش
مل کر تحریک آزادی کو اتنا طاقتور بنایا جائے کہ انگریز کو یہاں سے جاتے ہی بنے۔ ان کا خیال تھا کہ اب انگریز کی شاطرانہ چالیں ایسا انداز اختیار
گی کہ ہندو مسلم دن بدن دور ہوتے چلے جائیں اور تحریک آزادی قوت نہ پکڑے۔ اگرچہ مسلمان تحریک آزادی سے کچھ علیحدہ ہو گئے تھے، لیکن
ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ تحریک آزادی کو لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا، اور گاندھی کی حیثیت اس میں رشیوں کی ہو گئی ہے اور وہ ہر جگہ "مہاتما" کے لقب
سے معروف ہو رہے ہیں. ہندوستان کا ہر قریہ اور بستی اس بات سے متاثر ہو رہا ہے تو کیا مسلمان محض تماشائی بن کر یہ سب کچھ دیکھیں
اور وہ اپنے مستقبل کی خاطر تحریک آزادی میں حصہ نہ لیں۔

یہ اور اس طرح کے کئی اور مسائل تھے جن کو حل کرنے کے لیے جمعیۃ علمائے ہند نے ۱۹۲۹ء میں اپنا سالانہ اجلاس قصبہ امروہہ
ضلع مراد آباد میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن جمعیۃ علماء ہند کے رکن تھے۔ انھوں نے جمعیۃ کے اس اجلاس میں تحریک آزادی
میں شرکت اور کانگریس سے تعاون کرنے کی تجویز بھیج دی اور اجلاس سے تقریباً دو ہفتہ قبل اخبارات میں اس کا متن شائع ہوا اور
جگہ اس پر تبصرے ہونے لگے اور لوگ اس جرأت مندانہ تجویز پر حیران تھے کہ یہ عجیب دیوانہ ہے جو ان حالات میں اس طرح کی تجویز پیش کر
رہا ہے جبکہ مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی وغیرہ اس کے مخالف ہیں اور انھوں نے بھی ان دنوں ایک جمعیۃ کے نام سے امروہہ میں
اجلاس بلا رکھا تھا۔

بہر حال یہ اجلاس ہوا۔ جس کی سبجیکٹ کمیٹی میں تقریر کرتے ہوئے مورخ اسلام مولانا سید محمد سلیمان نے فرمایا:

> انقلاب کی تحریک جب شروع ہوتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ نتیجۃً
> ختم نہیں ہوتی بے شک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا
> ہے کہ وہ نیست و نابود معلوم ہونے لگتی ہے لیکن اس کی خاک میں چھپی ہوئی چنگاریاں بھڑکتی
> ہیں اور شعلہ بن کر مختلف طاقتوں کو نذر آتش کر دیتی ہیں۔ اب کیا مسلمان یہ پسند

کریں گے کہ مخالف انقلاب طاقتوں کا ضمیمہ بن کر وہ بھی نذر آتش ہو جائیں گے یا ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کا تماشا دیکھتے رہیں اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی حیثیت بھی ختم کر چکے ہوں اور ان کا شمار بھی انھیں پسماندہ قوموں میں ہو جن کے لیے ہندوستان میں نفرت و حقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لیے طے ہو چکی ہے۔"

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر میں فقہی انداز میں روشنی ڈالی اور ان علماء کی تردید کی جو انگریزوں کو "اولی الامر" قرار دے کر ان کے خلاف سول نافرمانی کو ناجائز اور بغاوت قرار دے رہے تھے۔ بہرحال عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ اس اجلاس میں تحریک آزادی کی یہ تجویز مولانا حفظ الرحمٰن نے پیش کی جو اکابر میں بیٹھے کمسن معلوم ہو رہے تھے۔ اس اجلاس میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا ابوالکلام آزاد، ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب، نائب امیر شریعت صوبہ بہار، حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی اور سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ جیسے مشاہیر اہل علم و فضل نے شرکت کی ان اکابر کی موجودگی میں مولانا حفظ الرحمٰن نے تجویز پیش کی اور اس کی تائید خطیب اعظم مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے کی۔ حضرت شاہ صاحب کی یہ شعلہ بار تائیدی تقریر تین گھنٹے تک رہی جس نے بہت سے متذبذب ذہنوں کو یکسو کر دیا، اور بہت سے دلوں کی دنیا بدل دی۔ شروع میں خاصے لوگ مخالف تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی تقریر اور شاہ صاحب کی تائید نے سب کو مطمئن کر دیا دو تین ساتھی پھر بھی مخالف رہے، مگر ان کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اٹھ کر مخالفت کریں۔ چنانچہ متفقہ طور پر یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ اس اجلاس میں اکابر کی موجودگی میں مولانا حفظ الرحمٰن کی صلاحیتوں کا ایسا اظہار ہوا کہ ان کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا رکن منتخب کر لیا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا ادارہ حربیہ

جمعیۃ علماء ہند نے جب جنگ آزادی میں شرکت طے کی تو یہ بھی طے کیا کہ اس کا علیحدہ پلیٹ فارم ہوگا۔ اس کے رضا کاروں کا نظام بھی علیحدہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں گرفتاریوں کا نظم بھی اپنے طور پر بنائے گی۔ کانگریس یا کسی دوسری جماعت کی طرف نظر نہیں اٹھائے گی۔ کانگریس اور جمعیۃ نے تحریک آزادی شروع کر دی تھی، لیکن اس تحریک کو غذا یعنی گرفتاریاں دینا مشکل ہو رہا ہے۔ کیونکہ گزشتہ حالات نے ایک اضمحلال سا پیدا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ولنگڈن حکومت نے تحریک شروع ہونے سے قبل ہی صف اوّل کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ مزید برآں جائیدادوں کی ضبطی وغیرہ کا سلسلہ سخت اور تیز کر دیا تھا۔

گورنمنٹ نے دفعہ ۱۴۴/۸۸ تقریباً نافذ کر رکھی تھی۔ ہفتہ میں ایک دو بار رضا کاروں کے جتھے گرفتاری کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ جو برسر عام قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتار کر لیے جاتے تھے۔ کانگریس نے اس نظام کو چلانے کے لیے جنگی کونسل اور جمعیۃ نے ادارہ حربیہ قائم کر دیا تھا اور دونوں جماعتوں نے اپنی اپنی مجلس عاملہ صدر سیکرٹری وغیرہ کے عہدے ختم کر کے "ڈکٹیٹرشپ" قائم کر دی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے پہلے ڈکٹیٹر حضرت مفتی کفایت اللہ تھے، لیکن یہ ڈکٹیٹر کی فہرست خفیہ ہوتی تھی۔ گرفتار ہونے والا ڈکٹیٹر اپنے جانشین کا اعلان کرتا تھا مفتی صاحب گرفتار ہوئے تو انھوں نے اپنا جانشین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو بنایا اور انھوں نے مولانا احمد سعید دہلویؒ

کو اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا رہا۔

مولانا حفظ الرحمٰن ادارہ حربیہ کے افسر انچارج یا کمانڈر تھے۔ مولانا اسی حیثیت سے مراد آباد پہنچے مگر حسب معمول سادے کپڑوں میں ملبوس کھدر کی شیروانی جو بوسیدہ تھی۔ احباب نے عرض کیا کہ آپ کو تو فوجی لباس میں ہونا چاہیے۔ آپ کی خاموشی اس کا جواب تھا۔ چند روز بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی، مقدمہ چلا لیکن جرم ثابت نہ ہوا اور رہا کر دیے گئے۔ اور اس سلسلے میں ایک بات حکومت کی شاطرانہ پالیسیوں میں سے یاد رکھنے کی ہے کہ اس نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دے رکھا تھا۔ لیکن جمعیۃ علماء ہند کو خلاف قانون قرار نہیں دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت اور اس کے کارندے عام طور پر یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ ہندو تحریک آزادی چلا رہے ہیں، مسلمان اس میں شریک نہیں ہیں اگر جمعیۃ علماء ہند کو خلافِ قانون قرار دیا جاتا تو اس کے فریب اور پروپیگنڈہ کا پردہ چاک ہوتا تھا۔ لیکن عملاً جمعیۃ کے ساتھ یہ ہوتا تھا کہ اس کے دفاتر پر چھاپے پڑتے تھے۔ نمایاں کارکنوں کو گرفتار کیا جاتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ

دہلی گھنٹہ گھر میں کانگریس کا خلافِ قانون جلسہ

کانگریس خلاف قانون تھی لیکن اس کے باوجود اس نے طے کیا کہ اس کا سالانہ جلسہ حسبِ معمول ہوگا صدر کا انتخاب ہوا۔ تاریخ مقرر کی گئی وقت بھی مقرر ہوا اور دل چسپ بات یہ کہ اس جلسہ کی جگہ دہلی کا گھنٹہ گھر تجویز ہوا جو چاندنی چوک میں واقع ہے۔ کانگریس اور حکومت دونوں کے لیے یہ جلسہ وقار کا مسئلہ بن گیا، حکومت نے سی آئی ڈی کا جال پھیلا دیا۔ بسوں میں گاڑیوں میں، انتظار گاہوں میں ہر جگہ سی آئی ڈی دہلی کے چپہ چپہ پر سی آئی ڈی تھی چند منٹ پہلے تک مجوزہ جگہ پر کوئی انتظام نہ تھا۔ حکومت کے کارندے خوش تھے کہ ہم کامیاب ہو گئے، لیکن عین وقت پر آس پاس کے گلی کوچوں سے ایک جھپکے میں اتنی تعداد اکٹھی ہوگئی کہ پولیس کی خاصی نفری اپنے کو ناکافی سمجھنے لگی۔ جب تک مزید پولیس آئی، آنے والوں نے کارروائی شروع کر دی انقلاب زندہ باد، کانگریس زندہ باد وغیرہ نعرے لگے۔ صدر نے حلف نامہ آزادی پڑھا۔ آزادی کی تجویز پیش کی جو منظور ہوئی۔ جلسہ برخاست ہوا اور سامعین و منتظمین غائب۔ اس پورے جلسے کی کارروائی پھر اس کے انتظام میں مولانا حفظ الرحمٰن کا تدبر اور حاضر حواسی شریک رہی اور کہا جاتا ہے کہ جلسہ کی کامیابی میں ان کا خاصہ دخل تھا۔ آپ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ بیوہارہ پولیس آپ کو وہیں سمجھتی رہی اور آپ وہاں سے خفیہ نکل گئے۔ آپ ہمیشہ کھدر کے کپڑوں میں ملبوس رہتے مگر اس دن راستے اور دہلی میں گرفتاری سے بچنے کے لیے لٹھے کا پاجامہ بیش قیمت کپڑے کی شیروانی جسے پوری صافہ جسے پوری انداز میں باندھ کر سفر کیا دہلی سٹیشن پر اترتے ہیں تو ہاتھ میں بیش قیمت عمدہ چھڑی تھی اور انداز بڑی شان سے دہلی میں داخل ہوئے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ یہ حفظ الرحمٰن ہے۔ حالانکہ پولیس کو آپ کی آمد کی توقع تھی۔ کیونکہ ہمیشہ ایسے کاموں میں آپ سرگرم رہتے تھے۔

جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کا اتحاد

۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کا نفاذ ہوا ———— اگر ایکٹ کو اپنایا جائے، تو وزارتیں قائم ہوتی تھیں اور اس کے لیے انتخابات ضروری تھے۔ تحریک آزادی میں شمولیت اور قائدانہ حصہ لینے پر جمعیۃ علماء ہند کا وقار اور اس کی شہرت یوپی، سی پی اور بہار وغیرہ میں بہت تھی۔ اگر وہ دوسری قوم پرست جماعتوں سے مل کر محاذ بناتی تو خاصی سیٹیں لے جاتی۔ لیکن اس موقعہ پر قائدِ اعظم محمد علی جناح نے جمعیۃ علماء کی طرف دست تعاون

بڑھایا، اور جمعیۃ علماء ہند کے عام اجلاس منعقدہ دہلی میں تشریف لانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ادھر سے پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ قائد اعظم، مولانا شوکت علی مرحوم، نواب محمد اسمٰعیل نے اکابر جمعیۃ سے گفتگو کی اور جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کا آپس میں اتحاد ہو گیا اور یہ معاہدہ یہاں تک پہنچا کہ اگر کانگریس کسی حلقے سے مسلمان امیدوار کو کھڑا کرے گی۔ وہاں مسلم لیگ کا امیدوار کھڑا نہیں ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب پلیٹ فارم دو رہ گئے تھے مسلم لیگ اور کانگریس، جب انتخابات ختم ہوئے تو قوم پرور مسلمانوں کا کوئی سٹیج نہ رہا۔ ان جماعتوں کا اتحاد کیوں ختم ہوا یہ ایک طویل داستان ہے یہاں اس اتحاد کا ذکر اس لیے ناگزیر ہے کہ عام طور پر لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مسلم لیگ اور قائد اعظم کی مخالفت کی حالانکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دونوں جماعتیں بغلگیر ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں جمعیۃ کی ساکھ بھی کمزور ہوئی لیکن اتحاد و اتفاق کے پیش نظر یہ قبول کیا گیا ان باتوں کی موجودگی اور ایسے واقعات کے تاریخ کا ایک حصہ ہونے کے باوجود بعض حلقے یہی رٹ لگائے جاتے ہیں کہ یہ ہمیشہ قائد اعظم کے مخالف رہے۔

۱۹۴۲ء کوئٹ انڈیا کی تجویز

۱۹۴۲ء میں دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی۔ ہٹلر کی فوجیں سٹالن گراڈ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں اور اس کے نتیجے حلیف جاپان نے سنگاپور کے قریب برطانوی بحری بیڑے کے سب سے بڑے جنگی جہاز (پرنس آف ویلز) کو غرق کر دیا تھا اور اس کے ہوائی جہاز کلکتہ تک تاخت و تاراج کرنے لگے تھے۔ برطانیہ کی حکومت پر ایسی پریشانی کا عالم تھا کہ شاید ہی کبھی آیا ہو اور اسی پریشانی کے عالم میں کانگریس نے بمبئی میں سالانہ اجلاس کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ان حالات میں کانگریس سے یہ توقع تو ہرگز نہ تھی کہ وہ حکومت برطانیہ کا ہاتھ بٹائے گی بلکہ یہ بات یقینی کہ وہ ان نازک حالات سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ پر ایک بھرپور وار کرے گی۔ حکومت کی کوشش تھی کہ اجلاس کو ناکام بنایا جائے اور کانگریس کی کوشش تھی کہ اجلاس کامیاب ہو۔ ان ہنگامی حالات میں اس اجلاس کے متعلق کام کرنا ہر کسی کا کام نہ تھا، بلکہ ان حربوں اور اقدامات کو دیکھ کر جو حکومت بروئے کار لا رہی تھی اچھے اچھے آدمیوں کے پتے پانی ہو رہے تھے۔ مسلح پولیس اور فوج مستعد مشین گنیں اور ٹینک تیار، خیال تھا کہ جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی تاریخ کو دہرایا جائے گا یا قصہ خوانی بازار کی روداد تازہ کر دی جائے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور ملک کے ہر باشندہ سے زیادہ مستعد و جفاکش، قوم کی طرف سے آپ کو مجاہد ملت کا خطاب ملنے والا تھا۔ لہٰذا آپؒ انہی حالات میں سیوہارہ سے بمبئی پہنچے اور علی بہادر خاں کے پاس قیام فرمایا۔

حکومت کو علم تھا کہ کانگریس اس اجلاس میں "ہندوستان خالی کرو" کی QUIT INDIA کی تجویز پاس کرنے والی ہے۔ اگر برطانیہ پر جنگ کی اتنی بڑی مصیبت نہ ہوتی تو شاید کانگریس کو قبل از وقت ہی خلاف قانون قرار دے دیا جاتا۔ مگر اب اس اجلاس کے بعد بھی شاید حکومت مجبوریوں کی بنا پر خلاف قانون قرار نہ دیتی، لیکن یہ قرارداد تقریباً بغاوت کے مترادف تھی اس کو پاس کرنے والے باغی، لیکن سوال یہ تھا کہ ان باغیوں کو گرفتار کون کرے۔ صوبہ بمبئی کی حکومت یا اس میں شریک ہونے والے کے وطنی صوبہ کی حکومت، حکومت بمبئی اس کے لیے تیار نہ تھی کہ بمبئی جیسے شہر میں سینکڑوں ممبروں اور لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل خانوں میں غیر محدود مدت تک ان کی نازبرداری کے فرائض انجام دیتی رہے۔ لہٰذا سرکاری پالیسی یہ طے پائی کہ گرفتار کرنے کا تلخ فرض دوسرے صوبوں کی حکومتیں انجام دیں یعنی جو ممبر جس صوبے کا ہو اسی صوبے کی حکومت اس کو گرفتار کرے۔

مولانا کی گرفتاری: مولانا حفظ الرحمٰن صاحب چونکہ یو۔پی کے تھے۔ لہٰذا ان کی گرفتاری یو۔پی حکومت کے حکم سے ہونا تھی، گرفتاری ناگزیر

تھی۔ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس نے کوئٹ انڈیا کی تجویز پاس کی اسی روز شب کو صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور دوسرے ورکنگ کمیٹی کے ممبر گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب کو احساس ہوا تھا کہ ان حالات میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے حضرت مدنیؒ چند ماہ پیشتر گرفتار ہو چکے تھے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نقاہت اور ضعف دماغ کے مریض تھے۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ بھی بیمار تھے۔ ضابطہ کے لحاظ سے مولانا عبدالحلیم صدیقی ان دنوں ناظم تھے، لیکن انہیں ایک بیدار مغز مشیر کی ضرورت تھی۔ مولانا حفظ الرحمن سے بہتر مشیر اور کون ہوتا۔ مولانا نے تہیہ کیا کہ زیادہ سے زیادہ عرصہ اپنے آپ کو گرفتاری سے بچایا جائے۔ بھیس بدل کر سیوہارہ پہنچے وہ اس طرح کہ کسی قریبی سٹیشن پر اتر کر خفیہ طریقے سے سیوہارہ گئے۔ یہ موسم برسات کا تھا اور اس سال بارشیں کچھ زیادہ ہی تھیں بارش چشم رقیب کے لیے گھونگھٹ بنی رہی آپ دیہاتی وضع بنا کر قریبی سٹیشن گانٹھ سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب تک یو پی گورنمنٹ سے وارنٹ گرفتاری آئے آپ محفوظ تھے ۲۷، ۲۸ اگست کو جمعیۃ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا اور اس میں کانگریس کی قرارداد کی حمایت کی گئی اور طے پایا کہ اس کو ملک کے گوشے گوشے پہنچایا جائے اس کا چھاپنا اور تقسیم کرنا خلاف قانون تھا۔ تاہم جمعیۃ نے محفوظ طریقے سے یہ سب کام کیا۔

مولانا کا وارنٹ گرفتاری آیا اور آپ کو ندوۃ المصنفین کے دفتر قرول باغ سے گرفتار کر لیا گیا۔ جہاں آپ روزانہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے آپ ضلع مراد آباد کی طرف سے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ لہٰذا آپ کو مراد آباد پہنچایا گیا حسن اتفاق کہ حضرت مدنیؒ حافظ محمد ابراہیم صاحب اور کئی دوسرے حضرات یہیں تھے، چند روز بعد رمضان آگیا تو جیل کی بارک تراویح گاہ بن گئی۔ حضرت مدنیؒ قرآن پاک سنایا کرتے اور تمام رفقا شیخ الاسلام کے پیچھے قرآن پاک سنتے

مولانا محمد میاں کی گرفتاری پر عتاب

اکتوبر میں مولانا سید محمد میاںؒ گرفتار ہو کر اسی جیل میں پہنچے تو مولانا حفظ الرحمن صاحب نے نہایت خفگی کے ساتھ استقبال کیا اور کہا "یہاں پہنچے بغیر چین نہ آیا۔ کیا خرابی تھی اگر باہر رہ کر یہ حرکتیں نہ کرتے اب باہر کا تمام کام چوپٹ ہو جائے گا" مولانا سید محمد میاں صاحب کے ذمے دہلی سے ہندوستان کے مشرقی کونے تک قرارداد کو پہنچانا تھا۔ مولانا نے اگرچہ خاصا کام کر لیا تھا تاہم مولانا حفظ الرحمن کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ کام کرتے اور گرفتاری سے بچتے رہتے کام کی اس قدر دھن تھی کہ باوجودیکہ مولانا سید محمد میاں ان سے عمر میں بڑے اور جمعیۃ کے ذمہ دارانہ عہدے پر تھے ان کو یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔

حضرت مدنیؒ کی تبدیلی

حضرت مدنیؒ کو مراد آباد جیل سے نینی تال منتقل کیا گیا تو سب ساتھی ان کی مفارقت کے صدمے سے کئی دن روتے رہے کیونکہ حضرت مدنیؒ کی یہ اتفاقیہ معیت ان سب کے لیے پارس کا حکم رکھتی تھی۔ بارس طرح شب و روز اکٹھے رہنا مشکل تھا۔ جنوری ۱۹۴۳ء میں مولانا حفظ الرحمن اور مولانا سید محمد میاں کو بریلی سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔

پیرول پر رہائی سے انکار

اس زمانے میں حکومت نے سیاسی قیدیوں کے لیے پیرول کی سہولت منظور کی تھی یعنی کچھ مدت کے لیے جیل سے رہائی۔ مولانا حفظ الرحمن کی صحت بہت خراب تھی اور درد سر کا دورہ پڑا کرتا تھا آپ کئی کئی گھنٹے تڑپتے رہتے۔ رمضان شریف میں کئی دفعہ دورہ پڑا عید کی رات اسی طرح گزری اس عارضہ کی بنا پر آپ پیرول کی سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے اور دوسرا عذر یہ تھا کہ آپ کی بڑی لڑکی شدید علیل تھی جو بعد میں تپ دق میں مبتلا ہو کر وفات پا گئیں باہر کے دوستوں اور اندر ساتھیوں نے بے حد اصرار کیا التجائیں کیں لیکن آپ پیرول پر رہا ہونے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

جمعیتہ کے باضابطہ ناظمِ اعلیٰ ۱۹۴۲ء میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو جمعیتہ کے ناظم اعلیٰ بنانے کی تجویز تھی، لیکن سیاسی حالات نے اپنی طرف متوجہ رکھا اور پھر گرفتاریاں ہوگئیں۔ ۱۹۴۴ء میں جرمنی کی جنگ دم توڑ رہی تھی، ہٹلر کی خودکشی اور ہیروشیما پر ایٹم بم داغنے کا وقت قریب آرہا تھا۔ کامیابی کی روشن توقعات نے برطانوی دماغ کی گرہیں کھول دی تھیں اور وہ مابعد جنگ کی مشکلات پر قابو پانے کے لیے ہندوستان کے معاملہ میں کچھ خاص فیصلہ کرنا چاہتا تھا لہٰذا گرفتار شدگان کو رہا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مئی ۱۹۴۴ء کو مولانا حفظ الرحمٰن — اور ۲۶ اگست ۱۹۴۴ء کو حضرت مدنیؒ رہا کر دیے گئے۔ ۴ تا ۷ مئی ۱۹۴۵ء مطابق ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ کو جمعیتہ علماء ہند کا اجلاس سہارنپور میں منعقد ہوا۔ حضرت مدنی صدر اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔

مجاہد ملت شہ سوار مجلس استقبالیہ نے صاحب صدر کے جلوس کی تیاریاں کر رکھی تھیں، لیکن حضرت مدنی ان چیزوں کے سخت خلاف تھے اور خصوصاً اپنے لیے تو وہ اس قسم کی کوئی چیز برداشت نہ کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت تو تیار نہ ہوئے۔ البتہ مولانا حفظ الرحمٰن نے دلداری کے لیے شرکت منظور کر لی مجلس استقبالیہ نے ایک نہایت عمدہ شوخ گھوڑا ناظم اعلیٰ کو سواری کے لیے پیش کیا۔ آپ اس سے قبل گھوڑے پر شاید ہی کبھی سوار ہوئے ہوں، لیکن جب سوار ہوئے تو معلوم ہوتا تھا پرانے شہ سوار ہیں۔ آپ نے اپنی غیر معمولی جرأت سے گھوڑے کو قابو میں رکھا حضرت مخدوم خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ جوانی کے زمانے میں شاہ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتیؒ کے سامنے سے گزرے تھے۔ تو انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

گلگوں لباس کردہ سوار سمند شد!
باراں خدر کنید کہ آتش بلند شد

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات اجلاس سہارنپور کے تھوڑے عرصہ بعد ۴۶-۱۹۴۵ء کا الیکشن تھا جس میں وزارتوں کے علاوہ قوم و ملت کا فیصلہ ہونا تھا کہ مسلمان پاکستان کے حق میں ہیں یا خلاف؟ مولانا حفظ الرحمٰن جمعیتہ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ تھے اور جمعیتہ علماء ہند کا موقف تھا کہ تقسیم نہیں ہونی چاہیے اور اب اس مسئلے میں ان کے ساتھ مقابلہ تھا۔ اکابر دیوبند بھی دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے زیر قیادت تحریک پاکستان کی حمایت کر رہا تھا اور دوسرا حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی قیادت میں مخالفت لیکن ان دونوں گروہوں میں اختلاف دیانتداری کا اختلاف تھا۔ ہر گروہ دیانتداری اور اجتہاد سے اپنے موقف کو صحیح سمجھتا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان بہت بلند ہے تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ میں آپس میں بعض دفعہ ایسا سخت اختلاف ہوا جنگ جمل اور جنگ صفین جیسی لڑائیاں ہوئیں لیکن پوری امتِ مسلمہ کا فیصلہ ہے کہ ان میں سے ہر گروہ دیانتدار تھا۔ کوئی بدنیت نہ تھا۔ ان صحابہ کے ساتھ اس اختلاف کی تشبیہ سخت بے ادبی ہے تاہم سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے پیروکاروں میں بھی اختلاف ہوا قوم کے سامنے دونوں گروہوں نے اپنے اپنے دلائل اور شواہد پیش کیے اور ملت اسلامیہ کی اکثریت پاکستان نے حق میں رائے دی اور اب پاکستان خدا کے فضل و کرم سے اپنی زندگی کے بائیسویں[1] سال میں ہے اور دنیا کے ہر طبقے کا مسلمان اس کی خوشحالی اور ترقی کے لیے دعا گو۔

ارباب علم کا اس بارے میں یہی فتویٰ ہوگا کہ جو صاحبان سچائی اور دیانتداری کے ساتھ جس نظریہ کے بھی حامی تھے ان میں سے کسی ایک کو خطاء اجتہادی میں تو مبتلا قرار دیا جاسکتا ہے۔ گنہگار کسی کو نہیں کہا جاسکتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مجتہد کے لیے دو ثواب ہیں یا ایک —— دو ثواب اس کو جس نے اجتہاد کیا اور اس کا یہ اجتہاد صحیح نکلا —— ایک ثواب کوشش کرنے کا اور

[1] اب انتیسویں سال میں۔ فالحمدللہ (طبع ثالث)

دوسرا صحیح اجتہاد کرنے کا ایک ثواب اس مجتہد کو کہ جس نے کوشش کی، لیکن اس کی یہ کوشش صحیح نہ نکلی تو اس کو کوشش کرنے کا ثواب ضرور ملے گا۔ لیکن کس مجتہد کا اجتہاد درست ہے اور کس کا نادرست، اس کا فیصلہ وحیٔ الٰہی کر سکتی ہے۔

اس انتخاب میں متحدہ ہندوستان کے موقف کی حمایت کرنے والی جماعتوں جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام، خدائی خدمت گار وغیرہ پر مشتمل ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا گیا اور اس کی طرف سے امیدوار کھڑے کیے گئے۔ اس طرح پورے ملک میں اگرچہ یہ بورڈ ہار گیا (یوپی بہار وغیرہ میں تیس سیٹیں حاصل ہوئیں) لیکن مجموعی طور پر جب ووٹوں کے اعداد و شمار حاصل کیے گئے تو قوم پرور مسلمانوں کو ۳۵ فیصد ووٹ ملے اور ۶۵ فیصد ووٹ مسلم لیگ کو۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان کس حیثیت سے رہیں گے۔ جمعیۃ علماء ہند نے اس کے لیے ایک فارمولا تیار کیا تھا جس کے اہم اجزاء یہ تھے۔

۱۔ صوبے خود مختار ہوں
۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔
۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لیے کر دی گئی ہو، باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔
۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔

ہندو ۴۵ مسلمان ۴۵ دوسری اقلیتیں ۱۰

۵۔ جس مسئلے کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے گی کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے۔ وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو سکے گا۔

اس فارمولے کو جمعیۃ علماء ہند اور دوسری جماعتیں پیش کرتی تھیں، لیکن قوم نے اس کو مسترد کر دیا اور پاکستان کے حق میں ووٹ دیے۔

وزارتی مشن کی آمد صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ابھی تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن جسے کرپس مشن کہا جاتا ہے کراچی پہنچ گیا اس مشن میں تین ارکان تھے۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر، ایک ہفتہ مطالعہ و آرام کے بعد اس وفد نے یکم اپریل کو ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کر دی۔

کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے حضرت مدنیؒ کو دعوت ملی آپ نے اپنے ساتھ شیخ حسام الدین (مجلس احرار اسلام) خواجہ عبدالمجید (صدر مسلم مجلس) شیخ ظہیر الدین (صدر آل انڈیا مومن کانفرنس) کو دوسری جماعتوں کے نمائندہ کی حیثیت سے حافظ محمد ابراہیم کو (جو بھارت میں وزیر برقیات رہے) ترجمان کی حیثیت سے لیا۔ اس جماعت کو ایک مشیر اور نمائندہ کی ضرورت تھی جو پریس نمائندگان وغیرہ کو مطالب کر سکے اس ضرورت کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو شریک کر کے پورا کیا گیا۔ اس وفد نے اپنا فارمولا (جس کا ذکر اوپر ہوا) پیش کیا۔ کرپس مشن نے اس فارمولا سے خاصی دلچسپی کا اظہار کیا اور مقررہ وقت سے ۴۵ منٹ زائد ملاقات جاری رہی

عارضی حکومت مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ایک کتاب میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ بھی اس فارمولے کے ساتھ ملتا جلتا ہے اس فارمولے کو وزارتی مشن نے خاص طور پر پسند کیا۔ ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو اپنی سفارشات

پیش کیں وہ تقریباً انہی لائنوں اور خطوط پر تھیں۔ ان سفارشات کی بنا پر ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا کیبنٹ کے ۱۴ ممبروں میں پانچ مسلمان تھے یعنی ⅓ سے کچھ زیادہ۔ مالیات کا اہم محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خانؒ کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن یہ عارضی حکومت بالکل ہی عارضی ثابت ہوئی اور بات پاکستان کی منظوری پر آکر ختم ہوئی اور ۱۴ اگست کو قیام پاکستان کا عمل ظہور میں آیا۔

ہمارے ملک میں اب تک یہ ناخوشگوار بحث چل رہی ہے کہ کون پاکستان کا مخالف تھا اور کون موافق؟ دیکھنا یہ چاہیے کہ جن لوگوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی قیام پاکستان کے بعد کیا وہ اب تک پاکستان کے مخالف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ایسے لوگ غدار اور قابل گردن زدنی ہیں لیکن اگر وہ محب وطن ہیں تو پھر ان کی مخالفت کیسی؟ مملکت پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد بیسیوں تک پہنچتی ہے جو تحریک پاکستان کے مخالف تھے مگر قیام پاکستان کے بعد وزارتوں میں شریک کیے گئے۔ ملک کی مقتدر جماعتوں کے صدر اور اعلیٰ عہدے دار رہے اور ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے جو پاکستان کی تحریک کے ہراول دستے میں تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد اپنے مفاد اور خود غرضی کی وجہ سے پاکستان میں انتشار و افتراق کا باعث ہوئے ہمیں خاص کسی فرد کا نام لینے کی ضرورت نہیں، ملک کے تمام افراد ہر دو گروہوں کے ان افراد کو جانتے ہیں۔ اگر کل کوئی (قیام پاکستان سے قبل) تحریک سے دیانتداری سے اختلاف کرتا تھا، لیکن قیام پاکستان کے بعد نظریہ پاکستان کو یہاں عملی شکل میں دیکھنے کے لیے جدوجہد کرتا اور ایثار و قربانی سے کام لیتا رہا ہے تو وہ اس آدمی سے ہزار درجہ اچھا ہے جو کل پاکستان بنانے والوں میں تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد اپنے مخصوص مفادات کی خاطر ایسے افعال و کردار کا حامل رہا کہ جس سے ملکی ترقی اور نظریہ پاکستان کی عملی تشکیل میں رکاوٹ پیدا ہوتی رہی۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ اکیس[1] سال گزرنے کے باوجود ہم اپنے محبوب نظریاتی ملک کو اسلامی آئین سے ہمکنار نہ کر سکے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قیام پاکستان کے دیانتداری سے مخالف تھے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ان خدمات نے ان کو اُمت مسلمہ کے ان افراد کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے کہ جن کی ذات پر پوری امت مسلمہ کو فخر ہے اور وہ تاریخ اسلام کے اکابر کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن ۱۹۴۷ء میں

۱۴ اگست کو قیام پاکستان عمل میں آیا اور ۱۵ اگست کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اسی شب کو بارہ بجے پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں انتقال اختیارات کا منشور پڑھا گیا اس کے بعد گورنمنٹ ہاؤس میں ایک پرشکوہ تقریب منعقد ہوئی ——— مولانا حفظ الرحمٰن نے خوشی خوشی تمام تقریبات میں شرکت کی۔ مولانا مرحوم نے آزادی وطن کے لیے جس طرح جان کی بازی لگائی اور جوانی کی تمام امنگیں اس کے لیے قربان کر دی تھیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک کی فضاؤں پر حریت و استقلال کی صبح مقصود نمودار ہو رہی تھی اس کی مسرتوں اور طرب آفرینیوں کا پورا لطف بھی کچھ انہی کو حاصل ہوا ہوگا اور ان ہی جیسے لوگوں کا حق تھا۔

بہرحال ملک آزاد ہونا تھا ایک تاریخ آئی اور آزادی کی رسم پوری ہو گئی۔ آزاد ہندوستان کے جھنڈے لہرانے لگے آزادی کے ترانوں سے فضائیں گونج اٹھیں یہ سب کچھ ہوا، لیکن تھوڑی دیر کے لیے ——— اور اس کے بعد ——— یکایک ——— ایک سناٹا ———

[1] اور اب انتیس سال کے بعد کہیں (طبع ثالث)

گھٹا ٹوپ اندھیرا، ایک ہیبت ناک منظر اور رجان لیوا دہشت ـــــــ گویا بھارت کی دھرتی پر بلاؤں کا دیوتا اپنے پورے غیظ وغضب کے ساتھ برس ہی پڑا ہو۔ تاریخ کو شاید ایک ایسے وقت کا انتظار تھا جو ۱۵ اگست کی خوشیاں بھلا دے ـــــــ مگر یہ سب بلائیں۔ آفات او مصیبتیں، شدائد اور تکلیفیں پورے بھارت کے لیے نہ تھیں یہ سب کچھ بھارت کی اقلیت اور صرف ایک اقلیت کے لیے تھا جس کا نا مسلمان تھا اور اس اقلیت کے لیے تھا جو سینکڑوں برس ہندوستان پر حکومت کرتی رہی، لیکن پھر اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے انگریز کی غلام گئی اور ڈیڑھ سو سال تک اسی طرح گزر گیا۔ اس کے بعد اس کا ایک بڑا حصہ خوبی قسمت سے آزاد ہو گیا۔ لیکن دوسرا حصہ شومئی قسمت انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنے ہی ملک کی اکثریت کے ظلم وستم کا نشانہ بن گیا اور کہنے کو تو وہ آزاد ہے، لیکن غلاموں سے بدتر ـــــــ دلی اپنے اندر کئی انقلابات کو سموئے ہوئے ہے کبھی وہاں اشوک کمار اور بکرماجیت کا جھنڈا لہراتا تھا۔ لیکن ایک صبح دیکھا گیا کہ جمنا کے کنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام وضو کر رہے ہیں انھوں نے توحید ورسالت سے بھرپور نغمۂ اذان کی صورت میں ہر چہار طرف بکھیر دیے اور سات سو برس یہ توحیدی نغمے دلی سے راس کماری آسام اور پشاور تک گونجتے رہے اور دلی کے تخت پر قطب الدین ایبک محمد تغلق، بابر شا اور اورنگ زیب جیسے اولوالعزم انسان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بن کر پورے ہندوستان پر حکمرانی کرتے رہے پھر دیکھا گیا کہ مسلمانوں کا ز ہو رہا ہے۔ لیکن اسی زوال کے دور میں شاہ ولی اللہ محدث جیسے نادرۂ روزگار انسان نے یہاں جنم لیا انھوں نے نرمی گرمی سے حکمرانوں کو نصیح کیں جو بے اثر رہیں تاآنکہ دلی کا آخری تاجدار صرف قلعہ میں تاجدار رہ گیا اور پھر اسی تاجدار کے سامنے اس کے عزیزوں کے سر تھال میں رکھ کر پیش کیے گئے اور اس کو رنگون میں جلاوطن کر دیا گیا۔

کتنا ہے بد نصیب ظفر کہ دفن کے لیے ؏ دو گز زمیں نہ ملی کوئے یار میں

اور دلی کے گوشے گوشے میں علماء کے لیے پھانسیاں لٹکائی گئیں۔ اشراف کو ذلیل کر دیا گیا۔ دلی کے در و دیوار نے دیکھا کہ جن شہزادوں کے خرام ناز سے موج آجاتی تھی وہ دربدر بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ ہندوستان کی دولت لٹتی رہی اور اس سے انگلستان کے کوچہ وبازار میں زی کے سامان جمع ہوتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ دلّی میں اس ظلم وستم کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہوئی اور ایک دن دیواروں پہ اشتہار چسپاں تھے کہ ہندوستان خالی کر دو ـــــــ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو قانونی طور پر انگریز ہندوستان سے چلا گیا اور لال قلعہ پر ہندوستان کا اپنا جھنڈا پورے شکوہ سے لہرانے لگا۔

۱۸۵۷ء کے پورے نوے سال اسّی دن بعد دلی کے کوچہ و بازار پھر خون سے رنگین ہونا شروع ہوئے لیکن اب کے قتل وخون کی ا بازاری میں دلّی کے صرف مسلمان کا خون بہتا تھا اور بہانے والے اسی ملک کی اکثریت کے باشندے تھے۔ انتقال آبادی کے نتیجے میں مغر پنجاب سے غیر مسلم پناہ گزینوں کے قافلے دھڑا دھڑ دہلی میں داخل ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وحشت وبربریت کا بے قابو سیلاب دلی کی طرف بڑھ رہا تھا تین روز تک نہ صرف دہلی اسٹیشن پر قتل عام ہوتا رہا بلکہ شہر کے اندر بھی کشت وخون کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ آ فاناً نئی دہلی کی وسیع آبادی پہاڑ گنج۔ قرول باغ، سبزی منڈی شاہدرہ اور قرب وجوار کے دیہات سے لاکھوں مسلمان اجڑ کر جامع مسجد او مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزین ہو گئے۔

اسلامی تاریخ میں جب ہم بغداد، کوفہ، شیراز، قرطبہ، غرناطہ، بخارا اور غزنی کا نام پڑھتے ہیں تو ایک خاص قسم کا شکوہ ان ناموں میں نظر آتا ہے۔ بعینہٖ یہی تصور وشکوہ دلی میں تمام پایا جاتا ہے۔ مگر جس طرح انقلابات عالم کے ہاتھوں مسلمانوں کی شامتِ اعمال کی وجہ سے اب

قرطبہ، غرناطہ اور بخارا وغیرہ شہروں کی عظمتِ ماضی کو "پدرم سلطان بود" کی طرح یاد کرتے ہیں یہی حال دلّی کا ہو رہا ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس میں زندہ معنوی اثرات باقی ہیں، لیکن حالات کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ بھی نہیں رہیں گے اللہ تعالیٰ اس روزِ بد سے ... اور دلی کو بچائے

... کے فسادات اور مجاہد ملت

انہی دنوں جب ہندوستان آزاد ہوا۔ مولانا کی چہیتی بیٹی خالدہ جو انہیں بیٹیوں سے زیادہ عزیز تھی مرض دق کی آخری منزل میں تھی تشویشناک علالت کی خبر پاکر مولانا ۲۵ اگست ۴۷ء کو سیوہارہ گئے۔ ... بعد خالدہ کا انتقال ہو گیا اور مولانا غم میں ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ ۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دلّی واپس آئے اگرچہ خالدہ کی موت کا حادثہ ایسا تھا کہ ... میں اپنے گھر میں چند دن اور رہنا چاہیے تھا، لیکن گھر والوں کے اصرار کے باوجود مولانا دلّی پہنچے تو ان کو شہر کا بھیانک منظر دیکھنا پڑا، ستمبر سے ... گھنٹے کا کرفیو آرڈر نافذ کر دیا گیا پورے شہر میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آواز آتی تھی تو گولیوں کی یا بے بس مظلوموں کی چیخ و پکار کی، رات ... خوفناک نعروں کے ساتھ پورے پورے محلوں پہ مسلح چڑھائیاں، دور دور تک آگ کی لپٹیں اور دھوئیں کے غول ہر طرف چھرے بھالوں اور بے باک ... وں کی گویا حکومت قائم ہو گئی تھی ایک اندازہ کے مطابق چالیس ہزار کے قریب بے گناہ تین یا چار روز کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے ... قیامت جن کے سروں سے گزری ان کا تو ذکر ہی کیا جو باقی تھے وہ بھی دم بخود پوری مایوسی کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس بھیانک اور ہیبت ناک فضا میں جبکہ بڑے بڑے لیڈروں کے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے یہ سوچنا بھی کہ اس سیلاب بلا ... رو کنے، بے گناہوں کو موت کے چنگل سے نکالنے اور ان کے تحفظ کے لیے کوئی قدم اٹھانے کی کوئی گنجائش بھی باقی ہے کسی کے بس کی ... بات نہ تھی ایک مولانا حفظ الرحمٰن کا دم تھا جو سر سے کفن باندھ کر اُٹھے اور بنام خدا ان کی ہمت نے کچھ ساتھی بھی تلاش کر لیے۔ جمعیۃ کا دفتر ریلیف کیمپ بن گیا۔ حالات انتہائی سنگین تھے مگر مولانا مرحوم کی ہمت اور جوش ان سے کچھ سوا تھا انھوں نے فوراً مقامی ایڈمنسٹریشن کو للکارا جمعیۃ اور کانگریس کے باہمت کارکنوں کو جمع کیا اور اصلاحِ حال کی مؤثر کوشش اور تدبیر شروع کی۔

مجاہد ملت فرمایا کرتے تھے کہ:

> "۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مسجد فتح پوری میں گولا پھینکا گیا وہ دلی میں قیامت خیز طوفان کا آغاز تھا۔ اسی وقت اپنے اور اپنے خدا کے درمیان یہ عہد کر لیا تھا کہ مخالفت و موافقت کے تمام قصے ختم ہو گئے اب ہر مظلوم، ہر پریشان حال، ہر مصیبت زدہ کی امداد فرض ہے خواہ اس کا سابق کردار کچھ رہا ہو۔"

اور اس عہد کو مجاہد ملت نے کس طرح پورا کیا اس کے متعلق دو تین واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی بات نہیں ہو سکتی

ٹاؤن ہال امن کمیٹی کا سنٹر تھا امن کی کوشش کرنے والے ہندو مسلمان یہاں تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن جمع ہوتے تھے۔ ایک روز جب خونریزی کا زور شباب تھا ٹاؤن ہال کے چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ بلوائیوں کے ہجوم کے سامنے پولیس اور ہجوم بھی گویا ہتھیار ڈالے ہوئے تھے۔ ہندو دوستوں نے بڑے اصرار سے کہا:

مولانا آپ اور آپ کے ساتھی ہمیشہ قوم پرور رہے ہیں ہماری ندامت کی کوئی انتہا

نہیں رہے گی۔ اگر آپ صاحبان پر آنچ آئی۔ یہ وحشی ہجوم کسی کے بس کا نہیں
ہے یہاں ہمارے تمام حفاظتی انتظامات ناکام ہو چکے ہیں او کھلے میں ایک کیمپ بنایا گیا
ہے وہاں یہ ہجوم نہیں پہنچ سکتا وہاں فوجی دستے لگا دیے گئے آپ اور آپکے ساتھی
وہاں تشریف لے چلیں آپ حضرات کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

اس نازک وقت میں جب موت سامنے کھڑی تھی ہندو دوستوں کی یہ اپیل کس قدر مؤثر ہو سکتی تھی۔ آپ خود اپنے دل سے پوچھیے کیا آپ اس وقت اس اپیل پر لبیک نہ کہتے؟ اس وقت آپ کے ساتھ اور رفقاء بھی تھے، مگر سب سے پہلے جس نے تڑخ کر جواب دیا وہ مجاہد ملت عالی حوصلہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

ہمارے لیے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم
پناہ گزین بن کر رہیں بے شک یہ سخت آزمائش ہے مگر اس میں ڈٹ کر اس بحران کا سامنا کرنا ہے ع
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید[1]

ایک دفعہ مولانا شہر کا گشت لگا رہے تھے۔ اچانک دیکھا کہ کچھ نہتے مسلمان کسی مومن کی نماز جنازہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے۔ مولانا تیزی سے اس مقام پر پہنچے تو صف بندی ہو چکی تھی۔ مولانا کی نظر اچانک سامنے پڑی تو دیکھا کہ چند فوجی اسلحہ سے لیس چلے آ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی صف باندھے دیکھ کر فوجیوں نے گولی چلانے کا ارادہ کر لیا اور بندوقیں سیدھی کر لیں۔ اگر چند لمحے اسی طرح بیت جاتے تو ان میں سے کوئی بھی نہ بچتا۔ مولانا اس منظر کو دیکھ کر موٹر سے کودے اور آناً فاناً ان درندے فوجیوں کے سامنے جا چکے اور گرج کر پوچھا۔ "ان نہتے مسلمانوں پر گولی چلانے کا تمہیں کس نے اختیار دیا ہے"...... مولانا کی پُر وقار آواز کانپ رہی تھی۔ قومی غیرت اور حمیت کے جذبات نے ان کو فرشتہ بنا کر بھیجا تھا۔ فوجی مولانا کی اس بے باکی اور غیر معمولی شجاعت پر حیران رہ گئے ان میں سے کسی نے کہا کہ یہ سب مسلمان مل کر ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں مولانا نے فرمایا کہ:

حفظ الرحمٰن کی زندگی تک ممکن نہیں

کیا یہ نہتے مسلمان جن کے سامنے ایک بھائی کا جنازہ رکھا ہے تم پر حملہ کر سکتے ہیں اگر تم چاہتے
ہو کر مسلمانوں کے خون سے اس طرح ہولی کھیلو تو یہ حفظ الرحمٰن کی زندگی تک ممکن نہیں میں
ہرگز یہ نہیں ہونے دوں گا۔

مولانا کے آہنی ارادے نے ان وحشیوں کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔[2]

کنور مہندر سنگھ آئی۔ اے۔ ایس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنگرور لکھتے ہیں:

"۱۹۴۷ء کے فسادات کے فوراً ہی بعد جب میں دہلی میں بطور مجسٹریٹ تعینات تھا۔ ان دنوں مجھے وقت بے وقت دہلی کے گلی کوچوں میں گشت کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھار مولانا بھی ہمراہ ہوتے

میں اکیلا ہی جاؤں گا

---

[1] مجاہد ملت از مولانا سیّد محمد میاں "الجمعیۃ" ص ۶۳

[2] "غم گسار قوم" از مولانا محمد منظور نعمانی "مجاہد ملت نمبر" ماہ نامہ "مشرب" دیوبند

تھے ــــــ جو شخص اپنے عقائد کا پکا ہو بہادر بھی ہوا کرتا ہے اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کیے ہیں مولانا بھی اپنے دھن کے پکے تھے اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ میں گھبراتے نہیں تھے میں نے ان کو کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹتے دیکھا۔ ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا میں پولیس لے کر فوراً موقعہ پر پہنچا۔ دیکھا کہ مولانا پہلے ہی وہاں موجود ہیں میں نے گزارش کی کہ اب آپ تشریف لے جائیے میں یہاں کی دیکھ بھال کرلوں گا میں نے ہر چند چاہا کہ پولیس ساتھ کر دوں تاکہ مولانا کو گلی قاسم جان تک پہنچا آئے، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی جاؤں گا میں نے تعمیل حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کے لیے بھیج دیا۔ مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جان کی طرف چل پڑے بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو میں آہستہ سے ان کے پیچھے ہو لیا تاکہ راستے میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آ جائے۔ مولانا کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سرمایہ تھی جسے ہم کسی قسم کے خدشہ میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے اس واقعہ کا ذکر آج پہلی بار کر رہا ہوں مولانا کو بھی اس کا علم نہ تھا۔[۱]

مجاہدِ ملت کے تین خاص وصف

مجاہدِ ملت کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے تین جوہر ایسے عطا فرمائے تھے جنہوں نے مجاہد ملتؒ کو ملک و ملت کا بہترین رہنما بنا دیا اور جن کی وجہ سے نہ صرف ان کی شخصیت ابھری بلکہ ہندوستانی مسلمانوں نے ان کی ان صفات اور شخصیت سے حیاتِ تازہ کا پیام پایا ورنہ ہندوستان میں ان کی حیثیت غلامانہ ہو گئی تھی۔ مولانا کے یہ تین جوہر تدبر، جرأت اور خطابت تھے۔ تدبر سے تقاضۂ وقت سمجھ کر جرأت سے عملی قدم اٹھاتے اور قوت بیان سے سمجھاتے تھے۔

مجاہدِ ملت کا حسنِ تدبر اور گاندھی جی

مجاہدِ ملت اور ان کے رفقاء کا تعارف گاندھی جی سے پہلے سے تھا۔ جیسے ہی گاندھی جی نواکھالی اور کلکتہ سے واپس ہو کر دہلی پہنچے۔ مجاہد ملت کا حسن تدبر تھا کہ آپ نے اپنے پرانے تعلقات کو از سرِ نو تازہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کو پختہ کر کے ایسا اعتماد حاصل کر لیا کہ گاندھی جی حکومت کے سربراہوں اور کانگریس کے بڑے ہندو لیڈروں پر بھی اتنا اعتماد نہ کرتے تھے جتنا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ان کے ساتھیوں پر گاندھی جی ۹ ستمبر ۴۷ء کو دہلی پہنچے تو فرقہ پرستوں نے ان کی اتنی مخالفت کی کہ انھیں اپنی پرارتھنا کی مجلسوں میں ترمیم کرنا پڑی، مجاہد ملت جو فرقہ پرستی کے خلاف نبرد آزما تھے گاندھی جی کے دست راست بن گئے مجاہد ملت کو سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی رفاقت و معیت حاصل تھی۔ بلکہ عجیب و غریب حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد سعید جو چند سال سے قلب کے مرض میں مبتلا تھے۔ نقل و حرکت سے معذور ہو کر تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مجاہد ملت نے ان کو کنج عزلت سے نکالا بلاشبہ سحبان الہند کا خود اپنا جذبہ اور ان کے قلب بیمار کی بھی تڑپ تھی کہ انھوں نے مجاہد ملت کی دعوت پر لبیک کہا اور ضعف و نقاہت کے باوجود مولانا کا ساتھ دینے کے لیے گوشۂ عافیت سے نکل آئے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں اس وقت تک کوئی گاڑی نہ تھی دلی کے مشہور تاجر حافظ محمد نسیم صاحب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی وہ صبح گاڑی لے کر دفتر پہنچ کر مجاہد ملت کو ساتھ لے کر مولانا احمد سعید کے پاس جاتے وہاں ایک مشہور صحافی سید محمد جعفری سابق ایڈیٹر "ہمدرد ملت" بھی وہاں موجود ہوتے یہاں سے پھر چاروں حضرات گاندھی جی کے پاس جاتے اور ان کو شہر کے صحیح صحیح حالات بلا کم و کاست روزانہ سناتے۔ شروع شروع میں گاندھی جی نے اپنے طور پر دوسرے اسباب و ذرائع سے بھی حالات کا جائزہ لیا اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ یہ حضرات مجھے بالکل صحیح حالات سے روشناس کراتے ہیں تو پھر ان پر اتنا اعتماد کرنے لگے کہ وزیر داخلہ سردار پٹیل باوجود پوری کوششوں کے انکے اس اعتماد کو ختم نہ کر سکے۔[۲]

---

[۱] "میرے مشاہدات" از کنور مہندر سنگھ۔ [۲] "مجاہد ملت نمبر" الجمعیۃ دہلی ص ۱۵۹

کانگریس کے لیڈر فسادات کے بارے میں مختلف جذبات رکھتے تھے۔ جن کی بناء پر گاندھی جیسی مہاتما شخصیت کی کوشش بھی ناکام ہوئیں، ایک دفعہ مجاہد ملت نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا کو ہنگاموں اور فسادات کے متعلق شکایات کیں اور گاندھی و نہرو کا نقطہ نظر اور منشا سمجھانے کی کوشش کی تو مسٹر رندھاوا نے فوراً تیوری بدل کر جواب دیا ——— ہمارا تعلق سردار پٹیل سے ہے اور وہ ہمارے کام سے مطمئن ہیں ——— تاہم گاندھی جی کا اثر و رسوخ بھی معمولی نہ تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام لاچاریوں اور بے بسیوں کے باوجود جمعیۃ علماء کے کارکن حاوی تھے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے افسر طنزاً کہا کرتے تھے کہ دہلی میں حکومت جمعیۃ علماء کی ہے۔

جدوجہد کی مختلف صورتیں

مجاہد ملت نے کارپردازان حکومت کے دروازوں پر دستک دے کر ان کو آرام گاہوں سے نکالا کو جھنجوڑا، اور ان سب کی بے نیازی و بے اعتنائی ختم کر کے ان کو مسلمانوں کی امداد و اعانت پر آمادہ بے شمار خاندان متفرق محلوں میں موت کے منہ میں پھنس گئے تھے ان کو انہی بے نیاز ممبروں کے ذریعہ تباہی سے بچایا۔ بارہا ایسا ہوا کہ پولیس فراہم نہ ہو سکی تو بنام خدا اس موت کے منہ میں مجاہد ملت خود کود پڑے اور زندگی سے مایوس انسانوں کو یاس و ناامیدی کی ظلمت سے نکال کر محفوظ پر پہنچایا۔ قدرت باری تعالیٰ حضرت مولانا کی محافظ و نگران تھی حضرت مولانا چونکہ مسلمانوں کے لیے اپنا سب کچھ وقف کر چکے تھے اور وہ دہلی میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سہارا تھے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ مسلمانوں کا تحفظ کر رہے تھے۔ لہٰذا مولانا کو کوئی گزند نہ پہنچا حالانکہ شہر مسلمان شہید ہوئے۔ مجاہد ملت کی ہمت مردانہ اور استقلال و استقامت دیکھ کر بے شمار کارکن بھی اسی راہ پر چل نکلے اور انہوں نے خطر مجاہد ملت کی طرح جان توڑ کر مسلمانوں کی خدمت کی۔ یہ حضرت مولانا کی معنوی و حسی کرامت تھی۔

مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے مجاہد ملت نے اپنے مذہبی مسلک اور عقیدہ کو معیار نہیں بنایا کسی جگہ سنت اور بدعت نہیں تھا، بلکہ سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کے شہری حقوق بحال کیے جائیں، ان میں تعزیے کی رسمیں، عرس وغیرہ بھی آتے تھے۔ بلکہ بعض پر نہ صرف خود گئے بلکہ گاندھی جی کو بھی ساتھ لے گئے۔ حکومت نے اہتمام کیا کہ حسب سابق تعزیے بنائے جائیں اور باضابطہ جلوس نکلیں تعزیوں اور عرسوں کے متعلق مسلک دیوبند ڈھکا چھپا نہیں ہے، لیکن مجاہد ملت ان دنوں تمام مسلمانوں کے حقوق کے تھے ہندوستان کی تمام درگاہوں اور خانقاہوں کی حفاظت کا انتظام کروایا۔ اجمیر، سرہند، بسی، قطب شریف (یعنی درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ) تمام جگہوں کے متعلق مخلصانہ کوششیں کیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شاہ افغانستان نے پنڈت جواہر لال نہرو کو حضرت مجدد کی خانقاہ کے متعلق تار دیا تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے منصب اور شخصیت سے کام لے کر ان تمام امور میں دلچسپی لے رہے تھے لیکن عوامی سطح پر جس نے سب سے زیادہ کوشش کی وہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات گرامی قدر ہے۔ قطب صاحب کا معاملہ پیچیدہ تھا کیونکہ مہرولی جہاں یہ درگاہ ہے ایک لاکھ شرنارتھی مغربی پنجاب وغیرہ سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ خانقاہ کا کونہ کونہ ان سے ہوا تھا۔ اس خانقاہ کو خالی کرانا ایک لاکھ شرنارتھیوں سے ٹکر لینا تھی اور ان سے ٹکر لینا تمام ہندوؤں کو مشتعل کرنا تھا تاہم اس کے کوشش کی گئی۔ سردار پٹیل کی ڈیوڑھی پر بار بار گئے چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر سے التجائیں کیں، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر گاندھی جی کا گیا بلکہ ان کو شیشہ میں اتار لیا گیا۔ مولانا احمد سعید صاحب روزانہ حضرت قطب صاحب کے حالات گاندھی جی کو ایسے انداز میں سناتے کہ وہ متأثر بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے دہلی شہر میں فسادات روکنے اور مسلمانوں کی جان و مال محفوظ کرنے کی خاطر ۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو جب رکھا تو برت کھولنے کی آٹھ شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ قطب صاحب کی خانقاہ مکمل طور پر خالی کرائی جائے۔ جب گاندھی جی کا

ہوگئی اور خانقاہ خالی ہوگئی تو عرس میں چند دن باقی رہ گئے تھے، چنانچہ ان حضرات کی بلیغ کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی نے عرس میں شرکت کی خواہش کی اور ان حضرات نے بھی اس کو حالات کے مناسب سمجھا اور گاندھی جی نے شرکت کی۔

پانی پت میں مسلمانوں کی امداد پانی پت میں تقریباً تیس پینتیس ہزار افراد کے متعلق (بھارگو حکومت) اخراج کا فیصلہ کر چکی تھی، مگر وہ لوگ رہنا چاہتے تھے۔ مجاہدِ ملت یہاں گاندھی کو دو دفعہ لے کر گئے اور فضا ہموار کرنے کی کوشش کی، لیکن افسوس کہ وہاں کے مسلمان استقلال کا ثبوت نہ دے سکے۔

میوات کا مسئلہ ریاست الور اور بھرت پور کی ریاستوں کی کھلی ہوئی یہ پالیسی تھی کہ وہ مسلمانوں کا نام و نشان ختم کر دیں اور اس پر عمل شروع کر رکھا تھا۔ یہاں کے مسلمانوں میں زیادہ تعداد میواتیوں کی تھی ان ریاستوں کی حدود ضلع گوڑ گانواں سے ملتی تھیں یہاں بھی کافی میواتی مسلمان موجود تھے تقسیم سے قبل مسلمان میو اور ہندو جاٹ یہاں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے۔ لیکن پھر ان میں ایسی حیرت انگیز صلح ہوگئی کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات بھی ان کے اتحاد کو ختم نہ کر سکے، لیکن تقسیم کے بعد ان ریاستوں کے حکمرانوں نے میواتیوں اور مسلمانوں کے جبراً اخراج کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے قتل عام شروع کر دیا۔ اگرچہ میواتیوں کی آدھی تعداد ترکِ وطن کر گئی تھی۔ مگر باقیماندہ تقریباً تین لاکھ اپنی ثابت قدمی اور مضبوطی کے باوجود کسی پشت پناہ اور دستگیر کے محتاج تھے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ الور اور بھرت پور کی ریاستوں کے علاوہ مشرقی پنجاب کی بھارگو حکومت اور مرکز میں سردار پٹیل ہوم منسٹر کا منصوبہ یہ تھا کہ راجدھانی دہلی سے ملے ہوئے علاقے کو "شدھ" کر لیا جائے کہ اس محفوظ علاقے پر مسلمان کا سایہ بھی نہ پڑ سکے اس علاقہ میں خشک پہاڑیاں ہیں وہ اکثر مواقع پر میواتیوں کے لیے پناہ گاہ بن جاتی تھیں۔ مگر اس موقعہ پر وہ بھی پناہ گاہ نہ بن سکیں ان کو کوہِ استقلال کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مجاہدِ ملت کی صورت میں یہ کوہِ استقلال نمودار ہوا آپ نے متعدد مرتبہ اس علاقے کا دورہ کیا۔ رفیقوں کو بھیجا۔ گاندھی جی کے یہ بات ذہن نشین کرائی۔ کہ گاندھی جی نے ان میواتیوں کو اپنی جگہ آباد کرانا اپنا نصب العین بنا لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ گاندھی جی نے کانفرنس میں کھلے اجلاس میں کہا کہ "میواتی بھارت کی ریڑھ کی ہڈی اور ہمارے ملک کا گاڑھا خون ہیں میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ وطن کا گاڑھا خون اس کے بدن سے نکال دیا جائے"
ان کے متعلق کانفرنس ہوئی جس میں مولانا حفظ الرحمٰن کے مشورہ پر کثیر تعداد میں میواتی شریک ہوئے۔ گھاسیرہ مقام پر اس کانفرنس میں پنجاب کے چیف منسٹر گوپی چند بھارگو بھی شریک ہوئے لیکن ان کی تقریر گاندھی کو مطمئن نہ کر سکی۔ گاندھی نے حکومت کے ذرائع سے علیحدہ ہو کر اپنے خاص ورکروں کو اس علاقہ میں لگایا جو کئی سال تک یہاں کام کرتے رہے گاندھی کے مشہور چیلے ونوبھاوے نے گاندھی جی کے حکم سے پورے علاقے کا دورہ کیا جو مسلمان ہندوؤں کی دہشت کی وجہ سے ہندو ہو گئے تھے ان کی چوٹیاں کٹوائیں اور یہ سب کچھ نتیجہ تھا مولانا حفظ الرحمٰن کی اس سعی بلیغ اور جدوجہد مشکور کا جس کا اوپر ذکر ہوا۔

اسپیشل ٹرینوں کا انتظام دہلی کے علاوہ یوپی وغیرہ دوسرے صوبوں کے ہزاروں بلکہ تقریباً ایک لاکھ مسلمان جو نہ دہلی والوں سے زیادہ واقف تھے نہ ان کو یہاں کی چور گلیوں اور کوچوں کی خبر تھی وہ اپنے آپ کو جب حوادث کے ان طوفانی حوادث میں گھرا ہوا پاتے تو اپنی موت سے زیادہ غریب الوطنی اور اپنے عزیزوں سے جدائی کا صدمہ ان کے ہوش گم کر دیتا تھا مجاہدِ ملت نے اصرار کر کے حکومت کی طرف سے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔ جب یہ لوگ اپنے اپنے مقامات پر پہنچے تو ان کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ یاد آ گیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو شکمِ ماہی سے صحیح سالم نکالا تھا۔

مجاہد ملت کا منتہائے نظر صرف یہی نہیں تھا کہ مسلمانوں کی جانیں بچ جائیں اور ان کے مال محفوظ رہ جائیں

شیرازہ بندی مسلم پراگندہ

آپ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے وطن میں مساویانہ حیثیت سے باعزت شہری بن کر رہیں۔ یعنی جس طرح وہ اپنے جان و مال، عزت و آبرو کی طرف سے مطمئن ہوں اسی طرح ان کو اپنی تہذیب اپنے مذہب اور اپنے مذہبی مراسم کی طرف سے بھی اطمینان ہو کہ یہ سب محفوظ ہیں اور ان کو آزادی ہے کہ جس کام کو وہ مذہبی کام سمجھتے ہیں اس کو آزادی سے کرتے رہیں جس طرح پہلے کیا کرتے تھے

پاکستان کا ہر ایک حامی نہ صرف مصیبت زدہ اور مایوس تھا۔ بلکہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا تھا غداری کا ایک عام الزام پاکستانی شرنارتھیوں اور ہندو فرقہ پرستوں کی گرجتی ہوئی کرخت آوازوں کے ساتھ ان کے سر تھوپا جارہا تھا۔ ان حالات میں تمام قوم پرور مسلم رہنماؤں کے سامنے خود اپنے متعلق ایک سوال تھا۔

"وہ ہندوستان میں رہیں تو کس حیثیت سے خود ان کی پوزیشن کیا ہو اور عام مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو بالخصوص ان مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو جو پاکستان کے حامی تھے"

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد سحبان مولانا احمد سعید صاحب دہلوی اور ان سے وابستہ حضرات سب ہی نے ان سوالات کا باعزم و ہمت اور بلند حوصلہ کے ساتھ سامنا کیا مگر جس شخصیت نے سب سے زیادہ اس میدان میں کام کیا اور اپنی زندگی اسی مقصد اور نصب العین کی خاطر تج دی اور عوامی لیڈر کی حیثیت سے سب سے زیادہ جرأت اور ہمت کے ساتھ ان سوالات کو حل کیا بلکہ جس نے حل کردہ منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے جان کی بازی لگا کر شب و روز کے ہر ایک لمحہ کو اپنی جدوجہد سے جاوید بنادیا وہ یہی مرد مجاہد تھا جس کو اس کی قوم نے بجا طور پر مجاہد ملت کا خطاب دیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ہندوستان ہمارا وطن ہے یہ ہماری روایات کا مخزن اور ہماری تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے اسکی درودیوار پر ہماری ہزار سالہ تاریخ کے نشانات کندہ ہیں اگر پنڈت جواہر لال نہرو کو یہاں رہنے کا حق حاصل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں جیسا ہمارا حق بھی اس سرزمین پر نہ ہو۔ وطن عزیز پر بہت سے حوادث آتے ہیں ایک حادثہ وہ تھا کہ برطانوی سامراج یہاں مسلط تھا ایک حادثہ یہ کہ ہندو واریت کا دیو حملہ آور ہو رہا ہے۔ اگر ہم نے تمام مجبوریوں اور لاچاریوں کے ساتھ برطانوی سامراج کے مظالم کا مقابلہ کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندو جبر و فرقہ پرستی کے مقابلہ میں مرد بہادر نہ بنیں اور مرعوب ہو کر وطن عزیز کو خیرباد کہہ دیں۔

ہمیں یہیں رہنا ہے اور باعزت طور پر ان تمام حقوق کے ساتھ رہنا ہے جو ایک باعزت شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ بیشک ہم مظلوم ہو سکتے ہیں مگر غلام نہیں بن سکتے اگر ہم نے برطانیہ کی غلامی برداشت نہیں کی تو ہم اکثریت کی غلامی بھی برداشت نہیں کر سکتے ہم آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں رہیں گے اور نہ صرف حفظ الرحمن ابوالکلام نہ صرف قوم پرور مسلمان بلکہ وہ کروڑوں مسلمان جو ہندیونین میں ہیں سب باعزت شہری کی حیثیت سے رہیں گے۔ پاکستان بن چکا۔ اس کی حمایت اور مخالفت کا سوال بھی ختم ہو گیا۔ اب ہندیونین کے تمام مسلمان ایک کشتی کے سوار ہیں ایک کی تکلیف

سب کی تکلیف ایک کی ذلت سب کی ذلت۔

یہ تھے وہ تصورات اور جذبات جن کو مجاہد ملت نے اپنایا اور جن کے لیے اپنی تمام کوششوں کو صرف فرما دیا۔۔۔۔۔وطن دوستی قوم پروری اور حقوق شہریت میں مساویانہ حیثیت حاصل کرنے کے جس بلند نظریہ کے ساتھ دہلی میں کام کیا گیا اور جس طرح مسلمانان دہلی کے ذہنوں کو احساس کہتری سے محفوظ رکھا گیا۔ ضرورت تھی کہ انھیں جذبات اور نظریات پر ہندیونین کے مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور قیامت خیز ہنگاموں نے جو خوف وہراس عام مسلمانوں میں پیدا کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ احساس کہتری میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنے متعلق غلامی کا فیصلہ کرلیں۔ ضرورت تھی کہ اس پست احساس کی کمائی ان کے ذہنوں سے صاف کی جائے ان مسلمانوں کے لیے ایسی روشنی کی ضرورت تھی جو گم گشتہ راہ کی سراسیمگی ختم کرکے ایک معین راستہ کی نشاندہی کر سکے۔

لکھنؤ کانفرنس اس میں شک نہیں کہ ہند یونین کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی اس عمومی حالت کے احساس نے سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کو متحرک بنایا چنانچہ آپ نے پورے ہندوستان کے ممتاز مسلم رہنماؤں کی ایک خصوصی کانفرنس ۱۲ نومبر ۴۷ء ۱۹ کو دہلی میں طلب کی جبکہ ۱۵ نومبر ۴۷ء ۱۹ کو کانگریس کا اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا جس میں فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تنظیمات کے خلاف تجویز منظور ہونے والی تھی۔ اس کے بعد کل ہند پیمانہ پر ایک عام کانفرنس لکھنؤ میں طلب فرمائی جو آزاد کانفرنس کے نام سے اب تک مشہور ومعروف ہے مگر جہاں تک عملی جد وجہد اور انتظامات کا تعلق ہے چونکہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن نے دست راست بلکہ پیکر عمل بن کر کام کیا۔ اس لیے ان دونوں کانفرنسوں کی کامیابی کا سہرا بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت ہی کو آراستہ کرتا ہے۔ نومبر ۴۷ء ۱۹ کو فسادات کا دور شباب تو نہیں کہا جاسکتا مگر دہلی میں خون مسلم کی کوئی قیمت اب تک بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ خاص انتظام کے بغیر گلیوں اور کوچوں میں کوئی شخص اپنی جان پر کھیل کر ہی گزر سکتا تھا۔

دہلی جنکشن اب بھی غیر محفوظ تھا خود پلیٹ فارموں پر سخت سے سخت جانی اور مالی حادثے پیش آجاتے تھے دہلی کے پرخطر حدود میں داخل ہونے سے پہلے آنے والے مدعوین کا اس طرح استقبال کیا جاتا کہ وہ حفاظت کے ساتھ اپنے تجویز کردہ قیام گاہ تک پہنچ سکیں یا قیام گاہ سے چل کر بحفاظت تمام کانفرنسوں میں شرکت کرسکیں پھر اس پریشانی کے دور میں فرائض مدارت انجام دینا بہت ہی خطرناک اور پریشان کن خدمت تھی جس کو نہایت بلند آہنگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ مجاہد ملت نے اپنے مخلص رفقاء کی مدد سے انجام دیا جمعیۃ علمائے ہند کے کچھ رضا کاروں کو اسپیشل پولیس کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ ان کو بندوقیں بھی دے دی گئی تھیں۔ یہ مسلح دستے حضرت مجاہد ملت کے زیر کمان ہر ایسے موقع پر فرائض حفاظت انجام دیتے تھے انتہا یہ کہ قبرستان تک مسلمانوں کا پہنچنا مشکل ہوتا تھا تو یہی دستہ جنازہ کے ساتھ جاتا تھا۔ ہفتہ میں دو یا تین بار اس دستہ کو جنازہ پہنچانے کی ڈیوٹی لامحالہ انجام دینی پڑتی تھی۔ یہ رضا کار اور کچھ اور ساتھی غازی آباد بھیج دیے گئے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو غازی آباد اتار لیا جاتا تھا اور وہاں سے جیپ کار یا موٹروں کے ذریعہ محفوظ راستوں سے نکال کر قیام گاہوں پر پہنچایا جاتا تھا

لکھنؤ میں یہ کانفرنس آزاد کانفرنس ۲۷ دسمبر ۴۷ء ۱۹ کو ہونے والی تھی۔ دہلی کی اس وقت یہ حالت تھی کہ صرف ریلوے جنکشن پر ہزاروں شرنارتھی پورا پورا اثاث البیت لیے ہوئے قیام پذیر تھے۔ اثاث البیت کے انباروں نے تمام پلیٹ فارموں کو گودام بلکہ خطرناک گھاٹیاں بنا رکھا تھا پلیٹ فارم پر گزرنا ہر ایک کے لیے مشکل تھا مگر خاص طور پر مسلمانوں کے لیے حد درجہ مخدوش تھا خنجر زنی کے واقعات رات دن ہوتے رہتے تھے۔

لکھنؤ کانفرنس میں دہلی سے نمائندگان کی بڑی تعداد جانے والی تھی تو اس وقت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی جد وجہد نتیجہ خیز ثابت ہوئی کہ ان کے لیے اسپیشل ٹرین کا انتظام کیا گیا۔ پولیس کا ایک دستہ ٹرین کے ساتھ کیا گیا۔ دہلی جنکشن کے جس پلیٹ فارم سے یہ اسپیشل ٹرین روانہ ہونے والی تھی۔ وہاں

پولیس کا خاص انتظام کیا گیا۔ ان تمام انتظامات کو مولانا آزاد کے اثر و رسوخ نے آسان کیا مگر ضرورتوں کا نقشہ تیار کرنے والے پھر اس میں عمل اور کردار کا رنگ بھرنے والے مجاہد ملت تھے رحمہ اللہ دہلی کے علاوہ اور علاقوں میں یہ دشواریاں نہیں تھیں۔ چنانچہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے تقریباً ایک لاکھ مدعوین اور ارکان و نمائندگان نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

حضرت مولانا آزاد کی تقریر صدارت یقیناً ایک تاریخی تقریر تھی۔ مگر جس نے مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور کر کے اعلیٰ نصب العین کی روشنی دکھلائی اور ایک بلند ترین مقصد کا عزم ان کے ذہنوں میں برانگیختہ کیا وہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تقریر تھی اسی پر کامیابی کا کریڈٹ آپ کو دیا گیا۔

آزاد کانفرنس لکھنؤ

بہرحال ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ کانفرنس لکھنؤ میں کی گئی سہمے ہوئے مسلمانوں نے اس کانفرنس کو پیغام زندگی کیا اور ملک کے تمام گوشوں سے سفر کر کے اس کانفرنس میں شریک ہوئے مسلمانوں کا اس سے بڑا اجتماع نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ اس کے بعد آج تک دیکھا گیا۔ یہ کانفرنس اصولی اور بنیادی طور پر اس بات کی ضمانت تھی کہ مسلمانوں کا دامن فرقہ واریت سے پاک اور وہ ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر ترقی پذیر عنصر کی حیثیت سے ملک کی خدمت کے لیے آمادہ ہیں۔ اس کانفرنس میں فرقہ واریت کے خطرات سے ملک کو آگاہ کیا گیا۔ صوبائی حکومتوں سے فرقہ واریت کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ کہ وہ فرقہ پرور عناصر سے اپنے نظام کو پاک کر کے فرقہ وارانہ جمہوریت کو کامیاب کرنے کی طرف تیزی اور مستعدی سے قدم بڑھائیں اس کانفرنس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے دامن ان تمام دھبوں کو دھویا گیا جو فرقہ پرستوں کی طرف سے لگائے جارہے تھے۔ اس کے بعد خوف و ہراس اور احساس کمتری کے باقی رہنے کے معنی نہیں تھے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تقریر

کانفرنس کے آخری اجلاس میں جمعیۃ علمائے ہند کے ترجمان مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے کانفرنس کی کارروائی اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ولولہ انگیز اور تاریخی تقریر فرمائی۔ مسلمانان ہند کے ایک لاکھ نمائندوں نے جب یہ تقریریں سنیں اور کانفرنس کے دو روز کی کارگزاری کا مشاہدہ کیا۔ اس تجویز پر غور و خوض کیا تو پھر وہی شخص خوف زدہ اور ہراساں رہ گیا جو بزدل تھا۔ یا جس کے دل میں کھوٹ تھی جمعیۃ علماء ہند کے ارکان نے پورے ملک میں دورے کر کے کانفرنس کے حیات بخش فیصلوں کو ہر سننے والے کان تک پہنچایا اور ان کروڑوں مسلمانوں کو جو مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ اطمینان بخش روشنی سے آشنا کیا

مجاہد ملت معمار سیکولرازم

اگر جمہوریت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر ایک باشندہ ملت شہری حقوق میں مساوی درجہ کا مالک ہو ہر ایک فرد کو رائے اور فکر کی آزادی حاصل ہو۔ مذہبی آزادی کے ساتھ اس کو یہ بھی حق ہو کہ اپنے کلچر، اپنی تہذیب و تمدن اور روایات کو زندہ رکھ سکے جہاں تک ممکن ہو ترقی دے سکے تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے مساویانہ شہری حقوق کے مستحق ہوں، جمہوریت کا لازمی تقاضہ یہ بھی ہوگا کہ نظام حکومت "سب مذہبی" ہو یا لا مذہبی لادینی ہو۔ جبکہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں بہت سے فرقے اور بہت سے مکتبہ خیال موجود ہوں تو "سب مذہبی نظام حکومت" ناممکن العمل بھی ہوگا اور اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کے بجائے تقسیم در تقسیم اور انتشار در انتشار پیدا کر دے گا۔ وطنی اور ملکی امور میں یک جہتی صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ مذہبیات سے الگ حکومت اور سیاست کا تعلق صرف ملکی امور سے ہو مذہبی معاملات میں حکومت قطعاً غیر جانبدار رہے، نہ کسی مذہب کی پشت پناہ بنے

نہ کسی کی مخالف۔ لادینی حکومت کا یہی مطلب ہے جس کو سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات میں ہندو فرقہ واریت کے مقابلہ میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے پھر جیسے جیسے فسادات کے آتش فشاں شعلہ بار ہوئے۔ مجاہد ملت کی سرگرمیاں ان کے مقابلہ میں بڑھتی رہیں، یہاں تک کہ وہ شعلے سرد پڑے اور وہ سیلاب پایاب ہوا۔ ظاہر ہے وہ ہندیونین میں سیکولرزم ہی کے حامی ہو سکتے تھے۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء میں جب ہندستان کا دستور اساسی منظور کیا جا رہا تھا فرقہ پرست طاقتوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ جب اسلامی حکومت کے نام پر پاکستان بنوایا گیا ہے تو لامحالہ ہندیونین ہندو حکومت ہو۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے باقاعدہ ممبر تھے۔ ایک سب کمیٹی کا ممبر آپ کو بنالیا گیا تھا، مگر آپ کی تمام سرگرمیاں ان کو کمک پہنچانے میں صرف ہوتی رہیں جن کو بانیٔ سیکولرزم کہا جا سکتا ہے یعنی مسٹر گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند۔

اس ماحول میں کہ فرقہ واریت شباب پر تھی اور ہر طرف فرقہ وارانہ جذبات کا دیو رقص کر رہا تھا۔ سیکولرزم کو دستور اساسی کی بنیاد قرار دینا ایک ایسی عجیب بات تھی جس کے لیے مذہب کی زبان میں کرامت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی ظاہری اسباب کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو کامیاب ہو مگر جو نتیجہ ظہور پذیر ہوا وہ اس کے خلاف اور قطعاً غیر متوقع تھا۔ سیکولرزم کا تصور کامیاب ہو سکا یا نہیں یہ ایک مستقل مسئلہ ہے اگر پندرہ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ ناکام ہے تو اس کے اسباب پر بحث کی جا سکتی ہے مگر جہاں تک مجاہد ملت کی مساعی کا تعلق ہے انکی درخشاں پیشانی داغدار نہیں ہو سکتی بلکہ حالات کی نامساعدت اس کو اور زیادہ آبدار بنا دیتی ہے۔ جب نظریات کا تصادم ہو تو اس کا اثر قوی کردار پر بھی پڑتا ہے چنانچہ ایک طرف سیکولرزم کے بانی اور معمار صاحبان کی کوششیں سیکولرزم کو کامیاب بنانے میں صرف ہوتی رہیں تو دوسری جانب فرقہ پرست جماعتوں نے جہاں موقع ملا مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ مسلمانوں کی مظلومانہ تباہی اور بربادی کا صدمہ مجاہد ملت سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے، مگر ہر موقع پر ایک اور صدمہ بھی آپ کے دل و دماغ کو متاثر کرتا رہا یعنی ہر ایک ہنگامہ اور فساد سیکولرزم کی تحریک کے خلاف ایک حملہ ہوتا تھا جس سے منزل دور ہو جاتی تھی۔ مجاہد ملت جیسے حساس مسافر کے لیے دوسری منزل کا صدمہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ چند سال یقیناً ایسے گزرے کہ جذبات جو ۴۷ء میں مشتعل ہو چکے تھے وہی ان ہنگاموں کا سبب ہوتے تھے، لیکن ۵۲ء کے الیکشن میں جب ملک کے عوام نے ۹۵ بلکہ ۹۹ فی صدی ووٹ غیر فرقہ پرست سیاسی جماعتوں کو دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ملک کے عام باشندے اپنا مذہب کچھ بھی رکھتے ہوں۔ وہ فرقہ پرستی کے حامی نہیں ہیں تو اسکے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری عوام پر نہیں ڈالی جا سکتی تھی بلکہ معقولیت پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کا ذمہ دار ان مٹھی بھر غلط کار لیڈروں اور انکے ساتھیوں کو قرار دیا جائے جو بنیادی طور پر سیکولرزم کے مخالف ہیں اور اپنی غلط حرکتوں سے عوام کو گمراہ کر کے ہنگاموں کی آگ بھڑکاتے ہیں، چنانچہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے حکومت کے سربراہوں کو بارہا اس طرف توجہ دلائی۔ بعض سربراہوں سے اس سلسلہ میں تلخ کلامی تک کی نوبت آئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یعنی ۵۳ء ۵۴ء میں اگر صوبائی حکومتوں کے سربراہ معقولیت پسندی سے کام لیتے اور اگر مجاہد ملت کے درد دل کا ایک کرشمہ بھی ان کو میسر ہوا ہوتا تو وہ نتیجہ یقیناً سامنے نہ آتا جو ۵۹ء میں قوم کا سرطان بن کر سامنے آیا۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صوبائی حکومتوں کے ... ت سے ذمہ داروں اور بعض مرتبہ مرکزی حکومت کے بھی بعض ذمہ داروں کی ذہنیت اسی رنگ میں رنگی رہی جو فرقہ پرست جماعت اور اس کے پریس کا خاص مشن تھا۔ انتہا یہ کہ ان خونیں ہنگاموں کو بھی جو ملک کے گوشہ گوشہ میں ہوتے

رہے۔ قوم پرستی ہی قرار دیا۔ بہت سے بہت لفظ "جارحانہ" کا اضافہ کر دیا یعنی فرقہ پرستوں کی ہنگامہ آرائیاں قوم پرستی ہی کا تقاضا ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ جارحانہ قوم پرستی ہے۔ جبکہ مظلوم مسلمان کی آہ و زاری کو بھی فرقہ واریت اور نہ صرف فرقہ واریت بلکہ پاکستانی ذہنیت کا شاخسانہ قرار دیا جاتا رہا۔ مجاہد ملت کا ظرف وسیع اور حوصلہ عالی یقیناً اپنی مثال آپ تھا کہ باوجودیکہ سربراہوں کی یہ مسموم ذہنیت مجاہد ملت کے لیے رات دن کی کڑھن تھی تب بھی سیکولرازم کی حمایت میں اٹھا ہوا قدم تیز سے تیز تر ہو رہا تھا اور ناممکن تھا کہ کوئی لغزش اس قدم میں آئے، لیکن چند سال بعد ہی ذمہ داران حکومت کی اس چشم پوشی کا نتیجہ سامنے آ گیا جب ۵۹ء میں انہوں نے دیکھا کہ خود ان کا ماحول ان کے خلاف ہو چکا ہے اور کار پردازان حکومت کی اکثریت فرقہ واریت کی وبا میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے وقتی ہنگاموں کے بعد جو فسادات گزشتہ پندرہ سال میں ہوئے ان کا شمار ہے ہر فساد کے موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے وفود بھیجے جاتے تھے، اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی امداد کی جاتی تھی، مگر ان وفود میں خود مجاہد ملت شریک نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ اہم مواقع پر مولانا محمد میاں صاحب کو بھیج دیا کرتے تھے، ورنہ اور ساتھیوں کو مامور فرما دیتے تھے، مگر ۵۹ء میں رمضان شریف کے ایام میں مبارک پور اور بھوپال میں ہنگامے ہوئے ان کا جائزہ لینے کے لیے خود مجاہد ملت نے سفر فرمائے۔ روزہ میں مجاہد ملت کی تکلیف بڑھ جاتی تھیں، مگر ان سفروں کے لیے نہ روزہ عذر بن سکا نہ ذیابیطس کی تکلیف راستہ روک سکی۔

۵۷ء کے ہنگاموں میں مراد آباد وغیرہ میں بھی بعض موقعوں پر ثابت ہوا تھا کہ مقامی حکام اور پولیس نے مظلوموں کی بجائے ظالموں کا دست و بازو بن کر کام کیا ہے، مگر واقعات کچھ اس قسم کے تھے کہ حکام کی اس غلط کاری کا عذر قابل تسلیم ہو سکتا تھا، لیکن مبارک پور اور بھوپال کے ہنگاموں نے کھلے طور پر ظاہر کر دیا کہ فرقہ واریت کی وبا سرکاری حلقوں کو بھی یہاں تک متاثر کر چکی ہے کہ بدامنی کے زمانہ میں پولیس بھی وہ کرتی ہے جو فرقہ وارانہ جماعتوں کے والنٹیر اور رضا کار کر سکتے تھے۔

مجاہد ملت کانگریسی حلقوں میں بہت کافی مقبولیت رکھتے تھے۔ کانگریس ان کو الیکشن کے موقعہ پر ٹکٹ دیا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ مقبولیت اور کانگریسی حلقوں میں محبوبیت امیدواروں کی عملی طاقت کو کمزور اور ان کی قوت گویائی کو سلب کر دیتی ہے، لیکن مجاہد ملت کی ہمت عالی اس کمزوری سے پاک تھی، آپ نے خاموشی کے بجائے بے پناہ خطابت سے کام لیا، مبارک پور اور بھوپال وغیرہ کے ہنگاموں پر وہ بیانات دیے، جنہوں نے ان ریاستوں کے چیف منسٹروں کے درمیان ایسا محاذ قائم کر دیا جس کو توڑنے کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کو دخل دینا پڑا۔

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک طرف مجاہد ملت تھے اور دوسری جانب مدھیہ پردیش اور یوپی کے چیف منسٹر اور ان کے حامی۔ صداقت، انصاف اور حقیقت پسندی نے حضرت مجاہد ملت کی قوت خطابت میں استدلال کی بے پناہ طاقت پیدا کر دی تھی، جس نے صرف چیف منسٹر صاحبان کو لاجواب ہی نہیں کیا بلکہ پوری ورکنگ کمیٹی کو مجاہد ملت کی حمایت پر مجبور کر دیا۔ یہ درست ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند کی جماعتی طاقت، اس کی مجلس عاملہ کی تجاویز وہ متعدد ممبران جو مرکزی حکومت کے ارکان اور کانگریس کے ہائی کمان کو بار بار پیش کیے گئے تھے۔ حضرت مجاہد ملت کی پشت پر تھے، مگر یہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں بالخصوص جمعیۃ علمائے ہند کی خوش نصیبی تھی کہ مجاہد ملت کی پرشوکت خطابت اور ناقابل تسخیر قوت استدلال ان کو میسر آئی تھی۔ آج اس قوت و طاقت کے فقدان پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

کنونشن کی تجویز

ہندوستان کے دستور میں اگرچہ ہندوستان کی حکومت کو سیکولر (غیر مذہبی) کہا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام لوگوں میں تو کیا حکومت کے دائرہ کار میں بھی اس کا احترام نہ کیا گیا۔ لوکل باڈیز، اسمبلی پارلیمنٹ وغیرہ سرکاری اداروں میں فرقہ پرستی کی تباہ کاریوں سے آئے دن مسلمان تباہ ہو رہے تھے اور پھر یہ فرقہ پرستی فسادات کی صورت میں ہی ظہور پذیر تھی

تھی، بلکہ ملازمتوں، لوکل باڈیز، صوبائی اسمبلیوں، پارلیمنٹ وغیرہ سرکاری اداروں میں نمائندگی، کاروباری سلسلہ میں لائسنس وغیرہ غرض سماجی سیاسی اور کاروباری زندگی کا ہر ایک شعبہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ چند ماہ تک جمعیۃ علماء ہند کے پیش نظر یہ رہا کہ مسلمانوں اور صاف دماغ سلجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والے ہندو رہنماؤں کا کنونشن طلب کیا جائے پھر مشترک نمائندگی کے ذریعہ حکومت کو اس خطرناک صورتحال سے آگاہ کر کے اس کے علاج کا مطالبہ کیا جائے، لیکن اس میں دشواری یہ پیش آرہی تھی کہ جن ہندو رہنماؤں کو غیر متعصب اور صاف دماغ سمجھا جارہا انکے سامنے بھی صحیح صورت حال نہ تھی کیونکہ وہ انگریزی یا ہندی کے اخبارات پڑھتے تھے اور ان اخبارات میں ان فسادات وغیرہ کی تفصیل ہی نہ آتی تھی اور اگر آتی بھی تھی تو اس میں اکثر جگہ مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا، خود مسلمانوں کا اونچا طبقہ انگریزی اخبارات پڑھتا ہے، دوسرا ذریعہ معلومات ریڈیو ہے تو وہ اخبارات سے بھی زیادہ سنگ دل اور ظالم ثابت ہو رہا تھا، ایسے غیر مسلم رہنماؤں کو کنونشن میں دعوت دینے سے پہلے ضروری تھا کہ پمفلٹوں کے ذریعہ مستقل پروپیگنڈا کر کے پہلے ان کو روشناس کرایا جائے بے شک بعض غیر مسلم رہنما مثلاً دہلی کے جن سے جمعیۃ کا رابطہ رہتا تھا وہ واقف بھی تھے، لیکن وہ پہلے ہی مسلم نوازی میں بدنام ہو چکے تھے۔

یہ مسئلہ ابھی زیر بحث تھا کہ اجین میں جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ اجلاس کا وقت آگیا اور مجاہد ملت نے اس اجلاس عام ہی سے کنونشن کا مقصد پورا کرنا چاہا، چنانچہ اکثر مسلم رہنماؤں کو دعوت دی گئی اور یہ مقصد ایک حد تک پورا ہوا اجلاس میں کھل کر ان حالات پر بحث کی گئی جس پر مدھیہ پردیش کے پریس نے (کہ جہاں یہ اجلاس ہو رہا تھا) بہت کیچڑ اچھالا، لیکن اس اجلاس کے چند روز بعد جبل پور کا حادثہ مسلمانوں کے حق میں بھونچال بن کر رونما ہوا، مجاہد ملت نے پہلے ایک وفد جبل پور بھیجا، پھر خود تشریف لے گئے۔ حالات کا معائنہ کیا اور واپس آنے کے بعد پارلیمنٹ میں ایسی زبردست تقریریں کیں کہ جن سے نہ صرف ہندوستان کے ایوان سیاست میں ہلچل پڑ گئی بلکہ پارلیمنٹ کی صدا پوری دنیا میں گونج گئی، ہندوستان کے مسلمان جو پہلے اخبارات کی زبان سے جبل پور ساگر وغیرہ کے ناتمام حالات سن رہے تھے جب انھوں نے مجاہد ملت کی پارلیمنٹ میں تقریریں پڑھیں تو ان کی شکستہ پائی تیز گامی میں تبدیل ہو گئی اور لاکھوں روپیہ سے ان جگہ کے مسلمانوں کی مالی امداد کی ان فسادات کے بعد کنونشن کی ضرورت و افادیت پھر کھل کر سامنے آئی اور جمعیۃ علماء ہند نے طے کیا کہ غیر مسلم رہنماؤں کو بلانا مشکل ہے لہٰذا تمام ملک سے مسلم رہنماؤں کو بلایا جائے مجلس عاملہ کی تجویز جیسے ہی پریس میں آئی۔ پورے غیر مسلم پریس نے مخالفت میں آسمان سر پر اٹھالیا اور جو لوگ پہلے کنونشن کے لیے مصر تھے ان کا رویہ بھی بدل گیا اور وہ بھی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئے چنانچہ کچھ دوستوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس ڈیپوٹیشن لے جا کر کنونشن کے نقصانات پنڈت جی کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی، سمپورنانند جی چیف منسٹر یو۔ پی اور اجیت پرشاد جین جیسے کانگریسی لیڈروں کی دلیل یہ تھی کہ اس کنونشن سے فرقہ پرستی کو شہ ملے گی وہ بھی اسکا جواب دیں گے، یعنی آج تک فرقہ پرست طاقتیں خاموش اور قطعاً غیر متحرک تھیں اور اب ان میں حرکت پیدا ہو گی ایک ایسا لیڈر جو آج تک مقبول واجب الاحترام اور ہر دلعزیز رہا ہو اس پر جب ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو تو بہت مشکل ہے کہ اسکا قدم لغزش سے محفوظ رہے مگر مجاہد ملت کی لیڈری مصنوعی نہیں تھی، بلکہ آپ کی لیڈری ان جذبات صادق اور مخلصانہ کوششوں کا ثمرہ تھی جو وہ قوم و ملک کے لیے کرتے آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اخلاص صداقت پسندی اور بے پناہ قوت عمل کے ساتھ وہ جرأت اور وہ استقامت آپ کو عطا فرمائی تھی کہ گرد و پیش کی زیادہ سے زیادہ مخالفت بھی آپ کو متاثر نہ کر سکتی تھی اس موقعہ پر آنریبل حافظ ابراہیم (وزیر برق و آب) نے بھی غیر معمولی جرأت و استقامت کا ثبوت دیا پہلے آپ زبانی حمایتی تھے ان دنوں عملی ہمدرد بن گئے۔ آپ نے سرکاری حلقوں کی غلط فہمی کو دور کر کے ان کے اندر بھی حمایت کا جذبہ پیدا کیا، مجاہد ملت کی وفات سے تیسرے روز کارپوریشن کی طرف سے جلسہ تعزیت کیا گیا تو لالہ

بہادر شاستری (جو بعد میں وزیر اعظم بنے) نے اپنی تقریر میں مجاہد ملت کی قوتِ خطابت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کنونشن کے متعلق ہماری رائے اپنی تھی چنانچہ مجاہد ملت سے ایک شب تفصیلی گفتگو کی گئی اگرچہ ہم مطمئن نہیں ہو سکے، مگر مجاہد ملت کو جواب بھی نہیں دے سکے۔

بہرحال مجاہد ملت نے استقلال واستقامت سے ہی نہیں بلکہ حسنِ تدبیر سے ایک طرف پریس کو ہموار کیا۔ انگریزی زبان پر عبور نہ رکھنے کے باوجود انگریزی اخبارات کے نامہ نگاروں، بیرونی ممالک کے نمائندوں کو مطمئن کر دینا آسان بات نہ تھا، لیکن مجاہد ملت نے انکے اعتراضات کے برمحل اور معقول وشافی جواب دے کر نامہ نگاروں کے اطمینان کو گرویدگی کا رنگ دیدیا، اسی طرح صدر کانگریس سنجیوا ریڈی سے گفتگو کر کے انہیں اس درجہ مطمئن کر دیا کہ مخالفت کرنیکے کے باوجود انہیں کہنا پڑا کہ مسلم کنونشن سے جمہوریت اور قومی یکجہتی کے مقصد کو تقویت پہنچے گی

بہرحال کنونشن ہوا اور جس شان سے ہوا اسکا علم صرف شرکا کنونشن کو نہیں بلکہ ہر اس صاحب بصیرت انسان کو ہے جو اخباری دنیا سے واسطہ رکھتا ہے۔ اس کنونشن نے ان سب کو جو سیکولرازم کے حامی تھے ایک مرکز پر متحد کر کے ثابت کر دیا کہ خوفزدہ مرعوب اور پست ہمت کرنے کی پندرہ سالہ کوششوں کے باوجود اس تن مجروح میں قوتِ مقابلہ باقی ہے اور بہترین قیادت کی یہ برکت ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ "تن ہمہ داغ داغ شد" وہ اپنے زخموں سے بے پروا میدانِ زندگی میں آگے قدم بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

دینی مدارس اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی

اپنے دوسرے اہم قومی وملی مسائل اور ہنگامی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو عام تعلیمی سرگرمیوں سے بھی مسلسل شغف رہا، وہ خود دینی مدارس کے تعلیم یافتہ تھے۔ فراغت کے بعد انھوں نے اپنی زندگی ایک استاد اور معلم ہی کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ ابتداءً دار العلوم دیوبند میں بھی، ور پر یا میٹ مدر اور پھر اس کے بعد ڈابھیل، امروہہ وغیرہ میں انھیں علمی خدمت کی کافی سعادت حاصل ہوئی، آزادی وطن کے بعد ان کے قیمتی اوقات کا بڑا حصہ ہنگامی اور وقتی مسائل میں گزرا، لیکن اس دور میں بھی انھوں نے ملت کی جو سب سے اہم تعمیری خدمت انجام دی وہ جمعیۃ علما کے پلیٹ فارم سے ملک گیر پیمانہ پر دینی تعلیم کی مہم برپا کرنا اور مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو الحاد و بے دینی سے بچا کر ان میں دینی حمیت و شعور اور ج ایمانی کا تحفظ و بقا ہی تھا جس کے لیے انھوں نے پورے ملک کے دورے کر کے تحریر و تقریر کے ذریعہ برادران ملت کے شعور کو بی کیا اور وقت کے تقاضوں سے روشناس کرایا۔

دہلی کی تعلیم گاہیں

اس اہم بنیادی خدمت کے ساتھ ساتھ وہ موجودہ دینی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کی ہر ممکن مدد اور سرپرستی بھی برابر فرماتے رہے تقسیم ہند کے بعد دہلی کے مشہور مدارس مدرسہ امینیہ، مدرسہ عالیہ فتح پوری، مدرسہ حسین بخش، مدرسہ مولانا عبدالرب مرحوم نیز فتح پوری مسلم ہائی سکول و دلی کالج اجمیری گیٹ اور اس کا اینگلو عربک ہائی سیکنڈری اسکول، دہلی کی مسلم آبادی کے ساتھ ساتھ ویران ہو کر رہ گئے تھے ان سب مدارس اور تعلیم گاہوں کو نئے سرے سے زندہ کرنے اور باقی رکھنے میں اور ان کی مشکلات کو دور کرانے میں بہت بڑا حصہ حضرت مجاہد ملت کی مسلسل کوششوں کا ہے وہ بذات خود ان تمام اداروں کی مجالس کے رکن رکین اور کار رہے اور اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود ان کی میٹنگوں میں پورے فکر و اہتمام کے ساتھ شریک ہوئے اور ان کے مسائل حل کراتے رہے۔

مدرسہ معینیہ اجمیر

اجمیر کی بربادی کے بعد جہاں درگاہ معلّی حضرت خواجہ اجمیریؒ کے تحفظ اور اس کے انتظامات کی اصلاح کیلیے مولانا مرحوم نے بھرپور کوششیں کیں وہاں مدرسہ معینیہ اجمیر کی نشاۃ ثانیہ بھی حضرت مرحوم کی مساعی جمیلہ کے

سہارے عمل میں آئی، اس مدرسہ کا افتتاح بھی خود حضرت مولانا نے ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو اپنے دست مبارک سے فرمایا اور پھر زندگی بھر اس کے معاملات و مسائل میں مدد فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ تقسیم بنگال کے ہاتھوں کلکتہ کا مشہور مدرسہ عالیہ جو مقامی اصطلاح میں کلکتہ مدرسہ کہا جاتا ہے ختم ہو گیا تھا۔ مجاہد ملت نے حضرت مولانا آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند کو توجہ دلا کر حکومت مغربی بنگال پر زور ڈلایا اور کافی جدوجہد کے بعد اس کا اجراء عمل میں آیا مدرسہ کا تمام اثاثہ لٹ چکا تھا۔ از سر نو اس کی زندگی کے تمام سروسامان مہیا کیے گئے۔ ابتداءً حضرت مولانا کے رفیق خاص "مولانا سعید احمد اکبرآبادی" اس کے پرنسپل رہے۔ بحمداللہ آج مشرقی ہندوستان کا یہ بڑا مدرسہ علوم دینیہ و اسلامیہ کی خدمت گزاری میں مصروف ہے

دوسری درس گاہیں جامعہ قاسمیہ مراد آباد، قدرت ہائی سکول سیوہارہ، مسلم انٹر کالج اٹاوہ اور دوسری کتنی ہی درسگاہوں کو مسلسل حضرت مولانا کی عظیم شخصیت سے فیض پہنچا۔ وہ ایسے متعدد علمی اداروں کے رکن مجلس انتظامیہ رہے اور ہمیشہ ان کی مدد و رہنمائی فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ رام پور، حمیدیہ کالج بھوپال، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ اور بعض دوسری اہم درسگاہیں جو تقسیم ہند سے پہلے سرکاری طور پر مستند اور اسلامی درسگاہیں رہیں اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے مضامین اور دینوی علوم بھی ان کے نصاب میں شامل رہے لیکن تقسیم ہند کے بعد متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ذمہ داران محکمہ تعلیم مسلسل درپے رہے کہ انکے نصاب سے اسلامی و مشرقی مضامین خارج ہو جائیں بلکہ عملاً ان درس گاہوں کے سرکاری استناد ریکوگنیشن کو ختم کر دیا گیا اور مروجہ امداد روک دی گئی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں برسوں ریاستی حکومتوں سے مراسلت اور زبانی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر ان کی قدیم حیثیت کو بڑی حد تک بحال کر دیا گیا۔

دسیوں چھوٹے بڑے دینی مدارس جو ٹونک، ہاپوڑ، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر، امروہہ، بریلی، شاہجہان پور، ہردوئی، مبارک پور، غازی پور وغیرہ میں چل رہے ہیں، اپنے معاملات و مشکلات میں حضرت مولانا مرحوم کی شفقتوں سے فیض یاب ہوتے رہے ان مدارس کے سالانہ جلسوں میں بارہا مولانا مرحوم نے شرکت فرمائی ان کے لیے مالی امداد فراہم کرانے میں بھی کوشش اور سفارش کا بڑا وسیلہ حضرت مولانا ہی کی ذات تھی۔

جامعہ ملیہ دہلی کے عمائدین و سربراہ بھی ۴۷ء کے بعد نئے الجھے ہوئے حالات میں مجاہد ملت کی ملی دردمندیوں سے جامعہ کے معاملات اور مشکلات میں مدد حاصل کرتے رہے اور بالآخر ان کو جامعہ کی با اختیار "مجلس جامعہ" کا کارکن بھی بنا لیا گیا ۵۹ء و ۶۰ء میں جبکہ جامعہ ایک اندرونی کش مکش اور الجھن سے گزر رہا تھا، حضرت مولانا ہی کی سعی و تدبیر نے اس کے لیے مسیحائی کا کام کیا اور ایک بڑے خلفشار سے جامعہ کو نجات حاصل ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ جو ہندوستان کی واحد مسلم یونیورسٹی ہے اور ہماری پچھلی ایک صدی کی عظیم الشان علمی وراثت ہے، لیکن ملکی سیاست میں اس کا ماحول اس کی روایات اور سیاسی رجحانات تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں بالکل بے ربط اور اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ تحریک آزادی کے بالکل آخری دنوں میں علی گڑھ اسٹیشن پر قوم پرور ملکی رہنماؤں اور خاص طور پر حضرت مولانا آزاد اور خود حضرت مجاہد ملت کے ساتھ جو حوادث پیش آچکے تھے ان کی یاد دلوں میں تازہ تھی۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کی صبح اس عظیم درس گاہ کے لیے خطرات و آزمائش کا پیغام بن کر نمودار ہو رہی تھی، مگر یہی دونوں اولوالعزم رہنما تھے جو مسلم یونیورسٹی کے پشت پناہ بن کر سامنے آئے اور ان کی چارہ گری و دستگیری ملک کے نئے حالات میں مسلم یونیورسٹی اور اس کے عزت و وقار کے باقی رکھنے کا وسیلہ ثابت ہوئی

مولانا آزاد نے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کو بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا سربراہ بنا کر بھیجا ادھر شروع ۴۸ء ہی سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے یونیورسٹی کے معاملات و مسائل سے دلچسپی لینی شروع کی اور ہر موقع پر اس کی مدد و رہنمائی میں پیش پیش رہے۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے بھی پورے احترام اور قدرشناسی کے ساتھ حضرت مولانا کے تعاون اور مشوروں کو اپنایا اور یونیورسٹی کی ایگزکٹو اور کورٹ کے معزز رکن کی حیثیت سے مسلسل انکی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کے تنگ نظر حلقے ۴۷ء سے مسلسل مصروف کار رہے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا نام و نشان تبدیل کر کے اس کی مخصوص حیثیت کو ختم کر دیا جائے، حکومت یو پی جس کی حدود میں مسلم یونیورسٹی واقع ہے اس کا رویہ شروع ہی سے بہت ہمدردانہ اور دوستانہ نہیں رہا۔ مرکز میں بھی ایک خاص طبقہ آج تک معاندانہ نکتہ چیں رہا ہے، مسلم یونیورسٹی کا نام بدل دینے کی بحثیں تو بارہا چھیڑی جا چکی ہیں، لیکن ۵۹ء میں ہند پارلیمنٹ تک میں مسلم یونیورسٹی کے خلاف کچھ کوششیں صف آرا ہو گئی تھیں، اس موقع پر تنہا مجاہد ملت کی ذات تھی جو پارلیمنٹ میں مسلم یونیورسٹی کے دفاع اور مدافعت کے لیے سینہ سپر ہوئی، انھوں نے پارلیمنٹ میں ہی ان تمام الزامات سے صاف کرنے کے لیے پوری جدوجہد فرمائی الغرض مسلم یونیورسٹی کے خلاف معاند اور تنگ نظر حلقوں کی ان تمام کوششوں کے تدارک اور روک تھام کے لیے جو سرگرمیاں پچھلے پندرہ برس میں مسلسل عمل میں آتی رہی ہیں اور جن کی بدولت مسلم یونیورسٹی کو تقسیم ہند کے بعد بقاء و استحکام نصیب ہوا حقیقت یہ ہے کہ ان تمام سرگرمیوں کا محور امام الہند مولانا آزاد اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہی رہے۔

دار العلوم دیوبند دار العلوم دیوبند جو ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی و دینی درس گاہ ہے مجاہد ملت نے اسکے دامن فیض سے پرورش پائی تھی۔ مادر علمی کا حق خدمت جس گہرے احساس اور لگن کے ساتھ عمر بھر انھوں نے ادا کیا، ذرہ بڑی سعادت و کرامت تھی جو ان کے حصہ میں آئی مجاہد ملت نہ صرف یہ کہ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے، بلکہ دار العلوم کی فلاح و بہبود ان کے فکر و عمل کا نمایاں عنوان رہی ہے خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد کتنے ہی نئے اور پیچیدہ مسائل سامنے آئے جن کی عقدہ کشائی میں مولانا مرحوم کی باا ثر شخصیت پیش رہی، پاکستان اور دوسرے ممالک سے آنے والے طلبہ کے پاسپورٹ اور ویزا کے نت نئے قوانین نے جب بھی کوئی پیچیدگی اختیار کی، مجاہد ملت ہی کا اثر و رسوخ اس کو حل کرا سکا۔ ابھی آخری دنوں جب دار العلوم پر ناگہانی افتاد نازل ہوئی اور ریاستی حکومت نے بھی اس موقعہ پر غیر ہمدردانہ موقف اختیار کیا، تو مولانا مرحوم ہی تھے جو سینہ سپر ہوتے اور پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں سے دار العلوم کا دامن بے داغ رکھ سکے۔ دار العلوم میں اسلامی ممالک کے سربراہ آئیں یا صدر جمہوریہ ہند ان کے خیر مقدم میں دوسرے عمائدین کے ساتھ ساتھ دار العلوم کا یہ نامور فرزند عالی مقام بھی پیش پیش نظر آتا۔

شخصیت و کردار

شکل وشباہت ایک سیدھے سادے انسان کا تصور کیجیے، گندمی رنگ، اوسط درجہ کا بدن، نکلتا ہوا قد، کتابی چہرہ جس پر سادگی بھی برستی ہو اور علم و فضل و وقار بھی، فکر و تدبر سے معمور کشادہ پیشانی، آنکھوں میں ایک حسین چمک، بھاری بھاری فلسفیانہ بھویں جنھیں دیکھ کر ایک دوست جارج برنارڈ شا کی بھوؤں سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ چہرہ پر گھنی داڑھی، آواز میں گرج اور گفتار میں بے ساختگی بس یہی حلیہ تھا مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کا۔

وضع قطع وضع قطع میں سادگی بھی تھی اور استقامت بھی، لباس ہمیشہ سادہ سفید کھدر کا کرتہ، اسی کا کسی قدر تنگ موری کا پاجامہ، کھدر کی ہی شیروانی سردیوں میں عموماً کسی عمدہ کھال کی اور گرمیوں میں سادہ سفید کھدر کی اونچی باڑ کی ٹوپی جس کا تراش ان کا خود ایجاد مخصوص تراش تھا، جوتا ہمیشہ عمدہ پہننے کے شوقین تھے۔ کبھی کھلا ہوا (نیوکٹ) پمپ اور کبھی جے پوری

افتاد طبع خوراک بہت معمولی اور سادہ ہوتی تھی اور مقدار میں بھی بہت کم، سادہ تندوری روٹی ہو اور معمولی دال، سبزی یا گوشت کی ترکاری یہی ان کی پسندیدہ غذا تھی، وقت پر جو کچھ بھی میسّر آجائے چند منٹ میں دس پانچ لقمے لیے اور بس فارغ ہو گئے کھانے پینے کے ذوق اور لذتوں کے اہتمام سے وہ تقریباً ناآشنا ہی رہے احباب اور مخلصین بڑے ارمانوں سے دعوت کرتے مگر ان کی دعوت کرنے والے ہمیشہ مایوس ہی رہتے۔ دسترخوان پر کتنی ہی مرغن اور مکلف غذائیں سجاتے، مگر مولانا کا ہاتھ جب اٹھتا تو کسی معمولی کھانے کی طرف اور اتنی جلدی فارغ ہو جاتے کہ ساتھ کھانے والوں کے لیے بھی بڑی دشواری ہوتی، اچار اور ترشی انہیں بہت مرغوب تھی اپنی تندرستی سے بے فکر اور اصول صحت سے بے نیاز کھانسی اور نزلہ کی حالت میں بھی اپنی مرغوب کھٹائی اور ترشی کے استعمال سے باز نہیں رہتے تھے۔ سردیوں میں رس کی کھیر (رساول) کے بہت شوقین تھے، پھلوں میں ان کو خربوزہ کا بے حد شوق تھا، صبح شام چائے کے پابند تھے وہ بھی بہت ہلکی جس میں دودھ بھی بہت کم ہوتا اور مٹھاس بھی برائے نام گرمیوں میں تیز برف کا پانی انھیں پسند تھا، پھلوں میں آم سے بھی کافی رغبت رکھتے تھے کئی برس سے احباب کے اصرار پر یہ معمول ہو گیا تھا کہ آموں کے موسم میں اپنے رفقا سمیت کاندھلہ جاتے تھے اور وہاں بڑی پُررونق محفل رہتی تھی۔ ادھر نئی دہلی میں ہر سال انڈیا گیٹ کے قریب آموں کی ایک محفل جما کرتی تھی جس میں چالیس پچاس بے تکلف احباب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اس کے اہتمام پر مولانا فقیہ الدین، حاجی محمد صالح، سلطان یار خاں صاحب وکیل اور رفقاء دفتر شریک رہتے تھے۔

لباس اور خوراک نیز اپنے رہن سہن میں بھی بے حد سادگی پسند اور تکلفات سے بہت دور رہتے۔ دفتر جمعیۃ میں ہمیشہ فرش پر بچھی ہوئی چاندنی یا چٹائی ہی ان کی مسند تھی یا رات میں ایک کھوڑا پلنگ اور ایک تکیہ سونے میں تنہائی پسند تھے۔

غرضیکہ سادگی ان کے مزاج کا وہ عنصر تھی جو ان کے لباس خوراک، وضع، قطع، رہن سہن اور زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر چھائی ہوئی تھی مزاج

کی دوسری خصوصیت تیز رفتاری تھی یہ وصف بھی ان کے ہر کام میں نمایاں نظر آتا، بولتے بھی تیز کوئی اہم سے اہم سوال ہو یا کوئی پیچیدہ مسئلہ انہیں نہ فیصلہ کرتے دیر لگتی نہ جواب دینے مخاطب کے منشا کو سمجھنے اور اسکے رجحان کا اندازہ لگانے میں بھی سبقت لے جاتے تھے رفتار کی تیزی انکے ہر عمل میں نمایاں رہتی یہاں تک کہ نماز پڑھنے اور قرآن حکیم کی تلاوت میں بھی لکھنے پڑھنے اور تقریر و خطابت میں بھی ان کی رفتار ہمیشہ تیز رہتی۔

خدمات کا جذبہ اور کاموں کی دھن

کام کی لگن اور دھن مولانا مرحوم کو حد سے زیادہ تھی سکون اور فرصت سے نہ ان کی زندگی کبھی آشنا ہوئی نہ انہیں کبھی اس کی جستجو ہوئی، کاموں کے ہجوم میں گھرا رہنا ہی انہیں راس آتا تھا اور خود بھی وہ کبھی چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جس وقت سے انہوں نے اپنے ہوش و حواس کی زندگی میں قدم رکھا تھا، آخر تک تقریباً پینتالیس برس وہ مسلسل تگ و دو انہماک و عمل، بے شمار تحریکوں اور خدمت گزاریوں میں اس طرح مصروف رہے کہ آج بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنی عمر کی تھوڑی مہلت میں جو کام انجام دے لیے دوسرے انسانوں کے لیے وہ کئی عمروں اور صدیوں کے کام تھے۔

خلوص و ایثار

کی اس مجاہدانہ زندگی کا اندازہ کیجئے اور پھر ساتھ ہی یہ دیکھیے کہ اس تمام بھاگ دوڑ، مسلسل خدمت و عمل، رات دن کی سرگرمیوں اور انتھک محنتوں سے مولانا نے خود اپنے لیے کیا حاصل کیا، ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے خطیب تھے، صاحب فکر و قلم بلند پایہ مصنف تھے، ملک گیر شہرت و مقبولیت کا اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ حکومت و اقتدار کے دائروں میں اونچی سے اونچی شخصیتوں سے ان کے برابر کے تعلقات تھے اگر کسی درجہ میں بھی انہیں اپنا اور اپنی راحت و منفعت کا خیال ہوتا تو وہ اپنے لیے کیا کچھ نہ حاصل کر سکتے تھے۔

لیکن انہوں نے اپنے لیے جو زندگی اختیار کی وہ غریبی اور بے سروسامانی کی زندگی بھر کرایہ کے مکان میں رہے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کا مستقبل بنانے کے لیے بھی وہ اپنے وسائل کبھی کام میں نہ لا سکے نہ ان کے لیے اپنے بعد کوئی اثاثہ چھوڑ گئے اپنی بھرپور صلاحیتوں اور زندگی بھر محنتوں اور کاوشوں کا پورا سرمایہ انہوں نے صرف کیا تو صرف ملک و وطن کی خدمت اور قوم و ملت کی خوشحالی اور سربلندی کے لیے پارلیمنٹ کے ممبر ضرور رہے مگر سچ یہ ہے کہ ان کی رکنیت پارلیمنٹ بھی سراسر دوسروں ہی کے کام آئی۔

قومی اور وطنی خدمت کی سعادتیں دوسروں کو بھی میسّر آئی ہیں، مگر بے غرضی اور خلوص و ایثار کا یہ مقام صرف مولانا ہی کو نصیب ہوا کہ وہ ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچے اور کوئی نہیں کہا جاسکتا جو عوام سے اتنا قریب رہا ہو، لیکن اکثر رات دن کے جماعتی رفقاء کار کو بھی آج تک یہ معلوم نہیں حفظ الرحمٰن صاحب کی اولاد بھی ہے۔ بحمد اللہ ان کا بیٹا بھی ہے اور بیٹیاں بھی، ان کے ہمہ گیر تعارف اور بے پناہ اثر و رسوخ کی فیض رسانیوں میں جس کا کوئی حصہ نہ تھا وہ صرف انکی اپنی ذات تھی اور اپنی اولاد اپنے اسفار یا اپنی مجلسی اور جماعتی سرگرمیوں میں انہوں نے اپنے بیٹے تک کو ساتھ رکھا اور متعارف کرانا کبھی گوارا نہیں کیا۔

کئی بار ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ ایسے بلند پایہ اور صاحب بصیرت عالم اور ایسے اکابر کے صحبت یافتہ ہوتے ہوئے یہ کیوں نہیں ہوا کہ مولانا کم از کم بڑھاپے کی اس زندگی میں تو رات دن کی بھاگ دوڑ اور مشاغل کے ہجوم و ہنگامہ سے کنارہ کش ہو کر تسبیح و مصلیٰ سنبھال کر کسی گوشہ میں بیٹھ گئے ہوتے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا وہ بھی ایک راستہ ہے پھر زیادہ سوچا تو اس کی توجیہ خود ہی ذہن میں آنے لگی کہ مولانا خلوص و ایثار کی جن بلندیوں پر فائز تھے وہاں عزلت نشینی کا ایسا تصور بھی عملاً دشوار ہی رہا تھا کہ "آخر فکرِ خویش" کا جو داعیہ اس کا محرک ہوتا ہے مولانا کے خلوص کا لبریز پیمانہ اس کی آمیزش بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

استغناء و بے غرضی

طبیعت کے استغنا کا یہ حال تھا کہ زندگی کے اس دور میں تو بڑے بڑے دولت مند تاجر، نواب اور اصحاب اختیار ان کے احترام میں دوزانو رہتے تھے اپنے ہاں دعوتوں پر بلاتے، بڑے بڑے قیمتی ہدیے پیش کرنا چاہتے، مگر مولانا کی بے نیازی اور بے رخی نے کبھی کسی کو موقع ہی نہ دیا، جمعیۃ علماء کی انہوں نے عمر بھر خدمت ہی نہیں کی بلکہ چار چاند لگا دیے، اٹھارہ برس اس کے سربراہ رہے اور اپنی بھرپور صلاحیتیں اس کی آبیاری پر صرف کیں لیکن کبھی کسی قسم کا کوئی معاوضہ، کوئی الاؤنس، آنریریم یا کسی طرح کی منفعت اس سے حاصل نہیں کی، اپنی کتابوں کی آمدنی ہی ان کا کسب معاش تھا۔

کانگریس کے حلقوں میں بھی ان کا جو مقام تھا وہ ظاہر ہے۔ کانگریس ٹکٹ پر انہوں نے تین بار پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے (۵۲ء میں حلقہ بلاری اور ۵۷ء، ۶۲ء میں حلقہ امروہہ ضلع مراد آباد سے) مگر پیش کش اور اصرار کے باوجود انہوں نے کبھی کانگریس کے انتخابی فنڈ سے کوئی امداد قبول کرنا گوارا نہیں کیا

ہمدردیٔ خلائق

مخلوق خدا کی ہمدردی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ بلا استثناء و بلا امتیاز ہر کس و ناکس، اپنے اور بیگانے، مسلم اور غیر مسلم سب کی خدمت ان کا عزیز ترین شغل تھا اور دن رات کا بیشتر حصہ اسی میں گزرتا تھا، کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کا خواہاں ہے کوئی وظیفہ اور امداد کے لیے سرگرداں، کسی کو کالج کے داخلہ میں دشواری پیش آ رہی ہے تو کوئی امتحان میں دو چار نمبروں سے رہ گیا ہے۔ کوئی اپنے پرمٹ کی میعاد میں توسیع چاہتا ہے، کوئی اپنی مقدمہ بازی کے لیے وکیل سے فیس میں رعایت کے لیے کوشاں ہے کسی کو مکان یا دکان کی ضرورت ہے تو کوئی بجلی یا پاور کا کنکشن لینا چاہتا ہے کسی کی فصل اور کھیتی خراب ہو گئی ہے اور پورا لگان دینے کے قابل نہیں ہے۔ تو کسی کی بیٹی جوان بیٹھی ہوئی ہے اور کوئی مناسب رشتہ نہیں آ رہا ہے غرضیکہ صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صدہا کام تھے جن کے لیے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورت مند کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں کسی کو سفارشی خط لکھ کر دے رہے ہیں۔ کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا کام کرا رہے ہیں اور کسی کے لیے واسطہ در واسطہ سفارشیں کرا رہے ہیں خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد تو سرکاری حلقوں میں ان کی عزت و منزلت ایک عوامی رہنما ہونے کے لحاظ سے یا پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے ان کے اثر و رسوخ پر لوگوں نے گویا جھولنا شروع کر دیا تھا، مولانا کی طبعی شرافت اور ہمدردیوں کا دامن اس قدر وسیع تھا کہ جس نے بھی ان کے سایہ میں سر چھپانا چاہا انہیں نہ راستہ چلتے کسی ضرورت مند کی مدد سے گریز تھا نہ آدھی رات گئے کسی کے آنے پر کوئی ناگواری بعض اوقات تو بڑی بڑی اونچی شخصیتیں بھی اپنے کاموں کے لیے ان کی مدد اور سفارش ڈھونڈتی تھیں، آج کون اندازہ کر سکتا ہے صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صدہا کام تھے جن کے لیے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورت مند کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا، کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں۔ کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا کام کرا رہے ہیں اور کسی کے لیے واسطہ در واسطہ سفارشیں کرا رہے ہیں۔

قلب کی وسعت اور عالی ظرفی

دنیا میں ان کے پایہ کے انسان ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں بھی شاید دو چار ہی مل سکیں، یوں تو ہر وقت ہی ان کے وسعت قلبی کے مشاہدات آنکھوں سے گزرتے رہتے تھے اور ہم خدام کار کے ساتھ تو انکے سلوک مہر و شفقت کا ذکر ہی کیا ان کے جیتے جی افسر و ماتحت کا کوئی امتیاز کبھی درمیان میں حائل ہی نہیں ہوا۔

اپنے عقیدہ اور مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے جہاں تک خدمت عمل کا تعلق ہے ان کی دردمندیوں کے سایہ میں دارالعلوم دیوبند

اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک ہی درجہ تھا، جدید و قدیم، مقلد اور غیر مقلد، شیعہ اور سنی، خوجے اور بوہرے، مسلم لیگی اور کانگریسی بلکہ مسلم اور غیر مسلم ہر انسان کی خدمت وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ عقیدہ اور مسلک کا اختلاف ان کو کسی کی خدمت سے باز نہیں رکھتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان تمام حلقوں میں یکساں طور پر ان کو احترام اور اعتقاد کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور کسی بھی گروہ نے ان کو اپنے لیے غیر اور اجنبی محسوس نہیں کیا۔

رواداری اور اعتماد

ان کی شرافتِ نفس کا قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ دوسروں کے ساتھ بے انتہا رواداری، احترام اور اعتماد کا معاملہ کرتے تھے ہمیشہ ہر معاملہ میں دوسروں کا احترام ملحوظ رکھتے اور ہر موقع پر دوسروں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے اپنے ساتھیوں اور کارکنوں پر حد درجہ اعتماد کرتے کسی سے شکایت کا موقع بھی ملتا تو وقتی ناگواری کا اظہار ضرور کرتے مگر دلی تعلق میں کبھی بال برابر فرق نہ آنے دیتے۔

جرأت حق اور مقامِ عزیمت

مولانا مرحوم کے افکار و کردار کا سب سے اہم اور جوہری وصف ان کی جرأت حق اور استقامت و عزیمت تھی ان کی پوری زندگی اس وصف و کمال کا ایک مسلسل اور شاندار مظاہرہ رہی ہے اہم سے اہم اور نازک معاملہ میں بھی جب وہ اپنی کوئی رائے قائم کرتے تو کسی اندیشہ اور کسی لالچ کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی تھیں ہر معاملہ میں کھلے دل سے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان سوچنا اور فیصلہ کرنا اور فیصلہ کر لینے کے بعد اس پر پختگی کے ساتھ جم جانا، یہی ان کا صحیح موقف تھا ان کی زندگی میں بارہا ایسے موقعے بھی آئے جہاں ان کی جرأت و حوصلہ اور ثباتِ فکر و نظر کے لیے بڑی آزمائشیں درپیش تھیں، مگر ان کے کردار میں کوئی تزلزل راہ نہ پا سکا۔ چند برس پہلے ایک صاحب نے گاندھی جی کی پرارتھنا پر شرعی نقطۂ نظر سے فتویٰ چاہا۔ اگرچہ عام طور پر فتویٰ لکھنے سے مولانا ہمیشہ بچتے تھے، اور دوسرے علماء کرام پر محول کر دیتے تھے، لیکن جب یہ خاص سوال سامنے آیا تو مولانا نے پوری اہمیت کے ساتھ فوراً اس کا جواب خود لکھا اور بہت صاف لفظوں میں مسلمانوں کے لیے یہ پرارتھنا شرعاً ناجائز قرار دی یہ سوال حقیقتاً ایسا تھا کہ مولانا تو خیر پکے کانگریسی اور گاندھی جی کو لیڈر ماننے والوں میں سے اگر کسی غیر کانگریسی عالم کے سامنے بھی رکھا جاتا تو ملک کے حالات اور گرد و پیش میں بہت مشکل ہوتا کہ اس صفائی اور جرأت کے ساتھ اس بکیر کا فیصلہ دے دیتا۔

اب آخری دنوں میں مسلم کنونشن کا معاملہ بھی مولانا کی جرأت فکر و عمل کی ایک مثال بن گیا کیونکہ وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو تک شروع میں اس کے خلاف تھے، لیکن مولانا کے لیے یہ بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، کسی نے پوچھا کہ پنڈت جی کی قطعی مخالفت کے بعد بھی کیا آپ کنونشن ضرور بلائیں گے۔ مولانا نے پوری مضبوطی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ پنڈت جی کی رائے بھی اس کے خلاف ہے تو ہو۔ ہم ان کی مخالفت کے ڈر سے کنونشن کا خیال ترک کر دیں، یہ ممکن نہیں۔

زندگی کے آخری ایام۔ مرض اور وفات

جبل پور، ساگر وغیرہ کے ان حوادث سے مولانا مرحوم کو جو قلبی اور ذہنی اذیت پہنچی اور اصلاح کے لیے ان تھک جدوجہد کا جو بے پناہ بوجھ پڑا اس نے مولانا مرحوم کی بڑھاپے کی صحت اور توانائیوں کو بے حد مضمحل کر دیا، رمضان کا مہینہ تھا اور اپنے معمول میں وہ سال کے گیارہ مہینے برابر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے، مگر رمضان میں دہلی سے باہر قدم رکھنا پسند نہیں کرتے تھے، مگر اس حال میں حالات کی سنگینی نے ان کے اس معمول کو بھی قائم نہ رہنے دیا ۸ فروری کو جب وہ ایک طویل سفر سے واپس آئے بے حد تھکے ہوئے تھے بخار بھی تھا یہاں آتے ہی انہیں جبل پور کی تشویشناک خبروں سے واسطہ پڑا اور پھر مسلسل کام میں لگا رہنا پڑا۔ رمضان ہی میں وہ جبل پور، ساگر وغیرہ گئے۔ پھر کنونشن کی تیاریوں کا عظیم بوجھ بھی ان ہی پر پڑا۔ اس دوران میں بعض رفقاء کار نے بھی غلط روش سے مولانا کی قلبی اذیتوں میں اضافہ کیا اور ایسے نازک وقت میں ان کا دل دکھایا شاید اسی وقت سے مولانا کے شعور پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑنی

شروع ہوگئی تھیں، چنانچہ مسلم کنونشن سے چند روز پہلے مقامی مسلم ورکرز کی میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا کی زبان سے وفات سے ایک سال قبل یہ کلمات بے اختیار نکلے۔

"میں نے تو اپنے خدا سے معاملہ کر لیا ہے۔ میں نعرہ ہائے تحسین و نفرین سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ دنیا کی عمر ہی کتنی ہے، میری تو بس یہی خواہش ہے کہ اللہ کے روبرو جاؤں تو سرخرو ہو کر۔"

مولانا کے ان جملوں کو دہلی کے نوجوان شاعر کامل قریشی صاحب نے اشعار کے رنگ میں یوں ادا کیا ہے۔

مانا کہ غم و رنج نے مارا ہے مجھے   ہر تلخی و ترشی بھی گوارا ہے مجھے
للہ ذرا وقت کے نباض سمجھ   ملت کی تباہی نے پکارا ہے مجھے

میں وقت کی تنقید سے مرعوب نہیں   تنقید نے اے دوست سنوارا ہے مجھے
دنیا کے سہاروں کا میں قائل ہی نہیں   اللہ کی رحمت کا سہارا ہے مجھے

غرضیکہ یہ تمام اندرونی اور بیرونی عوامل آہستہ آہستہ ان کی صحت کی جڑیں کاٹ رہے تھے تھوڑے ہی دن بعد رانچی میں (ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں) شدید فساد ہو گیا وہاں بھی مولانا فوراً ہی پہنچے اور ان کے پہنچ جانے سے حالات پر بہت ہی اچھا اثر پڑا اور حکومت بہار نے بروقت مفید قدم اٹھائے۔ رانچی سے مولانا دہلی پہنچے ہی تھے کہ اکتوبر شروع ہوتے ہی علی گڑھ، میرٹھ، ہاپوڑ اور چندوسی میں شر پسندوں نے ایک طوفان بپا کر دیا، مولانا کی صحت رفتہ رفتہ اتنی بگڑ چکی تھی کہ مرض و اضمحلال ان کے چہرہ سے نمایاں ہونے لگا تھا، ویسے بھی بخار، نزلہ اور کھانسی کی گرفت میں تھے۔ ایک قابل مقامی معالج "ڈاکٹر علیم" نے مولانا کا معائنہ کیا تو بڑی تشویش محسوس کی اور تمام مشاغل چھوڑ کر کم از کم دس دن کے لیے مکمل آرام اور علاج کا مشورہ دیا، لیکن مولانا کی طبیعت ان بندشوں کو گوارا نہیں کر سکتی تھی انھوں نے ڈاکٹر علیم سے صاف کہا کہ میرٹھ، علی گڑھ اور چندوسی میں لوگوں کی جان کے لالے پڑ رہے ہیں اور میں اپنی صحت کی خاطر گھر میں لیٹا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اور پھر واقعتہً اسی شام مولانا علی گڑھ اور پھر میرٹھ وغیرہ پہنچ گئے۔ ان دنوں خاص طور پر محترم حافظ ابراہیم صاحب جنرل شاہ نواز، چودھری چرن سنگھ وغیرہ جو بھی مولانا سے ملا چہرہ کی حالت دیکھ کر تشویش محسوس کی اور اصرار کیا کہ آپ اپنی صحت پر توجہ دیں، مگر مرض اپنی جڑیں پکڑتا رہا اور مولانا اپنے کاموں میں اسی تندہی کے ساتھ لگے رہے چندوسی بھی گئے دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملتے رہے۔ ۱۵، ۱۶ نومبر کو (زندگی میں آخری بار) جبل پور، ساگر، بھوپال کا سفر بھی اسی حال میں کیا۔ دسمبر بھی زیادہ تر سفروں میں گزرا۔ جنوری میں میرٹھ، کان پور، امروہہ کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر اپنے حلقۂ انتخاب میں واپس آئے اور آٹھ دس روز سخت سردی کے عالم میں دیہات و قصبات کا گشت کیا۔ یہاں تک کہ مرض پوری قوت کے ساتھ مولانا کی صحت پر چھا گیا۔ ۲۲ جنوری کو بمبئی جانے کے لیے دہلی واپس پہنچے اور ان کی حالت دیکھ کر ہم خدام نے زبردستی بمبئی کا سفر ملتوی کرایا۔ ۲۳ جنوری ۶۲ء کی تاریخ تھی کہ مولانا زندگی بھر کی تھکن اور مرض جانکاہ کو ساتھ لے کر بستر علالت پر ایسے گرے کہ آخر کار اللہ کی رحمتوں نے انھیں بستر علالت سے نہیں، دنیا ہی سے اٹھا لیا۔

علاج کے سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا نے اپنے پرانے معالج ڈاکٹر پانڈے سے رجوع کیا اور پہلے ہی دن انھوں نے پھیپھڑوں سے جو پانی نکالا اس میں خون کی گہری آمیزش دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

مزید تحقیق کے لیے خون ٹیسٹ کرایا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے ڈاکٹر پانڈے نے فوراً ہی مولانا کو بمبئی لے جانے کی ہدایت کی چنانچہ ۲۶ جنوری کو صبح ہی ہوائی جہاز سے مولانا کو بمبئی لے جایا گیا۔ گورنر بمبئی شری پرکاش مولانا کے پرانے رفیق اور دوست تھے انہوں نے پورے اہتمام کے ساتھ ٹاٹا ہوسپٹل میں مولانا کو داخل کرایا۔ ایک ماہ وہاں علاج ہوتا رہا اور ۲۶ فروری کو مولانا دہلی واپس پہنچے، یہاں بہترین اور ماہر ڈاکٹروں اور معالجوں سے رجوع رہا، مگر مولانا صحیح معنیٰ میں مریض عشق تھے ان کی حالت بھی یہ تھی کہ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

علاج کی آخری کوششوں کے لیے یہ طے ہوا کہ مولانا کو امریکہ لے جایا جائے چنانچہ ۱۶ اپریل ۶۲ء کو شام کے آٹھ بجے مولانا مرحوم عالمی ایروڈروم "پالم" سے امریکہ روانہ ہوتے مولانا کے داماد مسٹر عزیزالرحمٰن رفیق سفر رہے امریکہ کی ریاست "وسکونسن" کے مشہور شہر میڈیسن میں ڈھائی ماہ بغرض علاج مقیم رہ کر ۱۲ جولائی کو علی الصباح دہلی واپس پہنچے۔ حالت بہت گر چکی تھی۔ اتفاق سے ان دنوں دہلی میں گرمی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور بجلی کے تعطل نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ گرمی کی تکلیف سے مولانا بہت بے چین تھے اور گلمرگ (کشمیر) جانے کا ارادہ کر رہے تھے، تیاری بھی ہو گئی تھی، مگر قضائے الٰہی ان کے لیے گلمرگ کی بجائے گلزار بہشت میں ابدی و سرمدی راحتوں کا اہتمام کر چکی تھی۔ اکیس دن اور قید حیات کے گزار کر ع

آخر اس بیماریٔ دل نے اپنا کام تمام کیا

۲ اگست ۶۲ء مطابق یکم ربیع الاوّل ۸۲ھ کو صبح ۳½ بجے بارگاہ ربّی سے تقرب کی مخصوص ساعتوں میں وقت اور تاریخ کے طوفانوں سے کھیلنے والی پاکیزہ روح نے اس دیار فنا کو خیرباد کہا ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حضرت مولانا کی علالت نے پورے ملک کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور ان کی صحت و شفا کے لیے پورے ملک میں دعائیں ہو رہی تھیں مگر مشیت الٰہی کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا تھا ؎

کام تھے عشق میں بہت، پر میرؔ ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

صبح ہوتے ہوتے یہ اندوہناک خبر ہندوستان و پاکستان کی وسعتوں میں پھیل گئی ۱۱ بجے خدام نے اپنے مخدوم مجاہد ملت کو غسل دیا، کھادی کا کفن پہنایا، عطر کافور میں بسا کر سفر خلد بریں کے لیے دولہا بنایا اور احباب و مخلصین کے آخری دیدار کے لیے ۴ بجے تک بنگلہ کے ایک کمرہ میں آرام سے لٹا دیا جہاں روشن صدیقی صاحب اور دوسرے حضرات قرآن حکیم تلاوت کرتے رہے اور مولانا سے تعلق خاطر رکھنے والی بے شمار مخلوق خدا قطار در قطار اپنے محبوب رہنما کی آخری بار زیارت کرتی رہی ان میں دہلی کے لاکھوں ہندو مسلم عوام و خواص بھی تھے اور باہر سے پہنچنے والے احباب کے قافلے بھی، مولانا کے پرانے رفیق وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو، نائب صدر جمہوریہ، دوسرے وزراء اور پارلیمنٹ کے سینکڑوں ممبر بھی، مسلم ممالک کے سفراء اور عمائدین بھی، صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ، ایکس لوک سبھا، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، دہلی کانگریس کمیٹی، دہلی میونسپل کارپوریشن وغیرہ کی طرف سے ملک و وطن کے اس عظیم رہنما کے پھول پر خراج عقیدت و محبت کے نشان "پھولوں کے حلقے" (ریتھ) نچھاور کیے گئے ۴½ بجے دو لاکھ انسانوں کے بے حال و اشکبار ہجوم نے مجاہد ملت کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ دہلی دروازہ کے بیرونی میدان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب خلیفہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور مغرب کے وقت ملک وملت کا یہ سرمایۂ عزیز سپرد خاک کر دیا گیا۔ ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

واقعات و اقتباسات

ایک مرتبہ ۱۹۴۸ء میں میں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دونوں ایک ساتھ دہلی سے لکھنؤ جا رہے تھے، وہاں یوپی گورنمنٹ کی ایک تعلیمی سب کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ راستہ میں میں نے ان سے کہا کہ پاجامہ اور دھوتی کی جنگ ختم کرنے کے لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح مغربی لباس اختیار کر لیا جائے؟ مولانا نے فوراً تڑاق سے جواب دیا کہ اگر مسلمانوں نے ہندوؤں سے مرعوب ہو کر اسی طرح اپنی قومی تہذیب اور ملّی تمدّن کو چھوڑ کر مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کر کے اپنی عافیت و اطمینان کا سہارا ڈھونڈا تو پھر بات ہی کیا ہوئی، اور یہ تو کسی آزاد ملک کے ایک آزاد باشندہ کی زندگی نہ ہوئی۔ اسے میں ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(مولانا احمد سعید اکبرآبادی)

اسی طرح میرا ذاتی خیال تھا کہ ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر مسلمانوں کو گاؤ کشی کے انسداد کا اعلان کر دینا چاہیے کیونکہ مذہباً ایسا کرنا جائز بھی ہے اور اس سے ہندو مسلم تعلقات کے خوشگوار ہونے کی امید بھی ہو سکتی ہے۔

ایک دن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو حسب عادت سنتے ہی بگڑ پڑے اور لگے تقریر کرنے انھوں نے کہا کہ تقسیم سے پہلے اگر ہم کرتے تو اس کی قدر بھی ہوتی، لیکن اب کہا جائے گا کہ مسلمانوں نے ڈر کر ایسا کیا ہے تو پھر کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے مسلمانوں سے ہرگز نہیں کہوں گا کہ وہ انسداد گاؤ کشی کا اعلان کر دیں، حکومت سیکولر ہے، دستور جمہوری ہے۔ اگر ہندو اس سیکولرازم اور جمہوریت کو عریاں کرنا چاہتے ہیں تو وہ بڑے شوق سے گاؤ کشی قانوناً بند کرا دیں۔ اس وقت ہمارا موقف دوسرا ہوگا اور ہم اس مسئلہ پر پھر از سرِ نو غور کریں گے۔

مجھ کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ میں نے اس پر "برہان" میں لکھا، مگر ساتھ ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن کو اپنی رائے پر اس قدر پختگی تھی کہ انھوں نے میرے مضمون کا جواب "برہان" ہی میں دیا اور بڑے زور و شور کے ساتھ دیا۔ اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ہی غلطی پر تھا اور رائے انہی کی درست تھی۔

(از مولانا احمد سعید اکبرآبادی)

پوری عمر کے اشغال ایک رات کے بدلے

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے ایک مجلس میں (جو سیوہارہ میں مفتی جمیل الرحمٰن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند کے مکان پر) ہوئی مولانا حفظ الرحمٰن کے متعلق ارشاد فرمایا کہ فسادات کے زمانہ میں دہلی کے اندر مسلمانوں کے بچانے کے سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں میں ان کے بدلے میں اپنی پوری عمر کے اذکار و اشغال نثار کرنے کو تیار ہوں۔

(روایت مفتی جمیل الرحمٰن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا کی یاد میں بے شمار انسان مضطرب و بے قرار ہیں اور ان کے اعزہ و احباب نیز متعارفین کی لامتناہی تعداد ان کے لیے آج غم گسار ہے ان متعارفین میں بادشاہ اور امراء اور وزرا بھی ہیں اور علماء فقرا بھی ہیں اور عام پبلک بھی، لیکن سب سے زیادہ مضطرب مظلومین کا وہ طبقہ ہے جن کے لیے حضرت مولانا پشت پناہ تھے۔ ان میں وہ بے بس و بے کس اور لاوارث بازیافتہ مسلمان خواتین بھی ہیں جو حضرت مولانا کو اپنا باپ سمجھتی تھیں۔

جب تک بدن میں جان موجود ہے

۱۹۴۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مولانا ریل میں تشریف لا رہے تھے۔ مشرقی پنجاب کے ایک سٹیشن پر جب ٹرین پہنچی تو ایک مخالف مجمع نے جس کا اختلاف سیاسی نوعیت کا تھا حضرت شیخ الاسلام پر سنگ باری شروع کر دی، مولانا نے حضرت شیخ کو آڑ میں لے کر خود کو بلا تامل مجمع کے سامنے پیش کر دیا اور اب مولانا پر بلا تامل پتھر برسنے لگے حتّٰی کہ ایک پتھر نازک موقع پر آ کر لگا فرماتے تھے کہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ جب تک حفظ الرحمٰن کے بدن میں جان موجود ہے حضرت شیخ پر آنچ نہ آنے دوں گا۔

برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام

اس سنگ باری کے سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے جو مجھ سے حضرت رائے پوری نے بیان فرمایا کہ پاکستان میں کسی مقام پر ایک شخص ان کو ملا اور بے اختیار رونے لگا۔ دریافت کرنے پر اس نے یہ داستان سنائی کہ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہے اور جس مجمع نے حضرت شیخ الاسلام پر سنگ باری کی تھی بدبختی سے یہ بھی اس میں موجود تھا اس نے بتلایا کہ اس مظاہرہ کے موقع پر اپنی تشفی غیظ کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ برہنہ ہو کر حضرت شیخ کے سامنے ناچنے لگا۔ واقعہ رفت گزشت ہو گیا لیکن لا یضل ربی ولا ینسی کچھ عرصہ بعد جب پنجاب میں ہولناک فسادات ہوئے تو سکھوں نے اس کے ساتھ یہ طریقہ برتا کہ اس کو ایک ستون سے باندھ دیا گیا اور گھر کی بہو بیٹیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ برہنہ ہو کر اس کے اور مجمع کے سامنے ناچیں وہ کہتا ہے کہ اس وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ آج کا یہ ناچ اس برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام ہے جو حضرت مدنی کی اہانت کی غرض سے میں نے کیا تھا۔

(بروایت مفتی جمیل الرحمٰن نائب مفتی دار العلوم دیوبند)

غمگسارِ قوم

ملت کی خدمت کے اس لامتناہی سلسلہ کے علاوہ اسی سلسلہ کا ان کا ایک عظیم اور یادگار کارنامہ یہ بھی ہے کہ حکومتی پارٹی کانگریس کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ہونے والی بے انصافیوں اور خاص کر فسادات کے سلسلے میں انھوں نے پارلیمنٹ کے ایوان میں جس طرح کی تقریریں کیں (جو پارلیمنٹ کے ریکارڈ اور اخبارات کی فائلوں میں محفوظ ہیں) ان میں انھوں نے ملت کی مخلصانہ اور دردمندانہ وکالت اور حق گوئی و بے باکی کا حق ادا کر دیا ہے۔

اور اس "مجاہدانہ گفتار" کے علاوہ فسادات کے سلسلہ میں ان کا مستقل "خادمانہ کردار" یہ رہا کہ ملک کے جس حصے میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی انھوں نے وہاں جلدی سے جلدی پہنچنے کی کوشش کی اور جو کچھ کر سکتے تھے اس کے کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا اور ان کاموں کے تقاضے کے سامنے اپنی صحت بلکہ اپنی زندگی تک کے مسئلہ کو بھی بھلا دیا۔

۱۹۶۱ء نومبر میں علی گڑھ وغیرہ میں فسادات ہوئے تو انھوں نے علی گڑھ کا دورہ اس حالت میں کیا کہ ان کے پھیپھڑے میں کینسر ہو چکا تھا اور اس کے اثر سے پانی کی کافی مقدار پیدا ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے کھانسی کی سخت تکلیف تھی جسم گھلا جا رہا تھا، لیکن انہیں اپنے اس حال کی کچھ خبر نہ تھی ایکسرے اور معائنہ کرانے کے لیے فرصت نہیں مل رہی تھی علی گڑھ سے انہیں سیدھا دیوبند آنا تھا یہاں دار العلوم کی مجلس شوریٰ کا اسی دن اجلاس تھا اہم

لوگ پہلے پہنچ چکے تھے، لیکن مولانا راستہ میں موٹر فیل ہو جانے کی وجہ سے چار پانچ گھنٹے لیٹ پہنچے ہم لوگوں نے ان کی کھانسی کی تکلیف اور ان کی صورت دیکھ کر ان سے کہا کہ خدا کے لیے آپ اپنے اوپر رحم کریں چند روز آرام کرلیں اور قاعدہ کا علاج کرالیں۔ بہر حال اسی دن دیوبند ہی میں یہ بات طے ہوگئی کہ اب وہ دہلی پہنچ کر سب سے پہلے ڈاکٹری معائنہ کرائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا، لیکن ملت کی بدنصیبی کہ ڈاکٹری معائنہ سے معلوم ہوا کہ ان کی کھانسی معمولی کھانسی نہیں ہے بلکہ ان کے پھیپھڑے میں پانی کی بہت مقدار ہے پانی نکالا گیا اور علاج شروع ہوا چند روز کے بعد طے ہوا کہ مولانا علاج کے لیے بمبئی جائیں وہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ مولانا تو کینسر میں مبتلا ہیں اور پھیپھڑے میں پانی اسی کا نتیجہ ہے بہر حال کہنا یہ تھا کہ وہ پھیپھڑے میں کینسر لیے ہوئے اور پانی بھرے ہوئے ملت ہی کے کاموں سے علی گڑھ اور دیوبند دوڑ رہے تھے۔

اتفاق یا لطیفۂ غیبی یہ عجیب اتفاق ہے یا لطیفۂ غیبی کہ بستر علالت پر مستقل لیٹ جانے سے پہلے ملت کے کاموں کے سلسلے میں مولانا کی زندگی کا آخری سفر علی گڑھ اور دیوبند کا ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ملت اسلامیہ ہندیہ کا دنیوی مرکز۔ دارالعلوم دیوبند اس کا دینی مرکز ——— (محمد منظور نعمانی)

مدھیہ پردیش کی حکومت کو تنبیہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"آج مدھیہ پردیش کی سرکار فیلیور ہوئی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک جو واقعات ہوئے انہیں دیکھ کر کہنا چاہیے کہ اسے حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اس طریقہ سے تباہ اور برباد کر کے یہاں رکھا جائے گا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنوں میں سیکولرازم لانا ہوگا۔"

جبل پور میں ساگر، دموہ اور کٹنی میں فسادات ہو جائیں اور جو منسٹر ہیں وہ اسی طرح بیٹھے رہیں، کرسیوں پر قائم رہیں اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو برباد ہوتے دیکھتے رہیں یہ ان کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ چاہے اقلیتوں کا سوال ہو، چاہے اکثریت کا ہمیں سب کی حفاظت کرنی ہے اور خاص طور پر اقلیتوں کی پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ کرنی ہے۔ میں ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص توجہ دی جائے۔

ہم کسی جماعت پارٹی یا حکومت کے وفادار نہیں ہیں ہم صرف ملک اور وطن کے وفادار ہیں۔ اگر کوئی جماعت پارٹی یا حکومت ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے تو ہم اسے بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ جماعت یا پارٹی یا حکومت غلط راستوں پر جائے تو ہمارا کام ان کو سیدھا کرنا یا الٹ دینا ہے۔ جو افراد یا جماعتیں ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہیں ہم ان سے ملک کی وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جو لوگ فرقہ پرستی، تنگ نظری یا تعصب پیدا کرتے ہیں وہ ملک کے غدار اور وطن کے دشمن ہیں ان کو کسی دوسرے سے وفاداری کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے وہ خود اپنی وفاداری کا امتحان دیں

جو حالات ہمارے سامنے ہیں کہ انسان خود انسان کے خون کا پیاسا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو کن الفاظ سے تعبیر کریں۔

وحشت اور درندگی کا لفظ بھی کافی نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ وحشت اور درندگی اس حالت سے شرم کر رہی ہے شیر اور بھیڑیے جو سب سے زیادہ وحشت ناک درندے مانے جاتے ہیں وہ دوسرے جانوروں کا خون چوس کر درندگی کی پیاس بجھاتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو وہ بھی نہیں پھاڑتے۔ یہ حضرت انسان ہیں کہ خود اپنے ہم جنس بچوں اور عورتوں اور کمزور انسانوں کو ذبح کرتے ہوئے نہیں شرماتے، عوام کی وحشت اور درندگی کا علاج حکومت کا فرض ہے لیکن اس کا کیا علاج جب خود معالج اور امن کے ذمہ دار وحشت زدہ ہو جائیں۔ آج ذبیحہ گاؤ یا ناجائز اسلحہ کا الزام لگا کر جس طرح مسلمانوں کو پریشان کیا جا رہا ہے وہ اسی وحشت زدگی اور درندگی کا نتیجہ ہے

یہ کیا بزدلی ہے کہ تم در و دیوار سے وحشت زدہ ہو۔ تم خود اپنے سایہ سے ڈر رہے ہو اگر تم کل تک بہادر تھے تو آج بزدل کیوں ہو گئے۔ اسلام اور بزدلی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے، مگر بزدل نہیں ہو سکتا، مسلمان حق بات کہنے میں ہمیشہ دلیر ہوتا ہے۔ مسلمان ناانصافی برداشت نہیں کر سکتا، خوف ہراس اور بزدلی اور نامردی کو دل سے نکال دو۔ یہاں سے یہ عہد کر کے جاؤ کہ ہر ایک ناانصافی کا مقابلہ ڈٹ کر کریں گے۔ بیشک ہم وفادار ہیں۔ مگر ہم مادر وطن کے وفادار ہیں۔ وفاداری کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم کسی کلکٹر یا کسی سرکاری افسر یا وزیر کے فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کر سکتے۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا کہ حکام کی چاپلوسی وفاداری ہوا کرتی تھی۔ حکومت وزراء حکومت اور افسران کا پہلا فرض ہے کہ وہ ملک اور وطن کے وفادار ہوں۔ اگر ہم وفاداری کے خلاف کوئی حرکت دیکھیں گے تو یقیناً مقابلہ کریں گے۔ کانفرنس نے تمہیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو اور کسی سیاسی جماعت میں شرکت کرو جو ہندو مسلمانوں کے لیے مشترک ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کانگریس میں شرکت کرو۔ کیونکہ اس سے بہتر کوئی جماعت ہمارے سامنے نہیں ہے مگر کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہو۔ اگر تم پناہ ڈھونڈنے کے لیے کسی جماعت میں شریک ہوتے ہو تو اس سے نہ جماعت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ تمہاری یہ شرکت ملک کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ میں یہ کہ رہا ہوں کہ فرقہ وارانہ سیاسی پلیٹ فارم غلط ہے۔ اس غلطی کو ختم کرو اور مشترک پلیٹ فارم پر ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر ملک کی ترقی پذیر جماعت کی طاقت بڑھاؤ، ہمت بلند رکھو۔ خدمت وطن کے سچے جذبے کے ساتھ آگے بڑھو تمہیں انصاف اور حق و صداقت کو سربلند کرنا ہے۔ اگر تم نیک مقاصد کے لیے ڈٹ گئے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہو گی۔

حضرات محترم! مسلمانانِ ہند کے اس عظیم نمائندہ اجتماع کے موقع پر جو خصوصیت سے مسلم اقلیت کے ایک عام اور مسلسل اضطراب کی ترجمانی کے لیے یہاں منعقد ہو رہا ہے۔ بے جا نہ ہو گا کہ خود مسلمانانِ ہند کی خدمت میں بھی گزارش کروں کہ وہ اپنی اس پُرآشوب زندگی میں ظاہری تدابیر و وسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اعتماد علی اللہ، صبر و استقلال کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں پیدا کریں۔ اسوۂ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اپنا نصب العین بنائیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے سبق لیتے ہوئے اپنے اندر وہ اسپرٹ پیدا کریں کہ وہ تکالیف و مصائب کے طوفان سے گزر

بھی وہ احساس کمتری، پامالی اور مایوسی کا شکار نہ ہوں اور ان کے اس یقین میں کوئی تزلزل نہ آئے کہ اپنی وطنی زندگی میں ہمیں جو بھی حوادث و مشکلات درپیش ہیں وہ بہرحال وقتی اور دنیوی مصائب اور ہمارا حقیقی اعتماد کارساز حقیقی کی رحمت اور اس کی رضاجوئی پر ہی ہے، قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے انہ لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون (خدا تعالےٰ کی رحمت سے وہی مایوس ہوتے ہیں جنھیں خدا پر ایمان اور بھروسہ نہیں ہے)

ان مع العسر یسرا۔ ہر تنگی و پریشانی کے ساتھ آسائش و راحت بھی ضرور ہوتی ہے۔

اس عظیم الشان ملک میں جو ہماری طرح اور بھی متعدد مذاہب اور فرقوں کا پیارا وطن ہے "نبئ رحمت" کے نام لیواؤں اور اس رسول حق کے امتیوں کا (جس کی شان میں فرمایا گیا ہے انک لعلیٰ خلق عظیم آپ کے محاسن اخلاق کا ایک بے مثال نمونہ ہیں) فرض ہے کہ اپنی زندگی میں اخلاق و کردار کی وہ بلندیاں پیدا کریں کہ دنیا ان کے وجود کو امن و رحمت کا سایہ محسوس کرے۔ ان کی وطن دوستی، خیر اندیشی اور اخلاق کریمانہ کو نمونۂ عمل قرار دے اور اس سے سبق حاصل کرے آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اپنے موقف کا صحیح احساس و شعور پیدا ہو اس پیارے دیس کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم برابر کے شریک و سہیم اور اس دعوت حق کے علمبردار رہے ہیں جو پورے عالم انسانیت کے لیے امن و رحمت کا پیغام اور ہمدردی و خیر سگالی کا سرچشمہ ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس ملک میں ہماری زندگی کسی اجنبی و تماشائی کی زندگی نہیں ہوسکتی اس کے بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ ہمارا چولی اور دامن کا ساتھ ہے اس لیے ملی جلی وطنی زندگی میں اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے وطنی فرائض سے بھی کوئی غفلت ہمارے لیے جائز نہیں ہوسکتی میرا تو یقین یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر وطن کی سچی محبت اور اپنے فرض و منصب کا صحیح احساس بیدار ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں اپنے حقوق سے دیر تک محروم نہیں رکھ سکتی۔ ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون (اللہ کی مدد ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی ہے جو کردار و عمل کے کھرے اور نیکوکار ہوں)

(ماخوذ از خطبہ استقبالیہ انڈین مسلم کنونشن)

آج اگر جمعیۃ العلماء ہند مسلمانوں کے معاملات کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ قومی حکومت میں مسلمانوں کا کیا مقام ہونا چاہیے تو اس کو پورا حق ہے ملک کا بٹوارہ ایک پولیٹیکل بات تھی۔ بٹوارہ کے لیے ہندو جماعتوں کو بھی اور مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کو بھی دوش دیا جاسکتا ہے لیکن اب جو لوگ ہندوستان میں بس رہے ہیں یہاں کے چالیس کروڑ باشندے ہیں جو ایک بہتے ہوئے سمندر کی طرح ہیں ان میں ہندو بھی ہیں، پارسی بھی ہیں، سکھ بھی ہیں اور عیسائی بھی ہیں ان سب کا یہ حق ہے کہ وہ یہاں امن اور عزت سے رہیں اور اگر مسلمان بھی یہ بات کہیں کہ وہ بھی اپنے اس ملک میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اسے فرقہ پرستی کہہ کر دبایا نہیں جاسکتا۔ جو تعلق اس ملک سے یہاں کی اکثریت کو ہے وہی اقلیت کو بھی ہے۔ جہاں تک ملکی آزادی کا تعلق ہے یہ فرقہ پرست کیا ہمارے مقابلے میں آسکتے ہیں۔ جمعیۃ کے خدام نے تو اس وقت انگریز کی گولیوں کا مقابلہ کیا۔ جب فرقہ پرست بہت بزدلی اور گھبراہٹ کے ساتھ کنڈیاں بند کیے بیٹھے تھے۔ آج ہماری قربانیوں سے ملک آزاد ہے۔ فرقہ پرست ہمیں طعنہ دیں ان کی یہ بیوقوفی ہے۔

آج ملک آزاد ہے سب کو برابر کا حق ہے، لیکن ہم ان باتوں کو کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ خود دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس درجہ ڈی مورالائز کر دیا گیا ہے اس درجہ احساس کمتری اور خوف میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو کہتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ ہماری اس بات سے ہندو خوش ہوگا یا نہیں۔

ہم اس ملک میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمان یہاں اس لیے نہیں ہیں کہ کسی کی چاپلوسی کریں یا یہ سمجھیں کہ اس سے ہندو خوش ہوگا یا پنڈت نہرو خوش ہوں گے۔ اگر جمعیتہ کے خدام کے دل میں ایک منٹ کے لیے بھی ایسا خیال گزرے تو میں کہوں گا کہ اس سے بڑی بزدلی اور نفاق کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا ہم کہتے ہیں کہ جس طرح یہ ملک اکثریت کا ہے اسی طرح اقلیت کا بھی ہے جس طرح ہندو کا ہے اسی طرح حفظ الرحمٰن کا بھی ہے یہ ایک جمہوری ملک ہے۔

اس مسلسل پریشانی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ آیئے غور کریں کہ کس طرح اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک بات کا تعلق آپ سے ہے اور دوسری بات کا تعلق برادران وطن سے ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا اپنا ایک ذہن ہے اور وہ ذہن یہ ہے کہ یہ ہمارا بھی اسی طرح وطن ہے اور اس ملک پر ہمارا بھی اتنا حق ہے جتنا کسی دوسرے کا جس طرح ان کو رہنے کا حق ہے اسی طرح ہم کو بھی رہنے کا حق ہے۔ اس سلسلہ میں میں ایک مثال دیا کرتا ہوں، لیکن بات کو سمجھنے کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے اس لیے عرض کرتا ہوں یہ جسم ہے اس کے بہت سے حصے ہیں، پیر ہیں، ہاتھ ہیں، سر ہے، دل ہے، دماغ ہے، جگر ہے۔ ہر ہر حصہ کا اپنا مقام ہے۔ بلاشبہ سر کو یہ حق ہے کہ وہ کہے میں سب سے اوپر ہوں۔ دل کو یہ حق ہے کہ وہ کہے کہ میرے دم سے خون کی گردش کا نظام باقی ہے دماغ کو حق ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو مجھی سے قائم ہے۔ ہاتھ پیروں کو حق ہے کہ وہ اپنا اپنا راگ گائیں، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب خوبیاں اور بڑائیاں اسی وقت تک ہیں جب تک تمام اعضاء ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک جسم ہیں پھر بھی نہیں بلکہ اس جسم کی حالت تو یہ ہے کہ ایک معمولی سے ناخن میں ایک پھانس چبھ جاتی ہے تو دیکھو کیا حال ہوتا ہے نہ دل کو چین ہے نہ دماغ کو سکون نہ ہاتھ کو راحت ہے نہ پیر کو آرام۔ سارا جسم ہی اس درد سے بے چین رہتا ہے پس اس ملک کی مثال بھی ایک جسم کی مثال ہے اس میں رہنے بسنے والے اس کے ہاتھ پیر دل و دماغ ہیں۔ ہمارے ہندو بھائی شوق سے اس جسم کا اپنے کو دل دماغ کہہ لیں، اس کے ہاتھ پیر بن جائیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ اگر ناخن کے برابر بھی کسی اقلیت کے سینہ میں ذرا سی پھانس چبھنے لگی تو وہ بھی چین اور آرام محسوس نہ کریں گے ہمیں یہ شوق نہیں کہ ہم اس جسم کے دل و دماغ کہلائیں اپنی بڑائی جتائیں لیکن یہ ضرور بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم تو کیا ہم سے کم اقلیت کو بھی کوئی تکلیف پہنچے گی تو سارا جسم اس وقت تک درد میں مبتلا رہے گا۔ جب تک اس پھانس کو نکال نہ دیا جائے گا، آج ہم بھی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان چودہ سالوں میں مسلسل پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے ان پریشانیوں کو دور کیا جائے ورنہ سارا جسم درد اور بے چینیوں میں مبتلا رہے گا۔ اس درد کا علاج ڈھونڈنا ہوگا۔ اس تکلیف کو دور کرنا ہوگا۔

یہ دیش ہمارا دیش ہے یہ ملک ہمارا ملک ہے۔ اس ذرہ ذرہ سے ہم کو محبت ہے اس وجہ سے محبت ہے کہ وطن کی محبت ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ میرا مذہب مجھے بتاتا ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے ایک حدیث میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما رہے تھے تو شہر مکہ معظمہ کی طرف بار بار دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے مکہ! تو مجھے اتنا عزیز ہے کہ اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وطن سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنے کا ڈھنگ بدلنا ہے، ہمارا ملک آزاد ہے، آج اقلیت کی درخواست رحم و کرم کی درخواست نہیں ہے۔ ہم کسی سے "بھیک" نہیں مانگ رہے ہیں۔ ہر شہری کو ہر ایک چھوٹے بڑے کو ہر افسر کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا جائز حق مانگے ہمیں اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے کچھ طاقت بنانی ہے۔ وہ طاقت توپ اور بندوق کی طاقت نہیں ہے وہ ایٹم بم اور راکٹ یا میزائل کی طاقت نہیں ہے۔ وہ طاقت ہے اس دل کی یاد رکھیں جس کے پاس دل کی طاقت ہے اسے کوئی طاقت دبا نہیں سکتی ہے اس طاقت سے ہمیں اپنے حقوق کے لیے لڑائی لڑنی ہے اس ملک کے تمام معاملات کا ہم سے تعلق ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی کمزوری ہے تو ہم اسے دور کریں گے، ہم تماشائی بن کر اس کا تماشا نہیں دیکھیں گے۔

اس حالت میں ہمیں اس بات کا کیا خوف ہے۔ پاکستان کے ساتھ جوڑنے کا ٹیکنک کیوں اپنایا جاتا ہے ہم اس کے خلاف ضرور آواز اٹھائیں گے کیا ہر جگہ ظلم اور بربادی ہوتی رہے گی اور اس کے بارے میں مسلم اقلیت کسی بات کو کہے گی تو یہ کہہ کر منہ بند کر دیا جائے گا کہ پاکستان سے جوڑ ہے، پاکستان ریڈیو سے جوڑ ہے اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جا سکتا۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ اس طریقہ سے ایک اقلیت کو دبانے کی کوشش کی جائے۔

اسی طرح ٹیکسٹ بک کی بات ہے اس کے بارے میں ہم نے ایک شکایت کی تھی اور وزیر تعلیم کو ایک کتاب دکھائی تھی اور انھوں نے ہماری بات کو صحیح تسلیم کیا تھا اور کہا تھا کہ اس قسم کی کتابیں نہیں پڑھانی چاہئیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تیوہاروں کا ان میں کیوں ذکر کیا گیا ہے سوال یہ ہے کہ دیوالی ہی کا، دسہرہ ہی کا کیوں ذکر کیا گیا ہے یہ سب ہندوستان کے تیوہار ہیں۔ کسی کورس میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن جہاں اکثریت کے تیوہار کا ذکر ہے، وہاں مسلمانوں کے جو تیوہار ہیں عید ہے بقرعید ہے، شب برات کیا ہے، محرم کیا ہے، یا سکھوں کے تیوہار ہیں، عیسائیوں کے تیوہار ہیں، ان کا بھی اس میں ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اگر یہ کیا گیا ہوتا تو سیکولر اسٹیٹ کے اصولوں کے عین مطابق ہوتا، لیکن اس کے برخلاف اس طرح کی باتیں ان کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ آؤ بچو بھگوان کرشن کی پوجا کریں، آپ بتائیں کہ مسلمان کے بچے یہ کیسے کریں گے۔ بھگوان کرشن کی پوجا ہندو کر سکتے ہیں، لیکن مسلمان سکھ عیسائی کیسے کر سکتے ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی چیزیں پڑھانے کا اقلیتوں کے بچوں کو آپ کو کس نے حق دیا ہے، مسلمان اپنے خداوند قدوس کی عبادت کرتے سکھ اپنے طریقے سے کرتے ہیں عیسائی اپنے طریقے سے، اور ان کو پورا حق حاصل ہے، آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ

آپ دوسرے مذہبوں کی توہین کریں، خدا اور رسول کی توہین کریں اور یہ پرچار کریں کہ وہ سب اس طرح کی چیزوں کو پڑھیں۔

جو تجویز بھگت درشن جی نے پیش کی ہے اس کی تو میں تائید کرتا ہوں، لیکن جن معاملات کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے بارے میں پھر سے کہتا ہوں کہ پاکستان کا حوالہ دے کر آپ بچ نہیں سکتے ہیں یہ کہ کر کہ پاکستان کے ساتھ ان کا تعلق ہے کام چل نہیں سکتا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ناگپور ٹائمس میں یہ لکھا ہے مگر کیا آپ نے اسٹیٹسمین میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے ہندوستان ٹائمز میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس کو بھی پڑھتے جنھوں نے کہا ہے کہ صرف ایک سائڈ ہی کو برباد کیا گیا ہے جو کچھ ہوا ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہاں الیکٹو فائنز لگتے۔ جس طرح کہ وارداتیں ہوئی ہیں ان کو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ زندگی کا نہیں ہے اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا، اور صحیح معنوں میں سیکولرازم کو لانا ہوگا۔ مسٹر گاندھی کے بتائے ہوئے اخلاقی معیار اور نیشنلزم کو لانا ہوگا، میں یہ نہیں کہتا کہ اکثریت میں سبھی لوگ بُرے ہیں۔ اکثریت میں جو فرقہ پرست ہیں وہ جو کارروائی چاہیے کریں، من مانی کریں خوش رہیں اور جو مسلمان اقلیت ہیں یا دوسری اقلیتیں ہیں ان کو ہمیشہ ہی دبانے کی کوشش کریں اور پاکستان کا حوالہ دے کر اس کو ایک حربے کے طور پر استعمال کر کے اس قسم کی حرکتیں وہ کرتے جائیں اس کو کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ہم اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہاؤس برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، ممبر صاحبان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں سب ہی کو اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ صحیح معنی میں یہاں سیکولرازم قائم ہو۔

(۱۷ فروری ۱۹۶۱ء ۵ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ)

جتنے بھی حضرات ہوم منسٹر ہیں اگر ان میں کوئی ایسی کمزوری ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کو سنبھال نہیں سکتے ہیں تو یہ ان کا فرض ہے ان کی ڈیوٹی ہے۔ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں اور اگر وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں تو اس طرح کرسیوں پر بیٹھے نہ رہیں۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی
(ایڈیٹر معارف)

مجاہدِ ملّت کا تصنیفی مرتبہ

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کی شخصیت بڑی جامع تھی۔ ان کے کارنامے بڑے گوناگوں ہیں وہ نامور سیاسی لیڈر بھی تھے اور ممتاز عالم دین بھی، پرجوش خطیب بھی تھے اور خوش بیان واعظ بھی، ماہر تجربہ کار معلم و مدرس بھی تھے اور مشاق مصنف و صاحب قلم بھی انھوں نے مختلف اوقات میں دارالعلوم دیوبند مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دی۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے، مگر ان کی طوفانی سیاسی زندگی نے ان کے ان کمالات کو اتنا چھپایا تھا کہ مخصوص طبقہ کے علاوہ شاید عام لوگوں کو اس کا علم بھی نہ ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد ان کی علمی و تصنیفی حیثیت کا مختصر تعارف اور اس پر تبصرہ ہے ان کا اور ان کے رفیق کار اور میرے محترم و دوست مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ندوۃ المصنفین دہلی کا قیام ہے، دار المصنفین کے بعد یہ دوسرا ادارہ ہے جس نے مختلف علوم و فنون اسلامیات پر بڑا مفید اور دقیع ذخیرہ فراہم کر دیا ہے جس کے ذریعہ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کا علمی فیض ہمیشہ جاری رہے گا وہ خود بھی ایک اچھے اور ممتاز مصنف اور اہل قلم تھے اگر وہ علمی زندگی اختیار کرتے تو ہندوستان کے مشہور مصنفین میں ان کا شمار ہوتا اور یہ بھی ان کا کمال ہے کہ اپنی طوفانی سیاسی زندگی کے باوجود انھوں نے متعدد اہم تصانیف بھی یادگار چھوڑیں ان میں سب سے اہم "قصص القرآن" ہے۔

کلام اللہ میں عبرت و بصیرت کے لیے بہت سے انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں مگر ان کا مقصد تاریخ اور سوانح نگاری نہیں بلکہ سبق آموزی اور عبرت پذیری ہے اس لیے ان میں تاریخی اور سوانحی ترتیب و تسلسل نہیں ہے اور نہ ان کی تفصیلات میں پڑھا گیا ہے، بلکہ صرف عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے جہاں جن پیغمبروں اور ان کی امتوں کے جس قدر حالات کی ضرورت تھی ان کو بیان کر دیا گیا۔ اس لیے کلام مجید میں تاریخ و سوانح کی طرح ان کے مرتب اور مفصل حالات نہیں ملتے اور جس قدر ہیں وہ بھی یکجا نہیں ہیں بلکہ مختلف صورتوں میں بکھرے ہوتے ہیں ان کے حالات کا دوسرا ماخذ احادیث نبوی، تفسیری روایات، عہد عتیق کے صحیفے، قدیم تاریخی کتابیں، تاریخی آثار اور اسرائیلی روایات ہیں۔ جن کی مدد سے ان انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کے حالات مرتب کیے جا سکتے ہیں، مگر عہد عتیق کے صحیفے محرف ہیں ان میں اور کلام مجید کے بیانات میں بعض اختلافات ہیں، اسرائیلیات میں خرافات کا حصہ بھی شامل ہے اس لیے ان سے اخذ و استفادہ میں بڑی احتیاط اور تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے عربی میں تو اس نقطۂ نظر سے قصص القرآن پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اردو میں قصص انبیاء وغیرہ جیسی غیر معتبر اور افسانوی کتابوں کے علاوہ کوئی مستند کتاب نہیں تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قصص القرآن لکھی اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں کلام مجید میں مذکور انبیاء علیہم السلام کے حالات لکھے ہیں اور جا بجا دوسرے ماخذوں سے بھی مدد لی ہے اور جہاں ان کے اور کلام مجید کے بیان میں اختلاف ہے وہاں دلائل سے کلام مجید کے بیانات کی صحت و صداقت ثابت کی ہے اور مستشرقین

کے اعتراضات کے تحقیقی جوابات بھی دیے ہیں اور کلام مجید کے اصل مقصد عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے
اس طرح یہ کتاب انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ بھی ہے اور عبرت و بصیرت کا صحیفہ بھی۔
دوسری اہم تصنیف "بلاغ المبین" ہے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پورے عالم انسانیت کے لیے سراج منیر اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ کی بعثت کا مقصد ساری دنیا کو اسلام کے نور سے منور کرنا تھا اس لیے جزیرۃ العرب میں اسلام کے فروغ کے ساتھ ہی آپ نے عرب کے قرب و جوار کے حکمران اور امراء و حکام کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے نام تبلیغی خطوط ارسال فرمائے اس دعوت پر بعضوں نے اسلام قبول کر لیا۔ بعض نے انکار کیا اور بعض عناد اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے یہ تبلیغی مکاتیب اور ان کے نتائج احادیث و تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور عہد رسالت میں دعوت اسلام کی اہم کڑی ہیں۔ اس لیے سیرت کی تمام کتابوں میں ان کا ذکر ہے، مگر کسی ایک کتاب میں ایک جگہ جمع نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف کتابوں اور مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان کو جمع کر کے "بلاغ مبین" کے نام سے ان کا مجموعہ مرتب کر دیا ہے مگر یہ محض مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں اور بہت سی ضروری بحثیں بھی آ گئی ہیں چنانچہ یہ مجموعہ تین حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصہ میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں بڑی تفصیل سے تبلیغ اسلام کے اصول تحریر کیے گئے ہیں جن کی حیثیت دعوت و تبلیغ کے نصاب کی ہے۔ دوسرے حصہ میں مکاتیب مبارکہ ہیں ہر مکتوب کے ضمن میں مکتوب الیہ کے ضروری حالات اور اس کی دعوت کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے ان کی تفصیل ہے تیسرے حصہ میں نتائج کے عنوان سے اس تبلیغ کے اثرات و نتائج کی تفصیل اور تبلیغ اسلام کے متعلق بعض اصولی باتیں تحریر کی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں جو شکوک و سوالات ہوتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے دوسرے اور تیسرے حصہ میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں مخالفین اسلام کے اعتراضات اور ان کے جواب کا خاص طور سے لحاظ کیا گیا ہے اور ان کی مدلل تردید کی گئی ہے اس لیے یہ کتاب تنہا مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ دعوت و تبلیغ کا نصاب بھی ہے، عہد رسالت میں دوسری اقوام و مذاہب میں ان کی تاریخ بھی ہے اور تبلیغ اسلام پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا محققانہ جواب بھی ان مسائل سے متعلق بعض اور ضروری مباحث بھی آ گئے ہیں جن کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔
تیسری کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ اقتصادیات اور مختلف طبقوں میں دولت کی تقسیم کا ہے جس نے دنیا کو مختلف گروہوں اور مختلف نظاموں میں تقسیم کر دیا ہے اور سرمایہ و محنت میں ایک مستقل کش مکش برپا ہے۔ اسلام نے صدیوں پہلے اس مسئلہ کو حل کر دیا تھا اس کا اقتصادی نظام اس قدر متوازن ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو سرمایہ داری اور غربت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نہ کوئی اتنا سرمایہ دار بن سکتا ہے کہ قارون بن جائے اور نہ کوئی مفلس و محتاج باقی رہ سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے اسلام کے اقتصادی نظام پر ایک مستقل کتاب لکھی اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کو پیش کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ نظام اتنا متوازن ہے اور اس میں تقسیم دولت کے اصول اتنے عادلانہ ہیں کہ اس سے سرمایہ داری اور غربت و افلاس کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں نہ اس کے لیے کسی سوشلزم کی ضرورت رہتی ہے اور نہ کمیونزم کی۔
رسول کریم: یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سیرت نبوی پر اوسط استعداد کے طلبا کے لیے لکھی گئی ہے اس میں تاریخ نبوی کے ساتھ آپ کے خصائص و شمائل اخلاق اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مختصر مگر مؤثر انداز میں ذکر ہے ہر بحث کے خاتمہ پر اس کا خلاصہ اور اس کے متعلق سوالات دیے ہیں۔ طلبا کے لیے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے یہ کتاب

امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا کی ایک اہم تصنیف اخلاق اور فلسفۂ اخلاق ہے اور اپنے موضوع پر قدیم و جدید کتابوں میں نمایاں مقام کی حامل ہے بہت علمی اور فلسفیانہ کتاب ہے اس موضوع پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے اس سے بہتر کتاب میسر نہیں آسکتی۔

پردہ نشین خواتین کو سرکاری ملازمت میں بے پردگی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا

بہار کی بعض شکایات پر حضرت مجاہدِ ملتؒ کا نوٹس اور حکومت کا جواب

مارچ ۱۹۶۰ء میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ریاست بہار کے بعض علاقوں بالخصوص ضلع چمپارن سے یہ شکایت موصول ہوئی تھیں کہ محکمہ تعلیم کی جانب سے پردہ نشین مسلمان استانیوں اور انسپکٹریس وغیرہ کو جو سرکاری ملازم ہیں محکمہ کی جانب سے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ پردہ چھوڑ دیں یا سروس چھوڑ دیں، ممکن ہے ملک کے کسی دوسرے حصہ میں بھی کہیں کوئی ایسی شکایت درپیش ہو، بہرحال مولانا محترم نے اپنے خصوصی مراسلے کے ذریعہ وزیراعلیٰ بہار اور وزیر تعلیم بہار کی توجہ اس افسوس ناک شکایت پر مبذول کرائی اور لکھا:

"میں ان شکایات کو دیکھ کر حیران ہوں کہ اگر واقعتہً حکومت بہار نے کچھ ایسے احکام جاری کیے ہیں تو قانوناً وہ کہاں تک جائز اور قابلِ برداشت ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دستور ہند اور بنیادی حقوق کی دفعات ایسے احکام کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتیں میں چاہتا ہوں کہ ایسے غلط احکام کو اگر واقعتہً (وہ جاری کیے گئے ہیں) دستور کی روشنی میں چیلنج کروں۔ براہ کرم آپ مجھے اپنے ذمہ دارانہ اور اطمینان بخش جواب سے مطلع فرمائیں میں منتظر رہوں گا۔"

وزیراعلیٰ بہار شری ایس، کے سنہا نے مولانا محترم کو اس سلسلہ میں جو جواب بھیجا وہ بہت صاف تھا جو ایسے امور پر سرکاری موقف کو برملا واضح کرتا تھا ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پٹنہ۔ مارچ ۱۹۶۰ء ڈی۔ او نمبر ۳۸۸

مائی ڈیئر مولانا صاحب۔ آپ کے شکایت نامے پر میں نے ایک مکمل انکوائری کرائی ہے اور میں مطمئن ہوں کہ جو شکایت آپ تک پہنچائی گئی وہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے اس لیے کہ میری حکومت کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ سابق دستور اور ہدایات کو جہاں تک ممکن ہوسکے نباہا جاتے اور ان میں کوئی مداخلت نہ کی جائے چنانچہ مسلم خواتین کو خواہ وہ استانیاں ہوں یا طالبات ہوں یا گورنمنٹ کی کسی دوسری سروس میں ہوں، بے پردگی پر مجبور کرنے اور پردہ سے دست بردار ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوسکتا۔

آپ کا مخلص

(دستخط ایس کے سنہا)

محمد احمد ایڈووکیٹ

۱۹۴۷ء ہندی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک یادگار سال ہے۔ جو لوگ اس سال کی ہولناکیوں میں ڈوب کر ابھرے وہ کبھی اس سال کو بھول نہیں سکتے۔

۱۹۴۷ء کیا تھا؟ خاک و خون کی ہولی تھی ؟ یا موت کا بھنگڑا ناچ تھا؟

جہاں یہ سال ہمارے لیے ایک کڑی آزمائش تھی۔

وہاں یہ ہماری سخت جانی کا ایک عظیم الشان مظاہرہ بھی تھا۔ زمانہ نے تیر آزمائے ہم نے جگر آزمایا۔

خنجر نے حلقوم ہی نہیں کاٹے حلقوم نے خنجر کی باڑھ کو بھی موڑ دیا ہے۔

آزمائش اور مصیبت میں انسان کے جوہر ابھرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے صبر آزما دور میں ملت کا بھی ایک جوہر ابھرا۔

جتنی زبردست اور کڑی آزمائش تھی اتنا ہی زبردست اور عظیم الشان جوہر ابھرا۔

وہ جوہر تھا ——————— حفظ الرحمٰن ———————

صدیوں میں خاک کے پردہ سے ایسا انسان نکلتا ہے۔

چاروں طرف جمود طاری تھا، اور حفظ الرحمٰن سراسر حرکت تھا اور عمل پیہم۔

چاروں طرف بے حسی تھی اور حفظ الرحمٰن احساس کامل تھا۔

ہر طرف موت چھائی تھی اور وہ صور اسرافیل تھا۔

ہم گواہ ہیں اس کی بے مثال شجاعت کے!

لوگ پناہ کے لیے دوڑتے تھے اور وہ پناہ گاہوں سے نکل کر میدانوں کی طرف دوڑتا تھا۔

موت سے وہ نہیں ڈرا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ گرجا

جہاں دہشت تھی اور خطرہ تھا وہ وہیں پہنچا اس کے قدم کبھی نہ لڑکھڑائے راہ حق میں۔

وہ احد اور بدر کے مجاہدوں کے جذبہ سے سرشار تھا۔

ہم گواہ ہیں کہ اس میں منصور کی شوریدہ سری تھی۔ اس میں سرمد کی سرفروشی تھی۔ اس میں دار و رسن کا خوف نہ تھا۔ اس کی زبان طاقت سے کبھی مرعوب نہ ہوئی۔

مصلحت کوشی اس کی جرأت حق کو کبھی مغلوب نہ کر سکی۔

وہ مظلوم کی زبان تھا۔ وہ بانگ درا تھا اس ملت کا۔ ہم گواہ ہیں کہ وہ عمر بھر جیتا رہا۔ شمع سوزاں کی طرح جلتا رہا اوروں کو روشنی پہنچانے کے لیے۔

ہم گواہ ہیں کہ اس عظیم ملک کے جس گوشہ سے اس نے کسی زخمی کی کراہٹ کی آواز سنی وہ بے چین دوڑا گیا اس کی طرف۔

جس نے اسے پکارا اسے غافل اور سوتا ہوا نہیں پایا۔
وہ سرتاپا درد تھا اور اضطراب۔ وہ ناآشنا تھا سکون اور آرام سے۔ وہ برق تپاں تھا۔
ہم کو یاد ہے اس کی بے داغ محبت۔
اس کا خلوص بے پایاں۔ اس نے دولت کے آگے کبھی سر نہ جھکایا۔
وہ جیتا تھا اوروں کے لیے اس نے اپنی زندگی کا ایک دن اپنے لیے نہیں گزارا۔

اس کا سارا ورثہ اس کا پیغام ہے۔
حفظ الرحمٰن فتح تھی ملت کی موت پر!
کیا موت نے اس پر فتح پائی؟ کیا ظلمت نے شمع سوزاں کو مغلوب کر لیا؟ کیا حرکت کو سکون آگیا؟
جس ملت کے لیے وہ جیتا تھا اور تڑپتا تھا عمر بھر کیا وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا؟
کیا کینسر کے ایک زخم نے حفظ الرحمٰن کو ختم کر ڈالا؟ کیا ایک چنگاری نے آتش کدہ کو پھونک دیا؟
ہم کو یاد ہیں اس کی بیماری کے آخری دن بھی! اس دلِ مضطرب نے اس سے کہا۔
تیری ساری زندگی پیغام تھی یہ بیماری بھی ایک پیغام ہے۔ کینسر کی ٹیسیں ـــ جانکنیاں ـــ لیکن۔
ہجوم احباب میں اس کی محبت اور مروت بدستور تھی۔ وہ صبر و رضا کا مجسمہ ہر ایک کو خوش آمدید کہتا تھا۔
مرض کی انتہائی سختیوں میں اس کی استقامت اور خندہ پیشانی قائم تھی۔
اس کی استقامت اور صبر میں جھلک تھی اس صبر و استقامت کی جو مدینہ کے زمین و آسمان نے چودہ سو برس پہلے دیکھی تھی۔
موت کے سائے گہرے ہوتے جاتے تھے۔
لیکن وہ مایوس نہ تھا ـــ وہ ملت کے حال سے بھی غافل نہ تھا وہ عیادت کرنے والوں سے ملت کے حال کا پرساں تھا۔
ہم گواہ ہیں کہ ہم نے آخری دنوں تک اس کی شگفتہ پیشانی پر موت کا خوف نہیں دیکھا۔
سانس بے قابو ہو رہا تھا لیکن ہمت سینہ سپر تھی۔
وہ موت سے لڑتا رہا۔ وہ مجاہد تھا ملت کا۔
حفظ الرحمٰن کی زندگی ایک پیغام ہے ـــ اس کی موت بھی ایک پیغام ہے ـــ ایک پیغام جاوداں

وفات پر خراجِ عقیدت

ڈاکٹر ذاکر حسین، نائب صدر جمہوریہ ہند

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کی وفات، پورے ہندوستان کے لیے ایک سخت سانحہ ہے۔ بعض مرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ پُر کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کا شمار انہیں میں کرنا چاہیے انہوں نے اپنی مجاہدانہ زندگی کی ساری صلاحیتیں ہندوستانی قومی تعمیر کے لیے وقف کر دی تھیں ان کی حساس اور فرض شناس شخصیت نے مذہب وملت کا فرق وامتیاز کبھی روا نہ رکھا وہ ہر اس تحریک کے ساتھ تھے جو مظلوموں اور بے کسوں کی حمایت میں اُٹھائی گئی ہو۔ جب کبھی اور جہاں کہیں انہیں مظلوم کی چیخ سنائی دی تو وہ بیتاب ہو گئے اور غم گساری کے لیے پہنچ گئے اور جو بھی بن پڑا کیا کبھی حکام کو متوجہ کیا کبھی مالی اور طبی امداد کے لیے سامان فراہم کیا اور کبھی جرآت اور بے باکی سے حق اور صداقت کو اپنے اہل وطن کے سامنے پیش کیا۔

مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی ۱۹۱۹ء سے شروع ہوئی انہوں نے خلافت اور سوراج کی تحریکوں میں حصہ لیا اور متحدہ قومیت، حریت وآزادی کے پیغام کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کیا اور یہ وابستگی آخر دم تک برقرار رہی، ان کی زندگی مدح و ستائش سے ہمیشہ بے نیاز رہی۔ جو کچھ کیا اسے فرض سمجھ کر کیا۔ قید وبند کے مصائب برداشت کیے تو فرض سمجھ کر۔ آزاد رہ کر جو سختیاں جھیلیں، وہ بھی فرض سمجھ کر۔ ان کی ذات ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان اتصالی کڑی کے مثل تھی وہ قومی اتحاد اور یک جہتی کے زبردست علمبردار تھے انہیں پورا یقین تھا کہ جب تک اہل ملک میں جذباتی ہم آہنگی اور ہمدردی ومؤانست نہ پیدا ہو اس وقت تک آزادی کی برکتیں عام نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ حریت واخوت کے اصول جڑ پکڑ سکتے ہیں، جن پر ہندوستانی دستور کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

افسوس، صد افسوس کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے، لیکن کیا وہ واقعی ہم میں نہیں ہیں؟

نہیں وہ ہزاروں ساتھیوں کے سینوں میں محبت اور عقیدت کے روپ میں ہزاروں بے یاروں، بے مددگاروں بے شمار یتیموں، بیواؤں کے دلوں میں ایک سہارے کی یاد کی شکل میں، لاکھوں ہم قوموں کے ذہنوں میں، خوف کے وقت

جرأت، بے سروسامانی میں ہمت اور ہر حال میں خلوص اور صداقت کے عَلَم کی صورت میں زندہ رہیں گے۔ ایسے لوگ مرتے نہیں، موت ان کے لیے حیاتِ جاوداں کا دروازہ ہوتی ہے۔ ان کی روح اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں پہنچ گئی ہے اس کی رحمتوں اور برکتوں کی بارش اس پر ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

السیّد جمال عبدالناصر، صدر متحدہ عرب جمہوریہ:

مولانا حفظ الرحمٰن جنرل سیکرٹری جمیعۃ علماء ہند کی خبرِ وفات میں نے گہرے رنج و غم کے ساتھ سُنی۔ بلاشبہ ہم ایک جید عالمِ دین سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ خدائے پاک سے میری دعا ہے کہ انہیں اپنی رحمتوں سے نوازے اور آپ کو جو سخت نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کرے۔

جمال عبدالناصر

ڈاکٹر راجندر پرشاد، سابق صدر جمہوریہ ہند:

کیمپ حیدرآباد

مورخہ ۳۱ اگست ۶۲ء

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم جمیعۃ علمائے ہند کے ایک بلند پایہ رکن، ہماری قومیت کی ایک چمکتی مثال تھے اور میرے ان عزیزوں دوستوں میں سے تھے جن کے ساتھ بارہا کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ مثل ہے کہ عوام کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے اور اسے اپنے سچے خادموں کو بھی بھولتے دیر نہیں لگتی۔

راجندر پرشاد

مسز اندرا گاندھی

(خاص مکتوب کے ذریعہ)

مولانا کی وفات سے سب کو دلی صدمہ پہنچا۔ مولانا صاحب کی بیماری کا مجھے علم تو تھا، لیکن یہ گمان نہ تھا کہ ان کا وقت اتنا قریب آگیا ہے۔ علاج کرانے کے بعد انہوں نے میرے والد (پنڈت جواہر لال نہرو) سے کہا تھا کہ اب میں اچھا ہوں۔

مولانا صاحب نے اپنی تمام زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گزار دی۔ وہ بڑے حوصلے والے روشن خیال اور

بلند اخلاق انسان تھے ان کی وفات سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

شریک غم اندرا گاندھی

شری جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہند:

مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔ مولانا کو میں کب سے جانتا ہوں، کچھ کہہ نہیں سکتا تیس برس سے جانتا ہوں، یا شاید پینتیس چالیس برس سے جانتا ہوں، بالکل یاد نہیں ہم لوگ شروع میں دونوں یو پی کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے وہاں ان سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ سب مسئلوں پر بات چیت کیا کرتے تھے۔ جب انگریزی حکومت سے مقابلہ کرتے تھے تو ہمارا معمولی کام رک جاتا تھا، صرف مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ جیل جانے اور آنے کا کام رہتا تھا۔ ہم پھر آکر ملتے تھے تو اس سلسلے کو شروع کر دیتے تھے میں ان سے بہت ملتا تھا اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی۔ بہت محبت تھی۔ وہ بہادر سپاہی تھے بہادر نیتا تھے جو کہتے تھے، اس میں وزن ہوتا تھا، ان کی بات غور طلب ہوتی تھی۔ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے ان کی وفات سے مجھے کافی دھکا لگا ہے۔ آہستہ آہستہ سارے بزرگ گزرتے جا رہے ہیں۔ ان کے کاموں کا بوجھ نوجوانوں کے کندھوں پر آپڑا ہے۔ دنیا کا اس طرح ہی دستور ہے دستور کیسا بھی ہو۔ رنج تو ہوتا ہے اور رنج ہونا بھی چاہیے۔

ابھی وہ امریکہ سے واپس آئے تھے تب میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملا تھا، مجھ سے بڑے اطمینان سے انھوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹروں نے ان کو اچھا کر کے بھیجا ہے، ہاں کافی کمزور تھے میں نے انہیں مبارکباد دی شکر ہے کہ اچھے ہو گئے۔ سوچا تھا کہ ہلکے ہلکے طاقت آجائے گی ابھی کمزور ہیں ایک روز میں نے سنا کہ وہ گزر گئے۔ بڑا افسوس ہوا۔ اس بات کو برداشت کرنا ہی ہوتا ہے مناسب ہے کہ جمع ہوں رنج و غم کا اظہار کریں، لیکن کچھ غور کریں کہ کیسا آدمی تھا۔ اس کا کیا طریقہ تھا کیا کر گیا

ہمیں چاہیئے اس سے کچھ سیکھیں اس کے راستہ پر چلیں۔

جواہر لال نہرو

شری لال بہادر شاستری (ہوم منسٹر)

ٹاؤن ہال دہلی کے تعزیتی جلسے میں تقریر:

مولانا حفظ الرحمٰن کا کل انتقال ہو گیا۔ میرا ان کا ۳۰، ۳۲ سال کا ساتھ تھا۔ یو پی میں میرا ان کا ساتھ

رہا، پھر دلی آنے کے بعد میرا ان کا ساتھ رہا ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔ ابھی ٹنڈن جی اور مسٹر بی سی رائے کا انتقال ہوا تھا، اب مولانا بھی چل دیے اسی طرح ہم بھی ایک دن چلے جائیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ جو چلا جاتا ہے اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی دوسرا سامنے نہیں آتا۔

ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے تھے، گاندھی جی اس ملک میں آئے انھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی، ان کے ساتھ مل کر، ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر ان پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے، چھوٹے چھوٹے آدمی لیڈر بن گئے۔ ان کا ڈھنگ اور طریقہ ایسا ہی تھا۔

لیکن میں آپ سے ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ لیڈر دولت سے نہیں بنتا۔ بہت سا پڑھ لکھ جانے سے نہیں بنتا، حکومت کا وزیر بن جانے سے نہیں بنتا، لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے تو ان میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیدائشی لیڈر میں ہوتی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس ۳۲، ۳۳ سال کی مدت میں کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی جلسہ ہو کوئی موقع ہو اور مولانا اس میں شامل ہوں اور انھوں نے سب کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ لی ہو ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی، جہاں وہ بیٹھے ہوں تھوڑی ہی دیر میں وہ سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ میں نے ان کو کانگریس کے جلسوں میں دیکھا، یوپی اسمبلی میں دیکھا۔ پھر یہاں پارلیمنٹ میں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے دیکھا، وہ اپنی بات سے اپنی سچائی اور بردباری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔

مولانا ہمارے لیے بڑا سہارا تھے۔ ملک کے لیے مشکل مسئلوں میں ان کی رائے کا ایک وزن تھا اس لیے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تک تو ان کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ ملک کو آزاد کرانے کا لیکن اس کے بعد سے ان کے سامنے ملک کی ترقی اور ملک کے اتحاد کا سوال سب سے زیادہ رہتا تھا

اس ملک میں کبھی کبھی ایسی باتیں ہو جاتی تھیں جن سے مولانا کو بہت دکھ پہنچتا تھا میں آپ کو بتاؤں وہ کیا باتیں تھیں جن سے مولانا بہت دکھی ہوتے تھے یہی باتیں کہ کبھی ہم یہاں لڑ بیٹھے کبھی وہاں دنگا فساد کر دیا۔ جب لاٹھی اور خنجر کا استعمال ہوتا ہے تو کون ہندوستانی ہے جس کے دل پر چوٹ نہ لگتی ہو۔

مولانا کو ایسی باتوں سے بہت دکھ ہوتا تھا وہ ناراض ہوتے تھے، غصے بھی ہوتے تھے مگر سنجیدگی اور بردباری کے ساتھ ان باتوں کو سوچتے تھے ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے ان کے اندر ایسے واقعات سے کوئی تلخی پیدا نہیں ہوتی تھی وہ بے چین ہوتے تھے اور غلط باتوں کے خلاف پوری قوت سے آواز اٹھاتے تھے، مگر بردباری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے

جبلپور میں ایسا ہی دنگا فساد ہوا مولانا وہاں گئے اپنی آنکھوں سے وہاں کی باتیں دیکھ کر آئے۔ وہ بہت دکھی تھے انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے، ملک کے لیڈروں کے سامنے، وہ باتیں بڑے دکھ کے ساتھ

بیان کیں، جو وہ دیکھ آئے تھے میں آپ کو بتاؤں کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اس جلسہ میں اس صوبے کے چیف منسٹر صاحب بھی موجود تھے، لیکن مولانا نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جو غصہ لیے ہوئے، نفرت لیے ہوئے یا سخت ہو، ان میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ بڑی سے بڑی تکلیف میں اپنی زبان سے سخت لفظ نہ نکالتے تھے۔

بہت سی باتیں جو انھوں نے بیان کیں ان کے بارے میں جب ان کو ایسی باتیں بتائی گئیں جو ان کے علم میں نہیں تھیں تو انھوں نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ انھوں نے فوراً کہا۔ یہ باتیں میں نوٹ کیے لیتا ہوں، میں ان کی تحقیق کروں گا، اور آپ کو بتاؤں گا کہ اصل بات کیا ہے لیکن یہ جو میں اپنی آنکھ سے دیکھ کر آیا ہوں اس کے بارے میں میں نہیں مان سکتا، یہ ان کی سچائی کی بات تھی اسی طرح وہ ہر معاملہ میں ہماری مدد کیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے لیے ایک بڑا سہارا تھے۔

باتیں تو بہت سی ہیں، لیکن وقت نہیں ہے، اگر کبھی وقت ملا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاؤں گا کہ مولانا میں کیا خوبیاں تھیں انکی خوبیاں بہت زیادہ تھیں انکی باتیں کیسی ہوتی تھیں یہاں میں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں۔

انھوں نے دہلی میں انڈین مسلم کنونشن بلایا۔ میرا خیال یہ تھا کہ ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ اس طرح کا ایک کنونشن بلائیں، چنانچہ میری رائے ان کی رائے سے الگ تھی، اور اکثر ایسا ہوتا کہ ہماری رائے ان کی رائے کے مطابق نہ ہوتی لیکن مولانا کی رائے میں ایک وزن ہوتا تھا ہمیں انکی رائے ماننی پڑتی تھی، وہ اپنی بات کو بہت صفائی سے، جرأت سے اور دلیلوں کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ایک دن رات کو ۱۱ بجے وہ مجھ سے ملنے آئے۔ ایک گھنٹہ تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے اور انھوں نے اپنے دلائل سے مجھے رائے بدلنے پر مجبور کر دیا میں ان کی بات سے متفق ہوگیا، چنانچہ میں صبح سویرے ہی اُٹھ کر سب سے پہلے آپ کے ملک کے وزیر اعظم صاحب کے پاس گیا اور میں نے ان کو بتایا کہ رات ایک گھنٹہ تک مولانا سے میری بات چیت ہوئی ہے، میں نے پنڈت جی کو وہ باتیں سنائیں اور میں نے کہا کہ اب میں اس حق میں ہوں کہ مسلم کنونشن ہونی چاہیے۔ چنانچہ پنڈت جی نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور وہ کنونشن ہوا۔

مولانا ایک زبردست مقرر تھے میں یہاں کسی کی شان میں گستاخی کرنا نہیں چاہتا اور میری رائے اگر غلط ہے تو میں معافی چاہتا ہوں، لیکن میں کہوں گا کہ اس ملک میں ایک تو مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو بہت اچھی تقریر کرتے تھے ان کا نام ہی ابوالکلام تھا، لیکن ان کے بعد میں نے گزشتہ ۳۰، ۴۰ برس میں مولانا حفظ الرحمن سے زیادہ اچھی اور سلجھی ہوئی تقریر کرنے والا نہیں دیکھا، ایک دفعہ مجھے ان کے ساتھ فرخ آباد کے ایک جلسہ میں شرکت کا موقع ملا کوئی ۲½، ۳ لاکھ انسانوں کا مجمع تھا، مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے ان کی آواز کے اوپر اُٹھنے کے ساتھ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سارا مجمع نیچے گر رہا ہے مجھے تھوڑی دیر بعد یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اس ۳ لاکھ کے مجمع سے جو چاہے کرا سکتا ہے اسی طرح جب وہ پارلیمنٹ میں بولتے تھے تو پورے ہاؤس میں سکون اور خاموشی سے ان کی تقریر سنی جاتی تھی۔ اس کا خاص اثر ہوتا تھا۔ جنوبی ہند کے ممبران بھی جو ان کی زبان نہ سمجھ سکتے تھے۔ سکون اور خاموشی سے ان کی تقریر سنتے اور ان کے لب و لہجہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے ہی متاثر ہوتے تھے۔

اس ملک میں بڑے بڑے لیڈر آج بھی موجود ہیں، لیکن جو بات مولانا میں تھی وہ میں کسی میں نہیں پاتا ایک طرف تو مولانا ملک کے بڑے بڑے مسائل میں اپنی رائے دیتے تھے اور اونچی سے اونچی سطح پر کام کرتے تھے۔ دوسری طرف مولانا ایسی سادگی کے ساتھ زندگی گزارتے کہ غریب سے غریب اور کمزور سے کمزور آدمی مولانا تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا وہ سب کی بات سنتے تھے اور فوراً اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے تھے وہ روزانہ ہی مجھ کو یا تو کسی معاملے سے متعلق خط لکھتے تھے یا پارلیمنٹ میں مجھ سے آکر ملتے تھے وہ کسی ایک ہی فرقے کے لوگوں کے کام لے کر میرے پاس نہ آتے تھے بلکہ جس فرقہ کا بھی آدمی ان کے پاس پہنچ جاتا تھا اور اپنی مصیبت کا حال ان کو سناتا تھا اس کا ساتھ دینے کے لیے وہ تیار ہو جاتے تھے، وہ صحیح معنوں میں غریبوں کمزوروں، بیکسوں اور مظلوموں کا سہارا تھے، ان کے ہمدرد تھے، ان کے کام آتے تھے یہ لوگ ان تک آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے تھے۔

کسی کام کے کرنے کے سلسلے میں ہماری بھی اپنی دقتیں ہوتی ہیں۔ وہ جب کسی کام کے لیے کہتے تو میں ان کے سامنے اپنی دقتیں بیان کرتا، ان کو بھی وہ غور سے سنتے اور پھر جلد ہی ایک نتیجہ پر پہنچ جاتے وہ کہتے "اچھا یہ تو آپ کے ایڈمنسٹریشن کی مجبوریاں ہیں، میں انہیں مانتا ہوں، لیکن فلاں بات کا کوئی تعلق آپ کے ایڈمنسٹریشن سے نہیں ہے اسے تو ٹھیک ہی ہو جانا چاہیے" اور ہمیں ان کی بات ماننی ہی پڑتی، ان کی بات میں اتنا وزن ہوتا تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ ایسے لیڈر کہاں ہیں۔ آج ہمیں مولانا حفظ الرحمٰن جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے۔ ایسے لیڈرس کی ضرورت ہے جو ان کی طرح سوچ سکیں، ان کی طرح اپنی بات منوا سکیں، غریبوں، مظلوموں، بے کسوں کے بلا تفریق مذہب و ملت کام آسکیں۔ برائیوں پر ان کے دل دکھی ہوں، لیکن ان کے اندر تلخی پیدا نہ ہو، میں نہیں جانتا کہ اب مولانا جیسی سنجیدگی ذہانت تدبر اور بردباری رکھنے والے لوگ پیدا ہوں گے یا نہیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آج ہمیں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے، میں نوجوانوں سے کہوں گا کہ وہ مولانا کی طرح بننے کی کوشش کریں۔ درحقیقت مولانا کا انتقال نہیں ہوا ہے، بلکہ مظلوموں اور بیکسوں کا سہارا اُٹھ گیا ہے۔

لال بہادر شاستری سابق وزیر اعظم ہند

مولانا داؤد غزنوی۔ لاہور پاکستان

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر مجھے ایک سفر سے واپس آنے کے بعد ہوئی۔ اس خبر کا بے حد صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا اپنے علم و فضل کے لحاظ سے ملک کے ممتاز ترین علماء میں سے تھے اسلامی غیرت و حمیت اور اس کے لیے جاں نثاری میں قابل رشک مقام رکھتے تھے۔ ان کی خدمات علماء کی تنظیم اور ان کے مقام کو بلند کرنے میں بے مثال تھیں۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد وہ اسلام کے نڈر بہادر سپاہی بھی تھے اور کمانڈر بھی تھے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تقسیم کے بعد وہ مسلمانوں کا سہارا تھے۔ انہوں نے اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر جس جرأت اور بے باکی

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز بلند کی آج اس کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔ وہ حسن اخلاق، مروت ہمدردی ایثار نفسی اور تحمل و بردباری کے مجسمہ تھے۔

ان کے فراق پر آنکھیں اشکبار ہیں، دل حزیں و غمگسار ہے، لیکن رضا بالقضاء کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے رفیق قدیم کی جدائی پر انا للہ وانا الیہ راجعون کہیں اور ان کے حق میں دعا کریں۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج ونقہ من الخطایا کما نقیت الثوب الابیض من الدنس و بدلہ داراً خیراً من دارہ واھلاً خیراً من اھلہ وزوجاً خیراً من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر ومن عذاب النار۔

مولانا داؤد غزنوی لاہور

مولانا عبدالحامد بدایونی ۔ صدر جمعیۃ علماء پاکستان۔

سیوہارہ ضلع بجنور کی سرزمین قابل فخر ہے جس نے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسا عالم پیدا کیا جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فراغت وتکمیل علوم عربیہ کے بعد ہی قومیات، مذہبیات کی تحریکات میں پورے جوش کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تحریک خلافت، آزادی جزیرۃ العرب میں انہوں نے انتہائی سرگرمی کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ اس تحریک میں جو لوگ شریک ہوتے ان کے اندر مودت و محبت کے رجحانات و میلانات نمایاں طور پر پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ہمیں یاد ہے کہ جب ہماری اور مولانا کی پہلی ملاقات سیوہارہ خلافت کے ایک جلسہ خصوصی میں ہوئی اس دن سے تا قیام پاکستان وہ جب ملے انتہائی اخلاص و محبت سے ملے۔ سیاسیات میں اگرچہ ان کی ہماری دو جداگانہ راہیں اور منزلیں تھیں، مگر مولانا نے کسی وقت بھی تعلقات میں فرق نہ آنے دیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن بہترین خطیب و مقرر تھے ان کی تقاریر میں جوش و ولولہ، خطابت، علمی مواد ہوتا اور ہر ذوق کا سامان ہوتا، سیاسی تقاریر کے علاوہ ہیں نے چند تقاریر سیرت نبویہ پر بھی سنیں، بلاشبہہ یہ تقاریر یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں، کاش اس زمانے ہیں ٹیپ ریکارڈ ہوتے تو یہ ریکارڈ کی جاتیں۔

مولانا اگرچہ شروع سے لے کر آخر تک کانگریسی رہے لیکن ان کے اندر مذہبی تڑپ ملت اسلامیہ کی ضرورتوں کا احساس، مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے تاثرات زیادہ سے زیادہ موجود تھے، وہ جہاں اسمبلی کے اندر مسلمانوں کے معاملات پر آزادی کے ساتھ بولتے وہیں حکومت کی بنچوں میں بیٹھ کر کلمہ حق بلند فرماتے پورے ہندوستان میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر کوئی آفت آتی، مولانا حفظ الرحمٰن مضطربانہ انداز میں موقعہ واردات پہ پہنچ کر مصیبت زدوں کی امداد و اعانت فرماتے مولانا کی یہ خدمات جلیلہ تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ اسلامیان ہند کی طرح پاکستان کے علماء بھی مولانا مرحوم کو فراموش نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالےٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم۔ مظاہر العلوم سہارن پور

مکرم محترم، مدفیوضہم، بعد سلام مسنون

کل کے تار کی رسید تو مولانا محمد میاں صاحب کے کارڈ پر اسی وقت لکھ چکا تھا۔ اس حادثہ پر قلق اور رنج جتنا بھی ہو، قرینِ قیاس ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ جرأت اور بیباکی سے حکّام کے سامنے مسلمانوں پر مظالم کو پیش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ ہی مولانا مرحوم کو ان سب مساعی جمیلہ کا، جو انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود بالخصوص ۴۷ئہ کے حوادث میں کیں کہ یہ ناکارہ خود بھی اس وقت دہلی ہی میں موجود دیکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی شایان شان بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔ غالباً آپ کے علم میں تو یہ بات ضرور ہوگی کہ اس ناکارہ کے یہاں تعزیتی ریزولیوشن وغیرہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ میرے نزدیک جانے والے کے لیے اور پسماندہ دوستوں کے لیے کام آنے والی چیز دعاء مغفرت اور ایصال ثواب ہے۔ ——— کل سے جب حادثہ کی اطلاع سنی، مدرسہ کے علاوہ خصوصی احباب سے بھی یہی فرمائش کر رہا ہوں کہ ہر حافظ کم از کم قرآن پاک اور ناظرہ خواں تین مرتبہ سورہ یٰسین اور جو ان پڑھ ہوں وہ کم سے کم تین مرتبہ قل ہو اللہ پڑھ کر ضرور بخشیں۔ بندہ کے نزدیک مولانا کے احسانات علی المسلمین کا اگر کوئی بدلہ ہے تو یہی ہے۔

محمّد زکریا

مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب تھے۔ علیگڑھ یونیورسٹی کا خراج عقیدت۔

(تعزیتی قرار داد)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے انتقال پُر ملال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرنے کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا، اساتذہ، ممبران کورٹ اور جملہ کارکنان کا ایک جلسہ یونین ہال میں منعقد ہوا، اسی روز یونیورسٹی میں تعطیل کر دی گئی تھی، جلسہ کی صدارت پرو چانسلر نواب صاحب چھتاری نے فرمائی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے نواب چھتاری، جناب عبدالمجید خواجہ اور مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سیکرٹری بصیرت احمد صاحب نے حضرت مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بعد میں وائس چانسلر کرنل بشیر حسین صاحب زیدی نے مندرجہ ذیل قرار داد پیش کی جو متفقہ طور پر جلسے نے کھڑے ہو کر پاس کی۔

"مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء، اساتذہ، ممبران کورٹ اور جملہ کارکنوں کا یہ جلسہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات پر انتہائی رنج و الم اور ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، مولانا جنگِ آزادی کے عظیم مجاہد، روشن خیال عالم اور بلند پایہ خطیب تھے انہوں نے جنگ آزادی کے راستہ میں قید و بند کی ہر تکلیف کو بے نیازی کے ساتھ برداشت ہی نہیں کیا بلکہ انہیں جرأت اور پامردی کے ساتھ دعوت بھی دی وہ بجنور کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے، خلافت اور کانگریس کی تحریک کے سلسلہ میں مولانا کی قربانیاں۔ اُتر پردیش اور ہندوستان کی تاریخ میں یادگار ہیں، وہ ہندوستانی قومیت کے زبردست حامی تھے، ملک کی تقسیم کے بعد جس طرح انہوں نے ہندوستانی قومیت اور جمہوریت کے تصور کو اس ملک میں قائم کرنے کی جدوجہد کی وہ ہند[illegible]ستان کی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔

۱۹۴۷ء سے لے کر اپنے آخری لمحوں تک مولانا نے ان مقاصد کے لیے صحیح معنوں میں جہاد جاری رکھا۔ مولانا کی علمی خدمات نہایت گرانقدر رہیں، علمی اداروں کی خدمت اور اساتذہ کی بہبودی کے لیے انھوں نے اپنی ذات سے جو کچھ کیا وہ انجمنیں اور جماعتیں نہ کر سکیں، وہ ایک بڑے روشن خیال بزرگ تھے جس کا ایک بڑا روشن ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے دیوبند کے تصور کو علی گڑھ کے تصور پر اور علی گڑھ کے تصور کو دیوبند پر کبھی مسلّط نہیں کیا، وہ جہاں پرانے علوم کا احترام کرتے تھے، وہاں مغربی علوم کی ضرورت اور اہمیت کے معترف اور ان کے ماہرین کے سچے قدردان بھی تھے، ان کی رواداری اور وسیع المشربی میں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں تھا۔ وہ امیر، غریب، عالم اور جاہل سب کے غمخوار تھے، البتہ وہ ہر قسم کی غلامی اور ہر قسم کے استبداد کے سخت دشمن تھے اور ان کے خلاف جہاد کرنے میں اپنی جان و مال کی کبھی پروا نہیں کرتے تھے۔

مولانا مسلم یونیورسٹی کے ساتھ کئی حیثیتوں سے وابستہ تھے وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور ایگزیکٹیو کونسل کے رکن تھے انھوں نے اس ادارہ کی زبردست خدمات انجام دیں۔ مولانا کی وفات ہندوستان کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اور علمی، ادبی اور سیاسی جماعتوں کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ خدائے عزوجل سے دعا ہے کہ وہ حضرت مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان اور اقربا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ہز ایکسیلنسی الشیخ یوسف الفوزان سفیر سعودی عرب

لا ريب بأن وفاة المرحوم مولانا حفظ الرحمٰن كانت فادحة كبرىٰ بالنسبة للهند عامة، ولمسلمي الهند بصورة خاصة

اذ فقده مسلموا الهند و هم اشد ما يكونون حاجة لقيادة حكيمة ذات رزانة ومرونة يتصف صاحبها بالجرأة والثبات على المبدء

فلقد عرف الفقيد رحمة الله بحماسته الوطنية وغيرته الدينية واتساع افق تفكيره ونضوج ارائه

ولقد اتسم بالنزاهة والتجرد من الاطماع والاغراض والمآرب الذاتية. كما ان صلابته وصراحته كانت مثالاً من امثلة الرجولة الحقة. وبرفاته طويت صفحة بيضاء ناصعة فى الجهاد الوطنى والدينى. كان رحمة الله وغفرله أثناء مرضه مثال المومن الصابر المحتسب اذابدا جلدا وصبرا ينم عن عميق ايمانه، بالرغم مما عاناه من الاوجاع المبرحة وآلام الداء العضال الذى ادىٰ اخيرا بحياته.

اكرم الله مثواه وتغمده برحمته (وانا لله وانا اليه راجعون.)

"يوسف الفوزان"

مولانا سید محمد بدر عالم ۔ مدینہ منورہ

میرے علم میں اس وقت تمام ہند میں مسلمانوں کے سب سے بڑے خیر خواہ اور ہمدرد، مجاہد عالم، رفیق محترم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب غفر اللہ لہٗ و اعلیٰ درجاتہٗ فی علیین تھے۔ اپنے غم کا کیا اظہار کروں۔ بسترِ علالت پر پڑا ہوا اس الم سے کروٹیں بدل رہا ہوں، موجودہ دور میں مولانا جیسی ہستی کا فقدان ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربّك ذو الجلال والاکرام

مولانا سید محمد بدر عالم

ہز ہولی نس ملا طاہر سیف الدین ۔ بمبئی۔

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی خبرِ وصال دلی رنج و غم کے ساتھ سنی ان کی عظیم الشان خدمات کے تذکرے تا دیر باقی رہیں گے اور آئندہ نسلوں کو بے لوث خدمت و عمل کا سبق دیں گے۔ ان کی فیملی تک دلی ہمدردیاں پہنچا کر ممنون فرمائیے

"ملا طاہر سیف الدین"

شیخ الازہر الشیخ محمود شلتوت ۔ جامعہ ازہر (مصر)

"مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات پوری ازہر یونیورسٹی کے لیے باعث قلق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خدمات کا اجر جزیل بخشے جو انہوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے انجام دیں اور ان کے تمام پس ماندگان، متوسلین و رفقاء کار کو صبر جمیل سے نوازے۔"

شیخ محمود شلتوت

شورش کاشمیری ۔ ایڈیٹر "چٹان" لاہور۔

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے وصال سے دل پر جو بجلی گری ہے، ناقابلِ بیان ہے۔ ان کی وفات ایک بے مثل عالمِ دین، عظیم رہنما، مجاہدِ حق اور مسلمانانِ ہند کی آخری امید کی موت ہے۔"

شورش کاشمیری

تاریخ وداع فی ۱۳۸۲ھ

اثیم اُو حضرا مبارک تاریخی
۱۹۶۲ء

وداع ناظم عمومی جمعیت علماء ہند
۱۹۶۲

حفظ الرحمن راغ ۱۹۶۲ء

رکن جلیل مجلس دار العلوم دیوبند و مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
۱۹۶۲

مقبول الہند جناب
مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب
۱۹۶۲ء

برّد مضجعہ الولی العلیم
۱۳۸۲ھ

کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (البدیع) ۰ (الاو) کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ
۱۹۶۲ء ۱۹۶۲ء

اِنَّ اللّٰہَ المحصی لیرفع العلم برفع العلماء ● موت عالم القوم موت العالم
۱۳۸۲ھ ۱۳۸۲ھ

اما کان قیس ھلکہ ھلک احد — ولکنہ بنیان قوم تھدما
۱۳۸۲ھ

گئے حضرت مجاہد ملت ⋄ جان رحمت میں واصل جنت
۱۹۶۲ء ۱۳۸۲ھ

ہے اکسٹھ سال چھ ماہ بیس دن عمر مجاہد کل	ہیں دن بائیس ہزار و چار سو اور پھر تراسی کل
۶۱ برس ۶ مہینہ ۲۱ دن	۲۲۴۸۳
تری دس جنوری انیس سو اِک میں ولادت ہے	دریغا دو اگست انیس سو باسٹھ میں رحلت ہے
۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء	۲ اگست ۱۹۶۲ء
ولادت سال ہجری ہے مگر تیرہ سو اٹھارہ	ہے تیرہ سو بیاسی میں تری فرقت سے دل پارہ
۱۳۱۸ھ	۱۳۸۲ھ

نالائق خادم جمعیت بپورہ معروف ...... عثمان اعظم گڈھی مدرس مدرسہ معروفیہ پورہ معروف
۱۹۶۲ء ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء = ۳۳۴۴

بانیٔ تنظیم اہلِ سُنّت سردار احمد خان پتافی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۶۰ء

سید نور الحسن بخاری

بانئ تحریکِ تنظیم
سردار احمد خاںؒ پتافی رحمہ اللہ

ضلع ڈیرہ غازی خاں (سابق پنجاب) کے طول و عرض میں بلوچ قوم کثرت سے آباد ہے۔ یہ ایک دیندار، غیور، بہادر، مہمان نواز اور دوسرے بہت سے اخلاقِ حمیدہ، صفاتِ ستودہ سے متصف قوم ہے اس قوم کے متعدد مشہور قبیلے ہیں مثلاً: لغاری، مزاری، ریتک، کورچانی، بزدار۔

انہی بلوچی قبائل میں سے ایک معزز و مشہور قبیلہ پتافی ہے۔ راجن پور اور جام پور دو تحصیلوں میں پتافی بلوچوں کے کئی خاندان آباد ہیں۔

نسب

جام پور سے ڈیڑھ دو میل دور ساحل دریا پر ایک موضع ہے، لنڈی پتافی! یہ پتافی خاندان کی ملکیت ہے، جناب سردار صاحب مرحوم اسی خاندان کے ایک نہایت ہی معزز فرد تھے۔

جس زمانہ میں سردار صاحب کی پیدائش ہوئی اس زمانہ میں دین کا عمومی احترام زیادہ پایا جاتا تھا پھر ضلع ڈیرہ غازی خاں اپنے الگ تھلگ محل وقوع کے باعث فرنگی اقتدار و تہذیب کے اثرات اور لادینی رجحانات سے نسبتاً دور پھر دیندار خاندان اس صحت مند ماحول میں جناب سردار صاحب نے آنکھ کھولی۔

تعلیم

زمیندارہ دستور کے مطابق دین و دنیا کی واجبی تعلیم حاصل کی، انگریزی فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی اور فارسی تو صرف پڑھ اور سمجھ سکتے تھے، لیکن اردو بے تکلف بول سکتے تھے اور لکھنے پر بھی قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ دینی تعلیم کی عربی مکتب و مدرسہ سے باضابطہ تو حاصل نہیں کی تھی، لیکن اپنے وسیع مطالعہ کی بناء پر دین کا نہایت صحیح علم رکھتے تھے۔

دل و دماغ

سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ گو ایک زمیندار گھرانے کے فرد تھے، لیکن آپ کا دل و دماغ "زمیندارانہ" نہ تھا، آپ نے دماغ پایا تھا تو روشن و بیدار اور آپ کو دل ملا تھا تو زندہ و دردمند۔ بیدار دماغ نے اغیار کی مذہبی بیداری و حرکت، تبلیغی تنظیم و مرکزیت اور ایثار و فدائیت کا عمیق مطالعہ اور اضطراب انگیز احساس کیا اور دردمند دل اپنوں کے مذہبی جمود و غفلت اور تبلیغی انتشار و لامرکزیت پر تڑپا

تعلیمی مرکزیت

جب مالی فراخی و فراغت کے ساتھ دل میں درد اور تڑپ ہو تو انسان قوم و ملت کی خدمت کے لیے آگے بڑھتا ہے، چنانچہ اس وقت جب ضلع کے دوسرے بڑے آدمی

فرنگی کی خوشامد درآمد میں مست مگن تھے، سردار صاحب نے قوم وملت کی خدمت پر کمر کس لی، جس کا آغاز آپ نے تعلیمی سلسلہ سے کیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب کہ قومی کاموں پر ایک پیسہ خرچ کرنے کے تصور تک سے لوگ نا آشنا تھے آپ نے جام پور میں ایک اسلامی مڈل سکول اور تین چار پرائمری سکول قائم کر کے ان پر ہزاروں روپیہ صرف کیا۔ صرف مڈل سکول کی پختہ عمارت پر بیس پچیس ہزار سے کیا کم خرچ ہوا ہوگا۔ یہ سکول امتحانات کے نتائج کے اعتبار سے پورے ضلع میں اپنی مثال آپ تھے، سینکڑوں طلبہ نے یہاں سے سرکاری وظائف پا کر تعلیم حاصل کی اور اپنا مستقبل روشن کیا

تبلیغی جذبہ تعلیمی سلسلہ میں جناب سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے روپیہ بھی بے دریغ خرچ کیا اور اپنی زندگی کے بہترین دور کا گراں بہا وقت بھی، مدتوں صبح سویرے آپ سکول تشریف لے جاتے سارا دن وہاں رہتے اور شام کو گھر واپس تشریف لے آتے۔

پندرہ بیس سال کے بعد دور ارتداد میں آپ نے جب دیکھا کہ مرزائیت بلکہ آریہ سماجیت تک ہمارے ان سکولوں کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو کھائے جا رہی ہے اور زیادہ تر ملت کا تعلیم یافتہ وحساس طبقہ نہایت خاموشی سے ارتداد کی رو میں بہا چلا جا رہا ہے، تو آپ کا درد مند دل مسلمانوں کی بیکسی وبے چارگی اور ان کے انتشار ولامرکزیت پر سیماب وار بے قرار ہو گیا، اور آپ نے اپنے اندر ملی اصلاح کے طریق کار میں فوری تبدیلی کی ضرورت کا شدید احساس موجود پایا۔

اب آپ نے اسلام کے مستقل نظام تبلیغ کی ضرورت محسوس کی، کہ اس طریقہ سے اسلام کی اشاعت کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ اہل اسلام کو اغیار کی یورش ویلغار سے بچایا جا سکتا تھا

ضلع بھر میں تبلیغی کام چنانچہ آپ نے اپنے ضلع کے طول وعرض میں تبلیغ دین کا کام شروع کر دیا اور اس کام کو محدود حلقے میں منظم بھی کیا۔ ضلع ڈیرہ غازی خاں پر اس وقت جہالت وبدعت کی ظلمت وتاریکی چھائی ہوئی تھی۔ نہ ضلع کے اندر کوئی معیاری حق گو واعظ وداعی تھا نہ باہر سے کوئی اہل حق کبھی آکر حق کی دعوت دیتا تھا (الا ماشاء اللہ) پورے ضلع میں (سابقہ) ریاست بہاولپور کے مولوی محمد یار کا طوطی بولتا تھا۔

مولوی محمد یار محمد یار عالم اور مولوی کہلاتا تھا۔ محمد یار واعظ تھا، شاعر تھا، صوفی تھا، پیروں مرشدوں کا پجاری تھا، اور خود بھی "پیر مرشد" بنا ہوا تھا۔

یہ وہی محمد یار تھا جس نے ملتان کے بھرے جلسے میں مخدوم صدر دین شاہ صاحب کی موجودگی میں برملا کہا تھا ؎

برائے چشم بینا از مدینہ بر سر ملتان
بہ شکل "صدر دین" خود رحمۃ للعالمین آمد

شعر بھی اس محمد یار کا "شاہکار" بیان کیا جاتا ہے ؎

چاچڑ شہر مدینہ وسدا، کوٹ مٹھن بیت اللہ
ظاہر دے وچ پیر فریدن باطن دے وچ اللہ

محمد یار کی زبان میں بلا کا رس تھا، انتہائی سوز تھا، وہ اپنے لحن اور جادو بیانی سے حاضرین کو مسحور کر دیتا تھا، وہ منبر پر بیٹھ کر مولانا روم کی مثنوی اور خواجہ غلام فرید کا دیوان دردناک انداز، رس بھری آواز اور دلفریب طرز وترنم میں گاتا تو اڑتے پرندے ٹھہر جاتے اور چلتا دریا تھم جاتا۔

محمد یار اپنے طبع زاد یا دوسرے شاعروں تلمذ شاعروں کے رومانی اور مبتذل اشعار اور دوہڑے ملتانی زبان میں منبر پر پڑھتا اپنے اوپر کیف و سرور طاری کر لیتا تھا، وہ جھومتا اور وجد کرتا اور جھومتے جھومتے مست و بیخود ہو جاتا تھا جب وہ حاضرین سامعین کو اپنے اس رنگ میں رنگ کر مست و مدہوش اور مسحور و مسخر کر لیتا تو بڑی آسانی سے انہیں اپنی دعوت باطلہ کا شکار کر لیتا۔ اس مرد ضال و مضل نے خدا اور رسولؐ کے منبر و محراب سے برسوں شرک و بدعت کی دعوت اور پورے ضلع کے سادہ لوح و جاہل لوگوں کو الحاد و بے دینی، شرک و بدعت اور گمراہی و ضلالت کی آغوش سلا دیا۔

ضلع بھر میں بیسیوں نواب، تمندار، سردار، جاگیردار اور اعلیٰ زمیندار تھے، مگر اس ایمان سوز منظر اور دردناک صورت حالات سے کسی کے کان پر جوں تک بھی تو نہ رینگی اس المناک "حادثہ" سے اگر متاثر و مضطرب ہوا تو جناب سردار پتافی رحمہ اللہ! ضلع میں عبادؔ و زہاد بھی تھے، مگر کسی کا دل مسلمانوں کی اس مظلومیت وایمانی زبوں حالی پر نہ پسیجا اگر پسیجا تو سردار ہی کا دل!

کام اس سے فرقہ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی کچھ جو کام آتے تو یہ رندانِ قدح خوار آئے

سردار صاحب کا حساس و دردمند دل تڑپا، آپ نے مقامی علماء کرام کو ساتھ لے کر ضلع میں تبلیغی مہم کا آغاز کر دیا، مگر ایسے فصیح اللسان ساحر و فنکار کا باطل افسوں توڑنا ان حضرات کے بس کا روگ نہ تھا۔

فرعونے را موسیٰ

سردار صاحب کی مفکر و مدبر شخصیت نے جلد تر اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ اگر محمد یار کا ... سکتا ہے تو حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً) موسوی سے!

حضرت امیر شریعت سے ربط و تعلق

چنانچہ آپ نے حضرت بخاری صاحب رحمہ اللہ سے راہ و ... پیدا کی ان سے اپنا درد کہا اور بفضلہ تعالیٰ انہیں اپنا ہمدرد بنا... سردار صاحب نے حضرت امیر شریعتؒ کو اپنے ضلع میں تبلیغ دین کے لئے تکلیف دی اور بارہا تکلیف دی، ... منگروٹھ سے لے کر ڈیرہ غازی خان، چوٹی زیرین، جام پور، داجل، تونسہ، غربی حاجی پور، راجن پور اور روجھان تک پورے ضلع ... کئی تبلیغی دورے کرائے، سردار صاحب ہر جگہ حضرت امیر شریعت کے ساتھ ہوتے تھے، رحمہا اللہ تعالیٰ، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی قوت ایمانی جادو بیانی اور اعجاز لسانی سے محمد یار کے سحر سامری کو کچل کر رکھ دیا، خدا خدا کر کے باطل کا افسوں ٹوٹا، ضلع بھر میں ایمانی حرارت پیدا ہوئی اور درحقیقت اسلامیان ڈیرہ غازی خان نے ایک نئی زندگی پائی۔

آج اس ضلع میں جو اسلامی روح، دینی جذبہ، اصلاحی ولولہ، ایمانی جوش اور تبلیغی کام، خواہ وہ کسی جماعت کی قیادت میں نظر آتا ہے وہ انہی مردان حق آگاہ و غازیانِ سرفروش کے شبانہ روز عمل اور جہاد مسلسل کا نتیجہ ہے۔ رحمہما اللہ

مرزائیت اور آریہ سماج کی مزاحمت

ان تبلیغی دوروں میں دوسرے بہترین مبلغ بھی حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کے ساتھ ہوا کرتے تھے، خصوصاً اس سلسلہ میں خطیب پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی اور حضرت مولانا لال حسین صاحب اختر، کی خدماتِ جلیلہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت قاضی صاحب مدظلہ نے شرک و بدعت کے مضبوط و مستحکم قلعوں کو کتاب و سنت کی گولہ باری سے مسمار کرکے رکھ دیا، اور حضرت مولانا لال حسین صاحب اختر نے ضلع کے اندر مرزائیت اور آریہ سماج کی اٹھتی ہوئی تحریک کا قلع قمع کر دیا۔

ان دنوں پنجاب میں آریہ سماج اور مرزائیت پورے جوش و خروش سے مسلمانوں کے متاعِ ایمان پر شرر باری کر رہی تھی اہل ایمان و فرزندانِ توحید کا دامن پکڑ پکڑ کر مناظروں کا چیلنج دیا جا رہا تھا۔ مولانا لال حسین صاحب کے حدودِ ضلع میں قدم رکھتے ہی مرزائیت کو تو سانپ سونگھ گیا اور وہ دم بخود ہو کر رہ گئی ؎

وہ بے حجاب دیکھ رہے تھے مری طرف   میں نے نظر اُٹھائی تو گھرا کے رہ گئے!

البتہ آریہ سماج اپنے غرور و پندار کے نشہ میں سرشار و بدمست ہو کر میدان میں نکل آئی۔

جامپور میں آریوں سے مناظرہ

جام پور میں سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اہتمام آریہ سماج سے مناظرہ ہوا ضلع بھر سے لوگ سننے کے لیے آئے۔ سماج کے چوٹی کے دو مناظر تھے اور مسلمانوں کی طرف سے اکیلے مولانا لال حسین صاحب اختر تھے، دو دن مناظرہ ہوا۔ اللہ تعالےٰ نے دینِ اسلام کو فتح مبین عطا فرمائی۔

ایک لطیفہ

اس مناظرہ کے سلسلہ میں ایک لطیفہ عمر بھر بھلائے بھی نہیں بھولے گا۔ پہلے دن آریوں کے جو مناظر پیش ہوئے، غالباً وہ کسی کالج کے پروفیسر تھے، اور اپنے مقام پر قابل آدمی تھے، مگر مناظرِ اسلام کے آگے کسی کی بھلا کیا دال گل سکتی تھی؟ مولانا کے ہاتھوں ان کی وہ گت بنی کہ دوسرے دن آریوں کے جو مناظر پیش ہوئے اس نے اپنی تمہیدی تقریر میں تیسخی بگھارتے ہوئے کہا کہ:

مولانا صاحب! میں وہ کل والا . . . . . . نہیں، میں . . . . ہوں، میرے ساتھ آپ بات کریں گے تو . . . . . . اس پر حاضرین ہنس پڑے، گویا ایک آریہ مناظر دوسرے آریہ مناظر کی شکست کا واضح اعلان کر رہا تھا۔ بلکہ غیر شعوری طور پر اسلام کے مقابلے میں آریہ سماج کی شکست و ہزیمت تسلیم کر رہا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ آج ان "تیس مار خاں" کی وہ گت بنی کہ کل والے پنڈت جی کی کیا بنی تھی، غرور کا سر نیچا، بڑا بول بولنے والے ایسے چاروں شانے چت گرے کہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔

اللہ تعالےٰ نے اسلام کو فتح عطا فرمائی۔ آریہ سماج نے شکست کھائی اور ایسی فاش شکست کہ خود ہندوؤں کو اپنی اس شکست کا اقرار و اعتراف تھا۔ اس فیصلہ کن مناظرہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ پورے ضلع میں آریہ سماج کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نہ کہیں کسی آریہ کو پھر کبھی چیلنج دینے کی ہمت ہوئی نہ مناظرہ کرنے کی، حق و باطل کے ایک ہی معرکہ میں باطل کا سر ہمیشہ کے لیے کچلا گیا۔ اور

مرزائیت کی طرح آریہ سماج بھی جب تک رہا، سرفگندہ رہا اور سکوتِ مرگ سے زندگی کے دن پورے کرتا رہا۔
ارتداد طوفان سے ضلع ڈیرہ غازی خاں کا محفوظ رہنا۔ جناب سردار صاحب مرحوم کی دینی خدمات کا ایک کرشمہ ہے جس کی جزاء
بہر اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندے کو عطا فرمائیں گے۔

معیاری اور مرکزی کام کی تڑپ

جناب سردار صاحب کو اللہ تعالیٰ نے نہایت عالی حوصلہ، نہایت بلند نظر اور بدرجہ غایت وسیع ظرف عطا فرمایا تھا۔ آپ کی عالی حوصلگی، بلند نظری اور وسعتِ قلب وظرف آپ کو حدودِ ضلع میں محدود و مقید رہنے کی اجازت نہ دیتی تھی، آپ نے اپنے امکانات و وسائل کی حد تک اندرون ضلع ماشاء اللہ خوب کام کیا، اہل باطل، آریوں اور مرزائیوں کی بھرپور مزاحمت اور اہلِ حق مسلمانوں کی حفاظت کا بفضلہ وبعونہ تعالیٰ خاطر خواہ اہتمام کیا، مگر آپ نے اسی پر قناعت نہ کی، بلکہ آپ کی دلی امنگ اور خواہش یہ تھی کہ کسی طرح اہل حق کا تبلیغی مرکز قائم کر کے پورے ملک میں باطل کی مدافعت اور اسلام کی تبلیغ واشاعت کا معیاری کام کیا جائے۔

لاہور دیوبند، دہلی کا سفر

تبلیغی تنظیم و مرکزیت کی ضرورت کے شدید جذبہ نے آپ کے دل کو بے قرار کر دیا، آپ کے دردمند و بے قرار دل نے آپ کو چین سے گھر میں نہ بیٹھنے دیا، کوئی تیس پینتیس سال پیشتر آپ اپنے خرچ پر علماء کا ایک وفد لے کر جام پور سے چلے لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ وغیرہم اکابرین اور دہلی میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے ملے، رحمہم اللہ! ہر صاحب کو اپنا دردِ دل سنایا اہل سنت کی لامرکزیت وانتشار اور اس کے نتیجہ میں ان کے ارتداد کا رونا رویا، ان کی تنظیم اور نظام تبلیغ کی ضرورت پیش کی، ہر بزرگ نے جناب سردار صاحب کے دردِ دل کی داد دی، آپ کے فکر دور اندیش کو سراہا، تبلیغی مرکز کی ضرورت محسوس کی، مگر افسوس کہ سردار صاحب کی تجویز و تحریک کے مطابق کوئی بزرگ اس اہم ضرورت کے لیے اپنے آپ کو فارغ نہ کر سکے اور آگے بڑھ کر زمامِ کار ہاتھ میں لینے اور تحریک کی قیادت سنبھالنے کا فیصلہ نہ فرما سکے۔
سینکڑوں روپے خرچ کر کے جناب سردار صاحب دل کا درد جوں کا توں لیے واپس جام پور تشریف لے آئے۔

مولانا مودودی سے مراسلت

دل کا درد سکون سے کب بیٹھنے دیتا ہے۔ سردار صاحب رحمہ اللہ دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ آپ اکابر دیوبند سے خالی ہاتھ واپس آئے تو حزین و مایوس ہو کر بیٹھ نہ گئے بلکہ اس سلسلہ میں بعض دوسرے حضرات سے بھی مراسلت کی، جن میں سے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا نام میرے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہے۔ مولانا مودودی نے بھی اس کام کی اہمیت کا اعتراف کرنے کے باوجود اسے اپنانے سے اپنی معذوری کا اظہار فرمایا۔

مولانا مودودی سے ملاقات

جناب سردار صاحب نے مجھے ساتھ لے کر بمقام لاہور مولانا سے ملاقات بھی کی اور نہایت تفصیل سے اس بارے میں گفتگو فرمائی، مگر مولانا اپنے موقف و مقام پر قائم رہے اور آپ نے تحریک سے اپنی قلبی ہمدردی کا برملا اظہار فرمانے کے باوصف اہل سنت کے تحفظ اور باطل فرقوں کی مزاحمت کے خاص پروگرام کو اپنانے سے معذرت ظاہر فرمائی۔

اکابرِ احرار سے درخواست

سردار صاحب کا وردِ دل انھیں ہر اس شخص سے بات کرنے پر ہر وقت آمادہ اور تیار رکھتا تھا۔ جس سے انھیں تھوڑی سی بھی "بوئے وفا" آتی تھی، پھر اکابر احرار سے تو سردار صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے، حضرت امیرِ شریعت رحمہ اللہ تو سردار صاحب رحمہ اللہ کو اپنا بھائی سمجھتے اور اپنا بھائی کہتے تھے۔ دوسرے اکابر بھی آپ کے اخلاص وایثار کے پیشِ نظر آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سردار صاحب نے متعدد ملاقاتوں میں ان اکابر کو اپنا دکھڑا سنایا مگر مجلس احرار اپنے سیاسی افکار اور اپنی ہیئت ترکیبی کے باعث "تنظیمی" منصوبہ کو اپنانے سے معذور تھی۔

اس وقت مجلس کی زمامِ قیادت مولوی مظہر علی اظہر کے ہاتھ میں تھی، اگر حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری ان دنوں قائدِ احرار ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ مجلس احرار اس پروگرام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی اور تحریک تنظیم کا وجود ہی معرضِ ظہور میں نہ آتا، مگر قدرت کو جو منظور تھا وہ ہو کر رہا۔

اصابتِ فکر

جناب سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فکر اور پروگرام کی صحت واصابت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے، کہ جناب مولانا مودودی صاحب جناب سردار صاحب کی منطق سے تو متاثر نہ ہو سکے اور کھل کر اجرائے نبوت کے فتنہ کے خلاف لکھنے اور کہنے پر آمادہ نہ ہو سکے، مگر چند ہی سال بعد حالات کے اقتضاء سے تردیدِ مرزائیت کو اپنے لائحہ عمل میں جگہ دینے پر مجبور ہو گئے۔

اسی طرح مولوی مظہر علی کی قیادت میں جو مجلسِ احرار رفض کے جارحانہ حملوں سے اہل سنت کو بچانے کے نصب العین کو نہ اپنا سکی۔ وہی مجلس احرار تھوڑی ہی مدت کے بعد حضرت مولانا محمد علی صاحب کی قیادت میں بعنوان "مجلس تحفظ ختم نبوت" مسلکِ حقہ اہل سنت کی حفاظت اور اعدائے صحابہؓ کی مزاحمت کے پروگرام کو بڑی خوبی سے اپنانے لگی اور ماشاء اللہ آج بطور احسن اس فرض کو انجام دے رہی ہے۔

اندرون ضلع تحریک کی دعوت

بہر حال بیرون ضلع سے جناب سردار صاحب رحمہ اللہ کو کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا اور کام کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو آپ

وہی صورتیں تھیں، یا تو سردار صاحب یہ درد اور داغ قبر میں لے جاتے یا اپنے ناتواں اور کمزور بازوؤں پر اعتماد کرتے ہوئے توکلاً علی اللہ کام کا آغاز کر دیتے، سردار صاحب رحمہ اللہ نے دوسرے پہلو کو ترجیح دی اور یاس و قنوط کی آغوش میں محوِ استراحت ہو جانے کی بجائے آپ نے آس و امید کا دامن پکڑا، اور اللہ کا نام لے کر اندرونِ ضلع کام شروع کر دیا۔

میں ۱۳۴۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر آ گیا تھا۔ ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۴۳ھ تک قریباً چار سال سردار صاحب رحمہ اللہ نے راقم بخاری مولانا مشتاق احمد صاحب مرحوم اور محترم صوفی کریم بخش صاحب کو ساتھ لے کر تونسہ، چوٹی زیریں، کوٹ مغلان اور روجھان وغیرہ مقامات کا سفر کیا اور حضرت خواجہ نظام الدین صاحب نواب محمد جمال خاں لغاری مرحوم لغاری نواب زدگان مزاری سردار صاحبان اور مرزا صاحبان سے ملاقاتیں کیں اور اپنا درد دل پیش کیا۔

علاوہ ازیں قریباً ہر سال جام پور میں ضلع کے علماء، شرفاء کو جمع کر کے نظامِ تبلیغ اور مرکزِ تنظیم کے مسئلہ پر گہری سوچ بچار کی۔ سردار صاحب کی اس مخلصانہ جد وجہد اور شبانہ روز سعی مسلسل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ضلع کے امراء میں سے لغاری سردار صاحبان اور مرزا صاحبان کا دل اس طرف مائل کر دیا۔

آغازِ تحریک

آخر ذی الحجہ ۶۲ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۹۴۳ء کو ضلع ڈیرہ غازی خاں کے اسلامی درد اور تبلیغی ذوق رکھنے والے علماء و امراء کا سردار صاحب کے دولت کدہ پر اجتماع ہوا، محترم سردار حاجی محمد علی خاں لغاری کی صدارت میں ایک مجلس منعقد ہوئی خطبۂ صدارت جناب سردار صاحب نے ارشاد فرمایا۔

"اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا کوئی تبلیغی جماعت کہیں موجود ہے؟ اگر نہیں اور افسوس ہے کہ نہیں، تو ہمیں وہ جماعت پیدا کرنی ہوگی قرآن وحدیث پر عامل اور اسلامی تعلیمات وروایات کی حامل صرف جماعت اہل سنت ہے ساری دنیا میں اس کی زبردست اکثریت ہے، مگر ہمارا کوئی مرکز نہیں ہماری کوئی تنظیم نہیں، نظامِ تبلیغ نہیں، کاش! یہ تحریک کسی اسلامی ملک سے اُٹھتی، کاش شاہ فاروق یا سلطان ابن سعود اسے ہاتھ میں لیتا۔

تعلیمی محاذ پر یونیورسٹی کے مقابل یونیورسٹی اور کالج کے مقابلہ میں کالج قائم ہے، سیاسیات میں بھی مسلمانوں نے کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ جمعیۃ اور احرار بھی ہے۔ بہرحال اس پلیٹ فارم پر بھی کام ہو رہا ہے، مگر تبلیغ کا میدان اس وقت تک خالی ہے۔ آج ہندوستان بھر میں چراغ لے کر ڈھونڈیں گے تو آپ کو کہیں اہل سنت کا تبلیغی مرکز نظر نہیں آئے گا، حالانکہ اسی سرزمین پر عیسائیوں، آریوں، مرزائیوں اور شیعوں کے سینکڑوں ادارے اور مراکز برسرکار ہیں، شیعہ کی سرگرمیاں عموماً مدح اہل البیت اور سب وشتم صحابہؓ تک محدود ہیں، عام طور پر شیعہ زندگی کا پروگرام ماتم و سینہ کوبی اور سبّ وشتم پر مشتمل ہے۔ مرزائیوں نے انسانی سعادت کے بلند ترین وہبی مقامِ "نبوت" کو بازیچۂ اطفال بنا کر وحدتِ امت کا شیرازہ تار تار کر دیا ہے۔ ان فرق باطلہ سے ملت حقہ کا اتفاق واتحاد ناممکن ہے۔

اہل سنت کی حدود: باقی تمام مسلمان، اہل سنت والجماعت کے دائرہ میں داخل ہیں اور ہمارا حلقۂ عمل یہی دائرہ ہوگا۔

مرکزِ تنظیم کا قیام

چند اور مختصر تقریروں کے بعد اسی مجلس میں مرکزِ تنظیم اہلِ سنت کا قیام عمل میں آیا، جس کے صدر بالاتفاق جناب نوابزادہ محمود خاں صاحب لغاری تجویز ہوئے ناظم جناب سردار صاحب رحمہ اللہ اور مہتمم راقم بخاری قرار پائے۔

الی قربانی

تحریک چلانے کے لیے اسی مجلس سے فراہمی سرمایہ کی ابتدا کر دی گئی، محترم سردار صاحب نے دو ہزار روپیہ سالانہ کی پیشکش ں اور کئی سال تک برابر دو ہزار روپیہ سالانہ دیتے رہے، جس میں ایک ہزار سردار صاحب کا ذاتی ہوتا تھا اور ایک ہزار سردار عبدالرحیم اں صاحب کی طرف سے! اس طرح سردار صاحب کی دیرینہ تمنا بر آئی اور خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیا گیا۔

تحریک کا تعارف

چونکہ اس اہم تحریک کی خدمت اہتمام کا شرف راقم کو نصیب ہوا، لہٰذا میں نے تحریک کے اغراض و مقاصد شائع کر کے شروع فروری ۱۹۴۴ء سے وسط اپریل تک لاہور، امرتسر، سہارن پور، دیوبند، میرٹھ، دہلی اور لکھنؤ کا سفر کر کے اکابرِ ملت سے ملاقاتیں یں اور ۱۴ اپریل ۱۹۴۴ء کو امرتسر میں مرکزی دفتر کھول کر "زمزم" لاہور کے ذریعہ تحریک کو ملک میں متعارف کرنے اور مسلمانوں کو تحریک کی دعوت دینے کا کام شروع کر دیا اخبار "زمزم" لاہور کے مدیر محترم مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیط نے اپنے طویل افتتاحیہ بعنوان "لیغہ تبلیغ میں "مرکزِ تنظیم اہلِ سنت" کا تعارف کراتے ہوئے لکھا:

مرکزِ تنظیم اہلِ سنت

"سب سے آخر میں اور آخر زمانہ کے آخر دور میں مرکزِ تنظیم اہلِ سنت کے نام سے ایک آواز جام پور ڈیرہ غازی خاں سے اُٹھی ہے اس کے بانی جناب سردار احمد خاں صاحب پتافی ایک حساس اور دردمند مسلمان ہیں، آپ آج سے نہیں بیس سال سے اس فکر میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی مرکزی تنظیم ہو، امتِ اسلامیہ کی اصلاح کتاب و سنت کی بنیادوں پر ہو، فرقِ باطلہ کو راہِ راست پر لانے کے لیے حکمتِ قرآنی کو ذریعہ بنایا جائے۔ سردار صاحب کی یہ تحریک بیس سال کے طویل تجربے کا نتیجہ ہے اور آپ نے مخلصین کی ایک ایسی جماعت زیرِ صدارت نواب زادہ محمود خاں صاحب پیدا کر لی ہے جو اس کام کا بیڑا اُٹھائے گی اور اس آواز کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچانے گی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہر مسلم جماعت اور اکابرِ ملت سے تعاون کرے گی، تحریک کے اغراض و مقاصد شائع ہو چکے ہیں "زمزم" لاہور ۵/۴۴/۱۵۔

"مشرق ٹائمز" لاہور

سردار صاحب علیہ الرحمہ کے دل میں اہلِ سنت کی تنظیم اور ان کے تبلیغی مرکز کے قیام کا اس درجہ جوش اور ولولہ تھا کہ آپ ہر اس آدمی سے اس کا ذکر و مذاکرہ کرتے تھے جو ان سے ملتا تھا اور جس میں آپ اس

سلسلہ میں کسی قسم کی اہلیت وصلاحیت محسوس کرتے تھے چنانچہ لاہور کے مسلم انگریزی روزنامے کے ایڈیٹر نے تحریک کے منظر عام پر آنے کے بعد ایک مقالہ بعنوان "ایک نئی تحریک" شائع کیا اس میں لکھا :

"اس تحریک کے حامیوں میں سے ایک سردار احمد خاں صاحب پتافی رئیس جام پور ہیں جن کے ساتھ ہماری ہمدردی ہے۔ ہم آپ سے دس سال ہوئے ملے تھے اور آپ کے احیاء اسلام کے جذبات سے متاثر ہوئے تھے۔" "ایسٹرن ٹائمز" ۱۴ اکتوبر ۴۴ء

"نیّر اسلام" لاہور ہفت روزہ "نیّر اسلام" لاہور کے مدیر محترم نے لکھا: "سردار احمد خاں صاحب پتافی رئیس جام پور دین اسلام کے ایک نہایت مخلص کارکن ہیں میں ان کو ذاتی طور سے جانتا ہوں، ۱۹۳۸ء میں انہوں نے مجھ سے اپنے ان خیالات کا اظہار فرمایا تھا چنانچہ آج ہم انھیں عملی میدان میں دیکھ رہے ہیں اور ہم مسلمانان ہند سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تحریک تنظیم میں شامل ہو کر سردار صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔ "نیّر اسلام" لاہور ۲۴ مارچ ۴۵ء

اکابر کے ارشادات

مفتی اعظم حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے تحریر فرمایا :

"زمزم" مورخہ ۱۵ مئی ۴۴ء میں یہ خبر موجب مسرت ہوئی کہ تنظیم اہل سنت کی غرض سے ایک جماعت کا قیام عمل میں آیا اور اس کا مرکزی دفتر دہلی یا لاہور میں کھلنے والا ہے، میں سردار احمد خاں صاحب پتافی بانی اور جناب نواب زادہ محمود خاں صاحب صدر کے فکر دور اندیشی کی تحسین و تبریک کرتا ہوں، خدا تعالےٰ ان کو اس نیک مقصد میں کامیاب فرمائے اور اہل سنت والجماعت ایک مرکز پر جمع ہونے اور دنیا کے سامنے حکمت و موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت اسلامی پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ "زمزم" ۲۷/۵/۴۴

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا :

یہ بالکل غیر سیاسی اور خالص دینی تبلیغی سٹیج ہے۔ تبلیغ دین ہم سب کا فرض ہے آج اسلام پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سب کا جواب دو، مگر میٹھے طریقے سے، مخالف کے اعتراضات کا منظم طریقے سے جواب دو۔ مناظرے کا جواب مناظرے سے، اخباروں کا جواب اخباروں سے، تحریر کا جواب تحریر سے، تقریر کا جواب تقریر سے دو، مگر جواب میٹھا اور شیریں ہو چاہیے، یہ تحریک جن مقاصد کو لے کر اُٹھی ہے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اپنے فضل و کرم سے مرکز تنظیم کو اپنے مقاصد عالیہ میں کامیاب فرمائے آمین، روزنامہ "شہباز" لاہور ۲۹/۳/۴۵

بطور نمونہ صرف دو حضرات اکابر کے ارشادات گرامی پر کفایت کی جاتی ہے ورنہ اکثر مشاہیر علماء و مشائخ وقت نے تحریک تنظیم کا نہایت پرجوش استقبال کر کے بانیٔ تحریک جناب سردار صاحب کے فکر و تدبر کی تحسین و تصدیق فرمائی اس سلسلہ میں

۱۔ امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی۔
۲۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔
۳۔ مورخ اسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہم اللہ تعالےٰ اور
۴۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند۔

۵۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب،
۶۔ حضرت خواجہ نظام الدین صاحب تونسویؒ،
۷۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھریؒ، اور
۸۔ حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مدظلہم العالی
کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اغیار کی شہادت

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

خوبی اور کمال وہ ہے جس کا اقرار و اعتراف کرنے پر اعداء و بدخواہ بھی مجبور ہوں۔

سردار صاحبؒ کے تبلیغی جوش اور خلوص کا اعتراف اپنوں ہی کو نہیں بیگانوں کو بھی تھا، آپ کی ساری زندگی مرزائیت کی تردید و مخالفت میں گزری، مگر ایک پُرجوش مرزائی آپ کے حضور جو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے وہ قابلِ غور ہے۔

دوست محمد خاں ججانہ، سردار صاحب کا ہمسایہ زمیندار تھا، پڑھا لکھا اور نہایت سمجھ دار، ڈیرہ غازی خاں میں عرائض نویسی کرتا تھا بدقسمتی سے مرزائیت کا شکار ہو گیا آخر دم تک مرزائی رہا، بلکہ مرزائیت کا پرجوش پروپیگنڈسٹ تھا۔ تحصیل جام پور میں جو گنتی کے چند بدنصیب افراد مرزائی بنے، ان کے ارتداد میں اکثر اس کا ہاتھ تھا۔

جب بفضلہٖ تعالیٰ تحریکِ تنظیم منظرِ عام پر آئی، اور لاہور کے اولین مرکزی جلسہ کی کامیابی کے بعد ملک میں اپنا مقام حاصل کرنے لگی تو اسی دوست محمد خاں ججانہ نے انگاروں پر لوٹتے ہوئے "الفضل" میں ایک مقالہ شائع کرایا۔ اس میں لکھا کہ:

سردار احمد خاں صاحب پتافی رئیس جام پور، تبلیغِ اسلام کا بڑا اور سچا جوش اپنے اندر رکھتے ہیں اور آغاز جوانی سے نہایت جوش، اخلاص اور قربانیوں کے ساتھ اس مقصد کے لیے کوشاں رہتے ہیں وہ نمائشی باتوں سے بچ کر ٹھوس کام کرنے کے عادی ہیں۔۔۔۔ آپ نے ہندوستان کے تمام بڑے انسٹی ٹیوشنوں میں پہنچ کر اور قومی لیڈروں سے مل کر منظم اینٹی قادیاں تبلیغی پالیسی اختیار کرنے کی کئی سال تک کوشش کی۔۔۔۔ کچھ عرصہ سے آپ نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں اس تحریک کو لے لیا ہے۔ "الفضل" ۳۴/۴۵ ۵

رفعتِ عزم و نگاہ

سردار صاحب کی قلبی امنگ و آرزو بفضلہٖ تعالیٰ پوری ہو گئی، وطنِ عزیز میں تبلیغ اسلام، تنظیم ملت اور مدافعت عن الدین کا کام ہونے لگا۔ مگر سردار صاحب کی ہمت بلند اس کام سے قطعاً مطمئن نہ تھی، آپ کے عزم و ارادے بہت بلند اور ارفع تھے، آپ چرچ مشن یا کم از کم مرزائیوں کے معیار پر ساری دنیا میں تبلیغی نظام برسرِکار دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب میں مجھے ہدایت فرماتے ہیں۔

مسلمانوں کو متوجہ کریں کہ مخالفین کے سینکڑے مبلغ ہر جگہ مسلمانوں کو تنگ کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ برادرانِ اسلام کو

معلوم ہونا چاہیے کہ آریہ مرزائی عیسائی تبلیغی اداروں کے بالمقابل آپ کا ہندوستان بھر میں کوئی مرکزی تبلیغی ادارہ نہیں ہے، ہم حیران ہیں کہ تبلیغی ادارہ کے بغیر اسلام آج تک اعدائے اسلام کے چوطرفہ حملوں کے باوجود کس طرح باقی ہے، یقیناً یہ اسلام کی صداقت کا کرشمہ اور اس کے دین فطرت ہونے کا ثبوت ہے۔

ہندوستان اور بیرون ہند میں اسلام اور آنحضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آریوں اور عیسائیوں کے اعتراضات اپنے تبلیغی ادارہ کے فقدان کی وجہ سے ہیں۔ مرزائیوں کا عروج و اقبال تو محض ہمارے تبلیغی مرکز کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ ان کی وست درازی سے افریقہ کے مسلمان محفوظ و مامون ہیں نہ جاوا سماٹرا کے، یہ جہاں بھی جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو انتشار و بدنظمی میں مبتلا پاتے ہیں کوئی ان کے سامنے نہیں آتا۔ کہیں بھی مسلمان ان کے سامنے آنے کے قابل نہیں یہ لوگ ہر جگہ میدان صاف پاکر ڈینگیں مارتے ہیں اس گمراہ اور گمراہ کن فرقے نے آریہ، عیسائی، سکھ وغیرہ کسی جماعت کو مرزائی نہیں بنایا، ان کا نزلہ اگر گرا ہے تو عضو ضعیف پر، ان کی تمام ارتدادی تگ و دو محض مسلمانوں جیسی بے نظم و بے مرکز جماعت ہی تک محدود ہیں۔"

"زمزم" ۱۱ ۶/۴۶

اس سے پہلے ایک مکتوب میں مجھے لکھتے ہیں:

"جیسا کہ عرض ہوا دوسری جماعتوں کے پروگرام اور ارادے مسلمانوں کے سامنے لائے جائیں، انہیں یہ حقیقت سمجھائی جائے کہ مرزائی جماعت کا تختۂ مشق محض مسلمان ہیں، کسر صلیب تو محض بہانہ ہے اگر صلیب کو کچھ توڑا ہے تو دہریت نے، پھر یورپ اور امریکہ کے مشن بھی مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

خرابی کی بنیاد ایک ہے، اور صرف ایک ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کا کوئی تبلیغی مرکز نہیں، یہی وجہ ہے کہ مرزائی فتوحات پر فتوحات دکھا رہے ہیں، الغرض اسلامی دنیا کا انتشار لامرکزیت، جمود، غفلت، انحطاط اور تنزل پیش کر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا جائے۔

آپ اہل الرائے سے مشورہ، اہل دولت سے روپیہ اور اہل علم سے آنریری تبلیغی خدمات طلب کریں "پیغامیوں" نے آنریری تبلیغ کا مطالبہ قائم کر رکھا ہے اور قادیان تو ہر مرزائی سے مطالبہ کرتا ہے کہ کم از کم ایک مرزائی بنا کر رہے۔ اور یہ کوئی رسمی مطالبہ نہیں نہایت تاکیدی اور نہایت سنجیدہ مطالبہ ہے، یہ مطالبے برادران اسلام کو دکھائیں، پھر اس خستہ حالی میں مرکز تنظیم کی خدمات بایں بے سروسامانی ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ ان اہل باطل کی ناطقہ بندی مسلمانوں کے سامنے لائیں اور وسائل و ذرائع مہیا ہونے پر بیرون ہند اشاعت اسلام کا عالمگیر پروگرام ملت کے آگے رکھیں۔"

"زمزم" ۱۸ ۵/۴۶

ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"الغرض اندرون و بیرون ملک تبلیغی و حفاظتی انتظام کرنے، ہر مقام کے مسلمانوں میں دینی بیداری اور ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے درحقیقت لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔

الغرض ہمیں چاہیے کہ پچھلی غفلت سے توبہ کریں اور آئندہ کے لیے اسلام کی حفاظت و مدافعت کا کم از کم اس معیار

اور اس نتیجہ پر اہتمام کریں جس پر آریہ، عیسائی اور مرزائی نے کر رکھا ہے۔
آخر میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کے سینے کھول دے تاکہ وہ دینی ضروریات کو محسوس کریں اور پھر دینی ضروریات کو باقی جملہ ضروریات پر ترجیح دیں۔ آمین"۔

سردار صاحب رحمہ اللہ کی بطور" نمونہ مشتے از خروارے " ان تحریرات سے جہاں آپ کے فکر و ذہن، آپ کے نصب العین اور پروگرام کو سمجھنے میں مدد ملے گی وہاں آپ کے عزم و ارادے کی وسعت و بلندی بھی واضح ہو جائے گی، اور قارئین کرام کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے دل میں پوری اسلامی دنیا کا درد تھا۔

ع۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے ——— آپ عالم اسلام کو انتشار و لامرکزیت کے گہرے قعرِ مذلّت سے نکال کر ایک مرکز تنظیم و تبلیغ پر جمع کر دینا چاہتے تھے۔ آپ دنیائے اسلام کے ایک ایک فرد کو اعدائے دین کے حملوں سے محفوظ و مامون رکھنا اور دیکھنا چاہتے تھے اور بیرون ہند اشاعتِ اسلام کا عالمگیر پروگرام رکھتے تھے۔

وسعتِ صحرا.....

وسعتِ دل ہے بہت وسعتِ صحرا کم ہے
اس لیے ہم کو تڑپنے کی تمنا کم ہے

سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اعدائے اسلام کی مدافعت اور اسلام کی اشاعت کے لیے وسیع و بلند عزائم تڑپ رہے تھے۔ مگر آہ! کہ آپ کے ان بلند عزائم کو تکمیل کی کوئی راہ نہ مل سکی۔

مرکز تنظیم اہل سنت نے اپنی استطاعت اور اپنے امکانات کی حد تک ملک کے اندر بفضلہ تعالےٰ جو خدمت کی، یا کر رہا ہے۔ وہ سارا سردار صاحب کی آرزوؤں، امنگوں کی تعبیرات اور آپ کے خوابوں کی تعبیر ہے، مگر سردار صاحب اس سے قطعی مطمئن نہ تھے، وہ کام کو جس بلند تر معیار اور وسیع ترین پیمانے پر دیکھنا چاہتے تھے، اس کی حسرت آپ اپنے ساتھ لے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ؎

عدم آباد کو جاتے ہیں بشر خالی ہاتھ　　مجھ کو ہے ناز کہ لے جاؤں گا حسرت تیری

اخلاق و شمائل

سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ سراپا درد و اخلاص اور مجسمہ تبلیغ تھے، آپ کی پوری زندگی ملّی سوز و گداز کا مرقعِ جمیل تھی۔ درد ملت، جوشِ تبلیغ، جذبہ حمایتِ دین اور ولولۂ حفاظتِ مسلمین سے قطع نظر بھی سردار صاحب کی زندگی ایک نمونہ کی زندگی تھی، آپ کی سیرت و اخلاق کے چند قابلِ ذکر پہلو درج ذیل ہیں۔

سادگی

آپ کی سیرت کا ممتاز وصف سادگی ہے۔ آپ کی زندگی بے حد سادہ تھی، خوراک سادہ، لباس و پوشاک سادہ،

بود و باش سادہ، تکلّف و طمطراق اور ٹھاٹھ باٹھ — آپ کی پوری زندگی کے کسی ایک گوشہ کو بھی چھو کر نہیں گیا تھا۔ عیش و عشرت اور نشاط و تنعم کی پرچھائیاں بھی تو آپ کے کسی زاویۂ حیات پر نہیں پڑیں آپ کی زندگی ایک مردِ مجاہد کی زندگی تھی، سفر ہو یا حضر! نہایت سادہ کھانا کھاتے تھے، دال، ساگ، گوشت، سبزی کی ایک پلیٹ اور دو خشک روٹیاں یہ تھی آپ کی خوراک، روٹی تازہ اور گرم کھاتے تھے دستر خوان پر روٹیوں کو کپڑے میں لپیٹ کر رکھتے تھے اور حسبِ ضرورت نکال نکال کر تناول فرماتے جاتے کسی چیز سے خاص پرہیز نہ تھی اور کسی خاص چیز کے آپ عادی نہ تھے۔ البتہ آدھ سیر ڈیڑھ پاؤ دودھ رات کو سونے سے پہلے ضرور پیتے تھے گھر پر تو اللہ کا دیا اپنا دودھ ہوتا تھا، سفر میں بھی اس کا اہتمام و التزام فرماتے تھے۔

لباس کے معاملے میں تو اور زیادہ سادہ تھے، معمولی لٹھے کا تہ بند جسے عموماً رنگ لیتے تھے، کھدر کا سفید کرتا، کھدر کی لکیر دار پگڑی، اوپر مقامی جولاہوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی گاڑھے کی سفید چادر، بس یہ تھی آپ کی پوشاک، ململ کا کرتہ یا ململ کی پگڑی کبھی استعمال نہیں کی، کُلاہ کبھی سر پر نہیں رکھا، گرم یا سرد کوٹ یا اچکن تو کیا! واسکٹ تک بھی کبھی زیب تن نہیں فرمائی، شلوار بھی کمتر، صرف خاص تقریبات اور اہم ملاقاتوں میں استعمال کرتے تھے۔
سردیوں میں سادہ موٹا اونی کمبل اوڑھتے تھے، وفات سے کوئی دو سال پیشتر سوسوا سو کا پشمینہ ملتان میں خریدا تھا ابھی وہ میلا بھی نہ ہوا تھا کہ پیغامِ اجل آپہنچا۔
گرمیوں میں پاؤں خالی رکھتے تھے البتہ سردیوں میں گرم جرابیں استعمال فرماتے تھے، جوتا ساری عمر مقامی موچیوں کا سلاہوا استعمال کیا، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے پندرہ بیس روپے کا فل سلیپر تک بازار سے خرید کر استعمال فرمایا ہو، بڑے آدمیوں وزیروں تک سے ملتے تو اسی سادہ اور پرانی وضع قطع میں، البتہ اہم تقریبات میں تہ بند کی بجائے شلوار پہن لیتے تھے، اور بس، جس لباس میں ایک فقیر سے ملتے، اسی لباس ہی میں امیر اور وزیر سے ملتے تھے، جو لباس گھر پہ ہوتا تھا وہی سفر میں ہوتا تھا۔
ہاتھ میں بید کی ایک سادہ سی چھڑی ہمیشہ رکھتے تھے جس کی قیمت آٹھ دس آنے سے زیادہ کیا ہوگی؟ پڑھنے لکھنے وقت عینک لگاتے تھے، مگر اس کا فریم وہی پرانے ڈیزائن کا، چار پانچ روپے والا دس بیس روپے کا نئے ڈیزائن کا فریم آپ نے آخر وقت تک استعمال نہ فرمایا البتہ قلم آپ پارکر کا رکھتے تھے جو غالباً پچھتر روپے میں خریدا تھا، اس کے ساتھ ایک بالکل معمولی روپے سوا روپے والا قلم بھی رکھتے تھے، جب کوئی دوسرا آدمی لکھنے کی ضرورت سے طلب کرتا تو وہی دے دیتے مبادا اس شخص کو واپس دینا یا آپ کو لینا بھول جائے اور قیمتی چیز ضائع ہو جائے۔
اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ آپ کے مزاج میں احتیاط کس قدر تھی؟
اب مکان کا حال سنیے، آپ کی وجاہت و عظمت کے پیشِ نظر بڑے بڑے لوگ، علماء، فضلاء، تمندار، نواب، حکام اور اعلیٰ افسران آپ سے ملاقات کے لیے آپ کے مکان پہ آجاتے تھے، مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ سب لوگ ایک ایسی تنگ و تاریک کچی کوٹھڑی میں آپ کو موجود پاتے، جس کے نہ در و دیوار صحیح، نہ چھت سلامت

اور جس میں مشکل سے دو یا تین چار پائیاں آسکتی تھیں، جب سردار عبدالرحیم خاں جوان ہوئے، تب سردار صاحب نے دو ساؤ مگر پختہ، کھلے اور ہوا دار کمرے تعمیر کرائے اور خدا خدا کر کے اس کوٹھڑی سے ہم سب کو نجات ملی،

ہم نے اس کچی کوٹھڑی میں اس پختہ مکان کے اندر کبھی پلنگ بچھا نہیں دیکھا، سادہ بان سے بنی ہوئی نہایت مضبوط چار چار پائیاں ہر کمرے میں پڑی رہتی تھیں، سردار صاحب خود بھی ان ہی میں سے ایک چار پائی پر چھوٹا سا تکیہ لگا کر سارا سارا دن بیٹھے رہتے، لکھتے پڑھتے تو بھی اسی چار پائی پر، میز کرسی لگا کر میں نے کبھی آپ کو لکھتے پڑھتے نہیں دیکھا۔

کفایت شعاری

سادگی کے بعد آپ کا دوسرا وصف کفایت شعاری تھا۔ جہاں آپ ملی کاموں پر نہایت فیاضی سے خرچ کرتے تھے تعلیمی اور تبلیغی سلسلہ میں ہزاروں روپے لگا دیتے تھے، وہاں اپنی ذات کے معاملے میں حد درجہ کفایت شعاری سے کام لیتے تھے، جہاں ایک پیسہ سے کام نکل سکتا وہاں کبھی روپے خرچ نہ فرماتے تھے، سفر بمشکل انٹر کلاس میں کرتے، سیکنڈ یا فسٹ کلاس میں کبھی سفر نہیں کیا، البتہ حج کا مبارک سفر بحری جہاز کے سیکنڈ کلاس میں کیا، سفر میں کبھی کوئی خادم بھی ساتھ نہیں رکھتے تھے باوجود استطاعت کے نہ کوئی گاڑی خریدی نہ تانگہ رکھا، ایک اچھی گھوڑی تھی شہر سے باہر اپنے کنوؤں پر جانے یا دیہات کا سفر ہوتا تو اسی گھوڑی پر کرتے، آپ ایک اچھے سوار تھے۔

مہمان نوازی

آپ مہمانوں کا بڑا خیال رکھتے تھے، خاص طور پر تبلیغی جلسوں کے موقعوں پر حضرات علماء کرام کی رہائش اور خوراک کی خود نگرانی فرماتے تھے اپنی جماعت میں تقسیم کار کرتے وقت نہایت سمجھ دار، پختہ کار اور فرض شناس آدمیوں کو اس خدمت پر متعین فرماتے تھے۔ چنانچہ پہلے سردار مستو خاں کھوسہ اور بعد میں سردار عبدالرحیم خاں اس خدمت پر مامور ہوتے تھے۔

دستر خوان پر سالن یا چاول وغیرہ کبھی پلیٹوں میں ڈال کر نہ دیتے، ہمیشہ سالن وغیرہ ڈونگوں میں آتا اور ہر مہمان کو اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق ڈونگے سے نکال کر لینے کی تکلیف دی جاتی۔

مجلس مبلغین کے اجلاس کے موقع پر چونکہ اپنے بے تکلف مبلغ حضرات ہی دستر خوان پر ہوتے، اگر کبھی کوئی صاحب ضرورت سے زیادہ لے کر بچا چھوڑتے تو آپ فرماتے "اگر اتنا کھا نہیں سکتے تھے تو ڈونگے سے لیا کیوں؟ اب یہ آپ کو ختم کرنا ہوگا"

نیز آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کھانا بہر حال بچانا ہی پڑ جائے تو اس طرح کھایا اور بچایا جائے کہ بچا ہوا کھانا کھانے والا کراہت محسوس نہ کرے۔

صفائی

آپ صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتے تھے، آپ کا لباس سادہ تو ہوتا تھا، مگر صاف ستھرا، مجھے یاد ہے کہ

اگر کبھی آپ کی چادر نماز کے وقت نیچے بچھانے کی ضرورت پیش آئی تو کوشش یہ فرماتے تھے کہ اس کے اوپر پاؤں نہ رکھے جائیں۔
بعض لوگ کھانے کے بعد دستر خوان ہی سے ہاتھ پونچھنے کے عادی ہوتے ہیں، آپ اسے بہت بڑی بدتمیزی اور نہایت مکروہ سمجھتے تھے، لوگوں کے سامنے تھوکنے یا ناک صاف کرنے کو بھی اچھا نہیں جانتے تھے۔ اگر کبھی چھینکنے کی ضرورت پیش آتی تو چادر کا پلو منہ پر رکھ لیتے تھے۔

متانت و سنجیدگی

سردار صاحب بے حد متین و سنجیدہ تھے، آپ کی ہر ہر ادا میں سنجیدگی پائی جاتی تھی، کوئی فضول کام یا فضول بات نہ کرتے تھے کم بولتے تھے، ضرورت کی بات کرتے تھے، میں نے آپ کی زبان سے کبھی بیہودہ یا لغو اور دلآزار بات نہیں سنی اور آپ اپنے نجی ملازمین سے بھی بد کلامی تو بجائے خود درشتی سے بھی پیش آتے نہیں دیکھا، آپ کبھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے۔

شگفتہ مزاجی

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ لیا جائے کہ آپ ہمیشہ تیوری چڑھائے رہتے، بلکہ آپ کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ شگفتگی کا بھی حسین امتزاج تھا، آپ کی پیشانی پر میں نے کبھی بل نہیں پایا آپ کے مزاج میں لطیف مزاح کا جوہر بھی موجود تھا۔ بعض اوقات اپنے مخصوص احباب کی مجلس میں ایسے شگوفے چھوڑتے کہ اسے زعفران زار بنا دیتے آپ کو بہت زیادہ مثالیں یاد تھیں اور ان کو ایسا برمحل استعمال فرماتے کہ لطف آجاتا تھا۔
میں نے اپنی عمر میں گفتگو اور تقریر کے دوران میں برمحل اور سنجیدہ مثالیں پیش کرنے کے فن میں تین آدمیوں کو یکتا پایا ہے، ایک سردار صاحب مرحوم، دوسرے سردار گل محمد خاں بزدار رئیس اعظم سکھانی دار ضلع ڈیرہ غازی خاں اور تیسرے حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھریؒ۔

وضعداری

وضعداری آپ کی فطرت میں داخل تھی، جن کے دوست تھے، ان سے نباہ کی اور ہر حال میں نباہ کی، مجھے یاد ہے تحریک تنظیم کے معرض وجود میں آنے سے پہلے کی بات ہے، ایک دفعہ ہم لاہور میں تھے کہ آپ کو سخت پیچش کا عارضہ لاحق ہو گیا اتفاق سے ان ہی دنوں میں پشاور یا پنڈی مجلس احرار کی تبلیغی کانفرنس تھی، حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی تو آپ شدید تکلیف کے باوجود انکار نہ کر سکے اور تشریف لے گئے۔
اپنے ذاتی کام اور وقت کا حرج اور نقصان کر کے بھی لوگوں کے کام سرانجام دینے میں مصروف رہتے تھے ہر وقت آپ کے گرد و پیش ضرورت مند لوگوں کا اجتماع رہتا تھا اور آپ ہر آنے والے کی ہر ممکن مدد کرنے میں قلبی مسرت محسوس کرتے تھے

کئی دفعہ لوگوں نے آپ کو ان مشاغل سے روکا بھی، مگر آپ نہ رکے، اور عامۃ الناس کی خدمت میں برابر مصروف و منہمک رہے۔

اجتماعیت سے پیار اجتماعیت سے محبت آپ کی سیرت کا خاص جوہر ہے۔ جماعتی زندگی سے آپ کو محبت تھی پیار تھا عشق تھا اور انفرادیت سے نفرت تھی، جماعتی زندگی سے دور اور انفرادیت میں مبتلا لوگوں کی آپ کے دل میں قدر کم ہوتی تھی، میرے ایک مخلص مہربان ہیں چوٹی کے مقرر اور خطیب ہیں سردار صاحب کے دل میں ان کے کمالات کی وجہ سے ان کی خاص قدر و منزلت تھی، جب وہ خاص حالات و وجوہ کی بنا پر اپنی جماعت سے کٹ کر علیحدہ طور پر تبلیغی کام کرنے لگے تو سردار صاحب کے دل میں ان کا وہ مقام نہ رہا اور آپ نے اس کا بارہا اظہار فرمایا۔

ذاتی حالات آپ اپنی زندگی کے معمولات میں ایک ضابطہ کے پابند تھے، رات کو بروقت سو جاتے تھے، آخر شب عموماً اُٹھ جاتے تھے، آپ کے مطالعہ کا وقت بھی یہی تھا۔ اخبارات کا مطالعہ آپ بالالتزام کیا کرتے تھے، شام کو جمع کر کے درونِ خانہ ساتھ لے جاتے اور پچھلی رات ان کا مطالعہ فرماتے، آپ کا مطالعہ کافی وسیع تھا اور مطالعہ ہی کی بناء پر آپ بہت زیادہ معلومات کے مالک تھے، آپ کا شخصی کیرکٹر نہایت بلند تھا۔ دو شادیاں کیں، مگر اولاد نرینہ سے محروم رہے، دوستوں نے بہت زور دیا کہ ایک اور شادی کر لیں شاید اس سے خدا اولاد دے دے، بعض شریف لوگوں نے رشتہ کی پیش کش بھی کی، مگر آپ نے اس تحریک و تجویز پر عمل تو عمل کبھی سنجیدگی سے غور تک کرنے کی بھی تکلیف گوارا نہ فرمائی۔

اولاد ابھی عرض ہو چکا ہے کہ آپ کی اولاد نرینہ نہ تھی، صرف ایک صاحبزادی ہیں، آپ کے برادر زادہ سردار عبدالرحیم خاں صاحب گویا آپ کے لڑکے بھی ہیں اور داماد بھی، سردار صاحب نے اپنی اولاد کی طرح ان کی تربیت فرمائی اور اپنی زندگی ہی میں انہیں اپنا قائم مقام بنا دیا تمام دینوی امور کاروباری فرائض ان کے سپرد فرما دیے اور اپنے لیے صرف خدمتِ خلق اور تبلیغی کام رہنے دیا۔ ماشاء اللہ آپ کی تربیت کا فیض ہے کہ سردار عبدالرحیم خاں نہ صرف دینوی امور بلکہ دینی اور تبلیغی کاموں میں بھی سردار صاحبؒ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور سردار صاحب کی رحلت سے مقامی جماعتی کاموں میں کوئی فرق نہیں آیا، اگر آیا تو یہ کہ ماشاء اللہ انجمن کے اراکین، اس کی خدمات اور فنڈ میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

صحت کوئی بُری عادت آپ میں نہ تھی، حقہ اور سگریٹ تک کو آپ نے کبھی منہ نہ لگایا، بلکہ آپ کے سامنے کسی دوسرے کو بھی حقہ یا سگریٹ پینے کی جرأت نہ ہوتی تھی، جفاکش تھے، نہایت صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزاری، عیش و نشاط کے تصور تک سے دور، اس لیے آپ کی صحت ماشاء اللہ قابلِ رشک حد تک اچھی تھی، البتہ نزلہ اور زکام آخر عمر میں لگا رہتا تھا۔

مرضِ وفات آپ کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا جو قریباً سال بھر رہا، علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی گئی مقامی حکیموں سے بھی رجوع کیا گیا سول ہسپتال ڈیرہ غازی خاں میں بھی داخل رہے مگر کوئی خاص افاقہ نہ ہوا، آخر اسی عارضہ سے قریب پینسٹھ ستر سال کی عمر میں ۲۵ نومبر ۱۹۶۰ء کو بروز جمعۃ المبارک اس دارفانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کی وفات پر کون سی آنکھ تھی جو اشکبار نہ ہوئی جس نے آپ کے انتقال کی خبر سنی، دل پکڑ کر رہ گیا۔ اپنے بیگانے سب برابر کے غم زدہ و دلگیر تھے اور آپ کی صفاتِ حسنہ، اخلاق عالیہ اور خدماتِ جلیلہ کے گُن گا رہے تھے، کہتے ہیں کہ آپکے جنازہ میں اتنی خلقِ خدا جمع ہوئی کہ اس سے قبل کسی کے جنازہ پر بھی جمع نہ ہوئی تھی، ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں نے اپنے محبوب سردار کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کی۔

متروکات آپ نے ترکہ میں ہزاروں ایکڑ رقبہ اور پون لاکھ سے زائد روپیہ نقد چھوڑا، جس دن میں اور عزیزم محترم مولانا ضیاء القاسمی صاحب آپ کی خدمت میں بغرض عیادت حاضر ہوئے، اسی دن آپ اپنی وصیت لکھوانے کا اہتمام فرما رہے تھے آپ نے سارا رقبہ اپنے غریب عزیزوں، رشتہ داروں اور سارا نقد روپیہ تعلیمی اور تبلیغی اداروں میں تقسیم فرمانے کی وصیت فرمائی اور بعد وفات آپ کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔

آپ کی زندگی بھی قوم کے لیے تھی اور زندگی کے بعد زندگی بھر کا جمع کردہ سرمایہ بھی قوم و ملّت ہی کے کام آیا رحمہ اللہ تعالےٰ رحمۃً واسعۃً۔

ہو گئے رخصت جہاں سے بانیٔ تنظیم بھی
چھا گئی حلقۂ احباب پر غم کی گھٹا
اللہ اللہ کس قدر تھا ان میں ایثار و خلوص
صرف کی تبلیغ دین پر اس نے دولت بے بہا

(حافظ نور محمد انور)

مولانا ابوالحسن علی ندوی

اہل تصوّف اور دینی جدوجہد

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کتاب کا مقدمہ لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر اپنی بے پناہ مصروفیتوں، غیر ملکی اسفار اور مرض کی بنا پر خاص اس کتاب کے لئے مقدمہ نہ لکھ سکے، البتہ ان کا ایک پرانا مضمون بطور تکملہ شامل کر رہے ہیں۔ کتاب میں جن اکابر کے حالات مندرج ہیں وہ تقریباً سبھی سلوک و تصوف کے امام تھے، لہٰذا ضروری معلوم ہوا کہ تصوف کے متعلق جو غلط تاثرات عوام بلکہ خواص تک میں پائے جاتے ہیں، ان کی غلطی واضح کرنے کے لئے اس قسم کی تحریر شامل کتاب کر دی جائے ——————— عبدالرشید ارشد

دنیا میں بہت سی چیزیں خاص اسباب کی بنا پر بغیر علمی تنقید و تحقیق کے تسلیم کر لی جاتی ہیں اور ان کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی مگر خواص بھی ان کو زبان و قلم سے بے تکلف دہرانے لگتے ہیں۔

انہیں مشہورات بے اصل میں سے یہ بات بھی ہے کہ تصوّف، تعطل و بے عملی، حالات سے شکست خوردگی اور میدان جد وجہد سے فرار کا نام ہے لیکن عقلی و نفسیاتی طور پر بھی اور علمی اور تاریخی حیثیت سے بھی اور اس دعوے کے خلاف مسلسل طریقہ پر داخلی و خارجی شہادتیں ملتی ہیں۔

سیرت سید احمد شہیدؒ میں تزکیہ و اصلاح باطن کے عنوان کے ماتحت خاکسار راقم نے حسب ذیل الفاظ لکھے تھے جس میں آج بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اس حقیقت پر پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا ہے۔

> "یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرفروشی و جاں بازی، جہاد و قربانی اور تجدید و انقلاب و فتح و تسخیر کیلئے جس روحانی و قلبی قوت، جس وجاہت و شخصیت، جس اخلاص و للہیت، جس جذب و کشش اور جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے وہ بسا اوقات روحانی ترقی، صفائی باطن، تہذیب نفس، ریاضت و عبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جنہوں نے اسلام میں مجددانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں سے اکثر افراد روحانی و قلبی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، ان آخری صدیوں پر نظر ڈالئے، امیر عبدالقادر الجزائری مجاہد جزائر، محمد احمد السودانی (مہدی سوڈانی) سیدی احمد شریف السنوسی (امام سنوسی) کو آپ اس میدان کا مرد پائیں گے۔ حضرت سید احمد ایک مجاہد و قائد کے علاوہ ——— ایک عزیز القدر روحانی پیشوا اور بے مثل شیخ الطریقت تھے۔
>
> حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات و ریاضیات، تزکیہ نفس اور قرب الٰہی سے عشق الٰہی اور جذب و شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے۔
>
> ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر !
> مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں،
>
> اس لئے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری اور لازمی درجہ شوق شہادت ہے اور مجاہدے کی تکمیل جہاد ہے[1]۔

---

[1] سیرت احمد شہیدؒ طبع ثانی ص

نفسیاتی پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہپر ہیں جن سے جہاد و جدوجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوبات نفسانی، عادات و مالوفات مادی مصالح و منافع اغراض و خواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بلند ہو سکتا ہے اور لکنہ اخلد الی الارض واتبع ھواہ کے دام ہمرنگ زمین سے وہی شخص بچ سکتا ہے جس میں کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کے عشق نے پارہ کی "تقدیر سیمابی" اور بجلیوں کی بیتابی پیدا کردی ہو،

انسانی زندگی کا طویل ترین تجربہ ہے کہ محض معلومات و تحقیقات اور مجرد قوانین و ضوابط اور صرف نظم و ضبط، سرفروشی و جاں بازی بلکہ سہل تر ایثار و قربانی کی طاقت و آمادگی پیدا کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے، اس کے لئے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقت ور تعلق اور ایک ایسی روحانی لالچ اور غیر فانی فائدے کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی بار دوش معلوم ہونے لگے کسی ایسے ہی موقع اور حال میں کہنے والے نے کہا تھا۔

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
اس نوید جاں فزا سے سر وبال دوش ہے

اس لئے کم سے کم اسلام کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ تحریک کے سرے پر ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس نے اپنے حلقۂ مجاہدین میں یقین و محبت کی یہی روح پھونک دی تھی اور اپنے یقین و محبت کو سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں تک منتقل کر کے ان کے لئے تن آسانی اور راحت طلبی کی زندگی دشوار اور پامردی اور شہادت کی موت آسان و خوش گوار بنا دی تھی اور ان کے لئے جینا اتنا ہی مشکل ہو گیا تھا جتنا دوسروں کے لئے مرنا مشکل تھا یہی سر حلقہ وہ امام وقت ہے جس کے متعلق اقبالؒ مرحوم نے کہا ہے:

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے،
موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی اور بھی تیرے لئے دشوار کرے،
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے،
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے،

معمولی و معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کرنے والے فتح و نصرت کی حالت میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اس کسی غیر معمولی یقین و شخصیت کی ضرورت نہیں، لیکن مایوس کن حالات اور قومی احتضار کی کیفیات میں صرف وہی مرد میدان حالات سے کش مکش کی طاقت رکھتے ہیں، جو اپنے خصوصی تعلق باللہ اور اعتماد اللہ اور قوت ایمانی و روحانی کی وجہ سے خاص یقین و کیفیت عشق کے مالک ہوں، چنانچہ جب مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تاریک وقفے آئے کہ ظاہری علم و حواس اور قوت مقابلہ نے جواب دے دیا، اور حالات کی تبدیلی امر محال معلوم ہونے لگی تو کوئی صاحب یقین و صاحب عشق میدان میں آیا جس نے اپنی "جرأت رندانہ" اور کیفیات عاشقانہ سے زمانہ کا بہتا ہوا دھارا بدل دیا اور اللہ تعالیٰ یخرج الحی من المیت اور یحیی الارض بعد موتہا کا منظر دکھایا۔

تاتاریوں نے جب تمام عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا، جلال الدین خوارزمشاہ کی واحد اسلامی سلطنت اور عباسی خلافت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا تو تمام عالم اسلام پر یاس و مردنی چھا گئی، تاتاریوں کی شکست ناممکن الوقوع چیز سمجھی جانے لگی اور یہ مثال زبان و ادب کا جز بن گئی کہ اذا قیل لک ان التتار انھزموا فلا تصدق (اگر تم سے کوئی کہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو کبھی یقین نہ کرنا) اس وقت کچھ صاحب یقین و صاحب قلوب مردان خدا تھے جو مایوس نہیں ہوتے اور اپنے کام میں لگے رہے، یہاں تک کہ تاتاری سلاطین کو مسلمان کر کے صنم خانہ سے کعبہ کیلئے پاسبان مہیا

کرتے۔، ہندوستان میں اکبر کے دورِ حکومت میں ساری سلطنت کا رُخ الحاد و لادینیت کی طرف ہوگیا، ہندوستان کا عظیم ترین بادشاہ ایک وسیع و طاقتور سلطنت کے پُورے وسائل و ذخائر کے ساتھ اسلام کا امتیازی رنگ مٹانا چاہتا تھا، اس کو اپنے وقت کے لائق ترین و ذکی ترین افراد اس مقصد کی تکمیل کے لئے حاصل تھے، سلطنت میں ضعف و پیرانہ سالی کے کوئی آثار ظاہر نہ تھے کہ کسی فوجی انقلاب کی اُمید کی جا سکے۔ علم و ظاہری قیاسات کسی خوش گوار تبدیلی کے امکان کی تائید نہیں کرتے تھے۔ اس وقت ایک درویش بے نوا نے تن تنہا اس انقلاب کا بیڑا اُٹھایا اور اپنے یقین و ایمان، عزم و توکل اور روحانیت وللہیت سے سلطنت کے اندر ایک ایسا اندرونی انقلاب شروع کیا کہ سلطنت مغلیہ کا ہر جانشین اپنے پیشرو سے بہتر ہونے لگا، یہاں تک کہ اکبر کے تختِ سلطنت پر بالآخر محی الدین اورنگ زیب نظر آیا۔ اس انقلاب کے بانی امام طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھے۔

اُنیسویں صدی میں جب عالم اسلام پر فرنگی "تاتاریوں" یا مجاہدین صلیب کی یورش ہوئی تو اُن کے مقابلہ میں عالم اسلام کے ہر گوشہ میں جو مردانِ کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے، وہ اکثر و بیشتر شیوخ طریقت اور اصحابِ سلسلہ کے بزرگ تھے جن کے تزکیۂ نفس اور سلوک راہ نبوت نے ان میں دین کی حمیت، کفر کی نفرت، دنیا کی زندگی کی حقارت اور شہادت کی موت کی قیمت دوسروں سے زیادہ پیدا کردی تھی۔ الجزائر (مغرب) میں امیر عبدالقادر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۷ء تک نہ خود چین سے بیٹھے نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا۔ مغربی مورخین نے ان کی شجاعت عدل و انصاف، نرمی و مہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

یہ مجاہد، ذوقاً و عملاً صُوفی اور شیخ طریقت تھا، امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

وکان المرحوم الامیر عبدالقادر متضلعاً من العلم والادب سامی الفکر راسخ القدم فی التصوف لایکتفی به نظراً حتی یمارسه عملاً، ولایبحث البته تحقیقاً حتی یعرفه ذوقاً وله فی التصوف کتاب سماه "المواقف" فهو فی هذا المشرب من الافراد الافذاذ ربما لایوجد نظیره فی المتاخرین [1]	امیر عبدالقادر مرحوم پورے عالم و ادیب و عالی دماغ اور بلند پایہ صُوفی تھے، صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً اور ذوقاً بھی صُوفی تھے۔ تصوف میں ان کی ایک کتاب (المواقف) ہے۔ وہ اس سلسلہ کے یکتائے روزگار لوگوں میں تھے اور ممکن ہے کہ متاخرین میں انکی نظیر دستیاب نہ ہو سکے۔

دمشق کے زمانۂ قیام کے معمولات اور اوقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وکان کل یوم یقوم الفجر ویصلی الصبح فی مسجد قریب من داره فی محلة العمارة لایتخلف عن ذلك الا لمرض وکان یتهجد اللیل ویمارس فی رمضان الریاضة علی طریقة الصوفیه ومازال مثالاً للبر والتقوی والاخلاق الفاضلة، ان توفی رحمة الله سنة ۱۸۸۳م [2]	روزانہ فجر کو اُٹھتے، صُبح کی نماز اپنے گھر کی قریب مسجد میں جو محلۃ العمارہ میں واقع ہے پڑھتے، سوائے بیماری کی حالت کے کبھی اس میں ناغہ نہ ہوتا، تہجد کے عادی تھے اور رمضان میں حضراتِ صُوفیہ کے طریقہ پر ریاضت کرتے، برابر سلوک و تقویٰ اور اخلاقِ فاضلانہ پر قائم رہتے ہُوئے ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا۔

---

[1] حاضر العالم الاسلامی جلد دوم ص ۱۶۳ [2] ایضاً ص ۱۶۲

۱۸۱۲ء میں جب طاغستان[۱] پر روسیوں کا تسلط ہوا تو اُن کا مقابلہ کرنے والے نقشبندی شیوخ تھے جنہوں نے علمِ جہاد بلند کیا اور اس کا مطالبہ اور جدوجہد کی کہ معاملات و مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں اور قوم کی جاہلی عادات کو ترک کر دیا جائے، امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں:

"وتولى كبر الثورة علماؤهم وشيوخ الطريقة النقشبندية المنتشرة هناك وكانهم سبقوا سائر المسلمين الى معرفة كون ضررهم هو من امرائهم الذين اكثرهم يبيعون حقوق الامة بلقب ملك او امير وتبوؤ كرسي وسرير ورفع علم كاذب ولذة فارغة بالطعام او سمة ومراتب فثاروا منذ ذلك الوقت على الامراء وعلى الروسية حاميتهم وطلبوا ان تكون المعاملات وفقا لاصول الشريعة لا للعادات القديمة الباقية من جاهلية اوليك الاقوام، وكان زعيم تلك الحركة غازي محمّد الذي يلقبه الروس بقاضي مُلا، وكان من العلماء المتبحرين في العلوم العربية وله تاليف في وجوب نبذ تلك العادات القديمة المخالفة البرهان على ارتداد عرفاء طاغستان"

اس جہاد کے علمبردار طاغستان کے علما اور طریقۂ نقشبندیہ کے (جو طاغستان میں پھیلا ہوا ہے) شیوخ تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان ان احکام سے پہنچتا ہے جو خطابات، عہدہ و اقتدار، جھوٹی قیادت و سرداری، عیش و لذت اور تمغوں اور مرتبوں کی لالچ میں قوم فروشی کا ارتکاب کرتے ہیں یہ سمجھ کر انہوں نے ملکی حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اس کا مطالبہ کیا کہ معاملات کا فیصلہ شریعت مطہرہ کے مطابق ہو نہ کہ قوم کی قدیم جاہلی عادات کے اس تحریک کے قائد غازی محمّد تھے جن کو روسی قاضی مُلا کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ علومِ عربیت میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان جاہلی عادات کے ترک کرنے کے بارہ میں ان کی ایک تصنیف "اُقامة البرهان على ارتداد عرفاء طاغستان"، (طاغستان کے چودھریوں اور برادری کے سرداروں کے ارتداد کا ثبوت) ہے۔

۱۸۳۲ء میں غازی محمّد شہید ہوئے ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے، ان کے بعد شیخ شامل نے مجاہدین کی قیادت سنبھالی جو بقول امیر شکیب "امیر عبدالقادر الجزائری کے طرز پر تھے اور مشیخت سے امارت ہاتھ میں لی تھی"۔

شیخ شامل نے ۲۵ برس تک رُوس سے مقابلہ جاری رکھا اور مختلف معرکوں میں ان پر زبردست فتح حاصل کی۔ رُوسی ان کی شوکت اور شجاعت سے مرعوب تھے اور چند مقامات کو چھوڑ کر سارے ملک سے بیدخل ہوگئے تھے۔ ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۴ء میں شیخ نے ان کے سارے قلعے فتح کر لئے اور بڑا اچھا سامان مالِ غنیمت میں حاصل کیا۔ اس وقت حکومتِ رُوس نے اپنی پوری طاغستان کی طرف مبذول کی طاغستان میں جنگ کرنے کے لئے باقاعدہ دعوت دی۔

---

[۱] طاغستان بحر خزر کے مغربی ساحل پر اسلامی آبادی کا ایک ملک ہے۔ اگر شمالی قفقاز کو اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے تو ۲۰-۳۰ لاکھ کے درمیان مسلمان آبادی ہوگی ۱۱۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تھا، روس سے پہلے یہ ملک ایران کے زیر اثر تھا۔

شعرائے نظمیں لکھیں اور پے در پے فوجیں روانہ کی گئیں، شیخ شامل نے اس کے باوجود بھی مزید دس برس تک جنگ جاری رکھی بالآخر ۱۸۵۹ء میں اس مجاہد عظیم نے ہتھیار ڈالے۔

تصوف و جہاد کی جامعیت کی درخشاں مثال سیدی احمد الشریف السنوسی کی ہے۔ اطالویوں نے برقہ و طرابلس کی فتح کے لئے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا نوآبادیوں اور بادیوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز قائدین نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ یہ اطالویوں کی ناتجربہ کاری ہے اس مہم میں ممکن ہے تین مہینے لگ جائیں، لیکن نہ پندرہ دن نہ تین مہینے۔ اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے اور اطالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طور پر سر نہ کر سکے۔ یہ سنوسی درویشوں اور ان کے شیخ طریقت سیدی احمد الشریف کی مجاہدانہ جدوجہد تھی جس نے اطالیہ کو پندرہ سال تک اس علاقہ میں قدم جمانے نہیں دیا، امیر شکیب نے لکھا ہے کہ سنوسیوں کے کارنامہ نے ثابت کر دیا کہ طریقہ سنوسیہ ایک پوری حکومت کا نام ہے بلکہ بہت سی حکومتیں بھی ان جنگی وسائل کی مالک نہیں ہیں جو سنوسی رکھتے ہیں۔ خود سیدی احمد الشریف کے متعلق ان کے الفاظ ہیں:۔

وقد لحظت منه صبرا قل ان یوجد فی غیره من الرجال وعزما شدیدا تلوح سیماؤه علی وجهه فبینما هو فی تقواه من الابدال اذا هو فی شجاعته من الابطال۔	مجھے سید سنوسی میں غیر معمولی صبر و ثابت قدمی کھائی دی جو کم لوگوں میں دیکھی۔ اولو العزمی ان کے ناصیۂ اقبال سے ہویدا ہے۔ ایک طرف اپنے تقویٰ و عبادت کے لحاظ سے اگر وہ اپنے زمانہ کے ابدال میں شمار ہونے کے قابل ہیں تو دوسری طرف شجاعت کے لحاظ سے دلیران زمانہ کی صف میں شامل ہونے کے مستحق ہیں۔

امیر شکیب نے صحرائے اعظم افریقہ کی سنوسی خانقاہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بڑی دل آویز اور سبق آموز ہے۔ یہ خانقاہ واحۃ الکفرہ میں واقع تھی اور سیدی احمد الشریف کے چچا اور شیخ السید المہدی کے انتظام میں تھی اور افریقہ کا سب سے بڑا روحانی مرکز اور جہاد کا دار التربیت تھی، امیر مرحوم لکھتے ہیں۔

"سید مہدی صحابہ و تابعین کے نقشِ قدم پر تھے، وہ عبادت کے ساتھ بڑے عملی آدمی تھے ان کو معلوم تھا کہ قرآنی احکام حکومت و اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے اس لئے وہ اپنے برادرانِ طریقت اور مریدین کو ہمیشہ شہسواری نشانہ بازی کی مشق کی تاکید کرتے رہتے۔ ان میں غیرت اور مستعدی کی روح پھونکتے، ان کو گھوڑ دوڑ اور سپہگری کا شوق دلاتے رہتے اور جہاد کی فضیلت و اہمیت کا نقش ان کے دل پر قائم کرتے، ان کی یہ کوششیں بارآور ہوئیں اور مختلف مواقع پر اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے، خصوصاً جنگِ طرابلس میں سنوسیوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے پاس ایسی مادی قوت ہے جو بڑی بڑی حکومتوں کی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے اور بڑی باجبروت سلطنتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ صرف جنگ طرابلس ہی میں سنوسیوں کا جوش و غضب ظاہر نہیں ہوا بلکہ علاقہ کانم اور وادی سوڈان میں وہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۲ء تک فرانسیسیوں سے برسرِ جنگ رہے ہیں۔

سید احمد الشریف نے مجھے سنایا کہ ان کے چچا مہدی کے پاس پچاس ذاتی بندوقیں تھیں جن کو وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے صاف کرتے اور پونچھتے تھے، اگرچہ ان کے سینکڑوں کی تعداد میں مریدین تھے مگر وہ اس کے روادار نہ تھے کہ یہ کام کوئی اور کرے، تاکہ لوگ ان کی اقتدا کریں اور جہاد کی اہمیت کو سمجھیں

اور اس کے سامان و ذخائر کا اہتمام کریں، جمعہ کا دن جنگی مشقوں کے لئے مخصوص تھا، گھوڑوں کی ریس ہوتی نشانہ کی مشق ہوتی وغیرہ وغیرہ، خود سید ایک بلند جگہ پر تشریف فرما ہوتے، شہسوار دو حصّوں (پارٹیوں) میں تقسیم ہو جاتے اور دَوڑ شروع ہوئی یہ سلسلہ دن چھپے تک جاری رہتا، کبھی کبھی نشانہ مقرر ہوتا اور نشانہ بازی شروع ہوتی، اس وقت علماء و مریدین کا نمبر شہسواری و نشانہ بازی میں بڑھا ہی ہوا ہوتا کیوں کہ ان کے شیخ کی ان کے لئے خاص تاکید تھی، جو لوگ گھوڑ دوڑ میں بالاجیت لیتے یا نشانہ بازی میں بازی لے جاتے ان کو قیمتی انعامات ملتے تاکہ جنگی کمالات کا شوق ہو۔

جمعرات کا دن دستکاری اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے لئے مقرر تھا۔ اس دن اسباق بند ہو جاتے، مختلف پیشوں اور صنعتوں میں لوگ مشغول ہوتے، کہیں تعمیر کا کام ہو رہا ہوتا، کہیں نجاری، کہیں لوہاری، کہیں پارچہ بافی کہیں وراقی کا مشغلہ نظر آتا، اس دن جو شخص نظر آتا وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا دکھائی دیتا، خود سید مہدی بھی پورے مشغول رہتے، تاکہ لوگوں میں عمل کا شوق ہو، سید مہدی اور ان سے پہلے ان کے والد ماجد کو زراعت اور درخت لگانے کا بڑا اہتمام تھا، اس کا ثبوت ان کی خانقاہیں اور ان کے خانہ باغ ہیں، کوئی سنوسی خانقاہ ایسی نہیں ملے گی جس کے ساتھ ایک یا چند باغات نہ ہوں، وہ نئے نئے قسم کے درخت دُور دراز مقامات سے اپنے شہروں میں منگواتے تھے، انہوں نے کفرہ اور جغبوب میں ایسی زراعتیں اور درخت روشناس کرائے جن کو وہاں کوئی جانتا بھی نہیں تھا، بعض طلباء سید محمد السنوسی (بانی سلسلہ سنوسیہ) سے کیمیا سکھانے کی درخواست کرتے تھے تو وہ فرماتے تھے کہ 'کیمیا ہل کے نیچے ہے۔' اور کبھی فرماتے کیمیا کیا ہے ہاتھ کی محنت اور پیشانی کا پسینہ" وہ طلباء اور مریدین کو پیشوں اور صنعتوں کا شوق دلاتے اور ایسے جملے فرماتے جن سے ان کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ اپنے پیشوں اور صنعتوں کو حقیر نہ سمجھتے اور نہ ان میں علماء کے مقابلہ میں احساس کمتری پیدا ہوتا، چنانچہ فرماتے تھے "بس تم کو حسن نیت اور فرائض کی پابندی کافی ہے، دوسرے تم سے افضل نہیں، کبھی کبھی اپنے کو بھی پیشہ وروں میں شامل کر کے اور ان کے ساتھ کام میں شرکت کرتے ہوئے فرماتے" کیا یہ کاغذوں والے (علماء) اور تسبیحوں والے (صوفیہ و ذاکرین) سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں سبقت لے جائیں گے، نہیں خدا کی قسم وہ ہم سے کبھی سبقت نہیں لے جا سکتے۔" [1]

عالمِ اسلامی پر سید جمال الدین افغانی مرحوم کی شخصیت و دعوت نے جو اثر ڈالا ہے۔ وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نئی دُنیائے اسلام کے معماروں میں ہیں۔ سید جمال الدین افغانی سرتاپا دعوت عمل اور ایک شعلۂ جوالہ تھے جس نے افغانستان سے لے کر ترکی تک تمام عالمِ اسلام میں حمیتِ اسلامی کی روح اور اتحادِ اسلامی کا صور پھونکا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کے سوز دروں اور گرمیٔ نفس میں اور ان کی بے چین طبیعت اور مسلسل جد و جہد میں ان کے ذکر قلبی اور باطنی بیداری کو دخل بھی ہے جس کے بغیر اکثر آدمی مسلسل محنت اور مخالفتوں اور مایوس کن حالات کا ہمیشہ مقابلہ نہیں کر سکتا یہی حال ان کے شاگرد رشید اور دست راست شیخ محمد عبدہ کا ہے جو تصوف کے لذت آشنا اور اس کوچہ سے واقف تھے۔ [2]

---

[1] حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۱۶۳-۱۶۴

[2] آئندہ صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ہندوستان میں تصوف و جہاد کا ایسا عجیب امتزاج و اجتماع ملتا ہے جس کی نظیر دُور دُور تک ملنی مشکل ہے اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے کہ ان کی یہ جامعیت مسلمات میں سے ہے اور حد تواتر کو پہنچ چکی ہے ان کے رفقاء جہاد اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے جوش جہاد، شوق شہادت، محبت دینی، بغض فی اللہ کے واقعات قرون اولی کی یاد تازہ کرتے ہیں، جب کبھی ان کے مفصل واقعات سامنے آئیں گے تو اندازہ ہوگا کہ یہ قرن اوّل کا بچا ہوا ایک ایمانی جھونکا تھا جو تیرھویں صدی میں چلا تھا اور جس نے دکھا دیا تھا کہ ایمان، توحید اور صحیح تعلق باللہ اور راہِ نبوت کی تربیت و سلوک میں کتنی قوت اور کیسی تاثیر ہے اور بغیر صحیح رُوحانیت اور اصلاح کے پختہ جوش و جذبہ اور ایثار و قربانی اور جاں سپاری کی اُمید غلط ہے۔

سید صاحبؒ کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی سید صاحب کے پرتو تھے ان کے جانشینوں میں مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی دونوں حیثیتوں کے جامع تھے، ایک طرف ان کے جہاد و ابتلاء و امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبلؒ کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور وہ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر انبالہ کے پھانسی گھر، کبھی جزائر انڈمان میں محبوس نظر آتے ہیں، دوسرے وقت وہ سلسلۂ مجددیہ و سلسلۂ محمدیہ (سید صاحب کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت و تعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کی مجاہدانہ جدوجہد اور قربانیاں اگر ایک پلڑے پر رکھی جائیں اور اہل صادق پور کی جدوجہد اور قربانیاں اگر دوسرے پلڑے پر تو شاید یہی پلڑا بھاری رہے۔

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہل سلسلہ اور اصحاب ارشاد و دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ نشین نظر نہیں آتے، شاملی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت حافظ ضامن، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا رشید احمد گنگوہی انگریزوں کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔ حضرت حافظ ضامن وہیں شہید ہوتے ہیں، حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کرجانی پڑتی ہے۔ مولانا نانوتوی، اور مولانا گنگوہی کو عرصہ تک گوشہ نشین اور مستور رہنا پڑتا ہے۔ پھر مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کرکے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلی اور ان کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہو۔ ان کی بلند ہمتی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرنے اور ہندوستان و افغانستان و ترکی کو ایک سلسلۂ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے، ریشمی خطوط، انور پاشا کی ملاقات مالٹا کی اسارت انکی عالی ہمتی اور قوت عمل کا ثبوت ہے۔

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔

ان مسلسل تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ تعطل و بے عملی حالات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور پسپائی تصوف کے لوازم میں سے ہے۔ اگر اس دعوے کے ثبوت میں چند متصوفین اور اصحاب طریقت کی مثالیں ہیں تو اس کے خلاف بڑی تعداد میں ان آئمہ فن اور شیوخ طریقت کی مثالیں ہیں جو اپنے مقام اور رسوخ فی الطریقہ میں اوّل الذکر اصحاب سے بڑھے ہوئے ہیں۔

حاشیہ گذشتہ صفحہ: مجھ سے قاہرہ میں مصر کے مشہور فاضل و مصنف ڈاکٹر احمد امین بے نے (جن کو شیخ محمد عبدہ سے شخصی واقفیت اور اسباق میں شرکت کا شرف حاصل ہے) سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ کی اس مناسبت اور اشتغال کا ذکر کیا۔

[1] ان تفصیلی واقعات کے لئے ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ دوم وغیرہ مطبوعہ

مولانا محمد منظور نعمانی

تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ

۱۳۶۱ھ کے اواخر یا ۱۳۶۲ھ کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے میں دوچار ہوا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی، جہاں دل و دماغ افکار و تفکرات سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہو ——— اس مقصد کے لئے میری نظرِ انتخاب اس زمانہ کے ایک صاحب ارشاد بزرگ کی خانقاہ پر پڑی جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے اور منظر بھی سو سبز اور شاداب ہے، بہر حال میں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے، ازراہ کرم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا تھا، یاد آتا ہے کہ کوئی تیسرا شخص اُس وقت وہاں نہیں تھا۔ قریب ہی خانقاہ کی سہ دری میں چند ذاکر "نفی اثبات" کا اور بعض اُن میں سے "اسمِ ذات" کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور مشائخ سلوک کے تجویز کئے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب بھی لگاتے تھے۔ اللہ کے ذکر میں جہر و ضرب کا یہ طریقہ اُس وقت میرے لئے صرف نامانوس ہی نہ تھا بلکہ کسی درجہ میں گویا ناقابلِ برداشت تھا، چنانچہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا:-

"حضرات! ساری عمر دین کے بارہ میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے اُس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو (رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے، اور جس کی تعلیم آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو دی اور پھر صحابہ کرامؓ سے بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل و روایت کے ذریعہ جو اُن سے ہم تک پہنچا ——— اور یہ حضرات ذاکرین جس طرح جہری اور ضربی ذکر کر رہے ہیں، جہاں تک اپنا علم ہے نہ تو رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تابعین کو یہ تعلیم فرمایا تھا، نہ صحابہ کرامؓ نے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کرایا، اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو یہ طریقہ بتلایا تھا، اس لئے ذکر کے اس طریقہ کے بارہ میں مجھے خلجان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میرا یہ خلجان کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے۔"

اُن بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں فرمایا:-

"مولوی صاحب! یہ بیچارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے، بس اسی کام کے ہوتے ہیں، اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لئے میں ان کو یہ بتلا دیتا ہوں، آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تحریر و تقریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے۔ آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا لیکن اُن بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا، اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مکرر توجہ دلانے کی مہلت دیئے بغیر ہندو مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور ان کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرما دیا جو میرے لئے بھی دلچسپ تھا، اُن کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اُٹھانا میں نے مناسب نہ سمجھا اور عشاء کے قریب یہ مجلس ختم ہوگئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہوا کہ ذاکرین نے اُسی دُھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کر دیا، مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا، لیکن آج بھی اُن بزرگ نے وہی کل والا رویّہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظرانداز فرمایا ہندوستانی مسلمانوں کی غالباً ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرما دیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

اُن بزرگ کے اس رویّہ سے الحمدللہ میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا جواب ان کے پاس نہیں، اس لئے یہ اس سے پہلوتہی کر رہے ہیں بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالباً میرے سوال کو ایک اہل اور طالب صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے، بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظرانداز فرمایا جا رہا ہے[1] اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یاد ہے) مقصود بھی نہ تھی، بلکہ نیت کچھ اور ہی تھی۔

خانقاہ کے جس حجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نماز عشاء وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اُس میں جا کر لیٹ گیا اور تصوف کے اس قسم کے اعمال و اشغال پر بطور خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں خود ہی میں سائل تھا اور خود ہی مجیب، یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث مباحثہ میں دیر تک نیند نہیں آئی، میں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یکسو ہو جائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اُس کی تصحیح ہو جائے، اور اگر میں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو اس بارہ میں مجھے ایسا یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کر دوں، ان باتوں کے غلط باطل ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کر دوں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرح منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال و اشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کئے ہوئے ہیں اور اپنی قیود و اوضاع کے ساتھ سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کا رواج دینے والا ماننا پڑے گا، کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارہ میں تسامح اور تساہل ہی برتا ہو، بلکہ ان کی تعلیم سے ان کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے اُن کی کتابوں کے پڑھنے والے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دِل نے یہ فیصلہ تو جلدی ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ ممکن

---

[1] صوفیوں کو ان کے ایک بڑے اُستاد (حافظ شیرازی) کا مشورہ بھی یہی ہے کہ ۔ ؎

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذارید تا بمیرد در رنج خود پرستی

اور زیادہ قرینِ قیاس ہے بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ و شاہ اسمٰعیل شہید جیسے اکابر علم و دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے وہ بھی ایک فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھر اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دِل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لئے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور اُن کے شخصی حالات اور اصلاحی تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور عند اللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا، اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں اسرارِ دین کے عارف اور امت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر اُن میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے ——— بیشک مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحبِ وحی تو نہیں ہوتا، لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروّج بھی نہیں ہو سکتا، خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہُوا اور اس کا داعی خاص ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو، اُس میں اگر وہ بدعت و غیر بدعت میں امتیاز نہ کر سکے گا تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہو گا۔

بہرحال یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی اُلجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی رہی ہے، اور اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پالینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد چند میل ٹہلتے، اُس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہو لیا۔ اور رات اپنے بحث و مباحثہ اور اس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا، کہ :-

"میرے دِل و دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوف کے اعمال و اشغال کے بارہ میں جواب تک سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں، چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کُھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔"

موصوف میری یہ بات سُن کر مسکرائے اور فرمایا :-

"مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلایئے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا :-

"بدعت کی تعریف تو علمانے کئی طرح سے کی ہے لیکن جو زیادہ منقح اور محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی چیز کا اضافہ جس کے لئے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔"

فرمایا :-

"ہاں ٹھیک ہے لیکن یہ بتلایئے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو، اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جا سکتی ہو جس طریقے سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی،

بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے استعمال کو بھی آپ "دین میں اضافہ اور" بدعت" کہیں گے ؟ ——— (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا)
مثلاً دین سیکھنا اور سکھانا ضروری ہے اور دین میں اس کا نہایت تاکیدی حکم ہے اور آپ جانتے ھیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں اس کے لئے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کے لئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا، نہ مدرسے تھے نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کے لئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے، اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم و تعلم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا، اور اب تک اسی سے قائم ہے ——— تو کیا تعلیم و تعلم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی "دین میں اضافہ اور بدعت کہا جائے گا ؟"

میں نے عرض کیا :-

"نہیں ! "دین میں اضافہ" جب ہوتا ہے، جب کہ مقصود اور امر شرعی بنا کر کیا جائے لیکن اگر کسی دینی مقصد کے لئے حاصل کرنے کے لئے قدیم طریقے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو "دین میں اضافہ" نہیں کہا جائے گا، اور نہ وہ بدعت ہوگا"

فرمایا :-

"بس سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے اُن سب کی نوعیت بھی یہی ہے ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تحلیہ کے لئے کیا کرایا جاتا ہے جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے ——— مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اس کی رضا کا دھیان، فکر کرنا، اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا[1] ——— لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں دین کی تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضورؐ کے فیضانِ صحبت سے صحابہ کرامؓ کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی، لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کیلئے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی، تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کیلئے صحبت کے ساتھ ذکر و فکر کی کثرت" کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی ——— اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے اُن کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو

---

[1] کتاب و سنت کے جن نصوص سے یہ بات مع[illegible]تی ہے اُن میں سے چند آئندہ اوراق میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔

مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لئے اُن کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے ——— اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہے، تو ان میں سے کسی چیز کو مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے، اور اسی لئے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں رد و بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں؛ بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لئے ان کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کر دیتا ہے، اور بعضے ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنھیں اس طرح کا ذکر شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالےٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کرایا جاتا ہے۔"

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی خلجان تو دُور ہو گیا لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہو گئی کہ یہ جو کچھ فرمایا ہے اس کو خود آزما کے دیکھا جائے اور اپنے ذاتی تجربے سے قلبی اطمینان اور مزید یقین حاصل کیا جائے، لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربے کے لئے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں، اس لئے میں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا، کہ:-

"اگر یہ ذکر شغل ان مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے، اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر میں بھی اس کا محتاج ہوں، لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رکھا ہے، اُن کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

فرمایا:-

"مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے، اور جان پڑتی ہے۔ لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ وہ ادھر دیدیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے بادا صاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ، حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سوواں اور ہزارواں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سک رہی ہیں) اس میں اُن کے اخلاص اور قلب کی اُس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستہ سے پیدا کی گئی تھی ——— لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بیچارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں۔ ناقص اعلےٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔"

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:۔

" خدا معلوم لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے، وہ اسی راستہ سے حاصل کرلے اور ہم کو بھی بتلادے، ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے جن میں سینکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحب الہام بھی تھے۔"

میں نے عرض کیا، کہ:۔

" جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو اور وہ یہ محسوس کرتا ہو کہ اُسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے، تو کیا وہ کسی مدّت تک اُس کام کو چھوڑ کے اس کی تحصیل کرے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اُس کو بھی کرتا رہے اور اس کے ساتھ اس کو حاصل کرنے کی بھی کوشش کرے؟؟"

فرمایا:۔

" ہاں! ہو سکتا ہے، البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں کچھ مدّت کے لئے یکسوئی کے ساتھ اسی طرح مشغول ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

میں نے عرض کیا:۔

کیا اس کے لئے بیعت ہونا بھی ضروری ہے؟"

فرمایا:۔

" نہیں اور بالکل نہیں! ہاں طلب اور اعتماد کے ساتھ محبت اور صحبت ضروری ہے، بیعت تو صرف تعلق اور اعتماد کے اظہار کے لئے ہے، ورنہ اصل مقصد میں بیعت کو کوئی خاص دخل نہیں ہے۔"

میں نے عرض کیا، کہ:۔

" پھر مجھ کو بھی کچھ فرمادیں۔"

فرمایا:۔

" مولوی صاحب! حدیث شریف میں ہے "المستشارُ مؤتمَن" (جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اُس کو پوری دیانت داری سے مشورہ دینا چاہیئے) میں آپ کے لئے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ اس مقصد کے لئے فلاں صاحب یا فلاں صاحب کی طرف رجوع کریں، ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے اور آپ جیسے علم والوں کے لئے میں اُن ہی حضرات کو اہل سمجھتا ہوں۔"

میں نے عرض کیا:۔

"ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے بھی کچھ دل میں تھی، اور اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہوگئی لیکن چونکہ مجھ میں یہ طلب یہیں پیدا ہوئی ہے اس لئے میں تو اس راستے میں حضرت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔"

موصوف نے اپنی محبت و شفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یا دو دفعہ پھر انہی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا، لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمایا اور میری مصروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرما دیا اور میں نے کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد میں غالباً چار پانچ دن وہاں اور مقیم رہا، جب اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا، کہ :-

"حضرت دہلوی (یعنی مولانا محمد الیاس) کی خدمت میں ضرور جایا کریں، اور کچھ قیام کیا کریں۔"

اس موقع پر مولانا موصوف کے متعلق بہت بلند چند کلمات بھی ارشاد فرمائے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورہ کی تعمیل پر آمادہ کیا اور جیسا کہ مولانا مرحوم کے ملفوظات کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد ہی میں نے مولانا موصوف کی شخصیت کو کچھ جانا اور کچھ عرصہ کے بعد میں یہ بھی سمجھ سکا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہیت اور خانقاہی مشاغل اور اہل خانقاہ سے جو مجھے بُعد تھا اس میں اچھا خاصہ دخل میرے اس احساس کو بھی تھا کہ ان حلقوں میں دین کا فکر اور اس کی خدمت کا جوش میں کم پاتا تھا، حالانکہ میں اس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خاص میراث سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے کہ ان بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر اس کی اصلاح و تعدیل کے لئے ہی حضرت مولانا محمد الیاس کی خدمت میں حاضری اور قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے تاکید فرمائی، گویا مجھے ایک عشق باز اور صاحب اخلاص بندے کے دین کے درد اور اس کی راہ میں اس کی تڑپ اور بے کلی کا مشاہدہ کرانا تھا اور دکھانا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد!

آٹھ، نو برس پہلے کا یہ واقعہ ہے، حافظہ نے اب تک جتنا کچھ محفوظ رکھا لکھ دیا ہے اور اپنی اور ان بزرگ کی گفتگو کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے اس سب کو روایت بالمعنی ہی سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ کی باتیں رہ گئی ہوں، اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں جو اس موضوع پر بعد میں کسی اور صحبت میں ان بزرگ سے سُنی گئی ہوں، بہر حال جو توضیحات و تشریحات ان بزرگ کی طرف منسوب کر کے یہاں لکھی گئی ہیں اس کا اطمینان ہے کہ سب باتیں انہی کی ہیں۔

تصوف کے اعمال و اشغال کے متعلق جس ذاتی تجربہ کا ارادہ کیا تھا، افسوس ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لاابالی کی وجہ سے، اور کچھ اپنے دوسرے مشاغل کی کثرت کی وجہ سے اور خاص نوعیت کے سبب سے کما حقہٗ وہ تجربہ تو نہیں کیا جا سکا، تاہم جو ٹوٹا پھوٹا اور برائے نام سا تعلق اس سلسلہ سے اور اس کے اشغال سے ان چند سالوں میں رہا اسی وجہ سے اس راہ کے بعض اکابر سے جو قرب حاصل رہا، اور ان کے احوال اور ماحول کو قریب سے

مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا اُس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تصوّف کے مخالفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں اور بعض خود اہلِ تصوّف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں ــــــــ خدا لگتی بات یہ ہے کہ غریب "تصوّف" اپنے منکروں اور مخالفوں کا تو مظلوم ہے ہی، لیکن جو اس کے حامل اور علمبردار ہیں، کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس مظلومیت کا باعث بن رہی ہیں۔

آج آنے والی بربادیوں اور ہلاکتوں سے نکلنے کے لئے تم بے قرار ہو، اور اس کے لئے طرح طرح کی تدبیروں کو سوچتے اور ڈھونڈتے ہو لیکن یہ کیا بدبختی ہے کہ ایک لمحہ اور ایک دقیقہ کے لئے بھی تمہارے دل میں یہ خیال نہیں گذرتا کہ سب سے پہلے اس کو تو اپنے سے راضی کرلیں، جس کے دروازے سے بھاگ کر ساری دنیا میں ہم نے ذلّتوں اور نامرادیوں کی ٹھوکریں کھائیں، حالانکہ وہ کہہ چکا ہے اور کہہ رہا ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝ (۲۸:۸)

اے مسلمانو! اگر تم اللہ سے ڈرو اور اس کے حکموں کے آگے جھک جاؤ تو پھر تمہیں کسی چیز کیلئے بھی کسی دوسری تدبیر کرنے کی احتیاج باقی نہیں رہیگی وہ دنیا میں تمہارے لئے عزت و اقبال کا ایک شرف و امتیاز پیدا کردیگا اور تمہاری تمام گمراہیوں کو معاف کردیگا وہ تو سب سے زیادہ بخشدینے والا اور صاحب رحم و الطاف ہے۔

پھر اگر اُٹھنا ہے تو اُٹھ کھڑے ہو کیونکہ چلنے کا وقت یہی ہے اور اس کے بعد موت کے سوا کچھ نہیں۔ آج تم کو کوئی انجمن، کوئی جمع شدہ دولت اور روپیہ کی مقدار، کوئی پولیٹکل سرگرمی اور کوئی انسانوں اور ممبروں کے اجتماع محض کا ایک جتھا، آنے والے مصائب سے بچا نہیں سکتا، جب تک کہ خود تمہارے اندر کوئی انقلابی تبدیلی نہ ہو، اور جب تک کہ تم اپنے خدا سے اس کی راہ اور اس کی مرضیات کی راہ میں اپنے تئیں دے ڈالنے کا عملی عہد نہ باندھ لو، اور اسی کے بتلائے ہوئے طریقہ، اور اسی کے حکم و ایما کے ماتحت ہو کر اس کے نہ ہو جاؤ۔

ابوالکلام آزاد

مولانا محمد منظور نعمانی

تصوّف اور اسکے اعمال و اشغال کے متعلق چند یقین

(۱) تصوّف کا مقصد اور اُس کی حقیقت

الحمد للہ کہ اب اس باب میں کسی طرح کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات اور ملکات کی تحصیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے جن کو کتاب و سنت ہی میں کمال ایمان و اسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا ہے، چونکہ اس بارہ میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں اُلجھنیں ہیں۔ اس لئے جو کچھ اس سلسلہ میں میں نے سمجھا ہے اس کو ذرا تفصیل سے عرض کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کے لئے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے مثلاً محبت کے بارے میں سورۂ بقر کی ایک آیت میں ارشاد ہے:۔

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۝ (سورۂ بقرہ - ۲۰-ع)

اور جو ایمان والے ہیں اُن کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔

اور حدیث صحیح میں ہے:۔

(یعنی ایمان کی حلاوت اُس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں، اُن میں سے اوّل یہ کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اُس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اُس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ ہی کے واسطے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اُس کے لئے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ سورۃ الانفال: ع-۱

سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دِلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو، اور جب اُن کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نورِ ایمان میں زیادتی ہو، اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

اور سورۂ "مومنون" میں اللہ تعالیٰ کے اچھے اور کامیاب بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝

بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہیں، اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں، اور جن کا حال

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝
اَلْمُؤْمِنُوْنَ ع ۴

کہ اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک اعمال کرتے وقت) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ اُن کو اللہ کے حضور میں لوٹ کے جانا ہے (معلوم اُن کے یہ عمل وہاں قبول ہوں یا نہ ہوں) وہی لوگ بھلائی کی طرف تیز گامی کرتے ہیں اور وہی ان کے لئے دوڑ کر بڑھنے والے ہیں۔

اور سورۂ زمر میں قرآن مجید کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے، کہ :۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۝ زمر: ع ۔ ۳

اس سے ان لوگوں کے بدن کانپنے لگتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر اُن کا ظاہر و باطن نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے۔

اور سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے :۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ
اٰل عمران:

وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو (ہر وقت اور ہر حالت میں) یاد کرتے، اور یاد رکھتے ہیں، کھڑے، بیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔

اور سورۂ "مزمل" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ مزمل

اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہو کے اسی کی طرف متوجہ رہو۔

ان آیتوں میں جن اوصاف و کیفیات کو اہل ایمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں :۔

(۱) ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔

(۲) اُن کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف اور لرزش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

(۳) اُن کے سامنے جب آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نور ایمان میں اضافہ ہو۔

(۴) اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں، اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔

(۵) وہ ہر دم اللہ کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہوں۔

(۶) اللہ کا خوف اُن پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی وہ ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابل قبول بھی ہو گی یا نہیں۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت یا اس کی آیتیں سننے سے اُن کے جسم کانپ جاتے ہوں۔ اور اُن کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی طرف اور اُس کی یاد کی طرف جھک جاتا ہو۔

(۸) ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں، اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔

(۹) ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

اور قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال اور کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدْ اِسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔
مشکوٰۃ شریف

جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لئے محبت کرے (جس سے محبت رکھے) اور اللہ کے لئے ہی بغض رکھے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کے لئے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی رضا کے لئے ہی ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اُس نے اپنا ایمان کامل کرلیا۔

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے:۔

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔ (بخاری ومسلم) وَفِیْ رِوَایَۃٍ اَنْ تَخْشَی اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَعْبُدُ اللّٰہَ: (فتح الباری)

احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرو (یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو) گویا تم اُس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو پر وہ تو تم کو ہر جگہ اور ہر آن دیکھتا ہے۔

پہلی حدیث میں "اخلاص" کا ذکر ہے، اور دوسری حدیث میں "احسان" کا، اور یہ دونوں اِن ہی احوال وکیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دین میں ان احوال وکیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے حصول اور ان میں ترقی کے لئے اللہ تعالےٰ سے دعائیں فرماتے تھے ——— اس سلسلہ کی یہ چند دعائیں اس عاجز کے نزدیک خاص طور سے غور اور توجہ کے لائق ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ۔

اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیَّ کُلِّھَا وَخَشْیَتَکَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاءِ عِنْدِیْ وَاقْطَعْ عَنِّیْ حَاجَاتِ الدُّنْیَا بِالشَّوْقِ اِلٰی لِقَائِکَ وَاِذَا اَقْرَرْتَ اَعْیُنَ اَھْلِ الدُّنْیَا مِنْ دُنْیَاھُمْ فَاَقْرِرْ عَیْنِیْ مِنْ عِبَادَتِکَ

اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ ہر قابل محبت چیز سے زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو اور ڈرنے کے قابل ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کر دے کہ دنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کٹ جائیں اور جب تو دنیا والوں کو اُن کی چاہتی دنیا دے کے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کر، اور اپنی عبادت کے ذریعہ

میرے دل میں سکون اور ٹھنڈک پیدا کر۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ اَخْشَاكَ كَاَنِّیْ اَرَاكَ اَبَدًا حَتّٰی اَلْقَاكَ : الخ

اے اللہ! مجھے ایسا کردے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گویا ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جا ملوں

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِیْمَانًا یُبَاشِرُ قَلْبِیْ اِیْمَانًا صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّهٗ لَا یُصِیْبُنِیْ اِلَّا مَا كَتَبْتَ لِیْ وَرِضًا مِّنَ الْمَعِیْشَةِ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ :۔

اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہوجائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقینی اور قطعی علم حاصل ہوجائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئے گی جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے (یعنی یہ علم میرے دل کا حال ہوجائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گذارہ تو نے میرے لئے مقرر اور مقدر کردیا ہے میں اس پر اپنے دل کی رضا تجھ سے مانگتا ہوں

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ التَّوْفِیْقَ لِمَحَابِّكَ مِنَ الْاَعْمَالِ وَصِدْقَ التَّوَكُّلِ عَلَیْكَ وَحُسْنَ ظَنٍّ بِكَ ۔

اے اللہ! جو اعمال تجھے پسند ہیں میں اُن کی توفیق تجھ سے مانگتا ہوں اور سچے توکل کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے ساتھ حُسنِ ظن کی تجھ سے ہی استدعا کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ وَتَرْضٰی بِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ

اے اللہ! میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جسے تجھ ہی سے اطمینان اور اُنس حاصل ہو، جسے تیری ملاقات پر سچا ایمان اور یقین نصیب ہو جو تیری قضا و قدر پر راضی ہو اور جو تیرے دین پر قانع ہو

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِیْ مَسَامِعَ قَلْبِیْ لِذِكْرِكَ

اے اللہ! میرے دل کے کان اپنے ذکر کے لئے کھول دے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ قُلُوْبًا اَوَّاهَةً مُّخْبِتَةً مُّنِیْبَةً فِیْ سَبِیْلِكَ

اے اللہ! میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں جو نرم اور درد آشنا ہوں۔ ٹوٹے ہوئے ہوں اور تیری طرف رجوع کرنے والے ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشْیَتَكَ وَذِكْرَكَ

اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے

وَاجْعَلْ هِمَّتِیْ وَهَوَایَ فِیْمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰی — خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت اُن کی طرف ہو جو تجھے محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا . . . — اے اللہ! میرے قلب میں نور بھر دے اور مجھے نور عطا فرما دے

وَاَعْطِنِیْ نُوْرًا . . . . وَاجْعَلْنِیْ نُوْرًا — ..... اور مجھے سراپا نور بنا دے۔

یہ سب دُعائیں (اور اس قسم کی اور بھی بیسیوں دعائیں) کتب حدیث شریف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مروی ہیں، آپ یہ دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے اور اُمت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔

ان دعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں، مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ کا خوف، اللہ سے شوقِ ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دُنیا کی ضروریات اور خواہشات کو فراموش کر دیا کہ ہو جائیں، عبادت میں آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقین صادق، رضا بالقضا، توکل علی اللہ، حسنِ ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن ہونا اور مانوس ہونا، اور اُس کی عطا پر قانع ہونا، ذکر اللہ تعالیٰ سے قلب پر اثر لینا، اُس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا۔ اللہ تعالیٰ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ کی یاد اور اس کا خوف وساوس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے، اور بندہ کا جی صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں، نور سے قلب کا معمور ہو جانا۔

ظاہر ہے ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے، نہ اعمال کے باب سے، بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

پس تصوف در اصل اس قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہیں اور اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبتِ شیخ اور کثرتِ ذکر و فکر) کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں، ایسی تدبیریں جن کا تجربہ تصدیق کرتا ہے اور صاف ذہن رکھنے والوں کے لئے ان کی نفسیاتی اور عقلی توجیہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔[1]

یہاں یہ عرض کر دینا بھی غالباً ناظرین کے لئے مفید ہوگا کہ مندرجہ بالا آیات و احادیث و دعاؤں سے جن قلبی کیفیات کا دین میں مطلوب و مقصود ہونا معلوم ہو چکا ہے ان میں سے چند مثلاً عشق اور یقین اور قلب کی رقت اور سوز و گداز یہ تو اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں اور باقی زیادہ تر ان کے نتائج اور لوازم ہیں، اس لئے تصوف کے ان اعمال و اشغال کے ذریعہ براہِ راست صرف ان بنیادی کیفیات ہی کو قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کے بعد باقی چیزیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ اصولی نظریہ جس پر تصوف کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر اس کو دین کا تکمیلی شعبہ سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] عقلی توجیہ کے لئے "صراطِ مستقیم" (مرتبہ شاہ اسماعیل شہیدؒ) کے چند ابتدائی اوراق کا مطالعہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کسی درجہ میں کافی ہوگا۔

یہ عاجز بلا کسی انکسار کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا اُبالی پن اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے چونکہ میں اس سلسلے کے تجربے کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکا، اس لئے خود تو ان کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں، لیکن جو تھوڑی سی اور برائے نام توجہ کی جا سکی اور اس راہ کے بعض اکابر کی خدمت میں کبھی کبھی حاضری کی جو توفیق اس سلسلہ میں ملتی رہی، اسی سے الحمدللہ یہ یقین اور اطمینان حاصل ہوگیا کہ تصوف اور اس کے اعمال واشغال کی غرض وغایت اور ان کی حقیقت کے متعلق اُن بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

---

(۲) اور دل ودماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تصوف کے ذریعے جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی حلاوت کا حصول ان پر موقوف ہے۔

(۳) اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تصوف ایمان واسلام کی تکمیل کے علاوہ ایک خاص قسم کی رُوح اور طاقت پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے اور اگر حسن اور طبیعت کو مناسبت ہو تو یقین اور اعتماد، ہمت وعزیمت، صبر وتوکل اور ماسوی اللہ تعالیٰ سے بے خوفی جیسے اوصاف (جو طاقت کا سرچشمہ ہیں) تصوف کے ذریعہ ان کو پیدا کیا جا سکتا ہے اور اُبھارا جا سکتا ہے، اسی لئے تصوف کو اپنانے کی سب سے زیادہ ضرورت اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا سب سے بڑا حق میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں کو ہے جو بے دینی کی اس دُنیا میں انبیاء علیہم السلام کے طرز اور طریقے پر کسی بڑے اصلاحی تحریک کے لیے مصروفِ جد وجہد ہوں اور مادہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہوں۔

(۴) تصوف سے دُوری اور بے خبری کے دَور میں میری یہ رائے تھی کہ تصوف کا قالب ہم کو بدل دینا چاہیے، لیکن بعد میں جب تصوف اور اس کے عاملین سے کچھ قرب پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ صورت اور قالب میں ترمیم اور تبدیل کا عمل برابر جاری ہے، اور خود ہماری اس صدی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ وغیرہ نے اپنے تجربے اور اجتہاد سے اس میں بہت کچھ ترمیم کی ہے اور زمانۂ حاضر کے تقاضے کے مطابق اس کو بہت مختصر اور سائنٹفک کر دیا ہے، اور اب یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور بلاشبہ سلوک میں تجدید کے اس سلسلہ کو برابر جاری رہنا چاہیے، لیکن اب اس کا پورا یقین ہوگیا کہ یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس فن کے امام اور خود اس سمندر کے شناور ہوں، ورنہ اگر اس خدمت کی ذمہ داری ایسے حضرات نے لے لی جنہوں نے نہ اس شعبہ کی تکمیل کی ہے اور نہ اس کے ساتھ ان کا گہرا عملی تعلق رہا ہے، تو اس کا بڑا امکان ہے کہ اخلاص اور ذہانت کے باوجود تصوف میں ان کی اصلاح وترمیم خدانخواستہ اس قسم کی ہو جیسی کسی روایتی بڑھیا نے شاہی باز کی مرمت کی تھی۔

(۵) تصوف اور اہلِ تصوف سے قریب ہونے کے بعد جن چند باتوں کا یقین حاصل ہوا اُن میں سے ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا اور کیسا ہی ذہین فطین ہو، تصوف سے صحیح واقفیت حاصل کرنے کیلیے اور اس کے مالہ وماعلیہ کو علیٰ وجہ البصیرت جاننے کے لئے اس کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ تصوف کی حامل کسی شخصیت کی صحبت اور خدمت میں اس کا کچھ وقت گذرے اور اس شعبہ کا عملی تجربہ حاصل کرنے پر بھی وہ زندگی کے کچھ دن صرف کرے اور اس کے بغیر تصوف کو پوری طرح سمجھا اور جانا نہیں جا سکتا ـــــــ جن صاحب ارشاد بزرگ کی خانقاہ میں اپنی حاضری کا ذکر گذشتہ صفحات میں راقم سطور کر چکا ہے، ایک موقع پر میرے ہی ایک سوال کے جواب میں موصوف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں ادا فرمایا تھا، کہ:

”گھر کے اندر کی چیزوں کا پورا علم تو گھر میں داخل ہو کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔“

الغرض تھوڑے سے ہی تجربے سے اربابِ تصوف وسلوک کے اس مشہور مقولہ کی تصدیق حاصل ہوگئی، کہ ”من لم یذق لم یدر“، یعنی لذت ایں مے نشناسی بخدا تانہ چشی، کچھ دن ہوئے ایک بڑے اچھے ذی علم اور ذہین صاحبِ قلم دوست کی ایک تحریر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا جس کے

انہوں نے تصوف پر اظہارِ خیال فرمایا تھا، کم از کم ناچیز کو تو ایسا کچھ محسوس ہُوا کہ کوئی بڑا ذہین بچہ کسی ایسے موضوع پر اظہارِ خیال کر رہا ہے جس کے مبادی سے بھی واقفیت حاصل کرنے کا اس کو موقع نہیں ملا ہے، مگر پھر بھی اس کی ذہانت قابلِ داد ہے۔

(۶) تصوف اور اس کے بعض حلقوں کے اس چند روزہ قرب و تعلق سے بھی یہ اندازہ ہُوا کہ جس طرح دین کے دوسرے شعبوں کی طرف اچھی صلاحیتیں رکھنے والے افراد فی زمانا بہت کم متوجہ ہوتے ہیں، مثلاً دیکھا جا رہا ہے کہ علم دین کے طالبوں اور علمی نہ اور دین کی دعوت و خدمت کی طرف توجہ کرنے والوں میں بہت بڑی تعداد آج کل اُن ہی بے چاروں کی ہوتی ہے جو صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ادنیٰ اور پست درجہ کے ہوتے ہیں، بالکل یہی بلکہ شاید دین کے دوسرے شعبوں سے زیادہ افسوسناک اور ابتر حال اس لحاظ سے دین کے اس شعبہ (تصوف) کا بھی ہے —— اس وقت اُن "خانقاہوں" سے بحث نہیں جو در اصل دھوکہ فریب کی دُکانیں ہیں، اور جہاں اولیاء اللہ کے نام پر شرک و بدعت کا کاروبار ہوتا ہے، اور نہ یہاں اُن نااہل موروثی سجادہ نشینوں اور پیشہ ور پیروں، صوفیوں کا ذکر ہے جو تصوف کے نام اور بزرگوں کی نسبت کی تجارت کرتے ہیں، بلکہ جو واقعی مشائخِ حق اور صاحبِ ارشاد ہیں، اُن کے پاس بھی جو طالب بن کر اَب آتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ (شاذ و نادر مثالوں کو مستثنیٰ کر کے) دل و دماغ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بے چارے عموماً نیچی ہی سطح کے ہوتے ہیں، اور اگرچہ اپنے اخلاص اور اپنی صادق طلب اور محنت سے ان میں سے بھی بہت سے اس شعبہ کی کچھ برکتیں ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ بیچارے خانقاہیت کی بدنامی اور تصوف و روحانیت بیزاری کے اس دَور میں دین کے اس شعبہ اور افادیت تسلیم کرنے لوگوں کو مجبور کر دے۔

اصولی بات یہ ہے کہ جو کام جتنا زیادہ بلند اور لطیف و نازک ہو اُس کے کرنے والے بھی اُسی درجہ کے ہونے چاہئیں —— موجودہ دَور میں تصوف کی ناکامی اور بدنامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جو اس کے اہل ہیں وہ توجہ نہیں دیتے اور جو بیچارے توجہ کرتے ہیں، عموماً اُن کی صلاحیتیں معمولی ہوتی ہیں لیکن دنیا اُن ہی کو پھل سمجھ کر اصل درخت کے متعلق رائے قائم کرتی ہے۔

(۷) اس موقع پر ایک چیز خود مشائخ کرام کے متعلق بھی ناظرین سے بے تکلف عرض کرنا ضروری ہے۔

جس طرح دُنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کامیاب وکیل ہو وہ اچھا ڈاکٹر بھی ہو اور جو بالغ النظر فلسفی ہو وہ سیاسیات یا معاشیات کا ماہر بھی ہو اور جو ماہرِ فن انجینئر ہو وہ اچھا ادیب اور شاعر بھی ہو۔ بعینہٖ یہی حال دین کے مختلف شعبوں کا بھی ہے، بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو شخص وسیع النظر عالم اور بلند پایہ محدث یا فقیہ ہو وہ تصوف میں بھی خاص دستگاہ رکھتا ہو، یا جو صاحبِ قلم صُوفی اور عارف ہو وہ اسلامی قانون کا ماہر بھی ہو اور عہدِ حاضر کے اہم مسائل کے بارہ میں دینی نقطۂ نظر سے صحیح رائے قائم کرنے والی مجتہدانہ فکر و بصیرت بھی رکھتا ہو —— بلکہ حقائق اور واقعات کی اس دُنیا میں پہلے بھی اکثر ایسا ہی ہوا ہے، اور ہمارے اس زمانہ میں تو قریباً ۹۵، ۹۰ فی صد ایسا ہی ہے، کہ جو کسی ایک شعبہ میں ماہر اور کامل ہوتا ہے وہ دوسرے شعبوں میں اکثر خام ہی ہوتا ہے اس لئے اس زمانہ میں ایسے لوگ اکثر مایوس اور محروم ہی رہتے ہیں جو صرف کسی ایسے ہی شخص سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں جو اُن کے مفروضہ معیار کے مطابق ہر جہت سے کامل مکمل ہو۔

یاد آتا ہے راقم سطور نے اپنے ایک دوست سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ عرض کیا تھا:

> آپ ماضی اور حال کے ایسے متعدد حضرات سے یقیناً واقف ہیں جن کی زندگی آپ کی نظر میں دین اور تقوے کا کوئی اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ نہیں ہے اور بالخصوص اخلاص و احسان اور توکل و تسلیم جیسی اعلیٰ ایمانی صفات و کیفیات میں آپ کے نزدیک ان حضرات کا کوئی بھی خاص یا عام مقام نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کا علم و فکر اور ان کی خداداد ذہانت اور بصیرت آپ کے خیال میں قابلِ استفادہ ہے اور

ہم آپ ان کی چیزوں سے برابر استفادہ کرتے ہیں، اور اُن لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو صرف اس لیے اُن کی علمی اور تحقیقی کوششوں سے فائدہ نہیں اُٹھاتے کہ وہ ان کی نیک خواہش کے مطابق کوئی بڑے بزرگ اور صوفی قسم کے آدمی نہیں ہیں ——— اسی طرح ہم اللہ کے کچھ بندوں کو ایسا پاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں تصوف اور سلوک پر زیادہ توجہ دی اور کسی شیخ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا بڑا حصہ اس شعبہ کی تحصیل اور تکمیل پر صرف کیا اور اس لئے اس میں انہیں اختصاص اور امتیاز کا مقام حاصل ہو گیا، لیکن کسی دوسرے شعبے میں مثلاً علم و فکر ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں کوئی خاص بلندی حاصل نہیں ہے، اور اس لیئے دین کی بعض ضرورتوں کو جن کو ہم بہت اہم سمجھتے ہیں وہ اچھی طرح محسوس بھی نہیں کرتے اور ملت کے مشکل اور اہم اجتماعی مسائل میں وہ بہتر رہنمائی نہیں کر سکتے یا فرض کیجئے کہ مطالعہ یا غور و توجہ کی کمی کی وجہ سے وہ وقت کے بہت سے اہم معاملات کو صحیح طور پر سمجھتے بھی نہیں، تو ان خامیوں کو دیکھ کر اُن کے اس کمال کی بھی نفی کرنا جو واقع میں اُن کو حاصل ہے اور اپنی احتیاج کے باوجود اس شعبہ میں بھی ان سے ہمارا استفادہ نہ کرنا اُن ہی لوگوں جیسی عامیانہ غلطی ہے جن کو تنگ نظری اور تاریک خیالی کا مریض سمجھا جاتا ہے :

اس میں شک نہیں کہ جی تو اپنا بھی یہی چاہتا ہے اور ہر اچھا بھلا آدمی یہی چاہے گا کہ جو شیخ خانقاہ اور عارف حق آگاہ ہو وہ بلند پایہ مفسر محدث اور بالغ النظر فقیہ و مجتہد بھی ہو، بلکہ ساتھ ہی ملت کی قیادت اور امامت کبریٰ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھی پوری صلاحیتیں رکھتا ہو اور اسی طرح جو اچھی نظر و فکر رکھنے والا عالم دین ہو وہ اسلامی شریعت و قانون میں مہارت رکھنے کے علاوہ اُمت کی قیادت اور حکومت کے ز[illegible] کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو اور مزید براں اپنے قلب و باطن کے لحاظ سے اپنے دور کا جنیدؒ و بایزیدؒ بھی ہو ——— لیکن یہ صرف ہم[illegible] جی کی چاہت اور ایک خوش گوار تمنا ہوئی ——— اور یہ دُنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ خیالات اور تمناؤں کی دُنیا نہیں ہے. بلکہ حقائق واقعات کی دُنیا ہے اور عملی آدمی کو اپنا طرزِ عمل واقعات ہی کی اس دُنیا کو سامنے رکھ کر معین کرنا چاہیئے.

جن صاحب خانقاہ بزرگ کی خدمت میں اپنی حاضری کا ذکر راقم سطور نے گذشتہ صفحات میں کیا ہے اُن ہی کی زبان سے کئی بار یہ حکیما[illegible] ارشاد سُنا ہے :-

" یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ کسی ایک ہی دُکان پر سب سودے اچھے مل سکیں، اس لئے جو سودا جس دُکان پر اچھا ملے اُس کیلئے آدمی کو اُسی دُکان پر جانا چاہیئے "

یہاں تک جو کچھ عرض کیا اس میں راقم کا رُوئے سخن تصوف کے مخلص ناقدین اور منکرین کی طرف تھا، اب اپنے تجربے ہی کے چند نتیجے اور چ[illegible] تاثرات تصوف کے عالموں اور حامیوں سے بھی عرض کرتے ہیں.

(۸) تصوف کے مقصد اور اس کی حیثیت کے متعلق جو کچھ پہلے عرض کیا ہے اگرچہ خود اپنے کو بحمد اللہ اس میں شک نہیں رہا ہے کہ اصلیت وہی[illegible] لیکن بعض مشائخ حق اور ان کی خانقاہوں سے طلب اور عقیدت کا تعلق رکھنے والوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کا ذہن اس بارہ[illegible] صاف نہیں ہوتا اور وہ طرح طرح کی غلط خیالیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، مثلاً تصوف کے جن اعمال و اشغال کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے[illegible]

بعض کیفیات پیدا کرنے کا وہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں، خانقاہی حلقوں میں بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں جو ان اعمال و اشغال ہی کو دراصل سلوک سمجھتے ہیں، اسی طرح
ان اعمال و اشغال اور اذکار کے بعض وہ آثار جن کے متعلق تمام مشائخ محققین یہ فرماتے ہیں، کہ :-

" ان کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ یہ ایک طرح کے " اوہام وخیالات" ہیں "

تصوف کے ہمارے حلقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات ان ہی کی طلب میں الجھے ہوئے ملتے ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سی غلط باتیں اور الجھنیں ہیں جن میں خانقاہی طالبین بکثرت مبتلا ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگ ذہنوں کی طرف پوری توجہ نہیں فرماتے، حالانکہ یہ بڑے اہم درجہ کی ضرورت ہے، اور اس ناچیز کا خیال ہے کہ سلوک وطریقت کے جن حلقوں میں پہلے کبھی گمراہیوں نے جگہ پائی ہے وہ بعض ایسے بزرگوں کی اس قسم کی بے توجہی کا نتیجہ ہے، جو خود ہمارے نزدیک ان گمراہیوں میں مبتلا نہ تھے ——— تصوف کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ مشائخ اگر پوری طرح چوکنے نہ رہیں اور اپنے طالبین اور معتقدین کے ذہنوں کی صفائی اور خیالات کی اصلاح کی فکر نہ رکھیں تو شیطان کی گمراہ کرنے والی کوششیں اس حلقے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو سکتی ہیں، بہرحال ہمارے بزرگوں کو اس خطرے سے غفلت نہیں برتنی چاہیئے اور اذہان وخیالات کی صفائی اور اصلاح کو ذکر شغل سے بھی مقدم سمجھنا چاہیئے۔

(۹) ائمہ تصوف امام ربانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہ نے اس پر بڑا زور دیا ہے کہ طالب کو پہلے ضروری عقائد کی تصحیح اور بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنا چاہیئے اور اس کو شیخ کے فرائض میں گردانا ہے کہ وہ اگر طالب اور مرید میں یہ کمی دیکھے تو اس کو اس طرف متوجہ کرے لیکن بعض مشائخ کے یہاں اس ذمہ داری کے احساس اور اس کے عملی اہتمام میں بہت کمی دیکھنے میں آئی بہت سے بیچارے سیدھے سادے ایسے بندے بھی ان کی خدمت میں بیعت کے لئے آتے ہیں جن کی باتوں سے اور جن کے ظاہری حال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان بیچاروں کو دین کی وہ ضروری اور بنیادی باتیں بھی معلوم نہیں جو ہر مسلمان کو معلوم ہونا چاہئیں، اور بہت واضح اندازہ اس بات کا ہوتا ہے کہ غالباً ان کو صحیح نماز پڑھنا بھی نہ آتا ہوگا، لیکن کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ ایسوں کو بھی مشائخ کے عام طریقے پر تجدید ایمان اور توبہ کرا کے بس بیعت کر لیا گیا اور پڑھنے کے لئے کوئی تسبیح ان کو بتا دی گئی اور بقدر ضرورت دین سیکھنے کی طرف نہ کوئی توجہ دلائی گئی اور نہ اس کا کوئی انتظام فرمایا گیا، حالانکہ ان حضرات کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ ایسے جو لوگ بھی ان کے پاس آئیں، ان کو دو چار دن کے لئے ان کی ضروری تعلیم (عقائد اور نماز کی تصحیح وغیرہ) کسی خادم کے سپرد کر دی جائے، جیسا کہ نئے آنے والوں کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دستور تھا۔

ممکن ہے کہ ان بزرگوں کی اس بے توجہی کا سبب یہ ہو کہ ان آنے والوں کی اس درجہ جہالت اور دین کی بنیادی چیزوں سے بھی اتنی ناواقفیت کا ان حضرات کو اندازہ نہ ہوتا ہو، لیکن عرض یہی کرنا ہے کہ اس طرف ان حضرات کی توجہ کا مبذول نہ ہونا اور اس پہلو پر نظر نہ کرنا ان کے ذمہ دارانہ منصب کے شایانِ شان نہیں كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته۔

(۱۰) تصوف کی تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے ان سے یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ مختلف زمانوں میں اس راہ سے کیسی کیسی گمراہیاں امت میں داخل ہوئی ہیں، اور آج بھی اپنے تصوف وصوفیہ کی طرف منسوب کرنے والے حلقوں میں کتنی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے تصورات اور اعمال، اسلام اور توحید کی بہ نسبت کفر اور شرک سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنہیں واقفیت اور بصیرت دی ہے وہ جانتے ہیں کہ خانقاہی حلقوں میں اس قسم کی گمراہیاں زیادہ تر بزرگوں کے ساتھ عقیدت اور خوش اعتقادی میں غلو اور تعظیم میں افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے شریعت وسنت کے حامل اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والے مشائخ حق کا خاص الخاص فریضہ ہے کہ وہ اپنے سے تعلق ومحبت رکھنے والوں کو اعتقادی اور عملی غلو اور افراط

ں اس بیماری سے محفوظ رکھنے کی طرف ہمیشہ پوری بیداری کے ساتھ متوجہ رہیں اور اس معاملہ میں ہرگز تساہل سے کام نہ لیں ـــــــ رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوۂ حسنہ ہمارے بزرگوں کے سامنے رہنا چاہیئے۔

حدیث شریف میں ہے، کہ ایک دفعہ کسی صحابیؓ کی زبان سے نکل گیا "مَاشَاءَ اللہُ وشئتَ"، (یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کو سخت تنبیہ کی اور فرمایا:۔

جعلتنی للہ ندًا بل ماشاء اللہ وحدہٗ۔ — تُو نے مجھے اللہ کے برابر بنا دیا، بلکہ یہ کہو کہ "جو تنہا خُدا چاہے"۔

ایسے ہی ایک اور موقع پر بعض صحابہؓ کو تنبیہ کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:۔

لا یستھوینکم الشیطان انا محمد بن عبد اللہ عبد اللہ ورسولہ ما احب ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنی اللہ

لوگو! تمہیں شیطان گمراہ نہ کرے اور تم اس کے بہکائے بہک نہ جاؤ، میں عبداللہ کا بیٹا مُحمّدؐ ہوں۔ اللہ کا بندہ اور بس اُس کا رسُول ہوں، میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس درجہ سے اُوپر اُٹھاؤ جہاں خدا نے مجھے رکھا ہے۔

اس بارہ میں رسُول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر کتنی باریک بین تھی اور آپؐ کس قدر محتاط تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے جو صحاح میں مروی ہے، کہ جس روز آپؐ کے صاحبزادے "ابراہیم" علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ السلام) کی وفات ہوئی، اتفاق سے اُسی روز سُورج کو گہن لگ گیا اور آپؐ کو شبہ ہوا کہ لوگ کہیں اس غلط خیالی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ سُورج کو یہ گہن بیتِ نبویؐ کے اس حادثہ کی وجہ سے لگا ہے، تو آپؐ نے اُسی وقت اعلان کرا کے لوگوں کو مسجد میں جمع کرایا، اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد اعلان فرمایا:۔

ان الشمس والقمر اٰیتان من اٰیٰت اللہ لا ینکسفان لموت احد ولا لحیاتہ الخ

چاند اور سُورج اللہ کی قُدرت کی نشانیوں میں سے دو نشان ہیں، کسی کی موت وحیات سے ان کو گہن نہیں لگتا (بلکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حساب کے مطابق اور اس کے حُکم سے ایسا ہوتا ہے)

اور چونکہ اُمت کے تمام طبقوں میں صرف مشائخ ہی کا طبقہ ایسا ہے جس کے ساتھ عقیدت میں لوگوں کو اس قسم کا غلو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس لئے ان حضرات کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ اس بارہ میں اپنی ذمہ داری اور مسئولیت ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں۔

تصوف اور اُسکے اعمال واشغال کے متعلق بعض شبہات

"یہاں تک جو لکھا گیا جب "الفرقان" کے صفحات میں یہ شائع ہوا تو بعض دوستوں کی طرف سے کچھ سوالات اس سلسلہ میں کئے گئے، اور الفرقان ہی میں اس عاجز نے اُن کے جوابات، دیئے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن جوابات کو بھی اس کتابچہ کا جزو بنا دیا جائے۔" (مؤلف)

۱۔ ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"تصوّف کی جو اہمیت آپ کے اس مقالہ سے ظاہر ہوتی ہے اگر واقعۃً اس کی اتنی ہی اہمیت ہے تو رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق اور اس کے اعمال واشغال سے متعلق صریح احکام کیوں نہیں دیئے؟ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی چیز دین میں اس قدر ضروری ہو کہ ایمان واسلام کی تکمیل اُس پر موقوف ہو اور رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُمت کو اُس کی تعلیم نہ دی ہو۔"

——— معلوم ہوتا ہے ان صاحب نے میرے مقالہ کو بالکل غور سے نہیں پڑھا، میں نے جو کچھ اس میں لکھا ہے اُس کا حاصل ہی یہ ہے کہ تصوّف کا جو مقصود ہے اور جو اس کی غایت اور غرض ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت وخشیت اور یقین واستحضار اور اخلاص واحسان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا) اس کی تو دین میں اہمیت ہے اور یقیناً ایمان واسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پُوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اُمت کو اس کی تعلیم وترغیب بھی دی ہے، کتاب وسُنت کے جو نصوص اس سلسلہ میں پہلے لکھے جا چکے ہیں وہ اس کے ثبوت کے لئے کافی سے زائد ہیں،

——— رہے اس کے خاص اعمال واشغال (مثلاً اذکار ومراقبات وغیرہ) تو مَیں بصراحت لکھ چکا ہوں، کہ یہ اُس کے صرف وسائل اور ذرائع ہیں اور اس قسم کے ذرائع اور وسائل کے متعلق نبویؐ طریقِ تعلیم اور اصولِ تشریع کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی تصریح اور تعیین نہ کی جائے تاکہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق جو جائز ذرائع اور وسائل مناسب سمجھے جائیں انہیں اختیار کیا جا سکے اور اس میں تصوّف کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ دین کے دوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے ——— غور فرمایا جائے دین کا سیکھنا سِکھانا دین کے بنیادی فرائض میں ہے، لیکن کتاب وسُنت میں اس کے طریقے کی بھی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔

اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت اُمت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسُولِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق بھی نہیں بتلایا کہ تم اس کے لئے فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتیٰ کہ جب عہدِ صدیقیؓ میں یمامہ کی جنگ میں چار سو حافظِ قرآن صحابہؓ شہید ہو گئے تب

سے پہلے حضرت عُمر (رضی اللہ عنہ) کو یہ خیال ہُوا کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا بھی انتظام کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں خاص اہتمام اور ذمہ داری سے ایک سرکاری نسخہ بھی تیار ہونا چاہیئے، چنانچہ انہوں نے اپنی یہ تجویز حضرت ابُوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے سامنے پیش کی، حضرت صدیق (رضی اللہ عنہ) کو ابتدائً اس کے ماننے میں تامل ہوا اور انہوں نے یہی فرمایا، کہ جس چیز کو رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہ تو خود کیا اور نہ ہمیں اس کا حکم دیا، اس کا ہم کیوں اہتمام کریں، لیکن حضرت عُمرؓ کے دلائل سے بالآخر وہ مطمئن ہو گئے اور پھر اُنہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا ——— پھر حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے اس سلسلے میں ایک اور قدم اُٹھایا، کہ اپنے خاص اہتمام سے اور اپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کرا کر تمام بلادِ اسلامیہ میں روانہ کیں اور اُس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت واشاعت، تعلیم و تبلیغ اور ترجمہ و تفسیر کے سلسلے میں خدمتِ قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اُٹھائے جا چکے ہیں۔

پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو، اُس کے ذرائع اور وسائل کی تصریح اور تعیین بھی کتاب وسُنت میں ہونی چاہیئے اور اُمت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور تعیین کے ساتھ کتاب وسُنت میں ملنی چاہئیں، بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کے طریقِ تعلیم اور اصولِ تشریع سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

۲۔ ایک صاحب نے دریافت کیا، کہ :۔

اَللّٰہ کی محبت وخشیت اور اخلاص واحسان وغیرہ ایمانی کیفیت پیدا کرنے کے لئے تصوّف میں جن اعمال واشغال (مثلاً صحبتِ شیخ اور اذکار ومراقبات وغیرہ) پر زور دیا جاتا ہے، کیا کتاب وسُنت میں کہیں اس کا اشارہ ملتا ہے، کہ ان چیزوں سے یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں؟"

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ اس عاجز کے نزدیک صُحبت اور ذکر وفکر کا قلب پر اثر انداز ہونا کتاب وسُنت سے اشارۃً ہی نہیں بلکہ صراحۃً بھی معلوم اور ثابت ہے[1]۔ لیکن اگر بالفرض کتاب وسُنت میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہ ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اللہ تعالیٰ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ بیان کر رہے ہیں کہ ان اعمالِ صالحہ سے یہ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو اُن کی اس تاثیر اور افادیت کو ہمیں مان لینا چاہیئے۔

---

[1] حدیث شریف میں ہے کہ حضرت حنظلہ صحابیؓ اور حضرت صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) اپنا حال یہ پاتے تھے کہ جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور مجلس میں رہتے دل کی یہ کیفیت رہتی کہ ایک لمحے کے لئے غفلت نہ ہوتی اور غیب گویا شہود ہو جاتا، لیکن جب اپنے گھروں پر ہوتے تو یہ کیفیت نہ ہوتی ——— اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں دفن کر کے ہم نے مٹی سے ہاتھ جھاڑے ہی تھے کہ ہمیں اپنے قلوب بدلے ہوئے نظر آئے، یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عالم سے عالمِ برزخ میں منتقل ہو جانے سے ہمارے قلوب کی حالت میں محسوس فرق پڑا۔ ان دونوں روایتوں سے صحبت کا قلبی کیفیات میں مؤثر ہونا صاف طور سے معلوم ہوتا ہے اور ذکر کی تاثیر کے لئے قرآن مجید کی آیت "ولذکر اللہ اکبر" صریح شاہد ہے، جس سیاق میں یہ آیت وارد ہے اُس پر غور فرمایا جائے، اور فکر و مراقبہ بھی ذکر ہی کی ایک خاص اور زیادہ گہری شکل ہے۔

میرے جن دوست نے یہ سوال کیا ہے وہ "صالح لٹریچر" کے ذریعہ اصلاح پر بہت یقین رکھتے ہیں (مجھے بھی اس سے انکار نہیں ہے) لیکن وہ سوچیں، کیا کبھی اُن کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اُن کے "صالح لٹریچر" کی اس تاثیر کے متعلق کوئی اشارہ کتاب و سنت میں موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہ اُن کے دل میں کبھی بھی یہ سوال پیدا نہ ہوگا کیونکہ وہ اپنے ذاتی علم و تجربے سے اور اپنے جیسے بہت سے لوگوں کے تجربے سے اس بارہ میں مطمئن ہیں عجیب بات ہے کہ اپنی چیزوں اور اپنے تجربوں کے ساتھ تو ہمارا طرزِ عمل یہ ہے' لیکن حضرت جنید بغدادیؒ، سری سقطیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ شہاب الدین سُہروردیؒ، مجددالف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ جیسے ہزاروں بندگانِ خدا کا اجماعی اور اتفاقی تجربہ بھی ہمارے لئے موجبِ اطمینان نہیں۔

۳۔ ایک صاحب نے ذکر میں جہر اور ضرب سے اپنا سخت طبعی انقباض ظاہر کیا ہے، اور یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:

"اس میں ریاکاری کا شبہ ہوتا ہے اور آج کل کے اکثر سنجیدہ حضرات اس کو ریاکاری ہی سمجھتے ہیں۔"

جہری اور ضربی ذکر سے طبعی انقباض تو ایک ذوقی اور طبعی چیز ہے، اس لئے اس کے بارہ میں کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبیعتیں اور ان کے ذوق بہت مختلف بنائے ہیں، بعض طبیعتیں وہ بھی ہیں جنہیں جہری اور ضربی ذکر ہی سے اُنس اور سکون حاصل ہوتا ہے، اسی لئے مشائخ محققین طبیعتوں کے رُخ اور اُن کی مناسبتوں کو دیکھ کر جہری یا سری ذکر یا دوسرے اشغال اُن کے لئے تجویز کرتے ہیں' لیکن ذکر بالجہر کے بارہ میں ریاکاری کا جو خطرہ ظاہر کیا گیا ہے یہ میرے نزدیک بالکل بے سوچی سمجھی بات ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ بقول انہیں صاحب کے سنجیدہ آدمی ذکر بالجہر کو ریاکاری سمجھتے ہیں اپنا اندازہ یہی ہے کہ کسی کو بالجہر ذکر کرتا دیکھ کر لوگ اس کے معتقد نہیں ہوتے بلکہ بہت سے آدمی اس کو کم عقل یا مکّار اور ریاکار سمجھتے ہیں پس ایسی حالت میں جہری ذکر میں ریاکاری کا امکان فی زمانہ بہت کم ہے' بلکہ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل کے ماحول میں ذکر بالجہر اکثر ریا شکنی کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور دفعِ خطرات و وساوس میں ذکر بالجہر کی تاثیر اہلِ تجربہ کے نزدیک بالکل مسلّم ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات یہاں اور قابلِ ذکر ہے کہ ذکر میں جہر اور ضرب کے جو طریقے تصوف کے بعض سلاسل میں معمول ہیں۔ فنِ طب اور علم النفس کی روشنی میں انکی افادیت اور تاثیر بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ عاجز تو تصوف کے اکثر اشغال کے متعلق یہی سمجھتا ہے کہ بعض کیفیات اور تاثرات اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے سب ایک طرح کی طبی اور نفسیاتی تدبیریں ہیں۔

۴۔ ایک صاحب نے فرمایا، کہ:۔

"تم نے اپنے مقالہ میں مقامات اور لطائف پر کوئی روشنی نہیں ڈالی حالانکہ یہ تصوف کے وہ عناصر ہیں جنہیں سمجھے سمجھائے بغیر تصوف کو نہیں سمجھا جا سکتا۔"

جواباً گذارش ہے کہ اس عاجز کے نزدیک لطائف و مقامات کو کوئی مقصدی اہمیت حاصل نہیں' اور اس راہ کے جن بزرگوں کی میں حاضری اور اُن کے ارشادات سُننے کی سعادت راقم کو نصیب ہوتی رہی ہے اُن سب سے بھی ہمیشہ یہی سُنا کہ یہ لطائف وغیرہ راستہ چلنے کے اپنے محسوسات اور ملاحظات ہیں۔ نہ یہ خود مقصود کے لئے ذریعہ، اور اس لئے اس کو اہمیت دینا نہ صرف یہ کہ غیر صحیح ہے، بلکہ اصل مقصد سے

مُضر ہیں، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ان چیزوں میں ہر راہرَو کا دراک یکساں ہی ہو، بلکہ بعض اکابر سے سُنا کہ اللہ کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سُلوک کی راہ میں اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے بہت تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور سُلوک و تصوف جو اصل مقصد ہے وہ اُن کو بفضلہ تعالیٰ نصیب ہو جاتا ہے اور آخر تک اُنہیں کسی لطیفہ اور کسی مقام کا بھی ادراک اور احساس نہیں ہوتا۔

اس عاجز کو اس دَور کے جن اکابرِ سلوک سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، ان سب کو اس بات پر متفق پایا کہ خاص کر اس زمانہ کے لئے یہی اجمالی سلوک زیادہ مُناسب ہے اور محققین نے تصریح فرمائی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا سلوک بھی اجمالی ہی تھا۔

۵۔ ایک صاحب نے فرمایا، کہ :۔

"ہم بہت سے آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ برسوں خانقاہوں میں رہنے اور ذکر شغل کرنے کے باوجود اُن میں وہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں جن کے لئے تصوف اور خانقاہیت کی ضرورت بتلائی جاتی ہے۔"

بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن انصاف فرمایا جائے یہ حال اب صرف خانقاہوں ہی کا نہیں ہے بلکہ ہمارے دینی مدرسوں اور دوسرے تمام دینی و اصلاحی سلسلوں کا حال بھی اس وقت یہی ہے کہ سینکڑوں میں دس بیس مشکل سے نکلتے ہیں، تو کیا ان سب کو غلط اور فضول قرار دے کر ایک دم ختم کر دینا صحیح طرزِ عمل ہو سکتا ہے۔ صحیح طریق کار ان حالات میں یہ ہے کہ ہر سلسلہ اور ہر ادارہ کو زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی ہر ممکن کوشش اور تدبیر کی جائے، اور اس میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے۔ لیکن نتائج میں کمی اور نقص دیکھ کر اُس کو سرے سے ختم کر دینے اور فضول قرار دینے کا فیصلہ نہ کیا جائے جن ناسازگار حالات میں اور جس انتہائی درجہ کے فاسد اور سخت مادہ پرستانہ ماحول میں ہمارے ان دینی اداروں کو کام کرنا پڑ رہا ہے اُن میں دس پانچ فی صدی کامیابی بھی ہرگز ناکامی نہیں ہے۔

۶۔ ایک صاحب نے فرمایا، کہ :۔

"صُوفیوں کے طرزِ عمل سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ تصوف دراصل "رہبانیت" اور گوشہ نشینی کا نام ہے اور اس کی تائید کرنا دراصل اسلام میں رہبانیت کو داخل کرنا ہے۔"

میرے نزدیک یہ بھی اُن ہی باتوں میں سے ہے جو اس سلسلہ میں بے سوچے سمجھے کی جاتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں دراصل خود اُن کے دِل میں تصوف کے غلط معنی بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ اپنی اس غلط فہمی کی بناء پر صُوفی صرف اُن ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جو رہبانیت پسند ہیں اور گوشہ گیر ہیں، اور پھر اپنے اسی تصور کی بُنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ تصوف رہبانیت کا نام ہے اور ہر صوفی "راہب" ہی ہوتا ہے ——— اگر یہ حضرات خود اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے اور تصوف کے لئے رہبانیت اور گوشہ گیری کو ضروری نہ سمجھتے تو اس دَور میں بھی ایسے بہت سے بندگان خدا دیکھ سکتے تھے جو بحمد للہ سچے صوفی بھی ہیں اور مردِ میدان بھی، مگر بات وہی ہے کہ جو گوشہ گیر نہ ہو، یہ بیچارے اپنی کم نگاہی سے اُس کو صُوفی مان ہی نہیں سکتے۔ اس کا علاج تو خود اپنے علم اور تصور کی تصحیح سے ہی ہو سکتا ہے۔

؎ مقالہ کے ابتدائی حصے میں جن بزرگ کی خدمت میں حاضری اور تصوف کے متعلق اُن بزرگ سے اپنی گفتگو کا اس عاجز نے ذکر کیا ہے، بعض حضرات کا شدید اصرار ہے کہ اُن کا اسمِ گرامی ظاہر کیا جائے، اس لئے عرض کرتا ہوں کہ میرے وہ محسن اور مخدوم بزرگ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری مدظلہٗ ہیں۔

آخری بات

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ناچیز اُس تصوف کا قائل اور حامی ہے جس کا ذکر اس مقالہ میں کیا گیا ہے، اور یہی اہلِ حق کا تصوف ہے، باقی اس نام سے سینکڑوں خانقاہوں میں شرک و بدعت کا جو کاروبار ہوتا ہے، اللہ نے اپنے جس بندے کو بھی ایمانی بصیرت کا کوئی ذرہ نصیب فرمایا ہو وہ یقیناً اُس سے بیزار ہوگا۔

"جو رب الارباب انسان کی غذاء جسمانی کا یہ سب کچھ سامان رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس کی روحانی غذا کا انتظام نہ کرے۔

یہ روحانی غذا کیا ہے۔ یہ ہدایت و سعادت انسانی کی دعوتِ الٰہیہ ہے جس کے لئے فی الحقیقت روحِ انسانی بھوکی پیاسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسم حیوانی مدتوں کی بھوک اور پیاس کے بعد بے قرار و مضطرب ہو کر غذا کو پکارتا ہے اسی طرح ضلالت کی شدت اور ہدایت کا فقدان بھی روحِ انسانی کو ایک معنوی جوع و عطش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کے لئے اپنی غذا کو دیوانہ وار پکارنے لگتی ہے۔ پس وقت آتا ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق، اس فاطر الارض والسماوات، اس مدبر الامر والاشیاء اور اس مسبب الاسباب حقیقی کی ربوبیت ظاہر ہوتی ہے جس نے انسان کی حیاتِ جسمانی کے لئے تمام دنیا کو طرح طرح کے اغذیہ و ثمرات کی بخشش سے ایک خوانِ کرم بنا دیا ہے۔ اس کا دستِ مخفی غذائے روحانی کا بیج بوتا ہے۔ اور اپنی نشو فرمائی سے اسے یکایک سربلند و بالاقامت بنا دیتا ہے۔ پھر اسکی سعادت و ہدایت کی نعمتوں سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بھر جاتے ہیں۔ اور اس بخشش کی دعوت سے ارضِ الٰہی گونج اٹھتی ہے۔" (الہلال ۱۳ر جنوری ۱۹۱۴ء)

ابوالکلام آزاد

مولانا محمد الیاس

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

ایک دفعہ ان کے سامنے کسی نے خواجہ حافظ کی غزل کے یہ چند اشعار پڑھے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دل بری داند — نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
نہ ہر کہ طرف کلہ کج نہاد تند نشست — کلاہ داری و آئینِ سروری داند
ہزار نکتہ باریک تر ز موی این جاست — نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

فرمایا کہ یہاں خواجہ حافظ رہ گئے اور حزیں بنارسی بہت آگے نکل گئے ہیں پھر حزیں کے حسب ذیل اشعار پڑھے ؎

نہ ہر کہ طبل و علم ساخت سروری داند — نہ ہر کہ تاخت بہ لشکر سکندری داند
خیال سایہ نشیننانِ ندیار جداست — دگر نہ ہر شجرے سایہ گستری داند
علّوِ فطرت و طبع رسا خدا داد است — نہ ہر گیاہے کہ روید سنوبری داند
ز ہر دہان و لب نکتہ دلنشیں نشود — نہ ہر کہ خطبہ بخواند پیغمبری داند

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائیوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ راقم کو بھی رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ شیخ محمد اکرم ایم۔ اے کا "ارمغان پاک" دیکھا۔ فرمایا ذرا شعراء کی فہرست پڑھو۔ راقم نے حزیں بنارسی کا نام پڑھا۔ تو کہا اس کا منتخب کلام سنائیے! راقم نے حزیں کا سارا کلام جو "ارمغان پاک" میں منتخب تھا سنایا۔ فرمایا جس شخص نے حزیں کے کلام کا انتخاب کرتے وقت حسب ذیل اشعار نظر انداز کر دیئے۔ اس نے چنداں انصاف نہیں کیا ہے۔ بہر حال اپنا اپنا ذوق ہے۔ پھر یہ اشعار فرمائے ؎

علالم بادستی ہا مبارک سینہ چاکی ہا — قدح بیہودہ دگل در گریباں کردہ می آید
حزیں امشب نگاہ رہزن میخانہ پروازش — زمستی تکیہ ہر جانب بہ مژگاں کردہ می آید

پھر حزیں کے لوحِ مزار کے حسب ذیل اشعار سنائے ؎

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم — ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید ایں جا
حزیں از پائے رہ پیمابسے سرگشتگی دیدم — سرِ شوریدہ بر بالین آسائش رسید ایں جا

یہ تو قلندر کی بات تھی۔ اب سالک کی سنیئے (یعنی نظام الدین اولیاءؒ کی)

شرط است کہ با امر خدا دم نہ زنی — کیں نوع کہ گفتی نہ تو مردی نہ زنی
گل را چہ مجال است کہ پرسد ز کلال — از بہر چہ سازی و چرا می شکنی

بیماریوں کے ہجوم اور مصائب کی یلغار میں اس کوہِ استقامت کے معتقدات میں ادنیٰ لغزش بھی رونما نہ ہوئی ہر مزاج پرسی کرنے والے کو بشاشت سے "الحمدللہ" کہہ کر جواب دیتے فرماتے ہاں بھائی الحمدللہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ اس سے بدتر حالت بھی تو ہو سکتی ہے۔ اور میں تو ادھر سے شر کا قائل ہی نہیں ہوں۔ کوئی اللہ تعالیٰ ہمارے دشمن یا شریک ہیں۔ جو ہمیں شر اور ایذا پہنچائیں ادھر تو خیر ہی خیر ہے۔ وہ جو کچھ ہمارے لیے کرتے ہیں بہتر ہوتا ہے اگرچہ وہ ہمارے فہم سے بالاتر کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد ایک مجذوب کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ ان کی خدمت میں ایک رئیس حاضر ہوا اس نے عرض کیا حضرت کچھ پریشانیاں ہیں۔ دعا کرو۔ حضرت مجذوب نے فرمایا یہی پریشانیاں کہ خدا آپ کی بات نہیں مانتا یعنی جو کچھ آپ چاہتے ہیں۔ وہ نہیں ہوتا تو آپ اس کی بات مان لیجئے۔ وہ اس کے زیادہ لائق ہے۔ پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائیگا بھائی اس کے سوا چارہ نہیں الحمدللہ کہتے ہی ہیں خیر ہے۔ حضرت قلندر پانی پتی نے اس مسئلہ پر اعتراض کیا۔ تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے کیا خوب جواب دیا ہے

گہے راست کند او صورتِ مردی و زنی گہے بشکند جامۂ جاں را زتنی

کس نیست کہ پرسد استادِ قضا را از بہر چہ سازی و چرا می شکنی

فرمایا۔ میری دوستی اور دشمنی ایک دفعہ ہوتی ہے۔ اگر ایک مرتبہ دوست سے گزند پہنچ جائے یا کوئی دوست بن کر مکاریوں اور فریب کاریوں کا ہدف بنائے تو عمر بھر اس پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ "چناں رویم کہ دیگر بگرد ما نرسی" یہ بلیغ شرابیہ کے شعر کا دوسرا مصرع ہے مکمل شعر یہ ہے

شدیم خاک رہت گر بہ ورد ما نرسی چناں رویم کہ دیگر بگرد ما نرسی

کسی ایک اور محفل میں جب اپنے اس نظریہ کا اظہار فرمایا تو ارشاد ہوا

دل نیست کبوتر کہ پر د باز نشیند از گوشۂ بامی کہ پریدم پریدم

ما بخیر شما بہ سلامت۔ بس اسے کنارہ کشی سمجھئے یا دشمنی۔ میری طرف سے صرف اتنا ہوتا ہے۔ الحمدللہ کہ میں نے آج تک نہ کسی کے متعلق برا سوچا ہے۔ اور نہ برا کیا ہے۔ انگریز اور مرزائی کے سوا۔ جہاں تک بس چلا ان کے متعلق برا سوچا بھی اور کیا بھی "عمر بھر کبھی اعتماد نہیں کیا" اس فقرہ کو بڑے زوردار لہجے میں فرما رہے تھے۔ راقم نے چھیڑنے کی غرض سے کہا کہ کمال ضد ہے تو فرمایا۔ ارے جاہل! ضد نہیں یہ ایمان ہے حدیث میں کیا پڑھا ہے؟

لا یلدغ المومن من جحر واحد مرتین۔ مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنگ نہیں کھاتا۔

فرمایا۔ لوگ تعجب کرتے ہیں کہ میں کہاں سے کھاتا ہوں۔ ہائے اصغر کس وقت یاد آئے

میں رندِ بادہ کش بھی بے نیاز جام و ساغر بھی

رگِ ہر تاک سے آتی ہے کھنچ کر میری قسمت کی

میرا تو ہمیشہ خدا کی ڈھیری پہ ہاتھ رہا ہے۔ میرا رزق میرے پیچھے دوڑتا ہے۔ کبھی قبول کرتا ہوں کبھی رد کرتا ہوں۔ میں تو اپنے اللہ کا کو

ہوں۔ مجھے وہ صرف رزق دیتا ہی نہیں بلکہ میری ٹھوڑی سے پکڑتا ہے۔ اور میرے منہ میں ڈالتا ہے۔ ؎

مگس ہرگز نہ باشد عنکبوت رزق را روزی رساں پر می دہد

دنیا میں چار قیمتی چیزیں محبت کے قابل ہیں۔ مال۔ جان۔ آبرو۔ ایمان۔ لیکن جب جان پر کوئی مصیبت آئے تو مال قربان کرنا چاہیئے۔ اور آبرو پر کوئی آفت آئے تو مال و جان دونوں کو۔ اور اگر ایمان پر کوئی ابتلا آئے تو مال۔ جان آبرو سب کو قربان کرنا چاہیئے اور اگر ان سب کے قربان کرنے سے ایمان محفوظ رہتا ہے۔ تو یہ سودا سستا ہے۔

فرمایا شریف کبھی بزدل نہیں ہوتا۔ کمینہ کبھی بہادر نہیں ہوتا۔ کمینہ پر جب کوئی ابتلا آتی ہے۔ تو دشمن کے سامنے ایڑیاں رگڑتا ہے۔ اور شریف جب دشمن اس کے قابو میں آتا ہے تو اسے معاف کر دیتا ہے۔ اور نہ ماضی کے کسی واقعہ پر ملعون کرتا ہے میاںؐ (وہ اپنی زبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میاں کے نام سے پکارتے) کی شرافت اور بہادری دیکھئے۔ جب حضرت عمرؓ نے ایمان لانے کے بعد عرض کیا حضرت کعبہ میں کیوں نماز نہیں پڑھتے" تو فرمایا کہ تیری قوم نہیں پڑھنے دیتی۔ حالانکہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے رکاوٹ تو حضرت عمرؓ تھے۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ آپ نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا شرافت ہے۔

اس کے بعد چند کمینہ سیاسی لیڈروں کا ذکر آیا اور چند کمینہ صفت صحافیوں کا جو لوگوں کے ماضی کے بخیئے ادھیڑتے ہیں۔ اور بزعم خویش اسے حب الوطنی خیال کرتے ہیں چنانچہ اسی مناسبت سے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے ؎

خونے کہ مشک گشت دلش می شود سیاہ	زاں سفلہ کن حذر کہ دولت رسیدہ است	(غنی)
انار دانہ پختہ شود بکند اندپوست را	کمینہ گر بزرگ شود برنجاند دوست را	(صائب)
نہ ہر کہ صدر نشیند عزیز شد کہ غبار	گر بدیدہ فند طوطیہ نخواہد بود	(ایجی)
سفلہ خویش پوش را بر مسند خود جا مدہ	کفش گر زرّیں بود بر سر نمی باید نہاد	

اس عالم کی بے ثباتی اور ناپائیداری حیات کے متعلق حضرت کے ملفوظات نہایت دلچسپ اور علمی ہوتے تھے۔ اس موضوع پر غالب ان کا بڑا معاون ثابت ہوتا۔ راقم نے مختلف مجلسوں میں اس موضوع پر حسب ذیل اشعار سنے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مصرع ثانی کو کچھ اس رنگ سے پڑھتے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اسیر دامِ خیال ہو جاتا ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

دوسرے مصرع میں نفی و اثبات کا ذکر ہے۔ اس کے پڑھنے میں ایک عجیب سماں پیدا کرتے ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

یہ حیات دنیوی ان کے نزدیک۔ مرگ کا دربدر رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنے کلام میں بھی اس طرح ذکر کیا ہے "مردیم در انتظار مرگیم" فرماتے یہ کوئی حیات ہے لاحول ولا قوۃ۔ ہمیں تو اس حیات کے مسئلہ میں ابوطالب کلیم کی تعبیر پسند ہے۔ ؎

بد نامیٔ حیات دو روزے نبود بیش آں ہم کلیم با تو چہ گویم چساں گذشت
یک روز صرفِ بستنِ دل شد باین و آں روزِ دگر بکندنِ دل زین و آں گذشت

کلیم نے حیات نہیں کہا بلکہ تہمتِ حیات سے تعبیر کیا ہے۔

اپنی نشست گاہ میں تشریف فرما تھے۔ ان دنوں روس کے مصنوعی سیارے فضا میں پرواز کر رہے تھے اور اشتراکی مبلغ لوگوں کو یہ باور کرانے پھر رہے تھے از روئے مذہب اسلام آسمان پر کوئی نہیں جا سکتا۔ حضرت مرحوم کے سامنے کسی نے اس کا ذکر کیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا" ہم تو انسان کے اعلیٰ علیین پہنچنے پر ایمان لائے بیٹھے ہیں۔ یہ چاند اور ستارے تو راستے میں ہیں لیکن مجھے اس کامیابی (فضائی تسخیر) پر کوئی مسرت ہے نہ تعجب۔ ہم تو تب مانیں گے۔ جب یہ موت کا کوئی علاج کر دکھلائیں۔ اور کسی آدمی کے متعلق یہ فیصلہ کر دیں کہ اب وہ نہیں مرے گا۔ تو پھر میں انہی کو سجدہ کروں گا ؎

مدت سے لیے پھرتا ہوں ایک سجدۂ بیتاب ان سے کوئی پوچھے وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں

کبھی کبھی اپنے احوال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ....

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی
گو مشتِ خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد

شاہ صاحب کی قرآن کریم سے شیفتگی اور والہانہ محبت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ استغنائی صورتوں میں قرآن مجید کے علاوہ کسی دوسری کتاب کے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ آپ کا عقیدہ تھا۔ کہ میرے لیے جو کچھ ہے قرآن مجید میں موجود ہے۔ اگر آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں پر نگاہ کر سکتی ہے۔ تو میں دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے صرف کتاب الٰہی پر توجہ کیوں نہ مرتکز کروں۔ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں۔ میری باتوں میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ صرف قرآن کی برکت سے ہے۔

خواجہ فرید علیہ الرحمۃ کے ایک جولاہے مرید کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ وہ ہر سال حضرت خواجہ کی خدمت میں ایک لنگی ہدیہ لایا کرتا تھا۔ ایک سال ناغہ کرنے کے بعد دوسرے سال دو لنگیاں ہدیہ لایا۔ حضرت نے گذشتہ سال غیر حاضری کا سبب پوچھا تو اس نے عرض کیا کہ گذشتہ سال لنگی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔ تو فوراً حضرت نے لنگیوں کو آگ لگوا دی اور فرمایا "جہڑی شے یار کنوں نکھیڑے اونکوں بھاہ لا"۔ یعنی جو چیز یار سے جدا کرے اسے آگ لگا دو

میں بھی یہی کہتا ہوں جو چیز مجھے قرآن سے جدا کرے اسے آگ لگا دو ؎

چوں غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

شاہ صاحب کے ایک عقیدت مند عالم دین حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ وہ اپنے اس پاکیزہ سفر کے تاثرات بیان کر رہے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے ایک حدیث کا یہ مفہوم بیان کیا۔ کہ جب تک حج بیت اللہ کا سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت تک قیامت نہیں آئیگی۔ حج و طواف جب لوگ چھوڑ دینگے تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔ اس حدیث کے بعد حضرت شاہ صاحب نے رشید الدین وطواط کا حسب ذیل شعر پڑھا ؎

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است
عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

اوصاف حمیدہ اور اخلاق عظیمہ کا مجسمہ تھے۔ اپنی شخصیت کو ابھارنے کا خیال تک نہ لاتے تھے۔ ہمیشہ دوسروں کے محاسن کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کرتے۔ خود بینی سے احتراز فرماتے۔ اکثر کہا کرتے ہیں تو گندگی کا ڈھیر ہوں۔ اللہ میاں نے سفید چادر ڈال رکھی ہے اور پر عطاء اللہ لکھ دیا ہے۔ ارے بھائی ہم دوسروں کے عیب کیا دیکھیں ہمیں تو اپنے عیبوں سے فرصت نہیں ملتی ؎

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔

دوسروں کے عیب تلاش کرنا کوئی آدمی کا کام ہے۔ حضرت شیخ سعدی دو باتوں میں دین کا خلاصہ ذکر کر گئے ہیں ؎

مرا پیر دانائے مرشد شہاب دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آں کہ بر غیر بد بیں مباش دگر آنکہ بر خویش خود بیں مباش

سادہ طریق زندگی حضرت مرحوم کو بے حد پسند تھا۔ اسباب کی فراوانی۔ تکلفات کے بندھنوں کو قہر خداوندی سے تعبیر کرتے افرنگی صوفے ایرانی قالین، انہیں لہو لاتے۔ حجاج کرام سے جب عربوں کے عیش و عشرت کے واقعات سنتے تو بے حد افسوس کا اظہار کرتے۔ اور اپنی گرجدار آواز میں فرماتے "کر دڑ لعنت ہو اس رحم پر جہاں سے فرنگی کا نطفہ ڈھل کر آتا ہے۔ دیکھو عربوں کو کس کثرت سے اسباب عیش و تنعم فراہم کر رہا ہے۔ تاکہ یہ مشکل پسند شتر بان کسی کام کے نہ رہیں ؎

عیش کوشی۔ آرزوؤں کا ہجوم۔ کثرت حاجات۔ خدا سے بُعد کے اسباب شمار فرماتے ہوئے ایک صوفی شاعر میر کا یہ شعر پڑھا ؎

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

یہ پڑھتے ہوئے فرمایا۔ حاجتیں جس قدر کم ہوتی جاتی ہیں۔ بندہ خدا کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اگر کوئی حاجت نہ ہو تو خدا ہے۔
اپنے بارے میں ارشاد فرمایا۔ کہ اگر میرے ساتھ میرے بیوی بچوں کا دھندا نہ ہوتا تو میں کسی دریا کے کنارے خاک دھس کی

کٹیا میں زندگی گزارتا۔ وقت ضرورت اعدائے دین، دشمنانِ اسلام پر حملہ آور ہوتا۔ اور پھر اپنی کٹیا میں آ پناہ لیتا۔ اس کے بعد جامی ابن یمین۔ احمد رضا کے چند اشعار سنائے جنہیں طوالت کے پیشِ نظر چھوڑ رہا ہوں۔ صرف جامی کے اشعار عرض ہیں ؎

لنگکے زیر لنگکے بالا ! نے غم دُزد نے غم کالا

گز کے بوریا و پوستکے دِلکے دردمند و دوستکے

ایں قدر بس جامی را ! عاشق رند و لا اُبالی را

ایک عقیدتمند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ کہیں ملازمت کا امیدوار تھا۔ اُس نے اپنی آمد کا مقصد عرض کیا۔ اور ایک آفیسر کے نام سفارشی مکتوب کی خواہش کا اظہار کیا۔ جواباً شاہ صاحب نے فرمایا۔ بھائی میں نوکریاں چھڑانے والا پیر ہوں۔ اگر ملازمت کے لیے کسی سفارش کی ضرورت ہے۔ تو کسی سجادہ نشین یا کسی مخدوم یا کسی بڑے لیڈر کے پاس جاؤ۔ ہماری آشنا نوازی کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر آپ کہیں ملازم ہوں اور آپ کے اعلیٰ افسر کو معلوم ہو جائے یہ عطاء اللہ شاہ کا ملنے والا ہے۔ تو فوراً آپ پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ اور آپ ملازمت سے سبکدوش ہو کر آرام سے گھر بیٹھے ہونگے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میرا بھانجا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میں اس کی والدہ کو ملنے کے لیے گیا۔ جو میری پھوپھی زاد بہن تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے غم میں رو رہی تھی۔ میں نے اسے کہا دیکھو بہن ! اگر تیرا بیٹا ہفتے کے اندر واپس آ وے تو میرا کیا انعام ؟ کچھ انعام طے پا گیا۔ میں نے اسی روز اس کو ایک خط لکھا۔ (وہ اس وقت بنگال کی کسی چھاؤنی میں تھا۔)

عزیزم ! آپ بڑی مناسب جگہ پہنچ گئے ہیں اپنے کام کی رفتار سے مجھے مطلع کرتے رہنا۔ وغیرہ وغیرہ

نیچے میں نے دستخط کیے ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔

خط سنسر ہو کر اس یونٹ کے انگریز کرنل کو پہنچا۔ اس نے فوراً میرے بھانجے کو بلایا اور پوچھا کون ہے عطاء اللہ شاہ اس نے بتایا تو کرنل نے اسے واپس جانے نہیں دیا۔ بلکہ اس کا سامان وغیرہ منگوا کر فوراً ہی چھاؤنی سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

اس کے بعد سفارشی مکتوب لینے والے کو فرمایا بھائی ! ہمارا نام تو اس کام کے لیے ہے۔ اگر کہیں ملازم ہو جاؤ تو پھر میری خدمات حاضر ہیں۔ ؎

اے ہم نفساں ! آتشم از من بگریزید
ہر کس کہ شود ہمرہِ ما دشمن نویشت

بیس (۲۰) بڑے مسلمان

301 دیوبندی

- حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ
- مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
- مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
- شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
- مولانا اشرف علی تھانویؒ
- علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ
- مولانا عبید اللہ سندھیؒ
- مفتی کفایت اللہ دہلویؒ
- مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
- علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
- مولانا محمد الیاس دہلویؒ
- مولانا شاہ عبد القادر رائپوریؒ
- مولانا احمد علی لاہوریؒ
- مفتی محمد حسن امرتسریؒ
- مولانا ابو الکلام آزادؒ
- مولانا محمد علی جوہرؒ
- مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ
- مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
- مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
- سردار احمد خان پتافیؒ

جمع و ترتیب : عبد الرشید ارشد